تکملہ

اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ

زیر اہتمام

دانش گاہ پنجاب، لاہور

(جلد دوم)

شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

باراوّل: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ / مئی ۲۰۰۸ء

تکملہ

اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ

زیر اہتمام

دانش گاہ پنجاب، لاہور

مدیر اعلیٰ

پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف

جلد ۲

(افرنج ...... اے اے بیون)

شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

بار اوّل: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ / جون ۲۰۰۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب: تکملہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد دوم

یکے از تالیف: شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ناشر: پروفیسر ڈاکٹر محمد نعیم، رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر محمود الحسن عارف، صدر شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

زیر سرپرستی: مجلس انتظامیہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران، وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

پروفیسر ڈاکٹر ثمر فاطمہ، ڈین کلیہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

بار اوّل: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ / جون ۲۰۰۸ء

طابع: محمد خالد خان، سپرنٹنڈنٹ، پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور

تعداد: ایک ہزار

ملنے کا پتہ:	پنجاب یونیورسٹی سیلز ڈپو، البیرونی روڈ، علامہ اقبال کیمپس، لاہور
برائے رابطہ:	شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، علامہ اقبال کیمپس، پنجاب یونیورسٹی، دی مال روڈ، لاہور
	پوسٹل کوڈ: 5400 فون نمبر: 042-9211607 فیکس نمبر: 042-9211607
	ای میل ایڈریس: chairman@ueipuedu.pk hasanarif5@hotmail.com hasanarif15@yahoo.com

مجلس ادارت

اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

باراوّل: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ / جون ۲۰۰۸ء

2008ء : 125 سالہ تقریبات جامعہ پنجاب کا سال

مجلس انتظامیہ

اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

---

(۱) از ۳ جنوری ۲۰۰۸ء (۲) تا وفات ۵ مئی ۲۰۰۸ء

اختصارات ورموز وغیرہ

اختصارات

(الف)

کتب عربی وفارسی وترکی وغیرہ اوران کے تراجم اوربعض مخطوطات، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

آ آ = اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی لاہور)

اا تک: تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

آ آ، ت = اسلام انسائکلو پیدیسی (= انسائکلو پیڈیا آف اسلام، ترکی).

آ آ، ع = دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (= انسائکلوپیڈیا آف اسلام، عربی).

آ آ، لائیڈن ا یا ۲ = Encyclopaedia of Islam (= انسائکلوپیڈیا آف اسلام، انگریزی)، باراول یا باردوم، لائیڈن.

ابن الابّار = کتاب تکملۃ الصلۃ، طبع کودیرا F. Codera، میڈرڈ ۱۸۸۷ء تا ۱۸۸۹ء (BAH, V-VI).

ابن الابّار = تکملہ = M. Alarco'ny-C. A. Gonz'alez Ap'endice a la adicio'n Codera de :Palencia در Tecmila، Misc. de estudios y textos arabes، میڈرڈ ۱۹۱۵ء.

ابن الابّار، جلد اول = ابن الابار: تکملۃ الصلۃ، Texte arabe d' apr'es un ms. de Fès, tome I, complétânt, les deux vol. édités par F. Codera، طبع A.Bel و محمد بن شنیب، الجزائر ۱۹۱۸ء.

ابن الاثیر ا یا ۲ یا ۳ یا ۴ = کتاب الکامل، طبع ٹورنبرگ (C.J.Tornberg)، باراول، لائیڈن ۱۸۵۱ تا ۱۸۷۶ء؛ باردوم، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، یا بار سوم، قاہرہ، ۱۳۰۳ھ، یا بار چہارم، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۹ جلدیں.

ابن الاثیر، ترجمہ فاینان = Annales du Maghreb et de l' Espagne، ترجمہ فاینان E. Fagnon، الجزائر ۱۹۰۱ء.

ابن بشکوال = کتاب الصلۃ فی اخبار ائمۃ الاندلس، طبع کودیرا F. Codéra، میڈرڈ ۱۸۸۳ء (BAH,II).

ابن بطوطہ = تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار، (Voyages of Ibn Bato cota)، عربی متن، طبع فرانسیسی مع ترجمہ از C.Defrémery و B.R.Sanguinetti، ۴ جلد، پیرس ۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۸ء.

ابن تغری بردی، قاہرہ = النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر و القاہرۃ، W.Popper، برکلے ولائڈن ۱۹۰۸ء تا ۱۹۳۶ء۔

ابن تغری بردی، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۴۸ھ ببعد.

ابن حوقل، کریمرز۔ وائٹ = ابن حوقل، ترجمہ J.H. Kramers and G. Wiet، بیروت ۱۹۶۴ء، دوجلدیں.

ابن حَوقل = کتاب صُورۃ الاَرض، طبع J. H. Kramers لائیڈن ۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء (BGA, II باردوم)، ۲ جلدیں.

ابن خُرّ داذبہ = المسالک والممالک، طبع ڈخویہ (M. J. de Goeje)، لائڈن ۱۸۸۹ء (BGA, VI).

ابن خَلدُون: عِبَر (یا العبر) = کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر ....، بولاق ۱۲۸۴ھ.

ابن خلدون: مقدمہ = Prolegomenes d' Ebn Khaldoun، طبع E. Quartreme're، پیرس ۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۸ء (I Notices et I Extraits, XVI-XVII).

ابن خلدون: روزنتھال = The Muqaddimah، مترجمہ Fraz Rosenthal، ۳ جلدیں، لنڈن ۱۹۵۸ء.

ابن خلدون: مقدمہ، دیسلان = Prolégomeneses d' Ibn Khaldoun، ترجمہ وحواشی M. de Slane، پیرس ۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۸ء (باردوم) ۱۹۳۴ء.

ابن خَلّکان = وَفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان، طبع وستنفلت F. Wustenfeld، گوٹنجن ۱۸۳۵ء تا ۱۸۵۰ء (حوالے شمار تراجم کے اعتبار سے دیے گئے ہیں).

ابن خلکان = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۸ جلد، بیروت ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۲ء.

ابن خلکان = کتاب مذکور، مطبوعہ بولاق ۱۲۷۵ھ، قاہرہ ۱۳۱۰ھ.

ابن خلکان، مترجمہ دیسلان = Biographical Dictionary، دیسلان: کتاب وفیات الاعیان، ترجمہ M. de Slane، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۴۲ء تا ۱۸۷۱ء.

ابن رُستہ = الأعلاق النفیسۃ، طبع ڈخویہ، لائیڈن ۱۲۹۲ تا ۱۸۹۲ء (BGA, VII).

ابن رُستہ، ویت Wiet = Les Atours Precieux، مترجمہ G. Weit، قاہرہ ۱۹۵۵ء.

ابن سَعد = کتاب الطبقات الکبیر، طبع زخاؤ (H. Sachau) وغیرہ، لائیڈن ۱۹۰۴ء تا ۱۹۴۰ء.

ابن عذاری = کتاب البیان المُغرِب، طبع کولن (G.S.Colin) و لیوی پُرووانسال (E. Lévi-Provençal)، لائیڈن ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۱ء جلد سوم، پیرس ۱۹۳۰ء.

ابن العماد: شذرات = شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، قاہرہ ۱۳۵۰ تا ۱۳۵۱ (سنین وفیات کے اعتبار سے حوالے دیے گئے ہیں).

ابن الفقیہ = مختصر کتاب البُلدان، طبع ڈخویہ، لائیڈن ۱۸۸۶ء (BGA, V).

ابن قُتَیبۃ: شعر (یا الشعر) = کتاب الشعر والشعراء، طبع ڈخویہ، لائیڈن ۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۴ء.

ابن قُتَیبۃ: معارف (یا المعارف) = کتاب المعارف، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۰ء.

ابن ہشام = کتاب سیرۃ رسول اللہ، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۰ء.

ابو الفداء: تقویم = تقویم البلدان، طبع رینو J.T.Reinaud و دیسلان M. de Slane، پیرس ۱۸۴۰ء.

ابوالفداء: تقویم، ترجمہ = Geographie d' Aboulfeda traduite de l'arabe en francaiz، ج ۱ و ۲/۱، از رینو، پیرس ۱۸۴۸ء و ج ۲/۲، از St. Guyard، ۱۸۸۳ء.

الاِدریسی: المغرب = Description de l'Afrique et de l' Espagne، طبع ڈوزی R. Dozy و ڈخویہ، لائیڈن ۱۸۶۶ء.

الاِدریسی، ترجمہ جوبار = Geographie d' Edrisi، مترجمہ از P.A.Jauber، ۲ جلد، پیرس ۱۸۳۶ء تا ۱۸۴۰ء.

الاستیعاب = ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۲ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۸ تا ۱۳۱۹ھ.

الاِشتقاق = ابن درید: الاشتقاق، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۴ء (اناستاتیک).

الاصابہ = ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴ جلدیں، کلکتہ ۱۸۵۶ء تا ۱۸۷۳ء.

الاِصطَخری = المسالک والممالک، طبع ڈخویہ، لائیڈن ۱۸۷۰ء (BGA, I) و بار دوم (نقل بار اول) ۱۹۲۷ء.

الاغانی ۱، یا ۲، یا ۳: ابو الفرج الاصفہانی: الاغانی، بار اول، بولاق ۱۲۸۵ھ، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۴۵ھ ببعد.

الاغانی، برونو = کتاب الاغانی، ج ۲۱، طبع برونو R. E. Brunnow، لائیڈن ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ.

الانباری: نُزہۃ = نُزہۃ الالبّاء فی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۲۹۴ھ.

البغدادی: الفَرق = الفرق بین الفرق، طبع محمد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء.

البَلاذری: انساب = انساب الاشراف، ج ۴ و ۵، طبع M. Schlossinger و S.D.F.Goitein، بیت المقدس (یروشلم) ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۸ء.

البلاذری: انساب، ج ۱ = انساب الاشراف، ج ۱، طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء.

البلاذری: فتوح = فتوح البلدان، طبع ڈخویہ، لائیڈن ۱۸۶۶ء.

بیہقی: تاریخ بیہق = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تاریخ بیہق، طبع احمد بہمنیار، تہران ۱۳۱۷ش.

بیہقی: تتمۃ = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تتمہ صوان الحکمۃ، طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۳۵ء.

بیہقی، ابوالفضل = ابوالفضل بیہقی: تاریخ مسعودی، (Bibl. Indica).

ت ۱۱ = تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ.

تاج العروس = محمد مرتضی بن محمد الزبیدی: تاج العروس.

تاریخ بغداد = الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۴ جلدیں، قاہرہ

۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء۔

تاریخ دمشق = ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۷ جلدیں، دمشق ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء تا ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۱ء۔

تہذیب = ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب، ۱۲ جلدیں، حیدر آباد (دکن) ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء تا ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء۔

الثعالبی: یتیمۃ = الثعالبی: یتیمۃ الدہر، دمشق ۱۳۰۴ھ۔

الثعالبی: یتیمۃ، قاہرہ = کتاب مذکور، قاہرہ ۱۹۳۴ء۔

جوینی = تاریخ جہان کشا، طبع محمد قزوینی، لائیڈن ۱۹۵۶ تا ۱۹۳۷ء (GMS XVI)

حاجی خلیفہ: جہان نما = حاجی خلیفہ: جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء۔

حاجی خلیفہ = کشف الظنون، طبع محمد شرف الدین یالتقایا (S. Yaltkaya) و محمد رفعت بیلگہ الکلیسلی (Rifat Bilge Kilisli)، استانبول ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۳ء۔

حاجی خلیفہ، طبع فلوگل = کشف الظنون، طبع فلوگل (Gustavus Flügel)، لائپزگ ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۸ء۔

حاجی خلیفہ: کشف = کشف الظنون، ۲ جلدیں استانبول ۱۳۱۰ تا ۱۳۱۱ھ۔

حدود العالم = The Regions of the World، مترجمہ از منورسکی V. Minorsky، لنڈن ۱۹۳۷ء (GMS, XI، سلسلۂ جدید)۔

حمد اللہ مُستوفی: نُزہۃ = حمد اللہ مُستوفی: نزہۃ القُلوب، طبع لی سٹرینج، (Le Strang)، لائڈن ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۹ء (GMS, XXIII)۔

خواندامیر = حبیب السِیَر، تہران ۱۲۷۱ھ و بمبئی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء۔

الدُرَر الکامنۃ = ابن حجر العسقلانی: الدُرَر الکامنۃ، حیدر آباد ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۰ھ۔

الدَمِیری = الدَمِیری: حیٰوۃ الحیوان (کتاب کے مقالات کے عنوانوں کے مطابق حوالے دیے گئے ہیں)۔

دولت شاہ = دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن (E.G.Browne)، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۱ء۔

ذہبی: حُفّاظ = الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۴ جلدیں، حیدر آباد (دکن) ۱۳۱۵ھ۔

رحمٰن علی = رحمٰن علی: تذکرۂ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۴ء۔

روضات الجنات = محمد باقر خوانساری: رَوضات الجَنّات، تہران ۱۳۰۶ھ۔

زامباور، عربی = عربی ترجمہ از محمد حسن و حسن احمد محمود، ۲ جلدیں، قاہرہ ۱۹۵۱ تا ۱۹۵۲ء

زبیری، نسب = معصب الزبیری: نسب قریش، طبع پروونسال، القاہرہ ۱۹۵۳ء۔

الزرکلی، اعلام = خیر الدین الزرکلی: الاعلام قاموس تراجم الاشہر الرجال والنساء من العرب و المستعربین والمستشرقین، ۱۵ جلدیں، دمشق ۱۳۷۳ تا ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۹ء۔

السبکی = السبکی: طبقات الشافعیۃ، ۶ جلد، قاہرہ ۱۳۲۴ھ۔

سجلِ عثمانی = محمد ثریا: سجلِ عثمانی، استانبول ۱۳۰۸ھ تا ۱۳۱۶ھ۔

سَرکیس = سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، قاہرہ ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۱ء۔

السمعانی، عکسی = کتاب الانساب، طبع عکسی با عتناء مرجلیوث (D. S. Margoliouth)، لائیڈن ۱۹۱۲ء (GMS, XX)

السمعانی، طبع حیدر آباد = کتاب مذکور، طبع محمد عبدالمعید خاں، ۱۳ جلدیں، حیدر آباد (دکن) ۱۳۸۲ھ/۱۴۰۲ھ/۱۹۶۲ء۔۱۹۸۲ء۔

السیُوطی: بُغیۃ = بغیۃ الوعاۃ، قاہرہ ۱۳۲۶ھ۔

الشہرستانی = المِلل والنِحل، طبع کیورٹن (W. Cureton) لنڈن ۱۸۴۶ء۔

الضَبّی = بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس، طبع کودیرا (Codera) و ریبیرہ (J.Ribera)، میڈرڈ ۱۸۸۴ تا ۱۸۸۵ء (BAH, III)۔

الضَوء اللامع = السخاوی: الضوء اللامع، ۱۲ جلدیں، قاہرہ ۱۳۵۳ تا ۱۳۵۵ء۔

الطَبَری: تاریخ الرُسُل والمُلوک، طبع ڈخویہ وغیرہ، لائیڈن ۱۸۷۹ تا ۱۹۰۱ء۔

عثمانلی مؤلفلری = بروسہ لی محمد طاہر: استانبول ۱۳۳۳ھ۔

العِقد الفَرِید = ابن عبدربہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۲۱ھ۔

علی جَواد = علی جواد: ممالک عثمانیین تاریخ و جغرافیہ لغاتی، استانبول ۱۳۱۳ھ تا ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۹ء۔

عوفی: لُباب = عوفی: لباب الالباب، طبع براؤن، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۶ء۔

عیون الأنباء = طبع ملّر A. Muller، قاہرہ ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء.
غلام سرور = غلام سرور، مفتی: خزینۃ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۴ھ.
غوثی مانڈوی: گلزار ابرار، ترجمۂ اردو موسوم بہ اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ.
فرشتہ = محمد قاسم فرشتہ: گلشن ابراہیمی، طبع سنگی، بمبئی ۱۸۳۲ء.
فرہنگ = فرہنگ جغرافیائی ایران، از انتشارات دائرۂ جغرافیائی ستاد ارتش، ۱۳۲۸ تا ۱۳۲۹ھ ش.
فرہنگ آنند راج = منشی محمد بادشاہ: فرہنگ آنند راج، ۳ جلد، لکھنؤ ۱۸۸۹ تا ۱۸۹۴ء.
فقیر محمد = فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیۃ، لکھنؤ ۱۹۶۰ء.
فلٹن و لنگز = Alexander S. Fulton و Martin Lings: *Second Supplementary Catalogue of Arabic Printed Books in the British Museum*، لنڈن ۱۹۵۹ء.
فہرست (یا الفہرست) = ابن الندیم: کتاب الفہرست، طبع فلوگل، لائپزگ ۱۸۷۱ تا ۱۸۷۲ء.
ابن القفطی = ابن القفطی: تاریخ الحکماء، طبع لپرٹ J. Lippert لائپزگ ۱۹۰۳ء.
الکتبی، طبع بولاق، فوات = ابن شاکر الکتبی: فوات الوفیات، بولاق ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء.
الکتبی، فوات، طبع عباس = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۵ جلد، بیروت ۱۹۷۳ تا ۱۹۷۴ء.
لسان العرب = ابن منظور: لسان العرب، ۲۰ جلد، قاہرہ ۱۳۰۰ تا ۱۳۰۸ھ.
م آ = مختصر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ .
مآثر الأمراء = شاہنواز خاں: مآثر الامراء، Bibl, Indica.
مجالس المؤمنین = نوراللہ شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ ش.
مرآۃ الجنان = الیافعی: مرآۃ الجنان، ۴ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۹ھ.
مسعود کیہان = مسعود کیہان: جغرافیای مفصل ایران، ۲ جلد، تہران ۱۳۱۰ھ و ۱۳۱۱ھ ش.
المسعودی: مروج = المسعودی: مروج الذہب، طبع باربیر مینارد (C. Barbier de Meynard) و پاوہ دُکورتی (Pevet de Courte) طبع پیرس ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۷ء.
المسعودی: التنبیہ = المسعودی: کتاب التنبیہ والاشراف، طبع دُخویہ، لائیڈن ۱۸۹۴ء (BGA, III).
المقدسی = المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، طبع دُخویہ، لائیڈن ۱۸۷۷ء (BGA, III).
المقّری: Analectes = المقّری: نفح الطیب فی غصن الأندلس الرّطیب، *Analectes sur l'histoire et la litterature des Arabes de l' Espagne*، لائیڈن ۱۸۵۵ تا ۱۸۶۱ء.
المقّری، بولاق = کتاب مذکور، بولاق ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء.
منجّم باشی: صحائف الاخبار، استانبول ۱۲۸۵ھ.
میرخواند = میرخواند: روضۃ الصّفاء، بمبئی ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء.
نزہۃ الخواطر = حکیم عبدالحی: نزہۃ الخواطر، حیدرآباد ۱۹۴۷ء ببعد .
نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع لیوی پُرووَنسال، قاہرہ ۱۹۵۳ء.
الوافی = الصّفدی: الوافی بالوفیات، ج ۱، طبع رِٹر (Ritter)، استانبول ۱۹۳۱ء؛ ج ۲ و ۳، طبع ڈیڈرنگ (Dedering)، استانبول ۱۹۴۹ و ۱۹۵۳ء.
الہمدانی = الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع ملر (D. H. Muller)، لائیڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء.
یاقوت = یاقوت: معجم البلدان، طبع وسٹنفلٹ، ۵ جلدیں لائپزگ ۱۸۶۶ تا ۱۸۷۳ء (طبع اناستاتیک ۱۹۲۴ء).
یاقوت: ارشاد (یا ادباء) = ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب، طبع مرجلیوث، لائیڈن ۱۹۰۷ تا ۱۹۲۷ء (*GMS, VI*).
معجم الادباء (طبع اناستاتیک)، قاہرہ ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء.
یعقوبی (یا الیعقوبی) = الیعقوبی تاریخ، طبع ہوتسما (M. Th. Houtsma)، لائیڈن ۱۸۸۳ء؛ تاریخ الیعقوبی، ۳ جلد، نجف ۱۳۵۸ھ: ۲ جلد، بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء.
یعقوبی: بلدان (یا البلدان) = الیعقوبی: (کتاب) البلدان، طبع دُخویہ، لائیڈن ۱۸۹۲ء (BGA, VII).
یعقوبی، Wiet، ویت = *Yaqubi, Les Pays*، مترجمہ از G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۷ھ.

(ب)

کتب انگریزی، فرانسیسی، جرمن، جدید ترکی وغیرہ کے اختصارات جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں۔

Al-Agani: Tables = *Tables Alphabétiques du Kitab al-aghani, rédigées par I. Guidi*, Leiden 1900.

Babinger = F. Babinger: *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke*, 1st ed., Leiden 1927.

Barkan: *Kanunlar* = Omar Lutfi Barkan: *XV ve XVII inci Asirlarda Osmanli. Imparat Orlugunda Zirai`Ekonominin 'Hukuki ve Mali Esaxiari, I. Kamunlar*, Istanbul 1943.

Blachere: *Litt.* = R. Biachere: *Histoire de la litterature arabe, i*, Paris 1952.

Brockelmann, I, II = C. Brockelmann: *Geschichte der Arabischen Litterature, Zweite den Supplement banden angepasste Auflage*, Leiden 1943 - 1949.

Brockelmann, *SI*, II, III = G. *d. A.L., Erster (Zweiter, Dritter). Supplementband*, Leiden 1937-42.

Browne i = E.G. Brown: *AL Literary Histroy of Persia, from the earliest times until Firdowsi*, London 1902.

Browne, ii = *A Literary History of Persia, from Firdowsi to Sadi*,London 1908:

Brown, iii = *A History of Persian Literature under Tartar Dominion*, Cambridge 1920.

Brown, iv = *A History of Persian Literature in Modrn Times*, Cambridge 1924.

Caetani: *Annali* = L. Caetani: *Annali dell, Islam, Milano* 1905-26.

Chauvin: *Bibliographie* = V. Chauvin: *Bibliographie des ouvrages arabes et Relatifs aux Arabes, lille 1892.*

Dorn: Queulen = B. *Dorn: Muhammedanische Quellen zur Geschichte der sudlichen Kustenlander des Kaspischen Meeres*, St. Petersburg 1850-58.

Dozy: *Notices* = R. dozy: *Notices sur quelques manuscrits arabes*, Leiden 1847-51 and D.S. Margoliouth, London 1937.

Dozy: *Recherches*[3] = R. Dozy: *Recherches sur l'histoire et la littérature de l' Espagne Pendant le maoyen-âge*,3rd,ed., Paris-Leiden 1881.

Dozy, *Suppl.* = R. Dozy: *Supplément aux dictionaires arabes*, 2nd ed., Leiden-Paris 1927.

Fagnan: *Extraits* = E. Fagnan: *Extraits incdits relatifs au Maghreb*, Alger 1924.

Gesch. *des Qor.* = Th. Nöldeke: *Geschichte des Qorans*, new edition by F. Schwally, G. Bergst rasser and O. Pretzl, 3 vols., Leipzig 1909-38.

Gibb: *Ottoman Poetry*, = E.J.W. Gibb: *A History of ottoman Poetry*, London 1900-09.

Gibb-Bowen = H.A.R. Gibb and Harold Bowen: *Islamic Society and the West*, London 1950-57.

Goldziher: *Muh. St.* = I. Goldziher: *Muhammedanische Studien*, 2 Vols., Halle 1888-90.

Goldziher: *Vorlesungen* = I. Goldziher: *Vorlesungen uber den Islam*, Heidellberg 1910.

Goldziher: Vorlesungen[2] = 2nd ed. Heidelberg 1925.

Goldziher: *Dogme* = *Le dogme et la loi del'islam*, tr. F. Amin, Paris 1920.

Hammer-Purgstall: GOR = J. von Hammer (Purgstall): *Geschichte des Osmanischen Reiches*, Pest 1828-35.

Hammer-Purgstall: GOR² = the same, 2nd ed., Pest 1840.

Hammer-Purgstall: *Histoire* = the same, trans. by J.J. Hellert, 18 Vol., Bellizard (etc.), paris (Etc.), 1835-43.

Hammer-Purgstall, *Staatsverfassung* = J. von Hammer: *Des Osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staats-verwaltung,* 2 vols., Vienna 1815.

Houtsma: *Recueil* = M. Th. Houtsma: *Recueil des texes relatifs a l,histoire des Seldjoucides,* Leiden 1886-1902.

Juynboll: Handbuch = Th. W. Juynboll: *Handbuch des islamischen Gestzes,* Leiden 1910.

Juynboll: *Handleiding* = *Handleiding tot de kennis der mohammedaansche wet.,* 3rd ed., Leiden 1925.

Lane = E.W. Lane: *An Arabic-English Lexicon,* London 1863-93 (reprint New York 1955-56).

Lane-Poole: *Cat.* = S. Lane-Poole: *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum,* 1877-90.

Lavoix: Cat. = H. Lavoix: *Catalogue des Monnaies Musulmanes de la Bibliothéque Nationale,* Paris 1887-96.

Le Strange = G. Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate,* 2nd ed. Cambridge 1930 (Reprint, 1966).

Le Strange: Baghdad = G. Le Strange: *Baghdad during the Abbasid Caliphate,* Oxford 1924.

Le Strange: Palestine = G. Le Strange : *Palestine under the Moslems,* London 1890 (Reprint 1965).

Lévi-Proven cal: *Hist.* Esp. Mus. = E. Lévi-Provencal: *Histoire de l'Espagne musulmane,* nouv. éd., Leiden-Paris 1950-53, 3 vols.

Lévi-Provencal: Hist. Chorfa = E. Lévi-Provencal *Historiens des Chorfa,* Paris 1922.

Maspero-Wiet: *Matériaux* = J. Maspero et G. Wiet: *Matériaux pour servir á la géographie de l'Egypte,* Le Caire 1914 (MIFAO, XXXVI).

Mayer: *Architects* = L.A. Mayer: *Islamic Architects and their Works,* Geneva 1958.

Mayer: *Metalworkers* = L. A. Mayer: *Islamic Astrolabists and their Works,* Genva 1956.

Mayer: *Metalworkers* = L.A. Mayer: *Islamic Metalworkers and their Works,* Geneva 1959.

Mayer: *Woodcarvers* = L.A. Mayer: *Islamic Woodcarvers and their Works,* Geneva 1958.

Mez: *Renaissance* = A. Mez: *Die Renaissance des Islams,* Heidelberg 1922, (Spanish translation by S. Vila, Madrid-Granada 1936).

Mez: *Renaissance,* Eng. tr. = the same, English Translation by Salahuddin Khuda Bukhsh and D.S. Margoliouth, London 1937.

Nallino: Scritti = C.A. Nallino: *Raccolta di Scritti Editi e inediri,* Roma 1939-48.

Pakahn = Mehmet Zeki Pakahn: *Osmani Tarih seyimleri ve Terimleri Sozlugu,* 3 vols., Istanbul 1946 ff.

Pauly-wissowa = *Realenzyklopaedie* des *klassischen Altertums.*

Pearson = J. D. Pearson: *Index Islamicus,* Cambridge 1958.

Pons Boigues = *Ensayo bio-bibliográfico sobre los historiadores y geografos arábio-espanole,* Madrid 1898.

Rypka, *Hist of Iramican litterature* = J. Rypka et alii, *History of Iranian literature,* Dordrecht 1968.

Santillana: *Istituzioni* = D. Santillana: *Istituzioni di diritto muslmano malichita,* Roma 1926-38.

Schlimmer=John. L. Schlimmer: *Terminologie Medico- Pharmaceutique et Anthropologique,* Tehran 1874.

Schwarz: *Iran* = P. Schwarz: *Iran im Mittelalter nach den arabischen Geographen,* Leipzig 1896.

Smith = W. Smith: *A Classical Dictionary of Biolgraphy, Mythology and Geography* Hurgronje: *Verspr. Ged Geography,* London 1853.

Snouck Hurgronje: *Verspr, Geschr.* = C, Snouck Hurgronje: *Versprede Geschriften,* Bonn-Leipzig-Leiden 1923-27.

Sources inéd. = Comte Henri de Castries: *Sources inédites de l'histoire du Maroc,* Paris 1905, 1922.

Spuler: *Horde* = B. Spuler: *Die Goldene Horde,* Leipzig 1943.

Spuler: *Iran* = B. Spuler: *Iran in früh-islamischer Zeit,* Wiesbaden 1952.

Spuler: *Mongolenz* =B. Spuler: *Die Mongolen in Iran,* 2nd. ed., Berlin 1955.

SNR = Stephan and Naudy Ronart: *Concise Encyclopaedia of Arabic Civilization,* Djambatan Amsterdam 1959.

Storey = C.A. Storey: *Persian Literature: a biobibliographical survey,* London 1927.

Survey of Persian Art = ed. by A.U. Pope, Oxford, 1938.

Suter = H. Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke,* Leipzig 1900.

Taeschner: *Wegenetz* = F. Taeschner: *Die Verkehrslage und den Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten,* Gotha 1926.

Tomaschek = W. Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter,* Vienna 1891.

Weil: *Chalifen* = G. Weil: *Geschichte der Chalifen,* Mannheim-Stuttgart 1846-82.

Wensinck: *Handbook* = A.J. Wensink: *A Handbook of Early Muhammadan Tradition,* Leiden 1927.

Zambour = E. de Zambour: *Manuel de de genealogie et de chronologie pour l' histoire de l' Islam,* hanover 1927 (anastatic reprint Bad pyrmont 1955).

Zinkeisen = J. Zinkeisen: *Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa,* Gotha 1840-83.

Zubaid Ahmad = *the Contribution of India to Arabic Literature,* Allahabad 1946 (reprint Lahore 1968).

(ج)

مجلّات، سلسلۂ ہائے کتب وغیرہ، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں۔

AB = *Archives Berbèrs.*

Abh. G.W. Gott. = *Abhandlungen der Gesellschaft der Wissenschaften zu Gottingen.*

Adh. K.M = *Abhandlungen f.d. Kunde des Morgenlandes.*

Abh. Pr. Ak. W. = Abhandlungen d. Preuss. Akab. D. Wiss.

Afr. Fr. = Bulletin due Comité de l' Afrique francaise.

Afr. Fr. RC = Bulletin du Com de l'Afr. Franc, Renseignments Coloniaux.

AiÉO Alger = Annales de l' Institute d' Études Orientales de l' Université d' Alger.

AIUON = Annali dell' Istituto Univ. Orint, di Napoli.

AM = Archives marocaines.

And. = Al=Andalus.

Anth. = Anthropos.

Anz. Wien = Anzeiger der philos.- histor. Kl. d. Ak. der Wiss. Wien.

AO = Acta Oreintalia.

Arab.= Arabica.

ArO = Archiv Orientálni.

ARW = Archiv Fur Religionswissens- chaft.

ASI = Archaelogical Survey of India.

ASI, Nis = the same, new Imperial Series.

ASI, AR = the same, Annual Report.

AUDTCFD = Ankara Universitesi Dil ve arincogrfya Fakültesi Dergisi.

As. Fr. B. = Bulletin du Comité de l' Asie Francaise.

BAH = Bibliotheca Arabico-Hispana.

BASOR = Bulletin of the American School of Oriental Research.

Bell. = Turk Tarih Kurumu Belleten.

BFac. Ar. = Bulletin of the Faculty of the Egyptian University.

BÉt. Or = Bulletin d'Études orientales de l' Institut Francais de Damas.

BGA - Bibliotheca geographorum arabicorum.

BIE = Bulletin de l' Institut Egyptien

Bifaq = Bulletin de l' Institute Francais JA Arachologic oriental du caire.

BIS - Bibliotheca Indica series.

BRAH = Boletin de la Real Academia de la Historia de Espana.

BSE = Bolshaya Sovetskaya Éntsiklopediya (large Soviet Encyclopaedia) 1st ed.

BSE² = the same, 2nd ed.

BSL(P) = Bulletin de la société de Linguistique (de Paris).

BSO(A)S = Bulletin of the School of Oriental (and African) Studies.

BTLV = Vjdragen tot de Taal-, Land-en Volkenkunde (van ned.-Indie).

BZ = Byzantinische Zeitschrift.

COC - Cahiers de l'Orient Contemporain.

CT = Cahiers de tunisie.

EI¹ = Encyclopaedia of Islam, 1st edition.

EI² = Encyclopaedia of Islam, 2nd edition

EIM = Epigraphia Indo-Moslemica

ERE = Encyclopaedia of Religion and Ethics.

GGA - Göttinger Gelehrte Anzeigen.

GJ = Geographical Journal.

GMS = Gibb Memorial Series.

Gr. I. Ph. = Grundriss der Iranischen Philologie.

GSAI = Giornale della Soc. Asiatica Italiana.

Hesp. = Hesperis.

IA = Islâm Ansiklopedisi (Turkish).

IBLA = Revue de l'Institut des Belles Lettres Arabes, Tunis.

IC = Islamic Culture.

IFD = Ilahiyat Fakültesi Dergesi.

IG = Indische Gids.

IHQ = Indian Historical Quarterly.

IQ = The Islamic Quarterly.

IrM = International Review of Missions.

Isl. = Der Islam.

JA = Journal Asiatique.

JAfr. S. = Journal of the African Society.
JAOS = Journal of the American Oriental Society.
JAnthr. I = Journal of the Anthropological Institute.
JBBRAS = Journal of the Bombay Branch fo the Royal Asiatic Society.
JE = Jewish Encyclopaedia.
JESHO = Journal of the Enconomic and Social History of the Orient.
JNES = Journal of Near Eastern Studies.
JPak. HS = Journal of the Paksitan Hisotrical Society.
JPHS = Journal fo the Panjab Historical Society.
JQR = Jewish Quarterly Review.
JRAS = Journal of the Royal Asiatic Society.
J(R)ASB = Journal and Procedding of the (Royal) Society of Bengal.
J(R) Num. S = Journal fo the (Royal Numismatic Society.
JRGeog. S= Journal fo the Royal Geographical Soceity.
JSFO = Journal de la Societe Finno-augrienne.
JSS = Journal of Semitic Studies.
KCA = Korosi Csoma Archivum.
KS = Keleti Szemle (Revue Orientale.)
KSIE = Kratkie Soobshčeniya Instituta Étnographfiy (Short Communications of the Institute of Enthnography).
LE = Literaturnaya Éntsiklapediya (Literary Encyclopaedia).
Mash. = Al=Mashrik.
MDOG = Mitteilungen der Deutschen Orient-Gesells chaft.
MDPV = Mitteilungen und Nachr. des Deutschen Palästina-Vereins.
MEA = Middle Eastern Affairs.
MEJ = Middle East Journal.
MFOB = Mélanges de la Faculté Orientale de Beyrouth.
MGG Wien = Mitteilungen der geographischen Gesellschaft in Wien.
MGMN = Mitt. Geschichte der Medizin und der Naturwissenshaften.
MGWJ = Monatsschrift f. d. Geschichte u. Wissen schaft des Judentums.
MI = Mir Islama.
MIDEO = melanges de l'Institut Dominicain d' Études Orintales du Caire.
MIE = Mèmoires de l'Institut d' Égyptien.
MIFAO = Mémoires Publiés par les members de l'Inst. Franç. d' Archéologies Orientale du Care.
MMAF = Mémoires de la Mission Archéologique Franc. au Care.
MMIA = Madjallat al-Madjmaal' al-'ilmi al' Arabi, Damascus.
MO = Le Monde Oriental.
MOG = Mitteilungen zur osmanischen Geschichte.
MSE = Malaya sovetskaya Éntsiklopediya - (Small Soviet Encyclopaedia).
MSFO = Mémoires de la Societe Finno-ougrienne.
MSL = Mémoires de la Societe Linguishtique de Paris.
MSOS Afr. = Mitteilungen des Sem. Fur oriental. Sprachen, Afr. Studien.
MSOS As. = Fitteilungen des Sem. Fur oriental. Sprachen, Westasiatische Studien.
MTM = Mili Tetebbuler Medjmuast.
MVAG = Mitteilungen der Vorderasiatisch agyptischen Gesellschaft.
MW = The Muslim World.
NC = Numismatic Chronicle.
NGW Gött. = Nachrichten von d. Gesellschaft d. Wiss. zu Göttingen.
OA = Orientalisches Archiv.
OC = Oriens Christianus.
OCM = Oriental College Magazine, Lahore.
OCMD = Oriental College Magazine, Damima, Lahore.
OLZ = Orientalistische Literaturzeitung.
OM = Orient Moderno.
Or. = Oriens.
PEFQS = Palestine Exploration Fund Quarterly Statement.
PELOV = Publications de l' École des langues orientales vivantes.

Pet. Mitt. = Petermanns Mitteilungen.
PRGS = Proceedings of the R. Geographical Society.
QDAP = Quarterly Statement fo the Department of Antiquities of Palestine.
RAfr. = Revue Africaine.
RCEA = Répertoire Chronologique d' Épigrapie arabe.
REI = Revue des Études Islamiques.
REJ = Revue des Études Juives.
Rend. Lin. = Rendiconti della Reale Accad. die Lincei, Cl. Di sc. mor., stor. e filol.
RHR = Revue de l' Histoire des Religions.
RI = Revue Indigéne.
RIMA = Revue de l' Institut des manuscrits Arabes.
RMM = revue du Monde Musulman.
RO = Rocznik Orientalistyczny.
ROC = Revue de l'orient Chrétien.
ROL = Revue de l' Orient Latin.
RRAH = Rev. de la R. Academia de la Historia, Madrid.
RSO = Rivista degli Studi Orientali.
RT = Revue tunistenne
SBAK. Heid. = Sitzungsberichte der Ak. der Wiss. zu Heidelberg.
SBAK. Wien = Sitzungsberichte der Ak. der Wiss. zu Wien.
SBBayr. Ak. = Sitzungsberichte der Bayrischen Akademie der Wissenschaften.
SBPMS Erlg. = Sitzungsberichte d. Phys.-Midizin. Sozietät in Erlangen.
SBPr. Ak. W. = Sitzungsberichte der preuss. Ak. der Wiss. zu Berlin.
SE = Sovetskaya Étnografiya (soviet Ethnography).
SI = Studia Islamica.
SO = Sovetskoe Vostokovedenie (Soviet Orientalism).
Stud. Isl. = Studia Islamica.
s. Ya. = Sovetskoe Yazikoznanie (Soviet Linguistics).
SYB = the Statesman's Year Book.
TBG = Tijdschrift van het Bataviaasch Genootschap van Kunsten en Wetenschappen.
TD = Tarih Dergisi.
TIE = trudi instituta Étnografiy (Works of the Institute of Ethnography).
TM = Turkiyat Mecmuasi.
TOEM = Ta'rikh-i 'Othmani)Türk Ta'rikhi_ Endjümeni medjmu asT.
TTLV = Tijdschrift. v. Indische Taal-, Land- en Volkenkunde.
Verh. Ak. Amst. = Verhandelingen der Koninklijke Akademie van Westenschappen te Amsterdam.
Versl MED AK Amst = Verslagen en mededeelingen der Koninklijke Akademie Van Wetenschapphen te Amsterdam.
VI = Voprosi Istoriy (Historical problems).
WI = Die Welt des Islams.
WI, NS = the same, New Series.
Wiss. Veröff. DOG = Wissenschaftliche Veröffentlichungen der Deutschen Orient-Gesellschaft.
WMG = World Muslim Gazetteer, Karachi.
WZKM = Wiener Zeitschrift für die Kunde des Morgenlandes.
ZA = Zeitschrift für Assyriologie.
Zap. = Zapiski.
ZATW = Zeitschrift für die alttestamentliche Wissenschaft.
ZDMG = Zeeitschrift der Deutschen Morgenländischen Gesellschaft.
ZDPV = Zeitschrift des Deutschen Paläsatinavereins.
ZGErdk. Berl. = Zeitschrift der Gesellschaft für Erdkunde in Berlin.
ZK = Zeitschrift für Kolonialsprachen.
ZOEG = Zeitschrift F. Osteuropäische Geschichte.
ZS = Zeitschrift für Smitistik.

علامات و رموز و اعراب

(۱)

علامات

*	مقالہ، ترجمہ از آ آ، لائیڈن
⊗	جدید مقالہ، برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ
[ ]	اضافہ، از ادارہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ
⊗※	نظر ثانی شدہ/ اضافہ شدہ مقالہ

(۲)

رموز

ترجمہ کرتے وقت انگریزی رموز کے مندرجہ ذیل اردو متبادل اختیار کیے گئے:

f., ff.,sq.,sqq.	=	بعد
s. v.	=	بذیل مادہ (یا کلمہ)
see; s.	=	دیکھیے: کسی کتاب کے حوالے کے لیے
q.v.	=	رک بہ (رجوع کنید بہ) یا رک باں (رجوع کنید باں): آ آ کے کسی مقالے کے حوالے لیے۔
passim.	=	بمواضع کثیرہ
op.cit.	=	کتاب مذکور
cf.	=	قب (قارب یا قابل؛ دیکھیے)
B.C.		ق م (قبل مسیح)
d.	=	م (متوفی)
loc. cit.	=	محل مذکور
ibid.	=	کتاب مذکور
idem.	=	وہی مصنف
A.H.	=	ھ (سنہ ہجری)
A.D.	=	ء (سنہ عیسوی)

(۳)

اعراب

(ا)

Vowels

فتحہ	(ـَ)	= a
کسرہ	(ـِ)	= i
ضمہ	(ـُ)	= u

(ب)

Long Vowels

ا،آ	=	ā	(آج کل: āj kal)
ی	=	ī	(سیم: Sīm)
و	=	ū	(ہارون الرشید: Hārūn al-Ras͟hīd)
اے	=	aī	(سیر: Saīr)

(ج)

ـٖ	=	e آواز کو ظاہر کرتی ہے (پِن: pen)
ـٗ	=	o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (مول: mole)
ـُ	=	ü کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (تورکیہ: Turkiya)
و٘	=	ö کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (کول: köl)
ـٓ	=	ä کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (آرجب: ärädjäb؛ رَجب: rädjäb)
ـْ	=	علامت سکون یا جزم (بسمل: bismil)

(۴)

متبادل حروف

g	=	گ	s	=	س	ḥ	=	ح	b	=	ب
gh	=	گھ	sh.ch	=	ش	Kh	=	خ	bh	=	بھ
l	=	ل	ṣ	=	ص	d	=	د	p	=	پ
lh	=	لھ	ḍ	=	ض	dh	=	دھ	ph	=	پھ
m	=	م	ṭ	=	ط	ḋ	=	ڈ	t	=	ت
mh	=	مھ	ẓ	=	ظ	ḋh	=	ڈھ	th	=	تھ
n	=	ن	ʿ	=	ع	dh	=	ذ	ṫ	=	ٹ
nh	=	نھ	gh	=	غ	r	=	ر	th	=	ٹھ
w	=	و	f	=	ف	rh	=	رھ	th	=	ث
h	=	ہ	ḳ	=	ق	ṛ	=	ڑ	dj	=	ج
ʾ	=	ء	k	=	ک	ṛh	=	ڑھ	djh	=	جھ
y	=	ی	kh	=	کھ	z	=	ز	č	=	چ
						ž, zh	=	ژ	čh	=	چھ

※ **افرنج یا فرنج:** فرنگیوں کے لیے عربی نام۔ یہ نام جو مسلمانوں کو بزنطیوں کے ذریعہ پہنچا، شروع میں شارلیمان کی مملکت کے باشندوں کے لیے مستعمل تھا، بعد میں تمام یورپی باشندوں پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔ ازمنۂ وسطی میں یہ نام اندلسی عیسائیوں [رکّ بہ: اندلس، جلیقیا؛ نیز ذیل] اور غلاموں (صقالبہ) یا مجوسیوں کے لیے مختص نہ تھا، بلکہ عام طور پر براعظم یورپ اور جزائر برطانیہ بھی "فرنگستان" کہلاتے تھے۔

مغربی یورپ کے جغرافیائی نظم کا علم، سب سے پہلے مسلمانوں کو بطلیموس کے جغرافیہ Geographike Hypegesis سے، مگر زیادہ تر الخوارزمی کے عربی ترجمہ سے ہوا تھا۔ مسلمانوں کے قدیم ترین جغرافیہ نویس اس پر کوئی اضافہ نہیں کر سکے۔ ابن خرداذبہ (م۲۳۲ھ/۸۴۶ء) کو علم تھا کہ افرنجہ مشرکین کے دوسرے ممالک سمیت اسپین سے متصل (تجاور الاندلس) (B.G.A، ۶: ۹۰) اور یورپ کا حصہ ہے جس کو وہ اروفہ کہتا ہے (کتاب مذکور، ص ۱۵۵)۔ وہ بحیرۂ روم کے پار سے فرنگی غلاموں اور مونگوں کی درآمد کا ذکر کرتا ہے (کتاب مذکور، ص ۹۲)۔ مزید براں وہ یہودی سوداگروں کے متعلق، جن کو راذانیہ رک بآں کہا جاتا ہے، جو افرنجہ کی بندرگاہوں اور مشرق وسطی کے درمیان تجارت کیا کرتے تھے، عجیب و غریب افسانہ بیان کرتا ہے (کتاب مذکور؛ ص: ۱۵۳-۱۵۴؛ سی۔اے کاہن و (C.Cahen : Ya-t-it eu des Rahdanites، در REJ، ۴-۳ (۲۳) ۱۹۶۴ء، ص ۴۹۹-۵۰۵) کو اس کہانی کی صداقت میں شبہ ہے۔)

دوسرے قدیم جغرافیہ نویس افرنجہ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں دیتے، اگرچہ ابن رستہ (۲۹۰-۳۰۰ھ/۹۰۳-۹۱۳ء) جزائر برطانیہ کا ذکر کرتا ہے (B. G. A، ۷: ۸۵) اور روم کا تفصیل سے بیان کرتا ہے (کتاب مذکور، ۷: ۱۲۰-۱۳۰؛ [نیز رکّ بہ روم])۔ یہ بیان رہا شدہ جنگی قیدی ہارون بن یحییٰ [رک بآں] کی رپورٹ پر مبنی ہے جو (روم کا ذکر کرتے ہوئے) افرنجہ اور برطانیہ کا مختصر سا حوالہ دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ برطانیہ پر سات بادشاہوں کی حکومت ہے۔ غالبًا یہ اینگلو سیکسن سات بادشاہوں کی حکومت کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے زیادہ تو المسعودی کو معلومات حاصل تھیں، جو فرنگیوں کا ذکر مروج (۳: ۶۶-۶۷؛ طبع و ترجمہ Ch.Pellat، فصل ۹۱۰-۹۱۱، ۹۱۴-۹۱۶) اور تنبیہ (B.G.A، ۸: ۲۳ و بعد: ۱۷۶ بعد) میں کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ فرنگی [حضرت نوحؑ کے بیٹے] یافث کی نسل سے ہیں۔ وہ کثیر التعداد، منظم، بہادر، دلیر اور باہمت ہیں اور ان کا ملک وسیع اور نہایت مستحکم ہے۔ ان کے ملک میں ۱۵۰ شہر ہیں جن کا دارالخلافہ بویرہ (شاید بریزہ) ہے۔ اس زمانے میں المسعودی اکیلا مسلمان مصنف ہے جو کلووس (Clovis) سے لوئیس چہارم (Louis-iv) تک فرنگی بادشاہوں کی ایک فہرست دیتا ہے۔ وہ بتلاتا ہے کہ اس کی معلومات کا ماخذ ایک کتاب ہے جو ایک عیسائی پادری نے اندلس کے ولی عہد، بعد ازاں خلیفہ [الحکم] کے لیے ۳۲۸ھ/۹۳۹ء میں تیار کی تھی۔ اس کو اس کتاب کی نقل مصر میں ۳۳۶ھ/۹۴۷ء میں ملی تھی۔

فرنگیوں اور خلافت اسلامیہ کے درمیان سفارتی تعلقات بہت کم تھے جس کے بہت کم آثار ملتے ہیں۔ شارلیمان اور ہارون الرشید کے درمیان مشہور و معروف سفارتی تعلقات کا ذکر ایک فرنگی ذریعہ سے ملتا ہے، اگر کوئی ایسا واقعہ ہوا بھی ہو تو یہ عرب تاریخ نویسوں کے لیے قابل توجہ نہیں رہا، کیونکہ وہ سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ بارتھولڈ (Barthold) نے تو اس افسانے کو ناقابل یقین ٹھہرایا ہے (*Socineniya*، ماسکو ۱۹۶۶ء، ۲: ۳۴۲-۳۶۴: *I, Khristianskiy Vostok*، ج ۱، ۱ (۱۹۱۲ء)، ص ۶۹-۹۴)۔ اس کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے (دیکھیے F.W.Buckler: *Harunu-l-Rashid and Charles the Great*، کیمبرج ۱۹۳۱ء اور دوسری انگریزی کتابیں)؛ مجید خدوری (: الصلات الدبلوماطیقیہ بین ہارون الرشید وشارلمان، بغداد ۱۹۳۹ء؛ G. Musca: *Carlo Mango ed Harun al- Rashid*, *Bari*، ۱۹۳۶ء) واضح طور پر ایک حقیقی فرانسیسی سفارت کی بغداد میں ۲۹۳ھ/۹۰۶ء میں آمد کا ذکر کرتا ہے جبکہ اوحدی کی کتاب الذخائر والتحف کے مطابق لورین کے بادشاہ لوتھر (Lothair) دوم کی بیٹی اور Adalbert The Rich، Marquis of Ivree کی بیوی برتھا (Bertha) نے المکتفی باللہ کے دربار میں ایک سفارت بھیجی تھی (محمد حمید اللہ: *Embassy of Queen Bertha to Caliph al-Muktafi Billah in Baghdad 293AH/906A.D*، در *J.Pak. Hist Society*، (۱۹۵۳)، ۲۷۲-۳۰۰؛ وہی مصنف، در *Islam Tetkikleri Enstitusu Dergisi*، (۱۹۵۶-۱۹۵۷)، ۲: ۱۱۵ تا ۱۴۵؛ G.Levi Della vida: *La Corrispondenza di Berta di Toscana col Califfo Muktafi*، در Rivista Storica italiana، ۶۶ (۱۹۵۴ء)، ص ۲۱-۳۸؛ وہی مصنف *Aneddoti e Svaghi arabi e non Arab Milan-Naples*، ۱۹۵۹، ۲۶-۴۴)۔

یہ سفارت کار، جو شمالی افریقہ کا ایک خواجہ تھا، مختلف اقسام کے ہدیئے لایا تھا۔ ان کے علاوہ وہ ایک خط افرنگی رسم الخط میں بھی لایا تھا جو یونانی زبان سے ملتا تھا اور سیدھا تھا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد ایک فرنگی کپڑوں کے گودام میں کام کرتے ہوئے ملا، جس نے خط پڑھ کر اس کا یونانی میں ترجمہ کر دیا، پھر اسحاق بن حنین نے اس کا مفہوم عربی میں ادا کر دیا۔ اسی برس کے بعد ابن الندیم نے اس تحریر کو ماخذ بنا کر فرنگی رسم الخط پر اپنا شذرہ لکھا اور اس کو اپنی کتاب میں کتابت کے موضوع پر مقالے میں شامل کر لیا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ اس نے اس رسم الخط میں لکھی ہوئی تحریروں کو فرنگی تلواروں پر لکھا ہوا دیکھا ہے (الفہرست، طبع G.Flugel، ص ۲۰، لائپزگ ۱۸۷۱ء: مسلمانوں میں افرنگی تلواروں کی شہرت کے لیے دیکھیے: اے زکی ولیدی طوغان: *Die Schwerter der Germanen nach arabischen Berichten des 9-11 Jahrhunders*، در ZDMG، (۹۰) [۱۹۳۶]: ۱۹-۳۷)۔

اس عرصے میں مسلم ممالک سے یورپ جانے والا اہم ترین سیاح طرطوسہ (اسپین) کا ایک یہودی ابراہیم بن یعقوب [رک بآں] تھا جس نے شاید ۳۵۴ھ/۹۶۵ء میں قرطبہ کے اموی خلیفہ کے لیے ایک خاص مہم پر فرنگی یورپ کا وسیع دورہ کیا تھا۔ اس کا سفر نامہ آج کل ناپید ہے، لیکن متأخر جغرافیہ نویسوں کے دیئے گئے اقتباسات، خصوصاً البکری اور القزوینی، سے اس کے متعلق پتہ چلتا ہے۔ عثمانی نامہ نگاروں میں سے صرف یہی ایک سیاح ہے جس نے مغربی یورپ کا سب سے پہلے سفر کر کے وہاں کے حالات لکھے تھے۔

گیارہویں صدی عیسوی میں بحیرۂ روم کے مغربی، وسطی اور جنوبی مشرقی علاقوں میں اسلام کے خلاف

عیسائی دنیا کی یلغار نے دونوں میں نئے تعلقات کار پیدا کر دیئے۔ دو صدیوں کے دوران میں افرنگیوں اور مسلمانوں میں گہرے اور مسلسل تعلقات قائم رہے۔ یہ تعلقات نہ صرف جنگ، تجارت، سفارت، بلکہ بعض اوقات اتحاد اور تعاون سے قائم رہے۔ اب فرنگستان کا علم مسلمانوں کے لیے ایک اعجوبہ نہ رہا تھا، بلکہ ایک عملی ضرورت بن گیا تھا۔ حیرت تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے اب تک اس کے متعلق کچھ دل چسپی نہ لی تھی۔ مشرق میں مسلم تاریخ نویس جنگوں کا بہت ذکر کرتے ہیں اور اس سے کم صلیبیوں کی سیاسی مصروفیات کا، جن کو وہ افرنج کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ عیسائی ریاستوں کے اندرونی معاملات کے بارے میں اظہار رائے نہیں کرتے اور مختلف قومیتوں کے درمیان اختلافات اور ان کے وقوع اور وجوہ آمد کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھتے۔ مشرق میں صلیبی جنگ جوؤں اور بعض لوگوں، مثلاً ابن جبیر اور اسامہ بن منقذ کے مابین ذاتی تعلقات کا پتا چلتا ہے، لیکن یہ استثنائی مثالیں ہیں جن کا بعد میں آنے والوں پر کوئی اثر نہیں پڑا، البتہ اس نوع کی کتابوں میں پہلی کتاب چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی کے مصنف حمدان بن عبدالرحیم الاثاربی کی ہے جس میں ان افرنگیوں کا احوال درج ہے جو ان برسوں میں اسلامی دنیا میں آئے تھے (ابن میسر: اخبار مصر، ص ۷۰: قاہرہ ۱۹۱۹ء طبع *A History of Muslim* :F.Rosenthal :H.Masee *Historiography*، ص۶۲، لائیڈن ۱۹۶۸ء)، مگر عملی طور پر یہ کتاب مفقود ہو چکی ہے اور اس کے اقتباسات بھی نہیں ملتے۔ مسلمانوں کا یورپ کے بارے میں علم مشرق سے نہیں، بلکہ مغرب سے آیا ہے یعنی معلومات اندلسی، صقالوی اور شمال افریقہ کے مصنفوں، مثلاً ابوعبیدالبکری، الادریسی، ابن سعید اور ابن عبدالمنعم الحمیری [رک بآں] کی فراہم کردہ ہیں اور نسبتاً زیادہ صحیح اور مفصل جغرافیائی معلومات ہیں اور یہی بعد میں مشرق میں عربی میں لکھی جانے والی کتابوں کا مآخذ بنیں۔

المسعودی کی بنیادی کتاب سے قطع نظر، فرنگیوں کی تاریخ کا تذکرہ مسلمانوں کی تصانیف میں سے رشیدالدین کی تاریخ عالم یعنی جامع التواریخ میں پہلی مرتبہ کیا گیا ہے۔ اس کا ماخذ ایک فرنگی غالباً ایک راہب تھا، جو ایران میں منگول دربار میں سفیر بن کر آیا تھا، اس کے واسطے سے رشیدالدین نے کسی مغربی تاریخ کی کتاب سے استفادہ کیا تھا، "John" کے مطابق یہ "Martin of Troppa" تھا، جو مارٹن پلونس (Martin Polonus: م ۱۲۷۸ء) کے نام سے معروف تھا۔ اس کی کتاب اور زبانی معلومات کی مدد سے رشیدالدین نے مقدس رومن شہنشاہوں کی تاریخ البرٹ اول تک اور پاپاؤں کی تاریخ بنیڈیکٹ (Benedict) یازدہم تک مرتب کی، یہ دونوں اس وقت زندہ تھے۔

جامع التواریخ سے استفادہ کرنے والوں یا اس پر کتاب کی اساس رکھنے والوں کے علاوہ کسی دوسرے مسلم مصنف نے فرنگی تاریخ کے متعلق دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی تک کچھ نہیں لکھا حتی کہ ابن خلدون نے بھی عیسائی یورپ کے متعلق کچھ نہیں تحریر کیا، البتہ بڑے محتاط انداز میں یہ لکھا ہے کہ میں نے کچھ لوگوں سے سنا ہے کہ فلسفیانہ علوم وہاں بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے کہ وہاں کی کیا صورت حال ہے" (مقدمہ، طبع Quatremere، ۳: ۹۳، ترجمہ Rosenthal، ۳: ۱۱۷-۱۱۸)۔ ابتدائی زمانے میں مسلمانوں نے فرنگیوں کے بارے میں وہ دل چسپی نہیں لی جو انہوں نے یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں میں لی تھی، جس کی کافی وجوہ تھیں۔ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی تک یہ طرز عمل پرانا ہو چکا تھا

حتیٰ کہ صلیبی جنگوں کے بعد دونوں کے مابین تجارتی اور سفارتی تعلقات بھی کچھ محدود سی دل چسپی پیدا کر سکے۔ ۷۴۱ھ/۱۳۴۰ء میں شہاب الدین العمری نے صرف اندلس اور فرانس کے دو مغربی بادشاہوں کے نام عظیم حکمرانوں کی فہرست میں شامل کیے ہیں، جن سے سلطان مصر خط وکتابت رکھتا تھا۔ اس میں چند تفصیلات کے ساتھ، اس نے ان کا انداز تحریر اور ان کا انداز تخاطب بھی دیا ہے۔ اس کی اس پر مبنی اور کسی قدر نظر ثانی شدہ کتاب التثقیف میں مزید کئی نام ہیں اور القلقشندی تمام یورپین ممالک اور حکمرانوں کی مفصل فہرست دیتا ہے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کچھ معلومات کے ساتھ (العمری: التعریف بالمصطلح الشریف، قاہرہ ۱۳۱۲ء، ص:۶۰-۶۵؛ القلقشندی: صبح الاعشی، ۸: ۳۳-۵۳)۔

عثمانیوں کے فرنگیوں سے تعلقات سوداگر، دشمن سفارت کار اور ہمسائے کے طور پر کافی عرصے سے تھے۔ یونان میں انہوں نے کئی اہم فرنگی شہر فتح کر لیے۔ ۱۴۴۲ء میں ادرنہ کے مقام پر انہوں نے کئی فرنگی سرداروں کو گرفتار کیا۔ جنہیں ان کے خوبصورت کپڑوں میں سارے عالم اسلام حتیٰ کہ ہرات تک گھمایا گیا (دیکھیے: اشعار، زکی ولید طوغان، در Turk dili Ve Edebiyati Dergisi، ۱۹۳۹ء، ۳: ۳۳۵)۔ سولہویں صدی عیسوی تک ترک یورپی ممالک کے ساتھ وسیع، مگر پیچیدہ تعلقات میں الجھ چکے تھے۔ عیسائی یورپ میں ترکوں کی دل چسپی اگرچہ ہمہ گیر نہ تھی، لیکن قدیم مسلمانوں کے مقابلے میں پھر بھی زیادہ تھی۔ یہ دل چسپی دونوں کے درمیان قریبی تعلقات، یورپی سیاحوں، نیز سیاسی جھگڑوں کی آمد اور وقت کے ساتھ بڑھتی ہوئی یورپی طاقت اور دولت کی وجہ سے روز افزوں رہی۔

اس دل چسپی کا ایک مظہر یورپی تاریخ کا مطالعہ ہے، جو وسعت اور اثر پذیری کے لحاظ سے محدود تھا لیکن پہلے کے مقابلے میں، جبکہ یورپی تاریخ کا مطالعہ بالکل نظر انداز کیا ہوا تھا، ایک صاف اور واضح تبدیلی کا آئینہ دار تھا۔ ۵۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں دو مصنفوں نے جن میں ایک مترجم اور کاتب تھا، رئیس افندی فریدوں بیگ [رک بآں] کے حکم پر ترکی میں فرانس کی تاریخ فرامنڈ (Faramund) سے لیکر ۱۵۶۰ء تک مرتب کی اس کا واحد خطی نسخہ موجود ہے (Babingar، ص۱۰۷)۔ اس کے بعد مشہور ومعروف تاریخ الہند الغربی [رک بآں] لکھی گئی، جو نئی دنیا کے حالات میں یورپی کتابوں کی مدد سے مرتب کی گئی ہے۔ اس کے بعد سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں تاریخ اور جغرافیہ کی کئی کتابیں لکھی گئیں۔ جن کے مصنفین یورپی مصادر سے استفادہ کرکے یورپ کا حال لکھتے ہیں [دیکھیے جغرافیہ ششم، کاتب چلبی: منجم باشی، ابراہیم متفرقہ]۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں یورپی دارالحکومتوں کو جانے والے ترک سفیروں کو پرانے انداز میں چھپی ہوئی کتابیں مہیا کی گئیں۔ اسی قسم کی رپورٹیں مراکشی اور ایرانی سفیروں نے بھی لکھی تھیں (ترک رپورٹوں کی بابت دیکھیے Babinger، ص۳۲۳ بعد، اور koray، ص: ۱۹۶-۱۹۷؛ ایرانی رپورٹوں کے لیے دیکھیے Storey، ۱/۲: ۱۰۶۲-۱۰۷۱، ۱۱۵۳، ۱۱۹۵، مراکشی سیاحوں کے لیے دیکھیے H.Peres کا مقالہ: ES Pagne تا Voyageurs ،L، Vue par les musulmans de ۱۹۳۰-۱۹۱۰ء hespons iamuda، پیرس ۱۹۳۷ء، بمواقع عدیدہ، نیز دیکھیے سفرنامہ اور سفیر، بذیل مادہ)۔ دو ہندوستانی سیاحوں نے اپنے سفر یورپ کے دل چسپ اور عمدہ حالات لکھے ہیں ان میں ایک کا نام شیخ اعتصام الدین اور دوسرے کا نام ابوطالب خاں تھا۔ اول الذکر نے ۱۷۶۵-۱۷۶۶ء میں اور ثانی الذکر نے ۱۷۹۹ء اور ۱۸۰۳ء کے درمیان یورپ کا سفر کیا تھا، دونوں کے سفرنامے انگریزی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔

براعظم یورپ
(1907ء میں)
بین الاقوامی سرحد
ایشیا اور یورپ کی سرحد
دارالحکومت
اہم شہر
شمال
مشرق
مغرب
جنوب
کلومیٹر
0 200 400 600 800
بحر منجمد شمالی
ایشیائی روس
آئس لینڈ
رکجاوک
بحر اوقیانوس
سکاٹ لینڈ
شمالی آئرلینڈ
ڈبلن
بحیرۂ شمالی
برطانیہ
آئرلینڈ
ویلز
لندن انگلستان
رودبار انگلستان
ڈنمارک
ہالینڈ (نیدرلینڈ)
ناروے
سویڈن
فن لینڈ
ہیلسنکی
اوسلو
سٹاک ہوم
یورپی روس
سینٹ پیٹرز برگ
قازان
دریائے وولگا
ماسکو
کالنن (روس)
لتھوانیا
ولینوس
لیٹویا
ریگا
منسک
بائلورس
وارسا
پولینڈ
برلن
جرمنی
فرینکفرٹ
پیرس
فرانس
خلیج بسکے
لیون
مارسیلز
سپین
میڈرڈ
(اندلس)
پرتگال
قرطبہ
غرناطہ
جبرالٹر
جزائر بلیارک
کارسیکا
سارڈینیا
روم
اٹلی
وینس
میونخ
برن
چیک ری پبلک
پراگ
سلوواکیہ
ویانا
آسٹریا
بوڈاپسٹ
ہنگری
رومانیہ
بخارسٹ
بوسنیا
بلغراد
سربیا
صوفیہ
بلغاریہ
البانیہ
یونان
ایتھنز
کریٹ
قبرص (سائپرس)
لبنان
شام
عراق
ایران
ترکی
انقرہ
استنبول
(اناطولیہ)
ایشیا
بحیرۂ اسود
جارجیا
آذربائیجان
آرمینیا
کیف
یوکرین
وولگاگراڈ
قازاقستان
بحیرۂ روم
مراکش
الجزائر
تیونس
افریقہ

نقشہ 127

سولھویں اور انیسویں صدی کے درمیان مسلم ممالک میں فرنگی (Frank) کی اصطلاح تمام یورپی عیسائیوں کے لیے عام ہوگئی، اگرچہ اس کا استعمال کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں تک محدود رہا ہے جیسا کہ سامی فراشری نے اس کی وضاحت کی ہے (قاموس الاعلام، بذیل مادہ Firenk)۔ روسیوں، یونانیوں، بلغاریوں، سربوں اور دوسرے قدامت پسند عیسائیوں کو فرنگی نہیں کہا جاتا تھا۔ یہ اصطلاح فرنگیوں کی رائج کردہ چیزوں، مثلاً آتشک، توپ، یورپی لباس اور نئی تہذیب وغیرہ کے متعلق تھی۔

مآخذ: (۱) I.Guide: *L, Europa Occidentale negli antichi geografi arabi*، در *Florilegium Melchior de vogue*، پیرس ۱۹۰۹ء، ص۲۶۳-۲۵۹؛ (۲) B. Lewis: *The Mulsim Discovery of Europe*، در *BSOAS*، جلد ۲۰، (۱۹۵۷ء) ص ۲۵۹-۲۶۳؛ (۳) وہی مصنف: *Mas'udi on The Kings of the franks*، در *Al-Masudi millenary Commemoration Volume*، علی گڑھ ۱۹۶۰ء ص ۷-۱۰؛ (۴) وہی مصنف: *The use by Muslim Historians of non-Muslim Sources*، در B. Lewis اور P.M. Holt، *Historians of the Middle East*، بار دوم، لندن، (۱۹۶۴ء)، ص ۱۸۰-۱۹۱؛ (۵) D.M. Dunlop: *The British Isles, according to Medieval Arabic Authors*، در *IQ*، ۴ (۱۹۵۷ء): ۱۱-۲۸؛ (۶) T.Lewicki: *Die Vorstellungen arabischer schriftsteller des 9, und 10 Jahrhumderts von der Geographie und von den ethnischen Verhaltnissen osteurapas*، در Isl-۳۵ (۱۹۵۹ء): ۲۶-۴۱؛ (۷) وہی مصنف: *L,apport des Sources arabes medievales (IXe Xe siecles) a la connaissa nce de L,Europe centrale et orientale*، در *L,Occidente e l Islam nell'alto medioevo*، اسپولٹو، ۱۹۶۵ء، ص ۷۱-۴، بعد؛ (۸) یوسف قزما الخوری: الجغرافیون العرب واوربا، در الابحاث، ۲۰/۴، (۱۹۶۷ء)، ص ۳۵۷-۳۹۲؛ (۹) عبدالرحمان علی الحاجی، ہسپانوی اموی حکمران اور عیسائی یورپ کے تعلقات پر مقالات کا سلسلہ: در *IQ*: ۹ (۱۹۶۵ء): ۳۶-۵۵؛ ۱۰ (۱۹۶۶ء) ۱۹-۲۵ اور ص ۸۴-۹۴؛ ۱۱ (۱۹۶۷ء) ۱۲۹-۱۳۶؛ ۱۲ (۱۹۶۸ء): ۵۹-۷۰ اور ص ۱۴۰-۱۴۵؛ ۱۳ (۱۹۶۹ء): ۱۱۳-۱۲۶؛ (۱۰) رشیدالدین فیض اللہ: کتاب تاریخ افرنج (*Histoire des Froncs*)، تحقیق مع فرانسیسی ترجمہ از K . Jahm، لائیڈن (۱۹۵۱ء)؛ (۱۲) H. Lammens: *Correspondence diplomatique entre les sultans mamlouks d,Egypte et les Puissances chretiennes*، در *Roc*، ۹، (۱۹۰۴ء): ۱۵۱-۱۸۲؛ (۱۳) E.Ashtor: *Checosa Sapevano i geografi arabi dell' Europa Occidentale?*، در *Riv stor It*، ۸۱/۳ (۱۹۶۹ء): ۴۵۳-۴۷۹۔

([B.Lewis] ت شیخ نذیر حسین)

۲۔ اندلس: اندلس اور مغرب کے عربوں کے ادب میں "افرنج" کی اصطلاح: (اسی طرح افرنجہ، اضافی مفہوم یعنی فرنگیوں کی سرزمین کے ساتھ) ایسے عیسائیوں کے لیے مستعمل تھی جس سے مصنفین واقف تھے۔ اس کے لیے عام لفظ روم یا جزیرہ نما کے عیسائیوں کے لیے جلالقہ [رک بہ جلیقیا] یا بشکنش رائج ہے۔ یہ لوگ افرنج اور روم کے درمیان کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھتے۔ شاید کچھ مصنف ان الفاظ کو مخصوص معنوں میں استعمال کرتے ہوں، لیکن تائیدی شہادت کے بغیر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ابن الابار کے مطابق افرنگیوں نے ۶۱۴ھ/۱۲۱۴ء میں قصرابی دانش فتح کر لیا (حلۃ، ۳:۲۹۰)۔ الروض المعطار میں (جہاں اس کا تذکرہ بذیل قصر ابی دانش کیا گیا ہے) اس کی جگہ روم ہے، لیکن الروض القرطاس کے مصنف نے اس کے واقعات (بذیل سال ۶۱۴ھ) میں العدو لکھا

ہے، جو ایک عام اصطلاح ہے۔ یہاں متعلقہ عیسائی پرتگیزی ہیں جن کی جرمن چھاپہ مار مدد کیا کرتے تھے۔ اس مفروضہ کی، کہ افرنج کے معنی فرنگیوں کے ہیں، تاریخی کتابوں سے تائید نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ابن الخطیب (اعمال، ۲:۲۳) اسپین کے شمال مغرب کے عیسائی حکمران کو نہ صرف شہنشاہ افرنجہ لکھتا ہے، بلکہ بلاد روم پر ایک حملے کا ذکر کرتا ہے جس سے صاف طور پر اربونہ کا علاقہ مراد ہے۔ سب سے پہلے اس کا استعمال ایک اندلسی مؤرخ ابن القوطیہ (م ۳۶۷ھ/۹۷۷ء) نے کیا تھا، وہ اس کا اطلاق سرگوسہ (Saragossa) کے باشندوں پر کرتا ہے۔ مصطلحات کا یہ ابہام علمی ابہام کا مظہر ہے جو شوق تحقیق کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس میں جغرافیائی معلومات کے دعویدار بھی شامل ہیں۔ ان جغرافیہ نویسوں کی فراہم کردہ قلیل اور مبہم سی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ افرنج کو افرنگ ہی قرار دیتے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی میں کوہ پیرنیز کے شمال میں واقع برعظیم کے لیے سعید الاندلسی کی کتاب طبقات الامم میں، ''الارض الکبیرہ'' کا لفظ ملتا ہے (قاہرہ، ب ت، ص ۸۵) سعید ''افرنجہ العظمٰی'' کو الارض الکبیرہ قرار دیتا ہے، لیکن اسے فرانس سے الگ سمجھتا ہے۔ سعید کا معاصر البکری (م ۴۶۰ھ/۱۰۶۷ء) اور اس کے بعد آنے والے تذکرہ نگار، مثلاً عبدالمنعم الحمیری وغیرہ بھی اسی طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، لیکن فرانس کا ذکر نہیں کرتے (البکری: جغرافیۃ الاندلس والاروبا، طبع عبدالرحمان الحاجی، ص ۶۶-۶۷، بیروت، ۱۹۶۸ء؛ الروض المعطار، بذیل مادہ افرنجہ)۔ یہ ایک مقامی روایت ہے جس کا مشرق سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک قدیم تر روایت المسعودی کے ہاں بھی موجود ہے (مروج الذہب، ۳: ۶۷، طبع وترجمہ C.Pellat، ص ۹۱۱)۔ المسعودی کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں کہ اس نے لکھا ہے افرنج جلالیقہ سے مختلف لوگ ہیں۔ وہ جزیرہ نمائے اندلس کے رہائشی نہیں ہیں اور ان کا دارالخلافہ پیرس ہے۔

دونوں جغرافیہ نویس البکری (ص ۱۳۷) اور عبدالمنعم (بذیل مادہ افرنجہ) المسعودی کے مواد کو معمولی سے اضافے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، مگر ان اضافوں کے لیے انہوں نے کن مآخذ پر انحصار کیا ہے، اس کا پتا نہیں چلتا۔ اس میں سے کوئی مصنف بھی اتنا مواد اس طریقے سے پیش نہیں کرتا کہ پڑھنے والے کو یہ اطمینان ہو سکے کہ اس نے تمام موجودہ مواد سے اپنی معلومات کا موازنہ کر لیا ہے۔ اگرچہ الروض المعطار میں ''افرنجہ'' کا مقالہ معقول حد تک فرانس کے متعلق معلومات دیتا ہے، لیکن بردیکس (Bordeaux) پر مقالہ صحیح ہونے کے باوجود اس کو جلیقیا میں بتلاتا ہے اور کہتا ہے کہ برسلونہ (برشلونہ) افرنجہ کے حکمران کا دارالحکومت ہے۔ بعد کے سیاحوں، مثلاً طرطوشی، ربیع بن زید الیاس المعروف ریسمنڈو (Recemundo) میں سے کوئی سیاح بھی افرنج یا فرنگیوں کے متعلق کسی قسم کی معلومات نہیں دیتا۔

(مندرجہ بالا کتابوں کے مطالعہ سے) مغربی یورپ کی یہ تصویر ابھرتی ہے کہ یہ ایک وسیع، ٹھنڈی، مگر زرخیز سرزمین ہے جو شمال کی طرف تاحد آبادی پھیلی ہوئی ہے اور مشرق کی طرف پہاڑوں اور جنگلوں سے گھری ہوئی ہے، جس کے آگے صقلیہ ہے۔ یہ عیسائی (افرنج)، اگرچہ گندی عادات رکھتے ہیں، لیکن محنتی اور سخت لڑاکے ہیں۔ ایک عرصے تک یہ لوگ ایک بادشاہ کی اطاعت کا دم بھرتے رہے ہیں، جس کا دارالخلافہ پیرس یا لیونز (Lyons) تھا۔ یہ مبہم اور شکستہ سی تصویر ہے جو مغربی یورپ کے بارے میں اندلسی مسلمانوں کو ان کی کتابوں سے ملتی تھی۔

مآخذ: متن میں مذکور ہیں۔

(J.F.P.Hopkins)[ت شیخ نذیر حسین]

••------------••

⊗ **افغانستان**: جنوبی وسطی ایشیا کا ایک اسلامی ملک [۱۹۳۳ء تک کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی حالات کے لیے دیکھیے آ آ، بذیل مادہ، ۲: ۹۲۹—۱۰۱۳].

رقبہ: افغانستان کا رقبہ ۲۲۵, ۶۵۲ مربع کلومیٹر پر محیط ہے۔ دارالحکومت کابل ہے۔ کابل کے علاوہ اس ملک کے اٹھائیس صوبہ جات: (۱) کاپیسا؛ (۲) پروان؛ (۳) وردگ؛ (۴) لوگر؛ (۵) غزنی؛ (۶) پکتیا؛ (۷) ننگرھار؛ (۸) لغمان؛ (۹) کنڑ؛ (۱۰) بدخشاں؛ (۱۱) تاخار؛ (۱۲) بغلان؛ (۱۳) کندوز؛ (۱۴) سمنگان؛ (۱۵) بلخ؛ (۱۶) جوزجان؛ (۱۷) فاریاب؛ (۱۸) بادغیس؛ (۱۹) ہرات؛ (۲۰) فراہ؛ (۲۱) نیمروز؛ (۲۲) ہلمند؛ (۲۳) قندھار؛ (۲۴) زابل؛ (۲۵) اُرزگان؛ (۲۶) غور؛ (۲۷) بامیان؛ اور (۲۸) پکتیکا ہیں۔ رقبے کے اعتبار سے بڑے صوبے علی الترتیب ہلمند، ہرات، فراہ، قندھار اور بدخشاں ہیں، جبکہ آبادی کے اعتبار سے (۱۹۸۲ء کے اعداد و شمار کے مطابق) ہرات، ننگرہار، غزنی، جوزجان، فاریاب اور بلخ ہیں۔ اہم شہر: دارالحکومت کابل کے علاوہ قندھار، ہرات، مزار شریف، جلال آباد، کندوز، بغلان، پل خمری، غزنی، گردیز، اسد آباد، طالقان اور شبرگان ہیں.

جدید تاریخ: افغانستان کا آخری بادشاہ محمد ظاہر شاہ (ولادت ۱۹۱۴ء)، جو اپنے والد نادر شاہ (۱۹۲۹- ۱۹۳۳ء) کے قتل کے بعد اُنیس سال کی عمر میں، نومبر ۱۹۳۳ء میں، تخت نشین ہوا، عملاً ۱۹۵۳ء تک حکومتی اور سیاسی اختیارات سے محروم رہا اور امور سلطنت اس کے دو چچا ہاشم خان اور شاہ محمود انجام دیتے رہے۔ محمد ہاشم خان، جو نادر شاہ کے عہد ہی سے وزیر اعظم کا منصب سنبھالے ہوے تھا اور اعلیٰ سیاسی اور انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا، ۱۹۴۶ء تک فی الواقع ملک کا حکمران رہا۔ اس دوران میں اس نے ملک میں قیام امن کی غرض سے فوج کی تنظیم نو کرنے کے علاوہ اسے جدید اسلحہ سے لیس کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ اس نے ملکی تعمیر وترقی کے لیے وسطی یورپ کے مختلف ممالک بالخصوص جرمنی سے تعلقات استوار کیے۔ چنانچہ جرمنی کی طرف سے فراہم کردہ مالی و تکنیکی امداد سے ملک میں پن بجلی کے پلانٹ، سوتی اور ریشمی کپڑا تیار کرنے، کپاس سے بنولہ الگ کرنے، سوتی دھاگہ تیار کرنے اور چقندر سے چینی تیار کرنے کے کارخانے لگائے گئے۔ اس دور میں شاہراہوں کی تعمیر اور مختلف شہروں میں ٹیلی فون اور تار کی سہولیات کی فراہمی کے اقدامات کے علاوہ جدید تعلیم کی ترویج واشاعت کے لیے مختلف شہروں میں اسکول قائم کیے گئے۔ محمد ہاشم خان کے ان اقدامات کی بدولت ملک میں تعمیر وترقی کا آغاز ہوا۔ محمد ہاشم خان کے عہد حکومت میں افغانستان نے انجمن اقوام کی رکنیت حاصل (۱۹۳۴ء) کی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں افغانستان مکمل طور پر غیر جانبداری کی پالیسی پر گامزن رہا (Louis Dupree : Afghanistan، پرنسٹن ۱۹۷۸ء، ص ۴۷۷—۴۹۸؛ Vartan Gregorian : *The Emergence of Modern Afghanistan : Politics of Reform and Modernization- 1880-1946*، اسٹان فورڈ ۱۹۶۹ء، ص ۱۴۹-۲۱۵؛ Sally Ann Baynard : *Historical Setting*، در *Afghanistan: A Country Study*، واشنگٹن ڈی۔ سی، ۱۹۸۶ء، ص ۴۸—۵۰).

۱۹۴۶ء میں محمد ہاشم کی جگہ محمد ظاہر شاہ کے ایک دوسرے چچا شاہ محمود نے وزیراعظم کا منصب سنبھال لیا۔ شاہ محمود نے سیاسی معاملات میں روادارانہ پالیسی اختیار کی۔ ۱۹۵۱ء میں ملک میں آزادی صحافت کا قانون نافذ کیا گیا، جس کی بدولت ملک میں پہلی بار متعدد حکومت مخالف اخبارات وجرائد کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ ان اخبارات وجرائد نے جلد ہی حکومت کو کڑی تنقید کا ہدف بنانے کے علاوہ، مذہبی طبقات بالخصوص علما کے خلاف

جارحانہ رویہ اختیار کر لیا اور وسیع تر اصلاحات کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ۱۹۵۲ء میں ان اخبارات وجرائد پر پابندی عائد کر دی گئی۔ حکومت مخالف صحافیوں کو قید کر دیا گیا، جن میں سے بعض کو بعدازاں بیرون ملک افغان مشنوں (سفارتی وفود) میں تعینات کر دیا گیا۔ افغانستان کے اپنی نوزائیدہ ہمسایہ اسلامی ریاست پاکستان کے ساتھ تعلقات شروع ایام سے ہی کشیدہ رہے۔ جولائی ۱۹۴۹ء میں افغان لویہ جرگہ نے دونوں ممالک کے درمیان قائم سرحدی لکیر ڈیورنڈ لائن (قائم شدہ ۱۸۹۳ء) کو غیر قانونی قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ شاہ محمود کی حکومت کا رویہ پاکستان کے بارے میں جارحانہ و مخاصمانہ رہا۔ اس نے سرحدی لکیر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۹۵۰ء تک اس سرحدی لکیر کے جنوب مشرق کی طرف پاکستان میں شامل پختون علاقوں (شمال مغربی سرحدی صوبہ، چترال اور بلوچستان کے بعض حصوں) پر مشتمل پختونستان کا قیام افغان خارجہ پالیسی کا اہم ترین نکتہ بن گیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے افغان حکومت نے پختونستان فنڈ قائم کرنے کے علاوہ قبائلی سرحدی علاقوں میں زبردست پروپیگنڈا مہم شروع کر دی۔ اگست ۱۹۵۰ء میں کابل میں پختونستان کے جھنڈے لہرائے گئے۔ اگلے سال افغانستان کے ایک نیم سرکاری جریدے انیس نے پختونستان کا نقشہ شائع کیا جس میں چترال، سرحد اور بلوچستان کے علاقوں کو شامل دکھایا گیا۔ افغانستان کے بعض مغربی ممالک میں سفارتی مشن بھی پختونستان کے قیام کے لیے پروپیگنڈا کرتے رہے۔ بدیں وجہ دونوں ممالک کے باہمی تعلقات کشیدہ ہوگئے (W.K.Fraser-Tytler: *Afghanistan: A Study of Political Develcpment in Central and Southern Asia*، لنڈن، ۱۹۶۷ء، ص ۲۴۰—۲۵۰: John C.Griffiths: *Afghanistan: Key to a Continent*، لنڈن، ۱۹۸۱ء، ص ۵۸ —۶۵: مہناز زیڈ۔ اصفہانی: *Roads and Rivals*، لنڈن، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۵-۱۰۶: ایس۔فدا یونس: *Afghanistan: Jirgahs and Loya Jirgahs (977-1992)*، پشاور، (ت۔ن) ، ص ۵۴: عظمت حیات خان: *The Durand Line: Its Geo-Strategic Importance*، پشاور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۵-۱۸۸)۔

محمد ظاہر شاہ نے ۱۹۵۳ء میں اپنے چچا زاد اور برادر نسبتی سردار محمد داؤد خان کو جو افغان مسلح افواج کا افسر اعلیٰ تھا، ملک کا وزیراعظم مقرر کر دیا۔ نئے وزیر اعظم نے، جسے ملک کی مسلح افواج کا اعتماد حاصل تھا، تمام تر سیاسی وانتظامی اختیارات اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لیے۔ یوں محمد ظاہر شاہ کی حیثیت، سردار محمد داؤد کی وزارت عظمیٰ (۱۹۵۳—۱۹۶۳ء) کے عہد میں بھی، ایک بے اختیار بادشاہ کی سی رہی (Louis Dupree: *Afghanistan*، ص ۴۹۷۔۵۰۷)۔ سردار محمد داؤد نے تعمیر وترقی کے اقدامات کو مربوط و منظم کرنے کے لیے اپنی نگرانی میں وزارت منصوبہ بندی قائم کی اور وافر مقدار میں بیرونی امداد حاصل کر کے سماجی و اقتصادی تعمیر وترقی کی رفتار اور اس کے دائرے میں اضافہ کر دیا۔ داؤد کے دور حکومت میں افغانستان کی خارجہ پالیسی میں ایک بڑی دوررس اور اہم تبدیلی رونما ہوئی۔ یہ تبدیلی ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ سیاسی واقتصادی تعلقات میں سردمہری و جمود اور شمالی ہمسایہ ریاست سوویت یونین کے ساتھ سرگرم تعلقات کے قیام پر مبنی تھی۔ چنانچہ افغانستان نے سوویت یونین کی خارجہ پالیسی میں خصوصی اہمیت حاصل کر لی۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں سوویت رہنماؤں نکیتا خروشیف (Nikita Khrushchev) اور نکولائی بلغانن (Nikolai Balganin) نے کابل کا دورہ کیا۔ کابل حکومت کو سو (۱۰۰) ملین امریکی ڈالر قرضہ کی فراہمی کی

نقشہ ساز: محسن فارانی

شرائط طے ہوئیں۔ آئندہ سالوں میں داؤد حکومت کے سوویت یونین کے ساتھ مالی و فوجی امداد، فنی تعاون اور طویل المدت قرضہ جات کی فراہمی کے درجنوں معاہدے طے پائے۔ چنانچہ اس دور میں کثیر تعداد میں سوویت مشیروں اور فنی ماہرین کی خدمات حاصل کرنے کے علاوہ افغان طلبہ اور فوجی افسروں کو تعلیم وتربیت کے لیے سوویت یونین بھیجا جانے لگا۔ سوویت رہنماؤں نے سردار داؤد کی حکومت سے کثیر الجہات تعلقات بالخصوص اقتصادی و فوجی امداد کی فراہمی کو افغانستان کی معیشت و سیاست پر اپنی گرفت قائم کرنے کے لیے ایک مؤثر حربے کے طور پر استعمال کیا۔ سوویت یونین میں زیر تعلیم و تربیت افغان نوجوانوں اور فوجی افسروں کے ذہنوں میں اشتراکی فلسفہ و نظریۂ حیات کی آبیاری کا خوب اہتمام کیا گیا۔ نتیجتاً افغان فوج، افسر شاہی اور زندگی کے دوسرے مختلف شعبوں میں سوویت یونین کے حامی وہم نوا افراد کاایک مؤثر اور طاقت ور گروہ وجود میں آگیا۔ سوویت یونین کے دباؤ پر سردار داؤد کو اشتراکیت کے علمبردار اپنے سیاسی مخالفین کے بارے میں، جن کو اس نے قید یا پھر جلا وطن کر رکھا تھا، نرم رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا، چنانچہ اس نے بعض کو رہا کر دیا جب کہ دوسروں کو وطن واپس لوٹنے کی اجازت دے دی (Anthony Arnold: *Afghanistan's Two-Party Communism : Parcham and Khalq*، اسٹان فورڈ، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱- ۱۵؛ Anthony Hymen : *Afghanistan Under the Soviet Domination, 1964-81*، لنڈن، ۱۹۸۴ء، ص ۲۷-۳۰)۔ سوویت یونین کی طرف سے فراہم کردہ امداد سے ۱۹۵۶ء میں ملک میں پہلے پانچ سالہ اقتصادی منصوبے کا آغاز ہوا۔ زراعت، صنعت اور مواصلات کے علاوہ سماجی خدمات، صحت اور تعلیم کے شعبوں میں ترقی کے اہداف مقرر کیے گئے، تاہم ایک بہتر بنیادی صنعتی ڈھانچہ اور بہتر ترقیاتی منصوبہ بندی کے فقدان کی بنا پر ملکی اقتصادی ترقی میں کوئی نمایاں پیش رفت نہ ہو سکی (Richard S. Newell: *The Politics of Afghanistan*، لنڈن، ۱۹۷۲ء، ص ۱۲۴ — ۱۴۰)۔

سردار داؤد کا تعلق اس نئی افغان نسل سے تھا جس کی تعلیم وتربیت مغرب میں ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے ملک میں جدید تعلیم کی ترویج واشاعت کے لیے بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ کابل کے علاوہ دیگر صوبائی دارالحکومتوں میں جدید تعلیمی ادارے قائم کیے گئے جس سے افغان معاشرے بالخصوص کابل میں ایک "روشن خیال" طبقہ (طبقہ منور فکران/طبقہ روشن فکران) وجود میں آگیا جس نے جلد ہی سیاسی اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی (*Afghanistan Under the Soviet Domination*، ص ۵۰ —۵۵)۔ سردار داؤد نے افغان معاشرے کی قدیم تہذیبی وسماجی روایات کو نظر انداز کرتے ہوئے ملک میں آزاد روی پر مبنی (لبرل) اصلاحات متعارف کرائیں۔ ۱۹۵۹ء میں خواتین کے برقع اوڑھنے پر پابندی لگا دی گئی اور اس پر عملدرآمد کے لیے تشدد برتا گیا۔ چنانچہ اس اصلاحی قدم کے بعد شاہی خاندان اور اعلیٰ حکومتی و سیاسی عہدوں پر فائز شخصیات کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والی خواتین پردے کے بغیر منظرعام پر آنے لگیں۔ یہی وہ لبرل اصلاحی قدم تھا جس نے ماضی میں شاہ امان اللہ خان (۱۹۱۹-۱۹۲۹ء) کے اقتدار کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا تھا (L.Poullada: *Reform and Rebellion in Afghanistan, 1919-1929*، اتھاکا۔ ۱۹۷۳ء، ص ۲۵۷-۲۶۶)۔ سردار داؤد کے اس اقدام کو بھی عامۃ الناس کے ہاں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، جس کا عملاً اظہار دسمبر ۱۹۵۹ء میں قندھار میں شدید ہنگاموں کی صورت میں ہوا (Louis Dupree:

Afghanistan، ص ۸۳۰ -۸۳۷).

داؤد عہد حکومت میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے تعلقات میں سرد مہری اور سوویت یونین کے ساتھ کثیر الجہتی تعلقات کے قیام واستحکام کے باوجود افغانستان نے اپنی غیر جانبدارانہ حیثیت کو برقرار رکھا اور برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سرپرستی میں تشکیل پانے والے دفاعی اتحاد بغداد پیکٹ اور سیٹو (SEATO) جس میں اس خطے کے اہم اسلامی ممالک، ایران، عراق، پاکستان اور ترکی شامل تھے، کی رکنیت کے خیال کو مسترد کر دیا۔ سردار محمد داؤد نے امریکہ اور پاکستان کے مابین طے پانے والے فوجی معاہدے (مئی ۱۹۵۴ء) کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا۔ سردار داؤد کی پختونستان پالیسی سے شدید ذہنی وابستگی اور اس پالیسی کو رو بہ عمل لانے کے لیے اس کی حکومت کے بعض اقدامات جس میں پاکستان کے قبائلیوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسانے کے لیے پراپیگنڈا مہم کے علاوہ مالی ترغیبات بھی شامل تھیں، کی بدولت پاکستان کے اس کے ساتھ تعلقات کشیدہ رہے۔ ۱۹۵۵ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے مغربی پاکستان میں شامل چاروں صوبوں کے انضمام اور ایک اکائی (ون یونٹ) کی تشکیل بالخصوص شمال مغربی سرحدی صوبہ کی اس میں شمولیت کی سردار داؤد نے سخت مخالفت کی۔ افغان لویہ جرگہ نے پختونستان کے قیام کے لیے پاکستان میں شامل پختون علاقوں میں استصواب رائے کا مطالبہ کیا۔ مزید براں اس نے امریکہ اور پاکستان کے مابین دفاعی تعلقات کے توڑ کے لیے مؤثر کوششوں کا بھی فیصلہ کیا۔ لویہ جرگہ کے اس فیصلے کے بعد افغانستان کا جھکاؤ واضح طور پر سوویت یونین کی طرف ہوگیا۔ کابل میں پاکستانی سفارت خانے اور جلال آباد اور قندھار میں قونصل خانوں پر افغان مظاہرین کے حملوں (۱۹۵۵ء) کے بعد دونوں ممالک کے مابین تعلقات میں مزید بگاڑ پیدا ہوگیا۔ پاکستان نے افغانستان سے سفارتی تعلقات منقطع کرنے کے علاوہ اس کو تجارتی راہداری کی سہولیات معطل کر دیں۔ اگرچہ ۱۹۵۶ء میں دونوں ممالک کے درمیان مکمل سفارتی تعلقات بحال ہوگئے۔ تاہم ان کے مابین تناؤ بدستور موجود رہا۔ یہ کشیدگی ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ستمبر ۱۹۶۰ء اور مئی ۱۹۶۱ء میں افغان نیم فوجی دستوں نے پاکستانی حدود کے اندر واقع باجوڑ ایجنسی میں راست اقدام کر ڈالا۔ ردعمل میں حکومت پاکستان نے ایک بار پھر افغانستان سے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے اور اس ملک کے لیے تجارتی راہداری کی سہولیات بھی معطل کر دیں۔ علاوہ ازیں افغانستان کے خانہ بدوش قبائل، جو موسم سرما میں پاکستانی حدود کے اندر واقع چراگاہوں پر انحصار کرتے تھے، کے پاکستانی علاقوں میں داخلے پر بھی پابندی لگا دی۔ ان اقدامات کے نتیجے میں افغان معیشت شدید ابتری سے دو چار ہوگئی اور ملک کے اندر ایک سنگین بحران اٹھ کھڑا ہوا جس پر سردار داؤد کو محمد ظاہر شاہ کے مطالبہ پر مستعفی ہونا پڑا۔ پاک افغان تنازعہ میں سوویت یونین، جو پاکستان کے امریکہ سے دفاعی و اقتصادی تعلقات سے ناخوش تھا، کی طرف سے سردار داؤد کی پختونستان پالیسی کی اعلانیہ طور پر حمایت کی گئی۔ سوویت یونین کے مقابلے میں امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے پاکستان کے مؤقف کی حمایت کی جاتی رہی (Afghanistan: Key to a Continent، ص ۶۷–۷۹؛ Afghanistan Under The Soviet Domination، ص ۲۶–۳۸؛ Roads and Rivals، ص ۱۰۶–۱۱۹؛ Raghunath Ram: Soviet Policy Towards Pakistan، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۶۹–۷۰، ۱۱۲–۱۱۳، ۱۹۴–۱۹۷؛ Afghanistan: Jirgahs and Loya Jirgahs، ص ۵۵؛ The Durand Line،

ص۲۱۳ — ۲۱۹؛ سلطانہ افروز: Afghanistan in Central در ،US-Pakistan Relations, 1947-1960، Asian Survey، ۸:۲ (۱۹۸۹ء)، ص ۱۳۱ — ۱۵۴)۔ سردار داؤد کے مستعفی ہونے پر محمد ظاہر شاہ نے ڈاکٹر محمد یوسف، داؤد حکومت میں وزیر صنعت و تجارت، کو ملک کا وزیراعظم مقرر (۱۴ مارچ ۱۹۶۳ء) کیا۔ ڈاکٹر محمد یوسف نے حکومت سنبھالنے کے بعد پختونستان پالیسی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور پاکستان کے ساتھ سیاسی اور سفارتی تعلقات کو دوبارہ استوار کرنے کی سنجیدہ کوشش کی۔ چنانچہ شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کی ثالثی و مصالحانہ کوششوں کے نتیجے میں دونوں ملکوں کے مابین، مئی ۱۹۶۴ء میں تہران میں ایک معاہدہ ''معاہدہ تہران'' طے پایا اور مکمل سفارتی تعلقات بحال ہوے، جس پر پاکستان کی طرف سے تجارتی راہداری اور دیگر سہولیات بحال کر دی گئیں (Roads and Rivals، ص ۱۱۸)۔ محمد یوسف کے دور حکومت میں افغانستان کے سوویت یونین سے تعلقات میں گرم جوشی قدرے ماند پڑ گئی۔ دونوں ممالک کے مابین دو طرفہ معاہدوں پر عمل درآمد کی رفتار بھی سست ہو گئی۔اس کے مقابلے میں ریاست ہاے متحدہ امریکہ سے اس کے تعلقات میں بہتری پیدا ہو گئی۔ امریکہ کی طرف سے شاہراہوں کی تعمیر اور زرعی ترقیاتی منصوبوں کے علاوہ اسکولوں کے لیے نصابی کتب کی فراہمی کی غرض سے امداد مہیا کی گئی (Afghanistan's Two-Party Communism، ص ۱۳)۔ اسی دور میں افغانستان نے جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کے مابین اقتصادی تعاون کے لیے قائم تنظیم کولمبو پلان (۱۹۵۱ء) کی رکنیت بھی اختیار کی۔ داخلی محاذ پر سردار داؤد کے آمرانہ طرز حکومت کے برعکس سیاسی آزادی اور جمہوریت کی طرف سفر کے لیے اہم اقدامات کیے گئے۔ ملک میں ایک نیا آئین نافذ (اکتوبر ۱۹۶۴ء) کیا گیا، جس میں بادشاہت کو آئینی حیثیت دی گئی اور اسے نادر شاہ خاندان تک محدود کر دیا گیا، البتہ شاہی خاندان کے افراد کی سیاسی جماعتوں میں شمولیت کے علاوہ، اعلی حکومتی و انتظامی عہدوں پر تقرری پر پابندی عائد کر دی گئی (Afghanistan: Key to a Continent، ص۶۸؛ W.K. Fraser-Tytler: Afghanistan، ص ۳۲۵ — ۳۳۰؛ ایس۔ فدا یونس: The Constitutions of Afghanistan، پشاور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۳-۶۶؛ نگہت مہروز چشتی: Constitutional Development in Afghanistan، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۸۹ — ۹۸)۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں آئین کے نفاذ سے ملک میں ایک نئے سیاسی دور، جسے بالعموم ''ڈیموقراطی نو'' (جمہوریت نو) کے دور سے یاد کیا جاتا ہے، کا آغاز ہوا۔ ملک میں پارلیمنٹ کی تشکیل کے لیے انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کیا گیا۔ اس اہم اقدام کے بعد، سیاسی جماعتوں پر پابندی کے باوجود، کابل میں مختلف سیاسی گروہ منظم ہوے اور متعدد نئی سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں۔ ان نئی قائم ہونے والی تنظیموں میں ''روشن خیال'' پشتون دانش وروں کی دو جماعتوں افغان سوشل ڈیموکریٹس اور پروگریسو ڈیموکریٹک پارٹی کے علاوہ شعلہ جاوید (چین نواز اشتراکی نظریات کی علمبردار جماعت) اور ستم ملی (ماؤ کے انقلابی خیالات کی حامل ایک تنظیم، جس کا نصب العین پختون علاقوں میں غیر پختون نسلی اقلیتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف مسلح جدوجہد تھا) کے علاوہ انقلاب پسند اشتراکی جماعت پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان (PDPA) بھی شامل تھی۔ اشتراکی نظریات کے علمبردار نوجوانوں پر مشتمل جماعت کو، جن میں افغانستان کے تین سابق صدور نور محمد ترکئی، حفیظ اللہ امین اور ببرک کارمل بھی شامل تھے، آئندہ سالوں میں ملکی سیاست میں انتہائی

اہمیت حاصل رہی۔ اس دور میں قوم پرست اور اشتراکی نظریات کی حامل مذکورہ سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں اسلامی نظریۂ حیات کے حامی وداعی افراد بھی منظم ہونا شروع ہوئے۔ یہ افراد مصر کی اسلامی تحریک اخوان المسلمون کے قائدین (سید حسن البنّاء اور سید قطب شہید) اور جماعت اسلامی پاکستان کے بانی سیدابوالاعلیٰ مودودی کے افکار وخیالات سے متاثر تھے۔ ان افراد کی قیادت روایتی علما کے بجائے کابل یونیورسٹی اور سرکاری کالجوں کے اساتذہ (پروفیسر غلام محمد نیازی، پروفیسر عبدالرسول سیاف، ڈاکٹر سعید محمد موسیٰ توانا اور پروفیسر برہان الدین ربانی وغیرہ)، جن میں سے چند ایک مصر کی جامعہ ازہر سے فارغ التحصیل تھے، کر رہے تھے۔ ان اسلامی دانش وروں، جو اشتراکیت اور دیگر غیر اسلامی اقتصادی و سیاسی نظاموں کے مقابلے میں دین اسلام کو ایک نظریۂ حیات کے طور پر پیش کر رہے تھے، کو کابل یونیورسٹی اور دیگر تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور طلبہ میں مؤثر پذیرائی حاصل ہوئی۔ ۱۹۶۸ء میں کابل یونیورسٹی کے ایک طالب علم عبدالرحیم نیازی نے 'جوانانِ مسلمان' کے نام سے طلبہ کی ایک اسلامی تنظیم، جس کے بانی ارکان میں انجینئر گلبدین حکمت یار بھی شامل تھا، قائم کی (Louis Dupree: *Afghanistan*، ص ۵۸۷ — ۵۸۸؛ *Afghanistan Under The Soviet Domination*، ص۲۷ — ۳۵؛ طاہر امین: *Afghan Resistance: Past, Present, and Future*، در *Asian Survey*، ۲۴:۴ (اپریل ۱۹۸۴ء)، ص ۳۷۶ - ۳۷۷؛ Henry S. Bradsher: *Afghan Communism and Soviet Intervention*، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۲ — ۶)۔

آئین کے نفاذ کے بعد جولائی ۱۹۶۵ء میں آزادی صحافت کا قانون متعارف کرایا گیا جس پر ملک میں کثیر تعداد میں اخبارات وجرائد کا اجرا عمل میں آیا (سال ۱۹۶۶ء کے موسم بہار تک ان کی تعداد ۳۶ ہوگئی تھی)۔ اگرچہ ان اخبارات وجرائد میں سے زیادہ تر انتہائی قلیل العمر ثابت ہوئے، تاہم ان کی بدولت متضاد ومتبائن نظریات وخیالات کے علمبردار گروہوں کو اپنے اپنے نظریات کی اشاعت کا ایک بہترین موقع میسر آگیا۔ چنانچہ آزادی صحافت نے ملک کے سیاسی ونظریاتی ماحول پر انتہائی دور رس اثرات مرتب کیے (Louis Dupree: *Afghanistan*، ص ۶۰۱ — ۶۱۸)۔ ملک میں ۱۹۶۵ء میں پہلی بار انتخابات منعقد ہوئے۔ انتخابی مہم کے دوران میں پی۔ڈی۔پی۔اے (PDPA) کے خلاف حکومتی اقدامات بالخصوص کثیر تعداد میں اس کے رہنماؤں کی گرفتاری کی بدولت ان دونوں کے مابین محاذ آرائی کا آغاز ہوا۔ تاہم ان انتخابات میں اشتراکی جماعت کے چار ارکان، جن میں معروف طالب علم رہنما اور پرجوش مقرر ببرک کارمل بھی شامل تھا، منتخب ہوگئے۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں پارلیمنٹ کا افتتاحی اجلاس ببرک کارمل کے حامی طلبہ، جو اجلاس کی کاروائی دیکھنے آئے تھے، کی زبردست نعرہ بازی اور ہنگامہ آرائی کی نذر ہوگیا۔ ۲۵ اکتوبر کو اشتراکی جماعت کے حامیوں نے پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے ایک مظاہرہ کیا جس نے حکومت سے تصادم کی صورت اختیار کر لی۔ افغان سپاہیوں کی فائرنگ سے متعدد افراد قتل اور ۱۰۰ سے زائد زخمی ہوئے۔ وزیراعظم محمد ہاشم میوندوال نے اگرچہ اس بحران پر قابو پا لیا تھا، لیکن کابل میں انقلاب پسند طلبہ کو (جن کی تعداد میں ہر گزرتے سال کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا) ایک مؤثر سیاسی قوت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہ طلبہ ہر سال ۲۵ اکتوبر کو مذکورہ واقعہ کی یاد منانے لگے تھے (کتاب مذکور، ص ۵۸۷ - ۵۹۷؛ *Afghanistan's Two Party Communism*، ص ۲۵-۳۷)۔ آئینی دور میں

کابل یونیورسٹی طلبہ کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ یونیورسٹی میں درس وتدریس کے معمولات شدید طور پر متاثر ہوے۔ ہڑتالوں کی بدولت مہینوں تک تعلیمی سرگرمیاں معطل رہیں۔ کابل یونیورسٹی میں جاری سیاسی سرگرمیوں کا اثر ۱۹۶۹ء کے انتخابات پر بھی پڑا۔ حکومت نے بائیں بازو کی جماعتوں کے ارکان کو پارلیمنٹ سے باہر رکھنے کے لیے خصوصی اقدامات کیے۔ چنانچہ ببرک کارمل اور حفیظ اللہ امین کے علاوہ اشتراکی جماعت (PDPA) کے دیگر رہنما انتخابات ہار گئے۔ ۱۹۶۹ء کے انتخاباب کے نتیجے میں وجود میں آنے والی پارلیمنٹ اور بادشاہ محمد ظاہر شاہ کے مابین اختیارات کی تقسیم کی بابت کشیدگی پیدا ہوگئی۔ محمد ظاہر شاہ نے پارلیمنٹ کی طرف سے پاس کردہ سیاسی جماعتوں کی تشکیل کو قانونی طور پر جائز قرار دینے اور بلدیاتی کونسلوں اور صوبائی مجالس شوریٰ کی تشکیل و قیام کے بارے میں بلوں کی منظوری سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ کابینہ کے اختیارات اور کابینہ اور پارلیمنٹ کے باہمی تعامل سے متعلق مسائل بھی ابھر کر سامنے آگئے۔ شاہ اور اس کے مشیروں کی طرف سے دستوری و قانونی اور اقتصادی اصلاحات کی بھی مخالفت کی گئی، چنانچہ ایک طرف شاہ اور مقننہ جب کہ دوسری طرف مقننہ اور کابینہ کے مابین کشمکش کے باعث ملک میں کوئی مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی۔ ۱۹۷۳ء میں سردار محمد داؤد کی طرف سے اقتدار سنبھالنے تک پے در پے پانچ حکومتیں (ڈاکٹر محمد یوسف (۱۴ مارچ ۱۹۶۳—۲۵ اکتوبر ۱۹۶۵ء)، محمد ہاشم میوندوال (۲ نومبر ۱۹۶۵— ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۷ء)، نور احمد اعتمادی (۱۵ نومبر ۱۹۶۷— ۱۲ مئی ۱۹۷۱ء)، ڈاکٹر عبدالظاہر (۲۶ جولائی ۱۹۷۱— دسمبر ۱۹۷۲ء) اور موسیٰ شفیق (دسمبر ۱۹۷۲ء— جولائی ۱۹۷۳ء) کی سربراہی میں قائم ہوئیں (Louis Dupree: *Afghanistan*، ص ۶۴۸

—۶۵۸؛ Richard S. Newell: *The Government of Muhammad Musa Shafiq: the Last Chapter of Afghan Liberalism*، در *Central Asian Survey*، ۱:۱ (۱۹۸۲ء)، ص ۵۴ — ۶۱)۔

محمد موسیٰ شفیق کے عہد حکومت (۱۹۷۲-۱۹۷۳ء) میں ہمسایہ ملک ایران کے ساتھ دریاے ہلمند کے پانی کی تقسیم کے تنازعے کا تصفیہ ہوا۔ دونوں ممالک کے درمیان فضائی رابطوں میں توسیع ہوئی۔ ایران کی طرف سے افغانستان کو ذرائع مواصلات کی تعمیر و ترقی بالخصوص کابل کو براستہ غزنی قندھار تک ملانے کے لیے ریل کی پٹڑی بچھانے کے لیے ۲ ارب ڈالر کی خطیر امداد کی فراہمی کی پیش کش کی گئی۔ دراصل شاہ ایران افغانستان کو سوویت حلقہ اثر سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ بعض مغربی ممالک کی امداد و تعاون سے ایک قومی صنعتی ترقیاتی بنک (Industrial Development Bank of Afghanistan) بھی قائم (مارچ ۱۹۷۳ء) کیا گیا۔ اسی منصوبے کے ایک حصے کے طور پر افغانستان میں صنعتی ترقیاتی منصوبوں کے لیے سرمایہ کی فراہمی کی غرض سے فرانس، برطانیہ، ریاست ہاے متحدہ امریکہ اور جاپان کے بعض کثیر القومی بنکوں کا ایک کنسورشیم بھی قائم ہوا۔ شفیق حکومت کا اس کنسورشیم سے مختلف ترقیاتی منصوبوں کے لیے درکار سرمایہ کا چالیس فی صد فراہم کرنے کا معاہدہ طے پایا تھا (*Afghanistan: The Soviet Invasion in Perspective*، ص ۵۸-۵۹؛ *Roads and Rivals*، ص ۱۲۰—۱۲۲)۔

تمام تر آئینی دور میں ملک ایک بحرانی کیفیت سے دو چار رہا، جس کے منفی اثرات معیشت پر بھی مرتب ہوے۔ ان حالات میں ملک میں شدید قحط (۱۹۷۲ء) آپڑا۔ لاکھوں کی تعداد میں بھیڑ، بکریوں اور دیگر

مویشیوں کی ہلاکت کے علاوہ ایک لاکھ سے زائد افراد بھی لقمہ اجل بن گئے۔ اس قحط کے نتیجے میں دیہی معیشت برباد ہو کر رہ گئی۔ قحط کے دوران میں حکومت کی طرف سے غذائی قلت پر قابو پانے اور اناج کی فراہمی کے لیے ناکافی انتظامات پر شدید عوامی رد عمل ہوا۔ طلبہ، نظر انداز شدہ فوجی افسران اور معاشرے کے دیگر طبقات میں حکومت کے خلاف غم وغصہ اور بے چینی شدت اختیار کر گئی۔ سیاسی عدم استحکام اور اقتصادی ابتری کے اس دور میں بائیں بازو کی اشتراکیت پسند سیاسی جماعتوں کے حلقہ ہائے اثر میں توسیع ہوتی رہی۔ طلبہ، سرکاری ملازمین، فوجی و پولیس افسران اور ''روشن خیال'' طبقے کے ارکان کی کثیر تعداد ان جماعتوں میں شامل ہوگئی (Afghanistan`s Two -Party Communism، ص ۳۱ — ۳۴: The Government of Muhammad Musa Shafiq، ص ۵۷—۵۸)۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سابق وزیراعظم سردار محمد داؤد (۱۹۵۳—۱۹۶۳ء) نے سوویت یونین کی تحریک و ترغیب پر فوج کی حمایت سے ۱۷ جولائی ۱۹۷۳ء کو محمد ظاہر شاہ کا تختہ عین اس وقت الٹ دیا جب وہ آنکھوں کے علاج کے لیے روم گیا ہوا تھا۔ اس نے اقتدار سنبھالنے کے بعد افغانستان کے ایک جمہوریہ (Republic) ہونے کا اعلان کر دیا۔ سردار محمد داؤد نے فوج کے جن عناصر کی مدد سے اقتدار سنبھالا تھا، وہ سوویت یونین نواز اور اشتراکی نظریات کے حامل تھے جن کی تربیّت سوویت یونین میں ہوئی تھی۔ نئی حکومت میں متعدد فوجی افسران کے علاوہ پی۔ڈی۔پی۔اے (PDPA) کے دونوں دھڑوں خلق اور پرچم کے متعدد رہنماؤں کو بھی شامل کیا گیا، جس سے مغربی دنیا میں داؤد حکومت کے بارے میں اشتراکی اور سوویت نواز ہونے کا تاثر قائم ہوگیا۔ صدر داؤد نے اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے انقلاب کے کچھ عرصہ بعد ہی خلق اور پرچم کے متعدد ارکان کو حکومت سے باہر کر دیا۔ اگرچہ اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ اشتراکی جماعت (PDPA) کے رہنما صدر داؤد سے فوری اور ہمہ گیر سماجی، تعلیمی اور اقتصادی و سیاسی اصلاحات کی امید لگائے ہوئے تھے، جبکہ داؤد اپنے سیاسی تجربے اور افغان معاشرہ کی سماجی وتہذیبی روایات کے پیش نظر تدریج کے اصول کا حامی تھا۔ اصلاحات کے حوالے سے تدریج اور نرم روی پر مبنی داؤد حکومت کی پالیسیوں سے بائیں بازو کی انقلابی جماعتوں بالخصوص پی۔ڈی۔پی۔اے (PDPA) کے رہنماؤں کو شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ خود سردار داؤد کا پی۔ڈی۔پی۔اے (PDPA) کے ارکان کے بارے میں رویہ تبدیل ہوگیا (Anthony Arnold: Afghanistan :the Soviet Invasion in Perspective، اسٹان فورڈ، ۱۹۸۱ء، ص ۵۵ —۶۲)۔ سردار داؤد نے اقتدار میں آتے ہی مسئلہ پختونستان کو خوب ہوا دی، چنانچہ اس کی حکومت کی طرف سے پختون اور بلوچ علیحدگی پسندوں بالخصوص نیشنل عوامی پارٹی (NAP) کو مالی امداد کے علاوہ عسکری تربیت اور اسلحہ فراہم کیا جانے لگا۔ سوویت یونین کی طرف سے ایک بار پھر افغان پالیسی کی حمایت کی گئی (Afghanistan: Key to a Continent، ص ۶۹ — ۷۵: The Durand Line، ص ۱۹۱ — ۱۹۳)۔

صدر سردار داؤد کی اہم ترجیح زرعی اصلاحات تھیں۔ ان اصلاحات کی رُو سے، جن کا آغاز اگست ۱۹۷۳ء میں کیا گیا، بنجر اور قابل کاشت زمینوں کی ملکیت کی حدود مقرر کی گئیں۔ سردار داؤد کا انداز حکمرانی آمریت پسندانہ تھا۔ اس کے دور اقتدار میں سیاسی جماعتوں پر بندش عائد رہی تاہم اس دور میں بائیں بازو کی انقلابی جماعتوں کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریۂ حیات کے علمبردار گروہوں کی

قوت میں اضافہ ہوا اور ان کا حلقۂ اثر و نفوذ طلبہ کے علاوہ فوجی افسران تک وسیع ہوا۔ البتہ بائیں بازو کی جماعتوں کے برعکس سردار داؤد کا رویہ اسلامی گروہوں کے معاملہ میں معاندانہ و جارحانہ رہا۔ نتیجتاً بعض اسلامی تنظیموں اور داؤد حکومت کے مابین مسلح تصادم کا آغاز ہوا۔ سردار داؤد نے سیکڑوں (٦ سو سے زائد) نوجوانوں اور درجنوں مذہبی رہنماؤں کو قتل کرا دیا۔ جون ۱۹۷۴ء تک ان اسلامی گروہوں کے سیکڑوں حامیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ خفیہ پولیس کو اسلامی تنظیموں کی سرگرمیوں کی کڑی نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی۔ داؤد حکومت اشتراکی عناصر کے ایما پر اسلامی گروہوں پر کاری ضرب لگانے کا عزم رکھتی تھی، چنانچہ ان کے متعدد رہنما، جن میں پروفیسر برہان الدین ربانی (استاذ علوم اسلامیہ، کابل یونیورسٹی) اور اسی یونیورسٹی کی انجنیئرنگ فیکلٹی کے ایک طالب علم رہنما گلبدین حکمت یار بھی شامل تھے، اور سیکڑوں ارکان نقل مکانی کر کے پاکستان کے شہر پشاور پہنچ گئے۔ پاکستان کی دینی جماعتوں اور وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو (۱۹۷۱-۱۹۷۷ء) کی طرف سے ان کی پذیرائی کی گئی۔ حکومت پاکستان کی طرف سے افغان اسلامی تنظیموں کی طرف داری دراصل مسئلہ پختونستان کے بارے میں سردار داؤد کی پالیسی کا توڑ کرنے کی کوشش تھی۔ ان اسلامی گروہوں نے ۱۹۷۵ء کے موسم گرما کے دوران میں افغانستان کے جنوب مشرقی اور شمالی علاقوں (پکتیا، لغمان اور بدخشان) میں حکومت کے خلاف مسلح کاروائیاں شروع کر دیں۔ وادی پنج شیر کے علاقے میں تحریک مزاحمت کو منظم کرنے کی کوششیں بھی تیز ہوگئیں (*Afghan Resistance: Past, Present, and Future*، ص ۳۷۷-۳۷۸؛ Olivier Roy: *Islam and Resistance in Afghanistan*، کیمبرج، ۱۹۸٦ء، ص ۷۳-۷۷؛ عبدالحمید ملک: *Impelled Afghan Migration to Pakistan 1978-1984*، پشاور، ۲۰۰۰ء، ص ۲۸-۳۲).

سوویت اثر و نفوذ: سردار داؤد نے سوویت یونین کی تائید و حمایت بلکہ اس کی شہ پر ظاہر شاہ کا تختہ الٹ کر اقتدار سنبھالا تھا، چنانچہ اس کے عہد صدارت (۱۹۷۳ء-۱۹۷۸ء) کے نصف اول میں افغانستان کے اندر سوویت اثر و نفوذ میں مزید اضافہ ہوگیا۔ مختلف وزارتوں اور اقتصادی و تعمیراتی منصوبوں کے علاوہ مسلح افواج کے اندر بھی سوویت مشیروں کا، جن کی تعداد تین ہزار (۳۰۰۰) تک پہنچ گئی تھی، عمل دخل بڑھ گیا۔ سوویت اثر و نفوذ اب واضح طور پر داؤد حکومت کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔ روسی مشیر فی کس ۳۰۰ تا ۵۰۰ امریکی ڈالر کی شرح سے ماہوار تنخواہ وصول کر رہے تھے، جس کا ملکی اقتصادیات پر شدید منفی اثر مرتب ہوا۔ اس دور میں ملکی معیشت کا زیادہ تر انحصار سوویت یونین پر ہی رہا۔ سردار داؤد نے اپنی صدارت کے آخری دو سالوں میں ملک پر سے سوویت یونین کی معاشی و سیاسی گرفت کو ہلکا کرنے کی ایک (ناکام) کوشش کی۔ اس نے ایران اور عرب ممالک بشمول مصر کے دورے کیے۔ ان ممالک کی طرف سے، سوویت یونین پر افغانستان کے اقتصادی انحصار کو کم کرنے کے لیے، داؤد حکومت کو خطیر مالی امداد کی فراہمی کے وعدے کیے گئے۔ سوویت یونین کے حریف اور ہمسایہ ملک عوامی جمہوریہ چین سے بھی اقتصادی امداد کی فراہمی کی درخواست کی گئی، جس کا اس نے مثبت و حوصلہ افزا جواب دیا۔ سعودی عرب کے فرمانروا شاہ خالد اور اس خطے کے بعض دوسرے ممالک کی کوششوں کی بدولت سردار داؤد اور پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو [رک بآں، در تکملہ آآآ بذیل مادہ] کی حکومت کے مابین

مصالحت کے عمل کا بھی آغاز ہوا۔ چنانچہ ۱۹۷۶ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے کابل کا جبکہ سردار داؤد نے پاکستان کا دورہ کیا۔ مؤخر الذکر نے پاکستان میں اپنے خطاب میں مسئلہ پختونستان کو جلد سلجھانے کا اعلان کیا۔ عملاً اس نے جلد ہی مسئلہ پختونستان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مزید براں اس نے عسکری شعبہ میں پاکستان کے ساتھ روابط کی داغ بیل بھی ڈالی۔ چنانچہ اس کی حکومت کی طرف سے کچھ فوجی افسران کو تربیت کے لے پاکستان بھیجنے کا منصوبہ بنایا گیا (Afghanistan Under the Soviet Domination، ص ۶۴ — ۶۵)۔ اس دور میں سوویت یونین کی طرف سے اشتراکی جماعت (PDPA) کے دونوں دھڑوں خلق اور پرچم کو فراخ دلانہ مالی امداد فراہم کی گئی۔ سوویت خفیہ ادارے کے۔ جی۔ بی (K.G.B) نے افغان فوج کے اندر اشتراکی انقلاب کے حامی خفیہ گروہ بھی منظم کر لیے (Afghan Communism and Soviet Intervention، ص ۱۶ —۲۰)۔ سردار داؤد نے ملکی حکومت و سیاست میں سے اشتراکی جماعت (PDPA) کے اثر و نفوذ کو کم کرنے کی غرض سے جنوری ۱۹۷۷ء تک کابینہ اور دیگر انتظامی عہدوں سے اس کے ارکان کو نکال باہر کیا اور تمام ریاستی وانتظامی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اس نے ملک میں گذشتہ ساڑھے تین سالوں کے دوران میں اپنی حکومت کی طرف سے جاری و نافذ کردہ اصلاحات کو آئینی تحفظ فراہم کرنے اور ایک نیا آئین تشکیل دینے کے لیے جنوری-فروری ۱۹۷۷ء کو لویہ جرگہ منعقد کیا۔ لویہ جرگہ کے انعقاد اور پھر نئے دستور کی تشکیل و تدوین کے عمل سے اشتراکی جماعت (PDPA)کو الگ تھلگ رکھاگیا۔ نئے دستور میں افغانستان کو ایک نیم اشتراکی ریاست کے قالب میں ڈھالنے کی غرض سے وسیع و عمیق اقتصادی و سیاسی اصلاحات کی بنیاد فراہم کی گئی۔ قدرتی وسائل اور کلیدی اہمیت کے اقتصادی شعبہ جات بالخصوص بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کا اختیار دیا گیا۔ دستور میں ایک سرکاری جماعت ،جو جولائی ۱۹۷۳ء کے انقلاب (داؤد انقلاب) کے تحفظ کا وظیفہ انجام دے سکے، کے قیام کی راہ بھی ہموار کی گئی۔ یہ اقدام گویا اشتراکی جماعت(PDPA) کے متوازی ایک دوسری جماعت کے قیام کی تدبیر تھی۔ سردار داؤد کے مذکورہ اقدامات سے سوویت یونین اور اس کی حمایت یافتہ اشتراکی جماعت (PDPA) کو گہری تشویش لاحق ہوئی۔سوویت یونین کو سردار داؤد کے اقدامات کی بدولت افغانستان میں اپنے طویل المدت سیاسی و معاشی مفادات خطرے میں پڑتے دکھائی دینے لگے تھے۔ چنانچہ اس نے ان کے مؤثر سدِ باب کی ٹھان لی۔ دریں حالات اس (سوویت یونین) کی تحریک پر صورت حال کا مقابلہ کرنے بالخصوص ملکی اقتدار کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لینے کی غرض سے اشتراکی جماعت کے دونوں دھڑوں خلق اور پرچم کا ادغام عمل (جولائی ۱۹۷۷ء) میں آیا، جس کے بعد اس جماعت کی داؤد حکومت کے ساتھ کشمکش میں شدت آگئی (کتاب مذکور، ص ۱۱۹-۱۲۲ ؛ Afghanistan: The Soviet Invasion in Perspective، ص ۶۱-۶۴؛ Ralph H.Magnus و Eden Naby: Afghanistan:Mullah,Marx and Mujahid، بولڈر، آکسفرڈ، ۱۹۹۸ء ص ۱۱۹؛ Afghanistan: Jirgahs and Loya Jirgahs، ص ۵۷-۵۹؛ The Constitutions of Afghanistan، ص ۶۷-۹۶)۔ اس وقت تک پی۔ ڈی۔ پی۔ اے (PDPA)، جسے سوویت یونین کی بھرپور تائید وحمایت حاصل تھی، ملک کی سب سے بڑی سیاسی قوت بن چکی تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں سرکاری تعلیمی اداروں کے اساتذہ اس کے ارکان بن چکے تھے۔ اس کا حلقۂ اثر تعلیمی اداروں کے باہر سول سروس اور اعلی تعلیم

یافتہ اشرافیہ کے علاوہ مسلح افواج تک وسیع ہو گیا تھا۔ ملک میں اقتصادی ابتری کی وجہ سے کابل یونیورسٹی اور سرکاری کالجوں اور اسکولوں سے فراغت پانے والے ہزاروں نوجوان، اس کی صفوں میں شامل ہو رہے تھے۔ دریں حالات اس کے رہنماؤں بالخصوص حفیظ اللہ امین کی ترغیب و تحریک پر مسلح افواج نے ۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء کو ملک میں ایک فوجی انقلاب برپا کر کے داؤد حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ سردار داؤد کو اپنے بھائی محمد نعیم (سابق وزیر خارجہ) اور دیگر افراد خاندان سمیت قتل کر دیا گیا۔ اس انقلاب کو انقلاب ثور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انقلاب ثور (جسے صحیح ترمعنوں میں اشتراکی انقلاب کہنا چاہئے) کے بعد ملک میں نورمحمد ترکئی کی سربراہی میں اشتراکی جماعت (PDPA) کی حکومت قائم ہوئی۔ داؤد کے نئے آئین کو منسوخ کر دیا گیا اور نئی کابینہ ،جسے انقلابی کونسل کا نام دیا گیا تھا، میں انقلاب میں مؤثر کردار ادا کرنے والے فوجی افسران کو بھی شامل کیا گیا۔ نئی حکومت میں پی۔ ڈی۔ پی۔اے (PDPA) کے پرچم دھڑے کے رہنما ببرک کارمل نائب وزیراعظم جب کہ اس کے خلق دھڑے کے رہنما حفیظ اللہ امین کو نائب وزیراعظم اور وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔ فوجی افسران میں سے میجر محمد اسلم وطنجار کو نائب وزیراعظم کے علاوہ وزارت مواصلات کا قلمدان جب کہ کرنل عبدالقادر کو وزارت دفاع جیسے کلیدی نوعیت کے عہدے دیئے گئے (Afghanistan`s Two- Party Communism، ص ۴۷ -۶۵)۔ اشتراکی جماعت کی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی اس کے دونوں دھڑوں پرچم اور خلق کے درمیان اقتدار کی کشمکش شروع ہوگئی۔ خلق (جسے اکثریتی دھڑے کی حیثیت حاصل ہونے کے علاوہ مسلح افواج میں بھی اثر ونفوذ حاصل تھا اور جس کے ایک سرکردہ رہنما حفیظ اللہ

امین نے انقلاب ثور کی منصوبہ بندی کی تھی) کے رہنما نور محمد ترکئی نے حکومتی وسیاسی معاملات میں پرچم کے اثرو نفوذ کو کم کرنے کے لیے وسط جون تک سرکاری وزارتوں، کابل ریڈیو اور کابل یونیورسٹی میں تمام اہم انتظامی عہدوں پر اس کے حامیوں کی جگہ خلق دھڑے کے معتمد اور وفا دار ارکان کا تقرر کر دیا۔ پرچم کے صف اوّل کے قائدین، جن میں ببرک کارمل بھی شامل تھا، کومختلف ممالک میں بطور سفارت کار تعینات کر دیا گیا۔ یوں پرچمی رہنما اقتدار کی کشمکش میں کوئی مؤثر کردار کرنے کے قابل نہ رہے اور خلق دھڑے کی حکومتی وانتظامی معاملات پر گرفت مضبوط ہوگئی۔اشتراکی انقلاب کے بعد افغانستان میں سوویت اثر و نفوذ اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ترکئی کی حکومت سے ۲۵ سالہ دوستی اور تعاون کا ایک خصوصی معاہدہ بھی کیا۔ اس معاہدے کی بدولت افغانستان کے اندر سوویت افواج کی مداخلت کی راہ ہموار ہوئی (William J. Barnds : South Asia، در Kurt London (مدیر): The Soviet Union in World Politics ، بولڈر، لنڈن، ۱۹۸۰ء، ص ۲۱۴-۲۱۵؛ Afghanistan`s Two-Party Communism، ص ۶۴-۷۰؛ Afghan Communism and Soviet Intervention، ص ۲۳- ۳۵)۔

اشتراکی حکومت کا عزم اور نصب العین مسلم دنیا کے ایک انتہائی روایت پسند ملک (افغانستان) میں اشتراکی اصول ونظریات کی اساس پر تیز رفتار سیاسی، سماجی، تہذیبی اور نظریاتی انقلاب برپا کرنا تھا۔ چنانچہ انقلاب ثور کے فوراً بعد پی۔ڈی۔ پی۔اے کے منشور کی روشنی میں ملک کو اشتراکی قالب میں ڈھالنے (روس اور اس کے اتحادی اشتراکی ممالک کے نقش قدم پر چلتے ہوئے) کے عمل کا آغاز ہوا۔ ملک میں اشتراکی نظریات وتصورات کی ترویج

واشاعت اور قدیم تہذیبی وسماجی روایات اور مذہبی اقدار کی بیخ کنی اور اقتصادی وسیاسی ڈھانچے کی تشکیل نو کے لیے ہمہ جہت اصلاحات متعارف کرائی گئیں۔ ان اصلاحات پر عملدرآمد کی ذمہ داری خلق جماعت کے وفادار ارکان پر مشتمل کمیٹیوں کو سونپی گئی۔ ترکئی دور حکومت میں مذکورہ نصب العین کے حصول کے لیے ایک جبری خواندگی مہم چلائی گئی۔ اس سلسلہ میں فوجی بیرکوں کے علاوہ دیہی علاقوں پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ملک میں تعلیم بالغاں کے لیے کلاسوں میں مردوں کے علاوہ عورتوں کی شرکت کو لازمی قرار دیا گیا۔ نوجوانوں کے لیے خواندگی مہم میں کشش پیدا کرنے کے لیے اسکولوں میں جسمانی تعذیب پر پابندی لگا دی گئی اور امتحانات کا سلسلہ موقوف کردیا گیا۔ ان اقدامات کی بدولت شہروں میں اسکولوں اور کالجوں میں داخل ہونے والے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوگیا (Afghanistan`s Two- Party Communism، ص ۷۳-۷۸؛ Afghanistan Under the Soviet Domination، ص ۹۲-۹۵)۔ ترکئی حکومت کے انقلابی اقدامات میں سے ایک اہم قدم ملکی پرچم کی تبدیلی تھی۔ سابق پرچم کی جگہ ایک نیا قومی پرچم تیار کیا گیا جو سوویت یونین کی وسطی ایشیائی جمہوریاؤں کے پرچموں سے مماثلت رکھتا تھا (کتاب مذکور، ص ۱۰۱)۔ ۱۹۷۸ء کے بعد ملک میں ایک ایسا سیاسی نظام متعارف کرایا گیا جو بہت زیادہ حد تک سوویت نظام سے مشابہت رکھتا تھا۔ نئے سیاسی نظام میں انقلابی کونسل (کابینہ)، پولٹ بیورو اور بالخصوص پی۔ڈی۔پی۔اے (PDPA) کی مرکزی کمیٹی کو ملک کے تمام سیاسی وانتظامی اختیارات حاصل ہوگئے۔ ملک کی سیاسی وانتظامی تشکیل نو کے ضمن میں اہم قدم ملک میں یک جماعتی نظام بالفاظ دیگر اشتراکی جماعت پی۔ڈی۔پی۔اے کی آمریت کا قیام تھا۔ اشتراکی جماعت کو مستحکم اور اس کے دائرے کو وسیع کرنے کے لیے تمام ملازمین کو، ایک حکومتی فرمان کے ذریعے، اس جماعت کی رکنیت اختیار کرنے کا پابند بنایا گیا۔ اس کے وفادار اور بااعتماد ارکان وعہدیداران کو سرکاری محکموں میں کلیدی عہدوں پر فائز کیا گیا۔ اس کے علاوہ، سوویت یونین اور دیگر اشتراکی ممالک کی تقلید میں، افغان معاشرے کے مختلف طبقات طلبہ، مزدوروں، کسانوں، تاجروں اور عورتوں کی الگ الگ تنظیموں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اشتراکی جماعت (پی۔ڈی۔پی۔اے) اور اس کی ذیلی تنظیموں کے ڈھانچوں کی تشکیل میں اشتراکی ممالک کے افغانستان میں موجود سفارت خانوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ملک میں اشتراکی انقلاب کے تحفظ و بقا کے لیے سوویت یونین کی خفیہ ایجنسی کے۔جی۔بی (K.G.B) کی طرز پر ایک افغان خفیہ پولیس خاد (خدمتِ اطلاعاتِ دولتی۔ State Information Service) سوویت یونین اور مشرقی جرمنی کے ماہرین کی نگرانی میں قائم کی گئی۔ اس نے اشتراکی انقلاب کے مخالفین کو کچلنے کے لیے انتہائی ظلم وجبر سے کام لیا (Donald M. Seekins: Government and Politics، در Afghanistan: A Country Study، ص ۲۰۹-۲۱۷؛ Olivier Roy: The Sovietization of Afghanistan، در Milan Hauner؛ Robert L. Canfield (مدیران): Afghanistan and the Soviet Union: Collision and Trasformation، لنڈن، ۱۹۸۹ء، ص ۳۸-۴۰)۔ صدر ترکئی اور انقلابی کونسل (کابینہ) میں موجود پرچم کے ارکان اصلاحات کے نفاذ کے حوالے سے تدریج کے اصول کے حامی تھے، جبکہ سرکردہ خلقی رہنما حفیظ اللہ امین (جو سوویت یونین میں اشتراکی انقلاب کے قائدین لینن اور اسٹالن کے آہنی عزم کا زبردست مداح تھا) انقلاب ثور کے بعد روسی رہنماؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملک میں فوری، ہمہ

گیر اصلاحات اور ان پر عمل درآمد کی غرض سے ہر طرح کے ظلم و تشدد کا حامی تھا۔ چنانچہ اس کے زیر اثر حکومتی کارندے اور پی۔ڈی۔پی۔اے (PDPA) کے جوشیلے انقلاب پسند ارکان افغان معاشرے کی قدیم تہذیبی و ساجی روایات اور اسلامی مذہبی اقدار کی بیخ کنی اور اشتراکی اصول و تصورات پر مبنی اصلاحات کے نفاذ کے لیے متحرک ہوگئے۔ انہوں نے اس راہ میں درپیش رکاوٹوں پر قابو پانے کے لیے قوت و طاقت کے استعمال کی روش اختیار کی۔ چنانچہ ان کی طرف سے ملک کے مختلف حصوں میں اشتراکی انقلاب کی راہ میں مزاحم ہونے والے جاگیرداروں، عام کسانوں اور دینی رہنماؤں کو جبر و تشدد کا نشانہ بنانے کے علاوہ ان کے گھروں کو مسمار کرنے اور ان کے گھروں میں موجود دینی کتب کو نذر آتش کرنے جیسے ناخوشگوار واقعات کثرت سے پیش آئے (Afghanistan Under the Soviet Domination، ص ۶۴—۶۵)۔

افغان اشتراکی حکومت اور مغربی ممالک: اشتراکی انقلاب کے بعد مغربی ممالک بالخصوص امریکہ نے افغانستان سے اپنے سیاسی و سفارتی تعلقات کو برقرار رکھا تھا۔ تاہم ۱۴ فروری ۱۹۷۹ء کو اشتراکی نظریات کے حامل گروہ، ستم ملی کی طرف سے کابل میں تعینات امریکی سفیر اڈولف ڈبس (Adolph Dubs) کے اغوا اور قتل کا واقعہ پیش آنے کے بعد امریکہ افغان تعلقات میں بگاڑ و انحطاط اپنی انتہا کو جاپہنچا، چنانچہ امریکہ نے کابل میں اپنے نئے سفیر کا تقرر نہیں کیا۔ امریکہ کی طرف سے افغانستان کے لیے مختص امداد (۲۵ ملین ڈالر) میں سے ۸۰ فی صد کم کر دی گئی۔ ان امریکی اقدامات سے ترکئی حکومت کو سخت دھچکا لگا۔ مغربی ممالک کی طرف سے مالی امداد کی فراہمی کا سلسلہ منقطع ہونے پر اقتصادی اعتبار سے بھی افغانستان کا انحصار کلی طور پر سوویت یونین پر ہو کر رہ گیا (Afghanistan Under the Soviet Domination، ص ۹۶-۹۹؛ Afghan Communism and Soviet Intervention، ص ۴۷؛ Afghanistan: the Soviet Invasion in Perspective، ص ۹۷، ۱۵۴)۔

تحریک مزاحمت و جہاد: ترکئی حکومت کی انقلابی اصلاحات اور ان پر عمل درآمد کے لیے جبر و تشدد کی روش کے نتیجے میں افغان عوام میں جن کی بھاری اکثریت مذہبی اور ساجی رسوم و روایات کے حوالے سے شدید روایت پسند واقع ہوئی ہے، حکومت کے خلاف غم و غصہ اور نفرت و بے زاری کی لہر دوڑ گئی، جس نے جلد ہی حکومت کے خلاف مزاحمت کی ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی، چنانچہ ۱۹۷۹ء کے موسم بہار کے اواخر تک نورستان، کنڑ اور پکتیا کے صوبہ جات میں حکومت کے خلاف بغاوت و مزاحمت کا آغاز ہوگیا (Gerard Chaliand: Report from Afghanistan، نیویارک، ۱۹۸۲ء، ص۳۷-۳۸)۔ ۱۹۷۹ء کے وسط تک مزاحمت کا دائرہ افغانستان کے زیادہ تر علاقوں تک وسیع ہوگیا۔ جس کو ہزارہ جات، نورستان، بدخشان اور بالخصوص مغربی شہر ہرات میں خوب تقویت پہنچی۔ ہرات چھاؤنی سے کثیر تعداد میں افغان سپاہی سرکاری افواج سے منحرف ہو کر تحریک مزاحمت میں شامل ہوگئے تھے۔ منحرف فوجی دستوں نے کثیر تعداد میں افغان فوجی افسروں کے علاوہ سوویت فوجی مشیروں اور ان کے اہل خانہ کو قتل کر دیا۔ تاہم ترکئی حکومت نے جلد ہی بھرپور فوجی طاقت کے استعمال سے، جس کے نتیجے میں پانچ ہزار سے زائد شہری اور منحرف فوجی ہلاک ہوئے، ہرات شہر میں جاری مزاحمت پر قابو پا لیا (Bo Huldt و Erland Jansson: The Tragedy of Afghanistan : the Social, Cultural and Political Impact of the Soviet Invasion، لنڈن (کروم ہیلم)،

۱۹۸۸ء، ص ۲۰ —۳۷؛ Mark Urban: War in Afghanistan، لنڈن، ۱۹۹۰ء، ص ۲۷—۲۹)۔ ہرات میں پیش آنے والے واقعات کے بعد مختلف مزاحمتی گروہوں نے سرکاری افواج کے خلاف گوریلا کارروائیوں کا سلسلہ تیز کر دیا۔ ان کارروائیوں کے نتیجے میں فوجی مواصلات کے نظام کو شدید نقصان پہنچا جب کہ سیکڑوں کی تعداد میں افغان فوجی اور سول ملازمین ہلاک ہوے۔ افغان افواج نے تحریک مزاحمت کو کچلنے کے لیے سویت یونین کی طرف سے فراہم کردہ جدید ترین اسلحہ کا استعمال شروع کیا۔ ایسے علاقوں پر، جو حکومت مخالف سرگرمیوں کا مرکز تھے، وسیع پیمانے پر بمباری کی گئی جس کے نتیجے میں ہزاروں افغان ہلاک ہوے۔ افغان زمینی افواج اور فضائیہ کی کارروائیوں میں شدت آجانے سے لاکھوں کی تعداد میں افغان عوام ہجرت کرکے قریبی ہمسایہ ممالک پاکستان اور ایران چلے گئے۔ ستمبر ۱۹۷۹ء تک مجاہدین کی چھاپہ مار کارروائیوں کا دائرہ کابل کے گرد و نواح تک وسیع ہوگیا اور خود سرکاری افواج کے اندر برگشتگی اور انحراف ایک معمول بن گیا۔ مختلف علاقوں میں افغان فوجیوں نے مسلح افواج کے اندر سویت مشیروں سے جو افغان مزاحمت کو کچلنے کے لیے فوجی کارروائیوں کی نگرانی کر رہے تھے اور جن کی بدولت وسیع پیمانے پر افغان عوام ہلاک ہو رہے تھے، نفرت وبیزاری کے طور پر مقامی فوجی قیادت کے خلاف بغاوت کر دی۔ چنانچہ سرکاری افواج کو بھاری جانی ومالی نقصان اٹھانا پڑا۔ فوج کے اندر ٹکراؤ اور کثیر تعداد میں فوجی دستوں کی برگشتگی کی وجہ سے اس کا حجم دن بدن سکڑتا اور اس کا حوصلہ پست ہوتا رہا۔ اس چیز نے ۱۹۷۹ء کے موسم خزاں تک انتہائی سنگین صورت حال اختیار کرلی۔ تمام تر ممکنہ تدابیر کے باوجود ملک کے بڑے شہروں اور عسکری مراکز کے علاوہ باقی علاقوں پر سے حکومت کا اختیار واقتدار ختم ہوکر رہ گیا (Report from Afghanistan، ص۱۲۶ —۱۴۷؛ War in Afghanistan، ص ۳۰ —۳۴، ۵۵ —۵۶، ۶۸ —۶۹، ۷۸ —۸۳)۔ ملک میں جاری داخلی بحران کے اس دور میں حفیظ اللہ امین اور صدر ترکئی کے درمیان اقتدار کی کشمکش بھی شدت اختیار کرگئی۔ حفیظ اللہ امین نے ملکی معاملات پر اپنی گرفت کو مضبوط بنانے کے لیے وزیر اعظم کا منصب سنبھالنے کے علاوہ، مزاحمت کو کچلنے کے لیے فوجی کارروائیوں کا اختیار براہ راست اپنے ہاتھ (وزیر دفاع کا منصب سنبھال کر) میں لے لیا۔ جواباً صدر ترکئی نے اپنے اقتدار کی حفاظت کے طور پر پی۔ڈی۔پی۔اے (PDPA) کے سیکرٹری جنرل کے منصب کے علاوہ اعلیٰ سطحی ملکی سیاسی ادارے 'نیو ہوم لینڈ ہائی ڈیفنس کونسل' کی صدارت بھی سنبھال (ستمبر۱۹۷۹ء) لی۔ صدر ترکئی نے سوویت حکمرانوں کی تائید وحمایت سے حکومت میں فوجی عناصر کا کردار بڑھانے اور حفیظ اللہ امین سے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم وہ اپنے اس ایجنڈے پر عمل درآمد کی جدوجہد کے دوران میں حفیظ اللہ امین کے حامیوں کے ہاتھوں قتل (۱۶ ستمبر۱۹۷۹ء) ہوگیا۔ بعدازاں صدارت کے منصب پر حفیظ اللہ امین براجمان ہوگیا (Afghanistan Under the Soviet Domination، ص ۱۵۵ —۱۵۷)۔ صدر ترکئی کی ہلاکت کے بعد سوویت یونین نے حفیظ اللہ امین کے گرد آہنی شکنجہ کسنے اور افغانستان کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء کو سوویت ٹینکوں کے دستے شمالی سرحدوں کو عبور کرتے ہوے افغانستان کے اندر داخل ہوگئے، جس کے بعد ملک پر سوویت یونین کا فی الواقع تسلط قائم ہوگیا۔ صدر حفیظ اللہ امین کو قتل کر دیا گیا اور ببرک کارمل جو گذشتہ ایک سال

سے ماسکو میں پناہ لیے ہوے تھا اور جس نے سوویت یونین کی سرپرستی میں چند ماہ قبل امین حکومت کے مخالفین یعنی سابق فوجی افسران، اور جلاوطن سیاسی رہنماؤں پر مشتمل ایک ظلّی (Shadow) کابینہ بھی تشکیل دے رکھی تھی، کی سربراہی میں کابل میں ایک کٹھ پتلی حکومت تشکیل دی گئی (*Afghanistan : The Soviet Invasion in Perspective*، ص ۳۵—۶۰).

نور محمد ترکئی اور حفیظ اللہ امین کا دور حکومت انتہائی استبداد کا دور تھا۔ ان کے عہد میں مخالفین کو بدترین ظلم وجبر کا نشانہ بنایا گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ صرف پل چرخی جیل (کابل کے نواح میں) میں، اپریل ۱۹۷۸ء سے ستمبر ۱۹۷۹ء تک، ۱۲،۰۰۰ سے بھی زائد افراد کو قید کیا گیا تھا۔ پل چرخی اور ملک کی دیگر جیلیں قتل گاہوں میں تبدیل ہو کر رہ گئیں، جہاں اشتراکی انقلاب کے مخالفین کو اجتماعی طور پر موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں وزارت دفاع، وزارت خارجہ، وزیراعظم محل کے تہہ خانوں اور کابل میں بہت سے دیگر مقامات پر عقوبت خانے قائم کیے گئے تھے جہاں مخالفین پر تشدد کیا جاتا تھا (کتاب مذکور، ص ۱۰۶—۱۱۴؛ *Afghanistan under the Soviet Domination*، ص ۱۵۸).

سوویت یونین، جس کی افواج کی تعداد افغانستان میں ایک لاکھ سے متجاوز ہوگئی تھی، نے اس ملک پر اپنے تسلط کو مستحکم کرنے کی غرض سے کثیر تعداد میں فوجی بیرکوں، ہر موسم میں قابل استعمال ہوائی اڈوں اور تیل کو ذخیرہ کرنے کے لیے زیر زمین ٹینکوں کی تعمیر کے علاوہ متعدد فوجی چھاؤنیاں قائم کر لیں۔ مزید براں اس نے افغانستان اور وسطی ایشیائی جمہوریاؤں کے درمیان ذرائع مواصلات و نقل و حمل کو خصوصی طور پر ترقی دی۔ افغانستان میں موجود تیل، گیس اور دیگر قدرتی وسائل کے ذخائر کے استحصال کے لیے دریائے آمو پر جدید ترین پل تعمیر کرنے کے علاوہ، ریل پٹڑیوں اور شاہراہوں کے ذریعے افغانستان کو وسطی ایشیا سے گہرے طور سے مربوط کر دیا۔ افغانستان سے تیل اور گیس کی ترسیل کے لیے پائپ لائنیں بھی بچھائی گئیں (Robert L. Canfield: *Western Stakes in the Afghanistan war*، در *Central Asian Survey*، ۴:۱ (۱۹۸۵ء)، ص ۱۲۳—۱۲۷؛ محمد یوسف و Mark Adkin: *The Bear Trap : Afghanistan`s Untold Story*، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۴۴—۴۸)۔ افغانستان میں ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء کے بعد اگرچہ بظاہر ببرک کارمل کی حکومت موجود تھی، لیکن حقیقی اختیار واقتدار سوویت یونین اور افغانستان میں ان کے سویت نمائندوں کے ہاتھوں میں تھا۔ ببرک کارمل کی سربراہی میں تشکیل پانے والی کابینہ کے ارکان کا تقرر سوویت حکام کے طرف سے عمل میں آیا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے انتظامی عہدوں پر سوویت عمال اور عہدیداران کو تعینات کیا گیا تھا (*Afghanistan under the Soviet Domination*، ص ۳۵—۶۰)۔ سوویت تسلط کے اس دور میں افغانستان میں اشتراکی نظام کی ترویج واستحکام کے لیے خصوصی اقدامات کیے گئے۔ ملک کے سیاسی وانتظامی ڈھانچے اور نظام تعلیم کی تشکیل نو کے علاوہ افغان عوام میں، ان کی مذہبی وتہذیبی اقدار سے متصادم سوویت تہذیب و معاشرت اور طرزِ زندگی کو فروغ دینے کے لیے ہر ممکن تدابیر اختیار کی گئیں۔ چنانچہ کابل اور دیگر شہروں میں مرد و زن کے آزادانہ اختلاط، بے پردگی، رقص وسرود کی محفلوں کے انعقاد اور شراب نوشی جیسی چیزیں عام ہوگئیں۔ اس دور میں افغان نوجوان نسل کو اپنے موروثی مذہب اور تہذیب و ثقافت سے بے گانہ و ناآشنا بنانے اوراس کے دل و

دماغ میں اشتراکی نظریۂ حیات کو راسخ کرنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں کم سن بچوں کو اپنے والدین سے جبراً جدا کر کے، بظاہر تعلیم و تربیت کی غرض سے، سوویت یونین بھیجا جانے لگا۔ سوویت یونین نے وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں اور منگولیا میں اس حربے کو بڑی کامیابی سے آزمایا تھا (اے۔ رسول امین: The Sovietization of Afghanistan، در Rosanne Klass (مدیر): Afghanistan: The Great Game Revisited، نیویارک، ۱۹۸۷ء، ص ۳۰۱—۳۳۴؛ Marian Leighton: Soviet Options and Opportunities in Southern Asia، در Robin F. Laird و Erik P. Hoffmann (مدیران): Soviet Foreign Policy in a Changing World، نیویارک، ۱۹۸۶ء، ص ۷۹۶؛ The Sovietization of Afghanistan، ص ۴۸—۶۰؛ راجہ انور: The Tragedy of Afghanistan، ترجمہ: خالد حسن، لنڈن، نیویارک، ۱۹۸۸ء، ص ۲۲۳— ۲۲۸).

ببرک کارمل کی حکومت نے قومی مصالحت کی غرض سے ہزاروں کی تعداد میں سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کے علاوہ امین دور میں قتل ہونے والے حکومت مخالفین کی یاد میں سرکاری طور پر یوم شہدا منانے کا اہتمام کیا۔کچھ عرصہ کے لیے خفیہ پولیس ختم کردی گئی اور اس کے ظالم صفت کارندوں میں سے متعدد کو سزائے موت دی گئی۔ کارمل نے اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے جنوبی سرحدوں پر آباد قبائل کو تالیف قلب کے طور پر بھاری رشوتیں دیں اور قبائلی سرداروں کو علاقائی خود مختاری کا وعدہ دیا۔ اس نے ملک میں انقلابی اصلاحات کے عملدرآمد کے سلسلے میں بھی قدرے نرم رویہ اختیار کیا۔ تاہم یہ تمام اقدامات بے سود ثابت ہوے اور حکومت عوامی تائید وحمایت کے حصول میں ناکام رہی (ریاض ایم۔ خان: Untying the Afghan Knot: Negotiating the Soviet Withdrawal، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۵۷—۶۵).

سوویت یونین کے تسلط کے خلاف تحریک مزاحمت: ملک میں جاری تحریک مزاحمت، جسے خلق حکومت تمام ممکنہ تدابیر اختیار کرنے کے باوجود کچلنے میں ناکام رہی تھی، اب ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔ سوویت یونین کے ملک پر غاصبانہ تسلط کے بعد افغان قوم کا جذبہ حریت وعزیمت پوری طرح سے بیدار وتوانا ہوگیا تھا، چنانچہ اس نے جدید ترین اسلحہ سے لیس دنیا کی ایک عظیم عسکری قوت کے خلاف ڈٹ جانے کا پختہ عزم کر لیا۔ سوویت افواج کی مداخلت کے چند دن بعد (جنوری ۱۹۸۰ء) قندھار، ہرات اور کابل کے علماء نے سوویت افواج اور اس کی مسلط کردہ نام نہاد حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کردیا۔ جلد ہی سوویت افواج اور اس کی کٹھ پتلی افغان حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کے لیے پشاور میں موجود بعض افغان اسلامی تنظیموں کا ایک اتحاد قائم (جنوری ۱۹۸۰ء) ہوگیا۔ کابل شہر میں افغان ملیشیا فورس اور سوویت افواج کی طرف سے طاقت کا بے محابا استعمال کیا گیا، جس کے نتیجے میں سیکڑوں افراد ہلاک اور کئی ہزار زخمی ہوگئے۔ اس دوران ۵۰۰۰ سے زائد افراد کو حراست میں لے لیا گیا۔ اپریل ۱۹۸۰ء میں انقلاب ثور کی دوسری سالگرہ کے موقع پر کابل اور دیگر شہروں میں حکومت کے خلاف طلبہ کی قوم پرست اور اسلامی تنظیموں کے زبردست مظاہرے ہوے۔ کابل میں سوویت فوجوں کی طرف سے فائرنگ کے نتیجے میں ۲۰۰ سے زائد طلبہ ہلاک اور ۲۰۰۰ سے زائد زخمی ہوگئے، چنانچہ شہر پر کئی روز تک غم واندوہ کی کیفیت طاری رہی۔ سوویت افواج کی طرف سے کابل شہر میں ہائی اسکولوں میں موجود پانی کے ٹینکوں میں زہر ملانے جیسے واقعات بھی پیش آئے۔

کابل میں پیش آنے والے واقعات کے ملک کے دیگر حصوں پر گہرے اثرات مرتب ہوے۔ چنانچہ جلال آباد، ہرات، قندھار، بغلان اور کندوز میں تحریک مزاحمت میں تیزی آگئی اور کثیر تعداد میں افغان فوجی دستے منحرف ہو کر اس میں شامل ہوگئے (Afghanistan Under the Soviet Domination، ص ۱۸۱ — ۱۸۳؛ Islam and Resistance in Afghanistan، ص ۳۱ — ۶۲؛ Afghan Communism and Soviet Intervention، ص ۱۳۷ — ۱۴۰؛ War in Afghanistan، ص ۵۹ — ۶۱).

اتحاد اسلامی مجاہدین افغانستان: سوویت تسلط کے خلاف مزاحمت کو ۱۹۸۰ء کے وسط تک بھرپور عوامی حمایت حاصل ہوگئی۔ اگرچہ افغان معاشرے کے تمام طبقات اور نسلی، لسانی، دینی، قوم پرست وغیرہ سب گروہ تحریک مزاحمت و جہاد میں شامل ہوگئے تھے تاہم اس میں علما و صوفیا پیش پیش رہے (Olivier Roy: Sufism and the Afghan Resistance، در Central Asian Survey، ۲: ۴ (۱۹۸۳ء)، ص ۶۱-۸۰)۔ آغاز میں ایک مؤثر اجتماعی قیادت کی عدم موجودگی میں مختلف مزاحمتی گروہوں کی چھاپہ مار کارروائیاں غیر منظم وغیر مربوط رہیں۔ اجتماعی قیادت کے اس خلا کو پر کرنے کے لیے ۱۹۸۱ء میں سید احمد گیلانی (محاذ ملی اسلامی)، پروفیسر صبغت اللہ مجددی (جبہ نجات ملی)، مولوی نبی محمدی (حرکتہ انقلاب اسلامی)، گلبدین حکمت یار (حزب اسلامی)، برھان الدین ربانی (جمعیت اسلامی)، مولوی محمد یونس خالص (حزب اسلامی خالص) اور عبدالرب رسول سیاف (اتحاد اسلامی) کے دھڑوں پر مشتمل 'اتحاد اسلامی مجاہدین افغانستان' کے نام سے ایک وفاق و اتحاد قائم ہوا۔ حکومت پاکستان، ریاست ہاے متحدہ امریکہ اور سعودی عرب نے اس اتحاد کو افغان مزاحمت کے ترجمان کے طور پر تسلیم کر لیا۔ اتحاد کا ترجمان ہر تین ماہ کے لیے باری باری مقرر کیا جاتا رہا؛ جو اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے ملاقات کے سلسلہ میں سات جماعتی اتحاد کی نمائندگی کرتا۔ اسی طرح ہر سال اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں افغان مزاحمت کی نمائندگی کے لیے اتحاد اسلامی اپنا وفد بھیجتا رہا (Osta Olesen: Islam and Politics in Afghanistan، سرّے (یوکے)، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۲-۱۴۵)۔ اتحاد کی تشکیل کے بعد مشترکہ طور پر سوویت افواج کے خلاف کارروائیوں کا آغاز ہوا۔ ابتدائی دور میں افغان مجاہدین کے پاس جدید اسلحہ کی فراہمی کا کوئی انتظام نہ تھا چنانچہ وہ قدیم فرسودہ ہتھیاروں سے کام لیتے رہے۔ تاہم ان کے ہاتھوں افغان اور سوویت افواج کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ ۱۹۸۲ء کے اختتام تک صرف سوویت یونین کے ۵,۰۰۰ سے زائد فوجی ہلاک اور ۱۵,۰۰۰ زخمی ہوچکے تھے۔ مزاحمت کو کچلنے میں ناکامی اور بھاری جانی نقصان سے جھنجھلا کر سوویت افواج نے ملک پر جنیوا معاہدے کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرتے ہوے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا استعمال شروع کر دیا اور پاکستان سے ملحق سرحدی علاقوں میں، مجاہدین کی نقل وحرکت کو روکنے کے لیے بارودی سرنگوں کا جال بچھا دیا۔ چین افغان سرحد کو بھی بند کر دیا گیا۔ ان تمام اقدامات کے باوجود افغان تحریک مزاحمت، جس کی جڑیں عوام میں گہرے طور پر پیوست ہوچکی تھیں، پوری قوت سے جاری رہی۔ ۱۹۸۲ء کے بعد سے چین اور مصر کے علاوہ بعض مغربی ممالک بالخصوص ریاستہاے متحدہ امریکہ کی طرف سے جدید اسلحہ کی فراہمی کے بعد عسکری صورت حال بدل گئی۔ افغان اور سوویت

افواج کا جانی نقصان پہلے سے دو چند ہوگیا (John Fullerton: The Soviet Occupation of Afghanistan، ہانگ کانگ، فارایسٹرن اکنامک ریویو، (س-ن)، ص ۸۴-۱۱۸؛ Robert D.Kaplan: Soldiers of God : With the Majahidin in Afghanistan، بوسٹن، ۱۹۹۵ء، ص ۸۵-۱۳۵؛ Barnet R.Rubin: The Fragmentation of Afghanistan :State Formation and Collapse in the International System، لنڈن ۱۹۹۵ء، ص ۲۲۰-۲۲۵؛ Afghan Communism ، ص ۲۱۱-۲۱۳).

سوویت افواج کی جنگی کارروائیاں اور انسانی حقوق کی پامالی:

سوویت افواج نے ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء کوافغانستان میں مداخلت کے بعد افغان عوام کو زیر نگیں کرنے کے لیے قوت و طاقت کے ہر ہر حربے کو خوب آزمایا ۔ان کی طرف سے ملک بھر میں انتہائی خوف و ہراس کا ماحول پیدا کیا گیا ۔ تحریک مزاحمت کی حمایت اور پشت پناہی کے شبہ میں بیسیوں ہزاروں افراد کو جیلوں میں قید کیا گیا جب کہ ہزاروں کی تعداد میں افراد کو تشدد کر کے شہید کیا گیا ۔ شہریوں کی آزادی سلب کر لی گئی اور اخبارات وجرائد پر کڑی سنسرشپ عائد رکھی گئی۔ مخالفین کی جائیدادیں اور املاک ضبط کر لی گئیں ۔کے ۔جی ۔بی (K.G.B) اور خاد کے کارندے نہتے شہریوں کا قتل عام کرتے رہے۔ اس نوع کی کارروائیوں کا الزام مجاہدین کے سر، انہیں بدنام کرنے اور عوامی تائید و حمایت سے محروم کرنے کے لیے، تھونپ دیا جاتا ۔ سوویت افواج کی طرف سے تحریک مزاحمت کو کچلنے کے لیے نیپام بموں اور کیمیائی و حیاتیاتی ہتھیاروں کا بے تحاشا استعمال کیا گیا ۔ زمین اور فضا سے بمباری کر کے ہزاروں کی تعداد میں دیہاتوں کو نیست و نابود کر دیا گیا ۔ شہروں اور دیہاتوں میں کھلونا نما بموں کی بارش برسائی گئی ۔ جب کہ مجاہدین کی عسکری استعداد کو گزند پہنچانے کے لیے ملک کے طول و عرض میں بارودی سرنگوں کا جال بچھایا گیا ، مزید براں ان کی پناہ گاہوں اور محفوظ ٹھکانوں کو تہس نہس کرنے کی غرض سے وسیع پیانے پر باغات اور جنگلات کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا ۔میدان جنگ میں گرفتار کئے جانے والے مجاہدین کے ساتھ بہیمانہ و سفاکانہ برتاؤ کیا گیا ، انہیں اکثر و پیشتر اذیتیں پہنچا کر قتل کیا جاتا رہا ۔ غرض یہ کہ سوویت افواج نے افغانستان پر اپنے تسلط کے دوران میں انسانی حقوق کو بہت بری طرح سے پامال کیا۔ سوویت افواج کی کارستانیوں اور چیرہ دستیوں کی تفصیلات ، جو انتہائی روح فرسا اور المناک تھیں، منظر عام پر آنے سے انسانی حقوق کے وہ ادارے بھی، جن کا تعلق مغربی ممالک سے تھا ، چیخ اٹھے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق افغانستان میں سوویت افواج کی تقریباً عرصہ آٹھ سال پر محیط جنگی کارروائیوں کے نتیجے میں تقریباً ۱،۲۴ ملین (۱۲ لاکھ چالیس ہزار) افراد شہید، جبکہ اس سے بھی زیادہ تعداد میں زخمی اور معذور و اپاہج ہوئے (The Soviet Occupation of Afghanistan، ص ۸۴-۱۱۸، ۱۴۰-۱۴۹؛ Tears, Blood and Cries: Human Rights in Afghanistan Since Invasion,1979-1984، ہلسنکی واچ رپورٹ، دسمبر ۱۹۸۴ء نیویارک ، واشنگٹن . ۱۹۸۴ء، ص ۲۶-۳۳،۶۲-۷۶،۷۹-۹۹، ۱۲۷-۱۶۳،۱۶۷-۱۷۰؛ Barnet R.Rubin: Human Rights in Afghanistan، در Afghanistan: The Great Game Revisited، ص ۳۳۵-۳۵۸؛ John lagerfelt,Michael Barry و دیگر: International Humanitarian Enquiry Commission on Displaced Persons in Afghanistan، در Central Asian Survey، ۵ :۱ (۱۹۸۶ء)، ص ۸۵-۹۹؛

نصر اللہ صفی : Soviet Military Tactics in Afghanistan، در Central Asian Survey، ۵:۲ (۱۹۸۶ء)، ص ۱۰۳-۱۱۰؛ محمد اسحق: The Present Situation in Afghanistan، در Central Asian Survey، ۶: ۱ (۱۹۸۷ء)، ص ۱۲۹-۱۲۲، ۱۲۵؛ William Maley: The Geneva Accords of April 1988 در : William Maley، Amin Saikal (مدیران): The Soviet Withdrawal from Afghanistan، کیمبرج، نیویارک، ۱۹۸۹ء، ص۱۳).

جنیوا مذاکرات: ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء کو افغانستان میں سوویت یونین کی فوجی مداخلت کی دنیا بھر میں مذمت کی گئی اور اسے جارحیت سے تعبیر کیا گیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور اسلامی کانفرنس کی تنظیم (O.I.C) کی طرف سے جنوری ۱۹۸۰ء میں روسی افواج کی غیر مشروط طور پر واپسی اور افغانستان کی غیر جانبدارانہ حیثیت کی بحالی کا مطالبہ کیا گیا (ریاض احمد سید: المیہ افغانستان، اسلام آباد، ۱۹۸۱ء، ص ۱۶۳ —۲۲۱)۔ اس کے بعد پاکستان، اسلامی کانفرنس کی تنظیم(O.I.C) اور یورپی برادری (European Community) کی طرف سے افغان بحران کے حل کے لیے سفارتی کوششوں کا آغاز ہوا، جس کے نتیجے میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی جون ۱۹۸۲ء سے جنیوا میں متعلقہ فریقوں [پاکستان، سوویت یونین اور کابل حکومت] کے درمیان مذاکرات کی ابتدا ہوئی (محمد خالد معروف: United Nations and Afghanistan Crisis، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۳۹ —۶۹)۔ سوویت یونین اگرچہ بین الاقوامی دباؤ کی بنا پر مذاکراتی عمل میں شریک ہوگیا تھا، لیکن اس کے منفی رویے کی بدولت افغان مسئلہ کے تصفیے کے سلسلہ میں صدر میخائل گوربا چوف کے مارچ ۱۹۸۵ء میں برسراقتدار آنے تک کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

روسی صدر لیونڈبرزنیف (Leonid Brezhnev: اکتوبر ۱۹۶۴-نومبر ۱۹۸۲ء)، جس نے سوویت افواج افغانستان میں داخل کی تھیں، وسطی ایشیا کی مسلم جمہوریاؤں کی طرح افغانستان کا بھی سوویت یونین کے ساتھ الحاق چاہتا تھا، چنانچہ وہ اپنے دورِ اقتدار میں افغانستان میں اسلام پسندوں کی مزاحمت کو قوت و طاقت کے استعمال سے مکمل طور پر کچلنے کے عزم پر قائم رہا۔ اس کے جانشین یوری آندرو پوف(Yuri Andropov: نومبر ۱۹۸۲-فروری ۱۹۸۴ء) کو احساس ہو گیا تھا کہ افغانستان کو محض طاقت کے ذریعے زیرنگیں نہیں بنایا جاسکتا، چنانچہ اس نے افغانستان کے بارے میں سوویت یونین کی سابق پالیسی پرنظرثانی کا حکم دے دیا تھا تاہم اس کا جلد ہی انتقال ہو گیا ، اور عملاً اس سمت میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ صدر چرننکو (Konstantin Chernenko: فروری ۱۹۸۴-مارچ۱۹۸۵ء) ،جو افغانستان کے بارے میں برزنیف کی اختیار کردہ پالیسی کا پرجوش حامی تھا ،کے دور میں سوویت یونین کی طرف سے جنیوا مذاکرات کے عمل میں روڑے اٹکائے جاتے رہے۔سوویت یونین کے آخری صدر میخائل گوربا چوف (Mikhail Gorbachev: مارچ۱۹۸۵-دسمبر۱۹۹۱ء) اپنے پیش رووں کے برعکس افغانستان میں سوویت یونین کی فوجی مداخلت اور پھر اپنے تسلط کو قائم رکھنے کے لیے قوت و طاقت کے استعمال کو غلطی ہی نہیں بلکہ گناہ خیال کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے فروری ۱۹۸۶ء کو کیمونسٹ پارٹی (CPSU=Communist Party of the Soviet Union) کے اجلاس میں افغانستان کو ایک رستا ہوا زخم (ناسور) قرار دیتے ہوے اس ملک سے سوویت افواج کی واپسی کا اشارہ دے دیا۔ گورباچوف کی طرف سے افغانستان کو "رستا ہوا زخم" قرار دینا ، دراصل اس حقیقت کا واضح اعتراف تھا کہ سوویت یونین

کو اپنی افغان پالیسی کے سبب شدید زک پہنچ رہی تھی۔ اس وقت سوویت افواج تمام تر حربوں کے باوجود افغان مزاحمت کو کچلنے میں ناکام رہی تھیں۔ مجاہدین کے ساتھ کشمکش میں تقریباً دس ہزار سوویت فوجی ہلاک ، جب کہ بیس ہزار زخمی ہو چکے تھے۔ اربوں ڈالر سالانہ جنگی اخراجات بھی اُٹھ رہے تھے ،جس سے سوویت معیشت بری طرح سے متاثر ہو رہی تھی۔ مزید براں اس پر اشتراکیت کی راہ پر گامزن مشرقی یورپ اور تیسری دنیا کے ممالک ایتھوپیا، انگولا وغیرہ کا اقتصادی، سیاسی اور فوجی بوجھ ناقابل برداشت حد تک بڑھ گیا تھا۔ داخلی وخارجی محاذ پر بھی اسے گوناں گوں مسائل کا سامنا تھا۔ تیسری دنیا کی آزادی و خودمختاری کے بارے میں اس کے قدیم مؤقف کو شدید دھچکا لگا تھا۔ مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک میں اس کا اثر و نفوذ کم ہوگیا تھا۔ اشتراکیت کی راہ پر گامزن بعض مسلم ممالک سے بھی اس کے تعلقات میں قدرے بگاڑ پیدا ہوا۔ اس کی سرتوڑ سفارتی کوششوں کے باوجود غیر وابستہ تحریک (Non- Aligned Movement) کے مرکز سے بھی اس کے خلاف آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ مغربی ممالک سے اس کے اقتصادی تعلقات متاثر ہوئے تھے۔ انسانی حقوق کی عالمی تنظیمیں سوویت افواج کے مظالم کی تشہیر کر کے اس کی رسوائی کا سبب بن رہی تھیں۔ اندرون ملک بھی سوویت حکمرانوں کو مشکلات کا سامنا تھا ۔ افغانستان میں سوویت فوجیوں کی ہلاکتیں بالخصوص مجاہدین کے خلاف جنگ کے لیے فوج میں نوجوانوں کی جبری بھرتی عوام میں اضطراب اور بے چینی کا ایک بڑا سبب بن چکی تھی۔ سال ۱۹۸۴ء کے وسط میں جارجیا ، آرمینیا اور آذربیجان کے دارالحکومتوں میں فوج میں جبری بھرتیوں کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ بعض شہروں میں افغانستان میں برسر جنگ سپاہیوں کی ماؤں کی

طرف سے احتجاجاً خود سوزی کے واقعات بھی پیش آئے۔ لٹویا ، لتھوانیا اور اسٹونیا میں بھی افغانستان پر سوویت تسلط کے خلاف آوازیں اٹھتی رہیں ۔ یوکرائن کے کیتھولک کلیسا اور نامور سوویت نیوکلیائی سائنس دان اور انسانی حقوق کے علمبردار آندرے سخاروف (Anderie Sakharov؛ ولادت ۱۹۲۱ء) نے تو کھل کر افغانستان میں سوویت افواج کے مظالم اور جبر و قہر کی مخالفت کی تھی۔ اشتراکی نظام کے مخالف بعض زیر زمین گروہ مثلاً ڈیمو کریٹک نیشنل فرنٹ آف سوویت یونین کی طرف سے افغانستان سے سوویت افواج کی پسپائی کا مطالبہ کیا گیا۔ افغانستان پر سوویت تسلط کی سب سے زیادہ مخالفت وسطی ایشیا کی مسلم جمہوریاؤں کے عوام کی طرف سے ہوئی۔۱۹۸۱ء ہی سے ان جمہوریاؤں کے دارالحکومتوں میں سوویت افواج میں شامل مسلمان سپاہیوں کی افغانستان میں ہلاکتوں اور پھر ان کی غیر اسلامی طریقے پر تدفین کے خلاف احتجاجی مظاہرے ہونے لگے تھے۔ وسطی ایشیا کے مسلم عوام کی ہمدردیاں واضح طور پر افغان مجاہدین کے ساتھ تھیں۔ افغان مزاحمت و جہاد کی بدولت ان علاقوں کے مسلم عوام کے دلوں میں سوویت یونین کے تسلط سے آزادی کی خواہش و جذبہ بیدار ہونے لگا تھا۔ افغانستان میں تعیناتی کے دوران سوویت افواج میں شامل مسلمان سپاہیوں کو مجاہدین اور مقامی آبادی کے توسط سے ہزاروں کی تعداد میں قرآن حکیم کے نسخے اور اسلامی موضوعات پر کتب و رسائل پہنچے تھے۔ اس چیز نے اشتراکیت کے زیر اثر ان کے خوابیدہ اسلامی احساس و شعور کو نئی زندگی بخشی۔ چنانچہ سیکڑوں سوویت مسلم سپاہی منحرف ہو کر افغان مجاہدین کے ساتھ آملے تھے۔ مزید براں سوویت یونین کے لیے، مجاہدین کی عسکری کارروائیوں کے سبب، افغانستان میں موجود قدرتی وسائل

(تیل و گیس وغیرہ) کے استحصال کے منصوبے پر عمل درآمد بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ مجاہدین نے افغانستان اور وسطی ایشیا کے مابین مواصلاتی ڈھانچے کو درہم برہم کر دیا تھا اور تیل و گیس کی پایپ لائنوں کو شدید نقصان پہنچا تھا ۔ان سب عوامل نے سوویت منصوبہ سازوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا (Tad Daley : *Afghanistan and Gorbachev's Global Foreign Policy*، در *Asian Survey*، ۲۹:۵ (مئی ۱۹۸۹ء)، ص ۴۹۶-۵۱۳؛ Alexandre Bennigsen: *Islam in Retrospect*، در *Central Asian Survey*، ۸:۱ (۱۹۸۹ء) ص ۸۹—۱۰۹؛ وہی مصنف و دیگر: *The Soviet Islamic Strategy After the Invasion of Afghanistan*، در *Soviet Strategy & Islam*، مرتبہ Alexandre Bennigsen و دیگر، لنڈن ، ہامپشائر، ۱۹۹۱ء ، ص ۵۷—۷۸؛ *Soviet Options and Opportunities in Southern Asia* ، ص ۷۹۶—۸۰۳؛ Timothy J. Colton : *The Changing Soviet Unoin and the World*، در کتاب مذکور ،ص ۸۷۵—۸۸۹؛ Martin McCaulay : *The Soviet Union Under Gorbachev*، لنڈن، ۱۹۸۷ء، ص ۲۱۰—۲۱۱، ۲۲۳—۲۲۴؛ *The Bear Trap*، ص ۱۹۸—۲۰۸؛ Taras Kuzio: *Opposition in the USSR to the Occupation in Afghanistan*، در *Central Asian Survey*، ۶:۱ (۱۹۸۷ء)، ص ۹۹—۱۱۷؛ Ralph H. Magnus و Eden Naby: *Afghanistan and Central Asia: Mirrors and Models*، در *Asian Survey* ، ۳۵:۷ (جولائی ۱۹۹۵ء)، ص ۶۱۱-۶۲۵؛ Yuri Polsky: *Arab Views of Soviet Policy in the Era of Glasnost ,1985-1991*، در *The Middle East Journal*، ۵۶:۴ (۲۰۰۳ء)، ص ۲۴۲—۲۶۰)۔ دریں حالات میخائل گورباچوف نے اقتدار سنبھالنے کے ایک سال بعد افغانستان میں فوجی مداخلت کی پالیسی پر نظرثانی کا فیصلہ کر لیا، جس کا جولائی ۱۹۸۶ء میں باضابطہ طور پر اعلان کر دیا گیا (*Untying the Afghan Knot*، ص ۱۱—۲۰، ۹۲—۱۶۶)۔ نئی پالیسی کے تحت سوویت یونین افغانستان پر اشتراکی جماعت پی۔ ڈی۔ پی۔ اے کی گرفت کو مضبوط و مستحکم کرنے اور اس ملک میں اپنے مفادات کے تحفظ کی ضمانت فراہم ہونے کی صورت میں ہی اپنی افواج کی واپسی چاہتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مئی ۱۹۸۶ء میں کابل میں ببرک کارمل جو اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے میں ناکام رہا تھا، کی جگہ افغان خفیہ پولیس "خاد" کے سربراہ ڈاکٹر نجیب اللہ کی سربراہی میں نئی حکومت قائم کی گئی۔ نئی حکومت نے سیاسی حمایت کے حصول کے لیے ملک میں قومی مصالحت کے نام پر خصوصی اقدامات کے طور پر مجاہد جماعتوں کو شرکت اقتدار کی دعوت کے علاوہ قبائلی سرداروں کو پرکشش ترغیبات بھی دیں۔ البتہ یہ اقدامات غیر مؤثر ثابت ہوے (کتاب مذکور، ص ۱۹۱—۱۹۴)۔ دریں اثنا ملک میں سوویت تسلط کے خلاف مجاہدین کی گوریلا کارروائیوں میں شدت آگئی۔ ۱۹۸۷ء کے موسم گرما کے دوران میں مجاہدین نے عسکری اعتبار سے بڑی اہم کامیابیاں حاصل کیں۔ ریاستہاے متحدہ امریکہ کی طرف سے فراہم کردہ اسٹنگر میزائلوں کے ذریعے کثیر تعداد میں سوویت ہیلی کاپٹر اور لڑاکا بمبار طیارے مار گرائے گئے۔ قندھار، پلتیا اور کنڑ میں کثیر تعداد میں روسی فوجی ہلاک ہوے۔ جس کے بعد سوویت افواج نے سوویت افواج کے جانی نقصان سے بچنے کے لیے فضائیہ اور بمبار طیاروں کے ذریعے انتہائی بلندی سے کلسٹر بم برسانے شروع کر دیے، تاہم نئی فوجی حکمت عملی بھی غیر مؤثر ثابت ہوئی۔ سوویت یونین اپنی

جدید ترین مشینری کے استعمال کے باوجود افغان مجاہدین کے حوصلوں کو شکست دینے میں ناکام رہا (The Geneva Accords of April 1988، ص ۱۲—۱۶)۔

ستمبر ۱۹۸۷ء میں پہلی بار سوویت یونین کی طرف سے افغانستان میں فوجی مداخلت ختم کرنے کے واضح اشارے دیئے گئے۔ جس کے بعد پاکستان کی طرف سے افغانستان میں سوویت افواج کی واپسی کے بعد ملکی انتظام سنبھالنے کے لیے سابق بادشاہ محمد ظاہر شاہ (۱۹۳۳- ۱۹۷۳ء) کی سربراہی میں ایک عبوری حکومت اور اس کی توثیق کے لیے مجاہدین اور کابل انتظامیہ کے نمائندوں پر مشتمل لویہ جرگہ (قومی اسمبلی) کے انعقاد کی تجویز پیش کی گئی۔ افغانستان میں سوویت تسلط کے خلاف برسر پیکار اسلامی جماعتوں کے اتحاد نے، جسے مذاکرات کے عمل سے باہر رکھا گیا تھا، مستقبل کی کسی عبوری حکومت میں ظاہر شاہ کے کردار کو سختی سے مسترد کر دیا اور ایک غیر جانبدار شخصیت کی قیادت میں ایک عبوری حکومت کی تشکیل اور ایک منتخب شوری کی تشکیل کی تجویز پیش کی۔ پاکستان کی طرف سے اسلامی اتحاد کے اس منصوبے کی حمایت کی گئی، البتہ اقوام متحدہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے اسے حمایت حاصل نہ ہو سکی (Untying the Afghan Knot، ص ۲۰۵—۲۰۹)۔

دسمبر ۱۹۸۷ء میں واشنگٹن میں سوویت امریکہ سربراہی ملاقات کے بعد، سوویت رہنما میخائل گورباچوف نے افغانستان سے سوویت افواج کی واپسی کا اعلان کر دیا۔ فروری ۱۹۸۸ء میں واپسی کے نظام الاوقات کا اعلان بھی سامنے آگیا جس پر جنیوا مذاکرات تکمیلی مرحلہ میں داخل ہوگئے۔ سوویت یونین، جو اپنی افواج کی عزت و وقار کے ساتھ افغانستان سے واپسی کی غرض سے جنیوا معاہدہ کے جلد از جلد طے پا جانے کا آرزومند تھا، اور امریکہ نے جنیوا مذاکرات پر دستخط کے لیے پاکستان پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق [رک باں، در تکملہ آآآ، بذیل مادہ] افغانستان میں ایک عبوری سیاسی ڈھانچہ کی تشکیل تک جنیوا معاہدہ پر دستخط کرنے کے خلاف تھے، تاہم اس موقف کے برخلاف وزیراعظم محمد خان جونیجو (۱۹۸۵— ۱۹۸۸ء) کی حکومت نے بعض داخلی سیاسی مصالح کی بنا پر جنیوا معاہدہ پر دستخط کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۴ اپریل ۱۹۸۸ء کو سوویت یونین، کابل حکومت اور پاکستان نے اس معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کے بعد افغانستان سے سوویت افواج کی واپسی کا عمل شروع ہوگیا جو ۱۹۸۹ء کے موسم گرما تک تکمیل کو پہنچ گیا (Untying The Afghan Knot، ص ۲۰۵—۲۰۹، ۲۶۴—۲۸۶؛ United Nations and Afghanistan Crisis، ص ۷۷—۱۴۲؛ شاہد ایم۔امین: Pakistan`s Foreign Policy، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۹۵—۱۰۲؛ William Maley: The Afghanistan Wars، نیویارک ، ۲۰۰۲، ص ۱۳۵—۱۴۱)۔

سوویت نقصانات: سوویت یونین کو افغانستان پر لشکر کشی اور پھر اس ملک پر اپنے سیاسی و عسکری تسلط کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے تقریباً عرصہ دس سال تک افغان مجاہدین اور حریت پسندوں کے ساتھ کشمکش اور معرکہ آرائی کی بڑی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ ایک اندازے کے مطابق اس دوران میں اس کے ۱۴۴۵۴ فوجی ہلاک اور تقریباً ۵۰ ہزار زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں سے ۱۱۶۰۰ مستقل طور پر معذور اور اپاہج ہوگئے تھے، جب کہ سینکڑوں لاپتہ ہوئے۔ مزید براں ہزاروں فوجی مختلف بیماریوں اور ناموافق موسمی اثرات کے سبب لقمہ اجل بنے۔ اس جنگ کے سوویت افواج کے عزم و حوصلہ پر بھی منفی اثرات مرتب ہوئے، اور وہ نفسیاتی اعتبار سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی۔ چنانچہ افواج میں منشیات کا استعمال بے تحاشا بڑھ

گیا۔ ایک اندازے کے مطابق اس طویل اور بے مقصد جنگ میں جسمانی و اعصابی شکست و ریخت سے دوچار سوویت سپاہیوں اور افسروں کی پچاس سے اسی (۸۰) فی صد تعداد منشیات کا استعمال کرنے لگی تھی۔ فوج میں چوری چکاری اور لوٹ مار جیسے جرائم کا رجحان بھی عام ہوگیا تھا۔ ۱۹۸۹ء تک افغانستان میں تعینات ۳ ہزار سے زائد فوجیوں کو مختلف جرائم کی پاداش میں قید و بند کی سزا دی گئی۔ فوج میں اعلیٰ افسران کی حکم عدولی اور برگشتگی و انحراف ایک معمول بن گیا۔ افغانستان دراصل سوویت یونین کے لیے ویت نام ثابت ہوا تھا۔ اندرون ملک، افغانستان میں مجاہدین کے خلاف جنگ کے لیے، فوج میں جبری بھرتی عوام میں اضطراب اور بے چینی کا سبب بنی رہی۔ چنانچہ سوویت افواج اور معاشرہ، دونوں کے اندر عالمی اشتراکی نظام کے علمبردار حکمرانوں کی توسیع پسندانہ پالیسیوں کے خلاف نفرت اور بے زاری نے جنم لیا۔ اقتصادی اعتبار سے بھی یہ جنگ کافی مہنگی پڑی۔ صرف ۱۹۸۰ء کی دھائی میں ۹۶ ارب ڈالر اخراجات اٹھے تھے۔ بھاری جنگی اخراجات کے سبب ملکی معیشت ابتری سے دوچار ہوئی تھی۔ مذکورہ تمام عوامل و محرکات سوویت یونین کے انتشار اور شکست و ریخت پر منتج ہوئے۔ چنانچہ افغانستان سے اس کی افواج کے انخلاء کو تین سال نہ گزرے تھے کہ درجن بھر ریاستیں اس سے الگ ہوگئیں۔ سوویت مسلم جمہوریاؤں میں احیاے اسلام کی تحریک اور پھر ان ریاستوں کی سوویت یونین سے علیحدگی تو سراسر افغان جہاد و مزاحمت کا نتیجہ تھی (Alexandre Bennigsen: The Impact of the Afghan War on the Soviet Central Asia، در Afghanistan: the Great Game Revisited، ص ۲۸۷—۳۰۰؛ Opposition in the USSR to The Occupation of Afghanistan، ص ۱۰۰—۱۰۱؛ T.H.Rigby: The Afghan Conflict and Soviet Domestic Politics، در The Soviet Withdrawal from Afghanistan، ص ۶۷ — ۸۱: Afghan Communism and Soviet Intervention، ص ۲۴۳—۲۵۰؛ Olivier Roy: The New Central Asia: The Creation of Nations، لنڈن، ۲۰۰۰ء، ۱۲۵— ۱۵۷).

نجیب اللہ حکومت کا استحکام: جنیوا معاہدہ دراصل ایک غیر متوازن اور نامکمل دستاویز تھی، جس نے سوویت افواج کو افغانستان سے عزت ووقار کے ساتھ واپسی کا راستہ تو فراہم کر دیا تھا، البتہ افغانستان میں جاری بحران کے حل کی بنیاد فراہم نہ کر سکا تھا۔ اس معاہدے میں سوویت افواج کی واپسی کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی خلا کو پر کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ معاہدے میں مقررہ دنوں کے بعد افغان مجاہدین کو پاکستان اور امریکہ کی طرف سے عسکری امداد کے انقطاع کی دفعات تو شامل کی گئی تھیں، جب کہ کابل حکومت اور اس کی افواج کے لیے سوویت یونین کی طرف سے مالی و عسکری امداد کے حصول کا استحقاق باقی رہنے دیا گیا تھا۔ چنانچہ افغانستان مجاہد جماعتوں نے اس کو مسترد کر دیا (The Geneva Accords of April 1988، ص ۱۲—۱۵؛ The Afghanistan Wars، ص ۱۳۵—۱۴۱)۔ جنیوا معاہدہ کے بعد بھی سوویت یونین کی دلچسپی افغانستان میں برابر قائم رہی۔ اس کی طرف سے کابل حکومت کو فراخدلانہ عسکری ومالی امداد فراہم کی گئی۔ سوویت افواج نے واپسی پر افغانستان میں اسلحہ کے وسیع ذخائر بھی افغان افواج کے حوالے کر دیے تھے، جن کی مدد سے افغان افواج نے کابل اور دیگر بڑے شہروں سمیت ملک کی اہم شاہراہوں پر اپنی پوزیشن کو مستحکم کر لیا (Untying the

Afghan Knot، ص ۲۶۳—۳۰۰)۔

افغان عبوری حکومت: جنیوا مذاکرات کے آخری مرحلے میں حکومت پاکستان کی کوششوں سے اسلام آباد میں (فروری ۱۹۸۸ء) اتحاد اسلامی مجاہدین افغانستان میں شامل جماعتوں کے ایک اجلاس میں ایک وسیع البنیاد افغان عبوری اسلامی حکومت، جو سوویت افواج کی واپسی کے بعد نجیب اللہ کی حکومت کی جگہ لے سکے، کی تشکیل کا ایک فارمولا طے پایا۔ اس فارمولے میں ایک عبوری کابینہ، جس میں اسلامی اتحاد میں شامل جماعتوں کے علاوہ کابل حکومت میں شامل بعض عناصر کے علاوہ افغان جلاوطن رہنماؤں کو بھی نمائندگی حاصل ہو، کے علاوہ ایک اعلیٰ مشاورتی کونسل (جو عبوری آئین وضع کر سکے) اور ایک بااختیار انتخابی کمیشن کے قیام جیسے اقدامات تجویز کیے گئے تھے۔ تاہم ایران میں موجود افغان شیعہ گروہوں، جنہیں عبوری ڈھانچہ میں نمائندگی سے محروم رکھا گیا تھا، اور جلا وطن افغان رہنماؤں کی شدید مخالفت کے علاوہ خود اتحادی جماعتوں کے مابین ہم آہنگی کے فقدان کے سبب افغان عبوری انتظامی ڈھانچہ کی تشکیل کا مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ افغانستان سے سوویت افواج کی واپسی کے عمل کی تکمیل کے بعد امریکہ اور سعودی عرب کے اصرار اور پاکستان کی کوششوں سے ، ایک بار پھر اسلام آباد میں، ۱۹۸۹ء کے موسم بہار میں اتحاد میں شامل جماعتوں کی شوریٰ کے اجلاس میں، ایک افغان عبوری اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ امریکہ نے غیر رسمی جبکہ پاکستان اور سعودی عرب نے اسے باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا۔ تاہم ایران میں مقیم شیعہ گروہوں کی نمائندگی کے بارے میں اتحادی جماعتوں جبکہ عبوری حکومت کے لیے افغانستان کے اندر صدر دفتر کے قیام کی غرض سے جلال آباد پر قبضہ کی منصوبہ بندی کے بارے میں مجاہدین کمانڈروں کے مابین شدید اختلافات، بالخصوص تخار صوبہ میں گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی اور پروفیسر برہان الدین ربانی کی جمعیت اسلامی کی افواج کے مابین خونریز جھڑپوں، کے باعث عبوری اسلامی حکومت جلد ہی خلفشار کا شکار ہوگئی (کتاب مذکور، ص ۲۵۷—۲۶۰، ۳۵۲—۳۱۳)۔ افغان عبوری حکومت کی صفوں میں انتشار کی بدولت، مجاہدین کے مختلف دھڑوں میں قدیم قبائلی، لسانی اور نظریاتی اختلافات، جو گذشتہ ایک عشرہ کے دوران میں ایک مشترکہ نصب العین (افغانستان کی سوویت تسلط سے آزادی اور کابل میں قائم اشتراکی حکومت کے خاتمے) کے سبب دب گئے تھے، ایک بار پھر ابھر کر سامنے آگئے۔ افغان عبوری حکومت میں شامل دھڑوں میں جاری کشمکش کے طول پکڑنے پر امریکہ اور سعودی عرب نے پشاور میں اتحاد اسلامی مجاہدین افغانستان کو نظر انداز کر کے افغانستان کے اندر براہ راست مجاہد کمانڈروں اور قبائلی رہنماؤں کو مالی و فوجی امداد فراہم کرنا شروع کر دی۔ چنانچہ بہت سے مجاہد کمانڈر خودسر ہوگئے۔ انہوں نے مرکزی قیادت سے انحراف وسرکشی کی راہ اختیار کر لی۔ یوں انہیں اپنے اپنے زیر انتظام علاقوں پر ایک طرح سے خود مختار حکمرانوں کی حیثیت حاصل ہوگئی (The Fragmentation of Afghanistan، ص ۲۴۷—۲۶۴؛ شاہ ایم۔ طرزی: Politics of the Afghan Resistance Movement: Cleavages, Disunity, and Fragmentation، در Asian Survey، ۳۱:۱ (جون ۱۹۹۱ء)، ص ۴۷۹-۴۸۵)۔ سوویت افواج کی واپسی کے باوجود مجاہدین کمانڈر، سیاسی مفاہمت، باہمی ارتباط اور مؤثر نظم وضبط کے فقدان کے سبب عسکری محاذ پر کوئی نمایاں کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ کابل میں نجیب اللہ حکومت، جو سوویت افواج کی واپسی کے بعد غیر محفوظ ہو کر رہ گئی تھی، بدستور

قائم رہی۔ نجیب اللہ نے حکمران اشتراکی جماعت (پی۔ڈی۔پی۔اے) اور قومی سلامتی کے اداروں پر اپنی گرفت کو مستحکم کر لیا۔ اس نے افغان جلاوطن رہنماؤں، تہران میں مقیم سیاسی و عسکری گروہوں، افغانستان کے اندر مجاہد کمانڈروں اور قبائلی سرداروں سے ملکی بحران کے سیاسی تصفیہ کی غرض سے سلسلہ جنبانی شروع کیا۔ اس ضمن میں اس نے کابل میں اقوام متحدہ کی موجودگی میں ایک قومی امن کانفرنس کے علاوہ لوئی جرگہ کے انعقاد، متحارب گروہوں کے مابین مفاہمت کے لیے ایک ثالثی کمیشن کی تشکیل اور ایک وسیع البنیاد عبوری حکومت، جو ملک کے لیے ایک آئین کی تیاری اور ایک پارلیمنٹ (ملی شوری) کے انتخابات کا انتظام کر سکے، کے قیام کی تجاویز پیش کیں۔ تاہم نجیب اللہ اپنی ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے جلاوطن افغان رہنماؤں اور مزاحمتی گروہوں کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہا (Untying the Afghan Knot، ص۳۰۴—۳۱۰)۔

نجیب اللہ حکومت کا خاتمہ اور اس کے بعد کے حالات: سوویت یونین اور ریاستہاے متحدہ امریکہ کی طرف سے افغانستان میں اپنے اپنے حامیوں کو اسلحہ کی فراہمی کے منقطع ہو جانے (۱۹۹۱ء کے اختتام پر) کے بعد ۱۹۹۲ء کے موسم بہار میں افغانستان کے اندر عسکری وسیاسی محاذ پر اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ شمال میں جنرل عبدالرشید دوستم کی ازبک ملیشیا (گلجم) کی سرکاری افواج سے برگشتگی اور پھر احمد شاہ مسعود (م ۲۰۰۱ء) کے ساتھ آملنے کے بعد شمالی شہر مزار شریف اور کابل شہر کے شمال میں عسکری اعتبار سے اہم علاقے بگرام ائیرپورٹ اور قریبی قصبے چاریکار پر احمد شاہ مسعود کی قیادت میں جمعیت اسلامی کے مجاہدین نے قبضہ کر لیا۔ ۱۶ اپریل ۱۹۹۲ء کو افغانستان کے سیاسی حالات نے اس وقت غیر متوقع طور پر کروٹ لی جب صدر نجیب اللہ کو خود حکمران جماعت (پی۔ڈی۔پی۔اے) نے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ نجیب اللہ اقوام متحدہ کے زیر حفاظت کابل میں روپوش ہوگیا جبکہ حکمران جماعت کے ایک نائب صدر عبدالرحمن ہاتف نے قائمقام صدر کے طور پر اقتدار سنبھال لیا۔ نجیب اللہ حکومت کے زوال کے بعد ایک انتہائی قلیل عرصے میں افغانستان کے تمام اہم شہروں اور قصبات پر مجاہدین کے مختلف گروہوں کا قبضہ ہوگیا۔ ۲۵ اپریل ۱۹۹۲ء کو حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار اور جمعیت اسلامی کے سپہ سالار احمد شاہ مسعود اپنی اپنی افواج کے ساتھ کابل میں داخل ہوگئے جس پر سرکاری افواج نے ہتھیار ڈال دیئے اور حکومت مجاہدین کے حوالے کر دی (The Fragmentation of Afghanistan، ص۲۶۵—۲۸۴).

اقتدار کی کشمکش: کابل پر مجاہدین کے قبضے کے بعد حکومتی وانتظامی ذمہ داریاں سنبھالنے کی غرض سے پاکستان کے شہر پشاور میں اسلامی جماعتوں کے مابین ایک عبوری حکومت کی تشکیل کی غرض سے ایک نیا معاہدہ، جسے 'معاہدۂ پشاور' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، طے (۲۶/اپریل ۱۹۹۲ء) پایا۔ اس معاہدے کی رو سے صبغت اللہ مجددی (جبہ نجات ملی کے سربراہ) کو عرصہ دو ماہ کے لیے ملک کا قائمقام صدر مقرر کیا گیا۔ اس معاہدے میں طے کیا گیا تھا کہ مقررہ مدت کے اختتام پر برہان الدین ربانی (جمعیت اسلامی) عرصہ چار ماہ کے لیے ملک کا صدر ہوگا۔ اس میعاد کے اختتام پر شوری آئندہ اٹھارہ ماہ کے لیے ایک عبوری حکومت منتخب کرے گی۔ ملک میں انتخابات کرائے جائیں گے اور اقتدار منتخب حکومت کو سونپ دیا جائے گا۔ معاہدہ پشاور میں صدر کی معاونت کے لیے اتحادی جماعتوں پر مشتمل ۵۱ رکنی کابینہ (مجلس

قیادت/ اسلامی جہاد کونسل) کے قیام کی بھی منظوری دی گئی تھی۔ معاہدہ کی رُو سے ۲۸ اپریل ۱۹۹۲ء کو مجددی نے کابل میں اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ عبوری انتظامیہ میں وزارت عظمیٰ کا منصب حزب اسلامی (حکمت یار) کے ایک تاجیک کمانڈر استاد عبدالصبور فرید کو تفویض کیا گیا، جب کہ احمد شاہ مسعود کو وزیر دفاع مقرر کیا گیا۔ ۲۸ جون ۱۹۹۲ء کو صبغت اللہ مجددی کے عہدہ صدارت کی میعاد کے اختتام پر برہان الدین ربانی نے منصب صدارت سنبھال لیا (کتاب مذکور، ص ۲۶۵ — ۲۸۴؛ The Afghanistan Wars، ص ۱۳۵ — ۱۴۱)۔ اکتوبر ۱۹۹۲ء میں مجلس قیادت نے صدر ربانی کے عہدہ کی میعاد میں اس شرط پر عرصہ ۴۵ ایام کے لیے توسیع کر دی کہ وہ اس مدت کے اختتام پر شوریٰ اہل الحل والعقد کا اجلاس بلائے گا۔ شوریٰ آئندہ اٹھارہ ماہ کے لیے ایک عبوری حکومت منتخب کرے گی۔ صدر ربانی اپنی اس ذمہ داری کو انجام دینے سے قاصر رہا، البتہ اس نے صدارت کے منصب سے علیحدگی اختیار کرنے کے بجائے ملک کی عدالت عظمیٰ کے ذریعے اپنے عہدہ کی میعاد میں عرصہ دو سال کے لیے توسیع کروا لی۔ یوں وہ کابل پر طالبان ملیشیا کے قبضہ (۱۹۹۶ء) تک بدستور اس منصب پر متمکن رہا (Amin Saikal: The Rabbani Government، در Fundamentalism Reborn: Afghanistan and the Taliban، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۹ — ۴۲)۔

افتراق و انتشار اور جنگ وجدل: سات جماعتی اتحاد کی عبوری حکومت اپنے قیام کے چند روز بعد ہی افتراق وانتشار کا شکار ہوگئی۔ حزب اسلامی (حکمت یار) نے، جو کابل میں سابق حکومت کی گلجم ملیشیا کی موجودگی اور وزیر دفاع احمد شاہ مسعود کی طرف سے سابق سرکاری افواج کے سپہ سالار سمیت دیگر فوجی افسروں کو اپنے عہدوں پر برقرار رکھنے سے شدید طور سے نالاں تھی، عبوری حکومت میں وزیراعظم کا منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حزب اسلامی نے بعد ازاں معاہدہ پشاور ہی کو مسترد کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد حزب اسلامی (مولوی یونس خالص) نے بھی عبوری حکومت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ عبوری حکومت کی صفوں میں پیدا ہونے والے اس افتراق نے جلد ہی شدید ترین عسکری تصادم کی صورت اختیار کر لی۔ کابل پر ضبط و اختیار حاصل کرنے کے لیے حکمت یار اور احمد شاہ مسعود کی افواج کے مابین معرکہ آرائی چار سال تک (موسم گرما ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۶ء) تک پوری قوت سے جاری رہی۔ بعد ازاں حزب وحدت، جسے ایران کی طرف سے بھرپور فوجی وسیاسی امداد حاصل تھی، کی اتحاد اسلامی (عبدالرب الرسول سیاف) اور سلفی جماعت ''جماعۃ الدعوۃ'' کے ساتھ شدید معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ متحارب گروہوں کے مابین جنگ وجدل کے نتیجے میں کابل اور دیگر ایسے شہر، جو سوویت تسلط کے تمام تر دور میں کافی حد تک تباہی سے محفوظ رہے تھے، کھنڈرات کا منظر پیش کرنے لگے۔ صرف کابل شہر اور اس کے گرد ونواح میں پچاس ہزار سے زائد افراد ہلاک ہوے۔ بجلی اور پانی کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ غذائی اجناس اور دیگر ضروریات زندگی کی شدید قلت پیدا ہوگئی، جس پر کابل شہر سے پانچ لاکھ سے زائد افراد نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوگئے۔ کابل میں جاری اس کشمکش کا دائرہ ملک کے دیگر علاقوں تک وسیع ہوگیا تھا۔ ۱۹۹۶ء میں طالبان ملیشیا کے کابل پر غلبہ حاصل کرنے تک افغانستان میں جاری کشمکش اور بدامنی اپنے عروج پر رہی۔ اس دوران میں پاکستان سعودی عرب، ایران اور تنظیم اسلامی کی کانفرنس (او۔ آئی۔ سی) کی کوششوں سے متحارب گروہوں کے مابین مصالحت اور جنگ بندی کے لیے متعدد معاہدے طے

پائے، تاہم وہ سب ملک میں قیام امن کے لیے غیر مؤثر ثابت ہوئے۔ ملک کے مختلف علاقوں میں خود سر کمانڈروں نے خودمختار ریاستیں قائم کر لیں جن کی بدولت افغانستان کی وحدت وسالمیت شدید طور سے مخدوش ہوگئی۔ ملک میں قتل وغارت، ڈاکہ زنی اور آبروریزی کے واقعات ایک معمول بن گئے۔ یوں سوویت افواج کی پسپائی اور اشتراکی حکومت کے سقوط کے باوجود افغان عوام کے مصائب وآلام کم ہونے کے بجائے پہلے سے بھی دو چند ہوگئے اور خستہ حال وتباہ شدہ ملک کی حالت پہلے سے بھی ابتر ہوگئی (Politics of Afghan Resistance Movement، ص ۴۸۰-۴۹۵؛ The Fragmentation of Afghanistan، ص ۲۶۵ --۲۸۴؛ پیٹر مارسڈن:طالبان: افغانستان میں جنگ، مذھب اور نیا نظام، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۷--۳۰ ؛ Pakistan`s Foreign Policy، ص ۱۰۰--۱۰۷؛ Michael Griffin: Reaping the Wirlwind :Taliban Movement in Afghanistan، لنڈن، اسٹرلنگ، ۲۰۰۱ء، ص ۲۴- ۳۲).

طالبان تحریک: سیاسی انتشار اور خانہ جنگی کے اس دور میں ۱۹۹۴ء کے نصف آخر میں ملا محمد عمر [نیز رکّ بہ طالبان] کی قیادت میں دینی مدارس کے طلبہ اور مجاہدین کی ایک سیاسی وعسکری تحریک، جو طالبان تحریک کے نام سے مشہور ومعروف ہے [طالبان کے دینی نظریات، ان کی تحریک کے تنظیمی ڈھانچے اور ان کے طرز حکومت کے لیے دیکھیے مقالہ طالبان، در تکملہ آآآ بذیل مادہ]، جنوبی شہر قندھار میں منظر عام پر آئی۔ یہ تحریک شروع شروع میں چند سو ایسے نوجوانوں پر مشتمل تھی جن کی معتدبہ تعداد افغانستان کے مشرقی صوبہ جات کے دینی مدارس سمیت پاکستان میں شمال مغربی سرحدی صوبہ (N.W.F.P) اور بلوچستان میں افغان پناہ گزینوں کے قائم کردہ دینی مدارس کے علاوہ پاکستان کے چند اہم دینی مدارس مثلاً دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (ضلع پشاور) اور دارالعلوم الاسلامیہ (بنوری ٹاؤن کراچی) وغیرہ سے فارغ التحصیل تھی۔ طالبان تحریک افغانستان میں جاری خانہ جنگی وبدامنی کے خاتمے، جرائم و خلاف شرع امور، ڈاکہ زنی، آبروریزی (جن کا چلن ملک میں ایک مستحکم سیاسی حکومت کی عدم موجودگی اور عدالتی نظام کے تعطل کے سبب عام ہوگیا تھا اور جن کا ارتکاب بعض کمانڈر بھی کر رہے تھے) کے انسداد اور شریعت اسلامیہ کے اصول واحکام کی اساس پر ایک مملکت و حکومت کے قیام کا نصب العین لے کر اٹھی تھی۔ اس تحریک نے ایک انتہائی قلیل عرصے میں قندھار اور اس کے گردونواح میں ڈاکہ زنی، قتل وغارت اور دیگر خلاف شرع امور کی روک تھام میں کامیابی حاصل کر لی۔ جس کے سبب سالہا سال سے بدامنی اور خانہ جنگی سے ستائے ہوئے افغان عوام میں اسے غیر معمولی طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ یوں طالبان تحریک جلد ہی ملک کی ایک بڑی سیاسی و عسکری قوت کی حیثیت اختیار کر گئی (حفیظ ملک: Taliban's Islamic Emirate of Afghanistan : its Impact on Eurasia، در Journal of South Asian and Middle Eastern Studies، ۲۳: ۱ (۱۹۹۹ء) ص ۶۵ --۷۸؛ کمال متین الدین: The Taliban Phenomenon : Afghanistan 1994-1997، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۵ --۲۶؛ احمد رشید: Taliban: Islam, Oil and the New Great Game in Central Asia، لندن، نیویارک، ۲۰۰۰ء، ص ۲۱ --۳۰؛ Anthony Davis: How the Taliban became a Military Force، در Fundamentalism Reborn، ص ۴۳-۴۷؛ طالبان، ص ۳۲-۳۳)۔ طالبان نے اکتوبر ۱۹۹۴ء میں حزب اسلامی (حکمت یار)، اتحاد اسلامی (سیاف) اور جمعیت

اسلامی (ربانی) کے کمانڈروں (جو باہم برسرپیکار تھے)، کو شکست دے کر قندھار شہر پر قبضہ حاصل کر لیا۔ فروری ۱۹۹۵ء میں طالبان ملیشیا نے حکمت یار کی افواج کو ان کے عسکری مرکز 'چاراسیاب' سے بھی نکال باہر کیا اور صرف ایک ماہ کے عرصہ میں ملک کے ۱۰ جنوب مشرقی صوبوں پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ ستمبر ۱۹۹۵ء کے اوائل تک ہرات اور نواحی صوبہ پر بھی طالبان ملیشیا کا قبضہ ہوگیا۔ طالبان کی عسکری محاذ پر اس پیش رفت کے ردعمل میں کابل میں صدر ربانی کے سیکڑوں حامیوں نے پاکستانی سفارت خانے پر (حکومت پاکستان کی طرف سے طالبان کی حمایت کی پاداش میں) بلہ بول دیا اور اسے نذر آتش کر دیا۔ پاکستان کا ایک سفارت کار ہلاک اور متعدد، بشمول سفیر پاکستان، زخمی ہوے۔ طالبان کی کابل کی طرف پیش قدمی کو روکنے کے لیے صدر ربانی اور طالبان مخالف دھڑوں بالخصوص گلبدین حکمت یار کے مابین مصالحت ہوگئی۔ تاہم ستمبر ۱۹۹۶ء کے اواخر تک شدید لڑائی کے بعد طالبان نہ صرف کابل، بلکہ جلال آباد پر بھی قابض ہوگئے۔ صدر برہان الدین ربانی اور ان کی افواج شمال کی جانب پسپا ہوگئیں (The Taliban Phenomenon، ص ۴۰—۸۸، ۱۱۰—۱۱۲ و۱۲۵—۱۲۸؛ طالبان: افغانستان میں جنگ، مذہب اور نیا نظام، ص ۳۱—۳۵؛ How the Taliban Became a Military Force، ۴۵—۶۳؛ نعمت اللہ نجومی: The Rise of Taliban in Afghanistan، نیویارک، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۷—۱۳۳، ۱۵۸—۱۷۰).

شمالی اتحاد: طالبان کے مقابلے میں ان کے حریف ومقابل گروہوں نے ایک عسکری اتحاد، جسے شمالی اتحاد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، تشکیل دیا۔ اس کا مرکز عبدالرشید دوستم کے مضبوط گڑھ مزار شریف میں قائم کیا گیا۔ شمالی اتحاد کو ایران (جو افغانستان میں طالبان کی بڑھتی ہوئی قوت کو پسند نہ کرتا تھا) بھارت، وسطی ایشیائی مسلم جمہوریاؤں (جو شمال کی جانب طالبان کی پیش قدمی کی صورت میں اپنے عوام کے اندر اسلامی بیداری کے امکانات سے خائف تھیں) اور سوویت یونین کی طرف سے وسیع پیمانے پر مالی وفوجی امداد فراہم کی گئی (Taliban's Islamic Emirate of Afghanistan، ص ۴۲—۴۸؛ موسیٰ خاں جلال زئی: Taliban and the Great Game in Afghanistan، لاہور، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۵۴—۵۸، ۷۰—۷۹، ۹۳—۹۴؛ مختار حسن: افغانستان: جارحیت، جہاد، بحران، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۵۴۱—۵۴۲، ۵۶۳—۵۷۹)۔ شمالی اتحاد نے غیرملکی امداد وتعاون سے طالبان کو دارالحکومت کابل سے نکال باہر کرنے کے لیے کابل پر بلہ بول دیا۔ جس سے طالبان ملیشیا اور شمالی اتحاد کی افواج کے درمیان ایک نئی جنگ کا آغاز ہوگیا۔ طالبان نے نہ صرف یہ کہ کابل پر اپنے قبضے کو قائم رکھا، بلکہ شمال کی طرف پیش قدمی کرتے ہوے مئی ۱۹۹۷ء تک بگرام ایئرپورٹ، صوبائی دارالحکومت چاریکار اور شمالی اتحاد کے عسکری مرکز مزار شریف پر قبضہ کر لیا۔ جنرل دوستم فرار ہوکر ترکی چلا گیا۔ یوں افغانستان کے ۹۰ فی صد علاقے (بشمول تمام بڑے شہروں اور قصبات کے) پر طالبان کا قبضہ ہوگیا۔ تاہم مزار شریف پر طالبان کا قبضہ تین روز سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ جنرل عبدالمالک، جس کے عسکری تعاون سے طالبان نے مزار شریف پر قبضہ کیا تھا، منحرف ہوگیا اور اس نے شیعہ ملیشیا کے ساتھ مل کر طالبان کو مزار شریف سے پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اس دوران میں طالبان ملیشیا کے تین ہزار سے زائد ارکان، جو شہر میں محصور ہو کر رہ گئے تھے، کو جنرل عبدالمالک کی افواج نے موت

کے گھاٹ اتار دیا (The Taliban Phenomenon، ص ۹۵–۱۰۹؛ حفیظ ملک : مقالہ مذکور، ص ۴۵–۴۹)۔ جون ۱۹۹۷ء میں گلبدین حکمت یار اور سید احمد گیلانی (محاذ ملی اسلامی) کی افواج بھی شمالی اتحاد میں شامل ہوگئیں جس سے اس کی قوت میں اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ طالبان کو شمالی افغانستان میں پے درپے شکستوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اگست ۱۹۹۷ء میں شمالی اتحاد نے مزار شریف میں طالبان حکومت کے متوازی اپنی حکومت قائم کرلی۔ برہان الدین ربانی کو اس نئی حکومت میں بھی صدارت کے منصب پر برقرار رکھا گیا۔ لیکن حکمت یار کی طرف سے اس حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار اور جنرل عبدالرشید دوستم اور جنرل عبدالمالک کے مابین جاری کشمکش کے سبب شمالی اتحاد جلد ہی افتراق کا شکار ہوگیا۔ طالبان نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شمال کے جانب ازسر نو پیش قدمی کرتے ہوئے ستمبر ۱۹۹۸ء تک شبرگان اور مزار شریف کے علاوہ شمالی افغانستان کے آخری اہم شہر بامیان (مضبوط شیعی گڑھ) پر بھی قبضہ کر لیا۔ جس کے بعد طالبان کی مخالفت شمال میں وادی پنج شیر تک محدود ہو کر رہ گئی۔ تاہم شمال میں مخالف افواج کے ساتھ طالبان ملیشیا کی معرکہ آرائی کا سلسلہ ستمبر ۲۰۰۱ء تک بدستور جاری رہا (طالبان: افغانستان میں جنگ، مذہب اور نیا نظام، ص ۳۶–۳۹، ۹۳–۱۰۳؛ M.J. Gohari: The Taliban Ascent to Power، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص۹۳–۹۴؛ حفیظ ملک: Taliban's Rule and National Reconstruction in Afghanistan، در Journal of South Asian and Middle Eastern Studies، ۲۴: ۴ (۲۰۰۰ء)، ص ۷۵–۷۷، ۸۱).

طالبان حکومت اور تعلقات خارجہ: طالبان حکومت کو شروع دن سے ہی بیرونی دنیا سے سیاسی وسفارتی تعلقات کے قیام کے حوالے سے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تین اسلامی ممالک، پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے علاوہ کسی اور ملک نے ان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا۔ ہمسایہ ممالک میں سے سوویت یونین، ایران اور وسطی ایشیائی جمہوریاؤں سے اس کے تعلقات انتہائی کشیدہ رہے۔ سوویت یونین اور اس کے زیر اثر وسطی ایشیائی جمہوریائیں، شمال کی طرف طالبان کی پیش قدمی بالخصوص تاجکستان اور ازبکستان سے ملحقہ بدخشاں، تاخار، کندوز، سمنگان، جوز جان اور بلخ وغیرہ صوبوں پر ان کے قبضے سے شدید تشویش میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ ان علاقوں پر طالبان کا استقرار ہمسایہ ریاستوں میں اسلامی تحریکوں کے لیے تقویت کا باعث بن رہا تھا۔ چنانچہ سوویت یونین، جو طالبان کو چیچنیا میں جاری تحریک آزادی کی سیاسی وعسکری حمایت کے لیے مورد الزام ٹھہراتا رہا تھا، اور وسطی ایشیائی جمہوریاؤں کی طرف سے طالبان مخالف قوتوں کی سیاسی وعسکری امداد کا سلسلہ جاری رہا۔ بھارت، جس نے افغانستان پر سوویت تسلط کے بارے میں خاموشی کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی، افغانستان میں سوویت افواج کی واپسی پر اپنے اثر ونفوذ کو بڑھانے کے لیے سرگرم عمل ہوگیا۔ سابق صدر برہان الدین ربانی، جو طالبان کی ابھرتی ہوئی قوت کا حقیقی ذمہ دار حکومت پاکستان کو گردانتا تھا، نے بھارت سے سرگرم تعلقات استوار کر لیے۔ بھارت کابل میں ایک اسلام پسند حکومت کے قیام کو اپنے زیر تسلط کشمیر میں جاری تحریک آزادی کے حوالے سے انتہائی غیر مفید خیال کرتا تھا، چنانچہ اس نے طالبان کے مقابلے میں برہان الدین ربانی کی حکومت اور بعد ازاں شمالی اتحاد کو مالی امداد، عسکری سازوسامان اور فوجی مشیروں کی خدمات فراہم کرنے میں بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا (کمال متین الدین: Post-Cold War Geo-Strategic Realities In

Afghanistan and the Role of the European Union، در Journal of European Studies، ۱٦، ۱۷ :۲، ۱ (جولائی ۲۰۰۰ء جنوری ۲۰۰۱ء)۔ ص ۱۰—۱٦؛

طالبان: افغانستان میں جنگ، مذہب اور نیا نظام، ص ۹۵—۹۸؛ احمد رشید: Jihad :The Rise of Militant Islam in Central Asia، لاہور، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵۰—۱۷۲)۔ افغانستان کے قریبی جنوبی ہمسایہ ملک ایران، جو افغانستان میں سوویت یونین کی مداخلت سے براہ راست متأثر ہوا تھا اور جہاں پاکستان کے بعد سب سے زیادہ افغان پناہ گزین مقیم تھے، سے بھی طالبان حکومت کے تعلقات انتہائی کشیدہ رہے۔ ایران نے سوویت تسلط کے خاتمے کے بعد افغان شیعہ چھاپہ مار گروہوں کے اتحاد حزب وحدت اسلامی کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا۔ نجیب اللہ حکومت کے خاتمے کے بعد کابل پر تسلط کے لیے متحارب گروہوں کے مابین جاری کشمکش میں اس کو بھرپور مالی وفوجی امداد فراہم کی۔ ایران کی طرف سے حزب وحدت اسلامی کی تائید وحمایت کا سلسلہ کابل پر طالبان حکومت کے قیام کے بعد بھی جاری رہا۔ جس کے رد عمل میں طالبان حکومت نے جولائی ۱۹۹۷ء میں کابل میں ایرانی سفارت خانے کو بند کر دیا۔ جس سے ان دونوں حکومتوں کے مابین شدید کشیدگی پیدا ہوگئی۔ مزار شریف پر طالبان کے قبضے (اگست، ستمبر ۱۹۹۸ء) کے دوران میں طالبان ملیشیا کے ہاتھوں ۱۰ ایرانی سفارتکاروں اور ایک صحافی، جو طالبان ذرائع کے مطابق شمالی اتحاد کے لیے فوجی مشیروں کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے، کے قتل کے بعد ان دونوں ممالک کے مابین جنگ کے سے حالات پیدا ہوگئے۔ بعدازاں طالبان حکومت کی طرف سے افغانستان میں قید تمام ایرانیوں کی رہائی اور مزار شریف میں ایرانی شہریوں کے قتل پر اظہار افسوس اور اس واقعہ میں ملوث طالبان ملیشیا کے ارکان کو سزا دینے کے اعلان کے بعد، دونوں ممالک کے مابین کشیدگی قدرے کم ہوگئی (The Taliban Ascent to Power، ص ۱۲٦—۱۲۷؛ Taliban's Rule، ص ۷۳—۷۷؛ Post-cold War Geo-Strategic Realities In Afghanistan، ص ۱۰—۱٦؛ Taliban and the Great Game in Afghanistan، ص ۱۱۳—۱۲۵، ۱۷۵—۱۹۲)۔

طالبان حکومت اور نفاذ شریعت: طالبان نے افغانستان میں اپنے فہم وبصیرت کے مطابق خلافت راشدہ کے نہج پر ایک اسلامی حکومت کے قیام کی داغ بیل ڈالی۔ انہوں نے ریاستی و انتظامی اداروں کی تشکیل کے سلسلہ میں خلفاے راشدین کے قائم کردہ نمونے کی پیروی کو اپنا نصب العین ٹھہرایا [دیکھیے مقالہ طالبان بذیل مادہ]۔ ملکی نظم ونسق کے اعتبار سے طالبان حکومت کا اہم ترین اقدام شریعت کا نفاذ تھا۔ اس حکومت نے اسلامی احکامات پر عمل درآمد اور خلاف شرع اعمال واقدار کے انسداد کے لیے ایک محکمہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر قائم کیا۔ ملک میں ٹیلی وژن نشریات، موسیقی، جوا، شراب نوشی اور بعض مشاغل، مثلاً پتنگ بازی اور کبوتر بازی وغیرہ کو ممنوع قرار دیا گیا۔ سرقہ، زنا، قتل اور دیگر جرائم کے بارے میں اسلامی حدود وتعزیرات کا اجرا عمل میں لایا گیا۔ محکمہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی طرف سے مردوں کے لیے مساجد میں نماز پنجگانہ کے لیے حاضری اور داڑھی رکھنے جب کہ عورتوں کے لیے حجاب کی پابندی کو لازم قرار دیا گیا۔ شہروں میں سینما گھروں کے علاوہ خواتین کے حمام بھی بند کر دیے گئے۔ عورتوں پر ملازمت اور لڑکیوں کے لیے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کے حصول پر پابندی عائد کرنے کے علاوہ شہروں میں خواتین کے لیے قائم شدہ فنی تربیت کے بہت سے

ادارے بھی بند کر دیے گئے۔ ان اقدامات پر عمل درآمد کے سلسلہ میں طالبان انتظامیہ نے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا اور کسی قسم کی مصلحت کو آڑے نہ آنے دیا۔ البتہ طالبان انتظامیہ کے اہلکاروں نے بسا اوقات بے جا سختی سے بھی کام لیا (طالبان، ص ۴۰-۴۷؛ Taliban: Islam, Oil and the New Great Game in Central Asia ، ص ۱۰۵—۱۱۶؛ M.J.Gohari: حوالہ مذکور، ص ۹۸، ۱۰۵—۱۱۰؛ حفیظ ملک : کتاب مذکور، ص ۷۷—۸۰؛ وہی مصنف: Taliban's Rule and National Reconstruction in Afghanistan، در Journal of South Asian and Middle Eastern Studies، ۲۴: ۴ (۲۰۰۰ء)، ص ۷۵—۷۷، ۸۱؛ Cilha D. Maass: The Taliban and International Standards of Governance ، در: Conard Schetter (مدیران): Afghanistan: A Country Without a State، لاہور ۲۰۰۲ء، ص ۱۹۷— ۲۰۸)۔ طالبان حکومت کے ان اقدامات کے نتیجے میں ان کے زیر انتظام علاقے بہت زیادہ حد تک اخلاقی بے راہروی اور جرائم سے محفوظ ہوگئے اور وہاں امن وامان کی حالت حیرت انگیز طور پر بہتر ہوگئی۔ طالبان نے ملک میں پوست کی کاشت، منشیات کی پیداوار اور ان کی تجارت کی روک تھام کے علاوہ عوام سے اسلحہ واپس لینے میں بھی اہم کامیابی حاصل کی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے طوائف الملوکی کو ختم کر کے افغانستان کی وحدت اور سالمیت کو لاحق خطرات کا بھی ازالہ کر دیا۔ طالبان حکومت کو اپنے قیام کے ابتدائی ایام سے ہی انتہائی ناموافق و نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمسایہ ریاستوں ایران سوویت یونین اور وسطی ایشیائی جمہوریاؤں کی طرف سے ان کی حکومت کو غیر مستحکم ہی نہیں، بلکہ اس کے خاتمے کی کوششیں اپنے عروج پر رہیں۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ مغربی دنیا بالخصوص ریاستہائے متحدہ امریکہ کا رویہ انتہائی معاندانہ رہا (Jonathan Goodhand و Matthew Feilden: Beyond the Taliban: The Afghan Conflict and United Nations Peace Making، در Conflict, Security, Development=CSD، ۱: ۳ (۲۰۰۱ء)، ص ۱۸—۱۹)۔ جس کے سبب انہیں یک سوئی سے ملک میں تعمیر وترقی کا موقع میسر نہ آسکا اور نہ ہی انہیں اس مقصد کے لیے بیرونی دنیا سے مطلوبہ مالی وسائل دستیاب ہوسکے۔ تاہم تمام تر مشکلات، رکاوٹوں اور وسائل کی قلت کے باوجود طالبان ملک کی تعمیرنو میں منہمک رہے۔ انہوں نے سرکاری اداروں اور شہری سہولتوں کی بحالی اور ذرائع مواصلات کو بہتر بنانے پر پوری توجہ مبذول کی۔ طالبان کی ان کاوشوں کے سبب کابل اور دیگر شہروں میں روز مرہ زندگی کے معمولات ایک بار پھر بحال ہوگئے۔ طالبان حکومت کے سربراہ ملا محمد عمر اور دیگر اعلیٰ حکام نے فقیرانہ و درویشانہ طرزِ زندگی اختیار کرتے ہوئے سادگی اور قناعت کی ایک ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر دورِ حاضر کے معاشروں میں ملنا محال ہے۔

طالبان اور امریکہ کشمکش: افغانستان میں طالبان ملیشیا کی فتوحات اور کابل پر ان کی حکومت کے قیام کی جن ممالک نے حمایت کی تھی ان میں پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے علاوہ امریکہ بھی شامل تھا۔ مؤخر الذکر کو افغانستان کے اندر سیاسی وعسکری محاذ پر ہونے والی ان تبدیلیوں سے وسطی ایشیائی جمہوریاؤں میں معدنی تیل اور گیس کے وسیع ذخائر تک رسائی اور ان کے استحصال کی امید حقیقت بنتے نظر آئی تھی۔ تاہم امریکہ نے دیگر تین ممالک کے برعکس عملی طور پر کابل میں طالبان حکومت کو تسلیم کرنے سے گریز کی راہ اختیار

کیے رکھی۔ طالبان حکومت کی طرف سے ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا بیڑا اٹھایا گیا تو مغربی ممالک بالخصوص امریکہ کی طرف سے اسے شدید تنقید وملامت کا ہدف بنایا گیا۔ طالبان حکومت کے ان اقدامات کو جمہوری اقدار اور انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزی بلکہ پامالی سے تعبیر کیا گیا۔ مغربی ممالک بالخصوص امریکہ نے طالبان حکومت کے بارے میں انتہائی معاندانہ وجارحانہ رویہ اختیار کر لیا (*The Afghanistan Wars*، ص ۲۳۳—۲۳۵، ۲۴۲—۲۴۴؛ *Taliban and the Great Game in Afghanistan*، ص ۱۷۵—۱۹۲، ۲۵۶—۲۶۳؛ *Jihad: The Rise of Militant Islam in Central Asia*، ص ۱۸۷—۱۹۵؛ طالبان، ص ۸۱-۸۹؛)۔ اگست ۱۹۹۸ء میں مشرقی افریقہ کے دو ممالک تنزانیہ اور کینیا میں امریکی سفارت خانوں میں بم دھماکوں کے نتیجے میں ۲۲۴ افراد ہلاک ہوئے۔ امریکہ کی طرف سے ان دھماکوں کا ذمہ دار افغانستان میں مقیم عرب مجاہد اسامہ بن لادن (ایک معروف سعودی نژاد مجاہد، جس نے سوویت تسلط کے خلاف کئی سالوں تک جہاد میں سرگرم کردار ادا کیا تھا) اور اس کی تنظیم القائدہ کو ٹھہرایا گیا۔ امریکی افواج نے انتقامی کاروائی کے طور پر افغانستان میں اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں کے ٹھکانوں پر میزائلوں سے حملے کیے جس سے متعدد عرب اور پاکستانی مجاہد شہید ہوئے۔ امریکہ کی طرف سے طالبان حکومت سے اسامہ بن لادن کی تحویل کا مطالبہ کیا گیا۔ طالبان نے اسامہ بن لادن کو کسی دوسرے ملک کی تحویل میں دینے کے بجائے افغانستان کے اندر اس پر مقدمہ چلانے کی پیش کش کی اور مشرقی افریقہ کے ممالک تنزانیہ اور کینیا میں بم دھماکوں اور دیگر دہشت گردانہ سرگرمیوں میں اس کے ملوث ہونے کے بارے میں شہادتیں طلب کیں۔ نومبر ۱۹۹۸ء میں امریکہ کی طرف سے بعض ثبوت فراہم کیے گئے جنہیں افغانستان کی عدالت عظمٰی نے ناکافی قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔ امریکہ کی طرف سے اکتوبر ۲۰۰۰ء میں یمن میں امریکی بحری جہاز USS Cole پر ہونے والے خودکش حملے، جس کے نتیجے میں ۱۷ افراد ہلاک ہوئے، کی ذمہ داری بھی اسامہ بن لادن پر عائد کی گئی (تفصیلی مطالعہ کے لیے دیکھیے: Jason Burke: *Al-Qaeda: Casting A Shadow of Terror*، لنڈن، نیویارک، ۲۰۰۳ء، ص، ۱۹۱—۱۹۴؛ Peter L.Bergen: *Holy War: Inside the Secret World of Osama Bin Laden*، لنڈن، ۲۰۰۱ء، ص ۱۵۷—۱۸۲، ۱۸۳—۲۴۰؛ *The Afghanistan Wars*، ص ۲۴۸—۲۵۰؛ Gilles Kepel: *Jihad: The Trial of Political Islam*، لنڈن، نیویارک ۲۰۰۲ء، ص۳۱۹—۳۲۱)۔ اس واقعے کے بعد امریکہ کا رویہ طالبان حکومت کے بارے میں مزید جارحانہ ہوگیا۔ چنانچہ اس کی تحریک اور دباؤ پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرف سے طالبان حکومت کو غیر مستحکم کرنے کے لیے خود اقوام متحدہ کے چارٹر، بین الاقوامی قانون اور حقوق انسانی کے کنونشن کو پامال کرتے ہوئے، افغانستان پر سخت اقتصادی پابندیاں عائد کر دی گئیں (دسمبر ۲۰۰۰ء) (Samiullah Koreshi: *Sanctions on Taliban and their Objcetives*، در *National Development and Security*، ۹: ۳ (۲۰۰۱ء)، ص ۲۴—۳۸)۔ ۲۰۰۱ء کے وسط میں طالبان حکومت کی طرف سے بامیان میں مہاتما بدھ کے تاریخی مجسموں کو مسمار کرنے اور افغانستان میں غیر ملکی امدادی اداروں سے وابستہ اہلکاروں کو عیسائیت کی تبلیغ کے الزام میں گرفتار کرنے اور ان پر مقدمہ چلانے جیسے اقدامات پر جاپان اور مغربی ممالک میں شدید ردعمل کا اظہار ہوا۔ امریکہ اور

اس کے ہم نوا ممالک کی تحریک پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے بیرون ممالک طالبان حکومت کے اثاثوں کو منجمد کرنے کے علاوہ اس پر عائد پابندیوں کو مزید سخت (اگست ۲۰۰۱ء) کر دیا (Jihad :The Trial of Political Islam ص ۲۳۴-۲۳۵).

امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی لشکر کشی: ۱۱ ستمبر کو امریکہ کے شہر نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور اس (امریکہ) کی مسلح افواج کے مرکز پنٹاگون کی عمارتوں سے تین اغوا شدہ طیاروں کے ٹکرانے کے واقعات پیش آئے جن کے نتیجے میں ہزاروں افراد ہلاک ہوئے۔ حسب سابق ان واقعات کی ذمہ داری بھی اسامہ بن لادن اور اس کی تنظیم القائدہ پر عائد کی گئی۔ امریکہ کی طرف سے طالبان حکومت سے افغانستان میں موجود اسامہ بن لادن اور القائدہ کے دیگر ارکان کی تحویل کا مطالبہ بڑی قوت وطاقت سے کیا گیا۔ طالبان نے جوابا امریکہ میں ہونے والے حملوں میں اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں کے ملوث ہونے کے بارے میں ٹھوس شہادتوں کی فراہمی پر افغانستان کے اندر ان پر مقدمہ چلانے کی پیش کش پر اصرار کیا۔ امریکہ نے طالبان کے اس موقف کو سختی سے مسترد کرتے ہوئے اسامہ بن لادن، القائدہ تنظیم اور طالبان حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور افغانستان پر لشکر کشی کی غرض سے شمالی اوقیانوس کی دفاعی تنظیم (NATO) کے رکن مغربی ممالک کے علاوہ جاپان، آسٹریلیا، ترکی، وسطی ایشیائی جمہوریاؤں تاجکستان، ازبکستان اور پاکستان جیسے مسلم ممالک پر مشتمل ایک عالمی فوجی اتحاد تشکیل دیا۔ مؤخر الذکر تین مسلم ممالک نے اس جنگ میں امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کی افواج کو خفیہ معلومات کی فراہمی کے علاوہ افغانستان کے اندر زمینی اور فضائی حملوں کے لیے مطلوبہ سہولیات بھی فراہم کیں۔ امریکہ نے ۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو افغانستان کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اسامہ بن لادن، القائدہ تنظیم اور طالبان کے خلاف اس جنگ میں امریکی اور برطانوی افواج نے خلیج فارس، بحیرۂ عرب اور ڈیگو گارشیا میں موجود اپنے جنگی بحری بیڑوں سے میزائلوں کی بارش برسانے کے علاوہ جدید ترین جنگی طیاروں کے ذریعے انتہائی کثرت سے مہلک ترین بم اور میزائل برسائے۔ شدید بمباری کے نتیجے میں، کابل، جلال آباد، قندھار، کندوز، مزار شریف اور دیگر بڑے شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو کر رہ گئے۔ اس کے علاوہ کثیر تعداد میں مضافاتی دیہات بھی نیست ونابود ہوگئے۔ افغانستان میں طالبان اور القائدہ کے فوجی و تربیتی مراکز، سرکاری عمارات، دینی مدارس، مساجد، ہوٹل اور ہسپتال خصوصی طور پر ہدف بنے۔ اس جنگ میں ہزاروں کی تعداد میں انسانی جانیں جن میں طالبان فوجیوں اور عالم عرب، پاکستان اور دنیا کے مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے مجاہدین کے علاوہ شہری آبادی بھی شامل تھی، تلف ہوئیں (Rohan Gunaratna: Inside Al-Qaeda :the Global Network of Terror، سی ہرسٹ اینڈ کمپنی (یو۔کے)، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۳-۱۱۲؛ Al-Qaeda: Casting A Shadow of Terror، ص ۲۱۰-۲۱۴، ۲۲۸-۲۴۰؛ The Afghanistan Wars، ص ۲۵۱-۲۶۶؛ Jihad: The Trial of Political Islam، ص ۳۲۱-۳۲۲، ۳۷۵-۳۷۶).

طالبان حکومت کا سقوط: طالبان اور القائدہ کے خلاف اس جنگ میں اول الذکر کے عسکری وسیاسی حریف گروہ شمالی اتحاد کو از سرنو منظم کیا گیا۔ اسے سوویت یونین، بھارت، وسطی ایشیائی جمہوریاؤں اور امریکہ کی طرف سے وسیع پیمانے پر مالی امداد، اسلحہ اور فوجی سازو سامان فراہم کر کے طالبان افواج کے خلاف میدان میں

اتارا گیا۔ ازبک جنرل عبدالرشید دوستم اور افغان خفیہ ایجنسی کے سابق سربراہ جنرل فہیم کی قیادت میں شمالی اتحاد کی افواج، جنہیں اتحادی ممالک کی فضائی قوت اور بری وبحری افواج کے خصوصی چھاپہ مار دستوں کی مدد حاصل تھی، نے نومبر کے وسط میں شمالی افغانستان کے شہروں مزار شریف اور کندوز سے طالبان افواج کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ دوسری جانب جنوبی افغانستان میں طالبان کے سابق حریف کمانڈر محمد اسماعیل خان نے ازسرنو صف بندی کرتے ہوئے ہرات پر قبضہ کر لیا۔ عسکری اعتبار سے کلیدی اہمیت کے ان علاقوں پر مخالف افواج کے قبضہ ہوجانے کے چند ہی دنوں کے بعد طالبان افواج، جن کا تنظیمی ڈھانچہ، بعض کمانڈروں کے منحرف ہوکر شمالی اتحاد میں شامل ہوجانے کے بعد کمزور پڑ چکا تھا، کابل، غزنی، جلال آباد اور مشرقی افغانستان کے دیگر علاقوں سے پسپا ہونے پر مجبور ہوگئیں۔ چنانچہ ان کا کنٹرول، ان کے سیاسی مرکز قندھار اور ملحقہ صوبوں زابول اور ہلمند تک محدود ہو کر رہ گیا۔ دسمبر کے پہلے عشرے میں طالبان مخالف قوتوں، جن میں شمالی اتحاد کی افواج، امریکی وبرطانوی فوجی دستے اور پختون سیاسی رہنما حامد کرزئی اور اس کے حامی کمانڈر شامل تھے، نے ان علاقوں کا محاصرہ کر لیا۔ محصور طالبان رہنما قندھار کا کنٹرول ایک مقامی کمانڈر کے حوالے (۷ دسمبر ۲۰۰۱ء) کر کے مختلف علاقوں میں روپوش ہوگئے۔ جس کے ساتھ ہی افغانستان میں طالبان کے دور حکومت کا خاتمہ ہوگیا (The Afghanistan Wars، ص ۲۵۱—۲۶۶؛ Jihad: The Trial of Political Islam، ص ۳۲۱—۳۲۲، ۳۳۴، —۳۳۶، ۳۷۵—۳۷۶؛ موسیٰ خان جلال زئی: Taliban and the Post-Taliban Afghanistan، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء ص ۱۳۷—۱۴۰)۔ شمالی اتحاد کی افواج نے مزار شریف اور کندوز پر قابض ہونے کے بعد وہاں پر ہزاروں کی تعداد میں محصور طالبان بالخصوص ان کے غیر ملکی حامیوں، جن میں پاکستان، چیچنیا، مشرقی یورپ اور عرب ممالک کے مجاہد شامل تھے اور جنہوں نے ایک معاہدے کے تحت ہتھیار ڈال دیے تھے، کو امریکی و برطانوی فوجی مشیروں کی نگرانی میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ طالبان اور غیر ملکی مجاہدوں کے اس قتل عام میں امریکی وبرطانوی جنگی طیاروں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ کابل اور بعض دوسرے شہروں میں بھی شمالی اتحاد کی افواج نے امریکی اور برطانوی افواج کے سرگرم تعاون و اشتراک عمل سے ہزاروں افراد کا قتل عام کیا (Taliban and the Post-Taliban Afghanistan، ص ۱۶۹—۱۸۹)۔

بون کانفرنس اور افغان عبوری انتظامیہ کی تشکیل: نومبر (۲۰۰۱ء) کے اختتام پر اقوام متحدہ کی زیرنگرانی جرمنی کے شہر بون میں افغانستان کی عبوری انتظامیہ کی تشکیل کی غرض سے ایسے افغان رہنماؤں جنہیں امریکہ کی آشیرباد حاصل تھی، کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ کانفرنس میں شمالی اتحاد، روم میں مقیم سابق افغان بادشاہ ظاہر شاہ اور پاکستان میں مقیم افغان رہنما سید احمد گیلانی کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں دسمبر کے اوائل میں ایک پشتون قبائلی رہنما حامد کرزئی کی سربراہی میں ایک افغان عبوری حکومت تشکیل دی گئی۔ عبوری انتظامیہ، جس میں شمالی اتحاد کو وسیع تر نمائندگی دی گئی، نے ۲۲ دسمبر کو کابل میں اقتدار سنبھال لیا۔ عبوری انتظامیہ کی تشکیل کے ساتھ ہی امریکہ کی سرپرستی میں قائم عسکری اتحاد کی طرف سے افغانستان میں قیام امن اور عبوری انتظامیہ کے تحفظ واستحکام کی غرض سے کثیر القومی امن فوج کو، جن کی معتدبہ تعداد آسٹریلوی، برطانوی، ترکی، جرمن اور امریکی فوجیوں پر مشتمل ہے، تعینات کیا

گیا۔ کثیر القومی امن فوج کو افغانستان کے سیاسی و انتظامی ڈھانچے اور حکومتی و ریاستی اداروں کی تشکیل نو کے کام کی نگرانی کے علاوہ طالبان اور القائدہ کے قلع قمع کا وظیفہ بھی سونپا گیا (The Afghanistan Wars، ص ۲۶۸ — ۲۷۲؛ Taliban and the Post- Taliban Afghanistan، ص ۱۴۷ - ۱۵۹؛ Beyond the Taliban?، ص ۱۵-۲۳؛ کمال متین الدین: Post- 9/11 Afghanistan، در South Asian Journal، عدد ۳ (جنوری- مارچ ۲۰۰۴ء)، ص ۱۰۷—۱۱۹).

افغان مزاحمت میں پاکستان، امریکہ اور دیگر ممالک کا کردار:

پاکستان اس خطے کا ایک ایسا ملک ہے جس کی افغانستان سے طویل ترین قابل نفوذ سرحد ملتی ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان سرحدی لکیر کے آر پار پختون (آفریدی، شنیواری، مہمند اور وزیر)، بلوچ اور بعض دوسرے قبائل آباد ہیں جو گہرے طور سے آپس میں جڑے ہوئے ہیں (ایس۔ افتخار حسین: Some Major Pukhtoon Tribes Along the Pak-Afghan Borders، پشاور، ۲۰۰۰ء، ص ۲۸—۱۶۲)۔ چنانچہ افغانستان کے داخلی سیاسی حالات و واقعات، پاکستان پر بڑی شدت سے اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ ایک عرصہ تک افغانستان کے قوم پرست دانش وروں، سیاست دانوں اور حکومتوں کی مسئلہ پختونستان سے وابستگی کے پس منظر میں جب سردار داؤد کی حکومت اور اس ملک کی اسلامی تنظیموں کے درمیان کشمکش کا آغاز ہوا تو پاکستان کی طرف سے مؤخر الذکر کے بارے میں واضح طور پر ہمدردانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۵ء کے دوران میں داؤد حکومت کے مظالم اور جبرو تشدد سے بچنے کے لیے اسلامی تنظیموں کے متعدد رہنما اور ان کے سیکڑوں حامی افغانستان سے نکل کر پاکستان کے شہر پشاور چلے آئے تو ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کی طرف سے انہیں پناہ دی گئی (Afghanistan: Mullah, Marx and Mujahid، ص ۱۴۵-۱۴۶، ۱۸۰)۔ اس طرح انقلاب ثور (اپریل ۱۹۷۸ء) سے قبل ہی پاکستان کا شہر پشاور جلا وطن افغان سیاسی رہنماؤں کا اہم مرکز بن گیا تھا۔ گلبدین حکمت یار (حزب اسلامی)، برہان الدین ربانی (جمعیت اسلامی) اور مولوی یونس خالص (حزب اسلامی) وغیرہ نے پشاور میں اپنی تنظیموں کے صدر دفتر قائم کر لیے تھے (Afghanistan Under the Soviet Domination، ص ۱۲۲-۱۲۴)۔ افغانستان میں ثور انقلاب اور بالخصوص سوویت جارحیت کے بعد بڑے پیمانے پر افغان عوام ہجرت کر کے پاکستان پہنچنے لگے تو حکومت پاکستان نے شمال مغربی سرحدی صوبہ (N.W.F.P) اور افغانستان کی سرحدوں سے متصل قبائلی علاقوں وزیرستان، میرم شاہ، مہمند اور باجوڑ ایجنسی وغیرہ میں ان کے لیے خیمہ بستیاں قائم کیں۔ پاکستان کے پختون قبائل افغان حریت پسندوں کے لیے اسلحہ اور مالی امداد کی فراہمی کا اہم ذریعہ بن گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں سوویت افواج کی افغانستان میں مداخلت و تسلط کے بعد پاکستان کی سالمیت و استحکام کو بھی شدید خطرات لاحق ہو گئے تھے۔ دریں حالات پاکستان میں جنرل محمد ضیاء الحق [رک بہ تکملہ آآآ بذیل مادہ] کی حکومت (۱۹۷۷- ۱۹۸۸ء) نے افغانستان کی آزاد، خودمختار اور غیر جانبدارانہ حیثیت کی بحالی کے لیے سفارتی جدوجہد کے پہلو بہ پہلو در پردہ افغان تحریک مزاحمت کی پشت پناہی کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ بعض سرکاری اداروں کے ذریعے پاکستان میں موجود افغان مہاجرین کی خیمہ بستیوں نیز پاکستان کے پختون قبائل سے باقاعدہ طور پر مجاہدین کی بھرتی اور ان کی فوجی تربیت کا آغاز ہوا۔ یہ مجاہدین افغانستان کے اندر سوویت یونین اور افغان سرکاری افواج کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں میں مصروف ہو گئے۔اس طرح پاکستان کی سر زمین کو افغان مہاجرین کے لیے ایک بڑی پناہ گاہ جب

کہ سوویت یونین اور اس کی حمایت یافتہ افغان حکومتوں کے خلاف افغان مزاحمت و جہاد کے لیے ایک بنیادی عسکری و سیاسی مرکز (base camp) کی حیثیت حاصل رہی (Report from Afghanistan، ص ۳۵-۴۶، ۶۴-۶۵؛ Afghanistan Under the Soviet Domination ص ۱۲۴-۱۲۷؛ Amin Saikal: The Regional Politics of the Afghan Crisis، در The Soviet Withdrawal from Afghanistan، ص ۵۲-۵۵؛ Pakistan's Foreign Policy، ص ۸۳ — ۸۷؛ Frederic Grare: Pakistan and the Afghan Conflict 1979-1985، کراچی ، ۲۰۰۳ء، ص ۳۹ — ۹۶)۔

سوویت یونین مخالف بین الاقوامی اتحاد کی تشکیل:

امریکہ نے جو سوویت یونین کے توسیع پسندانہ عزائم اور خطے میں اس کے روز افزوں اثر ونفوذ کا سدباب چاہتا تھا، سال ۱۹۷۹ء کے وسط ہی سے افغانستان میں اشتراکی انقلاب کے خلاف جاری مزاحمت کو در پردہ مالی و اسلحی امداد بہم پہنچانا شروع کی تھی۔ تاہم افغانستان میں سوویت یونین کی فوجی مداخلت کے ساتھ ہی وہ کھل کر میدان عمل میں کود پڑا ۔ صدر کارٹر دور میں قومی سلامتی کا مشیر (Zbigniew Brzezinski) سوویت افواج کے مقابلے میں مسلمان مجاہدین کو کھڑا کیے جانے کے خیال کا پرجوش حامی تھا۔ اس خیال (منصوبے) کو حقیقت میں بدلنے کے لیے امریکہ کو قابل اعتماد اتحادیوں ، بالخصوص پاکستان کی اشد ضرورت تھی۔ مزید براں انہی دنوں امریکہ اس خطے میں اپنے انتہائی قابل اعتماد اور وفادار دوست محمد رضا شاہ پہلوی [رک بہ ایران در تکملہ آآآ بذیل مادہ]سے محروم ہو گیا تھا۔ پاکستان میں اس وقت جنرل ضیاء الحق کی حکومت کو داخلی اور خارجی محاذ پر شدید نوعیت کے مسائل و مشکلات کا سامنا تھا ۔ امریکی کانگرس پاکستان کے نیوکلیائی پروگرام کے سبب اس کو اقتصادی امداد و قرضہ جات اور فوجی سازوسامان کی فراہمی پر پابندی لگا چکی تھی۔ پاکستان کو قرضہ جات فراہم کرنے والے مغربی ممالک کا کنسورشیم بھی اس کے ذمے واجب الادا قرضہ جات کی مدت ادائیگی میں توسیع و اجرائے نو کرنے میں پس و پیش کر رہا تھا۔ ان حالات میں جنرل ضیاء الحق کو امریکہ کے ساتھ اقتصادی و فوجی روابط کے احیاء اور اپنی حکومت کے استحکام کے علاوہ سوویت یونین کے خلاف جنگ میں ایک انتہائی مؤثر اور طاقت ور حلیف میسر آیا تھا (حفیظ ملک : Soviet Intervention in Afghanistan and its Impact on Pakistan's Foreign Policy، در، ملک حفیظ (مدیر): Soviet-American Relations With Pakistan, Iran and Afghanistan، لنڈن ، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۹-۱۳۴)۔ چنانچہ اس نے سوویت یونین کے خلاف جنگ میں امریکہ کا اتحادی بننا قبول کیا۔ اس ضمن میں اس کی طرف سے عائد کی گئی بنیادی شرائط کہ مجاہدین کی جنگی تربیت اور ان کو اسلحہ، مالی امداد اور دیگر ساز وسامان کی فراہمی کو خفیہ رکھا جائے گا، مزید براں تمام تر کارروائی امریکی خفیہ ادارے سی- آئی- اے (CIA) کی طرف سے براہ راست نہیں بلکہ مکمل طور پر پاکستانی فوج کے توسط سے عمل میں لائی جائے گی، کو کارٹر انتظامیہ نے منظور کر لیا تھا۔ امریکہ کو، قومی سلامتی کے مشیر (Zbigniew Brzezinski)، وزیر دفاع ہیرالڈ براؤن (Harold Brown)، اس وقت کے سی- آئی- اے کے سربراہ ایڈمرل اسٹانس فیلڈ ٹرنر (Admiral Stansfield Turner) کی سفارت کاری اور ترغیب و تحریک کی بدولت، سوویت یونین کے خلاف افغان مزاحمت کی پشت پناہی کے لیے پاکستان کے جنرل ضیاء الحق (م۱۹۸۸ء)، مصر کے انور

سادات (م۱۹۸۱ء) اور مملکت سعودی عرب کے علاوہ عوامی جمہوریہ چین کا تعاون بھی حاصل ہو گیا۔ سال ۱۹۸۰ء کے آغاز سے سوویت افواج کی پسپائی تک افغانستان سی ۔ آئی۔ اے کی کارگزاریوں کا سب سے بڑا مرکز بنا رہا (Afghanistan: the Soviet Invasion in Perspective، ص۱۱۸-۱۱۹؛ Untying the Afghan Knot، ص ۸-۱۰ ، ۲۳-۲۵ ، ۱۷۰-۱۷۲؛ John K.Cooley: Unholy Wars :Afghanistan,America and International Terrorism، لندن ، اسٹرلنگ، ۲۰۰۱ء، ص۲۹-۳۵ ، ۴۸- ۵۵ ، ۶۰-۶۹؛ Jihad: The Trial of Political Islam، ص ۱۳۶-۱۳۸، ۳۹۴؛ The Bear Trap، ص ۷۸-۹۶).

جنرل محمد ضیاء الحق نے افغان مزاحمت سے متعلق امور کی نگرانی و ذمہ داری مسلح افواج کے ادارے آئی۔ ایس۔ آئی (Inter-Services Intelligence)، جس کا سربراہ افغانستان میں سوویت مداخلت کے فوراً بعد انہوں نے اپنے ایک معتمد ساتھی جنرل اختر عبدالرحمٰن کو مقرر کیا تھا ، کے سپرد کی۔ جنرل اختر عبدالرحمٰن ، اگست ۱۹۸۸ء میں جنرل محمد ضیاء الحق کے ساتھ ایک فضائی حادثے میں ہلاکت تک اس ذمہ داری کو نبھاتا رہا (The Bear Trap، ص۲۵-۳۰؛ محمد یوسف:خاموش مجاہد:افغان جہاد کے پس پردہ کار فرما حکمت کار، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص۶۱-۹۶)۔ افغانستان میں سوویت افواج کی مداخلت کو ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ امریکی سامان بردار طیاروں کے ذریعے مصر سے روسی ساختہ جب کہ براستہ شاہراہ ریشم چینی اسلحہ پاکستان پہنچنا شروع ہو گیا۔ پاکستانی فوج کے توسط سے یہ اسلحہ مجاہدین تک پہنچایاجانے لگا۔ صدر جمی کارٹر (Jimmy Carter: ۱۹۷۷-۱۹۸۱ء) کے دور اقتدار میں افغان مجاہدین کو مالی امداد اور اسلحہ کی فراہمی محدود نوعیت کی رہی ۔پہلے سال کارٹر انتظامیہ کی طرف سے ۳۰ ملین امریکی ڈالر امداد کی فراہمی کو جنرل محمد ضیاء الحق نے از راہ تحقیر ''مونگ پھلی'' سے تشبیہ دی تھی۔ تاہم رونالڈ ریگن (Ronald Wilson Reagan: ۱۹۸۱-۱۹۸۸ء) کے اقتدار میں آنے (۱۹۸۱ء) کے بعد اس کا دائرہ وسیع ہو گیا۔امریکی سی۔آئی۔اے چین اور مصر کے علاوہ اسرائیل ،شام اور مشرقی یورپ کے ممالک سے روسی ساختہ اسلحہ خرید کر پاکستان پہنچاتی رہی۔ ۱۹۸۴ء میں امریکی کانگرس نے مجاہدین کی مالی و عسکری امداد میں اضافہ کے لیے ایک قرار داد منظور کی، جس کے بعد اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور آسٹریلیا کے علاوہ خود امریکہ میں تیار ہونے والا اسلحہ اور دیگر فوجی ساز و سامان مجاہدین تک پہنچنے لگا۔مؤخر الذکر کی طرف سے ۱۹۸۶ء میں فراہم کردہ اسٹنگر میزائلوں نے سوویت و افغان فضائیہ کو شدید زک پہنچائی۔ سال ۱۹۹۱ء کے اختتام تک امریکہ کی طرف سے افغان مجاہدین کو ۲ء۴ ارب ڈالر مالیت کا فوجی سازوسامان فراہم کیا گیا (The Bear Trap،ص ۹۷-۱۱۲،۱۷۴-۱۷۸؛ Afghanistan:The Soviet Invasion in Perspective، ص ۱۳۶-۱۳۸؛ John K.Cooley: Unholy Wars،ص ۳۲-۳۵،۶۱-۶۳، ۷۳-۷۵، ۱۷۳-۱۷۵؛ Afghan Communism and Soviet Intervention، ص ۲۱۹-۲۲۰)۔ پاکستان کی مسلح افواج کے ادارے آئی۔ایس۔ آئی (ISI) نے مجاہدین میں اسلحہ وغیرہ کی تقسیم و ترسیل اور اس کے استعمال اور دیکھ بھال کی تربیت کے علاوہ مزاحمت کو منظم ومربوط بنانے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا ۔ چنانچہ اس کی کوششوں سے مجاہدین کے چھوٹے چھوٹے متفرق و منتشر گروہوں کی کثیر تعداد سات بڑے گروہوں: حزب اسلامی (مولوی یونس خالص)، حزب اسلامی (گلبدین حکمت یار) ،جمعیت اسلامی (پروفیسر برھان

الدین ربانی)، اتحاد اسلامی (عبدالرب الرسول سیاف)، حرکت انقلاب اسلامی (مولوی محمد نبی محمدی)، جبہ نجات ملی (صبغت اللہ مجددی) اور محاذ ملی (سید احمد گیلانی) میں ضم ہو گئے۔ بعد ازاں پاکستان ہی کی کوششوں سے مئی ۱۹۸۵ء میں ان سات بڑے گروہوں کا ایک وفاق اتحاد اسلامی مجاہدین افغانستان تشکیل پایا۔ افغانستان سے سوویت افواج کی واپسی پر انہی سات گروہوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک عبوری افغان حکومت کی تشکیل میں بھی پاکستان کا کردار بڑا اہم رہا۔ افغان بحران کے تصفیے کے لیے سفارتی محاذ پر بھی پاکستان نے فعال کردار ادا کیا۔ اقوام متحدہ کے تحت ہونے والے مذاکرات میں وہ باقاعدہ طور پر ایک فریق کی حیثیت سے شریک رہا۔ ۱۹۸۸ء میں طے پانے والا جنیوا معاہدہ، جس کی بدولت افغانستان سے سوویت افواج کی واپسی کی راہ ہموار ہوئی تھی، پاکستان کی رضا مندی و شرکت ہی سے طے پایا تھا۔ سوویت افواج کی واپسی کے بعد کابل میں نجیب اللہ حکومت کے سقوط (اپریل ۱۹۹۲ء) اور وہاں پر افغان مجاہدین کی حکومت کے قیام جیسے واقعات و امور میں بھی پاکستان نے اہم کردار ادا کیا (Marvin G. Weinbaum: War and Peace in Afghanistan: the Pakistani Role، در The Middle East Journal، ۴۵:۱ (۱۹۹۱ء)، ص ۷۱-۸۶؛ The Bear Trap، ص ۲۵-۳۰ : ۳۸-۴۰، ۹۷-۱۲۷؛ Untying the Afghan Knot، ص ۴۲-۴۳ ، ۹۴-۱۵۰، ۱۹۱-۱۹۴، ۲۴۲ - ۲۴۴، ۲۵۷-۲۵۹، ۲۶۲ - ۲۸۵، ۲۹۹-۳۰۲؛ The Foreign Policy of Afghanistan، ص ۲۱۳-۲۲۲؛ The Geneva Accords of April 1998، ص ۱۲-۲۵؛ Afghan Communism and Soviet Intervention، ص ۲۰۶-۲۱۵؛ Pakistan and the Afghan Conflict، ص ۷۶-۱۲۴)۔

پاکستان کو سوویت یونین کے خلاف جنگ میں افغان مجاہدین کی سرگرم تائید و حمایت کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ پاکستان کو مجاہدین کی پشت پناہی سے باز رکھنے کے لیے سوویت یونین کی طرف سے مسلسل ڈرایا دھمکایا جاتا رہا۔ چنانچہ روسی رہنما چرننکو نے آنجہانی آندروپوف کی آخری رسومات کے موقع (فروری ۱۹۸۴ء) پر جنرل محمد ضیاء الحق سے ملاقات سے انکار کر دیا تھا۔ بعد ازاں چرننکو کی آخری رسومات (مارچ ۱۹۸۵ء) کے موقع پر میخائل گورباچوف نے بھی جنرل ضیاء الحق کو سنگین نتائج کی دھمکی دی تھی (Afghan Communism and Soviet Intervention، ص ۲۷۲-۲۷۳)۔ جنگ کے ابتدائی سالوں میں سوویت افواج کی طرف سے کسی بڑی جوابی کارروائی کے خطرات پاکستان کے سر پر منڈلاتے رہے۔ سوویت اور افغان فضائیہ اور توپ خانے کی طرف سے سیکڑوں بار پاکستانی حدود کے اندر بمباری کی گئی۔ علاوہ ازیں پاکستان کے مختلف علاقوں بالخصوص صوبہ سرحد اور بلوچستان میں افغان خفیہ ایجنسی خاد کے کارندوں کے ہاتھوں وسیع پیمانے پر تخریب کاری اور بم دھماکوں کے واقعات پیش آئے۔ جن میں ہزاروں کی تعداد میں افراد ہلاک و زخمی ہوئے۔ تاہم جنرل محمد ضیاء الحق کی حکومت نے ان سب چیزوں سے بے نیاز و بے خطر افغان مزاحمت کی ہر ممکن تائید و حمایت کا سلسلہ جاری رکھا، تاآنکہ سوویت یونین کو توسیع پسندی کا راستہ ترک کر کے پسپائی پر مجبور ہونا پڑا (پرویز اقبال چیمہ: The Afghanistan Crisis and Pakistan`s Security Dilemma، در Asian Survey، ۲۳:۳ (مارچ ۱۹۸۳ء)، ص ۲۲۷-۲۴۳؛ Untying the Afghan Knot، ص ۱۷۲-۱۷۶؛ Afghan Communism and Soviet Intervention، ص ۲۳۰)۔

سوویت یونین کے خلاف جنگ میں جنرل محمد

ضیاء الحق کی حکومت کے علاوہ پاکستان کی بعض دینی جماعتیں بالخصوص جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام بھی پیش پیش رہیں۔ ان جماعتوں نے عسکری محاذ پر ہزارہا نوجوانوں کو روانہ کرنے کے علاوہ مجاہدین کو ضروری جنگی و غیر جنگی سازوسامان کی فراہمی، پاکستان میں آباد افغان پناہ گزینوں کی دیکھ بھال بالخصوص افغان خیمہ بستیوں میں طبی مراکز اور بچوں کے لیے مکاتب و مدارس کے قیام میں سرگرم کردار ادا کیا۔ جماعت اسلامی، پاکستان اور دیگر ممالک کے مخیّر افراد اور اداروں سے مالی امداد اور عطیہ جات بھی اکٹھے کر کے افغان مجاہدین اور پناہ گزینوں کو پہنچاتی رہی۔ پاکستان میں دیو بند مکتب فکر کے سیکڑوں مدارس ہزارہا افغان طلبہ کو تعلیم دینے کے علاوہ ان کی معاشی کفالت کا ذریعہ بنے رہے (Jihad:The Trial of Political Islam، ص ۷-۱۳، ۱۴۳، ۲۲۲-۲۲۳)۔ پاکستانی فوج اور اسلامی جماعتوں کی طرف سے افغان تحریک مزاحمت و جہاد کی حمایت و پشت پناہی کی بدولت افغان مہاجرین و مجاہدین اور پاکستان کے عوام کے درمیان اخوت و یگانگت کے رشتہ کو انتہائی تقویت پہنچی۔ چنانچہ دونوں ممالک کے مابین کشیدگی و محاذ آرائی کا موجب مسئلہ پختونستان دب گیا۔ پاکستان میں پختون اور بلوچ علیحدگی پسند تحریکیں بھی دم توڑ گئیں۔ مزید براں مستقبل میں دونوں ممالک کے مابین گہرے سیاسی، دفاعی اور اقتصادی تعلقات کی راہ ہموار ہوئی (.Marvin G Weinbaum: Pakistan and Afghanistan: the Strategic Relationship، در Asian Survey، ۳۱:۶ (جون ۱۹۹۱ء)، ص ۴۹۶-۵۱۱)۔

عرب ممالک کا کردار: سوویت یونین کے خلاف افغان مجاہدین کی اس جنگ میں مملکت سعودی عرب اور اس کی ہمسایہ عرب ریاستوں کا کردار، مالی وسائل کی فراہمی کے ضمن میں، بڑا اہم رہا۔ کارٹر دور میں امریکہ کی قومی سلامتی کا مشیر (Zbigniew Brzezinski) افغان مزاحمت کی حمایت کے لیے ایک اتحاد کے قیام کی ابتدائی مہم (جنوری-فروری ۱۹۸۰ء) کے دوران میں ہی سعودی حکمرانوں سے مالی امداد، جو کم از کم جنگ میں امریکی اخراجات کے مساوی ہو، کی فراہمی کا عہد و پیمان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ چنانچہ جنگ کے ابتدائی ایام سے سوویت افواج کی مکمل واپسی تک، سعودی عرب کی طرف سے امریکی اخراجات، جو ۱۹۸۰ء میں ۳۰ ملین ڈالر سالانہ سے بڑھ کر ۱۹۸۵ء میں ۲۵۰ ملین ڈالر سالانہ تک جا پہنچے تھے، کے مساوی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مالی امداد فراہم کی جاتی رہی۔ سعودی حکومت کی طرف سے مالی وسائل کی فراہمی اور اس سے اسلحہ و دیگر سازوسامان کی خریداری و ترسیل کے کام کی نگرانی سعودی رائل انٹیلی جنس کا سربراہ شہزادہ ترکی الفیصل کرتا رہا، جب کہ اس ادارے کا ایک سابق سربراہ شیخ کمال ادہم افغان مزاحمت کو مالی وسائل کی فراہمی کی کارروائی میں خزانچی کی ذمہ داری انجام دیتا رہا۔ سعودی عرب کی ہمسایہ عرب ریاستوں نے بھی افغان مزاحمت کے لیے مالی وسائل کی فراہمی میں حصہ لیا۔ سعودی عرب اور خلیج کی ان ریاستوں سے نجی سطح پر امراء و شیوخ اور دیگر صاحب ثروت طبقات نے افغان مجاہدین و مہاجرین کے لیے بھاری عطیہ جات جن میں خوردنی اشیا، طبی سازوسامان، کمبل اور خیمے ہوتے تھے، فراہم کیے۔ ان ممالک کی سرکاری و غیر سرکاری خیراتی و فلاحی تنظیموں بشمول رابطۃ العالم الاسلامی، الهیئۃ الاغاثۃ الاسلامیۃ العالمیۃ (International Islamic Relief Organization) (دونوں کا تعلق سعودی عرب سے ہے)، الهیئۃ الاسلامیۃ الخیریۃ العالمیۃ (International Islamic Charitable

Orgnanization (کویت)، جمعیۃ قطرالخیریہ (Qatar Charitable Society) کے علاوہ بیسیوں دیگر تنظیمیں افغان خیمہ بستیاں بسانے اور وہاں پر بنیادی سہولیات (پینے کا صاف پانی وغیرہ) کی فراہمی، ڈسپنسریوں، مساجد اورمکاتب و مدارس کے قیام اور ان کے انتظام و انصرام میں فعال کردار ادا کرتی رہیں۔ سال ۱۹۸۵ء اور مابعد دور میں مذکورہ عرب ریاستوں کی سرکاری و غیر سرکاری فلاحی و خیراتی تنظیمیں کم از کم ۶۰۰ ملین ڈالر سالانہ کے حساب سے ''افغان کاز'' کے لیے خرچ کرتی رہیں۔ نجی طور پر صاحب ثروت افراد کی طرف سے براہ راست افغان جہادی گروہوں کو فراہم کی جانے والی مالی رقوم اور سازو سامان یا افغان خیمہ بستیوں میں تقسیم کی جانے والی خوردنی اشیاء و ملبوسات اس پر مستزاد تھیں۔ افغانستان سے سوویت افواج کی واپسی اور بالخصوص عراق/ کویت جنگ کے بعد افغان مجاہدین اورمہاجرین کو عرب ریاستوں کی طرف سے فراہم کی جانے والی امداد میں کافی حد تک کمی واقع ہو گئی تھی تاہم نجی سطح پر یہ سلسلہ طالبان کے خلاف امریکہ کی جنگ (اکتوبر ۲۰۰۱ء) تک بدستور جاری رہا (John K.Cooley: *Unholy Wars*، ص ۲۰، ۱۱۱- ۱۱۵ : *Al-Qaeda : Casting A Shadow of Terror* ، ص ۵۷-۶۷: *Jihad: The Trial of Political Islam*، ص ۱۴۵-۱۴۶؛ ۳۹۶ حاشیہ ۲۴)۔ ایک اندازے کے مطابق اپریل ۱۹۹۲ء تک سعودی عرب اور اس کی ہمسایہ خلیجی ریاستوں نے افغان مجاہدین اور مہاجرین کو چھ ارب ڈالر سے زائد امداد فراہم کی تھی (*Afghan Communism and Soviet Intervention*، ص۲۲۰)۔

مغربی رضاکار تنظیموں اور ذرائع ابلاغ کا کردار:
اگرچہ امریکہ کے سوا شمالی اوقیانوس کی دفاعی تنظیم نیٹو (NATO) کے رکن دوسرے ممالک نے افغان مجاہدین کو اسلحہ اور جنگی سازوسامان کی فراہمی میں حصہ نہیں لیا تھا ، تاہم ان ممالک کے افراد اور رضا کار طبی اور فلاحی تنظیموں نے افغان مزاحمت کے دوران میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان تنظیموں نے محاذ جنگ اور افغان خیمہ بستیوں میں ڈاکٹر اور نرسیں روانہ کیں ، جو انتہائی کٹھن اور دشوار حالات میں زخمی مجاہدین کے علاج معالجے کے علاوہ افغان پناہ گزینو ں کو طبی سہولتیں فراہم کرتی رہیں ۔اس سلسلہ میں فرانس، سویڈن اور ناروے کی غیر سرکاری تنظیموں کا کردار بڑا نمایاں رہا۔ افغانستان کے اندر سرگرم ان تنظیموں کے کارندے نہتے افغان عوام کے خلاف سوویت یونین کی بربریت کے چشم دید واقعات کو عالمی ذرائع ابلاغ تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ چنانچہ مغربی ذرائع ابلاغ اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے افغانستان پر سوویت افواج کے غاصبانہ تسلط اور نہتے عوام پر اس کے وحشیانہ مظالم کے خلاف عالمی رائے عامہ کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا (*Afghanistan: The Soviet Invasion in Perspective*، ص ۱۱۸-۱۱۹: *Afghan Communism and Soviet Intervention*،ص ۲۲۷-۲۲۸)۔

جہاد افغان کے اثرات و نتائج: سوویت یونین کی افغانستان میں لشکر کشی اور اس کے خلاف افغان حریت پسندوں کی مزاحمت ومقاومت جدید عالمی تاریخ کا ایسا واقعہ ہے کہ جو عالمی سیاست میں دور رس تبدیلیوں کا ایک اہم ترین عامل و محرک ثابت ہوا ہے۔ اس واقعہ کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے عالم اسلام کی نوجوان نسل میں جذبہ حریت و جہاد کی بیداری و آبیاری میں اہم کردار ادا کیا۔سوویت یونین اور اس کی کٹھ پتلی افغان حکومت کے خلاف افغان علما کے اعلان جہاد (دسمبر ۱۹۷۹ء-جنوری ۱۹۸۰ء) کی توثیق و تائید کم و بیش دنیاے اسلام کی تمام اسلامی

تحریکوں نے کی تھی۔ اس واقعے کے بعد افغانستان کے قریبی ہمسایہ ملک پاکستان کی دینی جماعتوں بالخصوص جماعت اسلامی اور جمعیت علماے اسلام نے سوویت افواج کے خلاف جہاد کے لیے دعوت و تحریک کا آغاز کیا تھا۔ چنانچہ جلد ہی جماعت اسلامی کے حامی و کارکن اور دیو بند مکتب فکر کے علماء اور مدارس و جامعات کے طلبہ افغانستان میں جہاد کے لیے روانہ ہو نے لگے۔ پاکستان کے ان دینی حلقوں سے وابستہ ہزاروں کی تعداد میں نوجوان میدان جنگ میں سوویت افواج کے خلاف سال ہا سال برسر پیکار رہے جن میں سے سیکڑوں نے جام شہادت نوش کیا (سلیم منصور خالد (مدیر): دینی مدارس میں تعلیم: کیفیت، مسائل، امکانات ، اسلام آباد ، ۲۰۰۲ء، ص۲۵۰ ؛ Jihad:The Trial of Political Islam، ص ۱۳۷-۱۴۲)۔

آئندہ سالوں میں افغان مزاحمت نے سوویت یونین کے خلاف ایک عالمگیر جہادی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ دنیاے اسلام کے مختلف خطوں کے علاوہ مغربی ممالک، سوویت یونین کے زیر تسلط سابق مسلم جمہوریاؤں، مشرقی یورپ، فلپائن، عوامی جمہوریہ چین، برما اور ہندوستان سے مجاہدین کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں افغانستان میں سوویت افواج کے خلاف معرکہ آرائی کے لیے پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبہ (N.W.F.P) پہنچنے لگیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط تک پاکستان کا یہ علاقہ مجاہدین اور رضا کاروں کی ایک بین الاقوامی اجتماع گاہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ پشاور اور اس کے اطراف میں عرب و غیر عرب مجاہدین کی متعدد خیمہ بستیاں اور چھاپہ مار جنگ کے تربیتی مراکز وجود میں آ گئے۔ پاکستان کی افواج کے ادارے آئی ۔ایس۔ آئی (ISI) کے اہلکار انہیں عسکری تربیت دیتے رہے۔ بعدازاں ضروری حربی سازوسامان سے لیس کر کے انہیں محاذ جنگ کی طرف روانہ کیا جاتا۔ چنانچہ یہ غیر ملکی مجاہدین سال ہا سال تک سوویت یونین اور اس کی حمایت یافتہ افغان حکومتوں کے خلاف، برسر پیکار رہے۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۸۲ء سے۱۹۹۲ء تک کے دوران میں اسلامی و غیر اسلامی ممالک سے کم از کم پینتیس (۳۵) ہزار نوجوانوں نے افغان مجاہدین کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا جب کہ افغان جہاد سے کسی نہ کسی طور سے وابستہ دنیا بھر سے آنے والے مسلمان نوجوانوں کی کل تعداد ایک لاکھ سے بڑھ کر تھی (طالبان، ص ۶۱۔۶۲؛ Olivier Roy: Has Islamism Future in Afghanistan?، در Fundamentalism Reborn، ۲۰۱-۲۰۴: Afghan Communism and Soviet Intervention، ص۱۹۱-۱۹۲؛ Jihad:The Rise of Militant Islam in Central Asia، ص ۴۴)۔ دنیا کے مختلف خطوں سے آئے ہوئے ان مجاہدین اور رضا کاروں میں بھاری اکثریت عربوں کی تھی ۔ ان میں سے بھی زیادہ تر کا تعلق مصر ، شام اور فلسطین کی اسلامی تحریک اخوان المسلمون یا پھر سوڈان، یمن اور شمالی افریقہ کے ممالک الجزائر، تیونس اور موریطانیہ کی مختلف اسلامی تحریکوں سے تھا۔ عرب نوجوانوں (بالخصوص مصر ، شام اور فلسطین وغیرہ سے) میں جذبہ جہاد کی افزائش اور ان کے افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ سوویت افواج کے خلاف معرکہ آرائی کے لیے کشاں کشاں چلے آنے میں مصر کی الجماعۃ الاسلامیہ کے روحانی قائد شیخ عمر عبدالرحمٰن کے علاوہ اخوان المسلمون (فلسطین و اردن) کے رہنما اور ملک عبدالعزیز یونیورسٹی ، جدہ وبین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ،اسلام آباد کے ایک سابق استاد شیخ عبد اللہ عزام (۱۹۴۱ء - ۱۹۸۹ء) کی دعوت و تحریک جہاد کا بڑا عمل دخل تھا۔ اول الذکر نے کئی بار پشاور اور پاکستانی سرحدوں سے متصل افغان علاقوں کے دورے کیے تھے۔ شیخ عبداللہ عزام ۱۹۸۴ء میں اسلام آباد

کی اسلامی یونیورسٹی سے سلسلہ ملازمت ترک کر کے پشاور منتقل ہو گئے، جہاں انہوں نے مکتب الخدمات کے نام سے اپنا مرکز قائم کرنے کے علاوہ الجہاد کے نام سے عربی زبان میں ایک مجلّہ جاری کیا تھا۔ یہ مجلّہ عرب ممالک میں ان کے جہادی نظریات کی تبلیغ و تشہیر کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوا۔ شیخ عبداللہ عزّام عرب مجاہدین، رضا کاروں، فلاحی و خیراتی تنظیموں اور افغان جہادی گروہوں کے مابین رابطہ و تعامل کا ایک اہم ذریعہ تھے۔ عرب نوجوانوں کے ہاں تو انہیں ایک مربی و مرشد کی حیثیت حاصل تھی (Jihad: The Trial of Political Islam، ص ۱۴۴-۱۴۸؛ Al-Qaeda: Casting A Shadow of Terror، ص ۶۸-۷۱؛ John L. Esposito: Unholy War: Terror in the Name of Islam، نیویارک، ۲۰۰۰ء، ص ۷، ۱۹؛ John K. Cooley: Unholy Wars، ص ۴۰-۴۴، ۸۷-۸۸، ۲۲۵-۲۲۶، ۲۳۸-۲۴۳)۔ سعودی عرب اور اس کی ہمسایہ ریاستوں کے حکمرانوں ، امراء و شیوخ اور مخیّر حضرات کی افغان مزاحمت سے ہمدردی و دل چسپی اور وہاں کے ذرائع ابلاغ میں سویت مظالم اور افغان مجاہدین کی کار گذاریوں کے بارے میں خبروں کی متواتر اشاعت سے ان خوشحال ممالک کے نوجوان بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہاں سے بھی سیکڑوں نوجوان چلے آئے۔ امریکی ادارے سی ۔آئی۔ اے کی ایک رپورٹ کے مطابق دس سالہ افغان مزاحمت میں (کم از کم) پچیس ہزار عرب نوجوانوں نے حصہ لیا۔ ان میں سے نصف میدان جنگ میں معرکہ زن رہے، جبکہ باقی امدادی و فلاحی کاموں میں مشغول رہے۔ افغان جہاد میں حصہ لینے والے ان عربوں کو مغربی مصنفین بالعموم عرب افغانوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔ عرب مجاہدین میں سے جس شخص کو غیر معمولی کار گذاریوں کی بدولت انتہائی شہرت حاصل ہوئی وہ شیخ عبداللہ عزّام کا ایک شاگرد اور سعودی عرب کے ایک انتہائی دولت مند بن لادن خاندان کا رکن اسامہ بن لادن (ولادت ۱۹۵۷ء) تھا۔ اسامہ بن لادن نے عرب، افریقہ اور دیگر ممالک سے مجاہدین کو پشاور تک سفر کے اخراجات، اور وہاں رہائش و قیام کی سہولیات اور دیگر ضروریات کی فراہمی کے سلسلہ میں مرکزی کردار ادا کیا (Al-Qaeda: Casting A Shadow of Terror، ص ۵۴-۷۰؛ John K. Cooley: Unholy Wars، ص ۸۱-۸۴، ۱۲۰؛ Reaping the Whirlwind، ص ۱۳۱-۱۳۷، ۲۰۲-۲۰۷؛ Inside Al-Qaeda، ص ۴۳-۵۳).

اسامہ بن لادن نے افغان جہاد اور پھر اس ملک کی تعمیر نو کے لیے سعودی عرب اور خلیج کی عرب ریاستوں کے مالدار طبقات سے بیش قدر عطیہ جات اکٹھے کرنے کے علاوہ اپنے خاندان کی طرف سے کروڑوں ڈالر خرچ کئے۔ اس نے ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں سعودی عرب میں اپنے خاندان کی ملکیتی تعمیراتی کمپنیوں کے توسط سے پشاور میں بھاری تعمیراتی مشینری درآمد کرنا شروع کی اور افغانستان کے اندر مجاہدین کے مختلف گروہوں کے زیر انتظام پہاڑی علاقوں میں افغان اور غیر ملکی مجاہدین کے لیے عسکری مراکز تعمیر کئے۔ یہ مراکز بڑی بڑی غاروں اور سرنگوں پر مشتمل تھے۔ جہاں اسلحہ کے ڈپو، اشیاے خورد و نوش کے گودام، قیام و طعام گاہیں، مساجد اور ہسپتال بھی تعمیر کئے گئے تھے۔ خوست کے جنوب مغرب میں مولانا جلال الدین حقانی کے حامی مجاہدین کے زیر انتظام ژورہ کلی کمپلیکس، جلال آباد کے جنوب میں تیس میل کی مسافت پر مولوی یونس خالص کی حزب اسلامی کے زیر انتظام پہاڑوں میں تورا بورا کمپلیکس کہ جہاں طالبان کے خلاف جنگ میں امریکہ نے جدید ...

مہلک ترین بم برسائے ہیں،اور پاکستان کے سرحدی شہر پاراچنار سے متصل افغان علاقہ میں جاجی کمپلیکس ، جو حزب اسلامی ،گلبدین حکمت یار کے لیے تعمیر کیا گیا، کی تعمیر اسامہ بن لادن ہی کی رہین منت تھی۔ اس نے دو بڑے مراکز، خوست اور جاجی میں، عرب مجاہدین کے لیے بھی تعمیر کرائے۔ مزید براں اس نے مجاہدین کے زیر انتظام دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں سڑکوں اور عسکری تربیت گاہوں کی تعمیر میں بھی مدد بہم پہنچائی (Al-Qeada:Casting A Shadow of Terror، ص ۷۰-۷۴؛Unholy Wars:John K.Cooley، ۱۱۸-۱۲۱).

الجزائر سے انڈونیشیا تک دنیا کے مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے مجاہدین افغانستان میں سوویت افواج اور اس کی پسپائی کے بعد ڈاکٹر نجیب اللہ کی حامی و وفادار افواج کے خلاف برسر پیکار رہے۔ نجیب اللہ کی حکومت کے سقوط (اپریل ۱۹۹۲ء) پر کابل اور دوسرے شہروں پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے افغان جہادی گروہوں کے مابین مقابلہ و مسابقت اور کشمکش و معرکہ آرائی کا آغاز ہوا تو یہ غیر افغان مجاہدین اپنے اپنے ملکوں کو واپس لوٹنے لگے۔ تاہم عربوں اور وسطی ایشیا سے تعلق رکھنے والے مجاہدین کی ایک مؤثر تعداد افغانستان میں موجود رہی۔ افغان دھڑوں کی طویل کشمکش کے بعد جب طالبان ایک نمایاں عسکری و سیاسی قوت کے طور پر ابھرے تو ان کی ہمدردیاں ان کے ساتھ وابستہ ہو گئیں۔ طالبان کی فتوحات اور ان کی حکومت کے قیام و استحکام میں ان مجاہدین نے بڑا اہم اور فعال کردار ادا کیا۔ اسامہ بن لادن، جس کے طالبان حکومت کے سربراہ ملا محمد عمر [رک مقالہ طالبان در تکملہ آ آ آ بذیل مادہ] سے گہرے روابط استوار ہو گئے تھے،نے طالبان حکومت کی مالی مشکلات کو دور کرنے میں بھرپور مدد کی (Taliban:Islam,Oil and the New Great Game in Central Asia، ص ۶-۷،۱۳۱- ۱۳۳، ۱۳۶-۱۴۰ ، ۱۷۶-۱۷۷ ، ۱۸۰-۲۱۱؛Jihad:The Rise of Militant Islam in Central Asia،ص۷ ، ۱۷۴-۲۱۱ و بمواقع عدیدہ؛Reaping the Whirlwind،ص ۱۳۳-۱۳۷، ۲۴۷-۲۴۹)۔ طالبان حکومت نے امریکہ ، دیگر بڑی طاقتوں اور بعض اسلامی ممالک سعودی عرب ، تاجکستان، ازبکستان، مصر اور الجزائر وغیرہ کی طرف سے شدید دباؤ اور تخویف و ترہیب کے باوجود ان غیر ملکی مجاہدین سے انقطاع تعلق اور ان کی ملک بدری سے انکار کر دیا۔ جس کی پاداش میں اس پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے اکتوبر ۲۰۰۱ء میں جنگ مسلط کی گئی۔ افغانستان پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی جارحانہ لشکر کشی کے دوران غیر ملکی مجاہدین کی ایک بڑی تعداد شہید و زخمی یا پھر غنیم کے ہاتھوں گرفتار ہو گئی۔ باقی افغانستان میں روپوش ہو گئے یا پھر پاکستان، ایران اور وسطی ایشیا کے ممالک کی طرف نکل گئے۔بعد ازاں پاکستانی فوج اور پولیس نے اپنے ملک کی حدود میں داخل ہونے والے سیکڑوں کی تعداد میں ان مجاہدین کو گرفتار کر کے امریکی افواج کے حوالے کر دیا۔ جنھیں افغانستان میں موجود امریکہ کے فوجی اڈوں یا پھر خلیج گوانتانامو (کیوبا) میں امریکہ کے بحری مستقر میں قید کیا گیا (Al-Qaeda:Casting A Shadow of Terror، ص ۲۲۸-۲۴۰).

افغان مزاحمت نے دنیا بھر سے جذبہ جہاد و حریت سے سرشار مسلم نوجوانوں کو کسی ایک علاقے پاکستان و افغانستان میں مجتمع ہونے کا موقع فراہم کیا تھا۔ان میں سے ایسے بھی تھے جو اپنے اپنے ملکوں ، مصر ،شام ، یمن، الجزائر، لیبیا اورتیونس وغیرہ میں اسلامی معاشرہ و ریاست کی تشکیل و قیام کی جدوجہد میں مشغول ہونے کے سبب

وہاں کی حکومتوں کے زیر عتاب تھے اور پابند طوق و سلاسل رہ چکے تھے۔ بعض ایسے تھے جو غیر مسلم ریاستوں میں بطور اقلیت محکومی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جن کے ممالک (وسطی ایشیا کی سابق مسلم جمہوریائیں، چینی ترکستان، بوسنیا و ہرزے گووینا، فلپائن، اراکان اور کشمیر و فلسطین وغیرہ) پر ایک عرصہ سے استعماری طاقتوں نے بزور قوت تسلط جما رکھا تھا، جب کہ یہ نوجوان اس محکومی سے نجات کے آرزو مند تھے۔ افغان جہاد، جس میں سوویت یونین کو ہزیمت اٹھانا پڑی تھی، نے ان نوجوانوں کی خود اعتمادی اور ان کے جذبہ حریت و آزادی میں اضافہ کرکے انہیں اور زیادہ انقلابی بنا دیا۔ چنانچہ سوویت افواج کی پسپائی کے بعد مسلم ممالک سے تعلق رکھنے والے یہ مجاہدین اپنے اپنے ملک (مصر، الجزائر، تیونس، یمن وغیرہ) واپسی پر ایک نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ وہاں کی لادینی و مغرب نواز حکومتوں کے خلاف صف آراء ہوے۔ نتیجتًا ان مختلف ممالک میں اسلامی تحریکوں اور وہاں کی حکومتوں کے مابین ایک طویل تصادم اور کشمکش کا آغاز ہوا۔ بالکل اسی طرح سے غیر مسلم ریاستوں کے زیر نگین مسلم اقلیات سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں نے اپنے ممالک پر ناجائز طور پر قابض استعماری طاقتوں، سوویت یونین، اسرائیل، برما، ہندوستان، یوگوسلاویا، وغیرہ، سے آزادی کے حصول کے لیے مسلح جدو جہد کا آغاز کیا (تفصیلی معلومات کے لیے دیکھیے: مشتاق الرحمٰن: The Soviet Occupation of Afghanistan: Implications for Muslim Central Asia and the Muslim World، در American Journal of Islamic Social Sciences، ۳:۲ (۱۹۸۶ء)، ص ۲۹۱—۳۰۸: John L.Esposito: The Islamic Threat: Myth or Reality، نیو یارک، آکسفرڈ، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵۹-۱۸۹؛ وہی مصنف: Unholy War: Terror in the Name of Islam، ص ۶۲، ۸۵-۸۶، ۹۰-۹۲، ۱۰۲-۱۰۴، ۱۵۷-۱۵۸، وبمواقع عدیدہ: Reaping the Whirlwind، ص ۶، ۲۶، ۴۴-۴۳، ۸۶، ۱۲۵، ۱۶۳-۱۶۶، ۱۷۷-۱۷۸، ۱۸۰-۱۸۲، ۱۸۵، ۱۸۹، ۱۹۴، ۲۰۱، ۲۰۲- ۲۰۷، ۲۱۲ - ۲۱۷، ۲۲۳ -۲۲۸، ۲۳۳ - ۲۳۴: John K.Cooley: Unholy Wars، ص ۸۱-۱۰۶، ۱۸۵-۲۱۷، ۲۴۷-۲۵۸: Jihad: The Rise of Militant Islam In Central Asia، خصوصاً ص ۹۵- ۱۸۶، ۲۱۲-۲۱۸: Taliban: Islam.Oil and the New Great Game in Central Asia، ص ۱۲۸-۱۴۰: Jihad:The Trial of Political Islam، ص ۱۳۶ - ۱۵۸، ۱۶۳-۱۷۶، ۲۱۷، ۲۳۲، ۲۴۳، ۲۹۸، ۳۳۸- ۳۳۹).

سماجی حالت: افغانستان میں سوویت یونین کی عسکری مداخلت اور اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات سے ملک کے سماجی اور تعلیمی ڈھانچے کو شدید زک پہنچی۔ سوویت افواج کی جارحانہ کارروائیوں اور وحشیانہ مظالم کے سبب افغان عوام کی کثیر تعداد ہمسایہ ممالک پاکستان اور ایران کی طرف ہجرت کر گئی تھی یا پھر اپنے ہی ملک میں تتر بتر ہوگئی تھی۔ ۱۹۸۵ء کے اواخر تک افغان مہاجرین بیرون ملک آباد دنیا کی سب سے بڑی بے وطن آبادی بن چکے تھے۔ پناہ گزینوں سے متعلق اقوام متحدہ کے ادارے UNHCR کے مطابق پاکستان اور ایران کی طرف نقل مکانی کرنے والے ان افغان پناہ گزینوں کی تعداد بالترتیب ۳،۲۷۵،۰۰۰ اور ۲،۸۵۰،۰۰۰ تھی۔ جبکہ ۲۱ لاکھ افراد اپنے ہی ملک میں سوویت فضائیہ کی بمباری اور توپ خانہ کی گولہ باری سے بچاؤ کی خاطر بے سروسامانی کے عالم میں محفوظ مقامات کی تلاش میں دیہاتوں سے پہاڑوں یا پھر شہروں کی طرف نقل مکانی کر گئے تھے۔ کئی لاکھ افراد بھارت، ترکی، مشرق وسطی کے عرب ممالک، آسٹریلیا، شمالی امریکہ و یورپی

ممالک کی طرف ہجرت کر گئے تھے (International Humanitarian Enquiry Commission on Displaced Persons in Afghanistan، ص ۶۵ — ۸۳؛ Louis Dupree: Post-Withdrawal Afghanistan : Light at the End of The Tunnel، در : Amin Saikal و William Maley (مدیران): The Soviet Withdrawal from Afghanistan، کیمبرج، ۱۹۸۹ء، ص ۳۵ — ۳۷؛ Vitat Muntarbhorn: The Status of Refugees in Asia، آکسفرڈ، ۱۹۹۲ء، ص ۲۰ — ۲۲؛ Robert G.Wirsing: Repatriation of Afghan Refugees، در Journal of South Asian and Middle Eastern Studies، ۱۲: ۴ (۱۹۸۸ء)، ص ۲۰ — ۴۱)۔ ایک اندازے کے مطابق افغانستان میں اشتراکی انقلاب (اپریل ۱۹۷۸ء) سے ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت کے خاتمے (اپریل ۱۹۹۲ء) تک ۱۵ لاکھ سے زائد افراد شہید و ہلاک، جب کہ پانچ لاکھ سے زائد افراد معذور و اپاہج ہوے (The Geneva Accords of April 1988، ص ۱۳؛ Afghan Communism and Soviet Intervention، ص ۱۷۷ — ۱۷۸)۔ سوویت افواج کی پسپائی اور بعدازاں نجیب اللہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد مختلف افغان جماعتوں کی باہمی کشمکش نے ابتر سماجی حالت کو مزید بدتر بنا دیا۔ طالبان اور القائدہ کے خلاف جنگ کے دوران میں امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کی افواج کی طرف سے شدید ترین بمباری (اکتوبر ۲۰۰۱ء و مابعد) کے سبب ہزاروں کی تعداد میں افغان عوام ہلاک ہوے اور لاکھوں کی تعداد میں ایک بار پھر جاے پناہ کی تلاش میں در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوے۔ البتہ اس بار ان پر پاکستان اور ایران کی سرحدیں بند کر دی گئیں۔ شدید سرد موسم میں کھلے آسمان تلے پڑے اشیاے خوراک اور دیگر ضروریات زندگی سے محروم ان بے خانماں افغان عوام کو درپیش مصائب کے ازالہ کے لیے عالم انسانی بالخصوص دنیاے اسلام کی طرف سے کوئی تدبیر نہیں کی گئی۔ چنانچہ ہزاروں کی تعداد میں افغان بوڑھے، بچے اور عورتیں فقروفاقہ، شدید موسمی حالات اور مختلف وبائی امراض کا شکار ہوکر لقمہ اجل بن گئے.

اقتصادیات: اقتصادی اعتبار سے افغانستان کا شمار دنیا کے پس ماندہ ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ ملک کی آبادی کی بھاری اکثریت انتہائی غربت سے دوچار ہے۔ گذشتہ پچاس سال کے دوران میں ملکی معیشت کا زیادہ تر انحصار غیر ملکی امداد پر رہا۔ سردار داؤد کے دس سالہ دور حکومت (۱۹۵۳-۱۹۶۳ء) کے دوران میں ملک کے اقتصادی وتعمیراتی منصوبہ جات پر صرف ہونے والے سرمایہ کا ۶۵ فیصد حصہ غیر ملکی امداد، جس کا دو تہائی حصہ سوویت یونین کی طرف سے فراہم کیا گیا، سے بہم پہنچایا گیا۔ سوویت یونین کی طرف سے فراہم کردہ قرضہ جات سے کابل ایئر پورٹ، سوویت سرحد سے براستہ درہ سالانگ کابل تک ایک شاہراہ کے علاوہ ملک میں متعدد خوراک کے گودام تعمیر کیے گیے، متعدد روئی کے پلانٹ لگائے گئے اور بعض دیگر تعمیراتی منصوبے شروع کیے گئے۔ سوویت یونین کے اقتصادی تعاون اور فنی وتکنیکی امداد سے ملک کے پہلے پانچ سالہ اقتصادی منصوبے ۱۹۶۱-۱۹۶۵ء کا آغاز ہوا (Afghanistan Under The Soviet Domination، ص ۲۷ — ۲۸)۔ آئینی دور (۱۹۶۳-۱۹۷۳ء) میں بھی ملک کی معیشت کا انحصار غیر ملکی امداد پر رہا۔ جس کی بدولت ملک بیرونی قرضوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ سوویت یونین کو واجب الادا قرضہ جات کی ادائیگی کے لیے افغانستان سے روس کے زیر تسلط وسطی ایشیائی جمہوریاؤں کو معدنی گیس برآمد کی جانے لگی۔ سردار داؤد کے دوسرے دور حکومت (۱۹۷۳-۱۹۷۸ء)

میں ملکی معیشت مکمل طور سے سوویت یونین کی گرفت میں چلی گئی۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۸ء تک تقریباً پچیس سالہ دور میں سوویت یونین کی طرف سے افغانستان کو ۱ء۲۶ ارب (امریکی) ڈالر اقتصادی جب کہ ۱ء۲۵ ارب ڈالر مالیت کی فوجی امداد فراہم کی گئی۔ اس دوران میں ریاست ہاے متحدہ امریکہ کی طرف سے کل ۵۳۳ ملین ڈالر کی امداد بہم پہنچائی گئی تھی (کتاب مذکور، ص ۳۰-۳۱، ۵۴؛ Taliban: Islam, Oil and the New Great Game in Central Asia ، ص ۱۳)۔ افغانستان میں سوویت یونین کی عسکری مداخلت کا ایک اہم مقصد اس ملک کے غیر دریافت شدہ اور غیر استعمال شدہ معدنی وسائل کو اپنے تصرف میں لانا تھا۔ چنانچہ سوویت تسلط کے دور میں افغانستان میں کثیر مقدار میں موجود یورینیم، کروم، میگنیشیم، تانبہ، کوئلہ، خام لوہا اور ہیرے جواہرات کے ذخائر تک رسائی حاصل کرنے اور انہیں سوویت یونین اور اس کے زیر تسلط وسطی ایشیائی جمہوریاؤں تک منتقل کرنے کے لیے ضروری مواصلاتی ڈھانچہ کی تعمیر کے منصوبے شروع (۱۹۷۹-۱۹۸۰ء) کیے گئے۔ تاہم افغانستان میں جاری تحریک مزاحمت و جہاد، کے سبب سوویت یونین کو اس ملک کے قدرتی وسائل کو اپنے تصرف میں لانے کے اپنے اس منصوبے کو ترک کرنے پر مجبور ہونا پڑا (John F. Shroder Jr.: Afghanistan : Resources and Soviet Policy in Central and South Asia، در : Robert L. Canfield و Milan Hauner (مدیر) Afghanistan and the Soviet Union، لنڈن، بولڈر، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۳-۱۱۰؛ Edward R.Girardet: Afghanistan: The Soviet War، بیکن ہام، کینٹ، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۲-۱۶۰؛ ایم۔صدیق نورزئی: Long Term Soviet Economic Interests and Policies in Afghanistan، در Afghanistan: the Great Game Revisited، ص ۷۱-۹۴)۔ افغانستان میں سوویت افواج کی جنگی کارروائیوں سے ملک کی معیشت کو شدید زک پہنچی۔ سوویت افواج کی واپسی (۱۹۸۹ء) کے بعد بھی کابل میں طالبان حکومت کے قیام (۱۹۹۶ء) تک ملک میں اقتصادی بحالی اور تعمیر نو کی طرف کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ طالبان حکومت نے اپنے انتہائی محدود وسائل کے باوجود ملک میں تعمیر وترقی کے عمل کا آغاز کیا۔ ۱۹۹۷-۱۹۹۸ء کے دوران میں اس نے عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ معدنی تیل اور گیس کے ذخائر کی دریافت اور قندھار میں سیمنٹ سازی کے ایک کارخانے کی تعمیر کے لیے معاہدے کیے۔ طالبان انتظامیہ نے ملک میں تیل اور گیس کے ذخائر کو ترقی دینے کے لیے افغان نیشنل آئل کمپنی، جو ملک میں سوویت یونین کی مداخلت کے بعد ختم کر دی گئی تھی، کو ازسر نو بحال (۱۹۹۸ء) کیا۔ اسی سال امریکی آئل وگیس کمپنی (UNOCAL) سے اس کا وسطی ایشیائی ریاست ترکمانستان سے براستہ ہرات، قندھار پاکستان تک قدرتی گیس کی ترسیل کے لیے ۲ ارب ڈالر مالیت کی ۸۹۰ میل پائپ لائن بچھانے کا ایک معاہدہ طے پایا۔ مذکورہ کمپنی نے دیگر غیر ملکی کمپنیوں کے ساتھ مل کر ایک کنسورشیم بھی قائم کیا۔ تاہم اس کمپنی نے اس منصوبے کو ملک کی غیر یقینی سیاسی صورت حال کے پیش نظر معطل کر دیا (کتاب مذکور، ص ۳۵۴-۳۵۷؛ The Taliban Ascent to Power، ص ۹۳-۹۶؛ Taliban and the Great Game in Afghanistan، ص ۱۱۳-۱۲۶، ۱۷۵-۱۹۲، ۲۵۶-۲۶۳؛ The Afghanistan Wars، ص ۲۴۴-۲۴۵؛ Taliban : Islam, Oil and the New Great Game in Central Asia ، ص ۱۵۷-۱۸۲)۔ ۱۹۹۸ء سے امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی طرف سے افغانستان پر عائد سخت

اقتصادی پابندیوں کے نتیجے میں پہلے سے تباہ شدہ معیشت کی حالت مزید ابتر ہوگئی (The Europa World Year Book 2000، ص ۳۵۴—۳۵۷؛ The Afghanistan Wars، ص ۲۴۸—۲۵۰)۔ امریکہ کی افغانستان کے خلاف جنگ کے نتیجے میں تو اس ملک کی معیشت کا تار و پود ہی بکھر کر رہ گیا (Conard Schetter : The Bazaar Economy of Afghanistan، در Afghanistan: A Country Without A State، ص ۱۱۵—۱۳۴؛ William Maley: The Reconstruction of Afghanistan ، در Ken Booth و Tim Dunne(مدیران): Terror and the Future of Global Order: Worlds in Collision، نیویارک، ۲۰۰۲ء ، ص ۱۸۴—۱۹۳ء).

تعلیم: افغانستان میں جدید تعلیم کی ترویج واشاعت کے لیے ۱۹۵۰ء کی دھائی سے سرکاری مدارس قائم ہونا شروع ہوے۔ اس دوران میں کابل اور چند صوبائی دارالحکومتوں میں ہائی اسکولوں کے علاوہ تربیت اساتذہ کے ادارے بھی قائم ہوے، جب کہ قصبات اور دیہاتوں میں پرائمری اسکول کھولے گئے۔ ان سرکاری مدارس میں جدید علوم، طبیعات، ریاضی، جغرافیہ کے علاوہ تاریخ، فارسی زبان وادب، پشتو اور اسلامیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۹۶۰ء کی دھائی میں کابل یونیورسٹی میں غیر ملکی امداد سے متعدد کلیات (طب، ہندسہ، شریعہ و قانون، طبیعی وعمرانی علوم اور زبان وادب) قائم کیئے گئے۔ سردار داؤد کے دوسرے دور حکومت (۱۹۷۳-۱۹۷۸ء) میں ملک میں جدید تعلیم کی ترویج پر خصوصی توجہ دی گئی۔ شہروں، قصبات اور دیہاتوں میں نئے سرکاری مدارس قائم کیے گئے۔ اگرچہ ملک میں سرکاری مدارس کے قیام کے ساتھ ساتھ روایتی دینی مدارس کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تاہم دیگر ممالک کے مقابلے میں خواندگی کی شرح انتہائی پست رہی (Louis Dupree: Afghanistan، ص ۵۹۷—۵۹۹؛ Olivier Roy: The Mujaheddin and the Preservation of Afghan Culture، در Afghanistan and the Soviet Union، ص۴۰—۴۲)۔ انقلاب ثور (اپریل ۱۹۷۸ء) کے بعد اشتراکی نظریات واقدار کی ترویج کے لیے تعلیمی نظام میں ہمہ گیر تبدیلیاں لائی گئیں۔ سرکاری مدارس اور کابل یونیورسٹی کے نصاب کو یکسر تبدیل کر دیا گیا۔ دینیات، اسلامی آداب وفنون اور تاریخ اسلام کو تعلیمی نصاب سے خارج کر دیا گیا، جبکہ بعض نئے مضامین، مثلاً تاریخی و جدلیاتی مادیت، سائنسی عمرانیات اور مزدور تحریک کی تاریخ، شامل نصاب کیے گئے۔ اسی طرح اسکولوں اور یونیورسٹی میں روسی زبان کی تدریس کو لازمی قرار دیا گیا۔ ملک میں قائم تعلیمی اداروں بالخصوص کابل یونیورسٹی سے مغربی ممالک سے تعلق رکھنے والے اساتذہ نکال دیئے گئے۔اسی طرح کابل یونیورسٹی کے مختلف کلیات کو سوویت یونین اور اس کے اتحادی اشتراکی ممالک کے ماہرین کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ اشتراکی دور حکومت میں نرسریاں اور کنڈرگارٹن اسکول، جنہیں وطن پرورش گاہوں کا نام دیا گیا، قائم کیے گئے۔ ایسی ہی نرسریاں اور اسکول روس میں اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷ء) کے بعد ۱۹۲۰ء کی دھائی میں قائم کیے گئے تھے۔ ملکی تعلیمی ڈھانچے میں تبدیلی کے ان اقدامات کے ساتھ ساتھ ملک کے نوجوانوں کو اعلی تعلیم وتربیت کے لیے مغربی ممالک کے بجائے سوویت یونین اور دیگر اشتراکی ممالک میں بھیجا جانے لگا (کتاب مذکور،ص۴۰ —۴۲)۔ افغانستان میں اشتراکی حکومت کی تعلیمی پالیسیوں بالخصوص سوویت تسلط (۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء) کے بعد افغان عوام کی اکثریت کے سوویت افواج کے خلاف تحریک مزاحمت وجہاد میں شامل ہوجانے، یا پھر ہمسایہ ممالک کی طرف ہجرت کرجانے

سے ملک کے نظام تعلیم کا تارپود بکھر کر رہ گیا۔ سوویت افواج کی بمباری کے نتیجے میں ملک میں ۲۰۰۰ سے زائد سرکاری اسکول اور روایتی دینی مدارس تباہ و برباد ہوگئے۔ اگرچہ افغانستان سے ہجرت کرنے والے علماء و اساتذہ نے پاکستان اور ایران میں قائم خیمہ بستیوں میں خلیجی ریاستوں کی حکومتوں اور غیر سرکاری مخیّر اداروں کی امداد سے دینی مدارس قائم کیے، اسی طرح مغربی ممالک کی امدادی ایجنسیوں اور غیر سرکاری تنظیموں نے مہاجر خیمہ بستیوں میں جدید تعلیمی مدارس اور فنی تربیت کے ادارے بھی قائم کیے، تاہم یہ سب افغان پناہ گزینوں کی ضروریات کے لیے انتہائی طور پر ناکافی تھے۔ افغانستان کا شمار دنیا کے ایسے ممالک میں ہونے لگا ہے جہاں خواندگی کی شرح انتہائی کم ہے (The Mujaheddin and the Preservation of Afghan Culture، ص۴۴ — ۴۶؛ The Soviet Afghanistan: War، ص ۱۳۵ — ۱۵۰؛ The Europa World Year Book 2000، ص۳۵۶).

آبادی: افغانستان کی کل آبادی (بمطابق مردم شماری اپریل ۱۹۷۸ء) ۱۵ء۵ ملین جب کہ بعض دوسرے ذرائع کے مطابق سترہ اٹھارہ ملین کے لگ بھگ تھی (دیکھیے: Afghanistan: Mullah, Marx and Mujahid، ص ۹)۔ گزشتہ پچیس سالوں کے دوران میں افغانستان میں رونما ہونے والے واقعات کے سبب ملک کی کل آبادی کے بارے میں صحیح اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ایک اندازے کے مطابق افغانستان پر امریکہ کی لشکر کشی سے قبل ملک کی کل آبادی ۲۱ ملین نفوس پر مشتمل تھی۔ اس میں سے تقریباً ۳ ملین سے زائد آبادی افغانستان سے باہر پڑوسی ممالک پاکستان (تقریباً ۲ ملین) اور ایران (تقریباً ۱ء۴ ملین، یعنی ۱۴ لاکھ) میں پناہ گزینوں کے طور پر موجود تھی (یحیٰی معروفی، Refugee Situation in Afghanistan، در Afghanistan Crisis: Issues and Perspectives، مدیر: K. Warikoo، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۸۳ — ۸۹).

وسائل معیشت: زراعت، باغبانی اور گلہ بانی کو ملکی معیشت میں کلیدی وسائل کی حیثیت حاصل ہے۔ گندم، چاول، جَو، مکئی، باجرہ، آلو، چنے، ماش، مونگ اور کپاس اس ملک کی اہم فصلیں ہیں۔ سوویت جارحیت سے قبل ملک میں پھل اور میوہ جات، جن میں انگور، انار، سیب آڑو، ناشپاتی، آلو بخارا، خوبانی، بادام اور سنگترہ شامل ہیں، بکثرت پیدا ہوتے تھے۔ افغانستان کے خانہ بدوش قبائل وسیع پیمانے پر بھیڑ بکریاں پالتے تھے۔ جنگ میں نظام آبپاشی کے برباد ہوجانے اور سوویت افواج کی طرف سے اکثر علاقوں میں وسیع پیمانے پر بارودی سرنگیں بچھائے جانے کے بعد سے ملکی زراعت وباغبانی شدید طور سے متأثر ہوئے ہیں۔ بارودی سرنگیں افغان پناہ گزینوں کی واپسی و آباد کاری کی راہ میں بھی ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ سوویت افواج کی پسپائی کے بعد صرف وادی پنج شیر کے چند دیہاتوں سے ۲۵ ہزار بارودی سرنگیں صاف کی گئیں۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۹۸ء تک ملک میں ساٹھ لاکھ سے زائد بارودی سرنگیں موجود تھیں (Afghan Communism and the Soviet Intervention، ص ۳۴۷ — ۳۴۹)۔

ملک میں معدنیات جن میں تیل، کوئلہ، جپسم، تانبہ یورینیم، قیمتی پتھر، ہیرے جواہرات اور قدرتی گیس شامل ہے، کے وسیع ذخائر پائے جاتے ہیں۔ صنعتی اعتبار سے اس ملک کا شمار دنیا کے انتہائی پس ماندہ ممالک میں ہوتا ہے۔ ملک میں کوئی بڑی صنعت موجود نہیں ہے، تاہم بعض چھوٹی چھوٹی صنعتیں (گوکہ ملکی آبادی کی ضروریات کے مقابلے میں انتہائی کم ہیں) موجود ہیں۔ اشتراکی انقلاب سے قبل گھریلو صنعتیں غیر ملکی زرمبادلہ کمانے کا ایک اہم ذریعہ تھیں، لیکن بدامنی کے سبب ان کا حجم بہت

زیادہ حد تک سکڑ گیا ہے۔ طالبان حکومت کے خلاف امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی جنگ کے نتیجے میں تو افغانستان کے معاشی وسائل بری طرح سے پامال و برباد ہوے ہیں.

کرنسی و شرح مبادلہ: افغانستان کی کرنسی کا نام افغانی ہے، جس کی شرح مبادلہ ۳۰۰۰ افغانی= ایک امریکی ڈالر (مئی ۱۹۹۶ء) ہے۔ افغانستان میں طویل عرصے سے پاکستانی کرنسی (روپیہ) زیر استعمال رہی ہے۔ اکتوبر ۲۰۰۱ء کے بعد سے جنگی حالات کی بناء پر اس کے استعمال میں مزید اضافہ ہوا ہے.

تعمیر نو-تحدّیات و مسائل: افغانستان کو دنیا کی دو بڑی طاقتوں سوویت یونین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے یکے بعد دیگرے تاخت و تاراج کیا ہے۔ دونوں نے اس ملک میں جدید ترین اور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے بے محابا استعمال سے افغان قوم کی نسل کشی جب کہ قدرتی وسائل و ماحولیات کی بربادی وپامالی کا ارتکاب کیا ہے۔ چنانچہ یہ ملک بحیثیت مجموعی کھنڈرات میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے اور آج ایک اجڑے ہوئے دیار کا منظر پیش کر رہا ہے ۔ امریکہ کی طرف سے طالبان اور القائدہ کے خلاف جنگ کے نام پر ہیبت ناک جنگی کارروائیوں کی بدولت اس ملک کی بربادی و پامالی کا سلسلہ کہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔مزیدبراں یہ ملک گزشتہ ربع صدی سے لامرکزیت کا شکار رہا ہے۔ خودسر جنگجو سرداروں نے ریاست کے اندر بے شمار ریاستیں قائم کر رکھی ہیں ۔ سیاسی و انتظامی ادارے اور اقتصادی و تعلیمی ڈھانچہ مکمل طور پر شکست و ریخت کا شکار ہو چکے ہیں۔ دریں حالات افغانستان کی موجودہ اور مستقبل کی حکومتوں کو ملک کی تعمیر نو یعنی آئین و قانون کی حکمرانی کا قیام، ریاستی اقتدار و اختیار کی بحالی ، سیاسی و انتظامی اداروں کی تشکیل نو، اجڑی ہوئی تباہ حال قوم کی از سرنو آبادکاری و معاشی بحالی، تعلیم، صحت، رہائش اور دیگر بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی، بارودی سرنگوں کی صفائی، توانائی کے وسائل اور نظام آبپاشی کی درستی و اصلاح، زرعی زمینوں کی آبادکاری اور شاہراہوں کی تعمیر کا ایک انتہائی کٹھن اور دشوار چیلنج درپیش ہے۔ افغانستان کی تعمیر نو کا کام گویا مکمل طور پر ایک اجڑے ہوئے اور تباہ شدہ ملک کو ازسرنو آباد کرنا ہے۔ تعمیر نو کی غرض سے خطیر وسائل و سرمایہ، مہارت یافتہ افرادی قوت اور سب سے بڑھ کر عالمی برادری کا بھرپور تعاون و اشتراک درکار ہوگا۔ تاہم تعمیر نو کے عمل کا انحصار جارحانہ امریکی مہم جوئی اور اس کے نتیجے میں عامۃ النّاس میں جنم لینے والے خوف و ہراس، احساس عدم تحفظ اور بے یقینی کے خاتمے پر ہوگا (افغانستان میں مادی وسائل کی تباہی و بربادی اور ملک کی تعمیر نو کی راہ میں درپیش مسائل و مشکلات کے جائزہ کے لیے دیکھیے : Larry Goodson: *Afghanistan's Long Road to Reconstruction*، در *Journal of Democracy*، ۱:۱۴ (جنوری ۲۰۰۳ء)، ص ۸۲-۹۸؛ حبیب گل: *Degradation of Afghanistan's Environment During Wars (1978-2002)*، در *Central Asia* عدد ۵۳ (سرما ۲۰۰۳ء)، ص ۸۳-۹۸؛ سلطان براکات (مدیر): *Reconstructing War-Torn Societies :Afghanistan*، نیو یارک ، ۲۰۰۴ء).

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں: مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے:(۱) عبدالصمد غوث: *The Fall of Afghanistan :An Insider's Account*، واشنگٹن، (ڈی۔ سی)، ۱۹۸۸ء؛ (۲) آغا شاہی: *Pakistan's Security and Foreign Policy*، لاہور، ۱۹۸۸ء؛ (۳) Alexander Alexiev: *Inside the Soviet Army in Afghanistan*،

سانتا مونیکا، کالف، ۱۹۸۸ء؛ (۴) Alexandre
The Soviet States and Muslim :Bennigsen
Guerrill war 1920-1981: Lessons for
Afghanistan، سانتا مونیکا، ۱۹۸۱ء؛ (۵) وہی مصنف: The
Islamic Threat to the Soviet States، نیویارک،
۱۹۸۳ء؛ (٦) Myron Weiner ، علی بنو عزیز (مدیران):
The State, Religion and Ethnic Politics
Afghanistan, Iran and Pakistanسائرکیوس
(Syracuse) ۱۹۸٦ء؛ (۷) Allen F. Agnew:
International Minerals : A National Perspective
بولڈر ، کولو، ۱۹۸۳ء؛ (۸) The : Amin Saikal
Afghanistan Conflict : Gorbachev,s Options،
کانبرا (آسٹریلیا)، ۱۹۸۷ء؛ (۹) Anderzej Korbonski و
The Soviet Union and The : Francis Fukuyama
Third World :The Last Three Decades، لنڈن،
اتھاکا، ۱۹۸۷ء؛ (۱۰) Bo Huldt و Erland Jansson
The Tragedy of Afghanistan : The Social, :
Cultural and Political Impact of Soviet Invasion،
لنڈن، ۱۹۸۸ء؛ (۱۱) Edward Gerardet :
Afghanistan : The Soviet War، لنڈن ، نیویارک
۱۹۸۵ء؛ (۱۲) Afghanistan : Henry S.Bradsher
and the Soviet Union، ڈرہم، ۱۹۸۵ء؛ (۱۳) Jeri
A Nation is :(مدیران) Barnett R. Rubin و Laber
Dying : Afghanistan Under the Soviet
Union-1979-1987، ایوِ نسٹن، ۱۹۸۸ء؛ (۱۴) Joseph
The Soviet Invasion of Afghanistan : : J. Collins
A Study in the Use of force in Soviet Foreign
Policy، لیکسنگٹن، ۱۹۸٦ء؛ (۱۵) J. B. Amstutz :
Afghanistan : The First Five Years of Soviet
Occupation، واشنگٹن ، ۱۹۸٦ء؛ (۱٦) M.Nazi

Robert L.Canfield و Shahrani
(مدیران): Revolutions and Rebellions in
Afghanistan : Anthropolgical Perspectives،
برکلے، ۱۹۸٦ء؛ (۱۷) Mikhael S.Gorbachev:
Prestroika: New Thinking for Our Country and
the World، لنڈن، ۱۹۸۷ء؛ (۱۸) Michael
Military Objectives in Soviet Foreign :McGwire
Policy، واشنگٹن، ۱۹۸۷ء؛ (۱۹) The :Maxwell Fry
Afghan Economy, Money, Finance and the
Critical Constraints to the Economic
Development، لائیڈن، ۱۹۴۰ء؛ (۲۰) مہر النساء
علی: Pak-Afghan Discord : A Historical
Perspective،کراچی، ۱۹۹۰ء؛ (۲۱) Michael
Moscow`s Muslim Challenge :Soviet :Rywkin
Central Asia، نیویارک، ۱۹۸۲ء؛ (۲۲) محمد خالد
معروف: Afghanistan and the Super Powers، نئی
دہلی، ۱۹۹۰ء؛ (۲۳) Peregrine Hodson :Under a
Sickle Moon : A Journey Through Afghanistan،
لنڈن، ۱۹۸٦ء؛ (۲۴) Ralph H.Magnus: Afghan
Alternatives : Issues, Options and Policies،
آکسفورڈ، ۱۹۸۳ء؛ (۲۵) سعید الدین احمد ڈار: Selected
Documents on Pakistan's Relations with
Afghanistan 1947-85، اسلام آباد، ۱۹۸٦ء؛ (۲٦) Sleig
In Afghanistan's Shadow : Baluch :S.Harrison
Nationalism and Soviet Temptations، واشنگٹن،
۱۹۸۱ء؛ (۲۷) Sandy Gall: Afghanistan : Agony of
a Nation، لنڈن، ۱۹۸٦ء؛ (۲۸) Thomas
Islam Politics and Religion In the :W.Lippman
Muslim World، نیویارک، ۱۹۸۲ء؛ (۲۹) Thomas
Red Flag Over Afghanistan :The :Hammond T.

Communist Coup, the Soviet Invasion and the Consequences، بولڈر، کولو، ۱۹۸۴ء.

(محمد ارشد)

••-------------••

※ افنی: جنوبی مراکش کے ساحل پر ایک محصور قطعہ زمین جس کا سابقہ نام Santa Cruz de mar Peque na تھا۔ اس کا رقبہ چھ سو مربع میل ہے اور یہ ۲۸ درجے ۵۴ ثانیے، تین دقیقے اور ۲۹ درجے ۳۸ ثانیے ۱۰ دقیقے شمال میں واقع ہے۔ اس علاقے پر اندلس کو سیاسی اقتدار حاصل تھا اور معاہدہ تطوان ۱۸۶۰ء کی رو سے وہاں ایک اندلسی تجارتی کمپنی ۱۴۷۶ـ۱۵۲۴ء تک قائم رہی۔ اگرچہ افنی پر اندلس کے سیاسی حقوق کو فرانس نے ۱۹۱۲ء میں تسلیم کر لیا تھا تاہم اندلس کا اس علاقے پر حقیقی قبضہ ۱۹۳۴ء تک نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا دارالخلافہ سیدی افنی جو پہلے مرکزی انتظامیہ برائے Africa Occideutal Espanola، کا دارالحکومت تھا۔ نومبر ۱۹۵۷ء میں مراکش کے بے قاعدہ فوجیوں کے حملے اور پسپائی کے بعد جنوری ۱۹۵۸ء میں اندلسی صحارئی سے ایک علیحدہ صوبہ بن گیا، جس کے بعد ہر ایک کے لیے علیحدہ گورنر مقرر ہونے لگا۔ افنی جنوب میں ایک نیم صحرائی علاقہ ہے اور اس کے غیر ترقی یافتہ ذرائع اس کی چالیس ہزار نفوس پر مشتمل آبادی کی گزراں کے لیے ناکافی تھے۔ اس کی برآمدات بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ چنانچہ یہ اندلس پر معاشی لحاظ سے ایک بوجھ تھا اور معاشی اعتبار سے اس کا کلی طور پر انحصار مراکش پر تھا۔ جہاں اس کے نصف سے زائد مرد مزدوری کیا کرتے تھے۔ افنی میں ہسپانوی تہذیب وثقافت کا اثرونفوذ نہ ہونے کے برابر تھا۔ مراکش ۱۹۵۸ء سے افنی پر حق ملکیت کا دعویدار چلا آرہا تھا۔ مقامی آبادی جو سات بربری قبائل "ایت با امران" پر مشتمل تھی، کے رہنما بھی اس (مراکش) کے ہم نوا بن گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۶۵ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اندلس سے مطالبہ کیا کہ وہ افنی پر اپنا قبضہ ختم کر دے۔ اس کے بعد بھی اس پر دباؤ جاری رہا، تاآنکہ جنوری ۱۹۶۹ء میں مراکش اور اندلس کی حکومتوں کے درمیان طے پانے والے معاہدہ کی رو سے اس علاقے کا اقتدار اول الذکر (مراکش) کو منتقل کر دیا گیا۔

مآخذ: (۱) Santa Cruz de :T.Garcia Figueras Mar Pequena-Ifni-Sahara، میڈرڈ ۱۹۴۱ء؛ (۲) Estudios Saharinos :J.Caro Baroja، میڈرڈ ۱۹۵۵ء؛ (۳) Survey of North -West Africa :N.Barbour، لنڈن ۱۹۵۹ء؛ (۴) Les Territoires :R.Pelissier Espagnoles d'Afrique، پیرس ۱۹۶۳ء.

(D.H.Jones ت شیخ نذیر حسین)

••-------------••

※ افوغہ: افوغہ، توارگ قبائل کے ایک وفاق کا نام، یہ ملک جمہوریہ مالی کے انتہائی شمال مشرق میں صحرائے اعظم میں ۱۷ درجہ عرض البلد جنوبی اور ۲۱ درجہ شمالی کے درمیان واقع ہے۔ اس کی کل آبادی ۱۷۰۰۰ افراد ہے۔ یہ لوگ ادرار [رک بآں] کے نسبتہً کم بلند پہاڑوں اور خصوصاً ان کی وادیوں اور نشیبی مقامات میں مقیم ہیں.

ادرار ایک ٹھوس، بلوری اور گھٹے ہوئے سنگ ساق کاایک پہاڑی سلسلہ ہے جس کی بلندی ایک ہزار میٹر سے کم ہے، اس کے ڈھلان کا رخ مغرب کی جانب ہے۔ مغرب اور جنوب کی طرف اس کی سرحد پر سنگ صابون (سوپ سٹون) کی سطوح مرتفع واقع ہیں۔ تقریباً ہر موسم گرما میں خوب بارشیں ہوتی ہیں(کیدال میں ۱۳۶ملی میٹر تک) جس کی وجہ سے نشیبی علاقے جل تھل ہو جاتے ہیں۔ وادیاں مغرب میں تلمسی تک بھر جاتی ہیں ۔ درختوں گھنی جھاڑیوں

اور گھاس کی وجہ سے ہر طرف سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کیکر اور تمرس کے درختوں اور منطقۂ حارہ کے مخصوص پودوں کی بہتات ہے.

ملک میں پہلے سونگھائی نیگرو رہا کرتے تھے، جنہوں نے بعض دیہاتوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا، پھر توارگ ،بربر اور عرب کی مخلوط نسل موروں کے درمیاں تنازعہ چھڑ گیا۔ متعدد خون ریز لڑائیاں ہوئیں ،بالآخر میدان اول الذکر کے ہاتھ رہا اور وہ ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ یہ علاقہ نائیجیر (گاد) آگیذ اور اہاگر جانے والی تجارتی قافلوں کے لیے چوراہا بن گیا اور شمالی نخلستان ، خاص طور پر "توات" (Touat) میں ان کا زبردست مجمع لگا رہتا تھا.

افونغہ ، دیگر توارگ لوگوں کی طرح کھلتی ہوئی رنگت رکھتے اور بربری لہجے میں تماہک (Tamahakk) زبان بولتے ہیں اور خانہ بدوشوں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں اور شمال کے توارگوں (اہاگر اور ازجر) کی بہ نسبت بہتر مالی حیثیت والے ہیں، ان کا سلسلۂ نسب عورتوں کے حوالے سے نہیں چلتا۔ اور سماجی ڈھانچہ بھی ان سے کچھ مختلف ہے۔ مزاجاً جنگجو ہیں۔ وہ غلامی کی زندگی بسر نہیں کرتے ۔چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں بکری کے چمڑے کے خیموں سمیت سفر کرتے ہیں ، ان کی بھیڑ بکریوں کے ریوڑ دن میں تھوڑاتھوڑا فاصلہ طے کرتے ہیں۔ جبکہ وہ خود کافی آگے آگے رہتے ہیں، ان کی دیکھ بھال کے لیے الگ نگران مقرر ہوتے ہیں۔ توات اور تدیلکلت (Tidikelt) کے نخلستان سے کھجوریں لانے کے لیے اونٹوں ہی کو نقل و حمل کا ذریعہ بناتے ہیں، حالانکہ لاریاں، اس سے سستا اور تیز رفتار وسیلہ بن سکتی ہیں،جبکہ ساحلی علاقوں سے بڑی مقدار میں جوار،باجرہ اور چاول لاتے ہیں ان کے مقررہ مقامات شمال مغرب میں تسالت میں کھجوروں کا جھنڈ اور جنوب میں کیدال کا انتظامی مرکز ہے، کیدال ان کی واحد مارکیٹ بھی ہے جس میں مزابی (*Mzabis*) اور شمال سے آنے ہوئے عرب سال لگاتے ہیں.

مآخذ: R.Capot-Rey: *Le sahara Francais*، پیرس ۱۹۵۳ء؛ (۲) H.Bissuel: *Les Touareg de l'Ouest*، الجزائر ۱۸۸۸ء؛ (۳) M.Cortier: *D'une rive a l'autre du Sahara*، پیرس ۱۹۰۸ء؛ H.kaufman: *Wirtschaft und Sozialkaltur der Iforas Tuareg*، کولون ۱۹۶۴ء؛ نیز دیکھیے "توارگ" The Monod، L'Adrar Ahmet، پیرس، ۱۹۳۲ء.

(J.Despois) [ت محمد یحیٰی خان]

••-------------••

اقالہ: (ع) ایک معروف فقہی اصطلاح، لغوی معنی ساقط کرنا، کسی سابق حکم کو ختم کر دینا (التھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون ، ۵:۱۲۱۱)۔ اس کا مادہ ق-و-ل (قیل یا قول) ہے اور اس میں ہمزہ سلب مصدر کے لیے ہے یعنی اپنے سابق قول کو ختم یا باطل کر دینا (بحر العلوم: حاشیہ ہدایہ ، ۲:۶۹)۔ اس کا اس معنی میں اطلاق صرف باب افعال سے ہوتا ہے۔ شریعت اسلامیہ میں اقالہ ایک معروف اصطلاح ہے، جس کا مقصد بیع [رک بآں] کی تکمیل کے بعد باتفاق رائے اسے کالعدم قرار دینا ہے (التھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون ، ۵:۱۲۱۱)۔ اسے "اقالہ" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے مشتری اور بائع کے درمیان متعلقہ شے کی خرید وفروخت کا جو معاملہ طے پایا ہے وہ عموما الفاظ سے ہی طے پاتا ہے اور اقالہ بیع کے ان الفاظ کو ختم یا کالعدم قرار دینے کا نام ہے، یعنی "ازالۃ القول السابق"۔ اسلامی قانون میں احکام بیع کی اساس دونوں فریقوں (خریدار اور بائع) کے مشترکہ فائدے اور بھلائی پر رکھی گئی ہے۔ اسی لیے اسلامی قانون میں دونوں فریقوں کو نقصان اور خسارے سے بچانے کے لیے خیارات (مثلا خیار بیع، خیار رویت، خیار

وصف اور خیار مجلس وغیرہ) کے احکام دیے گئے ہیں، تاکہ دونوں فریقوں سے بیع کے نقصان کو دور کیا جا سکے۔

پھر جب بیع مکمل ہو جائے اور دونوں فریق اپنی اپنی اشیا (ایک فریق رقم پر اور دوسرا خرید کی ہوئی شے) پر قبضہ کرلیں اور اس طرح بیع مکمل ہو جائے، تو آیا اس کے بعد بھی کسی ایک فریق کو اپنے سابقہ عقد پر نظرثانی کی اجازت ہے؟ اسی صورت کو قانون اسلامی میں ''اقالہ'' کہا جاتا ہے۔

اقالہ کے سلسلے میں فقہا کے مابین اختلاف ہے کہ آیا یہ سابق بیع کا فسخ ہے یا یہ ''بیع جدید'' ہے۔ اس بات پر تو تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ اقالہ دونوں فریقوں (بائع اور مشتری) کے باہمی اتفاق سے جائز ہے، چنانچہ فقہ حنفی کی بنیادی کتاب ہدایہ میں ہے: الاقالة جائزة فی البیع بمثل الثمن الاول (ہدایہ، المجتبائی، دہلی ۲:۲۹)، یعنی اقالہ (بیع کا فسخ کرنا)، سابقہ قیمت پر جائز ہے؛ اس کے جواز میں ابوداؤد (کتاب البیوع، باب ۵۲، حدیث ۳۴۶، ص۱۴۸۱) اور ابن ماجہ (کتاب التجارات، باب ۲۶، حدیث ۱۹۱، ص۲۶۰۸) کی حدیث کا حوالہ دیا جاتا ہے، جس میں مذکور ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من اقال مسلما بیعته اقال الله عثرته یوم القیامة (جس نے نادم ہونے والے شخص سے اس کی بیع کا اقالہ (فسخ) قبول کیا، اللہ تعالیٰ اس کی لغزشوں کو قیامت کے روز معاف فرمائے گا)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقالہ نہ صرف جائز ہے، بلکہ اس کی فضیلت بھی ہے۔

اس کے حق میں جس دوسری دلیل سے استدلال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ''عقد'' (معاملہ بیع) کرنا دونوں فریقوں کا حق ہے، لہٰذا ضرورت کی بنا پر، وہ اس حق کو لوٹانے اور واپس کرنے کے بھی حق دار ہوں گے (ہدایہ، ۲:۶۹)۔

مؤخر الذکر دلیل سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اقالہ (بیع کا فسخ) عاقدین کا کوئی قانونی حق نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب کسی شے کی تمام شرائط کے ساتھ بیع مکمل ہو جائے اور ہر ایک فریق دوسرے فریق کی شے پر قبضہ کرلے تو اب ان کے مابین ہونے والا یہ عقد مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کسی شخص کو بھی اپنے اس ''عقد'' پر نظرثانی کرنے کا کوئی قانونی حق نہیں رہتا۔ البتہ اگر دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک فریق اس پر نظرثانی اور رجوع کی درخواست کرے تو دوسرے فریق کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اس کی بات کو قبول کرے اور چاہے تو رد کر دے۔ البتہ اگر دوسرا فریق اس کی بات کو قبول کر لے اور دونوں باہمی رضا مندی سے اس بیع کو ختم کر دیں تو چونکہ دوسرے فریق نے پہلے فریق کی بات کو قبول کیا ہے اور ایک انسان کی حیثیت سے دوسرے شخص کی بات بھلائی کے ساتھ سنی اور مانی ہے، لہٰذا وہ اس پر یقینی طور پر اجر کا حق دار ہوگا۔ اس لیے فقہاے کرام نے ''بیع'' کے اقالے والی حدیث کو (دیکھیے بالا) بطور دلیل اور ثبوت پیش کیا ہے، اس لیے کہ اس سے اہم بات پر ''اقالہ'' کرنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے، بلکہ اس پر اجروثواب کے مستحق ہونے کی بشارت بھی دی گئی ہے۔

(ب) اقالہ کے بارے میں اس بنیادی اتفاق کے باوجود، اس کی نوعیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض فقہا نے اسے ایک نیا معاملہ قرار دیا ہے اور بعض فقہا نے اسے محض سابق عقد (معاملہ بیع) کا فسخ مانا ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ''اقالہ'' دونوں فریقوں کے لیے محض سابق معاملے کا فسخ ہے، مگر دوسرے کے حق میں وہ نئی ''بیع'' ہے، ماسوا اس صورت کے جب اسے فسخ

بنانا ممکن نہ ہو تو اقالہ باطل تصور ہوگا (ہدایہ، ۲:۶۹)۔ مؤخر الذکر کی فقہا نے مثال یہ دی ہے کہ مثلاً کسی نے جانور کا سودا کیا مگر جب مشتری نے اس پر قبضہ کیا تو اس کے بعد اس سے کوئی بچہ پیدا ہوگیا تو یہ بچہ مذکورہ "بیع" کی واپسی میں شامل نہ ہوگا اور اقالہ کی صورت میں خریدار، بائع کو محض خریدا ہوا جانور ہی واپس کرے گا (بحر العلوم: حاشیہ ہدایہ، ۲:۶۹، ح۷)۔ امام ابوحنیفہؒ نے اسے جو دوسرے شخص کے لیے نئی بیع قرار دیا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک مال غیر منقولہ (جائیداد) کی صورت میں شفعہ کا حق رکھنے والے کو، شفعہ کا حق حاصل ہو جائے گا، جبکہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک یہ محض ایک "نئی بیع" ہے، ماسوائے اس صورت کے جب اسے نئی بیع بنانا ممکن نہ ہو؛ مثال کے طور پر، ایک فریق نے اپنی متعلق شے پر قبضہ نہ کیا ہو، جس کی بنا پر ابھی اس سابقہ بیع کی تکمیل ہی نہ ہوئی ہو، یا جن دو اشیا کے باہمی تبادلے کی بیع ہوئی ہو، ان میں سے کوئی ایک شے تلف ہو جائے تو ایسی صورت میں اسے فسخ تصور کیا جائے گا، لیکن اگر اسے فسخ قرار دینا ممکن نہ ہو، مثلاً ایک شخص نے دوسرے شخص سے نقد قیمت کے بدلے جو سامان خریدا تھا وہ تلف ہوگیا، تو ایسی صورت میں اس کا فسخ ہونا بھی باطل ہوجائے گا، امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اقالہ بنیادی طور پر سابق معاملے کا فسخ ہے، البتہ اگر اسے فسخ قرار دینا ممکن نہ ہو (مثلاً مبیع میں متصل طور پر اضافہ ہو جائے، یا دونوں فریقوں نے سابق قیمت سے یا جدید قیمت کے عوض اقالہ کیا) تو اسے بیع تصور کیا جائے گا، لیکن اگر اسے بیع بنانا بھی ممکن نہ ہو تو اس کا اقالہ ہونا باطل ہوجائے گا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ لفظ اقالہ بیع کے فسخ ہونے پر دلالت کرتا ہے، اس لیے کہ کہا جاتا ہے اقلنی عثرتی (میری کوتاہی معاف کر دو)، لہذا اس کے لغوی تقاضے پر ہی عمل کیا جائے گا، لیکن اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو اسے اس کی احتمالی صورت پر محمول کیا جائے گا۔

جبکہ امام ابویوسفؒ کا موقف یہ ہے کہ یہ باہمی رضا مندی سے مال کا مال سے تبادلہ ہے، اور یہی بیع کی تعریف ہے، اسی لیے اس پر بیع کے احکام جاری ہوتے ہیں، مثال کے طور پر، اگر مبیع (سامان) تلف ہوجائے تو اس سے اقالہ باطل ہوجاتا ہے اور عیب کی بنا پر اسے واپس کیا جا سکتا ہے، نیز اس سے شفعہ بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

مگر امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ لفظ اقالہ "فسخ اور رفع" کا مفہوم رکھتا ہے اور اصول یہ ہے کہ الفاظ کو ان کے حقیقی معنی ہی میں استعمال کیا جائے اور یہ "نئے عقد" کا احتمال نہیں رکھتا کہ اسے اس پر محمول کیا جائے، اس لیے کہ وہ تو اس کی ضد (فسخ) ہے، اور کوئی لفظ اپنی ضد کا احتمال نہیں رکھتا، لہذا اس کا باطل ہونا متعین ہوگیا (ہدایہ، ۲:۶۹-۷۰)۔

اقالے کے بارے میں بنیادی اختلاف کے باوجود، تمام حنفی فقہا کے نزدیک بالاتفاق اقالہ کے وقت قیمت میں کمی کرنا جائز ہے۔ اس لیے کہ "مبیع" کے، مشتری کی ملکیت اور قبضے میں جانے کے باعث اس میں جو عیب پیدا ہوگیا یہ کمی اس کے بالمقابل تصور ہوگی۔

پھر اگر قیمت تلف ہوجائے، تو اس سے اقالے کی درستگی متاثر نہ ہوگی، کیونکہ قیمت یعنی رقم میں تبادلہ جائز ہے، البتہ اگر مبیع (سامان) تلف ہوجائے، تو اس سے اقالہ ممکن نہیں رہتا (ہدایہ، ۲:۷۰)۔

حنبلی فقہا کے نزدیک اگر اقالہ قبضے سے قبل ہو، تو فسخ ہے اور جائز ہے، جو ظاہر ہے سابقہ شرائط اور سابقہ قیمت ہی کے ساتھ ہوتا ہے (معجم الفقہ الحنبلی، ۱:۱۲۶) ہے اور اگر قبضے کے بعد ہو تو اکثر فقہا کے

نزدیک وہ "بیع جدید" ہے۔ تاہم مذکورہ بالا احادیث میں لفظ اقالہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ اقالہ سابقہ قیمت اور سابقہ شرائط ہی کے ساتھ ہونا چاہیے۔

مآخذ: (۱) الکتب الستہ (صحیح البخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، جامع الترمذی، سنن النسائی، سنن ابن ماجہ)، طبع صالح بن عبدالعزیز، دارالسلام، لاہور ۱۹۹۹ء، ص:۱۸۱او۲۶۰۸ وبامداد فہرست؛ (۲) محمد فؤاد عبدالباقی: مفتاح کنوز السنۃ، بذیل مادہ؛ (۳) A.J.Wensinck: معجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی، بذیل مادۂ؛ کتب فقہ خصوصاً؛ (۴) المرغینانی، ہدایہ مجتبائی دہلی، ۲:۶۹۔۷۰؛ (۵) التھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون، بیروت، ۵:۱۲۱۱؛ (۶) معجم الفقہ الحنبلی، کویت، ۱۳۹۳/۱۹۷۳ء، بذیل مادہ؛ (۷) ابوبکر الکاسانی: بدائع الصنائع، فہرست؛ (۸) معجم الفقہ الظاہری، مطبوعہ کویت، بذیل مادہ.

(محمود الحسن عارف)

••..............••

⊗ اکیدر بن عبدالملک الکندی السکونی: اکیدر بن عبدالملک بن عبدالجن بن اعیا (یا اعبر دیکھیے الاصابہ، ۱:۵۴۶، القاہرہ ۱۳۵۸ھ) بن کندہ؛ عہد نبوی میں دومۃ الجندل کا ایک عربی النسل عیسائی حکمران جو اپنے جد امجد کندہ اور السکون کی وجہ سے الکندی اور السکونی کہلاتا ہے۔ یہ قبیلہ قحطانیوں کی ایک اہم شاخ سمجھا جاتا تھا، جس کے بعض لوگ حضرموت (یمن) میں بھی مقیم تھے (عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب، ۲:۵۲۸، بیروت ۱۹۸۵ء)۔ اس کے بھائی بشیر بن عبدالملک نے حیرہ میں تعلیم حاصل کی پھر مکہ میں سکونت اختیار کی جہاں اس کی شادی ابوسفیان کی بہن الضہباء سے ہوئی۔ حضرت معاویہؓ بن خدیج ابونعیم صحابی رسول بھی اسی خاندان کے ایک فرد تھے (ابن حزم الاندلسی: جمہرۃ انساب العرب، ص ۴۲۹، القاہرہ)۔

۹ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ رومیوں نے مسلمانوں کے خلاف شام میں فوج جمع کی ہے اور اس کا مقدمۃ الجیش بلقاء تک پہنچ چکا ہے۔ اس پر آپؐ نے تیس ہزار فوج جمع کی اور مقابلے کو نکلے [رک بہ تبوک]، لیکن جنگ کی نوبت نہ آئی اور آپؐ نے بیس دن تک تبوک میں قیام فرمایا۔ اس دوران میں گرد ونواح کے عربی النسل عیسائی رؤسا کو، جو قیصر روم کے ماتحت تھے اور اسلامی حکومت کے خلاف ریشہ دوانیاں کیا کرتے تھے، آپؐ نے مطیع کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ املیہ اور اذرح کے عیسائیوں نے بغیر قتال کے اطاعت قبول کر لی (شاہ معین الدین ندوی: سیر الصحابہ، ۱:۱۵۲، ۱۵۳ ادارۂ اسلامیات، لاہور)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ بن ولید کو چار سو بیس سواروں کے ساتھ دومۃ الجندل کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ اکیدر کو تم جنگلی بیل کا شکار کرتے ہوئے پاؤ گے۔ چنانچہ جب حضرت خالدؓ وہاں پہنچے تو اکیدر اور اس کے مصاحب کو چاندنی رات میں شکار کرتے پایا۔ انہوں نے ان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔ اکیدر کے بھائی حسان نے مقابلہ کیا اور مارا گیا اور اس کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اکیدر نے حضرت خالدؓ سے اس شرط پر صلح کر لی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات تک اس کی جان محفوظ رہے گی، نیز اس نے دو ہزار اونٹ، آٹھ سو گھوڑے، چار سو زرہ بکتر اور چار سو نیزے دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ حضرت خالدؓ نے بغیر لڑائی کے اس کے قلعے پر قبضہ کر لیا اور اسے حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا (ابن سعد: الطبقات، ۲:۶۷ بیروت)۔ ابن حجر العسقلانی نے ابن اسحاقؒ کے حوالے سے بجیر بن بجرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ جب اکیدر آپؐ کی خدمت میں حاضر

ہوا تو اس نے آپ کی مدح میں چند اشعار پڑھے، جس پر حضورؐ نے فرمایا: "لا یفضّض الله فاك" (یعنی اللہ تمہارا چہرہ سلامت رکھے) جس کی برکت سے اکیدر کی عمر نوے (۹۰) برس ہوگئی، لیکن اس کا کوئی دانت ہلا تک نہیں تھا (الاصابہ، ۱:۱۴۲)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو امان نامہ لکھ کر دیا اور جزیہ لینا منظور کر کے اسے (اور اس کے بھائی مصاد کو اس کے) وطن جانے دیا۔ الواقدی نے اس امان نامے کا متن دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس وقت تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نہیں بنی تھی اس لیے آپؐ نے اس پر اپنے انگوٹھے کا نشان ثبت فرمایا (المغازی: ۳:۱۰۲۵ بعد، طبع Marsdon Jhones، اوکسفرڈ، ۱۹۶۶ء)۔

یہ امر مختلف فیہ ہے کہ اکیدر نے اسلام قبول کیا تھا یا نہیں؟ ابوزکریا النووی کے مطابق ابن مندہ اور ابونعیم اصبہانی (اور واقدی بھی) اس کے اسلام لانے کا ذکر کرتے ہیں، جبکہ ابن اثیر کی رائے میں وہ مسلمان نہیں ہوا تھا اور یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس نے جزیہ دینے سے انکار کر دیا تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا جنہوں نے دومۃ الجندل کو فتح کر لیا اور اکیدر کو قتل کر دیا (تہذیب الاسماء واللغات، ۱:۱۲۴ القاہرہ)۔

تاہم ان واقعات میں تطبیق بھی ممکن ہے، جیسا کہ ابن عساکر نے ذکر کیا ہے کہ وہ اسلام لے آیا تھا تاہم بعد میں مرتد ہوگیا اور حضرت خالدؓ نے عہد ابوبکرؓ میں اسے قتل کیا (ابن منظور: مختصر تاریخ مدینہ دمشق، ۵:۱۹، دمشق ۱۹۸۴ء، نیز دیکھیے ابن اثیر، اللباب فی تہذیب الانساب، ۱:۵۵۴، ۵۶-۱۳۶۹ھ) تاہم اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ بہادر اور خطرناک جنگلی جانوروں کے شکار کا رسیا تھا۔ الزرکلی نے اس کی تاریخ وفات ۱۲ھ/۶۳۳ء دی ہے (اعلام، ۱:۳۴۵ بار دوم)۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں۔

(محمد امین)

••............••

البانی: شیخ محمد ناصرالدین، شام کے معروف عالم دین ⊗ اور محدث۔ ۱۹۱۴ء میں البانیہ کے دارالحکومت اشقودرہ میں ایک متدین اور علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد الحاج نوح نجاتی ایک حنفی عالم دین تھے جو دولت عثمانیہ کے دارالحکومت استانہ (استانبول) کو چھوڑ کر اپنے وطن مالوف لوٹ گئے تھے تاکہ وہاں کے لوگوں کو دین کی تعلیم دے سکیں، لیکن جب ملک احمد زوغو نے البانیہ میں اقتدار سنبھالا اور مغربی فکر وتہذیب کو وہاں نافذ وغالب کر دیا تو دین دار عناصر وہاں سے ہجرت پر مجبور ہوگئے، چنانچہ الحاج نجاتی نے بھی شام کی طرف ہجرت کی اور دمشق کو اپنا مسکن بنا لیا۔ شیخ محمد ناصرالدین کی ابتدائی تعلیم دمشق کے مدرسہ الاسعاف الخیریہ الابتدائیہ میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے والد اور ان کے اہل علم رفقا (خصوصا شیخ سعید برہانی) سے قرآن کی تعلیم وتجوید، عربی صرف ونحو اور بلاغت اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ شیخ نوعمری میں دوسرے طلبہ کی طرح عربی قصص مثلاً الظاہر وعنترہ اور الملک سیف وغیرہ پڑھتے تھے پھر وہ تاریخی واقعات کے مطالعے کی طرف راغب ہوئے۔ ۲۰ سال کی عمر میں انہوں نے مطالعۂ حدیث شروع کیا اور پھر عمر بھر اپنی صلاحیتوں اور وقت کا بڑا حصہ اس علم شریف کی خدمت کرتے ہوئے گزار دیا۔ حدیث میں ان کا پہلا کام الغزالیؒ کی احیاء علوم الدین پر حافظ عراقی کی تخریج (المغنی عن حمل الاسفار فی تخریج ما فی الاحیاء من الاخبار) کے کام کی تکمیل وشرح پر مبنی تھا، جس کی طرف ان کی توجہ المنار میں

الاحیاء پر رشید رضا کے ایک مبسوط تجزیاتی مقالے کو دیکھ کر ہوئی۔ شیخ البانی بعد میں تحدیث نعمت کے طور پر کہا کرتے تھے کہ ان کو حدیث کی طرف متوجہ کرنے میں رشید رضا کا بڑا ہاتھ ہے (شیخ محمد مجذوب: علماء ومفکرون)۔ شیخ البانی نے گھڑی سازی کا فن اپنے والد سے سیکھا تھا اور شروع میں اپنے وقت کا ایک حصہ کسب رزق کے لیے اس پیشے میں صرف کرتے تھے، لیکن جب حدیث سے شغف بڑھا تو انہوں نے صبح سے لے کر رات تک المکتبہ الظاہریہ میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ اس پر ان کے والد نے سمجھایا کہ شغف حدیث تو مفلسوں کا پیشہ ہے (علم الحدیث صنعۃ المفالیس)، روٹی کہاں سے کھاؤ گے اور بال بچوں کو کہاں سے کھلاؤ گے؟ لیکن شیخ نے جو ٹھان لی تھی اس پر قائم رہے اور پھر حدیث ہی کے ہو کر رہ گئے۔

۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء میں جب مدینہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو وہاں علم حدیث پڑھانے کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا۔ ان کی سادگی اور درویشی کا یہ عالم تھا کہ تفریح کے وقفہ میں ریت پر طلبہ کے ساتھ بیٹھ جاتے اور علمی گفتگوئیں جاری رکھتے۔ جامعہ میں انہوں نے تدریس حدیث کا ایک منفرد منہج متعارف کروایا جس میں وہ طلبہ سے احادیث کی تخریج اور نقد رجال کی عملی مشق کرواتے۔ بعد میں یہ منہج عمومی طور پر اسلامی جامعات میں مروج ہوگیا۔ شیخ نے یہاں تین سال تک پڑھایا، لیکن طلبہ میں بڑھتی ہوئی مقبولیت نے بعض معاصرانہ چشمکوں کو جنم دیا اور انہیں جامعہ کو الوداع کہنا پڑا۔ جہاں سے وہ واپس شام چلے گئے۔ اسی دوران شام میں حالات خراب ہونے پر وہ اردن، لبنان، کویت، قطر اور امارات میں استواری کے لیے کوشاں رہے بلکہ ان کے بعض شاگردوں نے انہیں پاک و ہند میں لانے کی سنجیدہ کوششیں بھی کیں جن میں بنارس کی جامعہ سلفیہ اور لاہور کی جامعہ لاہور الاسلامیہ قابل ذکر ہیں جس کے لیے مفتی اعظم سعودی عرب شیخ ابن باز مرحوم کا تعاون اور سفارش بھی شامل تھی لیکن انہوں نے دارالافتاء (سعودی عرب) کی زیر نگرانی ملازمت کی بجائے آزادانہ تحقیقی کام کرنے کو ترجیح دینے کا فیصلہ کیا اور اس پر تا حیات قائم رہے۔

علامہ البانی صرف محقق ہی نہ تھے، بلکہ پر جوش داعی بھی تھے۔ چنانچہ دمشق ہی سے انہوں نے دعوتی کام کی ابتدا کی۔ پہلے دوستوں کے گھروں میں دعوتی اجتماعات منعقد کرتے۔ پھر اس کے لیے ایک خصوصی مرکز بنا لیا۔ وہ بدعات اور تقلید کے سخت مخالف تھے، چنانچہ مقلد علما اور صوفیا کے ساتھ ان کے مناقشے اور مناظرے بعض اوقات شدت اختیار کر جاتے۔ اس حوالے سے شیخ کو دو دفعہ جیل بھی جانا پڑا۔ پہلی دفعہ ایک ماہ کے لیے اور دوسری بار ۱۹۶۷ء میں چھ ماہ کے لیے۔ دعوت و تبلیغ کی غرض سے وہ نواحی شہروں کے دورے بھی کرتے تھے خصوصا حلب، حماۃ اور سلمیہ وہ کئی دفعہ گئے۔ عمان (اردن) بھی وہ ہر مہینے جاتے تھے اور درس دیتے تھے۔ بعدازاں جب عمان میں مستقل رہائش اختیار کر لی تو درس کا سلسلہ وہاں بھی جاری رکھا۔ علاوہ ازیں شیخ ایک ہفتہ وار علمی مجلس بھی منعقد کرتے تھے۔ جس میں منتہی طلبہ اور جامعات کے اساتذہ شرکت کرتے تھے۔ اس مجلس میں متعدد علمی کتب کا درس ہوتا تھا جیسے امام بخاری کی الادب المفرد، امام نووی کی ریاض الصالحین، ابن دقیق العید کی الالمام فی احادیث الاحکام، حافظ المنذری کی الترغیب والترہیب، یوسف القرضاوی کی الحلال والحرام، سید سابق کی فقہ السنہ، احمد شاکر کی الباعث الحثیث شرح اختصار علوم الحدیث، نواب صدیق حسن خان کی

الروضۃ الندیۃ، محمد اسد کی منہاج الاسلام فی الحکم، اسد رستم کی مصطلح التاریخ، عبدالوہاب خلاف کی اصول الفقہ اور عبدالرحمٰن بن حسن آل شیخ کی فتح المجید شرح کتاب التوحید اور ابن تیمیہ کی اقتضاء الصراط المستقیم وغیرہ۔

شیخ البانی خواتین کو بھی صحیح احادیث اور ان پر اپنی تعلیقات کے منتخب حصوں کا درس دیا کرتے تھے۔ شیخ کے تلامذہ اور محبین نے ان کے مواعظ ودروس کو کیسٹوں کی صورت میں بھی محفوظ کیا ہے، جو سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اور عالم عرب میں عام دستیاب ہیں (تفصیلات کے لیے دیکھیے شیخ کے شاگرد محمد عید عباسی کی تالیف بدعۃ التعصب المذھبی)۔

شیخ کا مزاج نہایت خود داری کا تھا اسی لیے ہمیشہ اہل اقتدار سے گریزاں رہے۔ اسی بناء پر ان کے خلاف مخالفین کی شکایات حکام کے پاس تحقیق کا موقع دیئے بغیر پذیرائی پا جاتیں چنانچہ موصوف کو کھل کر اپنا مشن جاری رکھنے میں ہمیشہ مشکلات حائل رہیں۔ شیخ کے شہرت پسندی سے اجتناب اور اخلاص کا یہ عالم تھا کہ مرنے سے پہلے وصیت کر گئے کہ انہیں فوراً دفن کر دیا جائے اور سوائے قریبی اعزہ کے کسی کو ان کی موت کی اطلاع نہ دی جائے، چنانچہ عمان میں ۲/ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ان کی تدفین کے وقت اسی پر عمل کیا گیا اس کے باوجود پانچ ہزار کے قریب افراد نے ان کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔

عالم اسلام کے ثقہ علما وفضلا سے شیخ البانی کے علمی روابط تھے اور بہت سے علما نے اپنے کام میں ان سے علمی استفادہ کیا اور اپنی تالیفات میں اس کا اعتراف کیا ہے، مثلاً ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی نے صحیح ابن خزیمہ، استاذ محمد الغزالی نے فقہ السیرۃ اور استاذ ناجی طنطاوی نے ابن الجوزی کی صید الخاطر کے مقدمے میں شیخ البانی کی تعلیقات کی تعریف کی ہے اور ان کے مرجع علمی ہونے کی توثیق کی ہے۔ الاخوان کے بانی رہنما شیخ حسن البناء نے شیخ البانی کو خط لکھ کر ان کے عقائد اور علمی موقف کی تائید کی اور سید سابق کے مقالات پر ان کی تعلیقات مجلہ الاخوان المسلمون میں شائع کیں۔ ڈاکٹر یوسف السباعی، مدیر مجلہ المسلمون اور استاد احمد مظہر العظمۃ (صدر جمعیۃ التمدن الاسلامی بدمشق) ان کی تحریریں بڑے شوق سے شائع کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے ثقافۃ الداعیۃ میں (ص ۹۷)، ڈاکٹر عمر سلیمان الاشقر نے تاریخ الفقہ الاسلامی (ص ۱۴۷) اور مصر کے علامہ سید محب الدین خطیب، مفتی اعظم سعودی عرب مرحوم شیخ عبدالعزیز بن باز وشیخ صالح العثیمین، یمن کے شیخ محمد مقبل الوادعی، مراکش کے شیخ محمد الزمزمی و شیخ محمد امین شنقیطی، ہندوستان کے مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری و شیخ عبدالصمد شرف الدین اور پاکستان کے مولانا حافظ عبداللہ محدث روپڑی نے اپنی کئی تحریروں اور تقریروں میں البانی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی ثنا کی ہے۔ بعض مخالفین نے آپ کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا ہے، دیکھیے مثلاً ہندوستان کے مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی االبانی، شذوذہ واخطاؤہ، (جو چار جلدوں میں کویت کے مکتبہ دارالعروبہ للنشر والتوزیع سے شائع ہوئی ہے)۔

شیخ البانی نے شرق اوسط کے علاوہ بھی بہت سے علمی اور دعوتی سفر کیے۔ وہ یورپ بھی گئے اور وہاں مسلم اقلیتوں اور طلبہ سے خطاب کیا۔ ایک طلبہ تنظیم (الاتحاد العالمی لطلبۃ المسلمین) کی دعوت پر وہ اندلس (ہسپانیہ) گئے اور ''الحدیث حجۃ بنفسہ فی العقائد والاحکام'' کے موضوع پر خطاب کیا۔ انہوں نے مصر، مراکش اور مغرب اقصی کا متعدد بار دعوتی دورہ کیا۔ وہ

بہت سی علمی مجالس اور کمیٹیوں کے بھی روح رواں تھے خصوصاً کتب حدیث کی نشر واشاعت اور تحقیق کے لیے قائم کردہ مصر وشام کی مشترکہ کمیٹی لجنۃ الحدیث کے رکن تھے۔ سعودی عرب میں قیام کے دوران میں شاہ فیصل مرحوم نے انہیں مدینہ منورہ کی جامعہ اسلامیہ کی سپریم کونسل کا رکن مقرر کیا۔ وہ جامعہ کی دوسری بہت سی کمیٹیوں کے بھی رکن تھے۔ سعودی وزیر تعلیم نے انہیں ۱۳۸۸ھ میں جامعہ ام القریٰ مکہ کی قسم الدراسات العلیا للحدیث میں نگران کی ذمہ داری سونپی (موجزۃ عن حیاۃ الشیخ ناصر الدین)۔

تلامذہ: چاردانگ عالم میں ان سے براہ راست استفادہ کرنے والوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے تاہم ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے والے علماء میں سے چند معروف نام یہ ہیں: (۱) شیخ عبدالرحمٰن عبدالخالق جو دعوت وارشاد، اسلامی معیشت، تعلیم و تربیت اور نظام الحکم فی الاسلام جیسے موضوعات پر ۲۴ کتابوں کے مصنف ہیں؛ (۲) ڈاکٹر عمر سلیمان الاشقر جو کویت یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ میں پروفیسر ہیں اور کئی ایک کتابوں کے مصنف ہیں؛ (۳) شیخ حمدی عبدالمجید السّلفی جن کی تخریجات علمیہ ومؤلفات کی تعداد ۲۷ سے زیادہ ہے؛ (۴) شیخ محمد ابراہیم شقرہ، مسجد اقصیٰ کے سرپرست اور عمان کی مسجد صلاح الدین کے خطیب ہیں، ۶ کتابوں کے مصنف ہیں؛ (۵) شیخ عبدالرحمٰن عبدالصمد جو کویت کی جامع الوفرہ کے خطیب اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ سالہا سال تک حلب اور حماۃ میں شیخ البانی کے ساتھ رہے؛ (۶) شیخ محمد بن جمیل زینو، جو مکہ المکرّمہ کے دارالحدیث الخیریہ میں استاذ ہیں اور دس سے زیادہ کتابوں کے مؤلف ہیں؛ (۷) شیخ زہیر الشاویش جو المکتب الاسلامی کے مالک اور کئی کتب کے محقق اور مخرج ہیں اور ۱۹ سے زیادہ کتابوں کے مؤلف ہیں؛ (۸) شیخ مقبل بن ہادی الوادعی الیمنی۔ انہوں نے علم حدیث شیخ البانی سے جامعہ مدینہ میں پڑھا، پھر شیخ البانی کی خدمت میں کافی وقت گزارا۔ دس سے زیادہ کتابوں کے مؤلف ہیں؛ (۹) شیخ مصطفیٰ الزربول جو کویت کی وزارت اوقاف میں کام کرتے ہیں؛ (۱۰) شیخ محمد عید عباسی اور (۱۱) شیخ علی خشان جو شیخ البانی کے قریبی تلامذہ اور خدام میں سے ہیں اور متعدد کتابوں کے مؤلف ہیں۔

تصانیف: اگرچہ شیخ البانی نے دعوتی کتابیں بھی لکھی ہیں اور ان کی مستقل علمی تالیفات بھی ہیں، لیکن ان کا حقیقی میدان تخریج تھا۔ جس میں انہوں نے بہت کام کیا ہے خصوصاً ان کا سنن اربعہ کی تخریج و تحقیق کا کام بہت مفید اور معرکۃ الآرا ہے۔ انہوں نے سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کی صحیح اور ضعیف احادیث کو چھانٹ کر الگ الگ کر دیا اور دونوں کو الگ الگ طبع کر دیا، جس سے صحاح ستہ کی حد تک صحیح احادیث کا التزام کرنا اب مشکل نہیں رہا۔ ان مذکورہ آٹھ کتابوں کے علاوہ انہوں نے حدیث کی بعض دیگر اہم کتب کی تخریج بھی کی ہے، مثلاً (۹) التبریزی کی مشکوٰۃ المصابیح؛ (۱۰) السیوطی کی الجامع الصغیر وزیادتہ؛ (۱۱) (الفتح الکبیر) دو اجزاء میں صحیح وضعیف الگ الگ؛ (۱۲) المنذری کی الترغیب والترہیب، صحیح وضعیف الگ الگ؛ (۱۳) امام بخاری کی الادب المفرد؛ (۱۴) امام نووی کی ریاض الصالحین؛ (۱۵) سید سابق کی فقہ السنہ؛ اور اس کے علاوہ انہوں نے بہت سی دوسری دینی کتب کی احادیث کی تخریج بھی کی ہے جن میں سے چند اہم یہ ہیں: (۱۶) الکلم الطیب لابن تیمیہ؛ (۱۷) فضل الصلاۃ علی النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) لاسماعیل بن اسحاق؛ (۱۸) کتاب اقتضاء العلم العمل للخطیب البغدادی؛ (۱۹) کتاب العلم للحافظ ابی خیثمہ؛ (۲۰) لفتۃ الکبد فی تربیۃ الولد لابن

الجوزی: (۲۱) الآیات البینات فی عدم سماع الاموات عند الحنفیہ السادات لمحمود الآلوسی؛ (۲۲) تخریج الایمان لابن ابی شیبہ؛ (۲۳) تخریج فضائل الشام للربعی؛ (۲۴) تخریج کتاب الرد علی الجھمیۃ للدارمی؛ (۲۵) تخریج الایمان لابی عبید القاسم بن سلام؛ (۲۶) تخریج کلمہ الاخلاص و تحقیق معناھا لابن رجب الحنبلی؛ (۲۷) حجاب المرأۃ المسلمۃ ولباسھا فی الصلاۃ لابن تیمیہ؛ (۲۸) حقیقۃ الصیام لابن تیمیہ: (۲۹) تخریج العقیدہ الطحاویہ لابی جعفر الطحاوی؛ (۳۰) کتاب السنۃ ومعہ ظلال الجنۃ فی تخریج السنۃ لابی عاصم الضحاک؛ (۳۱) ما دل علیہ القرآن مما یعضد الھیئۃ الجدیدۃ القویمۃ البرھان لمحمود الآلوسی: (۳۲) ارواء الغلیل فی تخریج احادیث منار السبیل لابن ضویان (آٹھ جلدوں میں)؛ (۳۳) تحقیق کتاب حول اسباب الاختلاف للحمیدی؛ (۳۴) تحقیق کتاب دیوان اسماء الضعفاء والمتروکین للذھبی؛ (۳۵) تحقیق کتاب مساوی الاخلاق للخرائطی؛ (۳۶) تحقیق کتاب اصول السنہ واعتقاد الدین؛ (۳۷) تخریج کتاب اصلاح المساجد من البدع والعوائد لجمال الدین القاسمی، اور بعض معاصرین کی کتابوں میں سے: (۳۸) المرأۃ المسلمۃ للشیخ حسن البناء؛(۳۹) تخریج احادیث مشکلۃ الفقر وکیف عالجھا الاسلام للقرضاوی؛ (۴۰) غایۃ المرام فی تخریج احادیث کتاب الحلال والحرام للقرضاوی؛ (۴۱) تخریج کتاب المصطلحات الاربعہ فی القرآن للمودودی۔

اس کے علاوہ انہوں نے بعض کتابوں کا مراجعہ کیا ہے یا ان پر مختصر تعلیقات لکھی ہیں جن میں قابل ذکر یہ ہیں: (۴۲) التعلیق علی کتاب الباعث الحثیث شرح اختصار علوم الحدیث تحقیق احمد شاکر؛ (۴۳) صحیح ابن خزیمہ تحقیق الدکتور مصطفیٰ الاعظمی؛ (۴۴) مدارک النظر فی السیاسۃ بین التطبیقات الشرعیۃ والانفعالات الحماسیۃ لعبدالملک الجزائری؛ (۴۵) التعلیقات علی صفۃ الفتوی والمفتی والمستفتی لابن شبیب؛ (۴۶) التعلیق علی کتاب سبل السلام شرح بلوغ المرام: (۴۷) التعلیق علی کتاب مسائل جعفر بن عثمان بن ابی شیبہ؛ (۴۸) التعلیقات الجیاد علی زاد المعاد لابن قیم الجوزیہ؛ (۴۹) التعلیقات الرضیہ علی الروضہ الندیہ؛ (۵۰) تعلیق و تحقیق کتاب زھر الریاض فی رد ما شنعہ القاضی عیاض علی من اوجب الصلاۃ علی البشیر النذیر فی التشھد الاخیر: (۵۱) مختصر تعلیق الشیخ محمد کنعان؛ (۵۲) مختصر الشمائل المحمدیہ للترمذی؛ (۵۳) مختصر شرح العقیدہ الطحاویہ؛ (۵۴) مختصر کتاب العلو للعلی العظیم للحافظ الذھبی؛ (۵۵) تلخیص صفۃ صلاۃ النبیؐ؛ (۵۶) تلخیص کتاب تحفۃ المودود فی احکام المولود لابن قیم الجوزیہ؛ (۵۷) تلخیص احکام الجنائز؛ (۵۸) مختصر صحیح البخاری؛ (۵۹) مختصر صحیح مسلم۔

ردود ومشاجرات میں ان کی بعض کتابیں: (۶۰) الرد علی رسالہ الشیخ التویجری فی بحوث من صفۃ الصلاۃ؛ (۶۱) الرد علی کتاب المراجعات لعبدالحسین شرف الدین؛ (۶۲) الرد علی رسالہ التعقب الحثیث: (۶۳) الرد علی رسالہ ارشد السلفی؛ (۶۴) التعقیب علی کتاب الحجاب للمودودی؛ (۶۴) التعلیق الممجد علی التعلیق علی موطا الامام محمد للکنوی؛ کشف النقاب عما فی کلمات ابی غدہ من الاباطیل والافتراءات۔ بعض کتب خانوں میں موجود کتب حدیث کے مخطوطہ جات اور کتب حدیث کی فہارس بھی انہوں نے تیار کی ہیں مثلاً: (۶۵) فہرس المخطوطات الحدیثیۃ فی مکتبۃ الاوقاف بحلب؛ (۶۶) فہرس مخطوطات دار الکتب الظاہریۃ؛ (۶۷) فہرس مسند الامام احمد بن حنبل؛ (۶۸) فہرس کتاب الکواکب الدراری؛ (۶۹) فہرس احادیث کتاب التاریخ الکبیر؛ (۷۰) فہرس احادیث کتاب الشریعہ للآجری؛ (۷۱) فہرس اسماء الصحابہ الذین اسندوا الاحادیث فی معجم الطبرانی الاوسط؛ (۷۲) المنتخب من

مخطوطات الحدیث: (٧٣) بغیۃ الحازم فی فہارس مستدرک الحاکم؛ (٧٤) فہرس مسند الامام احمد بن حنبل فی مقدمۃ المسند۔

اس کے علاوہ شیخ کی بعض اہم تالیفات یہ ہیں: (٧٥) سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ وشیء من فقہہا؛ (٧٦) سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ واثرھا السیّیٔ فی الامۃ، ان دونوں کے متعدد اجزاء چھپ چکے ہیں اور مزید چھپ کر آرہے ہیں (٧٧) صلاۃ العیدین فی المصلی ھی السنۃ؛ (٧٩) مناسک الحج والعمرۃ فی الکتاب والسنۃ وآثار السلف؛ (٧٩) الحدیث حجۃ بنفسہ فی العقائد والاحکام؛ (٨٠) التوسل: احکامہ وانواعہ؛ (٨١) قیام رمضان وبحث عن الاعتکاف؛ (٨٢) احکام الجنائز؛ (٨٣) صحیح الکلم الطیب لابن تیمیہ؛ (٨٤) تصحیح حدیث افطار الصائم قبل سفرہ بعد الفجر؛ (٨٥) الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ التی ضعفہا او اشار الی ضعفہا ابن تیمیہ فی مجموع الفتاوی؛ (٨٦) مقدمہ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ فی امہات الکتب الفقہیۃ؛ (٨٧) تحذیر الساجد من اتخاذ القبور مساجد؛ (٨٨) تسدید الاصابۃ الی من زعم نصرۃ الخلفاء الراشدین والصحابۃ؛ (٨٩) دفاع عن الحدیث النبوی والسیرۃ؛ (٩٠) حجاب المرأۃ المسلمۃ فی الکتاب والسنۃ؛ (٩١) خطبۃ الحاجۃ؛ (٩٢) صفہ صلاۃ النبی؛ (٩٣) اللحیہ فی نظر الدین؛ (٩٤) المسیح الدجال ونزول عیسی علیہ السلام؛ (٩٥) الامثال النبویۃ؛ (٩٦) قاموس البدع؛ (٩٧) منزلۃ السنۃ فی الاسلام؛ (٩٨) نصب المجانیق فی نسف قصہ الغرانیق؛ (٩٩) وجوب الاخذ بحدیث الآحاد فی العقیدہ؛ (١٠٠) آداب الزفاف فی السنۃ المطہرۃ؛ (١٠١) احادیث البیوع وآثارہ؛ (١٠٢) ازالۃ الشکوک عن حدیث البروک؛ (١٠٣) وصف الرحلۃ الاولی الی الحجاز والریاض مرشدا للجیش السعودی؛ (١٠٤) معجم الحدیث النبوی؛ (١٠٥) مساجلہ علمیہ بین الامامین الجلیلین العز بن عبدالسلام وابن الصلاح۔ (١٠٦) کیف تفسیر القرآن

سطور بالا میں شیخ البانی کی ١٠٦ چھوٹی بڑی کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ غازی عزیر نے شیخ کی ١٢٤ کتابوں کا ذکر کیا ہے لیکن ان کی فہرست بھی نامکمل ہے (دیکھیے مآخذ) شیخ البانی کی کئی کتب کے تراجم دوسری زبانوں میں بھی ہوچکے ہیں۔ اردو میں صفہ صلاۃ النبی ؐ، کتاب الجنائز، سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ کے بعض اجزاء اور حجیت حدیث کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ صفۃ صلاۃ النبی کا ترکی میں اور مناسک الحج والعمرۃ کا انگریزی میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ شیخ کی کئی کتابیں ابھی مخطوطات کی صورت میں ہیں اور زیر طبع ہیں۔

مآخذ: (١) شیخ محمد بن ابراہیم الشیبانی، حیاۃ الالبانی وآثارہ وثناء العلماء علیہ، دو جلدیں، الدار السلفیہ کویت ١٤٠٧ھ؛ (٢) شیخ محمد عید عباسی، شیخ علی حشان وشیخ مجذوب: عن حیاۃ الشیخ ناصر الدین الالبانی؛ (٣) غازی عزیر، شیخ البانی کی شخصیت اور گرانقدر خدمات، ص١٣-٤٠ در ماہنامہ محدث، لاہور، شمارہ نومبر١٩٩٩ء؛ (٤) محمد افضل، محدث العصر علامہ محمد ناصر الدین الالبانی، ص ٢٦-٢٨ در ماہنامہ الدعوۃ، لاہور شمارہ دسمبر ١٩٩٩ء؛ (٥) خالد مدنی، علامہ محمد ناصرالدین الالبانی، ص١١-١٦ در ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث، لاہور شمارہ ٢٢ تا ٢٨ اکتوبر ١٩٩٩ء۔

(محمد امین)

••-------------••

البانیا: جنوبی یورپ میں واقع یورپ واحد اکثریتی⊗ مسلم ملک، [سابقہ ارنادولق، رکّ بہ آآآ (بذیل مادہ)]۔

محل وقوع، رقبہ اور آبادی: البانیا کے جنوب میں یوگوسلاویہ، مشرق میں مقدونیا، جنوب میں یونان اور مغرب میں ادریانوپل واقع ہے۔

آبادی: [٢٠٠٠ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی

آبادی ۳،۴۹،۰۰۰ ہے، فی کس آمدن کا تخمینہ ۳۶۸۰ ڈالر سالانہ ہے(Stateman's Year Book 2005، ص۱۳۱)۔

تاریخ: [ابتدائی تاریخ کے لیے دیکھیے ارناؤدلق]۔

دور استعمار: [دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ۵ اپریل ۱۹۳۹ء کو] اٹلی نے یورپ کی اتحادی افواج کو البانیا سے نکلنے کا الٹی میٹم دینے کے بعد اس کی افواج نے اپنی فضائیہ کی مدد سے البانیا کی بندرگاہ کی طرف پیش قدمی کرکے وہاں پڑاؤ ڈال دیا۔ اسی دن شاہ زوغ اور حکومت کے دوسرے اہلکار ملک سے فرار ہو کر یونان چلے گئے۔ اس طرح ۷ اپریل ۱۹۳۹ء کو تمام البانیا پر اٹلی کا مکمل قبضہ ہوگیا (World Muslim Gazetteer، ص۵۳)، مگر البانوی باشندوں نے اٹلی کے قبضے کو تسلیم نہ کیا اور [قوم پسندوں، جمہوریت پسندوں اور کمیونسٹوں نے باہمی اتحاد کرکے] اس قبضے کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ [مؤخرالذکر جماعت کو جنرل ٹیٹو کی حمایت بھی حاصل تھی، جس کی حمایت پا کر ۱۹۴۱ء میں یہاں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ مزاحمت کا سلسلہ ستمبر ۱۹۴۳ء تک [یعنی اس وقت تک جاری رہا جب تک وہاں اطالوی تسلط قائم رہا]۔ اٹلی نے [اس دوران میں] البانیا میں ایک نام نہاد حکومت قائم کی، جس کا سربراہ شویت بیگ وارلیس (Sheveet Beg Varlace) تھا۔ [اس نام نہاد حکومت نے] ۱۶ اپریل ۱۹۳۹ء کو اٹلی کو باقاعدہ طور پر البانیا پر حکومت کرنے کا حق دے دیا۔

اس پر آزادی کی جنگ تیز ہوگئی اور البانوی مسلمانوں نے آزادی کے لیے دونوں طریقے اختیار کیے، ایک طریقہ قانونی اور جمہوری تھا اور دوسرا مسلح جدوجہد کا۔ کچھ لوگوں نے ۱۹۴۰ء سے غیر ملکی آمریت کے خلاف مسلح جدو جہد کا راستہ اپنایا اور حکومت کے خلاف گوریلا جدوجہد شروع کر دی اور دوسری طرف کچھ جماعتیں آئینی اور جمہوری طریقے سے حصول آزادی کی جدوجہد کرتی رہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں البانیہ پر پہلے اٹلی نے اور پھر جرمنی نے قبضہ کر لیا (Stateman's Year Book 2002، ص۱۳۲) ۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران میں تحریک آزادی میں مزید شدت آگئی۔ بین الاقوامی محاذ پر جرمنی کی شکست کا اس کے زیر انتد اب علاقوں پر بھی اثر پڑا اور البانیا سے اس کی افواج کے انخلا کے بعد ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو ''انٹی فاسسٹ نیشنل لبریشن فرنٹ'' (Anti Fascist National Libration Front) کی حکومت کا قیام عمل میں آیا، جس کا سربراہ ھوکسا (Enva Hoxha) تھا۔ [جو ایک کمیونسٹ لیڈر اور فرانس سے تعلیم یافتہ ایک سکول ٹیچر تھا]۔ اسے پانچ سال کے لیے صدر نامزد کیا گیا۔ ۱۰ نومبر ۱۹۴۵ء کو برطانیہ، امریکہ اور روس نے ہوکسا کی عبوری حکومت کو اس شرط پر تسلیم کر لیا کہ حکومت آزادانہ انتخابات کرائے گی۔ چنانچہ ۲ دسمبر ۱۹۴۵ء کو انتخابات ہوے جن میں ہوکسا صدر منتخب ہوگیا، ۱۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو البانیا کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔

[اس تحریک میں چونکہ کمیونسٹ جماعتیں پیش تھیں، اس لیے ملک کو آزادی تو حاصل ہوگئی، لیکن اس کے نتیجے میں ایک طویل عرصے کے لیے یہاں کمیونزم کی حکمرانی قائم ہوگئی]۔ ۱۹۵۰ء میں ملک کے آئین کو سوویت یونین (روس) کے آئین سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کئی دفعات دستور میں شامل کی گئیں، [اس وقت سوویت یونین کے البانیہ کے ساتھ، خصوصی مراسم قائم تھے]، اسی بنا پر امریکہ اور برطانیہ نے البانیا سے تعلقات منقطع کر لیے اور البانیا کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے کی تجویز کو کئی بار ویٹو کیا۔ بالآخر وہ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کو اقوام متحدہ کا رکن بن گیا۔

اس عرصے میں ملک کے یوگوسلاویہ اور سوویت یونین سے تعلقات نہایت خوشگوار رہے۔ البانیا ۱۹۵۵ء میں

بوسنیا ہرزیگوینا
مونٹی نیگرو
سربیا
سربیا
پرسٹینا
پڈگوریکا (ٹیٹوگراڈ)
کوسوو (قصووہ)
دریائے ڈرین
جھیل شقودرہ
شقودرہ
(اسکوراسقوطری)
کریکس
سکوپجی (اُسکپ)
لیژا
بحیرۂ ایڈریاٹک
پیشکوپی
دریائے ماٹ
مقدونیہ
دیبر
دریس (درازو)
تیرانا
البصان
مناستر (بٹولا)
جھیل اوخری
جھیل پریسپا
دریائے سیمن
فائری
برات
کورچہ
ولورہ (افلونیا)
کستوریہ
اوترانتو
آبنائے اوترانتو
دریائے ویوسہ
گیتو قستر
اٹلی
یونان
جزیرہ کیرکرا (کورفو)
(یونان)
بحیرۂ یونان (Ionian Sea)
البانیہ (آرناودلق)
بین الاقوامی سرحد
ملکی دارالحکومت
صوبائی دارالحکومت

وارسا پیکٹ میں شامل ہوگیا، سوویت یونین نے البانیا کی ہر قسم کی سیاسی ومعاشی امداد جاری رکھی۔ ۱۹۶۰ء میں ''روس چین جنگ'' کے دوران میں البانیا نے چین کی حمایت کی۔ انہی دنوں میں (۱۹۵۶ء میں) سوویت یونین کے یوگوسلاویہ کے ساتھ تعلقات خراب ہوگئے، جس کا البانیہ کے حالات پر بھی اثر پڑا، چنانچہ ۱۹۶۲ء میں البانیا وارسا پیکٹ سے نکل گیا اور اُس نے چین سے اپنے ''خصوصی سرپرست ملک'' کے طور پر تعلقات قائم کر لیے، (۱۹۶۱ء۔ ۱۹۷۷ء)۔ ۱۹۷۱ء میں البانیا نے یوگوسلاویہ اور یونان کے ساتھ بھی تعلقات قائم کر لیے۔ ۱۹۷۲ء میں نیا آئین بنایا گیا، جس کے تحت البانیا کا نام ''سوشلسٹ پیپلز جمہوریہ'' رکھا گیا، ۱۹۷۸ء میں جب البانیا نے ''ویت نام'' کی مدد کی، تو چین نے البانیا کے ساتھ اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے۔

دسمبر ۱۹۸۱ء میں وزیراعظم محمد شاہ (Mehmet Shaha) کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ شاہ کی ہلاکت کے بعد حالات میں تبدیلی آئی اور ایک نئی حکومت تشکیل دی گئی اور عادل چرکینی (Adil Charcani) کو وزیراعظم بنایا گیا۔

انور ہوکسا کا اپریل ۱۹۸۵ء میں انتقال ہوا، تو کسی غیر ملکی وفد کو جنازے میں شرکت کی اجازت نہ دی گئی اور روس کی طرف سے افسوس کے پیغام کو مسترد کر دیا گیا اور فروری ۱۹۸۷ء میں، رمیز عالیا کو صدر منتخب کر لیا گیا (*The Europa World Year book 1996*، ۱:۳۱۶)۔

[انور ہوکسا کا انتقال ملک میں دور رس تبدیلیوں کا نقطۂ آغاز بن گیا اور کمیونزم نظام حکومت میں دراڑیں پڑنا شروع ہوگئیں اور ملک پر ''جبر وتسلط'' کا جو نظام ۱۹۴۴ء سے نافذ العمل تھا وہ آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد البانیا کے آئین میں کئی تبدیلیاں کی گئیں، جن میں سے ایک ''اپوزیشن'' جماعتوں کے قیام کی اجازت بھی تھی]۔

مئی ۱۹۹۰ء میں قومی اسمبلی نے عدالتی نظام میں جامع اصلاحات کی منظوری دی اور مختلف معاشی اصلاحات کا بھی اعلان کیا۔

جون ۱۹۹۱ء کے شروع میں ایک عام ہڑتال کی بنا پر وزیر اعظم، فیٹس نینو (Fates ninow) کی حکومت نے استعفیٰ دے دیا اور یلی بفی (Ylli Bafi) کی سربراہی میں نئی حکومت قائم ہوئی جس میں متعدد سیاسی جماعتوں کے نمائندے اور آزاد ارکان بھی شامل تھے۔

اگست ۱۹۹۱ء کے آخر میں منوش مفتی (سابق ڈپٹی چیئرمین وزارتی کونسل) اور کئی سابق سینئر افسران کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر اقتدار کے بے جا استعمال کا الزام تھا۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء میں لوگوں نے صدر رمیز عالیا سے استعفے کا مطالبہ کیا اور مختلف شہروں میں کامیاب ہڑتال کی۔ انہی دنوں ایک سیاسی جماعت (ڈی۔پی۔اے) نے نئے انتخابات کا مطالبہ کر دیا۔ ان مظاہروں کی وجہ سے دسمبر۱۹۹۱ء میں حکومت ختم ہوگئی۔ ولسن احمد (Vilson Ahmet) وزیر خوراک کو وزارتی کونسل کا چیئرمین بنا دیا گیا اور ایک نئی متحدہ حکومت قائم ہوگئی۔ مارچ ۱۹۹۲ء کے انتخابات میں غیر کمیونسٹ حکومت منتخب ہوئی اور یوں طویل عرصے کے بعد کمیونزم کی حکومت کا خاتمہ ہوا [*Stateman's Year Book 2005*، ص۱۳۱]۔

ایس۔پی۔اے (SPA) کی شکست کے بعد رمیز عالیا نے ۳ اپریل ۱۹۹۲ء کو صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ان جگہ ڈی۔پی۔اے (DPA) کے ڈاکٹر صالی (صالح) بریشا (Dr.Sali Berishs) کو صدر منتخب کیا گیا۔ اپریل کے وسط میں ایک قومی حکومت سکندر مکسی کی وزارت عظمیٰ میں قائم ہوگئی۔ ۱۸ستمبر ۱۹۹۲ء کو سابق صدر رمیز عالیا کو حراست میں لے لیا گیا اور دوسرے کمیونسٹ افسران کو بھی بدعنوانی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اسی ماہ میں اٹارنی جنرل میکسم ہوکسا (Maksim Hoxha) کو بھی معزول کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر الزام تھا کہ اس

نے اپنے اقتدار کا غلط استعمال کیا ہے۔ فروری ۱۹۹۳ء میں سابق وزیراعظم ولسن احمد کو گھر میں قید کر دیا گیا، جو اس وقت اپنی جماعت (ایس۔پی۔اے) کا صدر تھا۔

نومبر ۱۹۹۴ء میں صدر ڈاکٹر صالح بریشا نے آئین کا مسودہ قومی اسمبلی میں پیش کیا، مگر اسے دوتہائی اکثریت سے رد کر دیا گیا (The Europa World Year Book، ۱۹۹۶ء، ۳۱۸:۱)۔

پارلیمنٹ کے انتخابات مئی ۱۹۹۶ء میں ہوے۔ ان انتخابات میں سات جماعتوں نے حصہ لیا۔ ان انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی نے ۹۵ نشستیں حاصل کیں (The Statesman's Year Book، ص۴۷)۔ کچھ سیاسی جماعتوں (مثلاً ایس۔اے۔ایس، ڈی۔پی اور ڈی۔اے۔پی) نے ان نتائج کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔

الیکشن کا دوسرا مرحلہ ۲ جون ۱۹۹۶ء کو مکمل ہوا، سرکاری نتائج کے مطابق ڈیموکریٹک پارٹی نے ۱۱۵ میں سے ۱۱۰ سیٹیں حاصل کیں۔ حزب اختلاف نے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تھا جس کی وجہ سے ۱۶ جون ۱۹۹۶ء کے انتخابات میں DPA نے تمام نشستیں جیت لیں۔ اس طرح قومی اسمبلی کی ۱۴۰ سیٹوں میں سے ۱۲۲ نشستیں ڈیموکریٹک پارٹی نے حاصل کی لیں (The Europa World Year Book، ۳۱۲:۱) سکندر مکسی نے جولائی ۱۹۹۶ء میں نئی کابینہ تشکیل دی۔ اگست ۱۹۹۶ء میں حکومت نے ایک مستقل مرکزی ''الیکشن کمشن'' مقرر کیا اور ڈاکٹر صالح بریشا کو ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے ۳ مارچ ۱۹۹۷ء کو بلامقابلہ صدر منتخب کر لیا گیا۔

انہی دنوں ایک مالیاتی بحران نے سراٹھایا، جس کی وجہ ۱۹۷۷ء میں سرکاری طور پر شروع کی گئی اسکیم میں فراڈ کا منظر عام پر آنا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں سرکاری طور پر اسکیم شروع کی گئی تھی، جس میں لوگوں سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کے تحت سرمایہ لگانے والوں کو ۲۰ سے ۶۰% تک منافع دیا جائے گا۔ یہ اسکیم ۱۹۹۷ء میں بری طرح ناکام ہوگئی اور لوگوں کی رقوم ڈوب گئیں۔ اس پر پورے ملک میں ہنگامے شروع ہوگئے، جو اس قدر زور دار تھے کہ صدر بریشا نے مکسی حکومت کو معزول کر دیا اور ایمرجنسی کے نفاذ کا اعلان کر دیا، حتیٰ کہ امن وامان قائم رکھنے کے لیے، اقوام متحدہ کو امن فوج بھیجنا پڑی۔ ۳ مارچ ۱۹۹۷ء کو بریشا کا دوسری مرتبہ بطور صدر انتخاب عمل میں آیا۔ اگست ۱۹۹۷ء میں اقوام متحدہ کی امن فوج کی واپسی کے بعد ہنگامے دوبارہ شروع ہوگئے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۹۸ء کو صدر بریشا کو قتل کر دیا گیا، جس کی وجہ سے الیرمیتا (Ilir Meta) (ولادت ۱۹۶۹ء) ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ملک کا وزیراعظم منتخب ہوگیا۔ وہ ۳۰ سال کی عمر میں، پورے یورپ میں سب سے کم عمر وزیراعظم ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔ جب ۱۹۹۹ء میں البانوی باشندوں کو، یوگوسلاویہ کے اختتام پذیر ہونے کے بعد، کسووو میں قتل کیا جانے لگا، تو اس کے نتیجہ میں دونوں ملکوں میں کشیدگی بڑھ گئی، البانوی حکومت نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے مطالبہ کیا کہ البانوی باشندوں کی حفاظت کی جائے (The Statesman's Year Book 2002، ص۱۳۳)۔ ۱۹۹۹ء میں کسووو کے بحران کے موقع پر، نیٹو (NATO) نے یوگوسلاویہ پر ہوائی حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا، جس کے نتیجہ میں مہاجرین کا ایک سیلاب البانیہ کی طرف آمڈ پڑا (The Statesman's Year Book 2005، ص۱۳۱)۔

۲۔ آئین: البانوی آئین پر برسوں کمیونسٹ طرز حکومت کی چھاپ رہی۔ حصول آزادی کے بعد ۱۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو البانیا کا آئین منظور کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۵ء، ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۳ء میں کچھ ترامیم کی گئیں۔ دسمبر ۱۹۷۶ء میں ایک نیا آئین بنایا گیا جس کے ذریعہ البانیا کو

سوشلسٹ عوامی جمہوریہ قرار دیا گیا، سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد فروری ۱۹۸۹ء میں ریفرنڈم کے ذریعہ ایک نیا آئین منظور کیا گیا تھا۔ عبوری آئین اپریل ۱۹۹۱ء میں نافذ ہوا۔ فروری ۱۹۹۲ء میں انتخابات کا نیا قانون منظور ہوا۔ ایک نئے آئین کا مسودہ نومبر ۱۹۹۴ء میں قومی ریفرنڈم کے ذریعہ منظور کرانے کی کوشش کی گئی، جسے قومی اسمبلی نے اکثریت سے مسترد کر دیا۔

۲۸ نومبر ۱۹۹۸ء سے نیا آئین نافذ ہے۔ اس کے مطابق قومی اسمبلی آئین سازی کا سب سے بڑا ادارہ ہے، اسی کو جنگ کا اعلان کرنے اور بین الاقوامی معاہدوں کی منظوری دینے کا اختیار حاصل ہے۔ البانیا کے صدر، سپریم کورٹ کے جج، اٹارنی جنرل اور اس کے معاونین کا بھی وہی تقرر یا منظوری دیتی کر ہے۔

[۲۴ جون اور ۸ جولائی ۲۰۰۱ء میں جو انتخابات ہوئے۔ ان میںPSS (سوشلسٹ پارٹی آف البانیا) نے ۱۷۰ نشستوں میں سے ۷۳ نشستیں حاصل کیں اور الفرڈ موسیو ۲۴ جون ۲۰۰۲ء سے ملک کا نیا صدر ہے]۔

نئے آئین کی روسے قومی اسمبلی [۱۴۰] ارکان پر مشتمل ہے جو چار سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۱۰۰ براہ راست منتخب ہوتے ہیں اور ۴۰ ارکان کا انتخاب بالواسطہ طور پر کیا جاتا ہے [صدر کے انتخاب کے موقع پر اگر کوئی شخص واضح برتری حاصل نہ کرے تو زیادہ ووٹ لینے والے امیدواروں کے درمیان دوبارہ مقابلہ ہوتا ہے اور واضح برتری لینے والا شخص ہی جمہوریہ کا صدر اور ریاست کا سربراہ مقرر ہوتا ہے]۔ اس کا پانچ سال کے لیے قومی اسمبلی خفیہ بیلٹ کے ذریعہ انتخاب کرتی ہے۔ کوئی شخص دو میعادوں سے زیادہ صدر نہیں رہ سکتا، صدارت کے عہدے کے دوران میں صدر کسی اور عہدے پر کام نہیں کر سکتا (The Stateman`s Year Book 2005، ص ۱۳۲)۔

صدر قومی اسمبلی کے بنائے ہوئے قانون کی توثیق اور وزارتی کونسل کے چیئرمین کا انتخاب کرتا ہے۔ جب مقننہ کا اجلاس نہ ہو رہا ہو تو صدر قومی اسمبلی کی طرف سے احکام صادر کرتا ہے (The Europa World Year Book، ۱:۳۲۵)۔

نئے آئین کی رو سے صدر کو زیادہ اختیارات حاصل ہیں۔ وہ تمام افواج کا کمانڈر انچیف ہے۔ دفاعی کونسل کے ارکان کو بھی وہی نامزد کرتا ہے، اور قومی اسمبلی اس کی توثیق کرتی ہے۔ ریاست کے بنیادی ادارے مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ ہیں۔ لوگ اپنا حق اپنے نمائندوں کے ذریعہ استعمال کرتے ہیں جن کو وہ آزادانہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست خفیہ بیلٹ کے ذریعہ منتخب کرتے ہیں۔ عدلیہ آزاد ہے۔ جس کی نظر میں تمام شہری برابر ہیں۔

پرچم: پرچم کا رنگ سرخ ہے، اس کے مرکز میں دو سروں والا کالا عقاب بنا ہوا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات: البانیا ۱۹۵۵ء سے اقوام متحدہ کا باقاعدہ رکن ہے۔ دسمبر ۱۹۹۲ء میں اسے اسلامی کانفرنس کی تنظیم OIC (Organization of the Islamic Conference) کا بھی رکن بنا لیا گیا۔ وہ نیٹو (NATO) میں شامل ہے۔ البانیا نے نیٹو کے ساتھ فوجی تعاون کا معاہدہ ۱۹۹۴ء میں کیا۔ البانیا یورپی کونسل میں جولائی ۱۹۹۵ء سے شامل ہے (The Stateman`s Year Book 2005، ۱:۳۱۹۔۳۲۰)۔

معیشت: [البانیا یورپ کا ایک غریب ملک ہے۔ اس کی معیشت بحران کا شکار ہے] ملک میں بیروزگاری کی شرح ۳۵ فیصد ہے اور ملک میں صنعتی پیداوار کی شرح ۱۹۹۲ء سے تقریباً نصف ہوچکی ہے۔ حکومت ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے ذریعے ایک نئے اقتصادی اصلاحی پروگرام پر عمل کر رہی ہے۔ جس کے تحت معاشی آزادی اور پرائیویٹائزیشن کے پروگرام سرفہرست ہیں۔ [کتاب مذکور،

ص ۱۳۲]۔ ملک میں جو معاشی تبدیلی آئی ہے اس کے تحت ملک کی معیشت حصول ملکیت کے مختلف طریقوں پر استوار ہے۔ معیشت میں زراعت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

سیاحت اور قدرتی ذرائع کو زیادہ اہمیت دی جارہی ہے۔ یہاں کی کرنسی لیک (Lek) کہلاتی ہے اور اعشاری نظام رائج ہے۔ ایک لیک ۱۰۰ کندار (Qindar) کا ہوتا ہے۔ مارچ ۱۹۹۷ء میں شرح تبادلہ اپونڈ=۲۲۱.۲۸ لیک اور امریکی ڈالر ۱۳۶ لیک کے برابر تھا۔

البانیہ پانی سے بجلی کی پیداوار میں خود مختار ہے، تیل اور گیس ۱۹۲۰ء سے ملک میں نکل رہا ہے | جس کے ذخائر کا اندازہ ۲۰ ملین ٹن ہے|۔ ۱۹۹۲ء میں خام تیل کی مجموعی پیداوار ۰.۹۹ ملین ٹن تھی۔ قدرتی گیس بھی نکالی جاتی ہے جس کے ذخائر کا اندازہ ۸،۰۰۰ ملین کیوبک میٹر ہے۔ ۱۹۹۳ء میں اس کی پیداوار ۱۰۰ ملین کیوبک میٹر تھی (*The State man's Year Book 1996-1997*، ۱:۳۱۹۔۳۲۰)۔

معدنیات: البانیا میں بھورا کوئلہ، کرومیم، کچ دھات، لوہا اور نکل وغیرہ پایا جاتا ہے۔

زراعت: ۱۹۹۶ء کی مردم شماری کی رو سے ۶۰% آبادی زراعت پر گزارہ کرتی ہے۔ تمام ملک میدانی علاقے، جنگلات اور پہاڑوں پر مشتمل ہے، یہاں ایڈریاٹک بٹرل (Adriatic bittaral)، کورچ (Korce)، کورتزا (Koritza) اور بیسن (Basin) کے علاقے بہت زرخیز ہیں *The States man's World Year Book*) ۹۸۔۱۹۹۷ء، ص۷۶)۔

البانیا میں انگور، گندم، چقندر، مکئی، آلو، سورگھم، کپاس، باجرہ، سورج مکھی، زیتون اور تمباکو وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔ زرعی ملک ہونے کی بنا پر مویشی عام پالے جاتے ہیں *The States man's World Year Book*) ۹۸۔۱۹۹۷ء، ص :۷۶)۔

صنعت: مجموعی پیداوار کم ہے، خاص صنعتیں زرعی پیداوار کے متعلق ہیں۔ ملک میں کپڑے، تیل صاف کرنے اور سیمنٹ کے کئی کارخانے ہیں۔ اس کے علاوہ، سٹیل، فاسفیٹ، ایمونیم نائٹریٹ، سلفیورک ایسڈ، سگریٹ، صابن، سبزیوں کا تیل اور شراب وغیرہ کے کارخانے بھی ہیں۔

مواصلات: ملک میں مواصلات کا بہت عمدہ نظام ہے، ڈاک، ٹیلی فون اور موبائل فون وغیرہ کا نظام عمدہ طور پر کام کر رہا ہے، اس کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی کام کر رہے ہیں، جبکہ پرائیوٹ طور پر ریڈیو کے ۱۴ سٹیشن ہیں، جن پر علاقائی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ (کتاب مذکور، ۹۸۔۱۹۹۷ء، ص۷۲۔۷۳)۔

سڑکیں: البانیا میں پورے ملک کے بڑے بڑے شہروں کو سڑکوں کے ذریعے باہم ملا دیا گیا ہے۔ ایک جائزے کی رو سے وہاں پر بعد ۱۹۹۸ء میں ۳،۲۲۱ کلومیٹر مرکزی شاہراہیں، ۴۲۷۸ کیلومیٹر دوسرے درجہ کی، اور ۱۰،۵۰۰ کیلومیٹر دوسری سڑکیں ہیں۔ (کتاب ۲۰۰۲ء، ص :۱۳۶)۔

ریلوے: اس کے علاوہ ملک میں ریلوے کا نظام بھی کام کررہا ہے، ۱۹۹۶ء میں ریلوے لائن کی لمبائی ۷۴۲ کلومیٹر تھی۔

فضائیہ: ''البانیہ ایئر لائن'' کے نام سے ملک کا ایک فضائی ادارہ قائم ہے جس کا معاہدہ کویت کی ایک کمپنی کے ساتھ ہے، اس نے اکتوبر ۱۹۹۵ء سے کام شروع کیا۔ ۱۹۹۸ء میں، البانیا کوکئی ملکوں سے فضائی پروازوں کے ذریعے ملا دیا گیا ہے، اس کے علاوہ دنیا کی اہم ترین فضائی کمپنیاں بھی، یہاں سے اپنی خدمات مہیا کر رہی ہیں۔

بندرگاہیں: اہم بندرگاہیں دریز (Durres)، ولور، سرندے اور شنجین (Shengjin) ہیں۔

عدلیہ: ایک نیا ضابطہ فوجداری جون ۱۹۹۵ء میں متعارف کرایا گیا، جس کی رو سے عدلیہ کا نظام مجلس عدل (Council of Justice) کے ذریعہ چلایا جاتا ہے جس کی

سربراہی جمہوریہ کا صدر کرتا ہے، جو عدالت کے لیے ججوں کا انتخاب کرتی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں وزرت قانون ۱۹۹۳ء میں پارلیمنٹ نے بنائی رائج الوقت قانون میں عورتوں کو پھانسی دینا ممنوع ہے (The Europa World Year book، ۱۹۹۶ء، ۳۲۷).

مذہبی حالات: البانیا کی ۷۰% آبادی مسلمان ہے جس میں اکثریت سنی مسلمانوں کی اور کچھ بکتاشی بھی ہیں۔ ۱۱ فی صد عیسائی (۴% قدامت پرست اور ۵% رومن کیتھولک) ہیں اور ۱۸ فیصد دوسرے مذاہب کے حامل ہیں (The State man's World Year Book 2005، [ص: ۱۳۳۔ ۱۳۴].

ایک اندازے کے مطابق البانیا میں بکتاشیوں کے ۳۶۰ زاویوں کے علاوہ ۸۰۰ مسجدیں ہیں۔ البانیا کی سب سے پرانی مسجد ۱۳۸۰ھ میں ترکوں نے بیرت میں بنائی۔ الیاس مرہوری مسجد کرک (Korce) میں ہے جو ۱۴۹۴ء میں تعمیر کی گئی۔ شکودر مسجد پورے البانیہ میں، اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ استانبول کے شاہی انداز تعمیر کا نمونہ ہے۔ عبدالرحمٰن باشی مسجد پکینی (Peqini) کے قریب واقع ہے جسے البانیا میں اسلامی تہذیب کے اعلی ترین نمونوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے، یہ مسجد ۱۸۲۲ء میں تعمیر ہوئی اس کا گھڑی والا مینار اور عام مینار مرکزی حصے سے متعلق ہیں (The Oxford Enclopeadia of Modern Islamic World، ۱:۶۵).

تعلیم: ابتدائی اور ثانوی تعلیم مفت اور لازمی ہے۔ ابتدائی تعلیم ۸ برسوں میں اور ثانوی ۴ سالوں میں مکمل کی جاتی ہے۔ ۹۶۔۱۹۹۵ء میں ۲،۶۷۰ ابتدائی سکول ۴،۴۱۶ اساتذہ ، تعلیم پر مامور تھے۔ یہاں چار یونیورسٹیاں تھیں، ایک زرعی یونیورسٹی، ایک ٹیکنالوجی یونیورسٹی، ایک پولی ٹیکنیک یونیورسٹی، ایک فائن آرٹس اکیڈمی اور فزیکل ایجوکیشن کچھ اعلی تعلیم کا ایک ادارہ تھا (The States man's World Year Book ،۲۰۰۲ء، ص ۱۳۷).

صحت: ملک میں طبی سہولیات مفت مہیا کی جاتی ہیں۔ البتہ ادویات کی قیمت لی جاتی ہے۔ ۱۹۹۳ء میں کل ۴۰ ہسپتال تھے، ۶۳۰۸ ڈاکٹر، ۱۸۰۱۴ نرسیں تھیں اور ۱۹۹۵ء میں ہسپتال کے ۱۰،۰۰۰ بستر تھے (کتاب مذکور، ص:۷۳).

مآخذ: (۱) The States man's World Year Book 1997-98، ص۷۳ ۲۰۰۲ء، ص۱۳۲، ۱۳۷؛ (۲) The New Encyclopaedia Britannica (Macropedia)، ۱:۱۹۰ بعد؛ (۳) World Muslim Gazetteer، ۴۹ تا ۵۶؛ (۴) The Europa World Year Book 1996-1997، ۱:۳۱۶ تا ۳۳۱؛ (۵) New Age Encyclopaedia، ۱:۱۹۷ تا ۱۹۹؛ (۶) Deaek Hall: Albania and the Albanian، لنڈن، نیویارک ۱۹۹۴ء؛ (۷) The Oxford Encyclopaedia of the Modern Islamic World، ۱:۶۵ تا ۶۷؛ (۸) Marmalaka Ramadan: Albania and Albanica، لنڈن ۱۹۷۵ء؛ (۹) Skendi Staro: The Albanian Awakening 1878، پرنسٹن ۱۹۶۷ء؛ (۱۱) اسلامی الماننک، ۵۴ تا ۵۸.

(شمیم روشن آرا [و محمود الحسن عارف])

••-------------••

التزام: (ج) زراعتی محصول کی ایک قسم جو سلطنت ؐ عثمانیہ میں مستعمل تھی (عثمانی التزام پر خصوصی بحث کے لیے دیکھیے آآآ بذیل ملتزم)۔ [یہ مقالہ انیسویں صدی مصر کے التزام سے متعلق ہے۔ (ادارہ)].

مصر میں التزام بحیثیت ایک زرعی نظام محمد علی کی مرکزی دفتر شاہی حکومت کے قیام کی کوششوں سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے عہد حکمرانی سے متصل

پہلے دور میں التزام ایک دو برس یا چند برسوں کے لیے بھی عطا نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ قابض شخص [زمیندار] کو زندگی بھر کے لیے اور اس سے بڑھ کر قابل وراثت اور انتقال پذیر جائداد کے طور پر عطا کرنے کا رواج پڑ چکا تھا۔ اس طرح ریاست زرعی محاصل کے ایک حصے سے محروم ہو جاتی تھی، علاوہ ازیں وراثتی التزامات اقتدار کے نئے مراکز کے قیام کا باعث بن رہے تھے۔ اس عہد کے اہم ملتزمین قبائلی شیوخ اور علما تھے جو اس حیثیت میں خاصی بڑی دولت جمع کر رہے تھے اور زبردست سیاسی اثرات کے مالک تھے (جبرتی، ۴: ۶۸).

مصر پر فرانسیسی انتداب کے دوران میں التزام کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی (دیکھیے المویلحی، در BIE، (۳۰): ۱۹۴۹ء، ص ۱۹۷-۳۲۸)، لیکن کامیابی نہ ہوئی، بلکہ یہ نظام بعد میں دوبارہ قائم کر دیا گیا۔ محمد علی نے اپنے عہد حکمرانی کے ابتدائی برسوں میں کسانوں پر بتدریج براہ راست لگان کا بوجھ ڈالنا شروع کیا (یعنی یہ ٹیکس ملتزمین کے توسط سے نہیں لگایا گیا) اور ملتزمین کے فائض (منافع) کا کچھ حصہ ضبط کر لیا اور پھر ۱۸۰۸ء تا ۱۸۱۰ء میں ان ملتزمین کے پورے کے پورے التزامات چھین لیے گئے جو اپنے واجبات ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔ مارچ ۱۸۱۱ء میں محمد علی نے ممالیک کا اندھا دھند قتل عام کیا اور اس سال کے آخر میں اس نے ایک خاص دیوان قائم کیا جو معلومات جمع کر کے اور کسانوں کی شکایات کا ازالہ کر کے، ملک میں ملتزمین کا قلع قمع کرتا رہا۔ مئی ۱۸۱۲ء میں بالائی مصر میں ممالیک کی مکمل شکست کے بعد اس علاقے کے تمام التزامات کو بغیر معاوضہ دیے ضبط کر لیا گیا۔ یہ قطعات دوسرے ملتزمین کو منتقل نہیں کیے گئے، بلکہ المضبوط کے نام سے حکومت کے ہاتھ میں رہے۔ فروری مارچ ۱۸۱۴ء میں زیریں مصر میں بھی اسی طرح التزامات ضبط کر لیے گئے اور اراضی حکومت کی طرف منتقل ہو گئی۔ البتہ یہاں ملتزمین کو ان کے سابق فائض کے مساوی زندگی بھر کے لیے سالانہ وظیفہ دیا گیا (جو بعد میں موروثی بن گیا)۔ ۱۸۱۵ء میں محمد علی نے فوج اور علما کے زبردست دباؤ کے باوجود اپنی اصلاحات برقرار رکھیں اور دعویداروں اور باغیوں کو خالی خولی وعدوں پر ٹرخا دیا.

اسیہ اراضی (یعنی التزام کا وہ حصہ جو ملتزم کو اس کے اپنے استعمال کے لیے دیا جاتا تھا) بالائی مصر میں التزامات کے ساتھ ہی ضبط کر لی گئی۔ زیریں مصری علاقے میں ملتزمین کے احتجاج کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہیں ایسی زمینوں پر حق استفادہ دے دیا گیا۔ بنیادی طور پر فرض کیا جاتا تھا کہ اسیہ اراضی ملتزمین کی وفات پر ریاست کو واپس مل جائے گی مگر ملتزمین عملی طور پر ایسی زمینوں کو وقف اہلی قرار دے دیتے تھے۔ اس کی پیش بندی کے طور پر سعید نے ۱۸۵۵ء میں فرمان جاری کیا کہ جس شخص کو بھی اسیہ اراضی کے حقوق حاصل ہوں گے اسے اجازت ہوگی کہ وہ اسے قانونی ترکے میں دے سکے اور ایسی زمین صرف اس صورت میں ریاست کی طرف لوٹے گی جب قابض خاندان کا کوئی فرد باقی نہ رہ جائے.

زیریں مصر کے ملتزمین کا سالانہ وظیفہ معمولی (التزام) تھا کیونکہ بالعموم حکومت کو کم رقم ادا کرنے کے پیش نظر یہ تدبیر اختیار کی جاتی تھی کہ حقیقی آمدنی کے مقابلے میں کم آمدنی ظاہر کی جائے۔ اس کے علاوہ وظیفے کی رقم میں وقتاً فوقتاً کمی کی جاتی رہی اور اس کے ادائی یکمشت نہیں کی جاتی تھی۔ ۱۸۲۱ء سے ۱۸۳۵ء کے مابین یہ رقم چھ ہزار کس سے کم ہو کر پچیس سو رہ گئی۔ پھر ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۵ء کے قوانین کی رو سے اس کی جگہ زندگی بھر کے لیے صرف ایک ہی بار ادائی نے لے لی.

مندرجہ بالا کا تعلق صرف زرعی محاصل والے

التزامات سے ہے، مگر وہ مالگزاری (التزام یا مقاطعہ، یورپی منافع میں appalto) جس کا تعلق شہری محاصل، مخصوص قسم کی اشیا کی فروخت یا پیداوار اور بعض عوامی ضرورت کی اشیا کی فراہمی سے ہے تو وہ ۱۸۷۰ء کی دہائی تک باقی رہی۔ ایسے التزامات، جو نیلامی کے لیے پیش کیے جاتے تھے، مختلف ادوار میں حسب ذیل پر مشتمل تھے: محصولات اور چنگی، اشتام، نمک، مختلف شرابوں اور عطریات، سنا، مختلف بیجوں اور پام [تاڑ] کے پتوں کی فروخت، مخصوص بازاروں کو (مویشیوں کی منڈیوں کے زوال کے زمانے میں ۱۹۰۰ تک) پٹے پر دینا، شکار بازی اور ماہی گیری، پارچہ بافی اور دوسرے کارخانے جو محمد علی نے ان صنعتوں کے زوال کے زمانے میں ۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۰ء کی دہائیوں میں قائم کیے، سرکاری جریدے کی طباعت (۱۸۶۳ء)، دریائے نیل میں کشتیوں کے ذریعے نقل وحمل، ذبح خانے، مختلف شہروں میں اوزان و پیمائش، نیلام اور توارث وانتقال [جائیداد] کا مختارانہ۔ ۱۸۴۳ء اور ۱۸۵۵ کے قوانین میں نیلامی کے مواقع پر ملتزمین کی موجودگی کے بارے میں ضوابط بنائے گئے، ان کے مابین خفیہ معاہدوں کی ممانعت کر دی گئی اور بے تحاشہ قیمتوں پر فروختگی، غیر معقول واجبات کے ذریعے ناجائز دباؤ اور دوسرے جرائم پر مقررہ جرمانے عائد کیے گئے۔ جونہی مناسب حکام اور اہل کار عوامی خدمات کے سلسلے میں فرائض سنبھالنے یا محصولات کی براہ راست وصولی کے لیے میسر آنے لگے، التزامات کو منسوخ کر دیا گیا۔ ان کی تنسیخ کا یہ نتیجہ نکلا کہ عمومی طور پر محاصل میں خاصہ اضافہ ہوگیا۔

مآخذ: (۱) عبدالرحمٰن الجبرتی: عجائب الآثار فی التراجم والاخبار، بولاق ۱۲۹۷ھ/۸۰-۱۸۷۹ء؛ (۲) فیلب جلاد: قاموس الادارہ والقضاء، اسکندریہ، ۱۸۹۰ء؛ (۳) امین سامی: تقویم النیل، قاہرہ ۱۹۱۶ء - ۱۹۳۶ء؛ (۴) H. A. B. Revlin: *The Agricultural Policy of Muhammad Ali in Egypt*، کیمبرج، ۱۹۶۱ء؛ (۵) G.Baer: *A History of Land Ownership in Modern Egypt 1800-1950*، لنڈن ۱۹۶۲ء؛ (۶) وہی مصنف: *The Evolution of Private Landowership in Egypt and the Fertile Crescent*، در C.Issawi (مدیر): *The Ecomonic History of the Middle East*، شکاگو ۱۹۶۶ء، ص ۸۰-۹۰.

(G.Baer، [ت: امین اللہ وثیر])

••-------------••

الجزائر: شمالی افریقہ کا ایک مسلمان ملک ۔ الجزائر کی ⊗ قدیم تاریخ، اشاعت اسلام، اسلامی عہد حکومت، فرانسیسی تسلط اور اعلان آزادی (۵ جولائی ۱۹۶۲ء) تک کے سیاسی اقتصادی اور تہذیبی ومعاشرتی حالات کے لیے دیکھیے مقالہ الجزائر در، آآآ [۳:۸۰-۱۱۷؛]

الجزائر کے شمال میں بحیرۂ روم، مشرق میں تیونس اور لیبیا، جنوب میں نائیجر، مالی اور موریطانیہ جب کہ مغرب میں مراکش اور مغربی صحراء (ہسپانوی صحراء) کا مغربی حصہ واقع ہے۔ ملک کا کل رقبہ ۲,۳۸۱ ,۷۴۰ مربع کلومیٹر ہے۔ انتظامی اعتبار سے ملک کو ۴۸ اضلاع (ولایات) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بڑے شہروں میں الجزائر (دارالحکومت)، وھران، قسطینۃ، عنابہ، بطنہ، سطیف، سیدی، ابن عباس، سقیقہ، بسکرۃ، البلیدہ، بجایۃ، مستغانم، تبسۃ، تلمسان، بشار، تیزی أورو، معسکر، غردیۃ، اور تاھرۃ شامل ہیں۔

آبادی اور اہم شہر: ایک سرکاری اندازے (جولائی ۲۰۰۲ء) کے مطابق ملک کی کل آبادی ۳۲،۲۷۷،۹۴۲ نفوس پر مشتمل ہے۔ آبادی کی بڑی اکثریت (۹۹%) عرب بربر افراد پر مشتمل ہے۔ جو سنی العقیدہ مسلمان

ہیں۔ یہودی اور مسیحی یورپی آبادکاروں پر مشتمل ایک مختصر سی غیر مسلم اقلیت بھی موجود ہے (CIA: *The World Factbook 2002*، ص ٦).

ملک کا سرکاری مذہب اسلام،جب کہ قومی زبان عربی ہے۔ بربر آبادی کی زبان تمازغہ (Tamazight) کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ سرکاری خط و کتابت اور اعلیٰ سطحی تعلیم و تدریس کے لیے زیادہ تر فرانسیسی استعمال ہوتی ہے۔

الجزائر کے عوام کو ایک طویل اور صبر آزما جنگ آزادی (١٩٥٤-١٩٦٢ء) کے نتیجے میں جولائی ١٩٦٢ء کو فرانسیسی تسلط (١٨٣٠-١٩٦٢ء) سے نجات ملی۔آزادی کی اس جدوجہد میں الجزائری مسلمانوں کو بھاری قیمت چکانا پڑی تھی۔ جنگ کے دوران میں دس لاکھ سے زائد افراد جو (کل آبادی کا دسواں حصہ تھے) شہید ہوے، جب کہ بیس لاکھ سے زائد افراد محفوظ مقامات کی تلاش میں اپنے ہی ملک میں اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے۔ ان میں سے دو سے پانچ لاکھ افراد ہمسایہ ممالک تیونس اور مراکش کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوے۔ جب کہ دس لاکھ سے زائد افراد، نظر بندی کیمپوں میں محصور ومحبوس رہے۔ چنانچہ جب الجزائر آزاد ہوا تو اس وقت اس کا تہذیبی و سماجی اور تعلیمی و اقتصادی ڈھانچہ، استعماری طاقت کے سیاسی و انتظامی اقدامات اور اس کی افواج کی جنگی کاروائیوں کی بدولت، بری طرح سے شکست و ریخت سے دوچار ہوچکا تھا (Alasdair Drysale و Gerald H. Blake: *A Political Geography The Middle East and North Africa* ، نیویارک، ١٩٨٥ء، ص ١٨٨؛ David C.Gordon: *The Passing of French Algeria* ، نیویارک، ٹورنٹو، ١٩٦٦ء، ص٨٣-٨٥؛ Mahfoud Bennoune: *The Making of Contemporary Algeria*، کیمبرج، نیویارک، ١٩٨٨ء، ص٨٩-٩٠؛ John P. Entelis: *Religion and Politics in Algeria: Conflict or Consensus?*، در *Islam and Christian- Muslim Relations*، ١٢:٤ (٢٠٠١ء)، ص ٤١٨؛ تفصیل کے لیے دیکھیے: وہی مصنف: *Algeria:The Revolution Institutionalized*، بولڈر کولو، ١٩٨٦ء، ص ٦٩- ١١٠).

معاہدۂ آزادی: الجزائر کی آزادی کے لیے قومی محاذ آزادی (FLN=Front de Liberation Nationale) اور حکومت فرانس کے مابین طے پانے والے 'معاہدہ ایوین' (Accords d`Evian، ٨ مارچ ١٩٦٢ء) میں اگرچہ فرانس نے الجزائر کے حق آزادی کو تسلیم کر لیا تھا، تاہم اس نے اس معاہدے میں اس ملک کے اندر اپنی سیاسی، معاشی، عسکری اور تہذیبی وثقافتی موجودگی اور فرانسیسی و یورپی آباد کاروں (Colons) کے قانونی و سیاسی حقوق و مراعات اور معاشی مفادات کے تحفظ کو یقینی بنانے کا پورا اہتمام کیا تھا۔ اس معاہدے میں فرانس نے بہت سے ایسے حقوق ومراعات حاصل کر لی تھیں جو مستقبل قریب میں آزادی سے ہم کنار ہونے والی الجزائری ریاست کی حاکمیت وخود مختاری سے کوئی مناسبت نہ رکھتی تھیں، مثلاً یہ کہ فرانس الجزائر میں پہلے سے موجود اپنے تہذیبی وتمدنی اداروں کو باقی وقائم رکھے گا، بعض ریڈیائی نشریات اور سرکاری دستاویزات فرانسیسی زبان میں دستیاب رہیں گی، یورپی آبادی اپنے روزمرہ انتظامی معاملات میں فرانسیسی زبان ہی استعمال کرے گی، الجزائر میں تعلیم کا نظام فرانس کی امداد وتعاون سے مؤخرالذکر ملک میں رائج نظام تعلیم کے نہج پر ڈھالا جائے گا، یورپی آباد کاروں کو الجزائری پارلیمنٹ میں ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے گی اور ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک منظم ادارہ (*Association de Sauvegarde*)

جب کہ ان کے ساتھ امتیازی برتاؤ کے تدارک وانسداد کی غرض سے ایک خصوصی عدالت (Court of Guarantees)، قائم کی جائے گی۔ اس معاہدے میں الجزائر کو فرانک زون میں رہنے کا پابند کر کے فرانس نے گویا دونوں ممالک کے مابین ترجیحی تجارتی تعلقات کے نام پر الجزائر کی بیرونی تجارت کو بدستور اپنی گرفت میں رکھنے کا بندوبست کیا تھا۔ مزید براں فرانس کو الجزائر کے علاقہ الصحراء (بجائے صحارا) میں قدرتی وسائل بالخصوص تیل و گیس کے ذخائر کی دریافت و ترقی کے لیے شروع کی گئی اسکیموں کو جاری رکھنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ فرانس کی طرف سے الجزائر کو تعمیر نو کی غرض سے مالی امداد کے علاوہ مختلف شعبوں میں تکنیکی امداد و تربیت اور عملہ فراہم کرنے کی ضمانت بھی فراہم کی گئی۔ سب سے اہم یہ کہ عرصہ پانچ سال کے لیے فرانس نے مختلف علاقوں میں موجود اپنی عسکری تنصیبات اور ہوائی اڈوں پر کنٹرول کے اختیار کے علاوہ مرس الکبیر (Mers el-kabir) کا بحری مستقر عرصہ پانچ سال کے لیے پٹے پر حاصل کر لیا تھا۔ یوں 'معاہدہ ایوین' کے تحت فرانس نے بہت زیادہ حد تک الجزائر میں اپنے دیرپا تہذیبی، سیاسی، اقتصادی اور فوجی مفادات کے تحفظ کا انتظام کر لیا (Keith Irvine: *Towards a Greater French Community*، در *Current History*، ۵۴: ۳۱۹ (مارچ ۱۹۶۸ء)، ص ۱۴۸؛ *The Passing of French Algeria*، ص ۷۷-۷۸؛ William E. Watson: *Tricolor and Crescent: France and the Islamic World*، لنڈن، ویسٹ پورٹ، ۲۰۰۳ء، ص ۲۱۱- ۲۳۸، ۲۶۷-۲۶۸).

فرانس نے 'معاہدہ ایوین' پر دستخط اس مفروضے کی بنیاد پر کیے تھے کہ الجزائر میں یورپی وفرانسیسی آباد کاروں کی اکثریت موجود رہے گی اور آئندہ ریفرنڈم (یکم جولائی ۱۹۶۲ء) میں الجزائری عوام، فرانس کے ساتھ قریبی اتحاد واشتراک کو قائم رکھتے ہوئے، الجزائر کی آزادی کے حق میں ووٹ دیں گے۔ تاہم فرانس کی طرف سے قومی محاذ آزادی (FLN) سے رعایتوں کے حصول کے باوجود ۱۹۶۲ء کے موسم خزاں تک غیر ملکیوں کی بھاری اکثریت الجزائر سے نقل مکانی کر گئی۔ الجزائر میں آباد ۸۵۰,۰۰۰ یورپی نفوس میں سے صرف آٹھواں حصہ باقی رہ گیا۔ اس ملک میں نو آبادیاتی دور میں آباد ہونے والے ۱۳۰,۰۰۰ یہودیوں میں سے ۱۱۰,۰۰۰ فرانس جب کہ ۱۰,۰۰۰ اسرائیل کی طرف ہجرت کر گئے۔ ریفرنڈم میں الجزائری عوام نے نوآبادیاتی حکمرانوں کی توقعات کے برعکس فرانسیسی تسلط سے مکمل آزادی کے حق میں رائے دی (*The Passing of French Algeria*، ص ۷۱).

نوآبادیاتی دور میں الجزائر کا تہذیبی ومعاشرتی اور اقتصادی وتعلیمی ڈھانچہ گہرے طور سے شکست وریخت کا شکار ہوا تھا چنانچہ معاہدہ آزادی کے بعد قومی محاذ آزادی (FLN) کو گزشتہ کئی سالوں تک عسکری محاذ پر استعماری قوت کے خلاف برسرپیکار رہنے کے بعد اب آزاد الجزائر کی تعمیرنو کا وسیع الاطراف چیلنج درپیش ہوا۔ آزاد الجزائر کے سیاسی، معاشی، تعلیمی و ثقافتی ڈھانچے کی تشکیل، بین الاقوامی تعلقات کے قیام اور ملک کی نظریاتی جہت کے بارے میں رہنما اصولوں کے تعین کی غرض سے طرابلس میں قومی محاذ آزادی (FLN) کے ایک بڑے اجتماع (مئی-جون ۱۹۶۲ء) میں ایک جامع لائحہ عمل، جسے بالعموم 'طرابلس پروگرام' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کی منظوری دی گئی۔ اس پروگرام میں، جسے آزاد الجزائر کی تاریخ میں ایک اہم سیاسی دستاویز کی حیثیت حاصل رہی ہے، ملک میں اشتراکی نظام کی ترویج، اقتصادی وسائل کی قومی تحویل، عالمی سیاست میں غیر جانبداریت اور سامراجیت کی مخالفت کو

رہنما اصول ٹھہرایا گیا۔ 'طرابلس پروگرام' دراصل 'معاہدہ ایوین' کے استرداد کا آئینہ دار تھا اس میں آزاد الجزائر میں فرانس اور یورپی آبادکاروں کو دی جانے والی مراعات وتحفظات کو سامراج کی ایک نئی تزویر (strategy) کے طور پر دیکھا گیا (کتاب مذکور، ص ۷۷-۷۹؛ Religion and Politics in Algeria، ص ۴۱۷-۴۱۹)۔

احمد بن بیلا کا دور حکومت: جنگ آزادی کے دوران قاہرہ میں الجزائر کی ایک عبوری حکومت (GPRA: Gouvernement Provisoire de La Republique Algerienne) قائم کی گئی (۱۹۵۸ء) تھی۔ عبوری حکومت نے جنگ آزادی کی قیادت بڑی کامیابی سے کی۔ یہ حکومت تاریخی و قانونی اعتبار سے الجزائری عوام کی ایک جائز نمائندہ حکومت تصور کی جاتی تھی۔ تاہم معاہدہ ایوین پر دستخط ہوتے ہی عبوری حکومت کے ایک نائب صدر اور قومی محاذ آزادی کے ایک رہنما احمد بن بیلا (ولادت : ۱۹۱۹ء) نے تیونس ومراکش میں موجود قومی محاذ آزادی کی فوج 'نیشنل لبریشن آرمی' (ALN: Armee de Liberation Nationale) کی اعلیٰ قیادت سے عبوری حکومت (GPRA) کے خلاف سازباز کر لی اور اعلان آزادی کے ساتھ ہی فوج (ALN) کی حمایت وتعاون سے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا (The Making of Contemporary Algeria،ص ۹۵، ۱۰۸-۱۱۰)۔ جولائی ۱۹۶۲ء کو اعلان آزادی کے بعد قومی محاذ آزادی کی سیاسی بیورو کے ارکان پر مشتمل الجزائر کی حکومت کا قیام عمل میں آیا اور احمد بن بیلا اس کا سربراہ (وزیراعظم) مقرر ہوا (کتاب مذکور، ص ۷۳-۷۴؛ William H.Lewis: The Decline of Algeria's FLN، در Man, State and Society in Contemporary Maghrib، مدیر: I.William Zartman، نیویارک، ۱۹۷۳ء، ص ۳۳۴-۳۳۵)۔ ستمبر

۱۹۶۲ء میں آزاد الجزائر میں منعقد ہونے والے پہلے انتخابات کے نتیجے میں ایک ایسی دستور ساز اسمبلی وجود میں آئی جس کے ارکان کو فوج اور قومی محاذ آزادی (FLN) کے سیاسی بیورو نے نامزد کیا تھا۔ یہ اسمبلی حقیقی اختیار واقتدار سے یکسر محروم تھی، چنانچہ ملک کے اہم ترین سیاسی ودستوری معاملات میں اس کا کردار انتہائی محدود رہا۔ آئندہ سال (جولائی ۱۹۶۳ء) میں بن بیلا حکومت اور قومی محاذ آزادی کے سیاسی بیورو نے 'طرابلس پروگرام' کو اساس بنا کر ملک کے لیے ایک ایسا دستور وضع کیا جس میں بن بیلا کو بہت زیادہ سیاسی وانتظامی اختیارات تفویض کیے گئے، جب کہ سیاسی جماعت 'قومی محاذ آزادی' کو ملکی نظم ونسق میں کلیدی کردار سونپ دیا گیا۔ اس دستور کو قومی اسمبلی کو نظر انداز کرتے ہوئے محض 'قومی محاذ آزادی' کی منظوری کے بعد نافذ کر دیا گیا۔ بعدازاں ایک ریفرنڈم (ستمبر ۱۹۶۳ء) کے ذریعے اس دستور کی توثیق اور بن بیلا کا ملک کے صدر کے طور پر انتخاب عمل میں آیا۔ بن بیلا نے جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کرنے والے اپنے بااعتماد ساتھیوں پر مشتمل ایک ایسی کابینہ تشکیل دی جس میں فوج کے افسر اعلیٰ ہواری بومدین کو وزیر دفاع مقرر کیا گیا۔ یوں الجزائر میں آزادی کے ابتدائی دنوں ہی سے فوج اقتدار میں حصہ دار بن گئی (I.William Zartman: The Algerian Army in Politics در Man, State and Society in Contemporary Maghrib، ص۳۱۱-۲۲۳؛ The Passing of French Algeria، ص ۱۰۱-۱۰۶، ۱۳۰-۱۳۸)۔

آزاد الجزائر کے سیاسی وانتظامی مسائل: بن بیلا کو اپنے تمام تر دور حکومت (۱۹۶۲ - ۱۹۶۵ء) میں داخلی وخارجی محاذ پر سنگین مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اعلان آزادی کے ساتھ ہی ملک میں سیاسی خلفشار اور

بدنظمی نے سر اٹھایا اور اگست ۱۹۶۲ء تک ملک میں تین متوازی حکومتیں وجود میں آگئیں۔ تاہم بن بیلا نے فوج کی حمایت سے جلد ہی ملکی سیاست پر اپنی گرفت مضبوط کرلی (P.J.Vatikiotis: The Traditional and Political Leadership: Examples of Algeria، در Man, State, and Society in Contemporary Maghrib، ص ۳۱۱-۳۱۳، ۳۱۸-۳۲۵)۔ دستور میں متعین کردہ نظریاتی جہت (اشتراکیت اور لادینی نظام حکومت) اور حکومت کی ثقافتی ولسانی پالیسیوں کی ملک کے دینی گروہوں اور قبائل کی طرف سے مخالفت کی گئی۔ آزادی کے اگلے ہی سال (ستمبر-اکتوبر ۱۹۶۳ء) قبائل نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ بغاوتوں کا یہ سلسلہ آئندہ سال (۱۹۶۴ء) کے اختتام تک برابر جاری رہا (The Passing of French Algeria، ۱۴۲-۱۴۳)۔ سیاسی خلفشار کے اس دور میں ملک کے انتظامی ڈھانچہ کی تشکیل، اقتصادی بحالی، عوام کو بنیادی سہولیات اور ضروریات زندگی کی فراہمی بالخصوص سالہاسال سے نظربندی کیمپوں میں محبوس ومحصور یا پھر محفوظ مقامات کی تلاش میں سرگرداں آبادی کی اپنے قدیم علاقوں میں آبادکاری جیسے مسائل بڑی سنگین صورت حال اختیار کر گئے تھے۔ ملک سے بہت بڑی تعداد میں یورپی آبادکاروں کے نقل مکانی کر جانے سے، انتظامی ڈھانچہ اور تعلیم وصحت کے شعبے شدید طور سے متاثر ہوئے تھے۔ ان حالات میں احمد بن بیلا کو مہارت یافتہ افرادی قوت، بالخصوص ڈاکٹروں کی خدمات کی فراہمی کے لیے سوویت یونین، مشرقی یورپ، جب کہ اساتذہ کے لیے مشرق وسطیٰ کے ممالک سے مدد طلب کرنا پڑی۔ یورپی آبادکاروں کی اکثریت کے چلے جانے اور اپنا سرمایہ فرانس اور دیگر ممالک کو منتقل کرنے سے بہت سے کارخانے بند ہوگئے، جس کی بدولت بے روزگاری میں اضافہ ہوگیا (۱۹۶۴ء تک بیس لاکھ سے زیادہ افراد بے روزگاری کا سامنا کر رہے تھے)۔ ۱۹۶۳ء میں بجٹ خسارہ ۷۷۰ ملین فرنک تک جا پہنچا۔ بن بیلا نے معیشت کی بحالی کے لیے ملک کے معاشی وسائل کے علاوہ غیر ملکیوں کی املاک اور کارخانوں کو قومیانے اور ملک میں 'اشتراکیت' کی ترویج کا بیڑا اٹھایا۔ بن بیلا نے فرانس اور امریکہ کے مقابلے میں سوویت یونین سے تعلقات کی استواری کو ترجیح دی تھی جسے شمالی اوقیانوس کی دفاعی تنظیم (ناٹو) کی طرف سے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس اقدام سے نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ ابتدائی سالوں میں معیشت کا انحصار بیرونی امداد اور قرضوں پر رہا۔ خارجی محاذ پر بھی الجزائر کو سخت حالات کا سامنا رہا (کتاب مذکور، ص ۶۱-۸۶؛ Damian Helie: Industrial Self-Management in Algeria، در Man, State, and Society in Maghrib، ص ۴۶۵-۴۷۴؛ Robert Merlo: Ben Bella، لنڈن، ۱۹۶۷ء، ص ۱۲۱-۱۴۱، ۱۶۰-۱۴۲؛ The Making of Contemporary Algeria، ص ۸۹-۱۱۰؛ The Traditional and Political Leadership، ص ۳۲۴-۳۲۶؛ Tricolor and Crescent، ص ۱۴۰؛ The Passing of French Algeria، ص ۱۱۷-۱۱۸)۔

بن بیلا کے دور حکومت میں، حکمران جماعت قومی محاذ آزادی (F.L.N) کے سوا تمام جماعتوں کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ قومی محاذ آزادی کو ملک کی سب سے بڑی اور طاقت ور سیاسی جماعت بنانے کی غرض سے اس کے حلقہ اثر کو انتظامیہ، مزدور انجمنوں، پیشہ ورانہ مجالس اور اداروں، خواتین اور نوجوانوں کی تنظیموں تک وسیع کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ملک کے تمام اخبارات وجرائد کو سرکاری کنٹرول میں لے لیا گیا۔ اپریل ۱۹۶۴ء میں 'قومی

محاذ آزادیؑ' کی کانگریس میں، جس میں فوج کے مندوبین بھی شریک ہوئے تھے، ملک کے سیاسی وانتظامی معاملات میں فوج کے کردار اور حکمران جماعت 'قومی محاذ آزادی' کی آئیڈیولوجی اور منشور میں 'اسلام' کی حیثیت کے تعین جیسے مسائل نمایاں اہمیت اختیار کر گئے۔ اصلاح پسند دینی جماعت 'جمعیت علما الجزائر' [رک بہ آآآ بذیل مادہ] کے قائد شیخ بشیرالابراہیمی [رک بآں مقالہ جمعیت علما الجزائر در تکملہ آآآ بذیل مادہ] کی طرف سے امور حکومت میں 'اشتراکیت' کے بجائے اسلامی وعربی تعلیمات واقدار کو رہنما بنانے کا مطالبہ کیا گیا اور دینی تعلیمات واقدار کے متعلق بن بیلا کے طرز عمل پر سخت تنقید کی گئی۔ اس کانفرنس کے چند ماہ بعد (جولائی ۱۹۶۴ء) فوج کے ایک گروہ نے، جسے قومی محاذ آزادی کے بعض سرکردہ رہنماؤں کی حمایت حاصل تھی، کرنل شعبانی کی قیادت میں حکومت کے خلاف بغاوت کر دی، تاہم اس پر جلد ہی قابو پا لیا گیا۔ کرنل شعبانی کو سزائے موت دی گئی، جب کہ قومی محاذ آزادی میں بن بیلا کے سیاسی حریفوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایک سال بعد (جون ۱۹۶۵ء) میں بن بیلا حکومت کے بعض ایسے اقدامات جن کا مقصد ملکی سیاست وانتظامی امور میں فوج کے اثر ورسوخ اور عمل دخل کو کم کرنا تھا، کے ردعمل میں فوج کے افسر اعلیٰ حواری بومدین نے بن بیلا حکومت کا تختہ الٹ کر ۱۹ جون ۱۹۶۵ء) اقتدار خود سنبھال لیا (*The Passing of French Algeria*، ص ۱۴۶- ۱۴۷، ۱۵۳؛ E.A. Alport: *The Socialism in Three Countries: The Record in the Maghrib*، در *International Affairs*، شمارہ اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۶۸۵- ۶۸۷؛ *The Decline of Algeria's F.L.N*، ص۳۳۸-۳۳۹؛ Hugh Roberts: *The Politics of Algerian Socialism*، در *North Africa*، مدیران: Richard Lawless و Allan Findlay، لنڈن، کانبرا، ۱۹۸۴ء، ص۸-۹، ۱۳-۱۶).

بومدین دور حکومت: بن بیلا حکومت کے خاتمہ پر فوجی افسران اور قومی محاذ آزادی کے بعض ارکان پر مشتمل نئی حکومت کا قیام عمل میں آیا جس میں بومدین وزیراعظم اور وزیر دفاع مقرر ہوا۔ بومدین نے اقتدار پر اپنی گرفت کو مضبوط ومستحکم بنانے کے لیے ملک میں موجود سیاسی اداروں، قومی اسمبلی، سیاسی بیورو اور قومی محاذ آزادی کی مرکزی مجلس کو کالعدم کر دیا۔ چنانچہ فوج کو ملک کی سیاسی قوت کے مرکز ومحور کا درجہ حاصل ہوگیا (*The Making of Contemporary Algeria*، ص۱۱۱-۱۱۳)۔ بومدین کے دور حکومت میں انتظامیہ کی کارگزاری کو بہتر بنانے کے علاوہ ملک میں 'اشتراکی انقلاب' برپا کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی۔ حکمران سیاسی جماعت (FLN)کی تنظیم نو کی گئی اور صوبائی محکمہ جات کے ساتھ اس کا قریبی ربط پیدا کیا گیا۔ معیشت کے وہ شعبے جو تاحال نجی شعبہ میں تھے، انہیں بھی ریاستی کنٹرول میں لے لیا گیا۔ غیر حاضر مالکان کی زمینوں اور دیگر املاک کے علاوہ غیر ملکیوں کے قبضے میں موجود بعض معدنی کانوں کو بھی قومی اختیار میں لے لیا گیا۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آغاز پر ملک میں زرعی اصلاحات متعارف کرائی گئیں۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں ریاست کی ملکیت میں موجود زمینوں اور نجی املاک کی ازسرنو تقسیم عمل میں آئی۔ مزید براں اناج کی تقسیم کے نظام کو ریاستی تحویل میں لے لیا گیا۔ 'اشتراکیت' کی ترویج کے لیے بومدین حکومت کے ان اقدامات کو دیہی آبادی، قبائل اور دینی حلقوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بومدین کے دور میں بھی حکمران جماعت قومی محاذ آزادی کے علاوہ دیگر تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی بدستور قائم رہی۔ قومی محاذ آزادی کی طرف سے

سرکاری تعلیمی اداروں تک اپنا حلقہ اثر ونفوذ وسیع کرنے اور ہم خیال طلبہ کو منظم کرنے پر خاص توجہ دی گئی۔ اپریل ۱۹۷۶ء کو ایک نئے قومی چارٹر (میثاق) کی منظوری بذریعہ ریفرنڈم عمل میں آئی۔ اس چارٹر میں ملکی سیاست و انتظامی امور میں قومی محاذ آزادی کے کلیدی کردار کو بحال کر دیا گیا اور اشتراکیت سے الجزائر کی وابستگی کو ناقابل تنسیخ قرار دیا گیا۔ البتہ دینی حلقوں کے جذبات واحساسات کی رعایت کرتے ہوے 'اسلام' کو ملک کے سرکاری مذہب کے طور پر برقرار رکھا گیا۔ اس چارٹر کی اساس پر ایک نیا دستور بھی وضع کیا گیا۔ بعدازاں ایک ریفرنڈم (دسمبر ۱۹۷۶ء) کے ذریعے نئے دستور کی توثیق کے علاوہ آئندہ پانچ سال کے لیے بومدین کا بطور صدر انتخاب عمل میں آیا۔ فروری ۱۹۷۷ء میں ہونے والے انتخابات میں صرف حکمران جماعت قومی محاذ آزادی کے نامزد کردہ امیدوار کامیاب ہوے۔ قومی چارٹر کے مطابق قومی محاذ آزادی کو ملک کی مؤثر سیاسی قوت بنانے اور اس کے دائرہ اثر کو وسیع کرنے کے لیے اس کے عہدیداروں کو ملک کے تمام صوبوں اور اضلاع میں مقامی انتظامیہ میں شامل کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سوویت یونین اور دیگر اشتراکی ممالک کے نظام کی پیروی کرتے ہوے اس جماعت سے وابستہ معاشرے کے مختلف طبقات، مزدوروں، کسانوں، جنگ آزادی کے سپاہیوں اور خواتین کی کانفرنسیں منعقد کی گئیں (Socialism in Three Countries، ص ۲۸۶؛ The Middle East and North Africa A Political Geography: ،ص ۲۷۰-۲۷۳؛ The Politics of Algerian Socialism، ص ۲۳-۲۶).

صدر بومدین کے انتقال (۲۷ دسمبر ۱۹۷۸ء) کے بعد اقتدار "انقلابی کونسل" نے سنبھال لیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ۱۹۷۶ء کے آئین میں اس قسم کی کسی کونسل کو اس نوعیت کا کوئی کردار تفویض نہیں کیا گیا تھا۔ آئندہ سال فروری (۱۹۷۹ء) میں قومی محاذ آزادی کا نومنتخب سیکرٹری جنرل اور ضلع (ولایت) وہران کا فوجی کمانڈر کرنل شاذلی بن جدید ملک کا نیا صدر منتخب ہوگیا۔ صدر شاذلی بن جدید نے اپنے پیشرو، جس نے تمام تر سیاسی وانتظامی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے، کے برعکس کسی حد تک تقسیم اختیارات کی روش اختیار کی۔ اس کے دور میں دستور میں ترمیم کر کے وزیراعظم کے تقرر کی راہ نکالی گئی۔ چنانچہ کرنل محمد بن احمد عبدالغنی کو ملک کا وزیراعظم مقرر کیا گیا (۱۹۸۰ء)۔ صدر کے عہدہ کی میعاد بھی ٦ سال سے کم کر کے پانچ سال کر دی گئی۔ تاہم شاذلی بن جدید نے اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے کی غرض سے قومی محاذ آزادی (حکمران جماعت) کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے اس کے سیاسی بیورو کے ارکان کے انتخاب کا اختیار حاصل کر لیا۔ شاذلی انتظامیہ نے سال ۱۹۸۰ء میں بدعنوانی کے انسداد کے لیے ملک گیر مہم چلائی۔ اس دوران میں متعدد اعلیٰ حکام پر مالیاتی بدانتظامی کے ارتکاب پر خصوصی عدالتوں میں مقدمات قائم کیے گئے اور سزائیں سنائی گئیں (The Politics of Algerian Socialism، ص ۲۷-۲۹، ۴۰)۔ شاذلی دور میں قومی اسمبلی کے انتخابات (مارچ ۱۹۸۲ء) میں بھی صرف حکمران جماعت کو حصہ لینے دیا گیا۔ جنوری ۱۹۸۴ء میں شاذلی بن جدید ایک بار پھر عرصہ پانچ سال کے لیے صدر منتخب ہوگیا۔ اس بار اس نے حکومت میں وسیع رد وبدل کرتے ہوے عبدالحمید براہیمی کو وزیراعظم مقرر کیا۔

شاذلی دور حکومت میں گذشتہ دو ادوار حکومت سے جاری اقتصادی پالیسیوں پر نظرثانی کی گئی۔ اقتصادی ترقی کے لیے نئے اہداف وترجیحات متعین کی گئیں۔ ملک میں سرمایہ کاری کے لیے نجی شعبہ کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

تاہم اس کے دور حکومت میں ملکی اقتصادیات کا انحصار بیرونی ممالک پر گذشتہ ادوار کے مقابلے میں مزید بڑھ گیا۔ سیاسی جبر کا سلسلہ اس دور میں بھی کافی حد تک قائم رہا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں لسانی وثقافتی حقوق کے تحفظ کے لیے قائم بربروں کی تنظیموں کے ارکان کو جیلوں میں ڈالنے کے علاوہ مختلف اسلامی جماعتوں کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے جبر وتشدد سے کام لیا گیا۔ سیاسی جبر واستبداد کے اس دور میں بے روزگاری، افراط زر، اور اشیاے ضرورت کی قلت جیسے مسائل بھی شدت اختیار کر گئے (حوالہ مذکور ص۲۷۴-۲۷۵؛ *The Making of Contemporary Algeria*، ص۲۶۲-۲۸۶؛ Mary- Jane Deeb: *Islam and National Identity in Algeria*، در *The Muslim World*، ۸۷: ۲، اپریل ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۳).

اسلام ، اشتراکیت اور مغربیت کی کشمکش: نوآبادیاتی قوت 'فرانس' بالخصوص اس کے ہراول دستہ مسیحی مبشرین ومستشرقین کی طرف سے الجزائری عوام کو ان کے دین اور تہذیب وثقافت سے بیگانہ و ناآشنا بنانے، انہیں دائرہ مسیحیت میں داخل کرنے اور ان پر فرانسیسی تہذیب و ثقافت مسلط کرنے کی ہر ممکنہ تدابیر اختیار کی گئیں۔ روایتی دینی تعلیم و تدریس کے نظام کو درہم برہم کیا گیا، مسلم اوقاف کو ضبط کر لیا گیا۔ مسلم عدالتی و قانونی نظام کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ مساجد کو کلیساؤں میں تبدیل کیا گیا جب کہ عربی کو اجنبی و غیر ملکی زبان کا درجہ دے کر اس کی بیخ کنی کی خاص طور پر کوشش کی گئی (جمیل ابوالنصر: *A History of the Maghrib in the Islamic Period*، کیمبرج، لنڈن، ۱۹۸۷ء، ص ۲۶۹- ۲۷۲؛ Alf Andrew Heggoy: *The Origins of Algerian Nationalism in the Colony and in France*، در *The Muslim World*، ۵۸:۲ (اپریل ۱۹۶۸ء)، ص ۱۳۱-۱۳۷؛ وہی مصنف: *Looking Back: the Military and Colonial Policies in French Algeria*، در *The Muslim World*، ۷۳:۱ (جنوری ۱۹۸۳ء) ص ۶۲-۶۳؛ *Tricolor and Crescent*، ص ۴۱-۴۴؛ عمادالدین شاہین: *The Foreign Policy of The Islamic Salvation Front in Algeria*، در *Islam and Christian-Muslim Relations*، ۲:۱۴، ص ۱۲۴؛ *Religion and Politics in Algeria*، ص ۴۲۳؛ Madeleine Dobile: *Francophone Studies and the Linguistic Diversity of the Maghreb*، در *Comparative Studies of South Asia, Africa and Middle East*، ۲۳:۱-۲ (۲۰۰۳ء)، ص ۳۳-۳۴؛ Kevin Boyle و Juliet Sheen: *Freedom of Religion and Belief: A World Report*، لنڈن، نیویارک، ۱۹۹۷ء، ص ۲۱)۔ تاہم اس کے برخلاف الجزائری مسلمانوں کی غالب اکثریت کے ہاں اپنے دین اور تہذیبی ومعاشرتی اقدار وروایات سے وابستگی اور ان کے تحفظ ودفاع کا جذبہ پوری شدت وقوت کے ساتھ زندہ رہا۔ نوآبادیاتی دور میں غیر ملکی تسلط کے خلاف وقتاً فوقتاً رونما ہونے والی مزاحمت کی تحریک اور طویل جنگ آزادی درحقیقت اسی جذبہ کی کارفرمائی تھی۔ علما بچے کھچے مدارس ومساجد میں جب کہ صوفیا خانقاہوں اور زاویوں میں غیر ملکی تسلط کے خلاف جدوجہد کے لیے عوام کو تحریک دیتے رہے۔ وہ اسلامی وعربی طرز معاشرت واقدار حیات کے تحفظ وبقا کی تلقین کے ساتھ ساتھ عملی تدابیر میں لگے رہے۔ غرض فرانسیسی استعمار کے چنگل سے آزادی کی جدوجہد میں الجزائری عوام کے جذبہ اسلامیت نے فیصلہ کن کردار ادا کیا (*Islam and National Identity in Algeria*، ص ۱۱۳-۱۲۰؛ *Religion and Politics in*

Algeria، ص ۴۲۱-۴۲۳، ۴۲۷)۔ اسلامیت کے علمبردار اس اکثریتی گروہ کے برعکس الجزائر میں فرانس کے تہذیبی مشن (mission civilisatrice) کے زیر اثر ایک ایسی مختصر اقلیت بھی وجود میں آگئی تھی، جس نے فرانسیسی تہذیب وثقافت اور طرزِ حیات کو پوری طرح سے اپنا لیا تھا۔ یہ وہ افراد تھے جنھوں نے الجزائر میں فرانسیسی اسکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی اور فرانسیسی نظم ونسق کا حصہ بن گئے تھے یا پھر وہ افراد جو سالہا سال سے روزگار کے سلسلہ میں فرانس میں مقیم تھے۔ یہ اقلیت دو گروہوں میں بٹی ہوئی تھی، ان میں سے ایک گروہ جس کا سرخیل فرحت عباس اور الجزائر کے فرانس کے ساتھ مکمل انجذاب کی علمبردار سیاسی تنظیم Federation des Elus Musulmans کا سربراہ اور الجزائر کی عبوری حکومت (GPRA) اور دستور ساز اسمبلی کا پہلا صدر فرانس کے ساتھ الجزائر کے مکمل انجذاب کا حامی البتہ مساوی سیاسی حقوق کا طالب تھا (*The Passing of French Algeria*، ص ۲۲-۲۹، ۳۳، ۹۰-۹۲؛ *The Traditional and Political Leadership*، ص ۳۲۵-۳۲۶)، جب کہ دوسرا گروہ (اشتراکی وقوم پرست خیالات کا حامل) فرانسیسی تسلط سے آزادی کے ساتھ ساتھ آزاد الجزائر میں 'اشتراکی انقلاب' کا علمبردار تھا۔ یوں سیاسی مطمح نظر میں اختلاف کے باوجود 'لادینیت' ان دونوں گروہوں کے مابین ایک قدرِ مشترک کے طور پر بہرحال موجود تھی۔ فرانسیسی تسلط کے خلاف مسلح جدوجہد آزادی (۱۹۵۴ء-۱۹۶۲ء) کے دوران میں الجزائری معاشرہ کے تمام طبقات متحد ہوگئے تھے۔ اس جنگ میں 'اسلام' نے ایک زبردست قوت محرکہ کا کردار ادا کیا۔ جنگ آزادی کو 'جہاد' اور میدان جنگ میں معرکہ آرا آزادی کے متوالوں کو 'مجاہدین' کا نام دیا گیا۔ جمعیت علماے الجزائر کے علاوہ مختلف روحانی سلسلوں سے منسلک مجاہدین نے عزیمت و استقامت کی شاندار داستانیں رقم کیں۔ قومی محاذ آزادی کے قائدین نے، جو سیکولر اور اشتراکی خیالات و نظریات رکھتے تھے، مذہب کو فرانس کے خلاف جدوجہد کے دوران میں ایک زبردست قوت محرکہ کے طور پر استعمال کیا۔ جنگ کے دوران میں محاذ آزادی کے قائدین الجزائری عوام کو ،موقع محل کی نزاکت کے پیش نظر، دین اسلام سے اپنی غیر متزلزل وابستگی کا یقین دلاتے رہے۔ وہ آزاد الجزائر میں اسلامی طرز معاشرت، تہذیب وتمدن اور عربی زبان وادب کے تحفظ واحیاء کے لیے راسخ العقیدہ اسلامی گروہوں کے مطمح نظر کی حمایت کا دم بھی بھرتے رہے (*A History of the Maghrib in the Islamic Period*، ص ۳۲۸-۳۳۶؛ Robert Mortimer: *Islam and Multiparty Politics in Algeria*، در *The Middle East Journal*، ۴۵:۴ (۱۹۹۱ء)، ص ۵۷۵-۵۷۶؛ John L.Esposito: *The Islamic Threat: Myth or Reality*، نیویارک، ۱۹۹۹ء، ص ۱۷۱-۱۷۲؛ *The Passing of French Algeria*، ص ۱۱۰-۱۱۱؛ Rashid Messaoudi: *Algerian-French Relations 1830-1991*، در *Algeria:Revolution Revisited* مدیر: شوکت رضا کاظمی، لنڈن، ۱۹۹۷ء، ص ۱۷-۱۹؛ John O.Voll: *Islam:Continuity and Change in the Modern World*، بولڈر، کالوراڈو، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۸-۱۲۱، ۲۰۹-۲۱۲)۔ تاہم قومی محاذ آزادی کے رہنماؤں بالخصوص احمد بن بیلا نے جنگ آزادی کے آخری مرحلہ میں مذہب کے بارے میں اپنی پالیسی تبدیل کر لی اور اس کا جھکاؤ واضح طور پر 'اشتراکیت' کی طرف ہوگیا (Malek Bennabi: *The Problems of Ideas In the Muslim World*، ترجمہ: Mohamed T.Mesawi، کوالالمپور،

۱۹۹۴ء، ص ۱۱۲-۱۱۵؛ Gilles Kepel: Jihad: The Trial of Political Islam، لنڈن، نیویارک، ۲۰۰۲ء، ص ۱۶۲؛ Religion and Politics in Algeria، ص ۴۲۱-۴۲۳)۔

معاہدہ آزادی (مارچ ۱۹۶۲ء) کے بعد قومی محاذ آزادی کے طرابلس میں منعقد ہونے والے اجتماع میں آزاد الجزائر کی تعمیرنو کے لیے جو لائحہ عمل 'طرابلس پروگرام' تشکیل دیا گیا، اس میں 'اسلام' کے بجائے 'سائنسی اشتراکیت' کو ملک کی انقلابی آئیڈیالوجی کے طور پر اختیار کیا گیا۔ البتہ اس میں اسلامی و عربی ورثے کے احیا بالخصوص عربی کو قومی زبان قرار دینے اور اسے ذریعۂ تعلیم بنانے، جیسے رہنما اصولوں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ طرابلس پروگرام میں درحقیقت ملک کی نظریاتی جہت کے تعین میں متضاد ومتباین احساسات ونظریات کو ایک ساتھ نبھانے کی کوشش کی گئی تھی (Gilbert Grandguillaume: Islam and Politics in North-West Africa، در Islam and the State in the Modern World Today، مدیر: Olivier Carre، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۴۹-۴۸)۔

الجزائر کی آزادی کے ساتھ ہی حکمران جماعت قومی محاذ آزادی اور فوج کے اندر موجود سیکولر عناصر اور اشتراکیت کے کٹر حامیوں نے ملکی اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ انہی عناصر کے دباؤ پر الجزائر کے پہلے دستور میں اشتراکیت سے وابستگی کو ایک ناقابل تنسیخ اصول قرار دیا گیا۔ چنانچہ ملک میں نافذ کیے گئے پہلے دستور (۱۹۶۳ء) میں ملک کی تعمیر نو اور سیاسی و انتظامی اور اقتصادی و تعلیمی ڈھانچے کی تشکیل کے ضمن میں اشتراکی اصول و اقدار کو بنیاد ٹھہرایا گیا۔ آزادی کے بعد منعقد ہونے والی قومی محاذ آزادی کی پہلی کانگریس (۱۹۶۴ء) میں بھی مندوبین کی اکثریت نے دینی گروہوں کو سخت تنقید و ملامت کا نشانہ بنایا اور ملک میں 'اشتراکی انقلاب' کے حق میں رائے دی۔ قومی محاذ آزادی کی کانگریس (۱۹۶۴ء) میں عربی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے مختلف عملی اقدامات کے علاوہ عائلی قوانین کا ایک ایسا مجموعہ جو اسلامی تعلیمات اور اشتراکی نظریۂ حیات دونوں سے ہم آہنگ ہو، مرتب کرنے کی منظوری بھی دی گئی۔ کٹر اشتراکی عناصر ملک کی تعمیر نو کے سلسلہ میں سوویت یونین، یوگوسلاویہ، کیوبا اور چین جیسے ممالک میں رائج اشتراکی نظام کی کامل پیروی کے حامی تھے۔ چنانچہ حصول آزادی کے بعد احمد بن بیلا نے، جو خود فیڈل کاسترو، مارشل ٹیٹو اور جمال عبدالناصر کا بڑا قدر دان تھا، ملک میں اشتراکیت کی ترویج کا بیڑا اٹھایا۔ البتہ دینی حلقوں کی دل جوئی کے طور پر، الجزائر کے شہریوں کے لیے شراب نوشی پر پابندی جیسے سطحی اقدامات بھی کیے گئے (The Passing of French Algeria، ص ۱۰۲-۱۰۳، ۱۱۰-۱۱۱، ۱۳۵-۱۳۷، ۱۴۸-۱۴۹؛ Socialism in Three Countries، ص ۲۸۵- ۲۸۶؛ Traditional and Political Leadership، ص ۳۲۲-۳۲۳؛ Raymond Vallin: Muslim Socialism in Algeria، در Man, State, and Society in Maghrib، ص ۵۰-۵۲؛ The Islamic Threat، ص ۱۷۲-۱۷۳؛ Islam: Continuity and Change in the Modern World، ص ۲۱۵-۲۱۷؛ Francois Burgat: The Islamic Movement in North Africa، مترجم: William Dowell، آسٹن، ۱۹۹۳ء، ص ۲۴۸- ۲۴۹)۔ بن بیلا اور اس کے جدیدیت پسند قریبی ساتھیوں کی طرف سے، جو اسلام اور 'اشتراکیت' کو باہم متصادم یا بے جوڑ نہیں سمجھتے تھے، کارل مارکس، لینن اور ماؤزے تنگ کی برسرعام تعریف و توصیف، جب کہ علما اور دینی گروہوں کو قدامت ورجعت پسند قرار دے

کر ان کی تحقیر و مذمت کی جاتی رہی۔ اسلام کی تہذیبی ومعاشرتی اقدار کے بارے میں بھی ان کا رویہ اسی نوعیت کا رہا۔ سرکاری اخبارات و جرائد میں بھی اسلامی تعلیمات و اقدار کی تحقیر اور علما کو سخت تنقید و ملامت کا نشانہ بنایا گیا۔ آزادی کے پہلے ہی سال میں نہ صرف یہ کہ علما اور اسلام کے حامی دانش وروں کو قومی محاذ آزادی سے باہر کر دیا گیا، بلکہ ان کو مبتلائے جور وستم رکھنے کا آغاز بھی ہوا۔ جمعیت علماے الجزائر کے قائد شیخ بشیر الابراہیمی کو، جنہوں نے آزاد الجزائر کی تعمیر نو میں غیر اسلامی نظریات اور نظاموں کے بجائے اسلام سے رہنمائی لینے اور عربی و اسلامی روایات و اقدار کے تحفظ کے حق میں آواز بلند کی تھی، آزادی کے جلد بعد گھر پر نظر بند کر دیا گیا۔ جمعیت کے اکثر مدارس بند کر دیے گئے، جب کہ دیگر مدارس اور دینی اداروں کو اشتراکیت کے نام پر قومی تحویل میں لے لیا گیا (The Passing of French Algeria، ص ۱۴۸-۱۵۹؛ The Islamic Movement in North Africa، ص ۲۴۸-۲۵۰؛ Algerian-French Relations، ص ۱۹-۲۵)۔ الجزائر کی آزادی کے ساتھ ہی مذہب اسلام سے متعلق معاملات کو بھی قومی تحویل میں لے لیا گیا، انہیں ریاستی نظم و ضبط اور پالیسیوں کا تابع بنایا گیا انہیں خاص اس غرض سے ایک وزارت مذہبی امور قائم کی گئی۔ اشتراکیت کو مذہبی جواز و استناد فراہم کرنے اور اسلام کو اس سے ہم آہنگ کرنے کے لیے وزارت مذہبی امور و اوقاف کے زیر انتظام نیا دینی ادب تخلیق کیا گیا۔ جمعہ کے خطبات کو بھی اشتراکی نظام کے حق میں استعمال کیا گیا۔ اس غرض سے ریڈیو پر بھی خصوصی دینی پروگرام نشر کیے جاتے رہے۔ اخبارات میں بھی اشتراکیت کے حق میں مہم چلائی گئی۔ اشتراکی نظریۂ حیات کی تشہیر و تبلیغ کے ساتھ ساتھ حکومت نے ملک میں سیکڑوں کی تعداد میں نئی مساجد تعمیر کرائیں اور مکتب اسکول قائم کیے۔ وزارت مذہبی امور کو مساجد ومدارس کے نظم و نسق اور ان کے لیے ائمہ واساتذہ کے تقرر اور ان کی تعلیمی ودعوتی سرگرمیوں پر کڑی نگرانی کا اختیار حاصل رہا۔ مذہبی معلّمین ومبلّغین کو تعلیم و تربیت کے لیے مصر اور مشرق وسطی کے دوسرے ممالک بھیجا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں ایک قانون کے ذریعے دینی اور تبلیغی انجمنوں کے قیام اور مساجد کی تعمیر کے لیے حکومت سے پیشگی اجازت نامہ کے حصول کو لازمی قرار دے دیا گیا۔ مذہبی اجتماعات پر سخت پابندیاں عائد کی گئیں۔ وزارت مذہبی امور کو مذہبی مدارس و جامعات اور مساجد کی ملکیتی املاک و اثاثہ جات پر کلی اختیار کے علاوہ مذہبی کتب کی طباعت و اشاعت پر بھی کڑا ضبط حاصل رہا۔ ان سب اقدامات کا مقصد حکومت اور اس کی لادینی پالیسیوں کے مخالفین کے اثر و نفوذ کو محدود کرنا تھا (Islam:Continuity and Change in the Modern World، ص ۲۱۵-۲۱۷؛ Islam and Multiparty Politics in Algeria، ص ۵۷۷-۵۷۸؛ Muslim Socialism in Algeria، ص ۴۲-۵۳؛ Traditional and Political Leadership، ص ۳۲۱-۳۲۴؛ The Passing of French Algeria، ص۲۰۳؛ The Islamic Threat، ص۱۷۲-۱۷۳؛ Islam and National Identity in Algeria، ص ۱۱۲، ۱۲۲؛ Religion and Politics in Alger ia، ص ۴۲۳-۴۲۴، ۴۲۷)۔ درحقیقت قومی محاذ آزادی کے قائدین ملک کے سیاسی وقانونی نظام اور تعلیمی ومعاشرتی امور میں اسلام کو وہ مقام ہرگز نہیں دینا چاہتے تھے، جس سے اشتراکی انقلاب کے بارے میں ان کے ایجنڈے کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ مقتدر و بااثر طبقات کی طرف سے الجزائر میں اشتراکیت کی ترویج کے لیے اقدامات کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان، تہذیب وتمدن اور طرز

معاشرت کو عام کرنے کے لیے بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا گیا۔ اس دور میں ملک کے دروازے فرانسیسی تہذیبی وسماجی اثر ونفوذ کے لیے وا کر دیئے گئے۔ موسیقی، سینما، فیشن اور فرانسیسی طرز زندگی، تہذیب ومعاشرت اور اقدار وروایات کے ترجمان ہر قسم کے اخبار ورسائل اور ادب کی درآمد کے لیے بڑی وسعت قلبی کا مظاہرہ کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں مشرق وسطیٰ سے درآمد کی جانے والی اسلامی ودینی کتب پر کڑی سنسرشپ روا رکھی گئی (Algerian-French Relations، ص۲۴-۲۷؛ Islam and Politics in North-West Africa، ص ۴۷-۴۸)۔

مذہب کے بارے میں ریاستی پالیسیوں نے اسلامی علمی و فکری حلقوں میں بے اطمینانی کو جنم دیا۔ چنانچہ ملک میں اشتراکی نظریات اور مغربی تہذیب واقدار کی بالادستی کی کوششوں کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات وطرز حیات کے تفوق کے حامی وعلمبردار افراد، جو حکومتی اقدامات کو مسلم عوام کے اسلامی تشخص کی بقا کے منافی گردانتے تھے، آزادی کے ابتدائی سالوں ہی سے منظم ہونا شروع ہوگئے۔ مصر وشام کی اسلامی تحریک اخوان المسلمون کے قائدین امام حسن البناء اور سید قطب شہید کے افکار ونظریات سے متاثر دانش وروں اور اساتذہ نے تجدد و مغربیت (Westerinzation) اور اشتراکیت کی ترویج کے خلاف جدوجہد اور اسلامی نظریۂ حیات و ریاست کے تصور کو اجاگر کرنے کے لیے ایک تنظیم 'القیم الاسلامیہ' کے نام سے قائم کی (۱۹۶۴ء)۔ روایتی علما کے مقابلے میں القیم کے ارکان اسلامی احکام و تعلیمات کے علاوہ فرانسیسی زبان و ادب اور مغربی افکار و خیالات سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ وہ مغربی تہذیب و تمدن کے تحلیل و تجزیہ کی صلاحیت سے بھی بخوبی بہرہ ور تھے۔ اس تنظیم کے ارکان نے کھل کر ملک میں اشتراکیت و مغربیت کی ترویج کی غرض سے حکومت کے اقدامات کی مخالفت اور قومی محاذ آزادی کے قائدین اور ملک کے سیکولر دانش وروں کے رویے پر تنقید کی، حکومت سے سرکاری ریڈیو پر غیر ملکی پروگراموں کی نشریات اور فرانسیسی نظام تعلیم کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ "القیم الاسلامیہ" نے مغربی تہذیبی و سماجی اقدار و روایات کے استرداد اور اسلام کی تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے احیاء و ترویج کی دعوت مؤثر طور پر پیش کی۔ غیر سرکاری مساجد ومدارس کے ائمہ اور دینی معلمین ومبلغین نے اس کی دعوت کو عام کرنے میں سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔جلد ہی القیم اور سرکاری جامعات میں موجود اشتراکی نظریۂ حیات کے حامی عناصر کے مابین کشمکش کا آغاز ہوگیا۔ حکومت نے 'القیم الاسلامیہ' کے سربراہ الهاشمی التیجانی کو، جو الجزائر یونیورسٹی میں کلیۃ الآداب کے الامین العام تھے، ملازمت سے برطرف کر دیا جب کہ اس تنظیم میں شامل دیگر دانش وروں اور اساتذہ کو جیل میں بند کر دیا۔ قائد تحریک الهاشمی التیجانی کی طرف سے مصر کے صدر جمال عبدالناصر کو سید قطب شہید کو سزائے موت دیئے جانے کے خلاف احتجاجی مراسلہ بھیجنے پر ستمبر ۱۹۶۶ء میں القیم الاسلامیہ پر بندش عائد کر دی گئی۔ ۱۹۶۷ء تک اس تحریک کو کچل دیا گیا۔ اس کے بعض سرکردہ رہنما قتل کر دیئے گئے۔ بعض دوسری اسلامی تنظیموں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیا گیا۔ آنے والے سالوں میں الجزائر کے جدید تعلیم یافتہ سیکولر گروہ (Francophile)، جسے اس کے مخالفین کی طرف سے 'حزب فرنسا' کا نام دیا گیا تھا، اور اسلامی نظریۂ حیات کی بالادستی کے حامی دانش وروں کے مابین نظریاتی جنگ پوری قوت سے جاری رہی۔ الجزائر کے نامور مفکر و دانش ور مالک بن نبی [رک بآں در تکملہ آآآ بذیل مادہ] اور دیگر

متعدد دانش وروں اور اسلامی تحریک کے قائدین کو مغربیت واشتراکیت کی مخالفت و تنقید کی پاداش میں قید وبند سے دوچار کیا گیا۔ اسی طرح متعدد ایسے علما کو جو مغربی افکار ونظریات اور جدید تہذیب وتمدن کی تردید اور احیائے اسلام کے حق میں دعوتی و تصنیفی سرگرمیوں میں مشغول تھے، مراکش کی طرف جلا وطن ہونے پر مجبور کر دیا گیا (The Passing of French Algeria، ص ۱۹؛ Algerian-French Relations، ص ۱۹-۲۶؛ Mohamed Gharib : The Algerian Islamist Movement، در Algeria Revolution Revisited : ، ص ۷۸-۷۹؛ Jihad: The Trial of Political Islam، ص ۱۶۱-۱۶۲؛ Islam and Politics in North-West Africa، ص ۴۶-۴۸؛ The Islamic Movment in North Africa، ص ۲۵۱-۲۵۵)۔

سال ۱۹۸۲ء کے وسط میں مصطفیٰ بوعلی (Bouyali) الجزائر میں اسلامی حکومت کے قیام اور نفاذ شریعت کی جدوجہد کی دعوت لے کر اٹھے تو اخوان المسلمون کی فکر سے متاثر افراد، جن میں ۱۹۹۰ء کی دہائی میں قائم ہونے والی اسلامی سیاسی جماعت 'اسلامی محاذ نجات' (Front Islamique du Salut =FIS) [رک بآں در تکملہ آآآ بذیل مادہ] کے صف اول کے رہنما علی بالحاج (ولادت ۱۹۵۶ء) بھی شامل تھے، اس کے حلقہ میں شامل ہوگئے۔ تاہم حکومت کی طرف سے جلد ہی داروگیر کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مصطفیٰ بوعلی اور ان کے بعض رفقا روپوش ہوگئے۔ جنہوں نے بعد ازاں ایک خفیہ عسکری تنظیم Mouvement Islamique Arme = MIA، قائم کر لی۔ اس تنظیم نے قومی محاذ آزادی کے اقتدار کو چیلنج کرتے ہوئے حکومت کے خلاف مسلح کارروائیوں کا سلسلہ شروع کر دیا جو ۱۹۸۷ء میں مصطفیٰ بوعلی کے ریاستی اداروں کے ہاتھوں قتل تک برابر جاری رہا۔ اس دوران میں فوج اور پولیس کے ہاتھوں اس تنظیم کے سیکڑوں ارکان ہلاک ہوئے۔ اس عسکری تنظیم (MIA) کے سیکڑوں نوجوانوں نے الجزائر کے اتحادی ملک سوویت یونین کے خلاف افغان جہاد میں سالہا سال تک داد شجاعت دی (Jihad: The Trial of Political Islam، ص ۱۶۲-۱۶۴؛ The Islamic Movement in North Africa، ص ۲۶۵-۲۶۷)۔

مذہبی امور کو ریاستی ضبط میں لانے کے لیے مختلف حکومتوں کے اقدامات کے برخلاف ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں اسلامی تحریک کو خوب تقویت پہنچی۔ غیر سرکاری مساجد و مدارس نے اس ضمن میں اہم کردار ادا کیا۔ ان دو دہائیوں میں شہری آبادی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا۔ حکومت بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کے پیش نظر مساجد و مدارس کے قیام اور ائمہ و مدرّسین کے تقرر میں ناکام رہی۔ ائمہ و دینی مدرسین کی کمی نے حکومتی عمل دخل سے آزاد اسلامی تحریک کے زیر انتظام مساجد و مدارس کے دائرہ میں توسیع کے لیے راہ ہموار کر دی۔ چنانچہ اسلامی تحریک کے قائدین اور ائمہ و مبلغین کو اپنی دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں کو وسعت دینے کا موقع ملا۔ ان میں سے بعض نے سرکاری مساجد کا انتظام بھی سنبھال لیا۔ مساجد میں اسلامی کانفرنسیں اور دینی و تعلیمی اجتماعات منعقد ہونے لگے۔ اسلامی تحریک سے وابستہ مدرّسین و مبلغین اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کی معاشی و خارجی پالیسیوں، بالخصوص مقتدر طبقوں کی مالی بدعنوانیوں پر کڑی تنقید کر کے عوام کی سیاسی تربیت بھی کرتے رہے۔ اسلامی تحریک سے منسلک ان ائمہ و مدرسین نے دعوت و تبلیغ کے شانہ بشانہ فلاحی سرگرمیوں، مثلاً نادار افراد کو مفت طبی سہولیات و مالی امداد کی فراہمی اور پس ماندہ طبقات کے بچوں کے لیے مفت تعلیم کے علاوہ مساجد اور تزئین و آرائش اور صفائی ستھرائی، ان کے اردگرد گندگی کے ڈھیروں کی صفائی

پر خاص توجہ دی۔ چنانچہ اسلامی تحریک کو عامۃ الناس میں تحسین کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ نتیجتاً اس کے حلقہ اثر میں توسیع ہوئی (Religion and Politics in Algeria، ص ۴۲۷؛ The Islamic Movement in North Africa، ص ۲۵۸-۲۶۲).

۱۹۸۰ء کی دہائی میں الجزائر یونیورسٹی اسلامی تحریک کا مرکز بن گئی۔ اسی یونیورسٹی کے ایک استاد اور قومی محاذ آزادی کے ایک سابق رکن عباسی مدنی (ولادت: ۱۹۳۱ء) اسلامی دستور و قوانین کے نفاذ، عربی زبان کی ترویج، شراب نوشی اور دیگر غیر اسلامی طور طریقوں پر قدغن عائد کرنے، نیز مخلوط نظام تعلیم کے خاتمے، حکومتی عہدوں سے مذہب مخالف عناصر کے اخراج اور اسلامی نظام کے قیام کا مطالبہ لے کر اٹھے تو سرکاری جامعات اور کالجوں کے اساتذہ کے علاوہ دینی مبلغین و معلمین کی اکثریت ان کی ہمنوا بن گئی۔ اس دور میں سرکاری جامعات میں اسلامی تحریک کے حامی اور اشتراکیت ومغربیت کے علمبردار طلبہ گروہوں میں آویزش شدت اختیار کر گئی۔ حکومت کی طرف سے جلد ہی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسلامی تحریک کے قائدین عبداللطیف سلطانی (م ۱۹۸۴ء)، شیخ محمد سحنون (م ۲۰۰۳ء) اور عباسی مدنی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اول الذکر دونوں کو گھر پر نظر بند جب کہ مؤخر الذکر کو جیل بھیج دیا گیا (The Politics of Algerian Socialism، ص ۳۳-۳۵، ۳۹-۴۰؛ Jihad:The Trial of Political Islam، ص ۱۶۴-۱۶۵؛ The Islamic Threat، ص ۱۲۳-۱۲۶؛ The Islamic Movement in North Africa، ص ۲۶۲-۲۶۳).

حکومت کے جوابی اقدامات: شاذلی بن جدید کی حکومت نے اسلامی نظام حکومت کے قیام کے علمبرداروں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے نمٹنے کے لیے اسلامی تحریک کے قائدین اور ارکان کے خلاف پر تشدد کارروائیوں (جن میں ۱۹۸۲-۱۹۸۷ء کے دوران اسلامی تحریک کے متعدد قائدین کے علاوہ اس کے سیکڑوں ارکان کو گرفتار کر کے ان پر مقدمات قائم کیے گئے اور انہیں قیدو بند کی سزا سنائی گئی جب کہ بعض کو سزائے موت بھی دی گئی) کے ساتھ ساتھ اسلام سے متعلق ریاست کی بے اعتنائی و لاتعلقی کی پالیسی میں نرمی ولچک کا مظاہرہ کیا۔ دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں پر عائد بندشوں میں بھی تخفیف کر دی گئی۔ متعدد ممتاز اسلامی رہنماؤں بشمول عباسی مدنی کو جیلوں سے رہا کیا گیا۔ ۱۹۸۵ء میں ملک میں اسلامی تعلیمات و احکامات پر مبنی عائلی قوانین رائج کیے گئے۔ اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ مختلف علاقوں میں سرکاری سطح پر مساجد کی تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ۱۹۸۵ء میں ائمہ و خطباء کی تعلیم و تربیت کے لیے قسنطینہ میں امیر عبدالقادر اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے کے علاوہ اس شہر میں ایک بڑی مسجد بھی تعمیر کرائی گئی۔ شاذلی بن جدید کے دور میں عالم عرب کے دو نامور مفکرین علامہ یوسف القرضاوی اور شیخ محمد الغزالی کی خدمات اسلامی علوم کی تدریس کے لیے حاصل کی گئیں۔ ان دونوں مفکرین کے الجزائر میں قیام کی بدولت اسلامی بیداری کے عمل کو مزید تقویت پہنچی (Jihad:The Trial of Political Islam، ص ۱۶۵؛ Islam and Multiparty Politics in Algeria، ص ۵۴۴-۵۴۸؛ The Islamic Threat، ص ۱۲۶-۱۲۷؛ Kate Zebiri: An Overview . Islamic Revival in Algeria، در The Muslim World، ۸۳: ۳-۴ (جولائی-اکتوبر، ۱۹۹۳ء)، ص ۲۰۸-۲۱۰، ۲۲۱-۲۲۲؛ Religion and Politics in Algeria، ص ۴۲۷-۴۲۸).

سال ۱۹۸۸ء کے وسط میں عالمی منڈی میں معدنی تیل

اور گیس کی قیمتوں میں کمی سے ملک اقتصادی بحران کی لپیٹ میں آگیا۔ بے روزگاری کی بہتات، رہائشی مکانات اور اشیاے خوراک کی قلت نے مقتدر اشرافیہ اور جمہور عوام کے درمیان کشیدگی میں اضافہ کر دیا۔ ریاستی اشتراکیت اور آمرانہ طرز حکومت کی اپنے ملک کے سماجی واقتصادی مسائل کے حل میں ناکامی پر اکتوبر ۱۹۸۸ء کے اوائل میں ملک کے مختلف شہروں میں حکومت کی اقتصادی و سیاسی پالیسیوں بالخصوص اعلیٰ سیاسی شخصیات اور افسر شاہی کی بدعنوانی کے خلاف مظاہرے ہوے۔ جس پر حکومت نے ملک میں ہنگامی حالت نافذ کر دی اور خوب جبروتشدد سے کام لیا (John L.Esposito : *Unholy War :Terror in the Name of Islam*، نیویارک، آکسفرڈ، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲، ۱۰۲؛ *The Islamic Threat* ، ص ۱۷۳-۱۷۵؛ Frederic Volpi : *Islam and Democracy :the Failure of Dialogue in Algeria* ، لنڈن، اسٹرلنگ، ۲۰۰۳ء، ص ۳۷-۴۵)۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق حکومت مخالف ان مظاہروں میں امن وامان کے قیام پر مامور اداروں کے ہاتھوں ۱۵۹ افراد ہلاک ہوے، جب کہ ۳۵۰۰ سے زائد افراد جیلوں میں بند کر دیئے گئے ۔ ملک میں جاری اس بحران سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صدر شاذلی بن جدید نے تیسری بار صدر منتخب ہونے (دسمبر ۱۹۸۸ء) کے بعد دستور میں اہم ترامیم کر کے ملک میں اشتراکی انقلاب کے تحفظ کے لیے فوج کے کردار کو ختم کر دیا اور سیاسی جماعتوں کی تنظیم وتشکیل کی اجازت دے دی۔ سیاسی جماعتوں کی تنظیم وتشکیل سے متعلق نئے قانون کے نفاذ (جولائی ۱۹۸۹ء) کے بعد سال ۱۹۹۱ء کے وسط تک ۴۷ سیاسی جماعتیں جن میں سابق صدر احمد بن بیلا کی The Mouvement Pour la Democratie en Algerie اور اسلامی نظام کے قیام کی علمبردار اسلامی محاذ نجات (Front Islamique du Salut=FIS) بھی شامل تھیں، منظرعام پر آئیں (*The Islamic Movement in North Africa*، ص ۲۶۹-۲۷۱؛ *Islam and Multiparty Politics in Algeria*، ص ۶۵۷-۶۸۳)۔

موخرالذکر جماعت، اسلامی محاذ نجات (FIS) الجزائر میں اسلام کی تہذیبی ومعاشرتی اقدار کے احیا اور اسلام کے اصول وتعلیمات کی اساس پر نظام حکومت کے قیام کا عزم لے کر اٹھی تھی۔ چنانچہ اس نے عامۃ الناس کی معاشی محرومیوں کے ازالے، ملک میں جاری وسیع و ہمہ گیر بدعنوانی کے خاتمے اور الجزائر کے مسلم عوام کے اسلامی و عربی تشخص کے تحفظ کو اپنی جدوجہد کا ہدف بنایا۔ اسلامی محاذ نجات کو جلد ہی اپنی ملک گیر دعوتی وتبلیغی اور سماجی بہبود کی سرگرمیوں کی بدولت حزب مخالف کی ایک مضبوط ترین جماعت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ۱۹۷۵ سے۱۹۸۴ء کے دوران میں شرعی عائلی قوانین کے نفاذ کے لیے متحرک طلبہ اور خواتین کی انجمنیں اس اسلامی جماعت کا ہراول دستہ بن گئیں۔ اس کے حامیوں میں چھوٹے کاروباری حضرات، خوشحال تاجر، سرکاری ملازمین، یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ، اطباء ومعالجین، وکلاء اور دیگر پیشہ ور افراد شامل تھے۔ الجزائر کی دینی خیالات کی حامل نوجوان نسل کی تو گویا یہ ایک ہر دلعزیز جماعت بن گئی تھی۔ جون ۱۹۹۰ء کے وسط میں منعقد ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں اسلامی محاذ نجات نے سب سے زیادہ ووٹ (۵۵ فیصد) حاصل کر لیے۔ ملک کے تمام بڑے شہروں اور قصبات میں قائم ہونے والی اسلامی محاذ نجات کی بلدیاتی وعلاقائی حکومتوں نے مرکز کی طرف سے عدم تعاون ومعاندانہ رویے کے باوجود شہری سہولیات کی فراہمی، اشیاے خوراک اور روزمرہ کی دیگر ضروریات زندگی کی قیمتوں پر ضبط اور سماجی بہبود کے حوالے سے اعلیٰ کارکردگی

کا مظاہرہ کیا۔ اسلامی جماعت نے ملک میں علاج معالجے کی سہولیات کی فراہمی اور تعلیم کو عام کرنے کے لیے ایک مہم چلائی اور پس ماندہ علاقوں اور گنجان آباد شہری مضافات میں ہسپتالوں اور اسکولوں کا ایک وسیع سلسلہ قائم کر دیا، جبکہ مساجد کو تعلیم و تدریس کے مراکز بنا دیا۔ اقتصادی بدحالی کے دنوں میں اسلامی محاذ نجات کے زیر انتظام مساجد تعلیمی اور پیشہ ورانہ و فنی تربیت کے مراکز میں تبدیل ہوگئیں۔ ملک بھر میں سماجی خدمات اور طبی سہولیات کی فراہمی کے لیے خصوصی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ تحفظ ماحولیات مہم کے نتیجے میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اور ذخیرہ گاہیں چھوٹے چھوٹے باغیچوں اور پارکوں میں تبدیل ہوگئیں۔ گندی گلیوں اور گرد و نواح کی صفائی کے لیے خصوصی مہم چلائی گئی۔ معاشی میدان میں اسلامی محاذ نجات نے امداد باہمی کی بنیاد پر مارکیٹ کوآپریٹو اسٹور قائم کیے۔ جو صارفین کو حکومت کے زیر انتظام سوق الفلاح کے مقابلے میں سستے نرخ پر اشیاے ضرورت فراہم کرتے۔ اسلامی محاذ نجات نے معاشرے کے خوشحال طبقات سے بھاری عطیہ جات و مالی امداد اکٹھی کر کے ماہ رمضان المبارک میں عوام کو انتہائی ارزاں نرخ پر روزمرہ کی ضروریات زندگی سبزیاں، پھل اور اشیاے خورد و نوش فراہم کیں۔ ہزاروں بے روزگار مردوں اور عورتوں کو روزگار اور مالی امداد بھی فراہم کی گئی۔ مزید براں چھوٹے پیمانے پر کاروباری سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ غرض یہ کہ اس نے سماجی خدمات اور معاشی مواقع کا ایک انتہائی وسیع سلسلہ قائم کر دیا۔ جس سے عوام کی معاشی حالت میں بہتری پیدا ہوئی۔ اسلامی محاذ نجات نے سماجی بہبود کے منصوبوں پر بطور خاص توجہ دے کر گویا ایک فلاحی ریاست کا کردار سنبھال لیا۔ حکومت اور افسر شاہی کی نااہلی و بدعنوانی اور عامۃ الناس کے روز مرہ کے تفکرات و مسائل سے لاتعلقی وچشم پوشی کے مقابلے میں اسلامی محاذ نجات کی تنظیمی صلاحیت، اس کی بے لوث اور جذبہ ایثار سے سرشار قیادت، اس کا اخلاقی مقاصد کے حصول کے لیے جوش و جذبہ سب چیزوں نے مل کر اسے ملک کی ایک مقبول عام جماعت بنا دیا۔ اسلامی محاذ نجات کو اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بدولت الجزائری سیاست میں اخلاقی برتری حاصل ہوگئی۔ چنانچہ مغرب کی تہذیبی و سماجی اقدار کے استرداد اور اسلامی و عربی روایات کو اپنانے سے متعلق اس کی دعوت سے مرد و زن دونوں متاثر ہوے۔ مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں کی بڑی تعداد اسلامی محاذ نجات کی حامی و ہمنوا بن گئی۔ سرکاری ذرائع ابلاغ کے منفی پروپیگنڈے کے باوجود عورتوں نے اسلامی محاذ نجات کی دعوت پر مغربی طرز لباس ترک کر کے 'حجاب' کی پابندی شروع کر دی (*Religion and Politics in Algeria* ص ۴۲۰-۴۲۱، ۴۲۷-۴۳۲؛ *Unholy War*، ص ۱۰۲-۱۰۳؛ *Islam and Multiparty Politics in Algeria*، ص ۵۷۶-۵۸۰، ۵۸۳-۵۸۷؛ *The Islamic Threat*، ص ۱۷۵-۱۸۲؛ *Islamic Revival in Algeria*، ص ۲۱۳-۲۱۴؛ *Jihad: the Trial of Political Islam*، ص ۱۶۶-۱۷۰؛ *Islam and Democracy :The Failure of Dialogue in Algeria*، ص ۴۶-۴۹؛ *The Islamic Movement in North Africa*، ص ۲۸۳-۲۸۵؛ Andrew J. Pierre و William B. Quandt: *The Algerian Crisis: Policy Options for the West*، نیویارک، ۱۹۹۶ء، ص ۷).

خلیج کی جنگ کے دوران اسلامی محاذ نجات اور حکومت کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اگرچہ الجزائر کی تمام بڑی سیاسی جماعتوں نے عراق کویت تنازعہ میں غیر ملکی طاقتوں کی مداخلت کی مخالفت کی تھی تاہم اسلامی محاذ نجات نے امریکہ اور اس کے عرب اتحادیوں بالخصوص

سعودی عرب پر سخت تنقید کی۔ اسلامی محاذ کے قائدین کا ایک تیرہ رکنی وفد عراق اور اس کے ہمسایہ خلیجی ممالک کے مابین مصالحت و مفاہمت کے لیے بھی کوشاں رہا۔ وفد نے عراق اور سعودی عرب کے متعدد دورے بھی کیے۔ اسلامی محاذ نے مشرق وسطیٰ کے امور میں غیر ملکی طاقتوں کی مداخلت کے خلاف الجزائر کے بڑے شہروں میں مظاہرے بھی کیے۔ ان مظاہروں میں ہزاروں افراد، بشمول دیگر سیاسی جماعتوں کے ارکان کے، شریک ہوتے رہے۔ ان مظاہروں کے دوران اسلامی محاذ کی طرف سے حکومت سے قومی اسمبلی کے انتخابات کے لیے حتمی تاریخ متعین کرنے کا مطالبہ بڑے زور و شور سے کیا گیا (The Foreign Policy of the Islamic Salvation Front، ص ۱۳۱-۱۳۲؛ The Islamic Movement in North Africa، ص ۲۹۱-۲۹۲)۔ آئندہ مہینوں میں اسلامی محاذ نجات اور حکومت کے مابین کشمکش میں شدت پیدا ہوگئی۔ اپریل ۱۹۹۱ء میں صدر شاذلی بن جدید کی طرف سے ملک میں پہلے کثیر جماعتی انتخابات کے انعقاد کے اعلان کے ساتھ ہی ایک نیا انتخابی قانون (حکمران جماعت قومی محاذ آزادی کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے) ازسرنو انتخابی حلقہ بندیوں کے لیے نافذ کیا گیا۔ اسلامی محاذ نجات کی طرف سے انتخابی قوانین میں ترمیم کے علاوہ قومی اسمبلی اور صدارتی انتخابات بھی ایک ساتھ کرانے کا مطالبہ کیا گیا۔ اپنے مطالبات کے حق میں اس نے عام ہڑتال کرانے کے علاوہ احتجاجی مظاہرے بھی منظم کیے۔ جلد ہی یہ مظاہرے اسلامی محاذ اور ریاستی اداروں کے مابین تصادم کی صورت اختیار کر گئے۔ صدر شاذلی نے ملک میں ہنگامی حالت نافذ کرنے کے علاوہ مجوزہ انتخابات بھی ملتوی کر دیئے۔ پولیس اور فوج نے اسلامی محاذ کے قائدین عباسی مدنی (صدر) اور علی بالحاج (نائب صدر) سمیت ہزاروں کی تعداد میں اس کے ارکان کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا اور اس کے دفاتر پر قبضہ کر لیا۔ ان ناموافق حالات کے باوجود اسلامی محاذ نے دسمبر ۱۹۹۱ء میں قومی اسمبلی کے لیے منعقد ہونے والے انتخابات کے پہلے مرحلے میں حیران کن کامیابی حاصل کی۔ پہلے مرحلے میں قومی اسمبلی کی کل ۴۳۰ نشستوں میں سے ۲۳۱ کے لیے ووٹ ڈالے گئے۔ اسلامی جماعت نے ان میں سے ۱۸۸ نشستیں حاصل کر لیں۔ انتخابات میں اس جماعت کی مقبولیت وکارکردگی کو اپنے لیے خطرہ جانتے ہوئے فوج نے اقتدار پر اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کا عزم کرلیا۔ صدر شاذلی بن جدید فوج کے دباؤ پر ۱۱ جنوری ۱۹۹۱ء کو مستعفی ہوگیا۔ جس پر فوج کی نگرانی میں قائم اعلیٰ سلامتی کونسل (اعلیٰ فوجی افسران، سابق وزیراعظم اور کابینہ کے چند ارکان پر مشتمل) نے سنبھال لیا۔ ملکی نظم ونسق جس کا سربراہ جنگ آزادی کے ایک سرکردہ رہنما بوضیاف کو مقرر کیا گیا تھا۔ سلامتی کونسل نے قومی اسمبلی کے لیے ہونے والے انتخابات کے دوسرے مرحلے (۱۳ جنوری ۱۹۹۲ء) کو منسوخ کر دیا۔ فوج کی طرف سے کیے گئے، ان نئے اقدامات کی مخالفت اگرچہ ملک کی تمام اہم سیاسی جماعتوں نے کی تھی، تاہم اسلامی محاذ نے ان کو علانیہ طور پر چیلنج کر دیا۔ ملکی اقتدار کو بالواسطہ طور پر اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد فوج نے بھی پوری قوت وطاقت سے اسلامی تحریک کی سیاسی قوت کو کچلنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ ملک میں طویل عرصہ کے لیے ہنگامی حالت نافذ کر دی گئی۔ اسلامی محاذ کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ پولیس، ملیشیا اور فوج نے ملک بھر میں اسلامی محاذ نجات کے دفاتر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے اثاثہ جات کو بھی ضبط کر لیا گیا۔ فوج کی کڑی نگرانی میں صحراء کے علاقے میں قائم کیے گئے نظربندی کیمپوں میں اسلامی تحریک کے ۳۵ ہزار

سے زائد ارکان کو جن میں کئی ہزار اساتذہ اور ڈاکٹر بھی شامل تھے، قید کر دیا گیا۔ عباس مدنی اور علی بالحاج پر ریاست کے خلاف سازش کے الزام میں فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ عدالت کی طرف سے انہیں ۱۲ سال قید کی سزا سنائی گئی (جولائی ۱۹۹۲ء)۔ حکومت کے ان اقدامات کے ردعمل میں ملک کے تمام بڑے شہروں میں پرتشدد مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جن پر قابو پانے کے لیے پولیس اور فوج نے طاقت کا بے دریغ استعمال کیا۔ چنانچہ اس دوران میں سیکڑوں کی تعداد میں اسلامی محاذ کے ارکان اور حامی ہلاک ہوے۔ مزیدبراں ہزاروں کی تعداد میں اس کے حامیوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ جہاں ان پر ریاست کے خلاف بغاوت کے الزام میں خصوصی عدالتوں میں مقدمات قائم کیے گئے۔ ان عدالتوں کی طرف سے ۱۹۹۴ء تک پانچ سو سے زائد افراد کو سزائے موت سنائی گئی۔ چنانچہ درجنوں افراد کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ حکومت کو ان اقدامات پر انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے قائم بین الاقوامی تنظیموں کی طرف سے شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا (*Unholy War*، ص۱۰۲-۱۰۵؛ *The Islamic Threat*، ص ۱۸۰-۱۸۷؛ John L.Esposito *Suppressed Algeria: Democracy*، در *Islam and Democracy*، مدیران: J.L.Esposito و John O.Voll، نیویارک، ۱۹۹۵ء، ص ۱۵۰-۱۷۲؛ Lahouari Addi: *Religion and Modernity in Algeria :The Islamist Challenge*، در *Journal of Democracy*، ۳:۴ (اکتوبر۱۹۹۲ء)، ص۷۵-۷۶؛ *Jihad :The Trial of Political Islam*، ص ۱۷۱- ۱۷۵ ؛ *Islam and Democracy:The Failure of Dialogue in Algeria*: ص ۵۹ - ۶۶؛ *The Islamic Movement in North Africa*، ص ۲۹۳-۳۰۵)۔

اسلامی عسکریت پسندی، تشدد اور جوابی تشدد: اسلامی تحریک کو کچلنے کے لیے الجزائری فوج، ملیشیا اور پولیس کے اہلکاروں کے ہاتھوں روا رکھے جانے والے ظلم وجبر کے نتیجے میں اسلامی جماعت کے ہزاروں ارکان بیرون ملک چلے گئے یا پھر اپنے ہی وطن میں روپوش ہوگئے۔ ملک میں پرامن طور انتخابی عمل کے ذریعے سیاسی وسماجی تبدیلی کے امکانات سے مایوس ان افراد نے ریاستی جبروتشدد کا مقابلہ کرنے نیز موجودہ لادینی نظام کو نیست ونابود کر کے ایک اسلامی ریاست کے قیام کی غرض سے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔ الجزائر میں اسلام پسندوں کو اعتدال پسندی اور پرامن تبدیلی اقتدار کی جدوجہد کا راستہ ترک کر کے انقلابیت پسندی، یعنی مسلح جدوجہد کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کی طرف لانے میں فوج کی تحریک پر قائم سیاسی جبرو استبداد نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اسلامی محاذ نجات کا پرامن طور پر دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تعلم کے ذریعے سماجی و تہذیبی تبدیلیوں اور جمہوری عمل کے ذریعے انتقال اقتدار کے بارے میں اپنا طے شدہ لائحہ عمل ترک کر کے انقلابیت پسندی (radicalization) کی طرف مائل ہونا اور جی۔ آئی۔ اے (Groupe Islamique Armee= GIA) جیسی عسکری تنظیم کا وجود میں آنا، الجزائری فوج کے جبر و استبداد پر مبنی آمرانہ طرز حکمرانی اور بالخصوص ملک میں سے سیاسی اور مادی دونوں اعتبار سے 'سیاسی اسلام' کے آثارو نشانات کو مٹانے کے لیے اس کے عزم اور کارروائیوں کا ناگزیر نتیجہ ہے (*Religion and Politics in Algeria*، ص ۴۲۹- ۴۳۱)۔

چنانچہ اسلامی محاذ نجات سے وابستہ انتہا پسندی کی طرف مائل افراد نے ایک عسکری تنظیم اسلامی سپاہ نجات (Armee Islamique du salut =AIS) قائم کر لی۔ اسی طرح کی ایک عسکری تنظیم عرب افغان مجاہدین نے، جو

افغانستان میں سوویت افواج کے خلاف سالہا سال تک برسرپیکار رہنے کے بعد، سوویت افواج کی واپسی پر الجزائر واپس پہنچے تھے اور اسلامی تحریک میں شامل ہوگئے تھے، (Groupe Islamique Armee=GIA) کے نام سے قائم کر لی۔ ان دونوں عسکری تنظیموں نے مسلح افواج، پولیس، ملیشیا کے اہلکاروں اور اعلیٰ حکومتی وسیاسی شخصیات، سول افسران اور عدلیہ سے وابستہ افراد پر حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چنانچہ ان دونوں تنظیموں بالخصوص جی آئی اے (GIA) کے ہاتھوں متعدد سیاسی وحکومتی شخصیات اور اعلیٰ حکام قتل ہوے۔ اس نے مارچ ۱۹۹۴ء میں تزلہ (Tazoult) کی جیل پر حملہ کر کے ایک ہزار سے زائد سیاسی قیدی رہا کر الیے۔ اس عسکری گروہ پر صحافیوں، لادینی نظریات کے حامی دانش وروں اور یورپی ممالک بالخصوص فرانسیسی شہریوں اور مسیحی مبشرین کی ہلاکت کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۳-۱۹۹۴ء کے دوران میں ملک کے دیہی و دور افتادہ علاقوں میں عسکریت پسندوں کو مکمل غلبہ حاصل ہوگیا۔ الجزائری فوج اور پولیس کی طرف سے ان دونوں عسکری تنظیموں کے خلاف طاقت کا بے محابا استعمال ہوا۔ ان کے مراکز اور پناہ گاہوں پر فضائی حملے کیے گئے، ان کے گرفتار شدہ ارکان اور ان کے حامیوں کو اذیت رسانی کے بعد ہلاک کیا گیا۔ ۱۹۹۴ء تک جی آئی اے کے سربراہ اور اس کے نائب سمیت اس کے سیکڑوں ارکان ہلاک کیے گئے۔ اسلامی تحریک کو کچلنے اور انہیں عوام کی تائید و حمایت سے محروم کرنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت فوج اور پولیس کی طرف سے دیہی وشہری علاقوں میں نہتے شہریوں کے اجتماعی قتل کے واقعات روزمرہ کا ایک عام معمول بن گئے۔ قتل کے ان واقعات کا الزام اسلامی تنظیموں پر عائد کیا جاتا اور عوام میں دہشت اور خوف وہراس پیدا کرنے کے لیے سرکاری ذرائع ابلاغ سے ان کی خوب تشہیر کی جاتی۔ انسانی حقوق کی بعض عالمی تنظیموں کی رپورٹوں کے مطابق الجزائری فوج ایک طے شدہ منصوبے کے تحت شہری آبادی کے قتل عام کے واقعات میں ملوث رہی ہے۔ ''ہیومن رائٹس واچ'' نے اپنی رپورٹ (۱۹۹۹ء) میں متعدد ایسے واقعات کی نشان دہی کی ہے جن میں فوج کے دستوں نے رات کے وقت کارروائی کر کے سیکڑوں نہتے افراد کو قتل و ذبح کیا اور خواتین کی عصمت دری کی۔ الجزائری حکمرانوں نے حقائق پر پردہ ڈالنے کی پالیسی اختیار کیے رکھی، چنانچہ انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں کے وفود کے الجزائر میں داخلے اور تشدد و غارت گری کے واقعات کی تحقیق و تفتیش پر سخت پابندی عائد کی گئی۔ تاہم خود فوج کے بعض منحرف افسران کی طرف سے بھی، جو ۱۹۹۲ء کے بعد سے اسلامی عسکریت پسند گروہوں کے خلاف کارروائیوں کی قیادت کرتے رہے، الجزائری فوج پر ہزاروں نہتے اور بے گناہ شہریوں کے قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے (Freedom of Religion and Belief، ص ۲۱-۲۲؛ Human Rights Watch World Report 1999 نیویارک، لنڈن، ۱۹۹۹ء، ص ۳۳۴- ۳۳۶؛ Edward W. Said: The End of the Peace Process، لنڈن، ۲۰۰۲ء، ص ۲۳۴- ۲۳۵؛ Mohammed M.Hafez: Armed Islamist Movements and Poltical Violence in Algeria در Middle East Journal، ۴:۴ (۲۰۰۰ء)، ص۵۷۲-۵۸۹؛ Jihad: The Trial of Political Islam، ص ۲۷۱-۲۷۴؛ Islam and Democracy: The Failure of Dialogue in Algeria، ص ۶۷-۷۱، ۸۸ - ۸۹؛ Tricolor and the Crescent، ص ۱۴۲-۱۴۳؛ The Europa World Year Book 2002، ص ۴۳۲. تفصیل کے لیے دیکھیے: Youcef

Bedjaoui، Abbas Aroua و دیگر: An Inquiry into the Algerian Massacres، جنیوا، ۱۹۹۹ء).

مذاکرات و انتخابات: فوج کے بعض عناصر جو ملک میں بدعنوانی کے خلاف صدر بوضیاف کی مہم سے نالاں تھے، کے ہاتھوں بوضیاف کے قتل (۲۹ جون ۱۹۹۲ء) کے بعد علی کافی کی سربراہی میں نئی حکومت (ریاستی کونسل) قائم ہوئی۔ ریاستی کونسل کے سربراہ علی کافی نے بحران کے تصفیے کے لیے حزب مخالف کی جماعتوں سے مذاکرات کا ڈول ڈالا۔ تاہم قومی مصالحت کے لیے اس کی کوششیں ملک کی تمام اہم سیاسی جماعتوں کی طرف سے مذاکرات کے مقاطعہ کے سبب ناکام رہیں۔ سابق جرنیل الامین زیرول (Liamine Zeroul)، جو طاقت کے استعمال کے بجائے سیاسی مکالمہ و مذاکرات کے ذریعے بحران کے تصفیے کا حامی تھا، نے فوج کی طرف سے جنوری ۱۹۹۴ء میں عرصہ تین سال کے لیے صدر مقرر ہونے کے بعد اسلامی محاذ نجات کی صف دوم کی قیادت (علی جدی اور عبدالقادر وغیرہ) کو جیلوں سے رہا کر کے اس کے ساتھ بحران کے حل کے لیے مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا۔ تاہم مقتدر حلقوں بالخصوص فوج میں سخت گیر موقف رکھنے والے عناصر، جو اسلامی تحریک کو کسی بھی قسم کی رعایت دینے اور اس کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنے کے خلاف تھے، کے جارحانہ رویے کے سبب یہ مذاکرات بے نتیجہ رہے۔ مذاکرات کی ناکامی پر فوج نے مسلح گروہوں بالخصوص جی آئی اے کا صفایا کرنے کی غرض سے نومبر ۱۹۹۴ء سے ایک بڑی کارروائی کا آغاز کیا۔ چنانچہ ۱۹۹۵ء کے وسط تک اس کے ہاتھوں مختلف اسلامی تنظیموں کے ہزاروں افراد ہلاک ہوئے۔ ۱۹۹۴ء کے وسط میں صدر زیرول نے قومی مفاہمت اور ملک میں قومی اسمبلی کے انتخابات کی راہ ہموار کرنے کے لیے ایک عبوری قومی کونسل (NTC) قائم کی۔ ملک کی تمام اہم سیاسی جماعتوں کی طرف سے اس میں شمولیت سے انکار پر اس کے لیے گمنام سیاسی جماعتوں کے ۲۰۰ ارکان نامزد کیے گئے۔ قومی کونسل بھی ملک میں مفاہمت کے عمل کو آگے بڑھانے اور سیاسی جماعتوں کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ نومبر ۱۹۹۴ء اور جنوری ۱۹۹۵ء میں اٹلی کے شہر روم کی کیتھولک کمیونٹی (Sant`Egidio) کے زیراہتمام الجزائر کی سات اہم سیاسی جماعتوں (اسلامی وغیر اسلامی) کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں بحران کے تصفیے اور قومی مفاہمت کی غرض سے ان سیاسی جماعتوں (بشمول اسلامی محاذ نجات) کے مابین ایک معاہدہ طے پایا۔ "معاہدہ روم" میں حکومت و اقتدار کے حصول یا پھر اس پر تسلط و گرفت کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے جبر و تشدد کو ترک کرنے اور آمریت کے استرداد پر اتفاق کیا گیا۔ مزیدبراں الجزائر کے مقتدر حلقوں سے سیاسی تبدیلی و انتقال اقتدار کے لیے عوام کی رائے کے احترام اور بنیادی انفرادی و اجتماعی حقوق بالخصوص آزادی اظہار رائے کے تحفظ کا مطالبہ کیا گیا۔ شرکاے کانفرنس کی طرف سے سیاسی معاملات میں فوج کی مداخلت اور ملک میں نافذ ہنگامی حالت کے خاتمے اور اسلامی محاذ نجات کے محبوس رہنماؤں کی رہائی کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ کانفرنس میں ریاستی اداروں کی طرف سے جبروتشدد کا سلسلہ موقوف کرنے اور حکومت کے سیاسی جماعتوں سے مذاکرات جیسے مطالبات بھی پیش کیے گئے۔ اس موقع پر اسلامی محاذ نجات اور دیگر سیاسی جماعتوں کو آئندہ انتخابات میں باہر رکھنے کی بھی مخالفت کی گئی۔ فوج میں سخت گیر مؤقف کے حامل گروہ نے اس کانفرنس کے مطالبات کو بھی مسترد کر دیا۔ حکومت نے معاہدہ روم پر دستخط کرنے والی سیاسی جماعتوں کو معاہدہ کے حق میں رائے عام کو

متحرک کرنے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان جماعتوں کے قائدین کے خلاف زبردست پروپیگنڈا مہم چلائی گئی۔ انہیں غدار اور مسیحی کلیسا کا حاشیہ بردار قرار دیا گیا۔ مغربی ممالک (بشمول امریکہ اور فرانس) کی طرف سے معاہدہ روم کی صرف زبانی کلامی حمایت پر اکتفا کیا گیا۔ مذکورہ دونوں ممالک کی طرف سے اسلامی محاذ نجات کے خلاف فوج کی طرف سے جاری کارروائیوں کی حمایت کی گئی (*The Foreign Policy of The Islamic Salvation Front in Algeria*، ص ۱۳۳-۱۳۴؛ *The Islamic Threat*، ص ۱۸۹-۱۹۰؛ *The Algerian Crisis*، ص ۳۱- ۳۴،۵۹-۶۳).

اسلامی محاذ نجات کو انتخابی عمل سے باہر رکھنے کے لیے ۱۹۹۵ء کے وسط میں ملک میں نئے انتخابی قوانین رائج کیے گئے۔ان قوانین میں صدارتی منصب کے لیے امیدوار کی اہلیت کو ملک کے ۲۵ صوبوں (ولایات) میں سے پچھتر ہزار (۷۵,۰۰۰) افراد کی تائید، (بوقت نامزدگی کاغذات) سے مشروط کر دیا گیا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۹۵ء کے صدارتی انتخابات میں مطلوبہ معیار اہلیت پر پورا اترنے والے صرف چار امیدوار سامنے آئے تھے۔ صدر زیرول، ملک کی بڑی سیاسی جماعتوں کی طرف سے انتخابات کے مقاطعہ کی اپیل کے باوجود، سرکاری ذرائع کے مطابق ۶۱ فیصد ووٹ لے کر کامیاب ہوے جب کہ ڈالے گئے ووٹوں کا تناسب ۷۶ فیصد رہا۔ صدر زیرول کے دوسرے دور صدارت میں ملکی دستور میں ترمیم (۱۹۹۶ء) کر کے مجلس قانون ساز (پارلیمنٹ) کے دوسرے ایوان مجلس الشعب (Council of the Nation) کے قیام کے لیے راہ ہموار کی گئی، البتہ اس کے دوتہائی ارکان کی نامزدگی کا اختیار صدر کو دے دیا گیا۔ سب سے اہم یہ کہ مذہب، زبان، جنس اور جغرافیائی حد بندیوں کی بنیاد پر قائم تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ علاوہ ازیں ملک میں مکمل متناسب نمائندگی کے نظام کی بنیاد فراہم کی گئی۔ ان دستوری ترامیم کے بعد ملک میں چند نئی سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں جب کہ پہلے سے موجود بعض سیاسی جماعتوں نے اپنے نام بدل لیے۔ جون ۱۹۹۷ء میں ہونے والے پارلیمانی انتخابات میں صدر زیرول کی جماعت (Reassemblement Nationale Democratique-RND) اکثریتی جماعت (کل ۳۸۰ نشستوں میں سے ۱۵۶ حاصل کر کے) بن کر ابھری جب کہ نئی قائم شدہ اسلامی جماعت حزب النھضہ نے ۳۸ نشستیں حاصل کیں۔ سابق وزیراعظم احمد قیحیہ (Ahmad Quyahia) کی سربراہی میں تشکیل پانے والی نئی حکومت میں اسلامی جماعت حزب النھضہ اور اسلامی محاذ نجات کے چند منحرف ارکان بھی شامل کیے گئے (*Unholy War*، ص ۱۰۴-۱۰۵).

۱۹۹۵-۱۹۹۷ء کے دوران میں اسلامی عسکری تنظیموں اور ریاستی اداروں کے مابین تصادم مزید شدت اختیار کر گیا۔ فوج اور پولیس کے ہاتھوں شدید زک اٹھانے کے بعد جی آئی اے نے ملک بھر میں کار بم دھماکوں کا سلسلہ شروع کر دیا، جس سے ہزاروں افراد ہلاک ہوے جب کہ اس کے خلاف فوج اور پولیس کی کارروائیوں کے نتیجے میں، سرکاری ذرائع کے مطابق صرف عین دفلہ (Ain Defla)، جیجل (JiJle) اور مدیہ (Medea) کے علاقوں میں اس کے ۱۳۰۰ ارکان ہلاک ہوے۔ ۱۹۹۷ء میں اسلامی محاذ نجات کے عسکری بازو (AIS) نے یکطرفہ طور پر عسکری سرگرمیوں کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا (*Europa World Year Book 2000*، ص ۳۸۸- ۳۸۹)۔ ملک میں گزشتہ کئی سالوں سے جاری سیاسی بحران کے سبب عالمی سطح پر بھی حکومت کو شدید تنقید و ملامت کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۹۷ء میں اقوام متحدہ کے

سیکرٹری جنرل کوفی عنان کی طرف سے الجزائر کے بحران کے تصفیے کے لیے مداخلت کی دھمکی دی گئی۔ دریں حالات حکومت نے مفاہمت کا تاثر دینے کے لیے اسلامی محاذ نجات کے مرکزی رہنماؤں کو کچھ عرصہ کے لیے رہا کر دیا (The Islamic Threat، ص ۱۹۰ -۱۹۱؛ Islam and Democracy the Failure of Dialogue in Algeria: ص ۷۵-۷۹، ۸۸-۸۹).

اپریل ۱۹۹۹ء میں منعقد ہونے والے صدارتی انتخابات میں فوج کے حمایت یافتہ امیدوار عبدالعزیز بوتیف لیقہ سابق وزیر خارجہ (۱۹۶۳ـ۱۹۷۹ء) کامیاب ٹھہرے۔ عبدالعزیز بوتیف لیقہ، کے دور صدارت میں قومی مصالحت اور سیاسی استحکام کے عمل کی طرف قدرے پیش رفت ہوئی۔ حکومت اور اسلامی محاذ نجات کے رہنماؤں کے مابین مذاکرات بارآور ثابت ہوے۔ عبدالعزیز بوتیف لیقہ کی حکومت نے قومی مفاہمت و مصالحت کی غرض سے ملک میں ایک نیا قانون (Law of Civil Reconciliation) جولائی ۱۹۹۹ء میں نافذ کیا۔ قومی مصالحت کے قانون کے نفاذ کے بعد جنوری ۲۰۰۰ء میں حکومت ، فوج اور اسلامی محاذ کے نمائندوں کے مابین مذاکرات میں مؤخر الذکر فریق نے اسلامی محاذ کو، اس کے سابق ارکان کے مکمل سیاسی و شہری حقوق کی بحالی کے بدلے تحلیل کرنے کا معاہدہ کیا۔ جس پر محاذ کے تقریباً تین ہزار ارکان کو جیلوں سے رہا کر دیا گیا جب کہ سنگین جرائم کے الزامات میں ماخوذ سیکڑوں ارکان کی سزا میں تخفیف کی گئی۔ اس قانون میں حکومت کے خلاف مسلح کاروائیوں کو ترک کرنے والوں کے لیے عام معافی کا وعدہ کیا گیا۔ اس سال کے اوائل میں اسلامی عسکریت پسند گروہوں کے ہزاروں ارکان نے ہتھیار ڈال دیے۔ مفاہمت کے عمل میں پیش رفت کے باوجود آئندہ سالوں کے دوران میں ملک میں بم دھماکوں، اجتماعی قتل کے واقعات اور اعلیٰ حکومتی وانتظامی عہدیداروں پر قاتلانہ حملوں کا سلسلہ (قدرے تخفیف کے ساتھ) جاری رہا۔ جنوری ۲۰۰۰ء میں قانون قومی مصالحت کے تحت عام معافی اور ہتھیار ڈالنے کی مہلت کے اختتام پر فوج نے ملک کے شمال مشرقی اور جنوبی علاقوں میں عسکریت پسندوں کے مراکز پر حملے کیے۔ جولائی ۲۰۰۰ء تک سرکاری افواج کے ہاتھوں ۱۱۰۰ نہتے شہری اور ۲۰۰۰ عسکریت پسند ہلاک ہوے۔ آئندہ سال بھی فوج اور عسکریت پسندوں کے درمیان شدید جھڑپیں ہوئیں جن میں فوج اور پولیس کے سیکڑوں جب کہ عسکریت پسند گروہوں کے ہزاروں ارکان اور نہتے شہری ہلاک ہوے (Unholy War، ص ۱۰۴-۱۰۵؛ Islam and Democracy: The Failure of Dialogue in Algeria، ص ۷۹-۸۳، ۹۰-۹۲؛ The Europa World Year Book 2002، ص ۴۳۱ -۴۳۲)۔

اسلامی محاذ نجات کے رہنماؤں کے حکومت کے ساتھ طے پانے والے مذکورہ معاہدے کے بعد مئی ۲۰۰۱ء میں کالعدم اسلامی محاذ کے ایک سابق رہنما احمد طالب ابراہیمی نے 'الوفا والعدل' کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی۔ حکومت نے، اسے اسلامی محاذ نجات کے احیاء و تنظیم نو کی کوشش قرار دے کر، تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ نومبر ۲۰۰۰ء حکومت نے نئی تشکیل شدہ جماعت کے دفاتر بند کر دیئے اور تمام دستاویزات قبضہ میں لے لیں (The Europa World Year Book 2002، ص ۴۳۲).

۳۰ مئی ۲۰۰۲ء کو ہونے والے انتخابات میں صدر عبدالعزیز بوتیف لیقہ کی حمایت یافتہ جماعت قومی محاذ آزادی، جو آزادی کے بعد سے فوج کی حمایت واشتراک سے جنوری ۱۹۹۲ء میں صدر شاذلی کے مستعفی ہونے تک اقتدار میں رہی، کل ۳۸۵ نشستوں میں سے ۱۹۹ نشستیں

حاصل کر کے ایک بار پھر برسراقتدار آگئی۔ ان انتخابات میں اسلامی محاذ نجات قانوناً ممنوع قرار دیئے جانے کے سبب حصہ نہ لے سکا۔ البتہ دیگر دو اسلامی جماعتیں تحریک اصلاح (سابق نام حزب النھضہ) اور حمس (سابق نام حماس) علی الترتیب ۳۸ اور ۴۳ نشستیں حاصل کر کے تیسرے اور چوتھے نمبر پر رہیں (The World Factbook 2002، ص ۷)۔ اپریل ۲۰۰۴ء کو منعقد ہونے والے صدارتی انتخابات میں صدر عبدالعزیز بوتیف لیقہ ایک بار پھر عرصہ پانچ سال کے لیے ملک کے صدر منتخب ہوگئے۔

الجزائری حکومتوں کی مذہبی پالیسی: جنوری ۱۹۹۲ء سے فوج کی پشت پناہی سے قائم حکومتوں نے اسلامی سیاسی و عسکری گروہوں کے اثر و نفوذ کو محدود کرنے کے لیے اسلامی و دینی امور کو سختی سے ریاستی ضبط و نظم کے تابع رکھنے کی پالیسی اختیار کیے رکھی۔ گزشتہ چند سالوں سے اس سلسلہ میں خصوصی اقدامات کیے گئے۔ اس سلسلہ میں مساجد سے غیر سرکاری ائمہ کو ہٹا کر ان کی جگہ سرکاری ائمہ مقرر کیے گئے، سابق مسجد کمیٹیوں کو تحلیل کر کے ان کی جگہ سرکاری ملازمین پر مشتمل کمیٹیاں تشکیل دی گئیں، ''رسوماتی اسلام'' کو فروغ دینے کا اہتمام کیا گیا۔ اس غرض سے خصوصاً صوفیا اور درویشوں کو مالی مدد بہم پہنچائی جاتی رہی اور ان کے اعمال و رسوم کی ذرائع ابلاغ پر تشہیر کا خوب اہتمام کیا جانے لگا۔ ''اعتدال پسند اور لبرل و روشن خیال اسلام'' کی درآمد کی طرف خصوصی توجہ دی گئی، چنانچہ مصر کی جامعۂ ازھر سے درجنوں علما اور مبلغین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جو ''سیاسی اسلام'' کے پیدا کردہ ''انحرافات'' کی درستی و اصلاح پر مامور کیے گئے (Religion and Politics in Algeria، ص ۴۳۳، حاشیہ ۳؛ M`hand Berkouk: The Algerian Islamic Movement from Protest to Confrontation، در Intellectual Discourse، ۶: ۱ (۱۹۹۸ء)، ص ۵۹-۶۰)۔

اسلامیت کا استحکام: الجزائر میں اسلامی محاذ نجات پر قانونی پابندی اور اس کے رہنماؤں کی قید و بند کے باوجود اسلام کی بالادستی کے حامی افراد و گروہ متحرک رہے۔ ان کی طرف سے پرامن دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ حکومت سے پبلک مقامات پر شراب نوشی پر پابندی عائد کرنے، عورتوں کے لباس کے لیے مناسب ضابطہ کے نفاذ، قرآنی مکاتب کی تعداد میں اضافہ، عربی زبان کی ترویج اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر دینی پروگراموں کے دورانیے میں توسیع جیسے مطالبات پیش کیے جاتے رہے۔ گزشتہ دو دہائیوں سے اسلام پسندوں کے خلاف ریاستی اداروں کی کارروائیوں کے باوجود الجزائر میں عامۃ الناس میں اسلامی بیداری کے رجحان کو تقویت پہنچی۔ اسلام کی تہذیبی و سماجی اقدار کی پاسداری کی طرف میلان عام ہوا (Religion and Politics in Algeria، ص ۴۲۰-۴۲۱، ۴۲۶)۔

الجزائر کے بحران کی بین الاقوامی جہت: الجزائر میں اسلامی محاذ کی انتخابی عمل میں کامیابی، فوج کی مداخلت، انتخابی نتائج کی تنسیخ اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کے عالمی سیاست پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ الجزائر میں اسلامی ریاست کے قیام کی داعی و علمبردار جماعت کی انتخابات میں کامیابی پر عمان سے قاہرہ اور انڈونیشیا سے پاکستان تک کی تمام اسلامی تحریکوں نے انتہائی مسرت و شادمانی کا اظہار کیا۔ ان تحریکوں کو اپنے اپنے ممالک میں جمہوری عمل کے ذریعے اقتدار تک رسائی کی امید بندھی تھی۔ اس کے برعکس مغربی ممالک اور مشرق وسطیٰ کی موروثی بادشاہتوں اور مستبد حکومتوں کو شدید تشویش اور اضطراب لاحق ہوگیا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۹۲ء میں فوج کی طرف سے انتخابی نتائج کو کالعدم قرار دے کر اقتدار

براہ راست اپنے ہاتھ میں لینے اور اسلامی تحریک پر کاری ضرب لگانے کے عمل کا آغاز ہوا تو نہ صرف مغربی ممالک بلکہ شمالی افریقہ اور مشرق وسطی کی اکثر حکومتوں نے سکھ کا سانس لیا۔ کم و بیش تمام عرب حکومتوں نے الجزائری فوج کے اقدامات کی تائید و حمایت کی۔ مملکت سعودی عرب نے نئی الجزائری حکومت کو بھرپور مالی امداد بھی فراہم کی (The Europa World Year Book 2002، ص ۴۳۵)۔

بدقسمتی سے مغربی دنیا کے ہاں الجزائر جیسے اسلامی ملک میں ایک اسلامی جماعت کی انتخابی عمل میں کامیابی کو ایران کے اسلامی انقلاب سے بھی زیادہ خطرناک تصور کیا گیا۔ مغربی ممالک کو الجزائر میں اسلامی حکومت کے قیام کی صورت میں شمالی افریقہ اور مشرق وسطی کے ممالک کے علاوہ مصر اور ترکی میں ایسی دور رس سیاسی تبدیلیوں کا خدشہ لاحق ہوا، جو ان ممالک میں مغربی دنیا کے مفادات کے لیے نقصان دہ ہو سکتی تھیں۔ مغربی تجزیہ نگاروں کی رائے میں الجزائر میں اسلامی تحریک کی سیاسی کامیابی شمالی افریقہ اور مشرق وسطی کی اسلامی تحریکوں کی سیاسی فتوحات اور کامیابیوں کا محرک بھی بن سکتی تھی اور ان ممالک میں ایسی حکومتیں قائم ہو سکتی تھیں جن کا رویہ مغربی ممالک کے بارے میں اطاعت کیشی و حاشیہ برداری کے بجائے غیر دوستانہ ہو سکتا تھا (The Algerian Crisis، ص ۱-۲، ۱۷-۱۹)، چنانچہ مغربی دنیا کے حکمران جو دنیائے اسلام میں ایران جیسے کسی 'اسلامی انقلاب' کے امتناع کی پالیسی پر عمل پیرا تھے، ایک ایسی اسلامی جماعت کو جو گولی سے نہیں، بلکہ ووٹ کے ذریعے برسراقتدار آتے نظر آ رہی تھی، اقتدار سے باہر رکھنے اور اس پر کاری ضرب لگانے کے لیے پوری طرح میدان عمل میں اتر آئے۔ ان ممالک نے اسلامی نظام کی حامی سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں لادینیت و مغربیت کی علمبردار و محافظ الجزائری فوج کی کھل کر سیاسی حمایت کی (الجزائر کی اسلامی تحریک کے بارے میں مغربی ممالک کی حکمت عملی کے لیے دیکھیے: The Algerian Crisis، ص ۲۱-۳۰، ۳۷-۴۶، ۵۱-۵۸)۔

فرانس کا رویہ: اسلامی محاذ نجات کے قیام (۱۹۸۹ء) اور اس کی غیر معمولی مقبولیت پر فرانس کے حکومتی حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔ فرانس کو اس جماعت کے ایک مؤثر سیاسی قوت بننے کی صورت میں الجزائر میں اپنے سیاسی و معاشی مفادات اور تہذیبی و ثقافتی اثر و نفوذ کے لیے ایک حقیقی خطرہ دکھائی دینے لگا تھا، چنانچہ اس کی طرف سے اسلامی جماعت کا راستہ روکنے کے لیے ممکنہ تدابیر اختیار کی گئیں۔ فرانس کے وزیراعظم، ارکان پارلیمنٹ اور دانش وروں کی طرف سے اسلامی جماعت کے خلاف مذمتی بیانات صادر کیے گئے جب کہ ذرائع ابلاغ کی طرف سے اس کے خلاف زبردست پروپیگنڈا مہم چلائی گئی۔ فرانس میں، جہاں متعدد الجزائری سیاسی جماعتوں نے اپنے دفاتر کھول رکھے تھے، اسلامی محاذ نجات کو اپنا دفتر قائم کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ۱۹۹۰ء کے بلدیاتی اور بالخصوص دسمبر ۱۹۹۱ء کے پارلیمانی انتخابات میں اس جماعت کی کامیابی کے بعد مذکورہ فرانسیسی حلقوں کی طرف سے الجزائری فوج کو اقتدار سنبھالنے اور اسلامی جماعت پر کاری ضرب لگانے کی ترغیب دی گئی۔ فوج کے جنوری ۱۹۹۲ء میں اقتدار پر قابض ہونے اور اسلامی تحریک کے خلاف اس کی کارروائیوں کی فرانس کی طرف سے زبردست حمایت کی گئی۔ اسلامی تحریک کو کچلنے کے لیے اس کی طرف سے الجزائری فوج کو کثیر مقدار میں جنگی سازوسامان، جاسوسی کے آلات، تکنیکی معاونت اور ضروری معلومات (اسلامی تحریک کے مراکز اور پناہ گاہوں کے متعلق) فراہم کی جاتی رہیں۔ مزید براں فرانس میں اسلامی تحریک کی شاخوں پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کی طرف سے

شائع کیے گئے رسائل و جرائد اور کتابچوں کو ضبط کر لیا گیا، اس کے رہنماؤں اور متحرک وفعال کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا، جب کہ ان کے خاندانوں کو شہری سہولیات اور ضروریات زندگی کی فراہمی کے حوالے سے حاصل مراعات وفوائد سے محروم کر دیا گیا جس کے سبب یہ ہزاروں خاندان فقر وفاقہ سے دوچار ہوے۔ فرانس نے یورپی یونین (European Union) اور شمالی اوقیانوس کی دفاعی تنظیم (NATO) کے رکن ممالک کو الجزائری فوج کی پشت پر لاکھڑا کرنے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ فرانس ہی کی تحریک پر دہشت گردی کے قلع قمع کے نام پر یورپی یونین کے رکن ممالک میں اسلامی محاذ نجات کے حامی وترجمان عربی جرائد واخبارات کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی، جب کہ اس کے رہنماؤں ومنتخب ارکان پارلیمان کو، جو الجزائر میں فوجی انقلاب کے بعد ان ممالک کی طرف چلے گئے تھے، جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ فرانس ہی کی تحریک پر یورپی یونین کے رکن ممالک کے علاوہ شمالی افریقہ اور مشرق وسطی کے ممالک کے حکومتی نمائندوں کے تیونس (جنوری ۱۹۹۵ء) اور بارسیلونا (نومبر ۱۹۹۵ء) میں منعقدہ اجلاسوں میں اسلامی محاذ نجات اور دیگر اسلامی تنظیموں کو دہشت گرد قرار دیا گیا اور ان کے قلع قمع کے لیے باہمی اتحاد و اشتراک عمل کی غرض سے حکمت عملی وضع کی گئی اور اہم فیصلے کیے گئے.

اکتوبر ۱۹۸۸ء میں ملک میں جمہوریت کی بحالی کے حق میں مظاہروں کو کچلنے کے لیے فوج اور پولیس کے ہاتھوں قوت و طاقت کے استعمال، جس کے نتیجے میں تقریباً ۱۳ سو افراد، جن میں اکثریت نوجوانوں کی تھی، ہلاک ہوئے تھے، کی فرانس کی طرف سے سرگرم حمایت کی گئی۔ مغربی خصوصاً فرانسیسی ذرائع ابلاغ کا رویہ بھی الجزائر کی اسلامی محاذ کے بارے میں بطور خاص انتہائی متعصّبانہ اور معاندانہ رہا۔ اس امر کا اعتراف خود بعض مغربی مصنفین نے بھی کیا ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ نے اسلامی تحریک کی کامیابی کو مہذب دنیا کی سیاسی و تہذیبی اقدار خصوصاً جمہوریت اور انسانی حقوق کے لیے ایک خطرہ کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ الجزائری افواج اور اسلامی تنظیموں کے مابین تصادم کے دوران میں مؤخرالذکر فریق کو، الجزائری عوام کی تائید اور عالمی سطح پر ہمدردی اور حمایت سے محروم رکھنے کے لیے، ظالم اور سفاک ثابت کرنے جب کہ فوج اور پولیس کے مظالم کی شدت کو کم کر کے پیش کرنے اور اسے اخلاقی و قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے زبردست پروپیگنڈا مہم برپا کیے رکھی۔ فرانسیسی ذرائع ابلاغ نے اسلامی محاذ نجات کے قائدین اور اس کے کارکنوں کی تضحیک و تحقیر میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کے بارے میں انتہائی غلیظ اور ناشائستہ زبان استعمال کرتے ہوئے انہیں غلیظ و ناپاک اور ذلیل و کمینہ قرار دیا گیا۔ ان کی وضع قطع، لباس اور داڑھی کا تمسخر اڑایا گیا اور انہیں فرانس اور مہذب انسانیت کے لیے ایک خطرہ قرار دیا گیا۔ بدیں وجہ الجزائر میں جاری کشمکش محض نظام حکومت کی تبدیلی کے ایک مسئلہ کے طور پر نہیں بلکہ "تہذیبوں کے تصادم" کی ایک ایسی زندہ مثال کے طور پر ہی دیکھی جانی چاہیے (R Scott Appleby: *Religious Fundamentalism and Global Conflict*، نیویارک، فارن پالیسی ایسوسی ایشن، ۱۹۹۴ء، ص ۵۵؛ *The Islamic Movement in North Africa*، ص ۲۸۲؛ *Unholy War*، ص ۱۰۴-۱۰۵؛ *The Failure of Dialogue in Islam and Democracy Algeria*: ص ۷-۱۲).

اکثر یورپی ممالک نے اسلامی تحریک کو کچلنے کے لیے الجزائری فوج کی پوری قوت سے خم ٹھونکی تھی۔ مزید برآں اسلامی محاذ اور دیگر سیاسی جماعتوں کو شریک کیے بغیر

ملکی سیاسی اداروں کی تنظیم نو کے سلسلہ میں فوج کی حمایت یافتہ حکومت کی بھرپور حمایت کی تھی۔ ۱۹۹۵ء میں الجزائر میں صدارتی انتخابات میں فوج کے حمایت یافتہ امیدوار صدارت جنرل خالد نظار کی فرانس و دیگر یورپی ممالک اور امریکہ کی طرف سے برملا طور سے حمایت کی گئی (Foreign Policy of The Islamic Salvation Front، ص ۱۲۷، ۱۳۲-۱۳۳؛ Algerian-French Relations، ص ۲۵-۳۴، Tricolor and Cresient، ص ۱۴۲-۱۴۶؛ The Algerian Crisis، ص ۲۸-۳۰، ۳۷-۴۳)۔

الجزائری بحران کے دوران میں مغربی ممالک بالخصوص امریکہ اور فرانس کی طرف سے اسلامی جماعت کے مقابلے میں فوج کی غیر مشروط تائید و حمایت جمہوریت، معاشرتی آزادی اور انسانی حقوق کے بارے میں ان ممالک کے دوہرے معیار کی غماز ہے۔ مغربی ممالک کا رویہ اس حقیقت کا بھی غماز ہے کہ وہ عالمی سیاست میں تنوع (diversity) اور پرامن بقائے باہمی کے اصول کی بنا پر حقیقی اسلامی ریاستوں کے وجود کو برداشت کرنے پر ہرگز آمادہ نہیں (The Foreign Policy of Islamic Salvation Front in Algeria، ص ۱۲۶-۱۲۷)۔ الجزائر میں جاری سیاسی و تہذیبی کشمکش کے دوران مملکت فرانس کی طرف سے اسلامی تحریک کے مقابلے میں الجزائری فوج اور طبقہ اشرافیہ کی برملا طور پر تائید و حمایت دراصل اول الذکر فریق کی طرف سے، بقول ایڈورڈ سعید (م ۲۰۰۳ء)، اپنی اس سابقہ نو آبادی پر اپنے تہذیبی تسلط کو قائم و برقرار رکھنے کی کوشش کے مترادف ہے (ایڈورڈ سعید: Culture and Imperialism، لنڈن، ۱۹۹۴ء، ص ۱۷)۔ الجزائری فوج اور اس کے حامی طبقہ اشرافیہ نے بھی اپنی برتر سیاسی و سماجی حیثیت اور مفادات کے تحفظ کی غرض سے خود کو مغربی دنیا کے سامنے اسلامی نظریۂ حیات کی بالادستی کے علمبردار اسلامی سیاسی و عسکری گروہوں کے مقابلے میں (مغربی ممالک کی تائید و حمایت کے حصول کے لیے) جدیدیت، روشن خیالی و ترقی پسندی کا حامی و علمبردار نیز جمہوریت اور لادینیت (سیکولرازم) کا محافظ ثابت کرنے جب کہ مقابل گروہوں کی تاریک ترین تصویر پیش کرنے کے لیے ہر ممکن جتن کیے ہیں (Abdelaziz Testas: Models of Cultural Exclusion and Civilizational Clashes، در Islam and Christian-Muslim Relations، ۱۴:۲ (۲۰۰۳ء)، ص ۱۸۳-۱۸۴)۔

مغربی دنیا، شمالی افریقہ اور عرب ممالک کی حکومتوں کے اس رویے کی بدولت مختلف اسلامی ممالک میں سیاسی نظام کی تبدیلی کے لیے سرگرم عمل اسلامی گروہ یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوے ہیں کہ سیاسی عمل اور انتخابات میں حصہ لینا یا ووٹ کے ذریعے حکومتوں کی تبدیلی کی کوشش ایک سعی لاحاصل ہے۔ اپنے اس نقطۂ نظر کی تائید میں وہ الجزائر کو ایک مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں جہاں اسلامی جماعت پرامن طور پر قومی انتخابات میں فیصلہ کن اکثریت حاصل کرچکی تھی، لیکن آمرانہ مزاج رکھنے والی فوج نے اپنے مغربی حلیفوں کی تائید وحمایت سے اسے اقتدار میں آنے سے روک دیا۔ چنانچہ بعض شدت پسند اسلامی گروہوں کا پرامن جمہوری عمل کے بجائے مسلح جدوجہد کے ذریعے تبدیلی اقتدار پر یقین اور زیادہ پختہ ہوا ہے (Unholy War، ص ۱۰۴-۱۰۵؛ The Islamic Movement in North Africa، ص ۳۰۰،۳۰۴-۳۰۸)۔

سیاسی بحران کے نتائج و ثمرات : گزشتہ ڈیڑھ دہائی سے بھی زائد عرصہ (۱۹۸۸-۲۰۰۴ء) سے جاری کشمکش کی بدولت الجزائر بہت سے مسائل کی آماجگاہ بن کر رہ گیا ہے۔ ملک پر بالعموم دہشت اور خوف وہراس کا ماحول

طاری ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے آخر تک فوج، پولیس اور اسلامی گروہوں کے مابین تصادم کے نتیجے میں کم از کم ایک لاکھ سے زائد (بعض ذرائع کے مطابق تقریباً ڈیڑھ لاکھ) افراد ہلاک، جب کہ تقریباً بائیس ہزار سے زائد افراد لاپتہ ہوچکے ہیں۔ ملک میں جاری تشدد اور جوابی تشدد کے عمل نے گوناں گوں نفسیاتی وسماجی مسائل کو پروان چڑھایا ہے۔ سیاسی بحران کے سبب ملکی جامعات اور دیگر تعلیمی اداروں میں درس وتدریس کا عمل پے در پے تعطل کا شکار رہا، جب کہ دیہی علاقوں اور قبائل میں تعلیمی نظام، ہزاروں کی تعداد میں اساتذہ کو جیلوں اور نظربندی کیمپوں میں قید اور سیکڑوں کی فوج و پولیس کے ہاتھوں ہلاکت کے سبب، درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ اس دور میں ملکی معیشت کو سب سے زیادہ زک پہنچی ہے۔ زرعی اور صنعتی پیداوار میں کمی واقع ہوئی ہے۔ درآمدات وبرآمدات میں پہلے سے موجود عدم توازن شدت اختیار کر گیاہے۔ درآمدات کا حجم بڑھ گیا ہے جب کہ برآمدات کا حجم سکڑ گیا۔ ملک میں رہائشی مکانات اور دیگر شہری سہولیات کی قلت نے ایک بحران کی صورت اختیار کر لی ہے۔ گزشتہ سالوں میں افراط زر کی شرح میں بدستور اضافہ ہوتا رہا۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق بے روزگاری کی شرح ۳۰ فیصد، جب کہ بعض ذرائع کے مطابق ۵۰ فیصد تک پہنچ گئی۔ ملکی آبادی کو مختلف ضروریات زندگی کی فراہمی کے سلسلہ میں حکومت کی طرف سے فراہم کی جانے والی رعائتیں بھی ختم کر دی گئیں (Reza Shah Kazemi: *Algeria : Revolution Revisited*، ص۱؛ John P.Entelis: *Review of "Uncivil War:Intellectuals and Identity Politics During the Decolonialization of Algeria*، مصنف: James D. le Sueur، در *American Historical Review*، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۳۳۲؛ *The Europa World Year Book 2002*، ص ۴۳۲؛ *Unholy War*، ص ۱۰۵؛ *Jihad: The Trial of Political Islam*، ص۲۷۵)۔

خارجہ تعلقات اور معیشت: الجزائر کو آزادی کے بعد کئی سالوں تک سابق نوآبادیاتی ملک فرانس، جس نے اس نوآزادشدہ ملک کو تہذیبی وسیاسی اور عسکری واقتصادی اعتبار سے اپنے زیرنگیں رکھنے کے لیے معاہدۂ ایوین کی صورت میں قومی محاذ آزادی سے بعض ٹھوس ضمانتیں اور خصوصی مراعات حاصل کر لی تھیں اور اشتراکی دنیا کے ممالک سوویت یونین، یوگوسلاویا اور چین وغیرہ کے ساتھ جنہوں نے جنگ آزادی کے دوران بھرپور سیاسی ومادی امداد بہم پہنچائی تھی، تعلقات کے قیام میں توازن قائم رکھنے اور ملکی معیشت کی بحالی کا کڑا چیلنج درپیش رہا۔ الجزائر کو ۱۹۶۲ء میں فرانسیسی تسلط سے نجات ملی تو اس کی معیشت بری طرح پامال ہوچکی تھی۔ نوآبادیاتی ملک فرانس کے الجزائر پر اپنے تسلط کے استحکام کے لیے سیاسی و انتظامی اقدامات بالخصوص اس ملک میں غیر ملکی (یورپی افراد) کی لاکھوں کی تعداد میں آبادکاری، بزور قوت مقامی آبادی کی املاک اور زرعی زمینوں کو ضبط کر کے غیر ملکی آباد کاروں میں تقسیم، اس پر مستزاد یہ کہ مقامی آبادی پر محاصل کی بھرمار نے اس ملک کے عوام کو قلاش اور مفلوک الحال بنا کر رکھ دیا تھا۔ استعماری طاقت نے اس ملک کے قدرتی وسائل، تیل، گیس اور دیگر معدنی ذخائر کا بھرپور استحصال کیا تھا۔ تاہم اس نے الجزائری عوام کی معاشی وتعلیمی حالت کو بہتر بنانے کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی۔ اعلان آزادی کے ساتھ ہی یورپی آبادکاروں کی اکثریت کے یورپی ممالک کی طرف نقل مکانی کر جانے اور اپنا کثیر سرمایہ بھی دیگر ممالک کو منتقل کرنے سے بہت سے کارخانے بند ہوگئے۔ احمد بن

بیلا نے ملکی معیشت کی بحالی کی غرض سے ملک میں اشتراکی نظام کی ترویج کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ ملک کے بعض معاشی وسائل بالخصوص غیر ملکی آبادکاروں کے قبضہ میں موجود زرخیز زمینوں و دیگر املاک، مالیاتی اداروں، بینکوں، بیمہ کمپنیوں اور کارخانوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ ان اقدامات کی بدولت احمد بن بیلا کی حکومت کے فرانس سے تعلقات کشیدہ ہوگئے۔ فرانس نے ردعمل کے طور پر الجزائر سے درآمدات پر پابندی عائد کرنے کے ساتھ ساتھ اس ملک کو فراہم کی جانے والی مالی امداد میں بھی تخفیف کر دی۔ دریں حالات احمد بن بیلا کی حکومت کے اشتراکی ممالک، سوویت یونین، یوگوسلاویا، بلغاریا، کیوبا اور چین سے زراعت، صنعت اور مواصلات کے شعبوں میں تعمیر وترقی کے لیے فنی وتکنیکی تعاون اور طویل المدت مالی قرضہ جات کے لیے متعدد معاہدے طے پائے (John Ruedy: *Land Policy in Colonial Algeria: The Origins of The Rural Public Domain*، برکلے، لاس اینجلس، ۱۹۶۷ء، ص ۷-۱۳: *Socialism in Three Countries*، ص ۶۸۰- ۶۸۱، ۶۸۵- ۶۸۶؛ *A History of The Maghrib in the Islamic Period*، ص ۲۶۳، ۲۶۹- ۲۷۱، ۳۲۸، ۳۳۲؛ Jhon Waterbury: *The Soviet Union and North Africa* در *The Soviet Union and the Middle East: The Post-World War II Era*، مدیران: Ivo J. Lederer و Wayne S.Vucinich، اسٹان فورڈ، ۱۹۷۴ء، ص ۹۴-۱۰۵؛ *Tricolor and Crescent*، ص ۲۳-۲۷)۔ مارچ ۱۹۶۳ء میں الجزائری عوام نے الجزائر کے علاقہ "الصحراء" میں فرانس کی طرف سے کیے جانے والے ایٹمی تجربات پر اندرون ملک فرانسیسی افواج اور اس کی عسکری تنصیبات کے خلاف شدید ردعمل ظاہر کیا۔ حکومت الجزائر کی طرف سے معاہدۂ ایوین کی ان شقوں سے دست بردار ہونے کی دھمکی پر جن کی رو سے فرانس نے الجزائر میں عرصہ پانچ سال تک اپنے فوجی مراکز وتنصیبات کو باقی قائم رکھنے کی رعایت حاصل کر رکھی تھی، حکومت فرانس نے آئندہ سال (۱۹۶۴ء) الجزائر سے اپنی افواج واپس بلا لیں اور الصحراء کے علاقے میں موجود ایٹمی تنصیبات کو بحرالکاہل کی طرف منتقل کر دیا (*The Passing of French Algeria*، ص ۸۰-۸۶، ۱۰۷-۱۰۹، ۲۰۶-۲۰۹، ۲۳۲-۲۳۶)۔ دونوں ممالک (الجزائر اور فرانس) کے مابین جاری کشیدگی کے باوجود آئندہ کئی برسوں تک الجزائری معیشت کا انحصار کافی حد تک فرانس پر رہا۔ فرانس کو الجزائری مصنوعات کی سب سے بڑی منڈی کی حیثیت حاصل تھی۔ سب سے اہم یہ کہ ۱۹۶۴ء تک پانچ لاکھ سے زائد الجزائری باشندے فرانس میں روزگار کی غرض سے موجود تھے جو کثیر مقدار میں زرمبادلہ اپنے ملک بھجواتے رہے (کتاب مذکور، ص ۲۲۳-۲۲۷)۔ الجزائر میں موجود قدرتی وسائل بالخصوص تیل وگیس کے ذخائر ملکی معیشت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے ہیں۔ آزادی کے بعد کئی سالوں تک ان وسائل کی دریافت اور ترقی پر فرانسیسی کمپنیوں کو اجارہ داری حاصل رہی۔ چنانچہ فرانس نہایت ارزاں نرخوں پر الجزائر سے تیل اور گیس درآمد کرتا رہا۔ اگرچہ احمد بن بیلا نے تیل اور گیس کے ذخائر کے علاوہ تیل کی صنعت سے وابستہ غیر ملکی کمپنیوں کے بعض مفادات کو قومی تحویل میں لے لیا تھا تاہم فرانسیسی کمپنیوں کی قدرتی وسائل کی دریافت اور ترقی پر گرفت بدستور قائم رہی۔ ۱۹۷۰ء میں حکومت الجزائر اور فرانسیسی تیل کمپنیوں کے درمیان تیل کی قیمتوں کی بابت تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ صدر بومدین نے دو فرانسیسی تیل کمپنیوں Francaise des Petroles اور Enterprise de Recherches et d Activites

Petrolieres کے ۵۱ فیصد حصص سنبھالنے اور ان کمپنیوں کی پائپ لائنوں کو قومی تحویل میں لینے کا اعلان کر دیا۔ بعدازاں حکومت الجزائر اور فرانسیسی کمپنیوں کے درمیان ایک سمجھوتہ (ستمبر ۱۹۷۱ء) طے پایا جس کی رُو سے دونوں کمپنیوں نے تیل کی ترسیلات کی ضمانت پر الجزائر کی تیل و گیس کی قومی کمپنی SONATRACH کو اقلیتی شریک کار تسلیم کر لیا۔ اپریل ۱۹۷۵ء میں فرانسیسی صدر کے دورہ الجزائر کے بعد دونوں ممالک کے تعلقات میں عارضی طور پر بہتری آگئی تاہم الجزائر فرانس کی اقتصادی پالیسیوں سے نالاں رہا، جن کی بدولت دونوں ممالک کے مابین تجارتی توازن بگڑ گیا تھا، فرانس کی طرف سے مغربی صحراء (ہسپانوی صحراء) کے تنازعہ کے معاملے میں الجزائر کے خلاف مراکش کی حمایت کرنے اور اسے بھاری مقدار میں اسلحہ فراہم کرنے سے بھی دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی (*Middle East and North Africa 1988*، ص۲۷۲).

الجزائر میں اقتصادی و تہذیبی تسلط کی فرانسیسی حکمت عملی: الجزائر میں سوویت یونین کے روز افزوں اثر ونفوذ کے پیش نظر فرانس نے ۱۹۶۸ء میں اول الذکر کے ساتھ قرضہ جات، دفاعی سازوسامان اور مختلف شعبوں میں تعمیر وترقی کے لیے فنی وتکنیکی ماہرین کی خدمات کی فراہمی کے لیے متعدد معاہدے کیے۔ صدر بومدین کی سخت گیر اشتراکی پالیسیوں کے باوجود فرانسیسی کمپنیاں الجزائر میں سرگرم عمل رہیں اور تیل وگیس کے علاوہ، تعمیرات، موٹر گاڑیوں اور ادویات کی صنعت میں اپنے غلبے کو برقرار رکھا۔ ۱۹۶۷-۱۹۷۸ء کے دوران محض ٦ عدد فرانسیسی کمپنیوں نے الجزائر کو ۵۰ فیصد سے زائد صنعتی سازوسامان کی فراہمی کے ٹھیکے حاصل کر رکھے تھے۔ بعض اشیا خوراک مثلاً گندم اور گوشت کی برآمد پر بھی فرانس کو اجارہ داری حاصل تھی۔ فرانسیسی تجارتی کمپنیاں الجزائر کو صنعتی سازوسامان، ادویات اور اشیاے خوراک دیگر افریقی ممالک کے مقابلے میں زیادہ قیمت پر فراہم کرتی رہیں۔ ان غیر ملکی کمپنیوں نے بیوروکریسی اور فوج کے اندر رشوت ستانی اور بدعنوانی کے رجحان کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ شاذلی بن جدید کے دور میں نجی شعبے کی حوصلہ افزائی کی گئی تو ایسی فرانسیسی کمپنیاں جنہوں نے گزشتہ ادوار میں اپنی سرگرمیوں کو محدود کر لیا تھا ایک بار پھر متحرک ہوگئیں۔ اس دور میں الجزائر کی معیشت کا فرانس اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں پر انحصار بہت زیادہ ہوگیا۔ ملک میں بدعنوانی (مقتدر حلقوں میں) میں بھی اضافہ ہوگیا (*Algerian- French Relations*، ص ۱۹-۲۴)۔ آزاد الجزائر میں فرانس کی طرف سے اقتصادی میدان میں غلبے کے ساتھ ساتھ اپنے تہذیبی تسلط کو قائم وبرقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ ابتدائی سالوں میں فرانسیسی وزارت خارجہ میں بیرونی ممالک سے ثقافتی تعاون کے لیے مختص بجٹ کو الجزائر میں ۱۸۳۰ء سے جاری اپنی ثقافتی مہم (mission civilisatrice) کے دوام واستحکام کے لیے وقف کر دیا گیا۔ تاہم فرانسیسی ثقافتی مہم کی کامیابی آزاد الجزائر میں عربی واسلامی تہذیب وثقافت کے احیاء کی کوششوں کا گلا گھونٹے بغیر ممکن نہ تھی۔ فرانس نے اس مقصد سے الجزائری معاشرے کے مغرب زدہ طبقات کو، جو ملک میں فرانسیسی زبان اور تہذیب وثقافت کی بالادستی کے حامی وعلمبردار تھے، ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ الجزائر میں نوآبادیاتی دور میں عربی کو ایک اجنبی وغیر ملکی زبان کا درجہ دیا گیا تھا۔ بن بیلا کے دور (۱۹۶۳-۱۹۶۴ء) میں عربی کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا اور اسے ذریعہ تعلیم بنانے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ صدر بومدین کے

دور میں تعلیم کے علاوہ عدالتی، انتظامی اور دفتری امور میں خط وکتابت کے لیے عربی کی ترویج پر خصوصی توجہ دی گئی تو فرانس کی شہ پر حزب فرنسا (Francophile) کی طرف سے شدید مزاحمت کے سبب اس سمت کوئی اہم پیش رفت نہ ہوسکی۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں فرانس کے زیر اثر بربروں کے مختلف گروہوں کی طرف سے الجزائر کی بول چال کی زبان (colloquial) تمازغتہ کو قومی زبان کا درجہ دینے جب کہ فرانسیسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے تحریک چلائی گئی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں عربی کو اعلیٰ سطحی تعلیم کے لیے ذریعہ بنانے کے عمل کا آغاز ہوا تو فرانس کے حکومتی وسیاسی حلقوں اور دانش وروں کی طرف سے اس کی شدید مخالفت کی گئی۔ چنانچہ حکومت فرانس کی ترغیب وتحریک پر بربر قوم پرست عناصر اور الجزائری "حزب فرنسا" (Francophile) دونوں کی طرف سے عربی کی ترویج کے خلاف جب کہ اس کے مقابلے میں فرانسیسی زبان کے تحفظ و حمایت میں شدید مظاہرے کیے گئے (۱۹۸۸ - ۱۹۸۹ء) (*Socialism in Three Countries*، ص ۲۹۱؛ *Algerian- French Relations*، ص ۲۵-۲۹)۔

شاذلی بن جدید کے دور میں الجزائر فرانس تعلقات میں بڑی گرم جوشی دیکھنے میں آئی۔ شاذلی بن جدید آزاد الجزائر کا پہلا حکمران تھا جس نے فرانس کا دورہ کیا (۱۹۸۲ء)۔ اس کے دور میں فرانس نے برملا طور سے الجزائر کے داخلی سیاسی معاملات پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔ الجزائر میں تیزی سے ابھرتی ہوئی اسلامی بیداری کی تحریک کے مقابلے میں سیکولر حکمران طبقے کی پشت پناہی کو تو اس نے اپنی خارجہ پالیسی کا رہنما اصول بنا لیا۔

فرانس نے الجزائر میں گزشتہ تقریباً ایک دہائی سے جاری سیاسی خلفشار کے دوران میں اس ملک کی معیشت کو سہارا دینے کے لیے سالانہ ۱ء۲، عرب ڈالر قرضہ فراہم کرنے کے علاوہ یورپی ممالک اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے خطیرمالی قرضہ جات کے حصول اور ان کی مدت ادائیگی میں توسیع میں مدد فراہم کی۔ فرانس کی تحریک پر جون ۱۹۹۵ء میں یورپی یونین نے الجزائر کو آئندہ چار سالوں (۱۹۹۶ء-۱۹۹۹ء) کے لیے ۴ء۷ عرب ڈالر بطور امداد و قرضہ جات کی فراہم کی منظوری دی۔ فرانس نے دسمبر ۱۹۹۶ء میں یورپی ممالک اور شمالی افریقہ کے ممالک کے مابین آزادانہ تجارت کے معاہدے (Euro- Mediterranean Free Trade Zone) میں الجزائر کی شمولیت کی بھی سرگرم حمایت کی۔ اس غرض سے دسمبر ۱۹۹۶ء میں الجزائر اور یورپی یونین کے نمائندوں کے مابین مذاکرات بھی ہوئے۔ جنوری ۲۰۰۱ء میں یورپی یونین کے صدر کے دورہ الجزائر کے دوران میں یورپی یونین کی طرف سے اس ملک کو، بعض مشترکہ اقتصادی منصوبوں کے لیے، مالیات کی فراہمی کی یادداشت پر دستخط بھی ہوئے (*The Europ World Year Book 2002*، ص ۴۳۵)۔ الجزائر میں، ابتر سیاسی حالات اور امن و امان کے فقدان کے باوجود، گذشتہ ایک دہائی کے دوران میں فرانس، برطانیہ، اور دیگر مغربی ممالک نے تیل اور گیس کے شعبوں میں خطیر (صرف ۱۹۹۳ـ۱۹۹۴ء کے دوران ۶ء۵ ارب ڈالر) مالیت کی سرمایہ کاری کے معاہدے کیے۔ جس کے نتیجے میں تیل کی صنعت بہتر ہوگئی (*The Algerian Crisis*، ص ۱۴ـ۱۵). مغربی ممالک کی طرف سے فراہم کردہ قرضہ جات اور تیل و گیس کے شعبوں میں سرمایہ کاری کی بدولت اگرچہ اس ملک کی معیشت قدرے سنبھل گئی تاہم اس کے نتیجے میں معیشت پر غیر ممالک کی گرفت مضبوط و مستحکم ہوگئی۔ فرانس نے اس عرصہ میں اس ملک میں اسلامی

بیداری کی تحریک کی طرف سے اپنی تہذیبی و ثقافتی مہم (mission civilisatrice) کو درپیش چیلنج کا مقابلہ بھی بڑی مہارت اور چابکدستی سے کیا (*Algerian French Relations*، ص ۳۳-۳۵؛ *Islam and Democracy: The Failure of Dialogue in Algeria*، ص ۱۱۰-۱۱۶؛ *The Algerian Crisis*، ص ۳۹-۴۳).

دنیاے اسلام سے تعلقات: فرانسیسی تسلط سے آزادی کی جدوجہد کے دوران میں اسلامی ممالک تیونس، مراکش اور مصر نے قومی محاذ آزادی کو مالی، اسلحی اور سیاسی امداد فراہم کی تھی تاہم آزادی کے بعد اول الذکر دونوں ممالک کے علاوہ ہمسایہ ملک موریطانیہ کے ساتھ اس کے تعلقات کشیدہ رہے۔ تیونس نے دسمبر ۱۹۶۲ء میں صدر حبیب بورقیبہ [رک بہ مقالہ تیونس، آآآ بذیل مادہ] پر قاتلانہ حملے کے ایک منصوبے کے انکشاف کے بعد الجزائر سے سفارتی تعلقات، حملہ کے منصوبہ سازوں کو پناہ دینے کے شبہ میں، منقطع کر لیے۔ مراکش کے ساتھ الجزائر کا سرحدی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا تھا جس پر دونوں ممالک کے درمیان سرحدی جھڑپوں کا سلسلہ (اکتوبر- نومبر ۱۹۶۴ء) شروع ہوگیا۔ اس دوران فرانس نے مراکش کو جب کہ مصر نے الجزائر کو فوجی مدد فراہم کی۔ بعدازاں افریقی ممالک کے اتحاد کی تنظیم (Organization of African Unity) کی کوششوں سے دونوں کے درمیان عارضی طور پر مصالحت ہوگئی (George Lenczowski: *The Middle East in World Affairs*، اتھاکا، ۱۹۶۴ء، ص ۶۴۸؛ *The Passing of French Algeria*، ص ۱۱۸-۱۱۹؛ Robert. W. MacDonald: *The League of Arab States*، پرنسٹن، ۱۹۶۵ء، ص ۲۸۶)۔ صدر بومدین نے اقتدار سنبھالنے پر ہمسایہ اسلامی ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے قیام کی داغ بیل ڈالی۔ جنوری ۱۹۶۹ء میں اس نے مراکش کا دورہ کیا جس کے بعد دونوں ممالک کے درمیان ۱۹۶۳ء سے بند سرحد کو ازسرنو کھول دیا گیا۔ آئندہ سالوں (۱۹۷۰-۱۹۷۳ء) میں دونوں کے درمیان سرحدوں کے تعین اور الصحراء کے خطے میں موجود معدنی ذخائر کے مشترکہ استعمال کی بابت تصفیہ کے علاوہ شمالی افریقہ میں اسپین کی مداخلت کے خلاف باہمی اتحاد وتعاون کا معاہدہ بھی طے پا گیا۔ تیونس کے ساتھ سرحدی تنازعہ کا بھی تصفیہ ہوگیا، مزید برآں اس کے ساتھ دوستی کا معاہدہ بھی کیا گیا۔ الجزائر کے فوجی حکمرانوں کی طرف سے لیبیا میں برپا ہونے والے فوجی انقلاب (۱۹۶۹ء) کا خیر مقدم کیا گیا (*The Middle East and North Africa, 1986*، ص ۲۷۱-۲۷۲).

آزاد الجزائر شروع دن سے ہی بیرونی دنیا سے تعلقات کے حوالے سے غیر جانبداریت اور استعمار مخالف تحریکوں کی سرگرم تائید وحمایت کے اصول پر گامزن رہا۔ احمد بن بیلا نے جنوبی ومغربی افریقہ میں جاری آزادی کی تحریکوں اور فلسطین میں اسرائیل کے غاصبانہ تسلط کے خلاف جاری جدوجہد کی پر زور حمایت کی تھی۔ عدیس ابابا (حبشہ) میں افریقی ممالک کی ایک کانفرنس (۱۹۶۳ء) میں اس نے افریقہ میں آزادی کی تحریکوں کے لیے دس ہزار رضاکار فراہم کرنے کی پیش کش کی تھی۔ بن بیلا نے ۱۹۶۴ء میں مصر میں منعقدہ غیر جانبدار تحریک کی کانفرنس میں فعال کردار ادا کیا۔ آئندہ سال (۱۹۶۵ء) میں اس نے اپنے ملک میں نو آبادیاتی نظام کے خلاف ایک بین الاقوامی کانفرنس کی میزبانی کی۔ دریائے اردن کے پانی کی تقسیم کے تنازع میں اس نے اسرائیل کے مقابلے میں اردن کا ساتھ دیا (*The Passing of French Algeria*، ص ۱۲۰-۱۲۱، ۲۲۳-۲۲۴؛ *Tricolor and Crescent*، ص ۱۴۰)۔ صدر بومدین کے دور میں

بھی الجزائر بدستور سامراج مخالف پالیسی پر گامزن رہا۔ اس کی حکومت نے چاڈ کی آزادی کی علمبردار سیاسی جماعت قومی محاذ آزادی کو سیاسی ومالی امداد فراہم کی جب کہ رہوڈیشیا کے معاملے میں اس نے برطانیہ سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے (۱۹٦۵ء)۔ صدر بومدین مشرق وسطی میں اسرائیل کے توسیع پسندانہ عزائم کی مخالفت اور اس کے مقابلے میں عرب ممالک بالخصوص تحریک آزادئ فلسطین کو سیاسی، عسکری اور مالی امداد فراہم کرتا رہا۔ جون ۱۹٦۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں الجزائر کے فوجی دستے نہر سویز کے علاقے میں تعینات رہے۔ تاہم جنگ بندی کے طریق کار پر بومدین کی طرف سے مصر اور سوویت یونین کے کردار پر سخت تنقید کی گئی (The Middle East and North Africa 1986، ص ۲۷۱)۔ صدر بومدین نے مسئلہ فلسطین پر اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد کے بارے میں سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اقوام متحدہ کی قرارداد اور جنگ بندی (۱۹٦۷ء) کو بھی مسترد کر دیا۔ اس نے جولائی ۱۹۷۰ء میں قاہرہ میں قائم تحریک آزادئ فلسطین کے ریڈیو اسٹیشنوں پر پابندی لگائے جانے پر انہیں الجزائر میں قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ شاہ حسین کی افواج کی طرف سے اردن میں فلسطینی گوریلا مجاہدوں کے مراکز تباہ کرنے پر الجزائر نے اردن سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے (جون ۱۹۷۱ء)۔ ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران میں الجزائر سفارتی محاذ پر سرگرم رہا۔ اس نے عرب ممالک کے خلاف معاندانہ رویہ رکھنے والے مغربی ممالک کے خلاف تیل کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی غرض سے تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک کے ساتھ کامل یکجہتی واتحاد کا مظاہرہ کیا۔ الجزائر نے اگرچہ ۱۹۷۳ء میں اردن سے تعلقات بحال کر لیے تھے تاہم اس نے فلسطینی علاقوں پر اس ملک کے دعوی کو کبھی قبول نہیں کیا۔ الجزائر طرابلس اعلامیہ (دسمبر ۱۹۷۷ء)، جس میں اسرائیل کے ساتھ انور سادات [رک بہ مقالہ مصر، تکملہ آ آ آ بذیل مادہ] کے مذاکرات اور امن سمجھوتے کی مخالفت کی گئی تھی، پر دستخط کرنے والے ممالک میں سے ایک تھا۔ اس نے اسرائیل سے تعلقات کے قیام پر مصر سے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے۔ الجزائر کی طرف سے تنظیم آزادی فلسطین کی بھرپور سیاسی و اخلاقی حمایت اور مالی امداد کی فراہمی کا سلسلہ مابعد دور میں بھی جاری رہا۔ نومبر ۱۹۸۸ء کو فلسطینی ریاست کے قیام کا اعلان الجزائر ہی میں کیا گیا (The Middle East and North Africa, 1986، ص۲۷۲؛ The End of the Peace Process، مقدمہ، ص ۲۸)۔

مغربی صحرا کا تنازعہ: الجزائر کی اپنے قریبی ہمسایہ ممالک مراکش، تیونس اور موریطانیہ سے تعلقات میں کشیدگی کا اہم سبب مغربی صحرا کا تنازعہ رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں مغربی صحرا (ہسپانوی صحرا) [صحرا کی تاریخی و سیاسی حیثیت کے بارے میں دیکھیے: De Lacy O`Lary: The Sahara، در The Islamic Literature، ۸: ۲ (فروری ۱۹۵٦ء)، ص ۳۳-۴۰] کے مستقبل کا مسئلہ الجزائر اور اس کے دو ہمسایہ ممالک مراکش اور موریطانیہ کے درمیان شدید کشیدگی اور محاذ آرائی کا باعث بنا رہا۔ ۱۹۷۵ء میں اسپین نے ایک معاہدہ کے ذریعے مغربی صحرا سے اپنا تسلط (۱۸۸۴-۱۹۷۵ء) ختم کر کے اس کا نظم ونسق مراکش اور موریطانیہ کو منتقل کر دیا۔ چنانچہ اسی سال کے ربع آخر میں ان دونوں ممالک کی افواج نے اسپین کی اس سابق نوآبادی پر قبضہ کر لیا۔ الجزائر، جو اس علاقے پر مراکش و موریطانیہ کے دعوی کا مخالف اور ایک آزاد خود مختار صحرائی ریاست کے قیام کا حامی تھا، اس علاقے میں ہمسایہ ممالک کے مقابلے میں اپنی افواج کو حرکت میں لے آیا۔ ۱۹۷٦ء کے ابتدائی مہینوں میں الجزائر اور مراکش کی

افواج کے درمیان شدید جھڑپیں ہوئیں۔ الجزائر نے مغربی صحرا کی آزادی وخودمختاری کی تحریک عوامی محاذ آزادی Frente Popular para la Liberacion de Saguia) (el-Hamray Rio de Oro=Polisario Front کی کھل کر تائید وحمایت کی۔ مارچ ۱۹۷۶ء میں عوامی محاذ (Polisario Front) نے مغربی صحرا پر مشتمل ایک آزاد ریاست (Saharan Arab Democratic Republic= SADR) کے قیام کا اعلان کیا تو صدر بومدین کی حکومت نے اسے فی الفور تسلیم کر لیا۔ مزید برآں اس نے تحریک آزادی کو مراکش کے خلاف عسکری کارروائیوں کے لیے جنوب مغربی الجزائر میں مراکش کی سرحد کے قریب، اپنا فوجی مرکز قائم کرنے کی اجازت بھی دے دی، جس پر مراکش اور موریطانیہ نے اس سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے۔ ۱۹۷۵-۱۹۸۷ء کے دوران میں اس تحریک کے چھاپہ ماروں کو الجزائر کی طرف سے بھرپور مالی امداد، اسلحی سازوسامان اور فوجی تربیت فراہم کی جاتی رہی۔ الجزائر کے موریطانیہ کے ساتھ سفارتی تعلقات مؤخر الذکر کی طرف سے مغربی صحرا پر اپنے دعویٰ سے دستبردار ہونے پر (اگست ۱۹۷۹ء) از سرنو بحال ہوگئے تھے تاہم مراکش کے ساتھ اس کے تعلقات آئندہ کئی سالوں تک بدستور کشیدہ رہے۔ ۱۹۸۳ء میں مراکش کے شاہ حسن اور الجزائر کے صدر شاذلی بن جدید کے درمیان ملاقات کے بعد دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کم ہوگئی۔ الجزائر اور مراکش کے درمیان مکمل سفارتی تعلقات مملکت سعودی عرب کی مصالحتی کوششوں کی بدولت ۱۹۸۷ء میں بحال ہوے۔ الجزائر مغربی صحرا کے مسئلہ کے حل اور مغربی صحرا کے عوام کے حق خود اختیاری کے تعین کی غرض سے اقوام متحدہ کے زیر نگرانی ایک ریفرنڈم کے انعقاد کا حامی رہا ہے۔ الجزائر کے حکمرانوں نے ۱۹۸۸ء میں ملک کے اندر جنم لینے والے سیاسی ومعاشی بحران کے بعد سے کسی حد تک مغربی صحرا کے مسئلہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس دوران میں وہ ہمسایہ ریاستوں سے بہتر تعلقات کے لیے بھی کوشاں رہے۔ فروری ۱۹۸۹ء میں مغرب کی پانچ ریاستوں الجزائر، مراکش، تیونس، موریطانیہ اور لیبیا کے سربراہی اجلاس میں ان ریاستوں کے مابین اقتصادی وسیاسی روابط کے فروغ واستحکام کے لیے ایک نئی تنظیم 'عرب مغرب اتحاد' (Union du Maghreb Arabe=UMA) کا قیام عمل میں آیا۔ الجزائر کا ایک سابق صدر محمد بوضیاف (جنوری ۱۹۹۲ء- جون ۱۹۹۲ء)، جو ۱۹۶۰ء کی دہائی سے مراکش میں مقیم تھا اور جس کے مراکش کی سیاسی اشرافیہ سے قریبی تعلقات استوار تھے، کے دور میں صحرا کی بابت دونوں ممالک کے درمیان دیرینہ تنازعہ کے سلجھاؤ کی امید بندھی تھی، تاہم ابوضیاف کے قتل (۲۸ جون ۱۹۹۲ء) کے بعد دونوں ممالک کے مابین مفاہمت و مصالحت کا عمل موقوف ہوگیا۔ مابعد دور میں الجزائری حکومتیں مراکش کو حزب مخالف کی اسلامی تحریک کے کارکنوں کو پناہ دینے اور انہیں مراکش سے اسلحہ الجزائر اسمگل کرنے میں معاونت اور الجزائر کے داخلی بحران سے فائدہ اٹھا کر خطے میں اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کا الزام دیتی رہیں۔ ۱۹۹۴ء میں مراکش میں بم دھماکوں کا ذمہ دار الجزائر کو ٹھہرایا گیا۔ مراکش نے ردعمل میں الجزائر کے باشندوں کے لیے ویزا کی شرائط سخت کر دیں اور الجزائر سے ملحقہ سرحدوں کو بند کر دیا۔ دریں حالات الجزائر نے صحرا میں اقوام متحدہ کے زیرنگرانی ریفرنڈم کے انعقاد کے حق میں سخت موقف اختیار کر لیا۔ الجزائر کی طرف سے مغربی صحرا کی تحریک آزادی کی مسلسل حمایت کے سبب دونوں ممالک میں کشیدگی برابر موجود رہی (The Foreign Policy of

The Islamic Salvation Front in Algeria ، ص ۱۳۰-۱۳۱؛ The Middle East and North Africa، ص ۸۲-۸۸، ۲۵۱-۲۵۲؛ Bruce Maddy -Weitzman: Conflict and Conflict Management in the Western Sahara در Middle East Journal، ۴۵:۴ (۱۹۹۱ء)، ص ۵۹۴-۶۰۰؛ Saharan Stasis: Status and Future Prospects، ص ۵۲۲-۵۲۷، ۵۴۳-۵۴۴؛ The Europa World Year Book 2002، ص ۴۳۵).

الجزائر سوویت یونین تعلقات: الجزائر کا شمار ان عرب و افریقی ممالک (جمہوریہ مصر، شام، یمن، عراق اور لیبیا وغیرہ) میں ہوتا ہے جو ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائیوں میں امریکہ اور مغربی دنیا کے حلقہ اثر سے باہر اور اس کے مقابلے میں سوویت یونین کے زیر اثر رہے۔ صدر بن بیلا اور حواری بومدین دونوں کے ادوار میں الجزائر کے سوویت یونین کے ساتھ گہرے سیاسی، اقتصادی اور عسکری تعلقات قائم رہے۔ سوویت یونین کی طرف سے اس دوران الجزائر کو کثیر مقدار میں اسلحہ و دیگر فوجی سازو سامان، مالی قرضہ جات اور فنی و تکنیکی امداد بہم پہنچائی جاتی رہی۔ صدر بومدین کے دور حکومت میں اشتراکی ممالک بالخصوص سوویت یونین کے ساتھ الجزائر کے تعلقات مزید مستحکم ہوگئے۔ سوویت یونین کی طرف سے وافر مقدار میں قرضہ جات کے علاوہ معدنی وسائل کی دریافت و ترقی اور مختلف صنعتوں کے قیام کے لیے فنی و تکنیکی امداد فراہم کی گئی۔ فوج کی تربیت اور اسلحہ جات کے حصول کے لیے بھی زیادہ تر انحصار اسی ملک پر رہا۔ تاہم الجزائری معیشت کے گہرے طور سے فرانس کے ساتھ جڑے ہونے کے سبب سوویت یونین اور الجزائر کے مابین تعلقات قرب و گہرائی کی اس سطح کو نہ پہنچ پائے جو سوویت یونین کے مصر و شام کے ساتھ تعلقات میں پائی جاتی تھی (George Lenczowski: Soviet Policy in the Middle East، در Current History، ۵۵:۳۲۷ (نومبر ۱۹۶۸ء)، ص ۲۶۹-۲۷۳؛ William H, Lewis: Trends in North Africa، در Current History، ۵۲: ۳۰۷ (مارچ ۱۹۶۷ء)، ص ۱۳۰-۱۳۳؛ The Soviet Union and North Africa، ص ۹۴-۱۰۰، ۱۰۱-۱۰۵).

الجزائر امریکہ تعلقات:سوویت یونین کا نظریاتی حلیف اور استعمار مخالف ہونے کے سبب بن بیلا اور بومدین کے دور میں الجزائر برملا طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اقتصادی وخارجی پالیسیوں کا مخالف و ناقد رہا۔ الجزائر ویت نام اور مسئلہ فلسطین کے بارے میں امریکہ کے موقف کی شدید مخالفت کرتا رہا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں دونوں ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات خراب ہوگئے تھے تاہم تیل کی صنعت کی ترقی کے لیے امریکی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ۱۹۶۹ء میں امریکہ کو گیس کی فروخت کا ایک معاہدہ بھی طے پایا۔ امریکہ کے ساتھ الجزائر کے مکمل سفارتی تعلقات ۱۹۷۴ء میں قائم ہوئے۔ شاذلی بن جدید آزاد الجزائر کا پہلا سربراہ تھا جس نے امریکہ کا سرکاری دورہ (اپریل ۱۹۸۵ء) کیا۔ واشنگٹن میں شاذلی کی صدر رونالڈ ریگن (۱۹۸۱- ۱۹۸۸ء) سے ملاقات کے بعد امریکہ سے فوجی سازوسامان کی خریداری، جس پر امریکہ کی طرف سے گذشتہ دو دہائیوں سے پابندیاں عائد کی گئی تھیں، کی راہ ہموار ہوئی۔ بعدازاں دونوں ممالک کے مابین تجارتی و سیاسی تعلقات میں اضافہ ہوتا رہا چنانچہ امریکہ الجزائر کا ایک اہم تجارتی شریک بن گیا (The Middle East and North Africa, 1986، ص ۲۷۱-۲۷۲، ۲۷۵)۔ الجزائری حکومت کو اسلامی تحریک کا قلع قمع کرنے کے لیے صدر بل کلنٹن (۱۹۹۳- ۲۰۰۱ء) اور صدر

بش کی طرف سے بھرپور سیاسی تائید و حمایت حاصل رہی۔ الجزائری حکومت نے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ میں پیش آنے والے واقعات کی مذمت میں بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا۔ صدر بش کی طرف سے طالبان اور القائدہ کے خلاف اعلان جنگ پر الجزائری حکومت کی طرف سے امریکہ کے خفیہ اداروں کو القائدہ سے منسلک سیکڑوں افراد کی فہرستیں فراہم کی گئیں۔ نومبر ۲۰۰۱ء میں صدر بوتیف لیقہ نے امریکہ کا دورہ بھی کیا اور صدر بش کو "دہشت گردی" کے خلاف جنگ میں ہر ممکن امداد کی یقین دہانی کرائی۔ الجزائر نے ۲۰۰۱-۲۰۰۳ء کے دوران میں طالبان، القائدہ اور دیگر عسکری و غیر عسکری تنظیموں کے خلاف امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی اصلیبی جنگ میں ایک فعال اتحادی کا کردار ادا کیا۔ اس نے امریکہ کے علاوہ یورپی، شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کو، ان ممالک میں موجود الجزائر کی اسلامی تنظیموں سے ربط و تعلق رکھنے والے افراد کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ اس دوران میں الجزائر نے "دہشت گردی" کے خلاف جاری جنگ کی حکمت عملی پر غور کے لیے ایک بین الاقوامی کانفرنس کے علاوہ افریقی اتحاد کی تنظیم کے رکن ممالک کی سربراہی کانفرنس کی میزبانی (۲۰۰۲ء) بھی کی۔ اس دوران میں الجزائری افواج نے ملک کے اندر اسلامی تنظیموں بالخصوص عسکریت پسند گروہوں کے خلاف کاروائیاں تیز کر دیں، جس کے نتیجے میں سیکڑوں کی تعداد میں عسکریت پسند، ہلاک ہوئے۔ (Patterns of Global Terrorism 2002: و Patterns of Global Terrorism 2003، یو ایس سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ، Charles Dunbar: Saharan Stasis: Status and Future Prospects of the Western Sahara Conflict در Middle East Journal، ۴:۴ (۲۰۰۰ء)، ص ۵۲۵؛ The Europa World Year Book 2002، ص ۴۳۵)۔

تعلیم: نوآبادیاتی دور میں ملک کا روایتی تعلیمی ڈھانچہ پامال ہوگیا تھا۔ نوآبادیاتی حکمرانوں نے یورپی آبادی والے شہروں میں جدید تعلیمی اداروں کا ایک وسیع جال بچھا دیا تھا اور چند اسکول بربر اکثریتی علاقوں میں قائم کیے تھے جب کہ الجزائری عوام کی بھاری اکثریت کو تعلیمی سہولیات سے محروم رکھا تھا۔ آزادی کے وقت نوے فی صد سے بھی زائد الجزائری عوام ناخواندہ تھے۔ سابقہ نوآبادیاتی نظام سے جو تعلیمی ڈھانچہ ورثے میں ملا تھا وہ اپنے نصابات، روایت اور زبان (ذریعہ تعلیم) کے اعتبار سے مکمل طور پر فرانسیسی تھا۔ تاہم یورپی اساتذہ کی اکثریت (۳۰ ہزار میں ۲۷ ہزار) کے اعلان آزادی کے ساتھ ہی ملک سے نقل مکانی کے سبب وہ بھی تعطل کا شکار ہوگیا۔ دریں حالات الجزائری قیادت کو ملکی ضروریات اور اپنے تہذیبی وملی تقاضوں کے مطابق ایک نئے تعلیمی ڈھانچے کی تشکیل میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتدائی سالوں میں ابتدائی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اساتذہ کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں نئے اساتذہ بھرتی کیے گئے۔ اس سلسلہ میں مطلوبہ اہلیت جیسی بنیادی شرائط کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ جس کا معیار تعلیم پر منفی اثر مرتب ہوا۔ آزادی کے ابتدائی سالوں میں سماجی وسائنسی علوم کی اعلیٰ تعلیم اور عربی زبان وادب کی تدریس کے لیے کافی حد تک غیر ملکی اساتذہ پر انحصار کرنا پڑا، تاہم غیر ملکی اساتذہ پر انحصار بتدریج کم ہوتا گیا (The Making of Contemporary Algeria، ص ۲۱۸-۲۲۰؛ A History of the Maghrib in the Islamic Period، ص ۲۷۱-۲۷۲؛ The Passing of French Algeria، ص ۱۹۶-۱۹۸، ۲۲۱)۔

فرانسیسی زبان کے بجائے عربی زبان کی بطور ذریعہ تعلیم ترویج اور نصابات میں تبدیلی کا آغاز ۱۹۶۳-۱۹۶۴ء میں ہوا۔ ابتدا میں پرائمری سطح پر عربی زبان کو ذریعہ

تعلیم بنانے کے علاوہ تمام تعلیمی مراحل میں عربی زبان کی تدریس کو لازمی قرار دیا گیا۔ فرانسیسی زبان کی تدریس کا دورانیہ کم کر دیا گیا۔ تاریخ اور جغرافیہ کی نئی درسی کتب تیار کی گئیں۔ ۱۹۷۱ء میں اسکولوں میں دولسانی نظام رائج کیا گیا۔ اس نظام کے تحت ہر تعلیمی مرحلہ میں طلبہ کو دو طبقوں میں تقسیم کیا گیا۔ طلبہ کے ایک فریق کو سائنسی مضامین فرانسیسی میں جب کہ سماجی علوم عربی میں جب کہ دوسرے فریق کو تمام مضامین عربی میں پڑھائے جاتے تھے، البتہ غیر ملکی زبان کے طور پر انہیں فرانسیسی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اسکولوں میں دو لسانی نظام تعلیمی معیار پر اثر انداز ہوا۔ فرانسیسی زبان میں تعلیم دینے والے اساتذہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تدریس و تعلیم کی تربیت سے بہرہ ور تھے۔ چنانچہ اول الذکر فریق (فرانسیسی زبان میں تعلیم پانے والے طلبہ) کی تعلیمی کارکردگی مؤخر الذکر فریق کے مقابلے میں بہتر رہی (*The Making of Contemporary Algeria*، ۲۴۲-۲۴۳)۔ الجزائر کو نوآبادیاتی نظام سے ایک بڑی یونیورسٹی (الجزائر یونیورسٹی)، جس سے ملحقہ دو کیمپس قسطنطنیہ اور وہران میں موجود تھے، بھی ورثہ میں ملی تھی۔ ۱۹۶۸ء میں الجزائر یونیورسٹی کے دونوں ملحقات (Annexes) کو مکمل یونیورسٹی کا درجہ دینے کے علاوہ تلمسان، عنابہ (Annaba)، سطیف (Setif)، بطنہ (Batna) اور تیزی اوزو (Tizi-Ouzou) میں نئی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ نئی جامعات کے قیام سے اعلیٰ تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۲ء-۱۹۶۳ء میں ان طلبہ کی تعداد ۳،۷۱۸ تھی جو بڑھ کر ۱۹۷۸-۱۹۷۹ء میں ۵۵، ۱۴۸ تک جا پہنچی (کتاب مذکور، ص ۲۲۸-۲۳۰)۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے نصف آخر میں یونیورسٹی کی سطح پر عربی کو ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کرنے کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں سماجی علوم (تاریخ، معاشیات، عمرانیات اور قانون وغیرہ) کی تدریس کے لیے دو لسانی نظام اپنایا گیا۔ یونیورسٹی کے ہر شعبے میں دو فریق قائم کیے گئے ایک میں تدریس فرانسیسی میں جب کہ دوسرے میں عربی میں ہوتی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں اس نظام کو ختم کر کے سال اول میں جب کہ ۱۹۸۴ء سے تمام سماجی علوم کی تدریس مکمل طور پر عربی زبان میں ہونے لگی (کتاب مذکور، ص ۲۳۰-۲۳۲)۔ الجزائری حکومت نے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں تعلیم کو عام کرنے پر خصوصی توجہ دی۔ زراعت، صنعت اور تجارت کے شعبہ میں افرادی قوت کی فراہمی کے لیے کافی تعداد میں فنی وپیشہ ورانہ تعلیم وتربیت کے ادارے قائم کیے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں کل سالانہ بجٹ کا ۳۳ فی صد تعلیم پر صرف کیا گیا۔ البتہ تعلیم کے شعبہ میں صرف کی جانے والے خطیر رقم کے نتائج اطمینان بخش نہیں رہے۔ جون ۱۹۸۷ء میں گریجوایشن کے مرحلہ میں ۱۹۳,۰۰۰ امیدواروں میں سے صرف ۳۸,۰۰۰ نے امتحان پاس کیا۔ الجزائر کی جامعات میں معیار تعلیم تیسری دنیا کے ممالک کی طرح ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں انتہائی پست ہے(کتاب مذکور، ص ۲۹۰-۲۹۱)۔ ملک میں ۱۹۹۰ء کی دہائی سے جاری سیاسی بحران کے سبب، تعلیم و تدریس کے عمل کو بھی شدید زک پہنچی۔ اسلامی عسکریت پسند گروہوں اور فوج و پولیس کے مابین لڑائی کے نتیجے میں صرف تین سالوں ۱۹۹۲ء-۱۹۹۵ء کے دوران میں ۷۰۰ سو سے زائد اسکول تباہ ہوئے (*Freedom of Religion and Belief*، ص ۲۴)۔ اس وقت ملک میں ۱۰ یونیورسٹیاں اور پوسٹ گریجوایٹ سطح کی تعلیم کے سات مراکز (Centers Universitaires) موجود ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں پورے ملک میں ۳۴۷,۴۱۰ طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہوے۔ یونیسکو کے ۱۹۹۵ء کے تخمینہ کے مطابق الجزائر میں

بالغ افراد میں خواندگی کی اوسط شرح ۳۸ء۴ فی صد ہے۔ (Europa World Year Book.2000، ص ۳۹۳)۔

اقتصادیات و وسائل معیشت : عالمی بنک کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۸ء میں الجزائر کی کل خام پیداوار (GNP) ۴۶,۵۰۰ ملین (امریکی ڈالر) جب کہ سال ۲۰۰۰ء میں ۳۲۵, ۴۸ ملین امریکی ڈالر رہی۔ فی کس سالانہ آمدنی بالترتیب ۱,۵۵۰ اور ۵۹۰, ۱ امریکی ڈالر تھی۔ زراعت، بشمول جنگلات وماہی گیری، ملکی معیشت کا اہم ترین شعبہ ہے، جس سے تقریباً ۲۴ فی صد افرادی قوت کا روزگار وابستہ ہے۔ زراعت کا قومی پیداوار میں حصہ ۱۹۸۸ء میں ۱۲، جب کہ ۲۰۰۰ء میں ۸ء۶ فی صدر رہا۔ اہم فصلوں میں گندم، جو، آلو، زیتون، انگور، کھجور، اور ترشاوہ پھل شامل ہیں۔ قومی آمدنی کے اعتبار سے ملک کی معیشت کا اہم ترین شعبہ صنعت اور معدنیات کا ہے۔ جس کا کل قومی پیداوار میں حصہ ۱۹۹۸ء میں ۴۷ جب کہ سال ۲۰۰۰ء میں تقریباً ۶۰ فی صد رہا۔ صنعت سے برسرروزگار افرادی قوت کا ۳۱ء۲ حصہ جب کہ معدنیات وکان کنی سے ۶ء۱ فی صد منسلک ہے۔ صنعتی پیداوار میں زیتون کا تیل، چینی، سگریٹ اور پٹرولیم کی مصنوعات شامل ہیں (کتاب مذکور، ص۳۹۳- ۳۹۵؛ The Europa World Year Book 2002، ص ۴۳۵)۔ ملک میں جاری بحران کے سبب ۱۹۹۰-۱۹۹۸ء کے دوران میں ۱۰ فی صد سالانہ شرح سے صنعتی پیداوار میں کمی واقع ہوئی۔ ملک کے معدنی وسائل میں خام لوہا، کوئلہ، کچ دھات (Ore)، فاسفیٹ، سکہ، زنک اور تیل وگیس کے ذخائر شامل ہیں۔ گیس کی برآمد کے لیے الجزائر سے سپین اور اٹلی تک دو پائپ لائنیں بھی بچھائی گئی ہیں۔ کل خام قومی پیداوار میں تیل اور گیس کا حصہ سب سے زیادہ، ۱۹۹۷ء کے اعداد وشمار کے مطابق ۴۳ء۳ جب سال ۲۰۰۰ء میں ۳۲ء۸ فی صد رہا۔ توانائی کا اہم ذریعہ قدرتی گیس اور تیل ہے۔ تاہم نیوکلیائی توانائی بھی ایک اضافی ذریعہ ہے۔ ملک میں پہلے نیوکلیائی ری ایکٹر کی تنصیب ۱۹۸۹ء میں عمل میں آئی۔ ۱۹۹۵ء میں ملکی درآمدات کا سالانہ حجم ۸۳۰ء۶, ۹ ملین اور برآمدات کا حجم ۸,۵۵۵ء۵ ملین جب کہ سال ۱۹۹۷ء میں بالترتیب ۸۶۸۸ ء۶ اور ۸۹۴ ء۲, ۱۳ ملین امریکی ڈالر رہا۔ اہم درآمدی اشیاء میں غذائی اجناس، گوشت، ادویات، کیمیاوی مصنوعات، صنعتی مشینری، موٹر گاڑیاں اور گھریلو استعمال کا برقی والیکٹرانک سازوسامان شامل ہے۔ یہ اشیا مغربی ممالک، اٹلی، فرانس، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، نیدرلینڈ، اسپین، بلجیم اور جرمنی وغیرہ سے درآمد کی جاتی ہیں۔ برآمدات میں پٹرولیم اور اس کی مصنوعات اور قدرتی گیس کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ سال ۲۰۰۰ء میں کل ملکی برآمدات میں ان دونوں کا حصہ ۹۷ فی صد رہا۔ برآمدات کے لیے بڑی منڈیاں، فرانس، امریکہ، اٹلی، اسپین، جرمنی اور جاپان ہیں (Europa World Year Book 2000، ص ۳۹۷- ۳۹۸؛ The Europa World Year Book 2002 ، ص ۴۳۵-۴۳۶)۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق سال ۲۰۰۰ء کے اختتام پر ملک میں تیل کے ۹۲۰۰ ملین بیرل جب کہ گیس کے ۵۲۰,۰۰۰, ۴ ملین مکعب میٹر کے ذخائر موجود تھے۔ تیل کے ذخائر یومیہ ۱۵۹ء۱ ملین بیرل پیداوار کے حساب سے ۱۷ سال کے لیے جب کہ گیس کے ذخائر سالانہ ۳۰۰, ۸۹ مکعب میٹر پیداوار کے حساب سے عرصہ ۵۱ سال کے لیے کافی ہوں گے (The Europa World Year Book 2000، ص ۴۳۵)۔

الجزائر کے ذمے واجب الادا بیرونی قرضہ سال ۱۹۹۹ء میں ۰۱۵, ۲۸ ارب جب کہ سال ۲۰۰۱ء میں ۷ء ۲۴ ارب ڈالر رہا۔ (Europa World Year Book 2002 ، ص ۴۳۶) ۔

کرنسی اور اس کی شرح مبادلہ: ملک کی کرنسی کا نام

دینار ہے۔ شرح مبادلہ کے اعتبار سے ۷۷ء۸۸۹ الجزائری دینار ایک امریکی ڈالر کے مساوی جنوری ۲۰۰۲ء ہے۔ The World Fact World 2002، ص ۷).

دستور، عاملہ اور مقنّنہ: دستور کی رو سے الجزائر ایک عوامی جمہوری ریاست (Democratic Republic) ہے۔ اسلام ملک کا سرکاری مذہب اور عربی قومی زبان ہے۔ ملک کا منتظم اعلیٰ صدر ہے۔ صدر جمہوریہ، سربراہ ریاست و مسلح افواج کی حیثیت سے قومی سلامتی اور دفاع کا ذمہ دار ہے۔ صدر کا انتخاب براے راست بالغ راے دہی کی بنیاد پر عرصہ پانچ سال کے لیے ہوتا ہے۔ صدر مجلس وزراء کے اجلاس کی صدارت کرتا ہے۔ بنیادی پالیسی کے تعین اور وزیراعظم کے تقرر کا اختیار بھی اسی کے پاس ہے۔ البتہ ان پالیسیوں کی نفاذ سے قبل قومی اسمبلی سے منظوری لینا لازمی ہے۔ مقنّنہ دو ایوانوں، ایوان زیرین: قومی اسمبلی (Assem- blee Nationale Populair) اور ایوان بالا: قومی کونسل (Conseil de la Nation) پر مشتمل ہے۔ قومی اسمبلی کے ارکان کا انتخاب عام بالغ راۓ دہی کی بنیاد پر عرصہ پانچ سال کے لیے ہوتا ہے۔ ایوان بالا (قومی کونسل) کے دوتہائی ارکان کا انتخاب بلاواسطہ طور پر علاقائی اور بلدیاتی اسمبلیوں کے اراکین کرتے ہیں جب کہ ایک تہائی ارکان کو صدر نامزد کرتا ہے۔ غیر معمولی صورت حال میں صدر دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس طلب کرتا ہے۔ (Europa World Year Book 2002 ، ص ۴۳۶، ص ۳۹۹-۴۰۰).

مآخذ: متن مقالہ میں درج ہیں۔ (محمد ارشد)

••-------------••

✻اُلَق: (ت)، مغربی ایشیا کے ایک بڑے حصے اور خصوصاً عثمانی سلطنت میں منگول دورِ حکومت کے بعد، خطوط رسانی کے نظام کے لیے مستعمل ایک اصطلاح (عباسی اور منگول ادوار میں اس کے مماثل نظاموں کے لیے رکّ بہ "برید" اور "یم"۔ اُلق بطور اسم ترکی لفظ اُلا (Ula)، بمعنی "کس کر باندھنا، رسی سے باندھنا" سے مشتق ہے اور ایک فنی اصطلاح کی حیثیت سے اس کا ذکر شاخِ زرّیں کے خوانین کے فرمانوں اور دستاویزات میں ملتا ہے۔ عثمانی ترکوں کے ہاں مستعمل ہونے کی بنا پر یہ اصطلاح مغرب میں بلقانی اور یونانی زبانوں میں اور مشرق میں منگولیائی اور چینی زبانوں میں جا پہنچی (دیکھیے Turkische und Mongolische :G.Doerfer Elements im Neupersischen، ۲، ویزبیڈن ۱۹۶۵ء، ص ۱۰۲-۱۰۷، عدد ۵۲۱) .

اُلق، عثمانی سلطنت کا خطوط رسانی کا سرکاری ادارہ، اپنے قیام کی ابتدائی صدیوں کے دوران میں عبوری طور پر اور تدریجی انداز سے ارتقا پذیر ہوا اور اس میں اور منگول اور عباسی ادوار کے اس کے مماثل اداروں میں بہت سی چیزیں مشترک پائی جاتی ہیں۔ عثمانی ترک، کسی سبب کی بنا پر، یہ تسلیم کرتے تھے کہ اُنھوں نے اُلق کا نظام منگولوں سے لیا ہے (دیکھیے: لطفی پاشا: تواریخ آلِ عثمان، استانبول ۱۳۴۱ھ، ۳۷۱-۳۸۰)۔ سلطان ثانی کے عہد تک سرکاری خطوط رسانوں کی (جو خود بھی الق کہلاتے تھے)، تقرری کے فرمان (بق: الق حکمی) آسان اور سادہ الفاظ میں جاری کیے جاتے تھے جن کی رُو سے وہ مقررہ راستوں پر اپنے سرکاری منصب کی انجام دہی کے لیے حسب ضرورت فوجی گھوڑوں سے کام لے سکتے تھے۔ بعدازاں بارھویں صدی ہجری/اٹھارھویں صدی عیسوی تک ان فرمانوں کی عبارت نہایت معیاری اور شستہ انداز اختیار کر گئی (دیکھیے:J.H.Mordtmann: MSOS، ۳۲/۲ [۱۹۲۹ء] اور نسبتاً زیادہ تفصیل کے لیے مقالہ نگار کی ایک تاحال غیر مطبوعہ کتاب)۔ اس نظام

میں واضح طور پر پیدا ہونے والی خرابی خصوصاً سرکاری خطوط رسانوں کے ہاتھوں رعایا کا استحصال اور اس ظلم وزیادتی کے سدّباب کے لیے خصوصاً لطفی پاشا کی طرف سے کی جانے والی اصلاحات (دیکھیے: R. Tschudi (مدیر): *Das Asafname des Lutfi Pascha*، برلن ۱۹۱۰ء، متن، ص۱۱) سے عیاں ہوتا ہے کہ دور سلطان سلیمان کے درمیانی سالوں سے سلطنت کے اہم راستوں پر تھانہ جات کا جال بچھانے کا کام تدریجی انداز سے شروع کیا جا چکا تھا۔ اپنی تکمیل یافتہ صورت میں یہ نظام ''دائیں، وسطی اور بائیں ہاتھ والے'' چھ بڑے راستوں پر مبنی تھا، جو استانبول کو سلطنت کی سرحدوں سے ملاتے تھے۔ رُوم ایلی میں یہ بالترتیب زیریں ڈینیوب اور اخیراً اُوزو یا اُچکوف (Ocakov)، کریمیا اور ازق (ازوف) کو جاتے تھے؛ بلغراد اور اخیراً ہنگری کو؛ اور تھیسلنکی (Thessaloniki) یا موریہ (Morea) یا ایڈریاٹک کو (دیکھیے ''بائیں ہاتھ کے راستے'' کے بارے میں اہم کتابیں، در Elizbeth Zachariadou (مدیر): *The via Egnatia in the Ottoman Period (1389-1699)*، (Rethymnon) ۱۹۹۶ء)۔ اناطولیا میں تین راستے استانبول سے مشرق اور جنوب کی طرف ارضِ روم اور قفقاز کو، دیارِ بکر اور عراق کو اور حلب، دمشق اور قاہرہ کو جاتے تھے۔ ''ذیلی راستے'' بڑے اور اہم راستوں کے ایک یا دوسری طرف واقع انتظامی مراکز کو ایک دوسرے سے ملاتے تھے یا دو بڑے راستوں کو حسبِ موقعہ ملانے کا کام دیتے تھے۔ بڑے بڑے راستوں پر، جن کی حفاظت اور نگہداشت حکومت کی اولین ذمہ داری تھی، تھانہ جات چھ اور بارہ گھنٹوں کے سفر کے درمیانی فاصلے، یعنی بیس اور ستر کلومیٹر کے درمیانی فاصلے پر زمین کی طبعی کیفیت کے پیشِ نظر بنائے گئے تھے۔ سرحدی اضلاع یا گنجان آباد سرد میدانوں اور نیم صحرائی علاقوں میں تھانہ جات کے درمیان فاصلہ نسبتاً زیادہ ہوا کرتا تھا اور یہ چوبیس گھنٹے کا سفر یا تقریباً ۱۵۰ کلومیٹر ہوسکتا تھا (دیکھیے راستوں کی فہرست اور ان کے تمام تھانہ جات کے لیے کتابچہ از رضا بزکرت: *Osmanlı Imparatorlugunda kollar, Ulak ve iase menzilleri*، انقرہ ۱۹۶۶ء)۔ ان تھانوں کے لیے گھوڑے اور افرادی قوت اکثر وبیشتر ان کے نواحی دیہات کی طرف سے یا مقامی طور پر وصول کیے جانے والے محصولات کے ذریعے فراہم کی جاتی تھی۔

ان راستوں پر سرکاری ہرکارے، فوجی اور سفارتی عملہ دورانِ سفر تھانہ جات اور ان کی طرف سے فراہم کردہ گھوڑوں اور رہائشی مراعات سے بھرپور استفادہ کرتا تھا۔ جنگ کے دوران میں یہی راستے کسی خاص محاذ کی طرف پیش قدمی کے لیے سلطانی افواج استعمال کرتی تھیں۔ اُلق سے متعلق خدمات، یعنی ہر کاروں کی رہائش یا ان کے لیے گھوڑوں کی فراہمی سے ''مراعات یافتہ'' رعایا کے استثنا کے لیے عثمانی سلطنت کے ابتدائی دور کے ''معافی نامے'' خصوصی اہمیت کے حامل ہیں (دیکھیے: R. Anhegger و H. Inalcik: *Kanunname-i-Sultani Ber Muceb-i-orf-i Osmani*، انقرہ ۱۹۵۶ء)۔

دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں لطفی پاشا نے ان خرابیوں کی طرف توجہ دی۔ خطوط رسانی کے لیے گھوڑوں کی جبری بیگار، غیر مجاز افراد کو گھوڑوں کی فراہمی، الق کی مراعات کے استعمال میں اعلیٰ حکام اور ان کے کثیر تعداد خدمت گاروں کی طرف سے ہونے والی زیادتیاں اور لوٹ مار، یہ خرابیاں بعد کی صدیوں میں برابر بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور اس حقیقت کا اندازہ مختلف راستوں پر واقع علاقوں کے قاضیوں کی طرف سے باب عالی کو موصول ہونے والی درخواستوں (عرض

حال) کی بہت بڑی تعداد اور ان پر صادر شدہ سلطانی احکام سے ہو سکتا ہے (دیکھیے: Bistra Cvetkova: Obsciazenie Podatkowe rai to Bulgarii w czasie niewoli turechiej, Zwiazane Z Utrzymaniem Zajazdow (menzili)، ۲/۲۶ [۱۹۵۸ء]، ۱۹۳ـ۹۸)۔ جنگ کے دنوں میں اس نظام کے فوجی اہمیت کے حامل حصوں پر دباؤ میں بہت زیادہ اضافہ ہوجاتا تھا؛ چنانچہ آسٹریا اور سکرالیگا (Sacraliga) کے ساتھ جنگ (۱۶۸۳ـ۱۶۹۹ء) کے آخری مراحل میں کوپرولو [رک بآں] صدرِ اعظم نے خصوصی طور پر اُلق کے نظام میں اہم اور پائیدار مالی اور انتظامی اصلاحات کیں (ان کے بارے میں دیکھیے: C.J.Heywood: The Ottoman Menzilhane and ulak system in Rumeli in the eighteenth century، در عثمان اوکیار اور اِنچ الحیق (مدیر): (۱۰۷۱-۱۹۲۰) Turkiye` nin Sosyal ve ekonomik tarihi، انقرہ، ۱۹۸۰ء، ۷۹ـ۱۸۴۔ اہم تھانہ جات سے متعلق خصوصی مالیاتی توضیحات کے لیے دیکھیے وہی مصنف: The via Egnatia in the Ottoman Period: the Menzilhanes of the sol kol in the late 17th early 18th century، در E.Zachariadou: The via Egnatia under Ottoman rule، ۱۲۹ـ۴۴؛ اناطولیا کے نظامِ اُلق کے لیے دیکھیے Yucel Ozkaya، xviii در AUDTCFD، ۲۸/۳ـ۴ [۱۹۷۰ء (۱۹۷۷ء)] ۳۳۹ـ۳۶۸ـ بعدازاں یہ نظام کم وبیش تبدیلیوں کے ساتھ تنظیمات [رک بآں] کی اصلاحات اور اخیراً انیسویں صدی عیسوی میں تاربرقی کی ایجاد تک چلتا رہا۔ [اگرچہ] اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں خود الق کی اصطلاح ہی متروک ہوتی اور ایک درآمد شدہ اصطلاح ''قوریر'' اس کی جگہ لیتی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ منگول عہد کے بعد کا خطوط رسانی کا روایتی نظام سابقہ منگولستان میں شامل علاقوں میں تقریباً انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک رائج رہا۔ ۱۲۹۱ھ میں کاشغر سے محمد یعقوب بیگ کے جاری کردہ مشرقی ترکی خطوط رسانی سے متعلق ایک فرمان (کاشغر سے جاری کیے جانے والے پاسپورٹ کی نقل)، جو عثمانی سلطنت کے ابتدائی دور کے الق کے فرمانوں کی سی اکثر خصوصیات کاحامل ہے، کے متن اور ترجے کے لیے (دیکھیے: R.B.Shaw: A Grammer of the Language of Eastern Turkistan، در JRASB (۱۸۷۷ء)، عدد ۳، ۳۲۱ـ۳۔

مآخذ: (متنِ مقالہ میں مندرج ہیں ان کے علاوہ): عثمانیوں کے نظامِ اُلق کے بارے میں عثمانی سلطنت پر تفصیلی نگارشات کے وسیع یورپی ذخیرے میں، پندرھویں صدی عیسوی میں Chalcocondyles سے لے کر اب تک کے بے شمار ضمنی حوالہ جات اور بیانات ملتے ہیں مثال کے طور پر دیکھیے (۱) J.H.Mordtmann: Die Judischen kira im serai der sultane، در MSOS، ۲/۳۲ (۱۹۲۹ء)، ۱ـ۳۸، بر ۲۳ـ۲۵؛ (۲) اب تک طباعت پذیر ہونے والے قدیم ترین عثمانی اُلق فرمان کے لیے دیکھیے Fr.von Kraelitz و Greifen Horst: Osmanische Urkunden in turkische sprache aus der zweiten Halfte des 15. Jahrhunderts، در Sbwaw، Phil- Hist، ۳/۱۹۷ (۱۹۲۱ء)، ۱۰۶ـ ۱۰۷ (۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء کی دستاویز)؛ (۳) اس سے نسبتاً قدیم تر یعنی ۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء کا خطوط رسانی سے متعلق ایک فرمان استانبول کے توپ کاپی میوزیم کی تاریخی دستاویزات میں موجود ہے (بذیل TK.S.E.5568 Muhimme Defterleri کے دستیاب مجلدات میں اُلق کے انتظامی امور کے بارے میں دسویں صدی ہجری/سولھویں عیسوی کے وسط سے لے کر اخیر دور تک کے حوالہ جات بکثرت موجود ہیں اور ان سے اناطولیائی ''دائیں راستے'' کے فلسطینی حصے کے حوالے سے

U.Heyd نے اپنی تالیف Ottoman Documents on Palestine، (آکسفرڈ ۱۹۶۰ء، ۲۸، ۱۰۱، ۱۲۴۔۷) میں استفادہ کیا ہے۔ عثمانی اُلق اور تھانہ جات کے انتظامی امور سے متعلق دستیاب مفصل ریکارڈ کی، جو کہ وزیراعظم کے محافظ خانہ (باش بقنلک عرشوی [دیکھیے باش وکالت عرشوی] استانبول میں محفوظ ہے، ابتداء محض گیارھویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی کے اختتام پر کی جانے والی اصطلاحات کے نفاذ سے ہوتی ہے۔ بعدازاں صوبائی تھانہ جات (دیکھیے: خصوصاً، معلم جودت ...... نافعہ اور کامل قیچی کی تصانیف) اور اس کی مرکزی انتظامیہ اور ریکارڈ (احکام دفترلری۔ منزل " یا اجراء شدہ اُلق کے حکم ناموں کے ریکارڈ اور بارھویں صدی ہجری کے ابتدائی حصے/سترھویں صدی عیسوی کے آخری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصے میں کی جانے والی اصلاحات کی دستاویزات کی نسبتاً کم تر تعداد) طبع شدہ مجموعے ہر دو بکثرت دستیاب اور معلومات افزا ہیں۔ مذکورہ بالا محافظ خانے کے ریکارڈ میں متفرق دستاویزی اوراق بھی جابجا بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں (اس مواد کے ایک مختصر جائزے کے لیے: (۴) C.J.Heywood: Some Turkish Archival Sources for the History of The Menzilhane Network in Rumeli during the Eighteenth Century Bogazici universitesi dergisi، Beseri Bitimlar، در Notes and Documents on the Ottoman Ulak,1 ۴۔۵ [۱۹۷۶۔۱۹۷۷ء]، ۳۹۔۵۵).

(C.J.Heywood [ت: ظفر علی])

••-------------••

※ اِلٰہی: (ت) ایک اصطلاح جو ترکی میں مذہبی جوش وجذبے کی قسم کی ایک عوامی شاعری کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ یہ ایسے شعروں پر مشتمل ہوتی تھی جو آلات موسیقی کے بغیر، اجتماعی طور پر یا بعض تقریبات کے دوران میں ایک آدمی بھی گا سکتا۔ اس طرح "اِلٰہی" اپنی نغمگی اور مذہبی رسومات میں استعمال کے لحاظ سے عوامی مذہبی شاعری کی دوسری تمام قسموں سے ممتاز ہے۔ بہت سے ایسے متون جو بنیادی طور پر "اِلٰہی" کے مقصد سے نہیں لکھے گئے تھے، ممکن ہے بعد میں مناسب خوش آہنگی کے اضافے سے "اِلٰہی" میں شامل کر لیے گئے ہوں اور پھر ایسی تقریبات میں متعارف کرا دیئے گئے ہوں جہاں "اِلٰہی" کے الاپنے کا تقاضا ہوتا.

"اِلٰہی" بیشتر صوفی سلسلوں کے تکیوں (خانقاہوں) میں ذکر کی محفلوں میں گائی جاتی تھیں اور اس طرح وہ اپنی لے اور اپنے الفاظ کے اعتبار سے غایت انبساط کی حالت تک پہنچنے میں حاضرین کی ہمت بندھاتیں، لیکن کم وبیش غیر مذہبی ماحول اور حالات میں "اِلٰہی" مختلف عوامی تقریبات میں شعری اور نغماتی طربیہ کے طور پر مستعمل ہیں۔ یہ حسب ذیل مواقع پر گائی جاتی ہیں: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے واقعات یعنی "میلاد" کے بیان میں عارضی وقفوں کے دوران میں، یادگاری تقریبات، قرآن مجید کی تعلیم کے کسی مدرسے میں پہلے سبق کے لیے نئے طلبہ کو لے جاتے ہوئے باہم مل کر اجتماعی نغمے کی صورت میں، دولہا کے ساتھ جانے والے جلوس (بارات) اور شادی کی تقریبات کی آخری رات کو، مسجد سے حجلۂ عروسی کو جاتے ہوئے، ان تقریبات کے موقع پر جو حجاج کو مکہ مکرمہ کے لیے الوداع کہتے ہوئے منعقد کی جاتی ہیں (اور ان کی واپسی پر بھی).

بچوں کی اساطیر کے سلسلے میں جو روایات منتقل ہوتی چلی آئی ہیں وہ بھی ان مناجاتوں کے ساتھ مستعمل ہیں جو بعض ضیافتی تقریبات کے موقعہ پر کی جاتی ہیں۔ چنکری کے خطے میں "الٰہی" کی یہ بچگانہ نقالی منجم

(مناجات) کے نام سے معروف ہے۔ (صوبہ بولو میں) صدر نو کے مقام پر بچوں کی ایسی "اِلٰہی" اپنا سنجیدہ مفہوم کھو چکی ہیں اور ان میں مضحکہ خیز اور مزاحیہ عنصر شامل ہوگیا ہے۔ نہ صرف ان غیر معیاری صورتوں میں بلکہ ان روایات میں بھی جو تاحال اپنی اصلی کار گزاری کو محفوظ کیے ہوے ہیں "اِلٰہی" ہمیشہ عوامی حکایاتی عمل سے گزرتی رہی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ زبانی طور پر منتقل ہوتی چلی آئی ہیں اور ان متون میں جو تحریری طور پر موجود ہیں، وسیع پیمانے پر اضافے ہوتے رہے ہیں۔ بہت سی "اِلٰہی" جو فی الحقیقت معروف شعرا کا کارنامہ تھیں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غیر موسوم ہوچکی ہیں، ان میں تدریجاً انحطاط نے جگہ پالی ہے اور مختلف مصنفین کی تحریریں آپس میں گڈمڈ ہوگئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ نئی عوامی کہانیوں کی روایت نے جنم لیا ہے۔

اب تک کی باقی ماندہ "اِلٰہی" یونس ایمرے (م ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء) کی ہیں۔ بعد کی صدیوں میں "اِلٰہی" کے ذخیرے میں بہت سے دینی اور متصوفانہ وجدان کے حامل، مقبول عام شعرا کے کلام کی بنا پر اضافہ ہوا جن میں سے معروف ترین یہ ہیں: یونس نام کا ایک شاعر (یا ایک سے زیادہ شعرا؟) (نویں/پندرہویں صدی یا دسویں/سولہویں صدی) جس کی "اِلٰہی" اکثر اول الذکر یونس [ایمرے] کی "اِلٰہی" سے خلط ملط ہوجاتی ہیں؛ حاجی بیرم (م۸۳۳ھ/ ۳۰۔۱۴۲۹ء)؛اشرف اوغلو رومی (م۸۷۴ھ/ ۷۰۔۱۴۶۹ء)؛ ابراہیم گلشنی (م۹۴۰ھ/۳۴۔ ۱۵۳۳ء)؛ افتادہ (م۹۸۸ھ/ ۱۔۱۵۸۰ء)؛ سیف اللہ نظام اوغلو (م۱۰۱۰ھ/ ۲۔۱۶۰۱ء)؛ محی(م۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء)؛ ہدایتی (م۱۰۳۴ھ/ ۵۔۱۶۲۴ء)؛ ہمت (م۱۰۹۵ھ/ ۴۔۱۶۸۳ء)؛ نیازی مصری (م۱۱۰۵ھ/۱۶۹۴ء) یہ تمام شعرا صوفی سلسلوں سے تعلق رکھنے والے درویش یا شیوخ تھے۔

"اِلٰہی" سنّی رجحانات والے سلسلوں کی تقریبات کا جز بن گئیں۔ مولویہ [سلسلے] اور اسی طرح شیعہ علوی رجحانات کے سلسلوں اور فرقوں کے ہاں وہ نغمات جو "اِلٰہی" جیسے مواقع پر پیش کیے جاتے تھے اِلٰہی سے خاصے ممیز ہیں اور ان کے لیے مخصوص اصطلاحات مستعمل ہیں۔

"اِلٰہی" کے تحریری مجموعوں کی بقا سے نغموں اور ترانوں کے اسلوب اور آہنگ کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اس صدی کے آغاز تک اسکول کے بچوں کے استعمال کے لیے ان مجموعوں کی سنگی طباعت (Lithograhpy) کے نسخے موجود تھے۔ اولین "اِلٰہی" نغموں کی موسیقی ترتیب دینے کی صحیح تاریخ کا تعین ناممکن ہے۔ یہ واضح ہے کہ غیر دینی موضوعات پر مبنی، عوامی شاعری کی طرح، مقبول عام مذہبی شاعری بھی اسی زمانے میں مدون ہوئی جب ان کے ساتھ الاپے جانے والے سُر اور ترنم ترتیب دیے گئے۔ بہت سے سُر جو اب تک موجود ہیں اسی زمانے کے ہوسکتے ہیں جو ان کے متون کا زمانہ تھا اور غالبًا اسی مصنف کی ایجاد۔

اٹھارویں صدی کے آغاز سے "اِلٰہی" کے (فقط سُروں کے) بعض مرتّبین کے نام معروف ہیں: چاک زادہ (م۱۱۳۰ھ/۱۷۱۸ء)؛ توسن زادہ (م۱۱۲۷ھ/۱۷۱۵ء)؛ حمامی زادہ؛ اسمٰعیل دہدہ (م۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء)۔ اِلٰہی کی موسیقی کی علامات واشارات کا استعمال کہیں اس صدی کی پہلی چوتھائی میں جا کر ہوا۔ سُر اور تال کی خاصی تعداد کو صوتی علامتوں میں ڈھالنے کا کام سید عبدالقادر اور رؤف یکتا (م۱۹۳۵ء) نے انجام دیا۔

جدید ترک کمپوزر، عدنان سیے گن "اِلٰہی" سے متاثر ہو کر ایک مذہبی اوپیرا [ڈرامائی متن کی طویل نغمہ گری] حیطۂ تحریر میں لایا (Onario en trois :Yunus Emre *partid*, Op.26، نظموں کے متون کا فرانسیسی ترجمہ،

مطبوعہ پیرس، ۱۹۴۷ء)۔ اس مجموعے کے تیرہ نغموں میں سے جوگائے جاتے ہیں اور کئی ایک نہایت مقبول "الٰہی" ہیں، پانچ یونس ایمرے کے ہیں گویا ساتویں/ تیرھویں صدی کے آٹھ اور متون ایسے ہیں جن کی اس کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔

مآخذ: عوامی شاعری کی اس صنف پر کوئی خاص تحقیقی کام موجود نہیں، عام معلومات کے لیے دیکھیے: (۱) احمد طلعت:Khalr Ski`rlerinin Sheril ve new`i، استانبول ۱۹۲۸ء، ص ۹۵-۹۶؛ (۲) کوپرلوزادہ محمد فؤاد: Turk edebiyyatinda ilr Mutosawwifler، استانبول، ۱۹۱۹ء (۳) عبدالباقی گولپنرلی: Yunus Emre ve tasavvuf، استانبول، ۱۹۶۱ء، مقالہ "آلٰہی" در Pakalin؛سکولوں کی تقریبات میں آلٰہی کے لیے؛ (۴)رفعت اودمان: Folrioru، بروسہ ۱۹۵۵ء، ۱۱۷؛ (۵)M.Hibt Bayri: Istnnbul`da Mektebe Boslama در Halk Bilgisi Haberleri، (۱۹۴۲ء): ۴-۵۰؛ (۶) P.N،مقالہ " Aminalayi" در Turk Ensirlopedisi؛(۷)وہی مصنف مقالہ Aminalayi، در Istanbul Ansirlopedosi، شادیوں کی تقریبات میں الٰہی کے لیے دیکھیے: (۸) Gecmiste Bursa`da Nazim Yucelt Dugun adetleri، در F. Yenisey، در کتاب مذکور، ص ۶۷؛ (۹)M.Enver Bese، Safranbolu`da bir Roylunun Hayati، در HBH، ۸ (۱۹۳۹) ص ۱۰۶؛ (۱۰) Turkiyci Dugunleri، انقرہ ۱۹۴۴ء، ص ۱۵۴، ۲۵۳، ۳۰۲، (۱۱) Rina Fikret geceleri Harput`ta geceleri Memisoglu، در TFN= (Turk Folrlor Arostirmalari)، عدد ۳۸ (۱۹۵۲ء) اور ۸۷ (۱۹۵۶ء)؛ (۱۲)Mehmet Kalkanoglu: Sar Risla Jugunleri در (TFA) عدد ۶۶ (۱۹۵۵ء)؛ (۱۳) P.N. Boratav اور A Gulpinarl، Pir Sultan Abdal، انقرہ ۱۹۴۳ء، ۵۳-۵۵، حج بیت اللہ کو جانے والوں کو الوداع کہتے ہوئے گائی جانے والی الٰہی کے لیے دیکھیے (۱۴) Enver Bsce، کتاب مذکور بمحل مذکور، ان تقریبات سے متعلقہ دوسرے متون مصنف کے اپنے ذخیرۂ کتب میں عوامی نظموں کے مجموعے میں بصورت قلمی مسودہ جات محفوظ ہیں۔ (۱۵) A. Golpinarli، حوالۂ مذکور، ۱۵۱-۲۴۷؛ (۱۶) وہی مصنف Yanns Emre، استنبول ۱۹۳۶ء، ۳۳۲- ۵: (۱۷) Kopru Luzade، حوالۂ مذکور، متن کے اختتام پر؛ (۱۸) Salahattin Gurey Asik Yunns Emrenin besteInmis Siirlesi، استانبول ۱۹۶۱ء؛ (۱۹) Yunns Emrenin Bes telenmis, Ilahileri, Cahit Oztelli، در TFA، نیز ۲۲۳ (۱۹۶۸ء)

(P.N.Borator [ت: امین اللہ وثیر])

••-------------••

الٰہی بخش معروف: ایک اردو شاعر ۱۱۵۶ھ/ ۱۷۴۳ء میں پیدا ہوا۔ مرزا عارف جان کا چھوٹا بیٹا اور شرف الدولہ قاسم جان کا برادر خورد تھا۔ وہ ذوالفقار الدّولہ نجف خاں کی وزارت کے دوران میں مملکت کا بلند مرتبہ رئیس تھا۔ شرف الدّولہ کے بعد پرانی دہلی میں اب بھی ایک گلی قاسم جان کے نام پر موجود ہے جس میں بہت سی معروف شخصیات رہا کرتی تھیں جن میں اردو فارسی کا شاعر غالب [رک بآں]، مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر [رک بآں] کے روحانی پیشوا شیخ فخر الدین اور رئیس الاطباء محمد شریف خان، جو شفاء الملک حکیم اجمل خان (م۱۹۲۷ء) کے پردادا تھے، جنہیں احمد یسوی [رک بآں] کی اولاد میں سے ہونے کا دعوٰی تھا، وغیرہ شامل ہیں۔ اس کا دادا خواجہ عبدالرحمٰن یسوی بخارا سے نقل مکانی کر کے بلخ چلا گیا تھا، مگر اپنی

سرگرمیوں کے لیے اس نے بلخ کو بہت محدود پایا، لہٰذا مغل بادشاہ محمد شاہ [رک بآں] کے عہد حکومت میں اس کے بیٹے قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان آگئے۔ انہوں نے حاکم پنجاب میر منو کے پاس ملازمت اختیار کر لی اور اس کی وفات پر وہ شاہی دربار دہلی میں چلے گئے، جہاں انہوں نے بہت جلد اپنا مقام پیدا کر لیا۔ اولاً انہوں نے شاہ عالم ثانی [رک بآں] کو (باغی سکھوں کے خلاف) اور بعد ازاں انگریز گورنر جنرل لارڈ لیک کو اپنی عسکری خدمات پیش کیں، جس کے صلے میں اس خاندان کو فیروز پور (نزد دہلی) کا علاقہ بطور جاگیر ملا۔ بعد میں اس کا کچھ حصہ لوہارو ریاست کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کا سربراہ نواب احمد بخش خان کا پردادا خان کلاں نواب الٰہی بخش تھا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے سپاہی تھا لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کی بنا پر اس نے آغاز زندگی میں ہی شعری مذاق پیدا کر لیا تھا۔ اس نے ذوق [رک بآں] کے استاد شاہ ناصر اور سید علی غمگین کو اپنا استاد بنایا۔ (اس کے لیے دیکھیے گلشن بے خار، بذیل مادہ)۔ اگرچہ وہ ذوق سے کئی سال بڑا تھا لیکن وہ اتنا شریف النفس تھا کہ نظرثانی کے لیے اپنے اشعار اس کو دکھاتا تھا۔ یہ بیان محمد حسین آزاد [رک بآں] کا ہے جس کا ذکر اس نے آب حیات میں کیا ہے اور اس کی حمایت میں معقول دلائل دیئے ہیں، لیکن یہ بیان الٰہی بخش کی اولاد میں متنازعہ رہا، اس لیے کہ ان دنوں ذوق ایک جوان سال شاعر تھا، لہٰذا وہ یہ اعزاز کیسے حاصل کر سکتا تھا (دیکھیے دیوان معروف، ص ۲۲۱ تا ۲۴۵ اور گل رعنا، ص ۲۸۵)؛ بہرکیف چونکہ ذوق ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء میں پیدا ہوا اور الٰہی بخش ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء میں فوت ہوا، لہٰذا مؤخر الذکر کی وفات کے وقت ذوق اڑتیس برس کا تھا، لہٰذا ممکن ہے معروف نے اس سے ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء کے بعد رابطہ کیا ہو، جبکہ ذوق کی عمر بیس سال تھی اور وہ ایک پختہ شاعر تھا (دیکھیے عمدۂ منتخبہ، بذیل مادہ ذوق)۔ وہ ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء-۱۸۴۰ء کے درمیان لکھنو گیا جب مصحفی [رک بآں] وہاں شہرت کی بلندیوں پر تھا۔ اس نے وہاں دو ماہ قیام کیا تاہم اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ اس نے وہاں بالواسطہ یا بلا واسطہ اردو کی اس عظیم شخصیت سے استفادہ کیا ہو، جو اس وقت شاہ عالم ثانی کے فرزند شہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار میں اعتبار ومقام کی حامل تھی، اور لکھنؤ میں ہی رہائش اختیار کر لی۔ اگرچہ "معروف" نے فارغ البالی کی زندگی بسر کی تاہم وہ اس دنیا کی چمک دمک سے نالاں تھا اور اس نے درویشوں سے متاثر ہونے کی بنا پر، جو اکثر اس کے پاس آتے رہتے تھے، بڑھاپے میں درویشی اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ بالآخر وہ جے پور کے خواجہ ضیاء الدین چشتی فخری کا خلیفہ بن گیا جن کے ہاں وہ جاتا رہتا تھا۔ جوانی میں خوبصورت، انتہائی مہذب، شائستہ اور مسحور کن شخصیت کا حامل ہونے کی بنا پر وہ گلابی نقوش والے شہزادہ کے نام سے مشہور تھا۔

اس نے بہت سے قادرالکلام شعرا، مثلاً جرأت، سودا اور میر تقی میر [رک بآں] کا اسلوب اختیار کیا لیکن آخر کار اس نے درد [رک بآں] کا انداز اپنایا۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا دیوان شائع ہوا (اس میں ذوق کی قدیم صرف ونحو سے متعلق ایک نظم بھی شامل ہے، جو مؤخر الذکر کے الٰہی بخش کے ساتھ قریبی دوستانہ تعلقات کا ایک اور ثبوت ہے)۔ اس کے اشعار نہ تو کسی اسلوب کے حامل سمجھتے جاتے ہیں اور نہ ہی جدت آفریں خیال کے حامل ہیں۔ وہ ایک طویل نظم بعنوان "تسبیح زمرد" کا مصنف ہے جس میں ایک سو گیارہ اشعار ہیں۔ ہر شعر میں لفظ شہر کہیں استخراجاً، کہیں محاورۃً اور کہیں استعارۃً استعمال کیا گیا ہے۔

وہ ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء میں خاصے عمر رسیدہ ہو کر فوت ہوے (دیکھیے گل رعنا بحل مذکور)۔ اگرچہ قدرت اللہ قاسم (۱۲۲۱ھ/۱۸۵۶ء) اپنی تحریر میں اسے اعلٰی خصلت کا نوجوان بیان کرتا ہے (مجموعۂ نغز ۲: ۲۵۲)۔

اس کا فرزند علی بخش رنخود تھا، جس کی اولاد ۱۹۴۲ء میں تقسیم برصغیر تک ریاست حیدر آباد میں مقیم تھی۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں: (۱) بناری بیگم کی شادی غلام حسین خان مسرور سے ہوئی، جو نواب زین العابدین خان عارف کی والدہ تھی، جس کی بے وقت موت پر غالب نے اپنا مشہور مرثیہ لکھا تھا اور (۲) امراؤ بیگم (پ: ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء) مرزا غالب کی زوجہ تھی۔ جب کبھی غالب اپنے رشتہ داروں کے بچوں کو تحائف وجیب خرچ دینے سے مذاقاً انکار کرتا تھا تو وہ اسے بیوقوف بوڑھا کہا کرتی تھی۔ وہ خاوند کی وفات کے بعد دو سال تک حیات رہی اور بے اولاد ہی ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۵ء میں وفات پا گئی (اس کے لیے دیکھیے احوال غالب، بذیل امراؤ بیگم)۔

مآخذ: (۱) کریم الدین اور Fallon: طبقات شعرائے ہند، دہلی ۱۸۴۸ء، ص ۳۸۶-۳۸۷؛ (۲) مصطفٰی خان شیفتہ: گلشن بے خار، لکھنو ۱۸۷۴ء، ص ۱۲۱؛ (۳) مصحفی: تذکرۂ ہندی، دہلی ۱۹۳۳ء، ص ۲۴۵؛ (۴) محسن علی محسن: سراپا سخن، لکھنؤ ۱۸۶۱ء، ص ۶۲-۱۴۲-۲۵۹-۳۲۵؛ (۵) عبدالغفور خان: نساخ: سخن شعراء، لکھنؤ ۱۲۹۱ھ، ص۴۴۹؛ (۶) قادر بخش صابر: گلستان سخن، لاہور ۱۹۶۶ء ص ۳۷۵-۳۷۳؛ (۷) غلام قطب الدین باطن: گلستان بے خزاں، لکھنؤ ۱۸۷۵ء، ص ۲۲۵؛ (۸) قدرت اللہ قاسم: مجموعۂ نغز، ۱۹۳۳ء، ۲: ۲۵۱؛ (۹) عبدالحی لکھنوی: گل رعنا، اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء، ص ۲۸۴-۲۸۵؛ (۱۰) دیوان معروف (طبع عبدالحمید قادری بدایونی، بدایوں ۱۹۳۵ء، پیش لفظ مدیر، ص ۲۲۱-۲۴۵ (زیادہ تر اس پر بحث ہے کہ معروف ذوق کا شاگرد تھا)؛ (۱۱) عبدالحی صفا: شمیم سخن، لکھنؤ ۱۸۹۱ء، ص ۲۱۷؛ (۱۲) سید فرزند احمد صغیر بلگرامی: جلوۂ خضر، پٹنہ، ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء، ۱: ۲۱۵-۲۷۴؛ (۱۳) علی بخش خان: بزم سخن، آگرہ ۱۸۸۱ء، ص ۱۵۶؛ (۱۴) نصر اللہ خان خویشگی: گلشن ہمیشہ بہار، کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۷؛ (۱۵) محمد خان اعظم الدولہ سرور: عمدۂ منتخبہ، دہلی ۱۹۶۱ء، ص ۶۸۲-۷۰۶؛ (۱۶) مختار الدین احمد: احوال غالب، علی گڑھ ۱۹۵۳ء، ۸۷، ص ۲۶۶-۲۸۰؛ (۱۸) خوب چند ذکاء: عیار الشعراء (انجمن ترقی اردو کراچی میں فوٹو کاپی)، ورق ۶۸۷-۹۱؛ (۱۹) محمد حسین آزاد: آب حیات مختلف ایڈیشن ہیں، دیکھیے بذیل ذوق اور غالب) بعض بیانات میں تضاد پایا جاتا ہے)؛ (۲۰) A. Sprenger: *Catalogue of the Libraries of the King of Audh*، کلکتہ ۱۸۵۴ء جزوی اردو ترجمہ: یادگار شعراء، الٰہ آباد، ۱۹۴۳ء، ص ۱۹۱؛ (۲۱) حسرت موہانی: اردوئے معلٰی، در کانپور ۱۹۱۱ء؛ (۲۲) نور الحسن خان: تذکرہ طور کلیم، آگرہ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء، ص ۹۳؛ (۲۳) شاہ کمال: مجمع الانتخاب (انجمن ترقی اردو، کراچی کی لائبریری میں مائیکروفلم)؛ (۲۴) De Garcin De Tassy A: *Histoire la Litterature Hindlouie et Hindoustanie*، پیرس ۱۸۷۰ء، بذیل مادہ؛ (۲۵) تنویر احمد علوی: ذوق، سوانح وانتقاد، لاہور ۱۹۶۶ء ص۶۹-۷۸ (انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ الٰہی بخش ذوق سے مشورہ لیتا رہا تھا اور ذوق کے ہاتھ کی لکھی تین نظموں کی شمولیت معروف کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے)۔

(اے۔ ایس بزمی انصاری [ت: محمد نوازرومانی؛ ن: محمود الحسن عارف])

••-------------••

امارات اسلامی افغانستان: رک بہ افغانستان ⊗

••-------------••

امامۃ: (ع) قیادت وسیادت اور رسالت مآب ※ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مسلم امہ کی قیادت

عظمیٰ۔ اس مقالہ میں دینی اور عدالتی نقطہ نظر زیر بحث آئے گا۔ [ادارتی وانتظامی ارتقا کے لیے رک بہ خلافت]

ا۔ اولین ارتقا: رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلیفۂ رسول کی حیثیت سے حضرت ابوبکرؓ کے تقرر سے واحد رہنما کی زیر قیادت مسلم امہ کے قائم شدہ اتحاد پر مہر توثیق ثبت ہوگئی، اس تقرر سے امامہ کے لیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مکی قریشی صحابہؓ کے ترجیحی حق کی تائید اور واضح طور پر آپؐ سے خونی رشتہ کے تعلق کی بنا پر کسی طرح کے حق کی نفی ہوئی.

اگرچہ [امامت وقیادت کا] یہ اصول ابتدا ہی سے متنازع فیہ رہا، لیکن حضرت عثمانؓ کے خلاف سازش سے پیدا ہونے والے بحران کی وجہ سے، امامہ کے بارے میں نظریاتی اختلافات کا دروازہ کھل گیا (حضرت علیؓ کا چار سالہ دور خلافت اسی بحرانی کیفیت کا شکار رہا اور حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد) جب امیر معاویہؓ عملاً حکمران بن گئے تو حقیقی امامہ کے بارے میں مسلم امہ اپنے اعتقادات کے ضمن میں واضح طور پر منقسم ہوگئی۔ حضرت عثمانؓ کو خلیفۂ راشد ماننے والے عثمانیہ کہلاتے تھے جو ان کے خلاف ہونے والی بغاوت اور اس کے نتیجے میں وجود میں آنے والی حضرت علیؓ کی خلافت کے منکر تھے [اس گروہ] میں امیر معاویہؓ کے حامیوں کے علاوہ امامت وخلافت کے ابتدائی اصولوں (خصوصاً مدینہ میں زیادہ تر اقامت پذیر غیر ہاشمی صحابہ کے خاندانوں کے حق حکمرانی) کے علم بردار بھی شامل تھے۔ اگرچہ یہ حضرات حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دوران میں ان پر اکثر وبیشتر تنقید کرتے تھے، تاہم وہ حضرت علیؓ کی جانشینی کے حق میں بھی نہ تھے اور جنگ صفین میں ثالثی کرنے والوں کے اس فیصلے کو تسلیم کرتے تھے کہ حضرت عثمانؓ ناحق قتل ہوے۔ وہ امیر معاویہؓ کے بھی طرف دار نہ تھے، کیونکہ وہ قدیم الاسلام نہیں تھے، لیکن اتحاد [کو برقرار رکھنے] کی خاطر انہیں امیر تسلیم کرتے تھے۔ دوسری طرف حضرت علیؓ کے حامی ''شیعہ'' کہلاتے تھے جو حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کو جائز قرار دیتے تھے، جو ان کے خیال کے مطابق اپنی [نامناسب] کاروائیوں کی بنا پر خلافت کا استحقاق کھو بیٹھے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص لینے والے کی حیثیت سے امیر معاویہؓ کے دعویٰ کے برخلاف وہ قیادت کو اہل بیت، خصوصاً حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا حق تصور کرتے تھے تاکہ امامت کماحقہ دوبارہ قائم ہوسکے [یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسلام میں امامت وخلافت کا حق کسی خاندان (بشمول خاندان نبوی) کے ساتھ مختص نہیں ہے، اسی لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ کی خلافت کا عدم قیام] محض ابتدائی دو خلفا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے انکار پر مبنی نہ تھا، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ اس وقت یہ عقیدہ مقبول نہیں ہوا تھا کہ حضرت علیؓ کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وصی مقرر فرمایا ہے اور یہ کہ وہ ما فوق الفطرت طاقت کے مالک ہیں۔ اس عقیدے کو عمومی مآخذ کی رو سے عبداللہ بن سبا کی افسانوی شخصیت [رک بآں] سے منسوب کیا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ کا ساتھ چھوڑنے والے خوارج حضرت عثمانؓ کے بارے میں شیعوں کے خیالات سے متفق تھے اور خلافت کے لیے حضرت علیؓ کے استحقاق کے حامی تھے وہ امیر معاویہ سے چپقلش میں تحکیم پراتفاق کرلینے کی بنا پر حضرت علیؓ کے مخالف کے طور پر امیر معاویہؓ کے بھی پوری طرح مخالف تھے.

دوسری خانہ جنگی حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد شروع ہوئی اور موروثی بنیادوں پر بنوامیہ کی مستقل

حکومت [کے قیام] پر منتج ہوئی جس سے فریقین کے مابین محاذ آرائی میں شدت پیدا ہوئی۔ ابتدائی نظریۂ خلافت کے حامی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی طرف سے اس کی بحالی کی کوشش میں ناکامی کے بعد، ساری امیدیں کھو بیٹھے۔ یہ حضرات ابتدائی تین خلفا کے عہد کو مثالی قرار دیتے تھے۔ یہ لوگ اگرچہ اُموی حکومت کے حامی اور بغاوت کے مخالف تھے، مگر وہ شامیوں کے برعکس ان کے دور حکومت کو اُس خلافت حقیقی کا حصہ تصور نہیں کرتے تھے جو کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ساتھ ختم ہوگئی تھی۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت حسینؓ [رک بآں] کی اموی حکومت کے ہاتھوں المناک شہادت نے حضرت علیؓ کے طرف داروں [شیعوں] میں انقلابی رجحانات کو بڑھا دیا، چنانچہ مختار ثقفی [رک بآں] کی تحریک میں یہ انقلابی عناصر صف اوّل میں آ گئے اور انہوں نے قدامت پسند شیعوں سے لاتعلقی اختیار کر لی۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ معاشرہ حضرت علیؓ کو اللہ تعالٰی کی طرف سے عطا کردہ حق، یعنی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی سے محروم اور حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کی خلافت کو تسلیم کرکے راہ ضلالت اختیار کر چکا ہے۔ وہ زمین پر عدل کی بحالی کی توقع اپنے امام محمد بن حنفیہؒ کی فتح کے ذریعے کرتے تھے، جن سے اُنہوں نے مہدی کا مسیحائی کردار منسوب کر رکھا تھا۔ شیعوں کی اس انقلابیت کے پیش نظر حسن بن محمد بن حنفیہ کی برپا کردہ مرجئہ تحریک نے معتدل مزاج شیعوں اور حامیان حضرت عثمانؓ کے مابین واقع خلیج کو پاٹنے کی سعی کی۔ اولین مرجئۃ مابعد کے خلفا پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی برتری کا اثبات کرتے تھے اور حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور خانہ جنگی کے دیگر شرکا کا معاملہ [قیامت کے دن] اللہ تعالٰی کے فیصلے تک مؤخر کرتے تھے۔ وہ بنوامیہ کی روش کو درست مانے بغیر ان کی خلافت کو حکم خداوندی سمجھ کر قبول کرتے تھے اور معاشرے کے امن میں خلل اندازی کے خلاف تھے۔ خوارج [رک بآں] نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو اپنا ہم نوا بنانے میں ناکامی کے بعد دوسرے مسلمانوں کے خلاف عمومی اعلان جنگ کردیا اور اپنے امام خود منتخب کرنا شروع کر دیے۔ غیر خارجی مسلمانوں سے روا رکھے جانے والے سلوک اور دیگر معاملات پر خوارج بہت جلد کئی فرقوں میں منقسم ہوگئے۔

روایتی اعتقادات وافکار کا مفصل بیان:

(ا) اہل سنت کے افکار امامت کے بارے میں: اہل سنت کے افکار مقصد کے لحاظ سے بنیادی طور پر حضرت عثمانؓ کے حامیوں اور مرجئہ کے افکار جیسے تھے، یعنی مخالف تحریکوں کے دعاوی سے پیدا ہونے والی تہدیدات کے مقابلے میں تاریخی خلافت کے ماتحت مسلم معاشرہ کے اتحاد اور داخلی امن وامان کی محافظت کے آئینہ دار تھے۔ یہ افکار تاریخی خلافت کی غیر مشروط تائید وحمایت پر دلالت نہیں کرتے۔ سنی افکار عام طور پر خلافت راشدہ [خلافت علی منہاج النبوۃ] اور مابعد کے دور کی امامت میں واضح طور پر امتیاز روا رکھتے ہیں، جوکہ دنیوی بادشاہت کے مزاج کی حامل تھی اور جس میں مسلمہ طور پر غیر عادل اور جارح حکمرانوں کے ادوار حکومت شامل تھے۔ صرف خلفاے راشدین حقیقی امامت کی شرائط پر مکمل طور پر پورے اترتے ہیں۔ ان کی پالیسیاں اور احکامات سنت نبوی کے منشا کے عین مطابق تھے، چنانچہ مخالف فرقوں سے مباحثات میں اُن پر تنقید کے جواب میں ان کی حکومت کے جواز اور ان کی کاروائیوں کے مبنی برعدل ہونے کی باقاعدہ مدافعت کی جاتی تھی۔

یہ امتیاز صاف طور پر اہل سنت علما اور محدثین کے افکار میں پایا جاتا ہے، جیسے کہ یہ بات تشریعی حدیث میں

موجود ہے اور اس کی وضاحت حنبلی علما اور امام الاشعریؒ نے کی ہے۔ اوّلین عباسی عہد میں مدینہ منورہ، بصرہ، بغداد اور شام کے محدثین عموماً عثمانیہ [حامیان حضرت عثمانؓ] کے افکار کو اپنائے ہوے تھے اور خلافت راشدہ کو پہلے تین خلفا تک محدود خیال کرتے تھے اور حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ [اہل سنت حضرت علیؓ کی خلافت کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور ان کی فضیلت اور بزرگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ محدثین کرام سے بڑھ کر منشاے حدیث سمجھنے والا اور کون ہوسکتا ہے، اس لیے مقالہ نگار کا یہ خیال حقیقت پر مبنی نہیں، نیز یہ کہ کسی ایک فرد کے انکار کو ایک طبقہ کا انکار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پھر مقالہ نگار نے اپنا مآخذ بھی نہیں بتایا]۔ تاہم کوفہ کے محدثین کرامؒ کی طرف سے حضرت علیؓ کو بھی خلفاے راشدین میں شامل کرنے پر مبنی رائے سرعت سے پھیل گئی۔ اس کی تائید آخر میں امام احمدؒ بن حنبل نے کی، جو بنیادی طور پر عثمانیہ کے افکار کے حامی تھے۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی تک چاروں خلفا کی خلافت راشدہ متفقہ سنی عقیدہ بن گئی۔ حنبلی اور اشعری مسلک ترتیب خلافت کے لحاظ سے چاروں خلفاے راشدین کے مقام و مرتبہ پر شدت سے مصر تھے۔ یہ بات حنبلی مسلک کے افکار سے واضح ہوتی ہے اور الاشعریؒ نمایاں طور پر اس کا اثبات کرتے ہیں کہ مسلم معاشرے میں افضل فرد ہی خلیفہ راشد ہوسکتا ہے۔ مفضول کی امامت الاشعری کے نظریے کے مطابق دنیوی بادشاہت ہے، اگرچہ محدثین کے نقطۂ نظر سے خلفاے راشدینؓ کے بعد انفرادی طور پر چند ایک خلفا خلافت کی مثالی شرائط پر پورا اُترنے کے قریب تر تھے، جیسا کہ اموی خلیفۂ راشد حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ کے بارے میں اکثر اظہار کیا جاتا ہے، تاہم اس امر کی کوئی توقع نہ تھی کہ خلافت رسولؐ کی بحالی تیس سال کے بعد عمل میں لائی جاسکے، جسے اس مدت کے بعد، ایک مشہور حدیث کی رو سے اختتام پذیر ہونا تھا۔ مابعد دور میں امامت مسلم معاشرہ کے تسلیم کرنے کے عمل کے بغیر مؤثر نافذ ہوسکتی تھی، امام احمدؒ بن حنبل نے غلبہ سے حاصل کردہ امامت کے جواز کو خصوصی طور پر تسلیم کیا ہے۔ جب امام نہ ہو اور مسلمان آپس میں خانہ جنگی میں اُلجھے ہوے نہ ہوں، مسلمہ امام، خواہ وہ منصف ہو یا ظالم، متقی ہو یا فاسق، کی غیر مشروط اطاعت اور سرگرم تائید اُن کے لیے لازمی ہے، سواے شریعت کی خلاف ورزی کے۔ ارتداد سے یا نماز باجماعت پڑھانے کے فرض کو نظر انداز کرنے سے امامت کو کالعدم قرار دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث سے ثابت ہے.

حنفی اور اوّلین ماتریدی افکار محدثین کے نقطہ ہاے نظر کے قریب تھے۔ امام ابوحنیفہؒ، حضرت عثمانؓ اور علیؓ کو ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد کا درجہ دے کر ان دونوں کے درمیان کوئی ترجیح قائم نہیں کرتے تھے، یہ نقطۂ نظر کچھ احناف کے ہاں درست تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن اکثریت ترتیب جانشینی کے مطابق ان کے خلافتی مراتب کو تسلیم کرتی تھی۔ ایک قدیم مآخذ کے مطابق امام ابوحنیفہؒ نے امامت کے لیے افضل فرد کی شرط عائد کی ہے۔ یہ قول حدیث سے ثابت خلافت راشدہ بمدت تیس سال کے مطابق ہے۔ حنبلی مسلک کے برعکس حنفی مذہب میں خلفاے راشدینؓ کے بعد ہرگز خلافت کا ذکر نہیں کیا جاسکتا، حکمران کی اطاعت کا فریضہ مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہونے کی ممانعت سے اخذ کیا گیا ہے.

(۲) شافعیّت: اس سے وابستہ کلابیہ کلامی مکتب فکر نے ایک نظریہ اپنایا اور الباقلانی (م۴۰۳ھ/۱۰۱۳ء) کی اشعریت کو بھی بہت زیادہ متأثر کیا۔ شوافع کا نظریہ حقیقی

خلافت کو معاشرے کے افضل افراد تک محدود نہیں کرتا، یہ مفضول کی امامت کو بھی تسلیم کرتا ہے، خصوصاً اگر اس کے انتخاب کی بنا پر خلفشار کا خاتمہ ہوتا ہو۔ امام شافعیؒ اور اُن کے کچھ اہم متبعین فضلا نے مبینہ طور پر حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر درجہ میں فائق رکھا ہے (اگرچہ ابوبکرؓ وعمرؓ سے مؤخر)، اس طرح حضرت عثمانؓ کی امامت "مفضول" تھی۔ یہ نسبتاً لچکدار رویہ شوافع کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ خلفاے راشدین کے بعد کی اس خلافت کو بنیادی طور پر جائز تصور کریں کہ جس کا جائزہ ابتدا کی مثالی خلافت سے اخذ کردہ معیارات کی روشنی میں لیا جاسکے۔ معتزلی فکر سے متاثر ایک جامع قانونی نظام، امام کے خصائص، تقرر اور فرائض کے ضمن میں مرتب کیا گیا، یہ کام امام الماوردیؒ (۴۵۰ھ/ ۱۰۵۸ء) تک اپنے نقطۂ عروج کو جاپہنچا، جن کی کتاب الاحکام السلطانیہ امامت کے بارے میں سنی نقطۂ نظر کے ایک مستند بیان کی حیثیت سے مقبول عام ہوئی۔ یہ کتاب [آل] بویہ کے عہد اقتدار کے اواخر میں خلافت عباسیہ کے دوبارہ غلبہ کے وقت اس مقصد سے تحریر کی گئی کہ شریعت میں معاصر خلافت کی بنیاد کو مستحکم کیا جائے۔ پہلی بار اس کتاب میں، وزارت اور امارت سے بھی بحث کی گئی، جنہوں نے خلافت کی قوت حاکمہ کو بہت حد تک غصب کر رکھا تھا اور اس امر کو ان مناصب پر خلیفہ کے مکمل اقتدار کی برقراری سے مشروط کرتے ہوئے جائز قرار دیا۔ الماوردی کی تقلید میں حنبلی مفکر ابویعلی الفراء (م۴۵۸ھ) نے فوری طور پر ایک کتاب تحریر کی، جس میں الماوردی کی تحریر کردہ تفصیلات کی تائید کی گئی اور صرف چند نکات میں حنبلی روایت کے مطابق ترمیم کی گئی۔ الماوردی کے برعکس الفراء نے غلبہ کے ذریعے حاصل کردہ خلافت کا اثبات کیا اور فسق وفجور، ظلم اور بدعت کی بنا پر اس کے کالعدم قرار دیئے جانے کی تردید کی۔ الماتریدی احناف میں سے ابوالیسر البزدوی (م۴۹۳ھ/ ۱۰۹۹ء) نے بہت سے شافعی افکار سے بحث کی اور حنفی نقطۂ نظر سے اُن میں ترامیم کیں۔ اس زمانے میں خلافت راشدہ کے مابعد کی خلافت کے لیے اہل سنت کی توقیر کا مظاہرہ حنبلی مفکر ابویعلی الفراء اور اشعری مفکر ابوبکر الفورکی (م۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء-۱۰۸۶ء) کی جانب سے امیر معاویہؓ کی خلافت کو چاروں راشد صحابہؓ کی خلافت میں شامل کرنے سے ہوتا ہے۔ امامت کے بارے میں پوری طرح سے مرتب ومنظم سنی افکار کے اہم نکات درج ذیل ہیں: امام کا تقرر قانون الٰہی کے تحت امام کے فرائض پر مبنی عام نظریہ کے مطابق نہ کہ عقلی وجوہ کی بنا پر، معاشرہ پر مستقلاً واجب ہے۔ ایک وقت میں صرف ایک ہی امام ہوسکتا ہے۔ اپنے درمیان سمندر واقع ہونے کی بنا پر مشترکہ فوجی قوت کے قیام سے قاصر دو ملک اپنے اپنے امام منتخب کرسکتے ہیں، جو ایک استثنائی امر ہے۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے بیک وقت امام ہونے کے بارے میں کرامیہ کا نظریہ خصوصی طور پر مسترد کر دیا گیا۔

امامت کے لیے اہلیت کی شرائط: قریشی ہونا، فیصلہ جات کے صدور کے لیے قانون شریعت کا علم، عدالت، قانون شہادت کے تقاضے کے مطابق ثقاہت، جسمانی اہلیت اور خلافت کے عہدہ کے سیاسی و فوجی احکامات کی تنفید کی صلاحیت۔ امام کا تقرر اس کے پیش رو کے عہد یا وصیت کے ذریعے یا انتخاب کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ ان کا تقرر انتخاب کے ذریعے عمل میں آیا، جبکہ اس کے برخلاف یہ نظریہ بھی ملتا ہے کہ ان کا تقرر [یا تقرر کا اشارہ] جناب رسالت مآبؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ اس [دوسرے] نظریئے کو مشہور سنی علما

مثلا امام الحسن البصریؒ، ابن حزمؒ اور ابن تیمیہؒ نے اختیار کیا ہے۔ امامت کی نوعیت کا علم اور اس کے لیے ایک موزوں امیدوار کے انتخاب کے لیے بصیرت رکھنے والا کوئی بھی ''عادل'' مسلمان رائے دہندہ کی شرائط پر پورا اترتا ہے۔ معاشرہ کے لیے قابل تنفیذ انتخاب [خلیفہ] کے لیے اہل الحل والعقد کی تعداد عام اشعری نظریہ کے مطابق فرد واحد تک محدود کی جاسکتی ہے، جبکہ ابویعلی حنبلیؒ کے نزدیک جمہور اس میں شامل ہیں۔ انتخاب دو امیدواروں کے مابین حسب منشا چناؤ نہیں ہوتا، بلکہ ''افضل'' فرد کو منتخب کرنا ہوتا ہے۔ اگرچہ شرائط پر پورا اترنے کی بنا پر مفضول کا چناؤ بھی صرف خاص اسباب کی خاطر قابل تنفیذ قرار دیا جانا قابل رخصت تصور کیا گیا ہے۔ امامت دماغی یا جسمانی اہلیت کے ضیاع یا آزادی کے خاتمے کی وجہ سے کالعدم ہوجاتی ہے۔ بہت سے شافعی علما کے نزدیک بدکرداری، ظلم یا بدعت کی بنا پر وصف عدالت کے خاتمہ سے امامت کالعدم ہوجاتی ہے، لیکن دیگر علما اور حنبلی و حنفی مسلک کے نزدیک کالعدم قرار نہیں پاتی۔ امام کے فرائض میں کفر کے خلاف دین کی حفاظت، نزاع میں ملوث فریقوں میں قانون وانصاف کا نفاذ، حدود کا اجرا، اسلامی قلم رو میں امن وامان کی حفاظت، بیرونی دشمنوں کے حملوں سے اس کا دفاع، اسلام کی برتری میں خلل انداز ہونے والے کافروں کے خلاف جہاد، زکوٰۃ، محاصل اور مال غنیمت میں سے خمس کی وصولی، قانون وضابطے کے مطابق حاصل شدہ مال ودولت کی تقسیم اور اختیارات کی منتقلی کے سلسلے میں قابل اعتماد اور مخلص اشخاص کی تقرری شامل ہیں.

(۳) معتزلی مکتب فکر: اعتزال کی تحریک اموی عہد کے اواخر میں سیاسی اور مذہبی گروہوں کے مابین تنازعات کے ایک مصالحانہ حل پر مسلمان معاشرہ کو ازسرنو یکجا کرنے کے مقصد سے شروع کی گئی۔ معتزلہ امامت کے بارے میں خوارج کے نظریہ سے اتفاق کرتے ہوئے امام عادل کی ضرورت پر زور دیتے تھے اور یہ کہ اگر ضروری ہو تو طاقت کے استعمال سے غیر عادل امام کو الگ کرنا معاشرے کا فرض ہے۔ معتزلی عقائد کی رو سے درست عقیدہ اور نجی زندگی اور حکومتی امور میں قانون الٰہی کی پابندی امام عادل کا خاصہ ہیں۔ تاہم حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور ان کے دوسرے حمایت کنندگان کی خوارج کی طرف سے مذمت کے معتزلی مخالف تھے۔ ابتدائی دور کے معتزلہ حضرت عثمانؓ اور ان کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے مابین کشمکش اور جنگ جمل میں حضرت علیؓ اور ان کے مخالفوں کے مابین چپقلش کے بارے میں قدرے مختلف فیہ خیالات رکھتے تھے، جبکہ عموماً اس بات پر اتفاق رائے پایا جاتا تھا کہ ان کشمکشوں میں ایک فریق غلطی پر تھا اور غلطی پر ہونے والے فریق کی نشان دہی کے فیصلہ کے بارے میں عموماً سکوت اختیار کرلیا جاتا تھا، حتی کہ اگر ان میں سے ایک فریق کا غلطی پر ہونا واضح بھی ہوجاتا تو اُسے خاطی کہنے میں تذبذب سے کام لیا جاتا تھا۔ مابعد کے معتزلی عقیدے میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو غلطی سے بری قرار دے دیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کرنے والوں کی مذمت کی گئی۔ اس عقیدے کی رو سے حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے اپنی اپنی وفات سے قبل امام راشد کے خلاف بغاوت پر اظہار ندامت کیا تھا اور ان کے غیر نادم پیروکار قابل مذمت ہیں۔ امیر معاویہؓ تقریباً ان کے نزدیک بالاتفاق قابل مذمت ہیں۔ اگرچہ اموی خلافت کو عموماً یہ لوگ بنظر کراہت دیکھتے تھے، تاہم اسے اصولی طور پر مسترد نہیں کیا جاتا تھا۔ اموی خلفا حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز اور یزید بن الولید کو عموماً عادل ائمہ تصور کیا

جاتا تھا۔ ابتدائی خلافت عباسیہ کے بارے میں طرز فکر یکساں نہ تھا۔ کچھ معتزلی ان کے حق میں تھے جبکہ کچھ دیگر علویوں کی بغاوتوں کے حق میں تھے۔ مابعد کے دور کے معتزلیوں کے افکار علویوں کی حمایت میں ہوگئے۔ حضرت علیؓ کے فرزند حسنؓ کی امامت کے بارے میں معتزلیوں کے عقیدۂ عام کو ابوعلی الجبائی (م۳۰۳ھ/ ۹۲۵۔۹۲۶ھ) نے مروّج کیا۔ قاضی عبدالجبار (م۴۱۵ھ/ ۱۰۲۵ء) نے اپنی کتاب المغنی میں علویوں یعنی حسنؓ، حسینؓ، زید بن علی، محمد بن عبداللہ (نفس زکیہ) اور ان کے بھائی ابراہیم کی خلافت کے حق میں دلائل دیئے ہیں۔ اوّلین بصری معتزلہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت کے قائل تھے اور عموماً یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ امامت حقیقی معاشرے میں صرف افضل فرد کا استحقاق ہے۔ بغدادی معتزلہ، جو بصری معتزلہ سے تقریباً نصف صدی بعد وجود پذیر ہوے، حضرت علیؓ کو ابوبکرؓ سے افضل تصور کرتے تھے اور اس طرح سے مفضول کی امامت کے جواز کا اثبات کرتے تھے۔ بصری معتزلی ابوعلی الجبائی اور اس کا بیٹا ہاشم، جوکہ مابعد کے دور کے معتزلہ کے لیے سند کا درجہ رکھتے ہیں، حضرت ابوبکرؓ یا حضرت علیؓ کی فضیلت کے سوال پر خاموش رہے اور ان دونوں نے کسی خاص سبب سے مفضول کی امامت کو جائز قرار دیا۔ دونوں نے قرار دیا کہ کسی خاص سبب سے مفضول کی امامت جائز ہے۔ ابوعبداللہ البصری (م۳۶۷ھ/۹۷۷ء) اور عبدالجبار اپنے مابعد کے عقیدے کی رو سے حضرت علیؓ کی افضلیت کے حامی تھے۔ اولین معتزلی خوارج سے اتفاق کرتے ہوے امامت کو عموماً قریشی افراد تک محدود نہ سمجھتے تھے۔ جبکہ ضرار بن عمرو جیسے منفرد الرائے معتزلی یہ رائے رکھتے تھے کہ دو برابر کے امیدواروں میں سے غیر قریشی کو قریشی پر ترجیح دی جائے، جبکہ عمومی معتزلی رائے میں قریشی قابل ترجیح تھا۔ مابعد کے معتزلہ کی رائے میں اگر شرائط کو پورا کرنے والا قریشی نہ مل سکتا ہو تو غیر قریشی کو امام نہیں بنایا جاسکتا۔ امام کا تقرر ونصب معاشرے پر واجب تھا، البتہ زہد کی طرف مائل اولیں معتزلیوں کے ایک گروہ کا خیال تھا کہ معاشرہ کو صرف جہاد کے لیے امام اور دیگر ضروری کاموں کے لیے حکام کا چناؤ عارضی بنیادوں پر کرنا چاہیے تاکہ ان کی دنیوی اقتدار کی خواہشات کا قلع قمع ہو۔ اکثریت اس نظریئے کو مسترد کرتی تھی کہ امام کا تقرر [وغیرہ] عقلی وجوہ کی بنا پر واجب ہے، جبکہ الجاحظ، ابوالقاسم البلخی اور ابوالحسین البصری اس کے قائل تھے۔ عمومی نظریہ اس اصرار پر مبنی تھا کہ بیک وقت ایک ہی امام ہوسکتا ہے؛ صرف ابوبکر الاصم کی یہ رائے تھی کہ اسلام کی اشاعت عام کی وجہ سے ہر قصبہ کا اپنے لیے الگ الگ امام منتخب کرنا قابل ترجیح ہے، دیگر تمام معاملات میں معتزلہ پورے طور پر سنی افکار ونظریات سے متفق تھے۔

(۴) شیعّیت: زیدیہ حضرت زید بن علیؓ کی بغاوت ۱۲۲ھ/۷۴۰ء کے حامی، زیدیہ فرقۂ امامیہ کے برعکس امامت میں موروثی حسب ونسب کے قائل نہ تھے، بلکہ وہ غاصب حکمرانوں کے خلاف خروج کرکے اس کا دعوی کرنے والے اہل بیت کے کسی بھی فرد کی حمایت کرنے کے حق میں تھے۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں بعض زیدیہ علیؓ بن ابی طالب کے جملہ اخلاف کو امامت کا اہل تصور کرتے تھے، جبکہ ان کی اکثریت یہ حق صرف (حضرت) حسنؓ اور حسینؓ کی اولاد تک محدود سمجھتی تھی۔ دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی کے دوران میں زیدیہ نظریاتی اعتبار سے دو بڑے گروہوں بطریہ اور جارودیہ میں منقسم ہوگئے۔ بطریہ کوفی شیعوں کے اعتدال پسند فرقہ کے اتباع میں حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کی

امامت کو اور حضرت عثمانؓ کی پہلے چھ سال کی امامت کو، جس کے دوران میں حضرت علیؓ ان کے اطاعت گزار رہے، برحق تصور کرتے تھے۔ وہ مابعد کے چھ سالوں کی امامت کی بنا پر (حضرت) عثمانؓ کی مذمت حضرت علیؓ کے دیگر مخالفین کی طرح کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کو افضل تصور کرتے ہوے وہ مفضول کی امامت کو جائز سمجھتے تھے۔ جارودیہ، امامیہ کے نسبتاً زیادہ انقلابی نظریات کو اپناتے ہوے، پہلے تین خلفا کو مسترد کرتے تھے اور یہ نظریہ رکھتے تھے کہ حضرت علیؓ کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت سے اپنا وصی مقرر فرما دیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا اتباع کرنے سے صحابہ کرامؓ کی غالب اکثریت راہ راست سے بھٹک گئی تھی۔ وہ بطریہ کے برعکس ان ہر دو حضرات کی چھوڑی ہوئی قانونی روایت کو مسترد کرتے تھے اور دینی علم کے لیے مسلمہ طور پر منصب امامت پر فائز اشخاص کی بجائے بحیثیت مجموعی حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے اخلاف کی طرف رجوع کے قائل تھے، تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے بعد زیدیہ میں جارودیہ [فرقہ] کے رجحانات کو غلبہ حاصل ہوا۔

چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے دوران میں معتزلی اور امامی افکار کے نمائندوں سے بحث و تمحیص کے بعد تکمل طور پر ارتقا یافتہ نظریات کے اہم نکات حسب ذیل ہیں: امام کا تقرر و نصب، شریعت کی رو سے اس کے فرائض کے بارے میں عام نظریہ کے مطابق نہ کہ عقلی وجوہ کی بنا پر معاشرے پر واجب ہے، پہلے تین ائمہ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ بذریعہ نص رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ تھے۔ یہ نامزدگی خفی تھی تاکہ اس کا مطلوبہ مفہوم صرف تحقیق و جستجو سے دریافت کیا جا سکے، اس نظریہ کے تحت زیدیہ، امامیہ کے برعکس، رسالت مآبؐ کی حکم عدولی پر اس دور میں موجود حضرات کے گناہ میں تخفیف کی طرف مائل تھے، حضرت حسینؓ کے بعد امامت غاصب حکمرانوں کے خلاف خروج کرنے والے اور اپنی بیعت کرنے کے لیے لوگوں کو دعوت دینے والے ایسے شخص کا حق ہے، جو حضرت حسنؓ یا حضرت حسینؓ کی اولاد میں سے ہو اور شرائط امامت پر پورا اترتا ہو۔ امامت شرعاً اپنی بیعت کی دعوت دینے سے اور خروج سے جائز متصور ہوتی ہے، نہ کہ اختیار و عقد کے ذریعے؛ امام کے لیے ضروری خصائص حسب و نسب، بمطابق معتزلی و سنی رائے کے علاوہ دینی امور کا علم، اجتہاد، تقویٰ، اصابت کردار اور جرات ہیں۔ امامت کسی شرط کے فقدان، خصوصاً اخلاقی جرائم کی بنا پر کالعدم ہوجاتی ہے۔ صرف افضل فرد ہی جائز امام ہوتا ہے اور اگر امام سے افضل تر اس کے خلاف خروج کرتا ہے اور امامت کا دعویٰ کرتا ہے تو مفضول امام کو لازماً اس کے حق میں دستبردار ہوجانا چاہئے۔ امام کی اس خصوصیت کو ما بعد کے دور کے کچھ زیدی مجتہدین نے تسلیم نہیں کیا۔ اکثریتی رائے کی رو سے ایک وقت میں صرف ایک امام ہونا ضروری ہے۔ بحیرۂ کیسپین کے جنوب کے ساحلی علاقوں اور یمن میں دو علیحدہ علیحدہ زیدی برادریوں کی بنا پر بعد میں، دو معاصر اماموں کے تقرر کی کچھ مثالیں بھی ملتی ہیں، لیکن دو معاصر اماموں کے جواز کی رسمی منظوری ایک استثنائی امر ہے۔ ہر دور میں امامت کی شرائط پر پورا اترنے والا فرد لازماً موجود ہوتا ہے، جب امام اپنی طرف سے اپنی بیعت کے لیے اعلان کر دے اس کی معرفت سب مسلمانوں کے لیے لازم ہوجاتی ہے.

زیدیہ کے مسلمہ ائمہ کی فہرست حتمی نہیں اگرچہ اکثر ائمہ کے بارے میں اجماع پایا جاتا ہے، امامت کے لیے ضروری شرائط خصوصاً دینی علم سے بہت سے علوی

مدعیان امامت اور حکمرانوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا۔ ان لوگوں کو محتسبین یا مقتصدہ یا دعاۃ کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے، بمقابلہ مکمل ائمہ (یا سابقون) کے۔ احتسابی امامت کے بارے میں یہ رسمی نظریات صرف دور ما بعد کے یمنی زیدیہ نے پیش کیے۔ محتسبیہ امامت کے یہ فرائض بیان کیے جاتے ہیں: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، بیرونی حملے سے معاشرے کا دفاع اور کمزوروں کے حقوق کی نگہداشت۔ وہ امامت صلوٰۃ، صدقات ومحاصل کی وصولی، غیر مدافعانہ جنگ کرنے اور حدود کے اجراء کا مجاز نہیں ہوتا۔

(۵) امامیہ: (اثنا عشریہ) امامت کے بارے میں بنیادی نظریات امام جعفر صادقؒ (م۱۴۸ھ/۷۶۵ء) کے دور میں مرتب صورت میں سامنے آئے۔ ان نظریات کی رو سے امام ایک ہدایت یافتہ، متقی رہنما اور دین کے ایک مستند معلم کی حیثیت سے بنی نوع انسان کی ایک مستقل ضرورت ہے۔ اس طرح امامت کا درجہ رسالت کے درجے سے ملا دیا گیا۔ رسول اور امام میں فرق صرف یہ ہے کہ امام پر کلام الٰہی نازل نہیں ہوتا۔ مسلمہ امام سے بے خبری یا اس کی نافرمانی رسول سے بے خبری اور اس کی نافرمانی ہے۔ امام کا معصوم عن الخطا ہونا امامت کا بنیادی عقیدہ ہے؛ امام اپنی یا اپنے پیروکاروں کی سلامتی کے لیے تقیہ اختیار کر سکتا ہے۔ اس کی امامت عملی حکومت یا اسے حاصل کرنے کی سعی پر منحصر نہیں ہے، اگرچہ وہ دینی قیادت کے ساتھ ساتھ سیاسی سیادت کا مجاز بھی ہے۔ اولین انقلابی شیعہ گروہ کا اتباع کرتے ہوئے امامیہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی مذمت کرتے ہیں اور مصر ہیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً حضرت علیؓ کو اپنا وصی مقرر فرمایا تھا۔ صحابہ کرامؓ کی غالب اکثریت اس تقرر کو نظر انداز کر کے راہ راست سے دور ہوگئی تھی۔ حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے بعد امامت مؤخر الذکر کی اولاد میں وراثت کے طور پر چلتی ہوئی بارھویں امام مہدی کو ملی ہے۔ ۲۰۳ھ/۸۱۸ء میں محمد الجوادؒ کے سات سالہ بیٹے کی جانشینی پر یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا صغر سنی سے امامت معطل یا محدود ہوسکتی ہے اور یہ کہ امام مکمل علم کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ اکثریت نے وثوق کے ساتھ اس رائے کا اظہار کیا کہ ایک نابالغ امامت کے تمام فرائض سرانجام دے سکتا ہے اور یہ کہ اللہ تعالٰی کی طرف سے اسے دینی معاملات کے بارے میں ضروری اور بنیادی علم عطا کیا جا سکتا ہے۔ گیارہویں امام کے بظاہر لا ولد فوت ہوجانے پر بحران پیدا ہوگیا۔ جس کا حل اس کے ایک بیٹے کے وجود اور عقیدہ غیابہ [رک باں] کو تسلیم کر کے تلاش کر لیا گیا۔ بارھواں امام غائب ہونے کے باوجود زمین پر موجود ہو کر امامت کے ضروری فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ اسے مہدی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے [اور قبل از قیامت] دنیا میں اس کی رجعت متوقع ہے.

امامیہ امام کے بارے میں اپنے اعتقادات ایک حدیث سے اخذ کرتے ہیں: دنیا حجۃ اللہ (یعنی امام) کے بغیر ایک لحہ بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک وقت میں صرف ایک ہی امام ہوسکتا ہے اگرچہ اس کے جانشین (صامت امام) اس کے ساتھ موجود رہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ائمہ کا ذکر ''نور اللہ''، انسانوں میں''شہداء اللہ''، ''علامات اللہ'' اور ''راسخون فی العلم'' وغیرہ جیسے الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ وہ زمین پر اللہ تعالٰی کے خلفا، اس کے تقرب کا وسیلہ اور پیغمبر کے علم کے وارث ہوتے ہیں۔ ائمہ کے پاس جملہ منزل شدہ کتب موجود ہوتی ہیں، وہ قرآن کے ظاہری اور باطنی معنوں کا مکمل علم رکھتے ہیں۔ انہیں اللہ تعالٰی کا اسم اعظم عطا ہوتا ہے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے جنگی ہتھیار اور

کتب، صحیفہ، جفر، جامعہ اور خفیہ علم پر مصحف فاطمہ وراثت میں ملتے ہیں؛ ہر امام کا علم پیغمبر کے علم کے مشابہہ ہوتا ہے۔ اگرچہ ائمہ کو غائب چیزوں کے جاننے کا فطری ملکہ ودیعت نہیں ہوتا، پھر بھی وہ "ما کان وما یکون" (جو کچھ تھا اور جو کچھ ہونے والا ہے) کا علم رکھتے ہیں۔ وہ تمام فنون اور زبانوں کا مکمل علم رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے حسب خواہش انہیں ہر چیز کا علم عطا فرماتا ہے۔ ائمہ اپنے پیشرو کے مکمل علوم کا اس کے آخری لمحہ حیات یا بعد کی زندگی میں اکتساب کر لیتے ہیں۔ ہر سال لیلۃ القدر میں اگلے سال کے ہر واقعے سے متعلق قضاے الٰہی کا علم حاصل کرتے ہیں۔ امام فرشتوں کا مخالف و مفہّم ہوتا ہے، لیکن رسول کے برعکس اسے وہ دکھائی نہیں دیتے۔ روح القدس اس کی مؤید ہوتی ہے۔

امامیہ مذہب کے علماے دینیات امامت کے کلامی مباحث میں درج ذیل مواقف کا دفاع کرتے ہیں: امامت عقلی وجوہ کی بنا پر واجب ہے۔ امام کا تقرر ونصب اللہ تعالیٰ پر اس کے لطف کی بنا پر لازم ہے، نہ کہ بنی نوع انسان پر۔ امام کی نامزدگی لازماً رسول یا امام کی طرف سے کی جانی چاہیے، امام کو لازمی طور پر معصوم عن الخطا ہونا چاہیے۔ اسے اپنے وقت میں تمام افراد سے افضل ہونا چاہیے۔ امام معجزات دکھانے کی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے، وہ اپنے پیروکاروں میں سے گنہگاروں کی اللہ تعالیٰ سے شفاعت کر سکتا ہے۔

(۲) اسماعیلیہ: اسماعیلی مکتب فکر کی ابتدا امام جعفر صادقؒ کی وفات کے بعد ہوئی، جس میں بنی نوع انسان کے لیے ایک سیاسی ومذہبی رہنما کی حیثیت سے ایک معصوم عن الخطا امام کی مستقل ضرورت کے سلسلے میں بنیادی امامیہ عقائد کو برقرار رکھا گیا ہے۔ امامیہ سے ورثہ میں ملنے والے ان عقائد میں اسماعیلیہ نے تاریخ کے مخصوص ادوار [رکّ بہ اسماعیلیہ] کا اضافہ کر دیا ہے۔ ہر عہد نبوت میں نبی (یعنی امام ناطق) کے بعد سات ائمہ اور اس کا وصی یا اساس آتے ہیں۔ اس سات کے گروہ میں ساتواں امام آئندہ دور کے لیے ناطق ہوتا ہے۔ چھٹے دور میں نبی ناطق جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور حضرت علیؓ اساس اور ساتویں امام محمدؒ بن اسماعیل بن جعفر تھے۔ فاطمی عہد حکومت سے ما قبل کے اسماعیلیہ ساتویں ناطق امام کی حیثیت سے روپوشی کے بعد محمد بن اسماعیل کی رجعت کے منتظر تھے، جنہیں جرم وسزا کے ساتویں دور کا آغاز کرنے والا "قائم" یا مہدی تسلیم کیا جاتا تھا۔ فاطمیوں نے اس میں تبدیلی کر کے خود کو چھٹے دور کے ائمہ کی حیثیت سے متعارف کرایا اور جرم وسزا کے متوقع دور کو مستقبل میں مزید آگے کر دیا۔ محمد بن اسماعیل کی غیابت اور فاطمیوں کے آغاز کے مابین [دور] میں امامت کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی خاطر اس مدت کو روپوشی قرار دے دیا گیا اور ساتویں امام کے دور جرم وسزا اور فاطمی خلفا کی جانشینی میں پائی جانے والی بے قاعدگیوں نے اس امر پر مجبور کیا کہ عقیدے میں مستقل طور ترمیم و تنسیخ کی جاتی رہے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ امامت میں نسبی وراثت پر سختی سے عمل سے انحراف کی وضاحت "مستودع" امامت کی ترکیب کی مدد سے کی گئی، جس نے "مستقل" (یا مستقر) ائمہ کے سلسلہ کی طرف رجعت کرنا ہوتی تھی۔ اس طرح سے حضرت حسنؓ کو بعض اوقات مستودع امام تصور کیا جاتا تھا کیونکہ امامت حسینؓ، مستقر امام کے اخلاف میں جاری رہی۔ تاہم یہ نظریہ مستقبل کے ایک نمونے کی بجائے ماضی میں جانشینی کی بے قاعدگیوں کے جواز کی وضاحت کا کام دیتاہے۔

اسماعیلیوں کے باطنی عقیدے کی رو سے امام دینی سیادت میں ناطق واساس سے نیچے اور حجۃ سے اوپر ایک حد یا درجہ کی نمائندگی کا کام کرتا ہے۔ امام اپنے دور میں ناطق کا منصب سنبھال کر وحی الٰہی کے ظاہری معنوں کی تشریح کرکے انہیں محفوظ کرتا ہے اور تاویل پیش کرتا ہے۔ اپنے دور کی دینی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے امام مومن اور روحانی دنیا کے اصولوں کے مابین واسطہ رمصالحت کنندہ بھی ہوتا ہے۔

(۷) خوارج: خارجی نظریہ انقلابی طور پر امام کے عدل پر قائم رہنے سے مربوط رمشروط ہے؛ قانون الٰہی سے ذرہ بھر انحراف امام کو اس کی امامت سے محروم کر دیتا ہے اور اگر ضروری ہو تو طاقت کے ذریعے اسے معزول کر دیا جاتا ہے۔ غیر عادل امام اور اس کے حامی، جب تک توبہ نہ کر لیں بے دین تصور کیے جاتے ہیں اس طرح حضرت عثمانؓ اور علیؓ راہ راست سے دور ہوگئے تھے، اگرچہ ابتداءً ان کی امامت صحیح اور جائز تھی۔ ان سے اظہار برأت نہ کرنے والا مسلمان خود گمراہ ہے۔ اسی طرح سے عادل ائمہ مثلاً حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے اظہار یک جہتی نہ کرنے والا مسلمان بھی بے دین ہے۔

عام خارجی عقیدے کے مطابق امام کی تنصیب واجب ہے۔ صرف [فرقہ] نجدہ کے لوگ مبینہ طور پر یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اگر مسلمان آپس میں انصاف سے معاملات نمٹائیں تو ان پر امام کی تنصیب واجب نہیں۔ امام انتخاب کے ذریعے مقرر کیا جانا چاہیے۔ اس کی امامت دو عادل مسلمانوں کی بیعت سے شرعاً ہوجاتی ہے۔ معاشرے کا صرف افضل فرد ہی امام بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ بعض خوارج اپنے امام پر یہ شرط عائد کر دیتے ہیں کہ اس سے افضل امیدوار دستیاب ہوجانے کی صورت میں اسے لازمی طور پر اپنے منصب سے دستبردار ہونا ہوگا تاہم دیگر خوارج کے نزدیک یہ شرط عائد کرنا غیر شرعی امر تصور کیا جاتا تھا۔ خارجی عقیدے کی روسے قریش کا استحقاق خصوصی برائے امامت متفقہ طور پر مسترد کر دیا گیا تھا اور ان کے عقیدے کی رو سے شرائط پوری کرنے والا کوئی بھی مسلمان، خواہ وہ غلام نسل سے تعلق رکھتا ہو، امامت کا اہل ہے۔ حجاج کے عہد میں شبیب بن یزید کے پیروکار اس ضمن میں استثنائی نقطہ نظر رکھتے تھے۔ یہ لوگ عورت کو امامت کا اہل سمجھتے تھے۔ غالب نقطہ نظر کے مطابق ایک وقت میں ایک امام ہونا چاہئے اگرچہ کچھ غالی فرقے ایک سے زیادہ معاصر ائمہ کے جواز کو تسلیم کرتے تھے۔ امام کے لیے دیگر شرائط اور اس کے فرائض بعینہٖ اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق تھے۔ امام کی اخلاقی اصابت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور غیر خارجی مسلمانوں کے خلاف جہاد کی قیادت جیسے اس کے فرائض پر خاص زور دیا جاتا ہے۔

بہت سے خارجی فرقوں میں سے صرف اباضیہ [رک باں] کی تحریروں کا مطالعہ کیا جا سکا ہے، تاہم منظم طور پر تحقیق نہیں کی جا سکی۔ اباضیہ، عمومی خارجی عقیدے سے اتفاق کرتے ہوے، چار مسالک کی رو سے امامت کی مختلف انواع کو تسلیم کرتے ہیں۔ جن میں سچے اہل ایمان کا معاشرہ اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ مسلک ظہور، جب معاشرہ اتنا قوی ہو کہ دشمن پر غلبہ حاصل کر لے۔ مسلک دفاع، جب یہ صرف قوی دشمن کی مزاحمت کر سکے، مسلک شراء النفس، جب اہل ایمان کا ایک قلیل تعداد گروہ شہادت کی طلب میں دشمن کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا قصد کر لے اور مسلک کتمان، جب اہل ایمان دشمن کے زیر اقتدار زندگی بسر کرنے اور تقیہ اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔ مسلک ظہور کا امام ہی صرف امامت کے تمام فرائض، مثلاً اجرائے

حدود، مسلمانوں سے عشر اور غیر مسلموں سے جزیہ کی وصولی اور مال غنیمت کی تقسیم، سر انجام دے سکتا ہے۔ ایک غالی فرقہ خلیفہ کے برعکس عمومی عقیدہ یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی مسلک کے ایک سے زیادہ امام نہیں ہوسکتے۔

(۸) دور مابعد کا نظریاتی ارتقا: امامت کے بارے میں سنی افکار الماوردی کے دور کی معاصر عباسی خلافت سے استوار رہتے ہوئے اپنی بدلتی ہوئی ہیئت کے خلاف ردعمل ظاہر کرتے رہے۔ قبل ازیں الغزالیؒ (م۵۰۵ھ/ ۱۱۱۱ء) سلجوقی سلطانوں کی طاقت ور حکومت کے زیر اثر خلیفہ کو اسلام کے محض نمائندہ و سربراہ کا درجہ دینے پر آمادہ نظر آتے تھے؛ عملی سیاسی اداروں کی منظوری کے جواز کے لیے شروع کی گئی تحریک، الغزالی کے مشاہدہ کے مطابق، ساری سلطنت کے والیوں اور قاضیوں کی کاروائیوں کے جواز کی حفاظت خلافت بغداد کے سقوط کے بعد ایک بنیادی تشویش بن گئی۔ مشرق میں جو کئی عشروں تک غیر مسلموں کے زیر تسلط رہا، التفتازانی (م۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء) نے اس امر کا اثبات کیا کہ عدالتی کارروائیوں کے جواز کا انحصار ایک اہل قریشی امام کی موجودگی پر منحصر نہیں کیا جا سکتا۔ جب ظلم وجور کے غلبہ کی بنا پر ایسے امام کی تنصیب ناممکن ہوچکی۔ قاہرہ میں ممالیک کی قائم کردہ نمائشی عباسی خلافت کو عملی طور پر اس دور کے سنی فقہا مثلاً ابن تیمیہؒ (م۷۳۲ھ/ ۱۳۳۲ء) نے اپنی تحریروں میں نظر انداز کیے رکھا۔ اختیارات کے عملی استعمال کو امامت کے لیے لازمی تصور کرتے ہوئے انہوں نے اس کے فرائض عملی حکمرانوں کو واضح طور پر ودیعت کر دیئے۔ الغزالیؒ کے برعکس انہوں نے خلیفہ کی طرف سے اس کے جواز کی رسمی منظوری کی شرط عائد نہیں کی۔ خلافت کو تیس سال کی مدت تک محدود کرنے اور اس کے بعد آنے والی دنیوی بادشاہت کے بارے میں حدیث کا اکثر حوالہ دیا گیا اور یہ سنی افکار پر غلبہ اختیار کر گئی۔ روایتی عقائد وافکار میں امام کے لیے مقررہ خصوصیات کو نظر انداز کر دیا گیا یا واضح طور پر نظریۂ ضرورت کے تحت ترک کر دیا گیا کیونکہ اب بادشاہت اوصاف سے قطع نظر طاقت ور کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ اب روایتی نظریہ پر نظرثانی کی گئی بلکہ اسے زیر التوا تسلیم کر لیا گیا۔ الجوینیؒ اور الغزالیؒ کی پیروی کرتے ہوئے بعد کے دور کے سنی مفکرین نے اکثر زور دیا ہے کہ امامت فروعی معاملات سے متعلق ہے نہ اصول دین سے، اگرچہ روایتی طور پر اس کے مباحث علم اصول کی کتب میں شامل تھے نہ کہ شرعی قانون کی تفصیلی کتب میں۔ یہ تصور اصلاً شیعی نقطۂ نظر کی تردید کی خاطر اختیار کیا گیا تھا جس میں امامت کو دین کا جزو لا ینفک قرار دیا جاتا تھا اور اب اسے اس احساس کے اثر کو کم کرنے کے لیے اہل تشیع بروئے کار لاتے تھے کہ درحقیقت امامت کا وجود باقی نہیں رہا۔ بعد کے دور کے سنی عقائد میں اکثر امامت کا ذکر تک نہیں کیا جاتا یا صرف خلافت راشدہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

امامت کے ضمن میں جدت پسند سنیوں کا نظریہ ایک جیسا نہیں ہے۔ امامت کے لیے دین کی متعینہ ضرورت سے بعض اوقات مکمل طور پر صرف نظر کر لیا جاتا ہے جیسا کہ ۱۹۲۲ء میں عثمانی حکومت کے خاتمہ کی تائید میں "ترکش گرینڈ نیشنل اسمبلی" کے توثیق کردہ رسالہ میں اور مصری مفکر علی عبدالرازق نے اپنی کتاب الاسلام واصول الحکم (۱۹۲۵ء) میں کیا ہے۔ دیگر سنی مفکرین نے خلافت راشدہ کی طرز پر ایک عالمی خلافت کی بحالی کی حمایت کی ہے۔ اس بارے میں خصوصی طور پر قابل ذکر شامی مفکر سید رشید رضا [رک بآں] کی مفصل

تجاویز ہیں، جو انہوں نے اپنی کتاب الخلافہ والامامۃ العظمی (۱۹۲۳ء) میں پیش کی ہیں۔ امامت اور اسلامی حکومت کے بارے میں جدید سوچ پر مبنی شوری [رک باں] اور انتخابات وہ امتیازی اوصاف ہیں جو خلافت راشدہ کو ما بعد کی خلافت کے استبداد سے ممتاز کرتے ہیں۔

امامیہ نے اپنے مسلک کی بعد کی تشریحات میں امامت کے روایتی تصور کو برقرار رکھا۔ ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز سے امامی باطنی نظریہ کی تشریح پر بڑا کام کیا گیا، جو ایک حد تک صوفی اور اسماعیلی اثر کے تحت ہوا۔ امامت کی ابدی حقیقت کو اب عام طور پر ولایت (ولی کی خصوصیت، ولی: اللہ کا دوست) کا نام دے دیا گیا ہے اور اس کا تعین رسالت کی باطنی خصوصیت سے کیا گیا ہے، لہذا امام کو اس کی فطرت کے مرئی اظہار اور ائمہ کی طرف سے صادر شدہ فرامین میں بیان کردہ اس کی تعلیم کی بنا پر روحانی حقائق کا محرم تصور کیا گیا ہے۔

اسماعیلیہ فاطمی عہد خلافت میں اہم طور پر دو فرقوں میں منقسم ہوگئے، جن سے مختلف باطنی نقطہ ہائے نظر عملی طور پر وجود میں آئے۔ طیبی اسماعیلیہ نے فاطمی خلیفہ الآمر (م۵۲۴ھ/۱۱۳۰ء) کے شیرخوار فرزند الطیب کو امام تسلیم کر لیا اور اس کی موت سے انکار کیا۔ طیبی عقیدۂ اس امر کا اثبات کرتا ہے کہ امام الطیب اگرچہ مستور ہے تاہم اپنے پیروکاروں سے اس کا رابطہ قائم ہے اور خصوصاً غیابت امام کے امامی نظریئے کو مسترد کر دیا گیا ہے۔ امام مستور جرم وسزا کے دور کا "قائم" نہیں ہے۔ طیبی اسماعیلیہ کے باطنی عقیدے میں خصوصی طور پر امام کی آفاقی فطرت اور کردار سے بحث کی جاتی ہے۔ امام کی روحانی فطرت (لاہوت) اس کی انسانی فطرت (ناسوت) سے ممیز ہوتی ہے اور اسے ہیکل نورانی تصور کیا جاتا ہے۔ نورانی ہیکل سے گزرنے کے بعد، جس میں اس کے پیروکاروں کی ارواح مجتمع ہوتی ہیں، دسویں عقل (Intellect) کے افق (Demiurge) کی طرف چڑھتا ہے اور اپنا مقام پالیتا ہے۔

نزاری اسماعیلیہ نے فاطمی اسماعیلیہ سے الگ ہو کر فاطمی المستنصر (م۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء) کے فرزند نزار کو اپنا امام تسلیم کر لیا۔ ان لوگوں نے حاضر اماموں کے ایک سلسلے کو تسلیم کرنا جاری رکھا ہے۔ عقیدہ قیامت کا اعلان ۵۵۹ھ/۱۱۶۴ء [دیکھیے اسماعیلیہ] میں کیا گیا۔ اس کی تشریح وتوضیح میں باطنی حقائق کو منکشف کرنے والے امام کو ناطق (یعنی شریعت کی تشریح کرنے والے) سے اوپر کا درجہ دیا گیا۔ امام کی ابدی ہستی کو مظہر کلمہ یا امر اللہ قرار دیا گیا۔ مومن کی روحانی پیدائش یا اس کی حیات نو امام کو تسلیم کرنے سے واقع ہوتی ہے۔

مآخذ: (۱) ابوالعباس الناشی الاکبر: اصول النحل، مخطوطہ، برسہ، Haraccioglu، ۱۳۰۹، اوراق ۱-۵۱؛ (۲) النوبختی: فرق الشیعہ، طبع H. Ritter، استانبول ۱۹۳۱ء؛ (۳) الاشعری: مقالات الاسلامیین، طبع H. Ritter، استانبول ۱۹۲۹-۱۹۳۳ء؛ (۴) تجزیہ ازاں H.Brentjes: *Die Imamatslehren im Islam nach Darstellung des Ascha`ri*، برلن ۱۹۶۴ء؛ (۵) W.Madelung: *Der Imam al-Qasim b.Ibrahim und die Glaubenslehre der zaiditen*، برلن ۱۹۶۵ء؛ سنی مسلک: امامت کے بارے میں سنی احادیث کے حوالہ جات: (۶) A.J. Wensinck: معجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی، بذیل مادہ امام، ائمہ؛ حنبلی مسلک؛ (۷) ابن ابی یعلی: طبقات الحنابلہ، طبع ایم حامد الفقی، قاہرہ ۱۹۵۲ء؛ حنفی مسلک: (۸) A. J. Wensinck: *The Muslim Creed*، کیمبرج ۱۹۳۲ء؛ سنی مسلک کے نمائندہ تشریحی بیانات الغزالی تک

(۹) یوسف ایبش نے نقوش الفکر السیاسی الاسلامی، الامامۃ عند السنۃ، بیروت ۱۹۶۶ء میں یکجا کر دیئے ہیں، معتزلہ: (۱۰) الخیاط: الانتصار، طبع H.S.Nyberg، قاہرہ ۱۹۲۵ء، خصوصاً، ص۹۷۔۱۰۲؛ (۱۱) عبدالجبار الاسد آبادی: المغنی، ج ۲۰، طبع عبدالحلیم محمود وسلیمان دنیا، قاہرہ بدون تاریخ؛ زیدیہ: (۱۲) ابوطالب الناطق: الجامع فی تثبیت الامامۃ، مخطوطہ صنعاء، در جامع مسجد؛(۱۳) R. Strothmann: Das Staatrrecht der zaiditen، سٹراسبرگ ۱۹۱۲؛ امامیہ: (۱۴) الکلینی: الاصول من الکافی، طبع علی اکبر الغفاری، تہران ۱۳۸۱، ج۱، کتاب الحجۃ؛ (۱۵) الشریف المرتضی: الشافی فی الامامۃ، تہران ۱۳۰۱ھ؛ (۱۶) نصیر الدین الطوسی: رسالۂ امامت (الرسالۃ فی الامامۃ)، طبع ایم۔ٹی، دانش پژوہ، تہران ۱۳۳۵؛ (۱۷) W. M.Muller، ترجمہ، الباب الحادی عشر، ...... از ...... ابن المطہر الحلی مع مقدمہ از مقداد فاضل الحلی، لنڈن ۱۹۲۸ء، ص۶۲۔۸۱؛ اسماعیلیہ: فاطمی عقیدے کے نمائندگان یہ ہیں:(۱۸) النعمان بن حیان: کتاب الاساس فی التاویل، طبع ع۔ تامر، بیروت ۱۹۶۰ء؛ (۱۹) محمد بن علی السوری: القصیدۃ السوریہ، طبع ع تامر، دمشق ۱۹۳۵ء، ص۴۱۔۷۱؛ (۲۰) W.Madelung: Das Imamat in der fruher ismailtischen Lehr، در Isl، ۳۷ (۱۹۶۱ء)؛ خارجی مسلک: (۲۱) ای۔اے سلیم: Political Theory and Institutions of the Khawarij، بالٹی مور ۱۹۵۶ء، خصوصاً باب ۹ (جو بہت سی اغلاط پر مشتمل ہے)؛ (۲۲) A. de. C. Motylinski: L' Aqida des Abadhites, in Recunuil de Memoireset de textes Publie en l, honneur due xiv congres des orientaslistes، (عہد مابعد کی سنیت وجدیدیت): (۲۳) H. A.R. Gibb: Some Considerations in Sunni Theory of Caliphate، در Archives d'Historie du droit Oriential، ۳ (۱۹۳۹ء)، ص ۴۰۱۔۴۱۰؛ (۲۴) M.H.Kerr: Islamic Reform :The Political and Legal Theories of Muhammad Abduh and Rashid Raza، برکلے ۱۹۶۶ء، خصوصاً باب ۱۰۵؛ امامیہ باطنی عقیدہ: (۲۵) H. Corbin: Histoire de la philosph lie islamique، ج ۱، پیرس ۱۹۶۴ء، ص ۵۳۔۱۰۹؛ طیبی اسماعیلیہ؛ (۲۶) علی بن محمد بن الولید: کتاب تاج العقائد ومعاون الفوائد، طبع ع تامر، بیروت ۱۹۶۷ء ص ۶۰۔۷۹؛ باطنی عقیدہ؛ (۲۷) الحسین بن علی بن الولید: کتاب المبدأ والمعاد، طبع وترجمہ H. Corbin، در Trilogie Ismaelienne، تہران ۱۹۶۱ باب ۴، نزاری باطنی عقیدہ قیامہ کے بعد؛ (۲۸) M.G.S.Hodgson: The Order of Assassins، ہیگ، ۱۹۵۵ء، ص ۷۵۔۱۶۰.

(W. Madelung [ت ظفر علی؛ ن محمود الحسن عارف])

••-------------••

⊗ امامہ بنت ابی العاص(رضی اللہ عنہا) : نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی صاحب زادی (حضرت زینب) [رک بآں] کی بیٹی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی۔ اکثر روایات کی رو سے حضرت زینب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صاحب زادی تھیں، جن کی ولادت اعلان نبوت سے دس برس قبل ہوئی۔ یہ بات البتہ اختلافی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں حضرت قاسمؓ بڑے تھے یا حضرت زینب، مآخذ میں دونوں طرح کی روایات ملتی ہیں (ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴: ۳۱۲، ترجمہ زینب بنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم)۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت ابوالعاص سے کر دیا تھا جو حضرت خدیجہ کی حقیقی بہن ہالہ بنت خویلد کے بیٹے اور حضرت خدیجہ کے نواسے

تھے (ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴: ۱۲۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت لبنان)۔

حضرت زینبؓ کی رخصتی کے زمانے کی اگرچہ صراحت نہیں ملتی، مگر قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی رخصتی اعلان نبوت کے بعد ہوئی تھی، البتہ ابولعاص بدستور حالت کفر میں رہے۔ روایات میں ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت کیا تو قریش مکہ نے ابوالعاصؓ پر حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کے لیے دباؤ ڈالا، مگر انہوں نے حضرت زینبؓ کو کسی بھی صورت میں چھوڑنے سے انکار کر دیا...... جس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان کی وفاداری اور وعدہ ایفائی کی تعریف فرماتے تھے (ابن عبدالبر الاستیعاب، ۴: ۱۲۶)۔

غزوۂ بدر میں ابوالعاص گرفتار ہو کر مدینہ منورہ لائے گئے تو ان کی رہائی کے لیے حضرت زینبؓ نے اپنا وہ قیمتی ہار ارسال کیا جو ان کی والدہ حضرت خدیجہؓ نے انہیں شادی کے وقت دیا تھا، جسے دیکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آبدیدہ ہوگئے۔ آپؐ نے صحابہ کرام کے مشورے سے ان کا وہ ہار بھی واپس کر دیا اور ابوالعاص کو بلافدیہ رہا کر دیا (ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۴: ۱۲۶۔ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت) البتہ ان سے یہ وعدہ لیا کہ وہ مکہ مکرمہ میں جا کر حضرت زینبؓ کو مدینہ منورہ آنے کی اجازت دیدے گا (الاصابہ، ۴: ۳۱۲۔ ترجمہ حضرت زینب، عدد ۴۶۶)۔

چنانچہ ابوالعاص نے رہائی کے بعد حضرت زینبؓ کو حسب وعدہ مکہ مکرمہ کے لیے روانہ کر دیا، لیکن جب حضرت زینبؓ مدینہ منورہ کی طرف آرہی تھیں تو ہبار بن الاسود اور ایک دوسرے شخص نے ان کے اونٹ کو بدکا دیا۔ جس سے وہ گر پڑیں، اس وقت وہ حاملہ تھیں، اس ناگہانی مصیبت سے اسقاط ہوگیا جس سے وہ بیمار پڑگئیں اور پھر اسی بیماری سے، ۸ھ میں مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہوگیا (ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۴: ۳۱۲)۔

حضرت زینبؓ کے گلشن میں دو پھول کھلے ان کے بڑے صاحبزادے علی تھے جو بلوغ کی عمر کو پہنچنے کے بعد فوت ہوے اور ان سے چھوٹی ان کی بیٹی امامہ تھی.

امامہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پرورش پائی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ...... ان سے بے حد محبت تھی...... امام بخاریؒ اور دوسرے محدثین نے، حضرت ابوقتادہ انصاریؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امامہ بنت زینبؓ کو گود میں اٹھائے ہوئے نماز ادا کی۔ جب آپ سجدہ کرتے تو انہیں زمین پر بٹھا دیتے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے، تو انہیں دوبارہ اٹھا لیتے (البخاری مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت، لبنان، ۱: ۵۹۰، کتاب الصلوٰۃ باب ۱۰۶، حدیث ۵۱۶) غالبًا یہ اس وقت کا قصہ ہے جب حضرت زینبؓ بیماری کی حالت میں مدینہ منورہ پہنچی تھیں اور اس وقت تک نماز میں حرکت ممنوع نہ تھی (ابن حجر العسقلانی: فتح الباری، ۱: ۵۹۲، مطبوعہ بیروت)۔ بعض روایات میں یہ صراحت ہے کہ یہ واقعہ ظہر یا عصر کی نماز میں پیش آیا۔ پوری روایت اس طرح ہے۔ ''حضرت ابوقتادہ کہتے ہیں کہ اس اثنا میں کہ ہم لوگ نماز ظہر یا نماز عصر کا انتظار کر رہے تھے۔ حضرت بلالؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلانے کے لیے جاچکے تھے کہ اسی وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے۔ اس وقت امامہ بنت ابی العاص آپؐ کی نواسی آپؐ کے کندھے پر سوار تھی...... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کے لیے اپنی جگہ کھڑے ہوے اور ہم بھی آپ کے پیچھے کھڑے ہوگئے...... اس وقت بھی امامہ اپنی اسی جگہ (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے) پر رہیں...... وہ

کہتے ہیں کہ پھر آپؐ نے تکبیر کہی تو ہم نے بھی آپ کے پیچھے تکبیر کہی...... جب آپؐ نے رکوع کرنا چاہا تو آپؐ نے امامہ کو پکڑ کر زمین پر بٹھا دیا اور پھر جب آپؐ رکوع اور سجدے سے فارغ ہوگئے تو آپ نے امامہ کو دوبارہ اسی جگہ (اپنے کندھے پر) بٹھا لیا...... آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے ختم ہونے تک اسی طرح کیا (ابوداود: السنن، ۱: ۵۶۶، کتاب الصلوٰۃ، باب ۱۶۱۔ حدیث ۹۲۰ ، مطبوعہ دارالحدیث للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت لبنان ۱۳۸۸ھ / ۱۹۶۹ء).

اس حدیث نے خاص طور پر شافعی اور حنبلی فقہاء کو مشکل میں ڈال دیا ہے، جو قرآن مجید کی سورۃ المائدہ کی آیت (۵) میں "عورتوں کی ملامست" کو اس کے ظاہری معنی میں لیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مرد کا کسی عورت کو ہاتھ لگ جائے تو اس سے اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی لیے حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کی توجیہ میں شافعی فقہاء کے کئی اقوال نقل کیے ہیں...... جن میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت امامہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے محارم میں سے تھیں۔ دوسری توجیہ کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کپڑے کے ساتھ چھوتے تھے...... تیسری توجیہ کی رو سے وہ بچی تھیں اور یہ حکم بڑی عورتوں کے لیے ہے (فتح الباری، ۱: ۵۹۲).

حضرت امامہؓ سے نبی اکرم کی محبت کا مزید اندازہ ان روایات سے ہوتا ہے جو ان کو مختلف تحائف دینے کے سلسلے میں مروی ہیں.

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ تحائف لائے گئے جن میں مہروں کا ایک ہار بھی تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ ہار میں اپنے گھر والوں میں سے سب سے زیادہ محبوب شخص کو دوں گا...... یہ سن کر عورتوں نے کہا کہ آپ یہ ہار ابوبکر کی بیٹی کو دیں گے ...... مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امامہ کو بلایا اور یہ ہار انہیں پہنا دیا (الاصابہ ، ۴: ۲۳۶).

ابن سعد کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے اپنے ہاتھوں سے ہار ان کے گلے میں ڈالا (ابن سعد: الطبقات، مطبوعہ دار صادر، بیروت (ب ت) ۸/۴۰)

اسی طرح ایک دفعہ نجاشی شاہ حبشہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ زیورات بھیجے۔ جن میں ایک انگوٹھی بھی تھی۔ آپؐ نے یہ انگوٹھی حضرت امامہ بنت ابی العاص کو اس پیغام کے ساتھ ارسال کی "اے میری بیٹی تم اسے پہنو" (ابن سعد، ۸: ۴۰).

حضرت امامہؓ ابھی کم عمر ہی تھیں کہ پہلے ان کی والدہ حضرت زینب نے انتقال کیا اور پھر ان کے والد ابوالعاص بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس کے بعد حضرت امامہؓ اپنی خالہ حضرت فاطمہ الزہراءؓ کے پاس رہیں...... پھر جب حضرت فاطمہؓ بیمار پڑیں تو انہوں نے وصیت کی کہ ان کے بعد حضرت علیؓ ، امامہؓ سے نکاح کر لیں...... چنانچہ حضرت علیؓ نے اس تجویز کے مطابق حضرت امامہؓ سے نکاح کر لیا۔ نکاح کی یہ تقریب حضرت امامہؓ کی طرف سے حضرت زبیرؓ بن العوام کی اجازت سے تکمیل پذیر ہوئی...... جنہیں حضرت ابوالعاص نے اپنی لخت جگر کے نکاح کے لیے اپنا ولی مقرر کیا تھا...... (ابن الاثیر: اسدالغابہ ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، لبنان ۱۴۱۵ھ / ۱۹۹۴ء، ۷ / ۲۰)

حضرت علیؓ اور حضرت امامہؓ کی عمروں میں بہت فرق تھا، لیکن دونوں کی یہ جوڑی خوب کامیاب رہی...... جب ۴۰ھ میں حضرت علیؓ زخمی ہوئے اور انہیں اپنے بچنے کی امید نہ رہی تو انہوں نے حضرت امامہؓ کو بلایا اور فرمایا کہ "مجھے اندیشہ ہے کہ میرے مرنے کے بعد

معاویہؓ تم سے نکاح کے لیے زور دے گا۔ اگر تم نے میرے بعد نکاح کرنا ہو تو المغیرہ بن نوفل بن الحارث بن عبدالمطلب سے نکاح کر لینا...... چنانچہ ایسا ہی ہوا جونہی حضرت امامہؓ کی عدت گذری، امیر معاویہؓ نے مدینہ منورہ کے گورنر مروان بن الحکم کو لکھا کہ وہ ایک ہزار دینار مہر کے عوض امامہؓ کو ان کی طرف سے نکاح کا پیغام دیں...... اس پر حضرت امامہؓ نے مغیرہ بن نوفل کے پاس پیغام بھجوایا...... حضرت مغیرہؓ نے حضرت حسن کو، جو ان کے بڑے بھائی اور حضرت امامہؓ کے ولی بھی تھے۔ پیغام دیا جس پر حضرت حسنؓ نے بخوشی ان کا امامہ سے نکاح کر دیا (الاصابہ، ۴: ۲۳۱)۔ ابن سعد کی روایت میں حضرت علیؓ کی وصیت کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے بجائے یہ ذکر ہے کہ حضرت امامہؓ نے ...... امیر معاویہؓ کی طرف سے پیغام ملنے پر حضرت مغیرہؓ کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا کہ ”مجھ سے معاویہ نکاح کرنا چاہتا ہے (تمہاری کیا مرضی ہے)۔ انہوں نے کہا کہ تم ”جگر کھانے والی کے بیٹے سے نکاح کرو گی؟ اگر تم مجھے اپنے نکاح کا اختیار دے دو (تو مناسب ہوگا)۔ انہوں نے اس کی اجازت دے دی۔ اس طرح ان کا نکاح ہوگیا (ابن سعد: الطبقات، ۸: ۴۰)۔

حضرت امامہؓ کے ہاں، مغیرہ سے یحیٰی نامی لڑکا پیدا ہوا۔ مغیرہ نے ان کے نام پر اپنی کنیت ابویحیٰی رکھی (ابن عبدالبر، ۷: ۲۰)۔ حضرت امامہؓ نے (غالبًا حضرت امیر معاویہؓ کے دور حکومت میں) مغیرہ کے ہاں وفات پائی...... مگر کسی کتاب میں ان کا سال وفات درج نہیں ہے (دیکھیے مآخذ)۔

حافظ ابن حجر نے ایک اور روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت علی کے بعد ابوالھیاج بن شعبان بن الحارث سے نکاح کیا تھا (الاصابہ، ۴: ۲۳۱)

لیکن اوّل الذکر روایت زیادہ مستند ہے۔

حضرت امامہ کا شمار صحابۂ صغار میں ہوتا ہے ...... ان کے متعلق مختلف صحابہ کرام نے روایات نقل کی ہیں، مگر انہوں نے بذات خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہیں کی۔ حضرت امامہؓ نہایت نیک سیرت خاتون تھیں۔ انہوں نے خاندان نبوت میں تمام زندگی بسر کر دی اور کسی اور خاندان سے منسوب ہونا گوارہ نہیں کیا۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں۔

(محمودالحسن عارف)

••-------------••

امامہ بنت حمزہ بن عبدالمطلب (رضی اللہ ⊗ عنہا) : وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چچازاد بہن، آپ کے رضاعی بھائی اور چچا حضرت حمزہ کی بیٹی...... اور عہد نبوی اور عہد صحابہ کی ایک معروف خاتون تھیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے ان کے کئی نام نقل کیے ہیں۔ جن میں عمارہ، فاطمہ، امامہ، امۃ اللہ اور سلمٰی وغیرہ کے نام شامل ہیں اور لکھا ہے کہ اول الذکر زیادہ معروف ہے (فتح الباری: ۸: ۵۵، مطبوعہ بیروت)

بعض سیرت نگاروں نے ان کے نام کے متعلق صراحت کی ہے کہ وہ عمارہ ہی تھا (المنذری، حواشی ابی داوٗد، ۲: ۱۷۰)۔

معروف ترین روایت کے مطابق حضرت امامہ بنت حمزہ کی والدہ ماجدہ سلمٰی بنت عمیس تھیں جن کی ہمشیرہ اسماء بنت عمیس، عہد نبوی کی معروف خواتین میں سے تھیں...... جنہوں نے اپنے خاوند حضرت جعفر بن ابی طالب کے ہمراہ حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور جو حضرت جعفر کی شہادت کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے اور ان کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں

(ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴: ۲۲۵، مطبوعہ بیروت، تذکرہ اسماءؓ بنت عمیس)۔

حضرت سلمٰی کا شمار ان خواتین میں ہوتا ہے، جنہوں نے ابتدائی دنوں میں اسلام قبول کر لیا تھا اور جن خواتین کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "مسلمان بہنوں" (الاخوات مومنات) کا خطاب عطا کیا تھا (الاصابہ، ۴: ۳۲۴، ترجمہ سلمٰی بنت عمیس)۔ وہ ماں کی طرف سے ام المومنین حضرت میمونہؓ اور ام الفضلؓ زوجہ حضرت عباس بن عبدالمطلب کی بہن تھیں ...... حضرت حمزہؓ سے ان کے ہاں "امامہ" پیدا ہوئیں۔ حضرت سلمٰی نے حضرت حمزہؓ کی شہادت کے بعد شداد بن الہاد اللیثی سے نکاح کیا اور ان سے عبداللہ اور عبدالرحمٰن کی ولادت ہوئی۔ جن کے نام پر انہوں نے اپنی کنیت رکھی (ابن سعد: الطبقات، ۸: ۱۵۸)

حضرت امامہؓ کی ولادت غالباً ہجرت سے قبل کا واقعہ ہے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرۃ القضاء کے وقت تک مکہ مکرمہ میں رہنے والوں کے ہمراہ رہیں۔

پہلی مرتبہ ان کا ذکر کتب سیرت اور کتب حدیث میں اس وقت آتا ہے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمرۂ قضا ادا کرنے کے لیے ۷ھ میں مکہ مکرمہ تشریف لے گئے...... حضرت علیؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی طرف متوجہ کیا اور عرض کیا: یارسول اللہؐ آپ ہماری چچا زاد یتیم بہن کو کس بنا پر مشرکین کے درمیان چھوڑ کر جارہے ہیں۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع نہ کیا...... اور یوں حضرت علیؓ اس بچی کو ان کے گھر سے لے آئے، لیکن جب یہ بچی مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچی تو حضرت جعفرؓ، حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت علیؓ کے مابین اس بچی کی کفالت اور تربیت کے لیے جھگڑا ہوگیا۔ حضرت جعفرؓ نے جو حضرت حمزہ کے وصی (Nominee) اور ان کے ہجرت مدینہ کے موقع پر بھائی تھے، کہا: یہ میری بھتیجی ہے۔ میں اس کی کفالت کا تم سے زیادہ حق رکھتا ہوں۔ حضرت جعفرؓ نے، جن کے گھر میں امامہ کی حقیقی خالہ اسماء بنت عمیس تھیں، کہا کہ خالہ ماں ہی کی طرح ہوتی ہے اور میرے ہاں اس کی خالہ اسماء بنت عمیس ہے، لہٰذا میں اس کی کفالت کا زیادہ حق دار ہوں۔ حضرت علیؓ نے یہ باتیں سنیں تو کہا: تم مجھ سے میری چچا زاد بہن کے متعلق کیوں جھگڑرہے ہو، حالانکہ مشرکوں کے درمیان سے اسے میں نکال کر لایا ہوں اور تم دونوں سے نسب میں اس کے زیادہ قریب ہوں۔ لہٰذا اس بچی پر میرا حق ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہارا فیصلہ کرتا ہوں، "اے زید جہاں تک تیرا معاملہ ہے تو تو اللہ تعالٰی اور اس کے رسول کا مولٰی (آزاد کردہ غلام) ہے۔ اور اے علی تو میرا بھائی اور میرا ساتھی ہے اور اے جعفر تو میری صورت اور سیرت میں میرے زیادہ مشابہہ ہے اور چونکہ تمہارے گھر میں اس کی خالہ ہے اور شرعی حکم یہ ہے کہ خالہ کی موجودگی میں اس کی بھانجی سے نکاح نہیں ہوسکتا، لہٰذا اس بچی کی کفالت کے تم زیادہ حق دار ہو، چنانچہ آپؐ نے امامہؓ حضرت جعفر کو سونپ دی (ابن سعد، ۸: ۱۵۹۔۱۶۰)۔ اس بات کی تائید کہ حضرت امامہؓ کو حضرت علیؓ ہی لے کر آئے تھے، ابن سعد کی اس روایت سے ہوتی ہے جو انہوں نے محمد بن علی بن الحسین الباقر سے مرسل روایت کے طور پر نقل کی ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت حمزہ کی بیٹی لوگوں میں پھر رہی تھی کہ حضرت علیؓ نے اسے پکڑ لیا اور حضرت فاطمہؓ کے پاس ان کے ہودج میں لا بٹھایا (فتح الباری، ۱: ۵۰۶)

صحیح بخاری کی روایت میں، جسے حضرت علیؓ نے

روایت کیا ہے یہ صراحت ہے کہ یہ بچی ...... از خود حضرت علیؓ کے ساتھ یا عم یا عم (اے چچا اے چچا) کہتی ہوئی چل پڑی تھی اور حضرت علیؓ نے اسے پکڑ کر حضرت فاطمہؓ کو دے دیا تھا۔ اس حدیث کے آخر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: الخالة بمنزلة الام ...... (خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے) (البخاری: الجامع الصحیح ، ۸: ۴۹۹، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء، حدیث۴۲۵۱، مطبوعہ دارالمعرفۃ، بیروت؛ ابوداؤد: السنن، ۲/ ۱۰۷، مطبوعہ دارالحدیث ، بیروت لبنان، کتاب الطلاق، باب ۳۵، حدیث ۲۲۸۰)۔ حضرت علیؓ ہی سے مروی دوسری روایت میں ہے کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ مکہ گئے تو وہ حضرت حمزہؓ کی بیٹی کو لے آئے (ابوداؤد، ۲: ۱۰۷۔ ۱۰۷، حدیث ۲۲۷۸)۔ سنن الترمذی میں یہ روایت حضرت براءؓ بن عازب سے مروی ہے اور اس میں بھی یہ الفاظ ہیں: کہ "خالہ ماں کے بجائے ہوتی ہے۔ (الترمذی: ۴: ۳۱۲، حدیث ۱۹۰۴، مطبوعہ مصطفیٰ البابی، مصر، ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء)۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ ان بزرگوں کے مابین حضرت امامہ کی کفالت کے لیے جھگڑا مرالظہران کے مقام پر ہوا تھا (فتح الباری، ۸: ۵۵، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء)۔ جب کہ انہی نے ایک اور روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ یہ واقعہ مدینہ منورہ کے اندر یا اس کے قریب پہنچ کر پیش آیا تھا (کتاب مذکور، ۸: ۵۰۶).

حافظ ابن حجرؒ کے مطابق مغازی سلیمان التیمی میں ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سامان کے پاس آئے تو آپ نے حضرت حمزہؓ کی بیٹی کو وہاں موجود پایا تو آپ نے پوچھا: تمہیں یہاں کون لایا ہے بچی نے کہا: آپ کے گھر والوں میں سے ایک شخص مجھے یہاں لایا ہے۔ اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے وہاں سے لانے کا حکم نہیں دیا تھا...... اس میں یہ ذکر بھی ہے کہ جب حضرت علیؓ نے اسے حضرت فاطمہؓ کے حوالے کیا تو حضرت فاطمہؓ نے کہا: تمہیں علم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی ہے کہ کفار میں سے جو کوئی بھی آپؐ کو ملے گا، آپ اسے واپس کر دیں گے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: ہاں مجھے علم ہے، مگر یہ ان میں سے نہیں ہے، بلکہ ہم میں سے ہے (فتح الباری ، ۸: ۵۰۶)

صحیح بخاری کی روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں بزرگوں سے جو الفاظ کہے تھے، وہ ابن سعد کی روایت سے مختلف ہیں۔ اس میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا: تو مجھ سے اور میں تجھ سے ہوں اور حضرت جعفرؓ سے فرمایا تھا: تو میری صورت اور سیرت کے زیادہ مشابہ ہے اور حضرت زید سے کہا: تو ہمارا بھائی اور ہمارا آزاد کردہ غلام ہے (البخاری ، کتاب المغازی، باب ۴۳، حدیث ۴۲۵۱)

ابو جعفرؒ بن حبیب نے اپنی کتاب المحبر میں لکھا ہے کہ جب امامہ مدینہ منورہ میں آئی تو وہ لوگوں سے اپنے والد کی قبر کے متعلق پوچھتی تھی۔ اس پر حضرت حسان نے انہیں چند اشعار میں جواب دیا تھا (الاصابہ ، ۴: ۲۳۵)

حضرت امامہؓ، حضرت جعفرؓ کے گھر میں عزت و احترام کے ساتھ رہیں۔ اسی دوران میں حضرت جعفرؓ کی شہادت ہوگئی اور ان کی بیوی حضرت اسماء نے حضرت ابوبکرؓ سے نکاح کر لیا...... حضرت جعفرؓ نے شہادت سے قبل انہیں حضرت علیؓ کی تولیت میں دے دیا تھا۔چنانچہ انہی کے گھر میں اس نے حد بلوغ میں قدم رکھا (فتح الباری، ۸: ۵۰۸).

اس موقع پر حضرت علیؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کا ذکر کیا...... اور آپ کو ان سے نکاح

کرنے کی ترغیب دی اور عرض کیا۔ یارسول اللہؐ! آپ حمزہ کی بیٹی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ آپؐ نے فرمایا...... نہیں وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی (اور میری بھتیجی) ہے (البخاری ، کتاب المغازی، باب ۴۳، حدیث ۴۲۵۱)

طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت علیؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ آپ دوسرے خاندانوں میں شادی کر رہے ہیں۔ اپنے خاندان میں شادی کیوں نہیں کرتے۔ پوچھا کس سے، کہا حضرت حمزہؓ کی بیٹی سے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں اس سے میں شادی نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ وہ میری رضاعی بھتیجی ہے (ابن سعد: طبقات ، ۸: ۱۵۸) دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا:کہ رضاعت سے وہی رشتے حرام ہوتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔ (حوالۂ مذکور)

اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ سے اپنے سوتیلے بیٹے سلمہؓ کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا...... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر فرمایا: کیا سلمہ کو بدلہ مل گیا...... (ابن سعد، ۱۵۹:۸)۔ اس کی وجہ بقول حافظ ابن حجرؒ یہ تھی کہ حضرت ام سلمہؓ کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح میں حضرت سلمہؓ نے بڑا کردار ادا کیا تھا۔ اسی لیے آپؐ نے اس موقع پر فرمایا کیا سلمہ کو بدلہ مل گیا (الاصابہ ، ۴: ۲۳۶۔ عدد ۶۴) بعض روایات میں یہ بھی صراحت ہے کہ دونوں کا نکاح بچپن میں کر دیا گیا تھا اور ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی کہ دونوں کا انتقال ہوگیا۔ (الاصابہ ، ۲: ۶۶، ترجمہ سلمہ بن ابی سلمہ، عدد ۳۳۸۳) مگر حافظ ابن حجرؒ نے الواقدی اور ابوحاتم وغیرہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلمہ تو عبدالملک بن مروان کے زمانے تک حیات رہے، مگر حضرت امامہؓ کم عمری ہی میں رخصتی سے قبل فوت ہوگئی تھیں (حوالہ مذکور)۔ اس لیے مذکورہ بالا جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ دونوں کے مابین ملاقات نہ ہوسکی اور حضرت امامہ بچپن میں انتقال کر گئیں.

حضرت امامہ نے اگرچہ نہ تو کوئی روایت کی، اور نہ ہی اولاد کا سلسلہ چھوڑا ...... وہ معصومہ تو بن کھلے غنچے کی طرح بچپن ہی میں فوت ہوگئیں۔ البتہ اسلامی تاریخ اور سیرت طیبہ میں مذکورہ بالا دونوں واقعات کی صورت میں ان مٹ نقوش چھوڑ گئیں۔ اس معصومہ نے خالہ کی ماں کی جگہ ہونے اور رضاعت سے نسب ہی کی طرح حرمت کے ثابت ہونے کی صورت میں دو لازوال فقہی اثرات چھوڑے ہیں۔ جو اس عظیم باپ کی عظیم بیٹی کی یادگار کے طور پر اسلامی تاریخ میں ہمیشہ نقش رہیں گے.

مآخذ: متن مقالہ میں مندرج ہیں.

(محمودالحسن عارف)

••------------••

امتیازات: (تجارتی استحقاقات وخصوصی مراعات): ※

(ا) بحیرۂ روم کے علاقے میں، مسلمان حکومتوں کی طرف سے دی گئی تجارتی مراعات کے بارے میں صادر شدہ اولیں دستاویزی ثبوت کا پتہ چھٹی صدی ہجری/ بارھویں صدی عیسوی سے چلتا ہے۔ جہاں یہ امر قرین قیاس نہیں کہ یہ دستاویزات اسلامی حکمرانوں اور عالم نصرانیت کے مابین، اس سفارتی اور تجارتی سرگرمی کے ابتدائی مظاہرے کی نمائندگی کرتی ہیں، جو عثمانی دور کی مراعات واستحقاقات کی صورت میں عروج کو پہنچا۔ غالباً اس سے قدیم تر سرکاری مالیاتی دستاویزات کے قالب یا زبان کے بارے میں خیال آرائی بھی بے فائدہ ہوگی، مسلم اسپین سے لے کر شام اور مصر تک کی تا حال محفوظ وموجود دستاویزات کے عنوانات اس طرح کے ہیں: فصول، شروط، مرسوم، امان، کتاب امان اور بعض اوقات صلح۔ یہ سب بالعموم، باستثنائے چند، یک طرفہ ہیں اور قانونی نقطۂ

نظر سے، سنداتی دستاویز (حجج) کی نسبت حکومتی فرامین (مراسم) کی عکاسی کرتی ہیں۔ سفارتی/ مالیاتی طریق کار کے نقطۂ نظر سے تجارتی مراعاتی اصول امان سے اخذ کی گئی تھیں اور بالخصوص وہ جسے مسلم ضابطے میں "امان عام" کہا جاتا ہے۔ اس درجہ بندی کا ماحصل یہ تھا کہ ایسی دستاویزات کے صدور کو امام یا اس کے نائب تک محدود کر دیا جائے۔ امان کی اصطلاح کی برقراری کا مطلب مسلّمہ رسوم ورواج میں تبدیلی کے عمل کو مؤثر تحریر کے پردے میں چھپانے کی ایک کوشش قرار دیا جانا چاہیے۔ دارالاسلام میں غیر مسلم، غیر ذمی تاجروں کو دی گئی تجارتی مراعات کے سلسلے میں حسب ذیل قانونی استثناء ات حاصل تھے:

۱۔ ذات اور مال کا عمومی تحفظ، بشمول:(الف) حقوق وصیت، مذہب، تدفین اور لباس کی آزادی؛ (ب) جہازوں کی مرمت، ہنگامی ضروریات زندگی، بحری قزاقوں کے حملوں کے خلاف اعانت اور Lex naufragu کی تنسیخ؛ (ج) مسلم طبقے کے سربراہ کو شکایات پیش کرنے کی اجازت۔

۲۔ خارجی حقوق بشمول: (الف) سفارتی دائرہ اختیار؛ (ب) سفارتی عہدیدار کی تنخواہ اور دوسرے استثنائی معاملات؛ (۳) اجتماعی ذمہ داری کی تنسیخ؛ معلوم ہوتا ہے کہ حلف اٹھانے اور تصدیق نامہ منسلک کرنے کی شرط صرف ان معاملات تک محدود تھی جو باہمی دو طرفہ قسم کے ہوتے یا دارالحرب میں طے پاتے تھے۔ ایسے امور کے جواز کا عرصہ بعض شمالی افریقی دستاویزات میں واضح طور پر ملتاہے۔ جبکہ بحیرۂ روم کے مشرقی علاقوں میں اس کا وجود شاذ ونادر ہے۔ بعض دستاویزات سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ یہ عرصہ غیر محدود یا دوسال کے بعد قابل تجدید ہوتا تھا اور اس کا تعلق مخصوص تاجر برادری کے امور کے نگران سفارتی کارپرداز کی تعیناتی سے منسلک ہوتا۔

تجارتی مراعات کا ارتقا اجتماعی اور انفرادی قوانین کے ماورا اجرا ونفاذ سے منسلک ہے۔ اگر سفارتی کارپرداز کو (کسی تاجر کے) بلا وصیت وفات پانے پر اور اپنے طبقے کے دوسرے اندرونی معاملات میں مداخلت کا قانونی حق حاصل ہوتا، تو وہ اس طبقے کے زیر بار ارکان کے معاملات کا بھی ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ ایک امتیازی نوع کے نظریۂ کفالہ نے امان عام کے بنیادی طور پر تصوراتی نظریے کو ایک اجتماعی قانونی اقرار نامے کی حقیقی شکل عطا کی۔ اس لحاظ سے یہ یورپ کے تجارتی قانون میں "Procuratio" کے ارتقا سے مماثل ہے۔ سفارتی کارپرداز کا تصور بحیثیت (رھینہ) ضامن/کفیل ایک قابل عمل منصوبہ ثابت ہوا اور اس طرح تجارتی مراعات کے مسئلے کو مدلل تسلسل اور استحکام ملا۔ استثنائی امور بہت کم تھے اور غالبًا ان کی بہترین عکاسی ۹۱۳ھ/۱۵۰۷ء کے مملوک وینسی معاہدہ میں ہوتی ہے گو اس کی توثیق سلطان نے نہیں کی تھی.

اسلام کے تجارتی قانون اور زمانہ وسطی کے یورپی قانون کی باہمی اثر پذیری کا مسئلہ متنازع فیہ ہے اور اس کے جواب کے لیے عدالتی ضابطے کی بجاے لغوی دلیل (ثبوت) کی طرف رجوع کیا جانا چاہیے، اس امر کا صریح امکان ہے کہ ایسے عربی مسودات جو اب تک محفوظ رہے ہیں، کے معاصر یورپی "تراجم" حقیقت میں (مسلمہ) توضیحی عربی نسخوں کی "اصل" ہوں، مگر بے قاعدہ انداز میں مسلم سفارتی دفاتر کے رواج وعادت اور معاہداتی حالات کے مطابق ڈھال لیے گئے ہوں۔ اس سلسلے میں اشیا پر مبنی کتابچوں میں عام مسلمہ معیارات اور قواعد سے انحراف کی طرف توجہ مبذول کرائی جاتی ہے.

مآخذ: دیکھیے مقالات(۱) امان سفیر، (Consul) ضمان، سفارت، جوار، کفالہ؛ (۲) T.Wansbrough کا

مقالہ: The Safe Conduct in Muslim Chancery Practice، در BSOAS (۱۹۷۱ء) ۳۴: ۲۰-۳۵.

(Wansbrough [ت: امین اللہ وثیر])

۲۔ سلطنت عثمانیہ: (الف) "مراعات خصوصی" کا کردار اور اس کے مشمولات: حربیوں کو مراعات دینے میں عثمانی حکمرانی ہمیشہ (مذہب حنفی کی) فقہ کی تصریحات کے مطابق عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے تھے (دیکھیے: ابراہیم الحلبی: ملتقی الابحر، ترکی ترجمہ، موقوفاتی، استانبول ۱۳۲۰ھ، ۱: ۳۴۷-۳۴۹)۔ جب نئی مراعات کی تجویز سامنے آتی تو شیخ الاسلام سے مشورہ کیا جاتا تھا (دیکھیے G.F.Abbot: *Under the Turk*، ۱۴۹؛ ۳: ۹۲ Charriere) اور اگر کسی مستامن اور مسلمان کے مابین کوئی پیچیدگی پیدا ہوجاتی تو اس نکتے پر فتوی حاصل کیا جاتا (دیکھیے، بطور نظیر ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۷ء کا ایک فتوی، جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ کوئی مسلمان کسی تجارتی معاہدے کو یک طرفہ طور پر نہیں توڑ سکتا۔ استانبول، باشکوی قلعہ ارشوی، HA ،Fancalu,DHY، عدد ۱/۲۶).

کسی حربی کو امان دینے کی پیشگی شرط یہ تھی کہ وہ ایک درخواست اس موضوع کی پیش کرے گا اور اس میں اسلامی حکومت کے ساتھ دوستی اور امن کا وعدہ کرے گا۔ یہ نکتہ ہر عہدنامے کی ابتدائی سطروں میں تحریر کیا جاتا۔ اس وعدے کی بنا پر ہی امام اپنے آپ کو اسے امان دینے کا پابند تصور کرتا تھا۔ امان کی توثیق ایک عہد کے ذریعے کی جاتی۔ یہ نوشتہ جو عہد کی صورت گری کرتا "عہدنامہ" کہلاتا تھا اور اس میں کچھ شقیں قیود یا شروط ہوتیں۔ عثمانی انھی اصطلاحات کو استعمال میں لاتے رہے، مگر "عہدنامہ" مراعات کی عطائیگی کی دوسری تمام دستاویزات کی طرح، بیرات (حکومتی وثیقہ، لائسنس) کی شکل میں مرتب کیا جاتا۔ اس میں حلف (Berat) (اس کے طریق کار کے لیے دیکھیے: Menage، در V.L *Documents from Islamic Chancelleries*، در اوکسفرڈ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۹۴ء) وہ عنصر تھا جو سلطان کو خدا کے سامنے ذمہ دار ٹھہراتا اور اسی بنا پر وہ مستامن کو اپنے عہد کی یقین دہانی کراتا۔ عہدنامے کا اسلوب بہت خوبی سے J.Porter نے *Observations* (لنڈن ۱۷۷۱، ص۳۶۲) میں بیان کیا ہے۔ سلطان کو اس بات کا اختیار حاصل تھا کہ وہ یک طرفہ اس امر کا فیصلہ کرے کہ مستامن نے کب "دوستی اور اخلاق" کا عہد توڑا اور کب سے اس کے نتیجے میں عہدنامہ باطل قرار پایا۔ یہی وجہ تھی کہ ان فرامین وغیرہ میں جو عثمانی حکام کو جاری کیے گئے، ہمیشہ یہ جملہ موجود ہوتا تھا کہ مستامن نے وعدہ کیا ہے کہ اس کا رویہ دوستانہ اور وفادارانہ ہوگا (*dostluk ve Sdakat Uzere*)۔ تمام بیرات (معاہدوں) کی طرح کے "عہدناموں" کے لیے اس بنا پر کہ وہ کسی مخصوص سلطان کی طرف سے شخصی طور پر عطا کیے جاتے تھے، لازم تھا کہ اس کا جانشین ان کی برقراری کا اعلان کرے.

"عہدنامے" کی منظوری سے پہلے عثمانی حکام درج ذیل امور کو مدنظر رکھتے: (۱) فقہ کے اصول؛ (۲) درخواست گزار ملک کی طرف سے حاصل ہونے والے سیاسی فائدے؛ (۳) سلطنت (عثمانیہ) کے اقتصادی اور مالی مفادات۔ اس سلسلے میں فیصلہ کن عوامل بالعموم یہ ہوتے: مسیحی دنیا میں سیاسی حلیف پیدا کرنے کے مواقع، کم یاب اشیا اور خام مال مثلاً کپڑا، ٹن اور لوہے کا حصول اور بالخصوص درآمدی محصول کے ذریعے آمدنی میں اضافہ جو کہ سرکاری خزانے میں غیر ملکی کرنسی کے حصول کا اہم ترین ذریعہ تھا۔ متعلقہ یورپی طاقت، اپنے سفارتی عملے یا اپنے تاجروں سے مشاورت کے بعد، عہد نامے میں ایسی شرائط شامل کرنے کی کوشش کرتی جنھیں وہ مفید مطلب

سمجھتی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ وہ عثمانی بندرگاہوں کے مقاطعے کی دھمکی دے کر اپنی مرضی منوانے کی سعی کرتی۔ اگر عہدنامے کی تکمیل کے بعد محسوس ہوتا کہ نئے مسائل کی بنا پر مزید ضوابط کی ضرورت پیش آ رہی ہے تو یہ مسائل اضافی خط شریف کے ذریعے حل کر لیے جاتے اور انہیں نئے تحریر شدہ عہدنامے میں درج کر دیا جاتا۔ (بطور مثال ۱۶۷۵ء/۱۰۸۶ھ کی انگریزی مراعات) کسی تضاد کی صورت میں عہدنامہ مقامی طور پر لاگو قوانین، فرامین اور ضوابط پر حاوی ہوتا۔ کئی ایسے فرامین کا سراغ ملتا ہے جنہیں دوسرے احکام کے ذریعے "عہدنامے" سے متضاد ہونے کی بنا پر منسوخ کردیا گیا تھا (مثلاً، لنڈن پبلک ریکارڈ آفس Sp.105/216، 1111/1699 کا فرمان) "عہدنامے" کی تکمیل کے بعد سلطان متعلقہ سرکاری حکام کو فرمان جاری کرتا جس میں انہیں اس کے نکات سے مطلع کیا جاتا اور اس کی بجا آوری کا حکم دیا جاتا۔

یہ بات معنوی طور پر تسلیم شدہ تھی کہ متعلقہ مراعات کے بدلے میں مطلوبہ فوائد حاصل ہوں گے اور اگر یہ فوائد حقیقت کا روپ اختیار نہ کرتے تو مسلمان حکمران کے لیے یہ کہنے کا موقع پیدا ہوجاتا کہ "دوستی اور اخلاق" کی پیشگی شرط توڑ دی گئی ہے (دیکھیے: Latrie: *Mas traites de paix*، ص۱۱۴-۱۱۵)۔ جب وینس والے، وینس میں کام کرنے والے مسلمان تاجروں کی بری اور بحری راستے سے بحفاظت نقل و حرکت کی ضمانت نہ دے سکے (اس کے لیے دیکھیے: A. sagredo F. Berchet، در *Fondaco dei Turchi in Venedikte Venedik'teTurk ticaret merkesi*، در *Belleten*، ۳۲/۱۲۶) تو عثمانی حکومت نے بطور تنبیہ باہمی تحفظ کے سلسلے میں انہیں ان کی ذمہ داری یاد دلائی (دیکھیے: رستم پاشا کا مراسلہ، شائع کردہ ت۔ گوک بلگن، در *Belgeler*، ۱/۲:

۱۶۱ توران، کتاب مذکور؛ اناطولیا کے ترکمان حکمرانوں کی طرف سے عطا کی گئی مراعات کے ذیل میں) اور عثمانی عہد ناموں میں متبادل ذمہ داری کا اصول حسب ذیل امور کے سلسلے میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا تھا: سمندر میں پہنچنے والے نقصان کی تلافی، قرضے کی انفرادی ذمہ داری، بھگوڑے مقروض کی گرفتاری اور جہاز کی تباہی کا نشانہ بننے والوں کی زندگی اورسازوسامان کی حفاظت (دیکھیے ۹۴۷/۱۵۴۰ء کی وینسی مراعات، شائع کردہ گوک بلگن، در *Belgeler*، ۲۴۸-۲۵۰، ۱/۲) باہمی لین دین کے اس اصول نے بالخصوص عثمانی سلطنت کے ذمی باشندوں (یہود، ارمنی، یونانی اور سلاوی) کو یورپ میں تجارتی معاملات میں مصروف رکھا۔ مشرقی یورپ خصوصاً، پولینڈ میں لیونٹ (Levant) کی ساری تجارت ایسے ذمیوں کے ہاتھ میں چلی گئی، جنہیں سلطان کا تحفظ میسر تھا۔ بہت سے ذمی لیونٹ کی بندرگاہوں میں مغربی تاجروں کی ملازمت، بحیثیت ترجمان، دلّال اور کارندہ کرنے کے بعد، وینس اور لیگورن میں مغربی یورپی تاجروں کے حریف بن گئے، حتی کہ وینس والے اور فرانسیسی ان کی سرگرمیوں کو محدود کرنے کے امکانات پر غور وفکر کرنے لگے (H. Inalcik: *Capital Formation in the Ottoman Empire*، Roux، ص ۱۵۳؛ Parter، ص ۴۳۳، ۴۳۷، *J. Econ. Hist*، ۲۹ (۱۹۶۹ء): ۹۷-۱۴۹).

بحیرۂ ایڈریاٹک کے ساحل پر کروشیا کی ایک بندرگاہ کے علاقے کے لوگ خراج گزار کی حیثیت میں، عثمانی تحفظ سے سب سے زیادہ متمتع ہوتے تھے، اس طرح باہمی لین دین ایک حقیقت تھی جس سے پوری سلطنت فائدہ اٹھاتی تھی۔

ا۔ مستأمن طبقات کا قیام اور ان کے حقوق: کسی عثمانی شہر یا بندرگاہ میں مقیم غیر ملکی تاجر عثمانی حکام کے

ساتھ معاملات کے لیے اپنا ایک نمائندہ منتخب کرسکتے تھے، جو کئی طرح سے موسوم ہوتا، مثلاً بلیو (ترکی: بلیوز)، قونصل (ترکی: قونصولس) یا (فلورنس والوں کے لیے) امینو (ترکی: امین)۔ سلطان اس نمائندے کو بیرات (عہدنامہ) عطا کرتا، جس میں اس کے فرائض اور اختیارات کا تعین کیا جاتا۔ اس طرح سرکاری طور پر منظور شدہ ایک گروہ (طائفہ یا ملت) وجود میں آیا۔ اس طریق کار کا تقابل [پرانے زمانے کے] ہم پیشہ لوگوں میں کتخدا یا کسی مذہبی رہنما (پٹری آرک، بشپ وغیرہ) کے انتخاب سے کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی چند صدیوں میں عثمانی حکومت کا مستأمن طبقوں کے بارے میں یہی نقطۂ نظر تھا، مثلاً ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں سلطان نے خط شریف کے ذریعے Comte de Cesy کو شاہ فرانس کی طرف سے کسی اطلاع کی آمد کے بغیر فرانسیسی سفیر مقرر کر دیا (Tongas، ۳۲-۳۳)۔ بہرحال ۱۶۰۰ء کے لگ بھگ، جب دوسری مغربی اقوام نے خصوصی مراعات حاصل کرلیں تو انہوں نے نئے تصورات کی درآمد کا آغاز کیا اور تاجر طبقات کے لیے مکمل ملکی قوانین سے استثنائی حیثیت حاصل کرنے میں لگ گئے اور اس طرح تنازعات کو ہوا دی۔ یہ صحیح ہے کہ عثمانیوں نے ان طبقات کو اپنے مخصوص قلعہ بند علاقوں میں قیام پذیر خود مختار نو آبادیاں بننے کی کبھی اجازت نہ دی، جیسا کہ صورت حال بوزنطینی سلطنت اور گولڈن ہورڈ کے علاقہ جات میں ہوتی تھی، پھر بھی بعض اوقات کسی ایسے طبقے یا گروہ کی اپنی ملکی حکومت یا کمپنی اس طبقے کے اندرونی معاملات چلانے یا اس پر اپنا کنٹرول رکھنے کے لیے مجموعۂ ضوابط ترتیب دیتی تھی (فرانسیسیوں کے لیے دیکھیے: Comete P.Masson: *Memoires* : de Saint Priest *Un type* de: *reglementation Commerciale;*، در *Viertelsd,* *f. Soz und Wirt-gesch* F.Ch. Roux, *Les Echelles*، ۷:۲۴۹-۲۹۵، ص۱۷۱-۱۹۳؛ Hist. du, R. : Pais *Commerce de Marseille,*، ۵:۱۹۹-۲۳۷ وینشن؛ انگریزی اور ولندیزی طریق کار کے لیے دیکھیے: N.Steensgaard: *Consuls and Nations in the Levant*، در *The Scandinavian Economic History Review*، ۱۵/۱-۲، (۱۹۶۷): ۱۳-۳۵).

گیارھویں/سترھویں صدی میں مغربی ممالک نے عثمانی حکومت پر، قونصل کی حیثیت کے متعلق اپنی مخصوص توضیحات لاگو کرنے کی کوشش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ مراعات خصوصی میں ایسی شقوں کا اندراج کیا جائے جو قونصل کو سفیر کا نائب قرار دیں: یہ کہ اُسے قید نہ کیا جا سکے، اس کے خلاف مقدمات، فیصلے کے لیے باب عالی کو پیش کیے جائیں اور یہ کہ صرف سفیر ہی اسے ہٹا سکے یا اس کی جگہ کسی دوسرے آدمی کو مقرر کر سکے(مثال کے لیے دیکھیے: انگریزی مراعات ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء در فریدون: منشآت، ۲/۵۵۰)۔ پہلے پہل استانبول میں مقیم سفرا کے ساتھ قونصلوں اور بندرگاہوں میں تجارتی دلالوں کا تقرر، مرکزی حکومت کے ساتھ ملت کے باقی معاملات کی طرح صرف سفیر کے توسط سے انجام پاتے تھے۔ سفرا کے اپنی حکومتوں اور اپنی اقوام کی ملتوں کے ساتھ تعلقات، مختلف ممالک وینس، فرانس، انگلستان اور ہالینڈ کے لحاظ سے ممیز وممتاز ہوتے تھے(تفصیلات کے لیے دیکھیے Steensgaard: کتاب مذکور).

بیرات کی رو سے قونصل کو اپنی ملت، [کے لوگوں] کے معاملات کی نگرانی کا اختیار حاصل ہوتا۔ وہ درآمدی اشیا کو رجسٹر کرتا اور سفیر اور قونصل کی خاطر مناسب واجبات جمع کرتا، اس کی قوم کا کوئی جہاز اس کی منظوری کے بغیر بندرگاہ سے روانہ نہیں ہوسکتا تھا اور وہ اپنے

افراد قوم کے مابین، اپنے ملکی قوانین وروایات کے مطابق تنازعات حل کرتا اور مقدمات کا فیصلہ کرتا۔ اس کی ذات، اس کے ملازمین اور مویشی اس کی رہائش گاہ، شاہراہ اور شب باشی کے مقامات پر مداخلت سے محفوظ ومامون ہوتے اور اس کی ذاتی اشیا محصول سے مستثنیٰ ہوتیں (ایک سفیر کے برات (عہد، معاہدے) کی مثال کے لیے دیکھیے London، SP` PRO، ۱۰۵/۳۳۴، برائے ۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء)۔ ان فرائض کی انجام دہی کے لیے وہ عثمانی حکام کی امداد حاصل کرسکتا تھا (یہ اختیار ان اسباب میں سے ایک تھا، جو اس کے لیے برات کے حصول کو لازم قرار دیتا)۔ سفیر اور قونصل میں سے ہر ایک کو ایک چاؤش (نوکر) اور ایک یا ایک سے زیادہ ینی چری (فوجی) دیئے جاتے (اسے یزیچی بھی کہا جاتا تھا؛ دیکھیے: Kurat:Turk Ingiliz munasebetleri، ص۱۹۷ دستاویز)۔

"قانون کی فردیت" کے تصور پر مبنی قونصل کا قانونی اختیار (وینسی مراعات، ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء کی دفعہ ۱۶؛ فرانسیسی مراعات ۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء کی دفعہ ۱۲؛ انگریزی مراعات ۹۸۸ھ/۱۵۰۸ء کی دفعہ ۱۶؛) ایک ایسا اصول ہے جس کا تعلق اولیں مراعات خصوصی سے ہے، (Mas Latrie Traitesl، ص ۸۷۔۸۹)۔ فرانسیسی حکومت نے، عثمانی سلطنت میں اس کی تشکیل تفصیلی قوانین وضوابط سے کی تھی (K.Lippmann: Die Konsularjurisdiction im Orient، لائپزگ ۱۸۹۸ء؛ A.Benoit: Etude Sur les Capites Lation، نسی ۱۸۹۰ء)۔ کسی مستامن اور مسلمان کے مابین معاملات ومقدمات عثمانی عدالتوں میں سنے جاتے۔ عہد ناموں میں کئی نئی دفعات شامل کی گئیں تاکہ مستامن کے ساتھ عدالتوں میں منصفانہ سلوک کو یقینی بنایا جا سکے۔ عدالتی کارروائی صرف ان لین دین کے معاملات میں کی جاسکتی تھی جن کا اندراج ماضی کے رجسٹر میں کیا جاچکا ہو اور جن کے بارے میں حجت پیش کی گئی ہو (فرانسیسی مراعات، ۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء دفعہ ۲؛ انگریزی مراعات ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء دفعہ۲)۔ اس وقت تک کسی مقدمے کی سماعت نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ مستامن کا ایجنٹ موجود نہ ہو (وینسی مراعات دفعہ۷؛ فرانسیسی مراعات دفعہ: ۱۱؛ انگریزی مراعات، دفعہ ۱۵)۔ کسی مستامن اور ذمی کے مابین معاملے میں ذمی کی حلفی شہادت قبول کی جاتی (وینسی مراعات، دفعہ ۲۳)۔ چار ہزار سے زائد مالیت کے مقدمات اور اپیلوں کی سماعت صرف دیوان ہمایوں میں ہوسکتی تھی (انگریزی مراعات، ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء دفعہ۲۴)۔ جھوٹے گواہوں کے الزامات سے پیدا شدہ معاملات کی سماعت نہ ہوتی (فرانسیسی مراعات، دفعہ ۷)۔ جب کہ نویں صدی ھ/پندرھویں صدی اور دسویں صدی ھ/سولھویں صدی میں مستامن اکثر وبیشتر ان معاملات میں بھی عثمانی عدالتوں سے رجوع کرتے تھے جو ان کے اپنے مابین درپیش ہوتے (دیکھیے:Belleten، ۹۳/۲۴، ص ۷۱) بعد کے برسوں میں، بعض اوقات کمتر فیس کے پیش نظر مسلمان قونصلر عدالتوں کو ترجیح دیتے (Steengaard، ص۲۳)۔

۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء کے مسودہ مراعات خصوصی (دیکھیے: ذیل) کے مطابق ایک مستامن کے لیے جو عثمانی مقبوضات میں رہائش پذیر ہوجائے دس سال کے بعد یہ ضروری تھا کہ وہ ذمی کا درجہ حاصل کرے اور جزیہ ادا کرے (اگرچہ حنفی فقہ کے مطابق اُسے مستامن رہنے کی اجازت صرف ایک سال کے لیے ہوتی۔ موقوفاتی، ۱:۳۴۸)۔ عملی طور پر عثمانیوں نے مستامن تاجروں کے سلسلے میں کوئی ضابطہ نافذ نہیں کیا کیوں کہ وہ اکثر وبیشتر آتے جاتے رہتے تھے، بہرحال وقتاً فوقتاً ایسی کوششیں کی جاتی رہیں کہ انہیں جزیہ ادا کرنے کا پابند بنایا جاسکے (مثلاً ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء میں، دیکھیے:Belin:Les of Capitulation، ص

wood؛۸۹، ص ۵۰؛ نیز متاخر کے لیے دیکھیے باش وکالت ارشوی، Francalu.Dyy عدد ۲۶ میں ربیع الثانی ۱۰۵۹ ار رجب ۱۰۶۱ء).

استانبول کے بعد بہت سے غیر ملکی سمرنہ [موجودہ ازمیر] میں مقیم تھے۔ یہاں (دسویں/سولھویں صدی کے اختتام کے بعد) آباد ہونے والوں میں زیادہ تر انگریز، فرانسیسی، ولندیزی اور کچھ وینس والے تھے ان میں سے صیدا میں فرانسیسی، حلب میں فرانسیسی، وینسی، انگریز اور ولندیری، سالونیکا میں (۱۰۹۶ھ/۱۶۸۵ء) کے بعد فرانسیسی اور بعد میں دوسری قومیں، قاہرہ میں فرانسیسی، وینسی اور کچھ عرصے کے لیے انگریز آباد تھے۔ یہ مفروضہ کہ محمد ثانی نے جینوائی باشندوں کی بہت سی خصوصی مراعات کو باقاعدہ منظوری عطا کی اور یہ مراعات بعد میں لاطینی قوم (*Magnifica Communita di pera*) .... کو بھی عطا کی گئیں (دیکھیے:M.A.Belin,Hist: *de la Latinite dei Constantinople*) پیرس (۱۸۸۴ء- ص ۱۶۶) ازسرنو جائزہ کا محتاج ہے مختصراً دیکھیے:Belin، کتاب مذکور (عہدنامہ بزبان یونانی) کے اصل متن، محررہ ۲۳ جمادی الاولی ۸۵۷ھ/یکم جون ۱۴۵۳ء (متن کا ذکر Skeat نے کیا ہے)، میں سلطان حلفاً وعدہ کرتا ہے کہ وہ فوج کو استعمال نہیں کرے گا اور فصل کو تباہ نہیں کرے گا [بعض تراجم کے مطابق وہ دیواروں کو بھی تباہ نہ کرے گا] اور یہ جنیوا والے وہاں اپنے منتخب کردہ کتخدا کے تحت اپنے مخصوص قوانین وروایات کے مطابق زندگی گزار سکیں گے، لیکن ۳ جون کو ادرنہ روانہ ہونے سے پیشتر، جب خلیفہ نے پیرہ (Pera) کا دورہ کیا تو اس نے عوامی سلامتی کے مطالبات کی روشنی میں اپنا ارادہ بدل لیا اور اس نے جگہ جگہ سے دیواروں کو توڑ دیا اور اس طرح عہدنامہ کی اہم شرائط میں سے ایک کو منسوخ کر دیا۔ چنانچہ پیرا مکمل طور پر ایک "عثمانی" شہر بن گیا اور ایک صوبہ دار اور ایک قاضی کی نگرانی میں آ گیا (دیکھیے: استانبول).

بالکل ابتدائی عہد سے جنایات (دیکھیے دیت) یا دین کے سلسلے میں ملت کی اجتماعی ذمہ داری کے اصول کو استثنا حاصل تھا (دیکھیے: Mas Latrie، ص۹۲)۔ اس کے باوجود عثمانی حکومت اپنی پیش رو اسلامی حکومتوں کی طرح، مستأمن طبقے کو ایک اجتماعی تاوان کی ادائیگی کا پابند بناتی تھی۔ یہ ایک قسم کا [سامان کے نقصان کا] ہرجانہ ہوتا تھا، اس صورت میں کہ "مہمان" ریاست، "میزبان" ریاست یا اس کے باشندوں پر بوجھ ڈالتی جو بحری قزاقوں کے حملوں کی وجہ سے درپیش ہوتا اور سرکاری خزانے کو محصولات کے سلسلے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا التزام (دیکھیے: ملتزم) یا جعلی کرنسی کی وجہ سے یہ صورت حال پیش آتی (دیکھیے:مثلاً Chardin i: *Under the turks*، ۱۵:۱) عثمانی حکومت کی طرف سے اس کا جواز یہ تھا کہ اس طرح "مہمان ریاست" نے "دوستی اور اخلاص" برقرار رکھنے کے اپنے وعدے کی واضح طور پر خلاف ورزی کی ہے۔ ان محصولات کو عوانیہ Avania (فرانسیسی Avanies) سے مختلف سمجھا جانا چاہیے جنھیں پاشا اپنے مخصوص ذاتی فائدے کے لیے لازمی طور پر وصول کرتے تھے۔ لفظ عوانیہ جو تمام قسم کے جبری اجتماعی محصولات کی نشان دہی کرتا ہے B.Homsy (*Les Capitu Lations*، ص۵۷) کے مطابق عربی ھوانہ سے ماخوذ ہے، مگر زیادہ امکان یہ ہے کہ اس کی اصل عوان (جبراً وصول کی گئی کوئی چیز) ہے، جس کا مصدر عنی (ع ن ی) ہے۔ "عوارض" سے اس کا تعلق بعید از قیاس ہے۔ پاشاؤں کی طرف سے وصول کیے جانے والی عوانیہ (Avania) کے بارے میں مرکزی حکومت کا رویہ متعلقہ قوم کے ساتھ تعلقات کی مناسبت سے مختلف انداز کا ہوا

کرتا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے سرکاری محافظ خانوں میں ایسی دستاویزات موجود ہیں جن میں عوانیہ (Avania) کے معاوضہ کی ادائیگی کے احکام کا ثبوت ملتا ہے۔ (باش وکالت اوشوی: *Ecnebi defterleri DHY*)۔ ایسی مساعی کو روکنے کی خاطر اجنبی حکومتیں مراعات [کے عہد ناموں] میں نئی شقیں شامل کراتیں (فرانسیسی مراعات ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء، اور انگریزی مراعات، دفعہ ۲۰، ۳۰، عمومی طور پر avanias کے لیے دیکھیے: Svoronos، ص ۶۵۔۶۶؛ Masson، ۱:۱، ۴؛ Roux، ص۵۳۔۵۶)۔ عوانیہ کے مطالبات کے بارے میں سفرا اور قونصل اپنی قوم کی طرف سے مناقشہ کیا کرتے۔ اپنی قوم کی تجارتی اشیا پر عائد شدہ عوانیہ کی ادائیگی کے لیے، قونصلوں کی جانب سے جمع کیے جانے والے لگان نے بعد میں ایک مستقل صورت اختیار کرلی۔ وینس والے بعض درآمدی سازوسامان بالخصوص کپڑے پر ایک فیصد ٹیکس عائد کرتے (دیکھیے: موزۂ بریطانیہ، فہرست مخطوطات، Ms.OR، عدد ۹۰۵۳ ورق۲۸۲) فرانسیسی کسی عثمانی بندرگاہ پر سامان اتارنے والے جہاز سے سامان کے ٹنوں کے گنجائش کے مطابق ایک مقررہ فیس وصول کرتے (*Svorono*ص ۷۰- ۷۵؛ *Msson,* ۱:۱۷۶).

(۲) افراد کے حقوق ومراعات: عہد ناموں میں نئی دفعات کے اندراج سے انفرادی تاجروں کی مراعات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ عملی طور پر تسلیم شدہ حقوق مستأمنوں نے طویل دباؤ کے ذریعے حاصل کیے اور وقتاً فوقتاً ان کا اندراج مراعات میں بطور ضابطہ قوانین ہوتا رہا (ان دفعات کے لیے دیکھیے:Mas Latrie، ص۸۳۔۱۱۶).

امان جو کسی حربی کو بغیر غلام بنائے یا اس کا سازو سامان بطور مال غنیمت حاصل کیے دارالاسلام کے اندر سفر کا حق دیتی ہے، ساری عثمانی سلطنت کے لیے (بالجملہ ممالک عثمانیہ کے لیے) قانونی جواز رکھتی تھی، لیکن کسی فرد کی طرف سے دی گئی امان کو، عملی صورت دینے کی خاطر، تاکہ مستأمن مملکت میں سفر کر سکے ضروری تھا کہ وہ (اپنے سفیر کے توسط سے) سلطان سے ایک خاص اجازت نامہ (اذن ہمایوں) حاصل کرے اور اسے اپنے پاس رکھے (دیکھیے:J.H.Mordtmann، در *Zwei Osmanische Passbriefe*، در*Mog*، ۱:۱۷۷۔۲۰۱؛ Menage، کتاب مذکور، ۱:۹۶۔۹۹) اسے مرورنامہ کہا جاتا تھا۔ اس قسم کے اجازت نامے کو جو کسی قاضی یا دوسرے سرکاری اہلکار کا جاری کیا ہوا ہوتا "یول تذکرہ سی" کہا جاتا تھا، (ان کے لیے دیکھیے: وینسی مراعات ۹۲۸ھ/ ۱۵۲۱ء دفعہ ۲۱)۔ فی الحقیقت مستأمن بالعموم چند مخصوص بندرگاہوں اور مخصوص علاقوں اور خان [سرائے] میں رہائش رکھ سکتے تھے۔ صیدا کے یہ تاجر اپنے "خان" تک محدود ہوتے (۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء کی ایک دستاویز کے لیے دیکھیے:Francalu DHY، ۱/۲۶)، مگر دوسرے مقامات سمرنا [ازمیر]، حلب اور غلطہ میں انہیں نقل وحرکت کی زیادہ آزادی حاصل تھی۔ قضاۃ کے رجسٹروں سے غیر ملکیوں کو غلام بنانے کے کئی واقعات کا سراغ ملتا ہے کسی قسم کی ایذا رسانی سے بچاؤ کی خاطر مخصوص ہدایات کے تحت انہیں مسلمانوں جیسا لباس پہننے اور ہتھیار رکھنے کی اجازت ہوتی۔ عثمانی اہل کار مستامن کی رہائش گاہوں کی تلاشی صرف اس صورت میں لے سکتے تھے کہ جب وہاں بھگوڑے مجرموں یا غلاموں کو پناہ دی گئی ہوتی یا غیر قانونی اشیا چھپائی گئی ہوتیں۔ اس مخصوص معمول کے غلط استعمال کی بنا پر نئی قانونی دفعات کی ضرورت پیش آئی (مثلاً فرانسیسی مراعات ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء، دفعہ ۶۵).

جہاں تک مستأمن کی ملکیتی اشیا کا تعلق ہے، اگر وہ عثمانی سلطنت میں مر جاتا اور وصیت چھوڑ جاتا تو

اس کی جائیداد اس کے مقرر کردہ وارث کو مل جاتی، لیکن اگر بلاوصیت اس کی موت واقع ہو جاتی، یا اس کے ورثا کسی اور مقام پر رہائش پذیر ہوتے تو اس کی جائیداد بطور وقف قاضی کی تحویل میں چلی جاتی اور پھر وہ اسے قونصل یا مرنے والے کے شرکا اور دوستوں کے سپرد کر دیتا۔ یہ شق ایک فقہی اصول کے طور پر اور ایک علیحدہ قانونی دفعہ کے طور پر عثمانی ضابطہ قوانین میں شامل کر لی گئی تھی (دیکھیے: TOEM، براے ۱۳۲۹ھ، ص ۵۲).

(۳) بحری راستے کے لیے امان کا حصول: بحری راستے سے سفر کے لیے امان کے اصول سے حاصل کردہ ضمانتوں کا فقہ کی پرانی کتابوں میں واضح تصور نہیں ملتا (دیکھیے: مجید خدوری، ص ۱۰۹۔۱۱۷)، بلکہ ان کی نشان دہی خصوصی مراعات سے متعلق ابتدائی قوانین میں ہوتی ہے (Mas. Latrie، ص ۹۷)، چنانچہ جب کبھی مستأمن کو کسی مسلمان جہاز کی طرف سے خطرہ ہوتا تو وہ امان کے اصول کے اطلاق کا حق دار قرار پاتا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ برابر کے تجارتی حقوق کا اصول زیادہ وضاحت کے ساتھ ان دفعات میں ملتا ہے جو بحری روابط سے تعلق رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عثمانیوں کے نزدیک ان کا اقتدار اعلیٰ درج ذیل مقامات تک محیط تھا: بحیرہ ایجیئن، بحیرہ اسود، بحر احمر، آبنائے باسفورس اور (درۂ دانیال) اور آبنائے اوٹرانٹو (دیکھیے: ۹۲۸ھ/ ۱۵۲۱ء معاہدہ وینس) یا دوسرے لفظوں میں وہ سمجھتے تھے کہ یہ سمندر دارالاسلام کا ایک جز ہیں۔ ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں آسٹریا کی جنگ تخت نشینی کے دوران میں عثمانیوں نے فرانسیسی اور برطانوی جہازوں کو موریا کے مشرقی سرے سے لے کر صقلیہ (سسلی) اور پھر دور مصر تک پھیلے ہوے مغربی حصے تک جنگی اقدامات کرنے سے روکے رکھا۔ ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء، میں جنگی انداز کے تمام مظاہرے، عثمانی بندرگاہوں سے بہت دور تک ممنوع قرار دے دیئے گئے تھے (sp,Pro، ص ۱۰۵، دستاویز براے سال ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۸ء)۔ اولین خصوصی مراعات کی طرح عثمانی عہد ناموں میں بھی مستأمن کو سمندر میں آزادانہ جہاز رانی اور مسلمانوں کے جہازوں کی طرف سے حملوں کے خلاف تحفظ، اسلامی بندرگاہوں میں لنگر انداز ہونے اور کسی بھی ساحلی مقام سے پانی اور اشیاے ضرورت کی فراہمی، جہازوں اور ان کے عملے کو محاصل کی ادائیگی سے استثنا، سمندر میں یا ساحل پر اعانت اور تحفظ، زمین پر مجبوراً اترنے کی صورت میں ذات اور ملکیتی اشیا کی سلامتی، بحری قزاقوں کے خلاف مشترکہ مساعی اور قزاقی کی صورت میں نقصان کی تلافی کی ضمانت دی گئی تھی (۹۲۸ھ/۱۵۲۱ء کی وینسی مراعات، دفعہ: ۴، ۵، ۷، ۱۳، ۱۴، ۲۲، ۲۵، ۲۶؛ فرانسیسی مراعات ۹۷۷ھ/ ۱۵۶۹ء دفعہ:۱، ۲، ۱۳، ۱۵، ۱۷؛ برطانوی مراعات ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء دفعہ ۱، ۳، ۴، ۶، ۱۷، ۱۹)۔ جب تک بربری بحری قزاق عثمانی اقتدار اعلیٰ کے تحت تھے۔ ان کے خلاف محافظت کی خاطر نئی دفعات ترتیب دی گئیں (فرانسیسی مراعات ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۴ء کی شق ۱۹۔۲۰؛ برطانوی مراعات ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء کی دفعہ ۴۷)۔ جب گیارھویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں مستأمن جہازوں کو عثمانی بندرگاہوں تک مسافروں اور سامان کی بار برداری کی اجازت مل گئی تو اس کو قانونی شکل دینے کے لیے نئی دفعات کا اضافہ کیا گیا (مثلاً انگریزی مراعات ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء، دفعہ ۴۱۔۴۴).

(۴) آزادئ نقل و حمل اور اشیا کی بیع و شراء کی ضمانتیں:

ان معاملات کو بالعموم، امان کی ادائیگی کے اعلان کے فوراً بعد اولیں دفعات میں سمجھا جاتا اور بعد میں اضافی دفعات کا اضافہ کر دیا گیا، جو بدمعاملگی سے متعلق تھیں۔ یہ مقامی حکام اور عثمانی جہازوں کے افسران کے

ممنوعہ یا غیر قانونی طور پر درآمد کی جانے والی اشیا کی تلاشی کے حقوق کو محفوظ رکھتی تھیں (قانون کی خلاف ورزی سے متعلق ایسی دفعات یہ ہیں: فرانسیسی مراعات: ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء، ۳۰، ۳۲، ۴۴، انگریزی ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء، ۱۷، ۲۰، ۲۳، ۵۳)۔ یہ تسلیم شدہ امر تھا کہ جہازوں کی استانبول اور باسفورس میں تلاشی کے بعد، گیلی پولی میں ان کی دوبارہ تلاشی نہیں لی جائے گی (وینسی مراعات، ۹۲۸ھ/۱۵۲۱ء دفعہ ۲۶)۔ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا کہ کوئی کسٹم آفیسر تاجر کو اس کی مرضی کے خلاف سامان جہاز سے اتارنے پر مجبور کر دیتا (اس کے لیے دیکھیے دفعہ ۱۷، فرانسیسی مراعات: ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء)؛ اس صورت میں مقامی تاجر ساز باز کر لیتے یا اپنی مرضی کے مطابق اشیا خریدنے کے لیے (دفعہ ۳۳ وماقبل، انگریزی دفعہ ۵، ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء) یا اپنی قیمت پر فروخت کے لیے دباؤ ڈالتے (Framlalu: *DHY*، عدد ۱/۲۶)۔

غیر ملکی تاجروں کو کئی قسم کی رکاوٹیں درپیش ہوتیں مثلاً جب دولت عثمانیہ، وقتاً فوقتاً اپنی ملکی مارکیٹ کو مندی سے بچانے کی خاطر یا مختلف اجناس پر اجارہ داری "یا التزام" کے لیے بعض اشیا (خصوصاً دالیں، چمڑا، کپاس اور دھاتوں) کی برآمد کو ممنوع قرار دے دیتی تو اس کی بنا پر مراعات خصوصی میں نئی شقوں کے اضافے کی ضرورت پیش آتی (دیکھیے: فرانسیسی دفعہ ۱۴، انگریزی، دفعہ ۵۳)۔ اگرچہ اس کا عمومی علاج یہ ہوتا کہ منظم طور پر غیر قانونی درآمد وبرآمد کا طریقہ اپنایا جاتا (Masson، ۱: ۴۱۷)۔

اپنے اولین عہدناموں میں عثمانی حکام اس مجوزہ امر پر مطمئن رہے کہ کسٹم اور دوسرے محاصل معمول کے طریق عمل اور مروّجہ ضوابط (عادت وقانون) کے مطابق، معین شرح فیصد کا اظہار کیے بغیر، نافذ العمل ہوں گے۔ چنانچہ محمد ثانی کو درآمدی محصول کی شرح دو فیصد سے چار فیصد تک اور بالآخر اپنے دور اقتدار کے اختتام پر پانچ فیصد تک لے جانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی، لیکن عثمانی چنگی کی شرح، درآمد کرنے والے کے رتبے، اجناس کی نوعیت اور علاقہ نفاذ کے مطابق مختلف ہوتی تھی۔ پھر یہ واضح طور پر مملکت میں راہ داری کے سامان سے بھی ممیز نہیں ہوتی تھی (دیکھیے: مکس)۔

ان متناقضات کی بنا پر مناقشات ابھرتے رہتے اور مستأمن تین فیصد کی کم از کم شرح چنگی کسی دقت کے بغیر حاصل کر لینے میں کامیاب ہوجاتے (ایسے معاملات کی تاریخ کے لیے دیکھیے: Wood، ص ۲۷)۔ نیز دوسرے محاصل میں استثنا بھی حاصل کر لیتے (مثلاً بطور خاص "قصابیہ" یا "قصاب اکچیسی، مصدریہ، رفتیہ، بیسکچی، باج وغیرہ کے لیے دیکھیے: مکس)۔ مالیاتی محکمے کے کلرکوں اور دوسرے ملازمین کو ادائیگی کے رواجی عمل کی بنا پر سرکاری شرح چنگی تین فیصد سے ساڑھے چار فیصد تک جا پہنچی۔ بعض اجناس پر اضافی محصول بھی لاگو ہوتا۔ کپاس پر قنطار رسمی، ریشم پر میزان رسمی، انگوری بکری کی اون پر تمغہ رسمی وغیرہ۔ پھر ہر جہاز کو ایک مقررہ رقم (پہلے تین سو اکچہ، گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی میں نو ہزار چھ سو اکچہ تک) بندرگاہ کے بڑے افسروں کو ادا کرنا پڑتے۔ اس کا نام سلامک یا سلامتیہ ہوتا۔ مستأمن تاجروں کو قونصلیج کے طور پر اپنے سفر اور قونصلوں کی اعانت کے لیے بھی اڑھائی فیصد تک ادائیگی کرنا پڑتی۔ یہ سب ادائیگیاں، اصل محصول چنگی کے ساتھ مل کر عملی طور پر مجموعی شرح کو کم از کم نو فیصد تک پہنچا دیتیں۔ تنازعات سے بچنے کی خاطر سفیر آخرکار متعین چنگی کے حصول کا اہتمام کرتا اور اسے اپنی ملکی مراعات میں شامل کرا لیتا (دیکھیے مثلاً: ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء کی انگریزی مراعات، دفعہ ۶۲-۱۶۵)۔

(ب) تاریخی جائزہ: (۱) اطالوی جہاز ران ریاستوں کا

دور (۷۰۰ھ/۱۳۰۰ء۔۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء):

اناطولیا کے سلجوقی سلاطین نے صقلیہ اور وینس کی حکومتوں کو ۶۰۳ھ/۱۲۰۷ء سے تجارتی حقوق عطا کر رکھے تھے (O-Turan، انقرہ ۱۹۵۸، ۱۰۸، ۱۱۹، ۱۲۱)۔ اب تک موجود قدیم ترین عہدنامہ کا متن، ذوالقعدہ ۶۱۶ھ/جنوری ۱۲۲۰ء سے تعلق رکھتا ہے (Tafel and Thomas O-Turan، ص۱۲۴۔۱۳۷) ۱۲۲۵ء میں قونیہ میں ایک فرانسیسی تاجر کے سلسلے میں (دیکھیے: گیلی پولی)۔

جب عثمانی پہلے پہل ۷۵۳ھ/۱۳۵۲ء رومیلی میں داخل ہوے تو ان کے تعلقات جنیوا کے ساتھ دوستانہ تھے (جو اس وقت وینس کے ساتھ برسر پیکار تھا) اور انہوں نے جنیوا کو اولیں عثمانی مراعات عطا کیں۔ اگرچہ اس دستاویز کا پہلا متن اب دستیاب نہیں ہے، مگر ۱۹ جمادی الاولیٰ ۷۸۹ھ/جون۱۳۸۷ء کا متن محفوظ ہے (لاطینی متن کے لیے دیکھیے: Silvester de sacy: *Notices et extaits Atti della soc Lig*، در *M.Belgrano*، ۱۳:۱۴۶۔۱۴۹)۔ اناطولیا کے کسی ترکمان حکمران کی طرف سے کسی لاطینی ریاست کو دی گئی قدیم ترین تجارتی رعایت وہ ہے جو مقدس اتحاد (یعنی پاپائی مملکت، وینس، رہوڈز کے سورماؤں اور صقلیہ) اور آئیدین اوغلو خضر بیگ کے مابین ۱۳۴۸ء کے معاہدہ صلح میں موجود ہے (متن در Tafel and Thoma، ۴:۳۱۳)، مگر رہوڈز کے تاجر ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء سے ریاست میں مصروف کار تھے اور اس سلسلے میں ایک تجارتی معاہدہ بھی طے پایا تھا۔ "وینسی" قونصل خانے آٹھویں صدی ہجری/چودھویں عیسوی کے وسط میں آیا تولوق (Altoluogu) میں اور Palatia(بلت) میں قائم کیے گئے تھے (Heyd، ۱:۵۴۵) جب بایزید اول کے زمانے میں یہ مقامات عثمانی اقتدار میں آگئے تو سلطان نے مذکورہ مراعات کی توثیق

کی اور انہیں "اناطولیا اور رومیلیا میں اپنے تمام مقبوضات تک بحری وبری راستوں کے ذریعے وسعت دے دی (متن، در G.M.Thomas: *Diplomatarium*، ج۴، عدد ۱۳۴) ادرنہ کے عثمانی اقتدار میں آنے کے زمانے سے (۷۶۲ھ/۱۳۶۱ء) وینس سلطان سے مراعات کے حصول کی کوشش کر رہا تھا (I.Bratianu: *Etudes Byzantines*، پیرس، ص۱۶۷؛ ۱۹۳۸ء)۔ ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء میں وہ عثمانی علاقوں سے گندم کی درآمد کی اجازت اور عثمانی سرزمین پر ترجیحاً اسکودار بمقابل غلطہ میں تجارتی بستی کے قیام کے لیے سفارتی سرگرمیوں کو آگے بڑھا رہا تھا (Thomas: *Dipl*، ج۲، عدد۱۴۱، *F.Thiriet Regestes*، ۱:۱۶۵؛ ۸۲۲ھ/۱۴۱۹ء کے صلح نامہ میں وینس کی ریاست اور محمد اول کے دادا مراد اول کے مابین ایک معاہدے کی نشان دہی ہوتی ہے (Thomas: *Dipl*، عدد۱۷۲)۔ بایزید اول گندم کی ترسیل یا عدم ترسیل کی اجازت کے اپنے اختیار کو وینس کے خلاف سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا رہا (M.Silbrschmidt: *Das orient Problem Leipzig*، لائپزگ ۱۹۲۳ء)۔ جنگ انگورا کے بعد خانہ جنگی کے زمانے میں عثمانی تاج وتخت کے دعویداروں نے وینس کے ساتھ صلح جوئی کی ضرورت کو تسلیم کیا۔ سلیمان چلبی نے عملی طور پر اہل وینس کی اعانت طلب کی (Lorga: *Notes*، ۱:۱۲۲) اور ۸۰۶ھ/۱۴۰۳ء کے معاہدہ صلح میں پہلی بار اتحاد کے ارکان (وینس، بوزنطین، جنیوا اور رہوڈز کے سورماؤں) کو اہم رعایتیں عطا کیں(متن درThomas: *Dipl* ، ج۲، عدد ۱۵۹)۔ موسیٰ چلبی نے ۱۳ جمادی الاولیٰ ۸۱۴ھ/۳ دستمبر ۱۴۱۱ء میں فنر میں ان رعایتوں کی توثیق کی (کتاب مذکور، عدد ۱۶۴)۔ اس کے بعد ۱۷ شوال ۸۲۲ھ/۶ نومبر ۱۴۱۹ء (کتاب مذکور، عدد ۱۷۹)، ۱۵ ذوالحجہ ۸۳۳ھ/۴ ستمبر۱۴۳۰ء (عدد ۱۸۴) اور ۲۵ ذوالقعدہ ۸۴۹ھ/۲۵ فروری ۱۴۴۶ء کے معاہدات ہوئے

Mehmed,s ii Isuhester :F.Dolger و F.Babinger Statsver Trag، در Or- Chr.Per، ۱۵/۳ـ۴ (۱۹۴۷ء) ۳۵۰۰ـ۲۵۸.

محمد ثانی نے اپنے پردادا بایزید اول کی طرح اطالوی نوآباد کاروں کو خراج گزاروں کے درجے تک نیچے لے جانے کی پالیسی کو جاری رکھا۔ اگرچہ ۸۶۷ھ/۱۴۶۳ء اور ۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء کی جنگ میں وینسی تجارت کو سخت دھچکا لگا۔ کاروبار مکمل طور پر بند نہ ہوا اور ۴ ربیع الثانی ۸۸۴ھ/۲۵ جون ۱۴۷۹ء کے معاہدے کے تحت (دیکھیے: A.Bombaci، در B2 ۶۷ (۱۹۹۴): ۲۹۸-۳۱۹) اور بایزید ثانی کی طرف سے، اس کی تجدید کے ذریعہ (اختتام ذوالقعدہ ۸۸۶ھ/جنوری ۱۴۸۲ء، اصل مسودہ در Archivio di Stato، وینس) کو پہلی مراعات کے علاوہ کیفہ اور بحیرۂ اسود کے کنارے پر طرابزون میں بھی کاروبار کی اجازت دے دی گئی۔ ۹۰۴ھ/۱۴۹۸ء میں دوبارہ وینس کے خلاف برسرپیکار ہونے سے پہلے عثمانیوں نے نیپلز کے بادشاہوں کو مراعات عطا کیں (S.N.Fisher: The Foreign Ralations of Turkey، اربنہ ۱۹۴۸ء، ص۶۱)۔ عثمانی وینسی معاہدے ۲۴ رمضان ۹۰۹ھ/۲۴ مارچ ۱۵۰۳ء میں ان رعایات کو مزید وسعت دے دی گئی (Marino Sanuto، ۵:۴۲ـ۴۷)۔ ان کی تجدید سلیم اول نے (۱۶ شعبان ۹۱۹ھ/۱۷ اکتوبر ۱۵۱۳ء) اور سلیمان اول نے (۱۷ محرم ۹۲۸ھ/۱۷ دسمبر ۱۵۲۱ء میں) کی (اصل ترک مسودہ در Achivio di Stato)۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یکم جمادی الآخرہ ۹۴۷ھ/۲ اکتوبر ۱۵۴۰ء کے معاہدے کے ذریعہ (W-lehmann: Der Friedensvertrag، اوراب [ترکی متن] T.Gokbilgim، درBelgeler، ۱/۵۲، ص ۱۲۱ـ۱۲۸) تجارتی مراعات کو عرب علاقوں اور بوسنیا سمیت توسیع دی گئی، مگر طرابزون اور کیفہ کو ان سے خارج کر دیا گیا۔ وینس اور عثمانی سلطنت کے درمیان ۹۷۸ھ/۱۵۷۰ء، ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں کشیدہ تعلقات نے اس علاقے میں ایک نئے طالع آزما فرانس تک بحیرۂ روم کے علاقے میں مداخلت کا موقعہ بہم پہنچایا۔ اس وقت تک بحیرۂ روم کے علاقوں، استانبول اور مصر میں تجارتی میدان میں وینس ہی کو غلبہ حاصل تھا (بعد کی وینسی مراعات کے لیے دیکھیے، مراد ثالث، ترکی متن مخطوطہ، کتاب خانہ سلیمانیہ مسودہ مخطوطات افندی، عدد۲۳۶۲، ص۶۳ـ۷۳، [ربیع الثانی ۱۰۰۴ھ/دسمبر ۱۵۹۵ء] برلن، در J.A Serie، ۸:۳۸۴، ۴۴۲ ,Noradounghian, 1، 408-9، ۱:۴۰۸، ۴۰۹).

شام اور مصر کی عثمانی فتح کے بعد، مراعات خصوصی کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ سلیم اول نے مملوک سلاطین کی وینس (دیکھیےB.Mortiz: Ein Firman des Sultan Salim fur die Vcnctianer، در Chrift Sachau، ص۴۲۲) وبعدہ اور قشتالیہ اور فرانس کے قونصلوں کی عطا کردہ مراعات کی تجدید کی۔ (ربیع الثانی ۹۲۳ھ/مئی ۱۵۱۷ء میں بمقام غزہ سلیمان کی طرف سے تجدید شدہ شرائط کے اطالوی اور فرانسیسی متن کے لیے دیکھیے: Charriere، ۱:۱۲۱ـ۱۲۹)۔ یہ کہنا کہ یہ نسبتاً زیادہ مکمل مراعات ان مراعات کے لیے ایک مثال نہیں جو بعد میں مغربی یورپ کے ممالک کو عطا کی گئیں (J.H.Mord Tmann: Die Islamich frankischen Staatsvertrage، در Zeitschrift fur Politik، ۱۹۱۸ء) ایک مبالغہ آمیز بات ہے۔ بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ عثمانیوں نے ترجیحاً ریاست اناطولیہ کے عمل کی پیروی کی۔

قشتالیہ اور فرانس کے مشترکہ قونصل کی عطا کردہ مراعات فی الحقیقت ان مملکتوں کے مابین اقرار نامہ تھا۔ بہرحال ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء میں شاہ فرانس نے سلطان کے

ساتھ اپنے قریبی تعلقات سے فائدہ اٹھاتے ہوے، فرانس کے لیے براہ راست خصوصی مراعات کے حصول کی کوشش کی۔ وہ معاہدہ جس کا اس کے سفیر جے ڈی لا فوریسٹ (J.de la Forest) نے ابراہیم پاشا کے ساتھ گفت وشنید کے نتیجے میں خاکہ تیار کیا تھا (دیکھیے: Charriere، ۱:۲۸۵، مقدمہ)۔ سلیمان نے اس کی توثیق نہیں کی (دیکھیے:Charriere، ۴:۲۹۳)۔ اس کے بعد جلد ہی ابراہیم پاشا کو سزائے موت دے دی گئی (۲۲ رمضان ۹۴۲ھ/۱۵ مارچ ۱۵۳۶ء)۔ جے ڈی لا فوریسٹ کا تیار کردہ مسودہ معاہدہ کی اس شکل وصورت کا حامل تھا جو دو ہم رتبہ فریقوں کے مابین طے پاتا ہے۔ خصوصی مراعات کے سلسلے میں یہ اپنی قسم کا واحد امتیازی "سمجھوتہ" ہے (باقی تمام یک طرفہ طور پر عطا کیے گئے اقرارنامے تھے) اور جدید محققین نے ان کی مختلف توجیہات کی ہیں (دیکھیے Belin، ص۵۹؛ مجید خدوری، *War and Peace*، ص۲۷۳)۔ یہ حقیقت امری کہ یہ تحریر محض ایک مسودہ ہی رہی Rincon کے استانبول سے ارسال کردہ خطوط سے بھی واضح ہوتی ہے (Charriere، ۱:۳۸۹، ۳۹۶-۳۹۷، ۴۱۳-۴۱۴)۔ اس کا متن ۱۷۷۷ء میں Comte de Saint preist نے d.Aramom کی دستاویزات سے دریافت کیا تھا (G.Zeller: *Une legenda qui dure*، در *Revue d,hist mod.et Contemporaine*، ۱۹۸۸ء، ص۱۲۷-۱۳۲)۔

(۲) مغربی یورپ کی ریاستوں کے غلبے کا زمانہ (۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء-۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء): پہلی مصدقہ عثمانی فرانسیسی خصوصی مراعات ۷ جمادی الاولیٰ ۹۷۷ھ/۱۸ اکتوبر ۱۵۶۹ء سے تعلق رکھتی ہیں جن کی نسبت سلیمان کے عہد سے کی جاتی ہے۔ وہ یقیناً مملوک [عہد کی] مراعات ہوں گی جن کی سلطان نے تجدید کی تھی اور جنہیں پوری عثمانی سلطنت تک وسعت دے دی گئی تھی (Charriere، ۱:۱۲۳)۔ ۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء میں سلطان سلیم ثانی کی تخت نشینی کے ساتھ ہی نئی مراعات لازمی قرار پائیں۔ مصر میں ایسے اقدامات کیے گئے جنہوں نے فرانسیسی تجارت کو تباہ کر دیا (دیکھیے صفوت در Toem، ۳:۹۶۳) اور نئی مراعات کی ضرورت پیش آئی۔ فرانس کے بادشاہ نے اس معاملے کو سلجھانے کی خاطر کلاؤ ڈی برگ (Claude du Bourg) کو استانبول روانہ کیا (Charriere، ۳:۶۴، حاشیہ؛ *Mission diplomatique de claude du Bourg*، در *Revae d, Hist Dipl*) جس نے کسی دقت کے بغیر عہدنامہ حاصل کر لیا (دیکھیے ترکی متن در برطانیہ مخطوطات:۹۰۵۳، عدد ۲۵۲-۲۵۳، فرانسیسی متن در Testa، ۱:۹۱-۹۶)، جسے فرانسیسی سفیر Noailles نے ۱۵۷۲ء میں خوشگوار قرار دیا۔ (Testa، ۱:۳)۔ چونکہ اس سال عثمانی صقلیہ پر حملے کی تیاری کر رہے تھے (جو اس وقت وینس کے قبضے میں تھا) لہذا وہ فرانس کے ساتھ اچھے تعلقات کے قیام کے خواہش مند تھے۔ یہ مراعات وینس جیسی مراعات کے مطابق ترتیب دی گئی تھیں (دیکھیے: Art عدد ۱۶ اور Charriere، ۳:۹۱، حاشیہ ۱)۔ ان خصوصی مراعات کے نتیجے میں بحیرۂ روم کے علاقے میں فرانسیسی تجارت بڑی تیزی کے ساتھ وسعت پذیر ہوئی اور وینس سے آگے نکل گئی اور اس نے کئی دوسری یورپی مملکتوں کے تاجروں کو بھی فرانسیسی علم کے سائے میں اپنے جہاز سمندر میں اتارنے کی ترغیب دی، تاکہ وہ اس خوشحالی میں اپنا حصہ حاصل کر سکیں۔ ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء کی مراعات کے مطابق یہ غیر ملکی تاجر انگریز، پرتگیزی، ہسپانوی، قشتالی، اہل صقلیہ، اینکونن (Anconans) اور ریگوسن (Ragusams) تھے۔ اس زمانے میں سلطان صرف فرانس، وینس اور پولینڈ کو "مراعاتی مملکتیں" تسلیم کرتا تھا۔ (۲۰شعبان ۹۶۰ھ/رکیم

اگست ۱۵۵۳ء کی پولش مراعات کا ترکی متن T.gokbilgin کا شائع کردہ، در Belgeler، ۱/۲ (۱۹۶۳ء): ۱۲۸۔۱۳۰) جب ہسپانوی اثرات (۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء میں) کے تحت فرانس کی پسپائی کا آغاز ہوا، تو اس کے بارے میں سلطان کے شکوک وشبہات کو تقویت ملی چنانچہ ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء میں نئے سلطان مراد ثالث کی طرف سے فرانسیسی مراعات کی تجدید سے پیشتر انگریز تاجروں نے اپنے لیے مراعات کی درخواستیں پیش کرنا شروع کر دیں (wood، ص۷) ۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء میں جنکسن کو عطا کیے گئے، حقوق (Hakluyt، ۱۰۹:۵) کو عملی جامہ نہ پہنایا گیا۔ اس صدی کے وسط سے انگریز تاجر کوشش کر رہے تھے کہ ماسکو، قفقاز اور ہرمز کی طرف سے ایک نیا تجارتی راستہ کھولا جائے مگر یہ منصوبہ آذربائیجان پر عثمانی قبضے (۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء) کی بنا پر کامیاب نہ ہو سکا، تو انہوں نے اپنی توجہ ایک مرتبہ پھر بحیرۂ روم کی طرف پھیر دی (*England's Quest of Eastern Trade*: W.Foster، لنڈن ۱۹۳۳ء،۲۱۔۷۱)۔ لندن کے دو تاجروں اوسبورن اور سٹیپر نے سلطان کے نام ملکہ الزبتھ کا خط دے کر اپنے ایجنٹ ولیم ہاربورن کو استانبول روانہ کیا۔ ہاربورن نے "اجازت ہمایوں" حاصل کر لی جو صرف ان تینوں سربرآوردہ شخصیتوں تک محدود تھی اور انہیں استانبول میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی (محرم۹۸۸ھ /فروری۔ مارچ ۱۵۸۰ء، متن شائع کردہ اذون چارشلی در *Blleten*، ۵۱/۶۲، (۱۹۵۰ء) :۶۱۵ دستاویز:۲)۔ ملکہ کے نام اپنے جوابی خط میں سلطان مراد ثالث نے (حوالہ مذکور دستاویز:۱) انگریز تاجروں کے لیے "امان" کی منظوری دے دی تاکہ "دوستی اور اخلاص" قائم رہے۔ ان سربراہانِ مملکت کے مابین یہ مفاہمت سپین کے خلاف کی جانے والی سیاسی منصوبہ بندی کی بنا پر عمل میں آئی تھی (CSP، ونتیس، ۷: پیش لفظ، ص ۴۹ تا ۶۶)۔ اقتصادی میدان میں عثمانی حکام کو انگریزی کپڑے کی زیادہ سستی خریداری اور نئے خام مواد مثلاً ٹین اور فولاد کے حصول کی توقع پیدا ہو چلی تھی جس کی انہیں اسلحہ سازی میں ضرورت تھی۔ ۴ رمضان ۹۷۸ھ/۲۵ اکتوبر ۱۵۷۹ء کو ملکہ الزبتھ نے ایک خط میں یہ درخواست کی کہ تجارتی رعایات کو اس کی مملکت کے تمام باشندوں تک وسعت دے دی جائے (انگریزی ترجمہ از لاطینی، درKurat: *Turk Ingliz*، ص ۱۸۲۔۱۸۶) اور چونکہ اس وقت استانبول میں بعض سیاسی مدبر اسپین کے خلاف برطانوی دوستی کی ضرورت پر زور دے رہے تھے (Kurat، در کوپرولو ارمغان ص۳۰۸۔۳۱۵)۔ اس لیے فرانسیسی مراعات کی بنیاد پر ایک مکمل عہدنامہ (دیکھیے دفعہ۱۹) عطا کر دیا گیا (ربیع الثانی ۹۸۸ھ/مئی ۱۵۸۰ء) کرت کی کتاب ترک انجلیز، ۱۸۲۔۱۸۶ پر دیا گیا ترکی متن کئی اغلاط کا حامل ہے، لہٰذا اوزون چارشلی کا شائع کردہ متن در *Belleten*، ص۶۱۷۔۶۱۹) جو موزۂ بریطانیہ میں موجود (فہرست مخطوطات، Or ۹۰۵۳ وبعد، ص ۲۴۸۔۲۵۰) پر مبنی ہے جسے خصوصی مراعات کے تحت دیکھا جانا چاہیے۔ انگریزی متن کی تاریخ ۱۵۸۰ء ہے(دیکھیےHakluyt، ۱۷۸:۵۔۱۸۳؛ نیز دیکھیے P.wittek، در *Bull of the inst of Historical Research*،۱۹/۵۷ (۱۹۴۲): ۱۲۱۔۱۲۳).

M.de germigny بہرحال تجدید شدہ فرانسیسی مراعات میں یہ شق شامل کرانے میں کامیاب رہا کہ انگریز تاجر پہلے کی طرح فرانسیسی پرچم تلے جہازرانی کریں گے۔ تاہم ہاربورن نے فرانسیسی اور وینسی سازشوں کے باوجود ایک نیا عہدنامہ حاصل کر لیا (ربیع الثانی ۹۹۲ھ/۱۵۸۳ء) اور سلطان نے ملکہ کو ایک خط میں اسی ماہ کے آخر اس کی توثیق کی اطلاع دے دی (دیکھیے

Kurat: Turk- ingiliz، ص ۱۸۷، دستاویز ۵).

اس طرح بحیرۂ روم کے علاقے میں فرانس اور انگلستان کے مابین ایک طویل تجارتی کشمکش کا آغاز ہوا۔ Testa، ۱:۱۵۱-۱۷۱؛ A. Horniker: William Harborne and the Beginning of Anglo Turkish Diplomatic and Commercial Relations، در J.mod. Hist.، ج۱۸، ۱۹۴۶ء)۔ آخر کار فرانس نے نئے حالات کو تسلیم کر لیا (۱۰۱۲ھ/۱۶۰۴ء کی مراعات، دفعہ ۴)، مگر کچھ اور تصادمات بھی موجود تھے کیوں کہ ولندیزیوں نے، لیونٹ میں انگریزی پرچم تلے اپنی تجارت جاری رکھنے کو ترجیح دی۔ نتیجتاً عثمانی حکومت نے ولندیزیوں کو الگ سے خصوصی مراعات عطا کر دیں (۷ جمادی الاولی ۱۰۲۱ھ/۶ جولائی ۱۶۱۲ء، متن درDurmont: Corps diplomatique، ۵/۲:۲۰۵؛ نیز دیکھیے A.Ernstberger: Europes Widerstand gegen Hotlands erste Gesandt Schaft bei der Pfote، (۱۶۱۲)، میونخ ۱۹۵۶ء) پھر کہیں ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء میں جا کر فرانس نے اپنے اس مطالبے کے لیے باب عالی کی حمایت حاصل کر لی کہ ہر اس مسیحی قوم کے تاجروں کو جس کا استانبول میں سفیر موجود نہیں ہوگا، لازماً فرانس کے پرچم تلے تجارت کرنا ہوگی۔ (استانبول باش وکالت، ارشوی، DH II، فرنچلو دفترلری، 26 A)۔ تقریباً ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں رگوسہ (Ragusa) نے اس دعویٰ کی بنا پر کہ وہ سلطان کا خراج گزار ہے، فرانسیسی حمایت سے خلاصی حاصل کر لی (Testa، ص۱۰۱)۔ فرانسیسی ایک لمبے عرصے تک مصر میں انگریزوں کی تجارتی بستی کے قیام میں رکاوٹیں پیدا کرنے میں کامیاب رہے۔ (R. Feddem: Notes on the British Consulate in Egypt، در ۱۲-۱)۔ جمادی الاولیٰ ۱۰۵۴ھ/جولائی ۱۶۴۴ء کے ایک فرمان کے ذریعے سلطان نے مصر میں انگریز قونصل کو جنیوا اور صقلیہ کے تاجروں سے تجارتی محصول کی وصولی سے روک دیا (باش وکالت: ارشوی فرنچلو، DHY عدد 26)، لیکن ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۰ء سے ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء کے درمیانی عرصے میں انگریز لیونٹ (بحیرۂ روم کے علاقے) میں عمومی طور پر اپنے آپ کو بالادست منوانے میں کامیاب ہو گئے۔ دارالحرب کے ممالک انگریزی حمایت کی طرف رجوع کرنے کو ترجیح دیتے، کیونکہ وہ زیادہ معتبر اور کم خرچ ہوتی۔ بالآخر عثمانی حکومت نے فرانسیسی احتجاج کو نظرانداز کرتے ہوے، حربیوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنے تجارتی جہاز اپنی مرضی کے مطابق جس طاقت کے (پرچم تلے) چاہیں، سمندر میں چلاتے رہیں.

یورپی ممالک کے مابین زبردست مقابلے کی بنا پر اس عہد میں، تجارتی معاہدے میں "سب سے زیادہ مراعات یافتہ قوم" کی نئی شق کا اضافہ نمایاں ہونے لگا۔ (بطور مثال ۱۵۸۰ء کی انگریزی مراعات دفعہ ۱۹).

دوسری نئی دفعات بھی جنھیں مغربی ممالک اپنی اپنی خصوصی مراعات میں شامل کرا سکے، معاصر حالات اور دباؤ کی عکاسی کرتی ہیں۔ ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں لیلو (Lello) کی، برطانیہ کے لیے حاصل کردہ مراعات میں (ترکی متن در فریدون، منشآت، ۲:۳۸۱-۳۲۵)۔ ۱۷ نئی دفعات نظر آتی ہیں (دیکھیے: سینڈرسن: Travels، لنڈن، 1931-7-282)۔ جہاں انگلستان کے لیے "سب سے زیادہ مراعات یافتہ قوم" کے منصب کی توثیق کی گئی ہے اور ولندیزیوں کو انگریزی پرچم کے تحت کر دیا گیا ہے یہ فرانسیسیوں کے لیے ایک شکست تھی اور سونے چاندی کی نقدی کی آزادانہ نقل وحرکت کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ آخری شق چاندی کی کرنسی میں تجارت سے متعلق ہے جو اس وقت ایک اہم اقتصادی مسئلہ تھی (دیکھیے:

Belleten xv، در H.Inaleik (۱۹۵۱ء):۶۵۶تا۶۶۲)۔ اس میں ایک اور اہم شق وہ تھی جو انگریزوں کو ان اشیا پر جو وہ وینس اور دوسرے مقامات سے لائیں، تین فیصد مالیت داری محصول کی ادائیگی کی زد میں لاتی تھی۔ اس کی بنا پر دوسری قوموں کو بھی ترغیب ملی کہ وہ پانچ فیصد شرح کے مطابق، برطانوی پرچم تلے اپنی برآمدات روانہ کریں۔ بعد میں ایک اور شق، ہنڈی کے غلط استعمال کی روک تھام کے لیے داخل کی گئی (Noradounghian، ۱:۱۶۵، دفعہ ۵۸)۔ جمادی الاخریٰ ۱۰۸۶ھ/ستمبر۱۶۷۵ء میں، جان فنچ کی سفارت کے دوران میں، ایک نئی دستاویز رعایات ترتیب دی گئی جو پہلے سے موجود تمام حقوق اور "خط ہائے ہمایوں" کو محیط تھی، جو گذشتہ سالوں میں عطا کیے گئے (G.F.abbott در Under the Turk، لنڈن ۱۹۲۰ء)۔ اس میں اضافہ کی گئی شقوں میں سب سے اہم وہ تھی (Noradounghian، ۱:۱۶۷، دفعات ۷۲ـ۷۵) جو اون اور ریشم پر عائد حد درجہ زائد محصول کی ممانعت سے متعلق تھی۔ یہ وہ اہم ترین اشیا تھیں جو انگریز تاجر سمرنا کو برآمد کرتے تھے۔ ایسے محصولات تنازعات کا باعث بن رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ فنچ نے ناکام کوشش کی کہ اپنے ملک کے حکمران کے لیے "پادشاہ" کا لقب حاصل کر سکے جس سے فرانسیسی حکمران (King) ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۳ء سے متمتع ہو رہا تھا (فریدون ۲:۴۰۰)۔ فنچ کی حاصل کردہ مراعات فرانسیسی اور وینسی حسد کو ابھارنے کا باعث بنیں (Abbott، ص۱۴۷)۔

گیارھویں/سترھویں صدی میں عثمانی و فرانسیسی سیاسی تعلقات میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ فرانسیسی مراعات اور ان سے پیدا شدہ اثرات میں تبدیلی واقع ہوتی رہی۔ محمد ثالث کے تحت مراعات کی تجدید (۱۰۰۵/۱۵۹۷ متن درdeRauses، ۱:۱۴۱ـ۱۴۵) اور احمد اول (۱۰۱۲ھ/۱۶۰۴ء؛ متن درTesta، Noradounghian، i،۹۳ـ۱۰۲؛ ترکی متن در فریدون، ۲:۴۰۰ـ۴۰۴) سرگرم تعلقات کے دور کی بات ہے، جس کی بنا پر فرانسیسی بعض نہایت اہم نئی دفعات حاصل کرنے کے قابل ہوئے (F.S.de Breves: Relation، پیرس ۱۶۳۰؛ مقالات کا تنقیدی مطالعہ، در Belin، ۸۴ـ۹؛ J.der:Gontaut در Biron، Ambassade in Turqui، ۱۶۱۰ـ۱۶۰۵، ۲ جلدیں، پیرس، ۱۸۸۸ـ۱۸۸۹)۔ پہلی صورت حال میں اہم ترین دفعات "تمام قوموں" کے لیے ماسوائے وینس اور انگلستان کے تجارتی جہازوں کی آمد ورفت فرانسیسی پرچم تلے ضروری قرار دیتی تھیں...... غلے کی برآمد، چاندی کے سکوں میں تجارت کی آزادی (اس موضوع پر ایک "فرمان" کے لیے دیکھیے: باش وکالت ارشوی: فکرت تصنیفی، عدد ۲۳۹۶)، اور بربروں کی بحری قزاقی کے خلاف تحفظات کے سلسلے میں ۷ (دفعات ۱،۴،۸) مابعد کی صورت حال القدس کو جانے والے عیسائی زائرین اور وہاں رہنے والے راہبوں کے فرانسیسی حق تحفظ کو تسلیم کرتی تھیں (دفعات ۴،۵)۔ یہی دفعات تھیں جنہوں نے زمانہ مابعد میں، عثمانی سلطنت میں مقیم تمام کیتھولک عیسائیوں اور کیتھولک مشنریوں کی حفاظت کے لیے فرانس کے حق کی بنیاد رکھی۔ ۱۶۱۹ء/۱۰۲۸ھ میں Comte de cesy کی مراعات کی تجدید کے لیے کوشش ناکام ہوگئی (Tongas، ص۲۰) اور اس وقت سے باب عالی میں اور بحیرۂ روم کے ممالک کی منڈیوں میں فرانسیسی اثرات زوال پذیر ہونے لگے۔ (Masson،۱:۱۲۴ـ۱۳۰؛ Tongas، ص۱۳۹ـ۲۱۵)۔ باب عالی نے جنیوا کو الگ مراعات عطا کر دیں، جو اب تک فرانسیسی پرچم تلے تھا اور اس کے محصول کی شرح میں تین فیصد تک کمی کر دی (Voyagas Chardion: ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء، ج:۱ ایمسٹرڈم، ۱۷۱۱ء ص۶ـ۱۷، متن در

Noradoughian: ۱۲۴۔۱۳۲) کوپرولو (وزراء اعظم) کے عہد اقتدار میں فرانس کے ساتھ سیاسی تعلقات، کچھ عرصے کے لیے معطل ہوکر رہ گئے اور فرانسیسی تجارت ۱۶۲۰ء/۱۰۲۹ھ کے مقابلے میں دسویں حصے تک گر گئی (Tongas،۳۱:۱، ص ۶۵۵).

بالآخر کولبرٹ کی بحیرۂ روم کی تجارت کو از سرنو زندہ کرنے کی مساعی کے نتیجے میں، فرانسیسیوں نے ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۳ء میں اپنی مراعات کی تجدید، مع اہم نئی دفعات، میں کامیابی حاصل کی (ترکی متن در معاہدات مجموعہ سی، ۱:۴ تا ۱۴ (فرانسیسی متن در Noradoughian، ۱:۱۳۶۔۱۴۵؛ محمد پنجم کا ایک خط متعلق بہ عہدنامہ در Testa، ۱۶۹:۲؛ گفت وشنید کے لیے دیکھیے A.Varrdal: Les vovages du Maraquis de Nointe، ۱۶۷۰۔۱۶۸۰ وپیرس ۱۹۰۰، ص۹۹۔۱۱۲)۔ ان نئی دفعات میں سے اہم ترین وہ تھیں جن میں محصولات کی شرح تین فیصد تک کم، ''سب سے زیادہ مراعات یافتہ قوم'' کا سا برتاؤ، اور باب عالی میں ''یسوعی'' اور کپوسن مشنریوں کی حفاظت کے فرانسیسی حق کو تسلیم کر لیا گیا تھا.

۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء سے جب کہ یورپ میں دولت عثمانیہ کو کئی طرح کے خطرات کا سامنا ہوا اور باب عالی کو یورپی طاقتوں کی سفارتی اعانت کی ضرورت محسوس ہوئی، مراعات خصوصی کا ادارہ ایک نئے مرحلے میں داخل ہوا۔ اس وقت سے نئی مراعات سیاسی اعانت کے لیے برابری کے تعلقات کی ایک واضح علامت کے طور پر عطا کی جانے لگیں.

۱۶۹۰ء/۱۱۰۱ھ کے ایک ''خط شریف'' کے ذریعے فرانسیسیوں نے مصر میں محصولاتی رقم میں ۱۰ فیصد سے ۳ فیصد تک کمی اور القدس کے کئی مقدس مقامات کی کیتھولکوں کو واپسی میں کامیابی حاصل کر لی۔ (Hist. de marseille، ص ۸۹۔۹۰، ۱۶۹۷ء/۱۶۹۷ھ میں جب فرانس نے ھبس برگ کے لوگوں کے ساتھ صلح کر لی تو باب عالی نے انگلستان کی طرف رجوع کیا: مصر اور استانبول کے مابین تجارتی مال لے جانے کے لیے انگریزوں کو اجارہ داری مل گئی اور مصر میں ایک انگریزی قونصل خانہ کھولا گیا (Fedden، کتاب مذکور، ص۱۳۔۱۴) ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء اور ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء کے مابین فرانس کے ساتھ مفاہمت نے ایک بار پھر تصویر کا رخ بدل ڈالا: مرقس ڈی ویلینیو (Marquis de Villeneuve) جس نے ان مذاکرات میں ثالث کے طور پر حصہ لیا تھا جو معاہدہ بلغراد (۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء) پر منتج ہوے، اور جس نے اس کے لیے اپنے بادشاہ کی ضمانت پیش کی تھی (دیکھیے: A. Vandeal: *Une ambesade francaise en orient* sous louis xv، پیرس ۱۸۸۷ء)۔ اس نے اب تک حاصل شدہ حقوق سے کہیں بڑھ کر رعایتیں حاصل کیا (۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء ترکی متن در معاہدات مجموعہ سی، ۱:۱۴۔۳۵ فرانسیسی متن در Testa، ۱:۱۸۶۔۲۱۰؛ Noradoughian ۱:۲۷۷۔۳۰۰ سلطان نے اپنے ورثا تک کی جانب سے ان مراعات خصوصی کی توثیق کر دی (دیکھیے: ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۱ء کی پروشین مراعات در معاہدات مجموعہ سی،۱:۹۰)۔ اس طرح عثمانی حکومت نے اپنا وہ قیمتی سودا قربان کر دیا جو ہر نئی حکومت کے آغاز پر نئی مراعات کے سلسلے میں مذاکرات کے وقت اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ آنے والے برسوں میں فرانسیسیوں نے بحیرۂ روم کے علاقے کی تجارت اور عثمانی بندرگاہوں کے مابین نقل وحمل کے سلسلے میں ایک ناقابل مزاحمت رتبہ حاصل کر لیا (دیکھیے: R.Paris، ۱:۹۳۔۱۰۹) یورپ کی ہر اس مملکت نے جو کسی بھی اعتبار سے اقتصادی ترقی کر رہی تھی اب اپنی اپنی ''لیونٹ کمپنی'' ترتیب دینی شروع کر

دی اور باب عالی سے خصوصی مراعات کے حصول میں مشغول ہوگئی۔ عثمانیوں نے فرانس، انگلستان اور ہالینڈ کے مراعات یافتہ مقام کو کمزور کرنے کی پالیسی کے تحت اپنا رد عمل ظاہر کیا۔ (Sweden: ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۷ء، متن در Noradoughian، ۱:۲۳۹؛ ترکی متن در معاہدات مجموعہ سی، ۱:۱۴۶؛ ۱۱۵۳/۱۷۴۰: The Kingdom of the Sricilles، متن در Noradoughian،۱:۲۷۰؛ ڈنمارک: ۱۱۷۰/۱۷۵۶، فرانسیسی متن در Noradoughian، ۱:۳۰۸، ترکی متن در معاہدات مجموعہ سی، ۱:۵۲؛ پروشیا ۱۱۷۴/۱۷۶۱: فرانسیسی متن در Noradoughian،۱:۳۱۵؛ ترکی متن در معاہدات مجموعہ سی، ۱:۸۳؛ اندلس ۱۱۹۷/۱۷۸۳ ترکی متن در جودت، تاریخ، ۲:۳۳۸-۳۴۳ اور معاہدات مجموعہ سی، ۱:۲۱۲؛ فرانسیسی متن در Noradoughian، ۱:۳۴۴).

یہ مراعات عطا کرنے میں باب عالی کا اصلی مقصد سیاسی طور پر یورپ میں دوستوں کا حصول تھا (بالخصوص اندلس کو دی جانے والی مراعات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: جودت، ۱:۱۸۴-۲۰۳)۔ ایک نیا مرحلہ اس وقت درپیش آیا، جب دباؤ کے تحت، سلطنت عثمانیہ کے دو طاقت ور حریفوں روس اور ھبس برگس کو خلاف مرضی مراعات دی گئیں اور بحیرۂ روم کے علاقے میں مغربی اقوام کے غلبے کو خطرہ محسوس ہوا۔

(۳) خصوصی مراعات کا یورپی استعماری نظام کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال: نویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی کے وسط سے جرمن تاجر وینس کے تحفظ کے تحت آگسبرگ اور نورمبرگ سے استانبول آنے جانے میں متحرک رہتے تھے(دیکھیےH.Kellenbeny: Hendelsverbindung zwischen Mitteluocuopa und Istambul در Studi Venczianeی، ۹:۱۹۳-۱۹۹) کسٹم سے متعلق تحریرات بھی بریسلاؤ (Breslau) سے عثمانی (سلطنت کے علاقے) ہنگری میں بری راستے سے کپڑے کی درآمد کی تصدیق کرتی ہیں (L.Fekete and Gy. Kaldy Nagy: Rechnungsbuchher Turkicher Finanzstellen in Buda offem، ۱۹۶۲ء بوڈاپسٹ، ص۷۳) اس معاہدے کے تحت جو ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء شاہ چارلس پنجم اور فرڈننڈ کے ساتھ طے پایا تاجروں کو امن وامان کے ساتھ آنے جانے کی اجازت تھی (فریدون، ۲:۳۴۰-۳۴۱)۔ ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں معاہدۂ زستوا۔ طورک کی تجدید کے وقت (فریدون، ۲:۳۲۴؛ معاہدات مجموعہ سی، ص ۷۵، دفعہ:۹-۱۰، لاطینی متن در Noradoughian، ۲:۱۱۳-۸) شاہ چارلس آسٹریا، اندلس اور فلینڈرز کی اطاعت کا دم بھرنے والے تاجروں کو سفر کرنے، اور تین فیصد کی شرح محصول کے ساتھ تجارت کرنے کی اجازت دی گئی۔ علاوہ ازیں یسوعی پادریوں کو بھی عثمانی مقبوضات میں رہائش پذیر ہونے اور گرجے قائم کرنے کی اجازت مل گئی (دفعہ ۷)۔ ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء میں آسٹریا نے ایک تجارتی کمپنی قائم کرکے "لیونٹ" کی تجارت میں عملی کردار ادا کرنے کا عزم کیا (H.Hassinger: *Die erste wiener Handels kompanie*، (۱۹۳۲ء) :۵۳) لیکن دونوں مملکتوں کے مابین عداوت کے نتیجے میں ان تجارتی رعایات سے عملی طور پر پورا فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔ اگرچہ ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء کے معاہدہ کارلووٹز کے تحت عثمانیوں نے وہ مراعاتِ خصوصی جو دوسری یورپی اقوام کو دے رکھی تھیں، ان قوموں تک وسعت دینے پر رضامندی کا اظہار کیا جو ھبس برگ شہنشاہ کے تحت تھیں، مگر متاخر الذکر مکمل مراعات معاہدۂ پاسا رووئز کے بعد ہی حاصل کر سکے (۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء، فرانسیسی متن در Noradoughian، ۱:۲۲۰-۷؛ ترکی متن در معاہدات مجموعہ سی، ۳:۱۱۲-۱۲۰)۔ ان مراعات کے تحت جہازوں کو ڈینیوب میں کھلے عام

جہاز رانی کی اجازت تھی، مگر وہ بحیرۂ اسود میں داخل نہیں ہوسکتے تھے (دفعہ ۲۰)۔ شہنشاہ ہر اس مقام پر جہاں کسی دوسرے ملک کا قونصل خانہ موجود ہو، بلکہ ایسی کسی دوسری جگہ پر بھی جہاں وہ مناسب خیال کرے اپنا قونصل خانہ قائم کر سکتا تھا۔ آسٹریا اور ایران کے تاجروں کو اجازت تھی کہ وہ ڈینیوب اور بحیرۂ اسود کے راستے تجارت کر سکیں، بشرطیکہ پانچ فیصد محصول ادا کریں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان مراعات میں کسی رسمی تصدیق کا نشان نہیں ملتا۔ جرمنی کے ساتھ تجارت ڈینیوب کے ذریعے مگر زیادہ تر ٹریسٹ اور وینس کے راستے وسعت پذیر رہی(Observations: H.Groenville، طبع A.S Ehrenkreutz Ann Arbor، ۱۹۶۵ء، ص۵۴)۔ ان مراعات کی تجدید ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں کی گئی (ترکی متن در معاہدات مجموعہ سی، ۲:۱۳۵-۱۴۲)۔ شہنشاہ نے یہ رعایت بھی حاصل کر لی کہ تس کینی کے گرنیڈ ڈچی، ہیمبرگ اور لیوبک کے تاجر اس کے پرچم تلے سفر کریں گے (جیسا کہ جیوا کے تاجر ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۵ء سے ایسا کر رہے تھے)۔ روس کے ساتھ مسابقت نے آسٹریا کو اس بات پر اکسایا کہ وہ نئی دفعات اور ایک نئی سند حاصل کرے جس میں ضمانت دی گئی ہو کہ (ان دفعات کا) احترام کیا جائے گا۔ (۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء، فرانسیسی متن در Noradounghian، ۱:۳۷۹-۳۸۲، ترکی متن در معاہدات مجموعہ سی، ۳:۱۵۲- ۱۵۵) ان دفعات میں درج ذیل امور بھی شامل تھے۔ ویلشیا اور مولدیویا میں قونصل خانوں کے قیام کا حق، سمندر (بشمول بحیرۂ اسود) کے راستے مزید برآں دریاؤں کے ذریعے جہاز رانی کا وہی حق جو روس کو حاصل تھا اور اس امر کی منظوری کہ اکیلا آسٹروی پاسپورٹ ہی مسافر کے لیے کافی وجہ جواز ہوگا۔

نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی میں روسی تاجر ازک (ازوف) اور کیفے میں تجارت کرتے تھے اور صدی کے آخر تک برصہ میں ان کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے (۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء میں آئیون سوم نے اپنے سفیر "پلیش چے یو" کو استانبول بھیجا تاکہ ان تاجروں کے لیے سہولتیں حاصل کر سکے)۔ یہ لوگ انفرادی طور پر سفر کرتے تھے یا شخصی اذن ہمایوں کے ذریعے یا مسلمان تاجروں کی طرف سے امان کے ذریعے (بطور مثال دیکھیے Burs,da ipekculik:F.Dalser، استانبول ۱۹۶۰ء، ص۱۹۱)۔ پوستین کی بڑی مارکیٹ قازان پر زار کے قبضے کے بعد (۹۵۹ھ/۱۵۵۲ء) تجارتی روابط میں وسعت پیدا ہوئی۔ سلطان، شاہی محل سے وابستہ تاجروں کو ماسکو، پوستین خریدنے کے لیے، بھیجنے لگا (مثلاً دیکھیے:Dalsar، ص۱۹۲-۱۹۳) اور زار کے تاجر، شخصی اجازت نامے لے کر، ریشمی کپڑا خریدنے کے لیے برصہ آنے لگے۔ ۱۱۱۲ھ/۱۷۳۹ء کے معاہدۂ استانبول میں تجارتی مراعات کا مسئلہ آئندہ مذاکرات پر چھوڑ دیا گیا (دفعہ۱۰)، لیکن ایک خصوصی شق کے تحت روسی راہبوں کو القدس کی زیارت کی اجازت دے دی گئی (دفعہ ۱۲)۔ معاہدۂ بلغراد کی دفعہ۹ (۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء) دونوں ملکوں کے تاجروں کو کھلی تجارت کی اجازت دیتی تھی، مگر شرط یہ تھی کہ بحیرۂ اسود میں اشیائے تجارت صرف ترکی جہازوں کے ذریعے لائی جائیں گی۔ کوچک کائنارجہ کے تحت (۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء) باب عالی نے روس کا، جیسا کہ اس نے مغربی اقوام کو دے رکھا تھا عثمانی سمندروں میں، واضح طور پر بشمول بحیرۂ اسود، آبنائے ڈینیوب، جہاز رانی کا حق تسلیم کر لیا۔ بحری یا بری راستے سے آنے والے روسی تاجر "انتہائی مراعات یافتہ قوم" کے رتبے کے حقدار قرار پائے۔ روس کو انگریز اور فرانسیسی مراعات کے تمام عہد وپیمان دیئے گئے اور زار کو اجازت دی گئی کہ وہ جہاں

چاہے قونصل خانے اور نائب قونصل خانے قائم کرے۔ باقی دفعات میں دیئے گئے مزید حقوق کا تعلق مجرموں سے (دفعہ ۶)۔ سفرا اور ان کے کارندوں کی سفارتی استثناء (دفعہ ۵ و ۹)، عیسائی باشندوں کے تحفظ (دفعہ ۸۷ اور ۱۴) اور آخری نقطے کے طور پر زار کو "پادشاہ" کا خطاب دینے سے تھا (دفعہ۱۳)۔ چونکہ یہ تمام رعایتیں (جدید نقطۂ نظر سے) ایک دو طرفہ معاہدے کا حصہ تھیں، لہٰذا وہ اپنی ہیئت اور قانونی خصوصیت دونوں لحاظ سے عہدناموں سے مختلف تھیں، جو باب عالی کی جانب سے، یک طرفہ انداز میں فرانس اور انگلستان کو عطا کیے گئے اور پھر پانچ سال بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ جب باب عالی نے ان جہازوں کو روکنے کی کوشش کی جو استانبول کے لیے ضرورت کا سامان روس کو لے جا رہے تھے تو روس نے اس اقدام کو معاہدے کی خلاف ورزی (نقض عہد: جودت ۲: ۱۳۵) قرار دیا، اور ویلیشیا، مولدیویا اور سینوپ جیسے حساس علاقوں میں روسی قونصل خانوں کے قیام سے آویزش اور تناؤ پیدا ہوا (جودت، ۲: ۱۴۴؛ ۷: ۲۲۵)۔ باب عالی، اب بھی واضح طور پر خصوصی مراعات کو ایسی رعایات سمجھتا تھا جو دوست ممالک کے باشندوں کو کھلے دل سے دی گئی تھیں، مگر روس نے اب اپنا دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ ایائلی قاوق کے وضاحتی بیان میں (۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء: ترکی متن در معاہدات مجموعہ سی، ۲: ۲۷۵-۸۴) فرانسیسی متن در Noradoughian، ۱: ۳۳۸) معاہدہ کوچک قینارجہ کی دفعہ ۲ پر نظرثانی کی گئی اور اس بات کو دہرایا گیا کہ یہ ایک باہمی معاہدہ ہے (دفعہ ۶) جسے یک طرفہ طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ آخرکار کریمیا پر قبضے کے بعد روس نے باب عالی کو مجبور کیا کہ وہ اس "ادغام" کو تسلیم کرلے اور اکیاسی شقوں پر مشتمل مکمل مراعاتِ خصوصی، دینے کا اعلان کرے، جس کی بنیاد وہ

مراعات خصوصی ہوں گی جو فرانس اور انگلستان کو عطا کی گئی تھیں" (۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء: ترکی متن در معاہدات مجموعہ سی، ۳: ۲۸۵-۳۱۹؛ فرانسیسی متن در Noradoughian ۱: ۳۷۱-۳) دیباچے میں اور اختتام پر بھی یہ واضح کیا گیا کہ یہ "عہدنامہ" کوچک قینارجہ معاہدے کا ایک اضافی حصہ ہے۔

اس قانونی نوشتے نے یورپی طاقتوں کے ساتھ بابِ عالی کی مراعات خصوصی کے عہد ناموں کو ایک نئی ہیئت دی۔ بالخصوص انہوں نے بحیرۂ اسود کو روسی جہازوں کے لیے کھول دینے کے خلاف اپنے ردعمل کا اظہار کیا اور پہلے قدم کے طور پر، اپنی تجارت کو وسعت دینے کی امید میں، روس نے ان کی حوصلہ افزائی کی (Wood، ص۱۸۰-۱۸۱) دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی سے انگریزوں (Wood، ص ۴۹-۵۴؛ Grenville، ص ۴۹؛) اور فرانسیسیوں نے (Masson، ص۲: ۶۳۷-۶۵۵؛ R.Paris، ص ۴۵۵) بحیرۂ اسود میں بار بار داخل ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہے تھے۔ اب جبکہ روس نے یہ حق حاصل کر لیا تو انہوں نے بھی اپنے لیے اپنی اپنی حاصل کردہ مراعاتِ خصوصی کی شقوں کے مطابق' "انتہائی مراعات یافتہ قوم" کی بنیاد پر ویسی ہی رعایت کا مطالبہ کیا، لیکن یہ رعایت انہیں فوری طور پر نہیں دی گئی۔ انگریزوں نے اسے ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں ایک "تحریر" کے ذریعے (متن درNoradoughian، ۲: ۳۳-۳۶) اور فرانس نے معاہدۂ پیرس کی دفعہ ۲ (۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء متن در معاہدات مجموعہ سی، ص: ۳۶؛ منشورات کے لیے دیکھیے: Soysal : *Franis*، *Ihtilal ve Turk Fransis munasebetteri* ۱۸۰۲ھ/۱۷۸۹ء انقرہ ۱۹۶۴ء، ۳۱۵-۳۳۷) کی رو سے حاصل کیا۔ بعد میں یہی حق دوسری طاقتوں کو بھی عطا کیا گیا (سردینیا، ڈنمارک، سپین، سسلی کی دونوں حکومتیں، تس کینی دیکھیے: Noradoughian، ۲: ۱۰۲، ۱۳۷؛ ۱۴۰، ۲۱۹).

(۴) مراعات خصوصی کا غلط استعمال اور ان کی منسوخی کی کوششیں: بارھویں صدی ہجری/اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام تک سلطنت عثمانیہ کا رویہ یورپ کی تاجر اقوام کے ساتھ وہی روایتی قسم کا رہا جو وہ عام تجارتی امور میں اختیار کیے ہوے تھی اور اس نے فراخ دلانہ رعایات عطا کیں جن کی بنیاد امان کے تصور پر استوار تھی بغیر یہ سوچے سمجھے کہ بعد میں ان کے کیسے خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔ ۱۷۷۱ء میں باب عالی کا خیال تھا کہ اس سے زیادہ کا مطالبہ قطعاً غیر ممکن ہوگا (Observations، ص۳۵۷، ۴۶۴)۔ بحیرۂ روم کے علاقے کی تجارت کے ایک ماہر نے تسلیم کیا (Masson، ۱:۴۷۳) کہ عثمانی سلطنت سے اس سے زیادہ مراعات کا حصول بہت مشکل تھا۔ اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ یورپ والوں نے ان رعایات کا نہایت توہین آمیز انداز میں غلط استعمال کیا۔ صدی کے آخری برسوں میں وسعت پذیر استحصال نے دولت عثمانیہ کو سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے مغربی یورپ کا اس قدر دست نگر بنا دیا تھا کہ فرانسیسی سفیرChoiseul-gouffier عثمانی سلطنت سے فرانسیسی حکومت کے سامنے مکمل طور پر سرنگوں ہونے کا مطالبہ کر سکا (Masson، ۲:۲۷۹)۔ اٹھارویں صدی سے پیشتر یہ رعایتیں عثمانی ریاست اور اس کی اقتصادیات کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہیں تھیں، عثمانی حکومت ابھی اتنی طاقت ور تھی کہ ان زیادتیوں کا تدارک کر سکے، لیکن اب کمزور عثمانی حکومت کے خلاف یورپی حکومتیں دباؤ بڑھا رہی تھیں اور دھمکیاں دے رہی تھیں تاکہ مراعات کو نہ صرف بحال رکھ سکیں، بلکہ ان میں مزید وسعت پیدا کر سکیں۔ وہ ان زیادتیوں کی اصلاح کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے میں کامیاب رہیں۔ وہ بدمعاملگی جس نے فی الحقیقت سلطنت (عثمانیہ) کو گھن لگا دیا وہ "مراعاتی" حقوق کو باب عالی کی ذمی رعایا تک وسعت دے دینا تھا، کسی دارالحرب کا مستامن عثمانی رعایا سے بھی بڑھ کر رعایتوں سے مستفید ہو رہا تھا۔ بعض ذمیوں نے اپنے لیے ان مراعات کے حصول کا ایک اور طریقہ نکال لیا۔ وہ باب عالی سے، غیر ملکی سفرا اور قونصلوں کو رشوت دے کر اپنے کارندوں کے تقرر (بیرات) کی دستاویز حاصل کرنے لگے۔ مراعات خصوصی کے تحت سفرا اور قونصلوں کو مخصوص حد تک اپنے نمائندوں کے تقرر کا حق حاصل تھا اور ایسے ترجمان کو بیرات عطا کرنے کی بنا پر (نمونہ کے لیے دیکھیے: باش وکالت ارشوی: DHY Ecmbi Deterleri، لنڈن، پبلک ریکارڈ آفس، ۱۰۵/۳۳۴) سلطان نے اس کے حامل اور حامل کے بیٹوں اور ملازمین کو جزیہ کی ادائیگی سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا جو عام رعایا پر لاگو ہوتے۔ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں مغربی اقوام نے اپنے کارندوں کے لیے بھی سفارتی استثنا حاصل کر لیا (دیکھیے کتاب مذکور، ۱۰۸۶ھ/۱۶۵۷ء کی انگریزی اطاعت کی دفعہ ۴۵:

معاہدات مجموعہ سی ۱:۲۵۱؛ Noradoughian، ۱:۱۵۷)۔ سفیروں اور قونصلوں نے معاوضہ کی خاطر۔ ایسے ذمیوں کے لیے بھی بیرات حاصل کرنا شروع کر دی جنہیں سفارتی ترجمان ہونے کا ہرگز ادعا نہ ہوتا، اور اس طرح وہ خاصی بڑی رقمیں ہتھیانے لگے۔ یہ "بیراتری" (Barataires) اور ان کے ملازمین (Sous-barataires) جو ویسی ہی رعایات سے مستفید ہوتے تھے، مستامنوں جیسے مالی اور قانونی مفادات سے بہرہ ور ہوتے اور اس طرح کم تر شرح پر محاصل ادا کرتے۔ ۱۲۰۸ھ-۱۷۹۳ء میں، صرف حلب ہی میں تقریباً پندرہ سو ذمی تاجروں کے پاس ترجمانوں کی بیرات موجود تھی اور جب اس معاملے کی جانچ پڑتال کی گئی تو صرف چھ افراد حقیقی ترجمان ثابت

ہوے۔(کسی تاریخی جودت، ۱:۱۳۰؛ ۱۱۷۸ھ/۱۷۶۴ء میں، سالونیکا میں ایسی ہی جانچ پڑتال کے لیے دیکھیے (ص۱۵۲؛ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء اور ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں مزید جانچ پڑتال کے لیے دیکھیے جودت، ۳:۱۳۰،۲۷۰؛ ۸: ۱۰۷).

صرف یہی ایک غلط استعمال نہیں تھا۔ مراعات یافتہ طاقت، یہ حقوق ایسے "تحفظ یافتہ" افراد تک بھی وسعت دینے کی مجاز تھی جو اس کی اپنی رعایا نہ ہو، یوں کسی عثمانی باشندے کو صرف یہ ضرورت ہوتی کہ غیر ملکی افراد کو عطا کی گئی مراعات خصوصی کے ذریعے دیئے گئے حقوق سے مستفید ہونے کے لیے کسی متعلقہ سفیر یا قونصل سے "سند حق ایجاد" (Patent) حاصل کرے۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں رومیوں نے ایک لاکھ بیس ہزار یونانیوں کا بطور "تحفظ یافتہ افراد" اندراج کر رکھا تھا (Barataires، اور Proteges کے لیے خصوصی طور پر دیکھیے F.Rey: *La Protection diploamatique et consulaire dans les Echelles du levant et de Barbarie*، پیرس ۱۸۹۹)۔ سلیم ثالث کے عہد میں عثمانی مدبرین نے خصوصی مراعات کی مخالفت میں متحدہ رد عمل کا اظہار کیا اور عثمانی رعایا کو اس "غیر مراعاتی" رتبے سے نکالنے کے لیے کئی اقدامات کیے گئے جن کا وہ شکار ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء میں ایک ذمی تاجر اور اس کے دو نائبوں کو جو یورپ کے ساتھ تجارت کرتے تھے، تمام وہ حقوق اور استثنا حاصل تھے جو کسی مستامن اور اس کے ملازمین کے ترجمان کو حاصل ہوتے تھے" (دیکھیے: ع نوری: مجلّہ امور بلدیہ، ۱:۶۷۵۔ ۶۷۶)۔ ایسے لوگوں کو "اروپا تجاری" کہا جاتا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد بعض مسلمان تاجروں کو جو ایران اور ہندوستان کے ساتھ تجارت کرتے تھے بذریعہ بیرات وہی حقوق عطا کیے گئے (کتاب مذکور: ۶۸۱۔۶۸۵) اور انہیں "خیریہ تجاری" کہا گیا۔ ان کے معاملات خصوصی انتظامی طریق کار اور خصوصی عدالت کے تابع ہوتے تھے.

اعیان، یعنی مقامی مطلق العنان حکام نے جو اس وقت مملکت کے مختلف صوبوں میں اپنی طاقت بڑھا رہے تھے (فلسطین میں شیخ ظاہر اور بعد میں جزار احمد پاشا، مصر میں محمد علی، رومیلی میں تپہ دیلنلی علی پاشا [رک بآں] اپنے اپنے مخصوص مالی مفادات کے پیش نظر "مراعات خصوصی" کے غلط استعمال سے پیدا شدہ برے اثرات کے خلاف عملی جدوجہد کی اور موزوں اقدامات کیے جیسے بعض اشیا کی برآمد کو ممنوع قرار دینا، اجارہ داری کی تنفیذ اور ایسی اشیا کی فروخت پر سرکاری محاصل کی وصولی، برآمدی اشیا تجارت کی قیمتوں کا تعین اور مستامنین کو دیئے گئے حقوق جہاز رانی کی تنسیخ۔ مرکزی حکومت نے بھی، بتدریج اجارہ داری (ید واحد) اور برآمدی اشیا پر "التزام" [رک بآں] کا استعمال شروع کر دیا تاکہ محاصل میں اضافہ ہو سکے۔ یہ ایک قدیم اصول تھا جو مکمل طور پر حکومت کے اختیار میں تھا۔ پھر اندرونی محاصل اور دوسرے سرکاری واجبات جو اندرونی تجارت پر لاگو تھے، ایسے امور تھے جو "خصوصی مراعات" کے دائرۂ اختیار سے باہر تھے۔ بہرحال، ۱۸۳۰ء کے قریب مغربی طاقتیں، خصوصاً مملکت انگلستان، صنعتی انقلاب سے پیدا شدہ نئی صورت حال میں ضرورت محسوس کر رہی تھیں کہ بحیرۂ احمر کے علاقے کی منڈیاں زیادہ محفوظ، مستحکم اور بآسانی قابل رسائی ہونی چاہئیں۔ ایک سیاسی بحران سے فائدہ اٹھاتے ہوے انگلستان ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء کے میثاق بالٹا لیمان کے ذریعے اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا (متن عظیم برطانوی دستاویزات پارلیمنٹری (۱۸۳۰ء)، ص۲۹۱۔ ۲۹۵؛ Noradoughian، ۲:۲۴۹ اور نوٹ ص ۲۵۴ پر؛ V.J Puryear: *International Economics and Diplomacy in the Near East*، ۱۹۲۹ء،

۱۷۔۱۱۔۲۶) اس تجارتی معاہدے نے نہ صرف یہ کہ تمام موجودہ مراعاتی، حقوق کی ہمیشہ کے لیے توثیق کر دی (دفعہ ۱) بلکہ مالیت داری محصول لاگو کر دیا۔ درآمدات پر تین فیصد اور برآمدات پر نو فیصد (دفعہ ۴)۔ یہ نو فیصد چنگی اندرونی تجارت کے سلسلے میں جمع کیے جانے والے کئی طرح کے محاصل کی تلافی کے طور پر عائد کی گئی اور اس طرح وہ رخنہ بند کر دیا گیا جس کے ذریعے عثمانی حکومت محصولاتی پالیسی کے بارے میں اپنے آزادانہ اختیار کو بروئے کار لا سکتی تھی۔ علاوہ ازیں انگریزوں نے سلطنت کی حدود میں اپنی نقل وحرکت پر عائد قدیم پابندیوں کو بھی منسوخ کروا لیا (پروانہ راہ داری، سفری اجازت نامہ وغیرہ) اندرونی تجارت میں انہیں "انتہائی مراعات یافتہ" عثمانی باشندوں کا مرتبہ مل گیا، وہ ان اشیا کو جو انہوں نے خرید کی ہوتیں برآمد کر سکتے تھے اور اندرونِ سلطنت آزادانہ طور پر فروخت بھی کر سکتے تھے۔ اس کے بعد دوسری "مراعاتی" اقوام کے ساتھ بھی کئی معاہدے ہوئے (Noradoughian، ج:۲)۔ ان تبدیلیوں نے سلطنت عثمانیہ کو مکمل طور پر ایک کھلی منڈی بنا کر رکھ دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کی مشینی صنعت اپنی پیداوار کے لیے منڈیاں تلاش کر رہی تھی، اور ان اقدامات کے نتیجے میں آئندہ دس برسوں میں (ترکی کی) مقامی صنعت زمین بوس ہو کر رہ گئی (O.L.Sarc: Ottoman Industrial Policy در Ch.Issawi Ed. The Economic History of the Middle East، لنڈن اور شگاگو ۱۹۶۶، ص ۴۶۔۶۰).

جنگ کریمیا کی وجوہات میں سے ایک اہم سبب روس کا یہ دعویٰ تھا کہ عثمانی سلطنت کے تمام آرتھوڈوکس عیسائی باشندوں تک اس کا حق تحفظ وسعت پذیر ہے، یہ دعویٰ ایک قدیم "مراعاتی" حق کی تحریف پر مبنی تھا۔ اس کا سد باب کرنے کے لیے علی پاشا نے پیرس کی امن کانگرس (۱۸۵۶ء) میں اس بات پر زور دیا کہ چونکہ اب سلطنتِ عثمانیہ قوموں کی یورپی برادری میں شامل ہو چکی ہے اس لیے اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جانا چاہیے جو ان سب قوموں نے باہمی حقوق کے سلسلے میں تسلیم کر رکھا ہے اور اسی بنا پر مراعاتِ خصوصی (عہودِ عتیقہ) کو منسوخ کر دیا جائے۔ اس امر پر اتفاق رائے ہوا کہ یہ سوال ایک الگ کانفرنس میں زیر بحث آئے گا جو استانبول میں منعقد ہو گی (L.J.D Feraud-Giraud: *De la Juridiction francaise dans lesechelles du levent et de Barbarie*، پیرس ۱۹۶۶، ۲:۵۴۔۵۸) استانبول میں اس مسئلے کو بڑی سنجیدگی سے لیا گیا (اے۔فواد: رجال مہمہ سیاسیہ، استانبول، ۱۹۲۸، ص۷۰)، لیکن متعلقہ ممالک نے ایسا کوئی اجلاس منعقد نہیں کیا۔ ۱۸۶۱۔۶۲ء میں جب تجارتی معاہدوں کی تجدید ہوئی (Noradoughian، ۲:۹۱۔۱۳۰) تو مراعاتِ خصوصی کی کلی طور پر ازسرنو توثیق کر دی گئی اور صرف محصولاتی شرح میں چند ترمیمات کی گئیں [رکّ بہ مکس] نئی نسل کے مدبرین کو اب پختہ یقین ہوچلا تھا کہ سلطنت کی 'بازیابی' کے لیے اولین اور اہم ترین اقدام یہ ہوگا کہ مراعات خصوصی سے نجات حاصل کی جائے۔

اس مقصد کے پیش نظر جب انتظامی احکام اور قوانین کی مغربیت اور لادینیت (سیکولرازم) کے سلسلے میں ضروری اصلاحی اقدامات کیے جانے لگے تو انہوں نے ایسے طریقوں کی جستجو بھی کی جو کم ازکم مراعات خصوصی کے انتہائی غلط استعمال کا خاتمہ کر سکیں۔ ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء کے ایک فرمان میں (متن در Testa، ۷:۴۴۵-۴۴۷؛ Aristavrchi، ۱:۱۹-۲۱؛ ترکی متن، در "دستور" ۱:۲۳)۔ جہاں غیر ملکی باشندوں کو جائیداد رکھنے کا حق عطا کیا گیا،

وہیں یہ حکم بھی نافذ ہوا کہ وہ بعینہ ان شرائط کے پابند ہوں گے جو عثمانی رعایا پر عائد ہوتی ہیں، وہ ویسے ہی ٹیکس ادا کریں گے اور عثمانی عدالتوں کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ فرانسیسی سفیر نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ یہ نئی رعایت ''یورپی سرمایہ کو ضمانت فراہم کرتی ہے کہ اسے سلطنت عثمانیہ میں معدنیات، زراعت اور جنگلات کی فراوانی اور ترقی کے سلسلے میں غیر محدود حقوق حاصل ہوں گے'' (اخبار *La Turquie* (اخبار) کا شمارہ، ۱۲ ستمبر ۱۸۶۸ء)۔ باقی ممالک نے شکایت کی کہ مراعات خصوصی میں عطا کیے گئے پرانے استثناء ات کو اس فرمان میں شامل نہیں کیا گیا، مگر بالآخر نئی شرائط تسلیم کر لی گئیں (متن، در *Testa*، ۷:۷۳۰-۷۳۳، نئے حقوق پر ضیاء پاشا کے اعتراضات کے لیے دیکھیے: تنظیمات، ج۱، (انقرہ) ۱۹۴۰ء، ۸۳۵-۸۳۶)۔ دستاویز کے اختتام پر باب عالی نے واضح کر دیا کہ وہ ''عہود عتیقہ'' یعنی مراعات خصوصی کے پرانے م معاہدوں کو تبدیل کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ ایک موقعہ پر (۱۸۶۷ء) علی پاشا نے اس بات پر غور وخوض کیا کہ یورپی طاقتوں کے اعتراضات کے ہمیشہ کے لیے خاتمے کی خاطر فرانس کا سول کوڈ (ضابطہ دیوانی) اختیار کر لیا جائے (R.Davision: *Reforms in the Ottoman Empire*، پرنسٹن ۱۹۶۳ء، ص۲۵۲)۔ جمہوری عہد کی ابتدا تک مراعات خصوصی کے خاتمے کی آرزو مختلف انقلابی اصلاحات، بالخصوص لادینیت کی کوششوں کے سلسلے میں، اہم ترین محرک بنی رہیں۔

۱۸۶۹ء کے اپنے عثمانی شہریت کے قانون کے تحت علی پاشا کو امید پیدا ہوئی کہ مراعات خصوصی کی سب سے بڑی خرابیوں میں سے ایک کا خاتمہ ہو جائے گا (دستور، ۱:۱۶-۱۸، فرانسیسی متن: در *Testa*، ۷:۵۲۶-۵۲۷)۔ اس قانون میں کہا گیا تھا کہ شہریت کی تبدیلی کا خودساختہ دعویٰ عثمانی حکومت کی منظوری کے بغیر باطل ہوگا۔ یہ قانونی شق بھی حکومتوں کو تسلیم کرنا پڑی۔ کچھ عرصہ بعد، ایک یادداشت میں جو متعلقہ ممالک کو بھیجی گئی: (*Testa*، ۷:۵۴۷-۵۵۷) علی پاشا نے جہاں یہ بات تسلیم کی کہ مراعات خصوصی ایک معاہدے کا درجہ رکھتی ہیں، وہیں ان کی توجہ ان اہم نکات کی طرف بھی مبذول کرائی جن کا غلط استعمال کیا گیا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ یہ غلط رویے نہ صرف یہ کہ ''قانونِ اقوام'' سے متضاد تھے بلکہ لازمی طور پر ''مراعات کی اپنی حدود وقیود سے بھی ماوراء تھے، لہٰذا عثمانی حکومت کی یہ ذمہ داری تھی کہ اس غلطی کی اصلاح کرے۔ غلط استعمال والے اہم امور یہ تھے: ''تحفظ یافتہ افراد'' کا خصوصی رتبہ، عثمانی رعایا پر لاگو محاصل سے استثنا، قونصلوں کا علاقائی حدود سے ماورائی مرتبہ، غیر ملکی مجرموں کے خلاف قانونی کارروائی میں مشکلات، یہ امر واقعہ کہ غیر ملکی ان عثمانی قوانین اور دیوانی عدالتوں کے سامنے جواب دہ نہیں، جنہیں ان کی ملکی حکومتیں تسلیم نہیں کرتیں، قونصلر عدالتوں کی عثمانی عدالتوں کے معاملات میں دخل اندازی، (قونصلر) نمائندوں کا عثمانی ججوں کے فیصلوں میں حصہ داری کا مطالبہ (دیکھیے J.le Testa: *Observations sur be memoir de la Sablime porte relaif aux Capilation*، استانبول، ۱۸۶۹ء)۔ اس یادداشت کے بعد ایک مجموعۂ ضوابط (نظام نامہ) برائے قونصلر (۱۸۶۳ء: متن، در *Aristarchi*، ۴:۱۵-۱۹) اور ایک پروٹوکول (مضبط) بسلسلہ تفتیش مجرمانِ ممالک غیر (۱۸۶۷ء) بھی جاری ہوے، لیکن متعلقہ ممالک اندرونی محاصل، عدالتوں میں نمائندگان کی موجودگی اور سلطان کی منظوری کے بغیر مشن اسکولوں کے افتتاح وغیرہ جیسے نکات میں کسی تغیر وتبدل کو ماننے پر تیار نہیں تھے۔

دوسری (یورپی) طاقتیں اس وقت سخت برہم ہوئیں، جب ۱۸۹۰ء میں تجارتی معاہدوں کی تجدید کے لیے مذاکرات کے دوران میں جرمنی نے اس شرط کے ساتھ مراعات خصوصی کی تنسیخ پر آمادگی ظاہر کی، کہ دوسرے ملک بھی اس سے متفق ہوں۔ اب یہ مراعات سلطنت عثمانیہ کے لیے ایک بھاری بوجھ بن رہی تھیں، کیونکہ یورپی طاقتیں اپنی سرگرمیوں کے میدانوں کو وسعت دے رہی اور ہر جگہ اپنی مراعاتی حیثیت میں اضافہ کر رہی تھیں، حتی کہ اب سلطنت (عثمانیہ) کا مرتبہ ایک نیم نو آبادیاتی طاقت سے کچھ زیادہ نہیں رہ گیا تھا۔ بنک، ریلوے، کانیں، گیس، بجلی اور فی الحقیقت عوامی خدمات کے تمام اہم شعبے مراعات یافتہ یورپی کمپنیوں کے ہاتھ میں جا چکے تھے (دیکھیے N.Verney اور G.Dambtmann: Les Puissances etrangeres dans Le Levant، پیرس ۱۹۰۰ء؛ C.Morawity: Les Finances de la Turquie، پیرس ۱۹۰۲ء)۔ مراعات خصوصی کے غلط استعمال اور مشنری تحریکوں کی سرگرمیوں کے پس منظر میں سیاسی اور فوجی دباؤ کا خطرہ بھی موجود تھا آخرکار، ان اندیشوں کے نتیجے میں پیدا شدہ، ترکی کی رائے عامہ اب مراعات کے بارے میں سخت مزاحمتی انداز اختیار کرتی جارہی تھی۔ ۱۹۰۸ء کے بعد قائم ہونے والی ہر حکومت نے مراعات کی تنسیخ کے معاملے کو اپنے پروگرام میں سب سے زیادہ ترجیح دی (C.Bilsel: lozan، ج۱، استانبول ۱۹۳۳ء، ص ۶۳)۔ مئی ۱۹۱۳ء میں صدراعظم حقی پاشا نے، اپنی دو یادداشتوں میں جو اس نے برطانوی حکومت کے حوالے کیں، بعض فوری ترامیم کی تجویز دی، مثلاً چنگی کی شرح میں پندرہ فیصد تک اضافہ، غیر ملکی ڈاک خانوں کی موقوفی، غیر ملکی باشندوں کے منافع پر ٹیکس کا نفاذ اور مراعات خصوصی کی مکمل تنسیخ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وکلا پر مشتمل ایک کمیشن کا قیام۔ برطانیہ عظمی کا اصرار تھا کہ ان امور کے لیے تمام متعلقہ ملکوں کا اتفاق رائے ضروری ہے اور یہ کہ تجارتی اور مالی ضوابط کا مراعات خصوصی سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ ان کا تعلق حالیہ تجارتی معاہدات سے ہے (British Documents on the Origins of the War، ۱۰/۲، دستاویز، ۶۴، ۸۰، ۹۵، ۹۷)۔ پہلی جنگ عظیم کے آغاز پر عثمانی حکومت نے مراعات کی تنسیخ کا اہم ترین مسئلہ برطانوی، فرانسیسی اور روسی حکومتوں کے ساتھ اٹھایا تاکہ اس کی غیر جانبداری کا رویہ برقرار رہے، لیکن اتحادیوں نے کوئی واضح وعدہ نہ کیا (Y.H.Bayur: ترک انقلابی تاریخی، ج۳، انقرہ، ۱۹۵۷ء، ص ۱۵۶-۱۶۲)۔ اس پر سلطان نے ۱۷ شوال ۱۳۳۲ھ / ۸ ستمبر ۱۹۱۴ء کو ایک فرمان کے ذریعے ان تمام غیر ملکی استحقاقات، کی تنسیخ کا اعلان کر دیا "جو مالی، اقتصادی، قانونی اور انتظامی مراعات خصوصی کے نام سے جانی جاتی تھیں تاکہ سلطنت عثمانیہ میں رہائش پذیر غیر ملکی باشندوں کے ساتھ بین الاقوامی، قانون عامہ کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے مناسب سلوک کیا جائے"۔ (Bayur: کتاب مذکور، ۳/۱: ۱۶۲)۔ ممالک کے نام یادداشت کا متن، در Bilsel وہی کتاب ۶۵-۶۷)۔ اس کے فوری بعد "شرعی عدالتوں اور نظامی عدالتوں کی علیحدگی سے متعلق ضابطہ قانونی" کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ مراعاتی حکومتوں نے اس عمل کو یکطرفہ اور معاہدوں میں دیئے گئے حقوق کے خاتمے کو من مانی کارروائی قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی اور اس پر احتجاج کیا۔ معاہدہ سیسواز کے ذریعے مراعات خصوصی، بغیر کسی تغیر وتبدل کے بحال کر دی گئیں اور یہ استحقاقات دوسری فاتح حلیف طاقتوں تک بڑھا دیئے گئے، مگر معاہدۂ لوزان (۲۴/جولائی ۱۹۲۳ء) کے مطابق' اتحادی

ان کی مکمل تنسیخ کا فیصلہ قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔

مآخذ: (۱) دستاویزی مواد، سب سے زیادہ اہم عثمانی ذخیرہ معلومات، "دیوان ہمایوں دفترلری" سلسلے کے ایک سو چھ "اجنبی دفترلری" ہیں جو ان قانونی تحریروں کے مسوادات پر مشتمل ہیں جن کا تعلق گیارھویں/سترھویں صدی اور اس کے بعد کے زمانے کے یورپی ممالک کو دی گئی مراعات خصوصی سے ہے۔ ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء سے "نامہ ہمایوں دفترلری" عہد ناموں کی نقول پر مشتمل ہے؛ انیسویں صدی کے لیے اہم مواد حسب ذیل مجموعوں میں پایا جاتا ہے: مقاولہ نامہ دفترلری، امتیاز دفترلری۔ یورپ کے دستاویزات خانوں میں اس موضوع پر اصل عثمانی تحریریں موجود ہیں، خصوصاً وینس کے Archivio di Stato میں جس کے لیے دیکھیے: A.Bombaci: La collezione di documenti turchi Archivio di stato di venezia، در RSO، ۲۴، (۱۹۴۹ء): ۹۵-۱۰۷؛ برطانوی نایاب دستاویزات کے لیے Ingiliz: A.N. Kurat devlat arsivinde ve Kutu phanelerinde Turkiye tarihive ait bazi malzemeye dair، (۱۹۴۹ء) اہم مجموعوں کے لیے PROSP، ۱۰۵/۲۱۶، ۱۰۵/۳۴۳۔ یورپی زبانوں میں سب سے زیادہ وسیع مواد سے فرانسیسی دستاویزات خانوں میں درج ذیل نے فائدہ اٹھایا: P.Mason: E. charriere, ch-Roux, A. Vandal, V.Svorons, G.tongas، اور R.Paris.) انگریزی دستاویزات کو A.C Wood نے A History of the Levent Company، بار دوم میں استعمال کیا، دیکھیے طبع بار ثانی، ۱۹۶۴ء، ص ۹-۱۲)۔

۲۔ مراعات خصوصی کے مطبوعہ متون اور متعلقہ دستاویزات کے لیے دیکھیے G.L.F Tafel اور G.M. thomas: UrKunden Zur attern Handels-und staatsgeschichte er republik venedig، سلسلہ، ۲؛ اور (۲) G.M.Thomas: Diplomatarium vento-Levantinum، ۲جلدیں؛ وینس ۱۸۸۰-۱۸۸۹ء؛ (۳) G.Masi: Statuti dalle Colonie fiorentine all estero، دیکھیے ۱۵-۱۶، میلان ۱۹۴۱ء؛ (۴) I.T.Belgrano: Documenti rignardanti la colonia genovese dipera، جینوا ۱۸۸۸ء؛ (۵) G. Muller: Documenti sulle relazioni delle citta Toscane' Coll' Oriente critiano e coi Turchi fino all، ۱۵۳۱ء، روم بار ۱۹۶۶ء؛ (۶) Treaties Between Turkey and Foreign Powers ۱۸۵۵-۱۵۳۵، لندن دفتر خارجہ ۱۸۵۵ء؛ (۷) I. de Testa: Recueil des Traites de la Porte Ottomane awee les Puissances etrangers، جلدیں ۸، پیرس ۱۸۶۵-۱۸۹۶ء، ج۹-۱۰ زیر طبع؛ (۸) A. De Testa by اور L,de Testa، پیرس ۱۸۹۸-۱۹۰۱ء؛ (۸) G.Noradounghiam: Recueil dactes Internationpuc de l, Empire ottoman، ۴جلدیں، پیرس ۱۸۹۷-۱۹۰۳ء؛ (۹) معاہدات مجموعہ سی، ۵ جلدیں، استانبول ۱۲۹۴-۱۲۹۸ء؛ (۱۰) E.charriere: Negociations de la France dans le levant، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۴۸-۱۸۶۰ء:

یادداشتیں اور تحقیقی کام: (۱۱) De Bonnac: Ch.Schefer: Memoire Listorique Sur pambassade de France a Constantinople، پیرس ۱۸۹۴ء؛ (۱۲) D Saint Priest: Memoire et Fournal Sur Lambassade de Turquie et le Commerce des Franeais dans le Levant: پیرس ۱۸۷۷ء؛ (۱۳) J.de Gontaut- Biron: Ambassade en Turquie، ج ۲، پیرس ۱۸۸۸ء-۱۸۸۹ء؛ (۱۴) Comte de

Ambassade de M. le Comte de :Guilleragues Guilleragues et de m. de girardin Cupres du F.de. la (۱۵) ، Grand Seigneur، پیرس ۱۶۹۶ء؛
Memoires du Sieur de la croisc deixant : Croix ، Secretaire de lambassa de Constantinople
Memoires du : L.L. d Arvieux (۱۶) پیرس ۱۶۷۵ء؛ ، Chevalier d' Arvi Arvieux طبع J.B.Labat، ۶ جلدیں،
Relation : F.Savary de Breves (۱۷) پیرس ۱۷۳۵ء؛
: Sir Thomas Roe (۱۸) ، de Voyage پیرس ۱۶۳۰ء؛ ، The Negotiations of Sir Thomas Roeior لنڈن
Diplomatic and Other : Sir A Paget (۱۹) ۱۷۴۰ء؛
SirJ. (۲۰) ، Correspondence، ۲ جلدیں، لنڈن ۱۸۹۶؛
Observations on the Religion, Law, : Proter ، Government and Manners of the Turks لنڈن
، Voyage de Levant: L.Deshayes (۲۱) ۱۷۷۱ء؛
L'ambassdeur: G.Tongas (۲۲) ۱۶۲۱، پیرس ۱۶۲۴ء؛ ، Louis Deshayes de Cormenin ۱۶۰۰-۱۶۳۲، پیرس
Observations Sur :H.Grenville (۲۳) ۱۹۳۷ء؛
(۲۴) :l,etat actuel de L' Empire Ottoman :R.Davis ۱۹۶۵؛ A.s.EhrenKreutz Ann Arbor ، Aleppo and Devonshire Squre لنڈن ۱۹۶۷ء؛
، English Traders at Aleppo : G. Ambrose (۲۵) ۱۶۵۸-۱۷۵۶ء، در Eco. Hist Ren.، اکتوبر ۱۹۳۱ء؛ (۲۶)
Les Relations de le France avec l' : G.Tongas N.H. (۲۷) ، Empire Qttoman، تولوس ۱۹۴۲ء؛
، The Turco- Ragusan Shih : Beigman، دی ہیگ، پیرس ۱۹۶۷ء۔

سرمایہ اور تجارت پر Histoire :P.Masson(۲۸) de Commerce Francais dans le Levant au XVII-

Hist de : U.Hyed (۲۹) ، Siecle، پیرس ۱۹۸۷ء؛ ، Commerce du Levant au Moyen-age.2، ۲ جلدیں
Hist du ommerce : R.Paris (۳۰) لائپزگ ۱۹۳۶ء؛ ، au Marseille ۵:۱۶۶۰-۱۷۸۹: Le Levant، پیرس
Les Echelles de : Fr. Ch Rouse (۳۱) ۱۹۵۷ء؛ ، Syrie de Palestine au XVII Siecle، پیرس ۱۹۲۸ء؛
Traite Sur le Commerce de le : Pey Monel (۳۲) ، Mer Noire، ۲ جلدیں، پیرس ۱۷۸۷ء؛ (۳۳)
Hist Dir Commerce entre le : G.B.Depping Levant et l' Europe depuis les Croisades Jusqu' a la Fonndation des Colonies d ، Amerique، پیرس ۱۸۳۰ء۔

(۴) مراعات خصوصی اور تجارت کے لیے: (۳۴)

Hist de la Rivalite et dir Protectorat des : C.Famin ، eglises Chretiennesen Orient، پیرس ۱۸۵۳ء؛ (۳۵)
La France Catholique en : Pere H.de Barenton L' : G.de Mur (۳۶) Qrient، پیرس ۱۹۰۲ء؛
etablisement des Jesuites a Comtantin ople, Rev, les Questions Historiques، نمبر ۸۴، (۱۹۰۳ء)،
Hist de le Latinite de : M.Belin (۳۷) ۱۶۳-۷۲؛
Les : B.Homsy (۳۸) ، Constantinople، پیرس ۱۸۹۴ء؛ ، Proche- Orient, Harissa (لبنان) ۱۹۵۶ء۔

(۵) عمومی تحریریں: (۳۹) L.Mas Latrie :
Traites de Paix et de Commerce et documents ، divers، پیرس ۱۸۶۰ء؛ (۴۰) Des : M.Belin
Copitulations et des traites de la France en ، Orient، پیرس ۱۸۷۰ء؛ (۴۱) :G.Pelissie du Rausas
Le Regime Des Capitulations dans P Empire : ، Ottoman، ۲ جلدیں، پیرس ۱۹۰۲-۱۹۰۵؛ F. Rey(۴۲)

La Protection diplomatique et consulaire dans : les Echelles du levant et de Barbarie، پیرس ۱۸۹۹ء؛ (۴۳) A.Benoit : Etude sur les Capitulations entre l' Empire Ottomon et la france et sur la reforme Judiciaire le L Egypte ، نینسی ۱۸۹۰ء؛ (۴۴) F. Abelous : L' Evolution de la Turquie dans Turqouie dans'Ses Rapports avee les، ۱۹۲۸ء؛ (۴۵) N.Sunse : The Capitulary Regime of Turkey etrangers، بالٹی مور ۱۹۳۳ء؛ (۴۶) H.J. Liebesny : The Development of Western Judical Privileges in Law in the Midlde East، طبع مجید خدوری اور H.J. Liebesny واشنگٹن، ڈی سی (۱۹۵۵ء)، ص ۳۰۹-۳۳۳؛ (۴۷) محمودالیساد: du Regime des Capitulations ottomanes' leur charactere juridique d' apres histore et les textes، استانبول ۱۹۲۸ء؛ (۴۸) K. Lippmenn: Die Konsularjuris diction im olrient ، لائپزگ، ۱۸۹۸ء.

(H.Inaleik [ت : امین اللہ وثیر])

(۳) ایران: سترھویں اور اٹھارویں صدی کے دوران میں ایران میں یورپی تجارت افراد اور کمپنیوں کو مختلف "بادشاہوں" کے جاری کردہ فرامین کے تحت کی جاتی تھی۔ یہ فرامین بعض اوقات عمومی نوعیت کے ہوتے اور بعض اوقات استحقاقات اور استثناءات پر مشتمل ہوتے۔ ایسے لوگ جو ایسے فرامین کے خواہش مند ہوتے وہ بھی اور شاہ جو انہیں یہ رعایت دیتے سولھویں صدی کے نصف اول میں دولت عثمانیہ کی طرف سے ان کے علاقے فرانسیسی باشندوں کو عطا کیے جانے والے ماورائے حدود استحقاقات پر ہونے والے مذاکرات سے متاثر ہوتے رہے (دیکھیے: J.C. Hurewitz : Diplomacy in the Near and Middle East,a documenty record ، پرنسٹن ۱۹۵٦ء)۔ ۱۵٦٦ء اور ۱۵٦۸ء میں شاہ طہماسپ نے مسکووی کمپنی Muscovy Company کے لیے فرمان جاری کیا جس میں حسب ذیل امور شامل تھے: چنگی اور محاصل سے استثنا، سارے ملک میں سفر کی آزادی، بدقماش افراد سے ان کے تاجروں کو تحفظ، جائز قرضوں کی قانونی وصولیابی، چوری چکاری سے تحفظ، اپنے استعمال کے لیے مکانوں کی تعمیر یا خریداری کی اجازت اور سامان اتارنے میں اعانت (متون: در Hurewitz: کتاب مذکور، ۱:٦-۷)۔ سیاسی اور بعض دیگر حالات نے مسکووی کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں میں رکاوٹ پیدا کی چنانچہ اس کی طرف سے ۱۵۷۹ء۔ ۱۵۸۱ء میں روس کے راستے، ایران کے ساتھ چھٹی مہم کے بعد تجارتی کوششیں ترک کر دی گئیں۔ ۱۰۰۹ھ/ ۱٦۰۰ء میں اینٹونی شرلے (antony Sherley) نے شاہ عباس سے ایک فرمان حاصل کر لیا جس میں تمام عیسائی تاجروں کو بغیر ایذا رسانی کے ایران میں تجارت کی اجازت دی گئی۔ انہیں ذاتی طور پر اور ان کے مال اسباب کو بھی ایران کے عدالتی دائرۂ اختیار سے آزادی، قرضوں کی قانونی وصولیابی اور چنگی و محاصل سے استثنا عطا کیا گیا (متن در Hurewitz : کتاب مذکور، ۱:۱۵-۱٦)۔ اس سے کچھ عرصے کے بعد ۱٦۲۳ء میں شاہ عباس نے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک فرمان جاری کیا جس کے مطابق نیدر لینڈر کے لوگوں کو تجارت کی آزادی اور ان کے مال واسباب کو جانچ پڑتال نیز تمام محاصل، چنگی اور محصول راہداری سے ماسوائے اس درآمدی محصول کے جو "ناظر" (انسپکٹر) کو ادا کیا جائے استثنا عطا کیا گیا۔ دفعہ ۱۰ میں کہا گیا تھا کہ "ایران میں ڈچ قوم کا کاروباری ادارہ بلا استثنا مکمل آزادی سے متمتع ہوگا۔ کوئی حاکم یا قاضی

ان کے مقبوضہ مکان میں اس قوم کے ذمہ دار نمائندے کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکے گا اور اگر کوئی اہلکار زبردستی داخلے کی کوشش کرے گا تو ہالینڈ کے لوگوں کو اسے بزور طاقت روکنے کی اجازت ہوگی''۔ دفعہ ۱۴ میں تسلیم کیا گیا کہ ''اگر ولندیزی قوم کا کوئی رکن (خدانخواستہ) کسی شخص کو مار ڈالے، چاہے اس شخص کا تعلق کسی بھی قوم سے ہو، یا کسی جرم کا مرتکب ہو یا کسی قانون کی خلاف ورزی کرے، تو ایسے ولندیزی کا مقدمہ ایرانی مملکت کا کوئی قاضی نہیں سنے گا، بلکہ حالات کی مناسبت سے اور جس طریقے سے مناسب سمجھے، ان کا اپنا صدر یا سربراہ اُسے سزا دے گا۔ دفعہ ۱۷ ولندیزی گھروں کے ترجمان یا نمائندے کو بھی وہی حقوق دیتی تھی جو ولندیزی قوم کے کسی رکن کو حاصل تھے (متن در Hurewitz: کتاب مذکور، ۱: ۱۷۔۱۸)۔ نئے فرامین ۱۶۴۲ء اور ۱۶۹۴ء میں جاری کیے گئے۔ ۷ فروری ۱۶۳۱ء میں شاہ صفی کے ایک ولندیزی نمائندے نے، ہالینڈ میں بھی ایرانی تاجروں کے لیے ماورائے حدود تجارتی حقوق حاصل کر لیے۔ یہ اقرار نامہ یورپی قوموں کے مابین معاصر انتظامات کے نمونے پر طے پایا (متن، در Hurewitz: کتاب مذکور، ۱: ۲۰۔۲۱)۔ فی الحقیقت یہ دستاویز عملی نفاذ کی شکل اختیار نہ کر سکی، کیونکہ ایرانی تاجر ہالینڈ میں مستقل طور پر قیام پذیر نہ ہوئے۔

اکتوبر ۱۶۱۵ء میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ عباس سے ایک عمومی نوعیت کا فرمان حاصل کیا۔ دو سال بعد ۱۶۱۷ء میں ایڈورڈ کونوک (Edward Connock) نے زیادہ واضح شرائط پر مشتمل ایک فرمان حاصل کر لیا جس کی توثیق ۱۶۲۹ء میں شاہ صفی نے کی۔ اس فرمان کے ذریعے انہیں آزاد تجارت کا حق دیا گیا اور انہیں وہی حقوق حاصل ہوگئے جو مقامی باشندوں کو حاصل تھے۔ غیر قانونی حرکتوں کے ارتکاب کی صورت میں انگریزی باشندوں کو ان کا اپنا سفیر ہی سزا دے سکتا تھا۔ اگر خرید و فروخت کے معاملے میں برطانوی اور ایرانی باشندوں میں کوئی اختلاف رونما ہو تو ''اگر اختلافی معاملہ بیس تومان سے زائد کا ہوگا تو قاضی فیصلے کے لیے اسے سفیر کے پاس بھیج دے گا تاکہ وہ ہمارے منصفوں کی موجودگی میں ایسے اقدامات کر سکے جو محترم اور اعلیٰ وافضل قوانین سے مطابقت رکھتے ہوں'' (متن در Hurewitz :کتاب مذکور، ۱:۲۰۔۱۸)۔ اس فرمان کی توثیق شاہ سلیمان نے کی اور ۱۶۹۷ء میں (یا اس کے قریب قریب) جیمز بروس (James Bruce) نے شاہ سلطان حسین کے ساتھ اس کے متعلق ازسرنو مذاکرات کیے (انڈیا آفس ریکارڈز۔ای۳/۱۵۲؛ ۶۴۱۔۶۴۲؛ R.W.Ferrier: *British Persian Relations in the 17th Century*، ڈاکٹریٹ کا غیر مطبوعہ مقالہ، کیمبرج ۱۹۷۰ء، ص ۴۵۵ وبعد؛ نیز دیکھیے: *Colenier of State Papers*، کالونیل، جلد۶، عدد ۶۵۲؛ ای/۳/۱۲/۱۲۹۴ء، اور حوالہ مذکور، ص ۸۵۷، ای/۳/۱۲/۱۲۹۶)۔

فروری ۱۶۶۵ء اور دسمبر ۱۶۷۱ء میں فرانسیسیوں نے فرمان حاصل کیے جن میں فرانسیسی تاجروں کو وہی تجارتی حقوق عطا کیے گئے، جو برطانوی اور ڈچ لوگوں کو حاصل تھے۔ ۷ ستمبر ۱۷۰۸ء کو شاہ سلطان حسین اور لوئیس چہاردہم کے مابین ایک باقاعدہ معاہدہ طے پایا۔ اس معاہدے کی رو سے فرانسیسی تاجروں کو پورے ایران میں سفر اور تجارت کی آزادی دی گئی اور پانچ سال کی مدت کے لیے انہیں کئی درآمدی محاصل سے اس شرط پر استثنا مل گیا کہ دونوں ملکوں کے مابین تجارتی روابط کی توسیع کے لیے انہیں معقول رقم خرچ کرنا ہوگی (دفعہ ۲)۔ انہیں اپنی رہائش کے لیے مکانات یا ہوسٹل خریدنے یا

تعمیر کرنے کی اجازت بھی دی گئی (دفعہ ۴) اور یہ اجازت بھی کہ وہ ان عمارتوں پر فرانسیسی جھنڈا لہرا سکیں گے جس طرح کہ دوسرے یورپی لوگ اپنی عمارتوں پر اپنے جھنڈے لہراتے تھے (دفعہ ۵)۔ فرانسیسی رعایا اور تاجر اور ان کے ساتھ رہنے والے دوسرے یورپی لوگ، ان کے ترجمان، گھریلو ملازمین، آرمنی اور ہندوستانی، جو ان کے خدم وحشم میں شامل ہوں، بیس کی نفری تک نذر گزارنے اور خراج کی ادائیگی سے مستثنیٰ تھے (دفعہ ۱۱)۔ دفعہ ۱۶ کے مطابق فرانسیسی باشندوں کے مابین اختلافات فرانسیسی قوانین کے تحت حل کیے جاتے، جبکہ فرانسیسیوں اور دوسری قوموں کے لوگوں کے باہمی اختلافات کی صورت میں ایرانی حکام قونصل کی موجودگی میں معاملے کی حقیقت کا سراغ لگاتے اور ''فیصلہ اسلامی انصاف اور عالمی سچائی کے مطابق کرتے''۔ اس طرح کا معاہدہ فیکٹری کے سربراہ، جہاز کے کپتان یا قونصل کو تقرری کے وقت کسی ایرانی بندرگاہ پر دیا جاتا (دفعہ ۲۳)۔ اگر کسی فرانسیسی کے خلاف کوئی شکایت پیدا ہوتی تو مدعی کو اپنی شکایت علاقے کے گورنر کو پیش کرنا ہوتی جو قونصل کے ترجمان کو بلواتا اور اختلافات طے کرنے کے لیے مدعی کو قونصل کے پاس بھیج دیتا۔ اگر قونصل کسی اور معاملے میں مشغول ہوتا تو ایک معقول وقفے کے بعد اس قضیے کا فیصلہ ایرانی حکام خود کرتے (دفعہ ۲۴، متن در Hurewitz: کتاب مذکور، ۱:۳۲۔ ۳۸)۔

۱۳ اگست ۱۷۱۵ء کو اس معاہدے میں ترمیم کی گئی۔ فرانسیسی باشندوں کو برآمدی ودرآمدی محاصل کی ادائیگی سے استثنا دیا گیا (دفعہ ۲)۔ تمام فرانسیسی لوگ اور ان کے ملازم اور غلام' بغیر کسی تحدید کے عام محاصل' خراج اور دوسری تمام قسم کے نذرانوں اور جن کا ذکر ۱۷۰۸ء کے معاہدے کی دفعہ ۱۱ میں کیا گیا تھا، واجبات سے مستثنیٰ قرار پائے (دفعہ ۶)۔ دیوانی فوجداری مقدمات کی تفتیش سے متعلق شقوں میں بھی بعض تبدیلیاں کی گئیں۔ دفعہ ۱۰ میں واضح کر دیا گیا کہ فرانسیسی باشندوں اور کسی دوسری قوم کے افراد کے مابین پیدا شدہ دیوانی اور فوجداری معاملات کی تفتیش اور فیصلہ اسلامی محکمہ انصاف کے عہدیدار، فرانسیسی قونصل یا کسی دوسرے شخص کی، جسے وہ مقرر کرے، موجودگی میں کریں گے، ایسے اختلافات جو فرانسیسی قوم کے قونصل یا ان کے ترجمان اور کسی دوسری قوم کے افراد کے مابین پیدا ہوں گے ان کا فیصلہ شاہِ ایران بذاتِ خود کرے گا۔ علاقائی گورنر ایسے معاملات میں دست اندازی نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی صورت میں ان مکانوں کو مہربستہ کریں گے جن میں فرانسیسی رہائش رکھتے ہوں.

۱۷۱۵ء کے مذاکرات میں طے کی گئی علیحدہ دفعات میں سے دفعہ نمبر ۱ کے مطابق ایرانی تاجروں کو فرانس میں بعینہٖ وہی حقوق اور استثناءات حاصل تھے جو بادشاہ سلامت کی عیسائی رعایا کے تاجروں کو حاصل تھے۔ بہرحال شرط یہ تھی کہ وہ فرانس میں ایسی اشیا درآمد نہیں کریں گے جن کا داخلہ ممنوع ہو۔ وہ صرف ان اجازت یافتہ اشیا کی فرانسیسی جہازوں کے ذریعے نقل وحمل کریں گے، جو علاقوں کی پیداوار ہوں گی جو شاہ ایران کے تحت ہیں۔ ایرانی تاجر ان کا تصدیق نامہ فرانسیسی قوم کے قونصل سے حاصل کریں گے۔ دفعہ ۲ ایرانی تاجروں کو مارسلز میں ایک قونصل کے تقرر کا حق دیتی تھی جسے عام محاصل سے استثنا حاصل ہوتا۔ دفعہ ۳ کے تحت اسے ایرانی تاجروں کے مابین پیدا شدہ اختلافات کے فیصلے کا کلی اختیار دیا گیا، مگر ایرانیوں اور دوسری قوموں کے افراد کے باہمی اختلافات کی تفتیش اور فیصلے مقامی جج کو تفویض ہوتے (متن در Hurewitz: کتاب

مذکور، ۱:۴۰-۴۲)۔ اس طرح ہالینڈ اور فرانس دونوں کے معاملے میں، کم از کم نظریاتی طور پر، ایک حد تک، برابری کے حقوق کا لحاظ رکھا گیا تھا۔

۱۷۲۲ء میں افغان فوج کشی کے نتیجے میں صفوی خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ بدامنی کی بدولت تجارت بڑی حد تک ختم ہو کر رہ گئی اور اٹھارویں صدی کے باقی حصے میں وقفے وقفے سے ان (معاہدوں) کا اجرا ہوتا رہا، جبکہ صفوی فرامین کے تحت عطا کردہ استحقاقات کالعدم ہو گئے۔

۲۱ جنوری۔ یکم فروری ۱۷۳۲ء کے معاہدہ مابین ایران و روس کے تحت، نادر قلی مرزا (بعد میں نادر شاہ) کی طرف سے ایرانی تخت پر بٹھائے گئے کٹھ پتلی صفوی حکمران شاہ طہماسپ نے روسی باشندوں کو روس سے ایران میں، فروخت کی خاطر یا باہمی تبادلے کے لیے بغیر ادائیگی محاصل تجارتی اشیا لانے کی ضمانت دی۔ روسی تاجروں کو اپنی تجارتی اشیا محفوظ رکھنے کے لیے مکانوں اور گوداموں کی تعمیر کی اجازت بھی دی گئی (دفعہ ۳)۔ دوسری طرف روسی ملکہ نے وعدہ کیا کہ شاہ کی رعایا کو تجارت کی خاطر اس کے ملک میں آنے یا اس کے مقبوضات سے گزر کر دوسرے ملکوں کو جانے کے لیے وہ تمام آزادانہ اقدامات اور فوائد جو اس کی سلطنت کے رسم و رواج اور قانونی ضوابط کے مطابق ہوں عطا کیے جائیں گے" (دفعہ ۴)۔ ۱۷۳٦ء میں انگریزوں کو ایک "تحریر" حاصل ہوئی جس میں ان کے بیشتر استحقاقات کی تجدید کر دی گئی (Selections from State Papers، بمبئی ۱۹۰۸ء، ص ۴۸)، لیکن نہ تو وہ اور نہ ولندیزی یا فرانسیسی تاجر اپنے پرانے مکمل استحقاقات از سرنو حاصل کر پائے۔

۱۲/اپریل ۱۷٦۳ء کو انگلستان کی "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے ایک ایجنٹ نے بوشہر کے شیخ سعدون کے ساتھ ایک معاہدہ طے کیا جس میں انگریزوں کو درآمدات و برآمدات پر چنگی کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا اور فیصلہ ہوا کہ صرف تین فیصد محصول ان تاجروں سے وصول کیا جائے گا جو انگریزوں کے ساتھ اشیا کی خرید وفروخت کریں گے (دفعہ ۱)۔ اونی اشیا کی درآمد اور فروخت صرف انگریزوں کے ہاتھ میں ہوگی (دفعہ ۲)۔ انگریز ایسی اراضی رکھ سکیں گے جس پر وہ کارخانے کی تعمیر کر سکیں۔ اس پر وہ اپنا پرچم لہرا سکیں گے اور سلامی کے لیے اکیس توپیں رکھ سکیں گے (دفعہ ٦)۔ جب تک بوشہر میں انگریزوں کا کارخانہ موجود رہے گا کسی دوسری یورپی قوم کو وہاں آباد ہونے کی اجازت نہیں ہوگی (دفعہ ۳)۔ انگریزوں کے آڑھتی، ماہر لسانیات، ملازمین اور دوسرے متعلقین مکمل طور پر حکومت انگلستان کی محافظت میں ہوں گے (دفعہ ۴)۔ ۲ جولائی ۱۷٦۳ء کو کریم خان نے اسی قسم کی شرائط پر انگریزوں کو حقوق عطا کیے۔ انہیں اجازت دی گئی کہ بوشہر میں یا خلیج کے کسی بھی حصے میں کارخانے کے لیے زمین حاصل کر سکیں اور ایرانی مملکت کے کسی حصے میں کارخانے تعمیر کر سکیں۔ انہیں وہی استثناءات، اجارہ داری اور حقوق عطا کیے گئے جو شیخ سعدون نے عطا کیے تھے (متن در A Collection of : C.U.Aitchison *Treaties, engagements and Sanads relating to India and the neighboring Countries*، کلکتہ ۱۹۳۳ء، ۱۳: ۴۱-۴۴)۔ کریم خان کی وفات پر ایک مرتبہ پھر بے اطمینانی اور بدامنی پھیل گئی۔ اس کے بھتیجے جعفر خان نے ایک فرمان کے ذریعے پورے ایران میں غیر محدود تجارت کا حق اور تمام قسم کے محاصل سے استثنا دیا (برائے متن، کتاب مذکور، ص۴۴-۴۵)، مگر اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، کیونکہ جعفر خان کا حکم پورے ایران میں تو کجا صوبہ فارس میں بھی نافذ نہ ہو سکا۔

انیسویں صدی میں ایک مرتبہ پھر ایران اور یورپ

کے مابین زیادہ مستقل طور پر رابطہ استوار ہوا، مگر ان حالات سے قدرے مختلف تھا جو صفویوں کے زمانے میں تھے۔ ۱۸۰۱ء میں فتح علی شاہ اور برطانوی حکومت کی طرف سے سرجان میلکم کے مابین ایک ہی دن سیاسی معاہدے کے ہمراہ ایک تجارتی معاہدہ بھی طے پایا۔ دفعہ ا دونوں ملکوں کو برابر کے حقوق وفوائد عطا کرتی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ دونوں معاہد ملکوں کے "تاجر ایک دوسرے کے علاقوں میں مکمل تحفظ اور اعتماد کے ساتھ سفر کر سکیں گے اور اپنے معاملات انجام دے سکیں گے اور حکام اور تمام شہروں کے گورنر اس امر کو اپنی ذمہ داری سمجھیں گے کہ ان تاجروں کے چوپاؤں اور ساز وسامان کی حفاظت کریں"۔ دفعہ۲ کی رو سے انگریزی تاجروں اور خرید وفروخت کرنے والے لوگوں اور ایسے ہندوستانیوں کو جو انگریزی حکومت کی ملازمت میں ہوں اجازت دی گئی کہ وہ ایران میں آباد ہو سکیں گے اور ان کی ملکیت میں کسی مال و اسباب پر کسی قسم کا سرکاری محصول یا چنگی وغیرہ عائد نہیں ہوگی۔ ایسے محاصل خریداروں سے وصول کیے جائیں گے (دفعہ ۲)۔ ایک اضافی دفعہ میں یہ امر تسلیم کیا گیا کہ لوہا، سکہ، فولاد، ریشمی پارچات، اور Purpetts جو خصوصی طور پر انگریزی حکومت کی ملکیت ہوں گی ان پر صرف ایک فیصد محصول عائد کیا جائے گا۔ وقت کی مناسبت سے جو درآمدی چنگی اور محصول دوسری اشیا پر ایران اور ہندوستان میں عائد تھے وہ بدستور رہیں گے اور ان میں کوئی اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ دفعہ ۴ میں وضاحت کر دی گئی کہ ایرانی مملکت میں اگر کوئی شخص انگریزی حکومت کا مقروض ہو اور اس کی موت واقع ہو جائے تو علاقے کا حاکم پوری کوشش کرے گا کہ دوسرے قرض خواہوں، اگر کوئی ہوں، سے پہلے حکومت برطانیہ کا مطالبہ پورا کیا جائے۔ ایران میں قیام پذیر حکومت برطانیہ کے ملازمین کو اجازت ہوگی کہ اپنے تجارتی معاملات کو چلانے کے لیے جس قدر مقامی لوگوں کی ضرورت محسوس کریں ان کی خدمات حاصل کر سکیں گے۔ انہیں اختیار حاصل ہوگا کہ ایسے مقامی لوگوں کو بدمعاملگی کی صورت میں، جیسا وہ قرین مصلحت سمجھیں، سزا دے سکیں، بشرطیکہ ایسی سزا کا دائرہ زندگی (کے خاتمے) یا کسی جسمانی عضو (کے نقصان) تک دراز نہ ہو جائے۔ ایسی سزا مقامی حاکم یا گورنر ہی دے سکے گا۔ ایران کے کسی حصے یا کسی شہر میں مکانات تعمیر کرنے اور انہیں فروخت کرنے یا کرایہ پر دینے کی آزادی بھی دی گئی (دفعہ۵)۔ (متن در کتاب مذکور، ص ۵۳)۔ اس معاہدے کی توثیق کبھی نہ کی جا سکی.

مندرجہ بالا تمام فرامین اور معاہدے غیر ملکی باشندوں کو استحقاقات اور استثناءات عطا کرتے تھے؛ بعض تو ایسے بھی تھے جو محاصل اور تجارت کے معاملے میں غیر ملکیوں کو ملکی باشندوں سے برتر مرتبہ دیتے اور انہیں ملکی عدالتوں کے دائرۂ اختیار سے ماورا رکھتے تھے۔ یہ فرامین' فی الحقیقت یک طرفہ اقرار نامے تھے۔ اس اعتبار سے کہ بہت کم ایرانی تاجر یورپ میں رہائش پذیر تھے، معاہدات عملی طور پر، طرفین کے حقوق کی پاسداری کے دعوے کے باوجود، صرف ایک جانب کے مفاد کے لیے تھے۔ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ ایران میں ان مراعات خصوصی کی بنیاد یہی فرامین اور معاہدات تھے بالخصوص ۱۷۱۵ء کا معاہدۂ فرانس۔ ان کی بعض دفعات میں اور انیسویں صدی میں یورپی طاقتیں جن استحقاقات اور استثناءات سے ایران میں متمتع ہو رہی تھیں ان میں حیرت انگیز حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ بہرحال ترکمان چائے کا معاہدہ جو ۱۸۲۸ء میں ایران اور روس کے مابین طے پایا اور اس کی دفعہ ۱۰ کے تحت اسی تاریخ کو تجارتی

امور کے بارے میں جو ایک الگ معاہدہ ہوا، انہیں ایران میں خصوصی مراعات کی اصل سمجھا جاتا ہے۔ ان دونوں وثیقوں کی کئی دفعات، متقدم معاہدوں جیسے استحقاقات اور استثناءات کی حامل ہیں، مگر جہاں فرامین ریاستی اعزاز کا عطیہ اور قدیم معاہدے آزادانہ مذاکرات کا نتیجہ تھے ترکمان چائے کا معاہدہ ایک تباہ کن جنگ اور شمالی ایران پر روسی بالا دستی کے بعد دباؤ کے تحت طے پایا۔ اس میں دی گئی مراعات کا تعلق غیر ملکی غلبے کے خوف اور ان کا عملی نفاذ طاقت کے استعمال کے خطرے پر مبنی تھا۔ جدید ایرانی زبان میں 'مراعات خصوصی (Capitulations) کی اصطلاح کا استعمال صرف اس عہد سے متعلق ہے جس کا آغاز معاہدۂ ترکمان چائے سے ہوا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایسی اصطلاح کا اطلاق ایسے ماورائے حدود حقوق پر ہوتا ہے جو اس معاہدے کے ذریعے عطا کیے گئے اور دوسرے ملکوں تک ''انتہائی مراعات یافتہ قوم'' کی حیثیت سے وسعت پذیر ہوے۔ عملی طور پر مراعات کا نظم تجارتی استحقاق کے علاوہ (سیاسی) حمایت کے سوال سے بھی قریبی تعلق رکھتا تھا جو بعد میں (سیاسی) جائے پناہ کے مسئلے (Asylum) سے منتج کر دیا گیا۔ ان دونوں امور نے ایک طرف ایران اور دوسری طرف برطانیہ اور روس کے مابین کئی قسم کے اختلافات کو جنم دیا۔

تجارت سے متعلق علیحدہ قانون کی دفعہ ۱ کے تحت پاسپورٹ کے حامل روسی باشندوں کو پورے ایران میں تجارت کرنے کی اجازت تھی۔ ایرانی باشندوں کو بحیرۂ قزوین یا روس اور ایران کے مابین سرحدی راستے سے اپنا تجارتی سامان درآمد کرنے کی اجازت تھی اور انہیں انتہائی مراعات یافتہ قوم کا مرتبہ حاصل تھا۔ دفعہ ۲ کے تحت روسیوں اور ایرانیوں کے مابین تجارتی لین دین کے بارے میں معاہدات، تبادلے کے فرد حساب، ضمانتوں اور دوسری تحریروں کا روسی قونصل اور گورنر (حاکم) کے سامنے اندراج ضروری تھا۔ روسی باشندوں کے ذریعے ایران میں درآمد وبرآمد شدہ اشیا اور ایرانی باشندوں کے ذریعے روس میں درآمد وبرآمد کی جانے والی ایرانی اشیا پر صرف ایک مرتبہ، داخلے یا اخراج کے وقت، پانچ فیصد محصول عائد ہوتا۔ روس نے وعدہ کیا کہ وہ اس شرح محصول میں اضافہ نہیں کرے گا۔

دفعات نمبر۵،۷ اور ۸ کی نوعیت بالخصوص ''خصوصی مراعات'' کی تھی۔ دفعہ ۵ میں وضاحت کی گئی تھی کہ بایں وجہ کہ ایران میں موجودہ رسم ورواج کی بنا پر غیر ملکیوں کے لیے مکان یا ذخیرۂ اشیا کے لیے مخصوص جگہ کا حصول مشکل ہے، روسی باشندوں کو ایران میں نہ صرف ایسی جگہیں کرایہ پر حاصل کرنے کی، بلکہ بطور ملکیت رہائش کے لیے مکانات اور ذخیرہ کردہ اشیا کی جگہیں رکھنے کی اجازت ہو گی۔ ایرانی حکومت کے ملازمین کو، بوقت ضرورت، ایسی جگہوں یا مکانات میں داخلے کی اجازت نہیں ہوگی ماسوائے اس صورت کے کہ وہ کسی وزیر، سفارت خانے کے ناظم الامور یا روسی قونصل کی طرف رجوع کریں جو انہیں ایسا کرنے کا اختیار دے گا اور وہ ایک عہدیدار یا تجارتی نمائندے کا تقرر کرے گا جو ایسی جگہوں کی تفتیش کے وقت وہاں موجود رہے گا۔

دفعہ ۷ میں کہا گیا تھا کہ ''روسی باشندوں کے مابین تمام قانونی اور عدالتی امور روسی سلطنت کے قواعد وضوابط کے مطابق تفتیش اور فیصلے کے لیے صرف روسی سفارت خانے یا قونصل کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ اور یہی صورت ان اختلافات اور عدالتی امور کی ہوگی جو روسی باشندوں اور کسی دوسری مملکت کے باشندوں کے مابین رونما ہوں گے۔ اگر ایسے معاملات کا تعلق روسی باشندوں اور ایرانی باشندوں سے ہوگا تو وہ حاکم یا گورنر

کے سامنے پیش کیے جائیں گے، مگر ان کی تفتیش یا فیصلہ سفارت خانے یا قونصل خانے کے کسی نمائندے کی عدم موجودگی میں نہیں کیا جائے گا اور ایک بار فیصلہ صادر ہو جانے کے بعد ایسے تنازعات کے بارے میں دوبارہ تحقیق یا قانونی کارروائی نہیں کی جا سکے گی۔ اگر بار دیگر مقدمے کی صورت حال پیش آجائے تو روسی (سفارتی) وزیر، ناظم الامور یا قونصل کو پیشگی اطلاع دیئے بغیر ایسا کرنا ممکن نہ ہوگا اور ان حالات میں معاملہ ''دفتر'' میں پیش کیا جائے گا اور وہیں فیصلہ ہوگا، یعنی شاہ کی سپریم کورٹ میں بمقام تبریز یا تہران، نیز یہ فیصلہ روسی سفارت یا قونصلیٹ کے کسی نمائندے کی موجودگی میں صادر کیا جائے گا۔

دفعہ ۸ میں کہا گیا تھا، ''روسی باشندوں کے مابین قتل یا ارتکاب جرم کی صورت میں، معاملے کی تفتیش وتحقیق اور فیصلے کا اختیار محض روسی وزیر سفارت، ناظم الامور یا قونصل کو حاصل ہوگا۔ اس قانونی ضابطے کی رو سے جو انہیں اپنے ہم وطنوں پر اختیار تفویض کرتا ہے۔ اگر کوئی روسی باشندہ، کسی جرم میں، کسی دوسری قوم کے فرد کے ساتھ ملوث ہوگا تو اس جرم میں اس کے ملوث ہونے کے ثبوت کے بغیر اس پر مقدمہ نہیں چلایا جائے گا اور اس صورت میں بھی کوئی عدالت اس جرم کے بارے میں روسی سفارت یا قونصلیٹ کے نمائندے کی موجودگی کے بغیر فیصلہ صادر نہیں کرے گی اور اگر اس علاقے میں ان میں سے کوئی (ادارہ) موجود نہیں ہوگا تو مقامی حکام خطا کار کو اس مقام پر بھیج دینے کا اہتمام کریں گے، جہاں کوئی روسی قونصل یا کوئی مامور کردہ نمائندہ ہوگا۔ اس مقام کا حاکم یا منصف اس شخص کے خلاف یا اس کے حق میں پوری فرض شناسی کے ساتھ شہادت تحریر میں لائے گا اور اپنے دستخطوں سے اس کی تصدیق کرے گا اور پھر اس مقام تک پہنچا دے گا جہاں مقدمہ چلایا جائے گا۔ جب ملزم باقاعدہ طریقے سے جرم کا سزاوار ٹھہرایا جائے گا اور اس کے خلاف سزا سنا دی جائے گی تو اسے شہنشاہ معظم کے سفارتی وزیر یا ناظم الامور یا قونصل کی تحویل میں دے دیا جائے گا جو اسے واپس روس بھجوا دے گا جہاں وہ قانونی طور پر دی گئی سزا بھگتے گا'' (متن در کتاب مذکور، ص ۲۳۔۶۱)۔

محاصل کی ادائیگی اور چنگی یا شاہراتی ٹیکس سے استثنا کے بارے میں وقتاً فوقتاً دوسری یورپی قوموں کے افراد بھی روسیوں کے ہم پلہ قرار دیئے جاتے رہے، لیکن ایران سے اس کی مزاحمت ہوتی رہی اور ۱۸۵۱ء میں وزارت خارجہ نے اعلان کیا کہ ان ملکوں کے باشندے، جن کے ایران کے ساتھ تجارتی معاہدے نہیں ہیں، وہی محاصل ادا کریں گے جو ایرانی تاجر ادا کرتے ہیں، لیکن کچھ ہی مدت بعد بہت سی یورپی اور امریکی ریاستوں نے اپنے اور ایران کے مابین پہلے سے طے شدہ معاہدوں میں خصوصی دفعات کے اندراج یا ''انتہائی مراعات یافتہ قوم'' کی نئی دفعات کے حصول کے ذریعے ''خصوصی مراعاتی'' درجہ حاصل کر لیا۔ برطانیہ عظمی پہلے ہی ۱۸۴۱ء میں ایران کے ساتھ اپنے تجارتی معاہدے کی دفعہ ۱ کی رو سے محاصل کے معاملے میں ''انتہائی مراعات یافتہ'' قوم بن چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کا معاہدۂ پیرس بھی اسی قسم کے مرتبے اور رویے کو تسلیم کرتا تھا (متون در کتاب مذکور، ص ۶۷۔۶۹، ۸۱۔۸۵)۔ سپین نے ''انتہائی مراعات یافتہ قوم'' کا درجہ ۱۸۴۲ء میں ایران کے ساتھ ایک تجارتی معاہدے کے ذریعے حاصل کیا (متن در کتاب مذکور، ص ۶۲۔۶۴)۔ اسی قسم کے حقوق ومراعات دوسرے ملکوں نے حاصل کیے: فرانس (۱۸۵۵ء)، امریکہ (۱۸۵۶)، آسٹریا، ہنگری، بلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک، ناروے اور سویڈن (۱۸۵۷)، یونان (۱۸۶۱ء)، اٹلی (۱۸۶۲ء)، جرمنی اور

سوئٹزرلینڈ (۱۸۷۳ء)، میکسیکو اور ارجنٹائن (۱۹۰۲ء)، چلی، یوراگوئے اور برازیل (۱۹۰۳ء) (دیکھیے : A. Matine Daftary : la Suppresson des capitulatons en Perse، پیرس، ۱۹۳۰ء، ص ۶۷ بعد)۔

"مراعات خصوصی" ایران میں، سلطنت عثمانیہ کی نسبت کمتر محتاط انداز کی اور کمتر بوجھل کیفیت کی حامل تھیں۔ بہرحال وہ خصوصی طور پر اقتدار اعلیٰ کی توہین وتذلیل غیر ملکیوں کے مراعاتی درجے، ان کی شخصی حرمت رہائش و قیام، ساز وسامان اور ایرانی قوانین کے دائرہ اختیار سے ان کے استثنا کے لحاظ سے تکلیف دہ تھیں، کیونکہ وہ کسی نہ کسی غیر ملکی طاقت کے تحفظ میں تھیں۔ ان کے روبعمل ہونے کا انحصار حالات و واقعات اور سفارتی اہلکاروں کے جذباتی ردعمل پر ہوتا تھا۔

ایرانیوں اور غیر ملکیوں کے مابین تنازعات کے تصفیے کے لیے دارالحکومت میں وزارت خارجہ کے ایک شعبے کے تحت خصوصی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا جنہیں "دیوان محاکمات خارجہ" کہا جاتا اور جن کا عملہ وزارت کے اہلکاروں پر مشتمل ہوتا۔ صوبوں میں وزارت خارجہ کے نمائندے جنہیں "کارگزار" کہا جاتا تھا ان خصوصی عدالتوں کے صدر نشین ہوتے اور غیر ملکیوں کی سرگرمیوں کی عمومی نگرانی کرتے۔ سلطنت عثمانیہ کے مقابلے میں ان عدالتوں کا طریق کار اور تصفیے کا نظام عمل زیادہ سخت اور ناشائستہ انداز کا تھا (دیکھیے: A.C.Wratislaw: A Consul in the East، لنڈن ۱۹۲۴ء ، ص ۱۹۰)۔ غیر ملکی قونصلوں کو فی الحقیقت حق استرداد حاصل تھا کیونکہ عدالت کا کوئی فیصلہ مؤثر نہ ہوتا جب تک کہ قونصل اس پر اپنے تصدیقی دستخط ثبت نہ کر دے (Matine Daftary: کتاب مذکور، ص ۷۹، ۸۰)۔

انیسویں صدی کے پورے دور میں اور پھر بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ایرانی حکومت اور غیر ملکی طاقتوں کے مابین خصوصی مراعات سے پیدا شدہ مناقشے اور اختلاف کی ایک مستقل صورت جاری و ساری رہی، مگر ایران میں ان مراعات کے خاتمے کی سنجیدہ کوششوں کا آغاز پہلی جنگ عظیم کے زمانے اور ۱۹۱۴ء میں ترکی کی طرف سے ان کے یک طرفہ خاتمے کے بعد ہی ہو سکا۔ ۱۹۱۸ء میں صمصام الدولہ کی کابینہ نے ان کی یکطرفہ تنسیخ کا اعلان کیا، مگر یہ محض ارادے کا اظہار تھا اور اس کا کوئی فوری اثر نمودار نہ ہوا۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں امن کانفرنس میں ایرانی حکومت کی طرف سے اس سلسلے میں پیش کردہ مطالبہ بھی کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکا۔ بہرحال ۲۶ جون ۱۹۱۹ء کو روسی قونصل کے دائرہ اختیار کی تنسیخ کے بارے میں روسی حکومت کے ساتھ پیغامات کا تبادلہ ہوا۔ آئندہ برس یکم جون کو چین کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط ہوے جس میں ماورائے حدود استحقاق کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس سے ایرانی حکومت کی سوچ کی عکاسی ہوتی تھی۔ ۲۶ فروری ۱۹۲۱ء کو روسی حکومت اور ایران کی نئی حکومت کے مابین، جس نے اسی سال کے آغاز میں ایک فوجی انقلاب کے ذریعہ اقتدار حاصل کیا تھا، ایک معاہدہ طے پایا جو خصوصی مراعات کے خاتمے کی طرف پہلا اہم قدم تھا۔ دفعہ ۱ نے زاروں کی حکومت اور ایران کے مابین کیے گئے تمام معاہدات کو کالعدم قرار دیا۔ دفعہ ۱۶ کے ذریعے، ۲۶ جون ۱۹۱۹ء کی یادداشت کے مطابق، روسی باشندوں پر قونصل کے دائرہ اختیار کے خاتمے کی توثیق کر دی گئی اور اعلان کیا گیا کہ ایران میں سوویت یونین کے باشندے اور سوویت یونین میں ایرانی باشندے متعلقہ ملک کے شہریوں کے ساتھ اور مقامی عدالتی فیصلوں کے تابع ہوں گے (متون در Aithison : کتاب مذکور، ص ۸۶-۹۰؛ نیز دیکھیے Matine Daftary:

کتاب مذکور، ص ۱۵۱۔ ۱۵۳)۔

ایرانی حکومت نے رضا خان (جس نے ۱۹۲۵ء میں رضا شاہ کا لقب اختیار کیا) کے زیر ہدایت جدت پسندی کی پر زور منصوبہ سازی کا آغاز کیا جس میں بہت سے دوسرے امور کے علاوہ، دیوانی، اقتصادی اور فوجداری ضابطے، نئے قوانین کے نفاذ کی خاطر عدالتی افسروں کا تقرر اور تربیت اور مراعات خصوصی کی تنسیخ شامل تھی۔ نئے اقتصادی قوانین فروری، اپریل اور جون ۱۹۲۵ء میں تین مرحلوں میں اور فوجداری ضوابط فروری ۱۹۲۶ء میں نافذ ہوے۔ ۱۹۲۷ء میں حکومت کی تنظیم نو کے بعد تمام عدالتی ٹریبونل توڑ دیئے گئے اور نئے وزیر انصاف (داور) کو اختیار دیا گیا کہ وہ عدالتی نظام کی تنظیم نو کے سلسلے میں قانونی مسودے تیار کرے۔ اس کمیشن کے افتتاحی اجلاس منعقدہ ۲۶ اپریل ۱۹۲۷ء کو رضا شاہ نے اعلان کیا کہ وہ تمام خصوصی مراعات کو منسوخ کرنے کا آرزو مند ہے (متن در Daftary: کتاب مذکور، ص ۱۸۰، ۲۱۵)۔ اس کے مطابق وزارتی کونسل کے صدر مستوفی الممالک نے ۳۰ اپریل کو قومی اسمبلی کو بتایا کہ حکومت مراعات کے خاتمے کو اپنے پروگرام میں شامل کرے گی (کتاب مذکور، ص ۲۱۱)۔ سال کے اختتام پر ضابطہ دیوانی ترتیب دینے کے لیے ایک کمیشن قائم کر دیا گیا۔ ۱۰ مئی ۱۹۲۸ء کو یہ ضابطہ وقتی طور پر روبعمل آ گیا۔ اسی دن امور خارجہ کے قائم مقام وزیر نے متعلقہ سفارت خانوں کو ایک تحریر کے ذریعے خصوصی مراعات کے حامل تمام معاہدوں کے خاتمے کی باقاعدہ اطلاع دے دی اور اعلان کیا کہ آج کے بعد سے یہ کالعدم متصور ہوں گے اور اسی طرح "انتہائی مراعات یافتہ قوموں" سے متعلقہ دفعات بھی کالعدم ہوں گی۔ صوبائی ٹریبونل جو" کارگزار" کی زیر صدارت کام کر رہے تھے، ۳ ستمبر ۱۹۲۷ء کے حکم کے تحت توڑ دیئے گئے (کتاب مذکور، ص۲۲۲۔ ۲۲۵)۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں۔

(A.K.S.Lambton [ت: امین اللہ وثیر])

۴۔ جدید مصر: محمد علی اور اس کے جانشین بالخصوص سعید اور اسماعیل غیر ملکیوں کو توجہ دلانے، اپنی اقتصادی سرگرمیوں کو تیز کرنے اور جلد از جلد مصر کو جدید اور یورپی بنانے کے بے حد آرزو مند تھے۔ علاوہ ازیں، سیاسی وجوہات کی بنا پر وہ یورپی اقوام کے ساتھ مستقل مصالحانہ رویے کی ضرورت محسوس کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے "خصوصی مراعات" کے متون میں عطا کی گئی مراعات سے بھی کہیں زائد استحقاقات غیر ملکیوں کو دیئے۔ یہ مراعات، عثمانی سلطنت کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں مصر میں بہت زیادہ وسعت پذیر رہیں:

(الف) مصر میں غیر ملکیوں کے لیے مراعات:

(۱) محاصل: مراعات خصوصی کی مالیاتی شقوں کا بنیادی مقصد مغربی یورپ کے باشندوں کو جزیہ یا مخصوص بھاری ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار دینا تھا۔ بہرحال انیسویں صدی میں مصر میں اس کا یہ مطلب لیا گیا کہ یہ امر گویا 'مراعاتی قوموں...... کی پیشگی منظوری کے بغیر ان کے باشندوں پر مصری حکومت کے کسی قسم کے محصول عائد کرنے کے حق کی نفی ہے۔ صرف ایک استثنا موجود تھا: غیر ملکیوں نے زرعی ٹیکس کی ادائیگی کو خاموشی کے ساتھ قبول کر لیا تھا کیوں کہ اس طرح انہیں زمین خریدنے کا حق حاصل ہو جاتا تھا۔ یہ ایک ایسی رعایت تھی جو ۱۸۶۷ء میں رسمی طور پر سلطنت عثمانیہ میں بذریعہ قانون منظور کیے جانے سے بہت پہلے سے غیر ملکیوں کو مصر میں حاصل تھی، مگر اس محصول کی ادائیگی میں بھی کئی طرح کی مشکلات حائل تھیں (G.Baer : *A History of Land Ownership in Modern Egypt*، لنڈن ۱۹۶۲ء، ص

۶۵-۶۶)۔ غیر ملکیوں کی طرف سے باقی تمام قسم کے محاصل کی وصولیابی کے لیے متعلقہ ملکوں کی واضح رضامندی ضروری ہوتی۔ محصولات، تجارتی معاہدات میں شامل ہوتے تھے (دیکھیے نیچے)۔ ۱۷/مارچ ۱۸۸۵ء کو لنڈن کنونشن میں چھ بڑی یورپی طاقتوں نے ۱۳/مارچ ۱۸۸۴ء کے ہاؤس ٹیکس کے قانون پر دستخط کیے (بشمول بعض ترمیمات جن کا تعلق ٹیکس کمیشن میں غیر ملکیوں کی نمائندگی سے تھا)۔ ۱۸۹۰ء میں ان طاقتوں نے نئی قائم شدہ بلدیہ اسکندریہ کے اس حق کو تسلیم کر لیا کہ وہ غیر ملکی باشندوں پر بلدیاتی ٹیکس عائد کر سکتی ہے۔ ۱۹۳۰ء میں رات کے چوکیداروں کی تنخواہ کی ادائیگی کے لیے شہری جائیداد پر ٹیکس کی زائد شرح پر بھی اظہار رضامندی کیا گیا۔ اسی طرح ۱۹۳۲ء-۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصے میں کاروں پر ٹیکس کے علاوہ بعض دیگر معمولی محاصل کی منظوری بھی دی گئی۔ بہرحال ۱۹۳۷ء میں خصوصی مراعات کی تنسیخ سے پہلے ان یورپی طاقتوں نے مصر میں بہت سے دوسرے محاصل مثلاً انکم ٹیکس کے نفاذ میں رکاوٹ پیدا کی۔

(۲) درآمدی وبرآمدی محصولات (Customs): خدیو مصر کو (۱۸۶۷ء اور پھر ۱۸۷۳ء میں) تجارتی معاہدے کرنے کا حق دیئے جانے سے پیشتر مصر اور سلطنت عثمانیہ کی شرح محصولات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس صدی کے آخری چوتھائی حصے میں مصری تجارتی معاہدات، یورپی طاقتوں کے لیے عثمانی معاہدات کی نسبت زیادہ فائدہ مند نہیں تھے، مگر ۱۹۰۲ء میں فرانس درآمدی محصول کو بحساب قیمت آٹھ فیصد تک کی سطح پر لے آنے میں کامیاب رہا۔ پھر ''انتہائی مراعات یافتہ قوم'' کی شق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قدرتی طور پر یہی شرح محصول ان قوموں کے لیے بھی برقرار رہی جن کے مصر کے ساتھ تجارتی معاہدے طے پا چکے تھے۔ ۱۹۲۵ء کے بعد ایسے معاہدے یکے بعد دیگرے ختم ہوتے چلے گئے۔ بہر طور شرح محصول اس وقت تک تبدیل نہ ہو سکی جب تک آخری معاہدہ جو مصر اور یونان کے مابین تھا، ۱۹۳۰ء میں اختتام پذیر نہ ہوا۔ اسی سال ۱۷ فروری کو مصر نے درآمد وبرآمد کے محصول کی نئی شرح نافذ کی جس کا مقصد سرکاری آمدنی میں اضافہ اور مقامی نوزائیدہ صنعتوں کو کسی حد تک تحفظ فراہم کرنا تھا۔

(۳) انفرادی آزادی: انیسویں صدی میں مصر میں غیر ملکی، سلطنت عثمانیہ کے دوسرے علاقوں کی نسبت دو لحاظ سے زیادہ انفرادی آزادی رکھتے تھے۔ پہلی یہ کہ یہ عثمانی قانون کہ کوئی گرجا گھر متعلقہ حکام کی واضح اجازت کے بغیر نہ تو تعمیر کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی مرمت کی جا سکتی ہے، مصر میں نافذ نہیں تھا۔ دوسری یہ کہ ۱۸۴۴ء اور ۱۸۶۹ء کی غیر ملکیوں کی آزادی پر عثمانی پابندیاں مصر میں مروج نہیں تھیں، لہٰذا مصری حکام غیر ملکیوں سے مصر میں داخلے کے وقت بالعموم پاسپورٹ طلب نہیں کرتے تھے، نہ ہی ان سے ''تذکرہ'' [رک باں] یعنی ٹکٹ پاس رکھنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔

(۴) سکونت کی فسخ پذیری: مصر میں سکونت کی حرمت کا اصول نسبتاً زیادہ وسعت کا حامل تھا اور اس میں ہر قسم کی تجارتی جائیداد مقبوضہ بھی شامل تھیں، مثلاً ترکی میں کسٹم کے حکام ان تمام جہازوں کا معائنہ کیا کرتے تھے جو ان کی بندرگاہوں میں داخل ہوتے اور سامان کے اتارے جانے تک وہاں موجود رہتے۔ مصر میں، اس کے برخلاف، حکام صرف ممنوعہ اشیا کا جائزہ لیتے اور اگر وہ واقعتاً ساحل پر اتاری جاتیں تو انہیں اپنے قبضے میں لے لیتے۔ استثنائی حقوق ماہی گیری کی کشتیوں کے ان مالکان کو بھی حاصل تھے جو مالٹا، یونان اور اٹلی

سے تعلق رکھتے تھے۔ ان حقوق پر وہ پابندیاں جو ۱۸۶۸ء اور ۱۸۷۴ء میں باب عالی اور یورپی طاقتوں کے مابین طے پائی تھیں، مصر پر لاگو نہیں ہوتی تھیں۔ مصر نے ممنوعہ اشیا رکھنے والے جہازوں کی تفتیش کے حقوق ان تجارتی معاہدات کے تحت حاصل کیے جو اس کے اور یورپی طاقتوں کے مابین ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء میں طے پائے.

(۵) قانونی استثناء: جبکہ ترکی میں قوانین تنظیمات، مثلاً پریس لاز غیر ملکیوں پر لاگو تھے (سکاٹ، ۱۹۸)۔ مصر میں غیر ملکیوں کو مقامی قوانین سے مکمل استثنا حاصل تھا۔ کوئی مصری قانون غیر ملکیوں پر اس وقت تک نافذ نہ ہو سکتا جب تک اسے متعلقہ ملک کی حکومت کی واضح رضامندی حاصل نہ ہوتی۔ اس اصول نے کئی جدید اداروں کے قیام کی کوششوں کو ناکامی سے دو چار کیا (بطور مثال سعید کی پولیس سے متعلق اصلاحات۔ بلدیات کی ترقی پر اس کے ضرر رساں اثرات کے لیے دیکھیے: G. Baer: The Beginnings of Municipal Government in Egypt، در The Middle Eastern Studies، ۴: ۲، جنوری ۱۹۶۸ء).

(۶) ۱۸۷۶ء سے پیشتر عدالتی دائرہ اختیار: قانون کے علاقائی سے بڑھ کر انفرادی اصول کا کردار رکھنے کی بدولت مصر میں اس کا نفاذ سختی سے ہوتا رہا چنانچہ تدریجاً actor sequitur Forum rei کا اصول مسلمہ حیثیت اختیار کر گیا، یعنی یہ کہ ''مدعا علیہ کی عدالت'' کا دائرہ اختیار تمام معاملات پر حاوی ہے نہ کہ صرف ان امور پر جو مختلف قومیتوں کے غیر ملکی باشندوں سے متعلق ہیں، جیسا کہ سلطنت عثمانیہ کے دوسرے علاقوں میں ہے۔ اس طرح قونصلر عدالتوں نے فیصلہ کیا کہ ان کا دائرۂ اختیار کسی بھی ایسے فوجداری، تجارتی یا دیوانی مقدمہ پر حاوی ہوگا جس میں کوئی غیر ملکی باشندہ، حتیٰ کہ تحفظ یافتہ شخص مدعا علیہ ہوسکے گا۔ علاوہ ازیں مصر میں، مگر ترکی میں نہیں، ایسی جائیداد غیر منقولہ کے مقدمات بھی جن میں مختلف قومیتوں کے غیر ملکی لوگ ملوث ہوتے مدعا علیہ کی قونصلر عدالت میں طے پاتے۔ قونصل عام طور پر اپنے اپنے ملکوں کے قوانین کا نفاذ کرتے تھے۔ اگر اس کے خلاف اپیل دائر کی جاتی تو یہ درخواست مدعا علیہ کی اپنی ملکی عدالت میں پیش کی جاتی تھی اور قونصل کی طرف سے دی گئی فوجداری سزا کے عملی نفاذ کے لیے غیر ملکی مجرم کو عموماً اس کے اپنے ملک میں بھیج دیا جاتا تھا.

مصر میں غیر ملکیوں کو عطا کی گئی مذکورہ بالا خصوصی رعایتوں کے بارے میں ان دلائل کے علاوہ، مصر اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے علاقوں کے مابین یہ فرق بیشتر مراعاتِ خصوصی میں اصولی طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ایسے مقدمات جن میں غیر ملکی اور عثمانی باشندے ملوث ہوں گے اور جن میں کسی ایک کا مخصوص حد سے زیادہ مالی مفادات کا تعلق ہوگا، ان کی سماعت شاہی دیوان میں کی جائے گی۔ چونکہ مصر سے استانبول کا سفر خاصہ تھا اور مہنگا ہوتا تھا، لہٰذا بالعموم ایسے مقدمات عدالتِ مدعا علیہ میں پیش کیے جانے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ (برکات، ۱۷۳).

(ب) قانونی اصلاحات اور مراعات خصوصی کی تنسیخ

(۱) ۱۸۷۶ء سے ماقبل کی مشترکہ عدالتیں: ایک ایسے متحدہ عدالتی نظام کے قیام کی کم از کم ایسے مقدمات کے فیصلے کے لیے جس میں مختلف قوموں کے افراد ملوث ہوں، اور ایسے ہی ان عدالتوں میں مصری نمائندگی کو ممکن بنانا، جہاں مصری باشندے مدعی ہوں، ترکی میں اسی قسم کی مساعی سے پیشتر صورتیں روبعمل آئیں.

ایک مشترکہ تجارتی ٹربیونل ۱۸۲۰ء کے قرب وجوار میں محمد علی کے ایجنٹ، مشہور تاجر محمد المحروکی کی صدارت میں قائم کیا گیا (۵۶) F. Mengin: Histoire de l Egypte Sous le Government` de

Mohammed- Aly، پیرس ۱۸۲۳ء، ۲: ۴۴۱؛ ۲۴۳؛۱۸۲۷ـ۱۸۲۸؛ و امین سامی: تقویم النیل، قاہرہ ۱۹۲۸ء، ۲: ۳۳۳)۔ بے عملی کے ایک طویل دور کے بعد قاہرہ اور اسکندریہ میں مشترکہ تجارتی عدالتوں کو ۳؍ستمبر ۱۸۶۱ء کے ایک حکم کے ذریعے از سرنو منظم کیا گیا جس کے مطابق مصری اور غیر ملکی ارکان اور مصری صدر کے تقرر کی گنجائش پیدا کی گئی مگر کبھی مؤثر انداز میں کارروائی انجام نہ دے سکے کیوں کہ غیر ملکیوں نے ان کی حیثیت کو ان مقدمات میں تسلیم نہ کیا جن میں وہ خود مدعا علیہ ہوتے۔ وہ ان کی طرف صرف اس صورت میں رجوع کرتے جب وہ مدعی ہوتے (Stoddart to Amber Deen، ۳۱ دسمبر ۱۸۴۵ء ، پبلک ریکارڈ آفس لنڈن، F.O ۷۸/ ۶۲۴ اور کونسل گرین کے ذریعے رپورٹ ۲ اپریل ۱۸۵۶ء ، F.O ، ۷۸/ ۱۲۲۲ء)

(۲) ۱۸۷۵ء کی اصلاحات: ۱۸۶۷ء کی ایک رپورٹ میں، اس وقت کے مصری وزیرخارجہ نوبار پاشا نے مشترکہ عدالتوں کے قیام کی تجویز پیش کی جنہیں تمام مقدمات تجارتی، دیوانی یا فوجداری کا اختیار سماعت حاصل ہو۔ طویل مذاکرات کے بعد، جن کے دوران میں نوبار کو مجبوراً اپنے اصل منصوبے سے دستبردار ہوکر زیادہ معتدل اصلاحات پر مطمئن ہونا پڑا، ۱۸۷۵ء میں قوانین کی تنظیم نو کا نفاذ ہوا۔ اس قانون کے تحت ۱۸۷۶ء میں جو نئی مشترکہ عدالتیں قائم ہوئیں انہیں مختلف شہریتوں کے غیرملکی باشندوں کے مابین اور غیر ملکیوں اور مصریوں کے مابین پیدا شدہ تمام دیوانی اور تجارتی معاملات پر قانونی اختیار حاصل تھا۔ انہیں ایسے مقدمات کا بھی اختیار سماعت تھا جو مصر میں اراضی کے غیر ملکی فریق مقدمہ سے متعلق ہوں یا ایسے مصری اداروں سے ان کا تعلق ہو جن میں غیر ملکی سرمایہ لگایا گیا ہو (جنہیں ''مشترکہ مفادات'' کہا جاتا تھا)۔ فوجداری مقدمات میں مشترکہ عدالتوں کو صرف ان مقدمات پر اختیار حاصل تھا جو غیر ملکیوں سے سرزد ہوں اور قابل دست اندازی پولیس ہوں اور جن پر جرمانے کی رقم ایک انگریزی پونڈ یا ایک ہفتے کی قید ہو، یا مشترکہ عدالتوں کے خود اپنے جاری کردہ قانونی احکام کے خلاف سرزد ہوے ہوں۔ غیر ملکی باشندوں کے سرزد ہونے والے باقی تمام فوجداری جرائم قونصلر عدالتوں میں زیر سماعت آتے، جنہیں غیر ملکیوں کے شخصی معاملات پر بھی حق اختیار تھا بشمول ان مقدمات کے جو ایک ہی شہریت کے غیر ملکیوں کے مابین قائم ہوتے ماسوائے مرافعات اراضی کے۔

مشترکہ عدالتوں کے غیر ملکی جج متعلقہ ملک کے وزیر انصاف کے مشورے سے متعین کیے جاتے اور مصری ججوں کے تناسب سے ان کی تعداد کا تعین کیا جاتا تھا۔ ۱۸۳۷ء میں حسب ذیل تین ضلعی عدالتیں اور ایک مرافعہ عدالت تھی۔

اسکندریہ مرافعہ عدالت (اپیل کورٹ) مصری جج ۶، غیرملکی جج:۱۰۔ ضلعی عدالت قاہرہ ۸، ۱۷۔ ضلعی عدالت اسکندریہ ۶،۱۰۔ ضلعی عدالت منصورہ۳،۷۔میزان۲۳، ۴۴.

چونکہ مشترکہ عدالتیں تمام غیر ملکی باشندوں کے لیے قابل رسائی تھیں اس لیے ان کے قیام سے غیر مراعاتی طاقتوں کے باشندوں کے لیے نئی مراعات کی منظوری بھی متعلق تھی۔ مشترکہ عدالتیں اپنے فیصلے ''مشترکہ ضوابط'' کے مطابق صادر کرتیں جن کی اساس زیادہ تر نپولین کوڈ اور فرانسیسی قانون ہوتی۔ چونکہ یہ ضوابط پندرہ حکومتوں کی متفقہ منظوری کے بغیر تبدیل نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اس لیے ۱۹۱۱ء میں ایک مجلس قانون ساز قائم کی گئی جو قانون میں اضافے یا ترمیم کو منظور کرنے کا اختیار رکھتی تھی، (مگر اسے غیر ملکیوں کو حاصل مالی استثنا

میں مزاحم اقدامات کی توثیق کا حق نہیں تھا)۔

(۳) مراعات خصوصی اور غیر ملکیوں کے لیے خصوصی دائرہ اختیار کی تنسیخ: جنگ عظیم اول کے آغاز پر ترکی حکومت نے مراعات خصوصی کی تنسیخ کا اعلان کر دیا اور بعد میں ۱۹۲۳ء کے معاہدہ لوزان کی شق ۲۸ کے تحت مراعات یافتہ طاقتوں نے بھی اس اقدام کو تسلیم کر لیا، بہرحال مصر اس قانونی اقدام سے غیر متأثر رہا کیوں کہ ۱۹۱۴ء میں مصر پر برطانوی انتداب کے قیام سے ترکی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ بعد میں معاہدۂ لوزان کی شق ۱۷ کی رو سے، ۵/ نومبر ۱۹۱۴ء سے ترکی نے بھی اس سے دست برداری کا اعلان کر دیا تھا۔ بہرحال ۱۹۳۶ء کے مصری و برطانوی معاہدہ کی شق ۱۳ کے تحت اس بات پر اتفاق رائے ہوا کہ خصوصی مراعات کو بتدریج منسوخ کیا جائے گا، مصر کو قانون سازی کی مکمل آزادی حاصل ہوگی (بشمول مالی معاملات) اور مشترکہ عدالتیں ایک عبوری دور کے بعد ختم کر دی جائیں گی جس کے دوران قونصلوں کے اختیارات مصری عدالتوں کو منتقل ہو جائیں گے۔

اس کے نتیجے میں ۱۲/اپریل ۱۹۳۷ء کو مصری حکومت کی دعوت پر مونٹریکس میں "مراعاتی طاقتوں" کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ ۸/ مئی ۱۹۳۷ء کو اس کانفرنس کے 'حتمی قانون' کے متن پر دستخط کر دیے گئے۔ خصوصی مراعات اور اسی قانون سازی اور مالی معاملات سے غیر ملکیوں کے استثنا کو بھی منسوخ کر دیا گیا۔ بارہ سالوں پر محیط (۱۴/اکتوبر ۱۹۴۹ء تک) عارضی دور میں فوجداری اور ایسے دیوانی مقدمات جو تاحال قونصلر عدالتوں کے دائرہ اختیار میں آتے تھے ان کا حق سماعت مشترکہ عدالتوں کو منتقل کر دیا گیا اور قونصلروں کے پاس صرف شخصی معاملات کا اختیار رہ گیا۔ غیر ملکی باشندوں کو، جو بالعموم مشترکہ عدالتوں کے دائرہ کار میں آتے تھے، اجازت مل گئی کہ وہ اپنے مقدمات مقامی حکومتوں کے پاس لے جائیں۔ ضلعی عدالتوں کی تمام خالی اسامیاں بقدر دو تہائی، مصری ججوں سے پُر کی جانے لگیں اور وہ ان عدالتوں کے صدر نشین بھی بن گئے۔ عدالتی فیصلے عربی اور یورپی زبانوں میں دیئے جانے لگے۔

۱۵/اکتوبر ۱۹۴۹ء کو مشترکہ عدالتیں اور قونصلر عدالتیں بند کر دی گئیں۔ ان کا دائرہ اختیار مقامی عدالتوں کو منتقل کر دیا گیا اور قانونی ضابطے از سر نو ترتیب دیئے گئے اور انہیں یکجا کر دیا گیا۔

مآخذ: (۱) G. Pelissie de Rausas : *Le Regime des Cupitulations dans lempire ottoman*، پیرس ۱۹۰۵ء، ۲: ۱۱۷ بعد؛ (۲) J.H.Scott: *The Law Affecting Foreigners in Egypt*، ایڈنبرا ۱۹۰۷ء؛ (۳) M.Bahi طبع دین برکت: *Des Privileges et immunites dont Jouissent les etrangers en Egypte vis-a-vis des autorites locales*، پیرس ۱۹۱۲ء؛ (۴) محمد عبدالباری: الامتیازات الاجنبیۃ، قاہرہ ۱۹۳۰ء (۵) Le Groupe d` Etudes de L Islam dante: *L`Egypte Indepen*، پیرس ۱۹۳۸ء، ص ۱۱۱ تا ۲۴۲؛ (۶) H.Beeley: *Survey of International Affairs*، لنڈن ۱۹۳۹ء، ص ۵۸۱-۶۰۵؛ (۷) J.Y. Brinton : *The Mixed Courts of Egypt*، بار دوم نیوہیون ۱۹۶۸ء۔

(G.Baer [ت: امین اللہ وثیر])

••-------------••

⊗ **امتیاز علی تاج، سید**: معروف ڈراما نگار، صحافی اور ادیب۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو لاہور میں پیدا ہوے۔ سلسلۂ نسب امام رضاؒ سے ملتا ہے۔ ان کے بزرگ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ حکومت میں بخارا سے ہندوستان آئے اور انبالہ کے ایک قصبہ جگادھری میں مقیم ہوے، جہاں سے اس خاندان کے ایک بزرگ سید

ہاشم علی کسی وقت دیوبند (اترپردیش) منتقل ہوگئے۔ سید ہاشم کے بھانجے میر ستار علی کی تیسری پشت میں سید امتیاز علی تاج پیدا ہوئے۔ تاج کے والد سید ممتاز علی (ولادت ۲۷ ستمبر ۱۸۶۰ء ۔ وفات ۱۵ جون ۱۹۳۵ء) اپنے عہد کے نامور عالم، مصنف اور مصلح قوم تھے۔ انھوں نے اپنی دوسری اہلیہ محمدی بیگم (وفات: ۲ نومبر۱۹۰۸ء) سے مل کر ہندوستانی خواتین کی تعلیم وتہذیب کے لیے مشہور رسالہ ''تہذیب نسواں'' جاری کیا (یکم جولائی۱۸۹۸ء)۔ ہندوستانی خواتین کے لیے غیر معمولی تہذیبی خدمات کے باعث مولوی ممتاز علی کو عورتوں کا سرسید بھی کہا گیا (اگرچہ سرسید نے ''رسالہ تہذیب نسواں'' کی اشاعت کی مخالفت کی، تاہم مولوی ممتاز علی سے تعلق خاطر کے باعث رسالے کا نام سرسید ہی نے تجویز کیا)۔

سید امتیاز علی تاج نے ابتدائی تعلیم مختلف اداروں سے حاصل کی اور۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی. ستمبر۱۹۱۸ء میں جب ان کی محض اٹھارہ برس کی عمر تھی، ان کی ادارت میں ایک ادبی ماہنامے ''کہکشاں'' کا اجرا ہوا جس کا سلسلہ اشاعت جولائی ۱۹۲۰ء (ایک سال گیارہ ماہ) تک جاری رہا۔ اس رسالے میں پہلی بار تاج کے جوہر کھلے۔ اس میں ہندوستان کے نامور اہل قلم کی نگارشات شائع ہوئیں۔ خود تاج نے (زمانہ طالب علمی) میں کہانیاں لکھنا شروع کردی تھیں۔ رسالہ ''کہکشاں'' کا سلسلہ اشاعت منقطع ہوجانے کے بعد وہ رسالہ ''نقاد'' (مدیر: شاہ دلگیر اکبر آبادی) میں مضمون نگاری کرتے رہے.

گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانہ طالب علمی میں وہ گورنمنٹ کالج کے ڈراموں میں حصہ لیتے رہے اور اداکاری بھی کرتے رہے۔ یہی دل چسپی بعد ازاں اردو میں ڈرامہ نگاری سے ان کی گہری وابستگی کا سبب بن گئی۔ اسی زمانے (۱۹۲۲ء) میں انہوں نے ڈراما ''انار کلی'' لکھنا شروع کیا۔جو دارالاشاعت پنجاب سے (جسے مولوی ممتاز علی نے ۱۸۹۸ء میں قائم کیا تھا) ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ اس ڈرامے کا انتساب نواب سید محمد اسماعیل (مدراس) کی صاحب زادی اور اس زمانے کی ایک مصنفہ حجاب اسماعیل کے نام کیا گیا تھا، جن سے بعد ازاں ۳۱ مارچ ۱۹۳۴ء کو وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے.

تاج کے والدین نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو تاج کی نویں سالگرہ کے دن بچوں کے ایک جریدے ''پھول'' کا اجرا کیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جب مولوی سید ممتاز علی انتقال کر گئے تو اس اخبار پر بحیثیت مدیر، سید امتیاز علی تاج کا نام چھپنے لگا۔ ''پھول'' ایک عرصے تک بچوں کا محبوب رسالہ رہا، لیکن ۱۹۴۷ء میں، برصغیر کی آزادی اور دو نئ مملکتوں کے قیام کے بعد، اسے جاری رکھنا مشکل ہوگیا۔ چنانچہ تہذیب نسواں کے ساتھ ۱۹۴۹ء میں''پھول'' کی اشاعت کا سلسلہ بھی موقوف ہوگیا.

۱۹۵۸ء میں، تاج کو اردو میں اعلیٰ کتب کے تراجم اور کلاسیکی ادب کے فروغ کے لیے قائم کیے جانے والے ادارے ''مجلس ترقی ادب'' (لاہور) کا ناظم اعلیٰ بنا دیا گیا۔ ان کے زمانۂ نظامت میں ''مجلس ترقی ادب'' کی طرف سے تدوین مخطوطات، قدیم مطبوعات کی نئ اشاعتوں، مطبوعہ متون کی تصحیح وتراجم کا کام ہوا اور تاریخی، تمدنی نیز معاشرتی حوالوں سے دوسو کے قریب کتابیں شائع ہوئیں۔ خود امتیاز علی تاج نے کلاسیکی ڈراموں کی دریافت کے سلسلے میں تھیٹر کے قدیم ڈراموں کے متون کی تصحیح وتدوین کا کام کیا۔ چنانچہ انھوں نے ''خورشید مع اردو ڈرامے کا تاریخی جائزہ'' تالیف کی اور نہروان جی مہروان جی آرام، منشی رونق بنارس، حسینی میاں ظریف اور حباب کے ڈراموں پر مشتمل چھ مجلدات مرتب کر

کے شائع کیں۔

دارالاشاعت پنجاب سے تاج کی چھوٹی بڑی بیسیوں کتب شائع ہوئیں، جن میں سے بعض تو تاج کی طبع زاد تصانیف ہیں اور بعض کتب پر "تاج وحجاب" کا نام درج ہے، انھوں نے رسالہ "پھول" کے مختلف مندرجات سے مرتب کی ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے متعدد انگریزی تخلیقات کے اردو تراجم بھی کیے، جن میں شیکسپیر، ایڈگر ایلن پو، برنارڈشا، لارڈلٹن، مورس لیرال سین، جان ہنکر اور کیرل چیک کی متعدد تخلیقات شامل ہیں۔

اردو میں "چچا چھکن" کا مزاحیہ کردار بھی تاج کی تخلیق ہے۔ انھوں نے فلموں کے لیے بھی کہانیاں اور مکالمے لکھے۔ ایک زمانے میں شاعری بھی کی (مخزن، رفیق التعلیم اور "پھول باغ" میں ان کی منظومات شائع ہوتی رہیں)۔

ان کی شہرت کا اصل سبب ان کا ڈراما "انار کلی" بنا جس میں اکبر بادشاہ [رک بآں] کی ایک کنیز نادرہ کی شہزادہ سلیم (نور الدین جہانگیر) سے محبت کی داستان اور اس کے انجام کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈراما تین ابواب (ایکٹ) پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان "عشق" دوسرے کا "رقص" اور تیسرے کا "موت" ہے۔ تینوں عنوان ڈرامے کی کہانی کے ارتقا کا پتا دیتے ہیں۔ ہر باب چار مناظر پر مشتمل ہے اور آخری باب میں پانچویں اختتامیہ منظر کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اکبر بادشاہ کی ایک محبوب نظر کنیز دلارام، دربار میں نادرہ کے آنے اور بادشاہ کی نظر میں اہم مقام پا لینے پر پریشان ہے۔ بادشاہ، نادرہ کو انارکلی کے خطاب سے نواز چکا ہے۔ دلارام، انارکلی کو راہ سے ہٹانا چاہتی ہے، شہزادہ سلیم سے انارکلی کی محبت اسے سازش کا مواد فراہم کر دیتی ہے۔ حرم سرا کے جشن کے موقع پر دلارام اکبر پر سلیم اور انار کلی کے عشق کا راز فاش کر دیتی ہے جس پر طیش میں آکر اکبر "انار کلی" یعنی نادرہ کو دیوار میں چننے کا حکم دیتا ہے۔ بیٹے کی محبت پر ولی عہدی کے مطالبات غالب آجاتے ہیں اور "انار کلی" کو موت کے منہ میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ یہ بات کہ "انار کلی" سلیم کا المیہ ہے یا خود اکبر اعظم کا، اردو ڈرامے کی تنقید کا ایک اہم سوال ہے۔ انار کلی کے تہذیبی، معاشرتی، تمدنی اور ادبی پہلوؤں پر جس قدر لکھا گیا ہے اتنی تنقید اردو کے کسی اور ڈرامے کے حصے میں نہیں آئی۔

سید امتیاز علی تاج کو ان کی بہترین ادبی خدمات پر ۱۹۶۱ء میں، حکومت پاکستان کی طرف سے ستارہ امتیاز عطا کیا گیا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۷۰ء کو رات دو بجے جبکہ وہ محو خواب تھے، دو نامعلوم افراد نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا، جس سے وہ شدید زخمی ہو گئے۔ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء کو انھوں نے جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

مآخذ: (۱) صحیفہ: مجلس ترقی ادب، لاہور، ش ۵۳، اکتوبر ۱۹۷۰ء (تاج نمبر)؛ (۲) ماہنامہ کتاب: قومی کتاب مرکز پاکستان، لاہور، ج:۴، ش۹، جون۱۹۷۰ء (تاج نمبر)؛ (۳) نقوش: ادارہ فروغ اردو، لاہور، ش۵۹۔۶۰، اکتوبر ۱۹۵۶ء (شخصیات نمبر)؛ (۴) عبدالمجید سالک: سرگزشت، الفیصل ناشران کتب، لاہور،اشاعتِ نو، ۱۹۹۳ء؛ (۵) سید امتیاز علی تاج: انار کلی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، اشاعتِ نو، ۱۹۸۹ء۔

(زاہد منیر عامر)

••-------------••

⊗ **(سید) امجد الطاف**: اردو ادب کے معروف ادیب شاعر اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جامعہ پنجاب، لاہور) کے مدیر اور بعد ازاں صدر شعبہ۔

سید صاحب کا آبائی مولد و مسکن، ہندوستان کا مشہور مردم خیز شہر جالندھر تھا۔ ان کے والد محترم سید الطاف

ایک پولیس آفیسر تھے۔ وہ وہیں ۱۰ مارچ ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور پھر ایم اے (اردو) کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ طالب علموں کی اس جماعت میں شامل تھے، جنہوں نے حصول پاکستان کے لیے مسلم لیگ کے ہراول دستے کا کام کیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے تحت نکلنے والے رسالے ''اعلان'' کے مدیر بھی رہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد، انہوں نے ہیلی کالج آف کامرس (جامعہ پنجاب) میں لیکچرار (اردو) کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ دو سال کے بعد (۱۹۵۴ء۔۱۹۵۶ء) وہ دیال سنگھ کالج لاہور میں بطور لیکچرار (اردو) چلے گئے، لیکن وہاں زیادہ عرصہ نہ رہے ۱۹۵۶ء میں وہ سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ، لاہور میں اسسٹنٹ سیکرٹری بن گئے، مگر وہاں بھی دو سال سے زیادہ نہ ٹھہرے۔ ۱۹۵۹ء میں وہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے ایما پر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں بحیثیت معتمد (سیکرٹری) آگئے۔ ایک سال کے بعد پشاور یونیورسٹی (شعبہ اردو) میں سینئر لیکچرار ہو کر چلے گئے، مگر ایک سال کے بعد ہی انہیں ۲۲ مئی ۱۹۶۲ء کو بطور لیکچرار شعبہ اردو میں اورینٹل کالج میں تعینات کیا گیا اور ان کی خدمات شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے سپرد کر دی گئیں۔ اسی طرح وہ شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ سے بطور مدیر وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۷۰ء میں انہیں بطور سینئر مدیر ترقی دے دی گئی۔ یہاں سے ۹ مارچ ۱۹۸۴ء کو وہ بربنائے عمر شعبہ کی ملازمت سے سبکدوش (ریٹائر) ہوگئے، مگر معاہدہ کی بنیاد پر ان کی ملازمت کا سلسلہ جاری رہا۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے انتقال (اگست ۱۹۸۶ء) کے بعد، انہیں صدر شعبہ و مدیر اعلیٰ تعینات کر دیا گیا، چنانچہ وہ اپنی وفات (۵جولائی ۱۹۹۵ء) تک اسی عہدے پر تعینات رہے۔

سید امجد الطاف اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی تدوین میں طویل عرصہ (تقریبا ۳۵ سال) شریک رہے۔

اس دوران میں انہوں نے بہت سے مقالات کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ یا نظرثانی کے علاوہ، مختلف و متنوع موضوعات پر متعدد نئے مقالات بھی تحریر کیے۔ جن میں (حضرت) الیاسؑ (۲۱۲:۳) (حضرت) الیسعؑ (۲۱۴:۳)، انشاء اللہ خان (۴۰۵:۳) نامور اردو شاعر انیس (۵۰۰:۳)، ساتھرسٹ (۸۴:۳)، بدیل بن ورقاء الخزاعی (۲۳۷:۴)، بتی (۹۲۷:۴)، بوڈاپسٹ (۱۰۰۴:۴)، بہار بانو بیگم (۱۱۶:۵)، البیضاء (۲۸۶:۵)، علم المثلثات (۱۴/۱:۳۵۳)، علم طبیعیات (۱۴/۱:۳۲۳) اور علم المعادن (۱۴/۱:۳۴۷) وغیرہ شامل ہیں۔

انہوں نے کئی سال تک بطور سیکرٹری حلقہ ارباب ذوق بھی خدمات انجام دیں (۱۹۵۴ء۔۱۹۵۶ء اور ۱۹۷۸ء۔ ۱۹۸۵ء)۔ اس عرصے میں انہوں نے حلقہ ارباب ذوق کے اجلاسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے ترقی پسند ادیبوں کے مقابلے میں دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کو منظم کرنے میں سرگرم کردار ادا کیا۔ وہ حلقہ کے ترجمان نئی تحریریں کے شریک مدیر بھی رہے۔

ان کی ادارت میں ایک ادبی پرچہ 'علامت' بھی کئی سال (۱۹۸۹۔ ۱۹۹۵ء) تک شائع ہوتا رہا۔

انہیں اردو ادب میں بطور افسانہ نگار بھی پہچانا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ، کچے دھاگے کے عنوان سے (۱۹۶۰ء میں) چھپا۔ محفل ادب (مطبوعہ ۱۹۶۲ء)، فرصت کے مشغلے (مطبوعہ ۱۹۶۳ء)، جہاں اور بھی ہیں (مطبوعہ ۱۹۶۴ء)، کے ناموں سے ان کی دو کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہوچکی ہیں۔ ان کی دو کتابیں، انشاء

اور دشت طلب (شاعری)، زیر طبع ہیں.

وہ اردو زبان کے ایک شاعر بھی تھے، اگرچہ انہوں نے غزل اور نظم کے علاوہ دیگر اصناف [شعر] میں بھی طبع آزمائی کی، مگر ان کی شاعری زیادہ تر مرثیہ نگاری تک محدود رہی۔ وہ ایک مخلص، ہمدرد، شریف الطبع اور دوسروں کے کام آنے والے انسان تھے.

مآخذ: (۱) سید امجد الطاف کا اپنے ہاتھ سے تیار کردہ اپنے حالات زندگی پر مشتمل ایک مسودہ (مخزونہ شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ)؛ (۲)؛ یونس جاوید: حلقہ ارباب ذوق، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۸۴ء، ص۳۲۴؛ (۳) ذاتی فائل:سید امجد الطاف، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور.

(محمود الحسن عارف)

••-------------••

※امداد اللہ(حاجی): المہاجر الہندی المکی بن محمد امین الفاروقی، ہندوستان کی بہت سی سرکردہ دینی شخصیات، بشمول مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند [رک بآں]، کے مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) اور مولانا اشرف علی تھانوی [رک بآں] روحانی مربی ومرشد وہ نانوتہ (ضلع سہارن پور، بھارت) میں ۱۲۳۱ھ/ ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوے.

قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد انہوں نے فارسی، عربی صرف ونحو اور فقہ کی تعلیم حاصل کی، تاہم انہیں روایتی معنوں میں کبھی عالم [دین] نہیں سمجھا گیا، انہوں نے اپنا عہد شباب علم تصوف کے اکتساب میں صرف کیا اور جلد ہی اپنے آبائی قصبے تھانہ بھون (مظفر نگر کے شمال مغربی جانب، اٹھارہ میل کے فاصلے پر واقع) کی ایک مسجد میں ایک شیخ [طریقت] کی حیثیت سے مقیم ہوے، جو بعد ازاں خانقاہ امدادیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

۱۸۵۷ء میں مقامی آبادی کی بغاوت کے بعد [انگریز حکومت نے] اسے انتقامی کارروائی کرکے نذر آتش کر دیا، لیکن اسے [بعد میں] دوبارہ تعمیر کیا گیا اور یہاں سے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرح کی کئی مشہور ہستیوں نے تربیت پائی، جن کے مریدین میں سے نامور سیرت نگار [سید] سلیمان ندوی [بھی] ہیں.

انہوں نے ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں [فریضہ] حج ادا کیا اور یوں ''حاجی'' کا تعظیمی لفظ ان کے نام کا ایک لازمی جزو بن گیا۔ ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء میں ہندوستان کی جنگ آزادی کے دوران میں حاجی امداد اللہ اور ان کے رفقا نے، مجاہدین آزادی کا ساتھ دینے کے جرم میں ماخوذ تھانہ بھون کے ایک نامور شہری عبدالرحیم کو پھانسی کی سزا ملنے کے بعد، جہاد کا اعلان کر دیا۔ اپنے قصبے میں متوازی حکومت قائم کرنے کے بعد انہوں نے ایک چھوٹے سے قریبی قصبے شاملی پر حملہ کر دیا لیکن انگریز حکومت کے ہاتھوں شکست کھائی۔ حاجی امداد اللہ [وہاں سے] بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ دوسرے باغی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کے خطرے کے پیش نظر حاجی امداد اللہ بھیس بدل کر ۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء میں مکہ [مکرمہ] جا پہنچے۔ وہاں شروع شروع میں انہوں نے بڑے افلاس سے گزر بسر کی، وہ اپنی دیگر سرگرمیوں کے علاوہ، حرم شریف میں مثنوی [مولانا] جلال الدین رومیؒ کا درس دیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ایک صوفی کی حیثیت سے ان کی شہرت ہوئی اور بہت سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہوے۔ ہندوستانی لوگ، خصوصا علماے دیوبند نے وہاں جا کر ان سے بیعت کی، [مولانا] اشرف علی تھانویؒ بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل ہیں۔ مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران میں حاجی صاحب نے نسبتاً بڑی عمر میں تین نکاح کیے، لیکن کسی بیوی سے اولاد نہ ہوئی.

ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں: (۱) ضیاء القلوب (فارسی): دہلی ۱۸۷۷ء۔ یہ کتاب جو ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں تحریر کی گئی، سلسلہ چشتیہ [رک بآں] کے اشغال واذکار کے بارے میں ہے؛ (۲) غذائے روح (اردو)، شیطان کے مکر وفریب سے تنبیہ کی غرض سے منظوم حکایات وامثال پر مشتمل ہے؛ (۳) جہاد اکبر: فضائل جہاد پر ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۲ء میں لکھی جانے والی ایک طویل نظم [جو] دراصل فارسی میں تحریر کردہ ایک گمنام مصنف کے مقالے کا [منظوم] ترجمہ ہے۔ اس [کتاب] سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل جہاد پر غور وفکر کرتے رہے تھے (۴) تحفۃ العشاق: ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء میں لکھی گئی اردو مثنوی، جو معرفت ربانی اور حقیقت ومجاز کے بارے میں ہے؛ (۵) درد نامہ غمناک: ایک عاشق بے کس کی فریاد پر مبنی مختصر نظم؛ (۶) ارشاد مرشد: ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء میں، اردو میں لکھی گئی نظم جو روحانی وباطنی تجربات کے بارے میں ہے نیز مختصر و جامع اخلاقی نصائح بھی اس میں شامل ہیں؛ (۷) وحدۃ الوجود (فارسی): ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۳ء میں لکھا گیا ابن العربی کے فلسفہ وحدۃ الوجود پر مختصر رسالہ؛ (۸) فیصلہ ہفت مسئلہ: اس عہد کے سات متنازع فروعی مسائل مثلاً سماع، زیارت قبور، اولیاے کرام کے اعراس وغیرہ پر ایک رسالہ؛ (۹) گلزار معرفت: روحانی اور متصوفانہ موضوعات پر ان کے فارسی و اردو اشعار کا مجموعہ؛ (۱۰) حاشیہ (فارسی) بر مثنوی [مولانا روم] (کان پور، ۱۳۱۴ھ-۱۳۲۱ھ/ ۱۸۹۶ھ-۱۹۰۳ء): جزوی طور پر مصنف کی وفات کے بعد شائع ہوا؛ (۱۱) مکتوبات امدادیہ (طبع مولانا اشرف علی تھانویؒ، لاہور، ۱۹۶۶ء): اپنی زندگی کے آخری سالوں کے دوران مکہ مکرمہ سے زبان میں لکھے ہوئے پچاس مکتوبات کا مجموعہ، [ان میں سے] آخری مکتوب ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء میں لکھا گیا؛ (۱۲) مرقومات امدادیہ: فارسی زبان میں تحریر کردہ ۶۱ مکتوبات، امداد المشتاق کی ذیل کے طور پر شائع ہوئی (طبع اشرف علی تھانویؒ، لکھنو، ۱۹۱۵ء)؛ (۱۳) کلیات امدادیہ: پاک وہند میں بار بار شائع ہونے والا مجموعہ اشعار (مطبوعہ کان پور ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء، شاہ کوٹ ضلع شیخوپورہ ب۔ ت)۔ اگرچہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے اور ان کے متعدد شعری مجموعے بھی موجود ہیں تاہم انہوں نے کبھی شاعر عظیم ہونے کا دعوی نہیں کیا۔ ان کی اکثر کتب، ماسوائے حاشیہ برمثنوی، پاک وہند میں بار بار شائع ہوتی رہی ہیں۔

انہوں نے ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں چوراسی برس کی عمر میں مکہ مکرمہ میں رحلت پائی۔ وہ اس وقت ایک عظیم روحانی مربی مرشد کی حیثیت سے خوب شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ تاریخی قبرستان جنت المعلی میں مدفون ہوے۔ جہاں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی زوجہ [محترمہ] خدیجہؓ اور آپؐ کے چچا [جناب] ابوطالب کی قبور ہیں۔

مآخذ: (۱) اشرف علی تھانوی: امداد المشتاق، تھانہ بھون ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء؛ (۲) وہی مصنف: کرامات امدادیہ، شاہ کوٹ (ضلع شیخوپورہ)، ب۔ت؛ (۳) وہی مصنف: مکتوبات امدادیہ، لاہور ۱۹۶۶ء؛ (۳) محمد ارتضی خان ومحمد احسن نگرامی: شمائم امدادیہ (اردو ترجمہ نفحات مکیہ)، لکھنؤ ۱۸۹۷ء؛ (۴) امیر شاہ خان: امیر الروایات، طبع محمد طیب بعنوان ارواح ثلاثہ، دیوبند، ب۔ ت؛ (۵) عاشق الٰہی: تذکرۃ الرشید، ج:۲،۳، میرٹھ، ۱۹۰۵ء؛ (۶) محمد انوار الحسن انوار: ہدایات امداد، کراچی، ۱۹۶۵ء؛ (۷) عزیزالرحمٰن: تذکرہ مشائخ دیوبند، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۵۹-۹۰؛ (۸) امداد صابری: سیرت حاجی امداد اللہ، دہلی، ۱۹۵۱ء؛ (۹) رشید احمد گنگوہی: امداد السلوک، عربی رسالہ

بعنوان رسالۂ مکیہ کا فارسی ترجمہ، شاہ کوٹ، ب، ت؛ (۱۰) نامعلوم مصنف: حاجی امداد اللہ، تھانہ بھون (بھارت)، ب، ت؛ (۱۱) حسین احمد مدنی: نقش حیات، دہلی ۱۹۵۴ء، ۲ :۳۲- ۴۵ و۵۳-۶۳؛ (۱۲) گزیٹیئر ضلع مظفر نگر (بھارت)؛ (۱۳) رحمٰن علی: تذکرہ علمائے ہند، کان پور (بھارت) ۱۹۱۴ء، ص۲۸-۲۹؛ (۱۴) عبدالحی الحسنی لکھنوی: نزھۃ الخواطر، حیدر آباد (بھارت)، ج:۸ (مخطوطہ)؛ (۱۵) امداد صابری: فرنگیوں کا جال، دہلی ۱۹۴۹ء، ص ۷-۱۲؛ (۱۶) نذیر احمد دیوبندی: تذکرۃ العابدین وامداد العارفین، دہلی ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء؛ (۱۷) محمد حسین بن بخشیش علی: مظہر العلماء فی تراجم العلماء والکملاء (مرتبہ ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء) مخطوطہ درکتب خانہ قادریہ، بدایوں (بھارت)؛ (۱۸) محمد ایوب قادری (مرتب): مکتوبات حضرت امداد اللہ مہاجر مکی، دارالعلم، کراچی، ۱۹۵۷ء)، ص ۴۱-۴۹؛ (۱۹) سید محمد میاں: علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۱، دہلی، ب، ت؛ (۲۰) CA،Storey ۲/۱، ص ۱۰۵۵، ۱۳۴۵۔

(اے۔ ایس بزمی انصاری [ت: ظفر علی])

••------------••

⊗ (تعلیقہ) امداد اللہ، حاجی، مہاجر مکی: ہندوستان کے ایک عالم، صوفی اور تحریک آزادی ہند [۱۸۵۷ء] کے رہنما۔ وہ ۲۲ صفر المظفر ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۴ء کو پیر کے روز [قصبہ] نانوتہ، ضلع سہارنپور، صوبہ اترپردیش، بھارت میں پیدا ہوئے، ان کا وطن مالوف، تھانہ بھون تھا (محمد انوار الحسن شیر کوٹی: حیات امداد، ص ۵۴)۔ سلسلہ نسب کے اعتبار سے وہ فاروقی ہیں۔ ان کے والد ماجد نے ان کا نام امداد حسین رکھا لیکن شاہ محمد اسحاق دہلوی نے اس نام کو ناپسند فرمایا اور اسے امداد اللہ سے تبدیل کر دیا، خود انہوں نے بھی ساری زندگی، اپنے مکتوبات میں اپنا نام امداد اللہ ہی لکھا (محمد انوار الحسن شیر کوٹی: حیات امداد: ص۵۳)۔

سن شعور کو پہنچنے پر حاجی صاحبؒ کے اندر حصول علم کا ذوق پیدا ہوا۔ انہوں نے ہندوستان میں قرآن کریم حفظ کرنا شروع کیا، جو مکہ مکرمہ ۱۲۵۸ھ میں مکمل ہوا (حیات امداد :ص۵۴)۔

سولہ سال کی عمر میں (تقریباً ۱۲۴۹ھ میں) انہوں نے اپنے ایک ننھیالی عزیز مولانا مملوک علی کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا، اسی زمانہ میں مولانا رحمت علی تھانوی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے تقویۃ الایمان اور فارسی کی مختصر کتب پڑھیں اور علم صرف ونحو حاصل کیا (التھانوی: امداد المشتاق، ص۹)۔ انہوں نے مشکوۃ المصابیح کا ایک چوتھائی حصہ مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی سے پڑھا اور امام ابوحنیفہؒ کی ''الفقہ الاکبر'' مولانا عبدالرحیم نانوتوی سے پڑھی (حوالہ مذکور)۔

بیعت وارادت: ابھی وہ ظاہری تعلیم کے مدارج طے کر رہے تھے کہ تزکیہ و اصلاح روحانی جذبہ [ان کے] دل میں پیدا ہوا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں انہوں نے مولانا نصیرالدین نقشبندی مجددیؒ دھلوی کے ہاتھ پر بیعت کی جو شاہ محمد آفاقؒ دھلوی کے مرید وخلیفہ اور شاہ محمد اسحاقؒ دھلوی (نبیرہ شاہ عبدالعزیز دہلوی محدث کے داماد وشاگرد تھے۔ چند دن ان کی صحبت میں رہے اور اجازت خلافت وخرقہ بیعت حاصل کیے (تھانوی؛ امداد المشتاق، ص۷) بعدازاں شیخ نور محمد جھنجھانویؒ المعروف بہ میاں جی سے (م ۱۲۵۹ھ) جو وقت کے بلند پایہ عارف وصوفی تھے، بیعت ہوے۔ میاں جیؒ کی خدمت میں رہ کر انہوں نے چہار سلسلہ [نقشبندیہ، چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ] کے اجازت وخلافت حاصل کی۔

جنگ آزادی میں شرکت ہندوستان میں: ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء میں انگریز حکومت کے خلاف تحریک آزادی

شروع ہوئی۔ تو حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے اپنے قصبے سے اس جنگ آزادی کی قیادت کی۔ قصبہ تھانہ بھون میں انگریز کے متوازی مسلمانوں کی حکومت قائم کی گئی اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اس حکومت کے سربراہ مقرر ہوئے۔ حضرت مولانا محمد قاسم [نانوتوی] کو سپہ سالار افواج، حضرت مولانا رشید احمد [گنگوہی] کو قاضی، مولانا منیر نانوتوی اور حافظ ضامن تھانوی کو میمنہ اور میسرہ کا افسر مقرر کر دیا گیا ہے۔ شاملی [قصبہ] تھانہ بھون کے قریب تھا، وہاں انگریز فوجی چھاؤنی بھی تھی۔ مجاہدین کو معلوم ہوا کہ انگریز اپنا بھاری توپ خانہ شاملی بھیج رہا ہے چنانچہ حاجی صاحبؒ نے مولانا قاسمؒ کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا، جس نے اس توپ خانہ پر حملہ کر دیا۔ انگریز سپاہی توپ خانہ چھوڑ کر فرار ہوگئے۔ بعد ازاں ان مجاہدین نے شاملی پر حملہ کیا۔ ابتدا میں ان کا پلہ بھاری رہا لیکن حافظ ضامن کی شہادت کے بعد، انگریز فوج نے تھانہ بھون پر قبضہ کر لیا اور جو شخص بھی ہاتھ لگا اسے قتل کر دیا گیا۔ خانقاہ امدادیہ کو جو اس حکومت کا صدر مقام تھا، آگ لگا دی گئی، حاجی امداد اللہ اور ان کے ساتھیوں کے پروانہ گرفتاری جاری ہوگئے۔ چنانچہ وہ انگریز سے چھپتے ہوئے انبالہ اور گنگوہ سے ہوتے ہوئے سندھ میں داخل ہوگئے۔ چند دن سندھ میں روپوش رہنے کے بعد وہاں سے ۱۲۷۶ھ میں مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

مکہ مکرمہ میں، شروع شروع میں، انہیں مشکلات کا سامنا ہوا۔ کئی کئی روز فاقوں میں گزر جاتے۔ کچھ عرصہ کے بعد حالات بدل گئے۔ علما اور صوفیا ان سے کسب فیض کرنے لگے۔ ۱۲۷۹ھ میں، تقریباً ۴۸ برس کی عمر میں انہوں نے پہلا نکاح کیا، لیکن چند سالوں کے بعد ان کی رفیقہ حیات کا انتقال ہوگیا۔ پھر انہوں نے ایک عابدہ وزاہدہ خاتون بی بی خیر النساء سے عقد کیا، لیکن یہ خاتون نابینا ہونے کے باعث امورِ خانہ داری انجام نہ دے سکتی تھیں، لہٰذا انہوں نے تیسرا عقد کیا، تاہم ان تینوں بیویوں سے ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی.

چالیس برس تک ان کا مکہ مکرمہ میں قیام رہا اور یہیں جوار حرم میں انہوں نے ۱۲ یا ۱۳ جمادی الآخری ۱۳۱۷ھ، بدھ کے دن، فجر کی اذان کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا اور جنت المعلیٰ میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ [رک بآں، در تکملہ بذیل مادہ] کے پہلو میں دفن ہوئے، انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۴ سال تین ماہ تھی (حیات امداد، ص۸۵).

مریدین وخلفا: ان کے کل مریدین کی تعداد بتانا تو شاید مشکل ہو، البتہ طبقہ علما میں ۵۰۰ علما ان کے مریدین میں شامل تھے، جن میں سے چند ممتاز خلفا کے اسمائے گرامی اوپر تحریر کیے جاچکے ہیں.

علمی و تصنیفی خدمات: حاجی امداد اللہؒ نے کئی کتابیں اور رسالے تحریر کیے جو ان کی علمی لیاقت کے آئینہ دار ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین میں علما اور صوفیا کے لیے علوم ومعرفت کے خزائن جمع کر دیئے۔ ان کی شاعری محبت الٰہی، اخلاقی نصائح اور صوفیانہ واردات پر مشتمل ہے.

حاجی صاحبؒ کے اردو اور فارسی مکتوبات ایک جانب فارسی اور اردو ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں تو دوسری جانب تصوف وسلوک میں بھی بلند پایہ مقام رکھتے ہیں.

مآخذ: (۱) محمد انوار الحسن شیرکوٹی : حیات امداد، کراچی، مدرسہ عربیہ، ۱۹۶۵ء، ص۵۴؛ (۲) حاجی امداد اللہ: ضیاء القلوب؛ (۳) اشرف علی تھانوی، مولانا: امداد المشتاق، ص۷، ماخوذ از شمائم امدادیہ؛ (۴) عبدالرشید ارشد : بیس بڑے مسلمان، لاہور، مکتبہ رشیدیہ، ۱۹۷۰ء، ص ۸۷؛ (۶) اشرف علی تھانوی ارواح ثلاثہ، ص ۱۸۱؛ (۶) محمد میاں صدیقی: تذکرہ مولانا محمد

ادریس کاندھلوی، مکتبہ عثمانیہ لاہور؛ (۷) مولانا حسین احمد: نقش حیات، ص۴۲؛ (۸) محمد سعد صدیقی: علم تفسیر میں مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی خدمات (مقالہ برائے پی ایچ ڈی، جامعہ پنجاب)؛ (۹) قاری محمد طیب: تاریخ دارالعلوم دیوبند؛ (۱۰) عبدالحئی، مآثر حکیم الامت؛ (۱۱) عبدالماجد دریا آبادی: سوانح مولانا اشرف علی تھانوی (بامداد فہرست)

(محمد سعد صدیقی)

••..............••

※ اِمزد (بربر): (یا اَمزد، اُمزد) عوامی بولی کی رو سے "بال، پشم"، طوارق (بربر) [رکّ بہ بربر در آآآ] کے ہاں مروج ایک آلہ موسیقی جو وائلن (Violen) سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس کا صوتی کیسہ (Sounding box) ایک تونبا نما پر مشتمل ہوتا ہے جس کا قطر مختلف (۲۰ تا ۵۰ سینٹی میٹر) ہوتا ہے۔ اس کے اوپر بالوں سے صاف کر کے دباغت شدہ بکرے کی کھال طنابوں یا ببول کے کانٹوں کی مدد سے مہارت سے منڈھ دی جاتی ہے، اس کھال کو اکثر اوقات شوخ [اور تیز] رنگ کی جھالروں یا تِفنغ [دیکھیے بربر: ۲] کے نقوش سے مزین کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک اور دو جگہوں پر چھید ڈال کر آواز کے لیے سوراخ بنائے جاتے ہیں (Ahaggar: میں تط، "آنکھ") یہ سوراخ یا تو جسر (bridge) کے دائیں اور بائیں سمت بنائے جاتے ہیں یا جسر اور [اس] چوبی گردن کے نظر آنے والے حصے کے درمیان، جو کسی ہوئی بکرے کی کھال کے نیچے سے ہو کر [اس کے] دوسرے طرف نمودار ہوتی ہے۔ چوبی گردن کے ہر دو سروں پر چمڑے کی ایک پٹی کے ساتھ گھوڑے کے بالوں سے بٹی ہوئی [اور] بیروزہ ملی ہوئی ایک ڈوری لگی ہوتی ہے، [اس] ڈوری لکڑی کی دو چھوٹی [چھوٹی] تختیوں کو صلیب کی شکل میں باہم جوڑ کر بنائے جانے والے جسر کی مدد سے کھال کے اوپر رکھا جاتا ہے [اور] اس [ڈوری] میں کھچاؤ ایک پھندے کے ذریعے پیدا کیا جاتا ہے، جو گردن سے بندھی ہوئی ایک متحرک طناب کی صورت میں ہوتا ہے، جس کا فاصلہ سرے کی طرف گھٹایا [اور] بڑھایا جا سکتا ہے۔ کمان نیم مدور شکل کی ایک خمیدہ چھڑی ہوتی ہے جس کے دونوں سرے گھوڑے کے بالوں سے تیار شدہ رسی سے بندھے ہوتے ہیں [اور] اس پر بیروزہ کی بجائے درخت سلم (Gum-tree) کا گوند ملا جاتا ہے۔

امزد کو بجانے والی عورت دو زانو ہو کر زمین پر بیٹھتی ہے [اور] اسے اپنی رانوں پر رکھ لیتی ہے، گردن کا بیرونی حصہ اس کے بائیں ہاتھ میں ہوتا ہے اور انگوٹھا پھندے پر رکھا ہوتا ہے [جبکہ] دائیں ہاتھ میں وہ اس کے کیس کی جانب ڈوری کی عین سیدھ میں [موجود] کمان کو تھامے ہوتی ہے۔ اس طرح امزد "کسی حد تک ضرب سے بجنے والے ساز کی مانند تیار کیا جاتا ہے، کھینچی جانے والی ڈھیلی ڈھالی طنابوں سے اسے پکڑا جاتا ہے اور ایک کمان کی مدد سے بجنے والے ساز کی طرح اسے بجایا جاتا ہے"۔ امزد کو بجانے کا کام ایک تکنیکی مطالعہ [کے عمل] سے مشروط ہے (دیکھیے مآخذ) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ساز کی مدد سے بجائی جانے والی موسیقی اسلام سے قطعاً غیر متعلق ایک فرسودہ نوعیت کی ہے۔

پادری Ch.de Foucauld کے زمانے میں "امزد" ایک نہایت اعلیٰ درجے کا مقبول عام ساز تھا جو کسی حد تک سر زمین طوارق کے تشخص کی علامت بن چکا تھا، اسے اہال کے نام سے موسومہ [عشق و] محبت کی محفلوں میں بجایا جاتا تھا اور لوگوں کو موسیقی سے [لطف اندوز ہونے سے] محروم کرنا ایک سخت سزا تھی خصوصاً حملہ ناکام رہنے کے بعد، امزد کو بجانے یا زیادہ درست الفاظ میں امزد پر ضرب لگانے (اوت امزد) کا مفہوم "دل کش اور تملق آمیز الفاظ میں تکلم تھا۔ اس زمانے میں معزز طبقہ کی خواتین کی نصف تعداد اسے بجاتی تھی، اگرچہ اسے بکمال وخوبی بجانے والی

خواتین صرف چار یا پانچ تھیں۔ آج یہ ساز تقریبا متروک ہوچکا ہے اور بعض قریہ جات میں نوجوانوں پر اپنے مضر اثرات کی بنا پر اس کا استعمال ممنوع ہے۔
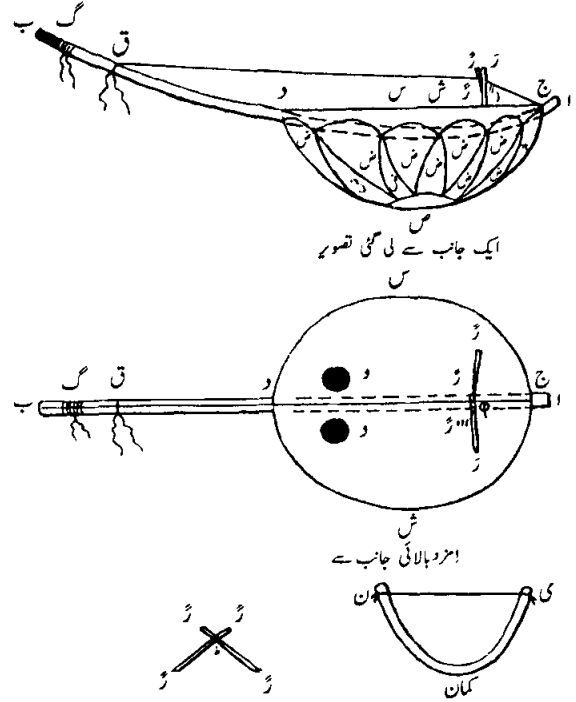
ا ب= عنق ر گردن

ج د= کھال سے نیچے کھال اور تونبے کے درمیان چھڑی والا حصہ

ج د ص = تونبا

د س ش ج= کھال

ض= تونبے کے اوپر کھال کو پھیلانے والے تسمے

رَ رُ ط رِ= جسر

و، و= آواز کے سوراخ

ق = بجانے کا پھندا

ج ط ق گ ب= ڈوری ر طناب

ج، گ = نقطہ جات جہاں پر Fixing لگی ہوئی ہے۔

ص ن = کمان کی رسّی

مآخذ: (۱) M.Benhazera: *Six mois chez les Touareg du Ahaggar*، الجزائر، ۱۹۰۸ء؛ (۲) A.Lavignac: *Encyclopedie de la musique*، ۴، ۱۹۲۲ء، ص ۲۹۲۵-۲۶؛ (۳) H.Lhote: *Les Touaregs du Hoggar*، پیرس ۱۹۴۴ء، ص ۲۸۷-۲۸۸؛ (۴) Ch. de Foucauld: *Dict. Touaregs Francais*، پیرس، ۱۹۵۲ء، ۳: ۱۲۷۰-۱۲۷۳؛ (۵) L.Balout، A.Sautin: Le Jeu de L,imzad، در AIEO Alger، ۱۶ (۱۹۵۸ء)، ص ۲۰۷-۲۱۹؛ (۶) L.Balout: (طبع)، Collections ethnographiques، پیرس (۱۹۵۹ء)، لوح، عدد ۷۵-۷۶.

[(Ch. PELLAT) ت: ظفر علی]

••--------------••

※ **اَمَل**: (تنظیم) لبنان کے شیعہ مسلمانوں کی ایک نیم فوجی تنظیم، جو پہلے پہل ۱۹۷۵ء میں منصۂ شہود پر آئی اور بعد میں لبنان کی ایک اہم سیاسی قوت بن گئی۔ [اسے موسیٰ الصدر کے حامیوں نے] شمالی لبنان میں قائم کیا ...... یہ تنظیم بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے معروف سیاست دان ولید جنبلات کے اتحاد قومی اتحاد (National Movement) میں شامل تھی (دیکھیے: Jellian Beeker: The Plo، لنڈن ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۳)۔

شیعہ آبادی کی سیاسی تنظیم: سماجی تنہائی اور اقتصادی محرومی کے پس منظر میں لبنان کے شیعہ، لبنانی منظر پر ایک بڑے سیاسی کردار کی حیثیت سے نمودار ہوے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں شیعہ لبنان میں معمولی کردار ادا کرنے والے لوگ تھے۔ دوسرے لبنانی باشندے ان سے اعتنا نہیں برتتے تھے۔ دانش وروں کی توجہ ان کی طرف بہت کم ہوتی تھی اور لبنانی سیاست دان انہیں غیر اہم سمجھتے تھے۔ لبنان کی مذہبی فرقوں پر مبنی مساواتی سیاست، جس میں مراعات، عہدے اور سیاسی حقوق فرقوں کی مناسبت سے منقسم تھے۔ شیعہ آبادی کے عدم مفاد پر چل رہی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ملک کے دوسرے فرقوں کے مقابلے میں ان کی آبادی کا تناسب

بہت کم تھا، ایک ایسے سیاسی نظام میں جس پر مارونی (عیسائیوں) اور سنی مسلمانوں کو غلبہ تھا، شیعہ اپنے مخصوص عقائد میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

تاہم دوسری غیر شیعی آبادی سے پیچھے رہ جانے کے باوجود، شیعہ فرقے کے لوگ اس تیز رفتار جدت پسندی سے بہت متاثر ہوے جس کا آغاز لبنان میں ۱۹۴۳ء میں حصول آزادی کے ساتھ ہوا تھا۔ تعلیم تک رسائی نے افراد کی ایک ایسی ترقی پذیر جماعت پیدا کی، جو اب محض گزر اوقات کی حد تک کھیتی باڑی پر راضی نہیں تھی۔

زرعی شعبے میں نئی ایجادات بشمول جدید زرعی مشینری اور نقد آور فصلوں کی بنا پر بے روزگاری میں اضافہ ہوا۔ بہت سے شیعوں کو اپنی بقا کی خاطر اپنی زمینیں چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ دیہات کی غربت اور کھیتوں پر حد سے زیادہ محنت ومشقت سے خلاصی پا کر بہت سے شیعوں نے بیروت میں بالعموم چھوٹی موٹی مزدوری اور خوردہ فروشی جیسے کام شروع کر دیے۔ مزدور پیشہ لوگوں کی اس ہجرت کی بنا پر ۱۹۶۰ء کی دہائی میں لبنانی دارالحکومت کی آبادی میں کثیر اضافہ ہوا۔ شیعہ افراد نے شہر کے قرب وجوار میں گھر تعمیر کر لیے۔ اگرچہ ان میں سے بعض لوگ واقعتاً غربت سے بچ نکلے، مگر ان کی اکثریت انتہائی غریب رہی۔ اس امر پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ دیہاتی علاقوں سے ترک سکونت کر کے آنے والے یہ افراد ان انقلابی انداز کی سیاسی جماعتوں کے لیے زرخیز سرمایہ ثابت ہوے جن کا دعویٰ تھا کہ ان کی مشکلات ومصائب کا توڑ ان کے پاس موجود ہے۔

اہم ترین بات یہ ہے کہ اندرون لبنان اقتصادی مواقع کی شدید کمی بہت سے شیعی افراد کی بیرون ملک خصوصاً خلیجی ریاستوں اور بالخصوص مغربی افریقہ کی طرف، منتقلی کا باعث بنی۔ جہاں غربت سے نجات کے زیادہ مواقع موجود تھے اور اس طرح انہیں اپنی پسند کی سیاسی تحریکات کو مالی وسائل مہیا کرنے کا موقعہ میسر آیا۔ بعد میں ان شیعہ عناصر کی کمائی ہوئی دولت نے اندرون لبنان میں شیعی سیاسی تحریک کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ شیعہ بحیثیت مجموعی اب بھی نسبتاً مفلس ہیں۔ وہ اچھے تاجر، تعمیراتی ٹھیکیدار اور دوسرے کئی ایک ہنر مندانہ پیشوں سے وابستہ ہیں۔ اس کے باوجود ان کے ہاں تا حال کسی حد تک احساس محرومی موجود ہے۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے عشروں میں لبنانی شیعوں کو سید موسیٰ الصدر کی پرجوش متحرک قیادت مل گئی۔ اگرچہ الصدر کی پیدائش ایران میں ہوئی، مگر وہ اپنی آبائی نسبت جنوبی لبنان کے ایک گاؤں مرکہ سے بتاتے تھے۔ وہ ۱۹۶۰ء میں نجف عراق سے لبنان منتقل ہوے، نجف میں وہ وقت کے کئی اہم ائمہ کے زیر سایہ اسلامی فقہ کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ خانہ جنگی سے ماقبل دور میں ان کی موجودگی خاصی واضح نظر آتی تھی اور انہیں کے زیر قیادت وہدایت امل تحریک کی پیش رو حرکۃ المحرومین ۱۹۷۴ء میں وجود میں آئی۔ الصدر ایک عوامی رہنما تھے، ان کا نصب العین تجدید و اصلاح تھا، نہ کہ تخریب اور انقلاب.

اگرچہ ''حرکۃ المحرومین'' کو ان کے عقیدے سے قطع نظر، سیاسی طور پر تمام محروم لبنانی باشندوں کی، نمائندگی کا دعویٰ تھا مگر وہ واضح طور پر شیعوں کی ایک جماعت تھی۔ پرکشش شخصیت کے مالک ''الصدر'' نے بڑی مہارت کے ساتھ شیعیت کی مؤثر رمزیت کو استعمال میں لاتے ہوے اپنے متبعین کو یاد دلایا کہ وہ ایسے لوگوں کے وارث ہیں۔ جو اسلام مخالف لوگوں کی مزاحمت کرتے اور اس کی پاداش میں قربانیاں دیتے رہے ہیں۔ انہوں نے ۶۱ھ/۶۸۰ء میں کربلا میں نواسۂ رسول حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بیان میں ایک نئی روح پھونک دی اور

اپنے پیروکاروں میں امامؑ کے شجاعانہ اقدام کی تقلید کا جذبہ بیدار کیا۔

بہت سے شیعی افراد کے لیے الصدر کی یہ تحریک سیاسی میدان میں شیعہ برادری کے لیے ان تحریکات میں سے محض ایک تھی، جنھوں نے کامیابی کے ساتھ رائے عامہ کو بیدار کیا۔ لبنان میں، عراق ہی کی طرح ۱۹۷۰ء کی دہائی میں اہل تشیع میں کمیونسٹ پارٹی بڑی شہرت رکھتی تھی۔ الصدر کی تحریک کو بعد میں جدید حالات کے تحت، شیعوں کے لیے مرکزی مقام کا درجہ دیا جاتا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں شروع ہونے والی خانہ جنگی کے ساتھ ہی الصدر کی قیادت کو کئی دوسری مسلح تحریکوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ جن میں فلسطین کی "فدائین" تحریک بھی شامل تھی، جس نے کئی شیعہ نوجوانوں کو اپنا رکن بنا لیا۔ الصدر کی مذکورہ بالا تحریک، ایک ایسے ماحول میں جہاں بندوق عمومی زیب وزینت کا باعث بن گئی تھی، کمزور پڑ گئی اور ان کی اصلاحی خطابت پر ظلم کے خلاف اٹھنے والی نفرت کی آواز نے غلبہ پا لیا۔

جنگی جوش وجذبے کا اظہار بڑھتا چلا گیا۔ لبنان کے جنوبی حصے میں، جو شیعیت کا مرکز تھا، اس کشمکش نے گاؤں کے گاؤں اجاڑ دیئے، بہت سی جانیں کام آئیں، معیشت تباہ ہو کر رہ گئی اور بہت سے شیعہ اپنے سیاسی اتحادوں سے بیگانہ ہوگئے۔ ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء کے پورے عرصے میں بسااوقات شیعوں نے اپنے آپ کو تحریک آزادی فلسطین (PLO) اور اسرائیل کے مابین گولیوں کے تبادلے میں محصور پایا۔ یہ سخت مشکلات کا زمانہ تھا، خصوصاً جنوبی لبنان میں جہاں مسلح فلسطینیوں کی موجودگی کی بنا پر جانوں کی بڑی قربانی دینا پڑ رہی تھی۔

"امل" کی ترقی پذیری اور سرگرمیاں: ۱۹۷۰ء کے عشرے کے آخری سالوں میں بہت سے شیعہ عناصر نے بائیں بازو کی سیاست سے لا تعلقی اختیار کر لی اور دوبارہ بحال شدہ تحریک "امل" میں شامل ہوگئے یا اس کی اعانت کرتے رہے۔ امل کا مفہوم ہے "امید" مگر یہ افواج المقاومۃ اللبنانیہ (Lebanese Resistance Detachments) کا مخفف ہے۔ ۱۹۷۸ء میں اسرائیلیوں نے جنوبی لبنان کے خلاف فوجی دباؤ بڑھا دیا اور اس طرح شیعہ اور پی ایل او کے مابین کشمکش کو مزید بھڑکا دیا۔ اگرچہ بعد کے حالات سے پتہ چلا کہ شیعہ برادری میں جو تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں، اسرائیل کو اس کا بہت کم شعور تھا۔ امل نے دیہی ہوم گارڈ تشکیل دینے شروع کر دیئے۔ جس کا مقصد پی ایل او کے اثرات کو محدود کرنا اور اس طرح شیعہ آبادی کو اسرائیلی حملوں کی براہ راست زد سے محفوظ کرنا تھا۔

۱۹۷۸ء میں ایرانی انقلاب کی تیز رفتاری کے ساتھ بہت سے لبنانی شیعوں نے اپنے ایرانی ہم مذہبوں کی سرگرمیوں سے بڑا جوش وجذبہ پایا۔ ایران کا اسلامی انقلاب لبنان کے لیے مثالی حیثیت تو نہیں رکھتا تھا، لیکن عملی طور پر وہ ایک نظیر ضرور تھا اور امل ایک صحیح شیعہ تحریک ہونے کی بنا پر اس ولولے سے بہت حد تک مستفید ہوئی۔ الصدر، آیت اللہ روح اللہ خمینی (۱۹۲۹۔ ۱۹۷۹ء) کے اہم حمایتی اور شاہ کے سخت مخالف تھے۔ علاوہ ازیں امل کے بہت سے عہدیدار بشمول ایک ایرانی باشندہ، مصطفیٰ کامران، ایران کی نئی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

اگست ۱۹۷۸ء میں الصدر اپنے دو ساتھیوں شیخ محمد شہادہ یعقوب اور صحافی عباس بدرالدین کی معیت میں لیبیا کے دورے پر گئے۔ ان لوگوں کے بارے میں اس وقت سے کچھ سننے میں نہیں آیا۔ الصدر اپنے متبعین کے لیے ایک ہیرو بن چکے تھے جو اس کے کارناموں سے مشکل حالات میں ہمیشہ رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ وہ امام

غائب کا مظہر بن گئے۔ ان کے متعلق اس کے دشمن بھی تعریفی الفاظ کہتے سنے گئے۔ جس اصلاحی تحریک کی بنیاد الصدر نے رکھی تھی، وہ لبنان کی سب سے بڑی شیعی تنظیم بن گئی۔ ۱۹۸۲ء تک جب اسرائیل نے لبنان کے خلاف لشکر کشی کی، امل بلاشبہ لبنانی سیاست کی متحرک ترین قوت کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔

بہرحال لبنان کے سیاسی نظام کی اصلاح و درستی کے سلسلے میں امل کی دعوت عمومی توجہ سے محروم رہی۔ مارونی عیسائی جو جدید لبنان کی سیاست میں برترکردار کے حامل رہے تھے، اس میں کسی دوسرے کو حصہ دار بنانے پر آمادہ نہ تھے۔ اسی طرح سنی مسلمان بھی شیعوں کی خاطر اپنے حقوق میں کسی کمی کے روادار نہ تھے۔ اس کا واضح نتیجہ شیعہ برادی کی مایوسی اور ان کے بڑھتے ہوے غیظ وغضب کی صورت میں نکلا تھا.

بنیادی اصلاح پسندی پر قائم رہتے ہوے، امل کی قیادت ۱۹۸۲ء کے پرجوش زمانے تک لبنان کے سیاسی نظام میں اہم کردار ادا کرنے کی خواہاں رہی۔ اگرچہ ۱۹۹۰ء تک لبنان کی خانہ جنگی کا حتمی خاتمہ نہ ہوسکا، مگر پی ایل او کے مجاہدین کی اکثریت کا لبنان سے جبری انخلا اور امریکی حکمت عملی کی فعالیت یہ اشارہ دے رہی تھی کہ بدترین حالات کا اختتام ہو رہا ہے۔ سیر الیون نژاد ایک شیعی تاجر کا بیٹا اور امل کا رہنما نبیہ بیری، امریکہ کی طرف سے کسی ''بلاوے'' کا منتظر رہا، مگر اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسا بلاوا کبھی نہ آیا۔ اس دوران میں اگرچہ فلسطینی مجاہدین کے اخراج کے سلسلے میں اسرائیل کو جنوبی لبنان کے بہت سے شیعہ عناصر کی سپاس گزاری حاصل رہی، اسرائیل نے بشمول جنوبی حصہ، لبنان کے زیادہ تر علاقوں پر اپنا قبضہ برقرار رکھا.

۱۹۸۳ء میں گذشتہ برس کی تمام امیدیں دم توڑ گئیں، ملک میں خانہ جنگی کے خاتمے کے لیے امریکی حکمت عملی بھونڈی اور کمتر سوچ بچار پر مبنی دکھائی دی۔ شام، اسرائیلی فتوحات اور لبنان میں امریکی آرزوؤں کی بیخ کنی پر آمادہ دکھائی دیتا تھا، چنانچہ بنیادی طور پر بائیں بازو کی جماعتوں پر مبنی، ایک تیز اور طاقت ور لبنانی مزاحمتی تحریک بروئے کار آئی، جس میں امل بھی شامل تھی۔ ۱۹۸۳ء کے موسم خزاں کے آتے ہی ''امل'' مزاحمت کی کارروائیوں میں بڑی حد تک شریک ہوچکی تھی۔ ۱۹۸۲ء کے بعد سے مارونی قیادت میں تشکیل شدہ حکومت کی طرف سے مخالفانہ کارروائیوں اور گرفتاریوں کے نتیجے میں شیعہ برادری زیادہ سے زیادہ جارحیت پسند ہوتی چلی گئی.

''امل'' کی منظم فوجی قوت کا نقطہ عروج ۱۹۸۴ء کا زمانہ تھا جب اس کے جنگجو لبنانی سر زمین پر اسرائیلی قبضے کے خلاف سخت ترین انداز میں مصروف پیکار تھے اور خود بیروت میں مرکزی حکومت سے ان کا مقابلہ تھا۔ حکومت کی افواج کے کثیر آبادی والے علاقے پر زبردست گولہ باری کے بعد نبیہ بیری نے کامیاب طریقے سے شیعہ فوجی عناصر کو ہتھیار ڈالنے کی تلقین کی۔ تب مغربی بیروت میں امل وقت کی نمایاں ترین قوت بن کر ابھری.

اس کے جلد ہی بعد ۱۹۸۴ء کے آغاز میں امریکی فوجی دستوں کا بیروت سے انخلا عمل میں آیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے ان ٹھکانوں پر زبردست حملے ہوے تھے، جن میں دوسو سے زیادہ سپاہی مارے گئے تھے۔ اب امل کے مسلح رضا کاروں نے ان کی جگہ لے لی، اپنی قوت میں اضافہ کیا اور جنوب میں اسرائیل پر دباؤ بڑھا دیا۔ چنانچہ تباہ کن حملوں سے بچنے کی خاطر اسرائیل نے لبنان سے اپنی زیادہ تر افواج واپس بلالیں، مگر ۱۹۸۵ء میں اپنے خود ساختہ حفاظتی خطے میں قدم جمائے رکھے۔ کچھ وقت

کے لیے امل کے رہنماؤں کا امریکی وعدوں پر کسی حد تک اعتبار قائم رہا، لیکن ۱۹۸۵ء تک ان وعدوں کا کھوکھلا پن واضح ہوگیا اور امل شام کے زیر اثر چلی گئی۔ پی ایل او کی سخت مخالفت کے باوجود امل کو بیروت کے گرد ونواح سے پی ایل او کو اس کے باقی ماندہ ٹھکانوں سے نکل جانے پر مجبور کرنے کی ضرورت نہیں تھی، مگر امل کو خونریز لڑائی کے لیے شام دل کھول کر اسلحہ اور جنگی ہتھیار دے رہا تھا۔ یہ معرکے ۱۹۸۸ء تک جاری رہے.

بہرحال امل کی بالادستی کو مزید تاخیر کے بغیر روک دیا گیا۔ دروز رہنما ولید جنبلات کے ساتھ اس کا اتحاد پارہ پارہ ہوگیا، اس کے علاوہ شیعی سیاسی تفوق کے خطرات نے سنی مسلمانوں کو مختلف طرح کے جوابی حملوں کو منظم کرنے کے لیے اکسایا۔ اس طرح امل کا عہد واحد قوت کے طور پر ختم ہوگیا.

حزب اللہ سے مسابقت: امل کی جو اسّی کے عشرے میں شیعہ کی بلند ترین تنظیمی آواز بن چکی تھی، اپنی صفوں میں گہرے شگاف پڑنے لگے۔ غیر مؤثر، بلکہ نااہل قیادت، بدعنوانی اور مبالغہ آمیز خودنمائی نے اس کی تائید واعانت کو خصوصاً بیروت کے مضافات میں بے حد کمزور کر دیا۔ ایرانی امداد یافتہ حزب اللہ، جو امل کی متبادل جماعت تھی، ۱۹۸۲ء میں ایک باصلاحیت اپنے مقاصد میں مخلص اور اہل قیادت کے ساتھ میدان میں اتری۔ اگرچہ حزب اللہ کی قیادت پر نوجوان شیعہ طبقہ علماء کا غلبہ تھا، مگر یہ امر قابل ذکر ہے کہ حزب اللہ بالخصوص پڑھے لکھے غیر مذہبی اطوار کے شیعہ عناصر میں مؤثر رہی ہے، جن میں سے اکثر کا امل پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ مئی ۱۹۸۸ء میں بیروت کے مضافات میں لڑائی کے دوران (جس میں حزب اللہ نے امل ملیشیا پر فتح پائی) دیکھنے میں آیا کہ حزب اللہ بہت سے ایسے شیعہ افراد کو اپنی صفوں میں لے آنے میں کامیاب رہی، جن میں سے بیشتر امل کے سابق ارکان تھے۔

جوں جوں حالات بدتر ہوتے گئے، حزب اللہ کو مزید معاون مل گئے۔ مسلسل عدم تحفظ کا احساس، سیاسی اصلاحات میں رکاوٹیں اور لبنان کی اقتصادی ومعاشی حالات کی قریب قریب مکمل تباہی نے مذہب کو ایک حقیقی پناہ گاہ بنا دیا، کیونکہ درپیش حالات میں مسائل کا اور کوئی حل موجود نہیں تھا۔ ایران کی پیروی کرتے ہوے، حزب اللہ نے عوامی تائید کی خاطر، شیعی مذہب کی رمزیت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ مثلاً "عاشورہ" جو شیعی کا سب سے زیادہ نمایاں دن ہے، نہ صرف یہ کہ ایک نیک عمل کا موقعہ سمجھا گیا ہے، بلکہ اسے انقلابی اعلان نامہ کا موقع قرار دیا گیا.

حزب اللہ کو جنوبی لبنان میں، جہاں ملک کی شیعہ آبادی کا تقریبا ایک تہائی حصہ بستا ہے، نسبۃً کم کامیابی ملی، لیکن اس علاقے میں پی ایل او کے مخالفانہ جذبات بھی گہرے ہیں۔ یہاں پی ایل او کی مسلح موجودگی کے خلاف امل کا کردار، عوامی جذبات کا آئینہ دار ہے اور یہی چیز امل کو حزب اللہ سے متمیز کرتی ہے.

۱۹۹۰ء میں لبنان میں خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا اور یہ عموی طور پر ۱۹۸۹ء کے معاہدہ طائف کے مطابق ہوا، جس میں پارلیمان میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے ما بین مساوات کا مطالبہ کیا گیا تھا، اس کے نتیجے میں لبنان کے سیاسی نظام میں شیعی مسلمانوں کا اثر کسی حد تک بڑھ گیا۔ معاہدہ کے مطابق ۱۹۹۱ء میں امل کو غیر مسلح کر دیا گیا اور اس کی کامیابی کا دور ختم ہوگیا، لیکن امل کی حریف، حزب اللہ غیر مسلح نہیں ہوئی اور وہ شام کی طرف سے اغماض اور ایران کی اعانت سے مستفید ہوتی رہی.

لبنان میں معمول کے حالات کی بحالی کے ساتھ ساتھ ضروری تھا کہ امل کے وجہ جواز اور بنائے قانونی

میں خاص بڑے پیمانے پر رد وبدل کیا جائے۔ اگرچہ ملک کے بیشتر حصے میں قتل وغارت تھم چکی تھی، مگر خانہ جنگی کے مابعد اثرات ایک قومی، اقتصادی بحران کی شکل میں موجود تھے خصوصاً لبنانی باشندوں کا معیار زندگی بے حد پست ہو چکا تھا اور ان حالات میں امل کی سیاسی تحریک بھی محدود ہو کر رہ گئی.

تاہم نبیہ بری، جو اب تک سیاست میں ایک خارجی عنصر کے طور پر موجود رہا تھا۔ ۱۹۹۱ء میں پارلیمانی سپیکر کے عہدہ تک جا پہنچا۔ یہ سب سے بڑا سیاسی عہدہ ہے جو کسی شیعہ فرد کو مل سکتا ہے۔ اس سے اس کی ذاتی حیثیت سے کامیابی کا اظہار بھی ہوا اور امل کی کامرانیوں کے بانی کی حیثیت سے بھی، جو وہ ۱۹۷۴ء میں اپنی تشکیل کے وقت سے حاصل کرتی آئی تھی، عزت ووقار اور سیاسی قوت کے حصول کے لیے لبنان کے شیعہ کی مساعی میں امل کا مرکزی کردار رہا۔ [نیز رک بہ حزب اللہ، لبنان اور موسیٰ الصدر].

مآخذ: (۱) Colling و Deidre (مدیران): Peace For Lebanon? From War to Reconstruction، بولڈر، ۱۹۹۴ء؛ (۲) Crighton، Elizabeth و Marthe Mciner Abele: The Evolution of Ethnic Conflict Group Dynamics and Political Underdevelopment in Northern Ireland and Lebanon، در Comparative Politics، جنوری ۱۹۹۱ء، ۱۲۔۱۴۲؛ (۳) Fiske Robert: Pity the Nation The Abduction of Lebanon، نیویارک، ۱۹۹۰ء؛ (۴) Hanf Theodor: Existence in Wartime Lebanon Decline of a State and Rise of a Nation، آکسفورڈ، ۱۹۹۳ء؛ (۵) Mallat Chibli: Shia Thought from the South of Lebanon، آکسفورڈ، ۱۹۸۸ء؛ (۶) Norton Augustus Richard: Amal and the Shia: Struggle for the Soul of Lebanon، آسٹن، ۱۹۸۷ء؛ (۷) Picard Elizabeth: Liban: etat de discord: Des fondations aux guerres Fratricides، پیرس، ۱۹۸۸ء؛ (۸) Sirriyeh Hussein: Lebanon: Dimensions of Conflict، در Adelphi Paper، اگست ۱۹۸۹ء، ص ۲۴۳؛ (۹) Therqux Peter: The Strange Disappearance of Imam Moussa sadr، لنڈن، ۱۹۸۸ء؛ (۱۰) ایوان نمائندگان (کانگریس) امریکہ کی امور خارجہ کی کمیٹی اور اس کی یورپ اور خلیجی ممالک کے لیے ذیلی کمیٹی کی رپورٹ بعنوان Islamic Fundamentalism and Islamic Radicalism، جو نناویں کانگریس کے پہلے اجلاس میں ۲۴ جون، ۱۵ جولائی اور ۳۰ ستمبر ۱۹۸۵ء کو پیش کی گئی۔ (۱۱) Oxfrd Encyclopaedia of Modern Islamic World، ۱: ۸۱-۸۴).

(امین اللہ وثیر [و ادارہ])

••-------------••

ام الرصاص: اردن کے ایک پرانے رومی قلعہ ※ کا موجودہ عربی نام، جو ابتدائی اسلامی عہد تک آباد رہا.

یہ مادبہ کے جنوب اور جنوب مشرق میں ۲۷ کلومیٹر/۱۷ میل کے فاصلے پر ایک ایسے مقام پر بنا ہوا ہے جہاں سے عمان سے جنوبی اردن کو جانے والی پرانی سڑکیں برابر برابر فاصلے پر واقع ہیں۔ کیسترون میفا کی طرح یہ تیسری صدی عیسوی کے اختتام اور چوتھی صدی عیسوی کی ابتدا میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی ساخت چوکور طرز کی ہے اور اس کا طول ۱۵۸ میٹر/۵۷۸ فٹ اور عرض ۱۳۹ میٹر/۷۵۶ فٹ ہے۔ اس کے چاروں طرف چوگوشہ برجوں والی مضبوط دیوار بنی ہوئی ہے۔ قیساریہ (Caesarea) کے

یوسی بیس (Eusebius) کا بیان ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں یہ ایک رومی فوجی مستقر تھا، بلکہ Notitia dignitatun کی رو سے زیادہ درست بات یہ ہے کہ یہ مقامی طور پر بھرتی کیے جانے والے گھڑ سواروں کا مستقر تھا۔

رومی دیواروں کے اندر کی زمین بتدریج عمارتوں سے گھرتی چلی گئی حتی کہ اندرونی صحنوں کے چاروں طرف تعمیر کیے جانے والے مکانوں کے درمیان صرف تنگ گلیاں ہی باقی رہ گئیں۔ دیواروں کے اندر کی طرف چار گرجے تعمیر کیے گئے تھے، جبکہ بارہ گرجے جن میں سے زیادہ تر پی۔مائیکل (P. Michele Piccirillo) نے کھدائی کے ذریعے دریافت کیے ہیں، قلعہ کے شمال کی بیرونی طرف کی زمین پر بنائے گئے تھے۔ ان قلعوں میں سے ایک قلعہ سینٹ سٹیفن (St.Stephen) کی پچی کاری سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کم از کم آٹھویں صدی عیسوی میں ان قلعوں کی دوبارہ تعمیرومرمت کا کام کیا گیا تھا لیکن عباسی دور میں یہ قلعہ بالکل ویران ہوگیا۔

مآخذ: M.Piccrillo: *Madaba, la Chiese e i Mosaici*، میلان ۱۹۸۹ء؛ (۲) وہی مصنف: *The Mosaics of Jordan*، عمان ۱۹۹۳ء؛ (۳) وہی مصنف اور E. Alliata: *Umm al Rasas/ Mayfa I.Gli Seavi del complesso di Santo Steano, Studium Biblicum francisconum*، یروشلم ۱۹۹۴ء؛ (۴) J.Bujard: *La Fortification de Kastron Mayfaa/ `Umm ar Rasas*، در *Studies in the History and Archaeology of Jordan*، ۵(۱۹۹۵ء)، ۲۴۱-۹؛ (۵)وہی مصنف: *Les eglises geminees de la Forteresse de Kastron Mefaa/Umm er-Rasos Jordanie* : در *Antiquite Tardive*، ۴ (۱۹۹۶ء)، ۱۴۶-۱۴۷۔

(J. Bujard [ت: شمیم روشن آراء، ن: ظفر علی])

••-------------••

اُمّ السمیم: [سلطنت] عمان کے اندر علاقہ اور ※ ربع الخالی [رک بآں] کے کناروں پر پھیلا ہوا ایک وسیع نشیبی، دلدلی اور شور زمین سنجہ [رک بآں: والا علاقہ، جس کے عین وسط سے ۲۱ درجے اور ۵۰ دقیقے شمالی خط عرض بلد اور ۵۶ درجے خط طول بلد گزرتے ہیں۔ یہ عمان اور سعودی عرب کے انتہائی مشرقی حصے کے درمیان کی غیر معینہ سرحد کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ ام السمیم کے شمال اور مشرق میں زیادہ تر الدروع یا الدرعی [رک بآں] کا اباضی غافری قبیلہ اور الفار کا سنی قبیلہ آباد ہیں۔

مآخذ: دیکھیے "الدروع"، "العفار" اور "ربع الخالی" در آآآ بذیل مادہ۔

(ادارہ آآ [ت شمیم روشن آراء :ن ظفر علی])

••-------------••

ام القوین: خلیج فارس (خلیج عربی) کی ایک ※ ریاست ساحل سمندر پر واقع اس کے دارالخلافہ کا بھی یہی نام ہے جو عجمان سے ۲۳ کلومیٹر اور رأس الخیمہ سے ۴۲ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔۱۹۷۱ء سے یہ باقاعدہ متحدہ عرب امارات (UAE) کا ایک حصہ ہے۔ ساحل سمندر کے ساتھ اس کی لمبائی ۳۰ کلومیٹر اور جنوب مشرق میں خشکی کی طرف ۵۰ کلومیٹر ہے۔ اس کا بڑا حصہ نخلستان "فلاج المعلی پر مشتمل ہے جو بہت زرخیز ہے۔ اس کا رقبہ محض ۷۷۷ مربع کلومیٹر ہے جو متحدہ عرب امارات کے کل رقبے کا محض ایک فیصد ہے۔ یہ اپنی آبادی (۱۹۶۸ء میں ۳۷۰۰ اور ۱۹۸۵ء میں ۲۹،۱۹۹ افراد پر مشتمل جو متحدہ عرب امارات کی آبادی کا محض ۱.۸ فیصد ہے)، دولت اور سیاسی وزن کے لحاظ سے متحدہ عرب امارات کی سب سے چھوٹی امارت ہے۔ اس میں ترقی بھی کم ہوئی ہے اور یہاں کا ماحول بھی قدیم اور روایتی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ام القوین کا شہر کشتی سازی

کے لیے معروف تھا۔ یہاں کا روایتی پیشہ ماہی گیری ہے، چھوٹے درجے کی صنعتوں کے ساتھ ساتھ کھجوروں کے باغات لگانے اور سمندر سے موتی نکالنے کا کام بھی ہوتا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں یہاں سیمنٹ کے کارخانے لگنا شروع ہوے۔ یہاں تیل کے ذخائر بھی کم ہیں۔ ابو موسیٰ نامی جزیرے میں مبارک آئل فیلڈ سے ۱۹۷۵ء میں تیل نکالنے کا آغاز ہوا، جو اس وقت ۳۰۰۰ بیرل یومیہ تھا، لیکن ۱۹۹۵ء میں یہ محض ۱۰۰۰ بیرل یومیہ رہ گیا۔ اس کی مجموعی خام ملکی پیداوار (P-B) متحدہ عرب امارات کی مجموعی ملکی پیداوار کا محض ۵.۰ فیصد ہے اور اس کے اخراجات کا بڑا حصہ ابوظبی کی امارت برداشت کرتی ہے۔

آبادی کی اکثریت آل علی قبیلے سے تعلق رکھتی ہے جو جس کے افراد بعض دوسری جگہوں میں بھی آباد ہیں۔ امارت اور قبیلے کی سربراہی المعلی خاندان کے پاس ہے جس کے اقتدار کو ۱۸۲۰ء میں برطانیہ نے اس وقت تسلیم کر لیا، جب شارجہ اس علاقے کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہوگیا۔ ۱۹۸۱ء سے شیخ راشد بن احمد المعلی یہاں کے حکمران ہیں جنھوں نے اپنے والد شیخ احمد بن راشد المعلی کی وفات پر منصب سنبھالا جو ۱۹۲۹ء سے حکومت کر رہے تھے۔ ام القوین اور علاقے کی دوسری ریاستوں کے ساتھ پہلے ۱۸۲۰ء میں اور پھر ۱۸۵۳ء میں امن معاہدہ پر دستخط کیے۔ جب ۱۸۹۲ء میں اس علاقے میں فرانس نے دل چسپی لینا شروع کی تو برطانیہ نے ام القوین کے ساتھ خصوصی دوستانہ تعلقات کا معاہدہ کر لیا۔

مآخذ: (۱) D.Hawley: *The Trucial States*، لنڈن، ۱۹۷۰ء؛ (۲) M.Sadik اور W.Snavely: *Bahrain, Qatar, and the United Arab Emirates*، لیکسنگٹن، ۱۹۷۲ء؛ (۳) J.Anthony: *Arab States of the Lower Gulf*، واشنگٹن، ۱۹۷۵ء؛ (۴) R.Said Zahlan: *The Origins of the United Arab Emirates*، لنڈن، ۱۹۷۸ء؛ (۵) F. Heard-Bey: *From Trucial States to United Arab Emirates*، لنڈن، ۱۹۹۶ء۔

(G. Nonneman) [ت: شمیم روشن آرا، ن محمد امین]

••-------------••

※ ام کلثوم: (۱۹۰۴ء۔۱۹۷۵ء) اپنے زمانے کی مقبول ترین مصری گائیکہ۔ ام کلثوم کا تعلق ایک غریب دیہاتی خاندان سے تھا۔ اس نے قرآن حکیم کی تعلیم کتاب (مقامی چھوٹے مدارس جہاں قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے) سے حاصل کی اور اپنے والد سے، جو ایک دیہاتی امام تھے اور شادیوں وغیرہ میں نظمیں پڑھتے تھے مذہبی ترانے اور نظمیں سیکھیں۔ اس کے والد اسے لڑکوں کے کپڑے پہنا کر شادیوں اور دوسرے خاص مواقع پر فن کے مظاہرے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے۔ ۱۹۲۳ء تک یہ خاندان مصر کے مشرقی دوآبہ میں سکونت پذیر رہا اور پھر قاہرہ کی نفع بخش کمرشل میوزک کی دنیا سے وابستہ ہوگیا۔ ۱۹۲۸ء تک ام کلثوم کا شمار شہر کے مشہور ترین فنکاروں میں ہونے لگا۔ لیکن بطور ایک خوب صورت، ماہر اور تجربہ کار مغنیہ کے وہ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء کی دہائی میں مشہور ہوئی۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے دوران میں ام کلثوم نے ذرائع ابلاغ کا استعمال بڑے پیمانے پر کیا۔ اس نے عوام کے دلوں میں اپنا مقام بنا لیا اور اپنے آپ کو ایسا سچا مصری ثابت کیا کہ جس پر اپنے تو کیا پرائے بھی انگشت نمائی نہ کر سکے۔

اس نے متعدد فلموں میں کام کیا، تین سو پروگرام ریکارڈ کرائے اور ٹی وی پر ماہانہ براہ راست موسیقی کے پروگرام نشر کیے جو تمام عالم عرب میں انتہائی دلچسپی سے سنے جاتے۔

بہت زیادہ مقبول گائیکہ ہونے کی بنا پر وہ ایک ثقافتی رہنما بن گئی۔ ۱۹۵۲ء کے انقلاب مصر کے بعد اس نے جمال عبدالناصر کی قیادت میں بننے والی نئی حکومت کے جلسے جلوسوں کی حمایت کی۔ ۱۹۶۷ء میں مصر کی اسرائیل سے شکست کے بعد اس نے عرب دنیا کا سفر کیا اور اپنے پروگراموں سے حاصل شدہ تمام رقم مصری حکومت کو عطیہ کر دی۔ اس کے یہ اسفار حکومتی دوروں کے مشابہ تھے۔

اُم کلثوم اپنی ساری زندگی اپنی سریلی آواز، ادائیگی الفاظ، نغمہ سرائی اور نظم کی معنویت و مزاج کے مطابق آواز کے زیروبم کے استعمال کی بنا پر ممتاز رہی۔

یہ مہارت جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اسے مذہبی قصائد و نغمے گانے کی بنا پر حاصل ہوئی کو نکھارنے والے موسیقار ابو العلاء محمد، داؤد حسنی اور محمد القصبجی تھے۔ اپنے زمانۂ عروج میں اس نے مشہور شعرا جیسے احمد شوقی [رک بآں] کے مذہبی قصائد گائے جن کی دھنیں ریاض النباشی نے ترتیب دیں۔ اسی طرح بیرام التونسی کی غزلوں کی دھنیں زکریا احمد نے ترتیب دیں۔

۱۹۶۴ء میں اس کا محمد عبدالوہاب سے مشہور معاہدہ ہوا اور پھر اس نے محبت بھرے جدید گانے سادہ دھنوں کے ساتھ گائے جو نوجوان نسل میں بہت مقبول ہوئے۔

مآخذ: (۱) ن. فؤاد: امّ کلثوم و عصر من الفن، قاہرہ، ۱۹۷۶ء ؛ (۲) محمد شوشہ: اُم کلثوم: حیاۃ نغم، قاہرہ، ۱۹۷۶ء؛ (۳) G.Braune: *Die Qasida im Gesang von umm Kultum: die arabische Poesie im Repertoire der grossten agyptischen Sangerin unserer Zeit* ، ہیمبرگ، ۱۹۸۷ء ؛ (۴) وہی مصنف: *Umm Kultum: ein Zeitalter der Musik in Agypten: die moderne agyptische Musik des 20. Jahrhunderts*، فرینکفرٹ ایم۔ مین، ۱۹۹۴ء (۵) آر۔ الحفنی: ام کلثوم: معجزۃ الغناء العربی، قاہرہ، ۱۹۹۴ء؛ (۶) V.Danielson: *The Voice of Egypt: Umm Kultum, Arabic Song and Egyption Society in the 20th Century*، شکاگو ۱۹۹۷ء

(Virginia Danielson) [ت: حافظ عبدالقدیر]

••-------------••

※ ام الولید: رومن دور میں آباد شدہ اردن کا ایک مقام، جہاں اسلامی فتوحات کے بعد بھی کئی صدیوں تک رومی تسلط رہا۔ یہ مقام مادبہ سے ۱۳ کلومیٹر/ ۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے جو کہ عرض بلد شمالی میں ۳۱ دقیقہ ۳۹ ثانیہ اور طول بلد شرقی پر ۳۵ دقیقہ اور ۵۲ ثانیہ پر واقع ہے۔ یہاں دو رومن معبد/ گرجے اور ایک عالیشان مقبرہ دریافت ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بوزنطی دور میں یہاں بہت کم بود و باش رہی ہے، تاہم اموی دور میں، یہ قصبہ اہم ترین ترقیاتی کاموں سے مستفید ہوا۔ جب یہاں ایک گاؤں معرض وجود میں آیا جس میں تین قلعے یا قصور (محلات) تھے اور ایک مسجد تھی۔ مملوک دور میں یہ قصبہ دوسری مرتبہ آباد ہوا۔ اس کے بعد یہ جگہ بے آباد ہوگئی۔ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۷ء کے دوران میں سوئٹزرلینڈ سے تعلق رکھنے والی ایک ماہرین آثار قدیمہ کی جماعت نے یہاں کھدائی کا کام کیا۔

مشرقی قصر، جو کہ دوسرے قصور کے مقابلے میں سب سے بڑا ہے، اپنے پہلو والے حصوں کے ساتھ ۷۰ مربع میٹر/ ۲۳۰ مربع فٹ رقبے پر محیط ہے، جس کے ساتھ ایک چار دیواری ہے، جسے نیم دائرہ نما پشتوں کے ساتھ مضبوط کیا گیا ہے۔واحد داخلی راستہ ایک مرکزی صحن میں جاتا ہے۔ جس میں دروازوں کے ذریعے پانچ بغلی احاطوں میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ جو پانچ گھروں سے منسلک ہیں۔ جس میں ہر ایک گھر میں پانچ یا چھ

کرے ہیں۔ چینی، شیشے اور کانسی کی بنی ہوئی اشیا، جو اس قصر کے اندر سے ملی ہیں، یہاں کی سب سے اہم دریافت ہیں۔ دوسرے دونوں قصر نسبتاً چھوٹے سائز (ایک ۴۶ مربع میٹر / ۱۵۰ مربع فٹ ،دوسرا ۴۸ مربع میٹر / ۱۵۷ مربع فٹ) کے ہیں اور وہ کسی پشتے کے بغیر ہیں، البتہ ان کا نقشہ ہوبہو مشرقی قصر جیسا ہی ہے۔ اموی دور کی بنی ہوئی مسجد تقریباً چوکور صورت میں ہے۔ جس کی دو محرابیں ہیں۔ جو مسطح چھت کو سہارہ دیتی ہیں، جبکہ ایک نیم دائراتی محراب ہے ،جو مکمل طور پر "خانِ الزبیب" کی مسجد کے مشابہہ ہے جو کہ ام ولید اور جبل سیز" سے شمال مشرق میں ۲۵ کیلومیٹر / ۱۶ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں ایسی متعدد مساجد کے آثار بھی ملے ہیں جو ابتدائی عہد میں بنائی گئیں اور جو مکمل طور پر چوکور صورت میں تھیں.

ام الولید کا گاؤں بہت وسیع پیمانے پر ہونے والی زرعی سرگرمیوں کا مرکز تھا جیسا کہ پانی کے بہاؤ کو روکنے اور ذخیرہ کرنے والے دو بڑے ڈیموں کی دریافت سے ظاہر ہوتا ہے جو وادی قناطر سے ایک کلومیٹر کے اور اس قصبے سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھے۔ اوپر والا بند ۱۳۵ میٹر/ ۵۱۵ فٹ طویل، نومیٹر/ ۳۰ فٹ اونچا اور ۵ء۸ میٹر/ ۱۹ فٹ چوڑا ہے۔ یہ اموی دور میں بنایا گیا تھا۔ اسے ۳ میٹر / ۱۰ فٹ زمین سے اوپر اٹھایا گیا تھا۔ زیریں بند جو اموی دور میں بنایا گیا، اس سے چوڑائی میں تنگ اور اونچائی میں کم ہے، یعنی ۱۸۷ میٹر/ ۶۱۳ فٹ طویل ہے۔) انگور کو دبا کر نچوڑنے والا ایک آلہ بھی جو اموی دور میں بنایا گیا، زیریں ڈیم کے کنارے سے دریافت ہوا ہے.

مآخذ: M.A. Haldiman : *Les Implantations omeyyades dans* Le Balqa: *appart d` Ummel-walid* : در *Annual of the Dept. of Antiquities of Jordon* ، ۳۵ (۱۹۹۵ء) ۳۰۷- ۳۲۳- (۲) J.Bujard و F.Schweizer : *Entre Byzance et* L, *Islam. Umm er-Rasas et ummel Walid* ، *fouilles genevises en Jordanie* Musee d` Art *et d` histoire et fondation max van Berchem* جنیوا ۱۹۹۳ء؛ (۳) W.Trillen ` Bujard : U*mm al walid et Khan ez. Zabibcing qusur omeyyades et Leur Mosquees revisitees* ، در A.D.A.F ۶۱- (۱۹۹۷ء) : ۳۰۷- ۳۷۴-

L.Buajard) [ت: محمودالحسن عارف]

••-------------••

⊗ ام ھانی: (رضی اللہ عنہا) ، بنت ابی طالب بن عبدالمطلب، الہاشمیہ القرشیہ المکیہ۔ حضرت علی بن ابی طالب [رک بآں] کی جڑواں بہن۔ ان کا نام فاختہ، یا فاطمہ یا ہند تھا۔ ان میں سے اول الذکر نام زیادہ معروف ہے مگر وہ اپنی کنیت سے مشہور ہوئیں (ابن حجر:الاصابہ، ۴:۵۰۳)۔ ان کی والدہ حضرت فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف تھیں، جنھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش اور نگہداشت کرنے اور پھر اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا.

حضرت ام ھانی ؓ کی ولادت قریبا ۱۰ ق۔ن میں ہوئی، یعنی طلوع اسلام کے وقت ان کی عمر مبارک ۱۰ برس تھی، اس طرح انہوں نے اسلام کی آغوش میں ہوش سنبھالا تھا، اس لیے کہ حضرت علیؓ اور حضرت جعفرؓ کی والدہ ابتدائی دور ہی میں اسلام قبول کر چکی تھیں، البتہ حضرت ام ھانی ؓ کے اسلام کے اظہار واعلان کی نوبت ۸ھ/۶۳۰ء سے پہلے نہ آسکی۔ حضرت ام ھانیؓ کا نکاح ھبیرہ بن ابی وھب المخزومی کے ساتھ ہوا، اس وقت جناب ابوطالب حیات تھے۔ ابن سعد(طبقات، ۸:۱۵۱) نے

الکلبی سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب ابوطالب کے پاس حضرت ام ھانیؓ کے لیے پیغام بھجوایا، لیکن ابوطالب نے ان کا نکاح ھبیرہ بن ابی وھب کے ساتھ کر دیا، اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے شکوہ کیا تو انہوں نے کہا: بھتیجے! ہمارا ان سے پہلے بھی سلسلہ مصاہرت ہے اور معزز آدمی معزز آدمی کے احسان کا بدلہ دیتا ہے (الاصابہ، ۴:۵۰۳)۔ اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو یہ واقعہ غالبًا اسلام کے ابتدائی ایام میں پیش آیا ہوگا۔

حضرت ام ھانیؓ کا خاوند ھبیرہ بن عمرو بن عائذ بن عمران المخزومی اسلام کے شدید ترین مخالفین میں سے تھا۔ اسی لیے وہ فتح مکہ کے روز بھاگ کر نجران چلا گیا۔ اس موقع پر اس نے حضرت ام ھانیؓ سے اپنی محبت کا اظہار چند اشعار کے ذریعے کیا (ابن عبدالبر: الاستیعاب)۔ چونکہ ام ھانیؓ نے اسی موقع پر اسلام قبول کر لیا تھا، اس لیے دونوں میں تفریق اور جدائی واقع ہوگئی (الذہبی: سیر اعلام النبلاء، ۲:۳۱۲)۔

فتح مکہ کے دن حضرت ام ھانیؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں۔ اس واقعے کو تمام کتب حدیث، خصوصاً صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مؤطا وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ ان میں مذکور ہے کہ فتح کے دن وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آپؐ کے ہاں گئیں، اس وقت آپؐ غسل فرما رہے تھے اور حضرت فاطمہؓ نے پردہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے آکر سلام کیا، آپؐ نے پوچھا! کون ہے؟ انہوں نے کہا: میں ام ھانیؓ بنت ابی طالب ہوں، فرمایا: ام ھانیؓ کو خوش آمدید۔ حضرت ام ھانیؓ فرماتی ہیں کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم غسل سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے آٹھ رکعتیں ادا کیں، اس وقت آپؐ ایک ہی کپڑے میں ملبوس تھے (اس سے نماز ضحیٰ (چاشت) کا استحباب اور ایک کپڑے میں ادائیگی نماز کا جواز ثابت ہوتا ہے)۔ میں نے کہا: یارسول اللہ میرے بھائی (حضرت علیؓ) کا خیال ہے کہ وہ اس آدمی سے لڑیں گے جسے میں نے پناہ دی ہے۔ یعنی فلاں ابن ھبیرۃ کا بیٹا، ارشاد ہوا: اے ام ھانیؓ جسے تو نے امان دی اسے میں نے بھی پناہ دی۔ اس وقت چاشت کا وقت تھا (الموطا:۱/۱۵۲، فی قصر الصلاۃ، باب صلاۃ الضحی؛ البخاری: ۶/۱۹۵-۱۹۶، کتاب الجہاد، باب امان النساء؛ مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلاۃ الضحی، حدیث ۸۲ (۳۳۶))۔

رہا یہ سوال کہ جس شخص کو حضرت ام ھانیؓ نے پناہ دی تھی، وہ کون تھا؟ مذکورہ روایت کی رو سے وہ جعد بن ھبیرہ، یعنی حضرت ام ھانیؓ کا اپنا بیٹا تھا، لیکن اس صورت میں اسے پناہ دینے کی کیا ضرورت تھی، حضرت ام ھانیؓ کا بیٹا ہونے کی بنا پر وہ تو از خود اسلام اور امان میں داخل تھا۔ نامور محقق حافظ ابن حجرؒ کے مطابق دراصل اس عبارت میں "عم" یا "قریب" کا لفظ حذف ہوگیا ہے۔ اصل عبارت یوں تھی: ابن عم ھبیرۃ یا "قریب ھبیرۃ" (ھبیرہ کا چچا زاد یا اس کا قریبی عزیز)۔ چنانچہ سیرت ابن ہشام میں یہ صراحت ہے کہ حضرت ام ھانیؓ نے جنہیں پناہ دی تھی وہ الحارث بن ہشام اور عبداللہ بن ابی ربیعہ تھے، جو ھبیرہ کے چچا زاد بھائی تھے (سیر اعلام النبلاء؛ ۲:۳۲)۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ام ھانیؓ نے فتح مکہ کے دن اپنے خاندان کے دو آدمیوں کو پناہ دی، انہیں اپنے گھر میں بند کرکے باہر سے تالا لگا دیا۔ حضرت علیؓ آئے تو انہوں نے ان دونوں پر تلوار تان لی۔ فرماتی ہیں کہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی تو وہاں مجھے حضرت فاطمہؓ ملیں، جو میرے لیے اپنے شوہر سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوئیں۔ کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے۔ اس وقت آپؐ کے جسم پر گرد و غبار کا اثر تھا، میں نے آپؐ کو سارا قصہ سنایا تو آپؐ نے فرمایا: "جسے تو نے امان دی ہم نے بھی اسے امان دی" (المسند الجامع، ۲:۴۳۸).

اسی (یا کسی دوسرے) موقع پر ایک دن حضرت ام ہانیؓ کی موجودگی میں آنحضرتؐ کے لیے دودھ لایا گیا۔ آپ نے دودھ پیا، بچا ہوا دودھ ام ہانیؓ کو دے دیا۔ انھوں نے وہ دودھ پی لیا۔ بعد میں انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ میں تو روزے سے تھی، فرمایا: پھر تم نے ایسا کیوں کیا۔ کہا: اس لیے کہ وہ آپؐ کا جھوٹا تھا، میں اس شے کو بھلا کیسے چھوڑ سکتی ہوں جس پر میں کبھی قادر نہ ہو سکتی تھی، سو جیسے ہی مجھے موقع ملا تو میں نے وہ دودھ پی لیا (ابن سعد: طبقات، ۱۵۲/۸)۔ آپؐ نے انہیں روزہ قضا کرنے کی ہدایت فرمائی۔

حضرت ام ہانیؓ کو پیغام نکاح دینے کے واقعے کی تحقیق: متعدد سیرت نگاروں نے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ہانیؓ کو دربارہ نکاح کا پیغام دیا تھا۔ جو یقیناً رمضان المبارک ۸ھ یعنی فتح مکہ کے بعد کا واقعہ ہے، مگر حضرت ام ہانیؓ نے معذرت کر لی تھی۔ ہمارے خیال کے مطابق ایسی تمام روایات انتہا کی کمزور ہیں (الاصابہ، ۴: ۴۷۹۔ عدد ۱۵۴۳)۔ حضرت ام ہانیؓ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دونوں باہم چچا زاد بہن بھائی تھے۔ آپؐ نے انہیں کے گھر میں، انہیں کے والدین کے ہاں، پرورش پائی تھی۔ اس لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خود پر اس خاندان کا حق سب سے فائق سمجھتے تھے۔ اس لیے حضرت ام ہانیؓ سے فتح مکہ کے موقع پر کیا جانے والا مروت والا سلوک اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے اور جہاں تک حضرت ام ہانیؓ کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دوبارہ پیغام نکاح دینے کا تعلق ہے تو ہمارے خیال کے مطابق یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بے جا تہمت طرازی ہے۔ پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ ابن سعد جیسے مؤلف نے ایسی عورتوں کی ایک طویل فہرست دی ہے (ابن سعد: طبقات، ۸:۱۴۱۔۱۶۰) جن سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے لیے پیغام دیا (یا ان سے نکاح ہوگیا، مگر فریق ثانی کی عدم رضا مندی کی بنا پر یہ سلسلہ کامیاب نہ ہو سکا)، ہمارے خیال میں یہ تمام روایات محض جھوٹ کا پلندہ ہیں، اور ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ورتبے کو گھٹانے کی مذموم سازش کا حصہ ہیں۔

حضرت ام ہانیؓ کے متعلق اس نوع کی حسب ذیل روایات ملتی ہیں: (۱) ہشام بن محمد بن السائب الکلبی اپنے والد محمد بن السائب الکلبی کے واسطے سے، حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ہانیؓ کے لیے جناب ابوطالب کی خدمت میں پیغام دیا، مگر انہوں نے ھبیرہ بن عمرو المخزومی کے ساتھ انہیں بیاہ دیا، بعد ازاں جب ان میں اور ھبیرہ بن عمرو بن عائذ المخزومی کے مابین تفریق اور جدائی ہوگئی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دوبارہ نکاح کا پیغام دیا، تو وہ بولیں: "بخدا میں تو زمانہ جاہلیت میں بھی آپ سے محبت کرتی تھی، چہ جائیکہ زمانہ اسلام میں، لیکن میں ایک بچوں والی عورت ہوں اور میں اس بات کو ناپسند کرتی ہوں کہ آپ کو تکلیف دوں" اس پر آپ نے قریشی عورتوں کی تعریف کی (ابن سعد: طبقات، ۸:۱۵۲۔۱۵۳).

۲۔ حضرت ام ہانیؓ کہتی ہیں کہ جب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام نکاح دیا تو میں نے آپؐ سے عذر کر لیا، اس پر اللہ تعالی نے حسب ذیل آیت مبارکہ نازل کی: "یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْٓ اٰتَیْتَ

اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمّٰتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۔ الایة" (۳۳[الاحزاب]:۵۰) ، یعنی اے پیغمبر ہم نے تمہارے لیے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کے مہر دے دیئے ہیں حلال کر دی ہیں اور تمہاری لونڈیاں جو خدا نے تم کو (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تمہارے ماموؤں کی بیٹیاں اور تمہاری خالاؤں کی بیٹیاں جو تمہارے ساتھ وطن چھوڑ کر آئی ہیں (سب نکاح کے لیے حلال ہیں)۔

کہتی ہیں: "کہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال نہ ہوسکتی تھی، اس لیے کہ میں نے ہجرت نہ کی تھی، میں تو الطلقاء میں سے تھی" (الترمذی، ۵/۳۵۵، کتاب التفسیر، باب سورۃ الاحزاب، حدیث ۳۲۱۴؛ ابن سعد: طبقات، ۸/۱۵۳)۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، ہم اسے صرف اسی طریقے سے "السدی" کی روایت سے جانتے ہیں۔

۳۔ طبقات ابن سعد میں عامر الشعبی سے مرسلاً مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ھانیؓ کو پیغام نکاح دیا۔ تو انہوں نے کہا: کہ رسول اللہ آپؐ مجھے میرے کانوں اور میری آنکھوں سے بھی زیادہ محبوب ہیں، لیکن خاوند کا حق بہت زیادہ ہوتا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ میں کہیں خاوند کا حق ضائع نہ کر دوں۔

۴۔ ابونوفل ابن ابی عقرب کے طریق سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پیغام نکاح دیا، تو انہوں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ بچہ میرے لیے شیر خوار ہونے اور میرے ساتھ سونے کے لیے کافی ہے (ابن سعد: طبقات، ۸:۱۵۲)۔

۵۔ السدی نے ابو صالح مولی ام ھانیؓ کے واسطے سے حضرت ام ھانی سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ھانیؓ کو پیغام دیا تو انہوں نے کہا: میں بچے کو دودھ پلاتی ہوں، جب بچہ بڑا ہوگیا، تو انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیش کش قبول کرنے پر رضا مندی ظاہر کی، مگر آپؐ نے فرمایا: کہ اب نہیں، اس لیے کہ اب اللہ تعالی نے ایسی رشتہ دار خواتین کی شرط رکھ دی ہے، جنہوں نے میرے ساتھ ہجرت کی ہے اور وہ ہجرت کرنے والی عورتوں میں سے نہ تھیں (ابن سعد، ۸:۱۵۳)۔

یہی روایت ابن سعد نے مختلف سندوں سے روایت کی ہے۔

ہمارے خیال میں یہ تمام روایات حقیقت سے بعید اور ابتدائی دور کے لوگوں کی قبول روایت میں غیر محتاط رویے کی غماز ہیں اور روایت اور درایت دونوں کے مطابق ضعیف، بلکہ موضوع کے زمرے میں آتی ہیں:

سند کے اعتبار سے دیکھا جائے، تو ان میں سے عدد ۳ اور عدد ۴ دونوں مرسل ہیں اور اتنے اہم مسئلے میں مرسل سند قابل لحاظ نہیں ہوسکتی، جبکہ عدد ۱، ۲، ۴، اور ۵ روایت اور درایت کے اصولوں کے مطابق محض "بے اصل" اور ضعیف ہیں۔ مثال کے طور پر روایت (۱) کے راوی محمد بن السائب الکلبی (م۱۴۶ھ) کے متعلق الحافظ صفی الدین الخزرجی نے اپنی کتاب خلاصہ تہذیب الکمال (ص۳۸۰) میں ابوحاتم کے حوالے سے لکھا ہے کہ تمام محدثین اس کی حدیث کے ترک پر متفق ہیں اور ایک جماعت نے ان پر وضع حدیث کا الزام لگایا ہے...... دوسری اور پانچویں روایت کے مرکزی راوی (اسماعیل بن عبدالرحمٰن السدی، م ۱۲۷ھ) پر تشیع کا الزام ہے (خلاصہ، ص ۳۰) اور پھر وہ جیسا کہ امام ترمذیؒ نے لکھا

ہے کہ اس روایت کو نقل کرنے میں منفرد ہیں۔ اس لحاظ سے یہ روایت کمزور ہے۔

جبکہ ابن سعد کی روایت کا مدار عبدالسلام بن حرب الہندی الطائی (م ۱۸۷ھ) پر ہے، جس کی بہت سی روایات کو امام احمد بن حنبل نے منکر قرار دیا ہے (خلاصہ، ص ۳۰۱).

جہاں تک درایت کا تعلق ہے تو وہ بہت واضح ہے۔ اس لیے کہ روایت نمبر ۱ میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ھانی کے لیے جناب ابوطالب کو پیغام دیا مگر انہوں نے قبول نہ کیا۔ حضرت ام ھانیؓ کا زمانہ بلوغ حضرت علیؓ کی جڑواں بہن ہونے کی بنا پر ۲ یا ۳ نبوی قرار پاتا ہے، یہ وہ وقت ہے جب آپؐ نے اعلان نبوت کر دیا تھا اور آپؐ کی تمام تر توجہ اور کوشش اسلام کی تبلیغ واشاعت میں صرف ہو رہی تھی، لہٰذا یہ وقت نکاح جدید کے لیے اول تو مناسب نہ تھا اور پھر جناب ابوطالب کے ہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو مقام ورتبہ تھا اس کی بنا پر اس پیغام کے رد کیے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (دیکھیے جناب ابوطالب کا حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا ہوا خطبہ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہا ہوا قصیدہ، در ابن ہشام: سیرۃ).

۱۳ ن/۱ھ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس طرح آپ کی حضرت ام ھانیؓ سے ملاقات ۸ھ/۶۳۰ء سے قبل نہیں ہوئی۔ حضرت ام ھانیؓ نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا، اس وقت تک سورۃ الاحزاب نازل ہو چکی تھی (زمانہ نزول ۶۔۷ھ) جس میں غیر مہاجر عورتوں سے اور بعد ازاں کسی بھی عورت سے آپؐ کو نکاح سے روک دیا گیا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے جو آخری نکاح فرمایا، وہ ام المؤمنین حضرت میمونہؓ سے تھا، جو ذوالقعدہ ۷ ھ کا واقعہ ہے، اس طرح اس موقع پر ان کو پیغام دینا، شرعی نصوص کی خلاف ورزی ہے جس کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا.

پھر حضرت ام ھانیؓ اور ان کے خاوند کے ما بین ''تفریق'' رمضان المبارک ۸ھ میں ہوئی اور آزاد عورت کی خاوند سے تفریق پر استبراء (عدت گزارنا) ضروری ہوتا ہے، حضرت ام ھانیؓ کی عدت ذوالحجہ ۸ھ کو ختم ہوئی ہوگی، عدت کے دوران میں نکاح کی بات چیت کرنا قرآنی حکم (۲ [البقرہ]: ۲۳۵) کی رو سے ناجائز ہے اور ذوالحجہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ منورہ پہنچ چکے تھے.

حضرت ام ھانیؓ کا مدینہ منورہ جانا ثابت نہیں ہے، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی دوبارہ ملاقات ۱۰ھ/۶۳۲ء میں حجۃ الوداع کے موقع پر ہوئی ہوگی، مگر اس موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حالت احرام میں مکہ مکرمہ گئے تھے اور حج کرتے ہی واپس تشریف لے گئے۔ اس وقت تمام ازواج مطہراتؓ آپؐ کے ہمراہ تھیں، اس لیے اس موقع پر بھی ایسی بات چیت کا ہونا ممکن نہیں ہے.

پھر روایت ۵ میں مذکور ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں کا ذکر کرکے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عذر کر دیا، حالانکہ یہ کوئی معقول عذر نہ تھا، حضرت ام سلمہؓ بھی نکاح کے وقت بچے دار تھیں، بلکہ ان کی چھوٹی بیٹی (زینب) دودھ پیتی تھیں، اس کے باوجود یہ بات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے نکاح سے مانع نہ ہوئی.

علاوہ ازیں ان سب روایات کا انداز ایسا ہے کہ ان میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں خفت

کا پہلو نکلتا ہے.

الغرض تمام عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ام ھانیؓ کو پیغام دینا محض "الکلبی" اور "السدی" کی ذہنی اختراع اور ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر محض افترا اور بہتان ہے۔ اسی طرح کے بیانات نے مغربی دنیا میں ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور غلط انداز میں پیش کیا ہے.

وفات: الترمذی کے مطابق وہ حضرت علیؓ کی شہادت (۴۰ھ/۶۶۱ء) کے بعد تک زندہ تھیں، جبکہ تقریب اور خلاصہ کی روایت کی رو سے انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے (۴۰-۶۰ھ) میں انتقال فرمایا (خلاصہ).

اولاد: حضرت ام ھانیؓ کا خاوند ھبیرہ بن عمرو فتح مکہ کے بعد حالت کفر میں مارا گیا، مگر اللہ تعالی نے ان کے خاندان کو مشرف بہ اسلام کر دیا۔ حضرت ام ھانیؓ کے ہاں حسب ذیل اولاد ہوئی: (۱) جعدہ بن ھبیرہؓ۔ مشہور قول کی رو سے، انہیں شرف صحبت حاصل تھا، مگر انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث روایت نہیں کی، البتہ اپنے ماموں حضرت علیؓ اور اپنی والدہ ام ھانیؓ سے روایت کرتے ہیں۔ العجلیؒ نے انہیں ثقہ تابعی شمار کیا ہے(خلاصہ تہذیب الکمال، ص:۵۳)۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے کہ انہیں شرف صحابیت تو حاصل ہے، مگر شرف سماع نہیں ہے (الاصابہ، ۱:۲۵۸ عدد ۱۲۶۵)۔ حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں وہ خراسان کے والی رہے۔ امیر معاویہؓ کے زمانہ امارت (۴۰-۶۰ھ) میں انتقال فرمایا (الاصابہ، ۱:۲۵۸).

(۲) عمرو؛ (۳) یوسف؛ (۴) ھانی، انہیں کے نام پر حضرت ام ھانی نے اپنی کنیت ام ھانی رکھی تھی؛ (۵) یحیٰ (الاصابہ، ۴:۵۶۴)۔ ان چاروں کی ولادت عہد نبوی میں ہوئی، اس لیے انہیں شرف صحابیت کا حامل تصور کیا جاتا ہے، البتہ ان میں سے کسی کو آپؐ سے شرف سماع حاصل نہیں.

روایات: حضرت ام ھانیؓ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ۴۶ احادیث روایت کرتی ہیں (جوامع السیرہ) جن میں سے چند ایک صحیحین میں بھی ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے جعد اور یحیٰ، ان کے پوتے ہارون، ان کے خدام ابومرہ اور ابوصالح، ان کے چچا زاد بھائی عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن الحارث وغیرہ روایت کرتے ہیں (الاصابہ، ۴:۴۸۰).

حضرت ام ھانیؓ ۸ رکعت نماز ضحیٰ (چاشت) کے متعلق روایت کرنے میں منفرد ہیں، اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی روایت کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو تلاوت کرتے تھے تو وہ اپنے گھر کے صحن میں آپؐ کی تلاوت کی آواز سنا کرتی تھیں (شمائل ترمذی) غالبا یہ فتح مکہ کے بعد کا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام مکہ مکرمہ کا واقعہ ہے.

مآخذ: (۱) البخاری، ۴۳/۳ کتاب الصلوۃ فی التطوع، وکتاب المغازی؛ (۲) مسلم، حدیث ۳۲۶ کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلوۃ الضحی؛ (۳) الترمذی، حدیث ۴۷۷ کتاب المناقب؛ (۴) ابوداؤد، حدیث ۱۲۹۱؛ (۵) ابن سعد: الطبقات، بیروت، ۸:۴۸، ۱۰۱ تا ۱۵۳؛ (۶) احمد بن حنبل: مسند، ۶:۳۴۰ تا ۳۴۴؛ (۷) بشار عداد معروف وغیرہ: جامع المسانید، ۴۳۷/۶-۴۳۸؛ (۸) ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴:۴۷۹ عدد ۱۵۳۲؛ (۹) حافظ صفی الدین احمد بن عبداللہ الخزرجی: خلاصہ تہذیب الکمال، مطبعۃ الخیریہ، ۱۳۲۲ھ بمواقع عدیدہ؛ (۱۰) ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۴:۱۹۶۴ء؛ (۱۱) الحاکم النیساپوری: المستدرک، ۵۲/۴؛ (۱۲) ابن الاثیر: اسد الغابۃ، ۶۲۴/۵؛ (۱۳) الذہبی: تاریخ الاسلام، ۲:۳۳۲؛ (۱۴) وہی مؤلف: سیر

النبلاء، ۲:۳۱۱؛ (۱۵) ابن حجر: تہذیب التہذیب، ۱۲:۴۸۱؛ (۱۶) ابن قتیبہ: المعارف، ص:۳٦، ۱۲۰، ۴۷۹؛ (۱۷)ابن ہشام: السیرۃ، ۲:۴۲۰.

(محمود الحسن عارف)

••.............••

⊗ امیر علی، سید: بن معظم علی الحسنی لمبلیح آبادی، (خاندانی نام عبدالرزاق محمد جو معروف نہیں)، ہندوستان کے ثقہ عالم دین، مؤلف تفسیر مواہب الرحمٰن و کتب کثیرہ۔ وہ ہندوستان کے مردم خیز شہر ملیح آباد میں ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوے۔ جو لکھنؤ سے پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان کا تعلق خاندان سادات سے تھا اور سید عبدالحی نے آپ کو حسینی سید لکھا ہے (نزھۃ الخواطر، ۸:۸۴) لیکن ان کے شجرہ نسب سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق حسنی سادات کی اس شاخ سے تھا جو ان کے ساتویں جدامجد سید داؤد بن سید قطب الدین کی سرکردگی میں (غالبًا عہد بابر بادشاہ یا اس سے کچھ پہلے) سبز وارہ سے منتقل ہو کر ملیح آباد میں آبسی تھی۔ ان کا سلسلۂ نسب چھتیسویں پشت میں حضرت امام حسنؓ سے جا ملتا ہے۔ ان کا تعلق ایک علمی خاندان سے تھا۔ ان کے والد فارسی زبان خصوصاً خطاطی کے ماہر تھے اور لارڈ ڈلہوزی، وائسرائے ہند کے دفتر میں صدر اعلی (میر منشی) تھے، ان کے چچا سید عبدالرحمٰن ناز علی بھی صاحب علم و فضل تھے اور سید احمد شہید کے قافلہ حج میں مع اہل و عیال شریک ہوئے تھے.

سید امیر علی بچپن ہی سے نہایت ذہین وفطین تھے۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ پندرہ سال کی عمر میں انہوں نے فارسی اور فنون ریاضیہ یعنی حساب، اقلیدس، جبر ومقابلہ اور علم المثلث والمساحۃ وغیرہ سے فراغت حاصل کر لی تھی (التوشیح، ص ۲۹۴).

دینی علوم کی طرف ان کا رجوع حادثاتاً ہوا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ فارسی اور ریاضی کی تعلیم کے بعد انہیں اوائل عمری ہی میں ملازمت کرنا پڑی۔ ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ چنانچہ وہ بہرائچ میں کسی ڈاک خانہ میں پوسٹ ماسٹر مقرر ہوگئے۔ اتفاق سے ایک دن وہ مسجد میں نماز پڑھنے گئے تھے کہ افسر معائنہ موقع پر پہنچ گیا اور ان کو غیر حاضر پا کر ناراضی کا اظہار کیا۔ ان کو مسجد میں اطلاع دی گئی، لیکن انہوں نے نہایت اطمینان سے نماز پڑھی اور پھر اپنے دفتر واپس آئے۔ افسر معائنہ نے ان کے رویے پر اعتراض کیا، لیکن انہوں نے معذرت کرنے کی بجاے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا.

اس واقعے کا ان کی شخصیت پر گہرا اثر پڑا، انہیں اپنی ملازمت سے محروم ہوجانے کا غم نہیں تھا بلکہ اس بات کی ندامت تھی کہ جس دین کے شعائر کی پابندی کی پاداش میں انہیں ملازمت سے محروم ہونا پڑا ہے، خود وہ اس دین کی تعلیمات سے ناواقف تھے (عبدالرزاق ملیح آبادی، در، صبح سعادت، ص ۴)۔ اس طرح ان کے دل کی دنیا بدلی اور انہوں نے عربی اور دینی علوم کی تحصیل کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ابتدائی کتب مولانا سید عبداللہ الدروی اور ان کے شیخ مولانا حیدر علی مہاجر کے ہاں پڑھنے کے بعد، قاضی بشیر الدین عثمانی مؤلف کشف المبہم فی شرح المسلم کے درس میں حاضر ہوے اور وہاں اصول، کلام، منطق اور حکمت کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد درس حدیث اور علوم عربیہ کی تکمیل کے لیے دہلی کا سفر کیا جہاں ان دنوں مولانا سید نذیر حسین دہلویؒ کے درس کا شہرہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے کتب صحاح وسنن کی پورے تدبر واتقان سے قرأت کی (نزھۃ الخواطر، ۸:۸۴؛ التوشیح، ۲۹۴) دہلی ہی میں انہوں نے حکیم عبدالمجید بن محمود دہلوی سے علم طب سیکھا اور پھر وطن لوٹ آے (نزھۃ الخواطر، ۸:۸۴)۔

مطبع نول کشور سے تعلق: سید امیر علی کے لکھنو منتقل ہوجانے کے بعد، وہاں ان کی کچھ تدریسی مصروفیات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ لکھنؤ میں اس وقت قصائی باڑہ، فرنگی محل، جھوائی ٹولہ اور قندھاری بازار میں کچھ تدریسی حلقے قائم تھے انہی میں سے ایک حلقہ میں ان سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے والد حکیم سید عبدالحی نے تفسیر جلالین پڑھی تھی (حیات عبدالحی، ص۴۷۔ ۷۶)۔ لکھنو میں ہی ان کا یہاں کے مشہور مطبع نول کشور سے تعلق ہوا۔ یہ وہ مطبع ہے جس نے ہندوستان کی علمی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ مسلم اہل علم سے اہم اسلامی موضوعات پر سیکڑوں کتابیں لکھوا کر طبع کیں اور بعض نایاب اور نادر مخطوطات کی بھی اشاعت کی (جیسے بدر الدین عینی (م ۸۵۵ھ) کی "البنایہ فی شرح الہدایۃ" اور ابن ہمام (م ۹۸۱ھ) کی فتح القدیر وغیرہ۔ منتظمین مطبع کا رویہ مسلمان اہل علم و فن کے ساتھ اتنا اچھا اور فراخ دلانہ تھا کہ ہندوستان کے بہت سے علماء اور فضلا اور ادباء و شعراء یہاں جمع ہوگئے تھے (علمی اجالے، ص ۹۲) چنانچہ سید امیر علی نے بھی اس مطبع کی ملازمت اختیار کر لی۔

سید امیر علی نے یہاں کتب اسلامی کی تصحیح، تحشیہ اور تراجم کا کام کرتے ہوئے اپنی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ صرف کیا (نزہتہ الخواطر، ۸:۸۵) جن میں سے اکثر زیور طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ ابتدا میں وہ اپنے فرائض مطبع کی عمارت میں بیٹھ کر سر انجام دیا کرتے تھے، بعد میں صاحب مطبع نے ان کو اس پابندی سے مستثنیٰ قرار دے دیا، چنانچہ وہ اپنے گھر پر ہی بیٹھ کر مطبع کا کام کرنے لگے۔ کچھ عرصہ یہاں کام کرنے کے بعد وہ ملازمت سے استعفیٰ دے کر حجاز مقدس چلے گئے۔ فریضۂ حج ادا کیا، مقامات مقدسہ کی زیارت کی اور پھر جدہ میں کچھ عرصہ تک خدمت تدریس سر انجام دیتے رہے (نزہتہ الخواطر، ۸:۸۵)۔ سوے اتفاق سے ان کو حجاز کی آب وہوا راس نہ آئی اور کچھ مدت بعد ہی بیمار پڑ گئے۔ ان کا بڑا لڑکا، جس کی بڑی محبت و شفقت سے انہوں نے تربیت کی تھی، وہیں فوت ہوگیا۔ طبیبوں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً ہندوستان لوٹ جائیں ورنہ ہلاکت کا خطرہ ہے، چنانچہ وہ وہاں سے ہندوستان واپس آکر دوبارہ مطبع نول کشور سے وابستہ ہوگئے، یہاں تک کہ ان کو مطبع ہذا سے پنشن مل گئی۔ وہ حجاز مقدس سے اس طرح واپسی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کرتے تھے: "نصاریٰ کی حکومت سے بیزار ہو کر جوار بیت اللہ میں پناہ ڈھونڈی، مگر خدا کی مشیت یہی تھی کہ وہاں نہ رہ سکوں"(صبح سعادت، ص ۲)۔

۱۹۱۵ء میں سید امیر علی، مدرسہ عالیہ کلکتہ میں صدر مدرس مقرر ہوے۔ حسن اتفاق سے انہی دنوں ان کے تلمیذ رشید مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے ناظم منتخب ہوے (حیات عبدالحی، ص ۱۹۱)۔ انہوں نے سید صاحب کو ندوہ آنے کی دعوت دی۔ جسے قبول کرتے ہوئے وہ کلکتہ چھوڑ کر ندوہ چلے گئے حالانکہ نئی ملازمت کی تنخواہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کی نسبت بہت ہی کم تھی (تاریخ ندوۃ العلماء، ۲:۱۷۷)۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جن لوگوں نے ان سے استفادہ کیا، ان میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (م ۱۹۵۹ء) اور مولانا خلیل عرب ہیں جو بعد میں دارالعلوم میں عربی ادب کے استاد مقرر ہوے۔ جن کے شاگردوں میں مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی انہی کے شاگرد ہیں (پرانے چراغ، ۲:۲۱۲)۔ سید امیر علی اپنے دور اہتمام (۱۳۳۳ھ۔۱۳۳۷ھ) میں دارالعلوم کی تعمیر وترقی میں نمایاں حصہ لینے کے بعد، ۲۶ اپریل ۱۹۱۹ء/ ۲۵ رجب ۱۳۳۷ھ کو اچانک بیماری کے نتیجے میں انتقال کر گئے

(تاریخ ندوۃ العلماء، ۲:۲۷۰).

اخلاق وصفات: سید امیر علی بڑے عالم وفاضل اور جامع الصفات شخص تھے۔ وہ اعلیٰ اخلاق کے حامل اور انکساری اور عاجزی کا نمونہ تھے اور نام و نمود سے پرہیز کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اردو کی ایک بڑی تفسیر مذاہب الرحمٰن، کا مؤلف ہونے کے باوجود خود کو ہر کہیں اس میں 'مترجم' کہا ہے۔ یہ اس عدم شہرت کا شاہنامہ ہے کہ عام لوگ ان میں اور ان کے ہم نام معروف معاصر جسٹس سید امیر علی میں فرق نہیں کرتے بلکہ ایک ناشر نے تو ان کے تراجم فتاوی عالمگیری پر باقاعدہ جسٹس سید امیر علی کا نام لکھ کر دیا طبع کر دیا۔ انہیں علوم عقلیہ میں کمال حاصل تھا، لیکن وہ اسے اہمیت دینے کی بجائے اسلاف سے وابستگی ہی میں عافیت سمجھتے تھے۔ انہوں نے مغرب سے فکری مرعوبیت کی وجہ سے مسلم فکر اور معاشرے پر پڑنے والے برے اثرات کو کم کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔

تصانیف: (۱) تفسیر مواہب الرحمٰن: یہ اردو کی ضخیم ترین تفسیر ہے جو مولانا امیر علی نے مطبع نول کشور کے لیے لکھی۔ ۱۸۹۶۔۱۹۰۲ء میں مطبع نے پہلی دفعہ اسے تیس جلدوں میں شائع کیا۔ اس تفسیر میں مولانا نے اپنے سے پہلے ہونے والے تفسیری کام کا، خصوصاً معروف عربی تفسیروں (جیسے تفسیر کبیر، کشاف، مدارک، معالم التنزیل وغیرہ) کا ملخص پیش کیا ہے اور سیوطی کی الاتقان و الدرالمنثور اور تفسیر جلالین سے خصوصی استفادہ کیا ہے (مواہب الرحمٰن: ۳۰:۸۵۴)۔ اس تفسیر میں مولانا نے زیادہ تر قدیم مفسرین کے خیالات کو جمع کیا ہے اور ان پر نقد و تبصرہ بہت کم ہے۔ تاہم تزکیۂ نفس، معرفت الٰہی اور اہل سنت کے مسلک کی حمایت ان کے پیش نظر رہی ہے۔ تفسیر کے شروع میں ۱۰۴ صفحات کا مبسوط مقدمہ ہے۔ جس میں مولانا نے کتاب کا ایک اہم مقصد تالیف یہ لکھا ہے کہ وہ جمہور مسلمانوں کو گمراہ فرقوں کے افکار، کے برے اثرات سے بچانا چاہتے ہیں۔ وہ سرسید کے رجحانات و افکار کے شدید ناقد تھے۔ اس لیے اس موضوع پر لکھتے ہوئے ان کے ہاں تلخی اور مناظرانہ رنگ نظر آتا ہے، جیسا کہ مقدمہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں ''مسلمانوں کو اعتقادات حقہ سے بہکانے و شک دلانے میں اہل شرک ظاہری یہود و نصاریٰ و ہنود و مجوس کا فتنہ چنداں مضر نہیں ہے، جس قدر فرقہ نیچر یہ سے ضرر ہے کیونکہ اس فرقہ نے ظاہری صورت اسلام و لباس و نام کے پیرایہ میں اپنی جاہلانہ کفر و بداعتقادیوں سے بہت سے جاہل مسلمانوں کو دائرۂ کفر میں کھینچ لیا۔ (مواہب الرحمٰن، ص ۸۴)۔ خود صاحب مطبع کا احساس یہ تھا کہ اس تفسیر کی اشاعت سے اس نے دنیائے اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے (قرآن حکیم کے اردو تراجم، ص ۲۳۷)۔ کتاب کئی مرتبہ اسی مطبع نے شائع کی۔ ۱۹۲۶ء کی طباعت کا ذکر ڈاکٹر ریحانہ ضیاء صدیقی نے کیا ہے (تفسیر بیان القرآن کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص ۱۲۲) اور ۱۹۳۱ء کا ایڈیشن کی عکسی طباعت نو کا اہتمام مکتبہ رشیدیہ لاہور نے ۱۹۷۷ء میں کیا۔ تفسیر کا شمار بلاشبہ اردو کی جامع اور بڑی تفسیروں میں ہوتا ہے لیکن تفسیر میں نقل و روایت کا رنگ غالب ہے (۲) شرح الجامع الصحیح للبخاری: یہ صحیح بخاری کی نہایت جامع شرح ہے اور تفسیر مواہب الرحمٰن کی طرح اس میں بھی صحیح بخاری کی مستند عربی شرحوں کے اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ یہ بھی تیس جلدوں میں ہے۔ بعض وجوہ سے یہ شائع نہ ہو سکی۔ تاہم اس کا مسودہ ابھی تک مطبع مذکور کے مالکان کے پس ماندگان کے پاس موجود ہے (نایاب علمی خزانہ، ص ۷)؛ (۳) ترجمہ فتاوی عالمگیری: مطبع؛

نول کشور نے اس کتاب کی پہلی جلد کا ترجمہ قاضی احتشام الدین مراد آبادی سے کروایا، جب کہ باقی تین جلدوں کا ترجمہ مولانا سید امیر علی نے کیا۔ یہ کتاب پہلی دفعہ مطبع مذکور سے ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع نے ۱۹۳۱ء میں شائع کیا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن متعدد ادارے شائع کر چکے ہیں (۴) عین الھدایہ: یہ حنفی فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کا اردو ترجمہ ہے۔ مطبع نول کشور سے اس کی اولیں طباعت کا سال معلوم نہیں ہوسکا، تاہم مولانا نے مواہب القرآن کے مقدمے میں اس کا ذکر کیا ہے (دیکھیے ص ۶۲) جس سے یہ واضح ہے کہ یہ کتاب تفسیر سے پہلے چھپ چکی تھی۔ حال ہی میں لاہور سے اس کا ایک ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

(۵) التوشیح: یہ التوضیح والتلویح پر مولانا سید امیر علی کا مبسوط حاشیہ ہے جو علوم عقلیہ پر ان کی مضبوط گرفت کا مظہر ہے۔ یہ کتاب مولانا کی زندگی ہی میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئی؛ (۶) حاشیہ علی تقریب التھذیب: یہ فن اسماء الرجال میں ابن حجر العسقلانی کی تقریب التھذیب پر حاشیہ ہے؛ (۷) التعقیب فی حواشی التقریب، (۸) تہذیب التعقیب علی التقریب، یہ تینوں حواشی مطبع نول کشور نے شائع کیے؛ (علوم دینیہ اور مطبع نول کشور ، ص ۱۵)۔

مآخذ: (۱) مولانا سید امیر علی کی اپنی تصانیف خصوصاً عدد (۱) (۲) (۳) (۴) مولانا اور ان کے کام کے بارے میں عدد (۵) (۶) (۷) (۲) ابوالحسن علی ندوی: حیات عبدالحی، کراچی ، ۱۹۸۵ء؛ (۳) وہی مصنف: پرانے چراغ، جلد دوم کراچی ، ۱۹۸۴ء؛ (۴) وہی مصنف: تاریخ دعوت وعزیمت ، جلد ششم کراچی، (۵) امیر حسین نورانی: منشی نول کشور اور ان کے خطاط وخوش نویس، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء؛ (۶) وہی مصنف: علمی اجالے، لکھنؤ، ۱۹۵۹ء؛ (۷) ایبٹ (کرنل): تواریخ نادر العصر، لکھنو، ۱۸۶۳ء؛ (۸) رام بابو سکسینہ :A History of Urdru Literature، سندھ ساگر اکیڈیمی، لاہور؛ (۹) ڈاکٹر ریحانہ صدیقی: مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، دہلی، ۱۹۹۱ء؛ (۱۰) فضل حسین بہادر، الحیات بعد المماتِ، کراچی (۱۱) ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم: قرآن حکیم کے اردو تراجم، کراچی؛ (۱۲) مولانا شمس تبریز خان: تاریخ ندوۃ العلماء جلد دوم لکھنو، ۱۹۸۴ء؛ (۱۳) حکیم عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر وبھجۃ المسامع والنواظر، جلد ہفتم و ہشتم ، ملتان، ۱۹۹۳ء، (۱۴) عبدالسلام خان: برصغیر کے علماے معقولات اور ان کی تصانیف، خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۶ء؛ (۱۵) عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان وہند میں، لاہور؛ (۱۶) مالک رام: تذکرہ ماہ وسال، مکتبہ جامعہ نئی دھلی لمیٹڈ؛ (۲۰) ظفر احمد صدیقی ندوی: علوم دینیہ اور مطبع نول کشور، در ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، شمارہ نومبر ۱۹۸۱ء، فروری ۱۹۸۲ء؛ (۱۷) عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا: مولانا سید امیر علی صاحب مرحوم، در ماہنامہ صبح سعادت، لاہور، شمارہ اپریل ۱۹۲۸ء؛ (۱۸) امیر حسین نورانی: ایک نایاب علمی خزانہ در ماہنامہ صدق جدید، لکھنؤ، شمارہ دسمبر ۱۹۶۲ء؛ (۱۹) تاریخ ادبیات پاکستان، جلد نہم، جامعہ پنجاب؛

(نورحبیب اختر [و محمد امین])

••-------------••

امین احسن، اصلاحی [رکّ بہ اصلاحی، امین احسن]⊗

••-------------••

امین الحسینی، الحاج: (۱۸۹۷-۱۹۷۴ء)۔ ⊗ فلسطین کے مفتیٔ اعظم، اس علاقے پر برطانوی تسلط (۱۹۱۷ء- ۱۹۴۸ء) کے دوران میں تحریک آزادی فلسطین کی روح رواں اور عالم عرب کے ایک سربرآوردہ سیاسی

رہنما۔ وہ ۱۸۹۷ء میں القدس کے 'الحسینی' خاندان میں، جسے فلسطین میں سیاسی و روحانی اعتبار سے ممتاز حیثیت حاصل تھی، پیدا ہوے۔ الحسینی خاندان کے مورثِ اعلیٰ 'محمد البدر' جن کا سلسلۂ نسب ۱۸ واسطوں سے حضرت حسینؓ بن علیؓ سے جاملتا ہے، ۱۲ ویں صدی عیسوی میں سرزمین حجاز سے نقل مکانی کر کے القدس میں آکر آباد ہوے تھے۔ عثمانی دور میں اس خاندان کے متعدد افراد اعلیٰ سیاسی وانتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ سترہویں صدی عیسوی سے 'مفتی القدس' جیسا اہم دینی منصب بھی بغیر کسی توقف کے اس خاندان کے پاس رہا (مجید خدوری: *Arab Contemporaries: The Role of Personalities in Politics*، بالٹی مور، ۱۹۷۳ء، ص۶۸-۷۱).

ایک مقامی مکتب سے ابتدائی تعلیم اور ایک فرانسیسی اسکول سے فرانسیسی زبان کی تحصیل کے بعد وہ ۱۹۱۲ء میں جامعۃ الازہر (قاہرہ) میں داخل ہوگئے۔ یہاں قیام کے دوران میں، انہیں عالم عرب کے ممتاز دینی مصلح ومفکر علامہ محمد رشید رضا [رک بآں] کی مجالس میں شریک ہونے اور ان کے اصلاحی خیالات وافکار سے استفادے کا موقع ملا۔ انہوں نے جامعۃ الازہر میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے علاوہ قاہرہ ہی میں جنگ عظیم اول سے قبل علامہ محمد رشید رضا کے قائم کردہ دارالعلوم 'جمعیۃ الدعوۃ والارشاد' سے بھی اپنا تعلیمی تعلق استوار کر لیا۔ ۱۹۱۳ء میں جامعہ ازہر سے ان کا تعلیمی تعلق منقطع ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور پہلی عالمی جنگ چھڑ جانے کے بعد استانبول میں قائم عسکری تعلیم وتربیت کی اکادمی میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے فراغت کے بعد بطور ایک افسر، عثمانی افواج میں شمولیت اختیار کر لی اور جنگ کے دوران میں سمرنا اور بحراسود کی جانب عسکری محاذوں پر خدمات انجام دیں.

درس و تدریس: امین الحسینی ۱۹۱۷ء میں واپس القدس آگئے جہاں وہ کچھ عرصہ کے لیے 'کلیۃ روضۃ المعارف کالج' اور مسلم اساتذہ کے قائم کردہ 'رشیدیہ سکول' سے بطور مدرس وابستہ رہے (Maurice Pearlman: *Mufti of Jerusalem: The Story of Haj Amin El.Hussaini*، لنڈن، ۱۹۴۷ء، ص ۱۰-۱۲؛ Beverley Milton- Edwards: *Islamic Politics in Palestine*، لنڈن، نیویارک، ۱۹۹۹ء، ص ۲۳-۲۴؛ *Arab Contemporaries*، ص۷۰).

ملی سیاست میں حصہ: امین الحسینی ۱۹۱۷ء میں جب القدس واپس پہنچے تو اس وقت تک عالم عرب میں ایک بہت بڑا سیاسی انقلاب رونما ہوچکا تھا۔ سلطنت برطانیہ کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں، شریف مکہ حسین بن علی الہاشمی [رک بآں] کی قیادت میں عربوں نے عثمانی سلطنت کے خلاف بغاوت (جون ۱۹۱۶ء) کر دی تھی۔ چنانچہ شام، فلسطین اور حجاز وعراق پر سے عثمانی سلطنت کے اقتدار کا خاتمہ اور ان ممالک پر برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کا تسلط قائم ہوگیا تھا (George Antonio: *The Arab Awakening*، لنڈن، ۱۹۶۱ء، ص ۶۰-۱۰۵).

برطانوی حکومت نے جنگ عظیم اول کے دوران میں، یورپ کے مختلف ممالک میں آباد یہودیوں کی شاندار خدمات کے صلے میں، فلسطین میں ایک یہودی قومی ریاست کے قیام اور دنیا بھر میں منتشر یہودیوں کو وہاں لا کر آباد کرنے کی غرض سے، ۲ نومبر۱۹۱۷ء کو ''اعلان بالفور'' جاری کر دیا [رکّ بہ فلسطین]۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ۱۹۲۰ء کے اوائل میں سان ریمو (San Remo) کانفرنس میں فلسطین کو برطانوی انتداب میں دینے کی سفارش کی گئی۔ امین الحسینی، ان حالات میں فلسطین کی عربی و اسلامی حیثیت کے تحفظ اور برطانوی تسلط اور صہیونی عزائم کے خلاف سرگرم عمل ہوگئے۔ اس مقصد کے لیے وہ مقامی اخبارات وجرائد میں مضامین لکھتے اور فلسطینی عربوں کے اجتماعات سے خطاب کرتے۔ ان

کے آتشیں مقالات و خطابات نے فلسطینی عربوں کو بیدار اور متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا (Maurice Pearlman: *Mufti of Jerusalem*، ص ۱۰-۱۲)۔ ۱۹۲۰ء کے موسم بہار میں، فلسطین میں، برطانوی تسلط اور صہیونی ریاست کے قیام کے منصوبے کے خلاف، پہلی 'انتفاضہ' (Up-rising) یعنی تحریک مزاحمت کا آغاز ہوا۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے اس تحریک کو بغاوت اور شورش سے تعبیر کیا گیا اور اس کا ذمہ دار عارف العارف اور امین الحسینی کو ٹھیرایا گیا۔ امین الحسینی، شام کی طرف نکل جانے میں کامیاب ہوگئے، چنانچہ ان کی غیر حاضری میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور دس سال قید کی سزا سنائی گئی (مجید خدوری: *The Role of Personalities in Arab Contemporaries: Politics*، ص ۷۰-۷۱)۔

امین الحسینی، شام پر فرانس کے تسلط اور فیصل حکومت کے خاتمے [رکّ شام، در آآآ بذیل مادہ] کے بعد جولائی ۱۹۲۰ء میں اردن، کہ جہاں اس وقت شام کے محبّ وطن اور فرانسیسی استعمار مخالف رہنما اکٹھے ہوگئے تھے، چلے گئے۔ اردن میں اپنے قیام کے دوران میں وہ فلسطینی عوام کے سیاسی حقوق کے تحفظ کی غرض سے عربوں کی حمایت کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ ۱۹۲۰ء کے اختتام پر فلسطین میں پہلے برطانوی ہائی کمشنر سرہربرٹ سیموئیل کی طرف سے، فلسطینی عربوں سے مفاہمت کی غرض سے، امین الحسینی کے لیے معافی کا اعلان کیا گیا۔ چنانچہ وہ فلسطین واپس آگئے اور دوبارہ سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ کمال الحسینی، مفتی القدس، کے انتقال (۲ مارچ ۱۹۲۱ء) کے بعد برطانوی ہائی کمشنر کی طرف سے انہیں 'مفتی القدس' مقرر کیا گیا، جس کے بعد فلسطین اور عالم عرب کے اخبارات و جرائد میں ان کا ذکر 'مفتیِ فلسطین' یا پھر 'مفتیِ اعظم' کے نام سے کیا جانے لگا۔ آئندہ سال (۱۹۲۲ء میں) انہیں 'مسلم سپریم کونسل' (المجلس الاسلامی الاعلیٰ، قائم شدہ ۱۹۲۱ء) کا سربراہ مقرر کیا گیا، جس پر فلسطین میں مسلم اوقاف، مساجد و دینی مدارس اور شرعی عدالتوں کے امور کا نظم و نسق ان کے ہاتھ میں آگیا۔ وہ ان دونوں عہدوں پر ۱۹۳۷ء تک فائز رہے۔ ان عہدوں پر فائز ہونے کے بعد ان کی سیاسی حیثیت مزید مستحکم ہوگئی، اب وہ فی الواقع فلسطینی مسلمانوں کے ایک ایسے رہنما بن چکے تھے جسے عوام پر گہرا اثر و نفوذ حاصل تھا (Maurice Pearlman: *Mufti of Jerusalem*، ص۱۵، ۷۲-۷۳؛ *Islamic Politics in Palestine*، ص ۲۵-۲۶)۔

مسئلہ فلسطین سے وابستگی اور ابتلاء و آزمائش: مفتی امین الحسینی کی اصل پہچان اور شہرت مسئلہ فلسطین سے ان کی غیر متزلزل وابستگی اور برطانوی و صہیونی تسلط سے القدس کی بازیابی کے لیے جہد مسلسل کی بنا پر ہے۔ فلسطین میں برطانوی انتظام کے تحت "مفتی القدس" اور صدر "مسلم سپریم کونسل" جیسے مناصب پر تقرر بھی، انہیں اس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد سے باز نہ رکھ سکا۔ جولائی ۱۹۲۲ء میں انجمن اقوام (League of Nations) نے باقاعدہ طور پر فلسطین کو برطانوی انتداب میں دے دیا۔ جس کے بعد برطانوی حکومت نے فلسطین کا تین چوتھائی حصہ جنگ عظیم اول کے دوران میں عثمانی سلطنت کے خلاف بغاوت کے صلے میں (ستمبر ۱۹۲۲ء)، شریف مکہ حسین بن علی الہاشمی کے بیٹے عبداللہ کے حوالے کر دیا۔ امین الحسینی نے تمام مصلحتوں سے بالا تر ہو کر ان اقدامات کی مخالفت کی اور ان کے مقابلے میں فلسطین میں جاری تحریک مزاحمت کی کھل کر حمایت کی (Jillian Becker: *The PLO: The Rise and Fall of Palestine Liberation Organization*، لنڈن، ۱۹۸۴ء، ص ۱۰، ۱۶-۱۷)۔ اس دور میں ان کی سیاسی سرگرمیوں کا محور، دنیا کے مختلف ممالک سے وسیع پیمانے پر یہودیوں

کی فلسطین میں آمد اور ان کی آباد کاری کے لیے یہودی سرمایہ داروں کی طرف سے غربت وافلاس سے دو چار اور خستہ حال فلسطینی مسلمانوں کی زرعی زمینوں، باغات اور دیگر املاک کی خریداری کی مخالفت ومزاحمت رہا۔ وہ فلسطینی مسلمانوں کو یہودیوں کے ہاتھوں اپنی زرعی زمینوں، باغات اور دیگر املاک کی فروخت سے باز رکھنے اور انھیں اس کے مضمرات سے آگاہ کرنے کے لیے پوری طرح سرگرم رہے۔ وہ برطانوی حکام سے بھی فلسطین کی طرف یہودیوں کی نقل مکانی اور صہیونیوں کی طرف سے مسلمانوں کی زمینوں اور املاک کی خریداری پر بندش عائد کرنے کا مطالبہ پوری قوت سے کرتے رہے (Ted Swedenburg : The Role of Palestinian Peasantry in the Great Revolt (1936-1939)، در Albert Hourani : A Reader : (مدیران):The Modern Middle East ، لندن ، نیویارک ، ۱۹۹۳ء ، ص ۴۸۶-۴۸۷؛ Islamic Politics in Palestine، ص۸۰؛ Palestine: A Study of Jewish, Arab and British Policies، نیویارک ، کراؤس ری پرنٹ کمپنی، بار دوم، ۱۹۷۰ء ، ۲: ۷۶۶-۷۶۷).

۱۹۲۸ء-۱۹۲۹ء کے دوران میں صہیونیوں کی طرف سے دیوار گریہ اور اس سے متصل مسجد الاقصیٰ پر قبضہ کرنے کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ دریں حالات امین الحسینی نے نومبر ۱۹۲۸ء کو صہیونی عزائم کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی غرض سے القدس میں فلسطین اور قریبی ہمسایہ ممالک کے عرب مسلم رہنماؤں کی ایک مؤتمر (کانفرنس) منعقد کی جس میں فلسطین کے مختلف سیاسی گروہوں کے قائدین کے علاوہ شام، لبنان اور شرق اردن سے وفود شریک ہوے۔ مؤتمر میں صہیونیوں کی غاصبانہ سرگرمیوں کے خلاف برطانوی انتظامیہ سے شدید احتجاج کیا گیا۔ مزید براں القدس میں مقدس مقامات کے تحفظ و دفاع اور مسئلہ فلسطین کی بابت عالم اسلام میں رائے عامہ کو ہم نوا بنانے بالخصوص ہمسایہ عرب ممالک کے تعاون کے حصول کی غرض سے ایک تنظیم 'جمعیت حراسۃ المسجد الاقصیٰ' تشکیل پائی۔ اگست ۱۹۲۹ء میں صہیونیوں کی طرف سے مسجد الاقصیٰ پر اپنا قومی جھنڈا لہرانے اور اس کے ایک حصے کو منہدم کرنے کا واقعہ پیش آیا۔ مفتی امین الحسینی نے ان شر انگیز کارروائیوں کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ ان کی تحریک پر فلسطینی مسلمانوں نے صہیونیوں کے خلاف مسلح مزاحمت کا آغاز کر دیا۔ القدس اور فلسطین کے دیگر شہروں میں یہودی بستیوں پر حملے کیے گئے۔ اس دوران میں ۱۳۳ صہیونی ہلاک، جب کہ ۱۱٦ فلسطینی شہید ہوے۔ ان واقعات کی تحقیقات کے لیے برطانوی حکومت کی طرف سے مقرر کردہ 'شاء کمیشن' (Shaw Commission) نے اپنی رپورٹ (مارچ ۱۹۳۰ء) میں امین الحسینی کو اگست/ستمبر ۱۹۲۹ء میں رونما ہونے والے واقعات (تحریک مزاحمت) کا اصل ذمہ دار قرار دیا (الدکتور کامل محمود خلۃ: فلسطین والانتداب البریطانی، بیروت: مرکز الابحاث منظمۃ التحریر الفلسطینیۃ، ۱۹۷۴ء، ص ۲۸۳-۲۸۴، ۲۸۹-۲۹۴؛ Palestine :A Study of Jewish, Arab and British Policies، ۲: ٦۲۱-٦۲۳؛ Philip Mattar : The Mufti of Jerusalem : Al-Hajj Aminal-Husayni and the Palestinian National Movement ، نیویارک (کولمبیا یونیورسٹی پریس)، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۷-۱۱۸).

جرمنی میں ہٹلر کے اقتدار سنبھالنے کے بعد، نازیوں کی یہودیوں کے خلاف کاروائیوں کے سبب، فلسطین میں یورپی ممالک سے یہودیوں کی آمد اور ان کی سرگرمیوں میں بہت زیادہ تیزی آگئی۔ صرف سال ۱۹۳۵ء کے دوران میں ٦۰ ہزار یہودی مشرقی یورپ سے نقل مکانی

کر کے فلسطین پہنچے تھے۔ اس پر امین الحسینی پہلے سے بھی زیادہ جوش وجذبے کے ساتھ ان کے خلاف سرگرم عمل ہوگئے۔ ان کی تحریک پر فلسطین کی آزادی کے لیے ملک گیر مسلح جدوجہد (انتفاضہ) کا دوبارہ آغاز ہوا۔ جسے کچلنے کے لیے برطانوی حکام نے فلسطین میں ہنگامی حالت نافذ کر دی اور شہروں میں کرفیو لگا دیا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے امین الحسینی کی کوشش سے فلسطینی عربوں کی سیاسی جماعتوں کا ایک سیاسی وتنظیمی اتحاد، الھیئۃ العربیۃ العلیا (Arab Higher Committee) کے نام سے قائم (۲۵ اپریل ۱۹۳۶ء) ہوا، جس کا سربراہ انہی کو منتخب کیا گیا (George Lenczowski: *The Middle East in World Affairs*، اتھاکا، نیویارک، کرنل یونیورسٹی پریس)، بار دوم ۱۹۵۶ء، ص ۳۸۰- ۳۸۲؛ George E. Kirk: *A Short History of the Middle-East*، لنڈن ۱۹۶۴ء، ص ۱۸۲-۱۸۵).

برطانوی حکومت کے ظلم وجبر پر مبنی اقدامات، بالخصوص برطانوی افواج کی طرف سے فلسطینی عربوں کی ہلاکتوں کے خلاف امین الحسینی نے ہڑتال کی، اپیل کی جس کے نتیجے میں فلسطین میں چھ ۶ ماہ تک ہڑتال جاری رہی [رکّ بہ فلسطین در تکملہ]۔ ۱۹۳۶ء کے اختتام پر برطانوی حکومت نے فلسطین میں جاری خلفشار کے اسباب کی تحقیق وتفتیش کے لیے لارڈ پیل (Peel) کی سربراہی میں ایک وفد فلسطین روانہ کیا۔ امین الحسینی نے فلسطین میں یہودیوں کی نقل مکانی کو معطل کرنے اور ماضی میں برطانیہ کی طرف سے عربوں سے کیے گئے عہد وپیمان بالخصوص حسین بن علی اور میکماھن (McMahon) کے مابین مراسلت [رکّ بہ فلسطین وحسین بن علی الہاشمی درآآآ بذیل مادہ] کی روشنی میں فلسطین کی آزادی وخود مختاری کے مطالبات پیش کیے۔ پیل کمشن کی طرف سے فلسطین کی دو حصوں میں تقسیم اور بیت اللحم اور القدس کے علاقہ کو بطور غیر جانبدار منطقہ (نیوٹرل زون) برطانوی انتظامیہ کے تحت رکھنے کی سفارش کی گئی۔ امین الحسینی نے تقسیم کے منصوبے کو مسترد کر دیا۔ ان کے ایما پر ہمسایہ عرب ممالک نے بھی اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ اسی اثنا میں الخلیل کا قائمقام کمشنر، کے فلسطینی مظاہرین کے ہاتھوں قتل کا واقعہ پیش آیا۔ جو تقسیم فلسطین کے منصوبے کا خالق تھا، برطانوی حکام نے سخت کاروائی کرتے ہوے، امین الحسینی کو، ملک میں کئی سالوں سے جاری انتفاضہ کا ذمہ دار گردانتے ہوے، مفتی القدس کے عہدے اور مسلم سپریم کونسل کی سربراہی دونوں سے برطرف جب کہ مجلس زعماے عرب (Arab Higher Committee) کو غیر قانونی قرار دے کر، اس کے ارکان کو گرفتار کر کے بحر ہند میں Seychelles کے جزائر کی طرف ملک بدر کر دیا۔ امین الحسینی نے حرم الشریف میں پناہ لے لی، جہاں سے وہ بھیس بدل کر لبنان اور بعد ازاں شام چلے گئے۔ بیروت اور دمشق میں قیام کے دوران میں بھی وہ فلسطین میں جاری مزاحمت کی رہنمائی کرتے رہے (*The Middle East in World Affairs*، ص ۳۸۳-۳۸۴؛ Ann. Mosely Lesch: *The Palestine Arab Nationalist Movement Under the Mandate*، در Ann Mosely Lesch: و دیگر، (مدیران): *The Politics of Palestinian Nationalism* لنڈن، لاس اینجلس، ۱۹۷۳ء، ص ۳۷-۳۹؛ Jillian Becker: *The PLO*، ص۲۳-۲۵)۔ ۱۹۲۹ء تک برطانوی افواج نے بھرپور طاقت کے استعمال سے انتفاضہ کو کچل کر رکھ دیا، چنانچہ امین الحسینی عراق چلے گئے۔ عراق میں استعمار مخالف اور محبّ وطن سیاستدانوں کی طرف سے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا (Ritchie Qvandale: *The Middle-East Since 1914*، لنڈن، نیویارک، ۱۹۹۲ء، ص ۱۶۶-۱۶۷، ۲۷۱).

عراق میں جلد ہی انہیں ایک سربرآوردہ استعمار

امین الحسینی، الحاج

مخالف عرب رہنما کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ برطانوی حکومت کے شدید دباؤ کے تحت، اگرچہ عراق کے وزیراعظم نوری السعید [رک بہ، در آآآ بذیل مادہ] نے امین الحسینی کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی تھی، تاہم وہ عراق میں برطانیہ کے خلاف رائے عامہ کو متحرک کرنے اور استعمار مخالف حلقوں کو منظم کرنے کے لیے بدستور کوشاں رہے۔ عراقی پارلیمان کے ارکان کی حمایت سے انہوں نے اپنا ایک صدر دفتر بھی قائم کر لیا۔ جہاں ان کے گرد ایسے عرب رہنما اکٹھے ہوگئے جو عراق اور دیگر عرب ممالک کے بارے میں برطانیہ کے عزائم کے مخالف اور اتحاد عرب کے حمایتی تھے۔ امین الحسینی نے عراق میں فلسطینی رہنماؤں پر مشتمل ایک ظلی کابینہ (Shadow Cabinet) بھی تشکیل دے دی تھی (*A Short History of The Middle-East*، ص ۱۹۶؛ Maurice Pearlman: *The Mufti of Jerusalem*، ص ۳۳-۳۴؛ *The Middle-East in World Affairs*، ص ۲۷۷).

عراق میں امین الحسینی نے الاستقلال کے نام سے ایک عربی اخبار بھی جاری کیا۔ ان کے خیالات کی اشاعت کے سبب عراق کے سیاسی اور عسکری حلقوں میں برطانیہ مخالف جذبات کی افزائش ہونے لگی تھی۔ عراق کے وزیر دفاع طہٰ پاشا الہاشمی اور ان کے ہم خیال فوجی افسران امین الحسینی کے حلقۂ اثر میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ ان فوجی افسران نے وزیراعظم نوری السعید، کہ جسے وہ برطانیہ کا آلۂ کار گردانتے تھے، کو اقتدار سے ہٹا کر رشید علی گیلانی [رک بہ عراق آآآ بذیل مادہ عراق] کو وزیراعظم کے منصب پر فائز کر دیا۔ رشید علی گیلانی، جس نے مفتی امین الحسینی کے اثر و نفوذ کی بدولت محوری طاقتوں سے خفیہ روابط استوار کر لیے تھے، نے برطانیہ سے اپنے دفاعی اتحاد و تعاون کے معاہدے (Anglo-Iraq Treaty/ ۱۹۲۲ء) کو منسوخ کر دیا، ملک میں معدنی تیل کے کنوؤں کو قومی تحویل میں لے لیا اور جرمنی سے سیاسی و عسکری روابط کے قیام کی داغ بیل ڈالی۔ مئی ۱۹۴۱ء میں رشید علی گیلانی کی حکومت نے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ تاہم محوری طاقتوں کی طرف سے بروقت عسکری امداد نہ پہنچ پانے کے سبب جلد ہی بغداد پر برطانوی فوجیں قابض (۲۹ مئی ۱۹۴۱ء) ہوگئیں۔ برطانیہ مخالف فوجی افسران کو گرفتار کر لیا گیا، مگر رشید علی گیلانی اور امین الحسینی بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ امین الحسینی عراق سے ایران چلے گئے اور وہیں جرمن بعد ازاں بلغاروی اور پھر جاپانی سفارت خانہ میں پناہ گزیں ہوگئے۔ ستمبر ۱۹۴۱ء میں برطانیہ اور ایرانی حکومت کے درمیان ان کی گرفتاری کے لیے معاہدہ طے پا گیا۔ ایرانی حکومت نے انہیں دشمن ملک کا ایجنٹ قرار دیتے ہوئے ان کی گرفتاری کا اعلان کر دیا۔ امین الحسینی ایران سے ترکی چلے گئے۔ ترکی کی حکومت نے انہیں اپنے ملک میں قیام کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ ترکی سے اکتوبر ۱۹۴۱ء میں اٹلی اور وہاں سے برلن چلے گئے۔ جرمن حکام کی طرف سے ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا (مجید خدوری: *Independent Iraq: A Study in Iraqi Politics Since 1932*، لنڈن، نیویارک، ۱۹۵۱ء، ص ۱۷۰-۱۷۳، ۱۸۷-۱۹۴؛ *Palestine : A Study of Jewish, Arab and British Policies*، ۲، ۹۷۵-۹۸۰؛ Nicholas Bethelm: *The Palestine Triangle :The Struggle Between the British, Jews and The Arabs: 1935-48*، لنڈن ۱۹۷۹ء، ص ۱۰۵-۱۰۸).

محوری طاقتوں سے اتحاد واشتراک: امین الحسینی، عالم عرب بالخصوص فلسطینی مسلمانوں کو درپیش مصائب وآلام کا حقیقی ذمہ دار سلطنت برطانیہ کو گردانتے تھے۔ چنانچہ وہ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں محوری طاقتوں (جرمنی اور اس کے اتحادیوں) کے مقابلے میں اتحادیوں کی شکست وپسپائی کے شدید آرزو مند تھے۔ ان کے خیال

میں اسی صورت میں عرب ممالک سے برطانوی تسلط کا خاتمہ اور فلسطین میں یہودی قومی وطن کے قیام کا منصوبہ نا کام ہوسکتا تھا۔ لبنان، شام اور عراق میں قیام کے دوران میں وہ اس نصب العین کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ جہاں انہوں نے مشرق وسطی میں موجود جرمن نمائندوں کے ساتھ روابط قائم کر لیے تھے (Palestine: A Study of Jewish ,Arab and British Policies، ۲: ۹۶۱، ۹۷۵-۹۸۰؛ Bernard Lewis: Islam in History: Ideas,Peoples and Events in the Middle East، اوپن کورٹ (امریکہ)، ۱۹۹۳ء، ص ۴۰۸-۴۰۹؛ Maurice Pearlman: Mufti of Jerusalem، ص ۳۴-۳۸، ۴۰-۴۲؛ The PLO، ص ۱۹-۲۰؛ Basheer M. Nafi: Arabism,Islamism and the Palestine Question :A Political History 1908-1941، ریڈنگ، ۱۹۹۸ء، ص ۵۹، ۳۶۵-۳۷۱).

جرمنی میں قیام اور سرگرمیاں: جرمنی پہنچنے کے بعد وہ امیر شکیب ارسلان کی ترغیب و تحریک پر برطانیہ اور صہیونیوں کے خلاف محوری طاقتوں کے ساتھ اتحاد واشتراک عمل کی منصوبہ بندی میں مصروف ہوگئے۔ اس دوران میں انہوں نے روم اور برلن کے درمیان بار بار سفر کیا۔ جرمنی کے فرمانروا ہٹلر اور اعلیٰ حکام بالخصوص اور نائب وزیر خارجہ ہملر (Himmler Von Weizocher) نے انہیں فلسطین کی آزادی کے لیے تعاون و حمایت کی یقین دہانی کرائی تھی۔ اسی نوعیت کی یقین دہانی انہیں اٹلی کی طرف سے بھی کرائی گئی۔ برلن میں قیام کے پہلے سال وہ وہاں کے ایک اسلامی ادارے (Islamische Zentral Institut) کے سربراہ بن گئے تھے۔ وہ برلن میں موجود مسلم اداروں کو ایک مرکز کے تابع لانے کے لیے کوشاں رہے۔ مزید براں انہوں نے مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے اتحادی طاقتوں کے مخالفین سے وسیع روابط استوار کر لیے۔ برلن میں، جہاں انہوں نے اپنا صدر دفتر قائم کر لیا تھا، اپنے قیام کے دوران میں اپنے نشری خطابات اور کتابچوں، جن میں وہ مسلمانوں کے خلاف برطانوی سامراج کی چیرہ دستیوں اور فلسطینی عربوں پر صہیونیوں کے مظالم کا ذکر انتہائی مؤثر انداز میں کرتے تھے، کے ذریعے وہ جرمنی میں پناہ گزیں مسلمانوں کو اتحادیوں کے خلاف جنگ میں محوری طاقتوں کا ساتھ دینے، نیز عالم عرب، شمالی افریقہ، ہندوستان اور مشرقی یورپ کے مسلمان سپاہیوں کو برطانوی افواج سے علیحدگی اختیار کر لینے کی تحریک و ترغیب دیتے رہے۔ ان کی ان کاوشوں کے نتیجے میں بہت سے عرب سپاہی برطانوی افواج سے الگ ہوگئے۔ اس دوران میں مشرق وسطیٰ، مشرقی یورپ اور بعض دیگر ممالک میں، برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی افواج کے خلاف خفیہ عسکری کاروائیوں کے لیے ایک مسلم سپاہ کی تنظیم وتشکیل بھی ان کی سرگرمیوں کا محور رہی۔ ۱۹۴۴ء میں انہوں نے جرمنی اور اٹلی میں موجود عربوں پر مشتمل ایک عسکری بریگیڈ منظم کیا۔ اس بریگیڈ نے، جسے برلن اور ایتھنز میں فوجی تربیت دی گئی تھی، مشرق وسطیٰ میں جرمن چھاپہ ماروں کے ساتھ مل کر اہم عسکری کارروائیوں میں حصہ لیا۔ اس وقت پولینڈ کے مسلمان سوویت یونین کی جارحیت کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ سینکڑوں مسلمان دانش وروں اور کسانوں کو سائبیریا اور وسطی ایشیا میں قائم کیے گئے جنگی اور سیاسی قیدیوں کے مراکز کی طرف ملک بدر کر دیا گیا تھا۔ امین الحسینی نے پولینڈ کے مفتی ڈاکٹر یعقوب (Jakob Szynkiewicz) [رک بہ بلقان در تکملہ آ آ آ بذیل مادہ] اوربلقان ریاستوں (کروشیا، بوسنیا اور ہرزیگووینا) کے مسلمان رہنماؤں کے تعاون سے مسلم فوجی دستے تشکیل دیئے۔ وہ ان مسلمان رضاکاروں کی بھرتی اور ان کی فوجی تربیت کی براہ راست نگرانی کرتے رہے۔ ۱۹۴۳-۱۹۴۴ء

کے دوران انہوں نے مذکورہ بلقان ریاستوں کے متعدد بار دورے کیے۔ مذکورہ مسلمان فوجی دستوں نے مشرقی یورپ میں اتحادیوں کے چھاتہ بردار دستوں اور بالخصوص یوگوسلاویہ میں مارشل ٹیٹو (Joseph Broz-Tito) کے دہشت گرد جتھوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ امین الحسینی کے سرگرم تعاون و حمایت سے، وسطی ایشیا کی مسلم جمہوریاؤں سے تعلق رکھنے والے ہزاروں مسلمانوں کو، جنہیں سوویت یونین نے جرمنی اور مشرقی یورپ کے دیگر ممالک کی طرف ملک بدر کر دیا تھا، بھرتی کر کے ایک مسلم فوجی بٹالین تشکیل دی گئی۔ ان مسلمان فوجی دستوں کے ساتھ نماز پنجگانہ کی ادائیگی کے لیے ائمہ کی تقرری عمل میں لائی گئی۔ ان ائمہ کی تعلیم و تربیت اور مسلمان سپاہیوں کی دینی تعلیم کے لیے مفتی کی زیرنگرانی جرمنی کے شہروں Dresden اور Gothingon میں دینی مدارس بھی قائم کیے گئے۔ ان مسلمان سپاہیوں نے سوویت حمایت یافتہ ملک چیکوسلواکیہ کے مسلح چھاپہ مار گروہوں کے خلاف عسکری کارروائیوں کے علاوہ برلن کے دفاع میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ اتحادیوں کے خلاف جنگ میں جاپان اور مذکورہ اسلامی خطوں کے مسلمان گروہوں کے درمیان اتحاد و اشتراک عمل کے سلسلہ میں بھی سرگرم عمل رہے۔ اس دوران میں امین الحسینی صہیونی عزائم کے خلاف بھی برابر برسرپیکار رہے۔ عالمی جنگ کے دوران میں وہ نازی حکومت سے (جرمنی اور مشرقی یورپ میں اس کے مقبوضہ علاقوں سے) یہودیوں کی فلسطین کی طرف نقل مکانی کو روکنے اور انہیں نظر بندی کیمپوں میں منتقل کرنے کا مطالبہ کرتے رہے۔ ان کے پیہم اصرار اور مطالبے پر جرمن حکومت نے یہودیوں کی فلسطین کی طرف نقل مکانی کے منصوبے کو ترک کر دیا۔ جرمنی میں یہودیوں کے خلاف سخت گیر موقف رکھنے والے سرکاری و غیر سرکاری حلقوں سے بھی ان کے رابطے قائم تھے۔

وہ بلغاریہ، ہنگری اور رومانیہ سے بھی یہودیوں کی فلسطین کی طرف نقل مکانی کو روکنے کا مطالبہ کرتے رہے (Martin Kramer: Islam Assembled: The Advent of Muslim Congresses، نیویارک، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۸-۱۶۲؛ Ataullah Bogdan Kopanski: Sabers of Two Easts: An Untold History of Muslims in Eastern Europe، اسلام آباد (انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز)، ۱۹۹۵ء، ص ۱۵۱ - ۱۵۳، ۲۰۴ - ۲۰۵، ۲۳۴-۲۳۸؛ The Arab Contemporaries، ص ۷۹-۸۵؛ The Palestine Triangle، ۱۰۸- ۱۰۹، ۱۳۸-۱۴۱، ۱۹۳-۲۲۳-۲۲۵؛ Wayne S. Vucinich: Islam in Balkans، در A.J. Arberry، Religion in the Middle East، مدیر: کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۹ء، ص ۲۴۰-۲۴۱).

دوسری عالمی جنگ کے آخری دنوں میں، محوری طاقتوں کی پے در پے شکستوں نیز مغربی اور سوویت افواج کی تیز رفتار پیش قدمی کو دیکھ کر، امین الحسینی بھیس بدل کر جرمنی کی حدود سے نکل گئے اور مئی ۱۹۴۵ء میں متحارب فریقوں کے مابین التوائے جنگ کے معاہدہ کے بعد، سوئٹزر لینڈ کے شہر برن (Berne) پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ سوئس حکام کی طرف سے انہیں سیاسی پناہ دینے سے انکار اور ملک چھوڑ جانے کے حکم کے بعد وہ فرانس کی طرف نکل گئے۔ فرانسیسی سرحدی پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا، چنانچہ وہ پیرس کے نواح میں ایک سال تک فرانسیسی حکام کی حفاظتی حراست میں رہے۔ (Philip Mattar: The Mufti of Jerusalem، ص ۱۰۸؛ Arab Contemporaries، ص ۸۰-۸۱).

نیورم برگ ٹرائل: جنگ سے قبل برطانوی حکومت نے امین الحسینی کو مشرق وسطی میں اپنا سب سے بڑا مخالف قرار دے دیا تھا اور انہیں مختلف الزامات کے تحت

گرفتار کر کے ان کے ساتھ دشمن کا سا سلوک کرنے کا اعلان کیا تھا، تاہم وہ گرفتاری سے بچ کر برلن پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ جہاں انہوں نے جنگ کے دوران برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف سرگرم کردار ادا کیا تھا۔ چنانچہ جنگ کے اختتام پر اتحادی ممالک بالخصوص برطانیہ کی طرف سے انہیں غدار اور جنگی مجرم قرار دے کر ان پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یوگوسلاویا کا مارشل ٹیٹو جنگ کے دوران میں بوسنیا کے مسلمانوں کی عسکری تنظیم کی تشکیل میں مفتی امین الحسینی کی ترغیب و تحریک اور تعاون کی پاداش میں ان پر مقدمہ چلانے کا زبردست حامی تھا۔ اس غرض سے ان کو تحویل میں لینے کے لیے فرانس پر شدید دباؤ ڈالا گیا، لیکن فرانس نے برطانوی مطالبے کو مسترد کر دیا۔ بایں ہمہ جرمنی کے جنوبی شہر نیورم برگ میں بین الاقوامی فوجی عدالت (International Military Tribunal) میں نازی جنگی مجرموں کے ساتھ ساتھ مفتی امین الحسینی پر بھی (ان کی غیر حاضری میں) مقدمہ چلایا گیا۔ ان پر نازی کیمپوں کے نگران افسران کے ساتھ مل کر یورپی یہودیوں (European Jewsy) کے قتل عام کا الزام لگایا گیا تھا (Maurice Pearlman: *Mufti of Jerusalem*، ص ۶۷-۸۲، ۸۸؛ *The Palestine Triangle*، ص ۲۲۲-۲۲۶؛ Philip Matter: *The Mufti of Jerusalem*، ص ۱۰۸-۱۰۹).

عبوری فلسطینی حکومت کی سربراہی: ۱۹۴۵ء کے دوران ممتاز عرب رہنماؤں بشمول سیکرٹری جنرل عرب لیگ عبدالرحمٰن عزام (۱۹۴۵-۱۹۵۲ء)، اخوان المسلمون [رک بآں در آآآ بذیل مادہ] کے بانی شیخ حسن البناء اور فلسطین عرب پارٹی کے قائد جمال الحسینی کی طرف سے حکومت برطانیہ سے امین الحسینی کو فلسطین واپس آنے کی اجازت کا مطالبہ کیا گیا۔ برطانوی حکومت نے عرب رہنماؤں کے اس مطالبے کو مسترد کر دیا، تاہم وہ ۱۹۴۶ء کے وسط میں پیرس میں شام کے قنصل ڈاکٹر معروف الدوالیبی (۱۹۰۸-۲۰۰۴ء) جو بعد میں شام کے وزیراعظم بھی ہوئے [رک بہ شام، در آآآ، بذیل مادہ] کی مدد سے فرانسیسی پولیس کی حراست سے بچ نکلنے اور بھیس بدل کر قاہرہ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ مصر میں شاہ فاروق (۱۹۳۶-۱۹۵۲ء) کی طرف سے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ فلسطینی سیاسی رہنماؤں نے انہیں ایک بار پھر مجلس زعماء عرب (Arab Higher Committee) کی سربراہی کے لیے منتخب کر لیا۔ فلسطین میں جاری تحریک مزاحمت بالخصوص صہیونیوں کے خلاف برسرپیکار فلسطینی عربوں کی ایک نیم عسکری تنظیم 'فتوۃ' (The Salvation Army) کی باگ ڈور بھی انہوں نے سنبھال لی۔ مفتی امین الحسینی ہی کے زیر اثر ایک اور عسکری تنظیم 'المنظمۃ الجہاد المقدس' اسرائیلی فوج کے خلاف چھاپہ مار کارروائیاں کرتی رہی۔ مفتی الحسینی نے اقوام متحدہ کی طرف سے فلسطین کی تقسیم کے منصوبے کی منظوری (۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء) اور اسرائیلی ریاست کے قیام (۱۹۴۸ء) کو سختی سے مسترد کر دیا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں عرب اسرائیل جنگ میں عرب افواج کی شکست کے بعد عرب لیگ کے رکن ممالک کی تائید و حمایت سے ان کی سربراہی میں ایک 'کل فلسطین حکومت' تشکیل (ستمبر ۱۹۴۸ء) پائی جو جولائی ۱۹۵۱ء تک قائم رہی (Robert W.Macdonald: *The League of the Arab States*، پرنسٹن، ۱۹۶۵ء، ص ۹۱؛ *The Middle East in World Affairs*، ص ۴۶۰، ۴۹۹؛ *The Palestine Triangle*، ص ۲۴۲-۲۴۴؛ *The PLO*، ص ۲۸-۳۲، ۵۱-۵۲).

عرب حکومتوں سے تعلقات: عرب حکمرانوں میں سے بطور خاص امیر عبداللہ والی اردن کے ساتھ ان کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے۔ وہ شاہ عبداللہ کی پالیسیوں

بالخصوص برطانوی حکومت کے ساتھ اس کے ذاتی مصالح پر مبنی تعلقات پر سخت تنقید کرتے رہے ۔۱۹۳۰ء کی دہائی میں امیر عبداللہ کی طرف سے صہیونیوں کو فلسطین میں وسیع اراضی پٹے پر دینے کی بھی انہوں نے زبردست مخالفت کی تھی ۔ جواباً امیر عبداللہ فلسطین میں امین الحسینی کے سیاسی حریفوں بالخصوص 'النشا شی' خاندان کی پشت پناہی کرتا رہا (P.J.Vatikiotis: Politics and Military in Jordon، لنڈن، ۱۹۶۷ء ، ص ۵۰-۵۲)۔ پہلی عرب اسرائیل جنگ (۱۹۴۸ء) کے اختتام پر امیر عبداللہ نے برطانوی تائید و حمایت سے فلسطین کے مشرقی اور وسطی علاقے پر قبضہ کر لینے کے بعد سلطنت ہاشمیہ قائم (۲۶ اپریل ۱۹۴۹ء) کی اور اسرائیل کے ساتھ مصالحت کے لیے آمادگی کا اظہار کیا تو امین الحسینی اور شاہ عبداللہ کے درمیان کشمکش میں تیزی آ گئی۔ شاہ عبداللہ کی طرف سے امین الحسینی کی حکومت کو نہ صرف یہ کہ تسلیم نہیں کیا گیا، بلکہ اسے ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ جولائی ۱۹۵۱ء میں امین الحسینی کے ایک پیروکار اور عسکری تنظیم 'جہاد مقدس' کے رکن کے ہاتھوں شاہ عبداللہ کے قتل کا واقعہ پیش آیا ، جس کے رد عمل کے طور پر مصری حکومت نے ان کی سربراہی میں قائم 'کل فلسطین حکومت' کو تحلیل کر دیا۔ اس واقعے کے بعد کئی سال تک وہ قاہرہ میں مقیم رہے، جہاں سے وہ بلا روک ٹوک مسئلہ فلسطین کے لئے حمایت کے حصول کی غرض سے عرب اور اسلامی ممالک کے دورے کرتے رہے، تاہم بعض عرب ممالک بالخصوص شام اور مصر میں ابھرنے والے قوم پرست انقلابی حکمرانوں سے (جن کے نظریات و میلانات ان کے مطمح نظر سے مطابقت نہیں رکھتے تھے) ان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ ان قوم پرست حکمرانوں نے اپنے اپنے ملک میں اسلامی جماعتوں بالخصوص اخوان المسلمون سے، جس سے مفتی صاحب کے انتہائی قریبی روابط تھے، معرکہ آرائی کی روش اختیار کر لی تھی۔ مصر میں صدر جمال عبدالناصر اور اخوان المسلمون کے مابین جاری کشمکش میں شدت آ جانے کے بعد ۱۹۵۹ء میں امین الحسینی کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ چنانچہ وہ مصر سے بیروت چلے گئے، جہاں وہ اپنی وفات (۱۴ جمادی الآخرہ ۱۳۹۴ھ ۴/جولائی ۱۹۷۴ء) تک مقیم رہے۔ تنظیم آزادی فلسطین (PLO)، جس کا قیام مصر میں جمال عبدالناصر کی عرب قوم پرست حکومت کی زیر سرپرستی عمل میں آیا تھا، سے بھی ان کے تعلقات کشیدہ ہی رہے۔ انہیں اس تنظیم کی پالیسیوں سے اتفاق شاذو نادر ہی رہا۔ تاہم وہ فلسطین کی آزادی کے لیے فدائیین کی عسکری جدوجہد کی بھرپور حمایت کرتے رہے (Philip Mattar: The Mufti of Jerusalem، ص ۱۱۱-۱۱۴؛ Arab Contemporaries، ص ۸۳؛ The Politics of Partition، ص ۲۱۸-۲۲۲، ۴۱۷-۴۱۸، ۴۲۶؛ Michael J. Cohen: Palestine and the Great Powers, 1945-1948، پرنسٹن ، ۱۹۸۲ء ،ص ۳۲۵-۳۳۱؛ Baruch Kimmerling، Joel S. Migdal: Palestinians: The Making of a People، نیویارک، آکسفرڈ، ۱۹۹۳ء ، ص ۱۸۶، ۲۱۷، ۱۳۵-۱۳۶، ۱۴۱؛ The Middle East in World Affairs، ص ۴۵۲-۴۵۳).

امین الحسینی اور اتحاد عالمی اسلامی : امین الحسینی عالم عرب کے ان رہنماؤں میں سے تھے جو عرب قوم پرست تحریک کے شدید مخالف اور عالم اسلام کے اتحاد و یکجہتی کے علمبردار تھے۔ وہ مشرق وسطی میں عثمانی سلطنت کے خلاف عربوں کی بغاوت کو خودکشی کے ارتکاب سے تعبیر کرتے تھے۔ اسی طرح وہ (۱۹۵۰ء۔۱۹۶۰ء کی دہائی میں عالم عرب بالخصوص شام اور مصر میں ابھرنے والے قوم پرستانہ رجحانات کو بھی عالم اسلام کی وحدت و یگانگت کے لیے مہلک اور ایک فتنہ خیال کرتے تھے۔ وہ استعماری

قوتوں کی چیرہ دستیوں سے تحفظ کے لیے امت مسلمہ کے اتحاد و اتفاق کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور وہ اس کے لیے ۱۹۲۰ء کی دہائی سے ہی سرگرم ہو گئے تھے۔ اس ضمن میں ان کا ایک ابتدائی اقدام نومبر ۱۹۲۸ء میں فلسطین میں عرب رہنماؤں کی ایک کانفرنس کا انعقاد اور اس میں 'جمعیت برائے تحفظ و دفاع مقدس مقامات، کا قیام تھا (فلسطین والانتداب البریطانی، ص ۲۸۳ - ۲۹۴؛ Palestine: A Study of Jewish,Arab and British Policies، ۲:۵۹۹-۶۰۳)۔ وہ فلسطینی مسلمانوں کو درپیش مسائل و مشکلات کی طرف عالم اسلام کی توجہ مبذول کرانے کے لیے ہر سال حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں حجاج کے نام اعلامیہ ارسال کرنے کے علاوہ، مسلم دنیا کے رہنماؤں سے وسیع پیمانے پر مراسلت کرتے رہے۔ شام ، مصر، یمن، مغرب اقصیٰ ، وسطی ایشیا، مشرقی یورپ اور ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں سے ان کے روابط استوار ہو گئے تھے (The PLO، ص ۱۷-۱۸؛ David Waines: The Failure of the Nationalist Resistance، در (مدیر):Ibrahim Abu-Lughod ، The Transformation of Palestine (مدیر)، ایونسٹن، ۱۹۷۱ء ، ص ۲۳۰-۲۳۵: نذیر احمد خان 'داستان پاکستان' لاہور، ۱۹۷۶ء ، ص ۱۴۷-۱۶۷)۔انہوں نے انڈین خلافت کمیٹی کے رہنما مولانا شوکت علی [رک بآں و خلافت] کے سرگرم اشتراک وتعاون سے فلسطین میں مقامات مقدسہ کے تحفظ و دفاع، القدس میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام اور مسلمانان عالم کو اسلامیانِ فلسطین کی حالت زار اور صیہونی و برطانوی مظالم سے آگاہ کرنے کی غرض سے دسمبر ۱۹۳۱ء میں القدس میں ایک عالمی مؤتمر اسلامی منعقد کی۔ اس میں یمن ، ایران ، مشرق بعید ، مشرقی یورپ، وسطی ایشیا، شمالی افریقہ اور ہندوستان سے ۱۴۵ مسلمان رہنما ، جن میں علامہ محمد اقبال بھی شامل تھے، شریک ہوے۔ مصر اور ترکی کے حکمرانوں نے، جو اس مؤتمر کو خلافت اسلامیہ کے احیا کی کوشش خیال کرتے تھے، اس کے انعقاد کی زبردست مخالفت کی۔ علماے ازھر جو فلسطین میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کو دنیاے اسلام میں حاصل اپنے شرف و وقار اور اثر و نفوذ کے لیے ایک خطرہ گردانتے تھے، کی طرف سے بھی اس مؤتمر کی مخالفت کی گئی۔ اس مؤتمر میں مشرق وسطی میں انتدابات (mandates) کے علاوہ صیہونیت کی شدید مذمت کی گئی۔ مؤتمر میں متعدد قرار دادیں منظور کی گئیں۔ جن میں برطانوی حکام سے فلسطین میں مقدس مقامات کے تحفظ کا، جب کہ دنیا اسلام سے برطانوی اشیا کے مقاطعہ کا مطالبہ کیا گیا۔ فلسطین میں صیہونیوں کی دست برد سے بچاؤ کی غرض سے غریب کسانوں سے زمینوں کی خریداری و آبادکاری کے لیے ایک زرعی تنظیم اور القدس میں الاقصیٰ اسلامی یونیورسٹی کے قیام اور مستقبل میں ہر دو سال بعد ایک عالمی کانفرنس کے انعقاد اور اس کے انتظام و انصرام کے لیے ایک مجلس منتظمہ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ شرکاے کانفرنس کی طرف سے امین الحسینی کو مجلس منتظمہ کا صدر جب کہ سید ضیاء الدین طباطبائی (۱۸۸۸ـ۱۹۶۹ء) ایران کے ایک سابق وزیراعظم (فروری-مئی ۱۹۲۱ء) کو اس کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا۔

امین الحسینی نے ۱۹۳۳ء میں، دوسری مؤتمر کے انعقاد کے بعد، محمد علی علوبہ پاشا [رک بآں در آآآ بذیل مادہ] اور سید ضیاء الدین طباطبائی کی ہمراہی میں مجوزہ الاقصیٰ اسلامی یونیورسٹی کے لیے مالیات کی فراہمی کے لیے عراق اور ہندوستان سمیت متعدد ممالک کے دورے کیے۔ تاہم وفد کو مطلوبہ مقدار میں مالی وسائل کی فراہمی میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ مؤتمر کی مجلس عاملہ کے ارکان کے مابین اختلافات کے سبب ۱۹۳۳ء کے بعد کوئی کانفرنس منعقد نہ ہوسکی۔ امین الحسینی کی سربراہی میں

مؤتمر اسلامی کے وفد نے ۱۹۳۴ء میں یمن اور سعودی عرب کے مابین سرحدی تنازعہ کو سلجھانے اور دونوں ممالک کے فرمانرواؤں، امام یحیٰی [رکّ بہ مقالہ یمن، آآآ بذیل مادہ] اور شاہ ابن سعود [رک بہ مقالہ سعودی عرب، آآآ بذیل مادہ] کے مابین مصالحت کرانے میں اہم کردار ادا کیا جس سے عرب دنیا میں ان کے شرف و وقار میں مزید اضافہ ہوا۔ امین الحسینی نے فروری ۱۹۳۷ء کو حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں ایک عالمی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کا منصوبہ بنایا تھا تاہم سلطان ابن سعود [رک بہ آآآ بذیل مادہ] نے اس کی اجازت نہ دی تھی (فلسطین والانتداب البریطانی ، ص ۳۲۶-۳۳۰؛ Jacob M.Landau: The Islam Assembled، ص ۱۲۳-۱۴۱؛ Ideology and Politics of Pan Islam، آکسفرڈ ، ۱۹۹۰ء ص ۲۴۰-۲۴۲؛ Palestine :A Study of Jewish, Arab and British Policies، ۲:۷۶۱-۷۶۵؛ H.A.R. Gibb: The Islamic Congress at Jerusalem، در Survey of International Affairs 1934، (مدیر): A.J. Toynbee، لنڈن، ۱۹۳۵ء، ص ۹۹-۱۰۹؛ The Palestine Arab Nationalist Movement Under the Mandate، ص ۱۹-۲۵، ۳۶؛ Noor Ahmad Baba: Organization of Islamic Conference :Theory and Practice of Pan-Islamic Co-operation ، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۷-۳۰؛ Sabers of Two Easts، ص ۱۵۲-۱۵۴، ۱۸۲-۱۸۴، ۲۳۴- ۲۳۸؛ Basheer M. Nafi: The General Islamic Congress of Jerusalem، در The Muslim World، ۸۶: ۳-۴ (جولائی۔ اکتوبر ۱۹۹۶ء)، ص ۲۴۳-۲۷۲؛وہی مصنف: Arabism, Islamism and the Palestine Question ص ۱۲۳-۱۲۴؛ Ralph M. Coury: Their Egyptians in Jerusalem: Role in the General Islamic Conference of 1931، در The Muslim World، ۸۲: ۱-۲ (جنوری - اپریل ۱۹۹۲ء)، ص ۳۷- ۵۴؛ سید ابوالحسن علی ندوی: 'پرانے چراغ'، کراچی (مجلس نشریات اسلام)، (ت-ن) ، حصہ دوم ، ص ۹۰-۹۲؛ محمد رفیق افضل: 'گفتار اقبال' لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۴۴- ۱۴۷).

مؤتمر عالم اسلامی، جو ۱۹۳۵ء میں ایک مستقل عالمی اسلامی تنظیم کے قیام میں ناکام ہوگئی تھی اور ۱۹۳۷ء میں امین الحسینی کی جلاوطنی سے عملاً معطل ہو کر رہ گئی، قیام پاکستان کے بعد اس کے احیاء کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ فروری ۱۹۵۱ء میں، کراچی میں امین الحسینی کی صدارت میں ایک بار پھر عالمی اسلامی مؤتمر کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں انہوں نے مسلم ممالک کے مابین تعلیم، ثقافت، معیشت اور دفاع کے شعبوں میں تعاون و اشتراک کی غرض سے ایک 'مسلم بلاک' کے قیام کی تجویز پیش کی (Organization of Islamic Conference، ص ۲۷-۳۱؛ World Muslim Congress، در The Islamic Review، ج ۳۹ (جولائی ۱۹۵۱ء)، ص ۱۴۵- ۱۴۷؛ داستان پاکستان، ص ۲۴-۳۶؛ Muslim News International، (کراچی)،جولائی ۱۹۷۴ء ، ص ۸)۔

امین الحسینی، رابطہ عالم اسلامی [رک بآں در تکملہ آآآ بذیل مادہ] کے نائب صدر اور جامعۂ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ وہ ان دونوں اداروں کی ثقافتی، دینی اور علمی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کرتے رہے (ابوالحسن علی ندوی: پرانے چراغ، ۸۹ -۱۰۰؛ وہی مصنف: شخصیات و کتب، لکھنو، (ت۔ن) ص ۱۲۲- ۱۲۹)۔

مآخذ: متن میں درج ہیں۔ مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے : (۱) Ann Mosely Lesch: Arab Politics in Palestine :The Frustation of a Nationalist Movement (1917-1939)، نیویارک ، ۱۹۷۹ء؛ (۲)

Hisham Sharabi: *The Lethal Dilemma: Israel and Palestine*، نیویارک ، ۱۹۶۹ء، باب ۸؛ (۳) J.B. Scheiman: *The Mufti and the Fuehrer*، نیویارک ۱۹۶۵ء؛ (۴) Lukasz Hirzowicz: *The Third Reich and the Arab East*، لنڈن، ۱۹۶۰ء (۵) Nehemia Levtzion: *International Islamic Solidarity and its Limitations*، یروشلم ، ۱۹۷۹ء؛ (۶) Taysir Jbara: *Palestinian Leader: Hajj Amin Al-Husayni Mufti of Jerusalem*، پرنسٹن ۱۹۸۵ء؛ (۷) Yehoshofat Porath: *The Emergence of the Palestinian Arab Nationalist Movement 1918-1929*، لنڈن ۱۹۷۴ء؛ (۸) وہی مصنف: *Mufti of Jerusalem: Al-Haj Amin al Husayni*، در *Asian and African Studies*، ۷، (۱۹۷۱ء) ، ص ۱۱۹-۱۳۸؛ (۹) *Report of Palestine Royal Commission*، لنڈن، ۱۹۳۷ء، ص ۱۷۴-۱۸۱؛ (۱۰) Nels Johnson: *Islam and the Ploitics in Palestinian Nationalism*، لنڈن و بوسٹن، ۱۹۸۲ء؛ (۱۱) عثمان کمال حداد: حرکۃ رشید علی، صیدون، ۱۹۵۰ء؛ (۱۲) محمد عزت دروازہ: حول الحرکۃ العربیۃ، صیدون، ۱۹۵۱ء.

(محمد ارشد)

••-------------••

※ **امیہ ، بنو** : خلفا کا وہ خاندان جو ۴۱ھ /۶۶۱ء سے ۱۳۲ھ/۷۵۰ء تک پورے عالم اسلام پر حکمرانی کرتا رہا۔ ان کا دارالحکومت [دمشق] شام تھا، اس دور کے تمام خلفا امیہ بن عبدالشمس [رک بآں] کی اولاد میں سے تھے، جو بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل قریش مکہ میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ یہ خلفا خاندان امیہ کی دو الگ الگ شاخوں کی نمائندگی کرتے ہیں: ان میں پہلے تین ابو سفیان بن حرب [رک بآں] کی اولاد میں سے تھے، انہیں سفیانی کہا جاتا ہے، جبکہ باقی گیارہ مروان بن الحکم ابی العاص [رک بآں] کی اولاد تھے، جنہیں مروانی کہا جاتا ہے.

ان خلفا کا عرصۂ اقتدار یوں تھا (ان میں سے ہر ایک کے حالات کی تفصیل بذیل کلمہ ملاحظہ فرمایئے)

امیر معاویہؓ (اول) بن حضرت ابی سفیانؓ	۴۱تا۶۰ھ/۶۶۱تا ۶۸۰ء
یزیدؓ (اول) بن معاویہؓ (اول)	۶۰ تا ۶۴ھ/۶۸۰تا ۶۸۳ء
معاویہؓ (ثانی)بن یزیدؓ (اول)	۶۴ھ/ ۶۸۳ء
مروان (اول)بن الحکم	۶۴ تا ۶۵ء/ ۶۸۴ـ۶۸۵ء
عبدالملک بن مروان (اول)	۶۵تا۸۶ھ/۶۸۵تا ۷۰۵ء
الولید (اول) بن عبدالملک	۸۶ تا ۹۶ھ/۷۰۵تا ۷۱۵ء
سلیمان بن عبدالملک	۹۶ تا ۹۹ھ/۷۱۵تا ۷۱۷ء
حضرت عمرؓ (ثانی) بن عبدالعزیزؒ	۹۹ تا ۱۰۱ھ/۷۱۷تا ۷۲۰ء
یزید (ثانی) بن عبدالملک	۱۰۱تا۱۰۵ھ/۷۲۰تا ۷۲۴ء
ہشام بن عبدالملک	۱۰۵تا۱۲۵ھ/ ۷۲۴تا ۷۴۳ء
ولید (ثانی) بن یزید (ثانی)	۱۲۵تا۱۲۶ھ/ ۷۴۳تا ۷۴۴ء
یزید(ثالث) بن ولید (اول)	۱۲۶ھ/ ۷۴۴ء
ابراہیم بن الولید (اول)	۱۲۶ھ/۷۴۴ء
مروان (ثانی) بن محمد مروان (اول)	۱۲۷تا۱۳۲ھ/۷۴۴تا ۷۵۰ء

اموی اقتدار مغربی دانشوروں کی نظر میں : مغرب میں اموی خلفا کے بارے میں سنجیدہ غورو فکر ۱۹۰۲ء میں ویلہاؤزن (Well Hausen) کی کتاب "*Das Aribische Reich und Sein Sturz*" کی اشاعت سے شروع ہوا ۔ اس کتاب کے مصنف نے اس عہد کے بارے میں کئی ابتدائی اسلامی روایات تلاش کر کے ان کی تاریخی اہمیت اُجاگر کی اور نہایت معتبر روایات کے حوالے سے تاریخ بنو امیہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے یہ کام تاریخ طبری کے لائیڈن ایڈیشن کی تکمیل کی وجہ سے ممکن ہوا جس نے اپنے قارئین کی رسائی عہد بنو امیہ کے اواخر اور عہد بنو عباس

کے اوائل سے متعلق ایسے شواہد تک کر دی ہے جو اب تک کہیں بھی دستیاب نہیں تھے ۔ ویلہاؤزن کی کتاب میں امویوں اور ان کے طرز حکومت کا نسبتاً بہتر تصور پیش کیا ہے اور انہیں نتائج پسند (Pragmatic) حکمران ثابت کیا ہے، جو عجمیوں پر عربوں کی برتری پر مبنی ریاست تعمیر کر رہے تھے اور مذہبی معاملات سے اس وقت تک بے تعلق رہتے تھے جب تک ان کے مذہبی رجحانات رکھنے والے حریف کسی خاص اقدام پر انہیں مجبور نہ کر دیتے۔ اموی ریاست کے اس تصور میں ویلہاؤزن کے متعدد دیگر معاصر مؤرخین بھی اس کے ہم نوا ہیں۔ اس تصورِ ریاست کو بلجیم کے یسوعی سکالرلیمنس (Lemmens) کی متعدد مطبوعات میں بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔

مغرب میں بنو امیہ کی تاریخ کے مطالعے کا طریق کار، ویلہاوزن کے طریق مطالعہ سے اگرچہ زیادہ مختلف نہیں تھا (لیکن اس کے زمانۂ تحقیق میں مؤرخین کے مرتب کردہ روایتی مآخذ کچھ زیادہ ہی میسر آتے رہے)، تاہم ان روایتی مآخذ کے حوالے سے تاریخ نویسی کا سلسلہ جاری رہا۔ ویلہاؤزن کی کتاب کی اشاعت کے بعد تقریباً سو سال کے عرصے میں بنو امیہ کی تاریخ سے متعلق تصور کافی حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔

ویلہاؤزن کا کہنا یہ ہے کہ کسی واقعے کے بارے میں اس کے وقوع سے قبل کے کچھ شواہد دستیاب ہو جائیں تو اس واقعے کو ان کی روشنی میں پہلے سے مختلف رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

گولت صیہر(Golziher) اور شاخت (Schact) نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد کی مذہبی اور قانونی روایات بعد کے زمانے کے تصورات و حالات سے بہت مختلف تھیں۔ حالیہ تحقیق میں، جس میں البریخت نارتھ (Albrecht North) کی تحقیق خاص طور پر نمایاں ہے، تاریخ نویسی کی روایت کی کافی کمزوریاں سامنے لائی گئی ہیں۔ ان محققین نے اگرچہ بنو امیہ کا خصوصی طور پر ذکر نہیں کیا، تاہم ان بنیادوں کے بارے میں بہت سے سوالات اٹھائے ہیں جن کو ویلہاؤزن نے متعصبانہ روایات قرار دیا ہے۔ لہٰذا بنو امیہ کے پورے دور کی تاریخ از سر نو مرتب ہونی چاہیے تاکہ ان کی ریاست کا تختہ الٹنے کے حقیقی اسباب کی نشان دہی ہو سکے۔ روایات میں بنو امیہ کے بارے میں معاندانہ رویے کو جوں کا توں قبول کر کے ہم نہ واقعات کا صحیح تجزیہ کر سکتے ہیں اور نہ افراد کے کردار کے محرکات کو صحیح تناظر میں دیکھ سکتے ہیں.

پیٹریشیا کرون نے اس صورت حال میں شخصی اور سوانحی مطالعے کا انداز اختیار کرنے کی تجویز پیش کی ہے اور ان چھوٹی چھوٹی شہادتوں کو اہمیت دینے کے لیے کہا ہے جو مسلم ادبی مآخذ میں قبائلی اور خاندانی پس منظر کو سمجھنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں، مثلاً شادیاں وغیرہ۔ ایک دوسرا طریقہ جو ویلہاؤزن نے بھی استعمال کیا ہے، غیراسلامی ادبی مواد، سکے، نقش و نگار، فنون اور آثار قدیمہ میں زیادہ دل چسپی لینا اور ان کے ذریعے انسانی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہے ۔ بنو امیہ کا دور حکومت اسلامی تاریخ کا پہلا عہد ہے جس کے لیے ایسے شواہد نسبتاً زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

ویلہاؤزن اور دیگر مغربی مؤرخین اس نقطے پر متفق نظر آتے ہیں کہ بنو امیہ کی مملکت ان کے قومی شعور (جیسا کہ لیوی ڈیلا ویڈا نے اپنے مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام بار اول، مقالہ امیہ بنو میں تحریر کیا ہے) اور عجمیوں پر عربوں کی حکمرانی کے اصولوں کا عملی مظہر تھی۔ اسے وہ بعض اوقات نسلی امتیاز کے تناظر میں یوں بیان کرتے ہیں کہ بنو امیہ کا زوال، دراصل عرب اقتدار کے خلاف ان کی رعایا بالخصوص اہل فارس کی بغاوت تھی۔ تاہم یہ کہنا بھی بجا ہے کہ بنو امیہ کی ریاست درحقیقت مفتوحین (عجمیوں) پر فاتحین

(عربوں) کے غلبے کے اصول پر استوار ہوئی تھی۔ "عرب" اس وقت ایک ثقافتی اور نسلی گروہ سمجھا جاتا تھا اور جس طریقے سے بنو امیہ عربوں اور غیر عربوں پر حکمرانی کرتے رہے وہی طریقہ نئے اسلامی معاشرے کی خصوصیت بنتا رہا۔ غیر عرب نسلوں کے لوگوں کے عرب قبیلوں اور خاندانوں سے رشتے ناطے طے کرنے، وسیع مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کے عربی کو ذریعہ ابلاغ بنانے اور عرب سپاہیوں کے مفتوحہ علاقوں میں چھاؤنیوں میں سے باہر نکل کر لوگوں سے ربط و ضبط بڑھانے سے ایک نئی " عرب" شناخت تشکیل پاتی رہی ، خواہ اس کے علمبردار اپنے آپ کو عرب کے طور پر نہ بھی پیش کرتے.

جہاں تک اس خیال کا تعلق ہے کہ اموی خلفا نے مذہب سے کوئی سروکار نہیں رکھا، لیوی ڈیلاویڈ اس پر پہلے ہی تنقید کر چکا ہے، یہ خیال عام مسلم روایات کو بلا تحقیق درست مان لینے کا نتیجہ ہے، ان میں سے بعض روایتوں میں تو انہیں " دشمنان اسلام" تک کہا گیا ہے ۔ پیٹریشیا کرون اور مارٹن ہنڈز نے اپنے مقالات میں بعض اموی خلفا کے اس دعوے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ زمین پر خود کو اللہ کے نائب سمجھتے تھے، لیکن جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ان کے طریق حکمرانی نے اسلام کی اشاعت یا اس کے فروغ میں حصہ لیا یا نہیں ، غور طلب ہے ۔ عمومی تاثر یہ ہے کہ [اسلام] کی پہلی دو صدیوں میں اسلامی تعلیمات کی جتنی پیش قدمی دکھائی دیتی ہے وہ زیادہ تر بنو امیہ کے مخالف حلقوں کی محنت و جانفشانی کا نتیجہ تھی، البتہ خاندان بنو امیہ یا اس کے حامیوں کی طرف سے کوئی پیش قدمی ہوئی تو انہوں نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ [اسے یوں کہنا بہتر ہوگا کہ خلافت بنو امیہ نے خود کو مذہبی اور دعوتی سرگرمیوں سے الگ رکھا اور یہ سرگرمیاں غیر سرکاری طور پر علماء و فقہا کی کوششوں سے جاری رہیں۔

البتہ حضرت عمر بن عبدالعزیز [رک بآں] کے دور کو اس سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے، جن کے دور میں اس عنوان پر خاصی پیش رفت ہوئی] "شاخت" نے اپنے ایک مقالے میں بنو امیہ کی کار گزاریوں کو مسلم فقہ کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے (اس کے مقالے کا عنوان تھا۔ " The Origins of Muhammadan's Jurisprudence" آکسفرڈ ۱۹۶۷ء) اور بتایا ہے کہ اس دور کے قانونی ذہن رکھنے والے اصحاب کا حکمرانوں کے بعض اقدامات کو مسترد کرنا، بعض کو درست قرار دینا اور بعض کو ترمیم کے ساتھ رد یا قبول کرنا، اسلامی فقہ کے فروغ کا نقطۂ آغاز حصہ تھا۔

بنوامیہ کے اس طرز عمل کے باوجود اسلام بطور مذہب بھی فروغ پاتا رہا اور بطور تہذیب بھی ترقی کرتا رہا۔ ان کے دور کی اصل اہمیت یہ ہے کہ یہ دور زمانۂ جاہلیت (قبل از سلام) اور "اسلامی عہد وسطیٰ" کی ایک درمیانی کڑی تھا۔ اموی خلافت بجائے خود روم و یونان کی کلاسیکی دنیا اور اسلامی دنیا کے مابین عبوری دور کا ایک حصہ تھی جسے اکثر متاخر دور قدیم (Late Antiquity) کہا جاتا ہے ۔

۲۔بنو امیہ : مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بنو امیہ کے بارے میں بعض مسلمان علما کی عمومی رائے منفی قسم کی ہے، البتہ کبھی کبھی بہتر شبیہہ بھی نظر آ جاتی ہے۔ بعض قرآنی آیات کی ایسی تشریح کر دی جاتی ہے جس سے بنو امیہ کے بارے میں ناگوار تاثر پیدا ہو جاتا ہے ۔ عام طور پر سورۃ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۶۰ میں "وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ" (اس درخت کو جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے) شجر کو بنو امیہ کی طرف اشارہ سمجھا جاتا ہے.

مزید براں علامتی طور یہ قریش کی دو شاخوں کے مابین دشمنی کی طرف اشارہ سمجھا جاتا ہے، ان میں سے ایک شاخ بنو امیہ (بنو عبدشمس) اور دوسری بنو ہاشم تھی جس میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، علویوں اور عباسیوں

نے جنم لیا ۔ عبدالمناف کے ہاں جنم لینے والے یہ دو بیٹے عبدالشمس اور ہاشم آپس میں جڑے ہوئے تھے اور انہیں تلوار سے الگ کیا گیا تھا ، اس سے جو خون بہا، اسے دشمنی کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، بنو امیہ اور خانوادۂ نبوت کے درمیان تاریخی چپقلش کی جڑیں اسی واقعہ میں پیوست سمجھی جاتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ہاشمیوں نے اپنی سخاوت اور عالی ظرفی کے مظاہروں میں اگرچہ اپنے حریفوں کو نیچا دکھا دیا تھا، لیکن جب پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ میں ایک بڑی طاقت بن کر اُبھرے تو امیہ اور بنو عبدالشمس اسلام کی مخالفت میں قریش کے سردار بن کر مقابلے میں آگئے۔ بنو امیہ کے پہلے خلیفہ امیرمعاویہؓ کا والد ابوسفیانؓ (جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا) جنگ اُحد اور جنگ خندق [رک باں] میں مکی افواج کے سپہ سالار کے طور پر پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فوج پر حملہ آور ہوا ۔ امیر معاویہؓ کی والدہ ہند بنت عتبہ [رک باں] نے (قبول اسلام سے قبل) جنگ احد میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شہید چچا حمزہؓ بن عبدالمطلبؓ کا کلیجہ نکال کر چبا ڈالا تھا۔

جوں جوں مدینہ میں پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قوت بڑھتی گئی آپؐ کا اقتدار وسیع اوروقار بلند ہوتا چلا گیا، بنو امیہ کے لیے اسلام قبول کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ رہا تو وہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے ۔ ابو سفیان اور ان کے دو بیٹوں یزید اور معاویہ نے کب اسلام قبول کیا؟ اس کے بارے میں روایتوں میں اختلاف ہے، لیکن غالب گمان یہ ہے کہ وہ فتح مکہ [کے موقع پر] مسلمان ہوے تھے۔ بنو امیہ کے مخالفین ان کے اسلام قبول کرنے کے حوالہ سے ان کے لیے (الطلقاء) کا لفظ استعمال کرتے تھے جس سے توہین کا پہلو نکلتا تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ مکہ کے فتح ہوجانے کے بعد یہ لوگ پیغمبر اسلام کی ملکیت بن گئے تھے، مگر آپؐ نے فیاضی اور عالی ظرفی سے کام لیتے ہوئے انہیں آزاد کر دیا (طَلَّقَهُم) [یہ بات درست نہیں ہے۔اسلام سے قبل جب کوئی قبیلہ دوسرے قبیلے پر فتح حاصل کرتا تھا تو محکوم اور مفتوح قبیلے کے لوگ فاتح کے لیے لونڈی غلام یا اسیر تصور ہوتے تھے۔ اور عام طور پر انہیں فاتحین کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ہوازن ، بنو مصطلق اور خیبر کے لوگوں کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔ مگر بعد میں انہیں آزاد کر دیا، فتح مکہ کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکمل ہوجانے کے بعد مقامی یا مفتوح لوگوں کے متعلق فرمایا: لاتثریب علیکم الیوم، انتم الطلقاء (تم پر آج کوئی پر عتاب نہیں۔ تم سب آزاد ہو؛ ابن ہشام السیرۃ النبویہ، بیروت بذیل فتح مکہ)] قرآن مجید میں ان کا ذکر (المولفۃ قلوبہم [التوبہ] ۹،آیت،۶۰) کے حوالے سے ان لوگوں میں کیا گیا ہے جنہیں صدقات میں سے مالی امداد دی جاتی ہے۔ یہ حکم محض بنو امیہ کے قبول اسلام تک محدود نہیں ہے۔ اس مد میں سے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والوں کی تالیف قلب کے لیے مالی مدد دی جا سکتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جن معزز مخالفین کو دائرہ اسلام میں لانے کے لئے تحائف دینا چاہتے تھے ، ان میں ابوسفیان کا نام بھی شامل تھا اس آیت نے آپؐ کی اس خواہش کی تکمیل آسان بنا دی۔

اسلام قبول کرنے کے بعد بنو امیہ کے متعدد افراد کو، جن میں ابو سفیان کا نام بھی شامل تھا ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین [رکّ بہ خلافت راشدہ] نے اہم عہدے اور فرائض تفویض کیے۔ حضرت ابوبکر [رک باں] نے حضرت معاویہؓ اور ان کے بیٹے کو شام بھیجی جانے والی فوج میں اہم ذمہ داریاں سونپ کر شامل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ شام پہنچ کر امیرمعاویہؓ نے اپنی جوڑ توڑ کی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنی خلافت کے لیے راہ ہموار کرلی اور یہ

کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت اور اس کے بعد وقوع پذیر ہونے والے حالات کو اپنے حق میں استعمال کیا۔

بنو امیہ کے کردار کے بارے میں منفی روایات کے پیچھے انہی لوگوں کا ہاتھ رہا ہے، جو ان کے عہد کو حقیقی خلافت تسلیم کرنے سے انکاری تھے۔ وہ اسے محض ایک ملوکیت سمجھتے تھے اور اسے بوزنطینی اور ساسانی سلطنتوں سے مختلف نہیں پاتے تھے۔ اس تاثر کو مزید گہرا کرنے کے لیے وہ امیر معاویہؓ کے نسلی وراثت کا اصول متعارف کرانے اور اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین نامزد کرنے کا ذکر کرتے تھے اور اس مفروضے کو پیش نظر رکھتے تھے کہ خلیفہ کا تقرر بذریعہ انتخاب ہونا ایک طے شدہ بات تھی، جس کی امیر معاویہؓ نے خلاف ورزی کی ہے ۔ اسی طرح جب بنو امیہ نے خلیفہ کے لیے خلیفۃ الرسول کی بجائے خلیفۃ اللہ کا خطاب مقرر کیا، تو یہ مفروضہ قائم کیا گیا کہ یہ ایک مسلمہ راستے سے انحراف ہے جو ان کے تکبر و نخوت کا مظہر ہے۔ انہی محرکات کے تحت انہوں نے خلفاے بنو امیہ اور ان کے عمال حکومت کے بعض طور طریقوں سے اظہار نفرت شروع کر دیا جو ان کے پیشرؤوں سے مختلف تھے، مثلاً خلفا اور گورنر منبر پر بیٹھ کر خطبہ دینے لگے تھے اور عیدین کی نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کر دیا گیا تھا۔ بعض خلفاء [مثلاً یزید] اور عمال حکومت کے ذاتی فعل شراب نوشی اور عیش و نشاط کی محفلوں میں شرکت کو جس انداز سے پیش کیا گیا وہ پورے خاندان بنو امیہ کی کردار کشی کے مترادف تھا اور اسے خلفاے بنو امیہ کو صحیح معنوں میں خلفا ماننے سے انکار کا جواز بنا لیا گیا جو کہ سراسر غلط تھا۔

جہاں تک بنو امیہ کی پالیسیوں اور اقدامات کا تعلق ہے، ان میں سے متعدد، اسلامی حکمرانوں کے کردار کے مطابق نہ ہونے کا تأثر دیتے تھے، مثلاً حجاز جانے والی یزیدی فوج نے [۶۳ھ میں] مدینے کو تباہ و برباد کر دیا، [اُسے جنگ حرہ [رک باں] کہا جاتا ہے]؛ شہر مکہ پر منجنیقوں کے ذریعہ پتھر برسائے اور کعبۃ اللہ کو اتنا نقصان پہنچایا کہ اسے شہید کر کے دوبارہ تعمیر کرنا پڑا۔ اس واقعہ کے دس سال بعد حجاج بن یوسف کی زیر قیادت حجاز جانے والی فوج نے ایک بار پھر مکے کا محاصرہ کر لیا ۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے حضرت حسین بن حضرت علیؓ کو ان کے اہل خاندان اور حامیوں سمیت میدان کربلا [رک باں] میں شہید کر دیا گیا۔ یہ جرم بھی بنو امیہ کی کارروائیوں میں شمار ہونے لگا۔ غیر عربوں کو "موالی" [رکّ بہ "مولیٰ"] قرار دے کر ان پر اسلام میں داخل ہونے کے دروازے بار بار بند کیے گئے۔ خلیفہ الولید ثانی پر یہ الزام بھی ہے کہ اس نے قران مجید کو تیر کا نشانہ بنایا تھا۔

بعدازاں متعدد ایسی مطبوعات منظر عام پر آئیں جن میں بنو امیہ کے داخلِ اسلام ہونے سے پہلے اور بعد کے کاموں کی فہرست پیش کی گئی ہے اور ان کا عباسی خلفا کی کارگردگی سے موازنہ کیا گیا ہے۔ ان مطبوعات میں الجاحظ [رک باں] کا "رسالہ فی بنی امیہ" اور المقریزی [رک باں] کی "کتاب النزاع والتخاصم فیما بین بنی امیہ و بنی ہاشم" اور اسی قسم کی ایک اور نسبتاً مختصر "کتاب فی شان بنی امیہ" شامل ہیں۔ مؤخرالذکر کتاب عباسی خلیفہ المعتضد نے ۲۸۴ھ/ ۸۹۷ء میں تیار کروائی (الطبری، ۳: ۲۱۶۴ تا ۲۱۷۸)

بنو امیہ کے بارے میں مسلمانوں کی عمومی رائے کو سمجھنے کے لیے ہمیں وہ مثالیں بھی ذہن میں رکھنی چاہئیں جو متذکرہ بالا منفی تاثرات کو ممکنہ طور پر کم کر دیتی ہیں، مثلاً ان کے خلفا میں حضرت عمر [ثانی] بن عبدالعزیزؒ اور ان سے کچھ ہی کم مرتبے کے خلیفہ یزید [ثالث] بن الولید تھے، جنہوں نے ناگوار تاثرات کو کافی حد تک کم کر دیا ۔ اول الذکر خلیفہ کی والدہ حضرت ام عاصمؒ، خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کی پوتی تھیں۔ ان کے اچھے کاموں کی بدولت لوگ

انہیں پانچواں خلیفۂ راشد سمجھتے تھے ۔بعض دیگر خلفا کو اگرچہ جائز طور پر منتخب شدہ نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن انہیں ان کی کارگردگی کی بنا پر قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ۔ ایک روایت کے مطابق عباسی خلیفہ المنصور نے اموی خلیفہ ہشام کے مالیاتی نظم و ضبط اور انتظامی دانش مندی کی بڑی تعریف کی تھی۔ اسی طرح معاویہؓ اور عبدالملک نے اپنا منصب سنبھالنے سے پہلے پھیلی ہوئی ابتری (فتنہ)پر قابو پانے پر جو "سال اتحاد" ("عام الجماعہ") منایا، اسے بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

اسلامی روایات میں بنو امیہ کے متعلق پائے جانے والے تعصب کو سمجھنے کے لیے ان تمام عوامل کو پیش نظر رکھنا ہوگا جو اس پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس خاندان کے بارے میں ہم تک پہنچنے والی روایات اس سے دشمنی رکھنے والے حلقوں کی وساطت سے آئی ہیں اور عباسی خلافت کے طویل دور میں پختہ ہوتی رہی ہیں۔ پھر جوں جوں شیعہ سنی اختلاف بڑھتا رہا اور سنیوں کو عروج حاصل ہوتا رہا، اس روایت میں تبدیلیاں آتی رہیں اور بنو امیہ کے بارے میں معاندانہ رویے میں کافی کمی واقع ہو گئی ۔ خاص طور پر ان کے دور میں اسلام کی ترقی کے حوالہ سے رائے عامہ میں بہت نرمی آ گئی۔

۳۔ تاریخی جائزہ: تاریخی روایات کے مآخذ و کردار اور اس عہد کے حقائق کے بارے میں جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں ان کی روشنی میں بنو امیہ کے عہد پر ہماری بحث کو عبوری نوعیت ہی کی سمجھنا چاہیے۔ یہ واقعات، ان میں لیے گئے نام اور ان کا زمانۂ وقوع اسلامی ادبی روایات کی وساطت سے موصول ہوے ہیں ، ان کی تفصیلات کو اسی وقت حتمی سمجھا جا سکتا ہے جب دوسرے ذرائع معلومات مثلاً سکے کتبے اور غیر مسلموں کی تحریریں بھی ان کی توثیق کردیں۔

عہد سفیانی : پہلی خانہ جنگی کے بعد دمشق [رک بآں] مملکتِ عربیہ کے سیاسی مرکز کے طور پر ابھر آیا۔ اس کی ممکنہ وجہ یہ تھی کہ یہ شہر اس خانہ جنگی میں کامیابی سے ہمکنار ہونے والی شخصیت حضرت امیر معاویہؓ کا بیس سال سے زائد عرصہ سے مستقر چلا آرہا تھا اور وہ یہیں بیٹھ کر اپنی خلافت کے لیے تدابیر اختیار کرتے رہے۔ ان کی کامیابی میں کسی حد تک اس شہر کی کثیر آبادی کا بھی حصہ تھا۔ یہاں کی آبادی دیگر مفتوحہ علاقوں سے کافی مختلف تھی۔ یہاں کی آبادیاں ٹکڑوں میں منقسم تھیں اور لشکروں کی چھاؤنیاں دکھائی دیتی تھیں۔ علاوہ ازیں وسطی شام زیادہ تر ایک مضبوط قبائلی گروہ قضاعہ [رک بآں] کا وطن تھا، جبکہ دوسرے شہر چھوٹے چھوٹے قبیلوں پر مشتمل تھے، جو ایک دوسرے سے مصروف پیکار رہتے تھے ۔ ان حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے امیرمعاویہؓ نے اپنے دربار کے لیے اسی شہر کو منتخب کیا۔ اس کی ایک مضبوط انتظامی مرکز کی حیثیت بزنطینی ریاست کے زمانے سے چلی آ رہی تھی، وہ اس کے بجائے کسی اور شہر میں دربار قائم کرتے تو ان کی توجہ برسر پیکار قبائلی گروہوں کی سرگرمیوں پر ہی رہتی.

امیر معاویہؓ اور ان کے جانشینوں نے یہیں سے چند ایک مضبوط گورنروں کے ذریعہ ساری ریاست کو اپنے قابو میں رکھا۔ جن میں ثقفی [رکّ بہ: ثقیف] زیاد بن ابیہ [رک بآں] اور پھر زیاد کا بیٹا عبید اللہ بن زیاد[رکّ بآں] خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ ان گورنروں نے ذیلی گورنروں کے تقرر کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا جن کے ذریعہ وہ قبائلی عمائدین [رکّ بہ: شریف] کو اپنے قابو میں رکھتے تھے۔ جبکہ آبادی کی اکثریت یعنی غیر عربوں کو محض ٹیکس دہندگان کی حیثیت حاصل تھی.

اس دور کا ذکر کرتے ہوے ایسا انداز بیان اختیار کرنے کا رواج پڑ گیا ہے جس میں خلفا عام آدمی سے کچھ ہی بڑے درجے کے "شیخ قبیلہ" دکھائی دیتے ہیں۔ ان

تذکروں میں امیر معاویہؓ کے ''حلم'' [رک بآں] اور ان کے دربار میں قبائلی وفود کی آمدورفت کا محض ایک تکلف کے طور پر ذکر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ امیر معاویہؓ نے خود ہی اس رجحان کی حوصلہ افزائی کی ہو جیسا کہ '' Maronite Chronicle'' نے ان کے تاج پہننے سے انکار کا ذکر کیا ہے (CSCO مسودہ شام، سلسلہ ۳، ۴: ۷۱، (متن)، ترجمہ، ص ۵۶)۔ یہ بھی معروف ہے کہ پر نطائن کرانیکلر تھیوفین (Theo Phanes) نے انہیں '' اپنی مثال آپ'' قرار دیا ہے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ ان کے پاس اتنے زیادہ انسانی اور مادی وسائل تھے کہ وہ اہم ترین قبائلی سرداروں میں سے بھی اہم ترین شخصیت کے مالک تھے.

انتظامی معاملات میں سفیانی خلفا کے طور طریقے وہی تھے جو انہیں بزنطینیوں اور ساسانیوں سے ورثہ میں ملے تھے۔ سرکاری ریکارڈ [رکّ بہ دیوان] اسی انداز اور اسی زبان میں برقرار رکھا گیا جو عربوں کی آمد سے پہلے مروج تھا ۔ سکے وہی گردش کرتے رہے جو سابقہ حکومتوں کے ڈھالے ہوے تھے [دیکھیے : دارالضرب]۔ میرونائیٹ کرانیکل نے شامیوں کے معاویہ حکومت کے جاری کردہ سکوں کو قبول کرنے سے انکار کا ذکر کرتے ہوے بتایا ہے کہ اس انکار کی وجہ یہ تھی کہ ان سکوں پر صلیب کا نشان نہیں تھا (CSCO مسودہ شام، سلسلہ ۳، ۴: ۷۱، (متن)، ترجمہ، ص ۵۶)

بنو امیہ کو حضرت امیر معاویہؓ کی وفات تک سوائے حجر بن عدی [رک بآں] کے واقعہ کے کسی بغاوت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بنانے کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں، لیکن جب اس نے اقتدار سنبھالا تو اس کی مخالفت بہت بڑھ گئی۔ یہ قبائل کی جانب سے مزاحمت نہیں بلکہ مدینہ میں چنداصحابِ رسول کی مزاحمت تھی ۔ جن میں دو شخصیات، حضرت حسین ابن علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ [رک بآں] نمایاں ترین تھیں۔ حضرت حسینؓ کی مزاحمت کو میدان کربلا میں ختم کر دیا گیا، لیکن مؤخر الذکر مکہ چلے گئے۔ یزید نے ان سے بیعت کرانے کے لیے فوج حجاز بھیج دی [رکّ بہ الحصین بن نمیر اور مسلم بن عقبہ]۔ اس فوج نے ان پر دباؤ ڈالنے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا کہ یزید کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے معاویہ ثانی کی بیعت کی گئی، اسے شام میں تو بڑی حد تک کامیابی ہوئی، لیکن وہ بڑی محدود نوعیت کی تھی اور اس کا عرصۂ اقتدار بھی بہت مختصر رہا ۔ بعد ازاں دوسری خانہ جنگی شروع ہوگئی۔

دوسری خانہ جنگی: معاویہ بن یزید کی موت (۶۴ھ/ ۶۸۳ء) سے لے کر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی آخری شکست (۷۳ھ /۶۹۲ء) تک نو سال کے عرصے میں بنو امیہ کی ''ابو العاص'' شاخ سے تعلق رکھنے والا مروان بن الحکم اور اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک برسر اقتدار آگئے، انہوں نے اس سارے علاقے میں اپنا اقتدار مستحکم کر لیا جو امیر معاویہؓ کے زیرنگیں تھے۔ مروان کو اور اس کے بعد اس کے جانشینوں کو جس طرح اقتدار منتقل ہوا یہ ایک پر اسرار اورپیچیدہ کہانی ہے اور کسی حد تک دھندلی اور تاریک بھی، لیکن اس اقتدار کا دارو مدار قضاعہ کے سردار حسان بن مالک [رک بآں] اور قیسی قبائل پر قضاعہ کی فوجوں کی فتح پر تھا جنہوں نے ۶۴ھ/۶۸۴ء میں مرج رہط کی جنگ میں حضرت عبداللہ بن زبیر کی حمایت کی تھی۔ [دراصل شام میں موجود قبائل کا طاقت ور گروہ کسی ایسے شخص کی اطاعت کرنے کے لیے تیار نہ تھا جو انہیں نظر انداز کر کے دوسرے علاقے کے لوگوں کو آگے کر دیتا۔ ان حالات سے مروان بن الحکم نے فائدہ اٹھایا۔ مروان ایک تابعی بزرگ تھا۔ اس نے حضرت عثمان کے کاتب اور سیکرٹری اور پھر مدینہ منورہ کے گورنر کے طور پر طویل عرصے خدمات انجام دی تھیں۔ وہ امیر معاویہ کے طرز حکمرانی سے واقف ہی

نہیں بلکہ اس کا حصہ رہا تھا۔ پھر خوش قسمتی سے امیر معاویہؓ کے خاندان میں اس کا کوئی مدمقابل بھی نہ رہا تھا۔ عبدالملک نے اپنے والد کی پالیسی کو جاری رکھا اور اس خانہ جنگی میں بھرپور کامیابی حاصل کی]۔

مروان نے اپنے نو ماہ کے دور اقتدار میں مصر پر بنو امیہ کا قبضہ بحال کر دیا۔ لیکن اس کے بیٹے عبدالملک کو حجاز اور عراق میں ابن زبیر کی فوجوں پر غلبہ پانے میں بڑا عرصہ لگ گیا اور اس کی توجہ شام پر بھی مرکوز رہی، جہاں اس کے حقِ خلافت کو اس کے رشتہ دار عمرو بن سعید الاشدق [رک باں] نے چیلنج کر رکھا تھا۔ تاہم ۷۱ھ/۶۹۱ء میں عراق میں مصعب بن الزبیر [رک باں] کی شکست کے بعد الحجاج کے زیر قیادت بھی ایک لشکر اس کی مدد کو آپہنچا۔ اس لڑائی میں عبداللہ بن زبیر مارے گئے، اس طرح اگلے سال حجاج مکہ پر قابض ہوگیا۔

دوسری خانہ جنگی کئی پہلوؤں سے خلافتِ بنو امیہ کے مستقبل کے لیے اہمیت رکھتی تھی۔ اولاً اس کے نتیجے میں بنو امیہ کا اقتدار ڈانواں ڈول ہوگیا۔ جانشینی کے لیے شروع ہونے والی رسہ کشی کے باعث شام، عراق اور خراسان میں عرب پہلی بار دو بڑے متحارب قبائلی گروہوں کی صورت میں بٹ گئے، یہ ہر خطے میں مختلف ناموں سے ایک دوسرے کے سامنے آکھڑے ہوے۔ شام میں بنو کلب (قضاعہ کا اکثریتی قبیلہ) اور قیس ایک دوسرے کے مد مقابل تھے۔ عراق اور اس کے مشرق میں تمیم اور ازد [رک باں] یا زیادہ عمومی طور پر انہیں مضر اور یمان [رک باں] کہا جاتا، کے حالات بھی اس کے مختلف نہ تھے۔ ان گروہوں کی تشکیل سفیانی دور میں مال و دولت کے لیے شروع ہونے والی آبادی کی نقل مکانی کی وجہ سے ہوئی، جو اب اس لیے زیادہ اہمیت اختیار کر گئے تھے کہ بڑے گروہوں نے اپنی قوت بڑھانے کے لیے انہیں اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا تھا۔

ثانیاً: المختار [رک باں] کے زیر قیادت چلنے والی تحریک نے عراق میں ابن زبیر کے عبوری دور میں کوفہ کا انتظام و اقتدار سنبھال لیا، اسے اگرچہ دبا دیا گیا تاہم اس نے پہلی بار موالیوں (غیر عرب غلاموں یا آزاد شدہ لوگوں) کی اہمیت واضح کر دی اور ساتھ ہی ایک ایسی بنیاد مہیا کر دی جس سے بعد ازاں ہاشمیہ [رک باں] کی تحریک ابھری۔ اس تحریک نے بنو امیہ کے خلاف بغاوت کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ثالثاً: بنو امیہ کے اقتدار کی عمارت گرنے سے اس کے انتظامی ڈھانچے کے ڈھیلے پن اور لامرکزیت کے نقصانات واضح ہو کر سامنے آ گئے جو سفیانی دور کا نمایاں پہلو رہا تھا۔ بنو امیہ کو جن علاقوں پر اپنے اقتدار کا دعوٰی تھا۔ وہاں کے اشراف دلی طور پر ان کے ساتھ نہ تھے، جب ان کی حکمرانی کی چولیں ڈھیلی ہوئیں تو ان طبقوں نے مروانیوں کی منظم فوج کا ساتھ دینا زیادہ مناسب سمجھا اور خود کو محفوظ کر لیا۔

مروانیوں کی بحالی: عبدالملک اور اس کے بیٹے ولید کے ادوارِ خلافت میں حجاج بن یوسف کا عراق اور اس کے مشرق کا گورنر ہونا، مشترک امر تھا۔ وہ ۷۵ھ تا ۹۵ھ/ ۶۹۴ء تا ۷۱۴ء، اس عہدے پر مامور رہا، جس کے دوران میں اس نے حکومت کے استحکام، انتظامیہ کی مستعدی اور تعمیرو ترقی کے لیے خاصا نمایاں کام کیا۔ یہی زمانہ تھا جس میں پہلی بار اسلامی سکہ رائج ہوا اور سرکاری ریکارڈ تاریخ وار محفوظ کرنے کا آغاز ہوا۔ عبدالملک نے ۷۲ھ/۶۹۱ء میں بیت المقدس میں قبۃ الصخرہ [رکّ بہ القدس] تعمیر کرایا اور ایک مسلمہ اسلامی فن تعمیر متعارف کرایا۔ [پیرس کے عجائب گھر لوٹر میں ۸۶/۷۰۵ء میں تعمیر ہونے والی ایک عمارت کا کتبہ محفوظ ہے۔ جس سے اسلام کے فن عمارت کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے]۔ عمارتوں کی تزئین و آرائش میں قرآنی آیات کی قابلِ تعیین کندہ کاری (Datable

(Inscriptions) کا آغاز ہوا۔ اس عہد میں بننے والی دیگر بڑی بڑی عمارتوں میں مسجد اقصیٰ، جامع مسجد دمشق اور مدینہ میں مسجد نبوی میں توسیع [رک بہ : مسجد] بھی شامل تھیں۔

دوسری خانہ جنگی کے زمانہ میں عراق میں پھیلنے والی ابتری کے دوران میں خارجی فتنے کا ظہور بھی [رکّ بہ ازارقہ، خوارج اور شبیب بن یزید] حجاج بن یوسف کی صلاحیتوں کے لیے ایک چیلنج تھا۔ اس نے اس کام میں المہلب کی فوجی صلاحیتوں کو استعمال کیا اور ان کے خلاف مہم میں شریک نہ ہونے والے اشراف کی سرکوبی کی اور شام سے فوج عراق لا کر خارجیوں کا قلع قمع کیا۔ اس طرح اس نے صوبوں میں بنو امیہ کے اقتدار کو مؤثر بنانے کے نئے طریقے متعارف کرائے۔ شامی فوج کو بطور کمک لانے کے نتیجے میں ان کے لیے فوجی چھاؤنیاں تعمیر کرنے کا سلسلہ بھی اسی نے جاری کیا۔

غالبًا خارجیوں کے خلاف مہم کے سلسلہ میں اشراف پر ڈالا جانے والا دباؤ اس بغاوت کا اصل سبب تھا، جو عبدالرحمان ابن اشعث کی قیادت میں اٹھی۔ اسے افغانستان جانے والی فوج کے ہمراہ بھیجے جانے پر بھی غصہ تھا۔ اس بغاوت میں مذہبی عنصر بھی شامل ہو گیا، اشراف نہایت سرگرمی کے ساتھ ابن اشعث کی حمایت کر رہے تھے۔ باغی نہ صرف عراقی گورنر کی بر طرفی، بلکہ عبدالملک کی خلافت کے خاتمے کا بھی مطالبہ کر رہے تھے ۔ بغاوت اتنی شدت سے اٹھی کہ اس کی کامیابی یقینی دکھائی دینے لگی تاہم باغیوں کی شکست سے حکومت کا تسلط مزید سخت ہو گیا۔

ابن الاشعث کی بغاوت میں ایک اہم عنصر غیر عرب موالی تھے۔ انیسویں صدی کے بعض اہل علم نے بھی اس کی تحریک کو ان کے [معاشرتی] عدم اطمینان سے تعبیر کیا ہے اگرچہ وہ تعبیر زیادہ قابل قبول نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ حجاج کے زمانے میں جو غیر عرب اسلام میں داخل ہونا چاہتے تھے (خواہ اس وقت اس کی وجہ کچھ بھی تھی) اس سے غیر عربوں کا مسئلہ روز بروز نمایاں ہو رہا تھا۔ بہت سے غیر عرب کاشت کار زمینوں کو چھوڑ کر عرب سپاہی بننے کے لیے فوجی چھاؤنیوں کے شہر عراق پہنچ رہے تھے لیکن حجاج انہیں چن چن کر نکال رہا تھا اور واپس جا کر زمینوں کو آباد کرنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ وہ اپنے پیشے کو اس لیے ترک کر رہے تھے کہ ٹیکس ادا کرنے سے بچ جائیں اور فوج میں شامل ہونے سے اجرت اور عزت بھی زیادہ پائیں۔ حجاج کے اقدام کا مقصد یہ تھا کہ اگر انہیں زراعت اور دیہات کی زندگی ترک کرنے کی اجازت دے دی گئی تو اس سے خزانے کو نقصان پہنچے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مروانی عہد میں ریاست اپنے مالیاتی معاملات اور ٹیکس جمع کرنے کو کتنی اہمیت دیتی تھی۔

بنو امیہ کے دور میں محاصل کے نظام کی نوعیت اور اس کی ترقی [رکّ بہ ضریبۃ، جزیہ اور خراج] کے بارے میں ماہرین نے کافی بحث مباحثہ کیا ہے ۔ ڈی سی ڈینیٹ نے اس بارے میں ویلہاؤزن کی سوچ کو غیر ضروری تسہیل کاری (Over-simplication) قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ بنو امیہ کے دور میں محاصل کے کئی نظام رائج تھے۔ ایک صوبے میں ایک نظام دوسرے میں دوسرا نظام ہوتا تھا، لیکن ٹیکس دہندہ کی سطح پر "پول ٹیکس" (Poll-tax) یا "نفر محصول" اور "محصول اراضی" نافذ ہوتے تھے۔ ڈی سی ڈینیٹ نے اگرچہ اس سلسلے میں کافی معلومات اکٹھی کی ہیں، لیکن ان سے اسلام قبول کرنے اور زمینوں کی آباد کاری چھوڑنے کے خواہشمند غیر عربوں کی حالت میں آنے والے فرق کا پتہ نہیں چلتا۔ صرف انہی افراد کو محصول سے کافی رعایت مل سکتی تھی جو اسلام قبول کرنے کے بعد زمینیں بھی چھوڑ دیتے تھے۔ ان کی کھیتی باڑی ترک کرنے سے ملک کی اناج کی ضرورتوں میں کمی آنے کے علاوہ خزانے کو بھی نقصان

پہنچتا تھا، معلوم نہیں کہ بنو امیہ نے اس مسئلے کا کیا حل نکالا تھا۔

فوج میں گروہ بندی اور موالیوں کا مسئلہ: مملکت کے مشرقی علاقوں میں یزید بن مہلب الازدی [رکّ بہ مہلب بنو] کی حمایت کے سلسلے میں "مضر" اور "یمان" کے درمیان عناد شدت اختیار کر گیا۔ ابن مہلب نے خراسان میں اپنی پوزیشن بہتر بنانے کے لیے لوگوں پر بہت سی مہربانیاں کیں اور انعام و اکرام دیتا رہا جس کی وجہ سے اسے "یمان کا سردار" کہا جانے لگا۔ اموی خلفا اور ان کے نمائندوں سے اس کے پیچیدہ اور بنتے بگڑتے تعلقات بالآخر بغاوت پر منتج ہوے، یہ یزید ثانی کا زمانہ تھا اور بغاوت کا مرکز بصرہ تھا۔ ابن اشعث کی طرح اگرچہ اسے بھی متنوع عناصر کی حمایت حاصل ہو چکی تھی مگر اس کی یمان کے ساتھ شناخت اس لیے قرار پا گئی کہ اس کی شکست کو ان کے لیے باعثِ تذلیل سمجھا گیا۔ علاوہ ازیں قیسی عمر بن ھبیرہ [رکّ بہ ابن ھبیرہ] کا گورنر عراق بننے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اس کے بعد مشرق میں مقرر ہونے والے بیشتر گورنر قیسی ہی تھے اور پھر اس کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے شام سے بھیجی گئی، فوج جو شام اور حلب کے سرحدی علاقوں سے بھرتی کی گئی تھی، بھی زیادہ تر قیسی تھی۔ ۱۳۲ھ/۷۴۹ء میں اموی خلافت کو ختم کرنے کے لیے چلائی گئی تحریک یمانی حامیوں کے نعروں میں سے ایک نعرہ "مہلبیوں کا انتقام" بھی تھا۔

اس کے بعد عراق اور اس کے مشرق کے لیے گورنروں کے تقرر میں اس امر کو ملحوظ رکھا جانے لگا کہ اگر ایک دفعہ ایک گروہ کا گورنر ہوتا تو دوسری بار دوسرے گروہ کا گورنر لگا دیا جاتا۔ اس اہتمام کے باوجود ہشام بن عبدالملک کی خلافت کے آغاز میں خالد بن عبداللہ القسری [رک بآں] کو گورنر بنا یا گیا تو اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ پھر یمان نواز پالیسی اختیار کر لی گئی ہے اور ۱۲۰ھ/۷۳۸ء میں خالد کو ہٹا کر یوسف بن عمر کو گورنر لگایا گیا تو کہا گیا کہ مضریوں کو پھر بحال کر دیا گیا ہے۔

ان گروہوں کو یمان اور مضر کا نام دینے پر بھی کافی بحث و تمحیص ہوئی ہے۔ پیٹر یشیا کرون کے خیال میں یہ مفروضہ درست نہیں ہے کہ وہ کسی قبیلے سے تعلق کی بنا پر یا اس کی نمائندگی کی وجہ سے ان ناموں سے پکارے جانے لگے تھے، اس کا کہنا ہے کہ یہ فوج کے اندر کی دھڑے بندی کے حوالے سے ان ناموں سے پہچانے جانے لگے تھے اور کسی حد تک ان میں قبائلی تعلق کا بھی دخل تھا، لیکن بعینہٖ ایسا نہیں تھا، مثلاً فوج میں ایک گروہ کو "تمیم" کہا جاتا تھا وہ اگرچہ قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتے ہوں، لیکن ان لوگوں کے مقاصد اور مفادات، فوج کے باہر کے تمیمیوں کے مفادات سے مختلف ہوتے تھے۔ ایم اے شبان کا خیال ہے کہ ان گروہوں کے واضح سیاسی مقاصد تھے ۔ یمان گروہ فوجی توسیع کا سخت مخالف اور موالیوں کے بارے میں فراخدلانہ پالیسی کا حامی تھا، جبکہ مضرگروہ شاہی تمکنت برقرار رکھنے اور عرب نواز پالیسی پر مصر تھا، پیٹر یشیا کرون اس توجیہہ کی مخالف ہے۔ عجمیوں کا قبول اسلام مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر ایک آزمائش بنا رہا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مذہبی اہمیت بڑھتی رہی۔ موالی اپنے حقوق کے دعوے کرتے تو بنو امیہ کے گورنر انہیں بادلِ نخواستہ منظور کرتے یا بالکل ہی انکار کر دیتے، جس پر لوگ ان کے اقدام کومذہب کے منافی قرار دیتے اورمذہبی حلقوں نے انہیں دشمنانِ اسلام کہنا شروع کر دیا۔

گورنر خراسان الجراح بن عبداللہ الحکمی [رک بآں] نے مقامی موالیوں کی طرف سے خراج کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دینے اور جنگ میں فوج کے دوش بدوش لڑنے کی بنا پر تنخواہ کی ادائیگی سے انکار کیا تو انہوں نے خلیفہ عمرؓ بن عبدالعزیز سے شکایت کر دی جس پر الجراح کو گورنری سے

سبکدوش کر دیا گیا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ دس سال بعد رونما ہوا۔ اس وقت الاشرس بن عبداللہ السلمی خراسان کا گورنر تھا۔ اس مسئلے پر بغاوت کی صورت حال پیدا ہو گئی، ساتھ ہی ترکوں نے حملہ کر دیا، نتیجتًا کافی علاقہ ہاتھ سے نکل گیا اور زبردست فوجی نقصان ہوا.

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مقامی غیر عرب سرداروں نے اموری گورنر پر زور دیا کہ وہ موالیوں کا مطالبہ ماننے سے انکار پر ڈٹا رہے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ موالیوں کی بڑی تعداد کو ''عرب'' بننے کی اجازت دے دی گئی اور ان کے مالی مفادات میں شریک ہونے کا موقع مل گیا تو ان کے مالی مطالبات تسلیم کرنا حکومت کے بس میں نہیں رہے گا، تاہم موالیوں کی بے اطمینانی کو بنو امیہ کے ''عرب مخالفین'' [رکّ بہ الحارث بن شریح] نے خوب استعمال کیا اور بالآخر ان کی خلافت کے خاتمے کی تحریک میں موالی اہم عنصر ثابت ہوے۔ یہ عموی طور پر مسلم ہے کہ عمر ثانیؒ موالیوں کے مطالبات کے بارے میں دیگر اموی خلفا کی نسبت زیادہ ہمدردانہ رویہ رکھتے تھے۔ وہ اسلام میں داخل ہو جانے والے عربوں اور عجمیوں کی مساوات کے علمبردار تھے۔ تاہم اس مقصد کے لیے انہوں نے جو طریقے اختیار کیے ان کے بارے میں مضبوط شواہد حاصل کرنا خاصا مشکل کام ہے ابن عبدالحکم [دیکھیے: The Fiscal rescript of Umar II H.A.R.Gibb,] نے جس ''مالیاتی فرمان'' کی رپورٹ کی ہے، اس میں بہت سے سوالوں کا جواب نہیں ملتا اور اس کی سند بھی متنازعہ ہے۔ علاوہ ازیں ان کا دور اقتدار مختصر تھا، جس کی وجہ سے ان کی اصلاحات غیر مؤثر رہیں۔ اشرس السلمی کے واقعہ سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ اس مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب نصر بن سیار [رک بآں] خراساں کا گورنر بنا تو اسے پتہ چلا کہ بہت سے مسلمان ٹیکس ادا کر رہے ہیں اور متعدد غیر مسلم ٹیکس کی ادائیگی سے بچے چلے آ رہے ہیں.

تیسری خانہ جنگی: تیسری خانہ جنگی جو ۱۲۶ھ/ ۷۴۴ء میں الولید ثانی کے خلاف بغاوت سے شروع ہوئی، اس کے اسباب بھی بعض پہلوؤں سے دوسری خانہ جنگی کے اسباب جیسے تھے۔ مروان ثانی نے برسر اقتدار آ کر حالات کو کچھ سنبھال لیا اور وہ ۱۲۹ھ/ ۷۴۷ء میں وسطی صوبوں میں نظم و ضبط بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا، لیکن مجموعی طور پر وہ بنو امیہ کے اقتدار کو دوبارہ مستحکم نہ کر سکا، بلکہ اس کے دور خلافت کی جڑیں اکھڑنے کا عمل شروع ہو گیا۔ مروان ثانی کے اقدامات بظاہر کامیاب دکھائی دے رہے تھے لیکن اندرونی کھوکھلا پن اپنے اثرات برابر دکھا رہا تھا۔ اس کے برسراقتدار آنے کے بعد جلد ہی دور افتادہ شمال مشرقی صوبے خراسان سے اٹھنے والی بغاوت نے مملکت کو شدید جھٹکے لگانا شروع کر دیئے۔ یمنی مضری قبائل کی کشمکش، جو پہلی خانہ جنگی کے دوران میں مشرقی حصے تک محدود تھی، اب شام میں بھی سرایت کر گئی اور خاندان بنو امیہ کے اندر بھی چپقلش شدت اختیار کر گئی۔ خاندان کے بہت سے ارکان جو پہلے در پردہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کررہے تھے، اقتدار سنبھالنے کے لیے کھل کر سامنے آ گئے جس سے زبردست جوڑ توڑ شروع ہو گیا۔ مروان ثانی کو اپنے بعض اقدامات میں جو کامیابیاں ہوئیں وہ قیس (مضر) کے مفاد میں گئیں۔ ان کاروائیوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۲۶ھ/ ۷۴۴ء سے ۱۲۹ھ/ ۷۴۷ء کے درمیان شام کی حیثیت دیگر صوبوں کے برابر رہ گئی۔ وہ مخصوص حالات، جنہوں نے امیر معاویہؓ کو تقویت دی تھی اور جو اب تک خاندان بنو امیہ کو فائدہ پہنچا رہے تھے باقی نہ رہے۔ باہمی چپقلشوں نے شام کے بڑے بڑے مراکز قوت حمص، دمشق اور بیت المقدس کو پارہ پارہ کر دیا تھا اور یہ بات محض

انتظامی یا علامتی تبدیلی ہی نہیں تھی کہ مروان ثانی اپنا دربار شام کی بجائے جزیرہ میں حران [رک باں] کے مقام پر منعقد کرنے لگا.

بنوامیہ کا زوال: خلافتِ بنو امیہ کی تباہی جس تحریک [رکّ بہ خلافتِ عباسیہ] کا نتیجہ سمجھی جاتی ہے، اس پر اسرار کے کئی پردے پڑے ہوے ہیں کیونکہ اس کے بارے میں بہت سے سوالات کا جواب نہیں ملتا۔ تاہم واقعات کا بہت طویل سلسلہ پھیلا ہوا ہے اور اس دور میں جتنے نظریات اور توجیہات سامنے آتی ہیں، ان سب کو سامنے رکھا جائے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے.

بنوامیہ کی حکومت کا دارو مدار زیادہ تر یمنی قبائل پر تھا۔ اس لیے ابتدائی دور میں ان کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ ان میں ایک مہلب بن ابی صفرہ خراسانی کا گھرانہ تھا۔ یہ ایک قحطانی سردار اور شان و شوکت رکھنے والا سردار تھا، جس نے خوارج اور ترکوں کا کئی مواقع پر مقابلہ کیا تھا۔ اس کے بیٹے بھی بڑے نامور تھے اس لیے اس خاندان کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ سوے اتفاق سے یزید بن مہلب اور یزید ثانی کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اور اتنا بڑھا کہ ابن مہلب نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے عراق اور خراسان پر قبضہ کر لیا، لیکن آخر میں اسے شکست ہو گئی اور یزید نے پورے گھرانے کو نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کرا دیا۔ اگرچہ یہ واقعہ قبائلی تعصب کا نہ تھا، لیکن چونکہ اموی خلفا مضری اور المہلب یمنی تھے اس لیے یہ قدرتاً قبائلی سوال بن گیا اور دونوں کی عصبیت ابھر آئی۔ بعد ازاں یزید نے یمان کے اقتدار کو گھٹانے کے لیے اپنے بھائی مسلم اور پھر عمرو بن ہبیرہ کو خراسان کا گورنر بنا دیا، لیکن یزید کے بعد ہشام نے یہ پالیسی بدل دی اور پھر یمان کو بڑھانا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس نے یمانی سردار امیر خالد بن عبداللہ قسری کو عراق اور اس کے بھائی اسد کو خراسان کا گورنر بنا دیا اور یمان کا کھویا ہوا اقتدار پھر عود کر آیا اور انہوں نے مضریوں سے بدلہ لینا شروع کر دیا.

لیکن پھر ہشام ہی کے زمانے میں ایسے حالات پیش آگئے کہ یہ صورت حال برقرار نہ رہ سکی۔ ۱۲۰ھ میں اسد بن عبداللہ قسری گورنر خراسان کا انتقال ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خراسان میں عباسی تحریک پھیل رہی تھی۔ امیر نصر بن سیار مضری بڑا مدبر اور تجربہ کار شخص تھا اس لیے ہشام نے عباسی تحریک کے استیصال کے لیے اسے خراسان کا گورنر بنا دیا۔ اسی سال اسد کا بھائی امیر خالد بن عبداللہ شاہی محاصل میں خورد برد کے جرم میں عراق کی گورنری سے برطرف کر دیا گیا اور اس کی جگہ ایک مضری سردار امیر یوسف بن عمر ثقفی کا تقرر ہوا، اس لیے پھر خراسان سے یمانی اثرو اقتدار کا خاتمہ ہو گیا، لیکن ہشام نے یمان کے ساتھ برا سلوک نہ کیا.

ہشام کے بعد ولید نے جو یمان سے تعصب رکھتا تھا، ان کی علانیہ تحقیر و تذلیل اور مضر کی حمایت شروع کر دی۔ اسی زمانے میں امیر نصر بن سیار اور امیر جدیع کرمانی کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے اور یمان و مضر کے [تعلقات کشیدہ ہوگئے] اور دونوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ابومسلم نے اموی حکومت کی طاقت کے مراکز کو ایک ایک کر کے تباہ کرنا شروع کر دیا۔ ابو مسلم فوج کے یمانی گروہ کو ازدی علی بن جدیع الکرمانی کی قیادت میں اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا اور ان کی مدد سے مرو میں داخل ہو گیا، جس کے بعد اس نے جلد ہی قحطبہ بن شبیب الطعری [رک باں] کونصر بن سیار اور اس کے حامیوں کے تعاقب میں مغرب کی طرف روانہ کر دیا جو نیشا پور چلے گئے تھے۔ اس فوج نے نیشا پور پر قبضہ کرنے کے بعد شمال مغربی فارس اور عراق کی طرف پیش قدمی جاری رکھی اور بنو امیہ کی فوج کو قومیس اور

نہاوند میں شکست دے کر کوفہ پر قبضہ کر لیا، جہاں ۱۳۲ھ میں ماہ ربیع الثانی (۷۴۹ء) میں ابوالعباس السفاح کو عباسی خاندان کا پہلا خلیفہ بنانے کا اعلان کر دیا گیا۔

اگلے سال کے آغاز میں بالائی زاب کے مقام پر بنو امیہ کی فوجوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور مروان ثانی شام سے ہوتا ہوا مصر کی طرف فرار ہو گیا۔ عباسی فوج مسلسل تعاقب کرتی رہی۔ شام کے کسی شہر نے، ماسوائے دمشق کے کوئی قابل ذکر مزاحمت نہیں کی۔ تعاقب کرنے والوں نے بالآخر مصر میں مروان ثانی اور اس کے مٹھی بھر ساتھیوں کو قتل کر دیا۔

۴۔ بنو امیہ کے عہد میں عربیت اور اسلامیت کا فروغ: عہد بنو امیہ کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ ان کے دور میں اسلام کو بے پناہ فروغ حاصل ہوا اور اسلامی مملکت کی سرحدیں ایک طرف وسطی ایشیا تک اور دوسری طرف مغرب اور الاندلس تک وسیع ہوئیں۔ یہ وسیع و عریض خطے پہلے مشرف باسلام ہوے اور بعد میں عربیت سے روشناس ہوے۔ اول الذکر مفہوم میں اسلام انفرادی زندگی میں لوگوں کا مذہب اور اجتماعی زندگی میں ان کا طرزِ زیست بن گیا اور عربیت سے آشنا ہونے کا مطلب عربی کا روزمرہ کی زندگی میں ذریعۂ اظہار اور ذریعۂ ابلاغ عامہ بن جانا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بنو امیہ کا دور اقتدار شروع ہونے پر اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں اور عربی بولنے والوں کی تعداد بہت کم تھی اور ان کے اقتدار کے آخری حصے میں ان دونوں امور میں بے حد توسیع ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ اس بارے میں ہمارے پاس شواہد کافی نہ ہوں اور ہمارے اخذ کردہ نتائج تاثر پسندانہ ہوں، لیکن ہمارا عمومی نتیجہ بالکل درست ہے۔

اسلامیت اور عربیت آپس میں مربوط اور منسلک تو تھیں، مگر انہیں قبول کرنے کے طریق ہائے کار لازماً متوارد نہیں تھے۔ بنو امیہ کے زیر اقتدار آنے والے تمام خطے ان سے یکساں حد تک متأثر نہیں ہوے تھے اور نہ ہی یکساں رفتار سے ان کی طرف آگے بڑھے تھے۔ اسلام نے ان خطوں میں ایک ایسے طرز زندگی کے طور پر فروغ حاصل کیا جس میں مذہب ایک ضروری عنصر تو تھا، مگر وہ واحد عنصر نہیں تھا چنانچہ بعض معاشروں میں اسلامیت کو ایک ایسے تہذیبی رویے کے طور پر قبول کیا گیا جس میں اسلام کو باقاعدہ طور پر قبول کرنا ضروری نہیں تھا اور عربوں کے زیر اقتدار علاقوں میں عرب شناخت کا فروغ مخصوص نتائج کا حامل تھا جو خود عربی زبان کے فروغ سے بھی الگ نوعیت رکھتے تھے۔ جب ہم اموی دور میں کسی فرد یا گروہ کے اسلام میں داخل ہونے یا اسلام کو قبول کرنے (یا اس امر کی کوشش) کا کوئی واقعہ پڑھ رہے ہوں تو مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس وقت "قبول" کے لفظ کو مذہبی معنوں میں نہ لیں۔

اسلامیت کے تصور میں ایک سماجی تبدیلی کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے، جس کے اندر مذہبی شناخت کی شعوری تبدیلی ہونا یا نہ ہونا دونوں شامل ہیں، لیکن یہ دونوں اس کے لیے عموماً راہ ہموار کر دیتے ہیں۔ "اسلام" عربی کا لفظ ہے جس کے معنی "اطاعت" کے ہیں اور ایک ایسے وقت میں جب عرب افواج ایشیا اور شمالی افریقہ کے وسیع خطوں میں اپنا سیاسی اور فوجی غلبہ جما رہی تھیں اس لفظ کا ابہام بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح "عربیت" کے تصور میں اس کا رسم الخط اور اس کا ذخیرہ الفاظ شامل سمجھا جا سکتا ہے، مگر اس کے باوجود اہل فارس نے عربی بولنا اور لکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

فاتحین نے مفتوحین پر یہ دونوں باتیں جبراً نافذ کیں اور نہ رعایا نے حاکموں سے یہ عاریتاً لیں، لیکن جب عربوں اور عجمیوں کی ایک مشترکہ تہذیب و ثقافت رائج ہو گئی تو "اسلامیت" اور "عربیت" عملاً وجود میں آ گئیں اور آبادی

کے دو عناصر ان سے متاثر ہوے۔ یہ کہنا بعید از قیاس ہوگا کہ عرب آبادی "اسلامیت" اور "عربیت" سے اسی طرح متاثر ہوئی جس طرح عجمی آبادی نے ان کا اثر قبول کیا لیکن یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ مذہب اسلام اور عربی زبان کی وہ شکلیں جن سے آج ہم آگاہ ہیں، نئی جنم لینے والی تہذیب و ثقافت میں از خود نمو پذیر ہوئیں۔ عربوں کے زیر اقتدار بسنے والے عجمیوں نے جو عربی [رکّ بہ: العربیہ] بولنا اور لکھنا شروع کی، اس سے عربی کی کئی نئی شکلیں اور بولیاں وجود میں آ گئیں، ان کا تلفظ، گرامر اور ذخیرہ الفاظ مقامی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اسی طرح اسلام بھی عربوں اور عجمیوں کا مشترک معاشرہ وجود میں آنے کی وجہ سے مقامی طور پر متشکل ہوا۔ یہ دونوں طبقے اس سے متاثر بھی ہوے اوراس کی ہیئت پر اثر انداز بھی ہوے.

ہمارے اسلامی ادبی مصادر و منابع میں بنو امیہ کے دور میں ہونے والی علاقائی توسیع واضح طور پر جھلک رہی ہے، اس کی وجہ سے عربی زبان اور اسلامیت بھی متاثر ہوئی۔ مغرب کی جانب ۵۰ھ/۶۷۰ء میں القیروان [رک بآں] کے مصر کی بنیاد کو ملحوظ رکھتے ہوے بربروں کو مطیع بنانے کے بعد انہیں فوج میں بھرتی کر لیا گیا تاکہ وہ عربوں کے دوش بدوش جنگوں میں شریک ہو سکیں۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری کے اواخر (آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل) میں عبدالملک اور الولید کے زمانے میں عرب اور بربر فوجیں جزیرہ نمائے آئبیریا کو عبور کر کے اندلس میں لڑنے کے لیے پہنچ گئیں۔ تقریباً اسی زمانے میں افغانستان اور ماوراء النہر میں مسلمانوں نے خاصی پیش قدمی کر لی۔ حجاج بن یوسف نے ابن الاشعث، قتیبہ بن مسلم اور محمد بن قاسم [رک بآں] کو وسطی ایشیا کی فتوحات کے لیے بھیج دیا۔ ہشام کے زمانۂ حکومت میں سوغدیہ اور طخرستان میں مسلمانوں نے اپنا خاصا مضبوط تسلط قائم کر لیا جس کی وجہ سے وہ ترک قبیلوں کے لیے خطرہ بن گئے۔ تاہم اس کے برعکس شام کے شمال میں بیزنطینی علاقے پر بنو امیہ کے حملے جن میں استانبول [رک بہ قسطنطنیہ] پر حملہ بھی شامل تھا، ناکام رہے.

بنو امیہ کے دور میں عجمی آبادی کے قبول اسلام کی دستاویزی شہادتیں معقول تعداد میں دستیاب نہیں ہیں۔ روایتی مسلم منابع سے اشارہ ملتا ہے کہ اموی گورنر اور اعیانِ حکومت عجمیوں کو "موالیوں" کا درجہ پانے سے روکتے رہتے تھے۔ مسیحی ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ کسی کسی گاؤں کی پوری آبادی کے مشرف با اسلام ہو جانے کی اطلاعات ملتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے بحث ہوتی رہتی تھی کہ جس شخص نے عربوں کا مذہب اختیار کر لیا، وہ اگردوبارہ عیسائی بن گیا تو کیا اسے از سر نو بپتسمہ دیا جائے گا یا نہیں؟ [دیکھیے E.Montet RHR، ۵۳ (۱۹۰۶ء) در F.Cumont، در کتاب مذکورہ، ۶۴، (1911)]

ایک بات سمجھنے میں ذرا مشکل پیش آتی ہے کہ اسلام قبول کرنے کے کیا معنی تھے، چونکہ مذہب اور اسلامی کلچر ایک ساتھ فروغ پا رہے تھے۔ جب کوئی شخص یا گروہ مذہب قبول کرتا ہے وہ اسے فروغ دیتا ہے اور اس کے کلچر کو بھی اختیار کرتا ہے۔ سنی مسلمان ہونے کا مطلب یہ ہے تھا کہ وہ سنتِ رسولؐ کو ماخذِ قانون سمجھتا ہے اور علما کو اس قانون کا شارح مانتا ہے۔ یہ تصور عہدِ بنو امیہ کے اواخر میں پیدا ہونا شروع ہوا تھا اور بنو امیہ کے اقدامات اور ان کے دعووں کے جواب میں ابھرا تھا۔ [رکّ بہ فقہ]۔ جہاں تک مآخذ کا تعلق ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں پیغمبر اسلامؐ کے ماخذ اقتدار ہونے کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ کم از کم شروع کے اموی خلفا اور ان کے نمائندے اس سے بالکل لاپرواہ تھے۔ ادبی منابع کے مطابق انہوں نے خود کو خلیفۃ الرسول کی بجائے خلیفۃ اللہ کہنا اسی

لیے شروع کیا تھا کہ وہ اپنی خلافت کو [رسول اکرمؐ کی سنت کی پابندی] سے برتر سمجھتے تھے (دیکھیے خالد القسری، منقول درالطبری، ۲:۱۱۹۹)۔ عہد بنو امیہ میں مختلف اوقات میں اٹھنے والی شیعہ تحریکیں، اپنے مقاصد، طریق کار اور اصولوں میں ایک دوسری سے اتنی زیادہ مختلف تھیں کہ ان سب کو یکجا کیا جائے تو ان کے مقابلے میں "سنیت" کی کوئی شکل ہی دکھائی نہیں دیتی تھی، ان تحریکوں کے مابین اس کے سوا کوئی بات مشترک نہیں کہ وہ اقتدار کا حقیقی منبع ، بنو امیہ کو نہیں بلکہ خاندانِ نبوت کو مانتے تھے (:W.M.Watt, Shicism under the Umayyads، در JRAS (۱۹۶۰ء) تاہم دور عباسی میں سنی اور شیعہ روایات کو استحکام حاصل ہو گیا اور ان کی خصوصیات واضح ہو گئیں.

بنوامیہ کے دور میں عبادات اور رسوم سے متعلق شہادتیں نسبتاً کم ملتی ہیں اور جو ملتی ہیں ان کی متنوع تعبیریں سامنے آتی ہیں [رکّ بہ حج، قبلہ، رمضان، صلوٰۃ اور صوم] دینیات اور عقائد کی صورت حال بھی یہی ہے۔ البتہ بعض معاملات پر بحث مباحثہ کی کافی شہادتیں ملتی ہیں، جیسے گناہ گار مسلمان کی حیثیت [رکّ بہ ایمان]، جسم انسانی میں روح پاک کا حلول کرنا [رکّ بہ تشبیہ]، انسان کا خود مختار ہونا اور خدا کی طرف سے تقدیر کا لکھ دیا جانا [رکّ بہ قدریہ]۔ یہ عقائد اموی دور میں پیدا ہوتے رہے اور ان کے مطابق بعض خلفا اپنی پالیسیاں بھی وضع کرتے رہتے تھے.

غالبًا بنوامیہ کے تصورِ اسلام کی نمایاں خصوصیت جس کا بعد میں پیدا ہونے والے علم و ادراک سے کوئی تعلق نہیں، یہ تھی کہ اسلام صرف عربوں کا مذہب ہے اور اس میں داخل ہونے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آنے والا شخص عرب معاشرے میں ضم ہو جائے۔ ایک عجمی غیر مسلم کے لیے اسلام میں داخل ہونے کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی عرب کا حاشیہ نشین بن جائے اور اس کے ذریعے عرب قبیلے سے منسلک ہو جائے۔ اس تصور مذہب سے لے کر اس تصور تک سفر جو کہ مذہب سے وابستگی اور نسلی قبیلے سے وابستگی میں امتیاز کرتا ہے اور جو اسلام کو سب کے لیے کھلا مذہب قرار دیتا ہے خواہ وہ عرب ہو یا نہ ہو، عہد امیہ کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ اس سفر کو روکنا ان خلفا کے بس میں نہیں تھا اور اس کا جاری رہنا بنو امیہ پر لحہ بہ لحہ کمزوری طاری ہونے کا مظہر تھا اور بالآخر ان کا یہی تصور مسلم روایت میں اس خاندان کے حصے میں آیا۔

مآخذ: اس سارے عہد سے متعلق مکمل کتابیات دینا ممکن نہیں ہے۔ بیان کردہ چند کتابیات اس مواد سے متعلق ہیں جو (Levi Della vida)، نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، بار اول، میں امیہ، بنو کے عنوان سے چھپوایا ہے یا جو عام دستیاب ہے ۔ مزید مکمل فہرست کے لیے قاری کو ذیل کی کتب کامطالعہ کرنا چاہیے:

(الف) روایتی اسلامی ادب: معروف تاریخی کتب اور روایتی ادب کی کتابیں جو (۱) الطبری (مکمل انگریزی ترجمہ چھپ چکا ہے: *The History of at-Tabari*، ۳۹ جلدیں، Albany ، نیو یارک)؛ (۲) الیعقوبی؛ (۳) الدینوری (ان کی جن دو کتابوں کا ذکر لیوی ڈیلا ویڈا (*Levi Della vida*) نے کیا ہے وہ جزوی طور پر چھپ گئی ہیں؛ اس کے علاوہ (۴) انساب الاشراف مصنفہ البلاذری، اب عام دستیاب ہے؛ (ج ۱؛ طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ۱۹۵۹؛ ج ۲؛ طبع عبدالعزی الدوری، بیروت ۱۹۷۸؛ ج ۳ طبع ایم بی، المحمودی ، بیروت ۱۹۷۴-۱۹۷۷؛ ج ۴، طبع M.Scholessinger، نظرثانی اور شرح M.J.Kister، القدس ۱۹۷۱؛ ج ۴؛ طبع احسان عباس ویزبیڈن ۱۹۷۹؛ (ج ۴) طبع M.Scholessinger، القدس ۱۹۳۸ء ؛ ج ۵ طبع S.D.Goitein القدس ۱۹۳۶؛ ج ۶؛ طبع خواجہ عثامنا القدس ۱۹۹۳ء)۔ خلافت الولید ثانی کے لیے دیکھیے(۵) D.Derenk: *Leben und Dichtung des*

Omaiyadenkplifen al-walid ibn yazid، فرایبرگ ام بریسگو ۱۹۷۴ء؛ امیر معاویہؓ کے بارے میں اطالوی ترجمہ کے لیے دیکھیے؛ (۶) IL :O.Pinto and G.Levi Della Vida Callifo Mu,awiya I Secondo il "Kitab Ansab al Asraf" ، روم ۱۹۳۸ء؛ (۷) العباسی: الاعلام بالحروب الواقعہ فی صدر الاسلام، طبع شیخ احمد محمود عمان(؟) ۱۹۸۷ء، دیگر قابل ذکر متون میں سے جن میں (۸) الجہشیاری: کتاب الوزراء والکتاب، طبع السقا قاہرہ ۱۹۳۸ء؛ (۹) جاحظ: رسالہ فی بنی امیہ فرانسیسی ترجمہ از Ch.Pellat: la "nabita" di Djahiz،در ALEOV، الگر، ۱۹۵۲ء؛ (۱۰) مصعب الزبیری، نسب قریش طبع، E.Levi-Provencal، قاہرہ ۱۹۵۳ء؛ (۱۱) الصفدی: کتاب امرائے دمشق طبع صلاح الدین المنجد، دمشق ۱۹۵۵ء؛ (۱۲) W.Caskel and G.Strenziok : Gamharat-un-nasab: Das genealogische werk des Hisam b.Muhammd al-katbi، دو جلدیں؛ لائیڈن ۱۹۶۶ء؛ (۱۳) خلیفہ بن خیاط: تاریخ، ۲ جلدیں :طبع اے ڈی العمری، نجف ۱۹۶۷ء؛ (۱۴) وہی مصنف: کتاب الطبقات ، طبع اے ڈی العمری ، بغداد ۱۹۶۷ء؛ (۱۵) ابن اعثم الکوفی: کتاب الفتوح ۸ جلدیں، حیدرآباد ۷۵-۱۹۶۸ء؛ (۱۶) المقریزی: النزاع والتخاصم فیما بین امیہ و بنی ہاشم' انگریزی ترجمہ از C.E.Bosworth؛ (۱۷) المقریزی: "Book of Contentions and strife" مانچسٹر ۱۹۸۰ء؛(۱۸) الذہبی: تاریخ اسلام، طبع التدمری، بیروت ۱۹۹۱ء؛ (۱۹) M.Hinds: An Early Islamic Family from Oman:Al-awtabi's Account of the Muhallabids، مانچسٹر ۱۹۹۱ء؛ (۲۰) ابن عساکر: تاریخ مدینۃ الدمشق جس میں امیہ کی تاریخ سے متعلق کافی تفصیلی مواد موجود ہے، فی الحال نا مکمل ہے لیکن اس کا متن لیتھو گراف (۱۹ جلدیں دارعمان میں) دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ ابن منظور کی مختصر تاریخ لابن عساکر (دمشق ۱۹۸۹ء) بھی دیکھی جا سکتی ہے.

۲۔ مطالعہ متعلقہ اسلامی ادب: (۲۱) G.Rotter، Abu-Zur'a Al-damasqi (ST.281/894) das problem، der fruhen arabischen Geschichts schreibung، در wo، ج ۶ (۱-۱۹۷۰ء)؛ (۲۲) U.Sezgin: Abu Mihnaf Ein beitrag zur Historiographie der umaiyadischenzeit لائیڈن ۱۹۷۱ء؛ (۲۳) F.M.Donner: The Problem of Early Arabic Historiography in Syria، در، محمد علی البخیت (مدیر): Proceedings of the Second Symposium on the History of Bilad al-sham، عمان، ۱۹۸۷ء؛ (۲۴) Ella Landau-Tasseron: Sayf ibn' umar in the Medieval and Modern Scholarship، دراسلام، شمارہ ۲۵، ۶۷ (۱۹۰۰ء)؛ (۲۵) G.Condard und Seine scriften, Abu'l Husain: al Razi 347/958 سٹورٹ گرٹ، ۱۹۹۱ء؛ (۲۶) S.Leder: The literary use of the Khabar: A basic form of Historical Writing، در A. Cameron and L.I.Conard (مدیران): The Byzantine and Early Islamic Near East. Problems in the Literary Source Material، پرنسٹن ۱۹۹۲ء؛ (۲۷) A.Noth (in collaboration with L.I.conrad and tr.by A M.Bonner source of The early Arabic historical tradition : critical study، پرنسٹن ۱۹۹۴ء.

۳۔ دیگر مصادر: (۲۸) J.A.Walker: A catalogue of the Arab-byzantine and post-reform Umaiyad coins، لنڈن، ۱۹۵۶ء؛ (۲۹) S.P.Brock: Syriac sources for 7th century History، در Byzantine and Modern Greek Studies ۱۹۷۶ء؛ (۳۰) وہی مصنف: North Mesopotamia in the late 7th century: Book xv of John bar

Penkay's Ris Melle، در JSAI ۱۹۸۷ء؛ (۳۱)
J.f.Healey: Syriac sources and the Umayyad period، در M. A Bakhit و R. Schick (مدیران): The Fourth International Conference on the History of Bilad Sham، عمان ۱۹۸۹ء؛ (۳۲) J.M Fiey: The Umayyads in Syriac Sources، در کتاب مذکور؛ (۳۳) M.L Bates: The Coinage of Syria Under the Umayyads، ص ۱۹۲ـ۲۵۰ء، در کتاب مذکور؛ (۳۴) L.I Conrad: Theophanes and the Arabic Historical Tradition Indications of Intercultiural، در Byzantinsche Forschungen ۱۵ (۱۹۹۰ء)؛ (۳۵) A. Palmar: The Seventh century in the West-syrian Chronices، لیور پول ۱۹۹۳ء، (۳۶) R. Hoylahd: The Islam as other saw it، پرنسٹن ۱۹۹۶ء؛
۴۔ جدید: (۳۷) J.Wellhausen: Das arabische Reich and sein sturz، برلن ۱۹۰۲ (انگریزی ترجمہ The Arab Kingdom and its Fall، کلکتہ ۱۹۲۷؛ (۳۸) C.H.Becker: Studien Zur Omajjadengeschichte Omer II، در، شمارہ ۱۵ (۱۹۰۰)؛ (۳۹) وہی مصنف: Beitrage Zur Geschichte Agypeng unter dem Islam ii، ج۲، سٹراسبرگ، ۱۹۰۳ (۴۰) وہی مصنف: Islam studien، لائپزگ، ۱۹۲۴؛ (۴۱) H.lammens: Etudes sur le regne du calife Omaiyade Mo'awia، پیرس ۱۹۰۸ء؛ (۴۲) وہی مصنف: Mo'awia II ou le dernier des sofianids، در RSO,vii (۱۱۹۶-۱۹۱۶) (۴۳) وہی مصنف: Le califat di Yazid ler، بیروت ۱۹۳۰؛ (۴۴) وہی مصنف: Etudes sur le siecle des omayyades، بیروت ۱۹۳۰؛ (۴۵) F.Gabriele: Il califatto di Hisham studi di storia omayyade، اسکندریہ ۱۹۳۵؛ (۴۶) D.C.Dennett: Conversion and the Poll-tax in early Islam، کیمبرج میسا چیوٹس ۱۹۵۰؛ (۴۷) H.A.R.Gibb: The Fiscal Recript of Umar II، در Arabica، (۱۹۵۵)؛ (۴۸) Ch.Pellat: Le milieu basrien et la formation de Gahiz، پیرس ۱۹۵۳؛ (۴۹) Lecilte de Mucawiya au IIII Seicle de Lhegire، در SI، ۵، ۱۹۵۶ء، (۵۰) وہی مصنف، Ali and Mu'awiya in early Arabic tradition، کوپن ہیگن ۱۹۶۴ء (۵۱)؛ R.Sellheim: Der Zeeite Burgerkrieg in Islam، ویزبیڈن، ۱۹۷۰ء، کوپن ہیگن ۱۹۶۴؛ (۵۲) M.A.Shaban: The Abbasid Revolution، کیمبرج، ج: ۱۹۷۰ء، (۵۳) وہی مصنف مذکور: Islamic History. A New Interpretation، کیمبرج ۱۹۷۱؛ (۵۴) A.A.Dixon: The Umayyad caliphate، لنڈن، ۱۹۷۱؛ (۵۵) A.North: Zum verhaltnis von kalifaler zentralgewalt und provinzen in umayyadischer zeit. Die 'sulh'-'Anwa'-Traditionen fur Agypten und den Iraq، در wl, xiv ، W، ۱۴ (۱۹۷۳)؛ (۵۶) وہی مصنف: Some remarks on the "Nationalization" of Conquered Land of the Time of the Umayads، در T.Klalidi، Land tenure and Social Transformation in the Middle East، بیروت ۱۹۸۴ء؛ (۵۷) وہی مصنف U.Haarman: Fruher Islam (مدیر) Geschichte der arabischen welt، میونخ ۱۹۸۷ء؛ (۵۸) ابن ـ عقیل، تاریخ خلافت بنی امیہ، بیروت ۱۹۷۵ء؛ (۵۹) رضوان سید: Die Revolte des Ibn Al-Ash'ath und die Koranleser، فرائبرگ ۱۹۷۷ء؛ (۶۰) W.Ende: Arabische Nation and Islamisce Geschichte.Die Umayyaden in Urteil arabischer Autoren des 20

Fahrhundrets، بیروت ۱۹۷۷ء؛(۶۱) Patricia Crone
Hagarism, M.Cook and کیمبرج،۱۹۷۷ء؛ (۶۲)
P.Crone: کیمبرج on Horses ،۱۹۸۰ء، وہی، (۶۳) مصنف
Roman Prowinceal and Islamic law: ، کیمبرج ۱۹۸۰ء؛
(۶۴) Were the Qays and Yemen of the Umayyad :
Period Potitical Parties? ، در in Isl,xxi ، ISL
(۱۹۹۴) (۶۵) M.Hinds: God's Caliph ،کیمبرج، (۱۹۸۶)
(۶۶) : G.Rother: Die Umayyaden und der Zweite
Burgerkrieg (۶۸۰-۶۹۲)، ویزبیڈن ۱۹۸۲ء؛ (۶۷)
M.Sharon: Black Banners from the East، یروشلم و
لائیڈن ۱۹۸۳ء؛ (۶۸) M.G.Morony: Iraq after the
Muslim conquest، پرنسٹن ۱۹۸۴ء؛ (۶۹) Hichem
Djait: Al-Kufa naissance de la ville islamique، پیرس
۱۹۸۶ء؛ (۷۰) H.Kennedy: The Prophet and the age
of the Caliphate، لنڈن ، ۱۹۸۶ء؛ (۷۱)
G.R.Hawting: The First Dynasty of Islam، لنڈن
۱۹۸۶ء؛ (۷۲) M.A.Bakhit and R.Schick:(مدیران):
: The Fourth International conference of the
History of Bilad al-sham during the Umayyad
Period، عمان ۱۹۸۹ء؛ (۷۳) I.Hasson: Les mawali
dans L'armee musulmane sous les premiers
umayyades, xiv، در JSAL ، ۱۴، ۱۹۹۱ء؛ (۷۴) J.Raby
and J.Johns:(مدیران): Bayt al-Maqdis abd
Al-Malik's jerusalm، آکسفوڈ ۱۹۹۲ء؛ (۷۵)
G.conrad: Die Qudat Dimasq und der Madhab
al-Auzat،بیروت ۱۹۹۴ء.

(G.R.Hawting [ت محمد یحییٰ خان])

••-------------••

امیہ، بنو:(تعلیقہ) خلافت راشدہ کے بعد پہلا ⊗ عرب حکمران خاندان (دور حکومت ۴۱ تا ۱۳۲ھ/ ۶۶۱ء تا ۷۵۰ء)۔ یہاں اس خاندان کی سیاسی تاریخ ، اس عہد کی دینی، سیاسی اور اصلاحی تحریکوں، اہم خصوصیات، کامیابیوں، ناکامیوں اور اسباب زوال کا ذکر کیا جائے گا۔

ا۔ سیاسی تاریخ: امیہ خاندانِ قریش کا ایک بڑا سردار تھا۔ اس کے بیٹے حرب کی اولاد میں سے حضرت امیر معاویہؓ بن ابو سفیان ، یزید اور معاویہ ثانی بنو امیہ کے پہلے تین خلفا تھے۔ اس کے بیٹے عاص میں سے مروان بن الحکم سے لے کر مروان ثانی تک گیارہ خلفا ہوے۔ اول الذکر گروہ کو سفیانی اور دوسرے کو مروانی کہا جاتا ہے۔ عرب معاشرہ قبائلی تھا اور بنو ہاشم اور بنو امیہ میں بعثت نبوی سے پہلے بھی باہمی مقابلے اور مخالفت کی فضا موجود تھی۔ عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے اوّلیں دور میں یہ مخالفت دبی رہی، لیکن حضرت عثمانؓ [رک بآں] کی نرم مزاجی سے فائدہ اٹھا کر عبداللہ بن سبا اور دوسرے اسلام دشمن عناصر ان دونوں قبیلوں میں مخالفت کی آگ بھڑکانے میں کامیاب ہو گئے۔ امیر معاویہؓ [رک بآں] حضرت عمرؓ [رک بآں] کے زمانے سے شام کے گورنر تھے۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ (اموی) کی شہادت کے بعد حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ (ہاشمی) کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور ان سے حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کیا۔ اس پر فریقین میں جنگیں ہوئیں جو فیصلہ کن ثابت نہ ہوئیں تاہم حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسن بن علیؓ خلافت سے رضا کارانہ دستبردار ہو گئے اور یوں ان سے ایک معاہدے کے نتیجے میں حضرت معاویہؓ نے ۴۱ ھ میں سارے مسلم علاقے کی حکومت سنبھالی۔ حضرت معاویہؓ زیرک، مدبر، حلیم، معاملہ فہم اور مدبر سیاستدان تھے۔ انہوں نے مضبوط گورنروں کے ذریعے کامیابی سے حکومت کی، محل بنائے، حاجب مقرر کیے،

بحری فوج بنائی، قسطنطنیہ پر حملہ کیا، افریقہ اور خراسان (موجودہ افغانستان) میں فتوحات حاصل کیں، بلکہ ان کا سپہ سالار مھلب بن ابی صفرۃ لاہور تک آپہنچا (البلاذری، فتوح البلدان، ص ۴۳۸)۔ انہوں نے ترغیب و ترہیب سے کام لے کر اپنے بیٹے یزید کی ولیعہدی کی بیعت لی اور اس طرح اسلام میں ملوکیت کی بنیاد رکھی، وہ خود تسلیم کرتے تھے کہ انا اول الملوک (تاریخ یعقوبی، ۲ : ۲۷۶)۔ یعنی میں پہلا بادشاہ ہوں۔ وہ صحابی رسولؐ تھے، ان سے کئی احادیث مروی ہیں اور وہ اپنے اعمال کی تاویل کرتے تھے۔

حضرت معاویہؓ نے تقریباً بیس سال حکومت کی اور جب ۶۰ ھ میں ان کا انتقال ہوا تو یزید خلیفہ بنا۔ وہ شاعر، شکار کا رسیا اور لہو و لعب کا عادی تھا۔ بعض جلیل القدر صحابہ نے اس کی امارت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے تو باقاعدہ مزاحمت کی۔ کوفہ کے گورنر ابن زیاد نے حضرت حسینؓ سے زبردستی بیعت لینا چاہی اور انکار پر کربلا کے میدان میں انہیں مع خاندان شہید کر دیا۔ حجاز پر قابو پانے کے لیے اس نے فوج بھیجی جس نے مدینہ پر حملہ کر کے اہل شہر کو ذلیل و رسوا کیا۔ پھر اس فوج نے مکہ پر حملہ کیا اور کعبہ کا محاصرہ کر لیا جہاں ابن زبیرؓ پناہ لیے ہوئے تھے۔ اس اثنا میں یزید فوت ہوگیا اور فوج واپس چلی گئی۔ یزید کے بعد اس کے بیٹے معاویہ ثانی کی باری آئی، لیکن وہ بیمار تھا اور چالیس دن بعد فوت ہوگیا۔ اس نے کسی کو ولی عہد بنانے سے بھی انکار کر دیا اور معاملہ مسلمانوں پر چھوڑ دیا (الکندی، کتاب الولاۃ و القضاۃ، ص۴۵)۔ اس سے معاشرے میں انتشار اور خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ حجاز پر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی حکومت قائم ہو گئی، جبکہ شام میں بنو امیہ کا زور تھا۔ پھر بڑے عرب قبیلے بھی تقسیم ہو گئے۔ بنو قیس نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا ساتھ دیا، جبکہ بنو کلب نے بنو امیہ کا۔ پھر بنو کلب میں بھی پھوٹ پڑ گئی اور ان میں سے بعض خالد بن یزید سے مل گئے اور بعض مروان بن الحکم سے۔ ایک موقع پر تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت سارے مسلم علاقوں پر قائم ہو گئی، لیکن پھر (ذوالقعدہ ۶۴ھ میں) موتمر الجابیہ میں بنو امیہ مروان بن الحکم پر متحد ہو گئے اور انہوں نے مرج راہط کے مقام پر حضرت ابن زبیرؓ کے لشکر کو فیصلہ کن شکست دے کر شام اور مصر پر قبضہ کر لیا۔ باقی علاقوں پر زبیریوں کی حکومت چند سال قائم رہی، لیکن رفتہ رفتہ بنو امیہ کے حامی زور پکڑتے گئے اور مروانی سلطنت کی راہ ہموار ہوتی گئی لیکن مروان صرف ۹ ماہ حکومت کر سکا اور (۶۵ھ) میں خالد بن یزید کی ماں نے جو یزید کی موت کے بعد مروان کے نکاح میں تھی اسے سوتے ہوئے قتل کر دیا (تاریخ الطبری، ۷:۸۳)۔ مروان قرآن کا عمدہ قاری اور کثیر التلاوت تھا، اس نے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ جیسے جلیل القدر صحابہؓ سے کئی احادیث روایت کی ہیں۔

عبدالملک کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک ۳۹ سال کی عمر میں خلیفہ بنا۔ وہ نہایت عالی حوصلہ، شجاع اور مدبر تھا۔ اس نے مضبوط والیوں (عراق و حجاز میں حجاج بن یوسف اور مصر میں اپنے بھائی عبدالعزیز) اور بہادر سپہ سالاروں (خراسان و ایران میں مہلب بن ابی صفرہ اور مغرب میں موسیٰ بن نصیر) کے ذریعے اپنے طاقتور دشمنوں (زبیریوں، خوارجیوں اور شیعوں) کو شکست دی اور ملک میں امن و امان بحال کیا۔ اس وقت تک مملکت اسلامی میں رومی سکّے ہی رائج تھے، لیکن رومی بادشاہ کی اس دھمکی پر کہ وہ سکوں پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ کلمات کندہ کروائے گا، عبدالملک نے رومی سکوں کا ملک میں داخلہ بند کر دیا اور خود سکّے ڈھالنے کا کام شروع کروادیا۔ اس طرح اس نے حکومتی ریکارڈ کو بھی عربی زبان میں منتقل

کرنے کا حکم دیا (گویا عربی کو سرکاری زبان قرار دیا)۔ اس نے تعمیر و ترقی کی طرف بھی توجہ دی اور قبۃ الصخرہ تعمیر کروایا۔ عبدالملک عالم و فاضل شخص تھا ۔ اس نے مدینہ کے کبار علما سے تفسیر، حدیث اور فقہ کاعلم حاصل کیا تھا، قرآن حکیم حضرت عثمانؓ بن عفان سے حفظ کیا اور جلیل القدر صحابہ (جیسے حضر ت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو سعید الخدریؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ وغیرہ) سے حدیث کی روایت کی (ابن سعد: طبقات، ۵:۱۷۳)۔ وہ ۶۲ھ میں حضرت زید بن ثابتؓ کے بعد مدینہ کا قاضی مقرر ہوا۔ وہ فصیح اللسان، ادیب اورنقطہ رس نقاد تھا۔ اہل ادب کے ساتھ اس کی مجالست کی روداد یں اور اس کی خطابت کے نمونے کتب ادب میں اب بھی ملتے ہیں (دیکھیے مثلاً العقد الفرید ۱:۲۸۸)۔

جب عبدالملک ۸۶ ھ میں فوت ہوا تو اس کے بیٹے ولید نے اس کی جگہ لی۔ ولید کا عہد حکومت اسلامی فتوحات اور ترقیاتی و فلاحی کاموں کے لحاظ سے سب سے بڑھ گیا ۔ اس کے نامور جرنیلوں میں سے قتیبہ بن مسلم نے افغانستان سے آگے بڑھ کر موجودہ وسط ایشیائی ریاستوں کا علاقہ بخارا، سمر قند ،کاشغر اور خیوہ فتح کیا اور چین کی سرحد پر جا پہنچا جس کے بادشاہ نے جزیہ دے کر اطاعت قبول کرلی۔ محمد بن قاسم سندھ کو فتح کرتا ہوا ملتان تک آپہنچا اور اگر اسے واپس نہ بلا لیا جاتا تو وہ یقیناً مزید علاقے فتح کر لیتا۔ اسی طرح موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد نے اسپین اورپرتگال کا علاقہ فتح کر لیا اور مغرب اقصیٰ کے اکثر علاقوں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ولید کے بھائی مسلم نے رومیوں پر مسلسل یلغار جاری رکھی اور ان سے کئی علاقے چھین لیے۔مسلم بحری بیڑے نے بحر اوقیانوس میں جزائر بلیارک پر قبضہ کر لیا۔ ولید کو تعمیراتی کاموں سے بہت دلچسپی تھی اس نے مسجد نبوی کی توسیع کی اور اسے از سرنو تعمیر کیا ۔دمشق کی جامع اموی ابھی تک اس کی یادگار ہے۔

اس نے سڑکیں بنوائیں اور رستوں پر کنو یں کھدوائے، مسافروں کے لیے مہمان خانے اور مریضوں کے لیے شفا خانے بنوائے ۔ علماء و فقہا کے وظیفے مقرر کیے، تیموں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا، معذوروں کے بھیک مانگنے پر پابندی لگائی اور بیت المال سے ان کے لیے وظیفے مقرر کیے۔ اس نے ہر معذور اور نابینا کے لیے ایک خدمت گار حکومت کی طرف سے مہیا کیا۔ ذاتی طور پر وہ مذہبی زندگی گزار تا تھا، تین دن میں قرآن ختم کرتا، ہر پیر اور بدھ کو روزہ رکھتا، قرآن حفظ کرنے والے کو عطیات سے نوازتا اور رمضان میں مسجدوں میں افطار کا اہتمام کرواتا تھا.

ولید کے بعد اس کا بھائی سلیمان سریر آرائے خلافت ہوا جونیک خو ہونے کے ساتھ متلون مزاج اور غیر متوازن شخصیت رکھتا تھا، چنانچہ اس نے جہاں اپنے بھائیوں اور بیٹوں کو چھوڑ کر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جیسے شخص کو ولی عہد نامزد کرنے کا عمدہ اور دلیرانہ کام کیا، وہیں وہ قتیبہ بن مسلم، محمد بن قاسم اور موسیٰ بن نصیر جیسے سپہ سالاروں کی معزولی اور تعذیب کا سبب بھی بنا، بلکہ اول الذکر دو کی موت بھی اسی کی پالیسیوں کا شاخسانہ تھی۔ اس کے عہد میں فسق و فجور کو بھی ترقی ہوئی، کیونکہ وہ خود اچھے کھانوں اور عیش و عشرت رسیا تھا۔ اس کے عہد میں قسطنطنیہ پر ایک بڑا حملہ کیا گیا جس میں مسلمانوں کو بہت نقصان اٹھا نا پڑا۔ سلیمان صرف اڑھائی سال برسر اقتدار رہا اور اس کے بعد خلافت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حصے میں آئی۔ انہوں نے اس انداز سے حکومت کی کہ لوگ عام طور انہیں کو پانچویں خلیفہ راشد کے لقب سے پکارتے ہیں۔ انہوں نے خلافت کو شوریٰ کی طرف لوٹایا (اگرچہ اپنے بعد اس کے تسلسل کا انتظام نہ کر سکے کیونکہ سلیمان نے آل عبدالملک کے دباؤکے پیش نظر انہیں ولیٔ عہد نامزد کرنے کے ساتھ ہی اپنے بھائی یزید (ثانی) کو ولی عہد دوم نامزد

امیہ، بنو (تعلیقہ)

کر دیا تھا اور خود وہ اس کے لیے کوئی منصوبہ بندی اس لیے نہ کر سکے کہ انہیں محض دو سال پانچ ماہ بعد ۳۹ سال کی عمر میں زہر دے کر اچانک مروا دیا گیا)۔ انہوں نے بیت المال کو مسلمانوں کی ملکیت بنا دیا۔ شاہی خاندان کو عطیات میں دوسروں کے برابر کر دیا اور جو عطیات ناجائز طور پر ان کو دیئے گئے تھے وہ ان سے بالجبر واپس لے کر داخل بیت المال کیے۔ نو مسلموں سے جزیہ لینا بند کر دیا ،ظالمانہ ٹیکس معاف کر دیئے، اشاعت اسلام کے لیے ترغیبات دیں اور لوگ اس کثرت سے مسلمان ہوے کہ بیت المال کی آمدنی کم ہو گئی۔ جس پر والی مصر نے توجہ دلائی تو اسے ڈانٹتے ہوے تاریخی جملہ کہا کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے جابی (ٹیکس کلکٹر) نہیں" (طبقات ابن سعد ۵:۲۵۸)۔انہوں نے ظالم اور جابر والیوں کو ہٹا دیا ۔ قانون و انصاف کو طاقت ور بنایا اور غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ کیا۔ مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی بد اخلاقی کے خلاف بند باندھنے کی کوشش کی۔ شراب کی خرید و فروخت بند کر دی۔ عورتوں کو حماموں میں جانے سے منع کر دیا۔ انہوں نے رفاہی کاموں کی طرف بھی توجہ دی۔ سرائیں بنوائیں،معذوروں کی مکمل فہرستیں بنوا کر ان کی مستقل تنخواہیں مقرر کیں۔ بچوں کے لیے بھی وظیفہ مقرر کیا (ابن الجوزی: سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ،ص ۱۰۲بعد).

ان کے بعد یزید (ثانی) بن عبدالملک رجب ۱۰۱ ھ میں خلیفہ بنا جو لہو و لعب کا رسیا تھا۔ وہ زیادہ وقت اپنی دو باندیوں حبابہ اور سلامہ کے ساتھ گزارتا تھا۔ اول الذکر جب بیمار پڑی تو وہ کار خلافت چھوڑ کر اس کی تیمارداری میں لگا رہا اور جب وہ مر گئی تو اس کی میت کے پاس سے ہٹتا نہ تھا۔ کئی دن بعد اس کے دفن کی اجازت دی اور اس کے غم میں خود بھی چند دن بعد انتقال کر گیا۔ یزید ثانی نے چار سال حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بھائی ہشام خلیفہ بنا جو بیدار مغز، صاحب کردار، کفایت شعار اور اچھا منتظم تھا اس نے بیس سال حکومت کی اور مملکت کو استحکام بخشا۔ اس نے نہ صرف شورشوں اور بغاوتوں کو کامیابی سے فرو کیا بلکہ فتوحات کا دائرہ بھی بڑھایا۔ اس کے عہد میں وسطی ایشیا میں نصر بن سیار اور مروان بن عبدالملک نے سلطنت خزر کے رومی حکمرانوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ والی اندلس عبدالرحمٰن جنوبی اور مغربی فرانس کو فتح کرتا ہوا پیرس کے قریب جا پہنچا، لیکن یورپ کی متحدہ فوج سے جیت نہ سکا ۔ سندھ کے گورنر جنید نے ایک طرف کشمیر تک کا وہ علاقہ فتح کر لیا جواس وقت پاکستان کہلاتا ہے تو دوسری طرف گجرات ، بھڑوچ، مارواڑ،اجین فتح کر لیے(لیکن بعد میں ان پر قبضہ برقرار نہ رہ سکا)۔ شمالی افریقہ میں وہ علاقے فتح کیے گئے جو آج کل سینی گال اور مالی کہلاتے ہیں (ابن اثیر،۵:۷۰)

ہشام کا جانشین ولید ثانی (بن یزید بن عبدالملک)بنا جو نااہل اور عیاش حکمران تھا اور متضاد طبیعت کا مالک تھا جو عیش و عشرت کے ساتھ نمازیں بھی باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ اس کی نا اہلی کی وجہ سے عربوں میں قبائلی عصبیت نے زور پکڑا۔ اس کی حرکتوں سے تنگ آ کر اہل خاندان اور اعیان سلطنت نے اسے قتل کر دیا۔ ولید ثانی نے سال بھر حکومت کی۔ اس کے قتل کے بعد ۱۲۶ھ میں یزید ثالث خلیفہ بنا، وہ عابدوزاہد تھا اور سلطنت کو اسلامی رخ دینا چاہتا تھا، لیکن سلطنت غیر مستحکم ہو چکی تھی اور حکمران خاندان میں چپقلشوں اور سازشوں کا زور تھا چنانچہ تخت کے کئی دعویدار اٹھ کھڑے ہوے اور وہ بمشکل چھ ماہ نکال سکا۔ اس کی جگہ اس کے بھائی ابراہیم بن ولید نے لی، لیکن چند ماہ کے اندر اس کاحریف مروان ثانی (بن محمد) اسے قتل کر کے خود خلیفہ بن بیٹھا، لیکن حالات اتنے خراب ہو چکے تھے کہ وہ انہیں قابو میں نہ کرسکا۔ قبائلی عصبیت ،حکمران

خاندان میں خانہ جنگی اور سب سے بڑھ کر شیعوں اور عباسیوں کی حکومت مخالف تحریک جو اب اتنی طاقتور ہو چکی تھی کہ اس نے (۱۳۲ ھ) میں مروان کو فیصلہ کن شکست دی اسے مہلت نہ دی اور یوں اقتدار عباسیوں کے پاس چلا گیا (یعقوبی، ۲: ۴۱۵بعد)۔

۲۔ عہد بنو امیہ کی دینی اور سیاسی تحریکیں : ہم یہاں اس عہد کی سیاسی تحریکوں (خوارج، شیعہ، زبیری اور عباسی) اور تین دینی تحریکوں (مرجئہ ، معتزلہ اور اصلاحی تحریک) کا مختصر ذکر کریں گے۔

خوارج: حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جنگ صفین میں تحکیم قبول کرنے پر حضرت علیؓ کے حامیوں کا ایک گروہ ان سے الگ ہوگیا۔ جمہور سے خارج ہونے کی بنا پر لوگ انہیں خارجی (جمع خوارج) کہنے لگے۔ یہ گروہ حضرت علیؓ ، حضرت معاویہؓ اور ان کے متبعین عامۃ الناس کو کافرو مرتد اور ان کے خون کو مباح سمجھتا تھا ۔ اس انتہا پسند گروہ نے نہ صرف حضرت علیؓ سے جنگ کی بلکہ پورے عہد بنو امیہ میں اموی خلفاکو سکھ کا سانس نہیں لینے دیا اور مسلسل بغاوتیں کرتے رہے یہاں تک کہ آخری اموی خلیفہ مروان ثانی نے ان کی بیخ کنی کی ۔ عارضی طور پر کچھ شہروں پر قبضہ کرنے کے علاوہ یہ خود تو کوئی بڑاسیاسی فائدہ نہ اٹھا سکے، البتہ ان کی جدوجہد نے بالواسطہ طور پر حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی جنگ میں امویوں کو جیتنے کا موقع دیا اور عہد اموی کے آخر میں عباسیوں کو۔ تحکیم کے بعد انہوں نے عراق میں حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور مصر میں حضرت عمروؓ بن العاص کو بیک وقت قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ حضرت معاویہؓ حملے میں زخمی ہوے، حضرت عمروؓ کی بیماری کی وجہ سے ان کی جگہ دوسرا آدمی مارا گیا اور حضرت علیؓ شہید ہوگئے۔

خوارج اپنے عقائد میں پختہ، روزمرہ زندگی میں متقی اور لڑائی میں شجاع تھے اور اللہ کی راہ میں موت کو اعزاز سمجھتے تھے۔ شروع میں ان کا اختلاف سیاسی تھا جو بعد میں دینی رخ بھی اختیار کر گیا۔ وہ خلافت کو عامۃ المسلمین کا حق سمجھتے تھے ، گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر قرار دیتے تھے اور اپنے مخالفین کو مباح الدم سمجھتے تھے ۔ وہ خود بھی متحد نہ تھے اور ان کے کئی فرقے تھے (مثلاً ازارقہ ، نجدیہ، صفریہ ،اباضیہ وغیرہ) جن کے خیالات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ (خوارج کے تاریخی مطالعے کے لیے دیکھیے (۱) الشہرستانی: الملل والنحل (اردو ترجمہ محسن صدیقی ص۱۷۴ بعد؛ (۲) البغدادی : الفرق بین الفرق، ص ۶۳ بعد؛ (۳) المسعودی، مروج الذھب، ۱:۶۹۱ بعد، (۴) الطبری، تاریخ الامم و الملوک ۱۱۹/۹ بعد؛(۵) نیز دیکھئے (بذیل مادہ)۔

شیعہ: (لفظی معنی حمایتی اورمدد گار) ابتدا میں شیعان علی کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی، لیکن کثرت استعمال سے اضافت محذوف ہو گئی اور محض شیعہ کا لفظ اس گروہ کے لیے استعمال ہونے لگا جو امامت کو خاندان علی میں محدود سمجھتا ہے اور اب اہل سنت کے مقابلے میں ایک مستقل فقہی اور کلامی مسلک رکھتا ہے۔ [مشہور قول کی رُو سے] تشیع کی بنیاد ابن سبانے رکھی اور حضرت علیؓ کے عہد میں ان کی نبوت اور الوہیت کا چرچا کرنے لگا۔ حضرت علیؓ تک جب یہ ہفوات پہنچیں تو انہوں نے اس فتنے کو روکنے کے لیے ان میں سے بعض کو زندہ جلانے کا حکم دیا اور ابن سباکوجلا وطن کر دیا (ابن حزم، الملل والنحل،۴:۱۸۶)۔ حضرت علیؓ کی شہادت اور حضرت حسنؓ کی خلافت سے دستبرداری کے بعد اموی حکومت کے استحکام اور حضرت معاویہؓ کے حلم و تدبر کی وجہ سے شیعہ حضرات دبے رہے، صرف حجر بن عدی اور ان کے ساتھی حکومت مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے قتل ہوے۔ امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ اور حضرت حسینؓ بن علیؓ نے

ان کے نامزد کردہ ولیعہد اور بیٹے یزید کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ یزید کے مقرر کردہ والی کوفہ عبیداللہ بن زیاد نے حضرت حسینؓ اور ان ساتھیوں کو کربلا میں گھیر کر شہید کر دیا۔ پھر ایک دوسرے لشکر نے مدینہ کو تاراج کیا اور مکہ پر حملہ کر کے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا گھیراؤ کر لیا۔ ان واقعات نے مسلمانوں میں بنو امیہ کے خلاف شدید نفرت کو جنم دیا۔ شیعان علی نے چونکہ واقعہ کربلا کے موقعہ پر حضرت حسینؓ کا ساتھ نہیں دیا تھا اس لیے اب انہیں پچھتاوے نے آگھیرا اور وہ متحد ہو کر حضرت حسینؓ کا بدلہ لینے کے لیے اموی حکمران مروان بن الحکم سے ۶۵ھ میں بھڑ گئے (یہ لوگ تواّبون یعنی توبہ کرنے والے کہلاتے تھے) لیکن شکست کھائی ۔ پھر مختار الثقفی اسی ٹولے گروہ کر اٹھا، لیکن ابتدائی کامیابیوں کے بعد مارا گیا۔ اس کی تحریک نے کیسانیہ کو جنم دیا جو اپنے معتقدات فاسدہ میں السبائیہ سے بھی بڑھ گئی (دیکھیے الشہرستانی ۱:۱۹۶)۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعہ کربلا نے اہل تشیع کو متحد کر دیا خصوصاًایرانی موالیوں میں اس کے اثرات بڑے گہرے اور دور رس تھے ۔ ہشام بن عبدالملک کے عہد میں زید بن علی زین العابدین نے خروج کیا اور مارے گئے (شیعہ فرقہ زیدیہ انہی سے منسوب ہے)۔ تاہم شیعہ امامیہ(اثنا عشریہ) کے چھٹے امام حضرت جعفر صادق نے سیاست میں پڑے بغیر علمی و فکری کام کیا اور شیعہ مسلک کو فقہی و کلامی بنیادیں مہیا کیں (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے [بذیل مادہ)

زبیری: حضرت زبیرؓ بن العوام حواریٔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پھپی زاد بھائی سے منسوب سیاسی گروہ جن کے بیٹے حضرت عبداللہؓ نے یزید بن معاویہ کے انتقال کے بعد خلافت کا دعویٰ کیا اور تقریباً ۹سال تک (۶۴ تا ۷۳ھ) اسلامی مملکت پر مکمل طور پر، یا مملکت اسلامیہ کے کچھ علاقوں پر حکومت کی۔ وہ متقی، شجاع اور با صلاحیت تھے چنانچہ حضرت عثمانؓ نے انہیں کو مقر خلافت کا ناظم مقرر کیا اور حضرت معاویہؓ کے ساتھ نزاع کے دنوں میں حضرت عائشہؓ نے (جو ان کی خالہ تھیں) مشورہ دیا کہ لوگوں کو نماز وہی پڑھائیں (تاریخ ابن الاثیر،۸۸/۴)۔ حضرت معاویہؓ کے عہد تک وہ خاموش رہے لیکن جب انہوں نے یزید کی ولیعہدی کی بیعت لینا چاہی تو انہوں نے اس کی مخالفت کی ۔ یزید جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو وہ بیعت کرنے کی بجائے مکہ چلے گئے جہاں انہوں نے لوگوں سے خفیہ بیعت لینا شروع کی۔ کربلا میں حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا اور ان کے حامی اہل مدینہ نے اموی گورنرکو نکال باہر کیا۔ یزید کی فوج نے مدینہ تاراج کیا اور مکہ میں ان کا محاصرہ کر لیا، لیکن یزید کی وفات کی وجہ سے اموی لشکر واپس چلا گیا۔ معاویہ بن یزید کے اقتدار سنبھالنے سے انکار پر ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی ۔ عام لوگ خلافت کے ملوکیت میں بدلنے، واقعہ کربلا و حرہ اور اموی گورنروں کے ظلم سے تنگ تھے لہٰذا جلد ہی حجاز،یمن اور عراق ان کے مطیع ہوگئے۔ بعد میں اہل مصر نے بھی آپ کی اطاعت کر لی البتہ شام میں امیوں کا اثر قوی تر تھا (العقدالفرید: ۱۴۵/۳).

بدقسمتی سے ابن الزبیرؓ کو بیک وقت خوارج، شیعہ اور بنو امیہ سے لڑنا پڑا۔ جب ان کے بھائی مصعب اور ان کے دوسرے سالار مختار الثقفی اور خوارج سے لڑ رہے تھے تو عبدالملک تماشا دیکھتا رہا اور جب زبیریوں کے تھکے ہارے فوجی ان سے فارغ ہوے تو اس نے ان پر ہلہ بول دیا اور انہیں شکست فاش دی، جبکہ اس سے پیشتر وہ ان کے بڑے بڑے کمانڈوں کو خطیر عطایا اور عہدوں کا لالچ دے کر توڑ چکا تھا ۔ اس طرح عراق سے زبیریوں کا صفایا ہو گیا اور پھر بتدریج دوسرے علاقوں سے بھی ان کا اقتدار صرف حجاز تک باقی رہ گیا ۔ عبدالملک نے حجاج بن یوسف الثقفی کو

زبردست فوج دے کر حجاز بھیجا، جس نے دوسرے شہروں کو فتح کرنے کے بعد مکہ مکرمہ کا محاصرہ کر لیا جہاں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پناہ لیے ہوے تھے، اور اس نے وہاں شدید سنگ باری کی۔ جمادی الآخرہ (۷۳ھ) میں وہ اپنے چند ساتھیوں سمیت مردانہ وار لڑتے ہوے شہید ہو گئے جبکہ اکثریت حجاج کے دباؤ اور ترغیب کے زیر اثر ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی (الطبری: تاریخ، ۷:۱۸۸)۔ زبیریوں کی شکست کے اسباب کئی ایک تھے: حجاز کو مرکز بنانے پر اصرار (یہاں تک کہ حضرت عبداللہؓ نے بعض گورنروں کے اصرار کے باوجود حجاز سے باہر جانے سے انکار کر دیا)، امویوں کی داد و دہش اور عطایا نیز ان کی سازشوں اور منصوبوں کا توڑ نہ کر سکنا، سادات بنو ہاشم کے ساتھ بد سلوکی، بیک وقت تین دشمنوں سے مقابلہ کرنا وغیرہ، نیز کعبے کی تعمیر نو اور اس میں اضافے کو بھی امویوں نے بدعت قرار دے کر لوگوں کو ابن زبیر کے خلاف مشتعل کیا.

عباسی تحریک: (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے منسوب)۔ بنو امیہ کے مقابلے میں بنو ہاشم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں سے ہونے کی وجہ سے، خود کو خلافت کا زیادہ حق دار سمجھتے تھے ۔ ان میں دو گروہ ہو گئے تھے ایک وہ جو حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کو خلافت کا حق دار سمجھتا تھااور دوسرا حضرت عباسؓ کی اولاد کو.

امامت و خلافت کا سادات سے عباسیوں کو منتقل ہونا ایک تاریخی حادثہ ہے(اگرچہ اس کے دوسرے سنجیدہ اسباب بھی ہیں) جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد شیعان علیؓ نے منصب امامت ان کے بیٹے زین العابدین کو پیش کیا، جنہوں نے اسے قبول کرنے سے معذرت کرلی، چنانچہ انہوں نے حضرت علیؓ کے غیر فاطمی فرزند محمد بن حنفیہ(م ۸۱ھ) کو امام بنا لیا۔ اس طرح امامت اہل بیت نبوی سے علویوں کو منتقل ہو گئی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے ابو ہاشم عبداللہ جانشین ہوے جن کی دعوت ایران میں خفیہ انداز میں پھیلتی رہی۔ ۱۰۰ھ میں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے خاندان کا کوئی شخص پاس نہ تھا۔ اتفاق سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پوتے محمد بن علی وہاں موجود تھے چنانچہ ابو ہاشم نے ان کو اپنا جانشین نامزد کر دیا، یوں امامت علویوں سے عباسیوں کو منتقل ہو گئی(ثروت صولت: ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ؛ ۱:۱۵۸).

بنو ہاشم کی دعوت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے لے کر ہشام کے عہد تک خفیہ رہی اور عراق و خراسان کے بڑے حصے میں پھیل گئی۔ ۱۲۶ھ میں محمد بن علی کا انتقال ہوا تو ان کے لڑکے ابراہیم ان کے جانشین ہوے۔ مروان کے عہد میں اس سازش کا انکشاف ہوا تو اس نے ابراہیم کو قتل کروا دیا۔ اس دوران میں ایرانی سردار ابومسلم خراسانی عباسی تحریک میں شامل ہو گیا۔ وہ بڑا متعصب، ظالم اور سفاک شخص تھا، لیکن زبردست تنظیمی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے عربوں کو آپس میں لڑایا، ایرانیوں کو عربوں کے خلاف مشتعل کیا اور خراسان میں بغاوت کرکے اموی گورنر کو شکست سے دوچار کیا۔ پھر بنو ہاشم کے یہ حامی ماوراء النہر اور ایران پر قبضہ کرکے عراق میں داخل ہو گئے جہاں آخری اموی حکمران مروان بن محمد نے دریائے زاب کے کنارے ان کا مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی اور فرار ہونے کے بعد پکڑا اور مارا گیا۔ معمولی مزاحمت کے بعد دمشق پر بھی عباسیوں کا قبضہ ہوگیا۔ یوں اموی اقتدار کا سورج غروب ہوا اور عباسی برسر اقتدار آگئے (یعقوبی ۲: ۴۱۵ بعد).

اب ہم اس عہد کی بعض اہم دینی تحریکوں کا ذکر کریں گے:

مرجئہ: پہلی صدی ہجری کے نصف ثانی کی ایک دینی تحریک جو شیعہ اور خارجیوں کے انتہا پسند انہ نظریات کے ردّعمل اور غالبًا مسیحی نظریات سے تاثر کی وجہ سے ابھری

اور جس کے سیاسی مقاصد نہایت واضح تھے۔ اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں دو آراء ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرجئۃ کا مصدر ہے ارجا یرجی ارجاءً، بمعنی موخرو ملتوی کرنا (لغوی بحث کے لیے دیکھیے لسان العرب بذیل مادہ رجا)۔ اس لحاظ سے کہ یہ لوگ ایمان کو مقدم اور عمل کو اس سے مؤخر کرتے اور اس کا جزو نہیں سمجھتے تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ ایمان کے ہوتے ہوئے اعمال کی کوتاہیوں (معاصی) سے نہ تو ایمان زائل ہوتا ہے اور نہ دنیا میں ان پر جزا مرتب ہوتی ہے کیونکہ اس کا فیصلہ تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کریں گے، گویا ان پر فیصلہ قیامت تک مؤخر و ملتوی ہے (عبدالقاھر البغدادی: الفرق بین الفرق، ص۱۹) دوسرے یہ کہ اس کے معنی توقع اور امید کے ہیں یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ تو اب اور غفور رحیم ہے۔ اس لیے وہ گناہ معاف فرما دے گا اور بقاے ایمان کی وجہ سے انسان جنت میں جائے گا۔ اس کے لیے سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۶ سے بھی استشہاد کیا جاتا ہے۔ مستشرقین اکثر اس دوسرے نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں (دیکھیے مثلاً نکلسن، *Literary History of the Arabs*، ص ۲۲۱).

بعض مرجئہ ردِّعمل کا شکار ہو کر انتہا پسندی کی راہ پر جا نکلے، چنانچہ جہم بن صفوان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کہتا تھا کہ ایمان کا تعلق دل سے ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص دل سے مسلمان ہے تو اسے کافر نہیں کہا جائے گا ،خواہ وہ زبان سے کفریہ کلمات ادا کرے یا بتوں کی پوجا کرے یا یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ مل کر رہے (ابن حزم، الفصل ، ۴: ۲۰۴)۔ (یہ بات ذہن میں رہے کہ بنو امیہ کے عہد کا کوئی تحریری ریکارڈ ہم تک نہیں پہنچا، لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ مابعد [خصوصاً عہد عباسی میں] ان کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے ، اس پر اعتماد کریں) اہل سنت بھی چونکہ مرتکب کبیرہ کو کافر نہیں کہتے اس لیے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے امام ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے علما کو بھی مرجئہ کہا ہے ورنہ مرجئہ کی انتہا پسندی اہل سنت سے بہت دور ہے۔

مرجئہ کے موقف کا سیاسی نتیجہ یہ تھا کہ وہ بنوامیہ کی غیر مشروط حمایت کرتے تھے۔ خوارج چونکہ مرتکب کبیرہ کو کافر سمجھتے تھے، لہٰذا وہ خلفا کو مرتکب کبیرہ قرار دے کر خلافت کے لیے نااہل بلکہ واجب القتل قرار دیتے تھے، مرجئہ کا رویہ ان کے بالکل برعکس تھا(مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ؤ بذیل مادہ).

معتزلہ: عہد اموی میں ابھرنے والی ایک دینی تحریک جس کے اثرات سیاست پر بھی پڑے ۔ اعتزال کے لفظی معنی الگ ہوجانے کے ہیں ۔ اس کی وجہ عموماً یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضرت امام حسن بصریؒ (م۱۱۰ھ) کا ایک شاگرد و اصل بن عطاء(م ۱۳۱ھ) اس بنیاد پر اپنے استاد سے الگ ہو گیا کہ وہ مرتکب کبائر کو خوارج کی طرح نہ تو کافر قرار دیتا تھا اور نہ مرجئہ کی طرح یہ سمجھتا تھا کہ اس سے ایمان پر کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اس کی رائے میں یہ کفر اور ایمان کے بین بین حالت تھی۔ (المنزلة بين المنزلتين) اس پر امام صاحب نے کسی کے استفسار پر واصل کے بارے میں کہا کہ ھذالرجل " اعتزل عنا" یعنی یہ شخص ہم سے الگ ہوگیا ہے، چنانچہ لوگ ان کو معتزلہ کہنے لگے (البغدادی: الفرق، ص ۹۷،۹۸)

معتزلہ کے بنیادی اصول پانچ ہیں :التوحید، العدل، الوعید، القول بالمنزلة بین المنزلتین اورامر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ یہ ایک عقلی تحریک تھی جس نے نقل اور عقل کے مابین تطابق اور توافق کی کوشش کی۔ اس کا منبع عراق تھا جو سامی اور فارسی النسل لوگوں کا مخلوط [علاقہ] تھا اور بعد میں عالم اسلام کا علمی مرکز اور دارالخلافہ بنا۔ اس تحریک کے ابھرنے کے اہم اسباب یہ تھے: یونانی علوم و

فنون کا ترجمہ اور ان کی اشاعت۔ غیر مسلموں سے روز افزوں ربط و اختلاط اور مشاجرات صحابہ پر اختلافات۔ قدریہ نے جبر و قدر کی جس عقلی بحث کا آغاز کیا تھا معتزلہ نے اس کو آگے بڑھاتے ہوئے سارے دینی وعصری مسائل کا عقل و دانش کی روشنی میں جائزہ لینے کا مسلک اختیار کر لیا (مروج الذھب ۲: ۱۹۰بعد)۔

اعتزال (معتزلہ) اصلاً ایک دینی تحریک تھی، لیکن رفتہ رفتہ اس نے سیاسی مباحث کے بارے میں بھی آراء قائم کر لیں، مثلاً امامت اور اس کی شرائط کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ امام کا اختیار امت کا حق ہے اور اس کا نص یا نسل سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی یہ رائے خوارج کے قریب تھی، لیکن الٰہیات، خصوصاً توحید اور عدل کے حوالے سے وہ اہل تشیع کے زیادہ قریب تھے۔ ان کے اس رویے نے کہ انہوں نے اپنے عقائد کو حکومتی طاقت سے نافذ کروانے کی کوشش کی، خصوصاً مامون اور معتصم کے زمانے میں ،اور حدیث و فقہ کے جلیل القدر ائمہ کو ظلم و تعذیب سے گزرنا پڑا، عوام الناس کو ان سے متنفر کر دیا اور ان کی آراء مسلم معاشرے میں جڑ نہ پکڑ سکیں (تفصیل کے لیے دیکھئے آآآ بذیل مادہ)۔

اصلاحی تحریک: اس عہد میں دین سے دوری، اخلاقی اور معاشرتی کمزوریوں اور لہو ولعب کے رجحان نے تقویت پکڑنا شروع کر دی تھی جس کے کئی اسباب تھے، مثلاً جہاد کی وجہ سے برق رفتار فتوحات، لیکن نو مسلموں کی تربیت کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونا، مال و دولت کی کثرت اور پر تعیش زندگی، غیر مسلموں سے اختلاط اور خلافت کو ملوکیت میں بدلنے کے برے اثرات، جیسے بیت المال کا غلط استعمال، حکام میں جواب دہی کے احساس کا خاتمہ، حکمرانوں اور والیوں کا ظلم وجور، بعض خلفا اور امرا کی لہو و لعب کی سر پرستی وغیرہ۔ ان وجوہ سے انحراف پسندطبیعتوں نے کھل کھیلنا شروع کر دیا تھا اگرچہ ابتدائے عہد بنو امیہ میں بعض جلیل القدر تابعین (جیسے حضرت علی زین العابدینؒ، سالم بن عبداللہ بن عمرؓ، قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ، سعید بن میسّبؒ اور عمرو بن زبیرؓ وغیرہ) کے علمی، دعوتی اور اخلاقی اثرات نے معاشرے کو سنبھالے رکھا، لیکن جب بعض اموی حکمرانوں نے خود رقص و موسیقی، مے نوشی اور عیش کوشی شروع کر دی تو یہ بیماریاں درباری امرا اور حلقۂ اغنیاء میں بھی پھیلنا شروع ہو گئیں اور عوام الناس بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے علاوہ تابعین کی ایک جماعت حرکت میں آئی جن کے چند اہم افراد حضرت سعید بن جبیرؒ، محمد بن سیرینؒ، شعبیؒ اور خصوصاً حضرت حسن بصریؒ، مالک بن دینار اور حضرت ثابت بنانیؒ وغیرہ تھے۔ اس اصلاحی تحریک نے آگے چل کر تصوف کا نام اختیار کر لیا (دیکھئے، مصطفیٰ حلمی: الحیاۃ الروحیہ فی الاسلام ، القاھرہ ۱۹۷۰ء اور ابوالحسن علی ندوی: تاریخ دعوت و عزیمت، جلد اول، معارف اعظم گڑھ ،۱۹۵۵ء)۔

اب ہم اس عہد کی کامیابیوں اور اہم خصوصیات کا ذکر کریں گے:

۱۔فتوحات اور اشاعت اسلام: اموی عہد میں مسلمانوں نے جذبۂ جہاد کو جاری رکھتے ہوئے فتوحات کا تسلسل برقرار رکھا اور مسلم مملکت رقبے کے لحاظ سے اتنی وسیع ہو گئی کہ آج تک اتنی بڑی حکومت دنیا میں قائم نہ ہوئی تھی۔ یہ مملکت ماوراء النہر سے لے کر افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں آج کل کی سیاسی تقسیم کے مطابق وسط ایشیائی مسلم ریاستیں ، آرمینیا ، افغانستان ، پاکستان، ایران، عراق، شام، لبنان، سعودی عرب، یمن، فلسطین (اسرائیل)، اردن، مصر، سوڈان، لیبیا، تیونس، مراکش، الجزائر، سپین (ہسپانیا، اندلس)، موریتانیا، مالی، سینیگال وغیرہ شامل تھے۔ یہ علاقے مسلمانوں

نے بزور شمشیر فتح ضرور کیے تھے، لیکن ان کے باشندوں پر قبول اسلام کے لیے کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا تھا، بلکہ مسلمانوں کے اخلاق اور اسلامی تعلیمات سے متأثر ہو کر ان ممالک کے باشندوں کی اکثریت نے بتدریج اسلام قبول کرلیا بلکہ بنوامیہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے نو مسلموں پر جزیہ برقرار رکھ کر غیر مسلموں کے قبول اسلام کی حوصلہ شکنی کی ۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے علاوہ اکثر اموی حکمرانوں اور گورنروں خصوصاً حجاج نے نو مسلموں سے جزیہ کی وصولی کی قبیح رسم جاری رکھی، لیکن اس کی وجہ ٹیکس وصول کر کے روپیہ جمع کرنے کی خواہش تھی، نہ کہ قبول اسلام میں رکاوٹیں ڈالنا اور نہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ امویوں کی اس حرکت کی وجہ سے لوگوں کے عملاً قبول اسلام میں کوئی فرق پڑا (دیکھیے ابن اثیر: الکامل فی التاریخ، ۴ :۲۵، نیز ٹی ڈبلیو آرنلڈ: دعوت اسلام (اردو ترجمہ محمد عنایت اللہ،ص ۶۳ بعد)

نظام مملکت: جہاد اور فتوحات کے نتیجے میں اموی سلطنت اتنی وسیع ہو گئی کہ اس سے پہلے تاریخ میں اتنی وسیع سلطنت قائم نہیں ہوئی تھی ۔ یہ سلطنت کئی صوبوں میں منقسم تھی جن کا حاکم والی یا عامل کہلاتا تھا۔ بعض علاقوں کے والیوں کو آج کی اصطلاح میں گورنر کی بجائے گورنر جنرل کہنا چاہیے، کیونکہ ان کے تحت کئی صوبے ہوتے تھے جن کے والیوں کا تقرر بھی وہ خود کرتے تھے، مثلاً حجاج بن یوسف کوفہ کا والی تھا، لیکن مشرق کے سارے علاقے ایران، افغانستان، ترکستان، اور سندھ اس کے ماتحت تھے، بلکہ آخر الذکر دونوں تو اسی کی کوششوں سے فتح ہوے تھے۔ یہی کیفیت مصر اور شمالی افریقہ کے والیوں کی تھی چنانچہ شمالی افریقہ کے والی موسیٰ بن نصیر نے ہی اندلس فتح کیا اور وہ انہی کے ماتحت تھا۔

اموی عہد میں انتظامی ضرورتوں کے تحت کئی نئے عہدے، بلکہ انتظامی ادارے وجود میں آئے، مثلاً کاتب جسے آج کل کا چیف سیکرٹری سمجھنا چاہیے جس کا کام خلیفہ کے نام آنے والے خطوط وصول کرنا، انہیں خلیفہ کو پیش کرنا ، ان کا جواب لکھنا، فرامین کا اجرا اور مہر لگانا وغیرہ تھے۔ حاجب (آج کی اصطلاح میں چیف آف پروٹو کول) اس کا کام مختلف افراد اور وفود کی خلیفہ سے ملاقات کا اہتمام کرنا تھا۔ قاضی (جج)، جس کا کام فصل خصومات تھا۔ یاد رہے کہ خلافت راشدہ میں قضا کا باقاعدہ منظم اور الگ شعبہ نہ تھا، لیکن اموی عہد میں ہر شہر کے لیے الگ قاضی کا تعین کیا جاتا تھا، صاحب البرید (یعنی پوسٹ ماسٹر جنرل) جو ڈاک کے محکمے کا سربراہ ہوتا تھا حضرت امیر معاویہؓ نے اس کا اجرا کیا اور بعد میں اس کو وسعت دی گئی۔ علاوہ ازیں عبدالملک بن مروان کے عہد میں عربی مملکت کی سرکاری زبان قرار دی گئی اور مملکت کی اپنی کرنسی کا اجراء ہوا.

دفاعی نظام: خلافت راشدہ میں مسلمانوں کو اپنے مخالفین پر جو برتری حاصل ہوئی وہ عہد بنوامیہ میں برقرار رہی۔ ابتدا میں مسلم فوجیں مختلف قبائل کے جہادی رضاکاروں پر مشتمل ہوتی تھیں، تاہم بتدریج پیشہ ور اور منظم فوج کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ عبدالملک نے فوجیوں کے باقاعدہ روزینے مقرر کیے۔ فوجی آبادیوں کو باقاعدہ چھاؤنیوں کی شکل دی گئی، فوج کو جدید ترین اسلحہ مہیا کیا گیا اور فوجی تنظیم کو بہتر بنایا گیا۔ مسلم فوج کی تعداد اور تحرک کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلم مملکت بیک وقت دو لاکھ فوج میدان میں لا سکتی تھی.

اس دوران میں مسلمانوں کی بحری قوت میں بھی اضافہ ہوا اور انہوں نے بحیرۂ روم پر تسلط حاصل کر لیا ۔قبرص، رہوڈز اور بلیالک کے جزائر فتح کیے گئے اور صقلیہ ، سردانیہ، اور یونان کے مختلف حصوں پر بحری حملے کیے گئے ۔شام، مصر اور تیونس میں جہاز سازی کے کارخانے قائم کیے گئے

جنہیں دارالصناعہ کہا جاتا تھا۔مسلمانوں کی بحری قوت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک کے زمانے میں جب قسطنطنیہ پر حملہ کیا گیا تو مسلمانوں کے بحری بیڑے میں ۱۸۰۰ جہاز شامل تھے (جرجی زیدان: تاریخ تمدن اسلامی ، جلد اول)

تمدنی ترقی: بنوامیہ کا دور معاشی خوش حالی کا دور تھا اس عہد میں زراعت اور صنعت و حرفت کو فروغ حاصل ہوا۔ شہر آباد اور بارونق تھے اور ان میں شہری سہولتوں کی فراوانی تھی۔ بصرہ سولہ مربع میل میں پھیلا ہوا تھا۔اس میں چاروں طرف نہروں کا جال بچھا ہو اتھا اور سبزہ کثرت سے تھا۔ کوفہ کی آبادی بھی چار لاکھ سے زیادہ تھی.

اموی عہد میں شاندار محلات اور مسجدیں تعمیر کروانے کی روایت کا آغاز امیر معاویہؓ کے عہدمیں ہو گیا تھا جنہوں نے محلات کے علاوہ بصرہ، کوفہ اور فسطاط میں مساجد تعمیر کروائیں۔ زیادہ بن ابیہ نے ایک ایرانی معمار سے کوفہ میں وسیع مسجد بنوائی جس میں ساٹھ ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے تھے ۔ عبدالملک نے قبۃ الصخرہ تعمیر کروایا جو آج بھی مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی یا د دلاتا ہے۔ ولید کے زمانے میں یہ تعمیراتی شوق و ذوق عروج پر تھا۔ اس نے مسجد نبوی کی توسیع کی اور دمشق میں جامع اموی تعمیر کروائی جس میں سنگ مرمر کثرت سے استعمال کیا گیا تھا اور درودیوار پرلاجوردی کا کام کیا گیا تھا۔مسجد میں روشنی کے لیے چھ سو قندیلیں سونے کی زنجیروں سے آویزاں کی گئی تھیں۔ رومی سفیر نے یہ مسجد دیکھی تو دنگ رہ گیا (یا قوت۔ معجم البلدان، بذیل مادہ دمشق)

اسلحہ سازی، جہازسازی، پارچہ بافی اور ظروف سازی اس زمانے کی خاص صنعتیں تھیں۔ ہشام کے دور میں ریشمی کپڑے کی صنعت نے خاص طور پر ترقی کی۔ روم و ایران کی تمدنی ترقی سے مرعوبیت بتدریج ان کی پیروی پر منتج ہوئی اور متاخر اموی حکمرانوں نے خواجہ سراؤں، حرم، موسیقی، رقص، شراب نوشی اور محلات میں تصویر کشی جیسی قبیح عادت کوثقافت سمجھ کر قبول کر لیا۔ پھر خلفا کی دیکھا دیکھی دینی رجحان نہ رکھنے والے امرا نے بھی ان کی تقلید شروع کر دی اور اس کے اثرات عوام تک بھی پہنچے۔ عام مسلم خواتین اس زمانے کی مجلسی اور علمی و ادبی زندگی میں شرکت کرتی تھیں، لیکن پردے کے ساتھ(اس وقت کے درباری حالات کے لیے دیکھئے الجاحظ: التاج فی اخلاق الملوک، ص۳۵-۳۲؛ نیز شعر و موسیقی کے لیے الاغانی ۳:۳۶۲-۳۷۵ اور ابن سیدہ: المخصص ۳:۱۱-۱۵).

علمی و ادبی ترقی: یہ تاثر درست نہیں ہے کہ اس عہد میں علمی ترقی نہیں ہوئی ۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس عہد میں علمی ترقی کی بنیادیں رکھی گئیں جن پر عظیم الشان عمارت عہد عباسی میں اٹھائی گئی ۔ دوسرے، قدیم عرب روایت کے مطابق اس زمانے میں مسلمان حافظے پر اعتماد زیادہ کرتے تھے اور لکھنے کو اہمیت نہ دیتے تھے، لہٰذا زمانۂ مابعد کے مقابلے میں اس عہد میں تصنیف و تالیف کا کام کم ہوا۔ تیسرے یہ کہ جو کام ہوا وہ حوادث زمانہ سے ہم تک نہیں پہنچا اس لیے مذکورہ تاثر کی گنجائش پیدا ہوئی ۔ یہاں ہم عہداموی کی دینی، ادبی اور عقلی علوم میں ترقی کی طرف محض اشارات پر اکتفا کریں گے.

دینی علوم میں تفسیر، قراءت ، حدیث، فقہ، اور سیرت و مغازی اہم تر ہیں۔ تفسیر میں اس عہد میں زیادہ کام حضرت عکرمہ، قتادہ، مجاہد،حسن بصری اور سعید بن جبیر نے کیا۔ یہ کام عموماً تفسیر ماثور کی نوعیت کا تھا جس میں حضرت عبداللہؓ بن سلام، کعب احبارؒ اور ابن جریجؒ کی وجہ سے تورات و انجیل کی روایات کا بھی اضافہ ہوا۔ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کا رجحان لغوی تفسیر کی طرف تھا اور وہ مشکل قرآنی الفاظ کے مفاہیم کے تعین میں شعر جاہلی سے

استفادے کو ضروری قرار دیتے تھے۔ تفسیر بالرائے سے اس عہد کے ائمہ دین تقویٰ کی وجہ سے احتراز کرتے تھے۔ ابن ندیم کے مطابق مجاہد، حسن بصری، سعید بن جبیر، امام باقر اور ابوحمزہ (رفیق حضرت علیؓ) نے بعض (جزوی) تفاسیر بھی لکھیں (الفہرست ، ص ۳۶) لیکن وہ ہم تک نہیں پہنچیں۔ قراءت کے فن نے بھی اس عہد میں ترقی کی۔ قرآن حکیم کی قراءت میں اختلاف کے اسباب کئی ایک ہیں جن میں سر فہرست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے (صحیح بخاری ، کتاب فضائل القرآن، باب انزل القرآن علی سبعۃ حرف) پھر عربی حروف کی اشکال، اعراب و نقط کا عدم استعمال اور عرب قبائل کا لہجوں کا اختلاف نیز ایک لفظ کا ایک سے زیادہ طرح کے تلفظ کا احتمال رکھنا۔ اس طرح قراءت کے سات مکتبہ ہائے فکر وجود میں آئے جن کے بانی قراء سبعہ سب بنو امیہ کے دور کے تھے (السیوطی: الاتقان فی علوم القران، جلد اول)۔

جمع و تدوین حدیث کا عظیم الشان کام بھی اسی عہد میں شروع ہوا۔ ابن شہاب زہری، ابو قلابہ جرمی، مکحول شامی اور دوسرے محدثین نے جمع حدیث کے لیے بڑی محنت کی اور طویل سفر کیے ۔ خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے امام زہریؒ سے چار سو حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کروایا تھا (تذکرۃ الحفاظ ۱:۹۷) ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے علما سے حدیثوں کے کئی مجموعے مرتب کروائے اور انہیں شائع کروایا (جامع بیان العلم و فضلہ ،ص ۲۸)۔ علاوہ ازیں خالدؒ بن معدانؒ، عطاء بن ابی رباحؒ ، عبدالرحمٰنؒ بن عبداللہؒ بن مسعودؓ، سلیمان بن قیسؒ اور دوسرے بہت سے تابعین نے احادیث کے مجموعے مرتب کیے تھے۔ بدقسمتی سے یہ مجموعے ہم تک نہیں پہنچے (باستثناء صحیفہ ہمام بن منبہ [م ۱۳۱ھ]) کے جسے ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے حال ہی میں شائع کر دیا ہے)

گو اغلب یہ ہے کہ وہ بعد میں مرتب ہونے والے مجموعوں میں ضم ہوگئے۔ مغازی اور سیرت النبیؐ پر لکھنے کا آغاز بھی اسی عہد میں ہوا۔ چنانچہ عروہ بن زبیر، شرحبیلؒ بن سعدؒ، وہب بن منبہؒ، امام زہریؒ، موسیٰ بن عقبہؒ، عکرمہؒ مولی بن عباس نے مغازی و سیرت سے متعلقہ روایات جمع کیں۔ حاجی خلیفہ کے مطابق اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب عروہ بن زبیر (م۹۳ھ) نے لکھی (کشف الظنون ۳:۱۴۷۰) اور محمد بن اسحٰق (م۱۵۱ھ) نے اس فن کو خوب ترقی دی (ابن اسحٰق کی سیرۃ النبی بھی اب متداول ہے)۔ فقہ اس زمانے میں قرآن و حدیث سے الگ کوئی مستقل علم نہ تھا، بلکہ فقہائے سبعہ کی آراء ہی فقہ کی اشاعت کا سبب بنیں۔ تابعین کبار میں سے سعید بن میسب ، سلیمان بن یسار، قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ ، عبید اللہ بن عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے بعد ربیعہ بن فروخؒ رائے، امام شعبی ،امام جعفر صادق، ابراہیم نخعیؒ اور قاضی شریحؒ وغیرہ اس زمانے کے مشہور فقیہ تھے.

ادب کے مختلف شعبوں میں بھی اس عہد میں خوب ترقی ہوئی، شاعری کا پرانا رنگ، جو عہد نبوت و خلافت راشدہ کی اخلاقی پابندیوں کی وجہ سے پھیکا پڑ گیا تھا، خلفاے بنو امیہ کی سرپرستی میں دوبارہ چمک اٹھا (یزید بن معاویہ اور عبدالملک بن مروان خود عمدہ شاعر تھے)، چنانچہ فرزدق، اعشی، جریر، نابغہ، اعشی، اخطل اور کمیت اس عہد کے فحول شعرا، شاعری چونکہ عرب معاشرے میں پروپیگنڈے کا ذریعہ تھی اور یہ زمانہ گروہ بندی اور مختلف مذہبی و دینی تحریکوں کے درمیان کشمکش کا تھا، اس لیے جماعتی شعرا بھی سرگرم ہوگئے، جو اپنی اپنی جماعت کی حمایت میں شعر لکھتے تھے، مثلاً ابن مفرغ، ابن خزیمہ اور نعمان بن بشیر انصاری علویوں کے حامی تھے۔ مسکین دارمی اور اعشیٰ امویوں کے اور طرماح، عمران بن حطان، نابغہ ذبیانی اور عبداللہ بن حجاج

خارجیوں اور زبیریوں کے حامی تھے۔ مواد کے اعتبار سے بھی اس عہد کی شاعری میں تنوع پیدا ہوا اور ماضی کے سادہ بدویانہ انداز کی جگہ عراق و شام کے جمالیاتی مظاہر کی وجہ سے خیالات کی لطافت و رنگینی نے لے لی۔ عربی نثر نے بھی اس عہد میں ترقی کی۔ حضرت عمرؓ نے اگرچہ دیوان مرتب کرنے کا حکم دیا تھا، لیکن مملکت کے صوبوں میں وہ مقامی زبانوں میں لکھے جاتے تھے، لیکن جب عبدلملک نے عربی کو سرکاری زبان قرار دیا تو ہر قسم کی سرکاری مراسلت عربی میں ہونے لگی اور غیر عربوں نے بھی عربی سیکھ کر لکھنا شروع کی اور ان کے اسالیب کا رنگ بھی عربی میں جھلکنے لگا۔ اس طرح انشا نے ایک باقاعدہ فن کی حیثیت اختیار کرلی اور متعدد نامور کاتب اس عہد میں پیدا ہوے جن میں عبدالملک کا کاتب عبدالحمید بہت مشہور ہوا جس نے اس فن کے اصول و قواعد وضع کیے (دیکھیے الجہشیاری: کتاب الوزراء و الکتاب، ص ۴۲-۷۹)۔ خطابت بھی اس زمانے کے عہد کے ادب کا ایک حصہ تھی اور احزاب کی کشمکش نے اسے اور بھی صیقل کیا، چنانچہ اس عہد میں کئی نامور خطیب پیدا ہوے۔ حجاج بن یوسف ثقفی کا وہ خطبہ جو اس نے اپنے تقرر کے وقت دیا اور طارق بن زیا د کا وہ خطبہ جو اس نے اندلس پر حملے کے وقت دیا، تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔

لغت پر بھی اس عہد میں بہت کام ہوا کیونکہ علما قرآنی الفاظ کے معانی کی تعیین میں اشعار سے مدد لیتے تھے۔ پھر عبدالملک کے عربی کو سرکاری زبان قرار دینے سے بھی عربی کی ترقی و اشاعت کو تقویت ملی۔ قتادہ (م۱۱۷ھ) اور ابو عمر و بن العلاء (م ۱۵۴ھ) نے عربی کی تحصیل و تحقیق میں بڑی محنت کی۔ حضرت علیؓ کے شاگرد ابوالاسود الدؤلی نے نحو کے اصولی قواعد مرتب کیے۔ ان کے شاگردوں نے اس کام کو آگے بڑھایا اور عیسی بن عمرو الثقفی (م۱۴۷ھ) نے اس فن میں کتاب الجامع اور کتاب المکمل لکھی۔ قرآن حکیم پر نقطے اور اعراب لگوانے کا کام حجاج بن یوسف نے کروایا (الفہرست، ص۶۱، ۶۲)

علوم عقلیہ میں پیش رفت بھی عہداموی میں شروع ہو گئی تھی۔ خالد بن یزید نے اسکندریہ کے یونانی سائنس دانوں سے کہہ کر کیمیا اور طب کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کروایا۔ اس نے سونا بنانے کی کوشش کی اور ابن ندیم کے مطابق وہ کتاب الحرارۃ، کتاب الصحیفۃ الصغیر و الصحیفۃ الکبیر کا مصنف بھی تھا (الفہرست ص۴۹۷)۔ ہشام کو غیر ملکی علوم و فنون سے دل چسپی تھی، چنانچہ اس نے فارسی کی ایک مصور کتاب کا جو ایرانیوں کے مختلف علوم اور وہاں کے سیاسی حالات پر مشتمل تھی، عربی میں ترجمہ کیا تھا (المسعودی: کتاب التنبیہ و الاشراف، ص۱۰۶)۔ اس کے کاتب سالم نے ارسطو کے بعض خطوط کا بھی ترجمہ کیا تھا جو اس نے سکندر کے نام لکھے تھے ۔ مروان نے اہرن القس کی قراباذین کا ترجمہ ایک اسرائیلی طبیب ماسر جویہ سے کروایا تھا ، حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے افادۂ عام کے لیے اسے شائع کر دیا (قفطی: اخبار الحکماء ،ص ۳۱۳)۔ مسعودی کے مطابق عبدالملک بن مروان نجوم کا قائل تھا اور بعض نجومیوں کو اپنے ہمراہ رکھتا تھا اور جنگوں کے اوقات وغیرہ کے تعین میں ان کی رائے پر عمل کرتا تھا (مروج الذھب، ۱۱۹/۲-۱۲۰).

کمزوریاں اور ناکامیاں: عہد اموی کی کامیابیوں اور ترقیوں کے ساتھ مناسب محسوس ہوتا ہے کہ اس عہد کی کمزوریوں اور ناکامیوں کا بھی ایک جائزہ لے لیا جائے۔ تاہم یہ جائزہ اس وقت تک معروضی نہیں ہو سکتا، جب تک دو باتیں ذہن میں نہ رکھی جائیں ایک تو یہ کہ امویوں کا زمانہ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے خلافت راشدہ کے فوراً بعد کا زمانہ ہے، لہٰذا ہر مسلمان غیر شعوری طور پر اسے خلافت

راشدہ کے معیار پر تولتا ہے اور اسے اس سے کم تر پا کر مایوس ہوتا اور تنقید کرتا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر اموی خلفا بعد میں آنے والے بہت سے خلفاء و حکام سے بدرجہا بہتر تھے۔ دوسرے یہ کہ بنو امیہ کے خلاف کتب تاریخ وغیرہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ عہد عباسی میں لکھا گیا اور اس کے بعض اہم لکھنے والے شیعہ تھے، جیسے یعقوبی، لٰہذا جو کچھ اولیں مراجع میں لکھا گیا ہے وہ تعصب سے خالی نہیں ہے (الدکتور زکی محمد حسن: دراسات فی مناہج البحث فی التاریخ الاسلامی، ص ۱۸۰ ، القاہرہ ۱۹۵۰ء) اور یہ حالات اس وقت تک نہیں بدلے جب تک کہ عباسیوں اور اہل تشیع میں اختلاف پیدا نہیں ہوا.

اموی عہد کی چند بڑی کمزوریاں اور خامیاں یہ ہیں:

۱۔ملوکیت: قرآن شوریٰ کا حکم دیتا ہے اور اس حکم پر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤثر طریقے سے عمل کیا اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی۔ خلافت راشدہ میں نہ صرف خلیفہ کے انتخاب میں مشاورت کا مؤثر عمل دخل ہوتا تھا، بلکہ امور مملکت بھی مشاورت سے چلائے جاتے تھے۔ اموی عہد میں یہ دونوں چیزیں باقی نہ رہیں اور خلافت موروثی ہو گئی اور ہر خلیفہ اپنے بعد اپنے بیٹے یا بھائی کو ولی عہد نامزد کر دیتا تھا۔ بیعت اب بھی ہوتی تھی، لیکن برائے نام اور محض رسماً۔ ورنہ عملاً عوام کی رائے کا انتخاب خلیفہ میں کوئی دخل نہ تھا۔ اس طرح خلفا امور مملکت میں اپنے حواریوں اور اہل خاندان سے تو مشاورت کر لیتے تھے، لیکن معاشرے کے سربرآوردہ لوگوں، علماء اور عوامی نمائندوں سے مشاورت کی ضرورت محسوس نہ کی جاتی تھی۔ ملوکیت کی دیگر خرابیاں جیسے قانون کی عدم پاسداری، خزانے کا غلط استعمال، اظہار رائے پر پابندی اور ظلم و جبر بھی اس عہد کی نمایاں خامیاں تھیں.

۲۔استبداد: ملوکیت میں اقتدار کی مرکزیت لامحالہ ظلم و استبداد کا سبب بنتی ہے، بلکہ شاہ سے زیادہ شاہ پرست عمال حکومت ظلم و ستم میں حکمرانوں کو بھی مات دے دیتے ہیں چنانچہ ابن زیاد نے حضرت حسین بن علیؓ اور ان کے خاندان کو کربلا میں شہید کیا۔ مسلم بن عقبہ نے مدینہ کو تاراج کیا اور کعبہ پر سنگ باری کی۔حجاج بن یوسف نے کعبہ پر حملہ کیا اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو شہید کیا۔ اس نے نو مسلموں پر جزیہ برقرار رکھا اور انہیں فوج میں شمولیت اور شہروں میں قیام کی اجازت نہ دی۔ موالیوں پر نفاذ جزیہ اور خراج میں زیادتی کے مرتکب عامل افریقہ یزید بن ابی مسلم، حاکم خراسان جراح، والی یمن محمد بن یوسف اور محصل مصر عبید اللہ بن حباب بھی تھے (قاضی ابو یوسف کتاب الخراج ،ص۲۶؛ البلاذری، فتوح البلدان ، ص۳۷ اور ابن خلکان وفیات الاعیان ،۲:۲۷۷)۔ اس استبداد کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض اموی خلفا نے اہم سپہ سالاروں اور عاملوں سے بدسلوکی کی، حالانکہ ان کی خدمات اسلام اور مسلم مملکت کے لیے شاندار تھیں، مثلاً سلیمان نے محمد بن قاسم فاتح سندھ اور مسلم بن قتیبہ فاتح چین کو قتل کروایا اور فاتح اندلس موسیٰ بن نصیر بھی اس کے عتاب کا شکار ہوے۔ یزید بن عبدالملک نے آل مہلب کا بے دردی سے خاتمہ کیا جنہوں نے استحکام سلطنت میں اہم کردار ادا کیا تھا ۔ظاہر ہے ایسی حرکتوں سے امرا میں بددلی پھیلتی ہے اور مملکت کے لیے جانثاری کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ اہل علم و فضل بھی ان کے استبداد کا شکار ہوے۔ عبدالملک نے حضرت سعید بن میتب کو کوڑوں سے پٹوایا۔ حجاج نے صحابی رسولؐ حضرت انسؓ سے بدسلوکی کی، سعیدؒ بن جبیر کو قتل کروایا اور حضرت حسن بصری نے روپوش ہو کر جان بچائی ۔ ان مظالم کی وجہ سے عوام و خواص امویوں کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے بنوامیہ کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کا ساتھ دیا جس سے اموی حکومت غیر مستحکم ہو گئی اور بالآخر

عباسی دعوت کی کامیابی نے اسے ڈھیر کر دیا۔

۳۔ بیت المال کا غلط استعمال: اسلامی نظریے کے مطابق بیت المال (خزانۂ ریاست) عوام کی امانت ہوتا ہے چنانچہ خلفاے راشدین اسے امانت سمجھ کر انتہائی حزم و احتیاط سے صرف کرتے تھے، لیکن اموی عہد میں خلفا نے اسے اپنی مرضی اور اپنی سیاسی اغراض کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا، چنانچہ انہوں نے اپنے لیے عظیم الشان محلات بنوائے اور دوسری عمارات تعمیر کروائیں۔ بیت المال کی مدات آمدنی میں حلال و حرام کا امتیاز بھی کمزور پڑ گیا اور سیاسی استبداد کی وجہ سے عوام اپنے اس حق سے بھی محروم ہو گئے کہ حکام سے خزانۂ عامرہ کے غلط یا صحیح استعمال کے بارے میں باز پرس کر سکیں (ابو الاعلی مودودی: خلافت و ملوکیت ،ص۱۶۱ بعد لاہور،۱۹۸۴ء)

۴۔انتقال اقتدار: دنیاے سیاست کا ایک اہم مسئلہ انتقال اقتدار کا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین نے اسے عوامی اور شورائی رنگ دیا، لیکن پہلے اموی حکمران حضرت امیر معاویہ نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت لے کر اسے موروثی بنا دیا اور اس میں مزید خرابی یہ پیدا ہوئی کہ ایک خلیفہ اپنے بعد ایک سے زیادہ افراد کو ولی عہد نامزد کر دیتا تھا اور ان میں سے ایک جب خلیفہ بنتا تھا تو وہ پہلے سے نامزد کردہ دوسرے ولی عہد کی نامزدگی منسوخ کر کے اپنی مرضی کا ولی عہد نامزد کرنے کی سعی کرتا تھا۔ اس سے نہ صرف حکمران خاندان میں پھوٹ پڑتی تھی، بلکہ وزراء اور عمال میں بھی گروہ بندی ہو جاتی تھی۔ اس رسم بد کا آغاز مروان نے کیا جس نے اپنے بعد اپنے بیٹوں عبدالملک اور عبدالعزیز کو ولی عہد نامزد کر دیا، حالانکہ موتمر جابیہ ہیں، جس میں اسے خلیفہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا، یہ بھی طے پایا تھا کہ اس کے ولی عہد خالد بن یزید اور عمروبن سعید ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عمرو بن سعید نے عبدالملک کے خلاف بغاوت کر دی اور قتل ہوا۔ مروان والی غلطی کا ارتکاب عبدالملک نے بھی کیا اور اپنے بھائی عبدالعزیز کی بجائے اپنے بیٹوں ولید اور سلیمان کو ولی عہد نامزد کرنے کا ارادہ کیا۔ حسن اتفاق سے عبدالعزیز کا اس کی زندگی ہی میں انتقال ہوگیا اور یوں ولید اور سلیمان کے لیے راستہ ہموار ہوگیا۔ پھر یہی معاملہ ولید نے اپنے بھائی سلیمان کے ساتھ کرنا چاہا اور اس کی بجائے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو ولی عہد بنانا چاہا، لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی ،گو حجاج بن یوسف اور قتیبہ بن مسلم وغیرہ نے اس کی حمایت کی۔ چنانچہ سلیمان نے برسر اقتدار آ کر زبردست انتقامی کاروائیاں کیں۔ حجاج کے خاندان پر مظالم ڈھائے اور اس کے مخالفین کو اقتدار دیا (محمد بن قاسم کا قتل اسی کا شاخسانہ تھا)، قتیبہ بن مسلم بھی قتل کیے گئے اور موسی بن نصیر بھی زیر عتاب آئے (تفصیل کے لیے دیکھیے، الکامل، ۴:۲۲۳؛ تاریخ یعقوبی :۲۳، ۳۵۴وفح الطیب ۱:۱۳۲)۔

۵۔ عربی تعصب: اسلام میں شرف کی بنیاد تقویٰ ہے نہ کہ کسی خاص نسل، قوم، علاقے یا زبان سے تعلق۔ خلافت راشدہ میں اسی پر عمل ہوتا تھا، لیکن عہد اموی میں جو فتوحات حاصل ہوئیں اور شام، عراق، ایران، مصر وغیرہ کے جو علاقے فتح ہوے ان کے فتح کرنے والے اور ان علاقوں کا انتظام سنبھالنے والے چونکہ سب عرب تھے اس لیے اموی خلفا نے عربوں اور عربیت کو سب پر مقدم رکھا اور اسے اپنے سیاسی نظام میں مرکزی اہمیت دی۔ اس سے مفتوح اقوام میں رد عمل کی نفسیات بیدار ہوئی۔ پھر اموی خلفا اور ان کے گورنروں نے زراندوزی کے لیے نو مسلم غیر عربوں (موالیوں) پر جزیہ برقرار رکھا جس سے ان کا ناراض ہونا فطری تھا، چنانچہ موالیوں نے ہر اس شخص اور تحریک کا ساتھ دیا جو اموی اقتدار کا خاتمہ چاہتی تھی۔ یوں انہوں نے مختار ثقفی، خوارج، عبدالرحمٰن بن اشعث اور

یزید بن مہلب کی بغاوتوں میں ان کا ساتھ دیا اور آخر میں عباسی دعوت کے علمبرداروں (خصوصاً ابو مسلم خراسانی) نے نہایت ہوشیاری سے موالیوں کا کارڈ استعمال کیا اور ان کی حمایت سے امویوں کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر اموی حکمران شروع ہی سے غیر عربوں اور نو مسلموں کو اپنے برابر کا درجہ دیتے اور عربی تعصب کا مظاہرہ نہ کرتے تو شاید اس عہد کی تاریخ وہ نہ ہوتی جو ہم آج پڑھتے ہیں (حسن ابراہیم حسن: تاریخ الاسلام، ۱:۳۴۲)۔

۶۔ اخلاقی زوال: بنوامیہ کے زوال کا ایک سبب بعض اموی خلفا کی عیش کوشی، دادو دہش اور طرب و نشاط میں ان کا مبالغہ بھی تھا۔ یزید بن معاویہ سیر وشکار کا رسیا اور مے نوشی کا عادی تھا۔ یہاں تک کہ مرض الموت میں جب حضرت امیر معاویہ نے وصیت کرنا چاہی تو اسے بلوانا پڑا۔ وہ آیا اور حضرت امیرؓ کی باتیں سن کر دوبارہ شکار کو چلا گیا اور ان کی وفات کے وقت بھی موجود نہ تھا (مروج الذھب، ۲:۹۴)۔ یزید بن عبدالملک نے چار ہزار دینار میں حبابہ نامی جاریہ خریدی اور اس سے فریفتگی کا اس کا یہ عالم تھا کہ وہ بیمار پڑتی تو دنوں اس کے پاس سے نہ ہٹتا اور جب وہ مر گئی تو اس کی میت سے کئی دن چمٹا رہا اور دفنانے کی اجازت نہ دیتا تھا اور اس کے غم میں چند دنوں کے اندر خود بھی مر گیا۔ اس کا بیٹا ولید لہوولعب میں اس سے بھی بڑھ کر تھا (الطبری، ۸:۲۸۸)۔ جب خلیفہ کا یہ حال ہو تو درباری امرا اور وزرا کا تو کام ہی یہ ہے کہ حکمرانوں کی پیروی کریں اور ان کی خوشنودی چاہیں، چنانچہ انہوں نے بھی خلفا کی طرح محلات کھڑے کر لیے اور ناچنے گانے والیوں کے طائفے بھرتی کر لیے۔ اس طرح غناء و طرب کے یہ احوال عوام میں بھی سرایت کرنے لگے اور یہ سب دین سے عدم وابستگی، رومی و ایرانی تہذیب کی پیروی، مال و دولت کی کثرت اور دنیوی نعمتوں و سہولتوں کی فراوانی کے بے جا استعمال کا نتیجہ تھا۔ اموی حکمرانوں کی ان حرکتوں کی وجہ سے دین دار طبقہ ان کے خلاف ہو گیا اور انہیں ہٹانے کی کوششوں کی حمایت کرنے لگا۔

۷۔ قبائلی عصبیت: جزیرہ نما عرب بنیادی طور پر ایک قبائلی علاقہ تھا جہاں مختلف قبائل میں متعدد اسباب کی بنا پر حریفانہ چپقلشیں جاری رہتی تھیں۔ اس طرح کی ایک گروہ بندی شمالی عرب میں بسنے والے عدنانیوں (مضریوں) اور جنوبی عرب میں بسنے والے قحطانیوں (یمنیوں) میں تھی جو زمانۂ جاہلیت سے حریف چلے آتے تھے، لیکن اسلام نے قبائلی عصبیت کو دبا دیا اور خلافت راشدہ میں، بلکہ بنوامیہ کے ابتدائی دور میں بھی جب تک حکومت مستحکم اور حکمران بیدار مغز رہے اس فتنے نے سر نہیں اٹھایا۔ بنوامیہ خود مضری تھے، لیکن ان کی قوت کا زیادہ تر دارومدار یمنی قبائل پر تھا، جنہیں سلطنت میں رسوخ حاصل تھا، لیکن جب یزید بن عبدالملک کے خراسان میں برسر اقتدار آل مھلب سے اختلافات پیدا ہوئے تو اس نے انہیں بے دردی سے کچل دیا اور ان کے مخالفین کو اعلیٰ عہدوں سے نوازا۔ یوں مضری، یمنی مسئلہ ابھر کر سامنے آگیا۔ یزید کے بعد ہشام نے توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی اور اس نے یمنی سردار خالد القسری کو عراق کا اور اس کے بھائی اسد کو خراسان کا حکم بنا دیا۔ یمنیوں کو اقتدار ملا تو انہوں نے مضریوں کے خلاف انتقامی کاروائیاں شروع کر دیں (الطبری، ۸:۱۹۲)۔ یہ حالت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہی۔ ہشام نے عباسیوں کی حمایت کے الزام میں خالد القسری کو قتل کروا دیا اور عراق، خراسان اور اندلس وغیرہ میں بھی مضری گورنر مقرر کر دیئے۔یمنیوں نے مشتعل ہوکر اور یزید بن الولید بن عبدالملک کو ساتھ ملا کر، ولید کو قتل کر دیا۔ یزید چونکہ یمنیوں کی حمایت سے برسر اقتدار آیا تھا، لہٰذا انہی کی سرپرستی کرتا رہا ۔مضریوں نے حمص، فلسطین اور اردن میں

شاہی خاندان کے افراد کی سرکردگی میں بغاوت کی، لیکن یزید نے انہیں کچل دیا۔ یزید نے اپنے بھائی ابراہیم کو ولی عہد بنایا لیکن وہ ایک کمزور حکمران ثابت ہوا (ابن اثیر: الکامل ۵:۱۱۵-۱۲۵)۔ مروان نے مضریوں کو ساتھ ملا کر ولید کا بدلہ لینے اور اس کے بیٹے کو تخت دلوانے کے لیے بغاوت کر دی، لیکن یمنیوں نے ولید کے دونوں بیٹوں کو قید خانے میں قتل کر دیا۔ مروان نے اقتدار پر قبضہ کر کے یمنیوں کو کچلنے کی کوشش کی، جنہوں نے حکمران خاندان کے افراد اور خوارج وغیرہ کو ساتھ ملا کر حمص، دمشق، عراق، یمن، حجاز وغیرہ میں سخت مزاحمت کی۔ مروان اس خانہ جنگی میں الجھا رہا اور ایران و خراسان کی طرف توجہ نہ دے سکا جہاں عباسی دعوت پھل پھول کر تناور درخت بن چکی تھی چنانچہ جب ابو مسلم خراسانی نے خراسان پر قبضہ کر کے شام اور عراق پر حملہ کیا تو مروان اسے روک نہ سکا اور شکست کھا کر قتل ہوا اور یوں اموی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا (ابن اثیر،۵:۱۳۱-۱۳۵)۔

زوال بنو امیہ: بنو امیہ کی مذکورہ بالا کمزوریاں ہی ان کی ہوا خیزی اور زوال کا باعث بنیں خصوصاً حکام کے استبداد، قبائلی عصبیت، ولی عہدی کے نظام، دینی عناصر کی حمایت سے محرومی اور حکام کی اخلاقی ابتری نے ان کے سیاسی نظام کو عدم استحکام کا شکار کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

مآخذ: متن مقالہ میں درج ہیں، مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: (۱) الدینوری: الاخبار الطوال، لائیڈن، ۱۸۸۸ء؛ (۲) الاصبہانی: الاغانی، بارسوم القاہرہ، ۱۳۴۵ھ؛(۳) ابن قتیبہ: عیون الاخبار ،القاہرہ ،۱۳۴۳-۱۳۴۸ ھ؛ (۴) وہی مصنف: ادب الکاتب، لائیڈن، ۱۹۰۰ء؛ (۵) البلاذری: انساب الاشرف، طبع بیروت و بیت المقدس وغیرہ؛(۶) الجاحظ: البیان والتبیین، القاہرہ،۱۳۶۷ھ؛ (۷) وہی مصنف: کتاب الحیوان، طبع ہارون، القاہرہ ؛ (۸) وہی مصنف: رسالہ فی بنی امیہ ،ترجمہ Pellat، الجزائر،۱۹۵۲ء؛(۹) مصعب الزبیری: نسب قریش، القاہرہ، ۱۹۵۳ء؛ (۱۰) ابو علی القالی: الامالی، القاہرہ ۱۳۴۴ھ؛(۱۰) الصفدی، کتاب امرائے دمشق، دمشق ۱۹۵۵ء؛ (۱۱) ہشام الکلبی: جمہرۃ النسب، لائیڈن، ۱۹۶۶ء؛ (۱۲) ابن خیاط: تاریخ نجف ۱۹۶۷ء؛ (۱۳) وہی مصنف: کتاب الطبقات، بغداد، ۱۹۶۷ء؛ (۱۴) ابن اعصم الکوفی: کتاب الفتوح، حیدرآباد ۱۹۶۸- ۷۵ ۱۹ ء ؛ (۱۵)المقریزی: النزاع والتخاصم فیما بین بنی امیہ و بنی ہاشم، انگریزی ترجمہ C.E Bosworth، مانچسٹر ۱۹۸۰ء؛(۱۶) الذھبی: تاریخ الاسلام، بیروت، ۱۹۹۱ء؛ (۱۷) ابن عساکر: تاریخ مدینۃ الدمشق، سنگی طباعت عمان؛ (۱۸) ابن منظور: مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر، دمشق ۱۹۸۹ء؛ (۱۸) حسن ابراہیم حسن: تاریخ الاسلام ،القاہرہ ۱۹۶۴ء.

اردو مراجع کے لیے دیکھیے: (۱۹) شاہ معین الدین احمد ندوی: تاریخ اسلام، حصہ دوم، اعظم گڑھ ۱۹۶۳ء؛ (۲۰) محمد اکبر شاہ نجیب آبادی: تاریخ اسلام، حصہ دوم، لاہور ۱۹۹۱ء؛ (۲۱) شاہ معین الدین احمد ندوی: سیر الصحابہ، ج ۶: اعظم گڑھ ۱۹۵۱ء؛ (۲۲) وہی مصنف: تابعین، اعظم گڑھ،۱۹۵۶ء؛ (۲۳) رشید اختر ندوی: تہذیب و تمدن اسلامی، لاہور ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۵۱ء؛ (۲۴) عبدالسلام ندوی: سیرت عمر بن عبدالعزیز، اعظم گڑھ ۱۹۵۹ء؛ (۲۶) اموی عہد کے اہم زعماء و خلفا مثلاً (حضرت) معاویہؓ، (حضرت) حسینؓ ،یزید، مروان، عبدالملک ،ہشام وغیرہ کے لیے دیکھیے انفرادی مقالات در البذیل مادہ؛ نیز دیکھیے (۲۵) M.A.Shaban: *Islamic History A New Interpretation, 600 -750AD.*، کیمبرج ۱۹۷۱ء؛(۲۸) وہی مصنف: *The Abbasid Revolution*،کیمبرج ۱۹۷۰ء.

(محمد امین)

••-------------••

*(۳) امیہ، بنو (اندلس میں): بنو امیہ نے اندلس میں ۱۳۸ھ سے ۴۲۲ھ /۷۵۶ء سے ۱۰۳۱ء تک حکمرانی کی۔ تاریخی اعتبار سے ان کا عہد حکومت اس طرح سے ہے:

عبدالرحمٰن اول بن معاویہ ابو المطرف الدّاخل ۱۳۸ھ/۷۵۶ء
ہشام اول بن عبدالرحمان اول، ابو الولید ۱۷۲ھ/۷۸۸ء
الحکم اول بن ہشام اول ابو العاصی ۱۸۰ھ/۷۹۶ء
عبدالرحمٰن ثانی بن الحکم اول ابو المطرف المتوسط ۲۰۶ھ/۸۲۲ء
محمد اول بن عبدالرحمان ثانی ابو عبداللہ ۲۳۸ھ/۸۵۲ء
المنذر بن محمد اول ابو الحکم ۲۷۳ھ/۸۸۶ء
عبداللہ بن محمد اول ابو محمد ۲۷۵ھ/۸۸۸ء
عبدالرحمان ثالث بن محمد ابو لمطرف الناصر ۳۰۰ھ/۹۱۲ء
الحکم ثانی بن عبدالرحمان ثالث ابو لمطرف المستنصر ۳۵۰ھ/۹۶۱ء
ہشام ثانی بن الحکم ثانی الولید المؤید (پہلا دور) ۳۶۶ھ/۹۷۶ء
محمد ثانی بن ہشام ثانی المہدی (پہلا دور) ۳۹۹ھ/۱۰۰۹ء
سلیمان بن حکم المستعین (پہلا دور) ۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء
محمد ثانی (دوسرا دور) ۴۰۰ھ/۱۰۱۰ء
ہشام ثانی (دوسرا دور) ۴۰۰ھ/۱۰۱۰ء
سلیمان (دوسرا دور) ۴۰۳ھ/۱۰۱۳ء
علی بن حمود الناصر حمودد ۴۰۷ھ/۱۰۱۶ء
عبدالرحمان رابع بن محمد المرتضیٰ ۴۰۸ھ/۱۰۱۸ء
القاسم بن حمودد المامون حمودد (پہلا دور) ۴۰۸ھ/۱۰۱۸ء
یحییٰ بن علی المعتلی حمودد (پہلا دور) ۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء
القاسم، حمودد (دوسرا دور) ۴۱۳ھ/۱۰۲۳ء
عبدالرحمٰن خامس بن ہشام المستظہر ۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء
محمد ثالث بن عبدالرحمان المستکفی (م ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء) ۴۱۴ھ/ ۱۰۲۴ء
یحییٰ حمودد (دوسرا دور) ۴۱۴ھ/۱۰۲۵ء
ہشام ثالث بن محمد (المعتمد م ۴۲۸ھ /۱۰۳۶ء، ۴۲۲) ۴۱۸ھ /۱۰۲۷-۱۰۳۱ء

ملوک الطوائف

ا۔نئے خاندان کا قیام: جزیرہ نمائے آئبیریا کے گورنر خواہ براہ راست دمشق کے ماتحت تھے، یا انہیں گورنر افریقہ کی طرف سے اختیارات ملے ہوئے تھے۔ اپنے علاقے کی مرکز سے دوری کی وجہ سے کافی حد تک خود مختار ہوتے تھے۔ شام میں عباسیوں کے ہاتھوں بنو امیہ کا زوال ان کی خود مختاری میں مزید اضافے کا سبب بن گیا.

جب یوسف بن عبدالرحمٰن الفہری کی حکومت قائم ہوئی تو وہ کم و بیش مکمل طور پر آزاد ہو گئی، کچھ دیگر حالات بھی ایسی شکل اختیار کرگئے کہ وہ اندلس میں ایک نئے حکمران خاندان کا بانی بن گیا۔ یوسف ایک قریشی [رک بآں] تھا، اور عقبہ بن نافع کا پڑپوتا، فاتحین اندلس کا بیٹا اور بھتیجا تھا، جس کا چچا حبیب بن ابی عبیدہ ان افراد میں سے تھا جنہوں نے موسیٰ بن نصیر کے بیٹے اور جانشین عبدالعزیز کو قتل کیا تھا۔ وہ اندلس کے عربوں کی متفقہ حمایت کی وجہ سے گورنر منتخب ہوا تھا، لیکن اس کے معتمد الصمیل بن حاتم کی فرقہ وارانہ سیاست کی وجہ سے یہ اتفاق رائے بے اثر ہو گیا.

اس میں ایک دوسرے مگر اس سے بھی زیادہ دور رس عامل کا اضافہ یوں ہو گیا کہ اموی نوجوان عبدالرحمان بن معاویہ عباسیوں کے خوف سے فرار ہو کر شمالی افریقہ آ پہنچا، یہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا پوتا تھا، اس کے ہمراہ اس کا ایک وفا دار غلام بدر بھی تھا۔ یہ کہیں جائے قرار حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے قدم جما کر کھویا ہوا اقتدار واپس لینے کی جدو جہد شروع کر سکے، لیکن افریقیہ کے گورنر عبداللہ بن حبیب الفہری نے اسے ٹکنے نہ دیا اور اپنا فرار جاری رکھنے پر مجبور کر دیا۔ اسے خوف تھا کہ اگر اس نے اسے پناہ دے دی تو اس کا حشر بھی اپنے چچا زاد یوسف بن عبدالرحمان جیسا ہوگا چنانچہ عبدالرحمان بن معاویہ مایوس ہو

کر مغرب کے بربر قبیلوں میں آوارہ گردی کرنے لگا، اس تجربے سے اس پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ان خطوں میں اموی حکومت کی بحالی ممکن نہیں ہے، اس نے سوچا کہ جب نئی ریاست کا قیام اور بربر قبیلوں کو متحد کرنے کا کام اتنا زیادہ مشکل ہے تو کیوں نہ اندلس میں قسمت آزمائی کی جائے۔ اس نے اپنے غلام بدر کو حالات کا رخ معلوم کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔

جب بدر نے آبنائے جبر الٹر عبور کر کے اندلس کے لوگوں کو اپنے آقا کے ارادوں سے آگاہ کیا، تو انہوں نے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے خود ہی اندلس کے مرد آہن الصمیل سے رابطہ قائم کیا اور اس سے کہا کہ امویوں کے ساتھ یہاں آنے کی شرائط طے کرے ۔ شروع میں تو الصمیل اس پر راضی ہو گیا، مگر بعد میں اسے جلد ہی یہ خیال آیا کہ اندلس میں اس کی آمد میرے لیے آزمائش بن سکتی ہے، میں نے لا قانونیت پر جتنا کچھ قابو پایا ہوا ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے اس تجویز کی مخالفت کا اعلان کر دیا۔ اس پر امویوں نے الصمیل کے مخالف دھڑے کی حمایت شروع کر دی، عرفِ عام میں انہیں یمنی پارٹی کہا جاتا تھا، حالانکہ یہ اول تا آخر اموی تھے۔ انہوں نے عبدالرحمان بن معاویہ کو لانے کے لیے کام شروع کر دیا، حتیٰ کہ وہ ان کی مدد سے آبنائے جبر الٹر عبور کر آیا ۔ لوگ جوق در جوق اس کے پاس پہنچ کر اسے اپنی وفا داریوں کا یقین دلاتے رہے.

۱۳۸ھ/۷۵۵ء کے موسم گرما کے اواخر میں عبدالرحمان، المنیکر میں آ لنگر انداز ہوا اور طوراکس میں اپنے ایک عقیدت مند عبید اللہ بن عثمان کے گھر میں پناہ لے لی۔ طوراکس ایک پہاڑی علاقہ تھا جو بہت دشوار گزار تھا اور تقریباً ناقابل رسائی تھا۔ اس وقت تک گورنر یوسف بن عبدالرحمان کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا اور اس نے الصمیل کی ہدایت کو بھی نظر انداز کر دیا تھا جس نے اسے اس نووارد کے خلاف بلا تاخیر کارروائی کا حکم دے رکھا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ لوگوں کی تائید حاصل کر کے کوئی مصیبت کھڑی کرے۔ گورنر سردیاں ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا، کیونکہ اس کی فوجیں حال ہی میں ایک مہم سے واپس آئی تھیں اور وہ کسی مہم پر جانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ یہ تاخیر بڑی مہلک ثابت ہوئی کیونکہ اس عرصے میں بنو امیہ کا دعویدار اپنے حامیوں کی تعداد خطرناک حد تک بڑھانے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اس نے بالآخر یوسف اور صمیل کا تختہ الٹ دیا۔ صمیل ۱۰ ذوالحجہ ۱۳۸ھ/۱۴ مئی ۷۵۶ کو قرطبہ چلا گیا۔ نئے فاتح نے پہلے اس سے زیادہ تعرض نہ کیا لیکن جب اس نے کچھ مزید طاقت حاصل کر کے بغاوت کرنے کی کوشش کی تو اسے شکست دے کر قتل کر دیا گیا۔

اس کے بعد سے اندلس کے بنو امیہ کی قسمت قرطبہ سے وابستہ ہو گئی۔ قرطبہ سے یعنی اس کے نواح (الرباد) سے اٹھنے والی شورش خطرناک ترین شورشوں میں سے تھی جس سے پہلے تین فرمانرواؤں کو نمٹنا تھا کیونکہ اس کے بغیر قیام امن ممکن نہیں تھا اور یہ آخری شورش بھی ثابت ہونا تھی۔ یہ قرطبہ ہی تھا جس نے بہت بعد میں عبداللہ کے عہد کے مشکل ترین لمحات میں اس خاندان کو زندہ رہنے اور مناسب ترین لمحات آنے تک انتظار کا موقع دیا۔ یہ بھی قرطبہ ہی تھا جس نے ''دورِ فتنہ'' میں عارضی خلفا کی یکے بعد دیگر آمدورفت دیکھی اور لوگ اس سلسلے سے اتنے بیزار ہو گئے کہ انہوں نے اموی حکومت کا بالکل صفایا کر دینے میں ہی عافیت سمجھی اور اعلان کیا کہ قرطبہ آئندہ بنو امیہ کا دارالخلافہ کبھی نہیں بنے گا۔ یہ بات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس اعلان کے بعد کسی دوسرے شہر نے بنو امیہ کی خلافت بحال کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ یہ خاندان

منظر سے بالکل غائب ہو گیا، لیکن اس "حادثہ یا اقتدار سے علیحدگی" کے بعد بدترین حالات سے دو چار ہو گیا اور کبھی وہ سیاسی کردار ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکا جو اس نے جزیرہ نمائے آئبیریا میں مسلمانوں کی موجودگی کی پہلی صدیوں کے دوران ادا کیا تھا۔

اندلس کے بنو امیہ کی تاریخ کو تین بڑے اور واضح ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، جن میں سے تیسرا "فتنہ کا دور" اور اس کے بعد کے چند سالوں پر مشتمل ہے، یہ ۳۹۹ھ/۱۰۰۹ء میں ہشام ثانی کی اقتدار سے پہلی برطرفی سے شروع ہو کر ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں خلافت کی منسوخی تک کے عرصے پر محیط ہے۔ جہاں تک پہلے دو ادوار کا تعلق ہے وہ کسی حد تک اس روایتی تقسیم پر منطبق ہو جاتے ہیں جو عہد امارت اور عہد خلافت کو دوسرے سے متمیز کرتی ہے۔ اگرچہ اس زمرہ بندی کے جواز کو اس لحاظ سے چیلنج کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنی مثال آپ نہیں تھا اور اس میں اس امر کو بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا کہ عبدالرحمان ثالث نے خود کو بطور خلیفہ ملقب کر لیا تھا۔ یہ دو ادوار بیک وقت ایک دوسرے کے مماثل بھی تھے اور قدرے مختلف بھی۔ مماثل اس لحاظ سے تھے کہ دونوں ادوار کے حکمرانوں نے بار بار عروج بھی دیکھا، شان و شوکت بھی دیکھی اور زوال کا بھی شکار ہوئے، لیکن اس لحاظ سے یہ ادوار ایک دوسرے سے مختلف رہے کہ ان میں حکمرانوں کے مراکزِ مفادات الگ الگ مقام پر مرکوز رہے اور پھر وہ وہیں سے پیدا ہونے والے مسائل میں الجھ کر رہ گئے۔

پہلے دور کے بنو امیہ کے امرا کی توجہ کا اصل مرکز اندلس تھا اور ان کی تمام سرگرمیاں اس کی سرحدوں کے اندر مرتکز تھیں۔ بعد ازاں ان کے جانشین خلفا کے روپ میں برسر اقتدار آئے تو وہ عبدالرحمان ثالث کے عہد کے آغاز تک داخلی امن و امان میں مصروف رہے اور پھر جارحانہ سیاست میں مصروف ہو گئے تاکہ مغرب بعید پر تسلط حاصل کر سکیں، اس سے انہیں شروع میں کچھ کامیابی ہوئی مگر بعد میں یہ بالواسطہ طور پر یکے از اسباب "فتنہ" بن گئی۔

۲۔ بنو امیہ کا دورِ امارات: عبدالرحمان اول کی تخت نشینی سے لے کر اس کے پوتے الحکم کی وفات (۲۰۰ھ/ ۸۲۲ء) تک اندلس کی تاریخ پے در پے بغاوتوں اور شورشوں سے بھری پڑی ہے جو "مضافاتِ قرطبہ" کے مشہور واقعہ پر منتج ہوئی۔ تین اموی حکمران پون صدی تک ہر قسم کی مزاحمتوں سے نبرد آزما رہے اور سارے علاقے کو مطیع بنانے کے لیے اپنی جملہ مساعی بروئے کار لاتے رہے۔ عبدالرحمان بن معاویہ نے کئی قسم کی بغاوتوں پر قابو پایا، ایک بغاوت وہ تھی جو یوسف کے طرف داروں نے کی اور ایک وہ بھی تھی جو یوسف کے خلاف اس کی طرف سے لڑنے والوں نے کر دی۔ اسی طرح بربروں نے بغاوت کی اور پھر ایک عباسیوں نے کر ڈالی۔ ساتھ ساتھ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے خلاف بنو امیہ کے اندر بھی سازشیں ہو رہی ہیں۔ ان تمام بغاوتوں کا نتیجہ (اور شاید ان میں سے بعض کامیاب بھی تھیں) یہ نکلا کہ اس نے اپنی حمایت کے لیے ان میں سے کسی واحد قوت پر انحصار نہ کرنے کی پالیسی اختیار کر لی۔ اس نے نہایت عجلت سے بربروں اور غلاموں پر مشتمل فوج تشکیل دی جس نے اسے صرف "جنود" پر انحصار سے بے نیاز کر دیا۔ تاہم اس نے باقاعدہ فوجی خدمات کا نظام ختم نہیں کیا۔ مختلف "جنود" کے ارکان باری باری فوجی خدمات کے لیے بدستور آتے رہے۔

۱۷۲ھ/۷۸۸ء میں جب اس کا اقتدار ختم ہوا تو خاندان بنو امیہ تمام مشکلات پر قابو پا کر استحکام حاصل کر چکا تھا۔ اس کے مخالف یا تو قتل ہو چکے تھے یا مطیع بن چکے تھے اور کوئی ظاہری خطرہ نہیں رہا تھا۔ تاہم الحکم اول کے عہد میں اس امر کا ثبوت ملنے والا تھا کہ تمام مخالفین کا

قلع قمع نہیں ہوا تھا، جیسا کہ سوچا گیا تھا، اور اس سے پہلے ہی ہشام اول کا مختصر دور اقتدار آ گیا جس میں خاندان کے اندر کے مسائل اس طرح ابھر آئے کہ انہیں حل کرنے میں کافی عرصہ لگ گیا۔

ہشام اول [رک باں] عبدالرحمان کا سب سے بڑا بیٹا نہیں تھا۔ وہ اندلس میں پیدا ہوا اور والد کی وفات کے وقت تیس سال کا تھا، جبکہ اس کے بڑے بھائی کی عمر چالیس سال سے زائد تھی۔ بہت سے تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ والد نے ہشام کو ہی اپنا جانشین نامزد کیا تھا، تاہم اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی تخت نشینی کا سبب شاید اس کی وہ تیز رفتاری تھی جس کا مظاہرہ، اس نے والد کی وفات کی اطلاع پا کر فوراً قرطبہ پہنچنے کے لیے کیا۔ ہشام اس وقت "میریدا" میں تھا اور اس کا بھائی سلیمان طلیطلہ میں مقیم تھا۔ اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، یہ یقینی بات ہے کہ بڑا بھائی اس صورت حال پر خوش نہیں تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی عبداللہ المعروف البلانسی (ویلنیشیا کا آدمی) کی مدد سے طلیطلہ میں بغاوت شروع کر دی۔ یہ وہ شہر تھا جو قرطبہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے ہر شخص کو پناہ دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ طلیطلہ عبدالرحمان اول کے دور میں بھی ایک بار بغاوت کر چکا تھا اور آئندہ بھی اس نے یہ سلسلہ جاری رکھا تھا، لیکن سلیمان اور عبداللہ کی یہ بغاوت ناکام ہو گئی اور ان دونوں کو شمالی افریقہ میں جلا وطن کر دیا گیا، جہاں سے انہوں نے اپنے بھائی ہشام کی موت کے بعد واپس آنا تھا تاکہ اپنے بھتیجے الحکم کے مقابلے میں حق تخت نشینی کا مطالبہ کر سکیں۔ جب واپس آئے تو سلیمان قتل ہو گیا اور عبداللہ نے ویلنیشیا میں اپنا مرکز قائم کر لیا، مگر اس میں کوئی جان نہیں تھی۔ اس نے عبدالرحمان ثانی کے دور اقتدار میں کچھ سر اٹھایا اور قبل اس کے کہ اپنی اہمیت واضح کر سکتا، اسے طبعی موت نے آ لیا۔

ہشام اول کا دور حکمرانی قدرے پر سکون تھا، سوائے بالائی سرحدوں، رونڈا کے بربروں اور شمال کی جانب کے عیسائیوں کی غیر متوقع چھوٹی موٹی شورشوں کے کوئی بڑا واقعہ پیش نہیں آیا۔ تاہم اس کے بیٹے اور جانشین الحکم اول [رک باں] کا دور بہت مختلف رہا۔ جیسے کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اس نے اپنی حکومت کا آغاز اپنے دو چچاؤں کے حصول تخت کی جدو جہد کے دوران میں کیا۔ پھر تین بڑے شہروں ساراگوسہ، طلیطلہ اور میریدا میں سے اٹھنے والی علیحدگی پسندانہ شورشوں سے واسطہ پڑ گیا۔ جن میں سے طلیطلہ کے ہتھیار ڈالنے کا واقعہ "یوم خندق" ۱۸۱ھ/۷۹۷ء بہت مشہور ہے۔ اس روز گورنر شہر امروس بن یوسف جو ایک موالی تھا، کے اصرار پر طلیطلہ کے متعدد اہم افراد کو سزائے موت دی گئی تھی۔ اس موقع پر مستقبل کا حکمران عبدالرحمان ثانی قصبہ میں موجود تھا، وہ اپنی فوج کی قیادت کرتا ہوا، جو سرحد کی طرف جا رہی تھی، یہاں پہنچا تھا۔ گورنر نے اس واقعہ کو طلیطلہ کے مسلح لوگوں کو دھمکانے کے لیے استعمال کیا تاہم یہ حربہ لوگوں کو مطیع بنانے میں زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوا، جتنا اس سے فائدہ اٹھایا جا سکا، اس سے کہیں زیادہ کشت و خون کرنا پڑا۔ اگلے پندرہ سال میں قرطبہ کو یہاں سے اٹھنے والی شورشوں سے مسلسل واسطہ پڑتا رہا۔ طلیطلہ اور "اپر مارچ" (بالائی سرحدی علاقہ) اگرچہ بنو امیہ کے دارالحکومت سے بہت دور واقع تھے، مگر یہاں سے اٹھنے والی تحریکیں اندلس کی عمومی تاریخ کا مستقل حصہ بنی رہیں ۔ تاوقتیکہ عبدالرحمان ثالث مرکز گریز رجحانات پر قابو پانے کے لیے آ پہنچا۔ اس نے ان رجحانات کا رخ موڑنے کے لیے کافی کارروائیاں کیں تاہم بنو امیہ کا اقتدار ختم ہو جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

کہا جاتا ہے کہ سرحدی شہروں سے چپقلش کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، ہر امیر کے دور میں ان شہروں کے

لوگ اس سے اپنا معاملہ کسی نہ کسی طرح طے کر لیتے تھے۔ حکم پہلا شخص تھا جسے اندلس میں بنو امیہ کی تاریخ کے پہلے بڑے بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بحران قرطبہ کی آبادی کی بے چینی کا نتیجہ تھا اور جنہوں نے ۱۸۹ھ/۸۰۵ء میں امیر کا تختہ الٹنے کی سازش کی۔ اس کے جواب میں ۶۲ بڑے بڑے آدمیوں کے سر قلم کر دیئے گئے۔ ان میں کئی قابل ذکر فقہا بھی شامل تھے، لیکن یہ صرف ابتدائی تنبیہہ تھی چند سال بعد حکم کے خلاف ایک حقیقی بغاوت ہوئی، جسے "مضافاتی بغاوت" (۲۰۲ھ/۸۱۸ء) کہا جاتا ہے۔یہ عوام میں پائے جانے والے سلسلۂ اضطراب کا نقطۂ عروج تھا۔ امیر کی فوجوں نے اگرچہ اس پر بھی قابو پا لیا، لیکن اس میں بہت زیادہ کشت و خون ہوا، باغیوں کو سنگین ترین سزائیں دی گئیں۔ تین سو افراد کے سر قلم کیے گئے اور قرطبہ کی ساری آبادی کو گھر بار چھوڑ دینا پڑے اور پورے ضلع کی عمارتوں کو پیوند خاک کر دیا گیا.

عرب تاریخی روزناچوں نے اس بغاوت کے بڑے اسباب میں عوام پر بھاری محاصل کا نفاذ اور ان کی وصولی کا طریق کار بتایا ہے۔ وصولی کے لیے ایک عیسائی افسر مقرر کیا گیا تھا، جس کے بارے میں بہت کم معلومات میسر ہیں، مگر اس معاملے میں اس کا کردار بہت اہم تھا۔ اس کا نام ربیع تھا اور وہ حکم کے محافظ دستے کا کمانڈر بھی تھا، جو غلاموں پر مشتمل تھا۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ کیا عوام محاصل کی زیادہ شرح کی وجہ سے مشتعل ہو گئے تھے یا غلاموں کے دستے کے عیسائی سربراہ کے طریق وصولی پر خفا تھے، جو کچھ بھی تھا، مگر یہ اونٹ کی پشت پر آخری تنکا ثابت ہوا تھا۔ عوام کے زبردست احتجاج کے باوجود حکم نے اس عیسائی کو اسی عہدے پر برقرار رکھا اور وہ اپنی محاصل پالیسی میں بھی سرمو کمی پر راضی نہیں تھا۔ وہ اپنے محلات کی حفاظت کے لیے غلاموں کے اس دستے اور عیسائی ربیع کی وفا داری سے بے حد متاثر تھا۔ ۲۰۶ھ/۸۲۲ء میں حکم کے فوت ہو جانے کے چند روز بعد جب اس کا بیٹا عبدالرحمان ثانی برسر اقتدار آیا تو اس نے ربیع کو صلیب پر چڑھا دیا۔ اس کے اس اقدام سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں، اپنی جگہ مگر اس سے اس امر کا اظہار ہوا کہ نیا حکمران بنو امیہ خاندان اور اہل شہر کے درمیان فاصلے کم کرنا چاہتا ہے۔ عبدالرحمان ثانی [رک باں] کا تیس سالہ دور اقتدار اندلس کا پہلا سنہری دور کہلاتا ہے، اس کے باوجود اسے مسلمانوں کے مکمل اطمینان کا دور نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ سرحدی شہروں اوربالخصوص بالائی سرحدی شہروں سے ناکام بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہاں کے بنو قاسی [رک باں] خاندان نے مالکانہ حقوق اور علاقے کی خودمختاری کا مطالبہ شروع کر دیا۔ امیر قرطبہ کبھی اس مطالبے کو تسلیم کر لیتا اور کبھی انکار کر دیتا۔ عیسائیوں کی شورشوں کے خلاف مہمیں چلانا بھی ایک عام بات ہو گئی تھی۔ بے سود فتوحات اور ناکام حملے بھی فوجوں کے معمولات میں شامل ہو گئے، اس عہد کا واحد ناقابل پیش گوئی واقعہ نارمنوں کا ظہور تھا جو ۲۲۹ھ/۸۴۴ء میں پچاس کشتیوں میں سوار ہو کر آئے اور الاشبیلیہ پر حملہ آور ہو گئے۔ امیہ کی فوج اس پر حیران رہ گئی، بہر حال وہ جلد موقع پر پہنچ گئی اور ان قزاقوں کو مار بھگایا۔ مجموعی طور پر عبدالرحمان ثانی کا دور پر امن تھا جس کی وجہ سے اسے انتظامی ڈھانچے کی تنظیم نو کا موقع مل گیا۔ یہ کم و بیش عباسیوں کی طرز کی اصلاحات تھیں۔ نئے قاضیوں کا تقرر عمل میں آیا، عدالتی طریق کار میں بھی بہتری آئی۔ عدلیہ اور خزانہ کے سربراہ مقرر ہوے، سیاسی اور اقتصادی شعبوں میں سول سرونٹس کا تقرر عمل میں آیا، ان کے عہدے بڑھنے سے ریاستی اخراجات میں خاصا اضافہ ہو گیا تاہم آمدنی بڑھانے کے طریقے بھی وضع کر لیے گئے۔ لیکن حکم کے عہد کے برعکس آمدنی اور اخراجات میں

توازن پیدا نہ ہو سکا.

۲۳۸ھ /۸۵۲ء میں جب عبدالرحمان ثانی کی وفات ہوئی تو جانشینی کے لیے محلاتی سازشوں کا سلسلہ چل نکلا۔ تاہم اس کے بیٹے محمد کے جانشین بننے کے اعلان کی دیر تھی کہ سب مخالفتیں ختم ہو گئیں اور سالہا سال تک حالات سابق دورِ حکومت کی طرز پر چلتے رہے۔ طلیطلہ جو ہمیشہ شوریدہ سروں کا شہر رہا تھا، وہاں کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھتا رہتا تھا۔ امیر محمد کے تخت نشین ہونے کے بعد بھی وہاں کچھ ہلچل ہوئی، مگر توقع کے برعکس یہ رکنے میں نہ آ سکی اور طلیطلہ کی حدود سے باہر پھیلنے لگی۔ باغیوں نے "کالا ٹراوا" پر قبضہ کر لیا جو جلد ہی چھڑوا لیا گیا۔ پھر وہ اندوجر میں قرطبہ کی فوج پر جا حملہ آور ہوے اور اسے شکست دے دی۔ امیر فوراً ان کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا، اگلے موسم گرما میں اس نے جنگ "گازلیٹ" میں طلیطلہ والوں کو شکست دے دی۔ یہ اگرچہ بہت اہم فتح تھی لیکن اس سے علیحدگی پسندوں کے حوصلے پست نہ ہوے۔ اس دوران "لوئر مارچ" میں ابن مروان الجلیکی منظر عام پر آ گیا، لیکن یہ بطور باغی نہیں، بلکہ مقامی لیڈر کے طور پر ابھرا "اپر مارچ" میں بنو قاسی، امیر قرطبہ کا وفا دار رہا، مگر یہ وفا داری بعض اوقات صرف برائے نام ہوتی تھی.

محمد کے دور اقتدار کے آخری برسوں میں یہ قدرے پر سکون حالت بھی برقرار نہ رہ سکی، رفتہ رفتہ اس میں شدت آتی چلی گئی۔ ابن مروان جیسے افراد جو پہلے ڈاکوؤں سے کچھ زیادہ دلیر تھے، اب ان کی دلیری کچھ اور ہی رنگ دکھانے لگی تھی اور انہوں نے بعض علاقوں میں کھلی لوٹ مار اور قتل و غارت گری شروع کر دی۔ اموی فوج ان گروہوں کے خلاف مؤثر کاروائی نہ کر سکی، فوج ناکام ہوئی تو ڈاکوؤں نے امیر علاقوں کا رخ کر لیا اور اپنے متعدد گڑھ قائم کر لیے.

۲۷۳ھ/۸۸۶ء میں محمد کی وفات تک یہ خطرات ایک خاص حد کے اندر ہی تھے، اس وقت اس کا بیٹا "المنذر" جو الہامہ میں تھا اس نے چند باغیوں کو محاصرے میں لے لیا جن میں عمر بن حفصون [رک باں] بھی تھا، المنذر نے اس عزم کے ساتھ اقتدار سنبھالا کہ وہ ان بغاوتوں کو کچل کر رکھ دے گا، اس کا پہلا ہدف علاقے پر قبضہ جما لینا تھا۔ ۲۷۵ھ/۸۸۸ء کے موسم گرما کے دوران میں فوج نے اس گروہ کے کئی محفوظ ٹھکانوں مثلاً "ازناجر" اور "ارچیدونا" کو تہس نہس کر دیااور اب وہ "بوبسترو" کے قلعہ میں محصور ہو چکا تھا۔ [دیکھئے رک بہ "بوبشترو"]۔ اپنے آپ کو خطر ناک حالات میں گھرا ہوا پا کر اس نے المنذر سے "امان" طلب کی جو اسے دے دی گئی، لیکن وہ لحات میں معاہدہ توڑ کر امیر کے کیمپ سے فرار ہو گیا اور دوبارہ "بوبسترو" میں پناہ لے لی، المنذر نے پھر اس قلعے کا محاصرہ کر لیا، لیکن المنذر کا اچانک انتقال ہو گیا۔ امیر نے مرنے سے قبل اپنی شدید علالت کی علامات پائیں تو اس نے اپنے بھائی عبداللہ کو جلدی سے قرطبہ سے بلا لیا تھا، لیکن دارالحکومت میں اس کے لیے ہنگامی طور پر دوبارہ فوج اکٹھی کرنا مشکل ہوگیا.

عبداللہ کی تخت نشینی چپقلشوں کے ایک طویل سلسلے کا آغاز بن گئی، جس سے بنو امیہ کا خاندان خطرے میں پڑ گیا۔ اندلس کے طول و عرض میں کئی بغاوتیں پھوٹ پڑیں، جن سے عہدہ برآ ہونا ریاست قرطبہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہاں تک کہ امیر کے لیے شہر قرطبہ کا کنٹرول سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ خوش قسمتی سے بہت سے باغی بھی آپس میں بھی الجھ گئے اور ایک دوسرے سے زور آزمائی کرنے لگے، ان کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ حکمران خاندان پر آخری ضرب لگانے کی منصوبہ بندی کر سکتے، صرف ابن حفصون نے قرطبہ پر قبضہ کی کوشش کی تھی، لیکن اسے جنگ پولے (۲۷۸ھ/۸۹۱ء) میں رضا کارانِ

قرطبہ کی فوج کے ہاتھوں شکست ہو گئی.

اس شکست کی وجہ سے بغاوت فرو نہیں ہوئی، بلکہ الناصر کے دور کے آغاز تک جاری رہی، تاہم اس دوران میں عبداللہ کو دارالحکومتی شہر پر اپنا قبضہ مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکتا تو اندلس میں بنو امیہ کا مکمل طور پر خاتمہ ہو جاتا۔ بلکہ ملک بھر میں خانہ جنگی بھی چھڑ جاتی۔ ابن حفصون کے طرف داروں کی، اگرچہ ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی، مگر رائے عامہ اس کے سخت خلاف تھی۔ عبداللہ اس کی ضرب کاری سے تو بچ گیا تھا، لیکن اس کے پاس مؤثر جوابی کاروائی کے لیے طاقت نہیں تھی۔ وہ حالات میں بہت بری طرح گھرا ہوا تھا، وہ صرف اتنا ہی کر سکتا تھا کہ اپنی بچی کھچی طاقت کو بچائے اور اسے انتہائی کفایت اور حکمت سے استعمال کرے۔ چنانچہ وہ کبھی تو اپنے مخالفوں کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرنے لگتا اور کبھی انہیں آپس میں زور آزمائی کے لیے چھوڑ دیتا۔ کچھ عرصہ کسی مضبوط دھڑے کا سہارا لے لیتا اور اپنی فوج کو کسی کمزور ترین گروہ کے خلاف لڑائی کے لیے بھیج دیتا۔ مختصر یہ کہ وہ کمزور تھا لیکن اپنی کمزوری کو جانتے ہوئے اپنی حدود کے اندر رہنے کی کوشش کرتا تھا.

اسے اپنے خاندان کے داخلی خلفشار نے بھی سخت پریشان کر رکھا تھا، اس خلفشار نے اس کے دو بیٹوں محمد اور المطرف کو نگل لیا اور اس کے چند بھائی بھی قتل ہو گئے، اس کے باوجود جب وہ ۳۰۰ھ/۹۱۲ء میں فوت ہوا، تو اس کا پوتا عبدالرحمان جو مقتول محمد کا بیٹا تھا، اس کا جانشین بن گیا۔ سیاسی صورت حال اگرچہ زیادہ اچھی نہیں تھی، لیکن کسی حد تک مستحکم دکھائی دینے لگی۔ اندلس کا زیادہ تر حصہ قرطبہ کے مؤثر قبضے سے باہر تھا لیکن مجموعی طور پر حالات پرسکون تھے.

۳۔ خلافت: عبدالرحمان ثالث نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی اپنے ارادوں کا بر ملا اظہار کر دیا اور موسم بہار کی آمد کا انتظار کیے بغیر ہی قرطبہ کے قریب ترین علاقوں میں باغیوں کی سر کوبی کے لیے فوجی دستے روانہ کر دیے۔ ان میں سے اہم ترین دستہ حاجب بدر کی زیر قیادت بھیجا گیا جس نے سردیوں کے وسط میں شہر اسیجا (Ecija) پر پر امن طور پر قبضہ کر لیا (یہ قبضہ بہت اہم تھا اور یہ کارنامہ یکم جنوری ۹۱۳ء کو انجام پایا، جب کہ اسے تخت نشین ہوے صرف ڈھائی ماہ گزرے تھے)۔ اس شہر کی فتح کے لیے اس کے اقدامات اس کی پالیسی اور عزم کا بھر پور اظہار تھے اور بعد میں ہونے والی متعدد فتوحات کے لیے مثال بنے۔ اس نے صلح جویانہ طرز عمل اپنایا، جس شہر کے لوگوں نے بھی کم سے کم مزاحمت دکھائی ان کے خلاف کوئی انتقامی اقدام نہ کیا گیا، اس طرح یکے بعد دیگرے کامیابیاں ہوتی چلی گئیں۔ شہروں کی فصیلیں اگرچہ مسمار کر دی گئیں، لیکن قلعوں کی دیواروں کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا اور اموی گورنروں کا تقرر عمل میں آتا چلا گیا.

موسم بہار آیا تو عبدالرحمان غرناطہ اور "جائین کے کراس" (Kuras of Jaen) کے چھوٹے چھوٹے باغی گروپوں کو کچلنے کے لیے خود ایک مہم لے کر روانہ ہو گیا۔ ان میں سے بہت سے گروہ ابن حفصون کے حلیف تھے، چند مہینوں کی کاروائی سے اشبیلیہ پر قبضہ بحال کر لیا گیا اور وہاں بھی اسی پالیسی کا اعادہ کیا گیا، یعنی طاقت کے غیر ضروری استعمال سے گریز، مزاحمت نہ کرنے والوں سے اچھا سلوک، لیکن شہر کی فصیلوں کا انہدام۔ عبدالرحمان اپنے اقتدار کے پہلے ہی سال قرطبہ کو حالت تنہائی سے نکالنے اور اسے صحیح معنوں میں "مفتوحہ" شہروں کے ساتھ مربوط کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی طرح پورا اندلس بنو امیہ کے زیر نگیں آ گیا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا، اس کے ساتھ ساتھ اسے دوسری مشکلات پر بھی قابو پانا تھا مثلاً چند سال

پہلے سے جو قحط چلا آ رہا تھا ، اس کی شدت بڑھ چکی تھی۔ کنگ آف لیون آرڈونوii کی جارحیت اور ۳۰۱ھ/۹۱۳ء میں اس کے ہاتھوں ایوورا (Evora) کی تباہی کے اثرات پر قابو پانے کی مشکلات اس کے علاوہ تھیں۔

لیکن یہ مشکلات امیر قرطبہ کے منصوبوں کو تبدیل نہیں کر سکتی تھیں، جس کا اولین مقصد اندلس کے جنوب کو اپنے قابو میں کرنا تھا ، اس کے لیے ابن حفصون کی بغاوت کو کچلنا بے حد اہم تھا، اس نے اپنے اقتدار کے پہلے پندرہ مہینے اسی کوشش میں صرف کر دیے۔ پہلے وہ خود ابن حفصون کے خلاف بر سر پیکار رہا اور ۳۰۵ھ/۹۱۸ء میں اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے کے خلاف لڑتا رہا۔ بنو امیہ کی فوجوں نے بو بسترو کے قلعے پر ۳۱۹ھ/۹۲۸ء میں مستقل طور پر قبضہ کر لیا اور اس کی اس بغاوت کے باوجود عبدالرحمان نے حفص بن عمر بن حفصون کو امان دے دی۔

ان تمام برسوں میں عیسائیوں نے سرحدوں پر حملے بدستور جاری رکھے، مگر قرطبہ کا رد عمل صرف دو مہموں تک محدود تھا جن کی قیادت عبدالرحمان بذات خود کرتا رہا۔ ان میں سے ایک ۳۰۸ھ/۹۲۰ء میں معز (Muez) کی مہم تھی اور دوسری پمپلونا (Pamplona) کی مہم تھی۔ علاوہ ازیں چند کم اہم درجے کی مہمیں بھی تھیں، جن میں سے ایک وزیر ابن ابی عبدہ کو عبرتناک شکست دینے کے لیے تھی جس نے ۳۰۵ھ/۹۱۷ء میں کاسترو موروز (Castro Muros) میں بغاوت کی تھی۔ جب جزیرہ نما کا جنوبی حصہ بالکل پر امن ہو گیا تو مارچز، جو اس وقت تک قرطبہ کے اقتدار کے خلاف مسلسل بغاوت کر رہا تھا، اگلا نشانہ بن گیا۔ میریدا (Merida) نے ۳۱۶ھ/۹۳۰ء میں اطاعت قبول کر لی۔ بداجوز (Badajoz) نے ۳۱۸ھ/۹۳۰ء میں قرطبہ کی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ طلیطلہ ۳۲۰ھ/۹۳۲ء تک مزاحمت کرتا رہا اور ساراگوسا نے ۳۲۶ھ/۹۳۷ء میں اطاعت قبول کر لی (اس معاہدے کا متن اب تک موجود ہے)۔

اب سارا اندلس بنو امیہ کے کنٹرول میں واپس آ گیا تو عبدالرحمان نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اب وہ اس قابل ہو گیا کہ داخلی سیاست پر کم توجہ دے اور ملک کے باہر مسائل کی طرف متوجہ ہو سکے۔ یہ اندلس کے بنو امیہ کی تاریخ کا پہلا موقع تھا کہ ان کے حکمران کی توجہ شمال کے عیسائیوں پر ہی مرتکز نہیں رہی تھی، بلکہ ہمسایہ مغرب کی طرف مبذول ہو گئی تھی، بلکہ یہ ایک ایسا خطہ تھا جس کا اہل اندلس کی نگاہ میں اب تک کوئی وجود ہی نہ تھا۔ برعکس ماضی کے ان حالات کے جب عبدالرحمان ثانی کے ابتدائی دور میں آرڈونودوم مسلمانوں کے اندر گہرائی میں جا جا کر حملے کیا کرتا تھا، اب جزیرہ نما کی عیسائی ریاستیں کوئی بڑا خطرہ نہ رہیں۔ کم از کم اس مسلم ریاست کو ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا، البتہ ۳۲۷ھ/۹۳۹ء میں الھنڈیگا کی سنسنی خیز شکست سے خلیفہ کی ذاتی حیثیت کو شدید نقصان پہنچا، جس کا اثر یہاں تک ہوا کہ اس کے بعد اس نے کسی فوجی مہم کی قیادت نہیں کی۔ اس کے باوجود نہ تو اس لڑائی نے اور نہ خلیفہ کی فوجوں کی کثیر فتوحات نے سرحدوں میں کوئی قابل ذکر تبدیلی پیدا کی۔ ان کا نتیجہ صرف لوٹ مار اور افراد کی پکڑ دھکڑ تک محدود رہا۔

خاندان بنو امیہ کو شمالی عیسائیوں سے کوئی خطرہ نہ تھا، بلکہ افریقیہ کے فاطمیوں سے خطرہ تھا جو رفتہ رفتہ اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کر رہے تھے اور مغرب میں بہت دور تک جا نکلے تھے۔ ان کی یہ توسیع پسندانہ پالیسی کم از کم عبدالرحمان ثالث کی نگاہ میں ایک بڑے خطرے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ وہ اسے نہ صرف ایک فوجی تصادم کا پیش خیمہ سمجھ رہا تھا بلکہ شیعی پروپیگنڈے کا ذریعہ بھی سمجھتا تھا جو ان کی فوجوں سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ جب تک وہ بنو حفصون کی بغاوت کو فرو کرنے میں مصروف رہا،

مغرب میں اس کی مداخلت، دور کے فاصلے سے، فاطمیوں کی پیش قدمی کے خلاف ڈٹے ہوئے شمالی افریقی بادشاہوں کی حمایت تک محدود رہی، لیکن جب جنوبی جزیرہ نما میں سکون ہو گیا تو عبدالرحمان الناصر کے بندھے ہوئے ہاتھ کھل گئے اور اس نے آبنائے جبر الٹر کے جنوبی کنارے کے علاقوں میں ایک نئی سیاست متعارف کرا دی۔ ۳۱۹ھ/۹۹۳ء میں "سبطہ" (Ceuta) پر اس کا پر امن قبضہ مغرب میں بنو امیہ کی مداخلت کا آغاز تھا جس کا سلسلہ اس خاندان کے خاتمے تک جاری رہا۔

"سبطہ" (Ceuta) پک کے پار ایسا مورچہ نہیں تھا، جہاں سے مغرب کو فتح کرنے کے لیے پیش قدمی کی جا سکتی اور نہ ہی اس سے الناصر (یا اس کے جانشینوں حکم، المستنصر اور ہشام المؤید) کے اس ارادے کا اظہار ہو رہا تھا کہ وہ آبنائے کے پار کے علاقے کو فتح کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ بربر قبائل کو اپنے زیر تحفظ رکھ کر جنوبی سرحدوں پر ایک "محفوظ علاقہ" قائم کر دیا جائے اور یہ کام ایسی احتیاط سے کیا پائے کہ اس پر توسیع پسندانہ اقدام کا شبہ نہ ہونے پائے۔ بالفاظ دیگر قرطبہ، مغرب پر ایک فوجی قوت کے تسلط کی بجائے سفارت کاری پر یقین رکھنے والی ایک قوت کا تاثر قائم کرنا چاہتا تھا، جو الناصر کے خلیفہ کے لقب سے ملقب ہونے کی پالیسی کا حصہ تھا۔

روایتی طور پر حفصون باغیوں پر قابو پانا اور عبدالرحمان ثالث کا خود کو خلیفہ ملقب کرنا آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہیں، تاہم یہ یقینی امر ہے کہ اگر قلعہ بو بسترو کے باغیوں کا پکڑا جانا مملکت میں قیام امن کے لیے ایک اہم واقعہ تھا تو یہ اس نصب العین کی طویل شاہراہ پر صرف پہلا قدم تھا۔ یہ قلعہ ۳۱۵ھ/۹۲۸ء میں فتح ہوا اور خلافت کا اعلان ۳۱۶ھ/۹۳۷ء میں کیا گیا۔ اس وقت شمالی صوبے (مارچز) عبدالرحمان کے قبضے میں نہیں تھے اور ۳۲۶ھ/۹۳۷ء میں ساراگوسہ پر قبضے سے پہلے یہ دعویٰ ممکن نہیں تھا کہ الناصر نے سارے ملک پر موثر قبضہ حاصل کر لیا ہے، لہٰذا داخلی پالیسیوں کے سیاق و سباق میں "خلیفہ" کا لقب اختیار کرنے کا صحیح جواز سامنے نہیں آتا، تاہم اگر اسے اس وقت مغرب میں جاری اقتدار کی جدوجہد کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ایک طاقتور حریف کو نیچا دکھانے کے لیے ایک مذہبی حربہ نظر آتا ہے کیونکہ فاطمی حکمران بھی خود کو خلیفہ کہتا تھا۔

ایک عام اصول کے طور پر بنو امیہ کی شمالی افریقہ پالیسی زیادہ مفید نہیں رہی تھی تاہم اس سے انہیں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ بربر قبائل کے قائدین سے ڈھیلا ڈھالا اتحاد قائم ہوگیا، حالانکہ یہ مشکوک کردار کے لوگ تھے اور فاطمیوں کا دباؤ برداشت کرنے کے قابل ہی نہیں تھے۔ اندلس کافی محفوظ تھا لیکن مہدی فاطمی کی توجہ مغرب کی بہ نسبت مشرق کی طرف زیادہ تھی اور اندلس کی طرف تو مغرب سے بھی کم تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ امیہ خاندان کو کوئی فوری خطرہ در پیش نہیں تھا، لیکن انہوں نے شمالی افریقہ پالیسی کے لیے جو انسانی وسائل استعمال کر ڈالے اگر وہ بہت زیادہ نہیں تھے تو اتنے کم بھی نہیں تھے کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے اور صرف حاجب المنصور کی حکومت کے اختتام اور ہشام ثالث کے عہد کے دوران میں اموی فوجوں کو مستعدی سے اور براہ راست استعمال کیا جا سکا۔ فوج نے صرف ایک مہم میں جس کا نگران 'آمر' عبدالملک تھا "فیض" پر قبضہ کیا تھا، اتنا زیادہ خرچہ اور اتنا کم نتیجہ دانشمندی نہیں تھی۔ بنو امیہ کو فوجی کامیابیاں، شکستوں کی نسبت مہنگی پڑیں۔ قبائلی سرداروں کی حمایت خریدنے، حامیوں کو ساتھ رکھنے اور مدد دینے والوں کے نقصانات کی تلافی کرنے پر کافی اخراجات اٹھے، علاوہ ازیں اموی فوجیوں کو "سیوتہ" میں مستقلاً ٹھہرانے پر بھی خزانے پر ناروا بوجھ پڑا۔

شمالی افریقہ کی مہم جوئی بالآخر بنو امیہ کے سنگ دلانہ زوال کے اسباب میں سے مہلک ترین سبب ثابت ہوئی۔ اس پالیسی نے نہ صرف اقتصادی وسائل کو ضائع کیا، بلکہ اس کی وجہ سے قرطبہ کی آبادی میں بربریوں کے ناپسندیدہ عناصر کی بھی بھرمار ہوگئی۔ یہ لوگ کرائے کے سپاہی تھے اور عام زندگی میں بڑا اجڈ اور شتر بے مہار رویہ رکھتے تھے۔ یہ جب سنگین جرم کے مرتکب ہوتے تو ان کے بااثر لوگ انہیں قانون کی زد سے بچالیتے۔ معاشرے میں ان کا وجود ہمیشہ ایک اجنبی عنصر سمجھا جاتا رہا۔ آگے چل کر انہوں نے اس "فتنے" کو انگیخت کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا جو بالآخر اموی ریاست کو لے ڈوبا تھا.

الناصر کے جانشین الحکم ثانی المستنصر (۶۶-۳۵۰ھ/ ۷۶-۹۶۱ء) کا دور بلا شبہ ہر پہلو سے تاریخ اندلس کا پر شکوہ عظیم الشان دور تھا۔ "مکتبی" کی جلد کا وہ حصہ جو محفوظ کرلیا گیا ہے اور جو اس کے دربار کی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ پیش کرتا ہے، اس کے مطابق اس کے دور میں کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا، جو حکومت یا رعایا کے لے دردِ سر بنا ہوا ہو، اس کے صفحات بتاتے ہیں کہ شمال کے مسیحی انتہائی عاجز و مسکین لوگ تھے جو دارالحکومت میں خلیفہ کو خراج عقیدت پیش کرنے آتے، بلکہ اپنے باہمی تنازعات میں اس سے ثالثی کی بھی استدعا کرتے تھے، لیکن ان واقعات میں جگہ جگہ افریقہ میں جنگ کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ اور الحسن بن جنون کے درمیان سخت محاذ آرائیاں ہوا کرتی تھیں۔ خلیفہ نے اس کے مقابلے کے لیے بھیجے ہوئے فوجیوں کو عسکری اور مالی کمک بھجوانے کے لیے خزانوں کے منہ کھول دیے تھے.

کتاب میں خلیفہ کے ایک خط کا بڑے نمایاں انداز میں ذکر آتا ہے، یہ خط مغرب میں بھیجے ہوئے اندلسی فوج کے کمانڈر، جنرل غالب کے نام بادشاہ نے خود لکھا تھا۔ اس میں کہا گیا کہ "نقد رقوم یا فوجی امداد کی فکر مت کرنا، یہ دونوں تھوڑے تھوڑے وقفے سے تمہارے پاس پہنچتے رہیں گے۔ خواہ اس کے لیے سارا خزانہ خالی کر دینا پڑے یا غلے کے لبالب بھرے ذخائر کا ایک ایک دانہ بھجوا دینا پڑے، خلیفہ اپنی ذمہ داری ضرور پوری کرے گا" (دیکھیے Garcia Gomez "*Anales palatinos*"، ۱۶۵ کا ترجمہ)۔ ابن حیان نے وقفے وقفے سے بھیجی گئی بھاری رقوم کی جو تفصیلات بتائی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ نے جو الفاظ کہے تھے محض شاعری نہیں تھے، بلکہ وہ مغرب پر اپنا اثرو رسوخ برقرار رکھنے کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھا۔ شمالی افریقہ پالیسی کے مالیاتی بوجھ نے خاندان کے زوال میں کتنا کردار ادا کیا، اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے، اس پالیسی کا ایک اور اثر یہ ہوا کہ اس کی وجہ سے "فتنے" کو مزید ہوا لگ گئی۔ اسی ابن حیان نے، جس نے غالبًا "مکتبی" کی مذکورہ جلد لکھی تھی "فتنے" کے بارے میں لکھا ہے کہ:

عبدالرحمان الناصر بربروں کو فوج میں بھرتی کرنے کا ہمیشہ مخالف رہا، فوج میں بربر نسل کے سپاہیوں کی ایک قلیل تعداد ضرور موجود تھی، مگر انہیں نہایت پست درجے میں رکھا جاتا تھا، انہیں "طنجہ والے" کہا جاتا تھا۔ ابتداء میں حکم مستنصر نے بھی وہی انداز اختیار کیا تھا اور وہ سرعام بھی بربروں سے متعلقہ چیزوں سے کراہت کا اظہار کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا لیکن بعد میں کسی موڑ پر جا کر اس کی رائے تبدیل ہوگئی اور وہ ان کا پرجوش حامی بن گیا اور انہیں بڑے پیمانے پر فوج میں بھرتی کرنے لگا۔ جب ابن ابی عامر بر سر اقتدار آیا تو یہ رجحان اتنا بڑھ گیا کہ اس نے اپنے طاقتور حاجب کی اس خواہش پر غور شروع کر دیا کہ وہ اپنی ایک ذاتی فوج بنائے تاکہ اس کی خلیفہ ہشام المؤید کو مکمل طور پر نظر انداز کرنے کی خواہش میں رکاوٹ باقی نہ رہے (دیکھیے گارشیا گومز کا ترجمہ سوانح حکم

ثالث، در اندلس، ۱۹۴۸ء، ۲۶۔۲۰۹)۔

یہ یقینی امر ہے کہ عبدالرحمان اول کے زمانے سے، بنو امیہ فوج کے اندر اجرتی سپاہیوں کی ایک معقول تعداد رکھتے تھے، جو فوج میں اپنی کمان کی نسبت خلیفہ کے زیادہ وفا دار ہوتے تھے، خلفاء انہیں دوسرے گروہوں کی طاقت کو محدود کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہ لوگ عام فوجیوں سے زیادہ قابل اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ یہ زیادہ تر غلاموں پر مشتمل ہوتے تھے، خواہ آزاد ہو چکے ہوں یا نہیں۔ ان میں بربروں کے علاوہ جنگی قیدی بھی ہوتے تھے، لیکن ان کی صفوں میں مختلف النسب افراد بھی شامل ہوتے تھے جن کے درمیان کوئی داخلی رابطے نہ ہوں۔ حکم کی فوجی بھرتی ماضی کی روایت سے بالکل مختلف تھی، کیونکہ اس کے بعد سے اس نے جو لوگ فوج میں بھرتی کیے وہ الگ الگ افراد نہیں تھے، بلکہ خاندانی گروہ یا مکمل خاندان ہوا کرتے تھے جن کے مابین ایک داخلی تعلق ہوتا تھا جن کی وفا داری تنخواہ دینے والوں سے کم لیکن اپنی قوم کے ساتھ زیادہ تھی۔ ایک طرف قرطبہ کی فوج میں شامل بربر آپس میں بہت زیادہ متحد، لیکن دوسری طرف قرطبہ کی آبادی سے ان کے تعلقات اچھے نہ تھے اور یہ حیرت کی بات نہیں کہ یہ مخالفت بالآخر شدید اختلاف میں تبدیل ہوگئی۔ یہ اس "فتنے" کی طرف پہلا اور اہم قدم تھا جس نے چند سال بعد خاندان بنو امیہ اور ریاستِ قرطبہ کا بالکل صفایا کر دیا، لیکن اس خوفناک انجام سے پہلے چند برس ایسے بھی تھے کہ قرطبہ ایک خوشحال ریاست دکھائی دیتا تھا اور اس کی فوجی قوت پر ناقابل شکست ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

۳۳۶ھ/۹۷۶ء میں الحکم المستنصر کی وفات کے بعد اس کا اکلوتا بیٹا ہشام ثانی تخت نشین ہوا، اس وقت اس کی عمر گیارہ سال تھی۔ اس صورت حال میں جب حکمران نابالغ ہو، دربار میں سازشوں کا سلسلہ شروع ہو جانا ایک لازمی امر ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے بنو امیہ میں سے کسی اور کو خلیفہ بنانے کی کوشش کی اور بعضوں نے خود اقتدار سنبھالنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے۔ آخر میں میدان محمد بن ابی عامر کے ہاتھ رہا جو الحکم کی انتظامیہ میں اہم عہدوں پر فائز رہا اور ہوتے ہوتے، حاجب کے طاقتور عہدے پر پہنچ چکا تھا اور اب وہ المنصور [رک باں] کے لقب کے ساتھ بر سر اقتدار آ گیا.

المنصور کی حکومت کی نمایاں اور اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ اس نے عیسائی بادشاہوں کے خلاف انتھک فوجی سرگرمیاں شروع کر دیں اور اس نے ان کے خلاف پچاس سے زائد فوجی مہموں کی خود قیادت کی اور ان کے علاقوں میں دور تک گھس گیا، اس نے جن شہروں کو پامال کیا ان میں "سنتیا گوڈی کمپوسٹیلا"، "آستورگا"، "لیون"، "پیمپلونا" اور "برشلونہ" بھی شامل تھے، تاہم الاندلس میں کوئی مزید علاقے مسلمانوں کے قبضے میں نہیں آئے۔ یہ مہمات دشمن کو کمزور کرنے، مالِ غنیمت حاصل کرنے اور چند افراد کو پکڑ لانے تک ہی محدود رہیں البتہ شمالی افریقہ میں مداخلت کرنے سے خزانے پر جو بوجھ پڑا تھا اس کی تلافی ہو گئی.

ابن ابی عامر ۳۹۲ھ/۱۰۰۲ء میں وفات پا گیا۔ اموی ریاست بظاہر ٹھوس بنیادوں پر استوار ہو چکی تھی، سرحدوں کے اندر مکمل امن و امان تھا، عیسائی دبے دبے اور خوفزدہ رہتے تھے۔ مغرب میں بھی صورت حال اطمینان بخش تھی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک [دیکھیے: المظفر] تخت نشین ہوا، وہ بھی چھ سال تک اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتا رہا اور کوئی قابل ذکر پیش رفت نہ کر سکا، لیکن ۳۹۹ھ/۱۰۰۸ء میں اس کی اچانک موت سے اموی ریاست کی تباہی کا آغاز ہوگیا.

۴۔فتنہ اور خاندان کا اختتام : عبدالملک المظفر کی موت کے بعد اس کا بھائی عبدالرحمان المعروف سنچولو

(Sanchuelo) حکمران بن گیا، وہ پہلے حاجب کے عہدے پر عبدالملک کا جانشین بنا تھا۔ وہ بطور گورنر اپنے والد کے مقابلے میں کمتر تھا۔ اس نے اپنے چھ ماہ کے مختصر دور اقتدار میں اپنے پیشرؤوں کے سیاسی ورثے کو خوب لوٹا اور اندلس کو خانہ جنگی کے دہانے پر پہنچا کر دم لیا۔ اس کا طرز عمل نہ صرف مستبدانہ اور ظالمانہ تھا، بلکہ اس نے ہشام ثانی کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کو بطور خلیفہ جانشین مقرر کردے ۔ اس پر وہ پورے قرطبہ میں نفرت اور حقارت کا نشانہ بن گیا۔ ایک بار جب وہ عیسائیوں کے علاقہ میں لوٹ مار کرنے گیا ہوا تھا، دارالحکومت کی ساری آبادی اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ عبدالرحمان ثانی کی اولادوں میں سے ایک شخص محمد بن عبدالجبار، مہدی کا لقب اختیار کر کے سامنے آ گیا، کوئی مقابلے پر نہ آیا اور اس کی بغاوت کو سب نے جائز تسلیم کر کے اطاعت قبول کر لی۔ عبدالرحمان بن ابی عامر نے قرطبہ واپس آنے کی کوشش کی تو اسے گرفتار کر کے سر قلم کر دیا گیا۔ بربری فوج جو اس کا آخری سہارا ہو سکتی تھی، اس نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا.

محمد المهدی نے ہشام ثانی کو دستبردار کرا دیا اور خلافت سنبھال لی، لیکن وہ جلدی ہی اس سازش کا نشانہ بن گیا جو اسی پالیسی کا نتیجہ تھی جسے اس نے بھی اختیار کر لیا تھا۔ بربروں نے المهدی کی حکومت کو ختم کر کے بنو امیہ کے کسی امیدوار کی تلاش شروع کر دی بالآخر قرعہ فال الناصر کے ایک اور پوتے سلیمان بن الحکم المستعین کے نام نکلا، جس نے ربیع الاول ۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء میں قرطبہ پر قبضہ کر لیا اور وہ اس وقت تک برسر اقتدار رہا جب قرطبہ کے لیڈروں نے ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء کے اختتام پر خلافت ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد سیاسی تبدیلیوں کا لا متناہی سلسلہ چل نکلا جن میں پہلے تو "فتنہ" کے تین خلفاء ہشام ثانی، المهدی اور المستعین فریق بنے، پھر خاندان کے وہ افراد فریق بنے جو ادریسیوں ، بنو حمود کی اولاد تھے اور آخر میں المستظہر، المستکفی اور المعتضد دیگر اموی فریق بن گئے.

ان برسوں کا اہم ترین واقعہ شوال ۴۰۳ھ/مئی ۱۰۱۳ء میں المستعین کی بربر فوجوں کے ہاتھوں قرطبہ میں کشت و خون اور لوٹ مار تھی۔ پھر گونا گوں سازشوں کے جال اور ہنگاموں اور بغاوتوں کے لامتناہی سلسلے تھے۔ انہیں دیکھ کر لوگوں کا یہ خیال پختہ یقین میں بدل گیا کہ اموی ریاست کی بحالی کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ کئی سال تک تخت قرطبہ پر قبضے کی کوششیں شہر کے اندر مار دھاڑ اور داخلی انتشار کی سطح سے آگے نہ بڑھ سکیں، جہاں تک باقی ماندہ اندلس کا تعلق تھا، اس نے خود مختاری کی راہ اختیار کر لی۔ انتشار اور بد نظمی کا وہ رجحان جو تاریخ اندلسیہ کا ہمیشہ طرّہ امتیاز رہا تھا اور جس پر عبدالرحمان الناصر کے عہد میں قابو پا لیے جانے کی امید پیدا ہو گئی تھی، اس بار ہمیشہ کے لئے غالب گیا.

مآخذ: ا۔ خصوصی مصادر: اندلس میں عہد بنوامیہ کے بارے میں بنیادی اور عدیم النظیر: (ا) معلومات ابن حیان کی تصانیف میں ملتی ہیں جو المقتبس اور المتین کے عنوان سے دستیاب ہیں۔ اول الذکر ان واقعات کا مجموعہ ہے جن کا مشاہدہ مصنف نے خود کیا ہے۔ بد قسمتی سے تاریخ کا بیشتر حصہ محفوظ نہیں رہ سکا، ہمارے پاس اول الذکر مواد کی چار جلدوں کے صرف چند اجزا ہیں جو عبدالرحمان ثانی سے لے کر محمد اول کے عہد تک ہیں(مطبع مکی، بیروت ۱۹۷۳) ، عبداللہ (طبع عربی کا سا بلانکا ۱۹۹۰) اور الحکم ثانی (طبع حاجی، بیروت ۱۹۶۵)۔ جہاں تک "متین" کا تعلق ہے اس میں دیگر مصنفین کے طویل اقتباسات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ابن بسام نے اپنے ذخیرہ میں حوالے دیے ہیں (طبع عباسی بیروت۱۹۷۹)۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اندلس کے بنو امیہ سے متعلق جتنا بھی تاریخی مواد

دستیاب ہے وہ ابن حیان سے ہی ماخوذ ہے، متاخرین نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اسی سے استفادہ کیا ہے۔

۲۔ عام کتب: اندلس کے بارے میں جتنی کتب موجود ہیں ان میں اس عہد پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، مثلاً (۱) Levi-Pervencal کی "*Hist.Esp.mus*" میں خاصا تفصیلی مواد موجود ہے تاہم اس کے ساتھ حالیہ طبع شدہ متون اور (۲) میم۔ عین، الف عنان کی دولۃ الاسلام فی اندلس ۲،۱ قاہرہ ۱۹۶۹ء کا بھی مطالعہ کیا جانا چاہیے؛ (۳) R.Arie کی *Espana musulmana(siglos,viii.xv) vol iii of Historia*، طبع Tunon di lara ، بارسلونا، ۱۹۸۲ء؛ اور (۴) J.Vallve، *El Califato di cordaba*، میڈرڈ ۱۹۹۲ء؛ امیہ خاندان کے بارے میں دیکھیے: (۵) S.D.al-Munadjdjid: معجم بنی امیہ، بیروت ۱۹۷۰ء؛ (۶) E.Tere's: Dos *familias marwanies en al-Andalus*، در اندلس، (۱۹۷۹)، ۹۳-۱۷۷ اور A.Urquica، *La familia Unaya en al-Andalus*، در *Estudios onohaslico biograficos di al-Andalus*، ۵(۱۹۹۲)۳۷۳-۴۳۲، خلافت کے بارے میں سوالات کے بارے میں دیکھیے (۷) M.Fierro، *Sobre l adopcion del titalo califat por, Abd al-Raman III*، vi، در شرق الاندلس (۱۹۸۹) ۴۲- ۳۳؛ *The Caliphate in the west. An Islamic political institution in Iberian Peninsula* اور *D.J.Wasserstein*، آکسفرڈ ۱۹۹۳ء نیز مؤخر الذکر کتاب کے بارے میں E.Manzano کے دو تبصرے بھی ملاحظہ فرمایئے۔ (۹) BSOAS کے صفحات ۱۴۳-۱۴۴ پر چھپے ہیں اور L.Molina کا تبصرہ القنطرہ میں شائع ہوا ہے؛ (۱۰) تاریخ اور انساب کے لیے دیکھیے *The New Islamic Boswort dynasties-*، ایڈنبرا ۱۹۹۶ء، ۱۱-۱۳ نمبر ۴۔

مزید تفصیل کے لیے مخصوص کتابیات کا مطالعہ کیجیے جو بنوامیہ کے افراد اور امرا کے بارے میں لکھی گئی ہیں.

(L.Molina، [ت: محمد یحیٰی خان])

••-------------••

※ امیہ بن خلف: بن وہب بن حذافہ جمحی المعروف بہ غطریف ۔ عہدی نبوی کا ایک نامور قریشی سردار، جو اپنی اسلام دشمنی کی وجہ سے معروف تھا، اس کا تعلق قریش کے قبیلہ بنو جمح سے تھا (دیکھیے جمہرۃ انساب العرب، ص ۱۵۹).

وہ ان قریشی سرداروں میں سے تھا جنہوں نے اسلام دشمنی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ کو ایذا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، خصوصاً حضرت بلالؓ بن رباح پر وہ بہت ظلم ڈھاتا تھا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ اس کے غلام تھے، لیکن دوسری روایت یہ ہے کہ وہ عبداللہ بن جدعان کے غلام تھے اور اس کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ ابوجہل اور امیہ نے عبداللہ کے پاس جا کر حضرت بلالؓ کے اسلام لانے کی شکایت کی، تو اس نے حضرت بلالؓ کو ان کے حوالے کر دیا (ابن منظور: مختصر تاریخ مدینہ دمشق لابن عساکر، ۵:۲۵۴،۲۵۵ مطبوعہ دارالفکر، دمشق ۱۴۰۴ھ)۔ وہ حضرت بلالؓ کو گرمیوں کی بھری دوپہر میں ننگے بدن گرم ریت پر اوندھے منہ لٹا کر، ان کے اوپر بھاری پتھر رکھ دیتا تھا اور کہتا تھا کہ اس وقت تک تمہاری جان نہ چھوٹے گی جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہ کرو گے اور لات و عزیٰ کو نہ مانو گے، لیکن وہ اَحد اَحد پکارتے رہتے۔ پھر وہ حضرت بلالؓ کو مکہ کے نوجوان لڑکوں کے حوالے کر دیتا جو ان کے گلے میں رسی ڈال کر ان کو گلیوں میں پتھروں پر گھسیٹتے۔ بالآخر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ کو امیہ سے ایک طاقتور غلام کے عوض خرید لیا اور اللہ کی راہ میں آزاد کر دیا (الروض الانف، ۳:۱۹۹)۔ امیہ اپنے چچا زاد بھائی حضرت عثمانؓ بن مظعون کو بھی اسلام لانے

کی پاداش میں ایذائیں دیتا تھا جس سے تنگ آ کر وہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینے اور ان کو ناکام کرنے کے لیے قریش نے جتنی تدبیریں اور سازشیں کیں ان میں امیہ پیش پیش تھا۔ وہ اس مجلس میں بھی موجود تھا جس میں قریش نے آنحضرتؐ کو سیادت و قیادت کی پیش کش اس شرط کے ساتھ کی کہ وہ لوگوں کو دعوت اسلام دینے سے باز آجائیں اور وہ اس قریشی وفد میں بھی شامل تھا جس نے ابو طالب کے پاس جا کر آنحضرتؐ کی شکایت کی اور آپؐ کو ابوطالب کی پناہ سے محروم کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس مشاورت میں بھی شریک تھا جس میں ہجرت سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے سازش کی گئی (ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ ص ۲۹۵، ۴۱۷، ۴۸۱)۔ ہجرت نبوی کے بعد بھی وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوششوں میں لگا رہا، چنانچہ ڈھائی ہزار اونٹوں کا قافلہ لے کر وہ شام گیا جس کا ایک مقصد مسلمانوں کے خلاف مہم جوئی کے لیے مالیات مہیا کرنا تھا۔ مسلمانوں نے اس قافلے کو روکنے کی کوشش کی لیکن یہ بچ کر نکل آیا۔ کتب تاریخ و سیر میں یہ واقعہ غزوۂ بواط کے نام سے مشہور ہے (الزرقانی: عیون الاثر، ۱:۳۹۲)۔

اسلام کا راستہ روکنے میں اس کی کوششیں اتنی نمایاں ہیں کہ قرآن کی کئی آیات کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ان میں اس کے کردار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مثلاً آیت استہزاء (۲۱ [الانبیاء]: ۴۱)، سورۃ الکافرون اور سورۃ الھمزۃ وغیرہ (ابن ہشام: السیرۃ النبویہ، ص ۳۵۶، ۳۶۲ اور ۳۹۶)۔

انصار مدینہ کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ کے ساتھ زمانہ جاہلیت سے امیہ کے حلیفانہ تجارتی تعلقات تھے۔ حضرت سعدؓ یثرب میں اس کے تجارتی مفادات کا خیال رکھتے تھے اور یہی کام وہ ان کے لیے مکہ میں کرتا تھا۔ وہ یثرب جاتا تو حضرت سعدؓ کے ہاں قیام کرتا اور وہ مکہ آتے تو اس کے پاس ٹھہرتے تھے۔ ہجرت کے فوراً بعد حضرت سعدؓ عمرہ کے لیے مکہ آئے تو امیہ کے ہاں ٹھہرے۔ ایک روز جب وہ امیہ کے ساتھ طواف کے لیے گئے تو ابوجہل نے انہیں کہا کہ اگر تم امیہ کے مہمان نہ ہوتے تو یہاں سے بچ کر نہ جاتے۔ حضرت سعدؓ نے کہا کہ اگر تم نے ہمیں عمرے سے روکا تو ہم بھی تمہارا شام کا تجارتی راستہ بند کر دیں گے۔ یہ کہتے ہوے ان کی آواز غصے سے بلند ہوگئی تو امیہ نے انہیں ٹوکا اور کہا کہ ابوالحکم (ابوجہل) کے سامنے اونچا نہ بولو، وہ ہمارا سردار ہے۔ حضرت سعدؓ نے کہا تم بھی اس کی حمایت نہ کرو، میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ تم مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوگے۔ اس پر امیہ ڈر گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ نہیں بولتے، چنانچہ وہ مکہ سے باہر کم ہی جاتا تھا۔ جنگ بدر کے وقت بھی جب قریش مکہ سے نکلنے لگے تو امیہ نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا لیکن ابوجہل حیلے بہانے اسے چلنے پر اکساتا رہا۔ اس نے کہا ”تم لوگوں کے سردار ہو، اگر تم ہی نہ گئے تو دوسرے لوگ کیونکر جائیں گے، تم ایسا کرو کہ ایک تیز رفتار اونٹ اپنے ساتھ رکھو، اگر کوئی ایسی ویسی بات دیکھو تو واپس آجانا“۔ اس کے باوجود امیہ ڈرتا تھا، یہاں تک کہ ابوجہل کے کہنے پر عقبہ ابن ابی معیط نے بھری مجلس میں اس کے سامنے بخور رکھتے ہوئے کہا کہ لیجیے اب لطف اندوز ہوتے رہیے کہ اب تو آپ عورتوں کی طرح گھر بیٹھ کر یہی کیا کریں گے جس پر امیہ نے اسے برا بھلا کہا۔ یوں بالآخر اسے جنگ کے لیے نکلتے ہی بنی تاہم جب بھی پڑاؤ ہوتا تو وہ اونٹ کو اپنے خیمے کے پاس ہی بندھواتا تاکہ موقعہ پائے تو بھاگ نکلے، لیکن مشیت الٰہی اسے بالآخر بدر تک لے

ہی آئی جہاں موت اس کے لیے گھات لگائے بیٹھی تھی (صحیح بخاری، ۱، کتاب المغازی، نیز بعض تفاصیل کے لیے دیکھیے، فتح الباری ۷: ۲۸۲ بعد).

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اس کے قتل کا واقعہ بیان کرتے ہوے کہتے ہیں کہ جب بدر کی جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو مَیں چند زرہیں اٹھاے جا رہا تھا کہ میں نے امیہ اور اس کے بیٹے کو دیکھا، میں نے زرہیں پھینک کر ان کو قیدی بنا لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے چلا۔ اتنے میں حضرت بلالؓ نے امیہ کو دیکھ لیا اور شور مچا دیا کہ یہ دشمن خدا امیہ بن خلف ہے، بچ کے نہ جانے پائے۔ چنانچہ انصار نے ان دونوں کو گھیر لیا اور امیہ کے بیٹے علی کو قتل کر دیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ یہ دیکھ کر امیہ کو بچانے کے لیے اس کے اوپر لیٹ گئے، لیکن مسلمان اتنے غصے میں تھے کہ انھوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کے نیچے سے تلواریں مار مار کر امیہ کو قتل کر دیا۔ اس دوران میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا پاؤں بھی زخمی ہوگیا (دیکھیے البخاری، کتاب الوکالہ اور بعض تفاصیل کے لیے الاصابہ، ۱: ۱۶۹)۔ ابن اثیر کے مطابق حضرت بلالؓ کے علاوہ حضرت خبیبؓ اور حضرت رفاعہؓ بن رافع الانصاری بھی امیہ کے قتل میں شریک تھے (الکامل ۲: ۴۸، دارالکتب، بیروت، ۱۳۸۷ھ).

جنگ بدر ختم ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ایک گہرے گڑھے میں سرداران قریش کی لاشیں جمع کر کے پھینک دی جائیں۔ لوگ جب امیہ کی لاش لانے لگے تو دیکھا کہ اس کی لاش پھول گئی ہے اور جب اسے اٹھانے لگے تو اعضا الگ ہونے لگے، چنانچہ انہوں نے مجبوراً اسے وہیں مٹی اور پتھروں سے ڈھک دیا۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں۔

(محمد امین)

••------------••

امیہ بن عبدالعزیز ابوالصلت الدانی الاشبیلی: ※ (۴۶۰۔ ۵۲۸ھ/ ۱۰۶۸۔ ۱۱۳۴ء): ایک ہسپانوی مسلمان محقق جس نے طب، سائنس، فلکیات اور موسیقی کے میدانوں میں خاص طور پر گراں قدر ورثہ چھوڑا ہے۔

وہ دینیا میں پیدا ہوا اور اپنے استاد قاضی الوقاشی [رک بآں] سے مختلف قسم کے علوم پڑھے۔ اس نے اشبیلیہ میں [بھی] تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ ۴۸۹ھ/ ۱۰۹۶ء میں مصر پہنچ گیا، جہاں اس زمانے میں فاطمیوں کی حکومت تھی [اس وقت کے فاطمی] خلیفہ کا وزیر الافضل [بن بدرالجمالی، رک بآں] فلکیات میں گہری دلچسپی رکھتا تھا، چنانچہ اس نے جلد ہی ابوالصلت کو خلیفہ کے دربار میں متعارف کرا دیا۔ مصر ہی میں اس نے تدریسی خدمات انجام دیں اور اپنا اہم ترین تصنیفی کام کیا، لیکن نواح ۵۰۰ھ/ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷ء میں بقول ابن ابی اصیبعہ [رک بآں] اسے مبینہ طور پر اس وقت رسوائی کا سامنا کرنا پڑا جب وہ اپنے دعویٰ کے مطابق اس جہاز کو جو قیمتی سازو سامان سمیت اسکندریہ کے قریب سمندر میں ڈوب گیا تھا، سطح آب پر نہ لاسکا۔ خلیفہ سخت ناراض ہوا اور سزا کے طور پر اسے تین سال کے لیے جیل میں ڈال دیا۔ اس نے یہ عرصہ مطالعے اور تصنیف وتالیف کے کاموں میں بسر کیا۔ [قید سے] رہائی پانے کے بعد، اس نے المہدیہ [رک بآں] کے راستے جو زیریوں کے عہد حکومت میں تونس کا دارالخلافہ تھا، اندلس واپس جانے کا ارادہ کیا، جہاں اسے اس وقت کے زیری حکمران علی بن یحیٰی نے والہانہ انداز سے خوش آمدید کہا۔ چنانچہ وہ اس کے دربار سے، اس کے قصیدہ گو شاعر اور مؤرخ کی حیثیت سے تا عمر منسلک رہا اور اُس نے وہیں وفات پائی۔ ابوالصلت کا ایک بیٹا، عبدالعزیز [بھی] تھا جو بذات خود ایک بڑا شاعر تھا۔ ابوالصلت، تاریخی اور ادبی، دونوں پہلوؤں کے اعتبار سے،

بہت سے متاخر عرب مصنفین کا اہم ماخذ رہا ہے، مثلاً ابن ابی اصیبعہ، ابن القفطی وغیرہ اور انہوں نے اپنی کتابوں میں اس [ابو الصلت] کی کتابوں سے بہت سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔

ابوالصلت، بسیار نویس اور انتخاب کے مجموعے تیار کرنے والا مصنف [و مؤلف] تھا۔ وہ بیک وقت طبیب، فلسفی، ماہر فلکیات، ماہر موسیقی، مؤرخ اور صاحب طرز شاعر تھا تاہم اسے مذہبی علوم سے کچھ زیادہ شغف نہ تھا۔

(۲) تصانیف: (الف) طب: (۱) کتاب الادویۃ المفردۃ۔ اس کے لاطینی اور عبرانی میں تراجم ہوئے۔ اس کے بعض حصوں کو تحقیق و تعلیق کے بعد ابراہیم بن مراد نے الحیاۃ الثقافیۃ (۱۹۷۹ء)، ۳/۴ : ۶۸-۱۵۳) میں شامل کیا اور الخطابی نے الاغذیۃ والأدویۃ میں تحقیق و تعلیق کے بعد اس کتاب کو شامل کیا(دیکھیے Steinschneider، در *Archiv fur Pathologische Anatomie und fur Klinische Medicin*، ۶۴ (۱۸۸۳ء)، ۲۸ - ۵۰؛ (۲) حنین بن اسحاق علی بن رضوان: کتاب الانتصار؛ (۳) فی الطب والتنجیم والالحان؛ (۴) کتاب الانتصار فی اصول الطب؛ تاریخ طب میں ابوالصلت کے مقام و مرتبے کے لیے دیکھیے (۵) Leclerc: *Histoire de la medicine arabe*، پیرس (۱۸۷۶ء)، ۲ : ۷۴-۷۵).

(ب) فلسفہ:(۶) تقویم الذہن: یہ افلاطون کی منطق پر تبصرہ ہے جسے ہسپانوی زبان میں A.Gonzalez Palencia نے *Rectification de la Mente* کے عنوان سے میڈرڈ سے ۱۹۱۵ء میں طبع کیا۔

(ج) تاریخ:(۷) الرسالۃ المصریۃ: یہ ابوالصلت کے مصر میں مشاہدات اور [اس کی] مختلف شخصیات سے ملاقاتوں کے احوال پر مبنی ہے۔ اس کا انتساب زیری شہزادے یحیٰی بن تمیم کے نام ہے جو علی بن یحیٰی کا والد تھا۔ اس کا تذکرہ المقریزی نے اپنی کتاب الخطط میں کئی جگہ کیا ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ تحقیق کے بعد ۱۹۵۱ء میں قاہرہ سے طبع ہوا اور اس کا [ایک] قلمی نسخہ ہارون نے نوادر المخطوطات میں ۱:۵۰۵۶، کے تحت درج کیا ہے اور جس کچھ حصہ A. L. de Premare نے ترجمہ کر کے *MIDEO* (۱۹۶۴ء-۱۹۶۶ء، ص ۱۷۹ تا ۲۰۸) میں شامل کیا ہے؛ (۷)الدیباجۃ فی مفاخر صنہاجۃ: یہ کتاب زیری حکمرانوں کے بارے میں شمالی افریقہ کے مؤرخین کی درج کردہ معلومات پر مبنی ہے، دیکھیے مثلاً الادریسی: زیریون، مقدمہ،۱: ۱۷ وبعد؛(۸) فی الأدب والعروض والتاریخ؛(۹) تاریخ: اس کے حوالے ابن الابار اور البلفیقی نے دیے ہیں۔

(د) ادب: (۱۰) کتاب الحدیقہ: یہ الثعالبی کی [کتاب] الیتیمہ کے نمونے پر ایک شعری انتخاب ہے، جس کے اقتباسات عماد الدین نے اپنی کتاب خریدۃ القصر [کے باب شعرائے مصر] میں دیے ہیں جو قاہرہ سے ۱۹۵۱ء-۱۹۵۲ء میں طبع ہوئی، نیز دیکھیے طبع الدسوقی وعبدالعظیم، قاہرہ ۱۹۶۴ء؛ (۱۱) کتاب الملح العصریۃ: اس کا انتساب اندلس کے شعرا کے نام ہے؛ (۱۲) الافضل اور یحیٰی بن تمیم کی مدح میں لکھی گئیں اور دیگر موضوعات پر مبنی نظمیں۔ اب یہ تمام [نظمیں] ناپید ہیں، لیکن ان کے اہم اقتباسات، ابن ابی اصیبعہ اور المقری نے دیے ہیں؛ (۱۳) دیوان: مرتبہ محمد المرزوق، تونس، ۱۹۷۴ء نیز دیکھیے J.Calvo Puig ، در *Canfali* (۱۹۸۵ء)، ص۱۶؛ (۱۴) لفظ، ''نکتہ'' کے مختلف معانی؛ (۱۵)دیوان رسائل؛ (۱۶) فی الفنون.

(ھ) فلکیات: (۱۷) رسالۃ فی العمل بالاسطرلاب: اس کا تجزیہ J. M. Millas Vallicrosa نے بعنوان *Assaig d' historia de les idees fisiques i*

امیہ بن عبدالعزیز ابوالصلت الدانی الاشبیلی

matematiques a la Catalunya medieval کیا جو بارسلونا سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا، ص۷۵ - ۸۱ ؛ (۱۸) صفات عمل صفیحہ جامعۃ تقوم بہا جامع الکواکب السبعۃ: اندلس کے خط استوا کی حد کا مطالعہ۔ اس [کتاب] کا مطالعہ E. S .Kennedy نے کیا جو *Physics* (۱۹۷۰ء)، شمارہ ۱۲، ص ۴۳ تا ۸۱ میں شائع ہوا، بار دوم در *Studies in the Exact Sciences*، بیروت، ۱۹۸۳ء، ص ۴۸۱-۴۹۱ ، مطبع M. Comes : ابن السمح، الزرکلی و ابوالصلت : *Ecuatories Andalusies*، برشلونہ ، ۱۹۹۰ء- ۱۹۹۱؛ (۱۹) کتاب الوجیز فی العلم الھیئۃ۔ یہ [کتاب] فلکیات کی بحوث کا خلاصہ ہے۔ اسے فاطمی دور کے [مشہور] ماہر فلکیات ابن الحلبی نے غیر مفید قرار دیا ہے؛ (۲۰) أجوبہ عن مسائل سئل عنہا فاجاب: اس میں فلکیات کے چھ مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے [جیومیٹری کے] خطوط اور زاویوں کی تصاویر سے [بھی] مدد لی گئی ہے۔

(و) علم الہندسہ:(۲۱) کتاب فی الہندسۃ (وجیز)؛ (۲۲) الاختصار فی الہندسہ ؛ (۲۳) مختصر: یہ اقلیدس کے عناصر [اربعہ] کے بارے میں ہے جنھیں ابن خلدون نے المقدمہ میں بیان کیا ہے۔

(ز) موسیقی: (۲۴) رسالۃ فی الموسیقی: اس کے متعلق دیکھیے H. Avenary ، در *Musica Disciplina* (۱۹۵۲ء)، ۴: ۲۷-۳۲ و در *Yuval* (۱۹۷۴ء)، ۳: ۷ - ۸۴؛ (۲۵) I. Adler: *Hebrew writings concerning music in manuscripts and printed books from Geonic times up to 1800 AD* در Repertorie internat؛ (۲۶) B.Serie : *Des Sources musicales* ، ۹۹/۲، میونخ ۱۹۷۵ء، ص ۹-۳۵۔

عربی مآخذ کے مطابق ابوالصلت، ستار بہت مہارت سے بجاتا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہسپانوی موسیقی کو تونس میں متعارف کروایا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابوالصلت نے ایک علمی موسوعہ [علوم] ریاضی، ہندسہ، فلکیات اور موسیقی کے بارے میں تالیف کیا تھا۔ ایسے اشارے بھی ملتے ہیں کہ اس کے اس تحقیقی کام کے جو اس نے علم الہندسہ، فلکیات، حساب اور موسیقی کے میدان میں کیا تھا،عبرانی زبان میں بھی تراجم ہوے تھے۔ اس کے تحقیقی کام کا بڑا حصہ ۱۳۹۵ء میں، عبرانی زبان میں، بنوینسٹ بن لاوی (Benvenist ben Lavi)نے ترجمہ کیا۔ جس میں ابوالصلت کے علم الحساب کے بارے میں توضیحی و تنقیدی حواشی بھی ہیں اور علم موسیقی سے متعلق متن بھی اس میں شامل ہے۔ دراصل یہ ابن سینا کی کتاب، الشفا کے متعلقہ حصے کا ترجمہ ہے؛ (۲۶) T. Langermann : *Un nouvel extrait de l' ouvrage des nombres amiables* ، *Le temoignage* (۲۷) *des textes hebrews medievaux* ، در *Arabic Science and Philosophy* (۱۹۹۶ء)، ۶: ۶۳- ۸۲؛ (۲۸) اسلامی ہسپانیہ میں سائنس کی تاریخ اور ابوالصلت کے حالات کے لیے دیکھیے J. Samso: *Las ciencias de los antiguos en al- Andalus*، میڈرڈ ۱۹۹۲ء ، ص ۳۱۰- ۳۱۷؛ (۲۹) کئی یہودی مصنفین نے اپنی کتابوں میں ابوالصلت کے حوالے دیے ہیں مثلاً مارسیلز (Marseilles) [جنوبی فرانس] کے سیموئل (Samuel)اور قرطبہ کے عیسیٰ بن اسحاق بن ناتھن [ان دونوں] نے چودھویں صدی عیسوی میں جبکہ پروفیٹ دوران (Profiat Duran) نے پندرہویں صدی عیسوی میں۔

مآخذ: (الف) مقالے میں مذکور حوالوں کے علاوہ دیکھیے (۱) ابن الابار : تکملۃ الصلہ، الجزائر ۱۹۲۰ء ، ص ۵۳۹؛ (۲) الذہبی: سیر اعلام النبلاء، ۱۹: ۳۳۴-۳۳۵، عدد ۲۷۵؛ (۳) یاقوت: ارشاد، طبع مارگولیوتھ، ۲: ۳۶۱-

۳۶۳، عدد ۱۳۳؛ (۴) ابن خلکان : وفیات الاعیان، طبع عباس، ۱: ۲۴۳ ـ ۲۴۷، عدد ۱۰۴ و ترجمہ de Slane ، ۱: ۲۲۸ـ۲۳۰؛ (۵) ابن القفطی : تاریخ الحکماء، ص ۲۳۷؛ (۶)ابن سعید: مغرب، قاہرہ ۱۹۵۳ء، ۱: ۲۵۶ـ۲۵۷، عدد ۱۸۶؛ (۷) الصفدی: الوافی بالوفیات، ۹: ۴۰۲، عدد ۴۳۳۳؛ (۸) ابن العماد: شذرات ، ۴: ۸۳ـ۸۵ و ۱۴۴؛ (۹)السیوطی: حسن المحاضرہ، ۱: ۲۳۲؛ (۱۰) حاجی خلیفہ : کشف الظنون ،۴ : ۴۳۰ .

(ب) مطالعاتی اور حوالہ جاتی کام : (۱۱) *Pons Boigues* ، ص ۱۹۸ ـ ۲۰۱، عدد ۱۵۹؛ (۱۲) Suter : Mathematiker ، ص ۱۱۵، عدد ۲۷۲؛ (۱۳) Steinschneider، در *Virchows Archiv* ، ۶۴: ۲۸ـ۶۵؛ (۱۴) J. A. Sanchez Perez: *Biografias de matematicos arabes que florecieron en Espana* ، میڈرڈ، ۱۹۲۱ء ،ص ۱۳۰ـ۱۳۲؛ (۱۵) بروکلمان، ۱/۲: ۶۴۱و تکملہ، ۱:۸۸۹؛ (۱۶) الزرکلی: اعلام، ۲: ۲۳؛ (۱۷) M. J. Rubeira Mata : Literatos del Sharq al-Andalus ؛ (۱۸) *Abu-s-Salt de Denia e Ibn Dihya Revista de Calpe* ، در *Revista del Instituto de Estudios Alicantinos* ، (۳۶) (۱۹۸۲ء) : ۳۳ ـ ۴۳؛ (۱۹) M. I. Fierro : *HATA* (ہسپانوی محققین کی فہرست جو [ابھی] زیر تکمیل ہے)۔

(Merce Comes [ت: سیّد محمد توقیر احمد اظہر])

••--------------••

※ انتحار: (ع) (خود کشی)، عربی میں زیادہ واضح لفظ ’’قتل نفس‘‘ ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ لفظ (انتحار) ابتداءً وضع کیا گیا اور انہی معانی میں حدیث شریف میں بھی آیا ہے، یعنی اپنا گلا چیرنا یا پھاڑنا۔ ایک غیر معینہ قدیم زمانے سے ہی یہ لفظ عموماً خودکشی کے لیے مخصوص چلا آرہا ہے، چنانچہ یہ لفظ جدید عربی، فارسی اور ترکی میں بھی مستعمل ہے.

قرآن مجید میں متعدد آیات (مثلاً ۲ [البقرۃ]: ۵۱ـ۵۴؛ ۴[النسآء]: ۶۶ـ۶۹؛ ۱۸ [الکہف]:۵ـ۶) ایسی آئی ہیں [جن میں خود کو ہلاک کرنے یا ہلاکت میں ڈالنے سے منع کیا گیا ہے] اور جن سے خودکشی کے بارے میں حقیقی اور اغماضی رویّے کا اظہار ہوتا ہے۔ تاہم قرآن حکیم میں خود کشی کی کھلے لفظوں میں واضح ممانعت نہیں آئی اور اس سلسلے کی متعلقہ آیات، مثلاً (۴[النسآء]:۲۹ـ۳۳) [وَلاَ تَقْتُلُوا اَنْفُسَكُمْ، یعنی اور اپنے آپ کو قتل مت کرو] کی تفسیر مفسرین نے باہمی قتال وخون ریزی سے کی ہے (کیونکہ) اَنْفُسَكُمْ میں جمع کا استعمال باہمی اور معکوس قتال کے معنوں میں لیا گیا ہے، جیسا کہ (۲[البقرۃ]:۷۹ـ۸۵) اور کچھ دیگر مقامات پر یہ لفظ وارد ہوا ہے [لیکن چونکہ اس میں ایسے اقدامات سے بھی روکا گیا ہے، جن کا واضح نتیجہ ہلاکت نفس کی صورت میں نکلتا ہے، لہذا اس سے خودکشی کی ممانعت تو بدرجۂ اولی مقصود ہوگی اسی لیے] یہ آیت اکثر خودکشی کے بارے میں ممانعت الٰہیہ کے ثبوت کے طور پر پیش کی جاتی ہے.

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خودکشی کو سخت ناپسند فرمایا ہے، احادیث مبارکہ کی [اس بارے میں خاصی] تعداد مروی ہے، جو اس میں کوئی شک باقی نہیں رہنے دیتی کہ خود کشی اسلام میں ممنوع ہے۔ حالات وواقعات سے قطع نظر، خودکشی کرنے والا فرد (جب تک کہ یہ حادثاتی طور پر واقع نہ ہو) جنت سے محروم ہو جاتا ہے۔ جہنم میں اس کی سزا اسی عمل کا اعادہ ہے جس کے ذریعے اس نے اپنے آپ کو ہلاک کیا ہوگا [بعض روایات میں ہے کہ] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کشی کرنے والے کی نماز جنازہ ادا کرنے سے انکار کر دیا

تھا اور دوسروں کو بھی اس سے منع کر دیا تھا، اس لیے خود کشی کو عمومی طور پر گناہ کبیرہ تصور کیا جاتا ہے (دیکھیے الذھبی: کبائر، قاہرہ ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء، ص۱۱۹ بعد، باب ۲۹؛ ابن حجر الہیثمی: الزواجر، قاہرہ ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۱ء، ۲:۸۹ بعد)۔ [دور نبوی میں بعض لوگوں کی خود کشی کے واقعات ملتے ہیں، مثال کے طور پر ایک جنگ میں ایک مسلمان نے زخم کی تکلیف برداشت نہ کرسکنے کی بنا پر خود کشی کر لی تھی، اسی بنا پر، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جہنمی قرار دیا تھا (ابوداؤد)]۔

فقہی کتب میں کامیاب خود کشی کے احکام کے بارے میں مقابلتاً بہت کم بیان کیا گیا ہے، خود کشی کی ناکام کوششوں کے بارے میں قرون وسطی کے قانونی رویہ کے بارے میں کوئی معتبر شہادت دستیاب نہیں۔ ماضی اور حال کا سب سے زیادہ متنازع فیہ اور بلاشبہہ سب سے زیادہ عملی اہمیت کا حامل سوال یہ ہے کہ آیا خودکشی کا ارتکاب کرنے والے فرد کی نماز جنازہ ادا کی جائے یا نہیں؟ اس نکتے پر مختلف فقہی مسالک کے علما متضاد آرا رکھتے ہیں اور ان کا عمل بھی مختلف فیہ دکھائی دیتا ہے (اس کے بارے میں) نسبتاً زیادہ فیاضانہ رویہ وسعت ومقبولیت کے ساتھ نافذ وجاری ہوچکا ہے، مثلاً جب دمشق کے مدرسہ امینیہ کے ایک نابینا استاد عیسیٰ بن یوسف العراقی نے ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں المناک حالات میں خود کشی کا ارتکاب کیا تو لوگوں نے اس کی نماز جنازہ ادا کرنے سے انکار کر دیا، لیکن ایک نامور شافعی عالم ابوشامہ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی (ابن کثیر:البدایہ، قاہرہ ۱۳۵۱-۱۳۵۸، ۱۳:۴۴)۔ فقہا کی گاہے بگاہے بحث کردہ تفاصیل ان نکات پر مبنی تھیں: خود کشی کے مقدمات میں عاقلہ [رک بآں]) اس کے خاندان) کی بے تعلقی (ابن ابی زید: رسالہ، طبع وترجمہ I.Berchet، مطبوعہ الجزائر، ۱۹۴۹ء، ص۲۴۶)، ایسی عورت کے مہر کا فیصلہ جو خلوت صحیحہ سے قبل خودکشی کا ارتکاب کر لے (الشیبانی: الجامع الصغیر، بولاق ۱۳۰۲ھ؛ ابویوسف: کتاب الخراج، ص۳۰۷، قاضی خان: فتاوی، ۱:۴۳۶)۔ ایسے شخص کی قانونی ذمہ داری جو کنواں کھود کر یا اس جیسا کوئی اور کام کر کے نادانستہ طور پر کسی کے لیے خودکشی کے ارتکاب کو ممکن بنا دے (قاضی خاں، ۴:۱۳۴، ۴۶۴؛ کسی کو دانستہ طور پر خودکشی کرنے کے قابل بنانے کے بارے میں معتزلی نقطہ نظر کے لیے دیکھیے عبدالجبار: مغنی، ۲:۲۳۲ بعد، مطبوعہ قاہرہ، ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء؛ نیز دیکھیے ابن قیم الجوزیہ: مفتاح دارالسعادۃ، ۲:۵۳ مطبوعہ قاہرہ بدون تاریخ)۔ جدید شیعی فقہ کی رو سے خودکشی کے قانونی جواز کا دارومدار اس وقت پر ہوگا جب اس کا ارتکاب کیا گیا (اے۔اے فیضی: Outlines of Muhammadan Law، کلکتہ ۱۹۴۹ء، ص ۳۰۶)۔

خودکشی کے بارے میں عوامی نظریات اور رویئے ایک قطعی مختلف تصویر پیش کرتے ہیں۔ خود کشی کرنے کی دھمکی اکثر نفسیاتی حربے کے طور پر استعمال کی جاتی تھی، حتی کہ مشہور صوفی ابوالحسین النوری نے بھی یہ نفسیاتی حربہ اختیار کیا تاکہ اللہ تعالی اس کی ولایت کو کسی معمولی کرامت سے مستحکم کرے اور جس سے وہ الجنید کی شدید ناپسندیدگی کو اشتعال دلائے (السراج: کتاب اللمع، طبع R.A.Nicholson، ص:۳۲۷، مطبوعہ لائیڈن، لنڈن ۱۹۱۴ء؛ تاریخ بغداد ۵:۱۳۲ بعد، الجنید کی ناپسندیدگی کے حذف کے ساتھ)۔ [صوفیا کے ایسے حالات کو علمائے کرام نے شطحیات قرار دیا ہے، جنھیں کوئی قانونی یا فقہی نظیر تصور نہیں کیا جاتا]۔ عورت اپنے شوہر کو اسے طلاق دینے پر مجبور کرنے کے لیے خودکشی کرنے کی دھمکی

دے سکتی ہے (ابن تیمیہ: فتاوی، قاہرہ، بدون تاریخ [۶۲-۱۹۶۵ء]، ۱۴۸:۴).

"خودکشی" وسیع طور پر مجازاً مندرجہ ذیل معانی کے لیے بھی مستعمل ہے: (الف) جنگ میں شدید خطرے کا رضاکارانہ طور پر سامنا کرنے کا اظہار؛ (ب) عبادات اور صیام جیسے اعمال میں شدید انہماک (جسے لفظی طور پر خود کشی قرار دیا جاتا ہے، دیکھیے المحاسبی: خلوۃ، ص ۳۳، طبع آئی-اے خلیفی، مطبوعہ دمشق ۱۹۵۵ء؛ السرخسی: اصول، ۱:۱۲۰، قاہرہ ۱۳۷۲-۱۳۷۳ھ؛ Die Lehre :B.Reiner von tawakkal، ص ۲۶۷، بعد مطبوعہ برلن ۱۹۶۸ء (ج)، غیر محتاط باتونی پن (السلمی: طبقات، تحقیق؛ J.Pederson، مطبوعہ لائیڈن ۱۹۶۰ء، ص ۲۱۰)۔ غیر معمولی مساعی اور خلاف معمول جوش وخروش کے لیے یہ (لفظ) استعارۃً مستعمل ہوتا ہے۔ مسلم شعرا متعدد مواقع پر نیم سنجیدگی اور نیم غیر سنجیدگی کے ساتھ "خودکشی" کا ذکر کرتے ہیں (مثلاً عمر بن ابی ربیعہ: دیوان تحقیق P.Schwarz، عدد ۱۲۷ (الاغانی: ۳ بار، ۱:۱۵۸)؛ تمیم بن المعز: دیوان، قاہرہ ۱۳۷۷ھ/۱۹۰۷ء، ص۵۰، ۲۵۱؛ الثعالبی: یتیمہ، ۱:۳۲۲ (نیز دیکھیے یاقوت: ادباء، ۲:۱۸۸؛ العماد الاصفہانی: خریدہ، شامی شعرا، مطبوعہ دمشق ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء، ۱: ۵۵۶؛ الابشیہی: مستطرف، مطبوعہ بولاق، ۱۲۶۸ھ، ۱:۲۲۹؛ الراغب:محاضرات، قاہرہ، ۱۲۸۷ھ، ۱:۱۵۲؛ الصفدی: غیث، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۵ھ، ۲:۲۶۲ بعد)؛ حتی کہ علمائے دین کسی خاص نکتہ کو ثابت کرنے کے لیے خودکشی کا ضمنی طور پر حوالہ دیتے ہیں (عبدالجبار: مغنی، ۱۲:۶: ۱۸۸؛ ۱۱، ۲۳۲ بعد، ص ۳۹۳، ۳۹۵ بعد ص ۴۹۲ وبعد؛ الغزالی: احیاء، قاہرہ ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء، ۲:۲۱۲، ۴:۲۱۹ بعد).

زمانۂ جاہلیت کے خود کشی کے مشہور واقعات کا ذکر بھی کبھی کبھار کیا جاتا ہے، مثال کے طور پر بادشاہ طالوت (الیعقوبی: تاریخ، ۱:۵۳)، یہوداہ اسکریوتی (Judas Iscariot) (المبرد: بلاغہ، تحقیق ر۔ عبدالتواب، قاہرہ ۱۹۶۵ء، ص۶۲)، قلوپطرہ (المسعودی: مروج ۲:۲۸۹ بعد وغیرہ) یا رومیوں سے جنگ کرنے والے یہودی (ابن خلدون: عبر، ۲:۱۳۷)۔ ہندوستان میں بیوہ عورتوں کے ستی ہونے کی رسم اور خود کشی کے لیے ایک عمومی ہندوستانی میلان کا بھی اکثر ذکر کیا گیا ہے (مثلاً الطبری: دین، تحقیق A.Mingana، مانچسٹر ۱۹۲۳ء۔ جلد دوم؛ المطہر: بداء، تحقیق C.huart ، ۴:۱۶ بعد، ترجمہ، ص ۲ بعد؛ ابن بطوطہ ۳:۱۳۶ بعد)۔ غیر مسلموں اور کافروں کی خود کشی کے واقعات، جن میں ان کی طرف سے اپنی انسانی عظمت کو برقرار رکھنے اور اپنے عقائد سے وفاداری کی خواہش ظاہر ہوتی ہے، کا بیان نفرت اور تحسین کے امتزاج کے ساتھ کیا گیا ہے۔ بے صلہ یا غیر قانونی محبت کی بنا پر خود کشی کی تشہیر وتعریف بہت سی ادبی تخلیقات میں معروف داستانوں کے ذریعے کی گئی ہے، خصوصاً محبت کے موضوع پر وسیع ادب (مثلاً الدیلمی: عطف، تحقیق J.Vadet، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۲ء، ص۷۷، ۱۲۲-۱۲۵؛ ابن الجوزی: ذم الہواء، قاہرہ ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۲ء، ص ۳۵۶، ۳۵۸، ۴۵۵، ۵۷۰، ۵۸۱)۔ ایک محبت بڑھانے والی ہیروئن کے لیے خود کشی کے بارے میں سوچنا قدرتی امر تھا (گورگانی: Wis and Ramin، تہران ۱۳۳۷ھ/۱۹۵۹ء، ص ۷۶، ترجمہ H.Masse، مطبوعہ پیرس ۱۹۵۹ء، ص ۹۳)۔ بلاشبہ یہ ادبی موضوع حقیقت کا ایک رومانوی انعکاس تھا۔ اس (موضوع) کی عہد جاہلیت کی جڑیں بڑی حد تک یونانی دنیا تک پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں.

معروف ھیلنسی یونانی فلسفہ اس نظریئے کو طاقت ور کرنے میں ممدومعاون تھا کہ بے عزت یا ناقابل برداشت زندگی کے مقابلے میں موت قابل ترجیح ہے، غالبًا اس

بحث کا موجب یہ سوال تھا کہ آیا عملاً اپنے آپ پر حملہ کیے بغیر مرنے کی خواہش ایک جائز امر ہے؟ (یہ ایک ایسی بات ہے جسے مسلمان دینی علما قبول نہیں کرتے)۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے دانشوروں میں خودکشی کے مفہوم کے بارے میں ایک فلسفیانہ نظریہ مقبول عام تھا (دیکھیے الجاحظ: حیوان، قاہرہ ۱۳۲۳۔۱۳۲۵ھ، ۲: ۹۹، ۱۱۴، وہ نظمیں، جن میں خودکشی سے خطاب کیا گیا ہے، جن کا حوالہ ابن ابی طاہر طیفور نے دیا ہے، منثور، مخطوطہ قاہرہ "بذیل ادب" ص ۵۸۱ ورق ۸۸ ب)۔ اس بحث کا کچھ (حصہ) ہمارے لیے ابوحیان التوحیدی کے حلقہ کی جانب سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ وہاں یہ استدلال پیش کیا گیا ہے کہ نیکی اور بھلائی کی حامل ہونے کی بنا پر انسانی ہستی قدر وقیمت رکھتی ہے، بصورت دیگر اس کا وجود و عدم مساوی ہے اور نتیجتاً اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک پست قسم کی اور ادھوری زندگی کا خاتمہ خودکشی سے کر دیا جائے۔ خودکشی کا ارتکاب کرنے پر مجبور کرنے والے حالات افلاس، مایوسی، شدید ناساز گار اور مخالف صورت حال اور محبت میں ناکامی کے معاملات ہیں۔ یہ امر خودکشی کے وقوع کی وضاحت کرتا ہے کہ چونکہ انسانی فطرت روح کی ان تمام تینوں قوتوں کی بیک وقت موجودگی کا نتیجہ ہے اس لیے غیر ذی عقل قوتوں کا وقتی اور عارضی غلبہ ناگزیر ہوتا ہے۔ خودکشی کی مذمت نہ صرف مذہبی روایت کی قوت کی بنا پر کی جاتی ہے، بلکہ ایک نامعقول اور لغو عمل کے طور پر بھی کی جاتی ہے جس کا ارتکاب انسان کو نہیں کرنا چاہیے، لیکن بعض اوقات اس سے بچا نہیں جا سکتا (المقابسات، قاہرہ ۱۳۴۷ھ، ص ۲۱۵ بعد؛ دیکھیے AOS، ۲۲ (۱۹۴۶ء): ۲۴۸ بعد؛ التوحیدی اور مسکویہ: حوامل، تحقیق اے امین اور اے صقر، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۴۷ھ/۱۹۶۱ء، ص ۱۵۰ بعد نیز دیکھیے، ص۷۲ بعد اور ص۱۸۷ وبعد، موت کے خوف یا اس کے لیے خواہش پر)۔ تاہم البیرونی نے خود کشی کی مذمت کے لیے یونانی ذرائع کا حوالہ دیا ہے (ہند، تحقیق سخاؤ، ص ۲۸۴، ت ۲: ۱۷۱)۔

خودکشی کی بہت سی اقسام کا ذکر مآخذ میں بہت زیادہ متفرق ہے حتی کہ خودکشی کی یادداشت، جیسی چیزوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے (یاقوت: ادباء، ۷: ۱۴۶؛ ابن کثیر: البدایہ، ۱۳: ۴۱ [؟]؛ ابن حجر: درر، مطبوعۂ حیدر آباد، ۱۳۴۸ھ/۱۳۵۰ھ، ۳: ۳۹۲)، چونکہ ہماری معلومات کے زیادہ تر مآخذ تاریخی اور سیاسی ہیں، اس لیے یہ جان کر کوئی حیرانی نہیں ہوتی کہ (خودکشی کے) زیادہ عام محرکات کسی قید وبند یا دشمن کے ہاتھوں سے موت کی پیش بندی کی خواہش یا مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہنگامہ خیز ادوار میں بے عزتی یا ذلت سے بچنے کی تمنا ہوتے ہیں۔ مذہبی نفرت کے موقع پر خودکشی کا فائدہ اٹھایا گیا تاکہ سیاسی قتل کو خودکشی کا نام دے کر چھپا دیا جائے۔ اہم اعلی حکومتی عہدے داروں کی موت پر خودکشی کی غیر معتبر افواہیں سنتے ہیں اور آدمی کی راسخ العقیدگی کے بارے میں شبہات خودکشی کے بلاوجہ الزامات کا سبب بنتے ہیں، جیسا کہ شاعر ابوالعلاء المعری کا معاملہ ہے (یاقوت: ادباء، ۱: ۱۹۴ بعد)۔ معاشرتی بے عزتی، سزا کا خوف، ناقابل برداشت مرض (دیکھیے ابن شہید کا معاملہ جس نے خودکشی کا سوچا تھا؛ ابن سعید: المغرب، قاہرہ ۱۹۵۲ء، ص۸۴؛ ابن بسام: ذخیرۃ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء، ۱: ۲۸۲؛ نیز دیکھیے Ch.pellat، ابن شہید، مطبوعہ عمان [۱۹۶۶ء] ۶۷۔۶۸)، جنون، احساس جرم اور انتقام کی خواہش خودکشی کے جذبے کو پختہ کرنے والی وجوہ ہیں۔

واضح اور قابل فہم اعداد وشمار کی عدم دستیابی کی بنا

پر خود کشی کے واقعات سے کوئی عمرانیاتی نتیجہ اخذ کرنا جلد بازی ہوگی۔ ازدواجی زندگی کی مشکلات کا عام محرک قرون وسطی کے مآخذ میں نسبتاً بہت معمولی کردار ادا کرتا نظر آتا ہے، لیکن اس (سوال) کا فیصلہ نہیں ہوسکتا کہ آیا یہ معلومات کی عدم فراہمی کی وجہ سے ہے یا اسلام کی پیدا کردہ معاشرتی فضا کی بنا پر۔ مذہبی علما کی خودکشی کا شاذ ہی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس کی چند مثالیں البتہ دی جاسکتی ہیں جہاں انتحار کا سبب ان علما کی سیاسی یا انتظامی سرگرمیاں نہیں، بلکہ مذکورہ الصدر وجوہ میں سے کوئی ایک ہے، مثلاً ۶۰۲ھ میں العراقی ۶۶۹ھ میں سنی ابن سبعین [رک بآں]، ۶۹۸ھ میں عبدالرحیم بن ابی بکر الجزری النحوی، ۷۳۱ھ میں محمد بن موسی الاشقر (ابن حجر: الدرر ۳:۳۹۲) ۷۸۸ھ میں احمد بن محمد بن الزرکشی، ۸۰۱ھ میں عبدالقادر الحنبلی (السخاوی: الضوء، ۴: ۳۰۰؛ یا جیسا کہ W.Ivanow کا ایک نہایت مختلف ماحول میں ذکر کردہ واقعہ "Satpanth، مطبوعہ لائیڈن و قاہرہ ۱۹۴۸ء Collectanea، ۱:۱۸). وغیرہ کی خود کشی کے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔

ایسے تمام واقعات کی تعداد، جسے مآخذ سے اکٹھا کیا جا سکتا ہے، کم ہے۔ تاہم "انتحار" کا اتفاقی اور استعاراتی استعمال، تدفین کی رسوم پر بحثیں اور عوامی ادبی کتب میں خودکشی کے تصور کی موجودگی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قرون وسطی کے مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں خودکشی کا تصور عام [مگر اس کا استعمال بہت شاذ] تھا (آخرالذکر کی تفصیل کے لیے دیکھیے الف لیلہ ولیلہ اور عہد جدید کی پریوں کی کہانیاں اور ڈرامے، مثلاً W. Eberhard اور P.N. Boratav: *Typen turkische volksmarchen*، ویزبیڈن ۱۹۵۳ء؛ O.Spies: *Tuirkische Puppenspiele*، مطبوعہ *Emsdetten/westf* (۱۹۵۹ء، ص ۷۷، ۱۰۴ وبعد؛ E.litmann: *Arabische machen und Schwanke*، ویزبیڈن ۱۹۵۵ء، ص۵۶) [تاہم یہ امر بھی واضح ہے کہ خودکشی کے معاشرے میں عموماً دینی بنیادوں پر مذمت کی جاتی تھی، نیز سوانحی مآخذ میں عام طور پر ان علماء و فضلاء کا ذکر آتا ہے جو دینی بنیادوں پر خودکشی کے مخالف تھے اور ان میں دوسرے عوامی طبقات کا کثرت تعداد کے باوجود ذکر نہیں ملتا۔ ان حالات میں یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ خودکشی کے واقعات مسلم معاشرے میں شاذو نادر ہی ہوتے تھے اور یہ کہنا بھی شاید غلط نہ ہو کہ اس کا بنیادی سبب خودکشی کے بارے میں اسلامی تعلیمات تھیں] .

مآخذ: (۱) T.P.Hughes: *A Dictionary of Islam*، لنڈن ۱۸۸۵ء بذیل (مادہ) Suicide؛ (۲) O. Rescher، در *Isl*، ۹ (۱۹۱۹ء) ۵۵ بعد (*Arabian Nights*)؛ (۳) W.M.Patton، در *Encyclopaedia of Religion and Ethics*، نیویارک، ۱۹۲۲ء؛ ۱۲/۳۸؛ (۴) مصطفیٰ جواد: المنتحرون فی الجاہلیۃ والاسلام، در الہلال، ۴۲ (۱۹۳۴ء) ۴۷۵ـ ۴۷۹؛ (۶) L.Nemoy: *A Tenth Century Disquisition on Suicide* (از یعقوب قرقسانی)، در *Journal of Biblical Literature* ۷ (۱۹۳۸ء) ۴۱۱ـ ۴۲۰؛ (۷) F.Rosenthal: *On Suicide in Islam*، در *JAOS* ۶۶ (۱۹۴۶ء) ۲۳۹ـ ۲۵۹، جہاں کافی سارے قدیم ادب کی فہرست دی گئی ہے؛ (۸) H.Ritter: *Das Meer der Seele*، مطبوعہ ویزبیڈن ۱۹۵۵ء، ص ۱۴۷، ۲۳۹، ۳۵۹، ۴۱۰، ۴۶۷، ۵۱۷، ۵۳۳ [اس نہایت مشکوک روایت پر بحث کے لیے کہ عثمانی سلطان بایزید اول [رک بآں] نے خود کشی کا ارتکاب کیا تھا، کے لیے دیکھیے M.F.Koprulu، در *Bell*، ۲:۱، ۱۹۳۷ء اور Mukrmin Halil Yinac در *IA*، ۲: ۳۸۸ـ ۳۸۹].

(F.Rosenthal [ت: ظفر علی])

••-------------••

※انتہاء [ع] خاتمہ، حاصل کلام، فن بلاغت کی ایک اصطلاح؛ القزوینی کی تلخیص المفتاح (مطبوعہ قاہرہ، بعنوان متن التلخیص، ص۱۲۶-۲۲۷ بدون تاریخ) میں توسیع شدہ متن ایضاح (تحقیق محمد عبد المنعم خفاجی، قاہرہ ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۵۰ء، ۶: ۱۵۳، ۱۵۴) اور تلخیص پر مبنی متعدد کتب اور کچھ قدیم متون میں، انتہا کا ذکر ابتدائیہ، مقدمہ، پیش لفظ اور تخلص (یا گریز) کے ساتھ کیا گیا ہے، یعنی کسی منظوم کلام یا نثری عبارت کے تین اجزا میں سے ایک جز (کچھ علما خطبہ کا بھی ذکر کرتے ہیں) جس کی طرف خصوصی طور پر توجہ مطلوب ہوتی ہے۔ ایک مصنف کو یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس کی نظم یا نثر کے آخری حصے کا سامعین (یا قارئین) کو یاد رہنے کا بہت زیادہ امکان ہوتا ہے اس لیے وہ اس (حصہ: انتہا) میں اپنی سابقہ خامیوں کو دور کر سکتا ہے۔ بصورت دیگر وہ اپنی کامیاب کوشش کو ناکارہ بنا سکتا ہے، یہاں اسے نہ صرف اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لینا چاہیے، بلکہ اسے یہ بھی واضح کرنا چاہیے کہ اس میں آئندہ مزید تہذیب وارتقا کی گنجائش نہیں ہے اور یہ (مقصد) "دعا" پر اختتام کرنے سے حاصل کیا جا سکتا ہے، جس میں لفظ کَمَلَ (اس نے مکمل کیا) یا خَتَمَ وغیرہ سے مشتق الفاظ کا استعمال (بمطابق زمانہ مابعد کی مختصر کتب) کیا جا سکتا ہے (دیکھیے ابن حجہ کی خزانۃ الادب کا متعلقہ باب، قاہرہ ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء، ص ۴۶۲، ۴۶۴، ۴۶۶) اور دیگر مآخذ۔ قدیم علما میں سے ابوہلال العسکری (کتاب الصنعتین، قاہرہ ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء، ص ۴۴۳- ۴۴۵) نظموں کے آخر میں ضرب الامثال کے استعمال کی وکالت کرتا ہے اور ابن رشیق کا خیال ہے کہ دعا صرف بادشاہوں سے خطاب کردہ منظومات میں استعمال کی جائے (اس کی ایک مخصوص تغیر پذیر قسم دعاے تابید ہے، یعنی حکمران کے دوام کی دعا)۔ اس مخصوص دعا کا ذکر رشید الدین وطواط نے حدائق الشعر (مطبوعہ تہران، تحقیق عباس اقبال، بدون تاریخ) میں کیا ہے۔ بطور حوالہ بیان کیے جانے والے اکثر اشعار محولہ بالا دلیل کو ایک روایتی مبالغہ آمیزی سے مستحکم کرتے ہیں۔ اکثر مصنفین اشارہ کرتے ہیں کہ زمانہ مابعد کے شعرا نے اپنے کلام میں تخلص کی طرح انتہا پر کافی توجہ دی ہے۔

انتہا پر بحث اکثر حسن المقطع، براعۃ المقطع اور حسن الخاتمہ وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت کی جاتی ہے (اس سیاق میں مقطع اسی جیسی اصطلاح سے ممیز سمجھا جائے جس کا اطلاق نظم کے آخری شعر پر ہوتا ہے)۔

قرآن مجید میں انتہا پر قابل قدر توجہ مرکوز کی گئی ہے، لیکن قزوینی کا تتبع کرنے والے علما تسلیم کرتے ہیں کہ قرآنی سورتوں کے اواخر کے اسلوبی خصائص کی تحسین کے لیے تجربہ درکار ہے۔

مآخذ: (۱) علی الجرجانی: الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ، قاہرہ ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء، ص ۱۴؛ (۲) ابن رشیق: العمدہ، قاہرہ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء، ۱: ۱۴۵، ۱۸۹-۲۶۱؛ (۳) ابن ابی الاصبع: تحریر التحبیر، قاہرہ ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء، ص ۶۱۶- ۶۲۳؛ (۴) وہی مصنف: بدائع القرآن، قاہرہ ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء، ص ۳۴۳-۳۵۳؛ (۵) بدرالدین ابن مالک: مصباح، قاہرہ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء، ص ۱۲۶-۱۲۸؛ (۶) شمس الدین محمد بن قیس الرازی: المعجم فی معاییر أشعار العجم، لندن ۱۹۰۹ء، ص ۳۷۹-۳۸۱؛ (۷) شروح التلخیص قاہرہ، ۱۹۳۷ء، ۴: ۵۴۳-۵۴۷؛ (۸) التفتازانی: الشرح المطول، استانبول، ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۱ء، ص ۴۸۱-۴۸۲؛ (۹) السیوطی: عقود الجمان۔ قاہرہ ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء؛ ص ۱۷۵-۱۷۶؛ (۱۰) العباسی: معاھد، قاہرہ، ۱۳۶۶ھ؛ ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۷ء- ۱۹۴۸ء، ۴: ۲۶۸-۲۷۴؛ (۱۱) اے ایف مہرین: Die Rhetorik der

Araber، مطبوعہ وی آنا ۱۸۵۳ء؛ ص ۱۴۶۔۱۴۷؛ (۱۲) Ruekert Pertsch: *Grammatik Poetik und Rhetorik der perser*، گوتھا ۱۸۷۴ء، ص ۳۵۹.

(S.A. Bone Bokker [ت: ظفر علی])

••------------••

※ انڈونیشیا: آبادی کے لحاظ سے عالم اسلام کا سب سے بڑا اور دنیا کا چوتھا بڑا ملک اور دنیا کا سب سے بڑا مجمع الجزائر جو جنوب مشرقی ایشیا میں واقع ہے، اس کی آبادی تقریباً بائیس کروڑ (جنوری ۲۰۰۴ء) ہے اور یہ چھوٹے بڑے ۱۷۵۰۸ جزائر پر مشتمل ہے (ابتدائی حالات کے لیے دیکھیے آآ، بذیل مادہ)

اس مجمع الجزائر پر ولندیزیوں نے سترھویں صدی عیسوی میں قبضہ کر لیا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ان کے خلاف سیاسی اور مسلح مزاحمت شروع ہوئی ۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں نے ولندیزیوں کو شکست دے کر جزائر پر قبضہ کر لیا، لیکن جنگ میں محوریوں کو شکست ہوئی تو قوم پرست تحریک نے ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء کو یک طرفہ آزادی کا اعلان کر کے حکومت بنا لی۔ ولندیزیوں نے اس حکومت کو تسلیم نہ کیا اور ملک پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ تاہم مقامی مزاحمت اور بین الاقوامی دباؤ کے نتیجے میں انہیں قبضہ چھوڑنا پڑا اور ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو انڈونیشیا کی آزاد حکومت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کر لیا گیا۔ ملک کے پہلے صدر احمد سوئیکارنو نے بتدریج آمرانہ رنگ اختیار کر لیا، سیاسی بے چینی، معاشی بدحالی اور بغاوت کے نتیجے میں ۱۹۶۷ء میں اسے حکومت فوج کے سربراہ جنرل سوہارتو کے حوالے کرنا پڑی۔ (سوئیکارنو کے زوال تک کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے آآ بذیل مادہ انڈونیشیا)۔

جدید سیاسی تاریخ: فروری ۱۹۶۷ء میں فوجی سربراہ جنرل سوہارتو نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد تیزی سے اقتدار پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیا۔ ایوان بالا، یعنی عوامی مشاورتی کونسل (انڈونیشی زبان میں Majelis Peoples = Perwusyawaratan Rakyat=MPR (Consultative Assembly نے، جو ملک کا اعلیٰ ترین آئینی ادارہ ہے، مارچ میں اسے قائمقام صدر نامزد کیا، اکتوبر میں وہ ملک کا وزیر اعظم بن گیا اور مارچ ۱۹۶۸ء میں اس نے مشاورتی کونسل سے خود کو باقاعدہ صدر منتخب کروا لیا۔ فوجی افسر تو اس کے ساتھ تھے ہی، اس نے سول طبقے کو ساتھ ملانے کے لیے گولکر (Golkar، یعنی Joint Secretariat of Functional Groups) کے نام سے پارٹی بنا لی۔ کمیونسٹ پارٹی پر اس نے پابندی لگا دی ۔ اسلامی جماعتوں پر سوئیکارنو کے زمانے سے پابندی عائد چلی آرہی تھی۔ یوں اقتدار عوام ،سیاسی جماعتوں ،مجلس نمائندگان یا ایوان زیریں (House of Representatives، یا Dewan Perwakilan Rakyat=DPR) اور کابینہ کی بجائے عملاً جنرل سہارتو اور ان کے چند پسندیدہ فوجی اور سول احباب تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اگرچہ ہر پانچ سال بعد مجلس نمائندگان اور صدارتی عہدے کے انتخابات باقاعدگی سے ہوتے رہے جس میں گولکر پارٹی کو اکثریت مل جاتی اور صدر سہارتو (بالعموم بلا مقابلہ) صدر منتخب ہو جاتا تھا۔ اس طرح جمہوریت کا نام تو باقی رہا، گو عملاً جمہوریت مفقود اور رائے عامہ غیر مؤثر تھی.

۱۹۸۴ء میں سہارتو حکومت نے پنچ شیلا (آئین میں مندرج ریاست کے پانچ بنیادی اصول، جو سیکولرزم پر مبنی ہیں) کو ملک کی واحد نظریاتی اساس قرار دینے کا اعلان کر دیا۔ اس پر مذہبی جماعتوں نے احتجاج کیا اور ملک بھر کے ۵۰ دانشوروں نے ایک اجتماعی بیان میں اس کی

مذمت کی۔ تاہم حکومت نے مخالفت کو سختی سے کچل دیا اور جولائی ۱۹۸۵ء میں قانون بنا کر اسے نافذ کر دیا۔ فروری ۱۹۸۸ء میں مشاورتی کونسل نے فوج کو باقاعدہ سیاسی کردار اداکرنے کے لیے قانون سازی کی اور اس کے لیے ایوان میں ۱۰۰ نشستیں مختص کر دیں، جس سے فوج کی سیاست میں مداخلت مزید بڑھ گئی۔ چنانچہ اس نے مارچ میں ہونے والے انتخابات میں نائب صدر منتخب ہونے والے جنرل سدھارمنو کی، جو گولکر کا صدر بھی تھا، مخالفت کی اور اسے مستعفی ہونا پڑا۔ ۱۹۸۹ء میں سیاسی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ جنوبی سماترا میں فوج کے ساتھ تصادم میں ۱۰۰ آدمی ہلاک ہو گئے جس کے نتیجے میں طلبہ نے مظاہرے شروع کر دیئے۔ اگست ۱۹۹۰ء میں ملک کے ۵۸ ممتاز دانشوروں نے صدر سوہارتو سے مطالبہ کیا کہ وہ اگلے صدارتی الیکشن میں امیدوار نہ بنیں اور جمہوری آزادیاں بحال کر دیں، تاہم سوہارتو حکومت نے روش تبدیل نہ کی ۔یونیورسٹیوں میں طلبہ کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ مجلس نمائندگان کے انتخاب کے لیے تیار کردہ گولکر کی فہرستوں میں سے ان افراد کے نام حذف کر دیئے گئے جو آزادیِ اظہار کے مدعی تھے۔ مزدوروں میں بے چینی کو بھی دبانے کی کوشش کی گئی۔۱۹۹۰ء میں خود فوج کے بعض عناصر نے فوج کے سیاسی کردار کے نقصانات واضح کرنے کی کوشش کی اور صدر پر جمہوری اقدار کو فروغ دینے کے لیے زور دیا۔

دریں اثنا صدر سہارتو نے (۱۹۹۳ء) صدارتی انتخابات میں اپنی کامیابی کے لیے سیاسی اقدامات جاری رکھے۔ انڈونیشی جمہوری پارٹی (Indonesian Democratic Party یا Partai Demokrasi = PDI Indonesia) سے حمایت کا اعلان کروایا۔ مسلم ووٹروں کو خوش کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے، مسلم عائلی عدالتوں کو مزید اختیارات دیئے، تعلیمی اصلاحات کیں، بلاسودی بنک کھولنے کی اجازت دی، حج کیا اور مسلم دانشوروں کی تنظیم (Association of Indonesian Muslim Intellectuals) قائم کی، حالانکہ فوج کے بعض عناصر نے اس کی مخالفت کی کیونکہ اس سے اسلام کی سیاسی طاقت میں اضافہ ہوتا۔ مارچ ۱۹۹۲ء میں دینی سیاسی جماعت نہضتہ العلماء نے ۲ لاکھ افراد کی ریلی نکالی جس سے خائف ہو کر حکومت نے اس کے سیاسی ونگ ڈیمو کریٹک فورم پر پابندی لگا دی۔

جون ۱۹۹۲ء میں ہونے والے مجلس نمائندگان کے انتخابات کے لیے چلائی جانے والی انتخابی مہم پر اگرچہ سوہارتو حکومت نے بہت سی پابندیاں عائد کر دیں، اس کے باوجود سیاسی جماعتوں نے سوہارتو اور اس کے بیٹوں کی مالی بدعنوانیوں کا موضوع چھیڑے رکھا اور رائے عامہ کو بیدار اور منظم کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۹۱ء میں قائم ہونے والی ایک سیاسی جماعت ”تحفظ حاکمیت عوام“ نے لوگوں کو انتخابات کے بائیکاٹ پر اکسایا تاکہ حکومت پر انتخابی عمل سے پہلے جمہوری اصلاحات خصوصاً صدر کے اختیارات کم کرنے پر زور دیا جا سکے۔ اس کے باوجود انتخابات میں حکمران گولکر پارٹی ۴۰۰ میں سے ۲۸۲ نشستیں جیتنے میں کامیاب ہوگئی، جب کہ مذہبی جماعتوں کے (حکومت کے قائم کردہ) جبری اتحاد پر مبنی متحدہ ترقیاتی پارٹی (United Development Party یا Partai Persatuan Pembangunan=PPP) نے ۶۲ اور جمہوری پارٹی نے ۵۶ نشستیں جیتیں۔ مارچ ۱۹۹۳ء میں ہونے والے صدارتی انتخاب میں سوہارتو نے طاقت اور جوڑ توڑ سے فوج اور سیاسی جماعتوں کو اپنی حمایت پر آمادہ کر لیا اور سیاسی نکتہ چینی کے باوجود فوج سے اپنی مرضی کا نائب صدر بھی منتخب کروا لیا۔

نقشہ اِنڈونیشیا
بحیرۂ جنوبی چین
بحیرۂ سلاویسی
بحر الکاہل
بحرِ ہند
پیمانہ بحساب میل

ان انتخابات میں کامیابی کے بعد جنرل سوہارتو نے کچھ اصلاحات کیں ۔ کابینہ میں نئے چہرے متعارف کروائے ، فوجی اور عیسائی وزرا کی تعداد کم کی، انڈونیشی مسلم دانشوروں کی تنظیم (ICMI) کے حمایت یافتہ افراد وزارت میں لیے ۔ مخالفین پر سفری پابندیاں نرم کیں۔ بنیادی حقوق کی قومی کونسل بنانے کا اعلان کیا، وغیرہ۔ ان اقدامات کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا، کیونکہ حکومت نے جابرانہ ہتھکنڈے بھی ساتھ ساتھ جاری رکھے۔ اس نے میگاوتی سوئیکارنو پتری کے جمہوری پارٹی کے صدر منتخب ہونے کی راہ میں روڑے اٹکائے اور جب وہ حکومتی مزاحمت کے باوجود پارٹی کی صدر منتخب ہو گئی تو پارٹی کی سیاسی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ امریکی دباؤ پر حکومت نے مجبور ہو کر مزدوروں کی تنخواہوں میں اضافہ کیا، لیکن ان پر عمل درآمد کے لیے جب مزدوروں نے دباؤ ڈالا اور ہڑتالیں کیں تو حکومت نے مزدوروں میں بے چینی پھیلانے کے الزام میں مزدور لیڈروں کو جیل میں بند کر دیا۔ ۱۹۹۵ء میں فوج نے یہ مہم چلائی کہ سماجی اور سیاسی بے چینی کے پیچھے کمیونسٹ عناصر کا ہاتھ ہے اور اس بہانے سیکڑوں سیاسی مخالفین کو جیلوں میں ڈال دیا ۔دنیا بھر میں جب بنیادی حقوق کی ان خلاف ورزیوں پر احتجاج ہوا تو حکومت نے ۱۹۶۵ء کی ناکام کمیونسٹ بغاوت کے چند بے گناہ اسیران کو رہا کرنے کا حکم دیا اور اس ضمن میں ۱۳ لاکھ متاثرہ افراد کو بھی بعض سہولتیں دینے کا اعلان کیا۔ سیاسی اجتماعات کے لیے فوج سے پیشگی اجازت لینے کی پابندی ختم کر دی گئی (تاہم اسے اطلاع دینا اب بھی لازمی تھا).

اس دوران میں پریس اور سیاسی مخالفین کو دبانے کے حکومتی حربے جاری رہے۔سوہارتو فوج اور دینی عناصر کے درمیان توازن قائم رکھنے کے لیے دینی عناصر کی محدود حمایت کر رہا تھا جب کہ فوج دینی عناصر کو دبانا چاہتی تھی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۹۵ء میں فوج نے مغربی جاوا میں ۳۰ اسلام پسندوں کو حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں گرفتار کر لیا اور اکے (ICMI) کے اخبارات و جرائد پر بھی لوگوں کے مذہبی جذبات کو ہوا دینے کے الزام میں نکتہ چینی کی.

مارچ ۱۹۹۶ء میں بعض سیاسی عناصر نے انتخابات کی نگرانی کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جسے حکومت نے غیر آئینی قرار دے دیا۔ اس دوران میں حکومت نے یہ محسوس کر کے کہ گولکر کی مخالفت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے، سیاسی جماعتوں کے خلاف رویہ مزید سخت کر لیا۔ سہارتوحکومت نے مئی میں ایک مذہبی رہنما سری بنتانگ (Sri Bintang) کی مجلس نمائندگان کی رکنیت ختم کر دی اور صدر کے خلاف اہانت آمیز تقریر کرنے کے الزام میں اسے دوسال قید کی سزا سنا دی۔ اس نے نئی سیاسی جماعت بنانے کا اعلان کیا تو فوج نے اس کی مخالفت کی اور حکومت نے بھی اس کی رجسٹریشن کرنے سے انکار کر دیا ۔ادھر میگاوتی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خائف ہوکر حکومت نے اس کی جماعت میں پھوٹ ڈلوا دی، لیکن میگاوتی کے حامیوں نے پارٹی ہیڈکوارٹر پر قبضہ کر لیا، جسے ختم کرنے کے لیے فوج حرکت میں آگئی۔ اس پر ہنگامے شروع ہوگئے اور فوج سے تصادم میں بہت سے لوگ مارے گئے۔ فوج نے ہنگاموں کا الزام بائیں بازو کے رجحانات رکھنے والی نوزائیدہ سیاسی جماعت(PDR) پر لگایا اور اُسے کمیونسٹ پارٹی کا جانشین قرار دیتے ہوے اس پر پابندی عائد کر دی۔ اس نے بائیں بازو کے رجحانات رکھنے والے لوگوں کی داروگیر شروع کر دی اور کئی مزدور رہنماؤں کو حوالہ زندان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی حکومت نے اگلے سال مجلس نمائندگان کے متوقع

انتخابات میں اپنی کمزور پوزیشن کو دیکھتے ہوئے فوج کے ذریعے حزب مخالف کی سیاسی جماعتوں کو دبانے کا آغاز کر دیا۔ انتخابی جلوسوں پر پابندی لگا دی گئی۔ اخبارات کے علاوہ پرائیویٹ ریڈیو اور ٹی وی سٹیشنوں پر بھی سخت سنسر عائد کر دیا گیا اور انہیں بند کر دینے کی دھمکیاں دی گئیں۔ انتخابی فہرستوں سے میگاوتی کی پارٹی کے ارکان کے نام حذف کر دیئے گئے۔ انتخابی مہم کو غیر مؤثر بنانے کے لیے بہت سی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ان اقدامات کے نتیجے میں مئی ۱۹۹۷ء میں ہونے والے انتخابات میں حکمران پارٹی نے ۳۲۵ نشستیں (کل نشستوں کا ۷۴ فیصد) جیت لیں۔ پی پی پی نے ۸۹ نشستیں اور میگاوتی کی جماعت کے حکومتی دھڑے نے ۱۱ نشستیں جیتیں، اگرچہ دھاندلی کی وجہ سے انتخابات میں خون خرابہ ہوا اور ۲۷۵ آدمی مارے گئے۔

۱۹۹۷ء میں جنوب مشرقی ایشیائی ممالک میں مالی بحران کی وجہ سے انڈونیشی کرنسی کی قیمت گر گئی اور سہارتو حکومت کو بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) سے ہنگامی مدد لینا پڑی، لیکن بعد میں وہ ان اصلاحات کو بروئے کار نہ لا سکی جس کا مطالبہ آئی ایم ایف کر رہا تھا کیونکہ اس سے سہارتو کے اعزہ و احباب کے ان مالی مفادات کو ٹھیس پہنچتی تھی جن سے وہ متمتع ہو رہے تھے۔ دریں اثنا سہارتو کی بیماری کی وجہ سے اس کے مستعفی ہونے کی افواہ پھیل گئی، لیکن کچھ نہ ہوتا دیکھ کر سیاسی اور دینی قوتوں نے متحد ہو کر سہارتو کے استعفیٰ کا مطالبہ کر دیا اور امین رئیس (محمدیہ) اور میگاوتی نے آئندہ صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ جنوری ۱۹۹۸ء میں سہارتو حکومت نے جو بجٹ پیش کیا وہ انتہائی غیر متوازن تھا اور اس کے نتیجے میں کرنسی کی قیمت مزید گر گئی اور ضروریات زندگی کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ لوٹ مار کے کئی واقعات ہوئے اور غیر یقینی حالات میں لوگوں نے کھانے پینے کی اشیا ذخیرہ کرنا شروع کر دیں۔ آئی ایم ایف کے دباؤ پر حکومت کو بجٹ تبدیل کرنا پڑا۔ اسی دوران میں مالی بدعنوانی کے الزامات اور سیاسی دباؤ کے باوجود سہارتو نے گولکر کی طرف سے اگلے پانچ سال کے لیے صدارتی امیدوار بننا قبول کر لیا اور نائب صدر کے عہدے کے لیے یوسف حبیبی کی حمایت کا اعلان کر دیا (حالانکہ حبیبی فوجی اور دیگر حلقوں میں غیر مقبول تھا اور اس طرح کی حمایت کی سیاسی روایت بھی موجود نہ تھی)۔ مارچ ۱۹۹۸ء میں ساتویں بار بلامقابلہ صدر منتخب ہونے کے بعد جنرل سہارتو نے نئی کابینہ تشکیل دی اور اپنے اعزہ و اقارب کو اس میں اہم وزارتیں دیں۔ اس پر سیاسی بے چینی میں اضافہ ہوا۔ اور جب مئی میں پٹرول کی قیمتوں میں ۷۰ فیصد اضافہ ہوا، تو طلبہ نے سہارتو کے استعفیٰ اور سیاسی ومالی اصلاحات کا مطالبہ کرتے ہوئے مظاہرے کرنے شروع کر دیئے جو جلد ہی سارے ملک میں پھیل گئے۔ ہر طرف طرف ماردھاڑ اور بلوے ہونے لگے۔ چینی نژاد لوگ خصوصاً اس کا ہدف بنے جو تجارت و صنعت پر چھائے ہوئے تھے۔ صرف جکارتہ میں ایک ہزار کے قریب افراد قتل ہوئے۔ دوسرے شہروں میں بھی بہت سا جانی و مالی نقصان ہوا۔ کئی وزرا مستعفی ہو گئے اور فوجی سربراہ نے بھی صدر سے استعفیٰ کا مطالبہ کر دیا۔ ان حالات میں جنرل سہارتو کو مجبوراً ۲۱ مئی ۱۹۹۸ء کو مستعفی ہونے کا اعلان کرنا پڑا اور آئینی تقاضوں کے مطابق نائب صدر یوسف حبیبی نے عہدۂ صدارت کا حلف اٹھایا۔

یوسف حبیبی اگرچہ سوہارتو کا آدمی تھا، لیکن عوامی دباؤ کے پیش نظر حالات سدھارنے کے لیے اس نے متعدد اقدامات کیے۔ سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے۔ سہارتو کے داماد جنرل پرابو کو عہدے سے ہٹا دیا گیا، بلکہ بعد میں اس کا کورٹ مارشل بھی ہوا۔ جنرل سہارتو اور اس

کے احباب و اقارب کا احتساب بھی شروع ہوا۔ ان میں سے جو مشاورتی کونسل کے رکن تھے، ان کی رکنیت ختم کر دی گئی، لیکن رائے عامہ سہارتو کے اتنا خلاف ہو چکی تھی کہ ان اقدامات سے مطمئن نہ ہوئی اور ملک کے کئی حصوں میں ہنگاموں کی وجہ سے جانی ومالی نقصان ہوتا رہا۔ نومبر میں جب مشاورتی کونسل کا اجلاس جکارتہ میں ہوا تو اس وقت بھی ہنگاموں میں کئی آدمی ہلاک ہوے، چنانچہ حبیبی حکومت نے اعلان کیا کہ جون ۱۹۹۹ء میں مجلس نمائندگان کے اور اگست میں صدارتی انتخابات ہوں گے۔ انتخابی اصلاحات کے لیے نئے قوانین متعارف کروائے گئے جن کی رو سے انتخابات تناسب نمائندگی کے تحت ہوتے اور اکثریتی اضلاع میں امیدوار کھڑے کرنے والی جماعتیں ہی انتخابات میں حصہ لے سکتیں ۔ سرکاری ملازمین کو گولکر پارٹی کو ووٹ دینے کی پابندی ختم کر دی گئی۔ فوج کی نمائندگی کم کرکے ۳۸ نشستوں تک محدود کردی گئی اور مشاورتی کونسل کے ارکان کی تعداد ایک ہزار سے کم کر کے ۷۰۰ کر دی گئی جن میں سے ۵۰۰ براہ راست منتخب ہوتے، جبکہ ۱۳۵ صوبائی اسمبلیوں کے ذریعے اور ۶۵ الیکشن کمیشن کے ذریعے نامزد کیے جانے تھے ۔ انتخابات سے پہلے ساری مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے گولکر کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کا اعلان کیا، لیکن اس پر مؤثر طریقے سے عمل درآمد نہ ہوا۔ ان انتخابات میں میگاوتی کی جمہوری پارٹی نے ۱۵۴ نشستیں (سب سے زیادہ اور کل ووٹوں کا ۳۴ فیصد) حاصل کیں۔ دوسرے نمبر پر گولکر نے ۱۲۰ نشستیں، عبدالرحمٰن واحد کی قومی بیداری پارٹی (PKB) نے ۵۹ اور امین رئیس کی (PAN) نے ۳۵ نشستیں حاصل کیں۔ اس کے بعد صدارتی انتخاب کے موقع پر یوسف حبیبی، عبدالرحمٰن واحد اور میگاوتی کے درمیان مقابلہ متوقع تھا، لیکن مشاورتی کونسل نے حبیبی کی نمائندگی پر اعتراض کر دیا۔ چنانچہ عین انتخابات کے روز اس نے کاغذات نامزدگی واپس لے لیے۔ گولکر نے عبدالرحمٰن واحد کو ووٹ دیئے اور اس طرح عبدالرحمٰن واحد میگاوتی کے ۳۱۳ ووٹوں کے مقابلے میں ۳۷۳ ووٹ لے کر جیت گیا۔ میگاوتی کے حامیوں نے پارلیمنٹ کی اکثریتی جماعت ہونے کی وجہ سے اس شکست کو قبول نہ کیا اور مظاہرے شروع کر دیئے جو اس وقت رکے جب اگلے روز (۲۱ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو) میگاوتی کو نائب صدر منتخب کر لیا گیا۔

صدر عبدالرحمٰن واحد نے متوازن کابینہ بنائی اور سارے اسلامی، سیاسی اور نسلی گروہوں کو نمائندگی دی۔ سیاست میں فوجی اثر و رسوخ کم کرنے کے لیے ایک سویلین کو وزیر دفاع بنایا اور فوج کا کمانڈر انچیف تبدیل کر دیا۔ اصلاحات اور احتساب کا عمل تیز کیا اور سہارتو کے خلاف مقدمات کا ازسرنو آغاز کیا۔ کابینہ کے تین وزیروں پر بدعنوانی کا الزام لگا تو انہیں برطرف کر دیا جن میں اس کی اپنی پارٹی کا ایک رہنما بھی شامل تھا۔ سیاسی حکومت بننے کے باوجود ملک میں فرقہ وارانہ اور نسلی فسادات جاری رہے۔ دسمبر ۱۹۹۹ء میں صوبہ ملوکو کے جزیرہ ایمبون میں عیسائی مسلم فسادات بھڑک اٹھے، جن میں سیکڑوں آدمی مارے گئے۔ مسلم اکثریت کے شمالی اضلاع کو الگ صوبہ بنا دیا گیا، مزید فوج بھی بھیجی گئی لیکن فسادات دوسرے صوبوں تک پھیل گئے۔ دریں اثنا فوج کے ساتھ اختیارات کی جنگ جاری رہی۔ جنوری ۲۰۰۰ء کے آخر میں قومی کمیشن برائے بنیادی حقوق نے اپنی ایک رپورٹ میں مشرقی تیمور میں تعینات سابق فوجی افسروں بشمول جنرل ورانٹو کے خلاف اختیارات کے غلط استعمال کا الزام لگایا جو اس وقت صدر واحد کی کابینہ میں اہم وزیر تھا۔ صدر نے اس سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا جسے

اس نے اہمیت نہ دی، کئی ماہ کی کشمکش کے بعد مئی میں جنرل ورانٹو مستعفی ہوا، تاہم حکومت مذکورہ جنرل اور دوسرے فوجی افسروں کے خلاف مقدمات نہ چلا سکی۔ اسی دوران میں واحد حکومت نے فوج کی تنظیم نو کی۔ جنرل ورانٹو کے حمائتیوں کو اہم عہدوں سے ہٹا دیا اور ایسے افسر اوپر لائے گئے جو سیاست میں فوج کے کردار کے حامی نہ تھے۔ ایک موقع پر صدر واحد نے میگاوتی اور حبیبی گروپ کے دو وزرا کو، بظاہر بغیر کسی وجہ کے، کابینہ سے فارغ کر دیا جس پر ملک کے سیاسی حلقوں میں بڑی لے دے ہوئی۔ مجلس نمائندگان نے جب اس کی وضاحت چاہی تو صدر واحد نے وضاحت دینے سے انکار کر دیا جس پر صدر واحد کے طرز حکمرانی پر عدم اطمینان کا اظہار ملک میں عام ہونے لگا اور مجلس اور صدر میں چپقلش بڑھ گئی۔ سیاسی دباؤ کم کرنے کی خاطر صدر نے یہ راہ نکالی کہ روزمرہ کے اختیارات نائب صدر میگاوتی کے حوالے کر دیئے۔ اس سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مشاورتی کونسل کے اگست ۲۰۰۰ء کے اجلاس سے نمٹا جائے، جس کے بارے میں یہ افواہ تھی کہ وہ صدر سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کرے گی یا عدم تعاون کی صورت میں اسے ہٹا دے گی۔ کونسل نے مجلس نمائندگان کے اس اختیار کی توثیق کی کہ وہ سربراہ حکومت سے باز پرس کر سکتی ہے اور حکومت مجلس کو جوابدہ ہے۔ نیز اس نے فوج کی ۳۸ نشستوں کو ۲۰۰۹ء تک توسیع بھی دے دی۔

کونسل کے اجلاس کے بعد صدرواحد نے کابینہ کی تشکیل نو کی، جس میں اہم وزارتیں اپنی مرضی کے آدمیوں کو دیں اور نائب صدر میگاوتی کی نمائندگی مزید کم کر دی جس سے صدر اور نائب صدر میں کشیدگی بڑھ گئی۔ اس دوران میں سابق صدر سہارتو کے خلاف مقدمے کی کاروائی آگے نہ بڑھ سکی، کیونکہ غیر جانبدار ڈاکٹروں کے ایک پینل نے یہ فیصلہ دیا کہ وہ اس قدر بیمار ہے کہ عدالت میں نہیں آسکتا۔ اس پر دارالحکومت میں ہنگامے شروع ہو گئے، کیونکہ اس وقت یہ تاثر عام تھا کہ ملک میں سبوتاژ کی جو کاروائیاں ہو رہی ہیں ان میں سہارتو کے قریبی حمائتیوں کا ہاتھ ہے۔ بعد میں عدالت عالیہ نے فیصلہ دیا کہ مقدمہ جاری رکھا جائے۔حکومت نے سہارتو کے بیٹے ہتومو کو بدعنوانی کے الزام میں سزا سنا دی، لیکن اسے گرفتار نہ کیا جا سکا کیونکہ وہ زیر زمین چلا گیا تھا۔ ستمبر ۲۰۰۰ء میں مجلس نمائندگان نے دو مشتبہ مالی معاملات میں صدر کے ملوث ہونے کے بارے میں تحقیقاتی کمشن قائم کیا، لیکن صدر نے اسے جواب دینے سے انکار کر دیا۔ جنوری ۲۰۰۱ء کے آخر میں کمشن نے اپنی رپورٹ جاری کرتے ہوئے معاملات میں صدر کے ملوث ہونے کے امکان کا شبہ ظاہر کیا گو وہ کوئی واضح ثبوت نہ پیش کر سکا کہ صدر نے ذاتی طور پر کوئی مالی فائدہ اٹھایا تھا۔کمشن کی رپورٹ شائع ہونے پر ہزاروں لوگوں نے جکارتہ میں مظاہرے شروع کر دیئے اور صدر سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا۔ ان مظاہرین کی پولیس سے شدید جھڑپیں ہوئیں۔ فروری ۲۰۰۱ء میں مجلس نمائندگان نے صدر کے مؤاخذے کی کاروائی کا آغاز کر دیا۔ متعلقہ قانون کے مطابق صدر کو تین ماہ کے اندر الزامات کا جواب دینا اور مجلس کو اپنی بے گناہی پر مطمئن کرنا تھا، بصورت دیگر مواخذے کی کاروائی آگے بڑھتی۔ صدر نے مجلس کی کاروائی کی مذمت کی اور اسے غیر آئینی قرار دیتے ہوئے تعاون سے انکار کیا۔ صدر نے سیاسی حلقوں کے استعفیٰ کے مطالبے کو رد کرتے ہوئے اپنی مدت صدارت پوری کرنے کے عزم کا اظہار کیا اور وزیر انصاف کو بھی برخواست کر دیا۔ صدر کے حامیوں نے ملک کے بعض حصوں میں اس کے حق میں جلوس

بھی نکالنے شروع کر دیئے۔ اس طرح ملک میں سیاسی تلخی بڑھ گئی اور مجلس نے مواخذے کی کاروائی کو آگے بڑھانے کااعلان کر دیا۔ صدر واحد نے کوئی چارہ نہ دیکھ کر مجلس توڑ کر ایمرجنسی نافذ کرنے کا اعلان کر دیا، لیکن فوج اور پولیس نے اس کے احکام کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے انہیں نافذ کرنے سے انکار کر دیا۔ معاملہ عدالت عظمی میں گیا اور اس نے بھی صدر کے احکام کو غیر آئینی قرار دے دیا۔ چنانچہ مجلس نے ۱۸ مئی ۲۰۰۱ء کو صدر واحد کو معزول کر کے نائب صدر میگاوتی کو صدر بنانے کا اعلان کر دیا۔

صدر واحد کے پونے دو سالہ عہد اقتدار (۲۰ اکتوبر ۱۹۹۹ء تا ۱۸ مئی ۲۰۰۱ء) پر ایک نظر ڈالیں تو اندازہ ہو گا کہ شروع میں حالات خاصے اچھے تھے۔ منتخب حکومت کو عوامی، سیاسی اور فوجی حلقوں کا تعاون میسر تھا، حزب مخالف برائے نام تھی، پریس آزاد تھا، بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کی انجمنیں فعال تھیں۔ اقلیتوں، نسلی اور علاقائی گروہوں اور مذہبی اختلافات میں حکومت کا رویہ مفاہمانہ اور غیر جانبدارانہ تھا اور اس نے قوت استعمال کرنے کی بجائے گفتگو اور مفاہمت کے ذریعے مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ مرکز میں ارتکاز اختیارات کی بجائے نچلی سطح پر اختیارات منتقل کرنے کی کوشش کی گئی اور بین الاقوامی مالیتی اداروں سے تعاون کی پالیسی اختیار کی گئی۔ بیرونی سرمایہ کاروں کا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی گئی اور عملاً معاشی بہتری کا رجحان بھی پیدا ہوا، لیکن اس کے باوجود متعدد وجوہ کی بنا پر (جن میں امن و امان کی ابتر صورت حال، بدعنوانی کے خلاف سخت اقدامات میں ناکامی، عوامی توقعات کی کثرت، صدر کے غیر جمہوری مزاج، سیاسی جماعتوں کے عدم تعاون وغیرہ جیسے امور شامل تھے) واحد حکومت اقتدار کے دو سال بھی پورے نہ کر سکی۔

صدر واحد کو ہٹانے کے بعد اسمبلی نے نائب صدر میگاوتی کو صدر بنا دیا جسے فوج کی حمایت بھی حاصل تھی کیونکہ وہ سابق صدر کے مقابلے میں، جس کا رویہ بعض اوقات فوج کے سخت خلاف ہوتا تھا، فوج کے ساتھ مفاہمانہ پالیسی کی قائل تھی، نیز اپنی لادینیت (سیکولر) اور قوم پرستانہ رجحان کی وجہ سے بھی وہ فوج کے نقطۂ نظر کے قریب تھی، اکثر سیاسی حلقوں کی حمایت بھی اسے حاصل تھی، مغرب کے لیے بھی وہ مضبوط مذہبی پس منظر رکھنے والے واحد کے مقابلے میں زیادہ قابل قبول تھی، چنانچہ اس کے برسراقتدار آنے کے مثبت اثرات کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے اقتدار سنبھالتے ہی انڈونیشی روپے کی قیمت ایک ہی رات میں ۱۱۵۰۰ فی ڈالر کی بجائے ۹۵۰۰ روپیہ فی ڈالر ہو گئی۔ تاہم لگتا ہے کہ میگاوتی ملک کو درپیش مسائل حل کرنے میں زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوسکیں، جس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ تین سالہ اقتدار کے بعد جب اپریل ۲۰۰۴ء میں پارلیمانی انتخابت ہوے تو اس کی جماعت جمہوری پارٹی کو شکست ہوئی اور وہ ۵۰۰ کے ایوان میں سے صرف ۱۰۸ نشستیں جیت سکی جب کہ گولکر پارٹی ۱۲۸ نشستیں جیت کر اول رہی- اسلامی جماعتوں میں سے ''انصاف و خوشحالی پارٹی'' نے ۷.۴ فی صد، عبدالرحمٰن واحد کی جماعت نے ۷ فی صد اور امین رئیس کی PANنے ۲ فی صد ووٹ حاصل کیے۔

مآخذ: انڈونیشیا کی جدید سیاسی تاریخ کے لیے دیکھئے: (۱) *Indonesia- An Official Hand Book*، جکارتہ وزارت اطلاعات۔ ہر سال اس کا نیا ایڈیشن شائع ہوتا ہے؛(۲) بلداس گوشل *Political Transition in Post-Suharto Indonesia* ، در *Beginning*

Indonesia : A New، نیو دہلی ۲۰۰۲ء؛(۳) Jonathan Indonesia-Living :Lemco and Scott Macdonald Dangerously، در Current History، اپریل ۲۰۰۱ء؛(۴) The Europa World Year Book 2003، بذیل مادہ.

مسائل و مشکلات: انڈونیشیا کو جن مسائل و مشکلات کا سامناہے ان میں سے دو زیادہ اہم ہیں، ایک علیحدگی کی تحریکیں اور دوسرے فوج کا سیاسی و انتظامی کردار۔ ان دونوں کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:

(الف)علیحدگی کی تحریکیں: انڈونیشیا ۱۷۵۰۸ جزائر پر مشتمل ہے، جس کی آبادی بائیس کروڑ اور رقبہ تقریباً ۵۲ لاکھ مربع کلو میٹر ہے، یہاں تین سو سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں‌اور اسی طرح سیکڑوں نسلی گروہ ہیں جن میں سے ہر ایک کا اپنا رہن سہن اور رسم و رواج ہے.

آبادی کی اکثریت اگرچہ مسلمان ہے(۸۷ فیصد سے بھی زیادہ)، تاہم عیسائی ،ہندو اور بدھ بھی ہیں اور بعض صوبوں اور شہروں میں ان کی اکثریت بھی ہے۔ بعض علاقوں میں آبادی بہت گھنی اور بعض میں کم گنجان ہے۔ اسی طرح بعض علاقے قدرتی وسائل (تیل، گیس،کوئلہ، سونا، وغیرہ) سے مالا مال ہیں، جبکہ بعض اس سے محروم ہیں۔ ان امور کی وجہ سے اختلافات کا ہونا تو فطری امر ہے تاہم جن اسباب کی بنا پر ان اختلافات نے بعض علاقوں میں مخاصمت اور مسلح مزاحمت کی شکل اختیار کر لی ہے وہ یہ ہیں:

ا۔ ملک کی ۸۷ فیصد سے زیادہ آبادی مسلمان ہے، لہٰذا منطقی طور پر ریاست کا مذہب اسلام اور سارے قوانین شریعت اسلامی کے مطابق ہونے چاہئیں، لیکن انڈونیشیا میں حکمران طبقوں نے ہمیشہ سیکولرزم پر عمل کیا اور اسلامی بالادستی کی مزاحمت کی۔اسی ضمن میں مذہبی جماعتوں پر پابندیاں لگائیں اورانہیں‌کام کرنے سے روکا۔ جنہوں نے احتجاج کیا انہیں قوت سے دبا دیا گیا اور یوں اکثریت کو محرومی اور اضطراب سے دو چار کیا.

۲۔ دنیا پراس وقت مغربی تہذیب کا غلبہ ہے اور مغرب کے طاقت ور ممالک عیسائی ہیں، چنانچہ انڈونیشیا میں عیسائی مشنری ادارے بہت فعال اور عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ نیز مغربی طاقتیں عیسائی اقلیتوں کی ہر طرح پشت پناہی کرتی ہیں، انہیں مالی وسائل مہیا کرتی ہیں،بین الا قوامی فورموں پر ان کی حمایت کرتی ہیں، انہیں حکومت کے خلاف اکساتی اور انہیں آزادی کا راستہ دکھاتی ہیں، بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک تو وہ انڈونیشیا کو جو سب سے بڑا مسلمان ملک ہے،کمزور کرنا اور توڑنا چاہتی ہیں.

۳۔ اندرونی اختلافات کا حل یہ سوچا گیا کہ مرکز مضبوط ہونا چاہیے اور اختلافات کی شدت کو قوت سے دبا دینا چاہیے۔ اس بہانے سوئیکارنو نے بیس سال اور سہارتو نے ۳۲ سال آمرانہ طریقے سے حکومت کی، لیکن آمریت اور قوت کے استعمال سے چونکہ مسائل پیدا ہوتے اور بگڑتے ہیں، لہٰذا ان آمریتوں کے نتیجے میں کئی صوبوں میں مزیدعدم اطمینان اور مایوسی پیدا ہوئی، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مالی استحصال ہو رہا ہے اور انہیں انتظامی امور سے بے دخل کر دیا گیا ہے چنانچہ مسائل بگڑ کر پیچیدہ تر ہو گئے ہیں .

۴۔ حکومت کی اس حکمت عملی نے بھی کہ گھنی آبادی والے علاقوں کی آبادی کو کم آباد جزیروں پر منتقل کر دیا جائے، مسائل پیدا کیے ہیں، کیونکہ فریقین کے درمیان عدم مفاہمت سماجی، مالی اور امن و امان کے مسائل پیدا کرتی ہے۔ان وجوہ سے ملک کے کئی صوبوں میں علیحدگی کی تحریکیں برسوں سے چل رہی ہیں۔انڈونیشیا

کے حالات کو صحیح تناظر میں سمجھنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علیحدگی کی بعض اہم تحریکوں کا یہاں ذکر کر دیا جائے۔

مشرقی تیمور(East Timor): انڈونیشی جزائر سے ملحق ایک جزیرہ جس پر ۱۹۷۵ء تک پرتگیزیوں کا قبضہ تھا۔ اس کی غالب آبادی کیتھولک عیسائی ہے اوریہاں گیس و تیل کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ پرتگیزیوں نے متبادل انتظامات کیے بغیر ۱۹۷۵ء میں اسے خالی کر دیا تو انڈونیشیا نے اس کا انتظام سنبھال لیا، کیونکہ جزیرے کی دفاعی اہمیت کے پیش نظر انڈونیشیا کے لیے یہ قابل قبول نہ تھا کہ اس کے مخالف ہمسائے اس پر قبضہ کر لیں۔ چنانچہ انڈونیشیا کی اسمبلی نے ۳۱ مئی ۱۹۷۶ء کو مشرقی تیمور کے انڈونیشیا سے الحاق کی منظوری دے دی، لیکن پرتگال اور مغربی اقوام کے دباؤ کے پیش نظر اقوام متحدہ نے اسے تسلیم نہ کیا ۔۱۹۸۳ء میں اقوام متحدہ نے مشرقی تیمور کے حق خود ارادیت کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس دوران میں مغربی دنیا نے اسے علانیہ سیاسی اور خفیہ مالی، تنظیمی اور فوجی مدد دینا شروع کر دی ،خصوصاً آسٹریلیا نے مقامی لوگوں کو تحریک مزاحمت منظم کرنے میں مدد دی اور باغی فوج نے کاروائیاں شروع کر دیں۔ جکارتہ میں مغربی ممالک کے سفارت خانے انہیں پناہ دیتے اور باغی لیڈر جب چاہتے بھاگ کر آسٹریلیا میں پناہ لے لیتے اور جدوجہد جاری رکھتے۔ ۱۹۹۲ء میں اقوام متحدہ نے اسی حوالے سے بنیادی حقوق کی خلاف ورزیوں پر انڈونیشی حکومت کی مذمت کی۔ ۱۹۹۶ء میں سڈنی میں مقیم باغی رہنما راموس ہورٹا اور مشرقی تیمور کے چیف پادری کارلوس بیلو کو امن کا نوبل انعام دیا گیا۔ یہ سلسلہ جاری رہا، لیکن سوہارتو کی فوجی حکومت نے کسی احتجاج کی پرواہ کیے بغیر مشرقی تیمور پر مضبوط گرفت برقرار رکھی، چنانچہ اس وجہ سے اور دیگر کئی عوامل کی بنا پر مغربی حکومتوں نے بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے مل کر انڈونیشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ممالک پر معاشی دباؤ بڑھا دیا جس کی وجہ سے سہارتو حکومت ختم ہو گئی (اگرچہ اس کے دوسرے کئی اسباب بھی تھے)۔صدر یوسف حبیبی کی عبوری حکومت نے مشرقی تیمور کو داخلی خود مختاری دینے کی پیشکش کی، لیکن مغربی ممالک کی حمایت کی وجہ سے اس نے یہ پیشکش قبول نہ کی اور حکومت کی مسلح مزاحمت جاری رہی۔ صدرواحد کی کمزور جمہوری حکومت بالآخر بین الاقوامی دباؤکے پیش نظر اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ریفرنڈم کرانے پر مجبور ہو گئی ۔ ۳۰ اگست ۱۹۹۹ء کو یہ ریفرنڈم ہواجس میں ۷۸٫۵ فیصد لوگوں نے آزادی اور ۲۱٫۵ فیصد لوگوں نے انڈونیشیا کے ساتھ رہنے کے حق میں ووٹ دیا۔انڈونیشیا نے ان نتائج کو تسلیم کر لیا، لیکن مقامی آبادی کے متحارب گروہوں میں شدید جھڑپیں شروع ہو گئیں جن میں بہت سا جانی و مالی نقصان ہوا،چنانچہ پہلے اقوام متحدہ نے آسٹریلیا کی سربراہی میں امن فوج بھیجی اور پھر اکتوبر ۱۹۹۹ء میں عبوری انتظامی ڈھانچہ قائم کر کے مغربی ممالک کی افرادی اور مالی مدد سے قومی تعمیر نو کا آغاز کر دیا۔ اپریل ۲۰۰۲ء میں مشرقی تیمور میں صدارتی انتخابات ہوے جن میں تحریک مزاحمت کے رہنما گسماؤ (Xana Gusmao)نے بھاری اکثریت سے جیت کر حکومت بنا لی۔ مئی ۲۰۰۲ء میں مشرقی تیمور مکمل طور پر آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر نمودار ہوگیا۔

مآخذ: مشرقی تیمور کے مسئلے میں دل چسپی کی وجہ سے مغربی دنیا خصوصاً آسٹریلیا اور امریکہ کی یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں اور ناشروں نے بلا مبالغہ سیکڑوں کتابیں اور ہزاروں مقالات اس موضوع پر شائع کیے ہیں جن میں سے چند ایک

کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے(تفصیلی مآخذ کے لیے دیکھیے
K.Sherlock: *List of Holdings on East Timor, The Timor Collection* (غیر مطبوعہ)؛
(۱) John G.Taylor: *East Timor*: *the Price of Freedom*، Pluto Press Australia Darwin، ۱۹۸۲ء؛
(۲) C.Budiardjo، Liong Soei: *The War against East Timor*، زیڈ پریس لنڈن ۱۹۸۴ء؛ (۳)
J.S.Dunn: *Notes on the Current Situation in East Timor*، Legitative Research Service، آسٹریلین پارلیمنٹ، کینبرا ۱۹۷۹ء؛ (۴)P.D.Elliott: *The East Timor Dispute*، در *The International and Comparative Law Quarterly* لنڈن ۲۷ جنوری ۱۹۷۸ء؛ (۵)جسٹس کمشن آف نیدرلینڈ، *East Timor, The Most Important Development*، Gravenhage، نیدرلینڈ ۱۹۸۲ء؛
(۶)J.J.Fox: *The Flow of Life: Essay on Eastern Indonesia*، ہارورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۰ء؛
(۷) F.Hiorth: *Timor: Past and Present*، *South-East Asian Monograhs No.17*، James Cook University، Northern Queensland، ۱۹۸۵ء؛ (۸) *East Timor: International Documentation Centre*، ج ۱۸ عدد ۱۱/ ۸۷، روم، ۱۹۸۷ء؛ (۹)R.Lawless: *The Indonesian Take Over of East Timor* در *Asian survey*، یونیورسٹی آف کیلے فورنیا، برکلے ۱۴/۱۰/۱۹۷۶ء؛(۱۰) G.Francillon: *Some Matriarchal Aspectis of the Social System of the southern Tetum*، مقالہ پی ایچ ڈی، آسٹریلین یونیورسٹی، کینبرا ۱۹۶۷ء؛ (۱۱)F.Montealegre: *The Background Information on Indonesia: The Invasion of East Timor and U.S.Military Assistance*، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، واشنگٹن، ۱۹۸۲ء
(۱۲): S.Nichterlein: *Australia Courtier or Courtesan? The Timor Issue Revisited*، در *Australian Outlook* ۳۶/ ۱، کینبرا ۱۹۸۲ء؛
T.Lazarowitz: *The Makassai: Complementary Dualism in Timor*، مقالہ پی ایچ ڈی، نیو یارک اسٹیٹ یونیورسٹی، Stony Brook ۱۹۰۸ء؛

(۲) اریان جایا (Irian Jaya): یہ علاقہ پاپوا نیوگنی کا مغربی حصہ ہے اس لیے اسے مغربی پاپوا بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا رقبہ ۴۳۱ مربع کلومیٹر ہے۔ انڈونیشیا کی آزادی کو ولندیزیوں نے اگرچہ ۱۹۴۷ء میں تسلیم کر لیا تھا، لیکن مغربی پاپوا کا علاقہ اس نے ۱۹۶۳ء تک انڈونیشیا کو نہیں دیا۔ الحاق کے بعد ۱۹۶۹ء میں انڈونیشیا نے یہاں ریفرنڈم کروایا جسے اقوام متحدہ نے تسلیم کر لیا، لیکن مقامی آبادی اسے متنازعہ سمجھتی ہے۔ اس جزیرے کی آبادی بیس لاکھ کے قریب ہے جس کی اکثریت پروٹسٹنٹ عیسائی ہے۔ یہ علاقہ قدرتی وسائل خصوصاً سونے اور دیگر معدنیات سے مالا مال ہے ۔ مقامی آبادی قبائلی طرز زندگی کی عادی اور مخصوص رسم و رواج رکھتی ہے۔ انڈونیشیا کی مرکزی حکومت نے ایک بڑی ملٹی نیشنل امریکی کمپنی (Freeport McMoran Copper Gold Inc.) کو یہاں کانکنی کا ٹھیکہ دے رکھا ہے۔ اس کمپنی نے علاقے میں وسیع سرمایہ کاری کی ہے اور وہاں ایک بندرگاہ بھی قائم کی ہے۔ مقامی لوگوں کو اعتراض اس بات پر ہے کہ علاقے کی معدنی دولت سے فائدہ یا تو بیرونی سرمایہ کار اٹھاتے ہیں یا مرکزی حکومت اور اس کے مقامی کارندے ،عوام کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ وہ جدید تہذیب و تمدن کے بھی خلاف ہیں۔ قبل ازیں مقامی آبادی نے

ولندیزیوں کے خلاف آزادی کی تحریک چلا رکھی تھی، انڈونیشیا سے الحاق کے بعد اس کا رخ غیر ملکی سرمایہ کاروں کے خلاف ہوا تو ان کی حفاظت اور ملکی مفادات کے تحفظ کی خاطر مرکزی حکومت نے یہاں فوج بھیج دی اور مقامی آبادی نے اس کی مزاحمت شروع کر دی۔ دریں اثنا حکومت نے تبادلہ آبادی کے منصوبے پر عمل کرتے ہوے جاوا سے لاکھوں لوگوں کو یہاں منتقل کر دیا (جن کی اکثریت مسلمان ہے۔) مقامی آبادی نے انہیں بھی قبول نہیں کیا اور اسے اپنے خلاف سازش قرار دیا۔ اس جھگڑے میں پاپوا نیوگنی بھی ملوث ہے، کیونکہ ایریان جایا کی علیحدگی پسند مسلح تنظیم (Free Papuan Organization) کے گوریلے چھاپہ مار کارروائیوں کے بعد پاپوا نیوگنی میں پناہ لیتے ہیں اور ان کے تعاقب میں انڈونیشی فوج بھی سرحد پار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ نیز فوجی کاروائیوں اور شدید جھڑپوں کے نتیجے میں عوام سرحد پار چلے جاتے ہیں اور نیوگنی کو پناہ گزینوں کا بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔۱۹۹۶ء میں امریکی کمپنی نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک فیصد مقامی آبادی کی بہبود پر خرچ کرے گی۔

صدر سہارتو کی سخت گیر حکومت کے زوال کے بعد مرکزی حکومت نے ایریان جایا سے فوج واپس بلانے اور علاقے کو زیادہ خود مختاری دینے کا اعلان کیا؛ تاہم مشرقی تیمور کی آزادی کے بعد علیحدگی پسندوں کے حوصلے بڑھ گئے ہیں اور وہ مکمل آزادی کے لیے ریفرنڈم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

(۳) جزیرہ مالوکا: (Maluku/Moluccu) اس جزیرے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی ملی جلی آبادی ہے۔ (جو ایک کروڑ سے زیادہ ہے) صوبائی دارالحکومت امبون (Ambon) بیروت کی طرح عیسائیوں اور مسلمانوں میں آدھا آدھا تقسیم ہے۔یہاں حالات پُرامن تھے، لیکن ۱۹۹۷ء میں معاشی بحران کے موقع پر چینی نژاد عیسائیوں کے خلاف ملک بھر میں مظاہرے ہوے تو امبون بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ یہاں کی آٹھ لاکھ عیسائی آبادی صاحب ثروت اور منظم ہے اور اسے مغربی طاقتوں کی اشیرباد بھی حاصل ہے۔ مسلمانوں پر جب منظم حملے کیے گئے اور ان کا بہت جانی و مالی نقصان ہوا تو ردّ عمل کے طور پر "لشکر جہاد" کے نام سے ایک مسلح مسلم تنظیم یہاں قائم ہو گئی اور اس کی معاونت کے لیے دوسرے علاقوں سے بھی افراد آنے لگے۔ اس میں مزید خرابی کی یہ صورت پیدا ہوئی کہ امن و امان بحال کرنے والی فوج کی اکثریت مسلمان ہے، جبکہ مقامی پولیس کی اکثریت عیسائی ہے۔ مسلمان الزام لگاتے ہیں کہ پولیس ان فسادات میں جانبدار ہے اور عیسائی الزام لگاتے ہیں کہ فوج فسادات میں ملوث ہے۔ مغربی ممالک میں خوب پروپیگنڈا کیا گیا کہ انڈونیشیا کی مسلم فوج عیسائیوں کو قتل کر رہی ہے۔صدر واحد نے حالات پر کنٹرول کرنے کے لیے پہلے تو جون ۲۰۰۰ء میں وہاں سول ایمر جنسی نافذ کر دی اور پھر فوج کے دستوں کو بھی تبدیل کر دیا۔اس سے پہلے صدر حبیبی نے مسلمانوں کے مطالبے پر جزیرے کے مسلم اکثریتی علاقوں کو شمالی مالوکا کے نام سے الگ صوبہ بنا دیا تھا تاکہ ان علاقوں میں مسلمانوں کے حقوق کا کچھ تحفظ ہو سکے۔ دونوں فریق چونکہ آبادی ، تنظیم اور وسائل کے لحاظ سے ایک دوسرے کے تقریباً برابر ہیں اس لیے فسادات میں دونوں طرف سے بہت جانی نقصان ہوتا ہے اور اس کے برے اثرات ملک کے دوسرے حصوں پر بھی پڑتے ہیں۔

(۴) آچے (یا آچہ=Aceh): یہ انڈونیشیا کے بڑے جزیرے سماٹرا کا ایک صوبہ ہے اور مسلم اکثریت رکھتا ہے۔ یہاں خلفشار کے دو بڑے سبب ہیں: ایک تو یہ کہ

آچے کے لوگ کٹر مسلمان ہیں اور اسلامی احکام کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں، جبکہ انڈونیشیا کی مرکزی حکومت، عموماً لادین اور قوم پرست مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہی ہے ۔نیز عام انڈونیشی مسلمانوں کے بارے میں عموماً یہ سمجھا جاتاہے کہ وہ ڈھیلے ڈھالے مسلمان ہیں کیونکہ ان کے عقائد و اعمال پر مقامی تہذیبوں اور مذاہب کا خاصا اثر ہے۔ دوسرے یہ کہ آچے میں گیس اور تیل کے وسیع ذخائر موجود ہیں اور تیل کی برآمد میں اس کا خاصا بڑا حصہ ہے جبکہ مقامی لوگوں کا تأثر یہ ہے کہ یہ دولت مرکزی حکومت لے جاتی ہے اور ان کے حصے میں کچھ نہیں آتا۔آچے جغرافیائی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ آبنائے مالوکا کے سرے پر واقع ہے جو ایشیا کو یورپ، مشرق وسطی اور جنوبی ایشیا سے ملاتی ہے۔ یہاں کے لوگ بہادر اور آزادی پسند ہیں اور ولندیزیوں کو بھی اس علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا ۔

یہاں آزادی کے فوراً بعد ہی خلفشار کی ابتدا ہو گئی کیونکہ ولندیزی عہد میں آچے کو الگ صوبے کا درجہ حاصل تھا اور مذہب اور تعلیم کے معاملے میں اسے خاصی خود مختاری حاصل تھی ۔آزادی کے بعد مرکزی حکومت نے آچے کی یہ خصوصی حیثیت ختم کر دی۔ پھر سوئیکارنو اور سہارتو کے عہد میں آمریت کی وجہ سے مرکزی حکومت بہت مضبوط رہی۔ آچے کے لوگوں کو تو پہلے ہی مرکزی حکومت سے مالیاتی استحصال کا شکوہ تھا۔ اوپر سے تبادلہ آبادی کی اسکیم نے انہیں مزید زچ کیا۔ جب ۱۹۷۰ء کی دہائی میں وہاں حالات بگڑنا شروع ہوے تو مرکزی حکومت نے وہاں کثیر تعداد میں فوج بھجوا دی جس نے سختی کر کے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ردعمل کے طور پر وہاں ''تحریک آزادی آچے'' کے نام سے تحریک مزاحمت منظم ہو گئی اور فوج کے ساتھ اس کی جھڑپیں شروع ہو گئیں۔یہاں تک کہ ۱۹۸۹ء میں آچے کو ملٹری آپریشن زون قرار دے دیا گیا اور فوج کو حالات سدھارنے کے لیے وسیع اختیارات دے دیئے گئے۔ فوج کے مظالم سے تنگ آکر ہزاروں لوگوں نے ہجرت کر کے سویڈن، ملائیشیا، سنگا پور اور تھائی لینڈ میں پناہ لے لی۔ تحریک کے بعض سخت گیر عناصر نے مزاحمت کے لیے سویڈن حکومت کی در پردہ مدد بھی قبول کر لی۔

سہارتو کے زوال کے بعد صدر واحد کی حکومت نے سیاسی طریقے سے آچے کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ وہاں کے ایک آدمی کو مرکزی وزارت دی اور دوسرے کو ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا۔ فوج کو وہاں سے واپس بلانے کا اعلان کیا۔ چار وزرا پر مشتمل ٹیم وہاں بھیجی کہ لوگوں کی شکایات سنیں اور ان کا حل بھی تجویز کریں۔ صدر نے خود بھی وہاں کا دورہ کیا اور ایک موقع پر تو وہاں ریفرنڈم کا مطالبہ بھی مان لیا، لیکن فوج کی طرف سے شدید دباؤ پر بعد میں اس کی تاویل کر لی کہ مجوزہ ریفرنڈم میں مکمل آزادی کی شق شامل نہ ہوگی۔ اس موقف پر آچے میں خاصے اضطراب کا اظہار ہوا۔ حکومت نے تحریک مزاحمت کے ساتھ گفت و شنید کرکے جنگ بندی کا اعلان کیا اور پھر اس کی توسیع کے لیے کوشاں رہی۔ حکومت انڈونیشیا خود بھی کسی قیمت پر آچے کو آزادی نہیں دینا چاہتی، کیونکہ مشرقی تیمور کو آزادی دینے کے بعد ایک مسلم اکثریتی صوبے کو آزادی دینے کا مطلب اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ ملک کی بقا ہی خطرے میں پڑ جائے۔ علاقائی حالات بھی اس کے لیے ناساز گار ہیں کیونکہ فلپائن اور تھائی لینڈ کو پہلے ہی سے ایسی تحریکوں کا سامنا ہے، لہٰذا آچے کی آزادی ان

کے لیے بھی خطرے کا سگنل ہے، چنانچہ میگاوتی نے برسراقتدار آتے ہی آچے میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور وہ علیحدگی پسندوں سے سختی سے نمٹنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے.

(۴) اس کے علاوہ جزیرہ سلاویسی (Sulawasi) اور کالی منتان (Kali Mantan) میں بھی اکثر فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ سلاویسی میں جھگڑا عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہے اور پوسو(Poso)، گورانتلو (Gorantalo) اور ترنیت (Ternate) جیسے شہروں میں زیادہ ہنگامے ہوتے ہیں، جہاں عیسائی آبادی نسبتاً زیادہ ہے۔ ہنگاموں کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ عیسائی آبادی اپنی بالادستی چاہتی ہے جو مسلمانوں کو قابل قبول نہیں.

کالی منتان میں فسادات کے دوبڑے سبب ہیں۔ ایک تو مقامی قبائلی افراد (جوڈایاک کہلاتے ہیں) اور باہر سے آئے ہوے لوگ جنھیں مادوری کہا جاتا ہے اور (جنھیں حکومت نے تبادلۂ آبادی کے منصوبے کے تحت یہاں بسایا ہے) کے درمیان خلیج، بلکہ نفرت اور دوسرے مرکزی حکومت کے خلاف معاندانہ جذبات۔ کیونکہ اس علاقے میں گیس اور تیل کے وسیع ذخائر ہیں جن کا انتظام مرکزی حکومت کے پاس ہے اور مقامی لوگوں کا خیال یہ ہے کہ انھیں ان کا جائزحصہ نہیں ملتا.

مآخذ: انڈونیشیا کے مختلف علاقوں میں علیحدگی اور خود مختاری کے لیے دیکھیے: (۱) V.Jaynath: *Trouble Spots: East Timor, Aceh, Ambon Irian Jay*، در S.Chandra and B.Ghoshal (Eds)، ص۱۰۴-۱۲۳، *Indonesia: A New Beginning*، مذکورہ بالا؛ (۲) Douglas E.Ramage: *Politics in Indonesia: Democracy, Islam and Ideology of Tolerance*، نیویارک ۱۹۹۶ء؛ (۳) Donald K.Emmersonl: *Will Indonesia Survive*، در *Foreign Affairs*، مئی جون ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۶ ببعد؛ (۴) ایشیا ویک، شمارہ ۲۴ ستمبر ۱۹۹۹ء؛ (۵) *International Herald*، لنڈن، شمارہ ۲۶ اپریل و ۱۸ جولائی ۲۰۰۰ء۔ سرکاری نقطۂ نظر کے لیے دیکھیے (۶) *Indonesia*، ۲۰۰۱ء طبع وزارت اطلاعات جکارتہ.

فوج کا سیاسی و انتظامی کردار: اگرچہ بہت سے مسلم ممالک میں فوجی آمریتیں قائم ہیں جن کے کچھ مشترک اسباب بھی ہو سکتے ہیں، تاہم انڈونیشیا میں فوج کے سیاسی، سماجی، معاشی اور قانونی کردار کی اپنی ایک تاریخ ہے.

دوسری جنگ عظیم میں محوریوں کی شکست کے بعد جب جاپان نے ہتھیار ڈالے تو انڈونیشی تحریک آزادی کی سیاسی قیادت نے انڈونیشیا کی آزادی کا اعلان کر دیا اور اپنی فوج بھی بنا لی جس میں سابقہ فوجی، (قوم پرست) سوئیکارنو، (اسلامی پارٹی کے) حتا اور کمیونسٹوں کے حامی بھی شامل تھے، لیکن ولندیزیوں نے برطانوی حمایت سے سیاسی آزادی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور سیاسی قیادت کو گرفتار کر لیا۔ نوزائیدہ انڈونیشی فوج نے، جو اس وقت ولندیزیوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑ رہی تھی، کسی اور منظم قوت کی غیر موجودگی میں سیاسی اور انتظامی خلا کو بھی پورا کرنے کی کوشش کی اور آزاد علاقوں میں حکومتی انتظام سنبھال لیا۔ اس طرح انڈونیشی فوج ملک کی باقاعدہ آزادی سے پہلے ہی سیاسی اور انتظامی معاملات میں شریک ہو گئی.

۱۹۴۹ء میں جب انڈونیشیا کی آزادی کو بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا گیا تو اس وقت بھی سیاسی حکومت کو برصغیر پاک و ہند کی طرح تربیت یافتہ سول بیورو کریسی ورثے میں نہ ملی اور یوں فوج کا سیاسی اور انتظامی کردار جاری رہا۔ صدر سوئیکارنو نے جب اپنی سیاسی پوزیشن

مستحکم کر لی تو پارلیمنٹ کے ذریعے فوج کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ اس پر ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو فوجی افسروں نے صدارتی محل کے باہر باقاعدہ احتجاجی جلوس نکالا اور مطالبہ کیا کہ فوج کے اندرونی معاملات میں سول مداخلت روکی جائے۔ سوئیکارنو نے اس احتجاج کو رد کر دیا، لیکن بعد میں جب اسے علیحدگی پسند تحریکوں کو کچلنے اور ملائیشیا کے خلاف جدوجہد میں دو دفعہ ملک میں مارشل لا لگانا پڑا اور اندرون ملک مخالفوں کو کچلنے اور سیاست میں اپنی مرضی چلانے کے لیے فوج کی حمایت کی ضرورت پڑی تو اسے فوج کی بات ماننا پڑی۔ چنانچہ اس نے فوج کے کمانڈر انچیف جنرل نسوشن کے ساتھ مل کر آئین منسوخ کر دیا اور ۱۹۴۵ء کا آئین بحال کر دیا، کیونکہ اس میں پارلیمنٹ میں فنکشنل گروپس کی نمائندگی کا ذکر موجود تھا اور منصوبہ یہ بنایا گیا کہ فوج کو فنکشنل گروپ قرار دے کر پارلیمنٹ میں باقاعدہ نمائندگی دے دی جائے۔

۱۹۶۵ء میں کیمونسٹوں نے بغاوت کر دی تو اسے کچلنے کے لیے فوج حرکت میں آئی۔ سوئیکارنو کی گرتی ہوئی صحت اور کمزور سیاسی پوزیشن نیز کیمونسٹوں کے خلاف تحریک کو مغربی (خصوصاً امریکی) پشت پناہی کی بنا پر فوج کی کمانڈو فورس (Stretigic Command= Kostrad) کے سربراہ جنرل سہارتو نے فوجی حکومت قائم کر لی اور سوئیکارنو کو رخصت کر دیا۔ سہارتو نے ۳۲سال تک آمرانہ طریقے سے حکومت کی۔ ابتدائی بیس سال (تقریباً ۱۹۸۵ء تک) اس نے فوج کے ذریعے حکومت کی (یعنی اس کی سربراہی میں فوج براہ راست بحیثیت ادارہ برسراقتدار رہی) اس کے بعد اس نے بحیثیت ادارہ فوج کا کردار قدرے کم کرتے ہوئے اور حکومت کو عوامیت کا روپ دینے کی خاطر اپنے وفادار فوجی عناصر، ٹیکنوکریٹس اور صنعتکاروں پر مشتمل حکومت قائم کی (*The Indonesian Armed Forces*: B.Raman، در *Indonesia: A New Beginning and Politics* ص ۲۱۸-۲۴۲)۔

انڈونیشی فوج اپنے آپ کو عوامی فوج کہتی ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ ملک اس کی وجہ سے وجود میں آیا اور صرف وہی اس کی بقا کی ضامن ہے۔ وہ شروع ہی سے ملک کے سیاسی، انتظامی اور معاشی ڈھانچے میں اپنے کردار کو ضروری سمجھتی آئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۵ء میں جب صدر سوئیکارنو نے گیس، تیل، کان کنی، جنگلات اور تجارت کو قومیانے کا اعلان کیا تو اکثر و بیشتر فوجی افسران کو ہی ان کارپوریشنوں کا سربراہ مقرر کیا۔ سہارتو نے جنرل نسوشن کے منصوبے کو آگے بڑھاتے ہوئے مختلف فنکشنل گروپس کو پارلیمنٹ میں نمائندگی دی اور اس طرح دفاعی افواج کو ایک سو نشستیں الاٹ ہوئیں ۔ ریاست میں فوج کے نفوذ کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۸۰ ء میں کابینہ کے ۵۰ فیصد ارکان اور صوبائی گورنروں میں سے ۷۵ فیصد فوجی افسران تھے۔ اسی طرح انتظامی ڈھانچے میں ۷۵ فیصد سیکرٹری جنرل، ۶۰فیصد ڈائریکٹر جنرل اور ۸۴ فیصد سیکریٹریز فوجی افسران تھے اور ان میں سے اکثر فوج کے حاضر ڈیوٹی افسر تھے۔

سیاسی ،انتظامی اور معاشی میدانوں میں فوج کے اثرورسوخ میں اضافے کا ایک بڑا سبب اس کے تنظیمی ڈھانچے کی خصوصی نوعیت بھی ہے۔ فیڈرل فوج، کل فوجی نفری کا صرف ساتواں حصہ ہے جب کہ باقی ساری فوج علاقائی نوعیت کی ہے۔ جو دس گروہوں میں منقسم ہے اور اکثر مقامی افراد پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔ ۴۰ فیصد فوج چھاؤنیوں میں نہیں رہتی اور تقریباً دو تہائی فوج جو ۲۷ صوبوں اور ۳۲۷ اضلاع میں تعینات ہے، اس کا عوام سے روزمرہ کا براہ راست رابطہ ہے اور وہ تحصیل، تھانہ،

بلکہ گاؤں کی سطح تک تعینات ہوتی ہے۔ اور چونکہ وہ سول بیوروکریسی کے مقابلے میں زیادہ منظم اور مربوط ہے لہٰذا گاؤں سے لے کر تھانے ،تحصیل، ضلع اور صوبے میں کہیں بھی کوئی کام ،خواہ اس کی نوعیت سیاسی ہو یا سماجی ومعاشی، اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس میں مقامی فوجی افسران/افراد کی مرضی شامل نہ ہو۔ یہ صورت حال بدعنوانی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ فوجیوں کی تنخواہیں کم ہیں اور ان پر معاشی دباؤ شدید ہے۔ اس لیے فوجی سپاہی اور افسر مال بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔خصوصاً وہ صوبے جہاں تیل اور گیس کے ذخائر ہیں یا جہاں معدنیات کی کانیں ہیں یا خام مال برآمد کیا جاتا ہے وہ سب فوج کی آہنی گرفت میں ہیں ۔ عوام اس صورت حال کو غصب حقوق سمجھتے ہیں اور یہ چیز فوج کے خلاف نفرت ابھارنے کا سبب بنتی ہے۔ اس بدعنوانی اور مداخلت کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ مرکزی حکومت کے محض قانون پاس کردینے یا اعلان کر دینے سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۱۹۹۷ء کا معاشی بحران سہارتو کی ۳۲سالہ آمریت اور اس کے اعزہ واحباب کی بدعنوانی پر آخری ضرب ثابت ہوا اور شدید عوامی مظاہروں نے اسے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ فوج بھی اسے بچانے کے لیے آگے نہ آئی کیونکہ وہ بھی ہدف تنقید تھی ۔ صدر واحد نے منتخب ہونے کے بعد فوج کے اختیارات کم کرنے کی کوشش کی۔ طویل مدت کے بعد کسی سول آدمی کو وزیر دفاع مقرر کیا، ایک اہم جنرل کو عوام پر مظالم ڈھانے کے الزام میں کابینہ سے برطرف کیا، اعلیٰ فوجی عہدوں پر وہ ایسے افسروں کو آگے لایا جو فوج کے سیاسی وانتظامی کردار کے حامی نہ تھے۔ اس نے پارلیمنٹ سے فوج کی نشستیں ختم کرنے کا بھی اعلان کیا۔فوج کو یہ سب کچھ قبول کرنا پڑا، لیکن جب صدر واحد کی سیاسی بے تدبیریوں سے سیاسی اور معاشی قوتیں اس کے خلاف ہو گئیں‌اور بدعنوانی کے الزام میں اس کا مواخذہ شروع ہوا تو صدر واحد نے فوج کی مدد سے ایمرجنسی نافذ کر کے پارلیمنٹ کو توڑنا چاہا تو فوج نے اسے غیر آئینی قرار دیتے ہوے اس کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس آئینی موقف سے فوج کی عزت بحال ہوئی۔ پارلیمنٹ نے فوج کی مخصوص نشستوں کی ۲۰۰۸ء تک توسیع کر دی اور فوج کے محاسبے کو مؤثر بہ ماضی نہ ہونے کا بل پاس کر دیا۔ مواخذے کے نتیجے میں صدر واحد کے ہٹائے جانے کے بعد نائب صدر میگاوتی صدر بن گئی جس کا رویہ فوج کے ساتھ مفاہمانہ ہے (بلداس گوشل *Political Transition in Indonesia - A* ،در *Post-Suharto Indonesia New Beginning* ، ص۵۰-۵۷) تاہم عوامی مشاورتی کونسل نے سیاسی زندگی میں فوج کے اثرات کو کم کرنے کے لیے دباؤ جاری رکھا اور ۲۰۰۰ء میں یہ فیصلہ کیا کہ اگلے انتخابات سے پارلیمنٹ میں افواج کی نشستیں ختم کر دی جائیں گی۔ اب اکتوبر ۲۰۰۴ء میں جب نئی کونسل کام شروع کرے گی تو وہ سوفیصد عوامی ہوگی اور اس میں کوئی فوجی افسر شامل نہیں ہوگا۔

اسلامی حالات: انڈونیشیا اس وقت عالم اسلام کاسب سے بڑا ملک ہے۔ یہاں کی ۸۷ فیصدسے زیادہ آبادی مسلمان ہے جس کی اکثریت شافعی مسلک کی حامل ہے۔ اسلام یہاں ساتویں صدی ہجری میں آیا اور نویں و دسویں صدی میں مستحکم ہوا۔ بارھویں صدی میں‌سارا جاوا اور ساترا مسلمان ہو چکا تھا۔ یہاں اسلام تاجروں اور صوفیا کے ذریعے پھیلا جو ہندوستان (گجرات ، مالا بار) اور یمن (حضرموت) سے آئے اور جنہوں نے اکثر پہلے مقامی حکمرانوں کو مسلمان کیا اور پھر ان کی مدد سے عام لوگوں

میں اسلام پھیلایا۔ اسلام سے پہلے یہاں ہندو اثرات تھے اور وہ ختم نہیں ہوے، بلکہ اسلام کے ساتھ خلط ملط ہو گئے، کیونکہ صوفیا نے مقامی اطوار کو رد نہیں کیا اور اسی وجہ سے لوگ آسانی سے ان کے قریب آ گئے۔ بارہویں صدی میں یمن سے آنے والے مصلحین نے اصلاحی کوششیں کیں تاہم صوفی اثرات باقی رہے اور معاشرے کا دینی مزاج ڈھیلا ڈھالا رہا جو اجتماع ضدین کو بھی قبول کرتا ہے اور آج بھی بہت سے انڈونیشی مسلمان اسلامی احکام پر سختی سے عمل نہ کرنے اور مقامی غیر اسلامی رسوم و رواج پر عمل پیرا ہونے کے باوجود خود کو مسلمان سمجھتے اور کہتے ہیں۔

جزائر انڈونیشیا اپنی زرخیزی اور بحری راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے اکثر بیرونی قوتوں کی تاخت و تاراج کا نشانہ بنے اور سترھویں صدی میں ولندیزیوں نے مقامی حکمرانوں کو شکست دے کر یہاں قبضہ کر لیا۔ بیسویں صدی میں مسلمانوں نے منظم ہونا شروع کیا چنانچہ ۱۹۱۱ء میں محمدیہ کے نام سے ایک اسلامی تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانی احمد دہلان تھے جنہوں نے قاہرہ میں شیخ محمد عبدہ سے تربیت پائی تھی۔

مصر کی سلفی تحریک کے اثرات جکارتہ میں مقیم عربوں کے ذریعے پھیلے اور مغربی ساٹرا میں ان کا مضبوط حلقہ بن گیا۔ محمدیہ نے تعلیمی اور سماجی اصلاح کا کام شروع کیا۔ تاہم مقامی احوال کے مطابق ساٹرا میں اس کا زور رد بدعات پر اور جاوا میں مغربی تہذیب کے چیلنج سے نمٹنے پر تھا۔۱۹۱۲ء میں ''شرکت اسلام'' کا قیام عمل میں آیا جس کا ایجنڈا دینی و سیاسی ہونے کے علاوہ معاشی بھی تھا، چنانچہ اس نے ولندیزی سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کے ساتھ چینیوں کے معاشی غلبے کے خلاف بھی جدوجہد کی۔مسلمان چونکہ خلافت اور ''پین اسلام ازم'' میں دلچسپی لیتے تھے، حج پر جاتے تھے اور طلبہ کو دینی تعلیم کے لیے عرب جامعات میں بھجواتے تھے اور ولندیزی حکمران ان کاموں کو ملک سے غداری کے مترادف سمجھتے تھے، لہٰذا حکومت نے نہ صرف خود ان دینی عناصر کی مخالفت کی، بلکہ قوم پرست مسلمانوں کو بھی ان کے خلاف بھڑکایا اور ان کی مدد کی۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں ''شرکت اسلام'' قیادت کے داخلی اختلافات اور کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کی مخالفت کی وجہ سے غیر مؤثر ہو گئی۔ اس خلا کو پورا کرنے کے لیے روایتی علما آگے بڑھے اور انہوں نے۱۹۲۶ء میں ''نہضتہ العلما'' قائم کی۔ اس زمانے میں مسلم سرگرمیوں کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۶ء میں سوا لاکھ انڈونیشیوں نے حج کیا۔ دوسو انڈونیشی جامعہ ازہر میں اور دو ہزار سعودی عرب میں زیرتعلیم تھے (Fred R.Mehden مقالہ انڈونیشیا، در The Oxford Encyclopeadia of the Modern Islamic World)۔ عرب جامعات سے فارغ التحصیل علما واپس آ کر عوام کی دینی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ مسلم جماعتوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں سے خائف ہوکر ولندیزیوں نے سیاسی رجحانات والی تنظیموں پر پابندی لگا دی۔ جس کے نتیجے میں ۱۹۳۰ء کی دہائی میں محمدیہ نے زور پکڑا، کیونکہ اس کا دائرہ کار زیادہ تر تعلیمی اور اصلاحی تھا۔

دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں نے ولندیزیوں کو شکست دے کر جزائر انڈونیشیا پر قبضہ کر لیا۔ اسلامی حوالے سے ان کی پالیسی دو رخی تھی، ایک طرف تو وہ اسلامی سرگرمیوں کی حمایت کرتے تھے تاکہ مسلم عوام کی ہمدردیاں جیت سکیں اور ان کو ساتھ ملا کر ولندیزیوں کے خلاف لڑیں۔ دوسری طرف ان کو اتحاد امت اور مکہ و مدینہ سے مسلمانوں کی وفاداری کھٹکتی تھی، کیونکہ یہ ان

کی رائے میں انڈونیشی۔ جاپانی اتحاد اور جاپان کو انڈونیشیوں کا مرکز نگاہ بننے میں ایک رکاوٹ تھی۔ چنانچہ انہوں نے قوم پرست قیادت کو منظم کیا اور آگے لائے اور اسلامی قیادت کی حوصلہ شکنی کی۔ اسلامی تنظیموں نے جکارتہ میں جمع ہو کر "جکارتہ چارٹر" منظور کیا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ اسلامی شریعت کے مطابق زندگی گزارنا انڈونیشی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، لیکن جب جاپانیوں کی طرف سے منتقلی اقتدار کے لیے بنائی گئی قومی کمیٹی نے دستوری خاکہ بنانا شروع کیا تو اس میں ڈاکٹر احمد سوئیکارنو کی تحریک پر لادینیت پر مبنی "پنچ شیلا" (پانچ اصولوں) کو آئین کے دیباچے میں شامل کر لیا گیا، لیکن مسجومی (یا اسلامی جماعت ماشومی) اور دیگر دینی عناصر کی پوری کوشش کے باوجود حکومت اور لادین، قوم پرست کمیونسٹ اور عیسائی عناصر سب نے مل کر "جکارتہ چارٹر" کو آئین کے دیباچے میں شامل کرنے سے انکار کر دیا اور یوں ۱۹۴۵ء کا آئین، پنچ شیلا کی سیکولر بنیادوں پر بنا دیا گیا۔ اس پر ماشومی اور دیگر دینی عناصر میں مایوسی اور اضطراب پھیلا، لیکن اسی دوران میں محوریوں کو شکست ہو گئی اور انڈونیشی جماعتوں نے مل کر ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء کو یک طرفہ اعلان آزادی کر دیا اور عبوری حکومت بنا لی جس میں سوئیکارنو کو صدر اور ماشومی کے حتا کو نائب صدر بنایا گیا۔ ولندیزیوں نے اس اعلان آزادی کو تسلیم نہ کیا اور برطانوی فوجوں کی مدد سے ملک پر دوبارہ قبضہ کر لیا، جس کی انڈونیشی تحریک آزادی نے مسلح مزاحمت بھی کی اور سیاسی جنگ بھی لڑی۔ حکومت میں قوم پرستوں کے بڑھتے ہوئے کردار، کمیونسٹوں اور عیسائیوں کی اسلام مخالفت سرگرمیوں اور ماشومی کی اسلامی مطالبے منوانے میں ناکامی پر مسلم دینی عناصر میں مایوسی پھیلی۔ مغربی جاوا میں بعض دینی عناصر نے دارالاسلام کے نام سے تنظیم بنا کر اسلامی ریاست قائم کرنے کے لیے مسلح جدوجہد شروع کر دی۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں فوج اس پر قابو نہ پا سکی اور یہ تحریک مشرقی انڈونیشیا تک پھیل گئی۔ ساٹرا، سلاویسی اور آچے کے صوبوں سے بھی اسے حمایت ملی۔ ۱۹۵۹ء میں حکومت نے بات چیت کے ذریعے اس کا زور توڑنے کی کوشش کی۔ ۱۹۶۲ء میں دارالاسلام کے اہم رہنماؤں کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔ سلاویسی میں بغاوت کا خاتمہ کہیں ۱۹۶۵ء میں جا کر ہوا (U.Sundhaussen: *The Road to Power -Indonesian Military Politics* ۱۹۴۵-۱۹۶۷ء، کوالالمپور اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۸۲ء)۔

دارالاسلام کی پندرہ سالہ جدوجہد میں تقریباً چالیس ہزار مسلمانوں نے جان کی قربانی دی، لیکن سیکولر فوج بالآخر انہیں کچلنے میں کامیاب ہو گئی، (K.D. Jackson: *Traditional Authority, Islam and Rebellion- A Study of Indonesian Political Behavior* Berkeley, Uniersity of California Press,1980).

اس عرصے میں ۱۹۶۵ء میں جب کمیونسٹوں نے بغاوت کر دی اور فوج نے اسے وسیع پیمانے پر کچلنے کی کوشش کی تو بعض مسلم گروہوں نے بھی کمیونسٹ مخالف سرگرمیوں میں حصہ لیا (Frederick Bunnell: *Indonesia Quasi Military Regime*، در *Current History*، عدد ۵۲ شمارہ ۳۰۵ (جنوری ۱۹۶۷ء) ۲۲-۲۸)

اسی دوران میں ماشومی اسلامی اصلاحات کے لیے سیاسی اور آئینی جنگ لڑتی رہی۔ انڈونیشی پارلیمنٹ میں طویل برسوں تک اسلامی آئین پر بحثیں ہوتی رہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے، Saifuddin Anshari: *The Jakarta Charter-The Struggle for An Islamic*

Constitution in Indonesia، کوالالمپور ۱۹۷۹ء) ۔اس دوران میں ڈاکٹر سوئیکارنو نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی اور اس کے آمرانہ رجحانات نمایاں ہونے لگے تھے ۔چنانچہ اس نے ۱۹۵۹ ء میں پارلیمنٹ توڑ کر ۱۹۴۵ء کا آئین بحال کر دیا (اس زمانے میں حکومت۱۹۴۹ء اور پھر ۱۹۵۰ء کے عبوری آئین کے تحت چل رہی تھی)۔ سوئیکارنو نے پابند جمہوریت (Guided Democracy) کا نظریہ پیش کیا اور اپنی ذات میں اختیارات کا ارتکاز کر لیا۔ بغاوت کی حمایت کے الزام میں اس نے ۱۹۶۰ء میں ماشومی پر پابندی لگا دی، جبکہ قوم پرست اور عیسائی اس کے پشت پناہ تھے۔ بندونگ کانفرنس کے بعد سی آئی اے اور چینی کمیونسٹوں نے سوئیکارنو کا تختہ الٹنے کی کوششیں شروع کر دیں (John Ranelagh : *The Rise and Decline of the CIA*، ص ۳۳۲۔۳۳۵، Simond Schuster، نیویارک ۱۹۸۷ء)۔ ۱۹۶۵ ء کی کمیونسٹ بغاوت کے نتیجے میں سوئیکارنو اقتدار پر گرفت کھو بیٹھا اور فوج نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ بعض اسلام پسند جرنیل بھی اس وقت فوج میں موجود تھے، تاہم بالآخر فوج پر کنٹرول جنرل سہارتو نے حاصل کر لیا، جسے مغرب کی حمایت حاصل تھی اور جو قوم پرستانہ لادینی خیالات کا حامل تھا.

سہارتو کا رویہ ۱۹۶۶ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک اسلام اور اسلامی جماعتوں کے ساتھ معاندانہ رہا ۔ اس عرصے میں دینی جماعتوں کو کھل کر کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ انہیں پنج شیلا کے لادینی نظریات کو ریاست کی واحد بنیاد ماننے پر مجبور کیا گیا۔ فحاشی اور بے راہ روی کو فروغ دیا گیا، تعلیم کو مزید لادینی کر دیا گیا، مسلمان لڑکیوں کو پردہ کرنے سے منع کر دیا گیا، رمضان کی چھٹی ختم کر دی، نکاح کے لیے مسلمان ہونے کی شرط ختم کر دی گئی اور دینی تعلیم کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ اس کے برعکس عیسائیوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی اور انہوں نے مغربی طاقتوں کی مدد سے تبلیغی کوششوں کو منظم کر کے ہزاروں مسلمانوں کو عیسائی بنا لیا۔ جن علاقوں میں عیسائی طاقتور تھے، وہاں انہوں نے مسلمانوں پر ظلم و ستم میں بھی کمی نہ کی اور آمر فوجی حکومت نے غیر جانبداری کا رویہ اختیار کیے رکھا۔آئینی راستے کھلے نہ پا کر کمانڈو جہاد، اسلامک یوتھ موومنٹ اور انڈونیشی اسلامک ریوولیوشن بورڈ (ایرانی اثرات کے تحت) جیسی تنظیمیں حکومت کے غیر اسلامی اقدامات کے خلاف مسلح مزاحمت کرتی رہیں جسے فوج نے سختی سے دبا دیا اور ان کی جدوجہد کو اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا کہ سیاست میں مذہب (اسلام) کا کوئی کردار نہیں ہونا چاہیے۔بعد میں متعدد دینی سیاسی جماعتوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ مل کر ایک دینی جماعت بنائیں اور انہیں محدود آزادیٔ عمل دی گئی۔ (Manning Nash: *Islamic Resurgence in Malaysia and Indonesia*، ص ۶۹۱۔۷۳۹، در *Fundamentalism Observed*) تاہم ۱۹۹۰ء کے بعد اس معاندانہ رویے میں کمی آ گئی اور سہارتو حکومت نے سیاسی مصلحتوں کی خاطر بعض اسلامی اقدامات کیے جیسے اسلامی بنک کا قیام، مسلم دانشوروں کے ادارے اکمے (I C M I) کا قیام، مسلمانوں کے عائلی معاملات میں شرعی عدالتوں کے قیام کی اجازت وغیرہ ۔ تاہم اس سے مجموعی طور پر ملک کے اسلامی ماحول پر کوئی خاص فرق نہ پڑا اور ۱۹۹۸ء میں جب سہارتو کے خلاف تحریک چلی تو اس میں اسلامی عناصر سرفہرست تھے۔ ۲۱ مئی ۱۹۹۸ء کو سہارتو کی اقتدار سے دست برداری کے بعد آئین کے مطابق نائب صدر یوسف حبیبی کو صدر بنا دیا گیا جو سہارتو کا دست راست ہونے کے ساتھ اسلامی رجحانات بھی رکھتا

تھا اور اسکے (ICMI) کا بانی صدر بھی تھا۔

سہارتو کے زوال کے بعد انڈونیشیا میں مذہبی پہلو سے جو تبدیلیاں آئیں ان میں سے ایک اہم بات یہ ہے کہ جب صدر حبیبی نے سیاسی جماعتوں کے قیام پر سے پابندیاں اٹھا لیں تو فوراً ۲۹ اسلامی جماعتوں نے رجسٹریشن کرا لی، جن میں سے نصف نے تو پنج شیلا کو قبول کر لیا، لیکن نصف نے اسے ردّ کر تے ہوئے اسلام کے سیاسی نظام کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ پھر جب ۷ جون ۱۹۹۹ء کو مجلس نمائندگان کے انتخابات ہوئے تو میگاوتی کی جمہوری پارٹی اور گولکر کے بعد جن پانچ جماعتوں نے سب سے زیادہ ووٹ لیے، وہ سب اسلامی جماعتیں تھیں۔ انہوں نے مجموعی طورپر ۴۱ فیصد ووٹ لیے اور ۱۲۰ نشستیں جیتیں جب کہ میگاوتی کی جماعت نے ۳۷.۴ فیصد ووٹ لیے اور ۱۵۴ نشستیں جیتیں اور گولکر نے ۳۴.۹ فیصد ووٹ لیے اور ۱۲۰ نشستیں جیتیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اسلامی جماعتیں متحد ہو جائیں تو یہ ملک کی سب سے بڑی سیاسی طاقت بن سکتی ہیں۔ پھر جب اکتوبر میں صدارتی انتخابات ہوئے اور مشاورتی کونسل نے یوسف حبیبی کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہ دی تومقابلہ عبدالرحمٰن واحد اور میگاوتی میں ہوا۔ ساری اسلامی جماعتوں (اورگولکر کے بعض ارکان نے) واحد کو ووٹ دیئے اور یوں ایک اسلامی جماعت (PKB، اصلاً نہضۃ العلما) کا صدر اورکیائی (Kiai یعنی دینی معلم) ملک کے صدارتی منصب تک جا پہنچا۔ بدقسمتی سے صدر واحد اپنے سیاسی اقدامات سے اپنی حمایت برقرار نہ رکھ سکا اور اس کے بعض اقدامات کو ساری دینی جماعتوں نے غیر اسلامی قرار دے کر رد کر دیا (جیسے اسرائیل کے ساتھ تعلقات کی بحالی، مسلمانوں پر عیسائیوں کے ظلم و ستم کی مذمت نہ کرنا......وغیرہ) لیکن انڈونیشی سیاست میں مسلم اثرات اس حد تک نفوذ کر چکے ہیں کہ جب صدر واحد کے مواخذے کے نتیجے میں میگاوتی نائب صدر ہونے کی وجہ سے صدر بن گئی تو اسے اسلامی جماعت پی پی پی کے صدر حمزہ حاز کو نائب صدرمقرر کرنا پڑا، کیونکہ صدر واحد کی جماعت پی کے بی کے علاوہ باقی ساری دینی جماعتوں نے امین رئیس (قومی منشور پارٹی، اصلاً محمدیہ) کی سرکردگی میں(جو اس وقت مجلس نمائندگان کا چیئرمین بھی ہے)"وسطی محور"(Central Axis) کے نام سے ایک گروپ تشکیل دے رکھا ہے جس کے پاس ۱۲۰ ووٹ ہیں اور یوں وہ بادشاہ گر کا کردار ادا کر رہا ہے۔

انڈونیشیا کے مخصوص حالات کے پیش نظر (جن میں یہ بات سرفہرست ہے کہ وہاں شروع ہی سے حکمرانوں نے اسلام اور اس کے سیاسی کردار اور اسلامی جماعتوں کی حوصلہ شکنی کی اور لادین قوم پرست عناصر اور اشتراکیوں اور عیسائیوں کی حوصلہ افزائی کی) وہاں کی دینی جماعتوں پر بھی لادینی نظام کے واضح اثرات ہیں اور وہی جماعتیں وہاں سیاست میں آگے ہیں جو لادینی نظام ،پنج شیلا اور انتظامیہ کے ساتھ مفاہمانہ کردار ادا کرسکتی ہیں۔ تاہم جنرل سہارتو کے بعدجب سے ملک میں اسلام کے حق میں ایک طاقت ور لہر وجود میں آئی ہے، اسلام کے سیاسی کردار کی حامی سیاسی جماعتوں (جیسے ہلال پارٹی اور جسٹس پارٹی)کے اثرو رسوخ اور حمایت میں بھی روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے.

انڈونیشی معاشرے میں اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات سیاسی میدان سے باہر بھی نمایاں ہیں خصوصاً تعلیم و تربیت کے میدان میں۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے نہضۃ العلماء کے تعلیمی نیٹ ورک پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہو گا۔ نہضۃ کے زیر اہتمام اس وقت ۵۷۴۲تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں۔ جن میں ۴۱۱۴ پرائمری سکول،

۸۷ ہائی سکول، ۲۹۹ کالج، ۱۹ یونیورسٹیاں اور ۲۶ تحقیقی و علمی ادارے شامل ہیں ۔صرف جکارتہ کے شریعہ کالج میں تین ہزار سے زیادہ طلبہ زیر تعلیم ہیں جن میں سے بعض ملائشیا اور سنگا پور سے آئے ہوئے ہیں۔ تربیت کے حوالے سے اسلامی تصوف کو مرکز بنا کر بعض ادارے جدید کورسز چلا رہے ہیں، جن میں بزنس ایگزیکٹوز اور جدید تعلیم یافتہ خواتین بہت دل چسپی لیتی ہیں اور بھاری فیسیں ادا کرتی ہیں ۔ خواتین کی غیر رسمی دینی تعلیم کا نیٹ ورک بھی سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے)۔ تفصیل کے لیے دیکھیے (۱) Peter G.Riddel: *The Diverse Voices of Political Islam in Post-Suharto Indonesia* در *Islam and Christian Muslim Relations*؛ ۱۳/۱، ۲۰۰۲ء؛ (۲) J.Day, Howwel: *Sufism and the Indonesian Islamic Revival* در *Journal of Asian Studies*، ۳ (۲۰۰۱ء) ص ۲۹-۷۰۱)۔میڈیا پر بھی اسلامی اثرات نمایاں ہیں ۔ اخبارات و جرائد میں اسلام اور عصر حاضر کے حوالے سے بحثیں اٹھتی رہتی ہیں۔ اشتہار سازی پر بھی اسلامی اثرات نظر آتے ہیں۔ اسلامی رجحانات رکھنے والی غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs) بھی قائم ہو رہی ہیں۔ مساجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، عورتوں کا حجاب زیادہ دیکھنے میں آتا ہے، رمضان کا احترام فزوں تر ہے.(دلیپ چندرا : *Islam and Political Movement in Indonesia*، در Satish Chandra and Baldas Ghoshal : (مدیران) *Indonesia-A New Begrnning*، ص ۱۲۳، ۱۳۹، نیو دہلی ۲۰۰۲ء)۔ (۲) Anthony H. Johns: *Indonesia: Islam and Cultural Pluralism*، ص ۲۲۱).

چونکہ اسلام کے حامی سیاسی عناصر کو کھل کر آئینی کردار ادا کرنے کا موقع نہیں دیا گیا اس لیے آزادی کے بعد سے ایسا انتہا پسند طبقہ بھی وجود میں آگیا جس نے مایوس ہو کر حکومت کی اسلام دشمن پالیسیوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے، چنانچہ بعض مجاہد تنظیمیں آج بھی انڈونیشیا میں فعال ہیں.

مآخذ: متن میں مذکور مآخذ کے علاوہ تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے(۱) B.J.Boland: *The Struggle of Islam in Modern Indonesia*، دی ہیگ ۱۹۷۱ء؛ (۲)D.Noer: *The Modernist Movement in Indonesia 1900-1962*، لنڈن ۱۹۷۳ء؛ (۳)M.B.Hooker(Ed.) : *Islam in South-East Asia*،لائیڈن۱۹۸۸ء؛(۴) R.S .Kipp and S.Rodgers(Eds.): *Religion in Indonesia Transition*،Tuscon،۱۹۸۷ء؛(۵)توفیق عبداللہ و شارون صدیقی (مدیران): *Islam and Society in South East Asia*، سنگا پور۱۹۸۳ء؛ (۶) M.W.Woodward: *Islam in Java*،Tucson، ۱۹۸۹ء؛ (۷)Alfian: *محمدیہ*،یوگ یاکرتہ، ۱۹۹۸ء؛ (۸) Fred R.Mehden: *Religion and Nationalism in South East Asia*،Madison،۱۹۶۳ء؛(۹)محمد کمال حسن: *Muslin Intellectual Response to New Order Modernization in Indonesia*،کوالالمپور ، ب ت ؛(۱۰)C.V.Dijk: *Rebellion Under the Banner of Islam:The Darul Islam in Indonesia*، دی ہیگ ۱۹۸۱ء؛ (۱۱) J.D.Howell: *Indonesia`s Urban Santries Challenging Stereo Types of Islamic Revival*،در ISIM، لائیڈن، ص ۱۷ ببعد ، (۱۲) M.Abdillah: *Responses of Indonesian Muslim*

Intellectuals to the Concept of Democracy (۱۹۶۶-۱۹۹۳ء)، ہیمبرگ ۱۹۹۷ء؛ (۱۳) A.Schwarz: *A Nation in Waiting: Indonesia in the 1990*، سڈنی ۱۹۹۴ء؛ (۱۴) R.W.Hefner: *Civil Islam: Muslims and Democratization in Indonesia*، پرنسٹن یونیورسٹی پریس ۲۰۰۰ء؛ C.Curzman(Ed): *Liberal Islam, A Source Book*، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۹۸ء؛ (۱۵) مجیب الرحمٰن: *Islam and Politics in Indonesia-The Political Thought of Abdurrahman Wahid* در *Islamic and Christian-Muslim Relations*، ۱۰ (۳) ۳۳۹ - ۳۵۲؛ (۱۶) M.F.Falaakh: *Nahdlatul ulama and Civil Society in Indonesia* در S.Siddique and Others(Eds.): *Islam and Civil Society in South Asia*، سنگا پور ۲۰۰۱ء؛ (۱۷) A.Saeed: *Ijtihad and Innovation in Neo-Modernist Islamic Thought in Indonesia*، در *Islam and Chistian-Muslim Relations*، ۸(۳) ۲۷۹-۲۹۶۔ اردو مراجع کے لیے دیکھیے (۱۸) پروفیسر مسلم سجاد: انڈونیشیا، بحرانوں کے درمیان راستے کی تلاش، ص۵۹-۶۲ در ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، شمارہ جنوری ۱۹۹۹ء؛ (۱۹) نوید قمر، انڈونیشیا: نیا بوسنیا، ص۲۸-۳۲ در ماہنامہ الدعوۃ لاہور، شمارہ جون ۲۰۰۰ء)۔

معاشی صورت حال: سوئیکارنو کے زوال کا ایک بڑا سبب افراط زر میں اضافہ، مہنگائی اور معاشی عدم استحکام بھی تھا۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۳ء تک سیاسی استحکام کی وجہ سے معاشی حالت میں کچھ بہتری آئی، لیکن معاشی استحکام کو فروغ اس وقت ملا جب ۱۹۷۳ء کے بعد عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں میں اضافہ ہوا جو ۱۹۸۰ء تک جاری رہا۔ سہارتو حکومت نے اس دوران میں بجٹ کا ۴۰ فیصد معاشی ڈھانچے کی تعمیر نو پر صرف کیا اور تعلیم و صحت جیسے سماجی شعبوں پر بھی توجہ دی۔ اس سے غربت میں کمی ہوئی اور معاشی شرح افزائش میں ۸ فیصد تک اضافہ ہوا۔جب تیل کی قیمتیں دوبارہ کم ہو گئیں تو حکومت نے برآمدات میں اضافے کے ذریعے معاشی صورت حال کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔سفارت خانوں کو متحرک کیا، تاجروں کو مراعات دیں اور ٹیکسوں اور ڈیوٹیوں کا نظام بہتر بنایا۔ اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور حقیقی مجموعی ملکی پیداوار ۶ فیصد تک بڑھ گئی۔خط غربت سے نیچے رہنے والی آبادی میں کمی ہوئی اور فی کس سالانہ آمدنی جو ۱۹۶۵ء میں ۷۰ ڈالر تھی ۱۹۹۶ء میں۱۱۴۲ ڈالر ہو گئی (Scot B.Macdonald and Jonathan Lemco: *Indonesia Living Dangerously*، در *Current History*، ۶۴۵ (اپریل ۲۰۰۱ء) ۱۷۶-۱۸۳۔

تاہم ۱۹۹۰ء کی دہائی کے شروع میں جب معیشت بظاہر مستحکم نظر آتی تھی اس میں کئی خرابیوں نے راہ پا لی۔ اکثر صنعتیں جاوا میں لگائی گئیں جس سے دوسرے صوبوں میں احساس محرومی پیدا ہوا۔ صدر کے خاندان اور دوستوں نے صنعتی اور تجارتی اجارہ داریاں قائم کر لیں جس سے مالی خوشحالی کے اثرات نچلے طبقوں تک پہنچنے کا راستہ بند ہو گیا۔ صنعتی ڈھانچے کی افزائش کے لیے اعلیٰ ٹیکنالوجی کو فروغ نہیں دیا گیا ۔پھر دہائی کے وسط میں مزید خرابیاں پیدا ہونا شروع ہوئیں۔ کئی صنعتی گروہوں نے بنک کھول رکھے تھے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے بنکوں سے بھاری قرضے لیے، بلکہ بین الاقوامی مارکیٹ سے فارن کرنسی میں بھی قرضے لے لیے۔ ۱۹۹۰ء میں

پرائیویٹ سیکٹر کے بیرونی قرضوں کی مقدار ۱۳ بلین ڈالر تھی جو ۱۹۹۷ء میں ۷۰ بلین ڈالر تک پہنچ گئی۔ جب مقامی بنکوں کو یہ قرضے واپس نہ کئے گئے تو بنک ڈوبنے لگے کرنسی کی قدر کم ہوئی تو مہنگائی بڑھ گئی ۔ مقامی کمپنیاں بیرونی قرضے اس لیے ادا نہ کر سکیں کہ ان کی آمدنی مقامی کرنسی میں تھی جب کہ ادائیگی ڈالروں میں کرنا تھی۔ مرکزی حکومت اس صورتِ حال کو سنبھالنے میں کوئی کردار ادا نہ کر سکی، کیونکہ وہ خود بھاری بیرونی قرضوں کے نیچے دبی ہوئی تھی (۱۹۹۰ء میں ۶۵ بلین ڈالر جو ۱۹۹۶ء تک ۱۳۷ بلین ڈالر تک پہنچ چکے تھے) نتیجتاً معاشی بحران پیدا ہوگیا اور ملکی معیشت بیٹھ گئی *Investment, Banking, Oil* :K.Subramaniam) *Indonesia- A New* در ، *and Gas in Indonesia* *Beginning*، ص ۱۶۹-۱۹۴) .

اس بحران کے نتیجے میں بیروز گاری بڑھ گئی ۔ مجموعی ملکی پیداوار میں ۱۳ فیصد ریکارڈ کمی ہوئی۔ بیرونی سرمایہ کار ملک چھوڑ کر چلے گئے اور بیرونی سرمایہ کاری جو ۱۹۹۷ء میں ۳۳.۸ بلین ڈالر تھی ایک سال میں کم ہو کر ۱۳.۵ بلین ڈالر رہ گئی۔ حکومت نے مختلف مدات پر چھوٹ ختم کر دی تو مہنگائی آسمان سے باتیں کرنے لگی (۱۹۹۸ء میں ۵۸.۵ فیصد اضافہ اور ۱۹۹۹ء میں مزید ۲۰ فیصد) لوگ، خصوصاً طلبہ جو سہارتو کی طویل آمریت اور بدعنوانی سے پہلے ہی تنگ آئے ہوئے تھے سڑکوں پر آ گئے ۔ آئے روز کے مظاہروں سے معاشی اور سیاسی بحران گہرا ہوتا گیا۔ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) نے مدد کرنے کی کوشش کی، لیکن حکومت معاشی بہتری کے لیے اس کی پیش کردہ شرائط پوری نہ کر سکی۔ بالآخر صدر سہارتو کو مستعفی ہونا پڑا۔ نائب صدر یوسف حبیبی نے انتخابات کروائے اور ملک میں جمہوری حکومت قائم ہو گئی۔ صدر واحد کے ابتدائی عہد میں معاشی صورت حال بہتر ہوئی۔ برآمدات میں اضافہ ہوا، مہنگائی قدرے کم ہوئی۔ زرمبادلہ کے ذخائر بڑھ کر ۲۵ بلین ڈالر ہو گئے۔ غربت میں بھی کمی ہوئی۔ بدعنوانی کو بھی کنٹرول کرنے کی کوشش ہوئی ۔غیر محتاط رویوں کی وجہ سے صدر کو دو سال کے اندر کرپشن کے الزام میں پارلیمنٹ نے برطرف کر دیا اور ملک دوبارہ سیاسی بحران کا شکار ہو گیا۔ نائب صدر میگاوتی سوئیکارنو نے مئی ۲۰۰۱ء میں صدارت سنبھالی اور وہ معاشی استحکام کے لیے کوشاں ہیں.

انڈونیشیا کی مجموعی قومی پیداوار (G N P) ۱۹۹۰-۱۹۹۴ء میں ۳۰,۰۰۰ بلین ڈالر تھی اور اس کی شرح افزائش (۱۹۹۰ـ ۱۹۹۷ء) ۴ فیصد سالانہ تھی، جبکہ اس دوران آبادی میں اضافہ ۱.۹ فیصد سالانہ رہا۔ ۱۹۹۹ء کے اعداد و شمار کے مطابق مجموعی ملکی پیداوار میں زراعت کا حصہ ۱۹.۵ فیصد ،کانکنی کا ۱۰.۱ فیصد ،صنعتی پیداوار کا ۲۵.۴ فیصد اور خدمات (Services) کا ۳۷.۳ فیصد تھا ۱۹۹۰ء۔ ۱۹۹۹ء کے دوران شرح افزائش ۴.۷ فیصد تھی۔ معاشی بحران کی وجہ سے ۱۹۹۸ء میں اس میں ۱۳ فیصد کمی ہوئی اور اب بتدریج اس میں بہتری آرہی ہے۔ ۲۰۰۰ـ۲۰۰۱ء کا خسارے کا بجٹ ۱۱۰, ۵۲۱ بلین انڈونیشی روپے کا تھا۔ ۱۹۹۸ء میں بیرونی قرضوں کی مقدار ۱۵۰,۸۷۵ بلین ڈالر تھی اور بجٹ کا تقریباً ایک تہائی قرضوں پر سود کی مد میں جا رہا تھا۔ ۱۹۹۰ـ۱۹۹۷ء کے دوران افراط زر کی شرح ۸.۴ فیصد سالانہ تھی، لیکن سیاسی حکومت کے آنے کے بعد حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے، چنانچہ ۲۰۰۰ء میں افراط زر میں اضافہ محض ۶.۸ فیصد رہ گیا۔ سیاسی حکومت کرپشن کے خاتمے، نجکاری، سٹیٹ بنک کی خود مختاری، برآمدات میں اضافے اور دیگر اصطلاحات کے ذریعے معاشی صورت حال کی بہتری کے لیے مختلف

اقدامات کر رہی ہے۔ (Europa World Year Book، ۲۰۰۳ء)۔

خارجہ پالیسی : سوئیکارنو قوم پرست اور لادین شخص تھا۔ وہ مغرب مخالف اور کمیونسٹ بلاک کے قریب تھا اور غیر جانبدار تحریک کے بانیوں میں سے تھا۔ اسلامی ممالک سے اس کے خصوصی تعلقات نہ تھے، بلکہ ملائیشیا کے ساتھ اس کا رویہ معاندانہ تھا۔ سہارتو چونکہ کمیونسٹ بغاوت کو کچلنے کے نتیجے میں برسر اقتدار آیا تھا جس کے ڈانڈے چین سے ملتے تھے، لہٰذا اس نے مغرب کی حمایت کی پالیسی اپنائی اور اسی پر عامل رہا۔ تاہم ۱۹۹۱ء میں مشرقی تیمور میں فوج کے مظالم کے الزام میں امریکہ نے انڈونیشیا پر بعض دفاعی پابندیاں عائد کر دیں۔ جون ۱۹۹۷ء میں امریکی مجلس نمائندگان نے تیمور کے حوالے سے انڈونیشیا کی پھر مذمت کی جس سے دونوں ملکوں میں تلخی پیدا ہو گئی۔ سیاسی حکومت قائم ہونے کے بعد حالات اس وقت پھر کشیدہ ہو گئے جب انڈونیشیا نے امریکی سفیر پر داخلی سیاست میں ملوث ہونے کا الزام لگایا اور فلسطین میں امریکی رویے کو غیر منصفانہ قرار دیا۔ امریکیوں نے مغربی تیمور میں انڈونیشی ملیشیا کے ہاتھوں اقوام متحدہ کے کارکنوں کی ہلاکت پر سخت ردّ عمل کا اظہار کیا۔ اسی سال نومبر میں بعض جہادی جماعتوں نے امریکی سفارت خانے کے باہر مظاہرے کیے، امریکی کمپنیوں پر حملے کیے گئے اور امریکی سفیر کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا۔ امریکی سفارت خانہ دو ہفتوں کے لیے بند رہا اور امریکہ نے اپنے باشندوں کو انڈونیشیا جانے سے منع کر دیا۔

۱۹۶۵ء کی کمیونسٹ بغاوت کے بعد انڈونیشیا نے چین کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کر لیے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں کچھ برف پگھلی تو دونوں ملکوں میں تجارت بحال ہو گئی۔ سفارتی تعلقات اگست ۱۹۹۰ء میں اس وقت بحال ہوئے جب چین نے وعدہ کیا کہ وہ انڈونیشیا کے داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا اور انڈونیشیا نے عہد کیا کہ وہ سوئیکارنو عہد میں لیے گئے قرضے واپس کرے گا۔ سفارتی تعلقات کی بحالی کے بعد سہارتو نے چین کا دورہ کیا۔ ۱۹۹۵ء میں متنازعہ جزیروں کی ملکیت پر پھر کشیدگی پیدا ہو گئی جو اس وقت عروج پر پہنچ گئی جب سہارتو کے زوال کے وقت عوامی مظاہروں میں چینی اقلیت سے زیادتیاں کی گئیں، یہاں تک کہ چین کو مداخلت کی دھمکی دینا پڑی۔ تاہم سیاسی حکومت آنے پر صورت حال بدل گئی۔ چینی اقلیت کے حقوق بحال کیے گئے اور ان پر عائد پابندیاں ہٹا لی گئیں۔ صدر واحد نے چین کا دورہ کیا اور تعلقات معمول پر لانے کی کوشش کی۔

آسٹریلیا بھی چین کی طرح انڈونیشیا کا سمندری ہمسایہ ہے تاہم دونوں ملکوں میں سمندری حدود کے تعین پر اتفاق نہیں ہے۔ دسمبر ۱۹۸۹ء میں دونوں نے تیمور کے قریب متنازعہ علاقے میں تیل کی تلاش کا معاہدہ کیا جسے مشرقی تیمور نے قبول نہیں کیا۔ ۱۹۹۰ میں دونوں ملکوں نے دفاعی تعلقات کی بحالی پر اتفاق کر لیا اور ۱۹۹۴ء میں انڈونیشی نائب صدر نے آسٹریلیا کا دورہ کیا۔ جولائی ۱۹۹۵ء میں جب انڈونیشیا نے اپنے ایک سابق کمانڈر انچیف کو آسٹریلیا میں سفیر مقرر کیا تو آسٹریلیا میں اس کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے کیونکہ عوام کی رائے میں وہ شخص مشرقی تیمور کے مظالم میں ملوث تھا۔ اس سے پہلے جب انڈونیشیا نے ۱۹۷۵ء میں مشرقی تیمور پر قبضہ کیا تھا تو اس وقت بھی بعض آسٹریلوی مارے گئے تھے، جس کے ردّ عمل میں آسٹریلیا کے شہروں میں انڈونیشی پرچم جلائے گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۹۵ء میں دونوں ملکوں میں دفاعی تعلقات بڑھانے کا معاہدہ ہوا۔ ستمبر ۱۹۹۶ء میں سمندری حدود کا تعین کیا گیا۔ سہارتو حکومت کے بعد مشرقی تیمور

میں آزادی کی تحریک زور پکڑ گئی تو جنوری ۱۹۹۹ء میں آسٹریلیا نے وہاں حق خود ارادیت کی حمایت کا اعلان کردیا جس کی انڈونیشیا نے مذمت کی۔ ریفرنڈم کے بعد مشرقی تیمور میں امان و امان کی بحالی کے لیے آسٹریلیا نے بین الاقوامی امن فوج کی سربراہی کی اور اس میں اپنے ۴۵۰۰ فوجی بھجوائے جس پر انڈونیشیا نے فوجی تعاون کا معاہدہ ختم کر دیا۔ انڈونیشیا میں بحالی جمہوریت کے بعد بھی دونوں ملکوں میں کشیدگی جاری رہی ۔ صدر واحد نے کئی بار آسٹریلیا کے دورے منسوخ کیے۔نومبر ۲۰۰۰ء میں انڈونیشیا میں آسٹریلوی سفیر پر حملہ ہوا جس پر انڈونیشیا کو معذرت کرنا پڑی.

صدر سوئیکارنو نے اپنے عہد میں ملائیشیا کے خلاف محاذ کھو ل رکھا تھا جسے اس کی خارجہ پالیسی میں اہم مقام حاصل تھا تاہم سوئیکارنو کے زوال کے بعد سہارتو حکومت نے ملائیشیا کے اقتدار اعلی کو تسلیم کرتے ہوے اس کے ساتھ پر امن بقائے باہمی کا اعلان کر دیا۔ اکتوبر ۱۹۹۶ء میں دونوں ملک باہمی رضا مندی سے بین الاقوامی عدالت انصاف میں چلے گئے تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان متنازعہ جزائر کی ملکیت پر فیصلہ کروایا جا سکے۔فروری ۱۹۹۷ء میں مغربی کالی منتان میں جب نسلی فسادات ہوے تو ملائیشیا نے ایک ہفتے کے لیے اپنی سرحدیں بند کر دیں تاکہ اسے مہاجرین کے ریلے اور دوسری مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔۱۹۹۷ء کے آخر میں جب جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں مالی بحران پیدا ہوا تو ملائشیا نے انڈونیشی مزدوروں کو جبراً انڈونیشیا واپس بھجوا دیا اس پر دونوں ملکوں میں تلخی پیدا ہو گئی، کیونکہ انڈونیشیا اس وقت اپنی تاریخ کے بد ترین معاشی و سیاسی عدم استحکام کا شکار تھا۔ اکتوبر ۱۹۹۸ء میں یہ تلخی اس وقت مزید بڑھ گئی جب انڈونیشیا نے ملائیشیا کے سابق نائب وزیر اعظم انور ابراہیم پر دوران نظر بندی تشدد کی مذمت کی حالانکہ آسیان ممالک نے باہم سیاسی عدم مداخلت کا معاہدہ کر رکھا تھا.

انڈونیشیا اقوام متحدہ ،اسلامی کانفرنس تنظیم (OIC)، تیل برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم اوپیک (OPEC)، ایشیا وبحرالکاہل کے ممالک کی معاشی تنظیم ایپک (APEC)، غیر وابستہ ممالک کی تنظیم (NAM) اور جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی تنظیم آسیان (ASEAN) کا رکن ہے- ایک بڑا ملک ہونے کے ناطے اسے علاقائی معاملات میں اہمیت حاصل ہے، چنانچہ اس نے اسّی کی دہائی کے آخر میں ویت نام اور کمبوڈیا کے درمیان صلح کروانے کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح اکتوبر ۱۹۹۴ء میں اس نے چین کے جنوبی سمندری علاقے کے متنازعہ جزائر پر گفت وشنید کے لیے چھ ایشیائی ملکوں کی کانفرنس کی میزبانی کی۔ اسی سال اس نے بوسنیا کے بین الا قوامی امن مشن میں شرکت کے لیے اپنا طبی مشن وہاں بھیجا۔ ۱۹۹۹ء میں انڈونیشیا نے سابقہ تلخیاں بھلاتے ہوئے پرتگال سے سفاری تعلقات قائم کر لیے۔ صدر واحد نے مسلم دنیا سے اپنے تعلقات بہتر بنانے کی خاطر جون ۲۰۰۰ء میں ایران اور اکتوبر میں پاکستان کا دورہ کیا۔ انڈونیشی خارجہ پالیسی کے لئے دیکھیے.(۱) Hadi Soeastro: *Indonesia as Australia's Nei ghbour* در Chris Manning and Peter v. Diermen: *Indonesia in Transition: Aspects of Reformasi and Crisis*، لنڈن ۲۰۰۰ء؛ (۲) *Indonesia 2001-An Official Hand Book*، جکارتہ ؛ (۳) *The Europa World Year Book 2003*، بذیل مادہ.

تعلیم :تعلیمی اداروں کی نگرانی وزارت تعلیم کرتی ہے تاہم پرائمری سطح کے دینی مدارس کی ذمہ داری وزارت مذہبی امور کے پاس ہے۔ ۱۹۸۷ء میں پرائمری تعلیم لازمی قرار دی گئی اور ۱۹۹۳ء میں اس کی مدّت چھ سال سے بڑھا

کر نو سال کر دی گئی۔ ثانوی سطح کی تعلیم تین تین سال کے دو مرحلوں پر مشتمل ہے۔ انڈونیشیا میں سرکاری تعلیم لادینی نظام پر مبنی ہے، اگرچہ پرائیویٹ سیکٹر میں مسلمانوں، عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کو سکول ،کالج اور یونیورسٹیاں قائم کرنے کی اجازت ہے اور ایسے بہت سے تعلیمی ادارے کام بھی کر رہے ہیں .حکومت پرائیویٹ سیکٹر کے تعلیمی اداروں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور انہیں فراخ دلانہ مالی امداد دیتی ہے۔پرائیویٹ دینی مدارس کا بھی ایک وسیع اور منظم حلقہ موجود ہے۔

انڈونیشیا میں تعلیم کو اہمیت دی جاتی ہے ۱۹۹۶-۱۹۹۷ء میں بجٹ کا ۹فیصد اور قومی مجموعی پیداوار کا ۱.۴ فیصد تعلیم پر خرچ کیا گیا۔ شرح تعلیم (۱۹۹۸ء) ۸۵.۷۱فیصد (طلبہ ۹۱فیصد، طالبات ۸۰ء۵فیصد)، داخلے کی شرح (۲۰۰۰ء-۲۰۰۱ء)، پرائمری میں ۹۵ء۴۰ فیصد ،مڈل میں ۵۶ء۱ فیصد ،ثانوی میں ۳۱ء۲فیصد اور یونیورسٹی سطح پر ۱۱ء۱ فیصد ہے۔(تعلیم خصوصاً خواتین کی مذہبی تعلیمی سرگرمیوں کے لیے دیکھیے (Linda Swalbridge: *The Santri-Wati of Indonesia's Pesantren*، در *Islamic Studies*،اسلام آباد ۳۷:۴ (۱۹۹۷ء) ۵۱۹-۵۳۲).

مآخذ: متن مقالہ میں درج ہیں

(محمد امین)

••--------------••

※ انڈیا: [رکّ بہ ہند، ہندوستان، در آآ نیز تکملہ، بذیل مادہ].

••--------------••

⊗ انڈین نیشنل کانگرس: ہندوستان کی ایک سیاسی جماعت۔ برعظیم پاک وہند میں جب مغلیہ سلطنت کو زوال آیا اور مسلمانوں کی حکومت کمزور ہوئی تو انگریزوں نے ”ایسٹ انڈیا کمپنی“ کی صورت میں ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ بعدازاں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت بھی ختم ہوگئی اور ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے زیر اقتدار آگیا، لیکن اہل ہند کو اطمینان خاطر نہ حاصل ہوا۔ حکومت برطانیہ نے نئے ٹیکس لگائے، اسٹامپ ایکٹ کے نفاذ سے بھی بددلی میں اضافہ ہوا۔ قانون اسلحہ نے مزید بے اطمینانی پیدا کی۔ پریس ایکٹ کے نفاذ سے لوگوں میں حکومت کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوا۔ ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگوں نے صوبائی سطح پر کچھ فلاحی تنظیمیں قائم کر رکھی تھیں۔ ان میں سے بنگال کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن، بمبئی ایسوسی ایشن اور ”سروجنک سبھا“ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں (دیکھیے سید حسن ریاض: پاکستان ناگزیر تھا، کراچی ۱۹۸۷ء، ص ۳۰-۳۱)، لیکن ایک ایسی ملک گیر تنظیم کی کمی بری طرح محسوس کی جا رہی تھی جو عوام کے مسائل حکومت کے علم میں لاتی اور ان کے حل کے لیے جدوجہد کرتی۔

مسٹر ایلن اکٹیوین ہیوم (Allan Octavian Hume) ہندوستان میں ایک اعلیٰ افسر رہ چکا تھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ ہندوستان کے سماجی مسائل کے بارے میں غور وفکر کرتا رہتا تھا۔ اس کے خیال میں ہندوستان کے لوگ حکومت کے طرزعمل سے خوش نہ تھے جس کا نتیجہ کسی بغاوت کی صورت میں سامنے آسکتا تھا۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ کوئی ایسا نظام ہو کہ جس کے ذریعے ہندوستانیوں کے دلوں کا بخار نکلتا رہے اور وہ حکومت کے خلاف خفیہ سازشوں سے باز رہیں۔ چنانچہ اُس نے ملکی سطح پر ایک جماعت بنانے کا منصوبہ بنایا (دیکھیے، بی پتابھی سیتارامیا: The History of the Congress، مدراس، ۱۹۳۵ء، ص ۱۱-۱۲)۔ اُس نے یکم مارچ ۱۸۸۳ء کو کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹس کے نام ایک خط لکھا جس میں اس نے تحریر کیا کہ صرف پچاس تعلیم

یافتہ ذمہ دار اشخاص کے پرخلوص تعاون سے ایک ملک گیر تنظیم قائم کی جاسکتی ہے۔ اُس نے وائسرائے لارڈ ڈفرن سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا، لیکن موصوف نے اس وعدے پر ایک سیاسی جماعت کے قیام کا مشورہ دیا کہ ہندوستان میں اُس کی مدت تعیناتی کے دوران میں اس کے اس مشورے کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے۔ مسٹر ہیوم نے اس وعدے کو خوب نبھایا۔ بعدازاں وہ انگلستان گیا اور لارڈ رپن، لارڈ ڈلہوزی اور دیگر اہم اشخاص سے مشورہ کیا (کتاب مذکور، ص ۱۱، ۲۳، ۲۴، ۲۵)۔

مارچ ۱۸۸۵ء میں مسٹر ہیوم نے اس نئی جماعت کے تاسیسی اجلاس کے سلسلے میں ایک گشتی مراسلہ جاری کیا کہ یہ کرسمس کے موقعہ پر پونا میں ہوگا، مگر وہاں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی، لہٰذا یہ اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو بوقت دوپہر بمبئی کے گوکل داس تیج پال سنسکرت ہال میں انعقاد پذیر ہوا۔ اس کی صدارت مسٹر ڈبلیو۔ سی۔ بنیر جی نے کی۔ دادا جی نوروجی، فیروز شاہ مہتہ، ڈی۔ای۔واچا، نریندر ناتھ سین اور کے۔ٹی۔ تلنگ اس کے اہم شرکا میں سے تھے۔ اس نئی سیاسی جماعت کے قیام کا مقصد قومی اتحاد اور ملک کے اہم مسائل پر تعمیری بحث و تمحیص کے ذریعہ اُن کا بہترین حل تلاش کرنا تھا (دیکھیے کتاب مذکور، ص ۲۴، ۲۶، ۲۷، ۲۸)۔ اس اجلاس میں کل (۷۲) مندوبین شریک ہوے جن میں صرف دو مسلمان تھے۔ انڈین نیشنل کانگرس کا دوسرا سالانہ اجلاس کلکتہ میں ۱۸۸۶ء میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں ہوا۔ وائسرائے نے مندوبین کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام کیا۔ اسی طرح اس کے تیسرے سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس ۱۸۸۷ء میں بھی گورنر مدراس نے مندوبین کے لیے گارڈن پارٹی کا انتظام کیا۔ نیز یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ انڈین سول سروس سے بطور سزا نکالے جانے والے ایک شخص سریندر ناتھ بیز جی کو کانگرس کے پہلے اجلاس میں شمولیت کرنے سے باز رکھا گیا (دیکھیے: سید شریف الدین پیرزادہ [مرتب]: Foundations of Pakistan، ج۱، مقدمہ، ص ۱۹، ۲۲)۔ علاوہ ازیں مندرجہ ذیل انگریز شرفا کو کانگرس کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت کرنے کا موقع ملا: ڈیوڈ ییل (David Yule)، الٰہ آباد ۱۸۸۸ء؛ سرولیم ویڈربرن (Sir William Wederburn) بمبئی ۱۸۸۹ء؛ اور الٰہ آباد ۱۹۱۰ء؛ الفریڈ ویب (Alfred Webb) مدراس ۱۸۹۴ء؛ سرہنری کاٹن (Sir Henry Cotton) بمبئی ۱۹۰۴ء)۔

سرولیم ویڈربرن برٹش کانگرس کمیٹی میں بھی اہم کردار ادا کرتا رہا، جبکہ برطانوی پارلیمنٹ کے متعدد ارکان کانگرس کے سالانہ اجلاسوں میں شمولیت کے لیے آتے رہے، مثلاً سیموئل سمتھ، چارلس براڈلے، ڈبلیو کین، ڈاکٹر روتھر فورڈ اور ڈاکٹر کلارک۔ ۱۹۱۱ء میں کانگرس کے سالانہ اجلاس کی صدارت لیبر پارٹی کے ایک لیڈر رمزے میکڈانلڈ نے کرنا تھی، مگر وہ اپنی اہلیہ کی وفات کی بنا پر نہ آسکا۔ مسٹر گلیڈسٹون بھی اس جماعت کے بہی خواہوں میں سے تھا۔ انگریزوں اور ان کی حکومت سے وفاداری کانگرس کی پالیسی کا ایک اہم بنیادی اصول تھا۔ دوسری طرف حکومت بھی اس جماعت کی سرپرستی کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں اس کے سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس میں صوبے کے گورنر نے شرکت کی اور ۱۹۱۶ء میں اس کے لکھنؤ میں ہونے والے اجلاس میں یوپی کا گورنر شریک ہوا (دیکھیے: بی پتابھی سیتاراميا: The History of the Congress، ص ۱۰۰، ۱۰۱ ح ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۷)۔ ۱۸۹۸ء میں بمقام مدراس کانگرس اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت میں آنند موہن بوس نے کہا: ”ملک کے پڑھے لکھے لوگ حکومت برطانیہ کے دوست ہیں، دشمن نہیں اور (عوامی فلاح) کے جو بڑے بڑے کام حکومت کے

پیش نظر ہیں، وہ ان میں حکومت کے فطری حلیف ہیں" (دیکھیے کتاب مذکور، ص ۱۰۰)۔

کانگرس کے برطانوی حکومت کے ساتھ خوشگوار مراسم کے باعث اُس کے متعدد صدور اور دیگر اہم اراکین اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہوے، مثلاً اس کے تیسرے سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس ۱۸۸۷ء کی صدارت کرنے والے بدرالدین طیب جی اور سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور ۱۹۰۰ء کے صدر چنداوارکر بمبئی ہائی کورٹ کے جج مقرر کیے گئے۔ ۱۸۹۷ء کے اجلاس منعقدہ امراؤتی کے صدر سرسنکرن نائر مدراس ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے۔ تقسیم بنگال کے خلاف احتجاج کرنے والے افراد میں سے ایک نمایاں شخصیت اے۔ چوہدری کلکتہ ہائی کورٹ کے جج بنا دیئے گئے؛ این ایم سمرتھ سٹیٹ کونسل کے سیکرٹری کے ممبر مقرر ہوے اور رام سوامی آئر اور سر پی ایس سیوا سوامی آئر ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بنے (کتاب مذکور، ص ۱۰۳-۱۰۶)۔

کانگرس کا دستور ۱۸۹۹ء کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں منظور کیا گیا اور ۱۹۰۶ء میں اس کے پلیٹ فارم سے سوراج (حکومت خود اختیاری) کا مطالبہ کیا گیا۔ جنوبی افریقہ کی حکومت کے نسل پرستی پر مبنی قوانین کے خلاف بھی آواز بلند کی گئی۔ مہاتما گاندھی نے وہاں کئی سال قیام کرکے وہاں کے لوگوں کی قانونی و سیاسی مدد کی (دیکھیے: The History of the Congress، ص ۸۶-۹۱، ۱۳۸-۱۴۰، ۷۶-۸۰)۔

انڈین نیشنل کانگرس کا شروع ہی سے یہ دعویٰ رہا ہے کہ وہ تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں ہمیشہ ہندوؤں کو غلبہ حاصل رہا ہے اور یہ آنندن موہن بوس (صدر کانگرس ۱۸۹۸ء) کی سدھارن برہمو سماج، دیانند سرسوتی کی آریہ سماج اور ایم جی رانا ڈے کی پراتھنا سماج وغیرہ کا مرکب ہے (دیکھیے کتاب مذکور، ص ۲۱، ۲۲) اور اس کی اختیار کردہ پالیسیاں اسی نقطۂ نظر کی غماز ہیں۔ ۱۹۰۵ء کے اجلاس منعقدہ بنارس میں اس کے صدر گوپال کرشن گوکھلے نے تقسیم بنگال پر ناخوشی اور افسوس کا اظہار کیا اور اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۰۶ء میں تقسیم کی منسوخی کے لیے ہندوؤں کی طرف سے چلائی جانے والی پر تشدد تحریک کو کانگرس کی طرف سے حق بجانب قرار دیا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں حکومت کی طرف سے سیاسی اصلاحات کا اعلان ہوا، جن میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا حق بھی شامل تھا، اس پر بھی کانگرس نے اپنی ناخوشی کا اظہار کیا اور اس کے خلاف اپنے مذعومہ دلائل پیش کیے (دیکھیے: کتاب مذکور، ص ۲۱، ۲۲، ۴۱، ۶۹، ۷۰)۔

انڈین نیشنل کانگرس کی اپنی مسلم کش پالیسیوں اور ہندووں کی بے جا طرف داری کی بنا پر، اسی زمانے میں آل انڈیا مسلم لیگ [رک بآں] منظم کی گئی۔ ۱۹۱۳ء میں کانگرس کے اجلاس منعقدہ کراچی میں بھوپندرناتھ باسو نے حکومت خود اختیاری کو اپنا مطمح نظر بنانے پر مسلم لیگ کی تحسین کی (دیکھیے: کتاب مذکور، ص ۱۲۵)۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں ان دونوں جماعتوں کے مابین ایک معاہدہ طے ہوا، جسے میثاق لکھنؤ کہا جاتا ہے، اس کی رو سے کانگرس نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرلیا اور ان کے لیے جداگانہ طریق انتخابات کو منظور کرلیا اور آئندہ کے لیے مشترکہ سیاسی جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا گیا (دیکھیے، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی: The Struggle for Pakistan، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۴۵)۔ جنگ عظیم اول کے اختتام پر مسلمانوں نے خلافت عثمانیہ کو بچانے کے لیے تحریک خلافت برپا کی۔ جس کی رہنمائی مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا

ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کر رہے تھے۔ اس موقع پر کانگرس نے بھی حکومت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا اور ہندو اور مسلمان مل کر حکومت کے خلاف جدو جہد کرنے لگے۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا افسوس ناک سانحہ پیش آیا جس میں حکومتی اعلان کے مطابق چار سو افراد ہلاک اور ایک سے دو ہزار افراد زخمی ہوے۔ اسی روز ملک کے دوسرے شہروں بمبئی، کلکتہ، احمد آباد اور ندیا وغیرہ میں ہنگامے ہوے (دیکھیے: سید حسن ریاض: پاکستان ناگزیر تھا، کراچی ۱۹۸۷ء، ص ۷۹-۸۰)۔ ۱۹۱۹ء میں حکومت نے رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا، جس کا مقصد ہندوستانیوں کو کچلنا تھا (کتاب مذکور، ص ۷۸)۔

برطانوی حکومت کے خلاف اہل ہند کے جذبات نقطۂ انتہا پر جا پہنچے اور ہندو مسلم اتحاد اس قدر مستحکم ہوگیا کہ ایک کٹر ہندو لیڈر سوامی شردھانند نے جامع مسجد دہلی میں جاکر حکومت کے خلاف تقریر کی۔ اسی دور میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی مساعی سے علما کی بین الملکی تنظیم جمعیت علماے ہند قائم کی گئی (چوہدری خلیق الزمان: Pathway to Pakistan، ص ۴۵، ۴۶)۔ فروری ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون کو بند کرنے کا اعلان کر دیا، کیونکہ ان کے خیال میں یہ تحریک پر تشدد بن گئی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں جدید ترکی کے بانی مصطفیٰ کمال پاشا اتا ترک [رک بآں] نے خلافت کی تنسیخ کا اعلان کر دیا (کتاب مذکور، ص ۷۳)۔ تحریک خلافت کے ختم ہونے پر ملک کے بڑے بڑے شہروں میں ہندو مسلم فسادات بھڑک اُٹھے اور سوامی شردھانند نے شدھی اور لالہ لاجپت رائے نے سنگھٹن کی تحریک شروع کرکے رہی سہی کسر پوری کردی (دیکھیے: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۵۰)۔ کانگرس نے ان فسادات کی روک تھام کے لیے ۱۹۲۴ء میں یونٹی کانفرنس کا انعقاد کیا، نیز اسی سال نومبر میں بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس بلائی (دیکھیے: The History of the Congress، ص ۴۵۱، ۴۶۵، ۴۶۶)۔ ہندو مسلم اتحاد کے حصول، حکومت سے محاذ آرائی اور بیرون ملک ہندوستانیوں کے مفادات کی نگہداشت کے کاموں کو جاری رکھا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں بیرون ملک مقیم اہل وطن کے حقوق ومفادات کی حفاظت کے لیے کانگرس میں شعبہ برائے امور خارجہ قائم کردیا گیا۔ ۱۹۲۷ء میں ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا ۔ اسی سال سائمن کمیشن کی آمد کا اعلان ہوا جس کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا گیا (دیکھیے: کتاب مذکور، ص ۵۰۳، ۵۳۲، ۵۳۹، ۵۴۱)۔ کانگرس نے سیاسی مسائل کے حل کے لیے آل پارٹیز کانفرنس بلائی اور پنڈت موتی لال نہرو کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کی مرتب کردہ تجاویز نہرورپورٹ کی صورت میں سامنے آئیں۔ مسلمانوں نے اس رپورٹ میں اپنے مطالبات نظر انداز کر دیئے جانے پر اسے مسترد کر دیا اور ردعمل کے طور پر قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے چودہ نکات پیش کیے (دیکھیے: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۶)۔

۱۹۲۹ء میں کانگرس کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں پنڈت جواہر لال نہرو نے نہرو رپورٹ سے دستبردار ہوتے ہوے ملک کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ بعد میں حکومت کی طرف سے مطالبات کے منظور نہ ہونے پر سول نافرمانی کا آغاز کر دیا گیا۔ اس زمانے میں لندن میں تین گول میز کانفرنسیں(۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱، ۱۹۳۲) منعقد ہوئیں تاکہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کا مشترکہ حل تلاش کیا جاسکے مگر بے سود۔ کانگرس نے صرف دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کی۔ ۱۹۳۵ء میں حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا اعلان کردیا، یہ دستور سواے وفاق سے متعلقہ حصہ

کے یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے نافذ العمل ہونا تھا (دیکھیے: سید حسن ریاض: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۷۱، ۱۷۷، ۱۸۱، ۱۸۲)۔ اسی سال صوبائی انتخابات منعقد ہوے۔ کانگرس نے پانچ صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل کی، جولائی ۱۹۳۷ء میں سات صوبوں میں اس کی حکومتیں قائم ہوئیں۔"مسلم عوام رابطہ مہم" کا آغاز کیا گیا۔ اردو کی بجائے ہندی کو ہندوستانی کا نام دے کر سرکاری زبان بنایا گیا۔ واردھا سکیم اور ودیا مندر سکیم کے ناموں سے تعلیمی منصوبے شروع کیے گئے۔ مسلمان اوردوسری اقلیتیں کانگرس حکومتوں ر وزارتوں میں احساس عدم تحفظ کا شکار رہیں (دیکھیے: The Struggle for Pakistan، ص ۷۷، ۹۲، ۹۵، ۱۱۳)۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ حکومت برطانیہ نے اہل ہند سے تعاون کی اپیل کی اور جنگ کے خاتمہ کے بعد اُنہیں آزادی دینے کا وعدہ کیا۔ حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے کانگرس صوبائی حکومتوں سے مستعفی ہوگئی اور اس طرح اس کا یہ دور اقتدار اختتام پذیر ہوا (کتاب مذکور، ص ۱۲۷)۔ مارچ ۱۹۴۲ء میں سراسٹیفورڈ کرپس کچھ تجاویز لے کر ہندوستان آئے، مگر کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے انہیں مسترد کر دیا۔ حکومت، کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین سہ طرفہ مذاکرات کا سلسلہ اب بھی جاری تھا مگر ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ (دیکھیے: Pathway to Pakistan، ص ۲۷۴ـ۲۸۱؛ پاکستان ناگزیر تھا، ص ۲۱۰، ۲۱۶، ۲۳۳، ۲۳۵، ۳۳۱، ۳۴۹)۔

۱۹۴۵ء کے اواخر اور ۱۹۴۶ء کے اوائل میں عام انتخابات منعقد ہوے جن میں مسلم نشستوں پر مسلم لیگ نے شاندار کامیابی حاصل کی (Struggle for Pakistan، ۲۳۸، ۲۳۹)۔ اسی سال حکومت برطانیہ کی طرف سے ایک وزارتی مشن ایک سیاسی فارمولا لے کر ہندوستان آیا جس کی رو سے وفاقی حکومت کے پاس صرف امورخارجہ، دفاع اور رسل ورسائل کے محکمہ جات رہنا تھے۔ نیز ملک کے تمام صوبوں کو تین گروپوں میں منقسم کر دیا گیا اور صوبے ہر دس سال کے بعد کثرت رائے سے آئین میں ترمیم کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی عبوری حکومت کا ایک خاکہ بھی پیش کیا گیا جو ۲۰ ستمبر کو قائم ہونا تھی۔ کانگرس نے وزارتی مشن کی تجاویز پر صاد نہ کیا، مگر اسے عبوری حکومت میں شمولیت کی دعوت ملی۔ مسلم لیگ نے حکومت میں شامل نہ کیے جانے پر راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ بالآخر اکتوبر میں اُسے بھی شامل کر لیا گیا، مگر دونوں جماعتوں کے وزرا کی آپس میں نہ بن سکی (دیکھیے: پاکستان ناگزیر تھا، ص ۴۰۶، ۴۱۰، ۴۲۱، ۴۵۸، ۴۶۰، ۴۶۲)۔

فروری ۱۹۴۷ء میں برطانوی وزیراعظم نے دارالعوام میں ہندوستان کو آزادی دینے کی تجویز کا اعلان کیا اور ۳ جون کو وائسرائے ہند نے تقسیم ملک کے منصوبے کا اعلان کیا۔ ۱۸ جولائی کو برطانوی حکومت نے اس منصوبے کی منظوری دے دی اور ۱۴ اگست کو ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہوا (دیکھیے: کتاب مذکور، ص ۴۷۴، ۵۲۳، ۵۳۶، ۵۳۷)۔ کانگرس نے تقسیم ملک کے اس منصوبے کو بادل نخواستہ تسلیم کیا کیونکہ اس کا کوئی اور متبادل سامنے نہ تھا (دیکھیے: مولانا ابوالکلام آزاد: India Wins Freedom، حیدر آباد [بھارت]، ۱۹۸۴ء)۔

کانگرس اور مسلمان: کانگرس ابتدا ہی سے سارے ہندوستان کی نمائندہ سیاسی جماعت ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی ترجمانی کی دعویٰ دار رہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے قیام کے ساتھ ہی اس سے تعاون وشمولیت کے سلسلے میں مسلمان دو واضح گروپوں میں بٹ گئے۔ کانگرس میں شمولیت کرنے والے مسلمانوں کے نمائندے بدرالدین طیب جی تھے، جبکہ اس میں شمولیت

کے مخالف گروپ کے سرخیل سرسید احمد خاں تھے (دیکھیے برائے تفصیل Foundations of Pakistan، ج ا، مقدمہ، ص ۲۳، ۲۹)۔ بدرالدین طیب جی کے علاوہ ۱۸۹۶ء میں کانگرس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کی صدارت ایک اور مسلمان محمد رحمت اللہ سیانی نے کی۔ بعد کے ادوار میں درج ذیل مسلمان زعما اس جماعت کے صدر بنتے رہے: ۱۹۱۳ء، سالانہ اجلاس کراچی: نواب سید محمد بہادر صدر؛ ۱۹۱۸ء خصوصی اجلاس بمبئی: حسن امام صدر؛ ۱۹۲۱ء خصوصی اجلاس، احمد آباد: حکیم اجمل خاں صدر؛ ۱۹۲۳ء خصوصی اجلاس، دہلی: مولانا ابوالکلام آزاد صدر؛ ۱۹۲۳ء، سالانہ اجلاس کوکناڈا: مولانا محمد علی جوہر صدر؛ ۱۹۲۷ء سالانہ اجلاس، مدراس: ڈاکٹر مختار احمد انصاری صدر؛ ۱۹۳۹ء-۱۹۴۶ء سالانہ اجلاس، مدراس: مولانا ابوالکلام آزاد (دیکھیے، The History of the Congress، اشاریہ سے پہلے مشمولہ Statement، ص ۱۸۲؛ Indian Wins Freedom، ص ۳۱، ۴۱)۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان اجلاسوں میں مسلمان مندوبین کی تعداد شروع ہی سے کم رہی اور کانگرس کے رہنماؤں کو اس کا احساس بھی ہوتا رہا (دیکھیے: Foundations of Paksitan، ج ا، مقدمہ، ص ۱۹، ۲۲)۔ ۱۸۸۸ء کے سالانہ اجلاس میں شیخ رضا حسین خاں نے اس جماعت کی حمایت اور تائید میں لکھنو کے ایک سنی عالم کا جاری کردہ فتویٰ پیش کیا (دیکھیے: The History of the Congress، ص ۱۱۰)۔ ۱۹۳۷ء کی "مسلم عوام رابطہ مہم" بھی اسی احساس کی غمازی کرتی ہے۔

کانگرس کے حامی مسلمان دو طبقوں سے تعلق رکھتے تھے: جدید تعلیم یافتہ مسلمان جیسے بدرالدین طیب جی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، آصف علی اور تصدق حسین شروانی وغیرہ اور علما مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی وغیرہ جن کا موقف یہ تھا کہ باطل کے خلاف حسب استطاعت نبرد آزمائی شریعت اسلامی کا ایک اہم اصول ہے (دیکھیے: صحیح مسلم، کتاب الایمان)۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں سکھوں کے خلاف حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے کچھ حضرات اور اس خاندان سے علمی استفادہ کرنے والے افراد نے جہاد کا آغاز کیا۔ اگرچہ اس میں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، مگر بعد میں بھی یہ تحریک کسی نہ کسی صورت میں جاری رہی اور انگریزی حکومت کے خلاف جہادی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رہا (دیکھیے: ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی: The Muslim Community of the Indo-Pakistan Subcontinent، اُردو ترجمہ از ہلال احمد زبیری، برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۸، ۲۷۲)۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی علما نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ علما نے ملک کی آزادی کی خاطر جہاد کا فتویٰ جاری کیا اور مختلف محاذوں پر جنگی کاروائیوں میں عملی حصہ لیا۔ انگریزوں نے اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ان حضرات پر مقدمے چلائے اور اُنہیں سخت سزائیں دیں (دیکھیے: خورشید مصطفیٰ رضوی: جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، لاہور ۱۹۹۰ء، ص ۳۶۶-۳۶۹، ۳۸۰-۳۹۶)۔

جنگ عظیم اول کے دوران شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے رفقا نے ملک گیر بغاوت کا ایک خفیہ پروگرام مرتب کیا اور ترکی اور دیگر مسلم ممالک سے اس سلسلے میں امداد کے لیے مذاکرات بھی کیے، بلکہ کابل میں راجہ مہندر پرتاپ کی قیادت میں ہندوستان کی آزاد عارضی حکومت کے قیام کا منصوبہ بنالیا گیا۔ مولانا موصوف حجاز پہنچ کر اپنے اس مشن کو آگے بڑھانے کی

کوشش میں مصروف تھے کہ انگریزی حکومت کو اس سازش کا پتہ چل گیا جس پر مولانا کو ان کے چند رفقا سمیت گرفتار کر کے تقریباً تین سال تک مالٹا میں قید رکھا گیا (دیکھیے: برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۳۹، حاشیہ؛ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، ص ۴۵۹، ۴۶۰؛ نقش حیات، کراچی ۱۹۷۹ء، ج ۲، ص ۶۵۴).

علما خصوصاً علمائے دیوبند تحریک خلافت کے دوران میں اس وقت کانگرس کے زیادہ قریب آگئے، جب اُس نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر حکومت کے خلاف کام کرنے کا فیصلہ کیا (اگرچہ اس سے کئی سال قبل مولانا رشید احمد گنگوہی کانگرس کے حق میں فتویٰ جاری کر چکے تھے، دیکھیے: جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، ص ۴۵۴)۔ اسی اثنا میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے علما کی ایک تنظیم "جمعیت علمائے ہند" تشکیل دی جس نے مستقبل میں علمائے اسلام کو ایک مستقل پلیٹ فارم مہیا کر دیا (دیکھیے: Pathway to Pakistan، ص ۴۶)۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ عدم تعاون کی تحریک چلانے کی تجویز گاندھی جی نے ایک اجلاس کے دوران میں پیش کی جس میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حکیم اجمل خان، علی برادران اور وہ خود موجود تھے۔ حکیم صاحب نے اس پر غور وفکر کے لیے مہلت طلب کرلی۔ مولانا عبدالباری نے استخارہ کرنے کے بعد اپنی رائے ظاہر کرنے کا وعدہ کیا، جبکہ علی برادران نے اپنی رائے کو مولانا موصوف کی رائے سے مشروط کر دیا، مگر انہوں [یعنی آزاد] نے اس کی فوری طور پر تائید کر دی (دیکھیے India Wins Freedom، ص ۹).

دراصل علمائے دیوبند سرسید احمد خاں کی انگریز نواز پالیسیوں کے سخت مخالف تھے اور مسلم لیگ کو بھی سرسید کی باقیات میں سے تصور کرتے ہوئے اس سے دور رہتے تھے اور ان کے خیال میں اس میں حکومت کے خطاب یافتگان اور وفاداروں کی اکثریت تھی۔ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سرسید علی گڑھ کالج کے ایک انگریز پرنسپل مسٹر بیک کے کہنے پر کانگرس کے مخالف ہوگئے تھے (دیکھیے: محمد انوارالحسن شیرکوٹی: حیات عثمانی، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۴۵۰؛ نقش حیات، ۲: ۴۸۱)۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ علمائے دیوبند کا ایک طبقہ مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کے زیر اثر کانگرس کی بجائے مسلم لیگ کا حامی تھا اور اس میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا قاری محمد طیب قاسمی، مولانا مفتی محمد شفیع اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی وغیرہ شامل تھے، جنہوں نے تحریک پاکستان کے دوران میں مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کی اور اس کے لیے میدان عمل میں آئے (دیکھیے: شیخ محمد اکرام: Modern Muslim India-Birth of Pakistan، نظرثانی شدہ ایڈیشن، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۱۵؛ حیات عثمانی، ص ۴۴۹).

علاوہ ازیں ہندوستان کی اولین سیاسی جماعت ہونے کی بنا پر بھی کانگرس بہت سے مسلمان لیڈروں کی توجہ اور دل چسپی کا مرکز بنی۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں اور قائداعظم محمد علی جناح کئی سال تک کانگرس کے رکن رہے۔ ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین ہونے والا "میثاق لکھنؤ" قائداعظم کی پرخلوص مساعی کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کے منظر عام پر آنے سے اکثر مسلمانوں کو کانگرس سے سخت مایوسی ہوئی اور وہ اس سے بدظن ہوگئے۔ البتہ مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں مسلمانوں اور علما کا ایک گروہ کانگرس سے وابستہ رہا اور ہندومسلم اتحاد کا حامی رہا۔ اس گروہ میں قید وبند کی صعوبتیں جھیلنے والے اصحاب کی اکثریت تھی۔ ان حضرات میں سے کئی ایک نے نہرو رپورٹ پر بھی تنقید کی اور قائداعظم کے چودہ نکات کی حمایت کی (دیکھیے: The Struggle for Pakistan، ص

۵۵)۔ ۱۹۳۷ء کے صوبائی انتخابات میں بھی جمعیت علماے ہند اور اُس کے ہم خیال گروہوں نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا (دیکھیے: Pathway to Pakistan، ص ۱۵۳)۔

کانگرس کے ان حامی علما نے کانگرسی وزارتوں کی کارکردگی کو بھی ہدف تنقید بنایا۔ خصوصاً واردھا سکیم کے نام سے چلایا جانے والا تعلیمی منصوبہ قابل ترمیم قرار دیا اور مولانا محمد سجاد بہاری نے وزیر تعلیم سید محمود کو ایک احتجاجی مراسلہ بھجوایا (دیکھیے:سید طفیل احمد منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل، لاہور، ب ت، ص ۵۱۴؛ ایچ بی خاں: برصغیر پاک وہند کی سیاست میں علما کا کردار، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۳۴۸، ۳۵۳)۔

ان مسلمان علما کی حمایت اور تعاون کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ کانگریس پر متعصب ہندوؤں کا ہمیشہ غلبہ رہا اور وہ اس کی پالیسیوں پر حاوی رہے۔ کانگریس کی اسی دو عملی نے مسلمانوں کو علیحدہ وطن حاصل کرنے پر مجبور کیا۔

کانگرس تقسیم ملک کے بعد: تقسیم ملک کے بعد بھارت میں کانگرس اقتدار کی مالک بنی اور آئندہ منعقد ہونے والے عام انتخابات میں مسلسل کامیابی حاصل کر کے ۱۹۷۷ء تک حکومت کرتی رہی، مگر اس سال ہونے والے انتخابات میں حزب اختلاف نے کانگرس کو شکست دے کر حکومت بنائی۔ البتہ ۱۹۸۵ء میں ہونے والے انتخابات میں وہ دوبارہ کامیاب ہوکر برسر اقتدار آئی۔ اس کی حکومت ایک عشرے سے زائد تک قائم رہی لیکن اس کے بعد ہونے والے انتخابات میں شکست کھانے کے بعد تاحال حکومت حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوسکی۔

اس جماعت کے طویل عرصۂ اقتدار میں دو سال کے مختصر عرصہ کو چھوڑ کر وزارت عظمٰی نہرو خاندان کے پاس رہی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے دور میں (۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۴ء) مسلمان ریاستوں کشمیر، حیدرآباد دکن اور جونا گڑھ پر فوج کشی کر کے اُن پر جبراً قبضہ کر لیا گیا۔ نہرو حکومت کی غیر حقیقت پسندانہ اور غلط پالیسی کی بنا پر مسئلہ کشمیر ابھی تک تصفیہ طلب چلا آرہا ہے اور اہل کشمیر بھارتی تشدد اور بہیمیت کا نشانہ بنے ہوے ہیں۔ اسی دور میں بھارت نے غیر جانبدار ممالک کی تنظیم میں نمایاں مقام پایا، مگر غیر جانبداری کے نظریئے کی مکمل نفی کرتے ہوے اُس دور کی ایک عظیم طاقت سویت یونین سے دوستی گانٹھ لی اور بعدازاں ۱۹۷۱ء میں اُس کے ساتھ بیس سالہ دوستی اور تعاون کا معاہدہ کر لیا۔ ملک میں سوشلسٹ طرز معیشت رائج کرنے کے لیے کئی اقدامات کیے گئے۔ کانگرسی حکومت سیکولر روایات کی علمبردار ہونے کے باوجود فرقہ واریت خصوصاً ہندو مسلم فسادات پر قابو پانے میں ناکام رہی۔ اس کے دور حکومت میں مسلمان بری طرح عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہوے۔ علاوہ ازیں نہرو حکومت نے اپنے نوزائیدہ ہمسایہ ملک پاکستان کے لیے بے شمار مسائل پیدا کر دیئے اور اس کے ساتھ ساتھ دکھاوے سے کام لیتے ہوے مذاکرات اور گفت وشنید کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ نہرو عربوں کا دوست اور ہمدرد بنا ہوا تھا، مگر ان کے دشمن اسرائیل سے خفیہ طور پر دوستی کی پینگیں بڑھانے کا کام بھی جاری رکھے ہوے تھا۔

لال بہادر شاستری کے دوسالہ عہد وزارت کے بعد پنڈت نہرو کی بیٹی مسز اندرا گاندھی دو مرتبہ بھارت کی وزیراعظم بنی۔ اس کے پہلے دور وزارت میں ملک کو خوراک کی کمی، بے روزگاری اور فرقہ وارانہ فسادات جیسے گھمبیر مسائل نے گھیرے رکھا۔ اس نے ایمرجنسی کا نفاذ کر کے اپنے مخالفین کو دبانے کی کوشش کی۔ ۱۹۶۹ء میں موصوفہ کی آمرانہ ذہنیت نے کانگرس کو دو دھڑوں میں

منقسم کر دیا اور اس کے حکمران دھڑے کو کانگرس (آئی) کا نام دیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں مسز اندرا گاندھی نے پاکستان کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرتے ہوے، اس کے مشرقی بازو کو اس سے علیحدہ کرکے دنیا کے سامنے اپنی امن پسندی، غیر جانبداری اور بقائے باہمی کے فلسفے کا بھانڈہ پھوڑ ڈالا۔ اپنے دوسرے دور وزارت میں مسز اندرا گاندھی نے اپنی سابقہ روش کو جاری رکھا، بھارتی مسلمان انتہا پسند ہندوؤں کی جارحیت کا نشانہ بنتے رہے اور حکومت بھی مسلمانوں کو دبانے میں مصروف رہی۔ اس دور میں خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام شروع کیا گیا، جس میں مردوں کی نس بندی کے ذریعے افراط آبادی کو روکنا بھی شامل تھا۔ مسلمانوں نے اس اقدام کو اپنی نسل کشی تصور کیا کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق اس کا مقصد اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کی آبادی کو بڑھنے سے روکنا تھا۔ ۱۹۸۴ء میں موصوفہ نے ملک کی ایک دوسری اقلیت، یعنی سکھوں کے گولڈن ٹمپل پر فوج کشی کرکے ان کے مذہبی جذبات میں سخت اشتعال پیدا کر دیا جس کے نتیجے میں وہ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں دو محافظ سکھوں کے ہاتھوں قتل ہوگئیں.

مسز اندرا گاندھی کے قتل کے بعد اس کا دوسرا بیٹا راجیو گاندھی وزیراعظم بنا۔ اس کا عہد بھی مسلمانوں کے لیے اچھا ثابت نہ ہوا۔ حکومت پر اس کے مخالفین نے کھل کر بدعنوانی کے سنگین الزامات عائد کیے۔ ۱۹۹۱ء میں راجیو گاندھی کو، ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوے، قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد نرسیماراؤ نے وزارت عظمٰی کا منصب سنبھالا۔ اس کے عہد وزارت میں انتہا پسند ہندوؤں کے ہاتھوں بابری مسجد کا انہدام ہوا۔ اس سانحہ سے ترقی پسند مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اُنہیں ہندوؤں کی اسلام دشمنی کا صحیح احساس اور ادراک ہوا۔ کانگرس کے دور اقتدار میں مسلمانوں کو بہت سے مصائب برداشت کرنا پڑے۔ ان کے مکان جلائے گئے اور بے شمار مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ کانگرسی حکومت کی مزید دوغلی پالیسی کا اس سے اظہار ہوتا ہے کہ ملک کی سول سروس وغیرہ میں بھی مسلمانوں کی تعداد نہایت قلیل رہی ہے خصوصاً اعلٰی اور کلیدی عہدوں پر بہت کم مسلمانوں کو مقرر کیا گیا ہے یا ترقی دی گئی ہے۔ بھارت کی مسلم آبادی سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے، لیکن ان کی کوئی ملک گیر سیاسی تنظیم موجود نہیں ہے۔ تاہم ان میں اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کا احساس موجود ہے۔ اُنہوں نے تقریباً چھتیس ہزار دینی مدارس قائم کررکھے ہیں اور مشکلات اور مسائل کے باوجود وہ ایک بہتر مستقبل کی اُمید رکھے ہوے ہیں.

مآخذ: اُردو کتب: (۱) حبیب احمد، چوہدری: نظریۂ پاکستان، ادارہ نظریۂ پاکستان، لائل پور [موجودہ فیصل آباد]، بار اول، ۱۹۶۹ء؛ (۲) حسن ریاض سید: پاکستان ناگزیر تھا، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی کراچی، طبع پنجم، ۱۹۸۷ء؛ (۳) خان، ایچ۔بی: برصغیر پاک وہند کی سیاست میں علماء کا کردار، قومی ادارہ برائے تحقیق وثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء؛ (۴) رضوی، خورشید مصطفٰی: جنگ آزادی۱۸۵۷ء، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، ۱۹۹۰ء؛ (۵) شیر کوٹی، انوارالحسن: حیات عثمانی، مکتبہ دارالعلوم، کراچی، ۱۹۸۵ء؛ (۶) قریشی، اشتیاق حسین، ڈاکٹر: *The Muslim Commuinty of the Indo-Pak Sub continent*، اُردو ترجمہ موسومہ بہ "برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ" از ہلال احمد زبیری، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۸۷ء؛ (۷) طفیل احمد سید: مسلمانوں کا روشن مستقبل، حماد الکتبی، لاہور، ب ت؛ (۸) مولانا حسین احمد: نقش حیات، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۹ء۔

(ب) انگریزی کتب: (۹) مولانا ابوالکلام، آزاد: India Wins Freedom، Orient longman، حیدر آباد [بھارت]، ۱۹۸۴ء؛ (۱۰) ایس ایم، اکرام: Modern Muslim India and the Birth of Pakistan، شیخ محمد اشرف لاہور، ۱۹۷۰ء؛ (۱۱) خلیق الزماں، چوہدری: Pathway to Pakistan، Longmans green & co، پاکستان برانچ، لاہور، ۱۹۶۱ء؛ (۱۲) سیتاراميا، پی، پٹابھی: The History of the Congress، کانگرس ورکنگ کمیٹی، مدراس، ۱۹۳۵ء؛ (۱۳) شریف الدین پیرزادہ، سید: Foundations of Pakistan، ج۱، نیشنل پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ب ت؛ (۱۴) قریشی، اشتیاق حسین، ڈاکٹر: The Struggle for Pakistan، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۶۹ء.

(ج) دائرہ ہائے معارف وجرائد: (۱۵) انٹرویو ڈاکٹر سید اجتبیٰ ندوی ، ہفت روزہ "زندگی" لاہور، جلد ۱۷، شمارہ ۲۵، ۲ نومبر تا ۸ نومبر ۱۹۹۷ء؛ (۱۶) مقالہ انڈین نیشنل کانگریس: New Age Encyclopaedia (D.A.Girling)، بذیل مادہ انڈیا، ج۱۵، طبع ہفتم.

(ظفر علی)

••--------------••

⊗ انسان: (ع) مادہ،ا۔ن= س اِنس سے بمعنی آدمی۔ (مذکر اور مؤنث)، لفظ انس اگر بمعنی موانست والفت ہو تو یہ نفرت ووحشت کی ضد ہے اور اگر انس بمعنی آدمی ہو تو یہ جن کی ضد ہے(الراغب الاصفہانی: معجم مفردات لالفاظ القرآن، بذیل مادہ)۔ اِنسیؔ سے مراد انسان سے منسوب کوئی شے ہے، مثال کے طور پر "اِنسی الدابہ" سے مراد سواری کا وہ حصہ ہے جو سوار سے متصل ہو اور "اِنسی القوس" سے مراد کمان کا وہ حصہ ہے جو تیر انداز کے قریب ہوتا ہے۔ بعض اوقات عورت کو "انسانہ" بھی کہا جاتا ہے (محمد فرید وجدی: دائرۃ معارف القرن العشرين، ۱:۶۹۸)۔ انس کی جمع اناسی ہے، قرآن مجید میں ہے: لِنُحْيِيَ بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا وَنُسْقِيَهُ مِمَّا خَلَقْنَا اَنْعَاماً وَّاَنَاسِيَّ كَثِيراً (۲۵[الفرقان]:۴۹) "یعنی تاکہ ہم اس سے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کریں اور پھر اُسے بہت سے چوپایوں اور آدمیوں کو، جو ہم نے پیدا کیے ہیں، پلاتے ہیں۔" انسان کو انسان اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ اور قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے (راغب الاصفہانی، ص ۲۴)۔ اسی لیے جدید دور میں انسان کی تعریف ایک معاشرتی حیوان (Social animal) سے کی جاتی ہے۔ ابن منظور الافریقی کے مطابق انسان اصل میں انسیان تھا، اس کی تصغیر انیسیان (چھوٹا سا آدمی) ہے، جو شاذ اور غیر قیاسی ہے (دیکھیے لسان العرب، بذیل مادہ)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ انسان کو اس لیے انسان کہا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے (اپنی اطاعت کا) عہد لیا تھا، مگر وہ اپنا یہ عہد بھول گیا، گو ان کے خیال میں انسان کا مادہ نسیان ہے، چنانچہ ابومنصور لغوی کا خیال ہے کہ انسان کا لفظ اصل میں انسیان (جو بروزن افعلان) تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول اس کے لیے حجت ہے، اس سے حرف "یا" حذف کر دی گئی اور اس طرح انسان بن گیا (لسان العرب ، بذیل مادہ)۔ دوسرے قول کی رو سے یہ لفظ انسیان مادہ انس ہے بروزن حرصیان سے (تاج العروس، بذیل مادہ)۔ حرصیان جانور کی اوپر والی کھال کو کہا جاتا ہے۔ الجوھری نے لکھا ہے کہ لفظ انسان فعلان کے وزن پر ہے اور شروع سے ہی اسی طرح ہے اور تصغیر کی صورت میں، اس میں حرف "یا" کا اضافہ اسی طرح کیا جاتا ہے جس طرح رجل کی تصغیر رویجل آتی ہے۔

اِنسؔ لوگوں کی جماعت کو کہتے ہیں اور اس کی جمع

اناس آتی ہے۔ تاہم بعض اوقات انس بھی مستعمل ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے: وقد تری بالدار یوماً انساً (آج مکان میں بہت سے لوگ نظر آ رہے ہیں، لسان العرب، بذیل مادہ)۔ اَنس (نون پر زبر کے ساتھ) کے معنی مقیم قبیلہ کے ہیں۔ انسان کی جمع اناس ہے، قرآن مجید میں واحد اور جمع دونوں طریقے سے اس کا استعمال ہوا ہے (دیکھیے محمد فؤاد عبدالباقی: معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، بذیل مادہ)۔

۲۔ قرآن مجید میں: قرآن حکیم میں لفظ انسان کا بکثرت استعمال ہوا ہے اور مختلف ترکیبوں کی صورت میں، اس استعمال کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: (۱) تخلیق انسانی اور (۲) صفات انسانی: دونوں کی تفصیل اس طرح ہے۔

(۱) انسان کی عجیب وغریب طریقے سے تخلیق، قرآن حکیم کا ایک اہم موضوع ہے، مثال کے طور پر ایک جگہ فرمایا، انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے (۴[النسآء]:۲۸)۔ انسان کی تخلیق بجنے والی مٹی یا کھنکھناتے اور سڑے ہوے گارے سے ہوئی، جب کہ جنات کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا گیا (۱۵[الحجر]:۲۸، نیز ۵۵[الرحمان]: ۱۴)۔ انسان کو نطفے سے بنایا گیا ہے (۱۶[النحل]:۴)۔ دوسری جگہ فرمایا کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے (سلالہ) سے پیدا کیا ہے۔ پھر اسے ایک مضبوط (اور محفوظ) جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا، پھر نطفے کا لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا دیا، پھر اس کو نئی شکل وصورت میں بنایا (۲۳[المؤمنون]:۱۲۔۱۴)۔ ان تخلیقی مراحل کا سورۃ الحج میں اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ ذکر آیا ہے۔ جہاں ارشاد ہے:'' لوگو! اگر تم کو (مرنے کے بعد) جی اٹھنے میں کچھ شک ہو، تو ہم نے تم کو (پہلی بار بھی تو) پیدا کیا تھا (یعنی ابتدا میں) مٹی سے پھر اسے نطفہ بنایا، پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر پھر اس سے بوٹی بنائی، جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی، پھر ایک میعاد مقرر تک رحم مادر میں ٹھہراے رکھا، پھر اسے ''بچہ'' بنا کر نکالا ...... تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو، پھر کچھ لوگ بڑھاپے سے قبل فوت ہوجاتے ہیں اور کچھ لوگ (بڑھاپے کی) نہایت خراب عمر کو پہنچ جاتے ہیں کہ بہت کچھ جاننے کے بعد بالکل بے علم ہو جاتے ہیں (۲۲ [الحج]:۵)۔ امام فخر الدین رازیؒ ان مراحل تخلیق کی تشریح یوں کرتے ہیں: انسان منی کے ایک قطرے سے پیدا ہوتا ہے، جو معروف غذاؤں سے بنتا ہے۔ یہ غذا یا تو حیوانی ہوتی ہے یا نباتاتی مؤخرالذکر غذا نباتات پر مبنی اور اس سے متولد ہوتی ہے اور نباتات مٹی سے اُگتی ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ہم نے انسان کو مٹی سے بنایا درست ہے (الرازی: تفسیر،۶:۲۱۱) انسان منی کے ایک خلاصہ (سلالۃ من طین) سے پیدا ہوتا ہے۔ بعدازاں یہ خلاصہ تشکیل کے مختلف مراحل اور ارتقائی ادوار سے مسلسل گزرنے کے بعد منی (نطفہ) کی شکل اختیار کر لیتا ہے (الرازی: تفسیر،۶:۲۱۱) جہاں تک قرآن مجید کے اس ارشاد کا تعلق ہے کہ ہم اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا دیتے ہیں (۲۳ [المؤمنون]: ۱۴)، تو امام رازی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی مخلوق بنا دیا جو پہلی مخلوق سے الگ ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک زندہ مخلوق بنایا جب کہ وہ بے جان (جامد) شے تھا۔ اسے بولنے کی قوت عطا کی جب کہ وہ پہلے گونگا تھا۔ اُسے سننے کی صلاحیت عطا کی جب کہ وہ بہرہ تھا، اُسے دیکھنے والا بنایا، حالانکہ وہ اندھا تھا، اس طرح انسان کے ریشے ریشے اور عضو عضو میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا ایک ایسا عجوبہ ہے

جس کی وضاحت موزوں طریقے پر ممکن ہے اور نہ تشریح (الرازی: تفسیر، ۶:۲۷۵۔ ۲۷۶)۔ امام رازی نے "ارذل العمر" (۲۲ [الحج] :۵) کی تشریح یوں کی ہے: خیالات میں خلل آجاتا ہے۔ سماعت، بصارت اور عقل زائل ہونے لگتی ہے، قوت جواب دے جاتی ہے اور انسان اعمال صالحہ کی انجام دہی سے بھی قاصر ہو جاتا ہے (الرازی: تفسیر کبیر، ۶:۲۱۳).

انسان کی تخلیق سب سے عمدہ شکل وصورت میں ہوئی، پھر اپنے اعمال کی بنا پر اسے (رفتہ رفتہ) پست سے پست کر دیا (۹۵[التین]:۴).

انسان اول، حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا بھی قرآن حکیم میں تفصیلاً ذکر آیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا ڈھانچہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور پھر اس میں اپنی روح پھونک دی تو وہ زندہ ہوگئے (۳۸ [ص]:۷۲) [نیز رکّ بہ آدم]۔ انسان کی تخلیق کے متعلق قرآن حکیم کے مذکورہ بیانات کا سائنسی انداز میں بھی جائزہ لیا گیا تو ان کی صداقت ہر شک وشبے سے بالاتر نکلی (دیکھیے موریس بوکالیے:بائبل، قرآن اور سائنس، اردو ترجمہ، کراچی).

(۲) انسانی عادتیں اور صفات: انسان کی تخلیق ہی کی طرح، اس کی عادتیں اور اس کے اطوار بھی قرآن حکیم کا ایک اہم موضوع ہیں اور انسانوں کی بہت سی عادتوں کو ان کی تخلیق (فطرت ، جبلت) کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر بتایا گیا کہ "انسان" بہت جلد باز ہے اور وہ اپنے اعمال کا بدلہ فوری اور جلدی چاہتا ہے (۱۷[الاسرآء]:۱۱؛ ۲۱[الانبیآء]: ۳۷)، وہ جلد مایوس ہوجانے والا اور ناشکرا ہے (۱۱[ھود]:۹)۔ جب اللہ تعالیٰ اس پر اپنی کوئی نعمت نازل کرتا ہے تو وہ اپنا پہلو پھیر لیتا ہے اور جب اُسے کوئی برائی یا تکلیف پہنچتی ہے تو وہ سخت مایوس ہوجاتا ہے (۱۷[الاسرآء]:۸۳)۔ جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ معبودان باطلہ کو بھلا کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو پکارنے لگتا ہے، لیکن جب اس سے مصیبت دور ہوجاتی ہے تو وہ دوبارہ ناشکرے پن پر اتر آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے (۱۷[الاسرآء]:۶۷)۔ انسان بہت تنگ دل ہے اگر اللہ تعالیٰ اسے اپنے خزانوں کا مالک بنا دیتا، تو وہ اس بنا پر کہ کہیں یہ ختم نہ ہوجائیں ان کی راشن بندی کر دیتا (۱۷[الاسرآء]:۱۰۰)۔ انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے (۱۸[الکہف]:۵۴) انسان ظالم اور جاہل ہے (۳۳ [الاحزاب]:۷۲)، انسان بڑا متمرد (سرکش) ہے اور جب وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں پاتا ہے تو وہ اس سے بے نیازی دکھاتا ہے (۹۶[العلق]:۶۔۷)۔ انسان سخت خسارے اور گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہے (۱۰۳ [العصر]:۲).

(۳) آخرت سے متعلقہ امور میں بھی لفظ انسان کا بکثرت ذکر آیا ہے حق تعالیٰ نے ہرانسان کے اعمال کو (بصورت کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے دن اسے وہ کتاب نکال کر دکھا دی جائے گی، جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا (۱۷[الاسرآء]:۱۳)۔ انسان آخرت اور معاد، یعنی دوبارہ زندگی کو ناممکن خیال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "جب میں مرجاؤں گا تو کیا زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔ کیا انسان کو یہ یاد نہیں ہے کہ ہم اسے پہلے بھی تو پیدا کرچکے ہیں اور (اس وقت) وہ کچھ بھی نہ تھا (۱۹[مریم]:۶۶۔۶۷)۔ ایک دوسری جگہ فرمایا: بے شک انسان پر زمانے میں ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ جب وہ کوئی بھی قابل ذکر شے نہ تھا، ہم نے انسان کو نطفہ مخلوط سے پیدا کیا تاکہ ہم اسے آزمائیں، پھر ہم نے اسے سنتا

اور دیکھتا بنا دیا (۷۶:[الدھر]:۱۔۲)۔ دراصل انسان احتساب اور جزاء وسزا سے راہ فرار اختیار کرنا چاہتا ہے، لیکن اسے یوں ہی نہیں چھوڑا جائے گا، بلکہ اس کا احتساب کیا جائے گا (۷۵:[القیامۃ]:۳۶)۔ الغرض آخرت یا قیامت کے متعلق انسان کے دل میں جو بھی شکوک وشبہات تھے، قرآن کریم میں ان کا بھرپور طریقے سے ازالہ کیا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ قیامت برحق ہے اور اس کے وقوع میں کسی بھی قسم کی شک وشبہے کی گنجائش نہیں ہے.

انسان کی جمع اناس اور اناسی ہے۔ قرآن حکیم میں مختلف واقعات کے ضمن میں ان دونوں الفاظ کا بھی استعمال ہوا ہے، مگر زیادہ تر شخصی حالات کے تناظر میں (دیکھیے محمد فؤاد عبدالباقی: معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، بذیل مادہ).

(ج) احادیث مبارکہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ میں بھی انس، انسی، انسان اور اناس وغیرہ کے الفاظ بکثرت استعمال ہوے ہیں (دیکھیے A. J. Wensinck: معجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی، بذیل مادہ انس)۔ مثال کے طور پر ایک موقع پر اپنی بعثت کا ذکر کرتے ہوے آپ نے فرمایا: وکان النبی یبعث الی قومه خاصةً وبعثت الی الناس عامةً (البخاری، مطبوعہ دارالسلام، لاہور، کتاب التیمم، باب ۱، حدیث:۳۳۵)، یعنی مجھ سے پہلے انبیاءؑ کو ایک قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مجھے تمام لوگوں کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا: من لا یرحم الناس لا یرحمه اللہ (الترمذی، کتاب البر، باب ۱۶، حدیث ۱۹۲۲)، یعنی جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ بھی اس پر رحم نہیں کرتا۔ دوسری جگہ ہر انسان کی فطرت پر تخلیق کا ذکر کرتے ہوے فرمایا: "ہر انسان کو اس کی ماں فطرت پر جنم دیتی ہے اور اس کے بعد اس کے والدین اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں اور اگر وہ مسلمان ہوں تو بچہ مسلمان رہتا ہے (مسلم، کتاب القدر، باب ۳۵، حدیث ۶۷۶۱، مطبوعہ دارالسلام)۔ انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اور اس پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے ہر جوڑ کی طرف سے صدقہ دے۔ صحابہؓ نے کہا۔ یارسول اللہ! اس کی بھلا کون طاقت رکھتا ہے؟ فرمایا: اگر مسجد میں کھنگار لگا ہو اس کو زمین میں دبا دینا اور کسی تکلیف دہ شے کو راستے سے ہٹا دینا صدقہ ہے اور اگر تجھے کچھ اور نہ ملے تو چاشت کی دو رکعتیں تیرے لیے کافی ہیں (ابوداؤد، کتاب الادب، باب ۱۵۹، حدیث ۵۲۴۲)۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: زمین کسی شخص کو مقدس نہیں بناتی، انسان کو صرف اس کے اعمال ہی مقدس بناتے ہیں (مالک بن انس: المؤطا، کتاب الوصایا، باب ۷)۔ بعض روایات میں انسانوں کی تخلیق کا بھی ذکر آیا ہے (دیکھیے نیچے)، جبکہ انسانی صفات اور اخلاق پر بھی، احادیث روشنی ڈالتی ہیں (دیکھیے مآخذ)، احادیث نبویہ میں انسی کا استعمال بھی ملتا ہے (دیکھیے ابوداؤد، کتاب فضائل القرآن، باب ۱۴).

۴۔ انسان کے لیے متبادل الفاظ بشر اور آدمی (انگریزی Human) وغیرہ ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ انسان جسم کو کہا جاتا ہے، یا روح کو یا دونوں کے مجموعے کو۔ نامور فلسفی اور مفسر قرآن امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر مفاتیح الغیب میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۵ کے تحت اس عنوان پر بڑی مفصل بحث کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "جب کوئی شخص انا (میں) کہہ کر کسی کو اپنے متعلق بتاتا ہے تو اس "انا" (یا "میں") سے، کیا مراد ہے؟ یہاں پانچ احتمال ہیں: اول یہ کہ: انسان "جسم" کا نام ہے، دوم یہ کہ انسان عرض (وصف) سے عبارت ہے، سوم یہ کہ ان دونوں کے مجموعے کا اور چہارم ان دونوں کے علاوہ کسی اور شے کا نام ہے اور پنجم یہ کہ وہ ایسی شے

ہے جو ان دونوں (جسم اور عرض) سے مرکب ہے۔

جہاں تک تو اس احتمال کا تعلق ہے کہ انسان محض ''جسم'' سے عبارت ہے تو اس کی پھر تین صورتیں ہوں گی: پہلی یہ کہ انسان اسی مخصوص جسم کو کہا جاتا ہے جو ہمیں نظر آتا ہے یا پھر وہ جسم جو اس کے اندر پوشیدہ ہے، یا وہ جسم جو اس سے الگ اور خارج ہے۔ یہ نظریہ کہ انسان اسی مخصوص جسم کا نام ہے جو ایک مخصوص اور محسوس ہیئت رکھتا اور ہمیں نظر آتا ہے، جمہور متکلمین کا قول ہے (الرازی: مفاتیح الغیب، ۵، ۶۴۳ مطبوعہ بیروت بدون تاریخ)، لیکن یہ قول اس لیے درست نہیں ہے کہ انسانی جسم، نمو، کمزوری، موٹاپے اور کسی عضو بڑھنے یا گھٹ جانے وغیرہ کی صورت میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور چونکہ جسم کا جو حصہ کم ہوجاتا یا گھٹ جاتا ہے، وہ موجودہ جسم سے مختلف ہے، اس لیے قطعی طور پر نظر آنے والے جسم کو انسان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ علاوہ ازیں ہر شخص اپنے جسم کے مختلف اعضا کی خود سے نسبت کرتا ہے، مثلاً وہ کہتا ہے: میرا سر، میرا ہاتھ، میرا پاؤں وغیرہ، جس سے معلوم ہوا کہ ''انسان'' تو وہ ہے جو یہ حکم لگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ یہ میرا سر ہے، یا یہ میرا جسم اور میرا بدن ہے اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ''مضاف'' (منسوب کی جانے والی سے) ''مضاف الیہ'' (جس سے اسے منسوب کیا جارہا ہو) سے مختلف ہوتی ہے، ثابت ہوا کہ ان دونوں میں واضح طور پر فرق ہے۔ علاوہ ازیں بعض اوقات انسان زندہ ہوتا ہے، مگر اس کا جسم مردہ ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (۳[آل عمران]:۱۶۹)، یعنی اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں مارے گئے، ان کو مرے ہوے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوے نہیں ہیں)، بلکہ وہ اللہ کے ہاں زندہ ہیں اور ان کو رزق مل رہا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا: اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَّيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (۴۰[المؤمن]:۴۶)، یعنی آتش (جہنم) کہ صبح وشام وہ اس کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور جس روز قیامت برپا ہوگی (حکم ہوگا) کہ فرعون والوں کو سخت عذاب میں داخل کر دو۔ ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ انسانی جسم اور انسانی بدن دو مختلف اشیا ہیں۔ علاوہ ازیں دنیا کے تمام اہل مذاہب، مثلاً یہود ونصاریٰ، مجوسی اور مسلمان وغیرہ اپنے مردہ عزیزوں کی طرف سے صدقہ وخیرات دیتے اور ان کے لیے دعائیں کرتے ہیں اور اگر جسم کے مرنے کے بعد وہ کسی نہ کسی درجے میں زندہ نہیں ہوتے تو ان تمام لوگوں کا یہ فعل مکمل طور پر عبث تصور ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ''انسان'' نہ تو کوئی جسمانی شے ہے اور نہ ہی وہ قابل محسوس ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی اصلیت اس کی ظاہری سطح اور رنگت سے مختلف ہے اور جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ تو اس کا ظاہری جسم اور رنگ ہے، اس کی اصلیت نہیں۔ اس سلسلے میں امام الرازیؒ نے سترہ دلائل پیش کیے ہیں (دیکھیے تفسیر کبیر، ۵: ۶۴۶)۔ کچھ لوگ اسے ایسی شے قرار دیتے ہیں جو غیر محسوس ہے اور وہ نظر آنے والے جسم سے مختلف ہے۔

اس اجمال کی مزید تفصیل اس طرح ہے کہ ان میں سے کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انسان یا تو اس عالم سفلی میں موجود اجسام چار عناصر میں سے کوئی ایک عنصر ہوگا۔ یا پھر ان کے باہمی اختلاط سے تشکیل پذیر ہوا ہوگا اور یہ بات ناممکن ہے کہ انسانی جسم مکمل طور پر عناصر اربعہ میں سے صرف ایک عنصر پر مشتمل ہو، لہٰذا لا محالہ طور پر انسانی جسم عناصر اربعہ سے متولد تصور ہوگا۔ اس کی پھر درج ذیل صورتیں ہیں: اول یہ کہ وہ ان اجزا سے

عبارت ہے جن پر مٹی والے عنصر کا غلبہ ہے۔ یہ ٹھوس جسم والے اجزا ہیں جیسے ہڈیاں، گوشت، چربی اور اعصاب وغیرہ۔ انسان کے متعلق یہ قول کہ جسم کی ان اشیا کو انسان کہا جاتا ہے، دنیا کے کسی بھی ذی عقل شخص نے اختیار نہیں کیا.

دوم یہ کہ جسم کے وہ حصے جن میں آبی عنصر کا غلبہ ہے، جس سے "اخلاط اربعہ" (بلغم، سودا، صفراء اور خون وغیرہ) مراد ہیں، تو کیا انہیں انسان قرار دیا جائے؛ تو یہ بھی درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے خون کے سوا کسی کے متعلق یہ خیال نہیں ہے کہ وہی روح ہے۔ خون کے متعلق بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ خون ہی اصل میں "روح" ہے، کیونکہ اگر جسم سے خون زیادہ مقدار میں نکل جائے تو انسان کی موت واقع ہوجاتی ہے.

رہے جسم کے ایسے حصے جن پر ہوا اور آگ کے عناصر کا غلبہ ہے، تو بعض لوگوں کا خیال ہے، ایسے اجزا ہی روح ہیں۔ پہلی قسم ہوائی اجسام کی ہے جو حرارت غریزیہ کے ساتھ مخلوط اور اس سے پیدا شدہ ہیں۔ یہ یا تو قلب میں ہیں، یا دماغ میں۔ بعض علما نے انہی کو روح کہا ہے اور یہ کہ وہی انسان ہیں، مگر بعدازاں ان کے مابین اختلاف ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ روح ایسے اجزا کا نام ہے جو انسانی قلب میں ہیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ ان دماغی اجزا سے عبارت ہے جو ناقابل تقسیم ہیں۔ جب کہ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ انسانی روح ان حرارت آمیز اجزا سے عبارت ہے جو ان قلبی اور دماغی اجزا کے ساتھ مخلوط ہیں، اور یہی حرارت آمیز اجزا، جو "حرارت غریزیہ" کہلاتے ہیں، انسان ہیں.

جبکہ بعض علما کا یہ کہنا ہے کہ روح ان نورانی، سماوی اور لطیف جوہر والے اجزا کا نام ہے، جو سورج کی شعاعوں کی طرح انسانی جسم میں حلول کرتے ہیں اور یہ اجزا مزید، تبدیلی و تقسیم اور تفریق وغیرہ کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ جب انسانی جسم ایسا ہو کہ اس میں روح کو قبول کرنے کی استعداد پائی جائے، تو یہ قابل احترام علوی اجسام "بدن کے داخلی حصے میں سرایت کر جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح کوئلے میں آگ اور پھول میں خوشبو سرایت کرتی ہے اور ارشاد باری تعالیٰ: فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي (۱۵:[الحجر]:۲۹)، یعنی"اور جب میں اس کو انسانی صورت میں درست کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں" میں یہی مراد ہے۔ پھر جب تک بدن صحیح وسالم ہو اور اس میں "اجسام مبارکہ" کو قبول کرنے کی اہلیت موجود رہے تو وہ زندہ رہتا ہے اور اگر جسم میں کوئی ایسا سخت عارضہ (مرض) پیدا ہو جائے، جو ان اجسام کے جسم میں نفاذ کو روکنے کا باعث ہو، تو یہ اجسام جسم سے الگ ہوجاتے ہیں اور بندے کی موت واقع ہوجاتی ہے، یہ مسلک سب سے زیادہ قوی ہے جس پر ضرور غور کرنا چاہیے.

ایک اور احتمال یہ ہے کہ "انسان" ایک ایسی حقیقت سے عبارت ہے، جو انسانی جسم سے باہر ہے اس کا کوئی شخص بھی قائل نہیں ہے.

دوسری صورت یہ ہے کہ "انسانی" جسم میں موجود کسی عرض (وصف وغیرہ) کو انسان قرار دیا جائے تو اس کا بھی کوئی عقل مند شخص قائل نہیں ہے، اس لیے کہ انسان کی اس کے علم، قدرت، تدبیر اور تصرف وغیرہ کے ذریعے تعریف کی جاتی ہے اور ایسی صفات کا حامل فرد محض عرض (محض وصف) نہیں ہوسکتا ہے، یہ صفات انسان کی ذات کا حصہ ہیں، البتہ ہر عقل مند شخص یہ ضرور سمجھتا ہے کہ انسان وہ ہے جو مختلف اعراض (صفات) سے موصوف ہو، اس بارے میں علما کے درج ذیل اقوال ہیں:

اول: یہ کہ عناصر اربعہ، جب ایک دوسرے سے مل

جائیں اور ایک عنصر دوسرے عنصر کی صورت اختیار کر لے تو اس سے ایک معتدل کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، جسے ''مزاج'' کہا جاتا ہے۔ اس مزاج کے درجات لامتناہی ہیں۔ ان میں سے بعض انسانی ہیں، بعض فرسی (گھوڑے) والے۔ جہاں تک انسانی مزاج کے درجات کا تعلق ہے تو یہ ایسے اجسام ہیں جو ایک خاص مقدار میں مخصوص کیفیات کے حامل اجزاے عناصر کے ایک دوسرے کے ساتھ ملنے (امتزاج) سے عبارت ہیں، یہی جمہور اطبا، نفس کے منکر لوگوں اور معتزلہ میں سے ابوالحسن وغیرہ کا مسلک ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ''انسان'' ایسے اجسام کا نام ہے جو حیات، علم اور قدرت کی صفات سے موصوف ہیں اور یہ حیات (زندگی) ایک ایسا عرض (وصف) ہے جو انسانی جسم کے ساتھ قائم ہے۔ اس مسلک کے حامل لوگ روح اور نفس دونوں کے منکر ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ انسان صرف ایسے مرکب اجسام کا نام ہے جو ان صفات کے ساتھ موصوف ہوں؛ یہی اکثر معتزلی مشائخ کا مسلک ہے؛ تیسرا قول یہ ہے کہ انسان بے شک ایسے اجسام کا نام ہے جو حیات، علم اور قدرت کے ساتھ موصوف ہوں، مگر انسان اپنی خاص شکل، اپنے اعضا اور اجزا کی خاص بناوٹ ووضع کی بنا پر دوسرے جانداروں سے ممتاز ہے، لیکن یہ قول اس لیے درست نہیں کہ بعض اوقات فرشتے بھی انسانی شکل وصورت میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی انسانوں کی شکل مسخ ہوجاتی ہے، لہٰذا شکل اور صورت کا اعتبار درست نہیں ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ انسان نہ تو جسم ہے اور نہ ہی جسم رکھنے والی کوئی (جسمانی) شے ہے۔ یہ قول فلاسفہ میں سے الٰہیین کا قول ہے، جو نفس انسانی کی بقا اور اس کے لیے روحانی معاد، ثواب اور روحانی سزا وغیرہ کا اثبات کرتے ہیں اور انسان کو ایک غیر جسمانی شے قرار دیتے ہیں۔ مسلمان فلسفیوں کی ایک جماعت کا بھی، جس میں امام راغب الاصفہانی، امام غزالی اور قدیم معتزلہ، مثلاً معمر بن عبادالسلمی اور اہل تشیع میں سے شیخ مفید اور کرامیہ میں سے ایک جماعت شامل ہے، یہی قول ہے، بہت سے صوفیاے کرام کا بھی، جو صاحبان ریاضت اور صاحبان مکاشفہ ہیں، یہی خیال ہے(الرازی، تفسیر، ۵:۶۴۸)یہ لوگ گویا ''نفس انسانی'' کو انسان قرار دیتے ہیں.

پھر جو لوگ نفس کا اثبات کرتے ہیں ان کے دو گروہ ہیں۔ ان میں سے پہلا گروہ محققین کا ہے جن کا خیال یہ ہے کہ انسان ایک خاص جوہر اور بدن (دونوں) سے عبارت ہے۔ اس اعتبار سے انسان اس کائنات کے اندر ہے اور نہ اس سے باہر اور نہ اس سے متصل ہے اور نہ اس سے الگ، لیکن اس کا انسانی جسم سے تدبیر اور تصرف والا تعلق ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا اس کائنات سے تدبیر اور تصرف کا تعلق ہے.

دوسرے گروہ کا یہ خیال ہے کہ جب نفس کا انسانی بدن سے تعلق قائم ہوتا ہے، تو وہ بدن کی صورت اختیار کر لیتا ہے چنانچہ اب نفس عین بدن اور بدن عین نفس بن جاتا ہے اور ان دونوں (نفس اور بدن) کے باہمی ملاپ کے وقت، یہ مجموعہ انسان کہلاتا ہے۔ پھر جب موت کا وقت آتا ہے تو ان دونوں کا یہ باہمی اتحاد ختم ہوجاتا ہے اور نفس باقی رہ جاتا ہے، جب کہ بدن خراب اور فاسد ہوجاتا ہے(الرازی، ۵:۶۴۸).

معروف مسلمان محقق ثابت بن قرہ بھی نفس کا ''قائل'' تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ''نفس انسانی'' آسمانی اجسام کے ساتھ متعلق ہے، جو کہ نورانی اور لطیف اجسام ہیں اور کون وفساد اور تفریق و تقسیم کو قبول کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور یہ اجسام انسانی جسم میں سیال طریقے پر

متحرک رہتے ہیں اور جب تک ان کا یہ تعلق باقی ہے نفس انسانی بدن کی تدبیر کرتا رہتا ہے اور جب ان لطیف اجسام کا جسم سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے تو نفس کا انسانی بدن سے تدبیر وتصرف کا تعلق بھی ختم ہوجاتا ہے۔ (تفسیر مفاتیح الغیب) (آگے امام رازیؒ نے نفس کا اثبات کرنے والوں کے عقلی دلائل دیئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود امام رازیؒ بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے (دیکھیے تفسیر الرازی، ۵:۲۴۸)۔ اسی طرح انہوں نے اس بات پر بھی دلائل دیئے ہیں کہ نفس جسم نہیں ہے (۵: ۶۵۴۔ ۶۵۵)۔

بعض صوفیا کا خیال ہے کہ انسان اسی "جامع کون" کا نام ہے ...... شیخ کبیر اپنی کتاب الفکوک میں لکھتے ہیں کہ حقیقی انسان وجوب اور امکان کے مابین ایک بزرخ (رکاوٹ) کی حیثیت رکھتا ہے اور صفات قدوم ، اس کے احکام اور صفات حادث کے لیے ایک جامع آئینہ ہے اور وہ حق اور اس کی مخلوق کے مابین ایک واسطہ ہے اور اسی کے ساتھ اور اسی کے مرتبہ سے حق کا فیضان اور اس کی امداد پہنچتی ہے اور حق کے سوا تمام عالم کی، خواہ وہ علوی ہو، یا سفلی ان کی بقا کا ذریعہ ہے اور اگر "انسان کامل" برزخیت کے طور پر درمیان میں موجود نہ ہو جو دونوں اطراف کے لیے مغایرت والا واسطہ نہیں ہے تو ہمارا یہ عالم اللہ تعالیٰ کی طرف سے امداد قبول نہ کرسکے گا، اس لیے کہ دونوں میں کوئی مناسبت اور ارتباط نہیں ہے (التھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون ، ۱:۷۶۔۷۷)۔

اخوان الصفا [رک بآں] نے ان قرآنی آیات کی روشنی میں اپنے نظام فکر کے اندر رہتے ہوئے انسان کے بارے میں کچھ نظریات پیش کیے ہیں، جو مادی اور اخلاقی دونوں نقطہ ہائے نگاہ پر مبنی ہیں۔ ان کے خیال میں انسان کا نام اس روح پر لاگو ہوتا ہے جو انسانی جسم میں مقیم ہے۔ انسان کے یہ دونوں حصے (روح، جسم) یکجا ہوتے ہیں تو ان دونوں کا مجموعہ اتحاد انسان کہلاتا ہے، لیکن ان دونوں میں روح زیادہ وقیع ہے۔ یہ گودے کی مانند ہے اور جسم کھال کی طرح ہے...... روح درخت کی طرح ہے اور جسم پھل اور اس کے ثمر کی طرح (رسائل اخوان الصفا، ۲۱: ۳۱۹:۲، وبعد، قاہرہ، مطبوعہ، ۱۳۹۸ء)۔ درحقیقت روح کا کام یہ ہے کہ وہ جسم کو اس کی کامرانی دے۔ جسم روح کے لیے کاریگر کی ورکشاپ کی طرح ہے ...... انسان ایک جہان اصغر (عالم اصغر) ہے جب کہ عالم ایک اچھا زیر تسلط شہر (المدینۃ الفاضلۃ) ہے جس کی حکمرانی روح کے ہاتھ میں ہے۔

اس سے اگلے رسالے میں مہینوں اور سیاروں کے اثرات کے مطابق انسانی جنین کے ارتقا پر بحث کی گئی ہے۔ پہلے ماہ میں زحل کے اثرات کے تحت جس کی خاصیت اشیا کو مادی شکل دینا ہے، اس میں نطفہ رحم میں قرار پاتا ہے۔ دوسرے ماہ میں مشتری کی روحانی قوتوں کے غالب اثر کے تحت "علقہ" میں حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس میں اخلاص کا توازن پیدا ہوتا ہے، تیسرے ماہ میں مریخ کے زیر اثر علقہ زیادہ قوت سے حرکت پکڑتا ہے اور بہت زیادہ حرارت پیدا کر لیتا ہے جو اسے تبدیل کر دیتی ہے۔ چوتھے ماہ میں سورج اس ارتقائی عمل میں رہنمائی فراہم کرتا ہے، اس کی روحانی قوتیں مضغہ پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اس میں حیوانی روح پیدا ہوجاتی ہے۔

پانچویں ماہ میں زہرہ کے زیر اثر جسم کی تخلیق اور اس کی تعمیر وساخت مکمل ہوتی ہے۔ چھٹے مہینے میں عطارد کی روحانی قوتیں جنین کو اپنے بازو اور ٹانگیں حرکت میں لانے کا اہل بناتی ہیں۔ یہ اپنا منہ اور پپوٹے کھول سکتا ہے۔ ساتویں ماہ میں چاند کے اثرات کے تحت جنین وزن ، گوشت اور موٹاپا حاصل کر لیتا ہے، اس کے جوڑ سخت

اور اس کی حرکات میں قوت آجاتی ہے۔ یہ خود کو مقید محسوس کرتا ہے اور باہر آنے کی کوشش کرتا ہے، اگر باہر نکل آئے تو وہ زندہ رہ سکتا ہے، لیکن اگر وہ آٹھویں مہینے تک رحم مادہ میں رہے تو وہ زیادہ وزنی ہوتا ہے، لیکن اگر اس ماہ میں اس کی پیدائش ہوجائے تو اس کی افزائش کی رفتار سست ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ مردہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ زحل کے اثرات کے تحت آجاتا ہے۔ نویں مہینے میں دوبارہ مشتری کا اثر غالب آجاتا ہے، مزاج متوازن ہوجاتا ہے۔ روحِ رئیسہ زیادہ قوی ہوجاتی ہے ...... اس طرح اس ماہ میں انسان کی تخلیق ہوجاتی ہے (دیکھیے، مقالہ۔آآآ، لائیڈن، بحوالہ رسائل اخوان الصفا)۔

فلاسفہ نے انسان کا مطالعہ روح کی فطرت ، جسم سے اس کے تعلق و حرکت اور محرک عقل اور مادی عقل کے اتحاد کے متعلق یونانی تصورات کے پس منظر میں کیا ہے (دیکھیے الفارابی: السیاسۃ المدینہ، بیروت ۱۹۶۴ء، ص ۳۵)۔

۲۔ جدید نظریات: جدید نظریات میں انسان کو ایک منفرد قسم کا حیوان قرار دیا جاتا ہے۔ علم الحیوان کی رو سے اس کا "فقریۃ الشدیہ" حیوانوں میں شمار کیا جاتا ہے جو دو ٹانگوں سے چلتے ہیں۔ اس کے جسم کی طوالت اوسطاً ۱.۶۰میٹر سے ۱.۸۲ ہوتی ہے (اس سے چھوٹا یا طویل جسم شاذ و نادر ہوتا ہے) اس کی جلد ہلکے بالوں سے ڈھکی ہوتی ہے اور اس کا رنگ مختلف علاقوں میں ، مختلف ہوتا ہے۔

"انسان" پہلے ایک خلیہ (Cell) کی صورت میں "مرد" کے مادہ کے طور پر ہوتا ہے۔ پھر وہ "جنین" کی صورت میں ماں کے شکم میں نو ماہ تک رہتا ہے۔ پانچ ماہ کی عمر سے لے کر دس ماہ کی عمر تک اس کے دانت آنا شروع ہوتے ہیں اور اس طرح اس کے بیس دانت آجاتے ہیں۔ دانتوں کی تبدیلی کا سلسلہ ساتویں برس سے شروع ہوتا ہے اور پرانے دانتوں کی جگہ نئے اور مزید دانت آنے لگتے ہیں حتیٰ کہ اس کا آخری دانت ۲۵ سال کی عمر میں نکلتا ہے ...... اس کی جسمانی نشوونما بیس سال کی عمر تک جاری رہتی ہے۔ پھر وہ ایک جگہ جا کر رک جاتا ہے۔ چالیس سال تک طاقت اور قوت بڑھتی رہتی ہے اور ۵۵ برس کی عمر تک محفوظ رہتی ہے۔ پھر اس میں درجہ بدرجہ کمی آنا شروع ہوجاتی ہے تاآنکہ وہ دنیا سے انتقال کر جاتا ہے۔

اس کی عام طور پر عمر اسی سال ہے، مگر بعض لوگ ۱۰۰ سال کی عمر کو بھی پہنچ جاتے ہیں ...... ارسطو اور دوسرے بہت سے قدیم و جدید مفکرین کا کہنا ہے کہ انسان ایک ایسی مملکت ہے جو بذات خود قائم ہے ...... ایک فلسفی نے مختلف جانداروں کا تجزیہ کرتے ہوے لکھا ہے کہ یوں تو پودے بھی جاندار ہیں اور جانور محسوس کرنے والے جاندار ہیں، مگر انسان محسوس کرنے اور غوروفکر کرنے والا (مفکر) جاندار ہے۔

انسان کی اہلیت کی اصلیت کے بارے میں جدید ماہرین کے تین گروہ ہیں: پہلے گروہ کا خیال ہے کہ انسان کی پیدائش مختلف طبعی عوامل کے فراہم ہو جانے پر اتفاقیہ طور پر ہوئی ...... یہ فرقہ دھریہ ...... یعنی منکرین خدا کا نظریہ ہے، جس کا باطل ہونا از خود ظاہر ہے۔ دوسری جماعت کا خیال ہے کہ انسان ایک مستقل طور پر پیدا کیا گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کی ایک منفرد قسم کی تخلیق ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے براہ راست پیدا کیا ہے اور اسے کسی اور جاندار کے واسطے سے پیدا نہیں کیا، یہ تمام مذاہب کا اور بعض حکماء کا قول ہے اور یہی قول درست ہے۔

تیسرا مسلک یہ ہے کہ انسان جانوروں سے ترقی کر کے اس درجہ تک پہنچا ہے۔ جدید دور میں ڈارون کے

نظریہ ارتقا سے اتفاق کرتے ہوے اکثر سائنس دانوں کا یہی خیال ہے ...... جدید کھدائیوں سے قدیم انسان کے جو ڈھانچے دریافت ہوے ہیں، یہ مسلک ان کے مطالعے اور استقرائی قیاس پر مبنی ہے جو درست نہیں ہے۔

پھر اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ آیا نسل انسانی کا ارتقا ایک مرد اور ایک عورت سے ہوا۔ یا متعدد مردوں اور متعدد عورتوں سے۔ اسلام اور دوسرے آسمانی مذاہب اور بہت سے جدید ماہرین پہلی صورت کا اثبات کرتے ہیں جب کہ دوسری جماعت کا یہ خیال ہے کہ نسل انسانی کئی مردوں اور کئی عورتوں سے وجود میں آئی ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ ہر علاقے کے لوگوں کی رنگت ، ان کا جسم ، ان کی عقل دوسرے علاقے کے لوگوں سے مختلف ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ نسل انسانی کا ارتقا ایک جوڑے سے نہیں ہوا، جیسے کہ جانوروں کے متعلق لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ان کی نسل متعدد جوڑوں سے چلی ہے۔

۳۔ اس دنیا میں انسان کی آبادی کا تخمینہ: یہ امر کہ انسان کی زمین پر آبادکاری کا دور کب شروع ہوا شروع سے ہی مختلف فیہ رہا ہے، ایک مصری حکمران نے دو علما کو جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دو سو سال قبل تک حیات تھے، اس بات پر مامور کیا کہ مصر میں قدیم ترین انسان کی موجودگی کا زمانہ معلوم کریں۔ انہوں نے پینتیس ہزار سال کا تخمینہ لگایا ...... نامور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس نے اس کا اندازہ تینتیس ہزار سال لگایا ہے ...... کلدانی مؤرخ (پیروز) نے، جو تیسری صدی عیسوی تک زندہ تھا، کلدان خاندانوں کی قدیم ترین مدت کا تخمینہ چار لاکھ تیس ہزار سال کا اور حضرت نوح کے طوفان اور سمیری ملکہ بابل کے مابین مدت کا تخمینہ ۳۵ ہزار سال قبل لگایا ہے۔

یہود ونصاریٰ کی کتابیں حضرت عیسیٰ اور طوفان نوح کے مابین تین ہزار تین سو آٹھ برس اور حضرت عیسیٰ اور قدیم ترین انسان کے مابین چار ہزار سال چار (۴۰۰۴) سال کا تخمینہ پیش کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے اس دنیا پر یہ انسان کی عمر ۶۰۰۰ سال کے قریب ہے۔

مگر جدید ماہرین کے مطابق یہ تمام اندازے درست نہیں ہیں، چنانچہ ان کے خیال میں قدیم ترین مصری آثار چار ہزار سال پرانے ہیں، گویا اس وقت تک انسان نے علمی اور سائنسی طور پر اتنی ترقی کر لی تھی جس کا مظاہرہ ان آثار کو دیکھنے سے ہوتا ہے جو وہاں موجود ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہزاروں سال قبل سے اس دنیا پر آباد تھا۔

برٹش رائل سوسائٹی نے مسٹر ہورنز کو اس زمین پر انسانی عمر دریافت کرنے کی ذمہ داری سونپی تو اس نے مصر کی ایک جگہ (عین شمس) کے مطالعہ سے اس زمین پر انسانی عمر کا ۳۰,۰۰۰ سالوں کا اندازہ لگایا۔ امریکہ میں ایک ''کھوپڑی'' دریافت ہوئی ہے جس کی عمر کا تخمینہ ایک لاکھ ۵۸ ہزار چار سو سال ہے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف تخمینے پیش کیے گئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب محض اندازے اور تخمینے ہیں اور حقیقی طور پر انسان کی اس زمین پر آباد کاری کی ابتدا کا کوئی قطعی تخمینہ سامنے نہیں آیا ...... (مزید معلومات کے لیے دیکھیے محمد فرید وجدی: دائرۃ معارف القران العشرین ، ۱:۶۹۹۔ ۷۱۱؛ F.Clark Howell : مقالہ Human ، در Encyclopaedia Americana ، ۱۴: ۵۴۵۔اپن) مزید معلومات کے لیے دیکھیے مآخذ.

مآخذ: (۱) القرآن الکریم، خصوصاً ۲ [البقرہ] :۳۰ تا ۳۱؛ ۱۵ [الحجر]: ۲۶۔۳۳؛ ۱۷ [بنی اسرائیل] ۸۵؛ ۲۲ [الحج] : ۵؛ ۲۳ [المؤمنون]: ۱۲؛۱۵؛ (۲)نیز باامداد اشاریہ محمد فؤاد عبدالباقی: معجم المفھرس لالفاظ القرآن الکریم، بذیل مادہ انسان، بشر، آدم، خلق، وغیرہ.

(ب) کتب تفسیر، خصوصاً (۳) ابو جعفر الطبری (۲۲۴۔ ۳۱۰ھ) جامع البیان فی تاویل آی القرآن، مطبع المیمنیہ، مصر ۱۹۰۰ء؛ خصوصاً بذیل آیات مذکورہ؛ (۴) ابن العربی، محی الدین (۵۶۰۔۶۳۸ھ): تفسیر، مطبوعہ بولاق ۱۲۸۳ھ؛ (۵) ابن کثیر القرشی (۷۰۰۔۷۷۴ھ): تفسیر ابن کثیر، مطبوعہ لاہور؛ (۶) ابوالسعود العمادی (۸۹۸؛ ۱۹۸۲ء): ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم، بولاق ـ ۱۲۷۵۔۱۲۸۵ھ؛ (۷) الخازن البغدادی (۶۷۷۔۷۴۱): لباب التاویل فی معانی التنزیل، مطبع المیمنیہ۔ ۱۳۱۲ھ؛ (۸) الثعالبی، عبدالرحمٰن (۷۸۵۔ ۸۷۵ء): الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن ؛ مطبع الجزائر ۱۳۲۷ھ؛ (۹) الرازی: فخر الدین (۵۴۳۔۶۰۶ھ): تفسیر مفاتیح الغیب، بولاق ۱۲۸۹ھ، خصوصاً ، ۵: ۶۴۸۔ ۶۶۰؛ (۱۰) البغوی ، ابو محمد الحسین بن مسعود (م ، ۵۱۰ھ یا ۵۱۶ھ): معالم التنزیل مطبوعہ مصر ۱۳۳۱ھ؛ (۱۱) قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۳۲۵ھ): التفسیر المظہری مطبوعۂ دہلی ۱۹۵۳ء وغیرہ (بذیل آیات مذکورہ).

(ج) کتب حدیث، خصوصاً (۱۲) امام محمد بن اسماعیل البخاری (۱۹۴۔ ۲۵۶ھ): الجامع الصحیح، مطبوعہ دارالسلام للنشر والتوزیع؛ (۱۳) مسلم بن الحجاج النیسابوری (۲۰۶۔۲۶۱ھ): الجامع الصحیح، مطبوعہ دارالسلام للنشر والتوزیع؛ (۱۴) ابوداؤد ،سلیمان بن اشعث ، الازدی السجستانی (۲۰۲۔ ۲۷۵): السنن ، (مطبوعہ عبدالسلام، مذکور) ؛ (۱۵) ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی (۲۰۰۔۲۷۹ھ): السنن ؛ (مطبوعہ دارالسلام)؛ (۱۶) النسائی ابو عبدالرحمٰن احمد بن اشعث (۲۱۵۔ ۳۰۳): السنن ؛ (مطبوعہ دارالسلام)؛ (۱۷) ابو عبداللہ محمد بن یزید الربعی (۲۰۹۔ ۲۷۳): السنن، بامداد اشاریہ؛ (۱۸) .A. J Wensincik : معجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی، بذیل مادہ انسان، بشر، آدم، خلق، نطفہ، وغیرہ.

(د) کتب لغات وغیرہ: (۱۹) الراغب الاصفہانی (م ۵۰۲ھ) معجم مفردات لالفاظ القرآن ، تحقیق ندیم مرعشلی، بذیل مادہ ہائے، مذکور؛ (۲۰) ابن منظور الافریقی (۶۳۰۔۷۱۱ء): لسان العرب، مطبوعہ بیروت جدید ایڈیشن؛ بذیل مادہ ہائے مذکور؛ (۲۱) مرتضیٰ الزبیدی (۱۱۴۵۔ ۱۲۰۵ء): تاج العروس من شرح جواہر القاموس مطبوعہ الکویت وغیرہ؛ (۲۲) Edward William (۱۸۰۱۔ ۱۸۷۶ء): مدالقاموس ...... مطبوعہ لاہور؛ (۲۳) محمد فرید وجدی: دائرہ معارف القرن العشرین ،مطبوعہ دارالمعرفۃ۔ بیروت، لبنان، المجلد الاول، بذیل مادہ انس، انسان، انسانیہ۔ وغیرہ، ۱: ۶۹۹۔۷۱۱.

ھ۔ جدید کتب: (۲۴) F.clark Howell ، و T.D. white : مقالہ Human Being، در *Encyclopaedia Americana* ۱۴: ۵۴۵ تا ۵۴۵؛ (۲۵) *Encyclopaedia Britamica* ، بذیل مادہ Human ، (۲۶) *Encyclopaedia of Islam* ، لائیڈن، بذیل مادہ؛ انسان؛ (۲۷) Camphell Bernard G. : *Human Evolution* ، بار سوم ۱۹۸۵ء؛ (۲۸) Howell F. Clark : *Early Man*، نظرثانی شدہ طباعت ۱۹۸۰ء؛ (۲۹) Isaac Glynn : *The Archaeology of Human origins* ، کیمبرج ۱۹۹۰ء؛ (۳۰) Poirier.Frank. E : *Under standing Human Evolution* ، بارثانی، ۱۹۹۰ء؛ (۳۱) Wood B.A و دیگر (مدیران): *Major Topics in Primate and Human Evolation* ،کیمبرج ۱۹۹۰ء.

(محمودالحسن عارف)

••-------------••

انسانی حقوق :(Human Right) :حقوق الانسان)※ یہ اصطلاح حال ہی میں استعمال میں آئی ہے، اس کے

مماثل ، فارسی میں حقوقِ انسان اور ترکی میں ''انسان حقوق لری'' ہے.

''انسانی حقوق'' کے مماثل تصورات کا کچھ سراغ فلسفے اور عقائد کے اسلامی ورثے میں ملتا ہے، لیکن ازمنہ وسطیٰ میں انسانی حقوق کا ٹھیک ٹھیک ہم معنی لفظ موجود نہیں ہے، فقہ میں حق العبد، یعنی کسی بندے کے شخصی حق کی درجہ بندی ان معاملات کو جن میں کسی مجرم کے خلاف قانونی عمل ، ضرر یافتہ جماعت یا جماعتوں کے اختیار پر چھوڑ دیا گیا ہے، دوسرے معاملات کے زمرے جو اللہ کے حقوق (حقوق اللہ) کے متعلق ہوتے ہیں، الگ شناخت ہوتے تھے جن میں قانونی کارروائی لازمی ہوتی ہے جو حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے...... فقہ کا ایک حتمی اصول جو جدید حقوق سے مطابقت رکھتا ہے، جائداد کے مالکوں کا یہ حق تھا کہ وہ اپنی ملکیتی اشیاء دخل در اندازی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتے تھے [دراصل اسلام میں انسانی حقوق مختلف درجوں میں شرح سے موجود تھے، ان میں ہمسایوں ، شہریوں، عام انسانوں حتیٰ کہ لڑنے والے دشمنوں تک کے حقوق موجود تھے، رکّ بہ تعلیقہ لیکن چونکہ مقالہ نگار کے لیے ان حقوق کا اسلام کو افتخار دینا مشکل ہے، اسی لیے اس نے اس طرح کی ترکیب اور الفاظ استعمال کیے ہیں].

حقوق اور آزادیوں کے تحفظ کے عملی مسائل سے نمٹنے کی خاطر مسلمان دانشوروں اور مدبروں نے انیسویں صدی میں یورپ کے دستوری نظام کے اصول مستعار لینے شروع کیے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں، دستوری نظام کے اصولوں کے عمومی طور پر تسلیم کیے جانے کے بعد، بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حقوق انسانی کے اسلامی نظریات کے ساتھ تطابق کا مسئلہ اٹھایا گیا۔ [در اصل اسلام میں حقوق انسانی کا تصور تو شروع دن سے موجود تھا، لیکن یہ حقوق اس عنوان کے تحت مدون نہ تھے]۔

مسلمانوں کے نظریات پر سب سے قوی اثرات ''روشن خیالی'' اور انقلاب فرانس کے دوران میں نشوونما پانے والے فرانسیسی تصورات اور قانونی اصولوں کے پڑے۔ ان میں ۱۷۸۹ء کا جدید انسانی حقوق کا عظیم اعلان Declaration des droits de l'Homme et du ...... Citoyen اور ۱۷۹۱ کا فرانسیسی آئین، نیز عوامی آزادیوں کے نظریات شامل تھے۔ مسلم دنیا کے ان علاقوں میں جو برطانیہ کے زیر اقتدار تھے، جہاں معین حقوق کی واضح طور پر ضمانت دینے والے تحریری آئین کا فقدان تھا ، کامن لاء (Common law) کی روایت اور برطانوی پارلیمانی نظام حکومت کے تحت پانے والے جمہوریت پسندانہ افکار اس کے لیے معیار و مثال بنے.

انیسویں صدی میں کئی مسلمان ملکوں کے عہدیداروں، سفارت کاروں اور مصنفوں نے دستوریت اور عوامی آزادیوں کے یورپی تصورات کی نشرواشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں مصر کے شیخ رفاعہ رافع الطہطاوی (۱۸۰۱-۱۸۷۱ء) شامل تھے، جو الازہر کے ایک دانش ور تھے، انہوں نے۱۸۲۶سے ۱۸۳۱تک پیرس میں فرانس کے قانونی اور سیاسی اداروں کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے سیاسی حقوق، قانون کی حکمرانی، انسانی مساوات کے تصورات اور روشن خیالی کے افکار کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کی اور فرانس کے آئین کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ۱۹۳۹ء میں اس رپورٹ کا ترکی میں ترجمہ ہوا۔ ایرانی سفارت کار مرزا ملکوم خان نے (۱۸۳۳-۱۹۰۸ء)، جو رہائش کے اعتبار سے ترکی تھا اور جس نے پیرس میں تعلیم پائی اور جو بعد میں برطانیہ عظمیٰ میں ایرانی سفیر بنا، حکومت کے یورپی تصورات، قانون کی حکمرانی اور تصورِ آزادی پر بالتفصیل قلم اٹھایا اس دعویٰ کے ساتھ کہ ان افکارو تصورات کو اسلام

کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے ۔ عثمانی عہد کی مشہور ادبی شخصیت ، ملک کمال (۱۸۴۰ـ۱۸۸۰ء) کو تصورِ حقوق و آزادی کی نشرواشاعت اور اسلام سے ان کے ہم آہنگ ہونے کے نقطۂ نظر کے سلسلے میں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ (دیکھیے: ملکوم خان اور کمال کے حالاتِ زندگی)۔

دستوریت اور حقوق: انیسویں صدی میں قانون کی نظر مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مساوات کے سوال پر موروثی اسلامی عقائد اور جدید تصورِ حقوق کے مابین پہلے پہل تصادم وقوع پذیر ہوا، اس وقت مغربی طاقتوں نے بھی ایکا کر لیا اورانہوں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ مسلم ممالک میں موجود غیر مسلموں کے ساتھ سلوک میں عدم مساوات کا خاتمہ کیا جائے۔

[انسانی حقوق، کے مسئلے کا سب سے تشویشناک پہلو یہ ہے کہ اس مسئلے کو ہمیشہ مغربی اقوام نے مخالف ملکوں کو دبانے اور دھمکانے کے لیے استعمال کیا، انیسویں صدی کے آخر میں عظیم مسلمان مملکت ترکی کے خاتمے اور اس کا اقتصادی اور سیاسی گھیرا تنگ کرنے کے لیے اس مسئلے کو جواز بنایا گیا، بیسیویں صدی میں بھی مختلف قوموں اور مملکتوں کو دبانے اور ان کے خلاف تادیبی کاروائی کا جواز تلاش کرنے کے لیے ''انسانی حقوق'' کے مسئلے کو وجہ جواز کے طور پر استعمال کیا، جبکہ خود مغربی اقوام کا ابھی تک انسانی حقوق کا ریکارڈ درست نہیں ہے، غیر ملکیوں، خصوصاً مسلمانوں اور اپنے ملک کے مشرقی اور افریقن نسل سے تعلق رکھنے والے افراد کے بارے میں ان کا رویہ ابھی تک درست نہیں ہے]۔

تونس میں ۱۸۵۷ء میں یورپی دباؤ کے تحت، ایک بنیادی معاہدہ کا اعلان کیا گیا جس کے مطابق قانون کے سامنے اور ٹیکس کی وصولی میں سب کی برابری نیز تمام باشند گان کے مکمل تحفظ کی بلا استثناء مذہب، قومیت یا نسل ، ضمانت دی گئی تھی۔ تونس پہلا مسلمان ملک تھا، جس نے ۱۸۶۱ء میں ایسے اقدامات کی خاطر نیز معاہدے میں تسلیم شدہ حقوق کی توثیق کے لیے دستور کا نفاذ کیا، بہر حال یہ دستور فرانسیسی انتداب (۱۹۵۶-۱۸۸۱ء) نے معطل کر دیا۔ تونس میں اور اس طرح ...... بہت سے دوسرے مسلمان ملکوں میں یورپی غلبہ کے خلاف آزادی کی جدوجہد نے حقوق اور جمہوری آزادیوں کی اہمیت کے متعلق لوگوں کے شعور کو زیادہ نمایاں کر دیا۔ آزادی کے بعد ۱۹۵۶ء کے تونسی دستور میں کہا گیا کہ جمہوری طرزِ حکومت ہی ''انسانی حقوق'' کی بہترین ضمانت ہے۔

حقوق کے احساس کی جانب سب سے پہلے اہم ترین اصطلاحات سلطنتِ عثمانیہ میں کی گئیں جس کی خاصی بڑی غیر مسلم رعایا تھی اور جو فوجی اور معاشی عدم تحفظ کی بنا پر یورپی طاقتوں کے دباؤ میں تھی۔ ۱۸۳۹ء کا ''خط شریف'' جسے ۱۸۵۶ء کے ''خط ہمایوں'' سے تقویت ملی، عہد تنظیمات میں تجدیدی اصطلاحات کے سلسلے کی ایک کڑی تھا جن کا مقصد بلا لحاظِ مذہب تمام عثمانی رعایا کی جان، مال، عزت کا تحفظ ، منصفانہ اور کھلی عدالتی تحقیقات، اور قانون کی نظر میں برابری کے اصول کا قیام تھا۔ ''خط ہمایوں'' کے ذریعے نسلی و لسانی عدم امتیاز و تفریق کے اصول کا اضافہ کیا گیا۔ ۱۸۴۰ء کے نئے ضابطۂ تعزیرات میں ، قانون کے سامنے تمام عثمانی باشندوں کی مساوات کی توثیق کی گئی، نصف صدی گزرنے تک اصلاحاتی دباؤ کی بنا پر ۱۸۷۶ء کے عثمانی دستور کے نفاذ کو تحریک ملی جس میں عثمانی رعایا کے ''حقوق عمومیہ'' (یعنی عوامی آزادیوں) کا ایک باب بھی شامل تھا۔ اس میں بلا استثنائے مذہب مساوات، تمام مذاہب کے اختیار اور عبادت کی آزادی، فرد کی آزادی کی حرمت اور مداخلت بے جا، غصب، گرفتاری یا فرد کی رہائش اور

جائیداد میں غیر قانونی دخل اندازی سے تحفظ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس میں جماعت سازی اور تعلیم کی آزادی کی دفعات بھی شامل تھیں۔ عملی طور پر آئین معطل رہا اور ۱۹۰۸ء کے نوجوانوں ترکوں کے انقلاب تک اس کا احیا نہ ہو سکا جس کا ایک مرکزی ہدف احیائے آئین اور تمام عثمانی شہریوں کی مساوات کا قیام تھا۔ نوجوان ترکوں کی اصلاحات دستوری حقوق کے تحفظ تک وسعت پذیر تھیں ، جو قانونی طور پر کی گئی گرفتاریوں اور تفتیش کے علاوہ ہر قسم کی بندشوں کی ممانعت کرتی تھیں۔ ان کے ذریعے خصوصی یا استثنائی عدالتوں کا خاتمہ کر دیا گیا اور پریس کی آزادی کی ضمانت دی گئی۔۱۹۶۱ء میں ترکی کی دوسری جمہوریہ میں اس دستور کا نفاذ عمل میں آیا، جس کے دیباچہ میں انسانی حقوق اور آزادیوں کی ضمانت دی گئی اور مردوں اور عورتوں کی مساوات قائم کر دی گئی (دفعہ ۱۲)۔ مذہب کی آزادی کے سلسلے میں کئی شرائط عائد کی گئیں جن کا مقصد جمہوریہ ترکی کے پہلے صدر مصطفیٰ کمال اتاترک (۱۸۸۱-۱۹۳۸ء) کے نافذ کردہ قوانین کا تحفظ تھا۔ ۱۹۸۲ کے ترک دستور کی دفعہ نمبر ۲ میں اعلان کیا گیا کہ ایک قانونی ریاست ہو گی جو حقوق انسانی کا احترام کرے گی۔

جمہوریہ ترکی میں مصطفیٰ کمال والے سیکولرزم کے مقاصد کی سرگرم پیروی نے، جس کا آغاز ۱۹۲۵ء میں ہوا تھا، مختلف اسلامی طبقوں، بالخصوص درویش سلسلوں کے بالجبر انسداد کی راہ دکھائی۔ مرکزی سوویاتی ایشیا میں سوویت یونین کی لا دینی پالیسیوں نے مسلم آبادی کی دینی آزادیوں پر پابندی لگا دی اور یہ رکاوٹیں ۱۹۹۱ء میں سوویتی ریاست کے اختتام تک برقرار رہیں۔ اسلام کو کچلنے کا عمل اور مذہبی آزادی سے انکار حکومتوں کے تحت ۱۹۴۵ سے ۱۹۹۱ء تک البانیا میں اور ۱۹۷۸ سے ۱۹۹۲ء تک افغانستان میں بھی جاری رہا۔ بیسویں صدی میں ، کئی اور ملکوں میں بھی سیکولر لائحۂ عمل رکھنے والی حکومتیں بالعموم اسلامی بنیاد پرستوں کی سخت ایذا رسائی میں مشغول رہیں۔

قاچار بادشاہوں کی استبدادیت کے خلاف عوامی احتجاج کا اختتام ۱۹۰۶-۱۹۰۷ء کے ایران کے پہلے دستور کی صورت میں نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ ایران کے شیعہ مذہبی رہنما دستوریت اور اس کے تحت حقوق کی فراہمی کے دینی جواز کے بارے میں منقسم تھے۔ ۱۹۰۷ء کا اضافی آئینی قانون دو قسم کے حقوق کے متعلق اسلامی معیار پر مشتمل تھا: پریس کو آزادی دے دی گئی، ماسوائے ایسے امور کے جو خلافِ مذہب ہوں یا اسلامی (نقطۂ نظر کے لیے نقصان دہ ہوں(شق نمبر۲۰)؛ اور سائنس کی تدریس و مطالعہ، تعلیم اور فنون کو بھی آزادی دی گئی، سوائے اس کے کہ دینی احکام میں ان کی ممانعت کی گئی ہو، (شق نمبر۱۸)۔ علاوہ ازیں وزرا کے لیے لازم تھا کہ وہ مسلمان ہوں (شق نمبر۵۸)۔ بہرحال ملک کے تمام باشندے قانون کی نظر میں برابر حقوق رکھتے تھے (شق نمبر۸)۔ ایران میں ۱۹۷۸-۱۹۷۹ء کے اسلامی انقلاب کے بعد، ایران نے شہری و سیاسی آزادیوں کے بین الاقوامی عہد نامے کی توثیق سے انکار نہیں کیا۔ ۱۹۷۹ کے اسلامی دستور کی دفعہ نمبر۲۰ میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ تمام شہریوں کو اسلامی معیار کے مطابق انسانی، اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق حاصل ہوں گے (شق نمبر۴) کے تحت اسلامی اصول کو آئینی احکام پر فوقیت حاصل ہے۔

۱۹۲۱اور ۱۹۲۴ء کے عرصے میں ہی افغانی آئین میں اسلامی اور مغربی تصورات کو یکجا کیا گیا، مثلاً یہ کہ تمام باشندے حکومت کی نظر میں ، مذہب اور فرقے کے امتیاز کے بغیر برابر کا درجہ رکھتے ہیں اور یہ اہتمام کیا گیا تھا

کہ شریعت اور ملکی قانون کے سامنے تمام افغان برابر ہوں گے۔ اس کے باوجود ہندوؤں اور یہودیوں کے لیے (صرف یہی دو مسلمہ غیر مسلم فرقے تھے) لازم تھا کہ وہ جزیہ-رسمی طور پر ذمیوں (تحفظ یافتہ غیر مسلموں)پر عائد کردہ شخصی محصول ادا کریں گے اور امتیازی [طبقاتی] علامات استعمال کریں گے.

بیسویں صدی کے اختتام تک تمام مسلمان ممالک ایسے دساتیر کو اپنا چکے تھے جن میں حقوق سے متعلق بعض یا سارے اصول شامل تھے جن کا اعلان انسانی حقوق کے بین الاقوامی قوانین کے ذریعے کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۹ء کا الجزائری آئین اس لحاظ سے قابل توجہ تھا کہ اس میں بلا لحاظِ جنس ، قانون کی نظر میں سب کی برابری (شق نمبر۲۸)، بنیادی آزادیوں اور انسانی حقوق (شق: ۳۱) اور ان حقوق کی پیرو کاری کی ضمانت دی گئی تھی (شق: ۳۲)۔ بہر حال اکثر مسلم ممالک کی طرح الجزائر نے بھی اسلام کے شخصی قوانین اور اسلام کو خصوصی مرتبہ دینے والی آئینی دفعات کو برقرار رکھا۔ اس طرح دینی اور آئینی معیارات کے مابین غیر واضح تعلق کو دوام بخشا گیا.

سعودی عرب میں فقہ لمبے عرصے تک ملک کے سرکاری قانون کی حیثیت سے باقی رہی۔ بہر حال ۱۹۹۲ء میں شروع ہونے والی تبدیلیاں اس امر کا پیش خیمہ بنیں کہ ملک بتدریج ایک ایسے حکومتی نظام کی طرف بڑھے گا جس میں کم از کم محدود انداز میں حقوق اور دستوریت کو اسلامی معیار سے مشروط تسلیم کیا جائے گا۔ یہ اصول کہ اسلام انسانی حقوق پر، بعض مخصوص حد بندیاں عائد کرتا ہے، سعودی حکومت کی جانب سے ۱۹۹۲ میں جاری کردہ بنیادی ضابطۂ حکمرانی بنایا گیا۔ دفعہ نمبر۲۶ کے ذریعے اہتمام کیا گیا کہ ”ریاست اسلامی شریعت کے مطابق انسانی حقوق کی حفاظت کرتی ہے“ [لیکن] اس بات کی وضاحت نہ کی گئی کہ حقوق پر شریعت کون سی حدود لاگو کرتی ہے، بنیادی ضابطے نے معاشرتی بہبود کے میدان میں شہریوں کو کئی حقوق عطا کیے، مگر سیاسی یا اجتماعی میدان میں صرف چند حقوق ہی تسلیم کیے گئے۔ ان میں یہ حق بھی شامل تھا کہ کوئی شخص نہ گرفتار کیا جائے گا نہ قید کیا جائے گا اور نہ ہی اس کے اعمال پر کوئی بندش عائد کی جائے گی ماسوائے اس طریق کار کے جو قانون میں طے کیا گیا ہے (دفعہ: ۳۶) ؛ قانون میں دیئے گئے معاملات کے علاوہ نہ رہائش گاہوں میں داخلے کی اجازت ہو گی نہ ان کی تلاشی لی جا سکے گی (دفعہ: ۳۷)، قانونی ضابطوں میں بیان کیے گئے طریق کے بغیر کسی ذریعۂ پیغام رسائی کو ضبط کیا جائے گا نہ اس میں تاخیر کی جائے گی، نہ اسے پڑھایا یا سنایا جائے گا (دفعہ: ۴۰)؛ اور یہ کہ ذاتی ملکیت کو تحفظ حاصل ہو گا اور اسے صرف عوامی مفاد کی خاطر اور معقول معاوضے کی ادائیگی پر ہی حاصل کیا جا سکے گا (دفعہ : ۱۷).

عورتوں کے حقوق : جن افکار کے میدان میں، رسمی اسلامی اصولوں اور بین الاقوامی انسانی حقوق کے تصورات میں شدید آویزش پائی جاتی ہے، ان میں ایک مسئلہ عورتوں کے حقوق کا ہے۔ اگرچہ قدامت پسند یہ نکتہ اٹھاتے تھے کہ عورتوں کی مکمل مساوات کا نظریہ اسلامی ہدایات کی خلاف ورزی ہے، جبکہ تحریکِ حقوق نسواں کے علمبردار یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ پرانا قبائلی رویہ ہے اور اسلامی مراجع کا ناقص مطالعہ اس تصور کا باعث ہے ہیں کہ اسلام عورتوں کو کمزور درجے میں رکھنے کا حکم دیتا ہے.

پیشتر ازیں انیسویں صدی کے آخر میں متعدد مصنفین مثلاً، قاسم امین مصری (۱۹۰۸-۱۸۶۵)نے واضح کیا تھا کہ مشرق اوسط کے معاشروں کو در پیش بعض مسائل،

مثلاً استبدادیت، اخلاقی گراوٹ اور عورتوں کا کمتر درجہ ہونا، اسلام کے فطری اجزا نہیں، بلکہ فاسد مؤثرات اور سماجی رسوم کی پیداوار ہیں۔امین نے عورتوں کی مکمل مساوات کی وکالت کرتے ہوے مطالبہ کیاکہ ان کے حقوق میں اضافہ کیا جائے۔ نیز اس نے عورتوں کی آزادی کے مقصد کو شہریوں کی آزادی اور حقوق کے عمومی حصول سے مربوط کیا۔ حقوق نسواں کے دوسرے علمبردار جیسے ہدیٰ شعراوی (۱۸۸۲ـ۱۹۴۷ء) عورتوں کے حقوق اور آزادی کے معروف وکیل بن کر سامنے آئے۔ اسلام کو عورتوں کی مکمل آزادی سے ہم آہنگ بنانے کی ایک جرات مندانہ کوشش الزیتونہ کے ایک فاضل التحصیل تونسی، الطاہر الحداد نے کی۔ جس نے ۱۹۳۰ میں "امرأتنا فی الشریعة والمجتمع" (ہماری خواتین شریعت و معاشرے میں) شائع کی۔ اس کتاب میں یہ نظریہ وضاحت سے اپنایا گیا کہ اسلام نے عورتوں کی ترقی پسندانہ آزادی کا تصور پیش کیا تھا۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ اسلامی قوانین میں بایں طور اصلاح کی جانی چاہئے کہ خاندانی امور کے ساتھ ساتھ معاشرتی امور میں بھی مرد اور عورت کی مساوات کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو ختم کر دیا جائے، اس نظریے کو اس قدر بے باکی کے ساتھ پیش کرنے کی بنا پر قدامت پسندوں نے شدت کے ساتھ اس کتاب کی مذمت کی اور اس کے مصنف کو ملحد قرار دیا۔

عورتوں کی مکمل مساوات کو غیر مبہم تائید کمال اتاترک سے ملی، جس نے جنگ آزادی کی پر جوش فضا میں اعلان کیا کہ عورتوں کو برابری کا حق حاصل ہے، اس کے نتیجے میں اس نے ترک روایات اور اسلامی قانون کے ذریعے عائد کردہ محرومیت کو دور کرنے کے اقدامات کیے۔ اس نے اپنی اصلاحات کے اسلامی احکام سے تطابق کی کوشش نہیں کی۔ عرب دنیا میں ، سب سے زیادہ ڈرامائی اصلاحات تونس کے صدر حبیب بورقیبہ کے ۱۹۵۶ء میں جاری کردہ قانون مراتبِ شخصیہ کی صورت میں بروئے کار آئیں۔ یہ ضابطہ جو اسلامی قانون کے نام سے پیش کیا گیا جرأت مندانہ اصلاحات پر مشتمل تھا جن کے ذریعے عورتوں کے معاشرتی رتبے میں اضافہ ہوا، مثلاً تعدد ازدواج کا خاتمہ کر دیا گیا اور طلاق کے معاملات میں مردوں اور عورتوں کو مساوی حقوق عطا کئے گئے۔

بیسویں صدی کے آخر تک مسلم ممالک ایسے قوانین کا تحفظ کیے ہوے تھے جن میں عورتوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا اور ان کے مکمل شہری اور سیاسی حقوق کی نفی کی جاتی تھی، باوجودیکہ دستوری ضوابط میں تمام شہریوں کی مساوات کا عہد ہوتا۔ عمومی طور پر قوانین ، عورتوں کو گھر سے باہر کے معاملات میں خاصی حد تک مساوات کا حق دیتے تھے۔ یہ تو شخصی حیثیت کا میدان تھا جہاں "فقہ" سے حاصل کردہ امتیازی خدوخال بروئے کار لائے جاتے تھے۔ سعودی عرب کو اس بارے میں نمایاں مقام حاصل تھا کہ وہ عورتوں کو وہ حقوق اور آزادیاں جو انہیں بالعموم دوسرے مسلمان ممالک میں حاصل تھیں، عطا نہ کرنے کے جواز کی بنیاد اپنے اسلامی قانون کو قرار دیتا تھا۔

چند مسلمان ملکوں نے ۱۹۷۹ کے "عورتوں کے خلاف تمام قسم کے امتیازی رویوں کے خاتمے " کے عہد نامے کی توثیق کی۔ جن ملکوں نے توثیق کی بھی تو انہوں نے اس کے کئی مرکزی تصورات کے بارے میں اپنے تحفظات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوے ہی ایسا کیا۔ بنگلہ دیش ، مصر، لیبیااور تونس کے تحفظات میں بالخصوص اسلامی قانون سے وابستہ رہنے کی حاجت کو بطور جواز پیش کیا گیا۔

انسانی حقوق کی تحریکیں:انسانی حقوق کے دفاع کے لیے قائم کی گئی آزاد اور غیر حکومتی تنظیموں نے مسلم

ممالک میں انسانی حقوق کی تکریم کو بہتر بنانے کی مہمات کی قیادت کی ہے، ایسی اسلامی تنظیموں میں سے اوّلین وہ تنظیم تھی جو دسمبر ۱۹۳۳ء میں اندلس کی حقوقِ انسانی کی تنظیم کے ساتھ الحاق سے تطوان کے ہسپانوی مقبوضہ علاقے میں مراکشی لوگوں نے قائم کی۔ ایران میں بھی اسلامی رجحانات رکھنے والا ایک طبقہ "کمیٹی برائے دفاع آزادی و حقوقِ انسانی" ترتیب دیا گیا جس میں کئی دینی شخصیات شامل تھیں۔ بنیادی طور پر اس کا مقصد جمہوری اقدار کا حصول اور ایذا رسانی اور خفیہ سیاسی مقدمات کا استیصال تھا۔ اس طبقے کا ایک اہم رکن مہدی باز رگان (پیدائش ۱۹۰۷) تھا، جو اسلامی آزادی پسندی کا مدعی تھا اور اسلامی انقلاب کے فوراً بعد ایران کا پہلا وزیراعظم بنا۔ ۱۹۸۰ کے عشرے میں مسلم دنیا میں ، حوصلہ شکن رکاوٹوں اور خطرات کے باوجود ، ایسی بہت سی، حقوقِ انسانی کی تنظیمیں منصۂ شہود پر آئیں جن میں مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والی تعلیم یافتہ شخصیتیں نمایاں تھیں ۔ اس قسم کی ایک بہت اہم تنظیم "انسانی حقوق کی عرب تنظیم" تھی جس نے پیش از پیش حقوقِ انسانی کی آزاد تنظیموں کے انداز میں ، بین الاقوامی قانون کے طے کردہ معیار کے مطابق حقوقِ انسانی کے مقاصد کی حمایت کو اپنائے رکھا۔ یہ سب تنظیمیں حقوقِ انسانی کی بین الاقوامی تحریکات سے تعاون کرتی رہیں۔

مسلمان حکومتیں اور بین الاقوامی قانونِ حقوقِ انسانی: یہ دوسری عالمگیر جنگ کا نتیجہ تھا کہ انسانی حقوق کے جدید بین الاقوامی ضوابط تشکیل دیئے گئے جو ان معیارات کا باعث بنے جنہیں بین الاقوامی قانون عامہ میں شامل کیا گیا۔ مسلم ممالک اقوام متحدہ کے بنیادی ارکان میں شامل تھے جس کے ۱۹۴۵ء کے چارٹر میں انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ بالآخر تمام مسلم مملکتوں نے اقوام متحدہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۸ء میں جنرل اسمبلی کے منظور کردہ عالمی اقرار نامہ انسانی حقوق کے بعض پہلو ایسے تھے، جنہوں نے مسلم ممالک کے نمائندوں کو تنقید پر ابھارا۔ اگرچہ آخر کار صرف سعودی عرب ہی اس کی تائید نہ کرنے پر قائم رہا۔ پھر اقوام متحدہ کی سرپرستی میں ترتیب دادہ انسانی حقوق کے معاہدوں کی توثیق سے بھی مسلم اقوامِ نے سخت اختلاف کیا، مسلمانوں نے یہ الزام بھی عائد کیا کہ بین الاقوامی حقوق کے معیارات مغربی یایہودی مسیحی رجحانات کے حامل ہیں جو مسلم معاشرہ میں ان کی قبولیت میں مانع ہیں۔

[دراصل اسلامی ممالک کو انسانی حقوق پر کبھی اعتراض نہیں رہا البتہ انسانی حقوق کی ان تعبیرات پر اعتراض رہا ہے جو مغرب اپنے شخصی اور اقتصادی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔ پھر ہمیشہ سے مغربی ملکوں کا انسانی حقوق کے حوالے سے رویہ دوغلے پن کا شکار رہا ہے، مغربی ملکوں نے کبھی اسرائیل، بھارت اور روس پر دباؤ نہیں ڈالا، جنہوں نے ہمیشہ مسلمانوں پر ایسے مظالم ڈھائے جس نے ہلاکو خان اور چنگیز خان کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے اور پھر امریکہ افغانستان اور عراق میں، برطانیہ اپنے مقبوضہ ملکوں میں اور فرانس الجزائر اور لیبیا میں جس طرح کے انسانی حقوق کا مظاہرہ کر چکا ہے، یہ دوغلا رویہ ہمیشہ اسلامی ممالک میں زیر بحث رہا اور اسے ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا]

اسلامی کانفرنس تنظیم (او آئی سی) کا ، جو ایک بین الاقوامی ادارہ ہے اور جس کا قیام ۱۹۶۹ء میں عمل میں آیا اور جس کے ساتھ تمام مسلمان ممالک وابستہ ہیں، منشور وضاحت کرتا ہے کہ اس کے ارکان "اقوام متحدہ کے چارٹر اور بین الاقوامی انسانی حقوق سے اپنی وابستگی کی توثیق

کرتے ہیں" بہر حال ۱۹۹۰ میں او آئی سی نے "اسلام میں انسانی حقوق کا اعلامیہ قاہرہ" جاری کیا جو واضح طور پر بین الاقوامی حقوقِ انسانی کے معیارات سے انحراف کرتا ہے۔ اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ اعلامیہ ، بین الاقوامی حقوقِ انسانی کے معاہدات ، جن کی اس کے ارکان توثیق کر چکے ہیں، میں مندرجہ متنازع مسائل سے یا اپنے اپنے ملکوں کے دستاویز میں موجود حقوق سے متعلق شقوں کی، جو کئی معاملات میں بین الاقوامی ضوابط سے ہم آہنگ ہیں، تطابق کیوں کرے گا.

"اسلامی" :انسانی حقوق کے معاملے کی طرح جن کا اظہار ۱۹۶۰ء سے کیا جا رہا ہے او آئی سی کے اعلامیہ میں بین الاقوامی قانون حقوقِ انسانی میں مستعمل اصطلاحات و افکار کو وسیع پیانے پر اخذ کیا گیا ہے۔ اسلامی کانفرنس تنظیم کا اعلامیہ قاہرہ یہ ہے کہ "بنیادی انسانی حقوق اور عالمگیر آزادیاں دینِ اسلام کا ایک جزوِ لاینفک ہیں"؛ لیکن ساتھ ہی بین الاقوامی قانون کے تحت عطا کی گئی ان آزادیوں اور حقوق کے بارے میں "اسلامی" ہونے کی شرط بھی عائد کرتا ہے۔ جو مذہبی اصولوں کو انسانی حقوق کو مسترد کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اعلامیہ کی شق نمبر ۲۴ میں یہ امر بھی شامل ہے کہ اس میں مندرج تمام حقوق اور آزادیاں شریعت کے تحت ہوں گی، مگر یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ اس متابعت کی کیا حدودہوں گی.

واضح ہے کہ اس اعلامیہ میں سیاسی اور جمہوری اصولوں کی پاس داری، مذہبی آزادی کی ضمانتوں، انجمن سازی اور پریس کی آزادی اور قانون کے سامنے برابری اور مساوی تحفظ کا ذکر نہیں ہے ۔ اگرچہ شق نمبر ۲۰ میں ایذا رسانی کی ممانعت کی گئی ہے، مگر ایسے ضوابط موجود نہیں جو بالوضاحت بین الاقوامی حقوق سے متعلق تعزیراتی ضابطہ قوانین کی توثیق کرتے ہوں۔ محض شق نمبر ۱۹ میں ایک مبہم سی یقین دہانی ملتی ہے کہ مدعاعلیہ "ایسے منصفانہ عدالتی عمل کا حق دار ہو گا جس میں اسے ہر طرح کے دفاع کی ضمانت دی جائے گی"۔ چونکہ شق نمبر ۲۵ وضاحت کرتی ہے کہ صرف "شریعت" ہی اس اعلامیہ کا منبع و ماخذ ہے یا اس کی مختلف دفعات کی تشریح و توضیح کرتی ہے " لہٰذا اس امکان کی گنجائش ملحوظ خاطر رکھی گئی کہ کوئی بھی مقدمہ "عادلانہ " ہی سمجھا جائے گا، جب تک کہ وہ شرعی ضوابط کے مطابق بروئے عمل لایا گیا ہو گا۔ حالانکہ یہ ضوابط تعزیراتی دستور العمل کے میدان میں تاریخی طور پرکم ترقی یافتہ تھے۔ یہیں بنیادی طور پر قانون کا کوئی اصول کارفرما نہیں ۔ شق نمبر ۱۹ کی یہ شرط کہ کسی جرم یا سزا کا بالفعل وجود متصور نہیں ہو گا ماسوائے اس کے کہ شریعت میں اس کی گنجائش ہو، تعزیری سزاؤں اور اسی طرح حدود کے جرائم سے متعلق احکام کے نفاذ کا دروازہ کھولنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ شق نمبر۲ کسی کی جان لینے کی ممانعت کرتی ہے، ماسوائے اس سبب کے جو شریعت میں مذکور ہو۔ تیسری دنیا کے حالات کی روشنی میں جس کا خود مسلمان ملکوں کو سامنا کرنا پڑا ہے، شق نمبر۱۱ نو آبادیاتی نظام کو ممنوع قرار دیتی ہے اور اعلان کرتی ہے کہ نو آبادیاتی نظام میں پسی ہوئی قوموں کو آزادی و خود مختاری کا مکمل حق حاصل ہے۔ او آئی سی کے اعلامیہ کا خلاصہ یہ ہے کہ شہری اور سیاسی حقوق کے بارے میں مسلمان ملکوں کا رویہ، ان کے شرعی احکام پر انحصار کی وجہ سے ، غیر مسلم ملکوں کے رویے سے جداگانہ ہے (دیکھئے: [تنظیم اسلامی کانفرنس] Organization of Islamic Conference).

پوری مسلم دنیا کی حکومتیں اور افراد حقوقِ انسانی سے متعلق بالعموم ایسا موقف اختیار کیے ہوے ہیں جو بوصف خود "اسلامی" ہے۔ رجحانات کی بو قلمونی اور متعلقہ

اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہے کہ انسانی حقوق کے بین الاقوامی اصولوں اور اسلامی قانونی ورثے میں باہمی تعلق اور دونوں کے تطابق کے بارے میں مسلمانوں کی آراء منقسم رہی ہیں.

مآخذ: Blaustein،A.P اور G.H.Flanz (مدیران): Constitutions of the Coutries of the world نیو یارک ۱۹۷۱ء؛ اس کی قیمتی تاریخی مقالات کے ذریعہ مسلسل نظر ثانی کی جاتی ہے اس میں مسلم ممالک کے دساتیر بھی شامل ہیں؛ (۲) Coulson,Noel ....: "The State and the Individual in Islamic Law" مقالہ در، J: International and Comparative law Quarterly، ۶: (۱۹۵۷ء)، ۴۹-۶۰، جدید قانونی ضوابط سے ما قبل کے متعلقہ قوانین کا جائزہ؛ (۳) Kevin، Dwyer: Arab Voices The Human Rights Debate in the Middle East، برکلے ۱۹۹۱ء، مختلف نقطہ ہائے نظر سے متعلق انٹر ویوز؛ (۴) حائری عبدالهادی: Shi,ism and constitutionalism in Iran، لائیڈن ۱۹۷۷ء، ایک تحقیقی جائزہ؛ (۵) حورانی البرٹ: Arabic thought in the liberal Age، ۱۷۹۸-۱۹۳۹ء، لنڈن ۱۹۶۲ء،عرب فکر میں ابتدائی آزادانہ رجحانات کا خیال انگیز جائزہ؛ Bernard, Lewis، مقالہ ''دستور'' در آآ، لائیڈن ، جدید ایڈیشن ۲: ۶۳۸-۶۷۷، ۱۹۶۰ء۔ بہت سے مسلمان ملکوں کی دستوریت کے بارے میں تحقیقی جائزہ؛ (۶) وہی مصنف: The Emergance of Modern Turkey،باردوم لنڈن و نیویارک، ۱۹۶۸ء، سلطنتِ عثمانیہ کے آخری دور اور ترک جمہوریہ کے ابتدائی عہد کے جدید سیاسی نظریات کی تاریخ؛ (۷) Mayer Ann: Islam and Human Rights:Tradition and Politics، Boulder ۱۹۹۱ء، شہری و سیاسی حقوق سے متعلق اسلامی بین الاقوامی افکار کا تحقیقی تقابل؛ (۸) النعیم ، عبداللہ احمد: Toward an Civil Human Right and Islamic Reformation، International Liberties، سیراکیوز،N.Y۱۹۹۰ء۔ ایک سوڈانی ماہر کا قانون عامہ اور قانون بین الاقوام کا حقیقی پیش منظر نامہ؛ (۹) نشاط،گیتی ، (مدیر): Women and Revolution in Iran، بولڈر ۱۹۸۳ء، ایران میں انقلاب کے ما بعد، خواتین کے مقام و مرتبہ پر مقالات کا مجموعہ؛ Franz Rosenthal: The Muslim Concept of Freedom Prior to the Nineteenth Century، لائیڈن ۱۹۶۰ء پر مبنی متون.

[Ann Elezabith Mayre (ت: امین وثیر[و ادارہ])]

••--------------••

⊗ [تعلیقہ] انسانی حقوق: بنیادی انسانی حقوق کا دائرہ بہت وسیع ہے اس سے مراد وہ تمام حقوق ہیں جو ایک انسان کو بطور انسان ، خواہ اس کا معاشرتی مقام کچھ بھی ہو ، ملنے چاہییں ، ان میں بقاے زندگی سے لے کر اچھی زندگی گزارنے تک کے تمام حقوق شامل ہیں۔ عصر حاضر میں یہ اصطلاح خالصتاً ریاست کی جانب سے شہریوں کو ملنے والے حقوق کے لیے استعمال ہوتی ہے [رک بہ حقوق، در آآ، بذیل مادہ]۔ اسلام ان حقوق کا نہ صرف یہ کہ موید و داعی ہے، بلکہ دنیا میں سب سے پہلے یہ حقوق دینے والا اور ان کا شعور بیدار کرنے والا مذہب بھی ہے.

اسلام نے دنیا میں سب سے پہلے ''حقوق'' (واحد حق: ماثبت و وجب ، جو شے واجب اور ثابت ہو) کا نظریہ دیا اور ان حقوق کی پابندی اور ان پر عمل کی تاکید فرمائی، اسلام کے عطا کردہ یہ ''حقوق'' ریاست کی طرف سے بھی ہیں اور مسلم عوام کی طرف سے بھی اور ان حقوق کو کوئی شخص غضب یا ختم نہیں کر سکتا، تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ جان کا تحفظ :اسلام بلا استثنا مذہب و ملت ، اور رنگ و نسل تمام انسانوں کے لیے " جان کے تحفظ" کا حق تسلیم کرتا ہے ، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :...... مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًا بَغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا [المائدہ]: ۳۲) جس نے کسی جان کو ، کسی جان کے بدلے یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کر دیا اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کر دیا (نیز دیکھیے [النسآء] ۴:۹۲-۹۳).

[جان کے تحفظ کا یہ حق اسلامی مملکت تک وسیع ہے اور اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ اس حق کو پختہ اور مؤکد بنانے کے لیے اسلام نے دیت [رک بآں در آآآ] کا نظام قائم کیا ہے.

آپؐ کا فرمان ہے " جس نے ہمارے طریقہ پر نماز پڑھی ، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا وہ مسلم ہے جس کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کا ذمہ قائم ہو چکا ہے ۔ تو اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں دغا نہ کرو (البخاری: الجامع الصحیح، کتاب الصلاۃ، باب فضل استقبال القبلہ ، ص: ۳۴).

(۲) مال کی حفاظت: جائز حد تک شخصی ملکیت اور مال و دولت رکھنا عوام کا حق ہے اور اس کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہے چنانچہ اسلام میں دوسروں کا مال چرانے یا لوٹنے کی سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ جن کے نفاذ کی ذمہ داری حکومت پر ہے، علاوہ ازیں آپؐ نے فرمایا ...... من قتل دون مالہ فھو شھید (موسوعۃ الحدیث :نسائی ابو عبدالرحمٰن شعیب بن علی : سنن ، کتاب المحاربۃ ، باب من قتل حدیث ۲۳۵۵)، یعنی جو شخص اپنا مال بچاتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے۔ اسی طرح آپؐ کا فرمان ہے من قتل دون مالہ مظلوماً فلہ الجنۃ (کتاب مذکور، حدیث ۲۳۴۹)۔ جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مظلومی کی حالت میں مارا گیا وہ جنتی ہے.

[شخصی ملکیت کا اسلام نے اس حد تک تحفظ کیا ہے کہ ذمیوں کے لیے باہمی طور پر شراب اور خنزیر کی خرید و فروخت کو بھی درست قرار دیا ہے اور اسلامی حکومت کو ان کی ملکیت کے حقوق کو پامال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ "ذمی" اسلامی حکومتوں کے زیر سایہ ہمیشہ بڑے امن وسکون کے ساتھ زندگی گزارتے رہے ہیں اور مسلمان حکومتوں نے ہر دور میں ان کی ملکیت کے حق کا تحفظ کیا ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں ذمیوں کی ملکیتوں کو جس طرح تحفظ عطا کیا وہ اس بات سے ظاہر ہے کہ آپ کو ذاتی طور پر اور امور مملکت کے لیے جب بھی نقد یا جنس کی ضرورت ہوئی تو آپ نے کوئی نہ کوئی شے گروی (رہن) رکھ کر ذمیوں سے قرض لیا.]

ناجائز ذرائع سے دوسروں کا مال لینے کی سخت ممانعت کی گئی (دیکھیے ۴ [النسآء]: ۹، نیز دیکھیے الدارمی، ابو محمد عبداللہ بن عباس عبدالرحمٰن : سنن الدارمی ، ۳: ۱۶۵۰)۔ اس امر کا خیال رکھنا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ نہ تو حکومتی سطح پر کوئی ایسا عمل ہو جس سے لوگوں کا مال ناجائز ذرائع سے مملکت کے خزانہ میں آئے اور نہ انفرادی سطح پر لوگ ایک دوسرے کا مال چھین سکیں اور ایسے تمام ذرائع کا سد باب سختی سے کیا جائے.

(۳) عزت کا تحفظ : اسلام نے جان اور مال ہی کی طرح (بلا تفریق) عزت و ناموس کی اہمیت اور اس کے احترام کو تسلیم کیا ہے، قرآن مجید میں تمام بنی نوع انسان کے تعظیم و تکریم کی بات کی گئی ہے فرمایا وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِىۡۤ اٰدَمَ (۷ [بنی اسرائیل]۷۰)، یعنی اور ہم نے اولاد آدم کو عزت بخشی ہے.

حجۃ الوداع کے موقع پر ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم نے اپنے خطاب میں خاص طور پر دیکھیے اعراض یعنی عزت و ناموس کی حفاظت کا بھی ذکر فرمایا (دیکھیے مسلم بن حجاج القشیری: الجامع الصحیح، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم المسلم، ص: ۱۱۲۷)، لہذا ہر شہری فطری طور پر محترم ہے اور حکومت اس بات کی پابند ہے کہ ایسے معاشرہ کی تشکیل کرے جس میں کسی بھی انسان کی عزت و ناموس متاثر نہ ہو۔ عزت و ناموس کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے اسلام نے حد قذف (جھوٹی تہمت کی سزا) کا اعلان کیا جو ۸۰ درّے (۲۴ [النور]: ۴) اور الزام لگانے والے کی مستقل طور پر عدالتی شہادت کے مردود ہونے کی صورت میں نافذ ہوتی ہے۔ اس بارے میں بھی اسلام مسلم اور غیر مسلم میں تفریق نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں اسلام حکمرانوں کو لوگوں کے گھروں کے اندر ان کی جاسوسی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ (۴۹ [الحجرات] :۱۱) .

(۴) بنیادی ضروریات کی فراہمی :ریاست کے تمام شہریوں کو زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کرنا ،ریاست کی ذمہ داری ہے ۔ اسلام میں معاشرہ کے ہر فرد کے لیے درج ذیل حقوق متعین ہیں: (۱) رہنے کا گھر ،(۲) پیٹ بھرنے کے لیے روٹی ،(۳) تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا ، (۴) استعمال کے لیے پانی، خواہ وہ آسمان سے برسے یا نہروں وغیرہ سے حاصل کیا جائے ۔(دیکھیے ، ابن حزم : المحلی)

اسی مقصد کی تکمیل اور اسلامی معاشرے کے بیمہ کے لیے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا گیا اور اس کے لیے عمال مقرر کیے گئے ارباب اقتدار کی ذمہ داری لگائی گئی، فرمایا: ان اللہ افترض علیھم صدقۃ فی اموالھم تؤخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم (البخاری ، الجامع، کتاب الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ، ص ۱۳۹۵).

دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ اسلامی مملکت کے رہنے والوں کی فہرستیں تیار ہوئیں اور ان کی ان کے سماجی رتبے کے مطابق تنخواہیں اور ان کے وظائف مقرر ہوے۔ حتی کہ ایسے غیر مسلموں کے نام بھی وظیفہ جاری ہوا جو بوڑھے تھے اور کمانے کی طاقت نہ رکھتے تھے (ابو یوسف: کتاب الاموال) آپؓ کا یہ قول تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے ”اس ذات کی قسم جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ بھیجا اگر ایک اونٹ بھی دریاے فرات کے کنارے بھوک سے مر گیا تو مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ روز قیامت مجھے اس بات کا جواب دینا پڑے گا (حوالہ مذکور)۔ تاریخ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

(۵) مساوات: اسلام کی نظر میں تمام شہری برابراور باہم مساوی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: یَاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ([۴۹][الحجرات]: ۱۳)، یعنی اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو شناخت کرو اور اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے.

چنانچہ اسلام کسی بھی انسان کو رنگ، نسل، قومیت، حسب و نسب یا مقام و مرتبہ کی بنا پر کوئی فوقیت عطا نہیں کرتا (یہ فوقیت بربنائے تقویٰ ہے اور وہ آخرت میں ہے۔ دنیا میں تمام لوگ برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہیں۔ آنحضورؐ کا اسوۂ حسنہ اس سلسلہ میں بہترین مثال ہے ، ایک مرتبہ بنو مخزوم کی فاطمہ نامی ایک عورت نے چوری کی ،لوگوں نے حضرت اسامہؓ سے سفارش کرنے کو کہا کہ یہ چونکہ معزز قبیلہ کی خاتون ہے آپؐ نبی اکرمؐ سے سفارش کریں اس پر حد نافذ نہ کی جائے ، سفارش سنتے ہی آپؐ کا چہرۂ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا” تم سے پہلی

امتیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ وہ لوگ کمتر درجہ کے لوگوں کو قانون کے مطابق سزا دیتے اور اونچے درجہ والوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ یاد رکھو اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو اسے بھی یہی سزا ملتی (البخاری : الجامع ، کتاب الحدود باب کراہیۃ الشفاعۃ فی الحد اذا رفع الی السلطان ، ص :۵۶۶)۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں شاہ غسان جبلہ بن ایہم نے ایک مسلمان کو بلا وجہ تھپڑ مار دیا ، خلیفہ المسلمین نے فیصلہ کیا ، کہ تم یا تو تھپڑ کھاؤ یا معافی مانگو ، جبلہ نے سوچ بچار کے لیے مہلت طلب کی اور رات کی تاریکی میں بھاگ نکلا اور وہ مرتد ہو گیا۔ اسلامی حکومت نے اس کا بھاگ جانا اور ارتداد تو برداشت کر لیا، لیکن ایک شہری کی حق تلفی برداشت نہیں کی.

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج کے خطبہ میں فرمایا تھا ”کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر ،کوئی بڑائی حاصل نہیں، سوائے تقوٰی کے، تم سب آدم سے پیدا ہوے اور آدم مٹی سے پیدا ہوے تھے“ (ابن ھشام : السیرۃ النبویۃ ، ۴ : ۲۵۹-۲۶۰)، چنانچہ حکومت کا فرض ہے کہ تمام شہریوں کے مابین ہر لحاظ سے مساوات کا خیال رکھے، تاکہ طبقاتی کشمکش کم سے کم ہو اور بد امنی و فساد سے بچا جا سکے ، معاشی دائرہ کار میں سب لوگوں کو کسب مال اور ترقی کے یکساں مواقع میسر آنے چاہئیں.

(٦) آزادی کا حق: اسلام میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ہر شخص فطری طور پر آزاد ہے اور اس کی آزادی کے لیے ہر فرد کو اس کی مدد کرنی چاہیے، لیکن چونکہ اس وقت پوری دنیا میں غلامی کا قانون رائج تھا۔ اس لیے اسلام یک طرفہ طور پر غلامی کے انسداد کا اقدام نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم غلاموں کی آزادی اور غلامی کے انسداد کے لیے اسلام نے جو کوششیں کیں اگر ان پر صحیح طریقے سے عمل کیا جاتا تو دنیا سے مکمل طور پر غلامی کا انسداد ہوسکتا تھا

[رکّ بہ عبد، غلامی]

(٦) آزادئ رائے : اسلامی ریاست کا ہر شہری حق رکھتا ہے کہ حکومت کے فیصلوں پر رائے دے اور سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں میں شرکت کر سکے،مثلاً حضرت سعد بن عبادہؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، نہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر، اور انہیں تمام عمر ان سے اختلاف رہا ، لیکن ایسی کوئی روایت نہیں ملتی کہ اسلامی ریاست نے ان سے کبھی تعرض کیا ہو (ابن قتیبہ: الامامۃ والسیاسۃ، ص ۱۱).

حضرت عمرؓ نے ایک بار لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ” میں تم ہی میں سے ایک ہوں ہر امر میں تم لوگ اپنی رائے آزادی سے دیا کرو ،اگر میں، اچھا کام کروں تو میری اعانت کرو اور اگر کج روی کروں تو مجھے سیدھا کر دو ۔ حضرت عمرؓ کا فرمان لا خلافۃ الا بحسن مشورۃ (متقی الھندی : کنز العمال، ۵:۶۴۸)۔ اسلامی ریاست کے سیاسی امور میں فرد کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے ۔ اور خلافت راشدہؓ کے عہد میں اس کی بہترین مثالیں بھی ملتی ہیں ۔ (مثلاً دیکھیے الشوکانی، نیل الاوطار، ۴:۷:۱۸۸۔ قرآن کریم میں ارباب اقتدار کے لیے یہ حکم موجود ہے ...... وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳[آل عمرانٓ]:۱۵۹)، یعنی آپؐ ان سے معاملات میں مشورہ لیجئے، لہٰذا حکومت اپنے فیصلے عوام پر مسلط کرنے کا حق نہیں رکھتی، بلکہ ان کے نمائندوں کے ذریعے مشاورت کرنے کی پابند ہے۔ حکومتی ارکان کے انتخاب اور حکومت کے تمام فیصلوں میں ہر ذی شعور شہری کو رائے دینے کا حق حاصل ہے، جسے ریاست اس سے چھین نہیں سکتی.

(۷) نجی زندگی چاردیواری کی سالمیت :اسلامی معاشرہ میں نجی زندگی کی سالمیت اور تحفظ کو بہت اہمیت دی گئی (دیکھیے ۲۴[النور]: ۲۷) ۔استیذان کے احکام اسی

لیے دیئے گئے تاکہ لوگوں کی نجی زندگی متاثر نہ ہو، آپؐ کا فرمان ہے: ''کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ بغیر اجازت کسی کے گھر میں جھانکے (ترمذی، محمد بن عیسیٰ: الجامع الصحیح، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء فی کراھیۃ ان یخص الامام نفسہ بالدعاء، ص۶۷۶، مطبوعہ دارالسلام)۔

(۸) شخصی آزادی کا تحفظ: اسلامی ریاست کا ہر شہری بالکل آزاد ہے محض شک و شبہ کی بنیاد پر کسی کی آزادی کو سلب نہیں کیا جا سکتا، جب تک کسی پر کوئی جرم ثابت نہ ہو۔ قرآن کریم میں لوگوں کی جاسوسی کرنے یا نجی حالات کی ٹوہ لگانے سے منع کیا گیا ہے (دیکھیے ۴۹ [الحجرات]: ۱۱) آپؐ کے عہد مبارک میں ایک شخص کو گرفتار کیا گیا جس پر کوئی الزام تھا (الزام کی صراحت نہیں ہے۔ غالبًا قرض کی عدم ادائیگی کا تھا)۔ اس کا پڑوسی آپؐ کے پاس آیا اور (اپنے پڑوسی کو چھوڑنے کی درخواست کی)، تو آپؐ نے حکم دیا کہ اس کے پڑوسی کو چھوڑ دو (ابوداؤد: سنن، کتاب القضاء باب فی الدین ھل یحبس لہ: ص۱۴۹۲، حدیث ۳۶۳۲)

شک و شبہ کی بنیاد پر لوگوں کو متجسس انداز میں دیکھنے اور ان کا پیچھا کرنے سے آپؐ نے منع کیا اور فرمایا: حکمران جب لوگوں میں شبہات تلاش کرے (اور ان کی جاسوسی کرے) تو وہ ان کو بگاڑ دیتا ہے (کتاب مذکور، کتاب باب فی النھی عن التجسس، ص۱۵۸۲، حدیث ۴۸۴۹)۔ تاہم اگر کوئی معاملہ واضح ہو، یا بہت اہمیت رکھتا ہو تو ایسی صورت میں حکم مختلف ہوگا۔ (دیکھیے، حوالہ مذکور۔ حدیث ۴۸۹۰)۔

روایت کی رو سے حضرت عمرؓ کو ابو لؤلؤ نے اور حضرت علیؓ کو ابن ملجم نے قتل کی دھمکیاں دیں (دیکھیے ابن الاثیر، ابو عمر یوسف بن عبداللہ: الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ۳: ۲۴۱)۔ حضرت علیؓ کو ابن ملجم کے بارے میں اور بھی کئی ذرائع سے معلوم ہوا تھا، کہ وہ خلیفۃ المسلمین کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث ہے، مگر حضرت علیؓ نے محض ان افواہوں کی بنا پر اس کے خلاف کاروائی نہیں کی جس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست میں کسی شہری کی شخصی آزادی کو محض شک کی بنا پر سلب کرنا تقاضاے عدل کے خلاف ہے۔

(۹) مذہبی آزادی: اسلامی ریاست اپنے شہریوں کو مذہب و مسلک کی بنا پر اختلاف رائے رکھنے کا بھر پور حق دیتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے: لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (۲ [البقرہ]، دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ریاست اس پر پابندی نہیں لگا سکتی، اجتہاد کی اجازت بلکہ ترغیب دی گئی ہے اور یہ مآخذ فقہ میں سے ہے، اجتہاد کا لازمی نتیجہ اختلاف کی صورت میں نکلتا ہے، کیونکہ ہر شخص کی سوچ کا معیار اور فیصلہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، اس کی مثالیں عہد نبویؐ سے بھی ملتی ہیں، ایک موقع پر آپؐ نے چند صحابہؓ کو کسی مہم پر بھیجا اور فرمایا کہ فلاں مقام پر پہنچ کر عصر کی نماز ادا کرنا، ان لوگوں کو کسی وجہ سے کچھ دیر ہو گئی اور وہ عصر کے مقررہ وقت تک وہاں نہ پہنچ سکے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے راستہ میں نماز ادا کر لی اور باقیوں نے یہ کہا کہ چونکہ آپؐ کا حکم یہی ہے کہ وہاں جا کر ادا کرنا تو ہم وہیں جا کر ادا کریں گے، جب آنحضورؐ کو علم ہوا تو آپؐ نے دونوں گروہوں کے عمل کو درست قرار دیا، گویا مسلک کی بنیاد پر اختلاف جسے ہم فقہی اختلاف بھی کہہ سکتے ہیں کی گنجائش موجود ہے۔ ریاست اس پر اس وقت تک پابندی نہیں لگا سکتی جب تک وہ حداعتدال میں رہے اور اس کی بنا پر فساد و عناد پیدا نہ ہو۔

(۱۰) حصول تعلیم کا حق: اسلامی ریاست کے ہر شہری کا حق ہے کہ حکومت اس کی ابتدائی اور ضروری تعلیم کا

انتظام کرے ، خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اسیران بدر کی رہائی کا فدیہ یہی قرار دیا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں ۔ آپؐ نے بعض صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ دوسری قوموں کی زبانیں سیکھیں۔ شہریوں میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے لوگوں کی باقاعدہ ذمہ داری لگائی گئی حکومت کے اعلیٰ ملازمین کے ذمہ تھا کہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کریں ،اور تعلیم سب کے لیے تھی (البخاری: الجامع ، کتاب الدیات ، باب من استعار ،عبدا اوصبیا،ص ۵۷۶).

اس بنا پر خلافت راشدہؓ کے دور میں جہاں مختلف علاقوں کے لیے حاکم اور قاضی ارسال کیے جاتے۔ وہاں معلم اور مفتی بھی بھیجے جاتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قیادت میں علما کی ایک جماعت کوفہ و بصرہ میں اور حضرت ابودرداءؓ کی قیادت میں اہل علم کی شام میں تقرری اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اس عہد میں حصول علم کے میدان میں آزاد لوگوں کے ساتھ غلام اور مردوں کے ساتھ عورتیں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں [رک بہ المتعلم والمعلم در ۱۱۱].

(۱۱) عدل و انصاف کی فراہمی : اسلامی ریاست کے شہری کا ایک اہم حق یہ بھی ہے کہ ریاست اسے ہر قسم کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھے ، اگر کسی پر کوئی زیادتی ہو تو بلا تفریق امیر و غریب ، عام و خاص ہر شخص کی داد رسی کی جائے ۔ حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اپنے پہلے خطبہ میں ارشاد فرمایا ”تم میں جو لوگ کمزور ہیں وہ میرے نزدیک طاقت ور ہیں جب تک میں انہیں ان کا حق نہ دلا دوں اور تم میں جو طاقت ور ہیں وہ میرے نزدیک کمزور ہیں جب تک کہ میں ان سے دوسروں کے حقوق وصول نہ کر لوں (ابن ہشام: السیرۃ النبویہ ، ۴:۳۱۸)

(۱۲) اقلیتوں کے حقوق: اسلامی ریاست کی حدود میں رہنے والی اقلیتوں کو بھی تمام حقوق حاصل ہیں ان کی جان ، مال عزت و آبرو بھی ویسے ہی محترم ہے جیسے مسلمانوں کی ، آپؐ نے فرمایا جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالا تو میں قیامت کے دن اس کا وکیل ہوں گا (یحیٰی بن آدم القرشی : کتاب الخراج ، ص ۸۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ”ذمی کی دیت بھی مسلم کی دیت ہی کی طرح ہے (کتاب مذکور ۸۳)، یعنی ذمیوں کے خون کو بھی محترم قرار دیا گیا۔ قانون کی نظر میں مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر ہیں، چنانچہ انصاف دونوں کے لیے یکساں ہے (دیکھیے الماوردی، ابو یعلی محمد بن حسن: الاحکام السلطانیہ ، ص،۱۶۶).

غیر مسلموں کی شخصی آزادی اور نجی زندگی بھی اس طرح محفوظ ہے جیسے مسلمانوں کی، [رکّ بہ اہل الذمہ] کوئی شخص ان کی آزادی کو بلا وجہ سلب نہیں کر سکتا۔ ان کو اپنے تہذیب و تمدن اور اپنے رسوم و رواج کے مطابق زندگی گزارنے کا پورا پورا حق حاصل ہے، جب تک کہ وہ ملک میں باعث فساد نہ بنیں۔ میثاق مدینہ میں یہود کو دیئے گئے حقوق شہریت ، مذہبی آزادی ، مساوات اس کا واضح مظہر ہے (ابن کثیر : السیرۃ النبویہ ، ۲: ۳۲۰-۳۲۲).

خلفاے راشدینؓ کے عہد میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً حضرت عمرؓ کے عہد میں بیت المقدس فتح ہوا انہوں نے فتح کے بعد عیسائیوں کو امان دی ، اس کے الفاظ یہ ہیں ” یہ امان ہے جو اللہ کے بندے عمرؓ نے اہل ایلیاء کو دی ،یہ امان جان ومال ، گرجا گھر، صلیب ، تندرست و بیمار اور ان کے تمام اہل مذہب کے لیے ہے۔ نہ ان کے احاطہ کو نقصان پہنچایا جائے گا نہ ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی ،مذہب کے بارے میں ان پر جبر کیا جائے گا نہ ان میں سے کسی کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا (الطبری ، ابو جعفر محمد بن جریر: تاریخ الامم والملوک ، ۳:۶۰۹).

غیر مسلموں کو زندگی کی تمام ضروریات فراہم کرنا اور ان کی کفالت کرنا بھی اسی طرح لازمی ہے، جیسے مسلمانوں کی۔ حضرت عمرؓ نے ایک بار ایک بوڑھے ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو اس کا جزیہ معاف کر دیا اس کا وظیفہ مقرر کیا اور اپنے افسر خزانہ کو لکھا "اللہ کی قسم ہم نے اس سے انصاف نہیں کیا، ہم نے اس کی جوانی کے دنوں میں اس سے ٹیکس لیا اور بڑھاپے کے دنوں میں اسے (بے سہارا) چھوڑ دیا "(ابو یوسف : کتاب الخراج ، ص ۷۲)۔ اسی طرح سیاسی دائرہ کار میں سوائے چند کلیدی مناصب کے، جن کا تعلق براہ راست اسلامی ریاست کی پالیسی سے ہو، باقی ملازمتوں کے دروازے غیر مسلموں کے لیے بھی کھلے رکھے گئے ہیں۔ عہد خلافت راشدہؓ میں یہ تمام حقوق غیر مسلم شہریوں کو ملتے رہے اور ان کو اسلامی ریاست کے مسلم شہریوں کی طرح تصور کیا گیا اور یہ صرف اسلامی ریاست کا تخصص ہے کہ اس میں مسلم و غیر مسلم دونوں کے مابین کبھی کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا گیا (صدر الدین: The Triumph of the Holy Quran، ص: ۱۶۵-۱۶۶)۔

(ب)عصر حاضر میں بنیادی انسانی حقوق کا تصور

اسلام سے قبل کی انسانی تاریخ میں بنیادی انسانی حقوق کے حوالہ سے کوئی واضح نظریہ یا رائے نہیں ملتی۔ بابل کی تہذیب جو قدیم تہذیبوں میں نسبتاً زیادہ متمدن تصور کی جاتی ہے، اس کے بادشاہ حمورابی کے قانون میں جو ۱۸۹۷ء میں سوس کے کھنڈرات سے دریافت ہوا، مختلف قوانین اور متعدد سزاؤں کا ذکر تو ہے، لیکن یہ وضاحت کہیں نہیں ہے کہ ریاست کے ذمہ شہریوں کے کون کون سے حقوق ہیں جو اسے لازماً ادا کرنے ہیں (مالک رام: حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن ، ص : ۱۵-۶۰) ۔ قدیم ہندوستان کا جائزہ لیا جائے تو تقریباً ۲۲۱ تا ۳۰۰ ق م کے زمانے میں ممتاز قانون دان کو تلیہ چانکیہ اچاریہ نے سنسکرت زبان میں "ارتھ شاستر" نامی کتاب لکھی، اولاً تو اس میں حقوق کے حوالہ سے کوئی ٹھوس رائے نہیں ملتی، تاہم جو کچھ درج تھا اس کی تعمیل و تنفیذ بھی ارباب اقتدار کے لیے ضروری نہ تھی.

اہل مغرب کے ہاں حقوق انسانی کی تاریخ کا آغاز پانچویں صدی ق م میں یونان سے ہوتا ہے ۔ اس عہد کے ممتاز فلسفی افلاطون نے ایک موقع پر کہا تھا:"میں اعلان کرتا ہوں کہ انصاف طاقت ور کے مفاد کے سوا کچھ نہیں۔ دنیا میں ہر جگہ انصاف کا ایک ہی اصول ہے، طاقت ور کا مفاد (Morris Hammer: Plato Dictionary, Stock، ص: ۳۳)۔ افلاطون کے شاگرد اور مشہور فلسفی ارسطو نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ کچھ لوگ فطرتاً آزاد ہیں اور کچھ فطرتاً غلام اور مؤخر الذکر کے معاملہ میں کثرت تعداد مفید ہے اور منصفانہ بھی (Thomas P Kierman: Aristotle Dictionary، ص:۴۵۴)، اس نے مزید لکھا ہے کہ ...... غریب لوگ امیروں کے پیدائشی غلام ہیں وہ بھی اوران کی بیویاں، بچے بھی (کتاب مذکور: ص، ۱۸۵)۔ یہ اقوال معاشرتی نظام اور مختلف طبقات معاشرہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے حوالہ سے اس کے نظریات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں [فرد کے شخصی حقوق کا تصور موجود نہ تھا؛ البتہ مختلف انسانی طبقات کے حقوق و مفادات کا ضرور تصور تھا اور یونان کے فلسفی اسی پر توجہ مرکوز کیے ہوے تھے]۔

بعدازاں فطری حقوق کا نظریہ پیش کیا گیا ، اس کے مطابق سب انسانوں کو فطری طور پر چند حقوق حاصل ہیں، ریاست بھی یہ حقوق ان سے چھین نہیں سکتی، دعوی کیا جاتا ہے کہ یہ نظریہ مذہب کی بنیاد پر عیسائیت میں پایا جاتا تھا ، تاہم مذہبی تفوق کے زوال کے بعد ان حقوق کی حالت تبدیل ہو گئی اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا (Heywood

Andrew: *Political Ideas and Concepts*، ص: ۱۴۱)۔ [تاہم عیسائیت کی پوری تاریخ میں شاید بطور مثال کے بھی کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں ان فطری اصولوں پر عمل کیا گیا ہو۔ حقیقت میں پاپائیت ہمیشہ شہنشاہیت کی مؤید اور اس کی ممدو معاون رہی ہے]۔

اس کے بعد حقوق کا تاریخی نظریہ سامنے آیا، جس کے مطابق حقوق دراصل وہ رسوم و رواج ہیں جو آگے چل کر خود بخود حق کی شکل اختیار کر گئے (Heywood Andrew: *Political Ideas and Concepts*، ص:۱۴۱)۔ اس سے اگلے مرحلے میں حقوق کی مثالی تاریخ کا نظریہ سامنے آیا اس کے مطابق حقوق سے مراد وہ سہولتیں ہیں جو فرد کی شخصیت کی ترقی کے لیے ضروری ہیں (Green.T.H: *Lectures on principles of Political obligation*، ص :۳۵)۔ اس کے بعد سماجی بہبود کا نظریہ سامنے آیا اس کے مطابق حقوق سے مراد وہ ضروری شرائط ہیں جن سے سماجی فلاح و بہبود کو تقویت پہنچتی ہو۔ انسان کو یہ حقوق اس لیے ملنے چاہئیں کہ وہ معاشرہ کی بہتر خدمت کر سکے اور اس کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکے (E.Asrivathen: *Political Theory*، ص : ۱۶۹)، مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ مغربی تصورات کے مطابق طاقت سہولتیں اور ہر وہ چیز جو کسی شخص کی سوچ کے مطابق ہو اسے ملنی چاہیے، حق ہے۔

ان تمام تعریفات و انواع حقوق سے بنیادی انسانی حقوق کی واضح تعریف یا حدود وغیرہ معلوم نہیں ہوتیں، متذکرہ بالا حقوق کے مطابق ریاست کسی بھی حق کی ادائیگی کی ذمہ دار نہیں ہے، اس میں یہ وضاحت بھی نہیں ہے کہ یہ حقوق کس کے ذمہ ہیں اور اگر ہر شخص کو اس کی ترقی کے لیے کلیۃً آزاد چھوڑ دیا جائے تو معاشرہ کی حالت کیا ہوگی۔ اس ایک فرد کے اپنی آزادی کو استعمال کرنے سے دوسروں کو جو نقصانات ہوں گے ان کی تلافی کس کے ذمہ ہو گی۔ گویا یہ سب تصورات ادھورے ، ناکافی اور الجھے ہوئے تھے۔

اسلام نے جو معاشرہ تشکیل دیا اس میں شہریوں کے لیے ریاست کی ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ انسانی میں حقوق انسانی کا پہلا اور جامع ترین چارٹر اسلام نے دیا۔ میثاق مدینہ حقوق انسانی کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے (دیکھیے محمد حمید اللہ: The First written Constitution in the world)۔ اس کے علاوہ آپؐ کا خطبۂ حجۃ الوداع اس سلسلے میں حقوق انسانی کا بہت اعلیٰ و ارفع تصور عطا کرتا ہے۔ اسلام کے دیئے ہوئے حقوق انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتے ہیں (بلکہ اس سے بھی پہلے ......چنانچہ جب بچہ شکم مادر میں ہوتا ہے اس وقت سے اسلام نے اس کے حقوق متعین کیے ہیں)۔ ریاست اور افراد ان تمام حقوق کی ادائیگی کے ذمہ دار ہیں، ان کو کوئی شخص بھی سلب نہیں کرسکتا۔ ان حقوق میں جان و مال ،عزت و ناموس کا تحفظ ، مذہبی آزادی ، معذوروں کمزوروں کا تحفظ، عدل و انصاف کی فراہمی ، معاشی تحفظ ، زندگی کے تمام شعبہ جات میں مساوات کا تصور ، سیاسی امور میں شرکت کا حق ، شخصی آزادی کا تحفظ، دوسرے کے عمل کی ذمہ داری سے بریت، خواتین کی عزت و ناموس کا تحفظ اور ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کی آزادی وغیرہ شامل ہیں۔

مغرب میں حقوق انسانی کی پہلی باقاعدہ دستاویز۔ برطانیہ سے جاری شدہ میگنا کارٹا ہے۔ ۱۲۱۵ء کی جاری شدہ یہ دستاویز امرا اور بادشاہ کے درمیان ایک معاہدہ کے علاوہ کچھ نہ تھی،اس میں شخصی آزادی کی کسی حد تک حفاظت کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ عام شہری کے لیے کوئی حقوق محفوظ نہ تھے (*Encyclopaedia Americana*، بذیل Magna Carta، ۱۸: ۹۲-۹۳)۔

چودہویں صدی عیسوی سے سولہویں عیسوی تک صرف میکیاولی کے نظریات کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ سترھویں صدی عیسوی میں فطری حقوق کا معاملہ سامنے آیا، چنانچہ ۱۶۸۹ء میں برطانیہ میں Bill of Right پیش ہوا جو خالصتاً حکمرانوں کے لیے اور سیاسی امور کے مطابق بنایا گیا تھا (دیکھئے Bill of Right، Ency Americana، ۷۴۱:۳) ۱۶۹۷ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے حبس بے جا کا قانون پاس کیا ۔ ۱۶۹۰ء میں جان لاک نے معاہدہ عمرانی پیش کیا۔ ۱۷۶۲ء میں روسو نے معاہدۂ عمرانی کے زیر عنوان ایک کتاب لکھ کر پچھلے نظریات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ۱۷۶۶ء میں امریکہ میں طبقاتی تقسیم کے خاتمہ کے لیے ایک بغاوت برپا ہوئی جو نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی (Ency Brittanica ، ۹۵۱:۱۸).

۱۷۸۹ء میں امریکہ کا قانون برائے حقوق پیش ہوا اور اسے منظور کر لیا گیا، اس میں انفرادی حقوق کو بھی تسلیم کیا گیا (کتاب مذکور: ۹۵۸)۔ اسی سال فرانس میں انقلاب کے موقعہ پر بنیادی انسانی حقوق کا اعلان کیا گیا، جس کے مطابق ایک عام شہری کے حقوق متعین کیے گئے جن میں آزادی، قانونی حریت، مساوات، حق ملکیت شامل تھے۔ البتہ سیاسی امور میں شرکت کا حق سب کو نہیں ملا (تفصیل کے لیے دیکھئے : Ency Brit، بذیل France، ۷:۶۵۰-۶۵۱).

۱۷۹۱ء میں امریکہ کے آئین کی پہلی دس دفعات میں ترمیم کر کے بنیادی انسانی حقوق پیش کئے گئے ، مذہب ، تقریر ، صحافت و شخصی آزادی ، ملکیت اور بعض دیگر حقوق دیئے گئے۔ (دیکھئے Ency Americana، ۷۴۱:۳-۷۴۵)۔ ۱۷۹۲ء میں تھامسن پین (Thamson pan) نے اپنا مشہور کتابچہ "حقوق انسانی" شائع کر کے اس سلسلہ میں کچھ پیش رفت کی۔ ۱۹۴۱ء میں منشور اوقیانوس پر دستخط ہوے جس کا مقصد بقول چرچل " انسانی حقوق کی علمبرداری کے ساتھ جنگ کا خاتمہ" بھی تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد حقوق انسانی کی اہمیت اور بڑھی اور ۱۹۴۷ء میں اٹلی نے اور پھر جاپان نے اپنے اپنے آئین میں انسانی حقوق کی ضمانت دی.نازیوں کے کیمپوں میں انسانوں کی اندھا دھند موت اور انسانوں کے ساتھ بے رحمی کے دیگر مظاہروں کے بعد بین الاقوامی سطح پر بنیادی انسانی حقوق کی جانب توجہ دی گئی اگرچہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی پہلی دفعہ یہی ہے، بغیر رنگ و نسل ، زبان و جنس کے امتیاز کے "انسانوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ واحترام کیا جائے تاہم اس میں اس بات کی کوئی وضاحت نہیں ہے کہ بنیادی حقوق کیا ہیں۔ اقوام متحدہ کے سربرآوردہ ممالک خود تذبذب میں ہیں کہ ثقافتی، سیاسی و نظریاتی اختلاف کی بنا پر یہ کیسے طے کیا جائے کہ بنیادی حقوق کون کون سے ہیں۔ بالآخر ۱۹۴۷ء میں بنیادی انسانی حقوق کا کمیشن بنایا گیا جس کی ذمہ داری تھی کہ ایسا مواد تیار کرے جو عالمی سطح پر بنیادی انسانی حقوق کی تکمیل کے سلسلہ میں تمام ممالک کے لیے قابل قبول ہو۔ اس کے منشور میں یہ نکات تھے کہ سب لوگ آزاد پیدا ہوے، کوئی کسی کو قید نہیں کر سکتا۔ سب آزادی و مساوات (زندگی کے تمام شعبوں میں) کے لحاظ سے برابر ہیں۔ شخصی آزادی، زندگی و جان کا تحفظ ، معاشی تحفظ و مواقع وغیرہ سب کے لیے ہیں" اس کا باقاعدہ اعلان ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو کیا گیا اور اسے حقوق انسانی کے دن کا نام دیا گیا۔

(Ency. Americana، بذیل United States، ۲۷:۴۵۴)، لہٰذا ۱۹۸۱ء میں ۶۹ ملکوں نے معاشرتی ، معاشی اور ثقافتی اور ۶۱ ملکوں نے شہری و سیاسی حقوق کو تسلیم کیا۔ یہ کمیشن انفرادی طور پر ان لوگوں کی شکایات بھی سنتا ہے جو بنیادی انسانی حقوق کے خلاف کسی شدید رویہ کا نشانہ بنے ہوں (حوالہ مذکور).

۱۹۸۲ء میں کینیڈا کے آئین کی دفعات میں انسانی حقوق کو باقاعدہ طور پر شامل کیا گیا، اس کے مطابق بنیادی انسانی حقوق میں بنیادی اور اظہار رائے کی آزادی، ذرائع ابلاغ، تعلقات عامہ، مساوات، اقلیتوں کا تحفظ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ قانون ۱۹۸۲ء میں منظور ہو کر نافذ ہوا (Ency Americana، بذیل Bill of Rights، ۳:۷۴۱-۷۴۵).

اس کے برعکس یہ بنیادی انسانی حقوق کو اسلام نے چودہ صدیوں قبل ریاست کے آئین کا حصہ قرار دیا اور نہ صرف یہ آئین کا حصہ تھے، بلکہ ان کو عملاً نافذ بھی کیا گیا، یثاق مدینہ کی صورت میں دنیا کا پہلا تحریری دستور سامنے آیا جو ریاست کے ہر ایک شہری کے تمام حقوق کی حفاظت کا ضامن تھا۔ خطبہ حجۃ الوداع میں ہر شعبہ حیات کے حوالہ سے تمام افراد معاشرہ کے حقوق واضح کر دیئے گئے۔ (دیکھیے بالا)

ان تمام معروضی حقائق کو سامنے رکھتے ہوے بلامبالغہ اور بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بنیادی انسانی حقوق کا جتنا قوی اور بہترین تصور اسلام نے دیا وہ مہذب دنیا کے علمبردار نہیں دے سکتے۔ اسلام میں انسانی جان اتنی اہم ہے کہ جنگ کے انتہائی ہنگامی حالات میں بھی کسی مسلمان سپاہی کے لیے عورت، بچے، معذور، بوڑھے اور اس شخص پرجو ہتھیار پھینک دے، ہاتھ اٹھانا جائز نہیں۔ معاشرہ میں عورت کی عصمت اتنی محفوظ ہے کہ ایک عورت سونے کے زیور ہاتھ میں لیے تنہا سفر کر لیتی ہے، اسے کسی بھی قسم کا خوف نہیں ہوتا، دشمن کی خواتین کا احترام بھی اسی طرح ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے، جیسے مسلم خواتین کا، اسلامی معاشرہ مثالی مساوات پیش کرتا ہے جس کی نظیر دنیا کے کسی معاشرہ میں نہیں ملتی۔ مختصراً قرآن و سنت کے احکامات کے مطابق تشکیل دیئے گئے معاشرہ میں ایک انسان خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم خود کو جتنا محفوظ و مامون اور زندگی کے ہر شعبہ میں آگے بڑھنے کا اہل پاتا ہے کہیں اور نہیں، جدید دور میں انسانی حقوق کے لیے بنائے گئے منشور، دستاویزات، ادارے سب یثاق مدینہ، خطبہ حجۃ الوداع اور اولین اسلامی ریاست کے اصول و قوانین سے مأخوذ ہیں۔

مآخذ: (۱) موسوعۃ الحدیث الشریف، الکتب الستۃ، دارالسلام المکتبۃ العربیۃ السعودیۃ، باراوّل، ۱۹۹۹ء؛(۲) الدارمی: ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن الفضل بن بہرام، سنن الدارمی دارالمغنی ریاض، بار اول ۲۰۰۰ء؛ (۳) البیہقی احمد بن الحسین ابی بکر: شعب الایمان، دارالکتب العلمیۃ، بار اول ۱۹۹۰ء؛ (۴)ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم: کتاب الخراج، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ پاکستان ۱۹۷۸ء؛(۵) ابن کثیر الدمشقی ابو الفداء اسماعیل: البدایۃ والنھایۃ، دارالکتب العلمیۃ بیروت؛ (۶) وہی مصنف: السیرۃ النبویہ، مطبعہ عیسیٰ البابی الحلبی و شرکا قاہرہ ۱۹۶۴ء؛ (۷) متقی الہندی، علاء الدین علی المتقی بن حسان الدین: کنز العمال فی السنن والاقوال، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۹۹۳ء؛ (۸) الشوکانی محمد بن علی: نیل الاوطار، مؤسسۃ تاریخ العربی، بیروت۔ ت ن؛ (۹) ابن قتیبہ، ابو محمد عبداللہ بن مسلم: الامامۃ والسیاسۃ، مطبعہ الفتوح الادبیۃ، مصر، ت ن؛(۱۰) الواقدی محمد بن عمر: المغازی، ت ن؛ (۱۱) مالک رام: حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن، اپنا ادارہ پاکستان ۲۰۰۰ء؛(۱۲) مالک بن انس: المؤطا، دار النفائس، طبع: ۱۱، ۱۹۹۰ء؛(۱۳) یحیٰی بن آدم القرشی: کتاب الخراج، المکتبۃ العلمیۃ، پاکستان طبع اول، ۱۳۹۵ھ؛ (۱۴) محمد بن الحسین الفراء: الاحکام السلطانیہ، شرکۃ مکتبہ و مطبعۃ البابی الحلبی مصر، طبع: ۲، ۱۹۶۶ء؛(۱۵)طبری، ابو جعفر محمد بن جریر: تاریخ الامم والملوک، دار سویدان، بیروت، ت

ن ؛(۱۶) القرطبی ابی عمر یوسف بن عبداللہ: الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، دارالکتب العلمیۃ بیروت، طبع ثانی ۲۰۰۲ء. (۱۷) H.J Laski: *An Introduction to Politics*، لنڈن ۱۹۶۰ء؛ (۱۸) Hey Wood Andrew: *Political Ideas and concepts*، لنڈن ۱۹۷۸ء؛ (۱۹) E-Asirvathen: *Political Theory*؛ (۲۰) Green T.H: *Lectures on Principles of Political Obligations*، لنڈن ت ن ؛ (۲۱) Morris Stock Hammer: *Plato's Dictionary*، نیو یارک؛ (۲۳) Thomas P kierman: *Aristotle Dictionary*، ای ۔ جے ۔ برل ۱۹۶۲ء؛ (۲۳) *Encyclopaedia Americana*؛ (۲۴) *Encyclopaedia Brittanica*، ولیم بینٹن پبلشرز ، ۱۹۴۳-۷۳؛ (۲۵) *Michael stewart: Modern Forms of Goverment*، لنڈن ۱۹۵۰؛ (۲۶) *An Introduction to Politics*, *Soltau*، لانگ مین لندن ۱۹۶۸ء.

حفصہ نسرین [ن : محمودالحسن عارف]

••-------------••

※انصاف: (ع) یہ عدل کا مترادف لفظ ہے اور عطاے حق، یعنی حق کی ادائیگی کے تصور کا مفہوم دیتا ہے۔ لسان العرب کے مطابق، اَنصف کا مطلب ہے: "دوسروں کو اُسی حق کی یقین دہانی کرانا جس کا انسان خود اپنے لیے طلب گار ہوتا ہے"۔ یہ نظریہ "برابری" سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے، لیکن یہ امر واضح نہیں کہ کب سے یہ لفظ انصاف کا مفہوم ادا کرنے کے لیے مستعار لیا گیا۔ اگرچہ انصاف قدیم شاعری میں بھی آیا ہے، لیکن انصاف ماقبل از اسلام دور کے "دواوین" میں نظر نہیں آتا۔ اسی طرح یہ لفظ اس شکل میں تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے شعری مجموعوں میں بھی نہیں ملتا۔ اشعار منصفہ (یا اشعار النصف الانصاف) کی ترکیب، گو اصناف شعر میں شامل نہیں، تاہم ایک ایسی اصطلاح ضرور ہے، جو دور جاہلیت کے اختتام اور ابتداے عہد اسلام کے معتدبہ شاعروں کے ہاں پہلی دفعہ ملتی ہے۔ اس قسم کے اشعار میں (جو اکثر بحر وافر میں ہیں اور مکرر الفاظ پر مشتمل ہیں)، شعرا حریف قبیلے کی جنگی شجاعت اور اس کے جوش وخروش کی تعریف و توصیف کرتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ فتح بمشکل حاصل کی گئی۔ اس طرح یہ نظمیں اپنے مدمقابل لوگوں کی تحقیر کیے بغیر اپنے آپ کو برتر ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ یہ ہجو [رک بآں] کے روایتی موضوعات سے متضاد شے ہے، جس کی طرف اشعار کے انتخاب کنندگان (ابن سلّام، ابوتمام اور البحتری) متوجہ ہوے ہیں اور منصفہ کا عنوان اختیار کیا ہے (دیکھیے: Ch. Pellat: *Sur l'expression arabe asi,ar m.n.s.fa/fat, Mel. Marcel Cohen*، ۱۹۷۰ء ص ۲۱۱۔۲۱۹).

انصاف کی اصطلاح قرآن مجید میں استعمال نہیں کی گئی۔ عدل کے لیے بنیادی لفظ "قسط" استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن ایسے مشتقات کے اکثر اور وافر استعمال سے اس کے مفہوم کو واضح کیا گیا ہے جو کہ تصوراتی طور اس کے قریب ہیں، یا اس کے متضاد ہیں، مثلاً عدو، ظلم، عدل، صلح، حسن۔ اِستحسان کا اصول، جسے خصوصاً احناف نے (بطور ایک فقہی مآخذ) اختیار کیا ہے، قرآنی نظریہ و مصطلحات میں سخت اور بے لوث تصور انصاف کے نسبتاً زیادہ نرم اور مفصل نظریۂ و دستور کا اظہار کرتا ہے۔ زمانے، رواج، دستور اور افراد کا راسخ احترام متعارف کرانے میں استحسان عدل کی طرف راجح حل اختیار کرنے کی رخصت مہیا کرتا ہے۔ مستشرق (Ch. Chehata) لکھتا ہے : "استحسان کو وہ صورت تصور کیا جاسکتا ہے جو عدل اس تصور کے مطابق ہے، جو مسلمان ماہرین قانون

[شریعت] کے ذہنوں میں راسخ ہوچکا ہے۔ استحسان (Jus est ars aequi et boni) کے اصول کا انسانی مظہر ہے یہ قانون [شریعت] اور اخلاقی اصولوں کے مابین حد فاصل ہے"۔ (Ch.Chehata دیکھیے *Etudes de philosophie musulmane du droit*، در *St. Isl*، ۲۵، ص ۱۳۸).

فلاسفہ نے فطری طور پر اس نظریے کو اپنایا تاکہ اس کے اخلاقی حسن کی تعریف کی جاسکے، مثلاً مسکویہ (تہذیب الاخلاق، طبع زریق، ص ۱۸) لکھتا ہے: "عدالت کی خاصیت انسان کو حیا ودیعت کرتی ہے جو اُسے ہمیشہ اولاً اپنے آپ سے اور ثانیاً دوسروں کے ساتھ عدل کرنے پر مستعد رکھتی ہے اور اسی عدل کی وہ اپنے لیے دوسروں سے توقع رکھتا ہے"۔

اس نظریہ کی عقلی توجیہ مفکرین کی تحریروں میں کی گئی ہے اور قطعی طور پر انصاف کا مفہوم غیر جانبداری، معروضیت اور دیانت داری قرار دیا گیا ہے۔ مختصرا یہ کہ ذی علم انسان کی سرگرمی کے لیے ایک مکمل اخلاقی مجموعۂ ضوابط ہے، جسے مثلاً الماوردی [بحث کرتے ہوے] آخر میں "روح کی صیانت" کا نام دیتا ہے (صیانۃ النفس در ادب الدنیا و الدین) طبع سقا، ص ۳۰ ببعد وبمواضع کثیرہ)۔ اس مجموعۂ ضوابط اخلاق کی اہمیت ادباء کے لیے کتاب الانصاف یا کتاب الانصاف والانتصاف (جن میں سے سولہ کا ذکر براکلمان کے ہاں ملتا ہے) کی جانب توجہ کی وضاحت کرتی ہے.

آخر میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انصاف بحث ومباحثہ کا ایک طریقہ ہے جس میں زیر مدافعت چیز کے مقابلے میں زیر اعتراض چیز کی کمتری یا سقم کو بصحت بیان کرنے کی بجائے، ہر دو کو ایک فرضی مساوی سطح پر رکھا جاتا ہے، اگرچہ یہ بھی تسلیم کرلیا جاتا ہے کہ ان میں ایک چیز کمتر یا غلط ہے۔ اس طرح سے غیر جانبداری کا اظہار کیا جاتا ہے، جبکہ ان دو میں سے ایک چیز یا بیان کو صراحتاً ناممکن یا لغو تصور کرلیا جاتا ہے۔ اس وصف کا نمونہ قرآن پاک میں ملتا ہے [وَاِنَّا اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ] "اور ہم یا تم (یا تو) سیدھے راستے پر ہیں یا صریح گمراہی میں" (۳۴ [سبا]: ۲۴؛ M.Canard: اخبار الراضی باللہ...، الجزائر ۱۹۴۶ء، ۱: ۶۷، عدد ۳)۔ نیز اس آیت کے بارے میں دیگر تفاسیر ملاحظہ ہوں جہاں حضرت حسانؓ بن ثابت کے دو شعر (بحر وافر، ردیف الف) اس سلسلے میں نقل کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں شعر دیوان حسان کے حصہ اوّل میں (نمبر شمار ۲۴-۲۵ مع تشریحات مرتبین) موجود ہیں.

مآخذ: مقالہ کے متن میں دی گئی کتب کے علاوہ دیکھیے: R.A.Gautrier و J.Y.Jolif: *Aristotle, Ethique a Nichomaque*، ۲/۱ و ۴۳۱-۴۳۲.

(M.Arkoun [ظفر علی])

••-------------••

اِنعام: (عربی) نوازش، احسان، خصوصاً افواج X وغیرہ کو دیئے جانے والے عطیہ جات، داد و دہش.

عسکری اقدام کے لیے تیار کردہ افواج کو مصروف کار رکھنا ہر قوم، خصوصاً مسلمان حکمرانوں اور سپہ سالاروں کے لیے ایک مستقل مسئلہ رہا۔ جب تک اُن کے سامنے عمدہ اور پرکشش تنخواہ کی ادائیگی اور عموماً پرکشش انعام کے وعدے نہ رکھے جاتے، اس بات کا خطرہ موجود رہتا تھا کہ یہ خود بخود منتشر ہو جائیں گی۔ افواج کو اگلے مورچوں میں ٹھہرا کر آمادۂ پیکار رکھنا اکثر بڑا مشکل ہوجایا کرتا تھا، ایک مسلمان فوج کے دوسری مسلمان فوج کے بالمقابل ہونے کی صورت میں، جبکہ ایک جیسی بنیادوں پر بھرتی کیے جانے اور بھرتی، رسد اور میدان جنگ میں صف بندی کے ایک جیسے مسائل کا سامنا ہوتا تھا، فریقین کی مشترک

مشکلات کی بنا پر فتح یابی کے برابر مواقع پائے جاتے تھے، لیکن صلیبیوں کے ساتھ جنگوں کے دوران میں افواج کو میدان جنگ میں رکھنا مسلمان سپہ سالاروں کے لیے ایک سنجیدہ مسئلہ تھا۔ فرانسیسی بحیرۂ روم کے مشرقی خطے میں واقع اپنے مفتوحہ علاقوں میں اقامت گزین ہوچکے تھے اور وہاں قرون وسطیٰ میں مغربی یورپ میں رائج جاگیرداری نظام سے ملتا جلتا ایک نظام قائم کرچکے تھے۔ اس طرح اُن کے سرداروں کو اپنے جاگیردارانہ منصب کی ایک شرط کے طور پر جنگ کے لیے مستقل طور پر مستعد رہنا ہوتا تھا۔ فریق مخالف، یعنی مسلمانوں کو اپنی افواج پیشہ ور عرب، ترکمان اور کرد تنخواہ دار سپاہیوں کو بھرتی کرکے تشکیل کرنا ہوتی تھیں اور تنخواہ کی ادائیگی اور ملازمت کے طویل عرصوں تک اپنے ساتھ رہنے کے متعلقہ مسائل سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ مسلمانوں میں سے سلطان صلاح الدین ایوبی کے بارے میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ سالہا سال تک اپنی افواج کو برسر پیکار رکھنے کی اہلیت رکھتا تھا [اور] یہاں کلیدی عنصر مالی ترغیبات کی بجائے ذاتی و شخصی اثرورسوخ تھا (دیکھیے برائے حوالہ H.A.R.Gibb: The Achievement of Saladin، در Bull. of the John Rylands Library، ۳۵ (۱۹۵۲ء، ۱۹۵۳ء) : ۶۰).

میدان کارزار میں حکمران یا سپہ سالار کی موت بھی ایک بحرانی واقعہ ہوتی تھی۔ فوجی رہنما سے وفاداری شخصی سطح پر ہوا کرتی تھی جو سپاہیوں میں جوش وخروش پیدا کرسکتا تھا اور مال غنیمت کے بارے میں وعدہ کر سکتا تھا۔ اور اگر یہ شرائط پوری نہ کی جاتیں تو جب تک دوسرا برابر کا طاقت ور یا متبادل سپہ سالار موجود نہ ہوتا، [اس وقت تک عدم وفاداری کا خطرہ نہ ہوتا تھا]۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری/نویں اور دسویں صدی عیسوی میں بغداد اور سامرا میں خلفا کی وفات پر فوج نے اکثر وبیشتر بغاوتیں کیں اور لوٹ مار کی۔ یہی کچھ دیگر سلطنتوں مثلاً آل بویہ اور سلاجقہ میں ہوا۔ ۴۳۵ھ/ ۱۰۴۴ء میں امیر عراق جلال الدولہ کی وفات پر اس کے وزیر کمال الملک بن عبدالرحیم اور دیگر سول وفوجی اعلیٰ حکام کے فوری اقدام کی بنا پر امیر کا محل اور حکومتی مستقر ترکوں اور ہجوم کی لوٹ مار سے محفوظ رکھے جاسکے۔ اس کے چار سال بعد جب ایک مہم کے دوران میں فارس واہواز کے امیر عماد الدین ابوکالیجار نے وفات پائی تو اس کا بیٹا اور وارث فُولاذستون ترک فوجیوں کی لوٹ مار سے اپنے باپ کے خزانے، اسلحے اور مویشیوں کو محفوظ کرنے میں ناکام رہا (ابن الاثیر، ۹: ۳۴۷، ۳۵۳، ۳۷۳) حتیٰ کہ ۴۵۵ھ/ ۱۰۶۳ء میں سلجوقی سلطان طغرل جیسے طاقت ور شہنشاہ کی وفات پر بھی اگر بعجلت جوابی اقدامات نہ کیے جاتے تو اسی طرح کی بدنظمی واقع ہوتی۔ وزیر عمیدالملک کندوری نے مرحوم سلطان کے غلاموں کو توشہ خانے کے بیش قیمت ملبوسات پر قبضہ کرنے سے باز رکھا؛ اور دوسری ہر چیز ان کے لیے کھلی چھوڑ دی، یہاں تک کہ شاہی گھوڑے بھی تاکہ فوج کو راضی کرکے اپنے زیر حمایت اور طغرل کے نامزد کردہ وارث سلیمان بن چغری بیگ داؤد کی جانشینی کو یقینی بنایا جائے (بنداری، ص ۲۶)۔ اگر فوج میدان جنگ میں ہوتی، جیسا کہ اوپر ابوکالیجار کی وفات کے سلسلے میں بیان کیا جاچکا ہے، تو مرحوم حکمران کا ذاتی خیمہ اور خزانہ ان بے قائد سپاہیوں کے عموماً پہلے ہدف ہوتے تھے اور یہ سپاہی جاری مہم یا محاصرہ سے دست کش ہوجایا کرتے تھے.

مالی امداد اور عنایات بغاوتوں کی پیش بندی کے واضح ترین ذرائع تھے۔ ایک حکمران کی موت کے نتیجے میں پیش آمدہ صعوبتوں کا خاتمہ اور نئے امیر کے لیے پیمان

وفاداری کا حصول اکثر صرف خصوصی زائد تنخواہوں، تحائف اور ترقی کے وعدوں کے ذریعے ہی ممکن ہوتا تھا۔ سپہ سالاروں کو بیش قیمت ملبوسات اور خلعت [رکّبہ خلعۃ] بطور تحفہ ملا کرتے تھے۔ جب عباسی خلفا بتدریج ترک سپہ سالاروں کے زیر اثر آتے گئے اور عمل کی آزادی سے محروم ہونے لگے تو جانشینی کے بحرانوں اور حکومت کا تختہ الٹنے کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ تخت کے لیے حریف دعویٰ داروں کو پایۂ تخت کے محافظوں سے عہد وفاداری حاصل کرنا ہوتا تھا اور یہ کام عموماً مالی ترغیبات کے ذریعے ممکن ہوتا تھا۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں سپاہ کو، جب کبھی حکومت تبدیل ہوتی، مالی منفعت کے حصول کی توقع ہوا کرتی تھی، جسے فنی اصطلاح میں مال البیعۃ (حق البیعۃ، رسم البیعۃ) کہا جاتا تھا۔ ان عطیات کا موازنہ مابعد کے دور میں عثمانی سلاطین کی طرف سے ینی چریوں (Janissarys) کو دیئے جانے والے جلوس آقچسی سے کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح جب خلیفہ المقتدر ۳۱۷ھ/۹۲۹ء میں اپنی دوسری معزولی کے بعد تخت نشین ہوا تو مال البیعہ کی ادائیگی از سرنو کرنا پڑی: ہر پیادے کے لیے چھ نوائب (؟ماہانہ تنخواہ) اور ایک دینار کی زائد رقم اور ہر سوار کے لیے ثلث رزق، یعنی ۹۰ دن کی تنخواہ کا ایک تہائی (دیکھیے Hoernerbac، در .Isl، ۲۴ (۱۹۵۰ء): ۲۷۹)؛ تین دینار کی زائد رقم یعنی زیادہ کی فنی اصطلاح کے لیے دیکھیے الخورزمی: مفاتیح العلوم، ص ۶۴؛ ترجمہ از C.E.Bosworth، در JESHO، ۱۲/۲ (۱۹۶۹ء):۱۴۳، ۱۴۴)۔ جب المقتدر کے خزانے میں رقم ختم ہوگئی تو ملبوسات اور دیگر بیش قیمت اشیا فروخت کر کے یہ وعدہ پورا کرنا پڑا (مسکویہ، در Eclipse of the Abbasid Caliphate، ا: ۱۹۹،۲۰۰؛ ترجمہ، ۴: ۲۲۴، ۲۲۵)۔ آل بویہ کے ہاں عاجلانہ اور متنازع فیہ جانشینی کا رواج عام ہوگیا اور اس موقع پر عطیات کی ادائیگی معمول بن گئی۔ ۳۵۶ھ/۹۶۷ء میں جب عزالدولہ بختیار اپنے والد معزالدولہ کا جانشین بنا تو اُس نے دیلمیوں کی حمایت کو غیر ضروری تصور کرتے ہوے اسے ترک کرنے اور اپنی ترک افواج پر اعتماد کرنے کی کوشش کی، لیکن دیلمی فوجی افسروں نے بغاوت کردی اور معمول کی تنخواہ کے ساتھ زائد رقم کا بطور عطیۂ جلوس مطالبہ کیا۔ بالآخر بختیار کو ثلث رزق کی ادائیگی پر مصالحت کرنا پڑی (حوالۂ مذکور، ایک ماہ یا شاید چھ ہفتے کی تنخواہ؛ مسکویہ، در Eclipse، ۲: ۲۲۶، ترجمہ ۵: ۲۵۰؛ نیز دیکھیے ہلال الصابی، کتاب مذکور، ۳: ۱۵۹، ترجمہ، ۶: ۴۶۶: ۳۷۹ھ/۹۸۹ء میں بصرہ میں بہاء الدولہ سے عطیۂ جلوس کے لیے دیلمیوں کے مطالبات)۔

اس قسم کے حالات میں فوج کی وفاداری سب سے زیادہ اور بعجلت عطیات دینے والے کی طرف منتقل ہوجایا کرتی تھی۔ جلال الدولہ کی وفات کے بعد اس کا فرزند الملک العزیز ابومنصور مطلوبہ مال البیعہ زیادہ جلدی سے مہیا نہ کرسکا اور نتیجتًا اس کا چچا زاد ابوکالیجار آگے آیا اور عراق میں بویہی سپاہ کی وفاداری بصرف زر حاصل کی (ابن الاثیر، ۹: ۳۵۳؛ دیکھیے H.Bowen: The last Buwayhids، در JRAS (۱۹۲۹ء)، ۲۳۲، ۲۳۳)۔ صرف طاقت ور ترین حکمران ہی ان عطیات سے بچ سکے۔ ہلال الصابی کے مطابق عضد الدولہ نے اصل تنخواہ سے زائد کسی طرح کی ادائیگی (زیادات فی الاصول) سے انکار کر دیا، ماسواے مناسب وجائز مواقع کے مثلاً جنگ میں فتح یابی یا خصوصی تائید وحمایت کے حصول کی حکمت عملی کے طور پر (دیکھیے: C.E.Bosworth: Military Oraganization Under the Buyids of Persia and Iraq،در Oriens، ۱۸_۱۹، ۱۹۶۵ء_۱۹۶۶ء)۔ محمودغزنوی کا

فرزند سلطان مسعود ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں تخت نشین ہوا اور اس کے تھوڑے عرصہ بعد اُس نے اپنے اقتدار کو اس قدر مستحکم کرلیا کہ سپاہ کے مال البیعہ کے مطالبے کو مسترد کردیا ؛ بلکہ اُس نے سپہ سالاروں سے وہ رقوم بھی واپس لے لیں جو اس کے بھائی محمد نے خود کو سلطان تسلیم کروانے کی غرض سے اُنہیں ان کی وفاداری حاصل کرنے کے لیے شاہی خزانے سے ادا کی تھیں (دیکھیے Ghaznevid Millitary :C.E.Bosworth Orgamisation، در Isl، ۳۶ (۱۹۶۰ء)، ص ۷۳۔۷۴).

جانشینی کے ان بحرانوں کے علاوہ بعض موقعوں پر، مثلاً فیصلہ کن مہمات یا جنگوں سے قبل سپاہیوں کو زائد رقوم دے کر اپنے سپہ سالاروں کو بلیک میل کرنے کے لیے بخوبی استعمال کیا جاتا تھا۔ جب خراسان کا نیا متعینہ گورنر عاصم بن عبداللہ الہلالی ۱۱۶ھ/۷۳۴ء میں ایک باغی الحارث بن سریج [رک بآں] سے برسر پیکار تھا تو اُس نے مرو کی عرب سرکاری سپاہ کو الحارث کے خلاف لڑنے کے لیے ایک دینار فی کس کے حساب سے ادا کرنے کی پیش کش کی اور پھر آخر میں اس رقم کو بڑھا کر تین دینار کر دیا (الطبری، ۲:۱۵۷۹، ۱۵۸۰)۔ ۱۹۵ھ/۸۱۱ء میں خلیفہ الامین نے علی بن عیسیٰ بن ماہان کو مغربی فارس کا والی اور وہاں پر موجود اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تو اُس نے سپاہ میں ایک خطیر رقم، دو ہزار مرصّع تلواریں اور چھ ہزار خلعت فاخرہ تقسیم کرنا قرین دانشمندی خیال کیا (کتاب مذکور، ۳:۷۹۶)۔ صفاری امیر عامر بن اللیث نے ایک خاص خزانہ قائم کر رکھا تھا جس میں سے نمایاں طور پر بہادر سپاہیوں کو انعامات عطا کیے جاتے تھے (دیکھیے، The Armies :C.E.Bosworth of the Saffarids، در BSOAS، ۳۱ (۱۹۶۸ء)، ص ۵۴۹)۔ بعض اوقات فتح یابی کے لیے خصوصی تگ ودو کرنے والے سپاہیوں کو علٰیحدہ طور پر صلۂ وانعام سے نوازا جاتا تھا۔ کئی مواقع پر آل بویہ اپنی افواج میں موجود ترک عنصر کے خلاف دیلمیوں کو استعمال کرنے میں کامیاب رہے اور یوں انہوں نے اپنے ایک وفادار طبقہ کی بقا کا اہتمام کیا، لیکن اُنہیں اکثر وبیشتر تائید وحمایت محض مالی ترغیبات کے ذریعے خریدنا پڑتی تھی۔ ۳۴۵ھ/۹۵۶ء۔ ۹۵۷ء میں دیلمی سپہ سالار روز بہان بن ونداد خورشید کی سنگین بغاوت سے نمٹنے کے لیے معزالدولہ کو اپنے نوجوان غلاموں کی وفاداری خریدنے کے لیے ان کی تنخواہیں بڑھانا اور انہیں ترقیاں دینا پڑیں (مسکویہ، در Eclipse، ۲: ۱۶۳، ۱۶۶، ۱۷۳، ۱۷۴، ترجمہ ۵: ۱۷۴، ۱۷۸/ ۱۸۶، ۱۸۷؛ ابن الاثیر، ۸: ۳۸۶)۔ اپنے چچا قورد پر ۴۶۵ھ/۱۰۷۳ء میں فتح یابی پر نئے سلجوقی سلطان ملک شاہ نے اپنی سپاہ کے عرب اور کرد سپہ سالاروں کو ان کے اہم کردار کی بنا پر مال غنیمت میں زائد حصہ، خاص اعزازات اور جاگیریں عطا کیں (بنداری، ص ۴۹؛ ابن الاثیر، ۱۰:۵۳).

ہندوستان میں بھی، سلاطین دہلی اور مغل حکمرانوں کے ہاں اپنے سپاہیوں کو انعام اور داد ودہش دینے کا سلسلہ موجود تھا، بعدازاں مغلوں نے اسے ترقی دے کر، باقاعدہ ایک نظام بنا دیا (دیکھیے: Latter Mugal:Irvlne، بامداد فہرست).

''مرأۃ الامراء'' کا لٹریچر اکثر وبیشتر وقتی عطیات کے ذریعے خصوصاً نمایاں فتوحات یا شجاعانہ کارناموں کے بعد سپاہ کی وفاداری کو برقرار رکھنے کی ضرورت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ کیکاؤس عقل مند شہزادے کو بڑی تاکید کے ساتھ مشورہ دیتا ہے کہ ''بہادری سے جنگ میں لڑنے، کسی دشمن کی زندگی کو ختم کرنے یا اُسے زخمی کرنے والے، اس کے گھوڑے کو چھیننے والے یا کوئی اور قابل ستائش کارنامہ سرانجام دینے والے اشخاص کا خاص

خیال رکھا جائے۔ ایسے افراد کو ان کی خدمات کے پیش نظر خلعت فاخرہ عطا کیا جائے اور ان کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے؛ ایسے موقع پر رقم کو بچا کر نہ رکھا جائے" (قابوس نامہ، باب ۴۱، ترجمہ Levy، ص۲۲۰)۔ فخر مدبر کی تصنیف آداب الحرب والشجاعہ میں ایک باب خصوصی خدمات اور میدان جنگ میں بہادری کا مظاہرہ کرنے پر سپاہیوں کو اعزازی نشانات (تشریف)، مالی صلے، گھوڑوں اور اسلحہ کے تحائف اور پنشن (نان پارہ) کی شکل میں انعام واکرام عطا کرنے کے بارے میں فرمانروا یا سپہ سالار کے فرائض کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ وہ مختلف نوعیت کے کارناموں، مثلاً دشمن کا کٹا ہوا سر لانے، گھوڑے کو سوار سمیت پکڑ کر لانے یا صرف گھوڑے یا صرف سوار کو پکڑکرلانے، حملے کی قیادت کرنے یا دوران حملہ ثابت قدم رہنے، انفرادی طور پر مبارزت کرنے، دشمن کا پرچم یا چتر وغیرہ لے آنے کے لیے موزوں انعامات کی قابل قدر تفاصیل دیتا ہے (انڈیا آفس فارسی مخطوطہ ۶۴۷، باب ۳۶ وبعد، ۱۲۶ب۔ ۱۲۸ب؛ تحقیق احمد سہیلی خوانساری، تہران ۱۳۴۶ھ/۱۹۶۷ء (مبنی بر مخطوطہ در موزۂ بریطانیہ) باب ۳۰، ص ۵۴۲۔ ۵۴۷) .[فوج میں شجاعت اور بہادری کے کارنامے انجام دینے والے افسروں اور جوانوں کو انعام و اکرام دینے کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے حکمران ذاتی طور پر ایسا کرتے تھے اب حکومتیں یہ کام انجام دیتی ہیں].

مآخذ: متن مقالہ میں دیئے گئے ہیں۔ اس موضوع پر کوئی مخصوص کتب نہیں ہیں.

(C.E.Bosworth [ت ظفر علی])

..-------------..

⊗ انعام[تعلیقہ]:فاضل مستشرق کے مقالہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مسلم فوج زر اندوزی کے لیے لڑتی تھی، اور جو مسلمان حکمران بھی اسے زیادہ انعام واکرام کا لالچ دیتا، وہ اس سے مل جاتی تھی، یہ تاثر درست نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم مملکتوں میں جب باقاعدہ مستقل اور تنخواہ دار فوج اور حکومتوں کی بنیاد اہلیت اور تقویٰ کے بجائے محض طاقت اور خاندانی حسب و نسب بن گیا تو فوج میں جذبۂ جہاد اتنا مضبوط نہ رہا جو صدر اسلام میں رضا کار مجاہدوں کے دل میں ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود کوئی مسلمان فوجی بھی جذبۂ جہاد سے خالی نہیں ہوتا اور نہ کوئی مسلمان جہاد کے تصور کے بغیر اپنی جان دیتا ہے۔ خصوصاً صلیبی جنگوں میں یہ جذبہ بہت فعال کردار ادا کرتا رہا۔ یہ بات بھی قابل تسلیم ہے کہ سیاسی نظام میں انتقال اقتدار کا کوئی مستحکم نظام نہ تھا اور خلافت کا وراثتی نظام بعض اوقات خاندانی رقابتوں، طاقتور سیاسی گروہوں یا مضبوط سیاسی شخصیات کے ہاتھوں چیلنج ہوجاتا تھا۔ دریں حالات حکمران بننے میں فوج کی پشت پناہی درکار ہوتی تھی اور فوج کے تقسیم ہونے کی صورت میں زیادہ اور مضبوط فوج رکھنے والا گروہ ہی کامیاب ہوتا تھا۔ ایسے میں جو شخص بھی حکمران بنتا اسے فوج کی حمایت کی ضرورت ہوتی تھی، لہٰذا وہ اسے انعام و اکرام سے نوازتا تھا۔ ویسے بھی یہ رواج مسلمان معاشرے میں عام ہے کہ خوشی کے موقع پر صدقہ خیرات کیا جاتا ہے اور گھروں اور اداروں کے ملازمین وغیرہ میں انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں.

مآخذ: اس موضوع سے متعلق منتشر اشارات کے لیے دیکھیے جہاد سے متعلق دینی و فقہی مآخذ اور مسلم معاشرت اور حروب و جیوش سے متعلق تاریخی و ادبی کتب، جدید مطالعہ بات کے لیے دیکھیے: (۱) وھبۃ الزحیلی: آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، دمشق ۱۹۶۲ء؛ (۲) محمد

ضیاء الدین الریس: النظریات السیاسیۃ الاسلامیہ، قاہرہ ۱۹۶۰ء؛ (۳)عبدالرؤف عون: الفن الحربی فی صدر الاسلام، دارالمعارف مصر ۱۹۶۱ء؛ (۴) دکتور صبحی صالح: النظم الاسلامیۃ، بیروت ۱۹۶۵ء؛ (۵) ماجد خدوری: War and Peace in Law of Islam، لنڈن ۱۹۵۵ء؛ (۶) [نیز دیکھیے آآ بذیل مادہ جیش، اقطاع، دفتر، جہاد وغیرہ].

(محمد امین)

••------------••

⊗ انقلاب: (ع) ایک معروف سیاسی اصطلاح۔) انقلاب قلب کے باب اِنفِعَالٌ سے ہے۔ اس کے لفظی معنی پلٹ جانا، واپس ہونا اور دوبارہ اپنی اصلی حالت پر آنا ہیں (دیکھیے، ابن منظور : لسان العرب، بیروت، ب ت، ج ا؛ E.W.Lane: Arabic English Lexicon، لنڈن ۱۸۶۳ء، ج ۷، بذیل مادہ قلب).

قرآن مجید میں مادہ "اِنْقِلَابٌ" سے مختلف افعال اور مشتقات وارد ہوے ہیں، مثلاً: "وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلاَّ لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ (۲[البقرہ]: ۱۴۳) یعنی "اور جس قبلے پر تم (پہلے) تھے اس کو ہم نے اس لیے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں کہ کون ہمارے پیغمبر کا تابع رہتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا: "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلاَّ رَسُوْلٌ قَدْخَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّاللّٰهَ شَيْئاً (۳[آل عمران]:۱۴۴)، یعنی اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ اُن سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر گزرے ہیں۔ بھلا اگر یہ مرجائیں یا مارے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ (یعنی مرتد ہوجاؤ گے؟) اور جو کوئی اُلٹے پاؤں پھرے گا تو خدا کا کچھ نقصان نہ کر سکے گا۔

سفر کی مسنون دعاؤں میں سے ایک دعا کے الفاظ یہ ہیں: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِن وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَ كَاٰبَةِ الْمُنْقَلَبِ (ابو یعلی موصلیؒ: المسند بحوالہ ابن جزریؒ: حصن حصین (مترجم)، کراچی ب ت، ص ۲۸)، یعنی اے اللہ! میں سفر کی زحمت اور واپسی کی مشقت سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں.

مذکورہ بالا آیات مبارکہ اور مسنون دعا سے بھی انقلاب کے یہی دونوں معنی، یعنی رجعت و واپسی اور انحراف و روگردانی واضح ہوتے ہیں، تاہم رفتہ رفتہ اس لفظ کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور اسے سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ چنانچہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں یورپ کے دو ممالک برطانیہ اور فرانس میں جو سیاسی قسم کی تبدیلیاں واقع ہوئیں تو ان کو بھی انقلاب کا نام دیا گیا۔ انگلستان ۱۷۶۰ء سے ۱۸۴۰ء کے عرصے میں کچھ مفید سائنسی ایجادات کی بدولت ایک صنعتی ملک بن گیا، چنانچہ یہ تبدیلی بھی صنعتی انقلاب کہلائی (دیکھیے: New Age Encyclopaedia، بار ہفتم، سڈنی ۱۹۸۳ء، ۱۵:۱۲۶-۱۲۷)۔ فرانسیسی عوام نے بادشاہ کے ظلم واستبداد سے تنگ آکر طاقت اور تشدد کے ذریعے اس کا تختہ اُلٹ دیا، تاریخ میں اس اہم واقعے کو بھی انقلاب فرانس کہا جاتا ہے (دیکھیے William L.Langer: An Encyclopaedia of World History، ۲:۴۲۹-۴۳۹).

ان دو اہم واقعات کے بعد اغلبًا انقلاب کی اصطلاح محض تبدیلی خصوصاً حکومت یا نظام حکومت کی تبدیلی بذریعہ طاقت (Revolution یا Coup De tat) کے معنوں میں مستعمل چلی آرہی ہے۔ عربی زبان میں اس کے لیے ثورۃ کا لفظ رائج و متداول ہے (دیکھیے منیر بعلبکی: المورد، بیروت ۱۹۷۹ء، بذیل لفظ Revolution).

موجودہ صدی عیسوی کو بجا طور پر انقلابات کی صدی کہا جاسکتا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں اور ۱۹۴۹ء میں چین

میں اشتراکی انقلاب آئے (دیکھیے An Encyclopaedia of World History، (اُردو ترجمہ)، ۳:۳۶۳، ۴۵۴) جوکہ سیاسی اور معاشی دونوں طرح کے تھے۔ تیسری دنیا کے دیگر ممالک کی طرح مسلم ممالک بھی انقلابات کی آماج گاہ بنتے رہے ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں خلافت عثمانیہ کی منسوخی اور جمہوریۂ ترکی کے قیام کا اعلان کیا گیا (دیکھیے، ڈاکٹرافضل اقبال:Contemporary Muslim World، لاہور ۱۹۸۵ء ص۳۵۸)۔ اس اہم واقعے کو بھی انقلاب کا نام دیا جاسکتا ہے۔ بعدازاں ۱۹۶۰ء میں بھی ترکی میں ایک فوجی انقلاب آیا (دیکھیے، کتاب مذکور، ص ۳۶۰)۔ ۱۹۵۲ء میں مصر میں فوجی انقلاب کے ذریعے شاہ فاروق کی بادشاہت ختم کردی گئی۔ ۱۹۵۸ء میں عراق اور سوڈان میں انقلاب آے (دیکھیے: An Encyclopaedia of World History، (اُردو ترجمہ)، ۳:۴۰۰، ۴۰۱).

بعدازاں عراق میں ۱۹۶۸ء میں بعث پارٹی نیا انقلاب برپا کرکے برسراقتدار آئی (دیکھیے: Contemporary Muslim World، ص ۱۳۸)۔ پاکستان میں بھی ۱۹۵۸ء، ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۷ء میں جو فوجی حکومتیں آئیں، انہیں انقلاب نام دیا گیا (دیکھیے: کتاب مذکور، ص ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۳)۔ ۱۹۶۲ء میں یمن ۱۹۶۳ء میں شام اور ۱۹۶۵ء میں الجزائر انقلابات کی زد میں آئے (دیکھیے: An Encyclopaedia of World History، ۱:۴۰۲، ۴۱۳، ۳۷۸)۔ ۱۹۶۶ء میں نائجیریا اور ۱۹۶۹ء میں لیبیا میں انقلاب آئے (دیکھیے، Contemporary Muslim World، ص ۲۵۰، ۱۹۰)۔ افغانستان میں ۱۹۲۹ء، ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۸ء میں انقلابات برپا ہوے (دیکھیے، وہی کتاب، ص ۴،۵) اور یہ ملک ابھی تک بدنظمی کا شکار ہے۔ ۱۹۷۹ء میں ایران میں آیۃ اللہ روح اللہ خمینی کی قیادت میں انقلاب برپا کیا گیا جس کے نتیجے میں رضا شاہ پہلوی کی بادشاہت کا خاتمہ ہوا اور نئی حکومت کا قیام عمل میں آیا (دیکھیے، کتاب مذکور، ص ۱۲۹).

مآخذ: مقالہ کے متن میں مندرج ہیں

(ظفر علی)

••-------------••

اِنگش: شمالی قفقاز کے جارجیائی، قفقازی اور لسانیاتی ※ خاندان کے وسطی گروپ یناخ (ve Ynakh) سے تعلق رکھنے والی ایک مسلمان قوم چیچن، بتزبی (Batzbi) اور کسٹن (Kistin) زبانیں بھی اسی گروپ سے تعلق رکھتی ہیں.

انگش نام سترھویں صدی میں قفقاز کے دامن کوہ میں بسائے گئے ایک گاؤں ''اُل انگش'' سے ماخوذ ہے۔ یہ لفظ پہلے ''کبارڈ'' (kabards) قوم نے استعمال کیا اور بعد میں اسے روسیوں نے مقامی نام گالگے (Galgay) دیا جو کہ اہم ترین انگش قبیلے کا نام ہے۔ دوسرا مقامی نام لامر (Lamur) ہے جس کے معنی ''کوہ پیا'' کے ہیں.

انگش لوگ دریائے تیرک (Terek) اور سنجا (Sunja) اور ان کے معاون دریاؤں کی بالائی اور وسطی وادیوں میں رہتے ہیں۔ ان کے مشرق میں چیچن اور مغرب میں کبارڈ آباد ہیں.

اٹھارہویں صدی عیسوی سے پہلے انگش قبائل کی تاریخ کے بارے میں بہت ہی کم معلومات دستیاب تھیں۔ گیارہویں صدی عیسوی میں جارجیا کے حکمرانوں نے ان پر غلبہ حاصل کرلیا، جن کے اثر سے اُنھوں نے عیسائیت قبول کی۔ پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں وہ کبارڈ قوم کو خراج ادا کرتے تھے۔ اسلام اس ملک میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصہ میں آیا جوکہ چیچن نقشبندیوں کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا اور اُسے اُنیسویں صدی کے آغاز تک کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ۱۸۶۵ء میں بھی عیسائی انگش موجود تھے (۳,۴۰۵ عیسائی

افراد بمقابلہ ۱۱,۹۶۰ مسلمان افراد، دیکھیے Semenov: Satisticeskiy slover Rossiyskoy Imper ii: Geograficeskiy، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۵ء ج:۲)۔
اٹھارہویں صدی کے آغاز میں ہی انگش قوم نے بلند علاقوں سے دریاے تیرک (Terek) اور سنجا کے زرخیز میدانوں کی طرف آہستہ آہستہ نقل مکانی شروع کی۔ یہ نقل وحرکت انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران میں بھی جاری رہی۔ اپنے چیچن ہمسایوں کے برخلاف انگش قوم نے روسیوں کی پیش قدمی کے خلاف بہت کم مزاحمت کی، جن کی فوج کا پہلا حصہ اُن کے علاقے میں تقریباً ۱۷۷۰ء میں داخل ہوا۔ اس کے برعکس اُنہوں نے کبارڈ قوم کے خلاف ان کی مدد کی اور چیچن شیخ منصور اشورمؒا کی بغاوت میں حصہ نہ لیا ..... اور نہ ہی امام شاملؒ کی عظیم تحریک میں وہ شامل ہوے۔

۱۸۵۰ء کے بعد انگش سرزمین میں روسیوں کے خلاف کوئی مقامی بغاوت نہ ہوئی، جیسا کہ داغستان اور چیچن علاقے میں ہوئی تاہم انیسویں صدی کے نصف آخر میں انگش لوگوں اور روسیوں کے مابین تعلقات قابل ذکر طور پر بدتر ہوگئے۔ کشمکش کی ابتدا نواح ۱۸۶۰ء میں ہوئی جب نذران کے ارد گرد دریائے سنجا پر واقع آبادیوں سے اُنہیں قازق قوم (Cossacks) نے پہاڑوں کی غیر زرخیز زمینوں کی طرف دھکیلا۔ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز پر سیاسی فضا تیزی سے ابتر ہوئی جب انگش سرزمین میں انگش قوم اور تیرک قازقوں کے مابین چپقلشوں سے گڑ بڑ پھیلی۔

انقلاب (۱۹۱۷ء) تک انگش لوگوں نے اپنے ہمسایہ چیچنوں کی طرح ایک نیم جاگیردارانہ معاشرتی نظام کو برقرار رکھا۔ تمام انگش خاندان اپنے آپ کو آزاد تصور کرتے تھے اور انہوں نے ''آزاد معاشروں'' کے گروپ بنا رکھے تھے جن میں سے اہم ترین گالگے، جیراک، کسٹن اور گالاش تھے۔ بڑے اور غیر منقسم خاندان علاقے کے تقریباً ہر حصے میں موجود تھے۔ سرداری رسوم (بیوگان کی ملکیت، کثیرالازواجی، وغیرہ) کی پابندی تہ دل سے کی جاتی تھی۔ انگش معاشرہ طبقات میں منقسم نہیں تھا؛ کوئی اشرافیہ (طبقہ) وہاں نہ تھا اگرچہ ایک ممتاز طبقہ بیسویں صدی کے آغاز پر قائم ہونا شروع ہوگیا تھا جوکہ خصوصاً افسروں اور عوامی ملازمین پر مشتمل ہوتا تھا.

اکتوبر (۱۹۱۷ء) کے انقلاب کے دوران انگش قوم نے اُن بے ہنگم جنگوں میں حصہ لیا جن کی وجہ سے ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۱ء کے مابین شمالی قفقاز میں بڑی خون ریزی ہوئی۔ تیرک قازقوں سے اپنی دشمنی کی بنا پر جنہوں نے انہیں قفقاز کی دامن کوہ کی زرخیز زمینوں سے نکال باہر کیا تھا، انگش قوم نے بالشویک افواج کی امداد کی۔ ۷ جولائی ۱۹۲۴ء کو ''انگش خود مختار علاقہ'' قائم کیا گیا۔ جس کا رقبہ ۳,۲۰۰ مربع کلومیٹر تھا اور آبادی ۸۱,۹۰۰ نفوس پر مشتمل تھی (اُس وقت یہاں انگش افراد کی تعداد ۷۵,۲۰۰ تھی)۔ ۱۵ جولائی ۱۹۳۴ء کو یہ علاقہ چیچنیا سے ملا کر ''چیچن انگش خود مختار علاقہ'' تشکیل دیا گیا جو بعد میں ۵ دسمبر ۱۹۳۶ء کو'' چیچن انگش سوویت اشتراکی جمہوریہ'' بنا.

۱۹۴۳ء میں جرمن افواج کے اگلے دستے انگش علاقوں کے مغربی اضلاع میں آپہنچے۔ ۱۹۴۴ء میں دوبارہ اس علاقے پر سوویت افواج نے قبضہ کرلیا اور انگش قوم پر ''سوویت مادر وطن سے غداری'' اور ''جرمنوں کے ساتھ اشتراک'' کے الزام عائد کیے گئے اور اُنہیں وسطی ایشیا میں جلاوطن کرکے بھجوادیا گیا(بیک وقت ان کے ساتھ چیچنوں، بلکاروں، کراچوں، کلمکوں اور کریمیا کے تاتاریوں کو بھی) اور ان کی قومی جمہوریہ کو ختم کردیا گیا۔ ۱۹۵۷ء میں اس اقدام کو شخصی مسلک کی بنا پر پیدا

ہونے والی غلطی کے طور پر تسلیم کرلیا گیا اور انگش قوم کو اپنی ازسرنو قائم ہونے والی جمہوریہ میں واپسی کی اجازت ملی اور انہیں وہاں سرکاری طور پر دوبارہ آباد کر دیا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں اُن کی تعداد ۱۰۶,۰۰۰ تھی (بمقابلہ ۹۲,۰۰۰، ۱۹۳۹ء میں)، لیکن سوویٹ یونین میں اُن کی شرح پیدائش سب سے زیادہ ہے۔

۱۹۵۹ء میں چیچن انگش خود مختار جمہوریہ کی مجموعی آبادی ۷۱۰,۰۰۰ تھی، جس میں سے ۲۹۲,۰۰۰ یعنی ۴۱ فیصد مسلمان تھے۔ اس تعداد میں تقریباً ۴۸,۰۰۰ انگش تھے۔

۱۹۲۳ء میں انگش زبان کو رومن رسم الخط دیا گیا۔ اسی سال انگش زبان میں پہلا رسالہ Serdalo (چراغ) جاری ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں لاطینی حروف تہجی کی بجائے روسی (Cyrillic) حروف اختیار کیے گئے [نیز دیکھیے چیچنیا]۔

مآخذ: انگش قوم کے بارے میں زیادہ تر مواد روسی زبان میں ہیں۔ اُن میں سے اہم کتب یہ ہیں: (۱) B.Dolgat: *Materiali Po obicnomu Pravu Ingushey*، مطبوعہ ولادی قفقاز ۱۹۳۰ء؛ (۲) N.F.Graborskiy: *Ingushi-Ikhzizh'i obicay in sbornik Sredeni o kavkazkikh Gortsakh*، در جلد ۹ مطبوعہ تفلس ۱۸۷۶ء؛ (۳) Narodi Kavkaza، جلد ۱ (Narodi Mira Series) مطبوعہ ماسکو، اکیڈمی آف سائنسز، ادارہ علم الاقوام، ۱۹۶۰ء ص ۳۷۵ - ۳۹۱؛ (۴) I.I.Pantukov: Ingushi، تفلس؛ Kavkaskoe *Otdelenie Russkogo Geograficeskogo obshcestva*، ۱۳: ۶، ۱۹۰۰ء؛ (۶) G.Vertenov: *Ingushi Istoricesko statisticeskiy*، مقالہ، جلد ۲ مطبوعہ ولاڈی قفقاز دیکھیے *Terskiy sbornik*، مقالہ نیز چیچن کے مآخذ

(A.Bennigsen [ت: ظفر علی])

••-------------••

※ انور پاشا (۱۸۸۱ـ۱۹۲۲ء): عثمانی ترک جنرل اور پہلی جنگ عظیم کے دوران میں عثمانی افواج کا ایک کمان دار۔ وہ ۲۳ نومبر ۱۸۸۱ء کو استانبول میں پیدا ہوا۔ اس کا والد احمد ریلوے میں ملازم تھا اور اس کی والدہ عائشہ ایک البانوی النسل خاتون تھی۔ اس خاندان کا تعلق مقدونیا کے شہر ماستر سے تھا۔ انور نے ۱۹۰۲ء میں استانبول کی ملٹری اکیڈمی (مدرسہ حربیہ) سے سند حاصل کی۔ بعدازاں اس کی تعیناتی مقدونیہ میں ہوئی جہاں اس وقت یونانی اور بلغاروی قوم پرست گوریلا جتھے عثمانی فوج سے برسرپیکار تھے۔ بلقان کی قوم پرست تحریکیں جو "ملت" کے نظریے کے تحت منصۂ شہود پر آئی تھیں، مضبوط اجزائے ترکیبی کی حامل تھیں اور نتیجتاً ابتدائی ترک قوم پرستی پر اسلام کا گہرا رنگ چھایا رہا۔

۱۹۰۶ء میں انور نے "انجمن اتحاد وترقی" میں شمولیت اختیار کی جو "نوجوان ترک" تحریک کی اہم ترین تنظیم تھی۔ جولائی ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد انور کو انجمن اتحاد وترقی نے "بطل حریت" کے طور پر ترقی دی، اس وقت اس کا فوج میں عہدہ سٹاف میجر کا تھا۔ انور جیسے جونیئر افسروں کی کرشماتی وجذباتی پکار سے حکومت خوفزدہ ہوگئی اور اس نے ان میں کئی ایک کو بیرونی ممالک میں عثمانی سفارت خانوں میں فوجی اتاشی بنا کر بھیج دیا۔ انور کو ۱۹۰۹ء میں برلن بھیجا گیا (جہاں اس نے فوجی اتاشی کی حیثیت سے خدمات انجام دیں)، لیکن جلد ہی استانبول میں جوابی انقلاب کے پیش نظر اسے مرکز میں واپس بلالیا گیا (وہ ایک معروف فیلڈ آفیسر کی حیثیت سے واپس آیا اور) بغاوت کو کچلنے میں اس کے کردار کی بنا پر اس کی مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں اس نے لیبیا میں امتیازی خدمات سرانجام دیں، جہاں اس نے اطالوی تسلط کے خلاف تحریک مزاحمت کو منظم کیا۔ بن غازی میں اس نے ترک اطالوی جنگ میں حصہ لیا اور نوران معاہدۂ

امن کے بعد وہ افریقہ سے استانبول آیا۔ ۱۹۱۲ء۔۱۹۱۳ میں بلقان کی لڑائی میں ترکی کی تباہ کن شکستوں کے نتیجے میں ہم اسے ایک بار پھر دارالخلافہ میں دیکھتے ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں انجمن اتحاد وترقی برسراقتدار آئی۔ انور اس وقت لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر فائز تھا (حکمران طبقے میں محمود شوکت پاشا نیازی بے، شیخ الاسلام خیری آفندی اور آخر میں انور پاشا اور سعید حلیم پاشا جیسے دینی رجحان رکھنے والے لوگ بھی شامل تھے۔ شروع شروع میں مصطفیٰ کمال کو ''انجمن'' میں امتیازی حیثیت حاصل نہ ہوسکی۔ وہ انجمن کی مجلس شوریٰ کا رکن بھی نہ تھا اور غالبًا یہیں سے انور پاشا سے اس کی رقابت اور حسد کا دور شروع ہوا)۔

انور بے نے ان ترک افواج کی کمان کی جنہوں نے ۱۹۱۳ء میں ادرنہ سے بلغاریا کا قبضہ ختم کرایا اور اس طرح اس کی عزت واحترام میں مزید اضافہ ہوا (اس وقت حکومت اور انجمن اتحاد و ترقی کی قیادت فی الحقیقت ارکان ثلاثہ کے ہاتھ میں آگئی۔ یہ ارکان انور پاشا، طلعت پاشا (۱۹۲۱ء) اور جمال پاشا (۱۹۲۲ء) تھے۔) اب ایک نوجوان مگر نہایت متحرک وزیر جنگ کی ضرورت تھی جو فوج کی تطہیر اور اصلاح کرسکے اور اس مقصد کی خاطر انور واضح طور پر، ایک بہترین انتخاب تھا۔ اُسے جنرل کے عہدے پر ترقی دی گئی اور ''پاشا'' کا خطاب عطا ہوا۔ وہ اب تک ''انجمن'' میں جرمنی کی حمایت کے رجحانات رکھنے والا بنیادی منصوبہ ساز شخص بن چکا تھا۔ جرمنی کے حامی گروپ کی قیادت اس کے ہاتھ میں تھی اور اسی گروپ کے دباؤ کے تحت ۱۹۱۶ء میں عثمانی سلطنت کو جرمنوں کے حلیف کی حیثیت سے جنگ میں شامل ہونا پڑا، مگر اس کے جرمنی کا حمایتی ہونے کا سبب صرف یہ تھا کہ اُسے یقین تھا کہ جرمنی کے ساتھ اتحاد عثمانی مفادات پر مبنی ہے۔ درحقیقت استانبول کا برلن پر انحصار اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ جنگ کے سارے عرصے میں عثمانی منصوبہ بندی، جرمنی کی تزویراتی ضرورتوں کے مطابق بروئے کار آتی رہی۔ اس پالیسی کی ناکامی کے علی الرغم انور کا خیال تھا کہ روس کا اشتراکی انقلاب ان ترکی النسل لوگوں کی ایک نئی اسلامی سلطنت کے قیام کا باعث ہو سکتا ہے جو زاروں کے تسلط میں رہ رہے تھے۔ یہ رومان پرور خواب حقیقت کا روپ دھارنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ کئی دوسرے محاذوں پر عثمانی افواج شکست سے دو چار ہوئیں اور اکتوبر ۱۹۱۸ء میں انہیں برطانیہ کے ساتھ متارکۂ جنگ کے ایک معاہدے پر دستخط کرنا پڑے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جب ترک افواج نے ہتھیار ڈال دیے تو انور ،طلعت اور جمال یہ دیکھ کر کہ اب وہ ملک کو نہیں بچا سکتے اور نہ ان شرائط پر راضی ہوسکتے ہیں جو فاتح اتحادیوں کی طرف سے عائد کی جارہی تھیں ملک سے باہر چلے گئے اور حکومت کی ذمہ داری ان لوگوں کے ہاتھ میں آگئی جو اس نازک موقع پر اسے پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ انجمن اتحاد وترقی کو مختلف وجوہ کی بنا پر اپنے تمام مقاصد میں کلی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ ان کی ناتجربہ کاری، سادہ لوحی اور بے بسی، عالم مسیحیت کی یلغار کو نہ روک سکی اور انور پاشا جیسی متحرک شخصیت بھی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہونے کے عمل میں رکاوٹ نہ بن سکی۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں انور اور انجمن اتحاد وترقی کے کئی دوسرے رہنما جرمنی میں جامقیم ہوے۔ پھر انور ترکستان چلا گیا جہاں اس نے بالشویکوں کے خلاف اسلامی قوتوں کو منظم کیا اور وسطی ایشیا میں جہادی کاروائیوں کا آغاز کیا۔ وہ اس زمانے میں ماسکو اور ارد گرد کے دوسرے علاقوں میں بھی گیا۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے باکو میں منعقدہ مشرقی عوام کی کانگرس میں بھی شرکت کی۔ وہ ۴ اگست ۱۹۲۲ء کو سرخ

فوج کے خلاف تاجکستان کی ایک لڑائی میں بخارا کے قریب ایک فوجی دستے کی کمان کرتے ہوے شہید ہوا.

قومی تاریخ نویسوں نے انور پاشا کی تصویر کشی تورانی اتحاد کے ایک علم بردار (Pan-Turanist) کی حیثیت سے کی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نظریے کے بعض اجزا سے اسے اتفاق رہا ہو، مگر اس کے عمل و کردار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عثمانیت میں یقین رکھتا تھا جو بالآخر ایک اسلامی تحریک بن گئی، جس کا اظہار اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ غیرمسلم اقوام نے عثمانی اقتدار سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ مزید براں انجمن اتحاد وترقی خود بھی "عثمانیت" کی قائل تھی، اس نے اپنے کئی فوجی حامیوں کی عثمانی شہزادیوں کے ساتھ شادیوں کا اہتمام کیا تاکہ اس کی خوش بختی شاہی خاندان کے لوگوں سے وابستہ رہے۔ انور پاشا نے ۱۹۱۴ء میں ناجیہ سلطان سے شادی کی جو سلطان عبدالمجید کے بیٹے شہزادہ سلیمان کی صاحبزادی تھی (اور اس طرح اسے "داماد" کا خطاب بھی ملا).

انجمن اتحاد وترقی کے حلقوں میں "عثمانیت" پختہ تر ہوتی رہی اور چونکہ سلطان خلیفہ بھی ہوتا تھا، لہٰذا سلسلہ شاہی اور اسلام ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اسلام ہی وہ رشتہ تھا جس نے سلطنت کے مختلف مسلمان نسلی گروہوں کو متحد کیے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ جونہی استانبول نے جنگ میں شمولیت اختیار کی جہاد کا اعلان کردیا گیا۔ اس اقدام نے نہ صرف یہ کہ مسلم عثمانیوں کو یک جان کر دیا، بلکہ برطانوی، فرانسیسی اور روسی تسلط میں زندگی گزارنے والے مسلمانوں کی ان طاقتوں کے لیے اطاعت گزاری کے زوال کی امید بھی رکھی گئی۔ [پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں ہندوستان کے ایک نامور قائد حریت مولانا محمود حسن نے بھی حجاز میں اپنے قیام کے دوران انور پاشا اور کئی دوسرے ترک رہنماؤں سے رابطہ قائم کیا اور ہندوستان میں ترکوں کے نصب العین کی کامیابی کے لیے اپنی مساعی کو بروئے کار لانے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے لیے انور پاشا بطور ایک مثالی ہیرو خاصی حد تک باعث دلکشی تھا۔] بعد میں جب انور پاشا بالشویکوں کے ساتھ برسر پیکار تھا تو اس نے اپنی فوج کو اسلامی فوج ("اسلام اردوسو") کا نام دیا، جبکہ کسی تورانیت پسند شخص کو اسے "ترک فوج" کہنا چاہیے تھا۔ ترکی کے قیام تک سلطنت عثمانیہ میں اسلام ہی ملک کی اہم ترین نظریاتی اساس تھا۔

مآخذ: (۱) احمد فیروز: The Young Turks، آکسفرڈ، ۱۹۶۹ء۔۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک کے عرصے کے سلسلے میں نہایت مفید کتاب؛ (۲) Swamson Glon: *Enver Pasha: The Formative Years*، در *Middle Eastern Studies*، ۱۶ (۱۹۸۰ء): ۱۹۹۔۱۹۳، انور پاشا کے ابتدائی برسوں کے لیے؛ (۳) Trumpener, Ulrich: *Germany and the Ottaman Empire*، ۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء، پرنسٹن ۱۹۶۸ء۔ ایام جنگ کے سلسلے میں بہترین کتاب، اگرچہ مصنف کی سبھی توضیحات کا انحصار جرمن مراجع پر ہے: (۴) Yamauchi Masayuki: *The Green Crescent Under the Red Star: Enver Pasha in Soviet Russia*، ۱۹۱۹ء۔۱۹۲۲ء۔ ٹوکیو ۱۹۹۱ء۔ یاموچی کو اصل ترک دستاویزات تک رسائی حاصل تھی، لہٰذا اس کی تحریر انور پاشا کے آخری برسوں کے متعلق مختلف مراجع سے حاصل کردہ صحیح واقعات پیش کرتی ہے؛ (۵) برنارڈ لوئیس: *The Emergence of Modern Turkey*، لنڈن ۱۹۶۸ء؛ (۶) The Combridge History of Islam، ۱۹۷۰ء، (دواجزاء)؛ (۷) ثروت صولت: بدیع الزمان سعید نورسی، کراچی ۱۹۷۷ء؛ (۸) مزمل حسین: سلطنت عثمانیہ کی انقلابی تحریکیں، کراچی ۱۹۷۳ء.

(فیروز احمد [ت: امین اللہ وثیر])

••--------------••

※ او۔ائی۔سی: در تکملہ آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس [رکّ بہ اسلامک اُمّۃ]

••-------------••

※الاوحد ایوب بن العادل ایوبی [رکّ بہ ایوبیۃ.]

••-------------••

※ اُوخری: اُہرد (Ohrid)، ایک سابق عثمانی قسمت (ڈویژن، سنجق) کا صدر دفتر اور اعلیٰ مرکز قضاء [وعدل]، موجودہ آبادی تقریباً بیس ہزار۔ یہ قصبہ سابقہ یوگوسلاویہ کی جمہوریہ مقدونیا کے انتہائی جنوب مغربی حصے میں واقع ہے۔ اس کا عثمانی [عہد] کا [یہ] نام سلافی [زبان] کے لفظ Ohrid سے ماخوذ ہے جو بنفسہٖ ایک قدیم نام Likhnidos سے بنا ہے۔ تحریری طور پر محفوظ تاریخ کی رو سے یہ سلافی عیسائیت کا ایک اہم مرکز اور آزاد مذہبی پیشوائیت کا مستقر (۹۷۶ء۔۱۷۶۷ء) رہا ہے، نیز ۹۷۱ء سے ۱۰۱۸ء تک زارسموئیل کی مغربی بلغاری یا سلافی مقدونیائی سلطنت کا پایۂ تخت رہ چکا ہے۔ عثمانی دور (۱۳۸۵ء یا ۱۳۹۵ء ۔۱۹۱۲ء) کے دوران میں یہ ایک قسمت کا ہیڈکوارٹر رہا ہے، جو جدید سلافی مقدونیا کے جنوب مغربی کونے اور وسطی البانیہ کے طویل (وعریض) میدانی حصوں پر مشتمل تھی۔ تنظیمات [رک بآں] کی تشکیل نو کے دوران میں اس کا عدالتی درجہ گھٹا دیا گیا اور مناستر [رک بآں] کی قسمت کو اعلیٰ مرکز قضاء (وعدل) بنا دیا گیا۔ یہ شہر مناستر کی ولایت کا بھی مرکز رہا۔ اُوخری علاقائی سطح کا اسلامی مرکز تھا۔ جہاں بہت سی مساجد، مدارس اور خانقاہیں موجود تھیں۔ ان خانقاہوں میں سے حیاتیہ، اس خطے میں سلسلہ خلوتیہ کی مرکزی خانقاہ کے طور پر خاصی اہمیت کی حامل تھی (اور) اس کے تحت خانقاہوں کی ایک بڑی تعداد خصوصاً جنوبی البانیہ میں موجود تھی۔

اُوخری (Ohrid) جھیل کے کنارے سطح سمندر سے ۸۰۶ میٹر/۲,۶۴۳ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور ایک چٹانی راس کی ڈھلوانوں پر بڑے خوب صورت انداز سے بسایا گیا ہے، جسے تین طرف سے یہ جھیل گھیرے ہوئے ہے اور ابھی تک زار سموئیل کا قلعہ اور شہر کی فصیل نہایت اچھی حالت میں ہیں، جن کی مرمت قرون وسطیٰ میں کی گئی تھی اور اُنیسویں صدی عیسوی تک عثمانیوں نے ان کی نگہداشت جاری رکھی۔ موزوں دفاعی پوزیشن رکھنے کے ساتھ ساتھ مچھلیوں سے لبریز جھیل اور ایک زرخیز میدان کے سرے پر واقع ہونے کی بنا پر یہ بات یقینی ہے کہ یہ قصبہ تحریری طور پر محفوظ تاریخ کے تمام ادوار اور قبل از تاریخ عہد میں آباد رہا ہے۔ علاوہ ازیں، اُوخری البانیہ کے مشرقی حصے میں (واقع وا اگنیٹیا Via Egnatia) کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔

قدیم عثمانی وقائع نگاروں (عاشق پاشا زادہ، نشری اور گمنان گیسہ) نے اُوخری کی فتح کا حال قلمبند نہیں کیا ، البتہ (اس سے) ملحقہ اضلاع (شرقاً مناستر، پری لپ اور غرباً وسطی البانیہ) کی فتح کی [.....] تصویر کشی کی ہے جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ۷۸۷ھ/۱۳۸۵ء میں فتح ہوئے۔ اس سال دراصل اندورن البانیہ ایک حملہ کیا گیا تھا، جو "جنگ وجاشی" پر منتج ہوا۔ اس جنگ کے بعد بہت سے البانوی سرداروں نے عثمانی سیادت قبول کرلی۔ یہ ممکن ہے کہ اس وقت اُوخری کے البانوی حکمران زپان انڈریوگروپا (Zupan Andrew Gropa) کو، جس کا ذکر اولڈ سینٹ کلیمنٹ (Old St.Clement) کے کلیسا کے سنگ بنیاد کے کتبے (۱۳۸۰ء) میں یہاں کے حکمران کی حیثیت سے کیا گیا ہے، معزول کرکے وہاں براہ راست عثمانی اقتدار قائم کر دیا گیا ہو۔ تاہم اُوخری پر براہ راست عثمانی اقتدار کا تصور (اس لیے بھی) مشکل ہے کہ

قسطنطین ڈیجانووک (Constantin Dejanovic) اور مارکو کراجیوک (Marko Kraljevic) اس دور میں تقریباً سارے سلافی مقدونیا پر عثمانی منصب داروں کی حیثیت سے (۱۳۹۵ء میں) اپنی اپنی وفات تک حکومت کرتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصبہ عثمانیوں کے قبضے میں کوئی جنگ لڑے بغیر آگیا ہوگا اور ضلعے کا الحاق کسی خاص افراتفری کے بغیر عمل میں آیا ہوگا۔ اس سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ یہاں کے عیسائی باشندے فصیل والے قدیم قصبے میں (بدستور) مقیم رہے اور ان کے تمام پرانے کلیسا انہی کے پاس رہے۔ علاوہ ازیں چودھویں صدی عیسوی کے مختلف فنون، مثلاً فن تعمیر، مجسمہ سازی اور دیواری نقش نگاری وغیرہ عثمانی اقتدار کے قائم ہونے کے بعد بھی باقی رہ کر ترقی کرتے رہے۔ اس کا اُوخری اور اس کے گرد ونواح کے دیہاتوں میں نوتعمیر شدہ یا منقش کلیساؤں کی ایک طویل فہرست سے پتہ چلتا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے آآ لائیڈن بذیل مادہ)۔ ان میں سے زیادہ تر اُوخری کے مقامی شرفا نے تعمیر کرائے۔ (لیکن) ۱۴۱۰ء اور ۱۴۳۰ء کے عشروں کا درمیانی عرصہ اس بنا پر باعث دل چسپی ہے کہ وہ سلطان بایزید کے بیٹوں کے مابین خانہ جنگی اور مراد ثانی کے عہد میں (ظاہر ہونے والے) اس کے نتائج کے سارے عرصہ کے دوران میں ہنگامہ خیز حالات کی غمازی کرتا ہے۔ اس صدی میں اُوخری کے فنکاروں کے فن پارے آج بھی موجود ہیں کچھ کلیساؤں کی فہرستوں میں اراضی اور باغیچہ جات پر مشتمل ان کی جائدادوں کا اندراج ہے (اور) بعض فہرستوں میں اُس اسقف کا نام مذکور ہے جس کے زمانے میں عمارت تعمیر کی یا منقش کی گئی یا ان میں برسراقتدار عثمانی سلطان کا ذکر ''زار'' کے طور پر کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر عیسائی ''فن'' کی محفوظ یادگاریں اُوخری کی انتظامی وحدت کے حالات کی عکاسی تاریخ کی کتابوں کی نسبت زیادہ عمدہ طریقے سے کرتی ہیں.

مقامی طور پر ''مسجد سلطان محمد'' پندرھویں صدی عیسوی [کی یادگار ہے۔ یہ مسجد] اس صدی کے آخری عشرے میں [پرانی عمارت کو منہدم کرکے] اور اس کی بنیادوں پر ایک عظیم گنبد کی صورت میں بایزید دوم کے عہد میں مروجہ عثمانی طرز پر تعمیر کی گئی، یہ جگہ پہلے ایک گرجا گھر کے پاس تھی۔ اس کی ضبطی سے قبل قصبہ کے عیسائیوں کو سینٹ کلیمنٹ کے تمام تبرکات، تصاویر، مجسمے اور کتابیں بیزنطینی شہنشاہ انڈرونکس (Andronicus) کے البانوی داماد لارڈ پروگن (Progon Sguros) کے ۱۲۹۵ء میں تعمیر کردہ Panayia Perivleptos کے بڑے گرجا گھر میں منتقل کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس طرح پرولپٹس (Perivleptos) کا یہ کلیسا اس کے بعد سینٹ کلیمنٹ کے کلیسا کے طور پر مشہور ہوا پرولپٹس اور عہد وسطیٰ کی تصاویر و مجسمہ جات اور مسودہ جات کا ایک عظیم ترین مخزن قرار پایا، نیز یہ اُوخری میں مذہبی پیشوائیت کے ادارے کے خاتمے تک اس کا مستقر رہا اور عثمانی قوانین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانوناً کام کرنے میں اسے کامیابی ہوئی.

اُوخری کی دیواروں کے اندر موجود قصبے کا رقبہ بتیس ایکڑ ہے۔ عہد وسطیٰ کی دیواروں کے اندر محصور بستیوں کے، ۱۳۰ تا ۱۵۰ افراد فی ایکڑ کے معروف کلیے کی رو سے، اس قصبے کی آبادی تقریباً ۴۰۰۰ افراد بنتی ہے جو اس دور اور مقامی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے زیادہ (نظر آتی) ہے، تاہم اس حصار کا مغربی نصف حصہ چونکہ قریب قریب خالی تھا (سیدھی ڈھلوانوں کی بنا پر یہاں عہد وسطیٰ کی عمارات کے کوئی آثار نہیں ہیں)، اس لیے عثمانیوں سے ماقبل عہد کی آبادی ۲۵۰۰ تا ۳۰۰۰ افراد

فرض کی جاسکتی ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں اُوخری کے اصلی باشندوں کی آبادی میں ضرور کمی ہوئی ہوگی۔ قسطنطنیہ کی فتح کے فوراً بعد یہاں کے یہودیوں کو جلاوطن کر کے (اس) نئے عثمانی دارالحکومت میں بھجوا دیا گیا۔ ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء میں یہاں سے استانبول پہنچنے والے یہودی خاندانوں کی تعداد صرف سولہ تھی (Tapu Defter، عدد ۲۱۰، ص۴۵-۴۷)۔ ۱۴۶۶ء میں سلطان محمد ثانی نے اُوخری کے عیسائیوں کی ایک غیر معلوم تعداد کو جلا وطن کرکے اپنے نئے بسائے ہوئے شہر الباسن (Elbasan) میں منتقل کر دیا۔ اس کا ذکر صرف سلاف کلیسا کی ایک کتاب کے حواشی میں ملتا ہے۔ عثمانی مردم شماری رجسٹر ٹپول دفتر (Tapul Dofter) ۳۶۷ از ۱۵۲۸ء-۱۵۲۹ء کے ص۴۳۲ پر(Elbasan)کے احوال کے تحت اس جلاوطنی کے تناسب کے بارے میں ایک دھندلا سا تصور ملتا ہے (اس شہر کے) ۱۷۴ عیسائی گھرانوں میں سے ۴۷ کو جلاوطن بتایا گیا ہے (Djemlat-i Surgunan-i gebran-i nefs ilbasan) جن سے نسبتاً کم مقدارمیں ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ اُوخری کی شہری آبادی کا تحریری طور پر محفوظ پہلا سروے بدیہی طور پر ۱۵۸۳ء میں کیا گیا۔ یہ انقرہ کے کڈسٹر دفتر (Cadaster office) میں اُوخری سنجق کے مفصل دفتر میں شامل ہے (Kuyudu Kadime، عدد ۲۵)۔ اس میں قصبہ کے پچیس عیسائی محلّہ جات کے نام دیئے گئے ہیں، یہ نام زیادہ تر کلیساؤں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ ان میں کل ۲۶۳ گھرانے آباد تھے (اور) مسلمانوں کا ذکر ایک گروہ کے طور پر کیا گیا ہے، جن کے گھرانوں کی تعداد ۲۷۰ بیان کی گئی ہے۔ ان گھرانوں کے سربراہوں کے نام ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کی پہلی نسل کا معتدبہ حصہ دائرہ اسلام میں داخل ہوگیا تھا (ابن ابی عبداللہ)، (اور) یہ کل آبادی کا ۲۱% تھے۔ مجموعی طور پر قصبے کی آبادی بشمول عسکری وانتظامی عملہ ۲,۶۰۰-۲,۸۰۰ ہوگی یا چودھویں صدی عیسوی کی آبادی سے کچھ زیادہ ۔۱۵۸۳ء کے رجسٹر میں صراحتاً تحریر ہے کہ عیسائی اور مسلم شہری عوارض اور تکالیف (یعنی ٹیکسوں؛ رکّ بہ عوارض) کی ادائیگی سے آزاد تھے، کیونکہ وہ طویل عرصے سے قصبے کی فصیل کی نگہداشت کرتے چلے آرہے تھے.

اُوخری کی قضائی/عدالتی حدود میں واقع دیہاتوں کی آبادی کے اعداد وشمار کے ضمن میں ۱۵۱۹ء سے ۱۵۸۳ء تک کے لیے مسلمانوں اور عیسائیوں (ہر دو) کی تعداد دستیاب ہے اور ۱۲۳۴ء کے لیے صرف عیسائیوں کی قدیم عہد کی عثمانی آبادی کے بہترین دستیاب اعداد وشمار (Vasil Kancev) میں ۱۹۰۰ء سے متصل پہلے عرصہ کے ہیں، جو اس صورت حال کے اختتام کو واضح کرتے ہیں، خصوصاً سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں، اس سے کلی طور پر ایک غیر مخصوص اور غیر متعین آبادی کے رجحان کی غمازی ہوتی ہے۔ ۱۶۳۴ء کے اعداد (نیشنل لائبریری صوفیہ، اُوخری ص۶-۷) ظاہر کرتے ہیں کہ دیہاتوں اور قصبوں کی آبادی کے ایک حصے کی طرف سے قبول اسلام (کا سلسلہ) جاری رہا، لیکن مجموعی طور پر کل آبادی میں، بلقان، خصوصاً یونانی علاقوں اور وسطی اناطولیہ میں شدید کمی کے برعکس صرف خفیف (سی) کمی واقع ہوئی۔ ۱۶۷۰ء میں اولیا چلبی اس قصبے کی سیاحت کے لیے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں عیسائیوں کے نہایت شاندار طریقے سے تعمیر کردہ ۱۶۰ مکانات ہیں، جو سب کے سب فصیل کے اندر واقع ہیں اور مسلمانوں کے ۳۰۰ سے زائد مکان بھی نہایت عمدہ اور محل نما ہیں۔ یہ اعداد و شمار نہایت قابل وثوق دکھائی دیتے ہیں۔ سترہویں صدی عیسوی میں وسط میں اُوخری میں عیسائیوں کی آبادی

نہایت قلیل رہ گئی۔ دور مابعد میں ان کی آبادی میں اس وقت قدرے اضافہ ہوا جب قصبے کی توسیع عمل میں آئی۔ یہی (بات) دیہی آبادی کے بارے میں (بھی) درست ہے۔ کچھ دیہات، جو سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں مکمل طور پر قبول اسلام کی طرف گامزن دکھائی دیتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں مسلمانوں (کے وجود) سے یکسر خالی تھے۔ اس کے برعکس کچھ مدت بعد ۱۵۸۳ء میں قابل ذکر مسلم دیہات، مثلاً رڈولسٹہ (Radolista) اور زگراکنی (Zagracani) یا ولسٹہ (Velesta) میں مسلمان کل آبادی کا ایک تہائی حصہ تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ (مسلم آبادی میں کمی کا یہ رجحان) سترہویں صدی عیسوی سے کافی پہلے کے دور سے تعلق رکھتاہے (اور یہ کہ) اس کے باعث پیدا ہونے والی اقتصادی مشکلات ناقابل تصور حد تک شدید تھیں۔

فتح عثمانی کے بعد قصبہ اوخری فصیل کے باہر کی جانب پھیلنا شروع ہوگیا۔ قلعے کی شمال مشرقی جانب سڑوگا (Struga) کی شاہراہ پر ایک حمام، اپنے پندرہویں صدی عیسوی کے خدوخال کے ساتھ، اس کی ایک مثال کی حیثیت سے آج بھی موجود ہے۔ اس قصبے کی اہم ترین عثمانی عمارت، مبینہ "طور پر جامعی" یا "شہنشاہی مسجد" (Careva Dzamija) ہے۔ مقامی روایت کی رو سے اس کا تعلق (سلطان) محمد فاتح سے جوڑا جاتا ہے، درحقیقت یہ (مسجد) ۸۹۷ھ/۱۴۹۰ء سے قبل تعمیر کی گئی جب اس کا وقف نامہ تحریر کیا گیا۔ اس اہم مآخذ میں قاضی محمود کے بیٹے سنان الدین یوسف چلپی کو اس کا بانی (بیان کیا گیا) ہے، اس شخص کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ ۱۴۷۹ء میں بوسنیا میں سلطانی دربار خاصلر (Khasseler) کی طرف سے انسپکٹر (کے طور پر مامور) تھا۔ رجب ۸۹۸ھ/اپریل ۱۴۹۳ء میں اُس نے وفات پائی اور اُسے اس کی مسجد کے قریب (واقع) قبرستان میں دفن کیا گیا، جہاں اب بھی اس کی قبر مع کتبہ محفوظ (وسلامت) ہے۔ ایک مقامی روایت کے مطابق سنان ایک پاشا تھا اور اُوخری کے ایک مقامی رئیس خاندان کے اخلاف میں سے تھا۔ وقف نامے میں ایک زاویے، مدرسے اور خیرات خانے کے قیام وانصرام کا ذکر (بھی) موجود ہے اور یہ کہ اس خیرات خانے میں روزانہ تمام مذاہب کے غریب افراد کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ اغلباً سنان چلپی نے اس مسجد کو سلطان بایزید دوم کے نام معنون کر دیا، جب موصوف نے ۱۴۹۲ء میں اپنی مہم البانیہ کے موقع پر اُوخری کا دورہ کیا تھا۔ (اس مسجد) کے لیے وقف املاک میں اُوخری کے قریب (واقع) سلطان بایزید کی طرف سے سنان کو بطور تحفہ ملنے والے ورانستا (Vranista) اور لزانی (Lezani) کے بڑے گاؤں کرافریا وریا (Karaferya Verria) کی ایک سرائے اور اُوخری اور اس کے گردو نواح میں (واقع) کچھ دکانیں اور پن چکیاں (Water Mills) شامل تھیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ مسجد کھنڈر بن چکی تھی، لیکن اس کی چاروں دیواریں موجود ہیں، جو بایزید دوم کے عہد کے فن تعمیر کے نمایاں خصائص کی عکاسی کرتی ہیں۔ دوسری تمام اہم اسلامی عمارات قدیم قصبے سے باہر اس کی مشرقی یا جنوبی سمت جھیل کے ہموار کنارے پر اور مناستر بٹولا (Bitola/Manastir) اور سڑوگا (Struga) کی شاہراہوں سے ملحق میدان میں واقع ہیں، متذکرہ بالا عمارات کے علاوہ ۱۵۸۳ء کی مردم شماری کے حصہ وقف (B. BA, T.D 717)، ایک سرٹ (Suret) (سال ۱۶۱۳ء، ص۷۴۱۔۷۵۳) میں زیادہ تر چھوٹے اسلامی اداروں اور ان کی عمارتوں کے بارے میں بتایا گیا ہے: سلیمان بے کا مدرسہ، اسکندر بے کی مسجد، محمود چلپی بن حاجی ترگت کی مسجد اور مدرسہ شیخ شجاع بن بارک کی

مسجد، علی چلپی بن حمزہ کا مدرسہ، یونس وائی دود (Voyvode) کا مدرسہ و مسجد اور حمزہ بازرگان کی مسجد، اُوخری زادہ مصطفیٰ چلپی، جس نے سڑوگا (Struga) میں ایک مدرسہ (بھی) قائم کیا تھا، اُوخری میں حمام بنوایا تھا، اور اغلبًا یہ وہی (حمام) ہے جو سڑوگا کی شاہراہ پر واقع ہے۔ اُوخری کے دیہات میں اسلام کے آہستہ آہستہ پھیلنے کا حال اس امر سے واضح ہوتا ہے کہ ایک (امیر) محمود بے بن اسحاق نے ڈیلو گوزگا (Delogozga) کے گاؤں میں ایک مسجد اور مدرسہ تعمیر کرایا، جہاں ۱۵۸۳ء میں ۱۴ مسلمان گھرانے ۳۷ عیسائی خاندانوں کے ساتھ اقامت پذیر تھے (۱۹۰۰ء میں اس گاؤں کی ساری کی ساری آبادی مسلمان تھی)۔ اس رجسٹر میں اُوخری کی مسجد حاجی قاسم کا ذکر بھی ملتا ہے، لیکن اس کے وقف کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں بیان کی گئی۔ آیا صوفیہ مسجد کا ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ اس کا اپنا کوئی وقف نہ تھا، بلکہ اس کی نگہداشت (کے مصارف) دیگر ذرائع سے پورے کیے جاتے تھے۔

۱۰۸۱ھ/۱۶۷۰ء-۱۶۷۱ء میں اولیا چلپی نے اُوخری کی سیاحت کی۔ وہ لکھتا ہے کہ اس قصبے میں ۱۷ مساجد اور مدرسے ہیں، جن میں مسجد حاجی قاسم مسجد قلوغلو، مسجد حیدر پاشا اور مسجد حاجی حمزہ کے علاوہ ایا صوفیہ مسجد اور مسجد سنان چلپی خصوصاً اہم ہیں۔ (یہ) سنان وہی شخص ہے جس کا ذکر ۱۵۸۳ء کی فہرستوں میں اور اولیا چلپی کے ہاں اُوخری زادہ یا اُوخری زادہ سنان چلپی کے نام سے کیا گیا ہے۔ مدارس کے ضمن میں اولیا چلپی سلطان سلیمان کے خانقاہی مدرسہ اور سیاؤش پاشا کے مدرسے کا ذکر کرتا ہے، جن دونوں کے بارے میں موجودہ (دستیاب) مآخذ بشمول جاہد بلتجی کی جامع تالیف میں کچھ بھی نہیں ملتا۔ نواح رومیلی (Rumeli) مدارس کی سرداری عثمانی فہرست (مرتبہ) نواح ۱۶۶۰ء Ozergin، ۱۹۷۴ء نواح میں، تاہم اُوخری میں کامیابی سے چلنے والے واحد مدرسے، مدرسہ بے کا نام مذکور ہے۔ (یہ) حمزہ غیر یقینی طور پر اولیا چلپی کا بیان کردہ حاجی حمزہ بانی مسجد اور ۱۵۸۳ء کے عثمانی رجسٹر (Defter) میں مذکور حمزہ بازرگان ہی ہے۔ ان عمارات کے علاوہ اُوخری میں تین سرائیں اور دو حمام (بھی) تھے۔ اولیا چلپی ایا صوفیہ مسجد کے بارے میں واضح طور پر لکھتا ہے، کہ اس میں صرف جمعے کے دن اس کے محافظ اور ملازم نماز جمعہ ادا کرتے ہیں، لیکن دیگر ایام میں ایک معمولی سی رقم کے بدلے عیسائیوں کو اس میں اپنے مذہبی مراسم سرانجام دینے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ ان تمام بیانات کو مدنظر رکھتے ہوے (یہ کہا جاسکتاہے) کہ سترہویں صدی عیسوی کا اُوخری ایک اہم (قسمت) سنجق کا مرکز ہونے کے باوجود ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔

۱۷۶۷ء میں قسطنطنیہ کے یونانی کلیسا کے مشورے پر اُوخری کی خودمختار پیشوائیت کو ختم کر دیا گیا۔ یہ پیشوائیت (۱۵۵۷ء سے قبل) عثمانی انتظامیہ نے بحال کردی تھی۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں خلوتیہ سلسلہ کے شیخ محمد حیاتی اُوخری میں اقامت پذیر ہو کر مصروف اصلاح وارشاد ہوے اور یہاں آستانہ حیاتیہ قائم کیا جو مقدونیہ اور خصوصاً البانیہ اور کسیہ اکستوریا کے یونانی مقدونیائی قصبے کی خانقاہوں کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ محمد حیاتی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ادرنہ میں مشہور عالم حسن سیزائی (م۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء) سے اکتساب علم کیا اور سیروزر سیرز (Siroz/ Serres) کے شیخ حسین سے خلافت حاصل کی۔ بعدازاں وہ اُوخری میں فروکش ہوے اور ایک قدیم مدرسے کو خلوتیہ کے اپنے نئے ذیلی سلسلہ (تصوف) کے پہلے مرکز میں تبدیل کیا، اس سلسلے کا پرچار انہوں نے اور ان کے پیروکاروں نے (نہایت) کامیابی سے کیا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر سے ۱۸۳۰ء تک اُوخری اور اس کے ضلعے پر وزیر احمد پاشا کے فرزند (اور) البانوی جاگیردار (Derebey) جمال الدین بے نے حکومت کی جس کا تذکرہ اس قصبے کی (بیرونی) دیواروں کی (مرمت وبحالی) کے سلسلے میں (اکثر) مقامی طور پر ہوتا رہتا ہے۔ اُس نے قصبے کو پینے کے لیے عمدہ پانی کی بہم رسانی کا اہم کام بھی کیا جس کا ذکر یہاں کے کمر (Cmer) چوک میں احتساب چشمہ کے ایک طویل عثمانی کتبے (۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء۔۱۸۲۲ء) میں کیا گیا ہے، اس کتبے کی عبارت (ایک) شاعر سلیمان فہیم (۱۲۰۳ھ۔ ۱۲۶۲ھ/ ۱۷۸۹ء۔۱۸۴۶ء) کی مرتب کردہ ہے۔ ۱۸۳۰ء میں ازسرنو منظم شدہ عثمانی افواج نے اسکندریہ/ سکودر کے بسکتلی وزیروں کی سرکوبی کے لیے جاتے ہوے، اس کے اقتدار کا خاتمہ کردیا اور وہاں دوبارہ باقاعدہ (طور پر) عثمانی انتظامیہ متعین کردی۔ ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء میں عثمانی قائم مقام شریف بے نے یہاں ایک بڑا نیا مدرسہ قائم کیا جس کا کتبہ اب بھی موجود ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں بہت سی مساجد کی مرمت (ودرستی) یا ازسرنو تعمیر موجودہ دور کے انداز پر کی گئی، ان میں سے اہم ترین علی پاشا کی گنبد والی مسجد ہے جو مارکیٹ میں (واقع) ہے.

اٹھارہویں صدی عیسوی کے دوران میں اُوخری کے قصبہ اور اس کی قضا (یعنی عدالتی حلقے) کی آبادی بڑھنا شروع ہوگئی۔ انیسویں صدی عیسوی میں اس اضافے نے (خوب) زور پکڑا جو یورپ اور عثمانی مقبوضات میں پائے جانے والے عمومی رجحان سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس (اضافے) کی ایک خصوصیت (یہ بھی) ہے کہ زیادہ گھرانے رکھنے والے مسلمانوں کے مقابلے میں عیسائیوں کی آبادی میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ ۱۹۰۰ء میں کن سیو (Kancev) کی طرف سے کی جانے والی تحقیق کی رو سے، جسے عموماً نہایت مستند سمجھا جاتا ہے، ۱۵۸۳ء میں مسلمان اور عیسائی اس قصبے کی آبادی میں برابر کا تناسب رکھتے تھے اور سترہویں صدی عیسوی کے وسط میں (یہاں کی) دو تہائی مسلمان آبادی عیسائی ہوگئی. [یا انہیں زبردستی عیسائی بنا لیا گیا].

انیسویں صدی عیسوی میں اُوخری ایک خوشحال قصبہ تھا، خصوصاً (یہاں کی) عیسائی آبادی نے خوب ترقی کی اور اس کی رہائش بڑے اور نہایت عمدہ طور پر تعمیر شدہ مکانوں میں تھی۔ پوستین کی صنعت اُن کا سب سے بڑا پیشہ تھا۔ وان ھان (J.C.von Hahn) نے ۱۸۶۰ء کے عشرے کے آغاز میں اس قصبے کی سیاحت کی۔ اس کا خصوصی مشاہدہ ہے کہ اس قصبے میں غریب ناپید تھے، اس کے زمانہ سیاحت میں سنان پاشا کا خیرات خانہ (Limaret) بھی چل رہا تھا، اگرچہ وہ اپنی آمدنی کے زیادہ تر حصے سے محروم ہوچکا تھا۔ ھان (Hahn)، ۲۰۰ سال قبل [یہاں کی سیاحت کرنے والے] اولیا چلپی کی طرح اس ادارے کی تحسین وستائش کرتا ہے جہاں بلاتفریق مذہب محتاجوں کو کھانا فراہم کیاجاتا تھا.

بلقان کی جنگوں کے دوران میں، ۲۹ نومبر ۱۹۱۲ء کو سرب مانٹینگریائی فوج نے اس قصبے پر قبضہ کر لیا جو (اس وقت) سربیائی ریاست میں شامل تھا۔ مناستر (Manastir) کی ولایت کے سالنامہ برائے ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء۔۱۸۹۱ء میں بتایا گیا ہے کہ اُوخری میں ۱۳ سرائیں، ۲ حمام، ۹ مساجد، ۲ خانقاہیں اور ایک مدرسہ تھا۔ ۱۹۳۴ء میں فہیم (Bajraktarevic) نے یہاں کی ۱۲ مساجد کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے اکثر کے نام اُس نے وہی بتائے ہیں جو اولیا چلپی نے (قبل ازیں) گنوائے تھے۔ ۱۹۱۲ء کے بعد سینٹ صوفیا مسجد کو (مکمل طور پر) دوبارہ کلیسا بنا دیا گیا۔ اس میں (کیے گئے)

عثمانی اضافہ جات، ماسوائے عمدہ مرمریں گنبد کے ختم کر دیئے گئے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد کے سالوں میں عہد وسطیٰ کے موجود کلیساؤں اور ان کی تصاویر وغیرہ کی مرمت و بحالی کا کام کیا گیا اور ان کا مطالعاتی جائزہ لیا گیا، اس سے نسبتاً کم پیمانے پر عثمانیوں کی یادگاروں کے ضمن میں بھی یہی طرز عمل اختیار کیا گیا۔ ۱۹۵۵ء۔۱۹۵۶ء میں اُوخری اور سٹروگہ (Struga) کے ترکی زبان بولنے والے مسلمانوں کی بڑی تعداد ترکی منتقل ہوگئی اور ان لوگوں کی جگہ البانوی مسلمانوں نے لے لی جن کی آبادی میں بیسویں صدی عیسوی میں زبردست اضافہ ہوا (اور) اس طرح اُوخری ترک مسلمانوں کی بجائے البانوی مسلمانوں کا قصبہ بن گیا، کیونکہ (یہاں کے) عیسائیوں کی آبادی میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ حیاتی سلسلے کا آستانہ (اپنے بانی شیخ محمد حیاتی کے ایک وارث شیخ قادری (پیدائش ۱۹۳۲ء) کی نگرانی میں مسلسل کام کررہا ہے اور اس کی عمارت صحیح وسالم ہے (دسمبر ۱۹۹۲ء)۔ یہ آستانہ مقدونیائی مسلمانوں کی اہم خانقاہوں میں سے ایک ہے اور سابقہ یوگوسلاویہ کے سقوط کے بعد اسلام کی عمومی نشاۃ ثانیہ میں اپنا کردار ادا کررہا ہے.

بیسویں صدی کی متعدد مردم شماریوں سے، جن سے صرف اُوخری کے پرانے قضائی/عدالتی حلقے کے مغربی نصف (حصے) کے بارے میں اعداد وشمار دستیاب ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتاہے کہ البانوی مسلمان اور پومکس (Pomacks) لوگ بلقان کی جنگوں اور (ان کے بعد) دونوں عالمی جنگوں کی ہنگامہ خیزیوں میں محفوظ رہے۔ ۱۹۰۰ء میں ۳۹ بستیاں، جو بعد میں یوگوسلاویہ کے ضلع سٹروگہ (Struga) کے تحت یکجا ہوئیں اور یہ ضلع بنیادی طور پر اُوخری کے میدان اور البانیہ کے سامنے واقع پہاڑوں پر مشتمل تھا ۲۴,۶۴۰ افراد کی آبادی رکھتی تھیں جس میں سے ۳۸% مسلمان تھے، بعد کے کچھ سالوں کی آبادی کی تفصیل حسب ذیل ہے: سال ۱۹۱۴ء، کل آبادی ۲۵,۹۲۷ مسلمانوں کا تناسب آبادی ۳۹%، سال ۱۹۴۴ء، کل آبادی ۳۱,۳۴۱، مسلمانوں کا تناسب آبادی ۴۲%، سال ۱۹۵۳ء، کل آبادی ۳۳,۳۱۹ مسلمانوں کا تناسب آبادی ۴۶%، سال ۱۹۶۹ء، کل آبادی ۴۰,۱۷۲ مسلمانوں کا تناسب آبادی ۵۲%۔ اس طرح انیسویں صدی عیسوی میں (پایا جانے والا) آبادی کا تناسب پورے طور پر تبدیل ہوکر رہ گیا، یعنی مسلمان خاندان تعداد میں بڑھ گئے جبکہ سلاف عیسائی آبادی نہیں بڑھی، خصوصاً ۱۹۷۰ء کے عشرے سے ۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل میں البانوی، سلافی، مقدونی اور ترکی زبانیں بولنے والی مسلم آبادی لازماً اس علاقے کی کل آبادی کا دوتہائی حصہ ہوچکی ہوگی.

دوسری عالمی جنگ کے بعد اُوخری کے پورے کے پورے قدیم قصبے کو ایک قومی ثقافتی یادگار قرار دے دیا گیا ہے جسے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ ومصون رکھنا مقصود ہے۔ سلافی مقدونیا کا یہ اہم ترین قصبہ اپنی بہت سی یادگاروں، مشرقی امتزاج اور جھیل کے قرب کی بنا پر بین الاقوامی سیاحت کا ایک مرکز بن چکا ہے.

مآخذ: ۱۵۱۹ء اور ۱۵۸۳ کی "تحریرات" کے لیے دیکھیے: (۱) Sokoloski، ۱۹۷۱ء؛ (۲) اولیاء چلبی: سیاحت نامہ، ۸، (استانبول ۱۹۲۸ء) ۷۳۵۔۷۴۳؛ (۳) J.G von Hahn: *Reise durch die Gebiete des Drin und Wardar*، در *Denkschriften der Akad. der Wiss, Phil Hist. Cl*، ویانا ۱۸۶۵ء، ۱۴، ص ۱۲۰۔۱۲۲؛ (۴) H. Gelzer: *Der patriarchat von Achrida, Geschichte und Urkunden*، در *Abh. der phil. Hist. Cl. der Sachischen Gesellschaft der Wiss*، لائپزگ ۱۹۰۲ء؛ (۵) V. Kancev: *Makedonija etnografija i*

Statistika، صوفیا ۱۹۰۰ء (بار ثانی)، در Izbrani Proezvedenija، صوفیا ۱۹۷۰ء، ص ۵۵۲ـ۵۵۵)؛ (۶) محمد توفیق: Manastir Wilayetinin tarikhcesi، مناستر ۱۳۲۷ھ/۱۹۱۱ء؛ (۷) Iv.Snegarov: Istorija na Ohrid Skata archiepiskopyija- patriarsija، صوفیا ۱۹۳۲ء؛ (۸) F. Mesesnel: Ohrid, varos i jezero starine, okoline، اوخری، سکوپ جی (ohrid ، Skopje) ۱۹۳۴ء؛ (۹) D.Koco: Klimentoviot manastir sv. pantalejmon i razkopkata pri Imaret vo Ohrid، در Godisen Sbornik na Filosofski Fakultet Scopje ۱۹۴۸ء؛ (۱۰) I. Dujeev: La conquete turque et la prise de Constantinople dans la litterature slave Contemporaine، در Byzantinoslavica، ۱۴ (پراگ ۱۹۵۳ء): ۱۴ـ۵۴ (۱۴۶۶ء کی جلاوطنی (کے احکام) کا متن)؛ (۱۱) F.Bajraktarevic: Turski Spomenici u Ohrid (فرانسیسی زبان میں طویل تلخیص کے ساتھ)، در Prilozi za Orientalnu Filologiju، ۵ (سراجیو ۱۹۵۴ء ـ ۱۹۵۵ء): ۱۱۱ـ۱۳۴؛ (۱۲) B.Cipan: Stara gradska arhitektura vo ohrid، سکوپا ۱۹۵۵ء؛ (۱۳) D. Boskovic-K.Tomovski: L'architecture medievale d' ohrid (سربیائی و فرنچ)، در Sbornik / Receuil de travaux du Musee National d' ohrid، ۱۹۶۱ء، ص ۷۱ـ۱۰۰؛ (۱۴) D.Cornakov, A.Nikolovski: K.Balabanov: The Cultural Monuments of the Poeple's Repubic of Macedonia سکوپے ۱۹۶۱ء، ص ۲۰۹ـ۲۵۹؛ (۱۵) Enciklopedija Jugoslavije، ۶، زغرب ۱۹۶۵ء، ص۳۴۲ـ۳۴۵؛ (۱۶) Semavi Eyice: Ohri'nin Turk devrine ait eserler، در Vakiflar Dergisi، ۶ (انقرہ ۱۹۶۵ء): ۱۳۷ـ۱۴۵؛ (۱۷) G. Palikruseva Krum Tomovski: Les Tekkes en Macedoine aux 18e-19e Siecle ، در Atti del Secondo Congresso Intern. di Art Turca، در نیپلز نیپولی، ۱۹۶۵ء، ص ۲۰۳ـ۲۱۱؛ (۱۸) K.Popovski: V.Malevski، در Demografski dvizenija (مدیر): Struga i Strusko، سٹروگا، ۱۹۷۰ء، ص۲۳ـ ۳۷ (بیسویں صدی عیسوی کی مردم شماریوں کا نایاب مواد)؛ (۱۹) M.Sokoloski: "Ohrid i Ohridska vo xbi vek"، در Makedonska Akademija na Naukite i Umetnostite,prilozi، ۲/۲ (سکوپے ۱۹۷۱ء)، ص۵ـ۳۷ (بنیادی ماخذ)؛ (۲۰) Hasan Kalesi: Najstariji vakufski dokumenti u Jugoslaviji na Arapskom Jeziku، پرسٹینا ۱۹۷۲ء، ص ۱۱۱ـ۱۴۳ (اوخری زادہ سنان چلپی کے قائم کردہ وقف کے لیے)؛ (۲۱) Kemal Ozergin: Eski bir ruzname gore Istanbu ve Rumeli medreseleri، در Tarik Enstitusu Dergisi (استانبول ۱۹۷۳) ص ۴ـ۵ (۱۹۷۳ءـ ۱۹۷۴ء)، ص۲۶۲ـ۲۹۰؛ (۲۲) A.Matkovski: Crkovni davacki (Kilise resimleri) vo Ohridskata arhiepiskopija (1371-1767) ، در MANU Prilozin، ۲/۲ (سکوپے ۱۹۷۱ء)؛ (۲۳) Ohrid i Ohridsko niz istorija, Kniga vtora، سکوپے ۱۹۷۸ء؛ (۲۴) G. Subotic: Ohridska Slikarska skola Xv veka ، بلغراڈ ۱۹۸۰ء (طویل فرنچ ملخص کے ساتھ بنیادی ماخذ)؛ (۲۵) A.Stojanovski: Gradovite na Makedonija od Krajot na Xiv do Xvii vek، سکوپے ۱۹۸۱ء (خصوصاً باب اوّل)؛ (۲۶) Dzemal Cehajic: Derviski redovi u Jugoslovenskim Zemljama، (سراجیو۱۹۸۶ء، ص ۱۱۲ـ۱۱۵).

(M. Kiel [ت ظفر علی])

••-------------••

※اوربے، حسین رؤف: بحری افواج کا ایک سالار، سیاست دان اور سفارت کار (۱۸۸۱ء۔۱۹۶۴ء)۔ اس کی تربیت بحری افسر کے طور پر ہوئی اور اس نے ۱۹۱۱ء میں اٹلی کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ جب اس نے حمیدیہ بحری بیڑے کے سربراہ کے طور پر جنگ بلقان میں حصہ لیا اور دشمن کی بندرگاہوں اور بحری بیڑوں پر دلیرانہ تابڑ توڑ حملے کیے (۱۹۱۲ء۔۱۹۱۳ء) تو اس وقت وہ قومی سطح پر مشہور ہوگیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں وہ ترکی بحریہ کا سربراہ رہا اور اکتوبر ۱۹۱۸ء میں اسے وزیر بحریہ بنا دیا گیا۔ اسی دوران میں اس نے مندروس کے معاہدہ جنگ بندی میں ترکی وفد کی قیادت کی۔ مئی ۱۹۱۹ء میں اس نے بحریہ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مصطفیٰ کمال (اتاترک) اور فتحی اوکیار کے ساتھ مل کر اناطولی میں تحریک مزاحمت کو منظم کرنے میں مشغول ہوگیا۔ ایک قوم پرست رہنما اور آخری عثمانی پارلیمنٹ کا رکن ہونے کی وجہ سے برطانویوں نے اسے مارچ ۱۹۲۰ء میں گرفتار کرکے مالٹا بھجوا دیا۔ وہ مارچ ۱۹۲۱ء میں ترکی واپس آیا اور اگست ۱۹۲۲ء میں اسے وزیراعظم مقرر کر دیا گیا، لیکن معاہدہ لوزانا میں عصمت انونو کے ساتھ اس کے شدید اختلافات ابھر کر سامنے آئے، چنانچہ اس نے اگست ۱۹۲۳ء میں وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا اور اپوزیشن میں شامل ہوگیا۔

دوسرے اپوزیشن رہنماؤں کی طرح وہ بھی کمال اتاترک کی آمرانہ پالیسیوں سے نالاں تو تھا، لیکن وہ اس کے اقتدار کے خاتمے کا خواہاں نہ تھا۔ اس کے برعکس اس کی رائے یہ تھی کہ اتاترک کے اختیارات کم کردیئے جانے چاہئیں۔ بہرحال نومبر ۱۹۲۴ء میں اس نے ''پروگریسو ری پبلکن پارٹی'' کے قیام میں اہم کردار ادا کیا اور جب جون ۱۹۲۵ء میں حکومت نے اس نئی جماعت پر پابندی لگا دی تو وہ علاج کے لیے بیرون ملک چلا گیا۔ اگست ۱۹۲۶ء میں جب ازمیر میں مصطفیٰ کمال پر ناکام قاتلانہ حملہ ہوا تو حسین رؤف اور دوسرے وطن پرست رہنماؤں پر اس میں ملوث ہونے کے الزام میں مقدمہ قائم کر دیا گیا اور اگرچہ عدالت میں استغاثہ یہ ثابت نہ کر سکا کہ مذکورہ قاتلانہ حملے میں اس کا کوئی ہاتھ تھا، پھر بھی اسے اس کی غیر حاضری میں دس سال قید کی سزا سنا دی گئی۔ ۱۹۳۳ء میں جب عام معافی کا اعلان کیا گیا تو وہ کچھ عرصہ انتظار کے بعد ۱۹۳۵ء میں ترکی واپس آگیا، لیکن ۱۹۳۹ء تک اسے مذکورہ جرم سے بری الذمہ قرار نہیں دیا گیا۔ اس کے بعد جب اس کی سیاسی حیثیت بحال ہوگئی تو وہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء تک برطانیہ میں ترکی کا سفیر رہا۔

مآخذ: (۱) ترک انسائیکلوپیڈیسی، انقرہ، ۱۹۷۷ء بذیل مادہ؛ (۲) E. J. Zurcher: *The Unionist Factor: The Role of the Committee of Union and Progress in the Tukish National Movement*، ۱۹۰۵ء۔۱۹۲۶ء، لائیڈن ۱۹۸۴.

(W.M.Hale [ت: محمد امین])

••--------------••

اورخاں کمال: محمد رشید (اورخاں کمال اوگوچو) ※ ایک ترکی افسانہ وناول نویس (۱۹۱۴ء۔۱۹۷۰ء)۔ اس کا والد عبدالقادر کمالی ایک وکیل تھا جو ۱۹۲۰ تا ۱۹۲۳ء رکن پارلیمنٹ اور کچھ دیر وزیر انصاف بھی رہا۔ اس نے عدنہ میں ''اہالی جمہوریت پارٹی'' کی بنیاد رکھی، تاہم پارٹی کی جبری بندش کے بعد اسے شام میں پناہ لینا پڑی۔ اورخاں کمال اس وقت ہائی اسکول کا طالب علم تھا اور اسے بھی ایک سال تک اپنے والد کے ساتھ شام اور لبنان میں رہنا پڑا۔ جیسا کہ اس کی بعد کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے اس دوران میں اسے ایک پرنٹنگ پریس میں مزدوری کرنا پڑی۔ ۱۹۳۲ء میں والد کی وفات کے بعد وہ عدنہ واپس

آگیا۔ یہاں بھی اسے جسم وجاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے پہلے مزدوری کرنا پڑی، بعدازاں وہ ایک ٹیکسٹائل فیکٹری میں ملازم ہوگیا اور ترقی کرکے اسٹور کیپر اور سیکرٹری بن گیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۲ء تک چلتا رہا، تاہم اس دوران میں وہ فارغ اوقات میں مسلسل مطالعہ کرتا رہا اور اس نے مہماتی ناول اور ڈرامے لکھنے شروع کر دیئے۔ جب وہ لازمی فوجی ٹریننگ کررہا تھا تو اس نے راصت کمالی کے نام سے شاعری بھی شروع کردی (بعد میں وہ اورخاں راصت کے نام سے بھی لکھتا رہا)۔ اسی دوران میں اس پر یہ الزام لگا کہ وہ سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہے اور اسے پانچ سال کی سزائے قید ہوگئی۔

اس کا پہلا افسانہ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا اور اگلے چند سالوں میں وہ ملک کے معروف ادبی پرچوں میں لکھنے لگا۔ بصرہ جیل میں اس کی ملاقات ناظم حکمت سے ہوئی اور اس کے ادبی اسلوب کے اثرات بھی اس نے قبول کیے۔ ۱۹۴۵ء میں ادبی رسالے ورلیک (Varlik) نے اسے بہترین افسانہ نگار قرار دیا۔ ۱۹۴۳ء میں جیل سے رہا ہوکر وہ عدنہ واپس آیا، لیکن اسے وہاں کوئی معقول ملازمت نہ مل سکی چنانچہ وہ اپنے اہل وعیال سمیت استانبول آ گیا اور قلم کے ذریعے روزی کمانے لگا۔ ۱۹۴۹ء میں اس کا پہلا ناول بابا ایوی (Baba Evi) اور افسانوی مجموعہ اکمک کوگیسی (Ekmek Kavgasi) شائع ہوا جس نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ۱۹۵۸ء میں کردس پارٹ (Kardes Part) اور ۱۹۶۹ء میں اونسی سکمک (on ce Sekmek) لکھنے پر اسے ادبی انعامات ملے۔ اس دوران میں وہ ناول، افسانے، ڈرامے اور فلمی کہانیاں لکھ کر روزی کماتا رہا۔ ۱۹۷۰ء میں اسے بلغاریہ آنے کی دعوت دی گئی جہاں وہ ۲جون کو انتقال کر گیا۔

اورخان کمال اپنی کتابوں میں غریب اور نچلے طبقے کے ان لوگوں کو موضوع بناتا ہے جو شہروں کی کچی آبادیوں کے تنگ وتاریک مکانوں میں رہتے ہیں اور فیکٹریوں اور کھیتوں میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اس کے اکثر کردار مزدور، غریب دیہاتی، قیدی، طوائفیں، ڈرائیور، کوڑا کرکٹ اکٹھا کرنے والے لڑکے، چھوٹے درجے کے سرکاری ملازم اور گداگر وغیرہ ہیں۔ اس نے ترکی افسانے میں اسیری کی زندگی کو موضوع بنانے کی ریت ڈالی۔ اس نے خواتین اور بچوں کے مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اس کے نسائی کردار اکثر مثبت روایات کے حامل ہوتے ہیں اور طفلی کردار وہ ہوتے ہیں جن کے بچپن کا سنہری زمانہ تلاش نان جویں کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کی بعض تصانیف میں مابعد جنگ کے اثرات خصوصاً صنعتوں کے پھیلاؤ، نظام سرمایہ داری کے اثرات، نچلے اور غریب طبقات کی بدلتی ہوئی اقدار پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس نے اپنے بچپن کے حالات بھی لکھے ہیں اور دوران اسیری میں قیدیوں سے سنی ہوئی کہانیاں بھی بیا ن کی ہیں۔ ۱۹۴۶ء کے بعد لکھی جانے والی اس کی اکثر تحریروں میں طبقاتی تفاوت خصوصاً شہروں اور دیہات کے درمیان بڑھتی ہوئی معاشی تفریق کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ وہ کرداروں کے نفسیاتی تاثرات براہ راست بیان نہیں کرتا، بلکہ انہیں کرداروں کے مکالمات کے ذریعے نمایاں کرتا ہے۔ اس کا اسلوب سادہ، واضح اور تشبیہات واستعارات سے مبرا ہوتا ہے۔ اس کی اکثر کہانیوں کو فلمایا گیاہے اور اس طرح کے فلمی متون اکثر خود مصنف کے اپنے لکھے ہوے ہیں.

مآخذ: تصانیف اور خاں کمال، باراول: (الف) ناول: (۱) Baba evi، ۱۹۴۹ء؛ (۲) *Avare yillar*، ۱۹۵۰ء؛ (۳) *Murtaza*، ۱۹۵۲ء؛ (۴) *Cemile*، ۱۹۵۲ء؛ (۵) *Bereketli Topraklar Uzderinde*، ۱۹۵۴ء

(فرانسیسی ترجمہ بعنوان Surles terres Fertiles، پیرس، Gallimard، ۱۹۷۱ء؛ (۶) Suclu، ۱۹۵۷ء؛ (۷) Devlet Kus، ۱۹۵۸ء؛ (۸) Vukuat Var، ۱۹۵۹ء؛ (۹) Gavurun Kizi، ۱۹۵۹ء؛ (۱۰) Dunya evi، ۱۹۶۰ء؛ (۱۱) El kizi، ۱۹۶۰ء؛ (۱۲) Hanimin Ciftligi، ۱۹۶۱ء؛ (۱۳) Gurbet kuslari، ۱۹۶۲ء؛ (۱۴) Eskici ve Ogullari، ۱۹۶۲ء؛ (۱۵) Sokakalarin Cocugu، ۱۹۶۳ء؛ (۱۶) Kanli Topraklar، ۱۹۶۳ء؛ (۱۷) Bir Filiz Vardi، ۱۹۶۵ء؛ (۱۸) Mufettisler Mufettisi، ۱۹۶۶ء؛ (۱۹) Yalanci Dunya، ۱۹۶۶ء؛ (۲۰) Evlerden Biri، ۱۹۶۶ء؛ (۲۱) Arkadas Islikalari، ۱۹۶۸ء؛ (۲۲) Sokakzardan Bir Kiz، ۱۹۶۸ء؛ (۲۳) Uc Kagitci، ۱۹۶۹ء؛ (۲۴) Kotu Yol، ۱۹۶۹ء؛ (۲۵) Kacak، ۱۹۷۰ء. (ب) افسانوی مجموعے: (۲۶) Ekmek Kavdasi، ۱۹۴۹ء؛ (۲۷) Sarhoslar، ۱۹۵۱ء؛ (۲۸) Camasircinim Kizi، ۱۹۵۲ء؛ (۲۹) 72, Kogus، ۱۹۵۴ء؛ (۳۰) Grev، ۱۹۵۴ء؛ (۳۱) Arka Sokak، ۱۹۵۶ء؛ (۳۲) Kardes Payt، ۱۹۵۷ء؛ (۳۳) Babil Kulesi، ۱۹۵۷ء؛ (۳۴) Serseri Milyoner، ۱۹۵۷ء؛ (۳۵) Kucucuk، ۱۹۶۰ء؛ (۳۶) Mahalle Kavgasi، ۱۹۶۳ء؛ (۳۷) Dunyada Harp Vardi، ۱۹۶۳ء؛ (۳۸) Issiz، ۱۹۶۶ء؛ (۳۹) Once Ekmek، ۱۹۶۸ء؛ (۴۰) Kucukler Ve Buyukler، ۱۹۷۱ء.

تنقیدی مطالعہ: (۴۱) Y.Kenan Karacanlar: Orhan Kemal، استانبول، ۱۹۷۴ء؛ (۴۲) H. Altinkayank, A.: Orhan Kemal، استانبول، ۱۹۷۷ء؛ (۴۳) Bezirci: Turk Roman Ve Oykusu، انقرہ، ۱۹۸۴ء؛ (۴۴) O-Oertoy: Turk Edebiyatin Da hikaye Ve Roman، C.Kudret، استانبول ۱۹۹۰ء.

(Ci.Gdem Balim، [ت: محمد امین])

••-------------••

※ اورک، ناہید صری: (ناہید صری اورک)، ایک ترک مصنف، صحافی اور ادبی محقق۔ وہ ۲۲ مئی ۱۸۹۴ء کو استانبول میں پیدا اور ۱۹۴۰ء میں فوت ہوا۔ وہ التی (Olti) کے احمد نافذ پاشا کا پوتا تھا، جو (خود) بھی شاعر تھا اور جس کے والد اورک آغاسی زادہ حسن صری سرکاری ملازم اور مترجم تھے۔ ناہید صری غلط سرائے کے مدرسہ لائی سی (lycee) میں تعلیم حاصل کرتا رہا اور ۱۹۱۳ء میں وہاں سے فارغ التحصیل ہوا۔ اس نے ۱۹۲۸ء تک یورپ میں قیام کیا اور ترکی واپس آنے کے بعد اخبار "جمہوریت" کے مراسلہ نگار کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ بعد ازاں وہ محکمہ تعلیم میں مترجم مقرر ہوگیا۔ اس نے اناطولیا کا سفر کیا اور مقالات لکھے جو زیادہ تر تاریخی مقامات اور قدیم آثار کے بارے میں تھے اور اس کے ذاتی مشاہدات وتأثرات پر مبنی تھے۔ وہ اپنی وفات ۱۸جنوری ۱۹۶۰ء تک صحافت سے وابستہ رہا۔ ناہید صری نے تجرد کی زندگی بسر کی اور عمر بھر شادی نہیں کی.

وہ استانبول سے دلی محبت رکھتا تھا اور اس کی ستائش کیا کرتا تھا اور یہ (بات) اس کی تصانیف سے بخوبی عیاں ہے۔ اس کے تاریخی ناولوں کا اسلوب معروضی اور دھیما ہے اور مزاحیہ انداز میں عہد ماضی کے استانبول کی زندگی کے واقعات کا بیان اس کی تصانیف کا ایک نمایاں وصف ہے۔ زبان کے معاملے میں اس نے وفاداری کے ساتھ شستہ عثمانی اسلوب کی رعایت ملحوظ رکھی.

مآخذ: پہلی بار کی طباعتیں: کہانیاں (۱) Zeyneb la Courtisane، ۱۹۲۷ء؛ (۲) Kirmizi ve Siyah، ۱۹۲۹ء؛ (۳) Sanatkarlar، ۱۹۳۲ء؛ (۴) Eski resimler، ۱۹۳۳ء؛ (ب) ناول: (۵) Eve dusen Yildirim، ۱۹۳۴ء؛ (۶) Kiskanmak، ۱۹۴۶ء؛ (۷) Hayat ve kadinlar، ۱۹۴۶ء؛ (۸) Sultan Hamid duserken،

۱۹۵۷ء؛ (ج) ڈرامے:(۹) Sonmeyen ates، ۱۹۳۳ء؛
(۱۰) Muharrir، ۱۹۳۴ء؛ (۱۱) Oyuncular، ۱۹۳۸ء؛
(۱۲) Alin Yazisi، ۱۹۵۲ء؛ (د) تحقیق وتنقید: (۱۳)
Edebiyat ve sanat bahisleri، ۱۹۳۳ء؛ (۱۴) Tarihi
Cehreler etrafinda، ۱۹۳۳ء؛ (۱۵) Yuzelli Yilin Turk
meshurlari ansiklopedisi، ۱۹۳۳ء؛ (۱۶) Roman ve
hikaye، ۱۹۳۳ء؛ (ر) سیاحتی یادداشتیں؛ (۱۷) Anadolu،
۱۹۳۹ء؛ (۱۸) Bir Edrine Seyahatnamesi، ۱۹۴۱؛
(۱۹) Kayseri Kirsehir Kastamonu، ۱۹۵۵ء؛

سوانحی مواد: (۱) T.Alangu: Cumhuriyetten
Sonra hikaye ve roman، استانبول ۱۹۵۹ء؛ (۲) .H
Yanuz: Roman kavrami ve Turk romani، استانبول
۱۹۷۲ء؛ (۳) O.Onertoy: Turk roman ve
oykusu، انقرہ، ۱۹۸۴ء؛ (۴) M. Unlu and
O.Ozcan: Yuzuil Turk edebiyati، استانبول، ۱۹۸۸ء۔
(Cigdem Balim [ت: ظفر علی])

••-------------••

※ اورومو: مشرقی افریقہ کی ایک قوم جس کا کچھ حصہ حلقہ بگوش اسلام ہوچکا ہے۔ یہ قوم حبشہ میں آباد ہے، اگرچہ اس کے افراد قلیل تعداد میں کینیا، صومالیہ اور سوڈان میں بھی مقیم ہیں۔ اڑسی، (اروسی) بورن، گجی، کرایو، لیقا، (ازیو) ماچا، رایا، قبائل تلاما، اور ویلو وغیرہ اس کے اہم قبائل ہیں۔ امہری قبائل، جن کے ہاں یہ لوگ بس رہے ہیں، انہیں "گالا" کا نام دیتے ہیں، جس کا اشتقاق مجہول ہے۔

عددی لحاظ سے اورومو کا شمار افریقہ کے بڑے نسلی گروہوں میں ہوتاہے۔ حبشہ کی کل آبادی میں اُن کا تناسب ۴۰ فی صد ہے، یعنی ایک کروڑ سے لے کر ایک کروڑ چالیس لاکھ کے درمیان۔ لسانی اعتبار سے وہ امہری زبان بولنے والوں کے مقابلے میں اکثریت رکھتے ہیں۔ وہ خود اپنی زبان کو افان اورمو کا نام دیتے ہیں اور امہری لوگ اسے اورمنا اور گلنا (Gallenna) کہتے ہیں اور یہ کشتی گروہ سے تعلق رکھتی ہے (دیکھیے Kush) جس میں اس کے ساتھ افر، اگاؤ، بیجا، نسہو اور صومالی (زبانیں بھی) شامل ہیں۔ لاطینی رسم الخط میں اورومو (زبان) کی تحریر اب عمومی طور پر مروج دکھائی دیتی ہے، اگرچہ (ماضی میں) اس کے (لکھنے) کے لیے حبشی یا عربی حروف ابجد استعمال کیے جاتے تھے.

مذہبی اعتبار سے اورومو قبائل مختلف مذاہب، مثلاً قومی کلیسا کے وفادار عیسائی (کیتھولک اور پروٹسٹنٹ)، مسلمان اور روایتی مذاہب کے پیروکار سبھی شامل ہیں۔ ان کا مذہبی وثقافتی تنوع ان کے مشترک تشخص کا تدریجی ارتقا نہیں روک سکا۔ یہ تشخص زیادہ تر ان کے لسانی اشتراک اور مشترکہ اقدار (مثلاً Gada نظام) پر مبنی ہے۔ یہ لوگ مختلف اورومو علاقوں کو یکجا کرکے اورومیا (Oromia) کے نام سے ایک الگ ریاست کے قیام کے لیے کوشاں ہیں اور غالباً حبشہ کے انتظامی وسیاسی ڈھانچے سے پوری طرح مطمئن نظر نہیں آتے.

اصلاً خانہ بدوش اورومو قوم کا علاقہ جھیل ابایا (Abaya) سے لے کر دریائے وبی شبیلہ (Webi Shebele) کی بالائی گزرگاہ تک پھیلا ہوا خطہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کی آبادی سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں، بڑے بڑے جنگجوؤں کی ترک تازیوں اور (ان کے نتیجے میں ہونے والی) نقل مکانیوں کی بنا پر شمال کی جانب چلی گئی۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں مسلمانوں، خصوصاً ہرر (Harar) کی مسلمان سلطنت [رک بآں] کے خلاف شروع کی جانے والی عیسائی حکومت کی جنگوں کے باعث

پیدا ہونے والی افراتفری ان کے حق میں فائدہ مند رہی۔ ان نقل مکانیوں کے باعث وہ (دریاے) نیل ازرق، ٹائیگرے اور شمال مشرق میں ہرر (Harar) کی طرف منتقل ہوگئے اور یہاں کے لوگوں کے رسم ورواج، اعتقادات اور حتیٰ کہ انہوں نے زبان تک کو اپنا لیا، اس طرح اُن میں سے کچھ لوگ جلد ہی دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے.

اٹھارہویں صدی عیسوی سے مسلمانوں میں سیاسی گروہ وجود پذیر ہونے لگے، جب کہ بہت سے لوگ تجارت کی طرف بھی مائل ہوے۔ شمال میں طجو (Tajju) اور ویلو (Wello) قبائل (۱۸۵۳ء تک) عیسائی ریاستوں کے سیاسی ارتقا کے سلسلے میں نہایت مؤثر ثابت ہوے۔ جنوب میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں قائم ہونے والی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں، مثلاً (Ennarya، Jimma، Gera، Gomma اور Guma) وغیرہ، خصوصاً ہرر (Harar) کے تاجروں کے اثرونفوذ کی بنا پر حلقہ بگوش اسلام ہوگئیں۔ اپنی داخلی رقابتوں کے باعث غیر متحد ہو جانے کے بعد ۱۸۸۱ء اور ۱۸۹۷ء کے درمیانی عرصے میں منیلیک (Menelik) نے انہیں ایک سلطنت کے تحت (ازسرنو) یکجا کر دیا، جس میں اس صدی کے نصف آخر میں حلقہ اسلام میں آنے والا ارسی (Arssi) کا خطہ اور خود ہرر (Harar) کی سلطنت بھی شامل تھی.

اورومو مسلمان "راسخ العقیدگی" سے کوسوں دور ہیں اور بعض اوقات برائے نام مسلمان دکھائی دیتے ہیں۔ ارسی کے علاقے میں شیخ نورحسین کے قبہ کی زیارت مشہور عام ہے اور یہاں سرانجام پانے والی مذہبی رسوم ابامدہ (Abba Mudda) کی روایتی زیارتوں کی رسوم سے مکمل طور پر مشابہ ہیں۔ اس خطے میں باأثر متصوفانہ سلاسل (تیجانیہ اور سلیمانہ) سوڈان کے راستے کے ذریعے اور (احمدیہ وقادریہ) عرب سے یہاں پہنچے ہیں.

مآخذ: اورومو مسلمانوں کے بارے میں معلومات نہایت منتشر حالت میں پائی جاتی ہیں۔ حبشہ کینیا اور صومالیہ پر شائع ہونے والے مآخذ کے علاوہ ذیل کی کتب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے:(۱) J.S. Trimingham: *Islam in Ethiopia*، لنڈن ۱۹۵۲ء؛ (۲) A. Trudnos: *Oromo: Documentations, Bibliography and Maps*، وارسا، ۱۹۸۴ء؛ (۳) P. T. W.Baxter: *The Present State of Oromo Studies*، در *Bull. des Etudes Africaines de L'Inalco*، ج ۶، عدد ۱۱ (۱۹۸۶ء)، ص۵۳۔۸۲.

(A. Rouaud [ت: ظفر علی])

••--------------••

اوزان: (ت)، ترک معاشرے میں مطرب، ※ شاعر، مغنی، داستان گو وغیرہ۔ یہ لفظ فعل Oz. سے مشتق ہے جو آگے بڑھ جانا اور دوڑ میں آگے نکل جانے کے معنوں میں آتا ہے (دیکھیے Clauson: *Etymological Turkish Dictionary of Pre-thirteenth Century*، ص ۲۷۹)۔ قبل ازیں کاشغری [رک بآں] نے دیوان لغات الترک (پانچویں صدی ہجری/ گیارہویں صدی عیسوی) میں بھی اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں، نیز یہ وسطی ایشیا کی موجودہ زندہ کرغیزی، سگائے (Sagay) اور کوئبل (Koybol) بولیوں اور اناطولی کی ترکی (زبان) میں بھی انہی معنوں میں مستعمل ہے۔ دراصل لفظ اوزن سلجوقی عہد کی فوج کے ساتھ رہنے والے مغنیوں کے لیے مختص تھا۔ نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی کے ایک اناطولی ترکی شاعر نے اپنے آپ کو اوزان کہا ہے۔ ترکمانی زبان میں یہ لفظ اب متروک ہے اور اس کی بجائے بگسی (Bagsi) بھی بمعنی در مقبول شاعر" مروج ہے۔ ترکی زبان میں دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی سے (اوزن کی بجائے) عاشق (asik) زیر استعمال

ہے، تاہم اناطولیا کی بعض معاصر بولیوں میں یہ (لفظ) "شاعر، مغنی کے معنوں کے ساتھ باقی ہے، نیز ان بولیوں کے متعدد الفاظ میں بطور سابقہ آتا ہے، جیسے (۱) Ozanlama، "مشابہہ الصوت اقوال، ضرب الامثال"؛ (۲) Ozanci، "باتونی شخص"؛ (۳) Ozanlik، "خوش باش شخص"، (۴) Ozanama، "فی البدیہہ (بیان کی جانے والی) کہانی یا فی البدیہہ (کہا جانے والا) گیت"۔ دور حاضر کی جدید ترکی زبان میں اوزن کی بجائے عربی کا لفظ شاعر (Sair) مستعمل ہو چکا ہے۔

مآخذ:(۱) *Turk Edebiyati* :Attila Ozkirimli، *Ansiklopedisi*، استانبول ۱۹۸۲ء؛(۲) *Turkiye de halk agzindan soz derleme dergisi*، ۳، ۱۹۴۷ء؛ (۳)P.n. Boratav: *Halk hikayeleri ve halk hikayeciligi*، استانبول ۱۹۸۸ء؛ (۴) کوپرولوزادہ محمد فواد: *Turk Edebiyyatinda ilk Mustesawwiflar*، استانبول ۱۹۱۸ء، ص۲۷۳-۲۷۴؛ (۵) وہی مصنف: *Meddahlar,in Turkiyyat Medjmuasi*، ا(۱۹۲۵ء) ص،۲-۳؛(۶) وہی مصنف: *Turk dili ve Edebiyati rakkinda Arastirmalar*، استانبول ۱۹۳۴ء، ص ۲۷۳-۲۹۳؛ (۷) Hamit Zubeyr Ishak Refet: *Anadilden derlemler*، ۲ مجلدات، انقرہ ۱۹۳۲ء-۱۹۵۲ء؛ (۸) K. k. Yudahin، ترجمہ عبداللہ تیماس: *Kirgiz Sozlugu*، انقرہ ۱۹۴۵ء؛ (۹) محمود کاشغری: دیوان لغات الترک، طبع کلسلی رفعت بے، استانبول ۱۹۱۴ء-۱۹۱۷ء؛(۱۰) W.Rodloff: *Proben der Volksliteratur der turkischen Stamme*، ۱-۱۰، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۴۴ء-۱۹۰۴ء۔

(P. N. Boratav [ت: ظفر علی])

••-------------••

※ اوزبگ:(اوزبک، اوزبیک)، ترکی زبان کی ایک قدیم وسیع المعنی اصطلاح.

۱۔ تاریخی پس منظر: (۱) یہ اصطلاح ان ترک، منگول خانہ بدوش قبیلوں کے لیے استعمال ہوتی تھی جو وسط ایشیا خصوصاً خوارزم اور جیحون کے اطراف میں بستے تھے اور پندرھویں صدی کے بعد جوچی چنگیزی حکمرانوں (مثلاً خوارزم کے سولھویں اور سترھویں صدی کے شیبانی [رک بآں] عرب شاہی [رک بآں]، اطراف جیحون کے سولھویں صدی کے شیبانی (ابوالخیری) اور اطراف جیحون کے سترھویں صدی کے تقای تیموری وغیرہ) کے لیے فوجی قوت کا منبع تھے.

سولھویں صدی سے ان قبائل (ایل،قوم، اولوس اور طائفہ) کی شاخوں کے بارے میں دو روایتیں زیادہ مشہور ہیں: ایک میں ۳۹ اور دوسری میں ۹۲ شاخوں کا ذکر ہے (T.I.Sultanov: *Kocevye Plemena Pri-Aralya 15-17*، ماسکو ۱۹۸۲ء ص ۷-۵۱)۔ ان میں سے جو سولھویں سے انیسویں صدی تک خوارزم [رک بآں] اور اطراف جیحون کی تاریخ میں زیادہ اہم ہیں، وہ یہ ہیں: منگیت، قنگرات، ارغون، قپچاق، قرغیز، قارلوق، کلموک [رک بآں] الچین، قیات، اورات، نیمان، قطغان، قانگلی (قانقولی)، اُتارچی، دورمن، ارلات، کیرایط، مینگ، یوز، جلائر، سرائے، انگت، تانگت، مراکت (مکریت)، قاری، اوغلان، اوشون، کنیکش، تاتار، قرق، کوشچی، یوغور اور بہرین۔ ان میں سے اکثر قبائل اور ان کے نام زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہے، تاہم بعض قبائل مثلاً منگیت، کنیکش، جلقہ، قنگرات، مینگ اور یوز، چنگیزی اقتدار کے خاتمے کے بعد چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی صورت میں عہد حاضر تک باقی رہے.

اصطلاح اوزبگ کے معانی سولھویں صدی کے وسط

ایشیا کے جوچی خاندان کی دو شاخوں ابوالخیری اور عرب شاہی یا یادگاری سے مربوط ہیں جو اپنا سلسلۂ نسب شیبان بن جوچی بن چنگیز خان سے جوڑتے ہیں۔ ان کے حلیف جوچی ازبک خاں کی عظیم فوجی قوت سے وابستگی اور نسبت کی وجہ سے خود کو (فارسی میں) اوزبک یا اوزبکیہ کہلاتے ہیں، تاہم جو قبائل چنگیز خان کے بیٹے چغتائی سے وابستہ تھے، وہ اپنے آپ کو مغل کہلواتے ہیں (دیکھیے ظہیرالدین محمد بابر: بابرنامہ، ترجمہ A.S.Beveridge، لنڈن ۱۹۲۲ء ص۲، نیز دیکھیے E.D.Ross (مدیر)، N.Elias(مترجم): *A History of the Moghuls of Central Asia being the Tarikh-i-Rashidi of Mirza Muhammad Haidar Dughlat* مقدمہ، حصہ ۲، لنڈن ۱۸۹۸ء)۔ متاخرین میں سے بابر اور اسکندر بیگ [رک بآں] کا خیال ہے کہ یہ اصطلاح وسط ایشیا کے چنگیزیوں اور ان کے حلیفوں دونوں کے لیے استعمال ہوتی تھی.

صرف جوچی نسل کے لوگ ہی خان اور سلطان کہلاسکتے تھے، جبکہ ان کے اوزبگی فوجی حلیف امیر کہلاتے تھے۔ اگرچہ اوزبکیوں کے تقرر کے وقت قدیم طرز کی پروقار درباری تقریب منعقد ہوتی تھی، لیکن ان تقرریوں کا عملاً سیاسی اثرورسوخ سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ اوائل سترھویں صدی کے ایک مصنف محمود بن امیرولی نے بلخ میں منعقدہ اس طرح کی ایک درباری تقریب کی جو نقشہ کشی کی ہے، جس میں ایک امیر کی تقرری کی گئی تھی، اس کا اسی مصنف کی تحریر کردہ دوسرے امرا کی سوانح سے موازنہ کیا جائے تو خوب اندازہ ہو جاتا ہے کہ درباری حیثیتوں اور سیاسی قوت کے مابین کوئی واضح تحریری رابطہ نہ تھا (دیکھیے R.D.Mc Chesney: *The Amirs of Seventeenth Century Central Asia*، در *JESHO*، ۲۶، ۴۱-۴۲).

بڑے امرا کو ٹیکس میں سے حصہ دیا جاتا تھا، جیسے اقطاع، سیرغال، تیول [رک بآں] میں سے (ملاحظہ ہو M.A.Abduraimov: *Ocerki agrarnikka otnoshenii v Bukharskom Khanstve*، تاشقند ۱۹۶۶-۱۹۷۰ء، ۲:۱۰۰-۱۲۴)۔ اس طرح امرا اور ان کے اہل خاندان اور حلیفوں کا اس علاقے سے ایک مفاد وابستہ ہوجاتا تھا، جہاں سے وہ ٹیکس اکٹھا کرتے تھے۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں چنگیزی خان ان امرا کا تبادلہ کرتے رہتے تھے تاکہ وہ کسی ایک جگہ اپنے پیر نہ جما بیٹھیں، لیکن سترھویں صدی کے نصف ثانی میں اس پالیسی کا نفاذ مشکل ہوگیا۔ نذر محمد [رک بآں]، جس نے ۱۰۱۵تا ۱۰۵۱ھ/ ۱۶۰۶- ۱۶۴۲ء اور ۱۰۵۵تا ۱۰۶۱ھ/۱۶۴۵-۱۶۵۱ء میں بلخ میں حکومت کی، اس وقت اپنا تخت گنوا بیٹھا جب اس نے جنوبی بلخ کے امیر اقطاع "یلنگتوش بے الچین" کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی، چنانچہ اس کے بعد آنے والوں نے پھر یہ غلطی نہیں دہرائی.

اٹھارویں صدی میں ان اوزبگوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنی پوزیشنیں مستحکم کرلی اور ان میں سے بعض نے انیسویں صدی کے اوائل میں اپنی خود مختار حکومتیں قائم کرلیں، جیسے بخارا اور سمرقند میں منگت، میمنہ (منگ) اور خوقند (منگ) قندوز میں قطغان، خیوہ میں قنگرات اور شہر سبز کنیکس۔ ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے سربراہوں نے قدیم چنگیزی روایت کے مطابق امیر یا میر کے لقب کا استعمال جاری رکھا گو اب نہ چنگیزی رہے تھے اور نہ ان کا اقتدار.

(ب) یہ اصطلاح بطور اسم معرفہ ان لوگوں کے ناموں کا ایک حصہ تھی جو ترکی بولنے والے شہری علاقوں میں رہتے تھے اور مذکورہ بالا قبیلوں میں سے کسی سے منسوب نہ تھے۔ چنانچہ بخارا کے جیوباری شیوخ کی ملکیتی

دستاویزات میں اس طرح کے نام ملتے ہیں، جیسے آق بیگا بنت عادل بے اوزبگ (۱۳۴)، تولوم بگ بنت بلال بے اوزبگ (۲۴۰) اور خواجہ محمد میر اوزبگ (۱۷۷) (دیکھیے P.P.Ivanov: Khozyaistvo dzbuibarskikh Sheikhov، ماسکو، لینن گراڈ ۱۹۵۴ء)۔ تاہم ہزاروں ناموں میں سے ایسے نام ایک درجن سے بھی کم ہیں یہ اصطلاح جن کے نام کا جزو ہے.

(ج) معاصر عہد کے متعدد مآخذ سے پتہ چلتا ہے، کہ یہ اصطلاح غیر مہذب اور ان پڑھ کسانوں اور خانہ بدوشوں کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی، دیکھیے مثلاً وسط سترھویں صدی کے محمود بن امیرولی کی بحرالاسرار فی مناقب الاخیار، جلد اول طبع و روسی ترجمہ، بعنوان More Tain Otnositel no doblestei blagorodnikh، تاشقند، ۱۹۷۷ء اور فارسی ترجمے کی جلد اول، جس میں اندیجان کے ان دانشوروں کا ذکر ہے، جو اس علاقے میں اوزبگوں کی آمد سے پہلے مقیم تھے، نیز ملاحظہ ہو محمد طالب جیوباری کی مطلب الطالبین، تاشقند، IVAN مخطوطہ ۳۷۵۷، ورق ۱۴۷ ب۔ جس میں مذکور ہے کہ امام قلی خاں (دور حکومت ۱۰۲۰ تا ۱۰۵۱ھ/۱۶۱۲ تا ۱۶۴۲ء)، اس علاقے کے اوزبگوں اور صحرا نشینوں سے ناراض ہوگیا اور جس میں بخارا کی ایک گلی میں ایک معزز شیخ کے شراب کے نشے میں مخمور اوزبیگی سے ٹکرانے کا ذکر ہے.

(د) یہ اصطلاح انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں شمالی افغانستان کے ان درانی سرداروں کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی جو سیاسی طور پر برتر حیثیت رکھتے تھے اور وہاں عرصۂ دراز سے مقیم تھے، خواہ وہ ترکی بولنے والے ہوں یا فارسی (R.D.Mc Chesney: Waqf In Central Asia، پرنسٹن ۱۹۹۱ء، ۳۰۳-۳۰۴؛ (۲) N.Tapper: Bartered Politics Brides Gender and Marriage in Afghan Tribal Society، کیمبرج ۱۹۹۱ء، ۳۹).

مآخذ: متن میں مذکورہ مآخذ کے علاوہ، عمومی مراجع کے لیے دیکھیے: (۱) Ya.G.Gulyamov (مدیر): Istorya Uzbeskol SSR، ج۱، تاشقند ۱۹۶۷ء؛ (۲) I.M.Muminov (مدیر): Istoriya Samarkanda، ج۱، تاشقند ۱۹۶۹ء؛ (۳) B.A.Akhmedov: Istoriko geograficeskaya Litera tura Sred neazll، تاشقند ۱۹۸۵ء (اس میں فارسی اور ترکی مراجع کا جائزہ لیا گیا ہے)؛ (۴) وہی مصنف: Gosudarstvo Kocevikh Uzbekov، ماسکو ۱۹۶۵ء.

(ب) سولھویں صدی کے مآخذ (ماوراء و اطراف جیحوں، خوارزم وخراسان)؛ (۵) نامعلوم مصنف (غالباً محمد صالح): تواریخ گزیدۂ نصرت نامہ، طبع A.M.Akramov، تاشقند، ۱۹۶۷ء)؛ (۶) خواند میر، طہران، ۱۳۳۳ھ/۱۹۵۴ء، ص ۶؛ (۷) برائے ماوراء و اطراف جیحوں، حافظ تنیش بخاری: شرف نامۂ شاہی، طبع وروسی ترجمہ M.A.salakhetdinova، ج۱، ماسکو ۱۹۸۳ء.

سترھویں صدی کے مآخذ (برائے خوارزم): (۸) ابوالغازی بہادر خاں: شجرۂ ترک، طبع وفرانسیسی ترجمہ P.I.Desmaisons بعنوان Histoire des Mongols et des Tatares، ایمسٹرڈیم، ۱۹۷۰ء (بار دوم سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۷۱-۱۸۷۴ء؛ (برائے اطراف جیحوں)؛ (۹) محمد بن امیر ولی: بحرالاسرار فی مناقب الاخیار، ۶/۴، انڈیا آفس لائبریری مخطوطہ p-10.575 ورق ۱۲۴ الف، ۱۲۶ ب، ۲۷۷ ب، ۲۸۶ الف، ۲۹۰ب، ۳۴۰ ب، ۳۸۷ ب، ۳۸۹،الف؛ (۱۰) محمد یوسف منشی Mukim Khanskaya Istoriya، طبع وترجمہ A.A.Semenov، تاشقند، ۱۹۶۶ء؛ (۱۱) (برائے کاشغر) شاہ محمد چوراس،

تاریخ: متن و روسی ترجمہ و شرح F. Akimushkin، ماسکو، ۱۹۷۶ء.

اٹھارویں وانیسویں صدی کے مآخذ: (عمومی) (۱۲) E.Schuyler: ترکستان، بارنو نیویارک ۱۹۶۶ء؛ (۱۳) Travels in Central Asia:A.Vambery، نیویارک ۱۹۷۰ء بار دوم، ۱۸۶۵ء؛ (برائے بخارا): (۱۴) مرزا عبدالعظیم سامی: تاریخ سلاطین منغیتیہ، روسی ترجمہ وشرح L.M.Epifanova، ماسکو ۱۹۶۲ء؛ (برائے خوقند)؛ (۱۵) محمد حکیم خاں: منتخب التواریخ؛ طبع A.Mukhtarov ، دو جلدوں میں، دو شنبہ ۱۹۸۳ء۔ ۱۹۸۵ء؛ (۱۶)T.K.Beisembiev: تاریخ شیخ رخی، Kak Istoriceskii Istocnlk، الماتا ۱۹۸۷ء.

(R.D. Mechesney)

••--------------••

(۲) نسلی پس منظر: اوزبک ترکستان یا وسطی ایشیا کے بڑے نسلی گروہوں میں سے ہیں جو بحیرۂ کیپیین سے سنکیانگ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ سوویت روس کی سابقہ ریاستوں ترکمانستان، ازبکستان، تاجکستان، قرغیزیہ، قازقستان، کابل اور افغانستان کے شمالی علاقوں اور عوامی جمہوریہ چین میں پائے جاتے ہیں۔ سابقہ سوویت روس میں کوئی دو کروڑ کے قریب اوزبک تھے۔ افغانستان [رک بآں] میں ان کی تعداد کم سے کم دس لاکھ بتائی جاتی ہے، جبکہ سنکیانگ میں ان کی تعداد چودہ ہزار کے قریب ہے اور ان کے بارے میں باہر کی دنیا کو کچھ معلوم نہیں ہے.

پاکستان، سعودی عرب، ترکی، یورپ اور امریکہ میں کافی تعداد میں ایسے اوزبکی مقیم ہیں، جنہیں روسی وچینی توسیع پسندی اور افغان جہاد کے نتیجے میں سیاسی، معاشی اور سماجی پراگندہ حالی میں اپنے وطن سے نکلنا پڑا۔ وسط ایشیا پر روسی قبضے کے دوران میں اوزبکوں نے وہاں کئی دفعہ بغاوت کی اور اپنے قومی جذبات کے اظہار کے لیے آواز اٹھائی [رک بہ بسماچی]۔ افغنستان میں اگرچہ غالب آبادی کے حامل پشتون روسیوں کا زیادہ نشانہ بنے، البتہ [متاخر دور میں] (۱۹۹۲ء) شمالی افغنستان کے رہنے والے اوزبکی بھی کمیونسٹوں کے خلاف تحریک میں شامل ہوگئے تھے.

بیسویں صدی کے زیادہ تر حصے میں اوزبکوں کے مختلف گروہ جو قومی اعتبار سے مختلف سرحدوں میں منقسم تھے کسی حد تک ایک دوسرے سے لاتعلق رہے۔ مثال کے طور پر اوزبک ابتدا ہی سے عربی رسم الخط استعمال کرتے رہے ہیں، لیکن ۱۹۴۰ء سے سوویت یونین میں موجود اوبگوں کے سیریلی رسم الخط کے استعمال کی بنا پر ان کے دوسرے اوزبگوں سے، جو عربی رسم الخط استعمال کر رہے ہیں، جیسے افغنستان کے اوزبک، یا جو لاتینی رسم الخط استعمال کرتے ہیں، جیسے وہ ترکستانی جو ترکی میں مقیم ہیں، رابطہ مشکل بنا دیا۔ بہرحال حال ہی میں سوویت یونین کے خاتمے اور پاکستان سے شروع ہو کر وسطی ایشیائی راستوں کی طرف جانے والی شاہراہ قراقرم کی تعمیر نے ان کے مابین رابطوں کو بہت آسان بنا دیا ہے.

انیسویں صدی کے اواخر میںاوزبکی [مثلاً بخارا، خیوا، اور خوقند) امارات کا سیاسی و اقتصادی ڈھانچہ متنوع خصوصیات و طبقات کا حامل تھا، جس میں حکمران خاندان، فوج، سول اور مذہبی نوکر شاہی اور مختلف سماجی طبقات کا اثر ورسوخ اہمیت رکھتا تھا۔ گاؤں اور دیہاتوں کا نظام نمبرداروں (اَقسَقل) کے ذریعے چلایا جاتا تھا جو ایک معزز اور تجربہ کار شخص ہوتا اور مقامی جھگڑے نمٹاتا تھا۔ سیاحوں کے وقائع اور مقامی ادبی مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی میں اکثر اوزبکوں نے خانہ بدوشی ترک کر کے مستقل رہائش اختیار کرلی تھی، تاہم ان کی نیم بدویانہ زندگی کی باقیات کا سراغ اب بھی اس امر سے ملتا ہے کہ ان میں سے بعض موسم گرما میں اپنے گھروں کے

صحنوں میں گرمی سے بچنے کے لیے روایتی گول خیمے (Yurts) نصب کر لیتے ہیں جو اوزبگی زراعت سے وابستہ تھے وہ یا تو اپنے کھیتوں کے قریب گاؤں میں مستقل رہائش رکھتے تھے یا آبپاشی کے لیے کھودی گئی نہروں کے ساتھ ساتھ اپنے گھر بنا لیتے تھے۔ دیہات اور قصبات میں اب بھی بعض لوگ کچی اینٹوں سے گھر بناتے ہیں جن کی چھتیں ہموار ہوتی ہیں یا گنبد نما۔

زراعت پیشہ اوزبگ چاول، کپاس، گندم، جو، سرغو، الفالفا اور مختلف اقسام کی سبزیاں اور پھل (خصوصا تربوز) اگاتے ہیں اور بھیڑ بکریاں، گائے اور گھوڑے پالتے ہیں۔ ریشم کے کیڑے پالنے کے لیے شہتوت کے درخت بھی اگائے جاتے ہیں۔ روایتی تجارتی سرگرمیوں میں صابن سازی، کپڑا بافی، ظروف سازی، چاول چھڑنا، چمڑے کی مصنوعات اور نمدہ سازی وغیرہ شامل ہیں۔ جپسم کے ظروف اور لکڑی کی بنی ہوئی اشیا پر آرائشی کندہ کاری بھی اوزبگوں کے خصوصی ہنر ہیں۔ اوزبگی خواتین کشیدہ کاری اور قالین بافی کی ماہر ہوتی ہیں اور ریشمی کپڑے کو ہلکے رنگوں میں رنگ کر ان سے فرغل اور دیگر لباس تیار کرنے میں انہیں خصوصی مہارت حاصل ہوتی ہے۔

مردوں اور عورتوں کی سرگرمیاں الگ الگ دائروں میں منقسم ہیں۔ عورتیں عام طور پر کھانا پکانے، صفائی، سلائی اور گھروں کے اندر جانوروں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی ہیں، جبکہ مرد تجارت وزراعت وغیرہ کے سلسلے میں باہر کے کام نمٹاتے ہیں۔ اس تقسیم کار پر افغانستان کے شمالی علاقوں میں سختی سے عمل ہوتا ہے اور لڑکیاں جوان ہوتے ہی پردے کی پابندی شروع کر دیتی ہیں۔ اس کے برعکس روس کے زیر اثر وسط ایشیائی ریاستوں میں عورتیں گھروں سے باہر دفتروں، کارخانوں اور زرعی فارموں پر بھی کام کرتی ہیں۔

تاریخی لحاظ سے اس علاقے کی زمینوں کی کاشت کا طریقہ خصوصاً آمو دریا [رک بآں] کے شمالی علاقے میں مالگزاری رہا ہے۔ بخارا [رک بآں] کی ریاست مالگزاری کے لحاظ سے کئی صوبوں میں منقسم تھی اور امیر کے مقرر کردہ بیگ مالیہ جمع کرتے تھے۔ یہ بیگ انتظامی مصارف منہا کرنے کے بعد باقی رقم امیر کو بھجوا دیتے تھے۔ اس علاقے پر روسی قبضے کے بعد عام لوگوں کے حالات میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی، سوائے فرغانہ کے، جہاں حکومت نے کپاس کے علاوہ ہر قسم کی کاشت کی ممانعت کر دی اور روایتی نوکر شاہی کا خاتمہ کر دیا۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائیوں میں ترکستان میں زراعت کا اجتماعی نظام نافذ کر دیا گیا، لیکن اس کے باوجود بعض اوزبگ نجی طور پر کاشتکاری کرتے رہے۔ اس وقت وسط ایشیائی ریاستوں کے دیہی علاقوں میں اندازاً ۳۳ سے ۵۰ فیصد تک لوگ نجی طور پر کاشتکاری کرتے ہیں۔ شمالی افغانستان میں مالگزاری نظام نجی ملکیت میں بدل گیا ہے، جہاں کسانوں کو زمین بیچنے کی بھی آزادی ہے اور وراثت کے اصول بھی نافذ ہیں۔ اکثر کاشتکار ۵ سے ۱۰ ایکڑ تک زمین رکھتے ہیں۔

اجتماعی گروہ بندی کے لیے دوسری اصطلاحات کے ساتھ قوم کا لفظ زیادہ مروج ہے جو بنیادی طور پر ایک ہی جد کی نسل کے مختلف گروہوں کا مجموعہ متصور ہوتا ہے۔ اگرچہ سسرالی رشتہ داری، برادری سے باہر رشتہ داری، سماجی تعلقات اور رہائشی قربت بھی قوم کا جزو بنتی جارہی ہے۔ دیہات اور قصبات میں قریب قریب رہنے والے وہ لوگ جن کی الگ مسجد ہو، آپس میں قریبی سماجی تعلقات ہوں یا وہ معاشی مفادات میں بندھے ہوئے ہوں، اب ایک قوم سمجھے جاتے ہیں۔ ایک گاؤں میں ایک سے زیادہ قوموں کا تصور بھی موجود ہے۔ شہروں میں کسی

خاص ہنر یا پیشے سے وابستہ لوگ بھی ایک قوم سمجھے جاتے ہیں۔ باہمی تعلقات میں بعض دیگر اصطلاحات بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں، مثلاً بڑے بھائی کے لیے آقا اور بڑی بہن کے لیے آپا کے الفاظ مستعمل ہیں.

شادی بیاہ کے سلسلے میں اوزبگوں میں خاندان کے اندر شادی کو ترجیح دی جاتی ہے اور خاندان سے باہر کی شادی کو پسند نہیں کیا جاتا۔ ایک سے زیادہ شادیاں شاذ و نادر ہوتی ہیں۔ اولاد کی شادیاں والدین کرتے ہیں، تاہم دلہا اور دلہن کی رائے بھی لی جاتی ہے، دولہا کی طرف سے دلہن کو نقد رقم کی ادائیگی (مہر) دونوں خاندانوں کے مابین ہونے والے مذاکرات کا حصہ ہوتی ہے۔ جس میں سے کچھ حصہ دلہن کے جہیز کے لیے اشیا کی خریداری پر بھی صرف ہوتا ہے۔ طلاق کے لیے اسلامی اور ملکی قوانین پر عمل ہوتا ہے، لیکن معاشرتی دباؤ کی وجہ سے اس کی نوبت کم ہی آتی ہے.

اوزبگوں میں خاندان کے ساتھ مل جل کر رہنا ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ والدین کے ساتھ ان کی غیر شادی شدہ اولاد کے علاوہ شادی شدہ بیٹے، بہوئیں اور پوتیاں سب مل کر ایک ہی گھر میں رہتے ہیں، تاہم بعض جوڑے والدین کے ساتھ رہنے کی بجائے الگ گھر بھی بسا لیتے ہیں.

اوزبگی عموماً بڑے خاندان کو پسند کرتے ہیں۔ شمالی افغانستان میں نومولود کو پیدائش کے چالیس دن کے بعد، لکڑی کے جھولے میں رکھا جاتا ہے یا کپڑے کی بُقچی میں جسے خواتین کمر کے ساتھ یا چارپائی وغیرہ کے ساتھ باندھ دیتی ہیں۔ لڑکوں کے ختنے سب اوزبگی اس وقت کرواتے ہیں جب بچے کی عمر دو سے چار سال تک ہو۔ سب بچوں کو روایتی طور پر قرآن حکیم کی تعلیم دلوائی جاتی ہے، تاہم اب خصوصاً لڑکوں کے لیے پرائمری سے یونیورسٹی تک کی تعلیم کا رواج بھی عام ہو چکا ہے.

اٹھارویں سے بیسویں صدی تک جن خاندانوں یا قبائل کو وسطی ایشیا کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں اقتدار حاصل تھا، ان میں بخارا [رک بآں] میں منکیت [رک بآں]، خوارزم [رک بآں] میں (جسے بعد میں خیوہ رک بآں کہا جانے لگا)، قنگرات [رک بآں] اور خوقند میں مینگ قابل ذکر ہیں۔ بعض اوزبگی اب بھی ان قدیم قبائلی خطابات کو اپنے ذاتی نام کا ایک حصہ بنا لیتے ہیں۔ اہم قبیلوں میں قنگرات، منکیت، قپچاق، قنگلی، نعمان، خطائی، دُرمن، چغتائی، مینگ، کینیلس اور لاکائی قابل ذکر ہیں۔ جو اوزبگ خاندانی نسبت نہ رکھتے ہوں وہ اپنے ضلع یا شہر کو بطور شناخت اپنے نام کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ جنس، عمر، لسانی مہارت اور تقویٰ کسی شخص کے معاشرے میں مقام کے تعین میں اہم کردار ادا کرتے ہیں.

اوزبگ سنی مسلمان ہیں اور حنفی فقہ [رک بآں] پر عمل کرتے ہیں۔ تصوف کا نقشبندیہ [رک بآں] سلسلہ وہاں مضبوط سماجی اور سیاسی اثرات رکھتا ہے۔ عامۃ الناس نظربد موکلات، جنوں [رکّ بہ جن] اور پریوں [رکّ بہ پری] پر یقین رکھتے ہیں اور ان کے دفعیے کے لیے تعویذ اور لکھی ہوئی قرآنی آیات اپنے پاس رکھتے ہیں۔ یہ لوگ امراض کو "گرم" اور "سرد" میں تقسیم کرتے ہیں اور علاج بالضد کے اصول پر غذاؤں سے ان کا علاج کرتے ہیں۔ علمائے دین اور مذہبی اساتذہ کو معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ بخارا اس علاقے کا سب سے بڑا مذہبی تعلیمی اور ثقافتی مرکز رہا ہے۔ دفع جنات وغیرہ کا کام جو عامل کرتے تھے انہیں بخشی، پری خواں یا دعا خواں کہا جاتا تھا اور وہ عام طور پر دین کے عالم ہوتے۔ چڑیل کا تصور بھی یہاں کے دیہاتیوں میں پایا جاتا ہے.

مذہبی تہواروں اور اوقات (جیسے رمضان) کے علاوہ ایک موسمی اور غیر مذہبی تہوار سال نو کے نام سے ہر

سال موسم بہار کے آغاز میں منایا جاتا ہے، جس میں پڈنگ کی طرز کا ایک میٹھا پکوان، جسے سومولک کہا جاتا ہے، اعزۂ واحباب کے گھروں میں بھیجا جاتا ہے۔ اوزبگ اچھے کھانوں کے شوقین ہیں اور ان کے گھروں میں کئی انواع کے کھانے پکتے ہیں۔ اوزبگوں کے آلات موسیقی میں مقامی طور پر تیارکردہ ''دوتار'' اور ''دائرہ'' (ایک طرح کی دھن) زیادہ معروف ہیں اور خوشی کے انفرادی واجتماعی مواقع پر عام بجائے جاتے ہیں۔ شادیوں اور ختنے کے مواقع پر مرد ''یولق'' نامی کھیل کھیلتے ہیں جس میں گھوڑوں پر سوار ہوکر مردہ گائے کی ہڈی سے گول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے.

مآخذ: (۱) E.Schuyler: *Turkistan Notes of a Journey in Russian Turkistan, Khokhand, Bukhara and Kuldja*، دو مجلدات لنڈن، ۱۸۷۶ء؛ (۲) A.N. Sjoberg B.Chagatay: *Notes on the Uzbek Culture of Central Asia*، در *Texas Journal of Science*، ۱/۷ (۱۹۵۵): ۷۲-۱۱۲؛ (۳) E.Bacon: *Central Asians Under Russian Rule* اتھاکا، ۱۹۶۶؛ (۴) E. A llworth: *Central Asia-a Century of Russian rule*، نیویارک ۱۹۶۷ء؛ (۵) I.M. Djabbarov: *Crafts of the Uzbeks of Southern Khorezm in the late Nineteenth and early Twentieth Centuries*، در *Soviet Anthropology and Archealogy* (۱۹۷۳-۱۹۷۵ء)؛ (۶) G.P. Snesarev: *Remnants of Pre-Islamic Beliefs and Rituals among the Khorezm Uzbeks* در *Soviet Anthropology and Archealogy* (۱۹۷۰-۱۹۷۴ء)؛ (۷) E. Naby: *The Uzbeks in Afghanistan*، در *Central Asian* Survey، ۱/۳ (۱۹۸۴ء) : ۱-۲۱.

(Audrey C.Shalinsky، [ت: محمد امین])

••------------••

※ اوزبگ بن محمد پہلوان: مظفرالدین (دور حکومت ۶۰۷ھ-۶۲۲ھ/۱۲۱۰ء-۱۲۲۵ء)، ایلدگزِد (یا ایلدگزِد) خاندان (دیکھیے ایلدزی) کا پانچواں اور آخری اتابک۔ یہ خاندان سلجوقی دور کے اواخر اور خوارزم شاہی عہد کے دوران میں آذربائیجان میں برسر اقتدار رہا۔ اوزبگ نے ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء میں قتل ہونے والے آخری عظیم سلجوق سلطان طغرل سوم (م ۵۹۰ھ/ ۱۱۹۴ء) [رک بآں] کی بیوہ ''ملکہ خاتون'' سے نکاح کیا.

اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں وہ اپنے بھائی نصرت الدین ابوبکر کے نائب کی حیثیت سے ہمدان کا والی رہا۔ اس وقت سلجوق عہد حکومت کے بعد آذربائیجان کے بیشتر حصے اور عراق عجم طوائف الملوکی کی نذر ہو رہے تھے۔ اُس کی آزادی عمل کو طاقت ور ترک امراء اُس کے برائے نام نمائندہ محافظ مثلاً ای۔ابا، ای طیغمش نے کافی حد تک ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء تک محدود کیے رکھا، تاوقتیکہ وہ تبریز میں ابوبکر کے جانشین کی حیثیت سے اتابک اور اپنے خاندان کا سربراہ (مقرر) ہوا.

سرکش اہل جارجیا (دیکھیے الکرج) کی طرف سے عسکری دباؤ کے تحت اُسے علاؤالدین خوارزم شاہ کے ساتھ ایک معاہدہ کرنا پڑا جس کی رُو سے خطبہ اور سکہ میں اُس کی بادشاہت کو تسلیم کرتے ہوے، اس کے اطاعت گزار کی حیثیت سے آذربائیجان اور ارّان پر اُس کی حکمرانی کی توثیق ہوئی۔ ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں منگول پہلی بار تبریز پر حملہ آور ہوے اور اُن کے تیسرے حملے پر اوزبگ اپنے پایۂ تخت کو چھوڑ کر نخچوان [رک بآں] منتقل ہوگیا اور خزاں ۶۱۹ھ/۱۲۲۲ء میں وہاں پھر واپس آگیا۔ ۶۲۱ھ/۱۲۲۴ء میں منگول دستوں کی ایک تازہ لہر نے خوارزم شاہ کو رے کے مقام پر شکست دی اور پھر فارس میں داخل ہوئی۔ انہوں نے اوزبگ کو تبریز میں پناہ لینے والے خوارزمیوں کی حوالگی پر مجبور کرنے کی خاطر اس

کے علاقے کی پیش قدمی کی۔ رجب ۶۲۲ھ/جون ۱۲۲۵ء میں جلال الدین خوارزم شاہ [رک باں] نے ایلدگزی پایۂ تخت پر قبضہ کرلیا، جبکہ اوزبگ کو گنجا [رک باں] کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ شاہ نے اُسے مجبور کیا کہ وہ اپنی زوجہ ملکہ خاتون کو طلاق دیدے، جس کے ساتھ اُس نے خود نکاح کرلیا۔ اسی اثنا میں ''الملک الاشرف ایوبی نے مداخلت کی اور اس خاتون اور اس کے بھائی کو چھڑا کر اپنے ہمراہ خلاط لے گیا۔ اب گنجہ بھی اوزبگ کے ہاتھ سے نکل گیا اور النجہ کے قلعے میں کسمپرسی کی حالت میں اُس کا انتقال ہوا (۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء)۔ اس طرح اس کے خاندان کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا.

وقائع نگاروں نے اوزبگ پر اُس کی آرام طلبی اور پُر تعیش طرز معاشرت کی بنا پر تندوتیز تنقید کی ہے لیکن اس کے دفاع میں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اہل جارجیا، خوارزم شاہیوں اور منگولوں جیسے زبردست دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ اس کا دربار علوم وفنون کے مرکز کی حیثیت سے شہرت رکھتا تھا اور اُس کا وزیر ربیب الدولہ شعراء کا قدر دان اور مربّی تھا.

مآخذ: بنیادی: (۱) راوندی: راحۃ الصدور؛ (۲) حُسینی: اخبار الدولۃ السلجوقیہ؛ (۳) ابن الاثیر: الکامل؛ (۴) نسوی :سیرۃ السلطان جلال الدین؛ (۵) مستوفی: تاریخ گزیدہ.

ثانوی: (۶) C. Defremery: *Recherches sur quatre princes d' Hamdan*، در *JA*، شمارہ ۹ (۱۸۴۷ء)، ص۱۴۸ـ۱۸۶؛ (۷) Bosworth، در *Cambridge History of Iran*، ۵: ۱۸۳ـ۱۸۴؛ (۸)Boyle: کتاب، مذکور ۳۲۵ـ۳۲۷؛(۹) Minorsky: مقالہ "Uzbek b. Muhammad ,Pahlawan"، در *EI*، باراول جس کا ملخص زیر نظر مقالہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے.

(C.E. Bosworth [ت: ظفر علی])

••------------••

※ اوزکند: اس کا ذکر مآخذ میں بعض اوقات یوزکند یا اُوزجند کے نام سے بھی آتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں ایشیا کی مسلم ریاست فرغانہ [رک باں] کا ایک قصبہ۔ یہ فرغانہ کی وادی کے مشرقی سرے پر واقع ہونے کی بنا پر کافر ترکوں کے ملک کے قریب سمجھا جاتا تھا.

قبل ازیں تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے وسط میں اُوزکند پر ایک مقامی فرد ترکی لقب والا خورتگین (چورتگین) نامی شخص حکمرانی کرتا تھا (ابن خورداذبہ، ص۳۰)۔ اگلی صدی (یعنی سامانی عہد) کے جغرافیہ دان اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ سہ گانہ خصوصیات کا حامل، مخصوص طرز کا ایک مشرقی اسلامی قصبہ ہے۔ اس کے اندرونی حصے میں ایک قلعہ ہے اور ایک مضافاتی بستی بھی۔ یہاں سے سمرسے (Semirecye) اور ترک علاقوں کی طرف راستہ ہے (۱) (ابن حوقل، طبع Kramers، ص۵۱۳ـ۵۱۴، ترجمہ Wiet، ص ۴۹۱ـ۴۹۲؛ المقدسی، ص۲۷۲؛ حدود العالم، ترجمہ ص ۱۱۶، شرح ص ۲۵۵؛ یاقوت، بیروت ایڈیشن، ۱، ۲۸۰؛ (۴) Le Strange:*Lands* ص۴۷۶).

قراخانیوں [رکّ بہ ایلک خان] کے عہد میں پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایلک نصر بن علی نے فرغانہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور بعد میں یہ مشرقی حصے کے نیم وفاق کا دارالحکومت بھی بنا اور یہاں ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء سے یوسف قدیر خاں بن ہارون بغراخاں نے سکے ڈھلوانے کا کام شروع کیا۔ محمود کاشغری نے اُوزکند کا ذکر کرتے ہوے اسے فرغانہ کا ایک بڑا قصبہ قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ ترکی زبان میں اس کے معنی بَلَدُ اَنفُسِنا یعنی ''ہماری اپنی جانوں کا شہر'' یا ''ہمارا اپنا خاص شہر'' ہے (دیوان لغات الترک، ترجمہ Atalay، ج ۱، ۳۴۳؛ R. Dankoff، J. Kelly: *Compendium of the*

Turkic dialects، کیمبرج وساچوٹس ۱۹۸۲ء۔۱۹۸۴ء ا، ۲۷)۔ یہ چنگیز خان کے حملوں تک قراخانیوں کا پایۂ تخت رہا اور یہاں ٦۱۰ھ/۱۲۱۳ء تک سکوں کی تیاری کا کام ہوتا رہا (E.von Zambaur: Die Munzpragumgen des Islam، ا ، ویز بیڈن ۱۹٦۸ء، : ۵۸)۔ لیکن منگولوں کے عہد کے بعد یہ روبہ زوال ہوا، کیونکہ فرغانہ کے منگول حکمرانوں نے اس کی بجائے اندجان کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ اس وقت اُوزکند، تاجکستان کے ضلع اندجان کا ایک گاؤں ہے (Barthold: A Short History of Turkestan in four Studies on the History of Central Asia، لائیڈن ۱۹٦۲ء ،ا: ۲۳،۴۸).

مآخذ: متن میں مذکور مآخذ کے علاوہ دیکھیے Barthold: Turkestan، ص ۱۵٦۔۱۵۷، ۲٦۰،۲۸۵۔ ۲۸٦،۳۵۳،۳٦۳.

(C.E. Bosworth)[ت: ظفر علی]

••..............••

※ اوزو [رکّ بہ انا طولی]

••..............••

※ اوزی، اوزو: (باہم) متعلق تین مختلف اعیان کے لیے ترکی زبان میں مستعمل نام: دریائے دنیپر، اُچکوف کا ساحلی قلعہ (یہ دونوں ریاست یوکرائن میں واقع ہیں) اور عثمانی عہد کا صوبہ، جو اوزی یا سلستر کے نام سے موسوم ہے (یہ سارے کا سارا ساحلی علاقہ ہے، جسے مشرقی سمت سے دریائے زیریں اوزی / دنپر جنوب مغرب کی طرف سے دریائے زیریں ڈینیوب گھیرے ہوئے ہیں اور مؤخرالذکر دریا پر قریبی بندرگاہ کا شہر سلستر واقع ہے۔ اس صوبے کا بیلربے (Beylerbeyi شاہی حاکم) اقرمان یا سلستر میں مقیم ہوا کرتا تھا، نہ کہ اوزی/ اُچکوف میں، جو اکثر سنجق (قسمت) کے حاکم کا مستقر رہا ہے۔

اس دریا اور قلعے ہر دو نے بحیرۂ اسود کے علاقے میں دو ترک (نژاد) مسلمان قوتوں کریمیائی تاتاریوں اور عثمانیوں کی تاریخ میں ایک اہم، مگر کسی حد تک پیچیدہ کردار ادا کیا ہے۔ اس دریا کی زیریں گزرگاہ پہلے مغرب کی جانب سے لتھونیا اور پولینڈ کے مابین اور مشرق میں تاتاریوں کے مابین ایک خط منقسمہ کی حیثیت رکھتی تھی اور دور مابعد میں اسی طرح سلستر (اوزی) کے صوبے اور خوانین کی سلطنت کے مابین یہ حد فاصل رہی۔ یہ خطہ مملکت عثمانی سلطنت کی حدود کے اندر واقع اور اس کی اطاعت گزار تھا۔ دریاے دنپر کا مشرق کی طرف سے بحیرۂ اسود میں ایک طویل وعریض دہانہ ہے جس میں شمال کی طرف سے دریاے بگ (Bug) بھی آگرتا ہے۔ یہ دہانہ روسی زبان میں "Liman" کہلاتا ہے (امکاناً یہ لفظ عثمانی عہد کی ترکی زبان سے ماخوذ ہے) اور خشکی کے بڑے ٹکڑے کو جزیرہ نما کریمیا سے جدا کرتا ہے جو ایک طرف کو باہر نکلی ہوئی پہاڑی کی شکل میں اختتام پذیر ہوتا ہے اور جسے کن برن سکیا کوسہ(Kinburnskaya Kosa) کہا جاتا ہے ("Kinburn spur" کے لغوی معنی "بڑی درانتی" کے ہیں، جو عثمانی ترکی نام Kilburun "چھدرے بالوں والی راس" کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے) اور یہ اُچکوف سے جنوب میں دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ دریاے بگ (Bug) کے دہانے کے مغربی کنارے پر لتھونیا کے شاہ وائی ٹاؤٹس (Vytautas) نے تقریباً ۱۴۰۰ء میں دشیو (Dashiv)کے نام کا قلعہ تعمیر کرایا، جس کا نام، ۱۴۹۲ء میں، کریمیا کے خان منگلی جرائے (Mengli Giray) کے فتح کرنے کے بعد، جانکرمان پڑگیا۔ ۱۵۳۸ء میں یہ قلعہ براہ راست عثمانی قلمرو میں شامل کرلیا گیا۔ روس کی بری اور بحری افواج کے ہاتھوں اپنے آخری سقوط تک، دو سو پچاس سال کے عرصے میں،

اوزی (عثمانی جانکرمان کو اسی نام سے موسوم کرتے تھے) کا کردار ایک طرف تو ترکوں اور تاتاریوں اور دوسری طرف لتھوینیا اور اہل پولینڈ کے لوگوں قازقوں (Cossacks) اور روسیوں کے مابین طویل کشمکش میں جنگی نقطۂ نظر سے بڑا اہم رہا۔ اس کشمکش میں کریمیا اور ڈینیوبی صوبہ جات پر قصبہ کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر بحیرۂ اسود پر مکمل تسلط حاصل کرنے میں مسابقت کا جذبہ کار فرما تھا۔ اگرچہ اوزی کو قازقوں کے حملے اور بحیرۂ اسود پر ان کی ترک وتاز روکنے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا (جنھوں نے دریاے دنپر پر مزید آگے کی طرف اُس کے بہاؤ کے رخ اپنا مشہور فوجی اڈہ سس Sic تعمیر کرلیا تھا......) تاہم اس سے عثمانیوں کو اس سرحدی محاذ پر اپنی موجودگی برقرار رکھنے اور فیصلہ کن روسی حملے کی کامیابی کو مؤخر کرتے رہنے میں مدد ملی۔ اٹھارھویں صدی عیسوی (۱۷۳۶ء۔۱۷۳۹ء اور ۱۷۸۷ء۔ ۱۷۹۲ء) میں روسیوں نے روس اور ترکی کے مابین ہونے والی دو جنگوں میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ ان دونوں جنگوں میں وہ اوزی پر قابض ہوتے رہے (جولائی ۱۷۳۶ء، لیکن بلغراد کے معاہدہ امن ۱۷۳۹ء کے تحت اسے ترکی کو واپس کردیا گیا۔ اسی طرح دسمبر ۱۷۸۸ء میں اس پر روسیوں نے قبضہ کیا اور ۱۷۹۲ء کے جسای Jassay کے معاہدہ امن کی رُو سے اسے ترکی کے حوالے کر دیا گیا)۔

یہ آخری مرحلہ، منجملہ دوسری باتوں کے عثمانی اور روسی بحری بیڑوں کے درمیان معرکہ آرائیوں کے ایک سلسلے کے ضمن میں بھی قابل ذکر ہے۔ ان معرکہ آرائیوں کے دوران میں عثمانی بحریہ کا سربراہ لائق، مگر نامناسب طور پر امداد مہیا کیے جانے والا کپتان غازی حسن پاشا تھا، جبکہ روسی بحریہ کی قیادت دو کمانڈروں جان پال جونز (John Paul Jones)، (جوکہ امریکی انقلاب کا ایک ہیرو تھا)، اور جرمن شہزادے چارلس آف نسوسی گن (Charles of Nassau-Siegen) کے ہاتھ میں تھی، جو مبینہ طور پر باہمی رقابت کا شکار تھے۔

یہ امر دل چسپی کا باعث ہے کہ اوزی کا سابقہ نام جانکرمان ہے (اور اس جیسی اس کی ایک اور صورت اولیا چلپی نے دیہہ کرمان بیان کی ہے)۔ اسی طرح اچکوف بھی تھا۔ جان کرمان کے نام کا اصل ماخذ نامعلوم ہے، لیکن یہ واضح طور پر دو لفظوں "جان" (ممکنہ طور پر فارسی لفظ برائے "روح" (یا) بعض اوقات "عزیز شے") اور "کرمان" (فارسی لفظ برائے "قلعہ") پر مشتمل ہے؛ یہ آخری لفظ یوکرائن میں متعدد مقامات کے لیے مستعمل ہے (مثلاً اقرمان، (سلافی بلغراڈ)، لیکن اور کہیں بھی نہیں (ماسوائے ایرانی شہروں کرمان اور کرمان شاہ کے)۔ اغلباً اس کا مآخذ سیتھین (Seythian) یا ایرانی ہے ایک قابل ذکر معاملہ علاقے کے نام کا ثبات وبقا ہے، اگرچہ اس مقام کا نام دریا کے نام پر اوزی قلعسی (Ozi Kalesi) پڑگیا (لیکن بعض مواقع پر اسے اوزن قلعہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے)، (تاہم) حصہ بالاحصار (Citadel part) کو اچی قلعہ کا نام دے دیا گیا ،جو اُس وقت سے روسی اور یوکرائنی زبانوں میں (اُچکوف اور اُچکف کے طور پر) سارے کے سارے قلعے کے لیے مستعمل ہوگیا۔

مآخذ:(۱) اولیا چلپی: سیاحت نامہ (ترکی) ص۱۷۳۔ ۲۱۳ (خصوصاً ص ۱۷۹۔۱۸۵، جہاں عثمانی اوزی /اُچکوف کے بارے میں پوری تفصیل دی گئی ہے)؛ (۲) I. H. Uzuncarsiu: *Osmanli tarihi*، ج ۳، ۴، مواضع کثیرہ، نیز بامداد اشاریہ؛ (۳) S.J.Shaw: *History of the Ottoman Empire and Modern Turkey*، کیمبرج ۱۹۷۶ء: ا: ۱۹۱، ۱۹۸، ۲۶۰، ۲۸۷؛ (۴) وہی مصنف: *Between old and new the Ottoman Empire*

under Sultan Selim III 1789.1807، کیمبرج میاچوئس، ۱۹۷۱ء؛ (۵) ukrains koy RSR Istoreya Mist i sil: History of the cities (S.S.R) 1، and towns of Ukrainian koy RSR ، ۱۵ (کیو ۱۹۷۱ء) : ۶۱۴-۶۳۱ (بذیل) اچکوف؛ (۶) Suleyman Nutki: Musawwer Muharebat bahriyyei Othmaniyye، استانبول ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء، ص۸۵-۸۸؛ (۷) R.C.Anderson: Naval Wars in the Levant، لیورپول ۱۹۵۲ء، ص۳۱۸-۳۴۷؛ (۸) S.E. Morison: John Paul Jones، بوسٹن ۱۹۸۵ء، ص ۳۴۸-۳۶۱؛ (۹) G. Veinstein: L 'occupation ottomane d' Ocakov et le probleme de la frontiere Lituano-tatare, 1538-1544، در Passe turco-tatar, Present Sovietique Etudes offertes a Alexandre Bennigsen، پیرس ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۳-۱۵۵.

(S. Soucek، [ت: ظفر علی])

••--------------••

※ اوسیشین: فارسی بولنے والے لوگ جو شمالی قفقاز کے وسطی علاقے، خصوصاً شمالی اوسیشیا اور جارجیا کے جنوبی پہاڑی علاقے میں رہتے ہیں۔ ۱۹۸۹ء کی مردم شماری کے مطابق سابق سوویت یونین میں ۵,۹۸,۰۰۰ اوسیشین باشندے تھے، جن میں سے ساڑھے ۳۳۵,۰۰۰ شمالی اوسیشیا میں تھے، اور ۱۶۴,۰۰۰ جارجیا میں ۔ جارجیا میں رہنے والے ۶۴ ہزار شمالی اوسیتیا کے رہنے والے تھے.

مذہبی لحاظ سے اوسیشین باشندے ایرون اور تولگ نسل سے تعلق رکھنے والے عیسائی ہیں اور سنی مسلمان ہیں۔ ایرون مشرقی ڈگور اسیشین باشندے، مثلاً شمالی اوسیشیا کے مشرق میں رہتے ہیں، جبکہ تولگ جارجیا میں رہتے ہیں، جب کہ ڈگور بنیادی طور پر شمالی اوسیشیا کے شمال مشرقی حصے میں واقع پہاڑوں ،وادیوں ، مشرقی کبرڈا اور ولادی قفقاز کے شہری علاقوں میں رہائش پذیر ہیں.

اوسیشین میں مسلمان ایک چھوٹی اقلیت ہیں اور ان کی آبادی کل آبادی کا ۲۰ سے ۳۰ فیصد ہے۔ ڈگور مسلمانوں کے آباء واجداد نے سولھویں تا انیسویں صدی کے عرصے میں ہمسایہ مسلم کبرڈا کے زیر اثر اسلام قبول کیا، تاہم مسلمان اور عیسائی دونوں اقلیت میں ہیں اور شمالی قفقاز کے قبائل کے قدیم مشرکانہ اور مظاہر پرستانہ اثرات اس علاقے کے لوگوں پر غالب ہیں اور مسلم وعیسائی اثرات کے ساتھ ساتھ کافرانہ رسوم ورواج بھی ان میں ابھی تک مروج ہیں۔ مثال کے طور پر سوویت یونین دور میں کثرت ازدواج کا رواج مسلمانوں اور عیسائیوں میں عام رہا اور اسی طرح ان دونوں مذاہب کے لوگ عموماً اپنے قابلِ احترام عقائد پر بھی عمل پیرا رہے۔ قدیم خانہ بدوشانہ زندگی کے اثرات بھی ابھی تک ان میں موجود ہیں۔ اس طرح مذہبی تفریق کے برخلاف ان لوگوں میں ایک مشترک اور ملا جلا کلچر وجود میں آگیا ہے.

اوسیشین لوگوں کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ان قدیم سیتھی اور سرمتی قبیلوں کی نسل سے ہیں، جو بحیرۂ اسود کی شمالی ڈھلوانوں پر آباد تھے۔ چوتھی صدی عیسوی میں ان قبائل کے اخلاف کو طاقتور ہن اور منگول وغیرہ طاقت ور قبائل نے جنوب کی طرف دھکیل دیا۔ یہ لوگ، جو اللان کہلاتے تھے، انہوں نے گو اپنا خانہ بدوشانہ طرز زندگی بالکل تو نہیں بدلا، تاہم ایک ڈھیلی ڈھالی ریاست ضرور قائم کرلی جو اللانیہ کہلاتی تھی اور قفقاز میں دریائے کوبن اور دیرئیل گورج کے درمیانی علاقے کی وادیوں اور دامن کوہ پر مشتمل تھی۔ اللانیہ نے بزنطینی ریاست سے گہرے تعلقات قائم کرلیے اور اس کے نتیجے میں دسویں صدی عیسوی تک عیسائیت اللانیہ کا سرکاری مذہب بن چکی تھی۔

تیرھویں صدی عیسوی میں منگولوں کے حملے نے الالانیوں کو تتر بتر کر دیا۔ ان میں سے بعض تو موجودہ ہنگری اور مغربی یورپ کی طرف نکل گئے اور بعض ہن قبائل کے پیچھے چل کر چین جاپہنچے۔ جو لوگ قفقاز میں رہ گئے وہ پہاڑوں کے اندر وادیوں اور جنوبی ڈھلوانوں میں جا بسے اور خانہ بدوشانہ طرز زندگی ترک کرکے مویشی پالنے اور کھیتی باڑی کرنے لگے۔ قفقاز کے مقامی لوگوں سے شادی بیاہ کرنے اور ان کی معاشرت میں مدغم ہوجانے کے نتیجے میں، وہ اگلی تین صدیوں میں منفرد نسلی حیثیت اختیار کر گئے اور آج کل اوسیشین کہلاتے ہیں.

اوسیشین زبان جو سیتھانی بھی کہلاتی ہے اور فارسی کی شمال مشرقی فرع سمجھی جاتی ہے، ابھی تک ایک زندہ زبان ہے۔اس کے دو بڑے لہجے ہیں: ایک مشرقی یا ایرونی اور دوسرے مغربی یا ڈگوری۔ ڈگوری لہجے پر قفقاز کی پرانی کبرڈائی زبان کے بھی اثرات پائے جاتے ہیں اور بہت سے ایسے پرانے الفاظ اس میں موجود ہیں جو ایرونی لہجے میں موجود نہیں۔ اس کے مقابلے میں ایرونی پر روسی زبان اور توگی پر جارجین زبان کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں ڈگوری عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگی، جب کہ ایرونی روسی رسم الخط میں اور توگی جارجین رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں کمیونسٹوں نے اوسیشین زبان کے سارے لہجوں کے لیے لاطینی رسم الخط کو اپنانا لازمی قرار دے دیا۔ ۱۹۳۹ء میں عربی رسم الخط والے مسلمانوں کے ڈگوری لہجے پر سختی سے پابندی لگادی گئی اور حکم دیا گیا کہ یہ ایرونی کی طرح روسی رسم الخط میں لکھی جائے.

۱۹۴۴ء میں ڈگوری مسلمانوں کو شمالی قفقاز کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ وسط ایشیا میں جلاوطن کردیا گیا اور پچاس کی دہائی کے آخر میں انہیں وطن واپس لوٹنے کی اجازت ملی تو بچے کھچے باشندے اپنی روایتی سرزمین یعنی وادی ڈگور اور کبرڈا سے ملحق شمال مغربی اوسیشیا کے دامن کوہ میں واپس آکر آباد ہوگئے۔ اس وقت ان کا پیشہ زیادہ تر مویشی پالنا اور کھیتی باڑی کرنا ہے جبکہ کچھ لوگ قلعی کی مقامی کانوں میں بھی کام کرتے ہیں۔ وادی ڈگور میں بڑے بڑے شہر نہیں ہیں اور بود وباش دیہاتی ہے، جبکہ اوسیشیا کی عیسائی آبادی شہری علاقوں میں رہائش پذیر ہے اور شہری سہولتوں سے متمتع ہوتی ہے.

مآخذ: (۱) R. Wixman: *Language Aspects of Ethnic Patterns and Processes in the North Caucasus*، شکاگو یونیورسٹی، شعبہ جغرافیہ، عدد ۱۹۱، ۱۹۸۰ء؛ (۲) وہی مصنف: *The Peoples of the USSR: An Ethnographic hand book*، نیویارک ۱۹۸۸ء؛ (۳) S.A. Shuiskii: *Ossetians*، در *Muslim Peoples: a World Ethnographic Survey*، ج ۲، طبع R.V.Weekes، بار دوم ویسٹ پورٹ ۱۹۸۴ء؛ (۴) *Osetini*، در *Narodi Kavkaza*، ۲، ماسکو ۱۹۵٦ء؛ (۵) T.Trilati: *Literature on ossetia and the Ossetians*، در *Caucasian Review*، عدد ٦، ۱۹۵۸ء؛ (٦) مزید دیکھیے: J.L.Wieczynski: *The Modern Encyclopaedio of Russian and Soviet History*، J.L. wieczynski، در ۱٦، Gulf Breeze, Fla، ۱۹۸۲ء؛ (۷) *Atlas Cevero -Osetinskaya ASSR*، ماسکو ۱۹٦۷ء.

(Nancy E. Leeper، [ت: محمد امین])

••-------------••

اوغزنامہ: (اوغز) [رک بہ غز] ترک قبائل کی ※ بہادری پر مبنی روایات پر مشتمل ادب کے لیے ایک اصطلاح جن کا پتہ پہلی دفعہ اورخان [رک بآں] کے کتبوں سے چلا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں کوک یا سلیشی ترک سلطنت کے زوال کے بعد اوغز قبائل مغربی

علاقے کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ آٹھویں ۔ نویں صدی کے بعد سے ان کے سیر دریا کے سطحی اور بالائی طاس میں موجودہ قازقستان میں جھیل ارل اور جھیل بلکش کے درمیان وہ آباد ہوتے رہے۔ جہاں انہوں نے قبائلی وفاق قائم کرلیا۔ سلجوقی بھی انہی کا حصہ تھے، جنہوں نے گیارھویں صدی اور اس کے بعد کے دور میں ایران اور ایشیاے کوچک کو تاراج کیا، اوغزوں کی یہ شجاعانہ روایات زمانہ قبل از اسلام سے چلی آرہی ہیں، جن کا منبع سیر دریا کا علاقہ ہے۔ عوامی شاعری اور نسلی روایات کی طرح یہ شجاعانہ روایات بھی شروع میں زبانی ہی ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہی ہیں.

ان روایات کے افسانوی ہیرو کا نام اوغز تھا، اس لیے انہیں ''اوغزنامہ'' کہا جانے لگا۔ ان کے راوی اوزن [رک باں] کہلاتے تھے، جو کوپوز کے ساتھ مل کر انہیں پڑھتے اور گاتے تھے۔ تحریری اوغزنامہ کی ابتدا سلجوقی عہد میں تیرھویں صدی سے ہوتی ہے، لیکن اس عہد کا کوئی اوغوز نامہ محفوظ نہیں رہ سکا، جو قدیم ترین اوغزنامہ ہم تک پہنچا ہے، وہ ایرانی مؤرخ رشید الدین (۶۴۶۔۷۱۸ھ/۱۲۴۸۔۱۳۱۸ء) کی جامع التواریخ میں مذکور ہے، جس کی ابتدا خان غازان ثانی (۶۹۴۔۷۰۳ھ/۱۲۹۴۔۱۳۰۴ء) [رک باں] کے عہد میں ہوئی اور اس کے جانشین الجایتو (۷۰۳۔۷۱۶ھ/ ۱۳۰۶۔۱۳۱۶ء) [رک باں] کے عہد میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اوغزنامہ کے مصنف نے حقائق اور زبانی روایات کو یکجا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی روایت تاریخی حقائق کی بجائے عوامی روایات پر مبنی ہے۔ رشید الدین کے اوغزنامہ میں اگرچہ قبل از اسلام کے واقعات بھی بیان ہوے ہیں، تاہم ان میں سلجوقی عہد کی فتوحات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے ان کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے کیونکہ اس کے الفاظ میں منگولی اور مشرقی ترکی کے لسانی اثرات جھلکتے ہیں۔ اس نے قرآنی آیات ذکر کرنے کے ساتھ فردوسی کے شاہنامے سے اشعار بھی نقل کیے ہیں اور اپنے مدعا کو واضح کرنے کے لیے مثالیں بھی دی ہیں.

پیرس کے قومی عجائب گھر (Nationale Bibliotheque) میں اوغزنامہ کا ایک مخطوطہ خط اوغز میں محفوظ ہے (دیکھیے *Suppl. 1001 fonds schefer*)۔ اس کے بارے میں P.Pelliot کی راے یہ ہے کہ یہ نواح ۷۰۰ھ/ ۱۳۰۰ء میں ترفان کے علاقے میں لکھا گیا تھا اور بعد میں غالبًا نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں خوارزم میں اس کی نقل تیار کی گئی۔ اس اوغزنامے کی کہانی میں اسلامی آثار نظر نہیں آتے۔ البتہ بعض منگولی الفاظ اور ایرانی اثرات کی جھلک ملتی ہے۔ یہ قدیم ترکوں کا ایک حماسی قصہ ہے جس میں بڑے بڑے معرکوں اور دیو مالائی واقعات کو افسانوی ہیرو اوغز سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس میں علاقائی رنگ بھی ہے، مثلاً سفید بھیڑیے کا نمودار ہونا۔ قصے کے ہیرو آسمان سے نازل ہونے والا اوغز خان اور اس کا مصاحب (بیگ) ہیں، جو اوغز قبیلوں اور ان کے اتحاد کے مظہر ہیں۔ یہ قصہ ساتویں اور نویں صدی ہجری کے دوران میں کسی وقت لکھا گیا تھا۔ نقل نویسوں نے اس کے اصل متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی، البتہ اسے اسلامی رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور اس میں مختلف ادوار کے ان اماکن کا تذکرہ کردیا ہے جن میں ترکوں کی سکونت رہی۔ ۶۵ سطور کا ایک اوغزنامہ ترک سلطان مراد ثانی (۸۲۴ھ۔ ۸۴۸، ۸۵۰ھ۔ ۸۵۵ھ/۱۴۲۱ء۔۱۴۴۴ء، ۱۴۴۶ء۔ ۱۴۵۱ء) [رک باں] کے عہد کے ایک مصنف یزجی اوغلو علی نے اپنی تالیف تاریخ آل سلجوق میں بھی دیا ہے۔ اس اوغوز

نامے کے آخر میں مذکور مصنف کے عصری حالات کے سوا اوغوزوں سے متعلق معلومات رشید الدین کی جامع التواریخ اور سلجوقیوں سے متعلق مواد ابن بی بی کی تحریر کے ترجمے پر مبنی ہے۔

اوغزنامے سے متعلق دو بنیادی کتابوں میں سے ایک تو دیدے قرقوت کی کتاب ہے، جس کے اواخر دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے لکھے ہوے دو مخطوطے آج بھی محفوظ ہیں، ایک ویٹکن لائبریری میں اور دوسرا ڈرسڈن میں۔ اس میں کافر عیسائیوں کے خلاف اوغزوں کے بہادرانہ کارناموں کا ذکر ہے۔ اس میں وسط ایشیائی پس منظر کے حوالے سے آٹھویں اور نویں صدی ہجری/ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے آق قویونلو کے وہ واقعات بھی درج ہیں، جب انہوں نے ایرانی آذربائیجان اور مشرقی اناطولیا پر قبضہ کیا۔ اس حماسی قصے کا ہیرو آق قویونلو کا جدامجد بے اندیر اور اس کا راوی دیدے قرقوط ہے جس کی طرف یہ قصہ منسوب ہے، دوسرا مصنف ابوالغازی بہادر (۱۰۱۲۔ ۱۰۷۴ھ/ ۱۶۰۳۔۱۶۶۳ء) ہے جو خوارزم کا ایک مہم جو خان تھا اور اس کا تعلق (ازبکوں اوزبگوں [رک بآں]) کے شیبانی خاندان سے تھا۔ اسے چنگیز خاں کا جد امجد بھی سمجھا جاتا ہے۔ترکمانوں کی نسلی تاریخ پر اس کی دو کتابیں ہیں شجرۂ تراکما اور شجرۂ ترک ہے، جو اس نے خیوہ میں اپنی وفات سے کچھ پہلے لکھیں۔ مصنف کہتا ہے کہ اس نے رشید الدین کی تاریخ کے علاوہ سترہ دیگر تاریخوں سے استفادہ کیا ہے۔ وسط ایشیا میں اوغوز ناموں کی یہ روایت جاری رہی اور نویں سے پندرھویں صدی ہجری / تیرھویں سے انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں متعدد اوغوز نامے لکھے گئے۔ بعض اوغوز ناموں کے ہیرو مسلمان ہیں ،جو اپنے ماتحتوں کو اسلامی احکام پر عمل کی تلقین کرتے ہیں.

مآخذ: (۱) W. Bang , G.R.Rahmati: *Die Legende Von Oghuz Kaghan*، در *SBAW*، برلن ۱۹۳۲ء، ۶۸۳۔۷۲۴؛ (۲) W.Barthold: *Histoire des Turcs d' Asie Centrale*، پیرس ۱۹۴۵ء؛ اس کے ترکی ترجمے کے لیے دیکھیے: *Orta Asya Turktarihi hakk inda dersler*، انقرہ ۱۹۷۵ء؛ (۳) L. Bazin: *Notes sur les mots "Oghuz" et "Turk"*، در *Oriens*، ۶ (۱۹۵۴ء): ۳۱۵۔۳۲۲؛ (۴) A. Bombaci: *Histoire de la Litterature Turque*، پیرس ۱۹۶۸ء، ص ۱۰۲۔ ۱۰۳،۱۶۲۔۱۷۱،۱۸۳۔۱۹۹؛ (۵) J. Eckmann: *Die Ts chagataische* Literatur در *PTF*, 2، ۲: (ویزبیڈن)، ۱۹۶۴ء): ۳۸۲۔۳۸۵؛ (۷) A.M.Von Gabain: *Die altturkische Literatur*، در کتاب مذکور ، ص ۲۱۸۔۲۲۰؛ (۸) G.Giraud: *L'empire des turcs Celestes* پیرس ۱۹۶۰ء؛ (۹) K.Jahn: *Die Geschichte der Oghuzen des Rashid-ad-Din*، ویانا ۱۹۶۹ء؛ (۱۰) A.N.Kononov: *Rodoslov Anaya Turkmen*، ماسکو لینن گراڈ ۱۹۵۸ء؛ (۱۱) H.Korogly: *Oguzskiy geroiceskiy Epos*، ماسکو ۱۹۷۶ء؛ (۱۲) B. Ogel: *Turk Mitolojisi*، جلد۱، انقرہ ۱۹۷۱ء؛ (۱۳) P.Pelliot: *sur la Legande d,Oghuz Khan en ecriture ouigure* در Toung Pao، ۲۷ (۱۹۳۰): ۲۴۷۔۵۳۸؛ (۱۴) A.M.Sherbak: *Oguz-Name- Muhabbatname*، ماسکو ۱۹۵۹؛ (۱۵) F. *Sumer*: *oguzlar*، در *IA*؛ (۱۶) وہی مصنف: *Oguzlar a ait destani Mahiyet de Eserler*، در *Audtcf Dergisi*، ۱۷ (۱۹۶۰): ۳۵۹۔۴۵۵؛ (۱۷) Z.V.Togan: *Umumi Turk Tarihine giris*، ج۱، استانبول ۱۹۴۶ء؛ (۱۸) وہی مصنف: Oguz Destani, *Resideddin Oguznamesi*

استانبول ۱۹۷۲ء .

(Irene Melikoff،[ت: محمد امین])

••-------------••

※ اوق چوزادہ: محمد شاہ [یا شاہی] بیگ (۹۷۰۔۱۰۳۹ھ/ ۱۵۶۲۔۱۶۳۰ء) ایک عثمانی انشا پرداز، مخصوص اسلوب رکھنے والا نثر نگار۔ عثمانی سیکرٹریٹ میں ۴۴ سال ملازمت کی۔ اس کے والد محمد اوق چوزادہ پاشا (م۹۹۵ھ/ ۱۵۸۷ء) نے بھی اسی سیکرٹریٹ میں طویل مدت تک ملازمت کی تھی۔ محمد شاہ (یاشاہی) بیگ ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں دیوان ہمایوں [رک باں] میں کاتب مقرر ہوا۔ ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء میں رئیس الکتاب بنا، ۱۰۰۶ھ/ ۱۵۹۷ء میں اس نے دفتر امینی کے عہدے پر ترقی پائی اور ۱۰۰۷ تا ۱۰۱۰ھ (۱۵۹۹۔۱۶۰۱ء) وہ دیوان انشا کے اعلیٰ عہدے نشانجی [رک باں] پر کام کرتا رہا۔ ۱۰۱۳ھ/ سے ۱۰۱۶ء (۱۶۰۵۔۱۶۰۸ء) تک وہ مصر کا دفتردار بعہدہ ”سالیانہ بیگی“ رہا۔ کچھ سال فارغ رہنے کے بعد اس کا تقرر دوبارہ ۱۰۲۹ھ/۱۶۲۰ء میں بطور ”دفتر امینی“ ہوگیا۔ عثمان ثانی کی پولینڈ کے خلاف مہم کے دوران (۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء) میں اس کی ترقی بطور نشان جی ہوگئی۔ اس کی مختصر عرصے کے لیے بطور نشانجی تقرری اس وقت ہوئی جب مصطفیٰ اول دوبارہ برسراقتدار آیا اور جب اس کا دوست اور سرپرست یحییٰ افندی شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھا۔ وہ ۱۰۳۹ھ/ ۱۶۳۰ء میں فوت ہوا (نوعی زادہ عطائی: ذیل شقائق النعمانیہ، استانبول ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء :۲:۷۳۰۔۷۳۱).

عطائی نے بطور نشانجی انشاء میں اس کی مہارت کو تاجی زادہ جعفر چلپی کے بعد دوسرا درجہ دیا ہے۔ اس کا اسلوب نگارش عظمی زادہ نرگسی اور ویسی [رک باں] کے پائے کا تھا۔ اس کی اہم تصانیف یہ ہیں: (۱) منشآت الانشاء: اس میں تقریباً ۸۰ خطوط ہیں جن کے شروع میں اس نے مقدمہ لکھا ہے۔ پہلی دفعہ اس کی طباعت ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۹ء میں عمل میں آئی۔ اس کے کئی مخطوطے موجود ہیں (۲) احسن الحدیث (مطبوعہ استانبول ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵۔ ۱۸۹۶ء)، قرق حدیث کی منظوم شکل مع نثری تشریحات کے لیے (دیکھیے A.Karahan: Islam-Turk Edebiyatinda Kirk Hadis Toplama, Tercume ve Serhleri، استانبول ۱۹۵۶ء، ص۲۱۸۔۲۲۲؛ (۳) کاشفی [رک باں] کی تحفۃ الصلوۃ کا نثری ترجمہ (تاریخ تکمیل ۱۰۲۱ھ/ ۱۶۲۱ء) .Tedhkires میں بذیل مخلص شاہی اس کے منتخب اشعار بھی موجود ہیں۔

مآخذ:(۱) عطائی ۲:، : ۷۳۰۔۷۳۱؛ (۲) اوق چوزادہ منشآت، استانبول یونیورسٹی لائبریری، مخطوطہ نمبر TY۳۱۰۵، ورق اب تا اب؛ (۳) کاتب چلپی: Fedhleke (از افادات عطائی)، استانبول، ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء، ص ۱۲۷، ۱۲۸؛ (۴) احمد رسمی: خلیفۃ الرؤساء سفینۃ الرؤسا، استانبول ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء، ص۲۳۔۲۵؛ (۵) سجل عثمانی، ۴: ۱۵۳؛ (۶) Othmanli Mu,ellifleri ۲ : ۷۸۔ ۷۹؛ مزید حوالہ جات کے لیے دیکھیے:(۷) C.Woodhead: Ottoman Insa and the Art of Letter-writing:influences upon the Career of the nisanci and prose Stylist Okcuzade (م۱۶۳۰ء)، در Osmanli arastirmalari، ص۷۔۸ (۱۹۸۸): ۱۴۳۔۱۵۹.

(Christine WoodHead،[ت: محمد امین])

••-------------••

اوکتائی: [رک بہ اوگدائی] ※

••-------------••

※ اوکٹے رفعت: (ہرزکو) ایک ترک ادیب اور شاعر جو ۱۹۱۴ء میں ترابزون میں پیدا ہوا۔ اس کا والد سمیع رفعت بھی ایک ادیب، شاعر اور ترابزون کا گورنر تھا۔ اوکٹے نے ۱۹۳۶ء میں قانون کی ڈگری لی اور حکومتی وظیفے پر اعلیٰ تعلیم کے لیے پیرس چلا گیا۔ تین سال بعد

جنگ عظیم دوم چھڑ گئی اور اسے اپنی ڈاکٹریٹ مکمل کیے بغیر واپس آنا پڑا۔ وہ محکمہ پریس واطلاعات میں ملازم ہوگیا اور وہاں سے فراغت کے بعد بطور وکیل کام کرتا رہا۔ اس نے ۱۸ اپریل ۱۹۸۸ء کو استانبول میں وفات پائی۔

اس نے ۱۹۶۰ء تک صرف شاعری کی ،اس کے بعد ڈرامے بھی لکھنے شروع کر دیئے اور ۱۹۷۰ء کے بعد ناول نگاری کی بھی ابتدا کر دی۔ ان اصناف ادب میں اس کی فکر اور اسلوب متنوع رہے ہیں، کیونکہ وہ جدت پسند اور نئے تجربات کا خوگر تھا۔ اس کے تخلیق کردہ کردار، افکار اور احساسات اس کے حقیقی زندگی کے عمیق مشاہدے کا نتیجہ تھے۔ وہ دوستوں کا دوست اور مستقل مزاج تھا۔ ارہان ولی کے ساتھ اس کی دوستی ہائی سکول کے زمانے میں ہوئی، جسے اس نے آخری عمر تک نبھایا۔

مآخذ: اس کی اپنی تالیفات: (الف) شاعری: (۱) Garip ۱۹۴۱ء (باشتراک ارہان ولی اور ملیح گیودت (Anday)؛ (۲) Guzelleme؛ (۳) Yasayip Olmek؛ (۴) Ask ve avarelik ustune sirler (۱۹۴۵ء)؛ (۵) Asagi Yukari (۱۹۵۲ء)؛ (۶) Karga ile Tilki (۱۹۵۴)؛ (۷) Percemli sokak (۱۹۵۶ء)؛ (۸) Asik Merdiveni (۱۹۵۸ء)؛ (۹) Elleri var uzgurlugun (۱۹۶۶ء)؛ (۱۰) Siirler (۱۹۶۹ء)؛ (۱۱) Yeni Sirler (۱۹۷۳ء)؛ (۱۲) Cobanil Siirler (۱۹۷۶ء)؛ (۱۳) Bir Cigara icimi (۱۹۷۹ء)؛ (۱۴) Elifli (۱۹۸۰ء)؛ (۱۵) Denize dogru (۱۹۸۲ء)؛ (۱۶) Konusma Dilsiz ve ciplak (۱۹۸۴ء)؛ (۱۷) Koca bir yaz (۱۹۸۷ء)(ب) ڈرامے: (۱۸) Bir takim Insanlar (۱۹۶۱ء)؛ (۱۹) Kadinlar arasinda (۱۹۶۶ء)؛ (۲۰) Atlare filler (۱۹۶۲ء میں سٹیج کیا گیا)؛ (۲۱) Yagmur sikintist (۱۹۷۰ء میں سٹیج کیا گیا)؛ (۲۲) Dirlik duzenlik (۱۹۷۵ء میں سٹیج کیا گیا)؛ (۲۳) Cilkoroz (۱۹۸۸ء میں سٹیج کیا گیا) (ج) ناول: (۲۴) Bir kadinin Penceresinden (۱۹۷۶ء)؛ (۲۵) Danaburnu (۱۹۸۰ء)؛ (۲۶) Bay Lear (۱۹۸۲ء)

(د) اوکٹے رفعت کے بارے میں لکھی گئی تحریریں: (۲۷) M Kaplan: Cumhuriyet devri Turk Siiri، انقرہ ۱۹۹۰ء؛ (۲۸) M.Unlu اور O.Ozcan: Yuzyil Turh Edebiyati، استانبول ۱۹۹۰ء؛ (۲۹) صوبت تیموز yazka edebiyat:Zayuzytl dergisi ۱۹۸۱ء؛ (۳۰) T.Uyar: Milliyet sanat dergisi، ۱۵ Ekim، ۱۹۸۴؛ (۳۱) S.K.Aksal: Cumhuriyet gazetesi ۳ Mayis، ۳ ۱۹۸۸ء۔

(Cigdem Balim [ت: محمد امین])

••-------------••

※ اوکیار، علی فتحی: (۱۸۸۰ء۔۱۹۴۳ء)، ایک ترک سیاست دان اور سفارت کار۔ وہ مقدونیا میں، جو اُس زمانے میں عثمانیوں کے زیر نگین تھا، پیدا ہوا اور (وہیں) پروان چڑھا۔ اس نے استانبول کے حربی کالج اور سٹاف کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے۱۹۰۴ء میں سٹاف کیپٹن کی حیثیت سے فارغ التحصیل ہوا۔ حربی کالج میں اس کی مصطفیٰ کمال اتاترک سے دوستی ہوگئی جو زندگی بھر قائم رہی۔ (تیسری) آرمی میں ملازمت کے دوران میں اس نے کمیٹی برائے اتحاد وترقی میں شمولیت اختیار کرلی [رکّ بہ جمعیت اتحاد وترقی] جس نے ۱۹۰۸ء کا انقلاب برپا کیا۔ موجودہ لیبیا کے علاقے میں ہونے والی جنگ (۱۹۱۱ء)، اور بلقان کی پہلی جنگ (۱۹۱۲ء) میں خدمات سرانجام دینے سے قبل وہ پیرس میں ملٹری اتاشی کی حیثیت سے کام کرتا رہا (۱۹۰۸ء۔۱۹۱۱ء)۔ وہ ۱۹۱۲ء میں مختصر سی مدت کے

لیے عثمانی ایوان نائبین کا رکن منتخب کیا گیا اور ۱۹۱۳ء میں اس نے فوج سے مستعفی ہوکر صوفیا میں سفیر کا عہدہ سنبھالا (۱۹۱۳ء۔۱۹۱۷ء)۔ ۱۹۱۷ء میں وہ دوبارہ پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہونے کے بعد جنگ عظیم اول کے خاتمے کے بعد عزت پاشا کی تشکیل کردہ کابینہ میں شامل ہوگیا۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں داماد فرید پاشا [رک بآں] کی نئی آنے والی حکومت نے اسے جیل بھجوا دیا، لیکن رہائی پانے کے بعد اس نے اکتوبر ۱۹۱۲ء میں وزیر داخلہ کی حیثیت سے مصطفیٰ کمال کی سرکردگی میں قائم ہونے والی قوم پرست حکومت میں شرکت اختیار کرلی۔ وہ اس حکومت میں دو بار وزیراعظم کے عہدے پر بھی متمکن رہا (اگست تا نومبر ۱۹۲۳ء اور نومبر۱۹۲۴ء تا مارچ ۱۹۲۵ء)۔ بعد ازاں وہ پارلیمنٹ کی رکنیت سے دستبردار ہوکر پیرس جاکر ترکی کے سفیر کے عہدے پر فائز ہوا۔ اگست ۱۹۳۰ء میں اس نے ترکی واپس آکر آزاد ریپبلکن پارٹی (Serbest Cumhuriyet Firkasi) قائم کی۔ یہ پارٹی اتاترک کے ایما پر تشکیل دی گئی تاکہ وہ برسر اقتدار ریپبلکن پیپلز پارٹی کی رہنمائی کے لیے ایک وسیع النظر اور روادار حزب اختلاف کا کردار ادا کرے۔ بدقسمتی سے یہ تجربہ قبل ازوقت ثابت ہوا اور فتحی کے عزائم کے برعکس یہ پارٹی جمہوریہ کے سیکولر اداروں کے مخالف لوگوں کی آماجگاہ بن گئی، چنانچہ ۱۹۳۰ء میں اسے ختم کردیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں فتحی کو لندن میں سفیر مقرر کر دیا گیا جہاں وہ ۱۹۳۹ء تک خدمات سرانجام دیتا رہا۔ بعدازاں وہ پھر پارلیمان کا رکن منتخب ہو کر وزیر انصاف کی حیثیت سے کابینہ میں شامل ہوگیا، لیکن ۱۹۴۲ء میں مستعفی ہوگیا۔ کچھ عرصہ علیل رہنے کے بعد اس نے ۱۹۴۳ء میں وفات پائی۔

مآخذ: W.F.Weiker: Political tutelage and Democracy in Turkey: The Free Party and its Aftermath، لائیڈن ۱۹۷۳ء؛ (۲) Turk Ansiklopedisi، ج۲۵، انقرہ ۱۹۷۷ء بذیل مادہ اوکیار.

(W.HALE [ت: ظفر علی]

••--------------••

اوگاڈین: ایتھوپیا (حبشہ) کے جنوب مشرق میں ※ ایک وسیع بنجر علاقہ، اس کے شمال مشرق میں سابقہ صومالی لینڈ اور جنوب مغرب میں وادی شبلی کی غیر معینہ سرحد ہے۔ یہاں دارود نسل کے صومالی خانہ بدوش پائے جاتے ہیں۔ ۱۹۹۱ء کی انتظامی اصلاحات میں اسے نسلی اور تہذیبی بنیادوں پر صومالی صوبے کا حصہ بنا دیا گیا، جب کہ اس سے پیشتر یہ صوبہ ہراجے (ہرارے) کا حصہ تھا۔ اس وقت یہ ایتھوپیا کا ایک حصہ ہے جب کہ جمہوریہ صومالیہ بھی اس کا دعوے دار ہے۔ اس کے بعض قابل کاشت علاقوں پر صومالیہ اور ایتھوپیا کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے لوگ کاشت کاری کرتے ہیں۔ یہاں گیس کے ذخائر بھی دریافت ہوئے ہیں.

۱۸۸۷ء میں جب ایتھوپیا کے عیسائی بادشاہ شوآمانی لیک (عہد حکومت ۱۸۸۹ء۔۱۹۱۳ء) نے مسلم ریاست ہرار پر قبضہ کرلیا تو اس نے اوگاڈین پر بھی فوج کشی کا حکم دیا اور ۱۸۹۰ء میں اس پر قبضہ کرلیا۔ برطانیہ، اٹلی اور فرانس نے جو اپنے استعماری مقاصد کے لیے افریقہ میں قدم جمائے بیٹھے تھے، ایتھوپیا کے اس قبضے کو تسلیم کر لیا ۔۱۸۹۷ء میں برطانیہ اور ایتھوپیا کے درمیان ایک معاہدے کے نتیجے میں ہاؤد کا چراگاہی علاقہ بھی ایتھوپیا کو مل گیا اور ۱۹۰۸ء میں اٹلی کے ساتھ بھی ایتھوپیا کا ایک معاہدہ ہوگیا، گو سرحدوں کا تعین نہ ہوسکا۔ سوائے گڑبڑ کے اکا دکا واقعات کے (مثلاً ۱۹۳۵ء۔۱۹۳۶ء میں ایتھوپیا پر اٹلی کا عارضی حملہ) یہ صورت حال ۱۹۶۰ء تک یوں

ہی جاری رہی.

اوگاڈین سے تعلق رکھنے والے سید محمد عبداللہ حسن (رک بہ محمد بن عبداللہ بن حسن) نے ۱۹۰۰ء میں علاقے میں برطانوی استعمار کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا۔ جو بیس سال جاری رہا۔ اس دوران ملا محمد کی کئی جھڑپیں اوگاڈین کے علاقے میں بھی ہوئیں جن میں ایتھوپیا نے انگریزوں کا ساتھ دیا.

۱۹۶۰ء میں اطالویوں اور انگریزوں کو افریقی مقبوضات سے دستبردار ہونا پڑا، چنانچہ صومالیہ اور صومالی لینڈ کا علاقہ جمہوریہ صومالیہ [رک بآں بذیل مادہ] کے نام سے متحدہ ریاست کے طورپر سامنے آیا۔ نئی جمہوریہ نے اوگاڈین کے علاوہ ہرارجے (ہرارے)، بالی، سدادو، ارسی، شمالی کینیا کے بعض حصوں اور ماضی میں فرانسیسوں کے زیر قبضہ صومالی ساحلی پٹی (جو ۱۹۷۷ء میں آزاد ہوکر جبوتی کے نام سے الگ مملکت بن چکی ہے) پر بھی ملکیت کا دعوی کیا اور اس کے قومی جھنڈے میں ستارے کے پانچ کونے جن علاقوں کی نمائندگی کرتے ہیں ان میں اوگاڈین بھی شامل ہے۔ صومالیہ کے مطالبات پر جب کسی نے کان نہ دھرے تو اس نے اوگاڈین پر قبضے کی خاطر ۱۹۶۴ء میں ایتھوپیا پر حملہ کر دیا جس میں اسے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ بین الاقوامی دباؤ پر خرطوم میں معاہدہ ہوا جس میں معاملات کو جوں کا توں رکھنے کا فیصلہ ہوا۔۱۹۷۴ء میں ایتھوپیا میں جب شاہ ہیل سلاسی کا تختہ الٹ دیا گیا اور وہاں سیاسی عدم استحکام پیدا ہوگیا، تو صومالیہ نے اس سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۷۷ء میں دوبارہ اوگاڈین پر حملہ کر دیا لیکن اس دفعہ روس کھلم کھلا ایتھوپیا کی مدد کو آگیا، جو ۱۹۷۰ء تک صومالیہ کا حلیف تھا، کیونکہ اب ایتھوپیا میں کمیونسٹ نواز حکومت برسراقتدار آگئی تھی۔ اس طرح کوئی بھی فیصلہ نہ ہوسکا اور اوگاڈین کا مقامی نوعیت کا مسئلہ بین الاقوامی رخ اختیار کر گیا۔ ۱۹۹۱ء سے صومالیہ سیاسی افراتفری اور باہمی خانہ جنگی کا شکار ہے اور اوگاڈین کا مسئلہ پس منظر میں چلا گیا ہے.

مآخذ: حبشہ، صومالیہ، بحراحمر کے علاقے اور افریقہ پر عمومی مآخذ کے علاوہ، دیکھیے:(۱) Wolde- Mariam Mesfin: The Background of the Ethio-Somalia Boundary dispute، عدیس بابا ۱۹۶۴ء؛ (۲) S.P. Petrides: The Boundary Question between Ethopia and Somalia، نیو دہلی ۱۹۸۳ء مذکورہ بالا دونوں کتابیں ایتھوپیا کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں؛ (۳) I.M.Lewis: A Modern History of Somalia، لندن وبولڈر ۱۹۸۸ء؛ (۴) A.Rimbaud نے ایک یونانی تاجر Sottiro کی یادداشتوں کی مدد سے اوگاڈین کے بارے میں ایک رپورٹ (Rapport sur liogadine) بعنوان Comptes -Rendus de ances de la societe des Seaeographie لکھی جو ۱۸۸۴ء میں پیرس سے شائع ہوئی.

(A.Rouaud [ت: محمد امین])

••-------------••

اوگدائی: (اوگودلی) منگول ریاست کا دوسرا بڑا ※ خان۔ وہ چنگیز خاں [رک بآں] کا تیسرا بیٹا تھا اور اس کی خاندانی بیوی بورتہ کے بطن سے اندازاً ۱۱۸۶ء میں پیدا ہوا۔ یہ پہلا منگول حکمران ہے جس نے قاآن کا لقب اپنایا اور الجوینی اس کثرت سے اس کا ذکر کرتا ہے گویا اس کے نام کا حصہ ہو۔ چنگیز خاں نے اپنی زندگی میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ اوگدائی ہی (اس کے دوسرے بیٹوں چغتائی اور قبلائی کی موجودگی کے باوجود) اس کا جانشین ہوگا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مزاجاً صلح جُو تھا اور سلطنت کو اس وقت ایسے ہی حکمران کی ضرورت تھی جو خاندان کے بڑوں کو، ان کے متضاد مفادات کے باوجود،

مشورے سے ساتھ لے کر چل سکے۔ مسلم مؤرخین الجوینی اور رشید الدین نے اس کی کریم النفسی کا ذکر کیا ہے اور اس کی رواداری اور سخاوت کے بہت سے واقعات نقل کیے ہیں.

۱۲۲۷ء میں چنگیز خاں کی وفات کے بعد دو سال تک عبوری نظام چلتا رہا اور ۱۲۲۹ء کے قرولتائی (جرگے) میں، جس کا انتظام اس کے چھوٹے بھائی تولوئی نے کیا تھا، اسے خان اعظم بنائے جانے کی توثیق کی گئی۔ اس کے بعد مشرق اور مغرب میں منگول سلطنت پھیلتی چلی گئی۔ چین کی فتح ۱۲۳۴ء میں مکمل ہوئی۔ ۱۲۲۹ء میں منگول فوجوں نے سالار چرمغون اور بیجو کی زیر سرکردگی شمالی ایران پر چڑھائی کر دی۔ اوگدائی کے عہد میں سب سے بڑی مہم جوئی غالبًا وہ تھی جو روس اور مشرقی یورپ میں کی گئی۔ ۱۲۳۵ء کی ایک قرولتائی میں اس مہم کا فیصلہ ہوا اور اس کی سربراہی چنگیز خاں کے سب سے بڑے بیٹے جوچی کے فرزند باتو [رک بآں] کے سپرد کی گئی، جسے مغربی علاقے کی حکمرانی ورثے میں ملی تھی۔ یہ مہم ۱۲۳۷ء سے ۱۲۴۱ء تک کامیابی سے جاری رہی اور مشرقی اور وسطی یورپ (بشمول پولینڈ، ہنگری اور آسٹریا) پر حملے کیے گئے لیکن اس مہم میں اس وقت توقف آگیا، جب ۷ دسمبر ۱۲۴۱ء کو اوگدائی غالبًا کثرت شراب نوشی سے مرگیا (یہ علت تقریباً سب منگول حکمرانوں میں تھی)۔ اس مہم کا دور رس نتیجہ یہ نکلا کہ باتو اور اس کی اولاد عرصے تک قپچاق کے علاقے پر حکمران رہی، جسے مغربی دنیا Golden Horde (سنہری غول) کے نام سے یاد کرتی ہے۔

اوگدائی نے صرف میدان جنگ ہی میں کامیابیاں حاصل نہیں کیں، بلکہ اس نے وسطی منگولیا میں ارخن [رک بآں] کی وادی میں قراقرم کے مقام پر منگول سلطنت کا دارالحکومت بھی تعمیر کروایا۔ چنگیز خاں نے بھی اگرچہ یہ جگہ استعمال کی تھی تاہم اوگدائی نے شہر کے گرد فصیل تعمیر کروائی اور بہت سی نئی عمارات بنوائیں (جو فرانسیسکی مغربی سیاح ولیم روبرک (William Rubruck) کے بقول، جس نے ۱۲۵۰ء میں اس شہر کی سیاحت کی، بہت عمدہ اور عظیم الشان نہ تھیں) اور اسے باقاعدہ دارالحکومت قرار دیا۔ اس کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ۱۲۳۴ء میں یام کے نام سے ڈاک کا عمدہ نظام قائم کیا [رکّ بہ منگول] یہ نظام پہلے اس نے اس علاقے میں قائم کیا جو براہ راست اس کے ماتحت تھا، لیکن بعد میں اس کی توسیع سلطنت کے ان حصوں تک بھی کر دی گئی جو چغتائی، تولائی اور باتو کے ماتحت تھے۔ اس کے عہد میں چینی وزیر یولوچوسائی کی، جو بہت بارسوخ شخص تھا جس نے منگول سرداروں کے اختیارات کو محدود کیے رکھا، اس تجویز پر عمل درآمد نہ ہونے دیا کہ شمالی چین کے علاقے سے مقامی لوگوں کو بے دخل کرکے وہاں منگولوں کے مویشیوں کے لیے ایک وسیع چراگاہ بنادی جائے.

مآخذ: بنیادی (الف) منگول: (۱) The Secret History of the Mongols انگریزی ترجمہ از F.W.Cleaves، کیمبرج ماس چوئس ۱۹۸۲ء؛ (۲) de. Rachewiltz، در Papers in Far Eastern History ۱۹۷۱ـ۱۹۸۵ء اور U.Onon لائیڈن ۱۹۹۰ء؛ (۳) فرانسیسی ترجمہ از P.Pelliot پیرس ۱۹۴۹ء.

(ب) چینی: (۴) Yuan-Shih، ترجمہ W.Abramowski: Die Chinesischen Annalen von ogodei und Guyuk Ubersetzung des Kapitels des Yuan-shih، در Zentralesiatische studien، ۱۰ (۱۹۷۶ء): ۱۱۷ـ۱۶۷؛

(ج) فارسی: (۶) الجوینی اور اس کا ترجمہ از Boyle (۷) رشیدالدین، جامع التواریخ کے متعلقہ حصے، طبع E.Blochet، GMS، لائیڈن و لنڈن ۱۹۱۱ء۔ اس کی ایک اور بہتر طباعت کے لیے دیکھیے اے علی زادہ ماسکو ۱۹۸۰ء، ترجمہ از J:A. Boyle: The Successors of

Genghis Khan نیویارک ولنڈن ۱۹۷۱ء.

(د) ثانوی مآخذ: منگول سلطنت پر لکھی گئی کتب میں اکثر اوگدائی اور اس کے عہد حکومت کے بارے میں مواد مل جاتا ہے، تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے؛ (۸) Barthold : *Turkistan*، لندن ۱۹۷۷ء باب پنجم؛ (۹) Hartog: *Genghis Khan Conqueror of the World, L.de* لنڈن ۱۹۸۹ء باب ۱۳تا ۱۵؛ (۱۰) یولو چوسائی (جس کا ذکر اسلامی مصادر میں نہیں ملتا) کے لیے دیکھیے de Rachewiltz: *Yeh-lu chu-ts-ai* (1189-1243) در، *Buddhist idealist and Confucian statesman* *A.F. Wright* و D.Twitchett (مدیران): *Confucian Personalities* ، سٹانفورڈ ۱۹۶۲ء، ص۱۸۹۔۲۱۶.

(D. O.Morgan [ت: محمد امین])

••-------------••

※ اولغن، محمد طاہر: (طاہر اولغن، طاہر المولوی) ایک ترک ادیب اور نقاد جو ۱۳ ستمبر ۱۸۷۷ء کو استانبول میں پیدا ہوا اور وہیں اُس نے ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔ اس نے عسکری تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی اور وزارت دفاع میں ملازم ہوگیا۔ اسی دوران میں اس نے مسجد (محمد) الفاتح کے مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور شیخ مثنوی خان سلانکلی محمد اسعد افندی سے اجازہ حاصل کیا۔ اسی وجہ سے اسے طاہر المولوی کہا جانے لگا۔ ۱۹۰۳ء کے بعد اس نے کئی تعلیمی اداروں (خصوصاً دارالشفقت ہائی سکول اور ملٹری ہائی سکول) میں فارسی، تاریخ اسلام اور تاریخ و ترکی ادب پڑھایا۔ عمر کے آخری دور میں اس نے استانبول کی لائبریریوں کی فہارس سازی میں بھی حصہ لیا۔ وہ اسلامی زعما اور تاریخ ادب ترکی پر اپنی مؤلفات کی وجہ سے معروف ہے.

مآخذ: (الف) اس کی اپنی تالیفات: (۱) میراث حضرت مولانا، ۱۸۹۸ء؛ (۲) نظم واشکال نظم، ۱۹۱۳ء؛ (۳) *Manzum bir muhtira* (Tanzimat oncesi edebiati ozeti) ۱۹۳۱ء؛ (۴) ادبیات لغتی، ۱۹۳۶ء؛ (۵) *Fuzuliye dair* ۱۹۳۶ء؛ (۶) *Sair Nev'i ve Suriye Kasidesi* ۱۹۳۷ء؛ (۷) *Baki'ye dair* ۱۹۳۷ء؛ (۸) *Muslumanlikta Ibadet Tariri* ۱۹۴۶ء؛ (۹) *Germiyanli Seyhi ve Harname,si*، ۱۹۴۹ء.

(ب)اس پر لکھی گئی کتب: (۱۰): *Son asir Turk sairleri*، استانبول ۱۹۷۰ء؛ (۱۱) کے۔ ای کرک چوغلو: *Edebiyat lugati:Tahri- ul -Mevlevi*، استانبول ۱۹۷۳ء؛ (۱۲) ایس کے کرالیو غلو : ترک ادبیات تاریخی، استانبول ۱۹۸۶ء.

(Cigdem Balim [ت: محمد امین])

••-------------••

※ اولنڈرک: یونانی لڈورکی (Lidoriki) کا ترکی مترادف۔ یہ وسطی یونان کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو سیلونا (Salona) کے مغرب میں ۴۶ سیدھی اڑان سے سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور اردگرد کے وسیع دیہی اور پہاڑی علاقے کا واحد شہر ہے۔ عثمانی عہد میں یہ مقامی قضائی یونٹ کا مرکز اور ترہالہ کے سنجق کا حصہ تھا۔ ۱۵۳۰ء کے بعد جب انابختی لپنٹو (Inebakhati-Lepanto) کو الگ سنجق بنادیا گیا تو اولنڈرک کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔ ۱۸۲۷ء میں عثمانی اقتدار کے خاتمے تک یہ انابختی ہی کا ایک حصہ رہا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یہ مقامی اہمیت کا ایک اسلامی مرکز تھا.

اولنڈرک ایک مختصر میدان میں (جو سطح سمندر سے ۶۳۰ میٹر بلند ہے) ۲۵۱۰ میٹر بلند جیونا (Giona) پہاڑ کے دامن میں مختلف سڑکوں کے سنگم پر واقع ہے جو ایتھنز اور تھیبز سے انابختی اور موریا سے (براستہ وٹرینٹسا وڈرونسی (بندرگاہ) اور وادئ سپرچیوس (Spescheios) مقدونیا اور تھی سیلے کو جاتی ہیں (یہ مؤخرالذکر شاہراہ اب کم ہی

استعمال ہوتی ہے).

اواخر نویں صدی سے یہ جگہ یونانی قدامت پرستوں کی عمل داری کا مرکز رہی ۱۲۰۴ء میں مطلق العنان شہنشاہیت میں شامل کر لی گئی اور ۱۳۲۷ء میں اسے ایتھنز کی کیٹلس ڈچی (Catalan Duchy) ۱۳۹۴ء میں اس پر سلطان بایزید یلدرم نے قبضہ کر لیا، وہ لیکن اسے برقرار نہ رکھ سکا اور تین سال بعد ہی اس پر تھیوڈور ہلیلوگس نے قبضہ کر لیا، قرون وسطیٰ میں لڈورکی میں قلعہ رہا ہوگا، لیکن اب اس کے کوئی آثار باقی نہیں، نہ ہی مقامی آبادی اس کے بارے میں کچھ جانتی ہے۔ ایس بومل جی (S. Bommelje) اور پی ڈون (P. Doon) کا خیال ہے کہ شہر سے تین کلومیٹر باہر کالیوں، نامی قلعے کے جو کھنڈرات اور آثار ملتے ہیں، وہ لڈورکی کے قلعے کے ہیں.

عثمانیوں نے اولنڈرک کو کب فتح کیا؟ اس کی صحیح تاریخ دستیاب نہیں۔ قوی اندازہ یہ ہے کہ یہ واقعہ سلطان مراد دوم (۱۴۲۱۔۱۴۵۱ء) کے عہد کا ہے کیونکہ تحریری ریکارڈ دیکھیے تحریر دفتر، ا، (Mal. Mud) سے پتہ چلتا ہے کہ اولنڈرک سے ملحق مغربی پہاڑی ضلع کراوری، جو ترہالہ سنجق ہی سے منسلک تھا، ۱۴۵۴ء میں عثمانیوں کے پاس تھا.

ترک قبضے کی ابتدا ہی میں قصبے میں کچھ ترک مسلمان بس گئے جن کی تعداد میں، بعد میں، اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۴۶۶ء کی مردم شماری کے مطابق (دیکھیے .Mal Mud، ۶۶) اولنڈرک ایک ضلعی مرکز تھا جس میں دس گاؤں اور ۳۴ کتون (خانہ بدوشوں کی غیر مستقل آبادیاں) شامل تھے اور یہ ۱۴۶ عیسائی اور ۲۴ مسلم گھرانوں پر مشتمل تھا۔ ایک صدی بعد ۱۵۶۹۔۱۵۷۰ء کی مردم شماری کے مطابق (انقرہ KUK، ۵۰) مسلم گھرانوں کی تعداد کم ہوکر ۱۹ رہ گئی، جب کہ عیسائی گھرانوں کی تعداد بڑھ کر ۲۴۳ ہوگئی۔ موریا سے اندرون یونان جانے والی شاہراہ کی حفاظتی ذمہ داری کی وجہ سے قصبے کی ایک خصوصی اہمیت تھی اور اسے لازمی فوجی بھرتی اور بعض محاصل کی چھوٹ حاصل تھی.

گیارہویں/ سترھویں صدی میں اس کی آبادی کم ہوگئی۔ریکارڈ کے مطابق ۱۶۴۲ء میں ۸۵ عیسائی گھرانے جزیہ دیتے تھے۔(BBA Mal Mud 1000، ص، ۲۵۲)، ۱۶۴۶ء میں ۶۹ گھرانے (Mal.Mud.1000، ص ۵)، جبکہ ۱۶۸۸ء میں ایسے گھرانوں کی تعداد گھٹ کر ۲۷ رہ گئی (Sofia Nat-Libr، الف۔ ۱۹۵/۲)۔ اس کمی کی وجوہ دوسری بھی ہوسکتی ہیں، مثلاً یہ کہ لوگ غریب ہوں اور جزیہ نہ دے سکتے ہوں یا پھر کسی وجہ سے ان کو ادائیگی سے مستثنیٰ کردیا گیا ہو۔ ۱۶۷۰ء میں تیار کی گئی سلطنت عثمانی کے یورپی صوبوں کی قاضی لیق (قضائی یونٹوں) کی فہرست میں اولنڈرک کا بارہ میں سے گیارھواں نمبر ہے، جو اس کی عدم اہمیت پر دلالت کرتا ہے (محمد کمال اوزرگن: *Rumeli Kadiliklarinadan 1078* در *Ord. Prof Ismail Uzuncarsili ya duzenlemesi armagan* انقرہ ۱۹۷۶ء، ص ۲۷۶)۔ اولیا چلپی جو ۱۰۸۱ھ/۱۶۶۹۔۱۶۷۰ء میں سیلونا سے کرنبش جاتے ہوئے اس علاقے سے گزرا، اس نے بھی اولنڈرک کا ذکر نہیں کیا۔ فرانسیسی سیاح فرانسس (Francois Pouquevile) نے ۱۸۰۵ء میں لکھا کہ اولنڈرک قصبے کی آبادی ۱۸۰ گھرانوں پر مشتمل ہے۔ ترک اور یونانی ایک ہی زبان بولتے ہیں کیونکہ ترک بھی مقامی رنگ اختیار کیے ہوئے ہیں (*Voyage de la Grece*، پیرس ۴(۱۸۲۶ء) ص ۵۶۔۵۷)۔ یہ ایک قاضی لق کا مرکز ہے جس میں ۴۲ گاؤں ہیں۔ بشپ اور دوسرے عیسائی معززین نزدیکی قصبے کلیمہ میں رہتے ہیں.

۱۸۲۵ء میں یونانی جنگ آزادی میں یہ قصبہ عباس پاشا دبرا کی سربراہی میں عثمانی فوج کا ضلعی مرکز تھا۔ ۱۸۲۷ء میں عثمانی فوج اور مسلمان سول آبادی کو اس ضلع

اور شہر سے باہر دھکیل دیا گیا۔ بعد میں مسلمانوں کی مذہبی اور دیگر عمارات کا نام ونشان مٹا دیا گیا۔ ترک اوقاف کے ریکارڈ Cevdet Evkat Tasnifi میں کچھ مساجد، مدارس اور تکیوں (خانقاہوں) کے نام ملتے ہیں.

اولنڈرک اپنی ساری تاریخ میں ایک چھوٹا قصبہ ہی رہا ہے اور اس کی آبادی ۱۵۰۰ سے ۱۶۰۰ نفوس تک ہی رہی ہے۔ ۱۹۲۸ء میں اس کی آبادی ۱۵۳۷ نفوس پر مشتمل تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں وہرمچٹ (Wehrmacht) نے یہ قصبہ اور اس کے نواحی گاؤں تاراج کردیئے۔ ۱۹۶۱ء میں قصبے کی آبادی ۱۳۳۸ نفوس پر مشتمل تھی، تقریباً اتنی ہی جتنی کہ سلطان سلیمان کے عہد میں تھی۔

مآخذ: (۱) Tabula Imperii : F.Hild ، J.Koder Byzantini ویانا ۱۹۷۶ء، ۲۰۵؛ (۲) Megali Elleniki Enkyklopedia ۱۶: ۱۰۱ـ۱۰۲؛ (۳) S.Bommelje، P.K.Doorn: Aetolla and the Aetolians towards the inter-disciplinary study of a Greek Region، اترخت ۱۹۸۷ء، جس میں طویل فہرست کتابیات بھی ہے۔ جن عثمانی مآخذ کا متن مقالہ میں ذکر آیا ہے وہ غیر مطبوع ہیں.

(M.Kiel [ت: محمد امین])

※ اومان: [رک بہ عُمان]

※ اویسیہ: صوفیا کا ایک گروہ، جو کسی فوت شدہ یا جسمانی طور پر غیر موجود [کسی اور جگہ پر موجود] بزرگ کی روح سے رابطہ کر کے رہنمائی یا فیضان حاصل کرتا ہے۔ یہ اصطلاح [حضرت] اویس قرنیؒ (م ۳۷ھ/ ۶۵۷ء) [رک بآں] کے نام سے لی گئی ہے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ [غیبی طور پر] روحانی رابطہ رکھتے تھے۔ ایک اور اہم اویسی شخصیت ابوالحسن علی بن احمد الخرقانیؒ (م ۴۲۵ھ/۱۰۳۳ء) [رک بآں] کی ہے، جو حضرت بایزید بسطامیؒ [رک بآں] کے مزار پر مسلسل کئی برس تک باقاعدگی سے حاضر ہوتے رہے اور ان کی روح سے فیضان حاصل کرتے رہے۔ الخرقانیؒ نے اللہ تعالیٰ سے بھی براہ راست تعلیم حاصل کرنے کا دعوی کیا ہے، جو اویسی روایت کا ایک اضافی پہلو ہے۔ مشہور شاعر حافظ شیرازی (م۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء یا ۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء) [رک بآں] کے مزار پر برصغیر [پاک و ہند] سے جانے والے ایک زائرنے ان کا ذکر ایک اویسی کی حیثیت سے کیا ہے (دیکھیے J.Baldick : Imaginary Muslims :The Uwaysi Sufis of Central Asia، لنڈن ۱۹۹۳ء، ص ۵ـ۲۱، بمواقع عدیدہ).

آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے بعد سے اب تک اویسی طریقے نے نقشبندی سلسلے میں ایک نئی جہت حاصل کر لی ہے۔ اس [سلسلے] کے بانی خواجہ بہاء الدّین نقشبندؒ (۷۱۸ـ۷۹۱ھ/۱۳۱۸ـ۱۳۸۹ء) [رک بآں] کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک اویسی بزرگ خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ (م۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء) کی روح سے تعلیم حاصل کی تھی۔ خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کے اخلاف نے دعوی کیا ہے کہ ان کے روحانی سلسلے میں بعض اور بزرگوں نے بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یا فوت شدہ صوفیا سے تعلیم حاصل کی ہے (کتاب مذکور، ص۲۵ـ۲۶).

اویسی نام کی ایک تحریک، دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں، مشرقی ترکستان میں موجود تھی، جس کے مرکزی رہنما ایک بزرگ خواجہ محمد شریفؒ (م ۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء۔ ۱۵۵۶ء) تھے۔ اس تحریک نے فارسی زبان میں لکھی گئی اویسی بزرگوں کے تذکروں پر مشتمل ایک کتاب، تذکرۂ بغراخانی کو بام شہرت پر پہنچا دیا۔ اس کتاب کے مصنف احمد بن سعدالدین اوزجانی، اوزجند، قیرغیزستان کے رہنے والے تھے۔ اس کتاب کا انتساب

قراخانی حکمران، ستوق بغراخان (م ۳۴۴ھ/ ۹۵۵ء) کے نام کیا گیا ہے (قلمی نسخے سے انگریزی زبان میں تلخیص در J. Baldick: *Imaginary Muslims*، ص ۵۴۔۲۰۱)۔ تاریخ [کے مطالعہ] سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری/ ساتویں صدی عیسوی سے آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی کے درمیانی عرصے میں، اویسی طریقے کو [زیادہ] رواج ملا۔ یہ کتاب تذکرۂ بغراخانی ایسی مختلف شخصیات کے حالات پر مبنی ہے، جو [جسمانی طور پر] موجود نہیں تھیں۔ اس میں [تحریر کیے گئے مختلف قصّوں میں] ہر شخص کو بطریق اویسی کسی نبی یا اولین دور کے کسی برگزیدہ مسلمان سے ہدایات ملتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ انبیاعلیہم السلام میں سے کوئی ایک اس کے قلب [کے عقب] پر یا اس کی پشت پر ہے۔ یہاں پر اہم نکتہ یہ ہے کہ [اس راہ پر چلنے والا] صوفی اس نبی سے مشابہت [نسبت] رکھتا ہو۔ اوزجانی اس بات پر زور دیتا ہے کہ یہ مشابہت [نسبت] اس وقت زیادہ کامل ہونی چاہیے جب وہ صوفی اس نبی کی پشت [قدم] پر ہو۔ چنانچہ [اوزجانی کے مطابق] ایک صوفی جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی پشت [قدم] پر ہوتا ہے، اسے فرشتے نظر آتے ہیں، وہ کثرت سے روتا ہے اور پھر اندھا ہوجاتا ہے [جبکہ] وہ صوفی جو حضرت داؤد علیہ السلام کی پشت [قدم]پر ہوتا ہے، خوش الحان ہوتا ہے اور عمداً کسی شخص کی موت کا باعث بنتا ہے۔ علی ہذا القیاس یہ تذکرے قصص الانبیاء [رک بآں] کے ادب کی طرز پر لکھے گئے ہیں جو وسطی ایشیا میں زیادہ پڑھے جاتے ہیں ۔ اس طرح [اس اسلوب تحریر کی وجہ سے] قاری کو ان تذکروں کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی اور رہنمائی ملتی ہے کیونکہ وہ انبیا علیہم السلام کے حالات سے پہلے ہی واقف ہوتا ہے۔ یہ کتاب، جیسا کہ اس کے مصنف نے مبینہ طور پر واضح کیا ہے، قاری کو باقاعدگی سے مسلسل پڑھنی چاہیے تاکہ وہ اس سے مدد لے کر بذات خود ایک ماہر اویسی بن جائے۔ اوزجانی نے وضاحت کی ہے کہ اویسی ایک خاص گمنامی کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ وہ کیا ہیں۔ اگر وہ اس دنیا میں عملی صوفی کی حیثیت سے ظاہر ہوں تو وہ غیبی ذرائع سے ہدایات یا رہنمائی لیتے ہیں.

ایک بہت اہم اویسی [بزرگ] برصغیر کے مشہور مصلح حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (۹۷۱ھ/ ۱۵۶۴ء۔ ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۴ء)[رک بآں] [المعروف بہ مجدد الف ثانیؒ] تھے جو نقشبندی سلسلے کے بھی اہم رکن تھے۔ وہ ہمیں ایک نقشبندی بزرگ [خواجہ محمد باقی باللہؒ]، [رک بآں]سے اسباق طریقت پڑھنے کے بعد بتاتے ہیں کہ وہ ایک ایسے [ماہر] اویسی بن گئے تھے، جو کسی نظر آنے والے استاد کی بجائے براہ راست حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فیضان [یا رہنمائی] حاصل کیا کرتے تھے۔ مزید براں وہ اللہ تعالیٰ سے بھی [براہ راست] ہدایات لیتے تھے (J.Baldick، کتاب مذکور، ص۲۶).

تخلص 'اویسی' ایک شاعر نے عثمانی [بادشاہ] مراد چہارم [رک بآں] (۱۰۳۲۔۱۰۴۹ھ/ ۱۶۲۳۔۱۶۴۹ء) کے دورِ حکومت میں، ترکی زبان میں لکھی گئی ایک طویل نظم میں استعمال کیا ہے۔ حکومت کی خستہ حالی پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ [اس نظم میں] اس دور کے فقہا، منتظمین اور صوفیا پر [بھی] تنقید کی گئی ہے۔ شاعر نے موازنہ کرتے ہوئے بہت سے اولیاے کرام کی مدح کی ہے۔ اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کی روح نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری اور خدمت کی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے رازوں سے [بھی] واقف ہے (حوالہ مذکور، ص ۷۔۲۶ اور [رکّ بہ ویسی]).

بیسویں صدی عیسوی میں، ایران میں، ایک نئی اویسی تحریک، ہم عقیدگی اور آبائی طریق کے خلاف شعوری رد عمل کے طور پر موجود رہی ہے۔ اس تحریک کے مرکز

[و رہنما] محمد عنقا (۱۳۰۶-۱۳۸۲ھ/۱۸۸۷ء-۱۹۶۲ء) اور اس کا بیٹا رہے ہیں۔ یہ [تحریک] ان کوششوں سے متصف رہی ہے جو تصوف کو جدید مغربی طبیعی علوم (Natural Sciences) کے نتائج سے متصل کر کے، اسے ترقی دینے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ محمد رضا شاہ [پہلوی] (۱۹۴۱ء-۱۹۷۹ء [رک بآں]) کے دور حکومت میں، اس تحریک کے اجلاسوں میں [محمد رضا شاہ پہلوی] کی شاہی حکومت کے اراکین شریک ہوتے تھے۔ ۱۹۷۸ء-۱۹۷۹ء میں، انقلاب [ایران] کے بعد، اس تحریک کی سرگرمیاں امریکہ جلاوطنی میں جاری رہیں، جبکہ دوسرے کئی ممالک میں بھی اس تحریک کی شاخیں قائم ہوئیں۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں۔

(J.Baldick [ت: سید محمد توقیر احمد اظہر])

••-------------••

※ ایاز اسحاقی: (۱۸۷۸ء-۱۹۵۴ء) ایک تاتاری سیاست دان اور ادیب۔ وہ جیلاجٹ ڈن (Giylajetdin) کے گھر میں ۲۳ فروری ۱۸۷۸ء کو پیدا ہوا، اس کا والد جبرنیا (Kazan guberniya) کے گاؤں یاشرما میں امام مسجد تھا۔ ایاز (یاجیاز) اسحاقی نے روایتی تعلیم چشتی (Chistay) نامی مدرسہ سے (۱۸۹۰ء-۱۸۹۳ء) کزان کے "مدرسہ کولبو (Kulbue) سے حاصل کی (۱۸۹۳ء-۱۸۹۸ء)۔ ۱۸۹۸ء میں اس نے کزان کے مدرسہ معلمین میں داخلہ لیا، جہاں سے اس نے ۱۹۰۲ء میں گریجویشن کی جس کی بنیاد پر اُس نے روسی زبان کے اُستاد کی حیثیت سے کزان اور اورن برگ (Orenburg) میں ملازمت حاصل کی۔ ۱۹۰۳ء میں وہ مختصر عرصہ کے لیے قصبے کے امام کے فرائض سرانجام دینے کے لیے یاشرما واپس آیا۔

اپنے طالب علمی کے دور میں اسحاقی ۱۸۹۵ء میں تاتاری نوجوانوں کے گروہ کی طرف سے تشکیل کردہ پہلے ادبی سیاسی حلقے میں شامل ہوا۔ اس نے ہاتھ کی مشین کے ذریعے اشاعت پذیر ایک اخبار "ترقی" جاری کیا اور ۱۹۰۱ء میں شاکردلک (Shakirdlik) پارٹی قائم کی۔ ایک سال بعد اس کا نام بدل کرُ حریّت پارٹی رکھ دیا اور خالصتاً سیاسی مقاصد کو اپنا لیا۔ اس دور میں اسحاقی نے کزان کے روس کے سوشلسٹ انقلابی حلقوں سے روابط قائم کیے اور اُن سے ایک خصوصی طریقۂ کار سیکھا۔ جسے یاشرما میں اس کے مختصر قیام کے اختتام اور کزان کی طرف اس کی واپسی کا سبب کہا جاسکتا ہے.

کزان واپس آکر اسحاقی انقلابی حلقوں میں شامل ہوگیا۔ ۱۹۰۵ء میں اس نے فواد تکتر (Tuktar) کے ساتھ مل کر تنگ چلر (Tangchilar) کے نام سے ایک خفیہ سیاسی تاتاری جماعت کی بنیاد رکھی اور زار حکومت کے خاتمہ کی وکالت کرنے والے دو سوشلسٹ اخبار تنگ (صبح) اور تنگ یولدیزی (ستارۂ صبح) جاری کیے۔ ۱۹۰۵ء کے موسم خزاں میں اس نے تکتر کے ساتھ مل کر سوشلسٹ پارٹی برک (Brek) قائم کی اور اس کا اخبار "آزاد" جاری کیا۔ بعد ازاں یہ اخبار "آزادیٔ خلق" کے نام سے اشاعت پذیر ہوتا رہا۔

اگست ۱۹۰۵ء میں اسحاقی نے سلطنت روس کے مسلمانوں کی پہلی کانگرس میں شرکت کی اور اس میں بیس انقلابی قوم پرستوں کی سربراہی کی جو مندوبین کی اکثریت کے معتدل نظریات کے مخالف تھے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے ایک سیاسی اتحاد کے حامی تھے۔ یہ نااتفاقی تیسری کانگرس (اگست ۱۹۰۶ء) میں اور بڑھی جس میں اسحاقی نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ مذہب اور کلچر میں اتحاد طبقاتی اختلافات کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کو ایک سیاسی پارٹی کے طور پر یکجا کرنے کے لیے ناکافی ہے.

۱۹۰۶ء تک اسحاقی نہ صرف اس کے سیاسی فلسفۂ انقلاب سے عدم دلچسپی رکھنے والے تاتاریوں سے متصادم رہا، بلکہ روسی حکومت سے بھی۔ ۱۹۰۵ء میں اس کے اخبار تنگ یولدیزی پر پابندی عائد کردی گئی اور اسحاقی کو

گرفتار کرکے چشتے جیل بھجوا دیا گیا۔ رہا ہونے پر اس نے اخبار تویش (آواز) جاری کیا جس نے اپنے دونوں پیشرو اخبارات کی سوشلسٹ انقلابی روش کو جاری رکھا۔ حکومت کی طرف سے فوری ردعمل سامنے آیا، اسحاقی کو گرفتار کرلیا گیا اور چھ ماہ کے لیے جیل بھجوا دیا گیا۔ بعدازاں اسے تین سال کے لیے ارخان جلسک (Arkhangelsk) میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ چھپ کر وہاں سے بھاگ آیا اور سینٹ پیٹرز برگ چلا گیا اور وہاں چھپا رہا، تاہم پولیس نے اُسے گرفتار کرلیا اور جلاوطن کرکے ولگڈا (Vologda) بھجوا دیا جہاں وہ ۱۹۱۳ء تک مقیم رہا۔

چونکہ اسحاقی کو کزان واپس آنے کی اجازت نہ تھی اس لیے اس نے اپنے آئندہ منصوبے بروئے کار لانے کے لیے سینٹ پیٹرزبرگ کو اپنی اقامت کے لیے منتخب کیا۔یہ منصوبے ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۳ء کے درمیانی عرصہ میں اخبارات "اِل" (مملکت) اور "سوز" (لفظ) اور "بزنگ اِل" (ہماری مملکت) کے اجرا کی صورت میں سامنے آئے۔ اس وقت تک اسحاقی سیاسی طور پر معتدل مزاج ہوگیا تھا اور سوشلسٹوں کے فلسفۂ انقلاب کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ وہ اتفاق پارٹی کے اعتدال پسند موقف کے قریب تر ہوگیا، جو تمام مسلمانوں کے اتحاد میں طبقاتی اختلافات کو رکاوٹ تصور نہیں کرتی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں اسحاقی نے اتحاد اور اشتراک عمل کے نظریئے کو فروغ دینے کے لیے سلطنت روس کے مسلم علاقوں کا دورہ کیا۔

فروری ۱۹۱۷ء میں رومانوف (Romanov) خاندان کے زوال کے بعد،اسحاقی نے اسی سال کے دوران (مئی میں ماسکو اور جولائی میں کزان) میں روسی مسلمانوں کی دو کانگرسوں کے انعقاد میں معاونت کی۔ اسحاقی نے دوسری کانگرس میں مسلمانان والگا۔ یورال کے لیے قومی ثقافتی خودمختاری کا اعلان کیا۔ اس کانگرس نے ملی مجلس، ملّی شوریٰ اور 'ملّی ادارہ' بھی قائم کیے۔ اسے والگا۔ یورال کے مسلمانوں کی کمیٹی برائے امور خارجہ کا سربراہ بھی بنا دیا گیا، لیکن جب ۱۹۱۸ء میں سرخ فوج نے والگا۔ یورال خطے کے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کرلیا تو ملّی ادارہ کو ختم کر دیا گیا۔ چونکہ بالشویکوں کے علاقائی دشمن اسحاقی کے بھی حریف تھے، لہٰذا وہ ملّی ادارہ کے ساتھ قزاق میدانوں کے شمالی اطراف میں واقع کیزلیار (پیٹروپاف لوسک) منتقل ہوگیا، جہاں اس نے اخبار مایک 'روشنی کا گھر' جاری کیا۔

۱۹۱۹ء میں اسحاقی والگا۔ یورال خطہ کے مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے یورپی امن کانفرنس میں شرکت کے لیے (براستہ جاپان) روانہ ہوا۔ یہ روانگی ایک سیاسی جلاوطن کی حیثیت سے اس کی زندگی کی ابتدا ہے جس کے دوران میں وہ وارسا، پیرس، برلن، مکڈن، انقرہ اور استانبول گیا۔ اس عرصے میں اس نے مسلمانان والگا۔ یورال کے قومی وجود کے احیا اور آزادئ وطن کے لیے ان کی جدوجہد کی تائید وحمایت کے لیے مساعی جاری رکھیں۔ وارسا میں اسحاقی (Promethee) کے نام سے موسوم تنظیم میں شامل ہوکر روس کی نسلی اقلیتوں کی آزادی کے حصول کے لیے سرگرم رہا۔ ۱۹۲۸ء میں اس تنظیم کا نام بدل کر یانگاملّی یُل (نیا قومی راستہ) رکھ دیا گیا۔

اسحاقی نے ۱۹۳۱ء میں القدس میں منعقد ہونے والی مسلم کانفرنس میں مسلمانان والگا۔ یورال کی نمائندگی کی اور مسلم ترک اتحاد کے حصول کے لیے جدوجہد جاری رکھنے کا اعلان کیا۔ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۸ء کے مابین اس نے والگا۔ یورال مسلم اقلیتی خطہ دیاسپورہ (Diaspora) کی ایک تنظیم کے قیام کے لیے فن لینڈ، عرب ممالک، منچوریا، کوریا اور جاپان کا دورہ کیا۔ جب ۱۹۳۵ء میں اس خطہ کی قومی کانگرس مکڈن میں منعقد ہوئی تو اُس نے اسحاقی کو اپنی قومی کونسل کا صدر منتخب کر لیا۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں والگا۔ یورال خطہ کے لوگوں کی آواز دنیا کے لوگوں

تک پہنچانے کے لیے اس نے اخبار ملّی بیرک (قومی پرچم) کا اجرا کیا جو ۱۹۴۵ء کے وسط تک اشاعت پذیر رہا۔ اس کے جاری کردہ اخبارات میں سے یہی جنگ عظیم دوم میں، جرمنی کے استبداد کے دوران بھی، شائع ہوتا رہا۔ جنگ کے بعد اسحاقی ترکی چلا گیا اور اپنی وفات ۲۲ جولائی ۱۹۵۴ء تک انقرہ میں مقیم رہا.

اسحاقی نے ترک اتحاد اور مسلمانان والگا۔ یورال کے لیے قومی خود مختاری کے لیے کوشاں سرگرم سیاست دان کی حیثیت سے سہ گونہ فکری ورثہ چھوڑا ہے۔ وہ اس نظریئے کو پروان چڑھانے والا ایک صحافی اور تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والا ادیب تھا۔ اس نے روشن خیالی، انصاف اور جدیدیت سے مربوط معاشی اور سیاسی ترقی کے اعلیٰ تصورات اپنی تحریروں کے ذریعے منعکس کیے۔ اس کی ادبی تصانیف کی تعداد پچاس کے قریب ہے جن میں مختصر کہانیاں، داستانیں، ناول، ڈرامے، سرگزشتیں اور تاریخی انشائیہ جات کے تراجم شامل ہیں۔ اس کے موضوعات کا دائرہ خاصا وسیع ہے، اپنے تخیلاتی ناول *Iki Yoz eldan Song inkiyraz* (دو سو سال بعد۔۔ انقراض مطبوعہ کزان، ۱۹۰۴ء) میں اس نے معاشرتی ترقی کی ایک شرط کی حیثیت سے تعلیم کی اصلاح اور اسے جدید بنانے کے مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اپنے ڈرامے زلیخا (مطبوعہ ماسکو، ۱۹۱۸ء) میں اس نے لوگوں کو جبراً عیسائی بنانے کی روسی حکومت کی پالیسیوں کے نتیجہ میں رونما ہونے والے المیہ واقعات کو موضوع بنایا ہے۔ دیگر ڈراموں اور کہانیوں میں اس نے معاشرتی انصاف، عورتوں کی زندگی اور تعلیم کی اہمیت جیسے موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ اسحاقی کے سیاسی نظریات کا واضح ترجمان اس کا ڈرامہ Dulkin ecrende (موج میں؛ مطبوعہ پیرس، ۱۹۲۰ء) اور اس کا ناول Oyga taba (گھر کی طرف؛ مطبوعہ برلن، ۱۹۲۲ء) ہیں، جن میں قوم پرستانہ اور پان توران وزم پر مبنی فکار کا غلبہ ہے۔ [رکّ بہ پان توران ازم].

۱۹۲۶ء کے بعد سویت یونین میں شائع ہونے والے تاتاری ادب اور ثقافت کی کتب تاریخ میں اسحاقی کا نام محو کردیا گیا اور اس کا ذکر صرف سوویت عوام کے دشمن اور ایک قوم پرست کی حیثیت سے تحقیراً کیا جاتا رہا۔ ۱۹۸۸ء میں اخبار *Vechernyaya Kazan* میں شائع ہونے والا ابراہیم نورالعین کا مقالہ اسحاقی کے ہم وطنوں کو اس کی طرف متوجہ کرنے کے سلسلے میں پہلا قدم تھا۔ بعدازاں اخبارات اور رسائل *Kazan Utlari* (آتش ہائے کزان)، میراث اور تاتارستان نے اس کے متعلق مقالات شائع کیے، نیز اس کی بعض تصانیف دوبارہ شائع کی گئیں۔ ۱۹۹۱ء میں تاتارستان کے اُدبا کی یونین نے اسحاقی کے اعزاز میں ایک ادبی انعام کا اعلان کیا، اسے حاصل کرنے والا پہلا ادیب رابت بتہ اللہ تھا، جس کی تصانیف مسلمانان والگا۔ یورال کے مستقبل کے بارے میں اسحاقی کے مثالی تصورات اور امیدوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں.

مآخذ:(۱) آغا، ایچ، ایس اکص وطاہر چغتائی (مدیران): *Mukammed Ayaz Ishaki Hayati ve faaliyeti: 1oo Dogum Yili Dolyisiyla*، مطبوعہ انقرہ، ۱۹۷۹ء؛ (۲) نورالعین، ابراہیم: *Vozvrashchenie Gayaza Ishaki*، در *Vechernyaya kazan*، ۱۰/۱۷ (۱۹۸۸ء)؛ (۳) وہی مصنف: ”*Gayaz Iskhakiyga Yoginti*“، در *Kazan utlari*، شمارہ۲ (۱۹۹۳ء): ۱۵۳۔۱۵۷؛ (۴) سعدی، اے: *Tatar adabiyati tarikhi*، کزان، ۱۹۲۶ء؛ (۵) سلطان، ایس: ”*A Ayaz Ishaki Idilli: Biograpby*“ Central Asian Servey شمارہ ۲ (۱۹۹۰ء): ص۱۳۳۔ ۱۴۳؛ (۶) Validov Dzhamaliutdin: *Ocherki istorii Obrazovannosti i literatury Tatar*، ماسکو وپیٹرگراڈ، ۱۹۲۳.

(آزاد عاصی روولیچ [ت: ظفر علی])

••-------------••

ⓧ ایران: سرکاری نام: جمہوری اسلامی ایران (Islamic Republic of Iran)، مغربی ایشیا (مشرقِ وسطی) کا ایک مسلم اکثریتی ملک، اس کی سرحدیں شمال میں وسطی ایشیا کی مسلم جمہوریاؤں آرمینیا، آذربائیجان، ترکمانستان اور بحیرہ قزوین (کاسپین) سے، مغرب میں عراق اور ترکی سے، جنوب میں خلیج فارس اور خلیج عمان سے جب کہ مشرق میں افغانستان اور پاکستان سے ملتی ہیں۔

ملک کا کل رقبہ ۱,۶۴۸,۰۰۰ مربع کلومیٹر پر محیط ہے۔ انتظامی اعتبار سے پورے ملک کو ۲۶ صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اہم شہروں میں تہران (دارالحکومت)، مشہد، اصفہان، تبریز، شیراز، اہواز، قم، زاہدان، ہمدان، مہرشہر، کرمان، اردبیل، یزد، قزوین، زنجان، بندرعباس، خرم آباد، اسلام شہر، رشت، کرمان شاہ اور سمنان وغیرہ شامل ہیں۔

۲۰۰۲ء کی مردم شماری کے مطابق ملک کی کل آبادی (۶۵,۴۵۷,۰۰۰) نفوس پر مشتمل ہے۔ اکثریتی آبادی فارسی النسل (۵۰٪) ہے۔ ترکی زبان بولنے والی آذربائیجانی آبادی کا تناسب ۲۴٪ ہے۔ بقیہ آبادی مازندرانی (۸٪)، کرد (۷٪)، ترک(۳٪)، عرب (۳٪)، بلوچ (۲٪) اور ترکمان وغیرہ، جیسے چھوٹے چھوٹے نسلی و لسانی گروہوں پر مشتمل ہے۔ ایران کی آبادی کی غالب اکثریت (۹۰٪) شیعہ مذہب کی پیروکار ہے۔ کرد، بلوچ، ترک اور ترکمان جیسے نسلی و لسانی گروہوں کی بھاری اکثریت سنی العقیدہ ہے۔ ملک میں چھوٹی چھوٹی غیر مسلم اقلیات، عیسائی (۰۵٪) یہودی، زرتشتی (۲ء۸٪)، اور بہائی وغیرہ بھی موجود ہیں (Encyclopaedia Britannica:Book of the Year 2003، ص ۶۳۳؛ "The Nation and Its Minorities William Samii Ethnicity, Unity and State Policy in Iran"، در Comparative Studies of South Asia, Africa and the Middle East، ج۲۰، عدد ۱، ۲ (۲۰۰۰ء) ، ص ۲۸)۔ ایک اندازے کے مطابق ایران میں سنی العقیدہ آبادی تیس فی صد سے بھی زیادہ ہے (خورشید احمد: تحریک اسلامی: درپیش چیلنج، اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز ، طبع دوم، ۱۹۹۵ء ، ص ۴۲)۔

جدید تاریخ: ایران کے ۱۹۵۳ء تک کے تاریخی، مذہبی و سیاسی ، تہذیبی و معاشرتی اور اقتصادی حالات و واقعات کے لیے ملاحظہ ہو: آ آ آ، ج ۳، ص ۶۲۷-۷۰۱۔

ایران (۱۹۵۳-۱۹۷۹ء): محمد رضا شاہ پہلوی نے ۱۹/اگست ۱۹۵۳ء کو امریکہ اور برطانیہ کی بھر پور امداد و حمایت سے قوم پرست وزیراعظم ڈاکٹر محمد مصدق (۱۹۵۱-۱۹۵۳ء) کی حکومت کو ختم کر کے ملکی اقتدار و سیاست پر ایک بار پھر اپنی گرفت قائم کرلی۔ اس سلسلے میں امریکہ کی خفیہ ایجنسی سی ۔ آئی۔ اے۔(CIA) اور تہران میں امریکی سفارت خانے نے کلیدی کردار ادا کیا۔ امریکی صدر آئزن ہاور (۱۹۵۳-۱۹۶۰ء) نے ڈاکٹر محمد مصدق کا تختہ الٹنے کے منصوبے کی منظوری دی تھی جبکہ معدنی تیل کی عالمی تجارت اور بنک کاری سے وابستہ بعض امریکی حلقوں نے سی۔ آئی۔ اے کو مصدق مخالف تحریک اور خصوصاً "فوجی انقلاب" کو منظم کرنے کی غرض سے مالی امداد بہم پہنچائی تھی۔ اس مہم میں راک فیلر (Rockefeller) خاندان، کا کردار بڑا نمایاں رہا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: William Blum: The CIA: A Forgotton History، لنڈن: زید بکس، ۱۹۸۶ء ،ص ۶۷-۷۶؛ وہی مصنف: Killing Hope :US Military and CIA Interventions Since World War II، لنڈن: زید بکس ،۲۰۰۳ء، ص ۶۴- ۷۱)۔

یہ واقعہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ایران کی داخلی سیاست میں امریکہ کی براہ راست اور کھلم کھلا مداخلت کا نقطۂ آغاز تھا۔ بعد کے سالوں میں ایران کی داخلی

سیاست، اقتصادی و خارجہ پالیسی، تعلیمی و زرعی اصلاحات وغیرہ امور و معاملات سمیت اس کے اہم ملکی و قومی اداروں بالخصوص فوج میں امریکی اثر و نفوذ انتہائی حد تک بڑھ گیا۔ چنانچہ امریکہ ہی کی خواہش و ایما پر شاہ نے محمد مصدق کی جگہ جنرل فضل اللہ زاہدی کو وزیراعظم مقرر کیا۔ علاوہ ازیں سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ کے زمانے میں ایران امریکہ کا ایک اہم فوجی اتحادی اور سوویت یونین کے خلاف جاسوسی کا اڈہ بن کر رہ گیا (ملاحظہ ہو: Gary Sick: All Fall Down: Americans Fateful Encounter With Iran لنڈن: آئی بی ٹاؤرس، ۱۹۸۵ء، ص ۶-۷؛ Killing Hope: US Military and CIA Interventions: ص ۶۴-۷۱)۔ شاہ نے نہ صرف ڈاکٹر محمد مصدق کو نظر بند کر دیا، بلکہ اس کی قائم کردہ سیاسی جماعت محاذ ملی (نیشنل فرنٹ) کے علاوہ سوویت نواز "تودہ" جماعت پر کاری ضرب لگائی۔ محاذ ملی کے متعدد سربرآوردہ رہنماؤں کو سزائے موت و عمر قید کی سزائیں دی گئیں۔ اس کے سیکڑوں ارکان اور حامیوں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ جہاں ان کو سخت تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ان حالات میں مصدق کے کچھ ساتھی امریکہ و یورپ کی طرف نکل گئے۔ جب کہ دوسرے خاموش رہنے اور سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیے گئے۔ محاذ ملی کے حامی بعض دانش وروں نے تہران یونیورسٹی میں تحقیق و تدریس کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ شاہ نے تودہ جماعت کے تنظیمی ڈھانچہ کو مکمل طور سے تباہ کر دیا (Marvin Zonis: The Political Elite of Iran، پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۱ء، ص ۷۰؛ The Times Guide to the Middle East، لنڈن: ٹائمز بکس، ۱۹۹۱ء، ص ۷۶-۷۷)۔

محمد رضا شاہ پہلوی نے اقتدار و سیاست پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنے کی غرض سے اپنے والد رضا شاہ پہلوی (۱۹۲۵ء-۱۹۴۱ء) کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، کلی طور پر فوج پر اعتماد و انحصار کی روش اختیار کی۔ اس نے فوج میں موجود اشتراکی نظریۂ حیات کی حامی و علمبردار تودہ جماعت کے حامی و رکن پانچ سو سے زائد افسران کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا۔ ان میں سے بیسیوں کو سزائے موت دی گئی، جب کہ کافی بڑی تعداد کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ شاہ کے اس اقدام سے فوج میں سے بھی تودہ کی قوت کا بڑی حد تک استیصال ہو گیا۔ شاہ نے فوج پر جسے وہ اپنی بادشاہت کا محافظ گردانتا تھا، اپنی گرفت کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے قریبی دوستوں، رشتہ داروں اور وفادار ساتھیوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ ان کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافے کے علاوہ انہیں بھاری مراعات و سہولیات سے نوازا (Leonard Binder: Iran : Political Development in a Changing Society، برکلی ولاس اینجلس: کیلی فورنیا یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۴ء، ص ۱۴۷-۱۴۸)۔ محمد رضا شاہ پہلوی نے حفظ ماتقدم کے طور پر تودہ، محاذ ملی اور دیگر سیاسی و مذہبی جماعتوں کی طرف سے مستقبل میں کسی ممکنہ خطرے سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سی۔ آئی۔ اے اور اسرائیل کی خفیہ تنظیم موساد کی مدد و تعاون سے ایک خفیہ پولیس ساواک (سازمان امنیت واطلاعات کشور) قائم کی۔ امریکی سی۔ آئی۔ اے اور اسرائیلی موساد کے مشیروں کی براہ راست نگرانی میں اس تنظیم کے اہلکاروں کی تربیت کا انتظام کیا۔ سی آئی اے اور موساد نے شاہ کے سیاسی مخالفین کو کچلنے کی غرض سے ساواک کے اہلکاروں کو جبر و تشدد، ظلم و ستم اور ایذا رسانی کے نت نئے حربے سکھا کر اسے ایک خونخوار اور درندہ صفت ادارہ بنا دیا۔ ساواک نے

نقشہ اسلامی جمہوریہ ایران
دارالحکومت
بین الاقوامی سرحد
اہم شہر
شہر
ریلوے لائن
دریا
شاہراہ
نہر
برساتی ندی
پہاڑی چوٹی
تاریخی کھنڈر
نمکین جھیل
ایران
ترکمانستان
ازبکستان
تاجکستان
افغانستان
پاکستان
عراق
ترکی
آذربائیجان
سعودی عرب
عمان
متحدہ عرب امارات
بحیرۂ خزر
(بحیرۂ کیسپین)
خلیج فارس
(خلیج عربی)
خلیج عمان
بحیرۂ عرب
دشت کویر
دشت لوت
خراسان
سیستان
بلوچستان
فارس
کرمان
اصفہان
مازندران
ہمدان
طہران
بغداد
مشہد
شیراز
تبریز
قرہ قم
عشق آباد
مرو
چہارجو
جھیل ہامون
بحرین
قطر
مسقط

شاہ مخالف سرگرمیوں کے شبہ میں تودہ، محاذ ملی اور ایک اسلامی عسکری تنظیم "فدائیین اسلام" کے ارکان اور حامیوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کرنا شروع کر دیا۔ جہاں پر عقوبت خانوں میں ان کو انتہائی تشدد اور ایذا کا نشانہ بنایا جاتا (The CIA: A Forgotton History، ص ۷۶؛ All Fall Down ، ص ۲؛ Iran: Political Development، ص ۱۴۹).

شاہ نے ملک میں تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی اور ان کے اخبارات و رسائل کی اشاعت روک دی۔ (The Political Elite of Iran، ص،۴-۵، ۳۹-۴۱؛ Iran:Political Development، کتاب مذکور ، ص، ۲۰۳، ۲۸۷-۲۸۸)۔ اس نے ۱۹۵۷-۱۹۶۱ء کے دوران میں عوام کی سیاسی سرگرمیوں کو منضبط کرنے کے لیے دو جماعتی سیاسی نظام متعارف کرانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کے وفا دار افراد نے دو سرکاری سیاسی جماعتیں "ملیّون" اور "مردم" بنائیں۔ اسد اللہ عالم کی سیاسی جماعت مردم نے سرکاری حزب مخالف کا کردار سنبھال لیا۔ اس جماعت نے زرعی اراضی کی از سر نو تقسیم، مزدوروں کی فلاح و بہبود اور خواتین کے لیے مساوی حقوق کا نعرہ لگایا۔ ملیون، جو وزیر اعظم ڈاکٹر منوچہر اقبال نے قائم کی تھی، کا منشور شاہ کی پالیسیوں کی حمایت و وکالت تھا۔ ان دونوں جماعتوں کی قوت و طاقت کا انحصار عوام کی سیاسی حمایت کے بجائے شاہ کی خوشنودی و نظر التفات و سرپرستی پر تھا۔ لہٰذا انہیں عوام میں پذیرائی نہ حاصل ہو سکی (Iran:Political Development، ص، ۲۲۲ -۲۲۳؛ The Political Elite of Iran ، ص، ۴۲-۴۳) یہ دونوں جماعتیں ملک میں قائم سیاسی جبر کے ماحول کو ہلکا کرنے اور سیاسی آزادیوں کو بحال کرانے میں ناکام رہیں۔ ۱۹۶۰-۱۹۶۱ء کے دوران میں یکے بعد دیگر دو بار مجلس کے انتخابات ہوے ، ان انتخابات کا محاذ ملی اوردیگر سیاسی و مذہبی گروہوں نے بائیکاٹ کیا تھا۔ مردم اور ملیون کے رہنماؤں کے مابین رسہ کشی کے سبب کوئی مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی اور ملک میں ایک سیاسی بحران کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ دریں حالات شاہ نے (۱۹۶۱ء کے انتخابات کے بعد) مجلس، جس پر جاگیر داروں کا غلبہ تھا، معطل کر دی، جو ستمبر ۱۹۶۳ء تک بدستور معطل رہی۔ شاہ کے اس اقدام نے اس کے اپنے تخلیق کردہ سیاسی نظام کی ناکامی پر مہر تصدیق ثبت کر دی (The Political Elite of Iran، ص ۴).

اقتصادی و تعلیمی ترقی: محمد رضا شاہ پہلوی نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ملک کی تعمیر و ترقی کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں اس نے ۱۹۵۵ء میں ملک میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے تحفظ کا قانون نافذ کیا، جس سے ملک میں غیر ملکی سرمایہ کاری کی راہ پھر سے ہموار ہو گئی۔ تیل کی برآمد سے حاصل ہونے والی آمدنی نیز امریکہ سے تکنیکی و مالیاتی امداد سے دوسرے سات سالہ ترقیاتی منصوبے ۱۹۵۵ -۱۹۹۲ء کا آغاز کیا گیا۔ یہ منصوبہ مربوط ترقیاتی حکمت عملی سے عاری تھا۔ اس کے لیے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سے کثیر مقدار میں قرضہ حاصل کیا گیا۔ زیادہ تر توجہ بڑے ترقیاتی منصوبوں، ڈیموں ،کپڑے ، چینی اور سیمنٹ کے کارخانوں کے قیام پر مبذول رہی۔ ۱۹۵۷-۱۹۶۰ء کے دوران میں ملک اقتصادی ابتری کا شکار رہا۔ روایتی اقتصادی شعبے زراعت اور ملکی تجارت بری طرح متاثر ہوے۔ اقتصادی مسائل نے عوامی بے چینی میں اضافہ کیا۔ روایتی کاروباری و پیشہ ور طبقات حکومتی پالیسیوں سے بری طرح متاثر ہوئے۔ دیہی علاقوں سے شہروں کی طرف نقل مکانی کرنے والی آبادی کو بے روزگاری کا سامنا تھا (M.H. Pesaran: Economic Development and Revolutionary

Haleh Afshar، در Upheavals in Iran (مدیر)، Iran:A Revolution in Trial، ص، ۱۹-۲۱) .

محمد رضا شاہ پہلوی نے ملک میں جدید تعلیم کی اشاعت پر بڑی توجہ دی۔ ۱۹۵۵-۱۹۶۰ء کے دوران میں بہت بڑی تعداد میں ابتدائی تعلیم کے مدارس قائم کئے گے۔ جدید تعلیم کی اشاعت کی غرض سے امریکی ماہرین تعلیم اور مشیروں کی خدمات حاصل کی گئیں اور وزارت تعلیم کو عملاً ان کے حوالے کر دیا گیا۔ مزید براں اس نے متعدد یورپی و امریکی جامعات اور دیگر فنی و تعلیمی اداروں کے تعاون سے تربیت اساتذہ، انصرام عامہ (Public Administration) اور زرعی و فنی تعلیم کے ادارے بڑی تعداد میں قائم کئے۔ غیر ملکی ماہرین کی نگرانی میں متعدد جامعات بھی قائم کی گئیں۔ اعلیٰ تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے پر بھی بڑی توجہ دی گئی (Joseph S. Szyliowicz: Education and Modernization in the Middle East، اتھاکا ولنڈن: کارنل یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۳ء، ص ۳۹۱-۴۰۳، ۴۳۲-۴۳۵)۔ شاہ نے ۱۹۵۹ء کے دورہ امریکہ کے بعد ایران میں امریکی جامعات کے طرز پر، پنسلوانیا یونیورسٹی کے تعاون سے، شیراز میں پہلوی یونیورسٹی قائم کی (جون ۱۹۶۲ء)۔ شاہ کا ارادہ اس کو ایک اعلیٰ پائے کی تدریسی و تحقیقی جامعہ بنانے کا تھا۔ اس جامعہ کے قیام کا ایک بڑا محرّک جامعہ تہران کی، جو شاہ مخالف سرگرمیوں کا مرکز گڑھ بن گئی تھی، اہمیت کو کم کرنا تھا (Education and Modernization in the Midle East، ص ۴۳۴-۴۳۵)۔

جدید تعلیم کی اشاعت نے ملک میں ذہنی و فکری اور تہذیبی و سماجی تبدیلیوں کے لیے زبردست قوت محرکہ کا کردار ادا کیا۔ جدید طرز کے تعلیمی اداروں بالخصوص جامعات میں زیر تعلیم نوجوان نسل پر جدید مغربی خیالات اور طرز زندگی کے اثرات نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگے۔ اس نوجوان نسل میں سیکولرازم کی افزائش ہوئی، مغربی عادات و اطوار اور طرز زندگی کی نقالی (غرب زدگی) کے رجحان میں تیزی آئی اور اپنے قدیم مذہب اور تہذیبی و معاشرتی اقدار و روایات سے اس کا تعلق کمزور پڑ گیا۔ جدید تعلیم کی اشاعت سے ملک کی نوجوان نسل کے دل و دماغ میں مروّجہ نظام حکومت اور سماجی ناہمواریوں بالخصوص صدیوں سے رائج جاگیردارانہ نظام کے بارے میں بے اطمینانی و بے زاری کے جذبات بھی پرورش پانے لگے (Education and Modernization in the Middle East، ص، ۳۹۱-۳۹۸)۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آغاز میں محاذ ملی اور تودہ جماعت میں ایک بار پھر زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ان جماعتوں کے رہنماؤں کی طرف سے بادشاہت و جاگیر دارانہ نظام کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں۔ ان دونوں جماعتوں نے ایک بار پھر ایرانی عوام کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ہزاروں کی تعداد میں طلبہ بھی محاذ ملی اور تودہ جماعت میں شامل ہوگئے۔ تودہ جماعت کو کسانوں اور صنعتی مزدوروں کے حلقوں میں گہرا اثرو نفوذ حاصل ہوگیا۔ ایرانی جامعات، بالخصوص جامعہ تہران، حکومت مخالف سرگرمیوں کا مرکز بن گئیں۔ ۱۹۶۰ء سے طلبہ نے حکومت مخالف مظاہروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ فوج اور پولیس نے طلبہ کو دبانے کے لیے طاقت کا بے دریغ استعمال کیا۔ ۱۹۶۰-۱۹۶۱ء کے دوران میں بیسیوں طلبہ ہلاک و زخمی ہوے۔ ۱۹۶۱ء کے اوائل میں تہران میں محاذ ملی کی دعوت پر عام ہڑتال ہوئی۔ اسی سال مئی میں تہران میں اسکولوں کے اساتذہ نے تنخواہوں میں اضافے کے لیے احتجاجی مظاہرے کیے۔ مظاہروں کے دوران درجنوں اساتذہ پولیس کے ہاتھوں ہلاک و زخمی ہوے۔ وزیراعظم شریف امامی

پولیس کے ہاتھوں اساتذہ کی ہلاکت پر احتجاجاً مستعفی ہو گئے۔ محاذ ملی داخلی خلفشار اور سربرآوردہ قائدین کی بیرون ملک جلا وطنی کے سبب سیاسی قیادت کے خلا کو پر نہ کر سکی۔ تاہم اسی سال ایک مذہبی رہنما آیت اللہ طالقانی (۱۹۱۱-۱۹۷۹ء) اور محاذ ملی کے ایک سابق رہنما ''مہندس مہدی بازرگان'' نے ایک نئی سیاسی جماعت ''نہضت آزادی ایران'' کے نام سے قائم کی (۱۹۶۱ء)۔ یہ جماعت اسلامی نظریۂ حیات کی بالا دستی اور جمہوریت کی علمبردار تھی۔ جلدی ہی اسے کثیر تعداد میں طلبہ، دانش وروں اور علما کی حمایت حاصل ہو گئی (Education and Modernization in the Middle East، ص ۴۰۵-۴۰۷؛ The Political Elite of Iran ، ص ۴۱، -۴۳؛ H.E.Chehabi: Iranian Politics and Religious Modernism، The Liberation Movement of Iran Under the Shah and Khomeini: ، لنڈن: آئی۔ بی۔ ٹاؤرس، ۱۹۹۰ء، ص، ۱۷۱- ۱۷۵)۔

اس موقع پر محمد رضا شاہ نے حقیقی اسباب کا تدارک کیے بغیر محض چند سطحی اقدامات سے عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی پر قابو پانا چاہا۔ اس نے عوام میں اپنی ساکھ کو بہتر بنانے کے لیے شاہی خاندان کی ملکیتی زمینوں کی غریب کسانوں میں تقسیم کا آغاز (۱۹۶۰ء) کیا (رضا شاہ اور خود محمد رضا شاہ پہلوی نے ملک کی وسیع اراضی، کثیر تعداد میں چراگاہوں اور وسیع جنگلات کو اپنی ذاتی ملکیت میں داخل کر لیا تھا)۔ شاہ نے مئی ۱۹۶۰ء کے دوران میں غیر ملکی دباؤ پر زرعی اصلاحات کی غرض سے مجلس سے قانون ''تحدید ملکیت اراضی'' بھی منظور کرایا، تاہم اس پر عمل درآمد کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی گئی۔ شاہ کے مغربی اتحادی، جو ایرانی کسانوں کی غربت و پس ماندگی اور جاگیرداروں کے ہاتھوں ان کے استحصال کو اس ملک میں اشتراکیت کے نفوذ کا ایک اہم سبب گردانتے تھے اور گزشتہ چند سالوں سے اصلاح احوال کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنے پر زور دے رہے تھے، شاہ کے ان سطحی اقدامات سے مطمئن نہ ہوے۔ ان مغربی ممالک خصوصاً امریکہ کے نزدیک داخلی سماجی و اقتصادی خصوصاً زرعی اصلاحات کے اجراء و نفاذ کے بغیر مستقبل قریب میں کسی سیاسی بحران کو روکنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ امریکہ کے صدر آئزن ہاور اور اس کے جانشین صدر کینیڈی (۱۹۶۱ -۱۹۶۳ء) کی طرف سے شاہ پر سیاسی ، سماجی اور زرعی و اقتصادی اصلاحات کے لیے دباؤ ڈالا گیا۔ امریکہ کی طرف سے ایران کو مستقبل میں مالی و فوجی امداد کی فراہمی کو زرعی و اقتصادی اصلاحات سے مشروط کر دینے کی دھمکی بھی دی گئی (K.S. Mclachlan: "Land Reform in Iran"، در The Cambridge History of Iran کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس ،ج ۱۹۶۸ء، ا،ص، ۶۸۴- ۶۸۹؛ K.S. Lambton: The Persian Land Reform 1962-1966، آکسفوڈ ۱۹۶۹ء، ۶۰-۶۱؛ Economic Development and Revolutionary Upheavals in Iran، ص، ۲۲-۲۳؛ Christos P.Loannides: America's Iran، نیویارک : یونیورسٹی پریس آف امریکہ، ۱۹۸۴ء، ص ۳؛ Douglas Little: American Orientalism The United States and the Middle East Since 1945، لندن، نیویارک: آئی۔ بی۔ ٹاؤرس، ۲۰۰۳ء، ص ۲۱۷-۲۱۹)۔ چنانچہ امریکہ کے ایما پر ہی جعفر شریف امامی کے بعد محاذ ملی کے ایک سابق رہنما ڈاکٹر علی امینی کو ، جو امریکہ میں ایران کے سفیر رہ چکے تھے، ملک کا نیا وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر علی امینی (۵ مئی ۱۹۶۱- جولائی ۱۹۶۲ء) اور اس کی کابینہ میں شامل وزیر زراعت ڈاکٹر حسن ارسنجانی دونوں زرعی اصلاحات بالخصوص تحدید

ملکیت اراضی کے خیال کے پرجوش حامی و وکیل تھے۔ وہ زرعی اصلاحات کے ذریعے جاگیر داروں اور زمینداروں کی سیاسی قوت کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔ علی امینی کے مطالبے پر شاہ نے ۱۹۶۱ء میں مجلس، جس پر جاگیر داروں کا غلبہ تھا، معطل کر دی تاکہ یہ افراد زرعی اصلاحات کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکیں۔ امینی حکومت نے ۱۹۶۲ء میں زرعی اصلاحات کا قانون، ۱۹۶۰ء کے قانون میں ترمیم کرکے، جاری کیا اور زرعی اراضی کی ملکیت کی حد مقرر کی (The Political Elite of Iran، ص ۴۲-۴۹؛ All Fall Down، ص، ۱۰، ۴۷)۔ جاگیرداروں کو پابند کیا گیا کہ وہ مقررہ حد سے زائد فاضل اراضی کو مزارعین، کسانوں یا پھر حکومت کو فروخت کر دیں یا پھر طویل مدت کے لیے پٹے پر دے دیں۔ اس قانون میں کسانوں کے مسائل، بیج و کھاد کی فراہمی اور پیداوار کی فروخت کے لیے امداد باہمی کی انجمنوں کے قیام کی بنیاد بھی فراہم کی گئی۔ ۱۹۶۲ء کے اواخر تک ۵ لاکھ ہیکٹر سے زائد اراضی ۳۵ سو کسانوں میں تقسیم کی گئی۔ جب کہ ملک بھر میں ایک ہزار سے زائد امداد باہمی کی انجمنیں قائم کی گئیں (The Persian Land Reform، ص ۶۳-۶۵؛ The Political Elite of Iran، ص ۵۸)۔

علی امینی شاہ کے استبداد و مطلق العنانیت اور سیاست میں جبر و تشدد کا حامی نہ تھا۔ چنانچہ اس نے مقدور بھر سیاسی جبر کو ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اخبارات پر عائد سنسر شپ کو نرم کرنے کے علاوہ سیاسی سرگرمیوں کی اجازت (محدود پیمانے پر) دے دی۔ چنانچہ ۱۶ مئی ۱۹۶۱ء کو تہران میں تقریباً آٹھ سال کے بعد محاذ ملی کا پہلا عوامی جلسہ ہوا (The Political Elite of Iran، ص، ۴۲-۴۳، ۴۹)۔ علی امینی کے دور میں ساواک کی سرگرمیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس نے سیاسی آزادیوں کے بارے میں وزیراعظم امینی کے اقدامات کو عملاً غیر مؤثر بنا دیا۔ ساواک نے ۶۱-۱۹۶۲ء کے دوران میں بھی محاذ ملی اور مہدی بازرگان کی نئی قائم شدہ سیاسی جماعت ''نہضت آزادی ایران' کے حامی و رکن طلبہ اساتذہ اور مذہبی رہنماؤں کے خلاف کارروائیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ مختصر یہ کہ علی امینی اپنی تمام تر روشن خیالی و جمہوریت پسندی کے باوجود شاہ کے طرز سیاست میں تبدیلی لانے میں ناکام رہا۔ البتہ اسے اپنے پیش رو وزرائے اعظم کے مقابلے میں عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ شاہ آزاد خیال وزیراعظم کو، جو عوام میں مقبولیت پکڑتا جا رہا تھا، زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۶۲ء کو اسے وزیراعظم کے منصب سے ہٹا کر اس کی جگہ اپنے دیرینہ وفادار و معتمد ساتھی اسداللہ عالم کو مقرر کیا۔ علی امینی کی معزولی کے ساتھ ہی زرعی اصلاحات پر عمل درآمد کی رفتار بھی ماند پڑ گئی (The Political Elite of Iran، ص، ۴۲-۴۳، ۴۹؛ American Orientalism، ص ۲۱۹)۔ اسداللہ عالم کی حکومت نے اکتوبر ۱۹۶۲ء میں ایک نیا انتخابی قانون منظور کیا۔ اس قانون میں خواتین کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ اس نئے انتخابی قانون میں ارکان مجلس اور ملکی عہدیداروں کے لیے قرآن حکیم پر حلف اٹھانے کی قدغن ختم کر دی گئی (Azar Tabari: "The Role of Clergy in Modern Iranian Politics"، در Nikki R. Keddie (مدیر): Religion and Politics in Iran، نیوہیون ولنڈن: ییل یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۳ء، ص ۶۶-۶۷)۔

سفید انقلاب: جنوری ۱۹۶۳ء کے اوائل میں شاہ نے زرعی، اقتصادی اور سیاسی اصلاحات کا ایک چھ نکاتی پروگرام، جسے 'سفید انقلاب' کا نام دیا گیا، متعارف کرایا۔ جنگلات اور چراگاہوں کو قومیانے، سرکاری کارخانوں کے

حصص کی جاگیرداروں کے ہاتھوں فروخت، زرعی اصلاحات کی بدولت ان کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی کی غرض سے، کارخانوں کے منافع میں مزدوروں کے حصہ کا تعین؛ خواتین کو حق رائے دہی و حق امیدواری برائے رکنیت مجلس کی عطائیگی اور دیہی علاقوں میں تعلیم کی اشاعت کی غرض سے سپاہ دانش کا قیام اس پروگرام کے اہم پہلو تھے۔ سفید انقلاب کا نمایاں اور اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں زرعی اصلاحات کے دائرے کو مذہبی اوقاف کی ملکیتی اراضی تک وسیع کیا گیا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۶۳ء کو ایک ریفرنڈم کے ذریعے ان اصلاحات کی منظوری لی گئی۔ ستمبر ۱۹۶۳ء میں پارلیمنٹ (مجلس)، جو ۱۹۶۱ء سے معطل چلی آ رہی تھی، کے انتخابات ہوے۔ اس بار علما و جاگیرداروں کے بجاے حامیانِ اصلاحات کا پارلیمنٹ پر غلبہ ہوگیا۔ دریں حالات شاہ نے آہنی عزم کے ساتھ چھ نکاتی اصلاحات کے پروگرام "سفید انقلاب" پر عمل درآمد کا بیڑا اٹھایا۔ شاہ ان اصلاحات (سفید انقلاب) کے ذریعے، ملک میں کسانوں اور مزدوروں کی محرومیوں کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی ملک کو تعلیمی و صنعتی اعتبار سے ایک ترقی یافتہ ملک بنانا چاہتا تھا۔ علاوہ ازیں اس کا ایک اہم اور بنیادی مقصد اپنے اقتدار کے تحفظ و استحکام کے لیے کسانوں اور صنعتی مزدوروں کی حمایت حاصل کرنا تھا۔ سپاہ دانش کے قیام کا بڑا مقصد دیہی علاقوں میں ناخواندگی کے خاتمے اور اپنی داخلی و خارجی پالیسیوں کی حمایت میں کسان طبقے کو متحرک و منظم کرنے کے علاوہ دیہی آبادی کو علماء و مجتہدین کے اثر و رسوخ سے آزاد کرانا تھا (The Persian Land Reform، ص ۱۰۳-۱۰۸؛ Education and Modernization in the Middle East، ص ۴۰۷، ۴۱۲-۴۱۳)۔

مخالفت و مزاحمت: شاہ کی زرعی اصلاحات و سفید انقلاب (۱۹۶۰ء-۱۹۶۳ء) کی طرف سے ایرانی معاشرے کے اہم اور طاقت ور طبقات جاگیرداروں، قبائلی سرداروں اور علماء و مجتہدین کو سب سے زیادہ تشویش لاحق ہوئی۔ جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں نے (۱۹۶۲-۱۹۶۳ء) کے دوران میں اس قانون پر عمل درآمد کی سخت مزاحمت کی۔ ملک کے بعض حصوں میں تو انہوں نے بغاوت کر ڈالی۔ قبائلی عوام کے ہاتھوں اصلاحات کے نفاذ پر مامور سرکاری اداروں بالخصوص پولیس اور فوج کے اہلکاروں کو ہزیمت و نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ تاہم شاہ نے ریاستی طاقت کے بھرپور استعمال سے اس مزاحمت و بغاوت کو کچل ڈالا (.The Persian Land Reform، ص ۱۰۱، ۱۱۲-۱۱۴)۔ زرعی اصلاحات کے دائرہ کی مذہبی اوقاف تک توسیع سے علما کو صدیوں سے حاصل مالیاتی خودمختاری ختم ہوگئی۔ مذہبی اوقاف سے حاصل ہونے والی آمدنی سے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں موجود مساجد، مدارس اور مزارات کا انتظام چل رہا تھا۔ سپاہ دانش کے قیام کی صورت میں مجتہدین و علما کو عوام میں اپنا روایتی اثر و رسوخ بھی خطرے میں پڑتا دکھائی دیا۔ اس لیے جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کے علاوہ ، علماء و مجتہدین کی طرف سے بھی سفید انقلاب کی شدید مخالفت کی گئی۔ علماء و مجتہدین زرعی اصلاحات بالخصوص نجی ملکیت کی تحدید اور خواتین کے حق رائے دہی اور پارلیمنٹ کی رکنیت کو احکام شریعت کے منافی گردانتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء کے قانون زرعی اراضی کے خلاف سربرآوردہ شیعہ عالم آیت اللہ سید محمد حسین بروجردی (۱۸۷۵-۱۹۶۱ء) نے آواز بلند کی۔ انہوں نے تحدید ملکیت اراضی کو شریعت اور ایرانی دستور سے متصادم قرار دیتے ہوے، ارکان مجلس کو اس قانون کی منظوری سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ۱۹۶۲ء کے قانون زرعی اصلاحات کے اجراء و نفاذ

پر آیت اللہ سید محمود طالقانی، آیت اللہ بہبہانی اور دیگر سربرآوردہ علما نے بھی محمد رضا شاہ پہلوی اور زرعی اصلاحات کے نگران وزیرزراعت ڈاکٹر حسن ارسنجانی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ علما اکتوبر ۱۹۶۲ء کے انتخابی قانون کے بھی، جس میں عورتوں کو ووٹ کا حق دیا گیا تھا اور قرآن حکیم پر حلف (ارکان مجلس اور عہدیداران ملکی کے لیے) کی روایت کو ختم کیا گیا تھا، سخت مخالف تھے (Shahrough Akhavi: *Religion and Politics in Contemporary Iran: Clerge-State Relations in the Pahlavi Period*، البانے اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک، ۱۹۸۰ء، ص ۹۱-۹۵)۔

آیت اللہ روح اللہ موسوی خمینی (۱۹۰۲ء-۱۹۸۹ء)، قم کی معروف دینی درس گاہ کے ایک استاذ، نے علما کی اس مخالفت کو ایک سیاسی تحریک میں بدل دیا۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء سے ان کی قیادت میں قم میں ان کے ہم خیال علماء و مجتہدین اور حوزۂ علمیہ کے اساتذہ اور طلبہ نے حکومت کے خلاف جلسے جلوس اور احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع کیا۔ جنوری ۱۹۶۳ء میں سفید انقلاب یعنی چھ نکاتی اصلاحات کے پروگرام کے اجرا کے اعلان پر آیت اللہ خمینی کی قیادت میں جاری تحریک میں بھی تیزی آگئی (*The Role of the Clergy in Modern Iranian Politics*، ص ۶۶-۶۷)۔ آیت اللہ خمینی کی تحریک و دعوت پر عوام میں ان کے حامی افراد خصوصاً کاروباری طبقہ نے سفید انقلاب کی منظوری کے لیے منعقدہ استصواب رائے کا بائیکاٹ کیا۔ آیت اللہ خمینی نے "سفید انقلاب" کو خلاف اسلام قرار دیا۔ انہوں نے اس کی مخالفت و تردید میں کتابچے بھی تحریر کیے۔ ان کے پیروکاروں نے ان کتابچوں کی وسیع پیمانے پر اشاعت و تقسیم کا اہتمام کیا۔ آیت اللہ خمینی نے ان کتابچوں میں شاہ کی خارجہ پالیسی بالخصوص اس کی طرف سے امریکہ کی ماتحتی قبول کرنے اور اسرائیل سے سیاسی و سفارتی روابط اُستوار کرنے پر بھی سخت گرفت کی۔ آیت اللہ خمینی کی تحریک پر جون ۱۹۶۳ء کے دوران میں قم، تبریز، تہران، مشہد اور دیگر شہروں میں علما، دینی مدارس کے اساتذہ و طلبہ اور ان کے حامیوں نے شاہ کے خلاف زبردست مظاہرے کیے۔ فوج اور پولیس نے ان پر قابو پانے کے لیے طاقت کا بے دریغ استعمال کیا۔ مساجد، مدارس اور مزارات کے تقدس کو بھی مجروح کیا گیا۔ چنانچہ ان چند ماہ کے دوران، بالخصوص جون (۱۹۶۳ء) میں فوج اور پولیس کے ہاتھوں سیکڑوں افراد ہلاک ہوے۔ تحریک پر قابو پانے کے لیے آیت اللہ خمینی کو گھر پر نظربند جب کہ ان کے حامی و پیروکار علما کی کثیر تعداد کو جیلوں میں قید کر دیا گیا۔ فوج اور پولیس نے بہت سے مزارات اور مساجد و مدارس پر قبضہ کر لیا۔ شاہ کی طرف سے مصر کے عرب قوم پرست رہنما جمال عبدالناصر پر حکومت مخالف تحریک کو انگیخت کرنے کا الزام لگایا گیا (*The Role of Clergy in Modern Iranian Politics*، ص ۶۸-۷۰؛ حامد الگر (Hamid Algar): *Roots of the Islamic Revolution in Iran*، اونین ٹا (Oneonta، نیویارک) : اسلامک پبلی کیشنز انٹرنیشنل، ۲۰۰۱ء، ص ۵۳-۵۵؛ *Iranian Politics and Religious Modernism*، ص، ۱۷۸-۱۷۹)۔ آیت اللہ خمینی کے ایماء و ہدایت پر ان کے پیروکاروں اور حامیوں نے مجلس کے انتخابات منعقدہ ستمبر (۱۹۶۳ء) کا بھی مقاطعہ کیا۔ انتخابات کی مخالفت پر انہیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا چنانچہ وہ آئندہ سال (مئی ۱۹۶۴ء) تک جیل میں قید رہے۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں مجلس نے ایک ایسے قانون کی منظوری دی جس میں ایران میں موجود امریکی سول و فوجی

مشیروں، اہلکاروں اور تکنیکی ماہرین وغیرہ تمام افراد کو سفارتی مامونیت عطا کی گئی۔ مجلس نے ایک اور قانون منظور کیا جس کی رو سے شاہ کو امریکہ کی طرف سے فوجی سازو سامان کی خریداری کے لیے ۲۰۰ ملین ڈالر قرضہ کی پیش کش کو قبول کرنے کا اختیار دیا گیا۔ آیت اللہ خمینی نے شاہ کے ایما پر کئے گئے مجلس کے ان فیصلوں کو تنقید و ملامت کا نشانہ بنایا۔ محمد رضا شاہ پہلوی آیت اللہ خمینی کی مخالفت اور تنقید و ملامت کو زیادہ عرصہ برداشت نہ کر سکا۔ چنانچہ اس کے حکم پر انہیں (آیت اللہ خمینی کو) ۴ نومبر ۱۹۶۴ء کو ترکی کی طرف جلا وطنی کر دیا گیا۔ آیت اللہ خمینی کی جلا وطنی کے ساتھ ہی علما کی تحریک مزاحمت کمزور پڑ گئی۔ شاہ نے داخلی مخالفت پر قابو پانے کے بعد اپنے دیگر سیاسی مخالفین و ناقدین خصوصاً نہضت آزادی و محاذ ملی وغیرہ کی بیخ کنی کی مہم بھی بدستور جاری رکھی (Roots of the Islamic Revolution in Iran، ص ۵۹؛ The Political Elite of Iran، ص ۴۶؛ Iranian Politics and Religious Modernism، ص ۱۴۷-۱۴۸؛ سعید امیر ارجمند: The Turban for the Crown، نیویارک: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۷-۱۴۸)۔

دریں حالات محمد رضا شاہ نے آہنی عزم کے ساتھ سفید انقلاب کے منصوبے پر عمل درآمد کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔ ۱۹۶۲-۱۹۶۷ء کے دوران میں زرعی اصلاحات پر عمل درآمد کے نتیجے میں ۳۴۷، ۳۱،۴۷ ایکڑ زمین کسانوں میں زمین تقسیم کی گئی۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۶۲-۱۹۶۷ء تک حکومت نے تقریباً ۶ ارب پچاس کروڑ ریال کی زمین جاگیرداروں سے خرید کر کسانوں کو فراہم کی۔ مزید براں کسانوں کو ان کی زرعی ضروریات بیج، کھاد، زرعی آلات کی فراہمی اور ان کی پیداوار کی فروخت کے لیے ملک بھر میں امداد باہمی کی انجمنوں کا جال بچھا دیا۔ کاشت کاروں کو امداد باہمی کی ان انجمنوں کی رکنیت اختیار کرنے کا پابند بنایا گیا۔ ۱۹۶۸ء تک امداد باہمی کی ۸۶۵۲، انجمنیں قائم ہوئیں اور ۴۰۲، ۱۰۵، کسانوں اور کاشت کاروں نے ان کی رکنیت حاصل کی۔ کسانوں کو قرضہ جات کی فراہمی کے لیے ایک دیہی ترقیاتی بنک بھی قائم کیا گیا۔ آب پاشی کے نظام کو بہتر بنانے کے لئے ۱۹۶۷ء میں پانی کے وسائل کو قومی تحویل میں لیا گیا۔ مزید براں ملک میں چند بڑے ڈیموں کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو مجلس نے ایک قانون منظور کر کے کسانوں پر سے لگان ختم کر دیا اور ماسوائے اوقاف کی ملکیتی املاک کے، کسانوں کو انہیں فراہم کی گئی زمینوں کے مالکانہ حقوق دیئے گئے۔ زرعی ترقی اور کسانوں کی بہبود کے لیے کیے گئے ان جملہ اقدامات کے باوجود، آب پاشی کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونے کے سبب ملک غذائی ضروریات میں خود کفیل نہ ہو سکا (The Persian land Reform، ص ۱۱۶-۱۲۲، ۲۴۷-۲۹۰، ۳۰۳-۳۱۰)۔

اثرات و نتائج: شاہ کے سفید انقلاب کے ایرانی معاشرے پر دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اس کی بدولت جاگیر دار طبقے کی سیاسی قوت کو ضعف پہنچا اور ایرانی مجلس پر سے ان کا غلبہ ختم ہوگیا۔ سب سے اہم یہ کہ کسانوں کو جاگیرداروں کے استحصال و غلامی سے بڑی حد تک چھٹکارا ملا اور ان کی معاشی و سماجی حالت بہتر ہوئی۔ سپاہ دانش نے دیہی علاقوں میں جدید تعلیم کو عام کرنے اور ناخواندگی کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ نتیجتاً دیہی علاقوں میں شاہ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ اس کا عملی اظہار جنوری ۱۹۶۳ء کے ریفرنڈم کے وقت ہوا۔ علما اور جاگیرداروں کی مخالفت کے باوجود دیہی آبادی کی

اکثریت نے سفید انقلاب کے حق میں رائے دی تھی۔ اس بات نے شاہ کو ملک و معاشرہ کی جدید کاری سے متعلق اپنے ایجنڈے پر عمل درآمد اور اس راہ میں در پیش رکاوٹوں کو عبور کرنے کے لیے حوصلہ تازہ دیا (Land Reforms in Iran، ص ۷۱۰-۷۱۲)۔ سفید انقلاب اور زرعی و تعلیمی اصلاحات کے اجراء و نفاذ اور ان پر عمل درآمد سے ملک کے روایتی مذہبی طبقات حد درجہ متاثر ہوئے۔ زرعی اصلاحات کے اوقاف کی ملکیتی اراضی تک توسیع کی بدولت علما و مجتہدین آمدنی کے ایک بڑے ذریعہ سے محروم ہو گئے تھے۔ نتیجتاً دینی تعلیم کی توسیع و اشاعت کا دائرہ سکڑ گیا۔ ۱۹۶۳-۱۹۷۷ء کے دوران میں تہران اور دیگر بڑے شہروں میں علما کے زیر انتظام دینی مدارس و مراکز، کی تعداد میں نمایاں طور پر کمی واقع ہوئی۔ ان مدارس میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد بھی بہت حد تک کم ہوگئی (Religion and Politics in Contemporary Iran، ص ۱۲۹-۱۳۲)۔ محمد رضا شاہ پہلوی نے ایرانی معاشرے سے مذہبی طبقات کے اثرو نفوذ کے استیصال کی غرض سے بھی متعدد اہم اقدامات کیے۔ ۱۹۶۴ء میں ''سازمانِ اوقاف'' کا قیام اس سلسلہ کی اہم کڑی تھی۔ اس ادارے کے قیام سے مذہبی اوقاف سے علماء و مجتہدین کا اختیار بالکل ختم ہو گیا اور وہ آمدنی کے ایک بڑے ذریعے سے محروم ہوگئے۔ یہ ادارہ بنیادی طور پر مذہبی اوقاف کے انصرام کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ مگر علماء و مجتہدین کی کردار کشی اور ان کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈا کو اس ادارے کی سرگرمیوں میں محور کی حیثیت حاصل رہی۔ چند سال بعد ۱۹۷۱ء میں ساز مان اوقاف کے ماتحت ایک اور ادارہ 'سپاہ دین' کے نام سے قائم کیا گیا۔ اس کے لیے تہران، مشہد اور بعض دوسری سرکاری جامعات میں قائم کلیات دینیات (Faculities of Religious Studies) کے ایسے فارغ التحصیل طلبہ کو بھرتی کیا گیا جو فوجی خدمت کے اہل تھے۔ سپاہ دین اور شعبہ تبلیغات کا اہم وظیفہ روایتی علماء و مجتہدین کی دینی تشریحات کے مقابلے میں اسلام کے اصول و احکام کی ایسی جدید تعبیر و تشریح پیش کرنا تھا جو شاہ کے سفید انقلاب کے اصولوں سے ہم آہنگ ہونے کے علاوہ جدیدیت و غرب زدگی کے فروغ کے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکے۔ غرضیکہ ان اصلاحات و جارحانہ اقدامات کی بدولت ایران میں علماء و مجتہدین کے اثرو نفوذ کو شدید گزند پہنچا (Religion and Politics in Contemporary Iran، ص ۹۷-۹۸، ۱۳۵-۱۴۱)۔

محمد رضا شاہ پہلوی ملک کی تیز رفتار جدید کاری کے شانہ بشانہ ملک میں مغربی طرز زندگی اور تہذیبی و معاشرتی اقدار کی ترویج کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس نے اسلامی تہذیب و تاریخ کی جگہ قدیم ایرانی تہذیب و تاریخ کے احیا پر بھی توجہ دی۔ ۱۹۷۵ء میں اس نے اسلامی تقویم کی جگہ قدیم ایرانی تقویم رائج کی۔ ۱۹۶۲-۱۹۷۸ء کے دوران میں مذہب، اہل مذہب اور مذہبی ادارے شاہ کے بے لچک حملوں کی زد میں رہے۔ بہت سے علماء کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ متعدد سربرآوردہ علماء خفیہ پولیس ''ساواک'' کے ہاتھوں قتل ہوے (The Turban For the Crown، ص ۷۷-۸۳، ۸۶)۔ شاہ کا مطمح نظر ہر قیمت پر ایرانی معاشرے پر سے علماء کی گرفت کو ختم کرنا تھا۔ چنانچہ اس کے دور میں قم کی دینی درس گاہ پر متعدد بار خفیہ پولیس اور فوج کی طرف حملے کیے گئے۔ مشہد شہر میں متعدد دینی ادارے اور مدارس تباہ کیے گئے (۱۹۷۵ء) (The Turban For the Crown ، ص، ۸۵-۹۳)۔ غرض ۱۹۶۳ء کے بعد سے شیعہ علماء و مجتہدین کا اندرون ملک ابتلاء شدید تر ہوگیا۔ جس کی بدولت ان کا اس بات پر یقین مزید پختہ ہوگیا کہ سیکولر ریاست اور بادشاہت و

ملوکیت اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

صنعتی ترقی، بدعنوانی اور لوٹ مار: ۱۹۶۲ء سے زرعی اصلاحات پر عمل درآمد کے شانہ بشانہ صنعتی ترقی بھی شاہ کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ تیسرے اور چوتھے ترقیاتی منصوبوں (۱۹۶۳-۱۹۷۲ء) میں صنعتی ترقی کو ملکی اقتصادیات میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ اس غرض سے بیرون ملک سے بھاری قرضے حاصل کیے گئے جس سے ادائیگیوں کے توازن نے تشویش ناک صورت حال اختیار کرلی۔ تاہم ۱۹۶۳-۱۹۷۲ء کے دوران میں صنعت و حرفت کے ہر شعبے میں ترقی ہوئی۔

شاہ نے، جو اپنے سفید انقلاب کے ثمرات و نتائج سے بہت مطمئن تھا، ۱۹۶۷ء میں جشن تاج پوشی منایا جب کہ اکتوبر ۱۹۷۱ء میں ایران میں شہنشاہیت کی پچیسویں صد سالہ تقریب بڑے تزک و احتشام سے منائی۔ اس پر شکوہ تقریب میں شاہ کی خصوصی دعوت پر دنیا کے بہت سے بادشاہان ، سربراہان مملکت و حکومت اور سیاسی قائدین نے شرکت کی۔ ان دونوں مواقع پر مال و دولت کی نمائش اور اسراف و تبذیر کا بے مثال مظاہرہ دیکھنے میں آیا (*All Fall Down*، ص ۱۲؛ مختار مسعود: لوحِ ایام، لاہور: العطاء، ۲۰۰۵ء، ص ۳۶۵-۳۶۷))۔ بہرحال ۱۹۷۲ء تک ایران تیسری دنیا کا ایک ترقی یافتہ ملک بن چکا تھا۔ ۱۹۶۷-۱۹۷۲ء کے دوران میں ملک کی خام قومی پیداوار میں سالانہ شرح افزائش اوسطاً ۱۰٪ رہی۔ عرب اسرائیل جنگ (۱۹۷۳ء) سے پیدا ہونے والے حالات خصوصاً اوپیک کے رکن عرب ممالک کی طرف سے مغربی دنیا کو تیل کی فراہمی کی بندش کے نتیجے میں تیل کی قیمتوں میں کئی گنا اضافے کی بدولت ایران کو تیل کی برآمد سے کثیر آمدنی حاصل ہوئی۔ حکومت کو ادائیگیوں کا خسارہ کم کرنے اور بیرونی قرضہ جات کی ادائیگی میں مدد ملی۔ شاہ نے کسی پیشگی منصوبہ بندی کے بغیر جاری پانچویں ترقیاتی منصوبہ (۱۹۷۳-۱۹۷۷ء) کے لئے بجٹ کی رقم دوگنا کر دی۔ چنانچہ مغربی ممالک سے درآمدات کئی گنا بڑھ گئیں اور وسائل کا بے تحاشا ضیاع ہوا۔ اس دور میں ۱۹۶۷-۱۹۷۲ء کے مقابلے میں سالانہ شرح افزائش ۱۰% سے کم ہو کر ۶%رہ گئی۔ اس عرصہ میں ایران میں بدعنوانی اور با اثر طبقات کی لوٹ مار کے ساتھ ساتھ افراط زر میں اضافہ ہو گیا۔ شاہی خاندان نے مال و دولت سمیٹنے کے لیے اپنے سیاسی اثرو رسوخ کو خوب استعمال کیا اور ملکی وسائل معیشت پر بلا روک ٹوک دسترس حاصل کر لی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاہی خاندان نے ملکی معیشت کے ایک بڑے حصے پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ ملکی صنعت میں شاہی خاندان بڑا حصہ دار بن گیا جبکہ درآمدات و برآمدات پر اس کی گرفت قائم تھی۔ شاہی خاندان کے افراد بڑے بڑے ہوٹلوں، بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور کارخانوں کے مالک بن گئے۔ انہوں نے بھاری رقوم بیرون ملک بنکوں میں منتقل کیں۔ پہلوی بنیاد (پہلوی فاؤنڈیشن) کو، جو بظاہر ایک فلاحی و خیراتی ادارے کے بطور قائم کی گئی (۱۹۵۸ء) تھی، شاہی خاندان نے ملکی معیشت پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا (حسین فردوست: *The Rise and Fall of Pahlavi Dynasty*: *Memories of General Hussain Fardoust*، تہران: حدیث پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۵ء ص ۱۷۵-۱۷۸، ۱۹۸-۲۱۶؛ ہنری کسنجر: *White House Years* ، لنڈن: (Phoenics Press)، ۱۹۷۹ء، ص ۱۲۵۹؛ *Economic Development and Revolutionary Upheavals in Iran*، ص ۲۵-۲۷، ۳۵-۳۶؛ *Killing Hope* ، ص ۴۷؛ Ryszard Kapuscinski: *Shah of Shahs* (مترجم: ولیم آر

برانڈ)، نیویارک: ونٹیج بکس، ۱۹۸۶ء ص، ۵۴-۵۸؛ The Persian Land Reform، ص ۵۴؛ The Political Elite of Iran، ص ۱۰۱-۱۰۲) .

شاہ کا طبقہ اشرافیہ اورسول و فوجی حکام کی لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانی کے متعلق رویہ اغماض و چشم پوشی اور تحمل و رواداری کا رہا۔ اس کے نزدیک ان طبقوں کی وفا داری کو یقینی بنانے کے لیے ان کی کار گزاریوں سے متعلق درگزر ضروری تھا۔ شاہ کی ذاتی اغراض نے بدعنوانی کے کلچر کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع دیا (The Political Elite of Iran، محل مذکور)۔ شاہ، اس کے خاندان کے افراد، اور دیگر بالادست طبقوں نے ایران میں انتہائی اسراف و تبذیر اور عیش و عشرت کے کلچر کو فروغ دیا۔ چنانچہ ایران میں اخلاقی بے راہ روی کا چلن عام ہوا۔ ملک کے بڑے شہروں میں شراب خانے، قحبہ خانے، رقص و سرود گاہیں اور نائٹ کلبیں (شبستان) عام ہو گئیں۔ طبقہ اشرافیہ کے ارکان لوٹ مار اور بد عنوانی کے ذریعے حاصل کردہ دولت کو ان خلافِ شرع امور کی نذر کرتے رہے۔ ایرانی معاشرہ اباحیت پسندی کا شکار ہو گیا۔ طبقہ اشرافیہ میں ہم جنس پرستی کی وبا بھی عام ہوگئی (The Rise and Fall of Pahlavi Dynasty، ص ۱۸۰-۱۸۲،۲۴۱۔ ۲۴۳؛ لوحِ ایام، ص، ۳۶۰-۳۶۴) .

ایران، امریکہ اور اسرائیل تعلقات: جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے اگست ۱۹۵۳ء میں ایران کے قوم پرست اور مغربی استعمار کے مخالف وزیر اعظم ڈاکٹر محمد مصدق کی حکومت کے خاتمے اور محمد رضا شاہ کی بادشاہت و اقتدار کی بحالی میں امریکہ نے کلیدی و مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ امریکہ نے شاہ سے اس کے اقتدار کی بحالی کا پورا پورا معاوضہ وصول کیا۔ ۱۹۵۴ء میں ایران میں تیل کی پیداوار پر سے اینگلو ایرانی آئل کمپنی (AIOC) کی اجارہ داری ختم کر دی گئی اور اس کی جگہ ایک بین الاقوامی کنسورشیم نے لے لی۔ تیل کی دریافت، پیداوار، خریداری اور تقسیم کے سلسلہ میں قائم اس کنسورشیم میں شامل امریکی تیل کمپنیوں نے چالیس فیصد حصص حاصل کر لیے (All Fall Down، ص ۶-۷؛ William Stivers: America's Confrontation with Revolutionory Change، لنڈن: میک ملن پریس ۱۹۸۶ء، ص ۴،۵،۲۰؛ White House Years، ص ۱۲۶۱-۱۲۶۲؛ Killing Hope، ص ۶۴-۷۱).

امریکہ مشرق وسطیٰ و خلیج فارس میں اپنے طویل المدت تزویراتی (سیاسی، فوجی اور اقتصادی) مفادات کے تحفظ، بالخصوص سوویت یونین کے توسیع پسندانہ عزائم کے مقابلے کے لیے ایران میں محمد رضا شاہ پہلوی کے اقتدار کے تحفظ و استحکام اور اس کے ساتھ قریبی تعاون و اتحاد کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ اسرائیل کے ساتھ خطے کے عرب ممالک کی آویزش و کشمکش کے تناظر میں امریکہ کے لیے ایران جیسے مسلم ملک سے قریبی تعلق اور وہاں پر قوم پرست و جمہوری حکومت کے مقابلے میں کٹھ پتلی و حاشیہ بردار ملوکیت و بادشاہت کا بقاء و استحکام زیادہ مفید ہو سکتا تھا۔ اس دور میں ایران، امریکہ کی قیادت میں سوویت یونین کے خلاف تشکیل پانے والے فوجی اتحادوں کا ایک سرگرم رکن رہا۔ ایران نے سوویت یونین کی توسیع پسندی کے خلاف قائم فوجی اتحاد "بغداد پیکٹ" (قائم، ۲۴ فروری ۱۹۵۵ء) کی رکنیت اختیار کی (۲۳ اکتوبر ۱۹۵۵ء)۔ بغداد کی اس دفاعی اتحاد سے علیحدگی (۲۴ مارچ ۱۹۵۸ء) کے بعد اس اتحاد کا نام بدل کر سینٹو (CENTO) قرار پایا تو ایران اس کا بھی رکن رہا (America's Confrontation، ص ۱۲-۱۴).

صدر لنڈن جانسن (۱۹۶۳-۱۹۶۹ء) کے دور میں امریکہ ویت نام کی جنگ میں بری طرح سے الجھ گیا تو

امریکہ کے نزدیک ایران کی تزویراتی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ اب امریکہ نے خطے میں شاہ کو اپنے تزویراتی مفادات کے محافظ کا کردار سونپنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء سے ایران کو جدید ترین اسلحہ، جنگی و لڑاکا طیارے جو اس سے قبل صرف اسرائیل کو دیئے گئے تھے، فراہم کیے گئے۔ صدر رچرڈ ایم نکسن کے دور (۱۹۶۹-۱۹۷۴ء) میں مشرق وسطی کے بارے میں امریکی پالیسی کا محور اسرائیل کے بعد ایران بن گیا۔ ۱۹۷۱ء میں نہر سویز سے برطانیہ کی واپسی ہوگئی تو مصر شام، عراق اور یمن وغیرہ ممالک میں سوویت یونین کا اثر ونفوذ بہت بڑھ گیا۔ مصر، جس کے امریکہ سے سفارتی تعلقات منقطع تھے، سوویت یونین کے ساتھ مضبوطی سے جڑا ہوا تھا۔ امریکہ کی نگاہ میں اس صورت حال میں ایک طرف تو اس کے دوست ممالک سعودی عرب، اردن اور امارات کا محاصرہ ہو چکا تھا، دوسری طرف اسے یورپ اور جاپان کی اقتصادی شہ رگ ''مشرق وسطی کے تیل'' پر مخالفین کے قبضہ ہو جانے کا سنگین خدشہ لاحق ہو گیا تھا۔ ان حالات میں صدر نکسن اور اس کے قومی سلامتی کے مشیر ہنری کسنجر نے خلیج فارس اور جنوب مغربی ایشیا میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اسرائیل کے بعد ایران کی فوجی قوت کو خاطر خواہ حد تک بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ ایران کے بارے میں امریکہ کی اس پالیسی کو ''نکسن کسنجر ڈاکٹرائن'' (اصول / نظریہ) کا نام دیا گیا۔ مئی ۱۹۷۲ء میں دورہ ایران کے موقع پر صدر نکسن نے شاہ کو خطے میں متوقع اہم کردار ادا کرنے پر آمادہ کرلیا۔ چنانچہ بطور ترغیب اسے ہر نوع کے جدید ترین روایتی وغیر نیوکلیائی ہتھیاروں کی فراہمی کا سلسلہ شروع کیا۔ امریکہ کی طرف سے اس سے قبل اسرائیل کے علاوہ دنیا کے کسی اور ملک کو اس نوع کی پیش کش نہیں کی گئی تھی۔ نکسن کے بعد صدر جیرالڈ فورڈ (۱۹۷۴-۱۹۷۷ء) کی انتظامیہ بھی ایران کے بارے میں اسی پالیسی پر عمل پیرا رہی (White House Years، ص ۱۲۶۳-۱۲۶۵؛ America`s Iran، ص ۳-۴، ۱۲-۱۹؛ All Fall Down، ص ۶-۸، ۱۸؛ America`s Confrontation، ص ۱۰-۱۴؛ ۶۰-۶۷، ۸۲)۔ صدر نکسن کے دورہ ایران (مئی ۱۹۷۲ء) کے بعد شاہ نے امریکی ساختہ اسلحہ کی خریداری کے لیے بڑے بڑے سودے کیے۔ اس نے ۱۹۷۳-۱۹۷۴ء کے دوران تیل کی قیمتوں میں چار گنا اضافہ کی بدولت حاصل ہونے والی آمدنی کا کثیر حصہ اسی مد پر صرف کیا۔ اس نے ۱۹۷۲-۱۹۷۸ء کے دوران میں ملک میں امریکی اسلحہ، جس میں جدید ترین ٹینک، لڑاکا و بمبار طیارے، ہیلی کاپٹر، جنگی آبدوزیں، میزائل اور بھاری مقدار میں دیگر جنگی سازو سامان شامل تھا، کے انبار لگا دیئے (America`s Iran، ص ۱۶-۲۰)۔

امریکی تجزیہ نگاروں اور عالمی سیاست کے ماہرین کی نگاہ میں امریکہ کو ایران کے بارے میں اس مذکورہ پالیسی کی بدولت وسیع فوائد حاصل ہوے۔ امریکہ نے کچھ خرچ کیے بغیر نیز اس خطے میں اپنی فوج اتارے بغیر مشرق وسطی و خلیج فارس میں اپنے تمام تر مطلوبہ اہداف و مقاصد حاصل کیے۔ ایران بلا معاوضہ خطے میں امریکی مفادات کے محافظ و نگران کا کردار ادا کرتا رہا۔ امریکہ کی دفاعی صنعت کو تیل کی دولت سے مالا مال ایک بڑی منڈی ہاتھ لگ گئی تھی (America`s Iran، ص ۵؛ Economic Development and Revolutionary Upheavals in Iran، ص ۳۶-۳۷؛ The Rise and Fall of Pahlavi Dynasty، ص ۱۲۶-۱۲۸، ۲۳۹-۲۴۳، ۴۲۰-۴۲۱)۔

غرضیکہ شاہ نے اپنے اقتدار کے دور ثانی (۱۹۵۳-۱۹۷۹ء) کے تمام تر دور میں خارجہ پالیسیوں کو امریکی مفادات کے تابع رکھا۔ اس نے کھل کر امریکہ اور اس

کے دست راست اسرائیل کے مفادات کا تحفظ و دفاع کیا (White House Years، ص ۱۲۶۱-۱۲۶۲، ۱۲۶۵)۔ درحقیقت شاہ اپنے اقتدار کے تحفظ و استحکام کے لیے امریکہ اور برطانیہ سے قربت کو بڑا اہم خیال کرتا تھا۔ ایران میں ان ملکوں خصوصاً اوّل الذکر کے سفیر اور فوجی مشیروں پر اس کا اعتماد بہت بڑھ گیا۔ امریکی و برطانوی سفیروں نیز ان دونوں ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں کے اہلکاروں سے ملاقاتیں تو اس کا ایک روزمرہ کا معمول بن گیا تھا۔ اس دور میں تہران میں امریکی سفارت خانہ سی۔ آئی۔ اے کی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا (The Rise and Fall of Pahlavi Dynasty، ص ۲۷۴-۲۸۰)۔

خلیج فارس اور مشرق وسطیٰ کے ممالک سے تعلقات: ۱۹۵۳ء کے بعد سے ایران علاقائی مسائل کو امریکی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں مصر میں جمال عبدالناصر (۱۹۵۶-۱۹۷۰ء) کے اقتدار میں آتے ہی امریکہ و مغرب اور عرب دنیا کی قوم پرست انقلابی تحریکوں میں آویزش شدت اختیار کر گئی۔ امریکہ اپنے مخصوص مفادات کے تحفظ کی خاطر قدامت پسند حکومتوں کا حامی اور انقلابی حکومتوں کا شدید مخالف تھا۔ تاہم خطے میں متعدد قدامت پسند حکومتیں ختم ہو گئیں اور انقلابی قوم پرستوں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ عرب انقلابی تحریکوں کا جھکاؤ سوویت یونین کی طرف تھا (America's Confrontation، ص ۱۷-۱۹)۔ مصر کے بعد جولائی ۱۹۵۸ء میں عراق میں جنرل عبدالکریم قاسم (۱۹۵۸-۱۹۶۳ء) کی قیادت میں انقلابی حکومت قائم ہو گئی اور ہاشمی مملکت کا خاتمہ ہوا۔ عبدالکریم قاسم کی حکومت نے مارچ ۱۹۵۹ء میں بغداد پیکٹ سے علیحدگی اختیار کر لی اور مارچ ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں سوویت یونین سے اقتصادی و دفاعی تعاون کے معاہدے کیے (Phebe Marr: The Modern History of Iraq، لنڈن: ویسٹ ویو پریس، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۵-۱۵۹، ۱۶۴-۱۶۷)۔

جنرل عبدالکریم قاسم کے دور میں عراق سے ایران کے تعلقات میں تیزی سے انحطاط واقع ہوا۔ انقلابی حکومت کے سوویت یونین کی طرف جھکاؤ اور عراق میں سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ سے شاہ کو تشویش لاحق ہوئی۔ جلد ہی شط العرب کی بابت دونوں ممالک میں تنازعہ ابھر کر سامنے آیا (نومبر ۱۹۵۹ء)۔ ایران نے شط العرب کی بابت دونوں ممالک کے درمیان طے پانے والے معاہدہ ۱۹۳۷ء، جس میں ایران کی طرف گہرے پانیوں تک عراق کا حق اور جہازوں کی آمدورفت کے راستوں (shipping channel) پر اسی طرح کنٹرول تسلیم کیا گیا تھا، کے جواز و معقولیت (validity) کو چیلنج کر دیا، [تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو شط العرب، در تکملہ آآآ بذیل مادہ)۔ ایران نے معاہدہ ۱۹۳۷ء کو مسترد و منسوخ قرار دے کر اباداان کے اردگرد کے علاقے میں لنگراندازی کے مقامات پر بھی اپنا حق جتایا۔ جس پر جنرل قاسم نے "عربستان" کا مسئلہ کھڑا کر کے ایران کے عرب آبادی والے صوبہ "خوزستان" پر عربوں کا حق جتایا۔ ۱۹۶۱ء میں عراق کی مجلس وزرا نے ایک قرارداد منظور کر کے خلیج فارس کا نام "خلیج عرب" تجویز کیا تو ایران کے عراق سے تعلقات مزید بگڑ گئے (The Modern History of Iraq.، ص ۱۸۰)۔ عراق میں بعث پارٹی [رکّ بآں در تکملہ آآآ، بذیل مادہ] کے اقتدار میں آنے (۱۹۶۳ء) کے بعد خصوصاً عبدالسلام عارف کے دور (۱۹۶۳-۱۹۶۶ء) میں حالات قدرے پر سکون رہے۔ تاہم جولائی ۱۹۶۸ء میں احمد حسن البکر کے منصب صدارت پر متمکن ہوجانے کے بعد دونوں ممالک میں پھر سے کشیدگی بھڑک اٹھی [رکّ بہ عراق، در آآآ بذیل مادہ]۔ بعث پارٹی کی نئی حکمران قیادت نے، جو عرب قوم پرست تحریک کی حامی تھی، ایران کے صوبہ خوزستان میں علیحدگی

پسند تحریک ”عرب محاذ آزادی“ کی حمایت وپشت پناہی کے علاوہ ایران کے علاقہ زفر میں بائیں بازو کے عناصر کی بھی پشت پناہی کرنا شروع کر دی (The Modern History of Iraq، ص ۲۲۱).

اس دور میں ایران اور امریکہ کے تعلقات میں مزید گہرائی اور استحکام واقع ہوا۔ چنانچہ ایران کا رویہ سراسر جارحانہ ہوگیا۔ اپریل ۱۹۶۹ء میں ایران نے شط العرب کی بابت عراق سے اپنے معاہدہ ۱۹۳۷ء کی یک طرفہ طور پر منسوخی کا اعلان کر دیا اور عراقی علاقے میں جنگی جہاز داخل کر دیئے۔ جواباً عراق میں بعث پارٹی کی حکومت نے ہزاروں کی تعداد میں ملک سے ایرانیوں کو نکال باہر کیا اور ایران میں شاہ کے سیاسی مخالفین خصوصاً ساواک کے سابق سربراہ جنرل تیمور بختیار کی امداد و حمایت شروع کر دی۔ ایران نے عراق میں بعث پارٹی حکومت کو گزند پہنچانے کے لیے کرد علیحدگی پسندوں کے ساتھ روابط بڑھا لیے (The Modern History of Iraq، ص ۲۲۱؛ America`s Confrontation، ص ۶۰-۶۳)۔ ۱۹۶۹ء میں برطانیہ کی طرف سے نہر سویز کے مشرقی علاقے سے فوجیں واپس بلانے کے اعلان کے ساتھ ہی خطے میں بالادستی کے حصول کے لیے ایران اور عراق میں کشمکش تیز ہوگئی۔ شاہ نے برطانیہ کی واپسی پر خطے میں طاقت کے خلا کو پر کرنے اور علاقے کی ایک بڑی طاقت بننے کا عزم کر لیا۔ ۱۹۶۸-۱۹۶۹ء کے دوران میں شاہ نے سعودی عرب، کویت اور قطر کے ساتھ خلیج فارس میں بین الاقوامی سرحدوں کے تعین کے لیے کامیاب مذاکرات کیے۔ اسی سال (۱۹۶۹ء) اس نے بحرین پر قدیم ایرانی دعوے سے دستبرداری و لاتعلقی کا اعلان کیا۔ بعدازاں ایرانی مجلس نے بحرین کی آزادی و خود مختاری و علاقائی سالمیت کے بارے میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی منظور شدہ قرار داد (۱۹۷۰ء) کی توثیق کر کے بحرین کی حاکمیت اعلیٰ اور اس کی آزادی و خود مختاری کو بھی تسلیم کرلیا۔ ۱۹۷۰ کی دہائی کے آغاز میں مصر کے ساتھ اس کے تعلقات میں بھی بتدریج استحکام اور گرم جوشی پیدا ہو گئی۔ مغرب نواز انورالسادات (۱۹۷۰-۱۹۸۱ء) کی صورت میں شاہ کو خطے میں ایک فطری اتحادی میسر آگیا۔ شاہ نے مصر سے تعلقات مستحکم کر کے خطے میں دو حریف و مخاصم ریاستوں، شام اور عراق، کو اپنی شرائط منوانے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء میں ایران اور شام کے درمیان سفیروں کا تبادلہ ہوا۔ مزید براں ایران کی طرف سے شام کو فراہمی قرضہ کے لیے ایک معاہدہ بھی طے پایا (America's Confrontation، ص ۶۴-۶۵)۔ شاہ نے خطے کے ممالک پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے بعض فوجی اقدامات بھی کیے۔ اس نے برطانوی فوج کے انخلا (۱۹۷۱ء) سے کچھ عرصہ پہلے، آبنائے ہرمز کے دہانے پر واقع جنگی اہمیت کے حامل جزیروں، ابوموسیٰ اور طنب پر قبضہ جما لیا۔ جزیرہ ابوموسیٰ عرب امارت شارقہ (شارجہ) کی حدود میں شامل تھا جب کہ طنب کے دونوں جزیرے رأس الخیمہ کی حدود میں تھے۔ جزیرہ ابو موسیٰ پر ایرانی افواج کی تعیناتی بظاہر شارقہ سے ایک معاہدے کے نتیجے میں عمل میں آئی تھی، تاہم دیگر دونوں جزائر پر بزور قوت قبضہ جمایا گیا۔ اس ایرانی فوجی کاروائی کے بعد ایران سے عراق نے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے۔ مزید براں دونوں ملکوں کی افواج کے مابین سرحدی جھڑپوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا (America's Confrontation، ص ۶۵-۶۷؛ The Modern History of Iraq، ص۲۲۰-۲۲۱)۔ ۱۹۷۲ء ہی میں شاہ نے اومان کی حکومت کی درخواست پر وہاں کی انقلابی و علیحدگی پسند تحریک ”عوامی محاذ برائے آزادی خلیج عرب“ کو کچلنے کے لیے بھاری توپ خانہ اور جدید

ہتھیاروں سے لیس تین ہزار فوجی روانہ کیے۔ ایرانی فوجی دستوں نے، جنہیں جدید لڑاکا طیاروں کی امداد بھی میسر تھی، اس تحریک کو کچلنے میں کلیدی کردار ادا کیا (Americ`s Confrontation، ص ٦٦).

ایران۔ عراق کشمکش : ۱۹٦۷-۱۹٦۹ء کے دوران میں شاہ نے عراق کو خطے میں یک و تنہا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو اپنی شرائط پر مفاہمت پر مجبور کرنے کی بھی کوشش کی۔ عراق میں ۱۹٦۸ء کے نصف آخر سے علیحدگی پسند کرد تحریک ''کردستان ڈیموکریٹک پارٹی'' اور بعث پارٹی کی حکومت کے مابین مسلح تصادم کا آغاز ہو گیا تھا۔ شاہ نے بعث پارٹی کی حکومت کو نیچا دکھانے اور اسے نقصان پہنچانے کے لیے ۱۹٦۷ء سے علیحدگی پسندوں کو مالی و فوجی امداد دینا شروع کر دی۔ ۱۹٦۹ء تک کرد علیحدگی پسند ایران سے وسیع پیمانے پر امداد حاصل کرنے لگے تھے، حتیٰ کہ ایرانی فوج کے دستے بھی کردوں کے روپ میں عراقی فوج سے لڑنے لگے۔ جس کے نتیجے میں عراقی حکومت کو مارچ ۱۹۷۰ء میں کرد رہنما مصطفیٰ البرزانی کے ساتھ ایک معاہدہ کرنا پڑا، جس میں کردوں کے متعدد اہم مطالبات ، علاقائی خود مختاری اور قومی اسمبلی میں آبادی کے تناسب سے نمائندگی وغیرہ تسلیم کیے گئے۔ کردوں کے لیے ایک نائب صدر کا عہدہ بھی مختص کیا گیا۔ مزید براں کردوں کو حکومت (مجلس وزرا) میں مؤثر نمائندگی کا حق دیا گیا (David McDowall: A Modern History of the Kurds، لنڈن : آئی بی ٹاؤرس، ۲۰۰۰ء، ص ۳۲۳-۳۲٦؛ The Modern History of Iraq، ص ۲۲۲-۲۲۳، ۲۳۲-۲۳۳)۔ تاہم کردستان ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے نائب صدر کے عہدہ کے لیے محمد حبیب کریم (کے ڈی پی کے سیکرٹری جنرل) کی نامزدگی کو عراقی حکومت کی طرف سے اس کے ایرانی پس منظر رکھنے کی بنا پر مسترد کیے جانے اور بعض کرد رہنماؤں پر قاتلانہ حملوں کے سبب ۱۹۷۱ء کے اختتام کے وقت دونوں فریقوں (بعث حکومت اور کردوں) میں ایک دفعہ پھر محاذ آرائی شروع ہوگئی۔ اس موقع پر برسرپیکار کردوں کی حمایت میں شاہ ایران کے ساتھ صدر نکسن اور اسرائیل بھی شامل ہوگئے۔ صدر نکسن نے ۳۱ مئی ۱۹۷۲ء کو دورہ ایران سے واپسی پر سی۔ آئی۔ اے کو علیحدگی پسند کردوں کو چوری چھپے خطیر رقم (١٦ ملین ڈالر) کی فراہمی کی ہدایت کی تھی (The Modern History of Iraq، ص ۲۳۲-۲۳۳؛ The White House Years، ص ۱۲٦۴؛ A Modern History of the Kurds، ص، ۳۲٦ -۳۳۱)۔ ایرانی ساواک کے اہلکاروں نے عراق کے علیحدگی پسند کرد رہنما ملا مصطفیٰ برزانی اور اسرائیلی فوج و خفیہ ادارے موساد کے افسران کے درمیان رابطہ قائم کرایا اور ملا برزانی اور اسرائیل کے سپہ سالار اعلیٰ (چیف آف آرمی سٹاف) کے مابین ملاقات کا انتظام کیا۔ اسرائیل کے فوجی افسران نے عراقی کردستان کا جب کہ ملا برزانی نے اسرائیل کا دورہ کیا۔ اسرائیلی اسلحہ اور مالی امداد براستہ ایران کردوں کو پہنچائی جاتی رہی۔ امریکہ، ایران اور اسرائیل کی مالی امداد اور اسلحہ کی بدولت کرد چھاپہ ماروں نے عراقی فوج کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائیاں کیں۔ عراق میں بعث حکومت کردوں کے خلاف برسر پیکار ہونے کے سبب ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی حمایت میں محاذ جنگ پر صرف ایک ڈویژن فوج بھیج سکی۔ گویا شاہ کی یہ پالیسی اسرائیل کے مفادات کی تکمیل کا ایک اہم اور مؤثر ذریعہ بنی (The White House Years، ص ۱۲٦۴-۱۲٦۵؛ Nader Entessar: Israel and Iran`s National Security، در Journal of South Asian and Middle

Eastern Studies، ج ۲۷، عدد ۴ (۲۰۰۴ء) ، ص ۲-۴؛ A Modern History of the Kurds ، ص۳۲۳، ۳۲۵-۳۳۱).

ایران۔ اسرائیل تعلقات: ایران خطے کا واحد اسلامی ملک تھا جس نے ۱۹۵۳ء کے بعد سے امریکہ کے زیر اثر اس کے اہم ترین اتحادی اسرائیل سے فی الواقع ر عملاً (de facto) سفارتی و سیاسی اور فوجی و اقتصادی تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ شاہ عرب ممالک کی انقلابی حکومتوں کی طرف سے لاحق خطرات کے مقابلہ کے لیے اسرائیل کو اپنا اہم اتحادی خیال کرتا تھا اور اس سے سیاسی، فوجی اور اقتصادی شعبوں میں قریبی تعاون اور اتحاد و اشتراک عمل کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ محمد رضا شاہ پہلوی کی عرب مخالف پالیسیوں کی تشکیل میں اسرائیل کا بڑا ہاتھ رہا۔ ایران کے اسرائیل سے اقتصادی روابط بھی استوار تھے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط تک اسرائیل سے اس کی درآمدات کا حجم ۷۰ ملین ڈالر سالانہ تک جا پہنچا تھا، جبکہ ایران اسرائیل کو سب سے زیادہ تیل برآمد کرنے والا ملک بن گیا۔ مصر اور اسرائیل میں مفاہمت کے لیے امریکہ کی سرپرستی میں جاری مذاکرات (ستمبر ۱۹۷۸ء بمقام کیمپ ڈیوڈ) کے دوران میں ایران کی طرف سے اسرائیل کو، سینا کے علاقے میں سے اس کی فوجوں کی واپسی کی صورت میں، مستقبل میں اس کی تیل کی ضروریات کو پورا کرنے کی ضمانت دی گئی تھی (The Rise and Fall of Pahlavi Dynasty، ص ۳۷۰-۳۸۲، ۴۷۰-۴۷۱؛ Israel and Iran`s National Security، ص ۱-۳)۔ شاہ کی امریکہ اور اسرائیل کے بارے میں مذکورہ پالیسیوں کی بدولت ایران میں یہودی اقلیت خود کو بڑا محفوظ اور توانا محسوس کرتی تھی۔ ایرانی یہودی اقلیت کو متحرک و منظم کرنے میں تہران میں اسرائیلی سفارت خانے کے ارکان نیز موساد کے اہلکاروں نے اہم کردار ادا کیا۔ صہیونی حلقے بھاری مقدار میں یہودی افراد سے عطیہ جات اکٹھے کر کے اسرائیل روانہ کرتے رہے (The Rise and Fall of Pahlavi Dynasty، ص، ۴۷۰-۴۷۲).

اسلامی انقلابی تحریک، اسلامی نظریہ حیات کے علمبردار جدید تعلیم یافتہ دانش وروں کا کردار: ۱۹۶۱-۱۹۷۸ء کے دوران میں جدید تعلیم یافتہ دانش وروں نے ایران میں تجدد و مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی راہ میں بند باندھنے، جدید تعلیم یافتہ نسل کو اس کے منفی اثرات سے بچانے اور اسلام سے اس کے ذہنی و قلبی تعلق کو استوار و مستحکم کرنے میں روایتی علماء و مجتہدین کے مقابلے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان دانش وروں نے تحریر و تقریر کے ذریعے ملوکیت و شہنشاہیت پر تنقید کے علاوہ مغربی تہذیب و تمدن کے مفاسد کو آشکارا کرنے اور اس کے مقابلے میں اسلامی نظریۂ حیات کے محاسن و فضائل کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن نشین کرانے میں بڑی جرأت و بے باکی اور حکمت و تدبر سے کام لیا۔ البتہ ان جدید خیال دانش وروں کی دینی تعبیرات و تشریحات روایتی علما کی تعبیرات سے ہم آہنگ نہ تھیں۔ انہوں نے اسلامی مفاہیم کی اشاعت کے سلسلے میں جدید اصطلاحات کا سہارا لیا۔ان مفکرین میں ایک اہم نام مہندس مہدی بازرگان (۱۹۰۶-۱۹۹۴ء) کا ہے۔ وہ [ڈاکٹر علی شریعتی (۱۹۳۳-۱۹۷۷ء) سے پہلے] جدید ایران میں اسلام کے اہم ترجمان و شارح بن کر ابھرے۔ انہوں نے کثیر تعداد میں دینی و فکری موضوعات پر کتب و رسائل تصنیف کیے۔ ان تصانیف میں اسلام کو ایک کامل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کیا گیا۔ سیاسی، سماجی اور معاشی و تہذیبی مسائل کا حل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تجویز کیا گیا۔ اسلام اور سیاست و جمہوریت کے باہمی

تعلق کی توضیح کے علاوہ اسلام اور جدید طبعی علوم کے مابین موافقت و ہم آہنگی کو اجاگر کیا گیا۔ مہدی بازرگان نے اسلام اور سیاست و حکومت میں علیحدگی کے تصور کی خاص طور پر تردید و تنقید کی۔ مہدی بازرگان کو اسلام اور سائنس نیز اسلام اور جمہوریت کے مابین موافقت و ہم آہنگی پر زور دینے کی بنا پر ایران کا 'محمد عبدہ' بھی کہا جاتا ہے۔ بازرگان کے اسلام کے بارے میں عقلی تصورات نے ایران کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو خاص طور سے متاثر کیا (Roots of the Islamic Revolution in Iran، ص، ۸۶-۸۷؛ Religion and Politics in Contemporary Iran، ص ۲۳-۲۴، ۱۱۰-۱۱۶؛ Henery Munson: Islam and the Revolution in the Middle East، لنڈن: ییل یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۸ء، ص ۵۷).

مہدی بازرگان کے علاوہ ایران کے مسلم دانش وروں میں ایک بڑا اہم نام ڈاکٹر علی شریعتی (۱۹۳۳-۱۹۷۷ء) کا ہے۔ وہ اسلامی اصلاح و تجدید کے پرجوش داعی و ترجمان بن کر ابھرے تھے۔ علی شریعتی نے انحطاط پذیر و شکستہ حال ایرانی معاشرہ کے سامنے، جو سیاسی و تہذیبی خود اختیاری سے بہت حد تک محروم ہو چکا تھا اور سیاسی و سماجی بحران کا شکار تھا، اسلام کو ایک نجات دہندہ انقلابی نظریۂ حیات (Ideology) کے طور پر پیش کیا۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے اسلام اور اشتراکیت میں امتزاج پیدا کرنے کی بھی کوشش کی اور اسلام کا ایک حر کی تصور پیش کیا۔ علی شریعتی نے آمریت و ملوکیت کے خاتمے کے لیے مسلح جدوجہد کی پرزور وکالت و حمایت کی۔ انہیں اپنے انقلابی خیالات کی پاداش میں متعدد بار قید و بند سے دوچار ہونا پڑا۔ حکومت نے ان کی غیر معمولی مقبولیت کے پیش نظر ۱۹۷۳ء میں ان کے دعوتی مرکز حسینیہ ارشاد (تہران) کو بند کر دیا اور خود انہیں جیل میں ڈال دیا۔ ۱۹۷۵ء میں انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ لندن میں جلاوطنی کے دور میں جون ۱۹۷۷ء کو ساواک کے اہلکاروں نے انہیں قتل کر دیا۔ ڈاکٹر علی شریعتی کے علاوہ قوم پرست ایرانی دانش ور جلال آلِ احمد نے تجدد و مغربیت (غرب زدگی) کے بارے میں شاہ کے طرز فکر و عمل کے خلاف ایسی زور دار تنقید کی کہ اس کی گونج ایران کے فہمیدہ حلقوں میں سنائی دینے لگی (Religion and Politics in Contemporary Ian، ص ۱۴۳-۱۵۸؛ Islam and Revolution in the Middle East، ص ۱۲۰-۱۲۱، ۱۳۱ -۱۳۲؛ شوکت علی: Contemporary Religious Thoughts in Islam، لاہور: پبلشرز یونائٹڈ، ۱۹۸۶ء، ص ۲۲۵-۲۵۰، ۲۵۶-۲۸۰؛ Ervand Abrahamian The Iranian Mojahedin: Radical Islam، لنڈن: آئی۔ بی۔ ٹاؤرس، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۵-۱۲۵؛ John L. Esposito:The Islamic Threat: Myth or Reality، نیویارک: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس،۱۹۹۹ء، ص ۱۰۹-۱۱۲؛ مہدی عابدی و دیگر (مدیران): Jihad and Shahadat :Struggle and Martyrdom in Islam، ہوسٹن: انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ اسلامک اسٹڈیز، ۱۹۸۶ء، ص ۳۲۔ ۳۵۔ غرب زدگی کی تردید و مخالفت میں جلال آلِ احمد کے خیالات کے بارے میں ملاحظہ ہو: جلال آل احمد: Occidentosis A Plague From the West(مترجمہ و مرتبہ:R.Campbell و Hamid Algar)، برکلی: میزان پریس ۱۹۸۴ء ؛ وحید اختر: The Evil of Westernization A Review Article، در Al- Tawhid، ج ۴، عدد ۱، ستمبر، نومبر ۱۹۸۶ء، ص ۱۵۳-۱۷۰)۔ مہدی بازرگان اور ڈاکٹر علی شریعتی کے افکار و خیالات کی بدولت ایران میں اسلامی بیداری کے رجحان کو تقویت پہنچی۔ ان کی فکر سے متاثر سرکاری جامعات کے طلبہ اور اساتذہ نے متعدد اسلامی انجمنیں قائم کیں، جن میں ''مجاہدین خلق'' بطور خاص قابل ذکر

ہے۔ ایران کے سربرآوردہ علما میں سے آیت اللہ سید محمود طالقانی (م ۱۹۷۹ء)، آیت اللہ مرتضیٰ مطہری (م ۱۹۷۹ء) اور آیت اللہ محمد حسین بہشتی کے ان انجمنوں سے گہرے روابط استوار ہوگئے (The Turban For the Crown، ص ۹۳-۹۴).

نظام کی تبدیلی کے لیے مسلح جدوجہد: ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آغاز سے ایران کی داخلی سیاست میں ایک نئی تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی۔ سیاسی جبر سے اکتائے ہوئے نیز پرامن جمہوری طریقوں سے ملکی سیاست میں کسی تبدیلی کے امکانات سے مایوس جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مختلف الخیال گروہوں نے شہنشاہیت کے خاتمہ کی غرض سے مسلح جدوجہد کی ٹھان لی / کا عزم بالجزم کر لیا۔ چنانچہ ۱۹۷۰-۱۹۷۴ء کے دوران انقلابی خیالات کی حامل متعدد چھاپہ مار عسکری تنظیمیں وجود میں آئیں۔ ان میں ڈاکٹر علی شریعتی ، آیت اللہ سید محمود طالقانی اور مہندس مہدی بازرگان کی فکر سے متاثر نوجوانوں کی 'مجاہدین خلق ایران' جو بالعموم 'مجاہدین خلق' کے نام سے مشہور و معروف ہے، اور اشتراکی نظریات کی حامل 'فدائیین خلق' کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ یہ دونوں تنظیمیں ملک پر قائم مغربی طاقتوں کے غلبہ و تسلط کے خاتمے کے علاوہ ، ملوکیت اور عوام کے استحصال کے جملہ مظاہر کو نیست و نابود کرنے کے حق میں تھیں۔ جامعات و دیگر اعلیٰ تعلیمی اداروں کے طلبہ و اساتذہ کی کثیر تعداد ان کی حامی و ہمنوا بن گئی۔ مجاہدین خلق اسلام کی ایسی انقلابی تعبیر و تشریح کی، جس میں اسلام اور اشتراکیت کا امتزاج پیدا کیا گیا تھا، حامل و علمبردار تھی۔ اس تنظیم کا دائرہ طلبہ و اساتذہ کے علاوہ ملک کے دیگر سماجی طبقات، مہندسین، وکلا اور اطبا وغیرہ تک وسیع ہوگیا۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس میں شامل ہوگئیں۔ آیت اللہ سید محمود طالقانی اور مہدی بازرگان نے مجاہدین خلق کو مالی ضروریات کی فراہمی کے لیے کاروباری طبقات کو ترغیب دی۔ جنھوں نے اس تنظیم کو خطیر مالی رقوم فراہم کیں (مجاہدین خلق اور دیگر عسکری تنظیموں کی تنظیم و تشکیل نیز ان کے افکار و نظریات کے بارے میں ملاحظہ ہو: The Radical Islam:Iranian Mojahedin ، ص، ۸۵-۱۰۴، ۱۲۲۔ ۱۲۵: Desmnond Harney: The Priest and the King، لنڈن: آئی۔ بی۔ ٹاؤرس، ۱۹۹۹ء ص ۸-۹)۔ مجاہدین خلق نے تنظیم آزادی فلسطین کے عسکری بازو "الفتح" سے بھی روابط قائم کر لیے۔ اس کے ارکان نے اردن ، لبنان اور عراق میں الفتح کی عسکری تربیت گاہوں میں چھاپہ مار کارروائیوں کی تربیت حاصل کی۔ ۱۹۷۱ء کے اوائل سے مجاہدین خلق اور فدائیین خلق نے فوج اور پولیس کی چوکیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ مجاہدین خلق کے بعض ارکان نے اگست ۱۹۷۱ء میں قدیم ایرانی بادشاہت کی پچیس سو سالہ سالگرہ کے موقع پر منعقدہ تقریبات کو درہم برہم کرنے کا منصوبہ بنایا مگر یہ بات کھل گئی اور ساواک نے ان ارکان سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں وسیع پیمانے پر پرتشدد کارروائیاں کیں۔ جن میں مجاہدین کے بیسیوں ارکان ہلاک جب کہ سیکڑوں کی تعداد میں گرفتار ہوے، جن پر فوجی عدالتوں میں مقدمہ چلایا گیا۔ چنانچہ ان میں سے بیسیوں کو سزائے موت دی گئی جب کہ دوسروں کو ساواک کے قائم کردہ عقوبت خانوں میں سالہا سال تک وحشیانہ مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کے کثیر ارکان تعذیب و اذیت رسانی کے باعث ہلاک ہوگئے۔ ساواک کی تابڑ توڑ کارروائیوں سے ان کا تنظیمی ڈھانچہ درہم برہم ہوگیا اور ان کے بچے کھچے ارکان روپوش ہوگئے۔ البتہ وہ نئے عزم و حوصلے کے ساتھ شاہ کے خلاف پروپیگنڈا میں مشغول ہوگئے۔ اسلامی مجاہدین خلق نے خفیہ طور پر ملک کی جامعات، کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا۔

انہوں نے انقلابی مفکرین خصوصاً علی شریعتی کی تحریروں اور ان کی تقاریر و خطبات کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی۔ مزید براں یورپ و امریکہ میں زیر تعلیم ایرانی طلبہ کی تنظیموں سے بھی روابط استوار کیے اور انہیں ان ممالک میں شاہ مخالف پروپیگنڈا کے سلسلہ میں خوب متحرک کر دیا (*Radical Islam:The Iranian Mojahedin* ، ص ۱۲۸-۱۴۴؛ *The Guerrilla Movement in Iran*: *Ervand Abrahamian*، در Haleh Afshar (مدیر)، *A Iran:Revolution in Turmoil* ، ص ۱۶۳-۱۶۴، ۱۶۷)۔ ۱۹۷۱-۱۹۷۷ء کے دوران میں ساواک اور فوج کے ہاتھوں مجاہدین خلق کے علاوہ دیگر تنظیموں کے بھی سیکڑوں ارکان ہلاک ہوے، جبکہ ہزارہا کو ملک دشمن سرگرمیوں کے الزام میں جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ جہاں ان پر تشدد و اذیت رسانی کے بدترین حربے آزمائے گئے۔ ۱۹۷۴-۱۹۷۵ء کی ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق ایران ایک ایسا ملک بن گیا تھا جو انسانی حقوق کو پامال کرنے میں دنیا کے دیگر ممالک پر سبقت لے گیا تھا، جہاں سزائے موت کی شرح دنیا کے دیگر تمام ممالک کے مقابلے میں بلند تر تھی (*The Guerrilla Movement in Iran*، ص ۱۵۰-۱۵۱؛ Killing Hope، ص ۷۲)۔

حزب رستخیز: شاہ نے ۱۹۷۵ء میں ایک نئی سرکاری جماعت ''حزب رستخیز'' کے نام سے قائم کی۔ تاہم اسے بھی اپنی پیش رَو سرکاری جماعتوں، حزب مردم اور حزب ملیون کی طرح عوام میں قبولیت حاصل نہ ہو سکی (Roger Howard: *Iran in Crisis*، لنڈن: زیڈبکس، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۲)۔

صدر کارٹر اور انسانی حقوق کی پالیسی: چنانچہ ایک ایسے وقت میں جب شاہ اپنی قوت و طاقت کے اوج کمال پر تھا، اسے انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں اور ماہرین قانون کے بین الاقوامی کمیشن کی طرف سے سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ انہی دنوں امریکہ میں جمی کارٹر منصب صدارت پر متمکن ہوا (۱۹۷۷ء)۔ شاہ کو نئے امریکی صدر جمی کارٹر (۱۹۷۷-۱۹۸۱ء) کی انسانی حقوق کی پالیسی کے دباؤ میں آکر سیاسی جبر میں قدرے تخفیف پر مجبور ہونا پڑا (*The Priest and the King*، ص ۸-۹)۔ بعض ماہرین کے مطابق امریکی پالیسی میں یہ تبدیلی ایران کی بڑھتی ہوئی فوجی قوت اور اس کی خطے میں سیاسی و عسکری بالادستی کے حصول کی خواہش کے ردعمل کے طور پر تھی۔

شاہ ایران کے رفتہ رفتہ ظاہر ہونے والے ان عزائم پر امریکہ کا ماتھا ٹھنکا، تب اس نے ماضی کے برعکس شاہ پر دباؤ ڈالنے ، اسے ڈرانے دھمکانے اور اسے امریکی مرضی کے تابع رکھنے کی غرض سے ''بنیادی انسانی حقوق'' کے مسئلے کو اٹھانا شروع کیا (خورشید احمد، اسلامی تحریک: درپیش چیلنج، اسلام آباد: انسٹی ٹیوب آف پالیسی اسٹڈیز، بار دوم، ۱۹۹۵ء ، ص ۳۹-۴۰)۔ چنانچہ شاہ نے ۱۹۷۷-۱۹۷۸ء کے دوران میں مجاہدین خلق اور فدائیین خلق کے علاوہ دیگر عسکری و سیاسی گروہوں کے ہزاروں ارکان کو رہا کیا۔ مزید براں سیاسی مقدمات کو فوجی عدالتوں سے سول عدالتوں کی طرف منتقل کر دیا۔ عسکری تنظیموں اور سیاسی جماعتوں کے اہم رہنما بھی رہا کیے گئے۔ اس اہم پیش رفت کے بعد ملک میں سیاسی سرگرمیوں کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ۱۹۷۷ء کے نصف آخر میں ڈاکٹر محمد مصدق کے 'محاذ ملی' اور مہدی بازرگان کی سیاسی جماعت 'نہضت آزادی ایران' کے مابین سیاسی اتحاد قائم ہوا اور ان دونوں جماعتوں نے مشترکہ طور پر ملک میں جمہوریت کے قیام کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ مجاہدین خلق کے ارکان رہائی کے بعد ایک بار پھر بادشاہت کے خاتمہ کے لیے صف بندی میں مشغول ہوگئے۔ ۱۹۷۷ء کے اختتام تک شاہ مخالف تمام اہم قوتیں

یکجا اور متحد ہوگئیں۔ سربرآوردہ مذہبی رہنما آیت اللہ شریعت مداری کے علاوہ آیت اللہ خمینی کے ہم خیال علماء و مجتہدین کی کثیر تعداد بھی اس میں شامل ہوگئی (The Radical Islam:Iranian Mojahedin، ص ۱۷۰-۱۷۱؛ The Turban for the Crown، ص ۱۱۳-۱۱۹).

آیت اللہ خمینی اور انقلابی نظریئے کی تشکیل نو: آیت اللہ خمینی نے، جو ۱۹۶۴ء سے عراق کے شہر نجف میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے، ۱۹۷۰ء میں نجف میں اپنے خطبات میں ملوکیت و شہنشاہیت کو خلاف اسلام قرار دے کر اس کے مقابلے میں اسلامی حکومت کا ایک نیا نظریہ ''ولایت فقیہ'' پیش کیا۔ آیت اللہ خمینی کے اس تصور کے مطابق ازروئے مذہب حکومت و اقتدار کا کسی عادل و متقی اور صاحب بصیرت عالم وفقیہ کے پاس رہنا ضروری ہے۔ آیت اللہ خمینی نے ظالم و سرکش اور مستبد حکمرانوں کی غلامی و محکومی سے مستضعفین کی رہائی و نجات اور ایک عادلانہ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کو علماء کا مذہبی فریضہ قرار دیا۔ اسلامی حکومت کے بارے میں اس تصور کو شیعہ مذہب کی تاریخ میں ایک جرأت مندانہ اختراع قرار دیا جاسکتا ہے۔ آیت اللہ خمینی نے اپنی تحریروں اور خطبات و بیانات میں ملوکیت کو طاغوتی نظام قرار دے کر اپنے پیروکاروں اور حامیوں کو اسے نیست و نابود کر کے اسلامی حکومت کے قیام کی تحریک کی (آیت اللہ خمینی، ولایت فقیہ، تہران: مؤسسۂ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۳ء، ص ۲۸-۳۵،۱۲۵-۱۴۱؛ Roots of The Islamic Revolution in Iran، ص ۶۰-۶۱، ۷۳-۷۴؛ "Religion and Politics in Contemporary Iran، ص ۱۶۴-۱۶۷؛ حسین سیف زادہ: Ayatollah Khomeini`s Concept of Rightful Government: The Velayat-e-Fiqih"، در حسین مطلب و تاج الاسلام ہاشمی (مدیران): Islam, Muslims and the Modern State، نیویارک :سینٹ مارٹن پریس (St. Martin Press، ۱۹۹۴ء، ص ۱۹۷-۱۹۹)۔ ایران میں آیت اللہ خمینی کے حامی علما نے، جن میں تقریباً ۱۲ ہزار سے زائد ایسے تھے جو قم کی درسگاہ میں ان (خمینی) سے دینی تعلیم حاصل کرچکے تھے، اسلامی انقلاب اور حکومت الٰہیہ کے بارے میں اپنے امام و مربی کے افکار و خیالات کی اشاعت میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی (Contemporary Religious Thoughts in Islam,، ص ۱۴۲-۱۵۰)۔ علماء و مجتہدین کو ایران کے روایتی کاروباری طبقات، جو شاہ کی اقتصادی پالیسیوں سے نالاں تھے، کا تعاون حاصل ہوگیا۔ چنانچہ تاجر اور کاروباری طبقے علماء و مجتہدین کو دل کھول کر مالی امداد فراہم کرتے رہے۔ آیت اللہ خمینی کے حامی ان علماء و مجتہدین کو ایرانی عوام کے متوسط طبقے میں نمایاں اثر و رسوخ حاصل ہوا (The Turban For the Crown، ص ۹۱-۹۶، ۱۴۷، ۱۴۸)۔ یوں تو ایران میں اسلامی بیداری کی تحریک کا بیج بونے اور پھر اس کی نشوونما میں جدید تعلیم یافتہ دانش وروں ، مہدی بازرگان اور ڈاکٹر علی شریعتی نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا، لیکن آیت اللہ خمینی نے ایرانی عوام کو اسلامی انقلاب اور حکومت الٰہیہ جیسے تصورات سے روشناس کر کے انہیں بادشاہت کے خلاف فیصلہ کن جدوجہد (سیاسی تحریک) کے لیے تیار و آمادہ کیا (Roots of the Islamic Revolution in Iran، ص ۱۴۲-۱۵۰؛ Contemporary Religious Thoughts in Islam، ص ۱۴۲-۱۵۰)۔ ۱۹۷۸ء کے آغاز تک علماء و مجتہدین کی اکثریت آیت اللہ خمینی کے تصور حکومت اسلامی (ولایت فقیہ) کی حامی و مؤید بن گئی۔ ان کے ہاں طاغوتی نظام کو نیست و نابود کرنے اور اسلامی حکومت کے قیام سے متعلق آیت اللہ خمینی کے خیالات کو خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ محمد رضا شاہ پہلوی نے آیت اللہ خمینی کو ان کی مذہبی و سیاسی

سرگرمیوں سے باز رکھنے کے لیے ۱۹۷۷ء میں ساواک کے کارندوں کے ذریعے ان کے ساتھ نجف میں مقیم ان کے بیٹے سید مصطفیٰ خمینی کو قتل کرا دیا، تاہم آیت اللہ خمینی کے عزم و استقامت میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ وہ بڑی پامردی سے شاہ کے خلاف ڈٹے رہے (جلال الدین مدنی:Islamic Revolution of Iran ، تہران: انٹرنیشنل پبلشنگ کمیٹی، ۱۹۹۶ء، ص ۳۲۸-۳۲۹؛ The Turban for the Crown،ص ۸۶،۹۶-۹۸)۔

جنوری ۱۹۷۸ء کے اوائل میں ایران کے سرکاری اخبار اطلاعات میں ایک ایسا مضمون شائع ہوا جس میں آیت اللہ خمینی کی اہانت و تنقیص کی گئی تھی۔ اس کی اشاعت پر قم کی معروف دینی درس گاہ (حوزۂ علمیہ) کے طلبہ و اساتذہ میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے اس کا اظہار احتجاجی مظاہروں نیز تھانوں اور سرکاری عمارتوں پر حملوں کی صورت میں کیا۔ فوج اور پولیس نے طاقت کا استعمال کیا جس کے نتیجے میں متعدد ہلاکتیں ہوئیں (۹ جنوری ۱۹۷۸ء)۔ سیکڑوں کی تعداد میں طلبہ و اساتذہ زخمی بھی ہوئے۔ اس حادثہ کے ردعمل میں دینی درسگاہوں کے طلبہ اور علماء و مجتہدین نے حکومت کے خلاف مظاہروں کا ایسا سلسلہ شروع کیا جس کا انجام شاہ کے اقتدار کے خاتمہ کی صورت میں نکلا۔ یوں جنوری ۱۹۷۸ء میں قم میں پیش آنے والے واقعات ایران میں اسلامی انقلاب کی تمہید بن گئے۔ جنوری میں ہلاک ہونے والے طلبہ وعلماء کی رسم چہلم کے موقعہ پر ۱۸ فروری کو تبریز میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ مظاہرین نے پہلی بار قومی بنکوں اور سرکاری عمارتوں خصوصاً سینماؤں اور جدیدیت و مغربیت (غرب زدگی) کی علامات خصوصاً شبستانوں، شراب اور جوأ خانوں پر منظم حملے کیے۔ تبریز میں مظاہروں پر قابو پانے کے لیے فوجی طاقت کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ مظاہرین پر ہیلی کاپٹروں کے ذریعے گولیاں برسائی گئیں جس سے ۵۰۰ افراد ہلاک ہوئے۔ مارچ کے اختتام تک ان ہنگاموں اور مظاہروں کا دائرہ ماسوائے دارالحکومت تہران کے دیگر بڑے شہروں یزد، اصفہان، کرمان شاہ اور بابل تک وسیع ہوگیا۔ مئی کے اوائل میں قم میں وسیع پیمانے پر ہنگامے اور فسادات ہوئے حتیٰ کہ شاہ کو اپنا مجوزہ دورہ ہنگری و بلغاریا منسوخ کرنا پڑا۔ ان شہروں میں بھی کثیر تعداد میں ہلاکتیں ہوئیں (The Priest and The King، ص ۱۲-۱۳؛ Roots of the Islamic Revolution in Iran، ص ۱۲۴-۱۲۶)۔ وسط مئی تک دارالحکومت تہران بھی شاہ مخالف مظاہروں اور ہنگاموں کی لپیٹ میں آگیا۔ جب کہ جون، جولائی تک اس کا دائرہ شیراز اور مشہد تک وسیع ہوگیا۔ ان ہنگاموں اور مظاہروں کی نوعیت ہر جگہ یکساں رہی۔ ہر جگہ اور ہر شہر میں بنکوں، سینماؤں، شراب کی دوکانوں، جوأ خانوں اور سرکاری عمارتوں کو نشانہ بنایا گیا اور انہیں نذر آتش کیا گیا۔ جب کہ فوج اور پولیس کی طرف سے مظاہروں پر قابو پانے کے لیے قوت و طاقت کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ چنانچہ ہر شہر میں سیکڑوں ہلاکتیں ہوئیں اور ہزارہا مظاہرین زخمی ہوئے (The Priest and the King،ص ۱۳-۱۸)۔ اگست کے دوران بھی تہران، اصفہان، ابادان اور مشہد میں مظاہروں کے دوران سیکڑوں افراد ہلاک ہوئے۔ صرف ۲۰ر اگست کو ابادان میں ایک سینما کی آتش زنی کے واقعہ میں تقریباً چار سو افراد ہلاک ہوئے۔ ابادان کا یہ حادثہ اصلاح پسند اور جدیدکاری کے حامی وزیراعظم جمشید آموزگار کو لے ڈوبا۔ ۲۷ر اگست کو شاہ نے اس کی جگہ جعفر شریف امامی کو، جو ایک عالم دین کا بیٹا تھا، وزیراعظم مقرر کیا۔ شاہ کا خیال تھا کہ جعفر شریف امامی علما کو مطمئن کر سکے گا۔ جب کہ علما اسے شاہ کا پروردہ اور حاشیہ بردار گردانتے تھے چنانچہ وہ اس تبدیلی سے ہرگز مطمئن نہ ہوئے۔ شریف امامی نے عوام کی

دلجوئی و اشک شوئی کے طور پر ساواک کے درجنوں اعلیٰ افسروں کو معطل و برطرف کرنے کے علاوہ گزشتہ مہینوں کے دوران گرفتار سیاسی قیدیوں کی رہائی کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ مزیدبراں اس نے قدیم ایرانی تقویم کی جگہ اسلامی ہجری تقویم کو پھر سے جاری کیا۔ تاہم یہ سطحی اقدامات عوام کے غیض و غضب کو سرد کرنے میں ناکام رہے (The Priest and the King، ص ۱۴-۱۶؛ Roots of the Islamic Revolution in Iran، ص ۱۲۷-۱۲۸]۔

شاہ مخالف اس تحریک پر، جس میں ایران کے تمام سیاسی گروہ اور عوام کے تمام طبقات شامل تھے، آیت اللہ خمینی کے حامی روایتی علماء و مجتہدین کی گرفت مضبوط ہوگئی جب کہ آیت اللہ خمینی کو اس تحریک کے رہبر و رہنما کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ آیت اللہ خمینی نجف سے اپنے پیروکار علماء و مجتہدین کو متواتر ہدایات جاری کرتے رہے۔ اس دور میں آیت اللہ خمینی کے بیانات اور پیغامات کو تحریک کے منشور و لائحہ عمل کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ ستمبر ۱۹۷۸ء کے آغاز سے ملک بھر میں شاہ مخالف مظاہروں میں بڑی شدت آگئی۔ آیت اللہ خمینی کی دعوت پر ملک میں ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دارالحکومت تہران میں بہت بڑے جلوس نکلے جس میں لاکھوں افراد شریک ہوے۔ تہران میں تھانوں، بنکوں، ہوٹلوں، شراب کی دوکانوں، جوأ خانوں، سینماؤں اور سرکاری عمارتوں پر حملوں کا سلسلہ وسیع و شدید تر ہوگیا۔ بحران سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ۸ ستمبر کو تہران میں مارشل لا لگا دیا گیا اور سخت گیر فوجی افسر جنرل غلام علی اویسی کو مارشل لاء انتظامیہ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اسی روز دارالحکومت تہران کے علاقے میدانِ ژالہ (Jaleh Square) میں مظاہرین کے ایک بڑے اجتماع پر فوج اور پولیس کی فائرنگ سے قریباً ۲۵۰ افراد ہلاک اور تین ہزار سے زائد زخمی ہوئے۔ فوج اور ساواک کے ہاتھوں تہران کے عوام خون میں نہا گئے۔ اس قتل عام میں ساواک کے مربی اسرائیلی مشیروں کے ملوث ہونے پر بھی شبہ ظاہر کیا گیا (The Turban for the Crown، ص ۱۱۶؛ The Priest and The King، ص ۱۴-۲۴، ۲۵؛ Roots of the Islamic Revolution in Iran، ص ۱۳۰-۱۳۱)۔ اب تو ایرانی عوام میں شاہ کی ساکھ و اعتبار کلیتاً ختم ہو کر رہ گیا۔ عوام کے دلوں میں شاہ کے حامی و سرپرست امریکہ سے نفرت و بے زاری اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ ایران کی فضا مرگِ برشاہ (شاہ مردہ باد) اور مرگِ بر امریکہ (امریکہ مردہ باد) کے نعروں سے گونجنے لگی۔ شاہ نے، جو آیت اللہ خمینی کو تحریک کو انگیخت کرنے کا ذمہ دار گردانتا تھا، عراق کے صدر صدام حسین پر دباؤ ڈال کر انہیں نجف سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ ستمبر ۱۹۷۸ء میں آیت اللہ خمینی نجف سے فرانس کے دارالحکومت پیرس چلے گئے۔ پیرس میں وہ اپنی سرگرمیوں میں نجف کے مقابلے میں زیادہ آزاد ہوگئے۔ وہاں پر وہ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ چنانچہ ان کے اعلانات و بیانات اور ایران کے عوام کے نام ان کے پیغامات ایران کے گلی کوچوں میں بآسانی پہنچنے لگے (The Turban for the Crown، ص ۱۱۸؛ Roots of the Islamic Revolution in Iran، ص، ۱۲۹-۱۳۰)۔ اکتوبر میں حالات مزید ابتر ہوگئے۔ شاہ مخالف تحریک نے، جس میں شاہ مخالف تمام مذہبی و سیاسی لادینی و قوم پرست قوتیں اور اشتراکی چھاپہ مار تنظیمیں شامل تھیں، آیت اللہ خمینی کی تحریک پر غیر معینہ عرصے کے لیے ہڑتال و سول نافرمانی کا راستہ اختیار کر لیا۔ جامعات اور دیگر تعلیمی اداروں کے طلبہ و اساتذہ کے علاوہ تمام حکومتی محکموں، تیل کمپنیوں، سرکاری کارخانوں اور فضائی و جہاز راں کمپنیوں حتیٰ کہ فوج کے سول ملازمین سبھی ہڑتال میں شریک ہوگئے۔ ہڑتالیں پہلوی بادشاہت کی بنیادوں کو

ہلانے میں مؤثر ترین حربہ ثابت ہوئیں۔ تمام حکومتی محکمے اور ادارے مفلوج ہوگئے۔ ملک میں تیل اور اشیائے خورد و نوش کی قلت ہوگئی۔ وسط اکتوبر سے تو ایران میں شاہ کی جگہ پیرس میں مقیم آیت اللہ خمینی کا سکہ چلنے لگا۔ آیت اللہ خمینی نے برملا طور سے شاہ سے اقتدار سے الگ ہوجانے اور ملک چھوڑ جانے کا مطالبہ کیا جب کہ وہ اقتدار و تخت کے ساتھ چمٹے رہنے کے عزم پر قائم رہا۔ اکتوبر میں امریکہ نے جنرل غلام علی اویسی کو اقتدار پر قبضہ کر لینے کا اشارہ دیا تھا۔ امریکہ کے بعض اعلیٰ حکومتی حلقوں نے شاہ کے بغیر اپنی پسند کی ایسی حکومت لانے کا فیصلہ کر لیا تھا، جو اس ملک میں اس کے مفادات کا تحفظ کر سکے (The Turban for the Crown، ص ۱۲۸-۱۳۱)۔ ۵/ نومبر کو وسطی تہران میں توڑ پھوڑ، آتش زنی اور پولیس تھانوں، فوجی چوکیوں پر حملوں کے کثیر واقعات پیش آئے۔ ایران میں مقیم بی۔ بی۔ سی کی جانبدارانہ رپورٹنگ پر مشتعل مظاہرین نے برطانوی سفارت خانہ پر قبضہ کر لیا اور اسے جلا کر خاکستر کر دیا۔ اگلے روز شاہ نے جعفر شریف امامی کی جگہ جنرل غلام رضا اظہری کی سربراہی و قیادت میں فوجی حکومت قائم کر دی۔ جنرل اظہری کی حکومت بھی تمام تر قوت و طاقت کے استعمال کے باوجود شاہ مخالف تحریک کو کچلنے اور شاہ کے اقتدار کو سنبھالا دینے میں ناکام رہی۔ تہران اور دیگر بڑے شہروں میں نظام زندگی معطل ہو کر رہ گیا۔ سخت کرفیو کے نفاذ سے شہری آبادی کو مشکلات کا سامنا رہا۔ ۵/نومبر کو برطانوی سفارت خانے کو نذر آتش کیے جانے کے بعد سے ملک سے غیر ملکیوں خصوصاً اسرائیل، امریکہ اور برطانیہ کے شہریوں کے انخلاء کا عمل تیز تر ہو گیا۔ علاوہ ازیں اعلیٰ فوجی و سول حکام کی طرف سے اپنے عہدوں سے مستعفی ہونے اور امریکہ و یورپی ممالک کی طرف روانگی کا سلسلہ بھی تیز ہو گیا۔ شاہ مخالف تحریک کے تیور دیکھتے ہوئے ان عناصر کو ایران میں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تھا۔ سرکاری ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ملازمین بھی شاہ مخالف تحریک میں شامل ہوگئے۔ ان واقعات سے شاہ کی خود اعتمادی کو شدید دھچکا لگا (The Priest and the King ص ۳۱، ۳۵-۳۶، ۴۲-۴۳، ۵۳، ۵۹-۶۱؛ The Tuban for the Crown، ص ۱۰۹-۱۱۸)۔ شاہ نے عوام کو مطمئن کرنے کی غرض سے سیاسی اشرافیہ اور مقتدر طبقہ کے بعض نمایاں افراد کو، جن میں اس کے بھائی بھی شامل تھے، ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا۔ بعض سابق وزرا اور اعلیٰ حکام کو گرفتار بھی کیا گیا۔ بحران اور افراتفری کے اس دور میں شاہ مخالف تحریک میں شامل مختلف گروہوں نے زیر زمین اخبارات و جرائد کی اشاعت کا آغاز کیا۔ ان اخبارات و جرائد میں تحریک کے دوران فوج اور پولیس کے ہاتھوں وسیع ہلاکتوں کی تفصیلات شائع ہونے لگیں۔ اخبارات میں گذشتہ بیس سالوں کے دوران میں ساواک کے ہاتھوں اس کے قائم کردہ عقوبت خانوں میں شاہ کے مخالفین پر ڈھائے جانے والے مظالم نیز محمد رضا شاہ پہلوی، اس کے خاندان کے افراد، اس کے مصاحبین و مقربین اور دیگر سول و فوجی حکام کی بدعنوانیوں، لوٹ مار اور ان کی طرف سے بیرون ملک بھاری رقوم کی منتقلی کی تفصیلات کی اشاعت سے تو ایرانی عوام کا شاہ طبقہ اشرافیہ کے ارکان اور اعلیٰ سول و فوجی حکام کے خلاف غصہ و نفرت اپنی آخری حدوں کو چھونے لگا۔ وہ ایران کے عوام کے لیے قطعاً ناقابل قبول بن گئے (Priest and the King، ص ۵۳-۵۴، ۸۹، ۹۱، ۱۰۸؛ The Turban for the Crown، ص ۱۱۸).

دریں اثنا پیرس کے مضافات میں مقیم آیت اللہ خمینی نے اپنے حامیوں کو اور انقلابی تحریک میں شامل دیگر گروہوں کو پہلوی بادشاہت کی وفادار و محافظ ساواک اور

فوج کے خلاف مسلح جدوجہد کی ہدایت کی۔ جس سے فوج اور عوام کے مابین تصادم شدید تر ہوگیا۔ صرف نومبر کے آخری عشرہ اور دسمبر کے پہلے عشرہ کے دوران میں کرفیو کی خلاف ورزی پر فوج کے ہاتھوں تقریباً ۱۵سو افراد ہلاک ہوے۔ تاہم فوج عوامی مزاحمت کے مقابلے میں بے بس نظر آنے لگی، اس کے اعصاب شل ہوگئے۔ اس کے اندر برگشتگی و انحراف اور ماتحت سپاہیوں کی اپنے افسروں کے احکامات کی تعمیل سے انکار ایک معمول بن گیا [Priest and the King، ص ۱۱۷، ۱۲۲-۱۲۳)۔ ماہ دسمبر (محرم الحرام) کے دوران میں علماء و مجتہدین کی قیادت میں عوامی مظاہروں نے پہلوی سلطنت کی چولیں ہلا دیں۔ فوج اور پولیس ان مظاہرین کے سامنے کلیتًا بے بس ہوگئی۔ ۱۱ دسمبر کو عاشورہ کے موقع پر تہران کے شمالی حصے میں شاہی پاسداران (Imperial Guards) کی بیرکوں اور ملک کے دوسرے حصوں میں آیت اللہ خمینی کے حامی ماتحت سپاہیوں اور افسروں کی کھلم کھلا بغاوت اور ان کے ہاتھوں درجنوں اعلیٰ فوجی افسروں کی ہلاکت نے صورت حال مزید ابتر بنا دی (*The Priest and the King*، ص ۱۱۲، ۱۱۷، ۱۲۲ -۱۲۳، ۱۳۱؛ *The Turban for the Crown*، ص ۱۲۱)۔ اس موقع پر شاہ نے اپنے اقتدار کے تحفظ و بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ اس نے بعض شیعہ علما کی حمایت حاصل کرنے حتی کہ آیت اللہ خمینی سے بالواسطہ طور پر گفت و شنید اور مفاہمت و مصالحت کی بھی کوشش کی۔ اس کے ایما پر اردن کے شاہ حسین نے پیرس میں آیت اللہ خمینی سے ملاقات کرنا چاہی جب کہ آیت اللہ خمینی نے کسی قسم کا سمجھوتہ اور مفاہمت و مصالحت کرنے سے انکار کر دیا۔ دریں حالات امریکہ اور برطانیہ نے بھی شاہ کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ امریکہ شاہ کو سیاسی بوجھ خیال کرنے لگا۔ دسمبر کے اوائل میں امریکی صدر جمی کارٹر کی طرف سے ایک خصوصی ایلچی کے ذریعے شاہ کو اقتدار سے الگ ہوجانے کا مشورہ دیا گیا۔ امریکہ کے مقتدر حلقے متبادل انتظامات پر غور کرنے لگے تھے۔ اندرون ملک شاہ کے قریبی حلقے خصوصاً اعلیٰ فوجی قیادت بھی اس کی ملک میں موجودگی کو نامناسب خیال کرنے لگی تھی۔ چنانچہ اعلیٰ فوجی قیادت نے سیاسی بحران سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جنرل غلام رضا اظہری کی حکومت کی جگہ محاذ ملی کے رہنما شاہ پور بختیار کی سربراہی میں نئی حکومت تشکیل دینے اور ساتھ ہی شاہ کو طویل رخصت پر بیرون ملک روانہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ سخت گیر فوجی افسروں کا ایک گروہ جنرل غلام علی اویسی اور جنرل اردشیر زاہدی کی قیادت میں فوجی مداخلت پر آمادہ تھا۔ یہ گروہ شاہ کو ہٹا کر یا اس کی بیرون ملک روانگی کی صورت میں اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ اس گروہ کو امریکہ کے بااثر و طاقت ور حلقوں خصوصاً قومی سلامتی کے مشیر برزیزنسکی [Zbigniew Brzezinski] اور محکمہ دفاع کے بعض عناصر کی پر زور تائید و حمایت حاصل تھی۔ امریکہ کے تہران میں سفیر بل سلیوان (Bill Sullivan) اور یورپ میں امریکی افواج کے ڈپٹی کمانڈر انچیف جنرل رابرٹ ہوئسر (Robert Huyser) اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تہران میں سرگرم عمل رہے۔ مذکورہ امریکی حلقے ایران میں شاہ مخالف تحریک کو قوت و طاقت کے بھرپور استعمال سے مکمل طور پر کچلنے کے پرجوش حامی تھے (*The Priest and the King*، ص، ۹۷-۱۰۰، ۱۱۷-۱۲۰،۱۳۱-۱۳۶ : *The Iranian Revolution 25 years later* An Oral *History with Henry Precht, then State Department Desk Officer*، در *The Middle East Journal*، ۵۸:۱(۲۰۰۴ء، ص ۱۷-۲۳)۔ مگر امریکی اہل کاروں کا یہ منصوبہ ناکام رہا۔ شاہ نے ۶ جنوری کو (فوجی قیادت کے ایماء پر) شاہ پور بختیار کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ آیت اللہ

خمینی نے بختیار کی حکومت کو بھی تسلیم کرنے یا ان سے کسی قسم کی مفاہمت اور سمجھوتے سے انکار کر دیا۔ وہ پا مردی اور استقامت سے ملک میں اسلامی حکومت کے قیام کے عزم پر قائم رہے۔ جنوری (۱۹۷۹ء) ایران میں شاہ کے اقتدار کا آخری مہینہ ثابت ہوا۔ شاہ پور بختیار کی حکومت نے راز داری کے ساتھ محمد رضا شاہ پہلوی کی ملک سے روانگی کے انتظامات کیے۔ چنانچہ ۱۶/ جنوری کو وہ پورے سرکاری اعزازات کے ساتھ طویل رخصت پر ملک سے روانہ ہوا۔ شاہ کی روانگی سے عوام میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی فوج میں شکست و ریخت کا عمل شدید تر ہو گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں سپاہی آیت اللہ خمینی کے ہم نوا بن گئے جبکہ سیکڑوں اعلیٰ فوجی افسر مستعفی ہوگئے (The Turban for the Crown، ص ۱۲۱-۱۲۳)۔

اسلامی انقلابی کونسل اورعبوری حکومت کی تشکیل: حزب مخالف کے رہنما، سیاست دان اور دانش ور، جن میں ابو الحسن بنی صدر، صادق قطب زادہ (جو بعد میں بالترتیب ایران کے صدر اور وزیرخارجہ منتخب و مقرر ہوے)، حسن حبیبی اور ڈاکٹر ابراہیم یزدی کے علاوہ نہضت آزادی ایران کے رہنما مہدی بازرگان شامل تھے، پیرس میں آیت اللہ خمینی کے گرد مجتمع ہو گئے۔ شاہ پور بختیار کی حکومت کے قیام کے چند روز بعد ہی آیت اللہ خمینی نے ایک اسلامی انقلابی کونسل، جسے صحیح تر معنوں میں ایک متبادل عبوری انقلابی حکومت ہی کہا جانا چاہیے، قائم کر دی۔ گو کہ انقلابی کونسل میں شاہ کے خلاف برسرپیکار مختلف جماعتوں کے چند ایک رہنما بھی شامل کیے گئے تھے، تاہم اس پر آیت اللہ خمینی کے پیرو کاروں کو غالب حیثیت حاصل تھی۔ آیت اللہ خمینی نے آیت اللہ سید محمود طالقانی کو اس کا صدر اور آیت اللہ محمد حسین بہشتی کو اس کا نائب مقرر کیا۔ انقلابی کونسل میں ابوالحسن بنی صدر، صادق قطب زادہ ، ڈاکٹر ابراہیم یزدی، حسن حبیبی اور مہدی بازرگان اور علما میں سے مرتضیٰ مطہری، ہاشمی رفسنجانی ، موسوی اردبیلی، جواد باہنر، مہدوی کانی اور علی خامنہ ای شامل تھے (The Turban for the Crown، ص ۱۱۳، ۱۳۴؛ وحید الزمان: Iranian Revolution: A Profile، اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، ۱۹۸۵ء ،ص ۱۲۹-۱۳۰)۔ اسلامی انقلابی کونسل کے قیام کے بعد دارالحکومت اور دیگر شہروں میں محمد رضا شاہ پہلوی کی بادشاہت کے آثار و باقیات کے خاتمہ کے لیے فیصلہ کن کشمکش کا آغاز ہوا۔ ملک میں آیت اللہ خمینی کی واپسی کا مطالبہ بھی زور پکڑ گیا۔ شاہ پور بختیار آیت اللہ خمینی کی واپسی کے لیے عوام کے غیر معمولی دباؤ کو زیادہ دن برداشت نہ کر سکا اور چارو ناچار ان کی واپسی کی اجازت دینے پر مجبور ہوا۔ یکم فروری (۱۹۷۹ء) کو آیت اللہ خمینی فاتحانہ حیثیت سے تہران واپس پہنچے تو ایران کے عوام نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔ آیت اللہ خمینی نے ملک واپسی پر مہدی بازرگان کی قیادت میں عبوری حکومت قائم کی (۵ فروری ۱۹۷۹ء)۔ آئندہ کئی روز تک ملک میں بیک وقت دو متوازی حکومتیں، شاہ پور بختیار کی حکومت جسے شاہ نے مقرر کیا تھا اور مہدی بازرگان کی حکومت، جس کا تقرر آیت اللہ خمینی نے کیا تھا، موجود رہیں۔ چند روز بعد ۹-۱۰ فروری کو مشرقی تہران میں فضائیہ کے کیڈٹوں نے آیت اللہ خمینی کے حق میں بغاوت کر ڈالی۔ فضائیہ کی بیرکوں میں آیت اللہ خمینی کے حامیوں اور حکومت کے وفا دار دستوں کے مابین گھمسان کی جنگ ہوئی۔ اس واقعہ کے ساتھ ہی فوج کی شکست و ریخت کا عمل اپنی انتہا کو جا پہنچا۔ یوں محمد رضا شاہ کے ملک سے نکل جانے کے ۲۶ دن بعد شاہ پور بختیار کی حکومت بھی ختم ہو گئی اور انقلاب کا پہلا مرحلہ تکمیل کو جا پہنچا (The Priest and the King، ص ۱۳۶-۱۳۷؛

The Turban for the Crown، ص ۱۲۶-۱۲۸؛ Roots of the Islamic Revolution in Iran، ص ۱۳۵-۱۳۶).

مہدی بازرگان کی عبوری حکومت: پہلوی بادشاہت کے خاتمہ پر آیت اللہ خمینی کو اپنے تصور "ولایت فقیہ" کے مطابق ایک اسلامی ریاست کے قیام کا موقع میسر آ گیا۔ دریں حالات ملک کے سیاسی و انتظامی، قانونی و عدالتی اور تعلیمی و اقتصادی نظام کی تشکیل نو اور حکومتی و انتظامی اداروں کی تنظیم نو ناگزیر تھی۔ چنانچہ اس عمل کا آغاز انقلاب کے پہلے مرحلہ کے مکمل ہوتے ہی کیا گیا۔ آیت اللہ خمینی نے ۵/فروری ۱۹۷۹ء کو اسلامی انقلابی کونسل کی تجویز پر مہندس مہدی بازرگان کو عبوری وزیراعظم مقرر کیا تو ایک خصوصی فرمان کے ذریعے ان کے وظائف و اختیارات کا تعین بھی کر دیا۔ عبوری حکومت کو بنیادی طور پر چار وظائف ملکی نظم و نسق اور معاشی و صنعتی سرگرمیوں کی بحالی، ملک میں اسلامی جمہوریہ کے قیام کی غرض سے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے ایک استصواب رائے کا انعقاد، اسلامی دستور کی تدوین کے لیے عوامی نمائندوں پر مشتمل ایک مجلس کی تشکیل اور پھر نئے دستور کی بنیاد پر مجلس (پارلیمنٹ) کے انتخابات کا انعقاد تفویض کئے گئے (وحید الزمان: Iranian Revolution، ص ۱۳۰-۱۳۱)۔ عبوری حکومت میں اسلامی انقلاب کے حامی متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے جدید تعلیم یافتہ ٹیکنو کریٹس کو وزیر مقرر کیا گیا، جبکہ علماء و مجتہدین کو اس سے باہر رکھا گیا۔ عبوری حکومت اسلامی انقلابی کونسل کے تابع و ماتحت تھی۔ اسلامی انقلابی کونسل کو ملک کے اعلیٰ ترین پالیسی ساز ادارے اور اس کی عبوری مقننہ کی حیثیت دی گئی تھی۔ یہ کونسل آیت اللہ خمینی کی طرف سے جاری فرامین و ہدایات کی روشنی میں پالیسی امور سے متعلق تمام اہم فیصلے کرتی تھی جب کہ مہدی بازرگان کی حکومت کا کام محض ان پر عمل درآمد کرنا تھا۔ مہدی بازرگان کو اس کونسل سے منظوری حاصل کیے بغیر وزرا اور دیگر اہم ملکی و انتظامی عہدے داروں کے تقرر کا کوئی اختیار نہ تھا۔

۳۰/ مارچ ۱۹۷۹ء میں ملک گیر ریفرنڈم کرایا گیا جس میں عوام کی بھاری اکثریت نے اسلامی جمہوریہ کے قیام کے حق میں رائے دی۔ آیت اللہ خمینی نے اسے ایران میں خدا کی حکمرانی کا پہلا دن قرار دیا (وحید الزمان: Iranian Revolution، ص ۱۳۰-۱۳۱)۔

اداراتی تشکیلات: انقلاب کے ساتھ ہی مہدی بازرگان کی عبوری حکومت کے متوازی ایک اور حکومتی نظم انقلابی کمیٹیوں "کمیتے" کی صورت میں وجود میں آ گیا، جس کی زمامِ کار علما کے ہاتھ میں تھی۔ علما و مجتہدین نے انقلابی تحریک کے آخری مرحلے میں مختلف شہروں میں انقلابی کمیٹیاں قائم کرنا شروع کی تھیں، پہلوی سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ہی انہوں نے ملک کے تمام شہروں ، قصبات اور دیہاتوں میں ان کا جال بچھا دیا۔ صرف دارالحکومت تہران میں اس نوع کی پندرہ سو کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ انقلابی کمیٹیوں نے ہر جگہ مقامی انتظامیہ اور پولیس کا کردار سنبھال لیا، بلکہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ آیت اللہ خمینی نے فروری ۱۹۷۹ء کے اواخر میں آیت اللہ مہدوی کانی کو ان کمیٹیوں کا نگران و سربراہ مقرر کیا تاکہ ان کو ایک نظم کے تحت لایا جا سکے (The Turban for the Crown، ص۱۳۵؛ وحید الزمان: Iranian Revolution، ص ۱۳۰-۱۳۲)۔ انقلابی کمیٹیوں نے، جن میں زیادہ تر آیت اللہ خمینی کے پیروکار پرجوش انقلابی نوجوان شامل تھے، ملک میں اپنے مخالفین کی پکڑ دھکڑ اور ان کو کیفر کردار تک پہنچانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کمیٹیوں نے اپنے طور پر ہزاروں افراد کو سزائیں سنا کر فوری طور پر اس پر عمل درآمد کا انتظام کیا۔ آغاز میں کئی ماہ تک ان کمیٹیوں کے ارکان کے ہاتھوں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے ان گنت واقعات بھی پیش آئے۔ تاہم جلد ہی ان میں موجود

ناپسندیدہ عناصر کی تطہیر کی گئی اور بہت سی کمیٹیوں کو ختم کر دیا گیا، جب کہ اضلاع کی سطح پر علما کی نگرانی و سربراہی میں ضلعی کمیٹیاں قائم کی گئیں (The Turban for the Crown، ص۱۳۵؛ لوح ایام، ص ۳۲۶-۳۲۷).

انقلاب کے پہلے ہی روز آیت اللہ خمینی کے فرمان پر علما نے اسلامی انقلابی عدالتیں قائم کیں۔ دارالحکومت تہران میں آیت اللہ صادق خلخلی کی سربراہی میں انقلابی عدالت قائم کی گئی۔ ان عدالتوں میں کثیر تعداد میں سابق نظام کے کارندوں خصوصاً شاہ کے مصاحبین و مقربین، وزرا، ارکان مجلس، فوج، پولیس اور ساواک کے افسروں کے علاوہ سول افسر شاہی کے ارکان پر مقدمات قائم کیے گئے اور فوری سماعت کے بعد انہیں سزائے موت دی گئی۔ سزائے موت پانے والوں میں سابق وزیراعظم امیر عباس ہویدا (۱۹۶۴-۱۹۷۷ء) بھی شامل تھا (The Turban for the Crown، ص۱۳۵؛ لوح ایام، ص ۳۲۶-۳۲۷؛ وحید الزمان: Iranian Revolution، ص ۱۳۱-۱۳۲)۔ عوام میں اسلامی انقلاب کے مقاصد کا شعور عام کرنے نیز ان کی سیاسی تربیت کی غرض سے آیت اللہ خمینی نے تمام بڑے شہروں میں جمعہ کی امامت و خطابت کے لیے ائمہ (امام جمعہ) مقرر کیے۔ ائمہ جمعہ آیت اللہ خمینی کے فرامین و ہدایات کے ابلاغ و اشاعت اور انقلابی اسلامی جمہوریہ کی پالیسیوں کی ترجمانی کا وظیفہ بھی انجام دیتے۔ آیت اللہ خمینی نے انقلاب کے جلد بعد مفلوک الحال طبقوں خصوصاً انقلابی تحریک کے دوران فوج، پولیس اور ساواک کے ہاتھوں ہلاک شدگان اور معذور و اپاہج ہو جانے والے افراد کے خاندانوں کی معاشی کفالت کے لیے ایک ادارہ "بنیاد مستضعفین" قائم کیا۔ پہلوی خاندان کے افراد کے علاوہ سابق دور کے تمام بڑے مالدار افراد کی املاک اور اثاثہ جات، جنہوں نے اپنے اختیار و اقتدار کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے وسیع دولت کمائی تھی، اس ادارے کی تحویل میں دے دیئے گئے (The Turban for the Crown، کتاب، ص۱۳۶).

سابق دور کی فوج ، پولیس اور ساواک کی شکست و ریخت کے بعد ملک میں امن و امان کے قیام اور اس کی علاقائی وحدت و سالمیت کے تحفظ کے لیے کوئی منظم ادارہ موجود نہ تھا۔ دریں صورت مارچ ۱۹۷۹ء میں کردوں، ترکمانوں اور صوبہ خوزستان کے عربوں نے علاقائی خود مختاری کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا۔ خلفشار کے اس دور میں پہلوی بادشاہت کے خاتمہ کی جدو جہد میں شامل مختلف سیاسی و عسکری انقلابی گروہوں نے، جو ما بعد انقلاب ملک کی تعمیر نو کے سلسلہ میں مختلف و متباین پروگرام رکھتے تھے، اپنی اپنی قوت و طاقت کے اظہار کا سلسلہ شروع کیا۔ دریں حالات ملک کے مختلف حصوں میں مختلف نسلی و لسانی اقلیتوں کی علاقائی خود مختاری کی تحریکوں کو کچلنے اور مختلف سیاسی و انقلابی گروہوں کی سرگرمیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے مئی ۱۹۷۹ء کے وسط میں ایک نیا ادارہ "پاسداران انقلاب اسلامی" قائم کیا گیا۔ آغاز میں آیت اللہ لاہوتی اس کے نگران و سربراہ مقرر ہوے۔ بعد ازاں حجۃ الاسلام ہاشمی رفسنجانی اور حجۃ الاسلام علی خامنہ ای بھی اس کے نگران و سربراہ رہے (The Turban for the Crown، ص۱۳۶)۔ پاسداران انقلاب نے کردوں ، ترکمانوں، عربوں اور بلوچوں اور علاقائی خود مختاری کے علمبردار دیگر گروہوں پر کاری ضرب لگائی (The Turban for the Crown، ص۱۳۶)۔

عبوری حکومت کی کارگزاری: مہدی بازرگان کی سربراہی میں قائم عبوری حکومت کو پہلوی بادشاہت کے خاتمہ پر ملک میں امن و امان اور نظم و نسق کے قیام کے علاوہ معاشی اور صنعتی و تجارتی سرگرمیوں کی بحالی کا کٹھن چیلنج درپیش تھا۔ ان گوناں گوں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عبوری حکومت کو شروع دن سے ہی شدید مشکلات کا سامنا رہا۔ مہدی بازرگان کی حکومت حقیقی اقتدار

و اختیار سے محروم تھی، ملک میں قوت و طاقت کے بیک وقت کئی مراکز موجود تھے۔ ایک طرف اسلامی انقلابی کونسل تھی جسے عبوری حکومت پر بالا دستی تھی اور جو پالیسی امور سے متعلق تمام اہم فیصلے کرتی تھی۔ دوسری جانب انقلابی کمیٹیوں نے ایک متوازی حکومت کی صورت اختیار کر لی تھی اور عملاً ملکی نظم و نسق کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ علماء و مجتہدین ملک کی زمامِ اختیار جدید مغربی تعلیم یافتہ افراد کے ہاتھوں میں دینے کے سخت مخالف تھے اور حکومت و اقتدار پر مکمل طور پر اپنی گرفت قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے مذہبی تصورات کے مطابق ریاست و معاشرہ کی آزادانہ طور پر تعمیر و تشکیل کریں۔ چنانچہ علماء و مجتہدین عبوری حکومت کو حقیقی معنوں میں نہ تسلیم ہی کرتے تھے اور نہ اسے کسی طور خاطر میں لاتے تھے۔ وہ اکثر و پیشتر براہ راست آیت اللہ خمینی سے ہدایات حاصل کر کے اہم ملکی و انتظامی فیصلے کر ڈالتے اور پھر ان پر عمل درآمد کرنے لگ جاتے۔ مہدی بازرگان نے حکومتی و انتظامی معاملات میں انقلابی کمیٹیوں اور حزب جمہوری اسلامی کے ارکان کی مداخلت پر علما کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا اور خود کو بے اختیار و بے بس محسوس کرتے ہوئے آیت اللہ خمینی کو کئی باراستعفا پیش کیا (وحید الزمان: Iranian Revolution، ص، ۱۳۳-۱۳۷)۔ مہدی بازرگان نے علما کو رجعت پسند و تنگ نظر قرار دیا، ان کی قائم کردہ انقلابی عدالتوں کی کار روائیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور قوت و طاقت اور جبر و تشدد کے ذریعے مذہب کے نفاذ کی مخالفت کی تو وہ اپنے رفقا سمیت علما کی تند و تیز تنقید بلکہ تابڑ توڑ حملوں کی زد میں آ گئے۔ حزب جمہوری اسلامی کے رہنماؤں اور اسلامی انقلابی کونسل کے ارکان نے عبوری حکومت کو انقلاب کے بعد ملک میں رونما ہونے والی تمام خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیا۔ علما نے مہدی بازرگان پر پہلوی دور کے انتظامی و حکومتی ڈھانچہ کو تحفظ دینے اور اسلامی انقلاب کے مقاصد سے انحراف کا الزام عائد کیا، مزید براں اس سے حکومت و انتظامیہ میں موجود سابق نظام کے آثار و باقیات کی کامل طور پر تطہیر و اخراج کا مطالبہ کیا۔ آیت اللہ خمینی نے ابتدا میں مہدی بازرگان کی حکومت اور علماء مجتہدین (انقلابی کونسل، انقلابی کمیٹیوں، اسلامی عدالتوں اور حزب جمہوری اسلامی کے ارکان و سربراہان) کے مابین جاری کشمکش میں غیر جانبداری اختیار کئے رکھی، تاہم جلد ہی انہوں نے اپنا وزن مؤخر الذکر فریق کے پلڑے میں ڈال دیا (وحید الزمان: Iranian Revolution، ص ۱۴۹-۱۵۵)۔

مہدی بازرگان اور آیت اللہ خمینی کے حامی و پیروکار علما کے مابین متعدد امور میں فکرو نظر کا گہرا اختلاف تھا۔ مہدی بازرگان حکومتی معاملات میں انقلابی کمیٹیوں کی مداخلت کے علاوہ ان کمیٹیوں کی طرف سے مخالفین کی اندھا دھند پکڑ دھکڑ اور انقلابی عدالتوں کی طرف سے دھڑا دھڑ سزائے موت کے پروانے جاری کرنے کے مخالف تھے۔ وہ کردوں اور دیگر نسلی و لسانی علیحدگی پسند گروہوں کو قوت و طاقت کے استعمال سے کچلنے کے حق میں بھی نہ تھے۔ مزید براں وہ مغربی ممالک خصوصاً امریکہ سے سیاسی و سفارتی تعلقات کے انقطاع کے بجائے مکالمہ ومفاہمت کے حق میں تھے۔ جبکہ رہبر انقلاب آیت اللہ خمینی اور ان کے وفادار علما ان امور میں ایک بالکل مختلف نقطہ نظر رکھتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں امریکہ نے شاہ کو علاج کے بہانے امریکہ میں داخلے کی اجازت دی تو مہدی بازرگان کی حکومت کے بارے میں علما کا رویہ مزید جارحانہ ہو گیا۔ اس واقعہ کو مہدی بازرگان کی خارجہ پالیسی کی ناکامی سے تعبیر کیا گیا۔ مہدی بازرگان اور وزیر خارجہ ڈاکٹر ابراہیم یزدی نے یکم نومبر ۱۹۷۹ء کو الجزائر کے قومی دن / یوم آزادی کی تقریبات میں شرکت کے دوران امریکہ کے قومی سلامتی کے مشیر اور بعض دوسرے امریکی اہلکاروں

سے ملاقات کی، جو یوم آزادی کی تقریبات میں اپنے ملک کی نمائندگی کر رہے تھے، تو ایران میں اس پر شدید ردِ عمل ہوا۔ علما کی طرف سے اس کی شدید مذمت کی گئی۔ مہدی بازرگان کو امریکہ کے سامنے کمزوری دکھانے اور اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کا قصور وار ٹھہرایا گیا۔ رد عمل کے طور پر انقلابی طلبا کے ایک گروہ نے، جسے علما کی سیاسی جماعت حزب جمہوری اسلامی کی آشیر باد حاصل تھی، ۴رنومبر ۱۹۷۹ء کو تہران میں امریکی سفارت خانے پر ہلہ بول دیا اور امریکی سفارت کاروں کو یرغمال بنا لیا۔ مہدی بازرگان نے اگلے روز (۵رنومبر ۱۹۷۹ء) کو وطن واپسی پر استعفا پیش کر دیا۔ حکومت سے علیحدگی کے بعد بھی مہدی بازرگان کے خلاف علما کی مہم جاری رہی۔ انہیں ''مغرب زدہ دانش ور'' کا لقب دیا گیا۔ مزید براں انہیں کرد علیحدگی پسندوں کے خلاف فوری اور سخت کاروائی نہ کرنے کے سبب علیحدگی پسندوں کے ہاتھوں سیکڑوں کی تعداد میں پاسداران انقلاب کی ہلاکت کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ بعض علما کی طرف سے تو ان پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ بھی کیا گیا (وحید الزمان: Iranian Revolution، ص، ۱۳۳-۱۳۷)۔

اسلامی دستور: مہدی بازرگان کی حکومت متعینہ اہداف کے حصول میں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ البتہ اس نے نئے دستور کے مسودہ کی تیاری کا کام کامیابی سے انجام دیا۔ عبوری حکومت کو جو وظائف تفویض کئے گئے تھے ان میں اسلامی جمہوریہ کے لیے ایک نئے آئین کی تیاری اور اس پر نظر ثانی کے لیے ایک مجلس ''شورای خبرگان'' کا انتخاب وتقرر بھی شامل تھا۔ یکم مارچ ۱۹۷۹ء کو منعقدہ استصواب رائے کے بعد حکومت نے ماہرین قانون کی ایک کمیٹی کو دستور کے مسودہ کی تیاری کا کام سونپ دیا، جس نے ۱۵۱ شقوں پر مشتمل ایک مسودہ تیار کیا۔ ۳راگست ۱۹۷۹ء کو دستور پر نظرثانی کے لیے ۷۳ رکنی ''شورای خبرگان'' کے لیے انتخابات کرائے گئے۔ ان انتخابات میں ''حزب جمہوری اسلامی'' کے نامزد ارکان کی اکثریت منتخب ہوئی۔ آیت اللہ خمینی نے شورای خبرگان کو مسودۂ دستور کو مکمل طور پر اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ اس مجلس نے عبوری حکومت کی طرف سے پیش کیے گئے مسودہ میں بہت سی بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں کیں۔ بہت سی نئی دفعات کا اضافہ کیا۔ ۱۵رنومبر کو شورای نگہبان نے دستور کی منظوری دے دی جبکہ ۲-۳ دسمبر کو منعقدہ ایک استصواب رائے میں اس کی توثیق و منظوری عمل میں آئی (وحید الزمان: Iranian Revolution، ص، ۱۶۷-۱۷۱، ۱۸۴)۔

اسلامی دستور کے خدوخال: اسلامی جمہوریہ کے دستور (۱۹۷۹ء) میں اثنا عشری شیعی مسلک کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ شریعت کو ملک کے اعلیٰ و برتر قانون (سپریم لا) کی حیثیت دی گئی۔ مجلس (پارلیمان)، جو جمہور کی نمائندہ ہے اور جس کا تقرر از روئے دستور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوتا ہے، کے لیے بہت سے میدانوں میں قانون سازی کا حق و اختیار تسلیم کیا گیا۔ البتہ اس کے وضع و منظور کردہ قوانین کو شریعت سے ہم آہنگ ہونا لازم قرار دیا گیا۔ چنانچہ دستور کی شق ۷۲ میں' مجلس شورای اسلامی' (پارلیمان) کو اسلام کے احکام و تعلیمات کے منافی قوانین وضع و منظور کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جبکہ ججوں پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایسے قوانین اور سرکاری احکامات و فرامین کے نفاذ سے انکار کر دیں جو شریعت کے منافی ہوں (شق ۱۷۰)۔ دستور میں قانون سازی کی نگرانی بالفاظ دیگر مجلس کے وضع ومنظور شدہ قوانین پر نظر ثانی کے لیے علما و ماہرین قانون پر مشتمل ایک ۱۲ رکنی کمیٹی 'شورای نگہبان' کے قیام کی بنیاد فراہم کی گئی تاکہ خلاف شریعت کوئی قانون منظور نہ ہو سکے۔ چنانچہ از روئے دستور ''شورای نگہبان'' کی توثیق کے بغیر مجلس (پارلیمان) کا منظور کردہ کوئی قانون ملکی قانون کی حیثیت نہیں اختیار کر سکتا (The

Constitution of the Islamic Republic of Iran، تہران: ڈائریکٹوریٹ جنرل آف اسٹیٹ لاء اینڈ ریگولیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰-۱۱،۲۵،۲۶).

اسلامی دستور کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں آیت اللہ خمینی کے تصور "ولایت فقیہ" کو کامل طور پر سمویا گیا ہے اور علما کی ریاستی اداروں پر بالا دستی کو یقینی بنایا گیا ہے۔ اس دستور (مجریہ ۱۹۷۹ء، شق ۵،۱۰۷،۱۰۹) میں آیت اللہ خمینی کے تصور ولایت فقیہ کے عین مطابق حضرت ولی العصر "مہدی زمان" کی غیوبت کے زمانے میں اسلامی جمہوریہ ایران میں حکمرانی و فرمانروائی کا حق عدالت، تقوٰی اور سیاسی بصیرت جیسی صفات سے متصف ماہر شریعت 'فقیہ' کے لیے تسلیم و مختص کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر آیت اللہ خمینی کو گویا باضابطہ طور پر 'ولی فقیہ' تسلیم کیا گیا اور ان کے لیے وسیع حکومتی و انتظامی، اور قانونی و عدالتی اختیارات تسلیم کیے گئے (دستور کی شق ۵۷)۔ ازروئے دستور فقیہ مسلح افواج کے سپہ سالار اعلیٰ اور ریاست کے تینوں شعبوں مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے نگران و سربراہ بن گئے۔ اسے مجلس کے وضع و منظور کردہ قوانین پر نظر ثانی کے لئے شورای نگہبان کے نصف ارکان (۶ علما)، اعلیٰ عدالتوں کے ججوں اور مسلح افواج کے سربراہوں کے تقرر و تنزل کا اختیار بھی حاصل ہو گیا (اصغر شیرازی : The Constitution of Iran:Politics and the State in the Islamic Republic، لنڈن: آئی بی ٹاؤرس، ۱۹۹۷ ؛ The Constitution of the Islamic Republic of Iran، ص ۱۰۹-۱۱۰)۔ دستور (شق ۱۱۰) کی رو سے رہبر کو ریاست کے اعضاء رئیسی انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے مابین رونما ہونے والے تنازعات کو سلجھانے کا وظیفہ و اختیار بھی حاصل ہو گیا۔ ان تینوں کے درمیان نزاعات میں رہبر کی رائے کو امر قاطع کی حیثیت حاصل ہوگئی (The Constitution of the Islamic Republic of Iran، ص ۱۰۹-۱۱۰)۔

اسلامی دستور میں ولی فقیہ اور رہبر آیت اللہ خمینی کو وسیع اختیارات تفویض کرنے کے علاوہ اسلامی جمہوریہ کے کلیدی اہمیت کے آئینی اداروں خصوصاً عدلیہ، شورای نگہبان اور شورای خبرگان کو بھی علما و مجتہدین کی دسترس میں دے دیا گیا۔ اسلامی دستور میں جن نئے آئینی اداروں کے قیام کی بنیاد رکھی گئی ان میں اہم ترین 'شورای نگہبان' ہے۔ اس ادارہ کو مجلس کے عمل قانون سازی پر نگرانی، اوراس کے منظور کردہ قوانین کو شریعت سے متصادم ہونے پر مسترد کرنے کے علاوہ دستور کی تعبیرو تشریح ،صدارتی و پارلیمانی انتخابات کی نگرانی اور منصب صدارت اور مجلس شورای اسلامی کی رکنیت کے امیدواروں کی اہلیت کی جانچ پرکھ کا اختیار بھی تفویض کیا گیا ہے۔ شورای نگہبان کے کل ۱۲ ارکان میں سے نصف کا ماہر شریعت، یعنی عالم و مجتہد، جبکہ بقیہ کا ماہر قانون ہونا ضروری ہے، البتہ مجلس کے منظور کردہ کسی بھی قانون کے بارے میں یہ رائے دینا کہ وہ شریعت سے ہم آہنگ ہے کہ نہیں، یہ اختیار صرف اس ادارے کے فقیہ یعنی عالم و مجتہد ارکان کو حاصل ہے۔ ان کے تقرر کا اختیار رہبر کو دیا گیا ہے۔ بقیہ چھ ارکان کے انتخاب و تقرر کا اختیار مجلس کو دیا گیاہے تاہم مجلس کا یہ اختیار بڑا محدود نوعیت کا ہے۔ وہ یہ انتخاب افراد کی اس فہرست میں سے کرتی ہے جو عدلیہ کے سربراہ کی طرف سے اسے پیش کی جاتی ہے (شق ۹۱-۹۹)۔ گویا شورای نگہبان کو مجلس (پارلیمان) پر ایک طرح سے بالادستی ہے۔ دوسرا اہم آئینی ادارہ "شورای خبر گان" کا ہے۔ اس ادارے کی ہیئت ترکیبی میں بھی علماء کی بالادستی کو یقینی بنایا گیا ہے، بلکہ یوں کہیے یہ ادارہ بھی بنیادی طور پر علماء و مجتہدین پر مشتمل ہے۔ اس ادارے کا اساسی وظیفہ دستور پر نظر ثانی کے علاوہ، رہبر آیت اللہ خمینی کے جانشین کا انتخاب و تقرر ہے۔ اس ادارے کو، اپنے اختیارات سے انحراف و تجاوز کرنے، بیماری یا کسی اور وجہ سے اپنے وظائف کی بجا

آوری کے قابل نہ رہنے کی صورت میں فقیہ کو معزول کرنے کا اختیار بھی دیا گیاہے (شق ۱۰۷-۱۰۸،۱۱۱؛اصغر شیرازی: The Constitution of Iran، ص۱۲)۔ اسلامی دستور کی رو سے عدلیہ کے سربراہ کے علاوہ عدالت عظمیٰ کے قاضی القضاۃ اور پراسیکیوٹر جنرل کا بھی عالم و فقیہ ہونا ضروری ہے.

مجلس: دستور (۱۹۷۹ء) میں ۲۷۰رکنی مجلس شورای اسلامی کی بالغ رائے دہی کی بنیاد پر تشکیل کی بنیاد بھی فراہم کی گئی۔ مجلس میں غیر مسلم اقلیتوں زرتشتیوں، یہودیوں، آشوریوں ، کلدانی مسیحیوں اور مسیحی ارمنوں کو بھی نمائندگی دی گئی۔ ان میں سے ہر اقلیت کے لیے ایک ایک نشست مختص کی گئی، البتہ مسلم مذہبی اور نسلی و لسانی اقلیتوں، ترکمانوں، کردوں، بلوچوں اور عربوں کو جداگانہ نمائندگی نہیں دی گئی(شق ۶۴)۔ مجلس کی رکنیت کی اہلیت کے لیے اسلامی انقلاب اور اس کے مقاصد سے پختہ وابستگی کو لازمی شرط قرار دیا گیا۔ مجلس کو عام نوعیت کے قوانین کی تعبیر و تشریح کے علاوہ شریعت اور اسلامی دستور کے دائرہ (فریم ورک) میں رہتے ہوے قانون سازی کا حق دیا گیا ہے۔ البتہ اس کے حق قانون سازی کو شورای نگہبان کے تابع رکھا گیا۔ مجلس کو صدر اور وزرا کی باز پرس اور مؤاخذہ کا حق و اختیار بھی حاصل ہے (شق ۱۱۰).

صدر : اسلامی دستور کی رو سے رہبر کے بعد ریاست کا سب سے بڑا حکومتی و سیاسی عہدہ صدر کا ہے جو انتظامیہ کے سربراہ کے طور پر دستور کے نفاذ اور ملکی نظم و نسق کا ذمہ دار ہے۔ صدر کا انتخاب عرصہ چار سال کے لیے براہ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ دستور میں عہدۂ صدارت کے لیے صرف ممتاز مذہبی و سیاسی شخصیات بالفاظ دیگر نمایاں طور پر دینی و سیاسی بصیرت رکھنے والے متقی، دیانت دار، اچھی شہرت کے حامل نیز اسلامی جمہوریہ کے اساسی اصول و تصورات سے سچی وفاداری رکھنے والے افراد ہی کو اہل قرار دیا گیا ہے (شق ۱۱۳-۱۱۵)۔ صدر کو اپنے وظائف کی بجا آوری اور اختیارات کے استعمال کے سلسلہ میں رہبر ،مجلس اور قوم کے سامنے جواب دہ ٹھہرایا گیا۔ دستور کی رو سے صدر کو کابینہ کا سربراہ اور اس کے ارکان کی کارگزاری کا نگران بنایا گیا ہے۔ اسے وزرا کے تقرر و انتخاب کا اختیار دیا گیا ہے۔ البتہ نامزد وزرا کو مجلس سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کا پابند بنایا گیا ہے (دفعہ ۱۳۳-۱۳۴،۱۳۵،۱۳۷) .

اسلامی جمہوریہ کے دستور کی ہیئت ترکیبی سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں قوت و اقتدار پر علما کی گرفت قائم کر کے ملک میں گویا مذہبی طبقہ کی حکومت، (تھیوکریسی) کی مضبوط و مستحکم بنیاد رکھ دی گئی(Nazih Ayubi: *Political Islam and Politics in the Arab World*، لنڈن: روٹ لیج، ۱۹۹۳ء ، ص۱۵۰؛ Olivier Roy: *The Failure of Political Islam*، لنڈن: آئی بی ٹاؤرس ، ۱۹۹۴ء، ص، ۱۷۷-۱۷۸؛ ڈاکٹر اسرار احمد، ”سفر ایران کا پس منظر“در ایران شناسی (لاہور)، ۴: ۱،۲ (۱۹۹۷ء)، ص ۱۰۰).

داخلی آویزش و کشمکش : محمد رضا شاہ پہلوی کی بادشاہت کے خاتمہ کی جدوجہد کے دوران میں ایران کے مختلف الخیال مذہبی و سیاسی جماعتوں اور انقلابی عسکری گروہوں میں ایک طرح کا عملی سیاسی اتحاد قائم ہو گیا تھا۔ واحد مقصد اور نصب العین جو ان کے درمیان قدر مشترک کے طور پر موجود تھا وہ ملک میں سے ملوکیت و آمریت کا خاتمہ تھا۔ البتہ پہلوی بادشاہت کے خاتمہ کی صورت میں ریاست کی تعمیر و تشکیل نو کے بارے میں یہ جملہ گروہ مختلف و متباین پروگرام اور منشور رکھتے تھے۔ سابق وزیر اعظم ڈاکٹر محمد مصدق کی سیاسی جماعت ’جبہ ملی‘ (National Front) اور ان کے پوتے ہدایت اللہ متین دفتری کی ’جبہ جمہوری ملی‘ (National Democratic Front)۔ ملک میں مغربی طرز کی سیکولر جمہوریت قائم کرنا چاہتی تھیں۔

مہندس مہدی بازرگان کی 'نہضت آزادی' بھی ملک میں جمہوریت قائم کرنا چاہتی تھی البتہ وہ سیاسی ، قانونی اور تعلیمی و اقتصادی نظام کی تشکیل میں اسلام کی تعلیمات کو رہنما بنانے کی حامی و علمبردار تھی۔ اشتراکی جماعت 'تودہ' اور مارکسی 'فدائین خلق' اشتراکی انقلاب لانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر علی شریعتی اور سید محمود طالقانی کے افکار و خیالات سے متاثر نوجوانوں کی تنظیم 'مجاہدین خلق اسلامی' اسلامی اشتراکیت کی علمبردار تھی۔ بعض ممتاز و سربرآورد علماء جن میں آیت اللہ العظمیٰ سید محمود طالقانی (م۱۹۷۹ء) اور آیت اللہ العظمیٰ شریعت مداری (م۱۹۸۶ء) وغیرہ شامل تھے، جمہوریت کے حامی البتہ علما کے راست طور پر اقتدار و حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے مخالف تھے۔ ان دونوں جیدو ممتاز علماء نے پہلوی بادشاہت کے خاتمے کی جدوجہد میں، خصوصاً آیت اللہ خمینی کی جلا وطنی کے زمانہ میں، بڑا افعال بلکہ قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ آیت اللہ خمینی اور ان کے حامی و وفادار علماء و مجتہدین تصور 'ولایت فقیہ' کے مطابق اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ بالفاظ دیگر وہ حکومت و اقتدار کو راست طور پر اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے فہم و تصور اسلام کے مطابق اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ ریاست کے تمام انتظامی و دستوری اداروں پر علما کے تفوق و بالادستی کو بہرحال یقینی بنانا چاہتے تھے۔ فکرو نظر کے اس وسیع اختلاف کی موجودگی میں ان مختلف جماعتوں اور تنظیموں کے درمیان تادیر اتحاد و اتفاق کا قائم رہنا کسی طور بھی ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انقلاب کے پہلے مرحلہ کے مکمل ہوتے ہی، یعنی پہلوی بادشاہت کے خاتمہ کے ساتھ ہی ان کے مابین فکرو نظر کا یہ اختلاف پوری شدت و قوت کے ساتھ ابھر کر سامنے آ گیا جس نے جلد ہی باہمی کشمکش اور تصادم و محاذ آرائی کی صورت اختیار کر لی۔ اس کا پہلا اظہار مارچ ۱۹۷۹ء میں منعقدہ ریفرنڈم کے موقع پر ہوا، جس میں عوام سے اس بارے میں استصواب رائے کیا گیا کہ آیا وہ ملک میں پہلوی بادشاہت کا تحفظ و بقا چاہتے ہیں یا ایک اسلامی جمہوریہ کا قیام۔ فدائیین خلق، متین دفتری کی سیاسی جماعت جبہ جمہوری ملی (NDF)، کرد ڈیمو کریٹک پارٹی (KDP) اور خواتین و وکلاء کی انجمنوں نے اس استصواب رائے کا مقاطعہ کیا، جبکہ ترکمانوں، بلوچوں، عربوں اور کردوں نے اپنے اپنے علاقوں میں علاقائی خود مختاری کا مطالبہ کر دیا۔ ان تحریکوں نے جلد ہی مرکز کے خلاف بغاوت کی صورت اختیار کر لی (Ervand Abrahamian: *Radical Islam*، ص ۱۸۶-۱۹۰).

آیت اللہ خمینی اور ان کے حامی و وفا دار علما نے علیحدگی پسند تحریکوں کو قوت و طاقت سے کچلنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ آیت اللہ العظمیٰ سید محمود طالقانی (م ۱۰؍ستمبر۱۹۷۹ء) اور آیت اللہ العظمیٰ شریعت مداری نے علماء کی نگرانی و سربراہی میں قائم انقلابی اداروں کی اپنے مخالفین کے خلاف اندھا دھند انتقامی کارروائیوں اور خصوصاً کردستان میں سنی العقیدہ کرد اقلیت کے خلاف قوت و طاقت کے استعمال کی برملا طور پر مخالفت کی۔ آیت اللہ خمینی اور ان کے حامی علما نے ان اکابر علما کے آراء و خیالات کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور انہیں تنقید و ملامت کا نشانہ بنایا۔ آیت اللہ طالقانی کو ان کے گھر پر نظر بند کرنے کے علاوہ تہران میں ان کے دفاتر کی تالہ بندی کی گئی۔ اپریل ۱۹۷۹ء کے اوائل میں ان کے دونوں بیٹوں، جن میں سے ایک کا تعلق اسلامی مجاہدین خلق سے تھا جبکہ دوسرا بائیں بازو کی تنظیم 'ہیئت پکار' سے منسلک تھا اور بہو کو اسلامی انقلابیوں نے گرفتار کر لیا۔ آیت اللہ طالقانی احتجاجاً تہران کو چھوڑ کر کسی خفیہ مقام پر چلے پر روپوش ہو گئے۔ مجاہدین خلق نے آیت اللہ طالقانی کے ساتھ اظہار یک جہتی اور ان کے خاندان کے افراد کی رہائی کے لیے دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر تہران میں

زبردست احتجاجی مظاہرہ (۵/اپریل ۱۹۷۹ء) کیا۔ آیت اللہ خمینی کو بائیں بازو کے گروہوں کی طرف سے پہلی بار شدید چیلنج اور مزاحمت در پیش ہوئی۔ چنانچہ انہیں موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے مفاہمت کی غرض سے آیت اللہ طالقانی سے ملاقات کرنا پڑی (۹/اپریل ۱۹۷۹ء)۔ مؤخر الذکر نے اس خیال سے کہ مذہبی قیادت اور دیگر انقلابی جماعتوں کے درمیان تصادم و محاذ آرائی کوئی نیا بحران نہ پیدا کر دے، اول الذکر کی حمایت کا اعلان کر دیا (Ervand Abrahamian: *Radical Islam*، ص: ۱۹۰-۱۹۱؛ Homa Omid: *Islam and the Post-Rovolutionary State in Iran*، نیویارک (St. Martin Press)، ۱۹۹۴ء، ص: ۶۸-۷۱؛ نذیر احمد ذاکر: *Notes on Iran: Aryamehr to Ayatollahs*، کراچی، رائل بک کمپنی، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۸۵-۱۸۷؛ *Jihad and Shahadat:Struggle and Martyrdom in Islam*، ص۳۲)۔ اپریل میں پیش آنے والے واقعات کے بعد مجاہدین خلق، مارکسی فدائیین، تودہ جماعت اور دیگر سیاسی گروہ بھی اپنے اپنے سیاسی پروگرام کے مطابق ملک کا انتظامی و سیاسی نقشہ ترتیب دینے کی غرض سے برسر جدوجہد ہوے۔ ان جماعتوں کے رہنماؤں اور ان کے حامی و ترجمان اخبارات و جرائد نے علما اور ان کے تخلیق کردہ نت نئے انقلابی اداروں کو تند و تیز تنقید کا نشانہ بنایا اور اپنی سیاسی و عسکری قوت و طاقت کے اظہار کے لیے احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع کیا۔ بعض انقلابی عسکری گروہوں کی طرف سے آیت اللہ خمینی کے حامی علما کو نشانہ بھی بنایا گیا۔ کسی ایسے ہی انقلابی گروہ کے ہاتھوں یکم مئی ۱۹۷۹ء کو اسلامی انقلابی کونسل کے سربرآوردہ رکن آیت اللہ مرتضیٰ مطہری کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ آیت اللہ خمینی اور ان کے حامی علماء و مجتہدین نے ان جملہ سیاسی جماعتوں اور عسکری تنظیموں کو ضد انقلاب (انقلاب دشمن) گردانا۔ انہیں مغرب کی استعماری طاقتوں کا حاشیہ بردار و کٹھ پتلی اور منافقین و مفسدین قرار دیا۔ مزید براں ان پر اسلامی انقلاب کو ناکام بنانے کے لیے مغربی طاقتوں سے ساز باز کرنے کا الزام عائد کیا۔ مجاہدین خلق کے فکری رہنما ڈاکٹر علی شریعتی کو بھی سامراجی کلچر کا ترجمان و آلہ کار قرار دیا گیا۔ اختلافی نقطۂ نظر رکھنے والے دانش ور اور اہل صحافت بطور خاص علما کے غیض و غضب کا نشانہ بنے۔ چنانچہ مئی ۱۹۷۹ء کے بعد سے اسلامی انقلاب کے محافظ اداروں نے دارالحکومت تہران اور ملک کے دوسرے شہروں میں مخالف سیاسی و عسکری گروہوں کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کر کے ان کے دفاتر کو تاراج کیا، ان کے مطبوعہ لٹریچر کو ضبط کر لیا اور اخبارات و جرائد کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ مزید براں ان کے سیاسی اجتماعات اور مظاہروں کو قوت و طاقت کے ذریعے منتشر کرنا شروع کیا۔ اسلامی انقلابی عدالتوں کے سربراہ نے ضد انقلاب عناصر کے محاسبہ اور ان کے قلع قمع کے لیے انقلابی عدالتوں کے دائرہ کار کو وسیع کیا۔ چنانچہ ان مخالف سیاسی و عسکری گروہوں کے سیکڑوں ارکان پر ان عدالتوں میں مقدمات قائم کر کے ان کو سزائے موت سنائی گئی۔ عبوری وزیراعظم مہندس مہدی بازرگان اور آیت اللہ شریعت مداری نے، جو آزادی صحافت و سیاست کے حامی و علمبردار تھے، سیاسی و نظریاتی مخالفین کے خلاف کارروائیوں کی شدید مخالفت و مذمت کی، تاہم ان کی یہ تنقید و مخالفت بے اثر رہی (سروش عرفانی: *Iran's Islamic Revolution: Popular Liberation or Religious Dictatorship?*، لاہور: وین گارڈ، ۱۹۸۳ء، ص: ۲۱۴-۲۱۸؛ *The Turban or the Crown*، ص: ۱۳۶-۱۳۸؛ Ervand Abrahamian: *Radical Islam*، ص: ۱۹۲-۱۹۳؛ نذیر احمد ذاکر: *Notes on Iran*، ص ۱۸۷؛ وحید الزمان: *Iranian Revolution*، ص: ۱۳۳-۱۳۶، ۱۴۵-۱۴۷).

اقتدار و حکومت پر علما کی بالا دستی و تسلط بالفاظ دیگر

تصور ولایت فقیہ کے مخالف مذکورہ گروہوں نے، ماسوائے اسلامی مجاہدین خلق کے، اگست ۱۹۷۹ء کو منعقدہ مجلس خبر گان کے انتخابات کا مقاطعہ کیا (Ervand Abrahamian Radical Islam: ص ۱۹۴-۱۹۹)۔ تصور ولایت فقیہ کے مخالف مذکورہ جملہ گروہوں نے اسلامی جمہوریہ کے نئے دستور، جس میں آیت اللہ خمینی کے تصور ولایت فقیہ کو اساس بنایا گیا تھا، کو یکسر مسترد کر دیا اوراس کی توثیق کے لیے منعقدہ ریفرنڈم (دسمبر ۱۹۷۹ء) کا مقاطعہ کیا، جس کے بعد اسلامی انقلابی حکومت کے ساتھ ان کی کشمکش میں شدت پیدا ہو گئی.

آیت اللہ خمینی کے تصور ولایت فقیہ اور اس پر استوار اسلامی دستور کی مخالفت علما کبار کی ایک مؤثر تعداد نے بھی کی۔ تصور ولایت فقیہ کے مخالف و ناقد ان علما میں سے سب سے نمایاں نام آیت اللہ العظمٰی شریعت مداری کا ہے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ملک کا سیاسی اقتدار علما کے بجائے عوام کے منتخب نمائندوں کے پاس ہونا چاہیے۔ علما کا کام صرف اہل حکومت کو مشورے دینا اور نصیحت کرنا ہے اس کے علاوہ وہ کسی اور بات کے شرعا مکلّف نہیں۔ البتہ علما سیاسی معاملات میں صرف اس وقت مداخلت کریں جب منتخب حکمران اسلامی قانون کے نفاذ میں ناکام رہیں۔ شریعت مداری نے آیت اللہ خمینی کے وفادار علما کی سیاسی جماعت "حزب جمہوری اسلامی" کے مقابلے میں ایک سیاسی جماعت (Muslim People`s Republican Party) بھی قائم کر لی۔ انہوں نے انقلابی حکومت اور اس کے اداروں کے بہت سے اقدامات مثلاً حاملہ عورتوں کو سزائے موت، نوجوانوں اور بوڑھے افراد کو سر عام کوڑا زنی، اخبارات و جرائد کی اشاعت پر عائد پابندی اور سرکاری محکموں اور دفاتر سے ملازمین (ناپسندیدہ) کی تطہیر و اخراج کی مخالفت کی۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں آیت اللہ شریعت مداری پر قم میں قاتلانہ حملہ ہوا جس پر ان کے حامیوں نے تبریز میں بغاوت کر ڈالی۔ انہوں نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اسٹیشنوں اور دیگر سرکاری عمارتوں پر قبضہ کر لیا جو کئی روز تک قائم رہا۔ پاسداران انقلاب نے بھرپور طاقت کے استعمال سے، جس کے نتیجے میں درجنوں افراد ہلاک و زخمی ہوے۔ اس بغاوت پر قابو پالیا۔ شریعت مداری کے حامیوں پر مقدمات قائم کیے گئے۔ متعدد سرکردہ ارکان کو سزائے موت دی گئی جب کہ کثیر تعداد کو جیلوں میں قید کیا گیا۔ شریعت مداری کو ان کی قائم کردہ سیاسی جماعت کو تحلیل کرنے پر مجبور کیا گیا (جنوری ۱۹۸۰ء)، جب کہ خود ان کو ان کے گھر پر نظر بند کر دیا گیا۔ بعدازاں اپریل ۱۹۸۲ء میں آیت اللہ خمینی کے ایما پر قم کے حوزۂ علمیہ کے ۴۵ علماء و مجتہدین نے متفقہ طور پر ایک فتویٰ جاری کر کے ان سے آیت اللہ العظمٰی کا مذہبی خطاب بھی واپس لے لیا۔ شریعت مدری ۱۹۸۶ء میں اپنی وفات تک برابر نظر بندی کی حالت میں رہے(سروش عرفانی: Iran's Islamic Revolution، ص ۲۱۸-۲۲۱؛ Islam and the Post-Rovolutionary State in Iran، ص، ۱۶۹-۱۷۰؛ The Turban for the Crown، ص۱۵۶)۔ تصور ولایت فقیہ پر استوار اسلامی دستور کی مخالفت کرنے والے دیگر علماے کبار میں آیت اللہ ابو القاسم الخوئی، آیت اللہ القمی، آیت اللہ گل پایگانی ،آیت اللہ بہاء الدین محلاتی (م۱۹۸۱ء)، آیت اللہ صادق روحانی، آیت اللہ مرتضٰی حائری یزدی (م۱۹۸۶ء)، اور آیت اللہ شیخ علی تہرانی، جو آیت اللہ خمینی کے ایک تلمیذ اور ان کے معتمد ساتھی رہ چکے تھے ، وغیرہ شامل تھے۔ ان علما کو آیت اللہ خمینی کے تصور ولایت فقیہ سے بھی گہرا اختلاف تھا۔ ان کی رائے میں غیوبت امام کے زمانے میں شیعہ علما کو جو حق ولایت و نیابت حاصل ہے ،اس کا دائرہ محض مذہبی اور فقہی امور و مسائل تک محدود ہے، حکومت و اقتدار کا معاملہ اس سے خارج ہے، لہٰذا علما کو حکومت و اقتدار ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ

ولایت (مذہبی و فقہی امور میں) تمام شیعہ فقہا کو اجتماعی طور پر حاصل ہے اس کو کسی فرد واحد (آیت اللہ خمینی) یا پھر چند علما پر مشتمل کسی مجلس تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ان علما نے آیت اللہ خمینی کے تصور ولایت فقیہ اور نئے دستور کو مسترد کر دیا اور خود کو انقلاب سے الگ تھلگ کر لیا۔ مزید براں انہوں نے اسلامی جمہوریہ میں سرکاری مناصب بھی قبول کرنے سے مکمل طور پر گریز کیا۔ چنانچہ اسلامی انقلاب کے دوسرے مرحلے میں آیت اللہ خمینی کا زیادہ تر انحصار علما کی نوجوان نسل پر رہ گیا۔ تاہم آیت اللہ خمینی کو جذبہ اسلامیت سے سرشار جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک وسیع تعداد کی تائید و حمایت حاصل رہی (The Turban for the Crown، ص ۱۵۵-۱۵۶؛ Olivier Roy: The Failure of Political Islam، ص ۱۷۳-۱۷۴).

انتخابات ۱۹۸۰ء:اسلامی دستور کی توثیق (دسمبر ۱۹۷۹ء) کے بعد جنوری ۱۹۸۰ء میں اسلامی جمہوریہ میں پہلے صدارتی انتخابات منعقد ہوے۔ ان انتخابات میں صرف انھی افراد کو حصہ لینے دیا گیا جو آیت اللہ خمینی کے تصور ولایت فقیہ سے اتفاق رکھتے تھے اور جنھوں نے تحریک انقلاب میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ شوریٰ نگہبان نے عہدہ صدارت کے لیے تقریباً ایک سو امیدواروں میں سے ۹۸ کو نااہل قرار دے دیا۔ نا اہل قرار دیے جانے والوں میں مجاہدین خلق، جس نے دستور کی توثیق کے لیے ریفرنڈم کا مقاطعہ کیا تھا، کے رہنما مسعود رجوی بھی شامل تھے۔ چنانچہ عہدہ صدارت کے لیے صرف دو امیدوار، آزاد خیال دانش ور اور ماہر اقتصادیات ابوالحسن بنی صدر (ولادت: ۱۹۳۵ء) اور علما کی سیاسی جماعت حزب جمہوری اسلامی کے امیدوار رہ گئے۔ بنی صدر ۱۹۶۵ء سے اسلامی انقلاب تک پیرس میں خود ساختہ جلا وطنی کی زندگی گزار چکے تھے اور آیت اللہ خمینی کے ساتھ یکم فروری ۱۹۷۹ کو ایران واپس پہنچے تھے۔ آیت اللہ خمینی نے اس پہلے صدارتی انتخابات میں غیر جانبداری کا رویہ اختیار کیا اور کسی امیدوار کی برملا طور سے حمایت کا اعلان نہیں کیا۔ دریں صورت تصور ولایت فقیہ کی مخالف تمام قوتیں ابو الحسن بنی صدر کے گرد مجتمع ہو گئیں کہ ان کے سامنے اس سے بہتر کوئی متبادل امیدوار موجود نہ تھا۔ چنانچہ بنی صدر حزب جمہوری اسلامی کے امیدوار کے مقابلے میں بھاری اکثریت سے (۷۶ %ووٹ حاصل کرکے) صدر منتخب ہوگئے۔ ۴ر فروری کو بنی صدر نے اسلامی جمہوریہ کے پہلے صدر کے طور پر حلف اٹھایا۔ آیت اللہ خمینی نے بنی صدر کو مجلس کے وجود میں آنے تک اسلامی انقلابی کونسل کے اجلاسوں کی صدارت کا اختیار بھی سونپ دیا۔ انہوں نے (آیت اللہ خمینی نے) عہدہ صدارت کو مضبوط و مستحکم کرنے کی غرض سے ایک خصوصی فرمان کے ذریعے مسلح افواج کے کمانڈر انچیف کے اختیارات بھی، جو دستور کی شق ۱۱۰ کی رو سے خود فقیہ کو حاصل ہیں، بنی صدر کو تفویض کیے۔ ان اختیارات میں اعلان جنگ، صلح اور مسلح افواج وپاسداران انقلاب کے سربراہوں کے تقرر کا اختیار بھی شامل تھا۔ آیت اللہ خمینی نے تمام سیاسی و انتظامی اختیارات بنی صدر کو سونپ کر صرف اسلامی جمہوریہ کی بحیثیت مجموعی نگرانی کا اختیار اپنے پاس محفوظ رکھا۔ رہبر کے ان اقدامات سے صدر کا عہدہ با اختیار ہوگیا چنانچہ بنی صدر رہبر کے بعد سب سے زیادہ طاقت ور بن گئے (Ervand Abrahamian: Radical Islam، ص ۱۹۷-۱۹۸؛ وحید الزمان: Iranian Revolution، ص، ۱۸۵-۱۸۸،۱۹۳-۱۹۶).

علما اور بنی صدر کے مابین کشمکش : بنی صدر نے منصب صدارت سنبھالتے ہی اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ وہ ملک میں کسی متوازی حکومت کے وجود بالفاظ دیگر حکومتی و انتظامی معاملات میں علما کی سیاسی جماعت حزب جمہوری اسلامی، انقلابی طلبہ کہ جنہوں نے امریکی سفارت خانے پر قبضہ جما رکھا تھا، یا پھر اسلامی انقلابی کونسل کی مداخلت کو

برداشت نہیں کریں گے۔ دراصل مہدی بازرگان کی حکومت کا انجام بنی صدر کے سامنے تھا، اقتدارو حکومت کے مختلف مراکز کی موجودگی نے اسے قطعاً بے دست و پا بنا رکھا تھا۔ تاہم حزب جمہوری اسلامی، جو خود کو اسلامی انقلاب کا محافظ و نگہبان گردانتی تھی، بنی صدر کے بطور صدر انتخاب اور ان کے عزائم سے خوش و مطمئن نہ تھی۔ علماء و مجتہدین اسلامی انقلاب کے ساتھ بنی صدر کی وفاداری کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اسے مغرب زدہ دانش ور خیال کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے تئیں روشن خیال اور جدید مغربی تعلیم یافتہ دانش ور کی صدارتی انتخابات میں کامیابی کو اسلامی انقلاب کے لیے ایک سنگین خطرہ کے طور پر دیکھا۔ چنانچہ انہوں اپنے تمام وسائل اور توانائیوں کو مارچ اور مئی ۱۹۸۰ میں دو مرحلوں میں منعقد ہونے والے مجلس کے انتخابات میں اپنے حامیوں کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے وقف کر دیا۔ اسلامی جمہوریہ میں مجلس شورای اسلامی (پارلیمان) کے ان پہلے انتخابات میں حزب جمہوری اسلامی کے نامز امیدواروں کی اکثریت منتخب ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ابوالحسن بنی صدر اور مجلس کے مابین وزیر اعظم اور کابینہ کے ارکان کے تقرر سمیت مختلف سیاسی و انتظامی معاملات کی بابت شدید محاذ آرائی اور کشمکش کا آغاز ہوا۔ طویل کشمکش کے بعد اگست ۱۹۸۰ء میں آیت اللہ خمینی کے ایک پیروکار محمد علی رجائی وزیراعظم مقرر ہوے۔ تاہم تقریباً ایک سال تک کابینہ کے بعض اہم ارکان کا تقرر نہ ہوسکا۔ ستمبر ۱۹۸۰ء میں عراق کے ایران پر حملے نے اس کشمکش کو اور گھمبیر بنا دیا۔ محمد علی رجائی کی کابینہ میں ایسے افراد شامل کیے گئے جو تصور ولایت فقیہ کے کٹر حامی اور آیت اللہ خمینی کے وفادار تھے، البتہ ان افراد کو حکومتی و انتظامی امور کا قطعاً کوئی تجربہ نہ تھا (Ervand Abrahmian: *Radical Islam*، ص ۱۹۷-۱۹۸؛ *The Turban for the Crown*، ص ۱۴۱، ۱۴۳).

داخلی و خارجی دونوں طرح کے پالیسی امور کی بابت علما اور بنی صدر کے طرز فکرو عمل میں گہرا اختلاف پایا جاتا تھا۔ بنی صدر مغرب کے ساتھ مفاہمت اور قریبی تعلقات کی بحالی خصوصاً امریکی یرغمالیوں کے قضیہ کو جلد از جلد سلجھانے کے حامی تھے، تاکہ ملک کی تعمیر نو اور عراق کے ساتھ جنگ کے چیلنج سے پوری یکسوئی سے نمٹا جا سکے۔ بنی صدر نے خفیہ طور پر امریکہ سے رابطے بھی قائم کر رکھے تھے۔ بنی صدر کے مقابلے میں علما ان امور ومسائل میں ایک بالکل مختلف زاویۂ نگاہ رکھتے تھے۔ علما نے انقلابی اداروں کے ذریعے تمام سرکاری محکموں اور اداروں پر اپنی گرفت مضبوط و مستحکم کر لی تھی، چنانچہ طاقت کا توازن علماء کے حق میں ہوگیا تھا۔ دریں صورت ان کے مابین، تصادم و کشمکش کا پیدا ہونا ایک ناگذیر امر تھا۔ علما اور بنی صدر کے مابین کشمکش کی اس حالت میں ستمبر ۱۹۸۰ء میں عراق نے مغربی طاقتوں کے ایما پر ایران پر حملہ کر دیا۔ عراق کے ساتھ جنگ کے آغاز سے ہی بنی صدر نے، جو مسلح افواج کے کمانڈر انچیف بھی تھے، فوج کے ساتھ اظہار یکجہتی کے طور پرجنگی محاذوں کے پے در پے دورے کیے۔ بنی صدر نے ملکی فوجی ڈھانچے کو شکستہ و پامال کرنے پر علما کو تندو تیز تنقید کا نشانہ بنایا۔ چنانچہ فوج میں بنی صدر کی حمایت کے جذبات پرورش پانے لگے اور اس کو قومی ہیرو کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ روایتی فوج کے علاوہ عوام میں بھی ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ بازار، جسے ایران کے روایتی سیاسی ڈھانچے میں ایک طاقت ور عامل و عنصر کی حیثیت حاصل ہے، کی طرف سے برملا طور پر بنی صدر کی تائید و حمایت کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ نومبر، دسمبر ۱۹۸۰ء اور پھر فروری، مارچ ۱۹۸۱ء کے دوران میں 'بازار' اور ملک کے روشن خیال و لبرل اور قوم پرست طبقوں نے بنی صدر کی حمایت میں ملک بھر میں مظاہرے کیے۔ تاہم ابوالحسن بنی

صدر اپنی پشت پر کوئی منظم و مضبوط سیاسی جماعت نہ ہونے کے سبب فوج، بازار اور ملک کے اعتدال پسند و آزاد خیال طبقوں کی طرف سے حاصل حمایت کو منظم کرنے اور اقتدار و حکومت پر سے علما کی گرفت کو توڑنے میں ناکام رہے (The Turban for the Crown، ص ۱۴۴-۱۴۵)۔

جنگ کے دوران میں بنی صدر کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے علما کو شدید تشویش لاحق ہوئی۔ چنانچہ انہوں (حزب جمہوری اسلامی، مجلس، وزیر اعظم محمد علی رجائی اور ان کی کابینہ وغیرہ) نے بنی صدر کو بے دست و پا بنانے کا پورا پورا اہتمام کیا۔ وزیراعظم محمد علی رجائی نے تمام سرکاری محکموں کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ انہیں وزیراعظم کے دفتر کی وساطت سے صدر سے رابطے و تعامل کا پابند بنایا۔ آیت اللہ خمینی نے شروع ایام سے ہی بنی صدر کو ذرائع ابلاغ (سرکاری) سے دور رکھنے کی حکمت عملی اختیار کی تھی۔ بدیں وجہ ان کے جنگی محاذوں کے دوروں کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشریات میں جگہ نہ دی جاتی۔ بنی صدر کا عوام سے رابطے کا واحد ذریعہ ان کا اپنا اخبار انقلاب رہ گیا تھا، جس میں وہ مختلف قومی و بین الاقوامی مسائل کی بابت مضمون نگاری کرتے رہے۔ آیت اللہ خمینی نے صدر کے اختیارات کی تحدید کی غرض سے ایک ماورائے دستور، اعلیٰ اختیاراتی و پالیسی ساز ادارہ 'سپریم ڈیفنس کونسل' کے نام سے قائم کر لیا جس میں علما کو بالا دست بنایا گیا۔مزید براں قدیم فوج کے مقابلے میں پاسداران انقلاب کی قوت و طاقت میں تیزی سے اضافہ کیا اور اس کے کماندار اعلیٰ کوسپریم ڈیفنس کونسل کا رکن بنایا گیا۔ علما نے بنی صدر اور ان کے حامیوں کی سیاسی سرگرمیوں کو کچلنے کی غرض سے قوت و طاقت کے استعمال کو بھی مناسب خیال کیا۔ فروری ۱۹۸۱ء میں تہران یونیورسٹی میں بنی صدر کے سیاسی اجتماع کو حزب جمہوری اسلامی کے مسلح دستوں نے حملہ کر کے درہم برہم کیاتو فریقین کے مابین کشمکش تیز ہوگئی۔ مارچ ۱۹۸۱ء میں سابق وزیراعظم محمد مصدق کی برسی کے موقع پر منعقدہ سیاسی اجتماعات میں تصور ولایت فقیہ کے مخالف سیاسی و عسکری انقلابی گروہوں اور بنی صدر کے مابین سیاسی اتحاد و اشتراک کامظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ علما کی طرف سے بنی صدر پر انقلاب دشمن طاقتوں سے ساز باز کرنے کا الزام لگاکر انہیں ہدف تنقید و ملامت بنایا گیا۔ سرکاری ذرائع ابلاغ سے ان کی کردار کشی کا سلسلہ زور پکڑ گیا۔ خود آیت اللہ خمینی نے مئی ۱۹۸۱ء کے اختتام پر بنی صدر اور ان کے رفقا صادق قطب زادہ اور سلاتیان کو تند وتیز تنقید و مذمت کا نشانہ بنایا اور ان کو ملک چھوڑ کر امریکہ اور یورپ کی طرف نکل جانے کا مشورہ دیا۔ جون کے اوائل میں بنی صدر کے اخبار انقلاب کی اشاعت پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ چند روز بعد (۸رجون ۱۹۸۱ء) آیت اللہ خمینی نے ابوالحسن بنی صدر سے مسلح افواج کے کمانڈر انچیف کے اختیارات واپس لے لیے اور پھر (۱۸رجون) انہیں صدر کے عہدے سے معزول کر دیا۔ بنی صدر کی معزولی کے اگلے روز (۲۰رجون ۱۹۸۱ء) ان کے حامیوں نے تہران میں احتجاجی مظاہرے کیے جنہیں کچلنے کے لیے انقلابی حکومت نے بھر پور طاقت کا استعمال کیا۔ چنانچہ پاسداران انقلاب اور حزب اللہ کے دستوں کے ہاتھوں درجنوں مظاہرین ہلاک و زخمی ہوے۔ سیکڑوں مظاہرین گرفتار ہوے، جن پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا کر انہیں سزائے موت دی گئی۔ بنی صدر کے معتمد رفقا میں سے صادق قطب زادہ اور سلاتیان کو بھی موت کے گھاٹ اتارا گیا (The Turban for the Crown، ص ۱۴۵-۱۴۶؛ سروش عرفانی: Iran's Islamic Revolution، ص ۲۲۲-۲۲۳)۔

مزاحمت و مخالفت: اسلامی جمہوریہ ایران کو سب سے زیادہ سنگین چیلنج مجاہدین خلق کی طرف سے درپیش ہوا۔

مجاہدین نے بنی صدر کی برطرفی پر جون ۱۹۸۱ء سے انقلابی حکومت کے خلاف مسلح مزاحمت و جدوجہد کا آغاز کیا۔ انہوں نے پاسداران انقلاب اور حزب اللہ کی کارروائیوں کے مقابلے میں خود کو بے بس محسوس کرتے ہوئے ملک میں بم دھماکوں کا سلسلہ شروع کیا۔ مجاہدین کے ہاتھوں متعدد ممتاز مذہبی رہنما اور حکومتی عہدے دار قتل ہوئے۔ جون ۱۹۸۱ء میں حزب جمہوری اسلامی کے صدر دفتر واقع تہران میں ہونے والے بم دھماکے میں اس جماعت کے سربراہ آیت اللہ محمد حسین بہشتی اور بہت سے دوسرے رہنما ہلاک ہوئے۔ دو ماہ بعد (اگست ۱۹۸۱ء) میں ایک اور بم دھماکے میں نئے صدر (سابق وزیر اعظم) محمد علی رجائی اور وزیراعظم جواد باہنر ہلاک ہوئے۔ انقلابی حکومت نے جواباً مجاہدین خلق کے خلاف سخت کارروائی کی۔ چنانچہ مجاہدین اور ان کے حامیو ں کی کثیر تعداد گرفتار ہوئی۔ ان پر خصوصی انقلابی عدالتوں میں مقدمے قائم کیے گئے، جہاں سر سری سماعت کے بعد انہیں سزائے موت سنائی گئی۔ ۱۹۸۱-۱۹۸۲ء کے دوران میں تقریباً آٹھ ہزار نوجوان مجاہدین حزب اللہ اور پاسداران انقلاب کے ہاتھوں ہلاک ہوئے یا پھر انہیں انقلابی عدالتوں کی طرف سے سزائے موت سنائی گئی۔ انقلابی حکومت نے دیگر مخالف عسکری گروہوں، پیکار اور مارکسی فدائیین کا بھی صفایا کر دیا۔ البتہ مجاہدین کی زیر زمین کاروائیوں کا سلسلہ گاہے بگاہے جاری رہا ہے (Nikki R.Keddie (مدیر): The Iranian Revolution and the Islamic Republic، ص۲۱؛ The Turban for the Crown، ص، ۱۵۴-۱۵۵؛ Islam and the Post-Revolutionar State in Iran، ص۱۰۴)۔

محمد علی رجائی کے قتل کے بعد آیت اللہ خمینی نے محمد رضا مہدوی کانی ، وزیر داخلہ اور تہران میں انقلابی کمیٹیوں کے سربراہ ،کو عبوری وزیر اعظم مقرر کیا۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں منعقدہ صدارتی انتخابات میں حزب جمہوری اسلامی کے نامزد امیدوار حجتہ الاسلام علی خامنہ ای صدر منتخب ہوئے۔ صدر خامنہ ای نے حزب جمہوری اسلامی کے ترجمان اخبار جمہوری اسلامی کے مدیر میر حسین موسوی کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ مذکورہ واقعات و حوادث کے بعد آیت اللہ خمینی نے تحفظ انقلاب کی غرض سے ریاست کے تمام کلیدی عہدوں پر علما کے تقرر کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ملک کا نظم و نسق مکمل طور پر علما کے ہاتھ میں آگیا (The Turban for the Crown، ص۱۵۴-۱۵۵)۔

تطہیر و اخراج : آیت اللہ خمینی سابق نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر ریاست و معاشرہ کی مکمل طور پر تشکیل نو کا عزم لے کر اٹھے تھے۔ بعداز انقلاب وہ محمد رضا شاہ پہلوی کی بادشاہت کے آثار و باقیات اور اس کے سابق کل پرزوں کے قلع قمع کے ساتھ ساتھ ریاستی و حکومتی اداروں خصوصاً، فوج، انتظامی مشینری اور تعلیمی اداروں کی ناپسندیدہ عناصر سے تطہیر و صفائی / عناصر کے اخراج کو ناگزیر خیال کرتے تھے۔ چنانچہ انقلاب کے ساتھ ہی گزشتہ دور کے تمام اہم عہدے داروں کو ان کے عہدوں سے برطرف کیا گیا۔ ان میں سے بہت سوں پر انقلابی عدالتوں میں مقدمات چلا کر ان کو سزائیں سنائی گئیں۔ ناپسندیدہ عناصر کے تطہیر و اخراج کا عمل فوج اور شعبہ تعلیم کے اندر مؤثر طور پر عمل میں لایا گیا۔ صرف انقلاب کے ابتدائی چھ ماہ کے دوران ۲۴۸ اعلیٰ فوجی عہدے داروں، جن میں ۳۸ جرنیل اور ۱۰۳ دیگر اعلیٰ افسران شامل تھے، کو سزائے موت دی گئی۔ جبکہ سیکڑوں کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ ایک اندازے کے مطابق بعد از انقلاب فوج کے پچیس ہزار افسروں میں سے ۱۳ ہزار کو برطرف کیا گیا۔ اگرچہ بعد از انقلاب سابق فوجی ڈھانچے کو تہس نہس کیا گیا تھا، اس کے سیکڑوں افسروں کو سزائے موت دی گئی تھی جب کہ ہزاروں کو برطرف کیا گیا، تاہم انقلابی حکومت بچی کھچی فوج کو بھی ہمیشہ شک و شبہ کی نگاہ سے

دیکھتی رہی۔ اسے قدیم فوج کی طرف سے کسی جوابی فوجی انقلاب کا اندیشہ لاحق رہا۔ ۱۹۸۰-۱۹۸۳ء کے دوران میں قدیم فوج کی طرف سے انقلاب لانے کی متعدد کوششیں ہوئیں البتہ وہ سب ناکام رہیں۔ اسلامی حکومت کا تختہ الٹنے اور آیت اللہ خمینی کے قتل کے منصوبہ بندی کے الزام میں سیکڑوں فوجی افسران کو سزائے موت دی گئی۔ ۱۹۸۳ء میں فضائیہ کے متعدد افسران، جنھوں نے آیت اللہ خمینی کے گھر پر بمباری کر کے انہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایاتھا، گرفتار ہوئے۔ دریں صورت انقلابی حکومت نے ایرانی فوج کی قوت کو کم سے کم اور اس کے دائرہ کار کو محدود کرنے کے ساتھ ساتھ پاسداران انقلاب اسلامی کی قوت و طاقت کو بتدریج بڑھایا اور اسے باقاعدہ فوج کا درجہ دے دیا۔ پاسداران نے اپنے بحریہ اور فضائیہ کے شعبے بھی قائم کیے۔ ۱۹۸۵ء تک کل مردانہ فوج ۵ لاکھ افراد پر مشتمل تھی، اس میں ۲ لاکھ پچاس ہزار پاسداران اور ایک لاکھ رضا کار مجاہد شامل تھے (The Iranian Revolution and the Islamic Republic، ص۲۵ : Haleh Afshar: "The Army در Iran A Revolution in Turmoil، ص۱۹۰؛ The Turban for the Crown، ص ۱۴۲-۱۴۴، ۱۶۳-۱۶۴)۔

فوج کے علاوہ ساواک، پولیس اور قومی سلامتی کے ذمہ دار دیگر اداروں کے اہلکاروں کی اکثریت کو بھی برطرف کیا گیا۔ ساواک کا تو بالکل نام و نشان ہی مٹا دیا گیا۔ بنی صدر کی معزولی اور مجاہدین خلق کے بم دھماکوں میں حزب جمہوری اسلامی کی صف اول کی قیادت کے خاتمے کے بعد ناپسندیدہ عناصر اور مخالفین انقلاب یا پھر اسلامی انقلاب سے کامل ذہنی ہم آہنگی نہ رکھنے والے افراد کے اخراج و تطہیر کا عمل انتہا کو جا پہنچا۔ چنانچہ وزارت داخلہ کے اعلیٰ افسروں کے علاوہ تمام بلدیاتی اداروں کے سربراہوں اور صوبائی گورنروں کو برطرف کیا گیا۔ وزارت تعلیم میں مخالف نقطۂ نظر رکھنے والے افسروں کے علاوہ تعلیمی اداروں بالخصوص جامعات میں سے انقلاب مخالف سیکولرو لبرل اور قوم پرست اساتذۂ و محققین کی اکثریت کو ملازمتوں سے نکال دیا گیا۔ ناپسندیدہ عناصر کے اخراج و تطہیر کے ساتھ ہی سرکاری محکموں اور اداروں میں تمام کلیدی عہدوں پر اسلامی انقلاب کے حامیوں کا تقرر کیا گیا پھر ان جملہ اداروں، محکموں اور دفاتر کو براہ راست علما کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ چنانچہ ملک کے انتظامی ڈھانچے پر اسلامی انقلاب سے غیر متزلزل وابستگی رکھنے والے عناصر کا غلبہ ہو گیا۔ اس تبدیلی کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ وزیراعظم اور اس کی کابینہ کے ارکان کے علاوہ دوسرے محکموں اور سرکاری اداروں کا سربراہ اسلامی ذہن رکھنے والے متوسط طبقے کے افراد کو مقرر کیا گیا (The Turban for the Crown، ص، ۱۴۲-۱۴۴)۔

انقلابی حکومت نے فوج کی اسلامی تربیت اور ذہن سازی پر خاص توجہ دی۔ فوج میں اسلامی تعلیمات و انقلابی نظریات کی تبلیغ کا مؤثر انتظام کیا گیا۔ فوجی دستوں کے ساتھ علماء و مجتہدین منسلک کیے گئے جو ان کو مذھبی تعلیمات سے روشناس کرانے کے علاوہ ان میں جذبہ جہاد و قتال ابھارتے تھے۔ تقریباً ۱۲ ہزار علما تو صرف عراقی محاذ پر فوج کے ساتھ تعینات کیے گئے۔ انقلابی حکومت نے نئی فوج 'پاسداران انقلاب اسلامی' میں بھرتیوں کے لیے ایک خاص طریق کار ترتیب دیا۔ فوجی افسروں کی بھرتی کے وقت ان کا دینی تعلیم (اسلامیات) میں امتحان لیا جاتا اور ان کے دینی رجحان اور ذہنی و فکری میلان کو خوب جانچا جاتا۔ بھرتی کے بعد جنگی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی اسلامی نظریاتی تعلیم و تربیت پر زور دیا جاتا۔ فوج میں اعلیٰ عہدوں پر صرف اسلامی انقلاب سے پختہ و غیر متزلزل وابستگی رکھنے والے افراد کو مقرر کیا جاتا (The Turban for the Crown، ص، ۱۷۰-۱۷۱)۔

عوام میں بے چینی اور اضطراب: انقلابی حکومت نے

اسلامی انقلاب کے مخالفین کو کچلنے کے لیے بڑی سختی سے کام لیا اور قوت و طاقت کا بے دریغ استعمال کیا۔ پاسداران انقلاب اور حزب اللہ کے اہل کاروں کی طرف سے صریح ظلم وزیادتی کے واقعات بھی سرزد ہوئے۔ بے گناہ افراد کو محض شک و شبہ کی بنا پر تشدد و ہلاکت کا نشانہ بنایا گیا جس سے عوام میں بے چینی اور خوف و ہراس نے جنم لیا۔ جس کا احساس انقلابی قیادت کو بھی ہوا۔ چنانچہ ۱۹۸۲ء کے آخری دنوں آیت اللہ خمینی کی طرف سے عوام کو جان و مال کے تحفظ اور زیادتیوں کے ازالہ، غیر قانونی حراست اور نجی املاک کی قرقی سے متعلق شکایات کو رفع کرنے کی یقین دہانی کرانا پڑی۔ آیت اللہ خمینی کے حکم پر عوام کی شکایات کے ازالہ کے لیے ایک کمیشن بھی تشکیل دیا گیا۔ کمیشن کو پانچ ماہ کے عرصہ میں حکام کے خلاف ایک لاکھ ساٹھ ہزار شکایات موصول ہوئیں جن میں سے زیادہ تر سرکاری ملازمین کے تطہیر و اخراج اور برطرفی سے متعلق تھیں۔ دریں حالات عوام کی تشویش اور اضطراب کے ازالہ کے طور پر بعض سخت گیر حکام خصوصاً پاسداران انقلاب کے بعض اعلیٰ عہدیداروں کو برطرف کرنے کے علاوہ انقلابی پراسیکیوٹر وکیل استغاثہ کو معزول کیا گیا۔ محکمہ تعلیم کے بعض ملازمین اور اساتذہ بحال کیے گئے۔ معمولی جرائم میں ماخوذ ومطلوب افراد کے لیے عام معافی کا اعلان (مارچ ۱۹۸۳ء) کیا گیا۔ سرکاری ملازمین کے تطہیر و اخراج اور ان کی برطرفی سے متعلق قائم کمیٹیوں کو کالعدم قرار دے دیا گیا(مئی ۱۹۸۳ء)۔سیاسی قیدیوں کے لیے تائب ہونے کی شرط پر معافی کا اعلان کیا گیا(The Turban for the Crown، ص، ۱۶۲-۱۶۳).

ریاست و معاشرہ کی اسلامی تشکیل: آیت اللہ خمینی کے نزدیک اسلامی انقلاب کے اہم مقاصد تصور ولایت فقیہ کے مطابق اسلامی حکومت کا قیام اور ملک میں سے استغراب (Occidentalism) یعنی امریکہ و یورپ کے تہذیبی و سیاسی اور اقتصادی غلبہ و استیلاء کا خاتمہ اور مستکبرین و مراعات یافتہ طبقات کے مقابلے میں محرومین و مستضعفین کے مفادات کا تحفظ بالفاظ دیگر سماجی و معاشی عدل کا قیام تھے۔ آیت اللہ خمینی نے اسلامی انقلاب کو محرومین اور مستضعفین (افتادگانِ خاک) کا انقلاب قرار دیا تھا۔ انہوں نے اپنے فرمودات میں ایرانی عوام کو ملک میں سے مراعات یافتہ اور استحصالی طبقوں کا قلع قمع کر کے محروم طبقات کے مفادات کا ضامن عادلانہ معاشی و سماجی نظام قائم کرنے کی نوید سنائی تھی (محسن آژینی، "امام خمینی کے معاشی نظریات" مترجمہ: ثمینہ عارف، در ایران شناسی، ۳:۴، ۱۹۹۶ء ص ۸۲-۹۲)۔ انقلاب کے اہداف و مقاصد کے حصول کی غرض سے سابق نظام کے کل پرزوں کی بیخ کنی اور داخلی مزاحمت و مخالفت پر قابو پانے کی جدو جہد کے شانہ بشانہ انقلابی حکومت نے ملک و معاشرہ میں سے مغربی تہذیب و معاشرت کے آثار و نشانات کو مٹاکر زندگی کے مختلف شعبوں کی اسلامی تشکیل کا عمل بھی جاری رکھا۔ چنانچہ تعلیمی اور قانونی و عدالتی نظام کو از سر نو ترتیب دیا گیا۔

آیت اللہ خمینی نے تعلیم کے شعبے کو علما کی نگرانی میں دے دیا۔ تمام تعلیمی اداروں بالخصوص جامعات میں اعلیٰ عہدوں پر ایسے دانش وروں اور اساتذہ کو مقرر کیا گیا جو اسلامی انقلاب کے پرجوش حامی اور اس کے مقاصد سے ذہنی ہم آہنگی رکھتے تھے۔ ملک میں موجود ملکی و غیر ملکی غیر مسلموں کے (مسیحی مشنریوں اور غیر ملکی اداروں کے زیرانتظام) تمام اسکولوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا، آیت اللہ خمینی کے نزدیک تعلیمی اداروں میں سے مغربی تہذیب و ثقافت کے آثار و علامات کو مٹائے بغیر نیز نظام تعلیم کی اصلاح و تشکیل نو کیے بغیر ملک میں اسلامی انقلاب کا تحفظ و استحکام ممکن نہ تھا۔ اس غرض سے سکولوں، کالجوں اور جامعات کے نصابات کو از سر نو مرتب و مدون

کرایا گیا۔ نصابات کو اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی انقلاب کے اصول و مقاصد سے ہم آہنگ کیا گیا۔ملک کی تاریخ بھی از سر نو مرتب کرائی گئی جس میں ملوکیت و استبداد اور غیر ملکی استعمار کے ایرانی معاشرہ پر مرتب ہونے والے منفی اثرات کو خوب اجاگر کیا گیا۔ نصابات کی تدوین کے دوران میں اعلیٰ تعلیم کے اداروں کو، ماسوائے طب و جراحت کی تعلیم و تربیت کے اداروں کے، عرصہ ۳ سال تک بند رکھا گیا۔ ان اداروں کی طویل عرصہ کے لیے بندش کا ایک اہم مقصد انقلابی حکومت کے مخالف طلبہ گروہوں کی سرگرمیوں کا استیصال بھی تھا۔ نئے تعلیمی نصابات میں اسلامی عقائد و تعلیمات اور اسلامی تاریخ و تہذیب کی تدریس کو مؤثر حیثیت دی گئی۔ تربیت اساتذہ کے خصوصی پروگرام مرتب کیے گئے۔ اساتذہ کو اسلامی نظریۂ حیات اور انقلابی فکرو فلسفہ سے آگاہ و متعارف کرانے کا اہتمام کیا گیا (The Turban for the Crown، ص ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۷۱-۱۷۲؛ Iran's Islamic Revolution، ص ۲۱۲).

اسلامی حکومت نے اسلامی قانون کی تدوین اور اسلام کی اخلاقی اور تہذیبی و معاشرتی اقدار کی ترویج پر خاص توجہ دی۔ چنانچہ شیعہ علما سے نئے فوجداری، دیوانی اور تجارتی و عائلی قوانین کے ضابطے مرتب کروا کے جاری ونافذ کیے گئے۔قانونی نظام کو اسلامی سانچے میں ڈھالا گیا علما اور ماہرین قانون نے گزشتہ ادوار کے قانونی ضابطوں پر نظر ثانی کرنے کے علاوہ نئے قانونی اسلامی ضابطے مرتب کیے ۔ وکلا اور ماہرین قانون کی دینی تعلیم کا نظام وضع کیا گیا۔ اگست ۱۹۸۲ء میں آیت اللہ خمینی نے ایک فرمان کے ذریعے اس وقت تک موجودتمام غیر اسلامی قوانین کو منسوخ قرار دیا۔ ۱۹۸۴ء میں دوہرے عدالتی نظام کو ختم کر دیا گیا۔ تمام عدالتوں کو باہم مدغم کر کے وزارت عدل کے تحت کیا گیا۔ پانچ سو علما کو بطور جج مقرر کیا گیا (The Turban for the Crown، ص ۱۶۶، ۱۶۷).

انقلابی حکومت نے تہذیبی و سماجی بگاڑ اور اخلاقی بے راہ روی اور عریانی و فحاشی کے انسداد کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اس غرض سے مرد و زن ہر دو کے لیے خصوصی اخلاقی و سماجی ضابطے خصوصاً لباس اور مرد و زن کی باہمی میل ملاقات سے متعلق، جاری کیے گئے۔ خواتین کے لیے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلتے وقت حجاب لازم قرار پایا۔ مرد و زن کے آزادانہ میل جول/اختلاط اور ان کے مخلوط اجتماعات پر پابندی لگائی گئی۔ عریانی و فحاشی کے انسداد کے لیے بھی مناسب احکام جاری کیے گئے۔ شراب نوشی و جوا بازی کو ممنوعہ قرار دیا گیا۔ رقص و سرود گاہیں بند کر دی گئیں۔ شائستہ و ستر پوش لباس سے متعلق ضابطے کی خلاف ورزی پر سرکاری محکموں میں سے کثیر تعداد میں خواتین کو ملازمتوں سے برطرف کیا گیا۔ عوام کو مذہبی عقائد و تعلیمات اور تہذیبی و سماجی اقدارو روایات سے آگاہ کرنے نیز اسلامی انقلاب کے مقاصد ان کے ذہن نشین کرانے کی غرض سے سرکاری ذرائع ابلاغ کو وقف کر دیا گیا۔ مزید براں تمام سرکاری محکموں، وزارتوں، کارخانوں اور دفاتر میں حتی کہ پولیس کی بیرکوں میں بھی علما کی نگرانی و سربراہی میں خصوصی شعبے/دفاتر "شورای ہائے اسلامی" قائم کیے گئے (The Iranian Revolution and the Islamic Republic، ص ۲۴؛ The Turban for the Crown، ص ۱۴۲-۱۴۳).

نئے اداروں کا کردار: انقلابی ایران میں آئینی و سیاسی اور حکومتی و انتظامی اداروں کی تشکیل و تنظیم نو کے ساتھ ساتھ متعدد نئے ادارے قائم کیے گئے۔ ان اداروں نے اسلامی انقلاب کے تحفظ و استحکام اور اس کے اہداف و مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا۔ جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ انقلاب کے فوراً بعد ملک کے طول و عرض میں اسلامی انقلابی کمیٹیاں علما کی سربراہی و نگرانی میں قائم کی گئیں۔ ان کمیٹیوں نے امن و

امان کے قیام کے علاوہ میدان جنگ میں (عراق کے خلاف) پاسداران انقلاب اسلامی کے رضا کار دستوں کے طور پر بھی اہم خدمات انجام دینے کے علاوہ اسمگلنگ اور منشیات کی روک تھام میں اہم کردار ادا کیا (The Turban for the Crown، ص ۱۶۵).

پاسداران انقلاب اسلامی کے نام سے جو نئی عسکری تنظیم: مئی ۱۹۷۹ء میں قدیم ایرانی فوج کی قوت کا توڑ کرنے اور کسی انقلاب اور جوابی انقلاب کے سدباب کی غرض سے قائم کی گئی، اس نے اسلامی انقلاب کے مخالفین کے صفایا کے علاوہ کرد علیحدگی پسندوں کے قلع و قمع میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے مجاہدین خلق پر کاری ضرب لگانے کے علاوہ حزب مخالف کے دیگر گروہوں کو بھی نیست و نابو کر کے رکھ دیا۔ پاسداران نے اندرون ملک امن و سلامتی کے قیام کے علاوہ عراق کے خلاف جنگ میں بھی بہادری کے جوہر دکھائے۔ ۱۹۸۵ء میں پاسداران کو باقاعدہ کا فوج درجہ حاصل ہو گیا۔ چنانچہ اس نے بحریہ اور فضائیہ کے شعبے بھی قائم کر لیے (The Turban for the Crown، ص ۱۶۵-۱۶۶)۔ مجاہدین خلق، تودہ جماعت اور بعض دوسرے عسکری گروہوں کی انقلاب مخالف سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے ستمبر ۱۹۸۲ء میں خفیہ اطلاعات (جاسوسی) کا ادارہ قائم ہوا۔ اس کے خصوصی دستے، گلیوں اور بازاروں میں گشت کرتے۔ ۱۹۸۴ء میں اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے ایک ادارہ "جند اللہ" کے نام سے جبکہ شہروں میں ناجائز منافع خواری، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ اور چور بازاری کے خاتمہ کے لیے 'انصار اللہ' کے نام سے ایک (نیم عسکری) ادارہ قائم کیا گیا (The Turban for the Crown، ص ۱۷۳)۔ سابق دور کی خفیہ پولیس ساواک کی جگہ ایک نیا ادارہ "سازمان اطلاعات و امنیت ملی" (ساوام) داخلی مخالفین انقلاب سے نمٹنے اور ان کا قلع قمع کرنے کے لیے قائم کیا گیا۔ اس ادارہ نے مخالفین کو کچلنے کے لیے ساواک کی طرح بھر پور طاقت کا استعمال کیا۔ تشدد و اذیت رسانی اور قتل و غارت گری سے کام لیا۔ مخالفین انقلاب کے صفایا کے لیے پاسداران انقلاب اور ساوام کے خصوصی دستوں نے بیرون ملک، جرمنی و فرانس وغیرہ میں کاروائیاں کیں۔ شاہ کے بھانجے شہریار اور سرکردہ سابق جرنیل غلام اویسی کو پیرس میں قتل کیا گیا۔ پیرس ہی میں شاہ پور بختیار، سابق وزیر اعظم، پر بھی متعدد قاتلانہ حملے ہوئے۔ اندرون ملک سرکاری جامعات اور دیگر اداروں میں پاسداران اور ساوام کے جاسوسوں کا وسیع حلقہ قائم کیا گیا تاکہ انقلاب مخالف سیکولر و روشن خیال، طلبہ اور اساتذہ کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھی جا سکے (Haleh Afshar: The Aramy: در Iran: A Revolution in Turmoil، ص۱۹۱-۱۹۲).

شہنشاہیت کے خاتمہ کے ساتھ ہی فروری ۱۹۷۹ء میں علما کی سربراہی میں جو اسلامی انقلابی عدالتیں قائم ہوئیں، ان عدالتوں نے انقلاب کے تحفظ اور ضد انقلاب سرگرمیوں کے قلع قمع کے علاوہ سماجی برائیوں ذخیرہ اندوزی وناجائز منافع خوری اور منشیات کی روک تھام میں اہم کردار ادا کیا۔ سابق دور کے کے اہل کاروں پر ان عدالتوں میں مقدمات چلائے گئے۔ انقلابی ایران میں کئی سالوں تک دوہرا عدالتی نظام رائج رہا۔ انقلابی عدالتوں کے شانہ بشانہ وزارت عدل کے تحت سابق دور کی عدالتیں بھی موجود رہیں، البتہ شاہ دور کا قانونی نظام ختم کر دیا گیا۔

انقلاب کے بعد نماز جمعہ کو ایک سیاسی ادارے کا درجہ دیا گیا۔ آیت اللہ خمینی نے تمام بڑے شہروں اور قصبات میں جمعہ کی نماز کے لیے ائمہ کے تقرر کا خاص اہتمام کیا۔ یہ ائمہ جمعہ جو بالعموم آیت اللہ خمینی کے نمائندے گردانے جاتے تھے، اپنے خطبات میں حکومتی پالیسیوں کی وضاحت و ترجمانی کرتے۔ انقلابی ایران میں نماز جمعہ حکومت اور عوام کے درمیان رابطہ کا ایک مؤثر ذریعہ

بن گئی۔ ائمہ جمعہ کا صدر دفتر قم میں قائم کیا گیا۔ ایک اسکیم کے تحت مساجد کو عوامی فلاح و بہبود کی سرگرمیوں کے مراکز بنایا گیا جہاں سے نادار افراد کو ضروریات زندگی فراہم کی جاتی رہیں۔ مساجد دینی تعلیم و سیاسی تربیت کے علاوہ آیت اللہ خمینی کے افکار و خیالات کی تبلیغ و تشہیر کا ذریعہ بن گئیں۔ ایران میں ائمہ جمعہ کو اسلامی انقلاب کا ستون اعظم قرار دیا گیاہے۔ ائمہ جمعہ نے عوام کو انقلابی حکومت کے حق میں متحرک کرنے اور ان میں دینی و سیاسی شعور کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۸۴ء تک اس ادارے نے بڑی اہمیت اختیار کر لی حتی کہ حزب جمہوری اسلامی کی سرگرمیوں کو بھی اس کے تابع کر دیا گیا۔ ۱۹۸۵ء میں حزب جمہوری اسلامی کی سرگرمیوں کو محدود اور پھر دو سال بعد آیت اللہ خمینی کی طرف سے صدر خامنہ ای اور مجلس کے اسپیکر ہاشمی رفسنجانی کی درخواست پر اس کی سرگرمیوں کو یکسر موقوف کیے جانے (جون ۱۹۸۷ء) پر ملک کے سیاسی نظام میں مساجد اور ائمہ جمعہ کی سیاسی اعتبار سے اہمیت پہلے سے بھی بڑھ گئی (The Turban for the Crown، ص ۱۶۷-۱۶۹).

کلیدی اہمیت کے مذکورہ سیاسی و مذہبی اداروں کے علاوہ متعدد دوسرے ایسے ادارے بھی قائم کیے گئے جن کی غایت عوام کی سماجی و فلاحی اور اقتصادی بہبود تھا۔ (۱) ان میں سے اہم ترین ادارہ بنیاد مستضعفین (قائم مارچ ۱۹۷۹ء) ہے۔ اس ادارے نے غریب و پس ماندہ اور مفلوک الحال طبقات کی معاشی کفالت اور ان کو بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی کے علاوہ سماجی و فلاحی بہبود کے متعدد اہم منصوبوں کی تکمیل میں سرگرم کردار ادا کیا۔ اس ادارے کی طرف سے نادار افراد کو مالی امداد و دیگر ضروریات زندگی، انقلابی کمیٹیوں اور ائمہ جمعہ کے توسط سے فراہم کی جاتی رہی ہیں؛ (۲) بنیاد مسکن (قائم اپریل ۱۹۷۹ء): یہ ادارہ بے گھر افراد کو رہائشی مکانات فراہم کرنے کے لیے وجود میں لایا گیا۔ اس ادارے نے وسیع پیمانے پر رہائشی مکانات تعمیر کروا کے بے گھر افراد کو اکثر و بیشتر مفت یا پھر سستے داموں فراہم کیے؛ (۳) جہاد سازندگی (قائم جون ۱۹۷۹ء): یہ ادارہ دیہی و پس ماندہ علاقوں کی تعمیر و ترقی کے لیے قائم کیا گیا۔ ملکی و سماجی خدمات کے جذبے سے سرشار اسکولوں، کالجوں اور جامعات کے طلبہ و اساتذہ رضاکارانہ طور پر اس ادارے کا ہاتھ بٹاتے رہے ہیں۔ جہاد سازندگی نے ۱۹۸۷ء تک ۳۷ ہزار تعلیمی اور تدریسی مراکز، جن میں سے ۲۸ ہزار مراکز عربی و قرآن حکیم کی تدریس و تعلیم کے لیے تھے، قائم کیے۔ مزیدبراں دیہی علاقوں میں دینی کتب ،رسائل و جرائد، پمفلٹوں اور آیت اللہ خمینی کے خطبات اور بیانات و پیغامات کی وسیع پیمانے پر تقسیم کا اہتمام کیا۔ اس ادارے نے دیہی و دور افتادہ علاقوں میں سڑکیں اور پل تعمیر کیے۔ دیہاتوں کو بجلی اور پینے کا پانی فراہم کیا اور آبپاشی کے نظام کو بہتر بنایا۔ مزید براں طبی امداد اور علاج معالجہ کی سہولتیں فراہم کیں (The Turban for the Crown، ص ۱۷۴)؛ (۴) اسلامی مجالس برائے دیہی علاقہ جات: انقلابی حکومت نے قومی یکجہتی کے استحکام اور علاقائی و نسلی علیحدگی پسند تحریکوں کو کمزور کرنے کے لیے دیہی علاقوں میں اسلامی مجالس "شورای ہائے اسلامی" کا وسیع سلسلہ قائم کر دیا۔ یہ مجالس ان علاقوں میں نظم و نسق اور امن و امان کی بحالی کے ساتھ ساتھ دعوت و تبلیغ کا وظیفہ انجام دیتی رہی ہیں۔ ان مجالس نے دور افتادہ علاقوں اور مرکزی حکومت کے درمیان ارتباط پیدا کر کے علیحدگی پسندی و خود مختاری کی تحریکوں کو غیر موثر و کمزور بنانے میں اہم کردار ادا کیاہے (The Turban for the Crown، ص ۱۷۴)؛ (۵) وزارتِ ارشاد اسلامی (وزارت ثقافت و اطلاعات و نشریات): اسلامی انقلاب کے دور میں قائم ہونے والا ایک انتہائی اہم ادارہ ہے۔ یہ وزارت بنیادی طور پر عامۃ الناس میں اسلامی انقلاب اور

اس کے اصول و مقاصد سے شعور و آگہی پیدا کرنے کے لیے قائم کی گئی۔ یہ وزارت عوام کی ذہنی و فکری تربیت اور ان کو اسلامی تعلیمات اور اس کی تہذیبی و سماجی اقدار سے آگاہ کرنے کے لیے سرکاری ذرائع ابلاغ بالخصوص ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نشریاتی پیروگراموں کو مرتب و منضبط کرتی رہی ہے۔ وزارت ارشاد اسلامی نے عوام میں اسلامی و انقلابی شعور کو عام کرنے کے لیے فارسی اور عربی کے علاوہ متعدد مغربی زبانوں میں رسائل و جرائد اور کتب کی وسیع پیمانے پر اشاعت و تقسیم کا اہتمام کیا ہے۔ یہ وزارت ملک میں اخبارات و جرائد اور کتب کی اشاعت کی نگرانی کی بھی ذمہ دار ہے۔ یہ اس امر کو یقینی بنانے کا اہتمام کرتی ہے کہ اسلامی انقلاب کے مقاصد کے خلاف کوئی تحریری مواد چھپ کر منظر عام پر نہ آ سکے۔ ایران میں نئی کتب و رسائل کی طباعت و اشاعت سے پہلے اس وزارت کے ذمہ داروں سے تحریری اجازت لینا لازمی ہے (The Turban for the Crown، ص ۱۷۰-۱۷۱)؛ (۶) بعد از انقلاب ایران میں احکام شرعیہ کی تنفیذ، اور اخلاقی بے راہ روی و سماجی برائیوں کے انسداد کے لیے جو متعدد ادارے قائم کیے گئے۔ ان میں 'صیغۂ امر بالمعروف و نہی المنکر' بھی ہے۔ یہ ادارہ عوام کے اخلاق و کردار اور چال چلن کی نگرانی کا ذمہ دار ہے۔ شراب نوشی، جوا، قحبہ گری اور دیگر خلاف شرع امور کے انسداد کے لیے اس کی نگرانی میں "سپاہ پاسداران انقلاب" کے خصوصی دستے "گشت ہائے مبارز منکرات" تشکیل دیئے گئے۔ یہ دستے شہروں اور گلیوں بازاروں میں گشت کرتے اور ان برائیوں کے مرتکب افراد کو گرفتار کر کے انہیں خصوصی انقلابی عدالتوں میں پیش کرتے۔ خلاف شرع امور کے لیے انسداد کے لیے انقلابی عدالتوں کو خصوصی اختیارات تفویض کیے گئے تھے۔ یہ عدالتیں ماخوذ افراد کو سرسری سماعت کے بعد سزائیں سناتیں۔ خواتین کے لباس کے بارے میں جاری ضابطہ پر عمل درآمد کے لیے ایک تنظیم "خواہران زینب" کے نام سے قائم کی گئی (The Turban for the Crown، ص ۱۷۰-۱۷۱).

امریکی یرغمالیوں کا قضیہ: جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے، محمد رضا شاہ پہلوی ۱۶/ جنوری ۱۹۷۹ء کو اسلامی انقلاب کی تحریک کو کچلنے میں ناکامی کے بعد ملک چھوڑنے پر مجبور ہوے تو وہ ایران سے نکل کر تھوڑے عرصہ کے لئے مصر، مراکش، ویسٹ انڈیز کی ریاست بہاماس (Bahamas) اور میکسیکو میں مقیم رہے۔ ان ممالک کے حکمران اگرچہ ابتدائی طور پر امریکی دباؤ کے سبب مفرور شاہ کو سیاسی پناہ دینے پر رضا مند ہو گئے تھے، تاہم وہ اندرون ملک اپنے عوام کی طرف سے مخالفت و دباؤ نیز ایران کی انقلابی قیادت کی طرف سے شدید ناراضگی اور غم و غصہ کے اظہار کے سبب شاہ کی تادیر اپنے ملک میں موجودگی کے حق میں نہ تھے۔ لہٰذا شاہ کو یکے بعد دیگرے ایک ملک کے بعد دوسرے اور پھر تیسرے کا رخ کرنا پڑا۔ دریں صورت امریکہ میں موجود شاہ کی طاقت ور اور بااثر لابی، جس کے ارکان میں راک فیلر (Rockfeller) خاندان سابق وزیر خارجہ ہنری کسنجر اور قومی سلامتی کے مشیر برزیزنسکی (Brzezinski) اور بعض دوسرے افراد شامل تھے، کے دباؤ پر صدر کارٹر شاہ کو امریکہ میں داخلے کی اجازت دینے پر آمادہ ہوگئے۔ امریکی انتظامیہ کی طرف سے یہ موقف اختیار کیا گیا کہ شاہ کو خالصتاً انسانی ہمدردی کی بنا پر علاج معالجہ کی غرض سے امریکہ میں داخلے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ شاہ گزشتہ کئی سالوں سے سرطان کے مرض میں مبتلا چلا آرہا تھا۔ ایران میں انقلابی قیادت کی طرف سے صدر کارٹر کے اس فیصلہ کی شدت سے مذمت کی گئی۔ شاہ ۲۲/اکتوبر۱۹۷۹ء کو میکسیکو سے نیویارک پہنچا تو ایرانی حکام کی طرف سے امریکہ سے شاہ کی حوالگی کا مطالبہ کیا گیا تاکہ اس پر ایرانی عوام پر ڈھائے جانے والے مظالم کی پاداش میں مقدمہ چلایا جاسکے۔ تاہم صدر کارٹر نے اس مطالبے کو سختی

سے مسترد کر دیا جس پر ایرانی عوام میں امریکہ مخالف جذبات پھر سے بھڑک اٹھے۔ چنانچہ ۴۔ نومبر کو چند سو (چار تا پانچ سو) انقلابی نوجوان طلبہ نے امریکی سفارت خانے پر ہلہ بول دیا اور وہاں پر موجود امریکیوں کو یرغمال بنا لیا۔ (Gary Sick: All Fall Down، ص ۱۸۰، ۱۸۴-۱۸۵، ۱۸۸-۱۸۹؛ وحید الزمان: Iranian Revolution، ص ۲۰۳-۲۰۶، ۲۱۵)۔

۴/نومبر ۱۹۷۹ء کو پیش آنے والے واقعات نے امریکی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ چنانچہ اس کی طرف سے اس واقعے کی شدید مذمت کی گئی اور یرغمالیوں کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ مزید براں اس کی طرف سے یرغمالیوں کی رہائی کی غرض سے مذاکرات کے لیے ایک وفد سابق امریکی اٹارنی جنرل رمزے کلارک ،جو شاہ کے ایک ناقد کے بطور مشہور تھے، کی سربراہی میں تہران بھیجا گیا۔ تاہم آیت اللہ خمینی نے ان سے ملاقات سے انکار کر دیا اور مذاکرات کے لیے پیشگی شرط کے طور پر شاہ کی حوالگی کا مطالبہ کیا (وحید الزمان: Iranian Revolution، ص ۲۰۳ -۲۰۷، ۲۴۱)۔جواباً صدر کارٹر نے نومبر ۱۹۷۹ء کے وسط میں ایک حکم نامے کے ذریعے امریکہ میں موجود ایران کے تمام اثاثے، جو ایک اندازے کے مطابق تقریباً ۵ء ۸ ارب ڈالر مالیت کے تھے، منجمد کر دیئے۔ مزید براں اس کی طرف سے ایران کی انقلابی قیادت کو، اقتصادی پابندیوں کے علاوہ سخت فوجی کاروائی کی دھمکی بھی دی گئی۔ تاہم ایرانی حکومت نے کسی قسم کے امریکی دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا۔ وہ بڑی استقامت سے شاہ کی حوالگی کے مطالبے پر قائم رہی (Gary Sick: All Fall Down، ص۲۳۴)۔ ایرانی حکومت کو تہران میں امریکی سفارت خانہ سے کثیر تعداد میں ایسی دستاویزات ہاتھ لگیں تھیں، جو ایران کے داخلی و خارجی معاملات میں امریکہ کی صریح مداخلت کے ٹھوس شواہد فراہم کرتی تھیں۔ چنانچہ علما کی طرف سے امریکی سفارت کاروں پر ملک کے داخلی معاملات میں بے جا مداخلت اور جاسوسی کے الزام میں مقدمات چلانے کی دھمکی دی گئی (وحید الزمان: Iranian Revolution، ص ۲۰۷-۲۰۸)۔ صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے صدر کارٹر کی انتظامیہ نے شاہ کو، اسے ایک سیاسی بوجھ خیال کرتے ہوے، امریکہ میں اس کے صرف ۵۴ دن قیام کے بعد ۱۵/دسمبر ۱۹۷۹ء کو پاناما بھیج دیا۔ شاہ کی گزشتہ گیارہ مہینوں میں یہ چھٹی منزل تھی (Gary Sick: All Fall Down، ص ۲۴۳-۲۴۴)۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے امریکی یرغمالیوں کی رہائی کے حق میں ایک قرار داد منظور کی، جبکہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اس غرض سے تہران کا دورہ بھی کیا۔ ایران کی قیادت کی طرف سے شاہ کے دور میں ایرانی عوام پر ڈھائے جانے والے مظالم کی تحقیقات کے لیے ایک بین الاقوامی کمیشن کی تشکیل کا مطالبہ کیا گیا، جس سے کرٹ والڈ ہائیم نے اتفاق کیا۔ جنوری ۱۹۸۰ء میں امریکہ کی طرف سے ایران پر اقتصادی پابندیاں عائد کرنے کی غرض سے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ایک قرار داد پیش کی گئی جسے سوویت یونین نے ویٹو کر دیا (Gary Sick: All Fall Down، ص ۲۸۲)۔ اسلامی انقلابی کونسل نے اقوام متحدہ کی طرف سے بین الاقوامی کمیشن ایران روانہ کیا۔ تاہم آیت اللہ خمینی شاہ کی حوالگی کے مطالبے پر سختی سے قائم رہے۔ انقلابی طلبہ نے کمیشن کو یرغمالیوں سے ملاقات کی اجازت دینے سے انکار کر دیا چنانچہ کمیشن کو ناکام واپس لوٹنا پڑا (Gary Sick: All Fall Down، ص، ۲۸۲؛وحید الزمان: Iranian Revolution، ص، ۲۱۰-۲۱۵)۔ دریں اثنا ایرانی قیادت کی طرف سے پاناما کی حکومت سے شاہ کی حوالگی کے مطالبہ نے زور پکڑا تو شاہ پاناما سے مصر کی طرف نکل گیا (۲۴/مارچ ۱۹۸۰ء)۔ امریکی اشارے پر صدر انور السادات نے انہیں ایک بار پھر مہمان بنانے کا

فیصلہ کیا تھا۔ مصر شاہ کی آخری منزل ٹھہرا۔ جہاں چار ماہ بعد ۲۷رجولائی ۱۹۸۰ء کو اس کا انتقال ہوگیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: William Shawcross: *The Shah's Last Ride The Story of the Exile, Misadventures and Death of Emperor*، لنڈن (Chatto Windus، ۱۹۸۹ء، ص ۳۷۶-۴۰۷).

امریکہ کی ناکام فوجی کارروئی: اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ذریعے ایران پر اقتصادی پابندیاں عائد کرنے میں ناکامی کے بعد صدر کارٹر نے اپریل ۱۹۸۰ء کے اوائل میں ایران کے ساتھ تجارتی و اقتصادی، فوجی اور سیاسی و سفارتی تعلقات کے انقطاع کا اعلان کیا۔ امریکہ کے دباؤ پر اس کے مغربی اتحادیوں نے بھی ایران سے سیاسی و سفارتی تعلقات منقطع کر لیے (وحید الزمان: *Iranian Revolution*، ص ۲۲۰)۔ اقوام متحدہ کے ذریعے ایران کے خلاف اقتصادی پابندیاں عاید کرانے کی کوششوں کی ناکامی اور اس کی تجارتی ناکہ بندی، اس کی بندرگاہوں اور تیل کی تنصیبات پر بمباری کی دھمکیوں اور اس سے سیاسی و سفارتی تعلقات کے انقطاع کے اقدام کے بے نتیجہ و بے اثر ثابت ہونے پر صدر کارٹر نے ایک زبردست چھاپہ مار عسکری کاروائی کے ذریعے اپنے شہریوں کی رہائی کے منصوبے کی منظوری دی۔ ۲۴-۲۵راپریل کو امریکی فوج نے سی آئی اے کے اشتراک سے اس منصوبے پر عمل درآمد کی کوشش کی۔ اس نے ایران کی حدود میں اپنے چھاپہ مار دستے اتار دیئے۔ تاہم متعدد امریکی ہوائی جہازوں کے فضا میں آپس میں ٹکرا جانے کے سبب یہ کارروائی ناکام رہی۔ اس حادثہ میں امریکی فوج کو جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ اس سے صدر کارٹر کی حکومت کو ایک بار پھر گہرا دھچکا لگا۔ اندرون ملک اور عالمی سطح پر اس کی خوب سبکی ہوئی (Gary Sick: *All Fall Down*، ص۲۹۳-۲۹۵؛ وحید الزمان: *Iranian Revolution*، ص ۲۲۰) ۔امریکہ کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایران میں علما اور ان کے حامیوں کی طرف سے امریکی یرغمالیوں پر، ایران کے داخلی معاملات میں مداخلت اور جاسوسی کے الزامات میں، مقدمہ چلانے کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا۔ البتہ ابو الحسن بنی صدر اور ان کے قریبی رفقا وزیر خارجہ صادق قطب زادہ اور وزیر دفاع مصطفیٰ چمران کی طرف سے اس مطالبے کی شدت سے مخالفت کی گئی۔ بنی صدر ملک کی تعمیر نو کی طرف یکسوئی سے متوجہ ہونے، نیز ملک کو درپیش اقتصادی مشکلات ومسائل کے حل اور خصوصاً بین الاقوامی سیاست مین ملک کی تنہائی کے خاتمہ کے لیے یرغمالیوں کے قضیہ کو جلد از جلد سلجھانے کے حق میں تھے (وحید الزمان: *Iranian Revolution*، ص ۲۳۰-۲۳۲)۔ ستمبر ۱۹۸۰ء میں مغربی طاقتوں کی شہ پر ایران پر عراق کی طرف سے حملہ اور اس کے بعض علاقوں پر قبضہ کے بعد خود آیت اللہ خمینی ، حزب جمہوری اسلامی اور وزیر اعظم محمد علی رجائی (اگست ۱۹۸۰-۱۹۸۱ء)کو بھی اس قضیہ کو جلد از جلد سلجھانے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ چنانچہ آیت اللہ خمینی کی طرف سے بعض شرائط، مثلاً امریکہ میں موجود شاہ کی املاک اور اثاثوں کی ایرانی حکومت کو واپسی؛ ایران کے خلاف امریکہ کی اپنے تمام دعووں سے دستبرداری؛ امریکہ کی طرف سے ایران کے داخلی معاملات میں عدم مداخلت کی ضمانت اور؛ امریکہ میں موجود ایران کے تمام اثاثوں کی واگزاری (release) وغیرہ پر امریکہ کے ساتھ مذاکرات کا عندیہ ظاہر کیا گیا۔ آیت اللہ خمینی کی تحریک پر طلبہ نے یرغمالیوں کا معاملہ حکومت کے سپرد کر دیا۔ بعدازاں آیت اللہ خمینی اپنی بعض شرائط سے دستبردار ہوگئے اور صرف ایک شرط یعنی، امریکہ میں موجود ایرانی اثاثوں کے واگزار کیے جانے پر معاملہ کے تصفیے پر راضی ہوگئے۔ چنانچہ ۱۹رجنوری کو حکومت الجزائر کی مصالحتی کوششوں کے نتیجے میں اس پر دونوں ملکوں کے مابین معاہدہ طے پایا۔ امریکہ کی طرف سے ۷,۹۵۵ ملین (سات ارب ،

پچانوے کروڑ اور پچاس لاکھ) ڈالر مالیت کے ایرانی اثاثے واگزار کئے جانے پر ۲۰/ جنوری کو اس وقت جبکہ نو منتخب صدر رونالڈ ریگن قصر صدارت میں داخل ہو چکا تھا، ۴۴۴ ایام کے بعد امریکی یرغمالیوں کی رہائی عمل میں آئی (وحید الزمان: Iranian Revolution، ص ۲۳۵-۲۳۹؛ Gary Sick: *All Fall Down*، ص ۲۳۶-۲۳۷).

اسلامی انقلاب پر عرب ممالک کا رد عمل: ایران میں علماء و مجتہدین کی قیادت میں عوامی تحریک کے ہاتھوں طاقت ور پہلوی بادشاہت کے خاتمے اور اسلامی انقلاب برپا ہونے پر خطے کے اکثر و پیشتر عرب ممالک کی بادشاہتوں اور پھر مغرب نواز مطلق العنان لادینی حکومتوں کو سخت تشویش لاحق ہوئی۔ چنانچہ سعودی عرب، عراق، خلیجی امارات اور مصر و اردن وغیرہ نے ایران میں واقع ہونے والی سیاسی تبدیلی کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ اسلامی انقلاب کی سب سے زیادہ مخالفت و مذمت مصر کے صدر انور السادات (م ۱۹۸۱ء) کی طرف سے کی گئی۔ اس نے آیت اللہ خمینی کو برملا طور سے تنقید و ملامت کا نشانہ بنایا، اسے جنونی و پاگل اور اسلام کے نام پر ایک دھبہ قرار دیا۔ دراصل مصر میں حزب اختلاف/ مخالف کی اسلامی جماعتوں اخوان المسلمون اور جماعۃ الدعوۃ نے ایران میں اسلامی انقلاب کا پرجوش خیر مقدم کیا تھا اور اس واقعہ پر بڑی خوشی و مسرت کا اظہار کیا تھا۔ ایران میں اسلامی انقلاب کے سبب ان جماعتوں کو مغرب نواز لادینی حکومت کے خلاف از سرنو جدوجہد کی تحریک ملی تھی۔ انور السادات کو بجا طور پر خدشہ لاحق تھا کہ ملک کی اسلامی جماعتیں ایرانی انقلاب سے تحریک پا کر کہیں موجودہ نظام کی تبدیلی کے لئے نہ اٹھ کھڑی ہوں۔ چنانچہ انور السادات اور پھر اس کے جانشین حسنی مبارک کا اسلامی انقلاب کے بارے میں رویہ مخاصمانہ و معاندانہ رہا (Rudi Mathee: *The Egypt's Opposition on the Iranian Revolution*، در *Jaun* *R.I.Cole* و Nikki R.Keddie (مدیران): *Shi'ism and Social Protest*، نیو ہیون و لنڈن: ییل یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۶ء، ص ۲۵۱-۲۵۴؛ ایڈورڈ ڈبلیو سعید: *Covering Islam*، لنڈن: ونٹیج، ۱۹۹۷ء، ص۱۱۸).

صدورِ انقلاب: ایران کے اسلامی انقلاب کے بارے میں خطے کے مسلم ممالک کی تشویش کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ آیت اللہ خمینی اس انقلاب کو آفاقی بنانے یعنی اس کا دائرہ دوسرے مسلم ممالک تک وسیع کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ انہوں نے ایرانی عوام کو بار بار صدور انقلاب (برآمدِ انقلاب) کی جدوجہد کی تلقین کے علاوہ ہمسایہ مسلم ممالک میں حکومت مخالف گروہوں کو اپنے اپنے ملک میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کی تحریک کی تھی۔ آیت اللہ خمینی نے بعد از انقلاب اپنے بیانات و اعلانات میں اسلام اور کفر کے مابین جاری کشمکش و معرکہ آرائی میں ایران کی انقلابی اسلامی قیادت کے تحت دنیا بھر کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کو یکجا و متحد ہونے کی دعوت دی۔ دنیا بھر کے مستضعفین (افتادگانِ خاک) کو جابرین ومستکبرین کے خلاف صف آرائی خصوصاً استعماری طاقتوں کی حاشیہ بردار و کٹھ پتلی مسلم حکومتوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلاوہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکنے کی تحریک و تلقین کی۔ ایرانی ذرائع ابلاغ خصوصاً ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی طرف سے عربی زبان میں نشریات کے ذریعے انقلابی آئیڈیالوجی کی تبلیغ و تشہیر کا خوب اہتمام کیا گیا۔ انقلابی قیادت نے بطور خاص ہمسایہ عرب ممالک عراق، سعودی عرب، بحرین اور لبنان وغیرہ کی شیعہ آبادی کو ان ممالک کی حکومتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور وہاں اسلامی انقلاب برپا کرنے کی تحریک کی۔ اس نے عراق میں بعث پارٹی کی حکومت کے خلاف برسر پیکار شیعہ سیاسی جماعتوں کے علاوہ لبنان کی شیعہ آبادی کو مالی و فوجی مدد بھی بہم پہنچائی۔ ان دو ممالک میں حکومت مخالف شیعہ سیاسی و

عسکری گروہوں اور تنظیموں کو منظم کرنے کے لیے پاسداران انقلاب اسلامی کے خصوصی چھاپہ مار دستے بھی روانہ کیے۔ مذکورہ ممالک میں وسیع مقدار میں انقلابی لٹریچر ، جس میں آیت اللہ خمینی کے خطبات و تقاریر اور اعلانات و بیانات پر مشتمل سمعی کیسٹ بھی شامل تھے، تقسیم کیا گیا۔ انقلابی حکومت کی اس حکمت عملی کے سبب ایران اور عرب دنیا کے مابین محاذ آرائی اور تصادم کی کیفیت پیدا ہوگئی (تفصیل کے لیے دیکھیے : Imam Khomeini on Exportation of Revoluition: ترجمہ: حمید تہرانی، تہران: مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، ۲۰۰۱ء؛ نوید ایس شیخ The New Politics of Islam: لنڈن و نیویارک: روٹ لیج کرزن، ۲۰۰۳ء، ص ۶۰-۶۵؛ Fred Halliday: "Iranian Foreign Policy Since 1979"، در Nikki R.Keddie,Jaun I.R.Cole (مدیران): Shi'ism and Social Protest، ص ۱۰۳-۱۰۵).

ایران کی انقلابی قیادت کی دوسرے ممالک کو انقلاب کی برآمدگی سے متعلق اس پالیسی کی وجہ سے مذکورہ ممالک کی شیعہ آبادی میں فعالیت پسندی کے رجحان نے تقویت پکڑ لی۔ خلیج فارس کے دھانے پر واقع تیل کی دولت سے مالا مال سعودی عرب کے مشرقی صوبے الاحساء میں، جس کی دو تہائی جب کہ اس کے شہر قطیف کی ۹۵٪ آبادی شیعہ مذہب کی پیروکار ہے، ۱۹۷۹ء کے دوران ایران کی انقلابی قیادت کی تحریک پر بڑی ہلچل پیدا ہوئی۔ نومبر ۱۹۷۹ء کو الاحساء کے شہروں میں شیعہ آبادی نے عاشورہ کے موقع پر بھی اعلانیہ طور پر ماتمی و عزہ داری کی تقریبات منعقد کیں اور مختلف شہروں میں حکومت کے خلاف مظاہرے کیے۔ مظاہرین کے ہاتھوں توڑ پھوڑ، لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات بھی پیش آئے۔ شیعہ مظاہرین اور پولیس کے مابین جھڑپوں میں درجنوں افراد ہلاک و زخمی ہوئے۔ فروری ۱۹۸۰ء میں اسلامی انقلاب کی پہلی سالگرہ کے موقع پر سعودی عرب کے مشرقی و شمالی علاقے کی شیعہ آبادی نے احتجاجی مظاہرے اور ہنگامے کیے۔ شیعہ آبادی کے رہنماؤں کی طرف سے آل سعود کی حکومت کو سخت تنقید کا ہدف بنایا گیا۔ ان واقعات کے بعد ایران کی انقلابی حکومت نے سعودی عرب کے خلاف پروپیگنڈا تیز کر دیا۔ ملوکیت کو خلاف اسلام قرار دے کر اس کے جواز کو سختی سے چیلنج کیا، جبکہ الاحساء کی شیعہ آبادی کی جدوجہد کی تائید و حمایت کا اعادہ کیا۔ دریں حالات شاہ خالد کی حکومت کو ملک کی شیعہ آبادی کی محرومیوں اور شکایات کے ازالہ کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ چنانچہ ان علاقوں میں تعلیم ، صحت اور رہائشی مکانات کی سہولیات کی فراہمی اور تعمیرو ترقی کے بعض دوسرے منصوبے شروع کئے گئے (نوید ایس۔ شیخ : The New Politics of Islam، ص ۶۲-۶۳؛ Jacob Goldberg: "The Shi'i Minority in Saudi Arabia" در Shi'ism and Social Protest، ص، ۲۳۱-۲۴۲، ۲۴۴ ۲-۲۴۹)۔ غرضیکہ ایران کی انقلابی قیادت کی صدور انقلاب سے متعلق حکمت عملی کے سبب ایران کے ہمسایہ ملک سعودی عرب سے تعلقات سخت کشیدہ ہوگئے.

لبنان: مشرقی وسطی میں اسلامی انقلاب کے وسیع و عمیق اثرات لبنان پر مرتب ہوئے۔ اسلامی انقلاب اور صدور انقلاب سے متعلق انقلابی حکومت کی حکمت عملی نے لبنان کی شیعہ آبادی کو ایک حقیقی سیاسی قوت میں تبدیل کر دیا۔ انقلابی حکومت کی وسیع حمایت و اعانت سے لبنان کے شیعہ انقلابیوں نے دونیم عسکری تنظیمیں "اسلامی اَمل ملیشیا" اور "حزب اللہ" کے نام سے قائم کیں اور دسمبر ۱۹۸۲ء میں بعلبک میں اسلامی جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا۔ حزب اللہ اور اسلامی امل نے اسرائیلی فوج کے خلاف کارروائیوں کے علاوہ ۱۹۸۳ء سے لبنان میں قیام امن پر مامور کثیر القومی فوج (امریکہ، اٹلی اور فرانس کے فوجی دستوں پر مشتمل) کے خلاف خود کش حملوں اور غیر

ملکی شہریوں (مغربیوں) کے اغوا کا سلسلہ شروع کیا۔ حزب اللہ کے خود کش حملوں میں لبنان میں تعینات سیکڑوں امریکی و فرانسیسی فوجی ہلاک ہوے، جب کہ سیکڑوں کی تعداد میں امریکی و فرانسیسی فوجیوں اور عام شہریوں کو شیعہ انقلابیوں نے یرغمال بنا لیا۔ ان واقعات سے ایران اور امریکہ و مغربی ممالک کے مابین کشمکش میں اضافہ ہوا (Gilles Kepel: Jihad: The Trial of Political Islam، لنڈن و نیویارک: آئی بی ٹاؤرس، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲۵-۱۳۰؛ Rodger Shanahan: The Shia of Lebanon: Clans, Practices and Parties، لنڈن و نیویارک: ٹاؤرس اکیڈیمک اسٹڈیز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۲-۱۱۷)۔

عراق: ایران میں اسلامی انقلاب نے دیگر مسلم ممالک کے مقابلے میں قریبی ہمسایہ ملک عراق، کہ جس کی آبادی کی اکثریت شیعہ ہے، کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ عراق کی طرف صدور انقلاب (برآمد انقلاب) اور بعث پارٹی کی حکومت کا خاتمہ تو آیت اللہ خمینی کی سیاسی جدوجہد کا ایک لازمی جز بن گیا تھا۔ آیت اللہ خمینی، جنھوں نے ۱۹۶۴ء میں ملک سے جلا وطن کیے جانے پر عراق کے شہر نجف میں تقریباً ۱۳ سال بسر کیے تھے، ۱۹۷۸ء میں شاہ کے دباؤ پر عراق کے صدام حسین کی طرف سے نجف سے نکالے جانے پر صدام حسین سے سخت ناخوش تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس وقت سے شاہ کے ساتھ ساتھ صدام حسین کو بھی تندو تیز تنقید و ملامت کا ہدف بنا لیا۔ ایران میں اسلامی انقلاب کے ساتھ ہی آیت اللہ خمینی نے عراق کی شیعہ آبادی کو عراق میں بعث پارٹی کی حکومت (صدر صدام حسین کی حکومت) کے خاتمے اور ایک اسلامی حکومت کے قیام کی تحریک کی۔ آیت اللہ خمینی اور دیگر انقلابی رہنماؤں نے بعث پارٹی کے بنیادی نظریات، یعنی لادینیت، اشتراکیت اور عرب قوم پرستی کو غیر اسلامی جب کہ صدام حسین کو اسلام اور مسلمانوں کا دشمن قرار دے کر عراقی عوام کو اس کے خلاف بغاوت کی بار بار دعوت دی تھی (The Modern History of Iraq، ص ۲۹۲-۲۹۳؛ M.S.El-Azhary (مدیر): The Iraq-Iran War: An Historical, Economic and Political Analysis، لنڈن و کرام ہیلم: ۱۹۸۴ء، ص ۳)۔

ایران کے اسلامی انقلاب سے تحریک پاکر عراق میں شیعہ علماء و مجتہدین کی تنظیمیں "مجاہدین" اور "الدعوۃ الاسلامیہ" از سر نو منظم و متحرک ہونا شروع ہوئیں۔ ان دونوں تنظیموں کے قائد عراقی عالم سید محمد باقرالصدر (۱۹۳۰-۱۹۸۰ء) آیت اللہ خمینی کی شخصیت اور ان کے افکار و خیالات سے گہرے طور سے متاثر تھے۔ آیت اللہ خمینی سے ان کی نجف میں ۱۹۶۴-۱۹۷۸ء کے دوران میں قریبی مصاحبت رہی تھی۔ ۱۹۷۹ء کے وسط میں آیت اللہ باقر الصدر آیت اللہ خمینی کی تحریک پر صدر صدام حسین کی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوے۔ چنانچہ شیعہ آبادی نے ملک میں سیاسی مظاہروں کا سلسلہ شروع کیا۔ بعث حکومت نے آیت اللہ باقرا لصدر اور دیگر شیعہ رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ایران کی انقلابی قیادت کی تحریک پر عراق کے شمال میں کرد علیحدگی پسندوں کی سرگرمیوں میں بھی تیزی آ گئی۔ صدام حسین کی حکومت نے جواباً ایران کے صوبہ خوزستان کی عرب آبادی کی علیحدگی پسند تحریک کی حمایت کی اور اسے مالی و اسلحی امداد بہم پہنچانا شروع کی۔ چنانچہ خوزستان کے عرب کھلم کھلا اسلامی انقلابی حکومت کے خلاف بغاوت پر اتر آئے۔ ان عرب علیحدگی پسندوں نے ایران کی تیل کی تنصیبات کو تخریب کاری کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ ان واقعات سے دونوں ممالک کے درمیان جاری سرد جنگ عروج پر پہنچ گئی۔ جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے دونوں ملکوں کے درمیان شط العرب کے علاقے پر قدیم زمانے سے تنازعہ چلا آتا ہے۔ جس پر اس سے قبل بھی دونوں ملکوں کے درمیان سرد جنگ جاری رہی تھی۔ عراق کی بعث حکومت نے شط العرب کی ملکیت اور

اس کی سرحدوں کے تعین کے سلسلہ میں ایران کے ساتھ طے پانے والے معاہدہ الجزائر (۱۹۷۵ء) کو بادل نخواستہ قبول کیا تھا (Tareq Y.Ismael: Iraq and Iran: Roots of Conflict، نیو یارک: سائراکیوس یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۲ء، ص ۶۰-۸۶؛ Kaiyan Homi Kaikobad: The Shatt-al-Arab Boundry Question، آکسفرڈ: کلارنڈن پریس، ۱۹۸۸ء، ص ۶۴-۶۷، ۱۳۶-۱۳۸)۔ چنانچہ جب اسلامی انقلاب کے نتیجے میں ایران کا روایتی فوجی ڈھانچہ شکست و ریخت سے دو چار ہوا اور ملک میں مختلف لسانی و نسلی اور مذہبی اقلیتوں / گروہوں (کردوں، بلوچوں، ترکمانوں، اور عربوں وغیرہ نے) علاقائی خود مختاری کے لیے جدوجہد شروع کی تو صدام حسین کو ۱۹۷۵ء کے معاہدہ الجزائر کے تحت ایران کو دی گئی رعایات کو کالعدم قرار دینے (reverse) کرنے کا بہترین موقع میسر آیا۔ چنانچہ اس نے ۳۰/اکتوبر ۱۹۷۹ء کو معاہدہ الجزائر کو یک طرفہ طور پر منسوخ و کالعدم قرار دے دیا۔ صدام حسین نے معاہدہ الجزائر پر نظرثانی یعنی شط العرب کی سرحدوں کے از سرنو تعین کے علاوہ آبنائے ہرمز کے تین جزائر، جن پر شاہ نے ۱۹۷۱ء میں بزور طاقت قبضہ کر لیا تھا، سے ایرانی فوج واپس بلانے نیز ایران میں موجود مذہبی اور نسلی و لسانی (سنی العقیدہ) اقلیتوں خصوصاً خوزستان کے عربوں کی علاقائی خود مختاری جیسے مطالبات پیش کر دیے۔ آخری مطالبے کا مقصد ایران کی علاقائی وحدت و سالمیت کی شکست و ریخت تھا (M.S.El-Azhary: The Iraq-Iran War، ص ۲؛ The Modern History of Iraq، ص ۲۹۲).

دریں اثنا عراق میں ایران کے اسلامی انقلاب کی حامی شیعہ جماعتوں کی سرگرمیوں میں تیزی آ گئی۔ ۱۹۸۰ء کے ابتدائی مہینوں میں ان جماعتوں کے ارکان نے ملک میں متعدد بم دھماکے کیے۔ اعلیٰ حکومتی شخصیات اور بعث پارٹی کے عہدیداروں پر قاتلانہ حملوں کے واقعات بھی پیش آئے، جس سے بغداد میں دہشت و خوف کا سماں پیدا ہو گیا۔ بعث حکومت نے سخت کارروائی کر کے شیعہ جماعت الدعوۃ کے ارکان اور حامیوں کو گرفتار کر لیا۔ ۱۹۸۰ء کے دوران اس جماعت سے تعلق رکھنے والے سیکڑوں افراد کو جن میں سے اس کے قائد سید محمد باقر الصدر کے علاوہ متعدد (۸) دوسرے اکابر علما بھی شامل تھے، سزائے موت دی گئی۔ مزید براں تقریباً ۳۵ ہزار ایرانی النسل افراد کو ملک سے ایران کی طرف دھکیل دیا (M.S.El-Azhary: The Iraq-Iran War، ص ۱-۲؛ Hanna Batatu: Shi'i Organizations in Iraq، در Shi'ism and Social Protest، ص ۱۸۰، ۱۹۲، ۱۹۵-۱۹۶؛ The Modern History of Iraq، ص ۲۹۲-۲۹۳)۔ ستمبر ۱۹۸۰ء کے اوائل میں دونوں ملکوں کے درمیان سرحدی جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۷ ستمبر کو صدام حسین نے ۱۹۷۵ء کے معاہدہ کو یک طرفہ طور پر مسترد کرتے ہوئے شط العرب پر عراقی ملکیت و اقتدار کا اعلان کر دیا اور پھر چند روز بعد ۲۰ ستمبر کو ایران کے خلاف اعلان جنگ کر دیا (The Modern History of Iraq، ص ۲۹۴)۔ صدام حسین کو ایران پر حملہ کے سلسلے میں امریکہ کی مکمل تائید و حمایت حاصل تھی، بلکہ یہ حملہ امریکہ ہی کی شہ پر کیا گیا تھا۔ بعث حکومت نے ایرانی فوج کی کمزوری اور اس کے شکست و ریخت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنوبی ایران میں تیل کے کنوؤں پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جنگ کے ابتدائی مہینوں میں عراقی فوج نے ایران کے سیکڑوں میل کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران میں دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کی تیل کی تنصیبات اور بندرگاہوں کو بھاری نقصان پہنچایا۔ جس سے دونوں ملکوں کی تیل کی برآمدات میں خلل پڑا (M.S.El-Azhary: The Iraq-Iran War، ص ۳).

ابتدائی دو سالوں میں عراق کے ہاتھوں زک اٹھانے کے بعد میدان جنگ میں ایران کا پلڑا بھاری ہونا شروع

ہوا۔ چنانچہ اس کی فوج نے جولائی ۱۹۸۲ء میں نہ صرف یہ کہ عراقیوں کو ملکی حدود سے نکال باہر کر کے تیل کی تنصیبات کا بڑا اہم مرکز خرم شہر واپس لے لیا، بلکہ عراق کے بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا اور یوں جنگ بندی کے سلسلہ میں اپنی شرائط منوانے کی صلاحیت اختیار کر لی (Fred Halliday: Iranian Foreign Policy Since 1979، ص ۹۶-۹۷)۔ انقلابی حکومت کا مقصد و عزم شط العرب پر قبضہ کو مستحکم کرنے کے علاوہ صدام حسین کی حکومت کا خاتمہ اور عراق میں اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ انقلابی حکومت کو امید تھی کہ عراق میں ایرانی فوج کی موجودگی نیز شیعہ اور کرد آبادی کی بغاوت سے بعث حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تاہم ایرانی حملہ ناکام ہوا اور اس کی فوج خصوصاً پاسداران انقلاب کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ جنوبی عراق میں بعث حکومت کے خلاف شیعہ بغاوت بھی سر نہ اٹھا سکی۔ جولائی ۱۹۸۲ء میں ایران سے عراقی فوج کی پسپائی کے بعد سے دونوں ملکوں کے مابین جنگ بندی کے لیے عالمی سطح پر متعدد کوششیں ہوئیں۔ تاہم ایران کی انقلابی قیادت کی طرف سے جنگ بندی کے لیے پیشگی شرط کے طور پر جنگ کے دوران پہنچنے والے نقصان کی تلافی کے لیے عراق سے ہرجانہ طلب کیا گیا جس کے سبب یہ کوششیں بے ثمر رہیں۔ آیت اللہ خمینی کی طرف سے صدام حسین کی حکومت کے خاتمہ تک جنگ جاری رکھنے کا عزم بالجزم کے اظہار کیا گیا (M.S.El-Azhary: The Iraq-Iran War، ص ۳)۔

عراق نے ایران کو جنگ بندی پر مجبور کرنے اور اس پر اقتصادی ضرب لگانے کے لیے پہلے خلیج فارس میں اس کے تیل کے ٹینکروں اور پھر ۱۹۸۴-۱۹۸۵ء کے دوران میں اس کے شہروں پر وسیع پیمانے پر بمباری کا سلسلہ شروع کیا۔ ایران میں انقلابی قیادت کی طرف سے جنگ کو طول دینے پر بعض مؤثر و طاقت ور حلقوں کی طرف سے تنقید کی جانے لگی۔ ایرانی مجلس میں سابق وزیراعظم مہدی بازرگان اور بعض دوسرے ممتاز ارکان آیت اللہ حسین القمی، آیت اللہ مرتضی الحیری اور آیت اللہ گل پائیگانی کی طرف سے جنگ کو طول دینے کے جواز کو شدت سے چیلنج کیا گیا۔ تاہم آیت اللہ خمینی اپنے عزم پر قائم رہے، حتیٰ کہ فروری ۱۹۸۶ء میں سپاہ پاسداران انقلاب نے عراق کی تیل کی ایک اہم بندرگاہ فاؤ (FAO) پر قبضہ کر لیا۔ عراق نے جواباً ایران شہروں اور خصوصاً اس کی تیل کی تنصیبات پر میزائل حملوں کا سلسلہ وسیع کر دیا۔ نتیجتاً ایران میں تیل کی پیداوار و برآمد شدید طور پر متاثر ہوئی حتیٰ کہ حکومت کو اندرون ملک تیل اور ایندھن کی فراہمی کے سلسلہ میں راشن بندی کرنا پڑی۔ جولائی ۱۹۸۷ء میں اقوام متحدہ نے جنگ بندی کے لیے قرار داد (۵۹۸) منظور کی، جس میں دونوں ملکوں سے فوج واپس بلانے کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا تاہم اس بار عراق نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ عراق ایران جنگ سے خصوصاً خلیج فارس میں آبی گزرگاہوں پر حملوں سے خطے کے دوسرے ممالک بھی متاثر ہوئے۔ ان کے تیل کے ٹینکر دونوں ممالک کے حملوں کی زد میں آتے رہے۔ چنانچہ اس دوران میں حکومت کویت کی درخواست پر تیل کے ٹینکروں کے تحفظ کے لیے امریکی بحریہ کے دستے خلیج فارس میں داخل ہو گئے۔ امریکی بحری دستوں نے ایران اور عراق کی طرف سے حملوں سے بچاؤ کے لیے کویت اور دوسرے ممالک کے تیل کے ٹینکروں پر امریکی پرچم لہرانے شروع کیے۔ خلیج فارس میں موجود امریکی بحریہ کی طرف سے کبھی کبھار ایرانی بحریہ کے دستوں پر حملے بھی کیے جاتے رہے۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء کے وسط میں امریکی دستوں نے سپاہ پاسداران انقلاب کے بحری دستوں سے لڑائی اور انہیں غیر مسلح کر کے گرفتار کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ امریکی بحریہ نے گشت میں مصروف سپاہ پاسداران انقلاب کی کئی کشتیوں کو پکڑ لیا۔ مزید براں

امریکی بحریہ کے حملوں میں ایران کی درجنوں کشتیاں تباہ ہوئیں، جب کہ سیکڑوں پاسداران ہلاک و زخمی ہوے۔ امریکی بحریہ نے بعض بندرگاہوں کو بھی نشانہ بنایا (Islam and the Post- Revolutionary State In Iran، ص ۱۲۴-۱۲۵)۔

جون ۱۹۸۸ء تک عراق نے فاؤ (FAO) سمیت اپنے تمام علاقے واپس لے لیے۔ اس نقصان پر آیت اللہ خمینی نے بری فوج کے سربراہ بریگیڈئیر جنرل اسماعیل شہرابی کو برطرف کر دیا اور حجۃ الاسلام ہاشمی رفسنجانی کو مسلح افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کر دیا۔ مزید براں اسے فوج، سپاہ پاسداران انقلاب اور دیگر عسکری تنظیموں کے ادغام و انضمام کا اختیار دے دیا۔ ہاشمی رفسنجانی نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوے صریح طور پر اعتراف کیا کہ عراق کے خلاف جنگ جیتی نہیں جا سکتی۔ چنانچہ انہوں نے آیت اللہ خمینی کو جنگ بندی کا مشورہ دیا۔ جسے انہوں نے بادل نخواستہ قبول کرتے ہوے ۱۸رجولائی ۱۹۸۸ء کو جنگ بندی سے متعلق اقوام متحدہ کی قرار داد سے اتفاق کر لیا۔ جس پر دونوں ملکوں میں جاری طویل خونریز جنگ ختم ہو گئی (Islam and the Post Revolutionary State in Iran، ص ۱۲۵-۱۲۶)۔

جنگ کے اثرات: عراق کے ساتھ طویل جنگ کے قومی زندگی کے کم و بیش تمام شعبوں خصوصاً معیشت پر گہرے و وسیع منفی اثرات مرتب ہوے۔ جنگ کے دوران میں لاکھوں کی تعداد میں افراد ہلاک و زخمی ہوے۔ وسیع پیمانے پر صنعتی، تجارتی اور رہائشی املاک کے علاوہ پل اور سڑکیں تباہ ہوئیں۔ تیل و گیس کی صنعت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ جنگی علاقے سے ۱۵ لاکھ سے زائد افراد اپنا گھر بار چھوڑ کر محفوظ مقامات کی تلاش میں ملک کے دوسرے علاقوں کی طرف نقل مکانی پر مجبور ہوے۔ ملکی وسائل کا کثیر حصہ جنگی و دفاعی اخراجات کی نذر ہو جانے کے سبب تعمیرو ترقی کے عمل کو شدید دھچکا لگا۔ ترقیاتی اخراجات میں بھاری کٹوتی کے سبب سماجی بہبود اور تعلیم و صحت کے منصوبے بھی متاثر ہوے۔ صنعتی افزائش کے عمل کے رک جانے کے سبب بے روزگاری نے سنگین مسئلہ کی صورت اختیار کر لی۔ غرض اس جنگ نے خطیر ملکی وسائل ہڑپ کر لیے۔ مہنگائی اور بے روزگاری کے سبب عوام کا معیار زندگی بھی شدید طور سے متاثر ہوا۔ بدیں وجہ جنگ کے اختتام پر ملکی تعمیر نو کے مسئلہ نے ایک کڑے چیلنج کی صورت اختیار کر گئی (Eric Hooglund: "Iran in 1980-1985: Political and Economic Trends"، در The Iranian Revolution and the Islamic Republic، ص ۱۷-۲۸)۔

انقلابی ایران، آیت اللہ خمینی کی مطلق العنانیت: ایران میں پہلوی شہنشائیت و ملوکیت کے خاتمہ کے لیے آیت اللہ خمینی نے طویل جدوجہد کی تھی اوراس راہ میں انہوں نے بڑی صعوبتیں اٹھائی تھیں۔ ان کے مذہبی و سیاسی افکار بالخصوص حکومت اسلامیہ کے بارے میں ان کے تصور "ولایت فقیہ" نے علماء و مجتہدین کو بادشاہت و ملوکیت کی جگہ اسلامی حکومت کے قیام کی راہ دکھائی تھی۔ سال ۱۹۷۸ء کے آغاز سے فروری ۱۹۷۹ء میں پہلوی بادشاہت کے خاتمہ تک آیت اللہ خمینی پہلے عراق کے شہر نجف اور پھر وہاں سے جلا وطنی کے بعد فرانس کے مضافات میں مقیم رہ کر انقلابی جدوجہد کی سیاسی و فکری رہنمائی کرتے رہے۔ انقلاب کی جدوجہد میں شامل جملہ گروہوں نے خواہی نخواہی ان کی قیادت کو تسلیم کر لیا تھا جب کہ عوام کی اکثریت نے انہیں رہبر و امام مان لیا تھا۔ دریں صورت مستقبل کے سیاسی انتظامات کے بارے میں فیصلہ سازی کا اختیار بھی آیت اللہ خمینی کو حاصل ہو گیا تھا۔ یوں تحریک انقلاب کے دوران میں ہی نہیں بلکہ اس کے بعد ملک کے سیاسی و انتظامی نظام میں بھی انہیں مرکزی

حیثیت حاصل ہو گئی۔ فیصلہ سازی کے عمل میں ان کی یہ مرکزی و بالا دست حیثیت ان کے انتقال (۱۹۸۹ء) تک بدستور پوری آب و تاب سے قائم و برقرار رہی۔ مجلس شورای اسلامی (پارلیمنٹ) اور شورای نگہبان کی کار گزاری اور فیصلوں پر ان کی مکمل طور پر گرفت قائم رہی۔ آیت اللہ خمینی اکثر مواقع پر اہم قانونی امور کے بارے میں کوئی فرمان یا فتویٰ جاری کرتے جسے ایک بالاتر قانون (سپریم لاء) کی حیثیت سے دیکھا جاتا اور ملکی و انتظامی قوانین کی تیاری میں ان کو رہنما بنایا جاتا (اصغر شیرازی: The Constitution of Iran، ص۶۳).

رہبر کو مقننہ (مجلس اور شورای نگہبان) ہی نہیں انتظامیہ پر بھی بالا دستی حاصل تھی۔ حکومت کے تمام اہم فیصلوں اور داخلی و خارجی پالیسیوں کی تشکیل میں ان (رہبر) کی رائے کو بڑا عمل دخل حاصل رہا۔ وہ اپنے بیانات و پیغامات اور خطبات میں جو کچھ کہتے اس کو پالیسی سازی و فیصلہ سازی میں رہنما اصول کا درجہ حاصل ہو جاتا۔ داخلی اور خارجی امور میں آیت اللہ خمینی کی رائے بقول ایرانیوں کے "خطِ امام" اور ان کے حکم "حکمِ ارشادی" و "حکم مولای" کو حرف آخر کی حیثیت حاصل تھی۔ جس کی پیروی بلا چون و چرا اور غیر مشروط طور پر کی جاتی۔ اعلیٰ ترین حکومتی و انتظامی اور آئینی و مذہبی عہدوں پر افراد کے تقرر و تنزل (نصب و عزل) میں آیت اللہ کی رائے کا بڑا عمل دخل رہا۔ ابوالحسن بنی صدر کے بطور صدر تقرر اور پھر عزل کے بارے میں حتمی و قطعی فیصلہ آیت اللہ خمینی ہی کا تھا، گو بظاہر یہ کام مجلس نے انجام دیا۔ اسی طرح آیت اللہ علی المنتظری کو، جن کو شورای خبرگان نے دوبار رہبر (آیت اللہ خمینی) کا جانشین مقرر کیا تھا، انہی کے حکم پر مارچ ۱۹۸۹ء میں نااہل قرار دیا گیا۔ حالانکہ دستور کی رو سے "فقیہ" کے نصب و عزل کا اختیار شورای خبر گان کو حاصل ہے۔ آیت اللہ خمینی کا یہ اقدام دستور کی صریح خلاف ورزی تھی۔ انہوں نے اس کے بعد کم مرتبے کے عالم علی خامنہ ای کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ خامنہ ای کو جانشین مقرر کی غرض سے رہبر کے ایما پر دستور میں ترمیم کی گئی اور اس کی اس شق کو حذف کیا گیا جس کی رو سے رہبر (فقیہ) کے لیے مرجع تقلید ہونا ضروری ہے (اصغر شیرازی: The Constitution of Iran، ص۷۲-۷۳)۔ اسلامی جمہوریہ کی خارجہ پالیسی بھی رہبر کے افکار و نظریات پر استوار کی گئی۔ خارجہ پالیسی کے باب میں غیر جانبداری کے اصول کی پیروی دراصل رہبر کے نعرہ "لا شرقی و لا غربی" کا آئینہ دار تھی۔ اسی طرح اسلامی انقلاب کا صدور (برآمد)، استعماری طاقتوں سے عدم مصالحت اور "شیطان بزرگ" (امریکہ) اور اس کی حاشیہ بردار عرب حکومتوں کی مذمت، جو ایک طرح سے اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول بن گئے تھے، کا مآخذ و منبع بھی آیت اللہ کے افکار و خیالات ہی تھے۔ خارجہ پالیسی کے میدان میں آیت اللہ خمینی کا ایک اہم فیصلہ عراق کے ساتھ جنگ کو طول دینا پھر ۱۹۸۸ء میں اچانک جنگ بندی کے سلسلہ میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرار داد کو قبول کرنا تھا۔ حالانکہ مجلس صرف دو ہفتے پہلے انہی ہی کے ایماء و تحریک پر اسلامی جمہوریہ کی واضح برتری اور فتح تک جنگ جاری رکھنے کے عزم کا اظہار کر چکی تھی۔ تاہم معیشت دانوں نے جنگ جاری رکھنے کی صورت میں ملک کی تباہی کا خدشہ و اندیشہ ظاہر کیا تو رہبر نے جنگ بندی کا فیصلہ کر لیا۔ البتہ اس فیصلہ کو انہوں نے زہر کا پیالہ نوش کرنے کے مترادف قرار دیا (اصغر شیرازی: The Constitution of Iran، ص۶۹-۷۱).

آیت اللہ خمینی جب تک حیات رہے انہوں نے تمام حکومتی و انتظامی اداروں پر اپنی کڑی گرفت قائم کیے رکھی۔ انہوں نے حکومت کے تمام محکموں اور سرکاری اداروں میں اپنے نمائندے مقرر کر کے گویا ان کو بالواسطہ طور پر

اپنے کنٹرول ان میں لے رکھا تھا۔ غرض اسلامی جمہوریہ میں رہبر آیت اللہ خمینی کی ذات میں تمام تشریعی و قانونی ، عدالتی اور تنفیذی اختیارات کا ارتکاز ہو گیا۔ دستور اور کاروبار حکومت میں ان کا تصور "ولایت فقیہ" پوری طرح سے کارفرما رہا (محمد حسین پناہی: An Introduction to the Islamic Revolution of Iran and Its Slogans، لنڈن: الھدیٰ، ۲۰۰۱ء، ص ۸۶-۸۷، ۹۰-۱۰۴، ۱۳۱-۱۳۲، ۱۳۶، ۱۵۱-۱۵۴).

اسلامی انقلاب کا دور ثانی ۱۹۸۹-۲۰۰۵ء (ایران آیت اللہ خمینی کے بعد): ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد کی تاریخ کو واضح طور پر دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: پہلا دور (۱۹۷۹-۱۹۸۹ء) جس میں انقلاب کی قیادت آیت اللہ خمینی کے ہاتھ میں رہی اور ریاست کی اسلامی تشکیل نو کا کام براہ راست ان کی نگرانی میں اور ان کے افکارو خیالات کے مطابق انجام پایا۔ جون ۱۹۸۹ء میں آیت اللہ خمینی کی وفات کے ساتھ ہی اسلامی جمہوریہ کے دوسرے دور کا آغاز ہوا۔ ملک کی سیاسی قیادت آیت اللہ خمینی کے معتمد و وفادار تلامذہ و رفقا کی طرف منتقل ہوئی۔ اس دور میں اسلامی انقلاب کی ماہیت میں تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی۔ نئی سیاسی قیادت کو عراق کے ساتھ طویل جنگ کے بعد ملکی معیشت کی بحالی و تعمیر نو کے علاوہ مغربی دنیا اور ہمسایہ مسلم ممالک سے تعلقات کی بحالی کا چیلنج درپیش تھا۔ جبکہ اندرون ملک عوام کی طرف سے آیت اللہ خمینی کے تصورات ولایت فقیہ پر استوار نظام میں اصلاح و ترمیم کی خواہش نے ایک زبردست تحریک اصلاح کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ملکی قیادت اور عوام واضح طور پر دو حصوں میں، آیت اللہ خمینی کے تصور ولایت فقیہ کے کٹر حامیوں یعنی موجودہ نظام کے محافظوں اور اصلاح پسندوں میں بٹ گئی.

حجۃ الاسلام علی اکبر ہاشمی کا دور صدارت (۱۹۸۹-۱۹۹۷ء): آیت اللہ خمینی کی وفات (۳رجون ۱۹۸۹ء) پر شوریٰ خبرگان نے صدر حجۃ الاسلام علی خامنہ ای کو بطور 'رہبر' منتخب کیا۔ آئندہ ماہ (جولائی ۱۹۸۹ء) میں منعقدہ صدارتی انتخابات میں مجلس کے اسپیکر علی اکبر ہاشمی رفسنجانی صدر منتخب ہوے۔ نو منتخب صدر کی تحریک و ایما پر حکومتی نظام میں موجود بعض تناقضات کو ختم کرنے کی غرض سے دستور میں بعض ترامیم تجویز کی گئیں۔ چنانچہ اسی ماہ ایک ملک گیر استصواب رائے کے ذریعے ان ترامیم کی توثیق کرائی گئی۔ دستوری ترامیم کے ذریعے وزیر اعظم کا عہدہ ختم ہوگیا، جبکہ صدر کی سیاسی طاقت اور حکومتی و انتظامی اختیارات میں اضافہ ہوا۔ ہاشمی رفسنجانی ۱۹۹۳ء میں منعقدہ صدارتی انتخابات میں ایک بار پھر صدر منتخب ہوے۔ ہاشمی رفسنجانی نے حکومت سنبھالتے ہی سابق دور کی داخلی و خارجی پالیسیوں پر نظرثانی و ترمیم کی ضرورت کو نہ صرف محسوس کیا، بلکہ اس معاملے میں بعض محاذوں پر عملی طور پر پیش قدمی بھی کی۔ ان کی حکومت انقلابیت پسندی سے دور ہٹتی چلی گئی۔ انہوں نے مغرب مخالف انقلابی نعروں سے اجتناب برتا۔ خارجہ تعلقات کے باب میں عملیت پسندی پر مبنی حکمت عملی اختیار کی۔ وہ ملک کی تعمیر نو اور معیشت کی بحالی و ترقی کے لیے مغربی دنیا سے محاذ آرائی ترک کر کے ان سے دو طرفہ تعلقات کی بہتری و بحالی کو ایک ناگزیر ضرورت خیال کرتے تھے۔ وہ ہمسایہ عرب ممالک سے تعلقات کی بہتری کی غرض سے صدور انقلاب (برآمد انقلاب) کی پالیسی سے بھی عملاً دستبردار ہو گئے۔انہوں نے مغرب دشمن سیاست کے بجائے داخلی سیاست اور تعمیر نو پر اپنی توجہ مرکوز رکھی خصوصاً خستہ حال ملکی معیشت کی بحالی کو اپنی حکومت کی اولیں ترجیح بنا لیا (حسین سیف زادہ: "The Landscape of Factional

"Politics and its Future in Iran"، در The Middle East Journal، ۵۷:۱ (۲۰۰۳ء)، ص ۵۸-۵۹، ۶۹؛ The New Politics of Islam، ص ۶۷)۔ ہاشمی رفسنجانی نے آزاد منڈی کی معیشت کے فروغ کی حکمت عملی اختیار کی اور ملک میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے فضا کو سازگار بنانے پر خاص توجہ دی۔ ملکی تعمیر نو خصوصاً صنعت کی بحالی و ترقی کے لیے مطلوبہ ٹیکنالوجی اور فنی مہارت و سرمایہ کے حصول کے لیے مغرب کے بعض ممالک سے سلسلہ جنبانی شروع کیا۔ داخلی محاذ پر انہوں نے سیاسی سرگرمیوں اور آزادی اظہار رائے کے سلسلہ میں سابق دور کی سخت گیر پالیسی سے کنارہ کشی اختیار کی۔ انہوں نے ذرائع ابلاغ خصوصاً غیر سرکاری اخبارات و جرائد اور کتب و رسائل کی اشاعت پر عائد سنسر شپ کی کڑی پابندیوں کو قدرے نرم کر دیا۔ ان کے پہلے دور صدارت میں ان کی حکومت میں شامل وزیر ثقافت و ارشادِ اسلامی (وزیر اطلاعات و نشریات) سید محمد خاتمی، جو بعد میں ملک کے صدر (۱۹۹۷ء) ہوے، اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ادارے 'صدا و سماع' کے سربراہ سید محمد رضا خاتمی تحریرو تقریر کی آزادی کے پر جوش حامی و علمبردار تھے۔ چنانچہ ۱۹۹۱-۱۹۹۲ء کے دوران میں ملک میں اخبارات و جرائد کی اشاعت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ سیاسی سرگرمیوں کو بھی مہمیز ملی۔ اہل صحافت، دانش وروں اور سیاست دانوں کی طرف سے آیت اللہ خمینی کے تصور ولایت فقیہ پر استوار ریاستی نظام پر تنقید اور ساتھ ہی نظام میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت پر بحث مباحثہ کا آغاز ہوا (Shahram Chubin: Reform, Domestic Politics and National Security: Wither Iran?، نیویارک: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲ء، ص، ۱۶-۲۰)۔

قدامت پسندوں "محافظ کاراں" کا رد عمل: صدر ہاشمی رفسنجانی کی آزاد منڈی کی معیشت کے فروغ اور غیر ملکی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی نیز مغربی ممالک سے تعلقات کی بحالی اور آزادی اظہار خیال سے متعلق پالیسیوں کو تصور ولایت فقیہ کے کٹر حامی و پیروکار علما نے سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا چنانچہ وہ ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہوے۔ یہ علما، جو خود کو اسلامی انقلاب کا محافظ گردانتے تھے، اصلاح پسندوں کے طرز فکرو عمل کو اسلامی انقلاب کے لیے خطرہ تصور کرتے تھے۔ علما کے اس گروہ، جس کی قیادت آیت اللہ خمینی کے جانشین علی خامنہ ای اور بعض دوسرے علما کے ہاتھ میں تھی، ہاشمی رفسنجانی کے بعض قریبی رفقا کو حکومت و انتظامیہ سے نکال باہر کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ چنانچہ ۱۹۹۲ء میں آزادی اظہار رائے کے حامی وزیر ثقافت و ارشاد اسلامی (وزیر اطلاعات) سید محمد خاتمی اور "صدا وسماع" کے سربراہ سید محمد رضا خاتمی کو اپنے عہدوں سے الگ ہونا پڑا۔ مجلس نے، جس پر قدامت پسندوں کا غلبہ تھا، ہاشمی رفسنجانی کے وزیر مالیات محسن نور بخش کا مواخذہ کر کے اسے برطرف کر دیا۔ ہاشمی رفسنجانی کو دیگر متعدد امور میں بھی قدامت پسندوں کے دباؤ کے سامنے جھکنا پڑا۔ قدامت پسند علماء و مجتہدین ذرائع ابلاغ کی حریت و آزادی اور سیاسی سرگرمیوں کو برداشت کرنے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ چنانچہ سپاہ پاسداران انقلاب نے بعض اخبارات کے دفاتر پر قبضہ کر لیا اور درجنوں آزاد خیال صحافیوں اور دانش وروں کو گرفتار کر لیا۔ عدلیہ نے متعدد افراد کو قید و بند کی سزا سنائی ("The Landscape of Factional Politics"، ص ۱۰-۶۱)۔

تحریک اصلاح: درحقیقت ایران کی اسلامی جمہوریہ کی ہیئت مقتدرہ کے اندر بہت سے تناقضات و تضادات موجود ہیں۔ اسلامی جمہوریہ اقتدار و طاقت کے مختلف مراکز میں بٹی ہوئی ہے جو ایک دوسرے پر غلبہ و بالا دستی کے لیے آپس میں برسر پیکار ہیں۔ اسلامیہ جمہوریہ میں اسلامی انقلاب کے تحفظ و استحکام کے لیے ایک طرف رہبر

(قیادت) اورشوریٰ نگہبان جیسے غیر منتخب ادارے موجود ہیں، جنہیں ملکی و ریاستی امور میں حتمی اختیار و اقتدار حاصل ہے ، جبکہ دوسری طرف عوام کو صدر، ارکان مجلس اور بلدیاتی کونسلوں کے انتخاب کا حق دیا گیا ہے، بالفاظ دیگر انہیں اپنی پسند کی انتظامیہ (صدر) اور مقننہ (مجلس) منتخب کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ تاہم عوام کے منتخب اداروں کو غیر منتخب اداروں کے تابع رکھا گیا ہے۔ یوں اس ملک کے سیاسی نظام میں ایک پیچیدہ ثنویت پائی جاتی ہے (Ray Takeyh: "Iran at Crossroads" در The Middle East Journal، ۵۷:۱، ۲۰۰۳ء، ص۴۳)۔ انقلاب کی پہلی دہائی کے دوران آیت اللہ خمینی جیسی شخصیت نے اسلامی جمہوریہ میں موجود تناقضات اور اس کے مختلف اجزا کے مابین کشمکش کو دبائے رکھا۔ عراق کے ساتھ جنگ کے دنوں میں بھی یہ مسائل دبے رہے ۔ ۱۹۸۸ء میں عراق کے ساتھ طویل جنگ کے خاتمہ اور پھر ۱۹۸۹ء میں رہبر انقلاب آیت اللہ خمینی کی وفات کے ساتھ ہی گوناں گوں داخلی تناقضات یک دم ابھر کر سامنے آ گئے۔ اسلامی جمہوریہ کی ماہیت اور اس کے جوہر اور سمت کے بارے میں بحث و مباحثے کا آغاز ہوا۔ دریں اثنا ایران کی نوجوان نسل نے سیاسی حریت و آزادی اور یکساں معاشی مواقع سے متعلق انقلابی قیادت کی طرف سے کیے گئے وعدوں کے ایفاء و تکمیل کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے آغاز سے اسلامی جمہوریہ کی ماہیت میں اصلاح و ترمیم کے لیے خود مقتدر مذہبی اشرافیہ کے اندر سے آواز بلند ہونا شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں سربر آوردہ عالم آیت اللہ علی حسین المنتظری ، جنہیں علی الترتیب ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۷ء میں دوبار آیت اللہ خمینی کا جانشین مقرر کیا گیا تھا، کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے۔ آیت اللہ المنتظری نے اصلاح پسندوں کی برملا طور سے حمایت کی اور امور مملکت میں محض چند افراد کی اجارہ داری اور غیر منتخب اداروں خصوصاً شوریٰ نگہبان کی مجلس پر بالا

دستی کو شدت سے چیلنج کیا۔ انہوں نے اسلامی احکام و تعلیمات کی ایک عملیت پسند (pragmatic) تعبیر و تشریح پیش کی اور ریاستی و آئینی اور حکومتی و انتظامی اداروں کو حقیقی معنوں میں جمہور کا نمائندہ بنانے پر زور دیا۔ ان کے افکار و خیالات سے متاثر نوجوان علماء و مجتہدین نے قدامت پسند علماء و مجتہدین کی تنظیم 'جمعیت روحانیت مبارز' کے مقابلے میں خود کو 'مجمع روحانیوں مبارز' کے تحت منظم کرلیا۔ تصور ولایت فقیہ کے مخالف آزاد خیال افراد کی طرف سے موجودہ نظام کو تندو تیز تنقید کا ہدف بنایا گیا ("Iran at Crossroads" ، ص۴۳-۴۵)۔ بعض ممتاز سیاسی رہنماؤں، دانش وروں اور صحافیوں نے ،جن میں عبداللہ نوری، سعید حجاریان، عبدالوندموسیٰ لاری، محسن خدیوار، سابق سفیر تعینات شام علی اکبر محتشمی پور، سابق میئر تہران غلام حسین قرباشی، مجلس کے سابق اسپیکر مہدی کروبی، محمد رضا خاتمی اور مستقبل کے صدر محمد خاتمی شامل تھے، اسلامی جمہوریہ کی ہیئت میں اصلاح کی بابت فکری بحث مباحثہ میں شدت پیدا کر دی۔ اسلامی جمہوریہ کی ہیئت کے بارے میں بحث و مباحثہ نے جلد ہی نظام میں اصلاح و تبدیلی کی ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۹۹۲ء سے اصلاح پسندوں نے خود کو مختلف تنظیموں اور جماعتوں کی صورت میں منظم کرنا شروع کیا۔ کالجوں اور جامعات کے اساتذہ، طلباء، ادبی و صحافتی حلقے، آزاد خیال دانش ور اور علما اس تحریک کا ہراوّل دستہ بن گئے۔ اصلاح پسندوں کی ایک جماعت ''کارگزاران سازندگی'' کے نام سے وجود میں آئی۔ اس کے بانی ارکان میں صدر ہاشمی رفسنجانی کی بیٹی اور بھائی کے علاوہ ان کے قریبی رفقا غلام حسین قرباشی اورمحسن نور شامل تھے۔ اس جماعت کا منشور ملک کی تعمیر نو اور اس کی معیشت کو جدید بنانے کے لیے ہاشمی رفسنجانی کی داخلی و خارجی پالیسیوں کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنا تھا ۔ صدر ہاشمی رفسنجانی کی رائے بھی یہی رہی کہ عوام کی رائے اور رجحان کو نظرانداز

کر کے اسلامی جمہوریہ کی موجودہ ہیئت کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ چنانچہ وہ عوام کی رائے کے احترام اور شہری آزادیوں کے حامی تھے۔ مزید براں وہ تہذیبی و سماجی قدغنوں کو نرم کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ بعد کے سالوں میں متعدد (اٹھارہ/۱۸) اصلاح پسند جماعتیں وجود میں آئیں جن میں سب سے بڑی اور مقبول عام دو جماعتیں، ''سازمان مجاہدین انقلاب اسلامی'' اور معین نظامی ''اسلامک پارٹیسی پیشن فرنٹ'' (Islamic Participation Front) ہیں۔ مؤخر الذکر کی قیادت سید محمد رضا خاتمی (ڈاکٹر محمد رضا خاتمی کے برادر خورد) اور ممتاز دانش و ر صحافی سعید باجریان کے ہاتھوں میں ہے۔ اصلاح پسندوں کے جملہ گروہ تصور ولایت فقیہ پر استوار نظام میں اصلاح و ترمیم چاہتے ہیں۔ وہ اسلامی جمہوریہ کے بعض غیر منتخب آئینی و سیاسی مناصب اور اداروں کے وسیع اختیارات کو ختم کر کے انہیں رضائے جمہور سے ہم آہنگ کرنے بالفاظ دیگر انہیں زیادہ سے زیادہ جمہوری بنانے کے حامی و علمبردار ہیں۔ مزید براں وہ سیاسی و ثقافتی اور معاشرتی دائروں میں زیادہ سے زیادہ حریت و آزادی کے حامی و طالب ہیں۔ وہ آیت اللہ خمینی کے دور سے نافذ و جاری اخلاقی و مذہبی اور تہذیبی و معاشرتی قدغنوں کا خاتمہ چاہتے ہیں (Roger Howard: Irah in Crisis?، لنڈن: زید بکس، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۸-۱۲۹؛ The Landscape of Factional Politics in Iran، ص ۶۲-۶۴؛ Nikolas K.Gvosdev,Ray Takeyh (مصنفین): The Receding Shadow of the Prophet: The Rise and Fall of Radical Political Islam، ویسٹ پورٹ: پرائیگر Praeger، ۲۰۰۴ء، ص ۲۳-۲۶؛ "Iran at Crossroads"، ص ۴۴-۴۵، ۵۱-۵۳)۔

فکری و نظریاتی آویزش و کشمکش: آیت اللہ خمینی کے تصور ولایت فقیہ پر استوار اسلامی جمہوریہ کے نظام میں اصلاح و ترمیم کی جدوجہد کا دائرہ صرف عملی سیاسی میدان تک محدود نہیں رہا بلکہ یہ جدو جہد فکری و نظریاتی محاذ پر بھی بپا ہے۔ اصلاح کے حامی علماء و دانش وروں نے بذریعہ تحریر و تقریر عوام خصوصاً نوجوان نسل کو اپنا ہمنوا بنانے اور اسے اصلاح کے لئے عملی جدوجہد پر اکسانے میں بڑا سرگرم کردار ادا کیا ہے۔ اصلاح پسند تحریک کے فکری قائدین میں بعض جیدو ممتاز روایتی علماء آیت اللہ علی حسین المنتظری، آیت اللہ العظمٰی یوسف ثانی اور حجۃ الاسلام محسن خدیوار جیسے جیدوممتاز علماء کے علاوہ محمد مجتہد شبستری، عبدالکریم سروش اور اکبر گنجی جیسے جدید تعلیم یافتہ و آزاد خیال دانش وروں کے نام بڑے نمایاں ہیں۔ آیت اللہ المنتظری اور آیت اللہ العظمٰی یوسف ثانی جیسے اکابر علما کے افکار و خیالات کے سبب اصلاح کی تحریک کو روایتی مذہبی طبقے (علماء و مجتہدین) میں نفوذ حاصل ہوا۔ حجۃ الاسلام محسن خدیوار نے اسلام اور جمہوریت کے مابین توافق و تلازم پر زور دیا اور علماء کی حکومت کے تصور کی مخالفت کی۔ ان کی رائے میں یہ امر ضروری و لازمی نہیں کہ اسلامی جمہوریہ کی بھاگ ڈور علما کی جماعت کے ہاتھ میں ہو۔ محمد مجتہد شبستری اور عبدالکریم سروش اسلام کی جدید (علمی و عقلی) تعبیر و تشریح کے حامی ہیں۔ عبدالکریم سروش، جو جامعہ تہران و جامع لندن (برطانیہ) سے سند یافتہ ہیں اور سالہا سال سے ملکی جامعات میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں، ایک پر جوش انقلابی اصلاح پسند کے طور پر سامنے آئے ہیں۔وہ اسلامی جمہوریہ کی موجودہ ہیئت کے سب سے زیادہ مستقل مزاج ناقد خیال کئے جاتے ہیں۔ انہوں (عبدالکریم سروش) نے قدامت پسند علما کے اس خیال کی مدلل اور پر زور طور پر نفی و تردید کی ہے کہ جمہوریت قطعی طور پر ایک مغربی و لادینی تصور ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے اس نقطہ نظر کے اثبات کی سعی کی ہے کہ اسلام اور جمہوریت باہم دگرگہرے طور سے موافق وہم آہنگ ہیں۔ مسلم معاشرہ اور جمہوریت کا تلازم و توافق ناگزیر ہے۔ وہ

کسی حد تک دین و سیاست کی علیحدگی جبکہ سیاست و حکومت میں سے علماء و مجتہدین کے عمل دخل کو ختم کرنے کے حامی ہیں۔ عبدالکریم سروش کی تحریروں اور خطبات نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو بہت حد تک متاثر کیا ہے۔ (عبدالکریم سروش کے اصلاحی خیالات کے بارے میں ملاحظہ ہو: Charles D. Fletcher: A Preliminary Study of The Methodology of Abdol Karim، در Islamic Studies، ۴۴: ۴ (۲۰۰۵ء)، ص ۵۲۷-۵۵۲؛ محمود صدری و احمد صدری (مرتبین و مترجمین): Essential Writings: Reason, Freedom, and Democracy in Islam، Essential Writings of Abdolkarim Soroush، نیویارک: آکسفوڈ یونیورسٹی پریس،۲۰۰۰ء؛ Valla Vakili: Debating Religion and the Politics in Iran Political Thought of Abdolkarim Soroush، نیویارک : کونسل آن فارن ریلیشنز، ۱۹۹۶ء؛ وہی مصنف: "Abdolkarim Soroush and Critical Discourse in Iran"، مشمولہ John L. Esposito و John O. Voll (مدیران): Makers of Contemporary Iran، آکسفوڈ: آکسفوڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۰ء، ص ۱۵۰-۱۷۶)۔ عبدالکریم کے مقابلے میں اکبر گنجی مذہب و سیاست کی علیحدگی کے تصور یعنی سیکولرازم کا حامی و مبلغ ہے۔ وہ مذہب و سیاست کی کامل علیحدگی اور اہل مذہب (علماء و مجتہدین) کو حکومت و سیاست سے نکال باہر کرنے کا حامی ہے۔ وہ اس امر کو ایران میں جاری کشمکش کے خاتمے اورکسی بڑے داخلی تصادم سے بچاؤ کے لئے ناگزیر ضرورت خیال کرتا ہے۔ ایران میں اسلامی جمہوریہ کی ماہیت و ساخت میں اصلاح و ترمیم سے متعلق جاری بحث و مباحثہ میں اصلاح پسند دانش وروں نے مہذب و متمدن معاشرہ (سول سوسائٹی)، قانون کی حکمرانی، انسانی حقوق، سیاسی و معاشرتی حریت و آزادی اور سیاسی تکثیریت جیسی سیاسی اصطلاحات کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ یہ اصطلاحات دراصل اسلامی جمہوریہ کی ہیئت میں اصلاح و ترمیم کے بارے میں ان اصلاح پسندوں کے طرز فکر اور ان کے سیاسی ایجنڈے کی آئینہ دار ہیں۔ ایران کے علمی و ادبی اور صحافتی حلقوں نے ان دانش وروں کے افکارو خیالات کی اشاعت میں بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا جس سے تحریک اصلاح کا دائرہ وسیع و عمیق ہوا ("The Landscape of Factional Politics and its Future in Iran"، ص ۶۲-۶۵: "Iran at Crossroads"، ص۴۴-۵۵: The Receding Shadow of the Prophet، ص۲۶-۲۸: Iran in Crisis?، ص ۱۳۷).

محافظ کاروں کی حکمت عملی: تحریک اصلاح کے مقابلے میں آیت اللہ خمینی کے تلامذہ اور ان کے افکارو خیالات کے کٹر حامی جن میں حجۃ الاسلام علی خامنہ ای، شورای نگہبان کے سربراہ آیت اللہ احمد جنتی اور عدلیہ کے سربراہ آیت اللہ محمدیزدی کے علاوہ حجۃ الاسلام مسلمین شامل رہے ہیں۔ آیت اللہ خمینی کے تصور ولایت فقیہ پر استوار نظام کو ہر حال میں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ تصور ولایت فقیہ پر قائم نظام کے تحفظ و استحکام کے حامی اس گروہ کو بالعموم "محافظ کاراں" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے قائدین اور حامی جمہوریت اور لبرل ازم (آزاد روی) کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ اصلاح پسندوں کو "مفسدین فی الارض" گردانتے ہیں اور ان کے خلاف قوت و طاقت کے استعمال کو از روئے مذہب و شریعت جائز ہی نہیں، بلکہ ضروری خیال کرتے ہیں۔ صدر ہاشمی رفسنجانی کے دورِ صدارت میں قدامت پسندوں کی اسلامی جمہوریہ کے مرکزی وعصبی نظام بالفاظ دیگر اس کے کلیدی اہمیت کے آئینی و انتظامی اداروں خصوصاً شورای نگہبان، عدلیہ، مجلس، پاسداران انقلاب اور انصار حزب اللہ پر مستحکم گرفت قائم رہی۔ چنانچہ وہ اسلامی جمہوریہ کی ہیئت میں اصلاح و ترمیم کی تحریک کی راہ میں سختی سے مزاحم

ہوے ("Iran at Crossroads"، ص۴۳، ۴۳-۴۵، ۵۱،۵۶-۵۲: "The landscape of Factional Politics"، ص۵۸)۔ چنانچہ ۹۲-۱۹۹۱ء سے عدلیہ نے اصلاح کے حامی سیکڑوں افراد کو قید و بند کی جبکہ متعدد کو موت کی سزا سنائی۔ پاسداران انقلاب اور انصار حزب اللہ نے اصلاح پسندوں کی سیاسی سرگرمیوں ، خصوصاً ان کے اجتماعات اور احتجاجی مظاہرہ کو کچلنے کے لیے قوت و طاقت بھی استعمال کی۔ شورای نگہبان نے ۱۹۹۲ء اور پھر ۱۹۹۶ء کے انتخابات کے مواقع پر اصلاح پسندوں کو حتی الامکان مجلس (پارلیمان) سے باہر رکھنے کی حکمت عملی اپنائی۔ اس نے انتخابات کی نگرانی، خصوصاً مجلس کی رکنیت کے امیدواروں کی اہلیت کے شرائط و اوصاف کی جانچ پڑتال سے متعلق اپنے اختیارات (حق نظارتِ استصوابی) کو بروئے کار لاتے ہوئے سیکڑوں کی تعداد میں اصلاح کے حامی امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیئے۔ ۱۹۹۶ء کے انتخابات میں شورای نگہبان نے، جس کی صدارت آیت اللہ احمد جنتی کے پاس تھی، ۳۹۸ امیدواروں کو پہلوی دور سے وابستگی، منشیات کے استعمال اور اسلام سے غیر متزلزل وابستگی نہ رکھنے کے شبہ میں نا اہل قرار دے دیا۔ ۱۹۹۷ء کے صدارتی انتخابات کے موقع پر ۲۳۸ امیدواروں میں سے چار کے سوا باقی سب کو نااہل قرار دیا گیا ("Iran in Crisis?"، ص۱۲۶؛ A.William Sami: "Iran's Guardians as an Obstacle to Democracy"، در The Middle East Journal، ۵۵:۴ (۲۰۰۱ء)، ص ۶۴۵-۶۴۸، ۶۵۱-۶۵۳)۔

انتخابات ۱۹۹۷ء، اصلاح پسندوں کی کامیابی: عدلیہ ، پاسداران انقلاب اور شورای نگہبان کی ان تدابیر اور اقدامات کے باوجود مئی ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں اصلاح پسند دانش ور سید محمد خاتمی بطور صدر منتخب ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ آیت اللہ علی المنتظری کی رائے میں فروری ۱۹۷۹ء کے بعد ایران میں یہ ایک دوسرا انقلاب تھا۔ نو منتخب صدر سید محمد خاتمی متوسط درجے کے عالم دین اور ایران کی دو ممتاز جامعات، جامعہ تہران اور جامعہ اصفہان سے سند یافتہ تھے۔ وہ آیت اللہ خمینی کے دور میں وزیر ثقافت و ارشاد اسلامی مقرر ہوے اور پھر عرصہ دس سال تک اس منصب پر فائز رہے۔ تاآنکہ وہ اپنے اصلاح پسند خیالات کی بنا پر قدامت پسندوں کے نقد و احتساب کا ہدف بنے اور ۱۹۹۲ء میں وزارت کے عہدے سے مستعفی ہونے پر مجبور ہوے۔ سید محمد خاتمی نے بھی اپنے پیش رو ہاشمی رفسنجانی کی طرح صدور انقلاب اور استعمار و مغرب دشمن سیاست کے بجائے داخلی، اصلاح، اقتصادی و انسانی وسائل کی ترقی اور بے روزگاری کے خاتمے پر توجہ مرکوز رکھی۔ انہوں نے بھی خارجہ پالیسی کو انقلابی آئیڈیالوجی (نظریۂ حیات) کے تابع رکھنے کے بجاے اسے ملکی و قومی مفادات کے تابع رکھنے کی حکمت عملی اپنائی ۔ انہوں نے برملا طور پر مغربی دنیا بالخصوص امریکہ سے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے مکالمہ و مذاکرات کا عندیہ ظاہر کیا (ملاحظہ ہو: سید محمد خاتمی: Islam, Dialogue and Civil Society، نئی دہلی: جواہر لال یونیورسٹی، ۲۰۰۳ء ، ص ۱-۱۴)۔

سید محمد خاتمی ملکی معیشت کی بحالی و ترقی کے لیے مغربی ممالک سے صنعت و تجارت کے شعبوں میں تعلقات کے دائرے کو ترقی دینا چاہتے تھے۔ ملکی وسائل معیشت خصوصاً تیل اور گیس کے شعبوں کو ترقی دینے کے لیے مغربی ممالک سے سرمایہ کاری اور ٹیکنالوجی کی منتقلی کے حامی و خواہش مند تھے۔ چنانچہ وہ ان ممالک سے کشیدگی و محاذ آرائی کو ملکی مفادات کے لیے مناسب خیال نہ کرتے تھے۔ سید محمد خاتمی ہمسایہ عرب و غیر عرب مسلم ممالک سے بھی بہتر تعلقات کے لیے کوشاں رہے۔ اس نے متحدہ عرب امارات کے ساتھ سرحدی تنازعات کا مذاکرات کے ذریعے حل تلاش کرنے کے عزم کا اعلان کیا۔ انہوں نے ایرانی حدود میں ترک فوج کی مداخلت اور ۱۹۹۸ء میں

طالبان کے ہاتھوں مزار شریف پر قبضہ کے دوران میں ۱۰ ایرانی سفارت کاروں کے قتل کے واقعہ پر تحمل و برداشت کا مظاہرہ کیا۔دسمبر ۱۹۹۷ء میں تنظیم اسلامی کی کانفرنس (او۔آئی۔سی) کی صدارت ایران کے حصے میں آئی۔ صدر سید محمد خاتمی نے اس تنظیم کے رکن ممالک کے مابین تنازعات کو پر امن مذاکرات کے ذریعے حل کرنے پر زور دیا۔ ۱۹۹۸ء میں سعودی فرمانروا شاہ فہد (م ۲۰۰۶ء) کی طرف سے ایرانی صدر اور مذہبی قیادت کو سعودی عرب کے سرکاری دورہ کی دعوت پر ایرانی حکومت کی طرف سے سابق صدر ہاشمی فسنجانی نے سعودی عرب کا دورہ کیا (مارچ ۱۹۹۸ء) اور شاہ فہد سمیت سعودی قیادت سے ملاقات کی۔ جس کے بعد ایران اور سعودی عرب کے درمیان منشیات کی روک تھام کے لیے مشترکہ طور پر سرحدوں کی نگرانی اور "دھشت گردی" کے خاتمہ کے لیے مشترکہ کوششوں کی غرض سے دو طرفہ معاہدہ طے پایا (اپریل ۱۹۹۸ء) (The New Politics of Islam، ص۷۱-۷۲،۷۸)۔ ۱۹۹۷-۱۹۹۸ء میں تیل کی قیمتوں میں کمی کے بعد ایران اور سعودی عرب کے مابین تزویراتی امور پر تعاون کا آغاز ہوا۔ اقتصادی مفادات نے دونوں ممالک کو ایک دوسرے سے قریب کردیا۔ سعودی عرب، جس نے ۱۹۸۵-۱۹۸۶ء کے دوران میں، ایران کی معیشت کو گزند پہنچانے کی غرض سے تیل کی پیداوار میں انتہائی اضافہ کرکے عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں میں کمی کرادی تھی، ایران کی درخواست پر ۱۹۹۸ء میں تیل کی پیداوار میں تین لاکھ بیرل یومیہ کے حساب سے کمی کردی۔ سعودی عرب قیادت نے مسجد نبوی کے شیعہ مخالف امام شیخ علی عبدالرحمٰن الحذیفی کو معطل کردیا (The New Politics of Islam،ص ۷۱-۷۲،۷۸-۷۹)۔ صدر محمد خاتمی کی حکومت نے فلسطین اور اسرائیل کے بارے میں سابق (انقلابی) دور کی پالیسی پر نظرثانی کرتے ہوئے فلسطین میں دو ریاستوں ، مسلم فلسطین اور اسرائیل کے قیام و وجود کی حمایت کی۔ سید محمد خاتمی کی حکومت نے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ میں پیش آنے والے واقعات کی پر زور مذمت کی اور طالبان کی حکومت کے خلاف جنگ میں امریکہ سے تعاون کیا۔ جس سے دونوں ملکوں کے مابین مفاہمت اور قریبی تعلقات کے امکانات بڑھ گئے۔ یورپی ممالک سے بہتر تعلقات کے لیے سید محمد خاتمی کی خارجہ پالیسی کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ جس کا واضح اظہار جون ۲۰۰۲ء میں یورپی پارلیمان کی طرف سے ایران کے ساتھ دو طرفہ تعلقات کے قیام کے حق میں ووٹ کی صورت میں ہوا ("The Landscape of Factional Politics"، ص ۶۹-۷۳)۔

سید محمد خاتمی اسلامی جمہوریہ کی ہیئت ترکیبی میں بتدریج تغیر و اصلاح کے حامی تھے۔ وہ بعض دستوری ترامیم اور قانون سازی کے ذریعے سے کلیدی اہمیت کے ریاستی اداروں پر سے علما کی بالادستی ختم کر کے انہیں جمہور کا نمائندہ بنانا چاہتے تھے۔ تاہم مجلس کہ جس پر قدامت پسندوں کو غلبہ حاصل تھا، ان کی راہ میں مزاحم ہوئی۔ چنانچہ صدر خاتمی کی حکومت کی طرف سے سیاسی و سماجی اور اقتصادی دائروں میں اصلاح کی غرض سے مجلس کو منظوری کی غرض سے پیش کی گئی دستوری ترامیم اور قانونی بل منظوری حاصل نہ کر سکے۔ مجلس کے قدامت پسند ارکان نے انہیں خلاف شریعت و خلاف آئین قرار دے کر مسترد کر دیا۔ شورای نگہبان نے دوسرے محاذوں پر بھی اصلاح پسندوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔ اس نے اکتوبر ۱۹۹۸ء میں شورای خبر گان کے انتخاب کے موقع پر ۳۹۶ امیدواروں میں سے ۲۲۹ کو نا اہل قرار دے دیا، جس کا مقصد ان ناپسندیدہ عناصر کو اس ادارے سے باہر رکھنا تھا ("Iran in Crisis?"، ص۱۲۶-۱۲۸؛ "Iran's Guardians as an Obstacle to Democracy"،ص ۶۴۵-۶۴۸)۔ سید محمد خاتمی ہیئت مقتدرہ سے کھلم کھلا تصادم سے ہر ممکن طور

پر بجنا چاہتے تھے۔ تاہم تحریک اصلاح میں شامل ایرانی معاشرے کے مختلف طبقات خصوصاً خواتین اور نوجوان نسل کو ، جو فوری اور مؤثر تبدیلی و اصلاح کے متمنی تھے، نظام میں اصلاح و تبدیلی کے باب میں کوئی مؤثر اور ٹھوس پیش رفت نہ ہونے پر مایوسی ہوئی۔ انہوں نے اسے سید محمد خاتمی کی ناکامی سے تعبیر کیا اور ان پر دباؤ بڑھانے کے لیے احتجاج پر اتر آئے۔ اصلاح کے حامیوں نے، جن میں طلباء پیش پیش تھے، جولائی ۱۹۹۹ء کے دوران ملک کے تمام بڑے شہروں میں احتجاجی مظاہرے اور ہنگامے کئے۔ پاسداران انقلاب اور عدلیہ نے صورت حال پر قابو پانے کے لئے اصلاح پسند سیاسی جماعت اسلامک پارٹیسی پیشن فرنٹ (Islamic Participation Front) اور طلبہ کی تنظیم 'دفتر تحکیم وحدت' کے بہت سے قائدین کو پابند سلاسل کر دیا۔ عدلیہ اور پاسداران انقلاب کی طرف سے اصلاح کے حامی دانش وروں اور لبرل و آزاد خیال اخبارات کے خلاف کارروائیوں کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا (?Iran in Crisis، ص ۱۷۰-۱۷۲؛ "Iran at Crossroads"، ص۴۷-۴۸)۔ گو کہ شورای نگہبان نے منتخب اداروں سے اصلاح پسندوں کو باہر رکھنے کے لیے اپنے صوابدیدی اختیار (حق نظارت استصوابی) کو ایک مؤثر حربے کے طور پر استعمال کیا تاہم اس کے باوجود سال ۲۰۰۰ء میں منعقدہ چھٹی مجلس کے انتخابات کے علاوہ اسی سال منعقدہ بلدیاتی و مقامی حکومتوں کے انتخابات میں بھی اصلاح پسندوں کو بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل ہوئی۔ چھٹی مجلس کے انتخابات کے موقع پر شورای نگہبان نے سیکڑوں (۴۰۱) امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کیے جن میں چالیس ایسے بھی تھے جو گزشتہ (پانچویں) مجلس کے رکن رہ چکے تھے۔ ۲۰۰۱ء کے صدارتی انتخابات میں سید محمد خاتمی ایک بار پھر بطور صدر منتخب ہوئے ("Iran at Crossroads"، ص ۴۵ ؛ "The Landscape of Factional Politics"، ص۵۸-۵۹)۔

اصلاح پسندوں کی پے درپے کامیابیوں کے سبب اسلامی انقلاب کے محافظ ادارے پہلے سے بھی کہیں زیادہ شدو مد سے نظام میں اصلاح و ترمیم کی کوشش میں مزاحم ہوے۔ چنانچہ صدر سید محمد خاتمی کے دوسرے دور صدارت میں مجلس کی اکثریت رائے سے منظورہ کردہ بعض دستوری ترامیم اور قانون بلوں، جن کا مقصد منتخب صدر کے اختیارات میں اضافہ جبکہ عدلیہ اور شورای نگہبان کے اختیارات کی مؤثر طور پر تحدید تھا، کو اپنا حق استرداد استعمال کرتے ہوے مسترد کر دیا۔ شورای نگہبان نے اس دستوری ترامیم اور قانونی بلوں کو خلاف شریعت و آئین قرار دیا۔ ("Iran at Crossroads"، ص۵۴ ؛ Iran in Crisis، ص ۱۲۵-۱۲۷)۔

تحریک اصلاح کی ماہیئت میں تبدیلی: قدامت علماء و مجتہدین کی طرف سے سید محمد خاتمی کی مجوزہ اصلاحات کی شدید مزاحمت و مخالفت کے بعد خود تحریک اصلاح میں ایک بڑی جوہری تبدیلی رونما ہوئی۔ اس پر اعتدال پسند نیز تدریج اور حزم و احتیاط کے اصول کے حامی بزرگ دانش وروں کے بجاے پر جوش نوجوان سیاست دانوں اور جری و نڈر طلبہ کی گرفت قائم ہوگئی۔ نئی قیادت نظام کے اندر رہتے ہوے قانون سازی اور دستوری اصلاحات و ترامیم کے ذریعے اصلاح و تبدیلی کے بجائے فوری و ہمہ جہت اصلاحات کی علمبردار ہے۔ اس نے قدامت پسندوں پر دباؤ بڑھانے کے لئے سیاسی احتجاج اور ہنگامہ آرائی کی روش اختیار کی، جس کا واضح اظہار جولائی ۱۹۹۹ء اور پھر نومبر ۲۰۰۲ء میں ملک کے تقریباً بڑے شہروں میں احتجاجی مظاہروں اور ہنگاموں کی صورت میں ہوا۔ ("?Iran in Crisis"، ص۱۷۱؛ "Iran at Crossroads"، ص، ۴۷-۴۸)۔ نئی اصلاح پسند قیادت تو گزشتہ سالوں سے اسلامی جمہوریہ کی نظریاتی اساس (تصور ولایت فقیہ) کو شدت سے چیلنج کرنے لگی ہے۔

عدلیہ اور پاسداران انقلاب کی طرف سے اصلاح کے حامی اخبارات و جرائد کی اشاعت اور سیاسی اجتماعات پر پابندیوں کے سبب، انٹرنیٹ اصلاح پسند نوجوان نسل کے مابین رابطہ کا مؤثر ترین ذریعہ بن گیا ہے۔ انٹرنیٹ اصلاح کے حامی دانش وروں اور سیاسی قائدین کے افکار و خیالات کی تشہیر کا بھی ایک ذریعہ بنا ہے۔ جو کردار ۱۹۷۸-۱۹۷۹ء کی انقلابی تحریک کے دوران آیت اللہ خمینی کے بیانات و خطبات وتقاریر پر مشتمل سمعی کیسٹوں نے ادا کیا تھا، موجودہ تحریک اصلاح میں بعینہ وہی کردار انٹرنیٹ نے سنبھال لیا ہے ("Iran at Crossroads"، ص۵۰؛ Iran in Crisis، ص۱۷۲-۱۷۵)۔

تحریک اصلاح کو گزشتہ چند سالوں میں مزید ممتاز علماء ومجتہدین کی حمایت بھی حاصل ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں آیت اللہ جلال الدین طاہری، جو آیت اللہ خمینی کے دور سے اسلامی جمہوریہ کی ہیئت مقتدرہ کا حصہ رہے ہیں، بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے جولائی ۲۰۰۲ء میں اصفہان کے امام جمعہ کے منصب سے استعفا پیش کر کے اور تحریک اصلاح کی حمایت میں آواز بلند کر کے ملکی سیاست میں شدید ارتعاش پیداکر دیا ("Iran at Crossroads"، ص۴۷)۔ افغانستان پر امریکی تسلط کے بعد جولائی ۲۰۰۲ء میں امریکی صدر جارج ڈبلیو بش اور ان کی انتظامیہ کے اہل کاروں کی طرف سے ایران کو بدی کے محور کا حصہ قرار دینے، جمہوریت و اصلاح کے حامی سیاسی گروہوں کی سرپرستی و حمایت کے اعلانات نیز ایرانی عوام کو موجودہ نظام کی لپیٹ دینے کی تحریک و ترغیب ، خصوصاً ایران کے ایٹمی پروگرام کو ختم کرانے اور اس پر اقتصادی پابندیاں لگوانے کی کوششوں کے بعد تحریک اصلاح کی قوت و طاقت میں اضافہ متوقع تھا۔ دریں صورت محافظ کاروں کا تحریک اصلاح کے بارے میں رویہ مزید سخت ہو گیا۔ انہوں نے اصلاح پسندوں کو امریکہ کا گماشتہ قرار دے کر ان کے خلاف کاروائیوں کا سلسلہ تیز کر دیا۔ ("Iran at Crossroads"، ص۵۴؛ Iran in Crisis، ص۱۲۵-۱۲۷)۔

محمد احمدی نژاد کا بطور صدر انتخاب: امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کی افواج کے عراق پر قبضہ اور پھر اس کے شہر نجف میں ممتاز شیعہ رہنما مقتدیٰ صدر کے حامیوں سے جنگ سے ایران کے مذہبی طبقے کو تقویت، جبکہ تحریک اصلاح کو ضعف پہنچا۔ اس کا واضح اظہار ۲۰۰۵ء کے صدارتی انتخابات میں آیت اللہ خمینی کے وفادار اور ان کے افکار و خیالات کے کٹر حامی محمد احمدی نژاد "سابق میئر تہران" کی کامیابی کی صورت میں ہوا ہے۔

انقلابی ایران کی خارجہ پالیسی: ایران کا اسلامی انقلاب ایک اعتبار سے محمد رضا شاہ پہلوی کی خارجہ پالیسی یا یوں کہیے کہ اس ملک کے داخلی سیاسی و اقتصادی اور دفاعی و خارجی معاملات میں غیر ملکی طاقتوں خصوصاً امریکہ ، اسرائیل اور برطانیہ کی حد سے بڑھی ہوئی مداخلت کے خلاف ایک ردّ عمل بھی تھا۔ آیت اللہ خمینی پہلوی بادشاہت کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ ملک و معاشرہ میں سے مغربی طاقتوں کے اثر و نفوذ اور مغربی تہذیب و معاشرت کے آثار و علامات کا بھی قلع قمع کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ چنانچہ اسلامی انقلاب سے اس ملک کی خارجہ پالیسی بھی گہرے طور سے تبدیل ہوئی۔ امریکہ، اسرائیل اور بعض دوسری مغربی طاقتوں سے مخاصمت و دشمنی اور محاذ آرائی انقلابی حکومت کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم اور بنیادی عنصر بن گئی۔ انقلابی حکومت نے امریکہ کے ساتھ طے پانے والے سابق دور کے بہت سے معاہدوں، خصوصاً فوجی و دفاعی اور تجارتی و ثقافتی معاہدوں کو منسوخ کر دیا۔ سوویت یونین کے خلاف امریکہ کی قیادت و سرپرستی میں قائم دفاعی اتحاد سینٹو

(CENTO) سے علیحدگی اختیار کر لی اور سوویت سرحد پر ایرانی حدود میں جاسوسی کی غرض سے قائم امریکہ کی چوکیاں اور تنصیبات ختم کر دیں۔ امریکہ کے ساتھ تعلقات کو انتہائی حد تک محدود کرنے کے علاوہ اس نے جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت اور اسرائیل سے سفارتی و اقتصادی تعلقات منقطع کر لیے۔ اس نے تہران میں موجود اسرائیلی سفارت خانے کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ آیت اللہ خمینی نے اسرائیلی ریاست کو "سرطان" سے تشبیہ دی اور اس کے وجود کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے خطرناک قرار دیا۔ انقلابی حکومت نے اسرائیل کے مقابلے میں فلسطینیوں کے ساتھ اظہار یک جہتی کیا اور تنظیم آزادی فلسطین (PLO) کو فلسطینی مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی تنظیم کے بطور تسلیم کر کے اسے تہران میں اپنا سفارت خانہ جب کہ صوبہ خوزستان میں ایک مرکز اطلاعات قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ فلسطینی رہنما یاسر عرفات (م:۲۰۰۴ء) پہلی اہم غیر ملکی شخصیت تھی جس نے اسلامی انقلاب کے ایک ہفتہ بعد تہران کا دورہ کیا تھا۔ ایران میں آیت اللہ خمینی کے حکم پر فلسطینی مسلمانوں سے اظہار یک جہتی کے طور پر ۱۷ اگست ۱۹۷۹ء کو 'یوم القدس' منایا گیا۔ ہر سال ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں ملک بھر میں فلسطینیوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کے طور پر یوم القدس منایا جانے لگا۔ آیت اللہ خمینی نے غیر جانبداریت کے اصول کو اپنی خارجہ پالیسی کا بنیادی ستون قرار دیا۔ تاہم مغرب کے مقابلے میں سوویت یونین کے ساتھ اسلامی حکومت کا رویہ تحمل و برداشت کا رہا۔ چنانچہ امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل کے ساتھ ایران کے تعلقات سخت کشیدہ ہو گئے۔ ان جملہ ممالک کی حکومتوں کا ایران کی اسلامی حکومت کے بارے میں رویہ سخت مخالفانہ و معاندانہ ہو گیا (Fred Halliday: "Iranian Foreign Policy Since 1979"، ص ۸۹-۹۱،۱۰۱-۱۰۴؛ "Israel and Iran's National Security"، ص ۵-۶)۔

ایران میں اسلامی انقلاب سے اگرچہ متعدد ممالک، خصوصاً امریکہ اسرائیل اور برطانیہ و فرانس وغیرہ کے مفادات کو نقصان پہنچا تھا تاہم امریکہ اس سے وسیع و عمیق طور پر متاثر ہوا تھا۔ اسلامی انقلاب نے نہ صرف اس خطے میں امریکہ کی تزویراتی حیثیت کو بلکہ اس کی بین الاقوامی ساکھ اور رعب و داب کو بھی نقصان پہنچایا۔ مزید براں ایرانی معیشت و تجارت اور اس کے قدرتی وسائل پر امریکہ کو جو غلبہ اور دسترس حاصل تھی، اس کا خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ ایران کے اسلامی انقلاب نے امریکی حکمرانوں اور پالیسی سازوں کو ایک طرح کی ہیجانی کیفیت میں مبتلا کر کے رکھ دیا (Gary Sick: *All Fall Down*، ص ۷-۸،۴۰، ۶۲، ۷۵،۱۵۷، ۱۶۸)۔ فلسطینی نژاد امریکی دانش ور ایڈورڈ سعید (م:۲۰۰۳ء) کے بقول امریکہ کو ایران میں اسلامی انقلابی حکومت کے قیام خصوصاً انقلابی قیادت کی طرف سے مغربی طرز زندگی، تہذیبی اقدار اور طرز سیاست و حکومت کے شدت و قوت سے استرداد نیز اسلام سے غیر متزلزل وابستگی کے اظہار و اعلان سے شدید ذہنی صدمہ لاحق ہوا تھا۔ آیت اللہ خمینی کی طرف سے تیسری دنیا اور خصوصاً مشرق وسطی کے بارے میں امریکی پالیسیوں کو چیلنج کرنا بھی امریکی مقتدر حلقوں کے لیے ناقابل برداشت تھا" (ایڈورڈ سعید: *Covering Islam*، لندن: ونٹیج، ۱۹۹۷ء ص ۳۰-۳۱،۸۴)۔ چنانچہ اس نے روز اول سے انقلابی حکومت کا تختہ الٹنے اور اس کو غیر مستحکم کرنے کی روش اختیار کر لی۔ امریکی دانش وروں (مستشرقین) اور ذرائع ابلاغ نے آیت اللہ خمینی اور ان کے حامی علماء و مجتہدین کی خوب تنقیص و تحقیر کی اور انہیں ناشائستہ و غیر مہذب القابات سے پکارا۔ آیت اللہ خمینی کو ہٹلر سے تشبیہ دی گئی۔ اسے ہٹلر کی طرح طالع آزما، ظالم و مستبد اور عالمی امن

کے لیے خطر ناک، جبکہ ان کے تصور اسلامی حکومت (حکومت الٰہیہ / تصور ولایت فقیہ) کو ہٹلر کے سیاسی نظریہ (Mein Kampf) کے مماثل قرار دیا گیا۔ امریکی دانش وروں اور ذرائع ابلاغ نے ایران کی انقلابی قیادت کے ساتھ ساتھ خود دین اسلام کو بھی ہدف تنقید و ملامت بنا لیا اور امریکی و مغربی عوام کے سامنے اس کی ایک انتہائی مسخ شدہ اور مکروہ صورت بنا کر پیش کی۔ اس چیز نے ایران کے اسلامی انقلاب اور خود اسلام کے بارے میں امریکی قوم کے احساس و شعور پر گہرے منفی اثرات مرتب کیے۔ اسلام اور ایران دشمنی تو امریکیوں کے تحت الشعور میں رچ بس گئی۔ چنانچہ آج (۲۰۰۶ء) میں اسلامی انقلاب کے صدور کو ربع صدی سے سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود اسلامی ایران کے بارے میں امریکی حکمرانوں اور عوام کے معاندانہ رویے میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی (Covering Islam، ص ۴۳-۴۴-۱۲۲؛ Robin Woodworth Carlsen: Crisis in Iran، وکٹوریا، دی سنومین پریس، ۱۹۷۹ء، ص ۹-۱۵، ۲۰-۲۵، ۲۹-۳۰؛ George Capozi Jr.: Ayatollah Khomeini's Mein Kampf: Islamic Government by Ayatollah Khomeini، نیویارک Manor Books، ۱۹۷۹ء، ص ۱۲۲-۱۲۵).

ایران عراق جنگ ،امریکہ اور اسرائیل کا کردار: عراق کے صدر صدام حسین نے کچھ اپنے مفادات کے تحت اور کچھ امریکہ کی شہ پر ایران کے خلاف جنگ کا آغاز کیا تھا۔ تاہم جس وقت جنگ کا آغاز ہوا اس وقت امریکہ کو اپنے یرغمال شہریوں کی رہائی کا چیلنج درپیش تھا۔ چنانچہ صدر کارٹر نے بظاہر دونوں ممالک کے مابین جنگ میں غیر جانبداری کی حکمت عملی اختیار کی، کیونکہ برملا طور پر عراق کی حمایت کی صورت میں اسے یرغمالیوں کی رہائی کے معاملہ کے پیچیدہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ صدر کارٹر نے خلیج فارس کو محفوظ رکھنے کے لیے براہ راست فوجی مداخلت سے بھی گریز کیا تھا۔ البتہ اس نے سعودی عرب کو اس کی درخواست پر ایران کی طرف سے کسی ممکنہ حملے سے بچاؤ کی خاطر فضائی نگرانی کا نظام، 'اواکس' (AWACS) فروخت کیا تھا۔ صدر رونالڈ ریگن نے نہ صرف یہ کہ ایران کو فوجی سازوسامان کی فروخت پر سخت پابندیاں لگا دیں، بلکہ اس نے یورپی ممالک کو ایران کی انقلابی حکومت کے ہاتھوں اسلحہ کی فروخت سے باز رکھنے کی بھی کوشش کی۔ امریکہ کی طرف سے اسلحہ کی فراہمی سے انکار کے بعد ایران نے اپنی فوجی ضروریات پورا کرنے کی غرض سے اسرائیل، شام، لیبیا، شمالی کوریا، سوویت یونین اور مشرقی و مغربی یورپ کے ممالک کی طرف رجوع کیا (M.S.El-Azhary: "The Attitude of the Super Powers towards the Gulf-War، در The Iran-Iraq War، ص ۹۳-۹۶؛ Stephen Green: Living by the Sword: Israel in the Middle East 1968-1972، لنڈن و بوسٹن: فیبر اینڈ فیبر، ۱۹۸۸ء، ص۲۰۵).

جنگ کے ابتدائی سالوں میں امریکہ ایران کے مقابلے میں عراق کی مدد کرتا رہا۔ خصوصاً ۱۹۸۱ء میں لبنان میں آیت اللہ خمینی کے انقلابی نظریات کے پیرو شیعہ عسکری گروہوں حزب اللہ اور اسلامی اَمل ملیشیا کی طرف سے بیروت میں امریکی سفارت خانے کو جلا کر خاکستر کرنے اور وہاں قیام امن پر مامور امریکی و فرانسیسی فوجیوں کی بیرکوں کو بم دھماکوں سے اڑائے جانے کے بعد امریکہ کی طرف سے عراق کی حمایت اور اسے اسلحہ کی فراہمی میں اضافہ ہوگیا۔ ۱۹۸۱ء میں اسلامی انقلاب کی حامی لبنانی شیعہ عسکری تنظیم حزب اللہ نے بیروت میں موجود چند سو امریکی شہریوں کو جن میں سی آئی اے کے اہلکار، جو سفارت کاروں کے بھیس میں وہاں تعینات تھے بھی شامل تھے، اغوا کر کے یرغمال بنا لیا۔ صدر ریگن کی انتظامیہ نے امریکی شہریوں کی رہائی کے لیے ایران کی اسلامی حکومت سے، جس

کے لبنان کی عسکری اسلامی تنظیموں حزب اللہ اور اسلامی امل ملیشیا سے گہرے روابط تھے، تعاون کی درخواست کی اور اس کے بدلے اسے اسلحہ کی فراہمی کی پیش کش کی تھی۔ امریکی یرغمالیوں کی بحفاظت رہائی کے بدلے ریگن انتظامیہ نے خفیہ طور پر اسرائیل کی وساطت سے ایران کو اسلحہ فراہم کرنا شروع کیا۔ جس کا سلسلہ بیروت میں امریکی یرغمالیوں کی رہائی کے بعد بھی جاری رہا۔ ۱۹۸۵-۱۹۸۶ء کے دوران میں امریکہ نے کثیر مقدار میں اسلحہ اسرائیل کے توسط سے ایران کو فروخت کیا۔ ریگن انتظامیہ ایران کو اسلحہ کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی سے وسطی امریکہ میں کنٹرااس (Contras) باغیوں کو امداد پہنچاتی رہی۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء میں مغربی ذرائع ابلاغ نے اس کارروائی کی تفصیلات شائع کیں۔ اس کارروائی کو ایران گیٹ اسکینڈل کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ اس واقعے سے صدر ریگن کی انتظامیہ کو شدید دھچکا لگا۔ چنانچہ اس نے ایران کو اسلحہ کی فراہمی کا سلسلہ ختم کر دیا، جبکہ عراق کو اسلحہ کی فراہمی کا دائرہ وسیع کر دیا۔ ایران کی اسلامی انقلابی حکومت کو جو بظاہر امریکہ سے کسی بھی قسم کی مفاہمت اور اقتصادی و تجارتی اور قومی روابط کے قیام کے خلاف تھی، اندرون ملک سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا (Oliver Trager: The Iran Contra Arms Scandal: Foreign Policy Disaster، نیویارک: فیکٹس آف فائل پبلی کیشنز ۱۹۸۸ء ص ۲ وبعد؛ Jihad of Political Islam: The Trial، ص ۱۳۰؛ Iranian Foreign Policy Since 1979، ص ۹۸؛ Israel and Iran's National Security، ص ۹-۱۰؛ Living by the Sword، ص ۲۱۴-۲۱۸؛ Islam and the Post-Revolutionary State in Iran، ص ۱۳۶-۱۳۸؛ ۹۵-۹۹ ؛ ۱۰۱-۱۰۲)۔

اسرائیل اگرچہ اسلامی انقلابی حکومت کے قیام و استحکام خصوصاً اس کے ہاتھوں تہران میں قائم اسرائیل کے غیر سرکاری سفارت خانے کے خاتمے اور فلسطینیوں کی حمایت سے سخت ناخوش تھا۔ تاہم وہ عراق کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت اور اس کے نیو کلیائی پروگرام کو بھی اپنے وجود کے لیے خطرہ گردانتا تھا اور اس کی تباہی چاہتا تھا۔ ایران کے ساتھ عراق کی جنگ کی بدولت اسے مؤخرالذکر پر کاری ضرب لگانے کا بہترین موقع میسر آ گیا۔ بنا بریں اس نے ایران کی اسلامی حکومت کو اسلحہ کی فراہمی و فروخت میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ جنگ کے ابتدائی مہینوں ہی سے اسلحہ کی فراہمی کے سلسلہ میں ایران کا زیادہ تر انحصار اسرائیل پر رہا۔ اس دوران میں اسرائیلی مشیروں نے ایران کی دفاعی ضروریات کا جائزہ لینے کے لیے تہران اور محاذ جنگ کا دورہ بھی کیا۔ عراق کے ساتھ جنگ کے تمام تر دور میں اسرائیل ایران کو سب سے زیادہ اسلحہ فروخت کرنے والا ملک بن گیا ("Israel and Iran's National Security"، ص ۷-۸)۔ ایران اور اسرائیل نے اسلحہ کے لین دین کو بڑی چابک دستی اور کامیابی سے خفیہ رکھا۔ اسرائیل سے یہ اسلحہ عموماً مال و مسافر بردار طیاروں کے ذریعے براستہ پرتگال، فرانس، ارجنٹائن، یونان ،شام اور قبرص ایران کو پہنچایا جاتا رہا۔ تاہم جون، جولائی ۱۹۸۱ء میں یکے بعد دیگرے دو ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی بدولت ایران کی اسلامی انقلابی حکومت اور اسرائیل کے مابین قریبی فوجی روابط کا راز افشا ہوگیا۔ اسرائیل نے جون ۱۹۸۱ء میں عراق کی نیوکلیائی تنصیبات پر حملہ کر کے انہیں مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ ایران نے اس منصوبے پر عمل درآمد کے سلسلہ میں اسرائیل سے تعاون کیا۔ اسے ضروری معلومات اور نقشے فراہم کیے۔ عراق پر اسرائیل کے حملے کے بعد پہلی بار مغربی ذرائع ابلاغ نے اسرائیل اور انقلابی ایران کے مابین فوجی تعاون کا انکشاف کیا۔ جولائی ۱۹۸۱ء میں ارجنٹائن کے ایک مال بردار طیارے کے، جو تہران میں اسرائیلی اسلحہ اتار کر واپس جا رہا تھا ، ترک سوویت یونین کی سرحد

کے قریب سوویت حدود میں داخل ہونے پر مار گرائے جانے سے یہ معاملہ مزید کھل کر سامنے آ گیا۔ بایں ہمہ ایران اور اسرائیل کے مابین اسلحہ کی خرید و فروخت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ مارچ ۱۹۸۴ء تک ایران نے کم از کم پچاس کروڑ ڈالر مالیت کا اسلحہ اسرائیل سے خریدا ("Israel and Iran's National Security"، ص ۸-۹؛ Living by the Sword: Israel in the Middle East، ص ۱۳۶-۱۳۸).

ایران امریکہ تعلقات مابعد دور میں: ایران نے لبنان میں حزب اللہ کی تحویل میں امریکی یرغمالیوں کی رہائی کے سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا، تاہم امریکہ ایران ہی کو اس واقعہ کا اصل مجرم گردانتا رہا۔ ۱۹۸۸ء کے وسط میں امریکی بحریہ کے دستوں نے خلیج فارس کے علاقے میں ایک ایرانی مسافر بردار طیارے کو مار گرایا جس سے دونوں ملکوں میں سخت کشیدگی پیدا ہوگئی۔ ایرانی قیادت نے ۱۹۹۰ء میں صدام حسین کی طرف سے کویت میں جارحانہ مداخلت کی مذمت کی تھی، تاہم اس نے کویت کو عراقی تسلط سے آزاد کرانے کے لیے امریکہ کی فوجی مداخلت کی بھی مخالفت کی۔ تاہم عراق کے خلاف امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی فوجی کارروائی اور عراق کی جنگی قوت کے تہس نہس کیے جانے پر ایرانی قیادت نے سکھ کا سانس لیا۔ ایرانی قیادت نے امریکہ کی نگرانی و سرپرستی میں اسرائیل اور فلسطینی قیادت کے مابین امن مذاکرات کی شدید مخالفت کی اور اوسلو معاہدہ (۱۹۹۳ء) کو نامنصفانہ قرار دیا (Shahram Chubin: Wither Iran?، ص ۹۹-۱۰۴)۔ ایرانی حکومت کے اس طرز عمل کو صدر کلنٹن کی حکومت نے سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ صدر کلنٹن نے حکومت ایران کی خارجہ پالیسی کو امریکہ کی سلامتی، اس کی معیشت اور خارجہ سیاست کے لیے ایک بڑا خطرہ قرار دیا۔ صدر کلنٹن نے ۱۹۹۶ء میں ایران کے خلاف تجارتی پابندیوں کو مزید سخت کر دیا اور ایک صدارتی حکم (مارچ ۱۹۹۶ء) کے تحت امریکی کمپنیوں کو ایران کے ساتھ تجارت خصوصاً خام تیل کی خریداری سے روک دیا۔ اس سے صرف ایک سال قبل امریکی کمپنیوں نے ایران سے چار ارب ڈالر مالیت کا خام تیل خریدا تھا۔ اس صدارتی حکم کے اجراء و نفاذ پر امریکی تیل کمپنی کونوکو (Conoco) کو ایران کے ساتھ سمندری حدود میں تیل و گیس کے ذخائر کی دریافت اور ان کی ترقی کے لیے طے پانے والے ایک بڑے معاہدہ (۱۹۹۵ء) سے الگ ہونا پڑا۔ یہ وہ پہلی غیر ملکی تیل کمپنی تھی جس کے ساتھ ۱۹۷۹ء میں اسلامی انقلاب کے بعد انقلابی حکومت نے تیل و گیس کے کنوؤں کی تعمیر و ترقی کا معاہدہ کیا تھا۔ صدر کلنٹن کے مذکورہ حکم کے نفاذ کے بعد اگست ۱۹۹۶ء میں امریکی کانگرس نے ایران اور لیبیا کے خلاف اقتصادی و تجارتی پابندیوں کے قانون آئی ایل ایس اے (Iran- Libya Sanctions Act) کی منظوری دی، جس کے تحت امریکی صدر کو ایران اور لیبیا میں سے کسی بھی ملک میں سالانہ بیس ملین ڈالر سے زائد سرمایہ کاری کرنے والی غیر امریکی کمپنیوں پر پابندیاں اور جرمانہ عائد کرنے کا صوابدیدی اختیار حاصل ہوگیا۔ صدر کلنٹن نے ستمبر ۱۹۹۷ء میں ایک نئے صدارتی حکم کے تحت فرانسیسی تیل کمپنیوں کے کنسورشیم ٹوٹل (TOTAL)، جس کے نمائندوں نے ایران سے ڈیڑھ ارب ڈالر مالیت کی معدنی گیس کی خریداری کا سودا کیا تھا، کو بلیک لسٹ کر دیا۔ یورپی ممالک کی طرف سے غیر امریکی کمپنیوں کو مذکورہ امریکی قانون (ILSA) کے دائرہ میں لانے کی مخالفت پر امریکی انتظامیہ نے ان ممالک کی کمپنیوں کو اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا۔ چنانچہ متعدد یورپی ممالک کی کمپنیوں نے ایران کے ساتھ تیل کی صنعت میں سرمایہ کاری کے معاہدے کیے (Roger Howard: Iran in

Crisis، ص ۱۶۰-۱۶۱؛ Emmanuel Karagiannis: "The U.S Iranian Relationship after 11 September and the Transportation of Caspian Energy"، در Central Asian Survey، ۲۲: ۲،۳ (جون - ستمبر ۲۰۰۳ء)، ص ۱۵۱-۱۵۴).

صدر جارج ڈبلیو بش کی انتظامیہ کا ایران کے بارے میں رویہ انتہائی حد تک معاندانہ و جارحانہ رہا ہے۔ صدر جارج بش نے اقتدار سنبھالنے (جنوری ۲۰۰۱ء) کے پہلے ہی سال اگست ۲۰۰۱ء میں نہ صرف ایران کے خلاف اقتصادی و تجارتی پابندیوں کے قانون کی تجدید کر دی، بلکہ اسرائیل کے ساتھ مل کر تجارت کی عالمی تنظیم (WTO) کی رکنیت کے لیے بھی ایران کی کوششوں کی مخالفت کی۔ ایران کی طرف سے خزاں ۲۰۰۱ء میں طالبان اور القاعدہ کے خلاف امریکہ کی جنگ میں تعاون کے باوجود امریکہ نے ایران کو مزعومہ بدی کے محور ممالک کی فہرست میں شامل کر دیا (انوشیروان احتشامی: "Irans International Posture After the Fall of Baghded"، در Middle East Journal، ۵۸: ۲ (بہار ۲۰۰۴ء) ص ۱۸۷-۱۸۹) ان کے نزدیک ایران بین الاقوامی دہشت گردی کی سرپرستی اور وسیع پیانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں خصوصاً میزائلوں اور نیوکلیائی ہتھیاروں کی تیاری جیسی ناپسندیدہ و ناقابل برداشت سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ ایران کے پاس جدید ہتھیاروں کی موجودگی اس کے پڑوسی ممالک خصوصاً امریکہ کے حلیف و اتحادی ملک اسرائیل کے لیے ہی نہیں، بلکہ عالمی امن کے لیے بھی خطرہ ہیں۔ صدر بش اور اس کے حواری اسرائیل کے ساتھ مل کر ایک طرف تو ایران کے نیوکلیائی پروگرام کا مکمل خاتمہ چاہتے ہیں، دوسری طرف وہ اس ملک کی باگ ڈور علماء و مجتہدین سے چھین کر امریکہ و مغرب نواز لادین و ''روشن خیال'' عناصر کے ہاتھوں میں تھما کر ایران میں ''حقیقی جمہوریت'' قائم کرنا چاہتے ہیں (Shahram Chubin: Wither Iran?، ص ۵۱-۵۲، ۷۲-۷۵، ۹۲-۹۶؛ جہانگیر آموزگار: Iran's Crumbling Revolution، در Foreign Affairs، ۸۲:۱ (جنوری - فروری ۲۰۰۳ء)، ص ۴۴-۴۶؛ Roger Howard: Iran in Crisis?، ص ۲۱۸-۲۱۹).

صدر بش اور اس کی انتظامیہ کے ارکان نے متعدد بار ایران کے خلاف فوجی طاقت کے استعمال کا امکان ظاہر کیا ہے۔ امریکہ کی سرگرم حمایت سے حوصلہ پا کر اسرائیل کے حکمرانوں نے بھی متعدد بار ایران کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کرنے کی دھمکی دی ہے۔ گو عراق میں امریکی تسلط کے خلاف جاری مزاحمت پر قابو پانے میں ناکامی، امریکی فوجیوں کی بڑھتی ہوئی ہلاکتوں، خصوصاً عراق میں فوجی مداخلت کے خلاف امریکی رائے عامہ کی بیداری نے امریکی انتظامیہ کے لیے ایران کے خلاف مہم جوئی کی راہ میں قدرے مشکلات کھڑی کر دی ہیں۔ تاہم موجودہ امریکی انتظامیہ میں موجود مہم جُو و جنگجو عناصر کسی بھی قیمت پر براہ راست امریکی فوجی کارروائی کے ذریعے سے یا پھر اسرائیل کے ہاتھوں ایران کے ایٹمی پروگرام کا خاتمہ چاہتے ہیں (Roger Howard: Iran in Crisis?، ص ۹۰-۹۱؛ Fariborz Mokhtari: Iranian Security Perceptions، ص ۲۲۸-۲۲۹).

ایران، سوویت یونین تعلقات: ایران میں اسلامی انقلاب کہ جس کے نتیجے میں امریکہ نواز پہلوی بادشاہت کا خاتمہ ہوا تھا، سوویت یونین نے گہرے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ سوویت یونین کے لیے اپنے پڑوسی ملک میں سے امریکی اثرو نفوذ کا خاتمہ، خطے میں اس کے تزویراتی و عسکری اہداف و مقاصد کی تکمیل کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ سوویت یونین نے اس حقیقت کے باوجود کہ ایران میں مذہب کی بنیاد پر انقلاب اور پھر اسلامی حکومت کا قیام، اس

کے لیے وجہ تشویش تھا، اسلامی حکومت کے ساتھ محتاط انداز میں تعلقات استوار کر لیے۔ اسلامی حکومت کی طرف سے امریکی قیادت میں قائم دفاعی و فوجی اتحاد سینٹو (CENTO) سے نکل جانے اور شاہ دور سے سوویت سرحد پر جاسوسی کے لیے موجود امریکی تنصیبات اور چوکیوں کو ختم کرانے کے بعد سے دونوں ممالک کے مابین بہتر تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ تہران میں انقلابی طلبہ کے امریکی سفارت خانے پر حملہ کے بعد امریکہ کی طرف سے ایران کے خلاف کسی جوابی کاروائی کے امکان کے پیش نظر، سوویت صدر لیونڈ برزنیف (۱۹۶۴-۱۹۸۲ء) نے ۱۹رنومبر ۱۹۷۹ء کو امریکہ کو ایران میں جارحانہ مداخلت اور انقلابی حکومت کا تختہ الٹنے اور اپنی پسند کی حکومت مسلط کرنے سے باز رکھنے کے لیے سخت لفظوں میں تنبیہ کی تھی۔ صدر برزنیف نے اپنے بیان میں صاف طور پر واضح کر دیا کہ ایران میں غیر ملکی (امریکی) مداخلت سوویت یونین کی سلامتی کے لیے خطرہ متصور ہو گی۔ دریں صورت ایران کی انقلابی قیادت کی طرف سے سوویت یونین کے ساتھ سیاسی و سفارتی اور اقتصادی و فوجی روابط کو بہتر بنانے پر خاص توجہ دی گئی (Robert O. Freedman: Moscow and the Middle East: Soviet Policy Since the Invasion of Afghanistan ، کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء، ص۶۸-۶۹،۷۹؛ Muriel Atkin "The Islamic Republic and the Soviet Union"، در Nikki R.Keddie: The Iranian Revolution and the Islamic Republic، ص۱۹۱-۱۹۳؛ Fred Halliday: Islam and the Myth of Confrontation، لنڈن و نیویارک : آئی بی ٹاؤرس، ۲۰۰۳ء، ص۶۶-۶۷؛ "Iranian Foreign Policy Since 1979"، ص ۹۵).

گو کہ ایران کے سوویت یونین کے ساتھ تعلقات میں متعدد حوالوں سے بہتری پیدا ہوئی تاہم بعض مسائل میں دونوں ممالک کے مابین کھچاؤ بھی موجود رہا اور گاہے بگاہے ان کے مابین سخت کشیدگی بھی رونما ہوتی رہی۔ ان کے مابین کشیدگی کا ایک اہم محرک افغانستان میں روس کی جارحانہ مداخلت تھی۔ ایران کی انقلابی قیادت نے دسمبر ۱۹۷۹ء میں افغانستان کی جارحانہ مداخلت کی مذمت کی تھی۔ آیت اللہ خمینی نے سوویت یونین اور افغانستان پر اس کی مسلط کردہ کٹھ پتلی اشتراکی حکومت کے خلاف افغان مزاحمت کو ایران میں پہلوی نظام اور امریکی غلبہ و تسلط کے خلاف عوامی جدو جہد کے مترادف و مماثل قرار دیا۔ بعد کے سالوں میں بھی انقلابی حکومت کی طرف سے افغانستان میں سوویت افواج کی جنگی کارروائیوں کی مذمت و مخالفت کی جاتی رہی۔ انقلابی حکومت نے افغان تحریک مزاحمت کی بھرپور تائید و حمایت کی۔ اس نے شیعہ مزاحمتی عسکری گروہوں کو فراخدلانہ مالی و اسلحی امداد فراہم کی۔ مزید براں لاکھوں کی تعداد میں افغان مہاجرین کو اپنے ملک میں پناہ دی (افغانستان میں سوویت مداخلت کے بعد سے طالبان حکومت کے خاتمہ تک کے دور کی انقلابی حکومت کی افغانستان پالیسی کے بارے میں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مقالہ "افغانستان"، در تکملہ آآ، بذیل مادہ)۔ ایران میں اسلامی حکومت کی طرف سے ۱۹۸۲-۱۹۸۳ء کے دوران میں اسلامی انقلاب کے مخالف عناصر خصوصاً مجاہدین خلق اور سوویت نواز اشتراکی عسکری و سیاسی تنظیموں 'تودہ' اور 'پیکار' اور "فدائیین خلق" کے خلاف کارروائیوں کو سوویت یونین کی طرف سے سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا (Moscow and the Middle East، ص ۱۰، ۶۶-۶۹، ۷۴-۷۶؛ "The Islamic Republic and the Soviet Union"، ص ۱۹۸-۱۹۹، ۲۰۲-۲۰۳)۔ اسلامی حکومت نے انقلاب مخالف سرگرمیو ں کے انسداد و تدارک کے طور پر اشتراکی جماعت تودہ کے ارکان اور حامیوں کی بڑی تعداد کو انتظامی مشینری، فوج اور شعبہ تعلیم سے نکال

باہر کیا۔ ۱۹۸۳ء میں اس نے تودہ پر پابندی لگا کر اس کے ایک ہزار سے زائد ارکان اور تمام اہم رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ تودہ کے سینکڑوں ارکان پر ملک سے غداری اور سوویت یونین کے لیے جاسوسی کے الزام میں مقدمات بھی قائم کیے گئے، جن میں سے درجنوں کو سزائے موت سنائی گئی۔ اسلامی حکومت نے تقریباً ڈیڑھ درجن سوویت سفارت کاروں کو جاسوسی اور ملک کے داخلی امور میں مداخلت کے الزام میں ملک سے نکال دیا (۱۹۸۳ء) جبکہ سوویت صحافیوں کو ویزوں کے اجرا کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ سوویت یونین کا ایران کی نسلی و لسانی اقلیتوں خصوصاً آذربائیجانیوں، کردوں، بلوچوں اور ترکمانو ں کی علاقائی خودمختاری کی تحریکوں کے بارے میں رویہ ہمدردانہ رہا۔ چنانچہ اس کی طرف سے ان اقلیتوں کی در پردہ پشت پناہی کا سلسلہ بھی جاری رہا ("The Islamic Republic and the Soviet Union"، ص ۱۹۸، ۲۰۲-۲۰۳)۔ ایران اور سوویت یونین کے مابین کشیدگی کا ایک بڑا اہم سبب ایران عراق جنگ بھی تھی۔ ایران نے جنگ کے ساتھ ہی امریکہ اور یورپی ممالک کی طرف سے سخت اقتصادی و فوجی پابندیاں عائد کیے جانے پر اسلحہ اور دیگر فوجی ضروریات کے سامان کی خریداری کے لیے سوویت یونین کی طرف رجوع کیا تھا۔ جنگ کے ابتدائی دو سالوں میں سوویت یونین نے دونوں ملکوں سے تعلقات کے ضمن میں کسی حد تک توازن برقرار رکھنے کی پالیسی اپنائے رکھی۔ چنانچہ جب تک عراقی افواج ایرانی حدود میں رہیں۔ سوویت قیادت نے سفارتی سطح پر ایران کی حمایت کے علاوہ عراق کو اسلحہ کی فراہمی کو قدرے محدود کیے رکھا۔ تاہم جولائی ۱۹۸۲ء میں ایرانی افواج کی طرف سے عراقی فوج کو اپنی ملکی سرحدوں سے باہر دھکیلنے اور پھر عراقی علاقوں کی طرف پیش قدمی کرنے پر سوویت یونین کی طرف سے عراق کی حمایت اور اسلحہ کی فراہمی میں اضافہ ہوا۔ جس پر اسلامی حکومت کے ساتھ اس کے تعلقات میں انحطاط رونما ہوا۔ سلامی حکومت نے رد عمل کے طور پر سوویت یونین سے ایران میں موجود اپنے سفارتی عملے کی تعداد میں کمی کا مطالبہ کر دیا ("The Islamic Republic and the Soviet Union"، ص ۲۰۲-۲۰۳؛ "Iranian Foreign Policy Since 1979"، ص ۹۷-۹۸)۔ ایران اور سوویت یونین تعلقات میں اتار چڑھاؤ کے باوجود ان کے مابین اقتصادی و تجارتی روابط میں نمایاں طور پر بہتری رونما ہوئی۔ انقلاب کے بعد ۱۹۸۰ء میں ایران کا سوویت یونین سے تجارتی راہداری کی سہولیات کے لیے ایک معاہدہ طے پایا جس کے سبب سے ۱۹۷۸ء کے مقابلے میں ۱۹۸۱ء میں دونوں ملکوں کے مابین تجارت کا حجم تین گنا بڑھ گیا۔ ایران کی سوویت یونین کے راستہ سے جاپان، مغربی جرمنی اور سوویت بلاک سے منسلک مشرقی یورپ کے اشتراکی ممالک سے تجارت ہونے لگی۔ ۱۹۸۳ء میں دونوں ملکوں کے مابین تجارتی تعلقات عروج پر رہے۔ اس سال ایران کا سوویت یونین سے تجارت کا حجم حالیہ تاریخ میں پہلی بار عراق سوویت یونین کے تجارتی حجم سے بھی بڑھ گیا۔ تاہم یہ حجم جاپان، انڈیا، لیبیا اور ارجنٹائن کے مقابلے میں کم ہی رہا (Moscow and the Middle East، ص۷۹-۸۰، ۱۹۲-۱۹۴؛ "The Islamic Republic and the Soviet Union"، ص، ۱۹۵-۱۹۶).

ایران عراق جنگ کے دوران میں، خطے کے عرب ممالک کا کردار: ایران عراق جنگ کے دوران میں خطے کے عرب ممالک میں سے سعودی عرب ، کویت ، خلیجی امارات اور اردن و مصر کی حکومتوں نے، جو ایران میں اسلامی انقلابی حکومت کے قیام اور اس کی طرف سے صدور انقلاب (برآمد انقلاب) سے لرزہ براندام تھیں، ایران کے مقابلے میں عراق کا بھر پور ساتھ دیا۔ ۱۹۸۱ء میں عراق کی نیو کلیائی تنصیبات پر اسرائیل کے حملے اور پھر ایران و اسرائیل کے درمیان فوجی تعاون کے انکشافات کے

بعد ایران اور اس کے ہمسایہ عرب ممالک کے درمیان فاصلے مزید بڑھ گئے۔ صدام حسین ایران کے مقابلے میں عرب ممالک کی، ماسوائے شام کے، ہمدردی و حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا، جس سے خطے میں ایران کی تنہائی میں اضافہ ہوا۔ ان عرب حکومتوں نے عراق کو خطیر مقدار میں مالی امداد و قرضہ جات فراہم کیے۔ سعودی عرب نے ایران کے خلاف اور عراق کی حمایت میں عرب ممالک کو لاکھڑا کرنے میں قائدانہ کردار ادا کیا (G.H.Jansen: "The Attitude of the Arab Governments Towards the Gulf War"، در M.S.El-Azhary (مدیر): The Iraq-Iran War، ص ۸۳-۸۸؛ "Israel and Iran's National Security"، ص ۸-۱۰).

یورپی یونین: بعداز انقلاب ایران کے یورپی اتحاد کے رکن ممالک سے بھی تعلقات ہموار نہیں رہے، بلکہ پاسداران انقلاب اور وزارت مخابرات کے کارندوں کی طرف سے بعض یورپی ممالک خصوصاً جرمنی و فرانس وغیرہ میں پناہ گزیں سیاسی منحرفین و مخالف انقلاب عناصر کے خلاف کارروائیوں کے سبب کشیدہ ہی رہے۔ ۱۹۹۷ء میں ایک جرمن عدالت نے برلن میں مقیم ایرانی حزب مخالف کے بعض عناصر کی ہلاکت کا ذمہ دار ایرانی حکومت (خصوصاً وزیر مخابرات فلاحیان) کو قرار دیا جس کے بعد متعدد یورپی ممالک نے ایران سے اپنے سفیر واپس بلا لیے۔ صدر خاتمی کی طرف سے فلاحیاں کو اس کے عہدے سے ہٹانے اور پھر ستمبر ۱۹۹۸ء میں سلمان رشدی کے قتل کے بارے میں آیت اللہ خمینی کے فتوے پر عمل درآمد کے معاملہ سے کنارہ کشی و لاتعلقی کے اعلان پر فریقین کے مابین معمول کے تعلقات بحال ہوئے اور مئی ۱۹۹۹ء میں سفیروں کا تبادلہ ہوا۔ سید محمد خاتمی نے ۱۹۹۹-۲۰۰۰ء کے دوران میں یورپی یونین کے چند اہم رکن ممالک اٹلی، فرانس اور جرمنی کے دورے بھی کیے، جس سے ان ممالک سے ایران کے تجارتی و اقتصادی تعلقات کا دائرہ وسیع ہوا اور ایران یورپی یونین کا ایک بڑا اہم تجارتی شریک کار بن گیا (Roger Howard: Iran in Crisis?، ص ۴۵-۴۷؛ Shahram Chubin: Whither Iran?، ص، ۲۰۰۲ء، ۲۴، ۳۱، ۷۱، ۱۳۱-۱۳۳)۔ اگرچہ یورپی ممالک بھی ایران میں نظام کی تبدیلی کے حامی ہیں، مزیدبراں ایران کے نیوکلیائی پروگرام اور جدید ہتھیاروں کی تیاری و حصول کے شدید مخالف ہیں۔ یہ ممالک ایران میں نظام کی تبدیلی یا پھر اس کے نیوکلیائی پروگرام کو ترک و ختم کرانے کے لیے اس کے خلاف بطور تادیبی کارروائی کے اقتصادی و تجارتی پابندیوں کے عائد کیے جانے کے بھی حامی ہیں، البتہ فوجی طاقت کے استعمال کے حق میں نہیں۔ ان ممالک کی حکومتوں کو اندیشہ لاحق ہے کہ ایران میں غیر ملکی فوجی مداخلت سے خطے میں شدید خلفشار برپا ہوگا اور یورپی ممالک کو تیل و گیس کی فراہمی میں رکاوٹ پیدا ہوجائے گی۔ جب کہ پرامن طور پر مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کے حل کی صورت میں ان ممالک کو ایران اور پھر اس کے راستہ سے بحیرہ قزوین اور وسطی ایشیا کے ممالک سے سستی توانائی حاصل ہوگی۔ مزیدبراں ان ممالک میں تیل و گیس کی صنعت میں سرمایہ کاری کے وسیع مواقع حاصل ہوں گے۔ گذشتہ سالوں میں یہ ممالک ایران پر اقتصادی و تجارتی پابندیوں کے مخالف رہے۔ ان ممالک کے سرمایہ کاروں اور تیل کمپنیوں نے گذشتہ ایک عشرہ کے دوران میں ایران کی تیل کی صنعت میں بھاری سرمایہ کاری کی ہے (Roger Howard: Iran in Crisis?، ص ۲۱۳-۲۱۷)۔ مذکورہ یورپی ممالک (فرانس، جرمنی اور برطانیہ) گذشتہ سالوں (۲۰۰۱ء-۲۰۰۵ء) کے دوران میں ایران کے ساتھ، اس کو ترک نیوکلیائی پروگرام پر آمادہ کرنے کے لیے، مذاکرات میں بھی مشغول رہے ہیں۔ ان کی طرف سے

نیوکلیائی پروگرام ترک کرنے پر حکومت ایران کو بعض ترغیبات خصوصاً تیل و گیس اور صنعتی شعبے کی ترقی کے لیے جدید ٹیکنالوجی کی فراہمی، بھی دی گئیں۔ تاہم ایران کی طرف سے پرامن مقاصد کے لیے اپنے نوکلیائی پروگرام کو ترک کرنے سے انکار کے سبب یہ مذاکرات لاحاصل رہے۔ چنانچہ یورپی ممالک نے امریکہ و اسرائیل کے دباؤ پر ایٹمی توانائی کے بین الاقوامی ادارے (IAEA) کی طرف سے ایران کے معاملہ کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پیش کرنے کی حمایت کی ہے۔

ایران، عراق تعلقات: ایران نے۱۹۹۰ء کی جنگ خلیج کے بعد سے عراق کی کمزور حیثیت سے فائدہ اٹھا کر عراقی کردستان میں اپنے اثر و نفوذ کو وسعت دی۔ اس نے عراق کی جلاوطن بڑی اسلامی سیاسی جماعت سپریم کونسل(Supreme Council of Islamic Revolution in Iraq، SCIRI کے عسکری بازو البدر بریگیڈ کو منظم کیا، اس کے ارکان کو جنگی تربیت دی اور اسلحہ سے لیس کیا۔ اس عسکری تنظیم نے عراق کے اندر فوجی کارروائیاں عراقی فوج کو نقصان پہنچایا۔ حکومت ایران نے کرد رہنما جلال طالبانی (صدر عراق، ۲۰۰۵ء) کی سیاسی جماعت PUK =Patriotic Union of Kurdistan کی بھی سرپرستی کی اور اس کو امداد بہم پہنچانا شروع کی۔ ایران کی کوششوں سے جلاوطن عراقی اسلامی شیعہ جماعت اور جلال طالبانی کی کرد جماعت کے مابین مفاہمت کا معاہدہ ہوا۔ ۱۹۹۶ء سے عراقی کردستان میں ایران کی مداخلت میں مزید اضافہ ہوا۔ اس نے جلال طالبانی کی جماعت کو بھرپور امداد (اسلحہ اور دیگر وسائل) بہم پہنچانے کے علاوہ کرد اسلامی جماعت 'انصار الاسلام' کی بھی پشت پناہی کی۔ ۱۹۹۶ء کے وسط میں عراقی کردستان میں ایران کی حمایت یافتہ کرد جماعت کا مسعود برزانی، جو عراقی صدر کی طرف مائل تھے، کی جماعت سے زبردست مسلح تصادم ہوا۔

اگست ۱۹۹۶ء میں اربیل اور سلیمانیہ میں صدام حسین کی افواج اور مسعود برزانی کے ہاتھوں زک اٹھانے کے بعد جلال طالبانی کی ملیشیا کے بہت سے ارکان ایران میں پناہ گزیں ہوئے اور ایران سے تازہ کمک حاصل کر کے اکتوبر ۱۹۹۶ء میں پھر سے انہوں نے سلیمانیہ پر قبضہ کر لیا۔ عراق کی جلاوطن اسلامی شیعہ جماعت سپریم کونسل نے، جس کے اہم رہنما اور ہزاروں ارکان ایران میں مقیم تھے، اس جنگ میں اہم کردار ادا کیا۔ پاسداران انقلاب کے دستوں نے بھی ان کے شانہ بشانہ جنگی کارروائیوں میں حصہ لیا۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر پاسداران انقلاب اور ایرانی فوج نے اندرون ملک (ایران میں) کرد علیحدگی پسند 'تحریک کرد ڈیموکریٹک پارٹی آف ایران' (KDPI) پر بھی کاری ضرب لگائی۔ پاسداران انقلاب نے عراقی حدود کے اندر گھس کر اس کے ٹھکانوں کو تباہ کر دیا۔ مزید براں انہوں نے عراق میں پناہ گزین ایرانی منحرف عسکری گروہ مجاہدین خلق کے ٹھکانوں کو بھی تباہ کر دیا (Roger Howard: *Iran In Crisis?*: ص ۸۱-۸۲؛۸۷-۸۸)۔

امریکی تسلط کے بعد ایران۔عراق تعلقات : عراق پر امریکی تسلط کے بعد اس ملک میں ایران کے اثر و نفوذ میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ صدام حسین کی حکومت کے خاتمہ پر ایران میں عراقی سپریم کونسل (SCIRI) کے قائد آیت اللہ محمد باقر الحکیم ۲۳ سالہ (۱۹۸۰ء-۲۰۰۳ء) جلاوطنی کے بعد ۱۰ر مئی ۲۰۰۳ء کو عراق میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوئے۔ باقرالحکیم کے بھائی عبدالعزیز الحکیم عراق میں امریکہ کی طرف سے تشکیل شدہ عبوری انتظامی کونسل کے رکن بھی بنے۔ البتہ باقر الحکیم چند ماہ بعد اگست ۲۰۰۳ء میں ایک بم دھماکے میں ہلاک ہوگئے۔ عراق کی دونوں بڑی اسلامی سیاسی جماعتوں سپریم کونسل (SCIRI) اور حزب الدعوۃ الاسلامیہ کی ایران کی ہیئت

مقتدرہ سے گہری فکری و نظریاتی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں جماعتیں عراق میں اسلامی حکومت کے قیام کی حامی و داعی ہیں اور ایران کے ساتھ گہرے اور وسیع تعلقات کے قیام کی حامی ہیں (Roger Howard: *Iran in Crisis?*، ص ۸۳-۸۵)۔ جنوری ۲۰۰۵ء میں عراقی انتخابات میں ایران کی حامی شیعہ جماعتوں کے اتحاد کو اکثریت حاصل ہوئی ہے اور الدعوۃ الاسلامیہ کے دو رہنما ابراہیم جعفری اور نوری المالکی یک بعد دیگرے وزیراعظم نامزد ہوے جب کہ ایران کی سابق اتحادی عراقی کرد جماعت 'کرد ڈیمو کریٹک پارٹی' کے رہنما جلال طالبانی صدر منتخب ہوے۔ امریکہ کو عراق میں ایران کے بڑھتے ہوے اثر و نفوذ سے سخت تشویش لاحق ہے۔ وہ عراق میں بعض شیعہ عسکری گروہوں خصوصاً مقتدیٰ صدر کی مہدی ملیشیا کی مزاحمتی کارروائیوں کا ذمہ دار بڑی حد تک ایران ہی کو گردانتا رہا ہے۔ امریکی انتظامیہ کی طرف سے حکومت ایران پر بار بار عراق میں جاری مزاحمتی کارروائیوں میں ملوث ہونے کا الزام عائد کیا گیا ہے (Roger Howard: *Iran in Crisis?*، ص ۸۰)۔ بایں ہمہ ایران کے عراق کی موجودہ حکومت کے ساتھ تعلقات بتدریج مستحکم ہورہے ہیں۔

ایران میں نسلی، لسانی اور مذہبی اقلیتیں: شاہ کے دور اقتدار میں قبائلی خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا۔ مزید براں مختلف نسلی و لسانی اقلیتوں بالخصوص کردوں، عربوں، بلوچوں اورترکمانوں کو،کہ جن کی آبادی کی اکثریت سنی العقیدہ تھی، قوت و طاقت کے ذریعے سے مرکز کے زیرنگیں بنایا گیا۔ ان کی جداگانہ لسانی اور ثقافتی شناخت کے قلع قمع کی پالیسی اختیار کر کے ان کو جبراً قومی دھارے میں سمونے کی کوشش کی گئی۔ ان کے بہت سے سیاسی و مذہبی قائدین کو ہلاک بھی کیاگیا۔ شاہ نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ہمسایہ ملک پاکستان میں بلوچ علیحدگی پسند تحریک کو کچلنے کے لیے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کو مدد بہم پہنچائی تھی (William Samii: *"Ethnicity, Unity and State Policy in Iran"*، ص ۱۲۹)۔ شاہ کے دور میں ان اقلیتوں کو مجلس کے علاوہ حکومتی و انتظامی اداروں میں ان کی آبادی کے مقابلے میں بہت کم نمائندگی دی گئی۔ جن علاقوں میں وہ اکثریت میں تھے ان علاقوں کی تعمیر و ترقی پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔ ان لسانی و نسلی اور مذہبی اقلیتوں کو ثقافتی و مذہبی آزادی سے بھی محروم رکھا گیا۔ انہیں اپنی زبانوں میں اخبارات و رسائل کی اشاعت کی آزادی بھی نہ تھی۔ اسکولوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں فارسی کے علاوہ کسی اور زبان کی تعلیم و تدریس ممنوع تھی۔ اس دور میں سنی العقیدہ آبادی ملک کی سب سے زیادہ دبی ہوئی مذہبی اقلیت تھی۔ اس کے افراد بڑے ڈرے اور سہمے ہوے تھے۔ ان کی ملک سے وفا داری کو مشکوک و مشتبہ خیال کیا جاتا اور ان کے ساتھ امتیازی برتاؤ روا رکھا جاتا۔ چنانچہ جن علاقوں میں یہ افراد اقلیت میں تھے وہاں وہ اپنے مذہب و عقیدہ کے افشاء و اظہار سے بالعموم گریز کرتے تھے۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے بالعموم ان پر بند تھے۔ انہیں سرکاری و غیر سرکاری اعلیٰ عہدوں پر تو قطعاً مقرر نہیں کیا جاتا تھا۔ قومی زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی ان کو کوئی قابل ذکر حیثیت حاصل نہ تھی۔ سنی العقیدہ آبادی کو مذہبی آزادی ہرگز حاصل نہ تھی۔ دارالحکومت تہران اور دیگر شہروں میں، یہودیوں ، زرتشتیوں اور بہائیوں کو، کہ جنہیں ایران کے شیعہ علماء و مجتہدین نے غیر مسلم قرار دے رکھا تھا، اپنے اپنے عبادت خانے تعمیر کرنے اور دیگر مذہبی رسومات کی اعلانیہ ادائیگی کی اجازت تھی۔ حتیٰ کہ ہندوؤں اور سکھوں نے بھی مندر اور گوردوارے تعمیر کر رکھے تھے، البتہ سنی العقیدہ آبادی کو تہران اور دیگر بڑے شہروں میں مساجد کی تعمیر اور ان کی آباد کاری کی اجازت نہ تھی۔ شمالی تہران میں تو سنی آبادی کی مساجد بہت ہی کم تھیں اور ان پر بھی تالا پڑا ہوا تھا۔

شاہ نے بعض سیاسی مصالح کی بنا پر شیعہ سنی کشمکش کو ہوا دینے کی پالیس بھی اختیار کر رکھی تھی (نذیر احمد ذاکر: Notes on Iran: Aryamehr to Ayatollahs، ص ۲۷؛ مختار مسعود: لوحِ ایام، ص ۲۷؛ "Ethnicity, Unity and State Policy in Iran"، ص ۱۲۸-۱۲۹) .

تحریک انقلاب کے دوران آیت اللہ خمینی اور دیگر علماء و مجتہدین کی طرف سے ان اقلیتوں کو ان کی محرومیوں کے ازالے اور ان کے حقوق کے تحفظ کا یقین دلایا گیا۔ چنانچہ بعد از انقلاب ان گروہوں کی طرف سے اپنے حقوق منوانے اور ان کے تحفظ کی غرض سے دستوری ضمانتیں فراہم کرنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ کردوں، بلوچوں اور عربوں کی طرف سے علاقائی و انتظامی خود مختاری کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ کردوں نے صوبائی سرحدوں کے از سر نو تعین کا مطالبہ بھی کیا تاکہ کردستان ایک بڑا صوبہ بن سکے۔ کرد رہنماؤں کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ اسکولوں میں سنی العقیدہ آبادی کے بچوں کو شیعہ دینیات کی تعلیم وتدریس سے مستثنیٰ قرار دے کر ان کے لیے سنی دینیات کی تعلیم و تدریس کا انتظام کیا جائے، کا حق تسلیم کیاجائے۔ خوزستان کی عرب آبادی نے عربی زبان کو ملک کی دوسری قومی/سرکاری زبان کا درجہ دینے، اسکولوں میں عربی زبان کی تعلیم وتدریس کے انتظام، عرب طلبہ کے لیے بیرون ملک (عرب ممالک) تعلیم کی غرض سے تعلیمی وظائف کی فراہمی کے علاوہ تیل کی پیداوار و برآمد سے حاصل ہونے والی آمدنی کا ایک معقول حصہ تیل کی دولت سے مالا مال اس علاقے کی تعمیر و ترقی پر خرچ کرنے کا مطالبہ کیا۔ ان مذکورہ اقلیتوں کی طرف سے مجلس اور حکومتی و انتظامی اداروں میں اپنی اپنی آبادی کے تناسب سے نمائندگی کا مطالبہ مشترکہ طور پر کیا گیا۔ مارچ ۱۹۷۹ء سے ان اقلیتوں نے اپنے مطالبات تسلیم کرانے کی غرض سے (خوزستان، کردستان، گورگان اور بلوچستان میں) ایک سیاسی تحریک کا آغاز کیا۔ بائیں بازو کی قوتوں نے ان کی سیاسی تحریک کی پرزور حمایت کی۔ ان جملہ اقلیتوں نے بعد از انقلاب مہدی بازرگان حکومت کی طرف سے مقرر کردہ نئے دستور کا مسودہ تیار کرنے والی کمیٹی میں نمائندگی کا بھی مطالبہ کیا۔ جسے تسلیم نہ کیے جانے پر انہوں نے ۱۹۷۹ء میں شورای خبرگان کے انتخابات کا مقاطعہ کیا۔ اسلامی انقلابی قیادت نے اس تحریک کو اسلامی انقلاب کے خلاف ایک سازش خیال کرتے ہوئے اس کی سرکوبی کی ٹھان لی۔ چنانچہ انقلاب کے بعد صرف چند ابتدائی مہینوں میں (مارچ تا مئی ۱۹۷۹ء) کے دوران میں کردستان کے علاقوں سنندج، نقدہ اور ر ضی کے علاوہ سیستان، زاہدان، خوزستان ،مغربی آذربائیجان کے شہر اُورمیہ اور شمالی ایران کے شہر گنبد کاؤوس وغیرہ میں پاسداران انقلاب نے بڑے پیمانے پر فوجی کارروائیاں کیں جس کے نتیجے میں مذکورہ گروہوں کے سیکڑوں افراد ہلاک و زخمی ہوے۔ پاسداران انقلاب نے کردوں کو، جن کے مذہبی و سیاسی رہنما اظہار رائے میں بڑے نڈر اور بے باک تھے، بطور خاص نشانہ بنایا۔ مارچ، اپریل ۱۹۷۹ء میں کردستان کے شہر سنندج میں کرد مظاہرین کو کچلنے کے لیے پاسداران کے زمینی دستوں کی طرف سے گولہ باری کے علاوہ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے بھی ان پر گولیاں برسائی گئیں جس سے کافی تعداد میں ہلاکتیں ہوئی (نذیر احمد ذاکر: Notes on Iran، ص ۲۷-۳۵؛ "Ethnicity, Unity and State Policy in Iran"، ص ۱۲۹-۱۳۰؛ اصغر شیرازی: The Constitution of Iran، لنڈن ، ص ۳۲).

نئے اسلامی دستور میں ان گروہوں کے ثقافتی اور آئینی و سیاسی حقوق مطالبات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ انقلابی حکومت ان کی طرف سے اپنی جداگانہ لسانی و ثقافی شناخت پر اصرار کو اسلامی انقلاب کے بقاء و استحکام کے منافی خیال کرتی تھی۔ چنانچہ کردوں اور دوسری اقلیتوں نے نئے دستور کی توثیق ومنظوری کے لیے منعقدہ ریفرنڈم

(دسمبر ۱۹۷۹ء) کا مقاطعہ کیا اور اپنے حقوق و مطالبات کو تسلیم کرانے کی غرض سے مسلح جدوجہد و مزاحمت کا راستہ اختیار کیا ("Ethnicity Unity and State Policy in Iran"، ص ۱۲۹-۱۳۰؛ نذیر احمد ذاکر: ص۳۵-۳۶؛ Homa Omid: Islam and the Post-Revolutionary State in Iran، ص ۶۶-۶۸)۔ انقلابی حکومت نے علاقائی خود مختاری کی تحریکوں کو کچلنے کے لیے ان علاقوں میں مقامی شیعہ آبادی کو بھی مسلح کیا۔ کردوں کے خلاف تو وسیع پیمانے پر عسکری کارروائیاں کی گئیں۔ عراق کے ساتھ جنگ کے آغاز سے کردوں کی علاقائی خود مختاری کی تحریک توانا ہو گئی تھی، تاہم پاسداران انقلاب نے ۱۹۸۲ء تک کردوں کے تمام بڑے شہروں اور قصبات پر قبضہ کر لیا اور انہیں دور افتادہ پہاڑی علاقوں کی طرف پسپا ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۸۴ء تک پاسداران نے مغربی ایران کے تمام کرد علاقوں پر اپنی مؤثر گرفت قائم کرلی، بلکہ سرحدی دروں پر قبضہ کر کے کردوں کے عراق سے رابطوں کو کہ جہاں سے انہیں سامان رسد پہنچنے کے امکانات تھے، بھی منقطع کر دیا۔ یوں علاقائی خود مختاری کی یہ تحریک دم توڑ گئی (The Iranian Revolution and the Islamic Republic، ص ۲۲-۲۳؛ نذیر احمد ذاکر: Notes on Iran، ص ۳۵-۳۶)۔

بعد کے سالوں میں بھی ان اقلیتوں کے بارے میں انقلابی حکومت کی سخت گیر پالیسی بدستور جاری رہی۔ پاسداران انقلاب اور فوج کے ہاتھوں کردوں اور بلوچوں کے سیاسی و مذہبی رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد قتل و ہلاک ہوئی۔ سیستان و زاہدان اور بعض دوسرے علاقوں میں سنی العقیدہ آبادی کی مساجد و مدارس کی تخریب و بربادی اور ان کے ائمہ و خطباء اور علماء کے قتل و ہلاکت کا سلسلہ جاری رہا (ملاحظہ ہو: Human Rights Watch World Report 1999ء، نیویارک ۱۹۹۹ء، ۵۵۲-۵۵۳؛ Freedom of Religion and Belief A World Report، لنڈن و نیویارک، روٹ لیج، ۱۹۹۷ء، ص ۴۱۸-۴۱۹)۔ اگرچہ اسلامی دستور (۱۹۷۹ء) میں چند ایسی شقیں بھی شامل کی گئیں جن میں تمام نسلی، لسانی اور مذہبی اقلیتوں کے لیے مساوی حقوق تسلیم کیے گئے ہیں۔ ان کے لیے مذہبی آزادی، زبان و ثقافت کے تحفظ خصوصاً علاقائی زبانوں میں اخبارات و رسائل کی اشاعت کے علاوہ جن علاقوں میں یہ اقلیتیں اکثریت میں ہیں وہاں ان کے لیے بہت محدود سی قانونی اور انتظامی خود مختاری کا حق بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ تاہم ریاست کی سالمیت و وحدت کو یقینی بنانے کے لیے دستور کی ان شقوں پر کبھی عمل درآمد نہیں کیا گیا ("Ethnicity, Unity and State Polic y in Iran"، ص ۱۲۸-۱۳۰)۔ کردوں نے مئی ۲۰۰۵ء کے صدارتی انتخابات کے مقاطعے کی تحریک برپا کی اور مہ آباد اور دیگر مختلف شہروں میں احتجاجی مظاہرے کیے۔ حکومتی اداروں نے ان کی احتجاجی تحریک کو کچلنے کے لیے حسب معمول طاقت کا بھرپور استعمال کیا، جس سے متعدد کرد رہنما اور دیگر ارکان ہلاک ہوئے (Laden Boroumand: "Iran's Peculiar Election: The Role of Ideology"، در Journal of Demacracy، ۱۶:۴ (۲۰۰۵ء) ص ۵۹-۶۰)۔

معیشت، انقلابی ایران میں: جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے، پہلوی دور میں ملک کے صنعتی شعبہ نے بڑی تیزی سے ترقی کی تھی۔ ۱۹۷۷ء کے اواخر تک ملک میں ۷۰ ہزار سے زائد صنعتی پیداوری یونٹ، جن میں ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے کارخانے اور ملیں شامل تھیں، قائم ہو چکے تھے ۔ اس کے باوجود ملکی معیشت میں تیل و گیس کی پیداوار و برآمد کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ کل خام قومی پیداور (GDP) کا ایک تہائی، سرکاری آمدنی کا تین چوتھائی جبکہ غیر ملکی زر مبارکہ کا ۹۰ فی صد حصہ تیل و گیس کی برآمدات سے حاصل ہوتا تھا۔ ۱۹۷۷-۱۹۷۸ء تک اس شعبہ سے حاصل ہونے والی آمدنی

۲۱/ارب ڈالر سالانہ تک جا پہنچی۔ شاہ کی زرعی اصلاحات کے باوجود ملک غذائی ضروریات میں خود کفالت حاصل نہ کر سکا۔ چنانچہ کافی حد تک غذائی ضروریات کے سلسلہ میں اس کا انحصار درآمدات پر رہا۔ ۱۹۷۸ء میں شاہ مخالف سیاسی تحریک کے دوران میں ملک گیر ہڑتالوں، اور صنعتی کارکنوں اور سرکاری وغیر سرکاری ملازمین کی سیاسی تحریک میں شمولیت اور کارخانوں کی تالہ بندی سے صنعتی اور کاروباری و تجارتی سرگرمیاں کافی حد تک ٹھپ ہوگئیں، برآمدات و درآمدات کا حجم بھی بہت حد تک کم ہو گیا۔ اس بحرانی دور میں کثیر تعداد میں ملکی و غیر ملکی سرمایہ دار وصنعت کار ملک سے اپنا سرمایہ لے کر نکل گئے۔ ملکی و غیر ملکی فنی و تکنیکی ماہرین کی ایک بڑی تعداد بھی ملک سے نکل گئی۔ دریں حالات بعداز انقلاب حکومت کو معیشت کے شعبہ میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انقلابی حکومت نے جون ۱۹۷۹ء میں ایک قانون منظور کر کے تمام بڑی صنعتوں اور بنکوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ نجی شعبہ میں صرف ہلکی صنعتیں باقی رہ گئیں۔ حکومت نے بعض غیر ملکی خصوصاً امریکی سرمایہ کار کمپنیوں کے حصص و سرمایہ کو بھی قومی تحویل میں لے لیا۔ قومی تحویل میں لیے گئے کارخانوں کے انتظام و انصرام کے لیے متعدد نئے ادارے قائم کیے گئے۔ ان میں سے ایک بڑا ادارہ "بنیاد مستضعفین" تھا۔ نئے منتظمین کی اکثریت انتظامی تجربہ اور کاروباری معاملات سے نابلد تھی، اس لیے صنعتی پیداوار میں بہت کمی واقع ہوئی۔ صنعتی افزائش رک ہی نہیں گئی بلکہ ترقی معکوس سے دو چار ہوئی۔ ۱۹۸۲ء تک صنعت کے شعبہ میں ۱۰/ارب ڈالر مالیت کا خسارہ واقع ہوا۔ مغربی دنیا سے تعلقات کے انحطاط اور عراق کے ساتھ جنگ سے بیرون ملک سے مطلوبہ ٹیکنالوجی، صنعتی مشینری اور خام مال کے حصول میں بڑی دشواری پیش آئی جس سے بہت سے کارخانے بند ہوگئے۔ انقلابی حکومت نے شاہ دور کے بہت سے ترقیاتی منصوبوں کو ترک کرنے کے علاوہ عراق کے ساتھ جنگ کے سبب تعمیر و ترقی کے کاموں کا حجم بھی کم کر دیا جس سے بے روزگاری میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۸۲-۱۹۸۳ء کے دوران میں تقریباً ۲٫۵ ملین (۲۵لاکھ) افراد، مرد و خواتین بے روزگار ہوئے۔ انقلابی دور میں صنعتی شعبہ میں بعض پہلوؤں سے نمایاں بہتری بھی رونما ہوئی۔ حکومت کی طرف سے بعض مصنوعات کی درآمد پر پابندی اور اندرون ملک ان کی مانگ کے سبب بعض چھوٹی صنعتیں خوب پھلی پھولیں (Homa Omid: *Islam and the Post-Revolutionary State in Iran*، ص۷۷-۸۴: Setareh Karimi: *"Economic Politics and the Structural Changes Since the Revolution"*،در Nikki R.Keddie، Eric Hooglund(مدیران): *Iranian Revolution and the Islamic Republic*، ص ۴۳-۴۵).

انقلابی حکومت نے آغاز ہی سے تیل کی پیداوار و برآمدات کو کم کرنے اور معیشت کے دیگر شعبوں خصوصاً زراعت کو ترقی دینے کی مؤثر اور کامیاب کوشش کی۔ اس نے ۱۹۸۲ء سے زراعت کو ملکی تعمیر و ترقی کا محور قرار دے کر اس کے لئے خطیر وسائل مختص کیے۔ کسانوں کو رعایتی نرخوں پر بیج، کھاد، زرعی ادویات اور جدید زرعی آلات و مشینری کے علاوہ کثیر مقدار میں قرضے فراہم کیے۔ مزید برآں زرعی اجناس کی بہتر قیمتیں مقرر کیں۔ انقلابی حکومت کا نصب العین غذائی اجناس و اشیاے خوراک میں خود انحصاری و خود کفالت حاصل کرنا تھا۔ حکومت نے زرعی و دیہی شعبوں میں تعمیر و ترقی کے لئے ایک ادارہ 'جہاد سازندگی' کے نام سے قائم کیا، جس نے دیہی علاقوں میں سڑکیں اور پل تعمیر کرنے اور پینے کے لئے صاف پانی کی فراہمی کے علاوہ صحت اور تعلیم کی سہولیات کو عام کرنے میں غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ انقلابی حکومت کے ان اقدامات کی بدولت دیہی علاقوں میں

روزگار کی حالت نمایاں طور پر بہتر ہوئی۔ کسانوں کا معیار زندگی بلند ہوا اور ملک بتدریج غذائی ضروریات میں خود کفیل ہوتا چلا گیا ("Economic Politics and the Structural Changes Since the Revolution"، ص ۴۷-۵۱؛ Reinhold Loeffler: Economic Changes in a Rural Area Since 1979، در The Iranian Revolution and the Islamic Republic، ص ۹۳-۱۰۹).

غرض انقلابی حکومت کو در پیش گوناں گوں مشکلات کے باوجود ایرانی معیشت میں متعدد پہلوؤں سے بہتری رونما ہوئی جبکہ گزشتہ دور کی بعض بے اعتدالیوں کی اصلاح ہوئی۔ چنانچہ معاشی و سماجی عدل، جو انقلابی قیادت کا ایک اہم ہدف تھا، کے قیام کی طرف عملی طور پر بڑی اہم پیش رفت ہوئی۔ انقلابی حکومت کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ملک میں سے عیش و عشرت، اسراف و تبذیر اور پر تعیش زندگی کی حوصلہ شکنی کی اور سادگی و کفایت شعاری کو رواج دیا۔ اس نے غیر ضروری درآمدات پر، خصوصاً جن کا تعلق پرتعیش زندگی کے لوازمات سے تھا، پابندی عائد کرکے معاشی وسائل کے بے یحاشا ضیاع کا سلسلہ بہت حد تک روک دیا (ارشاد احمد حقانی، انقلاب ایران: ایک مطالعہ، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۴ء، ص ۸۵-۹۲، ۱۵۸-۱۵۹؛ "Economic Politics"، ص ۴۷-۵۳)۔ انقلابی حکومت نے غیر ملکی امداد و قرضہ جات پر انحصار کو کم سے کم کرنے کی حکمت اختیار کی۔ امریکہ کی طرف سے اقتصادی و تجارتی پابندیوں نے ایران کی انقلابی حکومت اور عوام کو اپنے داخلی وسائل اور صلاحیتوں پر انحصار کا راستہ دکھایا۔ چنانچہ حکومت نے حتی الامکان نہ صرف یہ کہ بیرونی قرضہ جات کے حصول سے اجتناب برتا، بلکہ شاہ کے دور کے بعض غیر ملکی قرضہ جات کی واپسی کے سلسلہ میں اہم اقدامات کیے۔ انقلابی حکومت نے غیر پیداواری اخراجات میں مؤثر تخفیف اس طور سے کی کہ سماجی خدمات، خصوصاً تعلیم، صحت اور غریب طبقات کو فراہم کی جانے والی رعایتوں پر اس کا اثر کم سے کم پڑے۔ حکومت نے عراق کے ساتھ جنگ کے دنوں میں بھی دفاعی بجٹ کو کافی حد تک قابو میں رکھا۔ ۱۹۸۳ء میں سالانہ دفاعی بجٹ ایک ہزار (۱۰۰۰) ارب ایرانی ریال تھا جو زمانہ امن میں ۱۹۷۸ء کے سالانہ دفاعی بجٹ چھ سو ارب ریال کے مقابلے میں نسبتاً کم اضافہ تھا ("Economic Politics"، ص ۴۷-۵۳).

اسلامی انقلاب کے بعدایرانی معیشت میں امریکہ کا کردار انتہائی محدود ہو کر رہ گیا۔ امریکی درآمدات جو اب کسی دوسرے ملک کی وساطت سے درآمد ہونے لگیں تھیں، کا حجم انتہائی کم ہو گیا۔ انقلابی حکومت نے بڑے مغربی ممالک کے بجائے سویڈن، اسپین، آسٹریلیا، ارجنٹائن اور برازیل سے تجارتی تعلقات کو وسعت دی، ان ممالک سے اشیاے صرف کے علاوہ ضرورت کا اسلحہ بھی خرید کیا۔ اس نے فوجی ضروریات اور دیگر درآمدات کے سلسلہ میں کسی خاص ملک پر انحصار کی پالیسی کو ترک کر دیا۔ ہمسایہ ممالک میں سے پاکستان اور ترکی کے ساتھ اس کی تجارت میں توسیع و اضافہ ہوا ("Economic Politics"، ص ۳۹-۴۰).

دفاعی صنعت، ایٹمی و میزائل ایٹمی پروگرام: ایران کی طرف سے ایٹمی طاقت بننے کی کوششوں کا آغاز محمد رضا شاہ کے دور میں ہوا۔ رضا شاہ پہلوی نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ۲۰ ارب ڈالر مالیت سے ۱۲ عدد نیوکلیائی ری ایکٹر تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ۱۹۷۴ء میں بوشہر میں جرمنی کے تعاون سے ایک ایٹمی ری ایکٹر کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ شاہ مخالف تحریک کے دنوں میں جرمن کمپنیاں (Seimens، وغیرہ) کام ادھورا چھوڑ کر واپس چلی گئیں۔ عراق کے ساتھ جنگ کے دوران میں عراقی فضائیہ کے حملوں سے ایران کی ایٹمی تنصیبات کو نقصان پہنچا تاہم نامکمل پلانٹ کے بچے کھچے سازوسامان کو دیگر محفوظ

مقامات پر منتقل کر دیا گیا (Roger Howard: Iran in Crisis?، ص ۹۴)۔ جنگ کے اختتام پر ہاشمی رفسنجانی کے تاریخی دورہ ماسکو (جون ۱۹۸۹ء) کے موقع پر سوویت یونین سے لڑاکا طیاروں اور آبدوزوں سمیت دفاعی سازوسامان کی خریداری کے لیے متعدد اہم معاہدے ہوئے۔ ایران نے روس سے بوشہر میں ایٹمی پلانٹ کی ازسرنو تعمیر کا معاہدہ کیا۔ ماسکو ایران کو افزودہ یورینیم کی فراہمی پر بھی رضا مند ہوگیا۔ ۱۹۹۱ء میں حکومت ایران کا چین سے ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے معاہدہ ہوا۔ چین نے ایران کو دو ایٹمی ری ایکٹر اور دوٹن افزودہ یورینیم فراہم کرنے پر اتفاق کیا۔ ایران نے خفیہ طور سے جنوبی افریقہ سے بھی یورینیم خریدی۔ مزیدبراں سوویت یونین کے سقوط کے بعد وسطی ایشیا کی ریاستوں خصوصاً تاجکستان سے اپنی ضرورت کے مطابق یورینیم اور ایٹمی آلات خریدے۔ نجی طور پر روس اور وسطی ایشیا کے ممالک سے ایٹمی و تکنیکی ماہرین کی خدمات بھی حاصل کیں۔ روس کے امداد و تعاون کو ایران کے نیوکلیائی پروگرام کی تعمیر و ترقی میں کلیدی اہمیت حاصل رہی ہے۔ روس نے مئی ۱۹۹۵ء میں حکومت ایران سے بوشہر میں ایک ایٹمی بجلی گھر تعمیر کرنے کے لیے آٹھ سو ملین ڈالر مالیت کے ایک معاہدہ کے علاوہ ایران کو نیو کلیائی ایندھن کی تیاری و افزودگی کے لیے درکار سازوسامان کی فراہمی کا معاہدہ بھی کیا۔ امریکہ کی طرف سے چین اور روس پر ایران سے نیوکلیائی تعاون ختم کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جاتا رہا۔ امریکہ نے ۱۹۹۷ء میں چین سے جدید ایٹمی ٹیکنالوجی کی فراہمی کا سمجھوتہ اس شرط پر کیا کہ وہ ایران سے ایٹمی تعاون/ر کو ایٹمی سازوسامان کی فراہمی بند کر دے۔ اس سے قبل ۱۹۹۵ء میں امریکہ نے روس کو اس پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ ایران کو ہر نوع کے روایتی ہتھیاروں کی فروخت کا سلسلہ منقطع کر دے۔ تاہم ۲۰۰۰ء میں روسی صدر ولادی میر پیوٹن کے دورہ ایران اور پھر دسمبر ۲۰۰۰ء میں ایرانی وزیر دفاع کے دورہ ماسکو کے بعد دونوں ممالک کے مابین اقتصادی و دفاعی تعاون کا دائرہ وسیع ہوا۔ دونوں ملکوں کے مابین دس سالہ اقتصادی تعاون کا سمجھوتہ طے پایا۔ مزیدبراں روس کا ایران سے اس کے ایٹمی تنصیبات کے مرکز بوشہر میں ہلکے پانی کے تین ری ایکٹروں کے علاوہ اہواز میں ایک ایٹمی بجلی گھر کی تعمیر کا معاہدہ بھی ہوا۔ ۲۰۰۲ء میں ایران میں روس کے تعاون سے ہلکے پانی کے ایک پلانٹ کی تعمیر کا کام مکمل ہوا۔ اسی سال جولائی میں روس نے امریکہ کے اعتراضات و خدشات کو نظرانداز کرتے ہوئے حکومت ایران کے ساتھ ایران میں پانچ عدد ایٹمی بجلی گھروں کی تعمیر کا معاہدہ کیا (Roger Howard: Iran in Crisis?، ص ۹۵-۹۷)۔ امریکہ، اسرائیل اور ان کے اتحادیوں کی مخالفت کے باوجود حکومت ایران کسی قیمت پر بھی نیوکلیائی پروگرام کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں۔ وہ اسرائیل کے فوجی عزائم اور اس کی ہمسایہ ممالک میں جارحانہ عسکری مہم جوئی مزیدبراں خطے میں امریکہ کی بڑھتی ہوئی فوجی مداخلت کے پیش نظر اپنی قومی و ملکی سلامتی اور دفاع کے لیے اس پروگرام کو بتدریج ترقی دینے کے لیے کوشاں ہے (Friborz Mokhtari: Iranian Security Perceptions in Historical Context، در "The Middle East Journal"، ۵۹: ۲ (۲۰۰۵ء): ص ۲۲۸-۲۲۹)۔

ایران گذشتہ کئی سالوں سے خصوصاً عراق کے ساتھ جنگ کے اختتام کے بعد سے دفاعی صنعت کو ترقی دینے کے لیے کوشاں ہے۔ امریکہ اور مغرب کی طرف سے سالہا سال سے جدید اسلحہ جات خصوصاً جنگی و لڑاکا طیاروں کی فراہمی و فروخت پر پابندیوں کے سبب اس کی فضائیہ کی جنگی استعداد کو بہت حد تک نقصان پہنچا۔ دریں

صورت اس نے شمالی کوریا، چین، یوکرائن اور روس سے میزائل ٹیکنالوجی کے حصول اور اندرون ملک میزائل سازی پر توجہ دی۔ وہ دفاعی ضروریات میں خود کفالت کے حصول کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ایران نے گزشتہ چند سالوں میں مختلف النوع مختصر اور طویل فاصلے تک مار کرنے والے میزائل تیار کیے ہیں۔ اس نے جولائی ۱۹۹۸ء میں ۱۳ سو کلومیٹر تک مار کرنے والے میزائل شہاب کے کامیاب تجربے کیے ہیں۔ اس نے ٹینک شکن، کروز، اور بیلسٹک میزائلوں کی تیاری کا کام بھی شروع کر رکھا ہے۔ ایران نے راکٹوں کے لیے ٹھوس ایندھن تیار کرنے کی استعداد بھی حاصل کرلی ہے (جولائی ۲۰۰۰ء)۔ مزید براں اس نے مواصلاتی سیارے تیار کرنے اور اس کو فضا میں چھوڑنے کی استعداد بھی حاصل کر لی ہے (Shahram Chubin: *Wither Iran?*، ص، ۵۴-۵۷-۷۲-۷۳)۔ مارچ، اپریل ۲۰۰۶ء کے دوران میں بھی اس نے پے در پے مختلف النوع میزائلوں کے تجربات بڑی کامیابی سے کیے ہیں۔

معیشت و اقتصادیات اور قدرتی وسائل: ایران قدرتی وسائل خصوصاً معدنی تیل اور گیس کے ذخائر سے مالا مال ملک ہے۔ دنیا میں تیل کے معلوم ذخائر کا دسواں حصہ اس ملک میں پایا جاتا ہے۔ تیل برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم اوپیک (OPEC) کے رکن ممالک میں سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والا یہ دوسرا ملک ہے۔ اس کی تیل کی یومیہ پیداوار ۴٫۲ ملین (بیالیس لاکھ) بیرل ہے۔ خوزستان کے صوبہ میں تیل کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ تیل کی پیداوار کا کثیر حصہ اسی صوبہ میں واقع تیل کے کنوؤں سے حاصل ہوتا ہے۔ جولائی ۲۰۰۳ء میں بوشہر میں ۸ء ۳ ارب بیرل تیل کے ذخائر کی دریافت ہوئی۔ ایران میں آئندہ ۵۳ سال تک تیل کے وافر ذخائر موجود ہوں گے۔ اس ملک میں قدرتی گیس کا معلوم دنیا کا دوسرا بڑا ذخیرہ، تقریباً ۲۰ ہزار ارب مکعب میٹر، موجود ہے۔ قدرتی گیس کے یہ ذخائر زیادہ تر جنوب پارس فیلڈ (South Pars Field) میں واقع ہیں (Roger Howard: *Iran in Crisis?*، ص ، ۱۴)۔ ایران میں صرف تیل و گیس کے وسیع ذخائر ہی موجود نہیں ہیں بلکہ اسے وسطی ایشیا و بحیرہ قزوین کی ریاستوں اور روسی فیڈریشن کے بعض علاقوں میں، جو چاروں اطراف سے خشکی میں گھرے ہوے ہیں، موجود تیل و گیس کے وسیع ذخائر کی عالمی منڈیوں تک ترسیل کے نظام میں بھی بڑی اہمیت حیثیت حاصل ہے۔ ان ممالک میں موجود توانائی کے وسیع ذخائر کی ترکی وجاپان اور مغربی و یورپی ممالک تک ترسیل کے سلسلہ میں ایران ایک مرکزی گذرگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں خلیج فارس میں ایرانی جزیرہ خرج میں قائم ٹرمینل کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ایران اپنی جغرافیائی محل وقوع کے سبب سے مذکورہ ہمسایہ ریاستوں خصوصاً آذربائیجان، قازقستان اور ترکمانستان میں تیل و گیس کے ذخائر کی دریافت و ترقی اور ان کی عالمی منڈیوں تک ترسیل کے بڑے بڑے منصوبوں کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے۔ اس سلسلہ میں ۲۰۰۰ء میں ایران کے دو علاقوں نکہ اور خرج کے درمیان ۳۴۰ کلومیٹر لمبی ایک بڑی پائپ لائن تعمیر کی گئی، جس پر دنیا کی متعدد بڑی تیل و گیس کی کمپنیوں نے سرمایہ کاری کی۔ اس منصوبے کے تحت ایرانی تیل جزیرہ خرج سے بیرون ملک تیل کی منڈیوں کو ترسیل کیا جائے گا جب کہ ملکی ضروریات کے لیے تیل بحیرہ قزوین کی ریاستوں سے درآمد کیا جائے گا۔ گذشتہ چند سالوں میں ترکمانستان اور ایران کے درمیان گیس کی ترسیل کے لیے ایک بڑی پائپ لائن تعمیر کی گئی۔ تبریز سے انقرہ تک ۲,۵۷۷ کلومیٹر گیس پائپ لائن بچھانے کے لیے حکومت ایران کا ترکی سے دسمبر ۲۰۰۱ء میں ایک معاہدہ طے پایا۔ اس زیر تکمیل منصوبے پر تیس ارب ڈالر لاگت کا تخمینہ لگایا گیا

ہے۔ ایران اس منصوبے کے تحت ترکی اور یورپی یونین کی ریاستوں کو گیس برآمد کرے گا۔ ایک اندازے کے مطابق ۲۰۰۷ء تک ایران اس پائپ لائن کے ذریعے سالانہ ۱۰ ارب مکعب فٹ گیس ان ممالک کو برآمد کرے گا۔ حکومت ِایران نے پاکستان اور بھارت کو بھی قدرتی گیس برآمد کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے اس نے ان دو ممالک کے ساتھ ایران سے براستہ پاکستان، بھارت تک پائپ لائن بچھانے کے لیے ایک ابتدائی معاہدہ مئی ۲۰۰۳ء میں کیا۔ ۶ ارب ڈالر مالیت کے اس منصوبے پر جاپان اور جنوبی کوریا کی سرمایہ کار کمپنیوں کا ایک کنسورشیم سرمایہ کاری کرے گا (Roger Howard: *Iran in Crisis?*، ص ۱۵-۱۷)۔

کامیابیاں: انقلاب کے وقت مغرب و مشرق کے مبصرین اور تجزیہ نگاروں کا خیال تھا کہ مذہبی قوتوں کو محمد رضا شاہ کو اقتدار سے باہر کرنے کے بعد حکومت و سیاست میں کوئی خاص حیثیت و اہمیت حاصل نہ رہے گی۔ وہ دراصل حکومت و سیاست کے رموز سے بے بہرہ علماء و مجتہدین کی قیادت میں حکومت کا قیام اور پھر اس کے بقاء و استحکام کو ایک ناقابل یقین اور ناممکن الوقوع امر خیال کرتے تھے (Gary Sick: *All Fall Down*، ص ۱۶۵)۔ چنانچہ ۱۹۷۹ء میں اسلامی انقلاب اور پھر اسلامی حکومت کے قیام کے وقت سے ان تجزیہ نگاروں کا خیال تھا کہ نیا نظام اندر موجود داخلی تضادات، اور کمزوریوں اور خصوصاً داخلی مزاحمت کے سبب بہت جلد زمین بوس ہو جائے گا، بلکہ بھک سے اڑ جائے گا (Adam Tarock: *"Iran Between Religious Hardliners and Hawks in America"*، در *Central Asian Survey*، ۲۲: ۲، ۳ (۲۰۰۳ء)، ص ۱۳۳)۔

ایرانی انقلاب کے بارے میں مغربی مبصرین اور تجزیہ نگاروں کے اندازے اور قیاس آرائیاں درست ثابت نہیں ہوئے۔ بلاشک و تردد ایران کی اسلامی انقلابی حکومت نے انتہائی نامساعد و ناموافق حالات کے باوجود قومی زندگی کے بہت سے شعبوں میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ ملک میں سماجی عدل و انصاف کے قیام کی طرف عملاً پیش رفت ہوئی ہے۔ بالادست اور نچلے طبقات کے مابین معاشی تفاوت کم ہوا ہے۔ دیہی آبادی اور پس ماندہ طبقات کی معاشی حالت بہتر ہوئی ہے۔ ملک نے معیشت و تجارت، زراعت اور دفاعی ضروریات میں خود انحصاری کے حصول کی طرف نمایاں طور پر پیش رفت کی ہے۔ تعلیم اور صحت کی سہولیات اور سماجی بہبود کے منصوبوں کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ انقلابی حکمرانوں نے سادہ طرز زندگی اور کفایت شعاری کی روش اختیار کر کے حکومتی سطح پر اسراف و تبذیر اور قومی دولت کے بے محابا ضیاع پر موثر طور پر قابو پایا ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ایران ۲۰۰۰ء کی دہلیز پر، اسلام آباد: دفتر ثقافتی نمائندہ اسلامی جمہوریہ ایران، ۲۰۰۰ء، ص ۸۹-۱۱۱، ۱۳۷-۱۶۴)۔ سب سے اہم یہ کہ انہوں (انقلابی حکمرانوں) نے اپنے فہم و تصور اسلام کے مطابق قومی و اجتماعی زندگی کی تشکیل نو کا تجربہ بڑی کامیابی سے کیا ہے۔ ایران میں معیشت کی اسلامی تشکیل کی طرف خاطر خواہ پیش رفت ہوئی ہے۔ وہاں کی حکومت نے نظام بینکاری کی اصلاح اور اسے غیر سودی بنانے کے لیے جو ماڈل بنایا ہے وہ بحیثیت مجموعی درست خیال کیا جاتا ہے اور اس میں مضاربت، شراکت اور دوسری تدابیر (Instruments) کو جنہیں اس دور کے اسلامی ماہرین معاشیات نے اختیار کیا ہے، قبول کیا گیا ہے۔ اس باب میں پاکستان کے برعکس وہاں کی اسلامی حکومت نے ایک سنجیدہ کوشش کی ہے جس سے اندرون ملک نفع و نقصان کی بنیاد پر معیشت میں لین دین بڑھا ہے۔ ۱۹۹۱-۱۹۹۲ء کے اعداد و شمار کے مطابق ایران میں

قرضہ جات کے کل لین دین کا ۲۸ فی صد مشارکہ یا مضاربہ کی بنیاد پر ہوا جب کہ پاکستان میں یہ صرف پانچ اور سات فی صد کے درمیان رہا (خورشید احمد، اسلامی تحریک، درپیش چیلنج، اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، ۱۹۹۵ء، ص ۵۹).

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں.

(محمد ارشد)

••--------------••

⊗ ایرانی انقلاب: رکّ بہ ایران

••--------------••

⁕ **اِیلات**: لفظ ایلات (جو کہ ایل کی جمع ہے) ایلخانیوں کے عہد میں فارسی زبان میں مستعمل ہوا۔ اس کے معنی "خانہ بدوش" یا "نیم خانہ بدوش" قبائل ہیں۔ عشائر، قبائل اور طوائف بھی اسی مفہوم میں مستعمل ہیں اور یہ عموماً قبائل کے لیے بولا جاتا ہے، خواہ وہ پورے طور پر خانہ بدوش ہوں یا نہ ہوں۔ ایلات وعشائر کی ترکیب عہد وسطی اور دور جدید ہر دو میں بکثرت وارد ہوئی ہے اور یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ دونوں الفاظ واضح طور پر باہم مترادف ہیں۔ عہد وسطی میں ایلات اولوس (Ulus)، یعنی قبائلی حامیوں اور اومق (Oymak) کے ساتھ مل کر بھی آتا تھا.

عہدِ قدیم سے ایران کے بہت سے حصوں کی آبادی کے روزگار کا ذریعہ گلہ بانی اور زراعت تھا اور وہاں موسم گرما میں ریوڑوں کو قریبی چراگاہوں میں لے جانے کا رواج تھا۔ اس طرح کے گروہوں کو صحیح طور پر خانہ بدوش نہیں کہا جاسکتا، اگرچہ وہ موسم گرما خیموں میں بسر کرتے تھے۔ گلہ بانی اور معاشرے کی قبائلی ساخت خانہ بدوش گروہوں کی خصوصیات میں شامل تھیں، لیکن ان ہر دو (خصوصیات) میں سے کوئی ایک اُن تک محدود نہ تھی۔ اقامت پذیر آبادی سے اُن کا امتیاز اُن کے ہاں آباد شدہ دیہات کی عدم موجودگی اور طویل یا مختصر فاصلوں کی نقل مکانی تھی، تاہم نیم خانہ بدوش گروہ بھی موجود تھے جن کے رہنما سال کا ایک حصہ آباد شدہ دیہات یا قصبات میں بسر کرتے تھے اور اپنی مختصر سی تعداد اپنے گرمائی یا سرمائی مساکن میں یا ان دونوں میں چھوڑ کرجاتے تھے۔ ملک کے کچھ حصوں میں آبادی کا معتدبہ حصہ موسمی حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے قابل ہوگیا، جبکہ بصورت دیگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا، لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ ایرانی سطح مرتفع میں ایسے اقدامات ماوراء النہر اور وسطی ایشیا میں بروئے کار آنے سے کتنا پہلے واقع ہوئے۔ سلجوقی عہد سے آگے اور خصوصاً منگولوں کے حملے کے بعد اقامت پذیر اور نیم اقامت پذیر عناصر کے مابین توازن برقرار رکھنا ایک نازک مسئلہ ہے۔ خانہ بدوشوں کے علاقوں سے آبادی کے مستقل اقامتی علاقوں کی طرف معمول کی نقل مکانی کے علاوہ خشک سالی اور ایران کے اندر اور وسطی ایشیا تک اس کی سرحدوں تک آبادی بڑھنے کی بنا پر خانہ بدوش اشخاص کی بڑے یا چھوٹے پیمانے پر مستقل اقامتی علاقوں کی طرف نقل مکانی ہوئی۔ جب کبھی خانہ بدوش آبادی اور اس کے ریوڑ اُس حالت میں نہ ہوتے جو دستیاب چراگاہ کی بدولت برقرار رکھی جاسکتی تھی، خواہ اس کی وجہ بارش کی قدرتی زیادتی یا کمی ہوتی، تو مستقل اقامتی علاقوں کی طرف سے تشدد یا پر امن نقل مکانی وقوع پذیر ہوتی.

عہد ماقبل از اسلام میں ایران کے خانہ بدوش قبائل کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے، لیکن یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ وہاں زراعتی زندگی بہت اہمیت کی حامل تھی۔ قدیم ایرانی حکمرانوں ہخامنشیوں (Achaemenids)،

پارتھیوں (Parthians)، ارشکانیوں (Arsacids) اور ساسانیوں کے پایۂ ہاے تخت موسمی نوعیت کے ہوا کرتے تھے اور اغلب ہے کہ نقل مکانی کے وقت ریوڑ اُن کے ہمراہ ہوتے ہوں گے اور اُن کے پایۂ ہائے تخت کے چاروں طرف خیموں کے بڑے بڑے پڑاؤ ہوتے ہوں گے۔ اندازہ ہے کہ اُن کی افواج میں کچھ دستے خانہ بدوش قبائل کے بھی ہوتے تھے، لیکن اس امر کا امکان نہیں کہ وہ سلجوقوں اور دور مابعد کی ترک سلطنتوں کی مانند کسی حد تک خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش قبائل کی حمایت پر انحصار کرتے ہوں۔ تقریباً ۳۰۰ء میں ساسانی حیرہ کے نیم خانہ بدوش قبائل لخمی حکمرانوں سے اتحاد کرنے والے قبائل عرب کے خانہ بدوشوں کے حملوں کا دفاع کرتے رہے (دیکھیے بدو، اور العربیہ، بذیل مادہ)۔

اگرچہ عہدِ اسلامی کے ایران کے خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش قبائل کے بارے میں ہم کافی معلومات رکھتے ہیں تاہم اُن کی تاریخ اور نقل مکانیوں کا تفصیل سے سراغ لگانا اکثر مشکل ثابت ہوتا ہے۔ اُن کی تعداد میں مستقل طور پر تبدیلی ہوتی رہی۔ اُن میں سے کچھ خوشحال ہوگئے، جبکہ کچھ مفلس یا مستقل طور پر اقامت پذیر ہوگئے۔ ان قبائل میں سے اکثر اپنے آباء و اجداد کے ناموں سے موسوم تھے، لیکن اُن کی باہمی رشتہ داریاں معاہدوں اور آپس کی شادیوں کی بنا پر قائم ہوتی تھیں۔ یہ شادیاں بعض اوقات سرداروں کے مابین خون کے تنازعات کے فیصلوں کی رو سے سرانجام پاتی تھیں۔ طاقت ور قبائل دیگر قبیلوں کو اپنی طرف مائل کرلیا کرتے تھے اور اُنھیں اپنے اندر ضم کرلیتے تھے یا اُن کے ساتھ مل کر ایک وفاق بنا لیتے تھے۔ ایسے وفاق میں شامل قبیلے مابعد کے دور میں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوجاتے تھے اور ازسرنو مل کر وفاق کی تشکیل کر لیتے تھے۔ مختلف حکمرانوں کی طرف سے اپنی سلطنت کے دور افتادہ حصوں میں سوچے سمجھے طریقے سے قبائل کو الگ الگ طور پر بھی آباد کیا جاتا تھا، جبکہ اُن کے سرداروں کو فوجی یا دیگر خدمات کے عوض اراضی عطا کیے جانے کے باعث وہ ساری سلطنت میں منتشر کردیئے جاتے تھے۔

نسلی، بشری اور عمرانی معیاروں کو نظر انداز کرتے ہوے اسلامی عہد کے خانہ بدوش اورنیم خانہ بدوش قبائل کو بآسانی تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: عرب، ترکمان وترک اور ایران کی فتح سے قبل ہی وہاں مستقل طور پر اقامت پذیر ہونے والے غیر عرب وغیر ترک۔ ان تینوں گروہوں میں سے آخری دو اپنی تعداد اور مسلسل اثرو نفوذ کے لحاظ سے نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ آخری گروہ میں کُرد [رک بآں] لُر [رک بآں]، بلوچ [رک بآں] اور جیل شامل ہیں، جو خانہ بدوش ہونے کی بجاے کاشتکاری، مویشی پروری (دیکھیے ابن حوقل، ۲:۶۔۳۰۷) اور دوسرے پیشوں سے وابستہ تھے۔ کُرد تعداد میں سب سے زیادہ تھے، وہ قبائلی تھے اور جزوی طور پر دیہات میں اقامت پذیر اور نیم خانہ بدوش تھے۔ لُر تیموری عہد تک زیادہ تر اقامت پذیر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان تینوں گروہوں میں سے کوئی ایک بھی ایران تک محدود نہ تھا۔ کُرد شام میں شمال مغرب کی جانب منتشر ہوگئے اور دور جدید میں وہ ایران، ترکی، عراق اور شام میں آباد ہیں۔ شہاب الدین عمری نے لُر قبیلہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی میں مصر اور شام میں موجود تھا۔

قدیم جغرافیہ دان ایران کے حالات کے ضمن میں مجموعی طور پر ایک مستقل اقامت پذیر اور خوشحال آبادی کی تصویر کشی کرتے ہیں جو بہترین قسم کی دستی مصنوعات کے ساتھ ساتھ زراعت، خصوصاً آبپاشی کا پیشہ اپنانے

ہوے تھی۔ وہ چراگاہی اراضی کا بہت ذکر کرتے ہیں، مثلاً ابن حوقل نے بیان کیا ہے کہ پہاڑوں میں بھیڑوں کے ریوڑ پالنا عام پیشہ ہے (الاغنام، ۲: ۲۷۳۔ ۳۷۳)۔ تاہم اُن کی کتب میں وسطی ایشیا کے خانہ بدوش گروہوں کے علاوہ دیگر گروہوں کا خصوصی طور پر کوئی ذکر یا تو اس بنا پر نہیں آیا کہ وہ اُن جغرافیہ دانوں کے مشاہدے میں نہ آئے اور یا زیادہ اغلب ہے کہ دور مابعد کے حالات کے برعکس وہ اس زمانے میں قلیل اور غیر اہم تھے۔ الغرض یہ بالکل واضح نظر آتا ہے کہ ایران میں دیہاتوں کی کمی کا باعث عرب یا سلجوقی نہیں، بلکہ منگول تھے۔ قدیم جغرافیہ دان اور مؤرخ خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش گروہوں کو ''اکراد'' کے مخصوص لفظ سے موسوم کرتے ہیں جس سے وہ لازماً کرد نسل کے لوگ مراد نہیں لیتے، بلکہ غیر عرب اور غیر ترک خیمہ گزین اور گلہ بان مراد لیتے ہیں۔ اسی لیے طبری، تیئسویں اور انتیسویں سالوں کے تحت زگروس (Zagros) کے قبائل کو اکراد کا نام دیتا ہے۔ ابن حوقل بیان کرتا ہے کہ خوزستان (مشرقی ایران) میں شہروں اور دیہاتوں کے درمیان ریگستان ہیں جہاں کرد اور اُونٹوں اور بھیڑوں کے گلے پالنے والے لوگ آباد ہیں (۲: ۴۴٦) اور حسن بن محمد القمی طبرستان کے اکراد کا ذکر یوں کرتا ہے ''جو دیلمیوں کا ایک گروہ ہے'' (تاریخ قم، طبع سید جلال الدین تہرانی، تہران ۱۹۳۴ء، ص ۲٦۱)۔

قدیم صدیوں میں ایران میں خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش خاص طور پر خوزستان، اصفہان اور فارس کے درمیانی علاقے میں مرتکز نظر آتے ہیں۔ اصطخری (ابن حوقل اور دوسروں نے اس کی متابعت میں) فارس کے پانچ قبائلی علاقوں کا ذکر کرتا ہے، جنھیں وہ رموم (واحد رم) کا نام دیتا ہے، یاقوت انھیں ''مَحَالُ الۡاَکۡرَادِ وَمَنَازِلُھُم'' کہتا ہے (دیکھیے Barbier de Meynard: Geograpie de la perse، ص ۲٦۳)۔ ان میں سب سے بڑا جلویہ (کوہ جلویہ) تھا۔ اسے رم الزمیجان بھی کہا جاتا ہے جو خوزستان سے اصفہان تک پھیلا ہوا تھا اور اصطخر، شاپور، ارجان اور بیضا اس کے اطراف پر واقع تھے۔ اس کے تمام قصبات اور دیہات اصفہان کی محصولات جمع کرنے والی انتظامیہ کے تحت تھے۔ باقی ماندہ چار علاقے یہ تھے: رم احمد بن لیث (نیز اسے رم اللولجان بھی کہا جاتا تھا) جو کہ اردشیر خرہ کے کورہ میں واقع تھا۔ رم حسین بن صالح (نیز اسے رم الدیوان کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا تھا)، جو کہ شاپور کورہ میں واقع تھا، رم شہر یار (نیز اسے رم بازنجان بھی کہا جاتا تھا) جو کہ فارس کی محصولات جمع کرنے والی انتظامیہ کے دائرہ اختیار سے باہر تھا اور رم احمد بن الحسن (نیز اسے رم الکاریان بھی کہا جاتا تھا) جو کہ بنوالصفار کے ماتحت تھا، رم الباذنجان کرمان اور اردشیر خرہ کے درمیان واقع تھا۔ الاصطخری کے مطابق ان علاقوں کے باشندے ''عربوں کے رواج کے مطابق'' موسم سرما اور موسم گرما میں چراگاہوں کی تلاش میں گھوما پھرا کرتے تھے، سوائے اُن میں سے چند ایک کے جو سرد سیر (صرود) اور گرم سیر (جروم) میں موجود رہتے تھے۔ ان کے خیموں کی تعداد پانچ لاکھ تھی جن میں سے ہر ایک میں چرواہوں، ملازموں اور دیگر لوگوں سمیت دس افراد کے رہنے کی گنجائش ہوتی تھی۔ اصطخری اس تعداد میں ایک سوار کا اضافہ کرتا ہے، تاہم لکھتا ہے کہ اُن کی درست تعداد کا تخمینہ صرف صدقہ کے رجسٹروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ ایک سو سے زائد قبائل سے تعلق رکھتے تھے، لیکن الاصطخری کو ان میں سے صرف تیس کے نام معلوم ہیں۔ وہ افراد، چوپایوں اور گھوڑوں کے لحاظ سے کثیر تعداد، بہادر اور طاقت ور تھے۔ حکومت کے لیے

اُن کی طاقت کو کم کرنا یا اُن پر غلبہ پانا مشکل تھا۔ وہ بھیڑ بکریوں اور کم تعداد میں اُونٹوں کے مالک تھے، اُن کے مویشی عمدہ قسم کے تھے اور صرف اہل باذنجان کے ہاں اچھی نسل کے گھوڑے پالے جاتے تھے۔ ان کی گلہ بانی کا طریقہ عرب اور ترک قبائل جیسا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ نسلاً عرب تھے، ان رموم میں سے ہر ایک میں کئی کئی قصبات اور دیہات تھے۔ہر رم کا سردار خراج اکٹھا کیا کرتا تھا۔ وہ قافلوں کی حفاظت کا ذمہ دار اور شاہراہوں کا محافظ ہوتا تھا اور حکومتی امور سرانجام دیتا تھا (ص ۹۷۔ ۹۹، ۱۱۳)۔ الادریسی نے چھٹی صدی ہجری/ بارہویں صدی عیسوی کے حالات کے ضمن میں اس سے ملتا جلتا عمومی لیکن قدرے مختصر احوال بیان کیا ہے۔ وہ رم الکاریان کو چھوڑ کر باقی ماندہ چار رموم کا ذکر کرتا ہے۔ وہ مزید بیان کرتا ہے کہ ملک میں بکثرت آباد کرد قبائل خُوا (؟) اور یزید قبیلوں کے پانچ سو خاندان تھے اور ان میں سے ہر ایک قبیلہ میدان جنگ میں تقریباً ایک ہزار گھوڑے لاسکتا تھا۔ ابن درید کے حوالے سے وہ بیان کرتا ہے کہ وہ بنومرہ، بنوعمر اور بنوعامر کے اخلاف میں سے تھے (۱: ۴۰۶۔ ۴۰۷)۔

قبیلوں کے سردار اور شاید ان کے افراد واضح طور پر جاگیروں کے مالک ہوا کرتے تھے۔ الاصطخری بیان کرتا ہے کہ ان قبائلی لوگوں (اہل الرموم) کی مملوکہ جاگیروں (الضیاع) سے محصول، حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت عمرؓ بن الخطاب اور دیگر خلفا کی طرف سے عطا کردہ وثیقہ جات (عہود) کی رو سے مقاسمہ کے ذریعے [پیداوار کا] دسواں، تیسرا اور چوتھا حصہ وغیرہ ادا کیا جاتا تھا۔ ابن حوقل کا بیان اس سے قدرے مختلف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ قبائلی علاقوں (رموم) میں محصول کی تشخیص مقاطعہ، عبرۃ یا مقاسمہ کے ذریعے سے کی جاتی تھی۔ آخری صورت میں محصول دو طریقوں سے عائد کیا جاتا تھا۔ اگر جاگیر قبائلی لوگوں (قَوْمٌ مِنَ اَهْلِ الرُّمُوْم) کے زیر قبضہ ہوتی یا حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ یا خلیفہ کے مقررکردہ حاکم کی طرف سے عطا کردہ وثیقہ رکھنے والوں کے پاس ہوتی تو اُس کا محصول [پیداوار کے] دسویں حصے سے لے کر تیسرے حصے تک ادا کیا جاتا تھا۔ اگر وہ دیہات اپنے باشندوں کی شورش وغیرہ یا کسی دوسری وجہ سے حکومت کے زیرِ قبضہ آئے ہوئے ہوں، تو حکومت کے ساتھ طے پائے جانے والے معاہدات کی رو سے کاشت کار پیداوار کا پانچواں حصہ بطور محصول ادا کرتے تھے (۲: ۳۰۲۔ ۳۰۳)۔

فارس نامہ کا مصنف، ابن بلخی وثوق سے بیان کرتا ہے کہ فارس کے خانہ بدوش (کردان)، جو کہ ساسانی فوج کا قابل ذکر اور اہم حصہ تھے، اسلامی حملوں کے دوران مارے گئے۔ اُس کے زمانے میں فارس میں رہنے والے خانہ بدوش اُس گروہ کے اخلاف تھے، جنہیں آل بویہ کا حکمران عضدالدولہ (م ۳۷۲ھ/۹۸۲ء) اصفہان سے یہاں [فارس] لایا تھا۔ ابن بلخی ان خانہ بدوش گروہوں کو شبان کارہ کے نام سے موسوم کرتا ہے، اُنہوں نے واضح طور پر سابقہ رموم کی جگہ لے لی یا انہیں اپنے اندر جذب کر لیا۔ ابن بلخی کے زمانے میں (اُس نے فارس نامہ کا انتساب محمد بن ملک شاہ، م۵۱۱ھ/۱۱۱۷ء کے نام کیا)۔ فارس قبائل کے حملوں اور شورشوں سے بری طرح متأثر ہوتا رہا، حتیٰ کہ محمد بن ملک شاہ کے نامزد کردہ حاکم فارس اتابک چولی نے باغیوں کے ساتھ متعدد جھڑپوں کے بعد صوبے میں امن وامان بحال کردیا۔ ابن بلخی کے بیان کے مطابق ''شبان کارہ'' کے پانچ قبیلے تھے، جو ابتداءً فارس میں گلہ بانی اور لکڑی کی کٹائی کا کام کرتے تھے۔ آل بویہ کے اقتدار کے انحطاط پر اُن کی قوت میں اضافہ ہوا، حتیٰ کہ آخر کار اُن کے پانچ قبیلوں میں سے زیادہ طاقت ور قبیلے رامانی کا

سردار فضلویہ فارس کے بڑے حصے کا مالک بن بیٹھا اور آل بویہ سے وظیفہ حاصل کیا۔ بعد میں الپ ارسلان نے کاورد کو فارس میں امن وامان قائم کرنے کے لیے بھجوایا، فضلویہ مزاحمت نہ کرسکا اور واپس الپ ارسلان کے دربار میں جاپہنچا۔ اُسے صوبے میں محصول اکٹھا کرنے کے لیے دوبارہ فارس بھجوادیا گیا، اُس نے پھر بغاوت کردی اور نظام الملک کی قیادت میں سلجوقی فوج نے اُسے محصور کرلیا اور وہ گرفتار ہوا بعد ازاں وہ بچ نکلا اور بغاوت کو جاری رکھا، مگر آخر کار پکڑا گیا (فارس نامہ، طبع G.Le Strange، R.A.Nicholson، G.M.S ، ۱۹۶۲ء، ص ۱۶۴، ۱۶۶؛ احمد بن زرکوب: شیراز نامہ، طبع بہمن کریمی، تہران، ۱۹۳۱ء۔ ۱۹۳۲ء، ص ۳۸۔۳۹).

ان پانچ قبیلوں میں ایک اسماعیلی قبیلے کے بارے میں ابن بلخی بیان کرتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ شریف تھا اور اسلامی فتوحات کے بعد دشت اُرد میں آباد ہوگیا تھا، مسعود بن محمود کے سپہ سالار تاش فتراش نے اُسے اصفہان کے علاقے سے نکال دیا تھا۔ یہ لوگ پہلے جنوب کی طرف گئے اور پھر آلِ بویہ کے دباؤ کے تحت مغرب کی طرف جاکر دار ابجرد کے نزدیک آباد ہوگئے۔ آپس کی کشمکش کی بنا پر وہ کمزور ہوگئے اور یوں فضلویہ کو ان کے معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع میسر آیا (فارس نامہ، ص ۱۶۴۔۱۶۵؛ شیراز نامہ، ۳۷۔۳۸)۔ کرزوبی بھی گلہ بانی کرتے تھے۔ آلِ بویہ کے اقتدار کے خاتمہ پر انہوں نے کازرون اور اس کے نواح پر قبضہ کر لیا، حتیٰ کہ وہ چولی کے ہاتھوں وہاں سے بے دخل ہوے۔ فضلویہ نے مسعودی نام سے موسوم ایک غیر معروف قبیلہ کی ساخت پرداخت کی۔ فارس کے سلجوقی حاکم رکن الدین خمارتکین نے انہیں جاگیریں (اقطاع) عطا کیں۔ بعد کے دور میں انہوں نے فیروز آباد اور شاپورخرہ کے اکثر حصے پر قبضہ کر لیا، بالآخر چولی نے ان کی سرکوبی کی (فارس نامہ، ص ۱۶۷)۔ پانچواں قبیلہ شکانی تھا جو گرم سیر کے پہاڑوں میں اقامت پذیر تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ رہزنی کے عادی اور بدقماش لوگ تھے۔ چولی نے انہیں بھی زیرنگیں کیا (فارس نامہ، ص ۱۶۷)۔ مابعد عہد میں شبان کارہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، یا تو وہ کسی جگہ مستقل طور پر اقامت پذیر ہوگئے یا وہ چولی کے حملوں کی تاب نہ لاسکے اور اپنے خود مختارانہ تشخص کو ختم کر بیٹھے۔ یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ لُر نے انہیں اپنے اندر کھپا لیا ہو جو چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی کے دوران میں بڑی اہمیت اختیار کر گئے تھے.

لُر بزرگ [رک بآں]کا بانی شام کے جبلِ سُماق کا ایک کرد ابوالحسن فضلویہ تھا۔ اس کے کچھ اخلاف تقریباً ۵۰۰ھ/۱۰۰۶ء میں میا فارقین اور آذربیجان سے ہوتے ہوے اشتران کوہ کے شمال میں آپہنچے۔ ان کے سردار ابو طاہر بن علی بن محمد نے شبان کارہ کے خلاف ایک مہم میں سلغر سنقر (۵۴۳۔۵۵۶ھ) کے لیے خصوصی خدمات سرانجام دیں۔ جن کے عوض اُسے کوہ جلویہ کا علاقہ ملا اور اسے لُرستان کی تسخیر پر مامور کیا گیا۔ بعد میں سنقر سے اس کا تنازعہ ہوگیا اور اس نے آزادانہ حیثیت اختیار کر لی۔ ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز پر مزید شامی قبائل اُس کے بیٹے ہزاراسپ سے آملے۔ ان میں دو عرب قبیلے عقیلی اور ہاشمی اور اٹھائیس دوسرے تھے۔ جن میں بختیاری، جوانکی، جتوند، لراوی اور مماساتی (ممسنی، دیکھیے بدلسی: شرف نامہ، قاہرہ، ب ت، ص ۴۴ وبعد اور لر) وغیرہ قبائل تھے۔ ان تحریکات کے نتیجے میں شول بے خانماں ہوے اور فارس کی طرف چلے گئے (تاریخ گزیدہ، ص ۵۳۷۔۵۳۹ اور دیکھیے لر بزرگ).

قدیم جغرافیہ دان کرمان کے ان نیم خانہ بدوش

قبائلی گروہوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو قفص [کچ] اور بلوص (بلوظ، بلوچ) کہلاتے تھے۔ حدود العالم میں بیان کیا گیا ہے کہ مؤخرالذکر قوم ایک طرف جرفت اور بافت کے مابین میدانی علاقے میں اور دوسری طرف کوفج کے پہاڑوں پر قابض ہوگئی۔ ان کا پیشہ گلہ بانی تھا اور وہ پیشہ ور رہزن، نڈر اور ظالم تھے۔ ان کی تعداد آلِ بویہ کے فناخسرو نے مختلف جنگی تدابیر کے ذریعے گھٹائی (ص ۱۲۴)۔ المقدسی بیان کرتا ہے کہ عضدالدولہ نے بھی انہیں تاخت وتاراج کیا (ص ۴۷۱)۔ ابن حوقل لکھتا ہے کہ وہ منوجان اور ہرمز کی سرحدوں پر اقامت پذیر تھے اور یہ کہ وہ کردوں (یعنی نیم خانہ بدوش یا خانہ بدوش خیمہ زنوں) کی ایک شاخ تھے اور یہ کہ وہ عربی النسل ہونے کے دعویدار تھے اور وہ اپنی تعداد تقریباً دس ہزار بتاتے تھے۔ حکومتِ وقت انہیں پرسکون رکھنے کے لیے وظائف دیتی تھی۔ اس کے باوجود وہ رہزنی کے مرتکب ہوتے رہتے تھے اور کرمان، صحراے سیستان اور فارس کی سرحدات کے مابین آمدورفت کے لیے ایک مستقل خطرہ بنے ہوے تھے۔ آلِ بویہ کے بادشاہ نے ان کی طاقت کو ختم کیا اور وہ منتشر ہوگئے (۲:۳۰۹۔۳۰۱)۔ الاصطخری کے بیان کے مطابق وہ شیعہ تھے (ص ۱۶۷)۔ صاحب حدود العالم لکھتا ہے کہ کوہستانِ کوفج کے باشندے سات قبائل میں منقسم تھے اور ہر قبیلے کا اپنا سردار تھا اور یہ کہ حکومت کے محصلین ان کے پہاڑوں میں نہیں آتے تھے بلکہ سردار مقاطعہ کے حساب سے سالانہ رقم ادا کر دیتے تھے (ص ۱۲۴)۔ الاصطخری اور ابن حوقل کے بیانات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، لیکن وہ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ قفص ریوڑ پالتے تھے اور بدوؤں کے ہاں جیسے سیاہ خیموں میں رہتے تھے اور امن پسند ہونے کی بنا پر مسافروں سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے تھے (الاصطخری، ص ۱۶۴؛ ابن حوقل، ۲:۳۱۰) اور وہ شیعہ تھے (ص۱۶۷، ۲:۳۱۲)۔ ابن حوقل خواش کے نواح میں اونٹ پالنے والے خانہ بدوشوں یا گلہ بانوں کا ذکر بھی کرتا ہے (۲:۳۱۳)۔ سلجوقی دور میں کاؤرد قفص اور بلوچ قبائل پر قابو پانے کے لیے کچھ اقدامات کرنے میں کامیاب رہا اور اس نے مؤخر الذکر کو یم اور جرفت کے درمیان واقع کوہستانی علاقوں میں مقید کر دیا (دیکھیے افضل الدین عقدالاولٰی، طبع علی محمد عامری نائینی، تہران ۱۹۳۲ء۔ ۱۹۳۳ء، ص ۶۲)۔ سلطان سنجر کی وفات کے بعد کرمان میں غز قبیلہ کے بکثرت ورود سے بلوچ کسی حد تک بے خانماں ہوے اور مشرق کی طرف مزید دھکیل دیئے گئے۔

جہاں تک خوزستان اور خلیج فارس کے ساحلی علاقے کے عرب قبائل کا تعلق ہے۔ ان کی اکثریت اسلامی فتوحات کے ساتھ آگئی، اگرچہ ان میں بعض کی بستیاں ان فتوحات سے قبل وجود میں آچکی تھیں، جس زمانے میں مسلمان عرب ایران پہنچے۔ وہ اپنے خانہ بدوشانہ پس منظر سے پہلے ہی منقطع ہوچکے تھے، ان میں اکثر محافظ فوجی کالونیوں (Garrison Cities) سے آئے تھے اور قصبوں میں اقامت پذیر تھے۔ یعقوبی قزوین (ص ۷۰)، نہاوند (ص ۷۳)، دینور (ص ۶۹)، صیمرہ (ص ۲۶۹۔۲۷۰)، طوس (ص ۸۳) اور نیشاپور (ص ۸۵) کی مخلوط آبادی اور مرو (ص ۸۷) کے عربوں کے بونازد، بنو تمیم اور دیگر قبائل کا ذکر کرتا ہے۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ بست کے باشندے یمن سے وارد ہونے والے حمیر قبیلے کے اخلاف ہونے کا دعوی کرتے تھے (ص ۸۹)۔ اسی طرح سے بہت سے عرب ہرات میں رہتے تھے (ص ۸۸؛ حدود العالم، ص ۱۰۴)۔ ابن حوقل بیان کرتا ہے کہ قم کی آبادی کی اکثریت عرب نژاد ہے اگرچہ اس کی زبان فارسی ہے (۲:۳۷۰؛ نیز دیکھیے تاریخ

قم، ص ۲۴۰ وبعد)۔ محمد بن محمد قمی حمزہ کی نایاب تاریخ اصفہان کے حوالہ سے حجاج کے عہد میں اصفہان اور اس کے نواح میں عربوں کی بستیوں کا ذکر کرتا ہے (تاریخ قم، ص ۲۶۴)۔ یاقوت جرفت میں بنو ازد اور بنو مہلّب کے اخلاف کا ذکر کرتا ہے (Barbier de Meynard، ص ۱۸۵)۔ یزد میں بھی بنو تمیم اور بنو تازیان کی بعض بستیوں کا پتہ چلتا ہے (جامع مفیدی، طبع ایرج افشار، تہران ۱۳۴۲ھ/۱۹۶۴ء۔ ۱۹۶۵ء، ۱:۳۶)۔ ان متعدد گروہوں میں سے زیادہ تر مقامی آبادی کا حصہ بن گئے۔ کچھ ایسے خانہ بدوش گروہ بھی تھے جو زیادہ تر جنوبی ایران، کرمان، سیستان اور خصوصاً خراسان سے آئے [رکّ بہ العربیہ بذیل مادہ]۔ صاحب حدود العالم جزجانان کے گھاس کے میدان میں تقریباً ۲۰ ہزار عربوں کی موجودگی کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کافی تعداد میں بھیڑوں اور اونٹوں کے مالک تھے اور خراسان بھر میں بکھرے ہوے عربوں سے زیادہ متمول تھے۔ جزجانان کا بادشاہ ان کے امیر کی نامزدگی کرتا تھا جسے وہ صدقہ کی ادائیگی کیا کرتے تھے (ص ۱۰۸).

قبائل کا تیسرا گروہ ترکمان اور ترکوں کا تھا۔ یہ زیادہ تر سلجوقی، منگول اور تیموری مہمات کے ہمراہ آیا تھا اور اس میں ایسے قبائل شامل تھے جو ایران کے راستے ایشیاے کوچک اور شام میں داخل ہوے اور پھر آق قویونلو، قرا قویونلو اور صفوی سلطنتوں کے ہاں مشرق کی طرف واپس آ گئے۔ یہ گروہ دوسرے دونوں گروہوں سے اس طرح متمیز ہے کہ ترکمان اور ترک قبائل کی نقل وحرکت کی بدولت کم از کم اصلاً قبائلی حمایت پر مبنی سلطنتیں معرضِ وجود میں آئیں۔ دیگر قبائلی گروہوں، خصوصاً مغربی اور شمال مغربی ایران کے کردوں اور عراق اور جزیرہ کے عربوں نے خود مختار مملکتیں قائم کیں، لیکن ترکمان اور ترکوں کی طرح اپنے اقتدار کو سارے ملک میں وسعت دینے میں کامیاب نہ ہوے.

چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے اختتام پر اُغز/غز قبائل نے وسط ایشیا سے مغرب کی طرف نقل مکانی کا آغاز کر دیا۔ ان کا پہلا گروہ منخشلاق کی طرف چلا گیا۔ دوسرا گروہ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی کے چوتھے عشرے میں ایران پہنچا۔ ان کا بڑا حصہ، جس میں غز [رکّ بآں] کے کئی سارے خود مختار جتھے تفوق رکھتے تھے، سلجوق خاندان کے زیر قیادت تھا جو کہ ان ترکمانی یا ترک سلطنتوں کے قائم کرنے میں سرفہرست تھا۔ تیسرا گروہ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی میں بحیرۂ اسود کے راستے بلقان چلا گیا جب کہ چوتھا اور نسبتاً بڑا گروہ، جو کہ جزوی طور پر اقامت پذیر تھا، سیر دریا کے خطے میں رہا (فاروق سومر: *Oguzlar (Tishmenler)*، انقرہ، ۱۹۶۷ء)۔ روایت کے مطابق اغز چوبیس قبائل میں منقسم ہوے ان میں سے بائیس مع اپنے تمغوں کے محمود کاشغری کے علم میں تھے، لیکن صرف کنک (جس سے کہ سلجوق تعلق رکھتے ہیں)، ایوا، ذوجر، یغمہ، سلغور اور اوشار (افشار) منگول عہد سے قبل نمودار ہوتے ہیں۔ رشید الدین بھی چوبیس قبائل کا ذکر کرتا ہے، لیکن اس کی فہرست اور محمود کاشغری کی فہرست میں یکسانیت نہیں ہے (*Pre-Ottoman Turkey*: C.Cahen، لنڈن ۱۹۶۸ء، ص ۱۹ و بعد).

سلجوقی اگرچہ خانہ بدوش قبائلی نقل مکانی کے رہنما تھے۔ تاہم وہ شہری زندگی اور اسلامی تہذیب سے آشنا نہ تھے۔ آغاز سے ہی وہ مستقل دارالحکومت رکھتے تھے اور منگول ایل خانوں کے برعکس مقامی آبادی سے علیحدہ خیموں کے پڑاؤ میں رہتے بستے دکھائی نہیں دیتے، کم از کم اسی حد تک، ایران آنے والے زیادہ تر خودمختار یا نیم

خودمختار غز جتھے غیر مہذب تھے اور ان کی سرگرمیاں غیر مربوط تھیں۔ ان کے رہنماؤں اور سلجوقوں میں فرق یہ تھا کہ مؤخر الذکر مجموعی طور پر اپنے پیروکاروں پر تسلط رکھتے تھے۔ طغرل بیگ [رک باّں]اور الپ ارسلان [رک باّں] نے خود کو لائق سپہ سالار اور حکمران ثابت کیا۔ انہوں نے مشرقی خلافت کے علاقوں میں رائج حکومتی ڈھانچے کو اپنا کر اپنے قبائلی پس منظر کی رو سے اس کی نئی تشریحات کیں (A.K.S. Lambton: *The Internal Structure of Saljuq Empire*، در *The Cambridge History of Iran* ج ۵، کیمبرج ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۳-۲۸۲)۔ مجموعی طور پر سلجوقی حملے سے کوئی قابل ذکر خلل اندازی نہ ہوئی اور یہ غزنوی دور کے اواخر میں سرکاری فوجی دستوں کی نقل وحرکت کے باعث پیدا ہونے والی افراتفری سے زیادہ نہ تھی۔ اس میں ملوث افراد کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی، شاید دس ہزار کیونکہ اپنے گلوں کے ہمراہ سلجوقیوں کی آمد درحقیقت، ملک کے لیے فائدہ مند رہی ہوگی، کیونکہ یہ قصبات کے لیے گوشت، دودھ اور صنعت کے لیے اون اور کھالوں کی بہم رسانی کرتے اور چراگاہوں کی چری ہوئی گھاس کی بڑھوتری اور شادابی کا باعث بنتے تھے۔ ان کے اونٹوں کے گلے سامانِ تجارت کے لیے اضافی [ذریعہ] نقل وحمل بن کر بھی سود مند ہوتے تھے.

یہ بات پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچ سکتی کہ غز قبائل، ماسوائے مغربی آذربیجان اور بالائی عراق میں کردوں اور بدووں کے، دیگر قبائلی اور خانہ بدوش گروہوں سے برسرپیکار ہوئے۔ متذکرہ علاقوں میں غز کے اولین جتھوں کی مزاحمت کی گئی۔ اوّلین آباد کاری صرف کوہستانِ کرد کی نچلی ڈھلوانوں پر ہوئی۔ مابعد کے دور میں، جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے، ایک طرف تو سلجوقوں کے ساتھ دوسری طرف شبان کارہ اور قفص کے ساتھ ان کی جھڑپیں ہوئیں، لیکن یہ سب کچھ سلجوقوں کی مساعی سے ہوا جو اس وقت ایک سلطنت کے حکمران بن چکے تھے اور اپنی مرکزی حکومت کے اقتدار کو مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ یہ جھڑپیں چراگاہوں پر قبضہ کے لیے حریف خانہ بدوش گروہوں کے مابین ہونے والی جھڑپوں جیسی نہ تھیں۔ عمومی طور پر غز قبائل فارس، لُرستان، کوہستانِ قفص، طبرستان اور کردستان جیسے علاقوں میں ...... بڑی حد تک ...... خود کو مستحکم کرتے دکھائی نہیں دیتے، جہاں کہ پہلے ہی قبائلی اور نیم خانہ بدوش افراد آباد تھے۔ یہاں ایک مسئلہ درپیش آتا ہے جس کا جواب ہم اپنی موجودہ معلومات کی رُو سے نہیں دے سکتے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ آیا اس علاقے میں خلل اندازی یہاں کے آبپاش [مزروعہ] رقبے میں کمی کا باعث بنی، یا یہ کہ انہوں نے زیادہ تر اس اراضی سے استفادہ کیا جو وہاں پہلے سے موجود آبادی آبپاش یا ریفی زراعت کے لیے استعمال نہ کرتی تھی.

جب سلجوق ایک سلطنت کے فرمانروا بنے تو وہ غز قبائل کی طرف سے بہم پہنچائی جانے والی اساس اقتدار کی نسبت زیادہ مستحکم اساس تلاش کرنے پر مجبور ہوگئے۔ انہوں نے فوجی قوت اور صوبائی والیوں کے ضمن میں ان ترک غلاموں اور آزاد افراد پر بہت زیادہ انحصار کیا جو کہ اپنے خانہ بدوشانہ قبائلی پس منظر سے قطع تعلق کرچکے تھے۔ تاہم غز قبائل کے معتدبہ گروہ (یا ترکمان جیسا کہ دارالاسلام میں آجانے والے غز مسلمانوں کو عربی وفارسی مآخذ میں عموماً موسوم کیا جاتا ہے) ملک میں موجود تھے اگرچہ وہ مغرب کی طرف شام اور ایشیاے کوچک کی طرف نقل مکانی کرنے کا رجحان رکھتے تھے۔ ان وجوہ کے علاوہ ترکمان زیادہ تر بالائی عراق، گرگان، مرو اور

آذربیجان میں رہائش پذیر تھے جب کہ خوزستان اور فارس وغیرہ میں ان کی معمولی آبادیاں تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سلطان کی طرف سے حاکم مقرر کیے جانے والے ان کے بہت سے سردار مرکزی حکومت کے انحطاط پر مقامی حکمران بن بیٹھے۔ ان سرداروں میں سے ارتقد [رک باں] قابل ذکر ہیں.

سلطان سنجر کے عہد میں گرگان، دیہستان اور مرو کے ترکمان حکومت کی طرف سے مقرر کردہ شحنہ [رک باں] کے ماتحت ہوا کرتے تھے جو ان کے سرداروں کو ان کے خیموں کی تعداد کے مطابق چراگاہیں اور پانی کے ذخائر عطا کیا کرتا تھا اور اسی کی وساطت سے وہ حکومت سے رجوع کیا کرتے تھے۔ وہ چراگاہ کا محصول اور شحنہ کے مکتب کے لیے محصول ادا کرتے تھے (عتبة الکتبہ، طبع محمد عزوینی و عباس اقبال، تہران ۱۹۵۰ء، ص ۸ تا ۱۲، ۸۴ تا ۸۵)۔ ترکمانوں کے لیے خصوصی وظائف (نان پارہ) کا ذکر اکثر ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نظام الملک نے طے کر رکھا تھا کہ کتنی رقوم انہیں بطور وظیفہ عطا کی جائیں اور سفارش کی تھی کہ انہیں کافی تعداد میں دربار میں حاضر رکھا جائے تاکہ ان میں سے کچھ کو فوجی خدمت پر مامور کیا جاسکے اور کچھ کو اپنے قبیلے کے لوگوں کی نیک چلنی کی ضمانت میں یرغمال کے طور پر رکھا جاسکے۔ سلطان سنجر کے عہدِ اقتدار کے اختتام تک خراسان میں ترکمانوں کو وظائف عطا کیے جانا غالبًا بنیادی طور پر فوجی یا دیگر خدمات کی بجائے ان کی نیک چلنی کی یقین دہانی کی خاطر ہوا کرتا تھا.

چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی کے وسط تک ماوراء النہر پر خطائیوں کی فتح سے ان غز قبائل میں بے چینی پیدا ہوئی جو وسط ایشیا میں رہ گئے تھے اور سلجوقی حکومت کے لیے اس کی سرحدوں پر مقیم غزوں کو زیر تسلط لانا نہایت مشکل ہوگیا۔ سنجر کے ساتھ ان کے تعلقات ایک منظم حکومت کی طرف سے خانہ بدوشوں کو زیرنگیں لانے میں درپیش مشکل اور اقامت پذیر آبادی اور خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش کے مابین تعلقات میں موجود مفاہمت کی کمی کو واضح کرتے ہیں۔ غز قبائل کی طرف سے بھیڑوں کی صورت میں شاہی خزانے میں جمع ہونے والے سالانہ خراج پر مناقشوں اور اس کی وصولی میں بدعنوانیوں کے نتیجے میں سنجر کی افواج اور ان کے مابین بالآخر تصادم ہوا۔ ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء میں ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں سنجر گرفتار ہوا اور خراسان بھیج دیا گیا (مزید دیکھیے A.K.S Lambton: Landlord and Peasant in Persia، ص ۵۸-۵۹)۔ بعد میں سنجر قید سے بھاگ نکلا لیکن اپنا اقتدار بحال نہ کر سکا۔ ۵۵۲ھ/۱۱۵۶ء میں اس کی وفات کے بعد مزید غز خراسان آئے۔ ملک دینار کی سربراہی میں بعض غزوں نے کرمان پر قبضہ کر لیا مگر یہ غز سلجوقوں کی طرح سلطنت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوے اور ان کے برعکس بڑی تباہی اور خلل اندازی کا باعث بنے (مزید دیکھیے محمد ابراہیم: تاریخ سلجوقیانِ کرمان، طبع M.T. Houtsma لائڈن، ۱۸۸۶ء، ص ۱۰۶ ببعد)۔ سلجوق سلطنت کے زوال پر فارس میں خانہ بدوشی نے ازسرنو اہمیت اختیار کر لی، جب کہ سلغرد جندمان کے خطے کے باشندے نیم خانہ بدوش قبائل کواپنی طاقت کی بنیاد بنا کر اپنے اقتدار میں توسیع کر رہے تھے (احمد بن زرکوب: شیراز نامہ، ص ۴۸-۴۹)۔ تاہم دورِ مابعد کے سلغرد نے، اقامت پذیر حکمرانوں کے عام دستور سے موافقت اختیار کر لی.

منگولوں کے حملے کے ساتھ ہی ترک قبائل کی ایک نئی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ جنگی مقاصد کے لیے منظم شدہ قبائل کی طرف سے کیا جانے والا یہ حملہ سلجوق حملے

سے مختلف نوعیت کا تھا۔ سیاسی اقتدار قبائلی سرداروں کے ہاتھ میں رہا۔ جو فوجی اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے وہ اقامتی طرز زندگی کے مخالف تھے اور کسانوں اور قصبات کے باشندوں کو لوٹا کرتے تھے۔ اس حملے سے وسیع تباہی ہوئی اور قتل عام ہوا۔ منگولوں کے پیچھے پیچھے آنے والے قبائل کی لوٹ مار اور ان کے گلوں کے لیے چراگاہوں کی ضرورت کی بنا پر اراضی کا اکثر حصہ بنجر ہوگیا (دیکھیے، رشید الدین: تاریخ مبارکِ غازانی، طبع John، در GMS، شمارہ ۱۴، (لنڈن ۱۹۴۰ء): ۳۴۹ ببعد)۔ چراگاہیں قبائلی سرداروں کو عطا کی گئیں یا انہوں نے از خود ان پر قبضہ کر لیا۔ ان میں اکثر کو اراضی عطیے کے طور پر ملتی، جسے وہ بعض اوقات نجی ملکیت بنا لیتے، اور انہیں علاقے میں رہنے والے لوگوں پر اقتدار دے دیا جاتا۔ مختلف نئے محصولات بشمول قبچر [رک بآں] عائد کیے گئے، جو غالبًا شروع شروع میں خانہ بدوشوں کی طرف سے ادا کیا جانے والا چراگاہی محصول تھا (اگرچہ بعد میں اس نے اقامت پذیر آبادی پر عائد کیے جانے والے محصول کی صورت اختیار کر لی)۔ غازان خان (۶۹۴ھ/۱۲۹۵ء۔ ۷۰۳ھ/۱۳۰۴ء) کے عہد میں زراعت کی ترقی اور خانہ بدوش فوجی اشرافیہ کی قوت میں کمی کرنے کے لیے ایل خانوں کی پالیسی میں ایک ترمیم ہوئی۔ یہ ترمیم شدہ پالیسی جزوی طور پر کامیاب رہی (مزید دیکھیے I.P Petrushevsky : *"The Socio-economic Condition of Iran under the IL-Khans"* در *The Cambridge History of Iran*، ۵:۴۸۳۔۵۳۷ اور A.K.S. Lambton: *Landlord and Peasant in Persia*، ص ۷۷۔۱۰۴).

ایل خانی سلطنت کا مرکز آذربیجان تھا۔ وہاں پر اور اُران میں نسبتًا قلیل مقدار میں ایشیاے کوچک میں ایل خانوں کے ساتھ آنے والے قبائل اکثر آباد تھے۔ ان میں سے بہت سے قبل ازیں ایران میں آئے ہوے ترک قبائل سے قریبی رشتہ داریاں رکھتے تھے۔ ہلاکو کے ساتھ آنے والے یا اس کے ساتھ ملنے والے قبائل میں افشار بھی تھے (جن کے کچھ گروہ بظاہر سلجوقوں کے ساتھ نقل مکانی کر کے آئے تھے۔ دیکھیے افشار)۔ وہ خاص طور پر آذربیجان میں اقامت پذیر ہوگئے اور بتدریج ان کی تعداد اور قوت میں اضافہ ہوتا گیا۔

حمداللہ مستوفی سلیمانیہ کے جنوب کی طرف کچھ علاقوں کا ذکر کرتا ہے، جہاں منگولوں کے بسائے ہوے سیکڑوں گاؤں تھے اور ان کے ساتھ اچھی چراگاہیں تھیں (نزہۃ القلوب، طبع G.M.S G.Le Strange، ۱۹۱۹ء، ص ۶۴۔۶۵): نیز وہ مغان کے گھاس کے میدان میں منگولوں کے گرمائی مستقر کا ذکر بھی کرتا ہے (ص ۸۳)۔ اس کے بیان کے مطابق رے کے نزدیک سوج بلاغ میں زیادہ تر خانہ بدوش بستے تھے (صحرا نشین، ص ۶۳)۔ ان میں قرہ اولی بھی غالبًا شامل تھے۔ یہ تعداد میں زیادہ نہیں تھے اور بالآخر افشار قبیلہ میں مل گئے، اگرچہ ان میں سے بعض دیگر ترکمان قبیلوں میں مدغم ہوگئے (قائم مقام: منشات، طبع جہانگیر قائم مقامی، تہران ۱۹۵۹ء۔ ۱۹۶۰ء، ص ۳۶۳)۔ حمداللہ کے بیان کے مطابق نہاوند۔ ملائر کے علاقے میں بہت سے خانہ بدوش کرد قبائل (خیل اکراد صحرا نشین) بھی آباد تھے (اگرچہ اکراد سے محض وہ قبائل مراد لیتا ہے جو نہ ترک تھے اور نہ عرب)، وہ سات ہزار بھیڑیں بطور سالانہ خراج ادا کرتے تھے (ص ۷۴)۔ اس زمانے میں لُرستان میں خانہ بدوشی کے دستور کی توسیع بھی نظر آتی ہے۔ معین الدین نطنزی بیان کرتا ہے کہ اتابک شمس الدین الپ ارغون نے، جسے ہلاکو نے لُرستان کا والی مقرر کیا تھا، صوبے کو تباہ شدہ حالت میں اور اس

کے کسانوں کو انتشار میں پایا۔ اس نے ایک سال کے لیے محصول کی معافی دے دی اور عمدہ نظم ونسق کی بدولت زرعی خوشحالی بحال کر دی۔ صوبے کی خوشحالی کا ایک سبب یہ تھا کہ اتابک نے منگولوں کا اتباع کرتے ہوے گرمائی مستقر سے سرمائی مستقر کی طرف منتقلی کے عمل کو اپنایا۔ وہ موسم سرما ادج اور شوش میں بسر کرتا اور موسم گرما زردق کے پہاڑوں میں گزارتا، جہاں سے زندہ رود نکلتی ہے، تاکہ سپاہیوں کے مویشیوں کو جو کے چارہ کی احتیاج نہ رہے اور رعیت لوگوں کے ظلم وستم کا نشانہ نہ بنے (منتخب التواریخ معینی، طبع J.Aubin، تہران ۱۹۵۷ء، ص ۴۳۔۴۴)۔ بگدلو ان دیگر غز قبائل میں سے تھے جو بظاہر منگولوں کے ہمراہ ایران آئے، یہاں سے آگے چلے گئے اور بعد میں صفویوں کے ساتھ واپس آئے۔ وہ پہلے پہل نیانوں کے ساتھی تھے اور پھر جرمغون کے ساتھ ایران آئے۔ ان میں سے بعض شام چلے گئے جہاں وہ شاملو کہلائے۔ وہ صفویوں کے ساتھ ایران واپس آئے اور صفویوں اور افشاریوں کے ماتحت رہ کر طاقت ور بن گئے۔ قاچاری عہد میں ان کے مراکز مزدقان نزدِ تہران اور مراغہ تھے (قائم مقام: کتابِ مذکور، ص ۳۶۸)۔ بگدلو کے کچھ قلیل التعداد گروہ انیسویں صدی عیسوی میں تہران کے قرب میں موجود پائے گئے۔ روایت کے مطابق قاچار بھی منگولوں کے ساتھ ایران میں وارد ہوے۔ پھر شام کی طرف چلے گئے اور تیمور کے ساتھ ایران واپس آئے.

منگول دور کے اختتام تک نئے ناموں کے ساتھ قبائل کے وفاق وجود میں آتے نظر آنے لگے۔ خصوصاً آق قویونلو [رک بآں] کا وفاق (دیکھیے C.Cahen، کتاب مذکور، ص ۳۱۴ بعد؛ نیز آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے اختتام پر اس خطے میں ترکمان اور عرب قبائل کے انتشار وتقسیم کے لیے دیکھیے J. Aubin :Un Soyurghal Qara-Qoyunlu Concernant le Buluk Bawanat -Harat- Marwast، در Documents from Islamic Chanceries، آکسفرڈ ۱۹۶۵ء، ص ۴۷)۔ تقریباً ۷۶۷ھ/۱۳۶۴ء سے خراسان میں بھی خانہ بدوشی کو ازسرنو فروغ حاصل ہوا (دیکھیے: معین الدین نتنزی: کتاب مذکور، ص ۱۹۷ وبعد).

اسی اثنا میں مشرقی ترکستان میں منگول سلطنت کے خاتمے پر منگولستان کے چغتائی خاں کی قیادت میں خانہ بدوشوں نے مغربی ترکستان کی جانب رخ کیا۔ یہ کارروائی ایک جوابی حملے کا باعث بنی اور بالآخر مغربی ترکستان کے خانہ بدوشوں کو متحد کر کے تیمور وسطی ایشیا کے خانہ بدوشوں کے خلاف اسلامی سرحدی علاقوں کے محافظ کی حیثیت سے ابھرا اور یہ اقامت پذیر آبادی کے لیے سلامتی وتحفظ کا اقدام تھا جس میں کہ وہ اپنی تجارتی سرگرمیوں اور مذہبی زندگی کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھنے کے اہل رہے (مزید دیکھیے معین الدین نتنزی: کتاب مذکور و H. Hookham : Tamerlane the Conqueror لنڈن ۱۹۶۲ء)۔ چغتائی کے حامی خانہ بدوشوں اور قپچق گروہوں کو کچلنے کے بعد تیمور نے ایران اور نواحی ممالک میں مہمات کا ایک سلسلہ جاری رکھا جس کے نتیجے میں نئی قبائلی تحریکیں ظہورپذیر ہوئیں۔ تیمور کی عسکری تنظیم منگولوں کی طرح کی تھی۔ اس کی طاقت کی اساس ایک عسکری قبائلی اشرافیہ تھی جو اپنے ریوڑوں کے ساتھ ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ کی طرف منتقل ہوتی رہتی تھی۔ کلاوجو (Clavijo) تیمور کے حامی خانہ بدوش قبیلوں کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہے: ”تیمور جب اپنے آدمیوں کو جنگ کے لیے طلب کرتا تھا تو وہ سب اکٹھے ہو کر اس کے ساتھ چل پڑتے تھے۔ وہ اپنے ریوڑوں کو اپنے درمیان میں لے کر چلتے تھے۔ ان کی بیویاں اور بچے

لشکر کے پیچھے پیچھے ہوتے تھے اور زیر حملہ علاقوں میں ان کے ریوڑ خصوصاً بھیڑیں، اونٹ اور گھوڑے فوج کے لیے خوراک کا کام دیتے تھے Clavijo's embassy to (Tamerlane 1403-1406، اسپینی زبان سے ترجمہ G.Le Strange، لنڈن، ۱۹۲۸ء، ص ۱۹۱)۔ وہ محصولاتی مقاصد کے لیے خانہ بدوشوں کے ریوڑوں کی گنتی کا ذکر بھی کرتا ہے (ص ۱۸۷)۔ چغتائی افراد میں سے بعض فوجی خدمت کے عوض محصولات سے مستثنیٰ تھے (ص ۱۹۵۔۱۹۷)۔ خراسان میں نیشاپور کے نزدیک خانہ بدوش کرد (؟) بھی موجود پائے جاتے تھے۔ Clavijo ان کا ذکر کرتے ہوے تحریر کرتا ہے: ''خیموں کے علاوہ ان کی کوئی اور رہائش گاہ نہ تھی کیونکہ وہ کسی شہر یا گاؤں میں گھر نہیں بناتے تھے، بلکہ موسم گرما اور سرما میں کھلے دیہی علاقے میں رہ کر اپنے ریوڑ پالتے تھے۔ یہ مینڈھوں، بھیڑوں اور گائیوں پر مشتمل ہوتے تھے اور اسی قبیلے کے لوگ بیس ہزار اونٹوں کے مالک تھے۔ وہ تیمور کی قلمرو کے اندر اس سارے صوبے کے طول و عرض میں گھومتے پھرتے رہتے تھے اور اسے تین ہزار اونٹ نیز تقریباً پندرہ ہزار بھیڑیں سالانہ محصول / خراج کے طور پر ادا کرتے تھے'' (ص ۱۸۱).

تیمور کی موت کے بعد باہمی آویزش کا ایک دور آیا۔ مغرب میں قراقونلو کے ترکمانوں کا سردار بہارلو قبیلے کا بیرام خواجہ (م ۷۸۲ھ/ ۱۳۸۰ھ) تھا جو ابتداءً سلطان اویس جلائر کی ملازمت میں رہا تھا۔ اس نے ۸۱۲ھ/ ۱۴۰۸ء میں آذربیجان پر آرمینیا سے حملہ کر دیا جہاں کہ وہ تیمور کی طرف سے پسپا ہوکر آیا ہوا تھا۔ ۸۱۴ھ/ ۱۴۱۰ء میں انہوں نے جلائروں سے بغداد کا قبضہ لے لیا تھا۔ بعد میں آق قویونلو نے ان پر فوقیت حاصل کر لی جن کا بڑا مرکز دیارِ بکر تھا اور جن کے سردار بیندیر قبیلے [رک بآں] سے تعلق رکھتے تھے۔ مشرق میں بھی مزید قبائلی تحریکات ظہور پذیر ہوئیں۔ ۸۷۰ھ/ ۱۴۶۵ء۔۱۴۶۶ء میں تقریباً پندرہ ہزار خانہ بدوش عراق سے خراسان کی طرف روانہ ہوے ''کیونکہ ترکمانوں کے ظلم و ستم کی بنا پر وہ سخت مشکلات میں پھنس گئے تھے۔'' اور تیموری حکمران ابوسعید نے انہیں وہاں خیمے مہیا کیے (عبدالرزاق: مطلع السعدین، طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۴۹ء، ۲، ۱۲۹۶)۔ تقریباً اسی زمانے میں ہزارہ قبیلے (جو روایت کے مطابق منگولوں کے ساتھ ایران آئے تھے) کی تعداد ہرات کے نواح میں بڑھنا شروع ہوئی اور محصول کی ادائیگی سے انکار پر ان کے اور حکومت کے مابین مناقشوں کا آغاز ہوا (کتاب مذکور، ص ۱۲۹۶ ببعد).

قرا قونلو اور آق قونلو کی سلطنتوں کا یہ دور، جو کہ مغربی اور شمال مغربی ایران میں یکے بعد دیگرے طاقت ور ترین گروہوں کی حیثیت سے ابھرے اور آخر میں وسطی اور جنوبی ایران میں بھی، خانہ بدوش ترکمانوں کی حکمرانی کے احیاے نو کا نمائندہ دور ہے جس میں ایران کے مشرقی حصے کی طرف پیش قدمی ہوئی۔ سلجوقوں کے برعکس، جن سے کہ وہ منگولوں اور تیموریوں کی نسبت زیادہ مشابہت رکھتے تھے، وہ سارے ایران پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوے اور صرف اُن ترکمان قبائل کو ایک محدود پیمانے پر متحد کر سکے جو کئی نسلوں سے اسلام سے روشناس تھے اور ان میں سے بعض زیادہ انتہا پسندانہ شیعی مسالک کے گرویدہ ہوچکے تھے۔ ان کے رہنما، جن میں سے اوزن حسن (م ۸۸۲ھ/ ۱۴۷۷ء۔ ۱۴۷۸ء) نہایت نامور تھا، اکثر بڑے قابل ہوا کرتے تھے۔ ان کی انتظامیہ خوب منظم تھی اور ان کے دربار، ان کے خانہ بدوشانہ پس منظر اور عادات کے باوجود، فارسی ثقافت اور ترکمانی شاعری کے مرکز تھے (مزید

تفصیلات کے لیے دیکھیے V. Minorsky : Persia in A.D. 1478-1490 لنڈن، ۱۹۵۷ء؛ نیز Travels to Tana and Persia by Barbaro and Contarini، Hakluyt مطبوعہ، ۱۸۷۳ء)۔ اُوزن حسن کی وفات کے بعد آذربیجان اور شیراز میں آق قونلو کے بڑے مراکز پر قبائلیوں کے حملے دوبارہ شروع ہوگئے' حتیٰ کہ آخرکار صفویوں نے ترکمان قبائل کو متحد اور منظم کرکے، جس میں کہ قراقونلو اور آق قونلو ناکام رہے تھے، خود کو ایران کے حکمرانوں کی حیثیت سے مستحکم کر لیا۔

اسماعیل صفوی کے حمایتیوں کی غالب اکثریت ایشیاے کوچک، شام اور آرمینیا کے قبائل نیز قراقونلو اور آق قونلو سے الگ ہوجانے والے قبائل سے تعلق رکھتی تھی۔ اُن کی قوت کا منبع قزلباش تھے جو اُستاجلو، شاملو، تکلو، زملو، بہارلو، ذوالقدر، ترکمان، خنشلو، قاچار اور افشار قبائل پر مشتمل تھے (دیکھیے V.Minorsky : تذکرۃ الملوک، طبع G.M.S، ۱۹۴۳ء، ص ۱۸۹ بعد)۔ مابعد کے ادوار میں مؤخر الذکر دو ناموں سے ایران میں سلطنتیں وجود میں آئیں۔ اسماعیل صفوی سلسلے کا سربراہ تھا جس کی بنیاد اس کے آباؤ اجداد میں سے صفی الدین نے رکھی جو ۵۶۰ھ/۱۲۵۲ء میں اردبیل میں پیدا ہوا۔ یہ سلسلہ اپنے رہنما جنید کے دور میں جنگ جو بنا (نیز دیکھیے W.Hinz : Irans Aufsteig Zum Nationalstaat، برلن ۱۹۳۶ء)۔ اسماعیل کے انتہا پسند پیروکار اُسے خدا کا وارث اور مظہر تصور کرتے تھے۔ اُس کے اقتدار کے ابتدائی ایام میں اس کے قبیلے میں اس کے پیروکاروں اور سلسلے میں بڑا گہرا رابطہ تھا۔ ہر گروہ کا ایک خلیفہ ہوتا تھا جس کے ساتھ اسماعیل مرشدِ کامل کی حیثیت سے خلیفۃ الخلفاء کے توسط سے رابطہ برقرار رکھتا تھا (دیکھیے ذخیرۃ الملوک، ص ۱۲۵۔ ۱۲۶)۔

آق قویونلو دور کے اختتام پر وقوع پذیر ہونے والے انتشار میں بہت سے ترکمان سرداروں اور دیگر رہنماؤں نے خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ حسن رُوملو سال ۹۰۷ ہجری/۱۵۰۱۔۱۵۰۲ عیسوی کے تحت ان حکمرانوں کی فہرست پیش کرتا ہے۔ اس سال اسماعیل تبریز میں داخل ہوا (احسن التواریخ، طبع C.N. Seddon، بڑودہ، ۱۹۳۱۔ ۱۹۳۴ء، ۱: ۶۲)۔ اسماعیل نے بتدریج اُن کے اقتدار کو ختم کر دیا یا ان کی اکثریت کو گھٹا دیا۔ کچھ نے اُزبک حکمران محمد شیبانی خاں کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اسی حکمران کا بالآخر اسماعیل سے تصادم ہوا۔ خُراسان کی مشرقی سرحدوں پر آباد قبائل صفویوں کے زیرنگرانی تھے جیسا کہ ماقبل کی سلطنتوں میں ہوا کرتا تھا اور بعد کے دور میں قاچاروں کے لیے یہ ایک اہم مسئلہ بنا۔

اسماعیل کی وفات (۹۳۹ھ/۱۵۳۴ء) سے قبل ہی ملک میں ترکمان قبائل، کہ جن کی حمایت سے وہ برسر اقتدار آیا تھا اور فارسی النسل عناصر کے درمیان پھوٹ پڑ گئی، دیگر قبائلی گروہوں، چغتائیوں، کردوں، لُروں اور فیلسوں وغیرہ نے طہماسپ کی ماتحتی میں آ کر اُس کی فوجی قوت میں اضافہ کیا۔ اوّل الذکر زیادہ تر خراسان میں آباد تھے۔ ان میں قرابیات بھی شامل تھے جن کے سردار نیشاپور کے والی سلطان محمود نے طہماسپ کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ازبکوں کے خلاف معرکوں میں قربانیاں دینے کی بنا پر اُنہیں شاہی خراج کی ادائی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا (عالم آرا، ص ۵۸۵۔۵۸۶)۔ بعض مصنفین نے بیات کو ایک خود مختار قبیلے کا درجہ نہیں دیا بلکہ انہیں افشار قبیلے کا حصہ قرار دیا ہے (دیکھیے نیچے)۔ شاہ عباس کی طرف سے کی جانے والی تنظیم نو سے قبل کے صفوی عہد میں قبائلی سردار اپنے پیروکاروں کے ساتھ اپنے اپنے اُلکر (Ulkar) میں مقیم ہوا کرتے تھے،

جن پر وہ فتح یابی یا براہِ راست عطا سے قابض ہوتے تھے۔ ان میں سے اکثر والی مقرر کیے جاتے تھے۔ قبائلی سردار، سپہ سالار اور والیٔ صوبہ کے عہدوں کے مابین کوئی واضح خطِ امتیاز نہ کھینچا جاسکتا تھا۔ ابتدائی دور میں قزلباش سپہ سالار کے عہدے اور امیر الامرا کے منصب کو خود کو ملنے والی خصوصی مراعات میں سے تصور کرتے تھے۔ شاہ طہماسپ کے عہد میں صوبوں کے والی زیادہ تر قبائلی سردار ہوا کرتے تھے۔ انہیں ایک سے دوسرے صوبے میں بھجوا دیا جاتا اور کوئی قبیلہ ایک خاص علاقے پر حکمرانی کا خصوصی دعویٰ نہیں رکھتا تھا؛ لیکن شاہ عباس کے عہد میں کئی مقامات پر موروثی جانشینی عمل میں لائی گئی اور ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء تک اس کا دستور عام ہوگیا (مزید دیکھیے قاضی احمد قمی: خلاصۃ التواریخ، طبع H.Muller، ویزبیڈن ۱۹۶۴ء)۔ طہماسپ قبائلی سرداروں پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہوسکا اور ترکوں اور غیر ترکوں کی رقابتوں اور قبائل کے باہمی جھگڑوں خصوصاً اُستاجلو اور رُوملو کے تنازعات سے مملکت کے وجود کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ اب وہی مسئلہ درپیش تھا جس کا سلجوقوں کو سامنا کرنا پڑا تھا، یعنی اُن قبائل کا اتحاد وانضمام جن کی حمایت سے حکمرانوں نے اقتدار حاصل کیا اور ان کی سلطنت معرضِ وجود میں آئی۔ تاہم اس وقت حالات مختلف تھے، خصوصاً مغرب یا اس سے آگے سلطنت کی سرحدوں پر آبادکاری کے امکانات معدوم تھے۔

شاہ طہماسپ کی وفات کے بعد قبائلی سرداروں کے مابین لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ شاہ عباس (۹۹۵ھ-۱۰۳۷ھ/۱۵۸۷ء-۱۶۲۹ء) نے آخر کار قزلباشوں پر ازسرِ نو غلبہ حاصل کیا اور قبائلی قوتوں کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے ایک خصوصی شبہ سوار فوجی شعبہ قائم کیا جس میں جارجی اور ارمنی قیدیوں کے اخلاف اور نومسلموں کو بھرتی کیا گیا اور شاہی خزانے سے اُنہیں براہِ راست تنخواہ دینے کا اہتمام کیا گیا۔ نتیجتاً قبائلی اور فوجی سرداروں نیز قبائل اور مستقل فوج کے مرتبہ میں کسی حد تک فرق واضح ہونے لگا اگرچہ ابھی تک قبائل حکومت کے حکم پر ہنگامی فوجی دستے فراہم کرنے کے پابند تھے۔ مثال کے طور پر ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء میں شاہ عباس نے آذربیجان اور عراقی قبائل کے سرداروں کو ان کی تعداد کی فہرست تیار کرنے کا حکم دیا تاکہ ہر ایک قبیلے سے اس کی استعداد کے مطابق افراد ہنگامی فوجی خدمات کے لیے لیے جاسکیں (عالم آرائے عباسی، ص ۴۶۶، بحوالہ Minorsky: کتابِ مذکور، ص ۳۴-۳۵)۔ صاحبِ تذکرۃ الملوک سرحدوں پر مقیم امیروں کی ایک فہرست دیتا ہے اور ہر صوبے کے لیے مقررہ ہنگامی فوجی دستوں کی تعداد بھی۔ ان دستوں کا زیادہ تر حصہ قبائل فراہم کرتے تھے (ص ۱۰۰ وبعد)۔ مستقل فوج کے حجم میں اضافے اور خالصہ ارضیات سے اس کی تنخواہ کی ادائی کی بنا پر قبائلی سرداروں کے لیے نسبتاً کم اراضی باقی رہی جس سے ان کی قوت اور ان کے اثر ونفوذ میں مزید کمی واقع ہوئی (دیکھیے، صفوی سلطنت کے نامور امرا کے قبائلی روابط کے تجزیئے کے لیے تذکرۃ الملوک، ص ۱۳ وبعد)۔ علاوہ ازیں ترک سرحدی خطے کے بار بار میدانِ جنگ بننے اور دانستہ طور پر اُسے الگ تھلگ حیثیت دیئے جانے کی بنا پر وہاں پہلے سے قابض قبائل بری طرح سے متاثر ہوئے۔ شاہ عباس نے قبائلی سرداروں کی بجائے دربار کے غلام یا آزاد امرا کو صوبوں کی حکومتیں سونپ کر ان کی طاقت کو مزید کمزور کر دیا۔ شاہ عباس نے متعدد قبائل کو نقلِ مکانی کا حکم دیا اور ان میں سے بعض کو سلطنت کے دفاع کی خاطر بھجوایا گیا۔ اس طرح سے قاچار قبیلہ تین شاخوں میں منقسم ہوگیا: پہلی شاخ لِسگی کے حملوں کی روک تھام کے لیے

گنجہ میں رکھی گئی، دوسری ازبکوں کے بالمقابل خُراسان کے دفاع میں حصہ لینے کے لیے مرو میں ٹھہرائی گئی اور تیسری بحیرۂ خزر کے مشرق میں واقع ترکمان علاقے کی سرحد پر استر آباد میں رکھی گئی۔ دورِ ماقبل میں یہ قبیلہ دو حصوں میں منقسم ہوچکا تھا۔ یکاری باش اور اشاقی باش۔ ان دونوں کے خاندان استر آباد چلے گئے۔ شاہ عباس نے کچھ قبائل کو ان کی وفاداری کے بارے میں شبہات کی بنا پر سرحدی علاقوں میں منتقل کر دیا، مثلاً کزلکر قبیلے کو فارس میں تقریباً ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں قرجہ داغ سے دار ابجرد منتقل کر دیا گیا (عالم آرا، ص ۶۲۳)۔ قبل ازیں (تقریباً ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء۔۱۵۹۲ء میں) افشار قبیلے کا ایک گروہ کازیرون آیا اور اُن کے سردار خواجہ پیر بداق کو شاہ عباس نے اس علاقے کی گورنری دے دی۔ اس خاندان کے ہاتھ میں یہ حکومتی عہدہ، تقریباً ۲۵۰ سال تک رہا (فسائی: فارس نامۂ ناصری، تہران، Lith ، ۱۸۹۴ء۔ ۱۸۹۶ء، ۲:۲۵۰۔۲۵۲)۔ شاہ عباس نے اپنے کافی سارے حمایتیوں کو شاہ سوان کے نام سے موسوم کیے گئے قبیلے کی صورت میں منظم کیا جس نے بعد میں آذربیجان میں اہمیت حاصل کر لی۔

دستور الملوک کے مطابق (جو شاہ سلطان حسین کے لیے تحریر کی گئی تھی)، پانچ اہم صوبائی حکومتیں جارجیا، عربستان، لُرستان، کردستان اور بختیاری تھیں۔ آخری چاروں حکومتوں میں غیر ترک قبائلی اور نیم خانہ بدوش آبادی بہت زیادہ تھی۔ جب شاہ عباس نے ترکمان قبائل کا اثر ونفوذ کچھ حد تک کم کر دیا تو غیر ترک قبائل کی اہمیت میں اضافہ ہونے لگا۔ کچھ نسبتاً چھوٹی حکومتیں مثلاً قراباغ اور کوہ جلویہ کی حکومتیں زیادہ تر قبائلی علاقوں پر مشتمل تھیں اور دیگر مثلاً ہمدان کی حکومت کی آبادی کا معتدبہ حصہ قبائلی تھا۔ ان پانچوں صوبوں کے والیوں میں سے عربستان کا والی اپنے صوبے میں قبائل (ایل وعشائر) کی کثیر تعداد کی بنا پر زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ لُرستان اہمیت کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر تھا (محمد تقی دانش پژوہ : دستور الملوک، در Review of The Faculty of Letters، تہران یونیورسٹی، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۴۷۳۔ ۵۰۸، نومبر ۱۹۶۸ء، ص ۶۲۔۹۳)۔ چارڈن (Chardin) ان صوبائی حکومتوں کے ضمن میں لکھتا ہے: "یہاں کے باشندے شہروں میں عمارات کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے۔ نہ ہی وہ مستقل رہائش گاہوں کے مالک ہیں، بلکہ وہ خیموں میں زندگی بسر کرتے ہیں، کیونکہ ان کی کثیر تعداد اپنے ان گنت ریوڑوں کی نگہداشت کرتی ہے۔ وہ ایک "کاآن" کے زیر اقتدار ہیں جو ایران کے بادشاہ کا مقرر کردہ لیکن انہی میں سے اور انہی کا منتخب کردہ ہوتا ہے؛ اور ایک ہی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور باپ کے بعد بیٹا جانشین بنتا ہے ...... وہ خراج اور عشر ہر دو کی ادائیگی کرتے ہیں۔ یہ صوبہ اصفہان اور اُس کے نواحی حصوں کے لیے مویشیوں کی فراہمی کرتا ہے جس کی بنا پر ان علاقوں میں اس صوبے کے گورنر کا بڑا احترام کیا جاتا ہے" ("The Coronation of Solyman III"، ۳ : ۱۴۷: ضمیمہ The Travels of Sir John Chardin ، لنڈن ۱۶۹۱ء)۔

ان والیوں کی شرائطِ تقرری اور شاہی افواج میں ان کی طرف سے بوقت ضرورت فراہم کیے جانے والے فوجیوں (واضح طور پر قبائلی نفری) کی تعداد مختلف ہوا کرتی تھی۔ ان میں اکثر اپنے بیٹوں یا بھائیوں یا ہر دو کو بطور یرغمال شاہی دربار میں بھجوانے کے پابند ہوتے تھے۔ ریاست کے چار بڑے حکام میں سے ایک قُرچی باشی مملکت کے تمام قبائل (ایلات وعشائر) کا سردار (ریش سفید) ہوا کرتا تھا۔ قبائل کے امور کے سلسلے میں اُس کے فرائض کی صحیح وضاحت معلوم نہیں ہوسکی۔ وہ قبائل

کے اندراج کے رجسٹر اور قبائلی فوجی نفری کے لیے خوراک کی فراہمی کے امور کا مسئول ہو۔ فارس میں کارزن اس کا تیول (Tuyul) تھا۔ غالبًا یہ ایک غیر اہم قبائلی علاقہ تھا۔ تبریز، مغان اور آذربیجان کے بعض دیگر مقامات اس دور تک ترک آبادی کے اہم علاقے تھے اور یہ قرچی باشی کے بعد اہم ترین فوجی عہدے دار سپہ سالار کی ماتحتی میں ہوا کرتے تھے (دیکھیے دستور الملوک، محل مذکور)۔ صاحب تذکرہ الملوک نے سرحدوں پر مقیم امرا کے ناموں کی فہرست اور ہر صوبے کی طرف سے فراہم کی جانے والی ہنگامی فوجی نفری کی تعداد دی ہے۔ جس کا کچھ حصہ قبائل مہیا کرتے تھے (ص ۱۰۰ وبعد).

شاہ عباس کی وفات کے بعد مرکزی حکومت کی گرفت کمزور ہوگئی اور یہ صرف عارضی طور پر شاہ عباس ثانی کے عہد میں مضبوط ہوئی۔ اس کمزوری کی بنا پر قبائل خصوصاً مشرق میں غلزای اور ابدالی افغانوں نے خود کو مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ بلوچ بھی بم اور کرمان پر حملہ آور ہوئے جب کہ کردوں نے بغاوت کر کے ہمدان پر قبضہ کر لیا اور ۱۷۱۹ء میں اصفہان تک کے علاقے پر حملے کیے (دیکھیے L.Lockhart : *The Fall of the Safavi Dynasty*، کیمبرج ۱۹۵۸ء، ص ۱۱۰ وبعد)۔ اس صدی کے وسط میں اصفہان کے علاقے میں لر اور بختیاری بھی مسلسل حملے کرتے رہے (*A Chronical of the Carmelites in Persia*، لنڈن ۱۹۳۹ء، ۱، ۲۶۰).

شاہ سلطان حسین کے عہد کے سرکاری کاغذات میں شامل ایک مخطوطے میں قبائل کے مستقر اور اُن کی تعداد کی تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔ یہ اعداد اگرچہ نہایت مبالغہ آمیز دکھائی دیتے ہیں تاہم وہ امکانی طور پر اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں قبائل کی عمومی تقسیم کو واضح کرتے ہیں۔ اس مبالغہ آمیزی کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس دور میں قبائلی آبادی میں دوبارہ اضافہ ہو رہا ہو۔ مصنف قبائل کو ایرانی نژاد اور غیر ایرانی نژاد میں منقسم کرتا ہے۔ اول الذکر مندرجہ ذیل قبائل پر مشتمل تھے: (۱) لر، جن میں چار بڑے قبیلے شامل ہیں۔ فیلی (خرم آباد میں رہائش پذیر، سرمائی مستقر بنواحِ ہویزہ)، لک اور زند (جو کریم خاں زند کی قیادت میں ایک مختصر عرصہ کے لیے ایک سلطنت کے مالک رہے جس کا پایۂ تخت شیراز تھا)، بختیاری اور ممسنی۔ بختیاری کوہ جلویہ سے اصفہان اور شوشتر سے بھبھان تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ اصفہان کے بیگلر بیگی کو لگان ادا کرتے تھے۔ تاہم ان کی طرف سے ادا کی جانے والی رقم، اگرچہ لک اور زند کی ادا کردہ رقم سے زیادہ ہوتی تھی، ہر سال معمولی ہی ہوتی تھی۔ ان کے دو یا تین سردار ہمیشہ بادشاہ کے دربار میں اس کی خدمت پر مامور رہتے تھے اور وہ بعض اوقات دس ہزار سوار اور پیادے بلا تنخواہ فراہم کرتے تھے۔ ممسنی بختیاری یا فیلی قبیلوں کے مقابلے میں کم تعداد تھے۔ وہ فارس کے بیگلر بیگی کو لگان ادا کرتے تھے۔ لر قبیلے کے تمام کے تمام افراد شیعہ تھے: (۲) ہمدان اور مراغہ کی سرحدوں کے درمیان دیہاتی علاقے میں جزوس، کلحر اور مرکی آباد تھے۔ ان میں سے تقریبًا ایک چوتھائی شیعہ تھے: (۳) خراسان کے خانہ بدوش قبائل جن میں سے چار اہم قبیلے زعفران لواخلمد میں، سعدان لو خابوشان میں، لوان لو رادکان میں اور دوان لو جاجرم کے نزدیک آباد تھے۔ وہ حکومت کو کوئی لگان ادا نہیں کرتے تھے: (۴)جلائر، خراسان کے اندر مردِ شاہ جہان تک پھیلے ہوئے تھے: (۵) قرائی، تربت ِ جام میں مرتکز تھے اور (۶) جلائی غیر ایرانی النسل خانہ بدوش قبائل عربوں اور ترکوں پر مشتمل تھے۔ مؤخر الذکر میں، مخطوطے کے مصنف کے مطابق، یہ قبیلے شامل تھے: افشار، قاچار اور

شقاقی (درحقیقت کرد) آذربائیجان سے جیلان تک پھیلے ہوے تھے، کرمان، برود جرد اور نہاوند کے نواح میں آباد زنجانہ (دراصل کرد) اور قدرے فارس میں اور [زیادہ تر] آذربیجان اور جیلان کے درمیان آباد تھے۔ شاہ سوان میں اس دور میں افشار کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے کچھ نئے قبیلوں کو اپنے اندر مدغم کر لیا جب کہ کچھ دوسروں سے قطع تعلق کر لیا۔ ان میں شاملو، قرکلو اور شروان لُو شامل ہیں۔ وہ خراسان میں طوس پر اور آذربیجان میں ارومیہ پر قابض تھے۔ اس کے برعکس نیشاپور، خیوا اور سلماس پر قابض بیات اور دُنبلی ہرگز افشار نہ سمجھے جاتے تھے.

عرب قبائل میں ہویزہ کے ملائی، اور بنو کعب شامل تھے جو اس علاقے سے بغداد تک دیگر متعدد قبائل کے ساتھ پھیلے ہوے تھے۔ اندرونِ فارس شیراز، اصفہان اور یزد کے درمیان اس زمانے میں متعدد اہلِ عرب موجود تھے۔ خراسان میں مشمست ترشز اور قائن میں دیہاتوں پر قابض تھے۔ طبس میں بنوشیبان سمیت کچھ دیگر مراکز میں بھی عرب موجود تھے (دیکھیے مخطوطہ بشمولہ مجموعہ مخطوطات Dr. Caro Owen، اصفہان، اورینٹل مخطوطات عارضی نمبر ۱۱۳۴ (S&B)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مخطوطے کی نقل سرجان مالکم نے بھی دیکھی تھی (دیکھیے *History of Persia*، لنڈن ۱۸۲۹ء، ۲:۲۷۳)۔ انیسویں صدی عیسوی میں کاشان، لار اور لواسان کے درمیانی علاقے میں خانہ بدوشانہ معاشرت رکھنے والے مشمست عربوں کے کچھ گروہ آباد تھے (مرزا عبدالرحمٰن بن محمد ابراہیم الکاسانی؛ مراۃ الکاسان، موزۂ بریطانیہ، مشرقی مخطوطات، ۳۶۰۳، ورق ۶۱ ب).

صفویوں کے بعد تین سلطنتیں ظہور پذیر ہوئیں جن کے بانی یہ قبائلی سردار تھے: افشار کے قرقلو قبیلے کا نادر شاہ، کریم خاں زند اور آقا محمد خاں قاچار سنی قبائل یعنی افغانوں اور ترکمانوں کے طرف دار نادر شاہ نے بغاوت کے امکان کو کم کرنے کے لیے بہت سے قبائلی گروہوں کو دوبارہ بسایا۔ ۱۱۴۲ھ۔۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء میں پچاس ساٹھ ہزار قبائلی خاندانوں کو آذربیجان، ایران، عراق اور فارس سے خراسان منتقل کر دیا گیا۔ دو سال بعد ساٹھ ہزار ابدالی ہرات سے مشہد، نیشاپور اور دامغان پہنچائے گئے اور بختیاری قبیلے کی شاخ ہفت لنگ کے تین ہزار خاندان خراسان بھجوائے گئے۔ ہفت لنگ اور چہار لنگ کے دس ہزار خاندانوں پر مشتمل ایک دوسرے بختیاری گروہ کو ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء میں ان کی ایک بغاوت کے کچلے جانے کے بعد خراسان میں بھجوایا گیا (L.Lockhart : *Nadir Shah*، لنڈن ۱۹۳۸ء، ص ۵۱-۵۲، ۵۴، ۶۵، ۱۱۰؛ نیز دیکھیے M.Otter : *Voyage en Turquie et en Perse*، ۱۷۴۸؛ ۲، ۱۸۷)۔ انیسویں صدی عیسوی میں ایران میں افشار قبیلے کا وسیع پیمانے پر انتشار احتمالی طور پر جزواً نادر شاہ کے عہد میں شروع ہوا (دیکھیے Macdonald Kinneir : *A Geographical Memoir of Persia*، لنڈن ۱۸۱۳ء، ص ۴۶).

نادر شاہ کے قتل کے بعد بدنظمیوں کا آغاز ہوا۔ محمد حسین خان قاچار نے استر آباد میں اپنی پوزیشن مستحکم کر کے، جہاں شاہ عباس نے قاچار قبیلے کی شاخ کو آباد کیا تھا، جیسے اوپر بیان کیا جاچکا ہے، مازندران تک اپنا تسلط بڑھا لیا۔ ایک بختیاری سردار، علی مروان خان نے اصفہان پر قبضہ کر لیا اور کریم خان زند کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ بعد میں ان دونوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ علی مردان خاں قتل ہوا اور کریم خان نے آذربیجان کے افغان حکمران آزاد خان سے ابتداءً شکست کھانے کے بعد اپنی افواج کو دوبارہ منظم کیا اور خشت کے نزدیک آزاد خان کو ہزیمت سے دوچار کر کے شیراز پر قبضہ کر لیا۔ تب سے

محمد حسین خان، قاچار اور کریم خان کے مابین کشمکش چل پڑی جس میں مؤخر الذکر فتح مند رہا۔ اس کا دربار، بہت سے دیگر قبائلی حکمرانوں کے درباروں کی مانند، اربابِ علم وثقافت کا مرجع تھا (دیکھیے Malcolm : کتاب مذکور، ۲: ۸۶)۔ اس کا عہدِ حکومت، مجموعی طور پر پُرامن تھا۔ آذربیجان میں قبائل کی آباد کاری کی ایک کوشش کا پتا چلتا ہے۔ ایک فرمان مجریہ ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۴ء میں تبریز کے بیگلر بیگی کو ہدایت کی گئی کہ وہ انہیں ان کے اصل رہائشی مقامات پر آباد کرے اور انہیں زراعت اور سرکاری ملازمت کے کاموں پر مامور کرے (دیکھیے *Land lord and Peasant*، ص ۱۳۳)۔

کریم خان کی موت کے بعد طوائف الملوکی کا دور آیا اور "زندوں" میں باہمی چپقلش شروع ہوگئی۔ جس کا نتیجہ ان کے زوال کی صورت میں نکلا۔ انجام کار محمد خاں قاچار نے، جو شیراز میں کریم خاں کی قید سے بھاگ نکلا تھا، قاچار قبیلے کو متحد کیا اور ایران کے مختلف حصوں پر قابض متعدد قبائلی سرداروں کو زیرِ نگیں کر کے ملک کا حکمران بن بیٹھا۔ اگرچہ آقا محمد خان نے اپنا پایۂ تخت تہران کو بنا لیا، تاہم مازندران اور گرگان بدستور قاچار قبیلے کے مراکز رہے اور ان کے ساتھ حکمرانوں نے اپنے روابط استوار رکھے۔ ۱۸۴۴ء میں ایبٹ نے لکھا ہے کہ استرآباد میں قاچاروں کے صرف چار پانچ سو خاندان مقیم تھے۔ وہ محصول کی ادائی سے مستثنیٰ تھے (لنڈن، P.R.O ، F.O. 60:108۔ بحیرۂ خزر کے ساحل کے ساتھ ساتھ ایبٹ کے سفر کے احوال، Abbot To Encamp Aberdeen n.8 ، نزد تہران میں موجود/شامل ہیں، ۲۹ جون ۱۸۴۴ء)۔ سرجسٹن شیل (Sir Justin Sheil) نے بعد کے دور میں لکھتے ہوئے مازندران میں قاچاروں کے دوہزار مکانات کا ذکر کیا ہے (Lady Sheil: *Glimpses of Life and Manners in Persia*، لنڈن ۱۸۵۶ء، ص ۳۹۶) ان حکمرانوں نے اپنے قبائلی پس منظر کو مکمل طور پر ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ William Ousely لکھتا ہے کہ فتح علی شاہ کی مانند قاچار خاندان کے زیادہ تر افراد اقامتی زندگی پر خانہ بدوش طرزِ معاشرت کو، شہر پر گاؤں کو اور محل پر خیمے کو ترجیح دیتے تھے (*Travels*، لنڈن ۱۸۱۹ء، ۳:۱۵۱)۔ Lady Sheil نے خانہ بدوشانہ عادات کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ ساری قوم میں عام تھیں" (کتابِ مذکور، ص ۲۱۴)، حتیٰ کہ ناصر الدین شاہ قاچار، اپنے فرانسیسی معالج ڈاکٹر فیورر (Dr. Feuvrier) کے مطابق، طبعًا خانہ بدوش تھا (*Trois ans a La Cour de perse*، پیرس ۱۹۰۶ء، ص ۱۸۹)۔ بہت سے صوبائی والیوں کا تعلق حکمران خاندان سے تھا جو قبیلے کے بڑے دھارے سے کافی حد تک کٹ چکے تھے۔

سابقہ سلطنتوں کے دستور کے مطابق قاچاروں کی مسلح افواج میں مستقل فوج اور صوبائی والیوں کی افواج کے ساتھ ساتھ قبائلی دستے بھی ہوا کرتے تھے (دیکھیے *Land lord and Peasant*، ص ۱۳۷ وبعد)۔ موریئر بیان کرتا ہے کہ فتح علی شاہ کی بارہ ہزار افراد پر مشتمل مستقل فوج میں شہری آبادی یا قبائل کے لوگ بلاتخصیص بھرتی کیے جاتے تھے، مگر اس میں مازندران کے قاچاروں کی تعداد سب سے زیادہ ہوا کرتی تھی۔ سپاہی اور ان کے خاندان تہران اور اس کے نواحی دیہات میں رہائش پذیر ہوتے تھے اور طلب کیے جانے پر تیار پائے جاتے تھے (*A Journey Through Persia` Armenia and Asia Minor to Constantinople in the Year 1808 and 1809*، لنڈن ۱۸۱۲ء، ص ۲۴۰-۲۴۳)۔

قبائلی فوجی نفری کا ایک رجسٹر بنایا جاتا تھا۔ افواج میں ہر قبیلے کا اپنا ڈویژن ہوتا تھا، جس سال ان کی

خدمات درکار نہ ہوتیں، انہیں برخاست کر دیا جاتا۔ وہ قبائلی سپاہی خواہ شاہی چھاؤنی میں رہتے یا برخاست کر دیئے جاتے، انہیں متعینہ تنخواہ ادا کی جاتی تھی۔جوبرٹ شاہی چھاؤنی میں مخلوط فوجی آبادی کا ذکر کرتا ہے (Voyage en Armenie et en Persia, fait dans les annees 1805 et 1806، پیرس ۱۸۲۱ء، ص ۲۵۸۔۲۵۹)۔ عباس مرزا نے آذربیجان کے مختلف قبائل میں سے پچاس ہزار سوار اور پیادہ فوجی اور خراسان کے والی نے اپنے صوبے کے قبائلیوں میں سے بیس ہزار ہر دو قسم کے فوجی بھرتی کیے۔ عرب اور فیلی فوجی خدمات سرانجام دینے سے مستثنیٰ تھے، (Morier : کتاب مذکور، ص ۲۴۰۔۲۴۱)۔

موریئر قبائلیوں کی فوجی مخفی استعداد کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ”سپاہ کے لیے خام مواد کے طور پر ایلاتی لوگوں (Eelauts) سے کوئی اور بہتر نہیں۔ وہ اپنی شیرخوارگی سے خیموں کی زندگی سے مانوس ہوتے ہیں۔ وہ ہر قسم کی سختیوں اور موسمی تغیرات کے عادی ہونے کی بنا پر فطری طور پر سپاہی ہوتے ہیں۔ وہ بغیر خوراک کے اور کسی تھکاوٹ اور اکتاہٹ کے اظہار کے بغیر ناقابلِ یقین طویل فاصلے طے کرتے ہیں (A Second Journey Through Persia, Armenia and Asia Minor to Constantinople, 1810-16 AD، لنڈن ۱۸۱۸ء، ص ۲۱۵)۔ شیل بھی ایرانی سپاہ کی تعریف کرتی ہے اگرچہ اس بات سے اتفاق نہیں کرتی کہ ایلاتی ہی ان میں سے بہترین قسم کے جوان ہیں (Lady Sheil : کتاب مذکور، ص ۳۸۲)۔ فوج کو جدید طرز پر منظم کرنے اور توپ خانے پر زیادہ انحصار کرنے سے قبائلی افواج کی اہمیت گھٹ گئی، چنانچہ جنگ عظیم اول کے اختتام پر مملکت کی مسلح افواج کے ایک حصے کی حیثیت سے قبائلی فوج کو آخر کار ختم کر دیا گیا۔

بالعموم قبائلی علاقوں کا انتظام ان کے سرداروں کے توسط سے چلانے کے سوا قاچار کے پاس کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ حکومت کے براہ راست احکامات پر دور دراز کے علاقوں میں شاذ ہی عمل درآمد ہوتا تھا۔ بڑے بڑے قبیلوں پر ایل خانی اور ایل بیگی مقرر کیے جاتے تھے۔ ان کی نامزدگی نامور قبائلی خاندانوں تک محدود ہوتی تھی۔ بادشاہ، عمر رسیدہ ہونے کی صورت میں چچا کو بھتیجے یا چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی کی جگہ جانشین مقرر کر سکتا تھا، لیکن عموماً وہ ایسا نہیں کرتا تھا اور سردار کے خاندان سے تعلق رکھنے والے کسی فرد کو قبیلے کا سردار مقرر کر دیتا تھا۔ ایل خانی اور ایل بیگی سرکاری محصولات اکٹھے کرتے، عمومی طور پر قبائلی امور کی نگہداشت کرتے اور رواجی قانون پر عمل درآمد کراتے (نیز دیکھیے Land lord and Peasant، ص ۱۵۸ بعد)۔ قاچار قبیلے کا ایل خانی (جو کہ برسراقتدار بادشاہ نہیں ہوتا تھا) معززین کی کونسل کی صدارت کیا کرتا تھا اور وہ بڑے اثر ورسوخ کا مالک ہوا کرتا تھا (دیکھیے Malcolm : کتاب مذکور، ۲:۳۲۷)۔ ایل خانی عضدالملک ۱۹۰۹ء میں محمد علی شاہ قاچار کی معزولی کے بعد قائم مقام حکمران بنا۔

اپنے پیش رووں کی طرح آقا محمد خاں قاچار نے متعدد قبائل کو از سرنو آباد کیا۔ عبدالملکی قبیلہ یا اس کا ایک حصہ ، حاجیوند قبیلے کی طرح، فارس سے کلارِ ستاک اور کجور منتقل کیا گیا۔ ۱۸۴۴ء میں اول الذکر تقریباً تین ہزار اور مؤخر الذکر چار پانچ ہزار خاندانوں پر مشتمل تھا، یہ ہر دو مستقل طور پر اقامت پذیر تھے جب کہ اول الذکر کے گرمائی اور سرمائی مستقر تھے۔ وہ حکومت کو ضرورت پڑنے پر پندرہ سو گھوڑے مہیا کیا کرتے تھے (ایبٹ کے سفر کا احوال، کتاب مذکور)۔ اس نے لُرستانِ کوچک سے عملہ

کو بھی فارس منتقل کیا۔ اُس کی وفات کے بعد ان میں سے اکثر اپنے اصلی مساکن کی طرف واپس آگئے (C.A. de Bode : Travels in Luristan and Arabistan، لنڈن ۱۸۴۵ء، ص ۱۱۸۔۱۱۹)۔ دورِ مابعد کے حکمرانوں نے بھی متعدد قبائل کو مختلف مقامات پر منتقل کیا (دیکھیے Land lord and Peasant، ص ۱۵۸ بعد)۔

مستقل طور پر رہائش پذیر آبادی سے علیحدہ موجود وسیع قبائلی آبادی کو، جو اپنے سرداروں کے حکم پر اپنے ہمسایوں کے خلاف جارحیت کا ارتکاب، رہزنی یا قانون کے خلاف مزاحمت کر سکتی تھی داخلی امن وامان کے لیے غیر موزوں تصور کیا گیا۔ چنانچہ فتح علی خاں قاچار نے قبائل کے خاتمے کے لیے کافی توانائی صرف کی۔ بہت سے سرداروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا جب کہ بعض شاہی دربار میں لائے گئے۔ کچھ قبائل کو ویسے ہی ختم کر دیا اور دیگر کی نقل مکانی عمل میں لائی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کے وسط تک فارس میں قشقائی اور خراسان میں زعفران لُو کے ایلخانیوں کے سوا کوئی قبائلی سردار ملکی امور میں نمایاں اثر رکھنے کے اہل نہ رہا (Lady Sheil : کتابِ مذکور، ص ۳۹۵)۔ کینز قبائلی سرداروں کی ریاستوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ ”پیدائشی لحاظ سے اور اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر سلطنت کے اہم ترین اشخاص تھے؛ وہ ہمیشہ باہمی حسد ورقابت کا شکار رہتے تھے؛ بادشاہ ان کے تنازعات کو ہوا دے کر اور مہارت کے ساتھ ایک کی طاقت کو دوسرے کے خلاف بطور توازن استعمال کر کے اپنے تحفظ اور سلطنت کے امن وامان کو یقینی بنا لیتا ہے۔ قبائلی سردار یا اُس کے خاندان کے کچھ افراد کو بطور یرغمال شاہی دربار میں رکھنے کا رواج اس کے قبیلے کی وفاداری کی ضمانت کی خاطر عام تھا (کتاب مذکور، ص ۴۵)۔

اس دور اور مابعد کے ادوار میں قبائلی خطوں کے بارے میں حکومتی پالیسی ”لڑاؤ اور حکومت کرو“ کے اصول پر مبنی ہوا کرتی تھی...... ایک قبیلے کو دوسرے کے خلاف کر دینا، خاندانی تنازعات اور رقابتوں کو ہوا دینا، اُن کی باہمی آویزشوں میں بطور رشوت تحائف دینا یا قبیلے یا خاندان کی سربراہی کے لیے ایک کی دوسرے کے خلاف امداد کے وعدے (دیکھیے Layard : Early Adventures in Persia' Susiana and Babylonia، لنڈن، ۱۸۸۷ء، ۱:۴۵۳۔۴۵۴؛ Gordon: Maj. Gen. T.E. Report of a Jouurney from Tehran To the Karun and Mahamerah، ۹ جنوری ۱۸۹۱ء، خفیہ ۹۲۳۳ء، مطبوعہ برائے کابینہ، ۳۰ مئی ۱۸۹۲ء؛ Mrs. Bishop : Journey in Pesria and Kurdistan، لنڈن ۱۸۹۱ء، ۱:۳۲۸، ۲: ۵۲؛ و Curzon: Persia ، لنڈن ۱۸۹۱ء، ۲:۲۷۲)۔ قبائل سے افراد کو بطور یرغمال لینے کا رواج جاری رہا (دیکھیےMalcolm : کتاب مذکور، ۲:۳۳۲)۔ حکومت، کمزوری کے باوجود، اگرچہ اس پالیسی کی مدد سے اپنی طاقت برقرار رکھنے میں کامیاب رہی، تاہم اس سے حکومت پر ان کا اعتماد متزلزل ہوا اور اس سے بد نظمی میں اضافہ ہوا جو کہ قبائلی علاقوں میں اکثر وبیشتر پھیلی رہتی تھی۔ حکومت کی طرف سے صلح کے جھنڈے تلے قبائلی سرداروں کو مذاکرات کے لیے مدعو کیا جاتا اور قرآن مجید پر حلف کے ذریعے ان کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی اور وہ جوں ہی وہاں آتے انہیں گرفتار کر لیا جاتا یا وہ جب ملاقات کے بعد واپس جانے لگتے تو انہیں ”غیر ارادی طور پر گولی کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا جاتا۔“ قبائلی سرداروں کے اکثر شاہی دربار میں اپنے ایجنٹ موجود ہوا کرتے تھے جو انہیں ان کے مفادات اور خصوصاً ان کے خلاف کیے جانے والے مجوزہ اقدامات سے

مطلع کرتے رہتے تھے۔ حکومت کی طرف سے قبائلی سرداروں کو قابو میں رکھنے کا ایک دوسرا طریقہ باہمی شادیاں بھی تھا۔

محمد شاہ قاچار کے عہد اور خصوصاً ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد کے دوران میں قبائل کی طاقت گھٹ گئی اور مرکزی حکومت کا اقتدار مستحکم ہوگیا۔ ۱۸۹۶ء میں قبائلی امور کی نگرانی کے لیے ایک خصوصی وزارت یا اعلیٰ کونسل کے قیام کی تجویز سامنے آئی مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔

ریوڑوں پر محصول عائد کیا جاتا تھا اور بعض اوقات افرادِ خاندان پر بھی۔ اکثر قبائلی سردار اپنے زیر قبضہ علاقوں میں یا ان سے بیرون ملکیتی اراضی رکھتے تھے۔ ان کی اور ان کے قبیلے کے افراد کی ملکیتی اراضی پر محصول عائد ہوتے تھے۔ قبائلی علاقوں میں اراضی کی پٹہ داری کا نظام خاصا پیچیدہ تھا۔ نئے سال کے آغاز پر قبائلی سردار حکمران یا مقامی والی کو پیش کش اور خصوصی جبری محصول بھی ادا کرتے تھے۔ قبائلی سردار انہیں اپنے اہلِ قبیلہ سے وصول کرتے اور اس طرح ایک خطیر رقم اکٹھی ہو جاتی (دیکھیے *Land lord and Peasant*، ص ۱۴۲-۱۴۳، ۱۵۸)۔ جوبرٹ بیان کرتا ہے کہ فتح علی شاہ مصر رہتا تھا کہ قبائلی سرداروں کی طرف سے ادا کیے جانے والے محصولات کا پانچواں حصہ نقد رقم کی صورت میں ہو (کتاب مذکور، ص ۲۷۰)۔ کچھ قبائلی سردار خصوصاً سرحدی علاقوں کے مقیم فوجی نفری مہیا کرنے کے عوض بغیر ادائی محصول زمینیں رکھتے تھے۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر میں بجرد، درہ گز اور اشرف میں یہی نظام رائج تھا (دیکھیے *Land lord and Peasant*، ص ۱۶۳-۱۶۴)۔ بعض خصوصی وجوہ کی بنا پر کچھ اور قبائل بھی محصول کی ادائی سے مستثنیٰ تھے۔ معاہدۂ ترکمانچائے کے بعد عباس مرزا کی طرف سے سُلدُوز میں آباد کیے جانے والے قرا پَیَخ سپاہی فراہم کرنے یا محصول ادا کرنے کے پابند نہ تھے (E.Aubin : *La Perse d' aujourd` Hui*، پیرس ۱۹۰۸ء، ص ۷۸-۷۹)۔ محصولات کے بقایا کے سلسلے میں حکومت اور قبائلی سرداروں کے درمیان جھگڑے اکثر ہوتے رہتے تھے۔ خود کو طاقت ور جاننے والی حکومت ان کی وصولی فوجی مہم کے ذریعے کرتی۔ بصورت دیگر نادہندگان کے نام بل (برات) جاری کیے جاتے اور انہیں بہت زیادہ کمیشن (Discount) پر فروخت کر دیا جاتا۔ یہ برات دار اکثر نادہندگان کے ہاں جا ٹھہرتے اور مہینوں یا سالوں تک ٹھہرے رہتے جب تک کہ مطلوبہ رقم یا اس کے ایک حصے کی ادائی نہ ہو جاتی (دیکھیے Layard: کتاب مذکور، ۱: ۴۹۹ وبعد)۔

قبائل کی تعداد اور حالات تبدیل ہوتے رہتے۔ مجموعی طور پر ان کی زندگی سختی اور غیر یقینی کیفیت سے عبارت تھی۔ کرد اور ترکمان قبائل میں سے بعض متمول تھے لیکن نسبتاً چھوٹے قبیلے اکثر انتہائی غریب تھے (دیکھیے Lady Sheil: کتاب مذکور، ص ۱۰۷-۱۰۸)۔ جوبرٹ بیان کرتا ہے کہ خانہ بدوش اس آزادی کی بنا پر خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کیے ہوئے تھے جو اس سے حاصل ہوتی ہے اور جو ان کے لیے اعلیٰ درجہ کی مسرت تھی (کتاب مذکور، ص ۲۵۲)۔ مالکم (Malcolm) کردوں کے متعلق لکھتے ہوے کہتا ہے کہ وہ سنگلاخ پہاڑوں میں میسر آزادی کی قدر کرتے تھے اور جب وہ اپنے آپ کو آزادی سے ہم کنار پاتے تو درپیش افلاس اور صعوبتوں میں بھی فخر محسوس کرتے (کتاب مذکور، ۲: ۳۳۳)۔ بلاشبہ ان بیانات میں کچھ نہ کچھ سچائی موجود ہے اور مجموعی طور پر دورِ حاضر تک خانہ بدوش آزادی کو کھو دینے کے اندیشے کے پیش نظر مستقل آباد کاری کے خلاف مزاحمت کرتے رہے ہیں۔

۱۸۴۱ء میں جنوبی ایران کی سیاحت کرنے والے بارون ڈی بوڈ نے خانہ بدوش قبائل کے کردار کے بارے میں بیان کیا ہے کہ اس نے ان میں بڑی صاف گوئی دیکھی جس میں مکاری بھی کافی حد تک شامل تھی۔ اس نے اس واضح تناقض کی یہ توجیہ کی ہے کہ یہ جزوی طور پر ان کے سرداروں کی سادہ اور قبائلی زندگی ہے اور جزوی طور پر ہمیشہ سرداروں کی محافظت کی خاطر ان کا مستعد رہنا ہے تاکہ ان کے مخالفین کی سازشیں ناکام رہیں یا اپنے ہمسایوں کی جائداد پر غاصبانہ قبضہ کر لینے کا ان کا ذاتی میلان تھا (کتاب مذکور، ۱: ۲۵۳)۔ بالعموم قبائلی لوگ اقامت پذیر آبادی کے مقابلے میں عورتوں کے لیے نسبتاً زیادہ آزادی اور رواداری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ چنانچہ کبھی کبھار قبیلے کے سردار کی نابالغی کے دوران میں اس کی ماں قبیلے پر حکمران ہوا کرتی تھی (دیکھیے De` Bode، کتاب مذکور، ۲: ۱۳۴ وبعد)۔

قاچار سلطنت کا کثیر حصہ قبائلی علاقوں پر مشتمل تھا۔ کچھ علاقوں میں قبائل طویل مسافت کی نقل مکانی کرتے تھے، مثلاً بختیاری اور قشقائی؛ جب کہ کچھ دیگر کے سفر نسبتاً محدود ہوا کرتے تھے اور کہیں کہیں تو یہ سفر صرف خیموں سے گاؤں کے بیرونی حصوں تک ہی ہوتا تھا۔ قبائلی اور غیر قبائلی علاقے کے درمیان کوئی واضح حد بندی نہیں ہوا کرتی تھی اور یہ بات قدیم دور سے چلی آرہی تھی۔ قبائل اپنی نقل مکانی کے دوران اقامت پذیر آبادی کے علاقے میں سے یا اس کی سرحدوں پر سے گزرتے تھے۔ وہ اکثر اوقات سرکش اور قانون شکن ثابت ہوتے اور فصلوں اور باغات کو سخت نقصان پہنچاتے (دیکھیے *Land lord and Peasant*، ص ۱۵۷۔۱۵۸)۔

میکڈونلڈ کے خیال میں ایلات یا نقل مکانی کرنے والے قبائل کی آبادی قصباتی آبادی سے اغلباً زیادہ تھی (کتاب مذکور، ص ۴۴)۔ Sheil، جو فتح علی شاہ اور محمد شاہ کے عہدِ حکومت کے ایران کے بارے میں طویل مشاہدات و تجربات رکھتی ہے، نیم خانہ بدوش اور اقامت پذیر آبادی کو کل آبادی کا ممکنہ طور پر نصف قرار دیتی ہے (Lady Sheil؛ کتاب مذکور، ص ۳۹۳)۔ ۱۸۹۱ء میں Mrs. Bishop نے تحریر کیا ہے کہ ایلات کو "دیہی آبادی کا پانچواں حصہ سمجھا جاتا ہے" (کتاب مذکور، ص۸۴) Mrs. Bishop کے بتائے ہوئے کم اعداد وشمار کی شائد جزوی طور پر وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ سارا سال یا سال کے کسی حصے میں گاؤں میں رہنے والے قبائلی لوگوں کو امکانی طور پر ان میں شامل نہیں کیا گیا۔ اے ہاؤتم شنڈلر (A. Houtum) Schindler نے ۱۹۰۰ء میں نوے لاکھ کی کل آبادی میں سے قبائلی لوگوں کی تعداد بائیس لاکھ بیان کی ہے۔ اس خانہ بدوش آبادی کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: ترک ساڑھے آٹھ لاکھ، کرد اور لک آٹھ لاکھ، عرب تین لاکھ لُر دو لاکھ تیس ہزار اور بلوچ اور مستقل خانہ بدوش بیس ہزار (ایرانی افواج کے بارے میں رپورٹ مرتبہ Lt. Col.H.P.Picot، جنوری ۱۹۰۰ء؛ نیز دیکھیے Curzon: کتاب مذکور، ۲: ۴۹۳، جو Houtum Schindler کے بتائے ہوئے اعداد وشمار ہی ۱۸۸۴ء میں معمولی فرق کے ساتھ بیان کرتا ہے)۔ وہ لکھتا ہے کہ اس زمانے میں اُستاجلو اور ذوالقدر قبیلوں کی تعداد بہت ہی کم ہوگئی تھی جو آذربیجان میں مقیم تھے۔ تکلو قبیلے کا وجود ختم ہوچکا تھا (*Eastern Persian Irak*، لنڈن ۱۸۹۸ء، ص ۴۸۔ ۵۹)۔

اُنیسویں صدی عیسوی میں اہم ترین قبیلہ بختیاری تھا جس کی حکومت کے ساتھ کشمکش اکثر رہتی تھی اور جس نے بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ۱۹۰۹ء میں آئینی حکومت کی بحالی میں ایک اہم کردار ادا کیا (دیکھیے

St. Antony`s Paper در ،Persia : A.K.S Lambton ،Middle East Affairs. 3 ، No.16 لنڈن، ۱۹۶۳ء)۔ وہ دو بڑے گروہوں ہفت لنگ اور چہار لنگ میں منقسم تھے۔ اول الذکر گروہ کی چہار محال میں گرمائی چراگاہیں تھیں اور مؤخر الذکر کی فریدن میں؛ ہر دو کی سرمائی چراگاہیں خوزستان میں تھیں۔(Morier) ۱۸۰۹ء میں ان کے خاندانوں کی تعداد ایک لاکھ بیان کرتا ہے۔ (Journey، ص ۲۴۲)۔ مالکم لکھتا ہے کہ وہ اپنے رسم ورواج کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے داخلی دائرۂ اختیار میں حکومت کی طرف سے کسی مداخلت کو برداشت نہ کرتے تھے۔ وہ فوجی نفری مہیا کرتے اور معمولی مقدار میں خراج ادا کرتے تھے۔ملکی قوانین سے مانوس کرنے اور امنِ عامہ میں دلچسپی دلانے کی خاطر میدانوں میں اُن کی آباد کاری کے لیے اُن کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور اُمید رکھی جاتی تھی کہ وہ اس طرح اپنے ہمسایوں پر غارت گری کی روش کو ترک کر دیں گے (کتاب مذکور، ۲: ۳۳۱)۔ De Bode بیان کرتا ہے کہ ہفت لنگ کے بہت سے افراد مستقل طور پر آباد کر دیئے گئے تھے (کتاب مذکور، ۲:۸۶)۔ فتح علی شاہ قاچار نے بختیاریوں کو تہران میں بطور یرغمال رکھا ہوا تھا جہاں ایک علیحدہ علاقہ اُن کے لیے مختص کیا گیا تھا (De Bode: کتاب مذکور، ۲: ۷۵)۔ بعد کے حکمرانوں نے بھی یرغمال رکھنے کی رسم کو جاری رکھا۔ تاہم اس سے نہ تو قبائلی بغاوتیں ختم ہوئیں اور نہ ہی شاہراہوں پر امن وسلامتی کا مقصد پورا ہوا۔ جب ۱۸۱۱ء میں اصفہان سے گزرا تو اس نے لکھا ہے کہ یہ قصبہ مسلسل خطرے کی حالت میں تھا مبادا ہفت لنگ کا سردار اسد خاں اس پر حملہ آور ہو کر قابض ہو جائے۔ (Second Journey، ص ۱۵۶).

تقریباً ۱۸۳۶ء میں راولنسن بختیاریوں (چہار لنگ اور ہفت لنگ، دینارونیوں سمیت) کے خاندانوں کی تعداد اٹھائیس ہزار بیان کرتا ہے۔ ان پر ایک سو قاتر لگان عائد کیا گیا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ قاتر سے مراد وہ رقم ہے جو قبائل کی خوشحالی یا افلاس کی بنا پر بڑھا اور گھٹا دی جاتی تھی اور ان پر حکومت کی طرف سے اپنے اقتدار کی تنفیذ کا ذریعہ ہوتی تھی۔ اتابکوں کے عہد میں ایک قاتر واضح طور پر ایک ہزار تومان کے مساوی ہوتا تھا، لیکن راولنسن کے ورود کے وقت یہ ایک سو تومان کے برابر تھا، مگر حکومت کو رقم کی وصولی میں کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ چہار لنگ کے ذیلی قبیلے جانکی کا سردار محمد تقی خاں اس وقت ایل خانی کے عہدے پر فائز تھا۔ راولنسن لکھتا ہے کہ وہ دس بارہ ہزار مسلح فوجی فراہم کر سکتا تھا۔ وہ محمد تقی خاں کے عدل کی بڑی تعریف کرتا ہے اور یہ کہ اُس نے قبائلیوں کی خانہ بدوشانہ عادات کے خاتمہ کی مساعی کیں اور وہ کسی حد تک ان میں کامیاب رہا۔ اس نے فریدن میں اراضی خریدی اور دیہات بسائے اور قبائلیوں کو رام ہرمز کے میدان میں آباد کیا جس میں کاشت کاری وغیرہ کے عوض وہ حکومت کو تین ہزار تومان بطور لگان ہر سال ادا کرتے تھے۔ بختیاری خوزستان کو تمباکو فراہم کرتے تھے اور اناج کی معمولی سی مقدار برآمد کرتے تھے۔ وہ اصفہان کی منڈی میں چھوٹا گوشت بھی مہیا کرتے تھے۔ بختیاریوں کے ہر قبیلے کا اپنا ایک مسلمہ موروثی سردار یا خان ہوتا تھاجو اپنی رعیت پر مطلق العنانی سے حکمرانی کیا کرتا تھا۔("Notes on a march from Zohab, at the foot of the Zagros, along the Mountain roads to Khuzistan (Susiana) and from thence through the Province of Luristan to Kirmanshah, in the year 1836، در JRGS، ۱۸۳۹ء، شمارہ ۹، ص ۲۶۔۱۱۶)۔ لیارڈ بھی محمد تقی خاں کی بڑی

توصیف کرتا ہے اور بختیاریوں کو تجارت کی طرف راغب کرنے کی اس کی خواہش کی تحسین کرتا ہے۔ ۱۸۴۱ء میں والیٔ اصفہان معتمد الدولہ محمد تقی خاں سے محصولات کے بقایا کی ادائی کے مطالبے کی غرض سے مالمیر آیا کیونکہ اسے باغی قرار دے دیا گیا تھا۔ اس نے تصادم سے گریز کرتے ہوے دفع الوقتی سے کام لیا، لیکن کسی سمجھوتے پر نہ پہنچ سکا۔ اس نے فلاحیہ میں بنو کعب کے ہاں پناہ لی، لیکن اسے شوشتر میں معتمدالدولہ کے ہاں حاضر ہونے کی ترغیب دی گئی۔ معتمدالدولہ نے اسے گرفتار کر لیا اور قیدی بنا کر اصفہان لے گیا جہاں اس نے ۱۸۵۱ء میں قید میں وفات پائی (دیکھیے Layard : کتاب مذکور ، ا: ۳۷۳و بعد).

ڈی بوڈ بتاتا ہے کہ چہار لنگ پر پندرہ ہزار تومان محصول عائد کیا گیا، لیکن یہ باقاعدگی سے وصول نہیں ہوتا تھا کیونکہ انہیں صرف طاقت کے استعمال سے ہی اس کی ادائیگی پر مجبور کیا جاسکتا تھا (کتاب مذکور، ۲:۸۲)۔ ہفت لنگ کے بسائے ہوے ۱۹۵ دیہات سات ہزار آٹھ سو تہتر تومان نقد اور پانچ سو تیس خروار غلہ بطور لگان ادا کرتے تھے جب کہ دیگر قبائل، جو ابھی تک نقل مکانی کے عادی تھے اور نسبتاً زیادہ آبادی رکھتے تھے، صرف تین ہزار تومان ادا کرتے تھے۔ ہفت لنگ کے کچھ سردار سارے علاقوں میں کاشتکاری وغیرہ کرتے تھے (کتاب مذکور، ۲:۸۶)۔ مسز بشپ کا بیان ہے کہ ایلخانی نے چہار محال تقریباً بیس ہزار تومان (چھ ہزار پونڈ) سالانہ کے عوض پٹہ پر لگایا ہوا تھا (کتاب مذکور، ا: ۳۰۹)۔ وہ بختیاری خاندانوں کی تعداد اُنتیس ہزار ایک سو بتاتی ہے اور بیان کرتی ہے کہ پچھلی صدی میں ان کی آبادی بڑھ گئی تھی۔ محصولات اصفہان کے والی کو ادا کیے جاتے تھے۔ البتہ تین قبیلے بروجرد کے والی کے زیرِ اقتدار تھے

(کتاب مذکور، ا: ۲۹۵-۲۹۶)۔ وہ بختیاریوں کے ہاں موجود اپنے زیر مشاہدہ افلاس کا موازنہ ان قبائل کے تمول سے کرتی ہے جنہیں لیارڈ اور ڈی بوڈ نے دیکھا تھا (کتابِ مذکور، ۲:۵۴)۔ وہ بختیاریوں کے ہاں امن وامان کی خراب صورتِ حال اور دور دراز علاقوں میں ایل خانی کے غیر حقیقی اقتدار کا ذکر کرتی ہے (کتاب مذکور، ۲:۹۲-۹۳)۔ وہ بیان کرتی ہے کہ بختیاری خچر اور گھوڑے برآمد کیا کرتے تھے (کتاب مذکور، ۲:۱۱۷)۔ کرزن نے، جس زمانے میں ایران کے بارے میں تحریر کیا ہے، حالات بدل چکے تھے (کتاب مذکور، ۲، ۲۹۹)۔ اس کا بیان ہے کہ ایلخانی اور ایل بیگی کے عہدوں کے علاوہ جو کہ بادشاہ کی طرف تحفۃً اور مشاہرہ کے ساتھ عطا کیے جاتے تھے، ایک تیسرا عہدہ دار حاکمِ چہار محال بھی قبائلی سیاسیات سے گہرا ربط وضبط رکھتا تھا کیونکہ اس علاقے میں قبائلی سرداروں کی زیرملکیت اراضی تھی (کتاب مذکور، ۲: ۲۹۵).

لرستانِ کوچک پیش کوہ اور پشتِ کوہ میں منقسم تھا۔ اول الذکر علاقے میں جو بڑے قبیلے پائے جاتے تھے، جو ڈی بوڈ کے بیان کے مطابق ان میں سے سلاسلی اور دلفون تقریباً دو سے تین ہزار اور بالاگریوں چار ہزار گھرانوں پر مشتمل تھے (کتاب مذکور، ص ۲۸۶ وبعد) پشتِ کوہ کے قبائلی فیلی تعداد میں کم تھے۔ راولنسن پیش کوہ اور پشتِ کوہ کے قبائل کی مفصل فہرست دیتے ہوے ان کی تعداد اڑتیس ہزار اور بارہ ہزار بیان کرتا ہے (کتاب مذکور)۔ لُر بُروجرد، نہاوند، ہمدان اور کرمان شاہ کے بازاروں کو چھوٹا گوشت، دودھ کی مصنوعات اور لکڑی کا کوئلہ فراہم کرتے تھے۔ وہ غالیچے اور خچر سواروں کے لیے خرجیاں بنانے کے لیے استعمال ہونے والا کھردرا کپڑا بکریوں کے بالوں سے تیار کرتے تھے (De Bode، کتاب مذکور، ج ، ۲۹۲)۔ لُر کوچک کی قبائلی تنظیم

بختیاریوں (لُر بُزرگ) کی تنظیم سے مختلف تھی۔ قبیلے کے ہر ذیلی حصے کا اپنا توش مال یا سردار ہوتا تھا اور مشترکہ مفادات پر بحث و تمحیص کے دوران وہ ہم مرتبہ کی حیثیت سے ملتے تھے۔ پشِ کوہ کے قبائل کو ایک سو بیس قاتر لگان ادا کرنا ہوتا تھا (اس لفظ کے مفہوم کے لیے دیکھیے سطور بالا)۔ یہ رقم ایک عمومی اجلاس میں قبیلوں اور ان کے ذیلی حصوں پر پھیلا دی جاتی تھی اور ہر ذیلی حصہ اسے [اپنی] مختلف فرودگاہوں (Camps) پر پھیلا دیتا تھا اور ہر فرودگاہ کا ریش سفید اپنے ماتحت خاندانوں سے اس کی وصولی کرتا تھا۔ وزیر مرزا بزرگ کے عہد میں قاتر کی مالیت دو سو قدیم تومان سے بڑھ کر چار ہزار (رائج الوقت) تومان ہوگئی، لیکن اس سے کم رقم وصول ہوئی (Rawlinson : کتاب مذکور؛ نیز دیکھیے Curzon : کتاب مذکور، ۲: ۲۷۴ وبعد، وعلی محمد ساکی: جغرافیہ و تاریخ لُرستان، تہران ۱۹۶۴ء)۔

اُنیسویں صدی عیسوی میں فارس میں دو بڑے قبائلی گروہ خمسہ اور ترکی بولنے والے قشقائی تھے۔ اول الذکر گروہ، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، پانچ قبیلوں پر مشتمل تھا: تین ترک قبائل (اینلو، بہارلُو اور نفر)، ایک ایرانی قبیلہ (باسری) اور ایک عرب قبیلہ (اہلِ عرب) (دیکھیے فسائی: کتاب مذکور، ۲: ۳۰۹ وبعد اور Land lord and Peasant ، ص ۱۵۹)۔ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں قشقائی قبیلہ کے قوام الملک کا زور توڑنے کے لیے ابتداءً حاجی ابراہیم کے پوتے محمد علی خاں قوام الملک کو ان کا حاکم مقرر کیا گیا جس نے وعدہ کیا کہ وہ داراب اور ایلاتِ خمسہ کا لگان دس سال کی مدت کے لیے بصورتِ مقاطعہ ادا کرے گا (فسائی: کتابِ مذکور، ۲ : ۵۱) قشقائی قبیلہ اور حاجی ابراہیم کے خاندان کے درمیان رقابت گزشتہ کئی سالوں سے چلی آرہی تھی۔ ڈی بوڈ جو ۱۸۴۱ء میں شیراز میں تھا، بیان کرتا ہے کہ اس نے اس قصبے کو دو حریف فرودگاہوں میں بٹا ہوا پایا۔ ایک فرود گاہ کا سربراہ ایل بیگی جب کہ دوسری کا سربراہ کلانتر حاجی مرزا علی اکبر بن حاجی ابراہیم تھا (کتاب مذکور، ا: ۱۸۰۔۱۸۱) (۱۹۵۸ء میں خمسہ کے نیم وفاق کے باسری قبیلہ کے مفصل احوال کے لیے دیکھیے F. Barth : Nomads of South Persia، اوسلو ۱۹۶۱ء)۔

قشقائی انیسویں صدی میں زیادہ اہمیت اختیار کر گئے۔ تیرہ قبیلے کے مختلف حصے اپنے اپنے کلانتر کے ماتحت ہوتے تھے اور اس کے مزید چھوٹے چھوٹے گروہ اپنے اپنے کدخدا کے زیرِ اقتدار ہوا کرتے تھے۔ قبیلے کا اقتدار، مجموعی طور پر، ایل خانی اور اس کے نائب ایل بیگی کے ہاتھوں میں ہوتا تھا جو حکومت کے مقررکردہ لیکن قبائلی سرداروں میں سے منتخب شدہ ہوتے تھے (فسائی: کتاب مذکور، ۲: ۳۱۳)۔ شیل نے ان کے خیموں کی تعداد تیس چالیس ہزار بیان کی ہے۔ ان کی بڑی شاخ عملہ کے خیمے تین ہزار تین سو تھے اور وہ ایک ایل خانی کی ماتحتی میں تھے۔ ان کا گرمائی مستقر اصفہان کے نزدیک گندمان میں اور سرمائی مستقر ساحل کے قریب تھا۔ اُن کے متعدد گروہ بختیاریوں کے ساتھ کوہِ جانکی اور کوہِ دِنا کے نزدیک رہائش پذیر تھے۔ اُن کے ریوڑ بکثرت تھے اور اپنی نقل مکانی کے دوران وہ بڑا نقصان کرتے تھے (Lady Sheil : کتاب مذکور، ۳۹۸۔ ۳۹۹)۔ اُس وقت کے والیٔ فارس، حسین علی مرزا نے ان کے ایل خانی محمد علی خان کو ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء۔۱۸۳۴ء میں گرفتار کیا، لیکن جلد ہی اسے رہا کر کے دوبارہ قبیلے کا ایل خانی مقرر کرنے پر مجبور ہوا (فسائی: کتاب مذکور، ۱۲ : ۲۸۵)۔ بعدازاں وہ اپنے قبیلے کی نیک چلنی کی ضمانت کے طور پر تقریباً دس سال تک تہران میں یرغمال بنا رہا اور ۱۸۴۸ء میں اسے رہائی نصیب ہوئی (F.O. 60:137.Farrant To Palmerstan No

103 ، تہران، ۲۴ نومبر ۱۸۴۸ء) کرزن لکھتا ہے کہ ایل خانی فیروز آباد اور فراش بند کا والی بھی ہوا کرتا تھا مگر اس زمانے کے ایل خانی سلطان محمد خان کو حکومت نے اس کی قبائلی طاقت سے محروم کر دیا تھا اور قبیلے کی سربراہی ایل بیگی داراب خاں کو سونپ دی گئی جو صوبہ کے والی کو ریوڑوں پر عائد محصول اپنے قبیلے کے لوگوں سے اکٹھا کر کے ادا کرتا تھا۔ ۱۸۷۱ء۔۱۸۷۲ء کے قحط میں قشقائیوں کی تعداد گھٹ گئی اور انُ کی آبادکاری سے اس میں مزید کمی ہوئی۔ کرزن کا اندازہ ہے کہ قبیلے کے خیموں کی تعداد دس بارہ ہزار سے زیادہ نہ تھی (کتاب مذکور، ۲: ۱۱۲۔۱۱۴، دورِ جدید میں قشقائیوں کے رسم ورواج کے تفصیلی احوال کے لیے دیکھیے محمد بہمن بیگی: عرف وعاداتِ عشائرِ فارس، تہران ۱۹۴۵ء).

قشقائی اور خمسہ کے ترک قبائل کے علاوہ فارس میں متعدد دیگر ترک قبائل بھی تھے، مثلاً قنقاری میں خلج قبیلہ جس کے سربراہ مرزا قاسم خان کی شادی انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصے میں قنقاری کے ایل خانی جانی خان کی دختر سے ہوئی (فسائی: کتاب مذکور، ۲:۲۴۴)۔ کرمان اور آذربیجان میں خلج کے چھوٹے چھوٹے گروہ بھی موجود تھے (Houtum Schindler : Eastern Persian Irak، ص ۵۰)۔ فارس اور خوزستان کی سرحدات پر مقیم ممسنی چار بڑے حصوں پر مشتمل تھے: رُستمی، بکش، جی اور دُشمنز یاری۔ ان میں سے پہلے دو سب سے زیادہ طاقت ور تھے اور ان کے مابین رقابت تھی۔ دُشمنز یاری کے سردار محمد رضا خاں کو ۱۸۴۰ء میں فارس کے گورنر فریدوں مرزا کے حکم پر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا اور یہ قبیلہ نہایت کمزور ہوگیا۔ اس وقت ممسنی قبیلہ کے خاندانوں کی تعداد چار ہزار سے زائد بیان کی جاتی ہے۔ فارس کے والی کی طرف سے ان پر عائد کیا جانے والا محصول سات ہزار تومان (تقریباً دو ہزار آٹھ سو پونڈ) تھا۔ وہ فتح علی شاہ قاچار کے عہد کے بعد کے ان سالوں کے دوران کافی ڈاکہ زنی کیا کرتے تھے جب کہ حسین علی مرزا فارس کا والی ہوا کرتا تھا۔ بکش قبیلے کا سردار ولی خاں ان کا اہم سرغنہ تھا۔ وہ اور اس کا بیٹا باقر خاں بالآخر گرفتار ہوے اور تبریز میں قید کر دیے گئے اور یوں ممسنی قبیلہ کی طاقت کچھ حد تک گھٹ گئی (De Bode : کتاب مذکور، ۱: ۲۷۰ وبعد)۔ ڈی بوڈ باشت پر قابض باوی قبیلے کے خاندانوں کی تعداد چار ہزار تک بتاتا ہے۔ ان کے سردار شریف خان کو حسین علی مرزا نے اندھا کر دیا تھا۔ ابتداءً باوی کعب کے علاقے سے باشت آے تھے۔ پھر نادر شاہ نے انہیں خراسان منتقل کر دیا، لیکن وہ اس کی وفات کے بعد وہاں سے واپس آگئے۔ بوہر احمدی کے خاندانوں کی تعداد تین ہزار تھی اور وہ آرو اور دو جنبدان کے شمال کے علاقے پر قابض تھے۔ نوی قبیلہ تقریباً دو ہزار خاندانوں پر مشتمل تھا اور وہ بہبہان کے شمال مشرق میں رہتے تھے۔ طیبی کے خاندانوں کی تعداد تین ہزار تھی اور بہمئی جو بہبہان کے شمال مشرقی پہاڑوں میں رہتے تھے، ''فارس کے کوہستانی باشندوں میں سب سے زیادہ وحشی اور سرکش قبیلہ تھا۔'' یہ تھے ڈی بوڈ (De Bode) کے خیالات۔ ان کے خاندانوں کی تعداد دو ہزار سے کم تھی۔ ڈی بوڈ کی تحریر کے وقت وہ بختیاری سردار محمد تقی خاں سے جا ملے تھے۔ خونی جھگڑوں کی بنا پر ان میں سخت پھوٹ پڑ گئی۔ کئی ایک چھوٹے عرب اور ترک قبیلے بہبہان کے میدان پر قبضہ جماے ہوے تھے۔ ان میں سے کچھ دیہات میں آباد تھے اور کچھ خیموں میں فروکش تھے (De Bode : کتاب مذکور، ۱ : ۲۷۰ وبعد)۔ قبائل کے بارے میں شیل کے فراہم کردہ اعداد وشمار ڈی بوڈ کے بتاے ہوے اعداد

وشمار سے کم ہیں۔ ممسنی قبیلے کی طاقت صدی کے وسط تک کافی گھٹ چکی تھی۔ شیل نے ان کے خیموں اور مکانوں کی تعداد آٹھ ہزار بتائی ہے (Lady Sheil : کتاب مذکور، ص ۳۹۹؛ نیز دیکھیے Curzon: کتاب مذکور، ۲: ۳۱۸)۔ شیل کے تخمینے کے مطابق بہبہان اور کوہ جلویہ کے قبائل میں بہمئی سب سے بڑا قبیلہ تھا (دو ہزار پانچ سو خیموں کے ساتھ) اس کے بعد بویراحمدی آتا تھا (دو ہزار خیموں کے ساتھ) پھر باوی (ایک ہزار دو سو خیموں کے ساتھ) اور اس کے بعد چرامی اور طیبی (ہر ایک، ایک ایک ہزار خیموں کے ساتھ) اور پھر بہت سے نسبتاً چھوٹے قبیلے۔ ان میں بہت سے غریب تھے اگرچہ طیبی قبیلے کے افراد متمول بیان کیے جاتے تھے (Lady sheil: کتاب مذکور، ص ۳۹۹)۔ فرہاد مرزا نے ۱۸۸۲ء میں کوہ جلویہ کو گھٹا دیا (Curzon: کتاب مذکور، ۲: ۳۱۸) (نیز دیکھیے محمود باور: کوہ جلویہ وایلاتِ آں، تہران (؟) ۱۹۴۵ء اور منوچہر زرآبی: "طوائفِ کوہ جلویہ" در فرہنگِ ایران زمین، ۹، Fas ۱-۴: ۲۷۸۔ ۳۵۲۔ نیز بویری احمدی کے خوانین کے شجرۂ نسب اور ۱۹۱۳ء میں ان کی تعداد کے لیے دیکھیے ۱۷۲۸: F.O.371).

سرزمین عرب میں بنو کعب اُنیسویں صدی عیسوی میں شیخ ثامر کی وفات تک اہمیت میں فزوں تر ہوتے گئے مگر اس کی وفات کے بعد انہیں زوال آ گیا۔ ۱۷۴۰ء اور ۱۷۵۰ء کے درمیان انہوں نے افشاروں کو جراحی اور اس کے نواح سے واضح طور پر بے دخل کر دیا۔ قبل ازیں وہ چراگاہوں کے ضمن میں افشار سردار کو بعض سالانہ ادائیگیاں کرچکے تھے۔ آقا محمد خاں کے عہد کے دوران وہ فارس کے والی کو بے قاعدگی سے پیش کش کی ادائی کرتے رہے تھے۔ میکڈانلڈ کنیر نے لکھا ہے کہ بنو کعب کا شیخ اپنے ماتحت شیوخ کے تعاون سے پانچ ہزار سوار اور بیس ہزار پیادے میدانِ جنگ میں بادشاہ کے لیے بھجوا سکتا تھا (کتاب مذکور، ص ۹۱)۔ ۱۸۱۸ء میں محمد علی مرزا نے شیخ ثامر سے محصولات کے بقایا کی وصولی کے لیے فلاحیہ کی طرف پیش قدمی کی۔ محمد شاہ قاچار کے عہد میں بنو کعب کے افراد کو یرغمال بنا کر رکھا گیا اور لگان چار ہزار تومان سے بڑھا کر بیس ہزار تومان کر دیا گیا۔ (*F.O. 60:103* یادداشت از Rawlinson دربارہ کعب، مشمولہ در *Sheil To Aberdeen* عدد ۱۵، تہران، ۳ فروری ۱۸۴۴ء؛ نیز دیکھیے de Bode : کتاب مذکور، ۲: ۱۱۰ وبعد اور *F.O. 60:222* رپورٹ دربار، کعب برائے Outram مرتبہ عربی ترجمان George Percy Badger ، کیمپ قبل Bushire، ۲۱ فروری ۱۸۵۷ء) ۱۸۶۳ء میں Pelly نے سواروں کے علاوہ کعب کے قبائل کی تعداد اڑسٹھ ہزار بیان کی ہے جو مبالغہ آمیز ہے (*Report on the Tribes etc. and the Shores of the Persian Gulf*، کلکتہ ۱۸۷۴ء)۔ Curzon بنوکعب کی تعداد باسٹھ ہزار نفوس لکھتا ہے (کتاب مذکور، ۲: ۳۲۱ وبعد).

بنوکعب کے زوال کے ساتھ محمرہ کے محسنوں کے اثر ونفوذ میں اضافہ ہوا (Curzon : کتاب مذکور، ۲: ۳۲۵ وبعد)۔ جنوب کے دیگر عرب قبائل میں سے ہویزہ کے متفق بھی شامل تھے جو ۱۸۱۲ء میں ترکی سلطنت سے اس علاقے میں آئے (Curzon : کتاب مذکور، ۲: ۳۲۵ وبعد)۔ ان عرب قبائل میں دشتِ میشان کے بنی طروف اور بنی لام کے نام بھی آتے ہیں۔ بنی لام زیادہ تر ترک علاقے میں آباد تھے (نیز دیکھیے منوچہر زرابی: "طوائفِ میان آب" در فرہنگ ایران زمیم، ۱۰، Fas ۱-۴، ص ۳۹۴۔ ۴۰۷).

مشرقی ایران میں قبیلے زیادہ اور متنوع تھے۔ کرمان میں افشار اور عطا الٰہی تھے۔ صدی کے وسط میں ان کے

خیموں کی تعداد پندرہ ہزار اور مکانات کی تعداد تین ہزار بیان کی گئی ہے (Lady Sheil : کتاب مذکور، ص ۳۹۸)۔ جنوب مشرق میں اہم ترین گروہ بلوچ تھے جو زیادہ تر بلوچستان اور سیستان میں آباد تھے (دیکھیے J.P. Ferrier : *Caravan Journeys and Wanderings in Persia, Afghanistan, Turkistan and Beloochistan*، ترجمہ از Capt. W.Tesse، لنڈن ۱۸۵۶ء)، لیکن قائنات اور خراسان میں بھی معمولی طور پر مرتکز تھے۔ قاچار دور کے ابتدائی حصے میں سیستان اور بلوچستان کے بلوچ مرکزی حکومت کے زیرِ اقتدار نہیں تھے۔ وہ کوئی خراج ادا نہیں کرتے تھے، بلکہ موقع بموقع والی کرمان کے ہاں معمولی پیش کش جمع کرا دیتے تھے (عبدالرزاق بن نجف قلی: *Dynasty of the Kajass*، ترجمہ، لنڈن ۱۸۳۳ء، ص ۴۴۷)۔ مورئیر ۱۸۰۸ء میں لکھتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ اگرچہ بلوچ ماضی میں حکومت ایران کی رعیت رہے تاہم انہوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھا (*Journey*، ص ۴۹-۵۰) ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد میں بلوچوں کو مرکزی حکومت کے تحت لانے میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی (دیکھیے فیروز مرزا فرمان فرما: سفر نامۂ کرمان وبلوچستان، طبع منصورہ نظامانی، تہران ۱۹۶۳ء)۔ فیرئیر، جس نے ۱۸۴۵ء میں ایران کی سیاحت کی، بیان کرتا ہے کہ ترشز میں بلوچوں کے تقریباً آٹھ ہزار خیمے تھے اور اُن کے پاس وسیع ریوڑ تھے (کتاب مذکور، ص ۱۳۷)۔ شیل نے ان کی تعداد قدرے کم تقریباً دو ہزار خیمے اور گھوڑے بتائی ہے (Lady Sheil، کتاب مذکور، ص ۴۰۰)۔ قائن میں بھی بلوچ مقیم تھے (Ferrier: کتاب مذکور، ص ۴۴۱)۔ اور تربتِ حیدری میں اُن کے تقریباً دو ہزار خیمے اور مکانات تھے (Lady Sheil : کتاب مذکور، ص ۴۰۰)، تربتِ حیدری کا اہم ترین گروہ قرائی تھے جن کے خیموں اور مکانوں کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ وہاں کئی اور متفرق گروہ بھی آباد تھے اور ان کے خیموں وغیرہ کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی (Lady Sheil : کتاب مذکور، ص ۴۰۰)۔ فتح علی شاہ قاچار کے دور میں قرائی سردار اسحاق خان نے بڑی مؤثر حیثیت حاصل کر لی۔ آخر کار اسے اس کے بیٹے کے ہمراہ گرفتار کیا گیا اور وہ خراسان کے ولی محمد ولی مرزا کے ہاتھوں قتل ہوا۔ (Watson : *A History of Persia*، لنڈن ۱۸۶۶ء، ص ۱۷۵ وبعد)۔ کرنل ییٹ (Yate) جس نے ۱۸۹۳ء میں خراسان کا سفر کیا، قرائی خاندانوں کی تعداد تین ہزار بیان کرتا ہے۔ وہ پیادہ فوج کی ایک رجمنٹ مہیا کرتے تھے (*Khurasan and Sistan*، لنڈن ۱۹۰۰ء، ص ۵۳)۔ عربوں کے خیمے اور مکان ترشز میں چار ہزار، تن اور طبس میں سات ہزار اور قائن میں بارہ ہزار تھے (Lady Sheil : کتاب مذکور، ص ۴۰۰).

مشرقی خراسان میں ہزارے، تیموری، میمنی، فیروز کوہی، جمشیدی وزنجی تمام کے تمام ترک قبائل ابتدائی قاچار عہد میں بمشکل ہی حکومت کے تسلط میں تھے اور فتح علی شاہ اور محمد شاہ کی اموات پر انہوں نے شورشیں برپا کیں۔فیرئیر بیان کرتا ہے کہ جب اس نے خراسان کا سفر کیا تو دو ہزار خاندان محمود آباد کے قریب شہر نو سے نئے نئے ہرات منتقل ہوے تھے۔ وہ اچھی خاصی تعداد میں گھوڑے پالتے تھے اور وہ حکومت کو لگان گھوڑوں کی شکل میں ادا کرتے تھے۔ وہ حکومت کو ضرورت لاحق ہونے پر ایک ہزار سوار مہیا کرنے کے پابند تھے (کتاب مذکور، ص ۱۳۷)۔ ۱۸۹۳ء تک ایران میں ہزارہ قبیلے کی تعداد واضح طور پر کم ہوچکی تھی۔ ییٹ صرف ایک ہزار دو خاندانوں کا تخمینہ پیش کرتا ہے (کتاب مذکور، ص ۱۳۲)۔ شیل بتاتی ہے کہ خواف میں تیموریوں کے چار ہزار خیمے اور مکان تھے؛ مشہد کے

نزدیک دو ہزار افراد پر مشتمل ایک دوسرا گروہ آباد تھا۔ مشہد کے اردگرد کئی متفرق ترک اور ایرانی قبائل آباد تھے جن کے خیموں اور مکانوں کی تعداد تقریباً گیارہ ہزار تھی۔ نیشاپور میں دس ہزار بیات اور کرشاہی تھے جو مستقل اقامت پذیر تھے۔ بیات بر جرد، خرم آباد اور فارس میں بھی موجود تھے اور یہ بیات قبیلے کے ان افراد کے علاوہ تھے جو قاجار قبیلے میں جاملے تھے اور شاملیا تلو کے نام سے قبیلے کا ایک ذیلی حصہ بن چکے تھے (Houtum Schindler : *Eastern Persian Irak*، ص ۴۸۔۵۰) خراسان کے کرد قبائل میں سے زعفران لو کے کوچان میں چودہ ہزار، کیوان لو کے رادکان میں دو ہزار اور شادلو کے بجنرد میں تین ہزار خیمے اور مکان تھے، نیز اس کے متعدد دیگر گروہ سبزوار اور جوین وغیرہ میں رہ رہے تھے (Lady Sheil : ص ۴۰۰)۔ شاہ عباس نے ابتداءً ازبکوں کو اخل سے نکالنے کے لیے زعفران لو کو وہاں آباد کیا تھا، لیکن شاہ سلطان حسین کے عہد میں اُنہی کو وہاں سے نکال کر کوچان، شروان اور بجنرد بھجوا دیا گیا (Yate: کتاب مذکور، ص ۱۸۰ وبعد؛ نیز دیکھیے Curzon : کتاب مذکور، ۱:۹۷ وبعد، و۱۹۱۔۱۹۲)۔

ایران کی وسط ایشیائی سرحد اور ترکمانی گیاہی میدان میں مقیم قبائل پر تسلط سابقہ ادوار کے حکمرانوں کی طرح قاجاروں کے لیے بھی ایک مشکل مسئلہ ثابت ہوا۔ وہ ازبکوں اور ترکمانوں کی لوٹ مار کی خاطر عام یورشوں کی روک تھام نہ کر سکے اور اس صدی کے ابتدائی حصے میں بہت سے ایرانی باشندوں کو غلام بنا کر لے گئے۔ ایرانی سرحد کی جانب رہنے والے دو اہم ترین ترکمان قبیلے گکلان اور یموت سنی تھے۔ اول الذکر خانہ بدوش نہ تھے۔ مؤخر الذکر، جو غیر متعین سرحد کے دونوں طرف مقیم تھے، مزید دو حصوں چمور اور چروا میں منقسم تھے۔ چمور کاشت کاری کرتے تھے اور چروا خانہ بدوش تھے۔ یموت اور اتک دیہاتوں کے مابین دشمنی تھی اور اول الذکر کے حملے مؤخر الذکر پر عموماً جاری رہتے تھے۔ جس سے وہ مشتعل ہو جاتے اور سرکاری حکام اُن پر کافی تشدد کرتے۔ بحیرۂ خزر کے جنوب مشرق میں آباد گکلان مستقل طور پر یموت سے دہشت زدہ رہتے تھے اور اُن کے تعلقات بجنرد کے کردوں اور کبود جامہ کے حاجیلر قبیلے سے بھی کوئی اچھے نہیں تھے۔ حملے اور جوابی حملے معمول کی بات تھے (دیکھیے Yate: کتاب مذکور، ص ۲۴۵۔۲۴۷، ایک حملے کے احوال کے لیے)۔ گکلان اور یموت کا ہر حصہ کئی اوبوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا جس کا سردار (آق سقل) موروثی جاگیر (Yurt) کا مالک ہوتا تھا۔ یوں سارے قبیلے کا ایک سردار نہیں ہوتا تھا۔ ضرورت کے وقت اوبوں کے سردار اکٹھے ہو کر فیصلے کرتے تھے۔ قبیلے میں داخلی جھگڑے عام تھے۔ خراج حکومت کے مقرر کردہ نمائندوں (سرکردگان) کے توسط سے ادا کیا جاتا تھا اور وہی حسبِ ضرورت حکومت کو قبائلی فوجی نفری کا مقررہ حصہ مہیا کرنے کے ذمہ دار ہوتے تھے (*Land lord and Peasant*، ص ۱۶۰۔۱۶۲)۔

موریئر جس نے ۱۸۱۰ء اور ۱۸۱۶ء کے درمیان ایران کا سفر کیا، یموت اور گکلان کے خاندانوں کی تعداد آٹھ دس ہزار بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حکومت سے ان کی اطاعت برائے نام تھی۔ وہ سالانہ بادشاہ کو چند ایک گھوڑے بطور ہدیہ پیش کرتے تھے ”جو انہیں ناراض کرنے کی بابت بڑا محتاط رہتا ہے اور عموماً جو کچھ وہ اسے دیتے ہیں اس سے زیادہ انہیں واپس دے دیتا ہے۔“ ان کی سرحد استر آباد سے آٹھ فرسخ دور تھی۔ ان سے آگے تکی رہتے تھے جو عمومی طور پر یموت اور گکلان سے مختلف تھے (*Second Journey*، ص

۳۷۷-۳۷۸)۔ J.B. Fraser نے ۱۸۸۳ء میں گکلان کے ایک گروہ سے ملاقات کا احوال بیان کیا ہے (A *Winter Journey*، ۲: ۳۳۱ وبعد)۔ وہ لکھتا ہے کہ اس وقت یموت نے بغاوت کر رکھی تھی (وہی کتاب، ص ۳۸۲) ایبٹ ۱۸۳۸ء میں ایک ایرانی اہل کار کے مرتب کردہ اعداد وشمار کی بنیاد پر یموت کے خیموں کی تعداد ساڑھے اُنسٹھ ہزار بیان کرتا ہے (Abbot to Aberdeen` F.O.60: 92، تبریز، ص ۱۰ مئی ۱۸۴۲ء)۔ یہ اعداد وشمار اغلبًا مبالغہ پر مبنی تھے۔ٹیلر تھامسن (Taylour Thomson) ، جس نے ۱۸۴۶ء میں اس علاقے کا دورہ کیا، گکلان کے خاندانوں کی تعداد تقریبًا پانچ چھ ہزار اور یموت کے خاندانوں کی تعداد بیس ہزار بیان کرتا ہے۔ *Taylour Thomson To Sheil* ، *F.O. 60:122*) تہران ، ۱۵ اپریل ۱۸۴۶ء، مشمولہ در Sheil To Aberdeen No.50 ، تہران ۴ مئی ۱۸۴۶ء)۔ایبٹ (Abbot) ۱۸۴۴ء میں دوبارہ لکھتے ہوے بیان کرتا ہے کہ گکلان، جو گنبدِ کابوس، اَترک اور بجنرد کے درمیانی علاقے میں فروکش تھے، کے خاندانوں کی تعداد تین چار ہزار تھی۔ ماضی میں ان کے خاندان بہت زیادہ ...... تقریبًا بارہ ہزار تھے، لیکن ان میں سے نصف کچھ سال قبل اس وقت خیوا چلے گئے، جب فتح علی شاہ نے لوٹ مار کرنے پر انہیں سزا دینے کی دھمکی دی۔ ہیضے نے بھی ان کے اندر بڑی تباہی پھیلائی؛ اور ۱۸۳۶ء میں یموت کے خلاف پیش قدمی کرتے ہوے محمد شاہ کی فوجوں نے ان پر بڑی زیادتیاں کیں۔ اس وقت یموت زیادہ تر بیرونِ ایران رہ رہے تھے۔ ان کی تعداد زیادہ تھی اور وہ اپنی متلون مزاجی کی بنا پر ایران سے خیوا چلے گئے تھے۔ چرِوا کوہِ بلخان کی طرف موسمی نقل مکانی کرتے تھے۔ وہ استر آباد کے والی کو ہدایا یا محصول نہیں دیتے تھے، لیکن چمور کم خوش قسمت تھے۔ جب چرِوا نقل مکانی کر کے چلے جاتے تو چمور غیر محفوظ ہو جاتے اور استر آباد کا والی ان سے معمولی افرادی محصول اور پیش کش وصول کرتا۔ جب ایرانی حکومت ترکمانوں پر دباؤ نہ ڈال سکی تو اس نے جتنی جلد ہو سکا ان سے مصالحت کر لی (Abbot کے سفر کا احوال، کتاب مذکور)۔ ناصرالدین شاہ کے عہد میں گکلان کو مجبور کیا گیا کہ وہ چالیس یا پچاس خاندان بطور یرغمال بھجوائیں لیکن اس سے بھی وہ ایران میں چارہ کی تلاش کے لیے سفروں سے نہ رکے (Lady Sheil : کتاب مذکور، ص ۲۰۷ وبعد)۔ ییٹ (Yate) ۱۸۹۳ء میں لکھتا ہے کہ گکلان کے بعض افراد دولت مند تھے۔ ایرانی حکومت نے گرگان کے علاقے میں مقیم گکلان کے خاندانوں کی تعداد نوسو، ایک ہزار بیان کی ہے؛ لیکن دیگر ذرائع ایک ہزار سات اور دو ہزار کے درمیان بتاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ یموت سے دہشت زدہ رہتے تھے (کتاب مذکور، ص ۲۱۷ وبعد)۔ مختلف طور پر لگائے جانے والے تخمینوں کی رُو سے یموت کے خیموں کی تعداد سات ہزار سے پندرہ ہزار تک تھی۔ ییٹ کم تر تخمینے کو تقریبًا درست تصور کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے چار ہزار چھ سو چمور تھے اور دو ہزار چار سو چرِواس تھے (کتاب مذکور، ۲۷۹-۲۸۰)۔ (نیز دیکھیے Curzon : کتاب مذکور، ۱: ۱۸۹ وبعد؛ اور روسی وزیرِ مالیات کو ارسال کی جانے والی ۱۸۳۶ء میں بحیرہ خزر کے مشرقی سواحل کی جانب بھجوائی جانے والی مہم کے سربراہ کی کریملن میں موجود متعدد رپورٹیں جن کے تراجم *F.O.65. 226* ، میں موجود ہیں، مشمولہ، در *Durham To Palmerston* ، سینٹ پیٹرز برگ، ۱۹ دسمبر ۱۸۳۶؛ *F.O. 65: 223* مشمولہ در *Durham To Palmerston* نمبر ۲۸، نشان زدہ خفیہ، سینٹ پیٹرز برگ، ۱۳ فروری ۱۸۳۷ء، و *F.O.65: 234* ،

مشمولہ Durham to Palmerston No 63 سینٹ پیٹرز برگ، ۸/اپریل ۱۸۳۷ء).

تہران کے خطے میں اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط میں متفرق قبیلے موجود تھے جن میں شاہ سوان سب سے بڑا تھا۔ جس کے خیموں کی تعداد نو ہزار تھی۔ وہ موسمی لحاظ سے قم، تہران، قزوین اور زنجان کے درمیان بکھرتے رہتے تھے۔ باقی ماندہ قبائل متعدد چھوٹے چھوٹے گروہوں پر مشتمل تھے جن میں سے زیادہ تر انتہائی غریب تھے (Lady Sheil : کتاب مذکور، ص ۳۹۷)۔ قم اور ساوہ کے نزدیک خلج بھی رہتے تھے (De Bode : کتاب مذکور، ۲: ۳۱۸) ہاؤتُم شنڈلر (*Houtum Schindler*) انیسویں صدی کے آخر میں ورامین اور خاور میں تقریباً ایک ہزار پازوکی خاندانوں کا ذکر کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ کردی اور کچھ ترکی زبان بولتے تھے۔ وہ مشرقی ایرانی عراق میں متعدد دیگر چھوٹے قبیلوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ (کتاب مذکور، ص ۵۰).

زنجان کے خمسہ علاقے میں کئی ترک قبائل آباد تھے۔ وہ گرمیاں خیموں میں بسر کرتے تھے لیکن طویل فاصلے کی نقل مکانی نہ کرتے تھے۔ موسم سرما میں شدید سردی کی بنا پر وہ مکانات میں رہتے تھے۔ ان میں سے دو بڑے قبیلے جروس اور شاہ سوان افشار تھے۔ جزوس کے مکانات کی تعداد چار ہزار سے پانچ ہزار تک تھی اور شاہ سون افشار کے دو ہزار پانچ سو خیمے تھے (*Lady Sheil* : کتاب مذکور، ص ۳۹۷)۔ بیسویں صدی کے شروع میں وہ سب کے سب واضح طور پر مستقلاً اقامت پذیر ہوگئے تھے ماسوا چند ایک شاہ سوان اور جیلان سے تعلق رکھنے والے طالش قبیلے کے (E.Aubin : *La Perse d` aujour- d` Hui* ، پیرس ۱۹۰۸ء، ص ۱۴).

ہمدان، ملایر، تویسرکان، فربان خطے کا اہم ترین ترک قبیلہ قراگزلو تھا۔ کنیر بیان کرتا ہے کہ وہ سات ہزار آدمی میدان جنگ میں بھجوا سکتا تھا (کتاب مذکور، ص ۱۲۷)۔ کنگوار اور ہمدان کا درمیانی علاقہ افشاروں کے قبضے میں تھا جو کہ اسد آباد میں مرتکز تھے (کتاب مذکور، ص ۱۲۹)۔ شیل نے قراگزلو کے مکانات کی تعداد چار ہزار بیان کی ہے۔ اس زمانے میں وہ مستقلاً اقامت پذیر ہوچکے تھے۔ متعدد لک قبائل بھی تھے جن کے خیموں اور مکانات کی تعداد ہمدان، ملایر، تویسرکان، فربان خطے میں پندرہ سو تھی (Lady Sheil : کتاب مذکور، ص ۳۹۸).

کردوں کی بستیاں خراسان اور متذکرہ بالا مقامات کے علاوہ کرمان شاہ، اردلان اور مغربی آذربیجان میں بھی موجود تھیں۔ وہ ایرانی اور عثمانی سلطنتوں کی سرحد پر مقیم تھے اور کبھی کبھار ان ہر دو سلطنتوں کے اندر آجاتے تھے۔ اس سے ان پر تسلط قائم کرنے میں نہایت مشکل پیش آتی۔ شیل نے کرمان شاہ کے کرد قبائل کی ایک فہرست دی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے بتایا ہے کہ اسے شک و شبہ سے مبرا نہ سمجھا جائے۔ اس فہرست کی رو سے سب سے بڑے قبیلے کلخور کے مکانات اور خیموں کی تعداد گیارہ ہزار پانچ سو تھی۔ زنجانہ (بشمول سنجان) اور جوران کے مکانوں اور خیموں کی تعداد بالترتیب دس ہزار اور تین ہزار تین سو تھی (Lady Sheil : کتاب مذکور، ص ۴۰۱)۔ کرزن بیسویں صدی کے وسط میں کرمان شاہ کے کردوں کے خیموں کی تعداد تقریباً چوبیس ہزار تین سو بتاتا ہے، جس میں کلخور اور جوران ہر ایک کے پانچ پانچ ہزار اور سنجابی کے ایک ہزار پانچ سو خیمے شامل تھے (کتاب مذکور، ۱: ۵۵۷)۔ کرزن کے بیان کردہ اعداد و شمار میں امکانی طور پر قصبوں میں مقیم بہت سے کرد بھی شامل ہیں۔ اردلان کے کرد زیادہ تر اقامت پذیر تھے اور ناصر الدّین شاہ کے عہد کے

اختتام تک اردلان کے والی کی ماتحتی میں عملاً آزاد اور خود مختار تھے۔ آذربیجان کے کرد علاقوں کے باسی اگرچہ بادشاہ کے اطاعت گزار تھے تاہم درحقیقت وہ مرکزی حکومت کی مداخلت سے علاقے کے ناقابلِ رسائی ہونے کی بنا پر آزاد تھے۔ ان میں ہکاری بھی شامل تھے جو سلماس کے نزدیک ارومیہ کے مغرب میں اور عثمانی ایرانی سرحد کے دونوں جانب مقیم تھے (دیکھیے Malcolm : کتاب مذکور، ۲:۳۴۴۔ ۳۳۵) گیسپرڈ (Gaspard Drouville) جو ۱۸۱۲ء۔۱۸۱۳ء میں ایران میں موجود تھا، نے بیان کیاہے کہ وہ عباس مرزا کی محافظت میں تھے اور وہ ہر سال ایران کی چراگاہوں میں چرنے کے لیے اپنے بے حساب ریوڑ لایا کرتے تھے۔ جنگ کے وقت ان کے سردار (بیگ) عباس مرزا کو سوار اور پیادہ سپاہی فراہم کرتے تھے۔ جونہی وہ ایران میں داخل ہو جاتے۔ بادشاہ ان کے تمام مصارف برداشت کرتا۔ نیز ڈرو ول بیان کرتا ہے کہ عباس مرزا کو فوجی نفری مہیا کرنے کی بنا پر آذربیجان کے کرد محصول وغیرہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیئے گئے تھے (Voyagen Perse، پیرس ۱۸۲۵ء، ۲:۷)۔ صادق خاں کی سرداری میں میانہ اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں مقیم شقاقی دس ہزار گھوڑے رکھتے تھے۔ آقا محمد خاں کی وفات پر صادق خاں نے خود مختار ہونے کی ناکام کوشش کی۔ بعد میں اس نے دوبارہ بغاوت کی اور زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ بعدازاں یہ قبیلہ تتر بتر ہوگیا (Macdonald Kinneir : کتاب مذکور، ص ۱۵۲)۔ شیل کے بیان کے مطابق شقاقی اور مرکی دونوں کے پندرہ ہزار خیمے اور مکانات تھے۔ مؤخرالذکر سوج بلاغ کے اردگرد رہتے تھے (Lady Sheil : کتاب مذکور، ص ۳۹۶) کرزن کے دیئے ہوئے اعداد وشمار اس سے کم ہیں (کتاب مذکور، ۱: ۵۵۵) شیل کے مطابق سلڈوز میں جن کے مکانات پندرہ سو تھے: (Lady Sheil : کتاب مذکور، ص ۴۰۱) (نیز دیکھیے شیخ محمد مردوخ: تاریخ مرذوخ، ب ت، دو جلدیں؛ محمد مکری:عشائرِ کرد، ایلِ سنجابی، ۱، تہران ۱۹۵۴ء).

آذربیجان کے ترک قبائل میں سے شاہ سوان کثیر التعداد تھے۔ ایبٹ ، ۱۸۴۴ء میں لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ ان کے خاندانوں کی تعداد گیارہ بارہ ہزار بیان کی جاتی ہے جن میں سے تقریباً چھ سات ہزار مشکن میں اور تقریباً پانچ ہزار اردبیل میں آباد ہیں۔ یہ ہردو گروہ موسمِ سرما مغان میں بسر کرتے ہیں۔ اردبیل کے علاقے میں انہوں نے کئی دیہات آباد کیے، جن کی آبادی کسانوں اور قبائلیوں پر مشتمل تھی۔ ان دنوں یہ قبیلہ حکومت کو ایک ہزار تومان سالانہ ادا کرتا تھا۔ اس قبیلے کے خیمہ زن خاندان، اس کے برعکس، پانچ ہزار پانچ سو تومان ادا کرتے تھے جس میں سے چار ہزار تومان ذیلی قبیلہ مشکن ادا کرتا تھا۔ یہ رقوم ان قبیلوں کے سردار اپنے لوگوں سے اکٹھی کر کے حکومت کو ادا کرتے تھے۔ (Account of Abbot`s Journey، محل مذکور)۔ شیل کے بیان کے مطابق شاہ سون کے خیموں کی تعداد دس ہزار تھی (*Lady Sheil* : کتاب مذکور، ص ۳۹۴)۔ هاوتم شنڈلر کا بیان ہے کہ اتانلو شاہ سوان کی اہم ترین شاخ تھے۔ شاملو اس وقت جزوی طور پر شاہ سون کی ایک شاخ اور جزوی طور پر ایک علیحدہ قبیلے بہارلو کی حیثیت سے اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے تھے جن کے خاندانوں کی تعداد دو ہزار پانچ سو تھی۔ ان میں سے نصف فارس میں مقیم تھے اور خمسہ کا حصہ بنے ہوئے تھے جب کہ نصف آذربیجان میں آباد تھے (*Eastern Persian Irak*، ص ۴۸۔ ۵۰)۔ بیسویں صدی کے آغاز پر بہت سے شاہ سوان مستقلاً آباد ہوچکے تھے۔ ابن (Aubin) ان کے خاندانوں کی تعداد

اُنیس ہزار سات سو بیان کرتا ہے جو ساٹھ گروہوں یا یجاق میں منقسم تھے۔ ہر گروہ ایک کدخدا کی ماتحتی میں ہوتا تھا (کتاب مذکور، ص ۱۰۶۔ ۱۰۷)۔ بیسویں صدی کے وسط میں مقدم کے پانچ ہزار مکانات تھے اور محمود لُو کے دو ہزار پانچ سو؛ یہ دونوں مراغہ میں مقیم تھے۔ اُرومیہ میں مقیم بہار لُو اور افشار کے مکانات کی تعداد بالترتیب دو ہزار اور سات ہزار تھی اور دنبلی اور قراپیخ کے مکانات دو ہزار اور ایک ہزار پانچ سو بتائے گئے۔ نیز کچھ قلیل تعداد قبیلے تھے (*Lady Sheil* : کتاب مذکور، ص ۳۹۶)۔ بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں ان کے پانچ ہزار خاندان تھے (Aubin : کتاب مذکور، ص ۷۸۔۷۹)۔ ھاؤٹم شنڈلر نے اُنیسویں صدی کے اختتام پر آذربیجان کے افشار خاندانوں کی تعداد بارہ ہزار بتائی ہے (*Eastern Persian Irak* ، ص ۴۸۔۵۰)۔

قراجہ داغ، قرہ داغ اور طالش قبائل کو اکثر سرحدی قبائل کی طرح، زیر تسلط رکھنا مشکل ثابت ہوا۔ یہ بھی سرحد کی ایک سمت سے دوسری سمت نقل مکانی کر جاتے تھے۔ قاچار عہد کے ابتدائی حصے میں ایرانی روسی جنگوں کے دوران انہوں نے مضطربانہ کردار ادا کیا اور اپنی وفاداری بدلتے رہے۔ شیل ارسباران میں چلبیانلو کے خیموں اور مکانوں کی تعداد ایک ہزار پانچ سو، قراچرلو کی دو ہزار پانچ سو، حاجی علیلو کی آٹھ سو، بیگ دلو کی دو سو اور متعدد چھوٹے گروہوں کی پانچ سو پچاس بیان کرتی ہے (Lady Sheil : کتاب مذکور، ص ۳۹۶، مزید دیکھیے بایبردی: تاریخ ارسباران ، تہران ۱۹۶۲ء، ص ۱۲۱ وبعد و Aubin : کتاب مذکور، ص ۲۵۵)۔ ارسباران کے قبائل میں سے سب سے پہلے قرہ چرلو نے مستقل طور پر اقامت اختیار کی (بایبردی: کتاب مذکور، ص ۱۱۰ وبعد)۔

بیسویں صدی کے آغاز پر قبائل کی حیثیت کافی حد تک بدل چکی تھی۔ بہت سے قبائلی سردار، یا تو حکومت کی ملازمت کے ذریعے یا یرغمال کے طور پر یا اپنی حراست کی بنا پر، شہری زندگی سے روشناس ہوچکے تھے ان میں سے چند ایک بیرونِ ملک سفر کرچکے تھے۔ سرداروں اور قبائلی لوگوں کی نوآبادیاں بڑھ رہی تھیں اور دور افتادہ علاقوں کے سوا قبائل باقی ماندہ آبادی میں جذب ہوتے جا رہے تھے (دیکھیے Aubin : کتاب مذکور، ص ۱۷۷۔۱۷۸)۔

دستوری انقلاب کے ساتھ ہی ایران میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا جس نے قبائل کے ساتھ ساتھ آبادی کے دیگر حصوں کی حیثیت کو متاثر کیا۔ قبائلی قوتوں نے دستور کے لیے جدوجہد میں دونوں فریقوں کا ساتھ دیا۔ ۹ ستمبر ۱۹۰۶ء کے انتخابی قانون کے تحت انتخاب کنندگان اور منتخب شدگان کو چھ طبقات میں منقسم کر دیا گیا اور قاچاروں کے سوا دیگر تمام قبائل کو کوئی مخصوص طبقہ قرار نہ دیا گیا، بلکہ انہیں ہر صوبے کے باشندوں میں شامل کر دیا گیا اور اس طرح عائد شدہ شرائط کے تحت وہ ووٹ دینے کا حق رکھتے تھے (دفعہ ۱، ضمنی شق ۱)۔ یکم جولائی ۱۹۰۹ء کے انتخابی قانون میں شاہ سوان، قشقائی، خمسہ (فارس)، ترکمانوں اور بختیاریوں کے لیے یہ گنجائش رکھی گئی کہ وہ سب اپنا ایک ایک نمائندہ اسمبلی میں بھجوا سکتے ہیں (دفعہ ۶۳)۔ بعد کے انتخابی قوانین میں قبائلیوں کی نمائندگی کے لیے کوئی مخصوص گنجائش نہیں رکھی گئی۔ دستوری حکومت کے ابتدائی سالوں اور ۱۹۱۱ء میں دستوری حکومت کی معطّلی کے بعد کی طوائف الملوکی کے دوران میں حکومت قبائلی علاقوں پر تسلط قائم رکھنے کی اہل نہ رہی۔ اسی بنا پر جنوب مغربی ایران میں تیل کی دریافت کے ساتھ ہی ایک طرف حکومت کو اینگلو۔پرشین آئل کمپنی اور دوسری طرف محمرہ اور بختیاریوں کے شیخ کے

ساتھ خصوصی معاہدے کرنا پڑے۔ مؤخر الذکر انجینئروں کو لیبر اور تیل کے میدانوں کی حفاظت کے لیے محافظ مہیا کرتا تھا۔ جنگِ عظیم اول کے دوران قبائلی علاقوں میں بے چینی، بغاوت اور بد نظمی کا دور دورہ تھا۔ مزید دیکھیے Sir Percy Sykes : A History of Persia، ج۲)۔ جنگ کے بعد رضا خاں، بعد کے رضا شاہ پہلوی، نے ملک بھر میں مرکزی حکومت کی قوت مقتدرہ کو ازسرنو نافذ کر دیا۔ آذربیجان کے کردوں کو زیرِنگیں کرکے غیر مسلح کر دیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں بختیاریوں اور قشقائیوں کو جزوی طور پر غیر مسلح کر دیا گیا اور ترکمانوں کو کسی حد تک کمزور کر دیا گیا۔ بعدازاں قبائل کی مستقل آبادکاری کے لیے کوششیں کی گئیں (دیکھیے حسن عرفہ: Under Five Shahs، لنڈن ۱۹۶۴ء، و Land Lord and Peasant ، ص ۱۸۱، ۲۸۳ وبعد)۔ جنگ عظیم دوم کے دوران میں اور اس کے بعد قبائلی علاقوں میں بھی شورشیں برپا ہوئیں۔ خصوصاً آذربیجان کے کرد علاقوں میں ایک علیحدگی پسند تحریک چلی اور ۱۹۴۶ء میں جنوب میں سخت قسم کی قبائلی بغاوت ہوئی۔

مآخذ: مقالے کے متن میں درج ہیں۔ قبائل اور ان کی طرف سے چلائی جانے والی تحریکات کے بارے میں مزید مواد متعلقہ ریاستوں کی تاریخ اور مقامی تاریخی مآخذ میں دستیاب ہوگا، نیز دیکھیے H.Field:Contributions to the Anthropology of Iran، فطری تاریخ کے فیلڈ میوزیم کا سلسلۂ کتب نشریات، ۲۹/۱-۲، ۱۵ دسمبر ۱۹۳۹ء؛ X.de Planhol: Geography of settlement در Cambridge History of Iran

(A.K.S. Lambton [ت: ظفر علی])

••-------------••

※ ایلری، جلال نوری: ایک جدت پسند ترک انشاپرداز، قانون دان اور اخبار نویس (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء)۔ وہ گیلی پولی میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ،علوی زادہ مصطفیٰ جزیرہ صقلیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ بہت سے صوبوں میں گورنر رہا اور ۱۹۰۸ء میں سینیٹر بن گیا۔ اس کی والدہ، عابدین پاشا (المعروف بہ برینو :۱۸۴۳-۱۹۰۸ء) کی ، جو پریزرم سے نسبت رکھتا تھا، بیٹی تھی، وہ سلطان عبدالحمید دوم کے عہد حکومت میں گورنر اور وزیر رہا۔ اس نے مثنوی کی مشہور ومعروف شرح بھی لکھی۔ جلال نوری کا ایک بھائی صبحی نوری ایلری سوشلسٹ، انشا پرداز اور اخبار نویس تھا اور دوسرا اسداد نوری مصور تھا اور کارٹون بنایا کرتا تھا.

جلال نوری نے "غلطہ سرائے" کے سکول اور استانبول یونیورسٹی میں تعلیم پائی، جہاں اس نے قانون کا مطالعہ کیا۔ جلال الدین نے فرانسیسی زبان میں اس حد تک استعداد بہم پہنچا لی کہ وہ اس زبان میں کتابیں لکھنے لگا۔ ان میں ایک ناول "کوچی" بھی ہے، جس میں سلطان عبدالحمید کے زمانے میں استانبول کی زندگی دکھائی گئی ہے۔ اس نے انگریزی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ اس کی یہ تعلیم اس کے خاندانی ماحول کی مرہون منت ہے جس میں اُس کے باپ کا چچا سرّی پاشا اور اس کی بیوی لیلیٰ (۱۸۵۰ء-۱۹۳۶ء) شامل ہے جو شاعرہ، موسیقار اور حرم کی زندگی کے متعلق انیسویں صدی کی قیمتی یاد داشتوں کی مصنفہ ہے.

جلال نوری نے کئی دفعہ یورپ کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات کو دو کتابوں: قطب مصاحبلیری اور شمال خاطر لری میں رقم کیا۔ اس نے جلد ہی وکالت کے پیشے کو خیر باد کہہ دیا اور آزاد پیشہ اخبار نویس بن گیا۔ اس نے بہت سے اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھے (ان میں بعض رسائل کا وہ خود بانی تھا)، مثلاً اقدام، آتی، ایلری،

اجتہاد، ادبیات عمومیہ مجموعہ سی، ثروت فنون، ترک یردو، Le Courrier d, Orient اور Le Geune Turc، اس نے مؤخرالذکر فرانسیسی اخباروں میں پندرہ سو مقالات لکھے۔ ان میں سے بعض ۱۳/اپریل ۱۹۰۹ء کی بغاوت کے زمانہ مابعد کے لیے دستاویزی اہمیت رکھتے ہیں۔

جلال نوری گیلی پولی کے حلقے سے آخری عثمانی پارلیمنٹ کا رکن بنا۔ وہ چار دفعہ مجلس اعلیٰ (گرینڈ نیشنل اسمبلی) میں اس حلقے کی نمائندگی کر چکا تھا۔ اس کے وسیع قانونی علم اور مشرقی و مغربی ثقافتوں سے واقفیت نے اس کو انقرہ کی نئی قومی حکومت میں ہر دل عزیز مشیر بنا دیا تھا۔ وہ دیانت دار، بے لاگ اخبار نویس، با اصول حریت پسند اور دیانتدار حکومت کا داعی تھا۔ استانبول کے ایک روزنامہ میں چھپنے والے شخصی حکومت کی برائیوں اور ایک پارٹی نظام کے منافی جمہوریت ہونے کے بارے میں اس کے مضامین کا یہ نتیجہ نکلا کہ عام اخبارات میں اس حوالے سے تند و تیز بحث چھڑ گئی۔ حکومت کے انتہا پسند حامیوں، بالخصوص آغا انموغلو احمد اور یونس نادی نے حکومتی اخباروں اور رسالوں میں جلال نوری پر سخت حملے کیے۔ قلیچی علی نے، جس کا نام اپنے اثر ورسوخ سے غلط فائدہ اٹھانے والے ارکان پارلیمنٹ اور اہل کاروں میں شامل تھا، جلال نوری کے دفتر میں جا کر اس پر حملہ کر دیا (اس حملے اور مابعد کے حوادث کے لیے دیکھیے، اخبارات ایلری، حاکمیت ملی، جمہوریت اور سنڈے ٹیلی گراف از جون تا اگست ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۴ء)۔ اگلے دن جلال نوری کے اخبار نویس بھائی صبحی نوری نے اس واقعے کی مذمت کرتے ہوئے قلیچی علی کے خلاف ایک سخت مضمون روزنامہ ایلری میں لکھا (۳۱/جولائی ۱۹۲۴ء)، لیکن خود جلال نوری نے کبھی کبھار ہی اس کے متعلق لکھا اور جنگ وجدال سے گریزاں رہا۔ اس نے استانبول میں دو نومبر ۱۹۳۹ء کو انتقال کیا۔

جلال نوری تقریباً تیس کتابوں اور ہزاروں مقالات کا مصنف ہے۔ ان میں سے چند ایک کتابی صورت میں جمع کیے جاچکے ہیں۔ ۱۹۰۸ء کے بعد تشکیل پانے والی تین جماعتوں، ترک قوم پرستوں، اسلام پسندوں اور مغرب کے دلدادگان میں سے وہ کسی بھی جماعت کی حلقہ بگوشی اختیار نہ کرسکا اور آخری دو کے مابین درمیانی راستے پر گامزن رہا۔ سماجی، سیاسی، دینی، قانونی اور لسانی مسائل پر اس کی معرکہ آرائیاں اس زمانے کے مشہور انشا پردازوں سے ہوتی رہیں۔ وہ انتہا پسند قوم پرستوں، ترقی پسند مغرب زدگان اور اسلامی انتہا پسندوں کا مخالف تھا۔

جلال نوری خود اعتدال پسند مصلح تھا، لیکن اس کے خیالات مربوط نہ تھے، اس لیے اس کے ذاتی خیالات اور تجاویز کی باز گشت ہر مضمون میں نظر آتی ہے، چاہے کوئی موقع ہو۔ ۱۹۰۸ء۔۱۹۲۳ء کے درمیانی عرصے کے متنازعہ چند مسائل میں اس کے افکار و نظریات مندرجہ ذیل نمایاں موضوعات پر ہیں۔

۱۔نظام قانون: قانونی نظام کی اصلاح اس کا اہم موضوع ہے۔ اس کی رائے میں ہر ملک کے قانونی نظام کو اس ملک کے تاریخی ارتقا، نوعیت، خصوصیات، اس کے قومی احوال اور معاصرانہ زندگی کی ضروریات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ مدحت پاشا کا آئین، جودت پاشا کا مجلّہ اور دوسرے قوانین متعلقہ انتظامی امور، اصول قانون، جائیداد اور سول سروس وغیرہ اس کی رائے میں ناقص ہیں، کیونکہ وہ مذکورہ تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ وہ کہتا ہے کہ قوانین ناقابلِ تنسیخ نہیں ہوتے، بلکہ وقتاً فوقتاً ان پر نظرثانی ہونی چاہیے اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق ان میں تبدیلی کرتے رہنا چاہیے۔

حریت نسواں: عثمانی معاشرے میں سماجی برائیوں کی

بڑی وجہ عورتوں کی ذلت آمیز پستی ہے۔ تعدد ازدواج کی ممانعت ہونی چاہیے اور عورتوں کو مال نہیں سمجھنا چاہیے۔ شادی بیاہ، طلاق اور اولاد کے متعلق قوانین عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ہونے چاہئیں اور یہ بات غیر اسلامی نہیں، کیونکہ شادی بیاہ اور خواتین سے متعلق احکام کی عرصے سے غلط تعبیر کی جا رہی ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک جلال نوری کے یہ خیالات ضرورت سے زیادہ ترقی پسندانہ تھے.

ترکوں کے زوال کے اسباب: ترکوں کی پستی کے اسباب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انہوں نے بحری انکشافات، علوم و فنون کی ترقی خصوصاً پریس کے بڑھتے ہوے کردار میں کوئی حصہ نہیں لیا.

رسم الخط اور لسانی اصلاح: عربی رسم الخط ترکی زبان کے لیے ناموزوں ہے، اس لیے رومن رسم الخط پر مبنی ترقی یافتہ رسم الخط ضروری ہے۔ جہاں تک خود زبان کا تعلق ہے جلال نوری کے افکارو نظریات قدامت پسندانہ ہیں۔ اس کی دانست میں عربی، فارسی الفاظ کی آمیزش ترکی زبان میں قدرتی اور ویسے ہی لازمی ہے جس طرح لاطینی اور فرانسیسی الفاظ انگریزی زبان کے لیے، لیکن زبان کو آسان بنانے کی تحریک کو جمہوری دور میں پذیرائی نہ مل سکی.

اسلام میں اصلاحات: اسلام بذات خود ترقی میں رکاوٹ نہیں ہے، لیکن اس کی ہمیشہ سے غلط تشریح ہوتی چلی آرہی ہے اور متعصبین، تنگ نظر اور موقع پرستوں نے اس سے غلط فائدہ اٹھایا ہے، خاص کر فقہ اسلامی کی اصلاح (تشکیل جدید) ضروری ہے۔ مسلم ممالک (اسلامی دنیا) کا اتحاد سب مسلمانوں کا نصب العین اور ہر مسلم قوم کی فکرو نظر کا محور ہونا چاہیے۔ مذہبی ریاست کے قیام کا نتیجہ انتشار ہوگا۔ مغربی تہذیب وتمدن سے صرف نظر کرتے ہوے ہم کہیں کے نہیں رہے۔ تہذیبیں دو قسم کی ہیں: صنعتی اور حقیقی تہذیب۔ ترکوں کو چاہیے کہ وہ جاپانیوں کی طرح پہلی تہذیب اپنا لیں، لیکن وہ اپنی اسلامی، ترکی تہذیب کی بھی حفاظت کریں اور جہاں ضروری ہو وہاں اصلاح بھی کر دیں (بعد میں گوک الپ نے "تہذیب" اور "کلچر" (تمدن) میں فرق روا رکھا).

جلال نوری کے افکارو نظریات کا خلاصہ اس کی کتاب تاریخ زوال عثمانیہ کے علاوہ اس یادداشت میں بھی مذکور ہے جو انجمن اتحاد و ترقی کی کانفرنس منعقدہ سالونیکا میں ۱۹۱۱ء میں پیش کی گئی تھی جس میں ترکی کی خارجہ پالیسی پر بھی اس کے خیالات دیئے گئے ہیں.

مآخذ: (۱) حیدر کمال: *Tarikh-i-istikbal munaseb etiyle Djelal nuribey*، استانبول ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۰۳ء؛ (۲) Peyami safa: *Turk Inkilabina Bakislar*، استانبول ۱۹۳۸ء؛ (۳) T.Z.Tunaya: *Turkiyf`De Siyasi Partiler*، استانبول ۱۹۵۲ء، ص ۱۶۷، ۱۶۸؛ (۴) وہی مصنف: *"Garpcilik Cerey ani"*، در *Istanbul Hvkuk Faku Itesi Mecmuasi*، ۱۴ (۱۹۵۴ء)؛ (۵) H.Z.Ulker: *Turkiyede Cagdas Dusunce Tarihi*، کوینا (استانبول ۱۹۶۶ء، ص ۶۵۷ـ ۶۷۲؛ (۶) S.N. Ozefdim: *"Celalnuri ileri ve Dilimiz"*: در Dilcilere Saygi، انقرہ ۱۹۶۶ء، ص ۳۲۹ـ ۳۴۷.

(Gunay Alpay [ت: شیخ نذیر حسین])

•• ------------ ••

اینال: ایک ترکمانی سردار کا نام (جو وسطی ایشیا ※ کے عرف ینال سے ماخوذ ہے) جو پانچویں صدی ہجری/ گیارہویں صدی عیسوی کے خاتمے پر ملک شاہ کے جانشینوں کی خانہ جنگی کے دوران میں آمد [دیار بکر] کا خودمختار حاکم بن گیا۔ علاوہ ازیں یہ ایک خاندان کا بھی نام ہے جو چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی کے

خاتمے تک (وسطی ایشیا میں) برسراقتدار رہا۔ اگرچہ بعض کتبات میں اس کا ذکر ملتا ہے، لیکن مؤرخین نے اس کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔

اگرچہ اینالی ایسی جگہ اور مقام کے مالک تھے جو تجارتی اور فوجی لحاظ سے بڑی اہم تھی، لیکن وہ ارتقیوں کے مقابلے میں دیار بکر میں ثانوی حیثیت رکھتے تھے، جن کی زنگی حمایت کیا کرتے تھے جب کہ ان کو اندرون ملک نسانی [رک بآں] مقامی رؤسا کے تابع رہنا پڑتا تھا جو بعض اوقات خفیہ قاتلوں کا سہارا لینے سے بھی نہ ہچکچاتے تھے۔ ۵۷۹ھ/۱۱۸۳ء میں سلطان صلاح الدین نے دونوں خاندانوں کی طاقت کا خاتمہ کر دیا اور حصن کیفا کے اپنے اتحادی کو آمد دے دیا۔ اس وقت سے اس خاندان کی ایک شاخ کے تحت یہ دونوں خاندان متحد رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آمد شہر کو اینالیوں اور نسانیوں کے عہد میں کسی حد تک مادی اور ثقافتی خوشحالی حاصل رہی، علاوہ ازیں یہ عیسائیت کا بھی سرگرم مرکز رہا۔ اندرون ملک اینالیوں کے سکوں کا پتہ نہیں چل سکا۔

مآخذ: (۱) تمام علمی حوالے (ابن حوقل کی تکمیل کرنے والے شامی سمیت) کونل کہن (Cl.Cahen) کے مضمون *Le Diyar Bakr autemps des premicps Cirtukides* در *JA*، ۱۹۳۵ء، میں موجود ہیں۔ تکملہ از وہی مصنف بعنوان "*Mouvement Populaires*"، در *Arabica*، (۱۹۵۸ء) ص ۲۴۴۔ (۲) آثار قدیمہ اور کتبات پر نئی کتابوں کے لیے دیکھیے A. Gabriel *Voyage arch Clogique Dans les Prorinces Orientales de la Turquie*: (۳) کتبات پر تکملہ کے لیے دیکھیے G.Sauvagot: عدد ۶۲ تا ۶۵؛ (۴) نیز دیکھیے مقالہ ارتقیون اور Zambaur، ۱۳۹، عدد ۱۲۸.

(Cl . Cahen: [شیخ نذیر حسین])

••-------------••

※ اینال بن الامین، محمود کمال: ایک ترک سوانح نگار اور انشا پرداز اور روایتی عثمانی علم وفضل کے دور آخریں کا ممتاز نمائندہ (۱۸۷۰ء تا ۱۹۵۷ء)۔ اینال بن الامین کا والد محمود امین پاشا (۱۸۳۷ـ۱۹۰۸ء) "مہردار" کے نام سے معروف تھا، کیونکہ وہ اپنے مربی اور رشتہ دار یوسف کمال پاشا کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا، جو مصر کے محمد علی پاشا کا داماد تھا اور سلطان عبدالعزیز کے زمانے میں اناطولیہ کے مختلف صوبوں میں اعلیٰ عہدوں پر کام کرچکا تھا اور ۱۹۰۸ء میں جزائر ایجین (Aegein) کے گورنر (متصرف) کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہوا تھا۔ اس کی والدہ حمیدہ نرگس نے ۱۹۳۵ء میں انتقال کیا۔

محمود کمال کے اسلاف بخارا سے آئے تھے اور سلجین اوغلی (*Seldjen-oghli*) کہلاتے تھے۔ یہ نام خاندان کی ذاتی مہروں پر بھی کندہ ملتا ہے۔ بعد میں محمود کمال نے اپنی زندگی میں لکھا تھا کہ اسے افسوس ہے کہ جب ۱۹۳۴ء کے قانون سے نئے خاندانی اسما کو رائج کیا گیا اس نے اینال (امین) کا ترجمہ کیوں اختیار کر لیا، جیسا کہ خاندان کے بعض افراد نے کیا تھا اور اپنا قدیم خاندانی نام سلجین اوغلی نہ رکھا (*Son Hattatlar* : I.M.K.Inal ص۶۷۲)۔ اس نے سب سے پہلے۱۸۹۰ء میں اپنی تحریروں میں ابن الامین کا عرف اختیار کیا۔

شہزادہ ہائی سکول (رشدیہ) سے فراغت کے بعد جو سلیمانیہ کالج کی پرانی عمارت میں واقع تھا، محمود کمال کلیہ ملکیہ میں داخل ہوا، لیکن بیماری کی وجہ سے اسے کالج چھوڑنا پڑا۔ بعدازاں وہ لاء کالج (کلیہ حقوق) کے علاوہ بعض بڑے مدارس اور استانبول کی مساجد میں شریک درس رہا۔ اس نے اسلامی علوم کے حوالہ سے زیادہ تر تعلیم گھر میں اپنے والد اور دوسرے اساتذہ سے پائی۔ عربی، فارسی اور کچھ فرانسیسی کے معروف البانوی عالم

خوجہ طاہر، جو شاعر محمد عاکف کے والد تھے، اس کے پسندیدہ اساتذہ میں سے تھے۔ حسن تحسین خطاط (۱۸۵۱۔ ۱۹۱۵ء) بھی اس کا استاد تھا اور اس نے ہی اینال بن الامین میں ترکی خطاطی کی تاریخ کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا (Son Hattatlar Tar، ص ۴۲۴۔ ۴۲۷)۔

محمود کمال ۱۸۸۹ء میں وزیراعظم کے دفتر میں خود مختار صوبوں کے شعبہ میں بطور کلرک، سرکاری ملازمت میں شامل ہوا۔ ۱۸۹۱ء میں اس کا تبادلہ وزیراعظم کے سکریٹریٹ میں ہوگیا، جہاں وہ ۱۹۰۶ء میں ڈپٹی ڈائریکٹر اور ۱۹۰۸ء میں ڈائریکٹر بن گیا۔ ۱۹۰۸ء میں جب آئین بحال ہوا تو بوسنیا اور بلغاریہ کے بحران کے زمانے میں اسے خود مختار صوبوں کے معاملات (ایالات ممتازہ ومختارہ) کے دفتر کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔

جب سلطان عبدالحمید کو ۱۹۰۹ء میں معزول کر دیا گیا تو قصر یلدیز سے ملنے والی دستاویزات اور خفیہ رپورٹوں کی ترتیب وتدوین کے لیے اینال بن الامین کی سرکردگی میں ایک خاص کمیٹی بنائی گئی تو اس کا دفتر وزارت جنگ کے قریب ایک کوٹھی (موجودہ یونیورسٹی فیکلٹی کلب) میں منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح وہ سلطان عبدالحمید کے عہد حکومت (۱۸۷۶۔۱۹۰۹ء) کی داخلی اور خارجی پالیسیوں کے بارے میں بعض انتہائی اہم دستاویزات کی نقول حاصل کر سکا اور اپنی کتابوں میں ان سے استفادہ کر سکا۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں وزیر تعلیم شاکر بیگ [رک بآں] نے ، جسے ۱۹۲۶ء میں کمال پاشا کے خلاف سازش میں سرگرم حصہ لینے کے الزام میں پھانسی دی گئی تھی، اسے جناب شہاب الدین اور سلیمان نظیف وغیرہ کے ساتھ اس ادارے کے ادارتی بورڈ کا ممبر بنا دیا جس کے ذمہ ترکی ادبیات کے کم یاب قلمی نسخوں کو اشاعت کے لیے تیار کرنا تھا۔ اس نے اس سلسلے کی عمدہ کتابوں پر قیمتی مقدمات لکھے، لیکن جب شاعر عبدالحق نے سیاسی اثرو رسوخ سے اپنی کتابوں کو چھپوانا شروع کر دیا اور انور پاشا نے حکم دیا کہ فوج کے لیے نامق کمال کی کتابوں کو دوبارہ چھاپا جائے تو یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ اس کی ایک اور وجہ زمانہ جنگ کی مشکلات اور سامان طباعت کی قلت تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے اختتام سے لے کر استانبول حکومت کے برخواست کیے جانے تک (۱۹۱۸۔۱۹۲۲ء) وہ سرکاری اخبار تقویم وقائع کا مدیر رہا اور آخری دو مہینوں میں دیوان ہمایوں (گورنمنٹ چانسری) کا ناظم بھی رہا۔ اس حیثیت میں اس نے خصوصی سیاسی کمیٹیوں میں وزیراعظم کے دفتر کی نمائندگی کی جو متوقع صلح کے مذاکرات میں ترک تجاویز پر غور و فکر کے لیے بنائی گئی تھیں۔ کرنل عصمت بے (بعد میں عصمت انونو) اس کمیٹی میں وزارت جنگ کا نمائندہ تھا۔

عثمانی دیوان عمومی [رک بآں] کی انتظامیہ میں عارضی تقرر کے بعد جہاں اس زمانے کے بہت سے سرکردہ انشا پردازوں اور دانش مندوں کے ساتھ اس نے کام کیا۔ ۱۹۲۴ء میں اسے انجمن تاریخ عثمانیہ کی طرف سے تاریخی دستاویزات و وثائق کے کمیشن کا صدر بنا دیا گیا، جس کے ذمے تاریخی دستاویزات کی تہذیب وترتیب تھی۔ وہ ۱۹۲۳ء میں اس کمیشن کا رکن منتخب ہوچکا تھا۔ تین سال کی لگاتار محنت کے بعد اس نے بعد کی تصانیف کے لیے بہت سا قیمتی مواد جمع کر لیا۔ ۱۹۲۷ء میں اس کے دو دوستوں اور مداحوں، شاعر خلیل نہاد اور ابراہیم علاء الدین کی وساطت سے اسے نئی انقرہ حکومت نے اوقاف اسلامیہ کے میوزیم کا، جس کا نام بعد میں ترک واسلامک آرٹس میوزیم (Turk ve Islam Eserleri Muzesi) رکھا گیا، ڈائریکٹر بنا دیا۔ وہ اپنی ریٹائرمنٹ

(۱۹۳۵ء) تک یہیں رہا۔

۱۹۳۶ء میں اینال بن الامین مصری شہزادی خدیجہ عباس حلیم کی مدد سے مکہ معظمہ حج کرنے گیا اور مصر کا بھی سفر کیا۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں مصری ولی عہد شہزادہ محمد علی نے اسے نقاش کامل اوک کے ساتھ مصر آنے اور اسلامی خطاطی کے ذخیرے کو ترتیب دینے کی دعوت دی۔ فروری ۱۹۴۰ء میں استانبول واپسی پر اسے ''ترکی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام'' کے ادارتی بورڈ کا مشیر بنا دیا گیا۔ یہ مشہور مصنف، ماہر طباعت اور قابل وزیر تعلیم حسن علی یوس (۱۸۹۷ تا ۱۹۶۱ء) کا ذاتی فیصلہ تھا جس نے اپنی آٹھ سالہ وزارت کے دوران میں اس کی مسلسل حوصلہ افزائی کی اور اسے اپنی تصانیف کی طباعت کی طرف متوجہ کیا جو منتشر یادداشتوں کی صورت میں تھیں اور طباعت کے لیے ان کی تہذیب وترتیب کی ضرورت تھی (*Iabnul Emion Mahmud* :A.H. Tonipar *Kemale Dair*)۔ محمود کمال نے اپنی تحریروں کی ترتیب وتدوین اور ان پر پوری توجہ دینے کی اس وقت کوشش کی جب اسے سرکاری طور پر اس طرف متوجہ کیا گیا۔ (دیکھیے اینال کی وفات کے بعد اس کی شائع ہونے والی کتاب *Hos Sada*، استانبول ۱۹۵۸ء کا مقدمہ از *A.H.Tan Pinar*، ص ۵۴، مطبوعہ ۱۹۴۰ء) وہ اس وقت سے لے کر اپنی وفات یعنی ۲۴ مئی ۱۹۵۷ء تک اپنی کتابوں کی لکھائی چھپائی، اور تصحیح کی نگرانی کرتا رہا۔

محمود کمال قدیم عثمانی شرفا کی آخری زندہ مثال تھا۔ وہ نئے زمانے میں پرانے وقتوں کی یاد تازہ کرتا رہتا تھا۔ گزرے ہوئے عثمانی دور کے احترام اور اس کی تعریف نے اسے اردگرد کے انقلابات سے بے خبر رکھا۔ وہ بڑھاپے میں نئے حالات سے نباہ نہ کر سکا اور روز بروز جھگڑالو اور شوریدہ سر ہوتا گیا۔ ان رجحانات میں اس کی خود پسندی اور خود سری نے اور اضافہ کر دیا۔ ۱۹۳۰ء تک محمود کمال، جو ساری عمر کنوارا رہا، اپنے لباس، طور طریقوں، گفتگو اور ذاتی تعلقات کے حوالے سے سارے استانبول کا عجیب وغریب انسان بن چکا تھا۔ ساتھ ہی وہ زندہ کتب خانہ تھا، کیونکہ وہ عمر بھر بے شمار اور منفرد اہمیت کی دستاویزات جمع کرتا رہا اور ان کا مطالعہ کرتا رہا۔ تاریخ اور عثمانی حکومت بالخصوص ۱۸۷۰ تا ۱۹۲۱ء کے زمانے کی سیاسی اور علمی تاریخ پر وہ سند سمجھا جاتا تھا، کیونکہ وہ اس زمانے کی بعض کلیدی شخصیتوں سے بھی ملتا رہا تھا اور اس کا حافظہ بھی بلا کا تھا۔

وہ آغاز جوانی ہی سے دستاویزات، قلمی کتابیں اور قدیم اشیا جمع کرنے لگا تھا اور جب اس کی عمر پچاس برس کی ہوئی تو اس کا کتب خانہ استانبول کے ذاتی کتب خانوں میں ایک گرانقدر کتب خانے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جو اس کی خاندانی حویلی میں بایزید کے علاقے میں تھا۔ مدروس کی صلح کے بعد جب اتحادی فوجیں ۱۹۱۹ء میں استانبول میں داخل ہوگئیں تو محمود کمال کو چوبیس گھنٹے کا نوٹس دیا گیا کہ وہ اپنی حویلی خالی کر دے تو جیسا کہ وہ اپنی خود نوشت سوانح میں تلخی سے شکایت کرتا ہے کہ جب اس کا مکان اٹھارہ ماہ کے بعد واپس کیا گیا تو اس نے دیکھا کہ گھر کی بیشتر دستاویزات، قلمی نسخے اور دوسری قیمتی اشیا لوٹی اور تباہ کی جاچکی تھیں (قدیم ڈائری، درسون سیر ترک سیریلری، ص ۲۰۱ تا ۲۳۴، استانبول، ۱۹۳۰ء-۱۹۴۲ء)۔

محمود کمال ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے مضامین (۱۸۸۰ء میں) اخبار تریک میں چھپنے لگے۔ مشہور انشا پرداز اور اخبار نویس احمد مدحت کی ہمت افزائی سے وہ سال ہا سال تک احمد مدحت کے اخبار ترجمان حقیقت میں مضامین لکھتا رہا۔ اس کے بعد اس کے مضامین اس کے عرفی نام (ابن الامین) سے استانبول اور سالونیکا کے اخبارات ورسائل میں چھپتے رہے۔ محمود کمال کے مضامین زیادہ تر دینی، اخلاقی، ادبی اور تاریخی ہوا کرتے تھے، لیکن

پھر بھی ان کو سلطان عبدالحمید کی حکومت کے سنسر کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ محمود کمال کا حقیقی کارنامہ تذکرہ نگاری ہے۔ آخر میں وہ روایتی عثمانی تاریخ نویسی کے عام معیار سے بھی آگے نکل گیا۔ وہ کتب سوانح میں سرکاری عہدہ داری کی غیر دل چسپ تفصیلات بھی دیتا ہے، لیکن اس کے اضافے بڑے اہم ہوتے ہیں۔ دستاویزی مواد، نجی طور پر حاصل کردہ دستاویزات، مستند اور شاندار حکایات، متعلقہ نتائج، معاصر احوال کے بے لاگ تجزیہ کے علاوہ انسانی نفسیات کے گہرے علم، مزاحیہ حس کے ساتھ وہ اپنے مشاہیر کے دلپذیر، ناقابل فراموش اور قابل یقین حالات رقم کرتا رہا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حساس طبیعت رکھنے، ذاتی پسند و ناپسند اور متعلقہ اشخاص کے بارے میں چبھتے ہوئے جملے کہنے کے باوجود وہ اپنی تحریروں میں معتدل اور متوازن تھا۔ یہ کہنا قرین صواب ہوگا کہ اس کے اور اس کے قریبی دوستوں کے خاندان کے سرپرستوں (یوسف کامل پاشا، کامل پاشا، کوچک سعید پاشا) کے حالات بھی ہمدردی اور توجہ سے لکھے گئے ہیں۔

محمود کمال کی وصیت کا متن اس کے انتقال کے بعد چھپنے والی کتاب Hos Sode میں شائع ہوچکا ہے۔ بہت سے ترک علما کی پیروی کرتے ہوئے اس نے اپنا گرانقدر کتب خانہ استانبول یونیورسٹی کو اور اپنی حویلی استانبول کے امام حاطپ دینی مدرسہ کو ہدیہ کر دی۔ محمود کمال کے لیے نئے رومن رسم الخط (۱۹۲۸ء) کے قواعد و ضوابط کی پابندی کرنا دشوار تھا۔ چنانچہ اس نے آخر تک جدید ترکی کو نظر انداز کیے رکھا اور اپنی کتابیں اپنے خود ساختہ رسم الخط میں ہی چھپواتا رہا جو عثمانی ترکی کے تاریخی ہجوں کے مطابق ہوتا تھا۔ معلم ناجی کے خالص مکتب فکر کی طرح وہ ترکی میں شامل عربی الفاظ کو جدید ترکی کے استعمالات پر ترجیح دیتا رہا (مثلاً Tehlike،akraba ،eyalet کی بجائے Tehluke اور akriba ،iyalet).

چھوٹے موٹے علمی کاموں، کئی مختصر رسائل اور اخباری مضامین کے علاوہ محمود کمال بن الامین بہت سی مطبوعہ کتابوں کا مصنف ہے: (۱) اوقاف ہمایوں نظارت، تاریخ تشکیلات و نظارین تراجم احوالی، استانبول ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء وزارت اوقاف کے وزرا کی تاریخ۔ اگرچہ کتاب کی تدوین ایک جماعت کے سپرد کی گئی تھی، لیکن اس کے ساتھیوں نے اس میں کوئی حصہ نہ ڈالا؛ (۲) گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی کے شاعر شیخ الاسلام یحیٰی کے دیوان کی تدوین و تحقیق جس میں ۶۵ صفحات کا مقدمہ ہے جس میں شاعر کی زندگی اور کلام پر تبصرہ ہے۔ استانبول (۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء)؛ (۳) انیسویں صدی کے جدید کلاسیکل شاعر ھرسکلی عارف حکمت کے دیوان کی تدوین و تحقیق جس کے ساتھ ۷۸ صفحات کا دیباچہ ہے۔ استانبول ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء؛ (۴) انیسویں صدی عیسوی کے نئے کلاسیکل شاعر لیسقوف سالی غالب کی تدوین و تحقیق جس کے ساتھ ۴۷ صفحات کا پیش لفظ ہے۔استانبول ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء؛ (۵) مصطفیٰ عالی کے مناقب ہنروران، کی تدوین و تحقیق جس میں عالی کی زندگی کے حالات سمیت ۱۳۳ صفحات کا مقدمہ ہے۔ استانبول ۱۹۲۶ء؛ (۶) مستقیم زادہ سلیمان سعدالدین کے تحفۂ خطاطین کی تحقیقی اشاعت، جس میں ۸۵ صفحات میں خوش نویسوں کے حالات اور حواشی ہیں۔ استانبول ۱۹۲۸ء؛ (۷) Som asir Turk Sairleri، انیسویں/بیسویں صدی عیسوی کے شعرا کا تذکرہ مع نمونۂ کلام جو بارہ کراسوں میں طبع ہوا (۱۲۳۰ صفحات)، استانبول ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۲ء اس کا اصل نام کمال الشعراء تھا جسے ترک تاریخی سوسائٹی نے بدل دیا جس کے تحت یہ طبع ہوئی؛ (۸) Osmanli devrimde Som Sadriayamlar، استانبول، ۱۹۴۰ـ۱۹۴۹ء، مصنف کی اہم ترین کتاب جس میں ۳۷ وزرائے اعظم کے احوال اور

ان کے زمانے کا تذکرہ اور عثمان زادہ تائب کی حدیقۃ الوزراء کا ذیل ہے، اس کا اصلی نام کمال الصدور تھا۔ جسے وزارت تعلیم نے تبدیل کر دیا؛ (۹)Son Hattalar، استانبول، ۱۹۵۵ء، ۱۶۳ خوش نویسوں کے سوانح، ان کی کاریگری کے نمونے (۸۳۹ صفحات) اور کلاسیکل زمانے کی خوش نویسی کے حالات کے مآخذ اور ان کی ہنر مندی کے نمونے؛ (۱۰) Hos Sada (استانبول، ۱۹۵۸ء)۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے موسیقاروں کے حالات۔ اس کے پہلے ۱۲۸ صفحات اس کے اپنے قلم سے ہیں، باقی ماندہ صفحات (۱۲۹۔۳۱۴) اس کی یاد داشتوں سے Avni Aktuc نے مرتب کیے ہیں۔ ۷۲ صفحات کے مقدمے میں اس کی وصیت کے علاوہ اس کی شخصیت و کردار پر اس کے دوستوں حسن علی، احمد حمدی اور اس کے معالجوں K.I. Gurkan اور M.E.Gvchon نے روشنی ڈالی ہے۔

مآخذ: محمود کمال کی زندگی اور کتابوں کے بارے میں بہترین مآخذ اس کی اپنی کتابیں ہیں جن کی فہرست مقالہ میں درج ہے۔

(Fahiriz[ت: شیخ نذیر حسین])

••-------------••

※ اینگلو محمڈن لا: اسلامی متون کی تشریح و تاویل اور مزاولت پر مبنی قانونی نظام۔ جب انگریز ہندوستان میں آیا [رک بہ پاکستان] تو اس وقت تمام ملک میں اسلامی عدالتیں قائم تھیں جو شریعت اسلامیہ کے مطابق فیصلے کرتی تھیں البتہ دونوں فریقوں کے کسی اور مذہب کے پیروکار ہونے کی صورت میں ان کے اپنے مذہبی قوانین کے مطابق فیصلے کیے جاتے تھے۔ انگریز حکومت کے ابتدائی دنوں میں بھی یہ صورت حال برقرار رہی، لیکن جیسے جیسے انگریز نے حالات پر گرفت مضبوط کر لی تو اس نے عدالتی نظام میں بھی تبدیلی لانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے اپنا عدالتی نظام یہاں نافذ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے مقدمات کے تصفیہ کے لیے ایک نیا 'قانون' متعارف کرایا، جسے اینگلو محمڈن لاء کہا جاتا ہے اور جس کا لغوی ترجمہ ''برطانوی مسلم قانون'' ہے۔ برطانوی نوآبادیاتی ہندوستان کی عدالتوں میں نافذ العمل اینگلو محمڈن لاء (اکثر صرف ''محمڈن لاء'') اسلامی قانون کی حیثیت سے معروف تھا۔ اس قانونی نظام کی جڑیں اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں فتح بنگال کے بعد انگریزوں کے قائم کردہ ابتدائی نوآبادیاتی قانونی ڈھانچے میں پیوست تھیں۔ ابتداءً اینگلو محمڈن لاء میں قانونِ فوجداری ودیوانی ہر دو شامل تھے۔ مسلمانوں سے متعلق فوجداری مقدمات میں شریعت اسلام کے متخصصین برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالتوں میں برطانوی ججوں کو فیصلے کرنے میں شریعت کی فنی اصطلاحات کی تشریح وتوضیح کے لیے ان کے ساتھ منسلک ہوا کرتے تھے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں حکومتی قوانین کے ایک ملے جلے مجموعے نے بتدریج اسلامی فوجداری قانون کی جگہ لے لی اور ۱۸۶۰ء میں ایک جامع اور نرم تر تعزیری ضابطہ قوانین کے سرکاری نفاذ کے ساتھ ہی محمڈن فوجداری قانون عدالتی نظام میں اپنا مقام کھو بیٹھا۔

دیوانی مقدمات میں (متعلقہ بہ شادی، تبنیت، وراثت و اوقاف وغیرہ)، جن میں مسلمان اور ہندو اصولی طور پر اپنے اپنے قانون کی پابندی کرتے تھے، اینگلو محمڈن لاء کا اطلاق ونفاذ زیادہ دیرپا اور طویل المدت تھا۔ اینگلو محمڈن لاء کی تعبیر وتشریح کے لیے صرف مسلمانوں پر انحصار نہیں کیا جاتا تھا جن کا مشاورتی کردار عدالتوں میں ۱۸۶۴ء تک باقی رہا، بلکہ اسلامی شریعت کے عربی مآخذ کے انگریزی تراجم اور شروحات سے بھی استفادہ کیا جاتا تھا۔ اہم تر بات یہ ہے کہ عدالت کے فیصلوں پر مبنی ایک ارتقا پذیر مجموعے نے ایسے نظائر مہیا کیے جو انیسویں صدی عیسوی میں اینگلو محمڈن لاء میں نمایاں حیثیت کے حامل تھے اور یہ کہ

ہندوستانی مسلمانوں اور برطانوی وکلاء و جج صاحبان کے تحریر کردہ کثیرالتعداد ملخصات اور شروحات اس صدی کے نصفِ آخر تک بسرعت مؤثر ثابت ہوے۔ ملتِ مسلمہ کی تاریخ میں اینگلو محمڈن لاء کی اہمیت قابلِ ذکر ہے.

گریگوری کزلوسکی (Gregory Kozlowski) نے استدلال کیا ہے کہ اس قانون کے ارتقا کا انحصار ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق چند برطانوی (اور قطعی طور پر ہندوستانی) مفروضات پر تھا، مثلاً یہ کہ وہ ملتِ واحد ہیں اور یہ کہ یہ ملت شخصی قوانین کے ایک واحد منضبط مجموعے کو تسلیم کرنے سے ہی متشخص ہے اور یہ کہ ان قوانین کے اصل مآخذ، کم از کم نظری طور پر، مستحکم اور غیر متبدل ہیں، عملاً اینگلو محمڈن لاء تمام ہندوستانی مسلمانوں پر یکساں طور پر نافذ نہ تھا، کیونکہ بعض علاقوں میں‌اور بعض مسلم فرقوں کے لیے برطانوی عدالتیں امتیازی اسلامی یا "رواجی" قانون کے نفاذ پر آمادہ تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی علما میں‌سے اصلاحی ذہن کے مالک اہم طبقے برطانوی عدالتی نظام سے علیحدہ رہتے ہوئے فتوے جاری کرتے رہتے تھے اور یوں برطانوی قانونی نظام سے متمیز شریعت کی عملی تنفیذ کا ایک شعبہ سنبھالے ہوے تھے.

تاہم اینگلو محمڈن لاء کے ارتقا سے قانون کی نوعیت کے بارے میں مسلم نظریات پر گہرا اثر پڑا کیونکہ یہ شخصی قانون، عائلی ووراثتی مسائل اور منصب ومقام نسواں کو مسلم قانونی تشخص کا اہم ومرکزی حصہ بنانے کا باعث بنا۔ اس نے ہندوستان میں ملتِ مسلمہ کی ایک سیاسی تعریف وتعبیر میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا جیسا کہ ۱۹۳۷ء میں مسلمانوں کی طرف سے خاطر خواہ حمایت کے ساتھ مسلم پرسنل لا نفاذِ شریعت ایکٹ کی منظوری سے آشکارا ہوتا ہے۔ جس کی غرض وغایت ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مشترک سیاسی تشخص کے بیان واظہار کی حیثیت سے اینگلو محمڈن لاء کی تنفیذِ عام تھی۔ اینگلو محمڈن لاء نے نہ صرف نوآبادتی دور کے بعد کے برصغیر ہند و پاک کے قانونی نظام کو پوری طرح متاثر کیے رکھا، بلکہ وہ دورِ حاضر کے جنوبی ایشیا کے معاشروں میں قانون اور شریعت کے مفہوم کے بارے میں بحث و تمحیص کا موجب بھی بنا ہے.

مآخذ:(۱) سید امیر علی : Principles of Mohammadan Law؛ نظرثانی شدہ ایڈیشن، مطبوعہ الہ آباد، ۱۹۸۳ء۔ (مصنف (۱۸۴۹ء۔۱۹۲۸ء) کلکتہ ہائی کورٹ کے جج تھے اور اینگلو محمڈن لاء کے ارتقا کے سلسلے میں معاونت کرنے والے ہندوستانی مسلمانوں میں سے اہم ترین شخص تھے)؛ (۲) فیضی، آصف اے ، اے: Outlines of Mohammadan Law، بار سوم مطبوعہ آکسفرڈ، ۱۹۶۴ء۔ (برطانوی ہندوستان میں ارتقا پذیر ہونے والے "محمڈن لاء" کے مواد کا اہم ملخص) ؛ (۳) Gregory C. Kozlowski : Muslim Endowment in British India مطبوعہ کیمبرج، ۱۹۸۵ء۔ (اوقاف کا جائزہ لیتے ہوے مصنف اینگلو محمڈن لاء کے سیاق وسباق اور اس کے ارتقا کی سیاسی اہمیت کی تعبیر وتشریح کرتا ہے) ؛ (۴) Rol and Wilson : An Introduction to the Study of Anglo- Mohammadan Law، لنڈن، ۱۸۹۴ء۔ (اینگلومحمڈن لاء کے منضبط کنندگان میں شامل ایک برطانوی بیرسٹر کی تحریر کردہ ، انیسویں صدی میں اس قانون کے ارتقاء کی مختصر تاریخ).

[(David Gilmartin) [ت: ظفر علی]]

••------------••

ایوب خان: [رکّ بہ محمد ایوب خان] ※

••------------••

بادشاہ : [رکّ بہ پادشاہ] ※

••------------••

※ بازار: (منڈی)، یہ فارسی لفظ اقتصادی اور تعمیراتی صورتوں کے ایک سلسلے کا اظہار کرتا ہے ،جس میں مسقف بازاروں، عارضی دیہی منڈیوں اور گلی کوچوں میں واقع دوکانوں کی چھوٹی چھوٹی پٹیوں سے لے کر مختلف النوع منڈیوں، مثلاً تجارت میں مصروفِ کار معاشی شعبے ، خاص کر وہ جو حکومت کے بینکاری نظام کے کنٹرول میں نہیں ہوتے، شامل ہیں۔ ایک پیشہ ورانہ تنظیم کی حیثیت سے روایتی بازار، کمیشن ایجنٹوں، شاگرد پیشہ افراد، آوازیں لگا کر سودا فروخت کرنے والوں، پھیری لگانے والوں، تھوک فروشوں، دور دراز علاقوں تک کام کرنے والے تاجروں، رقوم کا تبادلہ کرنے والے بیوپاریوں، صناعوں اور دوکانداروں کے معاونین کے ایک متنوع حلقے پر مشتمل ہوتا ہے (دیکھیے خصوصاً رتبلت، Ratblat ، ۱۹۷۲ء)۔ بازار معاشرتی مقاصد کا ایک تنوع بھی رکھتا ہے، جس میں طبقاتی انداز یا طبقاتی نقطۂ نظر (تاجر چھوٹے دوکاندار جزوی طور پر بازار میں رائج ساکھ کے نظام (Credit System) سے متعلق معاشرتی نظم و ضبط کے طریقوں کی مدد سے ممیّز کیے جاتے ہیں؛جزوی طور پر بازار کے معاشرتی اداروں، مثلاً پیشہ ورانہ انجمنوں، مساجد، [مذہبی حلقہ جات] ، زُور خانوں اور حماموں کی مدد سے ؛ اور جزوی طور پر اندرونی پالیسی کو نافذ کرنے والوں کا انداز دیکھ کر جنھیں ان کے متنوع کردار کے لحاظ سے داش، مزدور، جاہل، اوباش، جوانمرد، آغا، اُستاذ اور شاگرد کہا جاتا ہے، شامل ہیں اور ان کے ساتھ آخر میں اسلامی شرع کے اخلاقی ضوابط بھی دخیل ہیں۔۔۔ جن کی رو سے بازار شخصی جہاد (اخلاقی جدوجہد) کے ایک مقام کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں فرضِ کفایہ (اجتماعی فلاح) کے طور پر خدمات سرانجام دی جاتی ہیں، اور جہاں بعض اوقات تجارت کے اسلامی ضوابط کو محکمہ عدل کے حکام محتسب ، قاضی اور مجتہد (ماہر شریعت) کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔

[بازار...... کی ابتدا...... سادہ شکل کی دکانوں سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ ان میں وسعت اور جدت پیدا ہوتی گئی اور انہوں نے مسقف دوکانوں کے ایک مربوط سلسلے کی صورت اور وضع اختیار کر لی۔ جن میں مختلف قسم کی اشیا دستیاب ہوتی ہیں]۔ مسقف بازار، زیادہ تر بادشاہوں [یا حکمرانوں]، گورنروں کی سرپرستی میں تعمیر کیے گئے جہاں سے محصولات اور کرایہ جات بآسانی وصول کیے جا سکیں، نسبتاً کچھ چھوٹے مسقف بازار تاجروں کی تنظیموں نے بھی تعمیر کرائے، لیکن سہولیات کی بہم رسانی اور دوکانداروں سے کرایہ کی وصولی کی ایک سود مند شکل وہ عمومی بازار ہیں جن کی دوکانوں کا سلسلہ جدید [طرز] کی گلیوں اور سایہ دار سڑکوں کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہوتا ہے.

بادشاہوں اور گورنروں نے وقتاً فوقتاً پیشہ ورانہ انجمنوں کو باقاعدہ بنانے اور انہیں کرایہ جات و محاصل کی وصولی اور سیاسی اثر و نفوذ قائم کرنے کے ذریعے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ عمل اس [مقصد کے لیے کچھ زیادہ] کامیاب نہ رہا اور پیشہ ورانہ انجمنیں (صنف) زوال پذیر ہو کر محض صنعتی یا پیشہ ورانہ انجمنوں میں بدل گئیں۔ اکثر اوقات یہ پیشہ ورانہ انجمنیں، جب وہ موجود ہوتیں،حکومت کے اثر و نفوذ سے مبرا ہوتی تھیں اور اپنے اراکین کے مابین مقابلے اور تنازعات کو نمٹاتی تھیں۔ مثال کے طور پر بینک کاروں کی پیشہ ورانہ انجمنیں نئی دوکانوں کے محلِ وقوع کا تعین کرنے اور معاشرے میں [آنے والے] نووارد افراد کو بیکری (Bakery) کھولنے کی اجازت دینے کا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیتی تھیں۔ بیکریوں اور کچھ دوسرے کاروباریوں ،مثلاً قصابوں اور پنساریوں کو نہ صرف مرکزی بازار میں، بلکہ سارے شہر میں منقسم اور منتشر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ دوسرے کاروبار اکثر یکجا ہوتے ہیں۔ چنانچہ، کپڑے کا بازار الگ ہوتا ہے۔

لوہا فروشوں کا الگ ، قدیم زمانے میں روایتی بازاروں کے وسط میں، بینکاری بازار قیصریہ (قیصر سے ماخوذ) ہوا کرتا تھا، جہاں صراف (رقوم کا تبادلہ کرنے والے) اور اُدھار فراہم کرنے والے دستیاب ہوتے تھے، قیصریہ کے دروازے اکثر بھاری قسم کے ہوتے تھے، جنہیں رات کے وقت زیادہ حفاظت کی خاطر بند کر دیا جاتا تھا، [قرض دینے کے لیے بازار میں متعلقہ تاجر کی ساکھ کو مدنظر رکھا جاتا تھا]۔ چھوٹے تاجر بڑے تاجروں کی گارنٹی پر قرضے حاصل کرتے تھے۔ قرض کی ادائیگی میں ناکامی ایک جرم تصور ہوتی تھی [قرض کی ادائیگی کی خاطر] سودی شرح پر اور قرض لینا بہتر سمجھا جاتا تھا کیونکہ [قرض کی ادائیگی میں] ناکامی اپنی کاروباری ساکھ کو نقصان پہنچانے کے مترادف تھی۔ یہ نظامِ مراتب معاشرتی اداروں کے ساتھ ساتھ مختلف مذہبی تنظیموں میں بھی جاری تھا جنہیں تاجر، دوکاندار اور صناع سرمایہ فراہم کرتے اور چلاتے تھے۔ اس بنا پر ریاست اکثر ان تنظیمات پر اثر انداز ہونے یا ان پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

ایران میں وقتاً فوقتاً پہلوی حکومت نے پیشہ ورانہ انجمنوں، قیمتوں ، روایتی زور خانوں وغیرہ کو منضبط کرنے کی کوشش کی، آخری مرتبہ ۱۹۷۵ء میں پہلویوں نے وسیع پیمانے پر یہ کوشش کی ، جس سے حکومت کی مخالفت میں شدت آگئی جو اس رائے عامہ کی بیداری کا پیش خیمہ تھی، جو ۱۹۷۷ء - ۱۹۷۹ء کے انقلاب پر منتج ہوئی۔

بازار اور ذرائع معیشت کو منضبط کرنے کی زیادہ کامیاب کوششیں ان ادوار میں مؤثر رہیں جب حکومت فیکٹریوں کے مالکان اور تاجروں کے ساتھ قیمتوں پر مشاورت کرنے کے لیے آمادہ ہوئی، انضباط کی دوسری کوششیں تعزیری کاروائیاں ثابت ہوئیں اور ردِ عمل سامنے لائیں ،دوکاندار اپنی کاروباری حدود کے اندر رہتے ہوئے نہ صرف مساجد اور مذہبی تنظیموں کو رقوم فراہم کرتے تھے، بلکہ مذہبی رہنماؤں کی بھی، جو بازار کو منفی طور پر متاثر کرنے والی حکومتی پالیسیوں کے خلاف اظہارِ رائے کرتے تھے، امداد دیتی تھیں۔

پہلوی حکومت کے اور موجودہ اسلامی حکومت کے ہر دو ادوار میں بازار اور اس میں ادھار کے لین دین کا نظام ایرانی معیشت کا ایک اہم ستون ہیں۔ پہلوی حکومت نے سرکاری بینکوں اور انجمن ہائے امدادِ باہمی کے توسط سے ساکھ اور تقسیم کے نظاموں کا متبادل فراہم کرنے کی ایک کوشش کی، لیکن جدید عام بینک محض ثانوی اہمیت کے حامل ثابت ہوے اور بازار کی طرح ادھار فراہم کرنے میں لچکدار پالیسی اپنانے میں ناکام رہے۔

اسلامی بازار کا ضابطۂ اخلاق مناسب دام اور بھاؤ تاؤ کے نظام پر مبنی نظریات کے ایک سلسلے پر اُستوار ہے۔ بازار کے بارے میں تاحال [رائج] اہم شیعی تجارتی ضابطۂ اخلاق ایک صدی قدیم "مکاسب" ہے جو شیخ مرتضیٰ انصاری کا مرتب کردہ ہے یہ مبادلہ اشیا اور تجارت کے شعبوں کے ان ضوابط پر مشتمل ہے جو ہر مرجع تقلید (طبقہ علما میں سے بلند ترین مقام کے حامل حضرات) نے رسالۂ توضیح المسائل کی طرح کے رسائل کی شکل میں جاری کیے۔ معاشرتی انصاف اور ترقی پسند سیاسی نظریات سے متعلقہ مباحث کے ذریعے، اس پر نظرثانی کرنے کی بہت کم کوششیں کی گئی ہیں، بلکہ اس کی بجائے معاملاتی امثلہ کے ذریعے یہ کام سرانجام دیا گیا ہے، جیسا کہ روایتی کتابچہ ہائے ضوابط سے عیاں ہوتا ہے (مثلاً صدر، ۱۹۶۱ء؛ طالقانی، ۱۹۶۲ء؛ شیرازی، ۱۹۷۳ء؛ عرب دنیا اور اخوان المسلمین تناظر کے سلسلے میں فارسی میں ترجمہ شدہ کتب کے لیے دیکھیے قطب، 1981؛ اردو کتب کے لیے دیکھیے مودودی، بدون تاریخ؛ نیز زیادہ عمومی لحاظ سے منان ، ۱۹۸۶ء) ۔ یا

اپنے ملک کے ضابطہ ہائے قوانین کو از سرنو مدون کرنے کے لیے اسلامی جمہوریہ ایران کی کوششوں کے ذریعے سے بازار کی معاشیات سے متعلق اخلاقی مباحث میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ چیز علم کی شرائط اور خرید و فروخت کے مبادلہ میں فریقین کی رضامندی کو یقینی بنانا ہے۔ مثال کے طور پر بچے خرید و فروخت نہیں کر سکتے، لیکن وہ مجاز بالغ افراد کے کارندے بن سکتے ہیں؛ اگر خریدار کسی خریدی ہوئی شے کو مناسب قیمت سے مہنگا پائے تو اشیا واپس کی جاسکتی ہیں یا اگر فروخت کنندہ قیمت کے بارے متذبذب ہے اور اسے علم ہو جائے کہ اس نے [اشیا] بہت کم قیمت پر فروخت کی ہیں، تو تب بھی بیع پر نظرثانی ہوسکتی ہے۔ بیع (قطعی فروخت) تصور کیے جانے والے معاہدات کے بارے میں بھی قوانین [موجود] ہیں اور ان دوسرے معاہدات کے متعلق بھی زیادہ باضابطہ نہیں ہوتے (جیسے کہ بیع معاطاۃ)۔ ان قوانین میں سے ربا (سود) سے متعلقہ زیادہ اہم اور وقیع ہیں (خصوصاً بازار کے مذکورہ قسم کے ادھار لین دین کے نظام سے متعلق ، جس میں سود کی شرحیں کم و بیش ہوتی ہیں ۔ قرونِ وسطی اور دورِ جدید کے ، آغاز ہی میں یورپ کے عیسائیوں اور یہودیوں نے بالآخر رقم پر سود کے خلاف توریت اور انجیل کے احکام پر مفاہمت کر لی (دیکھیے نیلسن، ۱۹۶۹ء)۔ مگر مسلمان قرآن مجید اور احادیث میں موجود سود کے خلاف نصوص کی بنا پر اس قسم کی مفاہمت نہ کر سکے گو مسلمانوں کے ہاں بھی منصفانہ سود اور غیر منصفانہ سود میں امتیاز کے حق میں دلائل دیئے جاتے ہیں، لیکن عالمی سطح پر اسے تاحال تسلیم نہیں کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حیل شرعی یا قرضِ حسنہ یا مہربانی اور مخاطرہ، جیسے طریقے اضافی رقم کا حساب لگانے کے لیے بروئے کار لائے گئے،گویا کہ یہ [سود کے علاوہ] کوئی اور چیز تھے.

پچھلے دو عشروں میں غیر سودی کاروبار کے لیے مختلف تجربات بھی کیے گئے ہیں، لیکن امانت و دیانت میں کمی اور بعض دوسری وجوہ کی بنا پر لوگ جمع شدہ سرمایہ کو کاروباری نفع و نقصان میں ایک طرح کا کاروباری خطرہ تصور کرتے ہیں.

صرافہ بازار (Bazar of exchanges) : یہ بازار فرد کے حقوق اور معاشرے کی بھلائی کے مابین کشمکش کے لیے ایک رزم گاہ فراہم کرتے ہیں ،جسے غیر واضح طور پر ذاتی اخلاقیات اور مقابلے کا جذبہ منضبط کرتے ہیں۔ امام الغزالیؒ کے مطابق بازار ایک داخلی جہاد کا میدان ہے ،جو انسان کے اخلاق کو اس وقت تک برقرار رکھتا ہے جب تک کہ اس سے کوئی نامناسب یا غلط فائدہ اٹھانے کی ترغیب موجود ہے۔ دیگر مفسرین تاجر کے کردار کا ذکر معاشرتی خدمت کے پیشے (فرض کفایہ) کے طور پر کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ان خطرات سے بھی آگاہ کرتے ہیں جو بازار یا منڈی میں موجود ہوتے ہیں، کیونکہ یہ ایک ایسا کام ہے جو معاشرے کو ضرور سرانجام دینا ہوتا ہے ۔اسی بنا پر بازار کا انتظام مناسب و موزوں بنیادوں پر استوار رکھنے کے لیے ''حسبہ'' [رک بآں] کا نظام وضع کیا گیا اور مختلف ادوار میں محتسب کے نام سے مقرر ہونے والے حکام نظم و ضبط برقرار رکھنے، قیمتوں کے تعین اور محاصل کی وصولی میں ممد و معاون رہے ہیں۔ یہ عہدہ یونانی و رومی منڈیوں میں پہلے ہی موجود تھا اور اب بھی اسی نام سے سعودی عرب ، مراکش کے بربر اسواق میں اور کچھ دیگر ممالک میں برقرار ہے (جہاں قیمتوں کے تعین کا کام محتسب تھوک فروشوں سے پیداواری لاگت پر مشاورت کے بعد کرتا ہے).

ایران میں، اسلامی انقلاب نے بینکوں، تامین (Insurance) کے اداروں ،بڑی صنعتوں ، غیر آباد اراضی اور کچھ تجارت کو قومیا لیا ہے۔ یہ سب کچھ عوام

کی بھلائی، انقلاب یا مسلم معاشرے کی محافظت، بدعنوانیوں کی بیخ کنی (مثلاً سود، مارکیٹ کے بڑے بڑے حصص کو کنٹرول کرنے والی بڑی بڑی کمپنیوں کی وسیع پیمانے پر نفع اندوزی) اور اللہ تعالیٰ کی [عطا کردہ] دولت کی منصفانہ گردش کی یقین دہانی کے نام پر کیا گیا، مشکل اراضی کی اصلاحات میں پیش آئی جہاں دولت کی از سر نو تقسیم کے سلسلے میں [اراضی] ایک فرد سے لے کر دوسرے کو دی جانا تھی، اگرچہ روایتی اسلامی مباحث کی اصطلاحات کو ایک جدید قومی معیشت تک توسیع دینے کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں تاہم بازار بنفسہٖ ایک نیم خود مختار سلطنت کی حیثیت سے [ایسے] طاقت ور معاشی اور سیاسی مفادات کا حامل ہے جن کا ہر اسلامی مملکت کو ضرور احترام کرنا چاہیے، اخیراً اسلامی قانون میں شامل اخلاقی ضوابط اور معاشرتی انصاف کے بارے میں افکار کے علاوہ بازار میں واقع معاشرتی ادارے بھی اخلاقی احکام پر مبنی اپنے ثقافتی افکار اور روایات رکھتے ہیں.

(مزید حالات کے لیے دیکھیے مال، علم معاشیات، مالیات، بنک، سود، وغیرہ۔ بذیل مادہ)

مآخذ: (۱) مہدی عابدی، و Gary Legenhrausen: Bibliography on Islamic Banking، ہوسٹن، ۱۹۸۸ء؛ (۲) مرتضیٰ، انصاری: کتاب المکاسب، نجف ۱۹۷۲ء؛ (۳) Pierre، Centlivres: Forme et Orgdnisation du Un Bazar d` Asie Centrale: Bazaar de Tashqurghan (Afghanistan)، مطبوعہ ویزبیڈن، ۱۹۷۲ء (۴)، Centlivses- Demount, Michaline: une Communaute de Potiers en Iran :Le Centre de Meybod (یزد) ویزبیڈن، ۱۹۷۱ء؛ (۵) Fox, Richard G: From Zamindar to Ballot box Community Change in a North Indian Market، اتھاکا، نیویارک ۱۹۶۹ء؛ (۶) Geertz Clifford: The Social History of an Indonesian Town، کیمبرج، مساچوزٹس، ۱۹۶۵ء (۷) وہی مصنف: "The Bazar Economy in Sefrou." In Meaning and order in Moroccan Society Sauq مرتبہ، در Clifford Geertz، ودیگر، کیمبرج ۱۹۷۹ء: (۷)حجازی، عبدالرضا: سسٹم اقتصادی اسلام، قم ۱۹۷۰ء؛ (۸) خوری، فؤاد اسحاق: Etiquette of Bargaining in the Middle East، ۷۰۔ ۷۴ (۱۹۶۸ء) ص ۶۹۸۔ ۷۰۶؛ (۹) عبدالمنان، محمد: Islamic Theory and Practice Economics:، بولڈر، ۱۹۶۸ء؛ (۱۰) مودودی، سیدابوالاعلیٰ، Capitalim. Socialism and Islam، کویت بدون تاریخ؛ (۱۱) نارائن، آر، کے: The Financial Expert، نیویارک، ۱۹۵۳ء؛ (۱۲) سید قطب: تفسیر آیات الربوا (سود سے متعلق آیات کی تفسیر)، بیروت؛ (۱۳) وہی مصنف: معرکۃ الاسلام والراس المالیہ (اسلام بمقابلہ سرمایہ داری)، بیروت و قاہرہ، ۱۹۸۳ء؛ (۱۴) محمد باقرالصدر: اقتصادُنا، نظرثانی شدہ طباعت، بیروت، ۱۹۷۷ء انگریزی ترجمہ انگریزی بعنوان "Our Economics"، ۲ مجلدات و چہار حصص، تہران ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۸۴ء؛ (۱۵) صادق شیرازی: راہِ بہ سوئے بینک اسلامی، قم ۱۳۹۳ھ/ ۱۹۷۳ء؛ (۱۶) محمود طالقانی، اسلام و ملکیت، تہران ۱۹۶۵ء انگریزی ترجمہ از، احمد جباری و فرہنگ رجائی بعنوان Islam and Ownership، مطبوعہ لسنگٹن کنٹکی ۱۹۸۳ء

(Mechael M.J Fischer)، [ت: ظفر علی، ن: محمودالحسن عارف]

••-------------••

※ بازرگان، مہدی: (پ: ۱۹۰۷ء)۔ ایرانی مسلم جدیدیت پسند اور مصلح، جو انقلاب سے پہلے اور بعد کے [ہر دو] ادوار میں اسلامی حزبِ مخالف کے اہم ترین زعما میں سے ایک تصور کیے جاتے ہیں۔ مہدی بازرگان ایرانی تاجروں کے ایک مذہبی خاندان میں پیدا ہوے۔ انہوں نے جدید نصاب پر مبنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم، روایتی قرآنی تعلیم کے ساتھ تہران سے حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء میں وہ ان چند طلبہ میں شامل تھے، جنہیں غیر ممالک میں تحصیلِ علم کے لیے حکومت نے منتخب کیا تھا۔ انہوں نے پیرس کے مرکزی سکول (Ecole Contrale) میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی [اور] ایران میں واپس آئے۔ پی ایچ ڈی کرنے اور ایک سال تک فوجی ملازمت کرنے کے بعد وہ نیشنل بنک میں ملازم ہوگئے اور تہران یونیورسٹی کے شعبۂ انجینئرنگ سے منسلک ہوگئے۔ بعدازاں ۱۹۳۰ء ہی کی دہائی میں انہوں نے ترقی پسند اسلام کے پیغام کی نشرواشاعت کی خاطر حزبِ مخالف سے تعلق رکھنے والے اہم مذہبی رہنما سید محمود طالقانی کے ساتھ زندگی بھر کے لیے اشتراک و تعاون کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۹ء میں شاہ کی مذہبی پالیسیوں کی مخالفت کرنے کی بنا پر وہ جیل بھجوا دیئے گئے۔ ۱۹۴۱ء سے بازرگان مسلم سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن اور ایسوسی ایشن آف انجینئرز سمیت مختلف پیشہ ورانہ اسلام پسند تنظیموں کے قیام کا ذریعہ بنے۔

ایک سرگرم قوم پرست کی حیثیت سے بازرگان محمد مصدق کے قوم پرستانہ نصب العین کی طرف متوجہ ہوے۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد انہوں نے مصدق اور قومی محاذ (National Front) کے ساتھ اشتراکِ عمل کیا۔ امانت و دیانت میں شہرت کی وجہ سے وہ ۱۹۵۱ء میں ایرانی تیل کے قومیائے جانے کے عمل کی نگرانی کرنے والی کمیٹی کے سربراہ کی حیثیت سے نائب وزیرنامزد کیے گئے ، بعدازاں وہ قومی ایرانی تیل کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے پہلے چیئرمین بنے۔

۱۹۵۳ء میں مصدق کی معزولی کے بعد ،وہ قوم پرست مزاحمتی تحریک "نہضۃ مقاومۃ ملی" (N.M.R) میں شامل ہوگئے۔ یہ تحریک ۱۹۵۷ء میں کچل دی گئی اور بازرگان سمیت اس کے بہت سے رہنما جیل میں محبوس کر دیئے گئے۔ ۱۹۶۱ء میں آیت اللہ طالقانی اور یداللہ صحابی کے ساتھ مل کر انہوں نے تحریک آزادی (*Liberation Movement of Iran*) کی بنیاد ڈالی، جس نے غیر ملکی تسلط کے خاتمے اور آئینی اور جمہوری حقوق کی بحالی کا مطالبہ کیا، ان تینوں اصحاب کی ان سیاسی سرگرمیوں کی بنا پرانہیں قید و حبس کی سزائیں ہوئیں۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء اور ۱۹۷۷ء کے مابین بازرگان بھی اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر کئی بار مختصر مدت کے لیے پابندِ سلاسل ہوے۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں بازرگان نے ماہانہ مذہبی سوسائٹی [کے] (لیکچروں) میں حصہ لے کر ایک دوسرے اہم مذہبی راہنما آیت اللہ مطہری سے بھی اشتراک کیا ، مطہری، طالقانی اور بازرگان اساتذہ کی اسلامی ایسوسی ایشن کے بانیوں میں سے تھے اور انہوں نے اس کی پہلی اور دوسری قومی کانگرس کا انعقاد کیا۔

۱۹۷۰ء کے عشرہ کے اواخر میں ،شاہ مخالف جاندار عوامی سیاسی تحریک سے کچھ عرصہ قبل بازرگان نے ۱۹۷۷ء میں حزبِ مخالف کے جمہوری حقوق کے دفاع کے لیے حقوقِ انسانی کی ایسوسی ایشن کے قیام میں ،اس کے شریک بانی کی حیثیت سے کام کیا۔ بازرگان نے شاہ کی معزولی پر منتج ہونے والے انقلاب میں اس وقت نمایاں کردار ادا کیا جب آیت اللہ خمینی نے انہیں ۱۹۷۸ء کے وسط میں تیل کے کارکنوں کی ہڑتالیں منظم کرنے کے لیے بھجوایا۔ فروری ۱۹۷۹ء میں خمینی نے انہیں عبوری حکومت کا پہلا وزیراعظم مقرر کیا، لیکن اسی سال نومبر میں بے اختیاری اور اقتدار

کے متعدد مراکز اور خاص طور پر ۱۴ر فروری ۱۹۷۹ء کو امریکی سفارت خانے پر قبضے سے شاکی ہو کر، انہوں نے نومبر ۱۹۷۹ء میں استعفیٰ دے دیا۔ بازرگان اسلامی انقلاب کی کونسل کے رکن بھی تھے اور ۱۹۸۰ء میں ایران کی پہلی پارلیمنٹ میں تہران کے نمائندے کی حیثیت سے منتخب ہو کر آئے۔ ۱۹۸۰ء کے عشرہ کے اوائل میں جب اسلامی جمہوریہ نے حزبِ مخالف پر ایک بڑا حملہ کیا تو اس سے بچنے والا واحد سیاسی گروہ ایل۔ ایم۔ آئی (LMI) تھا اگرچہ اس کے ارکان کو وفادار حزبِ مخالف کی حیثیت سے برداشت کیا جاتا تھا تاہم ان میں اکثر کو حراست میں لے لیا گیا اور تنگ کیا گیا، اسلامی جمہوریہ کی پالیسیوں سے عمومی طور پر اور جمہوری حقوق کے چھن جانے سے خصوصاً بددل ہو کر بازرگان نے ۱۹۸۴ء میں دیگر رہنماؤں کے ساتھ مل کر انجمن برائے دفاعِ آزادی و حاکمیتِ ایرانیاں (Association for the Defence of the Freedom and Soveriegnity of the Iranian Nation- ADFSIN) کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۹۰ء کے عشرہ کے اوائل میں بازرگان۔ ایل۔ ایم۔آئی اور اے ڈی ایف ایس آئی این ہر دو میں سرگرم عمل رہے۔

اپنی سیاسی سرگرمیوں کے سارے عرصہ کے دوران بازرگان نے شیعی دینیات کو دنیاے جدید اور اپنی جمہوری آرزوؤں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ان کی سیاست قوم پرستی، تدریج ، آزاد خیالی اور اسلام کا ایک امتزاج پیش کرتی ہے، یہ خصائص انہیں روایتی مذہبی رہنماؤں مثلاً خمینی اور انقلابی حامیانِ اسلام، مثلاً علی شریعتی سے ممیز کرتے ہیں۔ شریعتی کے فصیح و بلیغ اور شعلہ نوا طرزِ بیان نے نوجوانوں کو ابھارا اور خمینی نے غیر مراعات یافتہ طبقے اور روایتی معاشرتی گروہوں کے [پوشیدہ] غیظ و غضب کو زبان بخشی جب کہ بازرگان کے نظریات کی تحسین روایتی متوسط طبقہ کے زیادہ روشن خیال افراد تک محدود رہی۔ جس وقت انقلابی عوامی تحریک ابھری، بازرگان کی سیاسی اصلاح پسندی (Reformism) عوام کے انقلابی جوش و خروش سے ہم آہنگ نہ تھی۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں جب مصدق کے روا دارانہ نظریات اور اس کے سیاسی جدوجہد کے پارلیمانی طریق نے جنگ کے بعد کے دور کی نسل کو اپنی طرف راغب کیا تو بازرگان کے رواداارنہ اور تدریجی نظریات وسیع تر اہمیت رکھتے تھے، لیکن ۱۹۶۰ء کے عشرہ کے وسط سے ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اوائل تک ایرانی نوجوانوں پر عالمی واقعات ،مثلاً چین، ویت نام اور کیوبا کے انقلابات کے اثر کی بنا پر بازرگان کے مصلحانہ سیاسی پروگرام اور اسلامی روا داری پر مبنی ان کے افکار انہیں بے محل دکھائی دیئے۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے کی نسل کو مصدق کی روا دارانہ قوم پرستی پر مبنی نظریات کے بارے میں کچھ یاد نہ تھا، بلکہ وہ اس انقلابی نظریئے سے متاثر تھی جس کی رو سے مصدق کی شکست کو سیاسی جدوجہد کے اس پارلیمانی طریق سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مجاہدینِ خلق ایک گوریلا تنظیم تھی جس نے شاہ کی حکومت اور اسلامی جمہوریہ کے خلاف نبرد آزمائی کی۔ اس کے کچھ بانی ارکان نے ایل۔ ایم۔ آئی میں شمولیت کر لی جب کہ [دیگر] بہت سارے [ارکان] ۱۹۶۳ء میں اس جماعت میں شامل ہوگئے۔ ۱۹۶۵ء تک مسلح جدوجہد کی مثال سے متأثر ہو کر انہوں نے اپنی سیاسی پارٹی قائم کر لی۔ اس لیے معتدل مزاج ایل۔ایم۔ آئی نے ۱۹۷۹ء کے انقلاب کے دوران میں زیادہ قوت حاصل نہ کی۔ تاہم اس [بات] نے اس کے کچھ رہنماؤں کو اسلامی جمہوریہ کے ابتدائی سالوں میں بااثر عہدوں پر فائز ہونے سے محروم نہ رکھا۔ مارکسییت کے خلاف بازرگان کے مناظرے اور ان کے تدریجی [طرز کے] افکار بازار کے تاجروں کے قدامت پسندانہ میلانات سے مشابہ تھے جب کہ اسلامی جدیدیت کو ایک سائنسی بنیاد

پر مدون کرنے کی ان کی کوشش نے انہیں تعلیم یافتہ متوسط طبقہ میں مقبول بنا دیا، شاہ کی حکومت کے دوران میں اسلام کو جدید اور سیاسی انداز دینے کے سلسلے میں بازرگان کی سعی کا مقصد شہنشاہیت کا ایک اسلامی متبادل وجود میں لانا تھا، لیکن ۱۹۸۰ء تک طاقت پر مذہبی قیادت کی اجارہ داری اور انقلاب کے ابتدائی سالوں میں جمہوری حقوق پر پابندیوں نے انہیں ایک بار پھر حزبِ مخالف میں لا کھڑا کیا۔ اس بار اسلام سے متعلق ان کی کثیر الجماعتی تاویل مذہبی قیادت کے روایتی اسلام کے یک جماعتی نظریہ پر مبنی میلانات کے برعکس تھی۔ ۱۹۷۹ء کے انقلاب سے پیشتر مسلمانوں کو سیاسی بنانے کی اپنی کوشش میں بازرگان نے سیاست اور مذہب کی وحدت پر زور دیا تاہم انقلاب کے بعد کے دور میں ان کی تعبیرات بڑی تیزی سے اسلام کو ایک ذاتی عقیدہ کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ ریاست سے مذہبی اداروں کی علیحدگی کا مطالبہ کرتے ہوئے انہوں نے اس نظریے کا اظہار کیا کہ ذاتی عقیدہ کے معاملات میں ریاست کی مداخلت ایک مذہبی مطلق العنانیت کی طرف لے جائے گی۔ بازرگان نے اسلام کی کسی بھی [جامع] اور ہمہ گیر تعبیر کی مخالفت کی اور عوامی شراکت اور حاکمیت کے حق میں دلائل دیئے۔ یہ نظریاتی خصائص انہیں جنگِ عظیم دوم کے مابعد کے ایران میں اسلامی روا داری پر مبنی نظریات کے بڑے علمبرداروں میں سے ایک ثابت کرتے ہیں۔ [رک بہ ایران]۔

مآخذ: (۱) بازرگان، مہدی: مدافعات در دادگاہِ غیر صالح تجدیدِ نظر نظامے تہران، (بازرگان کی ذاتی اور سیاسی زندگی پر ایک عمدہ سوانحی مآخذ)؛ (۲) بازرگان، مہدی: رائے طے شدہ، ہوسٹن ۱۹۷۷ء، یہ کتاب ایرانی معاشرہ کے سیاسی مسائل پر روشنی ڈالتی ہے، نیز پہلوی خاندان کے دورِ حکومت میں حزبِ مخالف کے گروہوں پر بھی اور ان [مسائل] پر قابو پانے کے طریقے تجویز کرتی ہے۔)؛ (۳) وہی مصنف: بازیابی ارزش ہا، تہران ۱۹۸۳ء؛ (۴) وہی مصنف: انقلابِ ایران در دو حرکت، تہران ۱۹۸۴ء (لبریشن موومنٹ آف ایران [L.M.I] کے سیاسی تناظر سے ایرانی انقلاب اور انقلاب کے بعد کے حالات کا تجزیہ؛ (۵) شہابی، ایچ۔ ای: *The Iranian Politics and Religious Modernism Liberation Movement of Iran Under Shah and Khomeini*، اتھاکا، نیویارک ۱۹۹۰ء؛ (بازرگان اور لبریشن موومنٹ آف ایران پر دستیاب تازہ ترین عمدہ کتب میں سے ایک)؛ (۶) منوچہر دراج: مقالہ مہدی بازرگان در *Modern Islamic world*، ۱:۲۱۱-۲۱۳؛

[ترجمہ و تعلیق: ظفر علی]

••-------------••

※ باکو (باقو): آذربیجان کا دارالحکومت، دریائے خزر کے مغربی ساحل پر آبشاران کے جنوب میں واقع، جزیرہ نما ساحلی شہر ہونے کے باوجود صنعتی، تجارتی، علمی اور ثقافتی میدان میں سوویت یونین کے نمایاں مراکز میں سے ایک ہے۔ یہ تو علم نہیں کہ اس شہر کی بنیاد کب رکھی گئی، لیکن دسویں صدی کے مسلمان جغرافیہ دانوں کی کتابوں میں اس کا نام باکو، باکوہ، باکد اور باکویہ وغیرہ کی شکل میں ملتا ہے۔ بعض قدیم مآخذ میں اس نام کی اصل فارسی لفظ بادکوب بیان کی گئی ہے، جس کا مطلب "ہوا کی جائے پیدائش" ہے، لیکن یہ مفہوم اہل علم کے ہاں قبول نہیں کیا گیا (دیکھیے آآ، لائیڈن، ۲: ۲۵۹)۔ موسم گرما میں گرم اور خشک، بہار میں نیم گرم اور برساتی خصوصیات رکھنے والا باکو شہر سوویت یونین کے بہت گنجان آباد شہروں میں سے ہے۔ پٹرول کی صنعت میں ترقی کے ساتھ ساتھ آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور ۱۹۲۷ء میں ۳۰۰،۰۰۰ تک اور ۱۹۹۰ء میں ۱،۷۷۲،۰۰۰ تک بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ یہ شہر

مختلف النسل لوگوں کا شہر بن گیا ہے۔ یہاں کے باشندے آذری، روسی، تاتاری اور داغستانی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں زیادہ تر آذری ہیں.

بارہویں صدی کے نصف سے لے کر شیروان شاہان کی اقامت گاہ قرار پانے تک، تیرھویں اور چودھویں صدی میں مغلوں کے زیر تسلط رہا۔ پندرھویں صدی کے آغاز میں شیروان شاہان کا دارالسلطنت بن گیا اور صدی کے آخر تک یہی حالت رہی ۔ ۱۵۰۱ء میں صفوی حکمران شاہ اسماعیل نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد باکو کو اوذ دیمر اوغلو عثمانی پاشا نے فتح کر کے (۱۵۸۳ء میں) عثمانی سلطنت کو از سر نو تشکیل دینے والے شاہی صوبے سے ماتحت علاقے کے طور پر منسلک کر دیا، لیکن ۱۶۰۶ء میں صفویوں نے یہ شہر واپس لے لیا۔ عباس شاہ اول کی تعمیر و ترقی کے لیے اختیار کردہ کوششوں کے نتیجے میں باکو علاقے کے اہم مراکز میں سے ایک کے درجے کو پہنچ گیا.

۲۔ انیسویں صدی سے لے کر ایران اور روس کے درمیان وجہ نزاع قرار پانے تک کا دور : اُسے ۱۷۲۳ء میں پیٹرو۔ اول کی طرف سے روسی سلطنت میں شامل کر لیا گیا، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد نادر شاہ کے دور میں وہ دوبارہ ایران کے قبضے میں چلا گیا (۱۷۳۴ء)۔ آزاد باکو حکمرانی (۱۷۴۷ء) قائم ہونے پر یہ شہر اس کا دارالحکومت قرار پایا اور ۱۸۰۶۔ ۱۸۱۳ء میں روس و ایران جنگوں کے آخر میں گلستان معاہدہ امن پر دستخطوں کے بعد (باکو) قطعی طور پر روسی مملکت کا حصہ اور شاہی صوبے کا مرکز بنادیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد انگریزوں نے اس پر اپنا تسلط قائم کرلیا، مگر ۲۸ مئی ۱۹۱۸ء کو قائم ہونے والی ملی آذربیجان جمہوریہ کی سرخ فوج کی طرف سے اس جمہوریہ کو ختم کر دینے کی بنا پر یہ شہر اس کی جگہ قائم ہونے والی آذربیجان سوویت سوشلسٹ جمہوریہ (۲۸ اپریل ۱۹۲۰ء) کا دارالحکومت بن گیا.

بارھویں صدی سے پندرھویں صدی تک باکو کے حالات کے بارے میں معلومات مہیا کرنے والی کتب میں معدنی تیل (پٹرول) کے بارے میں وسیع معلومات دی گئی ہیں.

ابوالفدا (م ۱۳۳۱ء) نے خاص طور پر سبز اور سفید تیل (پٹرول) سے تفصیلی طور پر بحث کی ہے۔ ۱۷ ویں صدی کے نصف میں دو دفعہ باکو کی سیاحت کرنے والے اولیا چلبی نے شاہ عباس کی آمدنی کا بڑا حصہ باکو سے نکالے جانے والے معدنی تیل کی فروخت کو قرار دیا ہے۔ نیز اس علاقے میں سات مختلف مقامات پر معدنی تیل کی پیداوار کا ذکر کیا ہے۔ زارروس حکومت میں داخل ہونے سے پہلے یہاں پر پائے جانے والے تیل کے کنوئیں سرکردہ لوگوں کے ہاتھوں میں آنے کی بنا پر پیداوار زیادہ تھی۔ زار روس کے اقتدار میں کنوئیں قومیاے جانے کے سبب ان کی پیداوار کم ہوگئی۔ اس بنا پر ۱۸۷۲ء میں پٹرول کی صنعت پھر سے آزاد کر دی گئی۔ مغربی ذرائع سے آنے والے غیر ملکی سرمایے کی آمد سے شہر تیزی سے پھیلا ۔ ۱۸۵۹ء میں پہلی بار تعمیر ہونے والی ریفائنریوں کی تعداد بڑھی، باتوم پٹرول پہنچانے کے لیے باکو۔۔باتوم پٹرول لائن منصوبہ زیر عمل آنے سے شہر نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ شہر کے نواحی علاقوں میں بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ کئی شہر معرضِ وجود میں آئے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں باکو نے دنیا بھر کے نصف تیل کی پیداوار دینے والے شہر کے طور پر شہرت پائی۔ علاوہ ازیں یہ شہر علاقے کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ شہر کو ریلوے لائن کے ذریعے روستو اور ماسکو سے ملانے کی وجہ سے معاشی اور تجارتی میدانوں میں بھی اس کی اہمیت بڑھ گئی۔ صرف آخری دور میں پٹرول کے ذخائر میں کمی آ جانے کی وجہ سے باکو کی اہمیت اور اثرات میں کمی ہوگئی ہے.

روسی دور حکومت میں اس کی ترقی کا عمل بھی جاری رہا، چنانچہ اس وقت اس نے ایک طرف تو آذربائیجان سوویت سوشلسٹ جمہوریہ اور دوسری طرف سوویت یونین کے نمایاں تجارتی، صنعتی اور ثقافتی مراکز میں سے ایک کے طور پر ترقی کی۔ سویت یونین میں پہلی الیکٹرک ٹرین لائن، باکو اور سابنجی کے درمیان بچھائی گئی (۱۹۲۴ء)۔ ریلوے لائن کے ذریعے طفلس، ایری وان، دربند، کلفہ اور اسرا سے منسلک ہونے کی بنا پر اور بندرگاہ کی وسعت کے سبب نقل و حمل کے حوالے سے یہ ایک قابلِ ذکر شہر بن گیا۔ ہوائی اڈہ بن جانے اور ہوائی خدمات ادا کرنے کی بدولت شہر کی اہمیت بڑھ گئی.

باکو میں ۱۹۱۹ء میں قائم ہونے والی سرکاری یونیورسٹی کے ساتھ ۱۹۴۵ء میں قائم ہونے والی آذربائیجان سائنس اکیڈمی اور کافی تعداد میں انسٹی ٹیوٹ یہاں کام کر رہے ہیں۔ کئی ایک قسم کے تھیٹر اوپرا اور سنگت ناچ ادارے، ۱۵۰ سے زائد کتب خانے، ۱۶ میوزیم کے ساتھ کئی ایک سرکاری اور نمائشی گیلریوں نے شہر کو ایک تعلیمی اور ثقافتی شہرمیں بدل دیا ہے۔ باکو علاقے میں مسلمانوں کے حوالے سے بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ جارجیا، آرمینیا اور آذربائیجان میں رہنے والے مسلمانوں سے متعلقہ ''مشترکہ ماورائے قاف دینی امور'' کا دفتر یہیں ہے.

باکو، زاروں اور قومی دورِ حکومت کی طرح آج بھی نشریاتی اور طباعتی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ آذربیجان میں شائع ہونے والے آذری اور روسی اخبارات اور میگزین زیادہ تر یہاں سے شائع ہوتے ہیں۔ باکو سے شائع ہونے والے سارے کے سارے اخبارات اولیں طور پرکوہ قاف کے مسلمانوں کے حقوق کا دفاع کرنے والے ہیں ۔ ان میں روسی زبان میں شائع ہونے والے اخبار کسپی (Kaspiy) (۱۸۷۰ء۔ ۱۹۱۸ء) کے ساتھ ساتھ آذری زبان میں شائع ہونے والا پہلا آزاد اخبار ''Ekinci (دوسرا)'' (۱۸۷۵ء۔ ۱۸۷۷ء) ہے۔ ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے بعد روس میں انتظامی طور پر اداروں سے مشروط قائم ہونے والی آزادی کے ماحول میں، دیگر شہروں کی طرح باکو میں بھی ۱۹۰۵ء۔ ۱۹۲۰ء کے عرصے میں بڑی تعداد میں اخبارات اور رسائل و جرائد شائع ہوے، ان میں سے نمایاں ترین درج ذیل ہیں: حیات، ارشاد، تکامل ، تازہ حیات (حیات نو)، ترقی ، اتفاق، حقیقت، گنیش (سورج/ شمس)، یول داش (کامریڈ/ ہم راہی)، پراگریس، اقوام ، اقدام نو، تازہ خبر، آخری خبر، صحیح بات ،کھلی بات ، پرچم، عدالت، ہمت ، صدائے زحمت، قاف پرگنہ، اتحاد، اخبار، دبستان، رہبر، بہار، فیوضات، فیوضات نو، بہلول، لیلی، مظہر، زنبور، مرعاۃ، بلال، نجات، آذربائیجان، آذربائیجان حکومت کا سرکاری اخبار، راہ راست، عوامی، صدائے عوام، مساوات، استقلال، اوراق نفیس، مدنیت، آذربائیجان میں عوامی حکومت قائم ہونے کے بعد شخصی اخبارات اور رسائل و جرائد کی جگہ حکومت کی طرف سے نکالے گئے۔ اخبارات و رسائل، کمیونسٹ، شبان آذربائیجان، آذربائیجان، آزاد منش/ حر، آتشیں وطن، روشنی، آئینہ، اسلام، نوروز، علم، مدنیت، ادبیات، باکو، تاریخ اور باکو یونیورسٹی ہیں۔ آذربائیجان میں آذری اور روسی زبان میں نشریات کرنے والے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ساتھ ساتھ آذربائیجان خبر ایجنسی (Aztag) کا مرکز بھی باکو میں ہے.

ترک، اسلام کلچر کے مراکز قرار پانے والوں میں سے ایک باکو بھی ہے۔ اس میں تاریخی طور پر بہت سی مساجد، حمام، کارواں سرائے اور گنبدوں وغیرہ قسم کے تعمیراتی آثار موجود ہیں۔ باکو کا سب سے قدیم اور اہم ترین حصہ اندرون شہر کہلانے والا حصہ ہے۔ یہ آج تک قلعے کی شکل میں باقی ہے۔ شاہ اسماعیل کی طرف سے شہر کی فتح کے

دوران میں قلعہ تباہی کا شکار ہوا، لیکن اوزدیمر اوغلو پاشا، شاہ عباس اول کی طرف سے اور پھر زاران روس کی طرف سے اسے تعمیر کر دیا گیا۔ سنگ قلعہ کے نام سے معروف قلعے میں پائی جانے والی محمدی مسجد کا ۱۰۷۸ء سے متعلقہ مینار تاحال اپنی بنیادوں پر قائم سب سے قدیم ترک مینار ہے۔ مینار کی نفاست اور خوب صورتی کی خاطر نیچے والا حصہ خط کوفی سے سجایا گیا ہے اور اردگرد کا انداز زیبائش اس دور کے فن تعمیر کے ذوق کا آئینہ دار ہے۔ شیروان شاہان کے زمانے سے لے کر تاحال قلعہ دفتر، شیروان شاہی محلات، شاہی مقبرے، سید یحییٰ الباکوی کا گنبد اور مسجد جمعہ کا مینار قائم ہے۔ ان کے علاوہ باکو میں بعد کے ادوار میں قائم ہونے والی عمارت میں سے مسجد جمعہ، ملا احمد، (Hidir Gilek) (حیدرگیلک) مرزا احمد، شیخ ابراہیم، سرائے کیقباد، مکتب بی بی ہیبت بیگلیاس (Begliyas) مساجد کے ساتھ ملا خان، بہار، ملتان اور ہند کاروان سرائے اور خانان باکو کے محلات جیسی اہم تعمیرات پائی جاتی ہیں.

باکو میں جدید اور تاریخی انداز پہلوبہ پہلو دکھائی دیتے ہیں، یہ شہر قلعے سے باہر معاشی اور سیاسی طور پر ترقی پا چکا ہے اور جدید شہر (باکو) اندرون شہر سے باہر تعمیر و منتقل ہوچکا ہے۔ شہر کی نئی عمارتوں اور سماجی اداروں میں دکھائی دینے والے جدید انداز (تعمیر) ۱۹۲۰ء میں قبول کیے جانے والے مرکزی تعمیراتی پلان سے مطابقت رکھتے ہیں، جو تعمیراتی کارروائیوں کے نتیجے میں کامیابی سے ہمکنار ہوا ہے۔ [اس وقت باکو آذربیجان کا دارالحکومت ہے اور دنیا کے اہم ترین شہروں میں سے ہے۔ آذربیجان نے اگست ۱۹۹۱ء میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا جس کی جون ۱۹۹۲ء کے ریفرنڈم میں ۹۹.۶ فیصد لوگوں کی اکثریت نے منظوری دی ......

[رکّ بہ آذربیجان].

مآخذ: حدودالعالم طبع Minorsky، ص ۱۴۵، ۴۱۱؛ (۲) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ۲ : ۳۰۰۔ ۳۰۳؛ (۳) کتاگوگلین (Kiitakoglin) : عثمانی ایرانی سیاسی مناسبتیں ۱۵۷۸ء۔ ۱۵۹۰ء، استانبول ۱۹۶۲ء، ص ۶۰، ۶۳، ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۱۹؛ (۴) سارا آشوربے لی تاریخ باکو، باکو ۱۹۶۸ء؛ (۵) م، فخرالدین کرنہ اوغلو: (عثمانیوں کی قفقازوں کے ہاتھوں فتح)، (۱۴۵۱۔ ۱۵۹۰) انقرہ ۱۹۷۶ء، ص ۳۰۱، ۳۰۳، ۳۰۶، ۳۳۸؛ (۶) ابوالفداء : جغرافیا، ۲/۱: ۲۹۹؛ (۷) شریعت اکینز: Islamic Peoples of the Soviet Union، لنڈن ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۸، ۱۲۲؛ (۷) J.G.Tewari: Muslims Under the zars and the Soviets، ملکفو ۱۹۸۴ء، ص ۴۵، ۷۷، ۸۵، ۱۲۵، ۴۰۵؛ (۸) D.M. Dunlop: "Arslanpa de Turk Abidelesi"؛ (۹) قاموس العالم، ص ۴۵، ۷۷، ۸۵، ۱۲۵، ۴۰۵؛ (۱۰) Kucuk Turk Islam Ansiklopedisi، بذیل مادہ "Beku"؛ (۱۱) Encyclopaedia of Islam، (فرانسیسی)، ۱: ۹۹۶۔۹۹۷؛ (۱۲) Encyclopaedia Britannica، بذیل مادہ Bacu؛ (۱۳) ابراہیم پاک سیل: Az er Bayacan de Fikri Hayat ve Basin، استانبول ص ۹۳۔۱۲۸؛ (۱۴) The Statesman's Year Book 1984-1985، مدیر Daxton، لنڈن، (۱۵) ترکی دائرۂ معارف، بذیل مادہ .

(داؤد درشن [ت: خالد ظفر اللہ داؤدی])

••------------••

بحر مقتضب : (ع) مادہ ق، ض، ب سے باب ⊗ افتعال کا اسم مفعول، لغوی معنی: مقطوع، کاٹا ہوا، اصطلاح میں مقتضب :(۱) فی البدیہہ کلام (الکلام المرتجل) کو کہتے ہیں، نثر ہو یا نظم؛ (۲) علم عروض کی ایک بحر کا نام ، (المنجد، الفوائدالدریہ، مصباح، منتہی الارب، اقرب الموارد)

ہر چند کہ تقریباً تمام اساتذۂ فن نے وجہِ تسمیہ بیان کر کے تاویلیں کی ہیں، مگر مقالہ نگار اسے ضروری نہیں

سمجھنا، اس لیے کہ وہ تاویلیں حقیقت کے مطابق نہیں، مثلاً بحر منسرح سے مقطوع کہنا، بحالیکہ نہ مقطوع ہے ،نہ عربی میں مقلوب، البتہ فارسی اور اردو میں اسے مقلوب یا معکوس کہہ سکتے ہیں، مقطوع اس صورت میں بھی کہنا موزوں نہیں۔

عربی میں، جیسا کہ مذکور ہوا بحر مقتضب مسدّس الاصل ہے اور اس کے ارکان مفعولات مستفعلن مستفعلن (دوبار) ہیں، لیکن ہر دو مصرعوں میں سے ایک ایک آخری رکن حذف کر کے مجزو، مربع مستعمل ہے، اس لیے اس کے عروض و ضرب دونوں ایک ہی قسم کے مطوی آتے ہیں ۔ اس بحر میں زحافات: خبن، طے، قطع، صلم، وقف، کسف، جدع، عرج اور ازالہ وارد ہوے ہیں۔ عربی میں وزن پانچ مستعمل ہیں :(۱) مربع، ہر رکن مطوی: فاعلات مفتعلن (دوبار) ؛ (۲) مربع، صدر مخبون باقی ارکان مطوی:مفاعیل مفتعلن، فاعلات مفتعلن؛ (۳) مربع، صدر و ابتدا مخبون، عروض و ضرب مطوی: مفاعیل مفتعلن (دوبار)، (۴) مربع، صدر و ابتدا مخبوں (صدر و ابتدا میں مکانفہ ہے، یعنی مفعولات کے اسبابِ خفیفِ متوالی کے ساکنین کا معاً سقوط جائز ہے، چنانچہ یہ وزن دال، بلکہ ان اساتذۂ فن کے خلاف حجت ہے جو بحر مقتضب میں مراقبہ مانتے ہیں (یہ بھی واضح رہے کہ مکانفہ، مراقبہ معافیہ، بری وغیرہ زحافات نہیں احکام ہیں) ، عروض و ضرب مطوی: فعلات مفتعلن (دوبار) (۵) مربع، صدر و ابتدأ سالم (صدر و ابتدأء میں بری ہے، یعنی مفعولات کے اسبابِ خفیفِ متوالی کے ساکنین میں سے ازروے معاقبہ ایک ساکن کو جوازاً حذف کیا جاسکتا تھا، مگر نہیں کیا)، عروض و ضرب مطوی: مفعولات مفتعلن (دوبار)۔

فارسی اوزان میں بھی ان کی وضاحت بھی ضروری ہے، اس کی بھی دو وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ یہ فن عربی سے اردو میں براہ راست نہیں، بلکہ فارسی کی وساطت سے آیا ہے دوسری یہ کہ گو فارسی کے سات اوزان اردو کی طرح مثمن الاصل اور فارسی و اردو میں مشترک ہیں ، لیکن دو وزن مشطور ہو کر عربی کی طرح مربع بھی مستعمل ہیں، جب کہ اردو میں اس بحر کے اوزان مثمن کے سوا مسدس یا مربع قطعاً نہیں آتے۔

یہ راے بھی حقیقت پر مبنی نہیں کہ یہ بحر اردو میں سالم ارکان کے ساتھ نہیں آتی ، گو نظریہ اختصار و ایجاز مثال میں اشعار پیش کرنا ،ہمارا معمول نہیں، لیکن یہاں مناسب ہوگا کہ سالم ارکان کے استعال کے ثبوت میں فارسی و اردو کا ایک ایک شعر ضرور پیش کیا جائے۔

فارسی و اردو کے مشترک اوزان: فارسی اور اردو میں مسطورۂ فوق صراحت کے مطابق یہ بحر مثمن الاصل ہے اس کے ارکان ایک شعر میں مفعولات مستفعلن (چار بار) ہیں۔

(۱) مقتضب مثمن سالم: مفعولات مستفعلن (چار بار) ، فارسی

می سوزم ز داغِ جگر، می نالم ز درد و الم
می غلتم ز شب تا سحر، خوں گریم زاندوہ و غم

تقطیع می سوزم زِ= مفعولاتُ، داغ جگر = مستفعلن، می نالم زِ = مفعولاتُ، درد و الم= مستفعلن؛ می غلتم زِ= مفعولاتُ ، شب تا سحر= مستفعلن، خوگریم زِ = مفعولات= اندوہ غم = مستفعلن]۔

ان بالوں میں اب کیوں نہیں ہوتا شانہ کیا ہے صنم
تیرے گیسو الجھے میرا دل آشفتہ ہے اے صنم

تقطیع : ان بالوں= مفعولاتُ، اب کیوں= مستفعلن، ہوتا شان = مفعولاتُ، کیا ہے صنم= مستفعلن ، تیرے گیسو: مفعولاتُ، الجھے مرا= مستفعلن ، دل آشفتَ، مفعولاتُ ، ہے اے صنم = مستفعلن؛

(۲) مثمن،کسب ارکان مطوی: فاعلاتُ مفتعلن (چار بار)؛

(۳) مثمن ، عروض و ضرب و مطوی مذال، باقی ارکان مطوی ، فاعلات مفتعلن فاعلات مفتعلان

(۴) مثمن ، صدر و ابتدا اور حشوِ دوم و چہارم مخبون، حشوِ سوم مطوی مسکن، حشوِ اوّل اور عروض و ضرب مطوی: مفاعیل مفتعلن مفاعیل مفتعلن۔ مفاعیل مفعولن مفاعیل ،مفتعلن (اس وزن میں صرف عروض یا صرف ضرب یا دونوں میں مذال یعنی مفتعلان بھی جائز ہے)؛ (۵) مثمن ، صدر و ابتدا اور حشو ثانی و چہارم مطوی، عروض و ضرب اور حشوِ اوّل و سوم مطوی مسکن: فاعلات (چار بار) ؛ (۶) مثمن، عروض و ضراب اعرج، حشوِ اوّل و سوم مطوی مسکن، صدر و ابتدا اور حشوِ ثانی و چہارم مطوی: فاعلات مفعولن فاعلات مفعولان (دوبارہ) پنجم و ششم اوزان کا باہم خلط جائز ہے ؛ (۷) مثمن ، یہ وزن بھی اوزانِ پنجم و ششم کی طرح ہے اور اس کا بھی خلط ان دونوں سے جائز ہے، البتہ اتنا مستزاد ہے کہ اس میں حشوِ اوّل وسوم دونوں میں بھی عرج لا سکتے ہیں اور صرف ایک میں بھی: فاعلات مفعولن یا مفعولان فاعلات مفعولن یا مفعولان (دوبار)

فارسی: (۸) مربع، سب ارکان مطوی، فاعلات مفتعلن (دوبار) ؛ (۹) مربع، مفعولاتُ دونوں جگہ مخبون، مستفعلن دونوں جگہ مطوی: مفاعیل مفتعلن (دوبار)

(ھادی علی بیگ، وامق)

⊗ بحرین: [تعلیقہ] مشرق وسطیٰ کی ایک اسلامی ریاست (ابتدائی حالات کے لیے [رکّ بہ البحرین بذیل مادہ در آآ، بذیل مادہ].

یہ خلیج فارس / عرب کے چھوٹے بڑے ۳۶ جزائر پر مشتمل ہے، جن میں بحرین ، المحرق، سترہ النبیہ اور صالح زیادہ بڑے اور معروف ہیں۔ اس کا کل رقبہ اندازاً ۷۰۰ مربع کلومیٹر اور آبادی اندازاً ۶ لاکھ ہے (The Statesman's Year Book, 2001.، بذیل مادہ)۔ اس کے شمال مشرق میں سعودی عرب اور شمال مغرب میں قطر واقع ہے۔ دارالحکومت منامہ (آبادی ۱،۴۳،۰۰۰) بڑا تجارتی مرکز ہے.

سیاسی حالات: یہاں تقریباً دو صدیوں سے الخلیفہ خاندان برسراقتدار ہے جو دراصل نجد کے بنو عتبہ ہیں جنہوں نے پہلے کویت سے ترک وطن کیا اور پھر وہاں سے قطر منتقل ہوگئے۔ ۱۷۸۳ء میں ان کے جدامجد احمد بن خلیفہ نے ایرانی اثرات کے تحت قائم ھوالہ عربوں کی حکومت (ان عربوں کی اولاد جو پہلے ایرانی ساحل پر آباد ہوے تھے) ختم کر کے اپنا اقتدار مستحکم کر لیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں نے خلیج کی ریاستوں پر دباؤ بڑھا دیا اور مختلف معاہدوں کی آڑ میں شیوخ و امرا کو برائے نام باقی رکھ کر حقیقی اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۸۱ء اور ۱۸۹۲ء میں برطانیہ اور بحرین کے درمیان ہونے والے معاہدوں کے نتیجے میں دفاع اور خارجہ پالیسی بھی برطانیہ کے پاس چلی گئی اور ۱۹۱۴ء میں قدرتی وسائل کی ترقی کے جملہ حقوق بھی اسے حاصل ہوگئے۔ ۱۹۳۲ء میں یہاں تیل دریافت ہوا تو معمول کی تجارت، ماہی گیری اور تلاش صدف جیسے روایتی پیشوں کے مقابلے میں زیادہ وسائل میسر آ گئے، چنانچہ ۱۹۴۲ء میں برسراقتدار آنے والے شیخ سلمان بن حماد الخلیفہ نے ترقیاتی کاموں کو وسعت دی۔ نومبر ۱۹۶۱ء میں شیخ سلمان کے انتقال پر ان کے بڑے بیٹے شیخ عیسیٰ نے اقتدار سنبھالا اور برطانیہ سے آزادی کی کوششیں شروع کر دیں۔ ۱۹۷۰ء میں ملک چلانے کے لیے ایک کونسل بنائی گئی اور ۱۹۷۱ء میں بحرین نے آزادی حاصل کر لی۔ ۱۹۷۳ء میں آئین بنایا گیا اور قومی اسمبلی کے انتخابات ہوے، تاہم اختیارات کی تقسیم پر جھگڑے کی وجہ سے امیر بحرین نے اسمبلی برخواست کر دی اور کابینہ کی مدد سے حکومت کرنے لگے۔ شیخ عیسیٰ نے بحرین کو اقوام عالم میں اہم مقام دلوانے کے لیے متعدد اقدامات کیے اور ملک کی تعلیمی، سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے کئی منصوبوں پر کامیابی سے عمل کیا، گو بحرین اور خلیج کی دوسری ریاستوں پر امریکی اور برطانوی

سیاسی اثرات ابھی تک غالب ہیں اور حقیقی آزادی کی منزل ابھی دور ہے۔ مارچ ۱۹۹۹ء میں شیخ عیسیٰ کے اچانک انتقال پر ان کے بڑے بیٹے شیخ حماد نے اقتدار سنبھالا اور کئی بین الاقوامی پیچیدگیوں، ایران کی انگیخت پر مقامی شیعہ آبادی میں بے چینی، آئینی زندگی میں تعطل جیسے امور کے علی الرغم بحرین پر الخلیفہ خاندان کے اقتدار کو کوئی سنجیدہ خطرہ لاحق نہیں ہے (فواد حوزی: *Tribe and State in Bahrain*، شکاگو یونیورسٹی پریس ۱۹۸۰ء).

بحرین میں شیعہ سنی تنازعہ: بحرین میں ایرانی اثرات اور شیعہ سنی تنازعہ کی جڑیں صدیوں پرانی ہیں۔ اردشیر اوّل کے زمانے سے اس علاقے میں ساسانیوں کے عمل دخل کا آغاز ہوا۔ چنانچہ جب نبی کریمؐ نے حضرت العلاءؓ بن الحضرمی کو مشرق کی طرف مہم پر بھیجا تو اس وقت بحرین کے علاقے پر ایک ایرانی مرزبان کا قبضہ تھا۔ عہد ابی بکرؓ میں تحریک رِدّہ کے دوران میں مسلمانوں نے بحرینی حکمرانوں کو بحری اور نواحی بری علاقے دونوں جگہ شکست دی۔ پھر چوتھی صدی کے شروع میں قرامطہ نے یہاں قدم جما لیے اور ۳۱۷ھ/ ۹۳۰ء میں حرم مکہ سے حجر اسود اکھاڑ کر یہاں لے آئے جو بیس برس تک یہاں رہا۔ پانچویں صدی کے وسط میں الحساء کے بنی عیون نے عباسی خلافت کے نام پر اور سلاجقہ عراق کی حمایت سے یہاں سے قرامطہ کا خاتمہ کیا اور سنّی مسلمانوں کی حکومت قائم کر دی۔ ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۵ء میں ایران کے ایک سلغری اتابک ابوبکر بن سعد نے جزائر بحرین پر قبضہ کر لیا جو بیس سال کے بعد بنو عصفور نے ختم کر دیا اور اسے خودمختار حیثیت دے دی۔ نویں صدی ہجری میں یہاں خاندان جبریہ نے حکومت قائم کی اور مالکیوں کو شیعوں پر غلبہ حاصل کرنے میں مدد دی۔ ۱۵۱۴ء کے بعد پرتگالیوں نے یہاں اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا اور ایرانی سنیوں کے ذریعے حکومت کرتے رہے۔ ۱۰۱۱ھ/ ۱۶۰۲ء میں شاہ عباس اوّل کے عہد میں ایرانیوں نے بحرین لے لیا اور تقریباً ڈیڑھ سو سال تک یہاں قابض رہے، لیکن اس زمانے میں بھی انتظامی امور حوالہ عربوں کے ہاتھ میں رہے جو ابتداءً ساحلِ ایران پر آ کر آباد ہوے تھے۔ ۱۷۸۳ء میں بنو عتبہ کے احمد بن خلیفہ نے نصر آلِ مذکور کو شکست دے کر بحرین پر سنی اقتدار مستحکم کر دیا، جو ابھی تک جاری ہے۔ انیسویں صدی سے برطانیہ نے اس علاقے میں قدم جما لیے، لیکن اس نے خلیفہ خاندان کے ذریعے ہی معاملات چلائے۔ ایرانی حکومت اس دوران میں برابر بحرین کی سیادت کا دعویٰ کرتی رہی۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں جب بحرین میں برطانیہ سے آزادی کی مہم جاری تھی اس وقت اقوامِ متحدہ کے زیرِ اہتمام ایک سروے کرایا گیا جس کے مطابق اہلِ بحرین نے ایران کے ساتھ رہنے کی بجاے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ ایران کو طوعاً و کرہاً یہ رپورٹ قبول کرنا پڑی۔ چنانچہ ۱۵/ اگست ۱۹۷۱ء کو بحرین نے آزادی کا اعلان کر دیا، لیکن ایران نے غیر اعلانیہ مداخلت جاری رکھی۔ چپقلش کا بنیادی سبب یہ ہے کہ بحرین میں شیعہ آبادی مقابلتاً اکثریت میں ہے جب کہ حکمران خاندان سنی ہے اور حکومت میں عوام کی نمائندگی کا کوئی خاطر خواہ انتظام موجود نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق ملک کی ۹۸ فیصد مسلم آبادی میں سے شیعہ ۵۳ فیصد اور سنی ۴۵ فیصد تھے۔ اس کے بعد نہ تو مردم شماری ہوئی اور نہ قابل اعتماد یا سرکاری اعداد و شمار دستیاب ہیں، لیکن غیر جانبدار ذرائع شیعہ آبادی کی تعداد زیادہ ہی بتاتے ہیں (دیکھیے Fahim I.Qubain : *Social Classes and Tensions in Bahrain*، در *Middle East Journal*، (۱۹۵۵ء) ۹: ۲۷۰) اور جیسا کہ ذکر ہوا کہ ملک میں کوئی آئینی اور جمہوری ادارے یا پارلیمنٹ وغیرہ موجود نہیں ہے جہاں عوام اور ان کے نمائندوں کو اپنی آراء و مشکلات کے

اظہار کا موقع ملے، جب کہ بیرونی انگیخت کے امکانات بھی موجود ہیں۔ان حالات میں وقتاً فوقتاً شیعہ عوام کی طرف سے جلسوں، مظاہروں اور ہنگاموں کی اطلاعات آتی رہتی ہیں جو بعض اوقات جلاؤ، گھیرگھراؤ اور بم پھٹنے کے واقعات پر منتج ہوتی ہیں۔ دوسری طرف حکومت کی طرف سے بھی داروگیر اور قائدین کو جیل میں ڈالے جانے کی خبریں آتی رہتی ہیں *Arab States of People* and: John Duke anthony) *the Lower Gulf Politics Petroleum* ، مڈل ایسٹ انسٹی ٹیوٹ واشنگٹن ڈی سی ۱۹۷۵ء)۔

بحرین کا شمار دنیا کے ۳۷ امیر ترین ملکوں میں ہوتا ہے۔ اس کی ۸۰ فیصد معیشت کا انحصار تیل پر ہے۔ بحرین کے تیل کے ذخائر بہت وسیع نہیں ہیں اور ایک بڑا ذخیرہ سعودی عرب کے ساتھ مشترک ہے۔ قدرتی گیس بھی ہے جس سے ملکی صنعت چلائی جا رہی ہے۔ منامہ کا شمار دنیا کے بڑے مالی مراکز میں ہوتا ہے جہاں دنیا کے ۱۸۰ مالی اداروں اور بینکوں کے دفاتر کام کر رہے ہیں ۔ یہاں کی کرنسی بحرینی دینار ہے۔ بحرین میں صنعت کو غیر ملکی تعاون سے ترقی دی جا رہی ہے۔ یہاں ایلومینیم کا ایک بڑا کارخانہ ہے اور بحری جہاز توڑنے، پارچہ بافی، آلات بجلی نیز پانی اور تیل صاف کرنے کے کارخانے ہیں۔ بحرین ۲۵ کلومیٹر لمبے سمندری پل کے ذریعے سعودی عرب سے ملا ہوا ہے.

دارالحکومت منامہ کو ڈیڑھ میل لمبے پشتے کے ذریعے جزیرہ المحرق سے ملایا گیا ہے اور اسی طرح سمندری پل کے ذریعے جزیرہ سترہ سے جہاں گہرے پانی کی بندرگاہ بنائی گئی ہے۔ بحرین میں تعلیم مفت ہے۔ شرح خواندگی ۲. ۸۵ فیصد ہے۔ یہاں متعدد سکول و کالج اور دو یونیورسٹیاں ہیں (دیکھیے Europa world Year Book, 2000 بذیل مادہ بحرین)

بحرین اقوام متحدہ ، اسلامی کانفرنس، عرب لیگ ، اوپیک اور خلیج تعاون کونسل کا رکن ہے۔ جزیرہ ہوار کی ملکیت پر اس کی قطر سے آویزش چل رہی ہے۔ یہ جزیرہ تیل کی دولت سے مالا مال ہے اور قطر کے قریب ہے لیکن اس پر پہلے سے بحرین کا قبضہ ہے۔ خلیج تعاون کونسل میں سمندری حدود بڑھانے کا فیصلہ ہوا جس کی وجہ سے قطر کے ساتھ واقع ہونے کی بنا پر اس پر قطر اپنا دعوی کر رہا ہے۔ اس وقت یہ معاملہ بین الاقوامی عدالت انصاف میں ہے۔ بحرین برطانیہ اور امریکہ سے دفاعی معاہدوں میں منسلک ہے، بلکہ یہاں امریکی اڈہ بھی موجود ہے۔

مآخذ: متن میں مذکور مآخذ کے علاوہ دیکھیے بحرین کے بارے میں عمومی معلومات کے لیے: (۱) Michael Jenner: *Gulf Heritage in Transition* ، *Bahrain* ، لانگ مین لنڈن ۱۹۸۱ء؛ (۲) John Bulloch : *The Persian Gulf Unveiled* ، *Congdon and Weed* ، نیویارک ۱۹۸۴ء؛ (۳) James H.D. Belgrave : *Welcome to Bahrain* ، منامہ ۱۹۶۰ء؛ (۴) Molly Izzard : *The Gulf Johnmurray Western* : *Arabia's Approaches* ، لنڈن ۱۹۷۹ء ، بحرین کے سماجی اور سیاسی ڈھانچے کے لیے دیکھیے: (۵) محمد غانم الرمیحی: *A Study on Social and Political Changes* ، *Bahrian Since the First World War*، کویت یونیورسٹی پریس ۱۹۷۵ء؛ (۶) Jeffrey B. Nugent and Theodore ، H.Thomas (مدیران): *Bahrain and the Gulf* ، St. Martin ، نیویارک ۱۹۸۵ء؛ (۷) Fred H. Lawson : *The Modernization of Autocracy*۔ *Bahrain Westview Press*، لنڈن ۱۹۸۹ء (۸) Juan R.I.Golf : *Rival Empires of Trade and Imami* ، *Shiism in Eastern Arabia*، در *Imes* شمارہ ۱۹ (مئی ۱۹۸۷ء)؛ (۹) احمد ابوحکیم: *The Rise and Development of* ـ *History of Eastern Arabia*

Bahrain and Kuwait ، بیروت ۱۹۶۵ء؛ (۱۰) J.F. Peteson : Tribes and Politics in Eastern Arabia، در Mej ، شمارہ ۳۱ (۱۹۷۷ء): (۱۱) طلال توفیق فرح: Protection and Politics in Bahrain 1869-1915ء ، امریکن یونیورسٹی پریس بیروت ۱۹۸۵ء؛ (۱۲) Fahim I. Qubain : Social Classes and Tensions in Bahrain، در MEJ ، شمارہ ۹ (۱۹۵۵ء)۔ ایران کے ساتھ تنازعہ کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے دیکھیے: (۱۳) Freydoun Adamiyat : Bahrein Islands ۔ A Legal and Diplomatic Iranian Controversy Study of the British Praeger، نیویارک ۱۹۵۵ء ؛ (۱۴) امیر طاہری (مدیر): Policies of Iran in the Persian Gulf Region در عباس امیری (مدیر): The Persian Gulf and Indian Ocean in International Politics ، تہران ۱۹۷۵ء؛ (۱۵) R.K. Ramazani : Iran`s Islamic Revolution and the Persian Gulf ، در Currpent History شمارہ ۸۴ (جنوری ۱۹۸۵ء): (۱۶) Gary Sick : Iran`s Quest for Superpower Statu ، در Foreign Affairs ، شمارہ ۶۵ (۱۹۸۷ء) ؛ نیز دیکھیے: (۱۷) سید امجد علی، The Muslim World Today، اسلام آباد ۱۹۸۵ء؛ (۱۸) مسلم دنیا (۹۷-۱۹۹۶ء) ادارہ معارف اسلامی منصوررہ ، لاہور.

(محمد امین و شمیم روشن آراء)

••------------••

※ **بخارانیت** : بخارا کی ریاستِ خوانین

یہ اہم وسطی ایشیائی ریاست ہے، جو ۱۹۲۰ء تک تقریباً چار صدیوں کے عرصے پر محیط تھی، اس کی بنیاد ۱۵۰۰ء کے لگ بھگ سردار محمد شیبانی خان کی قیادت میں، ازبکوں کی ماوراء النہر کی فتح کے وقت سے پڑی۔ ابتدائی طور پر ازبکوں نے وسطی ایشیا سے تیموری شاہی خانوادوں کو نکال باہر کیا اور کئی شہروں میں ایک "لامرکزی حکمتِ عملی پر مبنی حکومت" کی بنیاد رکھی۔ ان شہروں میں اہم ترین بخارا، سمرقند، تاشقند اور بلخ تھے، جن پر چنگیز خان کے وارثوں میں سے ایک حکمران قبیلے اور تاحال بعض خانہ بدوش ازبک قبائل کے سرداروں کا غلبہ تھا، سولھویں صدی کے نصف آخر تک، ایک اہم ترین مرکزی ریاست کے بااثر "دارالحکومت" کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور جب شیبانی خاندان، چنگیزی نسل کے ایک ذیلی خاندان (جانی یا اشترخانی) کے سامنے پسپا ہوا تو بخارا نے اٹھارویں صدی میں وسطی ایشیا کو درپیش سیاسی اور معاشی تنزل کے باوجود اپنے مرکزی مقام کے طور پر برقرار رکھا۔ اس صدی کے وسط تک خان کی بالادستی کے طفیل، قبائلی اشرافیہ کی قوت میں تدریجی عروج، جو پورے اشترخانی عہد میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا، آخری چنگیزی خان کے قتل کی بنا پر اختتام پذیر ہوگیا اور اس کی جگہ ازبک منغت قبیلے (Manghit) کے سردار محمد رحیم نے لے لی۔ منغت خاندان، ۱۹۲۰ء میں خوانین کی ریاست کے سوویت کٹھ پتلی ریاست میں تبدیل ہو جانے تک بخارا پر حکمران رہا۔

بانی حکمران کے پوتے شاہ مراد (۱۷۸۵ء-۱۸۰۰ء) نے ایران اور افغانستان کی قیمت پر اپنے حلقۂ اقتدار کو وسعت دی، اندرونی طور پر اس کی حکومت، ریاستِ خوانین کے مرکزی ضوابط اور صوبائی انتظامیہ کی ترتیبِ نو کا باعث بنی۔ خود اس نے اور اس کے بیٹے حیدر (۱۸۰۰ء- ۱۸۲۶ء) نے خان کی بجائے "امیر" کے لقب کو ترجیح دی تاکہ انہیں دیہی آبادی اور علما کی اعانت حاصل ہو اور بنابریں ازبکوں کی قبائلی اشرافیہ کی قوت میں کمی واقع ہو اور ایک مرکزی ریاست کی تشکیل عمل میں آ سکے۔ اپنی ہم مقتدر حکومت کو درپیش تمام مؤثر مخالفتوں کو کچلنے کی ذمہ داری فی الواقع حیدر کے بیٹے نصراللہ (۱۸۲۷ء-۱۸۶۰ء) کے کندھوں پر

آپڑی، نصراللہ نے قبائلی لشکروں پر انحصار کے خاتمے کے لیے بخارا کی فوج کو بھی از سرنو منظم کیا، لیکن عسکری توسیع پسندی کے سلسلے میں اس کی مساعی ناکام رہیں اور فی الحقیقت خوقند کی ریاست ِ خوانین کے خلاف مسلسل جنگ و جدل نے روسی پیش قدمی کے وقت ان دونوں ریاستوں کو کمزوری سے ہمکنار کر دیا تھا.

نصراللہ کے بیٹے اور وارث مظفر کے عہد(۱۸۶۰ء-۱۸۸۵ء) میں روس کے ساتھ طویل تجارتی اور سفارتی روابط مسلح تنازعات میں بدل گئے کیوں کہ روسی افواج نے ۱۸۶۵ء میں تاشقند پر اپنی فتح کے فوراً بعد بخارا کی فوجوں کو عسکری امور میں الجھا رکھا تھا۔ مسلسل شکستوں نے امیر کو جون ۱۸۶۸ء میں روس کے ساتھ ایک معاہدے پر مجبور کر دیا جس کے تحت سمرقند کا علاقہ براہ راست روسی حکمرانی میں آ گیا، اگرچہ رسمی طور پر اس پر [بخاراکی خوانین کی ریاست] کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کیا جاتا رہا جو زارِ روس کی تابعدار تھی۔ سلطان مظفر کے عہد میں روسی غلبے کی بنا پر چند تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں، مگر اس کے بیٹے عبدالاحد کے زمانے (۱۸۸۵ء- ۱۹۱۰ء) میں ۱۸۸۷ء میں ریاستی حدود میں ریلوے لائن کی تکمیل، بخارا کے اندرونی اقتصادی و معاشرتی امور میں روسی اثرات کی وسعت اور سیاسی کارروائیوں پر منتج ہوئی.

عبدالاحد اور اس کے بیٹے سید عالم (۱۹۱۰ء- ۱۹۲۰ء) دونوں نے مغرب کے سیاسی اور معاشرتی نظریات سے متأثر آزاد رو اصلاح پرست حلقوں کی اندرونی مخالفت کو مؤثر طور پر زیر کیے رکھا۔ بہرحال ۱۹۱۷ء کے بالشویک انقلاب کے نتیجے میں، وہ اصلاح پرست لوگ جو ریاست سے فرار ہوگئے تھے، تاشقند میں سوویت عہدیداروں کی طرف متوجہ ہوے اور انہیں امیر بخارا کے ساتھیوں نے ستمبر ۱۹۲۰ء میں بخارا پر روسی فوجوں کے قبضے کے وقت داخلی تحفظ فراہم کیا۔ امیر نے ملک سے راہِ فرار اختیار کی اور اس وقت سے لے کر ۱۹۲۴ء تک، سابقہ ریاست ِ خوانین بخارا کی عوامی سوویت ریپبلک کے طور پر موجود رہی، پھر اسے بھی ۱۹۲۴ء میں وسط ایشیا کی "قومی حد بندی" کے وقت منسوخ کر دیا گیا اور اس کے زیادہ تر علاقے نئی سوویت جمہوریہ ازبکستان کو دے دیئے گئے، [نیز رکّ بہ: اسلام، اسلام در وسطی ایشیا و قفقاز؛ خان اور ازبکستان ، بذیل مادہ].

مآخذ: (۱) All Worth, Edward ، (مدیر) : 120 Central Asia : year of Russan Rule، ڈریم، این سی ۱۹۸۹ء، نظرثانی شدہ ایڈیشن: A Century of Russia Rule ، نیویارک؛ (۲) Becker Seymonr : Russia`s Protctorats in Central Asia ، کیمبرج (Mass) ۱۹۶۸ء- ۱۹۲۴- ۱۸۶۵، بذیل Bukhara and khiva؛ (۳) Helene, Earrore D` Encuume : Aevolution in Central Asia : Reform and Islam and the Russia Empire، ترجمہ از Quirtion Hoore ، برکلے، ۱۹۸۸ء، (۱۹۶۶ء)؛ (۴) Mary Holdsworth` : A Brief : Turkestan in the Ninteenth Century ، History of the Khanatos of Bukhera` Kakand and Khinae ، آکسفوڈ، ۱۹۵۹.

(Devin Deweese [ت: امین اللہ وثیر])

••------------••

⊗ **بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا محمد:** ہندوستان کے ایک معروف عالمِ دین محدث اور دارالعلوم دیوبند کے ایک معروف استاد ،والد کا نام حاجی سید تہور علی تھا جو پیشے کے اعتبار سے، انسپکٹر پولیس تھے اور نہایت فرض شناس، دیانت دار اور متقی شخص تھے اور سات مرتبہ حج کی سعادت حاصل کرچکے تھے۔ بدایون میں ان کی تعیناتی کے دوران میں ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء میں مولانا کی ولادت ہوئی ۔ قرآن حکیم ناظرہ پڑھنے کے بعد ابھی سکول میں زیر تعلیم تھے اور میٹرک بھی پاس نہیں کیا تھا کہ الہٰ آباد میں مولانا اشرف

علی تھانویؒ [رکّ بہ اشرف علی] کی تقریر سن کر انگریزی تعلیم کی بجائے دینی علم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا (دیکھیے مولانا سید آفتاب احمد: "مولانا کے والد محترم کی زندگی کی ہلکی سی جھلک" در ترجمان السنۃ، لاہور، ب ت، ۴: ۱۷۔۱۸).

چنانچہ ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء میں ان کے پرزور اصرار پر، ان کے والد نے انہیں سہارن پور کے مدرسہ مظاہرالعلوم میں داخل کرا دیا، جہاں انہوں مولانا خلیل احمدؒ (سہارنپوری) سے ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۸ء میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی اور آئندہ دو سال تک وہاں تدریسی خدمات سرانجام دینے کے بعد دارالعلوم دیوبند چلے گئے۔ وہاں انہوں نے مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ سے دورۂ حدیث پڑھنے کے بعد، ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۲ء سے تدریس شروع کر دی (فیوض الرحمٰن: مشاہیر علماء دیوبند، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۱۱۱).

۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء میں جب ان کے اُستاد محترم مولانا محمد انور کشمیریؒ دارالعلوم کی انتظامیہ سے اختلافات کی بنا پر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل چلے گئے تو وہ بھی اُن کے ہمراہ وہاں، نقل مکانی کر گئے جہاں وہ تدریسی فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ مولانا کشمیری کے حلقہ درس میں شریک ہوتے رہے۔ اس طرح انہوں نے پانچ بار دورۂ حدیث کیا، (ایک مرتبہ مولانا خلیل احمدؒ سے اور چار مرتبہ مولانا سید محمود انور شاہ کشمیریؒ سے ،دیکھیے عبدالرشید ارشد :(مدیر) بیس مردانِ حق ،لاہور، ۱۹۹۶ء، "مولانا سید بدرعالم" ص: ۸۷۷).

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے انہیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر خصوصی سند دی، وہ سترہ سال تک جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں درسِ حدیث دیتے رہے۔ اسی عرصے میں ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۲ء میں مولانا کشمیریؒ نے وفات پائی، اور وہ ان کے جانشین بنے مگر ادب و احترام کی بنا پر وہ ان کی جگہ پر بیٹھ کر درس نہیں دیتے تھے، بلکہ اس جگہ سے تھوڑا سا ہٹ کر بیٹھتے تھے۔ بعد میں وہ خرابی صحت کی بنا پر بہاولپور آگئے، مگر وہاں بھی زیادہ روز نہ ٹھہر سکے۔ کچھ عرصے کے بعد بہاول نگر چلے آئے اور پہلے سے قائم شدہ ایک معمولی سے مدرسے کی تنظیم نو کر کے ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۴ء میں مدرسہ "جامع العلوم" کا اجرا کیا۔ صرف ایک سال یہاں قیام کرنے کے بعد دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں ایک مشہور علمی و تحقیقی ادارے ندوۃ المصنفین کے رفیق کی حیثیت سے کام کرنے لگے اور اپنی مشہور تالیف "ترجمان السنۃ" کا آغاز کیا۔ اس کی جلد اوّل ہی مکمل ہوئی تھی کہ تقسیم ملک پر وہ ہجرت کر کے پاکستان کے شہر کراچی آ گئے (دیکھیے "ترجمان السنۃ" لاہور، ب ت، ۴: ۱۸۔۲۰).

پاکستان میں اپنے ایک استاد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ایما پر وہ دارالعلوم دیوبند کی طرز پر "ٹنڈوالہ یار" میں دارالعلوم اسلامیہ کے قیام میں مصروف ہوگئے، اس مدرسے کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس میں صحیح بخاری کی تدریس کی خدمت بھی سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے کچھ دن ریڈیو پاکستان پر درسِ قرآن بھی دیا، (بیس مردانِ حق، ۲: ۸۸۳).

مولانا ان اکتیس علمائے کرام میں شامل تھے، جنہوں نے ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے دستور کی تیاری وغیرہ کے سلسلے میں اپنے متفقہ بائیس نکات پیش کیے (مولانا محمد میاں صدیقی: تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۲۰۷)۔ ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۲ء میں وہ مدینہ منورہ چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی، ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء میں سفر حج سے واپسی پر حادثہ میں زخمی ہوگئے تو جدہ میں چند روز مجبوراً انہیں زیر علاج رہنا پڑا۔ اور افاقہ ہوتے ہی مدینہ منورہ میں آگئے۔ اپنی تصانیف ترجمان السنۃ اور جواہرالحکم کی ترتیب و تدوین میں، وہ اس درجہ منہمک رہے کہ خود کو لاحق عوارض کی بھی پرواہ نہ کی۔ اپنی عمر کے آخری چار سال انہوں نے شدید علالت میں بسر کیے،

مگر اس کے باوجود نہایت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے۔ ان کا چہرہ اتنا منور اور بشاش ہوتا کہ عام لوگ بیماری کا اندازہ بھی نہ لگا سکتے تھے۔ اس آخری عرصۂ علالت کے کچھ ایامِ محویت کے عالم میں ہر وقت نصائح پر مبنی اشعار موزوں کرتے رہتے اور ایک نعت بھی تحریر کی۔ ۵/رجب المرجب ۱۳۸۵ھ/ ۲۹/اکتوبر ۱۹۶۵ء شبِ جمعہ میں مولانا نے سفر آخرت اختیار کیا، اور حسبِ تمنا جنت البقیع میں امہات المؤمنینؓ کے عین قدموں میں مدفون ہوے (دیکھیے، ترجمان السنۃ، ۴: ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴).

انھوں نے ردّ قادیانیت میں بھی حصہ لیا۔ ردِ قادیانیت کے موضوع پر انھوں نے عربی زبان میں دو رسالے ''المسک الختام فی ختم نبوۃ خیرالانامؐ'' اور ''الکلام الفصیح فی نزولِ المسیح'' تحریر کیے، جن کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے، ان ہر دو رسالوں کے مندرجات ان کی تصنیف ترجمان السنۃ میں شامل ہیں (دیکھیے بیس مردانِ حق، ۲: ۸۸۸؛ تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، ص ۹۸-۹۹).

مولانا طریقت میں بھی، رہبر کامل کا درجہ رکھتے تھے، اُنھوں نے اپنے اُستاذ مولانا خلیل احمدؒ سے روحانی استفادہ کیا تھا، دارالعلوم دیوبند آنے کے بعد مولانا مفتی عزیزالرحمٰن عثمانی نقشبندیؒ سے بیعت کی اور ان کی وفات کے بعد ان کے خلیفۂ اعظم مولانا قاری محمد اسحاق میرٹھیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر تجدیدِ بیعت کی۔ قاری صاحبؒ کو مولانا کی ان سے ارادت اور تعلق پر بڑا ناز تھا۔ ایک موقع پر انھوں نے کھل کر اس کا اظہار یوں کیا تھا کہ قیامت کے دن اپنے نامۂ اعمال کے سلسلے میں مولانا کو دربارِ الٰہی میں پیش کر دیں گے۔ مولانا کے ارادت مندوں کا سلسلہ برصغیر پاک و ہند کے علاوہ جنوبی افریقہ تک پھیلا ہوا ہے (دیکھیے بیس مردانِ حق، ۲: ۸۸۵-۸۸۶؛ ''ترجمان السنۃ'' ص: ۲۲-۲۳).

مولانا کو حدیث نبویؐ سے ایک خاص تعلق اور شغف تھا، اس لیے ان کی اہم ترین تالیفات اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ انھوں نے صحیح بخاری پر اپنے اُستادِ محترم حضرت کشمیریؒ کی املا کرائی ہوئی تقاریر کو فیض الباری علی صحیح البخاری کی شکل میں مدوّن کیا اور اس پر حواشی موسومہ بہ ''البدر الساری الی فیض الباری'' لکھے۔ یہ شرح چار جلدوں پر محیط ہے اور مولانا نے اسے دو سال کی مدت میں مکمل کیا۔ اس کی ترتیب کے وقت مولانا میرٹھی نے مولانا کشمیریؒ کے دیگر مستند تلامذہ کی املا کی ہوئی تحریروں کو بھی پیش نظر رکھا۔ نیز ان کی حیات میں وہ ان کے فیوضِ علمیہ کے سلسلے میں پیدا ہونے والے اشکالات کے سلسلے میں ان سے مسلسل مراجعت کرتے رہے۔ حواشی کی دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے دیانتِ علمی کا مظاہرہ کرتے ہوے بعض مقامات پر تحریر کیا ہے کہ وہ اپنے اُستادِ محترم کی بات کو نہیں سمجھ سکے تھے (دیکھیے سیدانظر شاہ مسعودی: نقشِ دوام، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۰۱، ۳۰۳).

جواہر الحکم (چار حصے) مولانا کی ایک اور تصنیف ہے۔ اس کا موضوع وہ احادیثِ مبارکہ ہیں جو انسان کو حقیقی معنوں میں انسان بنانے کے لیے عقل و فکر کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی اصلاح میں مدد دیتی ہیں، اس کتاب کے تیسرے حصے میں دورِ حاضر کی مشکلات کا حل احادیث نبویہؐ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، اس کا ترجمہ گجراتی اور فرانسیسی زبانوں میں ہوچکا ہے۔ (دیکھیے ''ترجمان السنہ'' ۲۱-۲۲).

ترجمان السنہ (چار مجلدات) مولانا کی نہایت اہم اور وقیع تصنیف ہے۔ اس کی جلدِ اوّل تقسیمِ ملک سے قبل دہلی میں اُنھوں نے مکمل کر لی تھی۔ جلد دوم پاکستان کے قیام کے دوران میں تحریر کی، جب کہ جلد سوم اور چہارم کی تکمیل مدینہ منورہ میں ہوئی۔ آخری جلد کے مکمل ہونے پر اُنھیں بڑی مسرت ہوئی اور یہ اشعار موزوں کیے:

اک جلد معجزات کی لایا ہوں نذر کو
اس کے سوا تو حوصلہ کیا ہے غلام کو
کر لیں اگر قبول تو کیسا شرف ملے
پشتوں کو اس حقیر کی اور اس غلام کو

اس کتاب کے طرزِ تحریر و ترتیب کے بارے میں مولانا خود لکھتے ہیں: "کہنے کو تو یہ ایک ہی تصنیف ہے، مگر درحقیقت یہ چار مستقل تصنیفیں ہیں جن میں ہر تصنیف اپنی حیثیت میں بڑی جدوجہد اور سخت کاوش کی محتاج ہے۔" جدید عنوانات کا انتخاب، ان کے مناسب احادیث کا انتخاب پھر ان کا ترجمہ، اس پر تشریحی نوٹوں کا مرحلہ کھیل تماشہ نہیں ہے" (ترجمان السنہ، ۱: ۱۳)۔ اُنہوں نے اس کتاب کی تصنیف کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ احادیث نبویہؐ کو ہر دور میں اس کے مخصوص تقاضوں اور ضروریات کو مدنظر رکھ کر مدوّن کرنا نہایت ضروری ہے، اس لیے وہ بھی یہ کارِ خیر دین کے احیا کی خاطر کر رہے ہیں۔ احادیث ِ مبارکہ کے اخذو قبول کے سلسلے میں انہوں نے نہ تو بے جا شدت اختیار کی ہے اور نہ ہی اتنی وسعت کہ روایاتِ موضوعہ کی طرف اعتنا کیا ہو۔ جلد اوّل میں حدیث ِ افتراقِ امت پر طویل بحث کے بعد توحید اور رسالت ِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ جلد دوم کے عنوانات میں غیر معقول اور غیر مدرک کا فرق، مومن کی صفات، شرک کی حقیقت اور اس کی اقسام اور نفاق اور اس کی اقسام وغیرہ شامل ہیں۔ جلد سوم کا موضوع قضا و قدر اور انبیا کرام علیہم السلام کے حالات ہیں۔ جلد چہارم میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ، کراماتِ صحابہ رضی اللہ عنہم، امام مھدی اور دجال اکبر کا بیان ہے۔ اس کتاب میں درج احادیث مبارکہ کی کل تعداد ۱۷۱۴ ہے جو کہ صحاحِ ستہ کے علاوہ دوسرے مجموعہ ہائے احادیث مثلاً شعب الایمان للبیہقیؒ ، المستدرک للحاکمؒ ، کنزالعمال، المعجم للطبرانیؒ اور مجمع الزوائد للہیثمیؒ سے لی گئی ہیں۔ کتاب کے مآخذ کے متعلق (دیکھیے ترجمان السنہ، ۱: ۲،۳،۴، پیش لفظ و مواضع کثیرہ)۔

مولانا کی دوسری تصانیف میں سفر السعادۃ (عربی) شامل ہے ،جو سیرت طیبہ پر ایک مختصر کتاب ہے ۔علاوہ ازیں اُنہوں نے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی مناسک ِ حج کے بارے میں مشہور کتاب زبدۃ المناسک کی ایک عام فہم اور آسان تلخیص "خلاصۃ المناسک" کے نام سے تیار کی ، نیز ابن ہمام حنفیؒ کی کتاب زادالحقیر پر مستزاد الفقیر کے نام سے حواشی تحریر کیے ۔ اس کتاب کا موضوع عبادات ہیں۔ انہوں الحزب الاعظم کا اردو میں ترجمہ کیا۔ آوازِ حق کے نام سے ایک مفید دینی و اصلاحی رسالہ تحریر کیا۔ نصیحت نامہ میں اپنے اعزہ اور احباب کے لیے مفید اور قیمتی نصائح مرتب کیے۔ شانِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ، قسمت کا ستارہ اور فریادِ مظہر ان کے اشعار کے مجموعے ہیں۔

مولانا اردو زبان کے قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ انہوں نے نعت سمیت کئی موضوعات اور عنوانات پر طبع آزمائی کی ہے۔

مآخذ: متنِ مقالہ میں دیئے گئے مآخذ کے علاوہ دیکھیے:

(۱) ارشد، عبدالرشید (مدیر): بیس بڑے مسلمان ، مکتبہ رشیدیہ، لاہور، ب ت [۱۹۶۹ء] سوانح مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ ، ص ۳۷۰-۴۰۰؛ (۲) محبوب رضوی ، سید (مدیر): تاریخ دارالعلوم دیوبند، دیوبند، ۱۹۷۸ء ؛ (۳) الرشید لاہور، دیوبند نمبر، جلد ۴ شمارہ ۲،۳، فروری ، مارچ ۱۹۷۶ء .

(ظفر علی)

••-------------••

※ برائلہ : [رک بہ ابریل]

••-------------••

※ برازیل (میں اسلام): برازیل میں اسلامی تاریخ کا آغاز پرتگال سے ہوتا ہے، جس نے برازیل کو فتح کرنے

کے بعد ۱۵۰۰ء سے ۱۸۲۲ء تک اسے اپنی نوآبادی بنائے رکھا۔ بہت سی نوآبادیاتی رسمیں ،مثلاً خواتین کا پردہ کرنا اور مردوں سے علیحدہ رہنا، پرتگال میں مسلمانوں کے اثرات کو ظاہر کرتی ہیں۔ بہرحال پرتگالی حکومت نے مسلمانوں کے خلاف گہرے معاندانہ جذبے کا اظہار، مسلمانوں کو خود پرتگال میں اور اس کی نوآبادیات میں کلیدی عہدوں پر فائز نہ کرنے کے فیصلے کے ذریعے کیا۔ وہاں پر ہسپانوی مسلمانوں کو ، یہودیوں ، ہندوستانیوں اور سیاہ فام لوگوں کی طرح ایک (دوسرے کو متعدی متاثر کرنے والی) نسل سمجھا جاتا رہا، چنانچہ بے دینی کے خاتمے کا اہتمام کرنے والی عدالت نے مسلمانوں، یہودیوں اور دوسرے غیر عیسائی عقائد رکھنے والی قوموں کو سخت سزائیں سنائیں، لیکن برازیل میں مسلمانوں کی گرفتاریوں کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

برازیل میں مسلمانوں کی سب سے اہم نقل مکانی کا آغاز بحیرۂ روم کے آس پاس کے علاقوں سے نہیں ، بلکہ منطقہ حارہ براعظم افریقہ سے ہوا ، ان افریقی مسلمانوں نے ان غلاموں کو جو سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک چھوٹے چھوٹے گروہوں میں برازیل میں لائے گئے، مسلمان کیا ، ان کی مذہبی رسوم کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں، سوائے اس کے کہ انہوں نے اسے (Bolsas de Mandinga) کا مشہور نام دیا ، انیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں ان افریقی مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد برازیل میں آئی.

یہ لوگ بنیادی طور پر ہوسا (Hausa) اور یورولس (Yorolas) اور نسبتاً کم تعداد میں بورنس (Bornus) نیپز (Napes) اور فولانز (Fulanis) تھے۔ یہ لوگ شہروں میں کپاس اور کافی کے کھیتوں کے علاوہ کانوں میں اور زیادہ تر گنے کے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے لائے گئے تھے۔ مؤرخین کے ایک عام اندازے کے مطابق ۱۷۹۱ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان بینن (Benin) کے علاقے بائٹ (Bight) کے کم از کم تین لاکھ ، چون ہزار اورایک سو غلام، جن میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد شامل تھی، لائے گئے۔ زیادہ تر لوگ موجودہ نائیجیریا سے سیاسی اور مذہبی فسادات کے دوران میں قیدی بنائے گئے۔ ان فسادات میں مسلسل بغاوتیں بھی شامل تھیں، جس کے نتیجہ میں اویو (Oyo) کی اوروبا سلطنت کا خاتمہ ہوا اور ۱۸۰۴ء میں عثمان دان فوڈیو نے جہاد کا اعلان کیا، جس کی بنا پر اوریا کی سرزمین میں اسلام پھیلا.

برازیل میں مسلمان غلام ابتدا میں ہوسا، زبان کے لفظ مسلمی سے اور بعد میں یورویا کی نسبتاً زیادہ مشہور اصطلاح ''امل'' یا ''مالی'' سے جانے جاتے تھے۔ جس سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ ۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے مابین مسلمانوں میں یورویا لوگوں کی خاصی بڑی تعداد شامل تھی۔ اس غلام طبقہ لوگوں کی مذہبی ثقافت ان کی سیاسی تاریخ کی بنا پر متعارف ہوگئی۔ وہ باہیہ (Bahia) کی بیس سے زیادہ بغاوتوں میں شامل رہے۔ جو اس وقت شمال مشرقی برازیل میں چینی پیدا کرنے والا معروف صوبہ تھا اور جہاں ان مسلمان غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد آباد تھی.

۱۸۱۶ء میں ساحل پر موجود وہیل مچھلیوں کے گوداموں کے غلام ماہی گیروں نے سلواڈور کے دارالخلافہ ، بائیان کے مفرور غلاموں اور کچھ آزاد لوگوں کی مدد سے بغاوت کردی۔ ۲۰۰ سے زیادہ لوگوں نے کھالوں اور وہیل مچھلیوں کے گوداموں کو آگ لگا دی ، قریب کے ایک گاؤں پر حملہ کر دیا اور قریب ترین زرخیز علاقے تک پہنچنے کی کوشش کی، مگر اس سے پہلے کہ فوج ان پر قابو پاتی ، انہوں نے پچاس سے زیادہ لوگوں کو قتل کر دیا۔ باغیوں میں زیادہ تر ہوسا لوگ شامل تھے، لیکن ان میں کچھ تعداد نیپز (Napes) بورنو اور یورویا لوگوں کی بھی شامل تھی۔ ان کا سب سے زیادہ اہم قائد ''جوآ'' تھا جو ملوی یا مبلغ کی

حیثیت سے جانا جاتا تھا، ملوی کی اصطلاح یقینی طور پر ہوسا زبان کے لفظ معلم سے حاصل کی گئی ہے، جو مسلمان مبلغ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس واقعے میں مسلمانوں کی شمولیت کی تصدیق عربی زبان میں لکھے گئے، ان مضامین سے ہوتی ہے جو کہ ضبط کر لیے گئے تھے۔

ایک اور اہم واقعہ جو کہ نام نہاد میل بغاوت کے نام سے مشہور ہے، ۲۵ جنوری ۱۸۳۵ء میں پیش آیا، تقریباً چار گھنٹے تک کوئی پانچ سو افریقی باغی سلواڈور کی گلیوں میں لڑتے رہے۔ ان باغیوں میں زیادہ تر یوروبا اور ہوسا نسل سے تعلق رکھنے والے غلام اور کچھ آزاد لوگ شامل تھے انہیں ان بغاوتوں کے نتیجے میں کافی سزائیں دی گئیں ، ان سزاؤں میں سزائے موت سے لے کر کوڑے اور سخت جسمانی مشقتیں بھی شامل تھیں.

اس تحریک میں مسلمان مبلغین نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔ ان مبلغین میں سے زیادہ تر نے اپنے پیروکاروں سے تعویذات کے ذریعے ان کی حفاظت کا وعدہ بھی کیا۔ اگرچہ اس بات کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ انہوں نے اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کوششیں کیں، یا یہ تحریک، تلوار کے ذریعے جہاد اسلامی کی تحریک تھی۔ تاہم اس بغاوت میں مذہبی رسومات کی کوئی کمی نہ تھی۔ مثال کے طور پر یہ طے کیا گیا کہ اس تحریک کو ۱۲۵۰ھ (۲۵ جنوری ۱۸۲۵ء) کے رمضان کے آخر میں اور غالبًا لیلۃ القدر کے بعد شروع کیا جائے۔ اس تحریک کے شرکا کی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس تجربہ کے نتیجے میں اسلام کا دستور العمل بڑے وسیع پیمانے پر عملی طور پر دیکھنے میں آیا، جس میں مذہبی تہواروں کو منانا ، معمول کی عبادات، خوراک اور ناجائز جنسی تعلقات کی حرمت ، اسلام کے بنیادی اعتقادات پر عمل، قرآن اور عربی زبان کی تعلیم، تعویذات اور مسلمانوں کے لباس کی تیاری وغیرہ امور شامل ہیں۔ البتہ لوگوں میں مذہب اسلام کی طرف رجوع کرنے کے رجحان میں کمی بھی آئی۔ خاص طور پر یوروبا کے غلاموں اور آزاد لوگوں میں یہ بات خصوصاً دیکھنے میں آئی.

اس وحشیانہ ظلم و تشدد نے اسلامی معاشرے کو بری طرح متاثر کیا، کئی سو آزاد لوگوں کو دوبارہ افریقہ میں بھیج دیا گیا اور بہت سے دوسرے لوگ پولیس کے تشدد اور نسلی امتیاز سے بچنے کے لیے اپنی مرضی سے براعظم اوقیانوس کے پار چلے گئے، بہت سے غلام کافی کے باغات میں کام کرنے کی غرض سے پہنچا دیئے گئے ، اگر کسی سیاہ فام کے پاس مسلمانوں کی تحریریں دیکھ لی جاتیں تو اسے فوری طور پر مشتبہ سمجھ لیا جاتا.

۱۹۸۸ء میں غلامی کے خاتمہ کے نتیجے میں، برازیل میں "باہیہ" اور کئی مقامات پر سابق مسلمان غلام آج بھی اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، لیکن یہ لوگ زیادہ تر دوسرے لوگوں سے الگ رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تعویز سازی میں شہرت رکھتے ہیں،لیکن اس کے باوجود اسلام وسیع پیمانے پر افریقی برازیلیوں میں زیادہ اشاعت پذیر نہ ہوسکا۔ اس لیے انہوں نے عیسائیوں کے رومن قدامت پرستانہ عقیدے اور افریقہ کے مشرک مذاہب کے عقائد کے درمیان یگانگت سی پیدا کر لی تھی.

اس صدی کی ابتدا سے بہت سے افریقی مسلمان وہاں ادھر ادھر منتشر ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح مشرق وسطی کے مسلمان بھی تھوڑی تعداد میں، شام اور لبنان سے ، عثمانی حکومت سے خائف ہو کر ترک وطن کرنے والے عیسائیوں کے ساتھ مل کر برازیل پہنچے۔ آج کل برازیل میں رہنے والے مسلمانوں کی اکثریت ان سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد لبنان چھوڑا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں۔

تقریباً ۲ لاکھ کے قریب مسلمان "ساؤ پالو" (Sau Paulo) کے علاقے میں رہتے ہیں جو کہ اقتصادی حیثیت سے برازیل کا دل مانا جاتا ہے۔ جہاں پر وہ اپنی زندگیاں اسلامی طریقوں کے مطابق بسر کر رہے ہیں، وہاں انہوں نے مسجدیں اور اسلامی مراکز قائم کر رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی رسائل کا اجرا اور سماجی انجمنوں میں شمولیت وغیرہ میں بھی یہ لوگ پیش پیش ہیں (نیز دیکھیے Americanus "میں اسلام پر مقالہ جات").

مآخذ: (۱) Reymnt ، Kent : *African Revolt in Bahia* ؛ (۲) *Journal of Social History* ، ۲۵،۲۴ جنوری ۱۸۳۵ء ؛ (۳) Nina Redigues : *Os Africanos no Brasil* ؛ بار چہارم، ساؤپاؤلو، (۳) *Joa Jose cop : Reis Slave Rebellion in Brasil* ، در *The Muslims Uprising of Arther Brake 1835 in Bahia*، ۱۹۹۳ء بالٹی مور.

(جو آجوزولیس [ت: محمود الحسن عارف])

••-----------••

※ برطانیہ عظمیٰ [میں مسلمان]: کسی زمانے میں جزائر برطانیہ برطانوی سلطنت کی نو آبادیات کی طرح مسیحی تارکین وطن کا ایک بہت بڑا منبع تھے ، جو اب سابقہ نو آبادیاتی علاقوں سے مسلمان تارکین وطن کی خاصی بڑی تعداد کی قیام گاہ بن گئے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں اسلامی پس منظر کے حامل برطانوی باشندوں کی تعداد (ایک اعشاریہ پچیس) اور (ایک اعشاریہ پانچ) کے مابین تھی.

تاریخ: چند مخصوص افراد کے علاوہ برطانیہ میں مسلمانوں کی نمایاں طور پر آبادکاری کا آغاز ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی توسیع کے نتیجے میں ہوا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں ، ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں آنے والے بحری کارکنوں کو جب کہ ان کے جہاز لندن میں لنگر انداز ہوتے، خاصی تنہائی کا احساس ہوتا تھا۔ پھر جب ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کھل گئی اور جہازوں نے عدن میں کارکنوں کی بھرتی کا آغاز کیا تو بندرگاہوں پر واقع شہروں ،مثلاً کارڈف، ساؤتھ شیلڈز (نزد نیوکاسل)۔ لنڈن اور لورپول میں بحری کارکنوں کی آبادکاری کے نتیجے میں مختصر مسلم آبادیوں کے قیام کی بنیاد پڑی۔ نوآبادیاتی تاجروں اور نوآبادیاتی سرکاری ملازمین نے مقامی ممتاز شخصیات سے روابط قائم کر لیے اور اس کے نتیجے میں لندن میں تارکین وطن کی ایک عالمی نوآبادیاتی برادری قائم ہوگئی، جس میں مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد شامل تھی.

اوّلین طور پر قائم ہونے والے مسلم ادارے وہ علوی "زاویے" تھے، جو عدن سے بھرتی کیے گئے یمنی اور صومالی باشندوں کی (روحانی) ضروریات پورا کرتے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں لندن کی مسلمان برادری کے ممتاز افراد نے ووکنگ کے جنوب مغربی نواحی علاقے میںایک مسجد کی اساس رکھی۔ دو سال بعد لورپول میںمکانات کی ایک قطار کو ایک مسجد اور اس سے متعلقہ امور کی انجام دہی میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان دونوں کاموں میں برطانوی نومسلموں نے اہم کردار ادا کیا۔ لورپول کی مسجد جنگ عظیم کے آغاز کے ساتھ معدوم ہوگئی کیوں کہ اس کے بانی عبداللہ `Henry william Quilliam کوعثمانی حکومت کے ساتھ اپنے روابط کی بنا پر عوامی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی۔ البتہ ووکنگ مسجد جنگ کے زمانے میں بھی فعال رہی۔ اس دور میں قرآن کریم کے مترجم مارماڈیوک پکتھال اور عبداللہ یوسف علی اس مسجد کے ساتھ خاصے وابستہ رہے۔ کچھ عرصے کے لیے اس مسجد کا تعلق احمدیہ تحریک کی لاہوری برانچ سے بھی رہا، لیکن احمدیوں کے ساتھ ہندوستان کی سنی مخالفت میں

اضافہ ہوتا گیا اور بالآخر یہ تعلق ۱۹۳۵ء میں ختم ہو کر رہ گیا۔

۱۹۲۶ء کو پیرس میں ایک مسجد کی تعمیر سے ترغیب پاکر، بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں لندن میں ایک مرکزی مسجد کی تعمیر کے منصوبے کا آغاز ہوا، اس منصوبے کو نظام حیدر آباد کی اعانت بھی حاصل رہی اور اسے مزید تحریک اس وقت ملی جب ۱۹۴۴ء میں شاہ جارج ششم نے اس مقصد کے لیے ریجنٹ پارک میں اس کے لیے ایک قطعۂ اراضی مختص کر دیا۔ یہ مصری حکومت کے اس رویے کی قدر شناسی کے طور پر تھا، جس کا اظہار اس نے قاہرہ میں ایک نئے کیتھیڈرل برائے کلیسائے انگلستان کے لیے زمین دے کر کیا تھا۔ لیکن جنگ سے پیدا شدہ اقتصادی حالات پھر ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے معاملات اور شرقِ اوسط کی غیر یقینی صورتِ حال نے اس منصوبے کی تکمیل کو ۱۹۷۰ء تک مؤخر کیے رکھا، چنانچہ موجودہ مرکزی مسجد اور اسلامک کلچرل سنٹر کا افتتاح ۱۹۷۷ء میں ہوپایا، مگر اس وقت تک برطانیہ میں مسلمان برادری کے کردار اور ان کے مذاق میں نہایت گہری تبدیلیاں رونما ہوچکی تھیں۔

جنگِ عظیم دوم کے بعد دو عشروں میں جوں جوں برطانوی صنعت ترقی کرتی گئی اس میں جلد ہی نوآبادیاتی اور سابق نوآبادیاتی علاقوں سے کارکنوں کی بھرتی کی جانے لگی۔ ابتدائی طور پر اس کا آغاز ''جزائر غرب الہند'' سے ہوا اور لوگ وہاں سے آنے لگے، پھر بھارت اور ۱۹۵۰ء کے بعد پاکستان سے ہوا، یہاں آنے والے لوگوں کا تعلق زیادہ تر مغربی پاکستان سے تھا اور بعد میں مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد وہاں سے بھی کارکن آنے لگے، پاکستان کے دونوں حصوں کے تارکینِ وطن کی اکثریت مسلمان تھی، یہی حال بھارت سے آنے والی اہم اقلیت اور عرب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا تھا، علاوہ ازیں بہت سے مسلمان صقلیہ، مراکش اور دوسرے نیم صحرائی افریقی علاقوں اور خصوصاً کینیا اور یوگنڈا سے آئے۔ جب ساٹھ کی دہائی کے آخر اور ستر کی دہائی کے ابتدائی دور میں ان ملکوں نے افریقیائی پالیسی متعارف کرائی۔

برعظیم پاک و ہند سے آنے والے مسلم پس منظر کے تارکینِ وطن مخصوص علاقوں سے آئے، پاکستان سے آنے والے کارکنوں کا تعلق بنیادی طور پر پنجاب کے دیہات اور پاکستان کے آزاد کشمیر کے علاقہ میرپور سے تھا۔ جب کہ بنگلہ دیش سے زیادہ لوگ تر سلہٹ کے شمالی علاقے سے آئے، بھارتی مسلمان زیادہ تر گجراتی تاجر تھے۔

برطانیہ پہلا بڑا مغربی یورپی ملک تھا جس نے مزدور کارکنوں کے ترکِ وطن کو روکنے کی طرف پیش قدمی کی، اس نے ۱۹۶۲ء میں ''کامن ویلتھ امیگریشن ایکٹ'' کا نفاذ کیا، اس قانون کا مقصد غیر ہنر مند کارکنوں کی کثرتِ آمد کو روکنا تھا، مگر دو سال کے اندر اندر اس کا وسیع تر اطلاق ہنر مند کارکنوں اور پیشہ وارانہ طور پر تربیت یافتہ لوگوں پر بھی کیا جانے لگا، بہرحال یہ قانون خاندانی ملاپ میں رکاوٹ نہیں بنتا تھا۔ اس قانون کا پہلا نتیجہ ، جو اس کے فی الحقیقت نفاذ سے اٹھارہ ماہ پہلے رونما ہوا، یہ تھا کہ ترکِ وطن کر کے آنے والوں کی رفتار بالخصوص پاکستان سے بہت تیز ہوگئی، دوسرے ترکِ وطن کی صورتِ حال بدل گئی، یعنی اب تارکین کی غالب اکثریت پہلے سے برطانیہ میں مقیم لوگوں کی بیویوں، منگیتروں اور بچوں پر مشتمل تھی۔ بعد میں مزید ترکِ وطن کو روکنے کی خاطر کئی قانون پاس کیے گئے، اب جیسا کہ مغربی یورپ کے کئی ملکوں میں ہوا ، ۱۹۸۰ء کے بعد آنے والے لوگوں کی اکثریت ، اقتصادی حالات کے مارے ہوئے لوگوں کی بہ نسبت، پناہ حاصل کرنے والوں پر مشتمل رہی ہے۔ اس میں ایک بڑی تعداد ان اسلامی پس منظر رکھنے والے لوگوں کی رہی ہے، جن کا تعلق شرقِ اوسط بالخصوص لبنان، فلسطین، عراق اور ایران

سے ہے۔ اس کے علاوہ اس ملک [برطانیہ] نے ہمیشہ ذاتی دولت رکھنے والے لوگوں کو خوش آمدید کہا ہے اور اس طرح لندن نے خلیج کی عرب ریاستوں اور سعودی عرب کے صاحبِ ثروت طبقوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے.

آبادی سے متعلق اعداد و شمار : ان امور کا انکشاف دس سالہ مردم شماری کے ان حسابات سے ہوتا ہے جن میں مختلف افراد کے مقاماتِ پیدائش کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اوّلین دستاویز سے پاکستانیوں کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ ظاہر ہوتی ہے، جو ۱۹۶۱ء میں پچپن ہزار تک جا پہنچی۔ دس سال بعد یہ تعداد بڑھ کر (پاکستانی اور بنگلہ دیشی دونوں پر مشتمل) ایک لاکھ ستر ہزار اور ۱۹۹۱ء میں چھ لاکھ چھتیس ہزار تک جا پہنچی۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق پیدائش والے ملک کے حساب سے [مسلمانوں کی] تعداد درج ذیل تھی: بنگلہ دیشی ایک لاکھ ساٹھ ہزار، پاکستانی: چار لاکھ چھہتر ہزار، بھارتی ایک لاکھ چونتیس ہزار، ملائی پنتالیس ہزار، عرب : ایک لاکھ چونتیس، ترک: چھبیس ہزار، قبرصی ترک: پینتالیس ہزار اور نیم صحرائی افریقی: ایک لاکھ پندرہ ہزار، مجموعی تعداد: گیارہ لاکھ تینتیس ہزار۔ ممکنہ تصحیح کے بعد اندازہ لگایا گیا کہ ۱۹۹۱ء میں مسلم پس منظر رکھنے والی آبادی کی تعداد ایک اعشاریہ پچیس ملین ۱.۲۵ اور ایک اعشاریہ پانچ ۱.۵ ملین کے مابین تھی.

پاکستان سے ترکِ وطن کر کے آنے والے اوّلین مسلمان ، مزدوری کی خاطر آئے اور ان کی جغرافیائی تقسیم اس پر روشنی ڈالتی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر کو قدیم طرز کی صنعتوں، لوہے اور فولاد کی فیکٹریوں اور کپڑے بننے کے کارخانوں کے علاوہ پبلک ٹرانسپورٹ جیسے غیر ماہرانہ اداروں میں ملازمتیں ملیں۔ بنگلہ دیشی سب سے آخر میں پہنچنے والے گروہوں میں شامل تھے اور اس وقت تک پرانی طرز کی صنعتیں بتدریج تنزل کا شکار ہو رہی تھیں، چنانچہ ان کی زیادہ تر تعداد لندن میں قیام پذیر ہوئی۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری سے مختلف علاقوں میں درج ذیل تعداد کا پتہ چلتا ہے، عظیم لنڈن: نواسی ہزار پاکستانی اور ستاسی ہزار بنگلہ دیشی؛ ویسٹ مڈلینڈ: نواسی ہزار اور اٹھارہ ہزار علی الترتیب، ویسٹ یارک شائر: چھیاسی ہزار اور چھ ہزار، مانچسٹر پچاس ہزار اور تیرہ ہزار، گلاسکو اور نواحی علاقے: پاکستانی بائیس ہزار بنگلہ دیشی افراد کی تعداد معلوم نہیں ہے.

ترکِ وطن اور آباد کاری کے طریقِ عمل کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مقامی آبادی کی نسبت مسلمان آبادی جوان تر ہے، اس کا اندازہ پاکستان میں پیدا ہونے والے افراد کے بارے میں ۱۹۹۱ء کی مردم شماری سے لگایا جاسکتا ہے جس کی تفصیل درج ذیل جدول میں دی گئی ہے.

عمر	پاکستانی آبادی	سفید آبادی
۰-۴	۱۳.۱۳٪	۶.۳۶٪
۵-۱۵	۲۹.۵۲٪	۱۲.۹۷٪
۱۶-۲۴	۱۷.۴۷٪	۱۲.۵۵٪
۲۵-۴۴	۲۵.۷۹٪	۲۹.۰۱٪
۴۵-۶۴	۱.۷۳٪	۱۶.۸٪

۱۹۶۲ء امیگریشن ایکٹ ایک اور اہم تبدیلی کا باعث بھی بنا۔ ترکِ وطن کر کے آنے والے کارکنوں کی زیادہ تر مسلم اکثریت کی بجائے اب ایسے تارکِ وطن آباد کاروں پر مشتمل طبقات آنے لگے، جو نسلی اقلیات کا ایک ملغوبہ تھے (اسلام قبول کرنے والے برطانوی افراد کی تعداد بہت کم رہی ہے، شاید اب تک مجموعی طور پر پانچ ہزار سے زائد نہ ہو)۔ خاندانوں کی تشکیل اپنے ساتھ بہت سے عملی مفادات لائی جن کا تعلق زندگی اور ثقافت کے ایسے اوضاع و اطوار سے تھا جو اسلامی عناصر سے گہرے طور پر متاثر تھے۔ اس حقیقت کا خصوصی اظہار خواتین اور بچوں کی پیدائش اور

بچوں اور اسکول کے معاملات سے ہوتا ہے۔

ادارے: ۱۹۶۲ء کے بعد اسلام کی فعالیت خاندانی آبادکاری کے نتیجے کے طور پر بہت واضح انداز میں مساجد کی سالانہ رجسٹریشن کے اعداد و شمار میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں انگلستان اور والز کے رجسٹرار جنرل کے پاس تیرہ مساجد کا اندراج ہوا۔ پھر یہ تعداد بتدریج بڑھتی گئی اور ۱۹۷۰ء میں ۴۹ تک ۱۹۷۵ء میں ۹۹ تک ۱۹۸۰ء میں ۱۹۳ تک ۱۹۸۵ میں ۳۱۴ تک اور ۱۹۹۰ء میں ۴۵۲ تک جاپہنچی۔ ان مساجد کی اکثریت ایسی خرید کردہ جائدادوں پر مشتمل ہے جو پہلے بعض دوسرے مقاصد کے لیے استعمال ہوتی تھیں، بعض رہائشی عمارتیں تھیں کچھ چھوٹی فیکٹریاں یا گودام اور بعض قدیم سینما بھی تھے۔ (اب یہ تعداد ہزار سے بھی بڑھ چکی ہے)۔

آباد کاری کے پہلے دور میں برطانیہ میں مسلم اداروں کے قیام کے سلسلے میں زیادہ زور عبادت کے لیے سہولیات اور آئندہ نسل تک اسلامی تعلیمات اور اس کے عملی پہلوؤں کی رسائی پر دیا گیا۔ زیادہ تر رجحان یہ تھا کہ ان کا مرکز مسجدوں کو بنایا جائے۔ مقامی سطح کی منصوبہ سازی کے اہلکاروں کو اندازہ ہوچکا تھا کہ عبادت کے لیے ایک مخصوص جگہ کے قیام کی اجازت کا عموی طور پر یہ مطلب ہوگا کہ اسے تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی بھی اجازت ہے جب کہ منصوبہ سازی کے قانون کے تحت یہ بات ایک علیحدہ زمرے میں آتی ہے۔

جن تنظیموں نے یہ سہولتیں اور متعلقہ کاروائیاں انجام دیں ان کا تعلق مختلف اقسام کے پس منظر سے تھا۔ بالعموم کام کا آغاز کسی مقامی گروہ نے کیا، لیکن بایں وجہ کہ اس کے ذرائع محدود تھے، لہٰذا یہ ضروری قرار پاتا کہ مالی معاونین تلاش کیے جائیں۔ چنانچہ ایسے مواقع پر کئی تنظیمیں منظر عام پر آئیں جن کا تعلق اصل ملکی منابع سے تھا۔

اس سلسلے میں اہم ترین، کامیاب، رسمی سلسلہ کار کی جڑیں پاکستان کی بعض جماعتوں تک پہنچتی ہیں، اس سلسلہ کار میں یو کے اسلامک مشن بھی شامل ہے، جو کئی ایک مساجد مع تعلیمی و اجتماعی مقاصد کے لیے مصروفِ عمل ہے۔ دوسرے اداروں میں مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ، جو مقررہ تعلیمی اوقات کے بعد سرکاری مدارس میں [اسلامی تعلیم کے لیے] اساتذہ مہیا کرتا ہے، پندرہ روزہ مجلّہ ''امپیکٹ انٹرنیشنل''؛ اور اسلامک فاؤنڈیشن جو تحقیق، تربیت اور طباعت و اشاعت کا ایک مرکز ہے وغیرہ ادارے شامل ہیں۔ اسلامک کونسل آف یورپ نے جس کا قیام ۱۹۷۳ء میں عمل میں آیا۔ اسلامی اقتصادی نظام اور مستقبل میں مسلم اقلیتوں کی حیثیت کے بارے میں کئی کانفرنسیں منعقد کیں. ۱۹۸۲ء میں اس ادارے کو ''اسلامی کونسل'' کا نیا نام دیا گیا اور اس نے ''بین الاقوامی اسلامی اقرار نامہ'' اور ''انسانی حقوق کا عالمگیر اسلامی اعلانیہ'' جیسی دستاویزات مدوّن کیں.

کامیاب ہونے کے باوجود یہ سلسلہ زیادہ مؤثر نہیں ہے۔ دیوبندی اور بریلوی مسالک بھی برطانیہ میں پھیلے ہوے ہیں اور یہاں بھی وہ اپنی اس حریفانہ جدوجہد کو جاری رکھے ہوے ہیں جس کا آغاز ان کے وطن میں ہوا تھا۔ دیوبندی سلسلہ بریلوی سلسلے کی بہ نسبت زیادہ بہتر اور منظم ہے۔ اس کے دو مدارس شمالی انگلستان میں ہیں، جو دیوبندی مساجد کو خاصی تعداد میں ائمہ اور اساتذہ مہیا کرتے ہیں۔ تبلیغی جماعت بھی برطانیہ میں خاصی متحرک ہے۔ بریلوی سلسلہ مختلف معروف پیروں اور ان کے متبعین کے مابین پھیلاؤ رکھتا ہے۔ بریلویوں کے کئی ایک صوفی سلسلے ہیں جن میں سے نقشبندی اور چشتی بطور خاص مشہور و معروف ہیں۔ ایک طویل عرصے تک صوفی بمشکل ہی قابلِ توجہ تھے کیوں کہ ان کا دائرہ کار غیر رسمی اور ذاتی حد تک تھا، مگر حالیہ برسوں میں کچھ صوفی گروہوں نے تسلیم شدہ برطانوی تنظیمی شکل

اختیار کر لی ہے۔ اس طرح ان کے لیے مقامی ذرائع سے ربط اور مالی فوائد کا حصول آسان ہوگیا ہے۔ برعظیم سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں میں ایک مختصر سا گروہ اہل حدیث تحریک سے بھی مربوط ہے۔ بالخصوص وسطی انگلستان میں [نیز دیکھیے : دیوبندی ، بریلوی، تبلیغی جماعت، بذیل مادہ] .[جزوی اختلافات کے باوجود اعلیٰ قومی اور ملی مقاصد کے لیے تمام مسلمان فرقے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں]۔

ایک طویل عرصے سے ایک قومی، وسیع تر تنظیم کے قیام کے لیے مساعی کی جا رہی ہیں، ان میں سے اوّلین یونین آف مسلم آرگنائزیشنز (۱۹۷۰ء) تھی، جو اگرچہ اپنے مقاصد تو حاصل نہ کر پائی، مگر آج بھی موجود ہے۔ اس کے بعد بھی متعدد بار کوششیں بروے کار آئیں جن میں سے بعض کو سعودی عرب میں قائم ''رابطہ عالم اسلامی'' کی اعانت حاصل ہے۔ایک اور تنظیم اسلامی دعوہ سوسائٹی کا بنیادی تعلق لیبیا سے ہے۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ جسے ایک صحافی کلیم صدیقی نے قائم کیا، غالباًسعودی امداد و اعانت سے چلتا رہا، اسی کے عشرے میں اس کا رابطہ زیادہ تر ایران کے ساتھ رہا۔ ۱۹۹۱ء میں اسی انسٹی ٹیوٹ نے معروف ''مسلم پارلیمنٹ'' کی تشکیل کی جسے برطانوی مسلمانوں میں زیادہ تر متشکّکانہ انداز میں پذیرائی ملی۔

ان مقامی بنیادوں پر استوار اداروں کے علاوہ عالمی ''اہل بیت اسلامک لیگ (Abil)'' ایک بین الاقوامی شیعہ تنظیم ہے جس کا صدر دفتر لندن میں ہے اور جس کی شاخیں کئی دوسرے ملکوں میں ہیں۔ اس کا موجودہ سیکریٹری جنرل حجۃ الاسلام سید محمد موسوی ایک لبنانی شیعہ عالم ہے۔ اس کے مقاصد میں شادی بیاہ کا انعقاد ، نکاح اور طلاق کی رجسٹریشن، اعلیٰ مذہبی عہدیداروں (مراجع التقلید) کے مستند فیصلوں کی نشرواشاعت ، قمری مہینوں کے آغاز و اختتام کا اعلان جو رمضان کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتا ہے، ضرورت مند شیعہ طبقات کے لیے اساتذہ اور مذہبی رہنماؤں کی فراہمی، اپنی مختلف شاخوں کے مابین رابطے کا کام ، قدرتی آفات میں شیعہ متاثرین کی امداد و اعانت بالعموم زکوٰۃ کی تقسیم، قم نجف اور دوسرے مقامات کے مدارس میں زیر تعلیم طلبہ کے لیے امداد کی فراہمی ، اور غیر مسلم اور سنی مسلمانوں، دونوں گروہوں کی طرف سے درپیش مخاصمانہ تعصب پر مبنی پروپیگنڈا کا رد شامل ہیں.

لنڈن میں قائم ایک اور شیعی تنظیم، الخوئی، خیر سگالی فاؤنڈیشن ہے جس کی جڑیں ایک اہم ترین شخصیت آیت اللہ ابوالقاسم الخوئی کے متبعین تک گہری ہیں۔ آیت اللہ الخوئی کے اہل خانہ کو ۱۹۸۰ء کے عشرے میں عراقی حکومت نے گرفتار کر کے بعد میں قتل کر ڈالا تھا۔ خلیجی جنگ کے زمانے سے یہ فاؤنڈیشن برطانیہ کی مسلم برادری کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتی رہی ہے (دیکھیے : Al-Khoei Benovolent Foundation).

مسلم تنظیموں نے وسیع تر [عالمی] سوسائٹی میں بھی مؤثر کردار ادا کرنا شروع کر دیا ہے بہت سے لوگوں نے دوسرے مذہبی گروہوں، خصوصاً کلیساؤں کے ساتھ، مقامی اور قومی سطحوں پر مختلف طرح کے روابط کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۸۷ء میں مسلمان تنظیموں نے قومی سطح پر ''انٹرفیتھ نیٹ ورک'' کے قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔''رُشدی'' تنازعہ کے دوران میں اور پھر ۱۹۹۰ء-۱۹۹۱ء میں خلیجی بحران اور جنگ کے زمانے میں بھی مسلم اداروں اور کلیسا کے مابین مقامی اور قومی سطح پر عملی مشاورت کا سلسلہ جاری رہا.

سیاسی و سماجی منصوبے: ۱۹۸۰ء کی دہائی میں بہت سی مسلمان تنظیموں میں یہ احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ کس طرح زیادہ خود انحصاری کے ذریعے مقامی سیاست میں مزید کامیابی کی خاطر متحرک ہوا جائے۔ اس طرح انہوں نے مقامی سیاسی زندگی میں مدغم ہو کر خاصی کامیابی حاصل کرنا

شروع کر دی۔ تعلیمی مسائل کے بارے میں یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے برمنگھم کی مسلم رابطہ کمیٹی نے ساٹھ کے قریب مقامی مسلمان گروہوں کو یکجا کیا اور اس طرح سکولوں میں مسلمان طلبہ کی رہنمائی اور تربیت کے سلسلے میں شہر کی تعلیمی مقتدرہ سے مفید گفت و شنید کی طرح ڈالی۔ اس کے بعد اس نے "بلدیاتی حکومت" کے دوسرے کئی ادارو ں کے ساتھ بھی مذاکرات کیے اور عیدالفطر کے بارے میں ایک متفقہ دن اور تاریخ پر اتفاق پیدا کر لیا۔ بریڈ فورڈ میں مسلمانوں نے اسی کی دہائی کے وسط میں مقامی تعلیمی پالیسی کو تبدیل کرنے کی ایک تحریک کا ساتھ دیا، باہمی تعاون کے اسی مقامی جذبے کے تحت سلمان رشدی کی *Satanic Verses* کے خلاف پہلی بار عوامی پیش قدمی ہوئی۔ کئی شہروں میں مسلمان افراد سٹی کونسل کے رکن منتخب ہوئے ہیں [اور چند افراد پارلیمان میں منتخب ہوگئے ہیں]۔

ان تنظیموں میں سے بیشتر تنظیمیں تعلیمی مسائل کے بارے میں تشویش ظاہر کرتی رہی ہیں۔ تقریباً دوعشروں میں وقفے وقفے سے مساعی بروے کار لائی جاتی رہی ہیں کہ سرکاری اعانت سے مسلم مدارس بھی اسی طرح قائم کیے جائیں جیسے سرکاری خرچ پر رومن کیتھولک، اینگلین اور یہودی اسکول کام کر رہے ہیں۔ ابھی تک ایسی تحریکیں کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو پائیں اور اب تک مختلف سطح کے صرف تیس کے قریب مسلم تعلیمی ادارے، نجی طور پر قائم کیے جاسکے ہیں۔ چونکہ ۱۹۷۹ء سے برطانوی حکومتی ڈھانچہ کا زیادہ مرکزی حیثیت کا حامل بن گیا ہے، لہٰذا ایسی تحریکوں کا ہدف بھی زیادہ تر مرکزی حکومت رہی ہے۔ رشدی مسئلے کے تتبع میں مرکزی حکومت کا، ظاہری طور پر ہی سہی، ردّعمل زیادہ واضح اور مثبت ہو رہا ہے۔ چنانچہ حکومت نے برمنگھم کے ایک ٹیچرز ٹریننگ کالج میں سرکاری نظام میں مذہبی تعلیم کی خاطر مسلمان اساتذہ کے تربیتی پروگرام کی تشکیل میں تعاون کیا۔ اسی طرح محکمۂ ماحولیات نے (جو مقامی حکومت کا ذمہ دار ادارہ ہے) ایک بین بلدیاتی مذہبی کونسل قائم کر دی ہے۔ جہاں تک ان مسلمان نوجوانوں کا تعلق ہے جو برطانیہ میں پیدا ہوے اور یہیں جوان ہوے تو ان کا رابطہ ان کے آبائی وطن اور ثقافت سے کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں بہت سے نوجوانوں، خصوصاً زیادہ پڑھے لکھے نوجوانوں نے، موجودہ مسلمان تنظیموں کی انتظامیہ میں اپنا مقام بنانا شروع کر دیا ہے، بعض نے اپنی علیحدہ نوجوان انجمنیں قائم کر لی ہیں۔ جامعات میں وہ بتدریج ان مسلم طلبہ تنظیموں میں اہم مقام حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ جن پر اس سے پہلے غیر ملکی طلبہ کا غلبہ تھا۔ ایسے گروہوں نے انگریزی زبان میں کئی ایک ہفتہ وار اخبار جاری کر رکھے ہیں۔ ایک پشت سے دوسری پشت کی یہ تبدیلی اسلامی دنیا کے تعلق سے مسلم برادری کے نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی کاباعث بن رہی ہے، جب کہ ترکِ وطن کر کے آنے والی نسل، تاحال ان علاقوں اور اس ثقافت کی طرف دیکھتی ہے، جہاں سے وہ آئی تھی، نوجوان نسل ایک اور پس منظر میں گفتگو کرتی دکھائی دیتی ہے، اس سے واضح طور پر اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ایک برطانوی مسلم طرزِ زندگی نشو و نما پا رہا ہے، جس میں شمالی برعظیم [پاک و ہند] کی ثقافتی روایات سے قطع تعلق کیا جا رہا ہے، نوجوان مسلمان اب اپنے والدین کے اصل علاقوں کے حالات و واقعات کی نسبت بوسنیا اور فلسطین میں درپیش حالات سے زیادہ تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ اگرچہ کچھ نوجوان انقلابی گروہوں، مثلاً حزب التحریر سے متاثر دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان کی بہت بڑی اکثریت میں برطانیہ کے اندر مقامی اور ملکی تحریکوں میں حصہ لینے، نیز عالمگیر مسلم برادری کے زیادہ اہم مسائل میں حصہ داری کا رجحان پرورش پا رہا ہے۔

مآخذ: انور محمد: *Muslims in Britain*، ۱۹۹۱؛ (۲) *British Muslim Monthly Survey*، برمنگھم، فروری، ۱۹۹۳ء (مختلف واقعات میں متاثر ہونے والے مسلمانوں کا ماہانہ ریکارڈ) Centre For Study of Islam and Muslim Christian Relation (CSIC)، سیلی روک کالج، برمنگھم؛ (۳) Lewis, Philip : *Religion Politics and Identity among British Muslims* ، *Islamic Britain* ، لنڈن، ۱۹۹۴ء؛ (۴) طارق محمود: *Muslims , Race and Equality in Britain* ؛ جون ۱۹۹۰ء؛ (۵) Nielsen, Jorgenss : *Muslims in Western Europe* ، ایڈن برگ، ۱۹۹۳ء؛ (۶) محمد صدیق: *Moral Spotlight on Bradford* ، بریڈ فورڈ، ۱۹۹۳ء۔ (۷) Jorgen S. Nielsen : مقالہ *"Great Britain"* ، در *The Oxford Encyclopaedia of the Modren Islamic World*، ۱۰: ۶۸ تا ۷۲.

(ت : امین اللہ وثیر)

••------------••

⊗[تعلیقہ] برکیا روق سلطان: [اصل مقالے کے لیے دیکھیے آ آ آ، بذیل مادہ] ایک معروف سلجوقی حکمران، ابومظفر برکیاروق لقب رکن الدین بن سلطان ملک شاہ، شہاب الدولہ مجدالملک (ابن خلکان: وفیات الاعیان، ۱: ۲۶۸، بیروت).

سلطان برکیاروق ۴۷۴ھ میں پیدا ہوا (وفیات الاعیان، ۱:۲۶۸) ، وہ ملک شاہ کا بڑا بیٹا تھا، اس کی والدہ کا نام زبیدہ بیگم تھا، اس نے بارہ سال چھ ماہ حکومت کرنے کے بعد ۱۲ ربیع الاول ۴۹۸ھ [میں ۲۴ برس کی عمر میں وفات پائی اور اصفہان میں دفن ہوا] (ابن خلدون: تاریخ، ۵: ۳۳-۳۴ ؛ وفیات الاعیان، بیروت، ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء، ۱: ۲۶۸).

۴۸۵ھ میں جب ملک شاہ کا انتقال ہوا تو اس کی بیوی ترکمان خاتون نے اس خبر کو پوشیدہ رکھا اور اس کی لاش کو لے کر اصفہان پہنچ گئی، جہاں اس نے ملک شاہ کی وفات اور اپنے بیٹے محمود کی تخت نشینی کا اعلان کیا۔ محمود ملک شاہ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس وقت اس کی عمر محض چار سال تھی۔ فوج اور امرائے لشکر نے محمود کی بیعت کر لی، خلیفہ مقتدر [باللہ عباسی] نے ننھے سلطان محمود کا نام خطبات میں شامل کرنے کی اجازت اس شرط پر دی کہ نابالغی میں مجدالملک سلطنت کا نگران اور منتظم رہے گا اور یہی مجدالملک صیغۂ مال اور اور عزل و نصب کا مختار ہوگا ترکمان خاتون نے یہ شرط منظور کر لی۔ بعدازاں اس نے چند امرا کو برکیا روق کی گرفتاری کے لیے اصفہان بھیجا، چنانچہ اس کے حکم پر برکیا روق کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا (ابن خلدون :تاریخ، ۵: ۱۳، بیروت ۱۳۹۱ھ؛ ابن اثیر: الکامل فی التاریخ، ۸: ۱۶۴،۱۶۵، بیروت ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء).

ترکمان خاتون کے میدان میں آنے کے بعد ملک کی صورت حال خراب ہوگئی۔ اس سے سلطان ملک شاہ کی دوسری بیوی اور سلطان برکیا روق کی والدہ زبیدہ بیگم نے فائدہ اٹھایا، اس نے نظام الملک کے غلاموں کے ساتھ مل کر اصفہان کے قید خانہ پر دھاوا بول دیا اور برکیا روق کو [رہائی دلا کر] تخت حکومت پر بٹھا دیا۔ ان دنوں ترکمان خاتون اپنے بیٹے کے ساتھ دارالخلافت بغداد میں تھی، یہ خبر سن کر وہ فوراً اصفہان کی طرف روانہ ہوئی (ابن اثیر: الکامل فی التاریخ، ۸: ۱۶۵).

سلطان برکیا روق نے جواباً اس پر قبضہ کر لیا۔ ارغش نظامی اور اس کی فوج کے مطیع ہو جانے کی وجہ سے سلطان برکیا روق کی طاقت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا اور اس نے مزید پیش قدمی کرتے ہوئے قلعہ طبرک فتح کر لیا۔ ترکمان خاتون کو جب یہ خبر ملی تو وہ سخت برہم ہوئی اور اس نے برکیا روق کو مکمل طور پر شکست دینے کے لیے فوج روانہ

کر دی، مگر اس کے بعض امرا برکیا روق کے ساتھ مل گئے، اس کی باقی فوج میدان چھوڑ کر واپس اصفہان پہنچ گئی، برکیاروق نے ان کا پیچھا کیا اور اصفہان کا محاصرہ کر لیا، اس دوران میں مختلف امرا برکیا روق کے پاس آتے رہے اور اس کی قوت میں اضافے کا سبب بنتے رہے، جن میں عزالملک (ابوعبداللہ حسین) بن نظام الملک بھی جو خوارزم کا والی تھا اپنے بھائیوں، عزیزوں اور اپنی فوج کے ساتھ برکیاروق سے آملا، برکیاروق نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔

امیر تاج الملک کو جو ترکمان خاتون کا وزیر تھا اور جسے ترکمان خاتون نے اپنی فوج کا سپہ سالار بنا کر محاذ جنگ پر روانہ کیا تھا، فوج کی شکست کے بعد گرفتار ہو کر برکیاروق کے سامنے پیش کیا گیا، برکیا روق نے تاج الملک کو آزاد کر دیا اور اس کو وزارت دینا چاہی، لیکن نظامی افواج اُسے نظام الملک کے قتل کا ذمہ دار سمجھتی تھیں، لہٰذا انہوں نے ماہ الحرام ۴۸۶ھ میں اس کو مار ڈالا (ابن اثیر: الکامل فی التاریخ، ۸: ۱۶۵؛ ابن خلدون: تاریخ، ۵: ۱۴)۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ سلطان برکیاروق کے چچا تاج الدولہ تتش نے بھی قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے دیار بکر پر قبضہ کرنے کے بعد آذربائیجان پر حملہ کر دیا، مگر اس کے اور سلطان برکیاروق کے درمیان جنگ کی نوبت نہ آئی، اس لیے کہ اوّل الذکر کے دو بڑے امرا سردار قسیم الدولہ آق سنقر اور بوزان (والی الرہا وحران) اپنی فوجوں کے ساتھ مؤخرالذکر سے مل گئے، جس پر وہ جنگ کیے بغیر شام کی جانب لوٹ گیا (ابن خلدون: تاریخ، ۵: ۱۴، ۱۵ بیروت، ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء)۔

اس طرف سے مایوس ہو کر ترکمان خاتون نے اسماعیل بن داؤد کی طرف رجوع کیا، جو کہ برکیا روق کا ماموں اور آذربائیجان کا والی تھا۔ اس نے اسے لالچ دیا کہ اگر وہ برکیاروق سے لڑ کر ملک پر قبضہ کر لے تو وہ اس سے نکاح کرلے گی۔ اسماعیل اس کے فریب میں آگیا اور اس نے فوج اکٹھی کر کے برکیاروق کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ دونوں کے درمیان مقام کرج پر جنگ ہوئی۔ جس میں سرداران لشکر برکیا روق سے مل گئے اور اسماعیل کو شکست ہوئی۔ اس پرسلطان برکیا روق کی والدہ (ملکہ زبیدہ) نے دونوں میں مصالحت کرا دی، مگر سرداران لشکر کمشتکین، آق سنقر اور بوزان وغیرہ نے اس مصالحت کو قبول نہ کیا اور کہا کہ اسماعیل اس طریقے سے تخت حکومت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، لہٰذا انہوں نے اس کو قتل کر کے برکیا روق کو مطلع کر دیا، (ابن اثیر: الکامل، ۸: ۱۶۸)۔

اس طرح سلطان برکیا روق کے تمام مخالفین کا آہستہ آہستہ قلع قمع ہوگیا، اور اس کے والد کی پوری ریاست پر اس کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔

محرم الحرام ۴۸۷ھ میں خلیفہ مقتدی بامراللہ نے سلطان برکیاروق کو دارالخلافت بغداد طلب کیا اور اسے خلعت سے نوازا۔ اس کے نام کا خطبہ جامع بغداد میں پڑھوایا، امور سلطنت کے تمام اختیارات اس کو سونپ دیئے، چند روز کے بعد یعنی ۱۵ محرم ۴۸۷ھ میں خلیفہ کا انتقال ہوگیا۔

اس کے جانشین خلیفہ "مستظہر باللہ" نے بھی سلطان برکیاروق کے بارے میں اپنے والد کی پالیسی کو جاری رکھا، (ابن اثیر: الکامل فی التاریخ؛ جمال الدین ابی المحاسن یوسف بن تغری بردی الاتابکی :النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر والقاھرہ، ۵: ۱۳۹، قاھرہ، ۸: ۱۷۰، بیروت ۱۳۸۷، ۱۹۶۷ء)۔

لیکن خلیفہ کی طرف سے اس کی پذیرائی کے باوجود اس کی آزمائشیں ختم نہ ہوئیں، بلکہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ اس کے چچا تاج الدولہ (تتش) نے جزیرہ دیار بکر، خلاط اور آذربائیجان پر یکے بعد دیگرے قبضہ حاصل کر لیا، شکست ہوئی اور اس کی لشکر گاہ کو لوٹ لیا گیا اور برکیا

روق بمشکل جان بچا کر اصفہان پہنچا۔

دوسری طرف اصفہان میں ترکمان خاتون کے بیٹے سلطان محمود کی حکومت بدستور قائم تھی۔ اس وقت ترکمان خاتون کا انتقال ہوچکا تھا۔ سلطان محمود نے پہلے تو اپنے بڑے بھائی کا مقابلہ کرنا اور اس کو روکنا چاہا مگر پھر مصلحتًا خاموش رہا، اور پھر دھوکے سے گرفتار کر کے اسے نظر بند کر دیا۔ اتفاق سے محمود بیمار پڑ گیا اور ۲۹ شوال ۴۸۷ھ میں ایک برس کی حکومت کے بعد وہ فوت ہوگیا۔ اس کے بعد برکیا روق نے اصفہان پر قبضہ کر لیا، بعدازاں ایک اور جنگ میں تتش کو شکست ہوئی اور اسے آق سنقر کے ساتھیوں نے قتل کر دیا (ابن اثیر: الکامل، ۸: ۱۷۵؛ ابن خلدون: تاریخ، ۵: ۱۶)۔

اب راستہ اس کے لیے صاف تھا۔ چنانچہ سلطان برکیاروق نے نیشاپور، خراسان، ترمذ اور خوارزم پر قبضہ کر لیا، لیکن ایک مرتبہ پھر سلطان برکیا روق کا ستارہ گردش میں آ گیا۔ یہ اس وقت ہوا جب اس نے اپنے دو بھائیوں کو امورِ مملکت میں شریک کرتے ہوئے سلطان سنجر کو خراسان کی اور سلطان محمد کو گنجہ اور اس کے متعلقات کی حکومت عطا کی، چونکہ محمد کی عمر کم تھی اس لیے امیر قطلغ تکین اتابک کو بطور وزیر اس کے ہمراہ روانہ کیا، لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد محمد نے اپنے وزیر قطلغ تکین اتابک کو قتل کر دیا اور تمام صوبہ اران پر قابض ہوگیا اور برکیاروق کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

محمد نے ماہ ذوالقعدہ ۴۹۲ھ میں رے پر قبضہ کر لیا، اور اس کے ایک امیر موید الملک نے برکیا روق کی والدہ زبیدہ بیگم کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

اس وقت حالات اتنے خراب ہوگئے کہ برکیاروق کو بغداد بھی چھوڑنا پڑا، جس کے بعد سلطان محمد بغداد میں داخل ہوگیا، خلیفہ نے اس کو غیاث الدنیا والدین کا خطاب دیا اور اس کا خطبہ پڑھا جانے لگا (ابن اثیر: الکامل، ۸: ۱۹۱)۔

کچھ ہی عرصے کے بعد ۱۵ صفر ۴۹۳ھ برکیا روق اور اس کی افواج کا سالار نیال بن انوشتگین اپنی فوج کے ساتھ بغداد میں آ گئے۔ چنانچہ اس کے نام کا خطبہ جامع بغداد میں پڑھا گیا (ابن اثیر: الکامل؛ ۸: ۱۹۳؛ ابن خلدون: تاریخ؛ ۴: ۱، ۵۹۹؛ الاتابکی: النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر والقاہرہ، ۵: ۱۶۵)۔

بعدازاں دونوں بھائیوں کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی اور برکیاروق کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی، جس کے سبب بغداد پر ۵/ رجب ۴۹۳ھ کو سلطان محمد کا قبضہ ہوگیا (حوالۂ مذکور)۔ برکیاروق اپنے چند جانثاروں کے ساتھ رے پہنچ گیا۔ سلطان محمد کے خلاف دوسری لڑائی میں جو ۳ جمادی الآخرہ ۴۹۳ھ کو ہوئی، محمد کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور مؤیدالملک کو گرفتار کرکے قتل کر دیا گیا (ابن اثیر: الکامل، ۸: ۱۹۶؛ ابن خلدون: تاریخ، ۵: ۲۴)۔

جنگ کے بعد برکیا روق رے چلا گیا، جب کہ محمد جرجان روانہ ہوگیا اور اپنے بھائی سنجر سے مدد کی درخواست کی، دونوں بھائیوں کے باہم مل جانے کے بعد سلطان برکیاروق ان کا مقابلہ نہ کر سکا اور اس کو بغداد چھوڑنا پڑا اور سلطان محمد نے بغداد میں اپنی حیثیت مستحکم کر لی۔ خلیفہ مستظہر باللہ نے اس کو مبارک باد کا پیغام بھیجا (ابن خلدون: تاریخ، ۵: ۲۵۔ ۲۶)۔

نہاوند میں دونوں کے لشکر ایک مرتبہ پھر آمنے سامنے ہوے، لیکن کچھ امرا نے دونوں میں مصالحت کرا دی، مگر یہ صلح زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ اس کے بعد برکیا روق اور محمد کی فوجیں رے کے قریب صف آرا ہوئیں۔ یہ چوتھی جنگ ماہ جمادی الاولی ۴۹۵ھ میں ہوئی اس میں محمد کی فوج میدان چھوڑکر بھاگ کھڑی ہوئی اور محمد کو اپنے چند جانثاروں کے ساتھ اصفہان میں پناہ لینا پڑی۔ دونوں بھائیوں

کے مابین اگلی معرکہ آرائی خراسان میں ہوئی، اس جنگ میں بھی محمد کو شکست ہوئی اور اس نے ارقیس [صوبہ خلاط] میں جا کر دم لیا (ابن خلدون: تاریخ ، ۵: ۳۱۔۳۲).

سلطان برکیا روق اور سلطان محمد کے درمیان ایک مدت سے جنگوں کا سلسلہ جاری تھا، جس کی وجہ سے جانی اور مالی نقصان ہو رہا تھا، برکیاروق کو ان باتوں کا بہت احساس تھا، لہٰذا اس نے صلح کرنے کی کوشش کی۔ دونوں میں کچھ شرائط پر صلح ہوگئی اور پابندی شرائط پر حلف اٹھایا گیا (ابن اثیر: الکامل ، ۸: ۲۲).

ان شرائط میں ایک یہ بھی تھی کہ جن شہروں کا اقتدار سلطان محمد کو دیا جائے وہ ان پر مستقل حکمران ہوگا اور جن علاقوں پر برکیا روق کی حکمرانی ہوگی وہ مستقل ان پر قابض رہے گا۔ صلح کے بعد ۴۹۷ھ میں سلطان برکیاروق کا خطبہ جامع بغداد اور واسط میں پڑھا گیا۔ ذوالقعدہ ۴۹۷ھ میں خلیفہ مستظہر نے سلطان برکیا روق، امیر ایاز اور وزیر سلطنت کو خلعت عطا کی اور ان سے اطاعت و فرمانبرداری کا حلف لیا.

سلطان برکیا روق جب اصفہان سے واپس آیا تو وہ سل اور بواسیر کے امراض میں مبتلا ہوچکا تھا، یزدگرد پہنچا تو مرض میں اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے ملک شاہ کو (جو اس وقت پانچ برس کا تھا) ولی عہد مقرر کیا اور امیر ایاز کو وزارت اور ملک کا نظم و نسق سونپا، پھر بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی بغداد پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ ۱۲ ربیع الآخرہ ۴۹۸ھ میں اپنی حکومت کے بارہ سال چھ مہینے پورے کر کے سفر آخرت اختیار کیا، اسے اصفہان میں دفن کیا گیا، (ابن اثیر: الکامل، ۸: ۲۲۳؛ الاتابکی: النجوم الزاہرہ، ۵: ۱۹۱؛ابن خلدون: تاریخ ؛ ۵: ۳۳۔۳۴).

سلطان برکیاروق کا تمام زمانۂ حکومت اپنے مخالفین کے خلاف جنگ و جدل میں بسر ہوا ، اس لیے بطور حکمران اس کے انداز حکمرانی اور اس کی ذاتی زندگی اور سیرت و کردار کے متعلق معلومات بہت کم ملتی ہیں، مجموعی طور پر برکیاروق نیک طبیعت اور رحم دل تھا جیسا کہ اس کی طرف سے اپنے بھائیوں کے ساتھ مصالحت کے لیے اس کی پیش قدمی وغیرہ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کے بھائیوں نے اسے عوام کی خدمت اور سکھ چین کا سانس لینے کا موقع نہ دیا، وہ ایک عالی ہمت حکمران تھا (ابن عماد حنبلی شذرات الذھب فی اخبار من ذھب، ۳: ۴۰۸، دارالفکر، بیروت، ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۸ء).

مآخذ: (۱) ابن خلدون: تاریخ ابن خلدون: ۵: ۱۳۔ ۳۴ ، بیروت، ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء؛ (۲) ابن اثیر: الکامل، ۸: ۱۹۲۔ ۲۲۴، بیروت، ۱۳۸۷ھ/ ۱۹٦۷ء ؛ (۳) ابن خلکان: وفیات الاعیان: ۱: ۲٦۸، بیروت؛ (۴) جمال الدین ابی المحاسن یوسف بن تغری بردی الاتابکی: النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر والقاہرہ، ۵: ۱۳۵۔ ۱۹۱، مصر؛ (۵)ابوفلاح عبدالحی بن عماد حنبلی: شذرات الذھب فی اخبار من ذھب، ۳: ۴۰۷۔ ۴۰۸، دارالفکر بیروت، ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۸ء.

(شمیم روشن آراء؛ ن : محمودالحسن عارف)

••-------------••

⊗ برکینا فاسو: (Burkina Faso) (قدیم نام اپروالٹا) افریقہ میں واقع ایک معروف اسلامی مملکت.

(۱) جغرافیا: مغربی افریقہ میں واقع یہ ملک چاروں طرف سے خشکی سے گھرا ہوا ہے۔ اس کا بیشتر علاقہ میدانی ہے۔ سفید، سیاہ اور سرخ والٹا دریا اس کی اراضی کو سیراب کرتے ہیں۔ اکثر علاقہ زرخیز ہے، لیکن صرف دس فیصد رقبے پر کاشت ہوتی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ کسانوں کو یہ خدشہ رہتا ہے کہ ان کی سرزمین میں بہنے والا دریا اپنے ساتھ سیاہ مکھیاں لاتا ہے۔ جو اندھے پن کی بیماریاں پھیلانے کا باعث بنتی ہیں، اس کی سطح کچھ زیادہ بلند نہیں ہے اور

یہاں ۶۵۰ سے لے کر ۱۰۰۰ فٹ تک اونچی پہاڑیاں پائی جاتی ہیں، شمال میں صحرائی علاقہ ہے۔ اس کی آب و ہوا منطقہ حارہ سے ملتی جلتی ہے اور گرمیوں میں سخت گرمی پڑتی ہے۔ دسمبر تا مئی یہاں کا اوسط درجہ حرارت ۲۷ درجے سنٹی گریڈ ہوتا ہے۔ جون سے اکتوبر تک جنوب میں بارشیں ہوتی ہیں۔ بارش کی سالانہ اوسط اوگادوگو میں ۳۵ انچ ہے۔(The Europa world Year Book 1998، ص: ۷۳۹) اگست میں خوب جھکڑ چلتے ہیں۔ خشک موسم میں اس کے دریا جہاز رانی کے قابل نہیں ہوتے۔

اس کا رقبہ ۱۰۵۸۶۹ مربع میل یا ۲۷۴۲۰۰ مربع کلومیٹر ہے۔ اس میں فی مربع میل میں ۱۰۳ افراد رہتے ہیں۔ اس کے شمال اور مغرب میں مالی، مشرق میں نجر اور جنوب میں بینن، ٹوگو ، گھانا اور کوٹ ڈی آئیوڈی ممالک واقع ہیں۔

"برکینا فاسو" کو یہ نام "دیانتدار لوگوں کی سرزمین" ہونے کی وجہ سے دیا گیا (Universal Almanac، ص:۴۰۰۔) اس میں آباد اہم نسلی گروہوں میں ماسی (Mossi) بوبو (Bobo) ، گورنسی (Gurunsi)، سینوفو (Senufo) مانڈے (Mande) اور فولانی (Fulani) وغیرہ شامل ہیں۔

وسط ۱۹۹۷ء کے اعداد و شمار کے مطابق برکینا فاسو کی آبادی ایک کروڑ نولاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ آبادی کے بڑھنے کی سالانہ شرح تین فیصد ہے، اوگادوگو ملک کا صدر مقام ہے، جس کی آبادی ۴۴۱۵۱۴ ہے، دیگر بڑے شہروں میں بوبوڈیولاسو (Bobo- Dioulasso) (۲۲۸۶۶۸) کوڈوگو (Koudougou) ۵۱۹۲۶، افراد اوہی گویا (Ouahigouya) ۳۸۹۰۲، افراد اور بینفورا (Banfora) ۳۵۳۱۹، افراد اور کایا ۲۵۸۱۴، افراد شامل ہیں .(The ، Europa 1998 Source Universal Almanac 1996 ، ص ۷۴۴).

(۳) زبان: فرانسیسی ملک کی سرکاری زبان ہے ،لیکن نوے فیصد لوگ مقامی قبائلی زبانیں بولتے ہیں۔ (The Europa ، ۱۹۹۹، ص: ۷۳۹).

(۴) مذہب: برکینا فاسو کے ۶۵ فیصد باشندے مقامی عقائد پر یقین رکھتے ہیں اور روحوں وغیرہ کی پوجا کرتے ہیں، مسلمانوں کا تناسب کل آبادی میں ۳۰ فیصد ہے جب کہ آبادی میں دس فیصد باشندے عیسائی (اکثریت رومن کیتھولک) ہیں (The Europa World year book ، ۱۹۹۹، ص: ۷۳۹).

(۵) تاریخ: برکینا فاسو کو سب سے پہلے قبیلہ موسی (Mossi) نے ۴۸۵ھ /۱۱۰۰ء سے لے کر ۷۰۰ھ/ ۱۳۰۰ء تک آباد کیا۔ انہوں نے اوگادوگو، یا ٹینگا (Yatenga) اور فدا این گرما (Fada-n- Gurma) علاقوں پر مشتمل ایک ریاست قائم کی، بعدازاں انہوں نے ڈیگو مبا (Dagomba) ریاست کی بنیاد رکھی، ۱۸۸۰ء سے قبل کسی یورپین شخص کی اس علاقے پر نظر نہ پڑی، لیکن ۱۸۹۶ء میں فرانس نے اوگادوگو پر قبضہ کر کے اسے اپنا زیر تحفظ علاقہ قرار دیا۔ ابتدا میں اسے آئیوری کوسٹ کی نوآبادی میں شامل کر لیا گیا، لیکن ۱۹۱۹ء میں اسے اس سے الگ کر کے اس کا نام "اپروولٹا "رکھا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں علاقے کو آئیوری کوسٹ، نجر اور فرانسیسی سوڈان کی نوآبادیوں میں تقسیم کر دیا گیا، ۱۹۴۷ء میں ریاست کی تشکیل نو کی گئی۔ فرانسیسی آئین کے مطابق ۱۹۵۸ء میں اسے خودمختاری دی گئی ،لیکن ۵/ اگست ۱۹۶۰ء کو اسے مکمل آزادی سے ہمکنار کر دیا گیا۔ اگرچہ آزادی کے بعد اس نے فرانسیسی حلقہ اثر سے نکلنا چاہا، لیکن اپنی بقا کی خاطر اسے ۲۴۔ اپریل ۱۹۶۱ء کو دوبارہ فرانس سے اپنی وابستگی کا معاہدہ کرنا پڑا.

اس سال ہونے والے عام انتخابات میں مارس یا میوگو (Maurice Yameogo) واحد صدارتی امیدوار ہونے کی

وجہ سے صدر کے عہدے کے لیے منتخب ہوگئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد ملک میں حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا ،جو فسادات میں بدل گئے۔ چنانچہ ۳/ جنوری ۱۹۶۶ء کو فوج کے سربراہ لیفٹیننٹ کرنل ابوبکر سنگولی لامیزانہ (Aboubakar Sangouled)âLamizana نے ان کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اور قومی اسمبلی توڑ دی اور آئین معطل کر دیا، اور سابق صدر یامیوگو کو نظر بند کر دیا (*Almanic* ، ۱۹۸۶ء ، ص: ۱۵۹) ۱۴ جون ۱۹۷۰ء کو نیا آئین نافذ ہوا جس کے تحت ۱۹۷۰ء میں لامیزانہ نے عام انتخابات کرائے، جن کے نتیجے میں "ڈیموکریٹک یونین" نامی سیاسی جماعت نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ فروری ۱۹۷۱ء میں لامیزانہ نے اقتدار ڈیموکریٹک یونین کے رہنما جرارڈ کانگو اودراؤگو (Gerard Kango ouedraogo) کو پرامن طریقے سے منتقل کر دیا۔

تین سال کے بعد ۸۔ فروری ۱۹۷۴ء کو صدر لامیزانہ نے فوج کی مدد سے اودراؤگو کی منتخب حکومت برطرف کر دی اور خود اقتدار سنبھال لیا۔ ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۴ء میں برکینا فاسو میں شدید قحط پڑا جس کی وجہ سے اسے شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ ۱۹۷۸ء میں صدر لامیزانہ نے کثیر الجماعتی نظام کو بحال کر دیا، چنانچہ ۳۰/اپریل ۱۹۷۸ء کو پارلیمانی انتخابات منعقد ہوے جن کے نتیجے میں سابق وزیراعظم اودراؤگو کی جماعت ڈیموکریٹک یونین نے قومی اسمبلی کی ۲۸ نشستیں جیت لیں۔ تاہم جون ۱۹۷۸ء میں اکثریت سے لامیزانہ مزید پانچ برسوں کے لیے صدر منتخب ہوگیا۔ ۲۵ نومبر ۱۹۸۰ء کو سابق وزیر خارجہ سعی زربو (Saye Zerbo) نے فوج کی مدد سے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ نیز سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر کے ملکی نظم و نسق چلانے کے لیے فوجی کمیٹی قائم کی۔ ۷ نومبر ۱۹۸۲ء کو میجر جین بپٹست اودراؤگو (Maj. Jean Baptist Ouedraogo) نے اسے بھی اقتدار سے محروم کر دیا، مگر وہ بھی زیادہ عرصے مسند اقتدار پر فائز نہ رہا، اور صرف ایک سال کے بعد کیپٹن تھامس سنکارا (Thomas Sankara) نے اودراؤگو کو معزول کر دیا اور ۱۴/اگست ۱۹۸۴ء کو اس نے ملک کا نام برکینا فاسو رکھ دیا (*The Almanic* ، ص: ۱۵۹)۔ ۱۹۸۷ء میں کیپٹن تھامس سنکارا، کیپٹن بلیز کمپورے (Blaise Compaore) کے ہاتھوں مارا گیا۔ ستمبر اور دسمبر ۱۹۸۹ء میں اس کی حکومت کے خلاف بھی دو ناکام بغاوتیں ہوئیں، جس کے نتیجے میں باغیوں کے سرغنہ ہلاک کر دیئے گئے۔ ۱۹۹۲ء میں پارلیمنٹ کے انتخابات کے بعد صدر کمپورے نے قومی مصالحتی فورم کی ایک کانفرنس بلائی اور اس کے نتیجے میں مارک کرسچین راچ کبورے (Roch Kobore) کو وزیراعظم نامزد کیا۔ فروری ۱۹۹۶ء میں اس کی جگہ کا درے ڈیزائر کے اودراؤگو (Kadre Desire Ouedraugo) کو وزیراعظم کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ جنوری ۱۹۹۷ء میں آئین میں تبدیلیاں کی گئیں (*The Almanic* ، ۱۹۸۶ء، ص: ۴۰۰) اور عوامی نائبین کی مجلس (ADP) نے ایک نئے انتخابی ضابطہ اخلاق کی منظوری دے دی)۔

نئی ترامیم کے تحت ملک کے صوبوں کی تعداد تیس سے بڑھا کر ۴۵ کر دی گئی جب کہ پارلیمانی نشستوں کی تعداد ۱۰۷ سے ۱۱۱ تک بڑھا دی گئی۔ مئی ۱۹۹۷ء میں دستوریہ کے انتخابات منعقد ہوے۔ اس موقع پر سی ڈی پی نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ عوامی نائبین کی مجلس میں اس کی نشستوں کی تعداد ۱۰۱ تھی، جب کہ حزب اختلاف نے صرف چھ نشستیں جیتیں۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء میں عوامی نائبین کی مجلس نے اسمبلی کے حقوق اور عوامی جلسوں کی اجازت کا قانون منظور کیا۔ (*Europa* ، ۱۹۹۸ء ، ص: ۷۴۷)۔

۳۔ نظم و نسق: نظم و نسق کے اعتبار سے برکینا فاسو

تمیں صوبوں اور دو سو پچاس اضلاع میں منقسم ہے، صوبوں کے نام یہ ہیں:

بام (Bam) ، بازیگا (Bazega) ، بوگوریبا (Bougouriba) ، بولگو (Boulgo)، بولکمدی (Boulkimede)،کومو (Comoe)، گینزورگو (Ganzou Rgou)، گنگنا (Gnagna)،گورما (Gourma)، ہوٹ (Houet)، کادیوگو (Kadio Go)، کینی ڈوگو (Kene Dougou)، کوسی (Kossi)، کوری تنجا (Kouri Tenga)، موہن (Mouhoun)، ناہوری (Nahouri)،نامنتیجا (Namentenga)، اوبری تنجا (Oubritenga)،اوڈالن (Oudalan)،پسورو (Passoro)،پونی (Poni)، سینگوئی (Sanguie)، سان تنجا (San Tenga)،سینو (Seno) سسلی (Sissili)، سوم (Soum)، سورو (Souroo)، تپوآ (Tapoa)، یاتنجا (Yatenga)،زونڈ ویوگو (Zound Weogo).

(مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: The States man`s Year Book 1997- 98، ص: ۲۵۸؛ The Europa world year book 1998، ص: ۷۴۵).

آئین: ۲۵ نومبر ۱۹۸۰ء کو، نومبر ۱۹۷۷ء میں نافذ ہونے والا آئین منسوخ کر دیا گیا اور اس کی جگہ ۲ جون ۱۹۹۱ء کو عوامی ریفرنڈم کے ذریعے ایک نئے آئین کی منظوری دی گئی۔ جنوری ۱۹۹۷ء میں آئین میں تبدیلی کر کے مجلس نائبین کی نشستوں میں اضافہ کیا گیا۔ صدر ہی فوجی کونسل کا سربراہ ہے جس کے ارکان کی تعداد لامحدود ہے۔ (The Europa. 1998، ص: ۷۴۷).

آئین کے تحت پارلیمنٹ دو ایوانی ہے، یعنی عوامی نائبین کی مجلس (ارکان کی تعداد ۱۱۱) اور ایوان نمائندگان (ارکان کی تعداد ۱۲۰) جب کہ اقتصادی اور معاشی کونسل کے ۹۰ ممبران ان کے علاوہ ہیں۔ (Europa world Year Book، ص: ۷۴۷) .

برکینافاسو کا قومی پرچم: پٹیوں دوافقی (اوپر سے نیچے) یعنی سرخ اور سبز پر مشتمل ہے اور ان کے وسط میں زرد رنگ کا پانچ کونی ستارہ دکھایا گیا ہے (The States Man`s Year book .1997- 98، ص: ۲۵۸).

برکینا فاسو کا بنیادی سکہ سی ایف اے فرانک ہے۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۷ء میں شرح تبادلہ یہ تھی ۔ ایک پونڈ = ۹۵۸،۳ فرانکس ایک ڈالر = ۵۹۳،۲ فرانکس۔(The States man`s year Book 1997-98، ص ۲۶۰؛ The Europa، ص: ۷۴۹).

مالیات: ۱۹۹۱ء میں دوسرے پنج سالہ منصوبے (۱۹۹۱ء۔ ۱۹۹۶ء) کا حجم ۵۰ فیصد کم کر دیا گیا، اور زراعت کی بنیاد پر ۱۹۹۴ء۔ ۱۹۹۵ء کا ترقیاتی پروگرام بنایا گیا۔ اس کے لیے ۶۲۰۰۰ ملین فرانکس مخصوص کیے گئے۔ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ بنکوں اور صنعتی شعبے کو نجی تحویل میں دے دیا جائے۔ اس پروگرام کے تحت نومبر ۱۹۹۴ء تک گیارہ ادارے نجی تحویل میں دیے جاچکے تھے.

عالمی اداروں اور تنظیموں سے وابستگی: برکینا فاسو اقوام متحدہ، اسلامی کانفرنس کی تنظیم، جی ۷۷، غیر وابستہ ممالک کی تنظیم، یونیسکو اور عالمی بنک کا رکن ہے۔(Statesman`s year Book 1997-98، ص ۲۵۸).

زراعت: برکینا فاسو کی اہم زرعی پیداوار میں مکئی، باجرہ، چاول، چقندر، سکاوا، دالیں، مونگ پھلی، تیل نکالنے والے بیج، کپاس ، گنا، سبزیاں اور پھل شامل ہیں.

ملک کا قابل کاشت رقبہ ۳،۵۵ ملین ہیکٹر ہے۔ بیس ہزار ہیکٹر رقبہ آبپاشی کے ذریعے سیراب کیا جاتا ہے۔ چاول اور مونگ پھلی کی فصلوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

مویشی برکینا فاسو کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں ان سے گوشت، دودھ، چمڑا اور اون حاصل ہوتی ہے۔ (The

Europa 1998، ص: ۲۴۴).

ملک میں ۶۶ ملین ہیکٹر یا کل رقبے کے ۲۶ فیصد پر جنگلات پھیلے ہوئے ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں ان جنگلات سے ستانوے لاکھ اکہتر ہزار مکعب میٹر لکڑی حاصل کی گئی۔ (حوالہ مذکورہ).

معدنیات: یہاں کی کانوں سے مینگانیز، چونے کا پتھر، سنگ مرمر، سرمہ، ہیرے، تانبا، نکل باکسائٹ اور تھوڑی سی مقدار میں سونا نکالا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۵ء میں اڑھائی میٹرک ٹن سونا نکالا گیا۔

صنعت : برکینا فاسو کی اہم صنعتوں میں خام چینی، شراب، سگریٹ، جوتے، نیکل، موٹر سائیکل ٹائر اور ٹیوب، موٹر سائیکل ، سکوٹر اور کنولے کی مصنوعات وغیرہ شامل ہیں۔ (The Europa 1998 ، ص ۲۴۴۔ ۲۴۵).

برکینا فاسو نے ۱۹۸۸ء میں ایک خود مختار برکینافاسو ریلوے قائم کی، اس کی لمبائی ۶۲۲ کلومیٹر ہے۔ " ایئر برکینا" ملکی فضائی کمپنی ہے، ۱۹۹۵ء میں اس کے پاس صرف دو جہاز تھے، اوگادوگو اور بوبوڈیولاسو بین الاقوامی ہوائی اڈے ہیں۔ ملک میں ۴۹ ہوائی میدان اور ۱۳ نجی ہوائی کمپنیاں ہیں، ایئرانٹر برکینا کا قیام ۱۹۹۴ء میں عمل میں آیا۔ اس کی پروازیں اندرون ملک تک محدود ہیں. اس کے علاوہ ملک میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی نشریات کا معقول انتظام ہے (Britannica Book - of the year، ص ۵۷۲).

صحافت: آبزرویٹرپالگا (Observateur Paalga) سب سے بڑا اخبار ہے جو اوگادوگو سے شائع ہوتا ہے اور اس کی روزانہ اشاعت ۸۰۰۰ ہے۔ علاوہ ازیں لی پیز (Le Pays) اور سووایا (سچائی) دونوں اوگادوگو سے شائع ہوتے ہیں ، برکینا فاسو کی خبر رساں ایجنسی کا نام ایجنسی دا انفامیشن دو برکینا ہے (The Europa world year Book 1998، ص: ۲۴۹).

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں۔

(زاہد حسین انجم)

••-------------••

برما: جنوب مشرقی ایشیا کا ایک آزاد مسلم اقلیتی⊗ ملک، جس کی سرحدیں شمال مشرق میں چین سے، مشرقی جانب تھائی لینڈ اور لاؤس سے، جنوب اور جنوب مغرب میں بحر انڈیمان اور خلیج مرتبان (Martaban) سے جب کہ مغربی جانب خلیج بنگال اور بنگلہ دیش سے اور شمال مغرب میں بھارت سے ملتی ہیں۔ ملک کا رقبہ ۶٫۷۶٫۵۷۷ء مربع کلومیٹر ہے۔ ۲۰۰۲ء کی مردم شماری کے مطابق میں برما کی کل آبادی ۴۲,۲۳۸,۰۰۰ افراد پر مشتمل ہے (Encyclopaedia Britannica Book of the Year, 2003، ص ۴۷۱).

برما میں کثیر تعداد میں نسلی اور لسانی گروہ آباد ہیں۔ سو سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں، تاہم برمی زبان کو قومی اور رابطے کی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ ملک کی آبادی کی اکثریت (تقریباً ۳/۴ حصہ) برمی النسل لوگوں پر مشتمل ہے، جو میدانی علاقوں یا پھر وادی اراودی اور ساحلی پٹیوں پر آباد ہیں۔ ملک کے دیگر اہم قبائلی و نسلی گروہوں میں سے من (Mon)، چن (Chin)، کا چن (Kachin) ، شن (Shan)، کا رن (Karen)، کیہ (Kayeh) وغیرہ زیادہ تر پہاڑی علاقوں میں آباد ہیں۔ برما کی آبادی کی بھاری اکثریت بدھ مت کی پیروکار ہے (Encyclopedia Americana، ۵/ ۱-۷ بذیل مادہ George A; Theodorson: Minority People in the Union of Burma، در Journal of Southeast Asian History ، ۵: ۱ ، مارچ ۱۹۶۴ء، ص ۱-۱۶).

مسلم آبادی: برما میں مسلمان آبادی کے بارے میں صحیح صحیح اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ آزادی کے مابعد دور

میں حکومت نے اقلیتی گروہوں کی آبادی کے اعداد و شمار کو مخفی رکھنے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ تاہم ایک عام اندازے کے مطابق اس ملک کی مسلمان آبادی ۱۵ لاکھ سے زائد افراد پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر علی کتانی کے بیان کے مطابق ۱۹۸۲ء تک صرف اراکان کی ۲ء۶ ملین نفوس پر مشتمل آبادی میں سے ۱۴،۶۰،۰۰۰ (کل آبادی کا ۶۵ فیصد) افراد مسلمان تھے۔جب کہ اراکان کے علاوہ ملک کے دوسرے حصوں میں اکیس لاکھ (۲ء۱ ملین) مسلمان افراد آباد ہیں۔ یوں برما کی کل مسلم آبادی تقریباً ۳۵،۶۰،۰۰۰ نفوس پر مشتمل ہے (.M. *Muslim Minorities in the World* : Ali Kettani *Today* ، راولپنڈی، سروسز بک کلب، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۰-۱۴۱)۔ مسلم آبادی کی بھاری اکثریت اراکان، ٹنیسیرم (Tenasserim) ڈویژن اور رنگون میں آباد ہے جب کہ وہ تھوڑی تھوڑی تعداد میں دور افتادہ علاقوں میں بھی آباد ہے۔ برما میں متعدد شہر اور قصبات ایسے ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں.

برمی سلطنت (Pagan Dynasty) کی بنیاد اناؤ راھتہ (۱۰۴۴ء-۱۰۷۷ء) کے ہاتھوں پڑی۔ اس نے برما کے مختلف علاقوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت کے تحت یکجا کر دیا اور بدھ مت (تھیراویدا/Theravada) کو نئی قائم شدہ سلطنت کے سرکاری مذہب کے طور پر اختیار کر لیا۔ اس خاندان کے حکمرانوں کے ادوار میں سلطنت کی حدود میں وسیع اضافہ ہوا۔ تاہم ۱۲۸۷ء میں چین کی طرف سے حملہ آور منگول افواج کے ہاتھوں اس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ اگلے دو سو سال تک بالائی برما میں شن (Shan) جب کہ جنوب کی طرف واقع علاقوں میں من (Man) قوم کو غلبہ حاصل رہا۔ ۱۵ویں صدی میں برمی قوم نے اپنی سیاسی و عسکری قوت کی شیرازہ بندی کرتے ہوئے ٹونگو (Toungoo)سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ سلطنت ۱۷۵۲ء تک قائم رہی۔ اس سلطنت کے دو فرمانرواؤں تابنشوہتی [Tabinshwehti (۱۵۳۱-۱۵۵۰ء)] اور بیائی نانگ [Bayinnaung (۱۵۵۱-۱۵۸۱ء)] کے ادوار میں من (Mon) اور شن (Shan) دونوں گروہ برمی سلطنت کے زیرنگین ہوگئے اور سلطنت کی حدود میں چاروں اطراف سے توسیع ہوئی۔ تاہم مسلسل جنگ و جدل کے باعث یہ سلطنت جلد ہی زوال کا شکار ہوگئی۔ برمی سلطنت کا تیسری بار احیا الانگ پیا [Alaungpaya (۱۷۵۲ - ۱۷۶۰ء)] کے ہاتھوں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ یہ سلطنت ۱۸۸۶ء میں برما پر برطانوی تسلط کی ابتدا تک قائم رہی۔ الانگ پیا نے مغرب کی جانب آسام اور منی پور کے بعض علاقوں کو فتح کرنے کے علاوہ مشرق کی سمت سیام (تھائی لینڈ) پر بھی تاخت کی اور ٹنیسیرم پر تسلط جما لیا تھا۔ اس نے چین کی طرف سے ہونے والے حملوں کے مقابلے میں برما کا بھرپور انداز سے دفاع کیا تھا۔ انیسویں صدی کے ربع اول کے اختتام پر (۱۸۲۴ء) برما کا تصادم اس خطے میں بڑھتی ہوئی عسکری و سیاسی قوت برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ ہوا، چنانچہ برطانیہ نے ۱۸۲۴ء میں اراکان اور ٹنیسیرم اور پھر ۱۸۵۲ء میں پیگو پر قبضہ کر لیا۔ تیسری اینگلو برمی جنگ (۱۸۸۵ء) میں برمی حکمرانوں کی مکمل طور پر شکست کے بعد پورے ملک پر برطانوی تسلط قائم ہوگیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: *Annexation* : Anil Chandra Baner Jee *of Burma*، کلکتہ، اے مکر جی اینڈ برادرز، ۱۹۴۳ء).

نو آبادیاتی دور میں اس ملک کے معاشی و معاشرتی ڈھانچے میں دور رس تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ملکی اقتصادی وسائل کی ترقی اور ذرائع مواصلات کی تعمیر کا منظم طور سے آغاز ہوا۔ اراوادی (Irrawaddy) دوآبہ کے جنگلات کو صاف کر کے اس قطعہ زمین کو چاول کی فصل کی

برما - مسلمان آبادی والے شہر/علاقے
شمال
سکیل
کلومیٹر
۲۰۰ ۱۵۰ ۱۰۰ ۵۰ ۰
لیڈو
درۂ پانگ ساؤ
وادیٔ ہوکانگ
دیماپور
کوہیما
امپھل
سلچر
درۂ تامو
میاکائنا
کالیوا
شوابو
میمیو
مانڈلے
منیوا
سگینگ
چٹاگانگ
دریائے اراوادی
اکیاب
مگوے
تاؤنگپ
تاؤنگو
پروم
پیگو
رنگون
بسین
پاپن
سریام
مولمین
کلکتہ ۷۸۰ میل
مدراس ۱۰۰۰ میل
وہ علاقے جہاں مسلم آبادی معتدبہ تعداد میں آباد رہی ہے۔
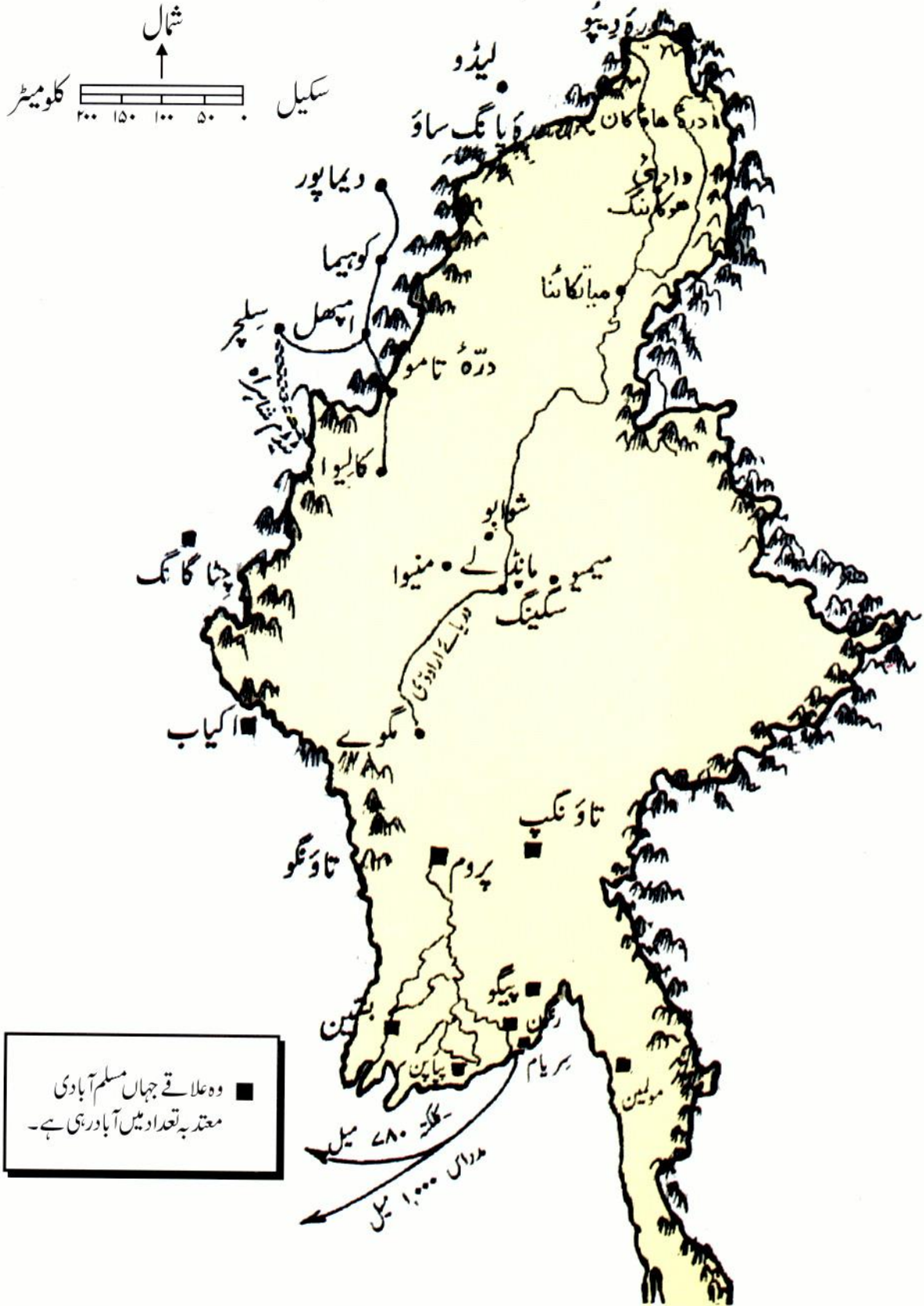
برما
سکیل
کلومیٹر
۲۵۰
۰
۲۰۰ ۱۵۰ ۱۰۰ ۵۰
بھارت
چِین
کاچِن
مائتکیانا
بھامو
یوننان
شمالی شَن
لاشیو
پانگ لانگ
وا
بنگلہ دیش
فالم
چِن
مانڈلے
برما (میانمار)
جنوبی شَن
تانگئی
مشرقی شَن
کینگ ٹنگ
لاؤس
لوے کاؤ
کایہہ
تھائی لینڈ
آبنائے بنگال
پاپن
کارِن
رنگون
بسّین
مولمین
بنگ کاک
بحرِ انڈامان
مرگوئی
خلیج تھائی لینڈ

کاشت کے قابل بنایا گیا۔ نہر سویز کے کھلنے (۱۸۶۹ء) کے بعد تو یہ ملک (برما) دنیا بھر میں سب سے زیادہ چاول برآمد کرنے والا ملک بن گیا۔ ملک میں برطانوی حکومت نے جدید نظام تعلیم متعارف کرایا۔ بہت سے مشن اسکول ملک میں قائم ہوے۔ جدید تعلیمی اداروں کی بدولت ایک جدید تعلیم یافتہ طبقہ وجود میں آیا جس نے تحریک آزادی میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں برطانوی تسلط کے اختتام کے ساتھ ہی برما کی آزاد اور خود مختار حیثیت بحال ہوگئی۔ ابتدا میں ملک کی زمام کار تحریک آزادی کے قائدین و سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں رہی، مگر سال بعد ہی میں ملک سے جمہوری نظام کی بساط لپیٹ دی گئی اور اقتدار پر جنرل نی ون (Ne Win) کی قیادت میں فوج نے قبضہ جما لیا (۱۹۵۸ء)۔ اس ملک پر اب تک فوجی آمریت مسلط ہے۔ آزادی کے دور میں برما کئی دہائیوں تک مختلف نسلی و لسانی، قبائلی اور مذہبی اقلیتوں کی ہنگامہ آرائیوں کا شکار رہا ہے، جس سے ملک کی اقتصادی ترقی شدید طور سے متاثر ہوئی۔ بین الاقوامی سیاست میں برما نے غیر جانبداری کے اصول کو اختیار کیے رکھا۔ ۱۹۶۲ء سے اس ملک پر اشتراکی نظام رائج ہے۔ ۱۹۸۹-۱۹۹۰ء کے دوران میں اس ملک میں جمہوری نظام کے حق میں جاری تحریک تقویت پکڑ گئی۔ تاہم فوجی حکومت ۱۹۹۰ء میں ہونے والے عام انتخابات کے نتیجے میں کامیاب ہونے والی سیاسی جماعت این۔ ایل ۔ ڈی (National League for Democracy) کو اقتدار منتقل کرنے سے منحرف ہوگئی۔ اس نے سیاسی مخالفین کو کچلنے کے لیے جبر و تشدد کی راہ اختیار کی۔ فوجی حکومت کی جمہوریت مخالف طرز عمل کی پاداش میں متعدد یورپی ممالک نے اس کے خلاف تجارتی و اقتصادی پابندیاں عائد کیں۔ فوجی آمریت اور بعض داخلی و خارجی پالیسیوں کے سبب یہ ملک عالمی سیاست میں تنہائی سے دوچار ہے۔

(Mya Maung: *The Burma road from the Union of Burma to Mynmar*، در *Asian Surrey* ، ۳۰: ۶، (جون ۱۹۹۰ء)، ص ۶۰۲-۶۲۴؛ George A. Theodorson ، ص ۱-۱۶؛ Joseph Silverstein : *"Civil War and Rebellion in Burma"* ، در *Journal of Southeast Asian Studies* ، ۲۱ : ۱ (مارچ ۱۹۹۰ء)، ص ۱۱۴-۱۳۴؛ Richard But Well : *Ne Win's Burma :At the end of the First Decade* ، در *Asian Survey* ، ۱۲:۱۰ (اکتوبر ۱۹۷۲ء)، ص ۹۰۱-۹۱۲؛ *Robert H. Taylor*: *Burma's Ambiguous Breakthrough.*، در *Journal of Democracy* ، ۱ : ۴ (سرما ۱۹۹۰ء)، ص ۶۲-۷۲؛ Christina Fink: *Living Silence :Burma Under Military Rule*، لنڈن و نیویارک : زید بکس ، ۲۰۰۱ء، ص۱۷-۲۱).

برما میں مسلمانوں کی آمد اور نوآبادیوں کا قیام: جغرافیائی اعتبار سے برما جنوب مشرقی ایشیا کی قدیم بری و بحری تجارتی شاہراہوں پر واقع ہے۔ زمانہ قدیم سے ہند اور چین کے درمیان زمینی تجارتی قافلے برما کی حدود سے گزرا کرتے تھے۔ اسی طرح سیلون، مالا بار، کرومنڈل اور سورت کی طرف سے آنے والے تجارتی جہاز اس کی بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ عرب ممالک میں اشاعت اسلام اور ہندوستان کے ساحلی علاقوں اور ترکستان تک اسلامی سلطنت کی حدود میں توسیع کے بعد ایشیا کی بری و بحری تجارت پر مسلمانوں کو قطعی طور سے غلبہ حاصل ہوگیا تھا۔ سولہویں صدی کے آغاز تک اس خطے میں ان کی تجارتی سرگرمیوں بالخصوص جہاز رانی کے میدان میں ترقی و توسیع کا سلسلہ بدستور عروج پر رہا۔ دریں اثنا مسلمان تاجر ہند اور جنوب مشرقی

ایشیا کے ممالک کی طرف پھیل گئے، جہاں انہوں نے کافی تعداد میں تجارتی نوآبادیاں قائم کر لیں (دیکھیے: اشتیاق حسین قریشی: The Muslim Community of the Indo-Pak Sub-Continent ، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۳-۹؛ محمد مہر علی : A History of the Muslims of Bengal ، الریاض، ۱۹۸۵ء، ج ۱:۲۸-۴۵؛ سید سلیمان ندوی: عربوں کی جہاز رانی، بمبئی: اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن ، طبع دوم، س۔ن، ص ۶۰-۶۹) .

برما میں مسلمانوں کی آمد اور اس کے ساحلی علاقوں اور شہروں میں ان کی نوآبادیوں کا قیام مذکورہ نوعیت کی تجارتی سرگرمیوں ہی کا نتیجہ تھا۔ ایشیا کی تجارت پر مسلمانوں کے غلبہ کے اس دور میں بنگال کو بحری تجارت میں محور کی حیثیت حاصل رہی۔ حبشہ، عرب، ایران، آرمینیا اور گجرات (ہند) سے تعلق رکھنے والے مسلمان تاجر اس تجارتی مرکز سے بحر احمر ، سیلون (سری لنکا) مالابار ، کرومنڈل ، سورت اور برما کے ساحلی شہروں، (پیگو، مرتبان، ٹینسیرم) اور سیام (تھائی لینڈ) اور مالاکا وسماٹرا سے وسیع پیمانے پر تجارت کیا کرتے تھے (دیکھیے Hugh Tinker: South Asia: A Short History ؛ لنڈن، پال مال پریس، ۱۹۶۶ء ، ص ۸۶-۸۹: ایس ایم امام الدین: Bengal's Maritime Trade With The Far East upto the Sultanate Period ، در Journal of the Asiatic Society of Bangladesh (Humanities)، ۲۷:۱ (جون ۱۹۸۲ء)، ص ۱۰-۱۷؛ History of the Muslims of Bengal ، ج ۱، ص ۲۵-۴۲)۔ یہ مسلمان تاجر جو خلیج بنگال اور سماٹرا کے درمیان اکثر آمدورفت رکھتے تھے، آٹھویں صدی عیسوی / دوسری صدی ہجری میں برما کے ساحلی علاقوں ، اراکان ٹینسیرم اور پیگو پہنچے۔ نویں صدی سے تیرہویں صدی عیسوی تک کے دور میں ان شہروں میں

مسلمان تاجروں اور جہاز رانوں کی متعدد نوآبادیاں قائم ہوچکی تھیں۔ تاہم اس دور میں مسلم آبادی اور اس کی سیاسی و سماجی اور معاشرتی حیثیت کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں (دیکھیے: ایم صدیق خاں : "Muslim Intercourse with Burma from the Earliest Times to the British Conquest" ، در Islamic Culture، ۱۰:۳ (جولائی ۱۹۳۶ء)، ص ۴۰۹-۴۱۳، ۴۲۲-۴۲۳؛ Moshe yeger : The Muslims of Burma: Yegar، ویزبیڈن۔ جرمنی، ۱۹۷۲ء، ص ۱-۳)۔ بعد کے دور میں برما کے ساحلی شہروں اور بالخصوص بندرگاہوں میں مسلمان تاجروں اور جہاز رانوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ وسطی اور بالائی برما میں مسلمان نوآبادیوں کے قیام کا آغاز گیارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ہوا۔ اس دور میں بعض مسلمانوں نے برمی بادشاہ اناؤ راہتہ [Anawrahta (۱۰۴۴ء-۱۰۷۷ء)] کی فوج میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اناؤراہتہ کے جانشین ساؤلو [Sawlu (۱۰۷۷ء-۱۰۸۸ء)] نے، جس نے نوعمری میں ایک عرب مسلمان سے تعلیم حاصل کی تھی، اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوتے ہی اپنے عرب استاد کے ایک بیٹے رحمٰن خان کو اُسّہ (Ussa موجودہ پیگوشہر) کاگورنر مقرر کر دیا۔ ساؤلو کے بھائی اور جانشین کیا نزتھہ Kyanzittha (۱۰۸۴ء-۱۱۱۲ء) کے عہد حکمرانی کے اختتام تک برما کے مختلف علاقوں سنگو (Singu)، نگتھیاؤلی (Ngathayauly)، کالادے (Kalade)، نواہتھہ، سائک تن (Seiktin)، رامو (Ramu) نگاتھا نپالے (Ngathanappale) اور تھان ڈانگ (Thandaung) [مؤخر الذکر تین مقامات ضلع رمری (Rumree) میں واقع ہیں] میں مسلمان آبادیاں وجود میں آچکی تھیں ("Muslim Intercourse with Burma"، ص ۴۱۲-۴۱۴).

بری راستہ سے پہلے پہل مسلمانوں کی برما میں آمد شمالی ہمسایہ ملک چین کے صوبہ یونان (Yunnan) کی طرف سے ہوئی۔ تاہم برما میں چین کی طرف سے مسلمانوں کی ایک معتدبہ تعداد کی آمد مغول افواج کی تاخت اور چین کے صوبہ یونان (Yunnan) کے مسلمانوں کی تجارتی سرگرمیوں کے سبب سے ہوئی۔ تیرہویں صدی کے ربع آخر میں مغول (تاتاری) فتوحات کا دائرہ جنوب مغربی چین تک وسیع ہوگیا، جس سے چین کا سارا ملک مغولوں کے اقتدارمیں آگیا۔ ان فتوحات اور ان کے نتیجے میں چین میں قائم مغول یوان سلطنت (Mogol Yuan Dynasty)کے قیام و استحکام میں وسطی ایشیا کے مسلمان ترک سپاہیوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ عہد مغول یا عہد یوان (۱۲۷۷-۱۳۶۸ء) کے دوران میں متعدد مسلمان اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ مغول حکمران اور بانی سلطنت قبلائی خان نے (۱۲۶۰-۱۲۹۴ء) [آآ، بذیل مادہ، ج ۱۲/۱، ص ۳۵۳-۳۵۴] جو اسلام اور مسلمانوں پر مہربان تھا، ترک جرنیل شمس الدین عمر البخاری کو، جو بخارا کے رہنے والے تھے اور سیدالاجل کے نام سے مشہور تھے، صوبہ یونان (Yunnan) کا گورنرمقرر کیا۔ مغول شہنشاہ قبلائی خان کی فوج نے یونان کے مسلمان گورنر کے بیٹے ناصر الدین کی قیادت میں ۱۲۷۷-۱۲۷۸ء کے دوران میں برما پر چڑھائی کی تھی.

صوبہ یونان کے مسلمان گورنر شمس الدین عمر البخاری (۱۲۷۴-۱۲۷۹ء) اور ان کے جانشین ناصر الدین (۱۲۷۹-۱۲۸۴ء) نے یونان میں اسلام کی توسیع و اشاعت اور اس کے استحکام میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ ان کے دور میں ایرانی و عرب تاجروں اور خصوصاً ترک مسلمان سپاہیوں کی ایک موثر تعداد یونان میں چلی آئی۔ جلد ہی اس صوبہ میں مسلمانوں کی ایک موثر اور خوشحال جماعت وجود میں آگئی (ملاحظہ ہو: ٹی ڈبلیو آرنلڈ: دعوت اسلام (مترجمہ: شیخ عنایت اللہ)، لاہور: محکمہ اوقاف، طبع اوّل ۱۹۷۲ء، ص ۲۹۴: آآ، مقالہ الصین، بذیل مادہ، ج ۱۲، ص ۲۶۷۔ مزید دیکھیے David G. Atwill: "Islam in the World of Yunnan: Muslim Yunnanese Identity in Nineteenth Century Yunnan"، در JIMMA، ۱:۱۷ (۱۹۹۷ء)، ص ۱۲: Andrew. D. W. Forbes: The "Panthay" (Yunanese Chines) Muslims Of Burma" در Joumal Institute of Muslim Minority Affairs، ۲:۷ (جولائی ۱۹۸۶ء)، ص ۲۸۵، ۲۸۷)۔ تاہم برما میں چین کی طرف سے مسلمانوں کی ایک معتدبہ تعداد کی آمد مغول فوج کی تاخت و تاراج کے سبب سے ہوئی۔ چین کے منگول شہنشاہ قبلائی خان [رک بآں در آآ بذیل مادہ] کی فوج نے ینان کے مسلمان گورنر، ترکی النسل جرنیل سید الاجل شمس الدین عمر البخاری (۱۲۷۴-۱۲۷۹ء) کے بیٹے ناصر الدین کی قیادت میں [چین کے منگول حکمران اگرچہ مشرف بہ اسلام نہیں ہوے تھے تاہم ینان ایک مسلم اکثریتی صوبہ بن چکا تھا اور متعدد مسلمان اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز تھے]۔ برما پر چڑھائی (۱۲۷۷-۱۲۷۸ء) کر دی تھی۔ ۱۲ ہزار سے زائد شہسواروں اور کمانداروں پر مشتمل اس منگول فوج نے، کہ جس میں اکثریت ترک مسلمانوں کی تھی، بھامو (Bhamo) اور اس کے گردو نواح کے علاقے فتح کر لیے۔ اس فوج کا دو تہائی حصہ جلد ہی چین کی طرف پسپا ہوگیا۔ جب کہ پیچھے رہ جانے والے سپاہیوں نے بھامو کے قریب کانگ سین (Kaung Sin) کے قریب ایک چھاؤنی قائم کر لی تھی۔ چند سال بعد (۱۲۸۳-۱۲۸۴ء) قبلائی خان کا پوتا ۷ ہزار سے زائد تازہ دم تاتاری سپاہ جس کی اکثریت حسب سابق ترک مسلمانوں پر مشتمل تھی، کے ساتھ برمی سلطنت کے دارالخلافہ پیگن (Pagan) پر حملہ آور ہوا اور اسے فتح کر

لیا۔ جس کے ساتھ ہی سلطنت پیگن کا خاتمہ ہوگیا (دیکھیے G.E. Harvey : History of Burma ، لنڈن، ۱۹۲۵ء، ص ۱۳-۱۴، ۴۳، ۴۸، ۶۵؛ ایم صدیق خان: ص، ۴۱۳-۴۱۵؛ Andrew D.W.Forbes : The Panthay، Yunnanese Chines" Muslims of Burma ، در Journal the Institute of Muslim Minority Affairs، ۲:۷ (جولائی ۱۹۸۶ء)، ص ۳۸۴-۳۸۷: (۴) Moshe Yegar ، کتابِ مذکور: ص ۲؛ T.W. Arnold : The Preaching of Islam ، لاہور ، ۱۹۷۹ء، ص ۳۰۱-۳۰۲؛ Hugh Tinker : South Asia A Short History ، ص ۲۱-۲۲)۔ اگرچہ منگول فوج ان فتوحات کے بعد ایک بار پھر چین کی طرف پسپا ہوگئی تھی۔ تاہم اس میں شامل چینی اور ترک مسلمان سپاہیوں بالخصوص جنھوں نے برما پر پہلی تاخت (۱۲۷۷-۱۲۷۸ء) کے بعد سے بھامو کے قریب پڑاؤ ڈال دیا تھا اور مقامی عورتوں سے شادی کرلی تھی، مستقل طور پر اسی ملک میں سکونت اختیار کرلی۔ برما کے چین سے متصل علاقوں (Wa States) میں موجود چینی اور ترک مسلمانوں کو بالعموم پنتھے (Panthay)سے موسوم کیا جاتا ہے، کے بارے میں‌یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ چین کی طرف سے حملہ آور ہونے والے انھی چینی اور وترک مسلمان سپاہیوں کی اولاد میں سے ہیں (ایم صدیق خان، ص ۴۱۴-۴۱۷؛ The "Panthay" : Yunnanese Chines) Muslims of Burma"، ص ۳۸۵).

آئندہ پانچ صدیوں میں یونان سے مزید مسلمان برمی علاقوں میں‌آکر آباد ہوگئے۔ یہ مسلمان بھامو (Bhamo)، کنگ تنگ (Kengtung)، موگوک (Mogok)، امارا پورا (Amarapura) اور مانڈلے وغیرہ، علاقوں میں آباد ہوئے۔ یونان کے مسلمانوں جنہیں بالعموم ھوی ھوی (Hui Hui) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، کی حیثیت اقتصادی اور عددی (آبادی) کے اعتبار سے بہت مستحکم ہوگئی تھی۔ یونان کے مسلمان تاجر جنوب مشرقی ایشیا کے دور دراز علاقوں سے زمینی راہ سے کارروائی تجارتی میں بڑی شہرت رکھتے تھے (چین میں عرب نو آبادیوں کے قیام نیز ان کی جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک سے تجارت کے بارے میں ملاحظہ ہو: ایس۔ ایم ۔ امام الدین: "Arab Mariners and Islam in China (Under the T'ang Dynasty. 618-906. A.C)"، در Journal of the Pakistan Historical Society، ج ۳۲:۳ (جولائی ۱۹۸۴ء)، ص ۱۶۸-۱۸۱)۔ چنانچہ یونان کے ھوی مسلمان تاجر ویت نام، لاؤس اور برما سے وسیع پیمانے پر زمینی راستہ سے تجارت کرتے تھے۔ یونان اور اس کے اطراف کے مسلمان انیسویں صدی کے وسط میں چین اور حجاز کے درمیان دخانی جہازوں کے ذریعے سفر کی سہولیات سے قبل حج بیت اللہ کے لیے سفر کے دوران برما ہی کی حدود سے گذرا کرتے تھے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ یونان کے ان مسلمان تاجروں کی برما میں چھوٹی چھوٹی نو آبادیاں وجود میں آگئیں (ملاحظہ ہو: The "Panthey" (Yunnanese Chinese) Muslims of Burma"، ص ۳۸۷،Andrew D.W.Forbes: The "Cin-Ho" (Yunnanese Chinese) Mslims of North Thailand، در Journal Institute of Muslim Minority Affairs ، ۲:۷ (۱۹۸۶ء) ، ص ۱۷۳-۱۷۵؛David G. Atwill : Islam in the World of Yunnan، ص ۱۳-۲۰).

برما میں نویں صدی سے تیرہویں صدی عیسوی کے اختتام تک آباد ہونے والی مسلمان آبادی کے بارے میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں۔ تاہم ملا کا، سماٹرا اور مالے مجمع الجزائر میں اسلام کی اشاعت و استحکام اور بالخصوص ملا کا میں اسلامی سلطنت کے قیام، (۱۴ ویں صدی عیسوی میں) سے جنوب مشرقی ایشیا کے تمام خطے میں مسلمان

تاجروں اور جہاز رانوں کی سرگرمیوں میں زبردست اضافہ ہوگیا۔ اس دور کی بحری تجارت میں برما کے ساحلی علاقوں اور شہروں میں مسلمان نو آبادیاں بڑی اہمیت اختیار کرچکی تھیں۔ پندرھویں صدی عیسوی اور اس کے مابعد دور میں ہندوستان ، برما اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کی سیاحت کرنے مغربی سیاحوں نے برما کے شہروں بسین (Bassein)، پیگو (Pegu)، مرتبان (Martaban)، ڈیلا (Dela)، سیریام (Syriam)، توانت (Tiwante)، مرگوئی (Mergui)، تنیسیرم، اراکان (Arakan)، اور رنگون میں موجود مسلمان آبادیوں اور ان شہروں کی بندرگاہوں پر مسلمانوں کی تجارتی سرگرمیوں کا ذکر اپنے تذکروں اور سفرناموں میں کیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے : John F. Caddy: *Southeast Asia Its Historical Development*، لنڈن (Mcgraw Hill Book Co.)، ص ۱۵۱-۱۵۵، ۱۶۱۔ ۱۶۳؛ D.G.E. Hall: *A History of the Southeast Asia* ، لنڈن: میک ملن، ۱۹۸۱ء، ۲۲۱ -۲۲۳، ۲۲۷، ۲۴۳ و بمواقع عدیدہ؛ Michael Adas : *The Modern Imperialist Rhetoric and Histriography Case of Lower Burma "Before and After Conquest"* ، در *Joumal of Southeast Asian Studies* ، (سنگاپور)، ۳:۳، ص ۱۷۵-۱۹۲؛ *Bengal's Maritime Trade With the Far-East*، در، ص ۱۰-۱۷)۔

امتداد زمانہ کے ساتھ برما کی بندرگاہوں اور ساحلی شہروں میں مسلمان آبادی کی بڑی تیزی سے افزائش ہونے لگی۔ برما کی مسلمان آبادی کی افزائش کا ایک اہم ترین سبب مسلمانوں کی مقامی غیر مسلم (بدھ) عورتوں سے شادی تھی۔ برمی حکام بالعموم ان غیر ملکیوں کی مقامی عورتوں سے شادیوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر یہ عورتیں اپنے شوہروں کے مذہب (اسلام) کو اختیار کر لیتی تھیں۔ البتہ یہ غیر ملکی جب اپنے وطن واپسی کے لیے روانہ ہوتے تھے تو انہیں اپنی برمی بیویوں اور ان کے بطن سے جنم لینے والی اولاد کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ یوں اس ملک کی مسلمان آبادی میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہوتا گیا۔ برما میں غیر ملکی مسلمان شوہروں اور مقامی عورتوں کے ملاپ سے جنم لینے والی آبادی کو بالعموم ”زیربادی“ کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔ ص، ۴۲۲-۴۲۳)۔ برما میں مسلمان ملت کا مرکز عصبی (Nucleus) انہی مسلمان تاجروں اور جہاز رانوں کی اولاد ہے۔

سولھویں اور اٹھارہویں صدی کے دوران میں وسطی برما میں مسلمانوں کی متعدد ایسی نوآبادیاں بھی وجود میں آئیں جنہیں خود اس ملک کے بادشاہوں نے قائم کیا تھا۔ ان نوآبادیوں میں زیادہ تر ایسے مسلمانوں کو آباد کیا گیا تھا جنہیں مختلف جنگوں میں (ارکان، بنگال، تھائی لینڈ، منی پور، آسام اور تھائی لینڈ کے ساتھ) قیدی بنایا گیا تھا۔ اسی طرح کی ایک نوآبادی برما کے ضلع شوابو (Shwebo) میں قائم کی گئی ۔ اس میں آباد مسلمانوں کو برما کی افواج نے پیگو (Pegu) پر حملہ ۱۵۳۹ء کے دوران قیدی بنا لیا تھا۔ تابنشوہتی (۱۵۳۱۔ ۱۵۵۰ء) کی فوج کے ۱۵۴۶ء اور ۱۵۴۹ء میں ارکان پر حملے کے دوران گرفتار کیے گئے مسلمانوں کو اسی نوآبادی میں بسایا گیا تھا تھا۔ سترہویں صدی میں اسی طرح کی نوآبادیاں مائیدو (Myedu) کے قریبی اضلاع سگینگ (Sagaing)، یمتھن (Yamethin)، اور کیاؤکس (Kyaukse)، میں بھی قائم کی گئیں یہاں پر آباد کیے جانے والے مسلمانوں کو کھیتی باڑی کے لیے زمینیں بھی فراہم کی گئی تھیں۔ (M. Sidiq Khan، ص ۲۵۷-۲۵۸؛ G.E. Harvey، ص ۱۸۹-۱۹۰، ۳۴۸)۔ برمی بادشاہ سانے

(Sane) نے ۱۷۰۷ء کو سنداوے کو فتح کیا تو وہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان قیدیوں کو میدیولے آیا۔ ۱۷۰۸ء میں ارکان پر حملہ کے بعد کئی ہزار مسلمان پناہ گزیں برما میں آ کر آباد ہوگئے تھے۔ ان پناہ گزینوں کو مختلف اضلاع شوابو، یمتھن (Yamethin) اور تاؤنگو (Taungo) میں تقسیم کر دیا گیا۔ انہیں بھی زمینیں فراہم کی گئیں۔ غالبًا ان قیدیوں اور پناہ گزینوں سے زمینوں کی کاشت و آبادکاری کا کام لیا جاتا رہا ہوگا۔

بادشاہ الانگ پیا [Alaungpaya (۱۷۵۲-۱۷۶۰)] کے عہد میں شمالی ہندوستان سے مسلمانوں کا ایک گروہ انہی اضلاع میں آ کر آباد ہوگیا تھا (Moshe Yegar : The Muslims of Burma ص۱۱-۱۲، "Muslim Intercourse wiht Burma"، در Islamic Culture، ۱۱:۲، (اپریل ۱۹۳۷ء)، ص ۲۵۲- ۲۵۸)۔ برما کے ان اضلاع میں آباد مسلمانوں اور ان کے اخلاف و اولاد کو مائیدوکالا (Myedu Kala) یا پھر کالابیو (Kalabyo) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ برطانوی دور میں ہونے والی مردم شماری کی رپورٹ (۱۹۳۱ء) میں مائیدو کالا مسلمانوں کا اندراج ایک جداگانہ گروہ کے طور پر کیا گیا ہے (Moshe yegar : کتاب مذکور، ص ۱۲ ، ۱۱۹-۱۲۰)۔

انیسویں صدی کے آغاز تک وسطی برما کے تمام اہم شہروں اور قصبات میں مسلمان قابل ذکر تعداد میں آباد ہوچکے تھے۔ مسلمان ان علاقوں میں عموماً مقامی آبادی سے الگ محلوں میں رہتے تھے، اگرچہ بعد میں وہ متفرق و منتشر ہوگئے۔ جہاں انہوں نے بہت سی مساجد تعمیر کر لی تھیں۔ (Moshe Yegar، کتاب مذکور، ص ۱۲: "Muslim Intercourse whit Burma"، (اپریل ۱۹۳۷ء)، ص ۲۶۱-۲۶۲)۔ برمی حکام نے ان مسلمانوں کی آباد کاری کے سلسلہ میں بڑی محتاط پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ مسلمانوں کو چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں مختلف اضلاع میں تقسیم کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ کسی ایک جگہ مجتمع ہو کر ایک بڑی قوت نہ بن جائیں جو کل کلاں برمی مملکت کے لیے خطرہ بن جائے، کیپٹن ہنری یول، گورنر پیگو آرتھر فیئر (Arthur Phayre) کے معتمد خاص، نے اپنی یادداشتوں میں انیسویں صدی کے وسط میں برما کے اہم وسطی شہر اور دارالحکومت امارا پورا (Amarapura) میں قیام پذیر مسلمان آبادی کے بارے میں تفصیلات فراہم کی ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق انیسویں صدی کے ربع ثالث میں آمارا پورا کی مسلمان آبادی ۸-۹ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ انہیں پاتھی (Pathee) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ہنری یول نے آمارا پورا میں ایک ایسے مسلمان گروہ کا بھی ذکر کیا ہے جو ۶/۵ سو سال قبل وسطی ایشیا کے شہر بخارا سے یہاں آکر آباد ہوا تھا۔ ۱۶/ ۱۷ گھرانوں پر مشتمل یہ گروہ شہر کے ایک الگ محلے میں مقیم تھا اور اس کے افراد رنگون اور کلکتہ کے درمیان تجارت کیا کرتے تھے (Captain Henry Yule: *A Narrative of the Mission Send by Generel the Governar To the Court of Ava in 1855 with Notices of the Country Government and People*، لندن: اسمتھ اینڈ ایلڈر، ۱۸۵۸ء، ص ۱۴۰-۱۴۳: ۲۲۸، ۲۶۱ و بمواقع عدیدہ: Moshe Yegar، کتاب مذکور، ص ۱۰، ۱۳-۱۴)۔ آمارا پورا میں زیادہ تر مسلمان آبادی شہر کے ایک خاص محلے (Ward) میں مجتمع تھی۔ ان میں بہت کم مقامی افراد ایسے تھے جنہوں نے اپنا قدیم مذہب (بدھ مت) ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں زیادہ تر مغرب اور ہند کی طرف سے آنے والے مسلمانوں کی اولاد میں سے ہیں۔ آمارا پورا کے بعض مسلمان خاندان ایسے بھی ہیں جن کا قدیم تعلق اراکان،

منی پور اور آسام کے علاقہ قاچار (Kachar) سے ہے اور جنہیں برمن فوج نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں ، ان علاقوں پر اپنی تاخت کے سبب وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چہرے مہرے کے اعتبار سے ان میں اور مقامی آبادی کے مابین تمیز مشکل ہے۔ وسطی برما میں آباد مسلمان آبادی نے اگرچہ مقامی تہذیب و معاشرت کی بعض رسوم و روایات اور لباس و زبان کو اپنا لیا ہے تاہم انہوں نے دین اسلام سے اپنی وابستگی کو برقرار رکھا ہے۔ اگرچہ مسلم آبادی کی اکثریت ناخواندہ اور اسلامی تعلیمات سے نابلد ہے البتہ ان میں سے اکثر کو نماز اور دیگر اذکار (عربی زبان میں) یاد ہیں۔ وہ نماز جمعہ بڑے اہتمام اور باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں۔ البتہ نماز پنجگانہ کی ادائیگی کا زیادہ خیال نہیں رکھتے۔ ہنری یول نے آمارا پورا میں موجود چند ائمہ و خطباء اور دینی مدرسین و مذہبی معلمین اور مبلغین کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو گاہے ماہے شہر میں چل پھر کر وعظ و تبلیغ کرتے تھے اور لوگوں کو روزمرہ زبان میں دینی تعلیم دیتے تھے۔ آمارا پورا کے زیادہ تر مسلمان مسلکاً اہل السنۃ والجماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم وہاں کچھ شیعہ بھی ہیں جنہوں نے ایک امام باڑہ بھی تعمیر کر رکھا ہے۔

آمارا پورا اور وسطی برما کے دیگر اضلاع میں جہاں کہیں بھی آٹھ دس گھرانے آباد ہیں وہاں ایک چھوٹی سی خس و خاشاک سے تعمیر کردہ مسجد بھی موجود ہے۔ ہنری یول نے صرف آمارا پورا شہر میں موجود مساجد کی تعداد چالیس (۴۰) بتائی ہے (Captain Henery Yule، کتاب مذکور، ص ۱۵۰-۱۵۲؛ Moshe Yegar: کتاب مذکور، ص ۱۳-۱۴)۔

تجارت اور جہاز رانی کے میدان میں زوال سے بہت پہلے مسلمان تاجروں کے اہم گروہ برما کے ساحلی شہروں اور قصبات میں آباد ہوچکے تھے۔ اٹھارہویں صدی میں رنگون کو برما کے اہم ترین تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل ہوچکی تھی۔ اس شہر کی تجارت زیادہ تر ایرانی ، آرمینیائی اور گجراتی مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی ("Muslim Intercourse with Burma" ، در (اپریل ۱۹۳۷ء)، ص ۲۵۷-۲۵۸)۔

جہاز سازی کی صنعت: وافر مقدار میں لکڑی کی دستیابی کی وجہ سے برما میں جہاز سازی کی صنعت بڑی ترقی کر گئی۔ پندرہویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی تک تھی جہاز سازی کی صنعت پر کلی طور مسلمانوں کو اجارہ داری حاصل تھی۔ سائیریم (Syriam)، ٹینسرم، پیگو، ڈیلا اور رنگون کی بندرگاہیں جہاز سازی کے اہم مراکز تھے۔ جہاں کشتیاں، بحری بیڑے اور جہاز تیار کر کے فروخت کے لیے ملاکا وسماٹرا ، خلیج فارس ، چین ، بحر احمر اور بحیرۂ عرب کے ممالک کی طرف روانہ کیے جاتے تھے۔ تاہم ملاکا کو ان تجارتی جہازوں کے لیے سب سے بڑی منڈی کی حیثیت حاصل تھی (Michael Adas : کتاب مذکور ، ص ۱۸۳؛ D.G.E Hall : ص ۲۴۳- ۲۴۴؛ John F. Caddy : کتاب مذکور، ص ۱۶۱)۔

مسلمان جہاز سازوں نے برما کے بادشاہ سانے [Sane (۱۶۹۸-۱۷۱۴ء)] کے لیے بھی دو جہاز تیار کیے تھے۔ برما کے آخری بادشاہ تھباؤ [Thibaw (۱۸۷۸-۱۸۸۵ء)] کے لیے بھی انہوں نے ایک شاہی بیڑا (کشتی) تیار کی تھی۔ اس کشتی کے عملے کے ارکان بھی مسلمان ہی تھے۔ برما اور برطانیہ کے مابین پہلی جنگ (۱۸۲۴ء) کے دوران جب انگریز سپاہیوں نے رنگون پر قبضہ کر لیا تو انہیں وہاں کی بندرگاہ سے ایک ایسا جہاز ہاتھ لگا تھا جو اکیس توپوں سے لیس تھا اور جو مسقط کے امام (حکمران) کے لیے تیار کیا گیا تھا (" Muslim

'Intercourse with Burma' (جولائی ۱۹۳۶ء)، ص ۴۲۱-۴۲۴؛ Moshe Yegar : کتاب مذکور، ص ۴-۵؛ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کے سمندروں میں یورپی (پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی اور برطانوی) جہاز رانوں اور قزاقوں کی آمد اور اس خطے کے اہم تجارتی مراکز، بندرگاہوں اور ساحلی علاقوں پر ان کے عسکری تسلط کے ساتھ ہی ایشیا کی تجارت پر مسلمانوں کی بالادستی ختم ہو کر رہ گئی۔ تاہم جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک پر مغربی اقوام کی تاخت و تاراج کے اس دور میں بھی برما کے مسلمان تاجروں کی، برما کے مختلف شہروں اور ملاکا و ساٹرا، سیلون، جنوبی ہند اور خلیج فارس کے درمیان تجارتی سرگرمیاں جاری رہیں۔ سترھویں صدی کے وسط تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے برما میں اپنی کوئی بندرگاہ قائم نہیں کی تھی۔ اگرچہ اس نے کرومنڈل اور برما کی دو اہم بندرگاہوں: پیگو اور سیریم کے درمیان مسلمان تاجروں کے متوازی اپنا تجارتی نظم قائم کر لیا تھا۔ تاہم اس دور میں برما کے ساتھ اس کی تجارت مسلمان تاجروں ہی کے ذریعے ہوتی رہی (Moshe Yegar : کتاب مذکور، ۸-۹)۔ یہ مسلمان تاجر اس دور میں برمی بادشاہوں اور ولندیزی تجارتی کمپنی (Dutch India Company) اور برطانوی تجارتی کمپنی ایسٹ انڈیا کمپنی (East India Company) کے درمیان پیغام رسانی اور رابطے کا اہم ذریعہ بھی تھے۔ (ایم صدیق خاں : "Captian George Sorrel's Mission to Court of Amarapura 1793-94"، در Journal of the Asiatic Society of Pakistan، ۲:۳ (اپریل ۱۹۵۷ء)، ص ۱۳۲-۱۳۵)۔

برما میں مسلمانوں کو، عددی اعتبار سے اقلیت میں ہونے کے باوجود، برطانوی تسلط سے ماقبل دور میں اپنی مستحکم معاشی حیثیت اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی بدولت بڑی اہمیت حاصل رہی۔ مقامی حکمران انہیں قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ بعض مسلمانوں کو اعلیٰ انتظامی و حکومتی عہدوں پر بھی مقرر کیا جاتا رہا۔ صوبہ ٹینسیرم کے گورنر کے منصب کے علاوہ ٹینسیرم اور ایودھیا [Ayudhiya (تھائی لینڈ کی سرحد پر واقع ایک شہر)] کے درمیان بری/ زمینی راستہ پر واقع شہروں اور قصبات میں اعلیٰ انتظامی مناصب بھی مسلمانوں کو تفویض کیے جاتے رہے۔ ان علاقوں میں اعلیٰ انتظامی عہدوں پر ان کے تقرر کا یہ سلسلہ برما پر برطانوی تسلط قائم ہونے تک برقرار رہا [Maurice Collis : Siamese White، لنڈن: فیبر اینڈ فیبر، ۱۹۳۶ء، ص ۳۶-۳۹؛ Moshe Yegar: کتاب مذکور، ص ۵)۔

برمی بادشاہ پیگن من [Pagan Min (۱۸۴۶-۱۸۵۸ء)] کے عہد حکومت میں بھی ایک مسلمان کو دارالحکومت آمارا پورا کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ بادشاہ کی طرف سے اسے وسیع انتظامی اختیارات تفویض کیے گئے تھے جس کے صلے میں وہ بادشاہ کو ایک کثیر رقم بطور خراج پیش کیا کرتا تھا۔ اسی طرح ایک اور مسلمان کو صوبہ پیگن (Pagan) کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ آمارا پورا اور پیگن کے یہ مسلمان گورنر بعدازاں قتل کر دیئے گئے۔ پیگن من کے جانشین منڈان [Mindon (۱۸۵۳-۱۸۷۸ء)] کے عہد سلطنت میں بھی متعدد مسلمان اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہے (Moshe Yegar : کتاب مذکور، ص ۱۱-۱۲)۔ برما کے ساحلی علاقوں اور بندرگاہوں میں، جہاں مسلمان کثیر تعداد میں آباد ہو چکے تھے، تو مسلم آبادی کو ایک گونہ خود مختاری حاصل تھی۔ ان مقامات پر آمدورفت رکھنے والے غیر ملکی تاجروں، جن میں اکثریت مسلمانوں ہی کی ہوتی تھی، سے لین دین معاملہ کرنے نیز

غیر ملکی تجارت کو کنٹرول کرنے کے لیے مسلمانوں کا اعلیٰ انتظامی عہدوں پر تقرر کیا جاتا تھا۔ یہ مسلمان افسران، جنھیں "شاہ بندر" (جس کے معنی بندرگاہ کے حاکم اور سربراہ کے ہیں) کا خطاب دیا گیا تھا، بندرگاہوں کے نظم و نسق اور غیر ملکیوں سے لین دین کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ برما کی بندرگاہوں پر انتظامی نوعیت کے تمام عہدے، عرب، ایرانی اور آرمینیائی مسلمانوں کے پاس تھے اس شہر کی تجارت پر ہر اعتبار سے مسلمانوں کو غلبہ حاصل تھا ("The Muslim Intercourse With Burma"، ۱۹۳۷ء، ص، ۲۵۹-۲۶۱)۔

عسکری خدمات: برما میں آباد مسلمان شجاعت اور بہادری کے اعتبار سے بھی مشہور و معروف تھے۔ برما کی افواج میں بھی مسلمان قابل قدر خدمات انجام دیتے رہے۔متعدد بادشاہ ایسے بھی تھے کہ جن کے محافظ دستے مسلمان سپاہیوں پر مشتمل تھے۔ مسلمان سپاہیوں اور جہاز رانوں نے سیام (تھائی لینڈ) کے خلاف برما کی جنگ میں بھی حصہ لیا ("Captain George Sorrels Mission to the Court of Amarapura 1793-94" : ج ۲، (۱۹۵۷ء) ص ۱۴۴-۱۴۵)۔ برمی افواج میں خدمات انجام دینے والے مسلمان سپاہیوں اور جہاز رانوں نے پندرھویں صدی کے اختتام پر متعدد مواقع پر جنگوں میں دھماکہ خیز اسلحہ بھی استعمال کیا۔ برما کے آخری بادشاہ کے پیش رَو منڈن [Mindon (۱۸۵۳-۱۸۷۸ء)] کے عہد میں بھی برما کی افواج میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان سپاہی شامل تھے۔ ان میں سے متعدد اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز تھے۔ مسلمان سپاہیوں نے برطانیہ کے خلاف منہلہ (Minhala) کی لڑائی میں کہ جس کے بعد مانڈلے کا سقوط (۱۸۸۵ء) واقع ہوگیا تھا، بڑی پامردی کا مظاہرہ کیا (Moshe Yegar : کتاب مذکور، ص ۱۱)۔ اٹھارہویں صدی میں برما میں آباد مسلمانوں نے اس خطے میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی تجارتی سرگرمیوں میں مزاحمت کی کوشش کی۔ متعدد بار انگریز قزاقوں اور مہم جو جہاز رانوں سے ان کا تصادم بھی ہوا۔ اٹھارہویں صدی کی آخری دہائی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے برما کو اپنے حلقہ اثر میں لانے کے لیے سفارتی کوششوں کا آغاز ہوا۔ ۱۸۹۵ء کے بعد سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کار پردازوں کی طرف سے برما کے ساتھ سیاسی تجارتی تعلقات کے قیام و استحکام کی غرض سے متعدد سفارتی مشن روانہ کیے گئے۔ دریں حالات برما کے مختلف شہروں بالخصوص رنگون کے مسلمان تاجروں کو ہندوستان میں رونما ہونے والے واقعات اور اس ملک کے تجارتی مراکز پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کے باعث برما میں حاصل اپنی تجارتی بالادستی کے تحفظ و بقا کے بارے میں خدشات لاحق ہوگئے تھے۔ چنانچہ ان کی طرف سے دونوں فریقین ایسٹ انڈیا کمپنی اور برما کے حکمرانوں کے مابین سلسلہ ہائے جنبانی کی شدید مخالفت و مزاحمت کی گئی۔ وہ برما کے حکمرانوں کو گورنر جنرل ہند سے قریبی روابط کے قیام سے اجتناب برتنے اور برما کی حدود میں انگریز تاجروں کی سرگرمیوں کو محدود رکھنے تحریک دیتے رہے۔ اسی طرح وہ انگریزوں کو اس خطے سے نکال باہر کرنے کے لیے در پردہ برما، ہندوستان، نیپال، افغانستان اور اس خطے میں موجود برطانیہ مخالف بڑی قوت فرانسیسیوں کے مابین اتحاد و تعاون کے لیے بھی کوشاں رہے۔ برطانیہ کے خلاف برما کی جنگوں (۱۸۲۴-۱۸۲۶ء، ۱۸۵۲-۱۸۸۵ء) کے دوران برما کے تحفظ و دفاع کی غرض سے مسلمان آبادی نے بڑی بہادری اور پامردی کا مظاہرہ کیا۔ ہنری یول (Henery Yule) نے انیسویں صدی کے وسط میں برطانیہ کے خلاف برمی افواج کے شانہ بشانہ مسلمان آبادی کی جنگی

کارروائیوں کا ذکر کیا ("The Muslim Intercourse with Burma" (۱۹۳۷ء) ص ۲۶۳-۲۶۵: Captain George Sorrels Mission To The Court of Amarapura, 1793 ۱۳۱-۱۳۵، ۱۴۲- ۱۴۴؛ Moshe Yegar: کتاب مذکور، ص ۱۱- ۱۶).

بہادر شاہ ظفر کی جلا وطنی: برصغیر پاک ہند میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد برطانوی افواج کا پورے ہندوستان پر تسلط قائم ہوگیا تھا۔ جس کے بعد مغلیہ سلطنت کے آخری فرمانروا بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے ان پر بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا اور رنگون کی طرف جلا وطن کر دیا گیا۔ جہاں ۱۸۶۲ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ رنگون میں ہی ان کو دفن کیا گیا (اشتیاق حسین قریشی: A Short History of Pakistan کراچی: کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء ص ۷۸۱-۷۸۲).

برطانوی عہد کے دوران برما میں ہندوستانی مسلمان: پہلی برطانیہ و برما جنگ (۱۸۲۴-۱۸۲۶ء) کے بعد اراکان اور ٹینیسرم پر جب کہ دوسری جنگ (۱۸۵۲ء) میں پیگو، مرٹبان اور رنگون پر برطانوی تسلط قائم ہو جانے پر ہندوستان سے لاکھوں کی تعداد میں افراد نقل مکانی کر کے ان علاقوں میں آ کر آباد ہوگئے۔ ۱۸۸۶ء میں تمام برما کا برطانوی ہندوستان سے الحاق کرکے اسے اس کا ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ برطانیہ کو برما میں انتظامی ڈھانچہ کی تشکیل و تنظیم اور مختلف اداروں اور محکموں کے قیام نیز اس ملک کی تعمیر و ترقی کی غرض سے وسیع پیمانے پر ہنرمند و غیر ہنرمند افرادی قوت درکار تھی۔ برطانوی اس سلسلہ میں ہندوستانی افراد کو مقامی باشندوں پر ترجیح دیتے۔ یہ لوگ برما کی مقامی آبادی کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ مہارت و تعلیم یافتہ بھی تھے۔ چنانچہ برما میں وسیع پیمانے پر افرادی قوت کی طلب کے پیش نظر برطانوی عہد کے ابتدائی سالوں میں ہندوستان کے مختلف شہروں سے روزگار اور تجارتی امکانات کے متلاشی افراد کی اس ملک کی طرف نقل مکانی میں وسیع اضافہ ہوگیا۔ ۱۹۲۱ء تک برما میں آنے والے ہندوستانی تارکین وطن کی تعداد دس لاکھ سے متجاوز ہوچکی تھی۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق برما میں ہندوستانی آبادی ۱۰۱۷،۸۲۵ نفوس پر مشتمل تھی، جن میں سے ۵۲۱، ۶۱۷ افراد کی پیدائش ہندوستان ہی میں واقع ہوئی تھی۔ برما میں ہندوستانی آبادی میں سے تقریباً نصف سے زائد تعداد مسلمانوں کی تھی. برما میں نئے آنے والے ان مسلمان تارکین وطن کی قلیل تعداد نے فوج، پولیس، سول انتظامیہ اور مختلف سرکاری محکموں اور اداروں میں ملازمت اختیار کی تھی جب کہ اس کی بھاری اکثریت ریلوے پٹڑیاں بچھانے، بندرگاہوں پر بار برداری، کان کنی، کارخانوں میں محنت مزدوری اور برطانوی تیل کمپنیوں یا پھر دھان کی کاشت سے منسلک ہوگئی تھی.

ہندوستان سے آنے والے ان مسلمان تارکین وطن کی بدولت اگرچہ اراکان، اراودی دوآبہ اور برما کے دیگر علاقوں کی مسلم آبادی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا، البتہ رنگون اور اس کے مضافات کو مسلمان آبادی کے سب سے بڑے مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ جہاں ان کی کثیر تعداد مختلف کارخانوں میں محنت مزدوری اور وہاں کی بندرگاہ پر تجارتی جہازوں پر سامان لادنے اور اتارنے جیسی سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق رنگون کی کل آبادی ۴۱۵، ۴۰۰ نفوس پر مشتمل تھی، جس میں سے ۹۲۹، ۲۱۲ افراد ہندوستانی تھے اور ان میں اکثریت مسلمانوں کی تھی (D.G.E. Hall: "*A History of South East Asia*" لنڈن: میک ملن ۱۹۵۸ء، ص ۶۴۹-۶۵۲، وبمواقع عدیدہ؛ Nicholas Tarling: *A Concise History of South east Asia*، نیویارک، ۱۹۶۶ء، ص ۲۱۰-۲۱۱: Hugh Tinker: *South Asia: A Short History*، ص

۱۱۸-۱۱۷؛ The Banyan Tree : Hugh Tinker، Overseas Pakistan and Bangladesh Emigrants، From India، دہلی، نیویارک: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۹-۱۴۷؛ John F Cady، کتاب مذکور، ص ۳۸۱-۳۸۴؛ Minority: George A.Thedorson "People in the Union of Burma"، ص ۷-۹).

برطانوی دور میں اگرچہ بین الاقوامی تجارت میں مسلمانوں کا عمل دخل محدود ہو کر رہ گیا تھا، تاہم اندرون ملک تجارت میں انہیں ایک طرح کی بالادستی حاصل رہی۔ رنگون اور دیگر بڑے شہروں کے علاوہ دیہاتوں میں تاجر اور دوکاندار زیادہ تر مسلمان ہی تھے، جو زیادہ تر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان مسلمان تاجروں اور دوکانداروں کے مختلف گروہوں نے بعض خاص خاص اشیا کی تجارت میں نمایاں شہرت حاصل کر لی تھی۔ ملیالم کے مسلمان ریسٹورنٹ (طعام گاہیں) چلانے اور شراب کشید کرنے میں، جب کہ گجراتی مسلمان، کپڑے، برتن، خوردنی اشیا اور ہیرے جواہرات کی تجارت میں غالب حیثیت رکھتے تھے۔ مدراس کے چولیا (Chulia) لوہے اور دیگر دھاتوں سے بنے ہوئے اوزاروں کا کاروبار کرتے تھے جب کہ چٹاگانگ کے مسلمان دریائی جہاز رانی پر حاوی ہوگئے تھے (The Union of Burma : Huge Tinker؛ Nicholas Tarling، کتاب مذکور، ص ۲۱۰-۲۱۱).

انیسویں صدی کے نصف آخر کے دوران میں یونان (Yunnan) سے بھی ہزاروں کی تعداد میں مسلمان نقل مکانی کر کے برما چلے آئے۔ ۱۸۵۵-۱۸۷۷ء کے دوران میں یونان اور شمال مغربی چین کے علاقوں کانسو (Kansu) اور ننگشیا (Ningsia) کے مسلمانوں نے حکمرانوں کے تسلط سے نجات حاصل کرنے اور اپنی آزادی و خودمختاری کے لیے پے در پے متعدد بغاوتیں کیں۔ ۱۸۵۰ء کی دہائی کے وسط (۱۸۵۶ء) میں صوبہ یونان کی مسلمان آبادی نے چینی حکمرانوں کی لوٹ کھسوٹ اور بدانتظامی اور مظالم سے اکتا کر ترکی النسل جرنیل سلطان محمد سلیمان (Tu Wen- Hsiu) کی قیادت میں آزادی کی تحریک برپا کی اور چنگ [Ching (مانچو- Manchu)] اقتدار کو ختم کر کے مسلم سلطنت (Ping- Nan Kuo) کی بنیاد رکھی (۱۸۵۷ء)۔ ینان میں مسلم آبادی کے قدیم مرکز تالی (Ta- Li) کو اس کا دارالحکومت بنایا گیا۔ ۱۸۷۳ء میں چنگ (مانچو) افواج نے یونان کی مسلم سلطنت کو ختم کر کے چینی حکمرانوں کے اقتدار کو از سرنو بحال کر دیا اور مسلم تحریک آزادی کو سختی سے کچل دیا۔ ۱۸۶۴-۱۸۷۷ء اور ۱۸۹۵-۱۸۹۶ء کے دوران میں بھی مانچو حکمرانوں نے یونان اور شمال مغربی چین کے علاقوں قانسو (Kansu)، ننگشیا (Ningsia) اور شنگھائی (Tsinghai) کے مسلمانوں کا خوب قتل عام کیا۔ اس دوران میں برما سے متصل چینی علاقوں سے ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہمسایہ برما کی طرف نقل مکانی کر کے آئے (ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ: دعوتِ اسلام، مترجم: شیخ عنایت اللہ)، لاہور: محکمہ اوقاف، ۱۹۷۲ء، ص ۳۰۶؛ Andrew D.W. Forbes: "Cin- Ho"(Yunnanese): The Muslims of North Thailand، در Journal Institute of The Muslim Minority Affairs، ۷:۲، (جنوری ۱۹۸۶ء)، ۱۷۳-۱۷۶؛ T.B. Irving: Islam Resurgent: The Muslim World Today، لاہور: سہیل اکیڈمی، ۱۹۷۹ء، ص ۲۰۰؛ David G. Atwill: "Islam in the world of Yunnan"، ۲۰-۲۶)۔ ینان سے نقل مکانی کر کے برما آنے والے مسلمانوں نے شن (Shan) اور وا ریاستوں (Wa States) بالخصوص چین برما سرحد کے ساتھ ساتھ جنگلی اور پہاڑی علاقوں کے علاوہ بڑے شہری

مراکز رنگون، مانڈے، تنگئی (Taunggyi)، بھامو، موگوک (Mogok)، اور کنٹنگ (Kentung) وغیرہ میں متعدد چھوٹی چھوٹی نو آبادیاں قائم کر لیں (*The (Yunnanes Chines) "Cin-Ho" Muslims of North Thailand*، ص ۱۷۵)۔ ان چینی مسلمانوں یا (Ch Hui-hui Huimin) کو بالعموم پنتھی (Pan -Thei) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ انگریزی میں عام طور سے اس نام کا ترجمہ (Panthay) کیا گیا ہے۔ برما کے بالائی علاقوں میں یونانی مسلمانوں کی اہم ترین نوآبادی پنگ لانگ (Panglong) تھی جو دریاے سالوین کے مشرقی جانب وا ریاستوں میں لاشیو (Lashio) میں واقع ہے۔ یہ مسلم نوآبادی ینان کی مسلم سلطنت کے سقوط (۱۸۷۳ء) کے دو سال بعد ۱۸۷۵ء میں سلطان سلیمان (Te Wen-Hsiu) کی فوج کے بچے کھچے سپاہیوں اور حامیوں کے ہاتھوں وجود میں آئی۔ ۱۸۹۱ء تک یہ مسلم نوآبادی تقریباً چار سوگھرانوں پر مشتمل تھی۔ پنگ لانگ کے ان نوآبادکاروں میں ینان کی سابقہ اسلامی سلطنت کے ایک ضلع کے گورنر (*Tsung- Kuei*) کے علاوہ سلطان سلیمان کی حکومت کے بعض اعلیٰ عہدیداران بھی شامل تھے۔ یوں اس مسلم نوآبادی کے اکثر مکین مالدار تاجر تھے یا پھر طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ تجارت کے علاوہ شجاعت اور بہادری اور جنگی سازوسامان کے اعتبار سے بھی یہ لوگ مقامی آبادی پر فوقیت رکھتے تھے۔ اقلیت میں ہونے کے باوجود گردوپیش کی مقامی آبادی پر ان کا رعب اور دبدبہ قائم تھا۔ چین اور برطانیہ کے عمل دخل سے محفوظ پنگ لانگ کی اس مسلم آبادی کو بہت زیادہ حد تک سیاسی اعتبار سے خودمختار حیثیت حاصل تھی۔ اس کا نظم و نسق اسی آبادی کے ایک نوجوان شخص کے پاس تھا جب کہ اس کی معاونت اور رہنمائی کے لیے ایسے زعما کی ایک مجلس بھی موجود تھی جو ینان کی مسلم سلطنت میں اعلیٰ مناصب پر فائز رہ چکے تھے۔ پنگ لانگ کے قرب و جوار میں ینانی مسلمانوں نے دو اور دیہات پاچنگ (Pachang) اور پنگ یاؤ (Pangyao) بھی آباد کیے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی آبادی تقریباً اسی سے ایک سو گھرانوں پر مشتمل تھی۔ ان کے مکین افراد چینی مسلمان (Han) (سو سو) تھے۔ یہ پنگ لانگ کے آبادکاروں کے غلام یا پھر ان کے خدام تھے۔ یہ لوگ کاشتکاری کرتے تھے یا پھر کارروانی تجارت میں خچروں پر سامان برداری کا کام کرتے تھے۔ پنگ لانگ کی مسلم آبادی میں آئندہ سالوں میں، بیسویں صدی کے ربع اول کے اختتام تک، بڑی تیزی سے اضافہ ہوا۔ اس کا ایک اہم سبب اس علاقے کی طرف ینان سے مسلم آبادی کی نقل مکانی کے علاوہ ینانیوں کے ہاں آبادی کی شرح افزائش کی فراوانی بھی تھی۔ ینانی مسلمان سنی العقیدہ تھے اور حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ مذہبی اعمال و شعائر کی پابندی کا اہتمام کرتے تھے۔ اس آبادی میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے ایک جامع مسجد کے علاوہ دینی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ جہاں تعلیم و تدریس کا انتظام لکھنؤ سے آنے والے ایک عالم دین مولوی فقیر سید محمد کے سپرد تھا (۱۸۹۲ء)۔ وہ مقامی آبادی کو عربی اور فارسی میں دینی تعلیم دیتے تھے (دیکھیے :Andrew D.W. Forbes: *"History of Panglong, 1875- 1900: "Panthay The:(Chinese Muslim) Settlement in the Burmese wa States"*، در *The Muslim world*، ۷۸:۱ (جنوری ۱۹۸۸ء)، ۳۸-۴۲؛ وہی مصنف (Yunnanese Chinese) ، *The Muslims of Burma*"Panthay"، ص ۳۸۷-۳۹۰).

شن اور کارن جیسے علاقوں میں آباد یونانی

مسلمان قیمتی معدنیات کی دریافت اور کان کنی میں مشغول ہوگئے تھے۔ جب کہ باقی علاقوں میں آباد لوگ تجارت کرتے تھے۔ان یونانی مسلمانوں نے برطانوی دور میں برما کے بالائی علاقوں بالخصوص وا ریاستوں میں تجارت کے تمام اہم شعبوں میں خوب ترقی کی۔ یہ لوگ زیریں برما کے شہری مراکز اور چین کے مختلف علاقوں بالخصوص صوبہ یونان کے درمیان زمینی راہ سے کاروانی تجارت میں بھی خوب متحرک رہے۔ کاروانی تجارت سے وابستہ یہ افراد چین سے افیون، چائے، مختلف دھاتوں سے بنی ہوئی اشیا اور مختلف خوردنی اشیا ، انڈے ، پھل ، میوہ جات ، درآمد کرتے تھے۔ جب کہ برما سے یورپی مصنوعات ، چاول، کپڑا، خام کپاس اور ملبوسات چین کو برآمد کرتے تھے (دیکھیے: "The Panthay" (Yunnanes Chinese) Muslims of Burma ، ص ۳۸۹-۳۹۰).

پنگ لانگ کے علاوہ دیگر علاقوں میں آباد ان یونانی مسلمانوں نے بھی اپنی مساجد اور مدارس قائم کر لیے تھے۔ مانڈلے (Mandalay)، رنگون، اور Myityina میں ان کی تعمیر کردہ متعدد ایسی مساجد موجود ہیں۔ ان میں سے بعض مغول طرز تعمیر کی جب کہ دوسری چینی عمارتی خدوخال کی مظہر ہیں۔ ان مساجد میں جہاں کہیں یونانی ائمہ و خطبا دستیاب نہ تھے وہاں ہندوستانی یا پھر برما کے زیربادی ائمہ و مدرسین دینی معمولات کی بجا آوری پر مامور کیے گئے تھے (حوالہ مذکورہ، ص ۳۹۱)۔ دوسری جنگ عظیم برما میں موجود یونانی مسلمانوں کے لیے بڑی تباہ کن ثابت ہوئی۔ برما پر جاپانی حملوں کے سبب پنگ لانگ کی مسلم نوآبادی پامال ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ بہت سے پنتھی "یونان" کی طرف واپس جانے یا پھر سرحد پار کر کے تھائی لینڈ اور لاؤس کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ چین میں اشتراکی انقلاب (۱۹۴۹ء) کے بعد ایک بار پھر ہزاروں کی تعداد میں مسلمان (صوبہ یونان اور دیگر علاقوں سے) جائے پناہ کی تلاش میں برما چلے آئے اور مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے۔ تاہم برما میں ۱۹۳۰ء کی دہائی سے ان مسلمانوں کے لیے سیاسی و معاشی اعتبار سے حالات سازگار نہ رہے تھے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں برما میں قوم پرست تحریک کے عروج کے سبب ان کو بھی برما میں آباد اپنے ہندوستانی ہم مذہب افراد کی طرح مقامی آبادی کی طرف سے غصہ و نفرت اور معاندانہ رویہ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مزید براں بالائی برما کے اہم مرکز لاشیو (Lashio) اور کنگ منگ (Kung- Mung) کے مابین برما شاہراہ کی تعمیر سے برما کے مابین یونان سرحدی علاقوں میں انہیں حاصل شدہ روایتی تجارتی غلبہ بھی ختم ہوگیا تھا۔ (حوالہ مذکور، ص ۳۹۰-۳۹۱).

بدھ، مسلم کشمکش اور برما سے مسلم آبادی کا انخلا: ہندوستانی تارکین وطن نے، جن کی تعداد ۱۹۲۱ء تک دس لاکھ سے متجاوز ہوچکی تھی، برما کے وسائل معیشت و تجارت، بالخصوص اندرونی تجارت اور سرکاری ملازمتوں وغیرہ پر تسلط و بالادستی قائم کرلی تھی۔ جس نے برما کی مقامی آبادی کے ہاں، جو غربت و پس ماندگی اور بے روزگاری سے دوچار تھی، احساس محرومی کو جنم دیا۔ ان غیر ملکیوں کی جن میں مسلمان پیش پیش تھے، برمی عورتوں سے شادیوں اور مقامی افراد سے وسیع پیمانے پر زرعی زمینوں اور دیگر املاک کی خریداری نے اس احساس محرومی کو شدید تر بنا دیا۔ ان عوامل نے ملک میں قوم پرست خیالات و رجحانات اور غیر ملکیوں ، (ہندوستانیوں) کے خلاف غصہ و نفرت کے جذبات کو پروان چڑھایا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں مقامی آبادی اور غیر ملکیوں کے مابین شدید کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اس کا عملی اظہار پہلی بار ۱۹۳۰ء میں فسادات کی صورت میں

ہوا۔ ان فسادات میں دو ہزار سے زائد افراد کو ہراساں کر کے ان کے مکانات سے بے دخل کر دیا گیا۔ ان حالات میں جون ۱۹۳۰ء میں صرف رنگون شہر سے ۳۳ ہزار سے زائد افراد اپنے آبائی وطن ہندوستان کی طرف نقل مکانی کر گئے (*The Banyan Tree* : Hugh Tinker، ص ۱۴۴؛ Nicholas Tarling : کتاب مذکور، ص ۲۲۱-۲۰۶؛ Muhammad Yunus : *A History of Arakan Past and Present*، ص ۱۰۲- ۱۰۳)۔ برما میں ان قوم پرست رجحانات نے جلد ہی بدھ مذہب و ثقافت کے احیا کی علمبردار تحریک کی صورت اختیار کر لی، جس نے مسلمانوں کو خصوصی طور سے ہدف بنا لیا۔

مسلم مخالف بدھ مذہبی تنظیموں کا قیام اور مسلم کش فسادات: ۱۹۳۰ء کی دہائی کے دوران میں بدھ بھکشوؤں نے دو بڑی تنظیمیں All Burma Young Monks Association (قائم شدہ ۱۹۳۸ء)، جو اپنے برمی نام Yahanpyu Aphwe سے مشہور ہوئی اور The Thathana Mamaka Young Monks Association قائم کیں۔ مؤخرالذکر رنگون میں سرگرم عمل تھی اس کی مانڈلے اور دیگر شہروں میں برانچیں قائم کی گئیں۔ یہ دونوں تنظیمیں مسلم مخالف سرگرمیوں میں پیش پیش رہیں۔ مؤخر الذکر تنظیم نے ۱۹۲۸ء کے فسادات، جن میں مسلم آبادی کو نشانہ بنایا گیا تھا، بھڑکانے میں بھی مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اس تنظیم کا اساسی نصب العین ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے بدھ مت کو لاحق خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے بدھ آبادی بالخصوص مذہبی عناصر کو منظم و متحرک کرنا تھا (Donald E. Smith : *Religion and Politics in Burma*، پرنسٹن (نیو جرسی): پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۵ء، ص ۱۸۹-۱۹۰)۔ قوم پرست سیاسی رہنماؤں اور بدھ مذہبی عناصر نے مسلم مخالف جذبات کو بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا۔ برما کے اخبارات نے مسلمانوں کو غاصبوں اور قزاقوں کے طور پر پیش کرنے کے علاوہ دین اسلام کی مخالفت و تردید میں وسیع پیمانے پر کتب و رسائل اور اخبارات میں مضامین شائع کر کے رائے عامہ کو ان کے خلاف خوب مشتعل کر دیا۔ بدھ مذہبی رہنماؤں اور بعض مسلمان مصنفین کے مابین مذہبی بحث و مجادلہ نے اس صورت حال کو مزید بگاڑ دیا۔ جس کا نتیجہ جولائی، اگست ۱۹۳۸ء کے ملک گیر مسلم کش فسادات کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ان فسادات میں رنگون، مانڈلے، شویبو (Shwebo) اور سگینگ (Saigaing یا Yenangyaung) کے علاوہ دیگر شہروں اور قصبات میں کثیر تعداد میں مسلمانوں کی ملکیتی دوکانوں کو نذر آتش کرنے کے علاوہ دیگر املاک کو شدید نقصان پہنچایا گیا۔ اس اثنا میں ۱۴۲ مسلمان قتل اور ۵۲۰ شدید زخمی ہوے۔ بدھ بھکشوؤں کی تنظیم All Burmese Council of Young Monks Association کے ارکان نے ان فسادات میں مرکزی کردار ادا کیا (Bruce Matheews: *Burddhism Under A Military Regime*، در *Asian Survey*، ج ۳۳: ۴ (اپریل ۱۹۹۳ء)، ص ۴۱۲)۔

برما میں ہندو مسلم تعلقات بالعموم اچھے رہے اور بعض مواقع پر وہ اپنے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے ایک دوسرے سے تعاون بھی کرتے رہے۔ تاہم ۱۹۳۸-۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء کے فسادات کے دوران میں ان کے مابین شدید جھڑپیں ہوئیں۔ ان فسادات میں بہت سے ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف برمیوں کا ساتھ دیا۔

ان (۱۹۳۸ء) کے فسادات میں ۱۱۳ سے زائد مساجد کو جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ مزیدبراں مسلمان آبادی کو وسیع پیمانے پر جانی و مالی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ چنانچہ گیارہ ہزار سے زائد افراد اپنا کاروبار تباہ ہو جانے

کے سبب مفلس و قلاش ہو کر ہندوستان واپس لوٹ آنے پر مجبور ہوئے۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں بھی اسی نوعیت کے فسادات میں بیسیوں افراد کو ہلاک کیا گیا۔ اس بار بھی ہزاروں افراد ترک سکونت پر مجبور ہوئے۔ ان ناخوشگوار واقعات کے بعد حکومت نے برما کی قوم پرست سیاسی جماعت اے۔ایف۔پی۔ ایف۔ ایل (Anti- Fascist Peoples Freedom League) کے مطالبہ پر بدھ خواتین کی غیر ملکیوں سے شادی اور وراثت سے متعلق ایک نیا قانون، جس کا مقصد مسلمان مردوں کو بدھ برمی عورتوں سے نکاح سے باز رکھنا تھا، متعارف کرانے کے علاوہ ہندوستان سے تارکین وطن کی آمد کو محدود کر دیا (*Religion and Politics in Burma* Donald E.Smith، ص ۱۰۹- iii؛ Hugh Tinker: *The Banyan Tree*، ص ۱۴۴-۱۴۶؛ John F. Cady: کتاب مذکور، ص ۳۸۱-۳۸۴، ۳۹۸، ۵۱۳-۵۱۶، ۵۲۴-۵۲۷؛ Nicholas Tarling: کتاب مذکور، ص ۲۱۲-۲۱۶؛ Moshe Yegar: کتاب مذکور، ص ۳۳-۳۷)۔

جاپانی تسلط اور ہندوستانی آبادی کا انخلاء: دسمبر ۱۹۴۱ء میں رنگون پر جاپانی فضائی حملوں اور مئی ۱۹۴۲ء میں برما پر اس کے قبضے کے بعد وسیع پیمانے پر ہندوستانی آبادی کا انخلاء عمل میں آیا۔ تقریباً پانچ لاکھ ہندوستانی افراد جن میں ایک محتاط اندازے کے مطابق نصف تعداد مسلمانوں پر مشتمل تھی، اپنے آبائی وطن لوٹ آئے جب کہ پچاس ہزار افراد راستے ہی میں لقمۂ اجل بن گئے۔ برما سے نقل مکانی پر مجبور تاجر اور کاروباری حضرات کی بھاری اکثریت نقدی و زیورات کے سوا باقی تمام کاروبار اور جائیداد و املاک، جن کا تخمینہ ۱۵۰ تا ۳۷۵ ملین برطانوی پاؤنڈ لگایا گیا [جب کہ برما میں اس وقت برطانیہ کی کل سرمایہ کاری ۴۰ تا ۵۰ ملین پاؤنڈ تھی] پیچھے چھوڑ آئے اور قلاش و مفلس ہو کر رہ گئے (Hugh Tinker: *The Banyan Tree*، ص ۱۴۴-۱۴۵؛ Hugh Tinker: *A Forgotton Long March*: *The Indian Exodus، From Burma، 1942*، در *Journal of South Asian Studies* (سنگاپور): ۶:۱، (مارچ ۱۹۷۵ء)، ص ۱-۱۵)۔ ۱۹۴۲ء میں اس وسیع پیمانے پر آبادی کے انخلا کے بعد برما میں ہندوستانی آبادی، جو ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۰،۱۷،۸۲۵ نفوس پر مشتمل تھی، نصف رہ گئی۔ تاہم برما سے جاپانی تسلط کے خاتمے اور برطانوی اقتدار کی بحالی کے بعد حکومت کو رنگون کی بندرگاہ پر جہازوں پر سامان لادنے اور اتارنے اور شہروں میں ذرائع نقل و حمل اور دیگر شہری سہولیات کی از سرنو بحالی کے لیے فوج کی نگرانی میں ہندوستان سے افرادی قوت کو واپس بلانا پڑا۔ اپریل ۱۹۴۷ء تک ۲،۴۵،۳۷۷ افراد جن میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو ۱۹۴۲ء میں اپنے قدیم وطن واپس لوٹنے پر مجبور ہوتے تھے، برما پہنچے، جب کہ اس دوران میں ملکی سیاسی حالات کے پیش نظر مزید ۱،۴۱،۷۲۸ افراد برما چھوڑ کر چلے گئے۔ جون ۱۹۴۷ء میں برما کے قوم پرست رہنما آنگ سان (Aung San) کی سربراہی میں اے۔ ایف۔ پی ۔ ایف۔ ایل (A.F.P.F.L) کی حکومت نے برما میں غیر ملکی تارکین وطن کی آمد پر ایک ہنگامی امیگریشن ایکٹ کے تحت سخت پابندی عائد کر دی (*The Banyan Tree*، ص ۱۴۶)۔ ہندوستان پر سے برطانوی تسلط کے خاتمے اور دو آزاد مملکتوں، پاکستان اور بھارت کے قیام کے بعد ہزاروں کی تعداد میں مسلمان جو برما میں اپنا مستقبل مخدوش خیال کرتے تھے اور جنھیں ان نوآزاد شدہ مملکتوں میں بہتر سیاسی و معاشی اور تجارتی امکانات یا پھر سرکاری ملازمتوں کی توقع تھی، برما سے بنگال، مغربی پاکستان اور بھارت میں اپنے آبائی علاقوں کی طرف واپس آ گئے۔

برما میں مسلمانوں کی دینی ، ثقافتی اور سماجی و سیاسی

سرگرمیاں: اگرچہ برما کی قدیم مسلمان آبادی معاشی اعتبار سے برصغیر پاک و ہند کی مسلم آبادی کے مقابلے میں خوش حال تھی تاہم وہ ثقافتی و سماجی اعتبار سے پس ماندہ اور سیاسی اعتبار سے ایک غیر منظم اقلیت تھی۔ دینی و تعلیمی اور علمی و ادبی حوالے سے بھی انہوں نے کسی مستعدی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ برطانوی دور میں ہندوستان سے آنے والے نئے مسلمان تارکین وطن کی آمد کے سبب، جن کی تعداد برما میں پہلے سے موجود مسلم آبادی کے مقابلے میں دوگنا سے بھی زائد ہوگئی تھی اور جو تہذیبی و معاشرتی اعتبار سے قدرے بہتر حالت میں تھے، اس ملک کی مسلمان آبادی کی دینی و تعلیمی، ثقافتی و سماجی اور سیاسی زندگی میں دور رس تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ نئے آنے والے مسلمانوں نے، جو بدھ اکثریتی ملک میں اپنے جداگانہ دینی و تہذیبی تشخص کے تحفظ و بقا کے لیے زیادہ حساس تھے، اپنی دینی و تعلیمی اور سماجی و سیاسی سرگرمیوں کو منظم و مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ملک کے مختلف شہروں خصوصاً رنگون میں نئی مساجد تعمیر کیں اور متعدد دینی مدارس قائم کیے۔ ان مساجد کے لیے ائمہ وخطبا اور مدارس کے اساتذہ کی تعلیم و تربیت کا ہندوستان کے دینی مدارس و جامعات میں انتظام کیا۔ ان ہندوستانی مسلمانوں نے جن میں گجرات کے شہر راندھیر کے سنی بوہرے اور سورت، ضلع سوراشٹر کے میمن، مالابار کے چولیا اور جنوبی ہند کے صوبہ تامل ناڈو کے تامل پیش پیش تھے، بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں کے دوران میں تعلیمی و ثقافتی اور سماجی بہبود کی تنظیموں انجمنوں کا ایک وسیع جال بچھا دیا۔ ان نو قائم شدہ انجمنوں نے جن میں راندھیر سنی بوہرا سورتی محمڈن ایسوسی ایشن، (قائم شدہ ۱۹۰۸ء)، 'رنگون میمن جماعت' (۱۹۰۸ء)، 'چولیا مسلم ایسوسی ایشن' (۱۹۱۲ء)، 'مالا بار مسلم ایسوسی ایشن' (۱۹۱۸ء)، 'آل برما تامل مسلم ایسوسی ایشن' پیش پیش تھیں، مسلمان نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے رنگون اور دیگر شہروں میں اسکول، کتب خانے اور اسپورٹس کلب قائم کرنے کے علاوہ کافی تعداد میں سماجی بہبود کے دیگر ادارے، ہسپتال، ڈسپنسریاں اور یتیم خانے قائم کیے۔ برطانوی دور میں صرف رنگون شہر میں پانچ یتیم خانے موجود تھے، جو مساجد سے متصل جگہوں پر قائم کیے گئے تھے۔ ان کا انتظام و انصرام متعلقہ مساجد کے ائمہ و خطبا کے پاس تھا۔ ان مسلم انجمنوں نے قبرستانوں کی دیکھ بھال نیز فقراء و مساکین اور بیواؤں کی فلاح و بہبود کے علاوہ برما کی مسلم و غیر مسلم آبادی کی فلاح و بہبود بالخصوص انہیں طبی سہولیات کی فراہمی اور ان کے تعلیم کے منصوبوں میں بھی تعاون کیا۔ مذکورہ مسلم گروہوں کے علاوہ داؤدی بوہرا جماعت، رنگون کی شیعہ برادری اور اسماعیلیوں نے بھی اپنے اپنے گروہ کی فلاح کے لیے چند انجمنیں قائم کر لیں تھیں۔ جنگ عظیم دوم تک بنگالی مسلمانوں اور برما کے زیر بادیوں نے بھی اسی نوعیت کی انجمنیں قائم کیں (Moshe Yegar : کتاب مذکور، ص ۴۰-۴۵؛ وہی مصنف "The Muslim of Burma"، در The Crescent in the East، (مدیر) : Raphael Israeli، لندن: کرزن پریس، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۵-۱۱۷).

سیاسی سرگرمیاں اور قانونی و دستوری حقوق کی جدوجہد: برما میں مذکورہ انجمنیں سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہیں۔ ان کی تمام تر توجہ تعلیمی، ثقافتی اور سماجی بہبود کے منصوبوں تک محدود رہی۔ تاہم اس دور میں ہندوستان میں رونما ہونے والی سیاسی بیداری کے اثرات برما پر بھی مرتب ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ہندوستان میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام (۱۹۰۵ء) کے چند سال بعد برما میں انڈین نیشنل کانگریس کی صوبائی شاخ کے مقابلے میں اس (مسلم لیگ) کی صوبائی شاخ قائم

کی گئی (۱۹۰۹ء)۔ اسی سال (دسمبر ۱۹۰۹ء) کے دوران میں برما میں مسلمانوں نے برما مسلم سوسائٹی (Burma Muslim Society) کے نام سے ایک اور سیاسی تنظیم بھی قائم کی۔ مسلم لیگ اگرچہ ایک سیاسی جماعت کے طور پر برما میں تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) تک قائم رہی تاہم یہ برما کی سیاست میں مسلمانوں کی نمائندگی کے سلسلہ میں کوئی اہم کردار ادا کرنے سے قاصر رہی (Paul Kratoska: *"Nationalism and Modernist Reform"* در Nicholas Tarling(مدیر): *The Cambridge History of Southeast Asia*، کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۹ء، ج ۲، حصہ اوّل، ص۳۰۳؛ Moshe Yegar : کتاب مذکور، ص ۴۷-۴۸)۔ مسلم لیگ کے برعکس برمی مسلمانوں (زیربادیوں) کی قائم کردہ سیاسی تنظیم 'برما مسلم سوسائٹی' (Burma Muslim Society ، قائم شدہ ۱۹۰۹ء) برما میں مسلمانوں کے سیاسی و دستوری حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے بڑے جوش و جذبہ سے سرگرم عمل رہی۔ دستوری اصلاحات کے سلسلہ میں لارڈ مانٹیگو چیمسفورڈ (۱۹۱۶ء) کی ہندوستان آمد (۱۹۱۷ء) کے موقع پر اس نے برما کی صوبائی قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے 'جداگانہ نمائندگی کا مطالبہ کیا۔ اگرچہ بی۔ ایم ۔ ایس کے اس مطالبہ کو پذیرائی حاصل نہ ہو سکی تاہم برما میں برطانوی انتظامیہ نے "زیربادیوں" کو اپنے اپنے رہائشی اضلاع سے قانون ساز کونسل کے انتخاب کے لیے اہل قرار دے دیا۔ برما مسلم سوسائٹی نے سرجان سائمن کی سربراہی میں ہندوستان آنے والے دستوری کمیشن (۱۹۲۹-۱۹۳۰ء) کو بھی اس کی برما آمد پر دستوری اصلاحات کے حوالے سے اپنے مطالبات پیش کیے۔ چنانچہ دستوری اصلاحات و سفارشات مرتب کرنے کی غرض سے (کمیشن کی معاونت کے لیے) برما کی صوبائی قانون ساز کونسل کے اراکین پر مشتمل جس کمیٹی کا تقرر عمل میں لایا گیا تھا اس میں دو مسلم ارکان ، یوسف اور مرزا محمد رفیع کو بھی شامل کیا گیا تھا (Moshe Yegar : کتاب مذکور، ص ۵۸-۵۹)۔ سائمن کمیشن سے برما کے مسلمان نمائندوں نے ان تمام سیاسی حقوق اور خصوصی دستوری تحفظات کا مطالبہ کیا تھا جو اس ملک میں دیگر اقلیات کو حاصل تھے۔ یہ مطالبات ان کی برمی شہریت کو تسلیم کرنے اور تمام ضلعی اداروں، میونسپلٹیوں، تعلیمی بورڈوں اور دیگر حکومتی و دستوری اداروں بالخصوص مجلس قانون ساز (Legislative Council) میں جداگانہ حق نمائندگی سے متعلق تھے۔ سائمن کمیشن نے مسلمان اقلیت کے بعض مطالبات تسلیم کر لیے اور مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی دینے اور ان کے لیے نشستیں مخصوص کرنے کی سفارش کی۔ تاہم برما کی غیر مسلم اکثریت کے نمائندوں کی طرف سے شدید مخالفت پر حکومت برطانیہ نے اسے یکسر نظرانداز کر دیا (Paul Kratoska: *Nationalism and Modernist Reform*، ص ۳۰۳؛ Moshe Yegar : ص ۵۷- ۶۱)۔ لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس (۱۹۳۲ء) میں مسلمانوں کی نمائندگی "برما نیشنل پارٹی" کے ایک مسلمان رکن او آنگ ہن (U Aung Hin) نے کی، جو پیشہ کے اعتبار سے ایک وکیل تھے۔ اس کانفرنس میں برما کی اقلیات [ہندی، یو پی اور مسلمان] نے خصوصی دستوری اور قانونی ضمانتیں فراہم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ کانفرنس، تارکین وطن سے متعلق قوانین، مجلس قانون ساز میں اقلیات کی نمائندگی اور انتخابات میں ان کے حق رائے دہی جیسے مسائل پر متعلقہ فریقوں کے درمیان شدید اختلافات کے سبب تعطل کا شکار ہوگئی۔ البتہ اس میں برما کی ہندوستان سے علیحدگی کا معاملہ طے پا گیا۔ برما کے مسلمان رہنماؤں کی طرف سے اس امر کی شدید مخالفت کی گئی۔ سائمن کمیشن اور لندن گول میز کانفرنس کی سفارشات کی روشنی میں

برطانوی پارلیمنٹ نے برما کے لیے ایک دستور کی ۱۹۳۵ء میں منظوری دے دی۔ اس دستور میں برما کی لسانی و نسلی اقلیات کو بشمول اینگلو برمن افراد کے، دستور ساز اسمبلی میں جداگانہ نمائندگی کا حق دیا گیا جب کہ مسلم اقلیت کے بارے میں یکسر خاموشی اختیار کی گئی۔ اس پر برما مسلم سوسائٹی کی قیادت میں برما کے مختلف شہروں میں مسلمانوں نے احتجاجی مظاہرے کیے۔ اسی طرح برما کی ہندوستان سے علیحدگی کے سلسلہ میں برطانوی حکام نے جو تجاویز مرتب کیں (۱۹۳۶ء) ان میں بھی مسلمانوں کی قانونی و آئینی حقوق و حیثیت کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی (Moshe Yegar : کتاب مذکور، ص ۶۲-۶۳)۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپانی افواج کے برما پر تسلط کے بعد مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیاں ایک نئے دور میں داخل ہوگئیں۔ جاپانیوں نے برما میں تمام ہندوستانیوں سے ہمدردانہ و دوستانہ رویہ اختیار کیا اور ملک میں امن و امان کو بحال کر کے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے خلاف برمیوں کے حملوں کو، جو عبوری دور (برطانوی اقتدار کے خاتمے اور جاپانی اختیار و اقتدار کے قیام کے دوران) میں ایک عام معمول بن گئے تھے، روک دیا۔ جاپانیوں نے اپنے سیاسی و جنگی مقاصد (ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک سے برطانوی تسلط کے خاتمہ) کے پیش نظر ان علاقوں میں آباد ہندوستانیوں اور خصوصاً برطانوی حکومت کی طرف سے ان علاقوں کی طرف جلاوطن کیے ہوے افراد پر مشتمل ایک فوج منظم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس مقصد سے بنکاک میں سبھاش چندرا بوس کی قیادت میں آزادی ہند لیگ (Indian Independence League- IIL) قائم (دسمبر ۱۹۴۱ء) ہوئی۔ اس کی ایک شاخ برما میں بھی قائم کی گئی جس کا صدر برما کی صوبائی مجلس قانون ساز کے ایک سابق مسلمان رکن ایم۔ اے کریم غنی کو مقرر کیا گیا۔ برما میں کافی تعداد میں ہندوستانی مسلمانوں نے برطانوی استعمار کے خلاف اس تحریک میں شمولیت اختیار کی، تاہم برمی مسلمانوں (زیر بادیوں) میں اس نوعیت کا جوش و خروش مفقود رہا۔ میمن اور اسماعیلی بھی اس سے کم و بیش الگ تھلگ رہے۔ مختلف اضلاع اور شہروں میں لیگ برائے آزادی ہند کی قائم شاخوں کے عہدوں پر اکثر و بیشتر متمول مسلمان رہنماؤں کو مقرر کیا گیا۔ لیگ نے برطانیہ کے خلاف عملی جدوجہد کی غرض سے انڈین نیشنل آرمی (*Indian National Army*) (*INA*-) کے دستے منظم کیے (۱۹۴۲-۴۳ء)۔ ان فوجی دستوں میں شمولیت اختیار کرنے والوں کی ایک معتدبہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ ان میں سے متعدد کو اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز کیا گیا۔ جولائی ۱۹۴۴ء میں سبھاش چندرا بوس نے رنگون میں سابق مغل بادشاہ کے مزار کی بھی زیارت کی۔ اس موقع پر ان کے مقبرہ کے سامنے انڈین نیشنل آرمی کی ایک پریڈ بھی منعقد ہوئی۔ انڈین نیشنل آرمی کے ان دستوں نے برطانوی افواج کے خلاف جب کہ وہ برما پر اپنے تسلط کی بحالی کے لیے جاپانیوں کے خلاف معرکہ آراء تھیں، لڑائی میں بڑی بہادری و پامردی کا مظاہرہ کیا۔ تاہم برما پر برطانوی تسلط کے بحال ہوتے ہی اس تحریک کا شیرازہ بکھر گیا (*Subhas Chandra*:S.R. Bakshi، نئی دہلی: انمول پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء ص، ۲۵۰-۳۰۴، خصوصاً ۲۸۷-۲۸۸؛ Moshe Yegar: کتاب مذکور، ص ۶۸-۶۹)۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر برما کی قوم پرست تحریک کے رہنماؤں نے جن میں آنگ سان (Aung San) اور ایک سابق مسلمان طالب علم رہنما اُو رشید پیش پیش تھے، فوج برائے آزادی برما ("Burma Independence Army") تشکیل دی۔ اس فوج نے برما پر سے برطانوی اقتدار کی بساط لپیٹنے کے لیے برطانوی فوج کے خلاف جاپانی افواج کے شانہ بشانہ جنگ کی۔ جاپان نے برما پر قبضہ حاصل

کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں برما کو ایک آزاد جمہوریہ (Independent Republic) قرار دے دیا، جس کا صدر ڈاکٹر باتھا (Ba Thaw) کو، جب کہ آنگ سان کو وزیر دفاع اور اونو (U Nnu) کو وزیر خارجہ مقرر کیا گیا (Sir Richard Allen : *Recent Developments In Burma* ، در *Journal of the Royal Asian Society* ، ۵۲ *L I I* :۱ (جنوری ۱۹۶۵ء)، ص ۹-۱۰)۔ برطانوی حکومت کی طرف سے انڈین نیشنل آرمی کے مسلمان افسران پر بغاوت کے جرم میں مقدمات قائم کیے گئے اور انہیں قید و بند کی سزائیں دی گئیں (Moshe Yegar: کتاب مذکور، ص ۶۹).

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وائسرائے ہند و برما کا منصب سنبھالنے کے بعد برما کے سیاسی مستقبل کے تصفیے کے لیے قوم پرست رہنماؤں سے مذاکرات کی داغ بیل ڈالی۔ دریں حالات مسلمان سیاسی رہنماؤں نے مستقبل قریب میں آزاد ہونے والے اس ملک میں مسلمان اقلیت کے قانونی و دستوری حیثیت کے تعین اور ان کے حقوق و مفادات کے تحفظ کی غرض سے متعدد نئی سیاسی تنظیمیں قائم کر لیں۔ ان نو قائم شدہ تنظیموں میں سے برما مسلم کانگرس (Burma Muslim Congress: BME)، جو دراصل قوم پرست مسلم رہنماؤں کی جماعت تھی، نے برما کی اہم سیاسی جماعت اے۔ ایف۔ پی۔ ایف۔ ایل۔ سے اتحاد و اشتراک عمل کر لیا۔ جنگ کے بعد برطانوی حکام کی طرف سے برما میں جو ایک عبوری حکومت تشکیل دی گئی تھی۔ اس میں قوم پرست تحریک اے۔ ایف۔ پی۔ ایف۔ ایل کے رہنما آنگ سان (Aung San) کو وزیراعظم جب کہ برما مسلم کانگرس کے قائد عبدالرزاق کو وزیر تعلیم و منصوبہ بندی مقرر کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں منعقدہ عام انتخابات میں برما مسلم کانگرس کے دو رہنما عبدالرزاق اور عبداللطیف دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں یہ دونوں رہنما کابینہ کے دیگر ارکان کے ساتھ ایک قاتلانہ حملے میں ہلاک ہوگئے۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کو سایا عبدالرزاق کے قتل کے بعد ایک دوسرے قوم پرست مسلمان رہنما عبداللطیف (Khin Maung Lat) کو بی ۔ ایم۔ سی کا سربراہ مقرر کیا گیا Huge Tinker): *Burma: the Struggle for Independence. 1944-1948*، لنڈن: ہرمیجسٹی (Hermajesty's) سٹیشنری آفس، ۱۹۸۴ء، ج ۲، ص ۹۱۹-۹۲۰؛ (Moshe Yegar: کتاب مذکور، ص ۷۳- ۷۹؛ Janelle M.Diller : *"Constitutional Reform in a Repressive State"* ،در *Asian Survey* ، ۳۳:۴ (اپریل ۱۹۹۳ء)، ص ۳۹۴-۳۹۵).

مسلمان آزاد برما میں: برطانوی اقتدار کے خاتمے (جنوری ۱۹۴۸ء) کے بعد آزاد برما میں مسلمانوں کو ابتلاء و آزمائش کے ایک نئے دور سے دوچار ہونا پڑا۔ برما کی قوم پرست جماعت اے. ایف. پی. ایف. ایل اور بدھ مذہبی رہنماؤں نے گزشتہ دو دھائیوں سے ہندوستانی تارکین وطن اور خصوصاً مسلمانوں کے بارے میں بعض معاشی و سیاسی اسباب و وجوہ کی بناء پر جو معاندانہ و مخالفانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا اور مقامی غیر مسلم آبادی میں ان کے بارے میں جس نفرت اور بے زاری کے جذبات کو پروان چڑھایا تھا، اس کے سبب مسلمانوں کو آزاد برما میں انتہائی ناموافق فضا و ماحول کا سامنا تھا۔ برما کی بدھ مذہبی و سیاسی تنظیمیں انہیں (مسلمانوں کو) اپنے ملک میں مساوی سیاسی، قانونی اور سماجی حیثیت دینے کو ہرگز تیار نہ تھیں Bruce Matthews) : *"Buddhism Under A Military Regime"* ، ص ۴۱۲).

اس ناموافق ماحول میں حکومت کے بعض انتظامی و سیاسی اقدامات نے مسلمانوں کو شدید مسائل و مشکلات سے

دوچار کیا۔ بطور خاص مسلمانوں کو غیر ملکی قرار دے کر برما کی شہریت کے حصول کا پابند کیا گیا جو ایک پیچیدہ نوعیت کا قانونی و دستاویزی معاملہ تھا۔ آزادی کے بعد تشکیل پانے والی پہلی حکومت میں اگرچہ قوم پرست جماعت ۔ اے ۔ ایف ۔ پی ۔ ایف ۔ ایل، کے ہم خیال دو مسلمان رہنماؤں او رشید (U. Rashid) اور برما مسلم کانگریس کے سربراہ عبداللطیف (U. Khin Maung lat)کو شامل کیا گیا۔ اول الذکر کو وزارت تعمیرات و محنت (Housing & Labour) کا جب کہ موخر الذکر کو وزارت عدل (Ministry of Justice) کا قلم دان سونپا گیا تھا۔ تاہم بحیثیت مجموعی مسلمان اقلیت کو سول سروس، تجارت و معیشت، زراعت اور ملکی کی سماجی زندگی میں امتیازی برتاؤ کا سامنا تھا۔ نئی حکومت نے مسلمانوں کو دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ ساتھ سرکاری ملازمتوں مثلاً محکمہ ڈاک و تار، ریلوے اور بنکوں سے نکال باہر کیا۔ سرکاری اداروں اور مختلف محکموں میں بدھ افراد کا رویہ مسلمانوں کے بارے میں مخاصمانہ رہا۔ تجارت اور صنعت کے میدان میں ان کی حیثیت کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مسلمان تاجروں اور صنعت کاروں پر درآمدات و برآمدات کے اجازت ناموں (پرمٹوں) اور نئے کارخانے لگانے کے لیے لائسنسوں کے حصول پر متعدد نوعیت کی قدغنیں عائد کی گئیں۔ رنگون شہر میں مسلمان تاجروں کی مشہور و معروف مارکیٹ 'سورتی بازار' کا نام بدل کر Bogyoke Market رکھ دیا گیا اور وہاں کی تمام دوکانیں اور اسٹال برمی تاجروں کی ملکیت میں دے دیئے گئے۔ ۱۹۴۹ء کے دوران ملک کی متعدد نسلی و لسانی اقلیات نے مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کر ڈالی اور مانڈلے سمیت متعدد شہروں پر قبضہ کر لیا۔ ملک میں جاری اس شورش اور بدامنی سے مسلم آبادی کو شدید زک پہنچی۔ جس کے بعد ہزاروں کی تعداد میں مسلمان اپنی املاک اور قیمتی اثاثہ جات اونے پونے داموں فروخت کر کے ہندوستان اور پاکستان کی طرف نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے۔ برما سے نقل مکانی کا یہ سلسلہ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں برابر جاری رہا۔ مذکورہ اسباب کی بدولت سرکاری محکموں اور حکومتی اداروں میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم رہ گئی جبکہ ان کی تجارتی و صنعتی سرگرمیوں کا حجم بھی سکڑتا چلا گیا (Moshe Yegar: کتاب مذکور، ص ۱۱۰-۱۱۳؛ Hugh Tinker: *The Banyan Tree*، ص ۱۴۶-۱۴۷؛ وہی مصنف: *The Union of Burma*، ص ۱۸۷-۱۸۹).

برما میں بدھ مذہب اور تہذیب و ثقافت کا احیاء: برما کی قوم پرست تحریک درحقیقت بہت زیادہ حد تک بدھ مذہب و ثقافت کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک تھی۔ چنانچہ آزادی کے بعد وزیراعظم اونو (U - N U)کے دور حکومت (۱۹۴۸-۱۹۶۲ء) میں مختلف النوع حکومتی اقدامات اور جامع و وسیع قانون سازی کے ذریعے بدھ مذہبی عناصر اور اداروں کی تنظیم نو کی گئی۔ ملک میں بدھ مت کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا گیا۔ سرکاری سرپرستی میں ۱۹۵۴-۱۹۵۶ء کے دوران میں متعدد بدھ کونسلوں کا انعقاد عمل میں آیا۔ ان کونسلوں میں بدھ مذہبی روایات کے تحفظ و احیاء کی غرض سے بدھ مت کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دینے سمیت متعدد دیگر تجاویز منظور کی گئیں۔ بدھ مذہبی تنظیموں کے مطالبے پر برما کی پارلیمنٹ نے ایک آئینی ترمیم کے ذریعے بدھ مت کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دیا (اگست ۱۹۶۱ء) مزید براں اس نے بدھ مت کے فروغ کے بل (State Religion Promotion Bill) کی منظوری دے کر حکومت کو ملک میں بدھ مت کی ترویج و اشاعت کا پابند کر دیا۔ اس بل کے تحت تمام سرکاری اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور تربیت اساتذہ کے اداروں میں بدھ مقدس مذہبی کتب کی تدریس لازمی قرار پائی۔ ملک کی آئندہ تعلیمی پالیسی میں نئے

پرائمری اسکولوں کے قیام کے لیے بدھ خانقاہوں کو اولین ترجیح دی گئی۔ دیگر تعلیمی اداروں میں پالی مقدس کتاب کی تدریس کے علاوہ مذہبی خطبات و مواعظ کا انتظام بھی کیا جانے لگا (Donald E. Smith: *India As a Secular State*، نیوجرسی: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۳ء، ص ۷، ۴۳-۴۴، ۵۰: وہی مصنف: *Religion and Politics in Burma*، ۱۴۰-۱۸۰، ۲۵۳-۲۶۱).

ملک میں اس نئی تعلیمی پالیسی کو مسلمان اپنے بچوں کے دینی و تہذیبی تشخص کی بقا کے لیے ایک سنگین خطرہ گردانتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کی سیاسی و دینی تنظیموں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ وزیراعظم اونو کی حکومت نے مذہبی اقلیات کو لاحق تشویش کے ازالے اور ان کے اعتماد کے حصول کی غرض سے دستور میں ایک نئی ترمیم لانے کا فیصلہ کیا (ستمبر ۱۹۶۱ء)۔ اس نئی ترمیم کے ذریعے حکومت کو تمام مذاہب کے تحفظ کے لیے مناسب اقدامات کا پابند کیا گیا اور تعلیمی اداروں (اسکولوں) میں عیسائی اور مسلمان طلبا کے لیے عیسائیت اور اسلام کی تعلیم و تدریس کا حق تسلیم کیا گیا۔ بدھ بھکشوؤں کی تنظیموں نے اس آئینی ترمیم پر شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ انہوں نے رنگون اور دیگر شہروں میں حکومت اور مذہبی اقلیات کے خلاف پرتشدد مظاہرے کیے۔ حکومت سے اقلیات کو دی جانے والی رعایتیں ختم کرنے، نیز مسلمانوں کی طرف سے عیدالاضحیٰ کے موقع پر کی جانے والی جانوروں کی قربانی اور مسلمان مردوں کی برمی عورتوں سے شادی پر پابندی عائد کرنے جیسے مطالبات کیے گئے۔ ستمبر ۱۹۶۱ء میں مذہبی اقلیات کے خلاف بدھ مذہبی تنظیموں کے احتجاجی مظاہروں نے رنگون اور اس کے گردو نواح میں ایک بار پھر مسلم کش فسادات کی صورت اختیار کر لی۔ ان مظاہروں کے دوران متعدد مسلمان ہلاک اور زخمی ہوے جب کہ متعدد ایسی مساجد کو مسمار اور نذر آتش کیا گیا جن کی تعمیر کے لیے وزارت داخلہ نے منظوری دی تھی (*Religion and Politics in Burma*، ص ۲۶۹-۲۷۹).

فوجی دور حکومت: بدھ مت کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دینے جانے اور بعض دیگر سیاسی وجوہ کی بناپر ملک کی بدھ اکثریت اور مذہبی اقلیات کے درمیان سخت کشیدگی پیدا ہوگئی. جبکہ بعض لسانی و نسلی اقلیات نے برما سے آزادی اور اپنی الگ الگ ریاستوں کے قیام کی جدوجہد شروع کر دی۔ دریں حالات جنرل نی ون (Ne Win) نے ایک فوجی انقلاب کے ذریعے اقتدار سنبھالنے (مارچ ۱۹۶۲ء) کے بعد ملک کی مذہبی پالیسی کو یکسر تبدیل کر کے سیکولرازم کو اختیار کر لیا اور بدھ مت کو ملک کے سرکاری مذہب کے بجائے افراد کا نجی معاملہ قرار دیا۔ بدھ سسنا کونسل (Buddha Sasana Council) کو بھی، جو ملک میں بدھ مذہب و ثقافت کے فروغ و احیا کے لیے قائم کی گئی تھی (۱۹۵۰ء) ختم کر دیا۔ فوجی حکومت نے ملک میں رائج ذبح گائے کے امتناعی قانون، جس کا مقصد عیدالاضحیٰ کے موقع پر مسلمانوں کو جانوروں کی قربانی سے باز رکھنا تھا، کو بھی کالعدم قرار دے دیا (*Religion and Politics in Burma*، ص ۲۸۵-۲۸۶؛ Bruce Matthews: *Buddhism Under A Military Regime*، ص ۴۱۵).

برما میں جنرل نی ون (Ne Win) کے چھبیس سالہ دور حکومت (۱۹۶۲-۱۹۸۸ء) میں مسلمان اقلیت حسب سابق شدید ابتلاء و آزمائش سے دوچار رہی۔ ملک میں ''اشتراکیت'' کی ترویج کے علاوہ ملکی سالمیت اور یکجہتی کے نام پر مختلف نسلی، لسانی اور مذہبی اقلیات پر اپنی گرفت مضبوط کرنے اور انہیں قومی دھارے میں شامل کرنے کی غرض سے حکومت کے متعدد قانونی و انتظامی اقدامات اس (مسلمان اقلیت) کے لیے معاشی و تعلیمی ابتری کے علاوہ دیگر گوناں

گوں مسائل و مشکلات کا باعث بنے۔ جنرل نی ون نے اقتدار سنبھالتے ہی اپنے پیش رو اونو (U-Nu) کے برعکس ملک کی معاشی ترقی کے لیے امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کے بجائے اشتراکی نظام کے علمبردار ممالک سے قریبی سیاسی و اقتصادی روابط استوار کر کے ملک میں "اشتراکیت" کے نفاذ کا بیڑا اٹھایا (Mya Maung: *"The Burma Road From the Union of Burma to Myanmar"*، ص ۲۰۳-۲۰۸)۔ جس کے ساتھ ہی نجی کاروباری املاک کے علاوہ تعلیمی اور سماجی بہبود کے اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس اقدام کی بدولت ہزاروں کی تعداد میں مسلمان تاجر اور دوکاندار اپنے کاروبار، دوکانوں اور قیمتی املاک سے محروم ہوگئے۔ حکومت نے علاقائی خودمختاری کی تحریکوں کو سختی سے کچلنے اور ملک میں آباد چینی اور ہندوستانی افراد کے جبری انخلاء کی مہم (۱۹۶۳-۱۹۶۵ء) شروع کی جس کی بدولت فوج، پولیس اور امن و امان کے قیام پر مامور اداروں کی طرف سے مسلم آبادی بالخصوص آراکانی مسلمانوں پر جبر و تشدد روز مرہ کا ایک معمول بن گیا۔ اس مہم کے دوران میں تمام سرکاری اداروں اور محکموں سے دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ ساتھ مسلمان ملازمین کو بھی نکال باہر کیا گیا۔ حکومت کے ان اقدامات کے بعد معاشی اور تجارتی اعتبار سے خستہ حال و پامال شدہ تقریبا دو لاکھ مسلمان ۱۹۶۴ء کے وسط تک ہندوستان اور پاکستان کی طرف نقل مکانی اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ برما سے نکالے گئے مسلمان افراد میں تاجروں، دوکانداروں اور سرکاری ملازمین کے علاوہ ایسے افراد بھی شامل تھے جو بلا تفریق مذہب و ملت، بہبود عام کے کاموں میں مصروف تھے (Hugh Tinker: *The Banyan Tree*، ص ۱۴۹-۱۵۰)۔ برما سے کثیر تعداد میں مسلم آبادی کے جبری انخلاء کے باوجود ۱.۵۰.۰۰۰ سے زائد مسلمان رنگون اور مانڈلے کے علاوہ ملک کے وسطی و بالائی علاقوں میں باقی رہ گئے۔ یہ عموماً وہ لوگ تھے جن کے پاس کوئی کاروبار یا جائیداد نہ تھی یا پھر ایسے طبقات سے تعلقات رکھتے تھے جو برمی معاشرے کے اندر کوئی اہم حیثیت نہ رکھتے تھے، یا پھر دور افتادہ علاقوں میں آباد تھے اور کھیتی باڑی اور دیگر معمولی نوعیت کے پیشوں سے وابستہ تھے۔ البتہ اراکان میں مسلمان ایک بڑی مؤثر تعداد میں موجود رہے (*The Banyan Tree*، ص ۱۵۱-۱۵۴)۔

برما میں بدھ مذہبی تنظیموں کا مسلم اقلیت کے بارے میں مخاصمانہ و معاندانہ رویہ اکثر و بیشتر مسلم کش فسادات کی صورت میں نکلتا ہے۔ فوجی قیادت بھی بسا اوقات سیاسی و معاشی مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے بدھ مذہبی عناصر کو مسلم آبادی کے خلاف کارروائیوں کے لیے استعمال کرتی ہے اور بلاواسطہ طور پر فسادات کی راہ ہموار کرتی ہے۔ ۱۹۸۸ء میں عین اس وقت جب رنگون میں طلباء فوجی حکومت کے خلاف پرزور مظاہروں میں مشغول تھے، ملک کے دو شہروں پروم (Prome) اور تانگ جئی (Taunggyi) میں فسادات پھوٹ پڑے۔ بدھ مذہبی تنظیموں کی طرف سے مسلمانوں کے مکانات اور دوکانوں پر حملے کیے گئے۔ لوٹ مار اور آتش زنی کے متعدد واقعات پیش آئے، جن میں مسلمانوں کا جانی نقصان بھی ہوا۔ ان نوعیت کے واقعات میں فوج اکثر مسلم آبادی کے مقابلے میں بدھ آبادی کی پشت پناہی کرتی ہے۔ ۱۹۹۴ء میں فوج اور بدھ مذہبی تنظیموں کے اشتراک عمل سے مانڈلے (Mandalay) کے علاقہ میں مسلم مخالف کارروائیاں ہوئیں جن میں مسلمانوں کے گھروں کے علاوہ مساجد کو خصوصی طور سے نشانہ بنایا گیا۔ (Christina Fink: *Living Silence: Burma Under Military Rule*، لنڈن و نیویارک: زید بکس، ۲۰۰۱ء: ص ۵۴، ۲۱۸-۲۲۵)۔

برما کی فوج، جو خود کو ملکی سالمیت اور یکجہتی کا محافظ و

پاسبان گردانتی ہے، آزادی کے بعد سے نسلی و لسانی اور مذہبی اقلیات کے خلاف برابر برسرپیکار چلی آ رہی ہے۔ مذہبی اقلیات میں عیسائی اور خصوصی طور سے مسلمان اس کا اہم ہدف ہیں۔ چنانچہ دور دراز علاقوں میں گرجا گھروں اور مساجد کو مسمار کرنا اور مسیحی اور مسلم افراد کو مہاتما بدھ کی مورتیاں تراشنے اور بدھ خانقاہیں تعمیر کرنے پر مجبور کرنا اس کا ایک عام مشغلہ رہا ہے (Christina Fink: کتاب مذکور، ص ۱۴۴)۔ فوج گذشتہ کئی دہائیوں سے مسلمان اقلیت کو غیر ملکی قرار دے کر اسے ملک سے نکال باہر کرنے میں کوشاں رہی ہے۔ ۱۹۹۷ء میں نسلی اقلیت (Karen) کی علیحدگی پسند علاقائی خودمختاری کی تحریک کے۔ این۔ یو (Karen National Union) کے خلاف کارروائی کے دوران میں فوج نے اس کے زیر انتظام بہت سے قصبات اور دیہاتوں میں مساجد کو برباد کر دیا۔ وہاں پر موجود دینی کتب بالخصوص قرآن مجید کے نسخوں کو نذر آتش کر دیا۔ اس کارروائی کے دوران متعدد مسلمان قتل اور بہت سے زخمی ہوے۔ چنانچہ سینکڑوں کی تعداد میں مسلمان محفوظ مقامات کی تلاش میں کارن آبادی کے ساتھ، سرحد پار تھائی لینڈ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے (Christina Fink: کتاب مذکور، ص ۲۲٦)۔

مذہبی و ثقافتی مسائل: برما میں فوجی حکومت کے قیام کے ابتدائی دور سے مسلمانوں کو دینی اعمال و شعائر کی بجا آوری کے سلسلہ میں بھی طرح طرح کی مشکلات مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت کی طرف سے فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ تک سفر کے علاوہ سرکاری ملازمین پر نماز جمعہ کی ادائیگی پر پابندی عائد رہی ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی و ثقافتی اور دینی و سماجی انجمنوں کی سرگرمیوں کو محدود کر دیا گیا۔ ۱۹٦۴-۱۹٦۵ء میں متعدد مسلم انجمنوں کو خلاف قانون قرار دے کر ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ ملک کے اندر نئی مساجد کی تعمیر، قرآن حکیم کے ترجمہ و تفسیر، دینی کتب و رسائل اور اخبارات و جرائد کی اشاعت پر بھی سخت پابندیاں لگا دی گئیں۔ اس کے علاوہ خالصتاً دینی نوعیت کی سرگرمیوں مثلاً دعوت و تبلیغ اور میلادالنبیؐ کی تقریبات کے انعقاد کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ ملک میں موجود دینی مدارس کو سخت قواعد و ضوابط کا پابند بنایا گیا۔ مسلم افراد کو اپنے دینی و روحانی مرکز مکہ مکرمہ کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک کی طرف سفر اور ان ممالک کی حکومتوں، وہاں کی سیاسی شخصیات، دینی و علمی و ثقافتی اداروں اور تنظیموں کے ساتھ روابط کے قیام کی سختی سے حوصلہ شکنی کی پالیسی اختیار کی گئی۔ حکومت نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کے مضمون کو خارج از نصاب کر دیا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے سلسلہ میں مسلمان طلبا کی حوصلہ شکنی کی غرض سے متعدد نوعیت کے اقدامات کیے گئے۔ سرکاری اداروں میں زیر تعلیم مسلمان طلبا کو اپنے آبائی مذہب اسلام کو ترک کرنے کی ترغیب و تحریک دی جاتی رہی۔ سرکاری ملازمتوں اور زندگی کے دیگر شعبوں میں ان کے ساتھ امتیازی برتاؤ کی پالیسی اختیار کی گئی۔ وقتاً فوقتاً حکومت کی طرف سے مسلمان اقلیت کے مذہبی و تہذیبی آثار و نشانات کو مٹانے کے لیے بھی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ کئی شہروں میں مسلمانوں کے قبرستانوں کو ہموار کر دیا گیا۔ مسلم افراد کو قومی یک جہتی کے نام پر اپنے جداگانہ اسلامی تشخص سے دستبردار ہونے اور اپنے اسلامی نام تبدیل کرنے پر بھی مجبور کیا جاتا رہا (Bruce Matthews: *"Buddhism Under A Military Regime"*، ص ۴۱۷، حاشیہ ۲۲)۔ اس پر مستزاد یہ کہ بدھ مذہبی تنظیموں نے حکومت کی سرپرستی میں وقتاً فوقتاً ملک بھر میں خصوصاً پس ماندہ و دور افتادہ دیہی علاقوں میں آباد ناخواندہ مسلمانوں کو دین اسلام سے جبراً منحرف اور برگشتہ کر کے بدھ مت قبول کرانے

کے لیے خصوصی مہم چلائی۔ جس کے نتیجے میں سیکڑوں ایسے مسلمان افراد نے، جو اسلامی تعلیمات سے نابلد تھے، بدھ مت اختیار کر لیا (*Impact International*، ۸: ۱۶، ۲۵ اگست-۷ ستمبر ۱۹۷۸ء، ص ۱۵)۔ جنرل نی ون کی حکومت کی طرف سے (لنڈن) مسلمانوں کو حقوق شہریت سے محروم رکھا گیا۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً ملک سے ان کے اخراج کے لیے عسکری مہمات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۸ء تک صرف چودہ سالوں کے دوران میں آراکانی مسلمانوں کے خلاف ایک درجن سے زیادہ فوجی کارروائیاں عمل میں آئیں۔ جس کے نتیجے میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہلاک ہوئے۔ آراکانی مسلمانوں کے خلاف برمی افواج کی سب سے بڑی کاروائی [جسے Operation Dragon King اور Operation Naga Min کا نام دیا گیا] جو ۱۹۷۸ء کے ابتدائی مہینوں میں کی گئی بطور خاص قابل ذکر ہے۔ اس کارروائی کے دوران تقریباً تین لاکھ افراد کو برما کے حدو سے نکال کر بنگلہ دیش کی طرف دھکیل دیا گیا۔سیکڑوں کی تعداد میں مسلمان عورتیں اغوا کر لی گئیں۔ برمی فوج اور مقامی بدھ آبادی کی طرف سے مسلمان عورتوں کی اجتماعی آبروریزی کے کثیر تعداد میں واقعات پیش آئے۔ اس کارروائی کے دوران ہزاروں افراد ہلاک ہوے۔ سینکڑوں مساجد اور مدارس کو مسمار اور نذر آتش کر کے ان کی جگہ بدھ خانقاہیں تعمیر کر لی گئیں۔ مسلمان آبادی کی املاک، مکانات اور زرعی زمینوں کو بھی غصب کرلیا گیا جسے بعدازاں مقامی بدھ آبادی میں تقسیم کر دیا گیا (سید سراج الاسلام: *"The Rohingyas In Myanmar (Burma) and the Moros in Philippines"*، در *Intellectual Discourse*، ۵:۱ (۱۹۹۷ء)، ص ۶-۸؛ Christina Fink: کتاب مذکور، ص ۲۲۶؛ شمس الدین احمد: *The Dilemma of the Arakanese Muslims*، در *The World Muslim League Journal*، (شوال ۱۴۳۰ھ)، ص ۵۹-۶۱؛ محمد عبدالقادر: *"The Plight of Muslims of Arakan"*، در *The World Muslim League Journal*، ۱۹: ۸ (فروری ۱۹۹۲ء)، ص ۱۷-۱۹؛ James Walsh: *The Dogs of War*: Bruma، در *Time*، ج ۱۷ (فروری: ۱۹۹۲ء)، ص ۸-۹؛ Mohammad Y-Siddiq: *"A Tragedy in Burma"* در The Message (Jamaica-N.J)، ۱۷: ۳ (اگست ۱۹۹۳ء): Burmese Muslims: A Struggle for Revival، در *The Islamic World Arabia Review*، ۵: ۵۸ (جون ۱۹۸۶ء)، ص ۳۴-۳۵).

۱۹۹۱ء کے وسط میں برمی افواج نے اراکان سے روہنگیا مسلمانوں کے اخراج کی غرض سے ایک کارروائی کے دوران میں اراکان کے شہری علاقوں مانگ ڈاو (Maungdaw) اور بتھی ڈانگ (Bathidaung)وغیرہ سے تقریباً ڈھائی لاکھ سے زائد افراد کو بنگلہ دیش کی طرف دھکیل دیا اور ان کے مکانات میں بدھ آبادی کو بسا دیا۔ جبکہ مساجد اور مدارس کو (حسب سابق) بدھ خانقاہوں میں تبدیل کر دیا۔ بنگلہ دیش میں موجود ان پناہ گزینوں کی واپسی کا مسئلہ تا حال حل طلب ہے۔ برما کی حکومت ان افراد کو اپنے ملک کا شہری تسلیم کرنے اور انہیں اپنے وطن واپسی کی اجازت دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں (Christina Fink، کتاب مذکور: ص ۲۲۶: *"Final Solution For Rohingya Muslims"*، در *Impact International*، ۲۲: ۵-۶ (۱۳ مارچ- ۹ اپریل ۱۹۹۲ء) ص ۱۱-۱۲: *Bertile Linter and Ajman*: *Rohingya Seek New Life in Middle East*: Distant Exile، در *Far Eastern Economic Review*، ۱۵۶: ۴ (جنوری ۱۹۹۳ء)، ص ۲۳-۲۴: *Far Eastern Economic Review Year Book 1993*، ص

The Status of Refugees : Vital :۲۸-۲۷ Muntarbhom in Asia ، آکسفرڈ: کلارنڈن پریس، ۱۹۹۲ء، ص ۸-۹، ۱۲٦، ۱۲۷-۱۳۱).

برما میں تحریک بحالی جمہوریت اور مسلمان: ۱۹۸۸ء کے موسم بہار میں برما میں طلبا نے فوجی آمریت کے خاتمہ اور بحالی جمہوریت کی تحریک کا آغاز کیا۔ حکومت کی طرف سے اس تحریک کو کچلنے کی غرض سے جبروتشدد کے نتیجے میں صرف اگست کے پہلے ہفتے میں تین ہزار سے زائد مظاہرین ہلاک ہوے۔ جس پر شدید عوامی ردعمل سامنے آیا تو جنرل نی ون نے عہدہ صدارت سے مستعفی ہوکر اقتدار بریگیڈیئر جنرل Sein Lwin کے سپرد کر دیا۔ نئی حکومت نے ملک سے مارشل لا اٹھا لیا اور عوامی دباؤ پر دستور میں بعض ترامیم کے بعد ملک میں غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کا ڈھول ڈالا (Moksha Yitri : "The Crises in Burma"، در Asian Survey، ۲۹: ۲ (جون ۱۹۸۹ء) : ص ۵۴۵-۵۴٦)۔ اس دوران این۔ ایل۔ ڈی (National League for Democracy) ایک بڑی سیاسی جماعت بن کر ابھری۔ متعدد مسلمان رہنماؤں نے بھی اس کی رکنیت اختیار کر لی، اس امید میں کہ جمہوری حکومت میں کے ساتھ روا رکھا جانے والا امتیازی برتاؤ ختم اور خصوصاً فوج کی طرف سے ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کا سلسلہ ہو سکے گا۔ مئی ۱۹۹۰ء میں منعقد ہونے والے انتخابات میں قومی اسمبلی کی کل ۳۹۷ میں سے ۲۳ مسلمان نمائندے بھی منتخب ہوئے جن میں سے پانچ کا تعلق آراکان سے جب کہ بقیہ کا ملک کے دوسرے حصوں سے تھا۔(No hurry to hand over: Burma Power، در Impact International، ۲۰: ۱۴ (۲۷ جولائی ، ۹ اگست ۱۹۹۰ء، ص ۲)۔ تاہم فوجی حکمرانوں نے قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنے والی جماعت این۔ ایل ۔ ڈی کو اقتدار منتقل کرنے سے انکار کر دیا (David I. Steinberg: "Myanmar in 1991"، در Asian Survey، ۳۲: ۲ (۱۹۹۲ء): ۱۴۷-۱۴۸).

مسلم اقلیت کی دینی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیاں ۱۹۸۰ء کے بعد سے: برمی حکمرانوں نے ملک میں نئے قانون شہریت کے نفاذ اور خصوصاً اراکان میں روہنگیا مسلمانوں کے خلاف فوجی کارروائیوں کے بعد بعض مسلم ممالک اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کی طرف سے ہونے والی تنقید کے سبب مسلمانوں کی دینی و ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں پر عائد پابندیوں میں قدرے نرمی کر دی۔ چنانچہ ۱۹۸۰ء میں پہلی بار پندرہ سال کے بعد ۱۵۰ افراد کو حج بیت اللہ کے لیے سفر کی اجازت دی گئی اور برما کے ایک سابق بادشاہ منڈن (Mindon) [۱۸۵۱-۱۸۷۳ء] کی طرف سے مکہ مکرمہ میں برمی حجاج کے قیام کے لیے تعمیر کرائے گئے "رباط" (۱۸٦۰ء) کی سرکاری خرچ پر مرمت پر آمادگی ظاہر کی گئی [Impact International : ج ۱۰، ش۱۷ (۱۲- ۲۵ ستمبر ۱۹۸۰ء)، ص ۱۲]۔ اسی سال برما کی چھ مسلم دینی و ثقافتی اور تعلیمی و سماجی تنظیموں: کل برما دینی کونسل(All Burma Islamic Religious Councill)، کل برما جمعیت العلماء، مسلم مرکزی ٹرسٹ فنڈ (Muslim Central Trust Fund) ، برما مسلم آرگنائزیشن (Burma Muslim Qrganization)، برما مسلم یوتھ لیگ (Burma Muslim Youth League) اور آل برما مولوی ایسوسی ایشن (All Burma Moulvi Association) پر مشتمل ایک مرکزی تنظیم (Central Islamic Organization = C.I.O) کا قیام، مسلم اقلیت کی دینی، تعلیمی و ثقافتی اور سماجی بہبود کی سرگرمیوں کو مربوط و منظم کرنے کی غرض سے عمل میں آیا (Impact International، ۱۰:۱۷، ش ۱۲-۲۵ ستمبر۱۹۸۰ء، ص ۱۲)۔ اس تنظیم نے متعدد نوعیت کی تعلیمی و سماجی بہبود کی سرگرمیوں کے علاوہ ، برمی زبان میں قرآن مجید کے ترجمہ

و تفسیر کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا، جو علامہ ہاشم غازی کی سربراہی میں علما کی ایک جماعت نے کیا تھا۔ ۱۹۸۵ء کے بعد سے مختلف مسلم انجمنیں موسم گرما کی تعطیلات میں اسکولوں، کالجوں اور سرکاری جامعات میں زیر تعلیم طلبا کے لیے اسلامی تعلیمات اور اسلامی تہذیب و تمدن کے بارے میں آگاہی و تعارف کی غرض سے مختصر دورانیے کے کورسز کی تدریس کا انعقاد بھی کرتی آرہی ہیں (*Impact Internationl*، ۱۵ : ۱۴ (۲٦ جنوری-۸/ اگست ۱۹۸۵ء) ، ص ۱۲).

برما میں مسلم اقلیت پر جبر و تشدد کے اس دور میں بھی بعض مسلمان مخیّر افراد اور سماجی بہبود کی تنظیموں نے بہبود عامہ کے کاموں میں فیاضانہ طور سے مال صرف کیا۔ اس سلسلہ میں برما کی ایک مسلمان خاتون ہاجرہ بی (Hajeema Daw Pu)بطور خاص قابل ذکر ہیں۔اس نے وسطی برما میں ینداوٗ (Yindaw)کے مقام پر ایک عربی کالج کے قیام کے لیے ایک ملین (Kyats) فراہم کرنے کے علاوہ رنگون جنرل ہسپتال میں شعبہ امراض گردہ کے قیام کے لیے تین ملین Kyats جب کہ امراض جلد کے علاج کے لیے ایک ہسپتال کی تعمیر کے لیے ۲ ملین Kyats مہیا کیے (*Impact International* ، ۱۰: ۱۷ (۱۲-۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء) ص ۱۲).

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں.

مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے:G. E. Harvey ، *British Rule in Burma* 1842-1942 ، لنڈن، ۱۹۴٦ء؛ Moshe Yegar : "*The Muslims of Burma Since Independence*" ، در *Asian and African Studies: Annual of the Israel Oriental Society*، عدد ۲ (۱۹٦٦ء) ۱۵۹-۲۰۵)؛ وہی مصنف *"The Panthay of Burma and Yunnan"* ، در *Journal of Southeast Asian History*، (سنگاپور)، عدد ۷۔ (۱۹٦٦ء) ص، ۷۳-۸۵).

(محمد ارشد)

••--------------••

⊗ بروقلس: ایک یونانی حکیم اور نو افلاطونی فلاسفر، استاد، عالم اور مذہبی شخص قسطنطنیہ میں پیدا ہوا۔ اس نے اسکندریہ میں اولمپوڈورس (Olymplodowrs) کے ساتھ تعلیم حاصل کی (Encyclopeadia Americana، بذیل مادہ)۔ وہ وکیل بننا چاہتا تھا، لیکن ایک حادثے کی بنا پر نوافلاطونی فلسفے کی طرف متوجہ ہو۔ سیریانز (Syrianas) کی وفات کے بعد افلاطون اکادمی (Ath enian School of Neoplatonism) کا سربراہ مقرر ہوا اس نے تمام عمر شادی نہیں کی اور خود کو پڑھنے، لکھنے کے لیے وقف کیے رکھا۔ وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں سے بہت محبت کرتا تھا اور اپنے نوکروں پر بہت مہربان تھا.

القفطی اپنی کتاب: حکمائے عالم میں لکھتا ہے کہ "بروقلس قومی و ملکی علوم میں شہرت رکھتا تھا۔" اس نے طیماوس (Timaeus) کی شرح لکھی تھی، اس کے ایک حصے (E ۸۹ تا C .۹: E.Pfoff : Corpus Medicorum Supplemention ، ۳: ۴۲، ۱۹۴۱ء) کا ترجمہ حنین بن اسحاق نے کیا تھا۔ اس کے مقدمہ میں وہ لکھتا ہے "جالینوس بقراط کا معیاری ترجمان ہے لیکن جو شخص افلاطون کے مطالب کی شرح کرنے کا سب سے زیادہ حق دار ہے، وہ فاضل شہیر بروقلس ہے" (مقالہ افلاطون در اردو دائرہ معارف اسلامیہ ، بذیل مادہ)۔ اس کا انتقال یونان کے شہر اطنہ میں ۴۸۵ء میں ہوا.

بروقلس کی تصانیف: ۱۔ Elements of

Theology یونانی متن مع شرح ، انگریزی ترجمہ " E.R. Dodds (آکسفرڈ، ۱۹۳۳ء)۔ یہ کتاب بروقلس کے نظریہ مابعدالطبیعات کے متعلق ایک اہم ذریعہ معلومات ہے؛(۲) The Platonic Theology : یونانی متن جس کا لاطینی ترجمہ A. Portus نے کیا (ہمبرگ ۱۶۱۸ء، فرینکفرٹ ۱۹۶۰ء، انگریزی ترجمہ از Thomas Taylor (لنڈن ۱۸۱۶ء) یہ کتاب بروقلس کے پورے فلسفہ کے لیے اہم ترین ذریعہ معلومات ہے، اسے امکاناً اس نے اس وقت مرتب کیا جب اس کے خیالات میں پختگی آ چکی تھی؛ (۳) De Providentia et Fato et eo Quod in Nobis (حزم و احتیاط اور قسمت) (۴) De Decem Dulitationbus Circa (حزم و احتیاط کے متعلق اس کے سوالات)؛ (۵) De Malurum Subsistentia (شیطان کا وجود) یہ تینوں کتابیں لاطینی زبان میں ہیں، جو ان کے جو ایک لاطینی ترجمہ کی بنا پر جو Williamg Moerbeeke نے کیا، معروف ہیں۔ ان کا ایک لاطینی متن یونانی تلخیص کے ساتھ بھی ملتا ہے، طبع Hel Met Boese؛ (۶) Tria Opuseula (برلن ۱۹۵۵ء) انگریزی ترجمہ از Thomas Taylor، لنڈن ۱۸۳۳ء) دنیا کے ثبات (Eternity) کے متعلق اٹھارہ دلائل۔ یہ کتاب بنیادی طور پر عیسائیوں کے خلاف ہے۔ (۷) H. Rabe : On the Eternity of the World agauist- H.Rab Proclus : (لائپزگ ۱۸۹۰) انگریزی ترجمہ از Thomas Taylor (لنڈن ۱۸۲۵) The Hieratie Mt متن مع فرانسیسی ترجمہ از J. Bidez ، برسلز Brussels ۱۹۲۸ء)، (۸) The Chaldean Philosophy متن طبع A.Jahn (ہیلی، جرمنی ۱۸۹۱) انگریزی ترجمہ از T. Johnson (Osceola . Mo ۱۹۰۷) یہ دونوں کتابیں بروقلس کی مذہبی تحریروں کی مثالیں ہیں.

افلاطون کی تین شروح: (۱) The Parmehdies :Commentoy Opera Inedita Victor Cousm، (پیرس، ۱۸۶۴) فرانسیسی ترجمہ از A.Chaignet، (پیرس، ۱۹۰۳) عکسی طباعت (Hildesheim ۔ جرمنی، ۱۹۶۱) یہ شرح بروقلس کی شروح میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے؛ (۲) Commentary on The First Alcibiades : متن طبع Victor Cousin یہ کتاب افلاطون کے فلسفہ اخلاق سے متعلق سب سے اہم شرح ہے؛ (۳) Commentary on the Timaeus : متن طبع E. Diehl (Leipzig ۱۹۰۶) انگریزی ترجمہ از The Mas Taylor کیا (لنڈن، ۱۸۲۰ء)؛ ۴۔ Commentary on the Republic : متن ، طبع W. Kroll (Leipzig ۱۹۰۱ء)؛ Commentary on the Cratylus : متن ، طبع G. Paoquali (Leipzig ۱۹۰۸ء).

بروقلس اپنے دور کا ایک متبحر شخص تھا، چنانچہ اس نے ریاضی، طبیعیات (زیادہ تر فلکیات) پر رسائل اور مقالات لکھے۔ اس کے اندازِ تحریر کی Dis Curssois نے اپنی کتاب Memorles dela Socicte میں تعریف کی ہے۔ (بروقلس کی تحریروں پر تفصیلی مطالعہ کے لیے دیکھیے L.J.Rosa: The Philosophy of Proclees ، نیویارک ۱۹۴۹ء).

مآخذ: (۱) The Encyclopaedia of Philosopny، ۶: ۴۷۹۔ ۴۸۲؛ (۲) Grolier Academic Encyclopaedia ، ۱۵: ۵۶۱؛ (۳) Encyclopaedia Americana ، ۲۲: ۶۳۲؛ (۴) Funk W Wagnalls New Encyclopedia ، ۱۹: ۱۶۷؛ (۵) جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف القفطی، ترجمہ ڈاکٹر غلام جیلانی

برق: حکمائے عالم، لاہور ۱۹۶۰ء ص: ۱۳۸۔ ۱۳۹.
(شمیم روشن آراء (ن: محمودالحسن عارف)

••-------------••

⊗ برونائی دارالسلام: جنوب مشرق ایشیا (South East Asia) کا انتہائی سر سبز شاداب ملک برونائی دار السلام ، جزیرہ بورنیو (Borneo) کے شمال مغرب میں واقع ہے اس کے شمال میں جنوبی بحر چین (South China Sea) اور دیگر تین اطراف میں ملائیشیا کا علاقہ سراوک (Sarawak) واقع ہے.

اس کا مجموعی رقبہ ۵۷۶۵ مربع کلو میٹر ہے اور آبادی ۲۰۰۲ء کے اواخر کے اعدادو شمار کے مطابق ۳،۴۰،۸۰۰ (تین لاکھ چالیس ہزار آٹھ سو) افراد پر مشتمل ہے، جن میں ۶۷ فیصد ملائی مسلمان (Malays) ۱۵ فیصد اصلی چینی (Chinese) اور باقی دوسری قومیں بشمول غیر ملکی باشندے ہیں۔ یہاں کی سرکاری زبان ملائی (Bahasa Melays) ہے، لیکن انگریزی کا استعمال ساتھ ساتھ ہوتا ہے، اس کے علاوہ چینی زبانیں، منڈرین (Mandrian)، ہاکین (Hokkien) اور کنٹونیز (Cantonese) اور شمالی و جنوبی ہندو پاک کی زبانیں تامل، ہندی اور اردو بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ملک کا سرکاری نام نگارا برونائی دارالسلام (Negara Brunei Darussalam) ہے۔ یہاں کا سرکاری مذہب اگرچہ اسلام ہے لیکن دیگر مذاہب مثلاً بدھ مت، عیسائیت اور ہندو مت کو بھی اپنے عقائد پر عمل کی اجازت ہے.

برونائی ایک خود مختار شاہی مملکت ہے، جس کے سربراہ سلطان حاجی حسن البلقیہ معز الدین و الدولہ ہے۔ یہاں کا سکہ برونائی ڈالر ہے جو سنگا پور ڈالر کے مساوی ہے.

خط استوا پر واقع ہونے کی وجہ سے برونائی کا موسم پورے سال گرم رہتا ہے اور بارشیں ہوتی رہتی ہیں۔ درجہ حرارت ۲۳ سے ۳۲ ڈگری سلشیس (Celsius) کے درمیان رہتا ہے.

نگارا برونائی دارالسلام اسم بامسمی ہے۔ عربی میں 'دار' کے معنی گھر، یا جائے سکونت، اور 'سلام' کے معنی 'امن و سلامتی' ہے۔ اس طرح 'دارالسلام' کے معنی سلامتی کا گھر' ہے اور نگارا (Negara) برونائی زبان میں "ملک" کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ ملک حقیقی معنوں میں صلح و آشتی کا گہوارہ ہے، جہاں کی عام فضا انتہائی پرسکون ہے اس لیے بجا طور پر اس کو 'امن' کا ملک یعنی (Negara Brunaie Darussalam) کہا جا سکتا ہے.

برونائی رقبہ اور آبادی دونوں کے لحاظ سے بہت چھوٹا سا ملک ہے جو درج ذیل چار اضلاع پر مشتمل ہے۔ ان اضلاع کا نام انہیں ناموں سے مشہور دریاؤں پر رکھے گئے.

برونائی موارا (Brunie Muara) : اس کا رقبہ سب سے کم ہے لیکن آبادی سب سے زیادہ یہاں ملک کا دارالخلافہ بندر سری بگاون (Bandar Seri Begawan) واقع ہے جہاں غیر ملکی سفارت خانے وزارتیں ، سرکاری دفاتر اور ملک کی یونیورسٹی "یونیورسٹی برونائی" (University Brunei) ہے.

اس شہر کے وسط میں دریا پر آباد تاریخی گاؤں "کانپونگ آئر" (Kampong Ayer) اور جدید ترین عالیشان مسجد "جامع عصر حسن البلقیہ" واقع ہے.

کانپونگ آئر: ملائی زبان میں کانپونگ 'گاؤں' کو کہتے ہیں اور آئر (Ayer) کے لغوی معنی ہیں "پانی" اس طرح کانپونگ آئر کا مطلب ہے وہ گاؤں جو پانی پر آباد ہے۔ موجودہ کانپونگ آئر ۴۱ گاؤں کا مجموعہ ہیں جن مین تیس ہزار (۳۰،۰۰۰) افراد رہائش پذیر ہیں، یہ دنیا کا سب سے بڑا 'پانی پر آباد گاؤں' (Water Village) ہے۔ اس کو مشرق کا

وینس (Venice fo the East) بھی کہا جا سکتا ہے۔

ان گاؤں کے مکانات لکڑی سے بنے ہوئے ہیں۔ ان کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ باوجود دریا پر واقع ہونے کے جدید دور کی تمام، آسائشیں مثلاً اسکول، شفاخانے، مساجد، دوکانیں، پولیس چوکیاں، فائر بریگیڈ سب موجود ہیں۔ گھروں میں بجلی بنے اور کمروں میں صوفہ سیٹ، کرسیاں، ریڈیو و ٹیلی ویژن سب کچھ ہے۔ لوگوں کے پاس اپنی کاریں بھی ہیں جو ساحل پر کھڑی کی جاتی ہیں، جن سے اتر کر لوگ کشتیوں کے ذریعے اپنے پانی پر واقع مکانوں میں جاتے آتے ہیں۔ یہاں کے اسکولوں میں کام کرنے والے غیر ملکی اساتذہ بھی روزانہ کشتی کے ذریعہ صبح جاتے اور شام کو گھر واپس آتے ہیں۔

کانپونگ آئر دراصل برونائی کے باشندوں کی روایتی رہائش گاہ ہے جسے چھوڑ کر وہ حکومت کے بنوائے ہوئے پختہ مکانوں میں منتقل نہیں ہونا چاہتے۔ اگرچہ حکومت وقتاً فوقتاً ان کے لیے خشکی پر مکانات بنوا کر دیتی رہتی ہے لیکن یہ لوگ خصوصاً بزرگ کسی نہ کسی بہانہ سے پھر واپس ان مکانوں میں واپس چلے آتے ہیں یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ جگہیں ان کے آباء و اجداد کا مسکن ہیں۔ یہاں کے بیشتر مکینوں کا پیشہ ماہی گیری اور گھریلو صنعت و حرفت ہے۔

۲۔ تمبورونگ (Temburong): یہ ملک کا سب سے کم آبادی والا علاقہ ہے جہاں گھنے جنگلات پائے جاتے ہیں۔ چونکہ اس کے اور بندر سری بگاون کے درمیان دریا حائل ہے اس لیے یہاں پہنچنے کے لئے پانی میں چلنے والی ٹیکسی (Water Taxi) یا موٹر بوٹ استعمال کی جاتی ہے۔ یہ کشتیاں دن میں آدھے آدھے گھنٹہ کے وقفہ سے چلتی ہیں۔ اس کا اہم شہر بانگر (Bangar) ہے۔ یہ ملک کے دوسرے نمبر کا ضلع ہے جہاں ستر (۷۰) فیصد زمین علاقہ ترقی پذیر (Under Developed) ہے۔

۳۔ تتونگ (Tutong): یہ بندر سری بگاون کے جنوب مغرب میں واقع ہے جہاں بذریعہ کار تقریباً نصف گھنٹہ میں پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ برونائی کا تیسرے نمبر کا ضلع ہے۔ اس کا مشہور چھوٹا سا شہر پکان تتونگ (Pekan Tutong) ہے۔ یہاں قدیم علاقائی نسل کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

۴۔ بلائٹ (Belait): یہاں ملک کی اہم ترین برآمدات تیل اور گیس کے ذخائر ہیں۔ رقبہ کے لحاظ سے یہ ملک کا سب سے بڑا ضلع ہے، اس کا اہم شہر کوالا بلائٹ (Kuala Belait) ہے جو مختصراً کے بی (K.B) کہلاتا ہے۔

یہاں قبائلی نسل کے لوگ رہتے ہیں جن میں اہم ترین ایبان (Iban)، دسون (Dusun)، پنان (Punan) اور دائک (Dayaic) ہیں۔ ان قبیلوں کے لوگ لانگ ہاؤسز (Long Houses) میں رہتے ہیں۔ لانگ ہاؤس وہ مکان ہے جہاں سو افراد پر مشتمل پورے گاؤں کے لوگ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں۔ یہ لوگ قبائلی نسل کے غیر مسلم افراد ہیں جن کا کوئی مذہب نہیں ہے۔

مختصر تاریخ: برونائی کا قدیم نام پونی (Puni) تھا۔ ۵۱۸، ۵۲۳ اور ۶۱۶ء کی قدیم چینی دستاویزات کے مطابق چینی وفود ایک ایسے ملک میں پہنچے، جس کا نام "Po-ni" "Po-li" یا "Bun-lai" تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہی اس وقت کا برونائی تھا۔

دوسری روایت کے مطابق اس ملک میں بسنے والے پہلے لوگ جب دریائے برونائی پر پہنچے تو قدیم ملائی زبان میں بے اختیار خوشی سے پکار اٹھے "Barunah" جس کا مفہوم تھا "بہترین جائے رہائش" یا "محفوظ مقام" یا "ساز گار ماحول" پھر "Brunaei" میں تبدیل ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ برونائی کی دریافت ۱۵۲۱ء میں میگیلن (Mageblan) نے کی۔ سنسکرت زبان میں برونائی کا مطلب ہے، 'تاجر' لہٰذا یہ بھی امکان ہے کہ اس کی دریافت تاجروں کے ذریعہ ہوئی۔

کسی زمانہ میں برونائی سماترا (Sumatra) کی بدھ سلطنت تھا۔ بعد میں جاوا میں مقیم ہندو بادشاہ ماجا پاہت (Majapahit) کے زیر اثر آ گیا۔ اس کے بعد یہ ایک اسلامی مملکت ہو گیا۔

اسلام کی آمد: برونائی میں اسلام، ہندو بادشاہ ماجا پاہت (Majapahit) کے عہد حکومت میں سلطنت تماسک (Tamasek) کے واسطہ سے داخل ہوا جو موجودہ سنگاپور کا قدیم نام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں یہاں بااثر مسلمانوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ چودھویں تا سولہویں صدی عیسوی تک برونائی ایک مضبوط شہنشاہیت تھی جس کے ماتحت سبا (Sabah)، سراوک (Sarawak) اور جنوبی فلپائن کے علاقے تھے۔

چودھویں صدی عیسوی مین جب اوانگ الاک بیتا تار (Awang Alak Betatar) نے اسلام قبول کر کے جہور (Johore) کے سلطان کی بیٹی سے شادی کی تو اسے برونائی کا سلطان مقرر کیا گیا۔ الاگ بیتا تار نے اپنا نام تبدیل کر کے اسلامی نام سلطان محمد رکھا۔

اشاعت اسلام کے ابتدائی دور میں بہت سے مسلمان مبلغین نے برونائی کے شاہی خاندان میں شادیاں کیں۔ سلطان محمد (۱۴۲۵۔۱۴۰۸) برونائی کا پہلا سلطان تھا۔ اس کے بعد طائف کے شریف نامی شخص نے سلطان دوم کی بیٹی سے شادی کی اور ۱۴۲۵ء میں تخت سلطنت سنبھالا۔ سلطان احمد کی شہرت اس وجہ سے ہے کہ اس نے اسلام کو سرکاری مذہب بنایا اور فروغ اسلام کے جذبہ کے تحت برونائی کے ساتھ عربی لفظ "دارالسلام" کا اضافہ کیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے سلطان سلیمان(۱۴۸۳۔۱۴۳۲) نے بھی اشاعت اسلام کے لیے بہت کام کیے۔

برونائی کا زریں اسلامی دور پانچویں حکمران ناخدار اگم (Nakhoda Ragam) یا سلطان بلقیہ(Sultan Bolkiah) کے عہد سے شروع ہوتا ہے جو سلطان سلیمان کے بعد تخت نشین ہوا۔ یہ بہت بڑا سیاح تھا جس کے عہد حکومت میں برونائی کے تحت پورا بورنیو (Borneo) اور فیلپین کے علاقے آ گئے تھے۔

برونائی کا اہم فرمانروا سلطان عمر علی سیف الدین اول (۱۷۴۰-۱۷۹۵ء)، سلطان عمر علی سیف الدین دوم (۱۸۲۵-۱۸۵۲ء) اور سلطان حاجی عمر علی سیف الدین سوم (۱۹۵۰-۱۹۶۷ء) تھے۔ آخر الذکر سلطان جدید برونائی کے معمار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے جس نے پہلی مرتبہ برونائی کے تیل و گیس کے ذخائر کو ملک کی ترقی، خوشحالی اور خود کفالت کے لیے استعمال کیا۔

۱۸۴۷ء میں برونائی کے سلطان نے حکومت برطانیہ سے ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق برونائی برطانیہ کی نو آبادی بن گیا اور ۱۹۰۶ء سے یہاں ایک برطانوی نمائندہ رہنے لگا جو سلطان کو اسلامی مذہب اور اسلامی رسم و رواج کے علاوہ تمام معاملات میں مشورہ دیتا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں ایک معاہدہ کے تحت برونائی کو تحریری دستور ملا جس میں ۱۹۷۱ء میں ترمیم کی گئی اس کی رو سے برونائی کو سوائے دفاع اور خارجی امور کے اندرونی آزادی مل گئی۔

سترہ سال کے شاندار عہد حکومت کے بعد ۱۹۶۷ء میں سلطان حاجی عمر علی سیف الدین سوم نے از خود عنان حکومت اپنے بڑے بیٹے سلطان حسن البلقیہ کے ہاتھ سونپ دی جس نے اپنے والد کی اصلاحی پالیسیوں کو جاری رکھا۔ یکم جنوری ۱۹۸۴ء کو برونائی مکمل طور پر آزاد ہو گیا اور سلطان نے بحیثیت وزیراعظم، وزیر مالی امور اور

وزیر داخلہ عنان حکومت سنبھال لی۔ اب برونائی ایک خود مختار شہنشاہیت ہے جس کے سربراہ سلطان حاجی حسن البلقیہ معز الدین والدولہ ہیں جو سلسلۂ شہنشاہیت کے ۲۹ ویں بادشاہ ہیں۔

فلسفہ ایم آئی بی (M.I.B): برونائی کا سرکاری مذہب اسلام ہے اور اس کا تمدن اور اس کی ثقافت نظریۂ ایم آئی بی پر مبنی ہے۔ ایم آئی بی (Malay Islamic Monarchy) کا مخفف ہے جس کا ترجمہ ہے اسلامی اصولوں اور ملائی رسم و رواج کی پابند بادشاہت فلسفۂ ایم آئی بی کا وجود پانچویں صدی کے آغاز سے بیان کیا جاتا ہے۔ ملایا میں اسلام بارہویں/ تیرہویں صدی میں آیا اور چودہویں صدی عیسوی میں جب برونائی کا بادشاہ پہلا سلطان مقرر ہوا اسی وقت سے نظریہ ایم آئی بی پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ سلطان حاجی حسن البلقیہ معزالدین والدولہ نے یکم جنوری ۱۹۸۴ء میں MIB کو رسمی طور پر نافذ کیا یعنی خود مختار سلطنت کے وجود کے اول یوم سے ہی یہ فلسفہ برونائی کا رسمی فلسفہ بن گیا۔ یہ ملائی زبان، ملائی رسم و رواج، اسلامی قانون و اقدار اور بادشاہی نظام کا امتزاج ہے جس کی پاسداری ہر شہری پر لازم ہے ملک کے نظام تعلیم میں ایم آئی بی ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے بڑھایا جاتا ہے۔ ایم آئی بی کے فلسفہ پر عمل کر کے اسلام اور ملائی تہذیب و ثقافت کا تحفظ کیا جاتا ہے نیز یہ فلسفہ یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ بادشاہ کی مکمل اطاعت و تابعداری کی جائے۔

سیاسی نظام: برونائی کا سیاسی نظام تحریری دستور اور فلسفہ ایم آئی بی کے مطابق ہے۔ اس نظام کے تحت سلطان ملک کا سربراہ اور جملہ انتظامی اختیارات کا مالک ہے، سلطان کا مشیر اعلی وزیراعظم ہوتا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ وہ برونائی مسلمان ہو اور مسلکاً شافعی ہو، وزراء کا تقرر خود سلطان کرتا ہے جس کی مدت سلطان کی صوابدید پر منحصر ہے۔ فی الوقت سلطان کے پاس وزیراعظم کا عہدہ بھی ہے۔

عدلیہ: برونائی کی عدلیہ آزاد ہے۔ اعلی عدالت سپریم کورٹ ہے جو ہائی کورٹ اور کورٹ آف اپیل پر مشتمل ہے جبکہ ماتحت عدالتیں مجسٹریٹ کورٹس ہیں۔ سول مقدمات کی اعلی کورٹ آف اپیل لندن میں واقع پریوی کونسل (Privy Council) ہے۔ سپریم کورٹ کے شانہ بہ شانہ شرعی عدالتیں ہیں جن کا دائرہ اختیار اسلامی قوانین ہیں۔

برونائی کے اسلامی قوانین میں ایک نمایاں قانون ایسا ہے جس کے ذریعہ ملک میں اخلاقی بے راہ روی اور جنسی جرائم کا سدباب کیا گیا ہے اور اس قانون پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ اس کا نام ہے ''خلوت'' کا قانون جس کی پابندی کرانا وزارت مذہبی امور اور شرعی عدالتوں کی ذمہ داری ہے۔ اس قانون کے تحت مسلمان مرد اور غیر محرم مسلمان عورت کا باہم اختلاط اور کسی ایسی جگہ پایا جانا جہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص موجود نہ ہو اور جنسی اختلاط کا قوی امکان ہو قابل سزا جرم ہے۔ اس قانون کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہے چنانچہ اگر دوسرا شریک غیر مسلم ہو تو صرف مسلمان مرد اور عورت کو سزا دی جائے گی۔ اس طرح اس قانون کی پابندی ملکی و غیر ملکی تمام مسلمانوں پر ہے اور اس جرم میں ملوث غیر ملکی شخص کو ملک بدر بھی کیا جاسکتا ہے۔

''خلوت'' کے قانون پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے برونائی معاشرہ میں جنسی جرائم بہت کم ہیں۔

تعلیم: پانچ سال سے زائد عمر کے تمام شہریوں کے لیے یونیورسٹی تک تعلیم مفت ہے جس میں ٹیوشن فیس، کتب، اخراجات آمدروفت، ہاسٹل میں رہائش سب شامل

ہے۔ جن مضامین میں ملک میں سہولتیں موجود نہیں ان کی تعلیم کے لیے طلبہ کو بیرون ملک بھیجا جاتا ہے جس کی کفالت حکومت کرتی ہے۔ اس وقت ملک میں ۲۲۱ مدارس اور کالجز اور ایک یونیورسٹی ہے۔ چونکہ اساتذہ کے معاملہ میں برونائی کی حکومت ابھی تک خود کفیل نہیں ہے، اس لیے تعلیمی اداروں میں غیر ملکی اساتذہ کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

مذہبی اور معاشرتی زندگی: برونائی دارالسلام کی تہذیب و ثقافت چار اہم تمدنوں سے متاثر ہے۔ قبائلی طور طریقے ہندو تہذیب، اسلام اور مغربی افکار، سے ماخوذ ہیں لیکن جس ثقافت کی گہری چھاپ برونائی معاشرہ پر پڑی وہ اسلام اور روایتی فلسفہ ایم آئی بی ہے۔

برونائی کے مسلمان جو ملائی کہلاتے ہیں۔ طبعیتاً مذہبی، منکسرالمزاج اور ملنسار ہیں۔ ان کی معاشرتی زندگی میں اخوت، سادگی اور خوش اخلاقی جیسے اوصاف حمیدہ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ قدیم روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ مذہب سے ان کو گہرا لگاؤ ہے۔مردوں کا روایتی لباس قمیص، سا رونگ اور ٹوپی ہے اور عورتوں کے لباس ڈھیلی قمیص، سارونگ اور تودونگ ہے۔ مردوں کی سازونگ تہمند ہوتی ہے جس کے اوپر ایک دوسرا کپڑا لپیٹا جاتا ہے جس کو سنجانگ (Sinjang) کہتے ہیں۔ عورتوں کی سارونگ (Sarong) بھی تہمند ہی ہوتی ہے اور تودونگ (Tudong) دوپٹہ کے طرح کا لباس ہے، عورتیں اپنے بالوں کو اسی تودونگ سے ڈھانپ کر رکھتی ہیں۔ مرد کالے رنگ کی ٹوپی اس پابندی سے پہنتے ہیں کہ اپنے روایتی لباس سارونگ، سنجانگ اور قمیص کے علاوہ جب وہ مغربی لباس قمیص، پتلون، ٹائی اور کوٹ پہنتے ہیں جب بھی وہ سر پر ٹوپی رکھتے ہیں۔ اس ٹوپی کو ان کی زبان میں سونگ کوک (Songkok) کہا جاتا ہے۔

ملائی معاشرہ میں لباس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مسجدوں، اسکولوں، شادی بیاہ اور دیگر مذہبی تقریبات میں لوگ فخر سے اپنا روایتی لباس پہنتے ہیں۔ شادی بیاہ کی تقریب مذہبی تقریب تصور کی جاتی ہے اس لیے اس موقع پر روایتی لباس ہی پہنا جاتا ہے، کھانا سادہ ہوتا ہے۔ مہر شرعی رکھا جاتا ہے اور جہیز برائے نام دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے لڑکی کے والدین زیر بار نہیں ہوتے۔ شادی کی تقریبات میں یہاں ایک رسم ہے کہ تمام مہمانوں کو میزبانوں کی طرف سے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور دیا جاتا ہے۔

برونائی مسلمانوں کی مذہبی تقریبات اور ان کے اہم تہوار رمضان میں تدارس (قرآن خوانی) اور تراویح، عید (Hari Raya Aidil Fitri)، بقر عید (Hari Raya Haji)، مولد الرسولؐ، ہجرت النبیؐ، نزول القرآن اور اسراء و معراج ہیں۔ یہاں رمضان بہت اہتمام سے منایا جاتا ہے، پورے رمضان مساجد اور گھروں میں 'تدارس' کی محفلیں ہوتی ہیں: تدارس کے معنی ہیں باہم قرآن کریم کی تلاوت کرنا۔ قرآن خوانی کے بعد ہر پڑھنے والے کو ایک چھوٹا سا لفافہ دیا جاتا ہے جس میں تدارس کا اہتمام کرنے والا حسب حیثیت ایک سے لے کر دس ڈالر کا نوٹ دیتا ہے۔ تراویح میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شریک ہوتی ہیں۔

مولدالرسولؐ ۱۲ ربیع الاول کو انتہائی عقیدت و احترام سے منایا جاتا ہے۔ اس دن عام تعطیل ہوتی ہے۔ اس موقع پر بادشاہ، اس کے بیٹے و دیگرمرد قریبی اقارب، وزراء، سفرا و دیگر عمائدین اور تمام تعلیمی ادارں کے اساتذہ و طلبہ اور عام شہری ایک بڑے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ سادہ سی تقریب ہوتی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ ہر آدمی سے مصافحہ کرتا ہے، پھر ایک بڑے جلوس

کی قیادت کرتے ہوئے پیدل شہر کی اہم شاہراہوں کا چکر لگاتا ہے۔ ایک جشن کا سماں ہوتا ہے۔ سب سے اہم تہوار جو پورے مہینہ منایا جاتا ہے اور اس کے لیے خوب خوب تیاریاں کی جاتی ہیں وہ عید الفطر ہے، جسے ملائی زبان میں (Hari Raya Aidil Fitri) کہا جاتا ہے اس کا لغوی مفہوم ہے: عید الفطر ایک عظیم دن۔

عیدالفطر کے موقع پر بادشاہ کا محل تین روز تک عام رعایا کے لیے کھلا ہوتا ہے، جہاں ہر روز تین گھنٹہ صبح اور دو گھنٹے سہ پہر بادشاہ اور اس کے بیٹے و بھائی مردوں اور بچوں سے اور ملکہ اور اس کی بیٹیاں عورتوں اور بچیوں سے مصافحہ کرتے ہیں، بچوں اور بچیوں کو عیدی بھی دی جاتی ہے اور ہر شخص کو ایک ڈبہ میں کیک وغیرہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ محل کے ایک وسیع ہال میں بادشاہ کی طرف سے وافر مقدار میں مرغن کھانوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ بادشاہ اور ملکہ کی زیارت ہر خاص و عام کر سکتا ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، مقیم ہو یا مسافر۔

خواتین: برونائی کی خواتین مردوں کے شانہ بہ شانہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں کام کرتی ہیں، سرکاری ملازمت ہو 'تدریس کا شعبہ ہو ، بنک و دیگر نجی ادارے ہوں، ہسپتال ہوں یا ہوٹل یا فیکٹریاں یا دکانیں ہر جگہ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ سڑکوں پر چلنے والی بڑی چھوٹی عام موٹر گاڑیاں مردوں کی طرح عورتیں بھی چلاتی ہیں، البتہ تمام عورتیں حجاب کی پابندی کرتی ہیں۔ یہ اپنے بالوں کو 'تدونگ' (Tudong) سے ڈھانکے رہتی ہیں۔ یہاں کے معاشرے میں عورت کا اپنے بال چھپانا ایک مذہبی فریضہ ہے یہ عورتیں چہرے پر نقاب نہیں ڈالتیں۔

معیشت: برونائی کی مضبوط اور پائیدار معیشت کا بیشتر انحصار تیل اور گیس کے ذخائر ہیں۔ یہ جنوب مشرقی ایشیا میں انڈونیشیا اور ملائشیا کے بعد سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والے ممالک میں تیسرے نمبر پر ہے - یہ ہر روز ۱۶,۳۰۰ بیرل تیل پیدا کرتا ہے۔ قدرتی گیس (Liquified natural gas) پیدا کرنے میں یہ دنیا کا چوتھا سب سے بڑا ملک ہے۔

ملک کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تیل اور گیس کی ۹۶ فیصد برآمدات ہیں۔ خام تیل آسیان (ASEAN = Association of South East Asian Nations) ممبر ممالک کے بعض ملکوں کو برآمد کیا جاتا ہے جبکہ ۸۳ فیصد گیس جاپان کو اور بقیہ کوریا کو برآمد کیا جاتا ہے۔ (آسیانASEAN برونائی، ملائیشیا، انڈونیشیا، فلپائن، سنگاپور، تھائی لینڈ، کمبوڈیا، لاؤس، اور ویت نام دس ممالک پر مشتمل تنظیم ہے)۔

برونائی کے بنیادی وسائل پیداوار میں زراعت، پھل، سبزیاں اور مچھلی ہیں۔ ملک کا تین چوتھائی زمینی علاقہ جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے۔ پھلوں میں رمبوتان (Rambutan) دوریان (Durian) منگوستین (Mangustin) سنگترے، کیلے اور اناس قابل ذکر ہیں۔

اس ملک کی بہترین معاشی حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں آمدنی پر کوئی ٹیکس نہیں ہے اور بیرون ملک ڈالر بھیجنے پر کوئی پابندی نہیں۔ اس طرح اس ملک پر کوئی بیرونی قرض نہیں ہے اور بجٹ میں خسارہ نہیں ہے۔

فلاحی مملکت: برونائی دارالسلام کو ایک فلاحی مملکت کہا جا سکتا ہے۔ ملک کے تمام بچوں کے لیے تعلیم اور علاج معالجہ تقریباً مفت ہے۔ ہر شخص کو مکان اور کار خرید نے کے لیے بلا سود قرض مل جاتا ہے۔ سرکاری ہسپتالوں میں اعلیٰ تعلیم اور تجربہ کار ڈاکٹر موجود ہیں

جہاں نہ صرف شہریوں کو، بلکہ غیر ملکی سرکاری ملازمین اور ان کے اہل خانہ کو طبی سہولتیں مہیا ہیں۔ شہریوں کے لیے طبی مشورہ کی فیس صرف ایک ڈالر اور غیر ملکوں کے لیے تین ڈالر ہے جس میں دواؤں کی قیمت بھی شامل ہے۔ بارہ سال سے کم عمر کے تمام بچوں کے لیے کوئی فیس نہیں ہے.

سرکاری ملازمتوں میں ریٹائرمنٹ کی عمر ۵۵ سال ہے جس کے بعد انہیں پنشن ملتی ہے پنشن یافتہ ملازمین کے لئے ایک قانون یہ ہے کہ اگر یہ ۷۰ سال تک بقید حیات رہیں تو اس کے بعد ان کی پنشن تقریباً وہ تنخواہ ہو جاتی جو ریٹائر منٹ کے وقت تھی.

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں.

(امتیاز احمد)

••------------••

※ برہان الدین، سیدنا محمد: (ولادت ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء)، اسماعیلی برادری داؤدی بوہرہ کے سربراہ اور باونویں داعیِ مطلق۔ اس کے منصب کا آغاز یمن میں ۵۳۲ھ/ ۱۱۳۸ء میں ہوا، جب فاطمی خلافت کے وارث، بائیسویں امام الطیب نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ اسماعیلی برادری کا عقیدہ ہے کہ اسی وقت سے الطیب کی نسل میں پوشیدہ طور پر امامت کا سلسلہ جاری ہے اور یہ کہ اس کے ''پیش رووں'' نے داعی مطلق کے ذریعے فاطمی اسماعیلی مشن کو جاری رکھنے کے لیے پیشگی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ داعیِ مطلق ''گوشہ نشین'' امام کی نیابت کرتا ہے اور اس کی طرف سے کام کرتا ہے۔ وہ عملی طور پر امام کے دینی اور قانونی فرائض کی انجام دہی کرتا ہے اور اپنے معتقدین اور برادری کی معاشرتی تنظیم کی محافظت کرتا ہے۔ موجودہ داعی بمبئی میں مقیم ہیں [کیونکہ] برادری کا مرکز ۹۷۴ھ/ ۱۵۶۷ء میں یمن سے ہندوستان منتقل کر دیا گیا تھا۔ ان کے ''پیش رووں'' کی طرح معتقدین ان کا بھی بڑا ادب و احترام کرتے ہیں.

برہان الدین نے مذہبی تعلیم اور انتظامی تربیت اپنے نامور پیش رو، اپنے والد طاہر سیف الدین (۱۹۱۵ء۔ ۱۹۶۵ء) کی زیرنگرانی حاصل کی اور ۱۹۶۵ء میں ان کے جانشین بنے ۔ انہوں نے بوہرہ برادری کو ایک تازہ ولولے اور جوش سے ہم کنار کیا ہے اور اپنی تمام تر توانائیاں فاطمی اسماعیلی وراثت کو محفوظ کرنے کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کے لیے روزمرہ زندگی میں قرآنی تعلیمات کو ملحوظ رکھنے پر زور دیا ہے۔ وہ اسلامی کاروباری اخلاقیات کی پابندی کے قائل ہیں، جس میں سود کی ممانعت بھی شامل ہے، بوہرہ برادری کی قرضہ جاتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے غیر سودی قرضہ سکیموں کا اہتمام کیا ہے۔ انہوں نے امام حسینؓ کی شہادت کی عزاداری کی قدیم شیعہ رسم کو مزید مستحکم کیا ہے؛ چنانچہ عاشورۂ محرم کے دوران میں شہادت کے ماتم کے لیے سالانہ مجالس فاطمی اسماعیلی برادری کا ایک اہم روحانی تشخص بن چکی ہیں، جن میں ہزاروں بوہرے داعی کے مواعظ سے مستفید ہونے کے لیے شرکت کرتے ہیں۔ یہ مواعظ دنیا بھر کے بوہرہ مراکز میں براہِ راست نشر کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے دنیوی اور دینی تعلیم میں امتزاج پیدا کرنے کے لیے اسلامی ماحول میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے اسلامی طرز کے سکول قائم کیے ہیں۔ اخیراً انہوں نے فاطمی تبرکات کی مرمت و درستی کا بھی اہتمام کیا ہے اور دنیا بھر میں بہت سی مساجد، مقابر اور دیگر عام عمارات کی تعمیرو مرمت کے ذریعے فاطمی فنِ تعمیر اور نمونہ کاری (Design) کو فروغ بخشا

ہے۔ ان تعمیراتی کاموں میں بہت سے اہم ترین کام ۱۹۸۰ء میں قاہرہ کی ایک عظیم مسجد جامع الانوار کی مرمت و تزئین ہے جو فاطمی خلیفہ الحکم (۹۹۶ھ۔ ۱۰۲۱ھ) نے تعمیر کرائی تھی۔

سیّدنا برہان الدین ایک متبحر عالم ہیں۔ وہ بذاتِ خود عربی درس گاہ "الجامعۃ السیّفیۃ" کی نصابی سرگرمیوں کی نگرانی کرتے ہیں، جہاں ان کے متبعین کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ وہ اسماعیلی افکار پر مبنی متعدد کتب کے مصنف ہیں اور مناجات/ ادعیہ، نعت اور مدحتِ آئمہ و وعاۃ کے ضمن میں عربی میں ہزارہا اشعار کہہ چکے ہیں۔ انہیں ۱۹۶۶ء میں الازہر یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں مل چکی ہیں۔

وہ اپنی کبرسنّی کے باوجود ذاتی طور پر اپنے معتقدین میں اسلامی اقدار کے فروغ و ترویج کے لیے اکثر و بیشتر دنیا بھر میں [قائم] بوہرہ مراکز کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہر روز داؤدی بوہروں کی ضروریات کی طرف توجہ دینے کے لیے کافی وقت صرف کرتے ہیں جو نوزائیدہ بچوں کے نام کے انتخاب جیسے دنیوی معاملات سمیت زندگی کے تمام شعبوں میں ان سے مشاورت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ وہ ۱۹۷۶ء میں مصر کی طرف سے اور ۱۹۸۱ء میں اردن کی طرف سے اعلیٰ ترین سول اعزازات وصول کرچکے ہیں۔ [نیز دیکھیے بوہرہ؛ سلطنتِ فاطمیہ؛ اسماعیلیہ؛ الجامعۃ السیفیہ]۔

مآخذ: امام حسینؓ کی شہادت کے سلسلے میں سیدنا برہان الدین کی سالانہ یادگاری تقاریر مختلف مقامات پر مقیم بوہرہ برادری کی مطبوعات میں محفوظ کی جاتی ہیں: (۱) مثلاً ذکر السفر الجمیل (بمبئی، ۱۹۹۳ء) اور (۲) The Mombasa Experience (بمبئی، ۱۹۹۳ء)۔ ان کی مطبوعہ تصانیف میں: (۳) استفتاح زُبدالمعارف (بمبئی ۱۹۶۵ء) اور (۴) المناجات الشریفۃ الرمضانیۃ (بمبئی، ۱۹۹۰ء) شامل ہیں۔ [یہ] آخری تصنیف رمضان [المبارک] کے لیے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۹۰ء تک کے لکھے گئے مناجاتی اشعار کا مجموعہ ہے۔ داعیٔ مطلق سیکرٹریٹ کی طرف سے شماریاتی اور تاریخی معلومات پر مبنی کتابچے شائع کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کے کتابچوں میں سے چند ایک یہ ہیں: (۱) A Golden chapter in Islamic Economy (بمبئی، ۱۹۸۵ء)؛ (۲) بی۔ ایچ زیدی: From Strength to Strength (بمبئی، ۱۹۹۱ء)؛ (۳) ٹی۔ اے۔ اے داؤد بھائی: Day of Thanks giving (بمبئی ۱۹۹۲ء)؛ (۴) کوثر نیازی: Heir to a Great Spiritual Heritage (بمبئی، ۱۹۹۲ء)؛ مندرجہ ذیل کتب سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے؛ (۵) نجم الدین، وائی: Seventy- Five Fifty- Second El- Dai el Fatimi : Momentous Years in Retrospect، بمبئی، ۱۹۸۵ء؛ (۶) قریشی، ادریس عمادالدین: عیون الاخبار وفنون الآثار، ج ۷، بیروت، ۱۹۷۴ء؛ (۷) سیف الدین، طاہر: ضوء نورالحق المبین، بمبئی، ۱۹۱۷ء۔ فاطمی مصر کے امام سے یمن میں داعیٔ مطلق کو منصب کی منتقلی کی علمی و فکری تشریح۔ جس میں چوتھی صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی کی کتاب الشواہد والبیان از جعفر بن منصور الیمنی سے حوالہ جات دیئے گئے ہیں؛ (۸) سیف الدین، طاہر: المشرب الکوثری، بمبئی، ۱۹۲۰ء، Souvenir Akhbar Nur، لنڈن، ۱۹۸۲ء؛ (۹) A Treasury of Reminiscience، بمبئی ۱۹۶۷ء۔ سیدنا برہان الدین کی ابتدائی زندگی کے بارے میں معلوماتی تصویری کتاب۔

(مصطفیٰ عبداللہ حسین [ت ظفر علی])

••------------••

بریدہؓ بن حصیب: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے ایک صحابی اور متعدد احادیث کے راوی۔ ان کا نام بریدہ بن حصیب بن عبداللہ بن الحارث الاسلمی اور کنیت ابوعبداللہ یا ابوسہل یا ابوالحصیب یا ابوساسان تھی۔ ابو علی الطوسی صاحب ابن المبارک کے مطابق ان کا نام عامر اور لقب بریدہ ہے (ابن حجر: الاصابۃ، ۱:۱۵۰) ان کا تعلق قبیلہ بنو سہم سے تھا.

ان کے قبول اسلام کے وقت کی بابت اختلاف ہے: ایک رائے کے مطابق جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو آپؐ راستے میں ان کی بستی غمیم میں ٹھہرے۔ وہاں حضرت بریدہؓ اور ان کے ساتھ خاندان کے دوسرے اسی (۸۰) لوگ مشرف باسلام ہوے۔ وہ غزوہ احد کے بعد مدینہ منورہ آئے۔ دوسرے قول کے مطابق وہ نبی اکرمؐ کے بدر سے لوٹنے کے بعد مسلمان ہوے۔ البتہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان میں شریک ہوے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سولہ غزوات میں شریک ہوے (الاصابۃ، ۱:۱۵۰؛ احمد بن حنبل مسند ،۵:۳۴۹؛ البخاری ، ۶/ ۲۰) جب کہ دوسری روایت کے مطابق انہوں نے نبی اکرمؐ کے ساتھ انیس غزوات میں شرکت کی جن میں سے ۸ میں جنگ بھی لڑی (مسلم: ۵ / ۲۰۰؛ ۳/ ۲۳۰).

فتح مکہ کے دن ان کے ہاتھ میں مسلمانوں کا جھنڈا (لواء) تھا، اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب لشکر اسامہ نے بلقاء کی طرف لشکر کشی کی، اس وقت بھی وہ لشکر اسلام کے علم بردار تھے (الذہبی: سیر اعلام النبلاء، ۲:۴۶۹، ۴۷۰)۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کی قوم میں صدقہ وصول کرنے کے لیے مقرر فرمایا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں سرغ (شام کی طرف سے آخری مگر حجاز کا ابتدائی علاقہ) کی مہم میں وہ حضرت عمرؓ کے امرا میں سے تھے.

انہوں نے قبولِ اسلام کے بعد شروع ہی میں مدینہ منورہ کو اپنی جائے سکونت بنایا لیا تھا، مگر پھر مدینہ سے بصرہ کوچ کر گئے، وہاں سے جہاد خراسان میں شریک ہوے اور مرو میں مقیم ہوگئے، وہیں فوت ہوے اور یہیں مدفون ہیں۔ ان کے بیٹے عبداللہ نے ان سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریدہؓ بن حصیب اور حکم بن عمرو غفاری سے کہا "انتما عینان لاهل المشرق" (تم دونوں اہل مشرق کی آنکھیں ہو)۔ چنانچہ یہ دونوں بزرگ مرو چلے گئے اور وہیں فوت ہوے (ابن الاثیر: اسدالغابۃ، ا: ۳۶۷۔ ۳۶۹)۔ ان کی وفات یزید بن معاویہؓ کے دور میں ہوئی.

ابن سعد اور ابوعبیدہ کا کہنا ہے کہ بریدہؓ کی وفات ۶۳ھ میں ہوئی، جب کہ دوسرے قول کے مطابق انہوں نے ۶۲ھ میں وفات پائی.

علامہ ابن حزمؒ کے مطابق ان سے مروی احادیث کی تعداد ۱۲۷ ہے (دیکھیے ابن حزم: جوامع السیرۃ، ص، ۲۷۷)۔ اسی طرح ابن حزم نے ان کا شمار عہد صحابہؓ کے معروف مفتیوں میں کیا ہے۔ البتہ صاحب المسند الجامع نے ان سے مروی سو احادیث کا ذکر کیا ہے (دیکھیے المسند الجامع ۳۶:۱۸۶او مابعد).

ان سے مروی احادیث کا تعلق مختلف شعبہ ہائے حیات سے ہے، جن میں نماز، زکوۃ، حج، روزہ، نکاح، معاملات، فرائض، حدود، دیات، لباس، طب و مرض، ادب، ذکر و دعا، قرآن، جہاد، مناقب صحابہؓ، زہد و فتن و اشراط ، جنت اور جنت و جہنم سرفہرست ہیں.

ان سے ان کے صاحبزادوں عبداللہ، اور سلیمان کے علاوہ عبداللہ بن اوس، ابوالملیح، ابوالمہاجر، عبدالرحمن

بن جوشن، نفیع ابی داؤد، شعبی، ابوداؤد الاعمی، ابن عباس اور عبداللہ بن مولی وغیرہ نے روایت حدیث کی ہے (حوالۂ مذکور)۔

ان سے زیارت قبور کے بارے میں بھی احادیث مروی ہیں۔ ان سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمھیں قبرستان کی زیارت سے روکا کرتا تھا، اب محمدؐ کو اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی اجازت مل گئی ہے تو تم بھی قبروں پر جایا کرو، کیونکہ یہ قبریں آخرت کی کو یاد دلاتی ہیں (المسند، الجامع، ۳: ۱۹۹، ۲۰۰؛ مسند احمد: ۵: ۳۵۹، ۳۶۱، ۳۵۶؛ ابن ماجہ، حدیث، ۳۴۰۵)

اسی طرح ان سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے والدہ کی غیر موجودگی کی صورت میں نانی کا میراث میں چھٹا حصہ رکھا (المسند الجامع: ۳:۲۰۸، ابوداؤد: حدیث،۲۸۹۵)۔

ان سے ہی وہ مشہور حدیث بھی مروی ہے کہ نبی اکرمؐ کی خدمت میں ایک بدو حاضر ہوا اور کہا کہ مجھے آپ اس بات کی اجازت دیں کہ میں آپ کو سجدہ کروں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں کسی کو کسی شخص کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے (المسند الجامع، ۳: ۲۲۵، دارمی: حدیث: ۱۴۷۲)۔

اسی طرح ان سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے ساتھ کھڑے تھے کہ پہاڑ نے ہلنا شروع کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہاڑ کو مخاطب ہو کر فرمایا اے حراء رک جا، تجھ پر نبی، صدیق اور شہید کے علاوہ کوئی نہیں (المسند الجامع : ۳:۲۴۰؛ مسند احمد : ۵:۳۴۶)۔

مآخذ: متن میں مذکور مآخذ کے علاوہ دیکھیے:(۱) ابن سعد: الطبقات : ۴:۲۴۱۔ ۲۴۳؛ (۲) ابن معین: التاریخ، ۵۷؛ (۳) الواقدی: المغازی ۳:۱۱۴۲؛ (۴) العجلی: ترتیب الثقات، ص: ۷۹؛ (۵) ابن حبان: الثقات، ۳:۲۹؛ (۶) الیعقوبی: تاریخ، ۲:۷۹؛ (۸) الوافی بالوفیات، ۱۰:۱۲۴؛ (۸) الطبری: تاریخ ۱:۱۵؛ (۹) شذرات الذہب، ۱:۷۰؛ (۱۰) جمہرۃ انساب العرب، ص: ۲۴۰.

(حافظ عبدالقدیر)

••------------••

بشر بن الولید: ابن خالد الولیدالکندی الحنفی، ⊗ ایک ممتاز عالم دین، نامور محدث، معروف امام، عراق کے قاضی، اندازاً دوسری صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوئے (الذہبی: سیراعلام النبلاء :۱۰: ۶۷۴)۔

انہوں نے متعدد اہل علم ، مثلاً عبدالرحمٰن بن الغسیل، مالک بن انس، حماد بن زید، حشرج بن نباتہ، صالح المری اور قاضی ابویوسفؒ سے علم حدیث حاصل کیا (کتاب مذکور، ۱۰: ۶۷۴)۔

انہوں نے قاضی ابو یوسفؒ شاگرد امام ابوحنیفہؒ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور اس میں بلند مقام پیدا کیا (ابن حجر العسقلانی: لسان المیزان ،۲: ۳۵)۔

انہوں نے قاضی ابویوسفؒ سے ان کی کتابوں کو روایت کیا۔ شریک، حماد بن زید، مالک بن انس اور صالح مری وغیرہ سے روایت حدیث کی ہے۔ وہ محمد بن طلحہ سے بھی روایت کرتے ہیں (ابن سعد: الطبقات الکبریٰ، ۷: ۳۵۶)۔

جن لوگوں نے ان سے روایت کی ہے، ان میں حسن بن علویہ، حامد بن شعیب البلخی، موسیٰ بن ہارون، ابوالقاسم البغوی، ابویعلی الموصلی، ابوالعباس الثقفی اور بہت سے دوسرے حضرات شامل ہیں (الذہبی: سیراعلام النبلاء ۱۰: ۶۷۴)۔

اکثر محدثین نے انہیں ثقہ کہا ہے، مثلاً ابن

حجرالعسقلانی نے مسلمہ کے حوالے سے ان کا شمار ثقات میں کیا ہے.

ابن ابی حاتم کے نزدیک ان کی احادیث قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں (ابن حجر: لسان المیزان، ۲: ۳۵) ابوعبدالرحمٰن السلمی کا بیان ہے کہ ابوالحسن الدارقطنی کے نزدیک ثقہ تھے (الذہبی: سیر اعلام النبلاء، ۱۰: ۶۷۵).

صالح بن محمد جزرہ کی رائے ہے کہ وہ صدوق تھے لیکن ضعیف العمری کے سبب ان کی عقل و فہم نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا (ابن حجر: لسان المیزان ، ۲: ۳۵)۔

بعض محدثین نے اس کے برعکس رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ نامور سوانح نگار ابن حجرؒ نے سلیمان کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ منکرالحدیث تھے.

الآجری نے ایک مرتبہ ابوداؤد سے سوال کیا، کیا بشیر بن الولید ثقہ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا وہ ثقہ نہیں ہیں، ان کی روایت کردہ حدیث کا اعتبار نہ کرنا (ابن حجر: لسان المیزان ، ۲: ۳۵)۔ تاہم امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے والدین سے حسن سلوک کے متعلق جو حدیث بیان کی ہے، اس کی سند میں بشیر بن الولید کا نام موجود ہے (دیکھیے الذہبی: سیر اعلام النبلاء ۱۰: ۶۷۵)۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے نزدیک وہ ثقہ تھے۔

وہ ۲۰۸ھ میں مہدی حکومت کی طرف سے قاضی مقرر ہوے۔ بعدازاں مدینۃ المنصور میں قضا کے عہدے پر فائز ہوے اور ۲۱۳ھ تک قاضی کے فرائض سرانجام دیتے رہے، فقہ پر کافی عبور رکھتے تھے، اسی لیے بحیثیت قاضی بہت بلند مقام پایا (ابن حجر: لسان المیزان، ۲: ۳۵).

بغداد کے دونوں حصوں پر بھی قاضی کے عہدہ پر فائز رہے (ابن سعد: الطبقات الکبری، ۷: ۳۵۶).

ان کا دور چونکہ ''معتزلہ کے عروج کا دور تھا، جس دور میں قرآن مجید کے مخلوق ہونے کا نظریہ گھڑا گیا۔ اس لیے انہوں نے بھی اس کی مخالفت کی۔ چنانچہ ایک شخص نے حکومت وقت کو اطلاع دی کہ یہ وہ قرآن کریم کے مخلوق ہونے کے قائل نہیں، یہ سن کر خلیفہ وقت نے انہیں گھر میں نظر بند کر دیا۔ دروازے پر پولیس کا پہرہ بٹھا دیا اور ان کے فتویٰ جاری کرنے پر پابندی لگا دی، لیکن جب جعفر بن ابی اسحاق نے اقتدار سنبھالا تو ان کی رہائی کا فرمان جاری کر دیا گیا اور تمام پابندیاں ہٹا لی گئیں۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک زندہ رہے اور اتنے بوڑھے ہوگئے کہ دوران گفتگو توقف کرنے لگے جس کے سبب محدثین نے ان سے روایت کرنا ترک کر دیا۔ (ابن سعد: الطبقات الکبری، ۷: ۳۵۶).

الذہبی کے مطابق عمر کے آخری حصے میں انہوں نے مسئلہ خلق قرآن کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اس توقف کے سبب اصحاب حدیث ان سے دور ہوگئے اور ان سے حدیث لینا چھوڑ دیا لیکن دوسرے لوگ بدستور روایت کرتے رہے۔ (الذہبی، سیر اعلام النبلاء ۱۰: ۶۷۴) بشر بن الولید صالح، دیانت دار اور احکام میں بڑے سخت تھے۔ سفیان بن عیینہ کی مجلس میں جب سوال و جواب کا دور ہوتا تو وہ کہتے سوال پوچھنا ہے تو بشیر بن الولید سے پوچھو [کتاب مذکور، ۱۰: ۶۷۵].

وہ انتہائی متدیّن اور عابد و زاہد تھے۔ نہایت صوفیانہ اور درویشانہ زندگی بسر کی۔ جس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ روزانہ ۲۰۰ رکعت نفل پڑھتے تھے، زندگی کے آخری ایام میں فالج کا عارضہ لاحق ہونے کے باوجود اس معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ (ابن حجر: لسان المیزان ، ۲: ۳۵) ذوالقعدہ ۲۳۸ھ میں عازم ملک بقا ہوئے ، (ابن حبان: کتاب الثقات، ۸: ۱۴۳).

مآخذ: (۱) ابن حجر العسقلانی: لسان المیزان، دائرۂ معارف عثمانیہ، حیدر آباد دکن ۱۳۳۰ھ، ۲: ۳۵؛ (۲)

ابن حبان: کتاب الثقات، دارالفکر، ۸: ۱۴۳، (۳) ابن سعد، الطبقات الکبری، مطبوعہ بیروت، ۱۳۷۷ھ/ ۱۸۵۸ء؛ ۷: ۳۵۶؛ الذہبی: سیر اعلام النبلاء، طبع صالح السمر و شعیب الارنووط، بیروت، ۱۹۹۲ء، ۱۰: ۶۷۳۔ ۶۷۶۔

(محمد فیاض سعید [و محمود الحسن عارف])

••----------••

⊗ بعث پارٹی: (حزب البعث العربی الاشتراکی): عالم عرب کی ایک معروف قوم پرست سیاسی جماعت جو اس وقت بھی (اوائل ۲۰۰۷ء میں) شام میں برسر اقتدار ہے اور عراق میں وسط ۲۰۰۳ء میں امریکی حملے اور قبضے تک برسر اقتدار رہی ہے۔ بعث پارٹی کی بنیاد ایک شامی عیسائی مائیکل عفلق (م ۱۹۹۰ء) (بعض لوگ اسے میخائیل اور میشیل بھی لکھتے ہیں) نے صلاح الدین البیطار کے ساتھ مل کر ۱۹۴۰ء میں ایک زیر زمین سیاسی اور فکری تحریک کی حیثیت سے شام میں رکھی۔ ابتدا میں پارٹی کا نام حزب البعث العربی تھا لیکن ۱۹۵۴ء میں جب اکرم الحورانی کی سیاسی جماعت الحزب العربی الاشتراکی کا ادغام بعث پارٹی میں ہوا تو الاشتراکی کا لاحقہ بھی بعث پارٹی کے نام کا حصہ بن گیا اگرچہ اشتراکیت (سوشلزم) شروع دن سے بعث پارٹی کے پروگرام اور فلسفے کا حصہ تھی۔

پس منظر: فرانس نے ۱۹۲۱ء میں شام پر قبضہ کر لیا جو بلا شرکت غیرے ۱۹۴۱ء تک قائم رہا۔ اس دوران میں اس نے مسلم اکثریت (اس وقت آبادی چالیس لاکھ) کو دبانے اور غیر مسلم اقلیتوں کو ابھارنے اور انہیں مسلمانوں کے خلاف کھڑا کرنے کی پالیسی اپنائی۔ ان اقلیتوں میں علوی (آبادی سوا دو لاکھ اور تاریخی نام نُصَیری) اور دروزی (تاریخی نام قرامطہ۔ آبادی ایک لاکھ) نمایاں تھے۔ فرانسیسیوں نے ان دونوں فرقوں کو، جو مسلم دشمنی کی ایک طویل تاریخ رکھتے ہیں، سول اور فوج میں آگے لانے کی خاطر نہ صرف کلیدی مناصب ان کے حوالے کیے، بلکہ انہیں محکمہ تعلیم اور فوج کے تربیتی اداروں میں بھی پیر جمانے میں مدد دی تاکہ وہ نوجوانوں کے ذہنوں کو بدل سکیں۔ مائیکل عفلق نے بھی ان دونوں اقلیتوں میں اپنے اثرات پھیلائے اور فرانسیسیوں کی مدد سے ایک موثر حلقہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا (خلیل حامدی: "شام کی حزب البعث: تاریخ، نظریات اور کارنامے" در ماہنامہ ترجمان القرآن اگست ستمبر ۱۹۶۷ء لاہور۔ مائیکل عفلق کے حالات زندگی کے لیے دیکھیے Middle East Forum، ج ۳۳، شمارہ ۹، اور کامل ابوجابر کی Syracuse, The Arab Ba`th Socialist Party، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰ بعد)۔

بعث پارٹی کے ابھرنے اور قدم جمانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ عالمی طاقتوں نے جب اسرائیل کے قیام میں مدد دی تو عربوں نے اس کی مسلح مزاحمت کی لیکن اس میں وہ ناکام ہوگئے۔ جنگ فلسطین میں اس اہانت آمیز شکست نے عربوں کو جھنجھوڑ ڈالا اوران کی کمزوریوں کو نمایاں کر دیا۔ اس صورت حال نے ایک عمومی اضطراب اور بے اطمینانی کو جنم دیا اور ایک عام آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ معمول اصلاحی اقدامات سے اس صورت حال کو نہیں بدلا جاسکتا بلکہ اس کے لیے ایسے انقلاب کی ضرورت ہے جو ان کی قومی زندگی کی کایا پلٹ کر رکھ دے۔ مروجہ نظام زندگی سے بیزاری اور اجتماعی حالات میں انقلابی تبدیلیوں کے تقاضے اور خواہش نے عربوں کے متوسط طبقے میں بعث جیسی تحریکوں کو پذیرائی بخشی جو نئی نسل کی باغیانہ اور انقلابی جذبات کی ترجمان تھیں۔ تیسری چیز جو بعث پارٹی کے قیام اور اس کے استحکام کا سبب بنی وہ یہ تھی کہ اس نے ایک نظریاتی خلا کو پُر کیا۔ قومیت (نیشنلزم) اور اشتراکیت (سوشلزم) کے خیالات

اگرچہ بعث پارٹی سے پہلے بھی عرب معاشرے میں موجود تھے لیکن بعث پارٹی نے ان کو اپنے سیاسی پروگرام اور سرگرمیوں کا مرکز و محور بنا کر اور انہیں لازم و ملزوم قرار دے کر قومی آزادی اور اتحاد کے ساتھ ساتھ اشتراکی معاشرے کے قیام کو عرب قومی تحریک کا نہ صرف ہدف قرار دیا بلکہ انہیں ایک جاندار علمی تحریک کی بنیاد بھی بنا دیا۔ اس طرح بعث پارٹی نے عرب دنیا کے ان لوگوں کے لیے جو جدید تعلیم و تہذیب کے زیر اثر اسلام کو بطور نظامِ حیات قبول کرنے پر تیار نہ تھے، ایک متبادل حل پیش کیا جس کے مطابق قومی زندگی کی تشکیل نو کی جاسکتی تھی۔ گویا بعث پارٹی کے پروگرام نے نظریاتی اعتبار سے ان عربوں کی ایک بنیادی ضرورت کو پورا کیا جو لادینیت کی طرف میلان رکھنے کی وجہ سے یہ سوچتے تھے کہ اگر اسلام کو قومی زندگی میں مرکزیت کے مقام سے بے دخل کر دیا جائے تو اس سے پیدا شدہ خلاء کو کس طرح پُر کیا جائے؟ (ظفر اسحاق انصاری: ''عرب بعث پارٹی کی اشتراکیت'' در ماہنامہ چراغ راہ، سوشلزم نمبر، جلد اول، کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۳۷۵ بعد)۔

نظریات: بعث پارٹی کے قیام کے وقت عفلق نے وحدت، حریت اور اشتراکیت پر مبنی تین نکاتی پروگرام پیش کیا۔ وحدت کے بارے میں اس نے کہا کہ اس سے مقصود ہے عربوں کی انقلابی قوتوں کی وحدت؛ صرف سیاسی وحدت نہیں، بلکہ شعور، وجدان، نظریے، جذبات اور نظریۂ حیات کے بارے میں مکمل وحدت نیز اقتصادی ڈھانچے، فوج اور عوامی تنظیم میں وحدت۔ اور حریت سے مراد ہے انسانی ارادہ کی حریت یعنی انسان کو ہر طرح کی نفسیاتی، اجتماعی، سیاسی اور فکری قیود سے آزاد کرنا اور اسے دینی خرافات کے بندھنوں سے نجات دلانا (مائیکل عفلق: فی سبیل البعث، ص ۸)۔ جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے بعث پارٹی کے بانیوں کے نزدیک وہ جس اشتراکیت کے علمبردار ہیں وہ اشتراکیت کی دوسری انواع و اقسام سے جداگانہ اور منفرد حیثیت کی مالک ہے۔ یہ عرب قوم کے مخصوص حالات، ضروریات اور مزاج کی پیداوار ہے اور اسی لیے عرب اشتراکیت کہلانے کی مستحق ہے۔ عفلق کے نزدیک اشتراکیت کا لفظ عربی زبان میں اگرچہ باہر سے آیا ہے لیکن جہاں تک عرب اشتراکیت کے جوہر کا تعلق ہے، وہ قطعاً اجنبی چیز نہیں، بلکہ خود عرب قومیت کی گہرائیوں سے ابھرا ہے (فی سبیل البعث، ص ۱۰۹، ۱۴۵، ۱۵۹ وغیرہ)۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو عفلق کی نظر میں وہ آسمانی دین نہیں، بلکہ عربوں کی قومی تحریک کی ایک کڑی ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عربوں کے قومی لیڈر ہیں۔ اس کے الفاظ میں ''اسلام ایک عربی تحریک تھی اور اس کا ہدف عرب قومیت کی تجدید و تکمیل تھا۔ اسلام نے جو زبان اختیار کی وہ عربی تھی، اشیا کے بارے میں جو نقطۂ نظر پیش کیا وہ عربی عقل کی عینک کے تابع تھا اور جن اوصاف کی اسلام نے تلقین کی وہ سب عربوں کے اوصاف تھے۔ اُس وقت مسلم سے مراد ترقی پسند اور انقلابی عرب انسان ہوتا تھا ویسے ہی جیسے ہم آج وطن پرست کہتے ہیں اور اس سے ہماری مراد یہ تخصیص کرنا ہوتا ہے کہ یہ افراد اپنے وطن کی تقدیس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے مسائل کو اہمیت دیتے ہیں.....اور یہ کہ اب اسلام عرب قومیت کی نئی تحریک کی شکل میں ظہور پذیر ہوا ہے'' (فی سبیل البعث ص ۴۶)...... نیز یہ کہ اسلام صرف عربوں کے لیے ہے۔ یہ عرب قوم، عرب اوصاف، عرب اخلاق اور عرب صلاحیتوں کے ماسوا کسی اور قالب میں نہیں ڈھل سکتا۔ (صفحہ ۴۷، ۴۹)۔ عفلق نے مشرکین عرب کو محض اپوزیشن لیڈر قرار دیتے ہوئے

اور ان کی اہمیت جتاتے ہوئے کہا ''کارنامہ اسلام اپنے طبعی سٹیج سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور وہ طبعی اسٹیج ہے سرزمین عرب...... اور نہ اسے اس کے اصل ہیروؤں اور ایکٹروں سے کاٹا جاسکتا ہے اور وہ ہیں تمام عرب۔ اسلام کو بروئے کار لانے کے لیے جس طرح حامیوں کا گروہ ضروری تھا اسی طرح مشرکین عرب بھی ضروری تھے۔ اسلام کی جن لوگوں نے مخالفت کی ہے انہوں نے بھی اسلام کی کامیابی میں اتنا ہی حصہ لیا ہے جتنا حامیوں اور مددگاروں نے......'' (کتاب مذکورہ، ص ۴۵، ۴۷)۔ نصیریوں اور دروازیوں میں اثر و رسوخ حاصل کرنا چونکہ شروع سے اس کے پیش نظر تھا اس لیے اس نے دین کی باطنی تعبیر کرتے ہوئے لکھا ''دین کی حقیقت اور دین کے ظاہر دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے کیونکہ دین کا ایک باطن ہوتا ہے اور ایک ظاہر اور بسا اوقات دین کے ظاہر اور باطن میں انتہائی فرق ہوتا ہے بلکہ تعارض کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی کبھی دین کا ظاہر دین کے اصل مقاصد کے برعکس ہوتا ہے اور اصل مشکل اسی وقت درپیش آتی ہے'' (کتاب مذکورہ ،ص ۲۰۰) .

تنظیم: بعث پارٹی کی ابتدا اگرچہ ۱۹۴۰ء میں ایک زیر زمین تحریک کی حیثیت سے ہوئی تھی تاہم ۱۹۴۷ء میں اس کا نظام اساسی منظور کیا گیا اور بعد میں اس نے جمہوری طرز کی تنظیم قائم کر لی جس کی باقاعدہ منظوری اپریل ۱۹۶۵ء میں ہونے والی آٹھویں عرب قومی کانگرس نے دی۔ جماعتی تنظیم میں دوہری قیادت تھی۔ ایک قومی یعنی سارے عالم عرب کی بنیاد پر اور دوسری علاقائی یعنی ہر ملک کی سطح پر۔ اس میں نیچے سے لے کر اوپر تک کی درجہ بندی تھی مثلاً بنیادی یونٹ خلوہ ، مقامی سطح پر فرقہ، پھر شعبہ، پھر فرع۔ کانگریس کے ارکان مرکزی قیادت اور سیکرٹری جنرل کا انتخاب کرتے تھے۔

بعث پارٹی ۱۹۶۳ء تک عالم عرب کی سطح پر کام کرتی رہی اور اس میں شامی اکثریت کے علاوہ اردن، فلسطین، لبنان ، عراق، تیونس وغیرہ کی خاطر خواہ نمائندگی موجود تھی، لیکن اسی سال جب یہ جماعت شام میں برسراقتدار آئی اور عراق میں بھی اسے چند ماہ کے لیے اقتدار ملا تو جماعت کے دو دھڑے وجود میں آگئے۔ ایک شام کے زیر اثر اور دوسرا عراق کے۔ جولائی ۱۹۶۸ء سے جب یہ جماعت عراق میں مستحکم بنیادوں پر اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تو مستقل طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوگئی اور شام و عراق کی بعث پارٹیوں نے خود مختارانہ کام شروع کر دیا۔ شام میں اس کے رہنما حافظ الاسد اور عراق میں صدام حسین تھے۔ نظریاتی طور پر ان دونوں میں کوئی بڑا اختلاف نہ تھا اور افتراق کا حقیقی سبب شخصیات کی آویزش تھی۔

اُس وقت شام اور عراق میں بعث پارٹی نے بلا شرکت غیرے حکومت بنائی کیونکہ شراکت اقتدار کے جتنے تجربے بعث نے کیمونسٹوں، جمال عبدالناصر اور دوسرے نیشلسٹ گروپوں کے ساتھ کیے ، وہ ناکام رہے۔ فوج کی مدد سے اقتدار میں آتے ہی بعث نے اقتدار کے مراکز پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور نظریاتی مخالفین کو جبراً ہر قسم کی سیاسی اور دوسری سرگرمیوں سے روک دیا گیا۔ اسلامی تنظیمیں اور افراد ان کا خصوصی نشانہ بنے۔ شام میں سنی اکثریت کو کچلا گیا اور پارٹی پر گرفت علویوں اور نصیریوں کی ہے۔ اس کے برعکس عراق میں کردوں اور شیعوں کو کچلا گیا اور پارٹی میں سنی مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ایران میں اسلامی انقلاب اور ایران۔ عراق جنگ کے نتیجے میں عراق کے شیعی عناصر متحرک ہوئے اور معاشرے میں اسلامی اقدار کی بالادستی کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔

(Encyclopaedia of Modern Islamic World، بذیل

مادہ)۔ وسط ۲۰۰۳ء میں امریکہ اور اس کے حلیفوں نے حملہ کر کے صدام اور بعث پارٹی کی حکومت ختم کر دی اور اب یہ صرف شام میں برسراقتدار ہے، جہاں حافظ الاسد کا بیٹا بشار الاسد پارٹی اور ملک کا سربراہ ہے۔

پارٹی پروگرام: بعث پارٹی کے مقبول عام نعرے تین تھے: ا۔عروبہ (عرب قومیت) ۲۔وحدۃ (عرب اتحاد) اور ۳۔الاشتراکیۃ (سوشلزم)۔ تاہم ایک فعال سیاسی جماعت ہونے کے ناطے جو عرصے سے برسراقتدار ہے داخلی، مقامی اور بین الاقوامی حالات میں اتار چڑھاؤ کی وجہ سے پارٹی پروگراموں کی ترجیحات میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ پارٹی پروگراموں کا مرکز و محور عرب قومیت کا نظریہ ہے کیونکہ بعث کے نزدیک عرب اتحاد کی اساس بھی یہی ہے اور عرب سوشلزم بھی اسی نظریے کی وجہ سے کیمونزم اور سوشلزم کے دوسرے عالمی نظریوں سے مختلف ہے۔ چنانچہ بعث پارٹی کا شعار ہے "العرب امة واحدة ذات رسالة خالده" (یعنی تمام عرب ایک قوم ہیں اور ایک ابدی مشن کے علمبردار ہیں) اور یہ بعثیوں کی تحریروں کی ابتدا میں اسی طرح لکھا جاتا ہے جس طرح عام مسلمان بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت خالی از دلچسپی نہیں کہ بعث اس نظریے کی خالق نہیں ہے اور نہ ہی اس کی نظریاتی توضیح میں بعث مفکروں کا کچھ زیادہ حصہ ہے بلکہ عرب قومیت کا نعرہ اس وقت ایک مقبول عام نعرہ اور سکہ رائج الوقت تھا چنانچہ انہوں نے اسے اختیار کر لیا (عرب قومیت کی نظری توضیح کے لیے دیکھیے ساطع الحصری کی کتب: (۱) آراء و احادیث فی القومیۃ العربیہ، قاہرہ، ۱۹۵۱ء؛ (۲) دفاع عن العروبہ، بیروت، ۱۹۵۶ء؛ (۳) العروبہ اوّلا، طبع دوم، بیروت، ۱۹۵۵ء؛ (۴) محاضرات فی نشوء الفکرۃ القومیۃ، طبع سوم؛ بیروت، ۱۹۵۶ء نیز (۵) H. Z. Nuscbeh: *The Ideas of Arab Nationalism*، بیروت، ۱۹۵۰ء)۔

بعث قیادت کی نظر دراصل اس نظریے کے نتائج پر تھی اور انہی پر انہوں نے زور دیا ہے یعنی زبان، ثقافت اور تاریخ کے اشتراک کی بنا پر تمام عرب ایک قوم ہیں اور الوطن العربی ایک سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی وحدت ہے لہٰذا اس مشترک عرب قومیت کی بنیاد پر تمام عرب ممالک کو متحد ہو جانا چاہیے اور صرف اسی پر وہ متحد ہوسکتے ہیں بلکہ تفریق کے مصنوعی اسباب کو مٹا سکتے ہیں۔

جہاں تک سوشلزم کا تعلق ہے تو بعث پارٹی کے نزدیک اشتراکیت اور عرب قومیت لازم و ملزوم ہیں اس لیے کہ عرب قومی تحریک (بعث) عربوں کی جس نشأۃ ثانیہ کے لیے کوشاں ہے اس کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے جب عربوں کی آزادی اور قومی وحدت کے ساتھ ساتھ ان میں سماجی انصاف قائم ہو اور وہ تیز رفتار اقتصادی ترقی کر کے دنیا کی دوسری قوموں کے ہمسر بن سکیں اور ان اہداف کا حصول اشتراکیت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ ذہن میں رہے کہ بعث محض اشتراکیت کی نہیں بلکہ الاشتراکیۃ العربیۃ (عرب سوشلزم) کی علمبردار ہے اور اس سے اس کا مقصود یہ ہے کہ اپنے پروگرام کو عالمی کیمونسٹ تحریک اور مغربی یورپ کے سوشلزم سے مختلف ثابت کرے کیونکہ کیمونسٹ وسوشلسٹ دونوں اس بات کے دعویدار ہیں کہ وہ جس نظام کے علمبردار ہیں اس میں پوری انسانیت کا حل موجود ہے اور اس کا پروگرام اس نوعیت کا ہے کہ ہر قوم اسے معمولی ردوبدل سے اپنا سکتی ہے۔ ان تحریکوں کی اصل دلچسپی کا مرکز کسی خاص قوم کی ترقی اور خوشحالی نہیں بلکہ ایک خاص نظام اور فلسفے کا فروغ ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان جس واحد تقسیم کو یہ اہم اور درست قرار دیتی ہے وہ طبقاتی تقسیم

ہے۔ اس کے برعکس بعث پارٹی کی فکر میں عرب قومیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اسی وجہ سے وہ عالمی کمیونسٹ / سوشلسٹ تحریکوں کا جزو بننے سے انکار کرتی رہی ہے بلکہ ابتدا میں تو بہت سے فکری اور عملی اشتراکات کے باوصف بعض اوقات اس کی حریف بھی رہی ہے۔ (دیکھیے، فی سبیل البعث ص ۹۶ بعد).

بعث پارٹی جس عرب سوشلزم کی علمبردار ہے اس کا اقتصادی پروگرام اصلاً کیا ہے؟ اس کا جواب ہمیں پارٹی کے دستور (نضال البعث، بیروت، ۱۹۶۵ء)، بعث پارٹی کی قومی کانفرنس منعقدہ ۱۹۶۳ء کی قراردادوں (خصوصاً یاسین الحافظ کی رپورٹ بعنوان 'بعض المنطلقات النظریہ' اور شام و عراق کے دساتیر کی دفعات میں نظر آتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعث پارٹی کے قائم کردہ اشتراکی نظام میں ذرائع پیداوار پر ایک وسیع پیمانے پر اجتماعی ملکیت قائم کر دی جائے گی، زرعی ملکیت کی اس اصول کے تحت تحدید کی جائے گی کہ مالکان اراضی صرف اتنی ہی زمین کے مالک ہوں جس کی وہ بلاشرکت غیرے خود کاشت کر سکیں۔ چھوٹی صنعتیں محدود پیمانے پر افراد کی ملکیت ہوں گی البتہ قومی مفاد کی حدود کے اندر انفرادی ملکیت اور وراثت کا تحفظ کیا جائے گا۔ (Kemal S. Abu Jaber : *The Arab Ba`th Socialist Party* ، Syracuse ، ۱۹۶۶ء).

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا بعث پارٹی اپنی قومیت کے فلسفے کی بنیاد پر تمام عربوں کو ایک قوم بنانے، عرب ممالک کو متحد کر کے ان کے مسائل حل کرنے یا عرب سوشلزم کی بنیاد پر ان کا معاشی مسئلہ حل کرنے میں کامیاب رہی ہے تو بدقسمتی سے اس کا جواب نفی میں ہے۔ بعث پارٹی جب ۱۹۵۸ء میں شام میں برسراقتدار آئی تو اس نے مصر کے ساتھ اتحاد کر لیا جو صرف تین سال چل سکا۔ ۱۹۶۳ء کے بعد سے یہ جماعت مستقل طور پر شام میں برسراقتدار ہے لیکن کسی عرب ملک سے نہ یہ اتحاد کر سکی اور نہ عربوں کو متحد کرنے میں کوئی کردار ادا کر سکی یہاں تک کہ ہمسایہ عرب ممالک خصوصاً عراق کے ساتھ جہاں بعث پارٹی ہی حکمران ہے، اس کے تعلقات کم ہی خوشگوار رہے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں شام نے لیبیا کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا لیکن اس پر بھی عمل درآمد نہ ہو سکا۔ یہی حال عراق کا ہے: جہاں بعث پارٹی پہلے ۱۹۵۸ء میں عارضی طور پر برسراقتدار آئی اور پھر ۱۹۷۹ء سے ۲۰۰۳ء تک صدام حسین کی زیر صدارت اقتدار پر قابض رہی ہے۔ اس نے عربوں کو متحد کرنے کی بجائے پہلے ایران کے ساتھ جنگ چھیڑے رکھی، پھر کویت پر قبضہ کر لیا اور سعودی عرب کو خطرے میں ڈالا۔ کردوں کے خلاف بھی اس نے مسلسل محاذ آرائی جاری رکھی۔ بعث پارٹی نے عرب قومیت پر اصرار کر کے فلسطین کو ساری دنیا کے مسلمانوں کا مسئلہ بنانے کی بجائے اسے عرب مسئلہ بنانے پر زور دیا جس سے مسئلہ فلسطین کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچا۔ عرب قومیت کا نعرہ چونکہ اسلام کی سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی تعلیمات کے خلاف ہے لہٰذا دینی جماعتوں، افراد اور حکومتوں سے بعثی حکمرانوں کا رویہ ہمیشہ کشمکش اور مزاحمت پر مبنی رہا جس سے عربوں میں اتحاداور اتفاق کی بجائے باہمی دشمنی اور نفرتوں میں اضافہ ہوا۔

عرب سوشلزم کے نام پر بعث پارٹی نے جو اقتصادی حکمت عملی اپنائی وہ بھی ناکام رہی۔ عملاً عرب سوشلزم سے مراد ذرائع آمدنی اور معاشی ترقی پر ریاستی کنٹرول کے سوا اور کچھ نہیں۔ ۱۹۵۸ء میں شام اور عراق میں زرعی اصلاحات نافذ کی گئیں اور ساٹھ کی دہائی میں بنکوں، انشورنس کمپنیوں، بیرونی تجارت اور بڑے بڑے صنعتی

اداروں کو قومیا لیا گیا لیکن اس سے بیورو کریسی کی کرپشن اور حکومتی استبداد ہی میں اضافہ ہوا۔ جمہوری اور دینی اداروں اور سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت نہیں اور نہ اجتماع اور اظہار کی آزادی ہے۔ تکنیکی لحاظ سے شام اور عراق کی معیشت کبھی بھی مغرب کی تجارتی پالیسیوں اور مارکیٹ اکانومی سے غیر متعلق نہیں رہی۔ لہٰذا بتدریج شام و عراق کو انفتاح یعنی کشادگی و رواداری کی پالیسی اپنانا پڑی۔ گو سوشلزم کا لفظ رسمی طور پر اب بھی پارٹی منشور کا حصہ ہے لیکن عرب سوشلزم ستر کی دہائی کے بعد سے عملاً وہاں عدل اجتماعی ہی کی تعبیر رکھتا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا ہوگا کہ روس کے ٹوٹ جانے او کمیونزم کی شکست کے بعد اشتراکیت اب عالم عرب میں بھی ناپید ہوچکی ہے۔ یہی حال عرب قوم پرستی کا ہے کہ وہ بھی چلا ہوا کارتوس ہے۔ لہٰذا شائد یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب بعث پارٹی کی پالیسیوں کی اساس وطنیت، آمریت اور اسلام دشمنی ہے۔

مآخذ: متن میں مذکور مآخذ کے علاوہ دیکھیے (۱) عرب سوشلزم کے حوالے سے: (۱) Hanna Batatu: The Old Social Classes and the Revolutionary Movements of Iraq، پرنسٹن، ۱۹۷۸ء؛ (۲) Iraqi Bathism: S.Farouk, Marion and S. Peter در CARDI (مرتب) In Saddam`s Iraq، ص: ۸۹ تا ۱۰۷ لنڈن ۱۹۸۶ء؛ (۳) A.H.Raymand: در Social Legislation in the Contemporary Middle East، ص، ۶۱-۱۰۹؛ برکلے، ۱۹۸۶ء؛ (۴) سعدون حمادی: نحن والشیوعیہ فی الازمۃ الحاضرۃ، دارالطلیعہ، بیروت ؛ (۵) کلوفیس مقصود : ازمۃ الیسار العربی، بیروت؛ (۶) منیف الرزاز: الاشتراکیۃ فی التجارب العربیۃ، دارالکتاب الجدید، بیروت، ۱۹۶۵ء؛ (ب) عرب قومیت کی تاریخ، ارتقاء اور اثرات کے لیے دیکھیے: (۷) Sylvia G.Haim (Ed): Arab Nationalism - An Anthologey، برکلے ۱۹۶۲ء؛ (۸) William L. Cleveland: The Making of an Arab ationalism، پرنسٹن ، ۱۹۷۱ء؛ (۹) رفیق فرح (مرتب): Pan Arabism and Arab Nationalism، بولڈر ۱۹۸۷ء؛ (۱۰) حسیب خیرالدین و دیگر The Future of the Arab Nation: Challenges and Options، لندن و بیروت، ۱۹۹۱ء؛ (۱۱) خالد بن رشید و دیگر: The Origins of Arab Nationalism، نیویارک، ۱۹۹۱ء ، نیز دیکھیے اسی موضوع پر مرکز الدراسات للوحدۃ العربیۃ، بیروت کی مطبوعات مثلاً:(۱۲) ببلوغرافیۃ الوحدۃ العربیۃ، دو جلدوں میں؛ (۱۳) یومیات الوثائق الوحدۃ العربیۃ؛ (۱۴) القومیۃ العربیۃ فی الفکر والممارسۃ، بیروت ۱۹۸۰ء؛ (۱۵) القومیۃ العربیۃ والاسلام، بیروت ۱۹۸۱ء؛(۱۶) الحوار القومی الدینی، بیروت ۱۹۸۹ء؛

(ج) بعث پارٹی کے غیراسلامی نظریات پر تنقید کے لیے دیکھیے؛ (۱۷) احمد فواد الیمانی، یومان لایتشابہان، دارالریحانی، بیروت:(۱۸) صلاح الدین المنجد: التضلیل الاشتراکی، دارالکتب الجدید، بیروت، طبع دوم ؛ (۱۹) محمد احمد باشمیل: القومیۃ فی نظر الاسلام؛ (۲۰) ماہنامہ حضارۃ الاسلام، دمشق، شمارہ نومبر ۱۹۶۲ء؛ (۲۱) ہفت روزہ الشہاب، دمشق، شمارہ ۱۵ جنوری ۱۹۵۶ء؛ (۲۲) ہفت روزہ اخبار العالم الاسلامی، مکۃ المکرمۃ ، شمارہ ۵ جون ۱۹۶۷ء؛ (۲۳) خلیل احمد الحامدی: "شام کی حزب البعث۔ تاریخ، نظریات اور کارنامے" در ماہنامہ ترجمان القرآن شمارہ اگست، ستمبر ، لاہور ۱۹۶۷ء؛ (۲۴) ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری: عرب بعث پارٹی کی قومی اشتراکیت در ماہنامہ چراغ راہ، سوشلزم نمبر جلد اول، شمارہ دسمبر ۱۹۶۷ء ، کراچی؛ (۲۵) خلیل احمد الحامدی: "عرب سوشلزم" در

ماہنامہ چراغ راہ، سوشلزم نمبر جلد اول، شمارہ دسمبر ۱۹۶۷ء، کراچی.

(محمد امین)

••-------------••

⊗ البغوی: ؛البغوی پر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کا مقالہ کمزور ہے...... حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی میں ان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا گیا ہے۔ اس مقالے کا ملخص پیش کیا جا رہا ہے؛۔ حسین بن مسعودالفراء البغوی، ان کا شمار پانچویں صدی ہجری کے مشہور ائمہ حدیث، تفسیر و فقہ میں ہوتا ہے۔ ان کی کنیت ''ابو محمد'' اور لقب ''محی السنۃ'' تھا.

الذہبی کے مطابق ان کے والد پوستین دوزی کا کام کرتے تھے، اس لیے ''فراء'' کے لقب سے بھی معروف ہوے ۔ (سیر اعلام النبلاء : ۱۹: ۴۳۹)۔ ان کے حالات زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں، ان کی پیدائش بغ یا بغشور میں ہوئی۔ قدیم و جدید مآخذ میں اس قریہ کا سراغ نہیں مل سکا۔ البتہ السمعانی اور یاقوت الحموی نے مختصراً اس قریہ کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بقول یہ قریہ خراسان میں مرو اور ہراۃ کے درمیان واقع ہے۔ (کتاب الانساب ، ص:۶؛ معجم البلدان، ا: ۴۸)۔ یہ قریہ اپنے دور میں بڑے بڑے فقہا اور محدثین کا مرکز رہا۔ السمعانی اور یاقوت نے اس کی طرف منسوب بہت سے اصحاب علم کی طویل فہرست اپنی کتب میں نقل کی ہے، جو بغوی کہلائے۔ السمعانی ایک سے زائد مرتبہ یہاں مقیم رہ چکے ہیں اور یاقوت کے بقول انہوں نے ۶۱۶ھ میں اس علاقے کی زیارت کی تھی، ان کے بقول اس کے اجڑنے کے آثار واضح تھے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قریہ امتداد زمانہ سے اجڑ چکا ہے.

بغوی کے مصادر میں سے صرف ''معجم البلدان'' نے ان کا سن ولادت ۴۳۳ھ متعین کیا ہے اور سن وفات تذکرہ نگاروں کے ہاں مختلف فیہ ہے۔ یہ اختلافی اقوال ۵۱۰ھ، ۵۱۵ھ اور ۵۱۶ھ کے بارے میں منقول ہیں۔ مختلف قرائن و وجوہ کی بنا پر سن ولادت ۴۳۳ھ اور سن وفات ۵۱۵ھ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، ان کی وفات مروالروز میں ہوئی اور وہیں مدفون ہیں.

ان کے خاندان کے بارے میں مصادر سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کے والد ''پوستین دوز'' تھے اور اس کی تجارت کرتے تھے، ان کے چھوٹے بھائی حسن اہل علم میں تھے اور بغوی ہی سے انہوں نے فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی حتیٰ کہ انہوں نے تمام فقہی مذاہب کو حفظ کر لیا تھا۔ ان کی بیوی نے وفات پائی تو انہوں نے اس کے ترکے میں سے کچھ نہیں لیا (دیکھیے مآخذ).

بغوی کی زندگی کے عام حالات پردۂ خفا میں ہونے کی وجہ سے مصادر ان کی تعلیمی سرگرمیوں پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے، قیاس یہ ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم کا آغاز بچپن ہی سے ہوچکا تھا اور سن شعور کو پہنچنے کے بعد وہ سماعِ حدیث کی طرف متوجہ ہوے۔ بغ یا بغشور، جو ان کا مولد و مسکن تھا، چونکہ کبارِ محدثین و فقہاء کا مرکز رہا ہے اس لیے گمان یہی ہے کہ انہوں نے علمِ حدیث کی تحصیل کا آغاز اپنے وطن مالوف ہی سے کیا، بعدازاں سماع حدیث کے لیے دیگر شہروں کا رخ کیا ہوگا۔ السبکی کے نزدیک ان کے سماعِ حدیث کا آغاز ۴۶۰ھ سے ہوتا ہے، (طبقات الشافعیہ الکبریٰ: ۴: ۲۱۵).

کچھ اہل علم تحصیل علم کے لیے بغ سے مروالروز کی طرف ان کی منتقلی کا سال ۴۶۰ھ متعین کرتے ہیں، جب کہ وہ طلبِ علم کے لیے مروکا سفر ۴۶۰ھ سے بہت پہلے کرچکے تھے۔ الذہبی کے اس قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ''بغوی نے قاضی حسین بن محمد المروالروزی صاحب تعلیقہ سے ۴۶۰ھ سے قبل فقہ کی تحصیل کی اور

ان سے سماع کیا (سیر اعلام النبلاء، ۱۹: ۴۴۰).
مروالروز چھٹی صدی ہجری کے اواخر تک بڑے بڑے علما و فقہا کا مرکز رہا ہے۔ یہاں وہ بالخصوص قاضی حسین (۴۶۲ھ / ۱۰۷۰ء) کی صحبت میں طویل عرصہ تک رہے جن کا شمار کبارِ علمائے شافعیہ میں ہوتا ہے، ان سے فقہ میں کمال حاصل کیا بعدازاں سماع حدیث کے لیے مختلف علاقوں کا سفر اختیار کیا، کسی بھی تذکرہ نگار نے ان شہروں کا ذکر نہیں کیا، سوائے یاقوت کے جو صرف دوشہروں مروالروز (اورنج دہ) کا ذکر کرتے ہیں (حوالہ مذکور) جب کہ ابن تغری بردی ان کے متعلق لکھتے ہیں۔ "رحل البلاد وسمع الکثیر" (انہوں نے مختلف شہروں کا سفر کیا اور بہت سے علما سے سماع کیا) لیکن انہوں نے شہروں کی تعیین نہیں کی، البتہ بغوی نے اپنی نقل کردہ اسانید میں اپنے کچھ شیوخ کا ذکر کیا ہے، جن میں سے اکثر و بیشتر مروالروز کے رہنے والے تھے اور بعض شیوخ کا تعلق دیگرعلاقوں سے بھی تھا، مثلاً شیخ زیاد بن محمد بن زیاد الحنفی الھروی، شیخ احمد بن ابی نصرالکوفانی الہروی، شیخ ابو عبداللہ محمد بن الحسین بن العیاش البوشنجی، ابو جعفر محمد بن عبداللہ المعلم الطوسی، ابوالحسن علی بن محمد الضحاکی الطوسی، شیخ ابومنصور محمد بن عبدالملک، شیخ احمد بن عبدالملک بن علی بن احمد، ابو صالح النیسابوری، شیخ عبدالکریم بن ہوازن القشیری النیسابوری، شیخ عبداللہ بن عبدالصمد الجوزجانی وغیرہ۔ ان شیوخ کے ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے تحصیل علم و سماع حدیث کے لیے ہراۃ، بوشنج، طوس، سرخس، نیشاپور اور جوزجان وغیرہ علاقوں کا سفر بھی کیا۔ انہوں نے اپنے دور کے جن اکابر علما سے علم کی تحصیل کی ان میں سے کثیر تعداد محدثین کی ہے، انہوں نے بکثرت ان سے احادیث روایت کیں اور اپنی تفسیر میں بھی ان ہی کی نقل کردہ روایات پر اعتماد کیا ہے اور ان کے سلاسلِ اسناد کا ذکر کیا ہے۔

تحصیل علم کے بعد وہ مروالروز ہی میں مقیم رہے اور تفسیر، حدیث اور فقہ کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بقیہ عمر صرف کی۔ علماء و فضلا کی کثیر تعداد ان سے مستفید ہوئی اور ان کے علوم و معارف کی نشرواشاعت میں حصہ لیا، ان کے مشہور تلامذہ میں سے حسن بن مسعود البغوی، عبدالرحمٰن بن علی الموفقی، عمر بن الحسین الرازی، (والد امام رازی) فضل اللہ بن محمد النوقانی، محمد بن الحسین بن محمد الزاعولی، اور محمد بن الطائی الہمذانی اپنی شاندار علمی خدمات کی بنا پر قابل ذکر ہیں۔

ان کی ساری زندگی زہد و تقویٰ عبادت و ریاضت اور اتباع سنت سے عبارت ہے، تذکرہ نگاروں نے ان کی ان صفات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ان کی طبیعت میں انتہائی سادگی تھی، سادہ لباس زیب تن کرتے تھے۔ الذہبی لکھتے ہیں۔ وہ اون کے کپڑے پہنتے اور چھوٹا سا عمامہ استعمال کرتے تھے۔ السبکیؒ کے بقول ان کی غذا انتہائی سادہ تھی۔ صرف خشک روٹی پر اکتفا کرتے، جب لوگوں نے حد درجہ اصرار کیا کہ یہ صحت کے لیے نقصان دہ ہے تو وہ خشک روٹی کو زیتون کے تیل کے ساتھ کھانے لگے۔

زہد و تقویٰ اور قناعت کا یہ عالم تھا کہ بیوی کی وفات پر ان کے متروکہ مال میں سے کچھ بھی نہ لیا۔ درس و تدریس سے انتہائی شغف تھا۔ ہمیشہ باوضو درس دیتے تھے۔ انہوں نے تدریس کے ساتھ ساتھ مختلف علوم میں گراں قدر کتب تالیف کیں، جو اہل علم کے ہاں ہر دور میں مقبول و متداول رہیں۔ یہ تصانیف جامعیت، حسن ترتیب اور منفرد اسالیب کی بنا پر امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ قدیم و جدید مآخذ سے ان کی تقریباً ۱۶ کتب کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان میں سے تین تصانیف معالم التنزیل، مصابیح السنۃ اور شرح السنۃ مطبوع ہیں، کچھ مخطوطات کی شکل میں ہیں

اور چند ایک مفقود ہیں۔

تفسیر معالم التنزیل: متعدد بار طبع ہوچکی ہے، آخری مرتبہ دارالمعرفۃ بیروت سے (۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء) میں خالد العک اور مروان سوار کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ چار جلدوں میں طبع ہوچکی ہے۔ یہ تفسیر درحقیقت تفسیر ثعلبی کا اختصار ہے جس میں بغوی نے متعدد اضافے اور ترامیم کی ہیں ۔ حاجی خلیفہ نے اس کے دو اختصارات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے ایک تاج الدین عبدالوہاب بن محمد الحسنی اور دوسرا خازن کا لباب التاویل فی معانی التنزیل کے نام سے معروف ہے (کشف الظنون، ۲: ۱۵۴۰۔ ۱۴۱، ۱۷۲۶ء) بروکلمان نے ان کے علاوہ مزید چار مختصرات کی نشاندہی کی ہے (بروکلمان: تاریخ الادب العربی: ۶: ۲۴۴)۔

تفسیر معالم التنزیل کا شمار تفاسیر ماثورہ میں ہوتا ہے اور تفسیر طبری و تفسیر ثعلبی کے برعکس یہ متوسط تفسیر خیال کی جاتی ہے اور اپنے طرز کی اوّلین تفسیر ہے۔ اس میں لغت، صرف، نحو، فقہ اور کلام کے مباحث بھی اعتدال کے ساتھ موجود ہیں۔ آیات احکام کی تفسیر میں فقہا کے اختلافی اقوال ان کے مسالک و مذاہب اور دلائل کا ذکر بھی جابجا کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس پر کوئی خاص رنگ غالب نہیں اور یہ کسی مخصوص رجحان کی نمائندگی نہیں کرتی، البتہ اختصار ، اعتدال اور جامعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ضروری مباحث کا بقدر ضرورت احاطہ کرتی ہے۔ تفسیر آیات کے ضمن میں بغوی نے اسرائیلیات کی بھی خاصی تعداد جمع کر دی ہے، جن میں سے بعض روایتی و درایتی اعتبار سے مورد جرح ہیں، تاہم یہ تعداد دیگر تفاسیر ماثورہ کی نسبت تفسیر بغوی میں کم ہے۔

قراء ت کے موضوع پر آپ کی ایک تصنیف "الکفایہ فی القراءۃ" کا ذکر بھی بعض مصادر نے کیا ہے۔

بغوی کا زیادہ اور انہماک حدیث سے تھا۔ ان کی دو مطبوعہ مشہور و معروف کتب مصابیح السنۃ اور شرح السنۃ اس فن میں ان کی مہارت و امامت کا کافی ثبوت ہیں۔ اول الذکر آخری مرتبہ بیروت سے ۱۴۰۷ھ میں ڈاکٹر یوسف عبدالرحمٰن المرعشی، محمد سلیم، ابراہیم سمارۃ اور جمال حمدی ذہبی کی تحقیق کے ساتھ چار جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔ محققین نے مصابیح میں موجود کتب، ابواب اور احادیث کی ترمیم کے ساتھ ساتھ آیات قرآنی و احادیث نبوی کی تخریج کی گئی ہے۔ مصابیح السنۃ "کتاب المصابیح" کے نام سے بھی معروف ہے (یہ نام خود مصنف کا رکھا ہوا نہیں، بلکہ دیباچہ کتاب کی عبارت "ھُنّ مصابیح الدّجی" سے ماخوذ ہے)۔ یہ کتاب احادیث کے اہم مجموعوں سے منتخب کردہ احادیث پر مبنی ہے جو حسن ترتیب، تنوع ابواب اور صحت کے اعتبار سے کئی کتب حدیث پر فائق ہے۔ بغوی کے بقول، انہوں نے موضوع و منکر احادیث سے اس کتاب میں اعتراض کیا ہے۔ شیخ ابوحفص قزوینی نے اگرچہ اس کی اٹھارہ احادیث کے متعلق موضوع ہونے کا دعویٰ کیا ہے، مگر ابن حجرؒ نے اپنے ایک رسالہ میں ان احادیث کا دلائل کے ساتھ دفاع کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ ان احادیث کی طرف وضع کی نسبت کسی طرح درست نہیں [ابن حجر کا یہ رسالہ "اجوبۃ الحافظ ابن حجر العسقلانی عن احادیث المصابیح" کے عنوان سے مشکٰوۃ المصابیح (طبع دمشق ۱۳۸۰ھ) اور مصابیح السنۃ (طبع بیروت ۱۴۰۷ھ کے ساتھ ملحق ہے]۔ بعض احادیث منکرہ کی وضاحت خود مؤلف نے کتاب میں کر دی ہے اور بعض کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، غالبًا یہ وہ احادیث ہیں جن کے منکر ہونے پر محدثین کا اجماع نہیں اور وہ از قبیل مختلف فیہ

ہیں۔ مصابیح السنۃ کی قدر و قیمت کا اندازہ ان شروح، تخاریجات، ملخصات، مکملات و تنقیحات سے لگایا جاسکتا ہے، جو تینتالیس کے قریب ہیں۔ بغوی نے مصابیح السنۃ میں احادیث کی ترتیب میں ایک منفرد اسلوب اختیار کیا ہے انہوں نے کتاب کے ہر باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول کو ''صحاح'' اور حصہ دوم کو ''حسان'' کا عنوان دیا ہے۔ صحاح سے ان کی مراد وہ احادیث ہیں جن کی تخریج بخاری اور مسلم نے کی ہے اور حسان سے مراد وہ احادیث ہیں جنہیں ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ وغیرہ محدثین نے روایت کیا ہے۔

مختلف ائمہ حدیث مثلاً ابن صلاحؒ، نوویؒ وغیرہ نے بغوی کی اس منفرد اصطلاح پر نقد و جرح کی ہے کہ یہ اصطلاح محدثین کے ہاں غیر معروف ہے، سیوطی، تاج تبریزی، ابن حجر، ہیتمی وغیرہ نے بغوی کا دفاع کرتے ہوئے اسے بغوی کی مخصوص اصطلاح قرار دیا ہے جو بربنائے سہولت انہوں نے وضع کی ہے تاکہ انہیں ہر تخریج کردہ حدیث کے بعد اس کے ماخذ (صحیحین یا سنن وغیرہ) کا حوالہ نہ دینا پڑے۔ بغوی نے اختصار کے پیش نظر احادیث کی اسناد کو بھی حذف کر دیا تھا۔ آٹھویں صدی ہجری کے عظیم محدث ولی الدین ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب العمری التبریزی نے اپنے استاد شرف الدین طیبی کے مشورہ سے مصابیح کی اصلاح و تہذیب کا کام پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ انہوں نے صحابی راوی کا نام حدیث کے متن کے ساتھ اور مخرج کا نام حدیث کے آخر میں ذکر کیا۔ بعض احادیث غریبہ و ضعیفہ کے ضعف کا سبب اور احادیث کے مرتبہ کی وضاحت کی۔ بغوی سے احادیث صحاح کو احادیث حسان اور احادیث حسان کو احادیث صحاح میں شامل کرنے میں بعض جگہ سہو ہوا، اس کی انہوں نے اصلاح کی۔ تبریزی نے ہر باب میں صحاح اور حسان احادیث کا اضافہ کیا، انہوں نے ہر باب کو دو کے بجائے تین فصلوں میں تقسیم کیا۔ پہلی فصل میں شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی مرویات جمع کیں۔ دوسری فصل میں وہ احادیث جمع کیں، جنہیں شیخین کے علاوہ دیگر محدثین نے روایت کیا ہے اور تیسری فصل میں دیگر کتب حدیث سے وہ احادیث جو اسی باب سے ملحق ہوسکتی ہیں جمع کیں، اس طرح خطیب نے ۱۵۱۱ احادیث کے اضافہ کے ساتھ ساتھ کتاب کی اصلاح و تہذیب کے ذریعہ اس کی افادیت کے دائرے کو مزید وسیع کیا۔ بڑے بڑے علماء مثلاً طیبی، سخاوی، ابن حجر، ہیثمی، ملا علی قاری، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ ادریس کاندھلوی اور عبیداللہ مبارکپوری وغیرہ نے اس کی شروح مرتب کیں۔

حدیث کے موضوع پر ان کی دوسری اہم تالیف شرح السنۃ ہے، جو طویل عرصہ تک نایاب رہنے کے بعد شعیب الارنووط اور زہیرالشاویش کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ ۱۳۹۰ھ/۱۴۰۳ھ میں المکتب الاسلامی بیروت سے ۱۶ جلدوں میں طبع ہوگئی ہے۔ اس کتاب کا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ کتاب کسی دوسرے متن کی شرح نہیں متونِ احادیث کو خود بغوی اپنی سند سے روایت کرتے ہیں اور پھر ان کی شرح و توضیح کرتے ہیں۔ یہ کتاب ایک جامع مرجع ہونے کی بنا پر عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق و آداب وغیرہ تمام شعبہ ہائے دین سے متعلق احادیث کا احاطہ کرتی ہے۔

شرح السنۃ بعض دوسری شروح کی طرح صرف غریب الحدیث سے ہی بحث نہیں کرتی، بلکہ مشکل لغات کی تحقیق، مجمل عبارات کی توضیح، اجتہاداتِ صحابہؓ و تابعین، مشہور فقہاء و مجتہدین کے مسالک و مذاہب اور ان کے دلائل کا ذکر، احادیث سے مختلف نکات و مسائل کا استنباط، متعارف احادیث میں جمع و تطبیق، راویوں پر

جرح و تعدیل، راویوں کے اسماء و القاب کی توضیح، اس کتاب کے اہم موضوعات ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حد درجہ صحت کا التزام رکھا گیا ہے اور اس میں احادیث کا غالب حصہ صحیحین کی احادیث پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ دیگر صحاح و سنن، موطا مالک، مسند احمد اور مسند دارمی وغیرہ کی احادیث بھی اس میں درج کی ہیں، بغوی اولاً ہر باب کے تحت ان احادیث کو درج کرتے ہیں جو متفق علیہ ہوں یا بخاری و مسلم میں سے کسی ایک نے ان کی تخریج کی ہو۔ صحیحین کے علاوہ دیگر احادیث نقل کرتے وقت ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایسی احادیث درج کریں جو صحیحین کی شرائط کے مطابق ہوں، چونکہ کتاب کے متنوع عنوانات و موضوعات کے پیش نظر ہر باب کے تحت صحیح احادیث کی تخریج ایک مشکل امر تھا۔ اس لیے ایسی احادیث بھی بکثرت اس میں موجود ہیں جو صحت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں مگر انہیں اصحاب ِ سنن وغیرہ نے اپنی کتب میں نقل کیا ہے۔ بغوی کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اس میں موضوع اور ضعیف احادیث سے اجتناب کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شرح السنۃ ضعیف احادیث سے مکمل طور پر پاک نہیں ہے، اگرچہ یہ احادیث کسی صحیح حدیث کی تائید یا کسی صحیح حدیث کے مجمل کی توضیح یا کسی باب میں صحیح حدیث دستیاب نہ ہونے کی صورت میں نقل کی گئی ہیں۔

شرح السنۃ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ یہ احادیث کی ابتدائی شروح میں شامل اپنے طرز کی اولین شرح ہے، اگرچہ طحاوی کی شرح معانی الآثار خطابی کی معالم السنن اور ابن عبدالبر کی التمہید کو شرح السنۃ پر شرف اولیت حاصل ہے، مگر ان کتب کے موازنہ سے واضح ہوتا ہے کہ شرح السنۃ پر نہ تو شرح معانی الآثار کی طرح فقہی رنگ غالب ہے نہ معالم السنن کی طرح باب کی صرف ایک حدیث کی شرح پر اکتفا کیا گیا ہے اور نہ ہی التمہید کی طرح اس میں حل لغات اور مشکلات اسانید پر زیادہ توجہ کی گئی ہے، بلکہ مؤلف کتاب متون احادیث کو خود اپنی ہی سند سے روایت کرنے کے بعد جامعیت و اختصار کے ساتھ حدیث کے تمام متعلقہ ضروری مباحث کو سمیٹتے ہوے شرح و توضیح کرتے ہیں۔ احادیث کی لغوی تحقیق اور شرح و توضیح میں ان کا اکثر و بیشتر انحصار ابوعبیدالقاسم بن سلام، ابن قتیبہ اور ابوسلیمان الخطابی پر ہے۔ احادیث سے متفرع ہونے والے مسائل و احکام، فقہاء و صحابہ تابعین اور بالخصوص ائمہ اربعہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔ احادیث کی تصحیح و تضعیف اور راویوں کے اسماء و انساب کی توضیح میں انہوں نے اکثر جامع ترمذی پر اعتماد کیا ہے۔

حدیث اور اس کے متعلقات پر ان کی بعض دیگر کتب کی نشاندہی بھی بعض مصادر نے کی ہے۔ مثلاً الانوار فی شمائل النبی المختار، الجمع بین الصحیحین، شرح الجامع للترمذی، المدخل الی مصابیح السنۃ، اربعین حدیثاً اور معجم الشیوخ وغیرہ۔

بغوی کو فقہ میں بھی خصوصی دسترس حاصل تھی، وہ مسلکاً شافعی تھے. جس ماحول اور جن علاقوں میں انہوں نے تعلیم حاصل کی وہاں فقہ شافعی کا غلبہ رہا ہے۔ (بالخصوص ایران کے مشرقی علاقے خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ میں، نیز جن اساتذہ سے انہوں نے فقہ پڑھی، وہ مذہب شافعی سے تعلق رکھتے تھے ۔ بالخصوص قاضی حسین جن کا شمار فقہ شافعی کے مشہور ائمہ میں ہوتا ہے اور جو مشہور شافعی فقیہ ابوبکر القفال کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے۔ انہوں نے طالب علمی کا طویل زمانہ ان کی صحبت و تربیت میں گزارا۔ فقہ میں وہ درجہ اجتہاد کو پہنچے ہوے

تھے، الذہبی ان کو مجتہد لکھتے ہیں (تذکرۃ الحفاظ، ۴: ۱۲۵۷)۔ السیوطی نے ان کو فقہ کا امام کہا ہے (طبقات المفسرین: ۳۹)۔ ملا علی قاری نے ان کو اصحاب الوجوہ فقہاء میں شمار کیا ہے (مرقاۃ المفاتیح، ۱/۱۰)۔ دیگر علوم کی طرح انہوں نے فقہ میں بھی یادگار کتب تحریر کیں، جو فقہ شافعی میں بلند مقام کی حامل ہیں۔ کبار علما شافعیہ نے ان سے استفادہ کیا اور اپنی کتابوں میں جابجا ان کے حوالے پیش کیے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں فقہ شافعی کی نشرواشاعت میں ان کی کتب کا گراں قدر حصہ ہے۔ ان کی فقہی تالیفات سب غیر مطبوع ہیں، ان میں سے سب سے زیادہ شہرت التہذیب کو حاصل ہے، جو فقہی مسائل پر مرتب کی گئی ہے اور بغوی نے اسے اپنے شیخ قاضی حسین کی تعلیق سے ملخص کیا ہے اور کسی قدر تلخیص و اضافے بھی کیے ہیں۔ یہ کتاب مسلک شافعی کی معتبر و مستند کتب میں سے ہے اور کبار شوافع نے اس کے مسائل کو اپنی کتب میں نقل کیا ہے (کشف الظنون، ۱: ۵۱۷؛ بروکلمان، ۲: ۲۴۳)

فتاوی البغویہ میں انہوں نے ان فتاوی کو جمع کیا ہے، جو ان سے پوچھے گئے تھے۔ فتاوی المروالروذی کے نام سے ایک فتاوی بھی ان کی طرف منسوب ہے جو ان فقہی مسائل کے جوابات پر مشتمل ہے جو بغوی کے استاد قاضی حسین سے پوچھے گئے تھے۔ بغوی نے ان کو جمع کر کے یہ فتاوی مرتب کیا (بروکلمان، ۲: ۲۴۶)۔ ان کے علاوہ ترجمۃ الاحکام فی الفروع فقہ شافعی پر فارسی میں لکھی گئی اور الکفایۃ فی الفروع عجمی زبان (غالباً) فارسی میں فقہ شافعی کا اختصار ہے۔ آخری دونوں کتب مفقود ہیں جب کہ دیگر کے مخطوطات کی نشاندہی بروکلمان وغیرہ نے کی ہے۔

مآخذ: (۱) السمعانی: کتاب الانساب، بغداد، مکتبۃ المثنیٰ (س۔ن)؛ (۲) یاقوت: معجم البلدان، بیروت، دارالکتاب العربی، (س۔ن)؛ (۳) الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، بیروت، دارالفکر العربی، (س۔ن)؛ (۴) الذہبی: سیر اعلام النبلاء، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۴۰۰ھ؛ (۵) السبکی: طبقات الشافعیہ الکبریٰ، بیروت، دارالمعرفۃ (س۔ن)؛ (۶) طاش کبری زادہ: مفتاح السعادۃ، القاہرۃ۔ دارالکتب الحدیثیہ۔ (س۔ن)؛ (۷) ابن العماد الحنبلی: شذرات الذہب، بیروت، دارالمسیرۃ ۱۹۷۹ء؛ ابن ہدایۃ اللہ الحسینی: طبقات الشافعیہ، بیروت، دارالآفاق الجدیدۃ، ۱۹۸۲ء؛ (۹) ابن تغری بردی: النجوم الزاہرہ، القاہرۃ۔ دارالکتب المصریۃ ۱۳۴۸ھ؛ (۱۰) یافعی: مرأۃ الجنان: بیروت، مؤسسۃ الاعلیٰ للمطبوعات ۱۹۱۶ء؛ ۳: ۲۱۳؛ (۱۱) القنوجی: اتحاف النبلاء، کانپور، مطبع نظامی ۱۲۸۸ء؛ (۱۲) الکتانی: الرسالۃ المستطرفۃ، کراچی، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، ۱۹۶۰ء؛(۱۳) حاجی خلیفہ: کشف الظنون، بیروت، مکتبۃ المثنیٰ، س۔ن، بمواقع عدیدہ؛ (۱۴) بغدادی: ہدیۃ العارفین، بغداد۔ مکتبۃ المثنیٰ، (۱۹۵۱ء۔۱۹۵۵ء) بمواقع عدیدہ؛ (۱۵) بروکلمان، کارل: تاریخ الادب العربی، تعریب عبدالحلیم النجار؛ القاہرۃ۔ دارالمعارف (۱۹۷۷ء)، ۲: ۲۴۴۔۲۴۶؛ بمواقع عدیدہ؛ (۱۶) سرکیس، معجم المطبوعات العربیہ، القاہرۃ، مطبعہ سرکیس (۱۳۶۴ھ) ۱: ۶۲۷۔۶۲۸ (۱۷) الزرکلی: الاعلام، بیروت، دارالعلم للملایین، (۱۹۷۹ء) ۲: ۲۸۴؛ (۱۸) bson, James: Mishkat- al-Masabih (English Translationo، ۱۹۶۰ء۔ ۱۹۶۴ء؛ (۱۹) ہاشمی، ازکیا: امام بغوی کی خدمات تفسیر و حدیث، تحقیقی جائزہ، پی ایچ ڈی مقالہ، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۹۱ء غیر مطبوع۔

(سید ازکیا ہاشمی)

••------------••

⊗ بکار بن قتیبہ: بن اسد بن عبیداللہ بن بشیر بن عبیداللہ بن ابی بکرۃ الثقفی البکراوی؛ ایک تبحر عالم

دین، عظیم قاضی، نامور محدث، حنفی فقہ کے ماہر اور مصر کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ۱۸۲ھ / ۷۹۸ء میں بصرہ میں پیدا ہوے (الذہبی، سیر اعلام النبلاء، ۱۲: ۵۹۹)۔

انہوں نے فقہ کا علم ہلال بن یحییٰ الرائی اور عیسی بن ابان سے حاصل کیا۔ حدیث ابوداؤد الطیالسی، یزید بن ہارون، صفوان بن عیسیٰ، عبدالصمد بن عبدالوارث اور موئل بن اسماعیل سے پڑھی، نیز بصرہ کے بہت سے محدثین سے شرف تلمذ حاصل کیا (ابن حجر العسقلانی: رفع الاصر عن قضاۃ مصر، ۱: ۱۴۰)۔

ابن حبان کے مطابق ابن بکار ایک ثقہ عالم اور محدث تھے، وہ ابوبکرۃ کی کنیت سے مشہور تھے (ابن حبان، کتاب الثقات ، ۸: ۱۵۲)۔ ان سے روایت کرنے والوں میں ابوعوانہ، ابن خزیمہ ،عبداللہ بن عتاب الزفتی، یحییٰ بن صاعد، ابن جوبا ، ابو جعفر الطحاویؒ اور دوسرے بہت سے حضرات شامل ہیں (الذہبی: سیر اعلام النبلاء، ۱۲: ۵۹۱)۔

ابن عساکر نے ان کے بیٹے بکر بن بکار کو بھی ان سے روایت کرنے والوں میں شمار کیا ہے، لیکن یہ بات محل نظر ہے۔ اس لیے کہ موسیٰ بن عبدالرحمٰن کے ساتھ ان کے ایک مقدمہ میں بکار بن قتیبہ نے یہ بیان دیا تھا کہ انہوں نے تو شادی نہیں کی (ابن حجر العسقلانی: رفع الاصر عن قضاۃ مصر، ۱: ۱۲۰) .

بطور قاضی بکار بن قتیبہ بڑے منصف مزاج اور بڑے عادل شخص تھے، چنانچہ ابوبکر بن المقری نے محمد بن بکر الشعرانی کے حوالے سے احمد بن سہل الھروی سے یہ نقل کیا ہے، کہ وہ بکار بن قتیبہ کے پڑوس میں رہائش پذیر تھے۔ ایک مرتبہ وہ نماز عشا کے بعد گھر لوٹے تو وہ یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (صٓ [۳۸]: ۲۶) ("اے داؤد ہم نے تجھے (دنیا میں) نائب بنایا ہے، پس تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کر، ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی)۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر جب وہ سحری کے وقت آئے تو تب بھی وہ یہی آیت پڑھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے (الذہبی، سیر اعلام النبلاء، ۱۲: ۶۰۰)۔

وہ عدل پروری اور انصاف پسندی میں کسی سے رعایت نہیں برتتے تھے، ایک دفعہ اہل بصرہ میں سے ایک شخص بکار کے پاس آیا اور کہا میں زمانہ طالب علمی کا تمہارا رفیق تھا۔ بکار نے اس کی بڑی خاطر مدارت اور عزت و تکریم کی، پھر انہی کی عدالت میں گواہی کی ضرورت پڑی تو ان کے اسی رفیق نے ایک مصری کے ساتھ مل کر گواہی دی، لیکن انہوں نے اپنے اس قدیمی دوست کی گواہی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور پوچھنے پر بتایا کہ ایک مرتبہ انہوں نے اس کے ساتھ ایک برتن میں شہد ملے چاول کھائے، ان کی جانب سے شہد ختم ہوگیا تو اس نے اپنے اس رفیق کی جانب سے اسے کھول دیا، جس پر شہد بہہ نکلا، تو اس نے مذاقاً کہا "اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا" (۱۸: [الکھف]:۷۲): (کیا تو نے اسے اس لیے پھاڑ دیا تاکہ اس کے رہنے والوں کو ڈبو دے) تو انہوں نے اسے کہا کیا تو اس مثال کے ذریعے قرآن کا مذاق اڑاتا ہے، لہٰذا انہوں نے اس کی شہادت کو قبول نہیں کیا (ابن حجر العسقلانی: رفع الاصر عن قضاۃ مصر، ۱: ۱۴۵) .

ان کی عدل پروری کا مزید اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کے زمانے میں ایک شخص امیر (ابن طولون) کا مقروض تھا اور وہ ادائیگی کیے بغیر فوت ہوگیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ امیر نے قاضی (بکار)

کو حکم دیا کہ قرض کی ادائیگی کے لیے اس کا گھر بیچ دے، مگر قاضی صاحب نے کہا جب تک قرض ثابت نہ ہو جائے ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس پر امیر نے قرض ثابت کر دیا۔ قاضی صاحب نے فرمایا، پہلے یہ تو معلوم کر لیں، کیا یہ گھر واقعی اس کی ملکیت بھی ہے یا نہیں؟ امیر نے ملکیت کے ثبوت فراہم کر دیئے۔ پھر قاضی صاحب نے کہا قرض خواہ (امیر) پہلے قسم اٹھائے (کہ وہ اس دعوے میں سچا ہے) تو پھر ایسا کیا جاسکتا ہے۔ اس پر ابن طولون نے قسم کھا لی، بکار نے کہا اب عدل کے تمام تقاضے پورے ہوگئے، لہٰذا انہوں نے مکان فروخت کرنے کے احکام صادر کر دیئے (کتاب مذکور، ا: ۱۴۶)۔

قاضی ابن بکارؒ کے زمانے میں، بغداد ایک بہت بڑے بحران سے گزر رہا تھا، آئے دن خلفا کے عزل و نصب کا معاملہ ہوتا تھا، ایک بار جب یہی عمل دہرایا گیا، ان حالات میں حکومتِ وقت نے بطورِ قاضی ابن بکار سے معزول ہونے والے خلیفہ پر "لعن طعن" کرنے کو کہا، مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا، جس پر ، ابن بکار کو کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ چنانچہ ابن خلکان کے مطابق ابن طولون ہر سال بکار بن قتیبہ کو اس کی مقررہ تنخواہ کے علاوہ ایک ہزار دینار بطور ہدیہ بھیجتا تھا، مگر وہ انہیں بغیر ہاتھ لگائے، جوں کا توں رکھ دیتے، پھر جب قاضی بکار نے ابن طولون کے کہنے کے مطابق موفق پر خطبہ جمعہ میں لعنت کرنے سے انکار کر کیا، تو اس نے اپنے عطا کردہ مال کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے دیناروں سے بھری ہوئی اٹھارہ تھیلیاں ویسے ہی مہر شدہ اسے واپس لوٹا دیں، جس پر ابن طولون بہت شرمندہ ہوا (الذہبی: سیر اعلام النبلاء ، ۱۲: ۶۰۳)۔

الطحاویؒ فرماتے ہیں کہ ابن طولون نے بکارؒ بن قتیبہ سے منصب قضا واپس لے کر انہیں قید خانے میں ڈال دیا، پھر جب مناظرہ ہوتا بکار مناظرہ کے لیے مجلس میں آتے، انہیں مجلس مناظرہ ختم ہو جانے پر دوبارہ جیل خانے میں بھیج دیا جاتا (ابن حجر العسقلانی: رفع الاصر عن قضاۃ مصر، ا: ۱۵۴)۔ جب بکار کی سزائے قید طویل ہوگئی تو بہت سے لوگوں نے ابن طولون سے درخواست کی کہ انہیں قاضی صاحب سے سماعت حدیث کی اجازت دی جائے، تو اس نے اجازت دے دی، اس کے بعد قاضی بکار قیدخانے کی کھڑکی سے اپنے شاگردوں کے سامنے احادیث بیان کرتے تھے۔ عمر کے آخری حصہ میں اکثر لوگوں نے اسی کیفیت میں آپ سے حدیث سماعت کی (کتاب مذکور، ا: ۱۵۴)۔

بعض لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ان کی نمازہ جنازہ میں عید کی نماز سے زیادہ ہجوم تھا، ان کے بھتیجے محمد بن الحسن بن قتیبہ الثقفی نے ان کی نماز پڑھائی (الذہبی: سیر اعلام النبلاء ، ۱۲: ۶۰۴)۔

وہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سے فقہ کی کتاب اس کتاب کا نام وثائق العھود بہت مشہور ہے (الزرکلی، الاعلام، ۲: ۶۰)۔

ابن طولون نے بکار کو جیل سے کرائے کے مکان میں منتقل کرنے کا حکم دیا، وہ کافی عرصہ اس میں رہے، پھر جب ابن طولون فوت ہوگیا تو بکار سے کہا گیا، امیر تو مر گیا ہے، اب اپنے گھر تشریف لے جائیں، مگر انہوں نے جواب دیا کہ کرائے کا گھر ہی ان کے لیے بہتر ہے۔ وہ ابن طولون کی وفات کے چالیس دن کے بعد (۲۷۰ھ/ ۸۸۳ء) میں اسی گھر میں فوت ہوئے، اس وقت ان کی عمر نواسی برس تھی (ابن حجر العسقلانی: رفع الاصر عن قضاۃ مصر، ا: ۲۵۴)۔

مآخذ: (۱) ابن حبان: الحافظ الامام محمد ابن حبان بن احمد ابی خاتم التمیمی: کتاب الثقات، ۸: ۱۵۲، دارالفکر ،

قاہرہ؛ (۲) ابن حجر العسقلانی ، احمد بن علی: (۷۷۳ھ۔ ۸۵۲ھ) : رفع الاصر عن قضاۃ مصر، القسم الاول المطبعۃ الامیریہ، بالقاہرہ، ۱۹۵۷ء؛ (۳) الذہبی، الامام شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان (م ۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء): سیر اعلام النبلاء ، جلد: ۱۲۔ مؤسسۃ الرسالۃ؛ (۴) الزرکلی، خیر الدین، الاعلام ؛ (۵) قاموس تراجم.

(فیاض سعید، و محمودالحسن عارف)

••-------------••

⊗ بکرۃ (بنو): قحطانی قبائل سے تعلق رکھنے والا، ایک عرب قبیلہ۔ ان کا نسب بنو ثعلبہ بن عقبہ بن السکون بن اشرس بن کندہ ہے (عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب، ۱: ۹۹، بیروت، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء)۔ الطبری نے لکھا ہے کہ بنو بکرہ قبیلہ سکون کا ایک بطن ہے (الطبری: تاریخ الرسل والملوک، ۱: ۱۸۵۵)۔

حضرت معاذؓ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف عامل (گورنر) بنا کر بھیجا تھا، صنعاء پر اسود عنسی کے قبضہ کے بعد حضرموت آگئے تھے، وہاں انہوں نے قبیلہ سکون کے ایک خاندان بنو بکرہ کی ایک عورت رملہ سے نکاح لیا تھا (طبری: تاریخ الرسل والملوک: ۱: ۱۸۵۵)۔

مالک بن فہیرہ کا تعلق بنوبکرہ سے تھا (القلقشندی: نھایۃ الأرب، ص: ۱۷۹، قاہرہ، ۱۹۵۰ء) بعض محققین کا خیال ہے کہ بکرہ ایک عورت تھی جس کا تعلق بنو وائل اور عدنانیہ سے تھا، بکرہ وائل کی بیٹی، بکر بن وائل کی بہن اور ثعلبہ بن عقبہ کی بیوی تھی (نھایۃ الأرب، ص: ۱۷۹؛ معجم قبائل العرب، ۱: ۹۹) اور اس کی اولاد بنو بکر کہلائی مزید معلومات کے لیے دیکھیے مآخذ.

مآخذ: (۱) عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب، ۱: ۹۹، بیروت، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء) ؛ (۲) ابی جعفر محمد بن جریر الطبری: تاریخ الرسل والملوک، ۱: ۱۸۰۰، (۳) ابی العباس احمد القلقشندی: نھایۃ الأرب فی معرفۃ انساب العرب، قاہرہ ۱۹۵۹ء، ص ۱۷۹؛

(شیم روشن آراء)

••-------------••

※ بلادالسودان: لغوی مفہوم "کالے لوگوں کی سرزمین" دورِ جدید سے قبل کے عربی مآخذ میں افریقہ کے صحرائی ساحلی علاقے کے لیے [مستعمل] عمومی نام، جو کہ المغرب، لیبیا اور مصر کے جنوب تک اور مغرب میں بحراوقیانوس سے لے کر مشرق میں بحیرۂ احمر تک پھیلا ہوا ہے.

۱۔ سوڈان کا مشرقی حصہ: اس کے لیے [دیکھیے چاڈ در تکملہ] دافور؛ کردفان، ؛ نوبیا؛ وادائے؛ اور دورِ جدید کے لیے دیکھیے سوڈان.

۲۔مغربی سوڈان کی تاریخ: بلاد السودان الغربی (اگرچہ "الغربی" کا لفظ ہمیشہ واضح طور پر مختص نہیں کیا جاتا) کے نام سے موسوم یہ علاقہ بعد کے ادوار میں مسلمان جغرافیہ دانوں اور مؤرخین کے نزدیک "حبشیوں کی سر زمین" ہے، جو بحراوقیانوس اور نائیجر یا ایر (Air) کے پھندے کی شکل والے علاقے کے درمیان صحاریٰ کے ساتھ ساتھ واقع ہے۔ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے بعد سے کم از کم لفظ تکرو، جو کہ ابتداً پانچویں صدی ہجری/ گیارہویں صدی عیسوی میں وسطی سینیگال کے ایک شہر کا نام تھا، دنیاے مشرق میں افریقہ کے اس اسلامی مغربی سوڈانی ساحلی علاقے کے لیے عمومی طور پر مستعمل تھا، لہٰذا [پہلے پہل] "مغربی سوڈان" اس کے مترادف کے طور پر سامنے آیا اور بعد ازاں اس نے (مکمل طور پر) اس کی جگہ لے لی.

عربوں کا سوڈان: مسلم تہذیب کی چھاپ کے ساتھ نمایاں سیاہ افریقہ سے طور پر مراد صرف اس برِ اعظم کے

ایک سرے سے دوسرے تک گھٹتی بڑھتی ہوئی چوڑائی والی ایک راہ داری لی جاتی تھی، نہ کہ سارے کا سارا یہ سیاہ براعظم۔ اس عمومی تصور میں قرون وسطیٰ میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ آئی اور یہ موجودہ دور میں بھی برقرار ہے۔ مغربی سوڈان میں اسلام کی اشاعت کا آغاز اس مقام سے ہوا جہاں (تجارتی) کارواں پہنچے اور ایک ہزار سال کے عرصے میں غیر معمولی سست رفتاری سے اس کی پیش قدمی صرف چند سو کلومیٹر تک ہی (محدود) رہی۔ (براعظم کو) عرضاً قطع کرتی ہوئی اس (زمینی) پٹی کے علاوہ جنوب کے کم تر شاداب میدانوں (Savahnahs) اور بارانی جنگلات والے مغربی افریقہ میں بیسویں صدی عیسوی تک بھی اسلام کی اشاعت کا کام نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔

ظہورِ اسلام کے اوّلین سالوں میں عربوں کے نزدیک سوڈان کرۂ ارضی کی انتہا (پر واقع) تھا۔ یہ (محض) نئے دین کا جوش و خروش نہیں، بلکہ بیش قیمت تجارتی سامان (سونا، ہاتھی دانت، غلام اور قیمتی لکڑی وغیرہ) تھا جو اوّلین ہجری صدیوں میں مسلمان تاجروں، عربوں، بربروں یا ایرانیوں کو (کشاں کشاں) سوڈان کے دروازے پر لایا اور خصوصاً المغرب کی فتح کے بعد اس کے مغربی علاقے میں، نیم صحارائی خطے کے بارے میں اوّلین عربی مآخذ میں سے ایک، جو کہ (دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے تعلق رکھنے والے) جغرافیہ دان الفزاری کی تصنیف ہے، جس میں "گھانا کی مملکت" کو (جو موجودہ دَور کا ملک گھانا نہیں، بلکہ عہدِ وسطیٰ کی ایک مملکت تھی جس کی سرحدیں موریطانیہ، سینیگال اور مالی سے ملتی تھی) "سونے کی سر زمین" کہا گیا ہے [رکّ بہ گھانا]۔ اس طرح مغربی سوڈان کا تصور تضادات پر مبنی [دکھائی دیتا] ہے: یہ بیک وقت ایک غیر مہذب اور دُور دراز علاقہ تھا اور وسائل [دولت] سے مالا مال [بھی]۔

مغربی صحارٰی کی چند ایک سیاحتی مہمات کو چھوڑ کر مشہور مسلم حکومتوں نے نہ تو مغربی سوڈان کے کسی حصے پر قبضہ کیا اور نہ ہی اس کی حوصلہ افزائی کی، حتیٰ موریطانیہ کے صحرا کے جنوب سے آنے والے نقاب پوش المرابطین نے (پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی)، جنہوں نے مراکش میں اپنے اقتدار کی بنیادوں کو استوار کیا اور سونے کی تجارت والی مغربی شاہراہ پر قبضے کو سب سے بڑھ کر اہمیت دی، جلد ہی نیم صحارائی علاقے کی سیاسی کشمکشوں میں دلچسپی ترک کردی۔ مغربی افریقہ کی باہم قریب واقع آبادیوں کو مشرف با اسلام کرنے میں ان کا کردار ہمیشہ متنازع فیہ رہا ہے۔

مرکزی خلافتی اقتدار یا مقامی امارتوں کی یہ عدم موجودگی ہی ثقافتی ربط و ضبط یا تعامل کی سست رفتاری کی جزوی طور پر غمازی کرتی ہے۔ بحیرۂ روم کے آس پاس کے علاقوں کے حالات سے اس صورت حال کے مختلف ہونے کی وجہ سے یہاں ایک طویل عرصے تک اسلام سے وابستگی کا مخصوص استحقاق رکھنے والی کوئی ہیئت حاکمہ ہی موجود نہ تھی، جو واحد سیاسی قوت کی حیثیت سے اپنا سارا زور اس نئے مذہب کی حمایت کے لیے وقف کر دیتی۔ شمال سے درآمدشدہ لیے اشیائے تعیش (گھوڑوں، نمک، پارچہ جات اور شیشے کے برتنوں وغیر) کی قدروقیمت کے مساوی معاشرتی رتبے کی علامت (Badge) کے طور پر اسلام نے افریقی تجارتی کارندوں خصوصاً سوننیک (Soninke) لوگوں (گھا نا کی "سلطنت" کے نمایاں ترین نسلی گروہ) اور سرداروں کے درباروں میں رسائی حاصل کی، لیکن اس کے شہروں سے دیہاتی علاقے تک، شرفا سے کسانوں تک اور صحرا کے کناروں پر آباد گروہوں سے اندرون صحرا بسے ہوئے گروہوں تک پھیلنے کے لیے مزید کئی صدیاں درکار تھیں۔

سوڈان میں ایک طویل عرصے تک اسلام [صرف] شہری علاقوں (علیحدہ علیحدہ مرائز اضلاع یا مکمل قصبوں)

تک محدود رہا۔ مسلمانوں ہونے والے ان قصبوں/شہروں کو اپنے آس پاس کی آبادیوں کو ان ذرائع سے یا گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی کے بعد سے مسلّح جہاد کے ذریعہ دائرہ اسلام میں لانے کے لیے خاصا طویل عرصہ لگا۔ عموماً جن علاقوں کی تجارت پر خصوصی مہارت کے حامل تاجروں کا قبضہ تھا۔ وہ تنگ نظری ترک کرتے اور طاقت کے توازن کو مدّنظر رکھتے ہوے مذہبی مسائل سے بالا تر رہ کر اپنی تجارتی کامیابی کی طرف متوجہ رہتے تھے۔ ان علاقوں میں جو مسلمان مقیم تھے، اس وقت وہ مشرک سرداروں کے ملازم تھے، ان کی طرف سے مراسلہ نگاری کیا کرتے تھے یا انہیں [مختلف مشکل کاموں میں کامیابی کے حصول کے لیے] نہایت مجرب قسم کے تعویزات فراہم کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب مسلمان مقامی سلطنتوں کے حکمران بن گئے تو بھی افریقی مذاہب کے حامل عوام کے ساتھ ان کے تعلقات پہلے ہی کی طرح استوار رہے۔ بارہویں /اٹھارہویں صدی تک جزوی طور پر مسلمان شہری آبادیاں ارواح پرست (رسوم و رواج کے حامل) دیہی علاقوں سے گھری ہوئی تھیں اور ان کے حکمران خود، جن کا مقامی (indigenous) استحقاق اصلاً آبائی رسوم و حقوق کے احترام پر مبنی ہوا کرتا تھا، عموماً مقررہ تقاریب میں شمولیت کر کے مروجہ قربانیاں ادا کر کے افریقی سرداروں کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی پورے کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

مغربی سوڈان اس طرح مشرف با اسلام ہونے کے عمل کا ایک مخصوص نمونہ پیش کرتا ہے جو بے دینی کی حامل مخصوص قسم کی رسومات کی کسی حد تک محدود تعداد کی بنا پر ہی نہیں، بلکہ مختصر مدت میں اقلیت کی طرف سے، اس کی قبولیت کی بنا پر واضح ہے یہ ایک ظاہری طور پر قبول کیے جانے والے اسلام کا اثر تھا، جس نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اپنے تشخص اور مرکزی سنی خصائص کی پاس داری کو استحکام بخشا تھا۔

اس براعظم کے دیگر خطوں مثلاً موجودہ جمہوریۂ سوڈان اور اس کے صدر مقام خرطوم [رکّ بہ سوڈان]، مغربی سوڈان میں اسلام کی اشاعت کی تحریک کا نتیجہ عربی زبان کی ترویج عام کی صورت میں سامنے نہ آیا، البتہ چند ایک تعلیم یافتہ علاقے اس سے مستثنٰی ہیں۔ بعض افریقی زبانیں مستعار عربی الفاظ، مثلاً دینی اصطلاحات، ہفتے کے دنوں، تجارتی الفاظ اور لوگوں کے ناموں کو اپنے ہاں جگہ دے کر زبانی دعوت و تبلیغ کے کام میں اور تحریر کی صورت میں (عربی رسم الخط کو اپنا کر) رابطے کا کردار ادا کرتی ہیں۔ اسی نوعیت کا نمایاں کردار سارے مغربی افریقہ میں فلفلدہ (Fulfulde)، سینیگال میں ولف (Wolof) کا، مالی، گنی اور ان کے بعض ہمسایہ ممالک میں مالینک (Malinke) اور جولہ(Jula) کا اور خصوصاً مغربی سوڈان کے انتہائی مشرقی علاقے میں ہوسا [رک بآں] کا ہے۔ موریطانیہ کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے جس کی آبادی پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی سے بتدریج عرب قبیلے بنو ہلال کی ذیلی شاخوں کے زیرِ اقتدار آتی گئی اور تقریباً مکمل طور پر عرب بن چکی ہے [دیکھیے موریطانیہ]۔

ابتدائی روابط: ۱۱۶ھ/۷۳۴ء میں مراکش کی جانب سے "سوس اور سوڈان کی سر زمین میں" حضرت عقبہؓ بن نافع [رک بآں] کے پوتے حبیب بن ابی عبید الفہری کی سرکردگی میں ایک مہم کے بھجوائے جانے کا ذکر آتا ہے۔ ابن عبدالحکم کے بیان کے مطابق اس نے "فقید المثال فتح حاصل کی اور واپسی پر اپنے ساتھ مال غنیمت میں نہایت کثیر مقدار میں سونا لایا"۔ خصوصی جائزے پر مبنی یہ مہم بظاہر طویل المدت اثرات سے خالی نہ تھی، بعد میں ۱۲۷ھ/۷۴۵ء میں اس کے بیٹے عبدالرحمٰن نے، جو افریقا کا گورنر بنا، [یہ عہدہ سنبھالنے سے قبل] مغربی سوڈان کو جانے والے صحرائی راستوں پر تین کنوئیں کھدوائے۔

عرب، بربری افواج کی جنہوں نے جبل الطارق [جبر الٹر] اور پوئی ٹرس (Poitiers) کے درمیانی فاصلے کو بیس سالوں میں طے کیا، اور یوں تذبذب کا شکار ہیں، ان مہمات کے بعد ساری توجہ صحرا کے شمالی گوشوں تک محدود رکھی۔

مغربی سوڈان کی حقیقی دریافت کا سہرا تاجروں کے سر ہے جو کہ زیادہ تر بربری تھے۔ عرب۔ مسلم فتح یابی کے زیرِ اثر، جس کی رو سے تجارتی محرک پید اہوا، صحرا کے دونوں سروں پر قصبے اور مسافر خانے تعمیر کیے گئے۔ مغرب کی طرف سجلماسا [رک بآں] (جنوب مشرقی مراکش) تھا، جو اودغست [رک بآں] (جنوبی موریطانیہ کا ایک بربری قصبہ) اور گھانا سے بذریعہ شاہراہ ملا ہوا تھا۔ یہ اول الذکر سے بارہ (۱۲) دن کی مسافت پر واقع ہے اور طویل عرصے تک اس علاقے کا اہم ترین شہر رہا۔ وسط میں ایک شاخ در شاخ شاہراہ طرابلس، افریقیا اور ورجل (wargla)گوا [رک بآں] (کوکو) سے ملاتی تھی جو کہ ایک دوسرے تجارتی قصبے تا دمک السوق کے راستے پر دریائے نائیجر پر واقع سیاہ فام آبادی والا قدیم ترین قصبہ تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں بڑی بنیادی قوتیں مسلسل مغرب سے مشرق کی جانب منتقل ہوتی رہیں جو شمال کی مقتدر طاقتوں کے تعاقب کی وجہ سے تھا۔ قرطبہ کے اموی، مرابطین، فاطمی اور بعد ازاں ایوبی اور مصری ممالیک، سوڈانی خطے میں بھی اس کے مماثل انتقالِ اقتدار عمل میں آیا یعنی مغرب (گھانا، پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی) سے مشرق گوا [رک بآں] نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی) کی جانب۔ اگرچہ بین الصحارائی تجارت کی خلل اندازیوں کے عنصر کا مقامی سیاسی مسائل سے صحیح طور پر مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔

ان اوّلین رابطوں کے زمانے سے، افریقی قبائل دائرہ اسلام میں داخل ہونا شروع ہوگئے۔ تمام متذکرہ صورتوں میں یہ سردار ہی تھے، جنہوں نے خود اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی رعایا میں اسے پھسلایا۔ البکری کے بیان کے مطابق تکرور کا بادشاہ وارا دیابی "مشرف باسلام ہوا اور اس نے اپنے ملک میں اسلام کی اشاعت کی۔ اس نے انہیں اسلام کی حقانیت سے آگاہ کر کے اسے قبول کرنے کی ترغیب دی۔ اس نے ۴۳۲ھ/۱۰۴۰-۱۰۴۱ء میں وفات پائی"۔ وارا دیابی تکرور کے ماتحت اس کے ایک نواحی قصبے سلا کو بھی مشرف باسلام کرنے میں کامیاب رہا۔ بعدازاں ۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء میں اس کا بیٹا لبی مرابطین کی افواج سے برسر پیکار رہنے کی وجہ سے معروف رہا۔ مزید مشرق کی طرف گوا کے بادشاہ "زا کسوئے" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تکرور کے بادشاہ سے بھی پہلے اسلام قبول کر چکا تھا؛ تاریخ السودان کے مصنف مطابق تقریباً ۴۰۰ھ / ۱۰۰۹-۱۰۱۰ء میں "وہ بغیر کسی جبرواکراہ کے حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکا تھا"۔ لیکن اس سے بھی قبل گوا کے حوالے سے المہلبی (م۳۸۰ھ/۹۹۰ء) نے تحریر کیا ہے۔ اس ملک کا حکمران اپنی رعایا سے پہلے ہی اسلام قبول کر چکا ہے؛ اس کی رعایا میں سے بھی بہت سے لوگ خود کو مسلمان کہتے ہیں۔ البکری ۴۶۰ھ/۱۰۶۸ء میں لکھتے ہوئے قرطبہ کے امویوں سے اطاعت گزاری کا ذکر کرتا ہے: "بادشاہ کی تخت نشینی کے موقع پر اسے ایک مہر، ایک تلوار اور قرآن حکیم کا نسخہ پیش کیے جاتے ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ امیر المؤمنین کی طرف سے موصول ہونے والے تحائف ہیں۔ ان کا حکمران مسلمان ہے اور صرف ایک مسلمان سے ہی وفا داری کی توقع کی جا سکتی ہے"۔ پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کے اختتام کے وقت گواسین کے قبرستان میں بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں کے ناموں کے کتبہ جات موجود ہیں۔ ان میں ایسے شرفا اور شاہی خاندان کے افراد کے نام بھی شامل ہیں، جن کی شناخت ابھی تک باوثوق طریقے سے ہونا باقی ہے۔ ان کتبہ جات میں سب سے قدیم ترین کتبے پر ۴۸۱ھ/۱۰۸۸ء کا سال تحریر ہے اور اس پر "ملکیہ؟ دختر

حسن الحاج" کا نام موجود ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ یہ اسلامی کتبہ سیاہ فام لوگوں کے افریقہ کا قدیم ترین دریافت شدہ کتبہ ہے۔ چند سال بعد، بادشاہوں اور ملکاؤں کے نام اسی مقام پر سامنے آئے؛ تین نہایت قدیم کتبے (۴۹۴ھ/ ۱۱۰۰ء،۵۰۲ھ/۱۱۰۸ء اور ۵۰۳ھ/۱۱۱۰ء) الجیریا سے درآمد کیے گئے سنگِ مرمر کے ہیں۔ دوسرے کتبہ جات مقامی طور پر تیار کیے گئے ہیں۔ گوا میں یوں ایک ہی طرح کے (تبدیلی مذہب کے) مآخذ کا ایک قابلِ ذکر ذخیرہ موجود ہے، جس کی وجہ سے یہ مذکورہ بالا قصبے کے مقابلے میں بلاشبہ اشاعتِ اسلام کا ایک دوسرا بڑا مرکز قرار پایا ہے۔

صرف گھانا میں اشاعتِ اسلام کی اولین سرگرمیوں کے خلاف ایک مختصر عرصے کے لیے مزاحمت کی گئی۔ مگر ۴۷۹ھ /۱۰۷۶ء میں یعنی جاری صدی کے اختتام سے قبل مرابطین کے اثرورسوخ کے تحت یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح سے پانچویں صدی ہجری/ گیارہویں صدی عیسوی وہ عظیم صدی ہے جس میں اسلام بین الصحارائی شاہراؤں پر واقع انتہائی آخری قصبوں کے شاہی درباروں میں متعارف ہوا۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین بقاے باہمی کے اصول کی کارفرمائی ایک قابل ذکر انداز میں دیکھنے میں آئی جیسا کہ اس دور کے عرب مصنفوں، خصوصاً البکری نے [خصوصی دلچسپی اور]توجہ سے بیان کیا ہے؛ بین الصحارائی شہر دو حصوں یعنی "تاجروں کے قصبے" اور "شاہی قصبے" میں منقسم ہو اکرتے تھے اور ان کے درمیان چند کلومیٹر کا فاصلہ ہوا کرتا تھا۔ گھانا اور گوا بھی اسی طرز پر بنائے گئے تھے۔

خارجی نو آباد کار: متذکرہ بالا عربی مآخذ تمام تر اہل سنت کے ہیں۔ اس لیے المغرب کے سنیوں کے اپنے خارجی حریفوں خصوصاً اباضیوں [رکّ بہ اباضیہ] کے ساتھ چند صدیوں تک چلنے والی کشمکش کے بارے میں مکمل خاموشی پائی جاتی ہے۔ مرکزی دنیاے اسلام اور مغربی و وسطی سوڈان کے درمیان خطے میں خارجی بربروں نے دو صدیوں (۱۳۰ھ-۳۴۰ھ/۷۵۰ء-۹۵۰ء) تک جنوبی المغربی (سجلماسہ اور تاہرت) اور صحارائی شاہراؤں پر قبضہ کیے رکھا اور وہ وسطی اور مغربی دنیاے اسلام اور سوڈان کے درمیان حائل رہے۔ چوتھی صدی ہجری تا چھٹی صدی ہجری تا دسویں صدی عیسوی /بارھویں صدی عیسوی کے اباضی مآخذ میں، جو کہ کم از کم دست زمان سے بچ نکلے ہیں اور بعد کے مآخذ کا تو ذکر ہی کیا، تاہرت، ورجلہ، نفذاوہ اور جبالِ نفوسہ سے تادمکت، گوا، گھانا اور مغربی سوڈان کے دیگر علاقوں کی طرف اباضی مسافروں کے سفروں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ البکری نے بھی اباضی علاقوں سے اودغست میں آنے والے اباضی تاجروں کا ذکر کیا ہے، جو کہ ۴۴۶ھ/۱۰۵۴-۱۰۵۵ء میں مرابطین کے ہاتھوں اس شہر کی فتح اور قتلِ عام تک کافی تعداد میں موجود تھے۔ درحقیقت مرابطین، جو کہ خانہ بدوش منہاجہ بربروں میں سے تھے، مستقل طور پر اقامت گزینی اختیار کرنے والے زناتہ بربروں کے خلا ف اپنی نفرت کی وجہ سے بھی اپنے ان مخالف خارجی بدعتیوں سے شدید عناد رکھتے تھے۔ اگرچہ خارجیوں کا اقتدار پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں نہایت کمزور حالت میں تھا تاہم یہ لوگ تمام بین الصحارائی شاہراؤں پر سیاسی اور تجارتی لحاظ سے قبضہ کیے ہوئے تھے۔ سجلماسہ کے خود مختار شہر (جس کی بنیاد ۱۴۰ھ/۷۵۷ء میں رکھی گئی) کے صفری خارجی [رکّ بہ صفریہ] مغربی جانب کے بڑے بیرونی راستے پر قابض تھے۔ تاہرت کے رستمی [رکّ باں] اباضی (۱۵۹-۲۹۷ھ/ ۷۷۶-۹۰۹ء) وسطی الجزائر سے ورجلہ اور جنوبی تیونس اور جبالِ نفوسہ تک کے صحارائی۔ گوشوں پر حکومت کرتے رہے۔ فزان میں خارجی روایات کے طویل عرصے سے حامل قصبے میں بنو الخطاب کی خارجی سلطنت نے چاڈ کے طاس تک رسائی کے راستے پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔

کچھ لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ صحارٰی میں خارجیت ہی اسلام کی اوّلین صورت ہو گی۔ یہ مفروضہ معقول دکھائی دیتا ہے، لیکن اس کا ثبوت مشتبہ ہے۔ افریقیوں کی خارجی نظریات سے وابستگی کی تائید صرف ایک ماخذ یعنی زھری کی کتاب الجغرافیہ سے ہوتی ہے جو غالبًا ۵۳۹ھ/۱۱۳۳ء سے بعد کی تحریر ہے۔ اس میں اس حوالے سے گھانا اور نائیجیر کے پھندہ نما علاقے کے مابین واقع ایک آبادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب ٹمبکٹو [رک بآں] محض بسایا ہی گیا تھا۔ ابن بطوطہ نے ۷۵۳ھ/۱۳۵۲ء نائیجر کے قریب اسی خطے کی سیاحت کرتے ہوئے ملنکہ نام والے ایک خاندان یعنی سفنفو کے سفید فام اباضیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح سے تادمکت [رک بآں] میں ساحل کے آس پاس دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں مقیم طاقت ور اباضی افریقی باشندے تھے جنھوں نے اپنے تجارتی شرکا کا مذہب اپنا رکھا تھا اور وہ مرابطین کے برپا کردہ انقلاب تک اور ممکنہ طور پر اس کے بعد بھی اس مذہب کے ساتھ وابستہ رہے۔ اس امر کا امکان بھی ہے کہ ایسی کئی اور بھی ہوں، لیکن اباضی مذہب کو زمانی یا مکانی لحاظ سے سیاہ فاموں کے افریقہ میں مزید کوئی ترقی نصیب نہ ہوئی۔

تحریک مرابطین: سیاہ فام افریقہ میں مرابطین [رکّ بآں] کے کردار کے بارے میں، قیاس آرائیاں مآخذ کے درمیانے معیار کی وجہ سے کی جاتی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ صحارٰی کے جنوبی حصے میں ان کی کاروائیوں کو شمالی حصے میں ان کے کارناموں کی نسبت کم تر حیثیت دے کر ان کا پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا کیونکہ مؤخرالذکر علاقے میں ان کے کارناموں کا ذکر بہتر انداز سے مفصل طور پر تیار شدہ دستاویزات کی صورت میں اور روایتی استشراقیت اور یورپی تاریخ سے "متعلق" زیادہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم مرابطین کی تحریک نے سیاہ فام افریقہ کے کناروں پر جنم لیا۔ "رباط" جس سے کہ انہوں نے اپنا نام اخذ کیا، اگر کہیں واقع تھا، تو شاید موریطانیہ کے جنوبی ساحل پر قریب کے ایک جزیرے میں تھا یا پھر دریائے سینیگال کے اندر ایک جزیدے میں۔ تحریک کے آغاز پر سینیگالی مملکت کے لیے تکرور سے اس کی حمایت کے لیے فوجی دستوں کی روانگی کا پتہ چلتا ہے، لیکن دستیاب مآخذ کے پست معیار کی وجہ سے طرح طرح کی قیاس آرائیوں کے لیے میدان کھلا ہوا ہے عزت و وقار کی خاطر اس علاقے کے مسلمان مؤرخین اس کی ابتدا یا باقاعدہ طور پر ایک تاسیسی تحریک کے اندر تلاش کرتے ہیں یا کم از کم ایسا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ مستشرق لیو افریقی (leo Africanus) نے ۱۵۲۶ء میں کچھ اسی طرح کا دعوٰی کیا ہے جس کی رو سے ساتویں صدی ہجری/ تیرہویں صدی عیسوی میں قائم ہونے والی مالی [رک بآں] کی سلطنت کا تعلق مرابطین کے بادشاہ یوسف بن تاشفین کے چچا زاد ابو بکر کے ساتھ جا ملتا ہے۔ لیکن زمانی اور جغرافیائی بُعد اور سلطنت مالی کے آغاز کے بارے میں دستیاب معلومات سے ان مفروضہ جات کی مکمل تردید ہوتی ہے۔ اسی طرح کی روایات کی رو سے سینیگال کی ایک شاہی سلطنت والو (Waalo) کے ایک دیومالائی بانی ندیدین ندیائے (Nadyadyan Ndyay) کو اسی ابو بکر کا بیٹا قرار دیا جاتا ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان دو سے زیادہ صدیوں کا زمانی بُعد ہے۔ ٹمبکٹو کے عظیم فاضلِ احمد بابا [رک بآں] (پ: ۹۵۳ھ/۱۵۵۶ء) کا شجرۂ نسب، جس میں انہیں ابو بکر کی انیسویں پشت سے دکھایا گیا ہے، بھی کچھ زیادہ قابلِ قبول نہیں۔

معلومہ حقائق کی طرف مراجعت: مرابطین کی تحریک، جو ایک صدی تک سینیگال سے ابرو تک شمالاً جنوباً ایک وسیع سلطنت کے قیام پر منتج ہوئی، موریطانیہ کے صحرا کے خانہ بدوش اور نقاب پوش صنہاجہ بربروں کے لمتونہ قبیلے

[رک بآں] کی قیادت میں اپنے حریف زناتہ قبیلے کو زک پہنچا کر عروج پر پہنچی۔ اس نے مغربی افریقہ کے سونے کے ذخائر تک مکمل رسائی حاصل کر کے معاشی میدان میں برتری حاصل کی۔ بہرحال اس سلطنت کا نقشہ مغرب کی ان جنوب مشرقی شاہراؤں کی مدد سے تشکیل پایا، جن سے شمالی افریقہ کو سونا بھجوایا جاتا تھا۔ دینی میدان میں المغرب کے سنی حلقوں سے ابھرنے والی یہ تحریک اس زمانے میں وہاں اور صحارا میں سرگرم خارجی اور شیعہ مخالفین پر اپنی بالا دستی کو آشکار کرتی ہے۔

نظریات کی دنیا میں مگن، سخت گیر ابن یٰسین، جس نے اپنے خانہ بدوشانہ تحفظات کے باوجود مرابطین کی تحریک کے نظریات اور اس کی تنظیم کو استحکام بخشا، ۴۵۱ھ/۱۰۵۹ء میں ایک جنگ میں قتل ہوا۔ بعد ازاں لمتونہ قبیلے کے رسمی امیر کو ابو بکر بن عثمان کے نام سے ابن یٰسین کا جانشین اور تحریک کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ دستیاب مآخذ میں سے ایک رو کی سے مراکش [رک بآں] کی بنیاد رکھنے کے بعد ابوبکر نے تحریک میں نظم و ضبط اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے اس کے گہوارے یعنی صحرا کی طرف واپسی کا فیصلہ کیا۔ اس نے شمالی علاقے میں اپنے اختیارات اپنے بڑے چچا زاد یوسف بن تاشفین کو منتقل کر دیئے جو ایک روشن مستقبل کا مالک بنا اور ۴۸۰ھ/۱۰۸۷ء (مآخذ کی رو سے تاریخ وفات میں اختلاف کے ساتھ) میں اپنی وفات تک جو تحریک کی جنوبی شاخ کا رہنما رہا اور اس نے موریطانیائی اورار میں ازکی کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔

اس دور سے متعلق جنوبی صحارا کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہو سکے۔ الزہری نے گھانا کے باشندوں کے بارے میں بیان کیا ہے کہ: "۴۶۹ھ/۱۰۷۶-۱۰۷۷ء میں وہ لمتونہ قبیلے کے دور میں مسلمان ہو چکے تھے اور اپنے اسلامی تشخص میں خاصے نمایاں تھے"۔ جبکہ بعد کے ادوار میں تحریر کی جانے والی متعدد درسی کتابوں میں مرابطین کے ہاتھوں گھانا کی فتح اور تباہی کا سال ۱۰۷۶ء بیان کیا گیا ہے، جبکہ موجودہ دور کے محقق اور تبصرہ نگار، گو متفقہ طور پر نہ سہی، اس فتح (الزہری کی عبارت غیر فیصلہ کن ہے) اور تباہی (قدیم گھانا کے مفروضہ مقام موجودہ کمبی، صالح کے آثار سے تو آٹھویں ہجری/چودھویں صدی عیسوی تک اس قصبے کی خوشحالی کے احیاء کی شہادت فراہم ہوتی ہے)، ہر دو پر شک کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ سوننکہ دارالسلطنت تو اس طرح سے مرابطین کے قبضے میں آ کر دائرہ اسلام میں آیا ہو گا اور الزہری اس واقعہ (۵۳۹ھ/۱۱۳۳ء) کے تقریباً پچاس سال بعد خود کو اس کے باشندوں کے مسلمان ہونے کی بنا پر ان کی تعریف و توصیف تک محدود رکھتا ہے، جن میں علما، فقہا اور ماہر قراء شامل تھے۔ اس کے چند سال بعد ۵۴۸ھ/۱۱۵۴ء میں ادریسی نے لکھا ہے کہ گھانا ایک خوشحال شہر ہے، جس کی ساری آبادی مسلمان ہے اور یہاں کا حکمران حضرت حسن بن علی ؓ کی اولاد میں سے ہونے کا دعوی کرتا ہے اور وہ عباسی خلیفہ کا اطاعت گزار ہے۔ الزہری نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ گھانا کے لوگوں نے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے "سات سال" بعد، یعنی تقریباً ۴۷۶ھ/۱۰۸۳ء میں کس طرح تادمکت اور اس خطے کے دوسرے شہر کے لوگوں سے مرابطین اور در حقیقت ابوبکر کی تائید و حمایت کی استدعا کی۔ یہاں "اسلام قبول کرنے" کا مطلب سنی مذہب کو اختیار کرنا ہے۔ سب سے آخر میں یاقوت، جس نے ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں پرانے مآخذ کی مدد معجم البلدان مرتب کی، بیان کرتا ہے کہ گھانا کے مغرب میں واقع ایک اور اہم سوننکہ مملکت زافونو/جافونو اور مرابطین کے مابین بھی ایک دیرینہ مستحکم اور گہرا اتحاد پایا جاتا ہے اور وہ ان کے بادشاہ کے دورۂ مراکش کے موقع پر مرابطین کی طرف سے اس کے لیے انتہائی عزت و احترام کا ذکر خصوصی طور پر کرتا ہے۔ ان متعدد شہادتوں سے واضح ہوتا ہے کہ

مرابطین نے خانہ بدوش سفید فاموں اور مستقل طور پر اقامت پذیر سیاہ فاموں کے درمیان شدید دشمنی پیدا کرنے سے اجتناب کرتے ہوے ان سیاہ فام مملکتوں خصوصاً سوننکہ بادشاہوں کے مابین پائیدار اتحاد پیدا کر کے اس سے خوب فائدہ اٹھایا جو ان کی سلطنت کو جنوب کی جانب سے گھیرے ہوے تھیں اور جن کے ہاں المغرب کے تجارتی قافلوں کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔

اس خطے کے اوّلین مسلمان نسلی گروہ کی حیثیت سے سوننکہ لوگوں نے ارد گرد کے خطوں میں اسلام کی روشنی پھیلانے والے مسلمان تاجروں اور مبلغوں کے لیے ایک نرسری کا کام دیا۔

۴۸۰ھ /۱۰۸۷ء میں ابو بکر کی وفات کے بعد، مرابطین کی یادیں ان متعدد مقامی خانہ بدوشوں کی نسبی دعوی جات کی شکل میں پروان چڑھتی رہیں جو خود ان کو اس کی یا اُزکی کے نامور فقیہ امام الحضرمی (م۴۸۹ھ/ ۱۰۹۶ء) کی اولاد قرار دیتے تھے۔ اگرچہ اس کے نہایت طویل عرصے بعد ان دعوی جات کی ایک نامکمل سی مثال، گو اس کا اظہار متذکرہ بالا دعوی جات کی طرح نہیں کیا گیا، گیارہویں صدی ہجری /سترہویں صدی عیسوی اور تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کے مغربی افریقہ کے جہاد ہیں، تاہم مرابطین کی تحریک، بنیادی طور پر ترقی کی حامل نہ ہونے کے باوجود سوننکہ مملکتوں کے کناروں اور ساحلی خطوں کے لیے ایک اتحاد پرور عنصر کا درجہ رکھتی ہے۔ اس نے اپنے دُور رس اثرات کے نتیجے میں ایک ایسی تخلیقی داستان کی حیثیت حاصل کر لی ہے جسے اکثر دہرایا جاتا رہا ہے اور اس کی طلب ہمیشہ سے رہی ہے۔

عظیم سوڈانی سلطنتوں کا دور: مغربی سوڈانی سلطنتوں، وسطی سوڈان کے چاڈ کے خطے میں کنیم، بورنو (Kanem-Borno) کی سلطنت سمیت کے حالات، جن سے کہ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں نئے آزاد ہونے والے ملک بہت ہی مسحور ہیں، نسبتاً زیادہ عمدہ طریقے سے تحریری طور پر محفوظ ہیں، انہیں مرکزیت سے کوئی سروکار نہ تھا جو عموماً ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یہ سلطنتیں عظیم تر وسیع انتظامی ڈھانچوں پر مبنی تھیں اور ان کی سرحدوں میں تبدیلی آتی رہتی تھی اور ان میں رقبے پر قبضے کی نسبت انسانوں پر اقتدار کا حصول زیادہ اہم تصور کیا جاتا تھا۔

یہ بڑے بڑے خاندانوں، مسلح گھڑ سواروں اور تجارت کے سلسلوں کا معاملہ تھا، کسان عوام، اپنی روز مرہ زندگی لازمی طور پر دیہات کے سرداروں (مالی کے "کفو") کی حاکمیت کے تحت بسر کرتے تھے اور ان کی مرکزی قوتِ حاکمہ سے کوئی رابطہ نہ ہوتا تھا: چنانچہ قرونِ وسطٰی کی سوڈانی سلطنتیں ایک پیچیدہ ڈھانچے پر مشتمل ہوا کرتی تھیں جن میں ثقافت اور اقتدار کے متعدد طبقے باہم مربوط ہوتے تھے۔ یہ سب کچھ اس بنا پر تھا کہ ان سلطنتوں کو چلانے والے تمام خاندان، جو کہ بین الصحارائی تجارت پر گرفت رکھتے تھے اکثر و پیشتر مسلمان تھے، جبکہ ان کی نزدیکی یا دور دراز کی رعایا اپنی روزمرہ زندگی میں اپنے کافرانہ مذاہب پر کار بند تھی۔

قرونِ وسطٰی کے یورپ کی صورتِ حال کے برعکس، جہاں کہ حکمران زرعی پیداوار پر محصول عائد کر کے آمدنی حاصل کیا کرتے تھے، سوڈان کی شاہی سلطنتیں بین الصحارائی تجارت کے منافع جات سے روپیہ کماتی تھیں، کیونکہ وہ ذرائع (سونا، ہاتھی دانت، غلام وغیرہ) اور بیرونی راستوں کے سروں کے مابین حائل رہا کرتے تھے۔ ان کے درباری مصاحبین بھی رہزنی کے عادی تھے۔ المغرب (یعنی مراکش، یورپ یا مشرق کی تیار شدہ قیمتی تجارتی اشیا کی بافراط رسائی میں مزید اضافے کی خاطر، جن سے ان کے وقار کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انہیں قوت فراہم کرنے والے آلات (گھوڑے اور بعد ازاں آتشیں اسلحہ) بھی ملتے رہتے

تھے، ان سلطنتوں کے قیادتی گروہ، ممکنہ حد تک، اپنے مستقل باج گزاروں کی سلطنتوں کی سرحدوں سے آگے دور تک حملوں اور غارت گریوں کا سلسلہ جاری رکھتے یا اپنے اندرونی یا بیرونی حریفوں کو نقصان پہنچا کر مادی فوائد حاصل کرتے تھے۔ اصولی طور پر اسلام سے وابستگی گرفتار ہونے اور غلام بنائے جانے سے بچنے کے لیے ایک ذریعہ تحفظ تھا لیکن یہ تحفظ طاقت ور لوگوں کے مفادات کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں ٹمبکٹو میں مرتب کی جانے والی اپنی تصنیف معراج السعود میں احمد بابا نے توات [رک بآں] کے ایک تاجر کو سوڈان کے متعدد خطوں کے باشندوں کو غلام بنانے کے بارے میں اس کے استفسار کو جواب کی صورت میں کیا ہے۔ وہ سوڈان کی کئی سلطنتوں کے قبول اسلام کا ذکر کرتے ہیں اور نتیجتاً ان کے ہاں مسلمانوں کے غلام بنائے جانے کو غیر شرعی قرار دیتے ہوئے شریعتِ اسلامی کی اس قدر بار بار کی جانے والی خلاف ورزیوں پر سخت اظہار افسوس کرتے ہیں۔

ان سلطنتوں کا تجارتی کاروبار وسیع پیمانے پر دور دراز علاقوں تک پھیلا ہوا تھا اور یہ نئے تجارتی مواقع پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتی تھیں۔ ان کے تشکیل کردہ حکومتی اور انتظامی ڈھانچوں کی باقیات پائیدار ثابت ہوئی ہیں ؛ مالی یا بورنو میں تشکیل دیئے گئے حکومتی عہدوں اور منصبوں کے نام ہمسایہ ممالک میں ترویج پاتے گئے اور باج گزار سلطنتوں نے شاہی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے مفادات کے پیشِ نظر انہیں اپنے سیاسی نظام میں برقرار رکھا۔ اس کے برعکس، عرب مبصرین کے خیال میں، درمیانی اور طویل فاصلوں کی تجارت کی فراہم کردہ مؤثر حفاظت کی بدولت ایک تمدنی ارتقا وجود پذیر ہوا جو اب صرف نائیجر کے پھندا نما علاقے کے علاوہ جا بجا نظر آتا ہے، جہاں کہ مالی اور سنگھائے کے متواتر تسلط کے تحت قدیم اور جدید قصبات کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔

جا(دیا) ، جنی، ٹمبکٹو، جاوا ، گوا وغیرہ۔

عرب۔ اسلامی دنیا کے مراعات یافتہ حلیفوں کی حیثیت سے ان سلطنتوں کا ذکر ان کے دور کے عربی مآخذ میں متعدد بار آیا ہے۔ ان مآخذ میں ان کے عربی تہذیب و تمدن کو اپنا لینے کی روداد کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ اکثر و پیشتر صورتوں میں مراکشی اور مصری سیاح صرف دارالسلطنتوں اور بڑے بڑے شہروں سے واقف تھے اور وہ معاشرتی حقائق سے محض جزوی طور پر آگاہ تھے۔ مقامی عربی مآخذ (تاریخ کی کتابیں) دستیاب معلومات کو متنوع بنانے میں مدد کرتے ہیں، لیکن اس امر کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ یہ مآخذ علمی اور تجارتی ہر دو مفادات رکھنے والے مستقل طور پر آباد شہری خاندانوں کے مرتب کردہ تھے، جو اپنے طرزِ معاشرت میں دنیاے عرب کے ساتھ اس حد تک واضح یگانگت رکھتے تھے کہ بعض اوقات، مثلاً ٹمبکٹو کے باشندوں کی طرح وہ افریقیوں سے زیادہ عربی معلوم ہوتے تھے۔ اس دور میں یہاں اسلام محض شاہی درباروں، شہروں، سرداروں اور تاجروں تک محدود تھا اور ابھی تک اس کی جڑیں یہاں مضبوط نہ ہو پائی تھیں اور دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی اور گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی کے متعدد بار کے "کافرانہ" ردِ عمل کے جواب میں اس کی طرف سے ایک کمزور سی مزاحمت دیکھنے میں آئی۔ جب تک اسلام معاشرے کے اعلیٰ طبقے سے عوام کی طرف منتقل نہیں ہوا، یہ سارے کا سارا عمل اپنے اثرات کی رو سے محدود رہا حتی کہ اسلامی نظریات، اقدار اور رسوم کی عوام میں ترویج کے بعد بھی .

جب بغداد کی عباسی خلافت کو منگولوں کی یورش کے نتیجے میں المناک انجام سے دو چار ہونا پڑا، مغربی افریقہ کی اسلامی سلطنتیں، اس کے برعکس، اپنے دورِ عروج میں جا پہنچیں، گھانا کے سقوط کے بعد جو کہ، (مالی اور موریطانیہ

کے کناروں پر) ایک محدود علاقائی قوت کی حیثیت سے مرابطین کے دور میں ٹکڑے ٹکڑے ہوتی دکھائی دیتی ہے (گھانا کا دارالسلطنت اس سقوط کے بعد بھی کئی صدیوں تک نہایت اہم تجارتی مرکز رہا)، دور جنوب کی طرف مقامی کشمکشوں کے بعد ایک نئی سلطنت وجود میں آئی جس میں بیور (Bure) کی سونے کی کانوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، یہ نائیجر کا دریائی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ مغربی اور وسطی صحارای سے شروع ہونے والی شاہراہوں کا نقطۂ اتصال بھی تھا۔ عوامی داستانوں کے مطابق کے بانی سنجتا/ سونجتا کیتا کا (اولین ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی) جو کہ جسمانی اور طلسماتی ہر دو طاقتوں کے مالک شکاری لوگوں کے معاشرے سے ابھرا، کا ذکر ایک اعلیٰ درجے کی رزمیاتی روایت میں آتا ہے اور تاریخی لحاظ سے اس کے زمانے کا تعین ابھی تک بحث و تمحیص کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس کا مشرف با اسلام ہونا، جس پر کچھ لوگوں نے شدید شک و شبہ کا اظہار کیا ہے، کچھ اور لوگوں کے خیال میں اگرچہ خالصتاً رسمی ہے۔ کیتا سلطنت کے حالات سے ابن خلدون کو خوب آگاہی حاصل تھی اور اس نے "ماری جاتا" (اغلباً غیر تحریری وقائع سنجتا) سے لے کر ۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء میں برسر اقتدار آنے والے منسا سوم تک کے تمام حکمرانوں کی فہرست مرتب کی ہے۔ ابن خلدون، جسے ان واقعات سے گوا میں بطور قاضی کام کرنے والے ایک شخص نے آگاہ کیا تھا، بادشاہوں کے ادوارِ حکومت اور اہم تاریخیں قلم بند کر دی ہیں۔ جس سے اس پورے کے پورے سلسلۂ سلطنت کو متعین کرنا ممکن ہو گیا ہے۔

حج کی ادائیگی کی روایت، جو ماری جاتا کے فرزند منسا اُلی کے عہد سے (یعنی ۶۵۹ھ/۱۲۶۰ء کے بعد) شروع ہو کر تقریباً ۷۰۰ھ/۱۳۰۰ء میں برسر اقتدار آنے والے اس شاہی خاندان کے ایک مملوک ساکورہ تک جاری رہی، منسا کنکو موسیٰ (منسا شاہی لقب، کنکو اس کی ماں کا ملتنکہ نام) کے عہد میں اپنے نقطۂ عروج کو جا پہنچی۔ (۷۲۴ھ/۱۳۲۴ء) میں اس حکمران کے سفر حج میں اس کے ہمراہ خدام کی ایک بہت بڑی تعداد تھی جو خصوصاً قاہرہ کے باشندوں کی توجہ کا مرکز بنی جہاں رابطہ کاروں (Intermediaries) اور مقامی شرفا کو فیاضانہ عطیات دینے کی وجہ سے اسے شہرت میسر آئی [رک بآں منسا موسیٰ]۔ موسیٰ کے بھائی منسا سلیمان (۷۳۵ھ-۷۵۹ھ/۱۳۳۵ء-۱۳۵۸ء) نے اپنی باری آنے پر فریضۂ حج کی ادائیگی کی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اسی زمانے میں بہت بڑی تعداد میں عرب علما دینی کتابیں اپنے ہمراہ لے کر یہاں پہنچے۔ مالی کا نام اس کے بعد بحیرۂ روم کے خطے میں خوب مشہور ہو گیا جس سے اس کے بارے میں سیاحوں کے دلوں میں تجسس پیدا ہونے لگا۔ ۷۳۵ھ/۱۳۵۲ء میں سلیمان کے عہدِ حکومت میں ابن بطوطہ مالی پہنچا اور اس کے دارالسلطنت کی سیاحت کی جس کے بارے میں اس نے قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے (اگرچہ اس کے تحریر کردہ احوال کی بنیاد پر اس دارالسلطنت کے محلِ وقوع کا تعین عملی طور پر ناممکن ہے۔ پھر وہ تمبکٹو اور جاو گیا جہاں وہ ایک مختصر سے عرصے کے لیے مقیم رہا اور وہاں مقیم مراکشی لوگوں کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ دی جن کی مہمان اندازی سے اس نے لطف اٹھایا۔

اس سلطنت کا ذکر آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے اختتام پر ان تاریخی مآخذ میں نہیں (جس سے قیاس ہوتا ہے کہ) اس وقت یہ اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی اور اس سے بہت سی علاقائی سلطنتیں ابھر آئیں۔ گیمبیا کی سمت واقع ان سلطنتوں میں سے ایک میں پرتگیزیوں نے پہنچ کر نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی سے اس خطے کی مرحلہ وار دریافت کی اور وہ "منڈنگاس" (منڈِنگ/ملنکہ) سلطنت کے وجود سے آگاہ ہوئے جو کہ اس وقت بحر اوقیانوس کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کا ایک اہم شہر ساحل سے کافی دور اندرونی علاقے میں واقع تھا

جسے وہ ٹمبکٹو (تمقتو) اور اس سے ملتے جلتے ناموں سے موسوم کرتے تھے۔

ساحل کے علاقے میں مالی کی سلطنت کے زوال پر ایک اور قوت نے ابھر کر شہرت پائی، طویل فاصلاتی تجارت کی بدولت مالا مال ہونے اور شہری تمدن کی طرف اقدام کے لیے نمایاں ہونے کی وجہ سے نائیجر کا پھندا نما علاقہ جو کہ بین الصحارائی شاہراؤں کے نئے مصروف ترین مراکز سے قریب تر تھا اور مصر کے ساتھ مستحکم ہوتے ہوئے تعلقات سے براہِ راست فائدہ اٹھا رہا تھا، مغربی سوڈان کا نیا فعال مرکز بن گیا۔ یہ سلطنت ایک مقامی طاقت یعنی جاکوا والوں کے ہاتھ آگئی اور اس طرح یہ تمام خطے ایک "دریائی سلطنت" کی صورت میں یکجا ہوگئے، چنانچہ سب سے پہلے انہیں سلطنتِ مالی کے تسلط سے نکالا گیا اور پھر اس کے بہت سے سابقہ مقبوضہ جات بطور ورثہ حاصل کر لیے گئے۔ یہ سلطنت اپنے قائم کرنے والے اہم ترین نسلی گروہ کے نام پر سنگھائے [رک بآں] کے نام سے موسوم کی گئی اور اس کا بانی ایک سیاسی اور فوجی سردار سونی علی (۸۶۹ھ-۸۹۸ھ/۱۴۶۵ء-۱۴۹۲ء) تھا، جو اغلباً اسلام سے محض برائے نام عقیدت و وفاداری رکھتا تھا۔ ۸۹۸ء/۱۴۹۳ء میں ایک صوبائی گورنر محمد تورے نے کے شہری رہنماؤں اور خطے کی "اسلامی پارٹی" کی تائید و حمایت سے سونی علی کے بیٹے کو معزول کر کے اسکیا (جس کے معنی ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے) سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ایک صدی تک قائم رہی۔

یوں سنگھائے سلطنت قائم ہوتے ہی ٹمبکٹو کے تعلیم یافتہ اور تجارت پیشہ رہنماؤں اور گوا کے جنگجوؤں کے مابین کشمکش کا اکھاڑہ بن گئی۔ نئے اور پرانے قصبوں کے مابین اور مختلف اقتدار کے نظاموں کے مابین اسکیا عہدِ حکومت میں بھی کشمکشیں جاری رہیں۔ ٹمبکٹو والوں کے مؤقف کی حمایت میں لکھی جانے والی تاریخ کی دو کتابوں (السودان اور الفتاش) سے یہ باہمی محاذ آرائی خوب آشکارا ہوتی ہے۔ تعصب پر مبنی ان ہر دو مآخذ میں سونی علی کے کردار کو خصوصی طور پر موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور اسے ایک "عیاش اور بد کردار جابر" حکمران قرار دیا گیا ہے۔ بلا شبہ شاہی درباروں تک محدود اسلام کو، جسے متعدد بار مصالحتوں کو قبول کرنا پڑا، اس طرح سے عربی طرزِ معاشرت کو پوری طور پر اختیار کر لینے والے اور عربوں کے حامی سرداروں کی طرف سے دیئے جانے والے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا، جو کہ اپنے مفادات اور نظریات سے مطابقت رکھنے والے طرزِ حکومت کی توقع رکھتے تھے۔ اسکیا محمد، جس نے (۹۰۱ھ/۱۴۹۶ء اور ۹۰۴ھ/۱۴۹۸ء کے درمیان) فریضہ حج کی ادائیگی سے اپنی حکمرانی کا آغاز کیا اور تلمسان سے تعلق رکھنے والے الجزائری مصلح مغیلی [رک بآں] سمیت متعدد علما کو اپنا مشیر مقرر کیا، اس طرز کے حکمران سے ملتا جلتا تھا جو ان لوگوں کے نزدیک قابلِ ترجیح تھا ۔ محمد کے جانشینوں نے زیادہ تر اسی حکمتِ عملی کو اپنائے رکھا۔ سلطنت کے مرکزی صوبوں میں اسلامی نظام نافذ کر دیا گیا: مساجد اور مدارس کا قیام، قاضیوں آئمہ اور اساتذہ کا تقرر کیا گیا۔ چنانچہ سنگھائے دورِ حکومت، سیاسی تغیرات کے باوجود مغربی سوڈان میں نفاذِ اسلام کے ضمن میں ایک اہم دور کی حیثیت رکھتا ہے۔

مغربی افریقہ میں مراکشی فتوحات کے ساتھ ہی سوڈانی سلطنتوں کے نظام کا خاتمہ ہوگیا۔ نئی سعدی سلطنت کا بلند حوصلہ حکمران احمدالمنصور [رک بآں] یورپی حملوں کی روک تھام کی غرض سے ایک وسیع افریقی سلطنت کے قیام کا خواہش مند تھا تاکہ وہ سونے، نمک اور غلاموں جیسے وسائل پر براہِ راست قابض ہو سکے۔ سنگھائے اور مراکش وسطی صحارای میں تغازہ [رک بآں] کے نمک کی کانوں کے مسئلے پر خصوصاً شدید اختلاف رکھتے تھے، ابتدا میں ایک ناکام کوشش کے بعد مراکشی افواج ایک اندلسی نو مسلم پاشا

جودر کی زیرِ کمان گوا پر اور اس کے بعد ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء میں ٹمبکٹو پر قابض ہوگئیں۔ مراکشی پاشاؤں نے اپنے آبائی ملک سے طویل عرصے تک دور اور الگ رہ کر ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء تک نائیجر کے بڑے بڑے قصبات پر حکمرانی کی۔ اس سے اس خطے کی خوشحالی اور اس کے بعد شہری قائدین کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ احمد بابا کو بھی چودہ سال کا عرصہ مراکش میں زیرِ حراست رہ کر گزارنا پڑا۔

اس وقت ''شاہی درباروں تک محدود اسلام'' کو شدید دھچکا برداشت کرنا پڑا اور ارواح پرست قوتیں جلد ہی اس کی جگہ لیتی دکھائی دینے لگیں، لیکن بالائی سطحوں پر اسلام کو جو کچھ کھونا پڑا وہ اس نے نچلی سطحوں پر پا لیا۔ مسلمان مبلغوں کی دانشمندانہ کوششوں سے عوامی احساسات سے زیادہ ہم آہنگ نئے اقدامات کی بنا پر تبلیغی عمل کامیابی سے ہم کنار ہوا۔ عوام میں مقبول درویشوں کے ذریعے اسلام کا بول بالا ہونے لگا اور یوں صوفیا کے سلسلوں [رک بہ طریقت] کے قیام کی داغ بیل پڑی جن کی مصر اور مراکش سے آمد کا ابھی بمشکل ہی آغاز ہوا تھا۔

مغربی افریقی اسلامی تمدن کا احیاء:سوننکہ سلسلے مغربی سوڈان میں عربی و اسلامی تعلیم کا اوّلین اور اہم ذریعہ تھے۔ بعد ازاں مالی اور دریائے نائیجر کی سمت میں ابلاغ کا عمل واقع ہوا۔ ملنکہ روایت نے مذہبی معاملات میں سوننکہ برتری کے تذکرے کو برقرار رکھا ہے۔ سوننکہ تاسیس والے ایک قصبے دیگر قصبات کی نسبت دریائے نائیجر کے آس پاس کے معاشروں میں یہ علمی ابلاغ کافی زیادہ کامیاب ہوا، جا کا شہر (دیا، جا، جبا جغا، یا رفجایا، زغا، اس کے نام کی مختلف صورتیں ہیں) ماسینا کے مغرب میں وسطی نائیجر کے اندرونی ڈیلٹے میں واقع تھا۔ یہ قصبہ، جس کی تاریخ کسی حد تک افسانوی (Mythic) نظر آتی ہے، مغربی افریقہ کے متعدد علمی خاندانوں کے مسکن کی حیثیت سے یا ان کے حوالے سے مشہور ہے، تاریخ الفتاش کے مطابق یہ سلطنتِ مالی کے زمانے سے ''فقہا کا شہر'' رہا ہے، اسے اس سلطنت میں مکمل خود مختاری حاصل تھی اور یہاں آ کر پناہ لینے والے مجرموں کو حفاظت و سلامتی کی مکمل ضمانت حاصل ہوا کرتی تھی۔ ابن بطوطہ نے، جو ۷۵۳ھ/۱۳۵۲ء میں یہاں آیا، بیان کیا ہے کہ ''زغا کے لوگوں کی اسلام سے وابستگی کی ایک طویل تاریخ ہے۔ وہ دینی ذہن کے مالک ہیں اور علم کے بڑے شائق ہیں''۔ یہ بات مذہبی مرکز بننے والے شہر کی شہادت جنی (Jenne) (جو کہ زغا کے قریب واقع تھا) اور ٹمبکٹو کے دینی مراکز، سے خوب واضح ہوتی ہے جو اس دینی جوش اور حمیت والی سر زمین کے وارث بنے۔ جا اور مغربی سوڈان کی اہم علمی شخصیات میں سے ایک الحاج سالم سواری بھی تھے وہ جا کے رہنے والے تھے اور پھر سونے کی دولت سے مالا مال خطے بمبوک میں دریائے سینیگال کے ایک معاون بفنگ (Bafing) کے کنارے پر واقع جا کے ہم پلہ اسی نام کے علمی مرکز جخا (دیا خا) میں جا کر رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ انہیں نویں صدی ہجری /پندرہویں صدی عیسوی کی شخصیت قرار دیا جاسکتا ہے، سواری اور دیا بجائے خود اس عظیم دینی اور امن دوست سلسلہ اشخاص کے نقطۂ آغاز کے حوالے سے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں جنھوں نے بعد کی صدیوں میں سینیگال اور گیمبیا کے علاقوں میں اپنا اثرو رسوخ قائم کیا اور اس شہر یعنی جا کے نام کو چار چاند لگائے ۔ آئی، ولکس (I.Wilks) نے اپنے طور پر گھانا اور ایوری کوسٹ میں اس خطے کے ملنکہ /جولا (یا دیولا) اساتذہ کی مجموعی طور پر چونتیس (۳۴) مالکی اسناد کا مطالعہ کیا ہے، جن کا آغاز بھی الحاج سالم سواری سے ہوتا ہے۔ اس طرح سے جا کا حلقۂ اثر ان گوناگوں اسناد کی بدولت مغربی افریقہ کے اس حصے کے سلسلۂ علما تک توسیع پذیر ہوا۔

ثقافتی اور لسانی تبادلے ان علمی حلقوں میں کسی دقت کے بغیر پایہ تکمیل کو پہنچتے تھے جو کہ تجارتی لحاظ سے انہی

خاندانوں، بلکہ انہی افراد کے ساتھ مدغم اور خلط ملط تھے۔ عربی مآخذ میں مذکور ایک عمومی نام یعنی ونگارہ تجارت میں خصوصی مہارت رکھنے والے افراد کے لیے مستعمل ہے۔ یہ ونگارہ لوگ ترکِ وطن کر کے آنے والوں اور تاجروں کے پیش رو تھے جو بعد کے ایک مرحلے پر ملنکہ علاقے اور اس کے ہمسایے ممالک میں جولا کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ونگارہ کسی ایک نسلی گروہ سے تعلق نہ رکھتے تھے، یہ ترکیب عمومی ہے اور اس کا اطلاق ان تمام لوگوں پر ہوتا ہے جو ایک جیسا طرزِ زندگی اپنائے ہوئے تھے، لیکن یہ واضح ہے کہ سوننکہ اور ملنکہ اس کے "اہم ترین اجزا" تھے، دوسرے لفظوں میں پہلی دو سلطنتوں کے ورثا جو بعد میں سنگھائے کے کچھ ورثا سے مل گئے (اسکیا محمد خود بھی اصلاً سوننکہ تھا)۔ اپنی نقل و حرکت میں آسانی کی بدولت یہ ونگارہ ان سلطنتوں کے اندرونی حصوں اور پھر مزید دور دراز علاقوں خصوصاً ہوسا (موجودہ شمالی نائیجیریا) تک جا پہنچے جس کی معلومہ تاریخ وسطی سوڈان کے حوالے سے، چودھویں صدی عیسوی کے لگ بھگ وجود پذیر ہوئی۔

اس دور کا اعلیٰ ترین علمی شہر ٹمبکٹو تھا، اس کی بنیاد چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی میں تورگ قبائل کے ہاتھوں پڑی، اور یہ صحرا کی طرف جانے والی گزر گاہ پر اور دریائے نائیجر کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے بڑی تیزی سے نہایت اہم تجارتی چوکی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ٹمبکٹو کی مسلمان برادری کی معلومہ تاریخ کا آغاز آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ ۷۵۳ھ-۷۵۴ھ/۱۳۵۲ء-۱۳۵۳ء میں جب ابن بطوطہ نے یہاں کا دو بار دورہ کیا تو یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور یہاں زیادہ ترصحرا کے مسوفہ بربر آباد تھے۔ تاہم اس نے دو مسلمان قبروں کا ذکر کیا ہے جو ان افراد کی تھیں، جو منساموسیٰ کے سفرِ حج سے واپسی کے بعد اس کے پیچھے یہاں آئے تھے۔ یہ اسکندریہ کا ایک تاجر جس نے ۷۳۴ھ/۱۳۳۴ء میں وفات پائی اور ایک اندلسی ابو اسحاق الغرناطی الساحلی تھے۔ مؤخرالذکر نے اپنی عملی زندگی کا آغاز غرناطہ میں وثیقہ نویسی سے کیا اور فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد منساموسیٰ کے ساتھ مالی پہنچا اور اس کے مشیر خاص اور ماہر تعمیرات کی حیثیت سے اس کا تقرر ہوا اس نے دارالسلطنت (جسے اب دریائے بالائی نائیجر پر واقع نیامی کہا جا سکتا ہے) میں اس حکمران کے لیے محل اور ممکنہ طرز پر، ٹمبکٹو کی عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی اور سوڈانی طرزِ تعمیر کو متعارف کرانے کا سہرا اس کے سر ہے، بعد میں اس نے ٹمبکٹو میں اقامت اختیار کر لی اور ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء میں وہیں وفات پائی۔ سونی علی کے پرشورشِ عہدِ حکومت کے بعد سنگھائے حکومت کے زیرِ قبضہ رہنے کے بعد اسکیا دورِ حکومت میں ٹمبکٹو اپنے پورے عروج پر جا پہنچا۔ خطے کے تمام نسلی گروہوں (بربروں اور حبشیوں)، مثلاً اقیت وغیرہ، جس سے احمد بابا تعلق رکھتے تھے، پر مشتمل چند بڑے بڑے خاندانوں کے تفوق کے ساتھ یہ افریقہ کے اس حصے میں اسلامی علوم کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

اس دور میں مشرق کے ایک عالِم اس علاقے میں علم کی اشاعت و ترویج میں رابطہ کار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے: یہ مشہور مصری بسیار نویس مصنف علامہ جلال الدین السیوطی (م۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء) [رک باں] تھے۔ وہ خود تو کبھی سوڈان نہیں گئے لیکن وہ قاہرہ کے راستے حج کے لیے جانے والے یا علم کی طلب میں وہاں آنے والے سوڈانیوں کے منظورِ نظر نمائندے کے طور پر خدمات سر انجام دیتے رہے۔ چنانچہ نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی کے اختتام پر، انہوں نے اسکیا محمد کا استقبال کیا جس کے ساتھ انہوں نے بعد میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی حکمران کی بدولت (۸۷۰ھ/۱۴۶۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچے والی) تفسیر جلالین کے نسخوں کی اشاعت کا کام بسرعت سر انجام پایا۔ السیوطی اس تفسیر کے شریک مؤلف تھے اور

اسے صحارا کے جنوبی حصے میں مستند اور معیاری تصنیف کا درجہ حاصل ہوا۔ اسلامی قانون کی ایک اہم کتاب بھی براستہ ٹمبکٹو مغربی سوڈان میں اسی دور میں پہنچی۔ یہ الخلیل بن اسحاق کی تصنیف مختصر تھی جو مالکی فقہ کا ایک معروف خلاصہ ہے۔ نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی کے اختتام پر اس قصبے میں متعدد اقسام کے علوم خوب ترویج پا چکے تھے۔

مدارس کی عدم موجودگی میں ٹمبکٹو میں دی جانے والی تعلیم، متعدد اقدامات اور مسجدوں کے مکاتب، جن میں سے سنکورے کا مکتب بہترین طرز کا تھا، کی تدریس پر مبنی ہوتی تھی۔ اس مسجد میں طلبہ اور اساتذہ بڑی تعداد میں آتے تھے۔ اس کا انتظام امام کے سپرد تھا، جو اکثر شہر کے قاضی کے فرائض بھی سر انجام دیا کرتا تھا۔ باہم خلط ملط دو خاندان اقیت اور اندا آگ محمد، جو کہ اصلاً تورگ تھے، سنکورے کے لیے اساتذہ فراہم کیا کرتے تھے۔ یہ حقیقت کہ (۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء سے قبل مرتب شدہ کتاب) مختصر اتنی دیر بعد یہاں متعارف ہوئی، اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ایک مقامی مرکز کی حیثیت سے ٹمبکٹو کا صوبائی مرتبہ طویل عرصے سے کس نوعیت کا حامل تھا، لیکن جب اس نے ترقی کی منزلیں طے کر لیں، تو اس سے اور نائیجر کے پھندا نما علاقے سے تعلق رکھنے والے علما، جو بین الصحرائی تجارت کے ذریعے خود کو نئی علمی ترقیوں سے خوب آگاہ رکھتے تھے اور دورے پر آنے والے دانش وروں سے استفادے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، اور جو بلا شبہ اپنے دور کے معیار کی رو سے استناد و اختصاص کا ایک قابلِ عزت مقام حاصل کر چکے تھے۔ واضح رہے کہ یہ دور متنی کتب، ان کی بکثرت شرح اور ان کے حواشی کا دور تھا۔

غلبہ اسلام کا ایک دوسرا قابلِ ذکر پہلو علما اور حکمرانوں کی شرفا یعنی سادات یا مشرق کے خاندانوں سے خود کو منسوب کرنے کی تمنا بھی تھی، گھانا کی اسلامی سلطنت کے حکمران، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، حضرت حسن بن علیؓ کی اولاد میں سے ہونے کے دعوی دار تھے۔ مالی کے کیتا خود کو جناب رسالت مآب ﷺ کے صحابی اور مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اولاد قرار دیتے تھے، کنیم کے سیفویہ کا دعوی تھا کہ وہ یمن کی ایک نامور شخصیت سیف بن ذی یزن [رک بآں] کی اولاد ہیں، اسی طرح کی بہت سی دوسری مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں۔ [جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد یعنی سادات یا] "شرفاء" [رک بآں] ("شریف" کی جمع) کا اس عظمت کی بنا پر فقید المثال احترام کیا جاتا تھا۔

تاریخ الفتاش میں بیان کیا گیا ہے کہ منسا موسیٰ نے کس طرح سے "شرفاء" کو اپنے دربار میں لانے کے لیے کوششیں کیں لیکن اسے صرف چند ایک قریشیوں کو اپنے ہاں لانے میں کامیابی حاصل ہوئی، جبکہ اسکیا محمد "مکہ مکرمہ کے امیر" مولای السقلی کے ایک بھتیجے کو اپنے دربار میں لا سکا جو ۹۲۵ھ/۱۵۱۹ء میں ٹمبکٹو میں آکر اقامت گزین ہوا۔ ان واقعات کی تاریخ واضح طور پر معذرت خواہانہ حیثیت رکھتی ہے، لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی افریقہ کی مسلمان برادری اس زمانے میں امہ میں اپنا مقام پیدا کرنے اور عالمِ عرب کے وسطی علاقوں میں مقبولِ عام (نوعیت کے) عزت افزائی اور استحقاق کے حامل القابات حاصل کرنے کے لیے کیا کیا علامتی ذرائع تلاش کرتی رہی۔ مشرق کے ساتھ استوار کیے جانیوالے ان روابط کی روشنی میں افریقہ کے مسلمان ملکوں میں مصر کی بڑھتی ہوئی اہمیت واضح ہے۔ آٹھویں صدی ہجری/چودہویں صدی عیسوی تک مغربی سوڈان کے بڑے بھائی (Progenitor) کی حیثیت سے مغرب [مراکش وغیرہ] کو یہ اہمیت حاصل تھی، منسا موسیٰ کے سفر حج کے زمانے سے مصر، جو کہ فاطمیوں کے عہد

اور عباسی خلافت کے سقوط کے بعد اہل سنت کا سب سے بڑا مرکز بن چکا تھا، حج کے راستے پر واقع ایک اہم مرکز کی حیثیت سے اپنا مرتبہ بڑھ جانے کی وجہ سے ایک مرکزی مقام بن چکا تھا۔ مسلم مغربی سوڈان اس کے بعد زیادہ یا کم حد تک مصری نمونے (Model) کی تقلید کر رہا تھا۔

تصوف اور اس کے حلقے: عہد وسطیٰ تصوف کے حلقے ساحلی، سوڈانی سلطنت میں مؤثر انداز میں داخل نہیں ہو پائے تھے، لیکن صوفی منش اور صوفیانہ نظریات رکھنے والے اشخاص صحاری میں پہنچ چکے تھے، سب سے پہلے [سلسلۂ] قادریہ [رک بآں] صحاری کے جنوب میں خوب پھیلا۔ قادری مآخذ میں کیے گئے دعوؤں یا [ان میں پیش کردہ] تخیل پر مبنی آرا کی بنا پر کچھ مصنفین نے اس خطے میں اس سلسلۂ طریقت کی آمد کی ضمن میں قدرے قبل کے زمانے کو اپنایا ہے، مثلاً وہ المغیلی (نواح ۹۰۰ھ/۱۵۰۰ء) کو اس کا داعی قرار دیتے ہیں۔ ان کی تعبیرات کو درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ صحاری اور مغربی سوڈان میں قادریہ کی تاریخ کنتا [رک بآں] سلطنت کے ساتھ پوری طرح سے مربوط ہے، جس کے حکمران عربی تہذیب و تمدن کو اپنائے ہوئے ایک خانہ بدوش گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور جنہوں نے اس سلسلۂ طریقت کے نظریات کی پاس داری کو اپنے اقتدار کے بنیادی امور میں جگہ دے رکھی تھی۔ کنتا [لوگ] مغربی صحاری ادوار اور سقیۃ الحمراء کے درمیانی علاقے میں سے ابھرے۔ ان لوگوں کا دعوٰی تھا کہ وہ سِدِی احمد البکائی (م ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء) کی نسل میں سے ہیں۔ گروہی تشکیل کے تھوڑے عرصہ بعد یہ لوگ دو شاخوں میں بٹ گئے۔ ایک شاخ مغرب میں ہی رہی جبکہ دوسری بارہویں صدی ہجری/اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں نائیجر کے شمالی جانب کے خطے میں جا بسی، وہیں اس پر اس صدی کے اختتام پر سدی المختار (۱۱۴۲ھ-۱۲۲۶/۱۷۲۹ء-۱۸۱۱ء) کو وہ پہلا شخص قرار دیا جا سکتا ہے جو سلسلۂ قادریہ سے وابستہ ہونے، اس کے شیخ کی حیثیت سے کام کرنے اور خطہ بھر میں شہرت کا حامل ہونے کی بنا پر مشہور ہے۔ لیکن صوفیت کے اثرات صحاری میں سلسلۂ قادریہ کی ترویج سے پہلے یقیناً یہاں آ پہنچے ہوں گے۔ "سلسلے کے بغیر صوفیت" کا یہ دور مسلم افریقہ کی تاریخ کے تاریک ادوار میں سے ایک ہے۔ ایچ۔ ٹی۔ نوریس (H.t.Norris) نے حال ہی میں ایر (Air) کے ایک صوفی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں تحقیق کی ہے، جو (۹۰۰ھ/۱۵۰۰ء) میں مشرق سے یہاں پہنچا اور جس کی شخصیت نیم افسانوی سی ہے۔ وہ صدری محمود بغدادی کے نام سے معروف تھے اور انہیں دسویں صدی ہجری/ سولہویں صدی عیسوی کے نصفِ اول کے کسی سال کے دوران اغادیس کے سلطان نے اپنے دربار کے فقہا کے فتوٰی پر قتل کرا دیا تھا۔ بغدادی کی تعلیمات جو کہ زبانی روایت کے ذریعے محفوظ تھیں اور جنہیں بعد میں ایک مرحلے پر قلمبند کر دیا گیا تھا، کثرتِ ذکر اور خلوت گزینی کی تلقین پر مشتمل تھیں۔ اس نے اپنے قتل کے بعد اپنا حلقہ اثر اور اپنے پیروکار اپنے پیچھے چھوڑے جن کی باقیات کچھ عرصہ بعد تک موجود رہیں۔ بہر صورت ۸۹۸ھ/۱۴۹۳ء میں، متذکرہ بالا صوفی کی مفروضہ آمد سے قبل، ایک تعلیم یافتہ بربر نے ایر کے خطے میں مروّجہ خلوت گزینی کی رسم کے بارے میں السیوطی کو مطلع کیا اور اس کے بارے میں ان سے فتوٰی طلب کیا لیکن انہوں نے اسے کوئی باعثِ تشویش امر قرار نہ دیا، لیکن اس کے ایک صدی بعد ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۶ء میں احمد بابا نے "بغدادی کی بدعات" کے حوالے سے کثرتِ ذکر کے واضح طور پر بدعت ہونے کی بنا پر اس کی مذمت کی اور اسے اختیار کرنے والوں کو سزا دینے کا فتوٰی دیا۔ یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ شاہراہوں کے مقامِ اتصال پر واقع قصبہ تادمکت کے بالمقابل گاؤں کیل السوق کے تورگ علما، جو نویں صدی ہجری/ پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں نائیجر اور ایر

کے درمیانی علاقے میں جا بسے، صوفیانہ اثرات کے داعی تھے لیکن سلسلہ ہائے تصوف کی یہاں آمد کا وقت ابھی نہیں آیا تھا اور یہ ابتدائی اقدامات صحارائی علما کے طبقے کی طرف سے کیے گئے تھے جو کہ زیادہ تر بربری تھے۔

اختتام: لفظ مغربی سوڈان کا استعمال تاریخ میں، عہدِ وسطیٰ سے شروع ہوتا ہے، جو بین الصحارائی تجارت اور "سوڈانی سلطنتوں" کی حیثیت سے مشہور شاہانہ سیاسی تشکیلات سے وابستہ ہے۔ مغربی سوڈان کے اس خطے کو بعد ازاں نئے سیاسی تجربات کی سر زمین بننا پڑا، غیر مسلم سیاسی نظاموں (بجیرہ، مسی) کے از سر نو متحرک ہونے پھر، سترہویں صدی عیسوی کے بعد سے فولبی علما کی تحریک پر مقامی جہادوں کے سلسلے کا آغاز، اصلاحی تحریکیں جن کی وجہ سے مسلمانوں اور ارواح پرستوں کے مابین بقاے باہمی کی حکمت عملی ایک بار پھر زیرِ بحث آئی: ۱۱۳۸ھ /۱۷۲۵ء-۱۷۲۶ء، گنی میں فوتہ جلون (Futa Jalon)؛ ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء، فوتہ تورو (وسطی سینیگال) ۱۸۰۴ء ، سوکوتو (Sokoto) خلافت کا قیام، شمالی نائیجیریا میں ؛۱۸۱۸ء، ماسینا، مالی میں؛ ۱۸۶۲ء الحاج عمر، گنی۔ مالی۔ سینیگال میں، ایک دوسرے دور میں دوسرے طریقے اور ایک اور قسم کی تاریخ سامنے لائے۔ "مغربی سوڈان" کی اصلاح، جو اپنی اصل اور نسبت کے لیے قبل کے ایک دور کے بیرونِ عرب کے نقطۂ نظر کی مرہونِ منت ہے، اس وقت اتنی عام اور ناموزوں ہو گئی کہ اس سے مراد ایک ایسی سرزمین لی جا سکے جہاں سیاسی اختلافات مستقل طور پر نمایاں ہوں، یورپی فتح (انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے) کے [پیدا کردہ حالات کے] برعکس، جو کہ واضح طور پر سامنے آ رہی تھی۔

مآخذ : (۱) اصل اور عربی تراجم J.M.Cuoq: *Recueil des sources arabes concernant l'Afrique occidentale du viiieme au xvieme siecle (Bilad al0sudan)*، پیرس: ۱۹۷۵ء؛ (۲) L.E.Kubhel اور V.V.Matvegev (مدیران): *Drevniye i sredny evekoviye istocniki po etnografi i istorii narodov Afriki yuzhnyeye sacari*، ماسکو، لینن گراڈ، دو جلدیں، ۱۹۶۰ء-۱۹۶۵ء؛ (۳) Ch.de la Ronciere: *La decouverte di l'Afrique cartographes et explorateurs*، قاہرہ: ۱۹۲۴-۱۹۲۷ء، تین مجلدات ؛ (۴) N.Levtzion اور J.F.P. Hopkins (مدیران): *Corpus of early Arabic sources for west African history*، کیمبرج: ۱۹۸۱ء؛ (۵) T.Lewicki: *Arabic external sources for the history of Africa south of sahara*، Wroclaw- Warsow- Cracow ، ۱۹۶۹ء، بار دوم: لندن، لاگوس: ۱۹۷۴ء.

۲۔ اہم عربی مآخذ (یا اصل عربی مآخذ) مترجم یا دو لسانی اشاعتوں میں۔: (۶) البکری، فرانسیسی ترجمہ M.G.de Slane: *Deseription le l'Afrique occidentale*، الجزائر: ۱۹۱۳ء اشاعتِ نو اور جزوی فرانسیسی ترجمہ V.Monteil: *Routierde l' Afrique blanche et noire du nordouest Bulletin de l'IFAN*، ب۳۰ (۱۹۶۸)؛ (۷) : ابن بطوطہ : رحلۃ ، جزوی فرانسیسی ترجمہ R.Mauny، V.Monteil اور دیگر: *Textes et documents relatifs a' l' history d'Afrique, Extraits tires de voyaged d'Ibn Battuta*، ڈاکار ۱۹۶۶ء انگریزی ترجمہ H.A.R. Gibb: *The Travels*، ۴، لنڈن: ۱۹۹۴ء، ۹۴۶-۹۸۷؛ (۷) ابن خلدون، طبع و ترجمہ M.G.de Slame: *Histoire des Berberes et des dynasties musulmanes di l'Afrique septentrionale*، پیرس ۱۹۲۵ء؛ (۹) الادریسی، ترجمہ: R.Dozy اور M.J.de Geoje (مدیران): *Description de l'Afrique et de l' Espagne*، لائیڈن: ۱۸۶۶ء؛ (۱۰) E.Cerulli و دیگر: *Opus geographicum*، نیپلز، روم: ۱۹۷۰ء؛ (۱۱) Leo Africanus، طبع اور فرانسیسی ترجمہ : (۱۲) A.Epaulard: *Description*

de l'Afrique، پیرس: ۱۹۵٦ء، دو جلدیں؛ (۱۳) عمری: ا Afrique moins l'Egypte، ترجمہ M.Gaudefroy Demombynes، پیرس ۱۹۲۷ء.

(۳) سوڈانی افریقی مآخذ (۱۳) سعدی: تاریخ السودان، فرانسیسی ترجمہ O.Houdas، پیرس: ۱۹۰۰ء؛ (۱۴) محمود کاتی اور اس کا پوتاہ، ابن المختار: تاریخ الفتاش، فرانسیسی ترجمہ Hordas اور M.Delafosse، پیرس: ۱۹۱۳ء.

(۴) پرتگیزی اور ان کی دریافتوں سے متعلقہ مآخذ: (۱۵) Gomes Eanes de Zurara، ترجمہ L.Bourdon: Chronique de Guinee، ڈاکار: ۱۹٦۰ء؛ (۱٦) Alvise Ca da Mosto، طبع و ترجمہ Ch.Sehefer: Relation des voyages a la Cote occidentale d'Afrique، پیرس: ۱۸۹۵ء، طبع T. Gasparrini Leporece: Le navigaziioni atlantiche del venziano Alvise da Mosto، روم: ۱۹٦٦ء؛ Valentim Fernandes، طبع و فرانسیسی ترجمہ Th.Monod: (۱۷) R.Mauny، اور G.Duval: De la Premiere de la Guinee، بساؤ ۱۹۵۹ء (لاطینی متن)، Durate Pachees Pereira، طبع اور فرانسیسی ترجمہ R.Mauny: Esmeraldo de situ orbis Cote occidentale d'Afrique du sud marocain au Gabon، بساؤ: ۱۹۵٦ء.

(۵) تالیفی اور رہنما کتب: (۱۸) Ade AJayi اور M.Crowder (طابع): History of west Africa، لندن ۱۹۷۱-۱۹۷۴ء دو جلدیں ؛ (۱۹) The Cambridge history of Africa، (طبع J.D.Fage)، Africa c.1050-c.1600، ۳، کیمبرج: ۱۹۷۷ء؛ (۲۰) The Cambridge history of Islam، ۲ اے، کیمبرج: ۱۹۷۰ء؛ (۲۱) Cuoq: History de l'islamisation 'de l' Afrique de l'Quest des origines a la fin du XVIeme siecle پیرس ۱۹۸۴ء؛ J.CGarcin اور دیگر: (۲۲) Etats, Societes et cultures du monde musulman medieval, Xeme-XVeme siecle، پیرس: ۱۹۹۵ء (دیکھیے J.L.Triaud: L' expansion de l'Islam en Afrique)؛ (۲۳) M.Hiskett: The development of Islam in west Africa، لندن: ۱۹۸۴ء؛ Histoire generale de l'Afrique، یونیسکو، ۳، L'Afrique du VIIeme au XIeme Siecle، پیرس: (۲٦) ۱۹۹۰ء، ۴، L'Afrique du XIIeme au XVIIeme Siecle، پیرس: ۱۹۸۵ء (ایم الفاسی، I.Hrbek، J.Devisse، Z.Dramani-Issifou)؛ I.M.Lewis (طابع): Islam in Tropical Africa، لندن: ۱۹٦٦ء بار: دوم ہچنسن یونیورسٹی لائبریری برائے افریقہ ۱۹۸۰ء؛ (۲۴) D.Mecall اور N.R.Bennett (طابع): Aspects of west African Islam، افریقہ پر بوسٹن یونیورسٹی کا مقالہ، ۵ (۱۹۷۲ء)؛ (۲۵) R.Mantran (مدیر): Les grandes dates de l'Islam، پیرس: ۱۹۹۰ء بشمول سیاہ افریقہ (J.L.Triaud)؛ (۲٦) V.Monteil: L'Islam noir، پیرس ۱۹٦۴ء نظر ثانی شدہ اشاعت ۱۹۸۰ء؛ (۲۷) Le Sol, la parole et l'eerit Melanges en hommage a Raynond Mauny، پیرس: ۱۹۸۱ء، دو مجلدات؛ (۲۸) J.S.Trininghan: Islam in west Africa، ۱۹۵۹ء؛ (۲۹) وہی مصنف: A history of Islam in west Africa، لندن: ۱۹٦۳ء؛ (۳۰) وہی مصنف: The in fluence of Islam upon Africa، ۱۹٦۸ء؛ سمیر اے، (۳۱) زغبی: Islam in Subsaharan Africa, A Partially annotated guide، واشنگٹن: ۱۹۷۸ء.

(٦) خصوصی مآخذ: (۳۲) J.Boulegue: Le Grand Djoluf، بلوپس: ۱۹۸۷ء؛ (۳۳) Sekene Mody eissoko: Tombouctou et l'Empire Songhay.Epanouissement du Soudan Nigerien aux XVeme-XVIeme siecles، ڈاکار: ۱۹۷۵ء؛ (۳۴) Devisse: Routes de Commerce et echanges

en Afrique occidentale en relation avee la Mediterranee. Un eassi sur le commerce africain medieval du Xleme au XVleme Sieele، در Revue d'Histoire Economique sociale (۱۹۷۲ء)، عدد: ا، ۴۲-۷۳، عدد: ۳، ۳۵۷-۳۹۷؛ (۳۵) J.O.Hunwick: Shari'a in songhay. The replies of al-Maghili to the questions of Askia al-Hajj Muhamma، آکسفرڈ ۱۹۸۵ء؛ (۳۶) N.Levtzion: Aneient Ghana and Mali، لنڈن: ۱۹۷۳ء؛ (۳۷) Lewicki: L'Etat nord-africain de Tahert et ses relations avec le soudan occidental a la fin du VIIleme et au IXeme siecle، در cahiers d'Etudes Africaines، ۴، عدد: ۸ (۱۹۶۲ء) ۵۱۳،۳۵۱؛ (۳۸) March: Traits d' histoire du commerce saharen and et missionnaires ibadites au soudan occidental et central au cours des VIIleme-IXeme siecles، در Ethnografia Polska، ۸ (۱۹۶۴ء)، ۲۹۱-۳۱۱؛ (۳۹) وہی مصنف: un etat soudanais medival incommu: le royaume di Zafun(u)، در CEA، اا، عدد ۴۴ (۱۹۷۱ء)، ۵۰۱-۵۲۵؛ (۴۰) وہی مصنف: West African food in the Middle Ages according to Arabic Sources، کیمبرج: ۱۹۷۴ء؛ (۴۵) M.Ly-Tall: L'Empire du Mali، ڈاکار: ۱۹۷۷ء؛ (۴،۵ الف) B.G.Martin: Kanem notes on the political history of a atrade route Bornu and fazaan، در final African History، ۱،۱، ۱۵-۲۷ ؛ (۴۶) عمر النقرہ : The Pilgrimage tradition in the west Africa، خرطوم: ۱۹۷۲ء؛ (۴۷) H.T.Norris: Shinqiti folkliterature and song، آکسفرڈ: ۱۹۶۸ء؛ (۴۸) وہی مصنف: The Saharam myth and saga، آکسفرڈ ۱۹۷۲ء؛ (۴۹) وہی مصنف: The Tuareges: theeir Islamic legacy and its diffusion in the Sahel، وارمنسٹر ۱۹۷۵ء؛ (۵۰) وہی مصنف: Sufi mystics of Niger desert. Sidi Mahamud and the hermits of Air، آکسفرڈ: ۱۹۹۰ء؛ (۵۱) الیاس ن، سعد: Social history of Timbuktu: the role of Muslim scholars and notables 1400-1900، کیمبرج: ۱۹۸۳ء؛ (۵۲) I. Wilks: The transmission of Islamic learning in the western sudan، در J.R.Goody (مدیر): Literacy in traditional societies، کیمبرج: ۱۹۶۸ء؛ (۵۳) J.R.Willes (طابع): Studies in west African Islamic history, i, the cultirators of Islam، لنڈن: ۱۹۷۹ء؛ (۵۴) وہی مصنف: Slaves and slavery in Muslim Africa, i, Islam and the ideology of slavery, ii, the servile estate، لنڈن: ۱۹۸۵ء؛ (۵۵) محمود اے ، زبیر: Ahmad Baba de Tombouctou (1556-1627) vie et son oeuvre، پیرس: ۱۹۷۷ء.

۸۔المرابطین سے متعلق مآخذ: (۵۶) S.L.Burkhalter: Listening for Silenees in Almoravid History: another reading of The conquest that never was، در History in Africa، ۱۴ (۱۹۹۲ء) ۱۰۳-۱۳۱ اور conrad اور fisher کی کتاب پر تبصرہ)؛ (۵۷) Cl. Cahen: mythe ou realite: L' or du soudan avant les Almoravides، در Revue franeaise d' Outre-Mer ۱۶ (۱۹۷۹ء)، ۱۶۹-۱۷۵؛ (۵۸) G.S.Colin، A,O Balacar اور Devisse: Un ensemble epigraphique almoravide: decouverte fortuite dams la region de Tikjija: chaton de bague decouvert a Tegdaoust، در D.Robbert-chaleix، Devisse اور دیگر: Tegdaoust III Recherches sur Awdaghust، پیرس: ۱۹۸۳ء، ۴۲۷-۴۴۴؛ (۵۹) D.e.Conrad اور H.J.Fisher: The conquest that never was: Ghama and the Almoravids، در History

in Africa، ۹ (۱۹۸۲ء)، ۲۱-۵۹؛ ۹ (۱۹۸۳ء)، ۵۳-۷۸؛ (۶۰)H.Hugot: Mission a l' il de Tidra، در Bull.IFAN، ۲۸ (۱۹۶۶ء)، B، ۵۵۵-۵۶۴، ۱۰۱۹-۱۰۲۳؛ (۶۱) Hunwick: hypothesis: Gao and the Almoravids: a، در B.K.Swartzir اور R.E.Dumeet(مدیر): West African dulture dynamics: Archaeological and historical Perspectines، ہیگ: ۱۹۷۹ء؛ (۶۲) عمر کانے: Le fuuta Tooro des satigui aux Almaami (1512-1907, Universite de Dakar, doctorat d' Etat، تین مجلدات، ص ۱۱۲۴: Multigr؛ D.Lange: les rois de Gao sane et les Almoravids، در Final Afr. History، ۳۲ (۱۹۹۱ء) ۲۵۱-۲۷۵ (اسی مجلّہ کے ۱۹۹۳ء کے ایک عدد میں Hunwick کا تبصرہ)؛ (۶۳)Levtzion: Abd Allah b. Yasin and the Almoravids، در Willis(طابع): Studies in the west African Islamic history, i , the cultivators of Islam ۱۹۷۹ء، ۷۸-۱۱۲؛ (۶۴)R.A.K.Messier: The Almoravids: West African gold and gold currancy of the Mediterranean world، در JESHO، ۱۷ (۱۹۷۴ء) ۳۱-۴۷؛ (۶۵)P.F.de moraes farias: The Almovavids some question concerning the character of the movement during its period of closest dontact with the Western Sudan، Bull.IFAN، ۲۹ (۱۹۶۷ء) ، B، ۳۰۴، ۷۹۴-۸۷۷؛ (۶۶) Norris: New Evidence on the life of 'Abdullah b. Yasin and the origins of the Almovavid movement، در final Afr. History، ۱۲ (۱۹۷۱ء) ۲۵۵-۲۶۸؛ (۶۷)A.Noth: Das ribat der Almoraviden، در W.Hoenerbach(مدیر): Der Orient in der forschungh. Festschnift fiir otto spies، ویز بیڈن ۱۹۶۷ء، ۵۰۳-۵۱۰؛ (۶۸) A.W.Ould Cheikh اور B.Saison: Le theologien et le somnambule: un episode recent de l' histore almoravide en Mauritanie، در Revue Canadienne d' Etudes Africaines، ۱۹ (۱۹۸۵ء) عدد: ۲؛ (۶۹) P.Semonin: The Almoravid movement in the western sudan, a revien of the evidence، در Transactions of the Historical Society of Ghama، ۷ (۱۹۶۴ء) ۴۲-۵۹.

۸۔ آثارِ قدیمہ اور کتبہ جات۔ (۷۰)D.Robert، S.Robert اور Devisse (مدیر) Tegdaoust.I. Recherchas sur Aoudaghost، پیرس ۱۹۷۰ء؛ (۷۱)C.Vanacker: Tegdaoust.II,Recherches sur Aoudaghost. Fouille d'un quarties artisanal، پیرس: ۱۹۷۹ء؛ (۷۲) Robert.chaleix,Devisse اور دیگر: Tegdaoust III. Recherches sur Aoudaghost campagnes Enquetes generales، ۱۹۶۵/۱۹۶۰ء، پیرس: ۱۹۸۳ء؛ (۷۳)J.Polet: Tegdaoust IV. Fouille d' un quartier de Tagdaourst. Urbanization, architecture, utilization l' espace construit، پیرس ۱۹۸۵ء؛ (۷۴)Robert Chaleix: Tegdaoust V. Recharches sur Aoudagghost. une concession medieval a Tegdaoust. Impolantation, evolution d' une unite d' habitation، پیرس: ۱۹۷۹ء؛ B.Saison: Tegdaoust VI d' une quarties artisanal a Tgdaoust (Mauritanie orientale)، اشاعت کے لیے تیار؛ (۷۵)S.Bernus اور P.Gouletquer: Du cuivre au sel ethno-archeologiques sur la region d' Azelik (campagnes 1973-1975، در Final. de la societe des Africanistes، ۴۶ (۱۹۷۶ء) ، ۱-۲، ۷-۶۸؛ (۷۶)W.Filipowiak: Etudes archeologiques sur la capital medievale du Mali، سذکزکن ۱۹۷۹ء ؛

(۷۷) de Moraes Farias: *The oldest extant writin of west Africa. Medieval epigraphs from Essuk, sany and EgefONOTwaqqast(Mali)*، در *Final.des Africanistes*، ۲/۶۰ (۱۹۹۰ء)، ۶۵-۱۱۳۔

(J.L.TRIAUD [ت ظفر علی])

۳۔ سوڈان کی زبانیں: عربوں نے (مختلف اشیا کے) تاجروں کی حیثیت سے بلادِ السودان میں اسلام کی اشاعت کی۔ساتویں صدی عیسوی کے اختتام پر بڑی بڑی سوڈانی منڈیوں میں بہت سی عربی بولیاں مستعمل تھیں۔ آج کے دور کے عوامی سوڈانی عربی (SCA) کی [متعدد] اقسام اور سوڈانی عربی (SA) سے واضح ہوتا ہے کہ وہ صعید [رک باں] یا بالائی مصر کی بولیوں سے بہت مماثلت رکھتی ہیں، مثلاً لفظ کی ابتدائی حالت میں قدیم عربی کے الف کی دیگر بولیوں میں شکل میں برقراری (دیکھیے ال / (انگریزی کے "The" قاہری ال/یا مضاف الیہ کی علامت "ہنین" یا "الیل") ۔ عوامی سوڈانی عربی کی اصطلاح جمہوریۂ سوڈان میں بولی جانے والی کسی بھی مخلوط/ خالص بولی کے لیے مستعمل ہے، جبکہ سوڈانی عربی کی وسیع تر اصطلاح وہاں کے شہری باشندوں بدوؤں ہر دور کی بڑی زبان کے لیے مخصوص ہے۔

یہ مقالہ بنیادی طور پر سوڈانی عربی کے وسیع تر حلقہ اثر کے اندر اندر عوامی سوڈانی عربی کے بارے میں ہے۔ [اس میں] بلاد السودان کی چند دیگر بڑی بڑی زبانوں کے خصائص بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اگرچہ (سوڈانی عربی سمیت) ان زبانوں کے قواعد اور ذخیرہ ہائے الفاظ مرتب کیے جا چکے ہیں، تاہم وہ ان میں مختلف [نوعیت کی حامل] ہیں۔ (۱) املاء (Transcription) کی کیفیت اور)(۲) اعداد و شمار کی ثقاہت، سگسمنڈ کوئلے (Sigsmud Koelle) کی تصنیف *Polyglotta Africana*(۱۸۵۴ء) سے توضیح کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ اس موضوع پر اوّلین کتاب ہے، تاہم یہ اوّل الذکر ہی ایک مثال ہے، کیونکہ چاڈ کی عربی اور شوہ عربی [دیکھیے شوہ۔ ۲] کے متعلق اس کا بیان، دیگر مسائل سمیت، نامکمل ہے۔

عوامی سوڈانی عربی کو اس وقت سوڈان کی تقریباً پونے تین کروڑ کی آبادی کے نصف حصے کی پہلی زبان ہونے کا درجہ حاصل ہے (۱۹۹۰ء) اور بہت سے لوگوں کی دوسری یا تیسری زبان کا۔ جنوبی سوڈان میں عربی سے بنی ہوئی مخلوط اور خالص بولیاں (مثلاً جوبہ عربی) بھی بولی جاتی ہے جس کی خصوصیات یہ ہیں (۱) منہ اور حلق کے درمیان سے بولے جانے والے حروف اور پر آواز والے صحیح حروف (Emphatic Consonants) کی عدم موجودگی،جو کہ سوڈانی عربی کی دیگر بولیوں میں بھی ہے اور (۲) الفاظ کے مشتقات (Morphology) کی کمی۔

عوامی سوڈانی بولیوں کے بارے میں عالم عرب میں تحقیقی کام بہت ہی کم ہوا ہے اور اس کا جزوی سبب متعدد عرب قبائل کی نقل مکانی اور ابتدا میں عربی کو مشترک زبان کے طور پر بعدازاں اسے بنیادی زبان کے طور پر اختیار کرنے والے مسلمان ہو جانے والے بہت سے نسلی گروہوں کی الجھی ہوئی تاریخ ہے۔ مذکورہ بالا صورتِ حال کی وضاحت نوبہ کی پہاڑیوں کے کثیر اللسانی باشندوں کے معاملے پر غور کرنے سے [بخوبی] ہو سکتی ہے جو کہ چاروں طرف سے عوامی سوڈانی عربی بولنے والے لوگوں سے گھرے ہوئے ہیں [دیکھیے نوبہ۔۳]۔ اعلیٰ طبقے سے رابطے کے ذریعے وقوع پذیر ہوا ہے۔علاوہ ازیں بڑے قصبوں اور شہروں کی طرف نقل مکانی کرنے والے دیہاتی لوگ وہاں عوامی سوڈانی عربی سیکھنے اور اپنانے اور جب اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں تو یہ نئی نسل لسانی مہارت ان کے وقار میں اضافے کا باعث بنتی ہے اور انہیں بڑی بڑی تنخواہوں والی ملازمتیں دلانے میں معاون ثابت ہوتی ہے جس سے متاثر ہو کر دوسرے لوگ بھی اسے اپنا لیتے ہیں۔

خرطوم اور ام درمان کی بولی کے بعد جس بولی کا سب سے زیادہ تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہے وہ اونٹ پالنے والے قبیلے "شکریہ" کی بولی ہے، ان لوگوں کی آبادی تین لاکھ ہے اور وہ اتبرہ اور دریائے نیل ازرق کے درمیانی علاقے بطانہ میں رہتے ہیں۔ اگرچہ وہ عربی نسل سے تعلق رکھنے اور حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی اولاد ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں تاہم ان کی بولی غیر عربی ہے۔عوامی سوڈانی عربی اور عربی بولیوں میں کچھ مشترک الفاظ پائے جاتے ہیں، تاہم مثلاً اس وقت مستعمل مضاف الیہ کی علامتوں میں سے ایک "حگ"(ایک علامت "بطاع) مصری بولی سے اس کی گہری مماثلت واضح ہوتی ہے۔

تاریخ کی کتابوں کی رو سے بہت سے عربی بولنے والے سوڈان میں مصر سے آئے (مثلاً جعلیّین) یا حجاز سے (مثال کے طور پر جہینہ)۔ موجودہ دور میں اول الذکر میں درج ذیل کو شامل کرنا ممکن ہے: شیقیہ، رباطاب،مراخاب، جعلیّین، کواھلہ اور رفاعہ؛ مؤخر الذکر کو شکریہ، جہینہ، حسانیہ، ہوا اور کبابش، حمد، سلیمہ، ھوازمہ، مسیریہ، حُمر، حَمر، رزیجات، حبانیہ، تعیشہ اور بجارہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ امر غیر واضح ہے کہ آیا یہ عربی خصائص اندرونِ عرب کے حالات کی بنا پر ہیں، یا بعد میں ہلال اور سلیم کے گروہوں کے زیر اثر سوڈان میں ظہور پذیر ہوے۔ تاہم بولیں کے جغرافیہ کی [مقررہ] شرائط کی روشنی میں، چار بنیادی خطے ممیّز کیے جا سکتے ہیں: (۱) شمالی حصہ، دنگولا کے عربی بولنے والے حصوں سمیت ؛ (۲) وسطی، بشمول خرطوم، ام درمان، جزیرہ اور دریائے نیل ازرق کے مشرق میں واقع علاقے ؛ (۳) مغربی، دریاے نیل ابیض کے علاقے ، کردفان اور دارفور سمیت (بگاڑا کی بولی، تاہم بجائے خود ایک گروہ تشکیل کیے ہوے ہے)؛ اور جنوبی،مذکورہ بالا خلط ملط شدہ /غیر خالص بولیوں سمیت۔

عوامی سوڈانی عربی کی بولیوں کی نمایاں ترین خصوصیات میں سے ایک ان کا مختلف اور الگ قسم کا ذخیرہ الفاظ ہے۔ مثلاً سوڈان بھر میں وہاں کے لوگ پتلی، گول اور چپٹی روٹی "کسرہ" یا اس کی نسبتاً زیادہ پتلی قسم "گرامۃ" کھاتے ہیں۔ یہ الفاظ عالم عربی کے دیگر حصوں میں غیر معروف ہیں اور سوڈانی پکوان سے واقفیت رکھنے والے ہی صرف انہیں سمجھ سکتے ہیں۔ دیگر مخصوص سوڈانی الفاظ میں درج ذیل شامل ہیں: کدیس، جمع کدسة اور کدایس، نیز نیاوہ، (بلی) برس (تنکوں کی چٹائی)؛ "مرفعین "؛ (بھیڑیا، لگڑ بگڑ) "بعشوم" (لومڑی؛ گیدڑ) "عنجریب" (بستر) کرکب (لکڑی کی کھڑائیں) وَطا اور وِطا (زمین) ؛ کدروك (سور) مریسة (عموماً باجرے سے کشیدہ کی جانے والی شراب کی ایک قسم) جنب (بیٹھنا) عوامی سوڈانی عربی کا لفظ کیر بہت زیادہ بالائی مصر کی عربی کے کیتر سے گہرے ربط کی ایک اچھی خصوصی مثال ہے (دیکھیے قاہری کتیر لیکن مراکشی عربی میں بزاف یا خلیجی عربی میں واجد/ واید)۔

جہاں تک افعال کا تعلق ہے عوامی سوڈانی عربی کی زیادہ تر بولیوں میں جانے کے لیے فعل مشی یمشی استعمال کیا جاتا ہے، جبکہ مصری اور دیگر مشرقی عربی زبانوں میں اس کے لیے راح یروح مروج ہے (اس کے لیے فعل ذھب صرف یمن میں مستعمل ہے) اگرچہ سوڈان میں فعل عاوز یا عایز "طلب" کے معنوں میں آتا ہے، تاہم اغلباً اس کا تجزیہ بہترین طریقے سے کرتے ہوے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی مصری بولی سے مأخوذ ہے۔ عوامی سوڈان عربی (SCA) کا متنقد اسم فاعل دائر ثلاثی مزید فیہ کے باب ۴ عارض کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے، جس کے شروع کے حروف کو ہٹا دیا گیا ہے دیکھیے عوامی سوڈانی عربی کا جملہ دایر شنو "تم کیا چاہتے ہو؟"جو مصری عربی کے اس جملے کا متبادل ہے عاوزیہ۔ چاڈ اور نائیجیریا کی عربی میں اس سے کچھ اس طرح سے بولا جاتا ہے: تا /ادور شنو۔ اسے عوامی سوڈانی عربی کے مذکورہ بالا جملے سے موازنہ سے

ثابت ہوتا ہے کہ سب بولیاں بنیادی طور پر سوڈانی عربی (SA) کی توسیعات (extensions) ہیں۔

عربی کے بعد ہوسا [رک بآں] بلاد السودان کی اہم ترین زبان ہے۔ یہ بائیس (۲۲)ملین لوگوں کی پہلی زبان ہے اور دیگر دس ملین لوگوں کی ثانوی زبان ہے (۱۹۹۱ء) یہ مغربی چاڈی (افریقی ایشیائی) زبان صدیوں سے چاڈ کی بہت سی دیگر زبانوں کی جگہ لے چکی ہے جن کے بولنے والوں کی تعداد بہت کم ہے ۔ اسے آج کل زیادہ تر لاطینی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے؛ تاہم اجمی (یعنی عربی) رسم الخط بھی ابھی تک زیرِ استعمال ہے جو کہ عربی زبان سے بہت سے مستعار شدہ الفاظ کے لیے موزوں ہے۔

کنوری [رک بآں] (نیل صحارائی زبان کی ذیل صحارائی زبان) بورنو ریاست، نائیجیریا کی بڑی زبان ہے جسے پینتیس لاکھ افراد بولتے ہیں (۱۹۸۷ء) ۔ ہوسا کی طرح یہ بھی اعجمی رسم الخط میں لکھے جانے کی روایت رکھتی ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد چاڈ میں ایک لاکھ (۱۹۸۵ء)؛ کیمرون میں چھپن ہزار پانچ سو (۱۹۸۲ء) اور اور نائیجیریا میں پچاس ہزار ہے (۱۹۹۱ء) ۔ اس زبان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں اور یہ علاقے کی زبانوں کو الفاظ مستعار دینے کی صلاحیت رکھتی ہے مثلاً نائیجیریا کی عربی کا لفظ "دجو" تب ، بعد ازیں"کنوری کے لفظ "دجو" "پہلا" سے مستعار لیا گیا ہے۔

فلفلودے (فلہ، فلبے،فلانی [دیکھیے فلبے]) نائیجیریا کی آبادی (چھہتر ہزار، (۱۹۹۱ء) کے ۹٫۸ فیصد کی زبان ہے اس کی چار بڑی نائیجیریائی بولیاں ہیں؛ (۳) بوررو، برنو ریاست میں بولی جاتی ہے؛ اور (۴) سکوتو۔ یہ اوقیانوسی (نائیجیریائی۔ کانگو) ایک وسیع و عریض علاقے میں بولی جاتی ہے چوکہ فلانی [لوقگ] بہت سے ممالک میں پائے جاتے ہیں مثلاً مالی میں ان کی تعداد دس لاکھ ہے (۱۹۹۱ء)۔

سنگھائے [رک بآں] (نیل۔ صحارائی) کے بولنے والے افراد کی تعداد مالی میں چھ لاکھ، نائیجیریا میں تین لاکھ نوے ہزار ؛ برکینا فاسو میں ایک لاکھ بائیس ہزار سات سوہے (یہ سارے اعدادو شمار ۱۹۹۱ء کے ہیں)۔ یہ ایک اہم تجارتی زبان کی حیثیت سے اپنے وجود کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور پرائمری سکولوں میں بطور ذریعہ تعلیم بھی رائج ہے۔

ایک اور نیل۔ صحارائی زبان بگرمی [رک بآں] بولنے والوں کی تعداد تیس تا چالیس ہزار ، (۱۹۷۷ء) چاڈ اور نائیجیریا میں بولی جاتی ہے۔ یہ قدیم بگرمی سلطنت کی زبان تھی اور اسے بطور ثانوی زبان بولنے والے بہت سے لوگ پائے جاتے ہیں۔

ولف (نائیجیر۔کانگو کی اوقیانوسی ذیلی شاخ) [دیکھیے سینیگال) سینیگال کی آبادی کے ۳۶ فی صد لوگوں کی زبان ہے (۱۹۷۶ء) اور گیمبیا کی آبادی کے ۱۴٫۶ فی صد افراد کی (۱۹۸۳ء)، گمبیائی اور سینیگالی بولیاں بولنے والے افراد کی تعداد تیس لاکھ ہے(۱۹۸۷ء)۔مزید دیگر تیس لاکھ افراد اسے بطور ثانوی زبان بولتے ہیں۔ (۱۹۹۱ء)۔ یہ مالی موریطانیہ میں بھی بولی جاتی ہے۔

اس علاقے کی دوسری اہم زبانوں میں تمشق (بربر، افریقی، ایشیائی،) بمبارہ اور منڈنکہ (ہر دو منڈے، نائیجر۔ کانگو) شامل ہیں۔

مآخذ: B.Grimes، (طابع): *Ethnologue*، ڈیلاس ۱۹۹۲ء؛ (۲) A.S.Kaye : *Chadian and sudanese Arabic in the light of comparative Arabic dialectology*، ہیگ، ۱۹۷۶ء؛ (۳) C.Mosely اور R.E.Asher (طابع): *Atlas of the world's languages*، لندن، ۱۹۹۴ء؛ (۴) J.Owens: *A grammer of Nigerian Arabic*، ویز بیڈن ۱۹۹۳ء؛ (۵) وہی مصنف (طابع): *Arabs and Arabic in the Lake chod region*، SUGIA، خاص عدد ، ۱۹۹۳ء۔

(A.S.KAYE [ت ظفر علی])

••------------••

⊗ بلغاریا: جنوب مشرقی یورپ کا ایک غیر مسلم مسیحی رعیسائی اکثریتی ملک جو جزیرہ نمائے بلقان کے مشرقی حصہ میں واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۴۳،۰۰۰ مربع میل (۱۱۱،۰۰۰ مربع کلو میٹر) پر محیط ہے۔ اس کے شمال کی جانب رومانیا، مشرق میں بحر احمر، جنوب میں ترکی اور یونان جبکہ مغرب کی طرف سربیا اور مقدونیا واقع ہیں۔

دارالحکومت صوفیا ہے جس کو تمام خطہ بلقان میں جغرافیائی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ تاریخی و تجارتی اعتبار سے تمام اہم شاہراہیں اور گزرگاہیں، شمالی اور مشرقی یورپ سے بحرالکاہل (Mediterranean Basin) اور مغربی و وسطی یورپ سے مشرق وسطی کی طرف جانے والی، اس کے آس پاس سے گزرتی ہیں۔

یہ ملک انتظامی اعتبار سے ۲۸ اضلاع میں منقسم ہے۔ ان میں سے تین اضلاع: سمولجن (Smoljan)، کردزالی(Kurdzali) اور رازغراد (Razgrad) ایسے ہیں کہ جہاں مسلمان آبادی کی اکثریت ہے۔ ۱۹۹۵ء کے ایک اندازے کے مطابق اوّل الذکر ضلع میں مسلمان آبادی کا تناسب ۵۵٪، ثانی الذکر میں ۶۶ء۷۴٪ اور مؤخر الذکر میں ۵۲ء۵٪ ہے۔ تین اضلاع سلسترا (Silistra)، شمن (Sumen) اور ترغوستہ (Turgoviste) ایسے ہیں کہ جن میں مسلمان آبادی کا تناسب ۳۵ سے ۴۹٪ کے درمیان ہے۔ ان اضلاع میں سے اوّل الذکر میں مسلمان آبادی کا تناسب ۳۶ء۳٪، ثانی الذکر میں ۳۶ء۵٪ اور مؤخر الذکر میں ۳۷٪ ہے۔ علاوہ ازیں آٹھ اضلاع ایسے ہیں کہ جہاں مسلمان آبادی کا تناسب ۱۰ سے ۳۴٪ کے درمیان ہے۔ ان اضلاع میں مسلمان آبادی کی شرح اس طرح سے ہے: روس (Ruse) میں ۱۵ء۴٪، ڈوبروک (Dobric) میں ۲۲ء۴٪ ، ورنا(Varna) میں ۱۰ء۶۵٪ ، برغاس (Burgas) میں ۱۵ء۶٪ ، سلیوین (Sliven) میں ۱۰٪ ، ہسکوود (Huskovo) میں ۱۳ء۴٪، پزاردک (Pzardzik) میں ۱۴ء۷٪ اور بلاغویئوغراد (Blagoevgrad) میں ۱۷٪ (بلغاریا میں مسلمان آبادی کے تناسب اور ضلع وار تقسیم کے لیے دیکھیے: علی امینوف: "Islam and Muslims in Bulgaria: *A brief* History"، در *Islamic Studies*، ۳۶:۲،۳ (۱۹۹۷ء)، ص، ۲۳۳).

بلغاریا کے حکمران مسلمانوں کو ایک مذہبی اقلیت تسلیم کرنے کے بجائے اسے ایک نسلی گروہ قرار دینے پر مُصر رہے ہیں۔ وہ ملک میں آباد مسلمان آبادی کی تعداد سے متعلق صحیح اعداد و شمار کو پردہ اخفاء صیغۂ راز میں رکھنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہے ہیں۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے اکثر و بیشتر مسلمان آبادی اور خصوصاً ''پوماق'' کی تعداد کو انتہائی حد تک گھٹا کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۱۰ء کی مردم شماری میں مسلم آبادی کی تعداد صرف ۶۰۱,۹۹۹، یعنی کل آبادی کا ۱۴٪، بتائی گئی۔ جس میں ۴۸۴,۱۴۴ ترک و تاتار جب کہ ''پوماق'' کی تعداد صرف ۲۱,۱۴۶ ظاہر کی گئی (Alexandre Popovic: "The Turks of Bulgaria(1878-1985)"، در *Central Asian Survey*، ۵:۲ (۱۹۸۶ء)، ص ۵)، جب کہ اس سے دو سال قبل ۱۹۰۸ء میں بعض دیگر ذرائع کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ۶۵۲,۰۴۷ رہی تھی۔ اس میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں کا تناسب اس طرح سے تھا: ترک، ۵۳۱,۲۴۰؛ خانہ بدوش ۷۹,۵۴۹؛ پوماق ۲۰,۶۴۷؛ تاتار ۱۸,۸۸۴؛ البانی ۱,۶۰۰؛ عرب ۶۷ اور ایرانی ۶۰ (Alexandre Popovic: "The Turks of Bulgaria"، ص ۲۵، حاشیہ ۱۷)۔ ۱۹۴۶ء کی مردم شماری میں ملک کی کل آبادی ۷,۰۲۹,۳۴۹۔ جب کہ مسلمان آبادی ۹۳۴،۴۱۸ ظاہر کی گئی۔ اس کے بعد ملکی آبادی کی نسلی

و مذہبی تقسیم کو ظاہر نہ کرنے کی پالیسی اختیار کر لی گئی۔ اشتراکی دور میں بھی مختلف سیاسی اغراض سے مسلمان آبادی کی تعداد سے متعلق اعداد و شمار کو مخفی رکھا گیا۔ نتیجتاً ۱۹۴۶ء سے ۱۹۹۲ء کے دوران میں مسلمان آبادی کی کل تعداد اور ان کی نسلی و گروہی تقسیم کے بارے میں اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ غیر سرکاری اندازوں کے مطابق اس دور میں بلغاریا میں مسلمان آبادی کی تعداد آٹھ لاکھ سے سترہ لاکھ کے درمیان رہی۔ ۱۹۹۲ء کی مردم شماری میں تقریباً ۴۶ سال بعد مسلمانوں کی آبادی کے بارے میں اعداد و شمار ظاہر کیے گئے۔ جبکہ مسلکی اور نسلی و لسانی تقسیم بھی ظاہر کی گئی۔ ۱۹۹۲ء کی مردم شماری کے مطابق ملک کی کل آبادی ۸,۴۸۷,۳۱۷ نفوس پر جب کہ مسلمان آبادی ۱,۱۱۰,۳۳۱ نفوس پر مشتمل تھی۔ اس مردم شماری کے مطابق مسلمان آبادی کی تین چوتھائی تعداد (۸۰۲,۱۸۷) ترکوں پر مشتمل ہے۔ بلغاری النسل افراد پوماق کے تناسب کی تعداد ۱۷۶,۶۸۷ (۱۵٫۹٪) ہے۔ رومانی (Roman) زبان بولنے والے خانہ بدوشوں کی تعداد (۱۲۳,۱۷۳) یعنی ۱۱٫۱٪ ہے۔ جب کہ تھوڑی تھوڑی تعداد میں تاتار (۴,۵۱۵) اور البانی (۰٫۶۸٪) بھی موجود ہیں۔ ترک مسلمانوں کی بھاری اکثریت ملک کے جنوب مشرقی اور شمال مشرقی حصہ میں آباد ہے۔ اس میں سے ترک آبادی کردزالی (Kurdzhali)، رازغراد (Razgrad)، شمن (Shumen)، بُرگس (Burgas) اور سلسترا میں آباد ہے۔ پوماق زیادہ تر جنوبی بلغاریا کے وسطی اور مغربی رہوڈوپ کے دیہی و پہاڑی علاقوں میں آباد ہیں۔ خانہ بدوش ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، اگرچہ ان میں سے زیادہ تر مسلمان آبادیوں کی ہمسائیگی میں رہتے ہیں۔ زیادہ تر تاتار دُوبروک کے علاقے میں آباد ہیں تاہم ان کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی آباد ہیں (علی امینوف: "Islam and Muslims in Bulgaria"، ص ۲۳۱-۲۳۲؛ ۱۹۹۲ء کی مردم شماری کے مطابق مسلمان آبادی اور اس کے مختلف گروہوں کے اعداد و شمار کے بارے میں مزید دیکھیے: Vladimir Chukow: "Political Behaviour of the Bulgarian Muslim Community"، در ISIM Newsletter، عدد ۴ (۱۹۹۹ء)، ص ۲۶؛ Alexandre popovic: "The Balkan Muslim Communities in the Post-Communist Period"، در Steven Vertove و دیگر (مدیران): The Islam in Europe Politics of Religion and Community، لنڈن، میک ملن پریس، ۱۹۹۷ء، ص، ۶۴-۶۵)۔

مسلکی تقسیم: بلغاروی مسلمانوں کی بہت بھاری اکثریت (۱,۰۲۶,۷۵۸ ، یعنی ۹۲٫۳٪) سنی العقیدہ اور حنفی مسلک کی پیروکار ہے جب کہ ایک تھوڑی سی تعداد شیعوں (۸۳,۵۳۷، یعنی ۷٫۷٪) کی بھی ہے (علی امینوف: "Islam and Muslims in Bulgaria" ، ص ۲۳۲)۔ بلغاریا کے شیعہ خود کو علوی یا قزلباش کہلواتے ہیں۔ بلغاری قزلباش ملک کے شمال مشرقی، وسطی اور جنوبی مشرقی حصے میں آباد ہیں۔ قزلباش متعدد ذیلی فرقوں میں منقسم ہیں۔ ہر فرقہ کا ایک مذہبی رہنما اورامام ہے۔ زیادہ تر قزلباش متعدد صوفی سلسلوں خصوصاً درویشوں کے بکتاشی سلسلہ سے منسلک رہے ہیں (علی امینوف: "Islam and Muslims in Bulgaria" ، ص، ۲۳۲-۲۳۳)۔

بلغاریا میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ: بلغاریا سے اسلام اور مسلمانوں کے روابط کی معلوم تاریخ کا آغاز نویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اس صدی کے ربع ثالث میں بلغار کے وولگا خطے سے بعض مسلمان ترک قبائل بلغاریا میں

نقشہ بلغاریا
رومانیہ
سربیا
مقدونیا
یونان
ترکی
بحر اسود
وِدین
مونتانا
وراکا
پلیوین
لووچ
ترنووو
جبرووو
ضلع صوفیا
صوفیا
پرنیک
جستینڈل
پلودیو
ستارازاغورا
جَمبول
رُس
۱۵٫۴%
رازغَراد
۵۲٫۵%
سِلسترا
۳۶٫۳%
دوبُروجہ
۲۲٫۴%
ترغووشتہ
۳۷٫۰%
شُمن
۳۶٫۵%
ورنا
۱۰٫۵%
سلیوین
۱۰٫۰%
بُرگاس
۱۵٫۶%
پزاردجق
۱۴٫۷%
بلاغوئیوغراد
۱۷٫۰%
ھسکووا
۱۳٫۴%
سمولجن
۵۵٫۰%
کردجالی
۷۲٫۶%
مسلمانانِ بلغاریا
وہ اضلاع جن میں مسلمان آبادی کی تعداد ۵۰% سے زائد ہے۔
وہ اضلاع جن میں مسلمان آبادی کی تعداد ۳۵ تا ۴۹% کے درمیان ہے۔
وہ اضلاع جن میں مسلمان آبادی کی تعداد ۱۰ تا ۳۴% کے درمیان ہے۔
ضلعی صدر مقام
۰ ۳۰ ۶۰ ۹۰ میل

آکر آباد ہوئے۔ بلغاریا میں مسلمانوں کی آمد و آباد کاری کو وہاں کے مسیحی مذہبی رہنماؤں کی طرف سے سخت تشویش کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ چنانچہ پوپ نکولس نے ۸۶۶ء کوایک خط میں ڈینوب کے علاقے (Bulgaria of Danube) سے مسلمانوں کو نکال باہر کرنے کا حکم جاری کیا (ملاحظہ ہو: H.T.Norris: Islam in the Balkans:Religion and Society Between Europe and the Arab World، کولمبیا، ساؤتھ کیرولینا: یونیورسٹی آف ساؤتھ کیرو لینا پریس، ۱۹۹۳ء،ص۲۶-۲۷؛ Smail Balic: "Muslims in Eastern and South Eastern Europe"، در Journal Institute of Muslim Minority Affairs، ج۶، عدد ۲ (جولائی ۱۹۸۵ء)، ص۳۶۱-۳۶۲)۔ بایں ہمہ بُلغار کے وولگا خطہ (Volga Region of Bulgar) سے مسلمان ترک قبائل کی بلغاریا میں آمد کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ بلغاریا ہی سے ان ترک مسلمانوں نے دیگر ممالک خصوصاً ہنگری کا رخ کیا۔ دسویں صدی عیسوی سے تیرہویں صدی عیسوی کے دوران میں ہنگری میں مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ آباد ہوگئے تھے۔ صرف سرمیا (Syrmia) میں ۱۰۸۰ تا ۱۲۵۰ء کے دوران میں بلغار کے وولگا خطے سے تعلق رکھنے والے ترک مسلمانوں کے تقریباً تیس دیہات آباد ہو چکے تھے۔ ہنگری میں آباد یہ مسلمان ترک قبائل بلغاریا کی حدود سے گزر کر ہی اس ملک میں وارد ہوے (H.T.Norris: Islam in the Balkans، ص۲۶-۲۷)۔ گیارہویں صدی میں ایک خانہ بدوش ترک مسلمان قبیلہ (Pece/Pechenegs) نے، جو مملکت خزر (Khazars) ، خطہ قزوین (Caspian Region)، شمالی قفقاز اور بوزنطہ کے درمیان سرگرداں رہتا تھا، بوزنطہ کی ڈینوبی سرحد عبور کر لی اور بلغاریا کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ ۱۰۴۸ء، میں اس ترک قبیلہ نے بلغاریا میں خوب ہلچل مچا دی اور وسطی بلقان میں اپنی یورشوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تاہم ۱۱۲۲ء میں بوزنطہ نے بعض دوسرے ترک قبائل (کُمان / Cumans) وغیرہ کی مدد سے اوّل الذکر ترک قبیلہ کو بلغاریا کے حدود سے باہر دھکیل دیا (H.T.Norris: Islam in the Balkans، ص۲۶).

تیرہویں صدی عیسوی سے بلغاریا میں مسلمانوں کی آمد اور آباد کاری کا عمل تیز ہو گیا۔ مغربی اناطولیا میں اقتدار کی کشمکش میں سلاجقہ کے سلطان عزالدین کیکاؤس ثانی نے قلیج ارسلان چہارم [رکّ بآں] کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ۱۲۶۱-۱۲۶۳ء میں باسفورس عبور کر کے بوزنطی سلطنت میں پناہ حاصل کر لی۔ اس کے ساتھ اناطولیا کے متعدد ترک قبائل بھی، جن میں اکثریت خانہ بدوشوں کی تھی، بوزنطہ چلے آئے۔ بوزنطی پالیو لوغ (Paleologue) شہنشاہ میخائل (Michael) ہشتم نے انہیں دو دُوبُروجہ [رکّ بآں]، جو اس وقت اَلتون اُردو (Golden Horde)، بلغاریا اور بوزنطہ کی عملداری سے باہر ایک آزاد علاقہ تھا، میں آباد کاری کی اجازت دے دی۔ چنانچہ دُوبُروجہ میں اناطولیا کے مسلمان ترکوں نے متعدد قصبات بسا لیے۔ تاہم ان میں سے اکثر عیسائی مشنریوں کی یلغار کے سبب ۱۳۰۷ تا ۱۳۱۱ء کے مابین اناطولیا کو واپس لوٹ گے اور جو باقی رہ گئے ان کے اولاد و اخلاف کو، عزالدین کیکاؤس ثانی کے نام کی مناسبت سے گاگوز گیگاؤز (Gagauzes) [رکّ بآں، آ آ، بار اوّل ۱۹۷۸ء، ۱۷/۵۱۸-۵۱۹] کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔ گاگوز گیگاؤز آج بھی دُوبُروجہ کے علاقے میں آباد ہیں، تاہم یہ عیسائی مذہب کے پیروکار بتائے جاتے ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: علی امینوف : "The Status of Islam and Muslims in Bulgaria"، در Journal Institute of Muslim Minority Affairs، ج۸، عدد ۲، (جولائی

۱۹۸۷ء)، ص۲۸۹؛ H.T.Norris: *Islam in the Balkans*، ص۱۴۸؛ Halil Inalcik: "Dobrudja"، آآ، لائیڈن، ۱۹۶۵ء، ۲/۶۱۰-۶۱۳؛ آآآ، طبع اوّل، ۱۹۷۲ء، ۹/۴۵۳؛ Woldzimierz Zajaczkowski: "Gagaus"، آآ، لائیڈن، ۱۹۶۵ء، ۲/۹۷۱-۹۷۲).

بلغاریا میں بلقان کے دیگر ممالک کی طرح مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر آمد اور ان کی آباد کاری کا آغاز چودھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ہوا۔ جزیرہ نمائے بلقان میں عثمانی فتوحات نے اس خطے کی طرف مسلمانوں کی نقل و حرکت کو زبردست مہمیز دی تھی۔ عثمانی سلاطین نے بلقان میں اپنے مقبوضات میں اناطولیا اور ایشیائے کوچک سے بڑی تعداد میں ترکوں کو لا کر آباد کیا اور یورپ میں مزید فتوحات کے لیے ایک مضبوط مورچہ (Base) قائم کر دیا۔ عثمانی سلاطین نے بلقان میں اپنی سیاسی و عسکری حیثیت کو مستحکم و مضبوط کرنے کے لیے مسلم نو آبادیوں کے قیام کو ایک مؤثر حربے کے طور پر استعمال کیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: علی امینوف: "The Stauts of Islam and Muslims in Bulgaria"، ص۲۸۰-۲۸۱؛ وہی مصنف: "Islam and Muslims in Bulgaria"، ص۲۰۹-۲۱۰).

فتح بلغاریا: بلغاریا کا بڑا حصہ (جنوبی حصہ) سلطان مراد اوّل (۷۶۳-۷۹۱ھ/۱۳۶۲-۱۳۹۲ء) کے عہد حکومت میں فتح ہو کر، ۱۳۸۵-۱۳۸۷ء کے دوران میں، سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوا۔ سلطان بایزید اوّل یلدرم (۷۹۱-۸۰۵/۱۳۸۹-۱۴۰۲ء) کے دور میں بلغاریا کا جنوبی حصہ بشمولِ بلغاری سلطنت کے پایہ تخت ترنووا (Tirnovo) ،فتح ہوا اور پورے ملک میں ترکوں کا اقتدار قائم ہو گیا (تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد عزیز: دولت عثمانیہ، اعظم گڑھ: معارف پریس، طبع دوم، ۱۹۵۸ء، ج۱، ص۴۴-۴۵، ۵۷-۵۸)۔ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط سے عثمانی سلاطین نے بلغاریا کے شہر صوفیا کو رُومیلیا /رُملیا (Rumelia) صوبے کا صدر مقام بنا لیا۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک صوفیا کو فی الواقع سلطنت عثمانیہ کے یورپی مقبوضات/بلقان کے علاقوں کے دارالحکومت کی حیثیت حاصل رہی (ملاحظہ ہو: Svetlana: "Sofia" مشمولہ آآ، لائیڈن، ۱۹۹۷ء، ج۹، ص۷۰۳)۔ عثمانی سلاطین نے اپنے عہد اقتدار میں بلقان کے دوسرے علاقوں کی طرح بلغاریا میں بھی اناطولیا اور سلطنت کے دوسرے علاقوں سے مسلمان قبائل کو لا کر آباد کیا۔ بلغاریا سلطنت عثمانیہ کے پایۂ تخت استانبول کے قریب واقع ہونے، پھر سلطنت کے یورپی مقبوضات میں اس کی اہم عسکری وتزویراتی اور تجارتی حیثیت نیز خطے کی اہم شاہراہوں اور گزرگاہوں پر واقع ہونے کے سبب، بلقان کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں مسلمان آبادی کا ایک بڑامرکز بن گیا۔ صوفیا (دارالحکومت صوبۂ رُومیلیا) کے علاوہ بلغاریا کے اکثر شہروں اور قصبات میں مسلمان آبادی کی اکثریت ہو گئی۔ ۱۵۲۰-۱۵۳۰ء کی دہائی کے دوران میں عثمانی حکومت کی مردم شماری کے مطابق صوفیا میں مسلمان آبادی کا تناسب ۶۶٫۴٪، جبکہ عیسائی آبادی کا تناسب ۳۳٫۶٪ تھا (L.S.Stavrianos: *The Balkans, 1815-1914*، نیویارک ولنڈن] ہولٹ (Holt)، رائنہارٹ (Rinehart)، و ونسٹن، ۱۹۶۳ء، ص۵۷؛ علی امینوف: "The Status of Islam and Muslims in Bulgaria"، ص۲۸۲)۔ بلغاریا کے شہروں میں مسلمان آبادی کے ارتکاز کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ مقامی مسیحی آبادی کی بڑی تعداد ترک افواج سے جنگ کے دوران میں اور پھر شہروں پر ان کے قابض ہو جانے پر، دورافتادہ علاقوں اور پہاڑوں کی طرف نکل گئی تھی۔ جس

کے نتیجے میں یہ شہر ویران و سنسان ہو گئے۔ چنانچہ عثمانی حکام نے وہاں مسلمانوں کو لا کر بسایا (علی امینوف: "The Status of Islam and Muslims in Bulgaria"، ص۲۸۱- ۲۸۲؛ وہی مصنف: *"Islam and Muslims in Bulgaria"* در، ص ۲۱۰-۲۱۱)۔ عثمانی عہد میں اس ملک میں متعدد نئے شہر اور بہت سے قصبات بھی آباد ہوئے جو خالصتاً مسلمان آبادی پر مشتمل تھے۔ عثمانی دور میں آباد ہونے والے ان شہروں میں تاتار پزار جک (Tatar Pzardjik) بطور خاص قابل ذکر ہے، جو صوفیا اور Plovdiv کے درمیان بلغراد- استانبول کے مرکز (axis) پر آباد کیا گیا۔ ترکوں نے فتح بوسنیا (۱۴۶۳ء) کے بعد سراجیوو (Sarajevo) اور استانبول کے درمیان کارروائی/ زمینی شاہراہ براستہ پریسٹینا (Pristina)، سکوپج (Skopje)، وغیرہ تعمیر کی۔ اس شاہراہ پر، بیسربیا (Bessarabia) سے نقل مکانی کر کے آنے والی تاتار نو آبادی (Colony) کے نواح میں، تاتار پزار جیک شہر کو بسایا گیا (۱۴۸۵ء)۔ اس شہر نے بلغراد- استانبول کے مرکز پر واقع ہونے کے سبب سولہویں صدی سے ایک اہم تجارتی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔ عثمانی گورنر ابراہیم پاشا نے ۱۵۷۴ء میں اس شہر میں ایک عالی شان کاروان سرائے اور ایک شاندار فوارہ (Fountain) تعمیر کرایا۔ ۱۶ محلوں اور ۸۷۰ گھروں / مکانوں پر مشتمل اس شہر میں ۱۶۶۴ء میں ایک گھنٹہ گھر (Clock-Tower) بھی تعمیر کرایا گیا۔ اس شہر کی مسلم آبادی میں بدستور افزائش ہوتی رہی۔ ۱۸۶۰ء کی دہائی میں اس شہر میں ۱۹ مساجد اور ۸ ترک مدرسے قائم تھے اور وہاں کم از کم ۵ سو طالب علم زیر تعلیم تھے۔ ۱۸۷۳ء میں ترکوں نے اس کو ریل پٹری کے ذریعے استانبول سے ملا دیا (ملاحظہ ہو: آ آ، لائیڈن، مقالہ "Tatar Pazarcik"، طبع، ۲۰۰۰ء، ج ۱۰، ص۳۷۱- ۳۷۲)۔

اشاعتِ اسلام: عثمانی دور میں بلغاری النسل مسیحی آبادی، خصوصاً جس کا تعلق رہوڈوپ (Rhodope) کے علاقہ سے تھا، کی معتدبہ تعداد نے اسلام قبول کیا۔ انہیں بالعموم پوماق (Pomak) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پوماقوں کی اکثریت کا تعلق رہوڈوپ کے علاقے سے ہے (ملاحظہ ہو: Carol Silverman: "Pomaks" در Richard V.Weeks (مدیر): *Muslim Peoples: A World Ethnographic Survey*، ویسٹ پورٹ: گرین ووڈ، ۱۹۸۴ء، ۲: ۶۱۲-۶۱۳)۔ عثمانی ترک رہوڈوپ کے علاقے میں ۱۳۷۱ء میں پہنچے تھے۔ سال ۱۷۰۰ء تک اس علاقے کی آبادی کی اکثریت مشرف باسلام ہو چکی تھی۔ ابتدائی صدیوں میں ترکوں نے بلغاریا پر بڑی مستعدی اور کامیابی سے حکمرانی کی۔ تاہم اٹھارہویں صدی کے اواخر سے سلطنت عثمانیہ کے زوال و انحطاط کے اثرات بلغاریا پر بھی مرتب ہوئے۔ ۱۷۸۳ء کی جنگ کریمیا میں روس کے ہاتھوں سلطنت عثمانیہ کی شکست اور تاتار کریمیا پر روس کے تسلط کے بعد اُس علاقے کی مسلمان آبادی کی بڑی تعداد نے خصوصاً تاتاری اور چرکسی (Circassian) قبائل نے غیر مسلم روس کے ماتحت غلامی کی زندگی بسر کرنے کی بجائے سلطنت عثمانیہ کے زیر اقتدار علاقوں کی طرف نقل مکانی کو ترجیح دی (M.E.Yapp: "The Golden Horde and its Successors"، در P.M.Holt و دیگر (مدیران)، *The Cambridge History of Islam*، کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۰ء، ج ۱، ص ۵۰۱-۵۰۲)۔ عثمانی حکومت نے کریمیا سے نقل مکانی کر کے / ہجرت کر کے آنے والے تقریباً ایک لاکھ تاتاری اور ۹۰ ہزار چرکسی (Circassians) صرف بلغاریا میں آباد کیے (علی الکتانی: *Muslim Minorities in the World*، راولپنڈی: سروسز بک کلب، ۱۹۹۰ء، ص۳۱؛ رک بآں، بلغاریا، آ آ،

بذیل مادہ، ج ۴، ص، ۸۱۵)۔

سولہویں صدی کے آغاز سے روس، ترک جنگ (۱۸۷۷-۱۸۷۸ء) تک اس ملک میں مسلمان آبادی کا تناسب کم از کم ایک تہائی رہا۔ ۱۸۶۶ء کی مردم شماری کے مطابق بلغاریا کے اکثر شہروں میں مسلمان آبادی اکثریت میں تھی جبکہ دیگر شہروں میں وہ ایک بڑی مؤثر اور طاقت ور اقلیت کی حیثیت میں موجود تھے (ان بلغاری شہروں کے نام اور وہاں پر مسلمان آبادی کے اعدادو شمار کے بارے میں ملاحظہ ہو: (علی امینوف: "The Status of Islam and Muslims in Bulgaria"، ص ۳۸۳-۳۴۰؛ وہی مصنف:"Islam and Muslim in Bulgaria"، ص۲۱۱-۲۱۲؛ بلغاریا، بذیل مادہ، آ آ، ج۴، ص، ۸۱۵)۔

غرضیکہ سلطنت عثمانیہ کے یورپی علاقوں میں بلغاریا کو مسلمان آبادی کے ایک اہم ترین مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ عثمانی دور میں اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی حیثیت خوب مستحکم ہوگئی۔ اس ملک کی تہذیب و معاشرت پر اسلامی و ترکی رنگ غالب آگیا۔ مسلم معاشرے نے ر مسلمان ملت نے اس ملک میں اپنے تحفظ و ترقی اور تسلسل کی غرض سے تمام ضروری ادارے قائم کر لیے۔ ملک میں کثیر تعداد میں مساجد تعمیر کی گئیں۔ تعلیم و تدریس کو عام کرنے کیلیے کثیر تعداد میں مدارس ومکاتب قائم ہوے۔ عثمانی حکام نے بعض بڑے شہروں میں عالی شان مساجد تعمیر کرائیں۔ عثمانی حکام میں سے گورنر ابراہیم پاشا کو مساجد اور دیگر پرشکوہ عمارتیں تعمیر کرانے میں بڑی دلچسپی رہی۔ اس نے دیلی اورمان (Deli Orman) کے شہر رازغراد میں ایک بڑی پرشکوہ مسجد بھی تعمیر کرائی (James W.Wiles: "*Amongst Bulgarian Moslems*"، در *The Msloem World*، ج ۲۵، عدد ۴ (اکتوبر ۱۹۳۵ء)، ص ۳۹۶-۳۹۷)۔ سلطنت کے دوسرے حصوں کی طرح اس ملک میں بھی شریعت پر استوار قانونی نظام قائم کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے دینی و شرعی معاملات کی تنظیم و تنسیق میں قضاۃ اور مفتیان کرام کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ۱۸۷۸ء کے لگ بھگ بلغاریا میں تقریباً ۱۲ ضلعی مفتی تھے (ہر انتظامی ضلع میں ایک)۔ ان کا تقرر استانبول میں مقیم شیخ الاسلام کی طرف سے ہوتا تھا اور وہ اس کے صدر دفتر کی طرف سے تنخواہیں وصول کرتے تھے۔ ان کی ذمہ داری اپنے اپنے علاقوں میں اسلامی اداروں کا انتظام و انصرام تھا۔

سلطنت عثمانیہ کی تعلیمی پالیسیوں کی بدولت ملک کے طول و عرض میں ترکی زبان سرایت کر گئی تھی اور ایک طرح سے رابطے کی زبان بن گئی تھی (Selcuk Aksin Somel: "Ottoman Islamic Education in the Nineteenth Century"، در *Islamic Studies*، ۳۶:۲، ۳ (۱۹۹۷ء)، ص ۴۵۶؛ محمد علی الکتانی: "Post-Ottoman Islamic Educational Institutions in the Balkans"، در *Islamic Studies*، ۳۶:۲،۳ (۱۹۹۷ء)، ص ۴۶۵، ۴۶۸-۴۶۹)۔

اس وقت بلغاریا میں ہر مسلمان دیہات میں کم از کم ایک سے زائد مساجد موجود تھیں جب کہ غیر مسلم اکثریتی بڑے شہروں کے ان تمام حصوں میں بھی جہاں ترک یا دوسرے مسلمان گروہوں کے چالیس پچاس گھر موجود تھے، ان کی اپنی اپنی مسجد تھی۔ متمول مسلمانوں نے کثیر مقدار میں فراخدلی سے اپنی جائیدادیں مذہبی اسلامی اداروں کو وقف کیں۔ جن سے حاصل ہونے والی آمدنی سے مساجد کی تعمیر و دیکھ بھال، قرآنی مکاتب کے قیام اور ان کے انتظام و انصرام خصوصاً معلمین و مدرسین، ائمہ و خطبا اور مفتیوں اور قاضیوں کو تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے استعمال کی جاتی رہی (علی امینوف: "Islam and

"Muslims in Bulgaria، ص ۲۲۲).

بلغاری قوم پرست تحریک: انیسویں صدی کے وسط میں بلقان کی دیگر مسیحی ریاستوں کی طرح بلغاریا کے مسیحی عوام میں بھی جذبہ قوم پرستی کے آثار نمودار ہونا شروع ہوے۔ عثمانی حکومت کی سماجی و معاشی اور انتظامی اصلاحات نے اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۸۳۹ء کی تنظیمات کے بعد سے حکومت نے اس علاقے کی جدید کاری و معاشی ترقی کے لیے وسیع سرمایہ خرچ کیا۔ حکومت نے صوبہ ڈینوب میں زراعت کی ترقی کے علاوہ اسکولوں کے قیام، سڑکوں کی تعمیر اور انتظامی نظم و نسق کی بہتری پر بڑی توجہ دی۔ ان اقدامات کے نتیجے میں بلغاریا کا متوسط طبقہ خوب پھلا پھولا اور اس کے خواندہ طبقے میں قومیت پرستی کے جذبات کی بڑی تیزی سے افزائش ہوئی۔ ۱۸۴۰ء تک بلغاریا کے متمول تاجروں کے بیٹے ازمیر (Izmir)، استانبول، اوڈیسہ ولاچیا، بخارسٹ اور روس کے اسکولوں میں تعلیم پانے لگے۔ بعض متمول تاجروں نے ملک کے اندر جدید اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکول قائم کر لیے (Kemal H. Karpat: "The Balkan National States and Nationalism"، در *Islamic Studies*، ۳۶:۲، ۳ (۱۹۹۷ء)، ص ۲۵۲-۲۵۳).

اس وقت تک بلغاری تارکینِ وطن کی بیرون ملک متعدد نو آبادیاں وجود میں آ چکی تھیں۔ ان میں سب سے بڑی نو آبادی سلطنت عثمانیہ کے پایہ تخت استانبول میں تھی۔ ۱۸۷۰ء کی دہائی تک استانبول میں تقریباً تیس چالیس ہزار بلغاری تجارت اور دیگر پیشوں سے وابستہ تھے اور معاشی اعتبار سے خوشحال تھے۔ بہت سے بلغاری بخارسٹ، اوڈیسا (Odessa)، روس کے مختلف شہروں اور ڈینوبی ولایات (Danubian Principalities) میں جا آباد ہوے تھے۔ بیرون ملک میں ان بلغاریوں نے معیشت و تجارت اور تعلیم کے شعبوں میں خوب ترقی کی۔ ان مالدار طبقات نے اندرونِ ملک بلغاروی معاشرے کو گہرے طور سے متاثر کیا اور بلغاریا میں قوم پرست تحریک کی تخم ریزی و آبیاری میں مرکزی کردار ادا کیا۔ دوسرے ممالک خصوصاً سربیا (Serbia)، یونان اور روس وغیرہ نے، کہ جہاں ہزاروں کی تعداد میں مسیحی بلغاری طلبا اسکولوں میں زیر تعلیم تھے، بلغاریا میں قوم پرست تحریک کو تقویت پہنچائی۔ روس میں ۱۸۵۶ سے ۱۸۷۶ء کے دوران میں تقریباً پانچ ہزار بلغاری طلبا نے تعلیم کے لیے وظائف حاصل کیے۔ روس میں زیر تعلیم بلغاری نوجوان اتحاد سلافی اقوام (Pan-Slav) کی تحریک کے پر جوش حامی اور عثمانی اقتدار کے شدید مخالف بن کر وطن لوٹے (L.S.Stavrianos: *The Balkans, 1815-1914*، ص ۵۸-۶۰).

بلقان میں انیسویں صدی میں روس آسٹریا اور دوسری طاقتوں کے ہاتھوں عثمانی فوج کی پے در پے شکستوں خصوصاً اول الذکر کی طرف سے ۱۸۵۳-۱۸۵۴ء کے دوران میں مولڈیویا، ولاچیا اور سلسٹریا وغیرہ پر تسلّط کے بعد بلغاریا میں بھی اُس کی مداخلت بہت بڑھ گئی۔ اس کی طرف سے اس ملک کی مسیحی رعایا کے لیے زیادہ سے زیادہ حقوق و مراعات کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اس کی تحریک پر بلغاریا کے مسیحی عوام میں علیحدگی پسند تحریک کو خوب انگیخت ملی۔ بلغاریا میں قوم پرست تحریک کو منظم و مستحکم کرنے نیز اس سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے میں روس کی سرپرستی میں قائم جمعیت سلافیہ (قائم شدہ ۱۸۴۰ء) نے، جس کا نصب العین تمام سلافی اقوام کو منظّم و متحد کرکے سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر ابھارنا تھا، کلیدی کردار ادا کیا۔ جمعیت سلافیہ نے بلغاریا میں خفیہ کمیٹیوں کا جال بچھا دیا اور بلغاروی

مسیحی نوجوان نسل میں سلطنت عثمانیہ کی غلامی کا طوق گردنوں سے اتار پھینکنے کے لیے انقلابی روح پھونک دی۔ انقلابی عناصر نے رومانیا کے دارالحکومت بخارست کو اپنا مرکز بنا لیا اور وہ عثمانی سلطنت کے خلاف برسر جدوجہد ہوے (تفصیل کے لیے دیکھیے: B.H.Sumner: *Russia and the Balkans, 1870-1880*، آکسفرڈ: کلارنڈن پریس، ۱۹۳۷ء، ص۵۶-۸۰، ۱۰۹-۱۱۳ وبمواقع عدیدہ؛ Erik J.Zurcher: *Turkey: A Modern Historty*، لنڈن ونیویارک: آئی، بی ٹاؤرس، ۲۰۰۱ء، ص، ۷۸؛ L.S.Stavrianos: *The Balkans*، ص۶۲)۔ بلغاریا کے جو مسیحی نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے لیے روس بھیجے جاتے تھے وہ وہاں سے سلافی اتحاد (Pan-Slavism) کے پُرجوش مبلغ ہو کر وطن لوٹتے تھے۔ یہ نوجوان دولت عثمانیہ کے لیے بڑے خطرناک ثابت ہوئے (دولت عثمانیہ، ج۲، ص ۹۶- ۹۸، ۱۲۰-۱۲۲)۔

بلغاریا کے قومی کلیسا کا قیام: ۱۸۷۰ء میں بلغاریا کے قومی کلیسا کے قیام کی صورت میں ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا۔ یہ بلغاریا کی قوم پرست تحریک کی ایک بہت بڑی فتح تھی، جس نے اس ملک کی خود مختاری و آزادی کی بنیاد رکھ دی۔ اس وقت تک بلقان کی مسیحی آبادی بجاے رنگ و نسل کے مذہب کے لحاظ سے منقسم تھی۔ جنوب مشرقی یورپ کی تمام عیسائی رعایا جو سلطنت عثمانیہ کے زیر فرمان تھی، خواہ کسی نسل و قوم سے تعلق رکھتی ہو، استانبول میں باب عالی [رکّ باں] کے زیر سایہ قائم یونانی کلیساکے ماتحت تھی۔ لیکن اہل بلغاریا نے اپنے جذبہ قوم پرستی کے تحت اپنا الگ قومی کلیسا قائم کرنے کا عزم کر لیا۔ روس نے باب عالی پر اثر ڈال کر بلغاریا کے لیے ایک مستقل قومی کلیسا قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ روس کا خیال یہ تھا کہ اس سے بلغاری قوم کا ایک مستقل وجود قائم ہوجائے گا۔ ۱۰ مارچ ۱۸۷۰ء کو سلطان عبدالعزیز نے روس کے دباؤ پر ایک فرمان جاری کر کے بلغاریا کی جداگانہ مذہبی حیثیت کو تسلیم کر لیا اور اس کے لیے کلیسائے یونان سے آزاد ایک مستقل قومی کلیسا کے قیام کی اجازت دے دی۔ اس تاریخ سے بلقان میں ایک جدید بلغاری قومیت کی بنیاد پڑ گئی (B.H.Summer: *Russia and the Balkans*،ص ۱۰۶-۱۱۲؛ L.S.Starrianos: *The Balkans*، ص۶۰-۶۱)۔ اس کامیابی کے بعد بلغارویوں کا سلطنت عثمانیہ کے خلاف رویہ انتہائی جارحانہ ہوگیا۔ ۱۸۷۵-۱۸۷۶ء کے دوران میں بلغاروی عیسائیوں نے مختلف اضلاع میں خصوصاً فلپو پولیس، ایسکی زغراء، ترنوا (Turnovo) اور اورت الان (Auratalan) میں شدید بغاوت بپا کئے رکھی۔بلوائیوں نے ان اضلاع میں مسلمانوں کو حملوں کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کو تہ تیغ کیا اور عورتوں پر وحشیانہ مظالم ڈھائے۔ تاہم ترک عثمانی فوج نے بر وقت کاروائی کر کے ان مسیحی انقلابیوں پر کاری ضرب لگائی، جس پر مغربی طاقتوں کی طرف سے شدید رد عمل ظاہر کیا گیا (دولت عثمانیہ، ج۲، ص۱۳۲-۱۳۷؛ L.S.Stavrianos. *The Balkans*، ص۶۳-۶۵؛ Kemal H. Karpat: "The Balkan National States and Nationalism"، ص ۳۵۳، *Chavdar Lyubenov Iliev: "the Bulgarian Nation Through the Centuries*، در *Journal Institute of Muslim Minority Affairs*، ج ۱۰، شمارہ ۱، (۱۹۸۹ء جنوری)، ص ۹-۱۰)۔ دریں حالات بڑی طاقتوں خصوصاً روس نے سلطنت عثمانیہ سے بلغاریا کو حق حکومت خود اختیاری دینے اور وہاں سے ترک فوجوں کے انخلا کے علاوہ دیگر کثیر الجہات اصلاحات کے اجراء و نفاذ کا مطالبہ کیا اور عدم

تعمیل کی صورت میں جنگ کی دھمکی دی۔ روس اور دیگر مغربی طاقتوں کے دباؤ پر سلطان عبدالحمید ثانی (ستمبر ۱۸۷۶- اپریل ۱۹۰۹ء) نے دسمبر ۱۸۷۶ء میں ایک دستور اساسی کا اعلان کیا جس میں سلطنت کے غیر مسلم رعایا کے لیے بھی مساوی حقوق تسلیم کئے گئے۔ تاہم بلغاری مسیحی رعایا اور ان کے سرپرست اس سے مطمئن نہ ہوئے (Jacob Gould Schurman: The Balkan Wars، ص۲۵-۲۶؛ Erik J.Zurcher: Turkey: A Modern History، ص۷۸؛ L.S.Stavrianos: The Balkans، ص۶۶-۶۷)۔ چنانچہ روس نے اپریل ۱۸۷۷ء کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور بلغاریا کے قدیم پایہ تخت ترنوا (جولائی ۱۸۷۷ء) کے علاوہ پلونہ اور ادرنہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۵ جنوری ۱۸۷۸ء میں اس کی فوجیں دار الحکومت صوفیا میں داخل ہوگئیں۔

۱۸۷۷-۱۸۷۸ء کی جنگ کے دوران میں، جو سات ماہ تک جاری رہی، تقریباً دس لاکھ ترک اپنے گھروں سے بے دخل ہونے پر مجبور ہوئے جبکہ تقریباً ساڑھے تین لاکھ فاقہ کشی، سخت سردی اور وبائی امراض کے سبب لقمہ اجل بنے یا پھر منظم قتل عام کا شکار ہوئے۔ وہ ترک تارکینِ وطن جنہوں نے جنگ کے اختتام پر اپنے گھروں کو واپس لوٹنا چاہا انہیں بلغارویوں اور قابض روسی فوج کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ یہ افراد سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے (Halit Mollahuseyin: "A Status Survey": Muslims in Bulgaria Report، در Journal Institute of Muslim Minority Affairs، ص ۱۳۷)۔

بلغاریا میں مسلم اور مسیحی آبادی میں جو توازن سولھویں صدی سے قائم تھا روس ترک جنگ ۱۸۷۷-۱۸۷۸ء کے بعد تیزی سے بگڑنا شروع ہوا۔ جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد، جن میں زیادہ تر ترک، تا تار اور چرکسی (Circassians) تھے اور خصوصاً جو منطقۂ جنگ میں واقع بلغاریا کے شہروں میں آباد تھے، عثمانی فوج کی پسپائی کے ساتھ ہی ان شہروں کو چھوڑ کر نکل گئی۔ تاہم منطقۂ جنگ سے باہر صوبہ ڈینوب کے مشرقی علاقے، میں آباد مسلمان آبادی کو اجتماعی طور پر نقل مکانی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ چنانچہ جنگ کے بعد بھی صوبہ ڈینوب کے مشرقی علاقہ میں مسلمان بدستور اکثریت میں رہے (علی امینوف: "Islam and Muslims in Bulgaria"، ص، ۲۱۳)۔

معاہدہ برلن: چار و ناچار سلطنت عثمانیہ کو روس کے ساتھ ایک صلح نامہ، معاہدہ سان اسٹیفانو (Treaty of San Stefano) پر، روس کی شرائط کو تسلیم کرتے ہوئے، مجبور ہونا پڑا۔ جس کی رُو سے بلغاریا کو ایک خود مختار ولایت کی حیثیت دی گئی جس میں سلطنتِ عثمانیہ کے اکثر یورپی صوبہ جات شامل کیے گئے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: B.H.Sumner: Russia and the Balkans، ص۱۱۶-۱۱۷، ۳۹۹-۴۱۹؛ L.S.Stavrianos: The Balkans، ص۶۸؛ دولت عثمانیہ، ج۲، ص۱۵۸-۱۵۹، ۱۶۳-۱۶۵)۔ صلح نامہ سان اسٹیفانو کی بڑی طاقتوں اور خصوصاً بلقان کی ریاستوں نے شدید مخالفت کی، جس پر بلغاریا کی سرحدوں کے از سر نو تعین کی غرض سے، روس، آسٹریا، جرمنی، برطانیہ وغیرہ کے درمیان جولائی ۱۸۷۸ء میں معاہدۂ برلن طے پایا [رکّ بہ بلقان، در آآآ، بذیل مادہ]۔ جس میں بلغاریہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا، خاص بلغاریا اور مشرقی رومیلیا کو سلطنت عثمانیہ کے تحت (باجگذار) دو خود مختار صوبوں کی حیثیت دی گئی۔ اس معاہدہ میں صوبہ بلغاریا کے عوام کو اپنا بادشاہ منتخب

کرنے کا حق دیا گیا، جبکہ مشرقی رُومیلیا کے گورنر کے تقرر کا اختیار، جس کا اگرچہ مسیحی ہونا ضروری تھا، استانبول کے لیے تسلیم کیا گیا (معاہدۂ برلن کے سیاسی پس منظر اور اس کے شرائط کے بارے میں ملاحظہ ہو: B.H.Sumner: *Russia and Balkans*، ص ۵۱۹ و بعد؛ L.S.Stavrianos: *The Balkans*، ص۶۸-۶۹).

دستور ترنووا: سلطنت عثمانیہ کے ماتحت خود مختاری کے حصول کے بعد ملک کے زعماء و امرا کی ایک مجلس نے ترنووا میں ملک کے لیے ایک دستور کی منظوری دی (۲۹/اپریل۱۸۷۹ء)، جس کو دستورِ ترنووا (Tirnovo Constitution) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دستور میں عوام کو شہری آزادیوں (civil liberties) کی ضمانت دی گئی اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب اسمبلی کی بنیاد فراہم کی گئی جسے وسیع اختیارات تفویض کیے گئے۔ اس دستور کی منظوری کے ساتھ ہی الیگزینڈر آف بیٹنبرگ (Battenberg، جرمنی)، جو کہ زار روس الیگزینڈر دوم کا قریبی عزیز تھا، ملک کا بادشاہ منتخب کیا گیا۔ اس نے ترکوں کے خلاف جنگ میں روسی فوج کے ساتھ حصہ لیا تھا (L.S.Stavrianos: *The Balkans*، ص۸۶-۸۷)۔ اس کا واضح طور پر جھکاؤ روس کی طرف رہا۔ جس کے سبب بلغاریا آزادی کے ابتدائی ایام سے ہی روس کے زیر اثر چلا گیا۔ بلغاریا کی پہلی اسمبلی کے لیے انتخابات ۱۲/اکتوبر ۱۸۷۹ء کو ہوے جس میں قوم پرست تحریک کے ایک رہنما سٹیفن اسٹامبولوف (Stephen Stambulov)، جس نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف برسرپیکار انقلابی تحریک میں اہم کردار اداکیا تھا، کی قیادت میں لبرل اور جمہوریت پسند گروہ کو اکثریت حاصل ہوئی۔ الیگزینڈر ۲۰/اگست ۱۸۸۶ء تک اپنے منصب پر فائز رہا۔ تاہم معاہدۂ برلن کی رو سے اس کی قانونی حیثیت ایک ترک پاشا (گورنر) کی سی تھی (L.S.Stavrianos: *The Balkans*، ص۹۲).

چند سال بعد ستمبر ۱۸۸۵ء میں بلغاریا اور مشرقی رُومیلیا کا اتحاد عمل میں آیا جو معاہدۂ برلن کی صریح خلاف ورزی تھی۔ یہ اتحاد مشرقی رومیلیا کی بلغاروی آبادی کی طرف سے سلطنت عثمانیہ کی بالادستی کے خلاف بغاوت کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ چنانچہ معاہدۂ برلن کی فریق تمام مغربی طاقتوں نے، اسے باب عالی کی طرف سے شدید احتجاج کے باوجود، بلا حیل و حجت تسلیم کر لیا (ملاحظہ ہو: L.S.Stavrianos: *The Balkans*، ص۹۰-۹۱؛ دولت عثمانیہ، ج۲، ص۱۵۸ -۱۵۹، ۱۶۳-۱۶۵؛ Jacob Gould Schurman: *The Balkan Wars*، ص ۲۶-۲۷)۔ اکتوبر ۱۸۸۶ء میں متحدہ بلغاریا کی اسمبلی کے لیے منعقدہ انتخابات میں قوم پرست رہنما سٹیفن اسٹامبولوف (Stephen Stambulov) کی سیاسی جماعت "قومی جماعت" (National Party) کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں سیکس کوبرگ (Saxe-Coburg) کے شہزادہ فرڈیننڈ (Ferdinand) کو ملک کا حکمران منتخب کیا گیا جو ۱۹۱۸ء تک اپنے منصب پر فائز رہا۔ جبکہ اسٹیفن اسٹامبولوف ستمبر ۱۸۸۷ -۱۸۹۴ء کے دوران میں ملک کے وزیراعظم کے عہدے پر فائز رہا (L.S.Stavrionos: *The Balkans*، ص ۹۳-۹۴؛ Jacob Gould Schurman: *The Balkan Wars*، ص ۲۷).

اعلانِ آزادی و خود مختاری: ترکی میں جولائی ۱۹۰۸ء کے انقلاب اور انجمن اتحاد و ترقی کی حکومت کے قیام [رکّ بہ] ترکی، آآآ، بذیل مادہ] کے بعد بلغاریا کے حاکم شہزادہ شاہ فرڈیننڈ (Ferdinand) نے ۵/اکتوبر ۱۹۰۸ء کو بلغاریا کی کامل آزادی و خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اپریل ۱۹۰۹ء میں بابِ عالی (استانبول) اور بلغاریا کے

مابین ایک صلح نامہ پر دستخط ہوئے اور سلطان نے بلغاریا کے حقوقِ آزادی و فرمانروائی کو تسلیم کر لیا دولت عثمانیہ، ج ۲، ص۲۹۱-۲۹۲ :Jacob Gould Schurman :The Balkan Wars، ص۲۶).

جنگِ بلقان (۱۹۱۲-۱۹۱۳ء) اور بلغاریا: بلغاریا مارچ ۱۹۱۲ء میں روس کی سرپرستی میں سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف قائم ہونے والے بلقان ریاستوں کے اتحاد کا ایک اہم رکن بن گیا۔ چنانچہ اس نے دیگر بلقان ریاستوں کی طرح ۸/ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۸/ اکتوبر کو بلغاروی فوجیں تھریس میں داخل ہو گئیں اور متعدد علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ۳ دسمبر ۱۹۱۲ء کو ترکی اور بلغاریا کے درمیان عارضی صلح ہوگئی، لیکن ۴فروری ۱۹۱۳ء کو بلغاریا نے ایک بار پھر حملہ کر دیا اور ادرنہ پر قبضہ کر لیا۔ تاہم چند ماہ بعد ترکوں نے ادرنہ کو واگذار کرا لیا (جولائی ۱۹۱۳ء)۔ ستمبر ۱۹۱۳ء میں دونوں ملکوں کے مابین صلح ہو گئی اور تھریس کا پورا علاقہ ترکوں کو واپس مل گیا (دولتِ عثمانیہ، ۲:۲۹۸، ۳۰۵-۳۰۸، ۳۱۸-۳۱۹؛ Erik J.Zurcher: *Turkey: A Modern History*، ص۱۱۱-۱۱۳؛ L.S.Stavrianos: *The Balkans*، ص۷۷، ۱۱۲-۱۱۴؛ Jacob Gould Schurman: *The Balkan Wars*، ص۳۴- ۳۶، ۵۴-۶۰).

مسلمانانِ بلغاریا ۱۸۷۸ء کے بعد: معاہدۂ برلن (۱۳ جولائی ۱۸۷۸ء) کی رُو سے بلغاریا اور مشرقی رُومیلیا کو خود مختاری ملنے پر اس ملک میں آباد مسلمانوں کی سیاسی و قانونی حیثیت یکسر تبدیل ہوگئی۔ ان کی سیاسی و عسکری بالادستی کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی آبادی کے ڈھانچے میں بڑی گہری تبدیلی واقع ہونا شروع ہوئی۔ گذشتہ کئی صدیوں سے ان (مسلمانوں) کے بارے میں مسیحی بلغاروی قوم کا رویہ جوانتہائی مخاصمانہ و معاندانہ ہوگیا تھا، اس نے مزید شدت اختیار کر لی۔ مسیحی عوام میں موجود ترک و مسلم دشمنی کے جذبات نے بدترین انتقام کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ قوم پرست مسیحیوں نے مسلمانوں کے تمام شہروں اور قصبات کو تاخت و تاراج کا نشانہ بنایا اور لوٹ مار کے علاوہ وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ اس دور میں بلغاریا میں موجود روسی سپاہیوں اور بلغاروی قوم پرست جنونیوں کے ہاتھوں تقریباً تین لاکھ سے زائد مسلمان شہید ہوئے۔ بلغاروی قوم پرستوں نے اس ملک میں سے اسلامی و ترک تہذیب و ثقافت کے آثار و نشانات کے محو کرنے کا عمل بھی پوری قوت و طاقت سے شروع کیا۔ چنانچہ کثیر تعداد میں مساجد، مدارس، خانقاہیں اور عثمانی دور کی دیگر تعمیرات/ عمارتیں حتیٰ کہ پل اور حمام وغیرہ بھی برباد کر دے گئے (Kemal H. Karpat: "Modern Turkey"،در The Cambridge History of Islam، ج ۱، ص ۵۶۴؛وہی مصنف: The Balkan National States and Nationalism، ص ۳۵۳-۳۵۴) اس بدلتی ہوئی صورت حال میں مسلمان آبادی کی اناطولیا کی طرف نقل مکانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بایں ہمہ اس ملک میں مسلمان ایک بڑی مؤثر اور طاقت ور اقلیت کے طور پر موجود رہے۔ ۱۸۸۰-۱۸۸۱ء کے ایک اندازے کے مطابق صوبہ بلغاریا کی کل آبادی بیس لاکھ نفوس پر جب کہ مشرقی، رومیلیا کی آبادی آٹھ لاکھ سولہ ہزار (۸۱۶,۰۰۰) نفوس پر مشتمل تھی۔ اوّل الذکر میں مسلمان آبادی کا تناسب ۲ء۲۶٪ جب کہ مؤخرالذکر میں ۴ء۲۱٪ تھا۔ تاہم مسلمان آبادی کی تعداد میں نقل مکانی کے سبب بتدریج کمی ہوتی رہی (B.H Sumner: *Russia and the Balkans* ، ص ۶۵۷)۔ تاہم بلغاریا کے بعض علاقے ایسے تھے کہ جہاں مسلمان آبادی اکثریت میں رہی۔ بلغاروی حکومت کے زیر

انتظام کرائی گئی پہلی مردم شماری ۱-۳ جنوری ۱۸۸۱ء کے مطابق ملک کے سات مشرقی اضلاع میں سے چھ میں مسلمان آبادی کی اکثریت تھی جب کہ ایک ضلع میں ان کی آبادی ۴۵-۵۰٪ کے درمیان تھی۔ مشرقی اضلاع میں مسلمان آبادی کا تناسب اس طرح سے تھا: (۱) Eski (Dzhumaja)، ۸۲٪؛ (۲) رازغراد (Razgard)، ۶۸٫۶٪؛ (۳) شمن (Shumen)، ۶۷٫۹٪؛ (۴) سلسترا (Silistra)، ۷۱٫۱ ٪؛ (۵) (Provadija)، ۶۲٫۳٪؛ (۶) رُس (Ruse) پچاس فی صد سے زائد؛ (۷) ورنا (Varna)، ۴۴٫۹٪ (ملاحظہ ہو: علی امینوف: "Islam and Muslims in Bulgaria"، ص ۲۱۳-۲۱۴)۔ ۱۸۸۱ء میں بلغاریا اور مشرقی رومیلیا کی کل آبادی میں مسلمان آبادی کا تناسب ایک تہائی سے بھی زائد تھا (علی امینوف: *"Islam and Muslims in Bulgaria"*، ص، ۲۱۴)۔

بلغاریا کے مسیحی عوام خصوصاً قوم پرست عناصر ملک میں بڑی تعداد میں مسلمانوں کی موجودگی سے خائف تھے اور اسے اپنی آزادی وخود مختاری کے لیے ایک بڑا خطرہ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے قتل عام کے ساتھ ساتھ ملک سے ان کے جبری انخلا کی حکمت عملی اپنائی۔ دریں حالات مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد، خود کو اس ملک میں غیر محفوظ محسوس کرتے ہوے، اناطولیا کی طرف نقل مکانی پر مجبور ہوئی۔ چنانچہ بلغاریا سے دس لاکھ سے زاید افراد (مسلمان) جن میں بڑی تعداد ترکوں، جبکہ تھوڑی تھوڑی تعداد میں چرکسی، تاتاری اور بلغاروی النسل مسلمانوں (پوماق) کی تھی، اناطولیا کی طرف ہجرت کر گئی۔ ۱۸۸۳-۱۸۸۴ء کے دوران میں مسلم آبادی کے بلغاریا سے جبری انخلا کا عمل اپنے عروج پر رہا۔ ان دو سالوں میں ایک اندازے کے مطابق کم از کم چھ لاکھ ترکوں نے بلغاریا کی سرحد عبور کی (Kemal H. Karpat: "The Balkan National States and Nationalism"، ص ۳۵۴؛ تھامس ایف مچل: بلغاریا کے مسلمان (مترجم: سجاول خان، اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، ۱۹۹۱ء، ص ۸-۹)۔ لوزان یونیورسٹی، سوئٹزرلینڈ، سے منسلک محقق وارڈن برگ (Jacques Waardenburg) کی رائے میں بلغاریا کی خودمختاری و علیحدگی کے بعد سے اس ملک سے تقریباً ۲۰ لاکھ سے زائد ترک مسلمانوں نے ہجرت اختیار کی (ملاحظہ ہو: Jacques Waardenburg: "Politics and Religion in the Balkans"، در *Islamic Studies*، ۳۶:۲:۳ (۱۹۹۷ء)، ص ۳۸۸)۔

تحریک مزاحمت: ۱۸۷۸ء میں جب کہ روسی سپاہیوں اور بلغاروی قوم پرستوں کی طرف سے بلغاریا اور مشرقی رُومیلیا میں مسلمانوں کے قتل عام کا سلسلہ جاری تھا، رہوڈوپ (Rhodopes) کے علاقے میں آباد مسلمانوں نے سلیمان پاشا کے بچے کھچے عثمانی سپاہیوں اور مقامی جاگیرداروں کے ساتھ مل کر ہدایت پاشا کی قیادت میں تحریک مزاحمت کا آغاز کیا۔ اس جدوجہد کا نصب العین اس علاقے کی طرف روسی اور بلغاروی فوج کی پیش قدمی و تسلط کو روکنا تھا۔ تاہم اس تحریک کو اس سال کے اختتام تک کچل دیا گیا۔ چند سال بعد ۱۸۸۵ء میں رہوڈوپ کے مسلمانوں نے بلغاریا اور مشرقی رُومیلیا کے اتحاد و وفاق کے قیام کے خلاف مزاحمت شروع کر دی اور اس علاقے میں تقریباً اکیس (۲۱) دیہاتوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی مسلم ریاست قائم کر لی۔ رہوڈوپ کے علاقے میں مسلمانوں کی مزاحمت کا سلسلہ ۱۹۰۳ء تک بدستور جاری رہا، تاآنکہ بلغاروی فوج نے اس علاقے / خطے پر اپنی گرفت مضبوط و مستحکم کر لی اور مزاحمت کو سختی سے کچل دیا۔ مزاحمت کے قائد طوبری اوغلو

(Tuberyuoglu) کو شہید کر دیا گیا جب کہ اس کے اہم رفقا جان بچا کر ترکی کی طرف نکل گئے (Alexandre Popovic: "The Turks of Bulgaria (1878-1985)"، در Central Asian Survey، ۵:۲ (۱۹۸۶ء)، ص ۴-۶).

ان حادثات و واقعات کے بعد بھی اس ملک میں تقریباً ۸-۹ لاکھ مسلمان، جن میں بھاری اکثریت ترکوں کی تھی، جب کہ ڈیڑھ دو لاکھ پوماق اور تھوڑی تعداد چرکسی اور تاتاری مسلمانوں کی تھی، باقی رہ گئے (ملاحظہ ہو: Alexandre Popovic: "The Turks of Bulgaria"، ص ۴)۔ تاہم جو مسلمان اس ملک میں باقی رہ گئے وہ شدید آلام و مصائب سے دوچار ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں اتحاد بلغاریا و مشرقی رومیلیا کے بعد ملک کا جو پہلا دستور تشکیل و ترتیب دیا گیا اگرچہ اس میں مسلمانوں کو ملک کے دیگر عوام کی طرح مساوی سیاسی حقوق اور مذہبی و ثقافتی آزادیوں کی ضمانت دی گئی، لیکن عملاً یہ ضمانتیں غیر موثر ہیں۔ تاہم ۱۸۸۶ء کے بعد مسلمانوں کے انخلا و نقل مکانی کا سلسلہ کافی حد تک تھم گیا۔ البتہ جنگ بلقان کے دوران (۱۹۱۲-۱۹۱۳ء) میں مسلمان ایک بار پھر تختۂ ظلم و ستم بنے۔ اس دور میں بھی ہزاروں کی تعداد میں مسلمان قتل کیے گئے۔ مسلمانوں پر تشدد ، ان کی بے جا قید و بند اور مسلم شخصیات کا قتل ایک عام معمول بن گیا۔ علاوہ ازیں بہت سی مساجد، مدارس اور اوقاف کی عمارتیں مسمار کی گئیں۔ بلغاروی حکومت نے مسلمانوں کے حقوق سے متعلق ملکی دستور اور دیگر جملہ معاہدوں کی صریح خلاف ورزی کی۔ دریں حالات ملک سے مسلمانوں کی اناطولیا کی طرف نقل مکانی کا سلسلہ ایک بار پھر سے شدت اختیار کر گیا۔ جس کے نتیجے میں ملک میں سے مسلمان آبادی کی تعداد مزید کم ہوگئی۔ جنگ بلقان کے دوران میں مسلمانوں کو بلغاروی جھنڈے تلے فوجی خدمت سے مستثنیٰ قرار دیا گیا، البتہ اس کے بجائے ان پر ایک محصول عائد کیا گیا (Alexandre Popovic: "The Turks of Bulagaria"، ص ۶-۷)۔ مسلمانانِ بلغاریا جنگ عظیم اوّل (۱۹۱۴-۱۹۱۸ء) کے اثرات و نتائج سے بھی محفوظ نہ رہے۔ جنگ میں سلطنت عثمانیہ کے کثیر علاقوں پر یورپی طاقتوں کے تسلّط نے بلغاریا کے مسلمانوں میں عدم تحفظ کے احساس کو شدید تر کر دیا۔ چنانچہ جنگ کے اختتام پر مزید ترک و تاتاری مسلمان ترکی کی طرف نکل گئے (James W.Wiles: "Amongst Bulgarian Muslims"، در The Moslem World ، ج ۲۵، عدد ۴ (اکتوبر ۱۹۳۵ء)، ص ۳۹۶).

جبراً تبدیل مذہب کرانے کی مہم: ۱۸۷۸ء کے بعد مسلمانوں کی معاشی حالت انتہائی ابتر ہوگئی اور ان کی بھاری اکثریت غربت و افلاس سے دوچار ہوئی۔ بلغاروی حکام نے زرعی اصلاحات کی آڑ میں مسلمانوں کو ان کی جاگیروں، زمینوں اور دیگر زرعی املاک سے بہت حد تک محروم کر دیا۔ چنانچہ زیادہ تر مسلمان آبادی کا ذریعہ معاش صرف معمولی کاشت کاری اور غلہ بانی رہ گیا (Alexandre Popovic: "The Turks of Bulgaria" ، ص ۶)۔ محکومی اور معاشی ابتری و بدحالی کے اس دور (۱۸۸۵-۱۹۱۴ء) میں بلغاروی حکام کی طرف سے ان کو جبراً تبدیل مذہب کرانے کی مہم کا آغاز ہوا۔ بلغاروی حکام کا خیال تھا کہ حالات کے ستائے ہوئے اور غربت و فاقہ قیدی سے دوچار مسلمان ترغیب و ترہیب کے سبب مسیحیت قبول کر لیں گے۔ چنانچہ ان کی تحریک پر مسیحی مشنریوں نے مسلمانوں کے علاقے پر یلغار کر دی (ملاحظہ ہو: Alexandre Popovic: "The Turks of Bulgaria"، ص ۵-۶؛ R.Thomson: "Conditions in Bulgaria"، در The Moslem World ، ج ۴ (۱۹۱۴ء)

ص ۴۳-۴۸؛ Pastor Awetaranian: "Results of war in Bulgaria"، در "The Moslem world" ، ج ۴ (۱۹۱۴ء)، ص ۴۰۷-۴۱۲).

مسلمانوں کو جبراً مسیحیت قبول کرانے کی اس مہم کو مزید ابھارنے میں بلغاروی قوم پرست مؤرخین اور اہل دانش نے مرکزی کردار ادا کیا۔ آزادی کے بعد بلغاری مؤرخین نے مسیحی عوام کے ذہنوں میں اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودگی خصوصاً بلغاری النسل مسلمانوں، جنہیں بالعموم پوماق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جن کی اکثریت رہوڈوپ (Rhodopes) کے پہاڑوں میں آباد ہے، میں اشاعت اسلام کے بارے میں بڑی غلط فہمیاں پیدا کیں۔ انہوں نے بلغاریا میں پانچ صدیوں پر محیط عثمانی دور کو بلغاریا کی تاریخ کے تاریک دور (Dark Age) سے تعبیر کیا اور خطے کے مسیحی عوام کے بارے میں عثمانی حکومت کی پالیسیوں سے متعلق حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا۔ (Hristo Hristov: Bulgaria: 1300 Years ، صوفیا: صوفیا پریس ، ۱۹۸۰ء ، ص ۶۳، ۲۴۶-۲۴۹؛ بحوالہ علی امینوف: "Islam and Muslims in Bulgaria"، ص ۲۱۴-۲۱۵).

چنانچہ آزادی کے بعد بلغاروی حکام کی طرف سے اس ملک میں آباد مسلمانوں خصوصاً پوماقوں کو جبراً اپنے آباء و اجداد کے مذہب (مسیحیت) میں داخل کرنے کی کوششوں میں تیزی آگئی۔ بلغاروی حکام نے اس غرض سے جبرو تشدد کے حربوں کو آزمانے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ جس کے سبب بعض ضعیف العقیدہ مسلمانوں نے مسیحیت قبول کر لی (ملاحظہ ہو: Alexandre Popovic : "The Turks of Bulgaria"، ص ۵-۶؛ R. Thomson : "Conditions in Bulgaria"، در The Moslem Wolrd ، ج ۴، (۱۹۱۴ء)، ص ۴۳-۴۸؛ Pastor Awetaranian : "Results of the War in Bulgaria"، در the Moslem World ، ج ۴ (۱۹۱۴ء)، ص ۴۰۷-۴۱۲؛ Stephan Thornoff: "Nathaniel Nazif: A Turkish Evangelist in Bulgaria"، در The Moslem World، ج ۲۲، عدد ۳ (جولائی ۱۹۳۲ء)، ص ۲۸۷-۲۹۰).

بلغاروی مسیحی مشنریوں نے بلغاروی النسل مسلمانوں "پوماق" جو کو ترکی کی بجائے بلغاری زبان بولتے ہیں، دین اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے بلغاروی زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ بھی شائع کیا (۱۹۳۰ء)، جس میں دانستہ طور پر اسلام کے اصول و تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ (Natanail Nazifoff: "The Bulgarian Koran"، در The Moslem world ، ج ۲۳، عدد ۲ (اپریل ۱۹۳۳ء)، ص ۱۸۷-۱۹۰)۔ بلغاریا میں اشتراکی انقلاب ۱۹۴۵ء سے قبل کے دور میں مسلمانوں میں مسیحی مشنریوں کی یہ سرگرمیاں عروج پر رہیں۔ ان مشنریوں کو امید تھی کہ بلغاریا کے مسلمان خصوصاً پوماق ایک نہ ایک دن اپنے قدیم آبائی مذہب عیسائیت کو ضرور اختیار کر لیں گے۔ انہوں نے اسلام مخالف پروپیگنڈا کی غرض سے ترک زبان میں اخبارات و جرائد کی بڑے پیمانے پر اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا۔ اگرچہ حکومت نے ترکی زبان میں مسلمانوں کے اخبارات وجرائد کی اشاعت پر طرح طرح کی قدغنیں لگا رکھی تھیں تاہم مسیحی مشنریوں کے اخبارات و جرائد کو ان پابندیوں سے مستثنٰی قرار دے رکھا تھا (Alexandre Popovic: "The Turks of Bulgaria"، ص ۱۱، ۲۸؛ بلغاریا میں مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مسیحی مشنریوں کی سرگرمیوں کے تفصیلی جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو G.Pedersen: "The Moslems of Bulgaria"، در The Moslem World، ج ۱۳ (۱۹۲۳ء)، ص۸۵؛ M.Hoppe: "Islam in Bulgaria"، در The Moslem

World، ج۱۴ (۱۹۲۴ء)، ص۱۵۹-۱۶۲؛ I.Gantcheff: "Islam in Bulgaria"، در The Moslem World، ج۱۶ (۱۹۲۶ء)، ص۱۵۸-۱۶۰؛ ن-م: "Two Pioneer Missionaries in Bulgaria"، در The Moslem World، ج۱۷ (۱۹۲۷ء)، ص۳۷۵-۳۸۲؛ I.Gantcheff: "The Bible and Islam in Bulgaria"، در The Moslem World، ج۱۷، (۱۹۲۷ء)، ص۳۹۱ - ۳۹۳؛ Dr. Freytag: "German Missions to Moslems in Balkans and the Near East"،در The Moslem World، ج۱۷ (۱۹۲۷ء)، ص۳۹۴-۴۰۰؛ I.T.Sanders: "The Moslem Minority of Bulgaria"، در The Moslem World، ج۲۴ (۱۹۳۴)، ص۳۵۶-۳۶۹؛ J.W.Wiles: "Amongst Bulgarian Moslems"، در The Moslem World، ج، ۲۵ (۱۹۳۵ء)، ص۳۹۶-۳۹۸).

دستوری و قانونی و سیاسی حقوق: بلغاریا نے ۱۸۷۸ء میں جس معاہدہ (معاہدۂ برلن) کے تحت سلطنتِ عثمانیہ کے ماتحت خود مختاری حاصل کی تھی، اس میں بلغاریا میں رہ جانے والے مسلمانوں کو ان کے بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی۔ بعدازاں ان قانونی ضمانتوں کو بلغاریا کے دستور و قانونی نظام میں شامل کر دیا گیا۔ چنانچہ خود مختار بلغاریا کے پہلے دستور (۱۸۸۶ء) میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی اور بعض دوسرے سیاسی و قانونی حقوق کی ضمانت دی گئی تاہم یہ ضمانتیں عملاً بہت حد تک غیر مؤثر رہیں۔ جنگ عظیم اوّل سے کچھ عرصہ قبل بلغاری حکومت نے مسلمانانِ بلغاریا کے بنیادی حقوق سے متعلق ترکی کی حکومت سے یکے بعد دیگرے دو معاہدے کیے (ستمبر ۱۹۱۳ء، و مارچ ۱۹۱۴ء) جن میں مسلمانوں کے لیے مذہبی وثقافتی آزادی سے متعلق بعض حقوق تسلیم کیے گئے۔ بلغاروی حکومت نے ان معاہدوں میں مسلمانوں کے لیے اپنے مفتیوں اور قاضیوں کے انتخاب کا حق تسلیم کیا۔ تاہم اس نے ترکی کی حکومت کے اس مطالبے کو تسلیم نہیں کیا کہ بلغاروی مسلمانوں کے منتخب کردہ مفتیوں اور قاضیوں کے تقرر کی توثیق و منظوری استانبول میں شیخ الاسلام کے صدر دفتر کی طرف سے عمل میں آئے۔ بلغاروی حکومت نے اس طرح سے بلغاریا کے مسلمانوں کے دینی و تعلیمی معاملات و امور کے انتظام سے متعلق سلطنت عثمانیہ کے شیخ الاسلام کے گذشتہ کئی صدیوں سے جاری اختیار کو ختم کر دیا۔ جس نے دینی و مذہبی امور کی تنظیم کے پہلو سے بھی بلغاریا کے مسلمانوں کو سلطنت عثمانیہ سے کاٹ کر الگ کر دیا (Alexandre popovic: "The Turks of Bulgaria"، ص ۶)۔ بلغاری حکومت نے مسلم اقلیت کو مفتیوں کے انتخاب و تقرر کی پوری آزادی نہیں دی.

ان مفتیوں اور نائب مفتیوں کو اکثر و بیشتر بلغاروی حکومت خود نامزد و مقرر کرتی تھی (Alexandre popovic: "The Turks of Bulgaria"، ص ۶-۷)۔ ۱۹۱۹ء میں طے پانے والے ترک بلغاریا معاہدۂ امن (Neuilly Peace Treaty) میں بھی ایک شق (۵۴) مسلمانانِ بلغاریا کے حقوق کے تحفظ سے متعلق شامل کی گئی۔ جس کی رو سے بلغاریا نے اس امر کو تسلیم کیا کہ ملک کی مسلم اقلیت کو وہی حقوق حاصل ہوں گے، جو وہاں کی مسیحی اکثریت کو حاصل ہیں اور اس کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی برتاؤ نہیں کیا جائے گا۔ اس معاہدہ کے بعد بلغاروی حکومت نے مسلم اقلیت کے مذہبی و تعلیمی امور کے انتظام و انصرام سے متعلق ایک قانون بھی منظور کیا۔ جس کی رو سے مسلمان اقلیت کو کافی حد تک مذہبی و تعلیمی اور ثقافتی امور میں خود مختاری دی گئی۔

خصوصاً مفتیوں اور قاضیوں کے انتخاب و تقرّر نیز اوقاف و مدارس کے نظم و نسق سے متعلق مسلمانوں کے حقوق و اختیارات تسلیم کیے گئے۔ علاوہ ازیں صوفیا میں مفتی اعظم کا عہدہ تخلیق کیا گیا۔ جس کا صدر دفتر بنجاباشی (Banja Bachi) کی قدیم مسجد میں قائم کیا گیا۔ مسلمان ملت صوفیا میں مقیم مفتی اعظم اور ۱۶ علاقائی و ضلعی مفتیوں کے ماتحت منظم کی گئی۔ اب مفتی اعظم کا تقرر علاقائی مفتیوں کی کونسل کرتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل الگ اضلاع قائم کیے گئے جن میں سے ضلع شمن (Schumen) کو خصوصی علاقائی حیثیت دی گئی۔ ان اضلاع میں ترک اسکول قائم کرنے کی اجازت دی گئی۔ البتہ صوفیا اور شمن میں قائم صرف دو ہی مدارس دینیہ قائم رہنے دیے گئے۔ مسلمانوں کو ثقافتی انجمنیں قائم کرنے کی اجازت بھی دی گئی چنانچہ کافی تعداد میں ثقافتی انجمنیں قائم ہوئیں جس میں سے بعض نے ترکی میں موجود اسلامی انجمنوں سے قریبی روابط قائم کر لیے (علی امینوف: *"Islam and Muslims in Bulgaria"*، ص ۲۲۲، بحوالہ Bilal Simsir : *Turkish Minority Education and Literature in Bulgaria*، انقرہ، ترکی: مطبعۂ وزارتِ خارجہ، ۱۹۸۶ء، ص ۴،۸۰؛ محمد علی الکتانی: *"Post-Ottoman Educational Institutions in the Balkans"*، در *Islamic Studies*، ۳۶: ۲، ۳ (۱۹۹۷ء)، ص ۴۶۸-۴۶۹).

تعلیمی و ثقافتی و مذہبی حالت: عثمانی دور میں بلغاریا اور مشرقی رُومیلیا میں مدارس و مکاتب کا ایک وسیع جال بچھا دیا گیا تھا۔ ان میں بعض مدارس تو ایسے تھے جنہیں جدید نظام (اصولِ جدید) کے تحت منظّم کیا گیا تھا جبکہ دیہی علاقوں میں قائم مدارس پرانے نظام کے تحت ہی چل رہے تھے۔ بلغاریا پر سے عثمانی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ہی خصوصاً متموّل اور تعلیم یافتہ افراد کے بڑی تعداد میں قتل و ہلاکت یا پھر اناطولیا کی طرف نقل مکانی کے سبب سے اس ملک میں صدیوں سے قائم مدارس و مکاتب کا نظام بھی بری طرح متاثر ہوا۔ بایں ہمہ ۱۹۰۴ء تک بلغاریا اور مشرقی رومیلیا میں تقریباً ۱۲۹۳ مسلم پرائمری سکول (مکتبِ ابتدائی) موجود تھے جبکہ بڑے شہروں میں چند سکول طالبات کے لیے بھی قائم کیے تھے، جن میں تقریباً ۴۲۲، ۶۴ طلبا و طالبات زیرِ تعلیم تھے۔ ۱۹۰۴ء میں ان کے انتظام و انصرام پر تقریباً ۵۸۰، ۲۸۳ فرانک اخراجات اٹھ رہے تھے۔ ان مدارس و مکاتب کا انتظام مسلمانوں کے متموّل افراد کی مالی اعانت اور اوقاف کی آمدنی سے چلتا تھا، تاہم تھوڑی سی مالی امداد بلغاری حکومت بھی فراہم کرتی تھی (Alexandre Popovic: *"The Turks of Bulgaria"*، ص ۷-۸).

بلغاریا کی خود مختاری (۱۸۷۸ء) اور اتحاد و وفاق کے قیام (۱۸۸۵ء) کے بعد ۱۸۷۶ء میں روس کی جارحانہ عسکری مداخلت کے وقت بلغاریا میں تقریباً بیس مدرسے تھے۔ تاہم ان میں سے چار مدارس ورنا (Varna) اور (Liljakovo) وغیرہ میں قائم، کے علاوہ باقی تمام مدارس جنگ عظیم اوّل کے آغاز تک صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ البتہ جنگ کے اختتام پر ۱۹۲۲ء میں شمن (Kolarovgrad/Choumen) میں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا گیا جو مدرسۂ نواب (Medrese-i-Nuwab) کہلاتا تھا۔ جنگِ عظیم دوم سے قبل تک اسی مدرسہ کو ملک کی سب سے بڑی اسلامی درس گاہ کی حیثیت حاصل تھی کہ جہاں بلغاریا کے علما تعلیم پاتے تھے۔ اس مدرسہ کے تین مدارج ،ابتدائی (چار سالہ) ، ثانوی (پانچ سالہ) اور علیا (تین سالہ) تھے۔ اس مدرسہ میں ترکی زبان کے علاوہ عربی زبان و ادب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ علوم دینیہ

کے نصابات مصر کی جامعۂ ازھر کے نصابات کے مطابق تھے۔ ۱۹۲۷ء میں مفتی محمد عبدہٗ کے ایک تلمیذ شیخ ضیاء الدین اس مدرسہ کے مہتمم (ریکٹر) اور عربی زبان و ادب کے استاد کے بطور خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس مدرسہ کا انتظام و انصرام مسلمان ملت کے مخیّر افراد کے مالی تعاون اور اوقاف سے حاصل ہونے والی آمدنی سے چلتا تھا۔ تاہم تھوڑی بہت مالی امداد بلغاری حکومت کی طرف سے بھی بہم پہنچائی جاتی رہی۔ سِلسترا (Silistra) میں بھی ایک مدرسہ ۱۹۲۰ء میں قائم کیا گیا۔ (محمد علی الکتانی: *"Post-Ottoman Islamic Educational Institutions in the Balkans"*، ص۴۶۹).

تاہم ۱۹۳۴ء میں ملک میں فوجی حکومت کے قائم ہوتے ہی بہت سے مدارس و مکاتب بند کر دیئے گئے۔ وہ ترک اسکول جنھیں کام کرنے کی اجازت تھی ان کو بھی گوناں گوں مشکلات و مسائل کا سامنا ہوا۔ فوجی حکومت نے مسلمانوں کے جداگانہ تعلیمی نظام کو محدود تر کرنے کی غرض سے جارحانہ حکمت عملی اپنائی (علی امینوف: *"Islam and Muslims in Bulgaria"*، ص ۲۲۲، بحوالہ Bilal Simsir: *Turkish Minority Education*، ص ۵-۶).

اشتراکی دور حکومت: اگرچہ جنگِ عظیم دوم سے قبل ملک میں اسلام اور مسلمانوں کو شدید ابتلا کا سامنا رہا۔ تاہم جنگ کے بعد اشتراکی جماعت کی اقتدار پر گرفت قائم ہوتے ہی اسلام اور مسلمانوں کا ابتلا شدید تر ہوگیا اور ان کی حالت مزید ابتر ہوگئی۔ اشتراکی دور میں ۱۹۴۷ء میں نئے دستور کی منظوری عمل میں آئی۔ جس کی شق ۷۹ کی رُوسے بلاتفریق مذہب و ملّت ملک کے تمام شہریوں کے لیے آزادی اظہار رائے اور آزادی مذہب کا حق تسلیم کیا گیا۔ مسلمان اقلیت کو بھی اپنے عقیدہ و مذہب کے اظہار کی مکمل آزادی کے علاوہ اپنی زبان (ترکی) کے تحفظ و استعمال کے حق کی ضمانت بھی دی گئی۔ اس دستور کے نفاذ کے بعد ۱۹۴۹ء میں قانون آزادی مذہب کی منظوری عمل میں آئی۔ اس قانون میں بھی عوامی جمہوریہ بلغاریا کے تمام شہریوں کو اظہار رائے اور مذہب کی آزادی کے حق کی ضمانت دی گئی (Wayne S.Vucinich: *"Islam in The Balkans"*، در A.J. Arberry (مدیر)، *Religion in the Middle East*، لنڈن: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۹ء، ج ۲، ص ۲۴۵؛ علی امینوف: *"Islam and Muslims in Bulgaria"*، ص، ۲۲۲-۲۲۳)۔ تاہم اس قانون کی منظوری و نفاذ کے ساتھ ہی حکومت نے پے در پے ایسے اقدامات کیے کہ جن سے یہ قانون عملاً غیر موثر ہوگیا اور دستور میں آزادی اظہار رائے اور مذہبی آزادی سے متعلق دی گئی ضمانتیں عملاً معطل ہو کر رہ گئیں۔ حکومت نے مسلمان آبادی میں مذہب کے اثر و نفوذ کو محدود بلکہ ختم کرنے کے لیے ۱۹۴۹ء میں تمام قرآنی مکاتب بند کر دیئے اور بہت سی مساجد مقفل کر دیں۔ بڑی بڑی مساجد کو عجائب گھروں، کتب خانوں، مال گوداموں، دوکانوں اورطعام گاہوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں حکومت نے تمام ترک سکولوں میں دینی تعلیم پر پابندی لگا دی اور تمام مدارسِ دینیہ کو بند کر دیا۔ مکاتب اور مساجد میں بھی اسلام کے درس و تدریس کی سختی سے حوصلہ شکنی کی گئی حتیٰ کہ مذہب اسلام کی اشاعت و تبلیغ اور تعلیم و تدریس ایک سنگین جرم بن گیا۔ چند سال بعد ۱۹۵۸- ۱۹۵۹ء میں تمام ترک اسکولوں کو بند کر دیا گیا۔ جبکہ ۱۹۸۲ء میں ترک اکثریتی اضلاع میں بھی ترک زبان کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ موقوف کر دیا (Frederick De Jong: *"The Muslim Minorities in the Balkans on the Eve of the Collapse of Communism"*، در *Islamic Studies*، ۳۶: ۲، ۳ (۱۹۹۷ء)، ص۴۱۵)۔ مزید براں حکومت نے وسیع

پیمانے پر مساجد، صوفیا کی خانقاہوں، مزارات اور عام قبرستانوں کو مسمار و برباد کر دیا (Frederick De Jong: "The Muslim Minorities in the Balkans"، ص، ۴۱۵؛ محمد علی الکتانی: "Post-Ottoman Islamic Educational Institutions in The Balkans"، ص ۴۶۹).

۱۹۵۰ء کی دہائی کے آخر میں تمام نجی ترک سکولوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا اور وہاں نئے نصابات رائج کیے گئے۔ ان نصابات کا مدعا مسلمانوں کی نوخیز نسل کے ذہنوں میں بلغاروی قومیت پرستی کے جذبات کی افزائش کے علاوہ ان میں الحاد و مذہب بیزاری کو پروان چڑھانا تھا۔ اس دور میں سرکاری سطح پر اسلامی عقائد و تعلیمات، اعمال و رسوم اور آداب و شعائر کے خلاف زبردست مہم چلائی گئی (علی امینوف: "Islam and Muslims in Bulgaria"، ص ۲۲۳-۲۲۴).

مسلمانوں کا جبری اخراج اور بلغاری قومیت میں ادغام:

بلغاریا کے قوم پرست حکام ملک میں مؤثر تعداد میں مسلمانوں کی موجودگی کو ملکی آزادی اور اس کی یک جہتی و سالمیت کے منافی خیال کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک یک رنگی (Homogeneous) بلغاروی قومیت کی تخلیق ان کے سیاسی نصب العین کا اہم نکتہ رہا ہے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے بالعموم دو طریقے اختیار کیے:۱) بلغاروی النسل آرتھو ڈاکس مسیحیوں کے علاوہ باقی تمام مذہبی اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کو جبر و تشدد کا نشانہ بنا کر ملک سے باہر دھکیل دیا جائے (۲) یا پھر انہیں بذریعہ قوت وطاقت ان کے مذہب، تہذیب و ثقافت، معاشرتی عادات و رسوم کہ جن سے ان کی جداگانہ قومی ہستی آشکارا ہوتی ہو، سے دست بردار کرا کے انہیں قومی دھارے میں جذب کر لیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۷۸ء کے معاہدہ برلن کے بعد بلغاروی حکمران اسی ایجنڈے پر عمل پیرا رہے ہیں۔ ۱۹۱۲- ۱۹۱۳ء، ۱۹۲۳ء، ۱۹۳۲- ۱۹۳۷ء، ۱۹۵۱-۱۹۵۲ء اور پھر ۱۹۸۴ء- ۱۹۸۹ء کے دورن میں ترک و تاتاری مسلمانوں کے ملک سے جبری بے دخلی و انخلا کی مہم چلائی گئی (Kemal H.Karpat: "The Balkan National States and Nationalism"، ص۳۴۵، ۳۵۴-۳۵۵)۔ خصوصاً دیہی علاقوں میں غریب و تنگدست مسلمان چرواہوں، گلہ بانوں اور کاشت کاروں کا سول و فوجی حکام کے ہاتھوں استحصال، ان سے جبری مشقت لینا، ان پر ناجائز و ناروا ٹیکسوں کا بوجھ ڈالنا اور پھر ان کو دہشت زدہ کرنے کے لیے ان پر ظلم و ستم ڈھانا ایک عام معمول رہا (Alexandre Popovic: "The Turks of Bulgaria"، ص۱۰)۔ حکومت نے ۱۹۲۱ء میں زمینوں کی ملکیت کے حقوق سے متعلق قانون کی منظوری دی، جس کی آڑ میں وسیع پیمانے پر مسلمانوں کی زرعی زمینیں اور دیگر املاک ضبط کر لی گئیں۔ ان کی زمینوں اور املاک کو سرکاری ملکیت قرار دیا گیا۔ اس کارروائی کا مقصد مسلمانوں کو ملک سے نقل مکانی پر مجبور کرنا تھا۔ ملک میں موجود قوم پرست منظم عسکری گروہ بھی وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بناتے رہے۔ ۱۹۲۳ء کی خانہ جنگی کے بعد مسلمان بلغاریا کی قوم پرست جماعتوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ قوم پرستوں نے دیلی اورمان (Deli Orman) شہر کی مسلمان آبادی کو ملک چھوڑنے پر مجبور کرنے کے لیے ان کے قتل و ہلاکت کا بازار گرم کیا۔ مسلمانوں کے خلاف ظلم و تشدد کی اس کارروائی میں سب سے اہم کردار قوم پرست جماعت Rodna Zachtita کا رہا، جس کی قیادت بعض فوجی افسران کر رہے تھے۔ دوسرے علاقوں میں بھی مسلمانوں کو خوب ستایا گیا۔ ان حالات میں جبر و ستم کے ستائے ہوے مسلمان، ترک وپوماق، ترکی کی طرف نقل

مکانی کرتے رہے۔ مابعد دور میں بھی قوم پرست تنظیموں اور حکومت نے ملک سے مسلمانوں کے جبری انخلا کی مہم برپا کیے رکھی۔ چنانچہ ۱۹۲۷، ۱۹۳۳ ، اور ۱۹۳۵ میں پوماق نے بڑی تعداد میں نقل مکانی کی تاہم ان میں سے اکثر واپس لوٹ آئے (Alexandre Popovic: "The Turks of Bulgaria"، ص۱۰- ۱۱)۔ بلغاروی حکومت نے ترک اقلیت پر بطور خاص بڑے مظالم ڈھائے۔ ۱۹۴۸ سے ۱۹۵۱ء کے دوران میں اس نے تقریباً دو لاکھ ترک مسلمانوں کو ملک سے بے دخل کر کے ترکی کی طرف دھکیل دیا (Wayne S.Vucinich: "Islam in the Balkans" ، در A.J.Arberry (مدیر): Religion in the Middle East، لنڈن: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۹ء، ۲:۲۴۷)۔ بلغاروی حکمران مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے نیز ان کی اسلامی شناخت کو محو کرنے کے لیے بطور خاص کوشاں رہے۔ اس غرض سے حکومت نے ترکوں اور پوماق کو الگ الگ منطقوں میں رکھنے کی پالیسی اختیار کی۔ اس نے ان دونوں مسلمان گروہوں کے مذہبی امور کے انصرام کے لیے بھی الگ الگ انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا۔ حکومت کا خیال تھا کہ پوماق کو ترکوں سے الگ تھلگ رکھنے اور ترکوں سے ان کے عدم میل جول کے سبب ان کی اسلامیت کمزور پڑ جائے گی اور ان کو قومی دھارے میں شامل کرنا آسان ہو جائے گا (Frederick De Jong: "The Muslim Minorities in Balkans on the Eve of the Collapse of Communism"، ص۴۱۴؛ W.S.Vucinich: "Islam in the Balkans"، ص، ۲۴۵) .

تاہم ۱۹۵۰ء کی دہائی کے وسط تک [۱۹۵۵-۱۹۵۶ء تک] حکومت پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ مسلمانوں پر ان کے مذہب ''اسلام'' کی گرفت بہت گہری اور مضبوط ہے اور حکومتی اقدامات خصوصاً مذہب بیزار تعلیم کی اشاعت اور اسلام مخالف پروپیگنڈا ان کو اسلام کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے کافی اور بہت مؤثر ثابت نہیں ہوئے۔ دریں صورت اشتراکی جماعت کی قیادت نے اسلامی عقائد و تعلیمات اور اعمال و رسوم کے انسداد و تدارک کی غرض سے سخت ترین اقدامات کا عزم کر لیا۔ اپریل ۱۹۵۶ء میں بلغاروی کیمونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں اس سلسلہ میں ایک ابتدائی لائحہ عمل کی منظوری دی گئی۔ جس کے تحت حکومتی سطح پر اسلام مخالف تشہیری نظام (apparatus) ترتیب دیا گیا۔ دو سال بعد کیمونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے بلغاریا کی ترک آبادی میں مذکورہ ہدف کے حصول کے لیے کام کی غرض سے ایک جامع لائحہ عمل کی منظوری دی۔ اس کا بنیادی نصب العین بھی مسلمانوں کے مذہبی رسوم و اعمال اور آداب و شعائر کے اظہار و اعلان کی ہر شکل و صورت کے خلاف اور اشتراکی نظریۂ حیات کی ترویج و اشاعت کی غرض سے پرعزم، مربوط اور فیصلہ کن جدوجہد کرنا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے جملہ گروہوں، ترکوں، خانہ بدوشوں اور بلغاروی النسل مسلمانوں (پوماق) میں کام کے لیے خصوصی کیڈر (جتھے) منظم کیے گئے۔ ان کیڈرز کو کیمونسٹ پارٹی کی مرکزی اور علاقائی و مقامی شاخوں کے ساتھ منسلک و مربوط کیا گیا۔ یہ کیڈر منجملہ دیگر امور کے مسلمانوں کی مذہبی و ثقافتی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھتے اور ان کی روک تھام کے لیے سرگرم عمل رہتے (علی امینوف: "Islam and Muslims in Bulgaria"، ص ۲۲۴).

بلغاری حکام نے تجہیز و تکفین سے متعلق روایتی مذہبی رسومات کی جگہ اشتراکی طریق کار متعارف کرایا۔ ابتدا میں تو اس پر عمل درآمد کے سلسلہ میں نرمی اور لچک سے کام لیا گیا تاہم ۱۹۷۸ء کے بعد اس پر جبر و اکراہ کے ساتھ عمل درآمد کرایا جانے لگا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد سے حکومت نے

اسلام مخالف پروپیگنڈے کو تیز تر کر دیا اور مسلمانوں پر اعلانیہ طور پر مذہبی اعمال و رسوم کی بجا آوری اور اسلامی تہذیبی آداب و شعائر کے التزام پر پابندی عائد کر دی گئی۔ سرکاری ذرائع ابلاغ میں اسلامی عقائد و تعلیمات، اعمال و رسوم اور اسلامی تہذیبی و معاشرتی اقدار کا خوب تمسخر اڑایا گیا۔ ختنہ کی رسم کو وحشیانہ قرار دے کر اس کی ممانعت کر دی۔ رمضان میں روزہ کے فرض کی بجا آوری کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ اسے انسانی صحت اور خصوصاً معاشی اعتبار سے نقصان دہ بتایا گیا کہ روزے کی حالت میں کاشت کاروں اور کارخانوں میں محنت کشوں کی پیداواری صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کو اقتصادی وسائل کے ضیاع اور قومی زرمبادلہ کے نقصان کا سبب بتایا گیا۔ چنانچہ حکومت نے رمضان کے روزوں اور قربانی پر پابندی لگا دی (علی امینوف: "Islam and Muslims in Bulgaria" ، ص، ۲۲۵-۲۲۷)۔ پردۂ و حجاب بھی سرکاری ذرائع ابلاغ کی جارحانہ تنقید و ملامت کا خصوصی ہدف بنا رہا۔ حجاب کی پابندی کرنے والی خواتین کو زندگی کے تمام شعبوں میں امتیازی برتاؤ کا سامنا ہوا۔ مئی ۱۹۷۸ء میں حکومت نے اشتراکی اعمال و رسوم اور تہواروں کا نیا نظام متعارف کرایا اور ان کی پابندی کو قانونی طور پر لازم قرار دیا اور اس پر عمل درآمد کے لیے قوت و طاقت سے کام لیا گیا۔ مسلمانوں پر عربی زبان میں نماز اور اذان کی ممانعت کی گئی۔ حکومت نے انہیں بلغاری زبان میں نماز ادا کرنے اور اذان دینے کا پابند بنانا چاہا۔ مذہبی امور و معاملات میں مداخلت پر احتجاج کرنے والے مسلمانوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کیا جانے لگا (علی امینوف: "Islam and Muslims in Bulgaria"، ص، ۲۲۷)۔

بلغاری اشتراکی حکام نے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں مسجد کے کردار کو بطور خاص مسدود کرنے کا اہتمام کیا۔ روایتی طور پر مسجد کو بلغاریا کے مسلمانوں کی سماجی و تہذیبی، دعوتی و تبلیغی اور تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں میں مرکز و محور کی حیثیت حاصل رہی۔ مسجد ان کی اسلامی شناخت کے تحفظ و استحکام کا ایک موثر اور طاقت ور عامل و وسیلہ تھی۔ اشتراکی دور میں مسجد کی یہ حیثیت تبدیل ہوتی گئی۔ حکومت نے بہت سی مساجد بند کر دیں۔ جبکہ ملک میں بڑی تعداد میں مساجد برس ہا برس سے دیکھ بھال اور مرمت کے انتظام کے نہ ہونے کے سبب پامال و برباد ہوگئیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط تک مسلمان آبادیوں کے ہاں سے بہت سے مساجد غائب ہوگئیں۔ مسلمانوں کو نماز جمعہ کے لیے کسی آباد مسجد کی تلاش میں دور دراز چل کر جانا پڑتا تھا۔ دیہاتوں اور شہروں میں مساجد کے غائب ہو جانے سے مسلمانوں کے درمیان باہمی میل جول اور دینی و ملی سرگرمیوں میں اشتراک عمل کے مواقع بھی بہت کم رہ گئے۔ چنانچہ ان کے درمیان رشتۂ اتحاد و یگانگت بھی کمزور پڑتا گیا (علی امینوف: ص، ۲۲۷)۔

۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں بھی مسلمانوں کے جملہ گروہ خصوصاً پوماق اور خانہ بدوش بلغاروی قومیت میں جبری انجذاب کی حکومتی پالیسی کا ہدف بنے رہے۔ حکومت نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اسلامی نام تبدیل کر کے بلغاروی و سلافی نام اختیار کر لیں۔ ۱۹۷۱-۱۹۷۶ء اور پھر ۱۹۸۱-۱۹۸۴ء کے دوران میں کئی بار ان کے اسلامی نام تبدیل کرکے انہیں بلغاری و سلافی نام رکھوائے گئے۔ پوماق مسلمانوں کی طرف سے سخت مزاحمت و مخالفت کی گئی، جسے کچلنے کے لیے حکومت نے اکثر و بیشتر قوت و طاقت کا بھر پور استعمال کیا۔ صرف ۱۹۸۲-۱۹۸۴ء کے دوران میں فوج اور خفیہ پولیس کے ہاتھوں تقریباً چار سو مسلمان ہلاک (۳۹۲) اور اس سے کہیں زیادہ تعداد میں زخمی ہوئے، جبکہ ہزاروں کی تعداد

میں انہیں قید و حراست میں رکھا گیا (علی امینوف، ص۲۳۰؛ Wayne S.Vucinich: "Islam in the Balkans"، ص۲۴۵- ۲۴۸؛ Frederick De Jong: "The Muslim Minorities in the Balkans"، ص۴۱۵).

اشتراکی حکومت نے مسلمانوں اور خصوصاً ترکوں پر شدید مظالم ڈھائے۔ بلغاریا میں سوویت خفیہ پولیس (KGB) کی طرز پر قائم خفیہ پولیس نے مسلمانوں کے قتل و غارت گری کا بازار خوب گرم کیا۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اشتراکیت مخالف مسلم افراد کا اغوا، ان پر جبر و تشدد اور ان کا قتل و ہلاکت روزمرہ کامعمول بن گیا (ملاحظہ ہو: Elizabeth Pond: "Reinventing Bulgaria"، در The Washington Quarterly، ۲۲: ۳ (۱۹۹۹ء)، ص ۴۰، ۴۳-۴۴؛ اشتراکی دور میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم، ان کے سیاسی و مذہبی رہنماؤں، علما اور مبلغین و معلّمین کے قتل، اور ان پر مذہبی اعمال و شعائر کی بجا آوری پر عائد شدید پابندیوں کے بارے میں مزید ملاحظہ ہو: Alexandre Popovic: "The Balkan Muslim Communities in the Post-Communist Period"، ص ۶۵).

صدر ٹوڈور زہیف کوف (Todor Zhivkov) کی حکومت نے تو مسلمانوں پر ظلم و جبر کی انتہا کر دی۔ اس نے ۱۹۸۴- ۱۹۸۹ء کے دوران میں مسلمانوں کے بلغاری قومیت میں انجذاب اور ان کی نسلی تطہیر (Purification) کی زبردست مہم برپا کیے رکھی، جس کو بلغاری قومیت اور تہذیب و ثقافت کے احیا کی کارروائی (Revival Process) سے تعبیر کیا گیا۔ اس مہم کا خصوصی ہدف ترک مسلمان ٹھہرے۔ چنانچہ ان کو بھی اپنے اسلامی (عربی و ترک) نام تبدیل کر کے سلافی و بلغاری نام اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جبکہ ترکی زبان میں کتب و رسائل اور اخبارات کی اشاعت کے علاوہ کھلے عام ترکی زبان میں بول چال کی کلیتًا ممانعت کر دی گئی۔ ترکوں (مرد و عورت) پر روایتی اسلامی و ترکی لباس پہننے پر سخت پابندی عائد کی گئی۔ اسلامی و روایتی ترک لباس میں ملبوس مرد و خواتین کے مقامات عامۃ، طعام گاہوں، ریستورانوں اور یوٹیلٹی اسٹوروں میں داخلے کو ممنوعہ قرار دیا گیا۔ مسلمانوں پر اسلامی اعمال و افعال اور آداب و شعائر کی بجا آوری پر پہلے سے عائد قدغنوں کو انتہائی سخت بنا دیا گیا۔ نماز اور دیگر عبادات بجا لانے کی سختی سے حوصلہ شکنی کی گئی جبکہ اسلامی تہوار (عیدین وغیرہ) اور مذہبی تقریبات منانے کی ممانعت کر دی گئی۔ مزیدبراں بہت سی مساجد مقفل کر دی گئیں۔ بچی کھچی مساجد کی سخت نگرانی کی جانے لگی۔ ان اقدامات پر عمل درآمد کے سلسلہ میں مسلمانوں کو جبرو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ مسلمانوں کو اپنے مُردوں کی، اپنے قبرستانوں میں اسلامی روایات کے مطابق تدفین کی ممانعت کر دی گئی۔ انہیں قبروں پر نصب ترکی یا عربی زبان میں مرقوم کتبے اکھاڑنے یا ان کو مسخ کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ختنہ پر پابندی کو مزید سخت کیا گیا۔ بچوں کا سرکاری طور پر معائنہ کیا جاتا۔ اس "جرم" کے مرتکب والدین کو اور دیگر متعلقہ افراد سزا دی جاتی۔ مزیدبراں فوج اور خفیہ پولیس کے کارندوں کے ہاتھوں مسلمان خواتین کے اغوا اور ان کی آبرو ریزی کے علاوہ مسلمانوں پر ظلم و تشدد اور ان کے قتل و ہلاکت کے واقعات عام معمول بن گئے (علی امینوف: ص ۲۲۸؛ ۱۹۸۴-۱۹۸۹ء کے دوران میں بلغاریا میں مسلمانوں کی حالت زار کے بارے میں ملاحظہ ہو: عبداللہ عمر نصیف: "Mission to Bulgaria": در Journal Institute of Muslim Minority Affairs، ۹: ۲ (۱۹۸۸ء)، ص ۲۰۷-۲۱۵؛ سید زین العابدین: "The Bulgarian Muslim

"Predicament In Retrospect"، در Al-Nahdah ، ۱۰:۱، ۲ (جنوری-جون ۱۹۹۰ء)، ص ۵۱-۵۴؛ علی امینوف: "Are Turkish-speakers in Bulgaria of Ethnic Bulgarian Origin"، در Journal Institute of Muslim Minority Affairs، ۲:۷ (جولائی ۱۹۸۶ء) ، ص ۵۰۳-۵۱۷).

ترکوں کی طرف سے مزاحمت و مخالفت کو سختی سے کچلنے کی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ انہیں ان کے گھروں سے نکال کر اندرون ملک مختلف علاقوں میں تتر بتر ہونے پر مجبور کیا گیا۔ جبکہ ان کے علاقوں ،دیہاتوں اور گھروں میں بلغاری النسل مسیحی باشندوں کو لا کر آباد کیا جانے لگا۔ جب ترکوں نے اس کی مزاحمت و مخالفت کی، اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور مختلف شہروں میں پر امن مظاہرے کیے تو حکومت نے ملک میں سے ان کے جبری اخراج کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ اس سال (۱۹۸۹ء) کے دوران میں تقریباً تین لاکھ پچاس ہزار ترک مسلمان بلغاریا سے ہجرت کر کے ہمسایہ ملک ترکی میں پناہ لینے پر مجبور ہوے۔ ترکی کی حکومت نے گو بلغاری ترکوں کو ملک میں پناہ دینے اور ان کی دیکھ بھال میں کسی جوش و جذبے کا مظاہرہ نہیں کیا، تاہم اس نے اس مسئلہ کی طرف عالمی رائے عامہ کی توجہ مبذول کرانے کی غرض سے سرگرم کردار ادا کیا (Jacques Waardenburg: "Politics and Religion in the Balkans"، ص۳۸۹؛ Frederick De Jong: "The Muslim Minorities in the Balkans"، ص۴۱۶؛ Elizabeth Pond: "Reinventing Bulgaria"، ص، ۴۳؛ Erik J.Zurcher: A Modern History: Turkey، لنڈن: آئی . بی . ٹاؤ رس، ۲۰۰۱ء، ص۳۳۳؛ "Outbreak of Bulgarian Chauvinism": The Balkans، در Impact International ، ۱۳:۱۹ (۹-۲۲ جون ۱۹۸۹ء)، ۱۴-۱۵؛ سید زین العابدین، "The Bulgarian Muslim Predicament In Retrospect"، ص، ۵۱-۵۴).

بلغاری حکومت کو مسلمان اقلیت کے خلاف ان کارروائیوں پر بین الاقوامی برادری خصوصاً انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں کے علاوہ اسلامی کانفرنس کی تنظیم کی طرف سے سخت تنقید و ملامت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ اس کو ۱۹۸۹ ء کے اواخر میں ترک تارکین وطن کی ایک بہت محدود تعداد کو اپنے گھروں کو واپس لوٹنے کی اجازت دینا پڑی (Jacques Waardenburg: "Politics and Religion in the Balkans"، ص ۳۸۹).

اثرات و نتائج: مسلمانوں کے جداگانہ اسلامی تشخص کو محو کرنے کی غرض سے بلغاروی حکومت کے یہ اقدامات ہرگز بے اثر نہ رہے۔ ان کی بدولت مسلمانوں میں دعوت و تبلیغ دین اور اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس جیسی سرگرمیاں انتہائی حد تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ چنانچہ ملک میں اسلامی مذہبی معلّمین و مدرسین اور ائمہ و خطبا کی تعداد میں کمی واقع ہوئی۔ مذہبی تعلیم و تدریس پر عائد قدغنوں کے سبب مسلمانوں کا اپنے آبائی مذہب اسلام سے رشتہ کمزور پڑتا گیا۔ چنانچہ عام مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں مذہبی اثر ونفوذ کو ضعف لاحق ہوا۔ مذہبی اعمال و رسوم کی بجا آوری خصوصاً نماز پنجگانہ و نماز جمعہ کے اہتمام کے رجحان میں کمزوری واقع ہوئی (علی امینوف: ص ۲۲۴-۲۲۵)۔ مساجد میں حاضری بہت کم رہ گئی۔ مسلمانوں کی اسلامی تہواروں میں دلچسپی بھی کم ہوگئی۔ ۱۹۴۵ء کے بعد سے کوئی بلغاری مسلمان حج کے لیے مکہ مکرمہ نہیں جاسکا۔ چنانچہ بیرون ملک مسلم دنیا سے بھی ان کے روابط منقطع ہوگئے۔ جس کے بہت منفی اثرات مرتب ہوئے۔ اشتراکی نظریۂ حیات و سائنسی اِلحاد کی یلغار سے مسلمانوں کی نوجوان نسل خاص طور سے متاثر ہوئی۔ وہ اپنے آبائی دین و عقیدہ

سے بڑی حد تک بیگانہ ہوگئی (The:Frederick De Jong" " Muslim Minorities in the Balkans، ص ۴۱۵-۴۱۶).

۱۹۸۰ء کی دہائی کے اختتام تک یوں محسوس ہوتا تھا کہ مسلمانانِ بلغاریا کی اکثریت کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسلام کو ایک زندہ قوت اور طاقت ور عامل کی حیثیت حاصل نہیں رہی۔ جب کہ بلغاروی حکومت اسلامی اعمال و رسوم کی روک تھام، اسلامی اداروں کو نیست و نابود کرنے اور مسلمانوں کی جداگانہ مذہبی اور تہذیبی و معاشرتی ہستی کے قلع و قمع میں بہت حد تک کامیاب ہوگئی ہے۔ چنانچہ اشتراکی حکمرانوں کو گمان لگا کہ اس ملک میں اسلام اپنی حالت دوبارہ نہیں سنبھل پائے گا (اشتراکی دور میں اسلام اور مسلمانوں کے مخالف بلغاری حکمرانوں کے اقدامات اور ان کے اثرات و نتائج کے بارے میں ملاحظہ ہو: Jacques "Politics and Religion in the :Waardenburg Balkans"، در Islamic Studies ، ۳۶:۲،۳ (۱۹۹۷ء)، ص ۳۸۸-۳۸۹).

سیاسی انقلاب اور اس کے اثرات: بلغاریا میں ۲۹ دسمبر ۱۹۸۹ء کو صدر زہیف کوف (Zhivkov) کو اقتدار سے علیحدہ کیے جانے اور اشتراکی نظام کے خاتمے پر مسلمانوں کے شدید ابتلا کا دور بھی ختم ہوگیا۔ لبرل و جمہوریت پسند ملادینوف (Mladenov) کی حکومت نے مسلمانوں کے بلغاروی قومیت میں جبری انجذاب کے بارے میں سابق دور کی پالیسی سے ترک تعلق کر لیا۔ ملک میں ایک جمہوری معاشرہ کے قیام کا وعدہ کیا اور اقلیتوں کو ان کے مذہبی اور شہری حقوق کے تحفظ کا یقین دلایا۔ جون ۱۹۹۰ء میں جنگ عظیم دوم کے بعد ملک میں پہلی بار کثیر جماعتی انتخابات ہوے۔ آزادانہ طور پر منتخب پارلیمنٹ نے گذشتہ کئی دہائیوں سے اختیار کیے گئے مسلم و ترک مخالف اقدامات کے خاتمے اور تمام مذاہب کے پیروؤں کو مذہبی آزادی کے حق میں رائے دی (علی امینوف : ص ۲۲۹)۔ بلغاروی پارلیمان نے ۱۹۹۱ء میں دستور میں بعض ترامیم کی منظوری دی جن کی رو سے تمام مذاہب کے پیروؤں کو مذہبی اعمال و رسوم کی ادائیگی و بجاآوری کے علاوہ اظہار رائے کی آزادی کی ضمانت دی گئی اور ہر مذہبی اقلیت کے لیے اپنی مذہبی و ثقافتی شناخت کے تحفظ کا حق تسلیم کیا گیا (علی امینوف : ص ۲۲۹؛ سید زین العابدین: "Minority :Majority Options" Crises" در حسین مطلب و تاج الاسلام ہاشمی (مدیران): Islam, Muslims and the Modern State، نیویارک:St Martin Press، ۱۹۹۴ء)، ص، ۳۱-۳۶).

احیائے اسلام: تاہم صدر زہیف کوف (Zhivkov) کی حکومت کے خاتمے (دسمبر ۱۹۸۹ء) پر اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی حالت بڑی تیزی سے تبدیل ہونا شروع ہوئی۔ بلغاریا میں سخت گیر اشتراکی دور کے خاتمے، اور جمہوریت کی طرف سفر مزیدبراں مسلمانوں کو اظہار رائے اور مذہبی آزادی کی دستوری و قانونی ضمانت یہ سب عوامل و محرکات ان میں احیائے اسلام کا سبب بنے۔ اس دور میں مسلمانوں کی مذہبی سرگرمیوں، اعمال و رسوم پر ۱۹۹۰ء سے قبل عائد کی گئی بہت سی قدغنیں ہٹا دی گئیں۔ چنانچہ ملک میں حقیقی معنوں میں احیائے اسلام کا دور شروع ہوا۔ چنانچہ اسلامی بیداری کے آثار واضح طور پر نظر آنے لگے۔ مساجد میں حاضری بڑھ گئی، گو کہ ان میں زیادہ تر بڑی عمر کے لوگ شامل تھے۔ مساجد نمازیوں سے بھرنے لگیں۔ مسلمانوں نے قدیم ویران و سنسان غیر آباد مساجد کی مرمت اور تزئین و آرائش کے علاوہ نئی مساجد تعمیر کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ سابق اشتراکی دور میں بند کیے گئے بہت سے اسکول اور مدارس پھر سے کھل گئے اور نئے اسلامی اسکول قائم ہوے۔ مسلمانوں کے بچوں کے لیے دینی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا۔ ۱۹۹۱ء کے آخر تک ایک اندازے کے مطابق تقریباً اسی ہزار مسلمان بچوں

نے ناظرہ قرآن حکیم پڑھنا سیکھا۔ مسلمانوں کو پرانی مساجد کی دیکھ بھال، ان کی مرمت اور تزئین و آرائش کے علاوہ نئی مساجد تعمیر کرنے کی اجازت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ سیکڑوں پرانی مساجد کی مرمت اور تزئین و آرائش کی گئی جبکہ نئی مساجد بھی تعمیر ہوئیں۔ ۱۹۸۹ء کے دوران میں ملک بھر میں بہت کم مساجد آباد تھیں جب کہ ۱۹۹۴ء کے اختتام تک تقریباً ۹۹۳ مساجد پوری طرح سے آباد ہوچکی تھیں۔ مساجد کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ جمہوری دور میں قرآن حکیم کے مطبوعہ نسخوں کی درآمد اور اشاعت و تقسیم پر پابندی بھی، جو اشتراکی دور میں لگائی گئی تھی، ہٹا لی گئی۔ چنانچہ اب ملک میں قرآن حکیم اور دیگر اسلامی علوم، حدیث، سیرت، فقہ پر مشتمل کتب دستیاب ہونے لگیں۔ قرآن حکیم کے ترک اور بلغاری زبان میں تراجم کے منصوبوں کا آغاز ہوا۔ (علی امینوف: *"Islam and Muslims in Bulgaria"*، ص ۲۲۷-۲۳۵)۔ بلغاریا میں ۱۹۹۷ء سے ترکی زبان میں جرائد و رسائل اور کتب بھی شائع ہونے لگی ہیں (Gyorgy Lederer: *"Islam in East Europe"*، در *Central Asian Survey*، ۲۰:۱ (۲۰۰۱ء)، ص ۲۰)۔ اسکولوں میں ترک مسلمانوں کے بچوں ترکی زبان کی تعلیم و تدریس، بطور اختیاری مضمون تدریس کی اجازت دی گئی۔ تاہم مسیحی عوام کی طرف سے شدید ردّعمل کا اظہار کیا گیا۔ طاقت ور اشتراکی عناصر کی طرف سے مسلمانوں کے حقوق کی بحالی کی سخت مخالفت کی گئی۔ ترکوں کے بارے میں نئی حکومت کی نرم روی پر مبنی پالیسی کے خلاف مظاہرے بھی ہوے (Ekuzaveth Pond: *"Reinventing Bulgaria"*، ص ۴۴)۔

داخلی مسائل: تاہم بلغاریا کے مسلمانوں کو ۱۹۸۹ء کے بعد سے دینی و سیاسی قیادت کے بحران کا سامنا رہا۔ قیادت کے لیے مختلف دھڑوں میں کشمکش بپا رہی۔ اشتراکی دور میں مسلمانوں کی مذہبی قیادت، مفتیوں، نائب مفتیوں اور ائمہ و خطبا کا تقرر حکومت کی طرف سے ہوتا تھا جو سراسر سیاسی و حکومتی مصالح کے تابع تھا۔ مذہبی عہدوں پر بالعموم حکومت کے وفادار اور اشتراکی نظریۂ حیات سے غیر متزلزل وابستگی رکھنے والے افراد مقرر کیے جاتے تھے، جو مسلمانوں کی نمائندگی کے بجائے کلیتاً حکومتی احکامات و خواہشات کے تابع رہ کر کام کرتے تھے۔ بالعموم حکومت کی اسلام اور مسلم دشمن پالیسیوں اور اقدامات کی تائید و حمایت کرتے تھے۔ انہیں مسلم عوام کا اعتماد ہرگز حاصل نہ تھا وہ اس سلسلہ میں اشتراکی دور کے مفتی اعظم ندیم غندزہیف (Nedim Gendzhev) کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے۔ ندیم غند زہیف نے صدر زہیف کوف کی مسلم دشمن پالیسیوں کی کھل کر حمایت کی تھی۔ ندیم غند زہیف کے حکومت نواز طرز فکر و عمل کو مسلمانوں نے سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ ۱۹۸۹-۱۹۹۱ء کے دوران میں مسلمان آبادی نے ندیم اور اس کے ساتھیوں کے خلاف زبردست مظاہرے کیے اور حکومت سے ان کی برطرفی کا پرزور مطالبہ کیا تاہم مفتی اعظم ندیم نئی حکومت کے اندر موجود طاقت ور اشتراکی عناصر کی حمایت کی بدولت مسلمان آبادی کی طرف سے شدید مخالفت اور احتجاجی مظاہروں کے باوجود اپنے جملہ ماتحت ساتھیوں سمیت ۱۹۹۲ء تک اپنے عہدوں پر مقرر رہے (علی امینوف: *"Islam and Muslim in Bulgaria"*، ص ۲۳۵؛ Gyorgy Lederer: *"Islam in East Europe"*، ص ۲۰)۔

۱۹۹۲ء میں بھی مسلمانوں نے ندیم کی قیادت کے خلاف شدید مظاہرے کیے اور حکومت سے ان کو مفتی اعظم کے عہدے سے ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ جس کے جواب میں حکومت نے ندیم کو ان کے عہدے سے معزول کر دیا اور مسلمانوں کو مفتی اعظم اور علاقائی و ضلعی مفتیوں کے انتخاب و تقرر کا اختیار دے دیا۔

مسلمانوں نے فکری صلی حسن (Fikri Sali Hasan) کو مفتی اعظم منتخب کیا۔ سابق مفتی اعظم ندیم، جسے اشتراکی عناصر (بلغاری اشتراکی جماعت) کی بھرپور حمایت حاصل تھی، نے فکری حسن کے انتخاب کو مسترد کر دیا۔ البتہ ستمبر ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۴ء کے دوران ملک میں پے در پے بننے والی دو حکومتوں نے مسلمانوں کی اس منتخب مذہبی قیادت کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا۔ تاہم ندیم غندزہیف نے بلغاری اشتراکی جماعت سرگرم تعاون و حمایت کی بدولت مسلمانوں کی جائز اور قانونی طور پر منتخب قیادت کو تسلیم کرنے کی بجائے صوفیا میں مفتی اعظم کے صدر دفتر کے علاوہ بعض علاقائی مفتیوں کے دفاتر پر بھی قبضہ کر لیا اور ان کو ان کے وظائف کی بجا آوری سے روک دیا۔ بلغاری اشتراکی جماعت کی تحریک پر مفتی ندیم نے اپنی ایک سیاسی جماعت بھی قائم کی (۱۹۹۴ء) اور دسمبر ۱۹۹۴ء کے پارلیمانی انتخابات میں حصہ لیا۔ انتخابات میں اشتراکی جماعت کی کامیابی پر نظامت مذہبی امور نے اپنے ۱۹۹۲ء کے فیصلے کو کالعدم قرار دے کر ندیم غندزہیف کو ان کے سابق عہدے پر بحال کر دیا۔ جنوری ۱۹۹۵ء کے بعد حکومت نے مسلمانوں کی قانونی و جائز طور پر منتخب سپریم کونسل برائے دینی امور کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ مسلمانوں نے مارچ ۱۹۹۵ء میں اپنے دینی و مذہبی امور میں حکومت کی صریح مداخلت پر احتجاجی مظاہرے کیے جو بے اثر رہے (علی امینوف: ص ۲۳۵؛ Gyorgy Lederer: "Islam in East Europe"، ص ۲۰-۲۱)۔

نئی اشتراکی حکومت مسلمانوں کو سیاسی طور پر کمزور کرنے کے لیے ان کی صفوں میں افتراق و انتشار اور دھڑے بندی کو ہوا دینے کی پالیسی پر عمل پیرا رہی۔ چنانچہ اس نے جائز اور قانونی طور پر مسلمانوں کی منتخب قیادت (مفتی اعظم، علاقائی مفتیوں، ائمہ مساجد اور سپریم کونسل برائے دینی امور) کے مقابلے میں قیادت کا ایک متوازی ڈھانچہ مفتی ندیم کی قیادت میں کھڑا کر دیا۔ اس سے مسلمانوں کے مذہبی امور کی تنظیم و تنسیق کا دوہرا نظام وجود میں آگیا اور حکومت کی حمایت یافتہ غیر نمائندہ مذہبی قیادت کے مقابلے میں جائز اور قانونی طور پر منتخب قیادت بے بس ہوگئی (علی امینوف: ص ۲۳۵-۲۳۶)۔

بلغاریہ میں ۱۹۹۶ء کے اواخر میں منعقدہ انتخابات میں لبرل و جمہوریت پسند سیاسی جماعت یو.ڈی.ایف. (Union of Democratic Forces) کو واضح اکثریت حاصل ہوئی اور اس کے قائد ستاؤیانوف (Stoyanov) صدر مقرر ہوے۔ جمہوری حکومت نے صریح طور پر سابق دور کے اشتراکی نیشنل ازم سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور ملک کی مسلم اقلیت کے بارے میں لچک اور نرم روی کا روّیہ اختیار کیا۔ صدر ستاؤیانوف نے ۱۹۹۷ء میں ترکی کے سرکارسرکاری دورے کے دوران میں بلغاروی ترکوں کے بارے میں سابق حکومتوں کے رویے پر معذرت طلب کی۔ آئندہ سال (۱۹۹۸ء میں) بلغاروی حکومت نے ترکی کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کیا اور اس کے ساتھ قدیم سرحدی تنازعات کو بھی سلجھا لیا۔ ۱۹۹۸ء میں دونوں ملکوں کے درمیان دو طرفہ آزادانہ تجارت کا معاہدہ ہوا (Elizabeth Pond: "Reinventing Bulgaria"، در The Washington Quarterly، ۲۲:۳ (۱۹۹۹ء)، ص۴۱-۴۵)۔

نئی حکومت نے مسلمانوں کے ساتھ نرم روی کا معاملہ کیا۔ نئی حکومت نے مسلم اقلیت کے بہت سے انسانی و شہری حقوق بحال کر دیے۔ مزیدبراں مسلمانوں کے دینی و تعلیمی امور کے نظم و نسق میں مداخلت کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اس نے سابق مفتی اعظم ندیم غندزہیف کی حمایت سے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ چنانچہ اذان، روزہ، ختنہ اور اسلامی طریقے پر تجہیز و تکفین، قرآن حکیم کے نسخوں کی تقسیم اور مذہبی تہواروں کے منانے

پر پابندی اٹھالی۔ مسلمانوں کو اپنے سابق اسلامی نام (عربی و ترکی) پھر سے اختیار کرنے، روایتی اسلامی لباس پہننے اور ترکی زبان میں اخبارات وجرائد اور کتب و رسائل کی اشاعت کی اجازت بھی دے دی گئی۔

کئی سال تک ملک میں دو مفتی اعظم، دو مذہبی امور کی کونسلیں (Supreme Theological Councils)، متوازی علاقائی مفتیوں اور ائمہ و خطبا کا نظم قائم رہنے کے بعد اگست ۱۹۹۷ء میں مفتی اعظم فکری صلی حسن اور ندیم غندزھیف کے درمیان ایک صلح نامہ طے پایا اور اسی سال اکتوبر (۱۹۹۷ء) ۳۵ سالہ نوجوان مصطفیٰ علیش (Mustafa Alish Hodzha) متفقہ طور پر بلغاری مسلمانوں کے مفتی اعظم منتخب و مقرر ہوے (Gyorgy Lederer: *"Islam in East Europe"*، ص ۲۱).

سیاسی سرگرمیاں: بلغاریا میں اشتراکی نظام کے خاتمہ اور لبرل و مسابقتی جمہوری نظام کے قیام کے بعد مسلم اقلیت ملک میں قائم نئی سیاسی جماعتوں کی توجہ کا مرکز بنی (انتخابی مقاصد سے)۔ خود مسلمان رہنما بھی انتخابی سیاست میں سرگرم عمل ہونے کے علاوہ سیاسی جماعتوں کی تنظیم و تشکیل کی طرف متوجہ ہوے۔ جون ۱۹۹۰ء میں ورنا میں احمد دوغان (Ahmad Dogan) نے، جو اشتراکی دور میں بلغاری قومیت کے احیا کی تحریک کے پرجوش مخالف رہے تھے، تحریکِ حقوق و آزادی (Movement of Rights and Freedom) کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی۔ اسے ترک مسلمانوں کی وسیع حمایت حاصل ہو گئی۔ اس کی مرکزی کونسل میں پوماق کو بھی نمائندگی دی گئی۔ ایک نائب صدر کا عہدہ ان کے لیے مختص کیا گیا۔ تحریکِ حقوق و آزادی نے اسلامی اسکولوں کے قیام اور قدیم مساجد کی مرمت جبکہ نئی مساجد کی تعمیر میں بڑا فعال کردار ادا کیا۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں اس نے ۵۴۰،۰۰۰ ووٹ حاصل کیے اور اس کے متعدد اراکین ۲۴۰ رکنی پارلیمنٹ میں پہنچے، حتیٰ کہ نئی حکومت کی تشکیل میں اس کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوگئی اور اس نے "بادشاہ گر" کا کردار ادا کیا۔ تاہم داخلی خلفشار و افتراق کے سبب اس کی مقبولیت میں بتدریج کمی ہوئی۔ البتہ جمہوری دور میں متعدد دیگر مسلم سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں۔ مذکورہ جماعت (MRF) کے ایک سابق رکن آدم کنعان (Adem Kenan) نے ایک نئی سیاسی جماعت ترک ڈیموکریٹک پارٹی (Turkish Democratic Party) کے نام سے قائم کی۔ یہ ایک سیکولر جماعت ہے جو بلغاریا کو ایک وفاقی ریاست بنانے اور ترک اکثریتی اضلاع کی خود مختاری کی علمبردار وخواہاں ہے۔ تاہم وفاقی ریاست کے قیام اور ترک اضلاع کی خود مختاری سے متعلق آدم کنعان کے مطالبات کو حکومت نے داخلی امن اور ملک کی وحدت و سالمیت کے منافی خیال کیا۔ چنانچہ حکومت نے اس جماعت کو قانونی طور پر تسلیم نہیں کیا۔ ایک ترک سیاسی جماعت محمد خواجہ (Mehmet Hodja) نے پارٹی آف ڈیموکریٹک چینجز (Party of Democratic Changes) کے نام سے قائم کی۔ یہ ایک علاقائی جماعت ہے، جس کو کرد جالی (Kardjali) کے ضلع میں، جو شمالی بلغاریا کا سب سے بڑا شہر ہے جہاں ترک مسلمانوں کی مؤثر تعداد آباد ہے، مؤثر حیثیت حاصل ہے۔ تاہم یہ جماعت ۱۹۹۴ء کے انتخابات میں ناکامی سے دو چار ہوئی۔ بلغاروی مسلمانوں کی متعدد دیگر علاقائی جماعتیں بھی موجود ہیں۔ ان میں اشتراکی دور کے مفتی اعظم ندیم غندزھیف (Nedim Gendzhev)، جو اشتراکی حکومت کے پر جوش حامی رہے، کی سیاسی جماعت ڈیموکریٹک پارٹی آف جسٹس (Democratic Party of Justice) بطور خاص قابل ذکر ہے۔ اس جماعت کا قیام بلغاریا کی اشتراکی

جماعت (Socialist Party of Bulgaria) کی تحریک اور تائید و حمایت سے عمل میں آیا۔ اس کے قیام کا مدعا و مقصد ملک میں قائم مسلم سیاسی جماعتوں کے اثرو نفوذ کو محدود کرنا تھا۔ اس جماعت کو شمال مشرقی بلغاریا کے مسلم اکثریتی ضلع شمن میں اثرو نفوذ حاصل ہے۔ اس نے ۱۹۹۴ء میں ۲۴ ہزار جبکہ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں ۲۷ ہزار ووٹ حاصل کیے۔ غرضیکہ بلغاریا میں ترک مسلمانوں کی قائم کردہ سیاسی جماعتوں میں سے احمد دوغان کی تحریکِ حقوق و آزادی کو افتراق و انتشار کے باوجود سب سے بڑی مسلم سیاسی جماعت کی حیثیت حاصل ہے۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں بلدیاتی اداروں اور مقامی حکومتوں کے انتخابات میں اسے ملک کی کل ۲۶۰ میونسپلٹیوں میں سے ۳۰ میں (مسلم علاقوں میں) اکثریت حاصل ہوئی، جبکہ وہ کل ۶۵ میونسپلٹیوں کے انتخابات پر اثر انداز ہوئی۔بلغاریا میں پوماق مسلمان، جو بالعموم ترک مسلمانوں سے الگ تھلگ دیہاتوں اور دور افتادہ پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں، انتخابات میں بلغاروی اشتراکی جماعت کی حمایت کرتے رہے۔ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں انہوں نے یونین آف ڈیموکریٹک فورسز کی حمایت کی۔ خانہ بدوش مسلمانوں میں بے روز گاری اور ناخواندگی کی شرح مسلمانوں کے دیگر گروہوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ یہ گروہ سیاسی اعتبار سے انتہائی غیر منظم ہے اور انتخابی سیاست سے لا تعلق رہتا ہے۔ خانہ بدوشوں کو سیاسی طور پر منظّم و متحرک کرنے میں احمد دوغان کی سیاسی جماعت کی کوششیں مؤثر ثابت نہیں ہوئیں، البتہ ۱۹۹۸ء میں خانہ بدوشوں کی ایک سیاسی جماعت یورو۔روما (Euro-roma) کے نام سے قائم ہوئی۔ جس کا مطمحِ نظر خانہ بدوش گروہ کے حقوق و مفادات کا تحفظ ہے (ملاحظہ ہو: Vladimir Chukov: *"Political Behaviour of the Bulgarian Muslim Community"*، در *ISIM Newsletter*، عدد ۴ (۱۹۹۹ء)، ص۲۶؛ Gyorgy Lederer: *"Islam in East Europe"*، در *Central Asian Survey*، ۱:۲۰ (۲۰۰۱ء) ، ص ۲۰-۲۱)۔

مشکلات و مسائل: جمہوری دورِ حکومت میں گو کہ مسلم اقلیت کے بعض مذہبی و شہری حقوق بحال ہوگئے ہیں تاہم اب بھی اسے گوناں گوں مشکلات و مسائل کا سامنا ہے، جن چند بڑے اہم مسائل کا بلغاری مسلمانوں کو سامنا ہے، ان میں اقتصادی و تعلیمی پس ماندگی سرفہرست ہیں۔ وہ اپنے دوسرے ہم وطنوں (مسیحیوں) کے مقابلے میں اقتصادی و تعلیمی اعتبار سے نہایت پس ماندہ ہیں۔ ان میں شرح خواندگی بہت کم ہے۔خصوصاً دینی تعلیم و تربیت کا کوئی موثر نظام موجود نہیں ہے۔ بلغاری حکام کی طرف سے مسلمانوں کی اعلیٰ دینی تعلیم کے نظام کا تار پود بکھیرنے کے سبب گذشتہ دہائیوں میں علما اور ائمہ و خطبا کی تعلیم بڑی کمزور رہی ہے۔ ۱۹۸۹ء کے بعد سے ملک میں احیاے اسلام (اسلامی بیداری) کی طاقت ور لہر اٹھی ہے اور مسلمانوں میں اپنے مذہب کی تعلیمات سے واقفیت کا احساس و شعور توانا ہوا ہے چنانچہ ملک میں چند اسلامی ثانوی اسکولوں کے قیام کے علاوہ دارالحکومت صوفیا میں بھی ایک دینی تعلیم کا ادارہ (Visshij Isljamski Institut) قائم ہوا ہے؛ تاہم وہاں سے سند فراغت پانے والے طلبا کی تعداد بہت تھوڑی رہی ہے۔ البتہ دینی تعلیم کے لیے طلبا بیرون ملک خصوصاً ترکی کا رخ کرنے لگے ہیں۔ گذشتہ سالوں میں ترکی کی حکومت نے بلغاریا میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کتابوں، نصابات کی تشکیل، اساتذہ کی فراہمی اور مالی امداد فراہم کرنے میں دلچسپی لی۔ تاہم ترکی کی سیکولر حکومت کے مقابلے ترکی کے بعض غیر سرکاری اسلامی اداروں خصوصاً نقشبندی اور قادری سلاسل اور مؤسسہ زمان (Zaman Foundation) کے

علاوہ جرمنی میں مقیم خوشحال ترک مسلمانوں (Milli Gorus) نے، جو بلقان میں آباد ترکوں کے مقابلے میں معاشی اعتبار سے خوشحال ہیں اور سیکولر ازم، لادینیت کے مخالف جبکہ راسخ العقیدہ و باعمل مسلمان ہیں بلغاریا کے مسلمانوں میں احیائے اسلام کے عمل میں زیادہ فعال رہے ہیں۔ جرمنی میں آباد ان ترکوں نے بلغاریا میں مساجد کی تعمیر میں خطیر رقوم صرف کی ہیں۔ بعض عرب حکومتوں اور غیر سرکاری تنظیموں کی طرف سے فراہم کردہ عطیہ جات بھی احیائے اسلام کے عمل میں مالی امداد کا موثر ذریعہ بنے تاہم بلغاریا میں عرب دعاۃ و مبلغین اور مسلمانوں کی سماجی بہبود کی سرگرمیوں میں مشغول غیر ملکی افراد کو مقامی صحافت اور حکام مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے رہے ہیں۔ ایران کی بنیادِ توحید (Tawhid Foundation)، بلغاریا کے شیعہ مسلمانوں کو جو خود کو علوی اور قزلباش کہلواتے ہیں اور کل مسلم آبادی کا صرف ۷٪ ہیں، مالی امداد بہم پہنچاتی رہی ہے (Gyorgy Lederer: "Islam in East Europe"، ص ۲۱)؛ بایں ہمہ ابھی اس میدان میں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کی نوجوان نسل کے دل و دماغ پر اشتراکی دور میں مرتب ہونے والے اثرات کلیتًا زائل نہیں ہوسکے ہیں۔ مسلمانوں کو اب بھی مسیحی مشنریوں کی طرف سے شدید چیلنج درپیش ہے۔ بلغاریا کے دستور کی دفعہ ۱۳ (۳) میں مشرقی آرتھوڈکس مسیحیت کو بلغاریا کا روایتی مذہب قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ مسیحی مشنریوں کی بڑی تعداد مسلمانوں کے دو گروہوں، پوماق اور خانہ بدوشوں کو جو اقتصادی و تعلیمی اعتبار سے بہت پس ماندہ ہیں، مسیحیت قبول کرانے کی کوششوں میں بڑی مستعدی سے مشغول ہے۔ آرتھوڈاکس کلیسا (چرچ) کے رہنما مسیحی آبادی میں مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمیوں کی سختی سے ممانعت کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں جب کہ وہ اپنے پادریوں کی، مسلمانوں میں مسیحیت کی تبلیغ کے لیے حوصلہ افزائی کرتے ہیں (علی امینوف: "Islam and Muslim in Bulgaria"، ۲۳۶).

مآخذ: متن میں مذکور ہیں.

(محمد ارشد)

••-------------••

بلال بن رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ: نبی اکرم ⊗ صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد علیہ اور قریبی صحابی حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام اور مؤذن و خازن و خادم و دربانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [آآ میں ان پر دیا گیا، مقالہ کمزور ہے لہٰذا تکملہ کے لیے شعبہ نے خصوصی طور پر یہ مقالہ تیار کرایا ہے (ادارہ)]

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد کا نام رباح اور والدہ کا نام حمامہ تھا (البلاذری: انساب الاشراف، ص ۱۸۴) اور ان کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ وہ ہجرت سے تینتالیس (۴۳) برس قبل تقریباً ۵۷۸ء میں مکہ مکرمہ اور یمن کے درمیان بمقام سراۃ میں پیدا ہوے۔

حضرت بلالؓ کے والدین کی زندگی غلامی میں گزری تھی اور انہوں نے بھی غلامی ہی میں آنکھ کھولی تھی۔ شروع میں وہ عبداللہ بن جدعان کے غلام تھے اور مکہ مکرمہ کے نواح میں اس کی بکریاں چرایا کرتے تھے (ابن الاثیر: الکامل فی التاریخ: ۴۵؛ تہذیب الاسماء واللغات: ص، ۱۳۶)۔

قبول اسلام : حضرت بلالؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو شروع ہی سے قبول کر لیا تھا۔ انہیں ان سات خوش نصیب افراد میں شمار کیا جاتا ہے، جنہوں نے اسلام کے ابتدائی ایام میں صدقِ دل سے دائرۂ اسلام میں قدم رکھا تھا۔ مؤرخین لکھتے ہیں: سب سے پہلے جن افراد نے اسلام

قبول کیا وہ سات تھے: یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ، حضرت بلالؓ، خبابؓ، صہیبؓ، عمارؓ اور ان کی والدہ سمیہؓ، رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، [یہ روایت محل نظر ہے۔ اس لیے کہ اس فہرست میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کے اسماے گرامی شامل نہیں۔ اس لیے اس روایت سے حضرت بلالؓ کی ابتدائی ایام میں قبول اسلام کی سعادت کا تو پتہ چلتا ہے۔ تاہم متعین طور پر ان کے قبول اسلام کے درجہ شمار کا علم نہیں ہوتا] بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ان کے چچا ابوطالب نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا [حضرت ابوبکرؓ بھی اپنے قبیلے کی بنا پر محفوظ رہے] اور باقی ماندہ افراد قریش کے ہتھے چڑھ گئے۔ انہیں لوہے کی زرہیں پہنا کر چلچلاتی دھوپ میں کھڑا کیا جاتا تھا اور ان پر اتنا ظلم ڈھایا جاتا جو انسانی قوت برداشت سے باہر تھا۔ ابوجہل نے حضرت سمیہؓ کو نیزے کا بھرپور وار کر کے شہید کر دیا تھا۔ وہ اسلام میں شہادت پانے والی پہلی خاتون ٹھہریں۔ رہے حضرت بلالؓ تو کفار ان کے گلے میں رسی ڈال کر لڑکوں کے حوالے کر دیتے اور وہ انہیں مکہ مکرمہ کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے تھے۔ اس ناقابل برداشت اذیت کے عالم میں بھی ان کی زبان سے "احد احد" کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کی اس مظلومیت کو دیکھ کر انہیں خرید کر آزاد کر دیا (دیکھیے ابن سعد: الطبقات الکبریٰ، ۳: ۱۶۹؛ ابن الجوزی: المنتظم فی تاریخ الملوک الامم: ۶۹۸)۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت بلالؓ نے شروع میں اپنے اسلام کو لوگوں سے مخفی رکھا، لیکن وہ اس عظیم نعمت کو زیادہ عرصہ تک نہ چھپا سکے، رفتہ رفتہ ان کے طرز عمل سے ظاہر ہوگیا کہ انہوں نے آبائی دین کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لیا ہے۔ وہ ایک دن بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے، اسی اثنا میں ان کا گزر بتوں کی ایک قطار کے پاس سے ہوا تو نفرت سے ان پر تھوک دیا اور کہنے لگے "خاب وخسر من عبدکن" (جو تمہیں پوجتا ہے وہ خائب و خاسر ہوا)۔ قریش نے ان کی یہ "حرکت" دیکھ لی جو ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے بلالؓ کو پکڑنا چاہا، لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آئے، اور اپنے آقا (عبداللہ بن جدعان) کے گھر میں جا چھپے۔ لوگوں نے عبداللہ کے گھر پر ہلہ بول دیا۔ عبداللہ باہر نکلا تو انہوں نے اس سے پوچھا "اصبوت" (کیا تو بھی صابی ہوگیا ہے؟") اس نے جواب دیا "کیا مجھ جیسے شخص سے یہ سوال کیاجارہا ہے (کہ تو صابی ہوگیا ہے) اگر ایسا ہوا ہو تو میں لات اور عزیٰ کے نام پر سو اونٹ ذبح کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ تیرے کالے(غلام) نے آج یہ حرکت کی ہے۔ چنانچہ حضرت بلالؓ کو باہر لایا گیا۔ عبداللہ نے ابوجہل اور امیہ بن خلف (جمحی) سے کہا کہ یہ غلام تمہارے سپرد کرتا ہوں تم جو سلوک مناسب سمجھو اس کے ساتھ روا رکھو (حلبی: السیرۃ الحلبیہ ۱: ۵۳۳؛ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی: سیرت بلال، ص ۱۰۔۲۱) [اس طرح حضرت بلالؓ امیہ بن خلف جمحی کی غلامی اور تسلط میں آگئے]۔

امیہ بن خلف کی غلامی میں آنے کے بعد حضرت بلالؓ پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ عین اس وقت جب سورج آگ برسا رہا ہوتا اور زمین تابنے کی طرح تپ رہی ہوتی انہیں شہر سے باہر لے جایا جاتا اور دہکتے ہوئے سنگ ریزوں پر پیٹھ کے بل گرا کر سینے پر بھاری بھرکم پتھر رکھ دیئے جاتے اور پھر ان سے کہا جاتا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کا انکار کر دے، لات اور عزیٰ کی عبادت کر، ورنہ تو اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ جواباً حضرت بلالؓ "احد احد" کا ورد کرتے رہتے۔

حضرت بلالؓ پر جو مظالم ڈھائے جا رہے تھے لوگ انہیں دیکھتے اور مہر بہ لب رہتے تھے کسی میں ہمت نہیں تھی کہ بڑھ کر ظالموں کے ہاتھ پکڑتا اور انہیں نجات دلاتا۔

حضرت عمرؓ بن العاص کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میرا گزر اس جگہ سے ہوا جہاں غضب کی دھوپ میں بلالؓ پر مشق ستم ہو رہی تھی۔وہ مقام اس قدر گرم تھا کہ اگر وہاں (بلامبالغہ) گوشت کا کوئی ٹکڑا رکھا جاتا تو وہ بھی جل جاتا۔ اس عالم میں بھی بلالؓ کہے جارہا تھا "میں لات اور عزیٰ کا منکر ہوں"۔ یہ سن کر امیہ مارے غصے کے آگ بگولا ہوگیا اور اپنے تشدد میں اضافہ کر دیا۔ اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور لگا اس کا گلا دبانے اور اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک وہ بے ہوش نہیں ہوگیا (البلاذری: انساب الاشراف ، ۱: ۱۸۵)۔ حضرت حسانؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ میں ایک بار حج (یا عمرہ) کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ گیا تو میں نے حضرت بلالؓ کو ایک لمبی رسی کے ساتھ بندھا ہوا پایا۔ لڑکے اسے گھسیٹ رہے تھے۔ اس حال میں بھی اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے "احد احد" میں لات، عزیٰ، ہبل، اساف اور نائلہ کو نہیں مانتا" اس پر امیہ اسے تپتی ہوئی ریت پر گراتا تھا۔ (حوالۂ مذکور)۔ کبھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر بھی اس مقام سے ہوتا تھا، جہاں حضرت بلالؓ پر مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ آپؐ انہیں صبر کی تلقین کرتے اور ارشاد فرماتے "ینجیك الله" اللہ ہی (اس عذاب سے) مجھے نجات دلائے گا (قرطبی: الجامع الاحکام القرآن ، تفسیر، سورۃ اللیل)۔

جب اُمیہ کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو تلقین کی کہ وہ اس مظلوم کو امیہ کے پنجہ استبداد سے رہائی دلائیں۔

چنانچہ ایک دن حضرت ابوبکرؓ وہاں جا پہنچے جہاں امیہ حضرت بلالؓ پر مظالم ڈھا رہا تھا جسے دیکھ کر ان کا دل بھر آیا۔ امیہ سے کہنے لگے کیا تو اس مسکین کے حق میں اللہ عزوجل سے نہیں ڈرتا؟ آخر کب تک تو اسے یونہی سزا دیتا رہے گا؟ امیہ پھٹ پڑا۔ کہنے لگا "تو نے ہی اسے بگاڑا ہے۔ اگر تجھے اس پر زیادہ ترس آتا ہے تو اسے چھڑالے"۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا "میں ایسا ہی کروں گا۔ میرے پاس ایک حبشی غلام ہے جو اس (بلال) سے زیادہ مضبوط اور زیادہ طاقت ور ہے وہ ہے بھی تیرا ہم مذہب، تو ایسا کر کہ وہ غلام مجھ سے لے لے اور اس کے عوض یہ غلام مجھے دے دے"۔ امیہ نے یہ سودا قبول کر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنا قیمتی غلام اسے دے کر حضرت بلالؓ کو اس سے خرید لیا اور انہیں فی سبیل اللہ آزاد کر دیا (الذہبی: سیراعلام النبلاء ، ۱: ۳۵۲؛ ابن الجوزی: صفۃ الصفوۃ، ۱: ۴۳۶)۔ حضرت ابوبکرؓ حضرت بلالؓ کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوے اور عرض کیا کہ میں نے بلالؓ کو خرید لیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے ابوبکر! مجھے بھی اس معاملے میں شریک کر لو۔ انہوں نے جواب دیا۔ یا رسول اللہؐ! اب تو میں اسے آزاد کرچکا ہوں (ابن الجوزی، المنتظم فی تاریخ الملوک والامم، ۴: ۲۹۸؛ ابن منظور: مختصر تاریخ دمشق، ۵: ۲۵۶)۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنا دس ہزار درہم مالیت کا قیمتی غلام دے کر حضرت بلالؓ کو رہا کرایا تھا۔ اس (بظاہر) خسارے کے سودے پر لوگ حیران ہوے اور انہوں نے طرح طرح کی باتیں کیں، کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ بلالؓ نے ابوبکرؓ پر کوئی احسان کیا ہوگا جس کا بدلہ ابوبکرؓ نے یوں چکایا ہے کہ اسے گراں قیمت پر خرید کر آزاد کر دیا۔ تفسیری روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے سورۃ "اللیل" میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کے اسی اقدام کی تعریف کی ہے

(الواحدی: اسباب النزول، ص ۲۰۶).

۳۔ مؤاخات: آزادی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کا رشتہ مواخات قائم کر دیا تھا۔ جس شخصیت کو ان کا دینی بھائی بنایا گیا، اس کی تعیین میں قدرے اختلاف ہے۔ مؤرخین نے مختلف نام لکھے ہیں، متعدد روایتوں کو جمع کرنے سے حسب ذیل پانچ نام سامنے آئے ہیں :

۱۔ عبیدہؓ بن الحارث؛ ۲۔ابوعبیدہؓ بن الجراح؛ ۳۔ابوذر غفاریؓ؛ ۴۔ ابورویحہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن خثعمی، ۵۔ابوزرعہ خثعمی (البلاذری: انساب الاشراف، ۱:۱۸۷؛ ابو جعفر ہاشمی: کتاب المحبر ۶،۱: ۳)۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے درمیان دو دفعہ رشتہ مواخات قائم کیا تھا۔ پہلی بار مکہ مکرمہ میں (ہجرت سے قبل) اور دوسری دفعہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں۔ بعض مؤرخین نے اسے ایک ہی مواخات سمجھا ہے اور روایات میں منقول مختلف ناموں میں سے کسی ایک آدھ نام کو ترجیح دے کر باقی ناموں کو رد کر دیا ہے۔ اس کے برعکس محتاط مؤرخین نے ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد قائم ہونے والے رشتہ ہائے مواخات کو الگ الگ بیان کر کے حضرت بلالؓ کے دو دینی بھائیوں کی تعیین کر دی ہے، چنانچہ علامہ ابن قیم الجوزیہ لکھتے ہیں: آپؐ نے اپنے اصحاب کے درمیان دو دفعہ مؤاخات قائم کی۔ انہوں نے ہجرت سے قبل حق اور ہمدردی کی بنیاد پر مہاجرین کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔ یہ مؤاخات ابوبکرؓ اور عمرؓ کے درمیان اور عبیدہؓ بن حارث اور بلالؓ کے درمیان قائم فرمائی اور دوسری دفعہ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد انسؓ بن مالک کے گھر میں مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا (ابن قیم: زادالمعاد، ۳: ۳۷۷۔ ۳۷۸)۔

علامہ نورالدین حلبی لکھتے ہیں: یہ بات مشہور و معروف ہے کہ مواخات دو دفعہ ہوئی، ایک دفعہ ہجرت سے پہلے مہاجرین کے درمیان اور دوسری دفعہ ہجرت کے بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان (حقیقت حال) اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جانتا ہے (سیرت حلبیہ : ۲،۱۲۴، ۱۲۵)۔

۴۔ خدمات: حضرت سیدنا بلالؓ نے آزادی کے بعد اپنی زندگی اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ سفر وحضر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے اور انہیں ہر طرح کا آرام پہنچانے کے لیے ہر وقت مصروف عمل رہا کرتے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہائش گاہ کے دربان کے فرائض بھی سنبھال لیے۔ وہ کسی کو بغیر اجازت لیے اور بغیر تحقیق کیے اندر داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ بن خطاب اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر ہوے تو دروازہ بند تھا اور نگرانی پر حضرت بلالؓ مامور تھے۔ انہوں نے اس وقت تک دروازہ نہیں کھولا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت نہیں فرمائی (سیرت حلبیہ، ۱:۴۷۶)۔

ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو صدقہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی بیوی زینبؓ صدقہ کے مصارف کی وضاحت کے لیے آپؐ کے گھر گئی تو دیکھا کہ دروازے پرایک انصاری عورت کھڑی ہے۔ اس کا مسئلہ بھی یہی تھا۔ دونوں نے دستک دی حضرت بلالؓ باہر آئے، دونوں کے مسائل سنے پھر اندر جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انہیں بیان کیا۔ آپؐ نے جو جواب عنایت فرمایا وہ باہر آکر ان عورتوں کو بتا دیا (مسلم بن الحجاج القشیری: الجامع الصحیح، کتاب الزکوٰۃ باب فضل النفقہ علی الاقربین)۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ

حضرت بلالؓ کاشانہ نبوت کے مستقل دربان تھے۔

۵۔ ہجرت : اہل ایمان پر مشرکین مکہ کا ظلم و تشدد ناقابل برداشت ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جانثاروں کو ہجرت کی اجازت عطا فرمائی، چنانچہ پہلے کچھ لوگوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی پھر دوسری بار متعدد افراد نے مدینہ منورہ کا رُخ کیا۔ حضرت بلالؓ بھی بارگاہ نبوت سے اجازت لے کر عازم مدینہ ہوئے۔ حضرت براءؓ بن عازب کا بیان ہے کہ (ابن سعد، الطبقات الکبری، ۱: ۲۳۴)

سب سے پہلے جو لوگ (ہجرت کر کے) ہمارے پاس پہنچے وہ مصعبؓ بن عمیرؓ اور ابن ام مکتومؓ تھے۔ انہوں نے (یہاں پہنچ کر) لوگوں کو (قرآن) پڑھانا شروع کردیا۔ پھر بلالؓ، سعدؓ (ابن ابی وقاص) اور عمارؓ بن یاسر (ہجرت کر کے) آئے۔ پھر عمرؓ بن خطاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیس صحابہ کے ساتھ آگئے۔ پھر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (بنفس نفیس) تشریف لے آئے۔ آپؐ کی آمد پر میں نے مدینہ کے باشندوں کو جتنا خوش و خرم دیکھا اتناکسی اور معاملے پر خوش ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا (محمد بن اسماعیل: صحیح بخاری ،۱: باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینۃ (نیز ابن سعد۔ طبقات، ۱/۲۳۴)۔

حضرت بلالؓ کو شروع میں مدینہ کی آب و ہوا راس نہ آئی، بلکہ وہاں پہنچتے ہی بخار میں مبتلا ہوگئے۔ جب بیماری میں کچھ افاقہ محسوس کرتے تو اشعار گنگنانے لگتے تھے۔ جن کا مفہوم یہ ہے: اے کاش کیا میں کبھی اس وادی میں رات بسر کر سکوں گا، جہاں میرے اردگرد اذخر اور جلیل (دو قسم کے گھاس، جو مکہ میں پیدا ہوتے ہیں) کا سبزہ زار ہو؟ کیا مجھے کسی دن مجنہ (جگہ کا نام) کے چشموں پر جانا نصیب ہوگا؟ اور کیا کبھی شامہ اور طفیل (مقام) مجھے اپنی جھلک دکھائیں گے؟۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ان کی اور حضرت ابوبکرؓ کی عیادت کرتیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی بیماری کے بارے میں معلومات فراہم کرتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حق میں (بشمول تمام مریض مہاجرین) دعا فرماتے۔ "اے اللہ تو ہمارے لیے مدینے (کی فضا) کو مرغوب بنا جیسا کہ ہمیں مکہ محبوب تھا یا اس سے بھی زیادہ محبوب اس شہر (مدینہ) کو (بیماریوں سے) پاک کر دے۔ یہاں کے صاع اور مد [ناپ تول کے پیمانے] میں برکت ڈال۔ یہاں کے بخار کو جحفہ [ایک مقام کا نام] کی طرف منتقل فرما۔ (البخاری: الجامع الصحیح، ۱، باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی المدینۃ)"۔

اذان: مدینہ منورہ میں آنے کے بعد ، ابتدائی ایام میں نماز کے لیے بلانے کا کوئی طریقہ موجود نہ ہونے کی بنا پر لوگوں کو دقت پیش آتی تھی۔ [رکّ بہ اذان] پھر جب حضرت عبداللہؓ بن زید بن عبدربہ کو خواب میں اذان سکھائی گئی اور انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا خواب سنایا تو رسول اللہ اکرمؐ نے اسے بہت پسند فرمایا اور فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے "اٹھو اور بلال کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اسے یہ(اذان کے) الفاظ بتاتے جاؤ اور وہ انہیں پکار کر اعلان کرے، کیونکہ اس کی آواز تم سے زیادہ بلند ہے۔" اس طرح حضرت بلالؓ کو مدینہ منورہ میں اذان کے آغاز کی سعادت اور اوّلین مؤذن نبوی کا شرف حاصل ہوا (سلیمان بن اشعث: سنن ابی داؤد، باب بدء الاذان، باب کیف الاذان؛ محمد بن عیسیٰ، جامع ترمذی، باب ماجاء فی بدء الاذان)۔ سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب اذان سے فارغ ہو لیتے تو نماز کی اطلاع دینے کے لیے بارگاہ نبوت میں حاضر ہوتے اور نہایت ادب سے عرض کرتے "حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح، یارسول

اللہ!" (البلاذری: انساب الاشراف، ۱:۱۸۷)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کے دوران میں ایک دن حضرت بلالؓ نماز کی اطلاع کے لیے حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا ابو بکر کو کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں (محمد بن اسماعیل البخاری: باب من سمع الناس تکبیر الناس تکبیر الامام، و باب الرجل یاتم بالامام ویاتم الناس الماموم)۔

دورِ نبوت میں حضرت بلالؓ مسجد نبویؐ میں پانچوں نمازوں اور جمعہ کی اذان و اقامت پر مامور تھے۔ اس مقدس زمانے میں صبح کی دو اذانیں ہوتی تھیں۔ پہلی اذان سحر، یہ حضرت بلالؓ کے ذمہ تھی، دوسری اذان فجر، اس کے لیے نابینا صحابی ابن مکتومؓ مقرر تھے۔ تاہم سفر کے دوران میں (اور کبھی کبھار حضر میں بھی) صبح صادق کی اذان بھی حضرت بلالؓ دیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذان بلال تم میں سے کسی کو سحری کھانے سے نہ روکے کیونکہ وہ رات (سحر) کے وقت اذان دیتے ہیں، تاکہ عبادت کرنے والے کو لوٹا دیں اور سونے والے کو جگا دیں (البخاری، باب الاذان قبل الفجر)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک بلال رات (سحر) کے وقت اذان دیتے ہیں، تم اس وقت تک کھا پی لیا کرو، جب تک ابن ام مکتومؓ اذان نہ دیں۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ صحابی نابینا تھے وہ اس وقت تک اذان نہیں دیتے تھے جب تک انہیں بتایا نہ جاتا کہ پو پھٹ چکی ہے (البخاری)۔

غزوات میں شرکت: سیدنا حضرت بلالؓ نے غزوۂ بدر واحد سے لے کر غزوۂ تبوک تک ہر معرکے میں بھرپور حصہ لیا۔ غزوۂ بدر میں حضرت بلالؓ کا سابق آقا امیہ بن خلف اپنے دوستوں کی ذلت آمیز ہلاکت پر سخت سراسیمہ ہوا اور اپنی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو اپنا ایک باہمی معاہدہ یاد کرا کے پناہ دینے کی التجا کی۔ موصوف اسے ہمراہ لے کر ایک پہاڑ کی طرف چل دیئے کہ اچانک حضرت بلالؓ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ چلا کر کہا اے اللہ کے مددگارو! یہ رہا کفر کا سرغنہ امیہ بن خلف، اگر یہ بچ نکلا تو میری خیر نہیں۔ انہوں نے بلند آواز سے انصار کو پکارا، دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے لوگ جمع ہوگئے اور مل کر امیہ پر حملہ کر دیا۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی پناہ تارِ عنکبوت ثابت ہوئی بہت جلد ظالم اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ بعض مؤرخین نے تصریح کی ہے کہ وہ حضرت بلالؓ کے ہاتھوں جہنم رسید ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا: اے بلالؓ مبارک ہو! خدائے رحمان تیرے لیے بھلائی میں اضافہ کرے، تو نے (دشمن سے) اپنا انتقام لے لیا ہے (البلاذری: انساب الاشراف، ۱:۱۹۱، ۱۹۳؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ۲: ۲۸۵)۔

غزوۂ اُحد وحمراء الاسد: حضرت بلالؓ نے غزوۂ احد میں بھی شرکت کی اور دشمنوں کے خلاف جانثاری اور شجاعت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس غزوہ میں ستر (۷۰) مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ جب کہ سیکڑوں زخمی ہوئے۔ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دو دندان مبارک شہید ہوئے۔ دشمن نے اپنی اس جزوی کامیابی سے یہ سمجھا کہ اس کو مکمل فتح حاصل ہوگئی ہے اور انہوں نے جنگ بدر کا انتقام لے لیا ہے۔ چنانچہ ابوسفیان نے اپنی فوج کو مکہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ جب یہ لوگ مقام روحاء پر پہنچے تو انہیں احساس ہوا کہ ان کی فتح ادھوری رہ گئی ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی فتح کی تکمیل کے لیے مدینہ منورہ پر دوبارہ حملہ کرنے کی

منصوبہ بندی کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اندیشہ تھا کہ دشمن اپنی مار دھاڑ کے بعد شہر پر دھاوا بول دے گا۔ دوسرے دن آپؐ کو دشمن کے نئے عزائم کا علم ہوا تو آپؐ نے اسی وقت ان کا تعاقب کرنے کا فیصلہ صادر فرمایا: مؤرخین لکھتے ہیں: ''آپؐ نے حضرت بلالؓ کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں دشمن کا تعاقب کرنے کا حکم دیتے ہیں اور یہ کہ ہمارے ساتھ وہی لوگ نکلیں جنہوں نے کل کی معرکہ آرائی میں حصہ لیا تھا۔'' مسلمان اگرچہ تھکے ہارے اور زخموں سے چور تھے، لیکن انہوں نے حضرت بلالؓ کی زبان سے کیے گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان پر لبیک کہا۔ ستر (۷۰) مجاہد اس تعاقب کے لیے تیار ہوگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی معیت میں مدینہ منورہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر حمراء الاسد کے مقام تک دشمن کا تعاقب کیا۔ ابوسفیانؓ کو اس تعاقب کی اطلاع ملی تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے مدینہ منورہ پر دوبارہ فوج کشی کا ارادہ ترک کر دیا اور مکہ مکرمہ کی طرف کوچ کرنے ہی میں عافیت سمجھی (البخاری، باب الذین استجابو؛ الواقدی: کتاب المغازی، ۱: ۳۳۴)۔ غزوۂ بنو نضیر میں، جو ربیع الاوّل ۴ھ میں پیش آیا۔ حضرت بلالؓ نے صبح کی نماز کے لیے اذان کہی، جس سے مطلع ہو کر ایک یہودی (غزول) نے آپؐ کے خیمے پر تیر برسائے، جس پر آپؐ کے خیمہ کی جگہ بدل دی گئی۔

غزوۂ احزاب (خندق): [رکّ بہ خندق] ۵ ہجری میں یہودیوں کی انگیخت پر عرب کے متعدد قبائل نے ابوسفیان کی سربراہی میں مدینہ منورہ پر یلغار کر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کھدوا کر اپنا دفاع کیا۔ (البخاری، باب قضاء الصلوت ، الاول فالاول، وباب غزوۃ الخندق وھی الاحزاب: مسلم ، باب التغلیظ فی تفویت صلاۃ العصر)۔ غزوۂ خندق کے متصل بنی قریظہ کے خلاف جنگ لڑی گئی، سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے حضرت بلالؓ کو مجاہدین کی طرف بھیجا، انہوں نے وہاں جا کر اعلان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں حکم دیا ہے کہ عصر کی نماز بنی قریظہ کے ہاں جا کر پڑھو۔ یہودیوں کے اس قبیلے کا محاصرہ کیا گیا۔ پچیس دنوں کے بعد انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ آخر کار تورات کے قانون کی روشنی میں ان کے خلاف کارروائی کی گئی۔ اگر وہ لوگ صدق دل سے اسلام قبول کر لیتے تو اس سنگین سزا سے بچ جاتے (الواقدی: المغازی، ۲: ۴۹۷؛ ابن سعد: الطبقات الکبری ۲: ۷۴)۔

غزوۂ خیبر: ۷ ہجری کے اوائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کا رخ کیا۔ یہ مقام یہودیوں کا گڑھ اور اسلام کے خلاف سازشوں کا مرکز تھا۔ اب وقت آگیا تھا کہ ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جاتی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر چڑھائی کی وہ لوگ قلعہ بند ہوگئے۔ مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا اور یکے بعد دیگرے سب قلعے فتح کر لیے۔ مالِ غنیمت میں یہودی سردار حیی بن اخطب کی بیٹی صفیہ آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ اسے سواری تک چھوڑ آؤ۔ وہ اسے لے کر اس مقام سے گزرے جہاں یہودیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرز عمل کو پسند نہ کیا اور فرمایا۔ اے بلال! کیا تیرے رحمت کے جذبات ختم ہوگئے ہیں؟ (الواقدی، کتاب المغازی، ۲: ۶۷۶؛ ابن قیم الجوزیۃ، زادالمعاد، ۳: ۳۲۷)۔

فتح مکہ مکرمہ: رمضان ۸ ہجری میں رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ کی طرف پیش قدمی کی۔ دشمن نے معمولی سی مزاحمت کی جو بہت جلد ختم کر دی گئی۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑے بغیر بڑی آسانی سے شہر فتح کر لیا۔ بیت اللہ میں تشریف لائے اور اسے بتوں کی آلائش سے پاک کیا۔ حضرت بلالؓ کو اس کی چابی لانے کے لیے بھیجا۔ وہ عثمان بن طلحہ (کلید بردار کعبہ) سے چابی لے آئے۔ کعبہ کا دروازہ کھولا گیا۔ آپؐ اندر داخل ہوئے، بلالؓ، اسامہؓ بن زید اور عثمانؓ بن طلحہ بھی آپؐ کے ساتھ اندر چلے گئے۔ آپؐ نے پانی منگوایا اور دیواروں پر انبیاے کرام کی بنی ہوئی تصویریں مٹا ڈالیں۔ اس کے بعد کعبہ کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ آپؐ نے نوافل ادا کیے اور اچھا خاصا وقت گزارا۔ جب باہر تشریف لائے تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ لپک کر آگے بڑھے اور حضرت بلالؓ سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے اندر نماز پڑھی ہے؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ نماز کا مقام پوچھا گیا تو انہوں نے اشارے سے وہ جگہ بتائی جہاں نوافل پڑھے گئے تھے (البخاری، باب اغلاق البیت، و باب الصلاۃ فی الکعبہ، وباب این رکز النبی صلی اللہ علیہ وسلم الرایۃ یوم الفتح، و باب دخول النبیؐ من اعلیٰ مکۃ: مسلم وباب استحباب دخول الکعبۃ وغیرہ، الموطا، ۱: ۳۹۸)۔

اذان بر سقف کعبہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ سے باہر تشریف لائے تو ظہر کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ آپؐ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ کعبہ کی چھت پر چڑھ جاؤ اور اذان دو۔ انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی، چھت پر چڑھے اوراپنی دلکش آواز میں اذان دینا شروع کی۔ دوسری طرف جہالت کے علمبردار مارے غصے کے پیچ و تاب کھا رہے تھے ان کی نظر میں ایک کالے کلوٹے، غلام ابن غلام کا اللہ کے گھر کی چھت پر چڑھنا ایک بہت بڑا سانحہ اور بہت بڑی گستاخی تھی۔ بیت اللہ کی یہ ''توہین'' ان کے لیے ناقابل برداشت تھی، عتاب بن اسید کہنے لگا ''اللہ نے میرے باپ (اسید) پر کرم کیا کہ اسے اس غلام کی اذان سننے سے پہلے اٹھا لیا ہے''۔ فرزند ابوجہل بولا ''رباح کا بیٹا کعبہ پر''؟ حارث نے لاف زنی کی ''کاش میں اس دن سے پہلے مر گیا ہوتا اور کعبہ پر بلالؓ کی آواز نہ سنتا''۔ حکم بن ابی العاص نے لب کشائی کی ''اللہ کی قسم! بنی جمح کے غلام کا اس طرح چیخنا ایک بہت بڑا حادثہ ہے''۔ ابوسفیان گویا ہوا ''اللہ کی قسم میں کچھ نہیں کہتا۔ اگر کچھ کہوں گا تو یہ کنکریاں اسے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو) سب کچھ بتا دیں گی''۔ اسی اثنا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے آئے جہاں یہ باتیں بنائی جارہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے جو کچھ کہا ہے وہ میرے علم میں آچکا ہے۔ آپؐ کی اس اطلاع پر سب آوازے کسنے والے لوگ نادم ہوے۔ حارث اور عتاب پکار اٹھے۔ ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں'' (القرطبی: الجامع، سورۂ الحجرات آیت، ۱۳؛ ابن سعد: الطبقات، ۳: ۲۳۴؛ الواقدی: المغازی، ۲: ۷۳۷،۸۳۸،۸۴۶)۔

اموال غنیمت: غزوات میں دشمنوں کے اموال اور غنائم مسلمانوں کے ہاتھ آتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت بلالؓ کو حکم دیتے کہ اعلان کر دو کہ جس کے ہاتھ دشمن کی کوئی چیز آئی ہو، وہ اسے جمع کرا دے۔ حضرت بلالؓ گھوم پھر کر مجاہدین میں یہ اعلان کرتے اور لوگ جو کچھ پاتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کر دیتے۔ پھر آپؐ اس مال کو اللہ کے قانون کے مطابق تقسیم کیا کرتے تھے۔ ایک غزوہ کے موقع پر آپؐ مال غنیمت تقسیم کرچکے تھے کہ ایک شخص بالوں کی بنی ہوئی ایک رسی (غالبًا اونٹ کی مہار) لایا اور عرض کیا ''اے اللہ کے رسول! یہ مہار

ہے جو ہمیں مال غنیمت میں ملی ہے"۔ آپؐ نے اس سے پوچھا "کیا تو نے بلالؓ کا اعلان سنا تھا؟" اس نے جواب دیا "جی ہاں" آپؐ نے پھر پوچھا "اسے اسی وقت لے آنے میں تجھے کوئی رکاوٹ پیش آئی تھی؟" اس نے معذرت کی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا "اب اسے قیامت کے دن لے کر آنا" (احمد بن حنبل: المسند، ۲: ۲۱۳؛ ابن قیم، زادالمعاد، ۳: ۱۰۸)۔

عام الوفود: فتح مکہ کے موقع پر قریش نے اسلام قبول کر لیا ان کے اس فیصلے کا اثر عرب کے تقریباً تمام قبائل پر پڑا اور ملک کے کونے کونے سے وفود مدینہ منورہ کی طرف آنے لگے۔ ابن سعد نے ان وفود کی تعداد ساٹھ بتائی ہے۔ یہ لوگ مدینہ منورہ میں کچھ روز قیام کرتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مسائل سے آگاہ کرتے، آپؐ سے تعاون کی درخواست کرتے اور اپنے اپنے علاقوں کی طرف لوٹ جاتے تھے۔ مدینہ منورہ میں ان وفود کی رہائش اور کھانے پینے کے تمام انتظامات حضرت بلالؓ کے ذمہ ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی وفد کو عطیات دینا چاہتے تو بھی انہیں کی وساطت سے دیئے جاتے تھے۔

حضرت بلالؓ نے جن وفود کی خدمت میں نمایاں اور اہم کردار ادا کیا تھا، ان کے نام حسب ذیل ہیں: (۱) وفد مرہ؛ (۲) وفد ثعلبہ؛ (۳)وفد بنی عامر؛ (۴)وفد محارب؛ (۵)وفد تجیب؛ (۶)وفد سعد ہذیم؛ (۷)وفد بجیلۃ؛ (۸)وفد ثقیف؛ (۹)وفد حمیر؛ (۱۰) وفد بلی؛ (۱۱) وفد سلامان؛ (۱۲)وفد کندہ؛ (۱۳) وفد صداء؛

حجۃ الوداع: حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان عرفات میں اپنا مشہور خطبہ دیا، خطبہ مکمل ہوتے ہی آپؐ نے حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔ انہوں نے اس کی تکمیل کی، پھر انہیں اقامت کا حکم ملا وہ اسے بھی بجا لائے۔ پھر آپؐ نے ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھائیں۔ منیٰ میں رمی جمار کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار تھے، حضرت بلالؓ اور اسامہؓ آپؐ کے ہم رکاب تھے۔ ایک غلام نے اونٹنی کی مہار تھام رکھی تھی اور دوسرے خادم نے آپؐ پر سایہ کیا ہوا تھا (احمد بن حنبل: المسند، ۶: ۴۰۲؛ مسلم ابن الحجاج: صحیح مسلم، باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سانحۂ ارتحال: صفر ۱۱ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوے۔ بیماری روز بروز بڑھتی گئی۔ ایک دن حضرت بلالؓ اذان دینے کے بعد حسب معمول آپؐ کو نماز کی اطلاع کرنے کے لیے حاضر ہوئے تو جواب ملا ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ اوائل ربیع الاول ۱۱ ہجری میں آپؐ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپؐ کی وفات کی خبر صحابہ کرام پر بجلی بن کر گری۔ حضرت عمرؓ جیسے مضبوط اعصاب کے لوگ بھی اپنے ہوش وحواس پر قابو نہ رکھ سکے۔ حضرت بلالؓ اس قدر مغموم و دل گرفتہ ہوے کہا اذان دینا ترک کر دیا۔ ان کا دل بجھ گیا۔ اب اذان میں وہ لطف و سرور کہاں جو انہیں دور نبوت میں مخمور کیے رکھتا تھا۔ (واضح رہے کہ وہ روایات صحیح نہیں ہیں، جن میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت بلالؓ دور صدیقی میں بھی مؤذن کے منصب پر فائز رہے اور انہوں نے دور فاروقی میں یہ منصب چھوڑا تھا، حافظ ابن کثیر: البدایۃ والنھایۃ، ۷: ۱۰۲؛ وہی مصنف: السیرۃ النبویۃ، ۴: ۶۵۷؛ الحلبی، سیرت، ۲: ۱۳۹، ۱۴۰۔

عیدین میں خدمات بلال: نجاشی (شاہ حبشہ) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تین عدد نیزے بطور تحفہ بھیجے تھے۔ آپؐ نے ان میں سے ایک نیزہ

حضرت علیؓ کو عنایت فرمایا، دوسرا حضرت عمرؓ کو اور تیسرا اپنے لیے رکھا۔ حضرت بلالؓ عید کے دن یہی نیزہ لے کر آپؐ کے آگے آگے چلا کرتے تھے۔عیدگاہ میں پہنچ کر اسے زمین میں گاڑ دیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کی طرف رُخ کر کے عید کی نماز پڑھایا کرتے تھے (بخاری، باب الصلاۃ العید، باب حمل العنزۃ بین یدی الامام یوم العید؛ ابن قیم الجوزیۃ، زادالمعاد، ۱: ۴۴۲)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کی نماز پڑھا لیتے تو حضرت بلالؓ کے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھتے اور خطبہ ارشاد فرماتے۔ خطاب کے بعد آپؐ عورتوں کی طرف تشریف لے جاتے۔ حضرت بلالؓ بھی آپؐ کے ساتھ ہوتے۔ آپؐ عورتوں کو وعظ و نصیحت کرتے اور راہ خدا میں صدقہ کرنے کی ترغیب دیتے۔ اس پر عورتیں نقدی اور زیور وغیرہ کی شکل میں عطیات دیتی تھیں۔ جنہیں حضرت بلالؓ اپنی چادر میں جمع کر لیتے تھے۔ پھر اس مال کو مستحقین کی حاجت روائی میں خرچ کرتے تھے۔

شام کا قیام: سیدنا حضرت بلالؓ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات رنج و الم کے گہرے نقوش چھوڑ گئی تھی۔ ان کی ساری خوشیاں رخصت ہوگئیں۔ مسجد میں اپنے آقا کی مسند خالی دیکھتے تو تڑپ اٹھتے تھے۔ ان کا جی دنیا سے اُچاٹ ہوگیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ زندگی کے باقی ایام جہاد میں گزارے جائیں۔ چنانچہ ایک دن حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اسی موضوع پر گفتگو کی اور شام کے جہاد میں شرکت کرنے کی اجازت طلب کی۔ حضرت ابوبکرؓ انہیں اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے فرمایا ''اے بلال! مجھے اس بڑھاپے میں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ''۔ حضرت بلالؓ نے کہا ''اگر آپؓ نے مجھے اپنی ذات کے لیے لیے رہا کروایا تھا تو پھر مجھے روکے رکھیں اور اگر اللہ کی رضا کے لیے آزاد کروایا تھا تو پھر مجھے جانے دیں۔ حضرت ابوبکرؓ اس بات پر آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا ''میں نے آپؓ کو اللہ کی رضا کے لیے غلامی سے نجات دلائی تھی''۔ پھر انہوں نے آپؓ کو جہاد میں شریک ہونے کی بخوشی اجازت دے دی۔ چنانچہ آپؓ ان دستوں میں شامل ہوگئے جو شام کی طرف جارہے تھے (حسین بن الدیار بکری: تاریخ الخمیس، ۲:۲۴۶؛ ابونعیم اصفہانی: حلیۃ الاولیاء، ۱: ۱۵۰)۔

آخری اذان: ۲ ہجری میں حضرت عمرؓ نے شام کا سفر کیا تھا۔ حضرت بلالؓ نے دوسرے فوجی افسران کے ساتھ جابیہ کے مقام پر انہیں خوش آمدید کہا اور بیت المقدس کی سیاحت کے دوران ان کے ہم رکاب رہے۔ ایک دن حضرت عمرؓ نے ان سے اذان دینے کی فرمائش کی تو بولے ''میں عزم کرچکا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے لیے اذان نہیں دوں گا لیکن آج (اور صرف آج) آپؓ کا فرمان بجا لاؤں گا''۔ یہ کہہ کر اس عندلیب توحید نے اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شوکت کا نغمہ کچھ ایسے انداز میں سنایا کہ سامعین بے تاب ہوگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی یادتازہ ہوگئی۔ سب پر کچھ ایسی رقت طاری ہوئی کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ حضرت ابوعبیدہؓ اورحضرت معاذؓ بن جبل کی حالت دیدنی تھی۔ خود حضرت عمرؓ اتنا روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ ان کے اتنے آنسو بہے کہ داڑھی تر ہوگئی اور یہ تاثر کافی دیر تک قائم رہا (ابن الاثیر: الکامل فی التاریخ، ۲: ۳۹۴؛ اسدالغابۃ، ۱: ۴۱۷)۔

وفات: حضرت بلالؓ نے دمشق میں ۲۰ھ/ ۶۴۱ء کو ۶۳ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ انہیں باب الصغیر کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا (التاریخ الصغیر، ص ۳۰؛ البلاذری: انساب الاشراف، ۱: ۱۹۳)۔

فضائل و مناقب: اللہ تعالیٰ نے حضرت بلالؓ کو عقیدے کی ایسی پختگی اور ایمان پر ایسی استقامت عطا فرمائی تھی کہ مشرکین مکہ کے لرزہ خیز مظالم بھی انہیں راہ راست سے نہ ہٹا سکے۔

حضرت بلالؓ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ سفر و حضر میں ہر وقت آپؐ کے ساتھ رہتے۔ عیدین اور استسقاء کی نمازوں کے مواقع پر نیزہ اٹھائے ہوے، آپؐ کے آگے آگے چلتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پند و وعظ کے لیے جہاں تشریف لے جاتے، حضرت بلالؓ ایک جاں نثار خادم کی طرح آپ کے ہم رکاب ہوتے تھے۔

وہؓ اکثر اوقات باوضو رہتے تھے۔ وضو ٹوٹنے پر فوراً دوسرا وضو کرتے اور دو رکعت نماز نفل (بطور تحیۃ الوضوء) ادا کرتے تھے۔ اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو زیادہ نوافل پڑھتے تھے۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھ لیا "اے بلال! مجھے اپنا کوئی ایسا عمل بتاؤ جس کے قبول ہونے کی آپ کو زیادہ امید ہو، کیونکہ میں نے جنت میں تمہارے قدموں کی آہٹ سنی ہے"۔ انہوں نے عرض کیا "میرا سب سے زیادہ پر امید عمل یہ ہے کہ میں نے رات یا دن کے جس لمحے میں بھی وضو کیا اس کے بعد جس قدر توفیق میسر آئی نوافل ادا کیے ہیں" (ابن عساکر: تاریخ دمشق الکبیر، ۳: ۳۱۰؛ النووی: تہذیب الاسماء واللغات، ۱: ۱۳۷؛ ذہبی: تاریخ الاسلام، ص ۲۰۳)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے راہ خدا میں جتنا خوفزدہ کیا گیا ہے، اتنا کسی اور کو نہیں کیا گیا اور جتنی اذیت مجھے پہنچائی گئی ہے اتنی کسی اور کو نہیں پہنچائی گئی۔ بسا اوقات مجھ پر مسلسل تیس دن ایسے بھی گزرے ہیں کہ جن میں میرے اور بلال کے کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تھا، سوائے اس (قلیل خوراک) کے جو بلال کے بغل میں چھپی ہوئی ہوتی تھی (الترمذی، باب مالاقاہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اول امرہ)۔

حضرت عمرؓ بن الخطاب فرمایا کرتے تھے "ابوبکر سیدنا واعتق سیدنا"۔ ابوبکر ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار (بلالؓ) کو آزاد کرایا تھا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے انہیں "سیدنا" کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان کے اصل مقام و مرتبہ کی نشاندہی کی ہے (البلاذری: انساب الاشراف، ۱: ۱۸۶)۔ امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے اپنی صحاح میں حضرت بلالؓ کی جو روایات درج کی ہیں ان کی تعداد چوالیس ہے (الدیار بکری: تاریخ الخمیس، ۲: ۲۴۶؛ ابن سعد: الطبقات الکبری، ۳: ۱۶۹)۔ حضرت بلالؓ سے اور بھی کئی لوگوں نے احادیث اور روایات نقل کی ہیں (دیکھیے ابن عساکر: تاریخ دمشق الکبیر، ۳: ۳۰۴؛ ابن اثیر: اسدالغابۃ، ۱: ۴۱۷؛ ابن عبدالبر: الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ۱: ۱۴۲)۔ شیخ ولی الدین الخطیب کے مطابق حضرت بلالؓ کا رنگ گہرا گندمی، مائل بہ سیاہی تھا۔ قد لمبا قدرے خمیدہ تھا، جسم لاغر اور سر کے بال گھنے، گھنگھریالے اور سیاہ و سفید (ملے جلے) تھے۔ آپؓ خضاب استعمال نہیں کرتے تھے۔ (الاکمال فی اسماء الرجال)

حضرت بلالؓ نے متعدد نکاح کیے لیکن اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔

مآخذ: (۱) القرآن الحکیم، (بامداد شاریہ)؛ (۲) آلوسی: تفسیر روح المعانی، داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان؛ (۳) ابن اثیر: اسدالغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، دارالکتب العلمیۃ بیروت، لبنان، بار الاول ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۴ء؛ (۴) وہی مصنف: الکامل فی التاریخ، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء؛ دارالکتاب

العربي بيروت: (۵) ابن الجوزی، ا: المنتظم فی تاریخ الملوک والامم، دارالکتب العلمیۃ بیروت، بار الاول ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء؛ (۶) وہی مصنف: صفۃ الصفوۃ، دارالمعرفۃ بیروت، لبنان، بار چہارم ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء؛ (۷) ابن حجر عسقلانی: حافظ: الاصابہ فی تمییز الصحابۃ ، داراحیاء التراث العربي، بیروت، لبنان، بار اوّل ۱۳۲۸ھ؛ (۸) ابن حزم: جوامع السیرۃ، دارالنشر الکتب الاسلامیۃ لاہور؛ (۹) ابن سعد: الطبقات الکبری، دارصادر بیروت؛ (۱۰) ابن عبدالبر: الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، داراحیاء التراث العربي بیروت، الطبعۃ الاولی ۱۳۲۸ھ؛ (۱۱) ابن عساکر: تاریخ دمشق الکبیر، دارالمسیرۃ بیروت، بار دوم ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۰ء؛ (۱۲) ابن العماد: شذرات الذهب، فی اخبار من ذهب، دارالمسیرۃ بیروت، الطبعۃ الثانیۃ ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۰ء؛ (۱۳) ابن قیم الجوزیۃ: زادالمعاد فی هدی خیرالعباد، مؤسسہ الرسالۃ بیروت، مکتبۃ المنار الاسلامیۃ، کویت، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء؛ (۱۴) ابن کثیر، حافظ: السیرۃ النبویۃ، دارالمعرفۃ، بیروت، ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۶ء؛ (۱۵) ابن منظور: مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر، دارالفکر، دمشق، بار اوّل ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء؛ (۱۶)ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ ، مصر؛ (۱۷)ابوجعفر ہاشمی: کتاب المحبر ، دارالآفاق الجدیدۃ، بیروت؛ (۱۸) ابونعیم اصفہانی: معرفۃ الصحابۃ، مکتبۃ الحرمین، مکتبۃ الدار، بار اوّل ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء؛ مدینہ منورہ؛ (۱۹)وہی مصنف: حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیاء، دارالکتاب العربي، بیروت، الطبعۃ الثانیۃ ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء؛ (۲۰)احمد بن حنبل، امام: المسند، شرح شیخ احمد محمد شاکر دارالمعارف مصر؛ (۲۱) احمد بن شعیب: سنن نسائی، بشرح الحافظ جلال الدین السیوطی قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی؛ (۲۲) احمد بن ابی یعقوب: تاریخ الیعقوبی، دارالصادر، بیروت، مؤسسہ نشر فرہنگ اہل بیت، قم خیابان؛ (۲۳) البلاذری: انساب الاشراف، تحقیق محمد حمیداللہ، دائرہ معارف، قاہرہ، جلد اول بامدار و اشاریہ؛ (۲۴) حاکم نیشاپوری: المستدرک؛ (۲۵)حسین بن محمد الدیار بکری: تاریخ الخمیس، مؤسسۃ شعبان للنشر والتوزیع، بیروت؛ (۲۶)حلبی: السیرۃ الحلبیۃ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲ء؛ (۲۷) خیرالدین زرکلی: الاعلام، دارالعلم للملایین، بیروت، الطبعۃ السابعۃ، مئی، ۱۹۸۶ء؛ (۲۸) الذہبی: تلخیص علی المستدرک؛ (۲۹) وہی مصنف: سیراعلام النبلاء، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت؛ (۳۰) وہی مصنف: تاریخ الاسلام، عہد الخلفاء الراشدین، دارالکتاب العربي، بیروت، بار اوّل، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء؛ (۳۱)سلیمان بن اشعث: سنن ابی داؤد، اردو ترجمہ وحید الزمان، نعمانی کتب خانہ، اردو بازار، لاہور، طبع اوّل ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء؛ (۳۲) شبلی نعمانی: الفاروق، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، بار اوّل ۱۹۷۲ء؛ (۳۳)عباس محمود عقاد: حضرت بلال بن رباح (اردو ترجمہ عبدالرشید ندوی) نفیس اکیڈیمی، اردو بازار، کراچی ۱۹۸۹ء؛ (۳۴) عبدالرحمٰن النصری: تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی، مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق؛ (۳۵) قرطبی، علامہ: تفسیر الجامع لأحکام القرآن، آخری، دارالکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء؛ (۳۶)مالک بن انس، امام: الموطا، میر محمد کتب خانہ آرام باغ کراچی؛ (۳۷) محمد بن اسماعیل: الجامع الصحیح، قدیمی کتب خانہ کراچی، بار دوم ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء؛ (۳۸) محمد بن عیسیٰ: جامع السنن، اردو ترجمہ بدیع الزمان، نعمانی کتب خانہ، لاہور، طبع اوّل ۱۹۸۸ء؛ (۳۹) محمد بن یزید: سنن ابن ماجہ، قدیمی کتب خانہ آرام باغ، کراچی؛ (۴۰) محمد عبداللہ، ڈاکٹر، چغتائی: سیرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، لاہور؛ (۴۱) مسلم بن الحجاج: صحیح، قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی؛ (۴۲) النووی: تہذیب الاسماء واللغات، دارالکتب العلمیۃ، بیروت؛ (۴۳) اسباب النزول: مطبعۃ الحلبی مصر، المکتبۃ التجاریۃ،

مکہ مکرمہ،الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۰ء؛ (۴۴) الواقدی: کتاب المغازی، دارالمعارف، مصر مطبعۃ جامعہ آکسفوڈ، ۱۹۶۶ء/ ۱۹۶۵ء؛ (۴۵) ولی الدین خطیب: الاکمال فی اسماء الرجال، قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی، ۱۳۶۸ھ؛ (۴۶) یافعی، علامہ: مرآۃ الجنان عبرۃ الیقظان، مؤسسۃ العلمی للمطبوعات، بیروت، الطبعۃ الثانیۃ ۱۳۹۰ھ/ ۱۹۷۰ء۔

(منظور آفاقی، [ان: محمودالحسن عارف])

••-----------••

※ بلقان: (ریاستیں) [آ آ آ میں شامل "بلقان" کے مقالات کے ساتھ مطالعہ کیا جائے]۔ ریاست ہائے بلقان اور جنوب مشرقی یورپ کے مسلمان کثیر الانواع نسلی گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں اور تقریباً دس مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ یہ اہلِ سنت کے حنفی مسلک کے پیروکار ہیں۔ یہ مسلمان اپنی اپنی ریاستوں کے مختلف معاشرتی و سیاسی حالات میں اپنی آبادی کے تناسب کی رعایت سے اور یکے بعد دیگرے برسراقتدار آنے والی حکومتوں کے اختیار کردہ نظریہ ہائے حیات کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان اختلافات کے باوجود ان مسلمان برادریوں میں بہت کچھ مشترک ہے اور وہ ہے رشتۂ ایمان۔ چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس خطے پر سلطنتِ عثمانیہ کے حملے اور قبضے کی بنا پر یہاں کے مسلمانوں کی تاریخ بھی مشترک ہے۔ اس مسلم آبادی کو تین طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ عثمانی حملے کے فوراً یا کچھ عرصہ بعد آنے والے ترک نژاد آبادکار، سلطنتِ عثمانیہ کے ماتحت دنیاے اسلام کے دیگر خطوں سے آنے والے لوگ اور حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والے مقامی باشندے۔

مسلمان ہونے والے لوگوں میں سے اکثریت کا تعلق البانیہ، بوسنیا، ہرزیگووینا، بلغاریہ (خصوصاً رہوڈوپس (Rhodopes) کے پوما (Pomah) جن کا سلسلۂ کوہ دورِ حاضر کی یونان اور مقدونیہ کی ریاستوں تک پھیلا ہوا ہے) اور صقلیہ سے تھا۔ عثمانی دور میں غیر مسلم افراد کے مقابلے میں، ان مسلمان گروہوں کا شمار مراعات یافتہ طبقے میں ہوتا تھا۔ اس خطے پر عیسائیوں کے دوبارہ قبضے کے بعد البانیہ کے سوا باقی ماندہ علاقوں میں وہ ایک کم حیثیت مذہبی یا نسلی اقلیت بن کر رہ گئے۔ آج کے دور میں بھی یہی صورت حال برقرار ہے اور مسلمان غالب اکثریت رکھنے والے عیسائی آرتھوڈکس یا کیتھولک معاشروں میں نہایت معمولی اقلیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ تاریخی طور پر یہ مسلمان مختلف عناصر سے متاثر ہوے ہیں۔ مثلاً برسراقتدار حکومت، تاریخی عرصہ اور اپنی نسلی اصل سے لبنان میں بہت سی ریاستیں شامل ہیں، جن میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:

البانیہ: جدید البانوی خطہ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے دوران میں عثمانیوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔ اس فتح یابی کے بعد مقامی آبادی میں اسلام کی اشاعت اس قدر وسیع پیمانے پر ہوئی کہ جب ۱۹۱۲ء میں البانیہ کی مملکت وجود میں آئی تو یہاں کی ستر فی صد آبادی مسلمان تھی۔ اس کثیر آبادی کی دو خصوصیات قابلِ ذکر ہیں: یہ مکمل طور پر ہم نسل ہے چونکہ ملک کے سارے مسلمان نسلاً البانوی ہیں اور البانوی زبان بولتے ہیں، یہ دو مماثل گروہوں پر مشتمل ہے، ایک سنی (کل آبادی کا ۸۰ فی صد)، دوسرا بکتاشیہ کے پیروکار۔

یہ دونوں برادریاں استقامت کے ساتھ آزاد اور خودمختارانہ روش پر گامزن ہیں، دونوں عالمی جنگوں کے درمیانی عرصہ میں، البانیہ کی سنی برادری نے ۱۹۲۳ء میں ترانہ میں منعقد ہونے والی اپنی پہلی کانگرس میں طے پانے والے فیصلے کی رو سے عثمانی خلافت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اشتراکی دورِ حکومت کے آغاز میں بکتاشیہ کو سنیوں،

آرتھوڈکس اور رومن کیتھولک عیسائیوں کے ساتھ چوتھا مذہبی گروہ تسلیم کیے جانے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ تاہم ۱۹۶۷ء میں اشتراکی حکام نے ملک کی تمام مذہبی تنظیموں پر پابندی عائد کر کے تمام عبادت گاہوں کو بند کر دیا۔

اس آمرانہ حکومت کے خاتمے پر ، حسبِ توقع، مساجد ، کلیسا اور بکتاشیہ و دیگر متصوفانہ سلاسل کے زاویے کھول دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد سے البانیہ میں دینی احیا کا عمل سرگرمی سے جاری ہے اور یورپ میں دین اسلام کو ممکنہ حد تک مستحکم کرنے کے متمنی دنیاے اسلام کے دینی حلقے اس کا مشاہدہ نہایت دلچسپی کے ساتھ کر رہے ہیں [نیز رکّ بہ البانیہ]۔

۲۔بلغاریہ: جدید بلغاریہ ، یونان کی طرح، چودھویں صدی عیسوی میں عثمانیوں کی فتح یابی سے لے کر ۱۸۷۸ء تک مکمل طور پر ان کے زیر نگیں رہا جب اس کے شمالی حصے نے ان سے آزادی حاصل کرلی۔ ۱۹۰۸ء میں اس کا جنوبی حصہ بھی سلطنتِ عثمانیہ سے الگ ہوگیا تاہم یہاں مسلمانوں کی آبادی اتنی زیادتھی کہ جنگ کی خلل اندازیوں، اس کے بعد کے قتلِ عام ، جبری اور رضاکارانہ نقل مکانی اور زبردستی عیسائی بنانے کے کچھ واقعات کے باوجود ۱۹۴۶ء کی مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ بلغاریہ کی آبادی کا ۱۳ء۳۵ فی صد حصہ مسلمان کہلانے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ یہاں کی اسلامی برادری چار متمیّز اور باہم مختلف نسلی گروہوں پر مشتمل ہے۔

تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار البانوی مسلمان پومک (Pomak) کہلاتے ہیں۔ وہ بلغاری زبان بولتے ہیں اور ترکی زبان سے بالکل ناآشنا ہیں۔ وہ رہودوپ (Rhodope) کے پہاڑوں اور ملک کے جنوب مشرق میں رزلانگ (Razlog) کے اردگرد کے خطے میں آباد ہیں۔ وہ موجودہ دور میں بھی زیادہ تر ناخواندہ ہیں اور ان کے اندر کوئی مقامی دانش ور طبقہ موجود نہیں ہے۔ آزادی کے حصول کے بعد بلغاریہ کے سول اور فوجی حکام نے پومک لوگوں کے تشخص کو مٹانے کی مساعی جاری رکھی ہوئی ہے۔ اس مہم کو ماضی کے چند عشروں میں یہاں کے برسراقتدار اشتراکیوں نے انتہا تک پہنچا دیا ہے، مثلاً ۱۹۸۰ء کے عشرے میں حکومت نے تمام اقلیتوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اور اپنے خاندانوں کے نام صرف بلغاروی طرز پر رکھیں۔ تاہم اشتراکی اقتدار کے خاتمے کے بعد یہ امر بخوبی واضح ہوگیا ہے کہ پومک افراد کے نسلی تشخص اور ان کی دینی روایات کا خاتمہ مشکل ہے اور یہ کہ وہ ملک کے موجودہ حکمرانوں کے لیے بدستور ایک مسئلہ بنے ہوے ہیں۔

بلغاریہ میں دوسرا بڑا مسلم گروہ ترکوں پر مشتمل ہے، ان کی تعداد ۱۸۷۸ تھی اور مختلف سالوں میں بڑھتی گھٹتی رہی ہے اور اب ایک محتاط اندازے کی رُو سے پانچ سے چھ لاکھ ہے۔ وہ دریائے ڈینیوب کے ساتھ ساتھ واقع مختلف خطوں اورماھا دلی (Ormah` Deli) اور دوبروجی (Dobroudji)اور مغربی رودوپ (Rhodopes) میں بکھرے ہوے ہیں اور یہ بتانا ناممکن ہے کہ ان میں کتنے واقعی طور پر باعمل مسلمان ہیں۔ دو حریف سیاسی گروہوں کے حال ہی میں منظر عام پر آنے سے متدین اور غیر متدین مسلمانوں کے مابین پھوٹ پڑ گئی ہے۔ ”تحریک براے حقوق و آزادی“ ترکی کے سرکاری اداروں سے روابط رکھنے والی ایک سیکولر سیاسی جماعت ہے، عرب دنیا کی اسلامی تنظیموں سے مستحکم تعلقات رکھنے والی پارٹی، جو مفتیٔ اعظم کے پیروکاروں پر مشتمل ہے، اس سے الگ ہے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۹۳ء میں بلغاریہ میں دو مدِ مقابل مفتیٔ اعظم موجود تھے، بلغاروی نام رکھنے کی مہم اور غیر ملکیوں سے نفرت پر مبنی

پالیسیوں کی بنا پر ۱۹۸۹ء میں تقریباً تین لاکھ افراد یہاں سے نکل کر ترکی پہنچے، جن میں سے کچھ بلغاریہ واپس آچکے ہیں، جب کہ بہت سے دوسرے افراد بالآخر دیگر ممالک میں بس چکے ہیں۔

بلغاریہ کے مسلمانوں میں تاتاری بھی شامل ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں ان کی تعداد چھ ہزار تھی، ان میں سے دین دار مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ وہ بتدریج اپنے سے نسبتاً بڑے ترک گروہ میں مدغم ہو رہے ہیں۔ آخری مسلم گروہ خانہ بدوشوں (Gypsies) پر مشتمل ہے، جن کی تعداد شاید ایک لاکھ کے لگ بھگ ہوگی، ان میں سے اکثر اپنے آپ کو مسلمان تصور کرتے ہیں اگرچہ ان کی زندگیوں میں مذہب کا کوئی خاص کردار نظر نہیں آتا۔

بلغاریہ کے ترک۔ تاتاری برادری کے بارے میں ایک قابل ذکر امر یہ ہے کہ وہ دو واضح مذہبی گروہوں میں منقسم ہے۔ ان کی غالب اکثریت سنی العقیدہ حنفی ہے، مگر اقلیت علوی مسلک رکھتی ہے، یہ لوگ مقامی طور پر علی جانی یا قزلباش کہلاتے ہیں اور (Orman) اور دلی (Deli) میں رہتے ہیں۔

۳۔ رومانیہ: دورِ حاضر میں رومانیہ کی سرزمین پر دو مختصر سی مسلم برادریاں آباد ہیں۔ ان میں سے ایک دریائے ڈینیوب کے ایک چھوٹے سے جزیرے اداکل (Adakale) میں اقامت پذیر ہے جو پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں عثمانیوں کے ہاتھوں فتح ہوا تھا۔ جنگِ عظیم اول کے اختتام پر اس جزیرے کی آبادی تقریباً ایک ہزار نفوس تھی، لیکن ۱۹۶۸ء میں اس مسلم آبادی کو یہاں سے نقل مکانی کرنا پڑی، جب آئرن گیٹ ہائیڈرو الیکٹرک ڈیم کی تعمیر سے یہ جزیرہ زیرِ آب آ گیا۔

دوسری مسلم برادری دوروجہ (Dobroudja) میں آباد ہے۔ یہ خطہ چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں عثمانیوں نے فتح کیا، مگر ۱۹۷۹ء میں اس کا الحاق رومانیہ سے ہوا اور اس کے نتیجے میں یہ لوگ کافی بڑی تعداد میں ترکی منتقل ہوے۔ آج کے دور میں ان لوگوں کی آبادی تقریباً پچاس ہزار ہے اور اس میں ترک اور تاتاری شامل ہیں جو زیادہ تر کاشت کار ہیں۔ اشتراکی دورِ حکومت میں اس مختصر سی مسلم برادری کو نہایت مشکل صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ترک اور تاتاری مدرسے بند کر دیئے گئے؛ مجیدیہ کی واحد اسلامی درس گاہ بھی بند کر دی گئی؛ اسلامی کتب کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی ؛ اور حج کے لیے سفر ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں بین الاقوامی حالات میں تبدیلی اور ملک کو درپیش شدید اقتصادی مشکلات کی بنا پر بلغاریہ کی برسر اقتدار حکومت مسلمانوں کو چند ایک مراعات دینے پر مجبور ہوگئی۔ یہ دراصل دولت مند عرب اور دیگر مسلمان ممالک کے سامنے رومانیہ کے تشخص کو ایک درست صورت میں پیش کرنے کی ایک واضح کوشش تھی۔ آج دوبروجہ (Dobroudja) کے مسلمانوں کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہیں اور نہ ہی گزشتہ چار پانچ عشروں کے دوران میں ترکی، عرب اور دیگر مسلمان ممالک کی دینی تنظیموں کے ساتھ ان کے روابط کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔

۴۔ ہنگری: میں دو ممتاز اسلامی برادریاں موجود رہی ہیں، ان میں سے ایک ۱۵۲۶ء اور ۱۶۹۹ء کے درمیان ہنگری کے عثمانیوں کے ہاتھوں فتح ہونے پر وجود پذیر ہوئی، یہ عیسائیوں کے ہنگری پر دوبارہ قابض ہونے پر معدوم ہوگئی، کیونکہ پسپا ہونے والی ترک افواج کے ہمراہ نہ جانے والے مسلمان افراد یا تو قتل کر دیئے گئے اور یا زبردستی عیسائی بنا لیے گئے۔

۱۸۷۸ء میں ہنگری میں بوسنیا ہرزیگوینا سے مسلمانوں

کی ایک قلیل تعداد کی آمد سے ایک نئی مسلمان برادری وجود پذیر ہوئی۔ اس زمانے میں بوسنیا پر آسٹریا اور ہنگری قابض تھے۔ نیز اس برادری میں عثمانی سلطنت سے آنے والے ترک صناع، تجار اور طلبہ بھی شامل تھے۔ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ ان گروہوں کے عام آبادی میں انضمام کی بنا پر ان کی تعداد میں نہایت کمی واقع ہوگئی ہے۔ آج کے دور کے ہنگری میں کوئی منظم مسلمان برادری موجود نہیں، اگرچہ چند سو، شاید چند ہزار، افراد اسلام سے وابستہ ہیں، ان میں عرب، ترک، پاکستانی، ایرانی اور دیگر نووارد افراد کے ساتھ اسلام قبول کرنے والے بہت محدود تعداد میں مقامی باشندے بھی شامل ہیں۔

۵۔ یونان: جدید یونان کے نام سے موسوم خطے کو چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں عثمانیوں نے فتح کیا، جب کہ کچھ جزائر سولھویں یا سترھویں صدی عیسوی میں فتح کیے گئے۔ یہ خطہ طویل عرصے تک سلطنتِ عثمانیہ کی تحویل میں رہا۔ جنگِ آزادی اور بعد کی (۱۸۲۱ء تا ۱۹۱۲ء) کی مہمات کے دوران میں یہ ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر آزاد ہوا۔ اکثر مسلم آبادی یہاں سے نقل مکانی کر گئی، نقل مکانی نہ کرنے والے افراد کو ان کی اراضی سے بے دخل کر دیا گیا، قتل کر دیا گیا یا زبردستی عیسائی بنا لیا گیا ۱۹۲۳ء میں یونان اور ترکی کے مابین آبادیوں کے تبادلے کے بعد یہاں صرف تین مسلم برادریاں موجود ہیں جن کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار اور ایک لاکھ پچاس ہزار کے درمیان ہے۔ یہ تعداد ملکی آبادی کا تقریباً دو فی صد ہے۔ ان تین مسلم برادریوں میں درج ذیل لوگ شامل ہیں: مغربی تھریس کے ترک اور خانہ بدوش قبائل (تعداد ایک لاکھ تا ایک لاکھ بیس ہزار) رہودوپ میں مقیم بلغاری زبان میں بولنے والے پومک (تعداد تقریباً پچیس ہزار) ؛ اور جزائر ڈوڈی کونز (Dodecanese) میں آباد ترک (تعداد تقریباً تین ہزار) جو بنیادی طور Rhodo اور Ko سے تعلق رکھتے ہیں۔

اپنے عمر رسیدہ افراد کی اموات سے جزائر ڈوڈی کونز (Dodecanese) میں مقیم مسلم برادری کی تعداد میں بتدریج کمی واقع ہورہی ہے۔ بلغاریہ کی سرحد سے ملحق رہودوپ کے پہاڑوں کے باسی پومک ایک محدود قسم کی دیہی سوسائٹی میں رہ رہے ہیں۔ وہ سنگلاخ میدانوں اور حربی پالیسیوں ہر دو کی بنا پر بیرونی دنیا سے الگ تھلگ ہونے کے باوجود خوداعتمادی سے تہی دامن نہیں ہیں۔ یونانی حکومت نے اس خطے کو فوجی علاقہ قرار دیا ہے اور بیرونِ علاقہ کے غیر فوجی افراد کے یہاں داخلہ پر پابندی لگا رکھی ہے۔

اس طرح سے مغربی تھریس میں آبادمسلمان بڑی مسلم برادری کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس برادری میں زندگی کے آثار موجود ہیں، لیکن یہ مقامی حکام کی عائد کردہ پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہے اور یونان اور ترکی کے مابین روز بروز کے بدلتے ہوئے تعلقات سے بری طرح سے متاثر ہوتی رہتی ہے، بلکہ خود اسی برادری کا وجود ہی تعلقات کو متاثر کرتا ہے۔ زمانۂ حال میں مراعات سے محروم اس برداری کے دینی، سیاسی، معاشرتی یا اقتصادی حالات میں بہتری کے آثار دُور دُور تک نظر نہیں آرہے۔ جب کہ یونانی حکومت ویسے ہی ان کا وجود ختم کرنے کی متمنی ہے۔

۶۔ سابق یوگوسلاویہ: یہ بلقانوی مسلمانوں کی کثیر آبادی کا مسکن رہا ہے۔ یہاں تیس لاکھ سے زائد مسلمان موجود ہیں اور یہاں کی صورتِ حال نہایت پیچیدہ ہے جو تاریخی ہنگامہ آرائی، اور متعدد نسلی اور لسانی گروہوں کے، وجود کو منعکس کرتی ہے۔ دورِ مابعد میں یوگوسلاویہ کی ریاستیں جمہوریہ (Republics) بننے والے علاقے

چودہویں صدی عیسوی کے اواخر سے سترہویں صدی عیسوی کے اواخر تک کے عرصہ میں عثمانیوں کے زیر تسلط آئے۔ اسلام نے ان علاقوں میں سے، بعض خصوصاً بوسنیا ہرزیگووینا اور مقدونیہ میں زیادہ فروغ پایا، جب عثمانیوں کے فوجی اور انتظامی اہلکار ملک کے بہت سے حصوں میں اقامت پذیر ہوگئے۔ دیگر مسلمان نووارد بھی ملک کے متعدد حصوں میں آباد ہوئے، ان میں نیم خانہ بدوش ترک اور غیر ترک مسلمان شامل تھے۔ غیر ترک مسلمانوں کے ضمن میں البانوی باشندے بڑے نمایاں ہیں، جنہوں نے سترہویں صدی عیسوی کے اواخر میں کوسوو (Kosovo) کی طرف نقل مکانی کا آغاز کیا۔

عیسائیوں کے دوبارہ فتح یاب ہونے پر مسلم آبادی کو بعض علاقوں سے باہر دھکیل دیا گیا اور بعض علاقوں میں محدود کر دیا گیا جس سے آج کے دور کا واضح نسلی اور جغرافیائی ڈھانچہ ظہور پذیر ہوا۔ بوسنیا ہرزیگووینا کے ایک خطے میں، جو ۱۸۷۸ء سے ۱۹۱۸ء تک آسٹریا ہنگری کے زیر قبضہ رہا، مسلم آبادی سرب کروشیائی زبان بولنے والے سلاوک (Slavic) پر مشتمل ہے؛ کوسوو کی مسلم آبادی میں البانوی اور قلیل تعداد میں ترک شامل ہیں (یہ ترک یوگوسلاویہ کی آزادی کے بعد سے یہیں رہ رہے ہیں)، مقدونیا کی مسلم آبادی میں سلاوک ، ترک اور البانوی شامل ہیں جن میں نووارد بھی ہیں اور پہلے سے مقیم افراد بھی، یہ دونوں طبقوں کے مسلمان مل جل کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ان بڑے مسلم گروہوں میں ہر ایک کی اہم واقعات پر مبنی تاریخ کو دہرانا ناممکن ہے، اس لیے نسبتاً بہت سے چھوٹے گروہوں، مثلاً ترکی عہد کے صوبہ نوی پزر (Novi Pazar) کے احوال کے بیان پر ہی اکتفا کرلینا چاہیے: اس خطے کی پچھتر سالہ تاریخ من حیث المجموع چار بڑے ادوار میں منقسم ہے: یوگوسلاویہ کی شہنشاہیت(۱۹۱۸ء۔ ۱۹۴۱ء) ، جنگِ عظیم دوم (۱۹۴۱ء۔ ۱۹۴۴ء) ، اشتراکی آمریت (۱۹۴۵ء۔ ۱۹۸۹ء) اور وفاق کا حالیہ خاتمہ۔ ان میں سے ہر دور نے اس خطے کے مسلمانوں پر اپنے اپنے اثرات ڈالے ہیں۔ شہنشاہیت کے دور میں یوگوسلاویہ میں دو نہایت مختلف مسلمان گروہ موجود تھے: بوسنیا، ہرزیگوینا کے خوب منظم مسلمان، جن کے رہنما غیر معین ”یوگوسلاوی مسلم برادری“ کے حقیقی سربراہ تھے، اور ”جنوبی سربیا“ (یعنی کوسوو و مقدونیا) کے مسلمان، مؤخرالذکر گروہ کے مسلمان اپنے نسلی تنوع (البانوی، ترک، مقدونی سلاوک اور جپسی) کی بنا پر غیر متحد تھے۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران کٹھ پتلی کروشیائی فاشسٹ ریاست نے بوسنیا کو اپنے اندر ضم کر لیا اور کچھ بوسنیائی مسلمان استاشی (Ustashe) دہشت گردوں سے مل گئے۔ جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد ان دہشت گردوں کے ساتھ روابط کے المناک نتائج برآمد ہوئے۔ مارشل ٹیٹو کی حکومت کے تحت صورتِ حال مزید پیچیدہ ہوگئی۔ ۱۹۶۰ء میں حکومت نے نمایاں آزادیٔ عمل اور مادی فوائد دے کر یوگوسلاویہ کی مسلم برادری پر نوازشات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۶۷ء میں مسلم قومیت کو ملک کی مسلمہ قومیتوں میں شامل قرار دے دیا گیا۔ اگرچہ یہ رعایت صرف بوسنیا۔ ہرزیگوینا کے مسلمانوں تک محدود رکھی گئی۔ یہ امتیازی حیثیت بعجلت ختم ہوگئی۔ تاہم یوگوسلاویہ کی معیشت کی بسرعت ابتری اور اشتراکی حکومت کے خاتمے کے بعد نسلی اور مذہبی کشیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ سابق یوگوسلاویہ میں حال ہی میں رونما ہونے والے واقعات سے تینوں بڑے مسلم گروہ مختلف انداز سے متاثر ہوئے ہیں۔ ۱۹۹۲-۱۹۹۵ء کے دوران میں یہاں کے باشندوں کا بڑے پیمانے پر سربوں نے منظم طور پر قتل عام کیا اور دو لاکھ کے قریب مسلمانوں کو

تہ تیغ کیا گیا۔ جس کی بنا پر علاقے میں نسلی بنیادوں پر تبدیلی آچکی ہے (تفصیل کے لیے رک بہ بوسنیا).

مقدونیا میں مقامی مسلم آبادی اپنے غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ پائیدار روابط قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کوسوو کے البانوی مسلمانوں کی گرفت سے آزادی چاہتے ہیں جو بڑی تعداد میں مغربی اور جنوبی مقدونیہ کی طرف اپنی نقل مکانی جاری رکھے ہوے ہیں.

کوسوو میں صورتِ حال سربوں اور البانویوں کی پرانی عداوت کی بنا پر دھماکہ خیز ہے۔ یہ عداوت اشتراکی دورِ حکومت میں اپنی انتہا کو جا پہنچی۔ البانوی مسلم برادری کی موجودہ دینی حیثیت کے بارے میں صحیح طور پر کوئی رائے قائم کرنا عملاً ناممکن ہے، کیونکہ البانوی قومیت پرستی عوامی مباحثات کا بڑا موضوع بنی ہوئی ہے، جس کی بنا پر مسجد اور متصوفانہ جمعیتوں کے حقیقی اثر و نفوذ کا تجزیہ کرنا مشکل ہے.

بوسنیا، ہرزیگوینا میں عالی جاہ عزت بیگووچ کی ڈیموکریٹک ایکشن (Democratic Action) پارٹی نے اسلام کو سیاسی رنگ میں پیش کیا ہے، موصوف نے اپنے نظریات اپنی ان کتابوں میں واضح طور پر پیش کیے ہیں: The Islamic Declaration (۱۹۷۰ء) اور Islam Between East and west (۱۹۸۰ء: انگریزی تراجم ۱۹۸۴ء)۔ عزت بیگووچ نے متعدد بوسنیائی مسلم برادریوں کو ایک "دینی اتحاد" قائم کرنے پر آمادہ کیا ہے اگرچہ پیشتر ازیں ان میں سے اکثر نے کسی نوع کی مذہبی فعالیت کے لیے ذرہ بھر جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا، ملک کے آرتھوڈکس سربیائی اور کیتھولک کروشیائی باشندے بھی اپنے اپنے کلیساؤں سے شہ پا کر اسی طرح کی انتہا پسندانہ قومیت پرستی کے علمبردار بنتے نظر آ رہے ہیں۔ ٹیٹو دورِ حکومت کے سیاسی زعما کی ملی بھگت سے وجود پذیر ہونے والی یہ فرقہ وارانہ چپقلش ۱۹۹۲ء کے موسم بہار میں ایک خوفناک خانہ جنگی کی شکل اختیار کر گئی ہے [نیز دیکھیے بوسنیا، البانیہ]

مآخذ: (۱) Clayer, Nathalie : Les Ordres Mystiques Musulmans en Albanie a L` epoque post Ottomane, 1912-1967 ؛ (۲) L`Albanie ، Pays des Derviches ، برلن و ویز بیڈن، ۱۹۹۰ء؛ (۲) Kalionsk, A : "The Pomak Dilemma" در La Transmission du Letter d` information ، Savoir Dans Le Monde Musulman Pesi Pherique ، عدد: ۱۳، ص: ۱۲۲۔ ۱۳۰، پیرس، ۱۹۹۳ء؛ (۳) Lederer, G : "Islam in Hungary" ، در Central Asian Survey ، ۱۱ا (۱۹۹۲ء) ، ص: ۱۔۲۳؛ (۴) Popovic Alexandre : Les Musulmans du sud- est europeen dans la Periode post- ottomane ، L`Islam Balkanique ، برلن و ویزبیڈن ، ۱۹۸۶ء۔ یہ تصنیف جنوب مشرقی یورپ کی مسلم برادریوں کا ایک عمومی جائزہ پیش کرتی ہے، نیز ممالک اور ادوار کی ترتیب سے مآخذ نہایت مفصل طور پر دیئے گئے ہیں؛ (۵) وہی مصنف: Les Musulmans ، ۱۹۴۵ء۔ ۱۹۸۹ : Medi ateurs et metaphores. ، لوزان، ۱۹۹۰ء (۶) Alexandre popovic ، فرانسیسی سے ترجمہ از Harry M. Mathews, Jr......

[ت ظفر علی]

••-------------••

بلی (بنو): عربوں کے قحطانی گروہ سے تعلق رکھنے ⊗ والا، ایک بڑا عرب قبیلہ (بنو قضاعہ کی ایک شاخ، یعنی بلی بن عمرو بن الحاف [یا الحافی] بن قضاعہ (ابن ماکولا: الاکمال فی رفع الارتیاب، ۱:۳۵۵، حیدر آباد دکن

۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۷ء؛ ابوجعفر محمد بن حبیب بن امیہ بن عمرو الہاشمی البغدادی: کتاب مختلف القبائل و مؤتلفھا، ص: ۲۷، ۳۱، ۶۰ ،لاہور، ۱۹۶۴ء)۔

بلی بن عمرو مدینہ اور وادی القری کے درمیان میں سکونت پذیر تھے۔ اج، غران [کے علاقوں میں ان کی بستیاں، بنوحنیفہ کا علاقہ ختم ہونے کے بعد شروع ہوتی تھیں بنک میں بنو جذام کی آبادیوں تک پہنچتی تھیں] اور بنک میں یشغب، تیما، مدینہ، یزال، رحیہ ، سقیا، بجشان مدین، فران، حسین، الہدم اور ذات السلاسل میں بھی بودوباش رکھتے تھے (الہمدانی : صفۃ جزیرۃ العرب، ص: ۱۷)۔ ابن خلدون کے مطابق ان کا وطن جہینہ کے شمال سے لے کر ایلہ کی گھاٹی اور بحر قلزم کے مشرقی ٹیلے تک تھا۔ کچھ قبائل ان میں سے، مغربی ٹیلے تک بھی چلے گئے تھے۔ مصر اور حبشہ کے علاقہ کے درمیان میں بھی ان کی کچھ شاخیں آباد تھیں، وہاں وہ لوگ اتنے زیادہ ہوگئے کہ وہ نوبہ کے علاقے پر غالب آگئے۔ یہاں انہوں نے حبشہ کے لوگوں سے جنگ کی اور انہوں نے غلبہ حاصل کر لیا (ابن خلدون:تاریخ، ۲: ۲۴۷) (جرجی زیدان: العرب قبل الاسلام ، ص: ۲۳۰)۔ المقریزی نے لکھا ہے کہ بنو بلی شام میں مقیم تھے (عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب ۱۰: ۱۰۵) القلقشندی کے مطابق ان کے گھر "ذاما" میں تھے۔ الھمدانی نے اخمیم کی صراحت بھی کی ہے (نہایۃ الأرب ، ص: ۱۸۰) .

تاریخ: بنو بلی عرب کا ایک قدیم قبیلہ ہے۔ جس کے حوالے ہمیں تاریخ کے مختلف ادوار میں ملتے ہیں، یہ قبیلہ "نصرانیت" کے ظہور کے وقت مصر میں تھا اور ان کا علاقہ القصیر اور قنا کے مابین تھا اور ظہور اسلام سے قبل، ہندوستان کی تجارت انہی کے ذریعے ہوتی تھی (دیکھیے العرب قبل الاسلام، ص: ۱۷۳)۔ ظہور اسلام کے وقت بنو بلی دشمنان اسلام کے ساتھ رہے، چنانچہ ۸ھ غزوہ موتہ [رک بآں] کے موقع پر بنو بلی ہرقل کا ساتھ دیا۔ اور ان کے ساتھ بہت سے دوسرے عرب قبائل بھی موجود تھے، جن کی مجموعی تعداد ایک لاکھ تھی اور ان کا سربراہ بھی بنو بلی کا مالک بن زافلہ تھا (الطبری: تاریخ، ۳: ۱۰۷؛ ابن ہشام: سیرۃ النبی، ۲: ۹، القاہرہ)۔ رومی لشکر کو زبردست نقصان پہنچانے کے باوجود مسلمانوں کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی، اس لیے جمادیٰ الآخرہ ۸ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓو بن العاص کی کمان میں تین سو مجاہدین کا لشکر شمالی سرحد کے علاقہ ذات السلاسل کی طرف، جو وادی القریٰ سے دوسری طرف واقع ہے، امن و امان قائم کرنے کے لیے روانہ کیا،جہاں قضاعہ میں موجود قبائل بلی، عذرہ، بلقین وغیرہ مدینہ منورہ پر لشکر کشی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے یہاں آ کر محسوس کیا کہ باغی قبائل کی تعداد زیادہ ہے۔ چنانچہ ان کی درخواست پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید دو سو مجاہدین حضرت ابوعبیدہؓ کی سرکردگی میں ان کی مدد کے لیے روانہ کیے، ان مجاہدین مین حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے صحابہ کرامؓ بھی شامل تھے۔ یہ لشکر ان قبائل کو سزا دینے اور منتشر کرنے میں کامیاب رہا (ابن سعد: طبقات، ۲: ۱۷۸، قاہرہ ۱۳۵۸)۔

۹ھ میں قبیلہ بلی کا وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی، جس کو انہوں نے قبول کر لیا (ابن سعد: الطبقات الکبری، ۱: ۹۴) بعدازاں یہ لوگ اپنے وطن لوٹ گئے۔

بلی کے قبیلہ سے متعدد صحابہ، تابعین اور شعرا تعلق رکھتے ہیں (الاکمال، ۱: ۳۵۵)۔ جن میں عبدالرحمٰنؓ بن

عبداللہ، مجدرؓ بن زیادؓ، عبداللہ بن زیادؓ، ابوبردہؓ بن نیار، زیدؓ بن اسلم اور ثابتؓ بن اقرم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سب صحابہ بدری ہیں۔ نعمانؓ بن عمرو بدری بھی ہیں اور عقبی بھی، ایک صحابی عبدہؓ بن مغتب کا تعلق بھی بلی کے، قبیلہ سے تھا۔ انہوں نے غزوۂ احد میں شرکت کی تھی، ایک صحابی معنؓ بن عدی تھے، انہوں نے بدر مین شرکت کی تھی اور غزوہ احد میں شہادت پائی (ابن حزم: جمھرۃ انساب العرب، ص: ۴۴۲) القلقشندی نے سہل بن رافع، ابوبردہ بن نیار، جبارہ بن زرارہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ (نہایۃ الأرب ، ص: ۱۸۰)۔

مآخذ: (۱) عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب، ا: ۱۰۴۔۱۰۷، بیروت: ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء ؛ (۲) ابوجعفر محمد بن حبیب: کتاب مختلف القبائل ومؤتلفھا، لاہور، ص: ۲۷، ۳۱، ۶۰: (۳) حافظ ابو نصر علی بن ھبہ اللہ المعروف بابن ماکولا: الاکمال فی رفع الاتیاب عن المؤتلف والمختلف من الاسماء والکنی والانساب، ا: ۳۵۵، دکن ، ہند ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۲ء؛ (۴) ابوالعباس احمد القلقشندی: نہایۃ الأرب فی معرفۃ انساب العرب، ص: ۱۸۰، القاہرہ ۱۹۵۹؛

(۵) ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم الاندلسی: جمھرۃ انساب العرب، ص: ۴۴۶، مصر، ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء؛ (۶) ابن ہشام السیرۃ النبویۃ، ۲: ۹، القاہرہ؛ (۷) ابوجعفر محمد بن جریر الطبری: ج جز ۲؛ (۸) ابن سعد: طبقات الکبری ، ا: ۹۴، ۲: ۱۷۸، بیروت، ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء؛ (۱۰) محمد الحسن بن احمد بن یعقوب بن یوسف بن داؤد الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، لائیڈن ۱۲۶۸ء، ص: ۱۷۰؛ (۱۱) جرجی زیدان: العرب قبل الاسلام، ص ۲۳۰۔

(شمیم روشن آراء ؛و محمودالحسن عارف)

••-------------••

⊗ بل یمنز: (ت ایک اصطلاح، اس سے مراد خلافت عثمانیہ میں استعمال ہونے والی ایک توپ تھی۔ بقول V.J. Pasey 'مقالہ بارود" بذیل مادہ، در آ آ آ) یہ لفظ جرمن لفظ Faule Metze سے نکلا ہے (دیکھیے پچوی، ا:۲۰۲)۔ معروف ترک مؤلف اولیا چلپی (۴۱۸:۸۔۴۱۸) نے اسے "دور تک مار کرنے والی ایک توپ" قرار دیا ہے، جب کہ سلحدار (۴۶:۲۔۴۷) میں اس سے مراد ایسی توپ لی گئی ہے، جس میں دس سے چالیس اکہ وزن کا گولہ استعمال ہوسکتا ہے۔ (نیز دیکھیے مقالہ بارود)۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں.

(ادارہ)

••-------------••

⊗ **بنگل خان جوگزئی، نواب:** بلوچستان کے ایک قبائلی سردار: انگریز ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کرتے اور آگے بڑھتے رہے۔ پنجاب میں سکھوں کی طاقت ان کو زیادہ دیر نہ روک سکی۔ چنانچہ وہ آگے بڑھ کر سندھ پر قابض ہوگئے۔ اس تمام عمل میں ان کو اتنا عرصہ نہیں لگا، جتنا بلوچستان کے سنگلاخ کوہساروں پر قابض ہونے میں لگا۔ یہاں چپے چپے پر بلوچ اور پشتون جنگجو قبائل ان کی پیش قدمی کرنے میں ان کے مزاحم ہوے اور بارہا انگریزوں کو بھاری نقصان بھی پہنچایا۔ بلوچستان کے شمال اور شمال مشرق میں غیور افاغنہ کے نامور قبائل آباد ہیں، کاکڑ، ترین، جوگزئی، اچکزئی وغیرہ ہر قبیلہ جنگجو ہے، بلوچ علاقوں میں بلوچ قبائل آزادی کے پروانوں کی طرح مادر وطن پر نثار ہوے تو شمالی خطہ میں پشتونوں نے ملی غیرت کا بھرپور اظہار کیا، ان سرفروشوں میں نواب بنگل خان جوگزئی کا تذکرہ ولولہ انگیزاور جان پرور ہے.

نواب بنگل خان جوگزئی دوست محمد خان جوگزئی کے فرزند تھے، نواب محمد خان جوگزئی، جس نے تحریک پاکستان میں قابل قدر خدمات انجام دیں ان کے بیٹے تھے۔ نواب بنگل خان کے والد دوست محمد خان کی زندگی

میں ہی بیٹے نے بڑھتی ہوئی برطانوی شہنشاہیت کے خلاف نعرۂ حریت بلند کیا۔ ۱۸۸۳ سے ۱۸۸۶ء تک تین سال کے عرصے میں انگریزوں کو ایک رات بھی سکھ اور چین کی نیند نہ سونے دیا۔ انگریزوں سے ان کی قیادت میں قبائل کی پہلی جھڑپ قلعہ سیف اللہ میں ہوئی، چونکہ انگریزی فوجیں تربیت یافتہ اور منظم تھیں، اس لیے قبائل کو مجبوراً میدانی علاقے چھوڑ کر ''تورغد'' نامی پہاڑ میں قلعہ بندیاں کرنا پڑگئیں، جہاں سے انگریزوں کو تہس نہس کرنے کے لیے وہ شاہینوں کی طرح ان پر جھپٹتے۔ انگریزوں نے جوگزئی قبائل سے جدال و قتال چھوڑ کر افغانستان کے امیر عبدالرحمٰن سے رجوع کیا اور امیر عبدالرحمٰن کی مداخلت پر جنگ بندی ہوئی۔ بعد میں ۱۸۹۱ء میں جب مشہور ڈیورنڈ لائن کھینچی جانے لگی، نواب بنگل خان کو اس مشن کے رکن کی حیثیت سے شامل کیا گیا تاکہ قبائل ان کی موجودگی میں شدید حملوں سے باز رہیں۔ نواب بنگل خان تین سال تک اس کمیشن میں شامل رہے۔ ۱۹۰۱ء میں برطانوی حکومت نے ان کو سردار بہادر کا لقب اور جاگیر بخشی، ۱۹۰۴ء میں وائسرائے نے ہندوستان کا دورہ کیا تو سرہندی میکوھن کے ہمراہ وہ بھی وفد میں شامل تھے، اس موقع پر ان کو نواب کا خطاب دیا گیا۔ بنگل خان جوگزئی ایک اچھے اور نعت گو شاعر بھی تھے۔ اس بہادر قبائلی سردار کو مئی ۱۹۰۶ء میں قلعہ سیف اللہ کے مقام پر کسی قبائلی تنازعے میں شہادت نصیب ہوئی۔

(غوث بخش صابر)

••————••

⊗ بنگلہ دیش: ایک معروف اسلامی ملک، سابق مشرقی پاکستان جو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان سے الگ ہوا۔ اس کا سرکاری نام ''گنا پراجتنتری بنگلہ دیش (People's Republic of Bengladesh: عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش) ہے۔ [ابتدائی حالات کے لیے رکّ بہ پاکستان]۔

اس مقالے میں درج ذیل عنوانات پر بحث ہوگی۔

(۱) محل وقوع اور انتظامی تقسیم؛ (۲) لسانی تشخص؛ (۳) زمین اور قدرتی وسائل (موسمی حالات وغیرہ)؛(۴) آئین (۵) اقتصادی جائزہ؛ (۶) مواصلات؛ (۷) دفاع؛ (۸) عدلیہ؛ (۹) تعلیم؛ (۱۰) تاریخ (قیام سے ۲۰۰۵ء تک)۔

(۱) محل وقوع: بنگلہ دیش کے مغرب اور شمال میں بھارت، مشرق میں بھارت اور میانمر(سابق برما) اور جنوب میں خلیج بنگال واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۵۶,۹۷۷ مربع میل (ایک لاکھ سینتالیس ہزار پانچ سو ستر [۱۴۷۵۷۰] مربع کیلو میٹر) ہے۔ ۱۹۹۹ء میں بھارت نے اُسے انگرپتہ (Angar Pota) اوردہا گرم (Dahagram) سے ملانے کے لیے ''ٹن بیگہ'' کا علاقہ ۹۹۹ برسوں کے لیے کرائے پر دے دیا (دیکھیے: The Statesman's year Book 2005، ص۲۵۸)۔ اس کا شمار دنیا کے غریب ترین اور گنجان ترین آبادی والے ملکوں میں ہوتا ہے۔ تازہ ترین مردم شماری (۲۰۰۳ء) کے مطابق ملک کی آبادی چودہ کروڑ سڑسٹھ لاکھ چھتیس ہزار (۱۴,۶۷,۳۶,۰۰۰) افراد پر مشتمل ہے اور آبادی کی گنجانی ۹۹۴٫۳ افراد فی مربع کیلومیٹر ہے (The Europa world Year Book 2005، مطبوعہ ۲۰۰۵ء، ۱/۱۱۷) تقریباً ۷۵فیصد آبادی دیہاتوں میں رہائش پذیر ہے (Britannica year book 2002، مطبوعہ ۲۰۰۲ء، ص ۳،۲؛ Statesman's Year Book 2005، ص ۲۵۹)۔

انتظامی لحاظ سے بنگلہ دیش چھ قسموں (Divisions) میں منقسم ہے۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے: باریسال ڈویژن (رقبہ ۱۳۲۹۷ مربع کیلومیٹر، آبادی ۸۵۱۴۰۰۰)، چاٹگام ڈویژن (رقبہ ۳۳۷۷۱ مربع کیلومیٹر، آبادی: ۲۵۱۸۷۰۰۰)، ڈھاکہ ڈویژن (رقبہ ۳۱۱۱۹ ک،م، آبادی ۴۰۵۹۲۰۰۰)، کھلنا ڈویژن (۲۲۲۷۴،ک،م، آبادی ۱۵۱۸۵۰۰۰)، راجشاہی ڈویژن (۳۴۵۱۵، ک م؛ آبادی

۴۷۸۰۰۰)، سلہٹ ڈویژن (رقبہ ۱۲۵۹۶ک م، آبادی ۸۲۹۱۰۰۰)، اس کے دوسرے اہم شہروں میں ڈھاکہ، چٹاگانگ، کھلنا، راجشاہی، سلہٹ کے علاوہ ٹونگی، رنگ پور، نرینگنی، میمن سنگھ، جیسوری، کوملا، دیناج پور، نواب گنج اور بوگرا وغیرہ شامل ہیں (The Statesman's Year Book 2005، ص ۲۵۹).

۱۹۹۷ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی میں ۸۸ فیصد میں مسلمان، ۱۱ فیصد ہندو اور باقی ایک فیصد دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں (کتاب مذکور، ص ۲۶۳).

سکہ: بنگلہ دیش کے قیام (۱۶ دسمبر۱۹۷۱ء) تک وہاں پاکستانی روپیہ ہی چلتا رہا، لیکن پاکستان سے الگ ہونے کے بعد بنگلہ دیش نے ۱۹۷۲ء کے اوائل میں اپنا سکہ جاری کیا، جو ٹکہ کہلاتا ہے۔ ہر ٹکہ ۱۰۰ پیسوں (poisha) پر مشتمل ہوتا ہے۔ ۳۰ ستمبر۱۹۹۸ء کو ایک سٹرلنگ پونڈ ۸۰٫۴ ٹکوں کے اور ایک امریکی ڈالر ۴۷٫۰۴ ٹکوں کے مساوی تھا.

پرچم: بنگلہ دیش کا پرچم گہرے سبز رنگ پر مشتمل ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ ملک کی اکثر آبادی مسلمان ہے، جبکہ مرکز سے تھوڑا سا ہٹ کر مستول کی طرف سرخ رنگ کا ایک نشان دکھایا گیا ہے، جو افق پر موجود سورج کو ظاہر کرتا ہے، جو ملک کی ترقی پذیری کی طرف اشارہ ہے(The Europa,2005، ص۷۰۳)۔ یہ جھنڈا قومی جھنڈے کے طور پر ۱۳ جنوری ۱۹۷۲ء کو اختیار کیا گیا(EMC.Baraclough and W.G. Grampton: *The Flags of the World*، لنڈن ۱۹۸۱ء، ص۱۸۱).

بنگلہ دیش کا قومی ترانہ ممتاز اور نوبل انعام یافتہ ہندو شاعر رابندرناتھ ٹیگور کی ایک نظم پر مشتمل ہے، جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

"میرا سنہرا بنگال، میں تجھ سے محبت کرتا ہوں"

تقریباً تین اطراف سے بھارت سے گھرا ہوا ملک ہونے اور آزادی کی تحریک میں بھارت کی سرپرستی کی بنا پر شیخ مجیب الرحمٰن کے دور تک ملک کی خارجہ پالیسی پر بھارت نوازی کے اثرات نمایاں رہے...... لیکن بنگلہ دیش حکومت نے رفتہ رفتہ اپنی خارجہ پالیسی کو متوازن بنالیا ہے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ بنگلہ دیش کی خارجہ پالیسی پر اس کی اقتصادی ضرورتوں کا سایہ بہت گہرا ہے۔ ملک غریب ہونے اور صنعت محدود ہونے کی بنا پر اُسے ہر سال امداد کی ضرورت ہوتی ہے، اسی لیے اس کی خارجہ پالیسی پر بھی اس کے اثرات نمایاں ہیں (Encyclopaedia Americana، ۳/ ۱۶۱، الف).

علاوہ ازیں بنگلہ دیش میں ہر سال سیلاب اور طوفان آتے ہیں اور کروڑوں روپے کی املاک تباہ ہوجاتی ہیں، پھر وہاں صنعت برائے نام ہے، اس لیے ملک کی خارجہ پالیسی انہی دو دائروں کے گرد گھومتی ہے۔ ملک کی مذہبی شناخت اسلام ہے، اس لیے خارجہ پالیسی کا پہلا محور مسلمان ممالک ہیں اور دوسرا ہدف اقتصادی امداد کا حصول ہے، اسی لیے امریکہ اور روس دونوں کے اتحادیوں کے ساتھ ملک کے تعلقات اچھے ہیں۔ بنگلہ دیش "سارک تنظیم" میں بھی بے حد اہم کردار ادا کررہا ہے(نیز دیکھیے، ذیل میں خارجی پالیسی کے اہداف).

(۲) لسانی تشخص: "بنگلہ دیش" کی قومی زبان بنگالی ہے، زبان کے مسئلے پر بنگالی بڑے حساس ہیں، پاکستان سے علیحدگی کی وجوہ میں سے ایک اہم وجہ زبان کا مسئلہ بھی ہے، جس پر قیام پاکستان کے وقت سے جھگڑا شروع ہوگیا تھا (بنگلہ زبان اور اس کی ادب اور اس کی تاریخ وغیرہ کے متعلق دیکھیے فیصلہ، بذیل مادہ).

(۳) زمین اور قدرتی وسائل: بنگلہ دیش برعظیم پاک و ہند کے کئی بڑے دریاؤں کے مثلثی (ڈیلٹاؤں) پر واقع ہے، جن میں سے دریائے گنگا (بنگلہ دیش میں: پدما)،

دریائے برہم پتر، اس کی نشیبی شاخوں میں دریائے جمنااور دریائے میگنا خاص طور پر قابل ذکر ہیں،...... بنگلہ دیش میں یہ تمام دریا ایک جگہ جاکر باہم مل جاتے ہیں اور پھر ایک دریا کی صورت میں خلیج بنگال میں جا کر گرتے ہیں، اس طرح ان دریاؤں سے ایک بڑا مثلث یا ڈیلٹا بن جاتا ہے (Encyclopaedia Americana، ۳/۱۶۱۔ الف و ب).

بنگلہ دیش کا نوے فیصد حصہ ایک وسیع، ہموار اور کم بلند میدان پر مشتمل ہے، جسے اصطلاحاً گنگا کی ''وادی زیریں'' کہا جاتا ہے۔ اس کی تشکیل دریائے گنگا (پدما برہم پترا=جمنا) میگنا اور ان کے بیسیوں معاون دریاؤں کی سیلابی مٹی سے ہوئی ہے۔ کئی مقامات کی سطح سمندر سے بلندی محض تین فٹ ہے۔ میدان کی ڈھلوان پانچ انچ فی میل سے بھی کم ہے اور اس پر دریاؤں اور ندی نالوں کا جال سا بچھا ہوا ہے، جن کی وجہ سے یہ میدان کئی دوآبوں میں تقسیم ہوگیا ہے، جو اپنی زرخیزی کی بنا پر دنیا بھر میں مشہور ہیں،...... پدما، جمنا اور میگنا یہاں دنیا کا سب سے بڑا ڈیلٹا بناتے ہیں، جس کا علاقہ موسم برسات میں اکثر زیر آب آجاتا ہے۔ کثرت باراں کی بنا پر کئی علاقے دلدل بن گئے ہیں۔ ڈیلٹا کے زیریں حصے میں سندر بن کے مشہور عالم جنگلات ہیں۔ علم طبقات الارض کی رو سے اس میدان کو جدید ترین میدان یعنی پلاسٹوسین (Plastocene) طبقہ قرار دے سکتے ہیں [رکّ بہ پاکستان، بذیل مادہ].

اس کے جنوب مشرق میں چاٹگام کی پہاڑیاں ہیں، جو اصل میں آسام کے پہاڑوں اور اراکان و برما کی شاخیں ہیں اور ساحل کے قریب ایک دوسرے کے متوازی پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ پہاڑیاں زیادہ بلند نہیں اور اپنی چوٹی پر عموماً ۱۲۰ فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں ہیں۔ بلند ترین چوٹی کراڈونگ ۴۰۳۴ فٹ اونچی ہے۔ ان پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر خوب بارش ہوتی ہے، اس لیے یہ جنگلات سے ڈھکی رہتی ہیں، اس علاقے کا سب سے بڑا دریا کرناکلی ہے، جو ان پہاڑوں کے درمیان بہتا ہے۔ مجموعی طور پر اس علاقے کی زمینی سطح کا شمار مرطوب منطقے میں ہوتا ہے(Encyclopaedia Americana، محل مذکور)۔

بنگلہ دیش کی آب و ہوا۔ بارش کی کثرت، سمندر سے قرب اور پہاڑ نہ ہونے کی بنا پر مرطوب اور معتدل ہے۔ یہاں نہ زیادہ گرمی پڑتی ہے اور نہ زیادہ سردی۔ کم از کم درجہ حرارت جنوری میں ۴۹ سے ۵۲ف (۱۰ تا ۱۱ سنٹی گریڈ) اور جولائی میں ۷۹ سے ۸۰ ف (۲۵ تا ۲۷ سنٹی گریڈ) کے درمیان رہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت جنوری میں ۷۵ سے ۸۷ ف (۲۵تا۲۷ سنٹی گریڈ) اور جولائی میں ۸۶ سے ۸۹ ف(۳۰ تا ۳۳ سنٹی گریڈ) ہوتا ہے۔ یہاں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت ۱۰۵ ف (۴۰۔۴۱ سنٹی گریڈ) ریکارڈ کیا گیا ہے.

یہاں بارش کی سالانہ اوسط مغربی حصے میں ۵۰ً سے جنوب مشرق میں ۱۰۰ً تک ہے۔ شمال میں مشرقی سلہٹ کے کوہ دامنی علاقے میں سالانہ کم از کم بارش ۲۰۰ً لال پور، راج شاہی میں ۴۷٫۹ً سالانہ اور زیادہ سے زیادہ بارش سلہٹ میں ۲۲۵٫۸ً سالانہ ریکارڈ ہوئی ہے۔ دو تہائی بارش جون سے ستمبر تک، یعنی مون سون کے موسم میں ہوتی ہے، لیکن بعض اوقات استوائی طوفان بھی اس کا سبب بنتے ہیں۔ خلیج بنگال سے اٹھنے والے طوفانوں کی بنا پر بعض اوقات برسات کا موسم اکتوبر، بلکہ نومبر تک بھی جاری رہتا ہے۔ دسمبر اور جنوری میں بہت کم بارشیں ہوتی ہیں (The Statesman`s year book 2005، ص ۲۵۹).

(۴) آئین : بنگلہ دیش کا آئین سولہ دسمبر۱۹۷۲ء کو نافذ ہوا۔ یہ شیخ مجیب الرحمان کے چھ نکات اور طالب علم تنظیموں کے بارہ نکات کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اسے ان ارکان اسمبلی نے منظور کیا جو بنگلہ دیش

کے قیام سے پہلے "مشرقی پاکستان" سے متحدہ پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن کے طور پر منتخب ہوئے تھے۔ اس آئین کی رو سے بنگلہ دیش ایک جمہوری ملک ہے اور اس میں ملک کے لیے پارلیمانی نظام حکومت تجویز کیا گیا۔ ریاست کا سربراہ صدر ہے، جسے ہر پانچ سال کے لیے ملک کی پارلیمنٹ منتخب کرتی ہے۔ اس کے نفاذ سے لے کر اب تک، پاکستان کی طرح، بنگلہ دیش کا آئین بھی کئی مرتبہ معطل اور بحال ہوا اور اب تک اس میں کئی ترمیمات ہوچکی ہیں۔ آخری مرتبہ جنرل محمد ارشاد نے ۲۴۔ مارچ ۱۹۸۲ء کو معطل کر کے مارشل لاء لگا دیا۔ یہ آئین دوبارہ ۱۰ نومبر ۱۹۸۶ء کو بحال کیا گیا۔ آئین کے چار بنیادی نکات قوم پرستی، سوشلزم، جمہوریت اور سیکولرازم ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں صدر ضیاء الرحمان نے ایک ترمیم کے ذریعے سیکولرازم کو اسلام سے بدل دیا۔ اس طرح اب اسلام آئین کے چار بنیادی نکات میں شامل ہے۔ ابتدائی دور میں آئین پارلیمانی طرز حکومت پر مشتمل تھا، مگر شیخ مجیب الرحمان نے ۲۵ جنوری ۱۹۷۵ء کو چوتھی ترمیم کے ذریعے پارلیمانی نظام حکومت کو صدارتی نظام حکومت سے بدل دیا...... یہ صدارتی نظام صدر محمد ارشاد کے عہد حکومت تک رائج رہا۔ ستمبر۱۹۹۱ء میں عوام کے استصواب رائے (Refrendum) کے ذریعے صدارتی نظام حکومت کی جگہ دوبارہ پارلیمانی نظام حکومت اپنا لیا گیا۔ اس استصواب رائے میں رائے دہی کی شرح بہت کم رہی۔ آئین کی رو سے صدر مسلح افواج کا کمانڈر انچیف بھی ہے، جبکہ انتظامیہ کا سربراہ وزیراعظم ہے، جو کابینہ کا سربراہ بھی ہوتا ہے۔آئین میں آخری ترمیم۱۹۹۶ء میں ہوئی، جس کی رو سے صدر کو پارلیمنٹ کے تحلیل ہونے کی صورت میں عبوری وزیراعظم مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ جو غیر جانب دارانہ انتخابات کی نگرانی کرے گا۔ ایک ایوانی پارلیمنٹ تین سو پینتالیس اراکین پر مشتمل ہے، جو پانچ سال کے لیے براہ راست انتخاب کے ذریعے منتخب ہوتے ہیں۔ ان میں سے پینتالیس سیٹیں خواتین کے لیے مخصوص ہیں، جنھیں ارکان پارلیمنٹ منتخب کرتے ہیں (The Europa world Year Book 2005، ۱/۱۶۱۷)۔ خصوصی حالات میں پارلیمنٹ کو ایمرجنسی لگانے کا حق دیا ہے اور جنگ وغیرہ کے حالات میں صدر کو مناسب فیصلہ کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

آج الدین......بنگلہ دیش کے موجودہ (جنوری ۲۰۰۶ء) صدر ہیں ، جن کا ۵ ستمبر ۲۰۰۲ء کو بلامقابلہ انتخاب عمل میں آیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ حزب اختلاف کوئی موزوں امیدوار سامنے نہ لاسکی۔ یکم اکتوبر ۲۰۰۱ء کو ہونے والے انتخابات میں، شیخ حسینہ واجد کی عوامی لیگ صرف ۶۲ سیٹیں حاصل کرنے کی بنا پر پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت برقرار نہ رکھ سکی اور خالدہ ضیاء کی جماعت "بنگلہ دیش جمہوری پارٹی" (Bangladesh Democretic Party) نے ۱۹۱ اور اس کی حلیف جماعتوں میں سے جماعت اسلامی نے اٹھارہ، جاتیا، دل (J.D.N) نے چار اور اسلامی لوکیا جوٹ (IOJ) نے چار (کل ۲۱۷) سیٹیں حاصل کیں، جو دوتہائی سے بھی زیادہ ہیں (The Statesmen`s.year book, 2005، ص۲۶۰)۔ ۲۰۰۷ء میں خالدہ ضیاء کی حکومت بھی برخاست ہوچکی ہے اور اسے اپنے اور اس کے بیٹے کے خلاف بدعنوانی کے مقدمات کا سامنا ہے اور ملک میں ایک قومی عبوری حکومت قائم ہے۔

ملک میں اگرچہ کئی جماعتی نظام رائج ہے، مگر عملی طور پر سیاسی جماعتیں دو حصوں میں بٹی ہوئی ہیں، دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی زیادہ تر جماعتیں خالدہ ضیاء کے ساتھ اور بائیں بازو اور بھارت نواز جماعتیں حسینہ واجد کے ساتھ ہیں، انتخاب بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منعقد کرائے جاتے ہیں، ہر ۱۸ سال یا اس سے بڑی عمر کے شہری کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔

(۵) ملک کا اقتصادی جائزہ: جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، آبادی میں اضافے اور وسائل میں کمی کی بنا پر بنگلہ دیش غربت کے حساب سے درجہ بندی میں سے چھبیسواں ملک ہے، جہاں ۳۶.۹ فیصد آبادی کی یومیہ آمدن ایک امریکی ڈالر سے بھی کم ہے۔ ملک میں زراعت کا شعبہ سب سے زیادہ لوگوں کا روز گار مہیا کررہا ہے، اس سے ملک کے دو تہائی باشندوں کی معیشت وابستہ ہے۔ ملک کی سب سے اہم اور سب سے بڑی زرعی پیداوار چاول ہے۔ بنگلہ دیش آئی ایم۔ایف کے ''اصلاح معیشت'' پروگرام پر عمل پیرا ہے اور اپنی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے، ''فنڈ'' کی ہدایات پر عمل کررہا ہے، لیکن ملک میں امن و امان کی خراب صورت حال، بد انتظامی، بجلی کی فراہمی کے ناقص انتظامات اور شرح سود کی زیادتی وغیرہ کی بنا پر غیر ملکی سرمایہ کاری کا تناسب دوسرے ایشیائی ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے ..... ناقص بنکاری نظام..... قدرتی آفتوں، خصوصاً سیلابوں کی تباہ کاریوں اور ملک میں سیاسی عدم استحکام وغیرہ کی بنا پر ملک کی اقتصادی صورت حال میں کچھ زیادہ بہتری نہیں آئی (The Europa world year book,2005, London. ۱/۷۰۹).

عالمی بنک کے جاری کردہ اعدادوشمار کے مطابق ۱۹۹۶ء میں بنگلہ دیش کی مجموعی قومی پیداوار (Gross National product =G.N.P) ۱۹۹۴۔۱۹۹۶ء کے تخمینوں کے مطابق ۳۱،۲۱۷ ملین امریکی ڈالر تھی۔ اس اعتبار سے قومی پیداوار میں فی کس شرح پیدائش ۲۶۰ امریکی ڈالر ہے۔ ۱۹۹۷ء میں اس کی مقدار ۳۳،۲۰۰ ملین ہوگئی، جس کی رو سے فی کس شرح ۲۷۰ امرکی ڈالر قرار پاتی ہے۔ فی کس شرح پیداوار (G.D.P) آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۹۰۔۱۹۹۷ء کے مابین GDPمیں اوسطاً ۴،۵ فیصد کے حساب سے اضافہ ہوا۔ ۱۹۹۵۔۱۹۹۶ء میں یہ شرح ۵،۶۳ فیصد، ۱۹۹۶۔۱۹۹۷ء میں ۵،۷ فیصد اور ۱۹۹۷۔۱۹۹۸ء میں ۵،۶۶ فیصد تھی۔ آئی ایم ایف کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۹۷ء میں بنگلہ دیش کا تجارتی خسارہ ۱۷،۱۰۸ ملین امریکی ڈالر تھا۔ ملکی برآمدات کے مراکز امریکہ، جاپان، چین اور ہانگ کانگ تھے، جہاں برآمدی تجارت سے ۶۹.۱ فیصد آمدن ہوئی۔ ۱۹۹۷۔۱۹۹۸ء میں بجٹ کا تجارتی خسارہ ۷۴۹۴۰ ملین تھا۔ برآمدی تجارت میں ملک کی سب سے اہم پیداوار پٹ سن ہے۔ ۱۹۹۷۔۱۹۹۸ء میں اس کا برآمدی تجارت میں حصہ ۱۰.۶۳ فیصد تھا، مچھلی اور چائے بھی برآمدی تجارت کا اہم ترین حصہ ہیں (حوالۂ مذکور).

بنگلہ دیش ان ممالک میں شامل ہے، جہاں قدرتی گیس کے وسیع ذخائر پائے جاتے ہیں، ایک اندازے کے مطابق اس کے بیس ''گیس فیلڈز'' میں گیس کے ذخائر کا اندازہ ۳۰۰،۰۰۰ ملین مکعب میٹر ہے؛ جبکہ کئی بین الاقوامی گیس کمپنیوں کا خیال ہے کہ بنگلہ دیش میں گیس کے ذخائر اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں گیس کی پیداوار ۱۱.۶۲ بلین مکعب میٹر تھی.

زراعت، بنگلہ دیش بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے، جہاں لوگوں کا سب سے بڑا ذریعہ معاش زراعت ہے۔ ۱۹۹۵ء کے ایک جائزے کے مطابق زراعت سے وابستہ افراد کی تعداد سات کروڑ اکتالیس لاکھ تیس ہزار افراد تھی، جن میں سے تین کروڑ ایک لاکھ اسی ہزار اقتصادی طور پر متحرک اور نسبۃً بہتر حالت میں تھے۔ اس کی زرعی پیداوار میں پٹ سن سب سے اہم ہے۔ ۲۰۰۰ء میں اس کی کل پیداوار پندرہ لاکھ تیس ہزار میٹرک ٹن تھی، دوسری اشیا میں چاول (۲۰۰۰ء میں ۳۵.۸۲ میٹرک ٹن)، گندم (۱۹ لاکھ میٹرک ٹن)، آلو (۱۷ لاکھ میٹرک ٹن) اور کیلا (پانچ لاکھ ساٹھ ہزار میٹرک ٹن) وغیرہ شامل ہیں (کتاب مذکور، ۲۰۰۵ء، ۱/۷۰۹۔۷۱۰)۔ تاہم پٹ سن کی پیداوار میں بنگلہ دیش سرفہرست ہے.

مویشی پالنے کی صنعت بھی یہاں مستحکم ہے: ۲۰۰۳ء کے ایک جائزے کے مطابق یہاں پائے جانے والے جانوروں میں گائے بیل (مجموعی تخمینہ ۲۳۶۵۲۰۰۰)، بھینسیں (۲۲۸۰۰۰)، بھیڑیں (۳۳۸۰۰،۰۰۰) بکریاں (۱،۱۲۱۰۰۰) اور مرغیاں (۱۳۹،۰۰۰،۰۰۰) وغیرہ شامل ہیں۔ لکڑی کی پیداوار میں بنگلہ دیش خود کفیل ہے۔ ملک کے تقریباً دس فیصد رقبے پر جنگلات پائے جاتے ہیں، یہاں گیلیاں، پلپ (pulp) اور دوسری اقسام کی لکڑی پائی جاتی ہے۔ ۲۰۰۱ء میں یہاں لکڑی کی پیداوار ۲۸.۴۲ میٹرک میٹر تھی.

ملک میں ماہی گیری کو بہت فروغ حاصل ہے۔ ملک کی آبادی کی معیشت کا انحصار ماہی گیری پر ہے۔ یہاں تازہ پانی کی مچھلی سے لیکر نالی شاد، سمندری مچھلیاں اور قشرہ دار مچھلیاں وغیرہ کثرت سے پائی اور پکڑی جاتی ہیں۔ یہاں پچاس لاکھ افراد سمندر اور اسّی ہزار افراد فارمی مچھلیوں کے روزگار سے وابستہ ہیں۔ یہاں اس مقصد کے لیے ۱۲۶۹ کشتیاں، بشمول ۵۲ ٹرالر اور ۳۳۱۷ موٹر بوٹس ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں فروخت ہونے والی مچھلی کی مقدار دس لاکھ ٹن سالانہ تھی، جس میں سے چھ لاکھ ستر ہزار ٹن فارموں سے حاصل کی گئی تھی۔ صرف چین اور بھارت تازہ پانی سے مچھلیاں پکڑنے میں بنگلہ دیش سے آگے ہیں.

جہاں تک صنعتوں کا تعلق ہے، ملک کی مجموعی پیداوار کا ۱۱ فیصد حصہ صنعتی اشیا کی برآمد سے حاصل ہوتا ہے۔ ملک میں ۲۰۰۰ء کے ایک جائزے کے مطابق مختلف صنعتوں سے وابستہ افراد کی تعداد ۵۱،۸۷۶۰۰ ہے، جن میں پندرہ برسوں سے زیادہ عمر کے مردوں کی تعداد ۳۲،۳۶۹۰۰ ہے (The Statesman`s year book, 2005، ص۲۶۲)۔ زیادہ تر لوگ زراعت ماہی گیری، جنگلات، تھوک اور پرچون کاروبار، تجارت اور ہوٹلوں وغیرہ کے روزگار سے وابستہ ہیں.

علاوہ ازیں ملک میں مختلف مقامات پر سیمنٹ ، کاغذ سازی، کھاد، پٹ سن، پارچہ بافی، ماچس، فولاد اور کیمیائی اشیا بنانے کے کارخانے کام کررہے ہیں،...... شیخ مجیب الرحمٰن کے زمانے میں تمام فیکٹریوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا تھا، مگر اس وقت حکومت مقامی اور بیرونی سرمایہ کاروں کو ملک میں سرمایہ کاری کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کر رہی ہے.

بنگلہ دیش کے قیام کے وقت ملک میں کئی بنک موجود تھے، جنہیں لوٹ لیا گیا تھا،...... بعد ازاں مختلف بنکوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ”بنگلہ دیش بنک“ کے نام سے مرکزی بنک کے علاوہ چار قومیائے گئے کمرشل بنک ہیں، ان کے علاوہ سولہ پرائیویٹ ، نو غیر ملکی کمرشل بنک اور دس ڈویلپمنٹ فنانس کارپوریشنیں ہیں۔ ۱۹۹۹ء کے اعدادوشمار کی رو سے بنگلہ دیش کے مرکزی بنک کے پاس ۹۱۱۸ ملین ٹکہ کا سرمایہ موجود تھا۔ ۱۹۹۹ء میں سونامی بنک قومیائے گئے کمرشل بنکوں میں سب سے بڑا بنک تھا، جس میں جمع کرایا ہوا سرمایہ ۱۷۰۹۶۱ ملین ٹکہ تھا، سٹاک ایکسچینج کی عمارتیں ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں ہیں.

(۶) مواصلات: ملک میں مواصلات کا نظام بہت اچھا ہے، جس میں سابق مشرقی پاکستان دور میں قائم شدہ ریل کا وسیع نظام موجود ہے، جس کے ذریعے ملک کے مختلف شہروں کو ایک دوسرے سے مربوط کیا گیا ہے۔ ۱۹۹۹ء کے اعدادوشمار کے مطابق ریلوے ٹریک ۲۷۰۶ کیلومیٹر رقبے پر محیط ہے، جبکہ سڑکوں کی لمبائی ۲۰۷۴۸۶ کیلومیٹر ہے، جن میں سے ۱۹۷۷۵ کیلو میٹر قومی اور ۱۷۲۹۷ ثانوی درجے کی سڑکیں ہیں.

ملک میں ٹیلیفون کا نظام بہت اچھا ہے۔ ۲۰۰۲ء کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ملک میں ۱,۷۵۷,۰۰۰ فون موجود ہیں۔ اس طرح فون رکھنے والوں کی شرح ۱۳،۲ فی

ہزار ہے، ان میں سے ۱,۰۷۵,۰۰۰ موبائل فون تھے، جبکہ ڈاک رسانی کے لیے سرکاری محکمہ ڈاک کام کررہا ہے، ۱۹۹۷ء میں ملک میں ۹۰۹۳ ڈاک خانے کام کر رہے تھے (The Europa,2005، ۱/۱۵۷).

قیام بنگلہ دیش کے وقت کئی شہروں میں ریڈیو اسٹیشن کام کررہے تھے اور بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان بھی انہی میں سے ایک اسٹیشن چاٹگام سے کیا گیا، جبکہ اس وقت کئی اور شہروں میں بھی ریڈیو اسٹیشن قائم ہوچکے ہیں، اس کے علاوہ سرکاری تحویل میں ٹیلی ویژن کے ساتھ ساتھ کئی پرائیویٹ چینل بھی کام کررہے ہیں.

۱۹۹۲ء میں یہاں سے ۳۷ یومیہ اخبارات شائع ہورہے ہیں جبکہ رسائل و جرائد کی تعداد ہزاروں میں ہے، ڈھاکہ میں امریکی اور برطانوی معلوماتی مراکز کے علاوہ ایک مرکزی لائبریری بھی ہے، جس کی کئی شہروں میں شاخیں ہیں (The Europa world year book,2005، ۱/۱۵۷).

ملک میں تاریخی اہمیت رکھنے والے کئی مقامات ہیں۔ ان میں تین مقامات کو یونیسکو کے تاریخی مقامات میں شامل کیا گیا ہے، جن میں سب سے اہم پندرہویں صدی عیسوی میں گنگا اور برہما پترا کے سنگھم پر معروف ترک حکمران الغ خان کے تعمیر کردہ خلافت آباد (موجودہ نام بگرھٹ) کی مسجد ہے،.... اسی طرح بدھ دھارا کے کھنڈرات بہارپور میں واقع ہیں.

تیسرا اہم مقام سندر بن ہے جو برہماپترا اور گنگا کے دھانے کے قریب واقع ہے (کتاب مذکور، ص۲۶۳)؛ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے مآخذ).

(۷) دفاع: بنگلہ دیش کا قیام چونکہ جنگ کے نتیجے میں عمل میں آیا اور اس کے قیام سے لیکر اب تک کم از کم چار مرتبہ فوجی انقلاب آچکے ہیں، اس لیے فوج ملک کی بنیادی ضرورت ہے۔ بنگلہ دیش کی فوج کو منظم کرنے اور اس کا حوصلہ بلند کرنے کا سہرا جنرل ضیاء الرحمان کے سر ہے، جو بنگلہ دیش کے قیام کے وقت، پاکستانی فوج میں میجر کے عہدے پر فائز تھا (دیکھیے ذیل)۔ اس نے اپنے دور اقتدار (۱۹۷۵ـ۱۹۸۲ء) کے دوران میں فوج کی مکمل طور پر تنظیم نو کی اور اُسے محدود وسائل کے باوجود جدید اسلحہ سے لیس کیا۔ اس وقت بنگلہ دیش کی فوج کے کماندار اعلیٰ صدر ہے۔ ۲۰۰۲ء میں ملک کے دفاع پر مجموعی اخراجات کا تخمینہ ۶۳۸ ملین ڈالر تھا، گویا فی کس ۴ رامریکی ڈالر فوج پر خرچ کیے جا رہے تھے۔ اس وقت مسلح افواج کے ارکان کی تعداد ۱۲۰۰۰۰ (ایک لاکھ بیس ہزار) ہے۔ اس کے علاوہ پانچ ہزار فوجی پولیس، ۲۰۰۰۰ خصوصی محافظ دستے (انصار) اور ۳۸۰۰۰ بنگلہ دیش رائفلز (سرحدی محافظین) کے علاوہ ۱۸۰۰۰۰ خصوصی محافظ ریزرو (انصار) بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ملک میں نیوی بھی ہے جس کے مراکز چٹاگانگ، ڈھاکہ، کپتائی، کھلنا اور منگلا کے مقامات پر ہیں۔ بنگلہ دیش نیوی کے پاس پانچ فرائی گیٹ، دس میزائل بردارجہاز، چار پیٹرو بردار جہاز اور انیس گشتی جہاز ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں نیوی کے ملازمین کی تعداد ۱۰۵۰۰ افراد تھی۔ فضائیہ میں چار لڑاکا سکواڈرن اور تین ہیلی کاپٹر پر مشتمل سکواڈرن موجود ہے، اس کے افراد کی تعداد ۶۵۰۰ تھے (The Statesman`s year book 2005،ص ۲۶۰) ۱۹۹۸ء میں بنگلہ دیش کا دفاعی بجٹ ۲۷۹۰۰۰ ملین تھا.

(۸) عدلیہ: آئین میں عوام کو انصاف کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ بنگلہ دیش میں مقامی سطح کی عدلیہ کے ساتھ مرکزی اور ملکی سطح پر سپریم کورٹ موجود ہے، جس کی سربراہی چیف جسٹس کرتا ہے، جو اپیلیٹ ڈویژن اور ہائی کورٹ پر مشتمل ہے، جسے ملک کی چھوٹی عدلیہ پر کنٹرول حاصل ہے، ہائی ججوں

کی تقرری صدر کرتا ہے اور ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر ۶۵ برس ہے؛ اس کے بنچ کومیلا، جیسور، بریسال، چٹاگانگ اور سلہٹ میں قائم ہیں۔ اس کے علاوہ ضلعی سطح پر عدلیہ کا نظام موجود ہے(The Europa 2005، ۱/۱۶۷).

(۹) تعلیم: بنگلہ دیش میں غریب ملک ہونے کے باوجود شروع سے تعلیم پر توجہ مبذول رہی ہے، ۱۹۹۳۔۱۹۹۴ء میں ملک میں ۹۵۸۸۶ سکول، ۱,۶۷۰۰,۰۰۰ طالب علم اور ۳۱۲۱۸۶ اساتذہ تھے۔ ۱۹۹۲۔۱۹۹۳ء میں ۱۱۳۸۲ سیکنڈری سکول تھے، جن میں ایک لاکھ انتیس ہزار چھ سو پچپن اساتذہ کام کر رہے تھے، جبکہ مزید تعلیم کے لیے ۱۰۳۱ کالج تھے، ان میں ۷۹۷ پرائیویٹ اور باقی سرکاری تھے، ان میں ۹۱۲،۸۹۵ طلبہ اور ۲۶۲۶۳ اساتذہ تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، ۱۹۹۳۔۱۹۹۴ء میں ۸۰ پیشہ وارانہ تعلیمی ادارے تھے، جن میں ۴۳۵۰۳ طلبہ اور ۲۷۵۲ استاد تھے (The Statesman`s year book.2005، ص ۲۶۳).

حکومت تمام لڑکے اور لڑکیوں کو اسکول کی ابتدائی درجے کی تعلیم مفت مہیا کر رہی ہے۔ اپنی اولاد کو پرائمری تعلیم دلانا تمام لوگوں کے لیے لازمی ہے۔ اس کی ابتدا چھٹے سال سے ہوتی ہے اور تعلیم کا یہ درجہ پانچ برسوں میں مکمل کر لیا جاتا ہے۔ ۲۰۰۰ء اور ۲۰۰۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۰۰ فیصد لڑکوں اور ۱۰۱ فیصد لڑکیوں نے اس درجہ کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی جبکہ ثانوی تعلیم کے درجے میں یہ شرح ۴۶ فیصد ہے (۴۵ فیصد لڑکے اور ۴۷ فیصد لڑکیاں) سرکاری اسکولوں اور تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ تعلیمی ادارے بھی کام کر رہے ہیں.

۲۰۰۱-۲۰۰۲ء کے ایک جائزے کے مطابق ملک میں تیرہ سرکاری جامعات، ایک اسلامیہ یونیورسٹی، ایک اوپن یونیورسٹی، ایک ایگریکلچر اور ایک انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی یونیورسٹی بھی کام کر رہی ہے۔ اساتذہ کی تعلیم و تربیت کے پانچ ادارے، پانچ طبی کالج، تین لاء کالج، دو فائن آرٹس کالج، ایک انسٹیٹیوٹ آف اپتھلمالوجی اور ایک ادارہ برائے بحالی معذوراں بھی موجود ہے۔ ۱۹۹۴۔۱۹۹۵ء میں یونیورسٹی سطح کے طلبہ ۹۲۶۵۴ اور یونیورسٹی اساتذہ ۲۲۱۷ تھے۔ چنانچہ ۲۰۰۱ء میں تعلیم یافتہ بالغ افراد کی شرح ۴۰.۶ فیصد مردوں میں (۴۹٫۹ فیصد) (اور ۳۰٫۸ فیصد عورتوں میں) تھی۔ ۲۰۰۰ اور ۲۰۰۱ میں حکومت تعلیم کی مد پر مجموعی پیداوار (G.N.P) کا مجموعی ۲٫۵ فیصد اور حکومتی اخراجات کا ۱۳.۸ فیصد خرچ کررہی تھی (The Europa world year book 2005، ۱/۱۰۷).

تعلیم کی طرح عوام کی صحت پر بھی خاص توجہ مبذول کی جارہی ہے۔ ۱۹۹۷ء میں ملک میں دس ہزار افراد کے لیے چار بستر کی شرح سے ۹۷۶ ہسپتال اور ۲۷۵۴۶ ڈاکٹر اور ۹۳۸ دندان ساز، ۱۵۴۰۸ نرسیں، ۱۳۲۱۱ دائیاں تھیں (حوالہ مذکور).

(۱۰) تاریخ: تاریخ کے تحت درج ذیل عنوانات پر گفتگو کی جائے گی:

(الف) قدیم دور (ابتدا تا قیام پاکستان)
(ب) قیام پاکستان تا اختتام ایوب حکومت
(ج) جنرل محمد یحیٰی خان کا دور اور قیام بنگلہ دیش
(د) شیخ مجیب الرحمٰن کا دور حکومت
(ہ) فوجی انقلاب جنرل ضیاء الرحمٰن کا دور حکومت
(و) جنرل محمد ارشاد کا دور حکومت
(ز) سول حکومت کا دور

(الف) قدیم دور (ابتدا تا قیام پاکستان):

بنگلہ دیش (مشرقی بنگال) دنیا کے ان خطوں میں سے ایک ہے، جو ہزاروں سال سے آباد ہیں۔ مآخذ کی رو سے یہاں ایک ہزار سال قبل از مسیح دراوڑ زبان بولنے والے لوگ آباد تھے۔ روایات کی رُو سے یہاں

قدیم دور میں بنگ قوم آباد تھی، جس کی بنا پر اس خطے کا نام بنگال پڑا...... آریاؤں کی اس خطے میں آمد سے قبل کے حالات ماضی کے دھندلکوں میں گم ہیں، خود آریاؤں کی آمد کی تاریخ اور زمانہ متعین نہیں ہے...... قیاس کی رو سے ایک ہزار ق۔م میں یہ لوگ یہاں آنا شروع ہوئے (آ آ آ، ۵: ۳۷۴)۔ ان لوگوں نے یہاں پہلے سے آباد دراوڑ زبان بولنے والے لوگوں کو علاقہ چھوڑنے پر مجبور کیا...... شمالی علاقے میں "پندر" آباد تھے، جو بہت زیادہ جنگجو تھے، ان کے آثار مہستان (ضلع بوگرہ) میں دریافت ہوئے ہیں۔ یہاں سے دریافت ہونے والے ایک کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خطہ مگدھ کے موریا راجاؤں کے ماتحت تھا۔ گپتا سلطنت کے عروج کے زمانے میں بنگال بھی اس میں شامل ہوا۔ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں اس سلطنت پر زوال آگیا، تو پورے بنگال میں سیاسی ابتری پھیل گئی۔

موریا حکومت (۳۲۰تا ۱۸۰ ق م) کے دور میں خصوصاً اشوک (۲۷۳تا۲۳۲ ق۔ م) کے عہد حکومت میں اس علاقے میں بدھ مت پھیلا۔ ۳۱۹ تا ۵۴۰ کے درمیان تمام شمالی ہند میں گپتا حکومت رہی، جس میں بنگلہ دیش سمیت تمام بنگال بھی شامل تھا۔ ۶۰۶ سے ۱۱۵۰ء کے مابین یہاں خاموش حکومت قائم رہی۔ اسی دور میں گوپال نامی ایک سردار نے پال خاندان (۷۵۰تا۱۱۵۰ء) کی بنیاد رکھی، جو اس صدی کے اختتام سے پہلے پورے بنگال اور بہار پر قابض ہوگیا۔ پال راجے بدھ مت کے پیرو تھے اور ان کے دور میں اہل بنگال کی بہت بڑی تعداد نے اسی مذہب کی پیروی اختیار کرلی۔ ان حکمرانوں نے بدھ مت کے کئی شاندار عبادت خانے بنوائے جن کے آثار آج بھی باقی ہیں، مثلاً راج شاہی کے نزدیک پندرنگر میں (۸۰۰ء) اور کومیلا کی پہاڑیوں ینامتی اور لال مائی (گیارھویں، بارھویں صدی) کے آثار ملتے ہیں۔ اس علاقے میں اسلام کی آمد سے قبل آخری حکومت سین خاندان کی تھی جو کٹر ہندو خاندان تھا (۱۱۵۰۔۱۲۰۲ء)۔ یہ دور بنگال کی تاریخ میں زوال کا دور سمجھا جاتا ہے۔ یہ راجے نکمے، بزدل اور بے علم تھے۔ بدھ مت رفتہ رفتہ کمزور ہوتا گیا۔ مذہبی بدھ تعلیمات، مثلاً دنیا سے بے رغبتی اور جنگ و جدال سے بے تعلقی کی بنا پر حکومت کمزور ہوگئی، یہی وجہ ہے کہ بہادر اور شجاع ترکوں کی ایک مختصر سی جماعت نے یہ پورا علاقہ فتح کرلیا اور یہاں اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔

اسلامی دور: ہندوستان میں اگرچہ اسلام پہلی صدی کی آخری دہائی میں داخل ہوچکا تھا اور محمد بن قاسم کے ہاتھوں ۹۳ھ/۷۱۲ء میں سندھ اور ملتان میں اسلامی حکومت کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا تھا، لیکن ان کے بعد آنے والے ان کے جانشین کچھ ذاتی کمزوری اور کچھ مرکز خلافت میں ہونے والی حصول اقتدار کی کشمکش کی بنا پر اس سے آگے نہ بڑھ سکے اور تین سو سال عربوں کی حکومت اندرون سندھ تک محدود رہی۔

اسلامی فتوحات کا دوسرا سلسلہ غزنویوں کے ساتھ شروع ہوا۔ سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر پانچویں صدی ہجری/ گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز (۱۰۰۰تا۱۰۳۰ء) میں سترہ حملے کیے۔ ان حملوں سے مسلمانوں کے قدم بنگال تک تو نہ پہنچے، لیکن وہ علاقے جو اس وقت پاکستان میں داخل ہیں، فتح ہوکر نئی قلمرو کا حصہ بن گئے۔

غزنویوں کے بعد سلاطین دھلی کا دور آیا، تو سلطان شہاب الدین غوری(م۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء) نے بنگلہ دیش سمیت تمام ہندوستان کو فتح کرکے اس پر اسلامی حکومت قائم کی (۵۹۸ھ/۱۲۰۲ھ) اور سین خاندان کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ سلطان غوری کی وفات کے بعد ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں سلطان قطب الدین ایبک کی قیادت میں خاندان

غلاماں کی حکومت کا قیام عمل میں آیا جو اسی برس تک حکمران رہا (۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء تا ۶۸۶ھ/۱۲۸۷ء)۔

سلطان محمد بن تغلق (۷۲۰ھ/۱۳۲۴ء۔۱۳۲۵ء) کے عہد حکومت میں بنگال نے سلطان شمس الدین حاجی الیاس کی قیادت میں افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود مختاری حاصل کرلی (۷۴۰ھ/۱۳۴۱ء) اور ڈھاکہ کو دارالحکومت کا درجہ مل گیا...... اس کے جانشینوں میں سلطان غیاث الدین (۷۹۲ھ/۱۳۸۹ء تا ۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء) بڑی شان و شوکت والا حکمران تھا[رکّ بہ بنگال]۔ تقریباً اڑھائی سو سال تک خود مختار رہنے کے بعد دوبارہ سلطان جلال الدین اکبر (۱۵۵۶ء۔۱۶۰۵ء) کے زمانے میں اس کے ایک سپہ سالار نعیم خان نے سلطان غیاث الدین سلسلے کے آخری حکمران داؤد کرانی کو شکست دیکر یہ تمام علاقہ فتح کر کے مغلیہ حکومت میں شامل کرلیا۔

جہانگیر (۱۶۵۵-۱۶۲۷ء) کے عہد حکومت میں انگریز نے "East India Company" قائم کر کے ۱۶۰۶ء میں یہاں پہلا تجارتی اڈہ قائم کیا۔

نیم خود مختار حکومت کا قیام: سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے عہد حکومت (۱۶۵۸ء- ۱۷۰۷ء) کے بعد اس کے جانشینوں کی نااہلی کے باعث کئی علاقوں میں نیم خود مختار حکومتوں کا قیام عمل میں آگیا، جن میں بنگال بھی شامل تھا، چنانچہ نواب شجاع الدولہ (۱۷۲۷ء۔۱۷۳۹ء) اس سلسلے کا پہلا حکمران تھا، اس کے بعد اس کا بیٹا سرفراز علاؤالدولہ حیدر جنگ حکومت نہ سنبھال سکا اور علی وردی خان سے ہار گیا۔ اپریل ۱۷۵۶ء میں نواب علی وردی خان نے وفات پائی، تو اس کا بیٹا نواب سراج الدولہ اس کا جانشین بنا، مگر اگلے ہی سال ۱۷۵۷ء میں ۲۹ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے مقام پر انگریزوں سے شکست کھا کر مارا گیا اور یوں ہندوستان پر بدیسی حکمرانوں کی حکومت کا آغاز ہوگیا۔ انگریزوں نے بنگال کی نوابی پر برائے نام میر جعفر کو برقرار رکھا، لیکن جب وہ ان کے مطالبات پورے نہ کرسکا تو ۱۷۶۰ء میں اس کی جگہ میر قاسم کو مسند نشین کردیا۔

۱۷۶۵ء میں میر جعفر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نجم الدولہ اس کا جانشین بنا، مگر وہ حقیقت میں محض انگریز کا وظیفہ خوار تھا، جس کا حکومت میں کوئی عمل دخل نہ تھا، اس طرح بنگال پر انگریز کا قبضہ مکمل ہوگیا۔

۱۷۹۳ء میں انگریزوں نے "مستقل دیوانی بندوبست" کا قانون نافذ کیا۔ جس کے تحت نئی زمینداریوں کا قیام عمل میں آیا اور کسانوں کو بے حد نقصان پہنچا۔ ۱۸۳۵ء میں کمپنی نے نیا تعلیمی نظام وضع کیا، جس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ ہندوستان میں ایسی نسل تیار کی جائے جو نسل کے اعتبار سے ہندوستانی اور اپنے جذبات اور خیالات کے اعتبار سے انگریز ہو۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان بھر میں انگریز کے خلاف جنگ آزادی لڑی گئی، یہ جنگ اپنے مقاصد کے حصول میں تو ناکام رہی، البتہ اس کے نتیجے میں کمپنی کی حکومت ختم ہوگئی اور برطانوی عملداری کا قیام عمل میں آگیا۔ یوں مغلیہ سلطنت کا باقاعدہ اختتام ہوگیا اور آخری مغلیہ تاجدار کو رنگون میں جلاوطن کردیا گیا۔

انیسویں صدی کے آخری ایام سے ہندوستان میں انگریز کے خلاف آزادی کی سیاسی تحریک شروع ہوئی، جس میں تمام بنگال نے بھی بھرپور حصہ لیا اور یہ تحریک بالآخر تقسیم ملک کی صورت میں کامیاب رہی [رکّ بہ بنگال، پاکستان، ہند، بذیل مادہ]۔

(ب) قیام پاکستان تا اختتام ایوب حکومت

قیام پاکستان یعنی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے لیکر ۱۶۔دسمبر ۱۹۷۱ء تک بنگلہ دیش کی تاریخ پاکستان کی تاریخ سے وابستہ رہی [رکّ بہ پاکستان]۔ مشرقی پاکستان سے متعلق اس دور کے اہم واقعات مندرجہ ذیل ہیں:

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کشمیر کے مسئلے پر پاکستان اور

بھارت کے مابین غیر اعلانیہ جنگ شروع ہوئی۔ ابھی یہ جنگ جاری تھی کہ ۱۱ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم محمد علی جناح کا انتقال ہوگیا، جس سے یہ نوزائیدہ مملکت اپنے عظیم قائد سے محروم ہوگئی؛ قائد اعظم کی جگہ خواجہ ناظم الدین نے پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھال لیا، کشمیر کی جنگ اقوام متحدہ کی مداخلت پر یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے بند ہوگئی، اسی دوران میں پاکستان کے وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خان کو اکتوبر ۱۹۵۱ء میں شہید کردیا گیا، جس کے بعد حصول اقتدار کی ایک طویل جنگ شروع ہوگئی.

نواب لیاقت علی خان کے قتل کے بعد خواجہ ناظم الدین پاکستان کے وزیراعظم اور غلام محمد گورنر جنرل بن گئے۔ ۶ اکتوبر۱۹۵۵ء کو غلام محمد کی ریٹائرمنٹ کے بعد اسکندر مرزا نے گورنر جنرل پاکستان کا عہدہ سنبھال لیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۵۵ء کو پاکستان کا پہلا آئین بنا، جس کے نتیجے میں اسکندر مرزا نے پاکستان کے صدر کا اور چوہدری غلام محمد نے وزیراعظم پاکستان کا عہدہ سنبھال لیا، مگر محلاتی سازشوں نے انہیں چلنے نہ دیا اور انہوں نے ۸راگست ۱۹۵۶ء کو وزارت عظمٰی سے استعفٰی دے دیا۔ اس کے نتیجے میں سید حسین شہید سہروردی کو جو ''عوامی لیگ'' کے لیڈر تھے اور مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) سے تعلق رکھتے تھے، وزیراعظم بنا دیا گیا، لیکن ان کی وزارت عظمٰی کے ابھی دو سال بھی مکمل نہ ہوئے تھے کہ اس وقت کے صدر پاکستان اسکندر مرزا نے ان کی آئینی حکومت کو سبکدوش کردیا اور آئین کو معطل کر کے مارشل لا لگا دیا۔ مگر یہ مارشل لا اُسے بھی موافق نہ آیا اور اسی ماہ کی ۲۷ تاریخ کو اس وقت کے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان نے اسکندر مرزا کو ملک بدر کردیا اور خود حکومت سنبھال لی..... ایوب خان نے ۱۹۶۲ء کو نیا آئین بنایا، جس کی بنیاد ون یونٹ (one-Unit) پر رکھی گئی اور پارلیمانی نظام حکومت کی جگہ صدارتی نظام متعارف کروایا۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان دوسری جنگ ہوئی۔ جس کے دوران مشرقی بازو (مشرقی پاکستان) میں خاموشی طاری رہی.

۱۹۶۸ء میں ایوب خان کے خلاف تحریک چلی، جس کے نتیجے میں یحیٰی خان نے جنرل محمد ایوب خان کی جگہ صدارتی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور آئین کو معطل کردیا.

اسی دہائی میں شیخ مجیب الرحمان نے عوامی لیگ کی بنیادی قیادت کا مقام حاصل کرلیا، بعد کے حالات نے اُسے مزید شہرت اور مقبولیت عطا کی۔ ایوب خان کے زمانے میں اگر تلہ نامی سازش کیس پکڑا گیا، جس میں مجیب الرحمٰن کا کردار مرکزی تھا۔ اُسے جنوری ۱۹۶۸ء میں گرفتار کرلیا گیا، ۱۱ جون ۱۹۶۸ء کو ڈھاکہ چھاؤنی میں شیخ مجیب الرحمٰن اور اس کے ۳۵ ساتھیوں کے خلاف مقدمے کی سماعت شروع ہوئی، مگر جب صدر پاکستان محمد ایوب خان نے ملک میں جاری سیاسی بحران پر قابو پانے کے لیے نواب زادہ نصراللہ خان کی قیادت میں مخالف رہنماؤں کو مذاکرات کی دعوت دی تو متحدہ محاذ کے مطالبے پر شیخ مجیب کو پیرول پر رہا کردیا اور پھر عوامی دباؤ کے پیش نظر ۱۹۶۸ء میں ایوب خان نے مکمل طور پر اُسے رہا کر دیا۔ بعدازاں ۲۵۔ مارچ ۱۹۶۹ء کو جنرل محمد ایوب خان نے استعفٰی دے دیا اور یوں یہ دورانیہ اختتام کو پہنچ گیا.

(ج) یحیٰی خان حکومت اور قیام بنگلہ دیش کی تحریک:

جنرل محمد ایوب نے استعفٰی دینے سے قبل جنرل محمد یحیٰی خان کو ایک خط کے ذریعے حکومت سنبھالنے کا حکم دیا تھا چنانچہ جنرل محمد یحیٰی خان نے ۲۵۔ مارچ ۱۹۶۹ء کو اقتدار پر قبضہ کر لیا اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ اس موقع پر شیخ مجیب الرحمان کو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا..... انہی حالات میں ۷دسمبر ۱۹۷۰ء کو پہلے عوامی انتخابات ہوئے، جس میں حکومت مکمل طور پر غیر جانب

دار رہی۔ ان انتخابات کے نتیجے میں شیخ مجیب الرحمان کی عوامی پارٹی نے ۳۰۰ میں سے ۱۶۰ نشستیں جیت کر واضح برتری حاصل کرلی، البتہ مغربی پاکستان میں پیپلزپارٹی نے ۸۳ نشستیں جیت کر دوسری بڑی پارٹی کی حیثیت حاصل کرلی (نیز رکّ بہ پاکستان، در تکملہ ۱۱۱)۔

شیخ مجیب الرحمان نے اس موقع پر انتخابات سے قبل اپنے چھ نکاتی ایجنڈا جاری کیا تھا، جس کو عملی شکل دینے کی صورت میں مرکز بے حد کمزور ہوجاتا اور اس کے پاس صرف دفاع اور امور خارجہ رہ جاتے۔ ان میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی الگ الگ کرنسیوں کی تجویز بھی شامل تھیں (محمد حنیف شاہد: مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش، لاہور بدون تاریخ، ص۳۶)۔ اس زمانے کے مخالف رہنما ذوالفقار علی بھٹو کے مطابق یہ چھ نکاتی پروگرام ہماری قومیت پر کاری ضرب کی حیثیت رکھتا تھا (ذوالفقار علی بھٹو: عظیم المیہ، ص۱۳)۔ دوسری طرف شیخ مجیب الرحمان نے لوگوں کو گلی گلی اور گاؤں گاؤں جاکر یہ بتایا کہ ان کی نجات انہی چھ نکات میں ہے۔ انہوں نے بنگالی قومیت کے نام پر علاقائی تعصبات کو ابھارا اور اپنی سزاؤں کا ذکر کرکے عوام کی ہمدردیاں حاصل کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بھارتی حکومت کھل کر شیخ مجیب الرحمان کی حمایت کررہی تھی۔ آل انڈیا ریڈیو نے شیخ مجیب الرحمان کی سرگرمیوں اور ان کے چھ نکات کو مقبول عام بنانے کے لیے باقاعدہ پروگرام شروع کیا، جس میں پاکستان کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا، اور مشرقی پاکستان کے عوام کو یہ ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ شیخ مجیب کا ساتھ دیں (محمد حنیف شاہد، ص۳۹)۔ علاوہ ازیں بھارت میں ایسی کتابیں شائع کی گئیں، جن سے پاکستان دشمن کارروائیوں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی، (دیکھیے مآخذ) اور آزاد بنگال کے منصوبوں کی تکمیل ہوتی تھی۔ جس کے نتیجے میں بالآخر پاکستان دو حصوں میں بٹ گیا اور دشمنوں کے عزائم کی تکمیل ہوگئی۔

یہاں چند باتیں خصوصاً قابل غور ہیں۔ پاکستان کی جدوجہد میں مشرقی پاکستان کا کردار ہراول دستے کا تھا، اسی لیے اقبال پارک (سابق منٹو پارک) لاہور میں، ۱۹۴۰ء میں قائد اعظم محمد علی جناح کی صدارت میں جو مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس منعقد ہوا، اس میں "قرارداد پاکستان" ایک ممتاز بنگالی رہنما مولوی فضل الحق نے پیش کی۔ اس قرارداد میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں جو پاکستان کے بارے میں ریفرنڈم کی حیثیت رکھتے تھے، ۹۶٪ بنگالیوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ مسلم لیگ نے آسام کی ۳۴ نشستوں میں ۳۱ اور بنگال کی ۱۲۱ نشستوں میں ۱۱۹ پر شاندار کامیابی حاصل کی (دیکھیے، سعید الدین: مشرقی پاکستان کا زوال، ص۱۷)۔ پھر چند ہی سالوں میں وہ کون سے عوامل تھے جن کی بنا پر دونوں حصوں میں ایسی دشمنی کی بنیاد پڑی کہ وہ نہ صرف ایک دوسرے سے الگ ہوگئے بلکہ اس علیحدگی کے دوران میں ایسے خونی واقعات پیش آئے کہ دونوں طرف سے ایک دوسرے کو قتل کیا گیا اور بے انتہا مظالم کا نشانہ بنایا گیا اور ایک دوسرے کی جائیدادوں اور اموال کو بے دردی سے لوٹا گیا۔

مختصر طور پر بنگلہ دیش کے قیام اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اہم ترین اسباب درج ذیل ہیں:

(۱) مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سیاسی قائدین کے ساتھ ناروا سلوک:

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان کی جدائی کا عمل قیام پاکستان کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا اور کچھ شعوری اور کچھ غیر شعوری کوششوں کی ابتدا تقسیم ملک کے متصل بعد ہوگئی تھی۔ قرارداد پاکستان پیش کرنے والے مولوی فضل الحق بنگالی کو دسمبر ۱۹۴۱ء میں مسلم

لیگ سے نکال دیا گیا (سعید الدین، ص۱۷)۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل بنایا گیا، بعدازاں لیاقت علی خان کے قتل (۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء) کے بعد انہیں پاکستان کا وزیراعظم بنا دیا گیا اور مسٹر غلام محمد کو، جو پیشے کے لحاظ سے سرکاری ملازم تھا، گورنر جنرل بنادیاگیا۔ جس نے محلاتی سازشوں کے ذریعے مملکت میں استحکام پیدا نہ ہونے دیااور محض دو برسوں کے بعد ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو پارلیمنٹ سے عدم اعتماد کرائے بغیر، خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو معطل کردیا۔ اس اقدام کو مشرقی پاکستان میں مشرقی صوبے کے خلاف ایک سازش سمجھا گیا (صدیق سالک : میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص ۲۲ بار نہم ۱۹۹۲ء)۔ یہ اس علیحدگی کی طرف گویا پہلا قدم تھا، جس کی تکمیل ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ شیر بنگال مولوی فضل الحق نے جنہیں مسلم لیگ سے نکال دیا گیا تھا ''کرشک سرامک'' (مزدور پارٹی) کے نام سے ایک علیحدہ جماعت بنالی، یہ بات صوبائی سیاست میں بڑھتے ہوئے لادینی رجحانات کی نشان دہی کرتی تھی (کتاب مذکور، ص ۲۱۵)۔

۱۹۵۴ء کے انتخابات میں ''جگتوفرنٹ'' کے نام سے مشرقی پاکستان کی کئی جماعتوں نے باہمی اتحاد کرکے شرکت کی، ان انتخابات میں مسلم لیگ صرف نو نشستیں جیت سکی، چنانچہ گورنر جنرل کی دعوت پر ۳۰ مارچ ۱۹۵۴ء کو جگتو فرنٹ نے نئی حکومت بنالی، مگر صرف دو ماہ کے بعد (۳۰ مئی ۱۹۵۴ء) کو گورنر جنرل غلام محمد نے نئی حکومت کو برطرف کردیا اور صوبے میں گورنر راج نافذ کر دیا (محمد رفیق الاسلام: The Bangladesh Libration Movement، یونیورسٹی پریس لمیٹڈ، ڈھاکہ ۱۹۸۷ء، ص ۱۶۔۱۷؛ بذیل Post Independence Period)۔ ۱۹۵۶ء میں پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر اسکندر مرزا نے مسلم لیگ کے نامزد کردہ چوہدری محمد علی کو حکومت بنانے کی دعوت دی، جبکہ عوامی لیگ کے قائد مسٹر حسین شہید سہروردی یہ سمجھتے تھے کہ وزارت سازی کا حق انہیں پہنچتا ہے۔ بنگالیوں نے اس واقعے کو بھی بنگالیوں کو اقتدار سے محروم رکھنے کی ایک سازش سمجھا (حوالہ مذکور)۔

اسی زمانے میں ستمبر ۱۹۵۵ء کو مسٹر عطاء الرحمان نے مشرقی بنگال کی مجلس قانون ساز میں تقریر کرتے ہوئے کہا: ''مسلم لیگ کا حکمران ٹولہ مشرقی بنگال، اس کی ثقافت، اس کی زبان، اس کے لٹریچر ، غرضیکہ اس کی ہر چیز کی طرف اہانت اور تحقیر کا رویہ رکھتا ہے، ہمیں برابر کا شریک گردانا تو درکنار مسلم لیگ کے لیڈر یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے ہم محکوم قوم سے اور وہ فاتح اور حکمران قوم سے تعلق رکھتے ہیں'' (صدیق سالک، ص۲۱۶)۔ اس احساس محرومی کو ون یونٹ نے مزید بڑھایا، یہ بل اسی سال (۱۴/اکتوبر ۱۹۵۵ء) کو نافذ ہوا۔ اس کے تحت مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں (پنجاب، سرحد، بلوچستان اور صوبہ سندھ) کو ملاکر ایک صوبہ (مغربی پاکستان) اور مشرقی بنگال کو مشرقی پاکستان کے نام سے دوسرا صوبہ قرار دیا گیا، یہ بل دو ہفتے قبل منظور کیا گیا تھا، جو اس بات کی ضمانت دیتا تھا کہ ملک کے دونوں حصوں کے مابین برابری کی سطح پر تعلقات استوار ہوں گے، مگر مشرقی پاکستان میں اس کا یہ مفہوم سمجھا گیا کہ یہ مشرقی پاکستان کو اس کے حقوق سے محروم رکھنے کی ایک سازش ہے (رفیق اسلام: The Bangladesh Libration Movement، ص ۱۶۔۱۷)۔ دراصل یہ ۱۹۵۴ء کے انتخابات کے ذریعے مشرقی پاکستان سے آنے والے پیغام کا سدباب تھا تاکہ مستقبل میں مشرقی پاکستان کے خطرے کا سدباب کیا جاسکے، لیکن اس نے ملک کی بنیادیں کمزور کر دیں اور ملک کو خطرناک صورت حال سے دوچار کر دیا۔ چوہدری محمد علی جن کی سربراہی میں پاکستان کا پہلا

آئین بنایا گیا تھا، بیوروکریسی کو ایک آنکھ نہ بھائے اور ۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء کو ان کی حکومت برطرف کر دی گئی۔ جس کے بعد مسٹر حسین سہروردی نے اسکندر مرزا کی منظور نظر پارٹی ریپبلکن کے ساتھ مل کر حکومت بنالی، مگر اسے ابھی ایک سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ۱۲ اکتوبر کو ری پبلکن پارٹی کی حمایت سے محروم ہونے پر انہیں بھی اقتدار سے الگ کردیا گیا۔ یوں مشرقی پاکستان میں ایک بار پھر مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کی فضا کو ہوا دینے کا ایک اور موقع ہاتھ آگیا۔ عوامی لیگ کی مخلوط حکومت کو اسمبلی میں شکست ہوجانے اور کے ایس پی کی وزارت کے نہ چلنے پر ۸ جون ۱۹۵۸ء کو ایک بار پھر وہاں گورنر راج قائم کردیا گیا، اس عرصے میں مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں شدید ہنگامہ ہوا، جس میں ڈپٹی اسپیکر مسٹر شاہد علی کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے (صدیق سالک، ص ۲۱۷)۔ الغرض قیام پاکستان سے لیکر مشرقی پاکستان کی علیحدگی تک ایسے کئی واقعات پیش آئے، جن سے مشرقی پاکستان میں یہ تاثر لیا گیا کہ مغربی پاکستان والے انہیں اپنے برابر نہیں سمجھتے اور انہیں اقتدار سے باہر رکھنا چاہتے ہیں، (دیکھیے ایم رفیق اسلام، ص ۲۵۔۲۹).

(۲) مشرقی پاکستان کی غربت اور اس کا احساس محرومی: مشرقی بنگال کے مسلمان صدیوں سے اپنے ہمسایہ ہندوؤں کے مظالم کا نشانہ بن رہے تھے، یہ سلسلہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت سے چلا آرہا تھا۔ انگریز حکمرانوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنے حقیقی دشمنوں کی طرح برتاؤ کیا، ان سے ہر بات میں امتیازی سلوک روا رکھا جاتا۔ بنگال کی نظامت کے سقوط کے بعد سیکڑوں مسلمان فوجی افسر اور قریباً ایک لاکھ سپاہی بے روزگار ہوگئے، جنہیں بامر مجبوری کاشت کاری کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ ۱۸۳۷ء میں جب ہندوستان بھر میں فارسی کے بجاے انگریزی زبان رائج ہوئی تو اس سے صورت حال میں مزید ابتری پیدا ہوئی اور اس تبدیلی نے ہزاروں مسلمان خاندانوں کو بے روزگار کردیا۔ اسی دور کے فارسی اخبار ''دوربین'' میں ہے ''ہر قسم کی چھوٹی بڑی ملازمتیں بتدریج مسلمانوں سے چھینی جارہی ہیں اور دوسری نسل کے لوگوں خصوصاً ہندوؤں کو دی جارہی ہیں (اٰیچ قریشی: A Short History of Pakistan، چوتھی کتاب، ص۸۰، مطبوعہ یونیورسٹی آف کراچی، ۱۹۶۷ء)۔ اس عہد میں ایسی تجارتی پالیسی اختیار کی گئی کہ مسلمانوں کو اندرونی اور بیرونی تجارت سے بے دخل کردیا گیا، چنانچہ کمپنی کی تجارتی پالیسی نے بنگال کی مشہور زمانہ ململ اور پارچہ بافی کی صنعت کو ختم اور صوبے کے نیل کے کاشت کاروں کو تباہ کر دیا، جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ مسلمانوں کے معاشی حالات میں ابتری پیدا ہوتی گئی اور پھر ولیم ہنٹر کے بقول'' ۱۷۰ سال قبل بنگال میں ایک امیر مسلمان بچے کے لیے غریب بن جانا قریب قریب ناممکن تھا، مگر اب اس کے لیے امیر رہنا ناممکن ہوگیا ہے (سعید الدین: مشرقی پاکستان کا زوال، ص ۱۵، بحوالہ Our Indian Muslims)۔ بنگال میں معاشی تفاوت کو کم کرنے کے لیے، وائسرائے لارڈ کرزن نے بنگال کو مشرقی بنگال اور آسام اور مغربی بنگال میں تقسیم کردیا، ابتدائی طور پر یہ تقسیم مسلمانوں کے لیے سود مند ثابت ہوئی اور ہندوؤں کی اجارہ داری پر زد پڑی (A Short History of Pakistan، ص ۱۳۴)، مگر رفتہ رفتہ حالات پھر اسی ڈگر پر آگئے، ہندوؤں میں چونکہ تعلیم کا تناسب زیادہ تھا اور مغربی بنگال میں وہ سیاہ و سفید کے مالک تھے، اسی لیے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت بدستور غربت کا شکار رہی اور اس تقسیم نے بھی مسلمانوں کو زیادہ فائدہ نہ دیا.

ان حالات میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا، تو مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یہ توقع تھی کہ ان کی

صدیوں کی محرومیوں کا ازالہ ہوگا اور ان کے معاشی حالات بہتر ہوں گے، مگر اس کے برعکس مغربی اور مشرقی پاکستان میں تفاوت کی یہ پالیسی نہ صرف جاری رہی بلکہ وقت کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا، جس سے شیخ مجیب الرحمان کے ساتھیوں نے فائدہ اٹھایا اور مشرقی پاکستان کو ''بنگلہ دیش'' میں تبدیل کردیا۔

اس معاشی تفاوت کے پیچھے بہت سے عوامل کار فرما تھے، جنہیں قیام پاکستان کے بعد بننے والی حکومتوں نے دور کرنے کی کوئی شعوری کوشش نہ کی۔ تقسیم کے بعد، مشرقی پاکستان میں کلیدی عہدوں پر کام کرنے والے ہندوؤں کی اکثریت نے مغربی بنگال جانے کا فیصلہ کرلیا، جن کے جانے کے بعد صرف چند تعلیم یافتہ مشرقی پاکستانی ان کی خالی جگہوں کو پر کرسکے۔ حقیقت میں مشکل سے ہی کوئی پیدائشی مشرقی پاکستانی ہوگا جو سابقہ آل انڈیا سروس میں ہو اور جو تھے وہ قائم مقام حیثیتوں میں تھے، یہی صورت حال صوبائی سول سروس کی تھی، اسی طرح فوجی پیشہ بنگالی نسل کے لوگوں میں کبھی مقبول نہیں ہوا اور پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اس ضمن میں برطانوی تجربات حوصلہ افزا نہ تھے، پھر جو مسلمان بہار سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آئے تھے وہ بھی زیادہ تر کاشت کار اور دوکاندار طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے وہ جانے والے ہندوؤں کا خلا پورا نہ کر سکے۔ ...... اس کے برعکس مغربی پاکستان کے حالات مختلف تھے۔ یہاں پہلے ہی فوج اور سول بیورو کریسی میں پڑھے لکھے مسلمانوں کی کمی نہ تھی۔ پھر مشرقی پنجاب خصوصاً یوپی اور بہار وغیرہ سے جو لوگ ہجرت کر کے آئے تھے۔ ان میں بھی اکثریت پڑھے لکھے مسلمانوں کی تھی۔ اس لیے مشرقی پاکستان پر حکومت کرنے والے افراد کی اکثریت کا تعلق مغربی پاکستان یا وہاں آباد لوگوں سے تھا۔ اس صورت حال نے...... بنگالی مسلمانوں کے احساس محرومی کو مزید ہوا دی (سعید الدین، ص ۱۷۔۱۹)۔

پھر مشرقی پاکستان میں ایوب حکومت کے زمانے میں جو کارخانے لگائے گئے۔ ان کے مالکان کی اکثریت مغربی پاکستان سے تعلق رکھتی تھی اور کارخانہ داروں نے مزدوروں کا استحصال کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی پاکستان میں بھی مزدوروں کے حالات اچھے نہ تھے۔ ان کے ساتھ بھی معاشی ناانصافی روا رکھی جارہی تھی، لیکن مشرقی پاکستان کی غربت اور کارخانہ داروں کے مخصوص سیاسی اور معاشی مفادات نے اس مسئلے کو مزید بگاڑ دیا اور یہ رویہ بھی ملک ٹوٹنے کا سبب بن گیا۔

مشرقی پاکستان کا یہ احساس محرومی یہاں تک جا پہنچا کہ ۲۹ مئی ۱۹۶۳ء کو قومی اسمبلی میں ایک بنگالی رکن نے تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا: ''مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان کی قیمت پر ترقی دی جا رہی ہے، پچھلے پندرہ برسوں میں کم درآمدات اور زیادہ برآمدات کی صورت میں مشرقی پاکستان کو اس کے گاڑھے پسینے کے ایک سو کروڑ روپیہ (ایک ارب روپے) سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اور جناب والا اس سرمائے کو صرف کر کے مغربی پاکستان کو ترقی دی گئی ہے اور اس کی زرعی اراضی میں کئی لاکھ ایکڑ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اب یہ لوگ بڑی اونچی باتیں کرتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کو اس کے حال پر رہنے دو۔ ہم اپنا گزارہ کر سکتے ہیں۔ اب یہ سولہواں سال جا رہا ہے، مغربی پاکستان کی تعمیر کے لیے ہمیں دیوالیہ کر دیا گیا ہے، ہم سے کہا جاتا ہے کہ چھو کرو نکل جاؤ، ہمارے پاس تمہارے واسطے کچھ نہیں ہے۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے'' (صدیق سالک، ص ۲۱۸)۔ ان معاشی حالات سے عوامی لیگ نے فائدہ اٹھایا اور اس نے اپنے تیسرے نکتے میں یہ موقف اختیار کیا کہ ایسے آئینی تحفظات کا بندوبست کیا جائے گا جن کے تحت مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو

سرمایہ کی آزادانہ منتقلی کو روکا جا سکے، ہر صوبہ علیحدہ علیحدہ بنک میں سرمایہ محفوظ رکھ سکے اور مشرقی پاکستان کے لیے الگ بجٹ اور الگ مالیاتی نظام اختیار کیا جائے (رفیق اسلام: The Bangladesh Libration movement، ص۸۲).

(۳) زبان کا مسئلہ: ہر قوم کی طرح مشرقی پاکستان کے لوگوں کو بھی اپنی زبان اور اپنے کلچر سے محبت ہے اور دوسری قوموں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ ان کے نزدیک ان کی زبان ان کی قومی شناخت کا ذریعہ ہے، مگر بدقسمتی سے پاکستان کی مرکزی اور سیاسی قیادت نے اس مسئلے میں بھی مشرقی پاکستان کے ساتھ آنکھ مچولی والا کھیل جاری رکھا اور ان پر "اردو زبان" تھوپنے کی ناکام کوشش کی۔ قائداعظم نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو مشرقی پاکستان کا دورہ کیا اور ڈھاکہ میں اعلان کیا کہ "پاکستان کی زبان صرف اردو ہوگی"۔ اسے بھی بنگالی نوجوانوں نے اپنی حق تلفی سمجھا اور اس کے خلاف مظاہرہ کیا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے بنگالی زبان دب جائے گی جو ملک کی ۵۴ فیصد آبادی کی مادری زبان ہے۔ شیخ مجیب الرحمان جو اس وقت یونیورسٹی میں طالب علم تھے، مظاہرہ کرنے والے نوجوانوں میں شامل تھے۔ حکومت نے شیخ مجیب الرحمان سمیت کئی طلبہ کو گرفتار کر لیا، مگر اس واقعے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی بنگالی زبان کی حمایت میں ہونے والی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی (صدیق سالک: ص۲۱۳)۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۲ء کو ، آئین کے بنیادی رہنما اصول مرتب کرنے کے لیے، پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے جو کمیٹی قائم کی تھی، اس نے اپنی سفارشات کا اعلان کر دیا۔ جن میں ایک سفارش یہ بھی تھی کہ اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی۔ اس پر مشرقی پاکستان میں غم وغصے کا اظہار کیا گیا (ایم رفیق اسلام: کتاب مذکور، ص۱۰۔۱۲)۔ اور اس کے خلاف ۳۰ جنوری ۱۹۵۲ء کو ڈھاکہ میں احتجاجی مظاہرے ہوے اور اسے اکثریتی صوبے پر لسانی اور ثقافتی یلغار کی تازہ ترین کوشش قرار دیا گیا۔ ان جلسوں سے مولانا عبدالحمید بھاشانی سمیت کئی سیاسی قائدین نے خطاب کیا۔ پھر اسی سال جب ۲۱ فروری کو صوبائی اسمبلی کا بجٹ اجلاس ہونا تھا، عام ہڑتال کی گئی، جس کے دوران میں پولیس سے تصادم ہو گیا۔ تین طالب علم اور کئی اور لوگ ہلاک ہوے۔ جن کی قربانی کی یادگار کے طور پر "شہید مینار" تعمیر کیے گئے...... بعد میں یہ مینار بنگالیوں کی اجتماعی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے اور گورنر اور سفارتی نمائندے ان یادگاروں پر ہدیۂ ارادت پیش کرنے کے لیے جاتے رہے (صدیق سالک، ص۳۱۴).

زبان کے مسئلے پر پذیرائی اور عوامی مقبولیت حاصل ہونے کی بنا پر ۸ تا ۱۱ مارچ ۱۹۵۴ء کے انتخابات میں عوامی لیگ اور کرشک سرامک اور دوسری جماعتوں پر مشتمل "جگتو فرنٹ" نے ۲۱ نکاتی منشور میں صوبائی خود مختاری کے مسئلے کے ساتھ ساتھ "بنگلہ زبان" کو بھی سرکاری زبان تسلیم کیے جانے کا نکتہ شامل کر لیا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی زبان کو بھی سرکاری زبان تسلیم کیا گیا۔ زبان کے اس مسئلے سے پیداہونے والے اختلافات نے بھی دونوں صوبوں کے مابین غلط فہمیوں کو جنم دیا۔ جس کے نتیجے میں بالآخر دونوں صوبوں کے مابین ایسی نفرتوں کی خلیج مائل ہوئی، جس نے بالآخر دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا.

(۴) عوامی لیگ اور شیخ مجیب الرحمان کا کردار:

بنگلہ دیش کے قیام اور پاکستان کے خلاف منفی سیاست کرکے دونوں ملکوں کو علیحدگی کی منزل تک پہنچانے میں جس جماعت نے مسلسل کام کیا، وہ "عوامی لیگ" ہے، جو شروع دن سے ہی احتجاجی اور منفی سیاست کی حامل رہی ہے، جسے تلک درمنی روزمن (Talikder mani ruzzaman) نے خودمختاری کے حصول کی سیاست

(The Politics of Autonomy) قرار دیا ہے (دیکھیے Talukder: The Bangladesh revolation and its after math، یونیورسٹی پریس، ڈھاکہ ۱۹۸۰ء)۔

عوامی لیگ کی ابتدا مسلم لیگ کے ان کارکنوں نے کی جو آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے تھے اور اس کی ابتدا قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل اس وقت ہوئی جب مشرقی بنگال میں، قیام پاکستان کے لیے انتہائی فعال کردار کرنے والے مسلم لیگی سیاست دان مسٹر حسین شہید سہروردی کی جگہ، جو ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے عرصے میں مقامی طور پر اور اس دوران میں ہونے والے انتخابات میں بہت متحرک رہے تھے، خواجہ ناظم الدین کو پہلے مشرقی پاکستان کا پارلیمانی لیڈر اور پھر وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا، جو قیام پاکستان کی تحریک کے دوران میں، مکمل طور پر غیر متحرک رہے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان میں آل انڈیا مسلم لیگ کو منظم کرنے والے اور عوامی سطح پر اسے فعال بنانے والے مولانا محمد اکرم کو مسلم لیگ سے نکال دیا گیا (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، Communist and regional Survey in East Pakistan، در Asiatic survey ، جلد ۱۰، ۷ جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۵۸۸۔۶۰۶)۔

مسلم لیگ کے سابق کارکنوں کو اس وقت مزید ذہنی دھچکا لگا، جب مشرقی پاکستان میں تمام حکومتی کارندے، سیکرٹری سے لے کر تھانوں میں تعینات ایس۔ ایچ۔ او تک مغربی پاکستان سے بھیجے جانے لگے، جو مکمل طور پر مقامی روایات اور زبان و ادب سے نا آشنا تھے، جس سے مقامی طور پر یہ تاثر پیدا ہونے لگا کہ "مغربی پاکستان" نے مشرقی پاکستان کو اپنی کالونی بنا لیا ہے (Talukder، ص۲۰۔۲۱)۔... چنانچہ ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر سہروردی کے حامی طلبہ نے ۴ جنوری ۱۹۴۸ء کو شیخ مجیب الرحمان کی قیادت میں، جو اس وقت ڈھاکہ یونیورسٹی میں ایک طالب علم تھے، مشرقی پاکستان مسلم طلبہ لیگ (East Pakistan Muslim Students League= EPMSL)' قائم کر لی اور فروری ۱۹۴۸ء میں اس "طلبہ تنظیم" نے بنگالی زبان کو قومی زبان قرار دلوانے کے لیے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ یہ مسئلہ چونکہ مشرقی پاکستان اور وہاں کے رہنے والوں کے لیے بڑا اہم تھا، اس لیے یہ تحریک بہت جلد پورے صوبے میں پھیل گئی، اس کے نتیجے میں جون ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان عوامی مسلم لیگ (East Pakistan Awami Muslim League= EPAML) قائم ہو گئی، جس کے صدر مولانا عبدالحمید خان بھاشانی تھے اور اس جماعت کی آل پاکستان کمیٹی کے سیکرٹری حسین شہید سہروردی تھے (کتاب مذکور، ص۲۱)۔ نئی قائم ہونے والی جماعت کے تقریباً ۷۳ فیصد بنیادی قائدین تیس اور چالیس سال کی عمروں کے درمیان تھے اور ۷۹ فیصد یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے، جبکہ عام ارکان کی اکثریت مختلف پیشوں سے تعلق رکھتی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی ۷۵۰ رکنی مجلس عاملہ کے زیادہ تر ارکان مغربی تعلیم یافتہ نوجوان تھے.... ایک سادہ سے اندازے کے مطابق ان میں سے ۶۰۰ یونیورسٹی گریجویٹ اور تقریباً ۳۰۰ افراد ماسٹر ڈگری رکھنے والے تھے اور ۸۵ فیصد لوگوں کی عمریں چالیس سال سے کم تھیں (حوالہ مذکور) اس جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں اکثریت نوجوانوں اور مغربی تہذیب و تمدن کے دل دادہ لوگوں کی تھی، اس جماعت کے انہی عناصر نے اسے ایک سیکولر اور علیحدگی پسند جماعت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

پھر جیسے جیسے یہ پارٹی عوام و خواص میں مقبول ہوتی گئی، اس کے ساتھ ساتھ پارٹی کے پروگرام اور منشور میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ ۱۹۴۹ء کے جاری کردہ

بنیادی منشور میں دونوں حصوں کی خود مختاری اور مشرقی پاکستان کے لیے الگ دفاعی فوج قائم کرنے کا مطالبہ بھی شامل تھا، لیکن پارٹی کے بائیں بازو سے تعلق رکھنے بہت سے کمیونسٹ ارکان کی طرف سے بہت جلد لیگ کی قیادت پر اشتراکی اور لادینی نظریات اپنانے اور سرمایہ دارانہ نظام حکومت کے خلاف پروگرام اختیار کرنے پر زور دیا جانے لگا۔ اس جماعت کے اکثر نوجوان قائدین مغربی پاکستان کے کالونی ازم کی مخالفت پر زور دیتے تھے۔ یہ لوگ صوبائی خود مختاری کے لیے ۱۹۴۰ء کی قرار داد پاکستان کی من مانی تشریح کرتے تھے اور یہ نظریہ رکھتے تھے کہ اس قرارداد میں دونوں بازوؤں، یعنی مشرقی اور مغربی علاقوں کی خود مختاری پر زور دیا گیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ان کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ بنگالی زبان کو پاکستان کی مشترکہ طور پر قومی زبان قرار دیا جائے (حوالہ مذکور، ص۲۱)۔ ۱۹۵۳ء میں "مشرقی پاکستان عوامی مسلم لیگ" کی کونسل نے ایک قرار داد کے ذریعے پارٹی کے نام سے "مسلم" کا لفظ حذف کر دیا اور یوں یہ جماعت "مشرقی پاکستان عوامی لیگ" بن گئی۔ ۱۹۵۴ء میں جب پاکستان نے امریکہ کے ساتھ تعاون کے معاہدے (SEATO) اور بغداد پیکٹ پر دستخط کیے، تو عوامی لیگ نے ان دونوں کی مخالفت میں قراردادیں پاس کیں (حوالہ مذکور)۔

۱۹۵۴ء میں عوامی لیگ نے مولوی فضل الحق (قرار داد پاکستان کے پیش کنندہ) کی سربراہی میں قائم کر شک پارٹی کے ساتھ "جگتو فرنٹ" (United Front Party) کے نام سے اتحاد کیا اور اپنا ۲۱ نکاتی منشور جاری کیا۔ جس میں مشرقی پاکستان کے لیے زیادہ سے زیادہ خود مختاری کا مطالبہ بھی شامل تھا اور مرکز کو صرف تین محکمے دفاع، امور خارجہ اور کرنسی..... دینے کی تجویز تھی، نیز بنگالی زبان کو ایک قومی زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ شامل تھا۔ اس منشور کی بنیاد پر متحدہ محاذ (جگتو فرنٹ) نے مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کی ۲۳۷ نشستوں میں سے ۲۲۳ نشستیں حاصل کیں اور ڈالے گئے ووٹوں میں سے ۵۷ فیصد ووٹ حاصل کیے (دیکھیے روزنامہ آزاد، ڈھاکہ ۲۵ مارچ ۱۹۵۴ء)۔ تاہم جلد ہی محاذ میں پھوٹ پڑ گئی، جس کے نتیجے میں محاذ کی حکومت ٹوٹ گئی..... اس طرح عوامی لیگ کو اس وقت شدید دھچکا لگا، جب "متحدہ محاذ" نے ۱۹۵۶ء میں صوبے میں اور پھر مرکز میں اقتدار حاصل کر لیا..... اسی دوران میں علیحدگی پسندی کے جذبات بھی متحرک رہے اور اپریل ۱۹۵۷ء میں مشرقی پاکستان کی قانون ساز اسمبلی نے ایک متفقہ قرار داد کے ذریعے..... مشرقی پاکستان کی مکمل خود مختاری کا مطالبہ کر دیا۔ جس میں دفاع، امور خارجہ اور کرنسی مرکز کو دیئے جانے کی تجویز تھی، مسٹر حسین سہروردی نے، اس قرارداد کو محض ایک سیاسی شو قرار دیا (دیکھیے مشتاق احمد: Government and Politics in Pakistan، کراچی، پاکستان پبلشنگ ہاؤس ۱۹۵۹ء، ص۱۷۳)۔ محاذ کے ساتھ ساتھ عوامی لیگ میں بھی بغاوت ہو گئی اور مولانا عبدالحمید خان بھاشانی کی زیر قیادت بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ارکان نے جولائی ۱۹۵۷ء میں نئی سیاسی جماعت "قومی عوامی پارٹی" (National Awami League) بنا لی (حوالہ مذکور)۔

۱۹۵۸ء میں جب ملک میں مارشل لا لگا، تو حکومت نے سیاسی جماعتوں اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی۔ جون ۱۹۶۲ء میں جنرل محمد ایوب خان نے مارشل لا اٹھا لیا اور نئے آئین کے تحت حکومت کی بھاگ ڈور سنبھال لی۔ پھر جب سیاسی سرگرمیاں بحال ہوئیں تو شیخ مجیب الرحمان نے، جو ۱۹۵۹ء سے لیکر ۱۹۵۸ءتک عوامی لیگ کے سیکرٹری رہ چکے تھے، اس جماعت کا ۱۹۶۴ء میں دوبارہ احیا کیا۔ انھی دنوں سید حسین سہروردی کا انتقال ہوگیا اور فوجی حکومت کے تحت ہونے والی زیادتیوں کی

بنا پر مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سول سروس کے فوجی اور بنگالی افسروں میں بھی علیحدگی کے جذبات پیدا ہونے لگے..... شیخ مجیب الرحمان نے، جو شروع سے پاکستان کے خلاف منفی جذبات رکھنے والے سیاست دان تھے، سول سروس کے افسران اور جامعات کے ماہرین اقتصادیات کو باہم جمع کر کے، ایک نیا منشور تیار کروایا، جس کے تحت مرکز کو صرف دو محکمے، یعنی ''دفاع اور امور خارجہ'' دینے کی تجویز تھی اور یوں عوامی لیگ نے مکمل صوبائی خود مختاری کے لیے اپنے عوام کو تیار کرنا شروع کر دیا (Talukder ص، ۲۴).

انہی حالات میں ۱۹۶۵ء کی جنگ لڑی گئی، جس میں ''مشرقی پاکستان'' کو بے یارو مددگار چھوڑ دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا اور اگر بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تو پاکستان دہلی پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لے گا۔ لیکن مشرقی پاکستان کے لوگ اس دلیل سے مطمئن نہ ہوے اور سترہ روزہ جنگ نے یہ ثابت کر دیا کہ مغربی پاکستان ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا، اس صورت حال سے بھی عوامی لیگ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور عوام کو یہ یقین دلایا کہ مغربی پاکستان ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور انہیں اپنا دفاع خود کرنا پڑے گا، چنانچہ شیخ مجیب الرحمان نے ۱۴ فروری ۱۹۶۶ء کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوے کہا ''صوبائی خود مختاری کا مسئلہ جنگ کے بعد زیادہ اہم ہو گیا ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ مشرقی پاکستان کو تمام معاملات میں مکمل طور پر خود کفیل بنا دیاجائے''(کتاب مذکور، ص۲۴).

چنانچہ ۵۔۶ فروری ۱۹۶۶ء کو لاہور میں حزب اختلاف کی قومی کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمان نے اپنے بدنام زمانہ ''چھ نکات'' کا اعلان کیا (دیکھیے Talukder : *The Bangladesh revolution and its aftermath* ص۲۴۔۲۵؛ صدیق سالک: میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص۳۲۔۲۲۳؛ شیخ مجیب الرحمان: *our right to live-6 point formula*، مطبوعہ عوامی لیگ مشرقی پاکستان ڈھاکہ ۱۹۶۶ء) یہ چھ نکات درج ذیل ہیں.

(۱) ''دستور میں قرار داد لاہور کی بنیاد پر پارلیمانی طرزِ حکومت کے مطابق پاکستان کا ایک وفاق قائم کیا جائے جس میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست منتخب شدہ مجلسِ قانون ساز کو بالادستی حاصل ہو''.

بعدازاں اس میں ترمیم کی گئی اور یہ الفاظ شامل کیے گئے۔ ''طرز حکومت وفاقی اور پارلیمانی ہو گا۔ وفاق کی مجلسِ قانون ساز اور وفاق میں شامل ''یونٹوں''کی مجلسِ قانون ساز کو عام بالغ حق رائے دہی کے اصول پر براہِ راست منتخب کیا جائے گا۔ وفاقی مجلس قانون ساز میں نمائندگی کا تناسب زبان کی بنیاد پر ہو گا.

(۲) ''وفاقی حکومت صرف دفاع اور امورِ خارجہ کے شعبوں کا انتظام کرے گی، باقی تمام شعبے وفاق میں شامل ریاستوں کے، تحت ہوں گے.

اس نکتے میں بھی بعدازاں تبدیلی کی گئی اور یہ الفاظ شامل کیے گئے۔ ''وفاقی حکومت صرف دفاع اور امورِ خارجہ کے شعبوں کی ذمہ دار ہوگی، اس کے علاوہ درج ذیل (نکتہ سوم) کی شرائط کے ساتھ کرنسی بھی اس کے سپرد ہوگی''.

(۳) ''دونوں بازوؤں میں کرنسی کا الگ الگ نظام رائج کیا جائے گا، اس کے ساتھ ساتھ دونوں بازوؤں میں اس کے آزادانہ تبادلے کا اہتمام ہوگا یا پورے ملک کے لیے کرنسی کا ایک ہی نظام رہنے دیا جائے، مگر اس صورت میں ایسے آئینی تحفظات کا بندوبست کیا جائے جن کے تحت مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو سرمایہ کی آزادانہ منتقلی کو روکا جا سکے۔ ہر صوبہ علیحدہ علیحدہ بینک میں سرمایہ محفوظ رکھ سکے اور مشرقی پاکستان کے لیے الگ

بجٹ اور الگ مالیاتی نظام اختیار کیا جائے"۔

اس نکتے میں بھی کچھ ترمیم کی گئی اور یہ عبارت بنائی گئی۔ "دو علیحدہ علیحدہ "کرنسیاں" رائج کی جائیں گی، جن کا ہر بازو اور ہر "ریجن" میں آزادانہ تبادلہ ممکن ہو گا یا متبادل صورت میں "کرنسی" کا ایک ہی نظام رہنے دیا جائے، لیکن اس کے لیے پھر "وفاقی محفوظات" کا ایک ایسا دستور العمل نافذ کیا جائے جس کے تحت "علاقائی فیڈرل ریزرو بینک" (Regional Federal reserve Banks) قائم کیے جا سکیں، جو ایک "ریجن" سے دوسرے "ریجن" میں وسائل اور سرمایہ کی آزادانہ منتقلی کی روک تھام کے اقدامات کرنے کے مجاز ہوں گے"۔

(۴) "محصولات کے نفاذ اور وصولی کا اختیار "وفاقی یونٹوں" کے پاس ہو گا اور "وفاقی مرکز" کو اس قسم کا کوئی اختیار حاصل نہ ہو گا۔ اخراجات کے لیے "وفاق" کو ریاست کے محصولات کا ایک حصہ دیا جائے گا۔ "وفاق کے مجموعی فنڈ" کی رقم ریاست کے مختلف محصولات میں سے ایک خاص شرح کے مطابق منہا کر کے مہیا کی جائے گی"۔

اس نکتے کو بھی بعدازاں بدل دیا گیا اور یہ کہا گیا: "مالیاتی حکمتِ عملی وفاقی یونٹوں کے تحت ہو گی "وفاق" کو دفاع اور امورِ خارجہ کے اخراجات کے لیے حصولِ سرمایہ کے ضروری وسائل مہیا کیے جائیں گے۔ "وفاقی حکومت" ان وسائل کے تصرف و استعمال کے طریق کار اور تناسب وغیرہ کے ضمن میں ان ضوابط کو ملحوظ رکھے گی جن کی صراحت آئین میں کر دی جائے گی"۔

(۵) الف۔ دونوں بازوؤں کے لیے زرِ مبادلہ کا حساب رکھنے کے لیے علیحدہ علیحدہ کھاتے رکھے جائیں گے؛ (ب)مشرقی پاکستان کی آمدنی مشرقی پاکستان کی حکومت کے اختیار میں ہو گی اور مغربی پاکستان کی آمدنی مغربی پاکستان کی حکومت کے اختیار میں ہوگی؛ (ج) وفاق کے زرِ مبادلہ کی ضروریات "دونوں بازو" پوری کریں گے، مساوی طور پر کسی طے شدہ تناسب کے مطابق؛ (د) مقامی مصنوعات کو ایک بازو سے دوسرے بازو میں لانے پر کوئی محصول نہیں لگایا جائے گا؛ (ھ)آئین کی رو سے یونٹوں کی حکومتیں اس امر کی مجاز ہوں گی کہ وہ بیرونی ممالک سے اپنے تجارتی روابط اور ان میں اپنے تجارتی مشن قائم کر سکے اور ان سے معاہدے کر سکیں"۔

اس نکتے میں بھی بعد میں درج ذیل ترمیم کی گئی: "آئین میں ہر "وفاقی یونٹ" کو اپنے زرِ مبادلہ کی آمدنی کا علیحدہ حساب کتاب رکھنے اور اس کو اپنے تصرف میں لانے کا اختیار دیا جائے گا۔ وفاق کے زرِ مبادلہ کی ضروریات "وفاقی یونٹوں" کی حکومتیں اس تناسب اور اس طریقِ کار کے مطابق مہیا کریں گی، جس کی صراحت آئین میں موجود ہوگی، علاقائی حکومتوں کو تجارت اور امداد کے لیے بیرونی ممالک سے مذاکرات کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ اس میں ان کو بہرحال ملک کی خارجہ پالیسی کے دائرے میں رہنا ہوگا جس کا تعین کرنا وفاقی حکومت کی ذمہ داری ہو گی۔

(۶) "مشرقی پاکستان کے لیے ایک نیم عسکری تنظیم کا قیام (ملیشیا) عمل میں لایا جائے گا۔ اس نکتے میں بعدازاں یہ ردوبدل کیا گیا: وفاقی یونٹوں کی حکومتوں کو قومی سلامتی میں مؤثر کردار ادا کرنے کی غرض سے "ملیشیا" یا نیم عسکری تنظیمات قائم کرنے کا اختیار ہوگا۔

غور کیا جائے تو یہ نکات مشرقی پاکستان کے مغربی پاکستان کے ساتھ گذشتہ ۲۰ یا ۲۱ برسوں کے تجربات اور مشرقی پاکستان کے لوگوں کے مغربی پاکستان کے لوگوں پر عدم اعتماد کے آئینہ دار تھے۔ جس سے عوامی لیگ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اسے ملک کو دولخت کرنے کے لیے استعمال کیا۔

ان نکات کی بنیاد پر "وفاق" یا مرکز اتنا کمزور

ہو جاتا تھا کہ وہ شاید ملک کے کسی بھی حصے کا دفاع نہ کر سکتا تھا۔ اسی بنا پر جہاں ان نکات کی بنیاد پر مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان کو بے حد پذیرائی ملی، وہاں مغربی پاکستان میں ان کے اور ان کے جماعت کے بارے میں شکوک و شبہات نے جنم لیا...... شیخ مجیب الرحمان نے عوامی لیگ کی کونسل میں، یہ نکات پیش کیے، جو اتفاق رائے سے منظور ہو گئے اور شیخ مجیب الرحمان کو پارٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا...... شیخ مجیب الرحمان نے طالب علموں کی مدد سے پورے ملک میں اپنے چھ نکاتی پروگرام کی تشہیری مہم چلائی۔ جس کی بنا پر صرف تین ماہ میں (وسط فروری تا وسط مئی) میں مشرقی پاکستان کے تمام دیہاتی مراکز عوامی لیگ کی گرفت میں آ گئے۔ اسی لیے مرکزی حکومت نے انہیں اور ان کے معاونین تاج الدین احمد، خوند کر مشتاق ، منصور علی، ظہور احمد چوہدری، اور دیگر افراد کو "ڈیفنس آف پاکستان" کے تحت گرفتار کر لیا، لیکن اس وقت یہ زہر تمام ملک میں سرایت کر چکا تھا۔ اسی لیے اس گرفتاری پر، ڈھاکہ میں ۷ جون ۱۹۶۶ء کو کامیاب ہڑتال ہوئی اور احتجاجی جلوس پر گولی چلنے کی بنا پر تیرہ افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے (عوامی لیگ کے مطابق مرنے والوں کی تعداد ۱۰۰ تھی)۔ رہنماؤں کی اس گرفتاری نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور شیخ مجیب الرحمٰن کی ذات مشرقی پاکستان میں صوبائی خود مختاری اور صوبائی حقوق کی علامت بن گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ فوج، پولیس، سول سروس کے ملازمین، وکلا، ڈاکٹروں، اساتذہ، سرکاری ملازمین، صحافی، طلبہ اور دوسرے پیشہ ور لوگوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کے چھ نکات سے متأثر نہ ہوا ہو...... اس وقت تک صدر پاکستان سمیت کسی بھی سیاست دان کو یہ احساس نہ تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور اس کی جماعت مشرقی پاکستان میں کیا کھیل کھیل رہی ہے۔ اسی لیے اس وقت کے صدر جنرل محمد ایوب نے اپنی ایک تقریر میں اس صورت حال کو عوامی جنگ (Cival war) قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف ہتھیار استعمال کرنے کی دھمکی دی (Talukder، ص۲۵).

جنرل محمد ایوب خان کی حکومت نے شیخ مجیب الرحمان اور اس کے ساتھیوں پر "اگر تلہ سازش" کا الزام لگایا لیکن اب حالات ایوب خان کی توقع سے بہت زیادہ بگڑ چکے تھے۔

"اگر تلہ" مشرقی پاکستان کی سرحد کے قریب بھارت کا ایک قصبہ ہے۔ استغاثہ کے مطابق شیخ مجیب الرحمان اور اس کے ۳۵ ساتھیوں نے پاکستان سے مشرقی پاکستان کو بھارتی کی فوج امداد کے ذریعے، الگ کرنے کی سازش تیار کی، شیخ مجیب الرحمان نے اپنے قریبی ساتھی لیفٹیننٹ کمانڈر معظم حسین کے ہمراہ یہاں ستمبر ۱۹۶۴ء میں ایک اجلاس میں شرکت کی تھی، جس میں مشرقی پاکستان کو، پاکستان سے الگ کرنے کی سازش تیار کی گئی تھی.

مقدمہ کی کارروائی ڈھاکہ چھاؤنی میں جون ۱۹۶۶ء میں شروع ہوئی اور اواخر نومبر ۱۹۶۶ء تک جاری رہی۔ عدالت سپریم کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج کی صدارت میں کام کر رہی تھی...... حکومت نے نہ صرف عوام کو مقدمے کی کارروائی دیکھنے کی عام اجازت دے رکھی تھی، بلکہ حکومت کی ماتحتی میں کام کرنے والے اخبارات میں اس کی روزانہ روداد بھی شائع کی جاتی تھی۔ شیخ مجیب کی گرفتاری اوراس کے خلاف ہونے والی اس کارروائی نے مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب کی مقبولیت میں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی، اسی لیے جب نومبر ۱۹۶۸ء میں، "مغربی پاکستان" میں طلبہ کی تحریک شروع ہوئی، تو مشرقی پاکستان میں اس نے حکومت اور مغربی پاکستان کی بالا دستی کے خلاف ایک بغاوت کی صورت اختیار کر لی (Talukder، ص۶۲).

شیخ مجیب الرحمٰن کی گرفتاری کے خلاف شروع شروع میں ڈھاکہ بار ایسوسی ایشن اور دوسرے قصبوں اور شہروں کی وکلا تنظیموں نے احتجاج کیا، پھر جلد ہی ماسکو نواز نیپ (NAP) اور بیجنگ نواز نیپ (NAP) اور عوامی لیگ بھی میدان میں اتر آئی۔ چنانچہ صوبائی خود مختاری، شیخ مجیب کے خلاف سازش کیس واپس لینے اور جمہوریت کی بحالی کے لیے روزانہ ہی ڈھاکہ اور دوسرے شہروں میں جلوس نکلنے لگے، جس سے پورے صوبے کی فضا مکدّر ہوگئی...... رفتہ رفتہ ان جلوسوں میں تشدّد کا عنصر بھی شامل ہونے لگا۔ چنانچہ ۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو مولانا عبدالحمید خان بھاشانی کی قیادت میں گورنر ہاؤس کا کچھ دیر کے لیے گھیراؤ کیا گیا اور پولیس پر سنگ باری کی گئی۔ ۷ دسمبر ۱۹۶۸ء کو مولانا بھاشانی نے عام ہڑتال کی اپیل کی، جس پر حکومت نے گھبرا کر دفعہ ۱۴۴، نافذ کر دی اور ڈھاکہ میں جلسے اور جلوس منعقد کرنے پر پابندی لگا دی.

اس کے باجود ڈھاکہ اور دوسرے شہروں میں ہڑتال کامیاب ہوئی اور ڈھاکہ میں عوام کے بپھرے ہوے ایک ہجوم نے پولیس وین اور میونسپل کارپوریشن کی ایک گاڑی کو نذر آتش کر دیا۔ اس پر پولیس اور "مشرقی پاکستان رائفلز" نے گولی چلا دی۔ جس سے دو آدمی موقع پر مرگئے اور ۳۲ افراد زخمی ہوے...... اس واقعے سے حکومت "مخالف سرگرمیوں" کو مزید تقویت ملی.

اس تحریک میں اس وقت مزید شدت پیدا ہو گئی۔ جب ۲۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کھولی گئی،جو ۲۲۔ اکتوبر سے بند تھی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے کھلتے ہی مختلف طلبہ تنظیمیں مسٹر طفیل احمد کی قیادت میں حکومت مخالف ہنگاموں کے لیے متحد ہو گئیں اور انہوں نے ایوب خان کی حکومت کے خلاف بارہ نکاتی منشور کا اعلان کر دیا۔ جس میں مشرقی پاکستان کی خود مختاری، جمہوریت کی بحالی اور شیخ مجیب الرحمان اور ان کے ساتھیوں کے خلاف بے بنیاد مقدمات واپس لینے کے نکات شامل تھے (کتاب مذکور، ص ۶۳۔۶۴)۔ ۲۱ جنوری ۱۹۶۹ء کو مشرقی پاکستان رائفلز نے طالب علموں کے ایک جلوس پر گولی چلا دی۔ جس سے ایک معروف کمیونسٹ لیڈر مارا گیا.

۲۴ جنوری کو پولیس (جس کے تمام لوگ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے) اور مشرقی پاکستان رائفلز جس میں ۲۵ فیصد بنگالی شامل تھے، جلوس روکنے میں مکمل طور پر ناکام ہو گئی اور حکومت نے امن و امان کے قیام اور اس تحریک کو کچلنے کے لیے فوج طلب کر لی۔ چنانچہ فوج نے تمام بڑے شہروں میں کرفیو لگا دیا۔ اس پر تشدد پسند طالب علموں اور عوامی لیگ کے کارکنوں نے "پیشہ ور فوج کے ساتھ جنگ" کا نعرہ لگایا۔ جس پر لوگوں نے کرفیو توڑ دیا۔ چنانچہ کئی جگہ گولی چلی اور کئی لوگ مارے گئے، جن کے ناموں اور تعداد کا اس لیے علم نہیں کہ فوج نے مرنے والوں کی لاشیں اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ اس دوران میں اگرچہ صدر پاکستان محمد ایوب خان کی طرف سے بہت جلد سیاسی جماعتوں کے ساتھ گفت و شنید کا اعلان کیا گیا، لیکن یہ ہنگامے بڑھتے ہی چلے گئے۔ انہی ہنگاموں کے دوران میں شیخ مجیب الرحمان کے اگر تلہ سازش کیس میں شامل ایک ساتھی ظہورالحق اور راجشاہی یونیورسٹی کے ایک استاد اور پروکٹر ڈاکٹر محمد شمس الضحیٰ (۱۸ فروری) کے قتل نے صورت حال میں مزید خرابی پیدا کر دی اور لوگوں نے حکومت کے حامی افراد پر حملے کرنا شروع کر دیئے (محمد صدیق سالک، ص۲۲۰).

جنرل محمد ایوب خان نے اپنے اقتدار کی کشتی کو ڈولتے دیکھ کر ۱۰ تا ۱۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو سیاسی لیڈروں سے مذاکرات کے لیے راولپنڈی میں ایک گول میز کانفرنس بلائی، اس کانفرنس میں مشرقی اور مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے بہت سے سیاسی قائدین نے شیخ مجیب الرحمان کی رہائی کا مطالبہ کیا، چنانچہ حکومت نے ۲۴۔ فروری

۱۹۶۹ء کو شیخ مجیب الرحمان اور اس کے ساتھ سازش میں شریک تمام افراد کو رہا کر دیا اور ان کے خلاف سازش کیس واپس لے لیا.

اس موقع پر طالب علم لیڈر طفیل احمد نے شیخ مجیب الرحمان کا والہانہ استقبال کرنے کا اعلان کیا۔ چنانچہ ۱۰ مارچ ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ میں بہت بڑا استقبالیہ جلوس نکالا گیا۔ جس میں شیخ مجیب الرحمان نے اعلان کیا کہ دونوں صوبوں میں مساوات (Parity) کا اصول اب ان کے لیے ناقابل قبول ہے۔ اب مشرقی پاکستان کو اس کی آبادی ۵۶ فیصد کے حساب سے نمائندگی ملنی چاہیے۔ بعدازاں شیخ مجیب الرحمان نے راولپنڈی میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ اس کانفرنس میں صدر ایوب خان نے سیاسی لیڈروں کے دو مطالبات تسلیم کر لیے: (۱) نئے انتخابات بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر کرائے جائیں گے؛ (۲) ون یونٹ ختم کر دیا جائے گا اور پارلیمانی نظام حکومت اختیار کیا جائے گا (صدیق سالک، ص۲۲۰)، مگر شیخ مجیب الرحمان نے ان باتوں کو ردّ کر دیا اور خود مختاری کے حصول تک جدو جہد جاری رکھنے کا اعلان کیا.

دوسری طرف نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) دو حصوں میں بٹ گئی: ماسکو نواز لوگ شیخ مجیب الرحمان کے دیئے ہوئے خطوط پر کام کر رہے تھے اور بیجنگ نواز لوگوں نے اپنے ارکان کو گھیراؤ اور ہڑتال پر اکسایا۔ چنانچہ نیپ کے اکسانے پر واپڈا کے ملازمین نے ہڑتال کر دی، جو دن بدن بڑھتی چلی گئی اور مارچ کے تیسرے ہفتہ میں تمام ملازمین اور افسروں کے ہڑتال پر جانے سے صورت حال بے حد خراب ہوگئی۔ فیکٹریاں بند ہو گئیں اور ان کے مالکان وہاں سے اپنا سرمایہ نکال کر ملک سے فرار ہونے لگے (Talukder، ص۶۴)۔ اس طرح حکومت کے حامی افراد کے مکانات کو جلانے اور ان کو قتل کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق یکم مارچ ۱۹۶۹ء سے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء تک دو سو افراد کو قتل کیا گیا اور ۲۰۰۰ مکانات کو آگ لگائی گئی اور نظام حکومت چلانے کے لیے، احتجاجیوں نے حکومت کے بالمقابل ہر حلقے میں ''انقلابی کمیٹیاں'' قائم کر لیں.

اس عرصے میں فوج کافی حد تک غیر جانب دار رہی، فوج کے اعلیٰ افسران اگر تلہ سازش کیس کو واپس لینے اور انتہا پسندوں کے ساتھ نرمی کے حق میں نہ تھے، کچھ ایسے ہی حالات تھے جب ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو جنرل یحییٰ خان نے جنرل محمد ایوب خان کو ان کے گھر بھجوا دیا اور حکومت پر قبضہ کر لیا.

شیخ مجیب کے حق میں ہونے والے مظاہروں نے یہ بات لوگوں پر واضح کر دی کہ مشرقی پاکستان کی فوج اور پولیس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ مشرقی پاکستان کی خود مختاری کی تحریک اب اس مقام تک پہنچ چکی ہے کہ اسے مزید دبایا نہیں جاسکتا.

(۵) جنرل محمد یحییٰ کا دور (۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء تا ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء) اور قیام بنگلہ دیش: مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ، وہاں کے طالب علموں اور ماسکو اور بیجنگ نواز جماعتوں کے ساتھ، مغربی پاکستان کی طرف سے جن شخصیات نے اس کھیل کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے میں بنیادی کردار ادا کیا، ان میں سے ایک کردار پاکستان کی تاریخ کے دوسرے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور پاکستان کے خودساختہ صدر جنرل (ر) محمد یحییٰ خان کا ہے، جس نے ایک ایسے وقت میں جب ملک کی سیاسی جماعتوں اور ایوب خان کے مابین معاملات کافی بہتر ہو رہے تھے، ایوب خان کو رخصت کر کے، اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ یحییٰ خان نے اپنی پہلی نشری تقریر میں یہ اعلان کیا تھا کہ ان کا پہلا کام عوام کے جان و مال اور ان کی آزادی کی حفاظت کا ہوگا اور آخر میں ایسے حالات پیدا کرنا جن سے ملک میں آئینی حکومت بحال ہو جائے (سعید الدین: مشرقی پاکستان

کا زوال، ص۱۷)۔ یحییٰ خان نے، جولائی ۱۹۶۹ء، میں اپنی نشری تقریر میں سیاسی جماعتوں سے اپیل کی کہ وہ ملکی مسائل کے حل کے لیے، باہم مل جل کر کام کریں، انہوں نے پاکستان اور امن و امان کے مخالفین کو خبردار کیا کہ اگر انہوں نے اسلام کے اصولوں یا پاکستان کے استحکام کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ انہوں نے اپنی اسی تقریر میں یہ بھی اعتراف کیا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو قومی امور میں شرکت کا موقع نہیں ملا، اسی لیے انہوں نے دونوں خطوں کے مابین عدم توازن کو درست کرنے کے لیے کئی اقدامات کا بھی اعلان کیا۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں فوجی بھرتی دوگنا کر دی جائے گی، (کتاب مذکور، ص۲۸)۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے اس عزم کو دہرایا کہ وہ حسب وعدہ غیر جانب دارانہ اور منصفانہ انتخابات کرائیں گے۔ جس کے بعد وہ اقتدار نو منتخب لوگوں کو سونپ دیں گے۔ صدر نے یہ اعلان بھی کیا کہ مارچ ۱۹۷۰ء تک انتخابی فہرستیں تیار کر لی جائیں گی اور انتخابی حلقوں کی تفصیل مرتب کر لی جائے گی ابتدائی طور پر انتخابات ۵ اکتوبر کو کرانے کا اعلان کیا گیا مگر بعدازاں یہ انتخابات ۷۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں کرائے گئے۔

یحییٰ خان اور اس کے ساتھیوں نے اس موقع پر ایک غلطی یہ کی کہ انہوں نے انتخابات کی تیاری کے لیے پورے ایک سال کی مہلت دی۔ انتخابی سرگرمیوں کی ابتدا جنوری ۱۹۷۰ء سے ہوئی اور یہ سلسلہ ۶۔دسمبر ۱۹۷۰ء تک تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ ایک ایسے وقت میں جب سیاسی جماعتوں کے پاس قومی منشور کے بجائے علاقائی، صوبائی، نسلی اور برادری وغیرہ کی بنیاد پر لوگوں کو اکسانے کے سوا کوئی منشور نہ تھا، ملک میں ایک طویل مدت تک سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دینا کسی پہلو سے بھی درست فیصلہ نہ تھا۔ جس کی بنا پر، رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی.

انتخابی مہم کا آغاز ہوتے ہی، مشرقی پاکستان میں لوٹ مار شروع ہوگئی۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۰ء کو ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں عوامی لیگ نے جماعت اسلامی کے جلسے کو درہم برہم کر دیا۔ جس میں سرکاری اعلان کے مطابق ایک آدمی ہلاک اور پانچ سو افراد زخمی ہوئے۔ اگلے ہی دن جماعت اسلامی کے دفتر پر حملہ ہوا اور جماعت کا لٹریچر جلا دیا گیا۔ یکم فروری ۱۹۷۰ء کو پاکستان جمہوری پارٹی کا جلسہ الٹا دیا گیا۔ اسی دن چٹاگانگ کے دو اخبارات کے دفاتر کو تباہ کر دیا گیا، جنہوں نے عوامی لیگ کے منشور کی مخالفت کرنے کی جسارت کی تھی۔ اس طرح اس پورے عرصے میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے اپنے سیاسی مخالفین کو کچلنے کے لیے تشدد کا راستہ اپنائے رکھا۔ جس سے مشرقی پاکستان میں، اس کے حامی مضبوط ہوتے گئے اور عوامی لیگ کی مخالفت میں اٹھنے والی آوازیں دبا دی گئیں (سعید الدین، ص۲۹)۔

۳۰ مارچ ۱۹۷۰ء کو صدر یحییٰ خان نے عبوری آئینی خاکے کا اعلان کیا۔ جس کی رو سے یکم جولائی سے ون یونٹ کو ختم کر دیا گیا۔ قومی اسمبلی کی ۳۱۳ نشستیں (۱۳ خواتین کے لیے) مقرر کی گئیں۔ ان کی تعداد مشرقی پاکستان کے لیے۱۶۲، پنجاب کے لیے ۸۲، سرحد کے لیے ۲۵، بلوچستان کے لیے چار اور سندھ کے لیے ۲۷ (پورے مغربی پاکستان کے لیے ۱۴۸) مقرر کی گئیں۔اسی سال ستمبر کے مہینے میں مشرقی پاکستان میں قیامت خیز طوفان آیا جس میں لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں۔ اس سے مشرقی پاکستان کے آٹھ قومی اور سترہ صوبائی حلقے بری طرح متاثر ہوئے اس موقع پر مغربی پاکستان کے سیاسی قائدین میں سے کوئی قائد بھی مشرقی پاکستان نہیں گیا، جس سے میدان عوامی لیگ کے لیے کھلا رہا۔ پروگرام کے مطابق ۷ دسمبر کو دونوں خطوں میں ایک ہی دن

انتخابات کروائے گئے۔ جن میں مشرقی پاکستان کی ۱۶۲ نشستوں میں سے ۱۶۰ نشستوں پر عوامی لیگ نے کامیابی حاصل کی، جبکہ مخالفین میں جو دو امیدوار کامیاب ہوے ان میں سے ایک کا تعلق جمہوری پارٹی سے تھا، جبکہ دوسرا آزاد امیدوار کامیاب ہوا تھا۔ جبکہ مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی نے ۸۱، عوامی لیگ نے ۳ ، پاکستان مسلم لیگ (قیوم گروپ) نے ۹، کنونشن مسلم لیگ نے ۲، کونسل لیگ نے ۷، جمعیت علماے پاکستان نے ۷ جمعیت علمائے اسلام نے ۷، نیشنل عوامی پارٹی (ولی خان) نے ۶ اور جماعت اسلامی نے ۴ نشستیں حاصل کیں، جبکہ چھ آزاد امیدواروں نے کامیابی حاصل کی (سعید الدین، ص۴۴۔۴۵)۔

مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے متعلق ایسی اطلاعات بھی ملیں کہ ان کے مسلح حامیوں نے مخالف ووٹرز کو پولنگ اسٹیشن ہی پہنچنے ہی نہ دیا۔ جس کی بنا پر ۴۳ فیصد ووٹرز اپنا حق رائے دہی استعمال نہ کرسکے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ڈالے گئے ووٹوں کا تناسب ۵۷ فیصد رہا۔ جن میں ۷۵ء۲۷ فیصد عوامی لیگ نے اور ۴۴ء۲ فیصد ووٹ ان کے مخالفین نے حاصل کیے تھے۔ جس میں نیب کے دونوں (ماسکو اور بیجنگ نواز)، جماعت اسلامی، پاکستان جمہوری پارٹی، پاکستان مسلم لیگ، (کنونشن گروپ) اور قیوم لیگ اور کونسل لیگ، جمعیت علماے اسلام، نظام اسلام اور آزاد امیدوار شامل تھے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ عوامی لیگ کی سر توڑ کوششوں کے باوجود ۱۰۰ فیصد عوام اس کے ساتھ نہ تھے اور ۵۰ فیصد سے زیادہ لوگ..... اس کے مخالف تھے، لیکن چونکہ وہ متفرق تھے اس لیے وہ اس وقت فیصلہ کن کردار ادا کرنے سے قاصر رہے (Talukder، ص۷۲۔۷۴)۔ یہاں یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے کہ عوامی لیگ کے امیدواروں میں ۶۰ اور اس سے زیادہ عمر کے کل نو افراد، پچاس اور اس سے زیادہ عمر کے ۲۴، چالیس اور پچاس سال کے درمیان ۷۷، تیس اور چالیس سال کی درمیانی عمر والے ۴۲، بیس اور تیس سال کی عمروں کے درمیان کے ۸ اور غیر معروف ۲ افراد شامل تھے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ عوامی لیگ کے منتخب شدہ لوگوں میں اکثریت نوجوانوں کی تھی، جنہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا جا سکتا تھا (کتاب مذکور، ص۷۱)۔

اس طرح انتخابات کے بعد جو صورت حال سامنے آئی، وہ اگرچہ غیر متوقع نہ تھی البتہ حیران کن ضرور تھی اور ان نتائج سے پہلی مرتبہ ملک کے سنجیدہ حلقوں میں ملکی سلامتی کے لیے تشویش محسوس کی گئی۔ چونکہ عوامی لیگ نے اپنے چھ نکات کی بنیاد پر انتخابات میں حصہ لیا تھا، اس لیے گویا مشرقی پاکستان کے لوگوں نے ان انتخابات کے ذریعے شیخ مجیب کے چھ نکات پر، اپنے اعتماد کا اظہار کر دیا تھا۔

اس ساری صورت حال میں ، یحییٰ خان نے ایک احمق سربراہ حکومت کا کردار ادا کیا اور وہ اس پورے عرصے میں خاموش تماشائی بنا رہا ...... اسی بنا پر مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں صدر یحییٰ خان کا کردار ہمیشہ سے زیربحث رہا ہے چنانچہ سابقہ وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے لکھا ہے "کسی ملک کے نظم و نسق میں یہ شاذو نادر ہی ہوتا ہے کہ اس کا ناظم اعلیٰ انتخابات کے صحیح نتائج کی سرشت سے اتنا بے نیاز رہے۔ جتنا کہ صدر یحییٰ خان اور ان کی حکومت رہی" (The East Pakistan Tragedy (المیہ مشرقی پاکستان) ص۴۰۔۴۱)۔

حکومت انتخابی مہم کے دوران میں عوامی لیگ اور بھارت کے مابین ہونے والے ان خفیہ روابط سے بھی بے خبر رہی، جنہوں نے بالآخر ملک کو دولخت کر دیا...... علاوہ ازیں صدر پاکستان نے ، عوامی لیگ، بھارت اور دوسرے ممالک کی سازش کو جس خوبصورتی سے پایۂ تکمیل تک پہنچنے دیا۔ اس سے بھی، ان کی اس قضیے میں

گہری شراکت کا پتہ چلتا ہے۔

(۲) بھارت اور عالمی سازشوں کا کردار: آل انڈیا کانگریس شروع سے ہی تقسیم ہند کے خلاف تھی اور مسئلہ کشمیر پر ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۵ء میں ہونے والی جنگوں نے اسے مزید مشتعل کر دیا تھا۔ اس لیے بدلے کے لیے اسے کسی موزوں وقت کا انتظار تھا اور یہ موزوں وقت اسے بہت جلد مل گیا۔ اس لیے اس موقع پر بھارتی قیادت نے مؤثر اور مربوط حکمت عملی کے ذریعے پاکستان کے مشرقی حصے کو اس کے مغربی حصے سے الگ کر دیا۔

بھارت کی مشرقی پاکستان میں دل چسپی کی کئی وجوہ تھیں: پاکستان کے ان دونوں حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا اور مشرقی پاکستان تین اطراف سے بھارت میں گھرا ہوا ملک ہے۔ پھر یہاں کے لوگ بھارتی صوبے مغربی بنگال کے ساتھ مضبوط لسانی اور ثقافتی رشتے میں بندھے ہوے ہیں اور زبان تعلقات کو استوار رکھنے میں سب سے قوی ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ جبکہ مشرقی پاکستان کے مغربی پاکستان کے ساتھ تعلقات کی راہ میں ہمیشہ زبان رکاوٹ رہی۔ پھر مشرقی پاکستان میں غربت اور افلاس کی بنا پر پیدا ہونے والے احساس محرومی نے بھی، اسے علیحدگی پسندی کی تخم ریزی کے لیے سازگار بنا دیا تھا۔ علاوہ ازیں مشرقی پاکستان میں، ہندوؤں کی کافی بڑی تعداد موجود تھی جو ترک وطن کر کے مغربی بنگال جانے کے بجائے وہیں بس گئے تھے اور تجارت اور تعلیم سمیت تمام شعبوں پر حاوی تھے۔ ان ہندوؤں نے بھی بھارت کے لیے اس کی تکمیل کو آسان بنا دیا (پروفیسر ایم اے صوفی: بنگلہ دیش میرا دیس، لاہور، ستمبر ۱۹۹۷ء ص۱۲۹) اور سب سے بڑھ کر، عوامی لیگ کے خود مختاری پر مبنی منشور اور اس کے لیے اس کی طویل جدوجہد اور اس کے لادینی نظریات و احساسات نے بھی، اس مشکل چوٹی کو سر کرنے میں بھارت کی مدد کی (حوالۂ مذکور)۔ اس لیے بھارت نے نہ صرف مالی جہت سے، بلکہ عملی اور فوجی و سیاسی پہلو سے بھی بنگالیوں کی مدد کی اور پاکستان کو دو الگ الگ حصوں میں بانٹ دیا (کتاب مذکور، ص۱۶۶-۱۷۰؛ Talukder، ص۱۲۶)۔

عوامی لیگ کی جدوجہد کے مراحل:

بعد میں رونما ہونے والے حالات و واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ''عوامی لیگ'' نے بھارت کے ساتھ طویل صلاح مشورے کے ساتھ ملک کو دولخت کرنے کے لیے تین اہداف طے کر لیے تھے: (۱) انتخابات میں کامیابی کا حصول؛ (۲) عوامی طاقت سے شیخ مجیب الرحمان کی حکومت کا قیام؛ (۳) عوامی اور بھارتی فوجی امداد کے ذریعے مکمل آزادی کا حصول۔

ان تینوں اہداف پر مرحلہ وار عمل کیا گیا، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) انتخابات میں کامیابی کا حصول:

عوامی لیگ اور بھارت کے مابین پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق انتخابات میں کامیابی کا حصول آزادی کا پہلا مرحلہ تھا۔ جس کے لیے ہر جائز اور ناجائز طریقہ اختیار کیا گیا۔ جس کی تفصیل سابقہ اوراق میں گذرچکی ہے، جس میں مخالفین کو قتل کرنے، ان کے انتخابی جلسوں کو درہم برہم کرنے، مخالفین کے اغوا اور عین انتخابات کے دن مخالف لوگوں کو انتخابی اسٹیشنوں سے دور رکھنے وغیرہ کے اقدامات شامل ہیں۔ جب انتخابات میں کامیابی حاصل ہوگئی، تو اب شیخ مجیب الرحمٰن کے لیے حصول اقتدار کا اگلا ہدف حاصل کرنا آسان ہوگیا۔

ان انتخابات کے نتیجے میں مغربی پاکستان سے سب سے بڑی جماعت کے طور پر ذوالفقار علی بھٹو کی ''پاکستان پیپلز پارٹی'' سامنے آئی۔ جس کی بنا پر شیخ مجیب الرحمٰن کے بعد، ملک کے مستقبل کے بارے میں سب سے بڑی ذمہ داری اسی جماعت اور اس کے قائد پر عائد ہوتی

تھی، لیکن حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ اس جماعت کو پاکستان سے زیادہ اپنی جماعت اور اس کے مستقبل کی فکر تھی اسی لیے، ان کی ساری سوچ محض مغربی پاکستان میں اقتدار کے حصول تک محدود رہی.

اوپر گذر چکا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی کامیابی اور اس کے چھ نکات کے متعلق مغربی پاکستان میں شکوک و شبہات پائے جاتے تھے اور شیخ مجیب الرحمٰن ان چھ نکات کے متعلق کوئی بات بھی سننے کے روا دار نہ تھے۔ چنانچہ شیخ مجیب الرحمان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے ذوالفقار علی بھٹو نے ۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ کا دورہ کیا اور شیخ مجیب الرحمان سے طویل مذاکرات کیے۔ بعد میں انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں ان مذاکرات کی تفصیل بتائی۔ انہوں نے کہا کہ انہیں "مشرقی پاکستان طلبہ تحریک" کے گیارہ میں سے دس نکات قبول ہیں، البتہ انہیں مغربی پاکستان میں ذیلی وفاق کے نکتے پر اعتراض ہے۔ جہاں تک عوامی لیگ کے چھ نکات کا تعلق ہے، انہوں نے کہا کہ ان کی جماعت نے پہلے نکتے کا پہلا حصہ جس میں حقیقی وفاق کا تذکرہ ہے، قبول کر لیا ہے۔ ان کی جماعت نے وفاقی یونٹوں کا ملائشیا بنانے کا حق بھی تسلیم کر لیا ہے، قرارداد لاہور کے بارے میں انہوں نے کہا کہ اسے مختلف صورت حال میں تحریر کیا گیا تھا جس میں ایسے پاکستان کا تصور تھا، جس میں آسام، مغربی بنگال اور مشرقی پنجاب بھی شامل ہو، اس لیے ان کا خیال ہے کہ تبدیل شدہ صورت حال میں قرارداد لاہور کو آئین کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ مسٹر بھٹو نے دوسرے نکتے کے بارے میں، جن کا تعلق ٹیکس عائد کرنے، کرنسی اور غیر ملکی تجارت سے تھا اپنی رائے محفوظ رکھی اور کہا کہ اس کے متعلق اپنی جماعت اور مغربی پاکستان کے دوسرے لیڈروں سے بات چیت کریں گے(سعید الدین: مشرقی پاکستان کا زوال، ص۵۱)۔ مسٹر بھٹو کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ابتدائی طور پر، شیخ مجیب الرحمان اور ان کی جماعت کو جمہوری اصولوں کے مطابق اقتدار کی منتقلی کے خلاف نہ تھے۔ تاہم کچھ ہی دنوں کے بعد صورت حال میں ڈرامائی تبدیلی آ گئی اور مسٹر بھٹو نے ۲مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں طلب کردہ قومی اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا (کتاب مذکور، ص۵۳) اور اپنی جماعت کے ایک بہت بڑے جلسے میں ڈھاکہ میں ہونے والے اجلاس میں شرکت نہ کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ وہ اس اجلاس میں دوسرے لوگوں کو بھی شریک نہ ہونے دیں گے۔ (دیکھیے مآخذ) جبکہ مغربی پاکستان کی چھوٹی جماعتوں کا موقف یہ تھا کہ فریقین دستور ساز اسمبلی میں پہنچیں اور دستوری مسائل پر آزادانہ طور پر بحث و مباحثہ کے بعد آئین تیار کریں اور اگر تمام دستوری باتیں قومی اسمبلی سے باہر ہی طے ہونا ہیں تو پھر انتخابات کی کیا ضرورت تھی...... دوسری طرف یحیٰی خان تو جیسے بہانے کا منتظر تھا، اسی لیے اس نے فوری طور پر، قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا...... عوامی لیگ نے اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ایک اقلیتی جماعت کے کہنے پر قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا ہے اور یہ کہ وہ "عوامی لیگ" کو اقتدار نہیں دینا چاہتے(حوالہ مذکور)، اس تاثر نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مشرقی پاکستان میں حالات خراب ہوگئے.

۳۔ عوامی اور بھارتی امداد سے مکمل آزادی کا حصول:

یہ ہدف دو مراحل میں حاصل کیا گیا:

(الف) شیخ مجیب الرحمان کی غیر سرکاری (De facto) حکومت کا قیام:

پاکستان پیپلز پارٹی کے اس موقف اور صدر پاکستان کے اس اقدام نے شیخ مجیب الرحمٰن کے لیے اگلا قدم اٹھانا آسان بنا دیا۔ بالآخر وہ لمحہ آگیا، جس کے لیے عوامی

لیگ کی قیادت نے پہلے سے ہی عوام کو تیار کر رکھا تھا، چنانچہ ادھر یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو ریڈیو پاکستان پر یہ اعلان ہوا کہ صدر پاکستان یحیٰی خان نے ۳ مارچ کو ڈھاکہ میں ہونے والا قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا ہے، ادھر مشرقی پاکستان کے لوگ گلیوں اور سڑکوں پر مشرقی پاکستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ لے کر نکل آئے۔ ''مشرقی پاکستان طلبہ لیگ'' نے ۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں بہت بڑا جلوس نکالا اور شیخ مجیب الرحمان کی موجودگی میں ''بنگلہ دیش'' کا جھنڈا لہرایا۔ اس کے چند دنوں کے بعد اسی طلبہ تنظیم نے مرکزی طلبہ ایکشن کمیٹی برائے آزادی بنگلہ دیش (Central Students Action committee of Independent CSACIB =Bangladesh) کی تشکیل کی (Talukder، ص۷۹۔۷۰)۔ اس مرحلے کو شیخ مجیب الرحمٰن کی طرف سے ''نہ فرمانی نہ تعاون'' (Non violent No.co-operation) تحریک کا نام دیا گیا۔ چنانچہ قوم سے اظہار یکجہتی کے لیے، حکومت کے تمام ملازمین، بشمول ہائی کورٹ کے جج صاحبان، اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر رہے اور ان کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ جب تک شیخ مجیب چاہیں گے وہ ایسے ہی کرتے رہیں گے۔ اس دوران میں شیخ مجیب الرحمان کا مکان ''سول سیکرٹریٹ'' میں تبدیل ہوگیا اور مختلف محکموں کو وہاں سے احکام جاری ہونے لگے (کتاب مذکور، ص۸۰)۔ ابتدائی دو دنوں کے بعد، جس کے دوران میں سرکاری فوج نے سول انتظامیہ کو بحال کرنے کی کوشش کی، مگر اُسے مکمل طور پر عدم تعاون اور سول نافرمانی کا سامنا کرنا پڑا، فوج واپس بیرکوں میں چلی گئی، اس کے ساتھ ہی عوامی لیگ اور طلبہ ایکشن کمیٹی نے مسلح مزاحمت کی تیار شروع کر دیں۔ چنانچہ اسی دن نرائن گنج اور رائفل کلب کو لوٹ لیا گیا...... ۲ مارچ کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں اسلحہ جمع کیا گیا اور اس کے احاطے میں فائرنگ کی مشق ہوتی رہی۔ جناح ایونیو اور بیت المکرّم کے کمرشل سنٹر پر حملہ کیا گیا، شالیمار ہوٹل اور گلشن سینما کو آگ لگا دی گئی۔ طلبا کے ایک گروہ نے پاکستانی پرچم کو جلایا۔ ۵ مارچ کو شیخ مجیب الرحمان کے حکم پر ٹیلی فون اور تار گھر کے ملازمین نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ طلبہ نے برٹش کونسل پر حملہ کیا۔ ۶ مارچ کو سنٹرل جیل سے قیدی بھاگ گئے۔ الغرض پورے ملک میں افراتفری اور لاقانونیت کی عملداری ہو گئی (سعید الدین، ص۵)۔ ۴ مارچ سے شہروں اور حکومت کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے ''بنگلہ دیش سیکرٹریٹ'' سے احکام جاری ہونے لگے۔ جو شیخ مجیب کے گھر پر قائم تھا۔ ان احکام نے جو ۴ مارچ سے ۱۵ مارچ تک جاری ہوتے رہے، بنگلہ دیش کی معیشت کو رواں دواں رکھنے اور لاقانونیت کے خاتمے میں بڑی مدد دی (Talukder، ص۷۰)۔ ۱۵ مارچ سے، ''ڈھاکہ ریڈیو ''کو ''ڈھاکہ ریڈیو سنٹر'' کا نام دے دیا گیا اور اس سے وقتاً فوقتاً انقلابی سرگرمیوں پر مشتمل بلیٹن اور ''مرکزی طلبہ ایکشن کمیٹی'' کی طرف سے پہلے ہی سے منظور کردہ قومی ترانہ ''میرا سنہری بنگال'' اور بنگال سے محبت والے دوسرے نغمے بار بار نشر ہونے لگے...... لطف کی بات یہ ہے کہ اسی دوران میں پاکستان ریڈیو پر بنگال میں رونما ہونے والے واقعات کے متعلق مکمل خاموشی رہی۔ اسی اثنا میں ۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب الرحمان نے (۱) مکمل طور پر مارشل لا کے خاتمے؛ (۲)نئے منتخب نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی اور (۳) تمام فوجوں کی بیرکوں میں واپسی کے اپنے تین مطالبات پیش کیے (کتاب مذکور، ص۸۰۔۸۱)۔ مولانا عبدالحمید بھاشانی نے ۱۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب الرحمان سے مطالبہ کیا کہ چونکہ بنگلہ دیش خود مختاری حاصل کرچکا

ہے، اس لیے وہ نگران حکومت بنائیں اور مغربی پاکستان سے اثاثوں کی تقسیم کا مطالبہ کریں (دیکھیے روزنامہ: The Pakistan Observer، ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء)۔ اس دوران میں شہر کے مختلف حصوں سے روزانہ جلوس نکلنے لگے۔ علاوہ ازیں کئی تربیتی مراکز قائم ہوگئے، جن میں بنگلہ دیش کی مختلف عوامی اور طلبہ تنظیموں، عوامی لیگ کے کارکنوں اور گھریلو خواتین کی کمیٹی وغیرہ نے لوگوں کی فوجی تربیت شروع کر دی اور ڈھاکہ یونیورسٹی سے دھماکہ خیز مواد لوٹ لیا گیا اور دوسری جگہوں سے اسلحہ جمع کرنا شروع کر دیا گیا (Talukder، ص۱۸)۔ اس کے ساتھ ساتھ لوگوں نے سڑکوں اور ریلوے لائن پر رکاوٹیں کھڑی کرنا شروع کر دیں۔ انہی دنوں جودھپور میں، جو ڈھاکہ کے قریب واقع شہر ہے، اعلیٰ فوجی افسران کی وین کو روک لیا اور اسلحہ لوٹنے کی کوشش کی گئی، جس پر انہوں نے گولی چلا دی جس سے سات افراد موقع پر مر گئے۔ چٹاگانگ گودی کے کارکنوں نے مغربی پاکستان سے آنے والے بحری جہاز این وی سوات (N.V.Swat) سے، فوجی سازو سامان اتارنے سے انکار کر دیا۔

مرکزی طلبہ ایکشن کمیٹی کی اپیل پر ۲۳ مارچ کا دن جو ''یوم آزادی'' کے طور پر منایا جاتا تھا، ''یوم مزاحمت'' کے طور پر منایا گیا اور اس دن تمام لوگوں نے اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرایا...... ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ صرف ایک ماہ میں مشرقی پاکستان ''بنگلہ دیش'' بن گیا تھا اور اب اسے دوبارہ فتح کرنے کی ضرورت تھی (کتاب مذکور، ص۸۲)۔ اس طرح بنگلہ دیش کی آزادی کا دوسرا مرحلہ مکمل ہو گیا۔

دوسری طرف صدر پاکستان یحییٰ خان، ان واقعات کی اہمیت سے بے خبر، اوٹ پٹانگ احکام جاری کر رہا تھا۔ اس نے فوری طور پر مشرقی پاکستان کے گورنر ایس۔ ایم احسن اور وہاں کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صاحبزادہ یعقوب علی خان کو تبدیل کر کے ان دونوں کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان کو نامزد کر دیا۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ مغربی پاکستان کی قیادت اس تحریک کو سختی کے ساتھ کچلنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ۱۵۔مارچ ۱۹۷۱ء کو جب جنرل یحییٰ خان بذات خود ڈھاکہ گیا تو اس وقت اس کے سامنے دو ہی راستے تھے، یا تو وہ شیخ مجیب الرحمان کی غیر سرکاری حکومت کو قبول کر لے اور اسے آئینی شکل دیدے اور یا پھر وہ آخری حربے کے طور پر شیخ مجیب الرحمان کے خلاف فوج کا استعمال کرے۔ بعد میں جو واقعات پیش آئے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ صدر یحییٰ اور ان کے مشیر (جن میں خاص طور پر ذوالفقار علی بھٹو کا نام لیا جاتا ہے) پہلے ہی، دوسری صورت کے حق میں فیصلہ کر چکے تھے۔ صرف رسمی اعلان باقی تھا۔ جنرل یحییٰ خان نے بظاہر عوامی لیگ کی قیادت سے گفت و شنید اور مذاکرات کا سلسلہ جاری رکھا، جس سے اس نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ معاملات کو بات چیت کے ذریعے سلجھانا چاہتا ہے۔ تاہم اس دوران میں فوج کو مختلف شہروں اور قصبوں میں، بڑی کارروائی کے لیے تعینات کیا جاتا رہا۔ ۲۳ مارچ کی رات کو، بنگالی کمانڈنگ افسر کو معزول کر کے ڈھاکہ پہنچا دیا گیا اور اس کی جگہ ایک مغربی پاکستان کے افسر کو تعینات کر دیا گیا۔ اسی طرح محمد پور اور میرپور میں موجود غیر بنگالیوں کو، جن کی اکثریت پاکستان کے حق میں تھی، مسلح کر دیا گیا۔ ایس۔ ایس۔ جی (سپیشل سروس گروپ) سے تعلق رکھنے والے فوجی دستوں کو بڑی تعداد میں، مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان بھیجا گیا اور انہیں ایسے مقامات پر تعینات کیا گیا، جہاں سے وہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو بنگالیوں کے مظالم سے بچا سکیں اور ڈھاکہ کے آئی جی

کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ بنگالی پولیس سے اسلحہ واپس لے لیں۔ اسی طرح ڈھاکہ میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ فوجی افسروں نے جودھپور میں تعینات سیکنڈ ایسٹ بنگالی رجمنٹ کے افسروں اور جوانوں کو غیر مسلح کرنے کی بھی کوشش کی۔ یہ صورت حال دیکھ کر فوجی افسروں کے اہل خانہ اور اعلیٰ تاجر طبقے کے قائدین ترک وطن کر کے مغربی پاکستان آنے لگے (Talukder، ص۷۴۔۷۵)۔

صدر پاکستان یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمان کے درمیان مذاکرات کا یہ سلسلہ دس روز تک جاری رہا اور غیر جانب دارانہ ذرائع کے مطابق یہ مذاکرات بہت حوصلہ افزا تھے۔ چنانچہ ۲۲۔ مارچ کو شیخ مجیب الرحمان نے اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے مذاکرات مثبت انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں، انہی دنوں ڈھاکہ میں مقیم انڈین ہائی کمیشن نے نئی دہلی کو مطلع کیا کہ دونوں کے درمیان بہت جلد معاملات طے ہونے والے ہیں۔

۱۹ مارچ کو ایوان صدر میں شیخ مجیب اور صدر یحییٰ کے درمیان مذاکرات کا تیسرا دور ہوا، جو ڈیڑھ گھنٹے جاری رہا۔ کہا جاتا ہے کہ صدر یحییٰ اور شیخ مجیب میں انتقال اقتدار پر اتفاق رائے ہو گیا تھا۔ اس موقع پر شیخ مجیب الرحمان نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ بات چیت کے چوتھے دور میں میری جماعت کے ممتاز اراکین بھی شریک ہوں گے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۷۱ء کو صدر یحییٰ اور شیخ مجیب الرحمٰن کے مابین مذاکرات کا دور دو سوا دو گھنٹے تک جاری رہا۔ ۲۲۔ مارچ کو مذاکرات میں ذوالفقار علی بھٹو بھی شامل ہو گئے۔ ۲۵ مارچ کو مسٹر بھٹو نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ عوامی لیگ نے صرف صوبوں کو اقتدار کی منتقلی کا مطالبہ کیا ہے۔ جبکہ ہم صوبوں کے ساتھ ساتھ مرکز میں بھی اقتدار کی منتقلی چاہتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو آنے والے حالات کا کچھ کچھ اندازہ ہوگیا تھا۔ اسی لیے صدر یحییٰ خان کی طرح ایک طرف تو وہ حکومت کے ساتھ مذاکرات میں مصروف تھا، دوسری طرف اس نے خفیہ تیاریوں کا سلسلہ بھی زور و شور سے جاری رکھا ہوا تھا، نوجوانوں کی جنگی تربیت کے ساتھ ساتھ تمام اعلیٰ قیادت زیر زمین چلی گئی۔ اس کا مزید اندازہ اس کی ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی ان تقریروں سے ہوتا ہے جو اس نے اس روز مختلف جلوسوں کے شرکا کے سامنے کیں۔ جو اس کی مشرقی پاکستان میں آخری تقریریں ثابت ہوئیں۔ اس نے کہا کہ بنگالی یا تو آزاد شہری کی طرح زندگی گزاریں گے یا پھر تباہ ہو جائیں گے، لیکن ناپاک گروہ کے آگے نہیں جھکیں گے انہوں نے عوام سے مطالبات کے پورے ہونے تک تحریک جاری رکھنے کی اپیل کی (سعید الدین، ص، ۵۸۔۵۹)۔

دراصل ڈھاکہ مذاکرات کی ناکامی میں تینوں فریقوں کی بدنیتی شامل تھی۔ شیخ مجیب کسی صورت میں اسلام آباد سے تعلق رکھنے پر راضی نہ تھا، بھٹو کو حزب اختلاف میں بیٹھنا اور یحییٰ خان کو مارشل لاء اٹھانا اور اقتدار سے الگ ہونا منظور نہ تھا (میاں محمد افضل. سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک، ص۵۳۶)۔

(ب) حصول آزادی کے لیے مسلح جدوجہد:

حسب توقع صدر پاکستان یحییٰ خان نے اپنی خفیہ تیاریاں مکمل ہونے پر ۲۵ مارچ کو اپنے خطاب میں شیخ مجیب الرحمان اور اس کے ساتھیوں پر غداری اور پاکستان توڑنے کی سازش کا الزام لگاتے ہوئے عوامی لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی (سعید الدین، ص، ۵۹-۶۰) اور مشرقی پاکستان کی بغاوت کو طاقت کے زور پر کچلنے کا اعلان کر دیا۔

اس طرح پاکستان کا اقتدار اعلیٰ بحال کرنے اور عوامی لیگ کی خون ریز بغاوت کو کچلنے کے لیے، فوجی کارروائی کا آغاز ۲۵اور ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کی درمیانی شب کو ہوا...... عین اسی وقت "ریڈیو چٹا گانگ" سے شیخ مجیب الرحمان کی آواز میں بنگلہ دیش کے قیام اور اس کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ جس میں اس نے ایسٹ پاکستان رائفلز، ایسٹ پاکستان رجمنٹ، مشرقی پاکستان کی پولیس اور انصار سے پاکستانی فوج کے سامنے مزاحمت کرنے کی اپیل کی تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی یہ تقریر پہلے سے ریکارڈ شدہ تھی اور اسے کرنل ضیاء الرحمٰن نے ریڈیو چٹاگانگ سے نشر کیا۔ کرنل ضیاء الرحمٰن بعد میں بنگلہ دیش کے کمانڈر انچیف اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر بنے۔

پاکستانی فوج نے ابتدائی کارروائی میں شیخ مجیب الرحمان کو گرفتار کر لیا، مگر عوامی لیگ کے تمام اہم لیڈر روپوش ہو گئے اور بچ بچا کر بھارت پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ مولانا عبدالحمید خان بھاشانی بھی فرار ہو کر بھارت چلے گئے.

فوج نے اپنی کارروائی جاری رکھتے ہوے ان مقامات کو نشانہ بنایا، جہاں سے مسلح مزاحمت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ایسٹ بنگال رائفلز اور ایسٹ پاکستان رائفلز اور طالب علموں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارے گئے اور بہت بڑی تعداد میں مزاحمت کاروں کو قتل کر دیا گیا۔ اس کا ایک مقصد علیحدگی کی تحریک کو مسلح دستوں کی حمایت سے محروم کرنا اور علیحدگی پسندوں میں خوف و ہراس پیدا کرنا تھا (Talukder، ص ۷۶-۸۵)۔ ایک اور وقائع نگار کے مطابق پاکستانی فوج نے ۲۵ مارچ کو اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال (ڈھاکہ یونیورسٹی) کے تمام طلبہ کو قتل کر دیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے نو پروفیسر بھی نشانہ بنے۔ پرانے ڈھاکہ میں تانتی بازار اور شنخاری بازار والے ہندو محلے نذر آتش کر دیئے گئے اور تمام رات قتل عام جاری رہا۔ عوامی لیگ کے بہت سے لیڈر قتل کیے گئے، کئی اخبارات خصوصاً اتفاق، اور سنگ باد وغیرہ کی عمارتوں اور روزنامہ "The People" کی کئی منزلہ عمارت کو آگ لگا دی گئی۔ ۲۸ مارچ کو ریس کورس ڈھاکہ میں واقع "کالی مندر" تباہ کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مارچ کے آخر تک سارا ڈھاکہ خالی ہو چکا تھا اور لوگوں نے آس پاس کے دیہات میں جا کر پناہ لے لی تھی۔ یہ اس جنگ کی ابتدا تھی، جو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء تک جاری رہی۔ جس میں بے شمار انسانی جانیں تلف ہوئیں (میاں محمد افضل: سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک ـ ص۵۳۷ـ۵۳۸).

بہر حال صدر پاکستان جنرل محمد یحییٰ خان کی طرف سے اٹھنے والے اس اقدام کو کبھی پسند نہیں کیا گیا، اسی لیے مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر لکھنے والوں نے، خواہ ان کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے یا مغربی پاکستان سے، اس کارروائی کو ہمیشہ ہدف تنقید بنایا ہے اس لیے کہ اس میں بہت سے بے گناہ مارے گئے تھے اور فوج کی اس اندھا دھند کارروائی نے علیحدگی کی اس تحریک کو وہ ایندھن فراہم کیا جس سے علیحدگی پسندوں کو ایسی آگ بھڑکانے میں بے حد مدد ملی، جس میں پاکستان کے دونوں حصوں کے مابین باہمی روابط کے سارے ذخیرے جل کر راکھ ہوگئے اور بالآخر دونوں حصے ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے الگ ہوگئے۔ جوابی کارروائی کے طور پر بنگالیوں نے بہاریوں، مغربی پاکستانیوں اور ان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا بے تحاشا قتل عام شروع کر دیا اور بلامبالغہ لاکھوں بے گناہ افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے.

۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں جو خانہ جنگی ہوئی، اس میں فریقین کے جانی نقصانات اور تباہی کے متعلق جو اعدادو شمار پیش کیے جاتے ہیں، وہ بڑی حد تک مبالغہ

آمیزی پر مبنی ہیں، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ دونوں طرف سے ہونے والی اس کارروائی میں لاکھوں کی تعداد میں بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور معصوم لوگوں کو قتل کیا گیا۔ جس کی کوئی مذہب بھی اجازت نہیں دیتا (کتاب مذکور، ص۵۴۰۔۵۴۱؛ نیز دیکھیے مقالہ پاکستان، در تکملہ، ج۲؛ حمودالرحمان کمیشن، تحقیقاتی رپورٹ، جلد ۱و۲)۔

(ج) جنگ کا ابتدائی مرحلہ اور اس کے نتائج:

پھر جیسے جیسے ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی درمیانی رات سے شروع ہونے والے پاکستانی فوج کے آپریشن میں شدت آتی گئی اس کے ساتھ ساتھ اس کی مزاحمت اور مسلح بغاوت میں بھی شدت آتی گئی۔ چنانچہ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق بھارت نے اپنی سرحدیں مشرقی پاکستان کے لوگوں کے لیے کھول دیں اور اس کی طرف سے مشرقی پاکستان کے باغیوں کو مکمل حمایت اور سرپرستی کا یقین دلایا گیا۔

پاکستانی فوج کی اس کارروائی کے نتیجے میں، عوامی لیگ اور ''طلبہ ایکشن کمیٹی'' کی پوری قیادت سرحد پار چلی گئی۔ اسی طرح بہت سے عام نوجوان بھی، بھارت چلے گئے، جہاں انہیں پناہ کے علاوہ اسلحہ سمیت مکمل فوجی تربیت دی جانے لگی۔ بھارت نے نہ صرف یہ کہ فوری طور پر ان کے تربیتی مراکز قائم کیے، بلکہ بھارتی حکومت نے ''ریڈیو بنگلہ دیش'' بھی قائم کر دیا جہاں سے پاکستانی فوج کے خلاف مسلسل زہریلا پروپیگنڈہ اور ظلم و جبر کی من گھڑت اور مبالغہ آمیز کہانیاں سنائی جاتی تھیں، جبکہ پاکستانی قیادت ان تمام باتوں سے دانستہ طور پر غافل رہی (کتاب مذکور، ص ۵۴۱، ۵۴۲)۔

عوامی لیگ اور بھارت کے مابین روابط تو پہلے سے موجود تھے، لیکن ریکارڈ کے مطابق دونوں میں پہلا رابطہ مارچ کے ابتدائی دنوں میں، ڈھاکہ میں موجود بھارتی کمشنر کے ذریعے ہوا، جس سے عوامی لیگ کی اعلیٰ قیادت نے، فوجی آپریشن کی صورت میں مدد کی درخواست کی تھی۔ یہ درخواست ڈھاکہ میں متعین بھارتی ہائی کمشنر بذات خود دہلی لے کر گیا اور سرکاری طور پر اس سفر کی وجہ بیٹی کی بیماری ظاہر کی گئی۔ ہائی کمشنر نے ''اعلیٰ حکام'' سے رابطہ کر کے ۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ واپسی پر، عوامی لیگ کے قائدین کو یہ بتایا کہ ''خوراک اور سیاسی نظام کے لیے ...... ہندوستان اور مشرقی پاکستان کی سرحد پر انتظام کر دیا گیا ہے (Talukder، ص۱۰۸، بحوالہ تاج الدین احمد سے ایک انٹرویو، ۲۹ اگست ۱۹۷۳ء)۔

بہرحال بھارت نے بہترین حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بنگلہ دیش کی بغاوت میں رنگ بھرے اور اسے کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔ اس سلسلے میں درج ذیل اقدامات کیے گئے:

(۱) جلاوطن حکومت کا قیام:

۲۵ مارچ کو فوجی آپریشن کے آغاز پر وزیراعظم بھارت مسزاندرا گاندھی نے فوری طور پر 'سیاسی امور سے متعلقہ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا جس میں تینوں افواج کے سربراہوں کے علاوہ بھارت کے اعلیٰ ترین پالیسی ساز اداروں کے نمائندہ افراد نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس میں ''مشرقی پاکستان'' میں ممکنہ فوجی مداخلت کے سوال پر، غور کیا گیا۔ تینوں مسلح افواج کے سربراہوں نے وزیراعظم کو بتایا کہ ابھی وہ فوجی مداخلت کے لیے تیار نہیں ہیں اور اس کے لیے انہیں مزید کچھ وقت درکار ہوگا: علاوہ ازیں تبت اور مشرقی محاذ پر چین کی طرف سے ممکنہ حملے کا بھی خطرہ موجود ہے۔ اس موقع پر یہ بھی کہا گیا کہ ''مشرقی پاکستان'' میں مداخلت سے پہلے قانونی ڈھانچے کی تشکیل ضروری ہوگی۔ البتہ اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مشرقی پاکستان کے باغیوں کی ہر

طرح مدد کی جائے گی (کتاب مذکور، ص۱۰۸۔ ۱۰۹؛ یہی بات بھارتی مصنف میجر جنرل (ر) ڈی کے پیلٹ نے اپنی کتاب The Lighting Campaign، [ص۴۰۔۴۲] میں لکھی ہے کہ اس وقت ہندوستانی فوج جنگ کے لیے تیار نہ تھی اور اسے مزید نو ماہ تیاری کی ضرورت تھی، صدیق سالک، ص۱۰۶).

۲۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو مسز اندرا گاندھی نے بھارتی لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "میں ان معزز اراکین کو جنہوں نے یہ دریافت کیا ہے کہ آیا (مشرقی پاکستان کے بحران کے متعلق) بروقت فیصلے کیے جائیں گے یقین دلانا چاہتی ہوں کہ ہمارے نزدیک بروقت فیصلوں کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ وقت گزرنے کے بعد فیصلے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے (بنگلہ دیشی دستاویزات، ۱:۶۶۹)۔ چار دنوں کے بعد، اسی ایوان میں ہنگامی باغیوں کو یقین دلایا گیا کہ ان کی جدوجہد اور قربانیوں کو بھارت کی بھرپور ہمدردی اور حمایت حاصل رہے گی (صدیق سالک: میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ۱۰۵).

اسی دن بھارت کے ادارہ برائے مطالعہ حکمت عملی (Institute of Strategic Study) کے سربراہ نے یہ کہا کہ بھارت کو اب اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس کا مفاد پاکستان کی شکست و ریخت میں ہے۔ اس طرح کا موقع ہمیں پھر کبھی نہیں ملے گا (کتاب مذکور، ص۱۰۵).

چنانچہ بھارت نے اپنی سرحدی افواج کو یہ ہدایات جاری کر دیں کہ وہ مشرقی بنگال کی مکتی باھنی کو ہر طرح کی مدد مہیا کریں، البتہ انہیں پاکستانی فوج کے ساتھ براہ راست لڑائی میں الجھنے سے منع کر دیا گیا (Talukder، ص۱۰۹).

مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر مبنی اس کارروائی کو قانونی شکل دینے کے لیے بھارت نے مرحلہ وار کام شروع کیا۔۔ فوری طور پر، عوامی لیگ کے جو سیاسی زعما بھاگ کر بھارت چلے گئے تھے، جن میں عوامی لیگ کے سیکرٹری جنرل مسٹر تاج الدین احمد بھی شامل تھے، ان پر مشتمل ایک جلا وطن حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا.

تاج الدین احمد ۳۰ مارچ کو کشتیا کی سرحد سے بھارت گیا، تو "بارڈر سیکیورٹی فورسز" کے ایک افسر نے رابطہ کرنے پر اُسے فوراً کلکتہ بھیج دیا، جہاں بھارتی فوج کے دو جرنیلوں (مسٹر رستم جی اور گوکل مجمدار) نے بھارتی حکومت کی طرف سے ان کا استقبال کیا۔ وہاں سے انہیں دہلی بھیج دیا گیا۔ جہاں ان کی مسز اندرا گاندھی سے ۱۲۔ اپریل کو ملاقات ہوئی اور انہیں جلا وطن حکومت بنانے کے متعلق بھارتی منصوبے سے آگاہ کیا گیا۔ مسز اندرا گاندھی کی طرف سے ہر ممکنہ امداد کے وعدے پر وہ ۴ اپریل کو واپس کلکتہ آ گئے۔ جہاں انہوں نے بنگلہ دیش کی جلا وطن "قومی اسمبلی" قائم کرلی۔ اس اسمبلی کا پہلا اجلاس ۱۷ اپریل ۱۹۷۱ء کو، مغربی بنگال کے ایک قصبے میں ہوا، جو میر پور سب ڈویژن میں واقع ہے۔ اجلاس میں اس قصبے کا نام "مجیب نگر" رکھنے کا فیصلہ ہوا۔ اس اجلاس میں شیخ مجیب الرحمان کو صدر اور نذر الاسلام کو نائب صدر نامزد کیا گیا۔ اعلامیہ کے مطابق شیخ مجیب الرحمان کی واپسی تک نائب صدر بطور صدر کام کریں گے (Talukder، ص۱۱۰)۔ اس کے بعد، پارلیمانی طرز حکومت کے مطابق تاج الدین احمد نے بطور وزیراعظم بنگلہ دیش اپنی کابینہ قائم کی جو خوند کر مشتاق احمد، منصور علی اور قمر الزمان پر مشتمل تھی: اس جلا وطن کابینہ نے ۵۲ سالہ مسٹر کرنل عطاء الغنی عثمانی (مشرقی پاکستان کے ایک سابق فوجی افسر) کو، اپنی "آزادی پسند افواج" کا کمانڈر انچیف مقرر کیا۔ اس کے علاوہ بہت سے سرکاری افسران بھی، جن میں ۱۳ سی۔ ایس پی افسران بھی شامل تھے، بھارت چلے گئے تھے جو اس جلا وطن حکومت میں شامل کر لیے

گئے (کتاب مذکور)۔

اس جلا وطن حکومت نے تیرہ کروڑ پچاس لاکھ روپے (ایک کروڑ نوے لاکھ ڈالر) سے ایک مالی فنڈ بھی قائم کیا، جس میں سب سے زیادہ وہ رقم شامل تھی جو مشرقی پاکستان کے مختلف بینکوں اور حکومت کے خزانوں سے لوٹی گئی تھی۔ اس میں سے چار کروڑ روپے کو بھارتی کرنسی میں تبدیل کر لیا گیا تھا۔ اس میں سے، ڈیڑھ کروڑ روپیہ بھارت کے مختلف اداروں اور بھارتی حکومت کی طرف سے بطور عطیہ دیا گیا تھا، اس کے علاوہ جلا وطن حکومت کے تمام عہدیداروں کے بیرون ملک کے دوروں کے جملہ اخراجات بھارتی حکومت پورے کرتی تھی۔ امور خارجہ پر اٹھنے والے اخراجات، سابقہ مشرقی پاکستانی افسران، بھارت میں پہلے سے موجود بنگالی افراد اور بھارت کے سفارتی مشن پورا کرتے تھے (کتاب مذکور، ص۱۱۱)۔

مبینہ طور پر اس جلا وطن حکومت کے اندر دو گروہ موجود تھے جو بعض امور میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے تھے: مسٹر خوندکر مشتاق احمد ، جو امور خارجہ کاوزیر تھا، اس بات کا حامی تھا کہ شیخ مجیب الرحمان کی رہائی اور مشرقی پاکستان کی خود مختاری کے لیے پاکستان سے بات چیت کی جائے اور اس کے لیے امریکہ کی گارنٹی حاصل کی جائے۔ اس سلسلے میں کلکتہ میں واقع امریکہ کے سفارت خانے سے، اس کے روابط تھے، مگر اس کے مقابلے میں جلا وطن حکومت کے وزیراعظم مسٹر تاج الدین احمد بھارت نواز ہونے کی بنا پر ایسے کسی بھی معاہدے اور پاکستان کے ساتھ تعلقات کے سخت خلاف تھا۔ اسی لیے اس نے پالیسی کے طور پر، خوند کر مشتاق احمد کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا (کتاب مذکور، ص ۱۱۱)۔ اس مقصد کے تحت اس نے مسٹر عبدالصمد کو، جس کا تعلق ماسکو نواز نیپ سے تھا، کابینہ کا سیاسی مشیر مقرر کر دیا۔ جس نے غیر سرکاری وزیر خارجہ کے طور پر فرائض سنبھال لیے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۷۱ء میں بوڈاپسٹ میں ہونے والی عالمی امن کانفرنس میں اسی نے بنگلہ دیشی وفد کی قیادت کی؛ ۱۹۷۱ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس کے لیے بنگلہ دیش وفد کی سربراہی کے لیے پہلے مسٹر خوندکر مشتاق احمد کے نام کا اعلان کیا گیا، لیکن بعد میں اس کا نام بنگلہ دیشی وفد سے حذف کر دیا گیا اور اس کی جگہ جسٹس ابو سید چودھری نے اس وفد کی قیادت کی۔ اس طرح تاج الدین خوندکر مشتاق احمد کو الگ تھلگ رکھنے میں کامیاب رہا (کتاب مذکور ، ص۱۱۱-۱۱۲)۔

الغرض بھارتی حکومت نے اس جلا وطن حکومت کی ہر طرح سرپرستی اور مدد کی اور مسٹر سدھارتا شنکر رائے، جو اس وقت بھارت کا ایک وزیر تھا اور بعد میں مغربی بنگال کا وزیر اعلیٰ بنا، دونوں حکومتوں میں رابطے کا کام انجام دینے پر مامور تھا اور وزارت خارجہ کے جوائنٹ سیکرٹری اے۔ کے رائے کو کلکتہ میں تعینات کر دیا گیا، تاکہ وہ بنگلہ دیشی حکومت کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھے۔ کسی بھی اہم معاملے کے لیے تاج الدین احمد اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے مابین براہ راست رابطے کے لیے مسٹر شنکر یامسٹر ڈی پی دھر کو ذمہ داری دی گئی۔

(۲) گوریلا تنظیموں کا قیام:

بھارت نے پاکستان کو دولخت کرنے کے لیے بنگالیوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی پالیسی کے تحت کئی گوریلا تنظیمیں بھی قائم کیں۔ جنہوں نے مشرقی پاکستان میں گھس کر تخریبی کارروائیاں کیں اور بالآخر پاکستانی فوج کو بے بس کر کے، پورے ملک پر بھارت کے قبضے کی راہ ہموار کی۔ ان تنظیموں کی تفصیل درج ذیل ہے:

(ا) مکتی باھنی: اوپر گزر چکا ہے کہ پاکستانی فوج کے ایک سابق کرنل عطاء الغنی عثمانی کو، جلا وطن حکومت نے اپنی فوج کا ، جو اس وقت مکتی باہنی پر مشتمل تھی، کمانڈر انچیف مقرر کیا۔ مکتی باھنی اسی کے ذہن کی پیداوار تھی۔ یہ نام نہاد فوج دراصل مشرقی پاکستان رائفلز اورمشرقی پاکستانی رجمنٹ کے بھگوڑے سپاہیوں اور متحدہ پاکستان کے خلاف تخریبی ذہن رکھنے والے طالب علموں پر مشتمل تھی۔ بھارتی حکومت نے ۱۵ مئی ۱۹۷۱ء کو انڈین آرمی کے میجر جنرل سرکار کو بریگیڈئیر داس کے ہمراہ، بھارتی حکومت اور بنگلہ دیشی جلاوطن حکومت کے مابین رابطہ افسر مقرر کیا۔ ان کا تقرر بنگلہ دیشی حکومت کے ہیڈ کوارٹر ہی میں کیا گیا۔ انہی دنوں میں میجر سیف اللہ، میجر خالد مشرف اور کرنل عثمانی نے سلہٹ میں واقع بھارت کی سرحد کے قریب ''تری پورہ'' کے مقام پر ایک اجلاس کیا اور بقول ان کے جنگ آزادی کے لیے حکمت عملی پر مشتمل ایک دستاویز تیار کی۔ اس حکمت عملی کی بنیاد دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان اور برما میں اختیار کردہ جاپانیوں کے طریقۂ جنگ پر رکھی گئی۔ اس حکمت عملی کی رو سے باقاعدہ فوج کے ساتھ ساتھ، عوامی فوج..... کے ذریعے گوریلا کارروائیاں کر کے دشمن کو پریشان کیا جاتا ہے۔ اس بات پر تمام بنگالی افسران متفق تھے کہ گوریلا کارروائیاں بھارتی فوج کی پشت پناہی کے ساتھ اور فوجی محاذ جنگ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے کی جائیں گی..... اس منصوبے کو ''تری پورہ دستاویز'' (منصوبہ) کہا جاتا ہے، اس منصوبے کے درج ذیل حصے خصوصاً قابل ذکر ہیں:

ا۔ بہت بڑی تعداد میں، تربیت کے ذریعے عوامی گوریلا فوج تیار کی جائے گی۔ یہ گوریلا فوج پاکستانی فوج کے باہمی مواصلاتی رابطوں کو ختم کرنے ، ان کی حرکت کو متاثر کرنے اور ان کے الگ تھلگ کیمپوں اور مقامات پر ''مارو اور بھاگو'' (Hit and Run) کی پالیسی اختیار کرے گی، تاکہ دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جاسکے۔

۲۔ مکتی باہنی کے باقاعدہ اور مسلح دستوں کو بڑھایا جائے گا اور انہیں کئی حصوں میں تقسیم کر کے، مختلف علاقوں میں تعینات کیا جائے گا، تاکہ وہ گوریلا سپاہیوں کو حفاظت مہیا کر سکیں۔

۳۔ مکتی باہنی کے باقاعدہ دستوں اور اس کے گوریلا کارروائیاں کرنے والے دستوں کو باہم ملا کر، ایک بڑی فوج تیار کی جائے گی، تاکہ وہ پاکستانی فوج پر براہ راست حملہ کر کے، ان کی خوراک اور اسلحہ کی سپلائی کو ختم کر سکیں۔

یہ منصوبہ جب بھارتی حکومت اور جلا وطن بنگلہ دیشی حکومت نے منظور کر لیا تو اس کے مطابق نوجوانوں کی بھرتی اور ان کی تربیت کا آغاز کر دیا گیا..... چونکہ بھارتی حکومت عوامی لیگ کے نمائندوں کے ساتھ مل کر کام کر رہی تھی، اسی لیے مکتی باہنی میں شامل ہونے کے لیے لوگوں کی نظریاتی وابستگی کو لازماً دیکھا جاتا تھا، جس کے لیے ایک سخت طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے بھارت کی سرحد کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کے لیے کئی ہزار استقبالیہ سنٹر قائم کیے گئے، جو بنگلہ دیش سے آنے والے نوجوانوں کا استقبال کرتے۔ چنانچہ پڑھے لکھے نوجوان، جو بھارتی سرحد کے قریب بنگلہ دیش میں آباد تھے، بھارت جا کر اس گروہ میں شامل ہونے لگے۔ ابتدائی دنوں میں ہی دو لاکھ پچاس ہزار نوجوان ان تربیتی کیمپوں میں تربیت حاصل کرنے کے لیے پہنچ گئے۔ یہ کیمپ بنگلہ دیش کی قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان چلا رہے تھے (Talukder، ص۱۱۸)۔ ابتدائی تربیت کے بعد، جن نوجوانوں کی عوامی لیگ کے نمائندے سفارش

کرتے تھے، ان کی مزید تربیت مغربی بنگال ، اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش اور تری پورہ وغیرہ علاقوں میں واقع تربیتی مراکز میں ہوتی تھی، یہاں انہیں چھوٹے خود کار ہتھیاروں، مارٹرگنوں اور بم دھماکوں وغیرہ کی تربیت دی جاتی تھی۔

یہاں پہلے محض دو ہفتوں کی تربیت دی جاتی تھی، بعدازاں اسے چار ہفتوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ گوریلا کارروائیوں کے کمانڈروں کی مزید خصوصی تربیت بہار کے ایک مقام چکولیا میں چھ ہفتوں کی ہوتی تھی (کتاب مذکور، ص۱۱۹)۔

نومبر ۱۹۷۱ء تک ایک لاکھ نوجوانوں کو گوریلا جنگ کی تربیت کے بعد وطن واپس بھیج دیا گیا تھا اور اتنی ہی تعداد میں مزید لوگ تربیت حاصل کر رہے تھے۔ شروع شروع میں گوریلا کارروائیوں کے لیے آنے والوں کی اکثریت طالب علموں، غریب اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں پر مشتمل ہوتی تھی، بعد میں صنعتی مزدوروں اور چھوٹے تاجروں اور کاشت کار خاندانوں کے لوگ بھی، اس میں شامل ہوتے گئے۔

اس نئی فوج کے نظم و نسق کے لیے، ایک باقاعدہ فوجی ہیڈ کوارٹر بنایا گیا، جہاں کمانڈر انچیف کرنل عثمانی کی ماتحتی میں دس افسران کام کرتے تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل ایم اے عثمانی کو چیف آف دی سٹاف اور گروپ کیپٹن اے کے خوند کر کو ڈپٹی چیف آف دی سٹاف مقرر کیا گیا۔ کرنل عثمانی کا دفتر مستقل طور پر بھارت میں اور ڈپٹی چیف آف دی سٹاف کا دفتر بنگلہ دیش ہیڈ کوارٹر میں قائم کیا گیا۔ تری پورہ منصوبے پر عمل درآمد کے لیے مشرقی پاکستان کو گیارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ان گیارہ سیکٹروں میں مکتی باہنی کے تربیت یافتہ کمانڈوز کسی نہ کسی سیکشن کمانڈر کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ نومبر کے آخر تک مسلح کارروائیاں کرنے والے مسلح افراد کی تعداد ایک لاکھ افراد تک پہنچ گئی تھی۔ (کتاب مذکور، ص۱۱۵)۔

یہ علاقائی دستے چھوٹے چھوٹے ہتھیاروں کے ساتھ مسلح تھے جو انہیں بھارت فراہم کرتا تھا...... اکتوبر ۱۹۷۱ء میں فوج کے تین بریگیڈوں نے جو زیڈ (z) اور "ایس" (s) کے نام سے موسوم تھے اور جن کی قیادت میجر ضیاء الرحمان، خالد مشرف اور محمد سیف اللہ کر رہے تھے، پاکستانی افواج پر حملہ کر دیا۔ اس کا مقصد پاکستانی افواج کے مورچوں پر پیش قدمی کر کے انہیں نقصان پہنچانا تھا...... اسی طرح اکتوبر میں مکتی باہنی کے "نیول ونگ" نے، جو چار سو نیول کمانڈروں پر مشتمل تھا، مشرقی پاکستان میں متعین پاکستانی نیوی پر دھاوا بول دیا۔ اس نیول فوج کو چھوٹے ہتھیاروں کے چلانے، تہہ آب کارروائیاں کرنے اور فوجی کشتیوں کو تباہ کرنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ اسی طرح ایک چھوٹی سی فضائیہ بھی جو دو ہیلی کاپٹروں، ایک ائیر کرافٹ اور ایک انجن والے ایک ڈکوٹا جہاز پر مشتمل تھی، تیار کی گئی......اس سکواڈ میں گنوں، بموں اور راکٹوں سے لیس دو ہیلی کاپٹر بھی شامل تھے...... یہ فضائیہ ناگا لینڈ کے ڈمپور ائیر پورٹ پر متعین کی گئی تھی، پاکستانی راڈار سے بچنے کے لیے اس کے پائلٹوں کو تین سو فٹ کی بلندی پر پرواز کی خصوصی تربیت دی جاتی تھی (کتاب مذکور، ص۱۱۶)۔

(۲) مجیب باہنی: باغیوں کے ہاں مکتی باہنی اور اس کی گوریلا جنگ لڑنے والی فوج کی غیر معمولی مقبولیت نے عوامی لیگ کے قائدین کی شہرت کو بھی ماند کر دیا، چنانچہ یہ سوچا جانے لگا کہ اگر شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان کی قید سے رہا نہ ہو سکے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ عوامی لیگ کی قیادت کی جگہ مکتی باہنی کے جانبازوں کو مل جائے، اس خطرے کے پیش نظر شیخ مجیب الرحمان کے قریبی

ساتھیوں (طفیل احمد، شیخ فضل الحق مونی، سراج العالم خان اور عبدالرزاق خان) نے مجیب باھنی کے نام سے ایک نئی گوریلا فورس تیار کرنے کی تجویز دی، تاکہ شیخ مجیب الرحمان اور اس کے قریبی ساتھیوں کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔ چنانچہ کالج اور یونیورسٹی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے طالب علموں اور دوسرے نوجوانوں کو اس فوج میں شامل کیا گیا۔ نومبر میں ان کی تعداد سات ہزار سے آٹھ ہزار افراد تک جا پہنچی۔

اس دستے میں شامل افراد کو بھارت کے شہر ''ڈیرہ دون'' اور آسام کے ''ہنلنگ'' کے مقام پر ڈیڑھ ماہ کی تربیت دی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں ان گوریلوں کو فوجی تربیت کے علاوہ ''مجیب ازم'' یعنی قوم پرستی، لادینیت، سوشلزم اور جمہوریت کے لیے خصوصی طور پر تیار کیا جاتا تھا، اسی لیے اس فوج کو جدید ذرائع مواصلات کی فراہمی اور دوسرے خصوصی وسائل کی بنا پر، خصوصی مقام حاصل رہا۔ یہ فوج بنگلہ دیش کی جلا وطن حکومت اور مکتی باہنی کی کمان سے بالا تر تھی۔

(۳) قدیر باھنی: مکتی باہنی اور مجیب باہنی کے ساتھ ساتھ، ایک اور باھنی (فوج) نے اس جنگ میں مؤثر کردار ادا کیا...... اس فوج کو عبدالقدیر صدیقی نے منظم کیا۔ وہ ٹینگیل نامی قصبے میں ایک ماتحت عدالت میں بطور وکیل کام کرنے والے شخص کا بیٹا تھا، جو پاکستانی فوج میں نان کمیشنڈ افسر کے طور پر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے وقت مغربی پاکستان میں بھارت کے خلاف مؤثر خدمات انجام دے چکا تھا۔ اس نے جنگ کے فوراً بعد فوج کی ملازمت چھوڑ دی اور ٹینگیل نامی قصبے کے قریب واقع کراتیا کالج میں آرٹس میں انٹرمیڈیٹ کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹ اپریل ۱۹۷۱ء کو جب پاکستانی فوج کا، ایک قافلہ ''میمن سنگھ'' کی طرف جا رہا تھا تو مشرقی پاکستان رائفلز کے ایک دستے نے کلاھتی میں اس پر حملہ کیا، مگر منہ کی کھائی۔ اس جنگ میں قدیر اور اس کے دوست بھی شامل تھے۔ اس ہزیمت کے بعد ، اس نے آس پاس کے دیہاتوں سے نوجوانوں کو جمع کیا اور ایک مسلح مزاحمتی دستہ تشکیل دیا۔ انھی دنوں ٹینگیل کے نوجوان، جو پاکستانی فوجیوں کا خصوصی ہدف تھے، بھاگ بھاگ کر ''مہندراپور'' میں جمع ہونے لگے (یہ ایک جنگلی علاقہ تھا، جو مادھ گھر اور بھاول گھر'' کے مابین واقع تھا۔ یہاں انہیں قدیر اور اس کے ساتھی پناہ مہیا کرتے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ قدیر نے وسیع پیمانے پر ایک مسلح فوج کی تشکیل شروع کر دی (کتاب مذکور، ص۱۱۷)۔ قدیر نے اس وقت بڑی مقبولیت حاصل کی جب اس نے ایک پاکستانی فوجی دستے پر حملہ کر کے ان کے سولہ سپاہیوں کو شہید کر دیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ۱۱ ۔ اگست کو بھی پیش آیا۔ جب اس کے مسلح دستے نے ایک پاکستانی کشتی پر حملہ کیا، جو بڑی تعداد میں اسلحہ اور سامان رسد لے کر جا رہی تھی۔ اس کشتی کا کمان دار اور تقریباً سو سپاہی شہید کر دیئے گئے۔ اس سے قبل کہ پاکستانی فوج کی طرف سے کمک پہنچتی قدیر باھنی کے لوگ اسلحہ اور سامان رسد لے کر وہاں سے فرار ہو گئے...... اس کشتی کے بارود سے اڑائے جانے کی آواز دور دور تک سنی گئی جس سے قدیر کو بڑی پذیرائی ملی (Talukder، ص۱۱۸)۔

ان گوریلا دستوں نے پاکستانی فوج پر حملہ کر کے تقریباً آٹھ ماہ (اپریل تا نومبر) میں اسے بے حد نقصان پہنچایا۔ ان باغیوں نے اپنی کارروائیاں تین ادوار میں مکمل کیں۔

ا۔ پہلا دور (جون تا جولائی ۱۹۷۱ء): اس دور میں باغیوں نے اپنی کارروائیاں سرحدی علاقوں تک محدود رکھیں، جہاں انہیں سرحدپار سے، بآسانی فوجی اور مالی امداد مل جاتی تھی...... اس دور میں باغیوں کی سرگرمیاں محض چھوٹے چھوٹے حملوں اور دوسری سرگرمیوں تک محدود

تھیں۔ ان کی زیادہ تر توجہ چھوٹی چھوٹی پلیاں اڑانے، متروکہ ریلوے لائنوں پر سرنگیں بچھانے اور ایک آدھ دستی بم پھینکنے تک محدود تھیں۔

۲۔ دوسرے دور (اگست تا ستمبر) میں انہوں نے فوجی قافلوں اور کانوائوں پر حملے کرنا شروع کر دیئے۔ نیز جہازوں کو ڈبونے اور مشرقی پاکستان میں موجود اہم شخصیات کو قتل کرنے وغیرہ کی کارروائیاں کیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تربیت اور طریق کار خاصا بہتر ہو گیا تھا۔

۳۔ تیسرے دور (اکتوبر تا نومبر) کے دوران میں ان کی سرگرمیوں میں زیادہ تیزی اور مستعدی آ گئی تھی اور اب وہ مشرقی پاکستان کے اندر دور دور تک جا کر کارروائیاں کرنے لگے تھے۔ انہوں نے بہت سے سرحدی علاقوں میں مستحکم مورچے بنا لیے تھے، جہاں سے انہیں ہٹایا نہ جاسکا اور بعدازاں یہ مورچے...... بھارتی فوجوں کے کام آئے (صدیق سالک، ص۱۰۷۔۱۰۸)۔

شروع شروع میں ان باغیوں کو بھارت کی طرف سے اسلحے کی سپلائی محدود تعداد میں ملتی تھی، لیکن بھارت کے روس کے ساتھ معاہدۂ دوستی (اگست ۱۹۷۱ء) نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا...... مبینہ طور پر روسی حکومت نے بھارت کو یہ یقین دلایا کہ "مکتی باھنی" کو دیئے گئے ہتھیاروں کی جگہ انہیں مزید ہتھیار دے دیئے جائیں گے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ روس کے پاس دوسری جنگ عظیم دور کا جو اسلحہ پڑا ہوا تھا وہ روس نے بھارت کے ذریعے باغیوں کو مہیا کر دیا۔ جس پر، ان کی سرگرمیوں میں بے حد اضافہ ہو گیا (حوالۂ مذکور)۔

دوسری طرف پاکستانی فوج کا یہ حال تھا کہ مشرقی پاکستان میں ۱۲۶۰ آفیسر اور ۴۱۰۶۰ جوان متعین تھے، جن کے ذمے ۵۵۱۲۶ مربع میل علاقے کا دفاع کرنا تھا...... ایک معروف گوریلا ماہر حرب ٹی۔ ای لارنس کے مطابق گوریلا جنگوں میں چار مربع میل قطعہ اراضی کی حفاظت کے لیے کم از کم ۲۰ سپاہی درکار ہوتے ہیں (Seven Pillars of Wisdom، ص ۱۹۲)...... یہ تناسب کھلی اور صحرائی جنگ کے لیے ہے۔ جبکہ مشرقی پاکستان کی سر زمین تو سبزے اور درختوں کی کثرت کی بنا پر اور بھی زیادہ حساس تھی...... بایں ہمہ اگر مذکورہ اصول کو بھی سامنے رکھا جائے، تو مشرقی پاکستان کی حفاظت کے لیے ۲۷,۵۶۴۰ افراد درکار تھے...... یعنی وہاں موجود وسائل سے تقریباً سات گنا زیادہ (صدیق سالک، ص۱۰۹)۔ اس لیے شروع سے ہی پاکستان فوج کا پلہ کمزور نظر آتا تھا۔ جو آہستہ آہستہ اور بھی کمزور تر ہوتا گیا۔ ان نامساعد حالات کے باوجود پاکستانی فوج نے بہترین حربی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلح باغیوں کا نوماہ تک پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا اور تمام اہم شہروں اور بڑے بڑے قصبوں کو باغیوں سے محفوظ رکھا اور تین سو ستر سرحدی چوکیوں میں سے تین سو ساٹھ چوکیوں پر اپنا قبضہ قائم رکھا (حوالۂ مذکور)۔ ان کارروائیوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ بنگالی عوام کا رویہ بھی بدلتا رہا، وہ عموماً جیتنے والوں کا ساتھ دیتے...... ان میں سے بعض لوگ ایسے ہوشیار تھے کہ انہوں نے بنگلہ دیش اور پاکستان دونوں کے پرچم بنوا رکھے تھے اور دونوں کا حسب موقع استعمال کرتے تھے۔

اس دوران میں پاکستان میں بھی سیاسی اتار چڑھاؤ کا سلسلہ جاری رہا۔سب سے معیوب اور گھناؤنا کردار صدر پاکستان یحییٰ خان کا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس کے ہاں ان واقعات کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی، اس نے جس بے توجہی اور جس سرد مہری سے اس طوفان کا مقابلہ کیا، اس کی دنیا کی تاریخ میں کوئی اور مثال موجود نہیں ہے۔ متحدہ پاکستان کے آخری ایام

(ص ۱۹۱) کے مؤلف کے مطابق شاید یحییٰ خان ان دنوں ذہنی طور پر ماؤف نظر آتا تھا اور کسی سے بات کرنے سے بھی کتراتا تھا۔ یحییٰ خان نے مارچ کی فوجی کارروائی اور دسمبر کی جنگ کے مابین صرف دو قدم اٹھائے: اس نے ایک ایسے وقت میں، جب باغیوں کے خلاف کارروائی عروج پر تھی مشرقی پاکستان کے کمان دار اعلیٰ جنرل ٹکا خان کو تبدیل کر کے ان کی جگہ امیر عبداللہ خان نیازی کو تعینات کر دیا اور ان کے ساتھ ڈاکٹر مالک کو مشرقی پاکستان کا گورنر بنا دیا۔ اس تبدیلی نے..... حاصل کردہ کامیابیوں کو کافی حد تک ختم کر دیا اور دوسرا اقدام باغیوں کے لیے عام معافی کا اعلان اور نام نہاد انتخابات کا انعقاد تھا۔ عام معافی کے اعلان سے باغی اپنے علاقوں میں واپس آگئے اور انہوں نے ملک کے اندر آکر فوجی اور گوریلا کارروائیاں کر کے پاکستانی فوج کے لیے مشکل ترین حالات پیدا کر دیئے (صدیق سالک، ص۱۱۵).

باغیوں کے لیے عام معافی کا اعلان ۴ ستمبر ۱۹۷۱ء کو ہوا۔ اس موقع پر ان ملزمان کے سوا، جن پر فرد جرم عاید کی جا چکی تھی، تمام زیر حراست شر پسندوں کو رہا کر دیا گیا۔ اس حکم کے تحت کئی سو افراد کو رہا کیا گیا.

علاوہ ازیں نئے سیاسی سمجھوتے کے مطابق مشرقی پاکستان کی ان نشستوں کے ضمنی انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا گیا، جو عوامی لیگ کے نمائندوں کے مفرور ہونے کی بنا پر خالی ہوگئی تھیں..... ان انتخابات کی ذمہ داری میجر جنرل راؤ فرمان علی پر ڈالی گئی۔ انہوں نے اسے، ان سیاسی جماعتوں کو نوازنے کا ذریعہ بنا لیا جو ان سے تعاون کر رہی تھیں۔ چنانچہ یہ نشستیں جمہوری پارٹی ، جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، کنونشن مسلم لیگ اور نظام اسلام پارٹی کے مابین ایک تناسب سے تقسیم کر دی گئیں(صدیق سالک، ص۱۱۸).

پیچھے گزر چکا ہے کہ مشرقی پاکستان پر آخری ضرب لگانے اور اسے پاکستان سے الگ کرنے کے لیے بھارت کو کچھ وقت درکار تھا، چنانچہ اندرونی طور پر اسے جس تیاری کی ضرورت تھی، وہ مکمل کرلی گئی اور بیرونی طور پر جو تعاون درکار تھا وہ بھی اسے حاصل ہو گیا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم پیش رفت روس کے ساتھ ہونے والا ''معاہدہ دوستی ''تھا۔ جس کی شق نمبر ۵ اور ۹ کے تحت بھارت کسی بھی وقت روس سے فوجی امداد طلب کر سکتا تھا (دیکھیے پاکستان، بذیل مادہ، در تکملہ ۱۱۱)۔ پھر جوں جوں دونوں ملکوں کے مابین جنگ کے حالات پیدا ہوگئے بھارت اور روس کے مابین دفاعی تعاون کی رفتار بڑھتی گئی۔ پہلے روس کے نائب وزیر خارجہ نکولائی فرومین کی قیادت میں پانچ رکنی وفد بھارت آیا۔ بعدازاں روسی فضائیہ کے سربراہ کی سرکردگی میں چھ رکنی وفد نے بھارت کا دورہ کیا۔ آخر میں روسی وزیر دفاع مسٹر گریچگو خود بھارت آئے اور جنگی تیاریوں کا بنفس نفیس خود جائزہ لیا (کتاب مذکور ص۱۲۰)۔ انہی دنوں یہ خبر بھی آئی کہ دہلی میں دونوں ممالک کے مابین ایک دفتر رابطہ قائم کر دیا گیا ہے جس میں روسی ماہرین اور ہوا باز مستقل طور پر متعین کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ بھارتی وزیر اعظم نے امریکہ، برطانیہ اور مغربی جرمنی کا دورہ کیا۔ اس دورے کا مقصد ان ممالک کو پاکستان کی امداد سے روکنا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہیں۔ دوسری طرف پاکستانی صدر مملکت اپنے آپ میں مگن رہے اور ان نو مہینوں میں سفارتی یا فوجی سطح پر کوئی اہم کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ جبکہ آخری دنوں کے دوران میں بنگالی باغی اتنے دلیر ہو گئے تھے کہ وہ تمام بڑے شہروں میں بڑی آسانی کے ساتھ کارروائیاں کرنے لگے

تھے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری روز کا معمول بن گئی تھی، حتیٰ کہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو دن دہاڑے مشرقی پاکستان کے سابق گورنر منعم خان کو ان کے گھر میں گھس کر قتل کر دیا گیا (ص۱۲۱)۔

(۴) پاکستان و بھارت کی تیسری جنگ:

بالآخر وہ دن بھی آ گیا، جس کا عرصے سے انتظار تھا، یہ بھارت کا اپنی مسلح افواج کے ذریعے مشرقی پاکستان پر باقاعدہ حملہ تھا...... جو ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو شروع ہوا۔ بھارت کو اس موقع پر ۱۹۶۵ء کی طرح سخت مقابلے کی توقع تھی، مگر اس کے برعکس اس نے بہت کم نقصان پر محض چودہ دنوں میں یہ جنگ جیت لی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ بھارت اپنے پروپیگنڈے، اپنی تیاریوں اور باغیوں کی مدد سے اس جنگ میں کامیابی تو پہلے ہی حاصل کرچکا تھا، اب محض رسمی کارروائی رہ گئی تھی، جو چند دنوں میں مکمل کر لی گئی...... اس کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

قیام پاکستان سے لے کر اب تک دونوں ممالک کے مابین مثالی تعلقات قائم ہونے کی کبھی نوبت نہیں آئی، لیکن اس کے باوجود دونوں ممالک کے مابین تعلقات میں اتار چڑھاؤ آتا رہا ہے۔ ۱۹۷۱ء کے آغاز ہی میں......دونوں ملکوں کے تعلقات میں کشیدگی آخری انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

پاکستان کے دونوں صوبوں کے درمیان تقریباً ایک ہزار میل (۱۶۰۰ کیلومیٹر) کا فاصلہ ہے۔ علاوہ ازیں مشرقی پاکستان تین اطراف سے بھارت میں گھرا ہوا ملک ہے، چوتھی جانب خلیج بنگال ہے، جہاں بھارتی بحریہ کو غلبہ حاصل تھا اور مشرقی پاکستان کو ۲۷۰۰ کیلومیٹر طویل محاذ جنگ کا سامنا تھا۔ جنوری ۱۹۷۱ء میں ایک سازش کے تحت بھارت نے اپنے آدمیوں کے ذریعے گنگا نامی ایک طیارہ اغوا کرایا جو لاہور میں لا کر اتارا گیا۔ اس کو اغوا کرنے والے دونوں افراد بھارتی ایجنٹ تھے، مگر پاکستان میں ان کا شاندار استقبال ہوا اور انہیں پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ جہاز کے اس اغوا کا ڈرامہ رچا کر بھارت نے پاکستان کے ساتھ اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے اور پاکستان کو مشرقی پاکستان کے ساتھ فضائی اور بحری رابطے سے محروم کر دیا۔ اس طرح پاکستان کو چین کے راستے سفر کرنا پڑتا تھا، جس پر وقت اور سرمایہ دونوں زیادہ لگتے تھے اور یوں جنگ کے دوران میں مغربی پاکستان اپنے مشرقی بازو کی کوئی مؤثر عملی مدد نہ کر سکا۔

مغربی پاکستان کے حکمت عملی اور پالیسی بنانے والوں نے ہمیشہ یہ پالیسی اختیار کیے رکھی کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا۔ اس حکمت عملی کے تحت، مشرقی پاکستان کی حفاظت کے لیے کبھی کوئی مؤثر منصوبہ بندی نہ کی گئی۔ اس کا اظہار ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہوچکا تھا۔ جس کے دوران میں مشرقی پاکستان کو مکمل طور پر بھارت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ جس کا اندازہ دونوں ملکوں کو تھا، مگر افسوس کہ اس بات کا علم ہونے کے باوجود کوئی مؤثر دفاعی پالیسی نہ اپنائی گئی اور گوریلا جنگ شروع ہونے پر بھی، پاکستان کے بیرونی دوستوں اور اندرونی وسائل سے مدد نہ لی گئی اور مشرقی پاکستان کو دشمن کے لیے تر لقمہ بنا دیا گیا۔

جنگ شروع ہونے پر بھی مشرقی پاکستان میں لڑنے والی فوج اپنے محاذ پر توجہ دینے کے بجائے مغربی پاکستان کی طرف دیکھتی رہی اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہی کہ مغربی پاکستان کا بازوئے شمشیر زن بہت جلد دہلی کو فتح کر کے ان کی مشکل کو آسان بنا دے گا، مگر بعد کے حالات سے پتہ چلا کہ یہ پالیسی سازوں کی بہت بڑی حماقت تھی اور وقت آنے پر اس نام نہاد حکمت عملی کی قلعی کھل

گئی (صدیق سالک، ص۱۴۵۔۱۴۷)۔

جنگ ہمیشہ تین بازوؤں سے لڑی جاتی ہے: فضائیہ، بحریہ اور زمینی افواج ...... مشرقی پاکستان میں فضائیہ اور بحریہ ویسے ہی برائے نام تھی اور جو تھی وہ جنگ کے ابتدائی دنوں میں ہی "بے کار" ہو کر رہ گئی تھی اور اب مکمل طور پر جنگ جیتنے کی ذمہ داری زمینی افواج (Army) پر تھی...... جس کی حالت انتہائی خراب تھی، پھر نوماہ کی مسلسل گوریلا جنگ نے اسے تھکا دیا تھا اور وطن سے دوری کی بنا پر، ان کے اعضا اور جذبات کافی حد تک کمزور ہوگئے تھے۔

پاکستانی فوج کی محدود قوت اور محدود وسائل کے پیش نظر یا فوجی کمانڈروں نے یہ حکمت عملی تیار کی کہ سرحدی شہروں، خصوصاً ان شہروں کو جو حملہ آوروں کے راستے میں پڑتے تھے دفاعی قلعوں میں تبدیل کر دیا جائے اور ان میں طویل جنگ کے لیے راشن، سامان رسد اور دوسرا جنگی اور ضروری سامان جمع کر لیا جائے اور شہروں کے اردگرد مورچے کھود لیے جائیں تاکہ اوپر سے دشمن جتنی بھی ضربیں لگاتا رہے، اسے بلا نقصان سہا جائے اور بوقت ضرورت انہی قلعوں کو بنیاد بنا کر دشمن پر ضرب کاری بھی لگائی جا سکے...... چنانچہ پاکستانی فوج نے جیسور، جنیدہ، بوگرہ ، رنگ پور، جمال پور، میمن سنگھ، سلہٹ، بہراب باز، کو میلا اور چٹاگانگ کو ایسے ہی قلعوں میں بدل دیا اور ان میں ۴۵ دنوں کا راشن اور ۶۰ دنوں کا گولہ بارود جمع کر لیا گیا، لیکن دشمن کی حکمت عملی اس سے مختلف تھی۔ اس نے عام اور مقررہ راستوں کے ذریعے حملہ کرنے اور آگے بڑھنے کے بجائے غیر معروف راستوں، ندی نالوں اور ایسے راستوں کا انتخاب کیا جن کے ذریعے وہ مشرقی پاکستان کے مرکزی شہروں تک بلامزاحمت پہنچ سکتے تھے، اس لیے دشمن کے سامنے پاکستانی فوج کی طویل جنگ کی حکمت عملی ابتدائی دنوں ہی میں بے فائدہ ثابت ہوئی۔

ابتدائی دنوں میں ہی، ۶ دسمبر کو بھارتی فضائیہ نے ڈھاکہ ائیر پورٹ پر شدید حملہ کر کے اسے ناقابل استعمال بنا دیا۔ اسی طرح کو میلا، راجشاہی، جیسور اور سلہٹ میں پاکستانی بحریہ کی جو چار بڑی جنگی کشتیاں تھیں، وہ بھی، جنگ کے ابتدائی ۲۴ گھنٹوں میں بے کار کر دی گئیں (صدیق سالک: ص۱۴۲۔۱۴۵)۔ جنگ شروع ہونے پر بھارت کو روس کی طرف سے بھاری مدد ملنا شروع ہو گئی، جو مبینہ طور پر دسمبر کے مہینے تک پانچ ارب ڈالر تک پہنچ گئی، جبکہ پاکستان کے حلیف امریکہ نے مکمل طور پر مجرمانہ خاموشی اختیار کیے رکھی (Talukder ص ۱۳۶)۔

پاکستانی فوج کی کمزوری ابتدائی تین دن کی جنگ کے بعد ہی واضح ہوگئی تھی، چنانچہ ۷ دسمبر تک پاکستان فوج کے ہاتھوں سے بہت علاقے نکل چکے تھے اور کئی محاذوں پر ان کی پوزیشن کمزور ہوگئی تھی۔ ان حالات کو دیکھ کر جنرل نیازی نے فوری طور پر گورنر مشرقی پاکستان عبدالمالک کو مطلع کیا، جس پر اس نے صدر پاکستان کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا اور یہ کہا کہ وہ جنگ بندی کی کوشش کریں (صدیق سالک، ص۱۹۵۔۱۹۷)۔ صدر پاکستان کی طرف سے، گورنر مشرقی پاکستان کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ حسب موقع جو بھی فیصلہ کریں گے صدر پاکستان کو منظور ہوگا اور جنرل نیازی بھی اسی کی تعمیل کرے گا۔ چنانچہ ۹دسمبر کو مشرقی پاکستان کے گورنر عبدالمالک کی طرف سے اقوام متحدہ کے جنرل اسسٹنٹ سیکرٹری مسٹر پال مارک ہنری کے نام ایک مراسلہ ارسال کیا گیا، جس میں پانچ شرائط کے ساتھ جنگ بندی اور مشرقی پاکستان کی حکومت منتخب نمائندوں کو سونپنے کی تجویز دی گئی تھی، لیکن حکومت پاکستان نے بعدازاں اس مراسلے کے مندرجات کو تسلیم نہ کیا اور یوں جنگ بندی ہوسکی اور نہ

ہی اس مسئلے میں اقوام عالم سے مدد لی جا سکی۔ اس وقت اگر جنگ بندی ہو جاتی تو پاکستان کی پوزیشن اتنی غیر مستحکم نہ ہوتی جو بعد میں ہوئی۔ انہی دنوں اقوام متحدہ میں پاکستان کے خصوصی سفیر ذوالفقار علی بھٹو نے...... ایک یورپی ملک کی طرف سے پیش کردہ قرار داد کو پھاڑ دیا اور ایک ہزار سال تک جنگ لڑنے کا اعلان کیا۔ ان احمقانہ اقدامات کی بنا پر بھارتی فوج اپنے مطلوبہ اہداف حاصل کرتی رہی۔ بالآخر ۱۵۔دسمبر کو جب بھارتی چھاتہ بردار فوج ڈھاکہ میں اتر گئی اور گورنر ہاؤس پر بمباری کر کے اسے کھنڈر بنا دیا گیا، تو جنگ بندی اور ذلت آمیز طریقے پر ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ کار نہ رہا۔

اسی دن گورنر، ان کی کابینہ کے وزرا اور سرکاری ملازمین ڈھاکہ میں واقع ہوٹل "انٹر کانٹی نینٹل" میں منتقل ہوگئے...... جسے بین الاقوامی ریڈ کراس نے "غیر جانب دار" علاقہ قرار دے رکھا تھا۔ ہوٹل میں جگہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے بین الاقوامی ریڈ کراس کو یہ یقین دلایا تھا کہ ان کا متحارب گروہوں سے کوئی تعلق نہیں (صدیق سالک، ص ۲۰۵۔۲۰۶)۔ یہ خطرناک حالات دیکھ کر جنرل نیازی نے ۱۵ دسمبر کو مشرقی پاکستان میں امریکی سفیر مسٹر سپیوک (Spivack) کے ذریعے بھارتی کمانڈر انچیف کو ایک پیغام بھجوایا: جس میں اس سے پاکستانی مسلح افواج، پاکستان کے وفادار شہریوں، بیماروں اور زخمیوں کے ملتی باہنی کی انتقامی کارروائیوں سے تحفظ کی درخواست کی گئی تھی۔ ۱۵۔دسمبر کو جنرل مانک شا نے یہ درخواست قبول کر لی۔ دونوں جرنیلوں نے یہ بھی طے کیا کہ جنگ بندی کی تفصیلات طے کرنے کے لیے ۱۵ دسمبر کی شام کو پانچ بجے سے لے کر اگلے دن ۹ بجے صبح تک عارضی جنگ بندی کی جائے گی۔ اس قرار داد کے مطابق علاقے میں بھارتی کمان دار اعلیٰ مسٹر جگجیت سنگھ اروڑہ ۱۶۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ کے ائیر پورٹ پر اترا تو جنرل نیازی نے اسے سلیوٹ کیا جو فوجی اصطلاح میں دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور اپنی شکست تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔ یہاں سے دونوں جرنیل رمنا ریس گراؤنڈ گئے، جہاں لاکھوں بنگالی عوام یہ منظر دیکھنے کے لیے جمع تھے۔ یہاں پاکستان کی مشرقی کمان کے کمانڈر انچیف جنرل امیر عبداللہ نیازی نے رسمی طور پر جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کیے۔ یوں مشرقی پاکستان کی جگہ "بنگلہ دیش" نے جنم لیا۔

لیکن چونکہ ابھی تک ڈھاکہ میں پاکستانی افسروں اور جوانوں سے ہتھیار ڈلوانے کے لیے بھارتی فوج کی نفری کافی تعداد میں موجود نہ تھی، اس لیے افسروں اور نوجوانوں سے ہتھیار نہ رکھوائے گئے۔ یہ تقریب ۱۹ دسمبر کو ڈھاکہ چھاؤنی کے "گاف کورس" گراؤنڈ میں ہوئی، جہاں باقی فوجی افسروں اور جوانوں نے اپنے ہتھیار بھارتی فوج کے حوالے کیے (کتاب مذکور، ص۲۱۰۔۲۱۱)۔ اس موقع پر ہتھیار ڈالنے والے پاکستانی فوجیوں کی تعداد ۹۳۰۰۰/۔ ہزار تھی، جن میں کچھ باقاعدہ فوجی اور کچھ ان کے ماتحت کام کرنے والے لوگ تھے (Talukder ص ۱۲۷)۔ لطف کی بات یہ ہے کہ پرانی حکمت عملی کے مطابق، مغربی پاکستان کا محاذ محض اکا دکا جھڑپوں کے سوا مکمل طور پر خاموش رہا اور پاکستانی قوم ۱۶۔دسمبر تک، ان حقیقی حالات سے مکمل طور بے خبر رہی۔

دونوں جرنیلوں نے اس موقع پر جس دستاویز پر دستخط کیے، اس کی عبارت یہ ہے:

پاکستان کی مشرقی کمان اس بات پر رضا مند ہے کہ بنگلہ دیش میں خودکو مشرقی میدان جنگ میں بھارتی اور بنگلہ دیش افواج کے جنرل آفسر کمانڈنگ انچیف جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے حوالے کر دے۔ اس حوالگی میں پاکستان کی تمام بری، بحری اور ہوائی فوجیں اور تمام پیرا

ملٹری فورسز اور سول آرمڈ فورسز شامل ہیں۔ یہ تمام فوج اس وقت جہاں موجود ہے، وہاں قریب ترین علاقے میں موجود لیفٹیننٹ جنرل اروڑا کے زیر کمان باقاعدہ دستوں کے سامنے ہتھیار ڈالیں گی اور خود کو ان کے حوالے کر دیں گی...... عدول حکمی کو حوالگی کی شرائط کی خلاف ورزی تصور کیا جائے گی اور اس صورت میں اس سے جنگ کے مسلمہ قوانین اور دستور کے مطابق نپٹا جائے گا۔ اگر حوالگی کی شرائط کی تشریح اور مفہوم کے بارے میں کوئی شک پیدا ہو تو لیفٹیننٹ جگجیت سنگھ اروڑہ کا فیصلہ حتمی ہوگا۔

لیفٹیننٹ جنرل اروڑہ باضابطہ یقین دہانی کراتا ہے کہ خود کو حوالے کرنے والے افراد کے ساتھ اسی عزت و وقار سے برتاؤ کیا جائے گا جو جنیوا کنونشن کے اصولوں کے مطابق سپاہیوں کا استحقاق ہے اور خود کو حوالے کرنے والی پاکستان کی تمام ملٹری اور پیرا ملٹری فورسز کے تحفظ اور خیروعافیت کی ضمانت دیتا ہے (۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء؛ دیکھیے محمد حنیف شاہد: مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش، ص۱۴۴)۔

یہاں یہ سوال ہمیشہ ذہنوں میں ابھرتا رہے گا کہ وافر فوجی سازوسامان کی موجودگی اور اتنی بڑی فوج (ترانوے ہزار افراد) کی موجودگی میں وہ کون سے حالات تھے جن کی بنا پر جنرل نیازی نے اتنی عجلت میں ہتھیار پھینک دیئے اور کسی باعزت نتیجے کے بغیر جنگ ختم کر دی۔ اس بارے میں متضاد بیانات ملتے ہیں۔

حکومت پاکستان نے بعدازاں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے مسئلے پر جسٹس حمود الرحمٰن کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن نے جنرل محمد یحییٰ خان سمیت مشرقی پاکستان میں لڑنے والی پاکستانی فوج کے کئی افسروں بشمول جنرل اے کے نیازی اور جنرل عبدالحمید......وغیرہ پر شکست کی ذمہ داری عائد کی اور ان کے کورٹ مارشل کی سفارش کی۔ (مشرقی پاکستان میں موجود فوجی افسروں کے کردار اور رویوں کے متعلق دیکھیے: پاکستان در تکملہ، بذیل مادہ۔

پاکستانی افواج کی طرف سے ہتھیار ڈالنے کے بعد، اگرچہ عملاً جنگ ختم ہو گئی تھی، لیکن پاکستانیوں اور غیر بنگالیوں کا قتل عام، لوٹ مار اور لاقانونیت کا سلسلہ مہینوں بلکہ برسوں تک جاری رہا، بھارتی فوج اپنی جگہ، مصروف عمل تھی اور مکتی باھنی، مجیب باھنی، قدیر باھنی عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنی جگہ مصروف کار تھے۔ دسمبر کے آخری عشرے میں بنگلہ دیش کے سیکڑوں علما، سیاسی زعما، صحافی اور ہزاروں بہاری اور غیر بنگالی افراد قتل و خونریزی کا شکار ہوے، ہزاروں لوگوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں اس انداز سے کی گئیں کہ اس کے سامنے نازیوں کے مظالم بھی ماند پڑ گئے (دیکھیے ڈاکٹر ایم اے صوفی: بنگلہ دیش، میرا بنگلہ دیش، ص۲۴۳ تا ۲۴۷؛ نیز حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ، جلد اول، دوم)۔ دوسری طرف بنگلہ دیش بنتے ہی (۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء) پاکستان کے خود ساختہ صدر یحییٰ خان نے فوری طور پر استعفیٰ دے دیا اور اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کر دیا۔ جب کہ پاکستانی عوام یہ سن کر سکتے میں آگئے اور ملک کے سنجیدہ حلقے اس واقعے پر کئی برس گذر جانے کے باوجود ابھی تک پریشان ہیں اور ہر سال ۱۶۔دسمبر کو مختلف کانفرنسوں اور اخبارات اور رسائل و جرائد کے مضامین کے ذریعے اس واقعے پر اپنا ردّعمل ظاہر کرتے ہیں۔

پاکستان کے نئے صدر مملکت جناب ذوالفقار علی بھٹو جو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھے، جلد از جلد شیخ مجیب الرحمان کو "بنگلہ دیش" بھیج کر اور اسے تسلیم کر کے...... اس المیے کا آخری باب لکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ کو (بنگلہ دیش بننے کے صرف پانچ دنوں کے بعد) شیخ مجیب الرحمان کو، جیل سے نکال کر ایک بنگلے

میں نظر بند کر دیا اور اس سے باقاعدہ ملاقات کی۔ اسے بہت جلد رہائی کا مژدہ سنایا۔ چنانچہ ۳ جنوری ۱۹۷۲ء کو انہوں نے کراچی کے نشتر پارک میں، ایک بہت بڑے جلسۂ عام سے خطاب کے دوران میں پہلے حاضرین سے شیخ مجیب الرحمان کی رہائی کی منظوری لی اور پھر وہیں ان کی رہائی کا اعلان کر دیا۔ اس جلسے میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ تاریخ یہ فیصلہ کرے گی کہ قصور کس کا تھا، اس لیے کہ کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ یحییٰ سے غلطی ہوئی، کچھ مجیب الرحمان کا اور کچھ میرا نام لیں گے (سعید الدین: مشرقی پاکستان کا زوال، ص۱۰۴)۔ بعد کے حالات سے واضح ہوتا ہے کہ پاکستان کی طرف سے شیخ مجیب الرحمٰن کی غیر مشروط واپسی کا فیصلہ مناسب اور موزوں نہ تھا، اس لیے کہ وہ شیخ مجیب الرحمان کی رہائی کے بدلے اپنے ۹۳ ہزار فوجیوں کو رہا کرا سکتے تھے، مگر انہوں نے شیخ مجیب الرحمان کو غیر مشروط طور پر رہا کر کے یہ موقع گنوا دیا۔ جب کہ سیاسی اور سفارتی ماہرین کا خیال ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی موجودگی میں پاکستان بھارت اور بنگلہ دیش کے ساتھ بہتر سودے بازی کی پوزیشن میں تھا۔

بہرحال ۸ جنوری ۱۹۷۲ء کو شیخ مجیب الرحمان کو صبح کے تین بجے پی آئی اے کے ایک خصوصی طیارے سے راولپنڈی سے لندن بھیج دیا گیا۔ ہوائی اڈے پر صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو اور پنجاب کے گورنر مصطفیٰ کھر نے اسے الوداع کہا۔ لندن میں شیخ مجیب الرحمٰن نے دو روزہ قیام کے دوران میں برطانیہ سمیت مختلف ممالک کے اعلیٰ عہدیداروں سے ملاقاتیں کی، آرام کیا اور ۱۰ جنوری کو ایک سربراہ مملکت کے طور پر، برطانیہ کے ایک خصوصی طیارے کے ذریعے لندن سے نئی دہلی پہنچ گیا۔ جہاں اس نے مسز اندرا گاندھی اور صدر بھارت کا ان کی اور بنگلہ دیش کی امداد پر شکریہ ادا کیا۔ یہاں اس نے ایک عوامی جلسے سے بھی خطاب کیا اور حسب معمول پاکستان اور پاکستانی فوج پر شدید الزامات عاید کیے اور آخر میں جئے بنگلہ اور جئے ہند کے نعرے لگائے...... شیخ مجیب الرحمٰن اسی دن دوپہر کے وقت وہاں سے بنگلہ دیش روانہ ہوا، جہاں ڈھاکہ ائیر پورٹ پر، اُس کا تاریخی استقبال ہوا۔ ایک رپورٹ کے مطابق اُس کا استقبال کرنے والوں کی تعداد ۲۰ لاکھ کے قریب تھی (سعید الدین، ص۱۱۰)۔ شیخ مجیب الرحمان نے ڈھاکہ کے تاریخی ریس کورس گراؤنڈ میں جلسہ عام سے خطاب کیا جس میں اُس نے اپنی اور ذوالفقار علی بھٹو کی ملاقات کا ذکر کیا اور اعلان کیا کہ مغربی پاکستان کے ساتھ تعلقات کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا ہے۔ اُس نے عوام سے اپیل کی کہ لاقانونیت اور لوٹ مار کی تمام کارروائیاں بند کر دیں۔ اُس نے آبدیدہ لہجے میں پاکستانی افواج کے مظالم کا ذکر کیا اور کہا کہ اُس نے بنگلہ دیشی عوام پر بے پناہ مظالم ڈھائے ہیں۔ اُس نے بقول اُس کے جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کو زبردست الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا اور ان کے لیے دعا کی (کتاب مذکور، ص۱۱۱۔۱۱۲)۔

(د) شیخ مجیب الرحمان کا دور حکومت (۱۲۔ جنوری ۱۹۷۲ء تا ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء):

شیخ مجیب الرحمان کی وطن واپسی پر، "بنگلہ دیش" کی آزادی کی تکمیل ہو گئی، چنانچہ ۱۲ جنوری ۱۹۷۲ء کو ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمان نے بنگلہ دیش کے پہلے وزیراعظم کے طور پر اور ابوسید چوہدری نے صدر مملکت کے طور پر حلف اٹھایا، جب کہ نذر الاسلام اور تاج الدین احمد کی حکومت نے اس سے پہلے استعفیٰ دے دیا تھا۔ بنگلہ دیش کابینہ کا قیام ایک عبوری آئینی حکم کے طور پر وجود میں آیا، جس کے تحت ملک میں پارلیمانی جمہوریت قائم کی

گئی تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے تاج الدین احمد کی کابینہ کے تمام وزرا کو اپنی نئی کابینہ میں شامل کرلیا...... جن کے نام یہ تھے: شیخ مجیب الرحمان (وزیر اعظم)، سید نذرالاسلام، تاج الدین احمد، کمال حسین، مقصود علی، مشتاق احمد خوندکر، عبدالصمد آزاد، اے ایس قمر الزمان، عبدالعزیز شیخ، یوسف علی، ظہور احمد چوہدری اور مجمدار۔ شیخ مجیب الرحمٰن سے گورنر ہاؤس کے ایک کمرے میں بنگلہ دیش کے پہلے چیف جسٹس نے وزیراعظم کے طور پر حلف لیا (سعید الدین، ص ۱۱۲).

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد اب محض ایک کسر رہ گئی تھی کہ اسے تسلیم بھی کر لیا جائے...... اس سلسلے میں وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے اگرچہ کئی جلسوں میں یہ کوشش کی کہ وہ عوام کی زبان سے یہ کہلوا سکیں کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا جائے، مگر عوام نے ہمیشہ اس کے خلاف ووٹ دیا، اسی بنا پر اس کام کی تکمیل کے لیے پاکستان کے وزیراعظم نے ایک مشکل راستہ اختیار کیا.

انہوں نے ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء کو لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس طلب کی، جس میں تیس کے قریب ممالک نے شرکت کرنا تھی۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو اس موقع کو، بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے او آئی سی کے سیکرٹری جنرل مسٹر حسن التہامی اور کویت کے وزیرخارجہ مسٹر شیخ الاحمد الجابر پر مشتمل وفد کو بنگلہ دیش بھیجا اور شیخ مجیب الرحمٰن کو اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی، مگر شیخ مجیب الرحمان نے اس وقت تک اس کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا جب تک پاکستان ان کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتا۔ چنانچہ وزیراعظم بھٹو نے ۲۳ فروری کو پاکستان ٹی وی کے ایک سٹوڈیو میں صوبائی گورنروں ، وزرا، اسمبلی کے اراکین اور پارٹی کے اراکین سے خطاب کیا اور اعلان کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کا نام لے کر حکومت پاکستان کی طرف سے اعلان کرتا ہوں کہ آج سے ہم بنگلہ دیش کو تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کل ان کا وفد یہاں آئے گا اور ہم ان کا استقبال کریں گے (سعید الدین ، ص۱۱۸۔۱۱۹)۔ اس طرح بھٹو نے اسلامی کانفرنس میں بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے پاکستان کی تقسیم پر مہر تصدیق ثبت کر دی (پاکستان کے جنگی قیدیوں کی واپسی وغیرہ امور کے متعلق دیکھیے پاکستان، در تکملہ ا و م ا، بذیل مادہ).

شیخ مجیب الرحمان دور کے اہم واقعات:

(الف) شیخ مجیب الرحمان نے بنگلہ دیش کے صدر کے طور پر، ایک آئینی عبوری ڈھانچے کی منظوری دی جس کے مطابق ، انہوں نے ۱۲ جنوری کو بنگلہ دیش کے وزیر اعظم کے طور پر حلف اٹھا لیا اور ۲۳ رکنی کابینہ تشکیل دی،جس میں جلا وطن حکومت کے پانچوں ارکان بھی شامل تھے.

۲۳۔ مارچ ۱۹۷۲ء کو جاری شدہ صدارتی حکم نامہ نمبر ۲۲، کی رو سے ۱۹۷۰ء میں ہونے والے انتخابات میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے منتخب ہونے والے اراکین پر مشتمل ایک قانون ساز اسمبلی کا قیام عمل میں لایا گیا...... بنگلہ دیش کی اس پہلی مقننہ نے محض سات ماہ میں آزاد بنگلہ دیش کا ''آئین مرتب کرلیا (دیکھیے A.f :Constitution making Bangladesh، در Pacefic affairs ، ۴۶/۱، ۱۹۷۹ء، ص۵۹۔۷۶).

بنگلہ دیش کے اس آئین کی اساس مجیب ازم یعنی سوشلزم، جمہوریت، قوم پرستی اور لادینیت پر رکھی گئی۔ آئین کے دوسرے حصے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ عوام کو خوراک ، لباس ،مکان ، تعلیم، علاج و معالجہ، ملازمت

اور معاشی تحفظ مہیا کرنا ریاست کی ذمہ داری ہوگی اور یہ کہ پارلیمنٹ کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکے گی جو آئین کے تیسرے حصے میں درج بنیادی حقوق سے متصادم ہو؛ آئین کے دوسرے حصے میں ریاست کی پالیسی کے متعلق اور تیسرے حصے میں بنیادی حقوق کی تفصیل دی گئی تھی.

بنگلہ دیش کا یہ آئین ۱۶ دسمبر ۱۹۷۲ء کو نافذ ہوا اور ۷ مارچ کو نئے آئین کے تحت انتخابات کرائے گئے، جن میں عوامی لیگ نے بھرپور کامیابی حاصل کی، اس جماعت نے پارلیمنٹ کی ۳۰۰ سیٹوں میں سے ۲۹۲ پر، کامیابی حاصل کی۔ باقی نشستوں میں سے ایک پر نیپ (بھاشانی گروپ) نے اور چھ آزاد امیدواروں نے کامیابی حاصل کی ایک سیٹ پر فیصلہ نہ ہوسکا۔ اس طرح یہ انتخابات مکمل طور پر یک طرفہ ثابت ہوے اور بنگلہ دیش بننے کے بعد......ان پہلے انتخابات میں شیخ مجیب الرحمان نے عوام کا بہت بھاری اعتماد حاصل کیا تھا (Talukder، ص۱۵۵۔۱۵۶).

عوامی لیگ کے منشور میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ انتخابات آئین کے چار بنیادی اصولوں قوم پرستی، سوشلزم، جمہوریت اور سیکولرازم" کے متعلق عوامی ریفرنڈم ہوں گے اور یہ انتخابات شیخ مجیب الرحمان کو، ان چاروں اصولوں کی روشنی میں بنگلہ دیش کی تعمیر نو کے متعلق بھرپور عوامی طاقت (Mandate) فراہم کریں گے۔ ان انتخابات میں اگرچہ مجیب الرحمان کی جماعت نے واضح کامیابی حاصل کی تھی تاہم بعض علاقوں میں تشدد کے واقعات بھی پیش آئے تھے، مثلاً بعض حلقوں میں مخالف امیدواروں کو کاغذات نامزدگی داخل کرنے سے پہلے اغوا کر لیا گیا۔ بعض حلقوں خصوصاً باریسال، تنگیل اور چٹاگانگ میں مخالف امیدوار جیت رہے تھے، مگر ان کے بیلٹ بکسوں کو اٹھا لیا گیا اور انہیں عوامی لیگ کے حامی امیدواروں کے ووٹوں سے بھر دیا گیا۔ بعدازاں عوامی لیگ کے امیدواروں کی کامیابی کا اعلان کر دیا گیا (Talukder، ص۱۵۷)۔ نئے انتخابات سے ملک میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی، تقریباً چھیاسٹھ فیصد ارکان وہی تھے، جو سابقہ قانون ساز اسمبلی کے رکن رہ چکے تھے۔ کابینہ میں محض ایک وزیر کا اضافہ کیا گیا اور ایک وزیر کا شعبہ تبدیل کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں مزید چار وزرائے مملکت کا اضافہ کیا گیا...... اور جسٹس ابوسید چوہدری کو دوبارہ صدر منتخب کیا گیا.

عوامی لیگ نے ابتدائی دو سالوں میں بہت سی کامیابیوں کے دعوے کیے جس کے مطابق نوماہ کی ریکارڈ مدت میں آئین سازی کرنا، چھ ماہ کے اندر نئے انتخابات کروانا، جنگ سے متاثر ہونے والے ۳۰۰ ریلوے اور ۲۷۴ سڑکوں کے پلوں کی تعمیر اور دس لاکھ بنگلہ دیشی مہاجرین کی واپسی اور اپنے اپنے علاقوں میں ان کی آباد کاری، چٹاگانگ کی گودی کی گیارہ روسی ماہرین حرب کی مدد کے ساتھ، بموں اور گڑھوں کی صفائی وغیرہ شامل تھے (کتاب مذکور، ۱۵۷)، اس سے ملکی اقتصادی حالات میں کافی بہتری آگئی تھی.

(۲) شیخ مجیب الرحمان کی مخالفت:

تاہم ابتدائی دو سالوں میں، مملکت میں جو بہتری آئی تھی، وہ بہت جلد ختم ہوگئی اور ریاست دوبارہ معاشی بحران کی طرف بڑھنے لگی...... اس کی بڑی وجہ شیخ مجیب الرحمٰن اور اس کے من پسند لوگوں کی سرکاری محکموں میں بڑھتی ہوئی سیاسی مداخلت تھی.

شیخ مجیب الرحمان جب عوامی لیگ کی حکومت میں ۱۹۵۶۔۱۹۵۷ء میں وزیر صنعت و تجارت بنے تھے، ان کا اس وقت کے وزیر اعلیٰ مسٹر عطاء الرحمان سے اس بات

پر اختلاف رہا کہ شیخ مجیب سرکاری محکموں کو عوامی لیگ کے کارکنوں کے تابع رکھنے کے قائل تھے، جبکہ عطاء الرحمان اس کے مخالف تھے...... چنانچہ اپنے اس دور میں انہوں نے اپنی جماعت کے کئی کارکنوں کو سرکاری عہدے اور بنکوں کے قرضے دلوائے تھے.

اب جب تمام اقتدار عوامی لیگ اور شیخ مجیب الرحمان کے پاس آ گیا، تو انہوں نے اپنی جماعت کے کارکنوں اور عہدیداروں کو سرکاری محکموں سے مختلف مراعات دلوانے کا سلسلہ شروع کر دیا...... شیخ مجیب الرحمان کی حکومت مختلف صنعتوں اور مالیاتی اداروں کو قومیانے کی قائل تھی، اس لیے حکومت سنبھالتے ہی انہوں نے مختلف قسم کی صنعتوں، بنکوں، فضائی کمپنیوں اور بحری جہازوں کی صنعت کو سرکاری تحویل میں لے لیا اور ایسی قومیائی گئی تمام صنعتوں میں عوامی لیگ کے کارکنوں اور عہدیداروں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا۔ جو اپنی حیثیتوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سپئیر پارٹس اور خام مال کو انڈیا سمگل کر کے راتوں رات امیر بن گئے۔ پھر مقامی اور درآمد شدہ اشیا کی فروخت حکومتی اجازت ناموں (Liscences) کے ذریعے کی جانے لگی۔ یہ لائسنس بھی پیشہ ور تاجروں کے بجائے عوامی لیگ کے کارکنوں کو جاری کیے جاتے تھے۔ اسی طرح درآمد و برآمد کے اجازت نامے بھی عوامی لیگ کے ارکان کو دیئے گئے، پھر غیر بنگالیوں کی نقل مکانی سے جو ساٹھ ہزار کے قریب مکانات خالی ہوئے تھے، وہ بھی عوامی لیگ کے عہدیداروں کے قبضے میں دے دیئے گئے تھے۔ مزید براں چاول اور پٹ سن اور باہر سے آنے والا بحالی کا سامان بڑی مقدار میں، بھارت کو سمگل ہوتا رہا۔ جس میں عوامی لیگ کے کارکن یا ان کے حمایت یافتہ لوگ ملوث تھے۔ اس کے نتیجے میں ، بہت جلد ''نو دولتیوں'' کی ایک کھیپ تیار ہو گئی۔ جو ملک کو بنانے اور سنوارنے کے بجائے اس کا سرمایہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے، چنانچہ بھاشانی گروپ نے اپنے ایک انتخابی اشتہار میں عوامی لیگ کو لٹیروں کی ایک جماعت قرار دیتے ہوئے الزام لگایا کہ پاکستان کے بائیس خاندانوں کے مقابلے میں عوامی لیگ کے دو ہزار (۲۰۰۰) خاندان پیدا ہو گئے ہیں۔ جو کسی بھی سوشلسٹ ریاست کی قیادت کے لیے اہل نہیں ہو سکتے۔ بہت جلد شیخ مجیب کے قریبی دوستوں اور رشتہ داروں کی لوٹ مار اور سمگلنگ کے قصے عام ہونے لگے، شیخ صاحب کا ایک بہت زیادہ معتمد غازی غلام مصطفیٰ ریڈ کراس اور اقوام متحدہ کی طرف سے مہاجرین کی بحالی کے لیے ارسال کردہ سامان کو خورد برد کرنے کے لیے بین الاقوامی سطح پر ملزم گردانا گیا۔ شیخ مجیب الرحمان کا ایک بھائی شیخ ابو نصر پٹ سن کی ہندوستان کو غیر قانونی تجارت کا سب سے بڑا سرغنہ تھا۔ اس کے دو بھانجے شیخ فضل حق مونی (جو شیخ مونی کے نام سے معروف تھا)، ابو الحسنات اور شیخ شاہد الاسلام، وغیرہ نے نہ صرف سیاسی طور پر بہت ترقی کی، بلکہ چند ہی دنوں میں غیر قانونی طریقے سے، بہت سی دولت جمع کر لی۔ شیخ مجیب الرحمان کا سب سے بڑا بیٹا بھی، ماورائے قانون اقدامات کے سلسلے میں بہت بدنام تھا۔ معروف اقتصادی مجلے Eastern Economic Review کے اگست ۱۹۷۴ء کے شمارے میں ایک مقالہ نگار Lawrence lifshultz، کے مطابق بنگلہ دیش میں بدعنوانی تاریخی طور پر چین کی ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ کے دور کی آئینہ دار تھی (دیکھیے، ص۵۱)۔ اس لوٹ مار سے عوامی لیگ کی مقبولیت بہت متاثر ہوئی اور لوگ یہ سوچنے لگے کہ کیا ہم نے عوامی لیگ اور شیخ مجیب الرحمان کے چند ساتھیوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے قربانیاں دی تھیں۔ بنیادی طور پر بنگلہ

دیش کی اقتصادیات زراعت پر مبنی ہے، مگر وہ یہ بوجھ برداشت کرنے کے اہل نہیں تھی۔ بین الاقوامی برادری بنگلہ دیش سے بے حد ہمدردی رکھتی تھی، اسی لیے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۳ء تک بنگلہ دیش کو ۳۷ کروڑ تیس لاکھ ڈالر بطور قرض اور بطور امداد دیئے گئے۔ پھر جب دسمبر ۱۹۷۳ء کو اقوام متحدہ کی طرف سے ملنے والی بحالی کی امداد کا اختتام پذیر ہوا تو بنگلہ دیش کی معیشت میں بحران کے پہلو نمایاں ہونے لگے، جس کی متعدد وجوہ میں سے اہم ترین وجہ بنگلہ دیش کی اہم ترین صنعتوں میں عوامی لیگ کے ایسے کارکنوں کی تقرری تھی جو انتظامی اور فنی تجربہ بالکل نہ رکھتے تھے، اس لیے صنعتی پیداوار صرف ۹ فیصد رہ گئی۔ اسی طرح پٹ سن اور چاولوں کی بھارت کو غیر قانونی تجارت کی بنا پر وہاں کی فیکٹریوں کی پیداوار مجموعی پیداوار کا اٹھارہ فیصد رہ گئی، حالانکہ ۱۹۷۱ء سے قبل وہ یہاں کی ۵۸ فیصد اقتصادی ضروریات پوری کرتی تھی (Talukder، ص۱۶۱).

ان حالات نے ملک کو بہت بڑی تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کیا۔ اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں کئی گنا اضافے کے ساتھ، افراط زر کی شرح تین سو فیصد یا اس سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ ۱۹۷۳ء کے آخر میں اقوام متحدہ کے امداد دینے والے ادارے برائے بنگلہ دیش" (UNROB) کا کام بند ہو جانے پر غیر ملکی امداد بند ہوگئی اور حکومت کے اخراجات اور محاصل سے حاصل ہونے والی آمدن میں، بہت زیادہ فرق پیدا ہوگیا، حتیٰ کہ جون ۱۹۷۴ء کے ترقیاتی منصوبوں پر عمل درآمد ناممکن ہوگیا، جس کی وجہ ملکی اقتصادیات کی تباہی تھی (کتاب مذکور، ص۱۶۲، نیز Holiday، جون ۱۹۷۴ء)۔ ان حالات میں جولائی۔ اگست ۱۹۷۴ء میں ملکی تاریخ کے سب سے زیادہ تباہ کن سیلاب نے صورت حال کو اور زیادہ خراب کر دیا۔ ایک عام اندازے کے مطابق ہزاروں افراد کے جانی نقصان کے علاوہ، دس لاکھ ٹن پٹ سن، جس کی مالیت ایک کروڑ ڈالر سے ڈیڑھ کروڑ ڈالر تک تھی، سیلاب کی نذر ہوگئی اور پھر سیلاب کے دوران میں اشیائے ضرورت کی قیمتیں ۱۹۶۹-۱۹۷۰ء کے مقابلے میں سات سو سے آٹھ سو فیصد تک بڑھ گئیں۔ سرکاری اعدادو شمار کے مطابق نومبر ۱۹۷۴ء تک ۲۷۵۰۰/- افراد بھوک کی بنا پر موت کا شکار ہو چکے تھے، جبکہ غیر سرکاری اعدادو شمار مطابق ایک لاکھ کے قریب افراد لقمۂ اجل بنے تھے (Talukder، ص۱۶۲).

(ج) بھارتی توسیع پسندی کے اثرات: ابتدائی دنوں میں شیخ مجیب الرحمان بنگلہ دیش کو ایشیا کا سوئٹزر لینڈ قرار دیتے تھے۔ مگر ان پر جلد ہی یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ بنگلہ دیش تو بھارت کی محض ایک محتاج ریاست ہے۔ بھارتی فوجیں ابھی تک بنگلہ دیش میں موجود تھیں، ابتدا میں ۱۲ مارچ ۱۹۷۲ء تک شیخ مجیب الرحمان بنگلہ دیش سے تمام افواج کے انخلا کا مطالبہ کرتے تھے، مگر اسی تاریخ کو اس نے بھارت کے ساتھ ، ۲۵ سالہ دوستی، باہمی تعاون اور امن کے معاہدے پر دستخط کر دیئے، اس لیے کہ اتنی مدت کے لیے بھارت کا سوویت یونین کے ساتھ بھی ایسا ہی معاہدہ تھا...... اس طرح شیخ مجیب الرحمان نے تازہ تازہ آزادی حاصل کرنے والی ایک خود مختار ریاست کو "بھارت اور روس" گٹھ جوڑ میں شامل کر دیا۔ اس طرح آزادی حاصل کرنے والی اس ریاست پر جلد ہی بھارت کی توسیع پسندی کا جذبہ غالب آ گیا۔

بھارتی تسلط کا ایک اور پہلو یہ بھی تھا کہ بھارتی فوجیں بنگلہ دیش سے جانے سے قبل محصور پاکستانی افواج کے چھوڑے ہوے اسلحے کی بہت بڑی مقدار اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ جس سے بنگلہ دیشی فوجیں، غیر مسلح

ہو گئیں۔ پھر بھارت نے بنگلہ دیش کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے دونوں کی سرحدوں کے دس دس میل کے اندر ایک دوسرے کے سامان تجارت کی خرید و فروخت کی اجازت دی گئی تھی۔ اس تجارت کا فائدہ بھی بھارت کو ہوا۔ جس کے نتیجے میں بہت بڑی مقدار میں بنگلہ دیشی مہاجرین کی بحالی کے لیے آنے والی امدادی اشیا پٹ سن اور چاول...... بھارت کو سمگل کیے جانے لگے۔ چنانچہ عوام کے مطالبے پر یہ معاہدہ ایک سال کے بعد ختم کر دیا گیا...... دونوں میں تجارت کے معاہدے کے تحت جن جن اشیا کی تجارت کی تجاویز شامل ہوتیں، بھارت اس کو دانستہ پورا نہ کرتا اور بنگلہ دیش، مقررہ حد سے زیادہ کی تجارت کرتا، اس سے بنگلہ دیش کی صنعت تباہ ہو گئی۔

شیخ مجیب الرحمان کی طرف سے بنگلہ دیش کو بھارت کی ایک ماتحت ریاست بنانے کے ساتھ ساتھ، اس نے ایک نئی فوج تشکیل دی،جس کا نام ''جیتو راکھی باھنی (قومی سلامتی فورس= JRB) رکھا۔ اس کے کرتا دھرتا شیخ صاحب کے بھانجے شیخ مونی تھے۔ اس میں مکتی باھنی، قدیر باھنی اور شیخ مجیب الرحمٰن سے وفاداری رکھنے والے لوگوں کا تقرر جانے لگا۔ جنوری ۱۹۷۵ء تک ان کی تعداد ۲۵۰۰۰ تک جا پہنچی۔ ان کی تمام تربیت بھارتی فوج کے افسران کرتے تھے اور ان کی وردی کا رنگ بھی ویسا ہی گہرا سبز تھا جیسا کہ بھارتی فوج کی وردی کا تھا۔

اس طرح جب ۱۹۷۵ء میں شیخ مجیب الرحمان نے بھارت کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرنا چاہا، تو عوام نے اسے بنگلہ دیش کو JRB کی مدد سے بھارت کے سامنے جھکانے سے تعبیر کیا۔

انھی دنوں ایک صدارتی حکم نامے کے ذریعے سول ملازمین کو، اپیل کے حق کے بغیر ملازمت سے سبکدوشی ''کا حکم نامہ جاری کیا گیا، جس سے حکومت کے تمام ملازمین اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرنے لگے۔ علاوہ ازیں اخبارات میں خفیہ قتل، اغوا برائے تاوان اور لوٹ مار کی بڑھتی ہوئی وارداتوں کی تفصیلات چھپنے لگیں اور ۱۹۷۳ء کے صرف پانچ ماہ میں ساٹھ تھانوں سے اسلحہ لوٹ لیا۔ وزیر اعظم نے سولہ دسمبر ۱۹۷۴ء کی تقریر میں عوام کو بتلایا کہ عوامی لیگ کے ۳۰۰۰ ارکان، بشمول چار ارکان پارلیمنٹ کو دہشت گردوں نے قتل کر دیا ہے (Talukder، ص ۱۷۷۔۱۷۸)۔

ان حالات نے مل کر بہت جلد عوامی لیگ کے غبارے سے ہوا نکال دی اور عوامی لیگ کے سوا تمام جماعتیں ، حکومت کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئیں ...... آئے دن جلسے اور جلوس نکلنے لگے اور عوام میں شیخ مجیب الرحمان سمیت عوامی لیگ کے لیڈروں پر کھلم کھلا تنقید ہونے لگی، (کتاب مذکور، ۱۶۲۔۱۶۴)۔ شیخ مجیب الرحمان کی بڑھتی ہوئی بھارت نوازی اور روس اور امریکہ کے بڑھتے ہوئے اثرات نے بھی عوام کو سڑکوں پر آنے پر مجبور کیا۔

(د) شیخ مجیب الرحمان کا دوسرا انقلاب: ملک میں حکومت کے خلاف بڑھتی ہوئی بے چینی اور عوامی لیگ کے نمائندوں پر بڑھتی ہوئی تنقید سے گھبرا کر، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۴ء کو حکومت نے کچھ عرصہ کے لیے ایمرجنسی نافذ کر دی اور عوام کے تمام بنیادی حقوق معطل کر دیئے۔ ۱۹۷۵ء کے اوائل میں سرکاری طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ سربو ہارا پارٹی کے قائد سراج سِک در کو گرفتار کر لیا گیا ہے، مگر اس نے جب فرار ہونے کی کوشش کی تو وہ پولیس کی گولی سے ہلاک ہوگیا۔ اس سے ایمرجنسی کے نفاذ کے باوجود، حکومت کو بائیں بازو کے لوگوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا خطرہ محسوس ہونے لگا (کتاب مذکور، The Europa world year Book 2005، ص

۱۷۸-۱۷۹، ا ر ۲۰۳).

ان حالات نے شیخ مجیب الرحمان کو ملک میں ایک جماعتی نظام لانے اور صدارتی نظام قائم کرنے پر مجبور کیا۔ مزیدبراں شیخ مجیب الرحمان ذاتی طور پر، کئی سیاسی جماعتوں سے اختلاف رکھتے تھے اور وہ محض ایک پارٹی (عوامی لیگ) کے کارکنوں کی مدد سے حکومت چلانے کے قائل تھے۔ پھر عوامی لیگ کے روز بروز گھٹتے ہوئے اثرو رسوخ کی بنا پر، عوامی لیگ کے قائدین نے بھی شیخ مجیب الرحمان کو پارلیمانی نظام کی جگہ صدارتی ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے اور ملک پر اقتدار کی گرفت مضبوط کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۷۴ء سے شیخ فضل الحق مونی نے عوامی جلسوں میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ بنگلہ دیش میں پارلیمانی نظام حکومت فیل ہو گیا ہے اور دوسرا انقلاب جلد ہی آنے والا ہے۔ یہ انقلاب بھی شیخ مجیب الرحمان ہی لائیں گے۔ اسی طرح ماسکو نواز جماعتوں نے نومبر ۱۹۷۴ء سے پارلیمانی نظام حکومت کو ختم کرنے کی وکالت شروع کر دی...... یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سوویت یونین کے سفارت خانے نے بھی، شیخ مجیب کے ایک معتمد علیہ ساتھی اور وزیر منصور علی کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ایک جماعتی نظام پر مبنی حکومت قائم کی جائے۔

چنانچہ جنوری ۱۹۷۵ء میں عوامی لیگ کی پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں یہی تجویز برائے بحث پیش کی گئی...... تاہم اس تجویز کے حق میں بہت کم لوگوں نے رائے دی۔ اس پر یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ اگر پارٹی نے شیخ مجیب الرحمٰن کی یہ تجویز قبول نہ کی تو شیخ مجیب الرحمان استعفیٰ دے دیں گے۔ یا پھر وہ اپنے حمایت یافتہ ارکان پارلیمنٹ کو بلا لیں گے...... اس افواہ یا دھمکی سے پارٹی کے ارکان بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے شیخ مجیب الرحمان کو، ملکی مفاد میں، جو بھی مناسب ہو قدم اٹھانے کی اجازت دے دی (Talukder، ص۱۷۹).

بالآخر ۲۵ جنوری ۱۹۷۵ء کو آئین میں ترمیم کر دی گئی اور اسے صدارتی شکل دے کر "صدر" کو ایک پارٹی نظام حکومت تشکیل دینے اور دوسری تمام جماعتوں کی سرگرمیوں کو روکنے کی اجازت دے دی۔ یہ ترمیم بھی منظور کر لی گئی کہ شیخ مجیب الرحمان "بنگلہ بندھو" (بابائے قوم) اس ترمیم کی تاریخ سے پانچ سال تک صدر مملکت رہیں گے۔

اس سے قبل بنگلہ دیش کے چیف جسٹس سیاسی کارکنوں کی رہائی اور JRB کی غیر قانونی سرگرمیوں کو روکنے کے متعلق فیصلہ دے چکے تھے۔ انہوں نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا کہ اس فوج کی قانونی حیثیت بھی واضح نہیں ہے۔ اس پر جنوری ۱۹۷۵ء کی اہم ترمیمات میں چیف جسٹس اور پھر دوسرے ججوں کی تقرری اور ان کی معزولی کا اختیار صدر مملکت کو دے دیا گیا (Talakder، ص۱۷۹-۱۸۰)۔ ایک اور ترمیم یہ کی گئی کہ آئین میں موجود یہ شق کہ مملکت کا کوئی شہری بنیادی حقوق کے متعلق درخواست دے سکتا ہے، ختم کر دی گئی۔ اس کے بجائے آئین کے تیسرے باب میں شامل بنیادی حقوق کے بارے میں قومی اسمبلی کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ آئینی کورٹ ، ٹریبونل یا کمیشن برائے نفاذ بنیادی انسانی حقوق تشکیل دے سکتی ہے۔

۶۔جون ۱۹۷۵ء کو شیخ مجیب نے اعلان کیا کہ وہ اپنی جماعت بنگلہ دیش کرشک سرامک عوامی لیگ" BAKSAL: کے لیے ایک نیا آئین تشکیل دیں گے...... شیخ مجیب الرحمان کی طرف سے نئی سیاسی جماعت میں، دوسری سیاسی جماعتوں کو شامل ہونے کی بار بار دعوت کے باوجود روایتی جماعتوں نے اس اعلان پر کوئی توجہ نہ دی۔ صرف ماسکو نواز جماعتوں سے تعلق رکھنے والے چند سیاسی

زعما اس کی ۱۱۵ رکنی ''پارٹی کی سینٹرل کمیٹی'' میں شامل ہوے۔ اس کمیٹی میں شیخ مجیب الرحمان (چیئرمین) کے علاوہ اس کے بہت سے قریبی دوست اور ساتھی شامل تھے۔ نئی جماعت کے اراکین وہی تھے جو سابق عوامی لیگ کے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ، بہت سے اخبارات یا تو بند کر دیئے گئے یا پھر قومی تحویل میں لے لیے گئے اور ان کے کئی مدیران کو جیل بھیج دیا گیا...... ۲۱ جون ۱۹۷۵ء کو بنگلہ دیش کے انیس اضلاع کو ۶۱ ضلعوں میں تبدیل کر دیا گیا..... اور ۱۶ جولائی ۱۹۷۵ء کو شیخ مجیب الرحمان نے ان ۶۱ گورنروں کے ناموں کا اعلان کیا، جنہوں نے یکم ستمبر ۱۹۷۵ء سے، اس وقت کی ضلعی انتظامیہ کی جگہ لینا تھی..... ان میں ۴۴ گورنر عوامی لیگ کے سیاسی کارکن تھے، جن میں سے ۲۹ .....قومی اسمبلی کے موجودہ ارکان میں بھی شامل تھے (کتاب مذکور، ۱۸۱)۔ ان تمام گورنروں کو ۱۶ اگست تک خصوصی سیاسی تربیت دی گئی۔ منصوبہ یہ تھا کہ JRB کی آدھی بٹالین ہر گورنر کے ماتحت ہوگی، اور ہر گورنر براہ راست صدر مملکت کے ماتحت ہوگا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ ۱۹۸۰ء تک اس فوج کی تعداد میں ایک لاکھ تیس ہزار تک اضافہ کیا جائے گا اور ہر گورنر کو ایک ایک بٹالین فوج دے دی جائے گی۔

(ھ) فوج کی مداخلت اور شیخ مجیب الرحمان کا افسوسناک انجام:

شیخ مجیب الرحمٰن جوں جوں نئے انقلاب کی طرف بڑھ رہے تھے اور ملک پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے الٹے سیدھے اقدامات کر رہے تھے، ان کے خلاف عوام اور خواص دونوں میں نفرت اور ناراضگی پید اہو رہی تھی، بالآخر اس نفرت اور شدید ناراضگی نے انہیں اپنے انجام تک پہنچا دیا۔

شیخ صاحب اور ان کے ساتھیوں سے ایک اہم غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے نئی منصوبہ بندی کرتے ہوے بنگلہ دیش کے اہم ترین ادارے، یعنی فوج کو نظر انداز کر دیا۔ اور ان کی یہی غلطی ان کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔

فوج کی بغاوت کے بارے میں تین نظریات ہیں:
اول یہ کہ فوج میں ہمیشہ تنظیمی امور پر توجہ رہی، مثلاً کمان کی مرکزیت، چھوٹے بڑے کا لحاظ، نظم و ضبط اور قوم پرستی، وغیرہ۔ انہی باتوں نے فوج کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ شیخ مجیب الرحمان کی گرفت سے ملک کو بچائیں اور اقتدار پر قبضہ کر لیں۔

دوم سیاسی نظام کی کمزوری، اور قوم اور ملک کے محافظ ہونے کی حیثیت سے ''شاہی محافظ دستے کے سپاہی'' کے طور پر، فوج کی ذمہ داریوں کے احساس نے انہیں سیاسی نظام میں مداخلت پر مجبور کیا۔

سوم فوج کے اندر مختلف گروہوں کے باہمی اختلافات اور بد انتظامی نے فوج کو اس اقدام پر مجبور کیا (کتاب مذکور، ص۸۲)۔

۱۹۷۵ء میں بنگلہ دیش کی افواج کی تعداد ۵۵۰۰۰/۔ افراد پر مشتمل تھی، جن میں ۲۸۰۰۰ وہ تھے، جو مغربی پاکستان سے واپس آئے تھے۔ جن میں ۱۰۰ افسران بھی شامل تھے..... باقی ۲۷۰۰۰ میں سابقہ مشرقی بنگال رجمنٹ اور ۱۹۷۱ء کی جنگ آزادی لڑنے والی گوریلا فوج میں سے منتخب شدہ افراد تھے..... مغربی پاکستان سے واپس آنے والے فوجیوں کو جنگ کا تجربہ نہ ہوا تھا اور وہ بدستور مغربی پاکستانی فوج جیسے خیالات رکھتے تھے۔ اسی بنا پر ان میں سے بہت سے سینئر افسران کو یا تو پنشن دیئے بغیر گھروں کو بھیج دیا گیا تھا، یا پھر انہیں ایسے افسروں کے ماتحت لگا دیا گیا تھا جو مغربی پاکستان کی فوج میں ان کے ماتحت تھے۔ اس سے بھی فوج میں

بددلی پائی جاتی تھی.

فوج میں گروہ بندی کے باوجود کئی وجوہ کی بنا پر ''بھارت دشمنی'' مشترکہ طور پر پائی جاتی تھی...... بنگلہ دیشی فوج کا بھارتی فوج کے متعلق عام تأثر یہ تھا کہ وہ اس وقت جنگ میں داخل ہوئی جب ہم قریب قریب اپنا کام ختم کر چکے تھے۔ پھر انہیں اس بات کا بھی دکھ تھا کہ بھارتی فوج اپنے ساتھ پاکستانی فوج کا تمام اسلحہ لے گئی تھی، جو بنگلہ دیش کا حق تھا۔ فوج میں بھارت دشمنی کا یہ جذبہ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ اس سے قبل حصول آزادی کے فوراً بعد کرنل طاہر اور کرنل ضیاء الدین نے ایک بیان میں یہ کہا تھا کہ ''جلا وطن حکومت نے بنگلہ دیش کی خود مختاری کے خلاف بھارت سے ایک خفیہ معاہدہ کیا ہے اور وزیر خارجہ نے بھی اس خفیہ معاہدے کا اعتراف کیا تھا''۔ فوج کے افسروں کا یہ خیال تھا کہ شیخ مجیب الرحمان اسی معاہدے کی بنا پر بنگلہ دیشی فوج کو طاقت ور نہیں بنانا چاہتے (کتاب،مذکور،ص، ۱۸۳۔۱۸۴).

انہی حالات میں ۱۹۷۴ء میں حکومت کی طرف سے مسلح افواج کو حکم دیا گیا کہ وہ غیر قانونی اسلحہ اور غیر قانونی ملکی تجارت کا خاتمہ کرے، لیکن جب فوج نے کام شروع کیا تو اس الزام کی تصدیق ہو گئی کہ غیر قانونی اسلحہ اور ناجائز تجارت میں عوامی لیگ کے سرکردہ رہنما بشمول شیخ مجیب الرحمان کے حقیقی بھائی ملوث ہیں؛ چنانچہ فوج کو حکم دیا گیا وہ ''عوامی لیگ'' کے حمایت یافتہ لوگوں کو پریشان نہ کرے اور اپنی توجہ دوسری جماعتوں کے لوگوں تک مرکوز رکھے ۔ اس سے بھی فوج کی شیخ مجیب الرحمان سے نفرت میں اضافہ ہوا (کتاب مذکور، ص، ۱۸۳۔۱۸۷).

شیخ مجیب الرحمٰن اور اس کے خاندانی لوگوں کا قتل:
اس انقلاب کے مختصر واقعات اس طرح ہیں۔ یہ ۱۵/اگست ۱۹۷۵ء کی صبح کا واقعہ ہے، شیخ مجیب الرحمٰن کے گھر واقع دھان منڈی ڈھاکہ میں ۱۵۔اگست ۱۹۷۵ء کو شیخ مجیب الرحمٰن کی بھتیجی کی شادی کی تقریب تھی، جس میں ان کے عزیز رشتہ دار سب جمع تھے۔ کچھ رشتہ دار چلے گئے تھے۔ عبدالرب بھی، جو شیخ مجیب الرحمٰن کے بہنوئی اور خوراک، فلڈکنٹرول ، پانی ، بجلی، جنگلات، مچھلی اور لائیو سٹاک محکموں کے وزیر تھے، گھر پر موجود تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے اگلے روز ڈھاکہ یونیورسٹی میں تقریر کرنا تھی، قوم کو نیا پیغام دینا تھا۔ یہ ایک جماعتی نظام کے قیام کے متعلق ایک اہم تقریر تھی...... اسی دن فوج کے تین میجروں نے شیخ مجیب الرحمٰن کے انجام پر آخری مہر لگائی۔ ان میں سے اس منصوبے کا بنیادی کردار شیخ شفیق الرحمٰن دلم تھا۔ اس کی بیوی کی شیخ مجیب الرحمٰن کے ایک قریبی دوست نے شادی کی ایک تقریب میں بے عزتی کی تھی، جب ان دونوں میاں بیوی نے شیخ مجیب الرحمٰن سے شکایت کی تو اس نے الٹا اسے جھاڑ دیا کہ اس نے شکایت کا دستوری راستہ (proper Channel) کیوں نہیں اختیار کیا اور اسے یہ دھمکی دی کہ وہ اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرے گا۔ یہ سن کر وہ واپس چلا گیا البتہ اس نے اپنی بیوی کی بے عزتی کا بدلہ لینے کا تہیہ کر لیا.

پھر جب شیخ مجیب الرحمان کے حکم پر دلم نے ایک مالیاتی معاملے میں عوامی لیگ کے کچھ رہنماؤں کو گرفتار کیا، جن میں ایک پارلیمنٹ کا رکن بھی شامل تھا اور شیخ مجیب الرحمٰن نے پارلیمنٹ کے رکن کی رہائی کا حکم دیا تو دلم نے اس کے خلاف احتجاج کیا، جس پر شیخ مجیب الرحمان نے اکتوبر ۱۹۷۴ء میں اسے برطرف کر دیا۔ اس کے علاوہ دوسرے منصوبہ سازوں میں میجر ایس جے نور اور محمد شہریار بھی شامل تھے۔ جنہوں نے مبینہ طور پر شیخ

ابوالنصر کے بھارت کے ساتھ ناجائز تجارتی تعلقات کا کھوج لگایا تھا۔ انہیں بھی شیخ مجیب نے برطرف کر دیا تھا۔ ان تین برطرف شدہ فوجی افسران نے اپنے ہم منصب بیس سے تیس افسروں کے ہمراہ، جن کا تعلق ٹینک اور سوار فوج سے تھا اور ۱۴۰۰ جوانوں کے ساتھ مل کر،رات کے وقت یہ آپریشن مکمل کیا...... اس موقع پر مذکورہ بالا تینوں افسران کے ساتھ فوج کے دو دوسرے افسر میجر فاروق الرحمان اور میجر عبدالرشید خوندکر بھی تھے۔ جن کا تعلق ٹینک رجمنٹ سے تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے نسبتی بھائی تھے۔ جبکہ عبدالرشید خوندکر "مشتاق خوندکر" کا دور کا رشتہ دار تھا ، جو اس انقلاب کے بعد بنگلہ دیش کے صدر بنے۔ فوجی انقلاب کے اس رکن کے ساتھ مشتاق احمد کی رشتہ داری اور طاہر الدین ٹھاکر کے، جو مجیب الرحمان حکومت میں وزیر مملکت برائے اطلاعات و ذرائع ابلاغ رہ چکا تھا، ان کے ساتھ دوسری اہم شخصیت کے طور پر شامل ہونے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس انقلاب میں عوامی لیگ کا بھارت مخالف اور مغرب نواز گروہ ملوث تھا۔ جس کی قیادت مشتاق احمد خوندکر کر رہا تھا۔ تاہم مشتاق احمد کے اپنے بیان کے مطابق وہ اور طاہر الدین میں سے کوئی بھی شخص، اس انقلاب سے آگاہ نہ تھا۔ انہیں اس کی تکمیل کے بعد آگاہ کیا گیا۔

بہرحال ۱۵ اگست کو میجر نور اور اس کے ساتھیوں نے مجیب الرحمان کے گھر میں داخل ہو کر اس کے پورے خاندان کو موت کی نیند سلا دیا۔ اس وقت میجر فاروق الرحمان نے ٹینک کھڑے کر کے ائر پورٹ اور ریڈیو سٹیشن وغیرہ کے سب راستے بندکر دیئے تھے۔ آخری لمحات میں شیخ مجیب الرحمان نے ادھر ادھر فون کر کے مدد طلب کرنے کی ناکام کوشش کی۔ میجر نور اور میجر معین الدین نے شیخ مجیب الرحمان کو سیڑھیوں کے پاس بیٹھے ہوے پایا تو انہوں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ آخری وقت میں بھی پائپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ان لوگوں نے شیخ مجیب الرحمان، خاندان کے باقی لوگوں کو بھی، جن میں شیخ مونی اور عبدالرب بھی تھے اور مجیب کا ۱۰ ماہ کا پوتا اور شیخ مجیب الرحمان کے بیٹوں جمال اور کمال کی نئی نویلی دلہنیں بھی تھیں، ختم کر دیا اور یوں بنگلہ دیش کی تاریخ کا ایک سیاہ دور ختم ہوگیا (ڈاکٹر ایم اے صوفی: بنگلہ دیش ، میرا دیس ، ص۲۳۹-۲۴۰).

(ھ) فوجی انقلاب اور جنرل ضیاء الرحمٰن کا دور حکومت:

شیخ مجیب الرحمان کے خاندان کے قتل کے بعد، نوجوان فوجی افسروں نے خوندکر مشتاق احمد سے رابطہ کیا اور اسے منصب صدارت سنبھالنے کی پیش کش کی، جو اس نے قبول کر لی۔ خوندکر مشتاق احمد مغرب نوازی اور بھارت دشمنی میں بہت معروف تھا اس لیے اس کے ساتھ ہی بنگلہ دیش میں بھارت اور روس نواز حکومت کا دور بھی ختم ہو گیا۔ اس لیے نئی حکومت کو مغرب نواز حکومتوں نے تسلیم کرنے میں پہل کی۔ پاکستان پہلا ملک تھا جس نے نئی حکومت کو اس کے قیام کے پہلے ہی دن تسلیم کیا (Talukder، ص۱۸۶).

سعودی عرب، جس نے شیخ مجیب الرحمان کی حکومت کو چار سال بعد تسلیم کیا تھا، دوسرا اہم ملک تھا جس نے اس انقلاب کے دوسرے دن اسے تسلیم کیا...... اور پھر چین نے بھی جلد ہی نئی حکومت کے ساتھ تعلقات قائم کر لیے۔ بھارت نے انقلاب کے بارھویں روز ۳۹ ویں ملک کے طور پر نئی حکومت کے ساتھ تعلقات قائم کیے۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے مرتے ہی اس کے وفا داروں

نے اپنی وفاداریاں تبدیل کرنا شروع کر دیں چنانچہ اس کی کابینہ کے اٹھارہ میں سے دس وزرا نے اور نو وزرائے مملکت میں سے آٹھ نے نئی حکومت میں وزارتیں قبول کر لیں۔ شیخ مجیب الرحمان اور اس کے خاندان کے اس بہیمانہ قتل کے بعد، اس کی جماعت کے بھارت نواز لوگ سہم گئے اور انہوں نے حکومت کی مخالفت میں کوئی سرگرمی نہ دکھائی۔ یہ مقام عبرت تھا کہ وہی شیخ مجیب الرحمٰن جس کی گرفتاری پر پورا ملک سڑکوں پر نکل آتا تھا اس کے اور اس کے خاندان کے قتل پر ایک شخص بھی احتجاج کے لیے سڑکوں پر نہ نکلا (ایم اے صوفی، ص۲۳۹۔۲۴۲)۔ ملک کی اکثر جماعتوں نے نئی حکومت کو خوش آمدید کہا اور ان فوج افسروں کو خراج تحسین ادا کیا جنہوں نے ملک کو شیخ مجیب کی جابرانہ حکومت سے نجات دلائی تھی.

خوندکر مشتاق احمد نے ایک صدارتی حکم کے ذریعے ۶۱ صوبوں اور گورنروں والی اسکیم کو ختم کر کے، انیس اضلاع والے سابقہ نظام ہی کو برقرار رکھا اور آئین کا وہ حصہ جو ایک جماعتی سے متعلق تھا، منسوخ کر دیا۔ اس نے مارشل لا لگا کر سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ اس نے شیخ مجیب الرحمان کے ۶ وزرا، ۱۰ ممبران قومی اسمبلی (بشمول تاج الدین احمد)، ۴ سول ملازمین اور بارہ تاجروں کو مارشل لا آرڈیننس کے تحت گرفتار کر لیا...... ۳ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو صدر نے پارلیمانی نظام حکومت دوبارہ بحال کر دیا اور اعلان کیا کہ ۱۵۔ اگست ۱۹۷۶ء سے سیاسی جماعتوں سے پابندی ختم کر دی جائے گی اور عام انتخابات ۲۶ فروری ۱۹۷۷ کو ہوں گے (Talukder، ص۱۸۷).

مگر جلد ہی فوج کے جونیئر اور سینئر افسران فوج کے مابین ٹھن گئی...... میجر کے عہدے پر فائز افسران ٹینکوں کے ساتھ صدارتی محل بھانگ بھون آگئے اور انہوں نے اعلیٰ کمان کا حکم ماننے سے انکار کر دیا...... انہی دنوں میجر جنرل شفیع اللہ، سابق کمانڈر انچیف کی جگہ، میجر جنرل ضیاء الرحمان نے کمانڈر انچیف کا عہدہ سنبھالا تھا، مگر جونیئر افسروں نے اس کا حکم ماننے اور ٹینک واپس لے جانے سے انکار کر دیا۔ اس دوران میں ۳۔نومبر ۱۹۷۵ء کو خالد مشرف کی قیادت میں، ایک نیا باغی گروہ وجود میں آ گیا۔ اس فوجی گروہ کے قائد خالد مشرف نے خوندکر مشتاق احمد کے ساتھ طویل مذاکرات کیے اور اس سے ان ۱۵ میجروں کو بنکاک کی طرف لے جانے کی اجازت حاصل کرلی جو زیادہ تر ۱۵۔ اگست کے خونی انقلاب میں ملوث تھے...... اس کامیابی کے بعد خالد مشرف نے خود اپنے آپ کو میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی اور از خود بنگلہ دیش کا کمانڈر انچیف بن گیا...... اس نے سابقہ کمانڈر انچیف جنرل ضیاء الرحمٰن کو قید کر دیا اور خوندکر مشتاق احمد کو اے ایس ایم سیام (A.S.M.Sayem) کے حق میں منصب صدارت سے دست برداری پر مجبور کر دیا۔ اس دوسرے انقلاب سے بنگلہ دیشی سیاست میں بھارت اور ماسکو کی دل چسپی دوبارہ بڑھ گئی، لیکن جب ۴۔ نومبر کو یہ خبر آئی کہ عوامی لیگ کے چار سرکردہ رہنما تاج الدین احمد، سید نذر الاسلام، منصور علی اور اے ایچ ایم قمر الزمان کو جیل میں مردہ پایا گیا ہے تو صورت حال مزید سنگین ہوگئی.

اسی دوران میں فوجی افسروں اور جوانوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ خالد مشرف بھارت کا ایجنٹ ہے اور اس نے یہ کارروائی بھارت اور روس کے کہنے پر کی ہے (کتاب مذکور، ص۱۸۸) تو اس پر چھاؤنی میں موجود فوجی جوانوں کی ایک تنظیم نے، جو ''جوانان انقلاب تنظیم'' کے تحت کام کرتے تھے، ۶ نومبر ۱۹۷۵ء کو خالد مشرف اور اس کے ساتھیوں کے خلاف بغاوت کر دی اور خالد مشرف کو

بھاگنے کی کوشش کے دوران میں قتل کر دیا اور میجر جنرل ضیاء الرحمان کو اس کے گھر سے نکال کر، ٹینکوں، جیپوں اور بسوں کے ایک بہت بڑے جلوس کے ہمراہ ڈھاکہ لے کر آئے۔ جہاں پہنچ کر عوام بھی قافلے میں شامل ہوگئے۔ یہ سب لوگ بنگلہ دیش زندہ باد، جنرل ضیاء زندہ باد اور جوان زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے (حوالہ مذکور)۔

۷ نومبر کو معاملات کچھ سلجھ گئے اور ضیاء الرحمان نے دوبارہ کمانڈر انچیف کا عہدہ سنبھال لیا۔ جبکہ سابق صدر خوندکر مشتاق احمد کے مشورے کے ساتھ جسٹس اے ایس ایم سیام کو غیر سیاسی اور غیر جانب دار فرد کے طور پر صدر کے عہدے پر برقرار رکھا گیا، مگر جلد ہی صدر نے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور فوج کے تینوں سربراہوں نے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر فرائض سنبھال لیے..... نئے صدر نے اعلان کیا کہ انتخابات سابقہ اعلان کے مطابق ہوں گے۔

چونکہ JSD (جاتیو سماج تنترک دل) نے اس فوجی بغاوت کو فرو کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا، اس لیے، اس کے لیڈروں ایم اے جلیل اور اے ایس ایم عبدالرب وغیرہ کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔ یہ لوگ شیخ مجیب الرحمان کے دور سے قید میں تھے۔ انہوں نے رہائی کے بعد فوج میں اپنے حمایتی افسروں کو ملا کر جنرل ضیاء الرحمان کے سامنے بارہ مطالبات پیش کیے، جن میں فوج کی اصلاح اور جوانوں اور افسروں کی تنخواہ سے متعلق کئی مطالبات بھی شامل تھے مگر جنرل ضیاء الرحمان نے یہ مطالبات تسلیم نہ کیے۔ نتیجے کے طور پر ڈھاکہ اور رنگ پور چھاؤنی میں فوجیوں کے مابین تصادم میں فوج کے چالیس افسر قتل ہوگئے۔ جس پر حکومت نےJSD کے مذکورہ قائدین کو دوبارہ گرفتار کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی

۷ نومبر کو ہونے والی فوجی بغاوت کے سربراہ کرنل ابو طاہر کو بھی حراست میں لے لیا گیا..... ۲۵نومبر کو جنرل ضیاء الرحمان نے اپنی نشری تقریر میں ان غیر ملکی ایجنٹوں کو سخت الفاظ میں متنبہ کیا جو ملکی آزادی کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔

جنرل ضیاء الرحمان پاکستانی فوج میں ۱۹۵۳ء میں شامل ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں کمیشن حاصل کیا۔ اس نے محکمہ سراغ رسانی میں خصوصی تربیت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۹۔ ۱۹۶۰ء میں فوج کے اسی شعبے میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۵ء میں وہ ایک کمپنی کمانڈر تھا جس نے بڑی بہادری کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں اسے کاکول اکیڈمی اور اسی سال سٹاف کالج کوئٹہ میں بطور استاد تعینات کیا گیا۔ ۹۶۹ ء میں وہ اعلیٰ تربیت کے لیے جرمنی گیا اور چند ماہ برطانوی فوج کے ساتھ بھی تربیت حاصل کی۔ وہ مارچ ۱۹۷۱ء میں آٹھویں مشرقی پاکستان رجمنٹ کے ہمراہ چٹاگانگ میں تھا، جہاں سے اس نے ریڈیو چٹاگانگ سے، پہلی مرتبہ اعلان آزادی کیا اور ۱۹۷۱ء کی پاکستان کے خلاف جنگ میں اس نے پہلی، دوسری اور آٹھویں مشرقی پاکستانی رجمنٹ کے جوانوں کو ملا کر بنگلہ دیش کی پہلی فوجی ڈویژن تشکیل دی (Talukder، ص ۲۰۰۔۲۰۱) اسی لیے جنگ آزادی کے بعد اس کا شمار بنگلہ دیش کے اہم ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔

جنرل ضیاء الرحمٰن نے بڑے ہی پر آشوب حالات میں ملک کی زمام اقتدار سنبھالی تھی۔ حقیقت میں یہ وہ دور تھا جب ۱۹۷۱ء کی جنگ کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوگئے تھے۔ اس وقت ان کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ فوج کے اندر ''گروہ بازی اور سیاسی مداخلت'' کے خاتمے کا تھا۔ جنرل ضیاء الرحمان نے بڑی حکمت عملی سے اس پر قابو پایا اور فوج کو اپنی ذمہ داریوں تک محدود کیا۔

دوسری طرف فوج کو ملنے والا بجٹ ناکافی تھا۔ جنرل ضیاء الرحمان نے دفاعی بجٹ میں اضافہ کیا اور فوج کی تنخواہوں اور ان کے ہتھیاروں کو بہتر بنایا۔ مزید براں ملک میں لاقانونیت اور رشوت کی گرم بازاری تھی، اس لیے اس نے سرحدوں پر نگرانی کو بہتر کیا اور غیر قانونی تجارت کا بڑی حد تک خاتمہ کیا۔

بھارت نے بنگلہ دیش کے ساتھ دوستی کی بہت بڑی قیمت وصول کی تھی۔ کئی سالوں تک جاری رہنے والی لوٹ مار کے ساتھ ساتھ، اس نے گنگا پر ڈیم بنا کر بنگلہ دیش کا پانی روک لیا تھا جو ۱۸ اپریل ۱۹۷۵ء کو دونوں ملکوں کے مابین ہونے والے معاہدے کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ اس اقدام نے خشک موسم میں بنگلہ دیش کی معیشت کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ماسکو نے خصوصی طور پر بنگلہ دیشی حکومت کو کہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بھارتی خواہشات کے مطابق ڈھالے رکھے۔

سیاسی محاذ کی صورت حال اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ ''جاتیو سماج تنترک دل'' (JSD) کے فوجی افسران کے ساتھ خفیہ تعلقات تھے اور ۸ نومبر کو ہونے والی فوجی مداخلت میں یہ جماعت براہ راست ملوث تھی۔ اس جماعت کی طرف سے فوج اور بیرون فوج جنرل ضیاء الرحمان کو سخت مخالفت کا سامنا تھا۔ پھر شیخ مجیب الرحمان کی جماعت (BAKSAL) کی طرف سے ضیاء الرحمان پر ناجائز طریقے سے طاقت اور اقتدار حاصل کرنے کا الزام لگایا جا رہا تھا اور اس کے لوگوں نے حکومت کے خلاف مسلح مزاحمت کے لیے بنگلہ دیش سرحد پر آباد قبائلیوں کو مسلح کرنا شروع کر دیا تھا (Talukder، ص۲۰۰-۲۰۱)۔

ان اندرونی اور بیرونی خطرات کے ساتھ ساتھ، ضیاء الرحمان کو تباہ حال معیشت، غیر منظم فوج اور اخلاقی طور پر کمزور اور کام چور بیوکریسی ملی تھی۔ ضیاء الرحمان چونکہ فوج میں اچھے عہدوں پر کام کر چکا تھا اور وہ بنگلہ دیش کی آزادی میں اپنی فوج کی قیادت کر چکا تھا، اس لیے وہ اعلیٰ قائدانہ صلاحیتیں رکھنے کے ساتھ ساتھ بڑی حکومتوں کے چھوٹی حکومتوں پر دباؤ وغیرہ کی پالیسیوں سے بھی بخوبی آگاہ تھا اور وہ حسب موقع بڑے بڑے اقدامات کرنا جانتا تھا...... پھر بھارتی حکومت کی بنگلہ دیشی عوام کے لیے تباہ کن پالیسیوں نے بھی جنرل ضیاء کو ملکی استحکام پیدا کرنے اور بھارت کے خلاف موجود ذہن سے کام لینے کا موقع مہیا کیا۔ علاوہ ازیں ضیاء الرحمان کو بائیں اور دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی جماعتوں کا بھی کسی حد تک اعتماد حاصل تھا۔ جس کی بنا پر اس کے لیے کام کرنا آسان ہوا (حوالہ مذکور)۔

جنرل ضیاء الرحمان نے سب سے پہلے تو اندرنی استحکام اور فوج میں نظم و نسق کے قیام پر توجہ دی اور فوج کو اندرونی طور پر مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ اسے جدید اسلحہ سے لیس کیا۔ اس نے ۷ نومبر کو فوج میں ہونے والی بغاوت کے موقع پر فوجی جوانوں کی طرف سے پیش کردہ بارہ مطالبات، خصوصیت کے ساتھ فوجی جوانوں اور افسروں کی تنخواہوں سے متعلق مطالبات، تسلیم کر لیے۔ اس سے فوجی جوانوں اور افسروں کے ہاں اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

ٹینک ڈویژن، جس نے شیخ مجیب الرحمان اور اس کے خاندان کے لوگوں کو قتل کیا تھا، متعدد حصوں میں تقسیم کر دی گئی اور اسے مختلف علاقوں میں بھیج دیا گیا اور ڈھاکہ کی حفاظت کی ذمہ داری ۹ ڈویژن پر عاید کی گئی۔ اس کے علاوہ جو فوجی افسران اور جوان زیادہ متحرک تھے، انہیں فوج سے فارغ کر دیا۔ JSD کے ایک بیان کے مطابق جنرل ضیاء نے ۱۵۰۰ افسروں اور جوانوں کو فوج کی ملازمت سے ان کے گھروں کو بھجوایا (کتاب

مذکور، ص۲۰۲۔۲۰۳) اس طرح JSD سے تعلق رکھنے والے، ایک فوجی افسر کرنل ابو طاہر کو موت کی سزا دی گئی اور مذکورہ سیاسی جماعت کے کئی قائدین کو لمبی لمبی جیل کی سزائیں دی گئیں۔ ان اقدامات کے ساتھ ساتھ پہاڑی علاقوں میں بسنے والے قبائلی سرداروں کو حکومت سے تعاون اور ترقیاتی کاموں میں دل چسپی کے لیے ماہانہ وظائف دینا شروع کیے اور آہستہ آہستہ ان علاقوں میں سکیورٹی فورسز کی تعداد اور ان کے وسائل میں اضافہ کیا، جس کی بنا پر ان علاقوں سے حکومت کے خلاف مہم جوئی کی کوشش کرنے والے سیاسی لوگوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ضیاء الرحمان حکومت نے بھارت کی طرف سے ''گنگا'' کا پانی روکنے کے مسئلے کو پہلے باہمی گفت و شنید سے حل کرنے کی کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی تو اس نے یہ مسئلہ اسلامی ممالک اور غیر وابستہ ممالک کی تنظیم میں اور پھر ان کی قراردادوں کے ذریعے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اٹھایا۔ جہاں اس کے حق میں ایک قرار داد پاس کی گئی اور یوں بھارت کو عالمی دباؤ پر یہ مسئلہ حل کرنا پڑا اور مرار جی ڈیسائی حکومت نے بنگلہ دیش کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا کہ وہ خشک موسم میں ۴۰ فیصد سے زیادہ پانی نہ روکے گا۔ اس کے علاوہ بنگلہ دیشی حکومت نے دوسرے ممالک، خصوصاً چین کے ساتھ اپنے تعلقات کو نئے سرے سے استوار کیا، اسی لیے چین نے سرکاری طور پر بھارت کے اس اقدام کی مذمت کی۔ دونوں ملکوں کے مابین سرکاری وفود کا تبادلہ بھی ہوا۔ اسی طرح جنرل ضیاء نے سعودی عرب کا دورہ کیا اور شاہ خالد کے ساتھ پراعتماد فضا میں مذاکرات کیے۔ اس حکومت نے پاکستان کے ساتھ تعلقات کو بھی نئے سرے سے قائم کیا۔ دونوں ملکوں کے درمیان مئی ۱۹۷۶ میں پہلا تجارتی معاہدہ ہوا۔

ضیاء الرحمان حکومت نے فوجی افسروں اور جوانوں کا اعتماد بحال کرنے کے بعد سول بیورو کریسی کی تنظیم نو پر بھی توجہ دی۔ مجیب الرحمان کے دور حکومت میں دوسرے اداروں کے ساتھ ساتھ اس ادارے کو بھی تباہ کر دیا گیا تھا۔ جنرل ضیاء نے پاکستان دور کے سفیروں اور بیورو کریٹس کو اہم عہدوں پر فائز کیا اور سول سروس کے ملازمین کا اعتماد بحال کیا۔ اور میرٹ کی پالیسی سختی کے ساتھ اپنائی اور ملازمتوں میں سیاسی مداخلت کا خاتمہ کیا (کتاب مذکور، ص۲۰۸۔۲۰۱)۔

مجیب الرحمان کے دور میں وسیع پیمانے پر اختیار کی گئی قومی صنعتوں کو قومیانے کی پالیسی ترک کرتے ہوے، حکومت نے پرائیویٹ سیکٹر کو مضبوط کیا اور جنرل ضیاء نے پاکستان کے سابق صدر محمد ایوب خان کے دور کو سامنے رکھتے ہوے، پرائیویٹ سیکٹر کی حوصلہ افزائی کی اور ان کو تحفظ فراہم کیا...... سرکاری تحویل میں موجود کئی فیکٹریوں اور اداروں کو پرائیویٹ سیکٹر میں دے دیا گیا۔ جس کا بہت مثبت رد عمل ہوا اور چند ہی برسوں میں بنگلہ دیش کی معاشی حالت بہتر ہو گئی۔ حکومت نے سمگلنگ کا خاتمہ کرتے ہوے مقامی زراعت کی بحالی پر بھی توجہ دی اور کاشت کاروں کو قرضے اور ضروری سہولیات مہیا کیں۔ جس کے نتیجے میں ورلڈ بنک کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۷۵۔۱۹۷۶ء میں بنگلہ دیش کی فی کس آمدن (GDP) ۱۱.۴ فیصد تک بڑھ گئی اور صنعتی پیداوار میں پانچ فیصد اضافہ ہوا۔

صدر سیام اور خوندکر مشتاق احمد کے اعلان کے مطابق اگست میں سیاسی سرگرمیاں بحال ہونا تھیں اور انتخابات فروری ۱۹۷۶ء میں ہونا طے تھے۔ چنانچہ سیاسی سرگرمیاں بحال ہوتے ہی، سیاسی جماعتیں دو حصوں میں

بٹ گئیں، مولانا عبدالحمید خان بھاشانی کی نیپ سمیت بیجنگ نواز بائیں بازو کی جماعتوں کا خیال تھا کہ پہلے بھارتی توسیع "پسندی" سے نپٹا جائے اور پھر انتخابات کرائے جائیں، جبکہ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی اسلامی جماعتیں پروگرام کے مطابق انتخابات پر زور دے رہی تھیں۔

چونکہ صدر سیام اس بات کے حق میں تھے کہ انتخابات پروگرام کے مطابق کرائے جائیں، اس لیے فوجی افسروں کو بھی اسی سے اتفاق کرنا پڑا اور اس کے لیے "سیاسی جماعتوں کا آرڈیننس" (PPR) جاری کیا گیا، جس کی رو سے سیاسی جماعتوں کو اپنے اپنے حلقوں میں کام کرنے سے قبل اپنے اپنے پروگرام حکومت سے منظور کرانا تھے۔ اس موقع پر ساٹھ سیاسی جماعتوں نے، ملکی سیاسی جماعت کے طور پر کام کی اجازت کے لیے درخواستیں دیں، جن میں سے ۲۶ جماعتوں کو، جن میں عوامی لیگ بھی شامل تھی، یہ اجازت مل گئی...... زیادہ تر جماعتوں کے پروگرام ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے، سب اپنے ملک کو "جدید ریاست" بنانے کے پروگرام کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔

لیکن ضیاء الرحمان اور اس کے ساتھی فوجی افسروں نے جب یہ دیکھاکہ عوامی لیگ کے کچھ لیڈر شیخ مجیب الرحمان کے قتل کو ایک سیاسی مسئلہ بنا کر ملک میں تشدد اور انتشار پھیلانے کا پروگرام بنا رہے ہیں اور دوسری طرف بھارتی حکومت کے عزائم بھی ٹھیک دکھائی نہیں دیتے، تو انہوں نے انتخابات کو ملتوی کر دیا۔

خوندکر مشتاق احمد نے ضیاء الرحمٰن کے اس اقدام کو تسلیم نہ کیا اور اس نے اپنے ضلع (کومیلا) سے تعلق رکھنے والے فوجی افسروں سے خفیہ رابطے شروع کر دیئے اور اسے فوجی افسروں کی ایک مختصر سی جماعت کی حمایت بھی حاصل ہو گئی۔ جنرل ضیاء نے اس کا سختی سے نوٹس لیا اور ۳۰ نومبر ۱۹۷۶ء سے خود مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھال لیا۔ اسی دن خوندکر مشتاق احمد اور اس کے دوسرے دس ساتھیوں کو ملک میں انتشار پھیلانے کے جرم میں حراست میں لے لیا گیا (کتاب مذکور، ص ۲۱۴۔ ۲۱۵)۔ چونکہ اس کے دو سابقہ اقدامات کو فوج نے قبول کر لیا تھا، اس لیے اس نے ۲۱ اپریل ۱۹۷۷ء کو بنگلہ دیش کی صدارت کا منصب بھی سنبھال لیا۔ اس نے اپنے ریڈیو اور ٹی وی خطاب میں نئے عام انتخابات دسمبر ۱۹۷۸ء میں کروانے کا اعلان کیا...... ضیاء الرحمان نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ اپنی صدارت کے حق میں ۳۰ مئی ۱۹۷۷ء کو عوامی استصواب رائے (ریفرنڈم) کروائیں گے۔ بعدازاں اس نے اسی سال اپنے صدارتی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ملکی آئین میں درج ذیل ترمیمات کیں: (الف) ملک کی بنیاد سیکولرازم کے بجائے...... اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اعتقاد پر ہو گی اور (ب) ملک کے آئین کی دوسری بنیاد سوشلزم کے بجائے "اقتصادی اور عوامی انصاف" پر ہوگی؛ (ج) اس بات کی ضمانت دی جاتی ہے کہ آئندہ کسی کی جائیداد کو قومیانے یا قبضے میں لینے وغیرہ کی کارروائی اس کی قیمت کی ادائیگی کے بغیر نہ ہو گی (کتاب مذکور، ص ۲۱۵۔۲۱۶)۔

ضیاء الرحمٰن نے ۳۰۔ اپریل ۱۹۷۷ء کو اپنے ۱۹ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا، جس میں پرائیویٹ سیکٹر کو مضبوط کرنے، خوراک میں کفالت حاصل کرنے اور دیہاتی معیشت کو مضبوط بنانے وغیرہ کے نکات شامل تھے۔

عوامی لیگ اور جے ایس ڈی کے سوا تمام سیاسی جماعتوں نے ریفرنڈم میں جنرل ضیاء الرحمٰن کی حمایت کی۔ عوامی لیگ نے مکمل طور پر خاموشی اختیار کر لی۔ جبکہ JSD نے اس کے خلاف مہم چلائی۔ ریفرنڈم کا نتیجہ بہت مثبت رہا۔ ۸۸.۵ فیصد لوگوں نے رائے شماری میں

حصہ لیا اور ۹۸.۵ فیصد لوگوں نے ضیاء الرحمان کے حق میں ووٹ دیا۔

لیکن اس ریفرنڈم میں عوامی شرکت کے ان اعداد و شمار کو غلط بیانی پر محمول کیا گیا اور اسے ضیاء الرحمان حکومت کی پہلی کمزوری تصور کیا گیا۔

ضیاء الرحمان نے اس موقع پر اپنی سیاسی جماعت بنانے کا بھی پروگرام بنایا۔ اس موقع پر پاکستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں کی طرح، اس کی نظر بھی دیہاتی اور بنیادی سطح کے سیاسی کارکنوں پر پڑی۔ چنانچہ اس نے دیہاتی سطح پر جنوری ۱۹۷۷ء کے انتخابات جیتنے والے نمبرداروں یا کونسلروں کا ملک گیر کنونشن بلایا جس میں ۴۳۶۲ یونین کونسلوں کے چیئرمین حضرات نے شرکت کی۔ اس نے اس موقع پر چیئرمین حضرات کے اعزازیے میں فی کس ۱۰۰ ٹکہ کی بجائے ۳۰۰ ٹکہ تک ماہانہ کے اضافے اور یونین کونسل کی سطح پر کئی ترقیاتی پروگراموں کا اعلان کیا۔ اس سطح پر اپنی مقبولیت بڑھانے کے لیے اس نے کئی یونین کونسلوں کے چیئرمین حضرات کو آب پاشی وغیرہ کے پروگراموں میں تربیت کے لیے جاپان، شمالی کوریا اور ایران وغیرہ بھجوایا...... اسی طرح اس نے طالب علموں کے لیے بھی کئی منصوبوں کا اعلان کیا (کتاب مذکور، ص ۲۱۸)۔

۱۹۷۷ء کو وسط تک ضیاء الرحمان ایک نئی سیاسی جماعت قائم کرنے کا پروگرام بنا چکا تھا، لیکن مجبوری یہ تھی کہ اس کی بنائی ہوئی سیاسی جماعت، بہت چھوٹی جماعت ہوتی جبکہ اسے ایک بڑی پارٹی کی ضرورت تھی، چنانچہ اس نے اپنے نائب صدر جسٹس عبدالستار کو یہ کام سونپا کہ وہ ملک کے مستقبل کے لیے سیاسی جماعتوں سے گفت و شنید کرے، بعض جماعتیں پارلیمانی نظام کے اور کچھ جماعتیں صدارتی نظام حکومت کے حق میں تھیں۔

اس گفت و شنید کے دوران میں بیجنگ نواز بائیں بازو کی جماعتوں اور مسلم لیگ سمیت کئی قدامت پرست اسلامی جماعتوں نے اس کے ساتھ مل کر، اس کے ہاتھ مضبوط کرنے سے اتفاق کیا۔

انہی دنوں فوج میں ایک اور بغاوت پھوٹ پڑی۔ جس کی ابتدا ۳۰ ستمبر ۱۹۷۷ء کو بوگرا چھاؤنی سے ہوئی۔ باغیوں اور حکومت کے حامی افسروں کے مابین تصادم میں تین افسر مارے گئے اور باغیوں نے چھاؤنی اور اس سے باہر کے علاقوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ بعدازاں ۲ اور ۳ ستمبر کی درمیانی رات کو، عین اس وقت جب جاپان کی ''ریڈ آرمی'' نامی تنظیم نے ایک طیارہ اغوا کر کے، اسے ڈھاکہ پہنچا دیا تھا اور حکومت اس سے بات چیت میں مصروف تھی، باغیوں نے ڈھاکہ چھاؤنی سے نکل کر کچھ دیر کے لیے ریڈیو اسٹیشن اور ائر پورٹ پر قبضہ کرلیا۔ حکومت کی حامی افواج کے وہاں پہنچنے پر، دونوں میں تصادم ہوا، جس میں ائر فورس کے ۱۱ سینئر افسروں سمیت کئی سو فوجی افسر اور جوان مارے گئے۔ تاہم حکومت نے جلد ہی اس بغاوت پر قابو پا لیا (کتاب مذکور، ص۲۲۰)۔ اس موقع پر جنرل ضیاء الرحمان نے پہلے باغیوں سے نرمی کا مظاہرہ کیا، لیکن جلد ہی خفیہ ٹربیونل قائم کر کے سیکڑوں جوانوں پر فرد جرم عاید کر دی گئی، ۲۵۰ سے زیادہ لوگوں کو موت کی سزا دی اور سیکڑوں افسروں اور جوانوں کے تبادلے کیے گئے۔ اس دوران میں اس کی طرف سے نئی سیاسی جماعت بنانے کے لیے سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ بالآخر فروری ۱۹۷۸ء کے آخری ہفتے کے دوران میں، نائب صدر جسٹس عبدالستار ایک نئی سیاسی جماعت بنانے میں کامیاب ہوگئے، جس کا نام جاتیو گنترا ترک دل (قومی جمہوری پارٹی) رکھا گیا۔ اس کی مرکزی کنوینگ کمیٹی میں سولہ

ارکان تھے، جن میں سے تیرہ وہ تھے جو حال ہی میں "کونسل آف ایڈوائزر" کے لیے مقرر ہوئے تھے، باقی تین ارکان میں سے ایک حال ہی میں ڈھاکہ میونسپل کارپوریشن کا منتخب شدہ چیئرمین تھا، جبکہ دو دوسرے سیاسی طور پر غیر معروف تھے...... اس کمیٹی میں بہت جلد کئی سیاسی لیڈر اور صنعتکار بھی شامل کر لیے گئے۔ اس جماعت نے اپنے منشور میں صدارتی نظام حکومت کے ساتھ ایک اعلیٰ اختیاراتی پارلیمنٹ اور صدر کی مدد کے لیے وزیر اعظم اور کابینہ جیسی تجاویز پیش کیں، جنرل ضیاء الرحمان نے ۱۸ اپریل کو انتخابی آرڈیننس کا اور ۲۱ اپریل کو انتخابی شیڈول کا اعلان کیا، جس کی رو سے پہلے انتخاب ۳ جون ۱۹۷۸ء کو کرانا طے کیے گئے۔ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ یہ انتخابات بالغانہ رائے دہی کی بنیاد پر کرائے جائیں گے۔

انتخابی مہم شروع ہوتے ہی سیاسی جماعتیں دو گروہوں میں بٹ گئیں۔ ضیاء الرحمان اور اس کی چھ حامی جماعتوں پر مشتمل ایک گروہ قومی محاذ (N.P. National Front) اور عوامی لیگ اور اس کی حامی جماعتوں پر مشتمل گروہ جمہوری محاذ (D.F- Democratic Front) کہلایا۔ چھوٹی جماعتوں کا ایک گروہ بھی تھا، جس کی قیادت عطاء الرحمان کر رہا تھا، جو ۱۹۵۴ـ۱۹۵۶ میں مشرقی پاکستان کا وزیر اعلیٰ رہ چکا تھا۔

صدارتی انتخابات کے نتائج جنرل ضیاء الرحمان کے حق میں حوصلہ افزا تھے، الیکشن کمیشن کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق انتخابات میں رجسٹرڈ ووٹوں میں سے ۵۳ء۵۹ فیصدووٹ ڈالے گئے، جس میں ۷۶.۶۷ فیصد ضیاء الرحمان کو اور ۲۱ء۷۰ فیصد مخالف امیدوار جنرل عثمانی کو ملے تھے (کتاب مذکور، ص۲۲۳)۔

صدارتی کامیابی ملنے کے بعد جنرل ضیاء الرحمان نے ۲۸ وزرا پر مشتمل کابینہ بنائی، جن میں سولہ افراد وہی تھے، جو اس کی مجلس مشاورت (Concil of Advisors) میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ دوسری سیاسی جماعتوں اور بعض کاروباری حلقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی کابینہ میں لیے گئے تھے۔

انتخابات کے بعد عوامی لیگ دو حصوں میں بٹ گئی، ایک حصہ شیخ مجیب الرحمان کے ایک جماعتی نظام کے حق میں تھا۔ دوسرا گروہ ضیاء الرحمان کے ساتھ مل گیا تھا۔ یوں انتخابات کے بعد ضیاء الرحمان نے کئی اور جماعتوں کو ملا کر ایک بڑی جماعت "بنگلہ دیش قوم پرست پارٹی" (BNP =Bangladesh Nationalaist Party) تشکیل دی۔

جنرل ضیاء الرحمٰن کی جماعت نے ۱۸ فروری ۱۹۷۹ء کو ہونے والے انتخابات میں شرکت کی، جس میں اسے قومی اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل ہو گئی۔ اسے تین سو میں سے ۲۰۷ اور عوامی لیگ کو ۳۹، مسلم لیگ کو ۲۰ اور JSD کو ۸ سیٹیں ملیں ۔ اس طرح ضیاء الرحمان کی سیاسی جماعت ملک کی سب سے بڑی جماعت کے طور پر سامنے آئی (حوالہ مذکور)۔ اسی سال ۶ اپریل ۱۹۷۹ء کو ضیاء الرحمان کے اس دور کے اقدامات کو آئینی تحفظ دینے کے لیے آئین میں پانچویں ترمیم لائی گئی، جس کے بعد ملک سے مارشل لاء اٹھا لیا گیا اور آئین مکمل طور پر بحال کر دیا گیا۔ اس نے ملک کے وزیر اعظم کے منصب پر عزیز الرحمان شاہ کو فائز کیا، لیکن اس صدارتی نظام میں وزیر اعظم کی حیثیت محض برائے نام تھی اور تمام تر اختیارات صدر کے پاس تھے۔ ضیاء الرحمان کا زیادہ تر وقت مجیب الرحمان دور کے غیر آئینی معاملات کو درست کرنے میں صرف ہوا۔ اس نے بالآخر اپنے ملک کو جمہوریت اور آئین کے راستے پر ڈال دیا، مگر وہ فوج میں ہونے والی گروہ بندی کو ختم نہ کر سکا اور ۳۰ مئی ۱۹۸۱ء

کو فوجیوں کے ایک گروہ کی فائرنگ سے جس کی قیادت میجر جنرل محمد عبدالمنظور کر رہا تھا، قتل ہو گیا۔ اس سے ملک میں ایک مرتبہ پھر عدم استحکام پیدا ہو گیا۔ قاتل نے بعدازاں خود کو بھی گولی مار کر ہلاک کر لیا۔

(د) جنرل حسین محمد ارشاد کا دور حکومت:

اس موقع پر نائب صدر جسٹس عبدالستار چوہدری نے منصب صدارت سنبھال لیا اور ۲۴ مارچ ۱۹۸۲ء کو منعقد ہونے والے انتخابات میں عبدالستار چوہدری بنگلہ دیش کے نئے صدر منتخب ہو گئے۔ انتخابات میں کامیابی کے بعد جسٹس عبدالستار چوہدری نے اعلان کیا کہ وہ مرحوم ضیاء الرحمان کی پالیسیوں کو جاری رکھیں گے، مگر انہیں فوج اور عوام کی طرف سے سخت دباؤ کا سامنا تھا۔ چنانچہ اس نے فوج کے مطالبے پر جنوری ۱۹۸۲ء میں ''قومی سلامتی کونسل'' تشکیل دی، مگر بنگلہ دیشی فوج کے سربراہ اور ''قومی سلامتی کونسل'' کے اہم ترین رکن لیفٹیننٹ جنرل حسین محمد ارشاد نے ۲۴ مارچ ۱۹۸۲ء کو حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عبدالستار چوہدری کو برطرف اور آئین کو معطل کر دیا۔ پارلیمنٹ برطرف کر دی اور غیر معینہ عرصے کے لیے ملک میں مارشل لا لگا دیا۔ تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی۔ مارچ ۱۹۸۳ء میں جنرل محمد ارشاد نے عبدالستار چوہدری کو کرسی صدارت پر بٹھایا (*The Europa world year book 2005*، ۷۰۳/۱) جو دسمبر ۱۹۸۳ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ جس کے بعد جنرل ارشاد نے منصب صدارت بھی خود ہی سنبھال لیا، مگر اب حالات بدل گئے تھے۔ اس لیے عوامی سطح پر اسے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ ۱۴ فروری ۱۹۸۳ء کو جنرل حسین محمد ارشاد کی حکومت کے خلاف طالب علم تنظیموں نے پہلی مرتبہ ملک گیر مظاہرے کیے۔

حزب اختلاف کا اتحاد: ہر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم اور اپنے ملک کا نجات دہندہ بن کر آیا ہے۔ پھر بیک وقت سول اور فوج پر اقتدار مستحکم ہونے کی بنا پر، اسے طویل عرصے تک ملک پر حکمرانی کی خواہش ہوتی ہے، اس لیے وہ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے مختلف پروگرام شروع کر دیتا ہے، جنرل حسین محمد ارشاد نے بھی کچھ ایسا ہی کیا، لیکن یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ اس کی سخت مزاحمت ہوئی اور حزب اختلاف کی جماعتوں کی طرف سے اسے سخت دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔

حزب اختلاف کا سب سے بڑا اتحاد آٹھ چھوٹی بڑی جماعتوں پر مشتمل تھا اور اس کی قیادت شیخ مجیب الرحمان کی واحد زندہ بچ جانے والی اس کی بیٹی شیخ حسینہ واجد کر رہی تھی: اس اتحاد میں زیادہ تر بائیں بازو کی جماعتیں شریک تھیں۔ دوسرا اتحاد جو مرحوم جنرل ضیاء الرحمان کی حامی دائیں اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی جماعتوں پر مشتمل تھا، اس کے پہلے سربراہ جسٹس عبدالستار تھے، مگر فروری ۱۹۸۴ء میں جسٹس عبدالستار کے استعفیٰ کے بعد اس کی قیادت بیگم خالدہ ضیاء نے سنبھال لی۔ ستمبر ۱۹۸۳ء سے ان دونوں جماعتوں نے باہمی اتفاق سے جنرل ارشاد کے خلاف بحالی جمہوریت (Movement for the Restoration of Democracy=MRD) کی تحریک شروع کی، اور ملک سے فوری طور پر مارشل لا اٹھانے، سیاسی قیدیوں کی رہائی، پارلیمانی نظام حکومت کی بحالی اور اس کے تحت فوری انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا (کتاب مذکور، ص ۷۰۴)۔

جنرل ارشاد نے عوامی دباؤ پر نومبر ۱۹۸۳ء میں سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی اور اعلان کیا کہ دسمبر ۱۹۸۳ء اور مارچ ۱۹۸۴ء کے درمیان مقامی سطح

کے انتخابات کے ذریعے صدارتی انتخابات کرائے جائیں گے اور بعدازاں پارلیمانی انتخابات اسی سال منعقد کرائے جائیں گے۔ اسی ماہ سیاسی گٹھ جوڑ کر کے، جاتا دل (Jata dal |Peoples Party|) کے نام سے اپنی سیاسی جماعت بنا لی...... لیکن جب مخالف سیاسی جماعتوں کی طرف سے سول حکومت کے قیام کا مطالبہ زور پکڑ گیا، تو ایک ماہ بعد، دسمبر ۱۹۸۳ء میں دوبارہ سیاسی سرگرمیوں کو خلاف قانون قرار دے کر ان پر پابندی عائد کر دی اور سیاسی رہنماؤں کو نظر بند کر دیا اور ۱۱۔ دسمبر ۱۹۸۳ء کو جنرل ارشاد نے از خود منصب صدارت سنبھال لیا۔

۱۹۸۴ء کے پورے سال کے دوران میں حکومت کے خلاف ہنگامے جاری ہے اور نظام حکومت انتشار کا شکار رہا۔ مارچ ۱۹۸۴ء میں ہونے والے انتخابات اور پھر مئی میں ہونے والے پارلیمانی اور صدارتی انتخابات بھی دسمبر تک ملتوی کر دیئے گئے۔ جنوری ۱۹۸۵ء میں حکومت کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ عام انتخابات اپریل میں منعقد ہوں گے، اس کے ساتھ ہی مارشل لا نرم کر دیا جائے گا، اور انتخابات کے بعد مارشل لا اٹھا لیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی جنرل ارشاد نے فوجی افسروں پر مشتمل کابینہ تشکیل دی اور کابینہ میں موجود جاتا دل کے ارکان کو نکال دیا۔ حزب اختلاف نے اس بنا پر انتخابات کے بائیکاٹ کی دھمکی دی اور کہا کہ جنرل ارشاد غیر جانب دار نگران حکومت کے قیام میں سنجیدہ نہیں ہے...... چنانچہ مارچ ۱۹۸۵ء میں حکومت نے انتخابات کو ملتوی کر دیا اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی اور ۲۱ مارچ کو صدر نے اپنی صدارت کے حق میں استصواب رائے کرایا اور اپنے دعوے کے مطابق ۹۴ فیصد ووٹوں سے کامیابی حاصل کی۔

جنرل محمد ارشاد نے عمومی انتخابات سے پہلے، مقامی سطح کے انتخابات کروانے کا فیصلہ کیا اور حزب اختلاف کی مخالفت کے باوجود مئی میں یونین کونسلوں کے انتخابات کروائے اور یہ دعوی کیا کہ منتخب شدہ ۸۵ فیصد کونسلر اس کے ساتھ ہیں۔ جس کے بعد ستمبر ۱۹۸۵ء میں اپنی سیاسی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کے لیے پانچ سیاسی جماعتوں پر مشتمل ایک بڑا سیاسی اتحاد قومی اتحاد (Natural Front) تشکیل دیا۔ جس کا مقصد صدر مملکت کو سیاسی مدد دینا تھا۔

یکم جنوری ۱۹۸۶ء کو دس ماہ سے قائم سیاسی پابندیاں اٹھا لی گئیں اور حکومت کی حامی پانچ سیاسی جماعتوں پر مشتمل قومی اتحاد (N.F) نے خود کو جاتیا دل (عوامی جماعت) کے نام سے ایک سیاسی جماعت میں ڈھال لیا اور معروف بزرگ سیاست دان عطاء الرحمان کو جو ۱۹۵۵۔۱۹۵۶ء میں مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ رہ چکے تھے، وزیراعظم مقرر کیا۔ ملک میں سیاسی سرگرمیوں کو بحال کرنے کی غرض سے سول عہدوں سے فوجی افسران کو ہٹا لیا گیا اور ڈیڑھ سو کے قریب فوجی عدالتیں بھی ختم کر دی گئیں۔

اسی ماہ صدر ارشاد نے اعلان تو کیا تھا کہ انتخابات اپریل کے آخر میں مارشل لاء کے تحت کرائے جائیں گے۔ مگر یہ انتخابات مئی میں کرائے جاسکے۔ ان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی شیخ حسینہ واجد اور جماعت اسلامی سمیت تمام چھوٹی بڑی پارٹیوں نے حصہ لیا مگر بیگم خالدہ ضیاء کی سربراہی میں کام کرنے والی NPB نے انتخابات کا مقاطعہ کیا۔ اس کی طرف سے انتخاب کے موقع پر وسیع پیمانے پر دھاندلی کے الزامات عاید کیے گئے (*The Europa world year book 2005*، ۱/۷۰۴)۔ بہرحال انتخابات میں جاتیا دل نے ۳۰۰ میں سے ۱۵۳ نشستوں پر کامیابی حاصل کر کے اکثریت حاصل کر لی۔ اس کے علاوہ خواتین کی ۳۰ نشستیں بھی اسی جماعت نے

جیت لیں۔

جولائی ۱۹۸۶ء میں...... جنرل محمد ارشاد نے نئی کابینہ تشکیل دی اور جاتیا دل کے سابق جنرل سیکرٹری میزان الرحمان چوہدری کو وزارت عظمٰی کا منصب دیا۔ وہ اس عہدے پر ۱۹۸۸ء تک فائز رہے (The States man's year book, 2005، ص ۵۵۸۔۵۵۹)۔ آئندہ انتخابات میں صدارتی الیکشن میں حصہ لینے کے لیے ۲۸۔ اگست کو جنرل ارشاد نے آرمی چیف کا عہدہ چھوڑ دیا۔ البتہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور مسلح افواج کے کمانڈر انچیف کے عہدے اپنے پاس رکھے۔ ستمبر میں جنرل ارشاد نے باقاعدہ طور پر ''جاتیا دل'' میں شرکت کر لی اور وہ پارٹی کا چیئرمین منتخب ہو گیا۔ ۱۵۔اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ہونے والے صدارتی انتخابات میں ایک امیدوار کے طور پر حصہ لیا۔ جس کا حزب اختلاف کی تمام جماعتوں نے بائیکاٹ کیا۔ مگر پھر بھی وہ بھاری اکثریت سے اگلے پانچ برسوں کے لیے صدر منتخب ہوگئے۔ نومبر ۱۹۸۶ء میں اپنے دور میں ہونے والے اپنے اقدامات کو قومی اسمبلی کے ذریعے تحفظ ملنے پر، اس نے ملک سے مارشل لا اٹھا لیا۔ صدر منتخب ہونے پر اس نے نئی کابینہ تشکیل دی اور اے کے ایم نورالاسلام کو نائب صدر تعینات کیا۔

۱۹۸۷ء کے دوران میں حزب اختلاف کی طرف سے حکومت کے خلاف ہنگاموں کا سلسلہ تجارتی انجمنوں اور طلبہ تنظیموں کی مدد کے ساتھ جاری رہا۔ جولائی ۱۹۸۷ء میں جاتیا سنگ ساد (پارلیمنٹ) نے ایک بل کی منظوری دی جس میں فوجی نمائندوں کو ضلعی کونسلوں میں منتخب شدہ افراد کے ساتھ، شریک کر لیا گیا۔ اس بل کی منظوری نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور حزب مخالف کی جماعتوں نے جلسے اور جلوسوں کے ذریعے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ صدر ارشاد نے اگست ۱۹۸۷ء میں یہ بل واپس لے لیا، مگر نومبر میں صدر ارشاد کو منصب صدارت چھوڑنے پر مجبور کرنے کے لیے حزب اختلاف کی تمام جماعتوں نے باہم مل کر حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک شروع کر دی۔ جس کے دوران میں حکومت نے ہزاروں افراد کو گرفتار کر لیا۔ مگر ہنگامے پھر بھی جاری رہے، جس پر تنگ آ کر حکومت نے نومبر میں دوبارہ ہنگامی حالت نافذ کر دی اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی، مگر اس کے باوجود ہنگامے جاری رہے۔ تو صدر نے قومی اسمبلی (جاتیا سنگ ساد) کو معطل کر کے دوبارہ انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ جنوری میں اعلان کیا گیا کہ عام انتخابات ۲۸ فروری ۱۹۸۸ء کو ہوں گے مگر اس موقع پر حزب اختلاف کی تمام بڑی جماعتوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ انتخابات مقررہ تاریخ پر ہوئے اور حسب توقع، جاتیا دل (جنرل ارشاد کی جماعت) نے انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ مارچ ۱۹۸۸ء کو نئی کابینہ تشکیل دی گئی۔ ۱۲۔اپریل کو ہنگامی حالت ختم کر دی گئی اور دائیں بازو کی جماعتوں کو خوش کرنے کے لیے آئین میں ایک ترمیم کے ذریعے، اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا۔ علاوہ ازیں نئے انتخابات کے بعد نورالاسلام کی جگہ مودود احمد کو ملک کا وزیراعظم تعینات کیا گیا، وہ اس عہدے پر ۱۹۸۹ء تک فائز رہے۔

جولائی ۱۹۸۹ء میں حکومت نے پارلیمنٹ سے ایک بل منظور کروایا جس کے تحت کسی بھی شخص کو پانچ پانچ سال کی مدت کے لیے دو مرتبہ صدر منتخب کیا جا سکتا تھا، نیز براہ راست انتخاب کے ذریعے ایک نائب صدر کا عہدہ بھی قائم کیا گیا۔ اگست ۱۹۸۹ء میں مودود احمد کو نائب صدر اور قاضی ظفر احمد کو، جو پہلے نائب وزیراعظم اور وزیر اطلاعات رہ چکے تھے، وزیراعظم کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ (The Europa world year book 2005، ۱/۷۰۵)۔

مارچ ۱۹۹۰ء میں بلدیاتی انتخابات ہوے، جن کا دونوں بڑی مخالف جماعتوں نے بائیکاٹ کیا۔ اپریل ۱۹۹۰ء میں جنرل ارشاد نے اگلے صدارتی انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا جو کہ وسط ۱۹۹۱ء میں منعقد ہونا تھے۔ سال کے آخری دنوں میں حزب اختلاف نے طالب علم رہنماؤں کے ساتھ مل کر حکومت کے خلاف زور دار تحریک شروع کر دی۔ ایک مظاہرے کے دوران آٹھ افراد ہلاک ہوگئے اور ۵۰۰ کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر تمام تعلیمی ادارے بشمول ڈھاکہ یونیورسٹی بند کر دیئے گئے۔ اب لوگ مہنگائی اور صدر کی اقربا پروری سے تنگ آ گئے تھے اور اسے مزید برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہنگاموں کو روکنے کے لیے صدر نے ۲۷ نومبر ۱۹۹۰ء کو تین سالوں میں دوسری مرتبہ ملک میں ہنگامی حالت نافذ کر دی اور لوگوں کے بنیادی حقوق سلب کر لیے، آزادی تقریر و تحریر پر پابندی لگا دی گئی اور ملک بھر میں غیر معینہ مدت تک کے لیے کرفیو نافذ کر دیا۔

لیکن ہنگامے اور توڑ پھوڑ پھر بھی جاری رہی، تو صدر ارشاد نے دارالحکومت ڈھاکہ کو فوج کے سپرد کر دیا۔ پولیس اور حفاظتی افواج نے مظاہروں پر قابو پانے کے لیے بے دریغ طاقت کا استعمال کیا، جس میں بیسوں افراد ہلاک و زخمی ہوے۔ بالآخر عوام کے شدید دباؤ کے تحت صدر حسین محمد ارشاد نے ۴ دسمبر ۱۹۹۰ء کو استعفیٰ دے دیا اور صدارتی انتخابات سے قبل پارلیمانی انتخابات کرانے کا اعلان کیا قومی اسمبلی کو معطل کر دیا اور یوں بنگلہ دیش کو ان کی آمریت سے نجات مل گئی۔ جس کے بعد، چیف جسٹس آف سپریم کورٹ شہاب الدین احمد نے قائم مقام صدر کی حیثیت سے صدارتی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ انہوں نے صدر ارشاد دور کے تمام مالیاتی سربراہوں کو برطرف کر دیا اور وسیع پیمانے پر جنرل ارشاد کی طرف سے کی گئی تقرریوں کو منسوخ کر دیا۔ حزب اختلاف کی طرف سے سابق صدر حسین محمد ارشاد کی طرف سے بدعنوانیوں اور اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال کے خلاف احتجاج کی بنا پر سابق صدر حسین محمد ارشاد کو نظر بند کر دیا گیا، بعد میں انہیں بیس سال کی سزا سنائی گئی (The Europa world year book 2005، ۷۰۵/۱).

جنرل محمد ارشاد ۲۴۔ مارچ ۱۹۸۳ء) سے ۴۔ دسمبر ۱۹۹۰ء تک مجموعی طور پر پونے نو برس تک برقرار رہے۔ ان کا دور حکومت بنگلہ دیش میں تسلسل کے اعتبار سے سب سے طویل دور حکومت ہے مگر شیخ مجیب الرحمٰن اور جنرل ضیاء الرحمٰن کے برعکس اس کی حکومت کو عوامی سطح پر بہت کم پذیرائی نصیب ہوئی اور اس کا یہ دور حکومت حزب اختلاف کی احتجاجی سرگرمیوں کا شکار رہا۔ اس کے دور حکومت میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ دستوری اعتبار سے اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دینے کے سوا کوئی بھی پیش رفت نہ ہوسکی اور پھر اس کے اقتدار کا انجام بھی بے حد عبرت ناک ہے۔ تمام سیاسی جماعتیں اس کے خلاف متحد رہیں اور وہ اپنی ''جاتیا دل'' پارٹی کے ذریعے ملک میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔

(ز) سول حکومت کا دور (۱۹۹۰ء-۲۰۰۵ء)

صدر محمد حسین ارشاد نے اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں حزب اختلاف کی جماعتوں کے پر زور اصرار پر صدارتی نظام کے بجائے دوبارہ پارلیمانی نظام حکومت کا اعلان کر دیا تھا۔ اسی بنا پر ۲۷ فروری ۱۹۹۱ء کو نئے پارلیمانی انتخابات ہوے، جن میں بیگم خالدہ ضیا کی قیادت میں ''بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی'' کے اتحاد نے کامیابی حاصل کی اور بیگم خالدہ ضیا ملک کی وزیر اعظم بن گئیں اور یوں ایک دفعہ پھر ملک میں جمہوری روایت کا احیا ہوگیا۔

خالدہ ضیاء کی ولادت ایک متوسط درجے کے تاجر

اسکندر محمد اور طیبہ محمد کے ہاں پاکستان میں ۱۹۴۵ء میں ہوئی۔ پندرہ برس کی عمر میں ان کی شادی ضیاء الرحمان سے ہوگئی (۱۹۶۰ء)، جو اس وقت پاکستانی فوج میں ایک افسر تھا۔ وہ اپنے خاوند کے قتل تک مکمل طور پر ایک گھریلو عورت رہی اور اس کی توجہ محض اپنے دو بیٹوں کی پرورش تک محدود رہی۔

جنرل ضیاء الرحمان کے قتل کے بعد، نائب صدر جسٹس عبدالستار ملک اور پارٹی دونوں کے صدر بن گئے، لیکن صرف چار ماہ کے بعد حسین ارشاد نے انہیں گھر بھیج دیا، تاہم پارٹی پر ان کی گرفت برقرار رہی۔ ستمبر ۱۹۸۳ء میں جسٹس عبدالستار نے خالدہ ضیاء کو اپنی جماعت میں، نائب صدر بنا دیا۔ فروری ۱۹۸۴ء میں جسٹس عبدالستار کے صدارت سے مستعفی ہونے کے بعد وہ پارٹی کی صدر بن گئیں، بیگم خالدہ ضیاء کی عملی سیاست کا آغاز اس وقت ہوا۔ جب انہوں نے دائیں بازو اور معتدل مزاج کی حامل سات سیاسی جماعتوں کو اپنے ساتھ ملا کر، حسین ارشاد کے خلاف عملی جدو جہد کا آغاز کیا۔ اس دوران میں انہیں تقریباً نو برسوں میں سات بار نظر بند کیا گیا، لیکن انہوں نے اس مہم کی شدت میں کمی نہ آنے دی۔

بیگم خالدہ ضیاء کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ بنگلہ دیش کی پہلی منتخب وزیر اعظم بنیں اور پارلیمانی نظام کی دوسری مرتبہ بحالی کے بعد، وہ پہلی طاقت ور وزیر اعظم کے طور پر سامنے آئیں۔

اہم مسائل: بیگم خالدہ ضیاء کے حکومت سنبھالنے کے فوراً بعد مئی میں زبردست طوفانی بارشوں اور سیلابی ریلے نے زبردست تباہی مچائی اور اڑھائی لاکھ افراد لقمہ اجل بنے۔ ملک میں سیاسی اور جمہوری تبدیلی آنے کے باوجود ہنگامے، ہڑتالیں اور محاذ آرائی بنگلہ دیش میں روز مرہ کا معمول بن گئی، بیگم خالدہ نے ان تمام باتوں پر قابو پایا، مختصراً اس دور کے اہم ترین مسائل درج ذیل ہیں:

(الف) اگست ۱۹۹۱ء میں پارلیمنٹ نے ایک بل کی منظوری دی جس کے تحت ملک میں سولہ سال سے قائم صدارتی نظام حکومت کو ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ پارلیمانی نظام حکومت نے لے لی۔

اس ترمیم کی منظوری ریفرنڈم کے ذریعے حاصل کی گئی۔ اس نئی ترمیم کی رُو سے صدر محض ریاست کا سربراہ قرار پایا اور اس کا پانچ سالہ مدت کے لیے انتخاب قومی اسمبلی کے ذریعے ہونا طے پایا۔

چنانچہ بیگم خالدہ ضیاء کی طرف سے نامزد امیدوار برائے صدارت عبدالرحمٰن بسواس کو اسمبلی نے صدر منتخب کرلیا۔

(ب) اب ضلعی نظام کا خاتمہ: اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے صدر حسین محمد ارشاد نے ۱۹۸۲ء میں "اب ضلعی نظام" قائم کیا تھا، جسے خالدہ ضیاء حکومت نے ۱۹۹۱ء میں ایک "صدارتی آرڈیننس" کے ذریعے ختم کر دیا؛ جس سے اختلاف کرتے ہوے صدر ارشاد کی جاتیو پارٹی اور شیخ حسینہ واجد کی عوامی لیگ نے احتجاج کیا۔ ان دونوں جماعتوں نے ۴ جنوری ۱۹۹۲ء کو صدر عبدالرحمان بسواس کے پارلیمنٹ کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کا بھی بائیکاٹ کیا۔۔۔ حسین ارشاد کی جاتیو پارٹی نے اس کے خلاف ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ میں اپیلیں بھی کیں، مگر دونوں اپیلیں خارج ہوگئیں (The Europa world، ۱/۲۰۵ے)۔

خالدہ ضیاء پر سیاسی دباؤ بڑھانے کے لیے شیخ حسینہ واجد نے جاتیو پارٹی کو اپنے ساتھ ملا کر اگست ۱۹۹۲ء قومی اسمبلی میں وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کا بل پیش کیا، مگر ناکامی ہوئی۔ اسی سال یکم نومبر ۱۹۹۲ء کو عوامی لیگ نے برسر اقتدار جماعت کے خلاف بہت بڑا جلوس نکالا اور ڈھاکہ کی سڑکوں پر مارچ کیا۔

۱۹۹۲ء میں جب حکومت نے قومیائی گئی صنعتوں کو

پرائیویٹائز کرنے کی کارروائی شروع کی تو اس کے خلاف لاکھوں مزدوروں نے احتجاج کیا اور سڑکوں پر مارچ کیا۔

اسی سال ڈھائی لاکھ اساتذہ نے تنخواہوں میں اضافے کے لیے ہڑتال کی اور ۱۸ فروری ۱۹۹۱ء کو حکومت کے خلاف بہت بڑا جلوس نکالا۔

(ج) جرائم اور شدت پسندی کی روک تھام: سیاسی نظام اور سیاسی حکومت کی بحالی کے باوجود ملک میں دہشت گردی کی وارداتیں جاری رہیں، حکومت نے اس سلسلے کو روکنے کے لیے یکم نومبر ۱۹۹۲ء کو ایک بل پارلیمنٹ سے منظور کرایا۔ جس کی رو سے حکومت کو دہشت گردی کی وارداتوں کے سدباب کے لیے خصوصی ٹربیونل قائم کرنے اور دہشت گردوں کے خلاف فوری اور مؤثر کارروائی کا اختیار حاصل ہوگیا۔ اس بل کی رو سے اس نوعیت کے مقدمات کی تحقیقات ۴۵ دنوں میں اور فیصلہ تین ماہ میں کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا...... اس موقع پر عوامی لیگ اجلاس سے غیر حاضر رہی۔

حکومت کی طرف سے اس سے قبل یکم اگست ۱۹۹۲ء کو بڑھتے ہوئے جرائم کی روک تھام اور دہشت گردی کی وارداتوں کا خاتمہ کرنے کے لیے، پورے ملک میں خصوصاً سرحدی علاقوں میں "آپریشن کلین اپ" شروع کیا گیا تھا، جس میں اس ماہ کے آخر تک اٹھارہ ہزار افراد گرفتار کیے گئے، (حوالہ مذکور)۔

(د) پروفیسر غلام اعظم کی ملک بدری کا مسئلہ: "عوامی لیگ" کی نشوونما چونکہ مکمل طور پر "احتجاجی" ماحول میں ہوئی تھی، اسی بنا پر شیخ مجیب الرحمان نے پاکستان کے خلاف اور ان کی صاحب زادی نے بنگلہ دیشی حکومتوں کے خلاف احتجاج کا سلسلہ جاری رکھا۔ بعض اوقات ایسے ایسے مسائل پر احتجاج کیا گیا جو ملک اور قوم سے مذاق کرنے کے مترادف ہیں۔ دسمبر ۱۹۹۲ء میں عوامی لیگ کی طرف سے جماعت اسلامی کے نئے امیر پروفیسر غلام اعظم کی بنگلہ دیش کی شہریت کے خلاف تحریک چلائی گئی۔ پروفیسر غلام اعظم ۱۹۷۱ء کے خطرناک حالات کو دیکھتے ہوئے پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ وہ شیخ مجیب الرحمان کے قتل پر ۱۹۷۶ء میں پاکستانی پاسپورٹ پر بنگلہ دیش گئے اور پھر وہیں بس گئے۔ انہوں نے بنگلہ دیشی حکومت کو اپنی شہریت کی بحالی کے لیے کئی درخواستیں دیں، مگر منظور نہ کی گئیں۔ اس دوران میں انہیں ملک چھوڑنے کا حکم دیا گیا، مگر انہوں نے اس بنا پر کہ ان کی اسی ملک میں پیدائش ہوئی ہے اور اسی ملک میں ان کی جائیداد ہے، ملک چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ ۲۶ مارچ ۱۹۹۲ء کو، عوامی لیگ کی ایک عوامی عدالت نے انہیں غدار قرار دے کر پھانسی کی سزا کا فیصلہ سنایا۔ عوامی لیگ کے دباؤ سے متاثر ہو کر، حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا۔ ان کا جرم یہ بتایا گیا کہ انہوں نے ۱۹۷۱ء میں پاکستانی فوج کا ساتھ دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی حکومت نے ان ۲۴ افراد کو بھی گرفتار کر لیا جنہوں نے عوامی لیگ کی عوامی عدالت میں پروفیسر صاحب کے خلاف فیصلہ سنایا تھا۔ اگلے ماہ کے وسط میں پارلیمنٹ میں ان کی شہریت پر عام بحث ہوئی، مگر عوامی لیگ نے اس اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا اور اعلان کیا کہ جب تک انہیں ملک بدر نہیں کیا جاتا، وہ اس وقت تک بائیکاٹ ختم نہیں کرے گی۔ ۱۶۔اپریل ۱۹۹۲ء کو ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ جب تک یہ بات ثابت نہ ہو جائے کہ انہوں نے یہاں غیر قانونی طور پر قیام کیا ہے اس وقت تک انہیں ملک بدر نہیں کیا جا سکتا۔ اس موقع پر عوامی لیگ نے پر تشدد مظاہروں کا سلسلہ جاری رکھا، جس کے دوران میں طلبہ کی سطح پر تصادم اور کئی طالب علموں کی ہلاکتوں کے افسوسناک واقعات پیش آئے۔ اسی دوران میں ۲۲ اپریل

۱۹۹۲ء کو ہائی کورٹ نے پروفیسر غلام اعظم کی شہریت بحال کر دی، اس کے خلاف حکومت نے سپریم کورٹ میں رٹ کی، مگر وہاں سے بھی رٹ خارج ہو گئی۔ یوں یہ مسئلہ حل ہوگیا۔

(ھ) برمی مسلمان مہاجرین کا مسئلہ: برما بنگلہ دیش کا ہمسایہ ملک ہے جس میں ابھی تک بدھ مذہب سے رکھنے والوں کی اکثریت ہے۔ ۱۹۹۰ء میں وہاں فوجی حکومت آگئی، جس نے برما میں صدیوں سے آباد مسلمانوں پر مظالم ڈھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس سے تنگ آ کر، ۱۹۹۱ء کے وسط میں ، برمی مسلمانوں نے اپنے ہمسایہ ملک بنگلہ دیش میں نقل مکانی شروع کر دی۔ چنانچہ نومبر ۱۹۹۱ء تک پچاس ہزار برمی مسلمان بنگلہ دیش میں پناہ لے چکے تھے۔ ستمبر ۱۹۹۲ء تک ان کی مجموعی تعداد تین لاکھ افراد تک جا پہنچی، بنگلہ دیش کی حکومت نے انہیں کاکس بازار کے علاقے میں کیمپوں میں آباد کیا، لیکن چونکہ ملک کی کمزور معیشت ان کا معاشی بوجھ اٹھانے کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے حکومت نے اقوام متحدہ کی طرف رجوع کیا، جس پر فروری ۱۹۹۲ء میں اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن برائے مہاجرین کے ایک وفد نے بنگلہ دیش کا دورہ کیا اور حکومت کو مالی امداد فراہم کی۔

اس کے ساتھ ہی حکومت نے اس مسئلے پر حکومت برما سے احتجاج کیا اور سفارتی ذریعے سے بھی یہ کوشش کی کہ برمی مسلمانوں پر مظالم کا سلسلہ بند کرایا جائے..... بالآخر ۲۳ اپریل ۱۹۹۲ء کو برما کے وزیر خارجہ نے بنگلہ دیش کا دورہ کیا اور اپنے ہم منصب سے طویل مذاکرات کے بعد ۲۷ اپریل کو ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ جس کی رو سے برمی حکومت ان تمام مہاجرین کو واپس لینے پر آمادہ ہو گئی۔ طے یہ پایا کہ یہ مہاجرین پانچ پانچ ہزار کی تعداد میں واپس جائیں گے اور حکومت برما انہیں ان کے علاقوں میں بسانے کے لیے ہر ممکن تعاون کرے گی، مگر مہاجرین کی اکثریت نے اس معاہدے کو مسترد کر دیا اور جبری انخلا سے بچنے کے لیے کیمپوں سے بھاگنا شروع کر دیا۔ حکومت نے ان کیمپوں پر پہرہ لگا دیا، مگر پھر بھی پندرہ ہزار مہاجرین روپوش ہوگئے۔ اس کے بعد بھی دونوں حکومتوں کے مابین مذاکرات کے کئی دور ہوے، بالآخر دونوں ملکوں کے اتفاق رائے سے یہ مسئلہ حل ہوا۔ اور یہ مہاجرین اپنے علاقوں میں واپس چلے گئے [رک بہ برما در تکملہ بذیل مادہ]۔

حکومت پر اپنا دباؤ بڑھانے کے لیے عوامی لیگ اور اس کی اتحادی جماعتوں نے فروری ۱۹۹۴ء کو پارلیمنٹ کی کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا، بعدازاں دسمبر ۱۹۹۴ء میں حزب اختلاف نے پارلیمنٹ سے استعفے دے دیئے، لیکن چونکہ حکومت کو پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل تھی۔ اس لیے اس نے آئینی حکومت کا سلسلہ جاری رکھا۔

ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۹۵ء میں حزب اختلاف کی جماعتوں نے، جن کی قیادت شیخ حسینہ واجد کر رہی تھی، ملک بھر میں وسیع پیمانے پر ہڑتالوں اور تالہ بندی کا سلسلہ شروع کر دیا جس کے نتیجے میں پولیس اور مظاہرین کے مابین تشدد آمیز جھڑپیں ہوئیں۔ حزب اختلاف کی سیاسی جماعتوں نے بیگم خالدہ کی نگرانی میں ہونے والے آئندہ انتخابات میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ ۲۴ نومبر کو وزیراعظم خالدہ ضیاء کی درخواست پر پارلیمنٹ کو تحلیل کر دیا گیا۔ صدر نے بیگم خالدہ ضیاء سے درخواست کی کہ وہ قائم مقام وزیر اعظم کی حیثیت سے کام کرتی رہیں، مگر اس کے باوجود حزب اختلاف نے دسمبر ۱۹۹۵ء اور جنوری ۱۹۹۶ء میں ہڑتالوں اور مظاہروں کا سلسلہ جاری رکھا اور انہوں نے ۱۵ فروری ۱۹۹۶ء کو منعقد ہونے والے انتخابات کا بائیکاٹ کردیا۔ ان انتخابات میں ڈالے گئے ووٹوں کی شرح

بہت کم رہی یعنی رجسٹرڈ ووٹوں میں سے ۱۰ سے ۱۵ فیصد تک کم رہی۔ حکمران پارٹی نے ۳۰۰ میں سے ۲۰۵ پر کامیابی حاصل کی۔ باقی سیٹوں پر گڑبڑ کی وجہ سے انتخابی مراحل مکمل نہ کیے جا سکے۔ مگر حزب اختلاف نے یہ نتائج تسلیم نہ کیے اور حکومت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک چلانے کا اعلان کیا۔

مجبور ہو کر خالدہ ضیاء نے ۳۰ مارچ ۱۹۹۶ء کو استعفیٰ دے دیا اور پارلیمنٹ تحلیل کر دی۔ صدر عبدالرحمان بسواس نے سابق چیف جسٹس محمد حبیب الرحمان کو قائم مقام وزیر اعظم مقرر کر دیا۔

۱۲ جون ۱۹۹۶ء کو عام انتخابات ہوے جن میں عوامی لیگ نے پارلیمنٹ کی ۳۰۰ میں سے ۱۴۶ نشستیں جیت لیں جب کہ خالدہ ضیاء کی "بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی" کے حصے میں ۱۱۶ نشستیں آئیں۔ جاتیادل نے ۳۲ اور جماعت اسلامی نے تین نشستیں جیتیں۔ ملک کی سب سے بڑی جماعت کی سربراہ ہونے کی بنا پر ۲۳ جون ۱۹۹۶ء کو شیخ حسینہ واجد نے ملک کی وزیراعظم کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ (The Europa world year book 2005، ۱/ ۷۰۵)۔

شیخ حسینہ واجد کے جماعتی صدارتی امیدوار شہاب الدین احمد بلا مقابلہ صدر منتخب ہوگئے۔

شیخ حسینہ واجد، شیخ مجیب الرحمان کی سب سے بڑی بیٹی ہیں۔ ان کی ولادت ۲۸ ستمبر ۱۹۴۷ء کو سابق مشرقی پاکستان کے گوپال گنج کے علاقے میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں "تنگی پارا" میں ہوئی، جہاں ان کے والد شیخ مجیب الرحمان کی ولادت ہوئی تھی؛ ان دنوں ان کا وہیں قیام تھا۔ ۱۹۶۸ء میں اس کی شادی ملک کے ایک معروف سائنس دان مسٹر ایم اے واجد میاں کے ساتھ ہوئی۔

شادی کے باوجود حسینہ شیخ نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں اپنی تعلیم جاری رکھی...... اس نے اس وقت یونیورسٹی میں، ایک طالب علم لیڈر کے طور پر اہمیت حاصل کر لی جب اس کے والد ملک کے وزیراعظم بنے۔ وہ طالب علموں اور اپنے والد کے درمیان رابطے کا کام کرتی رہی۔ اس وقت اسے ایڈن گرلز کالج کی یونین کا صدر بھی منتخب کیا گیا۔ یہ سیاسی تربیت بعد میں اس کے بڑے کام آئی۔

۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو جب باغی فوجیوں نے اس کے والد سمیت اس کے پورے خاندان کو قتل کیا، اس وقت وہ اپنے خاوند کے ہمراہ جرمنی میں تھی، اسی لیے وہ اس قتل عام سے بچ گئی۔

اس کی شہرت اور سیاسی زندگی کی ابتدا بھی، بیگم خالدہ ضیاء کی طرح جنرل حسین محمد ارشاد کے خلاف ۱۹۸۳ء میں ہونے والے مظاہروں کے دوران ہوئی۔ اسے ۱۹۸۱ء میں ہونے والے پارٹی انتخابات میں بطور صدر منتخب کیا گیا۔ اس طرح بنگلہ دیش کی سیاست میں وہ پہلی خاتون تھیں، جس نے سیاسی میدان میں قدم رکھا تھا۔ اس نے پہلے حسین محمد ارشاد کے خلاف اور پھر بیگم خالدہ ضیاء کے خلاف بڑے مؤثر طریقے پر تحریک چلا کر، اپنی شخصیت کا لوہا منوایا اور بائیں بازو خصوصاً روس اور چین نواز جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کیا۔ ۱۹۹۶ء میں اس کی جماعت کو واضح کامیابی ملنے پر وہ ملک کی وزیر اعظم بنیں۔

اس دور کے اہم واقعات: شیخ حسینہ واجد نے ملک کی وزیر اعظم کا منصب سنبھالا تو یہ عوامی لیگ کا دوسرا دور اقتدار تھا۔ یہ اقتدار اسے ۲۱ سالوں کی جدوجہد کے بعد ملا تھا، مگر اب صورت حال خاصی بدل چکی تھی۔ اب عوامی لیگ کو وہ حیثیت حاصل نہ تھی جو ۱۹۷۱ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک اسے حاصل رہی تھی۔ علاوہ ازیں بہت سے مسائل اسے ورثے میں ملے تھے، اسی لیے اس کے

لیے یہ دور بڑا کٹھن ثابت ہوا...... بہر حال اس دور کے اہم واقعات درج ذیل ہیں۔

(الف) گنگا کے پانی کی تقسیم کا معاہدہ: بھارت اور بنگلہ دیش کے مابین متنازع امور میں گنگا کے پانی کی تقسیم کا معاملہ سرفہرست رہا ہے۔ اگرچہ جنرل ضیاء الرحمٰن کے دور میں، دونوں ملکوں کے مابین ایک عبوری معاہدہ ترتیب پا گیا تھا، مگر اس بارے میں کوئی مستقل معاہدہ نہیں ہو سکا تھا۔ چنانچہ بنگلہ دیشی وزیراعظم کے دسمبر ۱۹۹۶ء میں دورۂ بھارت کے موقع پر دونوں ممالک کے مابین پانی کی تقسیم کا باقاعدہ معاہدہ ہوا، جس پر دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم نے اتفاق کیا، لیکن چونکہ اس معاہدے میں، جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے، گنگا کے زیادہ تر پانی پر بھارت کا حق تسلیم کیا گیا تھا، اس لیے حزب اختلاف نے اس معاہدے کو تسلیم نہیں کیا اور اس کے خلاف مارچ ۱۹۹۷ء میں زبردست مظاہرہ کیا، جس کے دوران ایک آدمی ہلاک اور کئی افراد زخمی ہوے۔

(ب) شیخ مجیب الرحمٰن کے قاتلوں سے انتقام: عوامی لیگ شیخ مجیب الرحمٰن کو بنگلہ بندھو، (قوم کا باپ) قرار دے کر ان کے لیے خاص احترام رکھتی ہے۔ اسی لیے اس جماعت کے منشور میں، ایک اہم مسئلہ شیخ مجیب الرحمٰن کے قاتلوں سے انتقام لینے کا بھی شامل تھا۔ نومبر ۱۹۹۶ء میں جاتیا سنگ ساد نے متفقہ طور پر اس کی منظوری دی۔ چنانچہ حسینہ واجد نے مارچ ۱۹۹۷ء میں شیخ مجیب الرحمان کے قاتلوں کو سزا دلوانے کی کارروائی شروع کی، جس کے نتیجے میں ۱۹ افراد کو بنگلہ بندھو کے قتل میں براہ راست ملوث ہونے کی بنا پر سزا سنائی گئی...... جن میں سے ۱۴ افراد مفرور تھے اور صرف چار افراد گرفتار تھے۔

(ج) تسلیمہ نسرین کا مسئلہ: بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والی، ایک ملحد خاتوں تسلیمہ نسرین نے ...... اپنی ایک کتاب میں ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کی، جس پر اس کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے، جس نے پورے عالم اسلام کو لپیٹ میں لے لیا، مگر یہ خاتون حکومت کی ملی بھگت کے ساتھ اگست ۱۹۹۴ء میں سویڈن بھاگ گئی۔ جہاں اسے شہریت دے دی گئی۔ عوام نے حکومت کی اس حرکت کو سخت ناپسند کیا اور اس کے خلاف کئی دنوں تک ہنگامے اور مظاہرے جاری رہے۔ ستمبر ۱۹۹۸ء میں چار سال سویڈن میں گزارنے کے بعد وہ خفیہ طور پر ملک میں واپس آگئی، جس کے بعد دوبارہ ہنگامے پھوٹ پڑے اور عوام نے اسے توہین رسالت کے جرم میں پھانسی دینے کا مطالبہ کیا۔ اس وقت عوامی لیگ کی حکومت تھی، ہائی کورٹ نے اسے فوری طور پر گرفتار کر کے پیش کرنے کا حکم دیا...... نومبر ۱۹۹۸ء کو وہ رضا کارانہ طور پر ہائی کورٹ میں پیش ہو گئی۔ عدالت نے اس کی ضمانت منظور کر لی، مگر وہ جلد ہی ۱۹۹۹ء میں، دوبارہ سویڈن فرار ہوگئی (The Europa world year book 2005، ۱/۷۰۵)۔

(د) بہاریوں کا مسئلہ: بنگلہ دیش کا قیام بغاوت اور کھلی جنگ کے ساتھ عمل میں آیا تھا اور پاکستان اور بنگلہ دیش کی حکومتوں کے مابین مذاکرات کی نوبت نہ آئی تھی۔ شیخ مجیب الرحمان کی پالیسی مکمل طور پر پاکستان دشمنی پر مبنی تھی، اسی لیے اس کے دور حکومت میں، اس طرف توجہ نہ دی گئی اور بعد کے حکمرانوں میں عوامی لیگ کی منفی سیاست کی بنا پر کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ وہ پاکستان کے ساتھ گفت و شنید کرتا، اس لیے دونوں ملکوں کے درمیان کئی مسائل تصفیہ طلب پڑے رہے، جن میں بہاریوں اور اثاثہ جات کی تقسیم کا مسئلہ سرفہرست ہے۔ قیام پاکستان کے وقت صرف بنگال کی تقسیم ہوئی تھی اور بہار اور آسام کی تقسیم نہ ہوئی تھی،

لیکن بہت سے بہاری اس موقع پر مشرقی پاکستان چلے گئے تھے۔ جیسے اترپردیش (یو۔پی) سے تعلق رکھنے والے لاکھوں مسلمان مغربی پاکستان آگئے تھے۔ مشرقی پاکستان میں آباد ہونے والے بہاریوں نے مشرقی پاکستان میں بس جانے کے باوجود اپنا تشخص برقرار رکھا اور مشرقی پاکستان کے مخصوص کلچر میں ضم نہ ہوسکے، اسی لیے بنگلہ دیش کے قیام کے وقت سے انہیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان لوگوں کا یہ مطالبہ ہے کہ انہیں پاکستان قبول کر لے۔ جبکہ حکومت پاکستان کا موقف یہ ہے کہ وہ پاکستان کے باشندے نہیں ہیں اور تقسیم کے وقت جو فارمولا طے ہوا تھا، اس کے تحت وہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے شہری ہیں۔ جبکہ دوسری طرف بنگلہ دیشی حکومت انہیں شہریت دینے کے لیے تیار نہیں۔ یہ لوگ وقتاً فوقتاً احتجاجی مظاہروں اور جلسے جلوسو ں کے ذریعے پاکستان اور بنگلہ دیش کی حکومتوں کو اس بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے دباؤ ڈالتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حسینہ واجد کی حکومت کے دور میں ۸ فروری ۱۹۹۹ء کو چار لاکھ بہاریوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ انہیں پاکستان میں آباد کرے، یا پھر بنگلہ دیش کی شہریت دے۔ مطالبات تسلیم نہ ہونے کی صورت میں انہوں نے دھمکی دی کہ وہ خود سوزی کر لیں گے۔ لیکن یہ مسئلہ ابھی تک حل طلب ہے اور بہاری کس مپرسی کے عالم میں انتہائی پریشانی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

(۲۰۰۷ء میں بنگلہ دیش حکومت نے انہیں بنگلہ دیش کی شہریت دینے کا اعلان کیا ہے۔ جس سے ۳۵ سالوں سے حل طلب مسئلے کے حل کی امید پیدا ہوگئی ہے)۔

اس دور کا اہم واقعہ مارچ ۱۹۹۹ء کو ڈھاکہ میں ہونے والا آٹھ ترقی پذیر ممالک کے سربراہوں کا اجلاس ہے۔ اجلاس کے اختتام پر اعلامیہ میں رکن ملکوں کے مابین اتحاد پر زور دیا گیا، نیز باہمی مشاورت، باہمی احترام، سماجی، اقتصادی ترقی کو فروغ دینے، لڑائی جھگڑے کی بجائے باہمی مذاکرت، تجارت، دیہی ترقی، صحت، ماحولیات اور زراعت کے شعبوں میں باہمی تعاون پر زور دیا گیا۔

(ھ) بنگلہ دیش کی سیاست اور معیشت میں سیلابوں اور طوفانوں نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے، سیلابوں سے ہونے والی تباہی پر حکومت کے خلاف حزب اختلاف کو تنقید کرنے اور احتجاجی سیاست چمکانے کا موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ اگست ۱۹۹۸ء میں تباہ کن سیلاب آیا جس میں ہزاروں افراد ہلاک ہوئے اور لاکھوں بے گھر ہوئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق سیلاب میں ۲۲ کروڑ ڈالر کی جائیداد کو نقصان پہنچا۔ حکومت نے سیلاب سے ہونے والے نقصانات کا ازالہ کرنے کے لیے بین الاقوامی امداد کی درخواست کی۔

(و) حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک کا آغاز: عوامی لیگ نے خالدہ ضیاء کی حکومت کے خلاف احتجاجی سیاست کا رویہ اپنایا تھا۔ کچھ اس کی بنا پر اور کچھ عوامی لیگ کی بھارت نوازی اور عوام کش پالیسیوں کی بنا پر جنوری ۱۹۹۹ء میں حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والی بنگلہ دیش کی تین جماعتوں بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی، جاتیو پارٹی اور جماعت اسلامی نے حسینہ اجد کی حکومت کے خلاف اتحاد قائم کر کے مشترکہ لائحہ عمل اپنانے کا فیصلہ کیا۔ اتحاد نے پارلیمنٹ سے مستعفی ہونے اور نئے انتخابات کے انعقاد اور گرفتار سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا، لیکن حکومت نے ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اعلان کیا کہ انتخابات مقررہ وقت پر ہی ہوں گے۔

تاہم حزب اختلاف نے احتجاج جاری رکھا اور فروری ۱۹۹۹ء میں بلدیاتی انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ اس بائیکاٹ کو مؤثر بنانے کے لیے انتخابات کے تینوں دنوں

(۲۳،۲۴،۲۵فروری ۱۹۹۹ء) کو عوام سے ہڑتال کی اپیل کی، جو کافی حد تک کامیاب رہی۔ ڈھاکہ، کھلنا اور سلہٹ میں انتخابی مراکز پر حملوں میں پولیس کی فائرنگ سے ۶ افراد ہلاک اور ۲۵۰ زخمی ہوئے۔

۱۶ مئی ۱۹۹۹ء کو حزب اختلاف کی رہنما بیگم خالدہ ضیاء نے حکومت کی پالیسیوں کے خلاف احتجاجی مارچ شروع کیا، اسی دوران اگست ۱۹۹۹ء میں حکومت نے بھارت سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت بھارتی حکومت کو بنگلہ دیش کے راستے اپنا سازوسامان بھارت کے دور دراز کے شمال مشرقی صوبوں کو بھجوانے کا اختیار دیا گیا۔ یہ بھارت نوازی کی انتہا تھی اور دوسرے ملک کو اپنے ملک میں مداخلت کا حق دینا تھا۔ اسی لیے اس معاہدے کے خلاف ۱۳ ستمبر ۱۹۹۹ء کو ڈھاکہ اور دوسرے شہروں میں شدید مظاہرے ہوئے اور حکومت کے خلاف جلسے اور جلوس نکالے گئے۔ مظاہرین نے درجنوں گاڑیاں بھی جلا دیں۔ پولیس نے مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے گولی چلائی جس سے صرف ڈھاکہ میں ۱۵۰ سے زائد افراد شدید زخمی ہوئے۔ حکومت کے ایک ترجمان نے یہ موقف اختیار کیا کہ بھارت کو کوئی راہداری نہیں دی گئی، بلکہ ابھی صرف بات چیت ہوئی ہے۔ حکومت کے مطابق بھارت یہ سہولت لینے کے عوض بنگلہ دیش کو بھاری زرمبادلہ دے گا اور ہزاروں افراد کو روزگار کے مواقع حاصل ہوں گے کیونکہ بھارتی حکومت راہداری حاصل کر کے کم از کم بارہ سو میل کا خرچ بچا سکتی ہے۔ بھارت اور بنگلہ دیش کے عوام کے درمیان رابطوں کو مؤثر بنانے کے لیے دونوں حکومتوں نے ڈھاکہ اور کلکتہ کے مابین بس سروس بھی شروع کر دی، جس سے بنگلہ دیش میں بھارتی باشندوں کی آمد میں اچانک اضافہ ہو گیا، مگر حزب اختلاف کی جماعتوں نے اس پر تنقید جاری رکھی اور (۲۳ تا ۲۹ ستمبر ۱۹۹۹ء) کے دنوں میں مظاہرین نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ان سمجھوتوں کو منسوخ کرے اور بھارت کو راہ داری دینے کا فیصلہ واپس لے۔ علاوہ ازیں بیگم خالدہ ضیاء نے وزارتوں کے گھیراؤ کا بھی اعلان کیا۔ جنوری میں حزب اختلاف نے پارلیمنٹ کی کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا۔

یہ سلسلہ آئندہ سال بھی جاری رہا۔ ۲ جنوری ۲۰۰۰ء کو بنگلہ دیش میں اپوزیشن کی اپیل پر دو دنوں کی کامیاب ہڑتال ہوئی، جس کے نتیجے میں سیاسی کارکنوں اور پولیس کے مابین جھڑپوں میں پچاس سے زائد افراد زخمی ہوگئے۔ شیخ حسینہ واجد کی حکومت نے حزب اختلاف کی جانب سے مسلسل مخالفت اور امن عامہ کو خراب کرنے کی کوشش پر قابو پانے کے لیے ۲۹ جنوری ۲۰۰۰ء کو پبلک سیفٹی بل کی منظوری دی، جس میں فوری سماعت کرنے والی خصوصی عدالتوں کی ضلعی سطح پر درج ذیل آٹھ جرائم کے مرتکب افراد کو سزا دینے کا اختیار دیا گیا: (۱)دہشت گردی؛ (۲) کسی کی جائیداد پر ناجائز قبضہ؛ (۳) اغوا برائے تاوان؛ (۴) گاڑیوں اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے؛ (۵) ٹریفک میں رکاوٹ ڈالنے؛ (۶) سرکاری امور میں مداخلت کرنے؛ (۷)حکومت کے خلاف عوام کو بھڑکانے اور اکسانے اور (۸) واجبات کی عدم ادائیگی وغیرہ۔

یہ بل حزب اختلاب کی اہم جماعتوں، مثلاً BNP اور اس کی حلیف جماعتوں کی غیر موجودگی میں بہت تیزی سے منظور کیا گیا، جس پر مخالف جماعتوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ یہ بل حکومت کی بڑھتی ہوئی مخالفت کی بنا پر حزب اختلاف کے خلاف استعمال ہوگا، چنانچہ ۸ فروری ۲۰۰۰ء کو بنگلہ دیش کی اہم سیاسی جماعتوں نے ڈھاکہ میں پبلک سیفٹی بل کے خلاف نو گھنٹے کی بھوک ہڑتال کی اور دھرنا دیا۔

خالدہ ضیاء نے حکومت کے خلاف مہم جاری رکھی اور ۱۲ فروری ۲۰۰۰ء کو ایک پرہجوم مظاہرے میں قومی

اسمبلی تحلیل کرنے اور عام انتخابات جلد کرانے کا مطالبہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ اسمبلی اب بے اثر ہو کر رہ گئی ہے، انہوں نے متنازعہ پبلک سیفٹی بل کے بارے میں یہ کہا کہ یہ بل مخالفین کو ہلاک کرنے اور ان پر جھوٹے مقدمات چلانے کے لیے منظور کیا گیا ہے۔

بالآخر عوامی دباؤ پر وسط جولائی ۲۰۰۱ء میں حکومت نے استعفیٰ دے دیا اور اسمبلی تحلیل کر دی گئی۔ یکم اکتوبر ۲۰۰۱ء کو پارلیمانی انتخابات ہوے جس میں چار جماعتی اتحاد نے، جس کی قیادت بنگلہ دیش قومی جماعت (BNP) کی رہنما بیگم خالدہ ضیاء کر رہی تھیں، دو تہائی اکثریت سے کامیابی حاصل کر لی۔ اسے ۳۰۰ میں سے ۲۱۴ نشستوں پر کامیابی ملی۔ جب کہ بیگم حسینہ واجد کی سربراہی میں عوامی لیگ کو کل ۶۲ نشستیں ملیں۔ بنگلہ دیش قومی پارٹی (BNP) نے بذات خود ۱۹۱ نشستوں پر کامیابی کا دعویٰ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے جماعت اسلامی (کل ۱۷ نشستیں) جاتیو پارٹی (کل چار نشستیں) اور اسلامک اوکیاجوٹ (کل دو نشستیں) کے ساتھ اتحاد قائم کر لیا۔ اس طرح بیگم خالدہ آسانی سے دوبارہ وزیراعظم منتخب ہو گئی ہیں.

الیکشن کمیشن کے مطابق انتخابات میں ۷۵ فیصد ووٹ ڈالے گئے۔ عوامی لیگ نے انتخابات کے ان نتائج کو مسترد کر دیا اور اس کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ سال کے باقی دنوں میں تشدد کا سلسلہ جاری رہا۔ ۲۰ جنوری ۲۰۰۲ء کو ڈھاکہ میں کمیونسٹ پارٹی کی ایک ریلی میں ایک بم دھماکہ ہوا جس میں چار افراد مارے گئے اور ۵۰ زخمی ہوے۔ ۱۴ اپریل کو ایک اور دھماکے میں ۹ افراد مارے گئے اور ۵۰ زخمی ہوے، جب کہ ۱۶ جون کو نرائن گنج میں ہونے والے ایک دھماکے میں ۲۲ افراد مارے گئے.

بدرالضحیٰ چوھدری کے بعد ۵ ستمبر ۲۰۰۲ء کو آج الدین انتخابات میں بلامقابلہ صدر منتخب ہوگئے اور آج (دسمبر ۲۰۰۵ء) تک وہی اس عہدے پر برقرار ہیں.

بنگلہ دیش اور بھارت کے تعلقات میں اس وقت بڑی ڈرامائی تبدیلی پیدا ہوئی۔ جب ۱۷۔ اپریل ۲۰۰۲ء کو بنگلہ دیش کی سرحدی سکیورٹی فورسز نے اچانک حملہ کر کے ایک سرحدی چوکی پر قبضہ کر لیا۔ جس پر بھارت نے گذشتہ ۳۰ برسوں سے قبضہ جما رکھا تھا۔ جوابی اقدام کے طور پر بھارتی افواج نے ایک اور سرحدی چوکی پر حملہ کر دیا، جس میں سولہ بھارتی فوجی مارے گئے اور یوں دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات انتہائی کشیدہ ہوگئے۔ تاہم بنگلہ دیش کو سرحدی چوکی واگذار کرنا پڑی۔ اس کے باوجود پورے سال سرحدی فضا کشیدہ رہی (محفوظ اتم، مقالہ بنگلہ دیش، در Year Book of Encyclopeadia Britannica، برائے سال ۲۰۰۵ء، ص ۳۹۳).

دوسری طرف BNP میں بھی اکھاڑ پچھاڑ کا عمل جاری رہا...... پارٹی کے سیکرٹری کو، اس بنا پر کہ وہ جنرل ضیاء الرحمٰن کی برسی پر اس کی قبر پر نہیں گیا استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا اور اس کا استعفیٰ غیر قانونی طور پر منظور کر لیا گیا...... دو دن کے بعد بیگم خالدہ نے اپنے بیٹے طارق رحمان کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل تعینات کر دیا.

اکتوبر ۲۰۰۰ء میں بڑھتے ہوے جرائم کے خلاف ایک خصوصی مہم شروع کی گئی، جس میں چالیس ہزار فوجی جوانوں کو بھی پولیس کی مدد کے لیے تعینات کیا گیا۔ اس مہم کے دوران پینتیس چالیس ہزار افراد گرفتار کیے گئے۔ جن میں دو سابقہ وفاقی وزراء بھی شامل تھے...... بہت سے لوگ فوج کی تحویل میں ہلاک ہوگئے۔ جس کے خلاف عوامی لیگ نے سخت احتجاج کیا (The Europa world year book 2005، ۱/۷۰۷)۔ حکومت نے ۲۰۰۳ء کے اوائل میں بلدیاتی انتخابات کروائے جس کی

انتخابی مہم کے دوران ۵۰ افراد مارے گئے اور ۶۰۰۰ سے زیادہ زخمی ہوے۔ ملک میں امن و امان کی صورت حال دن بدن خراب ہوتی گئی، حتیٰ کہ اگست میں عوامی لیگ کے دو سرکردہ رہنماؤں کو کھلنا میں قتل کر دیا گیا۔ جس کے خلاف عوامی لیگ نے ڈھاکہ سمیت پورے ملک میں ہڑتال کرائی اور احتجاج کیا۔

مئی ۲۰۰۴ء میں آئین میں چودھویں ترمیم لائی گئی جس کے ذریعے جاتیا سنگ ساد (پارلیمنٹ) میں نشستوں کی تعداد تین سو سے بڑھا کر ۳۴۵ کر دی گئی...... جن میں سے ۴۵ نشستیں خواتین کے لیے مخصوص ہیں مگر عوامی لیگ سمیت دوسری جماعتوں نے ووٹنگ کا مقاطعہ کیا۔

اگست ۲۰۰۴ء میں عوامی لیگ پر گرنیڈ حملہ ہوا۔ جس میں بیس افراد مارے گئے اور شیخ حسینہ واجد سمیت اس کے کئی قائدین زخمی ہوے۔ عوامی لیگ نے اس حملے کا الزام حکومت پر عاید کیا اور اس کے خلاف کامیاب ہڑتال کروائی...... بعدازاں ”حکمت جہاد“ نامی ایک تنظیم نے اس حملے کی ذمہ داری قبول کرلی۔

خالدہ ضیاء کے دور میں پاکستان کے ساتھ تعلقات میں مزید بہتری آئی اور جولائی ۲۰۰۲ء کے اواخر میں صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے بنگلہ دیش کا دورہ کیا۔ جس کے دوران انہوں نے ۱۹۷۱ء کی بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے دوران ہونے والی ہلاکتوں پر اظہار افسوس کیا۔

اس کے ساتھ ساتھ بھارت کے ساتھ معاملات میں بھی کچھ بہتری آئی اور اکتوبر ۲۰۰۳ء میں دونوں ملکوں کے مابین گنگا کے پانی کی تقسیم کے حوالے سے ایک اور معاہدہ پر دستخط ہوے (کتاب مذکور، ۷۰۹/۱)۔

جہاں تک اقتصادی صورت حال کا تعلق ہے تو اس کی بہتری کے متعلق متضاد خبریں ہیں۔ ان سالوں میں بنگلہ دیش کی فی کس پیداوار (GDP) کی شرح ۶٫۰۴ کی سطح تک جاپہنچی جو اب تک حاصل ہونے والی عوامی پیداوار کی سب سے اچھی شرح ہے۔ بایں ہمہ افراط زر کی شرح بدستور ۹ اء رہی۔ ۲۰۰۶ء میں بنگلہ دیش میں زراعت کی پیداوار غیر معمولی طور پر زیادہ ہوئی۔ یہ اقتصادی اور نفسیاتی پہلو سے تبدیلی کا واضح اشارہ ہے۔ تاہم بین الاقوامی سطح پر حکومت کی طرف سے مہنگے داموں قرض لینے کا سلسلہ جاری رہا اور ملک کے زرمبادلہ کے ذخائر خطرناک حد تک یعنی صرف پانچ کروڑ ڈالر رہ گئے (کتاب مذکور، ص ۳۹۳)۔

۲۰۰۷ء کے شروع میں خالدہ ضیاء کی حکومت نے استعفیٰ دے دیا ہے اور اب (دسمبر ۲۰۰۷ء) تک وہاں نگران حکومت قائم ہے۔

مآخذ: (الف) بنگلہ دیش کے قیام میں عوامی لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں کے متعلق دیکھیے:(۱) عبدالمنان (سیکرٹری اشاعت عوامی لیگ) : Manifesto of All Pakistan Awami League، ڈھاکہ ۱۹۷۰ء؛ (۲) شیخ مجیب الرحمان:Our Right to live 6-Point Formula؛ (۳) تاج الدین حمد (سیکرٹری عوامی لیگ): Annual Council Session of Bangladesh Awami League 1972: The Report of Mr. Tajuddin Ahmed, General Secretary, Bangladesh Awami League، طبع عبدالمومن ڈھاکہ ۱۹۸۲ء؛ (۴) Election Manifesto of Bangladesh Awami League، ڈھاکہ ۱۹۷۳ء؛ (۵) محمد الیاس خوندکر: Mujibbad (Mujibism)، ڈھاکہ ۱۹۷۲ء؛ (۶) Consitution of the East Pakistan Provincial Muslim League، مطبوعہ ۱۹۵۲ء؛ (۷) Manifesto of the Pakistan Muslim League،

مطبوعہ پاکستان مسلم لیگ کونسل، ڈھاکہ ۱۹۶۴ء؛ (۸) نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ: Declaration of Objectives، ڈھاکہ ۱۹۶۴ء؛ (۹) Manifesto of the Pakistan Democratic Party، مطبوعہ پاکستان ڈیمو کریٹک پارٹی ڈھاکہ ۱۹۶۹ء؛ (۱۰) Aims and Objectives of East Pakistan Jamiat-e-Ulema-e-Islam and Nizam-i-Islam Party، مطبوعہ ڈھاکہ، بدوں تاریخ؛ (۱۱) Election Manifesto of the Pakistan People's Party 1970، ورک پبلی کیشنز لمیٹڈ کراچی، ۱۹۷۰ء؛

(ب) بنگلہ دیش کے قیام سے متعلق حالات و واقعات کے لیے دیکھیے: (۱۲) ذوالفقار علی بھٹو: The Great Tragedy، مطبوعہ پاکستان پیپلز پارٹی، کراچی ۱۹۷۰ء؛ (۱۳) ایم۔ رفیق الاسلام: The Bangladesh Libration Movement: مطبوعہ جولائی ۱۹۸۷ء، ڈھاکہ بنگلہ دیش؛ (۱۴) فلک در منیر الزمان: The Bangladesh Revolution and Its aftermath، بار اول ۱۹۸۰ء و بار دوم ۱۹۸۸ء، ڈھاکہ، بنگلہ دیش؛ (یہ کتاب اپنے مصنف کے متوازن رویئے کی بنا پر انتہائی اہم کتاب ہے)؛ (۱۵) منیر احمد منیر: المیہ مشرقی پاکستان، پانچ کردار، آتش فشاں پبلی کیشنز، جنوری ۱۹۹۷ء؛ (اس کتاب میں آغاز محمد علی (برادر یحیٰی خان)، یحیٰی خان، جنرل گل حسن، ائیر مارشل اے رحیم اور میجر نادر پرویز کے انٹرویوز شامل ہیں)؛ (۱۶) صدیق سالک: میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، بار نہم ۱۹۹۲ء (اس عنوان پر ایک اہم کتاب جس میں دوران جنگ میں افواج پاکستان کے حالات پر بحث کی گئی ہے)؛ (۱۷) سعید الدین: مشرقی پاکستان کا زوال، مئی ۱۹۷۹ء (اس موضوع پر ایک عمدہ دستاویز)؛ (۱۸) محمد حنیف شاہد: مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش، اپریل ۱۹۷۶ء، لاہور؛ (اس کتاب میں ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے حالات دیئے گئے ہیں)؛ (۱۹) میاں محمد افضل: سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک (تاریخ میں ملت اسلامیہ کو پیش آنے والے خونچکاں حادثات کا عبرت آگیں تذکرہ)، خصوصاً باب ۱۷، سقوط ڈھاکہ (ص: ۴۳۱-۵۲۰)؛ (۲۰) صدیق سالک: ہمہ یاران دوزخ (بھارت میں قید پاکستانی فوجیوں کے حالات) لاہور ۱۹۷۴ء؛ (۲۱) حکومت پاکستان: قرطاس ابیض (مشرقی پاکستان میں کیا ہوا) اگست ۱۹۷۱ء؛ (۲۲) صفدر محمود: Pakistan devided، لاہور؛ (۲۲) احمد۔ ایم: Government and Politics in Pakistan، کراچی، ۱۹۷۰ء؛ (۲۳) ایوب محمد و دیگر (مدیران): Bangladesh-A struggle for Nationhood. نئی دہلی، ۱۹۷۱ء؛ (۲۴) ایوب محمدو کے سبرامنیم: The Liberation War، نئی دہلی ایس چاند اینڈ کمپنی ۱۹۷۲ء؛ (۲۵) بنرجی ڈی: East Pakistan- A Case study in Muslim politics؛ (۲۶) بھٹنا گروالے (مدیر): Bangladesh- Birhof a nation؛ نئی دہلی ۱۹۶۹ء؛ (۲۷) Buchheit, L.Secession: The Legitimecy of Self-Determination، ۱۹۷۸ء؛ (۲۸) G.W.Choudhury: The Last days of United Pakistan، لنڈن ۱۹۷۴ء؛ (۲۹) Choudhury, S.R.: The Gensis of Bangladesh، ایشیا پبلی کیشنز، نیو یارک ۱۹۷۲ء؛ (۳۰) Crawford, J: The Creation of States in International Law، لنڈن ۱۹۷۹ء؛ (۳۱) Gill,S: The Discovery of Bangladesh، ۱۹۵۷ء؛ (۳۲) INt'l. Com.Jurists: The events in East Pakistan، جنیوا، ۱۹۷۱ء؛ (۳۳) Jackson,R: South Asian Crisis، ۱۹۷۵ء؛ (۳۴) Mankekar, D.: Pak Colonialism in East Bangal، نئی دہلی

Sexena, J(۳۵): Self-Determination: from ۱۹۷۱ء؛ Biafra to Bangladesh، بمبئی ۱۹۷۵ء؛ (۳۶) خارجی اطلاعات ڈویژن، وزارت خارجہ حکومت بنگلہ دیش: Bangladesh: Contemporary Events and Cocument, ۱۹۷۱ء؛ (۳۷) Bangladesh Documents، دوجلدیں مطبوعہ وزارت خارجہ، حکومت ہند دہلی؛ (۳۸) وزارت اطلاعات و قومی امور حکومت پاکستان: White Paper on the Crisis in East Pakistan، اسلام آباد، ۵ اگست ۱۹۷۱ء؛

(ج) طلبہ تنظیموں اور ان کے کردار کے متعلق خصوصاً دیکھیے : (۳۹) شیخ فضل الحق (مونی) جنرل سیکرٹری) مشرقی پاکستان سٹوڈنٹس لیگ: Report of the General Secretary، مطبوعہ ڈھاکہ (ب۔ ت)؛ (۴۰) درمر: (Durmar) Anthology on 21 Febrary، مشرقی پاکستان سٹوڈنٹس لیگ ۱۹۷۰ء؛

(د) اس موضوع پر عوامی دستاویزات کے لیے دیکھیے: (۴۱) Assembly Proceedings, East Bangal Legislative Assembley, Official Reports (1948-1952)، مشرقی پاکستان گورنمنٹ پریس، ڈھاکہ؛ (۴۲) Report of th East Bangla League Committee، ڈھاکہ ۱۹۴۹ء؛ (۴۳) Assembly Proceedings, East Pakistan Assembly Official Reports. 1955-1958؛ مشرقی پاکستان گورنمنٹ پریس ڈھاکہ؛ (۴۴) Constituent Assembly Debates of Pakistan Official reports, 1949-1954، مینیجر پبلی کیشنز گورنمنٹ پاکستان پریس کراچی؛ (۴۵) National Assembly of Pakistan, Parlimentary Debates, Official Report 1956-1958، پاکستان پریس، کراچی؛ (۴۶) الیکشن کمیشن آف پاکستان: Presidential Election Result, 1965، راولپنڈی ۱۹۶۵ء؛ (۴۷) شعبہ فلم و مطبوعات وزارت اطلاعات و قومی امور حکومت پاکستان: White Paper on East Pakistan، ڈھاکہ: اگست ۱۹۷۱ء؛ (۴۸) صدارتی حکم نامہ نمبر ۸ مجریہ ۱۹۹۲ء حکومت بنگلہ دیش غیر معمولی گزٹ جنوری ۱۹۷۲ء ڈھاکہ؛ (۴۹) President's Order No.9 of 1972: Bangladesh Collaborators، ۲۶ جنوری ۱۹۷۲ء، ڈھاکہ؛ (۵۰) Report of the Constitution Drafting Committee ، بنگلہ دیش غیر معمولی گزٹ، ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء، ڈھاکہ؛ (۵۱) Constitution of the People's Republic of Bangladesh، دسمبر ۱۹۷۲ء، ڈھاکہ؛ (۵۲) وزارت اطلاعات نشریات انڈیا، شعبہ مطبوعات: Bangladesh Documents، نیو دہلی؛ (۵۳) Bangladesh and Indo-Pak War: India Speaks At the U.N، شعبہ مطبوعات: وزارت و اطلاعات و نشریات حکومت ہند: جنوری ۱۹۷۲ء، نیو دہلی؛ (۵۴) The 14-day war، حکومت ہند ، نئی دلی ۱۹۷۲ء؛ (۵۵) Soviet Union and the struggle of the Bangladesh people, Officia oocument and Articles from the Soviet Press Soviet Review Supplement Vol.IX، جنوری ۱۹۷۲ء؛

خصوصی کتب. (۵۶) کرنل محمد احمد: My Chief, Lahore، لاہور ۱۹۶۰ء؛ (۵۷) احمد قمر الدین: A Social History of East Pakistan، کریسنٹ بک سنٹر ۱۹۶۷ء؛ (۵۸) چوہدری جی۔ ڈبلیو: Constitutional Development in Pakistan، لنڈن ۱۹۶۹ء؛ (۵۹) رونق جہان: Pakistan: Failure in National integration، نیو یارک کولمبیا یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۲ء؛ (۶۰) جنرل محمد ایوب خان: Friends not Masters: A

Political Autobiography، کراچی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۶۷ء؛ (۶۱) Report (From April to December 1971)؛ (۶۲) Bangladesh: Classified and Annotated Bibliography in English and Bengali؛ (۶۳) چوہدری خالد: Genocide in Bangladesh، نئی دہلی اورینٹ لانگ مین، ۱۹۷۲ء؛ (۶۴) کیمونسٹ پارٹی انڈیا (مارکسٹ): The Party and the Struggle of Banghladesh، کلکتہ ۱۹۷۲ء؛ (۶۵) منیشا گرو تھلے پرائیویٹ لمیٹڈ کلکتہ: The role of Soviet Union in the Liberation struggle of Bangladesh، ۱۹۷۲ء؛ (۶۶) Mukherjee, S.K: Bangladesh and International Law, Calcutta، مغربی بنگال پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کلکتہ، ۱۹۷۱ء؛ (۶۷) Mr.Nikoloon: Bangladesh; The Birth of a Nation, مدراس ۱۹۷۲ء؛ (۶۸) Palit, Major-General D.K: The Lighting campaign: Indo-Pakistan war 1971، تھامسن پریس، نیو دہلی ۱۹۷۱ء؛ (۶۹) Verma, S.P: Banghadesh and the emerging internatinal plitical sysem، Horold laski institute of political science، احمد آباد ۱۹۷۲ء؛

خصوصی شمارہ جات: (۷۰) ہفت روزہ صحافت، غدار یحیٰی خان نمبر، جنوری ۱۹۷۸ء؛ (۷۱) وہی رسالہ، سقوط مشرقی پاکستان نمبر، ۶۔۱۳ دسمبر ۱۹۷۷ء؛ (۷۲) ہفت روزہ آثار، ۳ نومبر ۱۹۷۷ء؛ نیز اس عرصے کے اخبارات و جرائد وغیرہ؛

(محمود الحسن عارف)

••-------------••

⊗ **بنیاد پرستی:** انگریزی اصطلاح Fundamentalism کا لفظی ترجمہ، کیونکہ اردو میں یہ اصطلاح مروج نہیں۔ عربی میں بھی اس کا لفظی ترجمہ 'الاصولیہ' اب استعمال ہونے لگاہے ورنہ عربی میں بھی اس سے پہلے اس مفہوم کی کوئی اصطلاح موجود نہیں تھی، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فنڈامنٹلزم کا مفہوم اسلامی روایت میں کبھی موجود نہیں رہا۔ فنڈامنٹلزم کا مطلب دین کے بنیادی اصولوں سے تمسک ہے۔ اس اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے ان عیسائی عالموں کے لیے کیا گیا جنہوں نے بیسویں صدی کی ابتدا میں مغرب، خصوصاً امریکہ میں، لادینیت (سیکولرازم) ، جدیدیت (ماڈرن ازم) اور آزاد روی (لبرل ازم) کی بڑھتی ہوئی لہر اور مذہب کی پسپائی کے خلاف بند باندھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۵ء ایک سلسلۂ کتب بعنوان The Fundamentals : A Testimony to the Truth شائع کیا، جس میں یہ موقف اختیار کیا کہ بائبل کا ہر حرف سچ ہے اور اس میں کوئی چیز خلاف حقیقت نہیں (اس لیے کہ بہت سے سائنسی حقائق بائبل کی تعلیمات کو جھٹلا رہے تھے)۔ ان لوگوں کو بنیاد پرست (Fundamentalists) کہا جانے لگا (عیسائی بنیاد پرستی کی تفصیلات کے لیے دیکھیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا امریکانا بذیل مادہ)۔

۱۹۷۰ء کی دہائی تک یہ لفظ دوسرے مذاہب کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جیسے ہندو فنڈامنٹلزم اور یہودی فنڈامنٹلزم۔ یہاں تک کہ ایک دانشور نے سیکولرازم کے بنیادی اصولوں سے تمسک کو بھی 'سیکولر فنڈا میٹلزم' کہہ دیا (دیکھیے Ernest Gellner : Post Modernism, Reason and Religion ، لنڈن ۱۹۹۲ء)۔ یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں مسلم بنیادی پرستی (Muslim Fundamentalism) یا اسلامی بنیاد پرستی (Islamic Fundamentalism) کی اصطلاحات بھی یورپ اور امریکہ میں عام استعمال کی جانے لگیں۔ ان کا اطلاق عام طور پر مسلم ممالک کی ان

دینی تحریکوں پر کیا جانے لگا جو مسلم معاشرے میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی اصولوں کی پابندی پر زور دیتی ہیں، جیسے عالم عرب میں الاخوان المسلمون اور حزب التحریر وغیرہ۔ خاص طور پر ان کا نشانہ وہ دینی تحریکیں بنیں، جنہوں نے مسلم (اور غیر مسلم) حکومتوں کے ظلم و تشدد سے تنگ آ کر جواباً مزاحمت اور تشدد کا راستہ اپنا لیا جیسے فلسطین کی انتفاضہ، لبنان کی حزب اللہ، مصر کی الہجرۃ والتکفیر اور الجزائر کا نیشنل سالویشن فرنٹ وغیرہ۔ اسی طرح مسلم دینی تحریکوں کو تشدد اور انتہا پسندی سے مربوط کر کے یورپ اور امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کیا گیا اور کیا جا رہا ہے جس کے پیچھے خصوصاً یہودی سرمایہ اور مفادات ہیں تاکہ مغرب میں اسرائیل کی حمایت جاری رکھی جا سکے اور بڑھتی ہوئی مسلم آبادی اور اس کے مثبت اثرات کا راستہ روکا جا سکے اور عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کو تنہا اور بدنام کیا جاسکے۔

جہاں تک مغرب میں اس اصطلاح (مسلم بنیاد پرستی) کے استعمال کا تعلق ہے تو سیاسی اور صحافیانہ پروپیگنڈے سے قطع نظر علمی حلقوں میں وہاں اس کے بارے میں دو رجحان پائے جاتے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر وہ ہے جس کے قائل ڈاکٹر فضل الرحمٰن، R.Hrair Dekmejian اور John O.Voll وغیرہ ہیں کہ بنیاد پرستی یا بنیادی اصولوں کی طرف لوٹنے اور ان سے تمسک کی دعوت مسلم معاشرے کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ تاریخی نقطۂ نظر سے ہر مسلم عہد میں ایسی تحریکیں موجود رہی ہیں جو مسلمانوں کو بدعات و محدثات سے بچنے اور عہد رسالت کے خالص اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کی دعوت دیتی رہی ہیں جیسے حنابلہ (خصوصاً ابن تیمیہ کا کردار)، برصغیر پاک و ہند میں حضرت مجدد الفؒ ثانی، جزیرہ نما عرب میں شیخ عبدالوہاب نجدی کی تحریک، افریقہ میں سنوسیوں اور مہدیوں کی صوفیانہ جہادی تحریکیں اور برصغیر کی تحریک مجاہدین وغیرہ، یہ سب دعوت و اصلاح بلکہ تجدید و احیاء کی علمبردار تھیں (اس نقطۂ نظر کی تفصیل کے لیے دیکھیے: (۱) ڈاکٹر فضل الرحمٰن: *Revival and Reform in Islam* در *The Cambridge History of Islam*، ج: ۲، ص: ۶۳۲ تا ۶۵۶، کیمبرج، ۱۹۷۰ء؛ (۲) John Obert Voll: *Islam: Continuity and change in the Modern World* نیویارک، ۱۹۹۴ء؛ (۳) R. Hrair Dekmejian: *Islam in Revolution -The Fundamentalism in Arab world*، نیویارک ۱۹۸۹ء)۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بنیاد پرستی عہد جدید کی پیداوار ہے اور جدید مغربی فکر و تہذیب کے ردعمل میں وجود میں آئی ہے۔ اس رائے کے حامل Martin E. Marty، R. Scott Appleby اور Bruce Lawrence وغیرہ ہیں۔ (اس رائے کے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے: (۱) Martine E. Marty، *R. Scott Appleby* (مدیران): *Fundamentalisms Observed*، شکاگو، ۱۹۹۱ء، (۲) وہی مصنفین: *The Glory and the Power The Fundamentalist Challenges to the Modern World*، بوسٹن، ۱۹۹۲ء؛ (۳) Bruce. B.Lawrence: *Defenders of God - The Fundamentalist Revolt against the Modern Age*، نیویارک ۱۹۸۹ء۔

جہاں تک اس بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کا تعلق ہے تو بنیاد پرستی ایک بے معنی اصطلاح ہے کیونکہ دینی اصولوں کے بارے میں تمسک کے حوالے سے تو ہر مسلمان بنیاد پرست ہے، کیوں کہ ہر مسلمان قرآن کریم کو محفوظ، مقدس اور منزل من اللہ سمجھتا ہے اور دین

کی بنیادی تعلیمات پر عمل کرنا اپنے ایمان کا تقاضا سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ اچھے باعمل مسلمان نہیں ہیں، وہ اس پر فخر نہیں کرتے، بلکہ شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور اچھے باعمل مسلمان بننا چاہتے ہیں اور اپنی اولاد کو بنانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ہر عہد میں مسلمان معاشرے میں ایسے افراد اور جماعتیں و تحریکیں موجود رہی ہیں اور اب بھی ہیں جو مسلمانوں کو قرآن کریم اور دین کی اصلی اور حقیقی تعلیمات پر عمل کرنے پر اکساتی اور ابھارتی ہیں۔

اس مسئلے کا تشدد اور انتہا پسندی سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اسلام ہر طرح کے ظلم و جبر اور تشدد کے خلاف ہے اور وہ اسلامی ریاست کی بنیاد امن، انصاف، رواداری، مساوات اور فلاح پر رکھتا ہے اور اس میں مسلم و غیر مسلم کی بھی تمیز نہیں کرتا بلکہ وہ تو جانوروں اور پرندوں کے ساتھ بھی حسن سلوک پر اصرار کرتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو محبت و اخوت، خوش خلقی، عفوودرگزر اور حلم کی تلقین کرتا ہے۔ اختلاف کے باوجود حکمرانوں کی اطاعت اور ان سے تعاون کا حکم دیتا ہے۔ (دیکھیے تفصیل کے لیے قرآن و حدیث کے علاوہ (۱) الماوردی، الاحکام السلطانیہ؛ (۲) محمد رشید رضا: الامامۃ والخلافۃ؛ (۳) سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست، لاہور، ۱۹۸۷ء، (۴) محمد ضیاء الدین الریس: النظریات السیاسیۃ الاسلامیۃ، قاہرہ، ۱۹۷۱ء (۵) حامد الانصاری: اسلام کا نظام حکومت، دہلی، ۱۹۵۶ء، وغیرہ)

اسلام کے تصور جہاد کے بارے میں بھی مغرب کا رویہ عموماً غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ اسلام میں دین کی اشاعت و تبلیغ، امربالمعروف ونہی عن المنکر اور دین پر عمل اور اس کے نفاذ کی ہر پرامن کوشش جہاد ہے۔ اسی طرح بنیادی حقوق اور اپنے وطن اور دین کی حفاظت کے لیے اگرچہ اسلام، دوسرے ادیان اور تہذیبوں کی طرح، مسلح جدوجہد کی اجازت سمجھتا ہے لیکن اس بارے میں بھی اسلام کے اصول جنگ دوسری اقوام کے جنگی اصولوں کے مقابلے میں شائستہ، مہذب اور نرم ہیں۔ وہ مکان اور درخت جلانے کو جائز نہیں سمجھتا، عورتوں کی عصمت دری کو جائز نہیں ٹھہراتا، بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے سے منع کرتا ہے اور جنگ میں حصے نہ لینے والے سول شہریوں کو قتل کی اجازت نہیں دیتا، مذہبی افراد، مذہبی عمارتوں اور اداروں کو نقصان پہنچانے سے منع کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ (اسلام کے صحیح تصور جہاد اور اصول و ضوابط کے لیے دیکھیے: قرآن حکیم اور کتب احادیث و تفسیر کے علاوہ: (۱) ابن تیمیہ، رسالۃ القتال، درمجموعہ رسائل ابن تیمیہ، القاہرہ؛ (۲) ابن رجب الحنبلی: القواعد؛ مصر، ۱۹۳۳ء؛ (۳) ابویوسف: کتاب الخراج، قاہرہ ۱۹۵۲ء؛ (۴) عباس محمود العقاد: حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ، قاہرہ؛ (۵) سید قطب: السلام العالمی والاسلام، قاہرہ؛ (۶) سید ابوالاعلیٰ مودودی: الجہاد فی الاسلام، (۷) مجید خدوری War and Peace in the Law of Islam ورجینیا، ۱۹۶۲ء، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ بنیاد پرستی کا کوئی تعلق اسلام اور مسلمانوں کے صحیح عقائد سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اسلام اور مسلمانوں سے متعلق مغرب (خصوصاً یہودیوں) کے مزعومہ خیالات و مفادات سے ہے۔ پہلے عیسائیوں کو صلیبی جنگوں کا بخار چڑھا اور اس میں شکست کی وجہ سے ان کے دل و دماغ میں مسلمانوں کے خلاف بغض و نفرت نے جڑ پکڑ لی۔ پھر جب انیسویں صدی میں انہوں نے قوت حاصل کر لی تو مسلمان ممالک کو انہوں نے اپنے استعماری شکنجے میں جکڑ لیا اور ظلم وجبر کا ہر طریقہ آزمایا تاکہ وہ غلامی کا جوا اپنے کندھوں سے نہ اتار سکیں، لیکن ان کی باہمی لڑائی اور مسلمانوں کے جوش آزادی نے بالآخر غلامی کی زنجیریں کاٹ ڈالیں۔ اب مغرب کی

پوری کوشش ہے کہ مسلمان ممالک سیاسی اور معاشی طور پر مستحکم ہو کر مضبوط نہ ہوں، بلکہ ہر لحاظ سے ان کے محتاج رہیں۔ چنانچہ امریکہ و یورپ نے روس کے ساتھ مل کر مسلم دنیا کو دبائے رکھا۔ بیسویں صدی کے آخر میں روسی کیمونزم شکست و ریخت کا شکار ہوگیا اور اب مغرب کو اسلام کے سوا کوئی طاقت مقابلے میں نظر نہیں آتی۔ تاہم چونکہ وہ ماضی بعید اور قریب میں مسلم ملت کے ساتھ زیادتیاں کرتا رہا ہے لہٰذا اسے خدشہ ہے کہ کہیں مسلمان اس کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ چنانچہ مغرب کے سیاستدانوں، عالموں اور یہودی بادشاہ گروں نے مزعومہ اسلامی خطرے کے سدباب کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جھوٹے اور بے بنیاد پروپیگنڈے کا طومار باندھ رکھا ہے، مسلم فنڈا میٹلزم اسی وسیع تر مغربی پروپیگنڈے کا ایک مظہر ہے (اس پہلو کو سمجھنے کے لیے دیکھیے: (۱) Samuel P.Huntingtion : *The Clash of Civilizations* ، نیویارک، ۱۹۸۷ء؛ (۲) Bernard Lewis : *Roots of Muslim Rage* ؛ (۳) Henry Kissinger : *Los Angeles Times* ، ۴ دسمبر ۱۹۹۳ء؛ (۴) Iqbal S. Hussain : *Islam and Western Civilization*، لاہور، ۲۰۰۰ء؛ (۵) Richard M. Nixon: *Seize the Moment* ، نیویارک، ۱۹۹۶ء).

مآخذ: متن میں مذکور مآخذ کے علاوہ اس موضوع پر عمومی مطالعے کے لیے دیکھیے: (۱) احمد صقر و کرم اختر: *Islamic Fundamentalism* ، آئیووا امریکہ ۱۹۸۲ء؛ (۲) یوسف چوہدری: Islamic Fundamentalism ، بوسٹن، ۱۹۹۰ء؛ (۳) John L. Esposito : *The Islamic Threat, Myth or Reality?* ، نیویارک، ۱۹۹۲ء؛ (۴) Mohammad Mohaddessin : *Islamic Fundamentalisim - The New Global Threat* : واشنگٹن ڈی سی ۱۹۹۳ء؛ (۵) ڈاکٹر سید حسین نصر: *Traditional Islam in the Modren World* ، نیویارک ۱۹۸۷ء؛ (۶) وہی مصنف، *Ideals and Realities of Islam* ، لاہور، ۱۹۹۶ء (۱۲) وہی مصنف، *Science and Civilzation in Islam* ، لاہور، ۱۹۹۹ء؛ (۷) Dr. Shaukat Ali : *Dimensions and Dilemmas of Islamist Movement* ، لاہور، ۱۹۹۸ء؛ (۸) مصطفیٰ ہوگا، *Issues in Contemprary Islam* ، لاہور، ۱۹۹۹ء (۹) Gai Eaton : *Islam and Destiny of Man* ، لاہور، ۱۹۹۷ء (۱۰) T.B.Irving : *The Islam Resurgent - The Islamic World Today* ، لاہور، ۱۹۹۹ء؛ (۱۱) H.A.R. Gibb : *Studies on the Civilization of Islam* ، لاہور، ۱۹۸۷ء.

(محمد امین)

••------------••

بوسنیا: جنوب مشرقی یورپ میں جزیرہ نما بلقان ⊗ کی ایک مسلم اکثریتی ریاست۔ اسے عرصے سے بوسنیا ہرزیگوینا (Bosnia's Herzegovina) کہا جاتا ہے۔ ہرزیگوینا بوسنیا کے جنوب اور جنوب مغربی علاقے کا نام ہے۔ بوسنیا کے شمال اور جنوب مغرب میں کروشیا، مشرق میں سربیا، اور جنوب مشرق میں مانٹی نیگرو جب کہ جنوب میں بحیرۂ ایڈریاٹک واقع ہے۔ اس کا دارالحکومت سراجیو (Sarajevo) ایک قدیم تاریخی شہر ہے۔

قدیم تاریخ: دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح میں جب رومیوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا جسے آج کل بوسنیا کہا جاتا ہے تو اس وقت یہاں الیری (illyrian) قبیلے آباد تھے۔ چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں گوتھوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور چھٹی صدی کے اوائل میں یہ بوزنطی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ اس کے بعد یہاں سلافی لوگ آباد ہونا شروع ہوگئے اور

ساتویں صدی عیسوی میں ان کے دو بڑے قبیلوں کروشیائیوں اور سربوں نے یہاں کا رخ کیا۔ کروشیائی بوسنیا کے شمالی، مغربی اور وسطی علاقوں میں آباد ہوگئے جب کہ سربوں نے دریائے ڈرینا (Drina) کی وادی اور موجودہ ہرزیگونیا کے علاقے میں ڈیرہ جما لیا۔

گیارھویں اور بارھویں صدی میں یہاں بوزنطیوں نے سربوں اور کروشیائیوں کے ذریعے حکومت چلائی۔ اس دوران ہنگری نے بھی یہاں حکومت کی اور آزاد سرب سلطنت بھی قائم ہوئی، تاہم ۱۱۸۰ء میں بوزنطی حکمران مینوئل اوّل (Manuel-1) کی وفات کے بعد بوسنیا کا علاقہ ایک طرح سے آزاد ہوگیا۔ ۱۴۶۳ء تک یہاں مقامی حکمرانوں نے حکومت کی اگرچہ ہنگری نظری طور پر اس علاقے کا دعویدار رہا۔ اس دوران بوسنیائی ریاست میں توسیع بھی ہوئی، خصوصاً جنوب میں ھم (Hum۔ موجودہ ہرزیگونیا) اور دالماتا کی ساحلی پٹی تک کا علاقہ بوسنیائی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ اس دوران بوسنیائی چرچ بھی آزاد ہو کر خود مختار ہوگیا اور کیتھولک چرچ کی مرکزی تنظیم سے اس کا وفادارانہ تعلق ختم ہوگیا (بوسنیا کی قدیم تاریخ کے لیے دیکھیے: Malcolm Noel: *Bosnia A Short History*۔، میکملن پبلشرز لمیٹڈ، لنڈن ۱۹۹۶ء)۔

ترکوں کی آمد اور قبولِ اسلام: ۱۴۴۸ء میں ترکوں نے بلقان کا رخ کیا اور وسطی بوسنیا کا علاقہ فتح کر لیا۔ ۱۴۶۷ء میں انہوں نے موجودہ بوسنیا اور اس کے قرب و جوار کے علاقے پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ انہوں نے اسے اپنی سلطنت کا حصہ بناتے ہوے اسے کئی انتظامی اضلاع (سنجق) میں تقسیم کر دیا اور وھربوسنیا (Vrhbosnia) کو سراجیو کے شہر کی صورت میں ترقی دی۔ ۱۵۸۰ء میں انہوں نے بوسنیا اور گرد و نواح کے بعض علاقوں کو (جو اس وقت کروشیا اور سربیا میں شامل ہیں) اپنا ایک صوبہ (ایالت یا Eyalet) قرار دے دیا اور اس کی یہ حیثیت ترکوں کے زوال تک باقی رہی۔ اس کا انتظامی سربراہ وزیر کہلاتا تھا جس کے تحت پاشا اور قاضی ہوتے تھے۔ ترکوں نے یہاں اپنا جاگیرداری نظام قائم کر لیا جس کے مطابق جاگیردار فوجی خدمات مہیا کرنے کے پابند ہوتے تھے۔ نیز عیسائی بچوں کو شروع ہی سے خصوصی اکیڈیمیوں میں تربیت دی جاتی تھی اور انہیں سول سروس اور فوجی خدمات کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔

اگرچہ ترکوں نے ہندوستانی مغلوں کی طرح، اس علاقے میں اپنے اقتدار کی قوت سے مقامی آبادی پر دباؤ ڈال کر اسے قبولِ اسلام پر مجبور نہیں کیا لیکن چونکہ بوسنیا کے علاقے میں کیتھولک چرچ کے اثرات برائے نام تھے اس لیے یہاں کے لوگ اسلام سے متاثر ہوتے گئے اور تقریباً ایک صدی کے اندر بوسنیا کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہوگئی، خصوصاً سراجیو اور موستار جیسے شہر تو اسلامی ثقافت کا نمونہ بن گئے۔ ترکوں نے بعض بلقانی علاقوں (جیسے بوسنیا، البانیہ، کوسوو وغیرہ) میں مسلم اکثریت کے باوجود وہاں اسلامی یا مسلم حکومتیں قائم نہیں کیں بلکہ وفاقی نظام اپنایا اور غیر مسلم عناصر کو اقتدار میں حصہ دار بنانے کی خاطر وہاں مخلوط حکومتیں قائم کیں۔ نیز انہوں نے مقامی عناصر کو فراخ دلی سے اختیارات دیئے۔ بوسنیا کے صوبے کا طاقتور سربراہ کیپٹن (Kapetan) کہلاتا تھا۔ مسلم عہد میں بوسنیا نے خوب ترقی کی۔ اس خوبصورت پہاڑی علاقے میں عالی شان مساجد تعمیر کی گئیں، پل اور سرائے تعمیر کیے گئے، مدارس اور کتب خانے کثرت سے تھے۔ فواروں، چشموں اور سبزے کی بہتات کی وجہ سے یہ علاقہ بلقان کی جنت سمجھا جاتا تھا۔

مقامی طاقتور عیسائی عناصر نے ترک مسلم اقتدار قبول نہیں کیا اور مزاحمت کرتے رہے جب کہ ہمسایہ عیسائی

سلطنتیں انہیں اکساتی بھی رہیں اور ان کی مدد بھی کرتی رہیں۔ اس طرح بلکان کی ریاستیں بشمول بوسنیا مستقل جنگوں کا اکھاڑا بنے رہے۔ ۱۶۸۳ء میں آسٹریا نے حملہ کر کے بلغاریہ اور سلوونیا عثمانیوں سے چھین لیا جس پر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد وہاں سے جان بچا کر بوسنیا آنے پر مجبور ہوگئی۔ ۱۶۹۷ء میں آسٹریا کا ایک تیز رفتار چھاپہ مار فوجی دستہ بوسنیا میں داخل ہوا اور ہزاروں کیتھولک عیسائیوں کو ساتھ لے گیا۔ ۱۷۱۴ء میں آسٹریا اور اٹلی نے مل کر عثمانیوں پر حملہ کیا اور اطالوی مقبوضہ دلماتیا کی سرحدیں بوسنیا کے جنوب مغرب تک وسیع کر لیں۔ ۱۷۳۶ء میں آسٹریا نے پھر بوسنیا پر حملہ کیا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی، تاہم اس جنگ کے بعد جو صلح ہوئی اور اس میں جو سرحدیں طے ہوئیں وہ وہی ہیں جو آج بھی بوسنیا کی شمالی سرحدیں ہیں۔

مسلسل جنگوں نے بوسنیا کو کمزور کر دیا۔ جنگی اخراجات پورے کرنے کے لیے مرکزی حکومت کو ٹیکس لگانے پڑے۔ جب ٹیکس لوگوں کی استطاعت سے بڑھ گئے تو انہوں نے سول نافرمانی شروع کر دی۔ بوسنیا کے سپاہیوں کو عثمانی سلطنت کے دوسرے حصوں میں بھی جنگوں میں شریک ہونا پڑا۔ کئی دفعہ علاقے پر طاعون کا حملہ بھی ہوا۔ ان وجوہ سے مسلم اکثریت کی تعداد بھی متاثر ہوئی۔ ان حالات میں جب انیسویں صدی کے اوائل میں مرکزی عثمانی سلطنت نے بوسنیا میں اصلاحات کا زبردستی نفاذ کرنا چاہا تو بوسنیا کی مضبوط مقامی حکومت مزاحمت پر تل گئی۔ چنانچہ ۱۸۲۶ء میں جب سلطان محمود ثانی نے فوجی اصلاحات کے ضمن میں ینی چری دستوں کے خاتمے کا اعلان کیا تو بوسنیا کے ینی چری دستوں نے تعمیلِ حکم سے انکار کر دیا۔ ۱۸۳۱ء میں بوسنیا کے کیپٹن حسین پاشا نے ۲۵ ہزار فوج کے ساتھ بغاوت کرتے ہوئے مرکزی حکومت کے متعین کردہ وزیر کو ٹراونک میں قید کر دیا اور کوسوو میں متعین عثمانی وزیراعلیٰ (Grand Vizier) سے گفت و شنید کرنے جا پہنچا اور مطالبہ کیا کہ بوسنیا کو مکمل داخلی خودمختاری دی جائے اور اصطلاحات کو واپس لیا جائے۔

بوسنیا میں سیاسی بے چینی سے ترک مخالف قوتوں نے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ جب ہرزیگوینا کے علاقے میں عیسائی کاشتکاروں نے ٹیکس کے مسئلے پر بغاوت کی تو ان کی حمایت میں مونٹی نیگرو اور سربیانے (جہاں پہلے ہی نیم خودمختار متعصب عیسائی حکومت قائم تھی جو اپنے علاقے سے مسلمانوں کو تشدد کر کے بھگاتی رہتی تھی) ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ ۱۸۷۶ء میں ان کی حمایت میں روس بھی جنگ میں کود پڑا۔ یورپی طاقتوں نے بلقان کے علاقے میں بڑھتے ہوئے روسی اثرات سے خائف ہو کر ۱۸۷۸ء میں جنگ کے خاتمے پر برلن میں فریقین کی کانگرس بلوائی جس میں یہ طے پایا کہ بوسنیا کا علاقہ آسٹریا و ہنگری کے زیرانتظام رہے گا۔ بوسنیا کی مقامی حکومت نے آسٹریا و ہنگری کی فوجوں کی بھرپور مزاحمت کی لیکن وہ اس سیلاب کا رخ نہ موڑ سکی۔ یوں بوسنیا چار صدیوں تک مسلم عروج کی بہار دیکھ کر خزاں کے تھپیڑوں کی نظر ہوگیا ((۱) R.J. Donia: *Islam under The Double Eagle - Bosnia - Hercegovina, 1878-1914*، بولڈر ۱۹۸۱ء؛ عبداللہ اسانچ، بوسنیا کے مسلمان (اردو ترجمہ اشفاق حسین) اسلام آباد ۱۹۹۳ء)۔

آسٹریا ۔ ہنگری اقتدار کا عہد: آسٹریا اور ہنگری نے وزارت مالیات کا ایک مشترکہ کمیشن تشکیل دیا جس نے بوسنیا میں حکمت سے انتظام مملکت چلایا۔ عثمانی انتظامی ڈھانچہ برقرار رکھا اور قوانین میں تبدیلیاں بتدریج کیں لیکن اس نے ملک میں سیاسی ہم آہنگی کے لیے کوئی

کوشش نہ کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیشنلزم کی آکاس بیل، نے پھیلنا شروع کر دیا۔ پہلے سرب، کروشیائی اور سلافی قومیتیں وجود میں آئیں اور پھر انہوں نے منظم ہونا شروع کیا۔ اسی دوران میں اکتوبر ۱۹۰۸ء میں آسٹریا۔ ہنگری نے بوسنیا کو باقاعدہ اپنا حصہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سربوں اور سلافیوں نے خفیہ تنظیمیں بنا کر زیر زمین کارروائیاں شروع کر دیں۔ ان میں سے ایک تنظیم "ینگ بوسنیا" (Young Bosnia) کے نام سے بھی تھی جو بوسنیا کے تعلیمی اداروں میں فعال تھی۔ اسی دوران پہلی بلقان جنگ (۱۹۱۲-۱۹۱۳ء) چھڑ گئی جس میں آسٹریا۔ ہنگری نے ترک فوجوں کو کوسوو، مقدونیہ اور نیا بازار (Novi Pazar) سے باہر دھکیل دیا۔ بوسنیا پر بڑھتا ہوا دباؤ دیکھ کر وہاں متعین آسٹریا۔ ہنگری جنرل نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی اور پارلیمنٹ توڑ کر سول عدالتوں اور سرب ثقافتی اداروں پر پابندی لگا دی۔ اسی اثنا میں آسٹروی۔ ہنگری شہنشاہ کا ولی عہد ڈیوک فرڈی ننڈ ایک جنگی مشق کے معائنے کے لیے بوسنیا آیا تو سربیا کی شہ پر ینگ بوسنیا تنظیم کے ایک بوسنیائی سرب کارکن نے اسے سراجیوو میں قتل کر دیا۔ اس پر آسٹریا۔ ہنگری نے سربیا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور بعد میں یہی لڑائی پھیل کر جنگِ عظیم اوّل کی صورت اختیار کر گئی (B.E.Schmitt: *The Annexation of Bosnia-1908-1909*، کیمبرج یونیورسٹی پریس، لنڈن ۱۹۳۷ء)۔

مملکت یوگوسلاویہ کا قیام: جنگ عظیم اوّل کے خاتمے پر سربوں نے، جو شروع ہی سے عظیم ترسربیا کے علمبردار تھے، کروشیا اور سلووینیا سے مل کر اور بوسنیا کے سربوں اور کروشیائی قومیتوں کی حمایت سے آسٹریا۔ ہنگری حکومت سے جان چھڑانے اور ایک آزاد مملکت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۲۱ء میں جب نئی مجوزہ حکومت کا آئین بنا تو اس میں سے بوسنیا کو غائب کر دیا گیا، تاہم اس کے اضلاع کی عثمانی تنظیم کو سابقہ صورت پر باقی رکھا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں بوسنیا کے اس انتظامی ڈھانچے کو بھی تبدیل کر دیا گیا اور یوں بوسنیا کو نقشے سے بھی مٹا دیا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں کروٹوں کے دباؤ پر مملکت یوگوسلاویہ کے اندر کروٹ جمہوریہ قائم کی گئی جس میں بوسنیا کے بعض حصے بھی شامل تھے اس طرح بوسنیا کا علاقہ سربوں اور کروٹوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا۔

جب دوسری جنگ عظیم چھڑی تو جرمنی نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور کروٹوں کی حمایت کی وجہ سے اسے نوازنے کے لیے کروشیا کی "آزاد" (اور درحقیقت کٹھ پتلی) ریاست میں بوسنیا کے سارے علاقے ضم کر دیئے گئے۔ جنگی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عظیم تر کروشیا کی علمبردار استاشا نامی فاشسٹ تحریک نے مخالفین کا قوت سے قلع قمع کرنے کی حکمت عملی اپنائی۔ یاد رہے کہ کروشیائی آرتھوڈکس عیسائی تھے اور انہیں جرمنی اور اٹلی کی حمایت حاصل تھی اور استاشا کو کروٹ حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے دو تحریکیں وجود میں آئیں۔ ایک سربیا کی چٹنک (Chetniks) جو انتہا پسند کیتھولک عیسائیوں پر مشتمل تھی اور دوسری یوگوسلاویہ کی کمیونسٹ پارٹی جس میں سوشلسٹ نظریات سے دلچسپی رکھنے والے کروٹ، سرب اور مسلمان بھی شامل تھے اور جسے روس کی حمایت حاصل تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں ان انتہا پسند گروہوں کے درمیان لڑائی نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی جس میں ۱۶۴,۰۰۰ بوسنیائی سرب، ۷۵,۰۰۰ مسلمان، ۶۴,۰۰۰ کروٹ اور ۱۴,۰۰۰ یہودی مارے گئے۔ ان میں سے اکثر لوگوں کو دہشتگردی کے حراستی کیمپوں میں تعذیب سے بھی گزرنا پڑا (John Fine: *Late Medieval*

Balkans، یونیورسٹی آف مشی گن پریس، ۱۹۸۷ء).

کمیونسٹ یوگوسلاویہ: جوزف ٹیٹو کے زیر کمان کمیونسٹ پارٹی کے فوجی دستوں نے اپریل ۱۹۴۵ء میں سراجیوو پر قبضہ کر لیا اور بوسنیا میں 'عوامی حکومت' کے قیام کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۴۶ء میں جب پارٹی نے بلقان کی دیگر ملحقہ ریاستوں کا کنٹرول بھی حاصل کر لیا تو بوسنیا کی ریاست بھی 'عوامی یوگوسلاویہ' کے وفاق کی ایک اکائی کے طور پر اس میں شامل تھی۔ کمیونسٹ آمریت کے اس شدید دور میں بوسنیا کے مسلمانوں کو بہت بڑے ابتلاء سے گزرنا پڑا اور مسلم قوانین کے خاتمے کے ساتھ ساتھ بہت سے دوسرے مسلم ادارے بھی تباہ کر دیے گئے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ٹیٹو نے بوسنیا کے تینوں نسلی اور نظریاتی گروپوں (کیتھولک سرب، آرتھوڈکس کروٹ اور بوسنیائی مسلمانوں) کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلوں کو پاٹنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری سے پہلے بوسنیائی مسلمانوں کو بطور ایک 'قومیت' کے تسلیم کر لیا گیا کیونکہ اس وقت تک بوسنیا میں مسلمان عملاً غالب اکثریت میں تھے جب کہ سرب اور کروٹ آبادی کم شرح نمو اور دوسرے علاقوں میں منتقلی کے نتیجے میں واضح طور پر مسلمانوں سے کم ہوگئی تھی۔ اس دوران میں جمال بجدی (Demal Bijedi) ، حمزہ پوزدک (Hamdija Pozdderac)، اور برانکو (Branko Mikoli) جیسے رہنماؤں نے ریاست بوسنیا ہرزیگونیا کی بقا اور استحکام کے لیے منظم کوششیں کیں۔ اس دوران میں سربوں اور کروٹوں میں قوم پرستانہ رجحانات شدّت اختیار کر گئے تھے چنانچہ مسلمانوں نے بھی اپنے تحفظ اور بقا کی خاطر خود کو منظم کرنا شروع کیا۔ ۱۹۷۱ء ہی سے بوسنیا میں مشترکہ صدارتی نظام رائج کیا گیا جس میں تینوں گروہوں کے نمائندے باری باری صدارتی فرائض سر انجام دیتے تھے۔

کمیونسٹ نظام کے بعد: ۱۹۸۰ء میں مارشل ٹیٹو کا انتقال ہوا اور عالمی سطح پر کمیونزم کا زوال شروع ہوا تو یوگوسلاویہ کی متحدہ ریاست جو ٹیٹو جیسے مردِ آہن کی قاہرانہ پالیسیوں کی وجہ سے اب تک جڑی ہوئی تھی، ان جکڑ بندیوں کے ٹوٹتے ہی بکھرنا شروع ہوگئی اور قوم پرستانہ رجحانات کا جن بھی بوتل سے باہر آکر ناچنے لگا (Nora Beloff: Tito's Flawed Legacy-Yogoslavia and the West, 1939-1984، لنڈن ۱۹۸۴ء)۔ چنانچہ نومبر ، دسمبر ۱۹۹۰ء میں جب بوسنیا کی قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو تینوں گروہوں کی بڑی سیاسی جماعتوں (مسلمانوں کی 'جمہوری عمل پارٹی' (Party of Democratic Action=PDA)، سربوں کی 'سرب جمہوری پارٹی' (Serbian Democratic Party=SDP) اور کروٹوں کی 'کروٹ جمہوری یونین' (Croatian Democratic Uniono of Bosnia Herzegovin= CDU-BH)، نے بالترتیب ۸۶، ۶۷ اور ۴۴ نشستیں حاصل کیں اور سات رکنی مجلس صدارت (Presidium) کی نشستیں بھی انہی جماعتوں نے جیتیں اور دستور کے مطابق جمہوری عمل پارٹی کے سربراہ علی جاہ عزت بیگووچ (بوسنیا کے دانشور سیاستدان جنھوں نے عصر حاضر میں اسلام، مغرب اور اسلام کے سیاسی کردار کے حوالے سے کئی کتابیں لکھی ہیں اور طویل عرصہ تک جیل میں بھی رہے ہیں) صدر، سرب نمائندہ وزیراعظم اور کروٹ نمائندہ سپیکر منتخب ہوا۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ بوسنیائی سربوں کو جمہوریہ یوگوسلاویہ کی (جو اب عملاً صرف ایک سرب ریاست ہے اور جسے سرب لوگ عظیم ترسربیا (Greater Serbia) کا مظہر اور بیس کیمپ سمجھتے ہیں) اور اس کی فوج کی (جو زیادہ تر سربوں پر مشتمل ہے اور جس کا ہیڈکوارٹر ، اسلحہ فیکٹریاں اور اسلحہ ڈپو بوسنیا میں

تھے) اور بوسنیائی کروٹوں کو کروشیا کی حمایت حاصل تھی اور مسلمان اگرچہ بوسنیا میں سیکولر حکومت اور تکثیریت (Pluralism) کے قائل اور حامی تھے، لیکن ان حالات میں وہ بھی بالآخر خود کو صرف مسلمانوں کی سطح پر منظم کرنے پر مجبور ہوگئے تھے (دیکھیے: L.Silber - A.Little: *The Death of Yugoslavia*، نیویارک ۱۹۹۵ء)۔

بوسنیا کے خلاف جنگ (۱۹۹۲-۱۹۹۵ء): جون ۱۹۹۱ء میں جب کروشیا اور سلووانیا نے آزادی کا اعلان کیا تو بوسنیائی اور کروشیائی سربوں نے اعلان کر دیا کہ وہ (بوسنیا کی بجائے) وفاقی یوگوسلاویہ (یعنی سربیا) کا حصہ بننا پسند کریں گے۔ ساتھ ہی انہوں نے بوسنیا اور کروشیا کے سرب اکثریتی علاقوں میں انتظامی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور ان کی حمایت میں وفاقی فوج نے حملے کر کے سرب علاقوں کا کنٹرول سنبھالنا شروع کر دیا۔ حالات بگڑتے دیکھ کر اقوام متحدہ نے سب فریقوں کو اسلحے کی سپلائی پر پابندی لگا دی۔ بوسنیائی حکومت نے ان اقدامات کی مذمت کی اور ۱۵/ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو بوسنیائی پارلیمنٹ نے آزادی کی قرار داد منظور کر لی جب کہ سرب نمائندوں نے پارلیمنٹ کا بائیکاٹ کیا، بوسنیائی قوانین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بعد میں بوسنیا کے سرب عوام نے خودمختار قومی اسمبلی تشکیل دے لی اور اس کے ذریعے ریفرنڈم کروا کر بوسنیا کے اندر سرب جمہوریہ قائم کر لی اور فوج کی مدد سے بتدریج بوسنیا کے تقریباً ۶۵ فی صد علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ان حالات میں بوسنیائی حکومت نے ۲۹ فروری اور یکم مارچ ۱۹۹۲ء کو ملک گیر ریفرنڈم کروا کر آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس ریفرنڈم میں ۶۳ فیصد لوگوں نے (ماسوائے سربوں کے) ووٹ ڈالے اور ووٹ ڈالنے والوں کی ۹۹.۴ فی صد اکثریت نے آزاد بوسنیا کی حمایت کی۔ یہ اعلانِ آزادی سربوں کو ہضم نہیں ہوا اور انہوں نے دارالحکومت سراجیوو اور دوسرے علاقوں پر حملے شروع کر دیے اور امریکہ و یورپی یونین کے بوسنیا کی آزادی کو تسلیم کرنے پر انہوں نے سراجیوو کا محاصرہ کر کے اس پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس حملہ آور فوج میں سربیا کے رضاکار اور فوجی، وفاقی فوج اور بوسنیائی سرب شامل تھے۔ شہروں پر حملوں کے علاوہ اس فوج نے بوسنیائی سربوں کے زیر کنٹرول علاقوں سے مسلمانوں کی نسلی تطہیر کا آغاز کر دیا۔ نسلی تطہیر کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں سے ان کی زمینیں، مکانات، دفاتر اور دکانیں وغیرہ چھین لی جائیں، ان کی مسجدیں اور مدرسے گرا دیے جائیں، مزاحمت کے قابل نوجوانوں کو قتل کر دیا جائے یا کیمپوں میں قید کر دیا جائے، نوجوان عورتوں کی جبری آبرو ریزی کی جائے اور بوڑھوں کو مسلم علاقوں کی طرف دھکیل دیا جائے تاکہ ان علاقوں میں صرف سرب باقی رہ جائیں اور باقی قوموں خصوصاً مسلمانوں سے یہ علاقے صاف ہو جائیں۔ اس جنگ میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم اتنے زیادہ ہیں کہ ہم الگ عنوان کے تحت ان کی تفاصیل دیں گے، یہاں ہم تاریخی تسلسل کی خاطر اہم واقعات مختصراً بیان کریں گے.

اقوام متحدہ اور یورپی یونین کی مصالحتی کوششیں سربوں کی ہٹ دھرمی سے ناکام ہوگئیں اور انہوں نے امن فوج کے دستے غیر محفوظ سمجھ کر واپس بلا لیے۔ حالات خراب ہونے پر بوسنیا نے اقوام متحدہ سے اپیل کی کہ معصوم شہریوں کی جان بچانے کی خاطر فوج بھیجی جائے۔ اقوام متحدہ نے کروشیا میں تو فوج بھجوا دی، لیکن بوسنیا میں اس لیے فوج بھجوانے سے انکار کر دیا کہ بحالی امن دستوں کی حفاظت ممکن نہیں۔ اس پر بوسنیائی حکومت نے مجبور ہو کر وفاقی فوج کو 'قابض فوج' قرار دے دیا۔ ۲۲ مئی ۱۹۹۲ء کو جب بوسنیا کو اقوام متحدہ کی

رکنیت حاصل ہوگئی تو اقوام متحدہ نے وفاقی جمہوریہ یوگوسلاویہ پر (جواب صرف سربیا اور مونٹی نیگرو پر مشتمل تھی) بوسنیا میں مسلح مداخلت کے الزام میں معاشی پابندیاں لگانے کا اعلان کر دیا۔

جب سربوں کی طرف سے بوسنیا کے خلاف یہ اقدامات جاری تھے تو ان کی دیکھا دیکھی کروشیا نے بھی بوسنیا کے کروٹ اکثریتی علاقوں میں کروٹ خودمختار حکومت قائم کرنے کا اعلان کر دیا اور موستار و دیگر نواحی شہروں پر قبضہ کر لیا یہاں تک کہ بوسنیا ہرزیگوینا کا ۳۰ فی صد علاقہ ان کے زیر قبضہ آگیا۔ اس دوران بوسنیائی صدر عزت بیگووچ کروٹوں کے ساتھ صلح کی کوشش کرتے رہے اور اقوام متحدہ سے اسلحے پر پابندی اٹھالینے کا مطالبہ کرتے رہے، کیونکہ سربیا کے پاس اسلحہ کی بہتات تھی ، کروٹوں کو بھی اسلحہ مل رہا تھا جب کہ بوسنیائی تقریباً نہتے تھے کیونکہ انہیں سمندر تک رسائی حاصل نہ تھی (بوسنیا ایک Land Locked علاقہ ہے) اور ہوائی اڈوں اور زمینی راستوں پر سربیا اور کروشیا کا قبضہ تھا لیکن اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ سرب جنگی کیمپوں میں مسلمانوں کے قتل عام اور ایک منصوبے کے تحت مسلمان عورتوں کی جبری آبروریزی کے واقعات کی کثرت اور ٹیلی وژن پر ان امور کی تشہیر سے مجبور ہو کر اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن نے دسمبر میں سربوں کو ان مظالم کا ذمہ دار قرار دے دیا اور سلامتی کونسل نے بھی ان کی مذمت کی اور جنگی کیمپوں تک رسائی کا مطالبہ کیا لیکن سربیا پر اس کا ذرا اثر نہ ہوا۔ اوائل ۱۹۹۳ء میں اقوام متحدہ کے مصالحت کار (اور سابق امریکی وزیرخارجہ) سائرس وینس (Syrus Vance) اور مسئلہ بلقان کو حل کرنے کے لیے قائم کردہ جنیوا امن کانفرنس کے صدر ڈیوڈ اوون (David Owen سابق برطانوی وزیرخارجہ) نے سربیا کے دارالحکومت بلغراد میں صدر ملاسووچ سے ملاقات کر کے انہیں بوسنیائی سربوں پر دباؤ ڈالنے اور بوسنیا کی تقسیم اور اس میں ایک تہائی حصہ قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن بوسنیائی سرب اپنے زیر قبضہ سارے علاقے میں آزاد سرب ریاست کے قیام پر مصر رہے اور ایک مرحلے پر جب دباؤ میں آکر بوسنیائی سرب قیادت مان گئی تو بعد میں ان کی اسمبلی نے اسے رد کر دیا۔

یہ سب اس لیے ہوتا رہا کہ امریکہ، یورپی یونین اور ان کی وجہ سے اقوام متحدہ کی خاموش ہمدردیاں بھی سربوں کے ساتھ اور بوسنیائی مسلمانوں کے خلاف تھیں چنانچہ مئی ۱۹۹۳ء میں یورپی یونین اور اقوام متحدہ نے اپنے امن دستے سراجیو وغیرہ سے یہ کہہ کر واپس بلالیے کہ انہیں (سربوں کی طرف سے) تحفظ حاصل نہ تھا۔ بعد میں حالات مزید بگڑنے پر عزت بیگووچ مطالبات کرتے کرتے تھک گئے، لیکن امن دستے بوسنیا نہ بھیجے گئے، البتہ کروشیا بھجوا دیے گئے (کیونکہ وہاں کے رہنے والے عیسائی تھے) اور اقوام متحدہ کی طرف سے محفوظ قرار دیے گئے چھ علاقوں (safe zones) میں بھی جب سرب جارحیت سے باز نہ آئے تو امریکہ نے سربوں کے خلاف طاقت کے استعمال کی تجویز دی لیکن روس، فرانس اور برطانیہ نے اس کی مخالفت کی۔ دریں اثنا کروٹوں اور سربوں دونوں نے مل کر مسلم اکثریتی شہر مگلاج (Maglaj) پر چڑھائی کر دی۔ جولائی میں کروٹوں نے مسلمانوں کو موستار (Mostar) سے مکمل باہر دھکیلنے کے لیے حملہ کر دیا اور اس تاریخی شہر کے پل اور دوسری عمارت ملبے کا ڈھیر بن کر رہ گئیں ساتھ ہی 'بوسنیائی کروٹ جمہوریہ' کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ یوں سرب اور کروٹ عیسائیوں نے امریکہ و یورپ کی ملی بھگت سے

بوسنیا کے اندر نہ صرف اپنی آزاد مملکتیں قائم کر لیں بلکہ وہ اس پر بھی ذہناً تیار نہ تھے کہ باقی بچا کھچا بوسنیا مسلمانوں کے حصے میں آئے چنانچہ انہوں نے سراجیوو میں صدر عزت بیگووچ کی حکومت کو زچ اور بے توقیر کرنے اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے فکری عابد (Fikret Abdic) نامی ایک مسلمان فیکٹری منیجر اور پریذیڈیم کے رکن سے بوسنیا کے شمال مغرب میں 'مغربی بوسنیا کے ایک خودمختار صوبے' کے قیام کا اعلان کروا دیا۔ اس دوران بوسنیا میں مسلمانوں پر ظلم و ستم جاری رہا، عورتیں بے آبرو ہوتی رہیں، مسلمان اپنے علاقوں سے بے دخل کیے جاتے رہے، نوجوان ذبح ہوتے اور کیمپوں میں اذیتیں سہتے اور جان دیتے رہے اور مہذب دنیا کانوں میں روئی ٹھونسے تماشا دیکھتی رہی لیکن چونکہ سب کچھ میڈیا کے سامنے ہو رہا تھا اور ساری دنیا یہ تماشا دیکھ رہی تھی اس لیے انہیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ فروری ۱۹۹۴ء میں جب سرب دستوں نے محصور سراجیوو کی ایک مارکیٹ پر بمباری کی اور اس میں ۶۸ بے گناہ شہری مارے گئے اور سیکڑوں زخمی ہوئے تو نیٹو نے حملے کی دھمکی دی اور بنجا لیوکا (Banja Luka) پر بمباری کرنے والے چار سرب جنگی ہوائی جہازوں کو مار گرایا۔ اس کے باوجود سرب جارحیت جاری رہی۔

سربوں کی طاقت اور مظالم کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں اور کروٹوں میں یہ احساس ابھرنا شروع ہوا کہ اگر وہ الگ الگ اور باہم برسرپیکار رہے تو سرب ان دونوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے چنانچہ مارچ ۱۹۹۴ء میں بوسنیائی مسلمان اور کروٹ اپنے زیر انتظام علاقوں کو فیڈریشن کی صورت دینے پر آمادہ ہوگئے اور اس فیڈریشن اور کروٹ جمہوریہ میں باہمی تعاون کے منصوبے پر متفق ہوگئے۔ اپریل میں بوسنیائی سربوں نے نیٹو سے ہوائی حملوں کی دھمکی اور روس حکومت کے مطالبے کے باوجود گورازدے (Gorazde) کے 'محفوظ' قرار دیے گئے زون پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا، جس پر روسی حکومت نے بھی بیزاری کا اظہار کیا۔ مطلب یہ کہ سرب مسلمانوں پر ظلم و ستم کرنے میں اتنے شیر ہوچکے تھے کہ اپنے حمایتیوں کی بھی سننے پر آمادہ نہ تھے۔

اس اثنا میں بوسنیائی مسلمان اور حکومت سنبھل چکے تھے۔ مسلمانوں کا زیادہ نقصان ان کی سادگی اور بھولپن کی وجہ سے ہوا ورنہ جس وقت سرب اور کروٹ نسلی اور علاقائی بنیادوں پر فوجی انداز میں منظم ہورہے تھے اس وقت انہیں بھی خود کو منظم کر کے اپنے آپ کو حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا لینا چاہیے تھا لیکن چونکہ وہ تکثیریت اور متحدہ و سیکولر بوسنیا کے قائل تھے اور دوسروں کے ساتھ مل کر رہنا چاہتے تھے اس لیے ان کا خیال تھا کہ شائد حالات اتنے نہ بگڑیں، لیکن حالات نے انہیں خود سبق سکھایا اور وہ بتدریج سنبھلتے اور منظم ہوتے گئے۔ اگرچہ اس میں بھی تاخیر ہوئی کیونکہ بوسنیا کے پاس نہ تربیت یافتہ فوج تھی اور نہ اسلحہ، خشکی میں محصور ہونے کی وجہ سے اسے باہر سے امداد ملنا بھی ممکن نہ تھا اور یورپ اور امریکہ کی مخالفت مول لے کر امداد کرتا بھی کون، کہ اکثر مسلمان ممالک خود مغرب کے محتاج اور زیردست تھے۔اس صورت حال کے باوجود جون ۱۹۹۴ء میں بوسنیائی مسلم فوجوں نے وسط بوسنیا سے سربوں کو نکال باہر کیا اور دفاعی و جوابی حملے شروع کر دیے۔ انہوں نے بہاچ (Bihac) پر حملہ کر کے فکری عابد کے فتنے کا بھی خاتمہ کر دیا اور وہ علاقہ بوسنیا کی مرکزی حکومت کے زیر اقتدار آگیا۔

حالات کو بدلتے دیکھ کر اب مغرب نے جاگنا اور حرکت میں آنا مناسب سمجھا اور صلح کے لیے سنجیدہ

کوششوں کا آغاز ہوا لیکن بوسنیائی سرب اب بھی اپنے سر پُرغرور جھکانے پر آمادہ نہ ہوے بلکہ الٹا مزید مشتعل ہوئے۔ چنانچہ اگست ۱۹۹۴ء میں نیٹو نے ان کے ٹھکانوں پر ہوائی حملے کیے۔ اس کے جواب میں بوسنیائی سربوں نے اقوام متحدہ کے دستوں پر حملے شروع کر دیئے، محصور سراجیو پر از سرنو گولہ باری شروع کر دی اور کروٹ و بوسنیائی سربوں نے باہم ایکا کر کے اپنی قوت مجتمع کر لی اور لڑائی جاری رہی۔ مئی ۱۹۹۵ء میں سراجیو پر شدید بمباری رکوانے کے لیے اقوام متحدہ کی درخواست پر نیٹو نے بوسنیائی سربوں کے ٹھکانوں پر پھر حملے کیے جس کے جواب میں سربوں نے اقوام متحدہ کے محفوظ قرار دیئے گئے زونوں پر حملے شروع کر دیے، تزلا (Tuzla) پرشدید بمباری کی اور اقوام متحدہ کی امن فوج کے ۲۲۲ افراد کو اغوا کر کے گورازدے لے گئے۔ سربوں کے دباؤ میں آکر اقوام متحدہ نے اپنے آدمی آزاد کروانے کے لیے سراجیوو سے فوجی دستے واپس منگوا لیے۔ اس پر سربوں کے حوصلے مزید بڑھے اور انہوں نے بوسنیا کے مشرق میں نیٹو کے فضائی حملوں کے باوجود سربرینکا (Srebrenica) شہر پر قبضہ کر لیا، امن کے لیے فوجیوں کو غیر مسلح کر کے اغوا کر لیا اور کم از کم آٹھ ہزار مسلمانوں کو ایک دن میں تہ تیغ کر دیا اور شہر کو جلا کر راکھ کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ سب سے بڑا قتل عام تھا۔ اس کے بعد سرب دستوں نے زیپا (Zepa) کے محفوظ قرار دادہ علاقے پر قبضہ کیا اور پھر بہاچ پر حملہ آور ہوے۔ اس موقع پر بوسنیا اور کروشیا نے مل کر اپنے اتحاد کو مضبوط بنایا اور سربوں کی سپلائی لائن کاٹ کر محاصرے کو توڑ دیا۔ اسی دوران کروشیا نے کروشیائی سربوں کے زیر تسلط علاقے پر حملہ کر کے انہیں وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اگست ۱۹۹۵ء میں سربوں نے سراجیوو کے شہریوں پر شدید بمباری کی جس پر نیٹو نے سرب ٹھکانوں پر ہوائی حملے کیے اور وسط ستمبر تک جاری رکھے جس سے سربوں کا کافی نقصان ہوا اور ان کے موقف میں کچھ نرمی پیدا ہوئی (بوسنیا کی حالیہ تاریخ اور جنگ کے بارے میں وسیع لٹریچر موجود ہے۔ چند اہم مآخذ کے لیے دیکھیے (۱) Bog Don Denitch: Ethnic Nationalism- The Tragic End of Yugoslavia، لنڈن ۱۹۹۴ء؛ (۲) Roy Gutman: A Witness To Genocide، میکملن، نیویارک ۱۹۹۳ء؛ (۳) C. Bennett: Yugoslavia's Bloody Collapse Causes, Course and Consequeces، لنڈن ۱۹۹۵ء؛ (۴) R.Donia - J. Fine: Bosnia Herce govina - A Tradition Betrayed، کولمبیا یونیورسٹی پریس نیو یارک ۱۹۹۴ء؛ (۵) Brian Hall: The Impossible Country- A Journey throvch The Last Days of Yugoslavia، لنڈن ۱۹۹۴ء).

ڈیٹن معاہدۂ صلح: ۱۹۹۲ء کے بعد سے جب سے بلقان میں جنگ شروع ہوئی تھی، جنگ بندی کی بیسیوں کوششیں ہوئیں جو اکثر سربوں نے ناکام بنا دیں۔ اسی طرح اقوام متحدہ اور یورپی یونین نے صلح صفائی کی جتنی کوششیں کیں وہ بھی اکثر و بیشتر بوسنیائی سربوں کے رویے کی وجہ سے ہی ناکام ہوئیں۔ سربوں کی کوشش یہ تھی کہ بوسنیا کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قبضہ کر لیں، وہاں سے مسلمانوں کو نکال دیں اور اس علاقے کو ایک آزاد ریاست قرار دے کر سربیا سے اس کا الحاق کر دیں تاکہ اس طرح عظیم تر سربیا کا خواب کسی حد تک شرمندۂ تعبیر ہوسکے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا مارشل ٹیٹو کے زمانے سے بوسنیا وفاقی فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا، اسلحہ فیکٹریاں اور ڈپو بھی یہیں تھے۔ اس فوج میں چونکہ سربوں کی اکثریت تھی اس لیے بوسنیائی سربوں نے جنگ

کے آغاز ہی میں (جو خود انہوں نے ایک منصوبہ بندی کے تحت شروع کی تھی) وفاقی فوج کی مدد سے بوسنیا کے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا اور وہاں سربیا کی مدد سے آزاد حکومت قائم کر لی۔ صلح کی ہر کوشش میں ان کا اصرار یہ ہوتا تھا کہ اس مقبوضے علاقے پر ان کی آزاد ریاست کو تسلیم کیا جائے۔ یہ موقف چونکہ بوسنیائی مسلمانوں اور کروٹوں کو قبول نہ تھا اس لیے صلح کی ہر کوشش ناکام ہوجاتی۔ اب ایک تو بوسنیائی فوج کچھ منظم ہوگئی اور بوسنیا نے بوسنیائی کروٹوں اور کروشیا کے ساتھ اتحاد کر لیا لہٰذا انہوں نے مل کر بوسنیائی سربوں کے دانت کھٹے کرنا شروع کردیے۔ پھر یہ کہ سربوں کی زیادتیاں ساری دنیا ٹی وی پر بچشم خود ملاحظہ کر رہی تھی جس کی وجہ سے امریکہ اور یورپ کی بھی سبکی ہو رہی تھی چنانچہ ان کی بھی خواہش تھی کہ یہ جنگ بند ہو جائے۔ بوسنیائی سرب چونکہ اپنی خود سری میں یورپ و امریکہ کی بھی پرواہ نہیں کر رہے تھے لہٰذا یورپی یونین کے ایما پر نیٹو نے سرب ٹھکانوں پر لگاتار بمباری کی اور یوں بوسنیائی سرب بھی صلح پر آمادہ ہوگئے.

چنانچہ صلح کے لیے کانفرنس یکم نومبر ۱۹۹۵ء کو امریکی ریاست اوہایو کے شہر ڈیٹن (Dayton) میں شروع ہوئی اور ۲۱ نومبر تک جاری رہی۔ اس سے پہلے ۸ ستمبر کو جنیوا میں اور ۲۶ ستمبر کو نیویارک میں متعلقہ فریقوں کے درمیان بنیادی اصولوں پر سمجھوتے کی کوششوں نے آخری صلح کو ممکن العمل بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔
ڈیٹن معاہدے کی اہم شقیں یہ تھیں:

بوسنیا و ہرزیگوینا کی ریاست اپنی روایتی سرحدوں کے ساتھ باقی رہے گی جس کے دو حصے ہوں گے (صوبے کی بجائے Entity کا لفظ استعمال کیا گیا)۔ کروٹوں اور مسلمانوں کی قائم کردہ فیڈریشن کو بوسنیا کے ۵۱٪ علاقے پر اور بوسنیائی سربوں کے زیر انتظام حصے (یعنی Republica Srpska) کو ۴۹٪ علاقے پر کنٹرول حاصل ہوگا اور دونوں کے پہلے سے وضع کردہ آئینی ڈھانچے برقرارر رہیں گے۔ مرکزی حکومت کی مجلس صدارت تین افراد پر مشتمل ہوگی (کروٹوں، سربوں اور مسلمانوں کا ایک ایک نمائندہ) جو چار سال کے لیے براہ راست ووٹوں سے منتخب ہوں گے اور ہر رکن آٹھ ماہ کے بعد بدلتا رہے گا۔ وزیراعظم کا تقرر مجلس صدارت ایوان زیریں کی منظوری سے کرے گی اور یہ وزیراعظم پھر وزیرخارجہ، وزیر بیرونی تجارت اور دوسرے وزرا کا تقرر کرے گا۔ مرکز میں قانون سازی کے لیے دو ایوانی پارلیمانی اسمبلی ہوگی، یعنی مجلس عوام (House of Peoples) یا ایوان بالا جو پندرہ (۱۵) ارکان پر مشتمل ہوگی (ہر قومیت کے پانچ ارکان) ؛ جب کہ مجلس نمائندگان (House of Representatives) یا ایوان زیریں بیالیس (۴۲) افراد پر مشتمل ہوگی (ہر قومیت کے چودہ (۱۴) ارکان)۔ اس سارے نظام میں کروٹ اور مسلم نمائندوں کا انتخاب فیڈریشن کرے گی اور سرب نمائندوں کا انتخاب بوسنیائی سربوں کی پارلیمنٹ کرے گی۔ مرکزی پارلیمان میں فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے تاہم ہر قومیت کے ایک تہائی ووٹوں کی حمایت ضروری ہوگی۔ آئینی و قانونی امور کے تصفیے کے لیے مرکز میں ایک 'آئینی عدالت' ہوگی جس کے نو (۹) ارکان ہوں گے۔ چار (۴) فیڈریشن کے، ۲ سربوں کے اور تین ارکان کا تقرر 'یورپی عدالت برائے حقوق انسانی' کا صدر بوسنیائی مجلس صدارت کے مشورے سے کرے گا۔ جن لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا گیا ہے انہیں حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے گھروں کو واپس جاسکیں۔ ان کی جائدادیں یا تو انہیں واپس کی جائیں گی یا ان کا معقول

معاوضہ دیا جائے گا.

اس معاہدے کی رو سے مشرقی بوسنیا میں اقوام متحدہ کے اعلان کردہ چھ 'محفوظ زونوں' میں سے صرف ایک (گورازدے) کا الحاق فیڈریشن سے ہوگا جس کے لیے ایک زمینی راستہ (Land Coridor) دیا جائے گا۔ اسی طرح بوسنیائی سرب حکومت کے شمالی علاقوں کو سربیا اور جنوبی علاقوں سے ملانے کے لیے زمینی راستہ ہوگا۔ فیڈریشن کا دارالحکومت سراجیوو ہوگا تاہم سراجیو شہر کے جنوبی مضافاتی علاقے سرب حکومت کے زیرانتظام ہوں گے۔ زمینی راستوں کی تفصیلات اور براکو (Brcko) کی بندرگاہ کے بارے میں کوئی تصفیہ نہ ہوسکا۔ فیڈریشن اور بوسنیائی سرب حکومت کے انتظامی ڈھانچوں میں یہ فرق بھی نمایاں ہے کہ فیڈریشن کا ڈھانچہ تقسیم اختیارات پر مبنی ہے چنانچہ وہاں دو ایوانی مقننہ ہے اور بلدیاتی نظام مستحکم ہے (دس اضلاع (Cantons) اور ۷۴ میونسپل کمیٹیاں) جب کہ بوسنیائی سرب حکومت میں اختیارات کی ترکیز ہے چنانچہ وہاں ایک ایوانی مقننہ ہے اور بلدیاتی نظام برائے نام ہے.

اس معاہدے پر عمل درآمد کے لیے ۶۰ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج (IFOR) نیٹو نے مہیا کی اور اقوام متحدہ کے امن دستے واپس چلے گئے۔ اس جنگ میں اندازاً پونے تین لاکھ افراد مارے گئے اور ان سے زیادہ بے گھر ہوئے جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی (Carl Blidt: *Peace Journey - The Struggle for Peace in Bosnia*، لنڈن ۱۹۹۸ء).

ڈیٹن معاہدے پر عمل درآمد: بوسنیا میں ڈیٹن معاہدے پر عمل درآمد کے لیے یورپی ممالک نے 'رابطہ گروپ' کی طرز پر ایک 'نفاذ امن کونسل' (Peace Implementation Council) تشکیل دی۔ انتخابات کے انتظامات و نگرانی کی ذمہ داری 'یورپی تنظیم برائے امن و تعاون' (Organization for Security Co-operation in Europe=OSCE) کے سپرد کی گئی اور ان سب امور کی نگرانی کے لیے بین الاقوامی کمیونٹی کی طرف سے اعلیٰ اختیارات کا حامل ایک 'اعلیٰ نمائندہ' (High Representative) بوسنیا میں تعینات کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سابق یوگوسلاویائی ریاستوں پر عائد معاشی پابندیاں فوراً اور اسلحہ کی پابندیاں بتدریج ہٹا لی گئیں۔ انتخابات کا انعقاد ہوا اور حالات روبہ اصلاح ہونے لگے۔ اس کے بعد سے حالات میں جو تبدیلیاں آتی رہیں اور تینوں فریقوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور بوسنیا کو دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ایک متحدہ ریاست بنانے کے لیے جو اقدامات کیے گئے ان کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے.

فیڈریشن کے اندر کروٹوں اور مسلمانوں کے اندر باہمی یگانگت بڑھانے کے لیے اوائل ۱۹۹۶ء میں دونوں علاقوں کی فوج کو متحد کیا گیا، بنکوں، کسٹمز اور بجٹ کو ایک کیا گیا۔ بوسنیا اور سربیا (سرکاری نام فیڈرل ری پبلک آف یوگوسلاویہ =FYR) میں سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ بوسنیائی سرب حکومت کے صدر کرادزچ (Karadzic) اور فوجی سربراہ جنرل ملادیچ (Mladic) کو بین الاقوامی دباؤ پر سیاسی مزاحمت کے باوجود بالآخر الگ ہونا پڑا کیونکہ وہ مسلمانوں کی قتل و غارت اور نسلی تطہیر کی مہم کی قیادت کرتے رہے تھے اور جنگی مجرم تھے۔ جس طرح بوسنیائی سرب بامر مجبوری نیٹو کی بمباری کی وجہ سے معاہدہ صلح پر مجبور ہوے تھے اسی طرح انہوں نے نفاذ امن کی کوششوں میں بھی قدم قدم پر مزاحمت کی اور روڑے اٹکائے، مثلاً مئی ۱۹۹۷ء میں نیٹو کی طرف سے ایک "تنفیذ امن کانفرنس" پرتگال میں ہوئی جس میں

بوسنیا میں شہریت، پاسپورٹ اور جائدادوں کے بارے میں یکساں قانون کے نفاذ کا فیصلہ کیا گیا اور تینوں فریقوں سے سفارتی عہدیداروں کے لیے نئی فہرستیں مہیا کرنے کے لیے کہا گیا (کیونکہ اکثر سفارت کار سرب تھے جس سے دوسری قومیتوں کے لیے مسائل پیدا ہورہے تھے) لیکن بوسنیائی سرب اسمبلی نے یکساں شہریت کے قانون کی منظوری دینے سے انکار کر دیا اور سربیا سے مل کر مشترکہ شہریت کا معاہدہ کر لیا۔ بوسنیائی سرب حکومت نے ان سرب افراد کو جو جنگی جرائم کی انکوائری کرنے والے بین الاقوامی ٹربیونل کو مطلوب تھے، اس کے حوالے کرنے سے بھی انکار کر دیا، چنانچہ یورپی یونین نے اس پر اقتصادی پابندیاں لگا دیں۔ اسی طرح سربرینکا (Srebrenica) کی میونسپل کمیٹی (کے سرب عہدیداروں) نے شہر میں ان مسلمانوں کی آبادکاری میں تعاون سے انکار کر دیا جنھیں دوران جنگ وہاں سے نکال دیا گیا تھا اور سابقہ مسلم اکثریت کا یہ علاقہ اب بوسنیائی سرب حکومت کو دے دیا گیا۔ اس پر یورپی تنظیم برائے امن و تعاون (OSCE) نے اپریل ۱۹۹۸ء میں میونسپل کمیٹی کو معطل کر کے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اسی طرح فروری ۱۹۹۹ء میں جب "اعلیٰ نمائندے" نے بوسنیا کے دونوں حصوں (یعنی فیڈریشن اور سرب بوسنیائی حکومت) کی افواج کو مشترکہ طور پر بوسنیائی مجلس صدارت کی نگرانی میں دینے کا فیصلہ کیا اور بین الاقوامی مصالحت کاروں نے براکو کو بوسنیائی سرب حکومت کے کنٹرول سے نکال کر بین الاقوامی نگرانی میں دونوں حصوں کے مشترکہ کنٹرول میں دینے کا اعلان کیا تو بوسنیائی سرب حکومت نے ان فیصلوں کو ماننے سے انکار کر دیا اور اپنی اسمبلی کا اجلاس بلا کر اس کے خلاف فیصلہ کروا لیا۔ اس پر 'اعلیٰ نمائندے' (Westendorp) نے بوسنیائی سرب حکومت کے صدر (Poplasen) کو اس کے عہدے سے ہٹا دیا۔

بوسنیا میں مرکزی حکومت کو مزید مستحکم کرنے کے لیے اپریل ۲۰۰۰ء میں مرکزی اسمبلی نے یہ فیصلہ کیا کہ مرکز میں وزارتوں کی تعداد تین (وزارت خارجہ، وزارت بیرونی تجارت و اقتصادی امور اور وزارت مواصلات و شہری امور) سے بڑھا کر پانچ کر دی جائے۔ اس دوران بوسنیا میں (خصوصاً بوسنیائی سربوں میں) انتہا پسندوں کا اثر بتدریج کم ہونے لگا اور دونوں جگہ (یعنی فیڈریشن و بوسنیائی سرب علاقے میں) ایسی سیاسی پارٹیاں وجود میں آگئیں جو مخلوط قومیتوں پر مبنی اور بوسنیا کی وحدت کی علمبردار تھیں۔ اس طرح وطن پرست جماعتوں کا زور جب کچھ کم ہوا تو جنوری ۲۰۰۱ء میں پہلی دفعہ بوسنیائی سرب حکومت مخلوط قومیتوں کی حامل سیاسی جماعت (PDI BIH) نے بنائی اور مرکز میں وزیراعظم اور فیڈریشن کا صدر اور وزیراعلیٰ بھی اسی پارٹی کا بنا۔ تاہم جیسا کہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ انتظامی، سیاسی اور آئینی لحاظ سے تہرے نظام پر مبنی اور متفاوت نقطۂ نگاہ رکھنے والے تین گروہوں کو لے کر چلنا آسان نہیں چنانچہ کبھی ایک اپنی خواہش پوری ہونے پر بگڑ جاتا تو کبھی دوسرا۔ چنانچہ مارچ ۲۰۰۱ء میں بوسنیائی کروٹوں کی جماعت (CDU - BH) نے اپنے نمائندے کے بطور وزیراعظم قبول نہ کیے جانے پر مرکزی حکومت کا بائیکاٹ کر دیا اور فوج اور سِول میں کروٹ عناصر کی حمایت سے خودمختار کروٹ اسمبلی کی بحالی کا اعلان کر دیا اور فیڈریشن سے الگ ہونے کی دھمکیاں دینی شروع کر دی۔ تاہم بوسنیا کے 'اعلیٰ نمائندے' نے جھکنے کی بجائے مضبوط اقدام کرتے ہوئے اس پارٹی کے صدارتی ممبر کو بھی ہٹا دیا اور بالآخر بین الاقوامی دباؤ پر کروٹوں کو اپنا احتجاج واپس لینا پڑا۔

جولائی ۲۰۰۱ء میں بوسنیائی سرب حکومت مسلسل بین

الاقوامی دباؤ کے نتیجے میں یورپی یونین کی طرز پر انتخابات کے انعقاد اور جنگی جرائم کے بین الاقوامی ٹربیونل سے تعاون پر آمادہ ہوگئی۔ مارچ ۲۰۰۲ء میں بوسنیا کے 'اعلیٰ نمائندے' نے دباؤ جاری رکھتے ہوئے بوسنیائی سربوں کو مزید آئینی و عدالتی اصلاحات قبول کرنے پر مجبور کیا اور یہ طے کیا کہ مرکز اور نیچے ہر سطح پر تینوں قومیتوں کو نمائندگی دی جائے۔ چنانچہ بوسنیائی سرب مقننہ کے ڈھانچے میں ایک ۲۸ رکنی ایوان بالا کا اضافہ کیا گیا (تینوں قومیتوں کے آٹھ آٹھ ارکان مع چار متفرق ارکان کے) جس کی ایک ذمہ داری یہ تھی کہ وہ مرکزی ایوان بالا کے لیے بوسنیائی سرب نمائندوں کا انتخاب کرے۔ مرکز کی سطح پر ایک آٹھ رکنی عدالت عظمیٰ تشکیل دی گئی جس کے ججوں کا انتخاب قومیتی وابستگیوں سے بالاتر میرٹ پر تجویز کیا گیا۔ دسمبر ۲۰۰۲ء میں 'اعلیٰ نمائندے' نے مرکز کو مضبوط بنانے کی خاطر مزید اقدامات کے لیے قانون سازی کی جس کی رو سے مرکز میں دو مزید وزارتیں (برائے انصاف اور امن و امان) قائم کی گئیں اور وزارت عظمیٰ کی مدت چار سال کر دی گئی (اور تینوں قومیتوں کے وزرائے اعظم کے باری باری کام کرنے کا سلسلہ ختم کر دیا گیا)۔ اس پر بوسنیائی سرب نمائندوں نے اظہار ناراضی کرتے ہوئے مرکزی ایوان زیریں کا بائیکاٹ کر دیا۔ اسی دوران اقوام متحدہ نے حالات کو روبہ اصلاح دیکھتے ہوئے امن افواج کی مدت قیام میں مزید توسیع نہ کی اور تحفظ امن اور بوسنیائی فوج کی تنظیم نو اور تربیت کی ذمہ داری یورپی یونین کے پولیس مشن کو منتقل کر دی۔

جنوری ۲۰۰۳ء میں نئے قوانین کے مطابق نئی بوسنیائی سرب حکومت میں ۸ سربوں کے ساتھ ۵ مسلمان اور ۳ کروٹ وزیر بھی لیے گئے۔ اسی طرح فیڈریشن کا صدر ایک کروٹ کو بنایا گیا اور مسلم اور سرب نمائندے بطور نائب صدر چنے گئے اور ایک مسلمان کو فیڈریشن کا وزیراعظم منتخب کیا گیا۔ اسی سال 'اعلیٰ نمائندے' نے مجلس صدارت میں بوسنیائی سرب نمائندے سے استعفیٰ لے لیا (کیونکہ وہ عراق کو اسلحہ کی ترسیل اور سرب فوج کے لیے جاسوسی میں ملوث تھا) اور بوسنیائی سرب فوج کی سپریم ملٹری کونسل کو برخواست کر دیا اور بوسنیائی سرب علاقے کے آئین سے وہ تمام دفعات حذف کرنے کا حکم جاری کر دیا جو اسے خودمختار ریاست ظاہر کرتی تھیں۔ اوائل ۲۰۰۴ء میں بوسنیا میں متعین 'اعلیٰ نمائندے' نے یورپی یونین کے اصرار پر موستار شہر کو انتظامی طور پر متحد کرنے کا حکم دیا جو ۱۹۹۳ء سے کروٹوں اور مسلمانوں میں منقسم تھا۔ اسی طرح اعلیٰ آئینی عدالت نے بوسنیائی سرب علاقے کی بعض میونسپل کمیٹیوں میں لفظ 'سرب' کے لاحقے کو غیر آئینی قرار دے دیا۔

اپریل ۲۰۰۴ء میں 'اعلیٰ نمائندے' نے بوسنیائی سرب حکومت کے آرمی چیف آف سٹاف کو ملازمت سے برخواست کر دیا کیونکہ وہ سربرینکا کے قتل عام کی انکوائری کرنے والے کمیشن کو مطلوبہ معلومات مہیا کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اسی طرح جون میں اس نے بوسنیائی سرب حکومت کے وزیرداخلہ کو ساٹھ دیگر افراد سمیت ملازمت سے برخواست کر دیا کیونکہ وہ بین الاقوامی جنگی ٹربیونل کو مطلوب بوسنیائی سرب رہنما کرادزچ (Karadzic) کی گرفتاری میں تعاون نہ کر رہے تھے۔ اسی سال نومبر میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے بوسنیا میں فوجی امور کی نگرانی سات ہزار افراد پر مشتمل 'یورپی یونین فورس' کے سپرد کی اور اسے بوسنیا ہرزیگوینا کے یورپی یونین کے ساتھ الحاق کے لیے مزید اقدامات کرنے کا حکم دیا۔ اس پر بوسنیا میں بین الاقوامی برادری کے 'اعلیٰ

نمائندے' نے بوسنیا کی متحدہ حکومت کے مزید استحکام کے لیے حکم دیا کہ ۲۰۰۵ء میں فیڈریشن اور بوسنیائی سرب حکومتوں کی الگ الگ وزارت دفاع کو ختم کر دیا جائے اور اسی طرح پولیس اور سیکوریٹی ایجنسیوں کو بھی باہم مدغم کر کے واحد ادارے کی شکل دی جائے جو دونوں حکومتوں کے علاقوں میں یکساں طور پر کام کریں اور جن کی نگرانی مرکزی وزیر داخلہ کرے۔ 'اعلیٰ نمائندے' نے مرکزی وزیر دفاع کو حکم دیا کہ وہ بوسنیائی سرب فوج کے ان افسران کے خلاف تحقیقات کرے جو مسلمانوں کے قتل عام میں ملوث سرب رہنما ملادچ (Mladic) کے روپوش رہنے میں تعاون کر رہے تھے، نیز اس نے ۹ بوسنیائی سرب سیکوریٹی افسران کو ملازمت سے برخواست کر دیا جو جنگی ٹربیونل کو مطلوب افراد کو حراست میں لینے میں آڑے آئے تھے۔ اسی دوران امریکہ نے بوسنیائی سرب وطن پرست سیاسی جماعتوں کی حوصلہ شکنی کے لیے ان کے قائدین کے امریکہ میں داخلے پر پابندی لگا دی۔ ان اقدامات کو بوسنیائی سرب قائدین نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بوسنیائی سرب حکومت کے وزیراعظم، مرکزی حکومت میں بوسنیائی سرب وزرا اور مرکزی مجلس صدارت کے بوسنیائی سرب رکن (اور اس وقت عملاً صدر ریاست) سب نے بطور احتجاج اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا اور اپنا الگ فوجی ڈھانچہ رکھنے پر اصرار کیا لیکن بین الاقوامی برادری نے جھکنے سے انکار کر دیا اور نیا وزیراعظم نامزد کر دیا جو آئین کے مطابق تینوں فریقوں پر مشتمل کابینہ بنانے میں کامیاب ہوگیا (جس میں حسب دستور ۸ بوسنیائی سرب، ۵ مسلمان اور ۳ کروٹ شامل تھے)۔ بعد میں طویل کشمکش اور سیاسی گفتگو اور مباحثے کے بعد مارچ ۲۰۰۵ء میں بوسنیائی سرب وزرا نے استعفیٰ واپس لینے کا اعلان کر دیا اور یوں سیاسی حالات معمول پر آگئے۔ ان حالات میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اگر بین الاقوامی دباؤ اسی طرح جاری رہا تو شائد مستقبل قریب میں وہ وقت آجائے جب بوسنیا ہرزیگوینا ایک متحدہ ریاست کے طور پر ابھرے جس میں تینوں بڑی قومیتیں تحمل، روا داری اور امن سے مل جل کر رہیں کہ اس کے علاوہ بوسنیا کی بقا اور استحکام و ترقی کا دوسرا کوئی راستہ نہیں کیونکہ نفرت اور جنگ سے مسئلے بگڑتے اور پیچیدہ ہوتے ہیں، حل نہیں ہوتے (ڈیٹن معاہدے پر عمل درآمد کے سلسلے میں دیکھیے (۱) David Chandler: *Bosnia - Faking Democracy After Dayton*، لنڈن ۲۰۰۰ء؛ (۲) C.A. Cater : E.M.Cousens: *Towards Peace in Bosnia-Implementing the Dayton Accords*، کلوریڈو (امریکہ) ۲۰۰۱ء)۔

مسلمانوں پر ظلم و ستم: بلقان اور بوسنیا میں ۱۹۹۲-۱۹۹۵ء کی جنگ میں مسلمانوں پر ظلم و ستم (جس میں قتل عام، خواتین کی عصمت دری، مذہب کی جبری تبدیلی، گھروں سے بے دخلی، کلچر کی تباہی وغیرہ شامل ہیں، کوئی نیا یا پہلا واقعہ نہیں بلکہ یہ تب سے شروع ہے جب سے یورپی طاقتوں نے متحد ہو کر ترکوں کو یورپ اور بلقان سے باہر دھکیلنا شروع کیا چنانچہ جنگ وی آنا (۱۶۸۳-۱۶۹۹ء) میں ترکوں کی شکست کے بعد ہنگری، دلماتیہ، کوٹارسکا، لیکا وغیرہ میں جو مسلمان باقی رہ گئے اور جو ہجرت کر کے بوسنیا اور دیگر مسلم اکثریتی علاقوں میں نہیں گئے، انہیں جبری طور پر عیسائی بنا لیا گیا مثلاً ریکارڈ کے مطابق قدیم مونٹی نیگرو میں ایک ہزار مسلمان اور چھ مسجدیں تھیں، لیکن ۱۷۱۲ء کے بعد ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اسی طرح سربیا اور بلغراد میں کوئی بیس ہزار مسلمان رہتے تھے (بوسنیائی مسلمان ترک مقبوضہ جات میں پھیل گئے تھے جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ حکومت سرحدوں

کے استحکام کے لیے انہیں سرحدوں پر بساتی تھی لیکن بعد میں یہ سرحدیں تبدیل ہوتی رہیں)، ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا، خصوصاً ۸ جنوری ۱۸۰۷ء کو انہیں لوٹا گیا، مارا گیا اور خواتین کی عصمت دری کی گئی۔ ان اقدامات کی وجہ سے ۱۸۳۰ء میں وہاں مسلمانوں کی تعداد دس ہزار رہ گئی۔ اس دوران جب سربیا کو خودمختاری مل گئی تو مسلمانوں کو شہر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور ان کی مساجد و مدارس کو ملیامیٹ کر دیا گیا۔ ۱۸۵۲ء میں دریائے لم (Lim) کی وادی میں مسلمانوں کو جمع کر کے اجتماعی بپتسمہ دیا گیا۔ ۱۸۷۸ء میں جب کانگرس آف برلن نے سربیا اور مونٹی نیگرو کو آزاد ریاستوں کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تو ان سے مذہبی آزادی کا وعدہ لیا لیکن دونوں نے مسلمانوں کو اپنے علاقوں سے جبراً باہر دھکیل دیا اور وہ بوسنیا، سنجق، کوسووا اور البانیہ کے مسلم علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ اسی سال جب آسٹریا۔ ہنگری فوجوں نے بوسنیا پر حملہ کیا تو مسلمانوں نے شدید مزاحمت کی جس کے نتیجے میں فاتحین نے مسلمانوں کا اس بری طرح ناطقہ بند کیا اور انہیں یورپی تہذیب میں ضم ہونے پر مجبور کیا کہ بوسنیا کی تقریباً ایک تہائی آبادی اپنا دین و ایمان بچانے کی خاطر ترکی ہجرت کر گئی۔

۱۹۱۲-۱۹۱۴ء کی جنگ بلقان میں بلقانی خصوصاً سنجق کے مسلمانوں کے گھر جلا دیے گئے، ان کا قتل عام کیا گیا اور انہیں ہجرت پر مجبور کیا گیا۔ جو باقی بچے انہیں عیسائی ہوجانے پر مجبور کیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب مملکت یوگوسلاویہ کا قیام عمل میں آیا تو بھی مسلمانوں پر ظلم و ستم جاری رہا اور پہلے سال ہی مشرقی ہرزیگوینا میں مسلم بستیوں پر حملہ کر کے تقریباً ۳ ہزار مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا اور ان کے گھر لوٹ لیے گئے۔ نومبر ۱۹۲۴ء میں ضلع بجیلو (Bijelo) میں دو مسلم دیہات پر حملہ کر کے سربوں نے ایک رات میں ۶ سو مسلمان اس طرح شہید کیے کہ زندہ مردوں اور عورتوں کو پکڑ کر ان کے ناک، کان اعضائے تناسل اور دیگر اعضا کاٹے گئے، آنکھیں نکالی گئیں، پیٹ چاک کیے گئے اور ان کے سینوں پر چاقو سے کراس کے نشان بنائے گئے۔ نتیجتاً بچ جانے والے گردونواح کے سارے مسلمان بھاگ کر ہمیشہ کے لیے بوسنیا، ترکی اور البانیا چلے گئے اور یہی حملہ آوروں کا مقصد تھا کہ علاقے کو مسلمانوں سے پاک کیا جائے۔ اس دوران میں مسلمانوں کو معاشی طور پر تباہ کرنے والی پالیسیاں وضع کی گئیں۔ بوسنیا کے کئی اضلاع سربیا اور کروشیا کو دے دیے گئے اور باقی ماندہ علاقے کی تقسیم اس مصنوعی انداز سے کی گئی کہ اس میں مسلمانوں کی اکثریت نہ ہو اور انہیں دبانے، قتل کرنے اور ان کے علاقوں کو سربیا اور کروشیا میں مدغم کرنے میں آسانی ہو۔ سرب کلچرل کلب کی طرف سے سرب دانشوروں کو جمع کر کے سرب علاقوں کو مسلمانوں کے وجود سے صاف کرنے اور وہاں اپنے ہم مذہب بسانے کے لیے مختلف اسکیمیں زیر بحث آتی رہیں۔ اس منصوبہ سازی میں واسو کبریلووچ (Vaso Cubrilovic) اور مشہور ادیب و سفارت کار آئیو اینڈرچ (Ivo Andric) پیش پیش تھے۔ دوسری جنگ عظیم (۱۹۴۱-۱۹۴۵ء) کے دوران میں ان منصوبوں پر عمل درآمد سرب انتہا پسندوں کی مسلح گوریلا تنظیم چٹنک (Chetnik) نے کیا۔ ان کے نظریہ سازوں نے "سربیا صرف سربوں کے لیے" (Homogenous Serbia) کا نعرہ دیا اور کہا کہ سربیا کو غیر سربوں سے پاک کر دیا جائے، مسلمان ترکی اور البانیا جائیں اور کروٹ کروشیا۔ چٹنک قائد میہالوچ (Mihailovic) کی کئی تحریریں بھی اس ضمن میں ریکارڈ پر ہیں۔ دوسری طرف کروشیائی فاشسٹ حکومت اور وہاں کی مسلح گوریلا تنظیم اُستاشا (Ustasha)

بھی مسلمانوں کے قتل و غارت اور کروٹ علاقے سے ان کے جبری اخراج میں سرگرم تھی۔ چٹنک نے جون ۱۹۴۱ء سے فروری ۱۹۴۷ء تک، اگست ۱۹۴۲ء میں اور پھر ۱۹۴۳ء میں انتہائی بے دردی سے تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کو قتل کیا جس میں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی کوئی تمیز نہ تھی۔ ان کو گھروں کے اندر قتل کیا گیا، خواتین کی عصمت دری کی گئی اور لاشوں کا مثلہ کیا گیا۔ گھروں کو آگ لگا کر انسان اور جانور زندہ جلا دیے گئے۔ ہزاروں مسلمانوں کو دریاؤں اور ندی نالوں میں زندہ پھینک کر مار دیا گیا۔ مسلمان بچوں کو پختہ فرش اور دیواروں پر مار مار کر ہلاک کیا گیا۔ مسلمانوں اور ان کے اسلامی رسم و رواج سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ قتل کے بعد کئی عورتوں کے چہروں اور سر سے کھال کھینچ لی گئی (کہ وہ پردہ کرتی ہیں)، نو مردوں کے ہاتھوں کی کھال کھینچ کر اتاری گئی (وضو کی طرف اشارہ ہے) اور بہت سے مسلمانوں کو خاص طور پر دریائے ڈرینا کے پل پر لے جا کر قتل کیا گیا (کہ تمہارے مستقبل کو جانے والا کوئی پل نہیں)۔ فوچا (Foca) کے مفتی صاحب کو پہلے پانی میں زندہ ابالا گیا اور پھر ہڈیوں کے پنجر کو مسجد کے باہر علامتی پھانسی دی گئی اور دوسرے مسلمانوں کو سبق سکھانے کے لیے اس پنجر کو عرصے تک وہاں لٹکائے رکھا گیا۔ جانی و مالی نقصان کے علاوہ مسجدیں، مدرسے، لائبریریاں، خانقاہیں، قبرستان، ترک حمام سب گرا کر ملیامیٹ کر دیے گئے تاکہ مسلم تہذیب و تمدن کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس جنگ میں دوسری قوموں کا جانی نقصان بھی ہوا لیکن یہودیوں کے بعد سب سے زیادہ نقصان بلاشبہ سربوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا ہوا جن کا مقصد یہ تھا کہ سربیا اور ملحقہ بوسنیا ئی علاقوں سے مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا جائے تاکہ ان کے پاک وطن کی سرزمین اور مستقبل میں بننے والی 'عظیم سربیا' کی ریاست میں کسی مسلمان کا وجود دکھائی نہ دے۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ 'طاقتور مارے اور رونے بھی نہ دے' کے مصداق ان مظالم کو نمایاں بھی نہیں ہونے دیا گیا کیونکہ کمیونسٹ یوگوسلاوی انتظامیہ میں سرب اور چٹنک اثر و رسوخ بہت گہرا تھا اور ذرائع ابلاغ پر ان کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ ان مظالم کی تفصیلات پہلی دفعہ ۱۹۹۰ء میں دنیا کے سامنے آئیں جب جبر کا یہ آہنی شکنجہ کچھ ڈھیلا ہوا (دیکھیے: Vladimir Dedijer - Antun Miletic The Genocide against Muslims: 1941-1945, A Collection of Documents and Tests, monials، سراجیو ۱۹۹۰ء)۔

دوسری جنگ عظیم میں بلقانی مسلمانوں کے جانی نقصان کا اندازہ ۸۶,۰۰۰ سے ۱,۲۰,۰۰۰ افراد لگایا گیا ہے یعنی کل مسلم آبادی کا تقریباً ۶.۸ فیصد سے ۸.۷۰ فیصد لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی، بلکہ دنیا اس سے بے خبر رہی اور یہ سلسلہ اس کے بعد بھی رکا نہیں بلکہ کمیونسٹ نظامِ حکومت کے تحت اگلے ۴۵ سال تک جاری رہا۔ یکساں نظام تعلیم اور یکساں یوگوسلاوی کلچر کے نام پر مسلم تعلیم و ثقافت کو تباہ کر دیا گیا۔ کئی مدرسے اور مسجدیں بند کر دی گئیں، گلی کوچوں کے نام تک بدل دیے گئے۔ تعلیمی نصاب دہریت پر مبنی اور اسلام مخالف تھا اور اسلامی اخلاق و اقدار کا نام لینے والوں اور مسلمانوں کے حقوق کا ذکر کرنے والوں کو مقدموں میں پھنسایا گیا۔ جیلوں میں ٹھونسا گیا یا جعلی پولیس مقابلوں میں مار دیا گیا۔ اس عرصے میں سرب اور کروٹ نیشنل ازم کا جن بوتل سے باہر آگیا۔ سرب 'عظیم تر سربیا' قائم کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ یوگوسلاوی فوج میں ان کی اکثریت تھی، ان کے سول جتھے بھی مسلح تھے، حکومتی

بیوروکریسی، سفارت کاروں، ذرائع ابلاغ غرض ہر جگہ ان کی بالادستی تھی اور وہ غیر سربوں خصوصاً مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ یہی حال کروٹ قوم پرستوں کا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ دونوں گروہ چونکہ عیسائی تھے لہٰذا دونوں کو ہمسایہ یورپی عیسائی حکومتوں سے اسلحی اور مالی امداد وافر ملتی تھی۔ اس لیے دونوں کو اپنے عزائم پر عمل پیرا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی جب کہ مسلمانوں کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ تنہا، غریب، غیر منظم اور غیر مسلح تھے۔ جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ وہ پچھلے دو ڈھائی سو سال سے مار کھاتے آ رہے تھے اور ہر قوم نے انہیں مٹانے کی کوشش کی تھی لہٰذا وہ کمزور اور دبے ہوئے تھے۔ فوج ، سول بیوروکریسی اور صنعتوں میں ان کا حصہ برائے نام تھا اور ان کی اکثریت کاشتکار ، حرفت کار یا ملازم پیشہ تھی۔ عالم اسلام خود امریکی و یورپی طاقتوں کے مقابلے میں زیردست تھا لہٰذا بوسنیائی مسلمانوں کو کہیں سے مدد بھی نہ مل سکی۔ پھر بوسنیائی مسلمان طبعًا شائستہ، نفاست پسند اور پرامن لوگ ہیں۔ وہ لڑاکے اور منتقم مزاج نہیں، لہٰذا انہوں نے کبھی کوشش نہیں کی کہ انہوں نے ہمیشہ یہی چاہا کہ بوسنیا کے اندر سربوں اور کروٹوں کے ساتھ مل کر پرامن طریقے سے رہا جائے۔ اس نیک خواہش اور سادگی بلکہ سادہ لوحی کی قیمت انہیں بعد میں چکانا پڑی کیونکہ انہوں نے سربوں اور کروٹوں کے مقابلے کے لیے کوئی تیاری نہ کی تھی (ادوار سابقہ میں بوسنیائی وبلقانی مسلمانوں پر مظالم کی تفصیل کے لیے دیکھیے: M. Imamovic, R. Mahmutcehajic: *Bosnia and The Bosniana Muslims*، سراجیوو ۱۹۹۱ء).

بوسنیا میں ۱۹۹۲-۱۹۹۵ء میں مسلمانوں کے خلاف مظالم: سطور بالا میں ہم نے جو کچھ عرض کیا اس سے صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ ۱۹۹۲-۱۹۹۵ء میں جو ظلم و ستم بوسنیائی مسلمانوں کے ساتھ ہوا، وہ اچانک نہیں ہوا بلکہ اس کا ایک پس منظر ہے اور وہ یہ کہ سرب قوم پرست اس کے لیے برسوں سے کام کر رہے تھے اور بوسنیائی مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے ان کے اندر نفرت کا ایک لاوا پک رہا تھا جو ابل پڑنے کے لیے تیار تھا اور ۵ اپریل ۱۹۹۲ء کو جب بوسنیا نے آزادی کا اعلان کیا تو یہ لاوا پھٹ پڑا اور سرب بوسنیائی مسلمانوں پر پل پڑے اور یہی کچھ ان کے ساتھ کروٹوں نے کیا.

اس جنگ میں سربوں اور کروٹوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم و ستم کیا اسے نسلی تطہیر (Ethnic Cleansing) کا نام دیا جاتا ہے۔ اس جامع اصطلاح کے کئی اجزا ہیں مثلاً مردوں کا قتل عام، عورتوں کی منظم عصمت دری، مسلمانوں کو ان کے گھروں اور آبادیوں سے بے دخل کر کے باہر دھکیل دینا اور وہاں سربوں (اور کروٹوں) کو بسانا نیز شہروں کا محاصرہ ، جنگی کیمپ (صحیح تر لفظوں میں موت کے کیمپ اور زنا کیمپ) اور اجتماعی قبریں بھی اسی کا حصہ ہیں۔ اب ہم اس کی کچھ تفصیلات پیش کرتے ہیں:

بوسنیائی مسلمانوں کا قتل عام: اس جنگ میں تقریباً دو لاکھ ستر ہزار مسلمان قتل کیے گئے جو دوسری جنگ عظیم میں یورپ میں یہودیوں کے قتل عام کے بعد سب سے بڑی تعداد ہے (رادھا کمار: *Divide or Fall? Bosnia in The Annals of Partition*، لنڈن ۱۹۹۷ء) اور یہ قتل عام اس طرح نہیں ہوا کہ دو ملکوں کی فوجوں میں جنگ ہوئی ہو اور لوگ مارے گئے ہوں، بلکہ یہ قتل و غارت گری افرادی اور مقامی سطح پر ہوئی اور منصوبہ بندی سے ہوئی۔ اس کے لیے باقاعدہ علاقوں کا انتخاب کیا گیا (بڑی آبادی والے مسلم شہروں کے علاوہ ان علاقوں کو

چنا گیا جن کو عظیم تر سربیا میں شامل کرنا پیش نظر تھا۔ اس غرض سے ایسے علاقوں پر بھی حملہ کیا گیا جن میں سرب آبادی محض ۱۰٪ تھی) اور مسلمان معززین، پڑھے لکھے افراد، سائنسدانوں، ادیبوں، فنی ماہرین وغیرہ کی باقاعدہ فہرستیں بنائی گئیں اور انہیں چن چن کر قتل کیا گیا۔

اس کا طریق واردات عموماً یوں ہوتا کہ سرب فوجی دستے کسی آبادی کو گھیر لیتے۔ مقامی سرب گوریلے تاک تاک کر مسلمان گھروں پر مارٹر کے گولے برساتے، شہریوں کا پانی، بجلی اور گیس بند کر دی جاتی۔ کچھ گھنٹوں یا دنوں بعد لاؤڈ سپیکروں پر بار بار اعلان کیا جاتا کہ مسلمانوں باہر آجاؤ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ پھر جوں ہی مسلمان سڑکوں اور کھلی جگہوں پر جمع ہوتے ان پر مارٹر گولے برسا کر ان کے پرخچے اڑا دیے جاتے جیسے مثلاً ۲۶ مئی ۱۹۹۲ء کو قوزارق شہر میں ہوا (واشنگٹن پوسٹ، شمارہ ۳ نومبر ۱۹۹۲ء) یا مسلمان مردوں کو دھکیل کر جنگی کیمپوں میں پہنچا دیا جاتا یا نواحی جنگلوں میں لے جا کر کھائیوں کے کنارے کھڑے کر کے فائرنگ سے قتل کر دیا جاتا تاکہ لاشوں کو سنبھالنے کی ضرورت بھی نہ پڑے۔ اکثر جگہوں پر مسلمانوں کو قتل کرنے والے ان کے ہمسائے اور محلے دار سرب تھے جنہوں نے آنکھیں ماتھوں پر رکھ لی تھیں اور وہ بسا اوقات کلہاڑوں اور تیشوں سے مسلمانوں کے نرخرے کاٹتے۔ مقامی سرب حملہ آوروں کو مسلمان سیاستدانوں اور دوسرے لوگوں کی نشان دہی کرتے جنہیں موقع پر ہلاک کر دیا جاتا یا گرفتار کر کے جنگی کیمپوں میں بھیج دیا جاتا جہاں انہیں بھوکا پیاسا رکھ کر سسکا سسکا کر مارا جاتا۔

بوسنیا میں مسلمانوں کے قتل عام کی ایک زندہ مثال سربرنیکا کی ہے (زندہ مثال ہم نے اس لیے کہا کہ سب کچھ اخبارات، جرائد اور ٹی وی کے نمائندوں کی رپورٹوں کی موجودگی میں ہوا اور دنیا سب کچھ دیکھتی، پڑھتی اور سنتی رہی) جہاں اقوام متحدہ اور نیٹو کے دستے بھی موجود تھے اور یہ علاقہ اقوام متحدہ کے 'محفوظ' قرار دیے گئے چھ زونوں میں سے ایک تھا اور یہ واقعہ جنگ کے آخری مرحلے میں ہوا۔ جولائی ۱۹۹۵ء میں سربرنیکا کی ۳۸,۰۰۰ آبادی میں سے ۷۳٪ مسلمان اور ۲۵٪ سرب تھے۔ جنگ کے نتیجے میں اردگرد کے دیہات کے تقریباً ۶۰ ہزار مسلمان یہاں پناہ لے کر نہایت تکلیف دہ زندگی گزار رہے تھے۔ جب سربوں نے شہر کو گھیر لیا تو اس وقت اقوام متحدہ کے ۷۵۰ فوجی یہاں موجود تھے۔ سربوں کے مطالبہ پر اقوام متحدہ کے ڈچ فوجیوں نے مسلمانوں سے ہتھیار لے لیے اور ان کو یقین دہانی کروائی کہ تم ہماری حفاظت اور ذمہ داری میں ہو لیکن ۶ جولائی ۱۹۹۵ء کو سربوں نے شہر پر حملہ کر کے ڈچ فوجیوں کو بے بس اور پسپا کر دیا اور نہتے مسلمانوں کے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ ایک اندازے کے مطابق دس سے بارہ ہزار مسلمان بے رحمانہ طریقے سے قتل کر دیے گئے جب کہ اقوام متحدہ اور نیٹو کے دستے علاقے میں موجود تھے۔ بوسنیائی سرب رہنما ملادچ (Mladic) نے شہر فتح کرنے کے بعد اعلان کیا کہ 'سربرنیکا ہماری طرف سے سرب قوم کو تحفہ ہے اور ہم نے آج ترکوں سے بدلہ لے لیا ہے' (Norman Cigar: Genocide in Bosnia - The Policy of Ethnic Cleansing In Bosnia، ص ۴-۲۰، ہوسٹن ۱۹۹۵ء)۔ یاد رہے کہ بوسنیائی مسلمانوں کی اکثریت مقامی اور سلافی النسل ہے، لہٰذا درحقیقت یہ نسلی تطہیر نہیں یورپ و بلقان سے اسلام اور مسلمانوں کی تطہیر ہے لیکن پروپیگنڈا تکنیک کے طور پر اسے 'نسلی تطہیر' کا نام دیا جاتا ہے اور مسلمانوں کے خلاف اپنے آدمیوں میں نفرت پیدا کرنے کے لیے انہیں 'ترک' کہا جاتا ہے

[ترک فاتحین کے حوالے سے جنھوں نے پندرہویں صدی میں سربوں کو شکست دے کر یہاں اسلامی حکومت قائم کی تھی] حالانکہ بوسنیائی نسلاً ترک نہیں ہیں.

بوسنیائی مسلمانوں کے قتل عام کے حوالے سے سربوں کی ذہنیت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ وہ اسے کار ثواب سمجھتے تھے اور اس سے روحانی تسکین حاصل کرتے تھے چنانچہ بعض لوگ مسلمانوں کو گولی سے مارنے کی بجائے ٹکوے یا کلہاڑی سے مسلمانوں کا نرخرہ کاٹنا پسند کرتے تھے تاکہ مقتولوں کے تڑپنے کا مزا لے سکیں اور بعض تو قتل کرنے سے پہلے ان کی آنکھیں بھی نکالتے تھے۔ اسی طرح اعضائے تناسل کاٹنا یا ہاتھ پاؤں ایک ایک کر کے کاٹنا یا مردوں کو ان کے اہل خانہ کے سامنے قتل کرنا، یہ سب معمول کی باتیں تھیں۔ سرب لڑکیاں جو وفور جوش ایمانی سے جنگ میں حصہ لیتی تھیں اور انہیں نشانہ بازی کی مشق کی ضرورت ہوتی تھی۔ پستول یا رائفل دے کر مسلمان قیدیوں کے مجمع پر چھوڑ دیا جاتا کہ لو نشانہ بازی کی مشق کے لیے انہیں قتل کرو۔ ایک موقع پر سرب فوجی رضا کار نے ایک دن میں ۷۰۰ مسلمانوں کو اپنی رائفل سے قتل کیا۔ وحشت و بربریت کے یہ واقعات محض الزامات نہیں ہیں جو مسلمانوں نے محض دشمنی میں لگائے ہیں بلکہ خود یورپی مصنفین نے اپنی رپورٹوں اور کتابوں میں ان کا اعتراف کیا ہے۔ بعض سربوں نے بھی عالمی ٹربیونل میں ان کا اعتراف کیا ہے، (دیکھیے مثلاً (۱) Salahi Ranadan Sonyel: *The Muslims of Bosnia- Genocide of a People*، لیسٹر ۱۹۹۴ء؛ (۲) Michael A. Sells: *The Bridge Betrayed-Religion and Genocide in Bosnia*، لنڈن ۱۹۹۶ء؛ (۳) رابعہ علی و Lawrence Lifschultz (مرتبین): *Why Bosnia: Writings on the Balkan war Story Creek*، ۱۹۹۳ء).

منظم عصمت دری: جنگوں میں عصمت دری کے واقعات تو ہوتے ہی ہیں کہ فوجیوں کی حیوانیت جاگی ہوئی ہوتی ہے اور دشمن سے نفرت بھی ہوتی ہے۔ اس لیے عام لوگ سمجھتے ہیں کہ اس خانہ جنگی میں (یہ سربوں اور اہل مغرب کی ایک اور پروپیگنڈا تکنیک ہے کہ اسے خانہ جنگی (civil war) کہا جاتا ہے حالانکہ یہ متعصب عیسائیوں کی طرف سے، خواہ وہ آرتھوڈکس سرب ہوں یا کیتھولک کروٹ، ہمسایہ یورپی ممالک کی مدد سے بلقان اور یورپ سے مسلمانوں کے خاتمے کی جنگ تھی، لہٰذا یہ درحقیقت ایک صلیبی جنگ اور مذہبی جنگ تھی لیکن امریکہ و یورپ نے اپنے چہروں پر بنیادی حقوق، جمہوریت ، انسانی آزادی اور گلوبلائزیشن وغیرہ کے جو ماسک پہن رکھے ہیں، انہیں بچانے کے لیے اسے 'خانہ جنگی' کہا جاتا ہے) اگر چند واقعات مسلمان خواتین کی عصمت دری کے ہوئے ہیں یا کچھ زیادہ بھی ہوگئے ہیں تو جنگوں میں ایسا ہوتا ہی ہے لیکن ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اس جنگ میں ایسا نہیں ہوا بلکہ ایک منصوبہ بندی کے ساتھ اور ایک جنگی ہتھیار کے طور پر وسیع پیمانے پر مسلمان خواتین کی عصمت دری کی گئی ہے جس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس چار سالہ جنگ میں تقریباً ۷۰ ہزار مسلمان خواتین کی عصمت دری کی گئی۔ سربوں کا طریق و ارادت یہ تھا کہ جب وہ کسی بستی پر حملہ اور قبضہ کرتے تو معزز، جوان اور مزاحمت کر سکنے والے مردوں کو عموماً فوراً قتل کر دیتے یا انہیں جنگی کیمپوں میں لے جا کر بھوکے مارتے اور اذیتیں دے دے کر قتل کرتے۔ ان کیمپوں کا ایک ضمنی فائدہ یہ تھا کہ وہ لوگ جنگ میں حصہ نہ لے سکتے اور خاندانوں کو ان کی گم شدگی سے اذیت پہنچتی ('جنگی کیمپ' کی اصطلاح، جسے انگریزی میں Concentration

Camp یا Detention Camp کہا جاتا ہے، دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے سربوں اور اہل مغرب کی ایک اور پروپیگنڈا تکنیک ہے، ورنہ درحقیقت بوسنیائی مسلمان قیدیوں کے کیمپوں کو 'موت کے کیمپ' (Death Camps) اور مسلمان خواتین قیدیوں کے کیمپوں کو جبری عصمت دری کیمپ (Rape Camps) کہنا زیادہ قرین حقیقت ہے)۔ مسلمان خواتین کو الگ کیمپوں میں رکھا جاتا وہاں نوجوان کنواری لڑکیوں کی روزانہ کئی کئی مرد عصمت دری کرتے۔ شام ہوتے ہی سرب آتے اور بھیڑ بکریوں کی طرح لڑکیوں کو چھوتے، ٹٹولتے اور اپنی اپنی پسند کی لڑکی کو لے جاتے۔ جن سربوں کے حصے میں کنواری لڑکیاں نہ آتیں وہ شادی شدہ نوجوان عورتوں سے دل بہلاتے۔ یہاں تک کہ نابالغ بچیاں اور ساٹھ ساٹھ سالہ بوڑھی خواتین کی جبری آبروریزی کی گئی، بلکہ ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ ایک ماں سے اس کی ساڑھے تین سال کی صحت مند بچی سرب فوجی رات کے وقت چھین کر لے گئے۔ ایک گھنٹے بعد اس کو بلایا گیا اور کئی مردوں نے اس کی آبروریزی کی اور پھر اسے ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا اور کہا گیا کہ اپنی بیٹی کو لے جاؤ جو وہاں خون میں لت پت پڑی تھی۔ اس بچی کو نارمل ہونے کے لیے ایک طویل عرصہ ہسپتال میں رہنا پڑا (ہفت روزہ گارڈین ۲۸ مارچ ۱۹۹۳ء)۔

ایک سرب فوجی نے بتایا کہ وہ عصمت دری میں ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن جب اس نے اپنے افسر سے یہ بات کہی تو اسے سزا کی دھمکی دی گئی اور مجبور کیا گیا کہ وہ مسلمان خواتین کی عصمت دری کرے۔ یہ لوگ مسلم خواتین کی پہریداری کرتے ہوئے اور ان کو ستاتے ہوئے آپس میں شرطیں بدتے اور ٹھٹھے لگاتے کہ کس نے زیادہ بوسنیائی لڑکیوں سے داد عیش حاصل کیا اور یہ بھی اکثر ہوا کہ سرب فوجی رضاکار عورتوں کی بے حرمتی ان کے اہل خاندان کے سامنے کرتے۔ مردوں کو باندھ اور جکڑ کر اور ان کے سر پہ رائفل لے کر کھڑے ہو کر وہ باپ کے سامنے بیٹی کی، خاوند کے سامنے بیوی کی اور بھائیوں کے سامنے ان کی بہن کی جبری آبرو ریزی کرتے اور ایسا کرنے والے بعض اوقات مقامی سرب ہوتے جو ان مسلمانوں کے ہمسائے اور محلے دار ہوتے۔

سربوں نے اسی پر بس نہیں کیا۔ لڑکیوں اور نوجوان عورتوں کی ہفتوں تک اس وقت تک آبرو ریزی کرتے جب تک وہ حاملہ نہ ہوجاتیں اور جب وہ حاملہ ہوجاتیں تو ان کو الگ کیمپ میں یا کیمپ کے الگ حصے میں رکھا جاتا اور ان کی پوری نگہداشت کی جاتی کہ وہ اپنا حمل ضائع نہ کر سکیں۔ اس کے لیے باقاعدہ نگران عورتوں کا انتظام تھا۔ اس طرح سرب وحشیوں نے ان چار سالوں میں ہزاروں مسلمان عورتوں کو جبری آبرو ریزی سے حاملہ کیا تاکہ وہ سربوں کے بچے پیدا کریں۔ ایک برطانوی اخبار کے مطابق ۱۹۹۳ء کی ابتدا میں اس طرح کی جبری حاملہ عورتوں کی تعداد ۱۳ ہزار تک پہنچ چکی تھی (ایوننگ ٹائم، گلاسکو، یکم اپریل ۱۹۹۳ء)۔

سربوں نے یہ سب کیوں کیا؟ ظاہر ہے اس شیطنت کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی اور یہ منصوبہ بندی کسی وحشی جنگی جنونی نے نہیں، بلکہ ان سرب قائدین نے کی جن کی اکثریت انتہائی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی مثلاً ڈاکٹر رادو وان کرادزچ چٹنک رہنما اور عصمت دری کیمپوں کا نگران جو ذہنی امراض کا معالج تھا اور جس نے گروہی علاج اور ڈیپریشن میں ڈاکٹریٹ کی تھی۔ ڈاکٹر میخائل مارکووچ سرب حکمران پارٹی کا دماغ، ماہر عمرانیات اور مؤرخ فلسفہ، ڈاکٹر سرچکووچ بلغراد میں سرب پروپیگنڈے کا نگران اعلیٰ، پیشے کے لحاظ سے ماہر ذہنی امراض، اور

ڈاکٹر ووئے سلاف سسیلئے چٹنک کا مرکزی رہنما اور عمرانیات میں پی ایچ ڈی۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ مسلمانوں میں حیا اور عصمت کے مخصوص تصورات ہیں۔ اسلام نسل کے تحفظ اور عدم اختلاط پر بہت زور دیتا ہے اور اسی لیے اسلام میں زنا کی سزا موت ہے۔ ایک کنواری مسلمان عورت کی جبرو آبروریزی اور اسے ناجائز حمل ٹھہرانے کا مطلب ہے اسے زندہ درگور کر دینا اس کی شخصیت کو کچل دینا، اور توڑ پھوڑ دینا، اس کے خاوند، بھائی ، باپ اور پورے خاندان کو ساری زندگی سر اٹھانے کے قابل نہ رہنے دینا۔ یہ شیطان ان باتوں کو جانتے تھے اسی لیے انہوں نے عمداً منصوبہ بندی کی کہ مسلمانوں کی نسل پاک نہ رہنے دی جائے، ان کو خود ان کی نظروں میں گرا دیا جائے اور انہیں ذلیل و رسوا کر دیا جائے تاکہ یہ اور ان کے خاندان سر اٹھا کر جینے کے قابل نہ رہیں حالانکہ اس سارے عمل میں ان بیچاری مظلوم خواتین کی رتی بھر مرضی شامل نہ تھی اور ظلم پر ظلم یہ کہ جب یہ واقعات دنیا کے سامنے آئے اور جبری عصمت دری کے کیمپوں کی تفصیلات سامنے آئیں (گارڈین لندن، شمارہ ۱۹ دسمبر ۱۹۹۲ء نے ایسے ۳۳ عصمت دری کیمپوں کے نام اور وہاں کی تفصیلات مہیا کی) تو ان پروپیگنڈا ماہرین نے صاف ہاتھ اٹھا دیئے اور انکار کرتے ہوئے کہا کہ جبری عصمت دری کے تو صرف چند واقعات ہوئے ہیں یا یہ ایک آدھ جنسی جنونی کی حرکت ہے لیکن خود یورپی رپورٹوں اور مصنفین نے حقائق کو مصدقہ قرار دیا، اس کی تفصیلات مہیا کیں۔ عورتوں کی جبری آبرو ریزی اور مسلم کلچر کی تباہی دراصل سربوں کی بوسنیائی مسلمانوں کے خلاف نفسیاتی جنگ تھی جس کا مقصد بوسنیا میں مسلم شخصیت کو کچلنا اور تباہ کرنا تھا اور اس کی پلاننگ کرنے والے امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور فرانس سے انتہائی اعلیٰ تعلیم یافتہ پیشہ ور ماہرین نفسیات و ماہرین عمرانیات تھے (تفصیل کے لیے دیکھیے : Executive Intelligence Review، واشنگٹن ، ۱۲ فروری ، ۱۹۹۳ء)۔

ثقافتی تباہی: سربوں کی مسلمانوں سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے بوسنیائی مسلمانوں کے قتل عام، ان کے علاقے پر قبضے، ان کی عورتوں کی بے حرمتی اور ان کی معاشی تباہی پر ہی بس نہیں کی بلکہ ان کی عبادت گاہوں، تاریخی عمارات، لائبریریوں اور عجائب گھروں کو گرا کر اور جلا کر تباہ و برباد کر دیا تاکہ بوسنیا سے ان کے دین، تہذیب اور ثقافت کا بھی خاتمہ کر دیا جائے اور یہ کام انہوں نے جنگ کے آغاز ہی میں شروع کر دیا تاکہ بعد میں دنیا اگر شور کرے تو کرتی رہے، جو وہ چاہتے ہیں سو کر گزریں۔ بی بی سی کی ٹیم نے اوائل ۱۹۹۳ء میں بوسنیا کا دورہ کیا اور بتایا کہ سرب جب کسی مسلم گاؤں پر حملہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے وہاں کی مسجد گراتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ بنیادوں کی اینٹیں اور صحنوں میں لگے درخت جڑوں سے اکھاڑ دیتے ہیں تاکہ مسجد کا نام و نشان ختم ہو جائے (ہفت روزہ امپیکٹ انٹرنیشنل ، ۱۲ مارچ تا ۸ اپریل ۱۹۹۳ء)۔ اس جنگ میں سربوں نے اندازاً ۸۰۰ سے زائد مساجد شہید کیں، جن میں تریبنجی کی ۵۰۰ سالہ قدیم مسجد بھی شامل ہے جسے سربوں نے ۲۷ جنوری ۱۹۹۳ء کی رات گولہ باری سے تباہ کیا۔ یونیورسٹی سے ملحق سراجیوو کی قومی لائبریری جس میں پندرہ لاکھ کتابیں اور جرائد اور ڈیڑھ لاکھ مخطوطات تھے، اس پر سرب تین دن تک متواتر (۲۵ تا ۲۷ اگست ۱۹۹۲ء) آتش گیر مادہ پھینکتے رہے یہاں تک کہ یہ لائبریری راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ سراجیو کا اوری اینٹل انسٹی ٹیوٹ جس میں مشرقی علوم و ممالک سے متعلق مسودات، دستاویزات، کتب اور مائیکرو فلموں کا نادر ذخیرہ تھا اور جو جنوب

مشرقی یورپ میں اپنی نوعیت کا واحد علمی ادارہ تھا، اسے سربوں نے ۱۷ مئی ۱۹۹۲ء کو بمباری سے ملیامیٹ کر دیا۔ غازی خسرو بیگ کی مسجد جو ۱۵۳۷ء میں تعمیر ہوئی اور اس کے ساتھ ملحقہ بوسنیا کی قدیم ترین غازی خسرو بیگ لائبریری جس میں اسلام اور یہودیت سے متعلق بارہویں صدی کے نادر و نایاب مخطوطات اور مسودات تھے، اسے سربوں نے ۵ مئی ۱۹۹۲ء کو شدید گولہ باری کر کے تباہ کر دیا۔

اس علمی تباہی پر خود مغربی دنیا خاموش نہ رہ سکی اور نیویارک کے ایک علمی جریدے نے دنیا کے مختلف مذہبوں، علاقوں اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے ۲۹۶ دانشوروں، مؤرخوں، ادیبوں اور پروفیسروں کی طرف سے 'ثقافتی نسل کشی' کے عنوان سے ایک بیان شائع کیا اور سربوں کی علم دشمنی اور ثقافتی ورثے کی تباہی کی مذمت کرتے ہوئے اسے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی ایک منظم کوشش قرار دیا اور دنیا بھر کے اہل قلم سے اپیل کی کہ وہ اس کے خلاف آواز اٹھائیں اور اس ثقافتی تباہی کو رکوائیں (نیویارک ریویو آف بکس، شمارہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۳ء)۔

کروٹ قوم پرستوں نے جب سربوں کو یہ سب کرتے دیکھا تو انہوں نے سوچا کہ وہ کیوں پیچھے رہیں لہٰذا جوں ہی انہیں موقعہ ملا انہوں نے بھی وہی کیا جو سربوں نے کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے جب جنوبی بوسنیا میں کروشیا سے ملحق بوسنیائی علاقے پر حملہ کیا تو بوسنیا کے دوسرے بڑے اور قدیم تاریخی شہر موستار پر نہ صرف قبضہ کیا بلکہ وہاں کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو بھی تباہ کیا جس میں سب سے نمایاں دریائے ڈرینا کا 'قدیم پل' تھا جسے ترکی سلطان سلیمان اعظم نے ۱۵۶۶ء میں تعمیر کروایا تھا۔ اس میں کرجوز (Karadjoz) کی تاریخی مسجد بھی تھی جو ۱۵۵۷ء میں تعمیر کی گئی اور اس کے ساتھ ملحقہ قدیم قبرستان بھی جس میں صدیوں پہلے کے صوفیا کے مزارات تھے۔ آسٹریا۔ ہنگری عہد کی عمارتیں، قدیم جمنازیم (سکول)، بازار، مساجد، تکیے (خانقاہیں) سب ملیامیٹ کر دیئے گئے (دیکھیے بوسنیائی نوبل لاریٹ آئیو اندرچ (Ivo Andric) کی تالیف *The Bridge Over the Drina*، اور مائیکرو بک پبلشنگ ہاؤس کی مرتبہ 'موستار' موستار ۱۹۹۸ء)۔

اعترافات: بوسنیا کے خلاف اس جنگ میں پونے تین لاکھ مسلمان قتل کیے گئے، اس سے کہیں زیادہ گھروں سے بے دخل کر دیے گئے، ان کی عورتوں کی منظم بے حرمتی کی گئی، انہیں جنگی کیمپوں میں بھوک اور ذلّت کا سامنا کرنا پڑا، سراجیو چار سال تک محصور رہا اور وہاں زندگی سسکتی رہی، ان کا ثقافتی ورثہ تباہ کر دیا گیا اور ان کے علاقے پر قبضہ کر لیا گیا (ڈیٹن معاہدے میں بڑی مشکل سے سربوں سے نصف علاقہ مسلمانوں اور کروٹوں کو مشترکہ طور پر دلوایا جاسکا) اور یہ ظلم و ستم چوری چھپے نہیں ہوا۔ مہذّب دنیا علی الاعلان سب کچھ ٹی وی پر دیکھتی رہی اور امن، بنیادی حقوق، فریڈم، جمہوریت، رواداری ہیومنزم، سیکولرازم اور گلوبلائزیشن کا علمبردار اور بے مثل تہذیب و تمدن کا علمبردار یورپ و امریکہ کی آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے مزید اور زیادہ شرمناک و اندوہناک واقعات ہم نے قصداً اس لیے بیان نہیں کیے کہ پڑھنے والے انہیں ایک مسلمان کی طرف سے ہمدردانہ اور مبنی بر مبالغہ نہ سمجھیں لہٰذا مناسب محسوس ہوتا ہے کہ چند مغربی افراد اور اداروں کی طرف سے جنہوں نے ان مظالم کو دیکھا اور بیان کیا، ان کے اعترافات یہاں نقل کر دیے جائیں تاکہ سند رہیں۔

- اقوام متحدہ کے بنیادی حقوق کمیشن کے رپورٹر (Tade Usz Mazowiecki) نے سربرنیکا کے بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا "وسیع پیانے پر بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی جسے وحشیانہ ہی کہا جاسکتا ہے، سول آبادی پر حملے، قتل عام اور جبری آبرو ریزی"۔ اس صورت حال سے وہ اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ اپنی رپورٹ دینے کے بعد اس نے احتجاجاً نوکری سے استعفیٰ دے دیا (Noel Malcolm: *Bosnia - A Short History*، لنڈن ۱۹۹۶ء)۔

- اقوام متحدہ نے جنگ کے خاتمے کے بعد اپنے ایک سو سے زیادہ ذمہ داران کے انٹرویو کے بعد ۱۵۰ صفحات کی رپورٹ بوسنیا کے بارے میں مرتب کروائی۔ اس میں تسلیم کیا گیا ہے کہ جب ۱۹۹۵ء میں سرب فوج مسلمانوں کے خلاف دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ میں سب سے بڑا قتل عام کر رہی تھی تو اس وقت اقوام متحدہ نے معاملے کو معمولی بنا کر پیش کیا اور سربوں کی خاموش حوصلہ افزائی کی۔"...... "سربرنیکا کے بارے میں اپنی کوششوں اور فیصلوں کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد ہم انتہائی افسوس اور صدمے کے ساتھ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اپنی کوتاہی اور غلط اندازوں کی وجہ سے ہم صورت حال کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے اور نہ سربوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام کو روکنے میں کامیاب ہوسکے"؟

اقوام متحدہ کی امن فوج کے سربراہ کوفی عنان نے تسلیم کیا کہ ' ہم نے سلامتی کونسل کو غلط اطلاعات بہم پہنچائیں اور انہیں بتایا کہ سرب (سربرنیکا) حملہ نہیں کریں گے جب کہ وہ کر رہے تھے۔ جب اقوام متحدہ کی فوج پر سربوں نے حملہ کیا تو ہم نے اطلاع دی کہ حملہ بوسنیائی مسلمانوں نے کیا ہے۔ جب سراجیو فوری ہوائی حملے کے لیے منتیں کر رہا تھا تو ہم خاموش رہے اور ہم نے ہتھیاروں پر سے پابندی اٹھا کر بوسنیا کو دفاع کا موقع بھی نہیں دیا (انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون، شمارہ ۱۶ نومبر ۱۹۹۹ء نیز دیکھیے Misha Glenny: *The Balkans*، ۱۸۰۴-۱۹۹۹ء، لنڈن ۱۹۹۹ء)۔

- بوسنیا میں ہونے والے مظالم کو جب بعض برطانوی اخباری رپورٹوں نے مسلسل اپنی رپورٹوں کا موضوع بنایا تو یہ "دہشت ناک خبریں" بعض نستعلیق مزاج دانشوروں کو مبالغے پر مبنی لگیں۔ اختلاف اتنا بڑھا کہ معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ لندن ہائی کورٹ نے مواد کا جائزہ لینے کے بعد قرار دیا کہ جرنلسٹ سچے تھے اور ان کی رپورٹیں درست تھیں (دیکھیے Ed. Vulliamy: *Poison in The Well of History*، در گارڈین (لنڈن)، ۱۵ مارچ، ۲۰۰۰ء)۔

- بوسنیائی مسلمانوں کے خلاف مظالم اتنے بہیمانہ تھے کہ اقوام متحدہ کو جنگی مجرموں کے خلاف انکوائری کے لیے ایک انٹرنیشنل ٹربیونل بنانا پڑا۔ یہ ٹربیونل بہت سے سربوں کو ان کے جنگی جرائم میں ملوث ہونے پر سزا دے چکا ہے۔ احمچی کے واقعات کی تحقیقات کرنے والے جج نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ "۱۰ اپریل ۱۹۹۳ء کو احمچی میں جو کچھ ہوا بلاشبہ یہ انسانی تاریخ کا ہولناک اور مکروہ ترین واقعہ ہے اور اس چیز کا مظہر کہ انسان اپنے ہم جنس انسانوں سے اتنا غیر انسانی سلوک بھی کر سکتا ہے جس سے سر شرمندگی سے جھک جاتا ہے (*The Sunday Times*، ۱۶ جنوری ۲۰۰۰ء نیز دیکھیے Martin Bell: *In the Harm's Way*، لنڈن ۱۹۹۵ء)۔

- ۱۹۹۲ء کے موسم گرما میں جب اومارسکا اور دوسرے جنگی کیمپوں کا انکشاف ہوا تو امریکی وزارت خارجہ نے ایک رپورٹ جاری کی اور اقوام متحدہ اور امریکی انتظامیہ پر تنقید کی کہ وہ کچھ نہیں کر رہے حالانکہ ان کیمپوں میں انسانی حقوق کی شدید بے حرمتی ہورہی

ہے اندازاً وہاں ایک لاکھ ستر ہزار مسلمان قید ہیں۔ جن میں مردوں کی اکثریت کو بھوکا مارا جارہا اور قتل کیا جا رہا ہے اور عورتوں کی اکثریت کو جنسی غلام (Sex Slaves) کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے اور ان کو کیمپوں میں رکھنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے گھر اور علاقے ان سے چھین کر ان پر قبضہ کر لیا گیا ہے (.Ed V Ulliamy: Seasons in Hell-Understanding Bosnia`s War، لنڈن ۱۹۹۴ء)۔

اب ہم بوسنیا کی بحیثیت ایک ملک معیشت، تعلیم، دفاع، معاشرت وغیرہ کے بارے میں تازہ اعداد و شمار آپ کے سامنے رکھتے ہیں:

انتظامی تقسیم: بوسنیا اس وقت انتظامی لحاظ سے مرکز، دو صوبوں ، ۴ شہروں، دس اضلاع اور ۱۳۷ میونسپل کمیٹیوں پر مشتمل ہے۔ مرکز میں دو ایوانی مقننہ ہے اور مجلس صدارت تین افراد پر مشتمل ہوتی ہے جن کا تعلق تینوں قومیتوں سے ہوتا ہے اور وہ باری باری منصب سنبھالتے ہیں۔ صوبے پراونس (Province) کی بجائے حصے یا علاقے (Entities) کہلاتے ہیں۔ ایک حصہ فیڈریشن کہلواتا ہے جسے کروٹ اور مسلمان مل کر چلاتے ہیں اور یہ بھی دو ایوانی ہے۔ اس کے پاس ۵۱٪ علاقہ ہے۔ دوسرا صوبہ یا حصہ بوسنیائی سربوں کا ہے جس کے پاس ۴۹٪ علاقہ ہے (جس پر انہوں نے دوران جنگ قبضہ کر لیا تھا اور جسے مغربی طاقتوں نے قانونی حیثیت دے دی ہے)۔ ان دو حصوں یا صوبوں کے علاوہ بوسنیا میں ایک ضلع براکو ایسا بھی ہے جو دونوں کے علاقوں پر مشتمل ہے لیکن اس پر دونوں میں سے کسی کا بھی کنٹرول نہیں ہے بلکہ اسے مرکزی حکومت کے تحت لوکل گورنمنٹ کی طرز پر چلایا جاتا ہے۔ فیڈریشن میں دس اضلاع (Cantons) ہیں جب کہ بوسنیائی سرب حصے میں کوئی ضلع نہیں ہے۔ ملک میں ۱۳۷ مونسپل کمیٹیاں ہیں، ۷۴ فیڈریشن میں اور ۶۳ بوسنیائی سرب حصے میں ہر ضلع میں کئی میونسپل کمیٹیاں ہوتی ہیں جو لوکل گورنمنٹ کی طرز پر چلائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بوسنیا میں ۴ شہر ہیں (بنجا لیوکا، موستار، سراجیو اور مشرقی سراجیو) سراجیو اور مشرقی سراجیو کئی میونسپل کمیٹیوں پر مشتمل ہیں جب کہ موستار اور بنجالیوکا میں شہر اور میونسپل کمیٹی ایک ہی ہیں۔ شہروں کے علاوہ بعض میونسپل کمیٹیاں بھی اپنی قدیم تاریخی شناخت رکھتی ہیں۔

جغرافیائی صورت حال: بوسنیا، جس کا کل رقبہ ۵۱,۱۹۷ مربع کلومیٹر اور آبادی تقریباً ۴۵ لاکھ (تخمینہ جولائی ۲۰۰۶ء) ہے، جزیرہ نما بلقان کے مغربی حصے میں واقع ہے۔ ملک کا اکثر علاقہ پہاڑی ہے (کوہ ایلس وسطی سے متعلق)۔ گو اس کا ۲۰ کلومیٹر رقبہ بحیرہ ایڈریاٹک (بحر روم کی ایک شاخ جو جزیرہ نما بلکان اور اٹلی کے درمیان واقع ہے) سے ملتا ہے جہاں نیوم (Neum) کا شہر مشہور سیاحتی مرکز ہے لیکن عملاً بوسنیا Land Locked ہے کیونکہ مذکورہ ساحلی علاقہ کٹا پھٹا ہونے کے علاوہ خشکی اور آبی دونوں لحاظ سے کروٹ علاقے میں گھر ہوا ہے۔ ہرزیگوینا، بوسنیا کے جنوبی علاقے کا نام ہے جو بوسنیا کے پانچویں حصے کے برابر ہے اور دونوں میں کوئی متعین بارڈر نہیں ہے۔ بوسنیا کے اہم شہروں میں سراجیو (مرکزی دارالحکومت)، شمال مغرب میں بنجا لیوکا، شمال مشرق میں تزلا (Tuzla)، وسط میں زنیکا (Zenica) اور موستار (ہرزیگونیا کا دارالحکومت) ہیں۔ بوسنیا کا وسطی اور مشرقی حصہ پہاڑی علاقوں پر مشتمل ہے صرف جنوب کی آب و ہوا ساحلی اثرات رکھتی ہے۔ بوسنیا کا تقریباً نصف رقبہ جنگلات پر مشتمل ہے خصوصاً مشرقی حصے میں دریائے ڈرینا کے ساتھ گھنے جنگلات ہیں۔ شمالی بوسنیا میں دریائے

ساوا کے ساتھ واقع میدانی علاقہ بہت زرخیز ہے اور بھرپور طور پر زیرکاشت ہے۔ بوسنیا میں سات دریا بہتے ہیں جو بعض بڑے شہروں کے درمیان یا پاس سے گزرتے ہیں اور جنہوں نے اس علاقے کی خوبصورتی اور زرخیزی میں اضافہ کیا ہے۔ بعض دریا مختلف علاقوں کے درمیان قدرتی بارڈر کا کام بھی دیتے ہیں.

اقتصادیات: آزادی کے بعد بوسنیا کو دو بنیادی اقتصادی مسئلوں کا سامنا تھا۔ ایک تو یہ کہ پہلے اقتصادی حکمت عملی متحدہ یوگوسلاویہ کی بنا پر طے کی گئی تھی مثلاً ایک عظیم ہائی وے کا منصوبہ تھا جو ساری بلقانی ریاستوں کو باہم ملاتی۔ ظاہر ہے اس میں بوسنیا کا کوئی فائدہ نہ تھا چنانچہ اس طرح کی منصوبہ بندی کو تبدیل کر کے اب بوسنیا کے مقامی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اقتصادی پلاننگ کی ضرورت تھی۔ دوسرے ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۵ء تک کی جنگ نے سارا اقتصادی ڈھانچہ تباہ کر دیا تھا جس کی تعمیر نو درکار تھی۔ جنگ کے برے اثرات کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کی وجہ سے شرح پیداوار ۶٪ تک اور مجموعی، مقامی پیداوار (GDP) ۷۵٪ تک گر گئی۔ تاہم جنگ کے بعد متعدد مثبت اقدامات کے نتیجے میں، جن میں بیرونی امداد، بین الاقوامی مالیاتی ادارے (IMF) اور ورلڈ بنک کا تعاون، یورپی یونین کی مدد سے ٹیلی کمیونیکشن، بنکنگ، ٹیکس اور کسٹم کے متحدہ نظام کا قیام اور ویلیو ایڈڈ ٹیکس (VAT) کی یکساں شرح کا نفاذ، جبری بے دخل کیے گئے افراد کی گھروں کو واپسی، بیرونی سرمایہ کاری اور صنعتی ڈھانچے کی بحالی شامل ہیں، شرح پیداوار بڑھ گئی ہے اور اقتصادی زندگی بڑی حد تک معمول پر آگئی ہے۔ ۱۹۹۸ء میں نئی کرنسی (Convirtable Mark=MK) متعارف کروائی گئی جو جرمن ڈش مارک کے مساوی ہے۔ یورو سے اس کی شرح مبادلہ ایک یورو =1.95KM ہے.

بوسنیا کے اقتصادی مسئلے اس وقت دو ہیں ایک بے روزگاری (۲۰۰۳ء میں ۲۰٪) اور دوسرے تجارتی خسارہ۔ تجارتی خسارے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بوسنیا میں اجناس اتنی پیدا نہیں ہوتیں کہ ساری آبادی کی کفالت کر سکیں چنانچہ انہیں درآمد کرنا پڑتا ہے۔ اقتصادی زبان میں اس کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ۲۰۰۳ء میں مجموعی مقامی پیداوار (GDP) میں زراعت کا حصہ صرف ۱۶.۷ فیصد تھا اور باروزگار کارکنوں کا صرف ۴ فیصد اس سے وابستہ تھا (بہ نسبت صنعت کے جس کا جی ڈی پی میں حصہ ۳۴.۷ فیصد تھا اور ۴۷.۵ فیصد باروزگار کارکن اس سے وابستہ تھے۔ اس سال تجارتی خسارہ ۳,۹۴۵ ملین ڈالر تھا۔ بوسنیا کے تجارتی تعلقات جرمنی، اٹلی، سلووینیا، کروشیا، سربیا، مانٹی نیگرو، ہنگری، آسٹریلیا اور سوئٹزر لینڈ سے ہیں.

بوسنیا کی اقتصادی حالت کے دو امتیازی اور مثبت پہلو بھی ہیں۔ ایک تو یہاں افراط زر بہت کم ہے (۲۰۰۴ء میں ۱.۹ فیصد) اور دوسرے یہاں معاشرے کے مختلف طبقات میں آمدنی میں فرق بہت کم ہے۔ اس لحاظ سے دنیا کے ۱۹۳ ممالک میں سے اس کا آٹھواں نمبر ہے.

تعلیم: متحدہ سوشلسٹ یوگوسلاویہ میں تعلیم کی فراوانی تھی اور وہ معیاری بھی تھی۔ چنانچہ دو بوسنیائی باشندوں نے اس دوران نوبل پرائز حاصل کیا (۱۹۶۱ء میں آئیوا ندرے (Ivo Andri) نے ادب میں اور ۱۹۷۵ء میں ولادیمیر پریلاگ (Vladimir Prelog) نے کیمسٹری میں اور یہ اس امر کے باوجود ہوا کہ بہت سے بوسنیائی نامساعد حالات کی وجہ سے ملک چھوڑ کر ترقی پذیرملکوں میں جا مقیم ہوئے تھے۔ اس وقت بھی شمالی امریکہ، آسٹریلیا اور یورپی ممالک میں بہت سے بوسنیائی طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور وہاں ان کا شمار اچھے اور

ذہین طلبہ میں ہوتا ہے۔

بوسنیا میں ابتدائی لازمی تعلیم ۸ سال کی تھی جسے تعلیمی سال ۲۰۰۳-۲۰۰۴ء سے ۹ سال کا کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ۴ سال کی ثانوی تعلیم ہوتی ہے جس میں عمومی تعلیم کے علاوہ پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم کے سکول بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد طلبہ کو یونیورسٹی میں داخلہ ملتا ہے۔ بوسنیا کے بڑے شہروں میں ۷ یونیورسٹیاں ہیں (سراجیو، مشرقی سراجیو، بنجالیوکا، تزلا اور بیہاچ میں ایک ایک اور موستار میں دو) جن کے سٹیلائٹ کیمپس چھوٹے شہروں میں بھی ہیں۔ جب کہ تربیت اساتذہ کے چار پوسٹ گریجوایٹ کالج اور دو آرٹ اکیڈیمیاں بھی ہیں۔

۱۹۹۲-۱۹۹۵ء کی جنگ نے تعلیمی ڈھانچے کو بھی شدید نقصان پہنچایا اور بہت سے طلبہ کو تعلیم جاری رکھنے کے لیے دوسرے ملکوں کو جانا پڑا اور دوسرے سیاسی و تنظیمی اداروں کی طرح تعلیم بھی تین قومیتوں میں بٹ کر رہ گئی۔ ۲۰۰۴ء میں یورپی یونین کے دباؤ کے نتیجے میں نظام تعلیم کی وحدت کا فیصلہ ہوا اگرچہ اب بھی مابعد جنگ اثرات کی وجہ سے تعلیمی معیار کی بہتری اور خصوصاً نصاب تعلیم پر نظرثانی وغیرہ کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں۔ بوسنیائی فیڈریشن کے اعداد و شمار کے مطابق تعلیمی سال ۲۰۰۲-۲۰۰۳ء میں ۱۸٦۲ پرائمری سکولوں میں ۳٦۳,۰۷۲ طلبہ، ۳۰۱ ثانوی سکولوں میں ۱٦۹,۴۹۷ طلبہ اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں ۵۳,۹۸۵ طلبہ زیر تعلیم تھے۔

آبادی اور مذہب: ۱۹۹۱ء کے بعد سے بوسنیا میں رائے شماری نہیں ہوئی اور شدید سیاسی اختلافات کی وجہ سے آئندہ بھی اس کے جلد ہونے کے امکانات نہیں۔ ۱۹۹۱ء کی رائے شماری کی رو سے بوسنیا کی آبادی ۴۳,۵۴,۹۱۱ تھی جس میں بوسنیاک (یعنی بوسنیائی مسلمان) ۴۳.۷ فیصد، سرب ۳۱.۳ فیصد اور کروٹ ۱۷.۳ فیصد تھے جب کہ ۵.۵ فیصد نے اپنے آپ کو یوگوسلاوی قرار دیا تھا۔ ۱۹۹۲ تا ۱۹۹۵ء کی جنگ میں سربوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور انہیں گھروں سے بے دخل کیا جب کہ دوسری قومیتیں بھی اس سے متاثر ہوئیں۔ اس کے نتیجے میں موجودہ آبادی کا تخمینہ ۴۰ لاکھ ہے، جس میں بوسنیاک ۴۸ فیصد (مسلمانوں میں شرح آبادی دوسری قومیتوں سے زیادہ ہے) سرب ۳۷.۱ فیصد اور کروٹ ۱۴.۳ فیصد ہیں (سی آئی اے ورلڈ فیکٹ بک ۲۰۰۰ء)۔ یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ قومیتوں کی یہ تعداد تقریباً مذہبی تفریق پر مبنی اور اس کے مساوی ہے جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ۹۰ فیصد بوسنیاک مسلمان ہیں، ۹۳ فیصد سرب آرتھوڈکس عیسائی ہیں جب کہ ۸۸ فیصد کروٹ رومن کیتھولک عیسائی ہیں۔

دفاع: اگست ۲۰۰۳ء سے پہلے بوسنیا کے دونوں حصوں (صوبوں) کی افواج الگ الگ تھیں۔ بوسنیائی سربوں کے پاس ٦٦۰۰ اور (بوسنیائی + کروٹ) فیڈریشن کے پاس ۱۳,۲۰۰ سپاہی تھے۔ ۱۹۹۵ء کے ڈیٹن معاہدے کی رو سے فوجوں میں بتدریج کمی اور وحدت مطلوب تھی۔ بوسنیائی سربوں کی مزاحمت کی وجہ سے اس میں تاخیر ہوتی رہی، تاہم مارچ ۲۰۰۴ء میں مرکزی حکومت میں وزارت دفاع قائم کر دی گئی اور سرب فوجوں کی تعداد کم کر کے ۴۰۰۰ اور فیڈریشن کی فوج کی تعداد ۸۰۰۰ کر دی گئی۔ اسی سال نومبر میں مرکزی حکومت کی طرف سے پہلا فوجی یونٹ قائم کیا گیا جس میں تینوں قومیتوں کے سپاہی موجود تھے۔ دسمبر میں نیٹو نے اپنے پروگرام 'شراکت برائے امن' (Partnership for Peace) میں جب بوسنیا کی شمولیت کی درخواست دوبارہ مسترد کر دی اور بوسنیا کو مزید مفاہمتی اقدامات کے لیے کہا تو بوسنیا میں تعینات 'اعلیٰ نمائندے' نے

حکم دے دیا کہ ۲۰۰۵ء میں علاقوں (صوبوں) کی وزارت ہائے دفاع ختم کر دی جائے اور مرکزی حکومت کے تحت بوسنیا کی واحد فوج تشکیل دی جائے۔ اسی طرح پولیس اور بحالی امن و امان کے دیگر اداروں کو بھی باہم ضم کر کے مرکزی حکومت کے تحت ایک ہی پولیس فورس بنا دی جائے۔

اس سے پیشتر ۱۹۹۵ء میں جنگ روکنے اور ڈیٹن معاہدے پر موثر عمل درآمد کے لیے اقوام متحدہ کی طرف سے ۶۰ ہزار سپاہیوں پر مشتمل بین الاقوامی فوج، نیٹو کی سربراہی میں، بوسنیا میں تعینات کی گئی تھی۔ حالات بہتر ہونے پر دسمبر ۱۹۹۶ء میں اس کی تعداد ۳۲,۰۰۰ کر دی گئی اور اس کا نام 'فوج برائے عمل درآمد' (Implementation Force) کی بجائے، 'استحکامی فوج' (Stabilization Foce) رکھ دیا گیا۔ ۲۰۰۲ء کے آخر میں جب حالات مزید بہتر ہوگئے تو اقوام متحدہ نے بوسنیا میں بحالی امن کی ذمہ داری یورپی یونین پولیس فورس کے حوالے کر دی جس میں ۵۱۲ پولیس آفیسرز، ۵۰ سولین نگران اور ۳۰۰ مقامی افراد شامل تھے جس کا ایک کام مقامی پولیس اور بحالیٔ امن کے دیگر اداروں کے افراد کو تربیت دینا بھی تھا۔ دریں اثنا نیٹو نے 'استحکامی فوج' میں بتدریج کمی جاری رکھی، جس کی تعداد وسط ۲۰۰۴ء میں ۷۰۰۰ افراد رہ گئی۔ اسی سال دسمبر میں نیٹو نے بحالیٔ امن کی ذمہ داری یورپی یونین کی سربراہی میں سات ہزار افراد پر مشتمل ایک بین الاقوامی فوج کے سپرد کر دی جس میں یورپی یونین سے باہر کے گیارہ ممالک کی فوج بھی شامل تھی البتہ اس نے سراجیو میں اپنے ۲۰۰ فوجی آفیسرز برقرار رکھے جن کا کام بوسنیا کی یورپی یونین کے ساتھ ہم آہنگی میں مدد دینا تھا۔ اسی طرح ۱۵۰ امریکی فوجی افسر بوسنیا کے شمال مشرقی حصے میں تعینات رہے تاکہ وہ بین الاقوامی ٹریبونل کو مطلوب جنگی مجرموں کی گرفتاری میں مدد دے سکیں۔ ۲۰۰۲ء میں بوسنیا کی مرکزی حکومت کا دفاعی بجٹ ۱۳۰ ملین ڈالر تھا (بوسنیا کے بارے میں تازہ اعداد شمار کے لیے دیکھیے: The Europ a World Year Book 2006، یوروپا پبلی کیشنز، لنڈن ۲۰۰۷ء اور The Statesmen's Year book 2006، میکملن نیویارک ۲۰۰۷ء).

مآخذ: متن مقالہ میں درج ہیں۔ نیز بوسنیا میں اقوام متحدہ، یورپی یونین اور امریکہ کے کردار کے لیے مغربی مآخذ میں سے دیکھیے: (۱) B. Cohen :G.Stamkowski With No peace to Keep-United Nations Peace Keeping and the War in the Former Yugoslavia، لنڈن ۱۹۹۵ء؛ (۲) Ted Carpenter(مرتب): Nato's Empty Victory- A Postmortem of the Balkan War، واشنگٹن ۲۰۰۰ء؛ (۳) Phillip Corvin: Dubious Mandate-A Memoir of the U.N in Bosnia، در ہم، ۱۹۹۹ء؛ (۴) Wayne Bert: The Reluctant Superpower-United States Policy in Bosnia,1991-1995، لنڈن ۱۹۹۵ء؛ (۵) D.Rieff: Slaughter House-Bosnia and the Failure of the West، Simon - Schuter، نیویارک ۱۹۹۵ء؛ عالیجاہ عزت بیگووچ کی دو کتابیں بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہیں: (۶) War and Peace in Bosnia - Hercegovina، سراجیو ۱۹۸۸ء؛ اور (۷) The Islamic Declaration، سراجیو ۱۹۷۸ء؛ مسلم نقطۂ نظر کے لیے مزید دیکھیے: (۸) Dr. Iftikharh.Malik: Islam, Globalisation and Modernity- The Tragedy of Bosnia، وین گارڈ لاہور ۲۰۰۴ء؛ (۹) Brig G. M. Mohatarem: Bosnia- Is the Horrror Show

Over?، قرطاس کراچی ۲۰۰۰ء؛ (۱۰) ہارون الرشید: Conflict of Cultures- Lessons from Bosnia، ڈھاکا ۱۹۹۸ء؛ (۱۱) محمد نذیر شمس: Bosnia Harzegovina-A Global Tragedy، سلیمی فرینڈز، فیصل آباد ۱۹۹۳ء؛ (۱۲) سہ ماہی Islamic Studies، 'بلقانی ریاستوں میں اسلام' پر خصوصی اشاعت ، عدد ۳۶، شمارہ ۲،۳ ۱۹۹۷ء، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد؛ (۱۳) بنگلہ دیش انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ: The Bosnia Crisis - Different Dimensions، ڈھاکا ۱۹۹۳ء؛ (۱۴) محمد الیاس انصاری: مقدمہ بوسنیا، فیروز سنز لاہور ۱۹۹۵ء ۔ بوسنیا پر عمومی مطالعے کے لیے دیکھیے: (۹) The New Encyclopaedia Britannica، ج، ۱۴، ص ۶۰۲-۶۱۱؛ (۱۰) The Oxford Encyclopaedia of Modren Islamic world، بذیل مادہ Balkan States.

(محمد امین)

••-------------••

⊗ بیرم خاں: ابتدائی مغل دور میں ہمایوں کا سپہ سالار استاد اور وکیل السلطنت اکبر، صاحب دیوان شاعر، فیاض، اعلیٰ نسب اور تفضیلی، جس کو کم از کم ۲۸ خطابات سے نوازا گیا اور جس کے کم از کم ۲۵ مصاحب منصب، پنج ہزاری پر فائض ہوئے (منشی دیبی پرشاد، خان خاناں نامہ ، ص: ۱۷)

بیرم خاں ترکمان تھا۔ اس کے اجداد پہلے ہمیں پندرھویں صدی عیسوی میں نظر آتے ہیں۔ ۱۴۳۷ء سے ۱۴۶۶ء تک مغربی ایران میں جہاں شاہ کاطوطی بولتا تھا۔ علی شکر بیگ بہارلو، جہاں شاہ کا ایک سردار اور بیرم خاں کا جدِ اعلیٰ تھا۔ جہاں شاہ کے زوال کے بعد علی شکر کی اولاد کو تیموری سلطان محمود کے پاس حسار شادمان آناپڑا، کیونکہ علی شکر بیگ کی بیٹی پاشا بیگم سلطان محمود سے بیاہی ہوئی تھی۔ سلطان محمود نے یار علی بیگ کو جو بیرم خاں کا دادا تھا پرگنا علاؤالملک عطا کیا۔ یار علی بیگ بابر کے ساتھ معرکوں میں بھی شریک رہا۔ بابر نے اپنے واقعات میں یار علی بیگ کی بہادری اور سرداری کا ذکر کیا ہے (بابر ترجمہ اے ایس بیورج، ص، ۴۹، ۹۱، ۱۰۹، ۱۸۹، ۵۴۶)۔ یار علی کا بیٹا سیف علی بیگ اور پوتا بیرم بیگ بھی بابر کے ساتھ رہے۔ بابر نے بیرم کو ہمایوں کو تفویض کر دیا تھا۔

بیرم بیگ کی تاریخ پیدائش تصدیق شدہ نہیں رہے، سو کمار دے نے تحقیق کے بعد اس کو ۹۰۲ھ/ ۱۴۹۷ء بتایا ہے (سو کمار دے: بیرم خاں ،ص: ۱۳)

بیرم کی ابتدائی زندگی ہمایوں کی مصاحبی میں گزری، سولہ سال کی عمر میں آکر بابر کے ساتھ شامل ہوا۔ بابر نے خاندان، اجداد اور قابلیت دیکھتے ہوئے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہمایوں سے کہا کہ اگر تم جیسا میرا بیٹا نہ ہوتا تو میں بیرم کو اپنا بیٹا بنا لیتا (مآثر رحیمی، ا: ۶۳)

بیرم کی زندگی ہمایوں کے پہلے دور میں کیسی گزری، اس کے متعلق زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ وہ بابر کے ساتھ ہندوستان آیا ہوگا۔ ہمایوں کے ساتھ اس کی جنگوں میں شریک رہا ہوگا، ہمایوں کو جب بہار میں افغانوں سے جنگ کے لیے جانا پڑا تو بیرم اس کے ساتھ تھا۔ ہمایوں کو جب قنوج میں شیر شاہ کے ہاتھوں شکست ہوئی تو بیرم ہمایوں سے بچھڑ گیا اور تقریباً تین سال تک گجرات اور نواح میں پھرتا رہا۔ اس دوران میں اجین میں اس کو شیر شاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ سب تاریخیں اس ملاقات کا ذکر تفصیل سے کرتی ہیں، شیر شاہ نے بیرم کو چھیڑنے کے لیے کہا کہ جو کوئی اخلاص رکھتا ہے خطا نہیں کرتا، بیرم نے جواب دیا: سچ ہے جو اخلاص رکھے گا وہ خطا نہیں کرے گا، اس کے بعد شیر شاہ اکثر کہا کرتا تھا کہ

جب بیرم نے کہا کہ جو اخلاص رکھتا ہے وہ خطا نہیں کرے گا۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ یہ ہمارے پاس نہیں رہے گا۔

ہمایوں جب سندھ میں ارغونیوں سے نبرد آزما تھا اس وقت جون کے قریب بیرم وہاں پہنچا اور لڑائی میں حصہ لیا۔ ہمایوں نے بیرم کی آمد پر "شریک دردآمد" کہا جو ہمایوں کے لیے بیرم کے قرب کو ظاہر کرتا ہے (جوہر: تذکرۃ الواقعات، ص: ۸۱)۔ بیرم کی کوششوں سے شاہ حسین ارغون سے صلح ہوئی اور بیرم کے مشورے پر ہی ہمایوں نے قندھار کا راستہ بند ہونے پر ایران کا رخ کیا (عبدالباقی نہاوندی: مآثر رحیمی، ا: ۵۷۵)۔ ایران کے شاہ طہماسپ نے ہمایوں کو آنے کی اجازت دی۔ بیرم کو ایران میں رہنے کی ترغیب دینے کے لیے دیار بکر اور آذربائیجان کی صوبہ داری کی پیشکش کی۔ اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے خان کا خطاب دیا، بیرم خاں نے پھر بھی ہمایوں کی مصاحبی کو ترجیح دی، ہمایوں کی دربدری کے زمانے کی خدمات کو تاریخ دان ابوالفضل نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

بیرم خاں کے اگلے نو سال قندھار میں صوبہ داری، معاملہ فہمی، مدبری اور سیاسی جوڑ توڑ میں گزرے۔ خاص طور پر کابل میں بیرم خاں کی ہمایوں کے ایلچی کے طور پر آمد، وہاں امیروں سے ملاقات، کامران کو نیچا دکھانے کے لیے امیروں سے بات چیت۔ سوکمار روے کا خیال ہے کہ اس نو سال کے امن کے زمانے میں ہی، بیرم خاں کی شاعری کا زیادہ حصہ رقم کیا گیا۔ اسی دوران میں ہمایوں سے بیرم خاں کی شکایتیں بھی ہوئیں۔ ہمایوں نے قندھار آ کر خود دیکھا اور سب باتوں کو غلط پایا، اس لیے اس کی قندھار کی صوبہ داری برقرار رہی۔

اس دوران میں ہندوستان کے حالات خراب ہو رہے تھے، شیر شاہ اور اسلام شاہ سوری کے انتقال کے بعد چاروں طرف فتنے کھڑے ہو رہے تھے۔ ہمایوں نے یہ موقعہ غنیمت جان کر ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ کیا، وہ خود کابل سے روانہ ہوا اور بیرم خاں کو اپنے پیچھے مزید کمک لے کر آنے کو کہا۔ کلانور پہنچ کر خود لاہور کی طرف بڑھا اور بیرم خاں کو سپہ سالار بنا کر افغان فوج کے خلاف روانہ کیا۔ جن سے بیرم خاں کا معرکہ ماچھی واڑہ میں ہوا اور بیرم خاں نے یہ فتح مئی ۱۵۵۵ء کے دوسرے ہفتہ میں حاصل کی، اس کے بعد ایک دوسری لڑائی سکندر شاہ کی فوج سے سرہند میں ہوئی، یہ بڑی لڑائی تھی جس میں بیرم خاں کا سب سے زیادہ حصہ تھا۔ ہمایوں اپنے قولنج کی وجہ سے اس میں دیر سے شامل ہوا (ابوالفضل: اکبر نامہ ترجمہ ایچ بیورج : ۱ : ۶۲۷)

ہمایوں نے اکبر کو پنجاب کا حکمران مقرر کیا اور بیرم کو اس کا اتالیق بنا کر ساتھ بھیجا۔ پھر خود دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ پنجاب میں ابھی سکندر سوالی باقی تھا، اس سے پہلے کہ یہ فتنہ ختم ہوتا، بیرم کو خبر ملی کہ ہمایوں اپنے کتب خانے کی سیڑھیوں سے گر کر انتقال کر گیا ہے۔

بیرم خان نے اس خبر کو چھپایا اور تین دن کے اندر انتظامات کر کے اکبر کو کلانور میں تخت پر بٹھا دیا، خود وکیل السلطنت کا عہدہ لیا۔ اگلے چار سال عہد تیموریہ کے انتہائی مشکل اور بیرم خاں کا دور ثابت ہوئے۔ ابھی حکومت سنبھلنے بھی نہ پائی تھی، چاروں طرف دشمن سر اٹھانے کو تیار تھے۔ امرا بغاوت کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ کابل میں حالات دگرگوں تھے کہ ادھر ہیموں بقال نے سر اٹھایا اور ایک بڑی فوج لے کر آگرہ اور دہلی کو فتح کر لیا۔

بیرم نے تردی بیگ خاں کو جو ہیموں سے دہلی میں جنگ ہار کر بھاگ آیا تھا، قتل کروا دیا (کوثر چاندی پوری: محمد بیرم خاں، ص: ۹۳)۔ اس نے امیروں کو خطرناک

نتائج کی دھمکی دی، ایک پرجوش تقریر کر کے سب کو جان کی بازی لگانے پر تیار کیا، یہ پانی پت کی دوسری جنگ ۵ نومبر ۱۵۵۶ء کو لڑی گئی۔ ہیموں کی آنکھ میں ایک تیر پیوست ہونے سے جنگ کا نقشہ پلٹ گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دہلی، آگرہ اور الور مغل حکومت میں داخل ہوتے گئے اور چھ مہینہ کے محاصرے کے بعد مان کوٹ میں سکندر سوری نے ہتھیار ڈال دیئے، اب وکیل السلطنت بیرم خاں ہی مطلق العنان حکمران تھا۔

سال ۱۵۵۷ء میں، بیرم خاں کا نکاح سلیمہ سلطان بیگم سے ہوا، جو بابر کی نواسی تھی۔ اس طرح بیرم خاں کا قرب شاہی خاندان سے اور بھی بڑھ گیا (سو کماردے: بیرم خان ،ص: ۱۵۹)۔

اس دور میں اجمیر، گوالیار اور جون پور کی فتح ہوئی، لیکن قندھار ہاتھ سے نکل گیا۔ مالوہ کی بغاوت کو دبایا گیا اور بہادر خاں کے تحت ایک فوج اس کی فتح کے لیے روانہ ہوئی، یہ مہم ابھی تکمیل کو نہ پہنچی تھی کہ بیرم خاں کے زوال کے اثرات شروع ہوگئے۔

اس زوال کی بڑی وجہ تو اکبر کی خواہش حالات کو اپنے قابو میں کرنے کی تھی۔ بیرم خان کے دور کے آغاز میں اکبر کی عمر ۱۳ سال تھی، جب وہ ۱۷ سال کا ہوا تو اسے احساس کمتری ہونے لگا۔ کچھ بیرم خاں کے سخت اقدامات اور سیاسی غلطیاں بہانہ بن گئے۔

اکبر شکار کے لیے کول (علی گڑھ) گیا اور وہاں سے جمنا پار جا کر دہلی میں براجمان ہوگیا اور خود احکامات جاری کرنے لگا۔ بیرم کو جب حالات کا اندازہ ہوا تو پانسہ پلٹ چکا تھا۔ اس اطلاع کے عام ہونے پر امرا بیرم خان کو چھوڑ چھوڑ کر اکبر کے پاس جمع ہونے لگے۔ یہ حالات دیکھ کر بیرم نے مقامات مقدسہ کی زیارت کا ارادہ کر کے گجرات کا رخ کیا، لیکن لوگوں کے بہکانے اور ملا پیر محمد شیروانی کا نام سن کر جس سے اس کی مخاصمت تھی، کہ وہ فوج لے کر آ رہا ہے۔ اس نے مقابلے کی ٹھانی۔ گونا چور میں اس کو شکست ہوئی۔ اس پر اس نے تلواڑہ میں ہندو زمینداروں کے پاس پناہ لی۔ وہاں دوسرے معرکے میں جب اس کے سامنے سلطان حسین جلائر کا سر پیش کیا گیا تو اس کو بہت افسوس ہوا اور وہ اکبر سے معافی کا خواستگار ہوا (سو کماردے: بیرم خاں، ص: ۲۱۳) اکبر نے امیروں کو بھیج کر بلایا اور مال و متاع دے کر حج کے لیے رخصت کیا۔

گجرات میں ایک مقام پٹن پر ایک تالاب کی سیر کرتے ہوئے ایک شخص مبارک خاں لوحانی نے بدلہ لینے کے لیے دھوکے سے پاس بلا کر بیرم کو شہید کردیا، یہ واقعہ ۳۱ جنوری ۱۵۶۱ء کو پیش آیا۔ ''شہید شد محمد بیرام'' سے یہی تاریخ نکلتی ہے (دیبی پرشاد: خان خاناں نامہ ، ص، ۱۳)۔ لاش بے گور و کفن پڑی رہی۔ کچھ فقیروں نے ایک مقبرے کے پاس دفن کر دیا۔ اس کے بعد دہلی میں مسجد جمالی کمالی کے پاس امانت چھ سال رکھی رہی اور پھر مشہد بھیجی گئی، لیکن اب اس کا سراغ وہاں کہیں نہیں ملتا (سوکماردے، بیرم خاں ، ص: ۲۴۷)۔

بیرم خاں خود شاعر تھا اور فنون لطیفہ کا قدردان، شاعر اس کی فیاضی کا سن کر اطراف و اکناف سے اس کے دربار میں حاضر ہوتے۔ اس کا دیوان ۱۹۱۰ء میں کلکتہ سے اور ۱۹۷۱ء میں کراچی سے شائع ہوچکا ہے۔

ہر مغربی تاریخ دان بیرم کو شیعہ لکھتا ہے، مسلمان تاریخ دان اور علما اس کو تفضیلی کہتے ہیں، جن میں عبدالقادر بدایونی اور مولانا محمد حسین آزاد شامل ہیں (دربار اکبری ،ص: ۱۹۲) اس پر تفصیلی بحث سوکماردے کی بیرم خاں میں ہے (ص: ۲۳۶)

مآخذ: منشی دیبی پرشاد: خاں خاناں نامہ، کراچی

یونیورسٹی، ۱۹۹۰ء؛ (۲) بابر نامہ، ترجمہ اے ایس بیورج سنگ میل پبلی کشنز لاہور، ۱۹۷۹ء؛ (۳) سوکماردے: بیرم خاں ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۲ء؛ (۴) ملا عبدالباقی نہاوندی: مآثر رحیمی، ایشیا ٹک سوسائٹی ، بنگال، ۱۹۲۴ء؛ (۵) جوہر آفتابچی، تذکرۃ الواقعات: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، اردو ترجمہ معین الحق، ۱۹۵۵ء؛ (۶) ابوالفضل، اکبر نامہ ، ترجمہ ایچ بیورج، دہلی، ۱۹۸۹ء؛ (۷) کوثر چاند پوری: محمد بیرم خاں، بھوپال ۱۹۳۱ء؛ (۸) محمودالحسن صدیقی، حسام الدین راشدی اور محمد صابر: دیوان بیرم خاں، کراچی یونیورسٹی ، ۱۹۷۱ء؛ (۹) عبدالقادر بدایونی: منتخب التواریخ، پٹنہ، ۱۹۷۳ء؛ (۹) محمد حسین آزاد: دربار اکبر، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۱۰ء کا نسخہ

(حسن علی بیگ)

••------------••

※ **بینک و بینکنگ**: (روایتی و اسلامی) دنیائے اسلام میں جدید بینکنگ[نظام] کا آغاز انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں ہوا۔ مالی سودے کرانے والے دلال اس خطے کے لیے کوئی چیز نہ تھے۔ اسی طرح سے پیچیدگی پر مبنی مسلم تجارتی شعبے میں مبادلے کی غرض سے طویل عرصے سے سکے مستعمل چلے آ رہے تھے [اور] مبادلۂ زر کا کاروبار کرنے والے اور رقوم اُدھار دینے والے اکثر شہری مراکز میں اپنا اپنا کاروبار جاری رکھے ہوئے تھے۔ مبادلۂ زرکا کام خصوصاً حجاز کے شہروں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حجاج کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زوروں پر تھا، جس سے یہ امر واضح تھا کہ کرنسی کے کاروبار اور قیمتی دھاتوں کے مبادلے پر اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا، تاہم قرآن حکیم میں سود کی ممانعت کی رو سے یورپ میں ارتقا پذیر ہونے والی رواجی تجارتی بینکاری، ابا کے زمرے میں آتی ہے اور حرام ہے۔

استعماری بینکنگ کا نفوذ: ابتدا میں تمام تر تجارتی بینک اہلِ یورپ کی ملکیت تھے، امپیریل عثانی بینک برطانیہ اور فرانس کے مشترکہ تعاون کا نتیجہ تھا، امپیریل بینک آف ایران برطانیہ کا قائم کردہ اور اسی کے زیر انتظام تھا۔ عثانی سلطنت میں مالی سودے کرانے کا کام مسلمانوں کی بجائے یونانی عیسائیوں یا یہودیوں کے ہاتھوں میں تھا۔

مسلمان تجارت کی طرف بڑی رغبت رکھتے تھے کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کے پیشے کو اختیار فرمایا تھا، لیکن رقم اُدھار دینے اور پھر اس کی وصولی کرنے کے بارے میں مسلمانوں میں تذبذب پایا جاتا تھا۔ مسلمان تاجر سود دینے کی بجائے مؤخر شدہ ادائیگی کی بنیاد پر جنس کی صورت میں اصل سے کچھ زائد رقم کے لین دین کے روا دار تھے۔ پیشگی رقوم غیروں سے سود کے وعدے پر لی گئی بچتوں کی بجائے شخصی اور خاندانی معدلت (Equity) کے ذریعے حاصل کی جاتی تھیں۔

امپیریل بینک مقامی مسلمان تاجر طبقہ یا متمول جاگیرداروں کی بجائے حکومت اور یورپی سلطنتوں کی تجارت کے مفادات کی خاطر کام کرتے تھے۔ عثانی سلطنت کے لیے قرضہ جات کی فراہمی اس کی ایک اہم ذمہ داری تھی۔ یہ بینک سلطان کی طرف سے لندن اور پیرس میں تمسکاتِ زر کی تکمیل کا کام سرانجام دیتا تھا۔ ایران کا امپیریل بینک اینگلو ایرانیین آئل کمپنی، بعدازاں برٹش پٹرولیم سے خصوصی طور پر متعلق تھا۔ مصر کا نیشنل بینک ایک مکمل برطانوی ادارہ تھا۔ یہ خاص طور پر کپاس کی برآمدات سے متعلق مالی معاملات سرانجام دیتا تھا، جن پر کہ لنکا شائر کی پارچہ بافی کی صنعت کا انحصار تھا۔ یہ تجارت [بھی] مصری مسلمانوں کی بجائے یونانی اور بحیرۂ روم کے مشرقی حصے کے تاجروں کے ہاتھوں میں تھی،

ملایا میں ربڑ کی تجارت کے مالی معاملات میں ہانگ کانگ اینڈ شنگھائی بینک سرگرم تھا، بلکہ ربڑ کے درختوں کے لگانے والے افراد مقامی مسلمانوں کی بجائے غیر ملکی نوواردِ ہوا کرتے تھے.

مسلم ملکیتی تجارتی بینک : ۱۹۲۰ء کے عشرے میں مسلم کاروباری طبقوں کو احساس ہوا کہ رواجی مالیاتی توسیط (Traditional Financial Intermediation) جدید نظام ہائے معیشت میں ایک محدود قدر و قیمت کی حامل ہے، وسیع پیمانے پر لین دین، خصوصاً غیر ملکیوں کے ساتھ، لیٹر آف کریڈٹ ، ضمانتوں اور بل وغیرہ کی قبولیت (Acceptance) ناگزیر تھی، اس طرح کی سہولیات سے سودوں کی اخراجاتی قیمت میں نمایاں طور پر کمی واقع ہوئی اور غیر متوقع سودوں کی تکمیل ممکن ہوگئی، تاہم رقوم اُدھار دینے والے اور مبادلۂ زر کا کام کرنے والے ایسی سہولیات فراہم کرنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی امکانی طور پر اچھے مسلمان تاجروں (Potential Muslim Clients) کو اہل یورپ کے مملوکہ بینکوں سے قرضہ جات حاصل کرنے میں اکثر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، [اس لیے] مسلمان کاروباری طبقہ کے پاس خود بینک قائم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اسی دباؤ کے تحت مصر میں مصر بینک، فلسطین کا "عرب بینک" برطانوی ہندوستان میں "حبیب بینک" اور دیگر مسلم ممالک میں اسی طرح کے دیگر تجارتی بینک قائم کیے گئے.

سعودی عرب کے حکمران شاہ عبدالعزیز نے اپنے ہاں بینک نہ کھلنے دیئے، کیونکہ ان کے خیال میں مغربی بینک کفار کی سرپرستی میں کام کر رہے تھے [اور]ان کا طریق کار دینی لحاظ سے کبھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتا تھا، ملک کی ترقی اور تیل کی دریافت کی بنا پر یہاں غیر ملکی بینکوں کے قیام و ادخال کے لیے بڑا دباؤ پڑ رہا تھا اور مصر بینک نے بینکاری کے اجازت نامے (Licenes) کے لیے درخواست دے دی، کیونکہ اس کے ڈائریکٹروں کا خیال تھا کہ شاہ ان کے اسلامی تعارف و تشخص (Credentials) سے متاثر ہوں گے [تاہم] اس بینک کو اپنی برانچ کھولنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا، لیکن جب مبادلۂ زر کا کام کرنے والے دو معزز مقامی باشندوں ابن محفوظ اور کاکی خاندان نے بینکاری کے لیے اجازت نامے کی درخواست پیش کی تو شاہ نے جدہ کے چند اہم تاجروں سے مشاورت کے بعد ان کی اس درخواست کو منظور کر لیا.

یہ اجازت نامہ اس شرط پر جاری کیا گیا کہ بینک مسلم اکثریت کے لیے قابلِ قبول طریقے سے کام کرے گا۔ اس کا [واضح] مفہوم یہ ہے کہ سود کی ادائیگی یا وصولی سے احتراز کیا جائے گا۔ اس طرح قائم ہونے والا البنک الاھلی التجاری خدمات کے عوض فیس وصول کرتا اور کھاتہ داروں کے لیے چالو کھاتے کھولتا ہے، جن پر سود ادا نہیں کیا جاتا تھا۔ قرضے کا طریقہ کار پیشگی طور پر طے کیا جاتا تھا اور گاہکوں کے ساتھ واضح طور پر قرآن حکیم کے متعین کردہ تجارتی عمل [اور اصول] کے مطابق معاملہ طے کیا جاتا تھا، سعودی عرب میں تمام تجارتی امور کی طرح بینکاری میں بھی شریعت کی پابندی کی جاتی ہے [لیکن اب وہاں متعدد غیر ملکی اور سعودی اشتراک سے قائم ہونے والے روایتی بنک اور خصوصاً بنک الاہلی التجاری بلا روک ٹوک سودی بینکاری کر رہے ہیں].

قومیانے کا عمل اور مسلمان ممالک: ۱۹۵۰ء کے عشرے میں مصر، شام اور عراق میں آنے والے سیاسی انقلابات کے نتیجے میں استعماری بینکوں اور نجی بینکوں کو سرکاری ملکیت میں لے لیا گیا۔ پاکستان میں بینکوں کو قومیانے کا عمل ایک عشرہ بعد ہوا اور اکثر مسلم ممالک

میں حکومت کو مالیاتی نظام میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا پڑا۔ یہ حکومتی مداخلت اسلامی نظریۂ حیات کی بنا پر نہ تھی (اسی طرح دوسری ضرورتوں، خصوصاً اشتراکی نقطہ نگاہ پر نہیں ہوئی تھی؛ مختصراً یہ کہ قومیانے کا یہ اقدام ایک طے شدہ نقطۂ نظر کو اپنانا تھا اور سوویت یونین کی تقلید کرتے ہوئے، بھاری صنعتوں کے قیام کی ایک مساعی تھا۔

قومیائے جانے والے بینک زیادہ تر حکومت کے زیر اہتمام صنعتوں کو رقوم کی فراہمی کا کام کرتے۔ ان رقوم کا تعین ترقیاتی منصوبہ جات میں مقرر کی گئی ترجیحات کے مطابق کیا جاتا تھا، ہر صنعتی شعبے (Sector)، بلکہ انفرادی ملکیت کے کارخانوں کے لیے کوٹے مقرر کیے جاتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات کو بدلنے یا نئے مواقع پیدا کرنے کی اجازت کی ہرگز گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ عملاً دستیاب رقوم متوقع رقوم سے اکثر کم ہوتی تھیں، اس کا مطلب چیدہ چیدہ (Selective) کٹوتیوں کی بجائے عاریت کی حد (Lending Ceiling) میں مجموعی طور پر تخفیفات (Across- the Broad Reductions) تھا، جس سے معاہدہ کا حصول مشکل ثابت ہو سکتا تھا۔

ایک مسئلہ یہ [بھی] تھا کہ قومیائے ہوئے بینک رقوم جمع کرانے والے نئے افراد کو اپنی جانب راغب کرنے میں ناکام رہے۔ عام شہری اس حقیقت سے متاثر ہوتے نظر نہیں آتے تھے کہ سرکاری مملوکہ بینکوں کے چلتے رہنے کی بنا پر ان کی جمع شدہ رقوم زیادہ محفوظ ہیں۔ بچت کے کھاتوں پر سود ادا کیا جاتا ہے، لیکن اس کی شرح نہایت کم ہے اور افراطِ زر کو مدنظر رکھتے ہوئے بالکل ناکافی ہے، مالیاتی ظلم اس مفہوم میں موجود تھا کہ بچتیں رسمی بینکاری نظام میں سمٹی ہوئی نہ تھیں۔ اس کی بجائے کافی مقدار میں سونے اور اس سے کم مقدار میں چاندی کا احتکار جاری رہا۔ مبادلۂ زر کا کام کرنے والوں اور اُدھار پر رقوم دینے والوں نے بینکوں کی طرف سے واضح طور پر پوری نہ ہونے والی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنا کام جاری رکھا۔

قومیائے گئے بینکوں کی ناکامی کے ثبوت بہت واضح ہیں، مثلاً شام اور عراق میں ان سے ایک چھوٹے ملک اردن کے مقابلے میں بینکوں میں جمع شدہ رقوم کم تھیں، [کیونکہ] وہاں کے بینک قومیائے نہیں گئے تھے، بینک اثاثہ جات کا تناسب مصر میں مجموعی ملکی پیداوار کے لحاظ سے جامد تھا اور پاکستان میں یہ اس سے بھی نیچے گر گیا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مالیاتی دائرہ کار ترقی کے ساتھ ساتھ پھیلنے کی بجائے سکڑ گیا ہے۔ قومیائے گئے بینکوں کی افسر شاہانہ ذہنیت کی بنا پر امکانی طور پر اہل [اور اچھے] گاہکوں کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ پیش کی جانے والی خدمات کے دائرہ کو وسیع کرنے میں تذبذب آڑے آتا رہا۔ اور نہ ہی جدید ٹیکنالوجی کو اپنا کر [بینکاری] کے طریقِ کار میں [مفید] اختراعات متعارف کرانے کے لیے کسی طرح کا کوئی مسابقتی دباؤ [موجود] تھا۔

کچھ مسلم ممالک، خصوصاً خلیجی ریاستوں، ملائیشیا اور انڈونیشیا نے نجی ملکیتی بینکوں، جنہیں عرفِ عام میں جائنٹ سٹاک کمپنیاں کہا جاتا ہے، کی حوصلہ افزائی کی۔ تاہم نجی ملکیت کو زیادہ سے زیادہ حد تک مقامی مسلمانوں کے ہاتھوں میں رکھنے کی خواہش [شروع ہی سے] موجود رہی ہے، کویت میں اس کی آزادی کے بعد وہاں مشرقِ وسطیٰ کے برطانوی بینک کی برانچیں مقامی سرمایہ کاروں کے ہاتھ فروخت کر دی گئیں اور یہ البنک الکویتی والشرق الاوسط بن گیا۔ سعودی عرب میں سٹی بینک کے ساٹھ فی صد حصص خریدنے کے لیے عوام کو پیش کش کی گئی اور اس طرح ایک نیا مالیاتی ادارہ سعودی امریکن بینک قائم ہوا۔ سعودی سرمائے کی منتقلی (Injection) سے اب وہ

اپنی توسیع کے ساتھ ساتھ نسبتاً زیادہ مسابقتی ماحول پیدا کرنے کے قابل ہوگیا ہے۔

اسلامی مالیاتی متبادل: اکثر مسلم ممالک میں رواجی تجارتی بینکاری پر نمایاں طور پر عدمِ اطمینان کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یہ اظہار مسلمان اربابِ علم، دانشوروں اور عامۃ الناس کی طرف سے ہوا کرتا تھا جو کہ ربا کے بارے میں قرآنی موقف سے خوب آگاہ تھے۔ بہت سے مسلمان سود کی جگہ فیس اور خدمتی اخراجات (Service Charges) کو ایک تسلی بخش متبادل تصور نہیں کرتے تھے اور بہت سے مسلمان ممالک میں ربا کھلم کھلا جاری رہا، کچھ مسلمانوں کا خیال تھا کہ صرف مہاجنی سود (Usury) ہی ربا ہوتا ہے اور یہ کہ اگر ربا کی ممانعت کا مقصد قرض لینے والے غریب افراد کو مشکل سے محفوظ کرنا ہے تو کسی بھی صورت میں کاروباری مقاصد کے لیے قرضہ لینے والوں سے سود کی وصولی مذہبی وجوہ کی بنا پر کوئی مسئلہ نہیں۔ متحدہ عرب امارات کی ایک عدالت نے سود مرکب کو ناجائز قرار دیتے ہوئے سود مفرد کے جائز ہونے کا فیصلہ دیا۔

ترکی میں، جہاں افراطِ زر کافی عرصہ سے ایک مسئلہ بنا ہوا ہے، یہ دلیل پیش کی گئی کہ معمولی شرح کا سود قیمتوں کے اضافے کی خاطر جائز ہے، کیونکہ یہ قرض لینے والوں پر حقیقی سود کا سا بوجھ نہیں ہے۔ تاہم اس طرح کے دلائل سے راسخ العقیدہ مفکرین قائل نہ ہوسکے۔ ان کی سوچ محض سود کی ممانعت ہی نہ تھی، بلکہ ایک حقیقی اسلامی متبادل کی حیثیت سے شراکتی مالیاتی نظام کی ترویج بھی۔ محض سرمایہ جمع کر لینے (Hoarding) کے عوض پہلے سے متعین شدہ منافع کا حصول جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ نقصان کے خطرے (Risk) میں حصہ داری سے حاصل ہونے والا منافع نہ صرف جائز بلکہ نہایت درجہ مستحسن ہے۔

منافع میں حصہ داری: اسلام میں حصہ داری کا مسلمہ اصول مضاربہ کے نام سے معروف ہے [یہ قبل از اسلام سے رائج تھا۔ اسلام نے اس کی اجازت دی ہے] رقوم جمع کنندگان بینک کے منافعوں یا مخصوص سرمایہ کاری کے منافعوں میں سے حصہ حاصل کر سکتے ہیں۔ منافع میں شراکت والی رقوم کو عموماً سرمایہ کاری کی رقوم کہا جاتا ہے اور رقوم جمع وکنندگان کو اپنی رقوم واپس نکلوانے کے لیے ایک کم از کم مدت کا نوٹس دینا ہوتا ہے جو ایک ماہ سے ایک سال تک ہوسکتی ہے۔ منافع کی شرح کا اعلان مالی سال کے اختتام پر حسابات کی پڑتال (audit) کے بعد کیا جاتا ہے اور رقوم جمع کنندگان کے منافع کا حصہ طویل نوٹس کی رقوم کے لیے سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

اگر بینک کو خسارہ ہو تو کسی قسم کا منافع نہیں دیا جاتا اگرچہ رقوم جمع کنندگان کو ملنے والا منافع حصص مالکان کو ملنے والے مقاسمہ (Dividend) پر مقدم رکھا جاتا ہے۔ جمع شدہ رقوم کی قدروقیمت کی ضمانت عموماً بینک معدلت (Bank Equity) کے حساب سے فراہم کی جاتی ہے، جس کی قیمت کا دارومدار سٹاک مارکیٹ کے حالات پر ہوتا ہے، اس لیے سرمایہ کاری کی رقوم والوں کو معدلتی سرمایہ کاروں (Equity Investors) کے مقابلے میں نسبتاً نقصان کا خطرہ کم ہوتا ہے، لیکن مؤخرالذکر لوگ بینک کے سالانہ عمومی اجلاس میں رائے دہی کا حق رکھتے ہیں، جب کہ سرمایہ کاری کرنے والے یہ حق نہیں رکھتے۔

اسلامی بینک کاروباری رقوم کے لیے بھی چالو کھاتے کی سہولت فراہم کرتے ہیں جو فوری طور پر چیک یا خودکار Tellerمشین کے ذریعے نکلوائی جاسکتی ہیں۔ ان کھاتوں کے مالکان کو کوئی منافع نہیں دیا جاتا، لیکن بعض حالات میں بین الاقوامی کارڈ مثلاً ویزا وغیرہ کی انہیں پیش کش کی جاتی ہے اگرچہ ان کا اہتمام کریڈٹ کارڈ کی

بجائے براہِ راست اندراج (Debut) کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، عموماً صرف چالو کھاتوں والے ہی قرضہ / ادھار (Credit) کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔

قرضہ / اُدھار کی سہولیات: بینکوں کی رقوم کا استعمال ان کے گاہکوں کے مطالبات اور ان کے طریق کار پر حاوی ماحول کی عکاسی کرتا ہے، چونکہ مسلم ممالک میں زیادہ تر سرمایہ تجارتی کام میں لگانا مطلوب ہوتا ہے، اس لیے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ اسلامی بینک اس شعبہ میں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں، اسلامی تجارتی سرمایہ کاری کی پیش کش بیع مرابحہ کی بنیاد پر کی جاتی ہے جس کی رُو سے بینک ایک چیز کی گاہک کے لیے خریداری کرتا ہے اور بعدازاں مؤخر ادائیگی پر اس کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، بینک [ادا کردہ] قیمت کو پورا کرنے کے لیے اور نقصان کے خطرہ کے مدِنظر تجارتی اشیا کے اپنے عرصہ ملکیت کے دوران منافع حاصل کرنے کے لیے مارک اپ وصول کرتا ہے، اسلامی بینک عموماً خود ان اشیا کو اپنی حوالگی میں نہیں لیتا بلکہ روایتی تجارتی بینکوں کے برعکس یہ ان کی ملکیت کی ذمہ داری سنبھالتا ہے۔ [بعض فقہا کے نزدیک اس طرز پر کیا جانے والا مرابحہ شرعاً جائز نہیں ہے۔ مولانا محمد طاسین نے اپنی تصنیف متبادل سودی نظام میں لکھا ہے] بیع المرابحہ کا اصل تعلق نقد لین سے ہے۔ قرض اور ادھار سے نہیں، یہ الگ بات ہے کہ فروخت کرنے والا یہ دیکھے کہ خریدار کسی مجبوری کی وجہ سے فوراً نقد قیمت ادا نہیں کر سکتا تو اس کو بطور قرض دار کچھ مہلت دے دی جائے۔ لیکن اس مہلت اور ادھار کی وجہ سے نقد قیمت پر کچھ بھی اضافہ کرے۔ ورنہ یہ معاملہ ربوی ہوجائے گا]۔

اسلامی بینک طویل المیعاد قرضے / ادھار کی سہولیات بھی خصوصاً بڑی اشیا [کی خریداری] کے لیے اجارہ کے ذریعے فراہم کرتے ہیں۔ بعض معاملات میں خرید کرایہ (Hire Purchase) یا بالاقساط فروخت کا طریقہ اختیار کر لیا جاتا ہے۔ اسلامی بینک مضاربہ کے اصول پر کاروبار میں حصہ دار بن کر طویل المیعاد شراکتی سرمایہ کاری بھی فراہم کرتا ہے۔ [یہ] بینک صاحب المال کی حیثیت سے تمام کا تمام سرمایہ فراہم کرتا ہے اور مضارب فنی مہارت اور انتظامی امور وغیرہ کا ذمہ دار بنتا ہے۔

مضاربہ پہلے سے قائم کمپنی کو سرمایہ فراہم کیا جاسکتا ہے، متبادل طور پر ایک نئی کمپنی مالیاتی ذریعہ کی حیثیت سے قائم کی جاسکتی ہے جو مقررہ مدت کے بعد ختم کی جاسکتی ہے۔

اسلامی بینکاری کی توسیع: (Spread) ۱۹۵۰ء کے عشرے میں پاکستان میں کسان قرضہ یونینیں پہلے جدید اسلامی بینکاری کے اداروں کی حیثیت سے وجود میں آئیں اور ۱۹۶۳ء میں مصر میں ایک معمولی دیہی ادارہ "مت غمر" سیونگ بینک قائم ہوا جو جرمن لوکل سیونگ بینکوں کی طرز پر بنایا گیا۔ مت غمر بینک کے بانی احمد النجار ان جرمن بینکوں [کی کارکردگی] سے بڑے متاثر تھے۔ صدر ناصر کی سیاسی پارٹی، عرب سوشل یونین کے بااثر عناصر اور ملک کے قومیائے گئے بینکوں کے کچھ سینئر منیجروں نے احمد النجار کے اقدام نیز اس بینک کی اسلامی نوعیت کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا [نتیجتاً] ۱۹۷۱ء میں اسے ایک حکومتی ادارے ناصر سوشل بینک میں ضم کر دیا گیا جس کے ذمے زکوۃ کی رقوم کی وصولی تھی، اکثر لوگوں کے خیال میں یہ نیا ادارہ ایک بینک کی بجائے ایک سرکاری ایجنسی ہے۔

اسلامی بینکاری میں اہم توسیع: ۱۹۷۰ء کے عشرے کے دوران میں ۱۹۷۵ء میں دبئی اسلامی بینک، ۱۹۷۷ء میں مصر و سوڈان میں فیصل اسلامی بینک، اسی سال کویت

فنانس ہاوس، ۱۹۷۸ء میں اُردنی اسلامی بینک اور ۱۹۷۹ء میں بحرین اسلامی بینک کے قیام کی صورت میں ہوئی۔ ان بینکوں کے قیام کی ترغیب کا سبب جزوی طور پر خلیج فارس میں تیل کی آمدنی میں گراں قدر اضافہ اور جزوی طور پر سیکولر عرب قوم پرستی کی تحریک کی قیمت پر خلیج کے قدامت پسند مسلم ممالک کا بڑھتا ہوا اقتصادی غلبہ تھا۔ بہرصورت عرب سوشلزم پر خصوصاً نوجوان طبقہ میں فزوں تر عدمِ اطمینان پایا جاتا تھا نیز یہ احساس بھی موجود تھا کہ اقتصادی اور مالیاتی شعبے سمیت [دیگر] تمام شعبوں میں اسلامی اقدار پر زیادہ زور دیا جانا چاہیے۔

سعودی عرب کے شہزادہ محمد بن فیصل، فیصل اسلامی بینک کے قیام کے محرک تھے۔ جدہ میں قائم شیخ صالح کامل کے گروپ نے اُردن اسلامی بینک کو امداد دی اور البرکہ اسلامی بینکوں کے لیے رقوم فراہم کیں جو ترکی سے تیونس بلکہ لندن تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مبادلہ زر کا کام کرنے والے الراجحی گروپ نے سعودی عرب میں اسلامی بینکاری کے لیے اجازت نامے کے لیے درخواست دی اور لندن میں قائم شدہ اپنی سرمایہ کار کمپنی کے توسط سے بین الاقوامی سطح پر اسلامی مالیاتی خدمات کی پیش کش کی۔ شہزادہ محمد نے جنیوا میں ایک بین الاقوامی مالیاتی ادارے کے طور پر دارالمال الاسلامی کی بنیاد رکھی۔

اکثر مسلم ممالک میں نئے اسلامی بینکوں کو سودی نظام پر مبنی عام بینکوں کی مسابقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور وہ رقومات جمع کرنے میں خصوصی طور پر کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ کویتی فنانس ہاوس کے پاس اپنے ملک کی جمع شدہ رقوم کا پانچواں حصہ موجود ہے اور اردنی اسلامی بینک ان غریب لوگوں کی رقوم بھی اپنے ہاں جمع کرچکا ہے جو قبل ازیں بینکوں سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ نئے بینکوں نے مالیاتی افق کو وسیع کرنے میں مدد دی ہے۔ یہ پہلے سے موجود بینکوں کا نعم البدل بننے سے زیادہ ان کے لیے پسندیدگی کا باعث بنے ہیں۔ اسلامی بینکاری اب ملائیشیا اور انڈونیشیا تک وسیع ہوچکی ہے اور ملائیشیائی اسلامی بینک نے چینی زبان بولنے والے غیر مسلموں کی صنعتوں سمیت بہت وسعت پذیر صنعتی سکیموں کے لیے سرمایہ فراہم کیا ہے۔ انڈونیشیا کا معاملات بینک مسلمانوں کی اکثریتی آبادی والے نہایت تیزی سے صنعتی بننے والے اس ملک میں ایک عظیم امکانی [مالیاتی] قوت بنتا دکھائی دیتا ہے۔

مصر میں حکومت کے زیرِ تحویل بینکوں اور سعودی عرب کے البنک الدوَلی التجاری سمیت کچھ تجارتی بینکوں نے اسلامی بینکاری کی سہولیات کی فراہمی کا آغاز کر رکھا ہے۔ حتی کہ کچھ یورپی بینک بھی یہی سہولیات بہم پہنچاتے ہیں۔ ان بینکوں میں لندن کا Kleinworth Benson بینک اور سوئٹزر لینڈ کی بینکنگ کارپوریشن بھی شامل ہیں، اسلامی مالیاتی نظام بین الاقوامی سطح پر دن بدن مقبول ہو رہا ہے اور غیر مسلم ممالک میں بھی نیز اس کے بنیادی اصول عموماً [خوب] سمجھے جاچکے ہیں.

[پاکستان میں سودی بنکاری پر کبھی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ سعودی بنک مکمل آزادی کے ساتھ ہر زمانے میں کام کرتے رہے ہیں اور اب بھی یہی صورت حال ہے۔ ایران کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں سب بنک قومیا لیے گئے ہیں اور وہاں حکومت کا موقف ہے کہ اگر سود کی رقم ایک جیب سے دوسری جیب میں چلی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے].

تاہم یہ بات واضح ہے کہ اسلامی بینکاری محض ایک عارضی مظہر نہیں ہے۔ اس کے اخلاقی مصالح (Ethical Concerns) منفعت سے ہم آہنگ ہیں اور اسلامی بینک غیر اسلامی بینکوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ موافق شرائط

پر طویل المیعاد بچتوں کے حصول میں کامیاب رہے ہیں۔ قرضہ پر مبنی مالیات کے لیے معدلت (Equity) کی تبدیلی کی بہت سی ترقیاتی ایجنسیوں نے حمایت کی ہے۔ چھوٹے کاروبار کے لیے شراکتی مالیات خاص طور پر موزوں ہیں۔ بہت سے مسلم ممالک میں مشترکہ سرمایہ (Venture- Capital) کا خلاصہ (Gap) ہے۔ اسلامی مالیات ان ضروریات کو پورا کر سکتی ہے اور رواجی/روایتی عاریت (Lending) کا ایک قابلِ عمل متبادل فراہم کر سکتی ہے۔ ناگزیر مسائل کا سامنا ایک بدیہی امر ہے لیکن ابھی تک یہ تجربہ حوصلہ افزا [رہا] ہے۔ [اس کی] تحریک/ ترغیب (Mosivation) محض مالی ہونے کی بجائے اخلاقی [نوعیت رکھتی] ہے۔ نیز اسلامی مالیاتی توسیط (Intermediation) کو بڑے جوش و خروش سے خوش آمدید کہا گیا ہے۔

[نیز دیکھیے اقتصادیات، مقالہ بعنوان اقتصادی ادارہ جات؛ سود]

مآخذ: (۱) Beauge, Gilbert : Les Capitaux de ۱، پیرس، ۱۹۹۰ء اس موضوع پر فرانسیسی زبان میں اہم مآخذ۔ (۲) چھاپڑا، محمد عمر: Towards a Just Monetary System، لیسٹر ۱۹۵۸ء اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دولت، بینکاری اور مالیاتی پالیسی پر بحث و مباحث؛ (۳) الاشقر، احمد: The Islamic Business Enterprise، لنڈن، ۱۹۸۷ء، مصری تجربہ بشمول تخمینہ (Calculation) مالیاتی تناسب رہا۔ (۴) اقبال، زبیر و عباس میرا خور: Islamic Banking، واشنگٹن، ڈی، سی، ۱۹۸۷ء ایران و پاکستان کے تجربات کا اوّلین مفصل احوال کا زریاں، (۵) الیاس: Islamic : Finanee and Economic Development Banking in Egypt، لنڈن، ۱۹۹۱ء اقتصادی ترقی کے تناظر میں تحریر کیا گیا عمدہ مقالہ؛ (۶) ملت، چلپی: (طبع) Islamic Law and Finamce، لنڈن، ۱۹۸۸ء۔ خصوصاً ملائیشیا اور ترکی کے بارے میں موجب دلچسپی (۷) Meyer, Ann Elizabeth : Islamic Banking and Credit Policies in the Social The : Origins of Islamic Banking ind Egypt. Sadat Era Arab Law Quarterly، (لنڈن) ۱ءا (نومبر ۱۹۸۵ء): ص، ۳۲، ۵۰۔ حصہ لینے والے اصحاب کے انٹرویوز پر مبنی عمدہ محققانہ مقالہ؛ (۸) Presley, John : (طبع) Directory of Islamic Financial Institutions، لنڈن، ۱۹۸۸ء۔ مفید حوالہ جاتی تالیف۔ شیرازی، (۹) حبیب: Islamic Banking، لنڈن، ۱۹۹۰ء ایران میں اسلامی مالیاتی اقدامات کے قانونی پہلو [پر بحث کی گئی ہے] (۱۰) صدیقی، محمد نجات اللہ: Muslim Economic Thinking، لیسسٹر، ۱۹۸۱ء، اس موضوع پر معاصر لٹریچر کا جائزہ [پیش کیا گیا] (۱۱) وہی مصنف اللہ: Partnership and Profit Sharing in Islamic Law، لیسٹر، ۱۹۸۵ء ۔ معاہدات اور کاروباری ذمہ داریوں سے بحث کی گئی ہے۔ Wlson,Rodney : Theory and Practice : Islamic Business، لنڈن، ۱۹۸۵ء؛ (۱۲) Wilson Rodney : Islamic Financial Markets، لنڈن، ۱۹۹۰ء ۔ کویت، ایران، اُردن، پاکستان اور ترکی میں اسلامی بینکاری کے تجربات [کا احوال بیان کیا گیا ہے۔] (۱۳) Wilson Rodney : "Islamic Financial Instruments"، Arab Law Quarterly (لنڈن) ۲ء ۲ (اپریل ۱۹۹۱ء) : ص: ۲۰۵۔ ۲۱۴۔ اسلامی تمسکات، ڈیپازٹ سرٹیفکیٹس اور معدلت یا (Equities) پر بحث کی گئی ہے۔ (۱۴) مقالہ Redney wilson : Islamic Banking: در The Encyciopaedia of Modrn Islamic، بذیل مادہ۔

(ادارہ ۔ت ظفر احمد [ن: عبدالودود خان])

••------------••

⊗ تعلیقہ اسلامک بنکنگ کا فروغ اور سود کا خاتمہ:
قرآنی الفاظ میں سود کو ختم کرنا اللہ سے ڈر کی علامت اور ایمان کی شرط ہے اور اسے جاری رکھنے پر اللہ اور رسولؐ کی طرف سے جنگ کی وعید ہے، پھر بھی تمام مسلم ممالک میں سعودی نظام بلا روک ٹوک جاری ہے جو کہ انتہائی افسوسناک امر ہے۔

سید قطب شہید نے اپنی کتاب فی ظلال القرآن میں لکھا ہے "یہ امر ناممکن اور محال ہے کہ ایمان اور سودی نظام ایک جگہ جمع ہوں۔ اس معاشرہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا تصور ہی ممکن نہیں جو معاشرہ سودی نظام پر چل رہا ہو۔" لہٰذا امت مسلمہ کے لیے فلاح کی راہ پانے کے لیے اوّلین لازمی اقدام سود کا خاتمہ ہے۔

۱۹۷۴ء میں لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس میں مسلم ممالک میں اسلامی اصولوں پر مبنی اقتصادی ترقی اور ان کے مابین اقتصادی تعاون کو فروغ دینے پر اتفاق ہوا اور ۱۹۷۵ء میں جدہ میں اسلامک ڈیویلپمنٹ بنک قائم کیا گیا۔ فروری ۱۹۷۶ء میں مکہ مکرمہ میں اسلامی اقتصادیات (Islamic Economics) پر پہلی بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں روایتی سودی بنکنگ کے متبادل کے طور پر غیر سودی بنکنگ نظام کے قیام کی ضرورت اور اہمیت اجاگر کی گئی۔ کانفرنس کے اختتامی اعلامیہ میں سفارش کی گئی کہ مسلم ممالک اپنے قوانین اور اقتصادی و معاشرتی اداروں کو شریعت اسلامی کے مطابق ڈھالیں۔ تاہم ابھی تک کسی مسلم ملک میں روایتی سودی بنکنگ کے متبادل کے طور پر غیر سودی بنکنگ نظام قائم نہیں ہوا۔ البتہ دو سو سے زائد ایسے 'اسلامی بینک" قائم ہوگئے جو مسلمانوں کے اسلامی جذبہ کے باعث ستر (۷۰) ممالک میں خوب پھل پھول رہے ہیں اور روایتی سودی بنکوں کے متوازی کام کر رہے ہیں۔

روایتی سودی بنکوں کو ان سے کوئی خطرہ نہیں کیونکہ یہ سودی بنکوں کا متبادل نہیں۔ قرض کی فراہمی ان کے دائرہ کار سے خارج ہے جو روایتی سودی بنکنگ کا بنیادی کام ہے یہ نہ کسی کو بلا سود قرض دیتے ہیں اور نہ مسلم حکومتوں کو قرض دیتے ہیں جو بوقت ضرورت سودی قرض لیتی ہیں۔ مفتی تقی عثمانی (جو تقریباً ایک درجن اسلامک بنکوں کے شرعی بورڈز کے ممبر یا چیئرمین ہیں) اپنی تصنیف (Introduction to Islamic Finace) میں لکھتے ہیں کہ اسلامک بنک اپنی قلیل المدتی مالیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے روایتی بنکوں سے رجوع کرتے ہیں جو وہ کھلے یا مخفی سود کے بغیر مہیا نہیں کرتے۔" ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا اپنی تصنیف "حرمت سود" میں لکھتے ہیں: "ان بنکوں کو اپنے فاضل نقد کو نفع بخش طریقہ پر مختصر مدت کے لیے استعمال کرنے کی کوئی سبیل نہیں اور انہیں روایتی مال منڈی میں جانا پڑتا ہے جس کی وجہ سے ان پر تنقید ہوتی ہے۔ اسی طرح نقد کی تنگی کی صورت میں ضروری نقد تک رسائی میں بھی مشکل پیش آتی ہے۔" مالیاتی منڈی میں فاضل نقد پر سود کمایا جاتا ہے۔ جو تنقید کا باعث ہے، بلاسود قرض جاری کرنے کا طریقہ کار اختیار کرنے سے اسلامی بنک سود کے لین دین سے بچ سکتے ہیں۔

۱۹۹۸ء میں ایٹمی دھماکہ کے بعد اشد ضرورت کے وقت پاکستان کی درخواست پر "اسلامک ڈیویلپمنٹ بنک" اور چند دوسرے اسلامی بنکوں نے مل کر جو پیشکش کی وہ Libor سے ۵ فیصد زائد شرح سود پر قرض تھا۔ مندرجہ بالا حقائق سے ثابت ہوا کہ موجودہ شکل میں اسلامی بنک بدستور سودی بینکنگ میں مصروف ہیں۔

روایتی سودی بنکنگ کو فروغ اس لیے ملا کہ یہ وسیع پیمانہ پر قرض مہیا کرتا ہے جو انسان کی ناگزیر ضرورت

ہے۔ اسلامی بنک قرض مہیا نہیں کرتے، حالانکہ اسلام میں قرض کی ترغیب ہے۔ حدیث قدسی ہے کہ قرض کا اجر اٹھارہ گنا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام معاشرہ میں وسیع پیمانہ پر قرض کا استعمال چاہتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قرض لیا ہے۔ متعدد صحابہ کرامؓ نے تجارت کے لیے قرض لیا ہے اور امام ابوحنیفہؒ نے قرض کی رقم سے تجارت کی ہے، لہٰذا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ قرض کو ناپسندیدہ شے قرار دے اور اسے اسلامک بنکنگ سے خارج رکھنے کی سفارش کرے یا بلاسود قرض پر مبنی معیشت کی مذمت کرے۔ اس لیے ''اسلامی بنک'' چلانے والوں کو مسلم امہ کو سود سے نجات دلانے کی فکر کرنی چاہیے۔

چونکہ سود قرض مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اس کا اسلامی متبادل صرف اور صرف بلاسود قرض مہیا کرنے کا ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔ جس کی اسلام ترغیب بھی دیتا ہے۔ مضاربہ، مشارکہ یا نفع نقصان میں شرکت کو سود کا اسلامی متبادل قرار دینا غلط ہے، اولاً اس لیے کہ یہ قبل از اسلام رائج تھے۔ اسلام نے نہ ان کا حکم دیا اور نہ ترغیب دی۔ صرف اجازت دی ہے، ثانیاً اس لیے کہ بہت سے طبقے ان کے ذریعہ اپنی وقتی مالیاتی ضرورتیں پوری نہیں کر سکتے جو سود کے ذریعہ پوری ہوتی ہیں، مثلاً ایسے تجارتی و صنعتی ادارے جو دخل اندازی کے روا دار نہیں یا جن کے حساب کتاب بنک کے لیے قابل اعتماد نہیں اور وہ فلاحی اور سرکاری ادارے جو نفع نہیں کماتے مشارکہ و مضاربہ اور نفع نقصان میں شرکت سے مستفید نہیں ہوسکتے اور شریعت کے مطابق ان کی وقتی مالیاتی ضرورتیں صرف بلا سود قرض سے پوری ہوسکتی ہیں، لہٰذا اسلامک بنکنگ کے لیے بلا سود قرض دینے کا نظام درکار ہے۔

مرحوم پروفیسر شیخ محمود احمدؒ نے طویل غور و فکر کے بعد سود کا اسلامی متبادل ایجاد کر لیا جسے انہوں نے TMCL کا نام دیا۔ اس کے ذریعہ وسیع پیمانہ پر بلاسود قرضوں کی فراہمی کے علاوہ وہ سب خدمات بھی انجام دی سکتی ہیں جو روایتی بنکنگ میں سود کے ذریعہ انجام دی جاتی ہیں۔ (دیکھیے شیخ محمود احمد: سود کے متبادل کی تلاش، مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور)۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی مقرر کردہ اعلیٰ اقتصادی ماہرین اور تجربہ سینئر بنکاروں کے ۱۷ رکنی پینل نے اپنی جنوری ۱۹۸۰ء کی رپورٹ میں TMCL کی افادیت کو تسلیم کیا اور اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ مورخہ ۱۵ جون ۱۹۸۰ء میں اس پر کوئی شرعی اعتراض نہیں کیا گیا۔ سپریم کورٹ ایلپٹ بنچ کے ریمارکس کے فیصلے میں جو مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء میں ہوا TMCL پر مبنی غیر سودی بنکنگ کا بلا کسی اعتراض کے ذکر کیا گیا ہے۔

TMCL دراصل Time Multiple Counter کا مخفف ہے یہ بیک وقت دو فریقوں میں دو بلا سود قرضوں کا تبادلہ ہے جس میں ایک قرض کی بڑی رقم اور چھوٹی مدت کا حاصل ضرب دوسرے قرض کی چھوٹی رقم اور لمبی مدت کے حاصل ضرب کے برابر ہوتا ہے، مثلاً کسی تاجر کو اگر دس لاکھ روپیہ کا قرض ایک سال کے لیے درکار ہے تو وہ بنک کو ایک لاکھ روپیہ دس سال کے لیے قرض دے کر مطلوبہ قرض لے سکتا ہے۔ تاجر بنک کو دس لاکھ روپیہ ایک سال بعد اور بنک تاجر کو ایک لاکھ روپیہ دس سال بعد واپس کرے گا۔ تاجر سے لی ہوئی قرض کی رقم کو بنک دس سال تک منافع بخش کاروبار میں لگا کر اپنے حصہ داروں اور کھاتہ داروں کے لیے نفع کمائے گا۔ اس طرح TMCL کے ذریعہ تاجر اور بنک دونوں مستفید ہوں گے اور ایک دوسرے کی ضرورت پورا کرنے کے علاوہ سود ختم کرنے کا ذریعہ

ہونے اور حدیث قدسی پر عمل کرنے کا اجر و ثواب بھی حاصل کریں گے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مقالہ نگار کی کتاب "Interest free Banking".

(عبدالودود خان)

••-------------••

※ بیگی، موسیٰ جاراللہ: (۱۸۷۴ء۔ ۱۹۶۹ء)، روسی وسط ایشیا کا ایک عالم دین اور مسلم فلسفی۔ وہ ۲۴ ستمبر ۱۸۷۴ء کو رستاف (Rostov) میں پیدا ہوا۔ اس کے والد ملا یاراللہ دیلکم پینزا جبرنیا (Penza Ghbernia) کے گاؤں کیکن (Kikine) کے رہنے والے تھے اور اس کی والدہ فاطمہ اسی گاؤں کے امام حبیب اللہ کی صاحبزادی تھیں، اس نے قازان کے مدرسہ کو لیو میں داخلہ لیا لیکن وہاں تعلیم مکمل کیے بغیر رستاف واپس آگیا اور روسی سائنس کالج میں داخلہ لے لیا، یہاں سے اس نے ۱۸۹۵ء میں گریجویشن کیا اور دینی تعلیم کی تکمیل کے لیے بخارا چلا گیا، چار سال بعد وہ رستاف واپس آیا، لیکن مزید دینی تعلیم کے لیے اب اس نے مشرق وسطٰی کا رخ کیا۔

استانبول سے ہوتے ہوے وہ قاہرہ پہنچا اور جامعہ ازہر میں داخلہ لے لیا۔ اس نے شیخ محمد عبدہ سے بھی استفادہ کیا۔ چار سال تک فقہ، علم کلام اور فلسفہ کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ رستاف واپس چلا گیا اور شادی کرلی، لیکن ملازمت وغیرہ کر کے عملی زندگی گزارنے کی بجائے اس نے اپنی بیوی اسماء کو اپنی ماں کے پاس چھوڑا اور قانون پڑھنے کے لیے سینٹ پیٹرز برگ چلا گیا تاکہ وہ اسلامی فقہ کا مغربی قانون سے تقابلی مطالعہ کر سکے۔ سینٹ پیٹرز برگ میں اپنے قیام کے دوران (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۱۷ء) میں اسے روسی معاشرے کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ یہیں اسے سیاست سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اسلام کے ایک سیاسی قوت ہونے کا احساس پیدا ہوا، تاہم وہ عملی سیاست میں ملوث نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ اس نے مسلم کانگرس کے سیکرٹری کے طور پر کام کیا اور پان اسلام کے علمبردار جریدے الفت میں اس نے کئی مضامین لکھے، اور پہلے کی طرح علمی اور تحقیقی کاموں میں مصروف رہا۔ ۱۹۱۰ء۔۱۹۱۱ء میں وہ اوزن برگ کے مدرسہ خوسانیہ میں عربی، اسلامی تاریخ اور عقائد پڑھتا رہا، بحثیت ایک محقق و معلم وہ نہ صرف اجتہاد کا قائل تھا بلکہ اس پر کاربند بھی تھا لیکن اس کی آراء روایتی اسلام سے اتنی دور تھیں کہ رضا الدین فخرالدین جیسے بارسوخ عالم کی حمایت کے باوجود روایتی مذہبی حلقے کی مخالفت نے اسے برگ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

۱۹۱۷ء کے بالشویک انقلاب سے اس نے یہ امید باندھ لی کہ اس سے مسلمانوں کو کچھ آزادی کا سانس لینا نصیب ہوگا، لیکن جلد ہی اسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے بکارن کی "ABC Communism" کی طرز پر "*ABC of Islam*" لکھی اور (UFA) کے دانشوروں کی ایک کانگریس میں پیش کی، یہ دستاویز ۲۳۶ نکات پر مشتمل تھی، جس میں ۶۸ روسی مسلمانوں سے متعلق تھے اور باقی دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے بارے میں حکومت نے فوری ردعمل ظاہر کیا اور بیگی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا، تاہم فن لینڈ اور ترکی میں اس کے حق میں اخباری مہم چلائی گئی جس کے نتیجے میں حکومت نے تین ماہ بعد اسے رہا کر دیا۔ ان حالات کے باوجود نے بیگی نے روس میں قیام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ۱۹۲۶ء میں ہونے والی مسلم کانگریس میں اپنے ملک کی نمائندگی کی، اگلے سال اسے حج کی اجازت دے دی گئی اور وہ حج کے بعد دوبارہ روس لوٹ گیا کیونکہ وہ اب تک یہ سمجھتا تھا کہ وہ وہاں رہ کر مسلم ثقافتی ورثے کو بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ کردار ادا کر سکتا ہے۔

۱۹۳۰ء میں بیگی جیسا خوش گمان شخص بھی روس میں مسلمانوں کے مستقبل سے مایوس ہوگیا، وہ اس حالت میں وہاں سے فرار ہوا کہ اس کی بیوی اور چھ بچے وہیں رہ گئے۔ وہ چین، ترکستان اور افغانستان سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ ۱۹۳۱ء کا سال اس نے مصر اور فن لینڈ میں گزارا اور ۱۹۳۲ء میں ترکی تاریخ پر انقرہ میں منعقدہ ہونے والی پہلی کانگریس میں شرکت کی۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۷ء تک کا عرصہ اس نے فن لینڈ، جرمنی اور مشرق وسطیٰ میں گزارا۔ ۱۹۳۸ء میں اس نے چین اور جاپان کا سفر کیا، ۱۹۳۹ء میں وہ ہندوستان سے ہوتا ہوا افغانستان پہنچا اور وہاں مستقل رہائش کا ارادہ کیا، لیکن انگریزوں نے اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا، اٹھارہ ماہ بعد اسے رہائی ملی تو وہ ناچار ہندوستان لوٹ آیا۔ یہاں وہ ۱۹۴۷ء تک مقیم رہا اور پھر مصر چلا گیا۔ وہیں ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو کسمپرسی کی حالت میں اس کا انتقال ہوگیا۔

موسیٰ جاراللہ نے ۱۲۲ تصنیفات یادگار چھوڑیں، ان میں سے اکثر عربی میں ہیں اور عقائد و فقہ کے موضوع پر ہیں، اس کی بعض کتابیں تاتاری زبان میں بھی ہیں جو روسی مسلمانوں کی دینی، سیاسی اور سماجی حالات وغیرہ پر ہیں۔ اس کے اکثر علمی کاموں سے اس کے مجتہدانہ ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ شرح اللزومیات (قازان ۱۹۰۷ء) میں، جو دسویں صدی ہجری کے فلسفی شاعر ابوالعلاء معری کی بعض آرا کی شرح ہے، اس نے المعری کے فلسفہ تشکیک کی حمایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ موجودہ ادیان میں سے کوئی بھی اللہ کا پسندیدہ نہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک میں کسی نہ کسی رنگ میں تشدد کی حمایت موجود ہے۔

ایسی ہی ایک رائے کا اظہار اس نے اپنی کتاب "رحمت الٰہی کی طغیانی" (*Rahmat-i- Ilahiya Burhannari*) (اورن برگ ۱۹۱۰ء) میں کیا ہے اور اس روایتی عقیدے کی کہ "اللہ کی رحمت و عفو صرف مومنوں کے لیے ہے۔" مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اللہ کی رحمت و عفو مومن، غیر مومن سب کے لیے ہے، بیگی کے ان خیالات کی نہ صرف روایتی علما نے مخالفت کی (دیکھیے اس نقطہ نظر کی حامل کتاب دین اور زندگی (Din va Magishat) بلکہ معتدل اور جدید دانشوروں نے بھی اس کی مخالفت کی۔ مؤخرالذکر طبقے میں اسماعیل گسپرالی نے اس کے خلاف زور دار سلسلہ مضامین "فلسفے کے حوالے سے دین دشمنی" کے عنوان سے شروع کیا۔ فخرالدین ان معدود چند آدمیوں میں سے تھا۔ جنھوں نے بیگی کے نقطہ نظر کا دفاع کیا لیکن اس نے بھی معاملے کو صرف تاریخی تناظر میں سے دیکھا (رکّ بہ Gasprinskii, Jadidism).

ایک دفعہ بیگی نے ایک چھپے ہوئے قرآنی نسخے میں بعض اغلاط دیکھیں تو اپنی کتاب: تاریخ القرآن والمصاحف میں اس کے ذمہ دار علماء پر اس نے سخت تنقید کی اور انہیں ان کی جہالت قرار دیا۔ وہ تاتاری زبان میں قرآن حکیم کے ترجمے کی بھی حمایت کرتا تھا اور اس کی رائے تھی کہ اس سے مقامی مسلمانوں کی دین سے شعوری وابستگی میں اضافہ ہوگا، اس کے نزدیک مسلم معاشرے کی یہ ذمہ داری تھی کہ مقامی زبانوں میں قرآن حکیم کے ترجمے کا اہتمام کیا جاے اور ان کی درستگی اور اغلاط سے مبرا ہونے کا بھی انتظام کیا جاے، وہ خود تاتاری زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ شروع کر چکا تھا، لیکن روس سے اس کے فرار کے بعد وہ سارا کام غالبًا ضائع ہوگیا۔

بیگی نے اسلام میں عورت کے مقام (خاتون، حقوق النساء فی الاسلام، Aila Masalalar)، سنت و شریعت (کتاب السنۃ، بھوپال، ۱۹۴۵ء Shariat Esaslari ، سینٹ پیٹرز برگ، ۱۹۱۶ء)اور روسی مسلمانوں کی سماجی و سیاسی

زندگی (Islahat Esaslari) ، سینٹ پیٹرز برگ، ۱۹۱۶ء؛Khalq Nazaeinda Bir Nica Masale، قازان، ۱۹۱۲ء) وغیرہ کتب تالیف کیں۔ اس کی مجتہدانہ تحریروں میں سے دو اہم ہیں ایک Uzun Kunlarde Ruza طویل دنوں میں رمضان کے روزوں کے بارے میں ہے، جس میں بیگی نے قطب شمالی کے قریب علاقوں میں، جہاں دن رات دیگر اسلامی ممالک سے طویل تر ہوتے ہیں، روزے رکھنے کے بارے میں روایتی دینی فکر پر سخت تنقید کی ہے، دوسری کتاب Buyuk Mevzularda Ufak Fikirlar (اہم مسائل پر چند طالب علمانہ گزارشات) میں تصوف اور صوفی سلاسل کے مخالفین پر تنقید کی گئی ہے وہ نہ صرف تصوف اور صوفی سلاسل کا حامی تھا، بلکہ عیسائیت کے سری اور رہبانی نظریات میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔

اپنے وسیع علم اور تحقیقی رجحانات میں مجتہدانہ بصیرت رکھنے کے باوجود بیگی کے علمی اثرات نہ تو روس کی مسلم فکر پر نمایاں نظر آتے ہیں نہ کہیں اور اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ۱۹۱۷ء کے کمیونسٹ انقلاب کے بعد روس میں اسلامی علوم کی درس و تدریس پر پابندی لگا دی گئی۔ لہٰذا بیگی کی فکر عام نہ ہو سکی۔ دوسرے یہ کہ جلاوطنی اختیار کرنے کے بعد وہ کسی بھی جگہ جم کر نہ بیٹھ سکا۔ وہ جہاں بھی گیا بحیثیت ایک سکالر کے اس کی عزت تو ہوئی لیکن کسی بھی مسلم ملک میں وہ اپنی فکر کے بیج نہ بو سکا۔

مآخذ: نائلہ بنارک : موسیٰ یار اللہ بیگی قازان، ۱۶ (۱۹۷۵ء) ص: ۲۷۔ ۲۹؛ (۲) Kazan : Akdesn. Kurat AnKara ، Turklerin in Medeni Oyanis Devri ، Universitesi Dil Tarih Cografya Fakvltesi Dergisi ۳۔۴ (۱۹۶۶ء) میں ۹۴۔ ۱۹۶؛ (۳) Azade Ayse The Volga Tatars National : A Profile in: Rorlieh Resiliecf ، سٹنفورڈ، ۱۹۸۶ء میں ۵۳۔ ۶۱؛ (۴) Uralgiray Uzun Gunlerde Oruc : Y. Filozof Musa Carrlai Bigi Ictihad Kitabi ، انقرہ، ۱۹۷۵ء۔

[ت: محمد امین] Azade- Ayse Rorlich)

••------------••

※ بی بی آقا: رک بہ الجونپوری

••------------••

⊗ بیون۔ اے اے (Beven. A.A):ایک معروف برطانوی مستشرق (۱۸۵۹ء۔۱۹۳۳ء)، اس کی پیدائش ۱۸۵۹ء میں ٹرینٹ پارک میں ہوئی، ابتدائی تعلیم و تربیت لوزاں نامی قصبے میں پائی۔ اس زمانے میں مغربی ممالک میں استشراق کی تحریک عروج پر تھی، اور اس میدان کو بڑی ترجیح دی جاتی تھی، اسی لیے نوجوان بیون کو بھی اسی شعبے سے وابستگی کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نے اس دور کے مشہور ترین مستشرق ، پروفیسر نولڈیکی [رک باں] سے علوم شرقیہ میں تربیت حاصل کی اور اس مستشرق کی نگرانی میں جامعہ کیمبرج میں السنہ سامیہ کے اعلیٰ امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ۱۸۸۲ء میں عبرانی زبان میں انعامی وظیفہ اور انعام حاصل کیا۔

فراغت کے بعد انگلستان ہی کے معروف تعلیمی ادارے ٹرینی کالج میں مشرقی زبانوں کا لیکچرر مقرر کیا گیا، اور لارڈمونر کا لقب ملا۔۔۔ بعدازاں ۱۸۹۳ء۔ ۱۹۳۳ء یعنی اپنی وفات تک کیمبرج میں عربی زبان کے پروفیسر مقرر ہوا، اس دوران میں وہ ٹرینی کالج کا بھی فیلو رہا۔

پروفیسر بیون (Beven) علم کے فدائی، ریسرچ کے دلدادہ، مجرد اور کم گو انسان ہونے کی وجہ سے منفرد تھے، تعلیم کے اوقات میں وہ مطالعے میں منہمک رہتے، یونیورسٹی کے ہنگاموں میں وہ بہت کم حصہ لیتے تھے، سابق صدر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مولوی محمد

شفیع، براہ راست ان کے شاگرد تھے، انہوں نے اپنے استاد محترم کے متعلق لکھا ہے: "پروفیسر بیون کم سخن، کم آمیز اور کوتاہ قلم بزرگ تھے، کلاسیکی دور کی عربی میں ان کی نمایاں فضیلت مسلم تھی، تجرد میں ساری عمر گزار دی۔ ٹرینی کالج کے پہلے صحن کے بالاخانے میں مقیم تھے، وقت کے اس قدر پابند کہ تین برس میں صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جب کلاک نے لیکچر کا گھنٹہ بجایا تو وہ کمرے کے اندر نہ تھے، مگر جب میں ان کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ سیڑھی سے اوپر آئے، وہ اور میں اکٹھے کمرے میں داخل ہوے، جس کمرے میں وہ لیکچر دیتے تھے اس کے پاس ہی دوسرے کمرے میں ان کی لائبریری تھی۔ اثناے درس میں حوالے کی کتابیں وہ اٹھ اٹھ کر اپنی لائبریری سے لاتے اور مطلوبہ حوالہ جات کو میرے سامنے رکھتے، میں یادداشت میں لکھ لیتا تو کتاب لے جا کر اس کی جگہ رکھ آتے، اس پر بعض اوقات ایک گھنٹے میں شاید دس بیس مرتبہ چکر لگانا پڑتا، مگر وہ اس زحمت کی کچھ پروا نہ کرتے۔ ان کی آرا جچی تلی اور مستند ہوتی تھیں۔ بے سند یا مبالغہ آمیز باتوں سے انہیں کامل احتراز تھا۔ نقائض جریر و فرزدق کی کتاب جیسی سنگلاخ اور ضخیم کتاب کی تصحیح انہوں نے کمال علمی سے کی اور اپنے سے اسے تین جلدوں میں شائع کیا، اس خیال سے کہ میں اس سے استفادہ کر سکوں پوری کتاب کا نسخہ مجھے عنایت فرمایا: (مقالات علمی و دینی، ۲/ ۱۴۴)۔ مولوی محمد شفیع مرحوم نے اے اے بیون کی نگرانی میں عقدالفرید کا اشاریہ مدون کیا جو کہ ایک منفرد نوعیت کا علمی کام ہے۔ وہ ان سے بے حد متاثر تھے، پروفیسر بیون نے درج ذیل کتب تالیف کیں:

۱۔ فہرس الامالی لابی علی القالی، پروفیسر ایف کرنکوف (F. Krenkov) کی معاونت کے ساتھ، (لنڈن ۱۹۱۳ء)؛ ۲۔ فہارس المفضلیات (مطبوعہ ۱۹۲۴ء)؛ (۳) اعتقاد اوائل المسلمین فی الحیاہ الاخری؛ (۴) الاسراء والمعراج (۱۹۱۴ء)؛ (۵) المھون فی بعض اجزاء من القرآن؛ (۶) طبقات الشعراء، لابن سلام الجمعی (مطبوعہ ۱۹۳۵ء) (۷) قواعد اللغۃ العربیہ، ۱۹۲۲ء؛ (۸) انمح الدراسۃ العالمیہ، والتعلیق علی کتاب دانیال (۱۸۹۲ء) (۹) مقدس توملی: نشید الارواح (عبرانی سے انگریزی میں ترجمہ، کیمبرج) ۱۸۹۷ء؛ (۱۰) نقائض جریر و فرزدق، ۳ جلدیں، اس کتاب کی تصحیح میں پروفیسر بیون نے بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے (مطبوعہ لائیڈن، ۱۹۰۵ء، ۱۹۰۷ء) (دیکھیے المستشرقون، ۲: ۵۱۰)۔

ان کے علاوہ اس نے (Encyclopaedia of Religion and Ethics, Encyclopaedia of Islam)، لائیڈن کے لیے متعدد مقالات بھی لکھے، ان کی ژرف نگاہی کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے۔ جو مولوی محمد شفیع [رک بآں] نے اپنے استاد پروفیسر براؤن سے روایت کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ایک دن میں جب اپنے استاد بیون سے ملنے گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ بڑے غمزدہ بیٹھے ہیں، جب میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ انہوں نے النقائض (نقائض جریر و فرزدق) کی طباعت کے بعد یہ محسوس کیا ہے کہ انہوں میں ایک شعر کا وزن غلط چھپ گیا ہے (مقالات: مولوی محمد شفیع ۲/۱۴۴)، الغرض وہ بہت ہی علمی شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا۔

مآخذ: نجیب اللہ العقیقی: المستشرقون، ۲/ ۵۰۱؛ ۲۰)؛ (۲) ارمغان علمی، ص: xxix؛ (۳) ڈاکٹر مولوی محمد شفیع: مقالات علمی و دینی، ۲: ۱۴۴۔

(محمود الحسن عارف)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

تکملہ جلد دوم

Supplement

Urdu Encyclopaedia of Islam

Under the Auspices

of

The University of The Punjab Lahore
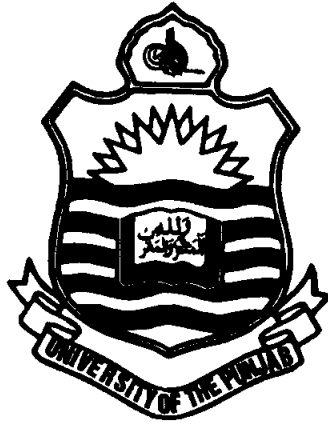
Chief Editor:

Professor Dr.Mahmood-ul-Hassan Arif

(Volume 2)

(Afranj······A.A Beven)

1429/2008

Department of Urdu Encyclopaedia of Islam Punjab University, Lahore